جلد اوّل

ہادیِ عالم ﷺ کی سیرت سے ماخوذ، عصرِ حاضر کے
تقاضوں سے ہم آہنگ دروس وعِبر اور فوائد وثمرات

سیرت النبی ﷺ



دارالسلام
DARUSSALAM

دکتور علی محمد صلابی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کے نام سے شروع جو نہایت رحم کرنے والا خوب مہربان ہے۔

مدحت النبی صلی اللہ علیہ وسلم

وأحسن منك لم تر قط عيني
وأجمل منك لم تلد النساء
خلقت مبرأ من كل عيب
كأنك قد خلقت كما تشاء

اور آپ کی ذاتِ اقدس سے زیادہ حسین میری نگاہ نے کبھی کوئی دیکھا ہی نہیں
اور آپ سے زیادہ حسن و جمال والا کبھی کسی ماں نے جنا ہی نہیں
آپ ہر قسم کے عیب سے پاک صاف پیدا کیے گئے ہیں
گویا آپ کی ذاتِ اقدس کو آپ کے منشا کے عین مطابق بنایا گیا ہے

ہادی عالم ﷺ کی سیرت سے ماخوذ، عصر حاضر
کے تقاضوں سے ہم آہنگ دروس و عبر اور فوائد و ثمرات

سیرت النبی ﷺ

1

© مكتبة دار السلام، ١٤٣٣ هـ
فهرسة مكتبة الملك فهد الوطنية أثناء النشر
الصلابي، علي محمد
سيرة النبي صلى الله عليه وسلم / علي محمد الصلابي - الرياض، ١٤٣٣ هـ
ص: ٦٧٠ مقاس: ٢١×١٤ سم
ردمك: ٨-٠٩١-٥٠٠-٦٠٣-٩٧٨ (مجموعة)
٥-٠٩٢-٥٠٠-٦٠٣-٩٧٨ (ج ١) (النص باللغة الاردية)
١. السيرة النبوية أ. العنوان
ديوي ٢٣٩ ١٤٣٣/٢٧٦٣
رقم الإيداع: ١٤٣٣/٢٧٦٣
ردمك: ٨-٠٩١-٥٠٠-٦٠٣-٩٧٨ (مجموعة)
٧-٠٥٦-٥٠٠-٦٠٣-٩٧٨ (ج ١)

سعودی عرب (ہیڈ آفس)

شاہ عبدالعزیز بن جلاوی سٹریٹ پوسٹ بکس: 22743 الریاض: 11416 سعودی عرب
فون: 4033962-4043432 1 00966 فیکس: 4021659 www.darussalamksa.com
Email: darussalam@awalnet.net.sa info@darussalamksa.com

الریاض • فون: 4614483 1 00966 فیکس: 4644945 • فون: 4735220 1 00966 فیکس: 4735221
• فون: 4286641 1 00966 • فون/فیکس: 2860422 1 00966
جدہ فون: 6879254 2 00966 فیکس: 6336270 مدینہ منورہ فون: 8234446,8230038 4 00966 فیکس: 8151121 04
الخبر فون: 8692900 3 00966 فیکس: 8691551 3 00966 خمیس مشیط فون/فیکس: 2207055 7 00966
ینبع البحر فون: 0500887341 فیکس: 8691551 قصیم (بریدہ) فون: 0503417156 فیکس: 3696124 6 00966

امریکہ • نیویارک فون: 5925 625 718 001 • : 0419 722 713 001 کینیڈا • فون: 4186619 416 001
لندن • فون: 77252246 20 0044-85394885 20 0044 • : 7739309 0121 0044
متحدہ عرب امارات • فون: 5632623 6 00971 فیکس: 5632624 فرانس فون: 52928 480 01 0033 فیکس: 52997 480 01 0033
انڈیا • فون: 45566249 44 0091 موبائل: 12041 98841 0091 • فون: 4180 2373 22 0091
• فون: 4892 2451 40 0091 موبائل: 30850 98493 0091 • فون: 42157847 44 0091
سری لنکا • فون: 358712 115 0094 • فون: 2669197 114 0094

پاکستان ہیڈ آفس و مرکزی شوروم

لاہور 36- لوئر مال، سیکرٹریٹ سٹاپ لاہور فون: 00 4 32 372,24 400 372,34 240 373 42 0092 فیکس: 72 540 373 042
• غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور فون: 54 200 371 42 0092 فیکس: 03 207 373 042
• Y بلاک، کول کمرشل مارکیٹ، دکان: 2 (گراؤنڈ فلور) ڈیفنس، لاہور فون: 10 926 356 42 0092

کراچی مین طارق روڈ، ڈاکٹر ہسپتال سے (بہادر آباد کی طرف) دوسری گلی کراچی فون: 36 939 343 21 0092 فیکس: 37 939 343 21 0092

اسلام آباد F-8 مرکز، اسلام آباد فون/فیکس: 13 815 22 51 0092

ہادیِ عالم ﷺ کی سیرت سے ماخوذ، عصرِ حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ دروس و عِبر اور فوائد و ثمرات

سیرۃ النبی ﷺ

تالیف:

دکتور علی محمد صلابی

مترجمین:

مولانا محمد یونس بٹ

مولانا محمد ادریس سلفی

مولانا محمد ندیم شہباز

دارالسلام
DARUSSALAM

اللهم صل على
محمد ﷺ
وعلى آل محمد كما صليت على ابراهيم
وعلى آل ابراهيم انك حميد مجيد
اللهم بارك على محمد وعلى آل محمد
كما باركت على ابراهيم وعلى آل ابراهيم
انك حميد مجيد

فہرست (جلد اول)

حصہ 2: | ولادت باسعادت تا بعثت نبوی

حصہ 6: ہجرت حبشہ، سفرِ طائف اور معراج

حصہ 7: دعوت اسلام اور صحابہ کی ہجرت مدینہ

اجمالی فہرست ونقشہ جات

عرضِ ناشر

سیرت نگاری کے مختلف اسالیب میں ایک اسلوب وہ ہے جس میں واقعاتِ سیرت کا احاطہ تو کیا ہی جاتا ہے، اس کے ساتھ واقعاتِ سیرت پر تدبر کرنے کے بعد جو اہم نکات اور احکام و مسائل معلوم ہوتے ہیں، سیرت نگاری کے اِس منفرد اسلوب میں اُن اہم نکات کو بھی مناسب جگہ دی جاتی ہے۔ اصطلاح میں کتابِ سیرت کے ایسے طرزِ نگارش کو فقہُ سیرت نگاری کہا جاتا ہے۔ فقہُ سیرت نگاری کی داغ بیل یوں تو ابتدائی زمانے کے محدثین نے ڈالی۔ بالخصوص امام بخاری، امام ترمذی اور امام نسائی رحمہم اللہ نے کتبِ حدیث میں احادیث جمع کرنے کے علاوہ اُن سے معلوم ہونے والے احکامات اور اہم نکات بھی بیان کیے، تاہم خاص فنِ سیرت میں فقہُ سیرت نگاری کی تدوین کا سہرا غالباً امام ابن قیم رحمہ اللہ کے سر ہے۔ امام ابن قیم، آٹھویں صدی ہجری میں کتاب و سنت کے عظیم شارح، بڑے پایے کے محدث، مورخ، فقیہ و مفسر اور بہت بڑے عالمِ دین تھے۔ فقہُ سیرت پر انھوں نے زادالمعاد کے عنوان سے ایک کتاب تحریر فرمائی جسے شہرت دوام حاصل ہوئی۔ امام ابن قیم کے بعد جن سیرت نگاروں نے فقہُ سیرت پر قلم اٹھایا وہ زیادہ تر زادالمعاد ہی کے مرہونِ منت ہوئے۔

کتبِ حدیث میں جس طرح فقۂ سیرت کے ذریعے سیرت کے موضوع کو موجودہ دور سے ہم آہنگ کرنا اہمیت کا حامل ہے، اسی طرح سیرت النبی ﷺ سے متعلقہ روایات کی استنادی حیثیت کی جانچ پرکھ بھی نمایاں اہمیت رکھتی ہے۔

معاصر سیرت نگاروں میں جن اصحابِ علم وفضل نے فقۂ سیرت کو اپنا موضوعِ تحریر قرار دیا اُن میں معروف مصری عالم ومصنف محمد غزالی اور مشہور شامی سیرت نگار ڈاکٹر محمد سعید رمضان بوطی کے نام نمایاں ہیں۔ ان دونوں حضرات کا کام اپنی جگہ بے حد اہمیت کا حامل ہے، تاہم دونوں فاضل مصنفین نے ثانوی مراجع یا معاصرین کی تحریروں سے بہت کم استفادہ کیا ہے۔

اور جن معاصر سیرت نگاروں نے سیرت کے موضوع پر استنادی حیثیت کو اہمیت دی ان میں بھی دو نام گل سرسبد کی حیثیت رکھتے ہیں: ① ڈاکٹر اکرم ضیاء عمری ② ڈاکٹر مہدی رزق اللہ۔ الحمد للہ دارالسلام کی طرف سے ڈاکٹر مہدی رزق اللہ حفظہ اللہ کی اُردو میں ''سیرت نبوی'' دو جلدوں میں شائع ہو کر قارئین سے خراج تحسین وصول کر چکی ہے۔

زیر نظر کتاب کے مصنف ڈاکٹر علی محمد محمد صلابی حفظہ اللہ نے مذکورہ دو باتوں پر خاص توجہ دی ہے۔ ایک تو انھوں نے فقۂ سیرت کے نکات نہایت تفصیل سے اور بڑی راست فکری کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے کم وبیش 350 کتابوں سے بھرپور استفادہ کیا ہے جن میں قدیم کتبِ تاریخ وسیرت کے علاوہ معاصر مصنفین کی تحریریں بھی بڑی تعداد میں شامل ہیں۔ اور ہر متعلقہ فن پر ہونے والے کام سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ اور کتبِ سیرت میں پائے جانے والے تاریخی اختلافات اور دیگر مباحث کو سمیٹنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ دوسرے اُنھوں نے واقعاتِ سیرت کے بیان میں بڑی حد تک قابل قبول روایات پر اعتماد کیا ہے اور سخت ضعیف روایات کے اندراج سے بھرطور اجتناب کیا ہے۔

سیرت کے متعدد پہلوؤں پر مستشرقین نے جو بے جا اعتراضات کیے ہیں، ڈاکٹر صلابی نے اُن اعتراضات کا بھرپور جائزہ لیا اور نہایت مدلل انداز سے اُن کا قلع قمع کیا ہے۔ انھوں نے اسلامی نظام حیات اور اسلام کے سیاسی و اقتصادی نظام کے خدو خال بڑی شرح وبسط سے واضح کیے ہیں۔ انھوں نے قرآن مجید کی روشنی میں نقوشِ سیرت کو نہایت خوبصورتی سے اجاگر کیا اور جابجا آیات قرآنی سے استدلال کیا ہے۔ اس اسلوب سے «کان خلقه القرآن» کی بھرپور سمجھ آتی ہے۔ یوں فقۂ سیرت کے باب میں یہ اپنی نوعیت کی بے حد جامع، مفصل اور منفرد کاوش ہے۔

کتاب کے فاضل مصنف جناب ڈاکٹر علی محمد محمد صلابی 1383ھ / 1963ء میں لیبیا کے معروف شہر اور صوبائی دارالحکومت بنغازی میں پیدا ہوئے۔ اُنھوں نے مدینہ منورہ اور ام درمان (سوڈان) کی یونیورسٹیوں میں دینیات کی اعلیٰ تعلیم پائی اور اسلامی تاریخ نگاری میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ مختلف دینی و تاریخی موضوعات پر لگ بھگ دو درجن کتابیں ترتیب دے چکے ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ دارالسلام اس سے قبل اُن کی اِس اہم کتابِ سیرت کا انگریزی ایڈیشن شائع کر چکا ہے جسے یورپ و امریکہ میں بے حد پذیرائی ملی۔ اب اس کا اردو ایڈیشن قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اصل کتاب عربی میں لکھی گئی ہے۔

دارالسلام کی جانب سے اس کتابِ سیرت کے اُردو ترجمے کی سعادت مولانا محمد یونس بٹ، مولانا ندیم شہباز اور مولانا محمد ادریس سلفی حفظہم اللہ نے حاصل کی۔ مذکورہ تینوں شخصیات جامعہ سلفیہ فیصل آباد جیسی عظیم دانش گاہ کے اساتذۂ کرام ہیں۔ جناب محسن فارانی اور جناب حافظ قمر حسن نے اُردو ترجمے کی نوک پلک سنوارنے کا اہم کام سرانجام دیا۔ مولانا حافظ نعمان فاروقی اور اُن کے رفقائے کار مولانا حافظ محمد فاروق اور مولانا حافظ سیف اللہ نے عربی متن کو سامنے رکھ کر اُردو ترجمے کی نظر ثانی اور حتمی پروف خوانی کی ذمے داری

بھرپور طریقے سے نبھائی۔ کمپوزنگ کرنے والوں میں عبدالرافع، رمضان شاد اور خرم شہزاد کے نام آتے ہیں جبکہ آرٹ ڈائریکٹر جناب زاہد سلیم چودھری، آرٹ ڈائریکٹر صفت الٰہی اور سینئر ڈیزائنر عبدالواسع، ہارون الرشید اور اسد علی نے کتاب کو ڈیزائننگ کی دلآویزیوں سے آراستہ کیا۔ میں ان تمام صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ کتاب کی اشاعت وطباعت کے یہ تمام مراحل دارالسلام، لاہور کے مدیر عزیزم حافظ عبدالعظیم اسد کے زیر نگرانی پایۂ تکمیل کو پہنچے جن کا میں تہ دل سے شکر گزار ہوں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں پیغام سیرت کے سمجھنے اور اُس کے مطابق عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

خادم کتاب وسنت

عبدالمالک مجاہد

الریاض، سعودی عرب

صفر 1433ھ / جنوری 2012ء

ہدیۂ عقیدت

میں یہ کتاب بطور ہدیۂ عقیدت باعمل علماء، مخلص داعیانِ حق، علم کے متوالوں اور غیور فرزندانِ ملتِ اسلامیہ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ اور اللہ عزوجل سے اس کے اسمائے حُسنٰی اور صفات عُلیا کے واسطے سے دعا گو ہوں کہ اس کتاب کو اپنی بارگاہ میں یوں شرفِ قبولیت بخشے کہ یہ ہر آلائش سے پاک ہو اور خالصتاً اس کی خوشنودی کے لیے ہو۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۝﴾

’’پھر جو شخص کہ اپنے رب کی ملاقات کی امید رکھتا ہو تو وہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو بھی شریک نہ ٹھہرائے۔‘‘[1]

1 الکہف 110:18.

مقدمہ

إِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ، نَحْمَدُهُ، وَ نَسْتَعِينُهُ، وَ نَسْتَغْفِرُهُ، وَ نَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ، وَ مَنْ يُضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهُ، وَ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ وَ أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ

اے پروردگار! ہم صرف تیری ہی حمد بیان کرتے ہیں اس انداز میں جو تیری عالی مرتبت ذات اور عظیم فرمانروائی کے لائق ہے، تیری خوشنودی کے حصول تک ہم تیری حمد بیان کرتے رہیں گے، جب تو راضی ہو جائے گا تب بھی تیری حمد بیان کریں گے اور تیری رضا کے حصول کے بعد بھی صرف تیری ہی حمد بیان کریں گے۔

سیرت نبوی کا مطالعہ یقیناً ہر مسلمان کے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ یہ بہت سے اہداف کو حقیقت کا روپ دیتا ہے۔ ان میں سے اہم ترین ہدف رسول اللہ ﷺ کے نقش قدم پر چلنا ہے۔ سیرت کے مطالعے سے جہاں آپ ﷺ کی شخصیت کی معرفت حاصل ہوتی ہے وہاں آپ کے معمولات و فرمودات اور ان امور و اعمال سے بھی واقفیت ہوتی ہے جنھیں آپ ﷺ نے دیکھ کر پسند فرمایا اور برقرار رکھا۔

مطالعۂ سیرت ایک مسلمان کے دل میں محبت رسول ﷺ پیدا کرتا ہے، اس محبت کو پروان چڑھاتا ہے اور اسے پختہ کر کے دل میں جاگزین رکھتا ہے، نیز مطالعۂ سیرت ہمیں

ان صحابۂ کرام کی زندگیوں سے بھی متعارف کرواتا ہے جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کی معیت میں جہاد کیا، اسی طرح یہ مطالعہ ہمیں اصحابِ رسول ﷺ سے محبت کرنے پر آمادہ کرتا ہے اور ان کے طرزِ زندگی کو اپنانے اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی ترغیب بھی دیتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی پیدائش سے وفات تک کے تمام مراحل یعنی بچپن، جوانی، بعثت، دعوتِ دین، جہاد، مشکلات پر صبر اور دشمن پر فتح یابی جیسے امور کو آشکار کرتے ہوئے حیاتِ طیبہ کی چھوٹی بڑی تمام جزئیات کی تفصیل سیرت نبوی کی بدولت ہمارے سامنے آتی ہے اور یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ آپ شوہر بھی تھے اور باپ بھی، رہنما بھی تھے اور سپاہی بھی، حکمران بھی تھے اور سیاستدان بھی، مربی بھی تھے اور داعی بھی، زاہد بھی تھے اور قاضی بھی۔ غرضیکہ ہر مسلمان کو اپنا مطلوب سیرت طیبہ میں مل جاتا ہے۔[1]

رسول اللہ ﷺ کی سیرت میں ایک داعی کو دعوت کے کئی اسلوب اور سلسلہ وار مراحل ملیں گے اور ہر مرحلے کے لیے مناسب وسائل کا علم حاصل ہوگا جو اس کے لیے لوگوں کے ساتھ میل جول اور انھیں اسلام کی دعوت دینے میں مفید ثابت ہوگا۔ مطالعہ سیرت سے وہ اس عظیم جدوجہد کا اندازہ کر سکے گا جو رسولِ کریم ﷺ نے اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر کی اور اسے معلوم ہوگا کہ رکاوٹوں، دشواریوں اور مشکلات کے سامنے آپ کا طرزِ عمل کیا تھا، نیز تکالیف اور آزمائش کے موقع پر ایک داعی کا صحیح کردار کیا ہونا چاہیے۔

نبی ﷺ کی سیرت میں ایک مربی کو عام لوگوں کی تربیت اور اس سلسلے میں موثر کردار ادا کرنے کے لیے رہنمائی ملے گی اور خصوصاً ان صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے کردار و عمل سے آگاہی ہوگی جن کی تربیت آپ ﷺ نے اپنے ہاتھوں سے فرمائی اور انھیں ہر نوع کی آلائشوں سے محفوظ رکھنے کا خاص اہتمام فرمایا۔ یوں قرآن کے مقصود کے مطابق آپ نے ایک بے مثال جماعت تشکیل دی اور لوگوں کی رہنمائی کے لیے ایک بہترین گروہ تیار کیا تاکہ وہ اچھے کاموں کا حکم دے اور برے کاموں سے منع کرے اور صرف اللہ پر یقین

[1] السيرة النبوية للدكتور محمد أبي فارس، ص: 50.

رکھے، نیز انھی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ذریعے آپ نے ایک ایسی سلطنت قائم کی جس نے دنیا کے مشرق ومغرب میں عدل وانصاف کا بول بالا کیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں فوج کی قیادت، قبیلے یا خاندان کی سربراہی یا زمامِ حکومت سنبھالنے کے اصول وضوابط جاننے کے لیے ایک مضبوط نظام اور مستحکم اسلوب ملے گا۔ منصوبہ بندی کے لیے واضح ہدایات اور ان کی تنفیذ کے لیے مکمل احتیاط و ہنرمندی نظر آئے گی، نیز انصاف کے اصولوں کو عملی جامہ پہنانے اور حاکم ومحکوم اور امراء ولشکر کے درمیان مشاورت کی بنیاد قائم کرنے کا جذبہ عیاں ہوگا۔

سیرت طیبہ کے مطالعے سے ایک سیاستدان کو معلوم ہوگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مخالفین کے ساتھ کیسا سلوک کرتے تھے۔ رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی ابن سَلُول جس نے اسلام کا اظہار تو کیا مگر دل میں کفر اور بغض چھپائے رکھا اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کمزور کرنے کے لیے اور لوگوں کو آپ سے دور کرنے کے لیے افواہیں پھیلائیں جو آپ کے لیے اذیت کا باعث تھیں۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف طرح طرح کی سازشیں کرتا مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان پر صبر کرتے اور اس کے بغض کو برداشت کرتے، یہاں تک کہ لوگوں کے سامنے حقیقتِ حال واضح ہوگئی، پھر سب نے اسے نظر انداز کردیا بلکہ اُس کے قریبی ساتھی بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئے، اس سے نفرت کرنے لگے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت پر سب کا اتفاق ہوگیا۔

سیرت مطہرہ میں علماء کو ایسی باتیں ملیں گی جو قرآن حکیم کو سمجھنے کے لیے ان کی معاونت کریں گی کیونکہ سیرت ہی عملی لحاظ سے قرآن حکیم کی تفسیر ہے۔ اس میں بہت سی آیات کی تفسیر اور ان کے اسباب نزول موجود ہیں جو آیات کی تفہیم، ان سے استنباط کرنے اور حالات و واقعات کو اچھی طرح سمجھنے میں علماء کی معاونت کرتے ہیں۔ علماء انھی کی بنیاد پر شرعی احکام اور اسلامی سیاسی نظام کے اصولوں کا استخراج کرتے ہیں، اسی سے انھیں اسلام کے مختلف علوم کی صحیح معرفت حاصل ہوتی ہے، ناسخ ومنسوخ اور دیگر علوم حاصل

ہوتے ہیں اور وہ اسلام کی روح اور اس کے اعلیٰ مقاصد سے آشنا ہوتے ہیں۔

سیرت پاک سے زاہدوں کو زہد کا مفہوم، اس کی حقیقت اور اس کے مقاصد کا علم حاصل ہوتا ہے۔ سیرت طیبہ سے تاجر حضرات تجارت کے مقاصد، اس کے اصول اور طریقے معلوم کرتے ہیں۔ آزمائش میں مبتلا لوگوں کو صبر وثبات کے اعلیٰ درجات کا علم سیرت نبوی سے حاصل ہوتا ہے جو دعوتِ اسلام کے راستے پر چلنے کے لیے ان کے عزائم کو تقویت پہنچاتا ہے، اللہ عزوجل پر ان کے اعتماد کو بڑھاتا ہے اور انھیں یقین ہو جاتا ہے کہ حُسنِ انجام صرف متقین کے لیے ہے۔[1]

اعلیٰ آداب، عمدہ اخلاق، شفاف عقائد، صحیح عبادات، اعلیٰ اوصاف، دل کی پاکیزگی، جہاد سے محبت اور شہادت کا جذبہ امت کو سیرت طیبہ ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ علی بن حسن فرماتے ہیں: ''جس طرح ہمیں قرآن کی ایک سورت کی تعلیم دی جاتی تھی اسی طرح ہمیں غزوات النبی ﷺ بھی سکھائے جاتے تھے۔''

واقدی کہتے ہیں کہ میں نے محمد بن عبداللہ کو سنا، وہ کہہ رہے تھے کہ میں نے اپنے چچا زہری کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''غزوات کے علم میں دنیا و آخرت کا علم ہے۔''

اسماعیل بن محمد بن سعد بن ابی وقاص فرماتے ہیں: ''میرے والد ہمیں رسول اللہ ﷺ کے غزوات کی تعلیم دیا کرتے تھے اور ہمارے سامنے انھیں شمار کرتے ہوئے فرماتے کہ یہ تمھارے آباء و اجداد کے کارہائے نمایاں ہیں تم انھیں بھلا نہ دینا۔''[2]

قوم کی تربیت اور قیامِ حکومت کے سلسلے میں سیرت نبوی کا مطالعہ، اسلام کے فروغ اور مسلمانوں کے استحکام کا راستہ معلوم کرنے کے لیے علماء، فقہاء، قائدین اور حکمرانوں کی معاونت کرتا ہے۔ اس سے ترقی کے عوامل اور زوال کے اسباب سے آگاہی ہوتی ہے، نیز افراد کی تربیت، امتِ مسلمہ کی تعمیر، معاشرے میں زندگی کی روح پھونکنے اور حکومت کے

1 مدخل لفهم السيرة للدكتور يحيىٰ اليحيىٰ، ص: 14. 2 البداية والنهاية: 242/2.

قیام کے لیے نبی کریم ﷺ کے دانش مندانہ اسلوب کا علم ہوتا ہے۔ ایک مسلمان دیکھتا ہے کہ دعوتِ دین اور اس کے تمام مراحل میں آپ کس قدر سرگرم تھے اور اسلامی دعوت کے مقابلے میں مشرکین کی سرگرمیوں کے سدباب کے لیے آپ نے کن صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ ہجرتِ حبشہ کے لیے آپ نے کیسی مستحکم منصوبہ بندی کی۔ اہل طائف اور مختلف مواقع پر دیگر قبائل کے سامنے دعوت پیش کرنے کے لیے آپ نے کس قدر جدوجہد کی، کس خوبی کے ساتھ آپ نے انصار کو مرحلہ وار دعوت دی اور پھر بتدریج مدینہ کی طرف ہجرت کا آغاز ہو گیا۔

جو شخص واقعہ ہجرت پر غور و فکر کرتا ہے، ہجرت کی ابتدا سے انتہا تک، اس کی تیاری سے اس کے دور رس نتائج کے حصول تک ٹھوس منصوبہ بندی اور اس پر مکمل عمل درآمد کو گہری نگاہ سے دیکھتا ہے تو اسے یہ ادراک ہوتا ہے کہ عہد رسالت میں وحی الٰہی کی بدولت درست منصوبہ بندی ہوتی تھی، نیز منصوبہ بندی کرنا رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے اور یہ ان فرائض کی تعمیل ہے جن کا اللہ تعالیٰ نے ایک مسلمان کو حکم دیا ہے۔

ایک مسلمان منہج نبوی سے سیکھ سکتا ہے کہ باطل کے ساتھ کشمکش میں کامیابی حاصل کرنے کے کیا ذرائع ہیں اور وہ تمام مراحل کے نظم و نسق کو چلانے اور ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں منتقل ہونے کی مہارت حاصل کر سکتا ہے۔ مطالعۂ سیرت سے اسے معلوم ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ نے کس طرح یہود و نصاریٰ اور کفار و منافقین جیسی دشمن طاقتوں کا مقابلہ کیا اور اللہ تعالیٰ کی توفیق اور قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی حصولِ فتح و نصرت کی شروط اور اسباب کی پابندی کے ساتھ کس طرح ان پر غلبہ حاصل کیا۔ میرا پختہ یقین ہے کہ اس امت کا اقتدار اور عظمتِ رفتہ کی بحالی رب ذوالجلال کے دین کے نفاذ اور اسوۂ رسول کی اتباع میں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَإِنْ تُطِيعُوهُ تَهْتَدُوا ط﴾

''اور اگر تم اس (رسول) کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پاؤ گے۔''[1]

اس آیت کریمہ نے واضح کر دیا کہ حصول اقتدار کا راستہ نبی کریم ﷺ کی اتباع میں ہے اور اس کے بعد کی آیات بھی حصولِ اقتدار کی شرائط واضح کر رہی ہیں، فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ﴾

''جو تم میں سے ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے اللہ نے ان لوگوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ انھیں زمین میں ضرور خلافت دے گا۔''[2]

رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ نے شرائط اقتدار کی عملی تطبیق کی طرف خاص توجہ دی۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے ایمان اور اس کے تمام مفاہیم و ارکان کو حقیقت کا جامہ پہنایا، ہر اچھے کام کو اپنے کردار کا حصہ بنایا اور ہر قسم کی خیر و بھلائی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کی کہ اس کی بندگی ان کی زندگی کے ہر پہلو پر چھا گئی۔ اور انھوں نے شرک کی تمام ظاہری و مخفی صورتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اقتدار کے مادی و معنوی ذرائع کو افراد اور جماعت نے ہر سطح پر اختیار کیا۔ یہاں تک کہ انھوں نے مدینہ میں ایک حکومت قائم کر لی اور اس کے ذریعے اللہ کے دین کو سب قوموں اور امتوں میں پھیلا دیا۔

آج مسلمانوں کا اقوامِ عالم کی قیادت سے پیچھے رہ جانا اُس قوم کے طرز عمل کا منطقی نتیجہ ہے جس نے اپنے مشن کو فراموش کر دیا ہو اور خود ہی اپنے مقام سے نیچے گر گئی ہو۔ اس نے علم و عمل کے میدانوں اور اپنے قیمتی ورثے میں کثافتوں کے بڑے بڑے انباروں کی آمیزش کر لی ہو، سنتِ الٰہیہ سے بے اعتنائی برتی ہو اور سمجھ لیا ہو کہ اقتدار خوابوں اور تمناؤں سے حاصل ہو جاتا ہے۔

یہ ایمانی کمزوری، روحانیت کا فقدان، فکری بے راہ روی، دلی اضطراب، ذہنی انتشار اور

[1] النور24:54. [2] النور24:55.

اخلاقی گراوٹ جو مسلمانوں کو لاحق ہوئی ہے، اس کا سبب وہ بہت بڑی خلیج ہے جو امت مسلمہ اور قرآن و حدیث، خلافت راشدہ اور درخشندہ اسلامی تاریخ کے درمیان حائل ہے۔

میرے ساتھ ساتھ آپ بھی دیکھتے ہوں گے کہ بہت سے لوگ اسلام کے ترجمان بن کر سامنے آرہے ہیں، حالانکہ وہ قرآن کریم، سیرت نبوی اور سیرتِ خلفائے راشدین سے کوسوں دور ہیں۔ مغربی تہذیب کے سامنے نفسیاتی شکست کے نتیجے میں انھوں نے اپنی گفتگو میں نئی اصطلاحات اور بے بنیاد نظریات داخل کر لیے ہیں اور الفاظ کو کھلونا بنا کر ان کا ہیر پھیر شروع کر دیا ہے۔ وہ گھنٹوں گفتگو کرتے ہیں، پُرکشش مضامین لکھتے ہیں لیکن نہ ان کی گفتگو سے محسوس ہوتا ہے اور نہ ان کے مضامین میں ہمیں نظر آتا ہے کہ انھوں نے گہری نگاہ سے قرآن کریم، منہج نبوی، دعوتِ انبیاء و رسل اور تاریخ اسلام کی روشنی میں یہ جائزہ لینے کی کوشش کی ہو کہ دنیا میں غلبہ حاصل کرنے کے اصول کیا ہیں اور قوموں کے انقلاب اور تعمیرِ سلطنت میں قانون الٰہی کا مقام کیا ہے۔ وہ جب ہمیں نور الدین محمود زنگی، صلاح الدین ایوبی، یوسف بن تاشفین، محمود غزنوی اور سلطان محمد فاتح کی کامیابی کے اسباب بتاتے ہیں جنھوں نے اُمت کی تربیت اور قیامِ حکومت کے لیے منہج نبوی کو اختیار کیا تو ایسا کرتے ہوئے ان مشرق و مغرب کے فرزندانِ تہذیب، مفکرین اور سیاستدانوں کے اقوال بطور دلیل پیش کرتے ہیں جو خود وحی الٰہی اور منہج ربانی سے کوسوں دور ہیں۔

میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اقوام و مِلَل کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کی مخالفت کرتے ہیں۔ حکمت تو مومن کی متاعِ گم گشتہ ہے۔ جہاں بھی ملے وہ اسے لینے کا زیادہ حقدار ہے۔ لیکن میں ان لوگوں کا مخالف ہوں جو منہج ربانی سے ناواقف ہیں یا ناواقف بن گئے ہیں اور انھوں نے امت کے ان تاریخی تذکروں کو فراموش کر دیا ہے جو دروس و عبر اور نصیحتوں سے لبریز ہیں۔ اس کے باوجود وہ چاہتے ہیں کہ اپنی ادنیٰ خواہشات اور قرآن و حدیث کے نور سے بے بہرہ افکار کے ساتھ مسلمانوں کی قیادت کریں۔ علامہ

ابن قیم رحمہ اللہ نے کیا خوب کہا ہے:

وَاللّٰهِ مَا خَوْفِي الذُّنُوبَ فَإِنَّهَا لَعَلٰى طَرِيقِ الْعَفْوِ وَالْغُفْرَانِ
لٰكِنَّمَا أَخْشَى انْسِلَاخَ الْقَلْبِ عَنْ تَحْكِيمِ هٰذَا الْوَحْيِ وَالْقُرْآنِ
وَ رِضًا بِآرَاءِ الرِّجَالِ وَ خَرْصِهَا لَا كَانَ ذَاكَ بِمِنَّةِ الرَّحْمٰنِ

''اللہ کی قسم! مجھے گناہوں کا کوئی خوف نہیں ہے کیونکہ گناہ تو معافی اور بخشش کی وجہ سے مٹ جائیں گے۔ مجھے تو ڈر ہے کہیں دل اس وحی اور قرآن کے کنٹرول سے باہر نہ ہوجائے اور لوگوں کی آراء اور ظن و قیاس پر مطمئن نہ ہوجائے۔ اللہ کے فضل وکرم سے ایسا کبھی نہیں ہوگا۔''

ہمیں یہ جاننے کی سخت ضرورت ہے کہ تربیتِ اقوام اور قیامِ حکومت کے سلسلے میں طریق نبوی کیا تھا اور اقوام و ملل اور حکومتوں کے بارے میں سنتِ الٰہی کیا ہے؟ اور نبی کریم ﷺ نے جب انسانی دنیا میں دعوت الٰہی کا آغاز کیا تو آپ ﷺ نے ان اقوام کے ساتھ کیا طرزِ عمل اختیار کیا تاکہ ہم اپنی دعوت اور اپنے دین کے استحکام کے لیے آپ کی سیرت طیبہ سے صحیح رہنمائی حاصل کرسکیں اور اپنی عمارت اُس منہجِ سلیم پر استوار کرسکیں جس کے اصول وفروع کتاب وسنت سے ماخوذ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾

''یقیناً تمھارے لیے رسول اللہ (ﷺ کی زندگی) میں بہترین نمونہ ہے۔''[1]

قوم کی تربیت اور قیامِ حکومت کے لیے نبی کریم ﷺ کا طریقہ متوازن، ہمہ گیر، ہمہ جہت اور اس نظام الٰہی کے ماتحت تھا جو معاشروں کے استحکام، قوموں کی زندگی اور حکومتوں کی تعمیر میں کارفرما رہا ہے۔ آپ ﷺ نے اس سلسلے میں انتہائی حِکمت اور اعلیٰ

1 الأحزاب 21:33.

درجے کی ذہانت کا مظاہرہ کیا۔ درجہ بدرجہ آگے بڑھنے کا معاملہ ہو یا باہمی کشمکش اور ابتلا کا، ذرائع کے حصول کی بات ہو یا افراد میں تبدیلی لانے کی، آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کے دلوں میں اللہ کے دین کا پودا اس کے تمام تر مفاہیم اور اقدار و نظریات سمیت کاشت کیا۔ اور اللہ تعالیٰ، انسان، کائنات، زندگی، جنت، جہنم اور قضا و قدر کے بارے میں صحیح تصورات ان کے دلوں میں راسخ کیے۔

آپ ﷺ کے صحابہ بھی آپ کے منہجِ تربیت سے بہت زیادہ اثر لیتے تھے اور آپ کی ہدایات کی پابندی کرنے کی مکمل کوشش کرتے تھے۔ باہر جانے والا جب پلٹ کر آتا تو اپنے ساتھیوں سے پوچھتا کہ انھوں نے نبی کریم ﷺ کے کیا کیا معمولات دیکھے، آپ نے کیا تعلیمات و ہدایات دیں اور میری غیر موجودگی میں کون کون سی آیات نازل ہوئیں۔ وہ ہر چھوٹے بڑے کام میں رسول اللہ ﷺ کے نقشِ قدم کی اتباع کرتے۔ یہ نہیں کہ دینی معلومات حاصل کرنے کا اس قدر اہتمام ان کی اپنی ذات تک محدود تھا بلکہ وہ اپنی اولاد اور دیگر احباب کو بھی اس کی تلقین کرتے تھے۔

اس کتاب میں سیرت کے احداث و واقعات کو جمع کیا گیا ہے جن سے ایک محقق کے سامنے یہ حقیقت عیاں ہوگی کہ بعثت سے پہلے دنیا کی حالت کیا تھی؟ اور بعثت کے وقت کن تہذیبوں کو بالادستی حاصل تھی اور ان کی سیاسی، معاشی، معاشرتی اور اخلاقی صورتِ حال کیا تھی؟ نبی کریم ﷺ کی ولادت سے قبل کون سے اہم واقعات رونما ہوئے؟ وحی کا نزول کیسے ہوا؟ دعوتِ دین کو کن کن مراحل سے گزرنا پڑا؟ عہد مکی میں نظریاتی، اخلاقی اور اطاعت و بندگی کی بنیادیں کیا تھیں؟ دعوت کے کام میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے مشرکین نے کون کون سے حربے اختیار کیے؟ مسلمانوں نے حبشہ کی جانب ہجرت کیوں اور کیسے کی؟ نبی ﷺ کو سفرِ طائف میں کیا کیا صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں؟ اسراء و معراج کی صورت میں کیا کیا انعامات حاصل ہوئے؟ تبلیغی دورے کیسے ہوئے اور ان کے نتائج کیا

نکلے؟ اہل یثرب کی جانب سے خیر کے کاروان کیونکر چلے اور روشنی کی کرنیں کس طرح نمودار ہوئیں؟ کن کن مراحل سے گزر کر ہجرت نبوی کی تکمیل ہوئی؟

یہ کتاب، پڑھنے والے کو واقعات کے ساتھ ساتھ ان سے حاصل ہونے والے دروس، نصیحتوں اور نتائج سے بھی باخبر کرے گی تاکہ موجودہ بین الاقوامی حالات میں مسلمان اس سے مستفید ہو سکیں۔ ایک محقق نبی کریم ﷺ کی مدینہ آمد اور دار آخرت کی طرف رحلت تک مکمل مدنی زندگی سے بخوبی آگاہ ہوگا اور آپ ﷺ کی خداداد صلاحیتوں کو جان لے گا کہ آپ نے کس طرح معاشرے کو ٹھوس بنیادوں پر استوار کیا، تربیت کیسے کی، قیامِ حکومت کے لیے کن کن وسائل کو اختیار کیا اور داخلی و خارجی دشمنوں کا کس طرح مقابلہ کیا۔ جستجو کرنے والا یقیناً نبی کریم ﷺ کی اس ذہانت وفطانت سے روشناس بھی ہوگا جس کا مظاہرہ آپ ﷺ نے معاشرے کو سنوارنے، اہل کتاب کے ساتھ تحریری معاہدے کرنے، جہادی تحریک پیدا کرنے اور معاشی گتھیاں سلجھانے میں کیا۔ اور کس احسن انداز میں آپ نے اس دین کے تمام تصورات کو مسلمانوں کے دل و دماغ میں پختہ کیا جو انسانیت کو گمراہی کے اندھیروں سے نکالنے، بتوں کی عبادت سے نجات دلانے اور حکیم و برتر ذات کے عطا کردہ ضابطۂ حیات پر لانے کے لیے آیا تھا۔

سیرت نبوی میں اختصار کے باعث فرزندان اسلام کے ذہنوں میں جو سوالیہ نشان رہ جاتے ہیں، ایک محقق ان کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ گزشتہ ادوار میں سیرتِ نبوی کے موضوع پر بہت سی عمدہ تحقیقی کتب منظر عام پر آئی ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے شرفِ قبولیت عطا کیا اور انھیں خوب پذیرائی حاصل ہوئی، مثلاً: مولانا صفی الرحمن مبارکپوری رحمہ اللہ کی ''الرحیق المختوم'' الشیخ محمد غزالی کی ''فقہ السیرہ'' دکتور محمد رمضان بُوطی کی ''فقہ السیرۃ النبویہ'' اور مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کی ''السیرۃ النبویہ''۔

یہ کتب اختصار کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔ ان میں سیرت کے تمام واقعات شامل نہیں

ہیں۔بعض یونیورسٹیوں نے انھی کتب پر انحصار کیا ہے، جبکہ کچھ طالبانِ علم بھی یہ سمجھنے لگے کہ جس نے ان کتب کو پڑھ لیا گویا اس نے مکمل سیرت نبوی کا مطالعہ کرلیا، حالانکہ یہ سیرت مطہرہ کے سلسلے میں بہت بڑی اور خطرناک غلطی ہے جو کہ بہت سے ائمۂ مساجد اوراسلامی تحریکوں کے ذمہ داران میں بھی سرایت کرچکی ہے اوراس کا اثر ان کے متبعین پر بھی پڑا ہے، یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگوں کے ہاں سیرت کا نہایت ناقص تصور پایا جاتا ہے۔

فضیلۃ الشیخ محمد الغزالی اپنی کتاب فقہ السیرہ کے آخر میں اس تصور کی سنگینی پر متنبہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ لوگ نبی کریم ﷺ کی پیدائش سے وفات تک کے واقعات پڑھ کر سمجھنے لگتے ہیں کہ انھوں نے آپ کی حیاتِ طیبہ کا مطالعہ کر لیا ہے، حالانکہ یہ بہت بڑی غلطی ہے۔کوئی بھی شخص اس وقت تک کما حقہ سیرت کونہیں سمجھ سکتا جب تک قرآن کریم اور سنت مطہرہ کا مطالعہ نہ کرے۔جس قدر کوئی ان کا مطالعہ کرے گا اسی قدر اس کا نبی کریم ﷺ سے تعلق پیدا ہوگا۔[1]

زیرِنظر کتاب کا مطالعہ کرنے والا محسوس کرے گا کہ فہمِ قرآن کی گہرائی تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اس میں وافر رہنمائی موجود ہے کیونکہ قرآن کا سیرت نبوی کے ساتھ گہرا تعلق ہے،جیسا کہ قرآن حکیم میں غزوۂ بدر، غزوۂ احد، غزوۂ احزاب، غزوۂ بنی نضیر، صلح حدیبیہ اور غزوۂ تبوک کا تذکرہ موجود ہے اور اسے سمجھنے کے لیے سیرت کے مطالعے کی اشد ضرورت ہے۔اس کتاب سے واضح ہوگا کہ ان واقعات میں ہمارے لیے کیا درس اور نصیحتیں ہیں، فتح و ناکامی سے متعلق اللہ تعالیٰ کا کیا ضابطہ ہے اور قرآن حکیم نے مختلف حوادث و واقعات کے دوران امراضِ قلوب کا علاج کس انداز سے کیا ہے۔

سیرت نبوی میں ہرقوم کے لیے ایسی رہنمائی موجود ہے جس سے وہ اچھے انداز میں زندگی گزار سکے۔ یہ ہر زمان و مکان میں کارگر ہونے کے ساتھ ساتھ اصلاحِ احوال کی

1 فقه السيرة للغزالي، ص:476.

صلاحیت سے مالا مال ہے۔

راقم نے اپنی زندگی کا ایک حصہ قرآن حکیم اور سیرت نبوی کے مطالعے میں بسر کیا اور وہ میری زندگی کے بہترین ایام تھے۔ اس جستجو میں نہ مجھے وطن سے دوری کا احساس ہوا اور نہ اجنبیت کا۔ میں نے اُمّہات الکتب (بنیادی کتابوں) میں چھپے ہوئے خزانوں اور قیمتی موتیوں پر دسترس حاصل کی، پھر انھیں مرتب کر کے عمدہ انداز میں پیش کرنے کے لیے کام کیا تاکہ امت کے عظیم سپوتوں کے لیے انھیں حاصل کرنا آسان ہو جائے۔

دریں اثنا میں نے یہ بات ملاحظہ کی کہ واقعات، نتائج، نصیحتوں اور دروس کا ذکر کرنے میں قدیم اور جدید سیرت نگاروں میں خاصا فرق ہے۔ بعض اوقات ابن ہشام رحمہ اللہ ایک بات بیان کرتے ہیں مگر امام ذہبی اسے بیان نہیں کرتے۔ کبھی ابن کثیر رحمہ اللہ ایسی چیزوں کا تذکرہ کرتے ہیں جنھیں اصحاب السنن نے بیان نہیں کیا ہوتا۔ یہ تو قدیم سیرت نگاروں کی بات تھی۔ جدید سیرت نگاروں میں بھی یہ چیز موجود ہے کہ علامہ سباعی نے وہ باتیں بیان کی ہیں جو شیخ غزالی نے بیان نہیں کیں اور دکتور محمد رمضان بُوطی نے وہ کچھ بیان کیا ہے جو دکتور منیر غضبان نے نہیں کیا۔ اسی طرح میں نے کتب تفسیر، شروحِ حدیث، مثلاً: فتح الباری، شرح نووی اور فقہاء کی کتابوں میں بہت سی ایسی باتیں پائیں جو قدیم وجدید سیرت نگاروں نے بیان نہیں کی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ اعزاز بخشا کہ میں نے ان دروس ونصائح اور ثمرات کو جمع کیا، انھیں خوبصورت انداز میں ترتیب دیا اور آسان اسلوب کے ساتھ پیش کیا تاکہ قارئین کرام ان سے بہ آسانی فائدہ حاصل کر سکیں۔

اس کتاب میں علمی نتائج اور عمدہ نکات ہیں جو میں نے سینکڑوں مصادر و مراجع سے حاصل کیے۔ میری اس کاوش میں بہت سے بھائیوں کا حصہ ہے جن کا تعلق لیبیا، یمن، عراق، مصر، سوڈان، سعودی عرب، عرب امارات، قطر اور شام کے علاقوں سے ہے۔ ان ارباب علم وتحقیق نے علمی گفتگو، بحث وتمحیص اور علمی مجالس کے ذریعے تعاون کیا۔ بعض

نے نایاب مصادر و مراجع کی نشاندہی کی اور ان کی فراہمی کے لیے کوشش کی، بعض نے رہنمائی کی کہ ان قواعد وضوابط کو مرکزی اہمیت دی جائے جو آپ ﷺ نے اپنی مبارک تحریک میں اختیار کیے، جیسا کہ موقع سے فائدہ اٹھانے کا طریقہ جسے قانون فرصت کہا جاتا ہے جو آپ نے فتح خیبر اور فتح مکہ میں اختیار کیا۔ بعض نے تاریخی یا واقعاتی سیرت اور عملی سیرت میں ربط کی اہمیت کی جانب توجہ دلائی۔ عملی سیرت سے مراد وہ سیرت ہے جو نبی کریم ﷺ کے فرامین ومعمولات کا مجموعہ ہے۔ اور وہ سیرت جس کا قرآن متقاضی ہے اسے ایک مرتب طرزِ زندگی کی صورت میں پیش کرنے سے قوم کے نونہالوں کو وافر علم، عمیق فقاہت اور توانا دینی جذبہ حاصل ہوگا، اس سے روح کو غذا حاصل ہوگی، عقلوں کی اعلیٰ تربیت ہوگی، دلوں کو زندگی ملے گی اور نفوس کو پاکیزگی حاصل ہوگی۔

دعوتِ اسلامیہ کی نشر واشاعت کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے اس کے ہر پہلو کے لیے سیرت نبوی میں رہنمائی موجود ہے۔ نبی کریم ﷺ نے رفیق اعلیٰ کے پاس جانے سے پہلے ہر اس انسان کے لیے بے شمار نمونے چھوڑے ہیں جو آپ ﷺ کے نقش قدم پر چلنا چاہتا ہو، خواہ وہ دعوت و تربیت کا میدان ہو یا تعلیم و ثقافت کا، جہادی امور ہوں یا زندگی کے کسی بھی شعبے سے تعلق رکھنے والے معاملات ہوں۔

سیرتِ رسول کا گہرائی سے مطالعہ خُلقِ عظیم کے اُس خزانے تک پہنچانے میں مددگار ثابت ہوگا جس کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ ہر انسان سے ممتاز ہیں، اسی طرح آپ کے ان اوصافِ حمیدہ کی معرفت بھی حاصل ہوگی جن سے آراستہ رہ کر آپ نے اس دنیا میں زندگی بسر کی۔ آپ ﷺ کی سیرت ان اشعار کا مصداق نظر آئے گی:

وَ أَحْسَنَ مِنْكَ لَمْ تَرَ قَطُّ عَيْنِي   وَ أَجْمَلَ مِنْكَ لَمْ تَلِدِ النِّسَاءُ

خُلِقْتَ مُبَرَّأً مِّنْ كُلِّ عَيْبٍ   كَأَنَّكَ قَدْ خُلِقْتَ كَمَا تَشَاءُ

''تجھ سے زیادہ حسین میری آنکھ نے کبھی نہیں دیکھا۔ اور تجھ سے زیادہ خوبصورت،

عورتیں پیدا نہ کرسکیں۔تجھے ہر عیب سے پاک پیدا کیا گیا گویا کہ تیری تخلیق تیری پسند اور چاہت کے مطابق ہوئی۔''

مجھے یہ دعویٰ ہرگز نہیں ہے کہ میں نے کوئی ایسی چیز پیش کی ہے جو پہلے لوگوں کی استطاعت سے باہر تھی۔ رسول اللہ ﷺ کی شان تو بہت بلند ہے اور آپ کی سیرت کے بہت سے نمایاں پہلوؤں کو روشناس کروانے کے لیے ایسے شخص کی ضرورت ہے جو رقیق القلب ہو، زود فہم ہو، اعلیٰ ذہانت کا مالک اور پختہ ایمان کا حامل ہو۔ اور میرا یہ دعویٰ بھی نہیں ہے کہ میری یہ جدوجہد اکمل اور ہر عیب سے پاک ہے کیونکہ یہ تو انبیاء اور رسولوں کا مقام ہے۔ جو یہ سمجھتا ہے کہ اس نے تمام علوم کا احاطہ کرلیا وہ جاہل ہے۔ اللہ نے سچ فرمایا ہے:

﴿وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ۝﴾

''اور تمھیں تو بہت ہی تھوڑا علم دیا گیا ہے۔'' [1]

علم تو بحرِ بے کراں ہے۔ ایک شاعر نے کتنی سچی بات کہی ہے:

وَ قُلْ لِّمَنْ يَّدَّعِي فِي الْعِلْمِ فَلْسَفَةً حَفِظْتَ شَيْئًا وَّ غَابَتْ عَنْكَ أَشْيَاءُ

''جو شخص علم میں کسی حکمت و تبحر کا دعویٰ کرتا ہے اسے کہیے کہ تو نے ایک چیز محفوظ کی ہے اور بہت سی چیزیں تجھ سے چھپی ہوئی ہیں۔''

ثعالبی کہتے ہیں کہ جب بھی کوئی شخص کتاب لکھتا ہے تو صرف ایک رات گزرنے کے بعد وہ چاہتا ہے کہ اس کتاب میں کچھ اضافہ کر دے یا کوئی چیز حذف کر دے۔ یہ کیفیت تو صرف ایک رات گزرنے پر ہے کئی برسوں کے بعد کیا کیفیت ہوگی؟

عماد اصبہانی کا قول ہے: ''میں نے دیکھا ہے کہ ایک انسان آج ایک کتاب لکھتا ہے تو اس سے اگلے دن وہ کہتا ہے کہ اگر اس میں تبدیلی ہو جائے تو زیادہ اچھا ہو، اگر یہ اضافہ کر دیا جائے تو اسے مستحسن سمجھا جائے گا، اگر فلاں عبارت مقدم کر دی جائے تو بہت

[1] بني إسرآئيل 85:17.

بہتر ہوگا، اگر اس کو حذف کردیا جائے تو زیادہ اچھا ہوگا ...... دراصل یہ ایک عظیم نصیحت ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ کوئی بھی انسان نقص سے پاک نہیں۔

میں آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ میرا یہ عمل خالص اس کی ذات کے لیے ہو اور اس کے بندوں کے لیے نفع مند ہو۔ اور اللہ تعالیٰ مجھے ہر حرف پر اجر عطا فرمائے اور اسے میری نیکیوں کی میزان میں رکھے اور میرے ان بھائیوں کو بھی اجر عطا فرمائے جنھوں نے اس کتاب کی تکمیل کے لیے مجھ سے ہر ممکن تعاون کیا۔ شاعر کہتا ہے:

أَسِيرُ خَلْفَ رِكَابِ الْقَوْمِ ذَا عَرَجٍ   مُؤَمِّلًا جَبْرَ مَا لَاقَيْتُ مِنْ عِوَجِ

فَإِنْ لَّحِقْتُ بِهِمْ مِنْ بَعْدِ مَا سَبَقُوا   فَكَمْ لِرَبِّ السَّمَا فِي النَّاسِ مِنْ فَرَجِ

وَ إِنْ ظَلَلْتُ بِقَفْرِ الْأَرْضِ مُنْقَطِعًا   فَمَا عَلٰى عَرَجٍ فِي ذَاكَ مِنْ حَرَجِ

''میں لنگڑے پن کے ساتھ عظیم لوگوں کی سواریوں کے پیچھے چل پڑا ہوں، اس امید سے کہ ٹیڑھے پن کی وجہ سے لاحق ہونے والی کوتاہیوں کی تلافی کرلوں گا۔ اگر میں ان کے سبقت لے جانے کے بعد بھی ان سے جا ملا تو (حیران ہونے والی بات نہیں) آسمان والے رب کی لوگوں پر کتنی وسعتیں (انعامات) ہیں۔ اور اگر میں بے آب وگیاہ زمین میں خالی ہاتھ (زادِراہ اور سواری سے محروم) ہوکر ہلاک ہوجاؤں تو ایسا ہو جانا لنگڑے پن کے ہوتے ہوئے کوئی عیب نہیں۔''

«سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ! وَبِحَمْدِكَ، أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ، وَ أَتُوبُ إِلَيْكَ» ''اے اللہ! تو ہر عیب سے پاک ہے اور تیری ہی تعریفیں ہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں تجھ سے مغفرت چاہتا ہوں اور تیری طرف رجوع کرتا ہوں۔''

فقیر الی اللہ: علی محمد محمد الصلابی

1422ھ بمطابق 2001ء

حصہ 1

قبل از پیدائش اہم تاریخی واقعات

وَاِنْ
كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ
ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝

”حالانکہ اس سے پہلے یہی لوگ واضح گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے۔“

(آل عمرٰن 3 : 164)

باب 1

پیدائش کے وقت بالا دست تہذیبیں اور مذاہب

رومی بادشاہت

روم کی مشرقی بادشاہت بازنطینی بادشاہت کے نام سے معروف تھی۔ اس کی حکمرانی یونان، بلقان، ایشیا، شام، فلسطین، پورے بحیرۂ روم، مصر اور اسی طرح شمالی افریقیہ کے تمام علاقوں پر قائم تھی۔ اس کا پایۂ تخت قسطنطنیہ تھا۔ یہ ایک ظالم حکومت تھی جو اپنے ماتحت عوام کے ساتھ مسلسل ظلم و تشدد اور ناانصافی کا رویہ اپنائے ہوئے تھی۔ اس نے کئی گنا ٹیکس عائد کر رکھے تھے۔ فسادات، ہنگامے اور انقلابات رونما ہوتے رہتے تھے، جبکہ عام زندگی طرح طرح کے لہو ولعب، موج مستی، عیاشی اور آسودگی پر مبنی تھی۔

مصر مذہبی ظلم و جبر اور سیاسی آمریت کا شکار تھا۔ بازنطینی حکمرانوں نے اسے دودھ دینے والی بکری بنا رکھا تھا جس سے وہ دودھ تو لیتے مگر کھانے کو کچھ نہ دیتے تھے۔

شام میں بھی ظلم و جبر بڑھ گیا تھا۔ حکمران عوام کے ساتھ برتاؤ میں طاقت اور شدید جبر پر انحصار کرتے تھے۔ یہ علاقہ بھی رومی خواہشات کا نخچیر بن گیا تھا۔ حکمرانی اغیار کی تھی جو صرف طاقت استعمال کرنا جانتے تھے اور اپنے محکوم عوام کے لیے کوئی نیک جذبہ نہیں رکھتے تھے۔ اکثر اہل شام اپنے قرضوں کی ادائیگی کے لیے اپنے جگر گوشے فروخت کر دیا کرتے تھے۔[1]

رومی معاشرہ تضادات اور افراتفری سے بھرا ہوا تھا جس کی عکاسی کتاب الحضارة

[1] السيرة النبوية للندوي، ص:31.

ماضیھا و حاضرھا میں اس طرح کی گئی ہے:

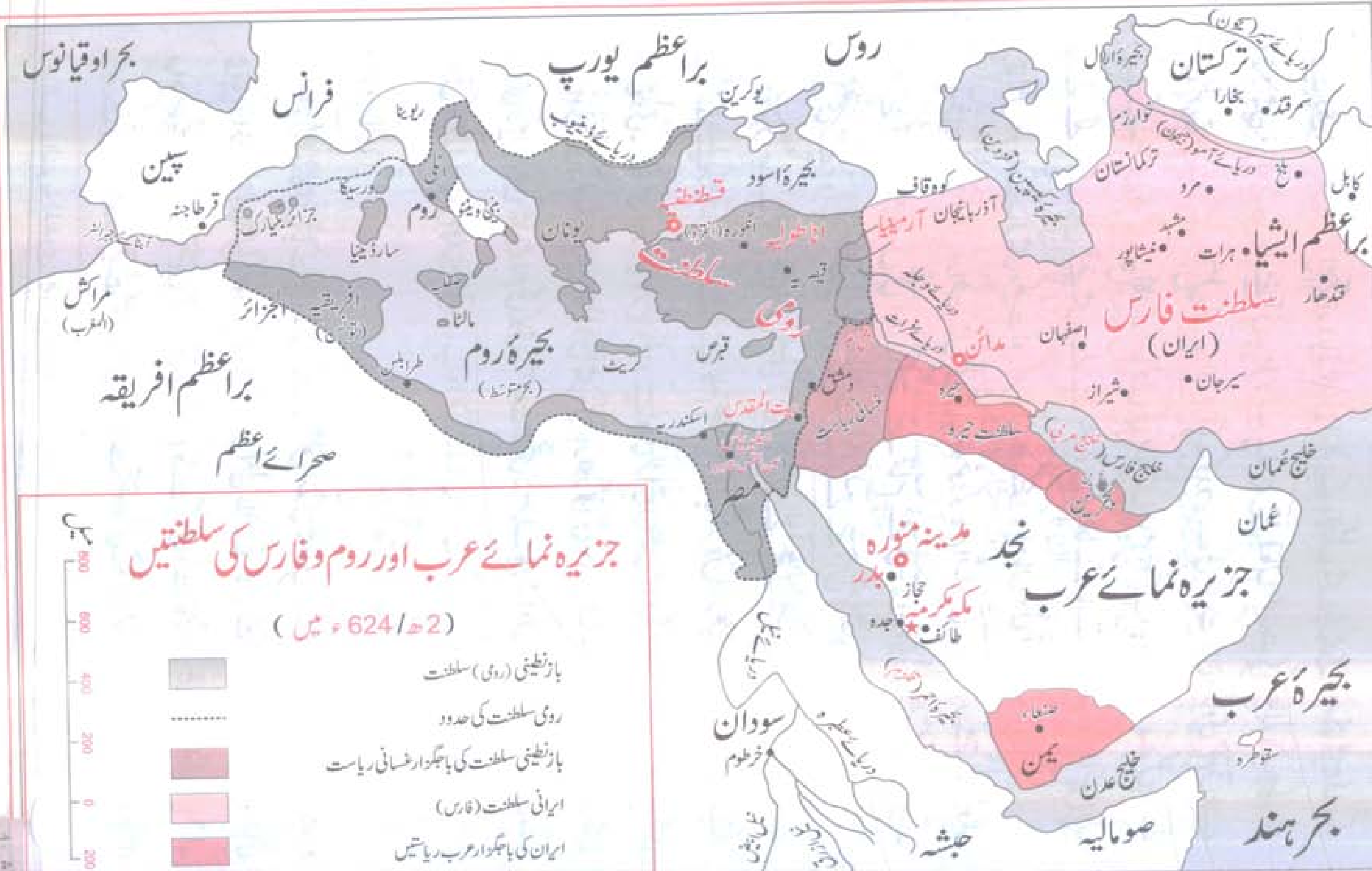
''بازنطینیوں کی معاشرتی زندگی میں زبردست تضادات تھے۔ مذہبی رجحانات ان کے ذہنوں میں راسخ تھے۔ رہبانیت عام تھی اور ملک کے طول وعرض میں پھیلی ہوئی تھی۔ ایک عام آدمی بھی دین کی گہری اور نازک بحثوں میں دخل اندازی کرنے لگا اور عوامی جھگڑوں میں مشغول ہوکر رہ گیا۔ ان کی عام زندگی پر مذہب کی چھاپ تھی لیکن جب ہم ان کی معاشرتی زندگی دیکھتے ہیں تو یہ لوگ ہر قسم کے لہوولعب اور مستی وعیاشی کے دلدادہ تھے۔ ان کے ہاں بڑے بڑے وسیع کھیلوں کے میدان (ایمفی تھیٹر جیسے) تھے۔ ہر ایک میں اسّی اسّی ہزار افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ ایمفی تھیٹر میں بیٹھ کر کبھی وہ انسانوں کی باہمی کشتی کا تماشا دیکھتے اور کبھی انسانوں اور جنگلی درندوں کی کشتی کا۔

عوام دو طبقوں میں منقسم تھے: سفید فام اور گندمی (سانولے) رنگ کے۔ رومی حسن و جمال کے شوقین تھے۔ تشدد پسند اور وحشت کے خوگر تھے۔ ان کے اکثر کھیل خونخواری اور درندگی پر مشتمل ہوتے تھے۔ ان کی سزائیں بڑی خوفناک ہوتی تھیں جن کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ ان کے امراء اور بڑوں کی زندگی بے حیائی، عیاشی، باہمی سازشوں، حد سے زیادہ طبقاتی امتیازات، بداعمالیوں اور بُری عادتوں کا مجموعہ تھی۔[1]

ایرانی بادشاہت

ایرانی بادشاہت سلطنت فارس یا سلطنت کسریٰ کے نام سے معروف تھی۔ یہ روم کی مشرقی بادشاہت سے زیادہ بڑی اور طاقتور تھی۔ یہاں مجوسیت (آتش پرستی) اور مانویت جیسے بگڑے ہوئے دین بکثرت پائے جاتے تھے۔ مانویت کی بنیاد تیسری صدی عیسوی کے آغاز میں ''مانی'' نے رکھی۔ (مانی کی دعوت ایران میں بڑھتے ہوئے شدید شہوانی رجحان کے ردّعمل کے طور پر رُونما ہوئی۔ اس نے کنوارے پن کی زندگی اختیار کرنے کی

1 السيرة النبوية للندوي، ص:31.


جزیرہ نمائے عرب اور روم و فارس کی سلطنتیں
(2ھ / 624ء میں)
بازنطینی (رومی) سلطنت
رومی سلطنت کی حدود
بازنطینی سلطنت کی باجگذار غسانی ریاست
ایرانی سلطنت (فارس)
ایران کی باجگذار عرب ریاستیں
میل
800
600
400
200
0
200
بحر اوقیانوس
فرانس
براعظم یورپ
روس
ترکستان
سپین
براعظم افریقہ
صحرائے اعظم
مراکش
(المغرب)
بحیرۂ روم
(بحر متوسط)
بحیرۂ اسود
یوکرین
یونان
روم
قسطنطنیہ
سلطنت رومی
اناطولیہ
قبرص
دمشق
بیت المقدس
اسکندریہ
مصر
سلطنت فارس
(ایران)
براعظم ایشیا
مدائن
اصفہان
شیراز
سیرجان
ہرات
مشہد
نیشاپور
مرو
بلخ
بخارا
سمرقند
کابل
قندھار
خوارزم
ترکمانستان
کوہ قاف
آرمینیا
آذربائیجان
دریائے دجلہ
دریائے فرات
حیرہ
سلطنت حیرہ
خلیج فارس
خلیج عمان
عمان
نجد
جزیرہ نمائے عرب
مدینہ منورہ
بدر
حجاز
مکہ مکرمہ
طائف
جدہ
بحیرۂ عرب
یمن
صنعاء
خلیج عدن
سقوطرہ
بحر ہند
صومالیہ
حبشہ
سوڈان
خرطوم
دریائے نیل

دعوت دی اور نکاح کو حرام قرار دیا۔) مانی ازم کے ردِّعمل میں پانچویں صدی عیسوی کے آغاز میں مَزْدَکیّت سامنے آئی۔ مَزْدَک نے ہر چیز (مال، عورت) کو حلال کر دیا۔ جو جس طرح چاہے انھیں حاصل کرے اور ہر ایک کو دوسرے کی ملکیت میں مساوی حقوق دے دیے گئے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کسانوں کی بغاوتیں عام ہوگئیں، بادشاہوں کے محل لوٹے جانے لگے۔ لوگ مال قبضے میں لے لیتے، عورتوں کو اٹھالے جاتے، املاک اور جائیدادوں پر قابض ہو جاتے۔ زمین، کھیت اور گھریوں ہوگئے، گویا وہاں کوئی آباد ہی نہ تھا۔

بادشاہوں کو حکمرانی وراثت میں ملتی تھی۔ وہ خود کو عام انسانوں سے بالا رکھتے تھے کیونکہ وہ اپنے آپ کو معبودوں کی اولاد سمجھتے تھے۔ تمام خطے کی آمدن ان بادشاہوں کی ملکیت ہوتی تھی جسے وہ ایسے متکبرانہ انداز میں صرف کرتے تھے جس کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

دوسری جانب عوام حیوانوں جیسی زندگی بسر کرتے تھے۔ ٹیکسوں اور فوجی خدمت سے بچنے کے لیے زمینداروں نے اپنے کام چھوڑ کر گرجا گھروں اور عبادت گاہوں میں رہنے کو ترجیح دی۔ تباہ کن اور ریزہ ریزہ کر دینے والی لڑائیوں میں عوام کی حیثیت ایک حقیر ایندھن کی ہوتی تھی۔ وہ لڑائیاں جو تاریخ میں کئی بار اور کئی کئی سال تک رومیوں اور ایرانیوں میں جاری رہیں، ان میں عوام کی کوئی مصلحت نہ تھی۔ صرف بادشاہوں کی خوش طبعی اور ان کے شوق کو پورا کرنا مقصود ہوتا تھا۔[1]

ہندوستان

مؤرخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ چھٹی صدی عیسوی سے جو زمانہ شروع ہوتا ہے وہ مذہبی، اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی لحاظ سے اس علاقے کا پست ترین دور تھا۔ بے حیائی عام ہو چکی تھی یہاں تک کہ فحاشی کو تقدس دے کر عبادت گاہوں تک پھیلا دیا گیا تھا۔ عورت کی کوئی قدر و قیمت تھی نہ اس کی عزت محفوظ تھی۔ جس عورت کا خاوند فوت ہو جاتا،

1 السيرة النبوية للندوي، ص:33,32.

اسے اپنے خاوند کے ساتھ زندہ جلا دینے کی رسم (سَتی) عام تھی۔ دنیا بھر کے ملکوں میں ہندوستان کو اب بھی یہ امتیازی حیثیت حاصل ہے کہ یہاں کے باشندوں میں ناقابلِ تسلیم حد تک ذات پات کی مذموم درجہ بندی پائی جاتی ہے جسے مذہبی، سیاسی اور سول قانون کی سرپرستی حاصل ہے۔ اس قانون کو ان ہندوستانی قانون سازوں نے وضع کیا جنھیں مذہبی مقام بھی حاصل تھا، اس لیے یہ ان کا دستور زندگی اور معاشرتی قانون بن گیا۔

اُس وقت ہندوستان بدامنی اور انتشار کا شکار تھا۔ چھوٹی چھوٹی ریاستیں وجود میں آ گئی تھیں اور ان میں تباہ کن لڑائیوں کی آگ کے شعلے بھڑکتے رہتے تھے۔ یہ خطہ دیگر ممالک میں رونما ہونے والے واقعات سے منقطع اور الگ تھلگ تھا۔ اپنی شان وشوکت بڑھانے کا جنون، رسم ورواج میں مبالغہ آرائی، طبقاتی اختلاف اور نسبی و خاندانی تعصب جیسی بیماریوں کا غلبہ تھا۔ ایک بھارتی مؤرخ، جو بھارت کی ایک یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر ہیں، ہندوستان میں اسلام کی آمد سے پہلے کے زمانے کے بارے میں لکھتے ہیں: ''اہل ہند دنیا سے کٹے ہوئے تھے، اپنے آپ میں مگن تھے، بین الاقوامی حالات کی انھیں کوئی خبر نہ تھی۔ اس جہالت نے ان کی پوزیشن کو کمزور کر دیا، ان میں جمود پیدا ہو گیا تھا، انحطاط و زوال کی علامتیں عام ہونے لگی تھیں۔ اس زمانے کا ادب روح سے خالی تھا اور یہی حالت فنِ تعمیر، مصوری اور دیگر فنونِ لطیفہ کی تھی۔''[1]

ہندوستانی معاشرے پر جمود طاری تھا۔ معاشرتی طبقات میں بہت زیادہ تفاوت تھا، خاندانوں کے درمیان معیوب قسم کے امتیازات تھے۔ بیوہ کو شادی کی اجازت نہ تھی۔ کھانے پینے کے معاملے میں وہ اپنے آپ پر پابندیاں لگا لیتے اور سختیاں جھیلتے۔ اچھوتوں کو شہروں میں رہنے کی اجازت نہ تھی، وہ شہر سے باہر رہتے تھے۔[2]

1 السيرة النبوية للندوي، ص: 38. 2 السيرة النبوية للندوي، ص: 39.

اہل ہند چار طبقات میں منقسم تھے:

① بَرہَمَن: یہ مذہبی لوگ اور مذہبی رہنما ہیں۔

② کھتری: یہ سپاہی اور جنگ کرنے والے لوگ ہیں۔

③ وِیش: یہ زراعت سے وابستہ اور تجارت پیشہ لوگ ہیں۔

④ شُودَر: یہ خدمت گار لوگ ہیں اور سماج کا سب سے حقیر طبقہ ہیں۔

ہندوؤں کے نظریے کے مطابق خالق کائنات نے شُودَروں کو اپنے پاؤں سے پیدا کیا۔ ان کا کام صرف یہ ہے کہ باقی تین طبقات کی خدمت کریں اور انھیں راحت پہنچائیں۔ اس قانون نے برہمنوں کو وہ اہمیت اور مقام دے دیا جس میں کوئی اور ان کا شریک نہیں۔ برہمن کے لیے عام معافی ہے اگر چہ وہ تینوں طبقات کو اپنے گناہوں اور افعال کے ساتھ برباد کردے۔ اس پر کوئی ٹیکس عائد نہیں کیا جاسکتا اور نہ کسی صورت میں اسے قتل کی سزا دی جاسکتی ہے لیکن شودر کو مال و دولت جمع کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ وہ کسی برہمن کے ساتھ بیٹھ سکتے ہیں نہ اسے اپنا ہاتھ لگا سکتے ہیں اور نہ مقدس کتب کی تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔[1]

بعثت نبوی سے پہلے دنیا کی دینی حالت

طلوعِ اسلام سے قبل انسانیت دینی، سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی لحاظ سے اپنی تاریخ کے انتہائی گھٹیا دور سے گزر رہی تھی۔ زندگی کے ہر شعبے میں عمومی انتشار تھا۔ عقائد و افکار اور نظریات و تصورات پر جاہلی طرزِ عمل کی گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ ناخواندگی، نفس پرستی، فساد، بے حیائی، سرکشی اور ظلم و تشدد اس جاہلانہ زندگی کے نمایاں خدوخال بن چکے تھے جو اِنسانی دُنیا کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔[2]

آسمانی مذاہب کی تاثیر ختم ہو چکی تھی یا ختم ہو رہی تھی کیونکہ یہ مذاہب اپنے اندر تحریف

1 منوشاستر، باب:10,9,8,2,1 بحوالہ السيرة النبوية للندوي، ص: 38. 2 الغرباء الأولون للدكتور سلمان العودة، ص: 57.

اور تغیر وتبدل آجانے کی وجہ سے اپنی اہمیت کھو چکے تھے۔ مذہب کی ایسی حیثیت نہ رہی تھی کہ یہ خالق کا اپنی مخلوق کے لیے ایک پیغام ہے۔ ان مذاہب کے ماننے والے لاینحل فکری کشمکش میں کھوئے ہوئے تھے جس کا سبب یہ تھا کہ انسانی افکار اور باطل نظریات ان میں سرایت کر چکے تھے یہاں تک کہ یہ کشمکش انھیں باہمی تباہ کن جنگ و جدال کی جانب لے گئی تھی، مذہبی تحریف سے بچنے والے لوگ بہت کم تھے۔ انھوں نے انسانی دنیا سے الگ تھلگ رہنے کو ترجیح دی۔ اصلاح سے ناامید ہوکر اور اپنے آپ کو بچانے کے لیے انھوں نے خلوت اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ اس طرح بگاڑ بلا استثنا تمام انسانی طبقات اور زندگی کے ہر شعبے میں داخل ہوگیا۔ قوموں کی مذہبی حالت یہ ہوئی کہ لوگ مرتد ہوگئے یا دین چھوڑ بیٹھے یا انھوں نے دین کو بالکل اختیار ہی نہیں کیا یا پھر آسمانی دین میں تحریف شروع کر دی۔

جہاں تک شرعی قوانین کا تعلق ہے تو لوگوں نے اللہ کی شریعت کو پسِ پشت ڈال دیا، اپنی پسند کے قوانین وضع کیے اور ایسی شریعت بنالی جس کی اللہ تعالیٰ نے اجازت نہیں دی۔ ان کی وضع کردہ شریعت خلافِ فطرت اور عقل سے متصادم بھی تھی۔ اس فساد کو پھیلانے کی قیادت قومی و سیاسی رہنماؤں، راہبوں، پادریوں، چودھریوں اور بادشاہوں نے کی۔ ساری دنیا کفر وشرک کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ڈوب گئی اور اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ضابطۂ حیات سے بہت دور ہٹ گئی۔

یہودیت: یہودیت رسوم ورواج کا مجموعہ بن گئی تھی جس میں روح تھی اور نہ زندگی کی کوئی رمق۔ یہود اپنے پڑوس میں اور ماتحت رہنے والی قوموں کے عقائد سے متاثر ہوئے، ان کے عقائد کو اپنے اندر پختہ کرلیا اور ان کے جاہلی اور بُت پرستی کے طور طریقے اختیار کر لیے جس کا اعتراف یہودی مؤرخین کو بھی ہے۔[1]

یہودی انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ بت پرستی پر انبیاء کی ناراضی اور غیظ وغضب اس

[1] السيرة النبوية للندوي، ص: 20.

بات کی دلیل ہے کہ بت پرستی اسرائیلیوں کے دلوں میں سرایت کر چکی تھی اور مصر سے جلاوطنی کے بعد اور بابل سے واپسی تک اسے جڑ سے نہیں اکھاڑا جا سکا تھا۔ ان لوگوں نے بیہودہ اور مشرکانہ عقائد اختیار کر رکھے تھے۔

تلمود بھی اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ یہودیوں کے لیے بت پرستی میں خاص کشش تھی۔[1]

بعثت نبوی سے قبل یہودی معاشرہ عقلی انحطاط اور دینی ذوق کے انتہائی بگاڑ تک جا پہنچا تھا۔ اگر آپ بابلی تلمود کا مطالعہ کریں، جسے یہودی انتہائی مقدس سمجھتے ہیں اور جو چھٹی صدی عیسوی میں یہودیوں کے ہاں متعارف ہوئی، تو آپ اس میں فکری انحطاط، بیہودہ گفتگو، اللہ تعالیٰ کی شان میں جسارتوں، حقائق کو خلط ملط کرنے اور دین و عقل کو کھیل تماشا بنانے کے عجیب و غریب نمونے دیکھیں گے۔[2]

عیسائیت: عیسائیت حد سے تجاوز کرنے والوں کی تحریف اور جاہلوں کی تاویل کی وجہ سے تختۂ مشق بنی ہوئی تھی۔ توحید کا نور اور عبادت الٰہی کا اخلاص مشرکانہ عقائد کے گہرے بادلوں میں چھپ گیا تھا۔ مسیح کی حقیقت اور فطرت کے بارے میں مصر کے عیسائیوں اور شام و عراق کے عیسائیوں کے درمیان جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے تھے۔ گھر، اسکول اور گرجے ایک دوسرے کے خلاف فوجی کیمپوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ مختلف شکلوں میں بت پرستی مسیحی معاشرے میں پھیل چکی تھی۔ عصرِ حاضر کی تصانیف میں عیسائیت کی تاریخ یوں بیان کی گئی ہے:

"کھلی بت پرستی اگرچہ ختم ہو گئی تھی مگر اس کا قلع قمع نہ ہو سکا کیونکہ وہ دلوں میں پختہ ہو چکی تھی۔ جلد ہی مسیحیت کے لبادے میں بُت پرستی از سرِ نو شروع ہو گئی۔ جو لوگ باطل معبودوں اور دیوتاؤں سے لاتعلق ہو کر انھیں چھوڑ چکے تھے انھوں نے کسی اپنے شہید کا

[1] السيرة النبوية للندوي، ص:20. [2] السيرة النبوية للندوي، ص:21.

انتخاب کرکے اسے خدائی اوصاف سے نوازا، پھر اس کا مجسمہ بنالیا۔ یوں شرک اور بت پرستی ان مقامی شہداء کی جانب منتقل ہوگئی۔ ابھی ایک صدی ختم نہ ہوئی تھی کہ شہداء اور اولیاء کی عبادت عام ہوگئی اور ایک نئے عقیدے نے جنم لے لیا کہ اولیاء بھی صفاتِ الوہیت کے حامل ہوتے ہیں، اس طرح یہ اولیاء اور بزرگ، اللہ اور انسان کے درمیان ایک ایسا واسطہ بن گئے جو اریسیوں کے عقائد کے مطابق وصف الوہیت کے حامل تھے۔ قرون وسطیٰ کے اولیاء، ورع، طہارت اور تقدس کی علامت بن گئے۔ بت پرستی کے تہواروں کو نئے نام دے دیے گئے۔ 400ء میں سورج دیوتا کا قدیم تہوار عید میلاد المسیح (کرسمس) میں تبدیل ہوگیا۔''[1]

جدید کیتھولک انسائیکلوپیڈیا میں مرقوم ہے کہ چوتھی صدی عیسوی کے آخری رُبع میں یہ عقیدہ عیسائی دنیا کے دل و دماغ میں پختہ ہوگیا کہ اللہ اقانیم ثلاثہ سے مرکب ہے۔ یہی ان کا مسلّمہ رسمی عقیدہ رہا جس پر پوری مسیحی دنیا میں اعتماد کیا جاتا تھا۔ اس عقیدۂ تثلیث کے راز اور اس میں تبدیلی سے پردہ صرف انیسویں صدی عیسوی کے آخری نصف میں اُٹھا۔[2]

عیسائیوں کے درمیان لڑائیوں کے شعلے بھڑکتے رہے۔ انھوں نے ایک دوسرے کو کافر کہا، ایک دوسرے کا خون بہایا۔ بجائے اس کے کہ بگاڑ کے خلاف جنگ کرتے، اصلاحِ احوال کے لیے کوشش کرتے اور انسانیت کی بھلائی سے لبریز دعوت قوموں کے سامنے پیش کرتے، عیسائی آپس میں ایک دوسرے سے برسرپیکار رہے۔[3]

مجوسیت: مجوسی زمانۂ قدیم سے طبعی عناصر کی عبادت کے ساتھ معروف ہیں۔ سب سے بڑا عنصر (ان کا معبود) آگ ہے۔ سلطنت فارس کے طول و عرض میں آتش کدے پھیلے ہوئے تھے۔ وہ آگ کی عبادت میں مشغول رہتے۔ اس کے لیے انھوں نے عبادت گاہیں اور عمارتیں تعمیر کر رکھی تھیں۔ عبادت گاہوں کے اندر خاص آداب اور ضوابط تھے مگر

---

1 السيرة النبوية للندوي، ص: 23. 2 دائرة المعارف الكاثوليكية: 395/14. 3 فتح العرب لمصر للدكتور محمد أبو حديد، ص: 37,38و48.

عبادت گاہوں سے باہر یہ لوگ پابندی سے آزاد تھے۔ وہ اپنی خواہشات کے مطابق زندگی گزارتے۔ ان میں اور کسی بے دین میں کوئی فرق نہ تھا۔

ڈنمارک کا ایک مؤرخ اپنی کتاب ''ایران ساسانی عہد میں'' میں بیان کرتا ہے کہ مجوسیوں کے ہاں مذہبی رہنماؤں کا مقام اور ذمہ داریاں کیا تھیں؟ وہ کہتا ہے کہ ان کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ دن میں چار مرتبہ سورج کی پوجا کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ چاند، آگ اور پانی کی بھی عبادت کریں۔ ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ سوتے وقت، بیدار ہوتے وقت، غسل کرتے وقت، جنیو (ان کے ہاں مقدس دھاگہ) پہنتے وقت، کھاتے وقت، چھینک آنے پر، بال منڈاتے وقت، ناخن کاٹتے وقت، قضائے حاجت کے وقت اور چراغ جلاتے وقت مخصوص دعائیں پڑھیں۔ انھیں اس بات کا حکم تھا کہ آگ بجھنے نہ دیں اور نہ ہی آگ اور پانی کا ایک دوسرے سے ملاپ ہونے دیں اور کوئی دھات بھی زنگ آلود ہونے نہ پائے کیونکہ دھاتیں ان کے ہاں مقدس ہوتی ہیں۔

اہل ایران اپنی عبادت میں آگ کی طرف رخ کرتے تھے۔ یزدگرد جو ساسانیوں کا آخری بادشاہ تھا، اس نے ایک مرتبہ سورج کی قسم کھاتے ہوئے یہ الفاظ کہے: ''میں سورج کی قسم اٹھاتا ہوں کہ یہ سب سے بڑا معبود ہے۔''

مجوسی ہر زمانے میں دو خداؤں کے قائل رہے ہیں۔ اور یہ ثنویت یعنی دو خداؤں کو ماننا ان کا امتیازی نشان ہے۔ وہ دو معبودوں کو مانتے تھے۔ ایک نور یا بھلائی کا معبود اور دوسرا اندھیرے یا شر کا معبود۔[1]

بدھ مت: بدھ مت ہندوستان اور وسطی ایشیا میں بت پرستی کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ یہ لوگ جہاں جاتے بت ساتھ لے کر جاتے اور عبادت گاہیں تعمیر کرتے، جہاں ٹھہرتے وہاں بدھا کے مجسمے نصب کر دیتے۔

1 إيران في عهد الساسانيين لأرثر كريستنسن، ص: 155 بحواله السيرة النبوية للندوي، ص: 27.

ہندومت: برہمنیت یا ہندومت ہندوستان کا اصل دین ہے۔ اس مذہب کے بے شمار معبود ہیں۔ چھٹی صدی عیسوی میں اس دین کو عروج حاصل ہوا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندومت اور بدھ مت یکساں طور پر بت پرستی کے مذہب ہیں۔

طلوع اسلام کے وقت بحراوقیانوس سے بحرالکاہل تک بسنے والی دنیا کے لوگ بت پرستی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ عیسائیت، یہودیت، بدھ مت اور ہندومت بتوں کی تعظیم و تقدیس میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں تھے، گویا وہ شرط لگے گھوڑے تھے جو ایک ہی میدان میں دوڑ رہے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے اس عمومی بگاڑ کی طرف اشارہ فرمایا جو بلا استثنا ہر طبقے اور ہر میدان میں پھیلا ہوا تھا۔ آپ ﷺ نے ایک دن اپنے خطبے میں فرمایا:

«أَلَا إِنَّ رَبِّي أَمَرَنِي أَنْ أُعَلِّمَكُمْ مَّا جَهِلْتُمْ مِّمَّا عَلَّمَنِي يَوْمِي هٰذَا، كُلُّ مَالٍ نَّحَلْتُهُ عَبْدًا حَلَالٌ، وَّ إِنِّي خَلَقْتُ عِبَادِي حُنَفَاءَ كُلَّهُمْ، وَ إِنَّهُمْ أَتَتْهُمُ الشَّيَاطِينُ فَاجْتَالَتْهُمْ عَنْ دِينِهِمْ، وَ حَرَّمَتْ عَلَيْهِمْ مَا أَحْلَلْتُ لَهُمْ، وَ أَمَرَتْهُمْ أَنْ يُّشْرِكُوا بِي مَا لَمْ أُنْزِلْ بِهٖ سُلْطَانًا، وَّ إِنَّ اللّٰهَ نَظَرَ إِلٰى أَهْلِ الْأَرْضِ فَمَقَتَهُمْ عَرَبَهُمْ وَ عَجَمَهُمْ إِلَّا بَقَايَا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ»

"متوجہ ہو جاؤ! بے شک میرے رب نے مجھے حکم فرمایا ہے کہ میں تمھیں ان باتوں کی تعلیم دوں جن کا تمھیں علم نہیں اور وہ آج اس نے مجھے سکھائی ہیں۔ اللہ نے فرمایا ہے: ہر وہ مال جو میں کسی بندے کو عطا کردوں، حلال ہے۔ میں نے اپنے بندوں کو فطرتاً توحید آشنا پیدا کیا ہے، پھر ان کے پاس شیاطین آتے ہیں اور انھیں ان کے دین سے دور کر دیتے ہیں۔ وہ (شیاطین) ان کے لیے وہ چیزیں حرام

باب 2

عرب اقوام اور ان کی تہذیبیں

عرب اقوام

مؤرخین نے عرب اقوام کی تین اقسام بیان کی ہیں، جن سے ان کا نسلی سلسلہ جاری ہوا۔[1]

① **عرب بائدہ:** ان میں عاد، ثمود، عَمالقہ، طَسْم، جَدِیس، اُمیم، جُرہم اور حضرمَوت وغیرہ کے قبائل شامل ہیں۔ اسلام سے قبل ہی ان اقوام کے آثار ناپید اور معدوم ہو چکے تھے۔ ان میں بادشاہی نظام تھا اور ان کی بادشاہت شام اور مصر تک پھیلی ہوئی تھی۔[2]

② **عرب عاربہ:** یہ وہ عرب ہیں جو یعرُب بن یشجُب بن قحطان کی نسل سے ہیں۔ انھیں قحطانی عرب کہا جاتا ہے۔[3] یہ جنوب میں بسنے والے عرب ہیں۔[4] یمن کے بادشاہ انھی میں سے تھے۔ مَعین، سَبا اور حِمیَر کی بادشاہت بھی انھی کی تھی۔[5]

③ **عدنانی عرب:** ان کی نسبت عدنان کی طرف ہے جس کا نسب حضرت اسماعیل بن ابراہیم علیہما السلام تک پہنچتا ہے۔ یہ عرب مُستعْرِبہ کے نام سے معروف ہیں، یعنی وہ لوگ جن میں غیر عربی خون شامل ہوا، پھر عجمی و عربی خون آپس میں مدغم ہو گئے اور عربی لغت نئی مخلوط نسل کی زبان بن گئی۔

---

1 فقه السيرة النبوية للدكتور الغضبان، ص:45. 2 السيرة النبوية لأبي شهبة، ص:1/46. 3 فقه السيرة النبوية للدكتور الغضبان، ص:45. 4 مدخل لفهم السيرة للدكتور يحيىٰ اليحيىٰ، ص:98. 5 السيرة النبوية لأبي شهبة، ص:1/47.

باب 2

عرب اقوام اور ان کی تہذیبیں

عرب اقوام

مؤرخین نے عرب اقوام کی تین اقسام بیان کی ہیں، جن سے ان کا نسلی سلسلہ جاری ہوا۔[1]

① **عرب بائدہ:** ان میں عاد، ثمود، عمالقہ، طَسم، جَدِیس، اُمیم، جُرہم اور حضرَموت وغیرہ کے قبائل شامل ہیں۔ اسلام سے قبل ہی ان اقوام کے آثار ناپید اور معدوم ہو چکے تھے۔ ان میں بادشاہی نظام تھا اور ان کی بادشاہت شام اور مصر تک پھیلی ہوئی تھی۔[2]

② **عرب عاربہ:** یہ وہ عرب ہیں جو یعرُب بن یشجُب بن قحطان کی نسل سے ہیں۔ انھیں قحطانی عرب کہا جاتا ہے۔[3] یہ جنوب میں بسنے والے عرب ہیں۔[4] یمن کے بادشاہ انھی میں سے تھے۔ مَعین، سَبَا اور حِمیَر کی بادشاہت بھی انھی کی تھی۔[5]

③ **عدنانی عرب:** ان کی نسبت عدنان کی طرف ہے جس کا نسب حضرت اسماعیل بن ابراہیم علیہما السلام تک پہنچتا ہے۔ یہ عرب مُستعَرِبہ کے نام سے معروف ہیں، یعنی وہ لوگ جن میں غیر عربی خون شامل ہوا، پھر عجمی و عربی خون آپس میں مدغم ہو گئے اور عربی لغت نئی مخلوط نسل کی زبان بن گئی۔

1 فقه السيرة النبوية للدكتور الغضبان، ص:45. 2 السيرة النبوية لأبي شهبة، ص:46/1. 3 فقه السيرة النبوية للدكتور الغضبان، ص:45. 4 مدخل لفهم السيرة للدكتور يحيى اليحيى، ص:98. 5 السيرة النبوية لأبي شهبة، ص:47/1.

یہ شمالی عرب ہیں جن کا اصل وطن مکہ ہے۔ یہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے بنو جُرہم سے عربی زبان سیکھی اور اسی خاندان میں ان کی شادی ہوئی۔ آپ کی اولاد نے عربوں ہی کی طرح نشوونما پائی۔ اولاد اسماعیل میں سے اہم ترین شخصیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جد اعلیٰ عدنان کی ہے۔ عدنان ہی سے عرب قبائل اور خاندان چلے۔ عدنان کے بعد اس کا بیٹا معدّ، پھر اس کا بیٹا نزار، پھر اس کے دو بیٹے مُضَر اور ربیعہ معروف ہوئے۔

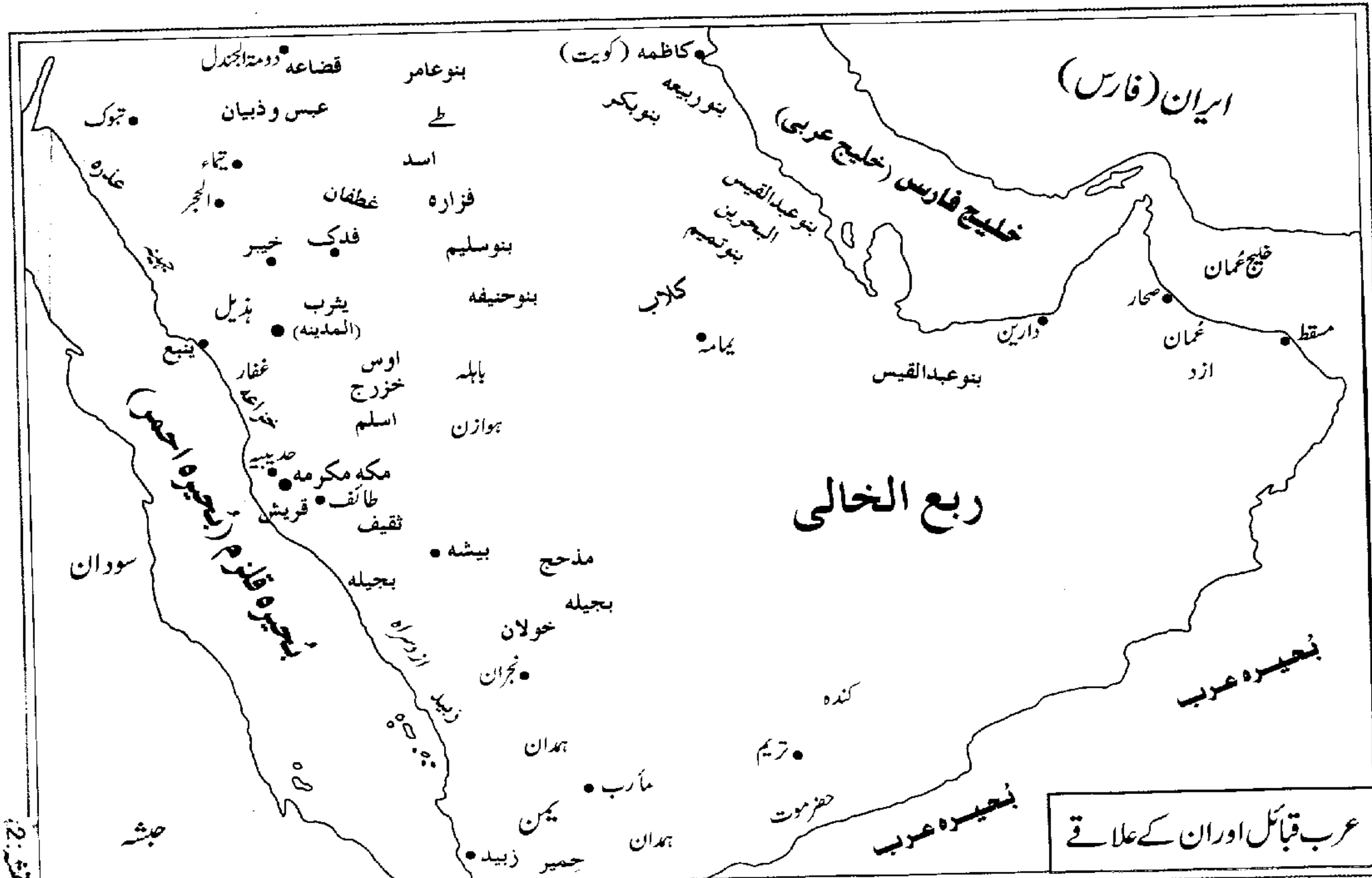
ربیعہ بن نزار کی نسل سے وجود میں آنے والوں نے مشرقی عرب کو اپنا مسکن بنایا۔ بنوعبدالقیس بحرین میں، بنوحنیفہ یمامہ میں اور بنوبکر بن وائل بحرین اور یمامہ کے درمیان جابسے۔ بنوتغلب دریائے فرات عبور کر گئے اور دریائے دجلہ اور فرات کے درمیان الجزیرہ میں قیام پذیر ہوئے۔ بنوتمیم نے بصرہ کے نواح میں سکونت اختیار کی۔[1]

مضر بن ربیعہ کی اولاد میں سے بنوسُلیم قُربِ یثرب (مدینہ) میں ٹھہرے، بنوثقیف نے طائف میں اقامت اختیار کی۔ بنوہَوازن نے مکہ کے مشرقی علاقے کو اپنا وطن بنایا، بنواسد نے تیماء کے مشرق سے کوفے کے مغرب تک کے علاقے میں سکونت اختیار کی۔ بنوذبیان اور بنوعبس نے تیماء سے حوران تک کے علاقے کو اپنا مسکن بنایا۔[2]

علمائے انساب اور دیگر اہل علم کی اکثریت نے عربوں کی دو قسمیں بتائی ہیں: عدنانی اور قحطانی۔ جبکہ بعض علماء کی یہ رائے بھی ہے کہ عدنانی اور قحطانی دونوں کا نسب حضرت اسماعیل علیہ السلام سے جا ملتا ہے۔[3]

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب صحیح البخاری میں اس مقصد کے لیے ایک عنوان: باب نسبة اليمن إلى إسماعيل علیہ الصلاۃ والسلام.....) قائم کیا ہے۔ انھوں نے اس باب میں حضرت

1 مدخل لفهم السيرة للدكتور يحيىٰ اليحيىٰ، ص:99,98. بنوتمیم دراصل نجد اور عراق کے درمیانی علاقے میں آباد ہوئے۔ 2 الطريق إلى المدائن لعادل كمال، ص:40. 3 السيرة النبوية لأبي شهبة، ص:48/1.


عرب قبائل اوران کے علاقے
ایران (فارس)
خلیج فارس (خلیج عربی)
خلیج عُمان
ربع الخالی
بُحیرہ قلزم (بُحیرہ احمر)
بُحیرہ عرب
بُحیرہ عرب
کاظمہ (کویت)
بنوربیعه
بنوبکر
بنوعامر
قضاعه
دومۃ الجندل
عبس وذبیان
تبوک
طے
اسد
تیماء
عذرہ
الحجر
غطفان
فزاره
فدک
خیبر
بنوسلیم
یثرب
(المدینه)
ہذیل
بنوحنیفه
ینبع
غفار
اوس
خزرج
خزاعه
اسلم
باہله
ہوازن
حدیبیه
مکه مکرمه
طائف
قریش
ثقیف
بیشه
مذحج
بجیله
بجیله
خولان
نجران
ازدسراة
زبید
ہمدان
مأرب
یمن
ہمدان
زبید
حمیر
سودان
حبشه
بنوعبدالقیس
البحرین
بنوتمیم
کلاب
یمامه
بنوعبدالقیس
دارین
صحار
عُمان
ازد
مسقط
کنده
تریم
حضرموت

نقشہ 2:

سلمہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک قوم کے پاس آئے جو بازار میں تیراندازی کا مقابلہ کر رہی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«اِرْمُوا بَنِي إِسْمَاعِيلَ! فَإِنَّ أَبَاكُمْ كَانَ رَامِيًا وَّ أَنَا مَعَ بَنِي فُلَانٍ»

''اے اولاد اسماعیل! تیراندازی کرو، تمھارا باپ بھی تیرانداز تھا اور (دو فریقوں میں سے ایک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:) میں فلاں لوگوں کے ساتھ ہوں۔'' تو دوسرے فریق نے اپنے ہاتھ روک لیے، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: «مَالَهُمْ؟» ''انھیں کیا ہوگیا ہے؟'' انھوں نے کہا کہ ہم کیسے تیر چلائیں، آپ تو فلاں لوگوں کے ساتھ ہیں۔ تب آپ ﷺ نے فرمایا: «اِرْمُوا وَأَنَا مَعَكُمْ كُلِّكُمْ» ''تم تیر چلاؤ، میں تم سب کے ساتھ ہوں۔''[1]

امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اسلم بن اَفْصٰی بن حارثہ بن عمرو بن عامر بنوخُزاعہ سے ہے، یعنی بنوخزاعہ سبا کے ان قبائل کا ایک حصہ ہیں جو اللہ کی طرف سے بھیجے گئے سیلاب (سَیلِ عَرِم) کی آمد پر بکھر گئے تھے۔[2]

رسول اللہ ﷺ قبیلہ مُضَر میں پیدا ہوئے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے کُلَیب بن وائل سے روایت بیان کی ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کی ربیبہ (بیوی کی پہلے خاوند سے بیٹی) زینب بنت ابی سلمہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ کیا نبی ﷺ مضر قبیلے سے تھے؟ تو انھوں نے کہا: اگر مُضَر قبیلے سے نہیں تھے تو کس قبیلے سے تھے؟ آپ (آلِ مضر میں) نضر بن کنانہ کی اولاد ہی سے ہیں۔''[3]

قریش کنانہ کی نسل سے ہیں اور یہ فہر بن مالک بن نُضر بن کنانہ کی اولاد ہیں۔ قریش کے بہت سے قبائل ہیں۔ مشہور قبائل کے نام یہ ہیں: جُمَح، سہم، عدی، مخزوم، تَیم، زُہرہ اور قُصَی بن کلاب کے خاندان۔ اور وہ یہ ہیں: عبدالدار بن قُصَی، اسد بن عبدالعزیٰ بن قُصَی، عبد مناف بن قُصَی۔

---

1 صحيح البخاري، حديث: 3507. 2 صحيح البخاري، قبل الحديث: 3507، باب: (4).
3 صحيح البخاري، حديث:3491.

عبد مناف کے چار بیٹے ہوئے: عبد شمس، نوفل، مطلب اور ہاشم۔ ہاشم کا گھرانہ وہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم ﷺ کا انتخاب فرمایا۔ [1]

نبی ﷺ کا فرمان ہے:

«إِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ اصْطَفٰى كِنَانَةَ مِنْ وَّلَدِ إِسْمَاعِيلَ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ، وَاصْطَفٰى قُرَيْشًا مِّنْ كِنَانَةَ، وَاصْطَفٰى مِنْ قُرَيْشٍ بَنِي هَاشِمٍ، وَاصْطَفَانِي مِنْ بَنِي هَاشِمٍ»

''بے شک اللہ تعالیٰ نے اولاد اسماعیل میں سے کنانہ کا انتخاب فرمایا، پھر کنانہ میں سے قریش کا، پھر قریش میں سے بنو ہاشم کا اور بنو ہاشم میں سے میرا انتخاب فرمایا۔'' [2]

جزیرہ نمائے عرب کی تہذیبیں

زمانہ قدیم ہی سے جزیرہ نمائے عرب (Arabian Peninsula) میں اعلیٰ اور عمدہ تہذیب و تمدن نے جنم لیا۔ جزیرہ نمائے عرب کی مشہور تہذیبیں درج ذیل ہیں:

یمن میں سبا کی تہذیب: قرآن حکیم نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اہل سبا نے بارشوں اور سیلابوں کے پانی سے، جو ریت میں جذب ہو جاتا تھا یا سمندر میں جا گرتا تھا، فائدہ اٹھایا اور جدید انجینئرنگ کے اصولوں کے مطابق اس کے لیے حوض اور بند بنائے۔ مشہور ترین بند سد مأرب (مأرب ڈیم) ہے۔ [3] انھوں نے اس کا پانی مختلف انواع کے کھیتوں، بلند و بالا درختوں اور لذیذ پھلوں والے باغات کی آبپاشی میں استعمال کیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

---

1 فقہ السیرۃ النبویۃ للدکتور الغضبان، ص: 47. 2 صحیح مسلم، حدیث: 2276. 3 مسعودی کے بقول مأرب کے پاس ایک آبی بند سبا بن یشجب بن یعرب نے بنانا شروع کیا تھا مگر اس کی تکمیل سے پہلے وہ فوت ہو گیا اور پھر حمیر کے بادشاہوں نے اسے مکمل کیا۔ ڈاکٹر محمد عبدالقادر بافقیہ ''تاریخ الیمن القدیم'' میں رقمطراز ہیں: ''مأرب کا عظیم بند اس وادی پر واقع ہے جس کے شمالی دہانے پر مأرب کا شہر بنا ہوا ہے۔ اس وادی کے دہانے پر مکربون (ملوک سبا) کے زمانے میں اہل سبا نے مٹی کی ایک موٹی دیوار کھڑی کی تھی جس کو انھوں نے سیلاب کی جانب سے بڑی بڑی چٹانوں سے ڈھانک دیا تھا۔ اس مٹی کی »

﴿لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكَنِهِمْ آيَةٌ ۖ جَنَّتَانِ عَن يَمِينٍ وَشِمَالٍ ۖ كُلُوا مِن رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوا لَهُ ۚ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَرَبٌّ غَفُورٌ ○﴾

''سبا (قوم) کے لیے ان کی بستی میں یقیناً ایک عظیم نشانی تھی، دائیں اور بائیں طرف دو باغ تھے، (ہم نے کہا:) تم اپنے رب کے رزق سے کھاؤ اور اس کا شکر ادا کرو، (یہ) پاکیزہ شہر ہے اور رب بڑا بخشنے والا ہے۔''[1]

قرآن کریم نے یہ بھی بتایا ہے کہ زمانۂ ماضی میں یمن سے براستہ حجاز، شام تک کے علاقوں میں قریب قریب بستیاں آباد تھیں۔ یمن سے شام تک سفر کرنے والے قافلے کہیں بھی سایہ دار جگہوں اور کھانے پینے کے سامان سے محروم نہیں رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَقَدَّرْنَا فِيهَا السَّيْرَ ۖ سِيرُوا فِيهَا لَيَالِيَ وَأَيَّامًا آمِنِينَ ○﴾

''اور ہم نے ان (اہل سبا) کے اور ان بستیوں کے درمیان جن میں ہم نے برکت رکھی تھی، کئی بستیاں باہم متصل (سرِ راہ آباد) رکھی تھیں اور ان میں ہم نے چلنے (آنے جانے) کی منزلیں مقرر کر دی تھیں، (ہم نے کہا:) تم ان میں راتوں اور دنوں کو امن سے سفر کرو۔''[2]

احقاف میں قوم عاد کی تہذیب: قوم عاد حضر موت کے شمال کی جانب آباد تھی۔[3] یہ وہی قوم ہے جس کی جانب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ہود علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔

«« دیوار یا بند کی لمبائی 1800 فٹ تھی، اس کی بلندی اس کے آخری دور میں 42 فٹ تک پہنچ گئی تھی۔'' پرانے سد مأرب سے دس کلومیٹر کے فاصلے پر نیا سد مأرب تعمیر کیا گیا ہے۔ جس کا افتتاح ستمبر 1987 کو عمل میں آیا۔ (اطلس القرآن اردو (دارالسلام لاہور) ص: 259,258) [1] سبا 15:34۔ [2] سبا 18:34۔

[3] اس عربی قبیلے کی رہائش عمان اور حضر موت (یمن) کے درمیان ریت کے ٹیلوں والے علاقے احقاف میں تھی۔ یہ علاقہ سمندر کے کنارے پر واقع تھا جو شِحر کے نام سے معروف تھا اور ان کی وادی کا نام مغیث تھا۔ (قصص الأنبیاء (دارالسلام، لاہور)، ص: 107)

یہ قوم بڑے عالی شان مکانات، محلات، باغات، کھیتوں اور چشموں کی مالک تھی۔[1]

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَ اتَّقُوا الَّذِيْٓ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ۚ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّ بَنِيْنَ ۚ وَ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ۚ ﴾

''اور تم اس ذات سے ڈرو جس نے تمھیں ان چیزوں میں بڑھایا (امداد دی) ہے جو تم جانتے ہو، اس نے تمھیں بڑھایا ہے مویشیوں اور بیٹوں میں اور باغوں اور چشموں میں۔''[2]

حجاز میں قوم ثمود کی تہذیب: قرآن حکیم نے بتایا ہے کہ حجر کے علاقے میں ایک تہذیب موجود تھی اور اشارہ کیا ہے کہ وہ پہاڑوں کو تراش کر گھر بنانے جیسی قوتوں کے مالک تھے۔[3] اور ان کے علاقے میں کثرت سے چشمے، باغات اور کھیت موجود تھے۔[4]

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اَتُتْرَكُوْنَ فِيْ مَا هٰهُنَآ اٰمِنِيْنَ ۙ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ۙ وَّ زُرُوْعٍ وَّ نَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ ۚ وَ تَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ ۚ ﴾

''کیا تمھیں یہاں کی چیزوں میں پرامن چھوڑ دیا جائے گا، (یعنی) باغوں اور چشموں میں اور کھیتوں اور کھجوروں میں جن کے خوشے نرم و نازک ہیں اور تم اتراتے ہوئے پہاڑوں سے گھر تراشتے ہو۔''[5]

---

[1] السيرة النبوية لأبي شهبة: 50/1. [2] الشعرآء 26:132-134. [3] قوم ثمود کی رہائش تبوک اور حجاز کے درمیان حجر کے مقام پر تھی جسے مدائن صالح بھی کہا جاتا ہے۔ یہ علاقہ خلیج عقبہ کے مشرق میں واقع شہر، مدین کے جنوب مشرق میں ہے۔ قوم ثمود کے مکانات اس علاقے کے پہاڑوں میں صاف کھدے نظر آتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ہمراہ تبوک جاتے وقت اس مقام سے گزرے تھے۔ (قصص الانبیاء، دارالسلام، لاہور، ص:133) [4] السيرة النبوية لأبي شهبة: 51/1.

[5] الشعرآء 26:146-149.

یہ سب کچھ عرصہ دراز سے ختم ہو چکا ہے۔ چند آثار، نشانات اور علامات باقی رہ گئی ہیں۔ بستیاں اور شہر معدوم ہو گئے۔ مکانات و محلات ویران ہو گئے۔ چشمے خشک ہو گئے۔ درخت سوکھ گئے اور کھیتیاں اور باغات بنجر زمین میں تبدیل ہو گئے۔[1]

1 السيرة النبوية لأبي شهبة:51/1.

باب 3

عربوں کی دینی، سیاسی، معاشی، معاشرتی اور اخلاقی حالت

عربوں کی دینی حالت

عرب قوم بتدریج شدید قسم کی دینی پسماندگی، بت پرستی، اخلاقی اور معاشرتی بے اعتدالی اور سیاسی و قانونی بدامنی کا شکار ہوگئی جس وجہ سے ان کی اہمیت ختم ہوکر رہ گئی اور وہ تاریخ کے ایک کنارے پر رہ کر الگ تھلگ زندگی گزارنے لگے۔ اپنی حالت کو سنوارنے کے لیے اتنا بھی نہ کر سکے کہ ایرانی یا رومی حکومت کی اتباع کر لیتے۔ ان کے دل اپنے اپنے آباء و اجداد کی میراث کی عظمت سے بھرے ہوئے تھے۔ انھی کے طریقے پر چلنا ان کا مطمح نظر تھا، خواہ وہ طریقہ گمراہی، بے اعتدالی اور کجی والا ہی کیوں نہ ہو، اسی وجہ سے انھوں نے بتوں کی پوجا شروع کر دی۔ ہر قبیلے کا ایک مخصوص بت تھا۔

بنو ہُذَیل بن مُدرِکہ کا بت سُوَاع تھا۔ بنو کلب وَدّ نامی بت کو پوجتے تھے۔ بنو مَذْحِج نے یَغوث کو معبود بنا رکھا تھا۔ بنو خَیوان یعوق کے پجاری تھے۔ بنو حمیر کا بت نَسر تھا۔ بنو خُزاعہ اور قُریش اِساف اور نائلہ کی عبادت کرتے تھے۔

مناۃ نامی بت ساحل سمندر پر نصب تھا۔ سارا عرب، خاص طور پر اوس و خزرج اس کی تعظیم کرتے تھے۔ لات بنو ثقیف میں پوجا جاتا تھا۔ عُزّیٰ ذات عِرق سے اوپر (وادی نخلہ) کے علاقے میں تھا اور قریش کے ہاں سب سے بڑا اور عظیم بت تھا۔[1]

[1] الغرباء الأولون للدكتور سلمان العودة، ص: 60.

ان بڑے بڑے بتوں کے ساتھ ساتھ بے شمار چھوٹے چھوٹے بت تھے۔ جنھیں سفر میں ساتھ لے جانا اور گھر میں رکھنا آسان ہوتا تھا۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں ابورجاء العطاردی سے بیان کیا ہے کہ ہم پتھر کی پوجا کیا کرتے تھے۔ جب ہمیں اس سے عمدہ پتھر مل جاتا تو ہم پہلا پتھر پھینک دیتے اور دوسرا لے لیتے تھے۔ اگر ہمیں کوئی پتھر نہ ملتا تو ہم مٹی کی ایک ڈھیری بناتے، اس پر بکری کا دودھ دوہتے اور اس کا طواف شروع کر دیتے تھے۔ [1]

یہی بت پرستی عربوں کے لیے رکاوٹ بن گئی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کریں اور صحیح معنی میں اس کی تعظیم وتوقیر کریں، نیز اس پر اور یوم آخرت پر ایمان لائیں۔ اگرچہ ان کا خیال تھا کہ یہ ہمارے اور اللہ کے درمیان واسطے ہیں مگر (حقیقت یہ ہے کہ) یہ خودساختہ معبود ان کے دلوں اور اعمال وکردار، بلکہ زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہو چکے تھے اور ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی قدرومنزلت ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

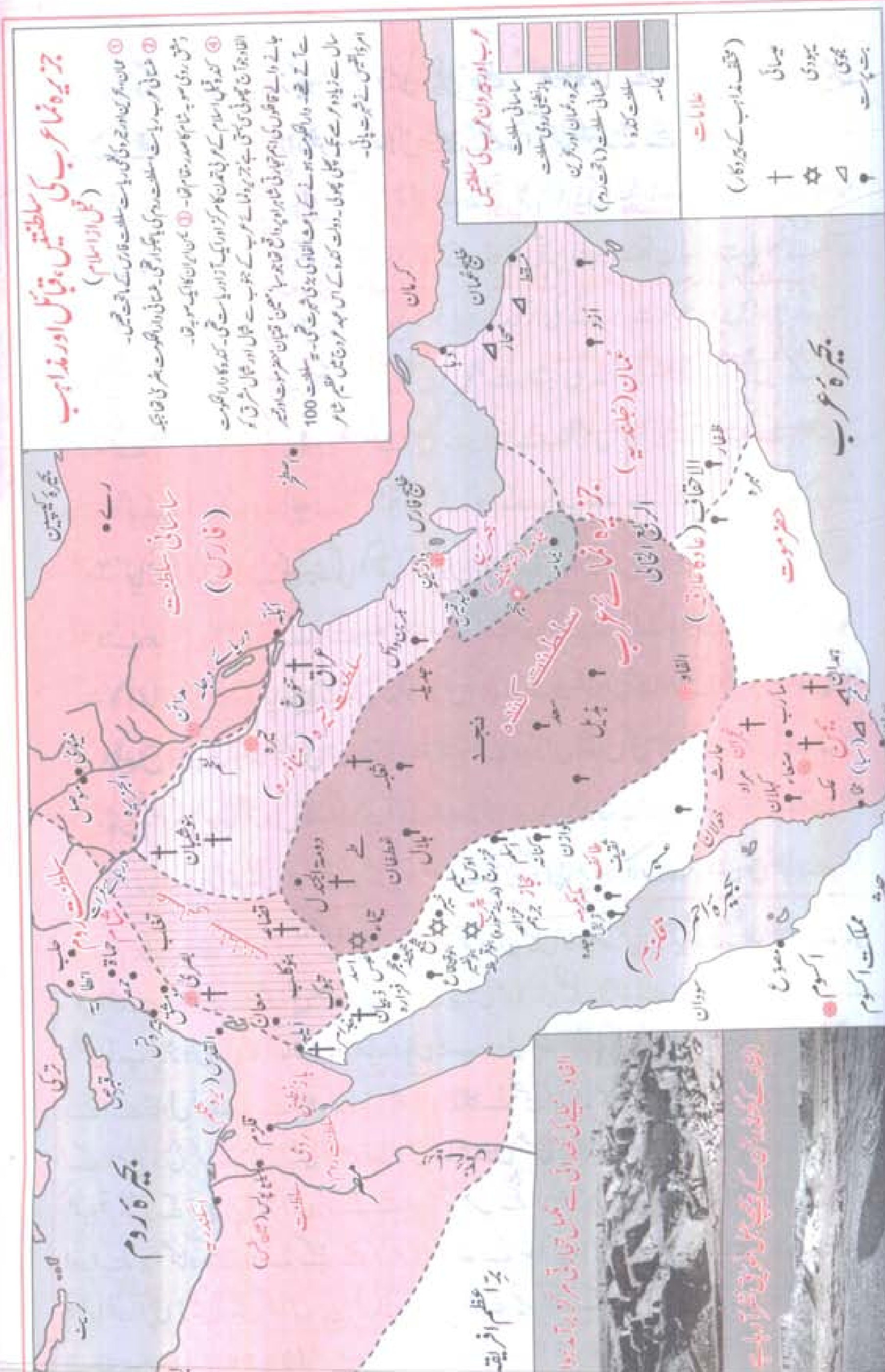
﴿إِنَّمَا يَسْتَجِيبُ الَّذِينَ يَسْمَعُونَ ۘ وَالْمَوْتَىٰ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ ثُمَّ إِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ○﴾

''حق کو قبول تو صرف وہ کرتے ہیں جو سنتے ہیں اور جو مردے ہیں، اللہ انھیں اٹھائے گا، پھر وہ اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔'' [2]

دین ابراہیم کے باقی ماندہ پیروکار بھی تحریف اور تغیروتبدّل کا شکار ہو چکے تھے۔ حج ایک ایسا معاملہ بن گیا تھا کہ جس میں وہ خاندانی، نسلی یا اپنے کارہائے نمایاں کے لحاظ سے ایک دوسرے پر فخر کا اظہار کرتے تھے۔ توحید کے عقائد ونظریات اپنی حقیقت کھو چکے تھے اور بہت سی خرافات اور من گھڑت کہانیاں اس میں شامل ہو چکی تھیں۔

کچھ ایسے موحدین ضرور تھے جنھوں نے بت پرستی اور اس سے متعلقہ امور کو ٹھکرا دیا

[1] صحیح البخاري، حدیث:4376. [2] الأنعام6:36.



جزیرہ نمائے عرب کی سلطنتیں، قبائل اور مذاہب
(قبل از اسلام)
علامات
(مختلف مذاہب کے پیروکار)
عیسائی
یہودی
بت پرست
ساسانی سلطنت
(فارس)
سلطنت کندہ
جزیرہ نمائے عرب
بحیرۂ عرب
بحیرۂ روم

تھا۔ ان لوگوں میں ایک زید بن عمرو بن نُفیل تھے [1] جو بتوں کے نام پر جانور ذبح نہیں کرتے تھے۔ اور نہ مردار اور خون کو حلال سمجھتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے:

أَرَبًّا وَّاحِدًا أَمْ أَلْفَ رَبٍّ؟ أَدِينُ إِذَا تُقُسِّمَتِ الْأُمُورُ؟

عَزَلْتُ اللَّاتَ وَالْعُزّٰى جَمِيعًا كَذٰلِكَ يَفْعَلُ الْجَلْدُ الصَّبُورُ

فَلَا عُزّٰى أَدِينُ وَلَا ابْنَتَيْهَا وَلَا صَنَمَيْ بَنِي عَمْرٍو أَزُورُ

وَلَا غَنَمًا أَدِينُ وَ كَانَ رَبًّا لَّنَا فِي الدَّهْرِ، إِذْ حُلْمِي يَسِيرُ

وَلٰكِنْ أَعْبُدُ الرَّحْمٰنَ رَبِّي لِيَغْفِرَ ذَنْبِي الرَّبُّ الْغَفُورُ

”کیا میں ایک رب کی بندگی اختیار کروں یا ہزاروں آقاؤں کی جب امور تقسیم کر دیے جائیں؟ میں نے لات وعُزٰی سب کو چھوڑ دیا ہے۔ ایک باہمت اور جفاکش کا انداز یہی ہونا چاہیے۔ میں نہ تو عزیٰ کی عبادت کروں گا اور نہ اس کی دونوں بیٹیوں (لات ومناۃ) کی اور نہ ہی بنوعمرو کے دونوں بتوں کی زیارت کروں گا۔ نہ میں غنم کی پوجا کروں گا، اگرچہ ایک عرصہ ہم نے اسے رب بنائے رکھا جس وقت ہم زیادہ دوراندیش نہ تھے۔ میں تو صرف رحمٰن کو اپنا پروردگار بنا کر اس کی عبادت

1 امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی ”صحیح“ میں زید بن عمرو بن نفیل کا واقعہ بیان کیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ زید بن عمرو بن نفیل رضی اللہ عنہ سے بلدح کے دامن میں ملے ابھی آپ پر نزول وحی کا آغاز نہ ہوا تھا۔ وہاں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھانا پیش کیا گیا تو آپ نے اسے تناول فرمانے سے انکار کر دیا۔ پھر زید رضی اللہ عنہ نے بھی کہا کہ میں وہ چیز نہیں کھاتا جو تم اپنے بتوں کے نام پر ذبح کرتے ہو۔ میں تو صرف وہی کھاتا ہوں جس پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا گیا ہو۔ نیز زید بن عمرو قریش کے ذبیحہ پر اعتراض کرتے تھے اور مشرکین کے ان ذبیحوں پر ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے اور اسے بڑا گناہ سمجھتے ہوئے کہتے تھے کہ بکری کو اللہ نے پیدا کیا، اسی نے اس کے لیے آسمان سے پانی اتارا اور اپنی زمین میں گھاس پیدا فرمائی، پھر تم اسے غیر اللہ کے نام پر ذبح کرتے ہو؟ (صحيح البخاري، حديث: 3826)

کروں گا تاکہ معاف کردینے والا رب میرے گناہ معاف فرما دے۔"[1]

حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے دین کے پیروکاروں میں سے قُس بن ساعدہ ایادی بھی ہے۔ یہ اپنی قوم کا خطیب، دانا اور سمجھ دار شخص تھا۔ بڑا زیرک اور صاحب فضیلت انسان تھا۔ بت پرستی چھوڑنے اور وحدانیت، یعنی ایک اللہ کی بندگی اختیار کرنے اور اس کی عبادت کرنے کی دعوت دیا کرتا تھا۔ بعث بعد الموت پر ایمان رکھتا تھا۔ اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی بشارت بھی دی تھی۔ ابو نُعیم نے اپنی کتاب دلائل النبوہ میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ قس بن ساعدہ ایادی نے عُکاظ کے میلے میں اپنی قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا: "اس جانب سے (اپنے ہاتھ سے مکہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) حق نمودار ہوگا۔" لوگوں نے پوچھا: "وہ حق کیا ہے؟" اس نے جواب دیا: "لوی بن غالب کی نسل سے ایک آدمی تمھیں کلمۂ توحید، غیر فانی زندگی اور لازوال نعمتوں کی جانب بُلائے گا، اگر وہ تمھیں دعوت دے تو اس کی دعوت کو قبول کرنا۔ اگر مجھے معلوم ہو کہ میں اس کی بعثت تک زندہ رہوں گا تو میں پہلا شخص ہوں گا جو اس کی جانب بڑھ کر اس کی دعوت قبول کرے گا۔" قُس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ تو پایا مگر آپ کی بعثت سے قبل ہی فوت ہوگیا۔[2]

وہ اپنے یہ شعر پڑھا کرتا تھا:

فِي الذَّاهِبِينَ الْأَوَّلِيـ ـنَ مِنَ الْقُرُونِ لَنَا بَصَائِرْ
لَمَّا رَأَيْتُ مَوَارِدًا لِّلْمَوْتِ لَيْسَ لَهَا مَصَادِرْ
وَ رَأَيْتُ قَوْمِي نَحْوَهَا يَمْضِي الْأَصَاغِرُ وَالْأَكَابِرْ
لَا يَرْجِعُ الْمَاضِي إِلَـ ـيَّ وَلَا مِنَ الْبَاقِينَ غَابِرْ
أَيْقَنْتُ أَنِّي لَا مَحَالَةَ حَيْثُ صَارَ الْقَوْمُ صَائِرْ

[1] السيرة النبوية لابن كثير: 163/1. [2] السيرة النبوية لأبي شهبة: 80/1.

"گزشتہ نسلوں کے (اس دنیا سے) چلے جانے میں ہمارے لیے بے شمار عبرتیں ہیں۔ جب میں نے دیکھا کہ موت کے راستوں سے واپسی کا کوئی ذریعہ نہیں اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ میری قوم کے چھوٹے بڑے سب اس (موت) کی طرف جارہے ہیں۔ نہ تو جانے والا میری طرف پلٹتا ہے اور نہ باقی رہنے والا (موت سے) بچتا ہے تو میں نے یقین کرلیا کہ میں بھی اس (آخرت کی) طرف جانے والا ہوں جس کی طرف (مرنے والے) لوگ جاچکے ہیں۔"[1]

کچھ عربوں نے عیسائیت اختیار کرلی تھی اور کچھ نے یہودیت کا لبادہ اوڑھ لیا تھا مگر ان میں سے اکثر بتوں کے پجاری تھے۔

عربوں کی سیاسی حالت

جزیرہ نمائے عرب کے لوگ متمدن اور غیر متمدن دو حالتوں میں منقسم تھے اور ان میں قبائلی نظام رائج تھا۔ یہ نظام جزیرہ نمائے عرب کے جنوب میں مملکتِ یمن، شمال مشرق میں سلطنتِ حیرہ اور شمال مغرب میں غسانی ریاست جیسی تہذیب یافتہ مملکتوں میں رائج تھا۔ یہ سب عربی قبائل ایک قوم میں تو نہ ڈھل سکے، البتہ ایک مربوط اتحاد کی شکل اختیار کرگئے۔

عرب قوم لوگوں کا ایک ایسا اتحاد تھی جنھیں نسب اور نسل کی وحدت آپس میں جوڑے ہوئے تھی۔ اسی وحدت سے اس رسمی قانون نے جنم لیا جو فرد اور جماعت کے مابین رشتوں کو ان کے حقوق و فرائض کے باہمی ربط کی بنیاد پر منظّم کرتا تھا اور عرب قوم اپنے سیاسی و معاشرتی نظام میں اسی رسمی قانون کو مضبوطی سے اختیار کیے ہوئے تھی۔[2]

قبائلی مقام و مرتبہ، شجاعت، جوانمردی اور سخاوت جیسے ذاتی اوصاف قبیلے کے سردار کو قیادت کا اہل ثابت کرتے تھے۔ قبائلی سردار کو سماجی اور مالی حقوق حاصل ہوتے تھے۔ سماجی حقوق میں سے اہم ترین امور یہ تھے:

---

[1] السيرة النبوية لأبي شهبة:81/1. [2] السيرة النبوية لأبي شهبة:60/1.

قبائلی سردار کی تعظیم و تکریم کی جاتی۔

اس کے حکم کی تعمیل ہوتی۔

اسے اپنا قاضی و جج تسلیم کیا جاتا۔

سردار کے مالی حقوق میں یہ چیزیں شامل تھیں:

مال غنیمت میں سے اسے ایک چوتھائی حصہ ملتا تھا۔

اسے یہ حق تھا کہ مال غنیمت کی تقسیم سے قبل جو چیز چاہے اپنے لیے پسند کرلے۔

جنگ سے قبل دشمن کا جو مال ہاتھ لگ جاتا اس پر سردار کے سوا کسی کا حق نہ تھا۔

مال غنیمت میں جو چیز ناقابل تقسیم ہوتی اس پر بھی سردار کا حق تھا۔

ایک عربی شاعر نے اسے بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے:

''(اے سردار!) تجھے مال غنیمت کا چوتھائی حصہ دینا، تجھے تیری پسندیدہ چیز دینا، تیرا حکم ماننا، جنگ سے قبل حاصل ہونے والا دشمن کا مال تیرے حوالے کرنا اور ناقابل تقسیم اشیاء تیرے سپرد کر دینا ہمارے فرائض میں ہے۔''[1]

ان حقوق کے مقابلے میں سردار کے بھی کچھ فرائض اور ذمہ داریاں ہوتی تھیں۔ وہ حالتِ امن میں مجسمۂ جود و سخا ہوتا اور حالتِ جنگ میں سب سے آگے رہتا، عہد و پیمان اور صلح کے معاہدے کرتا۔

قبائلی نظام میں حریت یا آزادی ہر چیز پر غالب تھی۔ ایک عربی آزاد فضا اور آزاد معاشرے میں جنم لیتا اور اس میں نشوونما پاتا تھا، اسی وجہ سے آزادی عربوں کی اہم خصوصیات میں سے ہے۔ وہ آزادی کو عشق کی حد تک چاہتے تھے۔ ظلم و ذلت تسلیم نہیں کرتے تھے۔ قبیلے کا ہر فرد اپنے قبیلے کی خاطر انتقام لیتا، اس کے کارہائے نمایاں کو بلند کرتا، اس کی تاریخ روشن کرتا اور قبیلے کے ہر فرد کی مدد کرتا، خواہ وہ حق پر ہوتا یا باطل پر،

1 مكة والمدينة في الجاهلية و عصر الرسول ﷺ للأستاذ أحمد الشريف، ص:31.

یہاں تک کہ ان کا بنیادی اصول بن گیا کہ اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ ایک شاعر کہتا ہے:

"(اہل عرب تو ایسے ہیں کہ) جب ان کا بھائی کسی مصیبت میں انھیں مدد کے لیے پکارتا ہے تو یہ اس سے کسی دلیل کا تقاضا نہیں کرتے۔"

قبیلے کا ہر فرد جماعت کے تابع ہوتا تھا۔ اپنی جماعت کی رائے پر کاربند رہنے کا جذبہ اس حد تک پہنچا ہوا تھا کہ فرد اپنے وجود کو جماعت کے وجود میں گم کر دیتا تھا۔ دُرید بن صِمّہ کہتا ہے:

"میری حیثیت تو صرف یہ ہے کہ میں (قبیلہ) غُزِیّہ کا ایک فرد ہوں۔ اگر وہ غلط راستہ اختیار کرے تو میں بھی وہی راستہ اختیار کروں گا۔ اگر وہ صحیح راستے پر چلے تو میں بھی صحیح راستہ اختیار کروں گا۔" [1]

عرب قبائل میں سے ہر قبیلے کا ایک سیاسی مقام تھا۔ اپنی اسی سیاسی حیثیت سے وہ دوسرے قبائل سے معاہدے کرتا اور اسی لحاظ سے اس پر جنگ مسلّط کی جاتی۔ عرب قبائل کے مابین ہونے والے معاہدوں میں مشہور ترین معاہدہ حلف الفضول کا ہے۔ [2]

قبائل کے مابین لڑائیاں بڑی طویل اور شدید ہوتی تھیں۔ ان میں مشہور ترین لڑائی حربِ فجار ہے۔ ان بڑی لڑائیوں کے علاوہ بھی قبائل میں لوٹ مار کے واقعات ہوتے رہتے تھے جو شخصی وجوہات کی بنا پر ہوتے تھے یا آسائشِ زندگی کے حصول کے لیے۔ کچھ قبائل تو ایسے تھے جن کی روزی کا بیشتر حصہ تلوار کی دھار میں پوشیدہ ہوتا تھا۔ اس وجہ سے ہر قبیلے پر یہ خوف طاری رہتا تھا کہ کوئی دوسرا قبیلہ دن یا رات کے کسی بھی لمحے میں ان کے مال مویشی چھیننے کے لیے معاہدہ توڑ سکتا ہے اور ان کی آبادیوں کو یوں برباد کرسکتا ہے

1 السيرة النبوية لأبي شهبة: 61/1. 2 دراسة تحليلية لشخصية الرسولﷺ للدكتور قلعجي، ص:31.

جیسے وہاں کوئی آباد ہی نہ تھا۔ [1]

عربوں کی اقتصادی حالت

جزیرہ نمائے عرب کا اکثر علاقہ وسیع اور دور تک پھیلے ہوئے صحراؤں پر مشتمل ہے، اس لیے وہاں زراعت نہ ہوسکی، سوائے اطراف و اکناف کے علاقوں کے، خاص طور پر یمن اور شام کے علاقوں میں زراعت بہت اچھی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں کچھ نخلستان ہیں جو جزیرہ نمائے عرب میں پھیلے ہوئے ہیں۔ دیہاتی زندگی میں بڑا کام اونٹوں اور بکریوں کا پالنا تھا۔ گھاس (اور چارے) کی تلاش میں قبائل سرگردان رہتے تھے۔ اپنے خیموں کے سوا ان کے لیے کہیں قرار نہ تھا۔

صنعت و حرفت کے میدان میں عرب سب اقوام سے پیچھے تھے۔ وہ صنعت و حرفت کو حقیر سمجھتے تھے، اس لیے صنعت و حرفت کا کام عجمیوں اور غلاموں کے سپرد کیے ہوئے تھے، یہاں تک کہ جب بیت اللہ کی تعمیر کا معاملہ پیش آیا تو بھی ایک قبطی آدمی سے معاونت لی گئی جو جدّہ کے پاس سمندر میں ڈوب جانے والے جہاز سے زندہ بچ گیا تھا اور مکہ میں مستقل رہائش اختیار کر چکا تھا۔ [2]

جزیرہ نمائے عرب اگرچہ زراعت اور صنعت کی نعمتوں سے محروم تھا مگر افریقیہ (شمالی افریقہ) اور مشرق میں ایشیا کے درمیان ایک اہم اور مناسب جغرافیائی محل وقوع نے اسے اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ اس دَور کی بین الاقوامی تجارت کی ایک کامیاب منڈی بن گیا۔

جزیرہ نمائے عرب کے وہ لوگ جو تجارت سے منسلک تھے ان کا تعلق شہری آبادی سے تھا، خاص طور پر اہلِ مکہ کو تجارت میں ایک ممتاز مقام حاصل تھا۔ چونکہ وہ سرزمینِ حرم کے رہنے والے تھے، اس لیے عربوں کے دلوں میں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ اسی وجہ سے

[1] دراسة تحليلية لشخصية الرسول ﷺ للدكتور قلعجي، ص: 33-35. [2] فقه السيرة النبوية للدكتور الغضبان، ص: 60.

وہ مکہ والوں کے ساتھ بُرائی سے پیش آتے نہ ان کی تجارت میں رکاوٹ ڈالتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اہلِ مکہ پر اس بات کا احسان یوں جتلایا ہے:

﴿أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا آمِنًا وَيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ﴾

"کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ بے شک ہم نے حرم (مکہ) کو پر امن بنایا ہے، جبکہ لوگ اس کے اردگرد سے اچک لیے جاتے ہیں۔"[1]

قریش کے دو بڑے تجارتی قافلے مشہور تھے۔ ایک موسم سرما میں یمن کی طرف جاتا تھا اور دوسرا موسم گرما میں شام کی طرف۔ قریش بڑا پُر امن سفر کرتے تھے، جبکہ ان کے اردگرد سے لوگ اغوا ہو جایا کرتے۔ یہ دونوں تجارتی قافلے ان تجارتی قافلوں کے علاوہ تھے جو سارا سال جاری رہتے تھے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿لِإِيلَافِ قُرَيْشٍ ○ إِيلَافِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ ○﴾

"قریش کے مانوس ہونے کی وجہ سے۔ (یعنی) ان کے سردی اور گرمی کے سفر سے مانوس ہونے کی وجہ سے۔"[2]

تجارتی قافلے لوبان، عود (خوشبوؤں کے لیے آگ میں جلانے والی اشیاء)، گوند، گرم مسالے، کھجوریں، عطریات، لکڑی کا سامان، ہاتھی دانت، آبنوس، پتھر کے نگینے، چمڑا، یمنی چادریں، ریشمی لباس اور اسلحہ وغیرہ، جو عرب میں ملتا تھا یا باہر سے درآمد کیا جاتا تھا، حاصل کرتے اور شام اور فلسطین لے جاتے، پھر وہاں سے گندم، اناج، منقّی، زیتون اور شام کے بنے ہوئے کپڑے لے کر آتے۔

یمنی لوگ تجارتی کاروبار میں مشہور تھے۔ ان کی تجارتی سرگرمیاں برّی اور بحری دونوں علاقوں میں تھیں۔ وہ افریقیہ کے ساحلوں تک سفر کرتے تھے اور ایشیائی ممالک میں ہندوستان، سوماٹرا (انڈونیشیا) اور بحر ہند کے جزائر کا سفر اختیار کرتے۔ اسلام قبول کرنے

[1] العنکبوت 67:29. [2] القریش 106:1،2.

کے بعد ان علاقوں میں دین اسلام کی نشر واشاعت میں یمنیوں کا بہت بڑا کردار ہے۔

جزیرہ نمائے عرب میں سودی لین دین بھی عام تھا۔ شاید یہ ہلاکت خیز وبا یہودیوں سے عربوں کی جانب آئی ہو۔ [1]

بڑے بڑے لوگ سودی کاروبار کرتے تھے۔ بعض اوقات شرح سود سو فیصد بھی ہو جاتی تھی۔ [2]

عرب میں کئی مشہور منڈیاں اور بازار لگتے تھے، مثلاً: عکاظ، مَجَنّہ، ذُوالمجاز۔ مکہ کے بارے میں بعض مؤلفین نے ذکر کیا ہے کہ عرب لوگ ذوالقعدہ کے آغاز میں عکاظ کا تجارتی بازار لگاتے، پھر ذوالقعدہ کے بیس دن گزرنے کے بعد مَجَنّہ چلے جاتے اور ذوالحجہ کا چاند نظر آتے ہی ذوالمجاز کا رُخ کرتے۔ وہاں آٹھ راتیں قیام کرتے، پھر میدانِ عرفات چلے آتے۔ عرفات اور منٰی کے ایام میں وہ خرید وفروخت نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ اسلام نے اسے جائز قرار دیا۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۠﴾

''تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم (حج کے دوران) اپنے رب کا فضل تلاش کرو، پھر جب تم عرفات سے لوٹو تو مشعر الحرام کے پاس اللہ کو یاد کرو۔'' [3]

زمانۂ اسلام میں بھی یہ بازار یا میلے ایک عرصے تک برقرار رہے، پھر آہستہ آہستہ ختم ہوگئے۔ یہ محض تجارتی بازار نہ تھے بلکہ شعر وادب اور خطابت کے مراکز بھی تھے۔ بڑے بڑے شعراء اور فصاحت و بلاغت کا مظاہرہ کرنے والے خطیب ان میلوں میں جمع ہوتے۔ وہ اپنے حسب نسب اور آباء و اجداد اور قبیلے کے قابل تحسین کارہائے نمایاں کا ذکر اور اظہارِ فخر میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے۔ اس طرح یہ بازار کاروبار کے فروغ

---

1 السيرة النبوية لأبي شهبة: 98/1-101. 2 دراسة تحليلية لشخصية الرسولﷺ للدكتور قلعجي، ص: 19. 3 البقرة 2:198.

کے ساتھ ساتھ عربی زبان و ادب کو بھی قیمتی سرمایہ فراہم کرتے تھے۔ [1]

عربوں کی معاشرتی حالت

عربوں کی زندگی پر رسم و رواج اس طرح غالب تھے کہ وہ امور حیات میں رسمی قانون کی حیثیت اختیار کر چکے تھے، خواہ اُن امور کا تعلق ان کے حسب نسب سے ہو یا قبائل کے باہمی تعلقات سے، یا افراد کے باہمی میل ملاپ سے۔ اُن کی معاشرتی حالت کو اجمالاً یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

① **حسب نسب کی بنیاد پر اظہارِ فخر:** عرب اپنے نسب کو محفوظ بنانے کی انتہائی کوشش کرتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ اپنے سوا کسی دوسری قوم سے سُسرالی رشتہ قائم نہیں کرتے تھے۔ اسلام نے اس چیز کو ختم کیا اور واضح کیا کہ باہمی شرف و منزلت کی بنیاد صرف تقویٰ اور نیک عمل ہے۔

② **شعر و کلام کی برتری اور اس کا اظہار:** فصیح کلام اور بلیغ انداز عربوں کے دلوں کو موہ لیتا تھا اور شاعری ان کے قابل فخر کارناموں اور حسب نسب کی دستاویز ہوتی تھی۔ ان کے علوم کا ذخیرہ اور جذبات و میلانات کے اظہار کا ذریعہ بھی یہی شاعری ہوتی تھی، اسی لیے ان میں فصاحت و بلاغت کا مظاہرہ کرنے والے خطباء اور بہترین شعراء کا پیدا ہونا کوئی تعجب انگیز نہیں تھا۔ صرف ایک شعر قبیلے کی شان بلند کر دیتا تھا اور کبھی کبھار ایک ہی شعر کسی قبیلے کی ذلت کے لیے کافی ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ قبیلے میں ایک شاعر کے پیدا ہونے پر وہ اس قدر خوش ہوتے کہ کسی اور چیز پر انھیں اتنی خوشی نہ ہوتی تھی۔

③ **عرب معاشرے میں عورت کا مقام:** اکثر قبائل میں عورت حقیر ساز و سامان کی طرح تھی اور بطور ترکہ تقسیم ہوتی تھی۔ بڑے بیٹے کا یہ حق تھا کہ اپنے باپ کی وفات کے بعد اس کی منکوحہ (اپنی سوتیلی ماں) سے شادی کر لے یا اسے کہیں اور شادی کرنے سے روک

[1] السيرة النبوية لأبي شهبة: 102/1.

دے۔ اسلام نے سوتیلی ماں سے شادی کو حرام قرار دیا، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان نازل ہوا:

﴿وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ﴾

''اور جن عورتوں سے تمھارے باپوں نے نکاح کیا ہو، ان سے تم نکاح نہ کرو۔''[1]

عربوں کے ہاں حقیقی ماں، صلبی بیٹی، بہنوں، خالہ اور پھوپھی سے نکاح کرنا حرام تھا۔[2]

اہل عرب بیٹیوں، بیویوں اور چھوٹے بچوں کو میراث نہیں دیتے تھے۔ صرف اسی شخص کو میراث دیتے تھے جو مالِ غنیمت حاصل کرتا ہو اور گھوڑے پر سوار ہو کر لڑ سکتا ہو۔ بچوں اور عورتوں کی میراث سے محرومی کے ضابطے پر عمل ہوتا رہا یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں حضرت اوس بن ثابت رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا۔ ان کی اولاد میں دو بیٹیاں تھیں جو کہ خوبصورت نہ تھیں اور ایک چھوٹا بیٹا تھا۔ اُوس بن ثابت رضی اللہ عنہ کے چچا کے دو بیٹے تھے جو ان کے عصبہ تھے، انھوں نے تمام میراث لے لی۔ اوس بن ثابت رضی اللہ عنہ کی بیوہ نے ان سے کہا کہ دونوں بیٹیوں سے شادی کر لو تو انھوں نے ان کے خوبصورت نہ ہونے کی وجہ سے انکار کر دیا۔ اوس بن ثابت رضی اللہ عنہ کی بیوہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور عرض کرنے لگی کہ اللہ کے رسول! میرا خاوند فوت ہو گیا ہے، اس کا ایک چھوٹا بیٹا اور دو بیٹیاں ہیں۔ اوس کے چچا زاد بھائیوں سُوَید اور عُرفُطَہ نے ساری میراث لے لی ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ اوس کی دونوں بیٹیوں سے شادی کر لو مگر وہ نہیں مانے۔ تو آپ ﷺ نے ان دونوں کو پیغام بھیجا کہ میراث میں سے کوئی بھی چیز دوسری جگہ منتقل نہ کرنا۔[3]

تب اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا:

﴿لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۪ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ؕ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ۝﴾

1 النسآء 22:4. السيرة النبوية لأبي شهبة: 87/1. 2 دراسة تحليلية لشخصية الرسولﷺ للدكتور قلعجي، ص: 22-24. 3 تفسير القرطبي: 45/5.

''مردوں کے لیے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ دار چھوڑ جائیں اور عورتوں کے لیے بھی حصہ ہے اس مال میں جو ماں باپ اور رشتہ دار چھوڑ جائیں، (یہ چھوڑا ہوا مال) تھوڑا ہو یا زیادہ، اس میں ہر ایک کا مقرر کیا ہوا حصہ ہے۔''[1]

عربوں کے لیے بیٹیاں باعثِ عار تھیں کیونکہ بیٹی جنگ کے لیے جا سکتی تھی نہ حملے کی صورت میں مرکز کا دفاع کر سکتی تھی اور نہ مردوں کی طرح محنت کر کے مال کما سکتی تھی۔ اور اگر دشمن کی قید میں چلی جاتی تو کئی ہاتھوں کا کھلونا بن جاتی بلکہ بعض اوقات اسے عصمت فروشی پر مجبور کیا جاتا اور اس کا آقا عصمت فروشی سے حاصل ہونے والے مال کے ساتھ اپنی دولت میں اضافہ کرتا۔ یہ بات عربوں کے ہاں کوئی جرم نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اگر کسی کے ہاں بیٹی پیدا ہوتی تو وہ باپ کے لیے غم، پریشانی اور شرمندگی کا سبب بنتی۔ قرآن حکیم نے ہمیں اس شخص کی کیفیت بتائی ہے جس کے ہاں بیٹی پیدا ہوتی۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُمْ بِالْأُنْثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ۝﴾

''اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی بشارت دی جائے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ غم و غصے سے بھرا ہوتا ہے۔''[2]

اکثر تو یہی فیصلہ کرتے کہ بیٹی کو زندہ مٹی میں دبا دیں۔ اس کا جرم اس کے سوا کچھ نہ ہوتا کہ وہ لڑکی ہے۔[3]

اس لیے قرآن حکیم نے ان کے اس رویے کی سخت مذمت کی ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ ۝ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ ۝﴾

''اور جب زندہ درگور کی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا، کس گناہ کی وجہ سے وہ قتل کی گئی؟''[4]

---

1 النسآء 7:4. 2 النحل 58:16. 3 دراسة تحليلية لشخصية الرسول ﷺ للدكتور قلعجي، ص:26,25. 4 التكوير 9,8:81.

بعض عرب لوگ اپنی اولاد کو فقر و فاقہ یا اس کے اندیشے ہی سے قتل کر دیا کرتے تھے۔ اسلام نے اسے بھی حرام قرار دیا۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿وَلَا تَقْتُلُوٓا أَوْلَـٰدَكُم مِّنْ إِمْلَـٰقٍ ۖ نَّحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ ۖ﴾

''اور اپنی اولاد کو تنگ دستی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم تمھیں بھی اور انھیں بھی رزق دیتے ہیں۔''[1]

اور قبائل میں سے کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو اس منحوس فعل کو بہت قبیح سمجھتے تھے اور وہ اپنی بیٹیوں کو زندہ درگور نہیں کرتے تھے۔ ان میں سے ایک زید بن عمرو بن نفیل تھے۔[2]

بعض قبائل عورت کا احترام بھی کرتے تھے۔ شادی کے معاملات میں اس سے رائے لیتے تھے۔ آزاد عرب عورت اپنے شوہر کے سوا کسی اور کی آغوش کو نہایت ناپسند کرتی تھی۔ عورتوں میں بھی شجاعت کے جوہر پائے جاتے تھے۔ وہ جنگ کرنے والے مردوں کے ساتھ میدانِ جنگ میں جاتیں، لڑائی کے لیے ان کے جذبات کو ابھارتیں اور بوقت ضرورت جنگ میں عملی طور پر شریک بھی ہوتیں۔ دیہاتی عرب عورت اپنے خاوند کے ساتھ مل کر جانوروں کی دیکھ بھال کرتی اور انھیں پانی پلانے کے لیے لے جاتی۔ روئی اور اون کاتتی، کپڑے بُنتی، چادریں اور لباس بناتی مگر عزت و ناموس پر آنچ نہ آنے دیتی۔[3]

④ نکاح: عربوں کے ہاں کئی قسم کے نکاح رائج تھے۔ ان میں سے کوئی بھی طریقۂ نکاح اختیار کر لیا جاتا تھا اور اسے عیب نہ سمجھا جاتا تھا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان اقسام کا ذکر کیا ہے۔ وہ فرماتی ہیں:

''جاہلیت میں چار قسم کے نکاح تھے۔ ایک نکاح تو وہی تھا جو آج کل لوگ کر رہے ہیں۔ ایک شخص کسی دوسرے کو اس کی بیٹی یا اس کے زیر کفالت لڑکی سے شادی کرنے کا پیغام بھیجتا، پھر (اس کی رضامندی کے بعد) اسے مہر دے کر اس سے نکاح کر لیتا۔

[1] الأنعام 151:6. [2] السيرة النبوية لأبي شهبة:92/1. [3] السيرة النبوية لأبي شهبة:88/1.

دوسرا طریقۂ نکاح یہ تھا کہ عورت جب حیض سے پاک ہوجاتی تو اس کا خاوند اس سے کہتا کہ فلاں شخص سے ازدواجی تعلقات قائم کرو اور خود اس سے الگ ہوجاتا اور ازدواجی تعلق برقرار نہ رکھتا، پھر جب دوسرے شخص سے اس کا حاملہ ہوجانا واضح ہو جاتا تو خاوند اگر چاہتا تو اس سے ازدواجی تعلق قائم کرلیتا۔ یہ طریقہ اس لیے اختیار کیا جاتا تھا تاکہ پیدا ہونے والا بچہ اعلیٰ صلاحیتوں کا مالک ہو (اس مقصد کے لیے اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک شخص کا انتخاب کیا جاتا تھا) اس نکاح کو نکاح اِسْتِبْضَاع (اعلیٰ نسل کی اولاد کے حصول کا ذریعہ) کہا جاتا تھا۔

تیسرا نکاح یہ تھا کہ مردوں کی جماعت جن کی تعداد دس سے کم ہوتی تھی ایک عورت سے ازدواجی تعلقات قائم کرتے ۔ جب بچے کی پیدائش ہوتی تو وہ عورت ان تمام مردوں کو بلاتی اور کوئی مرد آنے سے انکار نہیں کرسکتا تھا۔ جب سب مرد اس کے ہاں جمع ہوجاتے تو وہ ان سے کہتی کہ تمھارا میرے ساتھ جو تعلق تھا تم اس سے بخوبی واقف ہو۔ میرے ہاں بچہ پیدا ہوا ہے، پھر جس مرد کا وہ چاہتی نام لے کر کہتی کہ یہ بچہ تمھارا ہے۔ اس طرح اس بچے کا نسب اس مرد سے جوڑ دیا جاتا اور وہ مرد اس کا انکار بھی نہیں کرسکتا تھا۔

چوتھا طریقۂ نکاح یہ تھا کہ بعض عصمت فروش عورتیں اپنے گھروں کے باہر بطور علامت جھنڈے لگا دیا کرتی تھیں۔ بہت سے لوگ ان کے پاس (بدکاری کے لیے) آتے۔ وہ کسی کو نہ روکتیں، ہر کوئی ان کے پاس آسکتا تھا۔ جب ان میں سے کسی عورت کے ہاں بچہ پیدا ہوتا تو اس عورت کے پاس آنے والے تمام مردوں کو جمع کیا جاتا اور ایک قیافہ شناس کو بلایا جاتا جو بچے اور باپ کی مشابہت دیکھ کر فیصلہ کرتا، پھر جس شخص کے بارے میں وہ فیصلہ کردیتا، اس بچے کا نسب اس کے ساتھ ملا دیا جاتا۔ اسے اسی کی اولاد سمجھا جاتا اور وہ شخص راہ فرار اختیار نہیں کرسکتا تھا۔

جب محمد رسول اللہ ﷺ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا گیا تو آپ نے جاہلیت کے تمام

نکاحوں کو ختم کر دیا، صرف اس طریقۂ نکاح کو باقی رکھا جس پر آج لوگ عمل کر رہے ہیں۔'' [1]

بعض علماء نے نکاح کی کچھ اور اقسام بھی بیان کی ہیں جن کا تذکرہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نہیں کیا۔ ان میں سے ایک طریقہ خفیہ دوستی کا تھا جس کی طرف اس فرمان الٰہی میں اشارہ موجود ہے:

﴿ وَلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ ﴾

''اور نہ چھپے یار بنانے والیاں ہوں۔'' [2]

لوگ کہا کرتے تھے یہ دوستی (آشنائی) چھپی رہے تو کوئی حرج نہیں لیکن ظاہر ہو جائے تو باعثِ ملامت ہے۔ اس طریقۂ نکاح کو نکاح کے بجائے زنا کہنا زیادہ درست ہے۔

ایک طریقہ نکاحِ مُتعہ کا تھا۔ یہ نکاح محدود مدت کے لیے کیا جاتا تھا۔

ایک طریقہ نکاح بدل کا تھا۔ زمانہ جاہلیت میں ایک آدمی دوسرے سے کہتا کہ تم میری خاطر اپنی بیوی سے دستبردار ہو جاؤ۔ میں تمھارے لیے اپنی بیوی سے دستبردار ہو جاتا ہوں بلکہ اس سے بڑھ کر تجھے کچھ مال بھی دوں گا۔ [3]

باطل نکاحوں میں سے ایک وٹہ سٹہ کا نکاح بھی تھا کہ ایک آدمی اپنی بیٹی (یا زیر ولایت لڑکی) کا نکاح دوسرے شخص سے اس شرط پر کرتا تھا کہ وہ اپنی بیٹی (یا زیر ولایت لڑکی) کا نکاح پہلے شخص سے کر دے گا، (اس شرط کے سوا) ان کے درمیان کوئی حق مہر نہ ہوتا تھا۔ [4]

عربوں کے ہاں (ایک آدمی کے) نکاح میں دو بہنوں کا یکجا ہونا جائز تھا۔ وہ اسے بھی جائز سمجھتے تھے کہ ایک آدمی اپنے نکاح میں بغیر کسی تعداد کی پابندی کے جتنی عورتیں چاہے جمع کر لے۔ اور عرب معاشرے میں ایسے لوگ بے شمار تھے جن کی چار سے زائد بیویاں تھیں۔ [5]

---

1 صحيح البخاري، حديث: 5127. 2 النسآء 4:25. 3 فتح الباري: 9/150. 4 السيرة النبوية لأبي شهبة: 1/90. 5 دراسة تحليلية لشخصية الرسول ﷺ للدكتور قلعجي، ص: 24,25.

جب اسلام آیا تو کسی کے پاس دس بیویاں تھیں، کسی کے پاس اس سے بھی زیادہ تھیں اور کسی کے پاس اس سے کم تھیں۔ اسلام نے بیویوں کی تعداد چار تک محدود کر دی۔ وہ بھی اس شرط پر کہ خاوند کو یقین ہو کہ وہ ان سب کے اخراجات برداشت کر سکتا ہے اور ان میں انصاف سے کام لے سکتا ہے۔ اگر خاوند کو ڈر ہو کہ وہ عدل قائم نہیں کر سکے گا تو اسے حکم دیا کہ صرف ایک پر اکتفا کرے۔

عہد جاہلیت میں عرب لوگ بیویوں کے درمیان انصاف نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے ساتھ بُرا سلوک کرتے اور ان کے حقوق غصب کرتے۔ اسلام نے بیویوں کو انصاف دلایا اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی نصیحت کی اور ان کے لیے ایسے حقوق مقرر کیے جو کبھی ان کے خواب و خیال میں بھی نہ تھے۔[1]

⑤ طلاق: عرب کثرت سے طلاق دینے کے عادی تھے۔ ان کے ہاں طلاق دینے کے لیے کوئی تعداد متعین نہ تھی۔ ایک شخص اپنی بیوی کو طلاق دیتا، پھر اس سے رجوع کر لیتا، پھر طلاق دے دیتا، پھر رجوع کر لیتا۔ یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہتا۔ (نہ عورت کو حقوقِ زوجیت حاصل ہوتے اور نہ آزادی کہ دوسری جگہ نکاح کر سکے) اسلام کے آغاز تک یہی طریقہ جاری رہا۔[2]

آخر کار اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّاۤ اَنْ يَّخَافَاۤ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝﴾

[1] السيرة النبوية لأبي شهبة: 88/1. [2] دراسة تحليلية لشخصية الرسول ﷺ للدكتور قلعجي، ص: 25.

''طلاق (رجعی) دو مرتبہ ہے، پھر یا تو (عورت کو) دستور کے مطابق روک لیا جائے یا بھلائی کے ساتھ چھوڑ دیا جائے اور تمھارے لیے یہ جائز نہیں کہ تم انھیں جو دے چکے ہو اس میں سے کچھ واپس لو الا یہ کہ دونوں کو ڈر ہو کہ وہ اللہ کی حدیں قائم نہ رکھ سکیں گے۔ پس اگر تمھیں ڈر ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدیں قائم نہ رکھ سکیں گے تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ عورت فدیے میں وہ مال دے (کر خلع حاصل کر لے۔) یہ اللہ کی حدیں ہیں، سو تم ان سے آگے نہ بڑھو اور جو لوگ اللہ کی حدوں سے تجاوز کرتے ہیں، وہی ظالم ہیں۔''[1]

اسلام نے طلاقوں کی تعداد متعین کر دی اور خاوند کو یہ موقع دیا کہ اگر طلاق دے کر اس نے غلط فیصلہ کیا ہے تو اس کی تلافی کر سکے اور اسے اپنی (مطلقہ) بیوی کے ساتھ دو مرتبہ رجوع کا حق دیا۔ اگر وہ تیسری بار طلاق دے دیتا ہے تو رشتۂ نکاح مکمل طور پر منقطع ہو جائے گا۔ یہ عورت اپنے سابقہ خاوند کے لیے حلال نہیں رہے گی، سوائے اس صورت کے کہ وہ کسی اور شخص سے نکاح کرے اور رخصتی کے بعد اتفاقاً وہ خاوند فوت ہو جائے یا اس عورت کو طلاق دے ڈالے تو یہ دوبارہ پہلے خاوند سے نکاح کر سکتی ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

﴿فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ ۗ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ أَنْ يَّتَرَاجَعَآ إِنْ ظَنَّآ أَنْ يُّقِيمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۗ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝﴾

''پھر اگر وہ (خاوند) اسے (تیسری) طلاق دے دے تو اس کے بعد وہ (عورت) اس کے لیے حلال نہیں یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور خاوند سے نکاح کرے، پھر اگر وہ بھی اسے طلاق دے دے تو ان دونوں (سابقہ میاں بیوی) پر کوئی گناہ نہیں کہ آپس میں رجوع کر لیں اگر وہ دونوں خیال کریں کہ اللہ کی حدیں

[1] البقرۃ 229:2۔

قائم رکھ سکیں گے اور یہ اللہ کی حدیں ہیں، وہ انھیں ان لوگوں کے لیے بیان کرتا ہے جو علم رکھتے ہیں۔" [1]

طلاق کی طرح ایک صورت ظہار کی تھی جس سے بیوی اپنے خاوند کے لیے حرام ہو جاتی تھی۔ وہ یہ تھی کہ خاوند اپنی بیوی سے کہتا کہ تو میرے لیے میری ماں کی طرح ہے۔ (جاہلیت میں) یہ حرمت دائمی ہوتی تھی۔ اسلام نے اسے غیر معقول اور جھوٹی بات قرار دیا اور کفارے کے ذریعے خاوند کو اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کا راستہ دیا۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿ اَلَّذِیْنَ یُظٰھِرُوْنَ مِنْکُمْ مِّنْ نِّسَآئِھِمْ مَّا ھُنَّ اُمَّھٰتِھِمْ ؕ اِنْ اُمَّھٰتُھُمْ اِلَّا الّٰٓئِیْ وَلَدْنَھُمْ ؕ وَ اِنَّھُمْ لَیَقُوْلُوْنَ مُنْکَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا ؕ ﴾

"تم میں سے جو لوگ اپنی بیویوں سے "ظِهَار" کرتے ہیں، وہ ان کی مائیں نہیں، ان کی مائیں تو وہی ہیں جنھوں نے انھیں جنا اور بے شک وہ ناگوار بات اور جھوٹ کہتے ہیں۔" [2]

⑥ **لوٹ مار، حملے اور لڑائیاں:** عربوں میں نہایت معمولی معمولی باتوں پر لڑائیاں شروع ہو جاتی تھیں۔ وہ اپنے خود ساختہ معاشرتی اصولوں کی خاطر جن کی کوئی اہمیت بھی نہ ہوتی، بے دریغ انسانی خون بہاتے اور لڑائیاں چھیڑ دیتے تھے۔

تاریخ ہمارے سامنے عربوں کے جاہلی زمانے کے واقعات کا ایک ایسا سلسلہ بیان کرتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دلوں پر جنگی جنون پوری طرح مسلّط تھا جو ان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں پر بھی حاوی تھا۔ ان واقعات میں ایک واقعہ جنگ بَسُوس کا ہے۔

جنگ بسوس: جنگ بسوس دو قبیلوں بنوبکر اور بنوتغلب کے درمیان ہوئی جس کا سبب جَرمی نامی شخص کی اونٹنی تھی۔ جرمی بَسُوس بنت منقذ کا پڑوسی تھا اور بَسوس جَسّاس بن مُرّہ کی

[1] البقرة 2:230. [2] المجادلة 58:2. السيرة النبوية لأبي شهبة: 1/91.

خالہ تھی۔ بنو تغلب کے سردار کلیب نے اپنے اونٹوں کے لیے ایک خاص چراگاہ بنائی تھی۔ کلیب نے اپنی چراگاہ میں جرمی کی اونٹنی کو دیکھ کر اسے تیر مار دیا جس پر جرمی اور بَسُوس نے چیخ و پکار شروع کر دی۔ جساس نے کلیب کو قتل کرنے کے لیے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور اسے قتل کر ڈالا۔ اس وجہ سے دونوں قبیلوں میں چالیس سال تک زبردست لڑائیاں ہوتی رہیں۔[1]

جنگِ داحِس: اسی طرح جنگِ داحِس وغَبراء ہے جس کا سبب دو گھوڑوں داحِس اور غبراء کے درمیان ہونے والا دوڑ کا مقابلہ بنا۔ داحس قیس بن زہیر کے گھوڑے کا نام تھا اور غبراء حذیفہ بن بدر کی گھوڑی تھی۔ حذیفہ نے ایک آدمی کو چپکے سے اشارہ کیا کہ وہ وادی میں کھڑا ہو جائے۔ اگر وہ داحس گھوڑے کو آگے بڑھتا دیکھے تو اسے روکے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ گھوڑے کو دھکا دیا اور اسے پانی میں گرا دیا۔ اس طرح غبراء آگے بڑھ گئی۔ اس پر خوب قتل و غارت ہوئی اور دو قبیلوں بنو عبس اور بنو ذبیان میں جنگ چھڑ گئی۔[2]

اوس و خزرج کی باہمی جنگیں: اسی طرح جاہلیت کے زمانے میں اوس اور خزرج کے درمیان خاصی لڑائیاں ہوئیں، حالانکہ وہ چچا زاد بھائی تھے۔ اوس اور خزرج حارثہ بن ثعلبہ ازدی کی اولاد میں سے ہیں۔ ان کے درمیان مسلسل لڑائیاں ہوتی رہیں۔ آخری لڑائی جنگ بُعاث ہے۔ اس میں قبیلہ اوس کے حلیف یہودیوں نے ان سے مدد کرنے کے معاہدے کی تجدید کی تھی۔ اوس اور خزرج میں ہونے والی اکثر لڑائیوں کی آگ یہودیوں نے بھڑکائی تاکہ دونوں قبیلے کمزور ہو جائیں اور سرداری ان (یہودیوں) کو حاصل ہو جائے۔ ہر فریق نے اپنے حلیف ہمسایہ قبائل سے مدد حاصل کی۔ اس طرح ان کے درمیان شدید جنگ ہوئی جو آخر کار اوس کے ایک باصلاحیت شخص کے ہاتھوں مصالحت پر ختم ہوئی۔[3]

بعض قبائل صرف اس مقصد کے لیے حملے کرتے تھے کہ دوسروں کا مال چھینیں اور آزاد

---

1 الكامل في التاريخ لابن الأثير:1/312. 2 الكامل في التاريخ لابن الأثير:1/343. 3 التاريخ الإسلامي للحميدي:1/55.

لوگوں کو قیدی بنا کر فروخت کریں۔ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما ایک آزاد عربی النسل تھے اور سلمان فارسی رضی اللہ عنہ آزاد فارسی النسل تھے۔ (ان دونوں کو غلام بنا کر فروخت کیا گیا تھا) اسلام نے اس لوٹ مار اور غارت گری کا خاتمہ کیا اور اس طرح امن و امان قائم کیا کہ ایک اکیلا مرد اور ایک اکیلی عورت صنعاء سے حضر موت شہر تک سفر کرتے تھے مگر انھیں اللہ کے سوا کسی کا خوف نہیں ہوتا تھا سوائے اس کے کہ انھیں اپنی بکریوں پر بھیڑیے کے حملے کا خوف ہوتا تھا۔[1]

⑦ علم و خواندگی: عرب لوگ یہود و نصاریٰ کی طرح اہل کتاب تھے نہ ہی اہل علم بلکہ ان پر جہالت اور ناخواندگی غالب تھی۔ قدیم روایات، اگرچہ وہ کتنی ہی غلط کیوں نہ ہوتیں، ان کی تقلید اور ان پر جمود طاری تھا۔ عرب قوم لکھنا جانتی تھی نہ علم حساب سے واقف تھی۔ اکثر لوگوں کی یہی حالت تھی۔ بہت تھوڑے لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ اپنی جہالت اور محدود معلومات رکھنے کے باوجود عرب لوگ ذہانت و فطانت، زُود فہمی، خوش ذوقی، ذکاوت حِس، حُسنِ استعداد، علم و معرفت اور درست رہنمائی قبول کر لینے پر آمادگی میں مشہور تھے۔ اسی وجہ سے اسلام (قبول کر لینے) کے بعد وہ بہترین عالم، دانشور اور فقیہ بنے۔ جہالت کا خاتمہ ہوا۔ علم و معرفت ان کے خصوصی اوصاف بن گئے۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے علم قیافہ (نشانات کے ذریعے سے حقیقت کا کھوج لگانا) میں مہارت حاصل کی۔ کچھ طبیب تھے، مثلاً حارث بن کلدہ۔ ان کی طب کی بنیاد روز مرہ زندگی سے حاصل ہونے والے تجربات تھے۔[2]

اخلاقی حالت

عربوں کے اخلاق اچھے نہیں تھے۔ شراب اور جوئے کے رسیا تھے۔ قافلوں پر حملے اور لوٹ مار، عصبیت، ظلم، خونریزی، جذبہ انتقام کی تسکین، مال غصب کر لینا، یتیموں کا مال

1 السيرة النبوية لأبي شهبة:93/1. 2 السيرة النبوية لأبي شهبة:93/1.

کھانا، سودی لین دین، چوری اور زنا جیسے جرائم عام تھے۔ یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہیے کہ زنا صرف لونڈیوں میں تھا یا خاص قسم کی ان بدکار عورتوں میں تھا جنھوں نے (اپنے گھروں پر) علامتی جھنڈے لگائے ہوئے تھے۔ آزاد عورتوں میں یہ مرض بہت شاذ ونادر تھا۔ اس کی بہترین دلیل یہ ہے کہ جب فتح مکہ کے بعد نبی کریم ﷺ نے عورتوں سے اس بات پر بیعت لی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گی، نہ چوری کریں گی اور نہ زنا کریں گی۔ تو ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی بیوی ہند بنت عتبہ رضی اللہ عنہا نے کہا: کیا آزاد عورت بھی زنا کرسکتی ہے؟"[1]

تمام عرب ایسی اخلاقی گراوٹ کا شکار نہیں تھے بلکہ ان میں بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو زنا کرتے تھے نہ شراب پیتے تھے، خون بہاتے تھے نہ کسی پر ظلم کرتے تھے بلکہ یتیموں کا مال کھانے کو گناہ سمجھتے تھے اور سودی کاروبار سے دور رہتے تھے۔[2] ان میں بہت سی اچھی صفات و عادات تھیں جن کی وجہ سے وہ اس بات کے اہل بنے کہ اسلام کے جھنڈے کو دنیا میں لہرا سکیں۔ اور وہ خوبیاں یہ تھیں:

ذہانت و فطانت

عربوں کے دل بڑے شفاف تھے۔ ان پر ہندوستانی، رومی، یونانی اور ایرانی معاشروں کی طرح فلسفے، دیومالائی اور بے سروپا افسانے اثرانداز نہیں ہوتے تھے جن کے اثرات کو کھرچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے دلوں کو اسی مقصد کے لیے تیار کیا گیا ہو کہ وہ اس کائنات کے سب سے عظیم مشن یعنی اسلام کی لازوال دعوت کی ذمہ داریاں اٹھا سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام اقوام سے بڑھ کر قوتِ حافظہ کے مالک تھے۔ ان کی ذہنی صلاحیتیں اسلام کی حفاظت کے لیے استعمال ہوئیں۔ ان کی فکری قوتیں اور فطری صلاحیتیں خیالی فلسفوں، بے فائدہ رومی تنازعات اور منطق کی پیچیدگیوں میں ضائع نہیں ہوئی تھیں۔[3]

---

[1] السيرة النبوية لأبي شهبة:94/1، عورتوں کی بیعت کا واقعہ صحیح بخاری میں بھی ہے، ملاحظہ کیجیے: صحيح البخاري، حديث:4895. [2] السيرة النبوية لأبي شهبة:94/1. [3] السيرة النبوية للندوي، ص:12.

عربوں کی لغت کا وسیع ہونا ان کی ذہانت اور قوتِ حافظہ کی دلیل ہے۔ عربی میں شہد کے 80، لومڑی کے 200، شیر کے 500 اور اونٹ کے 1000 نام ہیں۔ اتنے ہی نام تلوار کے ہیں۔ حوادث و آفات کے لیے تقریباً 4000 نام ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اتنے ناموں کے احاطے کے لیے ایک روشن، بیدار اور مضبوط حافظے کی ضرورت ہوتی ہے۔[1]
اہل عرب کی ذہانت و فطانت اس حد تک پہنچی ہوئی تھی کہ کلام تو بہت دور کی بات تھی، محض اشارے سے بات سمجھ جاتے تھے اور اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔[2]

جود وسخا

یہ عربوں کا بنیادی وصف تھا۔ اگر کسی شخص کے پاس صرف ایک ہی اونٹنی ہوتی تو مہمان کی آمد پر اسے ذبح کردیتا۔ بعض لوگ انسانوں کو تو کیا جنگلی جانوروں اور پرندوں کو بھی کھلاتے تھے۔ حاتم طائی کی سخاوت زبانِ زدِ عام تھی اور اس کی مثالیں بیان کی جاتی تھیں۔[3]

بہادری، مردانگی اور دلیری

عرب لڑائی کی موت کو باعث فخر اور بستر پر آنے والی موت کو باعثِ ذلت سمجھتے تھے۔ ایک شخص کو جب اس کے بھائی کے قتل کی خبر ملی تو اس نے کہا: ''اگر وہ قتل ہوگیا ہے تو (کوئی نئی بات نہیں) اس کا باپ، بھائی اور چچا بھی قتل ہوئے تھے۔ اللہ کی قسم! ہم میں سے کوئی بھی طبعی موت نہیں مرتا۔ ہم تو نیزوں کی انیوں اور تلواروں کے سائے میں مرتے ہیں ؎

> ''ہمارا کوئی سردار طبعی موت نہیں مرا اور نہ کبھی ایسا ہوا ہے کہ ہم میں سے کوئی قتل ہو اور اس کا قصاص نہ لیا جائے۔ ہمارے خون تلواروں کی دھار پر بہتے ہیں۔ تلواروں کی دھار کے سوا کسی اور چیز پر نہیں بہتے۔''

اہل عرب چادر، چاردیواری اور عزت و ناموس کی حفاظت پر کسی چیز کو مقدم نہیں سمجھتے تھے اور اس مقصد کے لیے اپنی جانیں بھی قربان کردیتے تھے۔ مشہور شاعر عنترہ کہتا ہے:

---

1 بلوغ الأرب للآلوسي:40,39/1 2 مدخل لفهم السيرة للدكتور يحيىٰ اليحيىٰ، ص:80,79.
3 السيرة النبوية لأبي شهبة:95/1.

’’وہ مجھے یوں مرنے سے ڈرانے لگی جیسے میں مرنے سے دور ہوں۔ میں نے اسے جواب دیا کہ بے شک موت ایک ایسا گھاٹ ہے جس کا پیالہ مجھے ضرور پلایا جائے گا۔ تیرا باپ نہ رہے! تو اپنی حیا کو تھام کر رکھ اور جان لے کہ میں اگر قتل نہ بھی کیا جاؤں تو بھی موت ضرور آنی ہے۔‘‘ [1]

وہ مزید کہتا ہے:

’’مجھے ذلت کے ساتھ آب حیات نہ پلا بلکہ عزت کے ساتھ (کڑوا) اندرائن کا پیالہ پلادے (میں بخوشی پی لوں گا۔) ذلت کے ساتھ آب حیات پینا ایسے ہے جیسے جہنم میں جلنا اور اگر جہنم میں عزت محفوظ ہو تو جہنم بہترین جگہ ہے۔‘‘ [2]

عرب لوگ فطری طور پر دلیر اور خوددار تھے۔ وہ اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ طاقتور کسی کمزور، عاجز، بوڑھے یا صنفِ نازک پر زیادتی کرے۔ اگر کوئی ان سے مدد طلب کرتا تو اس کی مدد کرتے اور پناہ لینے والے کو بے یار و مددگار چھوڑ دینا کمینگی سمجھتے تھے۔

حریت پسندی اور ذلت و ظلم سے نفرت

ایک عربی فطری طور پر آزادی سے عشق کی حد تک محبت کرتا تھا۔ اسی کے لیے اس کا جینا اور مرنا تھا۔ وہ آزاد فضا میں اس طرح نشوونما پاتا کہ اس پر کسی کا تسلّط نہ ہوتا۔ وہ اس بات کو ناپسند کرتا تھا کہ ذلت والی زندگی گزارے یا کوئی اس کی عزت و ناموس پر ہاتھ ڈالے، خواہ ساری زندگی تکلیفوں میں گزارنی پڑے۔ [3] عرب لوگ ذلت قبول نہیں کرتے تھے، ذرا سی بے قدری اور توہین یا ذلت ان کے لیے ناقابل برداشت ہوتی تھی۔ اس کی ایک مثال یہ ہے: سلطنتِ حیرہ کا بادشاہ عمرو بن ہند اپنے ہم نشینوں میں بیٹھا ان سے پوچھ رہا تھا کہ تم عربوں میں کسی ایسے شخص کو جانتے ہو جس کی ماں میری ماں کی خدمت کرنا ناپسند کرے؟ انھوں نے جواب دیا: ’’ہاں! ایک غریب شاعر عمرو بن کلثوم ہے، اس کی والدہ ایسی ہے۔‘‘

[1] دیوان عنترة لفاروق الطباع، ص: 252. [2] دیوان عنترة لفاروق الطباع، ص: 82. [3] السيرة النبوية لأبي شهبة: 95/1.

بادشاہ نے عمرو بن کلثوم کو ملاقات کی دعوت دی اور اس کی والدہ کو بھی اپنی والدہ سے ملنے کی دعوت دی۔ بادشاہ نے اپنی والدہ سے یہ بات پہلے ہی طے کر لی تھی کہ کھانا کھانے کے بعد وہ عمرو بن کلثوم کی والدہ سے کہے گی کہ تمھاری طرف جو پلیٹ پڑی ہے مجھے پکڑاؤ، چنانچہ جب اس نے عمرو بن کلثوم کی والدہ سے یہ بات کہی تو اس نے جواب دیا کہ ضرورت مند خود اٹھ کر اپنی ضرورت پوری کرے۔ بادشاہ کی والدہ نے دوبارہ یہ بات کہی اور اصرار بھی کیا تو عمرو بن کلثوم کی والدہ لیلیٰ چلائی: ''اے بنو تغلب! مدد کے لیے آؤ، ہائے میں ذلیل ہوگئی!'' اس کے بیٹے نے یہ سنا تو غصے میں تیزی سے دوڑا اور سائبان میں بادشاہ کی لٹکی ہوئی تلوار دیکھی۔ اس نے وہی تلوار لے کر بادشاہ عمرو بن ہند کا سر تن سے جدا کر دیا اور بنو تغلب کو آواز دی۔ سب نے جو کچھ سائبان میں تھا لوٹ لیا، پھر عمرو بن کلثوم نے بادشاہ کی قوم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''اے عمرو بن ہند (کی قوم!) ہم کیونکر تمھارے بادشاہ کے غلام بنیں۔ اے عمرو بن ہند (کی قوم!) تم کس مقصد کے لیے ہمارے مخالفین کی بات مانتے ہو اور ہمیں حقیر سمجھتے ہو۔ تم ہمیں دھمکیاں دیتے ہو اور خوفزدہ کرتے ہو۔ باز آجاؤ۔ ہم کب تمھاری ماں کے غلام (خادم) تھے۔ جب بادشاہ ہی لوگوں کو ذلیل کرنے لگ جائے تو ہم اس ذلت میں رہنا کبھی قبول نہیں کریں گے۔''[1]

ایفائے عہد، صاف گوئی اور سچائی

عرب جھوٹ سے نفرت کرتے اور اسے عیب خیال کرتے تھے۔ وہ وفادار تھے، اسی لیے اسلام میں داخل ہونے کے لیے صرف زبان سے شہادت دینا کافی تھا۔ جھوٹ سے ان کی نفرت کی دلیل ابوسفیان (رضی اللہ عنہ) اور شاہِ روم ہرقل کا واقعہ ہے۔ ہرقل نے ابوسفیان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کئی سوالات پوچھے تھے، جبکہ قریش مکہ اور مسلمانوں کے درمیان کئی لڑائیاں ہو چکی تھیں اور اب وہ حالت صلح میں تھے۔ ابوسفیان کہتا ہے کہ

1 شرح المعلقات للحسين الزوزني، ص:196-204.

اگر مجھے یہ شرم نہ ہوتی کہ میری قوم کے جن لوگوں کو میرے پیچھے میری تکذیب یا تصدیق کرنے کے لیے بٹھایا گیا ہے، وہ میری طرف جھوٹ کی نسبت کریں گے تو میں نبی کریم ﷺ کے بارے میں ضرور جھوٹ بولتا۔[1]

نعمان بن منذر نے عربوں کی وفاداری کے بارے میں ایران کے بادشاہ کسریٰ سے کہا تھا: ''ایک عرب اگر آنکھ کے اشارے ہی سے کچھ کہہ دے تو وہ ایسا عہد و پیمان بن جاتا ہے جسے موت ہی ختم کرسکتی ہے۔ ان میں سے کوئی ایک زمین سے لکڑی اٹھاتا تو یہی اس کے قرض کے لیے رہن بن جاتی ہے۔ اس کی رہن شدہ چیز کو غصب کرنے کی نوبت آسکتی ہے نہ اس کی امان کو توڑا جاسکتا ہے۔ اگر عرب کے کسی باشندے نے کسی کو پناہ دی ہو اور وہ اس سے دور ہو۔ اسی اثنا میں پناہ لینے والے پر کوئی زیادتی ہو جائے تو پناہ دینے والے کو اس وقت تک چین نہیں آتا جب تک وہ تکلیف کا باعث بننے والے قبیلے کو ختم نہ کر دے یا اس کا اپنا قبیلہ انتقام لیتے لیتے فنا ہو جائے کہ اس کی امان کو توڑا کیوں گیا ہے۔ اور اگر کوئی مجرم جان پہچان اور رشتے داری کے بغیر ان سے حفاظت طلب کرتا ہے تو یہ اس کی جان بچانے کے لیے اپنی جانیں اور اس کا مال بچانے کے لیے اپنے اموال قربان کر ڈالتے ہیں۔''[2]

وفاداری عربوں کا بنیادی وصف تھا۔ اسلام نے اسے صحیح سمت عطا کی۔ اس انسان پر سختی کی جو کسی مجرم کو پناہ دیتا تھا، خواہ وہ کتنے ہی مرتبے والا ہو یا اس سے کیسی ہی رشتے داری کیوں نہ ہو، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَعَنَ اللّٰهُ مَنْ آوٰی مُحْدِثًا»

''اللہ اس انسان پر لعنت بھیجتے ہیں جو کسی جنایت کار (فسادی) کو پناہ دیتا ہے۔''[3]

وہ واقعات جو عربوں کی وفاداری پر دلالت کرتے ہیں ان میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ حارث بن عباد نے بنوبکر کے قبائل کی قیادت کی تاکہ وہ بنوتغلب اور ان کے سردار مہلہل سے لڑائی کریں جس نے حارث کے بیٹے کو جنگ بسوس میں قتل کر دیا تھا اور اس

[1] صحيح البخاري، حديث: 7. [2] بلوغ الأرب للآلوسي: 150/1. [3] صحيح مسلم، حديث: 1978.

سے کہا تھا کہ کلیب کے جوتوں کے تسمے کے برابر ہو جا۔ حارث نے مہلہل کو گرفتار کر لیا لیکن وہ اسے پہچانتا نہ تھا، (چنانچہ اسی سے) کہنے لگا: "مجھے مہلہل بن ربیعہ کے متعلق بتادو۔ میں تمھیں چھوڑ دوں گا۔ اس نے کہا کہ اگر میں تمھیں اس کے متعلق بتادوں تو تم عہد کرتے ہو (کہ مجھے چھوڑ دو گے؟) حارث نے کہا: "ہاں!" تب مہلہل بولا کہ وہ میں ہی ہوں۔ حارث نے اپنے بال نوچے اور اسے چھوڑ دیا۔ یہ بے مثال وفاداری و بہادری ہے اوران اوصاف کے حامل ہی سیادت و قیادت کے حقدار ہیں۔[1]

عربوں کی وفاداری کا ایک منفرد واقعہ یہ بھی ہے کہ جب نعمان بن منذر نے اپنی بیٹی کی شادی کسریٰ کے ساتھ کرنے سے انکار کیا تو اسے اپنی جان کا خوف محسوس ہوا، وہ اپنا اسلحہ اور قیمتی اشیاء ہانی بن مسعود شیبانی کے حوالے کر کے کسریٰ کے پاس چلا گیا۔ اس نے اسے پکڑ لیا اور ہانی کو پیغام بھیجا کہ نعمان کی تمام امانتیں میرے حوالے کر دو۔ اس نے انکار کر دیا۔ کسریٰ نے ہانی سے جنگ کرنے کے لیے لشکر بھیجا تو اس نے اپنی قوم بنو بکر کو جمع کیا اور ان سے خطاب کرتے ہوئے کہا: "اے آل بکر! مجبوری کی حالت میں مرجانے والا اس بھگوڑے سے اچھا ہوتا ہے جو اپنی جان بچالے۔ احتیاط تقدیر سے نہیں بچا سکتی۔ (تکلیف پر) صبر کامیابی کے اسباب میں سے ہے۔ موت ذلت سے بہتر ہے۔ موت کو سینے سے لگانا اس سے بہتر ہے کہ وہ پیچھے سے آلے۔ پشتوں پر نیزوں کے زخم لگوانے کی نسبت سینوں پر زخم لگوانے میں زیادہ عزت ہے۔ اے آل بکر! جنگ میں کود پڑو۔ موت سے چھٹکارا ممکن نہیں۔"[2] اس ایک شخص کی وجہ سے جس نے ذلت و رسوائی کی زندگی کو حقیر سمجھتے ہوئے اور ایفائے عہد کرتے ہوئے موت کی پروا نہ کی، بنو بکر کو حوصلہ ملا اور انھوں نے ذی قار میں ایرانی لشکر کو شکست سے دوچار کیا۔

صبر و قناعت اور قوت برداشت

عرب لوگ یہ کہتے ہوئے دسترخوان سے اٹھ کھڑے ہوتے تھے کہ بسیار خوری ہوشیاری

1 مدخل لفهم السيرة للدكتور يحيى اليحيى، ص:91. 2 تاريخ الطبري:2/207.

کو ختم کر دیتی ہے۔ اور وہ زیادہ کھانے والے لالچی شخص کو اچھا نہیں جانتے تھے۔ ایک عرب شاعر کہتا ہے:

''جب ہاتھ کھانے کی طرف بڑھتے ہیں تو میں جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کرتا کیونکہ جو لوگوں میں سے زیادہ حریص ہو وہی جلد باز ہوتا ہے۔''[1]

مشکلات سہنے اور تکالیف برداشت کرنے میں انھیں عجیب قدرت حاصل تھی۔ شاید انھوں نے اپنے خشک اور بے آب و گیاہ صحراؤں کے مزاج سے یہ چیز حاصل کی تھی۔ وہ دشوار گزار پہاڑوں کو عبور کرنے اور دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں سفر کرنے کے عادی تھے۔ وہ گرمی سے متاثر ہوتے نہ سردی سے، دشوار گزار راستوں سے نہ طویل سفروں سے اور بھوک سے نہ پیاس سے۔ اور جب وہ حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے تو انھوں نے صبر و تحمل کی بہترین مثالیں قائم کیں۔ وہ معمولی چیز پر راضی ہو جاتے تھے۔ کمر سیدھی رکھنے کے لیے چند کھجوروں اور حلق تر رکھنے کے لیے پانی کے چند گھونٹوں کے ہوتے ہوئے ایک عربی کئی کئی دن تک سفر جاری رکھتا۔[2]

جسمانی قوّت اور بلند حوصلے

عرب حوصلے کی بلندی اور دل کی مضبوطی کے ساتھ جسمانی قوت و بہادری میں بھی معروف تھے۔ جب روحانی اور جسمانی قوتیں یکجا ہو جائیں تو پھر عجیب و غریب نتائج برآمد ہوتے ہیں اور ان کے اسلام قبول کرنے کے بعد یہی کچھ ہوا۔

معاف کر دینے اور پناہ دے کر حفاظت کرنے کے اوصاف

عرب اپنے مخالفین اور ہمسروں کو مقابلے کی دعوت دیتے تھے، پھر جب ان پر دسترس حاصل کر لیتے تو انھیں معاف کر دیتے اور چھوڑ دیتے۔ وہ زخمیوں کو مارنے سے اجتناب کرتے۔ ہمسائیگی کے حقوق کا خیال رکھتے، خاص طور پر چادر اور چار دیواری کا تحفظ کرتے تھے۔ ان کا شاعر کہتا ہے:

1 بلوغ الأرب للآلوسي:377/1. 2 السيرة النبوية لأبي شهبة:96/1.

وَأَغُضُّ طَرْفِي إِنْ بَدَتْ لِي جَارَتِي   حَتّٰى يُوَارِيَ جَارَتِي مَأْوَاهَا

''اگر میری پڑوسن سامنے آجائے تو جب تک وہ چار دیواری میں چلی نہیں جاتی میں اپنی آنکھیں نیچی رکھتا ہوں۔''

جب کوئی بھی ان سے پناہ طلب کرتا تو وہ اسے پناہ دے دیتے اور کبھی اس مقصد کے لیے اپنی جان، اولاد اور مال بھی قربان کر دیتے تھے۔

اسلام کے لیے عرب معاشرے کا انتخاب؟

مذکورہ فضائل اور اخلاق حمیدہ عربوں کا قیمتی سرمایہ تھے۔ اسلام نے ان کی نشوونما کی، انھیں جلا بخشی اور درست راستے پر گامزن کیا۔ اس لیے یہ کوئی عجیب بات نہیں کہ جب عرب پاکیزہ فرشتوں کے روپ میں صحراؤں سے نکل کر ساری زمین پر پھیلے تو انھوں نے کفر سے بھری زمین کو ایمان سے لبریز کر دیا، ظلم وجور سے اٹی مخلوق کو عدل و انصاف دیا، خامیاں دور کر کے خوبیوں سے مالا مال کر دیا اور شر کے مقابلے میں خیر و بھلائی کو عام کر دیا۔[1]

یہ اس معاشرے کے خدّ وخال ہیں جس میں عربوں نے نشوونما پائی۔ یہ اس وقت افضل ترین معاشرہ تھا۔ اس معاشرے کے لیے رسول اللہ ﷺ کا انتخاب کیا گیا اور آپ کے لیے اس عربی معاشرے کا انتخاب ہوا۔ فارسیوں، رومیوں، ہندوؤں اور یونانیوں کے مقابلے میں یہ ایک نادر معاشرہ اور اعلیٰ مرکز تھا۔ فارسیوں کے علوم وفنون کی وسعت اور ہندوؤں کے فلسفے کی گہرائی کے باوجود رسول کا انتخاب ان میں سے نہیں کیا گیا، نہ رومیوں کے فنون لطیفہ کے باوصف نظر انتخاب ان پر پڑی اور نہ یونانیوں کی شاہکار شاعری اور اعلیٰ تصورات کے ہوتے ہوئے ان میں سے انتخاب کیا گیا۔ عرب کے اس اچھوتے معاشرے کا انتخاب اس لیے کیا گیا کہ عربوں میں فطرت سلیمہ، آزادی ضمیر اور روحانی بلندی جیسے اعلیٰ اوصاف موجود تھے اور دیگر اقوام ان اوصاف سے بے بہرہ تھیں۔[2]

[1] السيرة النبوية لأبي شهبة: 97/1. [2] نظرات في السيرة لحسن البنا، ص: 14.

حصہ 2

ولادت باسعادت تا بعثت نبوی

باب : 1 قبل از ولادت رونما ہونے والے واقعات اور ان کی حکمتیں

باب : 2 ولادت باسعادت سے حلف الفضول تک کا سفر

باب : 3 تجارتی سفر، نکاح اور بعثت سے قبل اہم واقعات

اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى

''کیا اس نے آپ کو یتیم پا کر جگہ نہیں دی؟''

(الضحیٰ 93:6)

باب 1

قبل از ولادت رونما ہونے والے واقعات اور ان کی حکمتیں

ذلت میں گھری انسانیت پر رحم فرماتے ہوئے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اسے پستی سے نکال کر عزت وشرف کے مقام پر فائز کرنا چاہا تو اپنے حبیب ﷺ کی بعثت کے ساتھ ان باسعادت لمحات کا آغاز فرمایا جن میں عالمِ بشریت کو ظلم و جہالت کی تاریکیوں سے نجات حاصل ہوئی۔

اس سے پہلے کہ ہم نبی ﷺ کی ولادتِ باسعادت کا تذکرہ کریں یا آپ کے بچپن، لڑکپن اور جوانی کے واقعات بیان کریں یا یہ واضح کریں کہ نزولِ وحی سے قبل اللہ تعالیٰ نے کس قدر آپ کی خصوصی نگہداشت فرمائی یا یہ بتائیں کہ بعثت سے قبل آپ کتنی شفاف اور پاکیزہ سیرت کے مالک تھے، ہم زیادہ مناسب سمجھتے ہیں کہ ان بڑی بڑی نشانیوں کو واضح کریں اور ان اہم واقعات کا تذکرہ کریں جو آپ کی ولادتِ باسعادت سے قبل رونما ہوئے، اس لیے کہ آپ ﷺ کی پیدائش سے قبل ان واقعات کا پیش آنا اس بات کا پیغام تھا کہ صبحِ روشن قریب آچکی ہے۔

اس کائنات میں دستورِ الٰہی بھی یہی ہے کہ سختی کے بعد آسانی پیدا ہوتی ہے، تاریکی کے بعد روشنی پھیلتی ہے اور بدحالی کے بعد خوشحالی میسر آتی ہے۔[1]

ولادت سے قبل چند اہم واقعات درج ذیل ہیں:

[1] هذا الحبيب محمد ﷺ يا محب للجزائري، ص: 51.

چاہ زمزم کی کھدائی

شیخ ابراہیم العلی رحمہ اللہ نے نبی کریم ﷺ کے جد محترم عبدالمطلب کے چاہ زمزم کھودنے کا واقعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ایک صحیح روایت میں بیان کیا ہے:

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''عبدالمطلب نے بیان کیا کہ میں حطیم میں سو رہا تھا (حطیم بیت اللہ کا وہ حصہ ہے جسے سرمائے میں کمی کی وجہ سے قریش مکہ نے بغیر تعمیر کے چھوڑ دیا تھا) کہ (خواب میں) میرے پاس ایک شخص آیا۔ اس نے مجھ سے کہا: ''طیبہ کو کھودیے!'' میں نے پوچھا کہ طیبہ کیا چیز ہے؟ مگر وہ شخص جواب دیے بغیر چلا گیا۔ (طیبہ کے معنی ہیں پاکیزہ ہونا، عمدہ ہونا، خوشبودار ہونا) اگلے روز میں پھر اس جگہ سویا تو وہی شخص پھر میرے پاس آیا اور کہنے لگا: ''بَرّہ کو کھودیے!'' (بَرّہ کے معنی ہیں بھلی، پاکیزہ) میں نے پوچھا: ''بَرّہ کیا چیز ہے؟'' مگر وہ بغیر جواب دیے چلا گیا۔ اگلے دن میں پھر اسی مقام پر سویا تو وہی شخص پھر میرے پاس آیا اور کہنے لگا: ''مضنونہ کو کھودیے!'' (مضنونہ کے معنی ہیں بیش قیمت اور عمدہ چیز جسے انسان سنبھال کر رکھتا ہے اور کسی دوسرے کو دینا پسند نہیں کرتا)۔ میں نے پوچھا: ''مضنونہ کیا چیز ہے؟'' تب وہ کچھ کہے بغیر چلا گیا۔ اگلے روز میں پھر اسی جگہ آ کر سویا تو وہ پھر میرے پاس آ کر کہنے لگا: ''زمزم کھودیے!'' میں نے پوچھا: ''زمزم کیا چیز ہے؟ اس نے جواب دیا: ''(زمزم وہ کنواں ہے) جس کا پانی کبھی ختم ہوگا نہ کم، وہ حجاج کرام کو سیراب کرے گا وہ گوبر اور خون کے درمیان ہوگا، (یعنی خوراک میں دودھ کا کام دے گا) سفید ٹانگوں والے کوے کے چونچ مارنے اور چیونٹیوں کی بستی کے قریب ہوگا (شاید یہ اشارہ تھا کہ کنویں کی تلاش کے لیے زمین کھودنی پڑے گی مگر زیادہ نہیں صرف چیونٹیوں کے بل کے برابر۔)'' [1]

1 صحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي:1/34,35.

مشہور سیرت نگار ابن اسحق کہتے ہیں کہ جب چاہ زم زم کی خوبیاں واضح ہو گئیں اور اس کی جگہ معلوم ہو گئی اور عبدالمطلب نے جان لیا کہ یہ خواب سچا ہے تو انھوں نے کدال پکڑی اور اپنے بیٹے حارث کی معیت میں اس جگہ کی کھدائی شروع کر دی۔ اس روز حارث کے سوا ان کے ساتھ کوئی اور بیٹا موجود نہیں تھا۔ جب کھدائی کے دوران میں عبدالمطلب کو کنویں کی منڈیر نظر آئی تو انھوں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ قریش سمجھ گئے کہ عبدالمطلب نے اپنا مقصد حاصل کر لیا ہے۔ وہ اس کے پاس آئے اور کہنے لگے: ''اے عبدالمطلب! یہ ہمارے جدامجد اسماعیل علیہ السلام کا کنواں ہے اور اس میں ہمارا بھی حق ہے، ہمیں بھی اس میں شریک کرو۔'' عبدالمطلب نے کہا: ''میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا کیونکہ ہر کام تمھیں چھوڑ کر میرے ذمے لگایا گیا ہے اور یہ کنواں تمھیں نہیں مجھے عطا کیا گیا ہے۔'' قریش نے کہا: ''(اے عبدالمطلب!) انصاف سے کام لو، ہم اسے تنہا تمھاری ملکیت میں نہیں رہنے دیں گے بلکہ تمھارا مقابلہ کریں گے۔'' عبدالمطلب نے کہا: ''(اگر یہ بات ہے) تو پھر جسے تم پسند کرتے ہو، میرے اور اپنے درمیان منصف تسلیم کر لو، میں اس سے تمھارا فیصلہ کروا لیتا ہوں۔'' انھوں نے بنوسعد بن ہُذیم کی ایک کاہنہ کا نام پیش کیا جو شام کے علاقے میں رہائش پذیر تھی۔ عبدالمطلب نے اسے تسلیم کر لیا۔

چنانچہ عبدالمطلب نے اپنے خاندان بنوعبدمناف کے چند افراد کے ساتھ رخت سفر باندھا۔ قریش کے ہر قبیلے کا ایک ایک فرد اس کے ساتھ روانہ ہوا۔ اس زمانے میں یہ سارا راستہ صحرائی تھا۔ وہ سب چل پڑے تو راستے میں عبدالمطلب اور اس کے ساتھیوں کا پانی ختم ہو گیا۔ پیاس کی وجہ سے بے حال ہو گئے حتی کہ انھیں اپنی موت نظر آنے لگی۔ اگر کسی کے پاس کچھ پانی تھا بھی تو وہ کسی دوسرے کو دینے کے لیے تیار نہ تھا۔ ہر ایک یہی جواب دیتا کہ صحرائی علاقہ ہے، اگر ہمارے پاس بھی پانی ختم ہو گیا تو پھر ہمارا وہی حال ہو گا جو تمھارا ہو رہا ہے۔ یہ صورتِ حال دیکھتے ہوئے عبدالمطلب نے اپنی رائے کا اظہار کیا کہ

شدتِ پیاس سے ہم سب موت کا شکار ہو جائیں گے، جبکہ ابھی ہم میں کچھ توانائی موجود ہے، اس لیے ہر شخص اپنے لیے ایک ایک قبر کھودے تا کہ جو مرتا جائے اس کے ساتھی اسے اس کی قبر میں دفن کرتے جائیں حتی کہ آخر میں صرف ایک ہی آدمی باقی رہ جائے (جسے دفن کرنے والا کوئی نہ ہو) ایک آدمی کی لاش کا ضائع ہو جانا پورے قافلے کی لاشوں کے ضائع ہونے سے بہتر ہے۔ سب نے اس رائے کو پسند کیا۔

ہر شخص نے اپنے لیے ایک ایک گڑھا کھودا اور شدتِ پیاس سے موت کا انتظار کرنے بیٹھ گئے۔ عبدالمطلب نے پھر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ یہ تو حماقت ہوگی اگر ہم نے اسی طرح اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دیا اور اپنی جان بچانے کے لیے (پانی کی تلاش میں) سفر نہ کیا۔ ہمت کرو اور سفر جاری رکھو۔ ممکن ہے اللہ تعالیٰ کسی جگہ ہمیں پانی مہیا فرمادے، چنانچہ وہ سفر کے لیے تیار ہو گئے۔ جب عبدالمطلب نے اپنی سواری کو اٹھایا تو اس کے پاؤں کے نیچے سے شیریں پانی کا چشمہ پُھوٹ پڑا۔ یہ دیکھ کر عبدالمطلب اور اس کے ساتھیوں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ سب کے سب جو روانگی کے لیے پابہ رکاب تھے، سواریوں سے اترے۔ انھوں نے خوب سیر ہو کر پانی پیا، اپنے مشکیزے بھی پانی سے بھر لیے۔ اب عبدالمطلب نے قریشی قبائل کو، جو تمام صورتِ حال کو بنظر غائر دیکھ رہے تھے، آواز دی کہ آؤ پانی لے لو اور دیکھو اللہ تعالیٰ نے ہمیں سیراب کر دیا ہے۔

وہ لوگ آئے، سب نے پانی پیا، اپنے اپنے مشکیزے بھرے اور بیک زبان کہا: ”اے عبدالمطلب! بخدا! اللہ نے ہمارے مقابلے میں آپ کے حق میں فیصلہ کر دیا ہے، اللہ کی قسم! اب ہم کبھی آپ سے زم زم کے بارے میں جھگڑا نہیں کریں گے۔ جس اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس بے آب و گیاہ جنگل میں سیراب کیا ہے، یقیناً اسی نے آپ کو زم زم کا کنواں عطا فرمایا ہے۔ خیر و برکت کے ساتھ اپنے زم زم کی طرف واپس چلیں، یہ آپ ہی کا حق ہے۔“ چنانچہ وہ سب کاہنہ عورت کے پاس جانے کے بجائے واپس ہوئے اور قریش زم زم سے دستبردار ہو گئے۔

سیرت نگار ابن اسحق فرماتے ہیں کہ زم زم کے بارے میں یہ روایت ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مجھ تک پہنچی۔ [1]

آبِ زم زم کے فضائل: آبِ زم زم کے فضائل میں بے شمار احادیث موجود ہیں۔ ان میں سے ایک روایت وہ ہے جسے امام مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کے واقعے میں بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّهَا مُبَارَكَةٌ إِنَّهَا طَعَامُ طُعْمٍ»

"یہ (آب زم زم) بہت بابرکت ہے اور خوراک کا کام بھی دیتا ہے۔" [2]

سنن دارقطنی اور مستدرک حاکم میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے جسے امام حاکم نے صحیح کہا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَاءُ زَمْزَمَ لِمَا شُرِبَ لَهُ، إِنْ شَرِبْتَهُ تَسْتَشْفِي بِهِ، شَفَاكَ اللّٰهُ! وَ إِنْ شَرِبْتَهُ لِشِبَعِكَ، أَشْبَعَكَ اللّٰهُ! وَ إِنْ شَرِبْتَهُ لِيَقْطَعَ ظَمَئَكَ، قَطَعَهُ اللّٰهُ! وَ هِيَ هَزْمَةُ جِبْرِيلَ، وَ سُقْيَا اللّٰهِ إِسْمَاعِيلَ»

"آب زم زم جس مقصد کے لیے پیا جائے وہ حاصل ہو جاتا ہے۔ اگر تم حصولِ شفا کے لیے پیو گے تو اللہ تعالیٰ شفا عطا فرمائے گا۔ اگر بھوک مٹانے کے لیے پیو گے تو اللہ تعالیٰ تمھاری بھوک مٹا دے گا۔ اگر پیاس بجھانے کے لیے پیو گے تو اللہ تعالیٰ پیاس ختم کر دے گا۔ یہ حضرت جبریل علیہ السلام کی ایڑی [3] کی ضرب کے ساتھ نمودار ہوا

---

1 السيرة النبوية لابن هشام: 1/151-153، والسير والمغازي لابن إسحاق: 25,24، تحقيق سهيل زكار، و دلائل النبوة للبيهقي: 1/94,93. (ابن اسحق نے سماع کی صراحت کی ہے، اس لیے اس کی سند صحیح ہے۔ امام زہری کی ایک مرسل روایت اس کی شاہد ہے، لہٰذا بیہقی اور ابن ہشام کے طریق سے یہ روایت صحیح ہے۔ 2 صحيح مسلم، حديث: 2473. 3 صحیح البخاری میں راوی نے شک کے ساتھ بیان کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السلام کی ایڑی یا پر کی ضرب کا تذکرہ کیا ہے، دیکھیے: صحيح البخاري، حديث: 3364.

اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی سیرابی کا سامان تھا۔‘‘[1]

شیخ محمد ابوشہبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بہر صورت حافظ دمیاطی نے «مَاءُ زَمْزَمَ لِمَا شُرِبَ لَهُ» کو صحیح کہا ہے اور وہ متاخرین حفاظ حدیث میں سے ایک قابل اعتماد شخصیت ہیں۔[2] اور حافظ عراقی نے بھی اس کی صحت کو تسلیم کیا ہے۔[3]

اصحابِ فیل کا واقعہ

یہ واقعہ قرآن کریم اور سنت نبویہ سے ثابت ہے۔ اس کی تفصیل، سیرت اور تاریخ کی کتب میں موجود ہے اور مفسرین نے بھی اپنی تفاسیر میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں فرمایا ہے:

﴿أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيلِ ۝ أَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِي تَضْلِيلٍ ۝ وَأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيلَ ۝ تَرْمِيهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّن سِجِّيلٍ ۝ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ ۝﴾

’’(اے نبی!) کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ آپ کے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟ کیا اس نے ان کی چال کو بیکار نہیں کر دیا؟ اور اس نے ان پر جھنڈ کے جھنڈ پرندے بھیجے، جو ان پر کھنگر کی کنکریاں پھینک رہے تھے، پھر اللہ نے انھیں کھائے ہوئے بھوسے کی طرح کر دیا۔‘‘[4]

واقعۂ فیل کی جانب نبوی اشارے: رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم صلح حدیبیہ والے سفر میں مکہ کی جانب جا رہے تھے۔ جب اس گھاٹی پر پہنچے جہاں سے مکہ کو راستہ اترتا تھا تو آپ کی سواری بیٹھ گئی۔ صحابہ کرام نے ’’حَلْ حَلْ‘‘ کی آواز لگا کر اسے اٹھانا چاہا مگر وہ (اونٹنی) بضد رہی اور

---

1 المستدرك للحاكم:473/1، و سنن الدارقطني:288/2. اس سند کے ایک راوی محمد بن حبیب جارودی کے بارے میں امام حاکم رحمہ اللہ نے فرمایا: ’’اس سند میں اگر محمد بن حبیب جارودی نہ ہو تو یہ سند صحیح ہے۔‘‘ دارقطنی کے محقق مجدی بن منصور بن سید الشوری نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ 2 السيرة النبوية لأبي شهبة:158/1. 3 مقدمة ابن الصلاح وشرحها للحافظ العراقي، ص: 13. 4 الفيل 105:1-5.

نہ اُٹھی۔ تب لوگوں نے کہا: ''قصواء (اونٹنی کا نام) اَڑ گئی ہے۔'' نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«مَا خَلَأَتِ الْقَصْوَاءُ وَمَا ذَاكَ لَهَا بِخُلُقٍ وَّلٰكِنْ حَبَسَهَا حَابِسُ الْفِيلِ»

''قصواء اڑی نہیں ہے اور نہ یہ اس کی عادت ہے بلکہ اسے اس ذات نے روکا ہے جس نے (مکہ مکرمہ سے) ہاتھی (والوں کو) روکا تھا۔'' [1]

امام ابو حاتم کی کتاب «السيرة النبوية» میں یہ واقعہ یوں مروی ہے کہ ایک بادشاہ جسے ابرہہ کہا جاتا تھا اور اس کا تعلق حبشہ سے تھا، اس نے یمن پر تسلط حاصل کیا۔ [2] اور صنعاء شہر میں ایک گرجا تعمیر کیا جس کا نام القُلَّیس رکھا۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ عربوں کے حج کا رخ اس کی طرف پھیر دے، چنانچہ اس نے پختہ ارادہ کرلیا کہ وہ مکہ جاکر کعبہ کو منہدم کرے گا۔ حمیر کا ایک بادشاہ جس کا نام ذونفر تھا، اپنی وفادار قوم کو لے کر ابرہہ کے مقابلے کے لیے نکلا مگر اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ جب اسے گرفتار کرکے ابرہہ کے سامنے پیش کیا گیا تو ذونفر نے اس سے درخواست کی: عالی جاہ! مجھے قتل نہ کریں۔ مجھے زندہ رکھنا آپ کے لیے میرے قتل سے بہتر ہوگا، چنانچہ ابرہہ نے اسے قتل کرنے کے بجائے اپنی قید میں رکھ لیا۔

پھر ابرہہ کعبے کی جانب روانہ ہوا۔ جب خَثعم قبائل کے قریب پہنچا تو نُفَیل بن حبیب خثعمی نے کچھ یمنی قبائل اپنے ساتھ ملا کر اس سے جنگ کی لیکن ابرہہ نے انھیں ہزیمت سے دوچار کیا اور نُفَیل بن حبیب کو گرفتار کرلیا۔ نفیل نے بھی ابرہہ سے درخواست کی کہ مجھے قتل نہ کرنا، میں عرب کی سرزمین سے خوب واقف ہوں (تمھارے کام آوں گا) اور

---

1 صحيح البخاري، حديث: 2731. 2 ابرہہ الاشرم: حبشہ کے گورنر ارياط نے یمن پر 525ء تا 543ء حکومت کی، پھر حبشی فوج نے بغاوت کی جس کا سربراہ ابرہہ تھا۔ ارياط اس فتنے میں مارا گیا اور ابرہہ تنہا یمن کا بادشاہ بن بیٹھا۔ لفظ ''ابرہہ'' لفظ ''ابراہیم'' کا حبشی تلفظ ہے۔ وہ نکٹا تھا، لہٰذا اشرم کہلاتا تھا۔ (ماخوذ از تاریخ ارض القرآن کامل از سید سلیمان ندوی، ص:244)

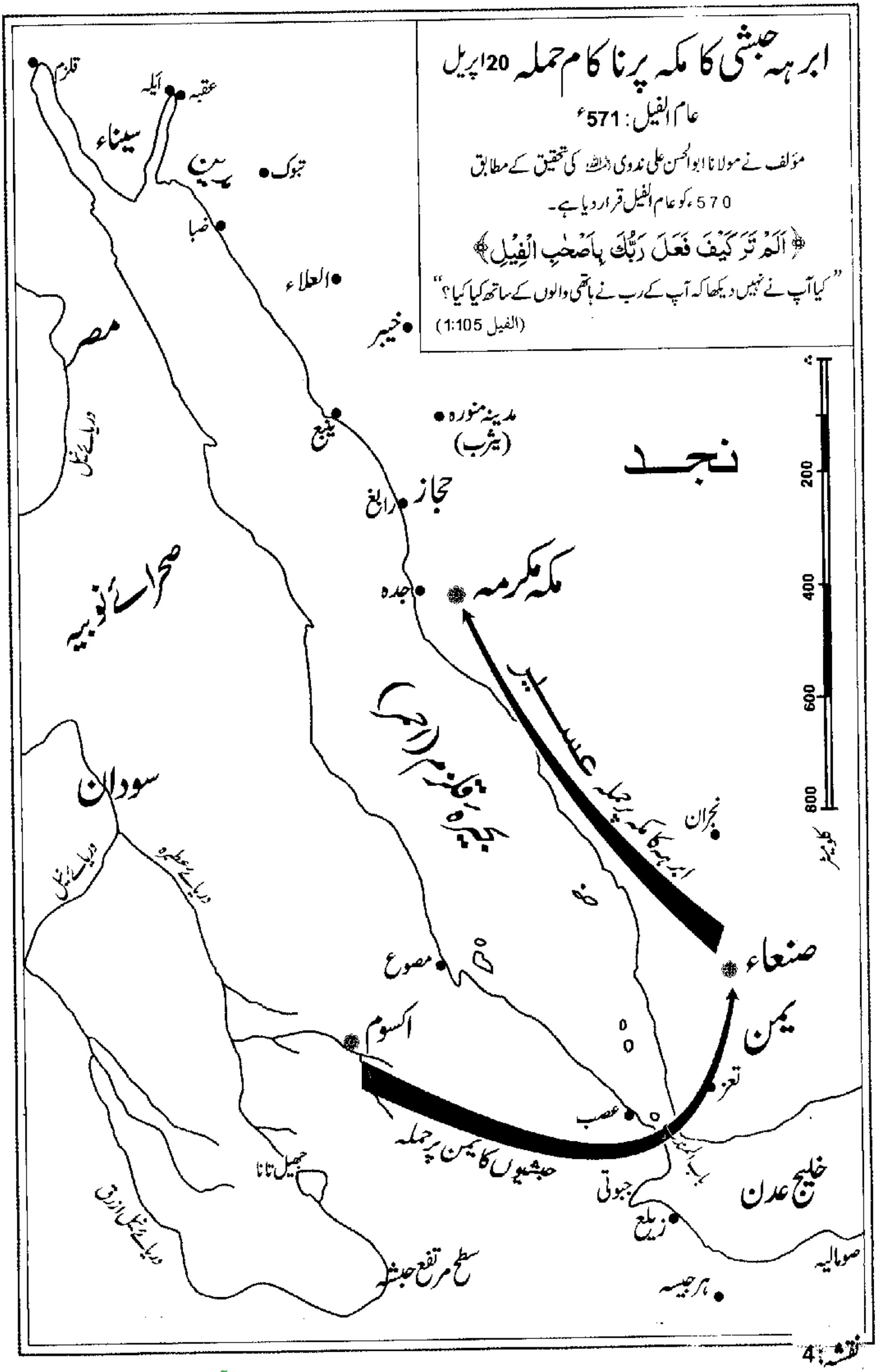
میری قوم بھی میری فرمانبردار ہے۔ میرا ان پر مکمل کنٹرول ہے۔ (اگر تو نے مجھے قتل نہ کیا تو میں انھیں تیرے ساتھ جنگ کرنے سے باز رکھوں گا)۔ اس پر ابرہہ نے اسے بھی زندہ چھوڑ دیا۔ اس طرح نُفَیل اس کی رہنمائی کے لیے اس کے ساتھ روانہ ہوگیا۔

جب ابرہہ طائف پہنچا تو مسعود بن مُعَتِّب بنوثقیف کے کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر اس سے ملا اور کہا کہ اے بادشاہ! ہم تیرے غلام ہیں اور ہماری تجھ سے کوئی مخالفت نہیں۔ ہم تو ''لات'' کو پوجنے والے ہیں جس سے تجھے کوئی غرض نہیں۔ تیری غرض تو مکہ سے ہے۔ ہم تیرے ساتھ ایک شخص کو بھیج دیتے ہیں جو تجھے مکہ تک پہنچائے گا، چنانچہ انھوں نے ''ابورِغال'' نامی اپنا ایک غلام اس کے ساتھ کر دیا۔ وہ انھیں لے کر چلا۔ جب (مکہ کے قریب) مُغَمَّس نامی مقام پر پہنچا تو وہاں ابورِغال فوت ہوگیا۔ یہ وہی ابو رِغال ہے جس کی قبر کے پاس سے گزرتے ہوئے لوگ اس کی قبر پر پتھر مارتے تھے۔[1]

ابرہہ نے مُغَمَّس سے اسود بن مقصود کو اپنے ہراول دستے کا کمانڈر بنا کر مکہ بھیجا۔ اہل حرم اس کے پاس جمع ہوگئے۔ اس نے ''اُرَک'' نامی جگہ سے عبدالمطلب کے دوسو اونٹ اپنے قبضے میں لے لیے، پھر ابرہہ نے حُناطہ حمیری کو اہل مکہ کے پاس بھیجا اور کہا کہ شریف مکہ سے مل کر اسے میرا پیغام پہنچا دو کہ میں جنگ کے لیے نہیں آیا۔ میں صرف اس گھر

---

1 یہ وہی ابورغال ہے جس کی قبر کا حوالہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے بھی دیا تھا۔ مسند احمد میں ہے کہ جب غیلان بن سلمہ ثقفی رضی اللہ عنہ مسلمان ہوا تو اس کی دس بیویاں تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حکم دیا کہ اپنی دس بیویوں میں سے چار کا انتخاب کر کے باقیوں کو طلاق دے دو۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں اس نے اپنی بقایا بیویوں کو طلاق دے دی اور مال اپنے بیٹوں میں تقسیم کر دیا۔ آپ کو معلوم ہوا تو اس سے فرمایا: ''مجھے لگتا ہے شیطان نے تیری موت کی خبر آسمان سے سن لی ہے اور یہ بات اس نے تیرے دل میں بھی ڈال دی ہے۔ اب شاید تو تھوڑا عرصہ ہی زندہ رہے گا۔ اللہ کی قسم! تجھے اپنی بیویوں سے رجوع کرنا ہوگا اور اپنا مال بھی بیٹوں سے واپس لینا ہوگا وگرنہ میں تیری بیویوں کو وارث بناؤں گا اور لوگوں کو حکم دوں گا وہ تیری قبر پر پتھر برسائیں گے جیسا کہ ابورغال کی قبر پر برسائے گئے تھے۔'' (مسند أحمد: 14/2)


ابرہہ حبشی کا مکہ پر ناکام حملہ 20 اپریل
عام الفیل: 571ء
مؤلف نے مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کی تحقیق کے مطابق
570ء کو عام الفیل قرار دیا ہے۔
﴿أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيلِ﴾
"کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ آپ کے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟"
(الفیل 105:1)
قلزم
ایلہ
عقبہ
سیناء
مدین
تبوک
ضبا
العلاء
خیبر
مصر
ینبع
مدینہ منورہ
(یثرب)
نجد
حجاز
رابغ
مکہ مکرمہ
جدہ
صحرائے نوبیہ
بحیرۂ قلزم (احمر)
ابرہہ کا مکہ پر حملہ
سودان
نجران
صنعاء
یمن
مصوع
اکسوم
تعز
عصب
حبشیوں کا یمن پر حملہ
جبوتی
خلیج عدن
زیلع
جھیل تانا
سطح مرتفع حبشہ
صومالیہ
ہرجیسہ
200
400
600
800
کلومیٹر
نقشہ: 4

(بیت اللہ) کو گرانے آیا ہوں، چنانچہ حناطہ مکہ پہنچ کر عبدالمطلب بن ہاشم سے ملا اور کہا کہ مجھے بادشاہ نے آپ کی جانب بھیجا ہے کہ میں آپ پر واضح کردوں کہ بادشاہ آپ سے جنگ کرنے کے لیے نہیں آیا، صرف اس گھر (بیت اللہ) کو گرا کر واپس چلا جائے گا لیکن اگر تم نے لڑائی کی تو پھر وہ بھی تم سے لڑے گا۔

عبدالمطلب نے جواب دیا کہ ہم بھی اس سے جنگ کا ارادہ نہیں رکھتے، اس لیے ہم اس کے اور بیت اللہ کے درمیان حائل نہیں ہوں گے۔ اگر اللہ نے اس کی رسی دراز کر دی ہے تو ہم اس سے لڑنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ حُناطہ نے عبدالمطلب سے کہا، پھر میرے ساتھ بادشاہ کے پاس چلو، چنانچہ عبد المطلب اس کے ساتھ فوجی کیمپ میں چلے گئے۔ ذونفر عبدالمطلب کا دوست تھا، وہ اس کے پاس گئے اور کہا: ''اے ذونفر! جس مصیبت میں ہم مبتلا ہوئے ہیں، کیا تم اس سے نجات کے لیے ہماری مدد کر سکتے ہو؟'' اس نے جواب دیا: ''وہ شخص جو خود قیدی ہو اور صبح وشام اسے موت کا دھڑکا لگا رہتا ہو وہ کسی کی کیا مدد کرسکتا ہے؟ البتہ میں ہاتھیوں کے منتظم انیس کی جانب پیغام بھیجتا ہوں اور اس سے کہتا ہوں کہ جہاں تک ممکن ہو، وہ بادشاہ سے تمھارے لیے مفاد حاصل کرے اور تمھارے مقام و مرتبہ کو اس کے سامنے بڑھا چڑھا کر بیان کرے۔'' چنانچہ ذونفر نے انیس کو بلوایا اور اس سے کہا کہ یہ عبدالمطلب قریش کے سردار ہیں۔ مکہ کی تجارت ان کے ہاتھ میں ہے۔ یہ بڑے مہمان نواز ہیں۔ پہاڑوں میں رہنے والے جنگلی جانور بھی ان سے مستفید ہوتے ہیں۔ تمھارے بادشاہ نے ان کے دو سو اونٹ چھین لیے ہیں، یہ میرا دوست ہے۔ اگر تم انھیں کوئی فائدہ پہنچا سکتے ہو تو ضرور پہنچاؤ۔

انیس فوراً ابرہہ کے پاس گیا اور اس سے کہا: ''اے بادشاہ سلامت! یہ (عبدالمطلب) قریش کا سردار ہے اور مکہ کا بہت بڑا تاجر ہے، اس قدر مہمان نواز ہے کہ جہاں عام لوگ اس سے مستفید ہوتے ہیں وہاں پہاڑوں میں رہنے والے جانور بھی اس سے فیض یاب

ہوتے ہیں۔ وہ شرفِ باریابی کا طالب ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ اسے اجازت مرحمت فرمادیں، وہ خود چل کر آپ کے پاس آیا ہے۔ آپ کا مخالف ہے نہ اس نے آپ کو کوئی نقصان پہنچایا ہے۔'' ابرہہ نے انھیں باریابی کی اجازت دے دی۔

عبدالمطلب بڑے قدآور، بارعب اور خوبصورت شخصیت کے مالک تھے۔ جب ابرہہ نے انھیں دیکھا تو وہ ان کی پُر وقار شخصیت سے بڑا متأثر ہوا۔ ان کی بڑی تعظیم وتکریم کی۔ جہاں اس نے نامناسب سمجھا کہ ان کو اپنے ساتھ تختِ شاہی پر بٹھائے، وہاں اس بات کو بھی مناسب خیال نہ کیا کہ وہ زمین پر بیٹھیں، لہٰذا وہ خود ہی تخت شاہی سے اتر کر قالین پر آبیٹھا اور عبدالمطلب کو اپنے ساتھ بٹھالیا۔

عبدالمطلب نے گفتگو کا آغاز کیا کہ اے بادشاہ سلامت! آپ نے میرے اموال کے ایک حصے پر قبضہ کرلیا ہے۔ میرا مال مجھے واپس لوٹا دیں۔ ابرہہ نے جواباً کہا کہ میں تمھیں دیکھ کر بڑا متأثر ہوا تھا لیکن تمھارا مطالبہ سُن کر میرے دل میں تمھاری کوئی قدرومنزلت نہیں رہی۔ عبدالمطلب نے پوچھا: ''وہ کیوں؟'' ابرہہ نے جواب دیا کہ میں اس گھر کو منہدم کرنے آیا ہوں جو تمھارے اور تمھارے آباء واجداد کے دین کی بنیاد ہے اور تمھارے دفاع اور قوت کا مرکز ہے۔ مگر تم نے اس کے بارے میں مجھ سے کوئی بات نہیں کی، صرف اپنے دوسو اونٹوں کو مذاکرات کا موضوع بنایا ہے۔ عبدالمطلب نے کہا کہ ان اونٹوں کا مالک میں ہوں، (اس لیے میں نے ان کی بات کی ہے)۔ اس گھر کا بھی ایک مالک ہے، وہ خود ہی اس کی حفاظت فرمالے گا۔ ابرہہ نے (بڑی رعونت سے) کہا: ''وہ بھی اسے مجھ سے نہ بچاسکے گا۔ تجھے جو کرنا ہے کرلے، اُسے جو کرنا ہوگا کرلے گا۔''

ابرہہ نے حکم دیا تو عبدالمطلب کے اونٹ انھیں واپس کردیے گئے، چنانچہ عبدالمطلب نے واپس آکر قریش کو تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا اور انھیں حکم دیا کہ وہ گھاٹیوں میں بکھر جائیں۔

ابرہہ نے، جو کہ مُغَمَّس میں تھا، مکہ میں داخل ہونے کا عزم کرتے ہوئے لشکر کو تیار کیا اور اپنے ہاتھی پر ضروری سامان رکھوادیا۔ لیکن ہاتھی کو جب حرکت دے کر چلانے لگے تو اس نے چلنے سے انکار کر دیا اور زمین پر بیٹھ جانا چاہا۔ لشکریوں نے اس کے سر پر ہتھوڑے مارے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس کو چلانے کے لیے ہر حربہ آزمایا گیا مگر اس نے قدم تک نہ اٹھایا۔ جب انھوں نے اس کا رخ یمن کی طرف کیا تو وہ تیز دوڑنے لگا۔ لیکن حرم کی طرف موڑنے پر وہ دوبارہ رک گیا اور ایک پہاڑ کے ساتھ جا لگا۔ اتنے میں اللہ نے سمندر کی طرف سے چڑیوں جیسے پرندوں کے جھنڈ بھیج دیے۔ ہر پرندے کے پاس تین تین کنکریاں تھیں۔ دو دو ان کے پنجوں میں اور ایک ایک چونچ میں۔ کنکریوں کی جسامت چنے اور مسور کے دانوں کے برابر تھی۔ پرندے ان کے اوپر سے گزرتے اور کنکریاں گراتے چلے گئے۔ جس کو بھی وہ کنکری لگتی، ہلاک ہو جاتا۔ اس طرح فوج کے خاصے سپاہی مارے گئے۔ جو بچ گئے انھوں نے واپس بھاگنا شروع کر دیا۔

یہی وہ واقعہ ہے جس کا ذکر سورۂ فیل میں کیا گیا ہے۔

ابرہہ کے لشکریوں نے تیزی سے واپس بھاگنا شروع کر دیا۔ ہر جگہ کوئی نہ کوئی مر کر جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے ابرہہ کے جسم میں ایک بیماری پیدا کر دی جس سے اس کا پور پور گرنے لگا۔ جب بھی کوئی پور گرتا تو وہاں سے خون اور پیپ رسنا شروع ہو جاتا۔ جب وہ اپنے بچے کھچے ساتھیوں کے ساتھ یمن پہنچا تو چوزے کی طرح ہو چکا تھا، پھر اسی حالت میں مر گیا۔ [1]

ابن اسحاق نے اپنی سیرت میں بیان کیا ہے کہ عبدالمطلب نے بہت سے قریشی لوگوں کی معیت میں بیت اللہ کے دروازے کا کنڈا پکڑ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہوئے ابرہہ اور اس کے لشکر کے مقابلے میں مدد طلب کی۔ عبدالمطلب نے باب کعبہ کا کنڈا پکڑ کر یہ اشعار پڑھے:

1 السيرة النبوية لأبي حاتم البستي، ص:34-39، و السيرة النبوية لابن كثير:1/30-37.

لَاهُمَّ إِنَّ الْعَبْدَ يَمْ نَعُ رَحْلَهُ فَامْنَعْ حَلَالَكْ

لَا يَغْلِبَنَّ صَلِيبُهُمْ وَ مِحَالُهُمْ غَدْوًا مِّحَالَكْ

إِنْ كُنْتَ تَارِكَهُمْ وَ قِبْلَتَنَا فَأَمْرٌ مَّا بَدَا لَكْ

''اے اللہ! بندہ اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے تو بھی اپنے گھر کی حفاظت فرما۔ کل ان کی صلیب اور تدبیر تیری تدبیر پر غالب نہ آجائے، اگر تو انھیں اور ہمارے قبلے کو اپنے حال پہ چھوڑنا چاہتا ہے تو تیری مرضی۔ تو جو چاہے کر۔''

دعا کے بعد عبدالمطلب نے باب کعبہ کا کنڈا چھوڑ دیا اور قریش کے لوگوں کو ساتھ لے کر پہاڑوں کی چوٹیوں پر پناہ گزیں ہوگئے اور اس انتظار میں رہے کہ ابرہہ مکہ میں داخل ہو کر کیا کرتا ہے۔ اس کے بعد ابن اسحاق نے ابرہہ اور اس کے لشکر کی ہلاکت کا واقعہ بیان کیا ہے۔[1]

اصحاب الفیل کے واقعے سے حاصل ہونے والے اسباق، عبرتیں اور نتائج

کعبۃ اللہ کا شرف و فضل: اس واقعے سے بیت اللہ کی فضیلت و عظمت واضح ہوتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے تعمیر ہونے والا یہ پہلا گھر ہے۔ مشرکین عرب اس گھر کی بہت تعظیم کرتے تھے، اسے نہایت مقدس سمجھتے تھے اور کسی بھی چیز کو اس پر فوقیت نہیں دیتے تھے۔ یہ مقام و مرتبہ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے دین کی باقیات کا ایک حصہ تھا جو عربوں میں چلا آرہا تھا۔

مکہ اور اہل عرب سے عیسائیوں کا حسد: بیت اللہ کی تعظیم کرنے والے عربوں اور سرزمینِ مکہ کے بارے میں عیسائیوں کے دلوں میں حسد اور بغض کے جو جذبات پنہاں تھے، کھل کر سامنے آگئے۔ اسی وجہ سے ابرہہ نے قُلَّیس نامی گرجا تعمیر کر کے عربوں کو بیت اللہ

1 السيرة النبوية لابن هشام بشرح الخشني، ص: 84-91.

کی تعظیم سے ہٹانا چاہا۔ اس مقصد کے لیے اس نے ترغیب و ترہیب کے حربے بھی استعمال کیے مگر عرب اپنے موقف پہ ڈٹے رہے۔ یہ کشمکش اس حد تک پہنچ گئی کہ ایک اعرابی نے اظہارِ نفرت کے لیے قُلَّیس گرجا کو گندگی سے آلودہ کر دیا۔

امام رازی رحمہ اللہ اس آیت: ﴿ اَلَمْ یَجْعَلْ کَیْدَهُمْ فِیْ تَضْلِیْلٍ ۝ ﴾ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ کید کے معنی ہوتے ہیں: ''خفیہ طریقے سے دوسرے کو نقصان پہنچانے کا ارادہ کرنا۔ اگر کوئی سوال کرے کہ ابرہہ کے اس معاملے کو ''کید'' کا نام کیوں دیا گیا، حالانکہ اس کا معاملہ واضح تھا، اس نے بیت اللہ کو منہدم کرنے کا اعلان کیا تھا، تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ابرہہ کے دل میں جو عزائم تھے وہ اس اعلان سے بھی زیادہ بدترین تھے۔ اس کے دل میں عربوں کے لیے بہت حسد تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کعبے کی وجہ سے جو شرف انھیں حاصل ہوا ہے، ان سے چھین کر اپنی ذات اور اپنے علاقے کے لیے خاص کر دے۔[1]

مقدس مقامات کی حفاظت کے لیے جذبۂ قربانی: بیت اللہ کی حفاظت کے لیے شاہانِ حمیر میں سے ایک بادشاہ ابرہہ اور اس کے لشکر سے ٹکرا جاتا ہے اور شکست کی صورت میں اس کا قیدی بن جاتا ہے۔ اسی طرح نفیل بن حبیب خثعمی نے یمنی قبائل کو اپنے ساتھ ملا کر ابرہہ سے جنگ کی مگر لشکر جرار کا مقابلہ نہ کر سکے لیکن اپنے مقدس مقامات کی حفاظت کے لیے جانوں کے نذرانے ضرور پیش کیے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مقدس اشیاء کی حفاظت اور اس کی خاطر قربانی کا جذبہ ایک ایسی چیز ہے جو انسانی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے۔

قومی غداروں کی رسوائی: دشمن کے مفاد کے لیے کام کرنے والے جن لوگوں نے ابرہہ کے ساتھ تعاون کیا، اس کے جاسوسوں کا کردار ادا کیا اور بیت اللہ کی جانب اس کی رہبری کی تاکہ وہ بیت اللہ کو گرانے کا عزم پورا کر سکے، وہ دنیا و آخرت میں ملعون قرار پائے۔

---

1 تفسیر الرازي:32/94.

لوگوں نے ان کے لیے لعنت کی اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انھیں اپنی رحمت سے دور کر کے ملعون بنا دیا۔ ابورغال کی قبر بددیانتی اور غداری کی علامت بن گئی۔ یہ لوگوں کے دلوں میں مبغوض و ناپسندیدہ ٹھہرا اور اس کی قبر کے قریب سے گزرنے والا ہر شخص اسے پتھر مارتا۔

اللہ تعالیٰ کے خلاف معرکہ آرائی کی حقیقت: سردار مکہ عبدالمطلب کے اس قول کہ ''ہم اس (ابرہہ) کے اور بیت اللہ کے درمیان حائل نہیں ہوں گے۔ اگر اللہ نے اس کی رسی دراز کردی ہے (اور اسے اس کے ارادے سے نہیں روکتا) تو ہم تو اس سے لڑنے کی طاقت نہیں رکھتے'' اس میں ایک باریک نکتہ ہے جو اس حقیقت کو ثابت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے دشمنوں کے درمیان معرکہ آرائی میں ناکامی و ذلت دشمن ہی کا مقدر ہے۔ دشمن کی قوت اور طاقت خواہ کتنی ہی ہو وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت، پکڑ اور سزا کے سامنے لمحہ بھر کے لیے بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ وہی زندگی عطا کرنے والا ہے اور جب چاہے اسے واپس لے سکتا ہے۔[1]

علامہ جمال الدین قاسمی رحمہ اللہ نے امام قاشانی رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے: ''اصحاب الفیل کا واقعہ مشہور ہے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے سے متصل ظہور پذیر ہوا۔ یہ قدرت الٰہی کی نشانیوں میں سے ایک عظیم نشانی ہے اور ان لوگوں کے لیے اس کی ناراضی کا ایک مظہر ہے جو اس کے حرم کی بے حرمتی کی جسارت کریں۔''[2]

بیت اللہ اور اس کے متولیوں کی تعظیم: عربوں کے دلوں میں بیت اللہ کی عظمت اور زیادہ بڑھ گئی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود اس کی حفاظت فرمائی۔ دشمنوں کی سازشوں اور مفسدین کی شرارتوں سے اسے بچایا۔ عربوں کے دلوں میں قریش کی عظمت بھی دو چند ہوگئی۔ وہ کہنے لگے کہ یہ تو اللہ والے ہیں، اللہ نے ان کی لڑائی خود لڑی اور خود ہی ان کے دشمنوں کو تباہ کردیا۔ یہ چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نشانی تھی اور مکہ سے ایک ایسے نبی

---

[1] السیرة النبویة لأبي فارس، ص: 112. [2] محاسن التفسیر للقاسمي: 262/17.

کی بعثت کا پیش خیمہ تھا جو کعبہ کو بتوں سے پاک کرے گا، اس کی شان بلند کرے گا اور اس کی عظمتِ رفتہ بحال کرے گا۔[1]

واقعۂ فیل نبوت کی دلیل: بعض علماء نے کہا ہے کہ واقعۂ فیل نبوت کے شواہد اور دلائل میں سے ہے۔ امام ماوردی رحمہ اللہ اسی سلسلے میں فرماتے ہیں: حاکم ہونے کی نشانیاں نمایاں اور نبوت کے شواہد واضح ہیں۔ ان کا آغاز انجام کی خبر دے رہا ہے۔ ان میں جھوٹ اور سچ کی آمیزش نہیں۔ حق ممتاز ہوتا ہے، ان شواہد کی قوت اور انتشار کے مطابق یہ نبوت کی بشارتیں اور انذارات ہوتی ہیں۔

جب ولادت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ قریب آیا تو علاماتِ نبوت کی عطر بیزیاں اور برکات کا ظہور شروع ہوگیا۔ ان میں سے بڑا اور سب سے زیادہ شہرت پانے والا واقعۂ فیل ہے۔ اس واقعے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی علامت اس طرح ہے کہ آپ اس زمانے میں سرزمین مکہ کے اندر بطنِ مادر میں تھے کیونکہ اس واقعے کے پچاس دن بعد 12 ربیع الاول بروز سوموار آپ کی ولادت باسعادت ہوئی۔[2] جبکہ آپ کے والد گرامی اس سے پہلے وفات پا گئے تھے۔ یہ واقعہ دو اعتبار سے بڑی نشانی ہے:

① اگر وہ (اصحاب الفیل) غالب آجاتے تو اہل مکہ کو غلام اور قیدی بنا لیتے مگر اللہ تعالیٰ نے انھیں ہلاک کردیا تاکہ اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر دونوں حالتوں، بطن مادر اور بچپن میں قید اور غلامی کے لمحات نہ آئیں۔

② قریش کا اپنے معبود حقیقی سے کوئی ایسا تعلق نہ تھا جس کی وجہ سے انھیں اس بات کا مستحق سمجھا جاتا کہ انھیں اصحاب الفیل سے بچایا جائے اور نہ ہی وہ اہل کتاب تھے بلکہ ان میں کچھ بتوں کے پجاری، کچھ مورتیوں کے معتقد، کچھ زندیق اور کچھ آخرت کے منکر تھے۔

---

1 السيرة النبوية للندوي، ص: 92. 2 قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری رحمہ اللہ نے تقویمی تحقیق کے ساتھ یہ ثابت کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت 9 ربیع الاول کو ہوئی۔ دیکھیے: رحمة للعالمین: 70,69/1.

جب اللہ تعالیٰ نے نبوت کی تاسیس اور کعبہ کی تعظیم کے لیے غلبۂ اسلام کا ارادہ فرمایا اور عرب میں یہ خبر پھیل گئی کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح ہاتھیوں والے لشکر کو تباہ و برباد کیا تو لوگوں پر حرم کی ہیبت چھا گئی اور وہ قریش کے پہلے سے بھی زیادہ مطیع و فرمانبردار بن گئے اور کہنے لگے کہ یہ تو بڑے اللہ والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی لڑائی خود لڑی اور خود ہی ان کے دشمنوں کی چالوں کو ناکام بنادیا۔ یوں قریش ان کے نزدیک اور زیادہ قابل تعظیم ہوگئے۔ رفادہ،[1] سِقایہ[2] اور سدانہ[3] کا سارا انتظام قریش کے ہاتھ میں آ گیا۔

اس طرح قریش مذہبی پیشوا اور محبوب قائد بن گئے اور اصحاب الفیل زمانۂ ماضی کی ایک ضرب المثل بن کر رہ گئے۔[4]

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''واقعہ اصحاب الفیل نبی کریم ﷺ کی پیدائش کے سال ہوا۔ بیت اللہ کے قرب وجوار میں رہنے والے لوگ مشرک تھے جو بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ ان مشرکین کی نسبت عیسائیوں (بیت اللہ پر حملہ کرنے والے اصحاب الفیل) کا مذہب بہتر تھا۔ اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اصحاب الفیل کی تباہی بیت اللہ کے آس پاس آباد لوگوں کی وجہ سے نہ ہوئی تھی بلکہ بیت اللہ کی وجہ سے ہوئی تھی یا نبی کریم ﷺ کی وجہ سے کیونکہ آپ ﷺ کی ولادت مبارکہ اسی سال بیت اللہ کے پاس ہوئی۔ ممکن ہے دونوں وجوہات ہوں۔ الغرض وجہ جو بھی ہو یہ واقعہ آپ ﷺ کی نبوت کے دلائل میں سے ایک دلیل تھی۔''[5]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں واقعہ اصحاب الفیل کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے لیے تمہید اور پیش خیمہ کی حیثیت رکھتا ہے، اس

---

1 رفادہ: ایک مخصوص رقم ہوتی تھی جو قریش ہر سال آپس میں جمع کرتے، پھر ایام منیٰ میں حجاج کرام کی ضیافت کرتے تھے۔ 2 سقایہ: زمانۂ جاہلیت میں حجاج کے کھانے پینے اور ان کی میزبانی کا انتظام سقایہ کہلاتا تھا۔ 3 سدانہ: خانہ کعبہ کی خدمت اور کلید برداری کو سدانہ کہا جاتا تھا اور کعبے کے خادم کو سادن کہتے تھے۔ 4 أعلام النبوة للماوردي: 185-189. 5 الجواب الصحيح لابن تيمية: 122/4.

لیے کہ مشہور ترین قول کے مطابق اسی سال آپ کی ولادت باسعادت ہوئی۔ گویا قدرت زبانِ حال سے کہہ رہی تھی کہ اے قریش کی جماعت! اللہ تعالیٰ نے اہل حبشہ کے خلاف تمھاری مدد اس لیے نہیں کی کہ تم ان سے بہتر ہو۔ یہ تو اس مقدس گھر کی حفاظت کے لیے کی تھی جسے ہم اپنے آخری نبی اُمّی محمد ﷺ کی بعثت کے ساتھ مزید شرف و منزلت عطا کرنا چاہتے تھے۔[1]

بیت اللہ اور حفاظت الٰہی: اللہ تعالیٰ نے خود اس گھر کی حفاظت فرمائی۔ اہل کتاب (ابرہہ اور اس کے لشکر) کو یہ طاقت نہ دی کہ بیت اللہ کو تباہ کریں یا اس مقدس سرزمین پر غالب آئیں، حالانکہ شرک اپنی نجاست سے اسے آلودہ کررہا تھا اور مشرکین اس کے پاسبان بنے بیٹھے تھے۔ یہ حکمتِ الٰہی تھی کہ بیت اللہ غاصبوں کے تسلط سے آزاد اور دیسہ کاروں کے مکر سے محفوظ رہے اور اس سرزمین کی آزادی بھی برقرار رہے تاکہ یہاں جدید نظریات و افکار (اسلامی عقائد) آزاد فضا میں پروان چڑھ سکیں۔ کوئی غاصب اس پر غلبہ پاسکے نہ کوئی سرکش اس پر اثر انداز ہوسکے اور اسلام جو تمام ادیان اور تمام انسانوں پر غالب ہونے کے لیے آیا ہے، جو کسی کی پیروی و اطاعت کے لیے نہیں بلکہ عالمِ انسانیت کی قیادت کے لیے آیا ہے، اس پر کوئی غالب نہ آسکے۔ یہ اس گھر اور اس دین کی حفاظت کے لیے ایک تدبیر الٰہی تھی جو اس وقت بروئے کار لائی گئی جب کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس دین کے پیغمبر کی ولادت باسعادت اسی سال ہوگی۔[2]

آج جب عالمی صلیبی اور صہیونی طاقتیں ان مقدس مقامات کے بارے میں غلط اور بُرے عزائم رکھتی ہیں اور ان کی خفیہ اور مکروہ سازشیں ان عزائم کو پورا کرنے کے لیے بتدریج آگے بڑھ رہی ہیں تو اصحاب الفیل کے واقعے میں تدبیر الٰہی سے ہمیں حوصلہ اور اطمینان حاصل ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس وقت یہود و نصاریٰ کے مقابلے میں بیت اللہ

---

[1] تفسير ابن كثير:4/549,548. [2] السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 113.

کی حفاظت فرمائی جب اس کے نگران مشرک تھے تو اب بھی وہ یقیناً مکہ مکرمہ اور اپنے نبی کے شہر مدینہ منورہ کو بدخواہوں کے عزائم اور سازشیوں کے مکر وفریب سے محفوظ رکھے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ [1]

واقعۂ فیل سے عربوں کی نئی تاریخ کا آغاز: اصحاب الفیل کے ساتھ جو کچھ ہوا، عربوں نے اس کو بڑی اہمیت دی اور اس واقعے سے ایک نئی تاریخ شروع کی، چنانچہ ان کی تحریر وگفتگو میں یہ نمونے ملتے ہیں کہ فلاں واقعہ عام الفیل میں پیش آیا، یا فلاں شخص عام الفیل میں پیدا ہوا، یا یہ واقعہ عام الفیل کے اتنے سال بعد پیش آیا۔

عام الفیل (اصحاب الفیل کی تباہی کا سال) 570 عیسوی کے مطابق ہے۔ [2]

1 تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب:6/3980. 2 السيرة النبوية للندوي:93.

باب 2

ولادت باسعادت سے حلف الفضول تک کا سفر

نبی کریم ﷺ کا نسب

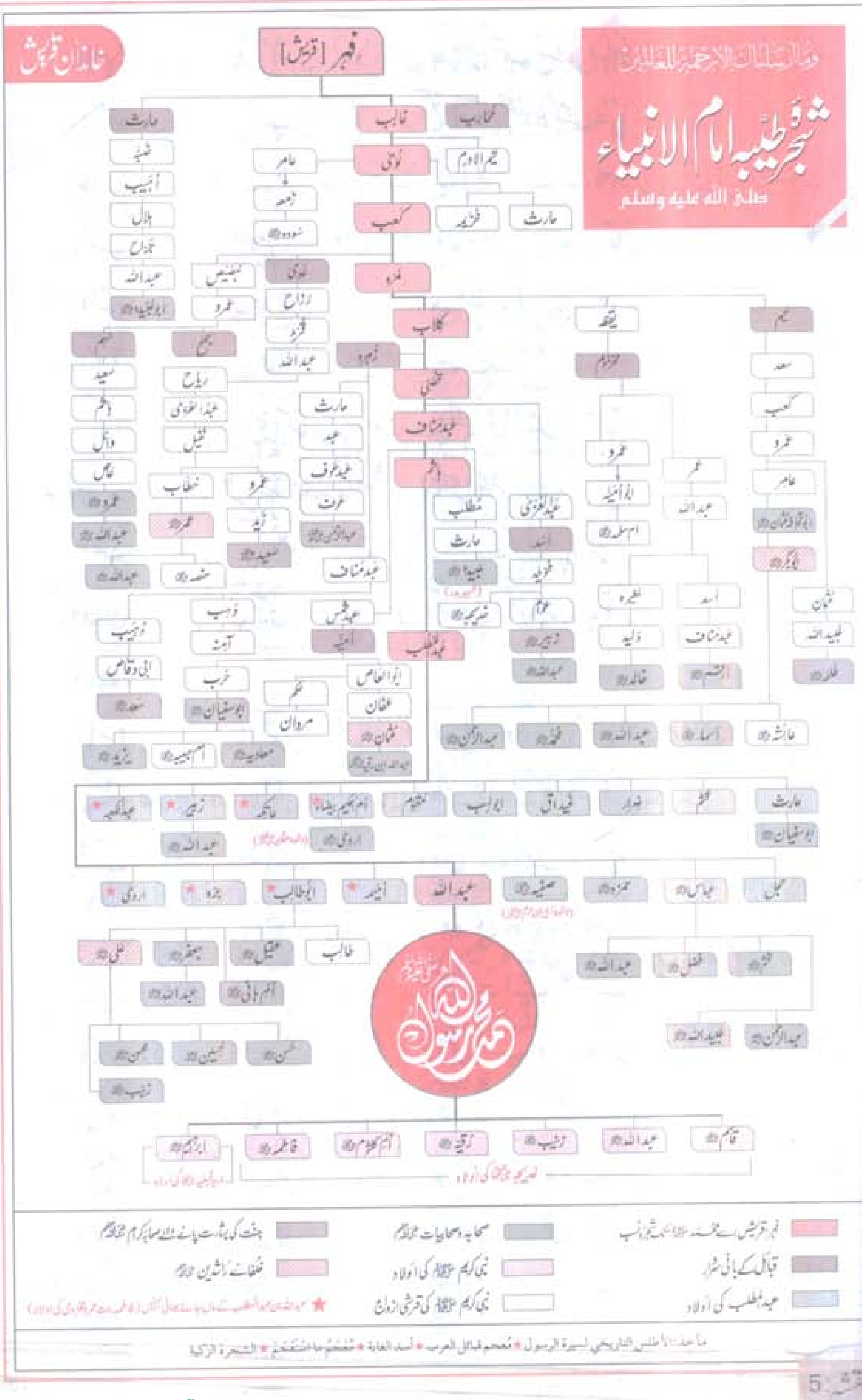
نبی کریم ﷺ اخلاق و کردار اور فطرت و مزاج کے لحاظ سے اکمل ترین انسان اور نسب کے لحاظ سے اعلیٰ واشرف نسب کے حامل تھے۔ آپ کے نسب کی فضیلت میں بہت سی صحیح احادیث موجود ہیں۔ صحیح مسلم میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«إِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ اصْطَفٰى كِنَانَةَ مِنْ وَّلَدِ إِسْمَاعِيلَ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ، وَاصْطَفٰى قُرَيْشًا مِّنْ كِنَانَةَ، وَ اصْطَفٰى مِنْ قُرَيْشٍ بَنِي هَاشِمٍ وَّاصْطَفَانِي مِنْ بَنِي هَاشِمٍ»

''اللہ تعالیٰ نے اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے کنانہ کا انتخاب فرمایا اور کنانہ سے قریش کو چنا، قریش سے بنی ہاشم کو منتخب کیا اور بنی ہاشم سے میرا انتخاب فرمایا۔''[1]

امام بخاری نے نبی کریم ﷺ کا نسب اس طرح بیان کیا ہے: ابو القاسم محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قُصَی بن کلاب بن مُرّۃ بن کعب بن لؤی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مُدرِکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معدّ بن عدنان۔[2]

1 صحيح مسلم، حديث:2276. 2 صحيح البخاري، قبل الحديث :3851.



شجرۂ طیبہ امام الانبیاء
صلی اللہ علیہ وسلم
خاندانِ قریش
فہر [قریش]
غالب
لؤی
کعب
مرہ
کلاب
قصی
عبدمناف
ہاشم
عبدالمطلب
عبداللہ
محمد رسول اللہ

امام بغوی رحمہ اللہ نے ''شرح السنۃ'' میں عدنان تک نسب مبارک ذکر کرنے کے بعد فرمایا: ''عدنان سے اوپر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب صحیح طور پر محفوظ نہیں۔''[1]

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے بھی عدنان تک نسب ذکر کرنے کے بعد فرمایا: ''یہاں (عدنان) تک نسب صحیح طور پر معلوم ہے۔ اس پر علماء و ماہرینِ نسب کا اتفاق ہے اور کسی بات میں بھی اختلاف نہیں، جبکہ عدنان سے اوپر معاملہ مختلف فیہ ہے۔ علمائے نسب کا اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ عدنان اولاد اسماعیل میں سے ہے۔''[2]

امام ابن سعد رحمہ اللہ اپنی کتاب ''الطبقات الکبرٰی'' میں فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک عدنان سے اوپر اسماعیل علیہ السلام تک خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔[3]

حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ہم نے کوئی ایسا ماہرِ نسب نہیں دیکھا جو عدنان اور قحطان سے اوپر کوئی یقینی بات جانتا ہو۔ اگر کوئی کچھ کہتا ہے تو محض اندازے کے ساتھ کہتا ہے۔[4]

امام ذہبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''بالاتفاق عدنان اولادِ اسماعیل بن ابراہیم علیہما السلام میں سے ہیں۔ لیکن عدنان اور اسماعیل علیہ السلام کے مابین علمائے نسب کا اختلاف ہے۔''[5]

نسب کی اہمیت و فضیلت ہمیشہ سے لوگوں کے دلوں میں موجود رہی ہے کیونکہ عالی نسب شخص کی قیادت کا انکار نہیں کیا جا سکتا، وہ نبی ہو یا بادشاہ۔ اس کے مقابلے میں حقیر نسب والے کی قیادت تسلیم نہیں کی جاتی۔ اکثریت ایسے شخص کے جھنڈے تلے جمع ہونے کو ناپسند کرتی ہے، اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اعلیٰ نسب اور خاندان ملا تاکہ یہ شرف و فضل لوگوں کو آپ کے گرد جمع کرنے میں معاون ثابت ہو۔[6]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسل مبارک بہت پاکیزہ اور نہایت عمدہ ہے۔ آپ اسماعیل ذبیح اللہ علیہ السلام

1 شرح السنة للبغوي: 193/13. 2 زاد المعاد: 71/1. 3 الطبقات الكبرٰى لابن سعد: 58/1.
4 الطبقات الكبرٰى لابن سعد: 58/1. 5 السيرة النبوية للذهبي، ص: 1. 6 دراسة تحليلية لشخصية الرسول صلی اللہ علیہ وسلم للدكتور قلعجي، ص: 96.

اور ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی نسل میں سے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام کی دعا کی قبولیت کا مظہر اور اپنے بھائی عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے دی گئی بشارت ہیں، جیسا کہ خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بارے میں فرمایا: «أَنَا دَعْوَةُ أَبِي إِبْرَاهِيمَ وَ بِشَارَةُ أَخِي عِيسٰى» ''میں اپنے باپ (جدامجد) ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور اپنے بھائی عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت ہوں۔'' [1]

نسل کی پاکیزگی اور نسب کی بلندی انسان کو گھٹیا امور سے بچاتی ہے اور فضائل و محاسن حاصل کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ انبیاء و رسل اور داعیانِ حق اس بات کے بہت زیادہ خواہش مند ہوتے ہیں کہ ان کے نسب پاکیزہ اور ان کی نسل عمدہ ہو۔ اس وصف کے ساتھ وہ لوگوں میں متعارف ہوں تاکہ لوگ انھیں اچھا سمجھ کر ان کی بات پر اعتماد کریں۔ [2]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو اعلیٰ و افضل نسب بیان کیا گیا ہے اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عربوں کو دیگر لوگوں پر فوقیت عطا کی ہے اور قریش کو دیگر قبائل پر فضیلت سے نوازا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا تقاضا ہے کہ اس قوم سے محبت کی جائے جس قوم سے آپ کا تعلق ہے اور اس قبیلے سے بھی جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی۔ اس کا مقصود یہ نہیں کہ قوم یا قبیلے کے ہر فرد یا شخصیت سے محبت کی جائے بلکہ یہ محبت خالصتاً ان افراد و شخصیات کے مجموعے، یعنی قوم یا قبیلے سے ہوگی، مثلاً عربوں کے قریشی قبیلے کے اس شرف و فضیلت کو تسلیم کرنا ہوگا جو انھیں محض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نسبت سے حاصل ہوا ہے۔ اگر کوئی عربی یا قریشی اللہ کے دین سے انحراف کرتے ہوئے خود کو اس مقامِ فضیلت سے گرا بیٹھے جو اللہ نے اپنی بندگی کرنے والوں کو عطا کیا ہے تو دین سے یہ انحراف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس کی نسبت کو ختم کردے گا، پھر اس نسبت کا اعتبار نہیں ہوگا بلکہ وہ اپنے انجامِ بد کو پہنچے گا۔ [3]

---

1 المستدرك للحاكم: 600/2، و مسند أحمد: 127/4، و مجمع الزوائد: 222/8. 2 السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 102. 3 فقه السيرة للبوطي: 45.

جناب عبد اللہ بن عبد المطلب کا نکاح اور آمنہ کا خواب

نبی کریم ﷺ کے والد گرامی عبد اللہ بن عبد المطلب نسبتاً اپنے بھائیوں کے اپنے والد عبد المطلب کو بہت زیادہ محبوب تھے۔ جب عبد اللہ بن عبد المطلب نذر کی وجہ سے ذبح ہونے سے بچ گئے۔[1] اور ان کی جگہ عبد المطلب نے سو اونٹ بطور فدیہ دے دیے تو ان کی شادی حضرت آمنہ بنت وہب بن عبد مناف بن زہرہ بن کلاب سے کردی جو کہ مکہ کی عورتوں میں سب سے زیادہ عالی نسب خاتون تھیں۔[2] شکمِ مادر میں استقرارِ رحم کے کچھ ہی عرصے کے بعد آپ ﷺ کے والد گرامی کا انتقال ہوگیا۔ وہ ایک تجارتی قافلے کے ساتھ شام سے واپس آرہے تھے۔ جب مدینہ پہنچے تو داعی اجل کا پیغام آپہنچا، چنانچہ انھیں اپنے ننھیال بنو عدی بن نجار کے ہاں مدینہ میں دفن کر دیا گیا۔ ان کی کوئی اولاد نہ تھی

1 اس نذر کی تفصیل کچھ اس طرح ہے: جب سردار عبد المطلب چاہ زم زم کی تلاش میں زمین کھود رہے تھے اس وقت ان کا صرف ایک ہی بیٹا حارث تھا۔ قریش نے ان کا مذاق اڑایا تو انھوں نے نذر مانی کہ اللہ تعالیٰ نے اگر انھیں دس بیٹے عطا کیے اور وہ ان کے لیے قوت کا ذریعہ بنے تو وہ ایک بیٹا کعبہ کے پاس ذبح کر دیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو دس بیٹے عطا کر دیے اور وہ جب ان کے قوت کا ذریعہ بنے تو انھوں نے اپنے بیٹوں کو اپنی نذر سے آگاہ کیا اور نذر پوری کرنے کی ترغیب بھی دی۔ چنانچہ جب قرعہ اندازی کی گئی تو عبداللہ کا نام نکلا جو عبدالمطلب کو سب سے پیارا تھا۔ عبدالمطلب نے چھری سنبھالی اور انھیں لے کر ذبح کرنے کے لیے اساف اور نائلہ کی طرف چل پڑے۔ لیکن عبداللہ کے ماموں زاد مغیرہ مخزومی کہنے لگے: اللہ کی قسم! ہمیں اس کی جان بچانے کے لیے سارا مال بھی قربان کرنا پڑا تو ہم دریغ نہیں کریں گے۔ پھر وہ ایک کاہنہ کے پاس گئے تو اس نے کہا: ایک آدمی کے قتل کے عوض تم کیا دیت دیتے ہو؟ کہا گیا کہ دس اونٹ دیتے ہیں۔ اس نے کہا دس اونٹوں اور عبداللہ کے درمیان اس وقت تک قرعہ اندازی کرتے رہو جب تک اونٹوں کا قرعہ نہ نکلے۔ وہ قرعہ اندازی کرتے رہے جب سو اونٹ ہوئے تب اونٹوں کا قرعہ نکلا۔ چنانچہ سو اونٹ ذبح کر دیے گئے اور اس طرح عبداللہ کی جان بچ گئی۔ (السيرة النبوية لابن هشام: 1/151-155، والطبقات لابن سعد: 1/88,89)

2 وقفات تربوية مع السيرة النبوية لأحمد فريد، ص: 46.

سوائے اس مبارک وجود کے جو ابھی ماں کے پیٹ میں تھا، گویا تقدیر زبانِ حال سے عبداللہ بن عبدالمطلب سے کہہ رہی تھی: ''تیری زندگی کا مقصد پورا ہو چکا ہے۔ تیری پیدا ہونے والی اولاد کی تربیت و پرورش خود ذاتِ الٰہی اپنی حکمت و رحمت کے ساتھ فرمائے گی تاکہ عالمِ بشریت کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی جانب لایا جاسکے۔''

جناب عبداللہ بن عبدالمطلب کی حضرت آمنہ کے ساتھ شادی ہی آپ ﷺ کی نبوت کے امور کا نقطۂ آغاز نہ تھا (بلکہ بہت سے دیگر امور بھی تھے) جیسا کہ آپ ﷺ سے پوچھا گیا: ''آپ کی نبوت کا نقطۂ آغاز کیا تھا؟''[1] آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَنَا دَعْوَةُ أَبِي إِبْرَاهِيمَ وَ بُشْرٰى عِيسٰى وَ رَأَتْ أُمِّي أَنَّهُ خَرَجَ مِنْهَا نُورٌ أَضَاءَتْ مِنْهُ قُصُورُ الشَّامِ»

''میں اپنے باپ (جد امجد) ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت ہوں۔ میری والدہ نے دیکھا کہ ان سے ایک نور نکلا جس سے شام کے محلات روشن ہو گئے۔''[2]

مولانا الطاف حسین حالی نے اس حدیث کے مفہوم کو یوں منظوم کیا ہے ؎

ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دعائے خلیل و نویدِ مسیحا

دعائے ابراہیم علیہ السلام

رسول اللہ ﷺ کا دعائے ابراہیم ہونا اس آیت کریمہ سے واضح ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا فرمائی تھی:

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ○﴾

1 وقفات تربوية مع السيرة النبوية لأحمد فريد، ص: 46. 2 مسند أحمد: 262/5، والمستدرك للحاكم: 600/2، و مجمع الزوائد: 221/8.

''اے ہمارے رب! اور ان لوگوں کے لیے انھی میں سے ایک رسول بھیج، وہ ان کے سامنے تیری آیتیں تلاوت کرے اور انھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور انھیں پاک کرے، بے شک تو ہی غالب، خوب حکمت والا ہے۔''[1]

بشارتِ عیسیٰ علیہ السلام

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آپ ﷺ کی آمد کی بشارت دی تھی، جیسا کہ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ط﴾

''اور جب عیسیٰ ابن مریم نے کہا: اے بنی اسرائیل! بے شک میں تمھاری طرف اللہ کا رسول ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں اس (کتاب) تورات کی جو مجھ سے پہلے ہے اور ایک رسول کی بشارت دینے والا ہوں، وہ میرے بعد آئے گا، اس کا نام احمد ہوگا۔''[2]

رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان: ''میری والدہ نے دیکھا کہ ان سے ایک نور نکلا جس سے شام کے محلات روشن ہوگئے۔'' کے بارے میں امام ابن رجب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وضع حمل کے وقت اس نور کا نکلنا اُس نور کی جانب اشارہ تھا جو آپ ﷺ لے کر آئے اور جس سے روئے زمین کے لوگوں نے ہدایت حاصل کی اور اس خطۂ ارضی سے شرک کی تاریکیاں ختم ہوگئیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝﴾ ''یقیناً تمھارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی اور واضح کرنے والی کتاب آ گئی ہے۔''[3]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''آپ ﷺ کے نور کے ظہور کو ملک شام کے ساتھ

---

1 البقرۃ 129:2. 2 الصف 6:61. 3 المآئدۃ 15:5.

خاص کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آپ کا دین بلاد شام میں خوب مضبوط ہوگا۔ صحیح احادیث کے مطابق آخری زمانے میں شام کا علاقہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے ایک مضبوط قلعہ ہوگا۔ اور یہیں دمشق کی مشرقی جانب سفید مینار پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا (آسمان سے) نزول ہوگا۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے:

«لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ أُمَّتِي ظَاهِرِينَ عَلَى الْحَقِّ، لَا يَضُرُّهُمْ مَّنْ خَذَلَهُمْ، وَلَا مَنْ خَالَفَهُمْ حَتّٰى يَأْتِيَ أَمْرُ اللّٰهِ وَ هُمْ كَذٰلِكَ»

''میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا۔ انھیں بے یارومددگار چھوڑنے والے نقصان پہنچا سکیں گے نہ ان کی مخالفت کرنے والے، یہاں تک کہ اللہ کا حکم (قیامت) آجائے۔''[1]

صحیح بخاری ہی میں سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے منقول ہے: «وَ هُمْ بِالشَّامِ» ''اور وہ شام کے علاقے میں ہوں گے۔''[2]

ولادت مصطفیٰ ﷺ

رسول اکرم ﷺ کی ولادت بالاتفاق سوموار کو ہوئی۔ اکثر کا خیال ہے کہ یہ 12 ربیع الاول کی تاریخ تھی۔[3] اور اس بات پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ آپ اسی سال پیدا ہوئے جس سال اصحاب الفیل کا واقعہ پیش آیا اور شعب بنی ہاشم میں واقع ابو طالب کے گھر میں آپ ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی۔[4]

لیبیا کے ایک شاعر و ادیب استاذ محمد بشیر المغیربی نے مخصوص انداز میں ولادت

[1] صحيح مسلم، حديث: 1920. [2] صحيح البخاري، حديث: 3641و7311. [3] السيرة النبوية لابن كثير: 203/1. قاضی سلیمان سلمان منصور پوری رحمہ اللہ نے تقویمی تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ آپ ﷺ کی ولادت باسعادت 9 ربیع الاول کو ہوئی، دیکھیے: (رحمة للعالمين ﷺ: 70,69/1) [4] وقفات تربوية مع السيرة النبوية لأحمد فريد، ص: 47.

رسول ﷺ کا تذکرہ کیا ہے جو بن غازی سے شائع ہونے والے اخبار ''الوطن'' میں 1947ء میں شائع ہوا:

''زمانہ زندگی کی انتہائی کمزور حالت کو پہنچ گیا ہے لیکن (ولادت رسول ﷺ کا) دن ہمیشہ جوان رہے گا۔

وہ صدیوں کے جھرمٹ میں ایک فاتح کی شان سے چل رہا ہے اور برسوں کو سواری بنا کر اس پر سوار ہے۔

زمانے نے اپنے ایام میں اس (یوم ولادت رسول ﷺ) کے لیے ایک تخت شاہی بنایا۔ اس طرح یہ دن زمانے کا دائمی تاج بن گیا۔

اس کی وجہ سے اقوام کے قدم اس طرح اٹھنے لگے جیسے بلوغت کی عمر کو پہنچنے والے بچے کے قدم (مضبوط اور درست) ہوتے ہیں۔

وہ کتنا عظیم دن ہے جو اس وجود مسعود کو لے کر آیا جو تمام جہانوں کے لیے مجسمۂ رحمت ہے، ان کی عزت کا سامان اور ترقی کا ضامن ہے۔

اور آپ ﷺ کی وجہ سے اس کائنات کو وہ حقیقت ملی جس نے زندگی کے راز کو آشکار کر دیا۔ اور آپ ﷺ نے دنیا میں لوگوں کے لیے راستہ روشن کر دیا تاکہ لوگ متقی بن کر آخرت کو جائیں۔

آپ ﷺ کی (ضیاء پاشیوں کی) وجہ سے شاید یہ دنیا سورج سے کہہ دیتی کہ مجھے اب تیری ضرورت نہیں کیونکہ مجھے میری روشنی مل چکی ہے۔''

اسی شاعر نے قاہرہ میں منعقدہ کانفرنس بعنوان ''طرابلس الغرب الثقافی'' میں 1949 میں یہ اشعار کہے:[1]

''اگرچہ میں مدحِ رسول کا حق ادا نہیں کر سکتا، پھر بھی میں دشمنوں کو ذلیل کرنے

[1] مؤلف کہتے ہیں کہ میں نے یہ اشعار خود شاعر کی زبانی سنے تھے۔

کے لیے مدحِ رسول میں نغمہ سرائی کروں گا۔
میں آسمان کو یوں دیکھ رہا ہوں جیسے وہ ایک بہت بڑی کتاب ہو۔اور ستارے فرشتوں کے روپ میں مجھے دکھائی دے رہے ہیں۔
چودھویں کے چاند کی شعائیں یوں معلوم ہوتی ہیں گویا پیغامِ رسالت کا نزول ہو رہا ہو۔
تب مجھے اس کائنات کی خوشی سے لبریز سرگوشی سنائی دیتی ہے۔ جو کہہ رہی ہے:
کہ ایسی ہی ایک روشن اور حسین رات میں رسول کریم ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی۔
اور محمد ﷺ کے نور نے پہاڑوں اور ہموار زمین کو روشن کر دیا۔
سارا زمانہ اس نور سے فیض یاب ہوا، جبکہ اس سے قبل وہ ایک طویل رات میں حیران و سرگرداں تھا۔‘‘

نبی کریم ﷺ کو دودھ پلانے اور پرورش کرنے والی خواتین

ثویبہ: رسول اللہ ﷺ کی حقیقی والدہ حضرت آمنہ کے بعد سب سے پہلے جس عورت نے آپ کو دودھ پلایا وہ آپ ﷺ کے چچا ابولہب کی لونڈی ثُوَیْبہ تھی۔ حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ام المومنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے انھیں بتایا کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: ’’اے اللہ کے رسول! آپ میری بہن سے شادی کر لیجیے۔‘‘ آپ ﷺ نے فرمایا: «أَوَتُحِبِّينَ ذٰلِكِ» ’’کیا تم یہ پسند کرتی ہو؟‘‘ میں نے کہا: ’’جی ہاں، پہلے بھی صرف میں ہی تو آپ کی بیوی نہیں ہوں، اس لیے میں اس بات کو پسند کرتی ہوں کہ اس خیر میں کسی اور کے بجائے میری بہن میرے ساتھ شریک ہو۔‘‘ اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ ذٰلِكِ لَا يَحِلُّ لِي» ’’میرے لیے یہ جائز نہیں۔‘‘

(بیک وقت دو بہنیں ایک مرد کے نکاح میں نہیں آسکتیں) تب میں نے کہا: ''ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ ابوسلمہ کی بیٹی سے نکاح کرنا چاہتے ہیں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: «بِنْتَ أُمِّ سَلَمَةَ؟» ''ام سلمہ کی بیٹی سے؟'' میں نے کہا: ''جی ہاں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَوْ أَنَّهَا لَمْ تَكُنْ رَبِيبَتِي فِي حَجْرِي مَا حَلَّتْ لِي، إِنَّهَا لَابْنَةُ أَخِي مِنَ الرَّضَاعَةِ، أَرْضَعَتْنِي وَ أَبَاسَلَمَةَ ثُوَيْبَةُ، فَلَا تَعْرِضْنَ عَلَيَّ بَنَاتِكُنَّ وَلَا أَخَوَاتِكُنَّ»

''وہ تو میری ربیبہ (پچھ لگ) ہے (میری بیوی ام سلمہ کی اس کے پہلے خاوند ابوسلمہ رضی اللہ عنہ سے بیٹی ہے)۔ اگر وہ میری ربیبہ نہ بھی ہوتی تب بھی وہ میرے نکاح میں نہیں آسکتی تھی۔ کیونکہ وہ میرے رضاعی بھائی کی بیٹی ہے۔ مجھے اور ابوسلمہ ہم دونوں کو ثُوَیبہ نے دودھ پلایا ہے، تم مجھے اپنی بیٹیوں اور بہنوں سے نکاح کی پیشکش نہ کیا کرو۔''[1]

حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا: حضرت ام ایمن نے آپ ﷺ کی پرورش کی۔ آپ ﷺ کو ان کا دودھ پلانا ثابت نہیں ہے۔ آپ نبی کریم ﷺ کے والد گرامی عبداللہ بن عبدالمطلب کی خادمہ تھیں۔ آپ کا نام ام ایمن برکت اور آپ کا تعلق حبشہ سے تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ بڑے ہوئے تو آپ نے ام ایمن رضی اللہ عنہا کو آزاد کردیا، پھر ان کا نکاح حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما سے کرا دیا، (اللہ تعالیٰ نے انھیں اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما جیسا فرزند بھی عطا کیا)۔ ام ایمن رضی اللہ عنہا کا انتقال نبی کریم ﷺ کی وفات کے پانچ ماہ بعد ہوا۔[2]

حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا: ان کا تعلق قبیلہ بنوسعد سے تھا۔ انھوں نے بھی نبی ﷺ کو دودھ پلایا تھا۔ حلیمہ سعدیہ محمد مصطفیٰ ﷺ کی ان برکات کے متعلق ہم سے ایک منفرد واقعہ

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 5101، و صحيح مسلم، حديث: 1449. [2] صحيح مسلم، حديث: 1771.

بیان کرتی ہیں جو برکات انھوں نے اپنی ذات، اولاد، بکریوں اور اپنے گھر میں محسوس کیں۔

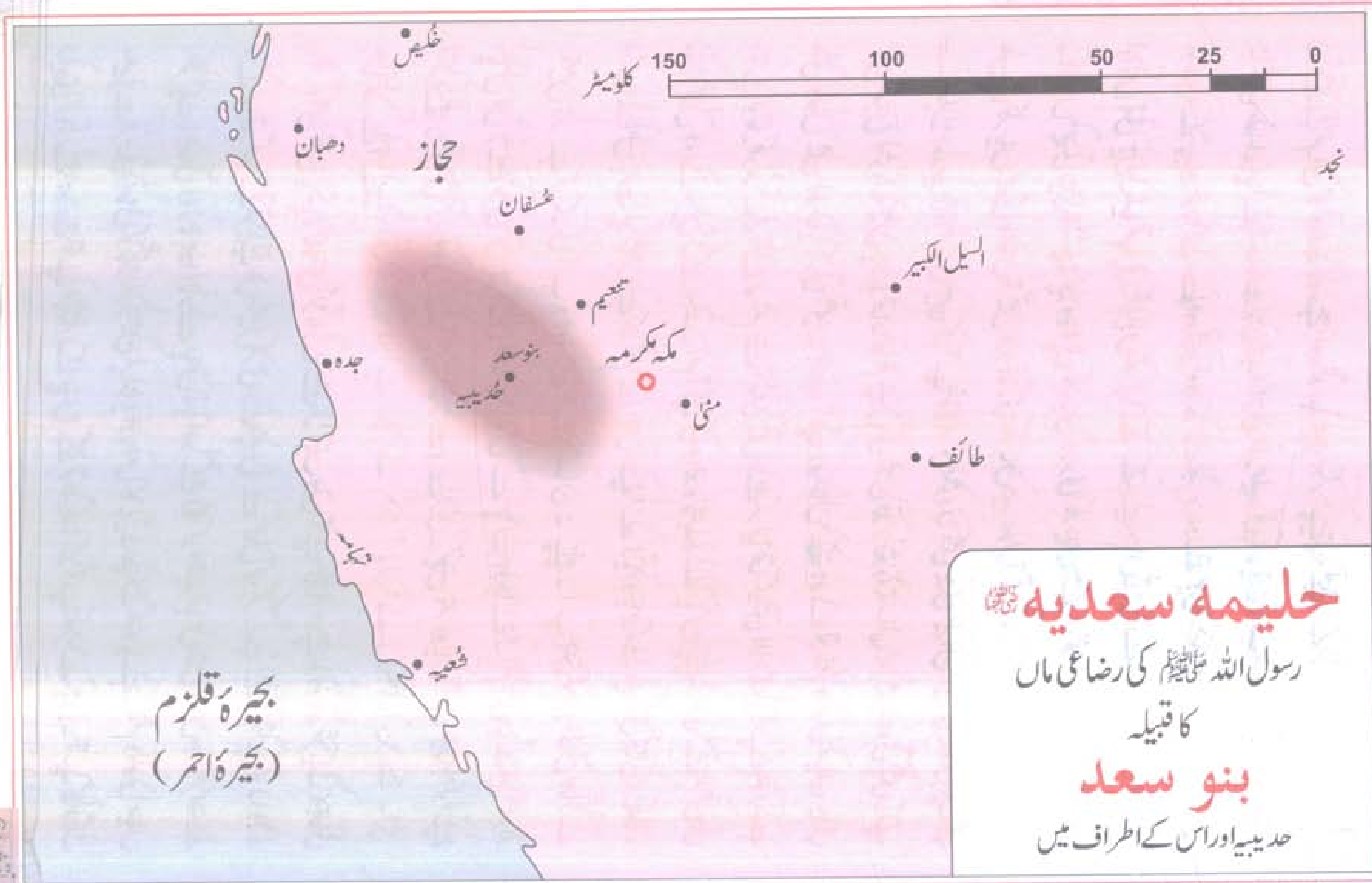
حضرت عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی تو بنو سعد بن بکر کی کچھ عورتیں، جن میں حلیمہ بنت حارث بھی تھیں، مکہ مکرمہ آئیں تاکہ عرب کے رواج کے مطابق شیرخوار بچوں کو رضاعت کے لیے حاصل کریں۔ حلیمہ سعدیہ بیان کرتی ہیں کہ میں سب سے پہلے روانہ ہونے والی عورتوں کے ساتھ اپنی سفید گدھی پر سوار ہوکر چلی۔ میرے ساتھ میرے شوہر حارث بن عبدالعزٰی بھی تھے۔ طویل سفر کی وجہ سے ہماری گدھی کی ٹانگوں پر رسنے والے زخم بن گئے تھے۔ میرے ساتھ ایک عمر رسیدہ اونٹنی بھی تھی جو دودھ کا ایک قطرہ بھی نہیں دیتی تھی۔ زمانہ بھی قحط سالی کا تھا۔ بھوک کی وجہ سے لوگ بہت مشکل میں تھے۔ میرے ساتھ میرا بیٹا بھی تھا جو (بھوک کی وجہ سے) ساری رات نہیں سوتا تھا۔ اسے بہلانے کے لیے بھی میرے پاس کوئی چیز نہ تھی۔ ہماری کچھ بکریاں تھیں اور ہم امید لگائے بیٹھے تھے کہ بارش ہوگی تو ہمیں خوشحالی نصیب ہوگی۔

جب ہم مکہ پہنچے تو ہمارے قافلے کی ہر عورت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لینا چاہا مگر پھر اس لیے نہ لیا کہ وہ یتیم تھے، ان کا باپ زندہ ہوتا تو دودھ پلانے والی کی عزت افزائی کرتا اور اسے انعام و اکرام سے نوازتا۔ بچے کی ماں، چچا اور دادا سے ایسی امیدیں وابستہ نہیں کی جاتی تھیں۔ میرے سوا میرے قافلے کی ہر عورت کو کوئی نہ کوئی بچہ رضاعت کے لیے مل گیا۔ مجھے کوئی بچہ نہ ملا تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کی طرف واپس آئی اور آپ کو لے لیا۔ اللہ کی قسم! میں نے صرف اس وجہ سے آپ کو لیا کہ مجھے کوئی اور بچہ نہیں ملا۔ میں نے اپنے خاوند سے کہا کہ میں بنو عبدالمطلب کے اسی یتیم بچے کو لے لیتی ہوں، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے ہمارے لیے نفع مند بنادے گا۔ اس طرح میں اپنی ہم سفر عورتوں کے ساتھ خالی ہاتھ بھی واپس نہ ہوں گی۔

حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: میرے خاوند نے کہا کہ ٹھیک ہے، چنانچہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو لے لیا اور اس سفر میں جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے میں انھیں لے کر وہاں آ گئی۔ اللہ کی قسم! میں جونہی وہاں پہنچی میری چھاتی دودھ سے لبریز ہوگئی۔ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دودھ پلایا اور آپ کے رضاعی بھائی (اپنے بیٹے) کو بھی۔ دونوں خوب سیر ہوگئے۔ میرے خاوند اونٹنی کی جانب گئے تو دیکھا اس کے تھن بھی دودھ سے بھرے ہوئے ہیں، انھوں نے اس کا دودھ دوہا، مجھے پلایا اور خود بھی پیا۔ ہم دونوں خوب سیر ہوئے۔ میرے خاوند نے کہا: ''حلیمہ! تو نے کچھ محسوس کیا ہے؟ اللہ کی قسم! ہمیں تو بہت ہی بابرکت ہستی مل گئی ہے۔ اللہ نے ہمیں وہ کچھ دے دیا ہے جس کی ہم نے تمنا بھی نہیں کی تھی۔'' حلیمہ فرماتی ہیں کہ ہم نے شکم سیری کی حالت میں بڑی پرسکون رات گزاری۔ اس سے قبل ہم اپنے بھوک سے بلبلاتے بچے کی وجہ سے سو بھی نہیں سکتے تھے۔

صبح ہم اپنی ہم سفر عورتوں کے ساتھ مکہ مکرمہ سے اپنے علاقے کی جانب روانہ ہوئے۔ میں اپنی سفید گدھی پر سوار ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی گود میں لے لیا۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں حلیمہ کی جان ہے! وہ گدھی اس قدر تیز رفتاری سے چلی کہ اس نے سارے قافلے کو پیچھے چھوڑ دیا حتی کہ سب عورتیں کہنے لگیں: ''حلیمہ! اسے روکو، کیا یہ وہی گدھی ہے جس پر تو ہمارے ساتھ آئی تھی؟'' میں نے کہا: ''ہاں، وہی ہے۔'' انھوں نے حیرت سے کہا کہ وہ تو آتے ہوئے خاصی زخمی ہوگئی تھی اب اسے کیا ہوا ہے؟ میں نے جواب دیا: ''میں جس بچے کو لے کر اس پر سوار ہوئی ہوں، وہ بچہ بڑا بابرکت ہے۔''

حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہمارا سفر جاری رہا، اللہ تعالیٰ ہمیں مزید بھلائیاں عطا کرتا رہا۔ بالآخر ہم اپنے علاقے میں پہنچ گئے۔ یہاں اُسی طرح قحط سالی تھی۔ چرواہے صبح جاتے اور شام کو واپس آتے۔ ہمارے قبیلے بنو سعد کی بکریاں بھی بھوکی پیاسی واپس آتیں مگر میری بکریاں جب واپس آتیں تو ان کے پیٹ بھرے ہوتے۔ اور تھن دودھ سے لبریز


حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی ماں
کا قبیلہ
بنو سعد
حدیبیہ اور اس کے اطراف میں
کلومیٹر
150
100
50
25
0
خلیص
وھبان
حجاز
عسفان
نجد
السیل الکبیر
تنعیم
مکہ مکرمہ
بنوسعد
حُدیبیہ
جدہ
منیٰ
طائف
شُعیبہ
بحیرۂ قلزم
(بحیرۂ احمر)

نقشہ: 6

ہوتے۔ ہم ان کا دودھ دوہتے اور خوب سیر ہو کر پیتے۔ قبیلے کے لوگ تعجب سے کہتے: ''بھئی معاملہ کیا ہے؟ حارث بن عبد العزیٰ اور حلیمہ کی بکریاں جب شام کو واپس آتی ہیں تو ان کے پیٹ خوراک سے اور تھن دودھ سے لبریز ہوتے ہیں، جبکہ تمھاری بکریاں بھوکی واپس آتی ہیں۔ کیا تم اپنی بکریوں کو چرانے کے لیے وہاں نہیں لے جاسکتے جہاں ان کی بکریاں چرتی ہیں؟'' چنانچہ وہ اپنی بکریاں ہماری بکریوں کے ساتھ لے جاتے، پھر بھی ان کی بکریاں بھوکی واپس آتیں اور ہماری بکریاں سیر ہو کر آتیں۔

حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ کی نشوونما بھی بڑی حیران کن تھی۔ کوئی بچہ بھی اس طرح نشوونما نہیں پا رہا تھا۔ عام بچوں کی جس قدر نشوونما سال بھر میں ہوتی تھی آپ کی دنوں میں ہو جایا کرتی تھی۔ جب آپ دو سال کے ہوئے تو ہم دونوں میاں بیوی آپ کو مکہ مکرمہ لے آئے۔ ہم نے آپس میں طے کر لیا تھا کہ حتی الامکان آپ کو خود سے جدا نہیں ہونے دیں گے۔ جب ہم آپ کی والدہ ماجدہ کے پاس پہنچے تو ان سے عرض کی کہ اللہ اس بات پر شاہد ہے کہ ہم نے اس بچے سے زیادہ بابرکت بچہ کبھی نہیں دیکھا۔ ہمیں ڈر ہے کہ مکہ کی آب و ہوا سے اسے نقصان نہ پہنچے۔ آپ اس کو فی الحال ہمارے پاس ہی رہنے دیں حتی کہ مکہ کی فضا بیماریوں سے پاک ہو جائے۔ ہم اس بات پر اصرار کرتے رہے حتی کہ انھوں نے ہمیں اجازت دے دی۔ یوں ہم دوبارہ آپ ﷺ کو اپنے ساتھ لے آئے۔

ابھی تین یا چار ماہ ہی گزرے تھے کہ ایک دن آپ ﷺ اپنے (دودھ شریک) بھائی کے ساتھ گھر کے قریب ہی بھیڑ بکری کے بچوں سے کھیل کود کر رہے تھے کہ آپ کا (دودھ شریک) بھائی دوڑتا ہوا ہمارے پاس آیا اور کہنے لگا کہ سفید لباس میں ملبوس دو افراد نے میرے قریشی بھائی کو پکڑ کر زمین پر لٹایا اور اس کا پیٹ چاک کر دیا ہے۔ ہم دونوں میاں بیوی دوڑتے ہوئے آپ ﷺ کے پاس گئے تو دیکھا کہ آپ کھڑے ہیں۔ آپ کا رنگ

فق ہے۔ آپ ہمیں دیکھ کر سسکیاں بھر کر رونے لگے۔ ہم نے لپٹ کر انھیں اپنی آغوش میں لیا اور کہا کہ ہمارے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، کیا بات ہے؟ آپ نے بتایا کہ میرے پاس دو آدمی آئے، انھوں نے مجھے لٹا کر میرا پیٹ چاک کیا اور پیٹ میں کچھ رکھ کر دوبارہ اسے پہلے کی طرح کر دیا۔ یہ سُن کر اس کے رضاعی باپ نے کہا: ''اللہ کی قسم! مجھے لگتا ہے کہ میرا بیٹا کسی مصیبت کا شکار ہوگیا ہے۔ اسے جلدی سے اس کے گھر والوں تک پہنچا دو۔'' اس سے قبل کہ ہمارے خدشات حقیقت بن کر اسے اپنی لپیٹ میں لے لیں، اسے اس کے گھر والوں کے سپرد کر دو۔ چنانچہ ہم آپ کو لے کر آپ کی والدہ کے پاس چلے آئے۔ انھوں نے ہمیں دیکھ کر بڑے تعجب کا اظہار کیا اور پوچھا: ''کیا بات ہے؟ ہمارے کہنے کے بغیر ہی اس بچے کو واپس لے آئے ہو، حالانکہ تم انھیں اپنے پاس رکھنے کے شدید خواہش مند تھے۔'' ہم نے کہا: ''کوئی بات نہیں، اللہ کی توفیق سے مدت رضاعت مکمل ہوگئی ہے۔ ہمیں اپنی چاہت کے مطابق مسرتیں اور خوشیاں بھی حاصل ہوگئی ہیں، چنانچہ ہم نے اس بات کو ترجیح دی کہ آپ کی خواہش کے مطابق اس بچے کو آپ کی آغوش میں دے دیں۔''

اس پر آپ ﷺ کی والدہ نے کہا: ''معلوم ہوتا ہے کہ تمھارے ساتھ کوئی خاص سانحہ رونما ہوا ہے۔ بتاؤ کیا بات ہے؟'' انھوں نے بہت اصرار کیا تو ہمیں تمام واقعہ بیان کرنا پڑا۔ جسے سن کر انھوں نے فرمایا: ''جو تم نے سمجھا ہے ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ اللہ کی قسم! اللہ اسے کبھی ضائع نہیں ہونے دے گا۔ میرے اس بیٹے کی تو بہت بلند شان ہوگی۔'' پھر انھوں نے کہا: ''کیا میں تمھیں اس کے بارے میں اہم بات نہ بتاؤں؟ اس بچے کا حمل بہت خفیف اور نہایت آسان تھا۔ حالتِ حمل میں مَیں نے خواب دیکھا کہ میرے اندر سے ایک نور نکلا جس سے بصریٰ (شام) کے اونٹوں کی گردنیں روشن ہوگئیں۔ یا یہ بات فرمائی کہ بصریٰ کے محلات روشن ہوگئے، پھر جب اس بچے کی ولادت ہوئی تو اس کی

ولادت عام بچوں جیسی نہ تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ زمین پر رکھ کر اپنا سر آسمان کی جانب اٹھا لیا تھا۔ بہر حال اب تم اسے لے آئے ہو تو اسے چھوڑ جاؤ۔'' یہ کہہ کر انھوں نے اس بچے کو ہم سے لے لیا اور ہم واپس چلے آئے۔[1]

حکمتیں اور فوائد

حضرت حلیمہ سعدیہ کے لیے نبی کریم ﷺ کی برکات: یہ برکات حلیمہ سعدیہ کی ہر چیز میں ظاہر ہوئیں۔ ان کی چھاتی کا دودھ سے بھر جانا اور دودھ کا زیادہ ہو جانا آپ ﷺ کی برکت کا ایک مظہر تھا۔ یہ دودھ تو حلیمہ سعدیہ کے اپنے بیٹے کے لیے کافی نہیں تھا مگر اب دونوں بچوں کے لیے وافر مقدار میں تھا۔ یہ بھی آپ ﷺ کی برکت تھی کہ حلیمہ سعدیہ کے بیٹے کو اطمینان وسکون حاصل ہوا۔ وہ قبل ازیں روتا رہتا تھا۔ اپنی ماں کی بے چینی کا سبب بنتا تھا۔ انھیں بے آرام کرتا تھا، سونے نہیں دیتا تھا۔ اب اسے شکم سیر ہو کر سکون ملا تو اس کی ماں کو راحت وسکون والی نیند نصیب ہوئی۔ آپ ﷺ کی برکت ان کی کمزور و لاغر بکریوں میں بھی ظاہر ہوئی جو پہلے دودھ کا ایک قطرہ بھی نہیں دیتی تھیں اب اتنا دودھ دے رہی ہیں جتنا کبھی دیکھا تھا نہ سنا تھا۔

یہ برکات اس بات کا ثبوت ہیں کہ حلیمہ سعدیہ کے خاندان کو یہ شرف حاصل ہوا کہ انھوں نے آپ کو دودھ پلایا اور اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انھیں عزت عطا فرمائی۔[2] اس میں حکمت یہ تھی کہ حلیمہ سعدیہ کے خاندان کے دل میں اس بچے کی محبت پیدا ہو، وہ آپ

---

1 مسند أبي يعلى، حديث: 7163، و صحيح ابن حبان، حديث: 6335، و المعجم الكبير للطبراني: 24/212-215، ومجمع الزوائد للهيثمي: 8/220،221، ودلائل النبوة للبيهقي: 1/133-136. والسيرة النبوية لابن هشام بشرح الخشني: 1/214. ابن اسحاق نے اس روایت میں سماع کی صراحت کی ہے۔ امام ذہبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث جید الاسناد ہے۔ اس کے شواہد بھی موجود ہیں جو اسے تقویت پہنچاتے ہیں، لہٰذا یہ حدیث شواہد کی وجہ سے حسن درجے کی ہے، دیکھیے: (السيرة النبوية للذهبي، ص: 8) 2 فقه السيرة للبوطي، ص: 44.

کے ساتھ شفقت سے پیش آئیں، آپ کے معاملے میں اپنی ذمہ داری عمدگی سے ادا کریں اور اچھے انداز سے آپ کی دیکھ بھال اور پرورش کریں اور پھر ایسا ہی ہوا۔ ان لوگوں نے اپنی اولاد سے بڑھ کر آپ کو چاہا اور آپ کے ساتھ شفقت بھرا سلوک کیا۔[1]

اللہ کا فیصلہ بابرکت اور افضل ہوتا ہے: بندے کے لیے اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہی بہتر اور زیادہ باعث برکت ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ تھا کہ یہ یتیم بچہ حلیمہ سعدیہ کو ملے، جبکہ حلیمہ سعدیہ نے کوئی اور بچہ نہ ملنے پر بحالتِ مجبوری آپ ﷺ کو لیا۔ ہر قسم کی خیر اور بھلائی اللہ کے فیصلے میں تھی، چنانچہ آپ ﷺ کو لیتے ہی اس کے نتائج ظاہر ہونا شروع ہو گئے۔ اس میں ہر مسلمان کے لیے درس ہے کہ اللہ کی تقدیر اور اس کے فیصلے پر اس کا دل مطمئن اور راضی رہنا چاہیے۔ اللہ نے جو اس کے مقدر میں نہیں کیا اور جو اس کو نہیں ملا اس پر پشیمان نہیں ہونا چاہیے۔

دیہی ماحول کے اثرات: دیہی ماحول کے جسمانی صحت، طہارتِ قلب اور عقل و ذہانت پر اثر انداز ہونے کے بارے میں الشیخ محمد الغزالی فرماتے ہیں کہ بچوں کی نشو و نما کے لیے دیہاتی ماحول میں بے شمار فوائد ہوتے ہیں، مثلاً: وہ فطرت کی آغوش میں پروان چڑھیں اور وہاں کی کھلی آب و ہوا اور آزاد اور وسیع فضا سے مستفید ہوں۔ اس سے بچوں کی فطری صلاحیتیں بڑھتی ہیں، اعضاء مضبوط ہوتے ہیں، احساسات جنم لیتے ہیں اور افکار و نظریات میں حریت پیدا ہوتی ہے۔

یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہمارے بچے کئی کئی منزلہ عمارتوں اور تنگ فلیٹوں میں زندگی گزار رہے ہیں۔ ایسے لگتا ہے جیسے کسی ڈربے میں بند کر کے انھیں تازہ ہوا میں سانس لینے کے حق سے محروم کر دیا گیا ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جدید سہولتوں سے آراستہ شہری زندگی میں اعصابی تناؤ جیسی بیماریوں کا اصل سبب فطرت سے دوری اور خلافِ فطرت تصنع اور

1 السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 105.

بناوٹ کی طرف حد سے زیادہ میلان ہے۔

اہل مکہ کی یہ خواہش قابل قدر تھی کہ ان کے بچے دیہی ماحول میں پرورش پائیں اور وہاں کی آزاد فضا میں ان کی تربیت کے مراحل طے ہوں۔ اکثر ماہرینِ علم التعلیم اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ فطرت ہی بچے کی پہلی درس گاہ ہونی چاہیے تاکہ اس کے عقل وشعور اور اس کائنات کی حقیقتوں میں یکسانیت پیدا ہو لیکن لگتا ہے کہ اس خواب کی تعبیر بہت مشکل ہے۔[1]

رسول اللہ ﷺ نے بنوسعد کے ماحول میں رہ کر فصیح عربی زبان سیکھی، پھر سب سے بڑھ کر فصیح اللسان بن گئے۔ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے کہا کہ میں نے آپ سے زیادہ کسی کو فصیح اللسان نہیں پایا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«وَمَا يَمْنَعُنِي وَ أَنَا مِنْ قُرَيْشٍ، وَّ أُرْضِعْتُ فِي بَنِي سَعْدٍ»

”یہ کون سی ایسی بات ہے میرا تعلق قریش سے ہے اور میری رضاعت بنوسعد میں ہوئی ہے۔“[2]

شق صدر

بنوسعد کے علاقے میں شقِ صدر کا جو واقعہ پیش آیا وہ علامات نبوت میں سے ایک علامت اور بار نبوت کے لیے آپ کے انتخاب کی ایک روشن دلیل تھا۔

امام مسلم رحمہ اللہ نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ حضرت جبریل علیہ السلام آپ کے پاس آئے۔ آپ کو پکڑ کر زمین پر لٹا دیا، پھر آپ کا سینہ مبارک چاک کرتے ہوئے دل باہر نکالا اور اس میں سے خون کا ایک لوتھڑا نکال کر فرمایا: ”تیرے جسم کا یہ حصہ شیطان کا تھا۔“ پھر سونے کے طشت

1 فقه السيرة للغزالي، ص:61,60. 2 الرّوض الأنف للسهيلي:188/1.

میں زمزم کے پانی کے ساتھ دل کو صاف کیا اور دوبارہ سینے میں رکھ کر اسے سی دیا۔ بچے دوڑتے ہوئے آپ ﷺ کی رضاعی ماں حلیمہ سعدیہ کے پاس گئے اور کہا کہ محمد ﷺ کو قتل کر دیا گیا ہے۔ وہ سب آپ کے پاس آئے اور دیکھا کہ آپ کا رنگ بدلا ہوا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے خود آپ ﷺ کے سینہ مبارک پر سلائی کے نشانات دیکھے ہیں۔[1]

دروس و حکمتیں: نبی ﷺ کے جسم مبارک سے شیطانی لوتھڑے کو الگ کر دینا یقیناً آپ کی نبوت کے ابتدائی دلائل میں سے ایک دلیل اور آپ کو ہر قسم کے شر اور غیر اللہ کی بندگی سے محفوظ رکھنے کی تیاری تھی تاکہ آپ ﷺ کے دل میں توحید خالص کے سوا کوئی اور چیز سرایت نہ کر سکے۔ آپ ﷺ کا بچپن اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ آپ کبھی گناہ کے قریب بھی نہیں گئے اور نہ کسی بت کو کبھی سجدہ کیا، حالانکہ شرک قریش میں بکثرت موجود تھا۔[2]

مُستشرق نِکلسن واقعہ شقِ صدر پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ ایک کہانی ہے جو اس قرآنی آیت ﴿ اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ﴾ کی تفسیر میں وضع کی گئی ہے اور اگر یہ واقعہ درست بھی ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ (معاذ اللہ) آپ کو مرگی جیسا کوئی مرض لاحق تھا۔ اس مستشرق نے یہ کوئی نئی بات نہیں کی۔ اس سے قبل مشرکین مکہ نے بھی (معاذ اللہ) آپ ﷺ پر جنون یا پاگل پن کا الزام لگایا تھا، جبکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے بارے میں ایسے تمام الزامات کی قرآن مجید میں یوں نفی کر دی:

﴿وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُونٍ ۝﴾

”اور (اے اہل مکہ!) تمھارا ساتھی (محمد) دیوانہ نہیں۔“[3]

---

1 صحيح مسلم، حديث: 162، و مسند أحمد: 149/3، ودلائل النبوة للبيهقي: 5/2. 2 السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 104/1. 3 التكوير 81: 22.

دکتور رمضان بوطی واقعۂ شق صدر کی حکمت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''معلوم ہوتا ہے کہ حکمت الٰہی یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ کا معاملہ واضح کر دیا جائے اور جسمانی طور پر بھی بچپن ہی سے آپ کو وحی کے لیے تیار کیا جائے اور ہر قسم کے شر سے محفوظ رہنے کا سامان کر دیا جائے تاکہ یہ چیز لوگوں کو آپ پر ایمان لانے اور آپ کی رسالت کی تصدیق پر آمادہ کر سکے۔ گویا یہ آپ ﷺ کی روحانی پاکیزگی کا آپریشن تھا مگر اسے مادی اور جسمانی شکل دے دی گئی تاکہ لوگ اس آسمانی اعلان کو سن لیں اور اس کا مشاہدہ بھی کر لیں۔''[1]

نبی ﷺ کے جسم مبارک سے اس لوتھڑے کو اس لیے نکالا گیا تاکہ بچپن کی لاابالی، غفلت اور بے فائدہ امور کی جانب میلانات سے آپ کو پاک کر دیا جائے اور اس کی جگہ آپ کو سنجیدگی، دور اندیشی اور توازن پسندی جیسے اوصاف حمیدہ سے متصف کر دیا جائے۔ اس سے ہمیں یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایت اور حفاظت حاصل تھی اور شیطان کے بس میں نہ تھا کہ آپ پر کسی بھی طرح اثر انداز ہو سکے۔[2]

والدہ محترمہ کا انتقال

نبی ﷺ کی والدہ محترمہ آپ کو آپ کے ننھیال سے ملوانے کے لیے، جن کا تعلق قبیلۂ بنونجار سے تھا، مدینہ لے گئی تھیں۔ واپسی پر راستے میں ابواء کے مقام پر آپ ﷺ کی والدہ کا انتقال ہو گیا اور انھیں وہیں دفن کر دیا گیا۔[3] اس وقت آپ ﷺ کی عمر چھ سال تھی۔

---

1 فقه السيرة للبوطي، ص: 47. 2 السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 107,106. صحیح مسلم میں اس کی وضاحت یوں ہے: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے ہر ایک کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ایک جن (شیطان) مقرر کیا ہے۔'' صحابہ کرام نے کہا: ''کیا آپ کے ساتھ بھی شیطان ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''جی ہاں، میرے ساتھ بھی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے خلاف میری مدد فرمائی ہے اور وہ مسلمان ہو گیا ہے۔ اب وہ مجھے صرف نیکی ہی کا کہتا ہے۔'' (صحیح مسلم، حدیث: 2814) 3 السيرة النبوية لابن هشام: 168/1.

دادا جان کی آغوش محبت میں

والدہ محترمہ کے انتقال کے بعد آپ کے دادا جناب عبدالمطلب نے آپ کو اپنی کفالت میں لے لیا۔ وہ اپنے بیٹوں، یعنی نبی ﷺ کے چچاؤں سے بڑھ کر آپ سے پیار کرتے تھے۔ چونکہ وہ بارعب شخصیت کے مالک تھے، اس لیے ان کا کوئی بیٹا اُن کے بستر پر بیٹھنے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ لیکن آپ ﷺ اپنے دادا جان کے بستر پر بیٹھ جاتے، آپ کے چچا آپ کو اپنے والد کے بستر سے دور رکھنے کی کوشش کرتے، جبکہ دادا آپ کو منع نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے بستر پر بیٹھا دیکھ کر خوش ہوتے تھے کیونکہ انھوں نے آپ کے رخ انور میں یہ بات محسوس کر لی تھی کہ یہ بچہ بڑی خوبیوں کا مالک ہوگا اور اس کی شان بہت بلند ہوگی۔ [1]

رسول اللہ ﷺ کے دادا جان کو آپ سے شدید محبت تھی۔ وہ آپ کو جس کام کے لیے بھی بھیجتے، آپ اسے پورا کر دیتے۔ ایک دن عبدالمطلب نے آپ ﷺ کو اونٹوں کے پیچھے بھیجا۔ واپس آتے ہوئے آپ کو کچھ تاخیر ہوگئی تو عبدالمطلب بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے شعر کی شکل میں اللہ سے دعا کرنے لگے:

رَبِّ رُدَّ رَاكِبِي مُحَمَّدًا رُدَّهُ لِي وَاصْنَعْ عِنْدِي يَدًا

"اے میرے پروردگار! میرے سوار محمد (ﷺ) کو لوٹا دے، اسے واپس کر کے مجھ پر احسان فرما۔"

جب نبی کریم ﷺ اونٹ لے کر واپس آئے تو عبدالمطلب ان سے کہنے لگے: "اے بیٹے! میں تو ایک ماں کی طرح پریشان ہوگیا تھا۔ مجھے ہمیشہ تیرا خدشہ لاحق رہتا ہے۔" [2]

نبی کریم ﷺ ابھی اپنی عمر کے آٹھویں سال میں تھے کہ آپ کے دادا عبدالمطلب اللہ

---

1 السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 101. 2 المعجم الكبير للطبراني: 314/5، حديث: 391، والمستدرك للحاكم:604,603/2، محقق سیرت نگار ابراہیم العلی نے اس واقعہ کو صحیح کہا ہے، دیکھیے: (صحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص:56)

کو پیارے ہو گئے۔[1]

چچا جان کی کفالت میں

آپ ﷺ کے دادا جان وصیت کرتے ہوئے آپ ﷺ کو آپ کے چچا ابوطالب کے سپرد کر گئے۔ چچا نے کمال مہربانی سے آپ کی حفاظت کرتے ہوئے کفالت کی۔[2]

حکمت الٰہی کا تقاضا تھا کہ رسول اللہ ﷺ یتیمی کی حالت میں پرورش پائیں، صرف اللہ کی حفاظت آپ کے شاملِ حال رہے، آپ لاڈ پیار اور دولت سے دور رہیں تاکہ آپ نازو نعمت کے عادی نہ ہو جائیں، آپ کے دل میں مال و منصب کی محبت جگہ پکڑے نہ آپ سرداری اور چودھراہٹ والے ماحول سے متاثر ہوں، وگرنہ لوگوں کے لیے نبوت کے تقدس اور دنیاوی جاہ و جلال میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا اور انھیں یہ کہنے کا موقع ملتا کہ آپ نے مستقبل میں نبوت کا دعویٰ کرنے کے لیے ہی یہ ڈھونگ رچایا ہے۔[3]

نبی کریم ﷺ کو بچپن ہی سے صدمات کا سامنا کرنا پڑا۔ باپ کی شفقت سے محروم تو تھے ہی، ماں کی آغوشِ محبت بھی چھن گئی، پھر دادا کی شفقت سے بھی محروم ہونا پڑا۔ یکے بعد دیگرے غم کے جام نوش کرنے پڑے جس کے نتیجے میں آپ نہایت حساس اور نرم دل ہو گئے۔ غم اشخاص کو سنگدلی، تکبر اور غرور سے پاک کرتے ہوئے کندن بنا دیتا ہے اور ان میں رحم دلی اور تواضع پیدا کرتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے والدین کی عالمِ جوانی میں وفات شاید اس حکمت کی حامل ہو کہ آپ ﷺ ان لوگوں کے لیے نمونہ بن جائیں جن کے والدین یا ان میں سے کوئی ایک بچپن ہی میں انھیں داغ مفارقت دے گیا ہو۔

اور یہ بھی منشائے الٰہی تھا کہ والدین کی محبت وشفقت اور تعلیم و تربیت سے محرومی کے

1 السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 101. 2 مدخل لفهم السيرة للدكتور يحيٰى اليحيٰى، ص: 119.
3 فقه السيرة للبوطي، ص: 46.

باوجود آپ کا اعلیٰ اخلاق اور بلند کردار کا مالک ہونا اس بات کا ثبوت بن جائے کہ آپ کی تعلیم و تربیت کا کام خود رب العالمین نے کیا ہے۔

والدین سے دور کرنے میں یہ بھی مشیت الٰہی تھی کہ نبی ﷺ مضبوط ارادے کے مالک اور اولوالعزم بن جائیں، اپنے معاملات میں کسی کے محتاج نہ بنیں، یہاں تک کہ آپ کی دعوت میں بھی والدین کا کوئی اثر نظر نہ آئے۔[1] اور آپ کی تعلیم و تربیت میں کسی انسانی ہاتھ کا دخل نہ ہو بلکہ خالصتاً یہ تربیت رب ذوالجلال کی جانب سے ہو۔ جاہلی نظریات اور رسوم و رواج کا آپ کی شخصیت پر کوئی اثر نہ ہو، آپ کی ہر سوچ اور فکر اس ذات کی عطا کردہ ہو جو حکیم و خبیر ہے۔ اسی نے آپ کے تمام ظاہری سہارے چھین کر خود آپ کو سہارا دیا۔ آپ کی مادی ضروریات کے لیے اسی نے دادا اور چچا کے دل میں آپ کی محبت پیدا کی، جبکہ آپ کی ذہنی، فکری اور اخلاقی تربیت مکمل طور پر ربانی تربیت تھی۔[2]

گلہ بانی

ابو طالب مالی طور پر اتنے خوشحال نہ تھے، اس لیے ان کے ساتھ تعاون کے طور پر نبی ﷺ کو بکریاں چرانے کا کام کرنا پڑا۔ آپ نے خود اپنے اور پہلے گزرے ہوئے انبیاء کے بارے میں فرمایا ہے کہ ان سب نے بکریاں چرانے کا کام کیا ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے اپنے لڑکپن میں معاوضے پر اہل مکہ کی بکریاں چرائیں۔ ایک صحیح حدیث ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: «مَا بَعَثَ اللّٰهُ نَبِيًّا إِلَّا رَعَى الْغَنَمَ»

''اللہ تعالیٰ نے جتنے بھی انبیاء مبعوث فرمائے سب نے بکریاں چرائی ہیں۔''

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے دریافت کیا: ''کیا آپ نے بھی؟'' آپ ﷺ نے فرمایا:

«نَعَمْ، كُنْتُ أَرْعَاهَا عَلٰى قَرَارِيطَ لِأَهْلِ مَكَّةَ»

1 رسالة الأنبياء لعمر أحمد عمر: 20/3. 2 فقه السيرة النبوية للدكتور الغضبان، ص: 85,84.

"ہاں، میں قراریط (رائج الوقت سکوں) کے عوض اہل مکہ کی بکریاں چراتا تھا۔"[1]

گلہ بانی کی وجہ سے آپ کو درج ذیل فوائد حاصل ہوئے:

آپ ﷺ کو جس متانت اور سنجیدگی کی ضرورت تھی، اسے سیکھنے کا موقع میسر ہوا۔

صحرائی حسن و جمال سے بہرہ ور ہونے کے مواقع حاصل ہوئے۔ تخلیق کائنات میں خالق کی شان وشوکت کے مظاہر پر غور کرنے کے لمحات حاصل ہوئے۔ رات کی خاموشی، چاند کی روشنی اور بادنسیم کے جھونکوں میں اپنے محبوب پروردگار سے سرگوشیوں کے لیے قیمتی ساعات میسر آئیں۔ اپنا تزکیہ کرتے ہوئے صبر، بردباری، تحمل، متانت اور شفقت و رحمت جیسے اوصاف حمیدہ اختیار کرنے کے مواقع حاصل ہوئے۔[2]

آپ ﷺ کے بکریاں چرانے کے اس عمل میں مسلمانوں کے لیے درس ہے کہ وہ حیوانات کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ آپ ﷺ کا گلہ بانی کرنا دراصل ایک مشق تھی کہ مستقبل میں آپ نے اقوام کی دیکھ بھال اور ان کے سیاسی امور کو کیسے انجام دینا ہے۔

گلہ بانی کے تربیتی اثرات

① صبر: بکریاں چرانے والے چرواہے کے لیے ضروری ہے کہ وہ طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک صبر و تحمل کا مظاہرہ کرے تاکہ بکریاں اپنا پیٹ بھر سکیں کیونکہ ان کی یہ عادت ہے کہ وہ آہستہ آہستہ گھاس پھوس چرتی ہیں۔ اگر چرواہا صبر و تحمل کا مظاہرہ نہیں کرے گا تو بکریاں بھوکی رہیں گی۔ اسی طرح انسانیت کی تربیت کرنے والے مربی حضرات کے لیے ضروری ہے کہ ان میں بھی صبر و تحمل کے اوصاف موجود ہوں۔[3]

ایک چرواہا بلند و بالا محلات میں نہیں رہتا اور نہ ہی اس کی زندگی ناز ونعم میں گزرتی ہے بلکہ وہ تو گرم آب وہوا میں زندگی بسر کرتا ہے، بالخصوص جزیرہ نمائے عرب کے صحرا

1 صحيح البخاري، حديث:2262. 2 محمد رسول الله ﷺ لصادق عرجون:177/1. 3 مدخل لفهم السيرة للدكتور يحيىٰ اليحيىٰ، ص:124.

میں تو انتہائی شدت کی گرمی پڑتی ہے۔ اسے اپنی پیاس بجھانے کے لیے وافر پانی کی ضرورت ہوتی ہے، جبکہ اسے خشک روٹی اور تنگی و سختی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اس طرح وہ اپنے نفس کو ایسی مشکلات برداشت کرنے پر آمادہ کرتا ہے اور اسی روکھی سوکھی زندگی پر صابر و قانع ہو جاتا ہے۔[1]

② تواضع: تواضع چرواہے کی فطرت بن جاتی ہے کہ وہ بکریوں کی خدمت کرے، نسل بڑھانے کا اہتمام کرے، ان کی حفاظت کا بندوبست کرے۔ اگر سونا ہو تو ان کے قریب سوئے۔ اگر ان کے بول و براز سے کوئی چیز اس کے جسم پر لگ جائے تو بھی تنگدل نہیں ہوتا۔ زندگی کے یہ رنگ ڈھنگ اس کے نفس کو غرور و تکبر سے پاک کر دیتے ہیں اور اس میں تواضع اور انکساری پیدا کرتے ہیں۔[2]

صحیح مسلم کی ایک حدیث ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِّنْ كِبْرٍ»

''جس شخص کے دل میں ذرہ بھر بھی تکبر ہوگا، وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔''

ایک صحابی نے عرض کیا: ''ہر شخص یہ پسند کرتا ہے کہ اس کا لباس خوبصورت ہو، اس کے جوتے اچھے ہوں۔ (کیا یہ بھی تکبر ہے؟)'' آپ نے فرمایا:

«إِنَّ اللّٰهَ جَمِيلٌ يُّحِبُّ الْجَمَالَ، الْكِبْرُ: بَطَرُ الْحَقِّ وَ غَمْطُ النَّاسِ»

''بے شک اللہ تعالیٰ صاحب جمال ہے اور خوبصورتی کو پسند فرماتا ہے۔ تکبر تو یہ ہے کہ حق بات قبول نہ کی جائے اور لوگوں کو حقیر سمجھا جائے۔''[3]

③ بہادری و شجاعت: گلہ بانی کے دوران ایسے لمحات بھی آتے ہیں کہ چرواہے کو جنگلی درندوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ اس میں شجاعت و بہادری بدرجۂ اتم

1 السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 115,114. 2 السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 114. 3 صحيح مسلم، حديث:91.

موجود ہوتا کہ وقت آنے پر وہ جنگلی جانوروں کا مقابلہ کر کے اپنی بکریوں کی حفاظت کر سکے۔[1]

④ **رحمت وشفقت:** اگر بکری بیمار ہو جائے، اسے چوٹ لگ جائے یا اس کی ہڈی وغیرہ ٹوٹ جائے تو اس کی یہ کیفیت اس بات کی متقاضی ہوتی ہے کہ اس کا علاج کیا جائے اور اس کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کیا جائے۔ ایک چرواہا ان تمام ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتا ہے۔ اس طرح اس کے دل میں رحمت و شفقت خوب پروان چڑھتی ہے۔ جو شخص حیوانات کے ساتھ مہربان ہو وہ انسانوں کے لیے تو بہت زیادہ مہربان ہوگا، خاص طور پر وہ ہستی جسے اللہ تعالیٰ نے اس مقصد کے لیے اپنا رسول بنا کر بھیجا ہو کہ وہ لوگوں کی تعلیم کا اہتمام کرے، ان کی رہنمائی فرمائے اور انھیں جہنم سے بچا کر دنیا اور آخرت میں سرخرو کرنے کے لیے کوشاں ہو جائے۔[2]

⑤ **محنت سے روزی کمانے کا جذبہ:** اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو حضرت محمد ﷺ کو بکریاں چرانے کی ضرورت پیش نہ آتی لیکن یہ آپ ﷺ کی تربیت کا ایک مرحلہ تھا اور آپ کی امت کے لیے درس تھا کہ اپنی روزی محنت کے ساتھ اور اپنے ہاتھوں سے کما کر حاصل کرو۔ بکریاں چرانا بھی ہاتھ کی کمائی کی ایک قسم ہے۔

ایک داعی کے لیے ضروری ہے کہ اس کی نظریں دوسروں کے اموال پر نہ ہوں اور نہ اس کی معاش کا انحصار غیروں پر ہو۔ وہ مالی طور پر ہر شخص سے مستغنی ہو۔ اسی صورت میں اس کی قدر و قیمت میں اضافہ اور اس کا مقام و مرتبہ بلند ہوگا، شکوک وشبہات سے محفوظ رہے گا اور اس کی جدوجہد میں اخلاص پیدا ہوگا۔ اس طرح ان دشمنان اسلام کے پیدا کردہ شبہات بھی باطل قرار پائیں گے جو لوگوں کو یہ تصور دیتے ہیں کہ (نعوذ باللہ)

1 السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 115,114. 2 مدخل لفهم السيرة للدكتور يحيىٰ اليحيىٰ، ص: 127.

انبیائے کرام علیہم السلام نے اپنی دعوت کے ذریعے دنیا وی دولت و اقتدار حاصل کرنا چاہا۔ [1]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ۭ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ؀﴾

''انھوں نے کہا: کیا تو ہمارے پاس آیا ہے کہ ہمیں اس (طریقے) سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا اور تم دونوں کے لیے زمین میں اقتدار ہو؟ جبکہ ہم تم دونوں پر ایمان لانے والے نہیں۔'' [2]

یہ بات فرعون نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام سے کہی تھی۔ ایسے لوگوں کی عقل پر دنیا کی محبت اس قدر غالب آچکی ہوتی ہے کہ کسی بھی نظریے اور تحریک کو دیکھ کر یہ لوگ فوراً الزام لگا دیتے ہیں کہ اس کا مقصد دنیا کا حصول ہے، اسی لیے انبیاء علیہم السلام نے واضح طور پر اپنی امتوں سے کسی دنیاوی اجر سے بے نیاز ہونے کا اعلان فرمایا:

﴿وَيٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔـلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَي اللّٰهِ﴾

''اور اے میری قوم! میں تم سے اس پر کوئی مال نہیں مانگتا۔ میرا اجر تو اللہ ہی پر ہے۔'' [3]

امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت مِقدام رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَا أَكَلَ أَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَيْرًا مِّنْ أَنْ يَّأْكُلَ مِنْ عَمَلِ يَدِهِ، وَ إِنَّ نَبِيَّ اللّٰهِ دَاوُدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَ يَأْكُلُ مِنْ عَمَلِ يَدِهِ»

''انسان کی بہترین خوراک وہ ہے جو اس نے اپنے ہاتھ کی کمائی سے حاصل کی

1 مدخل لفهم السيرة للدكتور يحيىٰ اليحيىٰ، ص: 137. 2 يونس 10:78. 3 هود 11:29.

ہو۔ اللہ کے نبی حضرت داود علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھایا کرتے تھے۔''[1]

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان اگر صرف حلال روزی پر اکتفا کرے تو اس کے اندر ایسی جرأت اور بہادری پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ کلمۂ حق دوٹوک الفاظ میں کہہ سکتا ہے۔[2]

کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جو اپنی آمدن اور نوکریاں بچانے کے لیے ظالموں کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں، ان کی غلط باتوں پر خاموشی اختیار کرتے ہیں اور ان کی خواہش پرستی کو تحفظ فراہم کرتے ہیں۔[3]

اگر کوئی داعی اپنی دعوت کے ذریعے سے دولت اور روزی کمانا چاہتا ہو یا اس کی دعوت کی بنیاد لوگوں کے صدقات اور چندے ہوں تو اس کی دعوت کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو، لوگوں میں کوئی پذیرائی حاصل نہیں کر سکتی، اس لیے ایک مسلمان داعی کو سب سے بڑھ کر اس بات کا اہتمام کرنا چاہیے کہ اس کی معاش کا انحصار ذاتی محنت اور عمدہ تجارت پر ہو۔ کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے تاکہ دنیاوی لحاظ سے وہ کسی کا احسان مند نہ ہو، وگرنہ اپنے محسن کے سامنے وہ آزادی کے ساتھ حق بات کا اظہار نہیں کر سکے گا، اس کا فضل و احسان ضرور اسے مرعوب کرے گا۔

اس مقصد کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس تربیتی مرحلے سے گزرنا پڑا۔ اگرچہ یہ بات آپ کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی اور نہ آپ جانتے تھے کہ مستقبل میں اللہ تعالیٰ کی رسالت اور اس کے دین کی دعوت کی ذمہ داریاں آپ کے سپرد کی جا رہی ہیں، البتہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی تربیت کے لیے جو انداز اختیار کیا اس میں یہی حکمت پنہاں ہے۔ تربیت کا یہ انداز بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہی مشیت تھی کہ بعثت سے قبل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں کوئی ایسی چیز پیش نہ آئے جو بعثت کے بعد آپ کی دعوت میں کسی قسم کی پیچیدگی یا

1 صحيح البخاري، حديث: 2072. 2 مدخل لفهم السيرة للدكتور يحيى اليحيى، ص: 128.
3 فقه السيرة النبوية للدكتور الغضبان، ص: 93.

رکاوٹ پیدا کرے یا اس پر منفی اثرات مرتب کرے۔[1]

حصولِ رزق کے لیے نبی کریم ﷺ کا گلہ بانی کی طرف متوجہ ہونا آپ کے اعلیٰ اوصاف کے مالک ہونے کی نشاندہی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو بلند ذوق اور نازک احساسات سے آراستہ فرمایا تھا۔ آپ کے چچا ابو طالب آپ ﷺ کے حقوق اور ضروریات کی مکمل نگہداشت کرتے تھے اور ایک مشفق باپ کی طرح آپ کے ساتھ محبت و شفقت کا مظاہرہ کرتے تھے لیکن جب نبی ﷺ نے محسوس کیا کہ میں محنت و مشقت کر سکتا ہوں تو گھریلو اخراجات پورے کرنے کے لیے اپنے چچا کا معاون بن کر خود کو کام کاج میں لگا دیا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ فطری خود داری اور حسن معاملت سے بہرہ ور اور حتی المقدور اپنا بوجھ خود اٹھانے والے تھے۔[2]

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کے لیے اس دنیا میں کس طرح کی زندگی پسند کرتا ہے۔ اس کے لیے یہ بہت آسان تھا کہ اپنے نبی ﷺ کو ابتدائی زندگی میں دنیا کی سہولتیں اور آسائشیں عطا کر دیتا تاکہ حصول رزق کے لیے آپ کو محنت و مشقت اور گلہ بانی نہ کرنا پڑتی۔ لیکن حکمت الٰہی کا تقاضا یہ تھا کہ ہم یہ بات جان لیں کہ انسان کا بہترین مال وہ ہوتا ہے جو وہ اپنے معاشرے اور بنی نوع انسان کی خدمت کرتے ہوئے اپنی جدوجہد سے حاصل کرتا ہے اور اس کا بدترین مال وہ ہے جو وہ بغیر کسی محنت و مشقت کے، راحتِ نفس و جان سے حاصل کرتا ہے اور اپنے معاشرے کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا۔[3]

بعثت سے قبل نبی ﷺ کی شرک وغیرہ سے حفاظت کا اہتمام

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو زمانۂ جاہلیت کے شرک اور بت پرستی سے محفوظ رکھا۔ امام احمد رحمہ اللہ مسند احمد میں روایت بیان کرتے ہیں کہ ہشام بن عروہ کو ان کے والد نے

[1] فقه السيرة للبوطي، ص:50. [2] فقه السيرة للبوطي، ص:50. [3] فقه السيرة للبوطي، ص:50.

بتایا کہ مجھ سے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ایک پڑوسی نے بیان کیا کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

«أَيْ خَدِيجَةُ! وَاللّٰهِ لَا أَعْبُدُ اللَّاتَ وَالْعُزّٰى»

''اے خدیجہ! اللہ کی قسم! میں نے کبھی لات وعزیٰ کی عبادت نہیں کی۔''[1]

لات وعُزیٰ مشرکین کے بتوں کے نام ہیں جن کی وہ عبادت کیا کرتے تھے اور ان کے سامنے جھکتے تھے۔ اسی طرح عہد جاہلیت میں آپ ﷺ اس جانور کا گوشت نہیں کھاتے تھے جو کسی بت خانہ میں ذبح کیا گیا ہو۔ زید بن عمرو بن نُفیل کا بھی یہی طرز عمل تھا۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔[2]

اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو عنفوان شباب میں عام نوجوانوں جیسے میلانات و جذبات اور خواہشوں سے بھی محفوظ رکھا، جو اگرچہ جوانی کا تقاضا ہوتی ہیں لیکن قائدین اور رہنماؤں کے مرتبہ و مقام کے شایانِ شان نہیں ہوتیں۔[3]

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''اہل جاہلیت جن غیر پسندیدہ کاموں کا شوق رکھتے تھے میں نے ساری زندگی صرف دو مرتبہ ان کا ارادہ کیا اور ہر بار اللہ تعالیٰ نے مجھے محفوظ رکھا۔ مکہ کے بالائی حصے میں ایک قریشی نوجوان میرے ساتھ اپنی بکریاں چرایا کرتا تھا۔ ایک رات میں نے اس سے کہا کہ میری بکریوں کا بھی خیال رکھنا۔ میں آج مکہ میں قصہ گوئی کی محفل میں شریک ہونا چاہتا ہوں جیسا کہ دیگر نوجوان کرتے ہیں۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے، چنانچہ میں چل پڑا۔ مکہ کی آبادی میں داخل ہوتے ہی مجھے ایک گھر سے موسیقی، گانوں اور باجوں کی آواز آئی۔ میں نے پوچھا: ''کیا معاملہ ہے؟'' مجھے بتایا گیا کہ فلاں قریشی عورت کی فلاں

1 مسند أحمد: 222/4 و 362/5. 2 وقفات تربوية مع السيرة النبوية لأحمد فريد، ص: 51.
3 محمد رسول الله ﷺ لصادق عرجون: 51/1.

قریشی مرد سے شادی ہوئی ہے۔ میں بھی اس ساز و آواز کی طرف متوجہ ہوا لیکن مجھے نیند نے آلیا، پھر صبح دھوپ کی گرمی سے میں بیدار ہوا اور واپس چلا آیا۔ اس نوجوان نے پوچھا کہ سناؤ، کیسا رہا؟ میں نے اسے ساری بات بتا دی۔

پھر ایک دوسری رات میں نے اس نوجوان سے وہی درخواست کی (کہ میری بکریوں کا خیال رکھنا)، اس نے آمادگی ظاہر کی تو میں چل پڑا۔ میں نے اسی طرح (موسیقی و گانے) کی آوازیں سنیں اور مجھے وہی بات (کہ فلاں مرد کی فلاں عورت سے شادی ہوئی ہے) بتائی گئی۔ میں پھر ان آوازوں کی جانب متوجہ ہوا تو مجھ پر نیند غالب آ گئی۔ اگلی صبح سورج کی شعائیں پڑنے پر ہی میں بیدار ہوا، چنانچہ میں واپس اپنے ساتھی کے پاس آ گیا۔ اس نے پھر پوچھا کہ سناؤ، کیا کر کے آئے ہو؟ میں نے کہا: ''کچھ بھی نہیں۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! اس کے بعد میں نے کبھی ایسے جاہلانہ عمل کا ارادہ نہیں کیا حتی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے نبوت سے سرفراز فرما دیا۔''[1]

اس حدیث سے دو اہم حقیقتیں آشکار ہوتی ہیں:

① نبی کریم ﷺ کی ذات مبارکہ میں تمام بشری اوصاف موجود تھے۔ ہر نوجوان کی طرح آپ بھی اپنے دل میں مختلف طبعی میلانات پاتے تھے جیسا کہ حکمت الٰہی کا تقاضا ہے کہ انسان کی فطرت میں یہ میلانات و جذبات ودیعت کیے جائیں، چنانچہ آپ ﷺ قصہ گوئی اور لہو و لعب کا مفہوم سمجھتے تھے۔ ان میں کیا لذت ہوتی ہے اس کا بھی آپ کو شعور تھا۔ دوسرے نوجوانوں کی طرح آپ کے دل میں بھی ان کا شوق کروٹ لیتا تھا۔

② اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے بگاڑ کی ہر صورت سے آپ کی حفاظت فرمائی اور ہر اس چیز سے آپ کو دُور رکھا جو اس دعوت کے تقاضوں کے منافی تھی جس کے لیے آپ کو تیار کیا جا رہا تھا۔[2]

[1] السنن الكبرىٰ للبيهقي:2/34,33، ومجمع الزوائد:8/226. [2] فقه السيرة للبوطي، ص:51,50.

بَحیرا راہب سے ملاقات

ابو طالب نبی کریم ﷺ اور بعض قریشی بزرگوں کی معیت میں تجارت کے سلسلے میں شام کی طرف سفر کے لیے روانہ ہوئے۔ جب بحیرا راہب (ایک عیسائی عالم و زاہد) کے پاس سے گزرے تو وہاں کچھ دیر قیام کیا۔[1] اپنی سواریوں سے سامان اتار کر نیچے رکھ رہے تھے کہ بحیرا راہب ان کے پاس آیا، حالانکہ اس سے قبل کسی بھی سفر میں وہ کبھی ان کے پاس آیا تھا نہ کبھی ان سے کوئی بات کی تھی۔

ابھی یہ اپنی سواریوں سے سامان اتار رہے تھے کہ راہب نے آ کر ہر ایک کو غور سے دیکھنا شروع کیا، پھر رسول اللہ ﷺ کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا: ''یہ تمام جہانوں کا سردار ہے، رب العالمین کا رسول ہے۔ وہ اسے تمام جہانوں کے لیے مجسمۂ رحمت بنا کر مبعوث فرمائے گا۔'' قریشی بزرگ اس سے پوچھنے لگے کہ تجھے کیسے معلوم ہوا؟ اس نے بتایا: ''جب تم گھاٹی سے نیچے اتر رہے تھے تو تمام درختوں اور پتھروں نے اسے سجدہ کیا اور شجر و حجر نبی ہی کو سجدہ کرتے ہیں۔ میں ان کی ایک اور علامت بھی جانتا ہوں۔ ان کے کندھے کی ہڈی کے نیچے سیب کے برابر مہر نبوت بھی ہے۔''

راہب نے واپس جا کر ان کے لیے کھانا تیار کیا، پھر وہ کھانا لے کر ان کے پاس آیا۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ اُونٹوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ اس نے کہا کہ انھیں بلاؤ۔ آپ ﷺ تشریف لائے تو ایک بادل آپ پر سایہ فگن تھا۔ سب لوگ ایک درخت کے سائے میں بیٹھے تھے۔ جب آپ آئے تو درخت کے سائے میں کوئی جگہ خالی نہ تھی۔ آپ

---

1 582ء میں جب آپ ﷺ کی عمر بارہ سال ہوئی تو آپ اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ شام کے تجارتی سفر پر گئے۔ قافلہ بُصریٰ شہر میں ٹھہرا جہاں بحیرا راہب کا عبادت خانہ تھا۔ بُصریٰ جنوبی شام میں اُردن کی سرحد سے 19 میل شمال کی جانب ہے۔ اسے بُصریٰ الشام بھی کہتے ہیں۔ (اٹلس سیرت نبوی، ص:94,93، دارالسلام)

ایک جگہ بیٹھ گئے تو درخت کا سایہ آپ کی جانب جھک گیا۔ اس پر راہب نے سب کو متوجہ کیا کہ دیکھو، درخت کا سایہ اس کی جانب ہو گیا ہے۔

ابھی وہ راہب ان کے پاس کھڑا ہو کر انھیں اللہ کا واسطہ دے کر کہہ رہا تھا کہ اسے لے کر رومیوں کے پاس نہ جاؤ۔ رومی ان کے اوصاف سے انھیں پہچان کر قتل کر ڈالیں گے۔ دریں اثنا اچانک وہاں سات رومی اشخاص آ موجود ہوئے۔ راہب ان کے پاس گیا اور پوچھا: ''کیسے آئے ہو؟'' انھوں نے کہا: ''ہمیں معلوم ہوا ہے کہ اس وقت کا نبی اس ماہ ایک سفر پر نکلنے والا ہے، اس لیے تمام راستوں پر لوگ بھیج دیے گئے ہیں۔ ہمیں اس کے متعلق خبر ملی ہے، اس لیے ہمیں اس کی تلاش کے لیے تمھاری خانقاہ کی طرف بھیجا گیا ہے۔'' راہب نے ان سے پوچھا: ''کیا تمھارے پیچھے کوئی تم سے بہتر بھی ہے؟'' انھوں نے جواب دیا: ''ہمارے آقا نے تمھاری خانقاہ کی طرف بھیجنے کے لیے ہمارا ہی انتخاب کیا ہے اور ہم ہی سب سے بہتر ہیں۔'' راہب نے انھیں سمجھایا: ''دیکھو! اگر اللہ تعالیٰ نے کسی کام کا ارادہ کر لیا ہے تو کیا کوئی شخص اس میں رکاوٹ ڈال سکتا ہے؟'' رومیوں نے جواب دیا: ''نہیں۔'' اس پر راہب نے کہا: پھر اس (ہونے والے نبی) کے ہاتھ پر بیعت کر لو اور اس کا ساتھ دو۔

پھر راہب نے (قریشی تاجروں سے) کہا: ''میں تمھیں اللہ کی قسم دیتا ہوں! بتاؤ اس کا سرپرست کون ہے؟'' انھوں نے کہا: ''ابو طالب۔'' تب راہب ابو طالب کو اللہ کے واسطے دینے لگا کہ آپ ﷺ کو واپس بھیج دو۔ بالآخر ابو طالب نے آپ ﷺ کو واپس مکہ بھیج دیا۔[1]

بَحیرا راہب کے واقعے سے ماخوذ اہم نکات: ① اہل کتاب کے حق پرست راہب یہ

[1] جامع الترمذي، حديث: 3620، و دلائل النبوة للبيهقي: 25,24/2، و المستدرك للحاكم: 615/2، و دلائل النبوة لأبي نعيم، ص: 109.

بات جانتے تھے کہ محمد ﷺ ہی تمام انسانیت کے لیے رسول ہیں۔ یہ بات انھیں اس لیے معلوم ہوئی کہ ان کی کتابوں میں نبی ﷺ کے اوصاف اور نشانیاں موجود تھیں۔

② شجر و حجر نے آپ ﷺ کو سجدہ کیا، بادل آپ پر سایہ فگن ہوا اور درخت کا سایہ آپ کی جانب جھک گیا۔

③ نبی کریم ﷺ نے اپنے سفر اور اپنے چچا کی معیت میں اس سیاحت سے بہت کچھ سیکھا۔ خاص طور پر قریش کے بزرگوں سے بہت فائدہ اٹھایا جو صاحبِ تجربہ اور نہایت دانشور تھے، جبکہ آپ ﷺ کی زندگی میں ایسے تجربات نہیں آئے تھے۔

④ بَحیرا راہب نے ابو طالب کو عیسائیوں کے شر سے متنبہ کیا اور واضح طور پر بتا دیا کہ اگر ان رومیوں کو اس نبی کا علم ہو گیا تو وہ انھیں زندہ نہیں رہنے دیں گے۔ اس نے آپ ﷺ کے چچا اور مکہ کے بزرگوں کو مجبور کیا کہ وہ آپ ﷺ کو لے کر رومیوں کے پاس نہ جائیں کیونکہ اگر انھوں نے آپ کو آپ کے اوصاف کی وجہ سے پہچان لیا تو وہ ضرور آپ کو قتل کر دیں گے۔ رومیوں کو یہ معلوم تھا کہ اس نبی کی آمد سے اس علاقے پر ان کا غاصبانہ قبضہ ختم ہو جائے گا اور تمام اشیاء اصل حقداروں کے پاس واپس چلی جائیں گی۔ ایسا کرنا رومی سلطنت کے مفادات کے خلاف ہے، اس لیے جس کی وجہ سے یہ سب کچھ ہو گا وہ رومیوں کا دشمن ہے۔ یہ وہ بات تھی جس سے رومی خوف زدہ تھے۔

جنگِ فجار

یہ جنگ بنو کنانہ اور بنو ہوازن کے درمیان ہوئی۔ قریش نے بنو کنانہ کا ساتھ دیا۔ اس جنگ کا سبب یہ بنا کہ نعمان بن منذر کا ایک تجارتی قافلہ عکاظ کی منڈی کی طرف جا رہا تھا۔ بنو ہوازن کے سردار عروۃ الرَّحَّال بن عتبہ نے اس قافلے کو بہ حفاظت عکاظ کی منڈی تک پہنچانے کے لیے پناہ دی۔ (بنو کنانہ اس قافلے کو لوٹنا چاہتے تھے) بنو کنانہ کے ایک سردار برّاض بن قیس بن کنانہ نے عروہ سے کہا: ''کیا تم بنو کنانہ کے مقابلے میں اس

قافلے کو پناہ دو گے؟'' اس نے کہا: ''ہاں، بنو کنانہ کیا ساری مخلوق کے خلاف بھی میں اس قافلے کو پناہ دوں گا۔ عروہ باہر نکلا تو بَرّاض نے موقع پا کر اسے قتل کر دیا۔ بنو کنانہ کو قتل کی خبر ملی (کہ ہمارے ایک سردار نے بنو ہوازن کے ایک سردار کو قتل کر دیا ہے) تو وہ فوراً حرمِ مکہ کی طرف روانہ ہو گئے (تاکہ حرم میں پناہ لے سکیں)۔ کچھ دیر بعد بنو ہوازن کو بھی خبر پہنچ گئی۔ انھوں نے بنو کنانہ کا تعاقب شروع کر دیا اور ان کے حرم پہنچنے سے پہلے ہی انھیں آلیا۔ رات گئے تک ان دونوں کے مابین لڑائی ہوتی رہی، پھر وہ (بنو کنانہ) حرم کی سرزمین میں داخل ہو گئے تو بنو ہوازن نے جنگ سے ہاتھ روک لیا، بعد میں بھی انھوں نے کئی جنگیں لڑیں۔ اس جنگ میں قریش نے بنو کنانہ کا ساتھ دیا۔ (کیونکہ قریش بنو کنانہ ہی کا ایک حصہ تھے۔) نبی کریم ﷺ بھی کچھ روز اس جنگ میں شریک رہے کیونکہ آپ کے چچاؤں نے آپ کو ساتھ چلنے کا حکم دیا تھا۔ اس جنگ میں چونکہ مکہ کے تقدس کو تار تار کیا گیا تھا، اس لیے اس جنگ کا نام حرب فجار پڑ گیا۔[1]

خود رسول اللہ ﷺ اس جنگ کے بارے میں فرماتے ہیں: «كُنْتُ أُنَبِّلُ عَلٰى أَعْمَامِي» ''میں اپنے چچاؤں کو تیر پکڑاتا تھا۔'' یعنی میں دشمن کے پھینکے ہوئے تیر اٹھا کر اپنے چچاؤں کو دیتا تھا۔[2]

اس وقت نبی ﷺ کی عمر مبارک چودہ یا پندرہ سال تھی۔ ایک قول بیس سال کا بھی ہے۔ لیکن پہلا قول زیادہ درست معلوم ہوتا ہے کیونکہ آپ ﷺ کا دشمن کے پھینکے ہوئے تیروں کو جمع کر کے اپنے چچاؤں کو پکڑانا آپ کی نوعمری پر دلالت کرتا ہے۔

ان چیزوں سے رسول اللہ ﷺ میں جرأت اور شجاعت پیدا ہوئی اور آپ نے نوجوانی ہی میں جنگ کی عملی تربیت حاصل کر لی۔

عربوں کی دیگر لڑائیوں کی طرح بالآخر یہ جنگ بھی ختم ہوگئی، پھر اللہ تعالیٰ نے ان میں

---

1 وقفات تربوية مع السيرة النبوية لأحمد فريد، ص: 53. 2 السيرة النبوية لابن هشام: 1/198، والسيرة الحلبية: 1/127-129.

اپنے دین اسلام کا نور بھیج کر ان گمراہیوں کا خاتمہ کردیا اور ان کے دلوں میں محبت و الفت پیدا کی۔[1]

حِلف الفُضُول

جنگ فجار سے قریش کی واپسی کے (تقریباً چار ماہ) بعد حلف الفضول[2] کا معاہدہ ہوا۔ اس کی وجہ یہ بنی کہ (یمن کے ایک علاقہ) زَبید سے ایک آدمی کچھ سامانِ تجارت لے کر مکہ آیا۔ عاص بن وائل نے اس سے سامان خریدا مگر قیمت ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ زَبیدی نے قریش کے معززین سے اس معاملے میں مدد چاہی لیکن انھوں نے عاص کے مقام ومرتبہ کی وجہ سے اس کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ زَبیدی نے کعبہ کے پاس کھڑے ہوکر بنوآل فہر اور مکہ کے باکردار لوگوں سے مدد کی درخواست کی اور باآواز بلند یہ اشعار پڑھے ؎

يَا آلَ فِهْرٍ لِمَظْلُومٍ بِضَاعَتَهُ ... بِبَطْنِ مَكَّةَ نَائِي الدَّارِ وَالنَّفَرِ

وَمُحْرِمٍ أَشْعَثَ لَمْ يَقْضِ عُمْرَتَهُ ... يَا لَلرِّجَالِ وَبَيْنَ الْحِجْرِ وَالْحَجَرِ

إِنَّ الْحَرَامَ لِمَنْ تَمَّتْ كَرَامَتُهُ ... وَلَا حَرَامَ لِثَوْبِ الْفَاجِرِ الْغُدَرِ

”اے آل فہر! (قریشیو!) اس مظلوم کی مدد کرو جس کا تجارتی مال وادی مکہ میں

---

1 وقفات تربوية مع السيرة النبوية لأحمد فريد، ص: 53. 2 وجہ تسمیہ: قریش سے پہلے بنو جرہم نے مظلوموں کی حمایت کے لیے ایک انجمن بنائی تھی۔ اس کام میں تین افراد پیش پیش تھے: فضل بن وداعہ، فضل بن فضالہ اور فضل بن حارث۔ ان سب کے نام میں ”فضل“ کا مادہ مشترک تھا۔ اسی اشتراک کی وجہ سے اس معاہدے کو حلف الفضول کا نام دیا گیا تھا۔ قریش نے جب اسی سے ملتا جلتا معاہدہ کیا تو اس کا نام بھی حلف الفضول رکھ دیا۔ اس کی یہ توجیہ بھی بیان کی گئی ہے کہ قریش نے اس معاہدے کا نام حلف الفضول اس لیے رکھا کہ وہ ایک فضیلت والے کام میں شامل ہوئے تھے۔ (البداية والنهاية: 271/2)

چھین لیا گیا۔ وہ یہاں اپنے گھر بار، خاندان اور انصار و مددگار سے بہت دور ہے، آؤ اور اس کی مدد کرو۔ وہ (مظلوم) نہایت پراگندہ حالت میں ہے، احرام کی حالت میں ہے، ابھی اس نے عمرہ بھی ادا نہیں کیا۔ اے لوگو! حجر اسود اور حطیم کے مابین بیت اللہ کے پاسبانو! اس مظلوم کی مدد کرو۔ عزت و حرمت اس شخص کی ہے جس کے کام اچھے ہیں۔ غدار اور بدکار (عاص بن وائل) کی چادر کی کوئی عزت و حرمت نہیں۔''[1]

یہ اشعار سن کر زبیر بن عبدالمطلب اٹھے اور کہا کہ اب اس معاملے کو یونہی نہیں چھوڑا جاسکتا، چنانچہ عبداللہ بن جدعان نے کھانے کا اہتمام کیا اور اس کے گھر میں بنوہاشم، بنوزہرہ، بنوامیہ اور بنومخزوم کے سرکردہ لوگ جمع ہوئے اور انھوں نے حرمت والے مہینے ذوالقعدہ میں حلف اٹھایا اور پختہ معاہدہ کیا کہ واللہ! ہم ظالم کے خلاف اور مظلوم کے ساتھ ایک ہاتھ کی طرح متحد ہوں گے یہاں تک کہ وہ مظلوم کا حق اسے لوٹا دے۔ جب تک سمندر میں ایک بھی قطرہ پانی ہے اور ثبیر وحراء پہاڑ اپنی جگہ قائم ہیں، یہ معاہدہ بھی برقرار رہے گا۔[2]

پھر وہ سب عاص بن وائل کے پاس گئے اور اس سے زبیدی کا سامان چھین کر زبیدی کے حوالے کیا۔

قریش نے اس معاہدے کا نام حلف الفضول رکھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ان لوگوں نے نہایت افضل کارنامہ سرانجام دیا ہے۔

زبیر بن عبدالمطلب نے اسی معاہدے کے بارے میں یہ اشعار کہے:

''معاہدہ حلف الفضول کرنے والوں نے یہ حلف اٹھایا ہے کہ سرزمین مکہ میں کوئی ظالم نہیں ٹھہر سکے گا۔ سب نے اس بات پر پختہ عہد و پیمان کیا ہے، لہٰذا مکہ میں رہنے والے اور باہر سے آنے والے سب محفوظ ہیں۔''

---

1 الروض الأنف للسهيلي:156,155/1. 2 السيرة النبوية لأبي شهبة:213/1.

اس معاہدے میں نبی ﷺ بھی شریک ہوئے۔ اس معاہدے نے ظلم کے محلات منہدم کر دیے اور حق کے مینار کو بلند کیا۔ یہ معاہدہ عربوں کے قابل فخر کارناموں میں شمار کیا جاتا ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ عرب انسانی حقوق سے آشنا تھے۔[1]

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«شَهِدْتُّ حِلْفَ الْمُطَيِّبِينَ مَعَ عُمُومَتِي وَ أَنَا غُلَامٌ، فَمَا أُحِبُّ أَنَّ لِي حُمْرَ النَّعَمِ وَ أَنِّي أَنْكُثُهُ»

''میں اپنے چچاؤں کے ساتھ مُطَیِّبِین (بنو ہاشم، بنو امیہ، بنو زہرہ اور بنو مخزوم) کے معاہدے میں موجود تھا اور میں ابھی لڑکا تھا۔ اگر مجھے اس کے عوض سرخ اونٹ بھی ملیں تو میں اسے توڑنا پسند نہیں کروں گا۔''[2]

آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

«لَقَدْ شَهِدتُّ فِي دَارِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ جُدْعَانَ حِلْفًا مَّا أُحِبُّ أَنَّ لِي بِهٖ حُمْرَ النَّعَمِ وَلَوْ أُدْعٰى بِهٖ فِي الْإِسْلَامِ لَأَجَبْتُ»

''میں عبداللہ بن جدعان کے گھر پر اس معاہدے میں شریک تھا۔ مجھے یہ پسند نہیں کہ میں اس معاہدے کو چھوڑ کر اس کی جگہ سرخ اونٹ لے لوں۔ اگر اب بھی دورِ اسلام میں اس عہد و پیمان کے لیے مجھے بلایا جائے تو میں لبیک کہوں گا۔''[3]

درس و عبرت اور فوائد: ① عدل و انصاف کا حصول ہر ایک کا حق ہے۔ اس پر کسی کی اجارہ داری نہیں۔ رسول اللہ ﷺ اپنی بعثت سے قبل، عدل و انصاف کے اصولوں کی سربلندی کے لیے اور ایسے معاہدوں میں شرکت اپنے لیے باعث اعزاز سمجھتے تھے۔ مثبت اقدار کو تقویت

1 السيرة النبوية لأبي شهبة:214/1. 2 مسند أحمد:190/1، والأدب المفرد للبخاري، حديث: 567، و مسند أبي يعلٰى، حديث:844-846. 3 السنن الكبرٰى للبيهقي: 367/3، والسيرة النبوية لابن هشام:141,142/1.

دینی چاہیے، خواہ وہ دین سے بے بہرہ لوگوں کی طرف ہی سے پیش کی گئی ہوں۔[1]

③ حلف الفضول جاہلیت کے اندھیروں میں روشنی کی ایک کرن تھی۔ اس میں اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ کسی معاشرے یا نظام میں فساد جس قدر بھی پھیل جائے اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ وہ معاشرہ یا نظام ہر قسم کی خوبی سے کورا ہے۔ مکہ مکرمہ کے جاہلی معاشرے پر بت پرستی اور ظلم و استبداد کی کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ ہر طرف زیادتی، زنا اور سودخوری جیسے برے اخلاق کا دَور دَورہ تھا۔ اس کے باوجود وہاں ایسے دلیر اور جری لوگ موجود تھے جو نہ صرف ظلم کو ناپسند کرتے تھے بلکہ ظلم ان کے لیے ناقابل برداشت بھی تھا۔ اس میں ان داعیوں کے لیے بہت بڑا درس ہے جو ایسے معاشروں میں کام کر رہے ہیں جہاں اسلام بالادست نہیں یا وہاں اسلام کی مخالفت میں تشدد کے رجحانات پائے جاتے ہیں۔[2]

اسلام ظلم کا قلع قمع کرتا ہے اور مظلوم کی حمایت کرتا ہے، قطع نظر اس سے کہ مظلوم کا تعلق کس قوم، نسل، مذہب اور وطن سے ہے۔[3]

④ اچھے کاموں کے لیے معاہدہ کرنا اور حلف اٹھانا مستحب ہے۔ یہی وہ باہمی تعاون ہے جس کا قرآن حکیم میں حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى﴾

''نیکی اور تقویٰ کے امور میں ایک دوسرے سے تعاون کیا کرو۔''[4]

مسلمانوں کے لیے جائز ہے کہ ایسی صورتوں میں باہمی معاہدے کریں کیونکہ یہ معاہدے اس چیز کی تاکید کے لیے ہوتے ہیں جو شریعت میں مطلوب ہے۔ لیکن یہ شرط ہے کہ معاہدے مسجد ضرار جیسے نہ ہوں کہ ان معاہدوں کی صورت میں مسلمانوں کے اندر گروہ بندی پیدا ہو اور وہ ظلم و تشدد کو ہوا دیں۔

ظلم روکنے کے لیے یا ظالم کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلمان غیر مسلم اقوام کے ساتھ

---

1 السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 112/1. 2 فقه السيرة النبوية للدكتور الغضبان، ص: 110. 3 السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 121. 4 المآئدة 2:5.

بھی معاہدہ کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ یہ معاہدے موجودہ حالات میں بھی اور مستقبل میں بھی اسلام اور مسلمانوں کے لیے فائدہ مند ہوں۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا: «مَا أُحِبُّ أَنَّ لِي بِهِ حُمْرَ النَّعَمِ» ''مجھے یہ پسند نہیں کہ میں اس معاہدے کو چھوڑ کر اس کی جگہ سرخ اونٹ لے لوں۔''[1] کیونکہ ایسے معاہدوں سے عدل و انصاف حاصل ہوتا ہے اور ظلم رکتا ہے۔ اور آپ ﷺ کا یہ فرمان بھی اس بات کی دلیل ہے: «لَوْ دُعِيتُ بِهِ فِي الْإِسْلَامِ لَأَجَبْتُ» ''اگر اسلام میں بھی مجھے اس معاہدے کی طرف بلایا جائے تو میں ضرور لبیک کہوں گا۔''[2]

کیونکہ یہ معاہدہ ظالم کو ظلم سے روکتا ہے اس لیے آپ ﷺ نے واشگاف الفاظ میں فرما دیا کہ اسلام کے بعد بھی اگر کوئی مجھے اس معاہدے کی رُو سے آواز دے گا تو میں اس کی دادرسی کے لیے تیار رہوں گا۔[3]

⑤ ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ معاشرے میں اس کا ایک مثبت کردار ہو۔ اپنے ماحول اور معاشرے میں رونما ہونے والے واقعات میں اس کی حیثیت ایک تماشائی کی نہ ہو۔ نبی کریم ﷺ اپنے (غیر مسلم) معاشرے میں لوگوں کی نگاہوں کا مرکز تھے اور آپ کا کردار مثالی تھا۔ سب آپ کو امین کے نام سے پکارتے تھے۔ آپ ﷺ یکساں طور پر مرد و زن کے دلوں کی دھڑکن تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عمدہ اخلاق سے آراستہ کیا تھا۔ آپ اعلیٰ اخلاق و کردار کا مسلسل مظاہرہ کرتے رہے یہاں تک کہ آپ نے اپنی قوم کے دل جیت لیے۔ یہ اس بات کی زندہ تصویر ہے کہ معاشرے میں اخلاق کی قدر و قیمت کس قدر زیادہ ہوتی ہے اور عمدہ اخلاق و کردار کی مالک شخصیت کا کس قدر احترام ہوتا ہے کہ ایک بگڑا ہوا معاشرہ بھی اس کی عزت و توقیر پر مجبور ہو جاتا ہے۔[4]

---

1 مسند أحمد: 190/1، والأدب المفرد للبخاري، حديث: 567، و مسند أبي يعلى، حديث: 844-846، والسيرة النبوية لابن هشام: 142,141/1. 2 السنن الكبرى للبيهقي: 367/3، والسيرة النبوية لابن هشام: 142,141/1. 3 الأساس في السنة لسعيد حوّى: 172/4. 4 فقه السيرة النبوية للدكتور الغضبان، ص: 111,110.

باب 3

تجارتی سفر، نکاح اور بعثت سے قبل اہم واقعات

سفرِ تجارت اور خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نکاح

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ایک اعلیٰ خاندان کی مالدار بیوہ خاتون تھیں۔[1] وہ معاوضے پر لوگوں کو تجارت کے لیے اپنا مال دیا کرتی تھیں۔ جب انھیں محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت و امانت اور اعلیٰ اخلاق کی خبر ہوئی تو انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش کش کی کہ میرا مالِ تجارت کے لیے شام لے جائیں، میں دیگر تاجروں کی نسبت آپ کو زیادہ معاوضہ دوں گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پیش کش قبول کر لی۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا غلام میسرہ بھی آپ کا شریکِ سفر بن گیا۔ شام پہنچ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھ لایا ہوا سامانِ تجارت فروخت کیا اور وہاں سے سامان خریدا۔ مکہ واپس آنے پر آپ کا لایا ہوا سامان جب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے فروخت کیا تو ان کے مال میں کئی گنا اضافہ ہوا۔

اس سفر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مالی فوائد کے ساتھ ساتھ اور بہت سے تجربات اور فائدے حاصل ہوئے۔ آپ کا مدینہ منورہ سے گزر ہوا جسے مستقبل میں آپ کی جائے ہجرت بننا تھا اور جسے آپ علیہ السلام نے اپنی دعوت کا مرکز بنانا تھا۔ آپ ان علاقوں سے بھی گزرے جو (بعثت اور ہجرت کے بعد) آپ کے ہاتھوں فتح ہوئے اور وہاں آپ کے

[1] خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پہلے خاوند کا نام عتیق بن عائذ تھا۔ ان کے انتقال کے بعد خدیجہ رضی اللہ عنہا ابو ہالہ کے نکاح میں آئیں، پھر ابو ہالہ کا بھی انتقال ہو گیا۔

دین کی نشر و اشاعت ہوئی۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے شادی کا سبب بھی یہی سفر بنا۔ ایک تو میسرہ نے ان سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فیاضی، صداقت اور کریمانہ اخلاق کا تذکرہ کیا،[1] دوسرا حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے خود دیکھا کہ ان کے مال میں اتنی برکت ہوئی جو ان کے وہم وگمان میں بھی نہ تھی اور لوگوں کی زبانی بھی انھیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادات عالیہ کی اطلاعات مل رہی تھیں۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو تو گویا اپنی گمشدہ منزل مل گئی۔ انھوں نے اپنے دل کی بات اپنی سہیلی نفیسہ بنت مُنَبِّہ کو بتا دی۔ نفیسہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئیں اور انھیں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے شادی کرنے کا مشورہ دیا۔[2] آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رضا مندی کا اظہار کرتے ہوئے یہ پیشکش اپنے چچاؤں کے سامنے رکھی تو سب نے موافقت کی۔ آپ کے چچا حمزہ بن عبدالمطلب نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے منگنی کی بات چیت کی۔ آخر کار حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت میں آگئیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر بیس اونٹنیاں بطور حق مہر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو دیں۔ یہ پہلی خاتون تھیں جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح ہوا اور ان کی زندگی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی اور عورت سے شادی نہیں کی۔[3]

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو بیٹے اور چار بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ ایک بیٹے کا نام قاسم تھا، انھی کے نام پر آپ کی کنیت ابوالقاسم تھی۔ دوسرے بیٹے کا نام عبداللہ تھا جنھیں طاہر اور طیب کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔ قاسم جب شہسواری کی عمر کو پہنچے تو اللہ کو پیارے ہوگئے، جبکہ عبداللہ ابھی چھوٹے ہی تھے کہ انھیں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس بلا لیا۔ دونوں بیٹے بعثت سے قبل ہی فوت ہوگئے۔

بیٹیوں کے نام زینب، رقیہ، ام کلثوم اور فاطمہ رضی اللہ عنہن ہیں۔ ان سب نے اسلام قبول

---

1 رسالة الأنبياء لعمر أحمد عمر: 27/3. 2 وقفات تربوية مع السيرة النبوية لأحمد فريد، ص: 56. 3 السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 122.

کیا، مدینہ کی ہجرت کا بھی انھیں شرف حاصل ہوا اور رسول اللہ ﷺ نے ان سب کی شادیاں بھی کیں۔[1]

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے شادی کے وقت آپ ﷺ کی عمر پچیس سال تھی اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر چالیس سال تھی۔[2]

درس و عبرتیں اور فوائد: ① ایک کامیاب تاجر کے اوصاف میں سے اہم ترین وصف صداقت و امانت ہے۔ تجارت میں نبی کریم ﷺ کی شخصیت کے یہی دو اوصاف تھے جنھوں نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو آمادہ کیا کہ وہ اپنا تجارتی سامان دے کر آپ ﷺ کو شام بھیجیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تجارت میں برکت فرمائی اور ہر قسم کی خیر اور بھلائی کے دروازے کھول دیے۔

② ذرائع آمدنی کا ایک بہترین ذریعہ تجارت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کے لیے بعثت سے قبل اسے نہایت آسان بنا دیا تھا۔ آپ ﷺ نے تجارت کے فنون میں مہارت حاصل کی اور تاجروں کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا: «اَلتَّاجِرُ الصَّدُوقُ الْأَمِينُ مَعَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ» ''امانت دار اور سچ بولنے والا تاجر قیامت کے دن انبیاء، صدیقین اور شہداء کی معیت میں اُٹھایا جائے گا۔''[3] روزی کے حصول کے لیے باوقار پیشے اختیار کرنا مسلمانوں کے فرائض میں سے ہے۔ ایسا شخص دوسرے کے احکامات کا پابند نہیں ہوتا، نہ کسی کا ماتحت ہوتا ہے نہ غلام اور نہ دوسروں کا محتاج ہوتا ہے بلکہ دوسرے لوگ اس کے محتاج ہوتے ہیں جو اس کے تجربات اور اس کی امانت و عفت سے مستفید ہوتے ہیں۔

③ آپ ﷺ کی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے شادی اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے مطابق تھی۔ اللہ تعالیٰ

[1] رسالة الأنبياء لعمر أحمد عمر: 28/3. [2] السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 122. [3] السلسلة الصحيحة: 1336/7، حديث: 3453، البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔

نے آپ ﷺ کے لیے ایسی شریک حیات کا انتخاب کیا جو ہر لحاظ سے آپ کے لیے مناسب ہو۔آپ ﷺ کا ہر بوجھ اٹھائے، آپ کے غموں کو ہلکا کرے۔نبوت کی ذمہ داریاں ادا کرنے میں آپ کی معاون ہو اور پریشانی کے عالم میں پیار اور محبت کے ساتھ زندگی بسر کرے۔[1]

شیخ محمد الغزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ عورتیں جو عظیم لوگوں کی زندگیوں کو کامیاب بنانے والی ہوتی ہیں، ان کے لیے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی زندگی ایک مثالی زندگی ہے۔ انبیاء اور رسولوں کے دل بڑے حساس ہوتے ہیں اور وہ جس قوم کی تقدیر بدلنے کے لیے جستجو کرتے ہیں اس قوم کی طرف سے انھیں بڑی زیادتیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اپنے مقاصد کے حصول کے لیے انھیں بھلائی کے راستے میں بڑی جدوجہد کرنا پڑتی ہے، اس لیے انھیں دوسروں کی نسبت ایسی شریکِ حیات کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے جو ان کی نجی زندگی کو محبت والفت اور اتفاق و یگانگت سے معمور کر دے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا میں یہ اوصاف بدرجہ اتم موجود تھے، اس لیے انھوں نے نبی کریم ﷺ کی زندگی پر نہایت عمدہ اور گہرے اثرات چھوڑے۔[2]

④ بچپن میں نبی کریم ﷺ کو اپنے والدین سے جدائی کا صدمہ برداشت کرنا پڑا اور جوانی میں اپنے بیٹوں کی جدائی کا دُکھ سہنا پڑا۔ اللہ تعالیٰ کے فیصلے بڑے حکیمانہ ہوتے ہیں۔ اس کی یہ مشیت تھی کہ آپ ﷺ کا کوئی بیٹا بقید حیات نہ رہے تاکہ مستقبل میں کوئی نبوت کا دعویدار بن کر اپنے آپ کو اور دوسروں کو آزمائش میں مبتلا نہ کر دے۔ ایک انسانی خواہش اور فطری تقاضوں کی تکمیل کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو بیٹے عطا بھی کیے۔ اس میں یہ حکمت تھی کہ نبی ﷺ کی کمال مردانگی پر کسی کو عیب لگانے اور زبان درازی کی جرأت نہ ہو، پھر کم عمری ہی میں انھیں واپس لے لیا تاکہ آپ ﷺ کی ذات ان لوگوں

1 السيرة النبوية لأبي شهبة:1/122,123. 2 فقه السيرة للغزالي، ص:75.

کے لیے اطمینان قلب اور حصول صبر کا وسیلہ بن جائے جنھیں اللہ نے بیٹے عطا نہیں کیے یا عطا کر کے واپس لے لیے، نیز یہ ایک طرح کی آزمائش بھی تھی اور انبیاء ہی شدید ترین آزمائشوں میں مبتلا کیے جاتے ہیں۔ [1]

یہ بھی حکمت الٰہی تھی کہ نرم دلی اور رحمدلی کو آپ ﷺ کی شخصیت کا ایک حصہ بنا دیا جائے۔ کیونکہ قوموں کے رہنما سخت مزاج اور تشدد پسند نہیں ہوتے۔ سخت مزاج اور تشدد پسند لوگ وہی ہوتے ہیں جن کی فطرت میں خود غرضی اور سنگدلی کوٹ کوٹ کر بھری گئی ہو۔ ان کی ساری زندگی آسائشوں اور خوشحالیوں سے بھری ہو، انھوں نے کبھی کوئی دکھ اور تکلیف نہ دیکھی ہو۔ لیکن وہ شخص جسے مصائب و تکالیف نے کندن بنا دیا ہو وہ مصیبت زدہ لوگوں کا سب سے زیادہ غمخوار ہوگا اور سب سے بڑھ کر ضرورت مندوں کے کام آئے گا۔ [2]

⑤ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ آپ ﷺ کی شادی سے یہ بات ایک مسلمان پر عیاں ہو جاتی ہے کہ آپ ﷺ کو جسمانی لذتوں کی کوئی فکر نہ تھی۔ اگر آپ دیگر نوجوانوں کی طرح صرف تسکینِ جسم و جاں کے رسیا ہوتے تو پھر کسی کم عمر عورت کی خواہش کرتے اور بڑی عمر کی عورت سے کبھی شادی نہ کرتے۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے شادی کا پیغام اس لیے قبول کیا کیونکہ وہ اپنے خاندان میں عزت و شرافت اور اعلیٰ مرتبے کی حامل تھیں اور زمانۂ جاہلیت میں انھیں عفیفہ و طاہرہ (پاکدامن و پاکباز) کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

⑥ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے نبی کریم ﷺ کی شادی نے مستشرقین اور سیکولر قسم کے اسلام دشمنوں کی زبانیں بند کر دی ہیں اور ان کے قلموں کو لگام دی ہے جنھوں نے یہ سمجھا تھا کہ ہم آپ ﷺ کی زیادہ شادیوں کو موضوع بنا کر پیغمبر ﷺ پر ایک کاری وار کر سکتے ہیں۔

---

1 جامع الترمذي، حديث: 2398، وسنن ابن ماجه، حديث: 4023. 2 فقه السيرة للغزالي، ص: 78.

انھوں نے (نعوذ باللہ) نبی کریم ﷺ کو ایک شہوت پرست شخص کے روپ میں پیش کیا جو اپنی ذات اور خواہشات میں ڈوبا ہوا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جاہلی معاشرے میں بھی اپنی زندگی کے شب و روز نہایت پاکباز شخصیت کے طور پر گزارے۔ آپ ﷺ کے گردو نواح میں ہر قسم کی برائی کے محرکات موجود تھے مگر آپ نے ان کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور پھر ایک ایسی عورت سے شادی کی جو عمر میں آپ سے 15 سال بڑی تھیں اور ان کی رفاقت میں زندگی بسر کرتے رہے۔ ان کے سوا کسی اور کو آنکھوں میں نہ بسایا، حالانکہ مواقع بھی موجود تھے اور ان کا حصول بھی نہایت آسان تھا۔ جوانی کی عمر گزر گئی۔ عمر کا درمیانی حصہ گزار کر بڑھاپے میں داخل ہو گئے لیکن یہ شادی برقرار رہی حتی کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا پینسٹھ سال کی عمر میں اپنے اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ خود نبی کریم ﷺ اپنی عمر کے پچاسویں سال میں داخل ہو چکے تھے۔ اس عرصے میں آپ نے کبھی کسی دوسری عورت کے ساتھ شادی کا سوچا بھی نہیں، جبکہ 20 سے 50 سال کے دورانیے میں کوئی مرد ایک سے زائد شادیوں کی تمنا کرتا ہے۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے اس عمر میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی موجودگی میں کسی اور عورت سے شادی کریں یا لونڈی ہی خرید لیں۔ اگر آپ کی ایسی خواہش ہوتی تو ایک اشارے پر سینکڑوں عورتیں آپ کی زوجیت میں آنے کے لیے تیار تھیں۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے انتقال کے بعد نبی کریم ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور دیگر امہات المومنین سے نکاح کیا۔ ہر نکاح کی ایسی حکمت اور وجہ تھی کہ ایک مسلمان جب ان پر غور کرتا ہے تو اس کے دل میں نبی کریم ﷺ کی عظمت و رفعت بڑھ جاتی ہے اور آپ کے خلق عظیم کا اعتراف مزید پختہ ہو جاتا ہے۔[1]

[1] فقه السيرة للبوطي، ص:54,53.

بیت اللہ کی تعمیر میں رسول اللہ ﷺ کی شرکت

جب محمد رسول اللہ ﷺ کی عمر مبارک پینتیس سال ہوئی تو قریش نے بیت اللہ کی ازسرنو تعمیر کا منصوبہ بنایا کیونکہ اس کا کچھ حصہ جل گیا تھا اور سیلاب کے تسلسل نے بھی اس کی دیواروں کو کمزور کر دیا تھا۔ یہ ابھی تک حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر پر قائم تھا۔ پتھروں کو ایک دوسرے سے جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ اس کی اونچائی انسانی قد و قامت سے کچھ اُونچی تھی۔ قریش اسے گرا کر مزید اونچا کرنا چاہتے تھے (چونکہ اس سے قبل بیت اللہ کی چھت نہیں تھی، اس لیے وہ) اس پر چھت ڈالنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن اسے منہدم کرنے سے گھبراتے اور خوف کھاتے تھے۔ اس پر ولید بن مغیرہ نے کہا کہ میں اسے گرانے کی ابتدا کرتا ہوں۔ اس نے کدال پکڑی اور یہ کہہ کر حجر اسود اور رکن یمانی کا درمیانی حصہ مسمار کر دیا کہ اے اللہ، ہم تجھ سے منحرف نہیں ہوئے، صرف خیر و بھلائی کے ارادے سے یہ کام کر رہے ہیں۔

لوگ رات بھر منتظر رہے کہ اگر ولید بن مغیرہ کسی مصیبت میں مبتلا ہو گیا تو ہم بیت اللہ کا کوئی بھی حصہ نہیں گرائیں گے بلکہ شکستہ دیوار مرمت کر دیں گے۔ اور اگر اسے کچھ نہ ہوا تو یہ اس بات کی دلیل ہو گا کہ اللہ تعالیٰ ہمارے کام پر راضی ہے، چنانچہ صبح سویرے ولید بن مغیرہ نے پھر سے بیت اللہ کی دیواروں کو گرانا شروع کر دیا۔ لوگ بھی اس کے ساتھ شریک ہو گئے اور دیواریں گراتے گراتے سبز رنگ کے پتھروں تک پہنچ گئے جو اُونٹوں کے کوہانوں کے مانند تھے اور ایک دوسرے میں پیوست تھے (بعض مؤرخین نے ان پتھروں کو اساس ابراہیم قرار دیا ہے۔)

قریش نے کام آپس میں تقسیم کر لیے تھے۔ ہر قبیلے کے لیے تعمیر کا ایک حصہ متعین کر دیا گیا تھا۔ قریش کے سردار اور بزرگ پتھر لانے اور لگانے میں شریک رہے۔ نبی کریم ﷺ

نے اور آپ کے چچا عباس بن عبدالمطلب نے بھی تعمیر کعبہ میں شرکت کی۔ آپ دونوں پتھر لاتے تھے۔ حضرت عباس نے آپ ﷺ سے کہا کہ اپنا تہبند اتار کر اپنی گردن پر رکھ لو، تمھاری گردن پتھروں کی وجہ سے زخمی ہونے سے محفوظ رہے گی۔ (آپ نے چچا کی بات مان لی) تو غش کھا کر زمین پر گر گئے۔ آپ کی آنکھیں آسمان کی طرف گڑ گئیں، پھر کچھ دیر بعد افاقہ ہوا تو فرمایا: «إِزَارِي، إِزَارِي» ”مجھے میری چادر دو۔“ پھر آپ ﷺ نے مضبوطی سے اپنی چادر باندھ لی۔[1]

جب حجر اسود کے نصب کا وقت آیا تو قبائل میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ ہر قبیلہ چاہتا تھا کہ اس پتھر کے نصب کرنے کا اعزاز صرف اسے حاصل ہو۔ ممکن تھا کہ اسی وجہ سے ان کے درمیان خونریزی شروع ہو جاتی، ابو امیہ ولید بن مغیرہ نے کہا: ”اے قریش کے لوگو! اپنے اختلاف کو دور کرنے کے لیے اس شخص کو منصف تسلیم کر لو جو اب سب سے پہلے مسجد کے دروازے سے اندر داخل ہو۔ سب اس پر متفق ہو گئے، پھر محمد رسول اللہ ﷺ (مسجد کے دروازے سے اندر) داخل ہوئے، سب نے انھیں دیکھ کر کہا کہ ہم اس امین پر راضی ہیں۔ جب قریش نے آپ کو ساری بات بتائی تو آپ ﷺ نے فرمایا: «هَلُمُّوا ثَوْبًا» ”ایک کپڑا لاؤ۔“ جب کپڑا لایا گیا تو آپ نے اپنے دست مبارک سے حجر اسود کو اس پر رکھ کر فرمایا: «لِتَأْخُذْ كُلُّ قَبِيلَةٍ بِنَاحِيَةٍ مِّنَ الثَّوْبِ، ثُمَّ ارْفَعُوا جَمِيعًا» ”اب ہر قبیلہ اس کپڑے کو ایک جانب سے پکڑ کر اوپر اٹھائے۔“ سب اسے اوپر اٹھا کر اس مقام پر لے آئے جہاں اسے نصب کیا جانا تھا تو آپ ﷺ نے اپنے ہاتھوں سے اسے وہاں نصب فرما دیا، پھر اس پر بقیہ تعمیر کی گئی۔[2]

کعبۃ اللہ کی دیواروں کی بلندی 18 ہاتھ تک کر دی گئی اور اس کا دروازہ زمین سے اس

---

1 صحيح البخاري، حديث: 1582، صحيح مسلم، حديث: 340. 2 المستدرك للحاكم: 459,458/1، والمصنف لعبدالرزاق: 101,100/5، ودلائل النبوة للبيهقي: 57,56/2.

قدر بلند کر دیا گیا کہ بغیر سیڑھی کے اس میں داخلہ ممکن نہ تھا۔ ایک مقصد تو یہ تھا کہ ہر کوئی بیت اللہ میں داخل نہ ہو، قریش جسے چاہیں داخل ہونے کی اجازت دیں۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ سیلاب کا پانی بیت اللہ میں داخل نہ ہو۔ اس کی چھت لکڑی کے چھ ستونوں پر بنائی گئی۔

قریش نے اپنے آپ سے عہد کیا تھا کہ بیت اللہ کی تعمیر میں صرف حلال کمائی استعمال کریں گے۔ بدکاری، سود خوری اور ظلم سے حاصل کردہ مال اس میں خرچ نہیں کریں گے۔ اس مقصد کے لیے جمع شدہ حلال مال اتنا وافر نہ تھا کہ بیت اللہ کی تعمیر اصل بنیاد پر مکمل ہو سکے، لہٰذا انھوں نے کچھ حصہ تعمیر کے بغیر چھوڑ دیا جسے حِجر (حطیم) کہا جاتا ہے اور چھوٹی سی دیوار بنا دی تاکہ اسے بیت اللہ کا حصہ سمجھا جائے۔ (اور طواف کے وقت اس حصے کو بھی شاملِ طواف سمجھا جائے۔)[1]

درس و عبرت اور فوائد: ① بیت اللہ کی اہمیت اور قریش کے ہاں اس کے تقدس کو جاننے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ اس کی تعمیر و تاسیس خود حضرت ابراہیم اور ان کے فرزند حضرت اسماعیل علیہما السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے کی۔ اس طرح یہ ایک اللہ کی عبادت اور توحید کا پہلا مرکز بنا۔

② تاریخی لحاظ سے بیت اللہ کی تعمیر چار مرتبہ ہوئی۔

پہلی مرتبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے تعمیر کیا اور ان کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے ان کی معاونت فرمائی۔

دوسری مرتبہ قریش نے بعثت نبوی سے قبل اس کی تعمیر کی اور اس تعمیر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی شرکت فرمائی۔

تیسری تعمیر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے کی۔ یزید بن معاویہ کے عہد حکومت میں

1 وقفات تربوية مع السيرة النبوية لأحمد فريد، ص: 57، و رسالة الأنبياء لعمر أحمد عمر: 30,29/3.

جب حصین بن نمیر السکونی نے مدعی خلافت حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کا محاصرہ کیا تھا تو اس دوران بیت اللہ کا کچھ حصہ جل گیا، پھر عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے اس کی تعمیر فرمائی۔

چوتھی تعمیر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی شہادت کے بعد عبدالملک بن مروان کے دورِ حکومت میں ہوئی۔ ابن زبیر رضی اللہ عنہما کی تعمیر ختم کر کے کعبے کو دوبارہ اسی بنیاد پر تعمیر کیا گیا جو عہد نبوی میں تھی۔[1]

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے اپنی تعمیر میں بیت اللہ کا وہ حصہ (حطیم) بھی شامل کر لیا تھا جسے قریش نے تعمیر کے بغیر چھوڑ دیا تھا۔ انھوں نے بیت اللہ کی اونچائی دس ہاتھ بڑھا دی تھی اور اس کے دو دروازے بنا دیے تھے، ایک داخل ہونے کے لیے اور دوسرا باہر نکلنے کے لیے۔ انھوں نے یہ سب کچھ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی اس فرمان نبوی کی روشنی میں کیا تھا:

«يَا عَائِشَةُ! لَوْلَا أَنَّ قَوْمَكِ حَدِيثُ عَهْدٍ بِجَاهِلِيَّةٍ، لَأَمَرْتُ بِالْبَيْتِ فَهُدِمَ، فَأَدْخَلْتُ فِيهِ مَا أُخْرِجَ مِنْهُ، وَ أَلْزَقْتُهُ بِالْأَرْضِ، وَ جَعَلْتُ لَهُ بَابَيْنِ، بَابًا شَرْقِيًّا وَّبَابًا غَرْبِيًّا، فَبَلَغْتُ بِهِ أَسَاسَ إِبْرَاهِيمَ»

”اے عائشہ! تیری قوم جاہلیت کو چھوڑ کر تازہ تازہ مسلمان ہوئی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں حکم جاری کرتا کہ بیت اللہ کو گرا کر اس میں وہ حصہ داخل کر دیا جائے جو بغیر تعمیر کے چھوڑ دیا گیا ہے اور میں اس کا دروازہ بلند کرنے کے بجائے زمین کے ساتھ برابر کر دیتا اور میں اس کے دو دروازے بناتا ایک مشرق کی جانب اور ایک مغرب کی جانب اور میں اسے ابراہیم علیہ السلام کی بنیاد پر استوار کرتا۔“[2]

③ حجر اسود کا جھگڑا ختم کرنے کا انداز نہایت عادلانہ و منصفانہ تھا جسے سب نے پسند کیا اور

1 السيرة النبوية للبوطي، ص:58,57. 2 صحيح البخاري، حديث:1586، و صحيح مسلم، حديث:(401)-1333.

اس کی وجہ سے خونریزی اور مہلک جنگ کے خطرات ٹل گئے۔ آپ ﷺ کے فیصلے کے عادلانہ ہونے کی یہ دلیل ہے کہ سب قبائل نے اسے پسند کیا اور ہر قبیلے کو حجر اسود اس کے مقام پر رکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ آپ ﷺ کو یہ توفیق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی تھی جس نے بعثت سے قبل آپ ﷺ کی صحیح رہنمائی فرمائی۔ باب صفا سے آپ ﷺ کا داخل ہونا بھی تقدیر الٰہی کے مطابق تھا تاکہ آپ ﷺ اس مشکل ترین بحران کو حل کریں جو قلوب و اذہان کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ سب نے آپ ﷺ کے فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ آپ ایسے امانت دار تھے کہ نہ کسی پر ظلم کرتے اور نہ بدسلوکی کرتے بلکہ آپ گھروں کے رکھوالے، جانوں کے محافظ اور خون کو تحفظ دینے والے تھے۔[1]

④ بیت اللہ کی تعمیرِ نو کے واقعے نے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ قریشی حلقے میں نبی کریم ﷺ کو کس قدر ادب و احترام حاصل تھا۔[2]

آپ ﷺ کو ایک اعزاز تو یہ حاصل ہوا کہ آپ نے ان کے جھگڑے کو ختم کیا اور قریشی قبائل کے درمیان شروع ہونے والی جنگ کو روک دیا۔ دوسرا اعزاز حجر اسود کو اس کے مقام پر رکھنا تھا جس کے لیے سارے قبائل ایک دوسرے پر بازی لے جانا چاہتے تھے، وہ اعزاز اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمایا۔[3]

⑤ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو بھرپور صلاحیت سے نوازا تھا کہ آپ مشکلات کا آسان حل تلاش کر لیتے تھے۔ یہ چیز آپ ﷺ کی پوری حیات طیبہ میں نظر آتی ہے اور یہ آپ کی رسالت و نبوت کی ایک اہم دلیل ہے۔[4]

⑥ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو عالم شباب میں جاہلیت کی تمام غلاظتوں اور عیوب سے محفوظ رکھا۔ تعمیر کعبہ کے دوران میں پتھر اٹھاتے وقت جب آپ نے (اپنے چچا کے کہنے

---

1 السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 125. 2 السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 1/116.
3 السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 125. 4 الأساس في السنة لسعيد حوّى: 1/145.

پر) اپنی چادر اپنی گردن پر رکھ لی تو غش کھا کر زمین پر گر گئے۔ اس کے بعد کبھی آپ ﷺ بے لباس نہیں ہوئے۔[1]

نبوت محمدیہ کے استقبال کی تیاری

حکمت الٰہی کا تقاضا تھا کہ لوگوں کو آپ ﷺ کی نبوت کے استقبال کے لیے تیار کیا جائے، چنانچہ درج ذیل طریقوں سے لوگوں کو تیار کیا گیا:

حضرت محمد ﷺ کے متعلق انبیاء علیہم السلام کی بشارتیں

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب سے دعا کی تھی کہ عربوں میں انھی میں سے ایک رسول مبعوث فرما تو اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کرتے ہوئے حضرت محمد کریم ﷺ کو مبعوث فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا یوں تذکرہ فرمایا:

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾

''اے ہمارے رب! اور ان لوگوں کے لیے انھی میں سے ایک رسول بھیج، وہ ان کے سامنے تیری آیتیں تلاوت کرے اور انھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور انھیں پاک کرے، بے شک تو ہی غالب، خوب حکمت والا ہے۔''[2]

قرآن حکیم ہمیں بتاتا ہے کہ پہلے انبیاء پر نازل کردہ آسمانی کتابوں میں اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کی بعثت کے بارے میں بشارتیں نازل فرمائیں۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِندَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ﴾

''(یعنی) وہ لوگ جو اس رسول اُمی نبی (محمد ﷺ) کی پیروی کرتے ہیں جس کا

1 صحيح البخاري، حديث: 1582. 2 البقرة 2:129.

ذکر وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں۔"[1]

عیسیٰ علیہ السلام نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت دی جس کا قرآن حکیم نے یوں تذکرہ کیا ہے:

﴿وَ اِذْ قَالَ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۝﴾

"اور جب عیسیٰ ابن مریم نے کہا: اے بنی اسرائیل! بے شک میں تمھاری طرف اللہ کا رسول ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں اس (کتاب) تورات کی جو مجھ سے پہلے ہے اور ایک رسول کی بشارت دینے والا ہوں، وہ میرے بعد آئے گا، اس کا نام احمد ہوگا، پھر جب وہ (رسول) ان کے پاس کھلی نشانیوں کے ساتھ آیا تو وہ بولے: یہ تو کھلا جادو ہے۔"[2]

اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بارے میں بتا دیا تھا اور انھیں حکم دیا تھا کہ اپنی امتوں کو بھی یہ بات بتا دیں کہ اگر وہ (آخری نبی) ان کی زندگی میں مبعوث ہو جائے تو اس پر ایمان لانا اور اس کے نقش قدم پر چلنا ان کے لیے ضروری ہے۔[3] اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَاۤ اٰتَیْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ ؕ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِیْنَ ۝﴾

"اور (یاد کرو) جب اللہ نے تمام نبیوں سے عہد لیا تھا کہ جب میں تمھیں کتاب اور حکمت عطا کروں، پھر تمھارے پاس کوئی رسول آئے جو اس (کتاب) کی

---

1 الأعراف 157:7. 2 الصف 6:61. 3 دراسة تحليلية لشخصية الرسول ﷺ للدكتور قلعجي، ص: 102,101.

تصدیق کرتا ہو جو تمھارے پاس ہے تو تمھیں اس پر ایمان لانا ہوگا اور اس کی مدد کرنی ہوگی۔ اللہ نے فرمایا: کیا تم اقرار کرتے ہو اور اس پر میرا عہد قبول کرتے ہو؟ انھوں نے کہا: ہم نے اقرار کیا۔ اللہ نے فرمایا: تو تم گواہ رہنا اور میں بھی تمھارے ساتھ گواہ ہوں۔"[1]

تورات اور انجیل کے نسخوں میں تحریف ہو چکی ہے اور ان سے اسم محمد ﷺ کی صراحت حذف کر دی گئی ہے، البتہ تورات سَامِرَہ اور انجیل برناباس جو عہد نبوی سے قبل موجود تھیں اور پانچویں صدی عیسوی کے آخر میں ارباب کلیسا نے انھیں ممنوع قرار دے دیا تھا، ان میں یہ صراحت موجود تھی۔ اس کی تائید ان مخطوطوں سے بھی ہوتی ہے جو اب بحیرۂ مردار کے علاقے سے ملے ہیں۔ انجیل برناباس میں ایسی عبارات موجود ہیں جن میں اسم محمد ﷺ کی صراحت ہے، مثلاً: باب:41 میں یہ عبارت موجود ہے:

29۔ اللہ تعالیٰ حجاب میں ہو گیا اور فرشتے میخائیل نے ان دونوں (آدم وحوا) کو جنت سے نکال دیا۔

30۔ جب آدم نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو دروازے پر لکھا ہوا تھا: لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔[2]

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ متواتر روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ اہلِ کتاب حضرت محمد ﷺ کو ان صفات کی وجہ سے پہچانتے تھے جو پہلی کتابوں میں مذکور تھیں، پھر وہ فرماتے ہیں کہ یہ بات بھی کئی واسطوں سے معلوم ہوئی ہے کہ آپ ﷺ سے پہلے انبیاء نے آپ کے بارے میں بشارت دی تھی، مثلاً: وہ کتب جو آج اہل کتاب کے پاس موجود ہیں ان میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے۔ اور جن لوگوں نے اُن (قدیم) کتب کو دیکھا، پھر وہ مسلمان ہوئے یا نہ ہوئے، انھوں نے بھی بتایا کہ ان کتب میں آپ ﷺ

[1] آل عمرٰن 3:81. [2] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 118/1.

کا تذکرہ موجود تھا۔ اور انصار سے یہ بات تواتر کے ساتھ منقول ہے کہ اہل کتاب (یہودی) جو ان کے ہمسائے تھے انھیں بتایا کرتے تھے کہ وہ (نبی) مبعوث ہونے والا ہے، وہ اللہ کا رسول ہوگا اور اس کا ذکر ان کی کتب میں موجود ہے۔ وہ بتایا کرتے تھے کہ ہم اس رسول کا انتظار کررہے ہیں اور یہی بات انصار کے قبول اسلام کا اہم سبب بنی جب انھیں نبی کریم ﷺ نے اسلام کی دعوت دی تو وہ فوراً ایمان لے آئے اور آپ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔[1]

بدری صحابی سیدنا سلمہ بن سلامہ بن وقش رضی اللہ عنہ[2] بیان کرتے ہیں کہ بنوعبدالاشہل کے علاقے میں ہمارا ایک یہودی پڑوسی تھا۔ نبی کریم ﷺ کی بعثت سے کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے کہ وہ اپنے گھر سے نکل کر بنوعبدالاشہل کی مجلس میں آبیٹھا۔ سلمہ بن سلامہ کہتے ہیں کہ میں اس مجلس کے تمام افراد سے کم عمر تھا اور میں ایک چادر اوڑھے صحن میں لیٹا ہوا تھا کہ اس یہودی نے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے، قیامت کے آنے، اعمال کا حساب ہونے، نیز میزان اور جنت وجہنم کا تذکرہ کیا۔ اس کے مخاطب سب کے سب مشرک اور بت پرست تھے۔ ان کا یہ عقیدہ نہ تھا کہ مرنے کے بعد پھر سے زندگی ہوگی۔ تب انھوں نے اس یہودی سے کہا کہ اے فلاں تیرا ستیاناس ہو! کیا تو سمجھتا ہے کہ مرنے کے بعد پھر سے لوگوں کو ایک ایسے جہان میں دوبارہ زندہ کیا جائے گا جہاں جنت بھی ہوگی اور جہنم بھی، وہاں لوگوں کو ان کے اعمال کی جزا وسزا دی جائے گی؟ یہودی نے کہا: ''ہاں، اس ذات کی قسم جس ذات کے نام پر حلف اٹھایا جاتا ہے! میں تو یہ چاہتا ہوں کہ کل قیامت کے دن مجھے اس جہنم سے نجات مل جائے اور اس کے بدلے میں بے شک مجھے اس دنیا میں ایک بہت بڑا تنور تیار کرکے اس میں آگ دہکا کر مجھے اس میں ڈال کر بند کردیا جائے۔''

1 الجواب الصحيح لابن تيمية:340/1. 2 سلمہ بن سلامہ اشہلی رضی اللہ عنہ بیعت عقبہ اولیٰ وثانیہ میں شریک رہے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں یمامہ کا حاکم مقرر کیا۔ انھوں نے 34ھ میں 70 سال کی عمر میں وفات پائی۔(أسد الغابة:523/2)

سب نے تعجب سے پوچھا: ''تم نے جو باتیں بتائی ہیں ان کی کیا نشانی ہے؟'' اس نے مکہ اور یمن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اس علاقے سے ایک نبی مبعوث ہوگا۔ سب نے پوچھا: ''ہم کب اسے دیکھیں گے؟'' یہودی نے میری جانب دیکھا، میں ان سب سے کم عمر تھا اور کہا کہ اگر اس بچے نے اپنی پوری عمر پائی تو ضرور اسے پائے گا۔ سلمہ بن سلامہ کہتے ہیں کہ شب و روز گزرتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا رسول ﷺ بھیج دیا۔ آپ اس وقت ہم میں موجود ہیں۔ ہم آپ علیہ السلام پر ایمان لا چکے ہیں مگر اس یہودی نے ظلم و حسد کا راستہ اختیار کرتے ہوئے نبی ﷺ پر ایمان لانے سے انکار کر دیا۔ ہم نے اس سے پوچھا: ''اے فلاں! تو برباد ہو۔ کیا تو نے ہم سے اس نبی کے بارے میں یہ یہ باتیں نہیں کہی تھیں؟'' اس نے کہا: ''ہاں، کہی تھیں لیکن ہم اس نبی پر ایمان نہیں لا سکتے۔'' [1]

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے زبور کے بعض نسخے دیکھے جن میں حضرت محمد ﷺ کا نام لے کر ان کی صراحت کی گئی تھی، پھر میں نے زبور کا ایک اور نسخہ دیکھا تو اس میں یہ صراحت نہ تھی۔ اس وجہ سے یہ بات کوئی بعید نہیں کہ بعض نسخوں میں نبی کریم ﷺ کے اوصاف موجود ہوں اور بعض میں نہ ہوں۔ [2]

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما تورات میں نبی کریم ﷺ کے اوصاف کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اللہ کی قسم! تورات میں آپ ﷺ کے وہی اوصاف بیان کیے گئے ہیں جو قرآن حکیم میں مذکور ہیں (تورات میں ہے) کہ اے نبی! ہم نے آپ کو شاہد، مبشر، نذیر اور ناخواندہ لوگوں کا محافظ بنا کر بھیجا ہے۔ تو میرا بندہ اور رسول ہے۔ میں نے تیرا نام متوکل رکھا ہے۔ نہ تو بدزبان ہے نہ تندخُو، نہ بازاروں میں چلّانے والا اور نہ برائی کا بدلہ برائی کے ساتھ دینے والا بلکہ معاف اور درگزر کرنے والا ہے۔ جب تک وہ

1 مسند أحمد: 467/3، ودلائل النبوة للبيهقي: 79,78/2، والسيرة النبوية لابن هشام: 226,225/1. 2 الجواب الصحيح لابن تيمية: 340/1.

نبی راہ حق سے بھٹکی ہوئی ملتِ (ابراہیم) کو راہ راست پر نہیں لے آتا اور وہ لا الہ الا اللہ کا اقرار نہیں کر لیتے اور وہ نبی جب تک بصیرت سے محروم آنکھوں، سماعت سے عاری کانوں اور غور وفکر سے بے بہرہ دلوں کو کھول نہیں دیتا، اللہ تعالیٰ اسے اپنے پاس واپس نہیں بلائے گا۔[1]

حضرت کعب احبار رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے خود تورات میں یہ لکھا ہوا دیکھا ہے کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ جو نہ بدزبان ہیں اور نہ تُند خو، نہ بازاروں میں چِلّانے والے اور نہ برائی کا بدلہ برائی سے دینے والے بلکہ وہ معاف اور درگزر کرنے والے ہیں۔ اس کی امت خوگرِ حمد ہوگی۔ وہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کریں گے، ہر بلند جگہ پر اللہ اکبر کہیں گے۔ نصف پنڈلی تک اپنی چادریں رکھیں گے۔ اپنے اعضاء کو پاک و صاف رکھیں گے۔ نماز اور جہاد میں ان کی صف بندی یکساں ہوگی۔ آسمان کی فضاؤں میں ان کی اذان گونجے گی۔ آدھی رات کے وقت (وہ ذکر الٰہی کریں گے اور) ان کے منہ سے نکلنے والی آواز شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح ہوگی۔ مکہ اس نبی کی جائے ولادت ہے۔ طابہ (مدینہ طیبہ) کی طرف وہ ہجرت کرے گا اور شام کے علاقے میں اس کی حکمرانی ہوگی۔[2]

بعثت نبوی کے متعلق علمائے اہل کتاب کی بشارتیں

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اپنے اسلام لانے کے مشہور واقعے میں بیان کرتے ہیں کہ

---

1 صحیح البخاري، حدیث: 2125و4838، و مسند أحمد: 174/2، و دلائل النبوة للبیهقي: 375,374/1. 2 صحیح السیرة النبویة لشیخ إبراهیم العلي، ص: 30، و دلائل النبوة للبیهقي: 377,376/1، کعب بن ماتع حمیری یمانی معروف بہ کعب الاحبار رحمہ اللہ یہودی تھے۔ نبی ﷺ کی وفات کے بعد اسلام لائے۔ عہد عمر رضی اللہ عنہ میں مدینہ آئے، پھر شام چلے گئے، صحابہ کے ساتھ جہاد کیا اور عہد عثمان رضی اللہ عنہ میں حمص میں فوت ہوئے۔ (سیر أعلام النبلاء: 489/3) کعب احبار 34 ھ میں 104 سال کی عمر میں فوت ہوئے۔ (تهذیب التهذیب: 393/8)

جب عَمُّورِیہ[1] کے راہب کی وفات کا وقت قریب آیا تو اس نے مجھ سے کہا کہ اس نبی کے ظہور کا وقت قریب آ گیا ہے جو دین ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ مبعوث کیا جائے گا۔ وہ سرزمین عرب میں پیدا ہو گا اور ایسی زمین کی طرف ہجرت کرے گا جو دو حَرّوں (سیاہ نوک دار پتھریلے علاقوں) کے درمیان واقع ہے۔ ان دونوں حَرّوں کے درمیان کھجوروں کے باغات ہوں گے۔ (یہ مدینہ منورہ کے اوصاف ہیں) اس نبی کی واضح علامتیں یہ ہیں: وہ ہدیہ تو کھائے گا مگر صدقہ نہیں کھائے گا۔ اس کے کندھوں کے درمیان مہر نبوت ہے۔ (اے سلمان!) اگر تم اس علاقے میں جا سکتے ہو تو ضرور جاؤ۔

اس کے بعد حضرت سلمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ وہ کس طرح مدینہ پہنچے اور کیسے انھیں غلام بنا کر فروخت کر دیا گیا، پھر ہجرت کے بعد کس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی ملاقات ہوئی اور انھوں نے کچھ کھانا بطور صدقہ آپ کو پیش کیا مگر آپ نے قبول نہ کیا، پھر کچھ کھانا بطور ہدیہ دیا تو آپ نے تناول فرما لیا، پھر سلمان رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کندھوں کے درمیان مہر نبوت دیکھنے کا تذکرہ کرتے ہیں اور آخر میں ان تمام شہادتوں کو دیکھ لینے کے بعد اسلام قبول کرنے کا واقعہ بیان کرتے ہیں۔[2]

یہودی علماء اور عوام بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے کچھ عرصہ قبل اسی طرح کی باتیں کیا کرتے تھے۔ ابو تَیِّہان (جو یہود کا بہت بڑا عالم، زاہد اور مستجاب الدعوات تھا) شام سے (یثرب) آیا اور بنوقریظہ کے محلے میں آ کر ٹھہرا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے دو سال قبل

---

1 عموریہ: اس تاریخی شہر کے کھنڈر انقرہ (ترکی) کے جنوب میں ''اسرقلعہ'' کے نام سے ملتے ہیں۔ عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید نے 666ء میں عموریہ کو اطاعت پر مجبور کیا مگر پھر عیسائیوں نے یہ شہر چھین لیا۔ دوسری بار 838ء میں معتصم باللہ کے سپہ سالار افشین نے اسے فتح کیا۔ 931ء میں امیر طَرسُوس ثُمل نے عموریہ کو نذر آتش کر دیا۔ (اٹلس سیرت نبوی، دارالسلام، ص: 180) 2 مسند أحمد:5/441-444، والمستدرك للحاكم:3/599-602، و دلائل النبوة للبيهقي:2/83-97، ودلائل النبوة لأبي نعيم، ص: 199، والسيرة النبوية لابن هشام:1/228-234، و السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري:1/122.

فوت ہو گیا۔ جب اس کی وفات کا وقت قریب آیا تو اس نے بنو قریظہ سے کہا: ''اے یہودیوں کی جماعت! تم جانتے ہو کہ شراب و کباب اور عیش و عشرت کی سرزمین شام کو چھوڑ کر میں بھوک و افلاس اور فقر و فاقہ کی سرزمین، یعنی حجاز میں کیوں چلا آیا؟'' سب نے کہا کہ تم ہی بہتر جانتے ہو۔ ابو تیِّہان نے کہا: ''میں اس علاقے میں اس لیے آیا تھا تاکہ اس نبی کا انتظار کروں جس کی بعثت کا زمانہ قریب آ گیا ہے۔ میں اس کی بعثت کا امیدوار تھا تاکہ میں اس کی اتباع کر سکوں۔''

یہ بات یہودیوں اور دوسرے لوگوں میں عام ہو گئی اور علم یقین کے درجے تک پہنچ گئی۔ اس بنیاد پر یہودی اہل مدینہ سے کہا کرتے تھے کہ ایک نبی کی بعثت کا وقت قریب آ گیا ہے۔ ہم اس نبی کی معیت میں تمھیں قوم عاد اور قومِ اِرَم کی طرح قتل کریں گے۔[1]

یہی بات انصار کے قبول اسلام کا سبب بنی۔ انصار کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور ہدایت کے ساتھ ساتھ جس چیز نے ہمیں اسلام کی طرف راغب کیا وہ یہودیوں کی باتیں تھیں۔ ہم تو مشرک اور بت پرست تھے۔ ہمارے پاس وہ علم نہ تھا جو اہل کتاب کے پاس تھا۔ ہمارے اور ان کے درمیان ہمیشہ سے لڑائیاں رہیں۔ جب ہم انھیں کوئی نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو جاتے تو وہ ہم سے کہتے تھے کہ ایک نبی کی بعثت کا وقت قریب آ گیا ہے۔ ہم اس نبی کی معیت میں تمھیں قومِ عاد اور قومِ اِرَم کی طرح قتل کریں گے۔[2]

روم کے بادشاہ ہرقل کو جب نبی کریم ﷺ کا خط ملا تو اس نے بھی کہا تھا کہ مجھے علم تھا کہ اس نبی کا ظہور ہونے والا ہے لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ نبی تم (قریش) میں سے ہوگا۔[3]

---

1 دراسة تحليلية لشخصية الرسولﷺ للدكتور قلعجي، ص: 107. 2 السيرة النبوية لا بن هشام: 231/1. 3 صحيح البخاري، حديث: 7، و صحيح مسلم، حديث: 1773.

لوگوں کی عمومی صورت حال

اس دور کے عربوں کے احوال کی عکاسی کرتے ہوئے مشہور سکالر علامہ ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ چھٹی صدی عیسوی کے وسط میں حالات اس قدر بگڑ چکے تھے اور انسانیت اس مقام تک پہنچ چکی تھی کہ ان کی اصلاح عام قسم کے مصلحین اور معلمین کے بس کی بات نہ تھی کیونکہ معاملہ نہ تو کسی ایک عقیدے کی اصلاح کا تھا نہ کسی عبادت کی ترغیب کا تھا، نہ ان کی کوئی بری عادت چھڑوانے کا تھا اور نہ کسی ایک معاشرے کی اصلاح کا تھا، ایسے کاموں کی تکمیل کے لیے تو ہر جگہ اور ہر زمانے میں مصلحین اور معلمین موجود رہتے ہیں اور یہ کام تسلسل سے ہوتا رہتا ہے۔

اصل مسئلہ اس جاہلیت اور تباہ کن بت پرستی کے خاتمے کا تھا جو نسل در نسل بڑھتی ہوئی ایک طویل عرصے کے بعد اس قدر مضبوط اور عام ہو چکی تھی کہ انبیاء اور رسولوں کی تعلیمات دب کر رہ گئی تھیں اور مصلحین و معلمین کی جدوجہد بے اثر بن چکی تھی۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ ایک ایسی مضبوط، عالی شان، وسیع و عریض عمارت قائم کی جائے جس میں تمام اقوامِ عالم پناہ لے سکیں اور وہ ساری دنیا کو اپنی وسعتوں میں سمیٹ لے۔ اس دور کا اہم قضیہ یہ تھا کہ ایک نئے انسان کو وجود میں لایا جائے جو ہر لحاظ سے قدیم انسان سے مختلف ہو، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿أَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَٰهُ وَجَعَلْنَا لَهُۥ نُورًا يَمْشِى بِهِۦ فِى ٱلنَّاسِ كَمَن مَّثَلُهُۥ فِى ٱلظُّلُمَٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ۚ كَذَٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكَٰفِرِينَ مَا كَانُوا۟ يَعْمَلُونَ ۝﴾

”کیا ایک ایسا شخص جو مردہ تھا، پھر ہم نے اسے زندہ کیا اور ہم نے اس کے لیے نور بنادیا، وہ اس کی روشنی میں لوگوں میں چلتا ہے، (کیا) وہ اس شخص جیسا (ہوسکتا)

ہے جس کا حال یہ ہے کہ وہ اندھیروں میں پڑا ہے، ان سے نکلنے والا نہیں؟ اسی طرح کافروں کے لیے ان کاموں میں کشش رکھی گئی ہے جو وہ کرتے ہیں۔"[1]

اس دور میں کرنے کا کام یہ تھا کہ فساد پیدا کرنے والے جراثیم کا قلع قمع کر دیا جائے۔ بت پرستی کو اس طرح جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے کہ اس کے اثرات بھی باقی نہ رہیں اور انسانی دلوں میں عقیدۂ توحید کو گہرائی اور مضبوطی کے ساتھ اس قدر پختہ کر دیا جائے کہ اس سے زیادہ پختگی کا تصور بھی نہ کیا جا سکتا ہو۔ ان میں رضائے الٰہی کے حصول کا شوق، عبادت الٰہی کی لگن، خدمت انسانی کا جذبہ اور نصرتِ دین کی تڑپ اس قدر پیدا کر دی جائے جو ہر چاہت اور خواہش پہ غالب آ جائے اور ہر مزاحمت کو دور کر دے۔

گویا ضرورت اس امر کی تھی کہ انسانیت جو خودکشی پر تیار تھی اور دنیا و آخرت کی بربادی کی اتھاہ گہرائیوں میں چھلانگ لگانے کے لیے پر تول چکی تھی، اسے اس ہلاکت سے بچا کر ایسے راستے پر چلا دیا جائے جس کا آغاز ایسی سعادت ہے جو صرف حقیقی معرفت اور ایمان رکھنے والوں کو نصیب ہوتی ہے اور اس راستے کا اختتام دائمی جنت پر ہوتا ہے جس کے انعام کا وعدہ خوف الٰہی رکھنے والوں سے کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بات کی عکاسی اور منظر کشی کس قدر عمدہ اور بلیغ انداز میں فرمائی جب قرآن حکیم میں نبی کریم ﷺ کی بعثت کا احسانِ عظیم کی صورت میں تذکرہ فرمایا:

﴿وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ﴾

"اور تم اپنے آپ پر اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، پھر اس نے تمھارے دلوں میں الفت ڈال دی اور تم اس کے احسان سے بھائی (بھائی) بن گئے۔ اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے، پھر اس نے تمھیں

[1] الأنعام 122:6.

اس میں گرنے سے بچا لیا۔"[1]

بعثت سے قبل علامات واشارات نبوت

نبی ﷺ کی نبوت کے بے شمار شواہد ہیں، مثلاً:

(i) بعثت سے قبل پتھر کا آپ علیہ السلام کو سلام کہنا: حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنِّي لَأَعْرِفُ حَجَرًا بِمَكَّةَ كَانَ يُسَلِّمُ عَلَيَّ قَبْلَ أَنْ أُبْعَثَ، إِنِّي لَأَعْرِفُهُ الْآنَ»

"مکہ مکرمہ میں ایک پتھر کو میں جانتا ہوں جو میری بعثت سے قبل مجھے سلام کہا کرتا تھا۔ میں اسے اب بھی پہچانتا ہوں۔"[2]

(ii) سچے خواب دیکھنا: باقاعدہ نزول وحی کے آغاز پر آپ کو سچے خواب دکھائے گئے۔ آپ جو خواب بھی دیکھتے روزِ روشن کی طرح وہ حقیقت کا روپ دھار لیتا۔[3]

(iii) گوشہ نشینی اور خلوت: گوشہ نشینی اور عبادت کے لیے خلوت آپ کا محبوب عمل بنا دیا گیا۔ آپ غار حرا میں گوشہ نشیں ہو جاتے، جو مکہ کے شمال مغرب کی جانب واقع ہے اور کئی کئی راتوں تک عبادت میں مشغول رہتے۔ کبھی دس راتیں کبھی اس سے زیادہ اور کبھی ایک ماہ تک وہاں رہتے،[4] پھر اپنے گھر واپس پلٹ آتے۔ گھر میں بہت کم عرصہ گزارنے کے بعد گوشہ نشینی کے لیے ضروری سامان لیتے اور دوبارہ غار حرا میں تشریف لے جاتے۔ یہ سلسلہ یونہی جاری رہا حتی کہ اسی ایک گوشہ نشینی کے دوران آپ پر پہلی باقاعدہ وحی نازل ہوئی۔[5]

---

1 آل عمرٰن 3:103. 2 صحيح مسلم، حديث:2277، و مسند أحمد:5/89، وجامع الترمذي، حديث:3624. 3 صحيح البخاري، حديث:3، وصحيح مسلم، حديث:160. 4 السيرة الحلبية: 2/12. 5 فقه السيرة للبوطي، ص:60.

حصہ 3

وحی کا نزول اور خفیہ دعوت کا آغاز

باب : 1 رسول اللہ ﷺ پر وحی کا نزول

باب : 2 خفیہ دعوتی سرگرمیاں

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ
عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ
رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ

”درحقیقت اللہ نے ایمان والوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے کہ
اس نے ان کے درمیان خود انہی میں سے ایک رسول بھیجا ہے۔“

(آل عمرٰن 3:164)

باب 1

رسول اللہ ﷺ پر وحی کا نزول

نبی کریم ﷺ کی عمر کے چالیس سال بیت چکے تھے اور آپ غارِ حرا میں گوشہ نشین ہو کر اس کائنات اور اس کے خالق کی معرفت حاصل کرنے کے لیے غور و فکر کیا کرتے تھے۔ غارِ حرا میں آپ کی گوشہ نشینی کئی کئی راتوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ جب سامانِ ضرورت ختم ہو جاتا تو اپنے گھر واپس آ کر مزید راتوں کے لیے ضروری سامان لے جاتے تھے۔[1]

ماہ رمضان کے ایک سوموار کو دن کے وقت حضرت جبریل علیہ السلام پہلی مرتبہ غارِ حرا میں داخل ہوئے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک حدیث نقل کی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ پر نزولِ وحی کے سلسلے کا آغاز حالتِ نیند میں اچھے اچھے خوابوں سے ہوا۔ آپ جو بھی خواب دیکھتے، وہ روزِ روشن کی طرح حقیقت بن جاتا، پھر خلوت و تنہائی کا شوق آپ کے دل میں پیدا کر دیا گیا، چنانچہ آپ غارِ حرا میں خلوت نشین ہو جاتے اور کئی کئی راتیں گھر تشریف لائے بغیر مصروفِ عبادت رہتے۔ ان راتوں کے لیے آپ ضروری سامان ساتھ لے جاتے تھے۔ سامان ختم ہونے پر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس واپس آتے اور اتنے ہی عرصے کے لیے سامانِ ضرورت دوبارہ لے جاتے یہاں تک کہ آپ کے پاس حق آیا۔ آپ اس وقت غارِ حرا میں تھے، یعنی آپ کے پاس فرشتہ آیا اور اس نے کہا:

---

[1] صحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 67.

«اِقْرَأْ، قَالَ: مَا أَنَا بِقَارِئٍ، قَالَ: فَأَخَذَنِي فَغَطَّنِي حَتّٰى بَلَغَ مِنِّي الْجَهْدَ، ثُمَّ أَرْسَلَنِي فَقَالَ: اِقْرَأْ، قُلْتُ: مَا أَنَا بِقَارِئٍ، فَأَخَذَنِي فَغَطَّنِي الثَّانِيَةَ حَتّٰى بَلَغَ مِنِّي الْجَهْدَ، ثُمَّ أَرْسَلَنِي فَقَالَ: اِقْرَأْ، فَقُلْتُ: مَا أَنَا بِقَارِئٍ، فَأَخَذَنِي فَغَطَّنِي الثَّالِثَةَ ثُمَّ أَرْسَلَنِي، فَقَالَ: ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ○ خَلَقَ الْاِنْسٰنَ مِنْ عَلَقٍ ○ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ○ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ○ عَلَّمَ الْاِنْسٰنَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ○﴾

’’پڑھیے! آپ ﷺ نے فرمایا: میں پڑھ نہیں سکتا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: پھر اس نے مجھے پکڑ کر اس زور سے دبایا کہ میری ہمت جواب دے گئی، پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا: پڑھیے! میں نے کہا: میں پڑھ نہیں سکتا، اس نے مجھے دوسری بار زور سے پکڑ کر دبوچا کہ میری ہمت جواب دے گئی، پھر چھوڑ کر کہا: پڑھیے! میں نے کہا: میں پڑھ نہیں سکتا۔ پھر اس نے مجھے تیسری بار پکڑ کر دبوچا، پھر چھوڑ کر کہا: ’’اپنے رب کے نام سے پڑھیے جس نے پیدا کیا، اس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا، پڑھیے اور آپ کا رب بڑا کریم ہے، وہ ذات جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا، اس نے انسان کو وہ علم سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔‘‘ [1]

رسول اللہ ﷺ ان آیات کو سن کر واپس گھر آئے۔ آپ کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ آپ حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا کے پاس پہنچے اور فرمایا: «زَمِّلُونِي، زَمِّلُونِي» ’’مجھے چادر اوڑھا دو، مجھے چادر اوڑھا دو۔‘‘ انھوں نے آپ کو چادر اوڑھا دی یہاں تک کہ آپ کا خوف جاتا رہا، پھر آپ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو تمام واقعہ بتاتے ہوئے فرمایا: «لَقَدْ خَشِيتُ عَلٰى نَفْسِي» ’’مجھے تو اپنی جان کا خطرہ محسوس ہوا تھا۔‘‘ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کہنے لگیں: «كَلَّا أَبْشِرْ! فَوَاللّٰهِ لَا يُخْزِيكَ اللّٰهُ أَبَدًا، إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ

1 العلق 96:1-5.

وَتَصْدُقُ الْحَدِيثَ وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُومَ وَتَقْرِي الضَّيْفَ وَتُعِينُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ» ''قطعاً نہیں۔ اللہ کی قسم! اللہ کبھی آپ کو رسوا نہیں کرے گا۔ آپ تو صلہ رحمی کرنے والے ہیں، دوسروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، تہی دست لوگوں کی ضرورت پوری کرتے ہیں، مہمان کی عزت افزائی کرتے ہیں اور حق کے راستے میں پیش آنے والی تکالیف پر لوگوں کی مدد فرماتے ہیں۔''

پھر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کو اپنے چچا زاد بھائی وَرَقہ بن نوفل بن اسد بن عبدالعُزّیٰ کے پاس لے گئیں۔ ورقہ زمانہ جاہلیت میں عیسائیت اختیار کر چکے تھے۔ وہ عبرانی زبان لکھنا جانتے تھے، اس لیے حسب توفیق انجیل عبرانی زبان میں لکھا کرتے تھے۔ اس وقت وہ بہت بوڑھے تھے اور نابینا ہو چکے تھے۔ ان سے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ''بھائی جان! ذرا اپنے بھتیجے کی بات تو سنیں۔'' ورقہ نے پوچھا: ''بھتیجے تجھے کیا نظر آیا ہے؟'' رسول اللہ ﷺ نے جو کچھ دیکھا تھا بیان فرما دیا۔ اس پر ورقہ نے آپ سے کہا: ''یہ تو وہی ناموس (فرشتہ جبریل) ہے جسے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمایا تھا۔ کاش! میں اس وقت جوان اور طاقتور ہوتا، کاش! میں اس وقت زندہ ہوتا جب آپ کی قوم آپ کو دیس نکالا دے گی۔'' رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: «أَوَ مُخْرِجِيَّ هُمْ» ''کیا یہ لوگ مجھے (یہاں سے) نکال دیں گے؟'' ورقہ نے کہا: ''ہاں، جب بھی کوئی شخص اس طرح کا پیغام (رسالت) لایا جیسا تم لائے ہو تو اس سے ضرور دشمنی کی گئی۔ اگر مجھے تیرا زمانہ حاصل ہوا تو میں تیری زبردست مدد کروں گا۔'' پھر ورقہ جلد ہی فوت ہو گئے اور وحی (کچھ عرصے کے لیے) رک گئی۔[1]

جب ہم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث کو بنظر غائر دیکھتے ہیں تو اس سے بہت سے ایسے امور مستنبط ہوتے ہیں جن کا نبی ﷺ کی سیرت کے ساتھ گہرا تعلق ہے، مثلاً:

1 صحيح البخاري، حديث: 3 و 4953.

اچھے خواب

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کے سلسلے کا آغاز اچھے خوابوں سے ہوا جنھیں سچے خواب بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس سے مراد عمدہ قسم کے مناظر ہیں جنھیں دیکھنے سے انشراح صدر ہو (سینہ قبولِ حق کے لیے کشادہ ہو جائے) اور روحانی تزکیہ حاصل ہو۔[1]

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا آغاز حالتِ نیند میں خوابوں کے ساتھ کیا۔ اس میں یہ حکمت بھی ہو سکتی ہے کہ اگر خوابوں کے ساتھ آغاز نہ کیا جاتا بلکہ فرشتہ اچانک آپ کے پاس آتا جبکہ اس سے پہلے آپ نے کسی فرشتے کو نہ دیکھا تھا تو آپ کو ایسی گھبراہٹ ہوتی کہ فرشتے سے وحی وغیرہ اخذ نہ کر سکتے، اس لیے حکمتِ الٰہی کا تقاضا یہ تھا کہ وحی کی ابتدا نیند کی حالت میں خوابوں کے ساتھ ہوتا کہ وحی اخذ کرنے کی آپ کو مشق ہو جائے اور آپ اس سے مانوس ہو جائیں۔[2]

اچھے اور سچے خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہوتے ہیں جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے:

«اَلرُّؤْيَا الْحَسَنَةُ مِنَ الرَّجُلِ الصَّالِحِ جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَّأَرْبَعِينَ جُزْءًا مِّنَ النُّبُوَّةِ»

''نیک آدمی کو آنے والا اچھا خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے۔''[3]

اہل علم کا قول ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اچھے خوابوں کی رؤیت کا سلسلہ چھ ماہ تک جاری رہا۔ امام بیہقی نے بھی یہ بات بیان کی ہے۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ نیند کی حالت میں قرآن نازل نہیں ہوا بلکہ سارے کا سارا قرآن حالت بیداری میں نازل ہوا۔

اچھے خواب اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس دنیاوی زندگی میں بشارت کا ذریعہ ہیں۔

---

[1] طريق النبوة والرسالة لحسين مؤنس، ص:21. [2] منامات الرسول لعبد القادر الشيخ إبراهيم، ص: 57. [3] صحيح البخاري، حديث: 6983، و سنن ابن ماجه، حديث: 3893، و مسند أحمد: 126/3.

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

«أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّهُ لَمْ يَبْقَ مِنْ مُّبَشِّرَاتِ النُّبُوَّةِ إِلَّا الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ، يَرَاهَا الْمُسْلِمُ أَوْ تُرٰى لَهُ»

''اے لوگو! نبوت کی خوشخبریوں میں سے صرف اچھا خواب ہی باقی رہ گیا ہے جسے مسلمان دیکھ لیتا ہے یا (کسی کے لیے) اسے دکھا دیا جاتا ہے۔''[1]

نزول وحی سے پہلے، نبی کریم ﷺ غار حرا میں بڑے خوبصورت خواب دیکھتے تھے۔ جب بیدار ہوتے تو انشراح صدر (قبول حق کے لیے سینہ کی کشادگی) جیسی دولت سے مالا مال ہوتے اور زندگی کے حسن و جمال سے بہرہ ور ہونے کے لیے آپ کا نفس تیار ہوتا۔[2]

آغاز وحی کے بارے میں مروی تمام روایات اس بات پر متفق ہیں کہ نبی کریم ﷺ پر نزول وحی کے سلسلے کا آغاز اچھے خوابوں سے ہوا جو آپ نیند کی حالت میں دیکھتے مگر بیدار ہونے پر وہ حقیقت بن کر سامنے آجاتے۔ اس میں ذرہ بھر تغیر و تبدل نہ ہوتا۔ کوئی بات نہ بھولتی گویا وہ آپ کے دل و دماغ پر نقش ہو جاتی تھی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جن کا شمار فصحائے عرب میں ہوتا ہے، انھوں نے نبی کریم ﷺ کے خوابوں کی صداقت اور ان کے حقیقت بن جانے کی تشبیہ اس انداز میں بیان کی ہے کہ عرب دنیا اپنی فصاحت کی معراج پر پہنچ جانے کے باوجود اس سے بلیغ تشبیہ پیش نہیں کر سکتی۔ عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس طرح تشبیہ دی کہ جب صبح کی روشنی پھیلتی ہے تو ہر قسم کی تاریکی دم توڑ دیتی ہے اور ہر چیز کی حقیقت واشگاف ہو جاتی ہے، اسی طرح جب آپ ﷺ نیند سے بیدار ہوتے تو آپ کا دیکھا ہوا خواب روز روشن کی طرح ایک حقیقت بن کر سامنے آجاتا۔[3]

---

1 صحيح مسلم، حديث: 479، و سنن أبي داود، حديث: 876، و سنن ابن ماجه، حديث: 3899، وسنن النسائي، حديث: 1046، ومسند أحمد: 219/1. 2 طريق النبوة والرسالة لحسين مؤنس، ص: 22. 3 محمد رسول الله ﷺ لصادق عرجون: 254/1.

غارحرا میں گوشہ نشینی

نبوت سے کچھ عرصہ قبل نبی کریم ﷺ کے دل میں خلوت اور گوشہ نشینی کا شوق پیدا کر دیا گیا تاکہ آپ ﷺ کا دل، دماغ اور روح نبوت کی اس عظیم ذمہ داری کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائے جو عنقریب آپ کے سپرد کی جانے والی تھی۔ آپ ﷺ نے گوشہ نشینی کے لیے غار حرا کا انتخاب کیا تاکہ زندگی کی مشغولیات ترک کر کے اور مخلوق سے الگ رہ کر اپنی فکری قوتوں، روحانی جذبات، دلی احساسات اور عقل و شعور کو یکجا کر سکیں اور کائنات کے بے مثال خالق و موجد سے مناجات کے لمحات میسر آ سکیں۔[1]

غار حرا جہاں حبیب کبریا ﷺ بار بار تشریف لے جاتے تھے وہ ایک ایسی جگہ تھی جو غور و خوض کے لیے نہایت مناسب تھی۔ غار میں کھڑے ہوں تو حدِ نگاہ تک پہاڑ ہی پہاڑ نظر آتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ عظمتِ الٰہی کے سامنے جھکے ہوئے اور سجدہ ریز ہیں یا پھر صاف و شفاف آسمان نظر آتا ہے۔ ایک تیز نگاہ رکھنے والا شخص غار حرا میں کھڑے ہو کر مکہ کا نظارہ بھی کرسکتا ہے۔[2]

نبی کریم ﷺ کے دل میں گوشہ نشینی کا شوق پیدا ہونا، ایک مخصوص قسم کی تیاری کا انداز تھا تاکہ آپ کا دل بشری اور مادی آلودگیوں سے پاک ہو کیونکہ آپ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ رب ذوالجلال کی خاص تربیت اور رہنمائی میں گزر رہا تھا۔ نبوت سے قبل آپ کی عبادت کا اسلوب یہ تھا کہ آسمانوں کی عظیم، زبردست اور بے مثال بادشاہت پر غور و فکر کرتے اور کائنات کی ایسی نشانیوں پر تدبر فرماتے جو اس بات کی دلیل تھیں کہ ان کا خالق بے نظیر کاریگری کا مالک ہے، اس کی قوت و قدرت بھی عظیم ہے اور تدبیر و تنظیم بھی نہایت مضبوط ہے اور وہ نہایت خوش اسلوبی سے اپنے امور کو انجام دینے والا ہے۔[3]

1 محمد رسول اللہ ﷺ لصادق عرجون:254/1. 2 السيرة النبوية لأبي شهبة:256/1. 3 محمد رسول اللہ ﷺ لصادق عرجون:469/1.

یہی وجہ ہے کہ بعض وعظ و ارشاد والے لوگ خلوت اختیار کرتے ہیں جس میں وہ ذکرِ الٰہی اور عبادت کا خاص اہتمام کرتے ہیں تا کہ ان کا دل منور ہو، دل کی ساری تاریکیاں ختم ہو جائیں اور وہ غفلت و شہوت اور بے راہ روی سے پاک ہو جائیں۔

نبی کریم ﷺ کی سنت ہے کہ وہ ماہ رمضان میں اعتکاف کیا کرتے تھے۔[1] ہر مسلمان کو اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ خواہ وہ حکمران ہو یا سیاستدان، عالم ہو یا تاجر تا کہ وہ ان آلودگیوں سے پاک و صاف ہو جائے جو دل و دماغ میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ہمیں اپنے حالات و واقعات کو کتاب و سنت کی روشنی میں درست کرنا چاہیے اور اس سے قبل کہ ہمارا محاسبہ ہو ہمیں خود اپنا محاسبہ کر لینا چاہیے۔

دعوتی امور کے دانشوروں کے لیے ضروری ہے کہ وہ کچھ وقت نکال کر سوچ بچار کریں کہ دعوتی کام کی کیا صورتِ حال ہے، کہاں کام میں تیزی ہے اور کہاں کمزوری؟ پھر ان عوامل کا جائزہ لینا چاہیے جو دعوتی امور میں خلل کا باعث بنتے ہیں۔

معاشرتی حالات سے بھی واقفیت حاصل کرنی چاہیے کہ معاشرے میں کیا خرابیاں ہیں اور کون سی خوبیاں ہیں؟ مخصوص حالات میں گوشہ نشینی اختیار کر لینے میں بھی کوئی حرج نہیں، خاص طور پر ان حالات میں جب بگاڑ عام ہو جائے، دنیا ہی کو ہر جگہ ترجیح دی جانے لگے اور نفس پرستی لوگوں کا نصب العین بن جائے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ گوشہ نشینی میں اچھے پہلو ملحوظ رکھے جائیں اور منفی پہلوؤں سے کنارہ کشی اختیار کی جائے اور پھر وہی اسلوب اختیار کیا جائے جو حق ہو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس بیان: ''آپ ﷺ کئی راتوں تک گوشہ نشینی اختیار کرتے تھے۔'' کی تشریح میں علامہ شیخ محمد عبداللہ دراز فرماتے ہیں کہ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ راتیں نہ تو بہت تھوڑی ہوتی تھیں اور نہ بہت زیادہ۔ اور میانہ روی کا یہ انداز جو

1 الأساس في السنة لسعيد حوّى: 1/195.

آپ نے بعثت سے قبل اختیار کیا تھا بعثت کے بعد بھی ہمیشہ سے ملت اسلامیہ کا شعار اور سیرت نبویہ کا نشان رہا ہے۔[1]

غار حرا میں حق کی آمد

غار حرا میں آپ ﷺ کے پاس جبریل علیہ السلام آئے اور کہا کہ پڑھیے! تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں پڑھ نہیں سکتا۔'' آپ فرماتے ہیں کہ جبریل نے مجھے تین بار معانقہ کرتے ہوئے دبوچا، پھر قرآن کی سب سے پہلی نازل ہونے والی آیات کی تلاوت فرمائی۔

قرآن کریم کی سب سے پہلی نازل ہونے والی بابرکت آیات کریمہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کی پیدائش کا آغاز خون کے ایک لوتھڑے سے ہوتا ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی کرم نوازی ہے کہ اس نے انسان کو وہ علم عطا کیا جو وہ نہیں جانتا تھا۔ اسے علم کی وجہ سے شرف وکرامت عطا کی اور اسی بنیاد پر حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں پر امتیاز حاصل ہوا۔ علم بسا اوقات اذہان میں ہوتا ہے، کبھی گفتگو میں اور کبھی ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریروں میں ہوتا ہے۔[2]

انھی آیات کے ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا آغاز ہوا۔ یہ نہایت عظیم واقعہ تھا۔ سید قطب اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''یہ ایک بہت عظیم واقعہ تھا، اتنا عظیم کہ جس کی کوئی حد نہ ہو۔ ہم اس کی عظمت بیان کرنے کی جس قدر بھی کوشش کریں اس کا احاطہ نہیں کر سکتے کیونکہ اس کے بے شمار پہلو تو ایسے ہیں جو ہمارے تصور سے بھی بالا ہیں۔ یقیناً یہ واقعہ اپنی حقیقت کے لحاظ سے بھی عظیم ہے اور اپنی ہدایت و رہنمائی کے لحاظ سے بھی اور اس لحاظ سے بھی بہت عظیم ہے کہ انسانی زندگی پر اس کے بے شمار اثرات مرتب ہوئے۔ وہ لمحہ جس میں یہ واقعہ رونما ہوا، بلا مبالغہ اس زمین کی طویل ترین تاریخ کا عظیم ترین لمحہ تھا۔ اس عظیم لمحے میں رونما ہونے والے واقعے کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ذات جس کے جاہ وجلال کی کسی کو تاب نہیں، جس کی عظمت مخلوق کے عقل وشعور سے بہت بالا

1 المختار من كنوز السنة لمحمد عبدالله دراز، ص: 19. 2 تفسیر ابن كثير: 4/528.

ہے، جو ایسی ہیبت کا مالک ہے کہ کوئی اس کے سامنے دم نہیں مار سکتا جو اس قدر زبردست ہے کہ اس کے سامنے کسی کی کوئی مجال نہیں، جو اتنا بڑا ہے کہ اس کے سامنے ہر چیز ہیچ ہے، جو تمام خزانوں اور بادشاہتوں کا حقیقی مالک ہے، اس نے انسان نامی مخلوق کو اپنی مہربانیوں میں لینا چاہا۔ وہ انسان جو کائنات کے اس گوشۂ زمین میں چھپا ہوا تھا، اللہ نے اسے عزت عطا کی اور ان میں سے ایک فرد (آخری نبی ﷺ) کا انتخاب کیا تاکہ وہ نور الٰہی کا مرکز، اس کی حکمتوں کا خزینہ اور اس کے کلام کے لیے جائے نزول بن جائے اور اس کے ذریعے سے ان انعامات کی تکمیل کرے جو وہ اپنی اس مخلوق کو عطا فرمانا چاہتا ہے۔''[1]

پہلی وحی نے قلم کی شان اور اہمیت کو بلند کیا اور واضح کیا کہ اقوام وملل کی تعمیر میں علم کا بہت بڑا کردار ہے اور یہ حقیقت بھی واشگاف کر دی کہ انسان کی سب سے بڑی خوبی اور خصوصیت علم ومعرفت ہے۔ اس عظیم واقعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں علم کا کیا مقام ومرتبہ ہے۔ نبوت ملنے پر سب سے پہلا کلمہ جو رسول اللہ ﷺ تک پہنچا، وہ پڑھنے کا حکم تھا۔ اسلام نے ہمیشہ علم کی ترغیب اور اس کے حاصل کرنے کا حکم دیا۔ اہل علم کا مقام بلند کیا اور انھیں دوسروں پر فوقیت عطا کی۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ﴾

''تم میں سے جو ایمان لائے ہیں اور جنھیں علم دیا گیا ہے، اللہ ان کے درجات بلند کرتا ہے۔''[2]

اور اللہ تعالیٰ کا یہ بھی فرمان ہے:

﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ ۝﴾

1 تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب:6/3936. 2 المجادلة 11:58.

''کیا جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے، برابر ہو سکتے ہیں؟ بس عقل والے ہی نصیحت پکڑتے ہیں۔'' [1]

فائدہ مند علم وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہے۔ اسی نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا اور انسان کو وہ کچھ سکھا دیا جو وہ نہیں جانتا تھا۔ جب سے انسانیت نے حصول علم کا یہ راستہ ترک کر دیا اور اس کا علم منہج الٰہی کی حدود و قیود سے آزاد ہو گیا، تب سے اس کا علم انسانیت کی تباہی و بربادی کا سبب بن گیا۔ [2]

وحی کی کیفیت اور نزول وحی کی شدت

پہلی وحی کے موقع پر جبریل علیہ السلام نے نبی کریم ﷺ کو بار بار دبوچا یہاں تک کہ آپ نے اس سے مشقت و تکان محسوس کی۔ اس کے بعد بھی آپ نزول وحی کی وجہ سے شدت، تکان اور تکلیف برداشت کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ۝ ﴾

''یقیناً ہم جلد آپ پر ایک بھاری بات ڈالیں گے۔'' [3]

یقیناً ایسا کرنے میں بہت عظیم حکمتیں ہیں، مثلاً: اس دین کی اہمیت وعظمت کو اور اس کے حصول کے لیے جو خصوصی اہتمام کیا گیا اسے واضح کرنا مقصود تھا اور امت کو یہ بتانا بھی تھا کہ جس دین کی نعمتوں سے وہ بہرہ ور ہو رہی ہے، وہ بڑی محنت و مشقت کے بعد حاصل ہوا ہے۔ [4]

فطری قوانین اور طریقوں سے ہٹ کر وحی کا نزول ایک معجزہ ہے جس کے ذریعے سے نبی کریم ﷺ نے کلامِ الٰہی، یعنی قرآن مجید کو جبریل امین علیہ السلام کی وساطت سے حاصل کیا۔ وحی کا قلبی غور وفکر یا داخلی احساسات سے بھی کوئی تعلق نہیں۔ یہ آپ ﷺ کی ذات گرامی

1 الزمر 9:39. 2 الوحي و تبليغ الرسالة للدكتور يحيىٰ اليحيىٰ، ص: 34. 3 المزمل 5:73.
4 الوحي و تبليغ الرسالة للدكتور يحيىٰ اليحيىٰ، ص: 31,30.

سے ایک الگ چیز تھی جو آپ کو عطا کی گئی۔ آپ ﷺ کی ذمہ داری صرف یہ تھی کہ وحی کو محفوظ کریں اور اسے امت تک پہنچائیں۔ وحی کی تفسیر و تشریح نبی کریم ﷺ کے اپنے اسلوب کے ساتھ ہوتی رہی جیسا کہ آپ ﷺ کی احادیث و اقوال سے ظاہر ہوتا ہے۔[1]

وحی وہ بنیاد ہے جس پر دین کے تمام حقائق، مثلاً: عقائد، شرعی احکام، اخلاق وغیرہ کا انحصار ہے۔ اسی وجہ سے مستشرقین اور ان کے پیشرو ملحدین وحی کی حقیقت پر تنقید کرتے اور اس کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے وحی کی اس حقیقت میں تاویل و تحریف کرنے کی کوشش کی جو ہمیں صحیح احادیث سے معلوم ہوئی اور جسے ثقہ محدثین نے بیان کیا۔ کسی نے کہا کہ محمد ﷺ نے اسلام کے نظریات اور قرآن حکیم کو بَحیرا راہب سے سیکھا۔ کسی نے کہا کہ آپ (معاذ اللّٰہ) اعصابی مریض (جلد غصہ میں آنے والے) تھے یا آپ کو مرگی کا مرض تھا، جبکہ حقائق یہ بتاتے ہیں کہ محمد ﷺ غارِ حرا میں تھے۔ اچانک جبریل علیہ السلام آپ کے سامنے آئے۔ آپ نے انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھا اور جبریل علیہ السلام آپ سے کہہ رہے تھے کہ پڑھیے۔[2]

اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وحی کا تعلق نبی ﷺ کے ذاتی خیالات و تصورات اور دلی احساسات و وساوس سے نہیں تھا بلکہ یہ آپ ﷺ کی ذات گرامی سے ایک الگ چیز تھی جو آپ کے سامنے پیش کی گئی اور آپ نے اسے قبول کیا۔ اس کا تعلق آپ کے دلی اور اندرونی احساسات کے ساتھ نہیں تھا۔

جبریل امین کا آپ ﷺ کو تین بار دبوچنا اور پھر چھوڑ دینا اور ہر بار کہنا کہ پڑھیے، اس حقیقت کو واشگاف کرتا ہے کہ وحی ایک خارجی چیز تھی جو آپ کو عطا کی گئی اور یہ اس باطل نظریے کا ردّ کرتا ہے کہ یہ سب کچھ ایک وہم تھا، اندرونی وسوسے تھے اور اس کی کوئی حقیقت نہ تھی۔

1 السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 129/1. 2 فقه السيرة للبوطي، ص: 64.

نبی کریم ﷺ نے جب جبریل علیہ السلام کو دیکھا اور وحی سنی تو آپ پر خوف اور ہیبت طاری ہوگئی تھی اور کانپتے دل کے ساتھ آپ جلدی جلدی گھر واپس آئے۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ آپ اس رسالت کا کوئی شوق نہیں رکھتے تھے جس کی تبلیغ کی ذمہ داری آپ کے کندھوں پر رکھی جانے والی تھی۔[1]

اسی مفہوم کی تائید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ مَا كُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ﴾

"آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے؟ لیکن ہم نے اسے نور بنا دیا، ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہیں راہ دکھاتے ہیں۔"[2]

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَیْهِمْ اٰیَاتُنَا بَیِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَاۤ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤى اِلَیَّ ۚ اِنِّیْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ۝﴾

"اور جب ان پر ہماری واضح آیتیں تلاوت کی جاتی ہیں تو وہ لوگ، جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے، کہتے ہیں: تو اس کے سوا کوئی (دوسرا) قرآن لے آ، یا اسے (کچھ) بدل دے۔ کہہ دیجیے: مجھے اختیار نہیں کہ میں اسے اپنی طرف سے بدل دوں۔ میں تو اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے، بے شک اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے (سخت) دن کے عذاب سے ڈر لگتا ہے۔"[3]

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی صحیح حدیث کے سامنے وحی کو مشکوک قرار دینے والوں کی آراء کی

1 فقه السيرة للبوطي، ص: 64. 2 الشورىٰ 52:42. 3 يونس 15:10.

کوئی حیثیت نہیں۔ اس کے بعد مسلسل وحی نازل ہوتی رہی اور ایسے دلائل سامنے آتے رہے جنھوں نے وحی کی حقیقت کو واضح کر دیا اور ان لوگوں کے اقوال کو باطل قرار دیا جو وحی کی حقیقت کو مشکوک بنانا چاہتے تھے۔ دکتور بوطی نے ان دلائل کا اس طرح تذکرہ کیا ہے:

① نبی کریم ﷺ نزول قرآن کے فوراً بعد اسے تحریر کرنے کا حکم فرماتے تھے، جبکہ حدیث کے لیے صرف صحابۂ کرام کے حافظے میں محفوظ رہنے پر ہی اکتفا کرتے تھے۔ یہ اس لیے نہیں کہ حدیث محض آپ ﷺ کا کلام ہے اور اس کا نبوت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اس لیے کہ قرآن حکیم کے الفاظ اور حروف حضرت جبریل علیہ السلام کی وساطت سے آپ تک پہنچائے گئے تھے، جبکہ حدیث کا مفہوم اگرچہ منجانب اللہ ہوتا تھا لیکن اس کے الفاظ اور ترتیب نبی کریم ﷺ کی تھی، اس لیے آپ ﷺ مکمل احتیاط برتتے تھے کہ اللہ کا کلام جو حضرت جبریل علیہ السلام کے ذریعے آپ تک پہنچا، وہ آپ ﷺ کے اپنے کلام کے ساتھ ملنے نہ پائے۔

② بعض اوقات آپ ﷺ سے کسی چیز کے بارے میں سوال کیا جاتا تھا لیکن آپ فوراً جواب نہیں دیتے تھے بلکہ کئی کئی دن گزر جاتے۔ جب اس کے بارے میں قرآن کی کوئی آیت نازل ہوتی، پھر آپ اس کا جواب دیتے اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ آپ ﷺ کسی معاملے میں کوئی طرزِ عمل اختیار فرماتے مگر قرآنی آیات کے نزول کے بعد آپ کو اپنا طرز عمل تبدیل کرنا پڑتا۔ اور بعض اوقات ان آیات میں تنبیہ کا پہلو بھی موجود ہوتا تھا۔

③ رسول اللہ ﷺ نے کسی بھی انسان کے سامنے زانوئے تلمُّذ تہ نہیں کیے تھے اور یہ ناممکن ہے کہ کوئی انسان محض مکاشفے ہی سے تاریخی حقائق معلوم کر سکے، مثلاً: حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعات، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا نومولود کو دریا کے حوالے کرنا اور فرعون کے واقعات کا بیان کرنا۔ یہ سب اس بات کے دلائل ہیں کہ آپ نے یہ کسی سے پوچھ کر یا سُن کر بیان نہیں کیے بلکہ ایسا صرف وحی کے ساتھ ہی ممکن تھا۔ رب ذوالجلال فرماتے ہیں:

﴿وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ﴾

''اور آپ اس (قرآن) سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے دائیں ہاتھ سے اسے لکھتے تھے، (اگر ایسا ہوتا) تب تو باطل پرست یقیناً شک کر سکتے تھے۔''[1]

④ نبی کریم ﷺ کا اپنی قوم کے ساتھ چالیس سال تک راست گوئی سے کام لینا اور ''صادق'' کے طور پر قوم میں معروف ہونا اس بات کا متقاضی تھا کہ آپ اپنی ذات کے بارے میں بھی سچائی اور راست گوئی سے کام لیتے اور وحی کے متعلق آپ کو کسی قسم کا کوئی شک نہ تھا، نہ فکری طور پر اور نہ بصری طور پر۔ اگر پہلی وحی کے نزول کے بعد آپ کو اس بارے میں کوئی تردّد تھا بھی تو اس آیت نے اسے ختم کر دیا:

﴿فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ فَسْــَٔلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ﴾

''پھر اگر آپ (اس کتاب کے متعلق) شک میں ہوں جو ہم نے آپ کی طرف نازل کی ہے تو ان لوگوں سے پوچھیے جو آپ سے پہلے کتاب پڑھتے ہیں، یقیناً آپ کے پاس آپ کے رب کی طرف سے حق آ گیا ہے، لہٰذا آپ شک کرنے والوں میں سے نہ ہوں۔''[2]

اور یہ مروی ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «لَا أَشُكُّ وَ لَا أَسْأَلُ» ''نہ تو میں شک کرتا ہوں اور نہ میں (کسی سے کچھ) پوچھوں گا۔''[3]

[1] العنکبوت 48:29. [2] یونس 94:10. [3] المصنف لعبد الرزاق: 126,125/6، حدیث: 10211، والدرالمنثور للسیوطي: 389/4. یہ حضرت قتادہ کی مرسل روایت ہے۔ صاحب کتاب نے زیرِ نظر آیت کے مرجوح معنی مراد لیے ہیں۔ جمہور مفسرین نے اس آیت کے یہ معنی لیے ہیں کہ یہ خطاب نبی کریم ﷺ کے واسطے سے عام انسانوں سے ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کو تو وحی کے متعلق کوئی شک ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ (مترجم)

وحی کی اقسام

علماء نے وحی کی درج ذیل اقسام بیان کی ہیں:

① سچے خواب: اسی سے سلسلۂ وحی کا آغاز ہوا۔ آپ جو خواب بھی دیکھتے وہ روشن صبح کی طرح حقیقت کا روپ دھار لیتے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: «رُؤْيَا الْأَنْبِيَاءِ وَحْيٌ» ''انبیاء کے خواب وحی ہوتے ہیں۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول یوں نقل فرمایا: ﴿يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ﴾ ''اے میرے پیارے بیٹے! بے شک میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے یقیناً ذبح کر رہا ہوں۔''[2]

② الہام: الہام کے معنی یہ ہیں کہ فرشتہ اپنا آپ دکھائے بغیر نبی کے دل میں کوئی بات ڈال دے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''بے شک روح القدس، یعنی جبریل علیہ السلام نے میرے دل میں یہ بات ڈالی کہ کسی نفس کو اس وقت تک موت نہیں آئے گی جب تک وہ اپنا رزق مکمل طور پر حاصل نہیں کر لیتا اور اپنی زندگی پوری نہیں کر لیتا، اس لیے اللہ سے ڈرتے رہو اور حصولِ رزق کے لیے عمدہ (جائز) طریقہ اختیار کرو۔''[3]

③ صدائے جَرَس کی طرح وحی کا نزول: جس طرح گھنٹی کی آواز زور دار ہوتی ہے اسی صورت میں وحی کی آواز بھی نہایت زور دار ہوتی تھی۔ یہ وحی کی سب سے سخت صورت تھی جیسا کہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ آپ پر وحی کیسے نازل ہوتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَحْيَانًا يَأْتِينِي مِثْلَ صَلْصَلَةِ الْجَرَسِ وَ هُوَ أَشَدُّهُ عَلَيَّ، فَيُفْصَمُ عَنِّي وَ قَدْ وَعَيْتُ عَنْهُ مَا قَالَ وَ أَحْيَانًا يَتَمَثَّلُ لِيَ الْمَلَكُ رَجُلًا

---

1 المستدرك للحاكم:432/2. 2 الصّٰفّٰت 102:37. 3 شرح السنة للبغوي:304/13، والتمهيد لابن عبد البر:284/1.

فَيُكَلِّمُنِي، فَأَعِي مَا يَقُولُ»

''کبھی کبھی گھنٹی کی آواز کی طرح ہوتی ہے اور یہ میرے لیے شدید ترین صورت ہوتی ہے۔ نزول وحی کی یہ کیفیت جب ختم ہوتی ہے تو وحی مجھے یاد ہو چکی ہوتی ہے اور کبھی فرشتہ انسانی شکل میں میرے پاس آتا ہے اور مجھ سے گفتگو کرتا ہے، پھر جو کچھ وہ کہتا ہے میں یاد کر لیتا ہوں۔''[1]

④ **اللہ تعالیٰ کا براہِ راست نبی ﷺ کو وحی کرنا:** جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے براہِ راست کلام کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے یہ اعزاز نصِّ قرآن سے ثابت ہے، اسی طرح ہمارے نبی ﷺ کے لیے اس اعزاز کا ثبوت حدیث معراج میں موجود ہے۔[2]

⑤ **فرشتے کا اپنی اصلی شکل میں آ کر وحی کرنا:** کبھی نبی ﷺ فرشتے کو اس کی پیدائشی شکل میں دیکھتے تھے اور اسی حالت میں وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق آپ کی جانب وحی کرتا تھا۔

⑥ **فرشتے کا انسانی صورت میں آنا:** کبھی فرشتہ انسانی شکل اختیار کر کے نبی کریم ﷺ سے مخاطب ہوتا۔ وہ جو کچھ آپ سے کہتا، آپ اسے یاد کر لیتے تھے۔ اس صورت میں کبھی کبھی صحابۂ کرام بھی فرشتے کو (انسانی شکل میں) دیکھ لیتے تھے۔[3]

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے وحی کے مذکورہ بالا مراتب بیان کیے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ پر وحی کا نزول انسانی زندگی کے نئے دور کا آغاز تھا۔ اس سے قبل یہ سلسلہ منقطع ہو چکا تھا اور انسانیت گمراہی کے تاریک پردوں میں گم گشتہ پھر رہی تھی۔ رسول اللہ ﷺ پر وحی کا نزول ایک سخت مرحلہ ہوتا تھا جیسا کہ حدیث مبارکہ سے واضح ہے،

---

1 صحيح البخاري، حديث: 2، وصحيح مسلم: 87-2333. 2 الرؤىٰ والأحلام لأسامة عبدالقادر، ص: 108. 3 زاد المعاد :34,33/1.

حالانکہ آپ سب لوگوں سے زیادہ بہادر اور مضبوط دل کے مالک تھے۔ 23 سالہ عہد نبوت کے کئی واقعات اس بات کے شاہد ہیں۔ دراصل نزول وحی کی شدت اس وجہ سے تھی کہ معاملہ کسی انسان کا دوسرے انسان سے ہم کلام ہونے کا نہ تھا بلکہ فرشتوں کی ایک عظیم ہستی جو حاملِ کلام الٰہی تھی، اس کے ایک ایسے اعلیٰ و اشرف انسان سے ہم کلام ہونے کا معاملہ تھا جو اللہ تعالیٰ کا منتخب کردہ تھا۔ رحمٰن کے کلام کو رحمٰن کے بندوں تک پہنچانے کا معاملہ تھا۔

اس بہت بڑی ذمہ داری کی ہیبت کا اندازہ رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان سے کیا جاسکتا ہے جو پہلی وحی کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: «لَقَدْ خَشِيتُ عَلٰى نَفْسِي» ''مجھے تو اپنی جان خطرے میں محسوس ہوئی۔'' اور اسی حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس قول سے بھی حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ پہلی وحی کے بعد واپس آئے تو خوف سے آپ کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ آپ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس پہنچے اور فرمایا: «زَمِّلُونِي، زَمِّلُونِي» ''مجھے چادر اوڑھا دو۔ مجھے چادر اوڑھا دو۔'' انھوں نے آپ کو چادر اوڑھا دی یہاں تک کہ آپ کا خوف جاتا رہا۔

نزول وحی کی شدت کو اور زیادہ واضح کر دینے والی روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ہے جسے امام بخاری اور امام مسلم نے بیان کیا ہے کہ میں نے شدید سردی میں دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ پر وحی نازل ہو رہی تھی۔ جب سلسلہ نزول وحی ختم ہوا تو آپ ﷺ کی پیشانی پسینے سے شرابور تھی۔[1]

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی نزول وحی کی شدت کو واضح کرتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ پر وحی نازل ہوتی تو آپ تکلیف محسوس کرتے اور آپ کا رنگ متغیر ہو جاتا۔[2]

[1] صحیح البخاري، حدیث: 2، و صحیح مسلم، حدیث:(80)-2333. [2] صحیح مسلم، حدیث:2334، و مسند أحمد:317/5.

میدانِ دعوت میں نیک بیوی کا کردار

غارِ حرا میں پہلی وحی کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ سخت گھبراہٹ اور خوف کی حالت میں گھر پہنچے تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کی ساری بات سن کر کسی گھبراہٹ کا اظہار نہیں کیا بلکہ بڑے اطمینان اور سکون سے جائزہ لیا اور سارا واقعہ سن کر فوراً ورقہ بن نوفل کے پاس تشریف لے گئیں اور سارا معاملہ ان کے گوش گزار کیا۔[1]

وحی کی خبر سننے کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے جو موقف اختیار کیا، یہ ان کی وسعتِ فہم اور دور اندیشی کی دلیل تھا۔ انھوں نے فوراً وحی کی خبر اور رسول اللہ ﷺ کی سیرت میں موازنہ کیا اور اس حقیقت کو پالیا کہ جو شخص فطری طور پر اخلاق عالیہ کا مالک ہو، اللہ تعالیٰ اسے کبھی رسوا نہیں کرتا۔

انھوں نے آپ ﷺ کا یہ وصف بیان کیا کہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں۔ رشتے داروں کے ساتھ کسی انسان کا میل جول اس بات کی دلیل ہوتا ہے کہ وہ شخص ذاتی طور پر اس خوبی کا مالک ہے کہ دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرتا اور ان پر اپنا مال بھی خرچ کرتا ہے۔

کسی بھی انسان کے اخلاق معلوم کرنے کے لیے سب سے پہلا آئینہ اس کے اقرباء ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اپنے رشتے داروں کے سلسلے میں اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے اُنھیں متحد و متفق رکھنے اور ان کا دل جیتنے میں کامیاب ہو جائے تو ایسا شخص یقیناً دوسرے لوگوں کے دل جیتنے میں بھی کامیاب ہو جاتا ہے۔[2]

ام المومنین سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ایمان لانے میں سبقت حاصل کی۔ انھوں نے وہ قانون قدرت جان لیا تھا جو اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے معاملے میں اختیار کرتا ہے اور ان کا

1 التاريخ الإسلامي للحميدي: 61/1. 2 التاريخ الإسلامي للحميدي: 64/1.

یقین مزید پختہ ہو گیا تھا کہ محمد ﷺ کے پاس اخلاق عالیہ اور عادات جمیلہ کا جو ذخیرہ ہے ایسا ذخیرہ اس کائنات میں کسی بھی انسان کے پاس نہیں ہے۔ ان کے دل نے یہ بات بھی جان لی تھی کہ آپ ﷺ پر رب ذوالجلال کی خاص نظرِ کرم اور مہربانیاں ہیں اور انھوں نے خود اس بات کا مشاہدہ بھی کیا کہ بہت سے ایسے مقامات پر آپ ﷺ پر عنایات ربانیہ کی بارش ہوتی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کے ایسے اعلیٰ کردار کی بدولت آپ ﷺ کی عزت و شرف میں اضافہ کیا۔ ایسے اعلیٰ کردار کو مقام نبوت و رسالت کہا جا سکتا ہے نہ معجزہ قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ خرق عادت امور کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ صرف اور صرف وہ انسانی فضائل اور خوبیاں تھیں جو عظیم کارہائے نمایاں انجام دینے والی خاص شخصیات میں ہوتی ہیں۔[1]

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو اس بات کا یقین تھا کہ ان کے سرتاج نبی ﷺ میں ایسی باکمال فطری خوبیاں، پائیدار اخلاق و محاسن، عمدہ اور پسندیدہ طرزِ عمل، اعلیٰ و بالا کردار اور کامل ترین انسانی شرافت موجود ہے۔ یہ تمام محاسن کسی بھی کامیابی کے ضامن اور فتح و کامرانی کو یقینی بنانے کا ذریعہ ہوتے ہیں، اسی لیے انھوں نے اپنے مختصر مگر گہرائی کے حامل کلمات کے ساتھ کمالِ محمدی کو ثابت کیا ہے۔[2] حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کی اعلیٰ صفات سے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو دنیا میں ہرگز رسوا نہیں کرے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی پیدائش مکارم اخلاق پر فرمائی تھی اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے جامع کمالات میں سے چند کی مثال بھی بیان کی۔

اس کائنات کے معاشرتی قوانین میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی بندے کو اخلاق کریمانہ عطا کیے ہوں اور پھر اسے زندگی میں رسوا بھی کیا ہو۔ جبکہ محمد ﷺ مکارمِ اخلاق کی بلندیوں تک پہنچے ہوئے تھے۔ کسی کے لیے اس سے آگے بڑھنا تو بہت دور کی بات ہے اس کے برابر پہنچنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔[3]

---

1 محمد رسول اللہ ﷺ لصادق عرجون: 307/1. 2 محمد رسول اللہ ﷺ لصادق عرجون: 308,307/1. 3 محمد رسول اللہ ﷺ لصادق عرجون: 232/1.

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے لیے صرف آپ کے اخلاقِ عالیہ سے دلیل نہیں لی بلکہ اس وقت کے ایک بہت بڑے عالم اور اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس تشریف لے گئیں، جو کہ نبی آخر الزمان کی آمد کے منتظر تھے کیونکہ انھوں نے اہل کتاب کے علماء سے یہ بات معلوم کی تھی کہ اس نبی کی آمد اور بعثت کا وقت قریب آچکا ہے۔ ورقہ کی گفتگو نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بڑا خوشگوار اثر چھوڑا، آپ کو حوصلہ ملا اور دل کو تقویت حاصل ہوئی۔ ورقہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلایا کہ جو فرشتہ غار حرا میں آپ سے ہم کلام ہوا ہے، یہ وہی فرشتہ ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے تمام انبیاء علیہم السلام کے درمیان پیغام رساں رہا ہے اور بہت سے رازوں کا مالک ہے۔ ورقہ کے مندرجہ ذیل اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا منتظر تھا ؎

لَجَجْتُ وَ كُنْتُ فِي الذِّكْرٰى لَجُوجًا   لِهَمٍّ طَالَمَا بَعَثَ النَّشِيجَا
وَوَصْفٍ مِّنْ خَدِيجَةَ بَعْدَ وَصْفٍ   فَقَدْ طَالَ انْتِظَارِي يَا خَدِيجَا
بِبَطْنِ الْمَكَّتَيْنِ عَلٰى رَجَائِي   حَدِيثَكِ أَنْ أَرٰى مِنْهُ خُرُوجَا
بِمَا خَبَّرْتِنَا مِنْ قَوْلِ قَسٍّ   مِّنَ الرُّهْبَانِ أَكْرَهُ أَنْ يَّعُوجَا
بِأَنَّ مُحَمَّدًا سَيَسُودُ فِينَا   وَ يَخْصِمُ مَنْ يَّكُونُ لَهُ حَجِيجَا

”ایک دیرینہ فکر جو میرے دل کو بھی رلاتا تھا میں اکثر اسی کے بارے میں سوچ و بچار میں رہتا تھا۔ اور علمائے اہل کتاب نے آنے والے پیغمبر کے جو اوصاف بیان کیے تھے ان کے بعد خدیجہ رضی اللہ عنہا نے جو صفات بیان کیں تو میں انھیں میں مگن ہو گیا۔ اے خدیجہ! میرا انتظار تو طویل ہوتا جا رہا ہے۔ تیری گفتگو سے مجھے امید بندھی ہے کہ میں سرزمین مکہ میں اس نبی کا ظہور دیکھ سکوں گا۔ اہل کتاب کے علماء اور راہبوں کی پیش گوئی کے مطابق تو نے مجھے جو خبر دی ہے میں نہیں چاہتا کہ یہ

غلط ثابت ہو۔ (وہ خبر یہ ہے) کہ محمد ﷺ عنقریب ہمارے سردار ہوں گے اور اپنے مخالفین پر غالب آئیں گے۔''[1]

ورقہ بن نوفل نے نبی کریم ﷺ کی رسالت کی تصدیق کی تھی اور نبی کریم ﷺ نے ان کے جنتی ہونے کی شہادت دی تھی۔

امام حاکم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت بیان کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «لَا تَسُبُّوا وَرَقَةَ فَإِنِّي رَأَيْتُ لَهُ جَنَّةً أَوْ جَنَّتَيْنِ» ''ورقہ کو برا بھلا نہ کہو۔ میں نے دیکھا ہے کہ اس کے لیے ایک یا دو باغ ہیں۔''[2]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے ورقہ کے بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: «قَدْ رَأَيْتُهُ فَرَأَيْتُ عَلَيْهِ ثِيَابًا بِيضًا، فَأَحْسِبُهُ لَوْ كَانَ مِنْ أَهْلِ النَّارِ لَمْ يَكُنْ عَلَيْهِ ثِيَابٌ بِيضٌ» ''میں نے اسے سفید لباس پہنے ہوئے دیکھا ہے۔ اگر وہ اہل جہنم سے ہوتا تو اس پر سفید لباس نہ ہوتا۔''[3]

امام ہیثمی کہتے ہیں کہ امام ابو یعلی نے اپنی مسند میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ورقہ بن نوفل کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: «أَبْصَرْتُهُ فِي بُطْنَانِ الْجَنَّةِ وَ عَلَيْهِ السُّنْدُسُ» ''میں نے اسے جنت کے ایک بہترین درجے میں دیکھا ہے اور اس کا لباس ریشمی تھا۔''[4]

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو اپنی قوم میں ایک اہم معاشرتی مقام حاصل تھا اور فطرتاً انھیں رحم دلی، بردباری، حکمت و دانائی اور معاملہ فہمی جیسے عمدہ اوصاف ودیعت فرمائے گئے

1۔ السيرة النبوية لابن هشام: 194/1۔ 2 المستدرك للحاكم: 609/2، ومسند البزار، حديث: 2751,2750، ومجمع الزوائد: 416/9، علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے، دیکھیے: (السلسلة الصحيحة: 761/1) 3 مسند أحمد: 65/6، اس کی سند ضعیف ہے۔ 4 مجمع الزوائد: 416/9، و مسند أبي يعلى، حديث: 2047، علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو حسن کہا ہے، دیکھیے: (صحيح السيرة النبوية: 94/1)

تھے، اس وجہ سے انھوں نے نبی کریم ﷺ کی زندگی میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو ایک مثالی بیوی عنایت فرمائی کیونکہ وہ تمام کائنات کے لیے اور خاص طور پر دعوتِ دین کا کام کرنے والوں کے لیے ایک بہترین نمونہ ہیں۔ ام المومنین کے اس اہم کردار کی روشنی میں اللہ تعالیٰ نے حاملین دعوتِ اسلامی کی رہنمائی فرمائی ہے کہ انھیں بھی اس میدان میں رسول اللہ ﷺ کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیے تاکہ انھیں وہ اعلیٰ مقاصد حاصل ہوں جن کے لیے وہ جدوجہد کر رہے ہیں۔[1]

دعوتِ دین کا کام کرنے والوں کی بیویوں کے لیے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ایک بہترین مثال اور اعلیٰ نمونہ ہیں۔ دعوتِ دین کا کام کرنے والا جہاں اپنے پاس ایک پیغام رکھتا ہے وہاں وہ صاحب درد بھی ہوتا ہے۔ اسے امت کے ضائع ہونے کا درد ہوتا ہے۔ وہ اس کے بگاڑ پر متفکر ہوتا ہے۔ اپنی قوم کی شان وشوکت بڑھانے کے لیے فکر مند ہوتا ہے۔ دنیا کے اطراف واکناف میں مسلمانوں پر ہونے والے ظلم وستم، ان کی بھوک و افلاس اور ان کے خلاف ہونے والی سازشوں پر وہ بے چین ہوتا ہے۔ دعوت دین کا کام کرنے والوں کی مشکلات، تکالیف اور آزمائشوں پر وہ مضطرب ہوتا ہے اور جس پیغام کا وہ حامل ہوتا ہے اسے دوسروں تک پہنچانا بھی اس کی ذمہ داری ہے۔ یہ ذمہ داری ایک طویل وقت کا تقاضا کرتی ہے جس کے لیے اسے اپنی نیند، آرام بلکہ اپنے اہل وعیال کے لیے مخصوص وقت بھی قربان کرنا پڑتا ہے۔ یہ فریضہ وقت، مال بلکہ دنیا کی ہر چیز کی قربانی مانگتا ہے۔ اگرچہ اس کی بیوی میں، اخلاق وتقویٰ، حسن و جمال اور حسب ونسب جیسی خوبیاں موجود ہوں لیکن دعوت دین کا فریضہ اس بات کا متقاضی ہے کہ وہ بیوی دعوت کی ضرورت و اہمیت سے واقف ہو اور اسے ان باتوں کا مکمل طور پر احساس ہو کہ اس کے خاوند کی کیا حیثیت و مقام ہے، اس کی کیا ذمہ داریاں ہیں اور اس کی کون سی مشکلات ہیں، پھر اسے

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي:69/1.

اپنے خاوند کے پہلو بہ پہلو ایک مددگار کی حیثیت سے اس کے کام کو آسان بنانا چاہیے نہ کہ اس کے راستے کا کانٹا یا رکاوٹ بنے۔[1]

دعوتِ دین کی کامیابی میں نیک عورت کا بہت نمایاں کردار ہوتا ہے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے پہلی وحی کے نزول کے موقع پر نبی کریم ﷺ کو حوصلہ دیا اور آپ کی ڈھارس بندھائی۔ اس طرح انھوں نے دعوت کے میدان میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ بلاشبہ ایک نیک بیوی اپنے خاوند کی کامیاب زندگی کے لیے ایک اہم رول ادا کرتی ہے اور ان معاملات میں اس کا کردار مزید اہم ہو جاتا ہے جن کا تعلق براہ راست لوگوں سے ہو۔ دعوت الی اللہ کی ذمہ داری ادا کرنے والے کو باصلاحیت نیک بیوی مل جائے تو یہ اس کی کامیابی کا ایک اہم سبب شمار ہو گا۔[2]

رسول اللہ ﷺ نے سچ فرمایا: «اَلدُّنْيَا مَتَاعٌ، وَّخَيْرُ مَتَاعِ الدُّنْيَا الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ»
''دنیا ساز و سامان کا نام ہے اور نیک بیوی اس دنیا کا بہترین سامان ہے۔''[3]

نبی کریم ﷺ کی خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ وفا شعاری

رسول اللہ ﷺ اپنے اہل خانہ کے ساتھ حسن سلوک اور وفا شعاری میں اپنی مثال آپ تھے۔ آپ نے اپنی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ان کی زندگی میں اور زندگی کے بعد بھی انتہائی درجے کی وفا شعاری کا مظاہرہ کیا۔ آپ ﷺ نے انھیں ان کی زندگی ہی میں جنت کی بشارت دے دی تھی اور انھیں اللہ تعالیٰ اور جبریل علیہ السلام کی جانب سے سلام بھی پہنچایا تھا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ کے پاس جبریل علیہ السلام آئے اور

1 وقفات تربوية من السيرة النبوية لعبد الحميد البلالي، ص: 40. 2 التاريخ الإسلامي للحميدي: 68/1. 3 صحيح مسلم، حديث: 1469، و سنن ابن ماجه، حديث: 1855، ومسند أحمد: 168/2، و السنن الكبرىٰ للنسائي: 272/3، حديث: 5325.

کہنے لگے: ''اے اللہ کے رسول! ابھی آپ کے پاس حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ایک برتن میں سالن، کھانا یا مشروب لے کر آرہی ہیں۔ جب وہ آپ کے پاس آئیں تو انھیں ان کے رب کی طرف سے اور میری طرف سے سلام کہیے اور جنت میں ایک ایسے گھر کی بشارت دیجیے جو ایک خول دار موتی (یا سونے) کا بنا ہوا ہے۔ اس میں شور ہوگا نہ کوئی تکلیف۔''[1]

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد ان کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفا شعاری کا تذکرہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ان الفاظ سے کرتی ہیں کہ میں نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے سوا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج میں سے کسی پر رشک نہیں کیا، حالانکہ میں نے انھیں نہیں دیکھا۔ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کثرت سے ان کا ذکر کیا کرتے تھے۔ اگر کبھی بکری ذبح کرتے تو اس کا گوشت تقسیم کر کے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی سہیلیوں کے ہاں بھیجا کرتے تھے۔ کبھی میں آپ سے کہتی: ''لگتا ہے دنیا میں خدیجہ کے سوا کوئی عورت نہیں تھی۔'' اس پر آپ فرماتے: «إِنَّهَا كَانَتْ وَ كَانَتْ، وَ كَانَ لِي مِنْهَا وَلَدٌ» ''وہ واقعی ایسی ہی تھی۔ میری اولاد بھی تو اسی سے ہوئی ہے۔''[2]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی بہن ہالہ بنت خویلد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے کی اجازت طلب کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا اجازت طلب کرنے کا انداز یاد آگیا۔ آپ بڑے خوش ہوئے اور فرمایا: «اَللّٰهُمَّ هَالَةُ بِنْتُ خُوَيْلِدٍ» ''یا اللہ! یہ ہالہ بنت خویلد ہے۔''

(حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:) مجھے بڑا رشک آیا۔ میں نے کہا: ''آپ قریش کی ایک بوڑھی عورت کو یاد کر رہے ہیں، وہ (دانت نہ ہونے کی وجہ سے) سُرخ مسوڑھوں والی جو عرصہ ہوا فوت ہو چکی ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے بہتر بیوی عطا کی ہے۔''[3]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کی بڑی عزت افزائی کی جو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی زندگی میں ان

1 صحيح البخاري، حديث: 3820، و صحيح مسلم، حديث: 2432. 2 صحيح البخاري، حديث: 3818، وصحيح مسلم، حديث: 2435. 3 صحيح البخاري، حديث: 3821، وصحيح مسلم، حديث: 2437.

کے پاس آیا کرتی تھی اور آپ نے یہ بات واضح کی کہ عہد رفتہ کی پاسداری ایمان کا جزو ہے۔[1]

رسولوں کی تکذیب کا سلسلہ

جب ورقہ بن نوفل نے کہا: ''کاش! میں اس وقت جوان اور طاقتور ہوتا۔ کاش! میں اس وقت زندہ ہوتا جب آپ ﷺ کی قوم آپ کو دیس نکالا دے گی۔'' رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: «أَوَ مُخْرِجِيَّ هُمْ» ''کیا یہ لوگ مجھے (یہاں سے) نکال دیں گے؟'' ورقہ نے کہا: ''ہاں جب بھی کوئی اس طرح کا پیغام (رسالت) لایا جیسا آپ لائے ہیں تو اس سے ضرور دشمنی کی گئی۔ اگر زمانہ (نبوت) مجھے ملا تو میں آپ کی پرزور تائید کروں گا۔''[2]

اس حدیث نے اس طرز عمل کی وضاحت کر دی جو پہلی امتیں ہر اس نبی کے ساتھ اختیار کرتی رہیں جس نے بھی انھیں اللہ کی طرف بلایا اور ان کا یہ طرز عمل انبیاء کی تکذیب اور انھیں وطن سے نکال دینا تھا۔ اللہ تعالیٰ قوم لوط کے بارے میں فرماتے ہیں:

﴿فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْٓا اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ۝﴾

''پھر اس کی قوم کا اس کے سوا کوئی جواب نہ تھا کہ انھوں نے کہا: آل لوط کو اپنی بستی سے نکال دو کیونکہ یہ لوگ تو بڑے پاک صاف بنتے ہیں۔''[3]

---

1 التاريخ الإسلامي للحميدي: 71/1، اس قصے کی وضاحت کچھ یوں ہے: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ایک دفعہ ایک عمر رسیدہ خاتون نبی ﷺ کے پاس آئیں۔ اس وقت نبی ﷺ میرے پاس تشریف فرما تھے۔ آپ ﷺ نے ان کا نام پوچھا تو انھوں نے اپنا نام جثامہ مزنیہ بتایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں تیرا نام حسانہ مزنیہ ہے۔ سناؤ! تمھارا کیا حال ہے؟ اب تم لوگ کیسے ہو؟ ہمارے بعد آپ لوگوں کے حالات کیسے رہے؟'' انھوں نے کہا: ''میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں! ہمارے حالات بہت اچھے ہیں۔'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب وہ عورت چلی گئی تو میں نے آپ ﷺ سے عرض کی: ''آپ اس خاتون کو بڑی اہمیت دے رہے تھے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّهَا كَانَتْ تَأْتِينَا زَمَنَ خَدِيجَةَ، وَإِنَّ حُسْنَ الْعَهْدِ مِنَ الْإِيمَانِ» ''یہ خدیجہ کے زمانے میں ہمارے پاس آیا کرتی تھی۔ اور گزرے ہوئے زمانے کو اچھے انداز میں نبھانا ایمان کا حصہ ہے۔'' (السلسلة الصحيحة: 424/1) 2 صحيح البخاري، حديث: 3، وصحيح مسلم، حديث: 160. 3 النمل 56:27.

قوم شعیب نے بھی اسی طرح کہا:

﴿قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ یٰشُعَیْبُ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْیَتِنَاۤ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا ؕ﴾

''اس کی قوم میں سے جو سردار تکبر کرتے تھے، انھوں نے کہا: اے شعیب! ہم تجھے اور ان لوگوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں، اپنی بستی سے ضرور نکال دیں گے یا تم ہمارے دین میں لوٹ آؤ گے۔''[1]

وحی کی بندش

قدیم اور جدید علمائے سیرت نے وحی کی بندش کا تذکرہ کیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وحی کی بندش سے مراد کچھ عرصے کے لیے وحی کا رُک جانا ہے اور اس کی حکمت یہ تھی کہ نبی کریم ﷺ پر جو خوف طاری ہو گیا تھا، دور ہو جائے اور دوبارہ وحی کی آمد کا انتظار رہے۔[2]

حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بندش وحی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: «بَيْنَ أَنَا أَمْشِي إِذْ سَمِعْتُ صَوْتاً مِّنَ السَّمَاءِ فَرَفَعْتُ بَصَرِي فَإِذَا الْمَلَكُ الَّذِي جَاءَنِي بِحِرَاءٍ جَالِسٌ عَلٰى كُرْسِيٍّ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ فَرُعِبْتُ مِنْهُ فَرَجَعْتُ فَقُلْتُ: زَمِّلُونِي، زَمِّلُونِي فَأَنْزَلَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ: ﴿یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ قُمْ فَاَنْذِرْ ۙ وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ ۙ وَ ثِیَابَكَ فَطَهِّرْ ۙ وَ الرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۙ﴾ فَحَمِيَ الْوَحْيُ وَتَوَاتَرَ» ''ایک دن میں جا رہا تھا تو میں نے آسمان سے ایک آواز سنی۔ میں نے نظر اٹھائی تو وہی فرشتہ جو غار حرا میں میرے پاس آیا تھا، زمین و آسمان کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ میں اس (منظر) سے ڈر گیا۔ گھر واپس آیا تو میں نے کہا: ''مجھے کمبل اوڑھا دو۔ مجھے کمبل اوڑھا دو''، پھر اللہ تعالیٰ نے یہ

1 الأعراف 88:7. 2 فتح الباري: 36/1.

آیات نازل فرمائیں:

﴿يَاأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَأَنذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝﴾

''اے لحاف میں لپٹنے والے! اٹھیے اور ڈرایئے اور اپنے رب کی بڑائی بیان کیجیے اور اپنے کپڑے پاک رکھیے اور ناپاکی چھوڑ دیجیے۔'' [1]

اس کے بعد وحی کی آمد تیز ہوگئی اور مسلسل آنے لگی۔'' [2]

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''رہی یہ بات کہ وحی کتنے دنوں تک بند رہی تو اس سلسلے میں ابن سعد نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت نقل کی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ بندش چند دنوں کے لیے تھی اور سارے پہلوؤں پر نظر ڈالنے کے بعد یہی بات راجح بلکہ یقینی معلوم ہوتی ہے۔ اور یہ جو مشہور ہے کہ وحی کی بندش تین سال یا ڈھائی سال تک رہی تو یہ قطعاً صحیح نہیں، البتہ یہاں دلائل پر بحث کی گنجائش نہیں۔ وحی کی بندش کے عرصے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حزین و غمگین رہے اور آپ پر حیرت و استعجاب طاری رہا۔'' [3]

امام بخاری رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ (وحی کی بندش کی وجہ سے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر غمگین ہوئے کہ کئی بار بلند و بالا پہاڑ کی چوٹیوں پر چڑھ گئے تاکہ وہاں سے چھلانگ لگا دیں۔ لیکن جب کسی پہاڑ کی چوٹی پر پہنچتے کہ وہاں سے چھلانگ لگائیں تو جبریل علیہ السلام نمودار ہوتے اور فرماتے: ''اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! آپ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں۔'' اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اضطراب تھم جاتا اور دل پُرسکون ہو جاتا، پھر آپ واپس آجاتے، پھر جب آپ پر وحی کی بندش کا عرصہ طویل ہوگیا تو آپ پھر ایسا کرنے (پہاڑ کی چوٹی سے چھلانگ لگانے) کے لیے نکلتے لیکن جب پہاڑ کی چوٹی پر پہنچتے تو جبریل علیہ السلام نمودار ہو کر پھر وہی بات دہراتے (کہ آپ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں)۔ [4]

---

1 المدثر 74:1-5. 2 صحيح البخاري، حديث:4. 3 الرحيق المختوم، ص:79، 80. 4 صحيح البخاري، حديث:6982، وصحيح ابن حبان، حديث:33، ودلائل النبوة للبيهقي:2/138.

باب 2

خفیہ دعوتی سرگرمیاں

پیغامِ الٰہی کی تبلیغ کے لیے حکم ربانی

پہلی وحی کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ کو اس بات کا پختہ یقین ہوگیا کہ آپ رحیم و کریم رب کی طرف سے منصب نبوت پر فائز ہو چکے ہیں۔

پھر جبریل علیہ السلام دوسری مرتبہ آپ کے پاس تشریف لائے اور آپ کو اللہ تعالیٰ کی یہ وحی پہنچائی:

﴿يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَأَنذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝﴾

"اے لحاف میں لپٹنے والے! اٹھیے اور ڈرائیے اور اپنے رب کی بڑائی بیان کیجیے اور اپنے کپڑے پاک رکھیے اور ناپاکی چھوڑ دیجیے۔"[1]

ان آیات کا تسلسل رسول اللہ ﷺ کے لیے اس بات کا پیغام تھا کہ آرام و سکون کی نیند کا دور ختم ہو چکا۔ اب مستقبل میں آپ کو ایک نہایت عظیم الشان کام پایۂ تکمیل تک پہنچانا ہے۔ اس کام کی ذمہ داریوں کا تقاضا یہ ہے کہ آپ نیند کو چھوڑ کر کمر بستہ ہو جائیے، معصیت کے خاتمے کے لیے ہر طریقہ آزمائیے تاکہ کسی کا عذر باقی نہ رہے۔ پیغام رسالت لوگوں تک پہنچائیے۔ وحی کے ساتھ تعلق مضبوط بنائیے اور اس راستے میں آنے

[1] المدثر 74:1-4.

والی ہر تکلیف پر دل کو مضبوط رکھیے۔ اس طریقے سے رسالت کا حق ادا ہوگا اور دعوت بھی مضبوط ہوگی۔[1]

دعوت دین اور اس کی ذمہ داریاں ادا کرنے کا سب سے پہلا حکم ان آیات میں دیا گیا ہے۔ ان آیات میں ایسے امور کی طرف رہبری کی گئی ہے جنھیں دعوت محمدی اور اسلامی تعلیمات کا نچوڑ کہا جا سکتا ہے۔ اسلام کی بنیاد انھی امور پر ہے اور وہ امور یہ ہیں: توحید، قیامت پر ایمان، تزکیہ نفوس، امتِ مسلمہ کو ہر قسم کے شر سے بچانا اور ان کے مفادات کا تحفظ کرنا۔

ان آیات کا مقصد رسول اللہ ﷺ کی عزیمت میں شدّت اور تیزی پیدا کرنا تھا تاکہ آپ اپنے رب کی رسالت کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لیے پوری طرح مستعد ہو جائیں اور کسی مزاحمت، رکاوٹ اور مشکل کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے دعوت الی اللہ کی احسن طریقے سے تکمیل کرسکیں۔

﴿يَآيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝﴾ کہہ کر بڑے پیارے انداز میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو مخاطب فرمایا۔ اس میں اس امر کا اظہار بھی تھا کہ اب نیند اور آرام کی پروا نہ کرتے ہوئے عزم صمیم کر لیجیے، پھر ساتھ ہی ﴿قُمْ﴾ کہہ کر حکم دے دیا کہ اب تبلیغ دین کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لیے ایسی عزیمت کے ساتھ جو کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہ لائے اور ایسی قوت کے ساتھ جس میں دور اندیشی بھی ہو، سرگرم عمل ہو جائیے۔[2]

وحی کی بندش کے بعد آپ ﷺ سے جو سب سے پہلا خطاب کیا گیا۔ اس میں صرف ڈرانے کا حکم ہے، خوشخبری دینے کا نہیں۔ اس میں یہ لطیف اشارہ موجود ہے کہ آپ کو فریضۂ رسالت کی ادائیگی کے لیے انتھک محنت اور تلخ ترین مرحلوں سے گزرتے ہوئے زبردست جدوجہد کرنی ہوگی۔ ان آیات سے رسول اللہ ﷺ کی عزیمت محکم ہوگئی، آپ کا

---

1 فقه السيرة للغزالي، ص: 90. 2 دولة الرسول من التكوين إلى التمكين للدكتور كامل سلامة، ص: 181.

حوصلہ مضبوط ہوگیا اور آپ ﷺ آمادہ ہوگئے کہ اپنے نصب العین کے حصول کے لیے سب کچھ کر گزریں اور اس راستے میں آنے والی کسی مشکل اور رکاوٹ کو خاطر میں نہ لائیں۔

آپ ﷺ سے کہا گیا: ﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ﴾ ''اور صرف اپنے رب ہی کی بڑائی بیان کریں۔'' یعنی خالق کے سوا کسی مخلوق کو بڑا نہ سمجھیں۔ مخلوق میں سے کسی کی عظمت آپ کے دل میں جاگزیں نہ ہو۔ نہ ان میں سے کسی کے کام کی ہیبت آپ پر طاری ہو اور نہ کسی کا خوف مسلّط ہو۔ صرف اپنے رب کی بڑائی بیان کیجیے۔ اسی نے آپ کی حفاظت کی تھی جب آپ دنیا میں نہیں آئے تھے بلکہ اپنے ماں باپ کے بدن میں تھے۔ اس نے آپ کو اپنے فضل سے پروان چڑھایا اور اپنی جود وسخا کے ذریعے آپ کی سرپرستی فرمائی۔ آپ کو بہترین صورت اور سیرت کے ساتھ تیار کیا، پھر اپنا رسول بنا کر آپ کو رسالت کی عظیم ذمہ داریاں سونپیں۔ ﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ﴾ تمام عظمتیں، بڑائیاں اور جاہ و جلال صرف ایک اللہ کے لیے ہے۔ ان میں کوئی بھی اس کا شریک نہیں۔ ﴿وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ﴾ کہہ کر گویا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے یہ فرمایا ہے کہ فطری پاکیزگی اور طہارت میں آپ انسانیت کی معراج پر پہنچے ہوئے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی تخلیق نہایت بلند اور عمدہ ترین اخلاق پر فرمائی اور آپ کو نبوت عطا کر کے اس کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لیے تیار فرمایا، لہٰذا اب اس امر کی زیادہ ضرورت ہے کہ آپ اپنے نفس کی طہارت میں اضافہ کریں۔ اس طرح آپ کے پاکیزہ معاشرتی میل جول سے آپ کی عزت و توقیر بڑھے گی۔ اس وقت آپ جہانوں کے لیے اللہ کے رسول ہیں۔ رسالت کا کمال اس وقت حاصل ہوگا جب آپ صبر، حلم، عفوو درگزر اور احسان جیسے معاشرتی اخلاق میں کمال حاصل کریں گے۔

دعوت الی اللہ کے نصب العین پر قائم رہیے۔ لوگوں کی ایذا رسانی اور طعن و تشنیع آپ کا رخ تبدیل کر سکے نہ مصائب کے ریلے آپ کو اپنے نصب العین کے حصول سے دور کر سکیں۔

اور اللہ تعالیٰ نے جو یہ فرمایا: ﴿وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ﴾ "اور پلیدی سے دور رہیے" گویا یہ کہہ کر آپ ﷺ کی رہنمائی فرمائی گئی کہ آپ اپنی فطرت اور مزاج کے باعث جن (ناپسندیدہ) چیزوں سے اجتناب برت رہے ہیں اس میں آپ کی نیت یہ ہونی چاہیے کہ میں یہ سب کچھ اپنے اللہ کے حکم کی تعمیل میں، اس کی بندگی اختیار کر کے کر رہا ہوں تاکہ آپ کا یہ عمل آپ کی امت کے لیے پیروی کا ایک نمونہ بنے اور آپ کی رسالت کے ذریعے سے ان کی تطہیر ہو جائے۔[1]

سورۂ مدثر کی ابتدائی آیات کے نزول کے بعد آپ نے چپکے چپکے اللہ تعالیٰ کی توحید اور اسلامی تعلیمات کی دعوت کا آغاز فرمایا۔ فطری بات تھی کہ آپ اس کا آغاز اپنے اہل خانہ، دوست احباب اور اپنے قریبی لوگوں سے کرتے، چنانچہ آپ ﷺ نے ایسا ہی کیا۔ اس کے نتائج کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا قبول اسلام

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو منفرد اعزاز حاصل ہے کہ وہ نہ صرف خواتین میں بلکہ مطلق طور پر سب لوگوں سے پہلے جناب رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائیں۔ رسول کریم ﷺ کی زبان مبارک سے سب سے پہلے آپ ہی نے وحیِ الٰہی سماعت فرمائی اور آپ ﷺ ہی سے سن کر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے سب سے پہلے قرآن کی تلاوت کا شرف حاصل کیا۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ سے نماز کی تعلیم سب سے پہلے آپ ہی نے حاصل کی۔ اور آپ ہی کے مکان کو یہ شرف حاصل ہوا کہ سب سے پہلی وحی جو جبریل علیہ السلام نے محمد مصطفیٰ ﷺ تک پہنچائی، اس کی تلاوت غار حراء کے بعد آپ ہی کے گھر میں کی گئی۔[2]

عقیدۂ توحید کے اقرار کے بعد شریعت اسلامیہ میں سب سے پہلی چیز جو اللہ تعالیٰ نے

1 محمد رسول اللهﷺ لصادق عرجون:1/589-593. 2 المرأة في العهد النبوي للدكتورة عصمة الدين، ص:36.

فرض کی وہ اقامت صلاۃ ہے۔ احادیث سے ثابت ہے کہ نماز کی فرضیت کے بعد نبی کریم ﷺ نے اپنی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو وضو اور نماز کی تعلیم دی۔

نماز کی فرضیت کے بعد جبریل علیہ السلام رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں تشریف لائے۔ اس وقت آپ ﷺ مکہ مکرمہ کی بالائی جانب تھے۔ جبریل علیہ السلام نے وادی کی ایک جانب اپنی ایڑی ماری تو وہاں سے ایک چشمہ پھوٹ پڑا۔ نماز کے لیے وضو کرنے کا طریقہ سکھانے کے لیے جبریل علیہ السلام نے وضو کیا۔ نبی کریم ﷺ انھیں دیکھتے رہے، پھر آپ ﷺ نے جبریل علیہ السلام کے وضو کی طرح وضو کیا۔ اس کے بعد جبریل علیہ السلام نے آپ کو نماز پڑھائی اور آپ ﷺ نے ان کی امامت میں نماز ادا کی، پھر جبریل علیہ السلام واپس چلے گئے اور رسول اللہ ﷺ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے۔ آپ نے جبریل علیہ السلام کی طرح حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو وضو کر کے دکھایا اور بتایا کہ نماز کے لیے اس طرح وضو کیا جاتا ہے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم ﷺ کو دیکھ کر ان کے وضو کی طرح وضو کیا، پھر نبی کریم ﷺ نے حضرت جبریل علیہ السلام کی طرح حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو نماز پڑھائی اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ کی امامت میں نماز ادا کی۔[1]

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام

سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بعد بچوں میں سب سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا۔ اس وقت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی عمر راجح قول کے مطابق دس سال تھی۔ امام طبری اور ابن اسحاق نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔[2]

اللہ تعالیٰ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر یہ خصوصی انعام فرمایا کہ انھیں نبی کریم ﷺ کے سایہ عاطفت میں تربیت حاصل کرنے کا موقع مرحمت فرمایا۔ نبی کریم ﷺ نے انھیں اپنے چچا

1 السيرة النبوية لابن هشام:261,260/1، ومعين السيرة لصالح الشامي، ص:41. 2 السيرة النبوية لأبي شهبة:284/1.

ابو طالب سے لے کر اپنے گھر کا ایک فرد بنا لیا تھا۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ تیسرے فرد ہیں جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بعد نماز ادا کی۔[2]

بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ نماز ادا کرنے کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کی وادیوں میں چلے جاتے تھے۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بھی اپنے والد، چچا صاحبان اور اپنی ساری قوم سے چھپ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلے جاتے تھے۔ دونوں وہاں نمازیں ادا کرتے اور شام کو واپس آ جاتے تھے، پھر وہ پاکیزہ گھر انھیں اپنی آغوش میں لے لیتا تھا جو دولت ایمان کی وجہ سے ہر قسم کی آلودگی سے پاک، صدق و وفا سے لبریز اور عزت و شرافت کا منبع تھا۔[3]

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کا قبول اسلام

غلامی کی زندگی سے نجات پانے والوں میں سب سے پہلے ایمان لانے کا شرف حضرت زید بن حارثہ الکلبی رضی اللہ عنہما کو حاصل ہوا۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت محبوب بھی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اپنا بیٹا (متبنّٰی) بنایا ہوا تھا۔

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کے والد گرامی اور دیگر گھر والوں کو اپنے بیٹے کی غلامی کا علم ہوا تو وہ انھیں واپس لینے اور خریدنے کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید کو مکمل اختیار دے دیا کہ واپس جانا چاہو تو جا سکتے ہو۔ زید رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے والد اور اہل خانہ پر ترجیح دی اور کہا کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر کہیں جانا پسند نہیں کروں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میرے لیے والد اور چچا کے درجے میں ہیں۔ یہ

1 السيرة النبوية لابن هشام:246/1. 2 عيون الأثر لابن سيد الناس:115/1. 3 المرأة في العهد النبوي للدكتورة عصمة الدين، ص:42.

سن کران کے والد اور چچا نے کہا: ''تجھ پر افسوس ہے تو آزادی کے بجائے غلامی کو پسند کر رہا ہے؟ اور اپنے باپ، چچا اور گھر والوں کو چھوڑ رہا ہے۔'' یہ سن کر حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''جی ہاں! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں ایسی خوبیاں دیکھی ہیں کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر کسی اور کا انتخاب نہیں کر سکتا۔''[1]

دختران نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قبول اسلام

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام صاحبزادیوں سیدہ زینب، ام کلثوم، رقیہ اور فاطمہ رضی اللہ عنہن نے بھی فوراً اسلام قبول کر لیا۔ کیونکہ وہ اپنے والد کی بعثت سے قبل ہی ان کی استقامت اور حُسنِ کردار کی وجہ سے بہت متاثر تھیں۔ اس زمانے کے لوگ بت پرستی اور طرح طرح کے گناہوں میں گھرے ہوئے تھے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان آلودگیوں سے یکسر پاک تھے۔ ان سب اوصاف سے متاثر ہو کر آپ کی صاحبزادیاں فوراً ایمان لے آئیں۔[2]

اس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانے کو یہ شرف حاصل ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے اور شریعت اسلامیہ کی پیروی کرنے والا پہلا گھرانہ بنا۔ تلاوتِ قرآن اور اقامتِ صلاۃ کے لحاظ سے بھی اس گھرانے کو فوقیت حاصل ہوئی اور اللہ نے انھیں خوبیوں سے نوازا۔ انھی خصوصیات اور امتیازات کی وجہ سے اسلامی دعوت کی تاریخ میں اس پہلے کاشانۂ نبوت کو عظمت حاصل ہوئی اور اس خانوادے نے اسلام کی نشر واشاعت میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔

اس مقدس کاشانے کی خصوصیات وامتیازات درج ذیل ہیں:

① غار حرا کے بعد آسمانی وحی کی پہلی تلاوت اس گھر میں ہوئی۔

② قبول اسلام میں سب مردوں اور عورتوں پر سبقت لے جانے والی شخصیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم

1 دراسة تحليلية لشخصية الرسول ﷺ للدكتور قلعجي، ص: 191. 2 السيرة النبوية لأبي شهبة: 284/1.

کی محبوب بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اسی گھر کی مکین تھیں۔

③ اقامت صلاۃ سب سے پہلے اسی گھر میں ہوئی۔

④ سب سے پہلے ایمان لانے والے تین افراد حضرت خدیجہ، حضرت علی اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہم اسی گھر میں اقامت گزیں تھے۔

⑤ نصرت دین کی ذمہ داری سب سے پہلے اس گھرانے نے قبول کی۔ گھر کا کوئی فرد، وہ چھوٹا تھا یا بڑا، دعوتِ دین کی حمایت سے پیچھے نہیں رہا۔[1]

قیادت کا حق صرف اسی گھر کو حاصل تھا۔ اسی گھر کی مالکہ کا یہ استحقاق تھا کہ وہ رہتی دنیا تک کے مسلمان گھرانوں اور ان کی عورتوں اور مردوں کے لیے ایک تابندہ مثال اور آئیڈیل بنے۔ اس گھر کے مکینوں میں ایک پاکباز، مجسمۂ ایمان واخلاق اور پیکر صدق و صفا بیوی تھی۔ ایک فرماں بردار، دست وباز و بننے والے دوست اور ساتھی کی صورت میں ایک چچا زاد نوجوان جسے سربراہ خاندان نے اپنی کفالت میں لے رکھا تھا۔ ایک سچا مومن، معاون اور مددگار منہ بولا بیٹا تھا۔ اور فرماں بردار واطاعت گزار، ایماندار اور حق کی تصدیق کرنے والی بیٹیاں تھیں۔[2]

اس خانوادے نے ایمان کا خوبصورت جامہ زیب تن کر لیا تھا اور تصدیق رسالت کے نور نے اس گھرانے کے تمام افراد کے کردار کو منور کر دیا تھا۔ شوہر نامدار اور زوجہ محترمہ میں کامل ہم آہنگی تھی اور ایک دوسرے کے جذبات واحساسات کا بھرپور احترام موجود تھا۔ اس جلیل القدر گھرانے کی فضا میں یہ ارشاد ربانی عملاً جلوہ گر نظر آ رہا تھا:

﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِیَسْكُنَ اِلَیْهَا ۚ﴾

''وہ (اللہ) وہی تو ہے جس نے تمھیں ایک جان (آدم) سے پیدا کیا اور اس سے

1 المرأة في العهد النبوي للدكتورة عصمة الدين، ص:43. 2 المرأة في العهد النبوي للدكتورة عصمة الدين، ص:45.

اس کا جوڑا بنایا تاکہ وہ اس سے سکون حاصل کرے۔''[1]

اس طرح اس گھر میں نبی کریم ﷺ کے اس فرمان کی عملی شکل موجود تھی جو آپ نے تربیت کے سلسلے میں فرمایا تھا:

«مَا مِنْ مَّوْلُودٍ إِلَّا يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ ، فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يُنَصِّرَانِهِ أَوْ يُمَجِّسَانِهِ»

''ہر بچہ فطرت سلیمہ پر پیدا ہوتا ہے۔ اس کی پیدائش کے بعد اس کے والدین اسے یہودی یا عیسائی یا مجوسی بنا ڈالتے ہیں۔''[2]

صحیح تربیت ہی کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کی بیٹیاں ایمان لانے اور تصدیق کرنے میں سبقت لے گئیں۔ اس طرح کا شانۂ نبوی کو سب پر فوقیت حاصل ہوگئی۔

ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے جو اللہ تعالیٰ کو اپنا رب مانتا ہے اور محمد ﷺ کو اس کا نبی اور رسول تسلیم کرتا ہے کہ وہ اپنی معاشرتی زندگی میں اعلیٰ قدریں اختیار کرنے، شرعی احکام کی بجا آوری اور دینی فرائض پر عمل کے لیے اس مثالی گھرانے کو اپنا آئیڈیل بنائے۔[3]

سنت الٰہیہ سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ قوم کی اصلاح اور تعمیر و ترقی کے لیے، ایک اچھے انسان، اچھے خاندان اور پھر ایک اچھے معاشرے کی تشکیل بنیادی عامل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسلام نے ایک مسلمان فرد کی تربیت کا خاص اہتمام کیا ہے اور ہر عمل سے پہلے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانا ضروری قرار دیا ہے۔ ایک مسلمان فرد کسی بھی معاشرتی تعمیر کے زاویوں کو درست رکھنے میں نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے۔

اسی طرح ایک خاندان بھی زبردست اہمیت کا حامل ہوتا ہے جس میں افراد تیار کیے جاتے ہیں۔ پیدائش سے موت تک ساری زندگی ایک شخص خاندان کی حفاظت و نگرانی میں رہتا

1 الأعراف 189:7. 2 صحيح البخاري، حديث: 1358، وصحيح مسلم، حديث: 2658.
3 المرأة في العهد النبوي للدكتورة عصمة الدين، ص: 46.

ہے اور یہ پہلی تربیت گاہ ہے جہاں کردار سازی ہوتی ہے، جہاں فرد کو اخلاق کے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے اور جہاں اس کی صلاحیتوں کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ اس طرح خاندان فرد اور معاشرے کے درمیان ایک پُل اور واسطے کا کام دیتا ہے۔ اگر واسطہ درست اور مضبوط ہوگا تو اس کی دونوں اطراف، یعنی فرد اور معاشرہ بھی درست اور مضبوط ہوں گے۔[1]

دعوت اسلامیہ کی تحریک کے آغاز ہی سے خاندان کی اصلاح کا اہتمام نمایاں تھا۔ تقدیر الٰہی کا فیصلہ بھی تھا کہ قبول اسلام میں ایک خاتون (حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا) سب سے سبقت لے جائے۔ اس طرح اسلام میں عورت کا درجہ بلند ہو اور اسلام کی مضبوط بنیاد بھی خاندان پر رکھی جائے۔

ایک بچے (حضرت علی رضی اللہ عنہ) کے قبول اسلام میں سبقت لے جانے میں اس جانب اشارہ تھا کہ قوم کے نونہالوں کے لیے جو کلیاں ہوتے ہیں، دعوت دین کی ضرورت ہے۔ اور نئی نسل کی تربیت کا خاص اہتمام کرنا چاہیے تاکہ وہ صحیح مراحل سے گزر کر اسلامی معاشرہ، اسلامی حکومت اور اسلامی ثقافت کی تعمیر میں اپنا کردار ادا کر سکے۔[2]

اسلامی دعوت کے نقطۂ آغاز پر ایک خاتون سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا، ایک آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ، ایک بچے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور خاندان نبوت کے بقیہ افراد کے سامنے دعوت پیش کرنا اس امر کی واضح دلیل ہے کہ یہ دعوت سب کے لیے ہے۔ چاہے کوئی چھوٹا ہو یا بڑا، مرد ہو یا عورت، آقا ہو یا غلام، یہ سب معاشرے کا حصہ ہیں اور اپنے وقت پر ان سب کو معاشرے کی تعمیر، حکومت کے قیام اور ثقافتِ اسلامیہ کی ترویج کے لیے اپنا کردار ادا کرنا ہے۔[3]

1 دولة الرسول ﷺ من التكوين إلى التمكين للدكتور كامل سلامة، ص: 208. 2 الأخوات المسلمات وبناء الأسرة القرآنية لمحمود جوهري، ص: 7. 3 دولة الرسول ﷺ من التكوين إلى التمكين للدكتور كامل سلامة، ص: 208.

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام

شرفاء اور معزّز مردوں میں سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے۔ بعثت سے قبل بھی وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نہایت قریبی ساتھیوں میں سے تھے۔ انھی کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میں نے جسے بھی اسلام کی دعوت دی، اس نے تردد کا اظہار یا توقف کیا یا اسے سمجھنے میں ٹھوکر کھائی، سوائے ابوبکر کے۔ میں نے جونہی انھیں دعوت دی، انھوں نے بلا تامّل قبول کرلیا۔[1]

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی بھی ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حسنات میں ایک بہترین عطیہ بھی ہیں۔ آپ کا قبول اسلام کسی ایک فرد کا اسلام لانا نہ تھا بلکہ قوم کا اسلام قبول کرنا تھا، جیسا کہ ابن اسحاق نے ذکر کیا ہے۔

- ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ قریش میں بڑی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔
- آپ بڑے نرم مزاج اور اپنی قوم میں نہایت ہر دل عزیز اور محبوب شخصیت کے مالک تھے۔
- آپ پوری قوم قریش میں لوگوں کا حسب نسب سب سے بہتر جانتے تھے اور قریش کے نسب کی خوبیوں اور خامیوں سے اچھی طرح واقف تھے۔
- آپ اعلیٰ اخلاق کے مالک اور سخاوت کرنے والے تاجر تھے۔
- آپ کی قوم کے لوگ آپ کے علم ونظر، تجارت اور حسن کردار کی وجہ سے آپ سے محبت کرتے تھے اور کثرت سے آپ کے پاس آیا کرتے تھے۔[2]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ایک بہت بڑی متاع تھے جو اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مرحمت فرمائی۔ فیاضی اور دریا دلی ایک ایسا وصف ہے جو لوگوں کی محبت حاصل کر لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ وصف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بڑی فیاضی سے عطا کیا تھا، اس لیے

1 دلائل النبوة للبيهقي: 164/2. 2 السيرة النبوية لابن هشام: 371/1.

ابوبکر رضی اللہ عنہ قریش کی ایک محبوب شخصیت تھے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ لوگوں سے اور لوگ ابوبکر رضی اللہ عنہ سے محبت کرتے تھے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: ”میری امت کے لیے میری امت کی سب سے زیادہ مشفق و مہربان شخصیت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں۔“ [1]

عربوں کے ہاں علم انساب اور علم تاریخ بہت اہم علوم مانے جاتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان دونوں علوم کے جید عالم تھے۔ قریش بھی اس بات کے معترف تھے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ قریش کے نسب اور ان کی تاریخ کو اس کے روشن دور اور تاریک ابواب سمیت سب سے بہتر جانتے ہیں۔ علم و ثقافت کے رسیا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھنے کے لیے کوشاں رہتے تھے تاکہ ان سے وہ علم حاصل کریں جو اس قدر فراوانی، گہرائی اور وسعت کے ساتھ کسی اور جگہ نہیں مل سکتا، اس لیے دانش مند اور بیدار مغز نوجوان ہمیشہ آپ کی مجالس کی جستجو میں رہتے تھے۔ یہ فکری اور علمی لحاظ سے ممتاز لوگ تھے جو جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ان علوم کے طلب گار رہتے تھے۔ یہ علمی وجاہت اور مقبولیت بھی جناب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی عظمت کو اجاگر کرتی ہے۔

مکہ میں محنت مزدوری کرنے والا طبقہ بھی موجود تھا اور مالدار طبقہ بھی۔ یہ سبھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی مجلس میں شرکت کے خواہش مند رہتے تھے۔ آپ مکہ کے بڑے تاجر تو نہ تھے لیکن مشہور تاجروں میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔

ضرورت مند لوگ بھی آپ کے پاس کثرت سے آتے تھے۔ آپ اپنے گھر آنے والوں کا نہایت خوش دلی سے پُر تپاک استقبال کرتے تھے۔ آپ بڑے مہمان نواز اور نرم طبیعت کے مالک تھے۔ مہمانوں کی آمد پر خوشی کا اظہار کرتے اور ان سے محبت بھرا سلوک کرتے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاں مکی معاشرے کے ہر طبقے کی دلچسپی کا سامان موجود تھا۔ [2]

---

1 جامع الترمذي، حديث:3791,3790، وسنن ابن ماجه، حديث:154، ومسند أحمد:184/3 و 281. علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے، دیکھیے: (السلسلة الصحيحة:298/3، وصحيح سنن الترمذي، حديث:3790) 2 التربية القيادية للدكتور الغضبان:115/1.

سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی دعوت: مکی معاشرے میں آپ کے پاس بڑا وسیع اور متنوع سماجی، علمی اور ادبی سرمایہ تھا، اس لیے جب آپ اسلام کی دعوت کے لیے متحرک ہوئے تو اچھے اور ممتاز لوگوں کی ایک جماعت نے آپ کی دعوت فوراً قبول کر لی۔ ان لوگوں کے نام درج ذیل ہیں:

① حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، قبول اسلام کے وقت عمر 34 سال۔
② حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ، قبول اسلام کے وقت عمر 30 سال۔
③ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، قبول اسلام کے وقت عمر 17 سال۔
④ حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ، قبول اسلام کے وقت عمر 12 سال۔
⑤ حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ، قبول اسلام کے وقت عمر 13 سال۔[1]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی محنت کا سب سے پہلا ثمر یہی پانچ جوان تھے۔ آپ نے انھیں اسلام کی دعوت دی جو انھوں نے فوراً قبول کر لی۔ وہ ایک ایک کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے کر آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے سامنے یہ لوگ ایمان لائے۔

یہ وہ ابتدائی ستون تھے جن پر دعوت دین کی عمارت استوار ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت کو مضبوط بنانے والا یہ پہلا سامان رسد تھا۔ انھی کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت فرمائی اور انھیں طاقت بہم پہنچائی، پھر کیا مرد اور کیا عورتیں، سب کے سب فوج در فوج اللہ کا دین قبول کرنے لگے۔ اس ہراول دستے کا ہر فرد اسلام کا داعی تھا۔ کم تعداد میں ہونے کے باوجود انھوں نے رسالت کی حفاظت کی اور ایک عظیم لشکر کی طرح دعوت کا کام کیا۔ اس میدان میں کوئی ان سے آگے نہ بڑھ سکا نہ ان جیسا کردار ادا کر سکا۔ تاریخ اسلام میں ان جیسی کوئی نظیر نہیں ملتی۔[2]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دعوت الی اللہ میں سرگرمی اس حقیقت کو نمایاں کرتی ہے

---

1 التربية القيادية للدكتور الغضبان: 116/1. 2 محمد رسول الله ﷺ لصادق عرجون: 533/1.

کہ دین حق پر ایمان کیسے لایا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی بجا آوری کیسے کی جاتی ہے اور ایک مومن کا طرز عمل کیسا ہوتا ہے۔ اسے ایک لمحہ کے لیے بھی چین اور سکون نہیں ملتا۔ جس سچائی پر وہ ایمان لایا ہے جب تک وہ اس کی حقانیت کو دنیا کے روبرو ثابت نہیں کر دیتا، آرام سے نہیں بیٹھتا، اس کی یہ تگ و دو کوئی جذباتی نہیں ہوتی نہ یہ عارضی اور جلد ختم ہونے والی ہوتی ہے کہ جھاگ کی طرح بیٹھ جائے یا کوئلے کی طرح راکھ ہو جائے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا دینی جذبہ اور سرگرمی و مستعدی ان کے آخری سانس تک باقی رہی۔ اس میں کوئی کمی، کمزوری یا اکتاہٹ پیدا نہیں ہوئی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ دعوت کا حامی بنانے کے لیے صاحب حیثیت لوگوں کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی نشر و اشاعت میں دوسروں کی نسبت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اثرات زیادہ وسیع اور دور رس تھے۔[1]

قبولِ اسلام سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جو تعلق تھا، وہ ذاتی اور طبعی میلان کی وجہ سے تھا۔ یہ لگاؤ نئے سرے سے ایک اللہ پر ایمان اور مصائب میں ایک دوسرے کے دست و بازو بننے کی بنیاد پر استوار ہوا۔ رسول اللہ ﷺ تمام اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں آپ ﷺ کا درجہ بہت بلند تھا اور عوام الناس میں بھی آپ ایک خاص مرتبے کے حامل تھے، تاہم آپ ﷺ کی دعوتی جدوجہد کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے سے بڑی تقویت حاصل ہوئی کیونکہ وہ عوام الناس میں خاصے مقبول تھے اور سبھی انھیں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔[2]

اہل ایمان کی ایک ایسی جماعت تیار کرنے کے لیے جو مملکت اسلامیہ کے قیام کے لیے جدوجہد کر سکے، لوگوں کو اپنے معبود حقیقی کے دین کی دعوت دے سکے اور ایک بے مثال

1 الوحي وتبليغ الرسالة للدكتور يحيىٰ اليحيٰ، ص: 62. 2 خاتم النبيين لأبي زهرة، ص: 298.

اسلامی معاشرہ وجود میں لا سکے، اس مقصد کے لیے قابل ترین شخصیات کا انتخاب کر کے انھیں انفرادی طور پر راز داری کے ساتھ دعوت دینے کا کام جاری رہا۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا دوسرا گروہ

پہلے گروہ کے حلقہ بگوش اسلام ہونے کے بعد صحابۂ کرام کا جو دوسرا گروہ تیار ہوا، اس میں اسلام قبول کرنے والی شخصیات کے نام یہ ہیں:

① ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ۔

② ابوسلمہ عبداللہ بن عبدالاسد بن مخزوم بن مُرّہ رضی اللہ عنہ۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی بھائی ہیں اور آپ کی پھوپھی (برۃ بنت عبدالمطلب) کے صاحبزادے ہیں۔

③ ارقم بن ابی الارقم مخزومی رضی اللہ عنہ۔

④ عثمان بن مظعون اَلْجُمَحِی رضی اللہ عنہ۔

⑤ عبیدہ بن حارث بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ۔

⑥ سعید بن زید بن عمرو بن نفیل رضی اللہ عنہ۔

⑦ قدامہ بن مظعون رضی اللہ عنہ۔

⑧ عبداللہ بن مظعون رضی اللہ عنہ۔

⑨ فاطمہ بنت خطاب بن نفیل رضی اللہ عنہا۔ یہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی بہن اور سعید بن زید رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ ہیں۔

⑩ اسماء بنت ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہما۔

⑪ خباب بن اَرت رضی اللہ عنہ، یہ بنوزہرہ کے حلیف تھے۔

⑫ عائشہ بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما۔[1]

[1] دولة الرسول ﷺ من التكوين إلى التمكين للدكتور كامل سلامة، ص: 212.

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا تیسرا گروہ

تیسرے گروہ میں مشرف بہ اسلام ہونے والی پاکیزہ ہستیوں کے نام یہ ہیں:

① عمیر بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ۔ یہ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے بھائی ہیں۔

② عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ۔

③ مسعود بن القاری رضی اللہ عنہ۔ انھیں مسعود بن ربیعہ بن عمرو بھی کہا جاتا ہے۔

④ سلیط بن عمرو رضی اللہ عنہ۔

⑤ حاطب بن عمرو رضی اللہ عنہ۔ یہ سلیط کے بھائی ہیں۔

⑥ عیاش بن ابی ربیعہ رضی اللہ عنہ۔

⑦ اسماء بنت سلامہ رضی اللہ عنہا۔ یہ عیاش بن ابی ربیعہ رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ ہیں۔

⑧ خنیس بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ۔

⑨ عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ۔ یہ آل خطاب کے حلیف تھے۔

⑩ عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ۔

⑪ ابواحمد بن جحش رضی اللہ عنہ۔

⑫ جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ۔

⑬ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا۔ یہ جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ ہیں۔

⑭ حاطب بن حارث رضی اللہ عنہ۔

⑮ فاطمہ بنت مجلّل رضی اللہ عنہا۔ یہ حاطب بن حارث رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ ہیں۔

⑯ حطاب بن حارث رضی اللہ عنہ۔ یہ حاطب بن حارث رضی اللہ عنہ کے بھائی ہیں۔

⑰ فکیہہ بنت یسار رضی اللہ عنہا۔ یہ حطاب بن حارث رضی اللہ عنہ کی اہلیہ ہیں۔

⑱ معمر بن حارث رضی اللہ عنہ۔ یہ حاطب اور حطاب رضی اللہ عنہما کے بھائی ہیں۔

⑲ سائب بن عثمان بن مَظعُون رضی اللہ عنہ۔

⑳ مُطَّلب بن ازہر رضی اللہ عنہ۔

㉑ رَمْلَہ بنت ابی عوف رضی اللہ عنہا۔ یہ مطلب بن ازہر رضی اللہ عنہ کی اہلیہ ہیں۔

㉒ نُحَّام بن عبداللہ بن اُسید رضی اللہ عنہ۔

㉓ عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ۔ یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام ہیں۔

㉔ فہیرہ رضی اللہ عنہ۔ یہ عامر رضی اللہ عنہ کے والد ہیں۔ یہ طُفیل بن حارث کے غلام تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انھیں خرید کر آزاد کر دیا۔

㉕ خالد بن سعید بن عاص رضی اللہ عنہ۔

㉖ اُمَینہ بنت خلف رضی اللہ عنہا جو خالد بن سعید رضی اللہ عنہ کی اہلیہ محترمہ ہیں۔

㉗ ابوحذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ بن عبدشمس رضی اللہ عنہ۔

㉘ واقد بن عبداللہ بن عبدمناف رضی اللہ عنہ۔

㉙ خالد بن بُکیر بن عبدیالیل رضی اللہ عنہ۔

㉚ عامر بن بکیر بن عبدیالیل رضی اللہ عنہ۔

㉛ عاقل بن بکیر بن عبدیالیل رضی اللہ عنہ۔

㉜ ایاس بن بکیر بن عبدیالیل رضی اللہ عنہ۔

㉝ عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ۔ یہ بنومَخزوم بن یقظہ کے حلیف تھے۔ ابن ہشام نے ان کی نسبت عنسی اور ان کا تعلق مذحج سے بیان کیا ہے۔

㉞ صُہیب بن سنان رومی رضی اللہ عنہ۔

㉟ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ۔

㊱ حضرت انیس غفاری رضی اللہ عنہ۔

㊲ اُمِ ابوذر و انیس غفاری رضی اللہ عنہم۔

(38) حضرت بلال بن رباح حبشی رضی اللہ عنہ۔[1]

اسلام کے اس ہراول دستے کا تعلق قریش کے تمام قبائل سے ہے۔ ابن ہشام نے ان کی تعداد چالیس سے زیادہ بیان کی ہے۔[2]

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ اس کے بعد لوگ جوق در جوق اسلام قبول کرنے لگے ان میں مرد وزن سبھی شامل تھے اور مکہ میں اسلام کا تذکرہ زبان زد عام ہوگیا۔[3]

مذکورہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اسمائے گرامی کا جائزہ لینے سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ اسلام کا یہ ہراول دستہ جسے سب سے پہلے اسلام قبول کرنے کا شرف حاصل ہوا یہ اپنی قوم کے بہترین لوگ تھے۔ یہ گھٹیا اور ادنیٰ درجے کے افراد نہ تھے جیسا کہ بعض دشمنان اسلام نے انھیں کمتر لوگوں کی صورت میں پیش کیا ہے اور کہا ہے کہ ان کی اکثریت غلاموں کی تھی جنھوں نے آزادی کے حصول کے لیے اسلام کا لبادہ پہن لیا تھا۔

بعض سیرت نگاروں نے بھی اسلام کے اس ہراول دستے (سابقین اسلام) کے بارے میں بحث کرتے ہوئے اس حقیقت سے پہلو تہی کی ہے۔ ایک سیرت نگار رقمطراز ہیں کہ سیرت ہمیں بتاتی ہے کہ اس مرحلے میں جو لوگ اسلام میں داخل ہوئے ان کی اکثریت تنگ دست، کمزور اور غلاموں پر مشتمل تھی۔ اس میں کیا حکمت تھی؟[4]

بعض سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ آغاز اسلام سے تین سال تک دعوت کے نتیجے میں چالیس خواتین و حضرات مسلمان ہوئے جن میں اکثر کمزور، پسے ہوئے، تنگ دست، غلام یا آزاد کردہ غلام تھے اور اس ہراول دستے میں مختلف عجمی لوگ شامل تھے، جیسے صہیب رومی اور بلال حبشی رضی اللہ عنہما وغیرہ۔[5]

بعض نے لکھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کمزور قسم کے مرد، عورتیں اور آزاد کردہ لوگ ایمان لائے۔[6]

1 السيرة النبوية لأبي شهبة: 287/1. 2 السيرة النبوية لابن هشام: 245/1-262. 3 السيرة النبوية لابن هشام: 262/1. 4 فقه السيرة للبوطي، ص: 77. 5 فقه السيرة للبوطي، ص: 79.
6 حدائق الأنوار ومطالع الأسرار لابن الديبع الشيباني: 301/1.

اگر بنظر عمیق دیکھا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ فقراء، کمزور، آزاد کردہ غلام یا عجمی کہہ کر جن لوگوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ صرف تیرہ افراد ہیں۔ اور اس زمانے میں اسلام قبول کرنے والے گروہ میں اس تعداد کو اکثریت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ حقیقت میں اس تعداد کا پانچواں حصہ ہے۔[1]

اس وقت جو لوگ مسلمان ہوئے تھے ان کے قبول اسلام کا سبب کوئی دنیاوی غرض نہیں تھی بلکہ وہ انشراح صدر کے ساتھ حق کو پہچان کر اس پر ایمان لائے تھے اور پیغمبر حق کے دست و بازو بنے تھے اور اس جذبۂ حق پرستی میں وہ سب لوگ یکساں تھے چاہے امیر ہوں یا غریب، آزاد ہوں یا غلام۔ حضرت ابوبکر صدیق، بلال، عثمان، صہیب رومی رضی اللہ عنہم، سب اس معاملے میں برابر تھے۔[2]

فضیلۃ الاستاذ صالح شامی فرماتے ہیں: ''ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم اولین اسلام لانے والے کمزور قسم کے لوگوں اور غلاموں کا انکار کریں۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ اور یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس قسم کے لوگوں کی اکثریت تھی تو پھر اسلام کی دعوت ایک طبقاتی جنگ کا منظر پیش کرے گی جس میں عام تحریکوں کی طرح کمزور اور پسے ہوئے لوگوں کے دلوں میں طاقتور طبقے کے خلاف نفرت پیدا کر کے انھیں ان کے مدمقابل کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ جبکہ یہ چیز تو کسی مسلمان کے تصور میں بھی نہیں تھی۔ جتنے لوگ بھی اسلام میں داخل ہوئے ان سب نے ایک اللہ کی بندگی اختیار کرتے ہوئے ایک دوسرے کو بھائی بھائی سمجھا۔

یہ تو اس دعوت کے حق ہونے کی بڑی مستند دلیل ہے کہ آغاز ہی میں ان لوگوں کی اکثریت نے اسے قبول کیا جو اپنی قوم کے بہترین افراد تھے اور انھوں نے اس عقیدے کی خاطر طرح طرح کی شدید تکلیفیں اور مشقتیں برداشت کیں اور ایسا اہانت آمیز سلوک

---

1 من معين السيرة لصالح الشامي، ص:39,38. 2 من معين السيرة لصالح الشامي، ص:40.

برداشت کیا جو کبھی ان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ آیا تھا۔"[1]

اسلام کی نسبت تو ایسی پاکیزہ ہستیوں، روشن عقلوں اور شفاف دلوں کی جانب ہے، جنھیں اللہ رب العزت نے اسی مقصد کے لیے وجود بخشا تھا۔ ان جلیل القدر ہستیوں کے نام یہ ہیں: حضرت خدیجہ، حضرت ابوبکر صدیق، حضرت علی، حضرت عثمان، حضرت زبیر، حضرت عبدالرحمٰن، حضرت طلحہ، حضرت ابوعبیدہ، حضرت ابوسلمہ، حضرت ارقم، حضرت عثمان بن مظعون، حضرت سعید بن زید، حضرت عبداللہ بن جحش، حضرت جعفر طیار، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت فاطمہ بنت خطاب، حضرت خالد بن سعید، حضرت ابوحذیفہ بن عتبہ رضی اللہ عنہم اور ان جیسی دوسری کئی شخصیات ہیں جنھیں سب سے پہلے اسلام قبول کرنے اور مسلمانوں کا ہراول دستہ بننے کا اعزاز حاصل ہوا اور یہ سب کے سب اپنی اپنی قوم کے معزز اور باوقار افراد تھے۔[2]

1 من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 40. 2 من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 40،

ملحوظہ: شروع شروع میں کس قسم کے لوگ ایمان لائے تھے۔ اس ضمن میں مؤلف نے ایک اہم دلیل کا ذکر نہیں کیا۔ وہ یہ ہے کہ شاہ روم ہرقل نے ابوسفیان رضی اللہ عنہ، جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، سے ایک یہ سوال بھی کیا تھا: «فَأَشْرَافُ النَّاسِ يَتَّبِعُونَهُ أَمْ ضُعَفَائُهُمْ؟» "امیر کبیر اور وڈیرے لوگ ان کی اتباع کرتے ہیں یا غریب مسکین؟" حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کمزور لوگ۔ ہرقل اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہنے لگا: "انبیائے کرام علیہم السلام کے پیروکار ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔" (صحيح البخاري، حديث: 7) ایک روایت میں ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے جواب کی وضاحت خود ہرقل کی زبانی اس طرح منقول ہے: «فَزَعَمْتَ أَنَّهُمُ الْأَحْدَاثُ وَالْمَسَاكِينُ وَالضُّعَفَاءُ وَكَذٰلِكَ أَتْبَاعُ الْأَنْبِيَاءِ فِي كُلِّ زَمَانٍ» "تمھارا خیال ہے کہ آپ کی اتباع کرنے والے نوعمر، مسکین، غریب اور ناتواں قسم کے لوگ ہیں۔ اور انبیائے کرام کے پیروکار ہر زمانے میں ایسے ہی ہوتے ہیں۔" (دلائل النبوة للبيهقي: 383/4) ایک اور روایت میں ہرقل کا سوال اس طرح بھی منقول ہے: «أَضُعَفَائُهُمْ أَمْ أَشِدَّائُهُمْ؟» "ان میں سے کمزور لوگ آپ کی اتباع کرتے ہیں یا سرکردہ اور طاقت ور لوگ؟" (المصنف لعبدالرزاق: 345/5 و 9724) دراصل ہرقل کا یہ تبصرہ قرآن مجید کی حسب ذیل آیات کی عکاسی کرتا ہے: ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ○ ﴾ "اور ہم نے کسی بھی بستی میں کوئی متنبہ کرنے والا بھیجا تو وہاں کے خوشحال متکبر لوگوں نے یہی کہا کہ تم جو دے کر بھیجے گئے ہو ہم اسے نہیں مانتے۔" (سبا 34:34) اور نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کے سرداروں نے کہا: »

یہی مسلمانوں کا وہ ہراول دستہ ہے جو نبی کریم ﷺ کی دعوت پر سب سے پہلے ایمان لایا اوران کی تصدیق کی۔

دعوت وتبلیغ کا تسلسل

نبی کریم ﷺ نے نہایت خفیہ انداز میں دعوت وتبلیغ کی مہم جاری رکھی اور اپنے خاندان اور حلقۂ احباب میں سے ایسے افراد کو جمع کرتے رہے جو آپ کے فرماں بردار بھی ہوں اور مدد گار بھی، نیز ان کے حلقہ بگوش اسلام ہونے کے بعد دعوت وتبلیغ کی راز داری بھی برقرار رہے۔ بعد میں یہی لوگ رسول اکرم ﷺ کے قابل اعتماد معاون بنے اور انھوں نے چپکے چپکے دعوت کا حلقہ وسیع کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ رسول اللہ ﷺ کی دعوتی زندگی میں یہ ایک مشکل ترین مرحلہ تھا۔ آپ ﷺ اور آپ پر ایمان لانے والوں کو اس مرحلے میں دعوتی سرگرمیوں کے سلسلے میں شدید تکالیف اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ دعوت صرف انھی لوگوں کے سامنے پیش کی جاتی تھی جو قابل اعتماد ہوں اور ان سے کسی ضرر یا خرابی کا اندیشہ نہ ہو۔ اس وجہ سے دعوتی عمل کی رفتار دھیمی اور محتاط رہی۔اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دعوت کے تقاضوں کی معرفت کا حصول اور ان کی انجام دہی ایک دشوار گزار عمل تھا۔ اس دعوت کو قبول کرنے والے سے پہلا تقاضا ادائیگی نماز اور حسب

﴿ وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا ﴾ ”اور ہم تجھے نہیں دیکھتے کہ ان لوگوں کے سوا کسی نے تیری پیروی کی ہو جو ہم میں سے گھٹیا ہیں۔“ (ھود 27:11) ان سب دلائل کو سامنے رکھیں تو یہی بات سمجھ آتی ہے کہ جن سیرت نگاروں نے شروع شروع میں اسلام لانے والی اکثریت کے کمزور اور ناتواں ہونے کا بتایا ہے وہ اس حساب سے ہے کہ وہ مالدار اور سردار قسم کے لوگ نہیں تھے اور واقعتاً ایسا ہی تھا۔ سردار قسم کے لوگ تو بدر میں جہنم واصل ہوئے۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ بسا اوقات غریب لوگ بھی خاندانی عزت، وقار اور شرف میں بڑا نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ مؤلف نے جن صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا ذکر کیا ہے ان کی اکثریت اسی نوعیت کی تھی۔ لہٰذا اس صورت میں کوئی تضاد نظر نہیں آتا۔ اور اگر مؤلف کے نتیجے کو تسلیم کر لیں کہ کمزور فقراء اور آزاد کردہ غلام کل تعداد کا پانچواں حصہ تھے تو اس صورت میں مذکورہ دلائل سے تضاد لازم آتا ہے۔ واللہ أعلم (ن ۔ ف)

استطاعت فہم قرآن کا ہوتا تھا۔ لیکن وہ علانیہ نماز ادا کرسکتا تھا نہ تلاوت قرآن، اس لیے مسلمان وادیوں اور گھاٹیوں میں چھپ کر نماز ادا کرتے تھے۔[1]

سلامتی کی تدابیر

دعوت دین کے اس مرحلے کا امتیازی نشان اخفا اور راز داری تھا۔ اپنے قریبی عزیزوں سے بھی یہ کام مخفی رکھا جاتا تھا۔ راز داری برقرار رکھنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کی ہدایات بہت واضح اور قطعی تھیں۔ آپ ﷺ نے اسلام قبول کرنے والوں کے متعدد حلقے بنا دیے تھے۔ یہ حلقے مخفی طور پر اپنی تیاری اور تربیت کے مراحل طے کر رہے تھے۔ ان حلقوں کا خود کو مخفی رکھنا کسی بزدلی یا گریز کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اس لائحہ عمل ہی کا ایک حصہ تھا جو رب العزت نے ودیعت فرمایا تھا۔ آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو چھوٹے چھوٹے حلقوں کی صورت میں منظّم فرمایا۔ نئے مسلمان ہونے والے ایک دو افراد کو ایک ایسے شخص کی کفالت میں دے دیا جاتا جو طاقتور بھی ہوتا تھا اور صاحب استطاعت بھی۔ وہ اسی کے پاس رہتے اور وہی ان کے کھانے پینے کی ضروریات کا اہتمام کرتا تھا۔ جس نے قرآن حکیم کا نازل شدہ حصہ یاد کیا ہوتا، وہ دوسروں کو یاد کرا دیتا تھا۔ اس طرح یہ علمی حلقے تشکیل پاتے جو علمی حلقے ہونے کے ساتھ ساتھ اخوت و محبت کے گہوارے بھی تھے۔

قرآن حکیم ہی رسول اللہ ﷺ کا وہ منہج تھا جس کی اساس پر آپ نے صحابۂ کرام کی تربیت فرمائی۔ آپ کی تربیت نہایت جامع اور ہمہ جہت تھی۔ آپ ﷺ نے ان کے عقائد درست کیے، عبادات کا طریقہ بتایا۔ اخلاق حسنہ کا سلیقہ سکھایا اور انھیں سلامتی کا راستہ اختیار کرنے کی ترغیب دی، اس لیے کہ قومی ترقی کے اہم عوامل میں سے یہ بھی ہے کہ قوم کے ہر فرد میں اپنی حفاظت اور سلامتی کا احساس بیدار ہو، خاص طور پر اس ہراول دستے کے افراد میں جو اسلام کا پاسبان بھی ہو اور انسانی دنیا میں اس دین قیم کے غلبے کے

[1] الغرباء الأولون للدكتور سلمان العودة.

لیے جدو جہد بھی کررہا ہو، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مکی دور میں تربیت اسی اساس پر ہوئی۔ جوں جوں دعوت وتبلیغ کا عمل وسیع ہوتا گیا اپنے تحفظ وسلامتی کا احساس بھی بڑھتا گیا۔ اسی راہ عمل میں دعوت کی کامیابی کے ساتھ اسلامی حکومت وجود میں آگئی۔

مکی دور میں نازل ہونے والی آیات بھی اس حقیقت کی طرف رہنمائی فرماتی ہیں:

﴿ يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝﴾

''اے میرے بیٹو! تم جاؤ اور یوسف اور اس کے بھائی کو ڈھونڈو اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا، بے شک اللہ کی رحمت سے تو کافر ہی مایوس ہوا کرتے ہیں۔''[1]

حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو اس بات کی ترغیب دی کہ وہ یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائی کی تلاش کے سلسلے میں معلومات اکٹھی کریں اور انھیں تلاش کریں۔ اللہ کا ایک نبی دوسروں سے اطلاعات حاصل کرنے کی اہمیت واضح کررہا ہے۔ معلومات حاصل کرنا فن سراغ رسانی کے بنیادی امور میں سے ہے۔ اور فرمان الٰہی: ﴿ وَلَا تَايْـَٔسُوْا ﴾ ''اور مایوس نہ ہونا'' حصول معلومات کی اہمیت کو اجاگر کررہا ہے۔[2]

اسی لیے صحابۂ کرام سب سے پہلے اس شخص کے بارے میں معلومات حاصل کرتے تھے جسے دین کی دعوت دینا مقصود ہوتا تھا اور اعلیٰ قیادت ان امور کی نگرانی کرتی تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقصد کے لیے امن وسلامتی کا ایک اعلیٰ نظام ترتیب دیا تھا جس سے قیادت اور دعوتی مراکز کے باہمی تعلق کی نگرانی ہوتی تھی تاکہ راز داری برقرار رہے۔

قرآن حکیم کی مکی آیات میں یہ ارشاد ربانی بھی موجود ہے:

﴿ وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ ۡ فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰٓي اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ ۝﴾

---

[1] يوسف 12:87. [2] الاستخبارات العسكرية في الإسلام لعبدالله علي السلامة، ص: 105.

''اور موسیٰ کی ماں نے اس (موسیٰ) کی بہن سے کہا: تو اس کے پیچھے پیچھے جا، پھر وہ (گئی تو) اسے دور سے دیکھتی رہی، جبکہ وہ (فرعونی) بے خبر تھے۔ اور ہم نے موسیٰ پر دائیوں (کے دودھ) کو پہلے ہی سے حرام کردیا تھا، پھر موسیٰ کی بہن نے کہا: کیا میں تمھیں ایک گھر والے کا بتاؤں جو تمھارے لیے اس کی پرورش کریں اور وہ اس کے خیرخواہ بھی ہوں؟'' [1]

مذکورہ دونوں آیات سے ہمیں درج ذیل امور کی رہنمائی ملتی ہے:

① حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ محترمہ اپنے بیٹے کی حفاظت کے لیے اس کے بارے میں حصول معلومات کے ذرائع بروئے کار لاتی رہیں۔ ﴿وَقَالَتْ لِأُخْتِهِ قُصِّيهِ﴾ میں ''قص'' کے معنی ہوتے ہیں نشانات وعلامات کا پیچھا کرتے ہوئے معلومات جمع کرنا۔

② حصول معلومات کے لیے اس شخصیت کا انتخاب کیا گیا جو قابل اعتماد بھی تھی اور خود بھی حصول معلومات میں دلچسپی رکھتی تھی تاکہ حاصل ہونے والی معلومات صحیح اور قابل اعتماد ہوں۔ اور یہ سارا کام دلچسپی اور شوق کے ساتھ کیا جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے حضرت موسیٰ کی بہن کے سوا کسی اور شخصیت کا انتخاب نہیں کیا کیونکہ بہن اس مقصد کے لیے دلچسپی بھی رکھتی ہے اور قابل اعتماد بھی ہوتی ہے۔ اور اپنی ذات سے بالاتر ہو کر ہر قسم کی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے، لہٰذا یہ نہایت اہم بات ہے کہ حصول معلومات کے لیے جس شخصیت کو بھیجا جائے وہ اپنی ذات کی فکر کیے بغیر دلچسپی اور شوق و ولولے کے ساتھ اپنا مقصد حاصل کرے۔

③ اپنے ہدف کا پیچھا اس انداز میں کیا جائے کہ نہ کسی کی نظروں میں آیا جائے اور نہ کوئی ایسی حرکت سرزد ہو جس پر دیکھنے والوں کو شک گزرے۔ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے اپنی بیٹی سے یہی کہا تھا کہ وہ خبردار رہے اور کسی کی نگاہ میں نہ آئے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ وہ دور

1 القصص 28:11،12.

ہی دور سے اپنے بھائی کو دیکھتی رہی اور کسی دیکھنے والے کو گمان تک نہ گزرا کہ یہ لڑکی کسی خاص مقصد سے آرہی ہے۔

④ حصول معلومات کے لیے انتہائی گہری نگاہ، بہت ہوشیاری اور دانائی سے کام لینا چاہیے جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے کیا۔

⑤ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے سراغ رسانی کا جدید طریقہ اختیار کیا۔ یہ طریق کار اپنے موقف کے مطابق ذہن سازی کرنے یا رائے عامہ ہموار کرنے سے تعبیر کیا جاتا ہے جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے جب دیکھا کہ دودھ پلانے والی عورتیں اس بچے (موسیٰ علیہ السلام) کو دودھ پلانے میں کامیاب نہیں ہوسکیں تو ان سے (ہمدردی کے انداز میں) کہا:

﴿هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰٓى اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَهُمْ لَهٗ نٰصِحُوْنَ۝﴾

"کیا میں تمھیں ایک گھر والے بتاؤں جو تمھارے لیے اس کی پرورش کریں اور وہ اس کے خیر خواہ بھی ہوں؟"[1]

⑥ حصول معلومات کے ساتھ ساتھ اپنا مقصد حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کی جائے۔ موسیٰ علیہ السلام کی بہن نے ان کا ٹھکانا معلوم کر کے اپنی ماں تک صرف اس کی اطلاع نہیں پہنچائی بلکہ اس نے تمام معلومات اکٹھی کیں، موسیٰ علیہ السلام تک رسائی حاصل کی اور انھیں اپنی ماں کی گود تک واپس لانے کی بھرپور کوشش کی جس میں وہ کامیاب بھی رہی۔[2]

ان آیات سے صحابۂ کرام میں تحفظ و سلامتی کا جذبہ بیدار ہوگیا اور انھوں نے اپنے دعوتی کام میں احتیاط کا پہلو ہر آن ملحوظ خاطر رکھا۔ افراد کی تربیت کا زمانہ ہو یا قیامِ حکومت کے بعد کا دور، سیرت نبوی میں ایسی تدابیر بکثرت موجود ہیں جو اپنی حفاظت اور سلامتی کے لیے ضروری ہیں۔ اس لیے عہد حاضر میں اسلامی تحریکوں اور مسلمان حکومتوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ امن و سلامتی کو یقینی بنانے کے لیے تمام جدید وسائل بروئے کار لائیں

[1] القصص 12:28. [2] الاستخبارات العسكرية في الإسلام لعبد الله علي السلامة، ص: 111-113.

بلکہ اس مقصد کے لیے مطلوب آلات تیار کریں تا کہ یہود ونصاریٰ اور بے دین لوگوں کے مذموم ارادوں سے اسلام اور مسلمانوں کو محفوظ رکھا جا سکے۔ امت میں انتشار پیدا کرنے والی اسلام دشمن سازشوں کا مقابلہ کر کے وحدت اُمّت کو مضبوط کیا جا سکے اور اسلام دشمن طاقتوں کی معاندانہ کارروائیوں کی نگرانی کی جا سکے۔ امن وسلامتی کے ضامن ان آلات سے جو معلومات حاصل ہوں گی وہ اسلامی قیادت کے لیے نہایت مفید ہوں گی۔ لیکن ضروری ہے کہ پوری دنیا پر نگاہ رکھنے اور معلومات حاصل کرنے کے لیے جو ادارے قائم کیے جائیں اور جو آلات تیار کیے جائیں وہ قرآن وسنت کی ہدایات کے مطابق ہوں۔ ان اداروں میں کام کرنے والے لوگ اعلیٰ اخلاق واوصاف کے مالک ہوں۔ اور ان میں امن پسند مسلمانوں کی صفات نمایاں ہوں۔

اگر مسلمان اس بات کا اہتمام کر لیں تو دشمنوں کی بہت سی غیر متوقع کارروائیوں سے محفوظ رہا جا سکتا ہے کیونکہ اگر آپ دشمن کے داخلی حالات سے آگاہ ہوں اور آپ کو اپنی صلاحیتوں کا بھی ادراک ہو تو پھر چاہے سینکڑوں معرکے ہو جائیں آپ کو کوئی خوف دامن گیر نہیں ہوگا۔ اس کے برعکس اگر آپ اپنی صلاحیتوں اور طاقت کا ادراک رکھتے ہوں مگر دشمن کی قوت اور اس کے داخلی حالات سے بے خبر ہوں تو پھر ہر معرکے میں شکست آپ کا مقدر بن سکتی ہے۔[1]

ایسے ادارے قائم کرنا اور وہ آلات تیار کرنا جو قیادت کو معلومات پر مبنی رپورٹیں مہیا کریں اور جن کی روشنی میں قیادت مستقبل کی منصوبہ بندی کر سکے، کوئی انوکھی بات نہیں بلکہ یہ تاریخ انسانیت کا ایک اہم باب ہے جو عہد نبوی اور خلافت راشدہ کے زمانے سے اب تک مسلمانوں کی تاریخ کا بھی حصہ رہا ہے۔

استحکام سلطنت کے اہم اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ مذکورہ انٹیلی جینس

[1] الاستخبارات العسكرية في الإسلام لعبد الله علي السلامة، ص: 113.

نظام پر توجہ دی جائے اور موجودہ حالات کے تقاضوں کے مطابق اسے تمام ارتقائی مراحل سے گزار کر نئے اور بہترین اسلوب پر استوار کیا جائے۔[1]

نبی کریم ﷺ صحابۂ کرام کی ہمہ جہت تربیت کی بنفس نفیس نگرانی فرمایا کرتے تھے۔ آپ نے صحابۂ کرام کے کئی گروپ تشکیل دیے تھے۔ مثلاً حضرت فاطمہ بنت خطاب (جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بہن تھیں) اور ان کے سرتاج حضرت سعید بن زید جو حضرت عمر کے چچازاد بھائی ہیں[2] انھیں حضرت نعیم بن عبداللہ النَّحام کے ساتھ ملا کر حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ کا شاگرد بنا دیا گیا تھا۔ قرآن حکیم سے ان کا تعلق محض یہ نہ تھا کہ قواعدِ تجوید کے ساتھ اس کی تلاوت کریں یا حروف کو ان کے صحیح مخارج سے ادا کریں یا اس کی بکثرت تلاوت کریں بلکہ ان کا اہم ترین مقصد قرآن کی تعلیم کا صحیح فہم حاصل کرنا تھا تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام اور عائد کردہ پابندیاں جان کر ان کے مطابق عمل کریں۔[3]

نبی کریم ﷺ ہمیشہ بڑی محکم اور منظّم منصوبہ بندی کرتے اور ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھاتے تھے۔ آپ کو کامل یقین تھا کہ ایک دن آپ کو علانیہ دعوت کا حکم ملنے والا ہے۔ دعوت کا یہ مرحلہ نہایت شدید اور صبر آزما ہوگا۔ اور اس مقصد کے لیے ایک منظّم اور قابل اعتماد جماعت کی موجودگی نہایت ضروری ہے۔ ایسی جماعت کی تیاری کے لیے ایک مرکز بھی ناگزیر تھا جہاں تربیت دینے والے پیغمبر ﷺ بنفس نفیس اپنے ساتھیوں سے براہ راست ملاقات کرتے۔ اسلام قبول کرنے والوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کی وجہ سے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا گھر تنگ پڑ گیا تو نبی کریم ﷺ اور صحابہ کی نظرِ انتخاب دارِ ارقم بن ابی ارقم پر پڑی۔ رسول اللہ ﷺ کو اس بات کا مکمل احساس و ادراک تھا کہ معاملات کی راز داری کے لیے

1 فقه التمكين في القرآن الكريم للصلابي، ص:311. 2 درحقیقت سعید بن زید رضی اللہ عنہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بھتیجے لگتے تھے۔ ان کے والد زید بن عمرو، عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے چچا زاد بھائی تھے اور ان دونوں کے دادا نفیل تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ عربی محاورے میں چچا کے پوتے کو بھی ابن عم ہی کہتے ہیں۔ (أسد الغابة: 476/2) 3 الدعوة الإسلامية لعبد الغفار عزيز، ص: 96.

انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے، اس کے ساتھ ساتھ تربیت دینے والے قائد کا اپنے ساتھیوں سے مسلسل رابطہ رکھنا اور ملتے رہنا بھی بے حد ضروری ہے۔ یہ میل ملاقات لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل بھی رہنی چاہیے تھی تا کہ دعوتی اور قائدانہ صلاحیتیں رکھنے والے افراد کی تیاری اور ان کی عملی وفکری رہنمائی کے لیے قائدِ تحریک اور اس کے پیروکاروں کے مابین وقفے وقفے سے ملاقاتوں کا منظّم سلسلہ جاری رہے۔

نبی کریم ﷺ کی طرف سے خفیہ اور مستحکم تنظیم سازی کا اس قدر اہتمام اس کی واضح دلیل ہے کہ آپ ﷺ کا مقصد صرف داعی تیار کرنا نہیں تھا کیونکہ اس کام کے لیے اس قدر اہتمام کی ضرورت نہ تھی۔ آپ ﷺ کا مقصد تو یہ تھا کہ ایسے افراد تیار کیے جائیں جو اسلامی حکومت کے نہ صرف ماہر معمار ثابت ہوں بلکہ دعوت دین کے ابلاغ کی ذمہ داریاں نبھانے اور اقوام عالم کی قیادت کا حق بھی ادا کرسکیں۔

اگر رسالت کا مقصد لوگوں تک محض دعوت پہنچانا ہی ہوتا تو اس کے لیے بہترین جگہ بیت اللہ تھی جہاں سبھی قریش جمع ہوتے اور محفلیں جماتے تھے۔ لیکن مقصد کچھ اور تھا، اسی لیے تنظیم سازی میں مکمل راز داری شرطِ لازم تھی تا کہ وہ جگہ کسی کی نظر میں نہ آئے جہاں نبی ﷺ اپنے ساتھیوں سے ملاقات کرتے ہیں، نہ اس جگہ پہنچنے کا کسی کو علم ہو سکے۔[1]

دار ارقم ایک مرکز قیادت

کتب سیرت میں یہ تذکرہ موجود ہے کہ فریقین (مسلمانوں اور مشرکین مکہ) کے درمیان سب سے پہلے ٹکراؤ، جس میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے ایک مشرک کو زخمی کردیا تھا، کے بعد دار ارقم کو اعلیٰ قیادت کا مرکز بنا لیا گیا تھا۔ ممتاز مؤرخ ابن اسحاق لکھتے ہیں کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اپنی قوم کے افراد سے چھپ کر گھاٹیوں میں جا کر نماز ادا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ مکہ کی

[1] دولة الرسول ﷺ من التكوين إلى التمكين للدكتور كامل سلامة، ص: 218.

ایک گھاٹی میں نماز پڑھ رہے تھے کہ کچھ مشرکین نے انھیں نماز پڑھتے دیکھ لیا۔ ان کے مابین تکرار ہوگئی اور نوبت برا بھلا کہنے اور لڑائی جھگڑے تک پہنچی۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر ایک مشرک کو اونٹ کی ران کی ہڈی دے ماری جس سے اس کا سر پھٹ گیا۔ یہ پہلا خون تھا جو حق و باطل کی کشمکش میں بہایا گیا۔[1]

دار ارقم دعوت دین کا ایک نیا مرکز بن گیا جس میں مسلمانوں کے اجتماعات ہوتے تھے اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی ہر نئی وحی رسول اللہ ﷺ سے براہ راست سیکھتے تھے۔ آپ ﷺ اللہ کی یاد دلاتے اور تلاوتِ قرآن سے ان کے قلوب و اذہان منور کرتے۔ مسلمان نہایت توجہ سے آپ کے فرمودات سنتے اور اپنے دل کی ہر بات اور درپیش اندیشے آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیتے تھے۔ یوں نبی ﷺ اپنی نگرانی میں ان کی تربیت فرماتے جیسا کہ اللہ عزوجل کی براہ راست نگرانی میں آپ ﷺ نے تربیت حاصل کی تھی۔ ان اجتماعات سے رسول اللہ ﷺ کو دلی سکون واطمینان حاصل ہوتا تھا۔[2]

رسول اللہ ﷺ کے تربیت یافتہ ہراول دستے کی اہم خصوصیات

رسول اللہ ﷺ سے براہ راست تربیت پانے والے اس ہراول دستے میں بہت سی اہم خوبیاں نمایاں تھیں۔ ان کی بدولت وہ ایسے مسلمان افراد کی تیاری کا کام نہایت ثابت قدمی سے انجام دیتے چلے گئے جو دولت ایمان سے سرشار حکومت قائم کرنے اور ایک شاندار تہذیب وجود میں لانے کی صلاحیت سے مالا مال ہوں۔ ان اہم خصوصیات میں سے چند ایک یہ تھیں:

وحی الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا اور سر مو انحراف نہ کرنا: عقائد ونظریات، احکام و مسائل اور اخلاق وآداب وغیرہ کا مکمل علم اور ذات باری تعالیٰ کا صحیح شعور وحی الٰہی اور قرآن وسنت ہی سے ممکن ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ذات باری تعالیٰ، اس کے

1 السيرة النبوية لابن هشام:282,281/1. 2 التربية القيادية للدكتور الغضبان:198/1.

اسماء و صفات اور اس کے افعال کی معرفت حاصل ہو۔ اس امر کا بخوبی علم ہو کہ اللہ تعالیٰ کو کن صفات سے متصف اور کن عیوب سے پاک جاننا چاہیے۔ فرشتوں، آسمانی کتابوں اور انبیاء کے بارے میں مکمل معرفت حاصل ہونی چاہیے۔ یوم حساب اور جنت وجہنم کے متعلق کامل شعور کے ساتھ ساتھ شریعت کے بارے میں مجمل و مفصل علم ہونا چاہیے۔ اور ان تمام شرعی احکام سے واقفیت ہونی چاہیے جن کا تعلق ہر بالغ و عاقل انسان سے ہوتا ہے۔ اس بات کی معرفت بھی رکھنی چاہیے کہ کس حالت میں کیا اسلوب اختیار کرنا چاہیے، غصے اور پیار کی حالت میں کیا انداز اپنانا چاہیے، امیری اور غریبی میں کونسا طریقہ اختیار کرنا بہتر ہے، حالت امن وجنگ میں کیا رویہ اختیار کیا جائے، خیر وشر میں کون سا راستہ اپنانا ضروری ہے اور فتنوں سے کیسے محفوظ رہا جائے اور فتنوں والے زمانے میں کیا کردار ادا کیا جائے۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ صحیح ایمان کی نعمت سے نوازتے ہیں ان کا طریقہ یہی ہوتا ہے کہ ہر موقع پر شرعی دلیل کی پابندی کرتے ہیں۔[1] فرمان الٰہی ہے:

﴿ وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ أُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ○ ﴾

’’اور جنھیں ہم نے پیدا کیا ان میں سے ایک گروہ (ان لوگوں کا) ہے جو حق کا راستہ بتاتے ہیں اور اسی کے ساتھ انصاف کرتے ہیں۔‘‘[2]

صحابۂ کرام نے دوسروں کی نسبت وحی اور دلائل سے زیادہ استفادہ کیا اور سب سے بڑھ کر احکام ربانی کے آگے سر تسلیم خم کیا۔ اس کے کچھ اسباب تھے، مثلاً:

① ان کے دل ہر قسم کی آلودگی اور غیر شرعی میلانات ورجحانات سے بالکل پاک تھے اور وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے ملنے والی ہدایات وتعلیمات کو قبول کرنے اور بلا تامل ان پر عمل پیرا ہونے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔

② انھیں شرعی قانون سازی اور وحی الٰہی کے نزول کا زمانہ میسر آیا اور اس کے ساتھ ساتھ

[1] صفة الغرباء للدكتور سلمان العودة، ص: 83. [2] الأعراف 181:7.

انھیں جناب رسول اللہ ﷺ کی رفاقت ومصاحبت کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ شرعی نصوص کے اسبابِ نزول اور احوال دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ بہتر جانتے تھے۔ یہ حقیقت محتاج وضاحت نہیں کہ شرعی نصوص کے صحیح فہم اور ان کی حقیقت اور فقاہت جاننے میں ان سے متعلقہ امور اور اسباب کی معرفت بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے۔

③ قرآن وسنت کی نصوص عام طور پر انھی واقعات وحالات کے بارے میں ہوتی تھیں جن کا تعلق صحابۂ کرام کی انفرادی یا اجتماعی زندگی سے ہوتا تھا، اس لیے ان نصوص کا روئے سخن براہِ راست ان کی طرف تھا۔ اسی وجہ سے وہ ان پر زیادہ اثر انداز ہوتی تھیں چونکہ یہ نصوص ظہور میں آنے والے نت نئے واقعات کا حل پیش کرتی تھیں اور وقوعے کے ساتھ ہی نازل ہوجاتی تھیں، اس لیے ایسے لمحات میں قلوب واذہان فوری اثر قبول کرتے تھے اور حکم کی عاجلانہ تعمیل کے لیے معاً مستعد رہتے تھے۔

④ عہد نبوی میں ہونے کی وجہ سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو نصوص (احادیث) کی صحت اور ضعف جانچنے کے لیے کسی مشقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور نہ بعد میں آنے والے لوگوں کی طرح انھیں سلسلہ اسناد کی ضرورت محسوس ہوئی، نہ اسماء الرجال اور فن عِلَل کی معرفت حاصل کرنا پڑی اور نہ غیر صحیح (ضعیف یا موضوع) روایات سے سابقہ پڑا، اس لیے کسی بھی حدیث کی قبولیت میں انھیں کبھی کوئی تردد نہیں ہوا جیسا کہ بعد میں آنے والے، خصوصاً وہ لوگ جن کے دلوں میں نفاق تھا یا جنھوں نے روایتِ سنت اور درایتِ سنت کی تعلیم پائی نہ اس میں تفقُّہ حاصل کیا، بیشتر احادیث قبول کرنے میں متردد ہوئے۔[1]

جبکہ صحابۂ کرام کا طرز عمل یہ تھا کہ بقول حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، وہ جو نہی کسی شخص کی زبان سے یہ کلمہ سنتے کہ "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" تو ہر طرف سے نظر پھیر کر اسی کی طرف متوجہ ہو جاتے۔[2]

1 صفة الغرباء للدكتور سلمان العودة، ص: 93,92. 2 صفة الغرباء للدكتور سلمان العودة، ص: 94.

ایمان اور وحی کا دلوں میں اُتر جانا: صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا وحی کے ذریعے حاصل ہونے والے علم کے ساتھ وہ معاملہ اور برتاؤ نہ تھا جو عام علمی حقائق کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ عقل تو ان کا ساتھ دیتی ہے مگر دل اور بقیہ اعضاء کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

ذات باری تعالیٰ، اس کے اسماء وصفات اور اس کے کارخانہ قدرت کی معرفت نے ان کے دلوں میں اس کی بے کراں محبت اور عبادت کے جذبات پیدا کر دیے تھے۔ اس سے ملاقات اور جنت میں اس کے جمال بے مثال کی دید کا شوق بڑھا دیا تھا۔ اس کی عظمت اور اس کے مؤاخذے، سزا، پکڑ اور عذاب کا خوف دلوں میں بٹھا دیا تھا۔ اس کی بے مثل نعمتوں کے حصول کا جذبہ بیدار کر دیا تھا۔ اور اس کی ذات پر حسنِ اعتماد، اس کی خوشنودی اور جنت کے حصول کی زبردست تڑپ پیدا کر دی تھی۔

یوں معرفت الٰہی اور ایمان باللہ کے تمام اثرات ان میں جمع ہو گئے تھے، یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت تمام محبتوں پر غالب آچکی تھی، ہر چیز کا خوف اس کے خوف تلے دب گیا تھا اور اسی کی ذات عالی ان کی تمام امیدوں کا مرکز بن گئی تھی۔ جنت اور جہنم کی معرفت نے ان کے دلوں میں دائمی اور لازوال نعمتوں کے حصول کی لگن اور خوفناک عذاب سے بچنے کا ڈر پیدا کر دیا تھا۔ کبھی ان کے دلوں پر جنت کی ان نعمتوں کا تصور چھا جاتا تھا جن کے حصول کے لیے وہ بے قرار تھے اور ان کی محرومی سے خوف کھاتے تھے۔ اور کبھی اس عذاب کا خیال آجاتا جس کے خوف سے وہ لرزتے رہتے تھے۔ ان کے دل صرف عالم آخرت ہی میں اٹک گئے تھے۔ انھیں اسی کی فکر تھی، اسی کا خوف تھا اور اسی سے ان کی ساری تمنائیں اور آرزوئیں وابستہ تھیں۔ گویا وہ قبروں سے جی اٹھنے، روز قیامت، میزان، پُل صراط، جنت اور جہنم کے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

تقدیر کی معرفت نے انھیں تمام اسباب سے بے نیاز اور ایک اللہ پر کامل یقین واعتماد عطا کر دیا تھا۔ کسی چیز کے نہ ملنے پر انھیں کوئی غم نہ ہوتا اور مل جانے پر وہ اتراتے نہیں

تھے۔ ہر چیز کے حصول کے لیے وہ خوبصورت اسلوب اختیار کرتے تھے کیونکہ جو انسان کے مقدر میں ہے وہ اسے ضرور ملے گا اور جو اس کے مقدر میں نہیں ہے، وہ ہرگز ہاتھ نہیں آئے گا۔ اس حقیقت کے ادراک نے ان کے دلوں میں ایسی دلیری پیدا کر دی کہ وہ اپنے مقاصد جلیلہ کے لیے آگے بڑھنا تو جانتے تھے مگر پیچھے ہٹنے کے تصور سے یکسر نا آشنا تھے۔ موت کی حقیقت جان کر اور اس پر ایمان لا کر وہ دنیا سے کنارہ کش ہو گئے اور تمام توجہ آخرت کی جانب مبذول کر لی۔ نیک اعمال پر ہمیشگی اختیار کی کیونکہ موت انسان کے بہت قریب ہے اور وہ نہیں جانتا کہ موت کب اسے اپنے شکنجے میں کس لے۔

حصول علم کا سب سے بڑا مقصد یہی ہے کہ وہ دل کی گہرائی تک اتر جائے اور باطن میں ایک انقلاب برپا کر دے۔ اگر یہ مقصد حاصل نہ ہو تو ایسا علم بے کار اور لاحاصل ہے بلکہ دنیا و آخرت میں نقصان پہنچانے والا ہے۔[1]

قلبی طور پر اثر قبول کرنے کا وصف دوسروں کی نسبت صحابۂ کرام میں بدرجۂ اتم موجود تھا۔ کیونکہ دوسروں کی نسبت ان کا ایمان زیادہ مستحکم اور اکمل تھا اور ایسا کیوں نہ ہوتا کہ انھوں نے ایمان براہ راست رسول اللہ ﷺ سے اس حالت میں حاصل کیا تھا کہ یہ نہایت شگفتہ، شاداب اور تر و تازہ تھا۔ اس میں کسی نفسی آلائش، خواہش پرستی اور غفلت کا شائبہ تک نہ تھا۔[2]

صحابۂ کرام دن کو شہسوار بن کر جہاد کرتے تھے اور رات کو دنیا سے لاتعلق ہو کر اپنے رب کی رضا کے لیے اس کے حضور قیام کرتے تھے۔ ان کا علم، ایمان اور خشیت الٰہی دنیاوی امور کی ادائیگی میں رکاوٹ نہیں بنتے تھے۔ وہ خرید و فروخت بھی کرتے تھے، کھیتی باڑی کی مشقت بھی اٹھاتے تھے، شادی بیاہ کے معاملات طے کرتے تھے۔ اپنے اہل و عیال اور دیگر انسانوں کی ضروریات کا خیال رکھتے اور انھیں بخوبی پورا کرتے تھے۔ وہ خود پسندی سے

1 صفة الغرباء للدكتور سلمان العودة، ص: 97. 2 صفة الغرباء للدكتور سلمان العودة، ص: 102.

بہت دور تھے، اہم کارنامے اور عظیم الشان نیک اعمال کر کے بھی انھیں معمولی سمجھتے تھے۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ہراول دستے کے اوصاف

دعوت دین کا پہلا مرحلہ راز داری کے ساتھ انفرادی دعوت پر مشتمل تھا۔ نبی کریم ﷺ کی منصوبہ بندی نہایت منظم اور احتیاط پر مبنی تھی۔ آپ ﷺ نے تمام سیاسی مصلحتیں ملحوظ رکھ کر بہت ٹھوس منصوبہ بندی کی تھی۔ آپ ﷺ نے دار ارقم کا انتخاب محض مسلمانوں کے اجتماعات منعقد کرنے کے لیے نہیں کیا تھا کہ جہاں وہ محض وعظ ونصیحت کی باتیں سن سکیں بلکہ وہ قیادت کا مرکز اور تعلیم وتربیت کی عظیم درس گاہ کی حیثیت رکھتا تھا جہاں دعوت اور قیادت کے لیے افراد تیار کیے جاتے تھے۔ ایک ایک فرد کی ہر لحاظ سے مکمل اور شایانِ شان تربیت کی جاتی تھی اور بعض افراد کی خصوصی تربیت کا اہتمام کیا جاتا تھا تاکہ وہ دعوت دین اور اقوام عالم کی قیادت کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے اہل ہو جائیں۔

رسول اللہ ﷺ نے نہایت احتیاط اور حکیمانہ نظم ونسق کے ساتھ ہر شخص کی ذمہ داری متعین فرما دی تھی اور ہر فرد اپنے سپرد کی گئی ذمہ داری سے بخوبی واقف تھا۔ سب کو اس امر کا احساس تھا کہ دعوت دین کس مرحلے سے گزر رہی ہے اور اس کے لیے کون سا طریق کار اور کیسا اسلوب ہوگا۔ یوں تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم احتیاط، راز داری، حفاظتی تدابیر اور نظم وضبط کی پوری پابندی کرتے تھے۔[1]

مکی زندگی میں اہل ایمان کی جماعت تیار کرنے کا کام آہستہ آہستہ، بتدریج اور راز داری کے ساتھ مکمل ہوا۔ اس مرحلے میں اللہ تعالیٰ کے اس حکم میں مضمر رہنمائی کو شعار بنایا گیا:

﴿ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ ﴾

''اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ روک رکھیں جو صبح و شام اپنے رب کو

[1] دولة الرسول ﷺ من التكوين إلى التمكين للدكتور كامل سلامة، ص: 237.

پکارتے ہیں، وہ اس کا چہرہ چاہتے ہیں۔"[1]

اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ذریعے نبی کریم ﷺ کی رہنمائی فرمائی ہے کہ جو لوگ آپ کی دعوت قبول کر رہے ہیں ان کی کوتاہیوں اور لغزشوں پر صبر کیجیے۔ اگر وہ بار بار سوال کریں تو چاہے ان کے سوالات غلط ہی ہوں ان کا بُرا نہ مانیے۔ اگر وہ کبھی آپ کی رہنمائی قبول کرنے میں تردد کا اظہار کریں تب بھی انھیں اپنے آپ سے دور نہ رکھیے اور دعوت دین کے سلسلے میں پیش آنے والی تکالیف پر صبر وہمت سے کام لینے کی ترغیب دینے اور ان کا حوصلہ بڑھانے کی بھر پور کوشش کیجیے اور دعوت دین کے راستے کی نزاکتیں ان پر واضح کر دیجیے۔ انھیں خبردار کر دیجیے کہ یہ کوئی آسان راستہ نہیں تاکہ وہ کسی کے فریب میں آکر غریب مسلمانوں کو اپنے سے دور نہ کر دیں۔[2]

سورۂ کہف کی مذکورہ آیت میں امت مسلمہ کے ہراول دستے کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ ان میں سے چند اہم ترین صفات درج ذیل ہیں:

صبر: قرآن حکیم اور احادیث نبویہ میں لفظ صبر کا ذکر متعدد بار ہوا ہے اور لوگوں کو اس امر کی تلقین کی گئی ہے کہ وہ اپنے باہمی معاملات میں صبر سے کام لیں۔ صبر کی اہمیت اس بات سے واضح ہو جاتی ہے کہ خسارے سے محفوظ رہنے والی جماعت کی چار صفات ہیں جو کہ سورۂ عصر میں بیان کی گئی ہیں۔

اس میں رب ذوالجلال نے یہ حقیقت واضح کر دی کہ سبھی انسان خسارہ اٹھانے والے ہیں اور ان میں سے صرف ان لوگوں کو مستثنیٰ قرار دیا ہے جو درج ذیل چار امور انجام دیں:

① اللہ پر ایمان لائیں۔

② نیک عمل کریں۔

③ ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کریں۔

1 الکہف 28:18. 2 الطریق إلی جماعة المسلمین لحسین بن محسن، ص: 170.

④ ایک دوسرے کو صبر وتحمل کی تلقین کریں۔

انسان کی نجات صرف اس وقت ممکن ہے جب وہ ایمان اور اعمال صالحہ کے ساتھ خود کو ایک اچھا انسان بنالے اور دوسروں کی خیر خواہی کے جذبے سے ان کی درست رہنمائی کر کے انھیں اچھا انسان بنانے کی کوشش کرے۔ گویا اس طرح وہ حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کو ادا کرنے کا اہتمام کرے گا اور صبر وتحمل کی نصیحت کرنا بھی انتہائی ضروری ہے کیونکہ کسی فرد یا جماعت کے لیے سب سے مشکل کام ایمان اور عمل صالح پر استقامت اور حق وعدل کی پاسداری ہے۔ اس مقصد کے لیے سب سے پہلے اپنے نفس سے جہاد کرنا پڑتا ہے۔ اپنے نفس پر قابو پانے کے بعد دوسروں کو ایمان اور اعمال صالحہ کی زندگی پر لانے کی جدوجہد کا مرحلہ آتا ہے اور اس مرحلے میں پیش آنے والی تکالیف ومصائب پر صبر کا دامن نہایت مضبوطی سے تھامنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ باطل کی بدتمیزیوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ طویل سفر اور کٹھن مراحل کی صعوبتیں سہنی پڑتی ہیں اور کبھی انجانے راستوں اور منزل کی دوری سے پیدا ہونے والی مایوسیوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔[1]

دعاؤں کا بکثرت اہتمام: یہ وصف اس فرمان الٰہی سے واضح ہوتا ہے: ﴿يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ﴾ ''وہ صبح وشام اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں۔''[2]

دعا کامیابیوں کا بہت بڑا دروازہ ہے۔ جب کسی انسان کو دعا کا سلیقہ اور اس کی توفیق حاصل ہوجائے تو اس پر خیر وبرکت کا مسلسل نزول ہونے لگتا ہے، اس لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ جن افراد کو دعوت دین کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لیے تیار کیا جارہا ہو انھیں اس بات کا عادی بنانا چاہیے کہ وہ تعلق باللہ کو نہایت مضبوط اور مستحسن بنائیں۔ کثرت سے دعائیں اور اللہ تعالیٰ کے حضور التجائیں کیا کریں۔ کیونکہ یہ کامیابی اور غیبی نصرت کا نہایت محکم اور یقینی ذریعہ ہے۔[3]

1 تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب: 3968/6. 2 الكهف 28:18. 3 فقه التمكين في القرآن الكريم للدكتور الصلابي، ص:221.

اخلاص: یہ وصف فرمان الٰہی کے اس جز سے واضح ہوتا ہے:

﴿ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ﴾ ''وہ اس کا چہرہ چاہتے ہیں۔''[1]

دعوت دین کا کام کرنے کے لیے جن افراد کو تیار کیا جاتا ہے ضروری ہے کہ انھیں اس بات کی تربیت دی جائے کہ ان کے خطبات و دروس، ان کی ساری محنت و مشقت اور تمام جدوجہد صرف اللہ تعالیٰ کی خاطر ہو۔ صرف اسی کی خوشنودی حاصل کرنے کی تمنا ہو اور اسی سے حسن انعام کی امید ہو۔

دنیاوی مال وجاہ اور بڑے بڑے توصیفی القاب کا حصول اس کا مطمح نظر نہ ہو۔ اُسے چھوٹے یا بڑے کسی منصب کی طلب نہ ہو۔ اسے جہاں بھی کھڑا کر دیا جائے وہ فوج کے ایک سپاہی کی طرح اللہ کے دین اور صحیح عقیدے کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دے اور زبان حال سے یہی صدا بلند ہو رہی ہو:

﴿ قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ ﴾

''کہہ دیجیے: بے شک میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت، (سب کچھ) اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی (بات یعنی توحید) کا حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں۔''[2]

قبولیت اعمال کے لیے اخلاص ایک رکن لازم کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بات ذہن نشین ہونی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں صرف وہی عمل شرف قبولیت پاتا ہے جس میں اِخلاص ہو، نیت درست ہو اور وہ قرآن وسنت کے مطابق ہو۔

عزم و استقلال: یہ وصف فرمان الٰہی کے اس حصے سے عیاں ہے:

﴿ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ﴾

1 الکهف 28:18. 2 الأنعام6:162,163.

’’اور آپ کی آنکھیں ان سے تجاوز نہ کریں کہ آپ دنیاوی زندگی کی زینت چاہنے لگیں۔‘‘ [1]

یہ عزم واستقلال جو اس آیت میں مذکور ہے یہ اُس ثابت قدمی کا ایک جز ہے جس سے ہر داعی کو متصف ہونا چاہیے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴾

’’مومنوں میں سے کچھ وہ لوگ بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے جو عہد کیا تھا وہ سچ کر دکھایا، چنانچہ ان میں سے بعض نے اپنا عہد پورا کیا (شہادت پا گئے) اوران میں سے بعض منتظر ہیں اور انھوں نے (عہد میں) کوئی تبدیلی نہیں کی۔‘‘ [2]

اس آیت کریمہ میں تین صفات کا تذکرہ ہے:

① ایمان ② جوانمردی ③ سچائی۔

یہ تینوں صفات دین حق پر ثابت قدمی کے اہم اسباب ہیں۔

ایمان اعلیٰ اقدار اختیار کرنے اور ان سے وابستہ رہنے کی ترغیب دیتا ہے بلکہ بلند مقصد کے لیے جان کی قربانی کا جذبہ بھی پیدا کرتا ہے۔

جوانمردی اپنے اغراض ومقاصد کے حصول کے لیے جوش پیدا کرتی ہے، پھر انسان کو کسی ذلت وحقارت کی پروا نہیں ہوتی۔ وہ اپنے بلند مقصد اور اعلیٰ نظریے کی جانب مسلسل رواں دواں رہتا ہے۔

سچائی ہر تغیر وتبدل اور واپسی کا راستہ بند کر دیتی ہے۔ اس طرح یہ سب خصوصیات مل کر انسان میں ثابت قدمی پیدا کرتی ہیں، پھر وہ اپنی گردن پر چمکتی ہوئی تلوار دیکھ کر بھی راستہ نہیں بدلتا۔ پھانسی کا پھندا دیکھ کر بھی اس کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آتی۔ دولت کی چمک اور کسی حسینہ کا حسن وجمال بھی اسے لبھا نہیں سکتا۔ وہ اپنی جگہ محکم اور ثابت قدم رہتا ہے۔

1 الكهف 28:18. 2 الأحزاب 23:33.

جن کندھوں پر دعوت دین، قیام حکومت اور تہذیب وتمدن کی تعمیر جیسی اہم ذمہ داریاں ڈالنی مقصود ہوں، ضروری ہے کہ ان میں وہ پختگی اور عزیمت پیدا کردی جائے جو بلند اقدار اور اعلیٰ مقاصد کے حصول میں مددگار ثابت ہو۔[1]

یہ وہ چند اہم اور نمایاں اوصاف ہیں جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اس ہراول دستے میں نمایاں تھے۔

بعد میں آنے والے کچھ عبادت گزار لوگوں کو مرض خود پسندی لاحق ہوا جس کی وجہ سے وہ دوسروں کے اعمال کو حقارت سے دیکھنے لگے، ان کی دینی خدمات کو معمولی سمجھنے اور ان کی منزلت شناسی سے محروم رہ کر جرم ناقدری کے مرتکب ہوئے۔ ان کی ہر نیکی اور عبادت اپنی ذات کے گرد گھومتی ہے۔ ایسے لوگ خود کو عظیم انسان تصور کرتے ہیں، حالانکہ یہی چیز بداخلاقی کا پیش خیمہ اور نیک اعمال کے اکارت ہونے کا سبب ہے۔ جو لوگ اس مرض میں مبتلا ہوتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ صرف ہم ہی دین کے ٹھیکے دار ہیں۔ وہ عقل و شعور کے دریچوں اور آنکھوں کو بند کر لیتے ہیں۔ انھیں دوسروں کی خوبیاں نہیں، صرف خامیاں نظر آتی ہیں بلکہ دوسروں کی خوبیاں بھی ان کے نزدیک خامیاں بن جاتی ہیں۔[2]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اور اثر انگیز قیادت

تاریخ انسانیت میں دارارقم کو تعلیم و تربیت کی عظیم ترین درس گاہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا کہ اس درس گاہ کے عظیم معلم خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے جو ساری انسانیت کے معلم ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے زانوئے تلمّذ تہ کرنے والی ہستیاں وہ تھیں جنھیں مستقبل میں دعوت الی اللہ کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا تھا اور اقوام عالم کی رہنمائی کرنی تھی۔ وہ ایسے راہنما بنے جنھوں نے انسانیت کو انسانوں کی

1 دعوة الله بين التكوين والتمكين للدكتور علي جريشة، ص:92,91. 2 صفة الغرباء للدكتور سلمان العودة، ص:104,103.

غلامی سے نجات دلائی اور انھیں تاریکی سے نکال کر روشنی میں لا کھڑا کیا۔ رب ذوالجلال نے بھی اپنی نگرانی میں ان کی ایسی تربیت فرمائی جس کی کوئی مثال اس سے پہلے ملتی ہے نہ قیامت تک مل سکے گی۔[1]

اللہ تعالیٰ نے دار ارقم میں رسول اللہ ﷺ کو اپنے صحابہ کا ایک ایسا ہراول دستہ بنانے کی توفیق مرحمت فرمائی جو جہالت کی گھٹاؤں میں گھرے ہوئے تھے مگر جناب رسول اللہ ﷺ کی محنت شاقہ سے انھیں ایمان کا نور حاصل ہوا، پھر وہ دنیا کے مایہ ناز شہرت یافتہ انسان بن گئے۔ انھوں نے عالم بشریت کی عظیم ترین دعوت کا حق ادا کر کے انسانی تاریخ سازی کا اہم کردار ادا کیا۔

دارارقم کی درس گاہ سے فیض یافتہ ارباب علم و دانش عظیم ترین شخصیات قرار پائے۔ ان کے بعد جتنا بھی دعوت و جہاد کا کام ہوا، جتنی اسلامی حکومتیں قائم ہوئیں اور جو تہذیب و تمدن وجود میں آیا، اس کی اساس یہی مبارک ہستیاں تھیں۔ زمانے اور زندگی کی کروٹیں آج تک ابوبکر صدیق، عمر بن خطاب، عثمان بن عفان، علی بن ابی طالب اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم جیسی ہستیوں کی ایک بھی مثال پیش نہیں کر سکیں۔

اللہ تعالیٰ نے مربی اعظم ﷺ کو یہ توفیق عنایت فرمائی کہ انھوں نے دعوت کے خفیہ مرحلے میں دار ارقم جیسی درس گاہ میں ایسی نادر اور بے مثال شخصیتوں کی تربیت فرمائی جنھوں نے توحید اور دعوت و جہاد کا پرچم ہر جگہ لہرا دیا حتیٰ کہ جزیرہ نمائے عرب ان کے سامنے سرنگوں ہو گیا اور نصف صدی میں انھوں نے عظیم فتوحات حاصل کیں۔

نبی کریم ﷺ کو خداداد اعلیٰ صلاحیتیں حاصل تھیں، ان کی بدولت آپ ﷺ نے دعوت و تبلیغ کے ابتدائی تین برسوں میں بہترین انسانی جواہر کا انتخاب کیا اور پھر خاص اسلوب میں ان کی تربیت فرما کر اس قابل بنایا کہ اقوام عالم کی قیادت اور انسانوں کی رہنمائی کا

1 دولة الرسول ﷺ من التكوين إلى التمكين للدكتور كامل سلامة، ص: 219.

اہم ترین فریضہ انھیں سونپا جاسکے۔ کیونکہ عظیم مقاصد اور انسانی بھلائی کے اہم ترین اہداف انھی لوگوں کے سپرد کیے جاسکتے ہیں جو نابغۂ روزگار، اعلیٰ قائدانہ صلاحیتوں کے مالک اور غیر معمولی لیاقت وصلاحیت کے حامل ہوں۔

دنیا کی تمام یونیورسٹیوں اور درس گاہوں میں دارارقم کو نہایت عظیم الشان مقام ومرتبہ حاصل ہے جہاں رسول اللہ ﷺ ایک مُربّی کی حیثیت سے ہراول دستے کے منتخب وممتاز افراد سے ملاقات فرماتے تھے اور یہ مسلسل ملاقاتیں اس درس گاہ کے شرکاء کی عملی تربیت کا باعث تھیں۔ وہ شرکاء جن میں فوج کے ایسے سپاہیوں کا سا ولولہ کارفرما ہوتا تھا جن کی رگ رگ میں سمع وطاعت، حکم کی تعمیل، بڑوں کا ادب واحترام اور اصول پسندی سمائی ہو، ایسی تربیت جس میں سپہ سالار اپنے سپاہیوں کے دلوں میں اللہ رب العزت پر اعتماد، عزیمت، پختگی اور ثابت قدمی کوٹ کوٹ کر بھر دیتا، ان کے اخلاق وکردار کی خوب دیکھ بھال اور کانٹ چھانٹ کرتا اور انھیں تعلیم وتربیت کے تمام مراحل طے کراتا تھا۔ یہ منظّم ومرتب ملاقاتیں عزائم کو پختہ کرتیں، ہمتوں کو تقویت پہنچاتیں اور جذبۂ ایثار وقربانی کو بیدار کرتی تھیں۔[1]

ان تربیتی سرگرمیوں کا نقطۂ آغاز یہ ہوتا تھا کہ جسے دین کی دعوت دی جاتی اس کی ملاقات براہ راست رسول اللہ ﷺ سے کرا دی جاتی تھی۔ اس ملاقات سے اس انسان میں ایک عجیب انقلاب برپا ہو جاتا اور اس کے لیے غیر متوقع طور پر ہدایت کے راستے کھل جاتے۔ وہ جہالت کی ظلمتوں سے نکل کر اسلام کی روشنی سے منور ہو جاتا اور کفر چھوڑ کر ایمان کی دولت سمیٹ لیتا تھا۔ یوں اس خالص عقیدے اور نئے دین کی وجہ سے آنے والی آزمائشیں، مصیبتیں اور تکالیف برداشت کرنا اس کے لیے آسان ہو جاتا تھا۔

جناب رسول اللہ ﷺ وہ پہلی شخصیت ہیں جنھوں نے تحریک اسلامی میں حرکت پیدا کی۔ آپ ﷺ انتہائی پرکشش اور اثر انگیز شخصیت کے مالک تھے۔ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی

1 دولة الرسول ﷺ من التكوين إلى التمكين للدكتور كامل سلامة، ص:220.

نگرانی میں تیار فرمایا تھا اور آپ ﷺ کو انسانی تاریخ کی کامل ترین شخصیت عطا کی تھی۔

عظمت ہمیشہ سے محبوب خلائق رہی ہے۔ لوگ اسے نگاہ اشتیاق سے دیکھتے ہیں۔ ہر عظیم شخصیت کے گرد چاہنے والے لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ محبت اور پسندیدگی کی وجہ سے اس سے کبھی الگ نہیں ہوتے۔ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کو اس عظمت کے ساتھ ساتھ یہ عالی رتبہ بھی حاصل تھا کہ آپ اللہ کے آخری پیغمبر تھے، آپ پر وحی الٰہی نازل ہوتی تھی اور آپ ﷺ اللہ کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچاتے تھے۔ یہ ایک دوسرا پہلو تھا جو رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ایک مومن کے جذبات واحساسات کو ایک نرالی کیفیت عطا کرتا تھا۔ ایک مومن آپ ﷺ کی ذات والا صفات ہی کی وجہ سے محبت نہیں کرتا تھا جیسا کہ عموماً عظیم شخصیتوں سے ان کی ذات کی بنا پر محبت ہوتی ہے بلکہ ایک مومن کی آپ ﷺ سے بے پایاں محبت اس عطیۂ خداوندی کے باعث بھی تھی جو اللہ تعالیٰ نے یگانہ شخصیت کی صورت میں آپ کو عطا کیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ آپ ﷺ کی معیت میں وحی الٰہی کی نورانیت بھی حاصل کرتا تھا۔ اس طرح آپ ﷺ کی ذات والا صفات میں ایک عظیم انسانی ہستی کا وجود اور ایک عظیم رسول کا وجود یکجا ہو کر جگمگاتا تھا۔ ان دونوں وجودوں کی یکجائی سے ایک ایسا حسین اِمتزاج ظہور میں آتا تھا کہ ایک وجود کو دوسرے سے جدا کرنا ناممکن ہو جاتا تھا اور ان دونوں وجودوں سے محبت بھی یکجائی اختیار کر کے اپنی انتہا کو پہنچ جاتی تھی، یہاں تک کہ مومن کے دل میں حُب رسول ﷺ کے ساتھ حُب الٰہی بھی جاگزیں ہو جاتی، پھر ان دونوں محبتوں کے دھارے سے مومن کے جذبات واحساسات جنم لیتے تھے۔ یہی محبت اس کے افکار اور کردار کا محور بن جاتی تھی۔ اسی محبت نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہراول دستے میں جوش وجذبہ پیدا کیا۔ یہی محبت اسلامی تربیت کا نقطۂ آغاز، اساس اور سرچشمہ بن گئی۔[1]

1 منهج التربية الإسلامية لمحمد قطب، ص:35,34.

دار ارقم کے تدریسی مضامین

رسول اللہ ﷺ نے دار ارقم میں جس مضمون کی تعلیم دی وہ صرف قرآن حکیم تھا۔ آپ ﷺ قرآن حکیم کی آیات کی توضیح فرماتے۔ روح القدس جبرائیل علیہ السلام نو بہ نو آیات لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں تشریف لاتے، صحابۂ کرام براہ راست زبان رسالت سے وہ آیات اور ان کی تفسیر سنتے تو وہ ان کے دلوں کو سیراب کرتی ہوئی ان کی روحوں میں اتر جاتیں اور خون کی طرح ان کے رگ وریشے میں سرایت کر جاتیں۔ یوں ان کے قلوب وارواح قرآن حکیم سے لگاتار اس کی تاثیر سے مستفید ہوتے رہے۔ اس طرح ایک شخص اپنی اقدار، جذبات واحساسات، اغراض ومقاصد، طرز عمل اور امنگوں کے لحاظ سے ایک نیا انسان بن جاتا تھا۔ نبی کریم ﷺ کی پوری کوشش تھی کہ اس درس گاہ میں صرف قرآن حکیم ہی تدریسی مضمون ہو، اس منہج پر صحابۂ کرام کی تربیت ہو اور قرآن کے علاوہ کوئی اور چیز ان کی تعلیم کا جز نہ بنے۔[1]

دار ارقم میں صحابۂ کرام نے اس حقیقت کا سراغ پالیا کہ دعوت وارشاد کا میدان ہو یا انسانی زندگی کے معاملات ہوں، امور سلطنت ہوں یا تہذیب وتمدن کی تعمیر ہو، ان سب کے لیے دستور اعلیٰ کی حیثیت صرف قرآن حکیم اور فرامین محمد مصطفیٰ ﷺ ہی کو حاصل ہے۔ قرآن حکیم ہی وہ واحد نصابی کتاب تھی جو دار ارقم کے طالبان علم نے مربی اعظم رسول اللہ ﷺ کی تفسیر اور فرمودات کی روشنی میں پڑھی۔ حصول علم کا تنہا یہی منبع تھا، اسی کے مطابق امت مسلمہ کی اس بے مثال جماعت نے تربیت حاصل کی۔

قرآن حکیم اس امت کے لیے ایک زندہ وتابندہ کتاب ہے۔ اس میں امت کے لیے نہایت مخلصانہ خیر خواہی اور رہنمائی موجود ہے اور امت مسلمہ اپنی بقا اور زندہ قوم بننے کے لیے اس کتاب لاجواب سے سبق حاصل کر سکتی ہے۔

1 دولة الرسول ﷺ من التكوين إلى التمكين للدكتور كامل سلامة، ص:225.

صحابۂ کرام کے اس ہراول دستے نے بڑی محنت اور جستجو سے قرآن حکیم کی تعلیم حاصل کی، اسے اپنے دل ودماغ میں محفوظ رکھا اور انتہائی ذوق وشوق سے اس کی تعلیمات و ہدایات کا فہم حاصل کیا اور پھر مکمل طور پر خود کو اسی سانچے میں ڈھالا۔ وہ اپنے حال اور مستقبل کے لیے قرآن حکیم ہی کی آیات سے رہنمائی حاصل کرتے تھے۔

صحابۂ کرام کے اس ہراول دستے کی پوری نشوونما تعلیمات قرآنیہ ہی کی روشنی میں ہوئی اور وہ تعلیمات الٰہیہ ہی کا ایک عملی نمونہ بن کر لوگوں کے سامنے آئے۔ قرآن حکیم کو درس گاہ ربانی کی حیثیت حاصل تھی۔ اس مدرسے نے معرفت الٰہی سے سرشار ایسے قائد تیار کیے کہ تاریخ انسانیت آج تک ان کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے اور تا قیامت عاجز و قاصر رہے گی۔

نبی کریم ﷺ پر نزول قرآن کا مقصد یہی تھا کہ آپ ﷺ اس کے مطابق ایک امت (جماعت) تیار کریں، حکومت اسلامیہ کا قیام وجود میں لائیں، ایک بے مثال انسانی معاشرہ تشکیل دیں، قرآن کے ذریعے لوگوں کے قلوب واذہان، اخلاق و کردار اور افکار ونظریات کو جلا بخشیں اور اس کے مطابق ان کے اعتقادات، اخلاق اور جذبات واحساسات سنواریں، پھر آپ ﷺ نے امت مسلمہ کے اس ہراول دستے کو اس طرح تیار کیا کہ وہ نظریاتی، جذباتی، اخلاقی، معاشرتی، سیاسی اور عسکری طور پر ہر لحاظ سے تمام انسانی معاشروں پر سبقت لے گیا اور اسے ساری دنیا پر ایک امتیازی حیثیت حاصل ہوگئی۔[1]

دارارقم کو مرکز قرار دینے کی وجوہات

دارارقم کو کئی اسباب وعوامل کی بنا پر مرکز بنایا گیا، مثلاً:

① حضرت ارقم رضی اللہ عنہ کے اسلام قبول کرنے کا علم دشمنان اسلام کو نہیں ہو سکا تھا، اس لیے ان کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ رسول اللہ ﷺ دارارقم میں صحابۂ کرام

[1] دولة الرسول ﷺ من التكوين إلى التمكين للدكتور كامل سلامة، ص:335.

سے ملاقاتیں کرتے ہوں گے۔

② حضرت ارقم بن ابی ارقم رضی اللہ عنہ کا تعلق بنومخزوم سے تھا۔ بنومخزوم کا قبیلہ اور بنو ہاشم (جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قبیلہ تھا) دونوں ہمیشہ آپس میں برسر پیکار رہے تھے، لہٰذا کسی کے تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ ارقم کا گھر مرکز اسلام بن سکتا ہے۔ یہ تو دشمن کے دل میں اپنا قلعہ بنانے والی بات تھی (کہ بنو ہاشم اپنے مخالفین بنومخزوم کے کسی گھر کو اپنا مرکز بنالیں)۔

③ حضرت ارقم رضی اللہ عنہ نے جب اسلام قبول کیا تو ان کی عمر اس وقت تقریباً سولہ (16) سال تھی۔ اور قریش کا ذہن اس جانب گیا ہی نہیں کہ ایک نوعمر کا گھر بھی اسلامی مرکز بن سکتا ہے۔ ان کا ظن غالب یہی تھا کہ یہ لوگ بنو ہاشم کے کسی گھر کو اپنا مرکز بنائیں گے یا پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ یا ان جیسے کسی اور مسلمان کا گھر مرکز اجتماعات قرار پائے گا۔

یہاں پہنچ کر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حفاظتی تدابیر کے لحاظ سے دار ارقم کو مرکز بنانا حکمت عملی کے اعتبار سے نہایت حکیمانہ فیصلہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قریش نے کبھی اس مرکز پر دھاوا بولا نہ انھیں مسلمانوں کے اس مرکز کا علم ہوسکا۔[1]

قبائلِ قریش میں دعوت دین کا فروغ اور اس کی عالمگیریت

پس پردہ دعوت کے مرحلے میں اسلام قریش کے تمام قبائل میں یکساں پھیلا۔ کسی بھی قبیلے کا اس جانب جھکاؤ دوسروں کی نسبت زیادہ نہیں تھا اور یہ چیز اس وقت کی قبائلی زندگی کے مزاج کے خلاف تھی۔ اسلام نے اپنی دعوت کی اشاعت کے لیے قبائلی نظام اور قبائلی تعصب سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھایا۔ اسی وجہ سے اس دعوتی مرحلے میں اسے دیگر قبائل کی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا کیونکہ اس دعوت نے کسی قبیلے کی بالادستی روا نہیں رکھی بلکہ سب کو یکساں مقام دیا۔ اسی لیے یہ دعوت قریش کے متعدد قبائل میں عصبی تحفظات سے بالاتر رہ کر یکساں طور پر پھیلتی چلی گئی۔

1 المنهج الحركي للدكتور الغضبان:49/1.

اس دور میں اسلام قبول کرنے والی ہستیوں کے ناموں پر ایک نگاہ ڈالیے:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا تعلق بنو تیم سے تھا۔

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ بنو امیہ سے تعلق رکھتے تھے۔

حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کا قبیلہ بنو اسد تھا۔

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ بنو عبدالدار سے تھے۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بنو ہاشم کے چشم و چراغ تھے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا تعلق بنو زہرہ سے تھا۔

حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کی نسبت بنو عدی سے تھی۔

حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کا قبیلہ بنو جمح تھا۔

گویا اس مرحلے میں اسلام قبول کرنے والی اکثریت کا تعلق قریش سے نہیں تھا۔

اب کچھ اور نومسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نام ملاحظہ کیجیے:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا تعلق بنو ہذیل سے تھا۔

حضرت عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہ کا تعلق بنو مازن سے تھا۔

حضرت عبداللہ بن قیس رضی اللہ عنہ بنو اشعر کے فرزند تھے۔

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما بنو مذحج کی شاخ عنس سے تعلق رکھتے تھے۔

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کا قبیلہ بنو کلب تھا۔

حضرت طفیل بن عمرو رضی اللہ عنہ قبیلہ دوس کے سردار تھے۔

حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ کا تعلق قبیلہ بنو سلیم سے تھا۔

حضرت صہیب بن سنان رضی اللہ عنہ بنو نمر بن قاسط سے تعلق رکھتے تھے۔

اس سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اس مرحلے میں اسلام صرف مکہ مکرمہ تک محدود نہیں رہا تھا۔[1]

[1] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 133/1.

نبی کریم ﷺ نے ٹھوس منصوبہ بندی کے ساتھ اپنا دعوتی اسلوب وضع کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ پر توکل کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ نے ہر قسم کے اسباب و وسائل سے بھی کام لیا۔

رسول اللہ ﷺ نے پختہ تربیت، مضبوط تنظیم سازی، وسیع تعلیم اور حفاظتی تدابیر کا مکمل اہتمام کیا۔ اپنے سماجی تعلقات میں کوئی فرق نہیں آنے دیا اور پس پردہ دعوت کے پہلے مرحلے کے بعد اگلے مرحلے کے لیے بھر پور تیاری کی کیونکہ رسالت مآب ﷺ یہ بات بخوبی جانتے تھے کہ دعوت الی اللہ صرف رازداری کے مرحلے تک محدود نہیں رہے گی کہ لوگوں کو بس فرداً فرداً دعوت دی جائے بلکہ یہ دعوت تو ساری کائنات پر حجت قائم کرنے کے لیے نازل ہوئی ہے تاکہ مشیت الٰہی سے انسانوں کو انسانوں کی غلامی اور ظلم و ستم سے نجات دلائی جائے اور انھیں شرک و جہالت کے اندھیروں سے نکال کر توحید و اسلام کی روشنی سے منور کیا جائے، اس لیے ابتدا ہی میں رب ذوالجلال نے دعوت کی حقیقت اور اس کا میدان عمل واضح کر دیا تھا۔ مکی آیات سے صاف ظاہر ہے کہ یہ دعوت علاقائی نہیں بلکہ عالمگیر ہے۔

فرمان الٰہی ہے: ﴿ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾

''یہ تو تمام جہانوں کے لیے ایک نصیحت ہے۔''[1]

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَمَا هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾

''اور وہ تمام جہانوں کے لیے نصیحت ہی تو ہے۔''[2]

اس دعوت کے مخاطب تمام بنی نوع انسان ہیں۔ یہ دعوت دراصل ان لوگوں کے لیے نجات دہندہ بن کر آئی ہے جو اللہ کے فضل و احسان کے مستحق ٹھہر چکے ہیں۔ اس سے یہ بات

1 صٓ 87:38. 2 القلم 52:68.

واضح ہو جاتی ہے کہ اس دعوت کا اعلان سرعام کھلم کھلا ہوگا اور اس کا پیغام ہر فرد تک پہنچایا جائے گا۔ خیر و شر کو واضح کیا جائے گا۔ غلط راستے پر چلنے والوں کو بُرے انجام سے ڈرایا جائے گا، پھر اس دعوت عام کے نتیجے میں پیش آنے والی مخالفتوں، اذیّتوں اور تکلیفوں کو برداشت کرنا ہوگا۔

نبی کریم ﷺ نے اپنی دعوت کے آغاز میں رازداری کا جو اسلوب اختیار کیا تھا وہ مخصوص حالات کے پیش نظر محض ایک استثنائی صورت تھی کیونکہ ابتدا میں یہ دعوت نامانوس تھی اور نہایت نازک احوال میں دی جا رہی تھی، اس لیے یہ پہلو نظروں سے اوجھل نہیں ہونا چاہیے۔

جنگ اور امن کی حالت میں اسلام کے بہت سے امور سیاسی مصلحت کے باعث پوشیدہ رکھے جاتے ہیں۔ اسی طرح دعوت کے معاملے میں بھی بعض اوقات رازداری کا اہتمام ضروری ہو جاتا ہے۔ تاہم اصل بات یہی ہے کہ اللہ کا دین چھپایا نہ جائے اور اس کی شریعت اور احکام کو سب لوگوں پر اچھی طرح واضح کر دیا جائے۔ لیکن بسا اوقات ایسے حالات پیش آجاتے ہیں کہ اسے صیغۂ راز میں رکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ دینی امور کے علاوہ دیگر معاملات جیسے کسی مہم کی منصوبہ بندی یا اس کی تفصیلات صیغۂ راز میں رکھی جاتی ہیں۔ درحقیقت یہ ایک مصلحت ہے جس کا تعلق انسانی فکر واجتہاد سے ہے۔ اس قسم کی حکمت عملی کو نہ کتمان دین کا نام دیا جا سکتا ہے نہ اسے اظہار حق سے گریز کہا جا سکتا ہے۔

مثال کے طور پر اگر کسی مصلحت کی وجہ سے اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد پوشیدہ رکھی جائے تو اس طرح دعوت دین اور تبلیغ و ارشاد میں کوئی خلل پیدا نہیں ہوتا، نہ وہ مقصد فوت ہوتا ہے جس کے لیے کتابیں نازل کی گئیں اور رسول بھیجے گئے۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے کھلم کھلا دعوت اور اعلان نبوت کے بعد بھی بہت سی باتیں ظاہر نہیں فرمائیں، مثلاً: اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟ ان کے اجتماعات کہاں ہوتے ہیں؟ اور مخالفین

کے حربے ناکام اور ان کی سازشیں ناکارہ کرنے کے لیے کیا منصوبہ بندی کی گئی ہے؟ آپ ﷺ نے یہ ساری باتیں صیغۂ راز میں رکھیں اور اس سے دین کی تبلیغ واشاعت کے کام پر کوئی ناگوار اثر نہیں پڑا۔[1]

1 الغرباء الأوّلون للدكتور الغضبان، ص: 124-126.

حصہ 4

مکی دور اور تعلیم و تربیت کا اہتمام

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ

''وہ انہیں اس کی آیتیں سناتا ہے اور ان کی زندگیوں کو سنوارتا ہے
اور انہیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔''

(آل عمران 3 :164)

باب 1

مکی دور میں عقائد ونظریات کی تعمیر واصلاح

قوانین قدرت کے ساتھ طرز عمل میں دانشمندانہ اسلوب نبوی

قیام حکومت اور اقوام کی تعمیر وترقی ان اصول وقواعد اور قوانین کو تسلیم کیے بغیر ممکن نہیں ہے جو انفرادی واجتماعی اور قومی وملکی کارکردگی میں کارفرما ہوتے ہیں۔ جب ہم سیرتِ حبیب ﷺ کا بنظر غائر مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی صلاحیتیں بروئے کار لاکر قوانین قدرت کے ساتھ نہایت حکیمانہ طرز عمل اختیار کیا۔

قوانین قدرت دراصل اللہ تعالیٰ کے وہ احکام ہیں جو اس کائنات میں ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہیں اور انھیں تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ یہ قوانین قدرت بے شمار ہیں۔ لیکن اس کتاب میں ہمارے پیش نظر وہ قوانین قدرت ہیں جن کا تعمیر وترقی کی جدوجہد سے بڑا گہرا تعلق ہے۔

رب العالمین کی مشیت یہ تھی کہ دین اسلام بلکہ اس کائنات کے تمام معاملات قوانین فطرت کے مطابق طے پائیں اور کسی معاملے کا ظہور ونفوذ کرامتوں اور معجزوں سے وابستہ نہ رہے تاکہ بعد میں آنے والے مسلمان یہ کہہ کر دین کے راستے پر چلنے سے گریزاں نہ رہیں اور انبیاء وسلف صالحین کے منہج سے پیچھے نہ ہٹ جائیں کہ پہلے لوگوں کو خرق عادت معجزے عطا کیے گئے تھے، اسی لیے دین کے راستے پر چلنا ان کے لیے ممکن تھا لیکن اب سلسلۂ نبوت ختم ہونے اور رسولوں کی بعثت موقوف ہو جانے کی وجہ سے معجزات کا دروازہ

بند ہو چکا ہے، اس لیے اب ہم دین پر نہیں چل سکتے۔[1]

قرآن حکیم کی آیات پر غور وفکر کرنے والا واضح طور پر محسوس کرتا ہے کہ یہ آیات ان قوانین قدرت سے لبریز ہیں جن میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ وہ یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ ان قوانین کو کھول کھول کر بیان کر کے ان کی طرف توجہ مبذول کرانے کا خصوصی اہتمام کیا گیا ہے اور ان سے عبرت حاصل کرنے اور ان کے مطابق عمل کرنے کی تلقین کی گئی ہے تاکہ مسلم معاشرہ احکام الٰہیہ کے مطابق صحیح خطوط پر استوار ہو۔

قرآن حکیم جب اس سرزمین پر جاری وساری قوانین فطرت کے مطالعے کی طرف مسلمانوں کو دعوت نظارہ دیتا ہے تو انھیں وہ اصول بھی سمجھا دیتا ہے جن کے مطابق یہ قوانین کام کرتے ہیں۔ مسلمان کوئی انوکھی مخلوق نہیں ہیں کہ وہ ان قوانین فطرت سے مستثنیٰ ہوں بلکہ یہ قوانین تو ساری کائنات، سبھی اقوام وملل اور افراد وحکومت پر لاگو اور کارفرما ہیں۔ اس زمین پر زندگی بے مقصد نہیں۔ نہ امورِ زندگی بے ترتیب رکھے گئے ہیں بلکہ سب کے سب قوانین فطرت کے پابند ہیں۔

جب مسلمان ان قوانین فطرت پر غور کرتے ہیں اور ان کی حقیقت دریافت کر لیتے ہیں تو ان پر واضح ہو جاتا ہے کہ ان واقعات وحوادث میں کیا حکمتیں اور مقاصد پوشیدہ ہیں، پھر اس نظام قدرت پر ان کا یقین پختہ ہو جاتا ہے جس کے تحت یہ حوادث رونما ہوتے ہیں اور وہ جان جاتے ہیں کہ اس نظام میں بے شمار حکمتیں پوشیدہ ہیں۔ اس ادراکِ حقیقت سے انھیں اپنی منزل کی طرف تیز رفتاری سے سفر کرنے کے لیے صحیح منصوبہ بندی میں آسانی ہو جاتی ہے۔ اور وہ محض اپنے مسلمان ہونے ہی پر اعتماد نہیں کرتے بلکہ کامیابی اور حصول مقصد کے لیے مناسب اسباب ووسائل بھی بروئے کار لاتے ہیں۔[2]

حیاتِ کائنات کے لیے جو قوانین فطرت جاری وساری ہیں وہ تبدیل نہیں ہوتے۔ یہ

1 واقعنا المعاصر لمحمد قطب، ص: 414. 2 تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب: 478/1.

قوانین جس طرح ماضی میں کارفرما تھے اسی طرح مستقبل میں بھی برسرِ کار رہیں گے۔[1]

یہی وہ قوانین قدرت ہیں جن کے مطابق اللہ تعالیٰ اس جہان زندگی کو چلا رہا ہے اور اسی کے منشا کے مطابق یہ رواں دواں ہے۔ انسانی زندگی میں کوئی بھی چیز بلا وجہ نہیں ہوتی بلکہ سب کچھ انھی قوانین الٰہیہ کے مطابق ہوتا ہے جن میں نہ کوئی تغیر و تبدّل ہوتا ہے، نہ کسی پر کوئی زیادتی کی جاتی ہے اور نہ کسی کی خواہش ملحوظ رکھی جاتی ہے۔[2]

مسلمانوں کو دوسری قوموں سے بڑھ کر ان سنن الٰہیہ کا ادراک ہونا چاہیے جو کتاب اللہ اور سیرتِ رسول ﷺ میں واضح طور پر موجود ہیں تاکہ یہ دین کو غالب کرنے کا مقصود حاصل کر سکیں۔ دین کا غلبہ بغیر جدوجہد کے خود بخود نہیں ہوسکتا اور نہ ظلم وزیادتی سے دین غالب آ سکتا ہے۔ اس کے لیے تو نور بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں کچھ اصول وضوابط متعین فرمائے ہیں تاکہ اس کے مومن بندے ان کی معرفت حاصل کر کے ان پر بصیرت کے ساتھ عمل پیرا ہوں۔[3]

اقوام وملل اور افراد کے بارے میں جو قوانین فطرت اور سنن الٰہیہ ہیں، لازم ہے کہ ہم ان کا بغور مطالعہ کریں اور سنن الٰہیہ کے سمجھنے کے بعد ان کے مطابق اپنے لیے ایک متوازن نظام تمدن اور معاشرتی قوانین وضع کریں۔[4]

سنن الٰہیہ کے مطابق طرزِ عمل اختیار کرنے کے سلسلے میں استاذ البنا رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قوانین قدرت سے ٹکراؤ کا راستہ اختیار نہ کرو کیونکہ وہ یقیناً تم پر غلبہ حاصل کرلیں گے۔ ان پر دسترس حاصل کرنے اور انھیں اپنے مفاد میں استعمال کرنے کی کوشش کرو۔ ان کی لہروں اور بہاؤ کو روکنے کے بجائے ان کا رخ اپنی مرضی کے مطابق تبدیل کردو۔ فطرت کے بعض قوانین کی زد سے بچنے کے لیے دیگر قوانین فطرت کا سہارا لو، پھر اپنی

1 تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب: 478/1. 2 التمكين للأمة الإسلامية لمحمد السيد، ص: 227. 3 جيل النصر المنشود للقرضاوي، ص: 15. 4 المشروع الإسلامي لنهضة الأمة قراءة في فكر حسن البناء، ص: 58.

کامیابی کا انتظار کرو، اس طرح کامیابی یقیناً تمھارے قدم چومے گی۔[1]

استاذ البنا کی گفتگو سے ان اہم امور کی نشاندہی ہوتی ہے:

① قوانین فطرت سے عدم ٹکراؤ۔

② ان پر دسترس حاصل کرنا۔

③ انھیں اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنا۔

④ ان کا رخ تبدیل کر دینا۔

⑤ ایک قانون کی زد سے بچاؤ کے لیے دوسرا قانون بروئے کار لانا۔

⑥ پُر امید ہو کر کامیابی کا انتظار کرنا۔[2]

استاذ البنا نے جو نتائج اخذ کیے ہیں اس بات کی دلیل ہیں کہ انھوں نے سیرتِ نبوی اور تاریخ اسلام کا بہت گہرا مطالعہ کیا ہے۔ وہ اقوام و ملل کے امور کا خوب تجربہ رکھتے ہیں۔ اپنے معاشرے اور اس کے گردونواح پر ان کی گہری نگاہ ہے اور وہ مرض کی صحیح تشخیص اور علاج پر قادر ہیں۔

دعوت دین کی جدوجہد کو منظّم کرنے، اسلامی حکومت قائم کرنے اور ایک متمدن اور اپنے خالق کا فرمانبردار مثالی انسان بنانے کے لیے سب سے پہلی اسلامی تحریک بھی، جس کی قیادت خود نبی کریم ﷺ نے فرمائی، سنن الٰہیہ اور قوانین فطرت کے تابع تھی جن میں سے بعض کا تذکرہ بالاختصار ہو چکا ہے، مثلاً:

تہذیب و تمدن کی تعمیر و تشکیل کے لیے قیادت کی اہمیت۔

باطل کے مقابلے کے لیے ایک قابل اعتماد اور منظّم جماعت کی اہمیت۔

اس منہج کی اہمیت جس سے عقائد، اخلاق، عبادات، اقدار اور نظریات اخذ کیے جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی ایک نہایت واضح سنت ''سنتِ تدریج'' یعنی کسی کام کو درجہ بدرجہ کرنا ہے۔

1 رسالۃ المؤتمر الخامس، ص: 127. 2 المشروع الإسلامي في فكر حسن البنّاء، ص: 58.

یہ سنت اس کی تمام مخلوق اور کائنات میں کارفرما ہے اور یہ اس جماعت کے لیے بھی بے حد ضروری ہے جو ترقی کے راستے پر گامزن ہے اور غلبۂ دین کے لیے کام کررہی ہے۔ اس سنت کو اختیار کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ (منزل مقصود تک پہنچنے کا) راستہ طویل ہوگا۔ خصوصاً موجودہ حالات میں جبکہ ہر چیز پر جاہلیت مسلط ہوچکی ہے اور اپنے سازوسامان سمیت بڑھتی جارہی ہے۔ شر اور فساد لوگوں کے دلوں میں سرایت کر چکا ہے، اب اس کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے بتدریج کام کرنے کی ضرورت ہے۔

اسلام کی پہلی دعوت کا آغاز بھی بتدریج ہوا تھا۔ جو آہستہ آہستہ مگر مستحکم انداز میں چلتی رہی۔ پہلے مرحلے میں باصلاحیت افراد کا انتخاب ہوا۔ ان کی تربیت کرکے ایک جماعت کی بنیاد رکھی گئی، پھر باطل قوتوں سے مقابلہ ہوا جس کے نتیجے میں کامیابی اور غلبہ حاصل ہوا۔ یہ سب مرحلے بیک وقت شروع نہیں کیے جاسکتے تھے۔ اگر یہ بیک وقت شروع کردیے جاتے تو مشکلات اور ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا۔ اسی طرح یہ بھی ناممکن تھا کہ بعد والے مرحلے کو پہلے مرحلے پر مقدم کردیا جاتا۔ اس طرح بڑا خلل اور پیچیدگی پیدا ہوجاتی اور کام آگے بڑھنے سے رک جاتا۔[1]

اسلوب تدریج اختیار کرنا نہایت ضروری ہے کیونکہ دعوت دین کا کام کرنے والے بعض حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ غلبۂ اسلام کی منزل رات بھر میں حاصل کی جاسکتی ہے۔ ان کی خواہش یہ ہے کہ وہ پلک جھپکنے میں امت مسلمہ کی موجودہ صورت حال تبدیل کردیں۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ انھیں مطلوبہ نتائج حاصل بھی ہوں گے یا نہیں؟ وہ یہ بھی نہیں سمجھتے کہ موجودہ صورت حال کیونکر پیدا ہوئی؟ اس کے اسباب کیا ہیں؟ نہ وہ کوئی ایسی حکمت عملی وضع کرتے ہیں کہ کن وسائل کو بروئے کار لایا جائے، کون کون سے اسالیب اختیار کیے جائیں اور کام کا آغاز کس طرح کیا جائے؟[2]

---

1 التمكين للأمة الإسلامية لمحمد السيد، ص: 227. 2 آفات على الطريق لمحمد سيد نوح: 1/57.

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں کئی مقامات پر ہماری توجہ تدریجی طریق کار کی طرف مبذول کرائی ہے، مثلاً: اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان کو چھ ایام میں پیدا فرمایا ہے، حالانکہ وہ اس بات پر قادر ہے کہ پلک جھپکنے سے بھی کم وقت میں انھیں پیدا فرمادے۔ ہر چیز اس کے احاطۂ علم میں ہے۔ نباتات، حیوانات اور انسان کی تخلیق کے بھی ادوار ہیں۔ حکیمانہ سنت الٰہی کے مطابق سب چیزیں درجہ بدرجہ ارتقائی مراحل سے گزر کر نشوونما پاتی ہیں۔ آہستہ آہستہ مکمل ہوتی ہیں اور اپنے عروج بام تک پہنچتی ہیں۔[1]

اسی طرح شریعت اسلامیہ میں بھی اسلوب تدریج واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے، اسلام لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرتا ہے، اسی لیے اسلام نے لوگوں پر جو چیزیں واجب یا حرام کی ہیں ان میں تدریجی مرحلے ملحوظ خاطر رکھے گئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ نماز، روزہ اور زکاۃ کی فرضیت کئی مراحل سے گزر کر اپنی موجودہ شکل تک پہنچی۔

اسلام کے ابتدائی زمانے میں انسانوں کی خرید وفروخت، یعنی غلامی کا نظام ساری دنیا میں رائج تھا۔ اگر اسے فوراً ختم کرنے کی کوشش کی جاتی تو اس وقت کی معاشی اور معاشرتی زندگی میں ایک طوفان برپا ہوجاتا، اس لیے اسلام نے اس مقصد کے لیے اسلوب تدرُّج اختیار کیا۔ اور اس نظام کو ختم کرنے کے لیے یہ حکمت عملی اختیار کی کہ غلاموں کو آزاد کرنے کی ترغیب دی۔ علاوہ ازیں مختلف قسم کے کفارے کے لیے غلاموں کی آزادی کا دائرہ وسیع کیا تاکہ اس طرح آہستہ آہستہ غلامی ختم ہو جائے۔[2]

جب ہم قرآن کریم اور سنتِ مطہرہ کا گہرائی سے مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ رسالت مآب ﷺ کے ذریعے عالمِ عرب اور پھر ساری دنیا میں کس قدر منظّم طریقے سے آہستہ آہستہ اسلامی انقلاب برپا ہوا، تمام معاملات اپنی طبعی رفتار سے رواں دواں رہے اور بالآخر مشیت الٰہی کے مطابق اپنی منزل سے ہمکنار ہوئے۔[3]

1 التمكين للأمة الإسلامية لمحمد السيد، ص: 227. 2 الخصائص العامة للإسلام للقرضاوي، ص: 166. 3 التمكين للأمة الإسلامية لمحمد السيد، ص: 229.

اسلوب تدرّج اپنانا قانون ربانی ہے۔ اسے میدان سیاست میں بھی بروئے کار لانا چاہیے۔ اگر اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور اس کی عملی تنفیذ کے لیے یہ اسلوب اختیار کیا جائے تو یقیناً غلبۂ اسلام کی منزل حاصل ہوگی۔ اگر ہم حقیقی اسلامی معاشرہ قائم کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ کسی صدارتی آرڈیننس، شاہی فرمان یا کسی پارلیمنٹ کی قرار داد سے اس خواب کی تعبیر حاصل ہوجائے گی۔ اس کے لیے اسلوب تدرّج اختیار کرنا ہوگا، یعنی اس کے لیے ہر قسم کی تیاری کرنا ہوگی۔ فکر اور سوچ پیدا کرنے کی ضرورت ہوگی۔ افراد کی تربیت کے لیے ایک جماعت کو تیار کرنا ہوگا۔ نبی کریم ﷺ نے جاہلانہ طرز زندگی کو اسلامی طرز حیات میں تبدیل کرنے کے لیے یہی منہج اختیار کیا۔ آپ ﷺ بعثت کے بعد تیرہ سال مکہ مکرمہ میں رہے، اس عرصے میں آپ کا بنیادی مقصد یہی رہا کہ اہل ایمان کی ایک ایسی تربیت یافتہ جماعت تیار ہوجائے جو دعوت کی ذمہ داری اٹھانے کی صلاحیت رکھتی ہو اور دین کی حفاظت اور پوری دنیا میں اس کی نشر واشاعت کے لیے جدوجہد کرنے کی اہل ہو، اسی لیے مکی دور میں اتنے شریعت کے قوانین نازل نہیں ہوئے جتنا کہ تعلیم وتربیت اور رجال کار کی تیاری کا کام ہوا۔[1]

تبدیلی کا اسلوب اور اس کا عقائد سے تعلق

ترقی کے راستے پر گامزن ہونے کے لیے ایک اہم ترین طریقہ وہ ہے جس کی نشاندہی اس فرمان الٰہی سے ہوتی ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ﴾

''بے شک اللہ نہیں بدلتا جو کسی قوم میں ہے، حتی کہ وہ اسے بدل لیں جو ان کے نفسوں میں ہے۔''[2]

[1] الخصائص العامة للإسلام للقرضاوي، ص: 168. [2] الرعد 11:13.

یہ بات نہایت واضح ہے کہ امت مسلمہ کو غلبہ حاصل نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنے اندر تبدیلی نہیں لے آتی ۔لیکن اس وقت امت مسلمہ کی جو صورت حال ہے اس میں کسی قسم کے غلبے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس مقصد کے لیے امت کا اپنے آپ کو بدلنا نہایت ضروری ہے۔ وہ قوم جو ذلت آمیز زندگی پر راضی ہوجائے، اس میں آگے بڑھنے کا جذبہ مفقود ہوجائے، اپنی تکلیف دہ صورت حال کو بدلنے اور اس کی بندشوں سے آزاد ہونے کی کوشش نہ کرے، ایسی قوم کو کبھی غلبہ واقتدار حاصل نہیں ہوتا۔[1]

اسلام کو روز اول ہی سے شدید قسم کی صورت حال پیش آئی ۔صرف جزیرہ نمائے عرب نہیں بلکہ پورے کرۂ ارض کا مقابلہ کرنا پڑا۔ ایک طرف عقائد وتصورات سے ٹکراؤ تھا تو دوسری طرف کئی قسم کے اقدار اور معیار سے جنگ تھی۔ اگر ایک طرف مختلف نظاموں اور تہذیبوں کا مقابلہ کرنا پڑا تو دوسری جانب کئی قسم کی مصلحتوں اور تعصّبات سے نبرد آزما ہونا پڑا۔

پہلے دن ہی سے اسلام اور جزیرہ نمائے عرب بلکہ پوری دنیا کے انسانوں کی صورت حال میں بہت زیادہ بُعد تھا۔ اسلام ان لوگوں میں جو تبدیلی لانا چاہتا تھا اس کا دور دور تک تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ نوع انسانی کی اس صورت حال کو ایک طویل تاریخ بنیاد فراہم کر رہی تھی، بہت سی مصلحتیں اسے تقویت پہنچا رہی تھیں اور بہت سی طاقتیں اسے مضبوط کر رہی تھیں۔ یہ سب اس نئے دین اسلام کے راستے میں ایک مضبوط بند کی شکل اختیار کرگئیں کیونکہ یہ دین جو صرف عقائد ونظریات، اقدار ومعیار، رسوم ورواج اور کردار وجذبات کی تبدیلی کو کافی نہیں سمجھتا بلکہ وہ تمام ظالمانہ نظام ہائے زندگی اور تہذیبوں کو بدلنا چاہتا ہے اور جابرانہ دساتیر وقوانین کا خاتمہ اس کا مقصود ہے۔ وہ انسانی قیادت کو ظلم وجبر اور جہالت کے ہاتھوں سے چھین کر ایک اللہ اور اس کے دین اسلام کے حوالے کرنے کا خواہاں ہے۔[2]

اس میں کوئی شک نہیں کہ جو چیز ایک مرتبہ وقوع پذیر ہوجائے وہ دوسری مرتبہ بھی رونما

---

1 التمكين للأمة الإسلامية لمحمد السيد، ص: 210. 2 هذا الدين لسيد قطب، ص:52,51.

ہوسکتی ہے۔ اسلام کو جو عروج حاصل ہوا تھا وہ ان قوانین فطرت کے ساتھ ہی حاصل ہوا تھا نہ کہ مافوق الفطرت معجزات کے ساتھ۔ یہ عروج اور کامیابی ہر اس شخص کو آج بھی حاصل ہوسکتی ہے جو قوانین فطرت کے اس سرمائے کو حاصل کرنے کے بعد اس کا صحیح استعمال کرے اور اس کے مطابق اپنی پوری قوت اور صلاحیتیں صرف کرے۔[1]

نبی کریم ﷺ نے منہج ربانی کے مطابق جس انقلاب کی قیادت فرمائی اس کا آغاز نفس انسانی سے کیا۔ آپ نے عظیم انسان تیار کیے، پھر ان کے ذریعے انسانی معاشرے میں ایک عظیم انقلاب پیدا کیا جس نے انسانیت کو تاریکی سے نکال کر روشنی کی جانب، جہالت سے نکال کر علم کی جانب اور پسماندگی سے نکال کر ترقی کی راہ پر گامزن کیا اور پھر ان کی بدولت ایک بہترین اور شاندار تہذیب کو متعارف کروایا۔[2]

نبی کریم ﷺ نے قرآنی منہج کے مطابق عقائد، افکار، نظریات، اخلاق اور احساسات کی اصلاح فرما کر اپنے صحابہ کے دلوں میں ایک انقلاب پیدا کردیا جس کی بدولت آپ ﷺ کے گردونواح کی انسانی دنیا ہی تبدیل ہوگئی۔ مدینہ منورہ کی حالت بدل گئی، پھر مکہ مکرمہ میں تبدیلی آئی۔ اس کے بعد جزیرہ نمائے عرب اور روم و فارس کی سلطنتیں اس انقلاب کی وجہ سے بدلتی چلی گئیں۔ یہ ایک ایسی بین الاقوامی تحریک تھی جس میں صبح وشام خالق کائنات کا ذکر ہوتا تھا اور اس کی تسبیح بیان کی جاتی تھی۔ مکی دور میں قرآنِ حکیم کے ذریعے عقائد کی اصلاح کا بہت زیادہ اہتمام کیا گیا۔ مختلف اسالیب کے ساتھ عقائد سمجھائے گئے جس کی بدولت ان کے دل ایمان سے لبریز ہوگئے اور ان میں بہت بڑی تبدیلی پیدا ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس عظیم اور درجہ بدرجہ حاصل ہونے والی ترقی کی وضاحت اس طرح بیان فرمائی ہے:

1 هذا الدين لسيد قطب، ص: 65. 2 نفوس و دروس في إطار التصوير القرآني لتوفيق محمد سبع، ص: 367.

﴿ أَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَٰهُ وَجَعَلْنَا لَهُۥ نُورًا يَمْشِى بِهِۦ فِى ٱلنَّاسِ كَمَن مَّثَلُهُۥ فِى ٱلظُّلُمَٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ۚ كَذَٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكَٰفِرِينَ مَا كَانُوا۟ يَعْمَلُونَ ○ ﴾

''کیا ایک ایسا شخص جو مردہ تھا، پھر ہم نے اسے زندہ کیا اور ہم نے اس کے لیے نور بنا دیا، وہ اس کی روشنی میں لوگوں میں چلتا ہے، (کیا) وہ اس شخص جیسا (ہوسکتا) ہے جس کا حال یہ ہے کہ وہ اندھیروں میں پڑا ہے، ان سے نکلنے والا نہیں؟ اسی طرح کافروں کے لیے ان کاموں میں کشش رکھی گئی ہے جو وہ کرتے ہیں۔''[1]

درحقیقت یہ ایک بہترین اور حیران کن منظر نامہ ہے جسے بیان کرنے میں قلم بھی چکرا کررک جاتے ہیں۔ اور قرآن کا اسلوب تو ہر آن ایسا ہے جس سے عقلیں سیراب ہوں اور مختلف اسلوبِ بیاں جنم لیں، پھر بھی تعبیر کا حق ادا نہ کرسکیں۔ موت سے زندگی کی جانب سفر، اندھیروں سے اجالوں کی طرف سفر، کیا یہ دونوں مردہ اور زندہ، اندھیرا اور اجالا یکساں ہوسکتے ہیں؟ نہیں ان کے درمیان تو ایک طویل مسافت ہے، ایک واضح تضاد ہے جسے وہی شخص محسوس کرسکتا ہے جو حیرت انگیز قرآنی بیانات کی روشنی میں اہل عرب کی حالت پر گہری نگاہ رکھتا ہو۔[2]

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے عقائد کی اصلاح

بعثتِ نبوی سے قبل لوگوں کو صحیح معنوں میں معرفتِ الٰہی حاصل نہ تھی، اس وجہ سے وہ اسماء وصفات باری تعالیٰ کے سلسلے میں درست منہج سے ہٹے ہوئے تھے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿ وَلِلَّهِ ٱلْأَسْمَآءُ ٱلْحُسْنَىٰ فَٱدْعُوهُ بِهَا ۖ وَذَرُوا۟ ٱلَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِىٓ أَسْمَٰٓئِهِۦ ۚ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوا۟ يَعْمَلُونَ ○ ﴾

1 الأنعام 122:6۔ 2 الانحرافات العقدية والعلمية لعلي بن تجيب الزهراني: 26,25/1۔

''اور اللہ ہی کے لیے اچھے اچھے نام ہیں، لٰہذا تم اسے ان (ناموں) سے پکارو اور چھوڑ دو ان لوگوں کو جو اس کے ناموں میں کج روی اختیار کرتے ہیں۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں، جلد اس کی سزا پائیں گے۔''[1]

وہ لوگ بعض صفات الٰہیہ کا انکار کر دیتے تھے اور اللہ تعالیٰ کو ایسے ناموں سے موسوم کرتے تھے جو اس کے شایانِ شان نہ ہوتے یا ان میں غلط معنی پوشیدہ ہوتا۔ اسی طرح بسا اوقات وہ کچھ خامیوں اور عیوب کی نسبت بھی اس کی طرف کر دیتے، مثلاً: وہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں سمجھتے تھے اور جنات کو اس کا شریک بنا بیٹھے تھے۔

فرمانِ الٰہی ہے: ﴿وَجَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ﴾

''اور (اس پر بھی) لوگوں نے جنوں کو اللہ کا شریک ٹھہرا دیا۔''[2]

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَيَجْعَلُونَ لِلَّهِ الْبَنَٰتِ سُبْحَٰنَهُۥ﴾

''اور وہ اللہ کی بیٹیاں ٹھہراتے ہیں، وہ (اولاد سے) پاک ہے۔''[3]

قرآن حکیم نے صحیح عقائد کو مضبوط کیا اور اہل ایمان کے دلوں میں انھیں پختہ کیا، پھر تمام لوگوں کے لیے وضاحت سے بیان کر دیا کہ سب کا پروردگار ایک ہے، اس کے سوا کوئی پروردگار نہیں۔ معبود بھی ایک ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور اس کے اسماء وصفات اسی کے ساتھ خاص ہیں، کوئی اور ان اسماء وصفات کا مالک نہیں۔ اور قرآن نے ہمیں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کی خبر دی ہے ان پر ایمان لانا ضروری ہے، مثلاً: فرشتوں، آسمانی کتابوں، انبیائے کرام علیہم السلام، اچھی اور بری تقدیر اور آخرت کے دن پر ایمان۔ قرآن نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ تمام رسولوں پر ایمان اور ان کی بتائی ہوئی تعلیمات کو ماننا بھی نہایت ضروری ہے۔[4]

---

[1] الأعراف 180:7. [2] الأنعام 100:6. [3] النحل 57:16. [4] أهمية الجهاد في نشر الدعوة لعلي العلياني، ص: 47.

قرآن حکیم کی مکی آیات نے لوگوں میں معرفت الٰہی پیدا کی اور انھیں بتایا کہ انھیں کس معبود کی عبادت کرنی چاہیے۔ نبی کریم ﷺ نے بھی انھی آیات کو بنیاد بنا کر صحابۂ کرام کی تربیت کی۔ پہلے دن ہی سے آپ ﷺ کی یہ تمنا رہی کہ لوگوں کو اپنے رب کے بارے میں صحیح تصور دیں اور انھیں بتائیں کہ ان کے رب کے ان پر حقوق ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کو اس بات کا احساس تھا کہ یہ تصور ہی ان پاکباز نفوس اور فطرت سلیمہ کے حاملین کو ایمان و یقین کی دولت دے سکتا ہے۔ قرآن کریم سے ماخوذ اس تصور کو عام کرنے کے لیے نبی کریم ﷺ نے اپنی تمام تر توجہ ان پہلوؤں پر مرکوز رکھی:

① اللہ تعالیٰ ہر عیب اور نقص سے پاک ہے۔ ہر قسم کے کمالات سے متصف ہے جن کا شمار ممکن نہیں۔ وہ ایک ہے، کوئی اس کا شریک نہیں۔ نہ اس کی کوئی بیوی ہے اور نہ اولاد۔

② اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق و مالک اور تمام معاملات کنٹرول کرنے والا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ قف یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا لا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ ؕ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ؕ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۝﴾

”بے شک تمھارا رب وہ اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر مستوی ہوگیا۔ وہ دن کو رات سے اس طرح ڈھانپتا ہے کہ وہ (رات) جلدی سے اس (دن) کو آلیتی ہے اور اس نے سورج، چاند اور تارے اس طرح پیدا کیے کہ وہ سب اس (اللہ) کے حکم کے پابند کردیے گئے ہیں۔ آگاہ رہو! پیدا کرنا اور حکم صادر کرنا اسی کے لیے روا ہے، اللہ رب العالمین بہت بابرکت ہے۔“ [1]

[1] الأعراف 54:7.

③ اس کائنات میں ہمیں چھوٹی بڑی یا ظاہر و مخفی جو بھی نعمت حاصل ہوتی ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا بِكُم مِّن نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ ثُمَّ إِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَإِلَيْهِ تَجْأَرُونَ ۝﴾

''اور تمھارے پاس جو بھی نعمت ہے وہ تو اللہ ہی کی طرف سے ہے، پھر جب تمھیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اسی سے تم آہ و فغان کرتے ہو۔''[1]

④ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے احاطۂ علم میں ہے۔ زمین و آسمان کی کوئی چیز اس سے مخفی نہیں۔ انسان جو کچھ چھپاتا یا ظاہر کرتا ہے سب اس کے علم میں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ يَتَنَزَّلُ الْأَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ وَأَنَّ اللَّهَ قَدْ أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ۝﴾

''اللہ وہ ذات ہے جس نے سات آسمان پیدا کیے اور زمینیں بھی ان (آسمانوں) کی مثل، ان کے درمیان اس کا حکم نازل ہوتا ہے تاکہ تم جان لو کہ بلاشبہ اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے اور بلاشبہ اللہ نے (اپنے) علم سے ہر شے کا احاطہ کر رکھا ہے۔''[2]

⑤ اور اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کے ذریعے سے ہر انسان کے تمام اعمال کا ریکارڈ (نامۂ اعمال) تیار کرواتا ہے۔ اس میں معمولی سے معمولی چیز اور بڑی سے بڑی چیز بھی موجود ہوتی ہے۔ اس نامۂ اعمال کو ایک مناسب وقت پر انسان کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿مَا يَلْفِظُ مِن قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ ۝﴾

''(انسان) جو بات بھی (منہ سے) نکالتا ہے (اسے لکھنے کو) اس کے پاس ایک نگران (فرشتہ) تیار ہوتا ہے۔''[3]

---

1 النحل 53:16. 2 الطلاق 12:65. 3 ق 18:50.

⑥ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ان کی پسند اور چاہت کے مطابق مختلف معاملات میں مبتلا کر کے ان کا امتحان لیتا ہے تا کہ لوگوں کو ان کی حقیقت معلوم ہو جائے کہ کون اللہ تعالیٰ کی قضاء وقدر پر راضی رہتا ہے اور ہر حال میں اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہے۔ یقیناً ایسے لوگ ہی خلافت و امانت اور سرداری کے اہل ہوتے ہیں۔اور کون ہے جو اس کی قضاء و قدر پر راضی نہیں ہوتا بلکہ غصے کا اظہار کرتا ہے، ایسے لوگ غضب الٰہی کا شکار ہوتے ہیں اور کوئی ذمہ داری ان کے سپرد نہیں کی جاتی۔

⑦ اور اللہ تعالیٰ ایسے انسان کی نصرت و تائید فرماتے ہیں اور اسے مکمل توفیق عنایت کرتے ہیں جو سب کو چھوڑ کر اس کی پناہ، حفاظت اور امان میں آنا چاہے اور کسی کام کے کرنے یا چھوڑنے میں اسی کے حکم کی تعمیل کرے۔

⑧ اللہ تعالیٰ کا بندوں پر یہ حق ہے کہ صرف اس کی عبادت کریں، اس کی توحید کو تسلیم کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔

﴿ بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝ ﴾

"بلکہ آپ اللہ ہی کی عبادت کریں اور شکر گزاروں میں سے ہو جائیں۔"[1]

⑨ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں توحید اور بندگی کے تقاضے بیان فرما دیے ہیں۔[2]

امت مسلمہ کے ہراول دستے نے اس تربیت کے دوران میں اللہ تعالیٰ کی صفات اور اسمائے حُسنیٰ کا فہم حاصل کیا اور ان کے تقاضوں کے مطابق اس کی بندگی اختیار کی۔اس طرح اللہ تعالیٰ کی عظمت ان کے دلوں میں پختہ ہوگئی اور اس کی خوشنودی کا حصول ان کا نصب العین اور زندگی کا مقصد بن گیا۔انھوں نے اس احساس کو ہمیشہ بیدار رکھا کہ وہ ہر لمحے اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں ہیں اور وہ انھیں دیکھ رہا ہے۔ اس طرح انھوں نے اپنی خواہشات نفس پر کنٹرول کیا اور بے قابو نہیں ہونے دیا۔صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنے آپ

1 الزمر 66:39. 2 منهج الرسول في غرس الروح الجهادية للسيد محمد نوح، ص: 10-16.

کو ہر قسم کے شرک سے پاک رکھا۔ نہ شرک فی التصرف کے قریب گئے نہ شرک فی الاسماء والصفات کو قریب آنے دیا۔ ہمیشہ یہی عقیدہ رکھا کہ امور کائنات کے چلانے میں کوئی اس کے ساتھ شریک نہیں ہے، نہ کسی کو وجود بخشنے میں، نہ عدم کی طرف لے جانے میں، نہ زندگی عطا کرنے میں، نہ زندگی ختم کرنے میں۔ اور اس کے اذن کے بغیر نہ کوئی خیر حاصل کر سکتا ہے نہ شر دور کر سکتا ہے۔اور اس بات کا عقیدہ رکھا کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہو سکتے، مثلاً: علم غیب اللہ کے سوا کسی اور ذات کو حاصل نہیں۔عظمت و کبریائی صرف اسی کے لیے ہے، حاکمیت مطلقہ اور اطاعت مطلقہ صرف اس کی ہے کسی اور کو یہ وصف حاصل نہیں ہو سکتا۔[1]

نبی کریم ﷺ نے توحید کی بنیاد پر افراد کی تربیت فرمائی۔اسی تربیت پر اسلام کی عمارت قائم ہوئی اور یہی وہ صحیح منہج ہے جسے پہلے انبیاء اور رسولوں نے اختیار کیا۔ ہر رسول نے اپنی قوم کو سب سے پہلے صرف ایک اللہ کی عبادت کی دعوت دی۔حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں فرمان الٰہی ہے:

﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ ۡ اِنِّیْ لَكُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ﴾

"اور البتہ ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا (اس نے کہا:) بے شک میں تمھیں صاف صاف ڈرانے والا ہوں، یہ کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔"[2]

حضرت ہود علیہ السلام کے بارے میں فرمان الٰہی ہے:

﴿وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ﴾

"اور (ہم نے) عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو (بھیجا)، اس نے کہا: اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کرو، تمھارے لیے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔"[3]

[1] أهميّة الجهاد في نشر الدعوة لعلي العلياني، ص: 53. [2] هود 11:25,26. [3] هود 11:50.

اور حضرت صالح علیہ السلام کے بارے میں ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا ۚ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ ﴾

''اور (ہم نے) ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو (بھیجا)۔ اس نے کہا: اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں۔''[1]

اور حضرت شعیب علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

﴿ وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۗ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ ﴾

''اور (ہم نے) مدین (والوں) کی طرف ان کے بھائی شعیب کو (بھیجا)، اس نے کہا: اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں۔''[2]

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

﴿ إِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۚ هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ۝ ﴾

''بے شک اللہ میرا اور تمھارا رب ہے، چنانچہ اسی کی عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔''[3]

الغرض تمام رسولوں نے توحید الوہیت کی دعوت دی۔ توحید الوہیت کا مفہوم یہ ہے کہ صرف ایک اللہ کی عبادت کی جائے اور اس کے سوا ہر باطل معبود سے دور رہا جائے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ ۖ ﴾

''اور یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔''[4]

1 ھود 61:11. 2 ھود 84:11. 3 آل عمرٰن 51:3. 4 النحل 36:16.

رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کے دلوں میں خالص اور مکمل توحید پختہ کی اور اس کے مطابق ان کی تربیت فرمائی۔ آپ ﷺ بذات خود انتہائی درجے کے موحد مومن کی زندہ مثال تھے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۚ۬ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ○ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ لَا شَرِیْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ○ قُلْ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَیْءٍ ؕ﴾

”(اے نبی!) کہہ دیجیے: بے شک مجھے میرے رب نے سیدھے راستے کی طرف ہدایت دی ہے صحیح اعلیٰ اقدار کے حامل دین کی، ایک رب کے پرستار ابراہیم کے طریقے کی اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھا، کہہ دیجیے: بے شک میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت، (سب کچھ) اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی (بات، یعنی توحید) کا حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں، کہہ دیجیے: کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کروں؟ جبکہ وہی ہر چیز کا رب ہے۔“ [1]

رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کی جو تربیت فرمائی اس سے بڑے ہی مبارک ثمرات حاصل ہوئے۔ صحابۂ کرام میں کوئی ایسی بات نہ رہی جو توحید الوہیت یا توحید ربوبیت یا توحید اسماء و صفات کے منافی ہو۔ انھوں نے ایک اللہ کے سوا کسی کی حاکمیت تسلیم نہ کی، اس کے سوا کسی کو مطاع نہ جانا۔ اسے ناراض کر کے کسی دوسرے کی اتباع نہ کی اور کسی دوسرے کی محبت کو اللہ کی محبت پر غالب نہ آنے دیا۔

اللہ کے سوا کسی اور کا خوف ان کے دلوں پر غالب نہ آسکا۔ انھوں نے صرف اسی پر

[1] الأنعام 6:161-164.

مکمل اعتماد کیا، اس کے سوا کسی کو جائے پناہ نہ سمجھا۔ صرف اسی سے مانگا، اسی سے مغفرت طلب کی، اسی کے نام پر جانور ذبح کیے، اسی کے لیے نذریں دیں، اس کے سوا کسی کو مدد کے لیے نہیں پکارا اور وہ امور جو صرف اسی کی قدرت وطاقت میں ہیں، ایسے امور میں صرف اسی سے استعانت چاہی۔ صرف اسی کے سامنے سر جھکایا، اسی کو سجدہ کیا۔ اس کے لیے حج کیا، اسی کے گھر کا طواف کیا اور ہر قسم کی عبادت خاص اسی کے لیے کی۔ نہ اسے مخلوق سے تشبیہ دی نہ معدوم سے بلکہ اس سے ہر قسم کے عیب اور نقص کی نفی کی۔ انھوں نے اس کی ایسی تمام صفات کو تسلیم کیا جو اس نے خود بیان کیں یا اس کے رسول ﷺ نے بیان کیں۔ کسی بھی صفت میں نہ تحریف کی نہ تاویل اور نہ تعطیل سے کام لیا۔ صرف اسی کا خوف دل میں بسایا۔ مطلق اطاعت کا حق اس کے سوا کسی کو نہ دیا۔ اس کے اوصاف ربوبیت میں کسی کو شریک نہ کیا، مثلاً: زندگی عطا کرنا، موت سے ہمکنار کرنا، رزق دینا، اس علم کا مالک ہونا جو ہر چیز کا احاطہ کرنے والا ہے، قدرت کاملہ کا مالک ہونا، قائم بالذات ہونا، مطلق بقاء کا مالک ہونا، تحلیل وتحریم کا فیصلہ کرنا اور اس جیسی صفات میں وہ کسی دوسرے کو اللہ تعالیٰ کا شریک نہیں سمجھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی توفیق عنایت فرمائے کہ ہم قولاً، فعلاً اور اعتقاداً توحید کے تقاضے پورے کریں۔ یقیناً اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے اور وہی ایسا کرسکتا ہے۔[1]

قرآن حکیم کی مکی آیات نے عقیدۂ توحید کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ بتایا کہ محمد ﷺ کی رسالت تمام انسانوں اور جنوں کے لیے ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝﴾

”اور ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لیے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا ہی بنا کر بھیجا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔“[2]

1 أهمية الجهاد في نشر الدعوة لعلي العلياني، ص:55,54. 2 سبا 28:34.

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قُلْ يَآيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ﴾

''کہہ دیجیے: اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں، جس کے پاس آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے۔''[1]

فرمان الٰہی ہے:

﴿وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ○﴾

''اور (یاد کیجیے) جب ہم نے جنوں کی ایک جماعت کو آپ کی طرف متوجہ کیا، جبکہ وہ قرآن سنتے تھے، پھر جب وہ اس (کی تلاوت سننے) کو حاضر ہوئے تو (ایک دوسرے سے) کہا: خاموش رہو، چنانچہ جب (تلاوت) ختم ہوگئی تو وہ اپنی قوم کی طرف ڈرانے والے بن کر پھرے۔''[2]

اور اس سے ملتی جلتی دیگر آیات میں بھی یہی بات موجود ہے۔[3]

قرآن حکیم کی مکی آیات نے جس طرح توحید باری تعالیٰ اور رسالت کے بارے میں صحابۂ کرام کے دلوں میں صحیح اور شفاف عقیدہ پختہ کیا، اسی طرح فرشتوں کے متعلق ان کے عقیدے کی اصلاح کی اور انھیں بتایا کہ فرشتے بھی اللہ کی مخلوق ہیں، اللہ کے سامنے سربسجود ہوتے ہیں، اس کی بندگی بجالاتے ہیں اور خود کو اس کی بندگی سے بالا نہیں سمجھتے۔ زمین و آسمان میں کہیں بھی ان کی شراکت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر یہ کسی کو نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ فرمان الٰہی ہے:

[1] الأعراف 158:7. [2] الأحقاف 29:46. [3] أهميّة الجهاد في نشر الدعوة لعلي العلياني، ص: 56.

﴿وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ○﴾

''اور آسمانوں اور زمین کے تمام جاندار اللہ کو سجدہ کرتے ہیں اور تمام فرشتے بھی اور وہ تکبر نہیں کرتے۔''[1]

اور اسی طرح دیگر آیات میں بھی یہی چیز موجود ہے۔

قرآن حکیم کی مکی آیات نے اپنے بے مثال اور اثر انگیز اسلوب سے ایمان کے جملہ ارکان اہل ایمان کے دلوں میں پختہ کیے اور سب لوگوں کے لیے واضح بھی کر دیے۔

آپ ﷺ پر نزول قرآن اور آپ سے قبل تورات اور انجیل کے نزول کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ○﴾

''اسی نے آپ پر حق کے ساتھ کتاب نازل کی ہے جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے اور اسی نے تورات اور انجیل کو نازل کیا۔''[2]

اللہ تعالیٰ نے یہ بات بھی واضح فرمادی کہ اس نے بہت سے انبیاء کو لوگوں کی ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا:

﴿وَكَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِيْنَ ○﴾

''اور ہم نے پہلے لوگوں میں کتنے ہی نبی بھیجے۔''[2]

قرآن کریم میں جنت کا بیان اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر اس کے اثرات

قرآن کریم کی مکی آیات میں یوم آخرت کے ذکر کو خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ شاذ و نادر ہی کوئی مکی سورت ہوگی جس میں قیامت کے دن کے احوال مذکور نہ ہوں، انعام پانے

[1] النحل 16:49. [2] آل عمرٰن 3:3. [3] الزخرف 43:6.

والوں کا اور عذاب میں مبتلا ہونے والوں کا ذکر نہ ہو اور لوگوں کو میدان محشر میں جمع کرنے اور ان کے محاسبے کی کیفیت بیان نہ کی گئی ہو۔ ان آیات کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ انسان اپنی آنکھوں سے قیامت کو دیکھ رہا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ ۚ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ۗ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ○ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الْكِتٰبُ وَجِايْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ○ وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا ۗ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۚ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ○ قِيْلَ ادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ○ وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ۗ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ○﴾

”اور انھوں نے اللہ کی قدر نہیں کی جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق ہے اور قیامت کے دن ساری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان بھی اس کے دائیں ہاتھ میں لپیٹے ہوں گے، وہ پاک ہے اور اس شرک سے بالاتر ہے جو وہ کرتے ہیں۔ اور صور میں پھونکا جائے گا تو جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہے بے ہوش ہوجائے گا سوائے اس کے جسے اللہ چاہے، پھر اس میں دوسری بار پھونکا جائے گا تو وہ یکا یک کھڑے (ہوکر) دیکھنے لگیں گے اور زمین اپنے رب کے نور سے چمک اٹھے گی اور (عملوں کی) کتاب رکھی جائے گی اور انبیاء اور گواہ لائے جائیں گے

اور لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ اور ہر شخص نے جو عمل کیا ہوگا اسے اس کا پورا پورا اجر دیا جائے گا اور جو کچھ وہ کررہے ہیں اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا، وہ جہنم کی طرف گروہ در گروہ ہانکے جائیں گے، حتی کہ جب وہ اس کے پاس پہنچیں گے تو اس کے دروازے کھول دیے جائیں گے اور اس کے دربان ان سے کہیں گے: کیا تمھارے پاس تمھی میں سے رسول نہیں آئے تھے جو تم پر تمھارے رب کی آیتیں پڑھتے تھے اور تمھیں تمھاری اس دن کی ملاقات سے ڈراتے تھے؟ وہ کہیں گے: کیوں نہیں! لیکن کافروں پر عذاب کا فیصلہ ثابت ہو چکا۔ (انھیں) کہا جائے گا: تم جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ، اس میں تم ہمیشہ رہو گے، چنانچہ تکبر کرنے والوں کا (یہ) ٹھکانا بہت برا ہے۔ اور جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے رہے ہوں گے، وہ جنت کی طرف گروہ در گروہ لے جائے جائیں گے، حتی کہ جب وہ اس کے پاس پہنچیں گے تو اس کے دروازے کھول دیے جائیں گے اور اس کے دربان ان سے کہیں گے: تم پر سلام ہو، تم پاکیزہ رہے، اب تم اس میں ہمیشہ کے لیے داخل ہو جاؤ۔"[1]

قرآن حکیم نے جنت کے اوصاف نہایت واضح انداز میں بیان کیے ہیں جس کا صحابۂ کرام کے دلوں پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ قرآن حکیم نے جنت کے متعلق یہ بیان کیا کہ وہ بے مثال ہے، اس کے کئی دروازے ہیں، اس میں بہت سے درجات ہیں۔ اس میں بہتی ہوئی نہریں ہیں، جاری چشمے ہیں، محلات اور خیمے ہیں۔ طرح طرح کے درخت ہیں جیسے سدرۃ المنتہیٰ اور طوبیٰ۔ قرآن حکیم نے اہل جنت کو ملنے والی نعمتوں ملبوسات، زیورات، بستروں، قالینوں، خدام، بیویوں اور آپس کی گفتگو کی کچھ کچھ تفصیلات بیان کی ہیں اور اہل جنت کو

1 الزمر 39:67-73.

ملنے والی سب سے اعلیٰ نعمت اور ان کے اظہار تشکر کی وضاحت کی ہے۔ قرآن حکیم کی اس توضیح نے صحابۂ کرام کے قلوب و اذہان اور ان کے جذبات و احساسات پر مکمل غلبہ پالیا (حتیٰ کہ خالقِ جنت کی اطاعت کر کے ان نعمتوں کا حصول ان کا مطمحِ نظر بن گیا۔) قرآن حکیم کی روشنی میں جنت کے بعض اوصاف درج ذیل ہیں:

جنت کا بے مثال ہونا: جنت کی نعمتیں خالصتاً اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے جود و کرم اور فضل و احسان کا مظہر ہیں جو اس نے اپنے صاحبِ تقویٰ بندوں کے لیے تیار کر رکھی ہیں جن میں سے چند ایک نعمتوں کا ذکر فرما دیا (تا کہ ان کے حصول کے لیے تڑپ پیدا ہو) اور بہت سی نعمتوں کو پردۂ غیب میں رہنے دیا۔ ہمیں رب ذوالجلال نے صرف اتنا بتایا کہ وہ نعمتیں ایسی ہیں جو فی الحال تمھاری عقل سے بالا ہیں، تمھاری سوچ اور فکر بھی اس تک نہیں پہنچ سکتی۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ أُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ ﴾

”کوئی شخص نہیں جانتا کہ (ان کے اعمال کے بدلے میں) ان کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک کی کون کون سی چیزیں پوشیدہ رکھی گئی ہیں۔“[1]

اللہ تعالیٰ نے اس اجر عظیم کا سبب بھی بیان فرمایا کہ قیام اللیل اور انفاق فی سبیل اللہ جیسے عظیم اعمال کے صلے میں انھیں یہ انعامات حاصل ہوں گے۔

جنت کے درجات: سب اہل جنت کے اعمال یکساں نہیں ہوں گے۔ بعض کی نیکیاں دوسروں کی نسبت زیادہ ہوں گی اور اس وجہ سے انھیں دوسروں پر فضیلت حاصل ہوگی۔ آخرت میں بھی ان کے درجات ان کی نیکیوں کی نسبت بلند ہوں گے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿ وَمَنْ يَّأْتِهِ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَأُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ۝ ﴾

”اور جو اس کے حضور مومن (بن کر) حاضر ہوگا، جبکہ اس نے نیک عمل کیے ہوں

[1] السجدة 17:32.

تو انھی (لوگوں) کے درجے بلند ہیں۔''[1]

ایمان لانے والے اولیاء اللہ اپنے اپنے ایمان اور تقوے کے لحاظ سے ان درجات کو حاصل کریں گے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ۝﴾

''دیکھیے! کس طرح ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی؟ اور یقیناً آخرت درجوں میں بڑھ کر ہے اور فضیلت دینے میں (بھی) بڑھ کر ہے۔''[2]

اور فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ اتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ۝﴾

''اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے بھی ایمان کے ساتھ ان کی پیروی کی تو ہم ان کی اولاد کو (جنت میں) ان سے ملادیں گے اور ہم ان کے عمل میں سے کچھ بھی کم نہیں کریں گے۔ ہر شخص اس کے عوض جو اس نے کمایا گروی ہے۔''[3]

جنت کی نہریں: قرآن کریم کی متعدد آیات میں جنت کی نہروں کا تذکرہ ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ فِيْهَآ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ۚ۬ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ؕ وَلَهُمْ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَ مَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ؕ﴾

''اس جنت کی صفت جس کا متقین سے وعدہ کیا گیا ہے یہ ہے کہ اس میں (ایسے) پانی کی نہریں ہیں جو بدلنے والا نہیں اور ایسے دودھ کی نہریں ہیں جس کا

1 طٰه 75:20. 2 بني إسرآئيل 17:21. 3 الطور 21:52.

ذائقہ (کبھی) تبدیل نہ ہوا ہوگا اور ایسی شراب کی نہریں ہیں جو پینے والوں کے لیے لذیذ ہے اور صاف شفاف شہد کی نہریں ہیں، اور وہاں ان (متقین) کے لیے ہر طرح کے پھل ہوں گے اور ان کے رب کی طرف سے مغفرت ہوگی۔" [1]

جنت کے چشمے: جنت میں ایسے بے شمار چشمے ہیں جن کے مشروبات اور ذائقے مختلف ہیں، فرمان الٰہی ہے: ﴿اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ﴾

"بے شک متقی لوگ باغوں اور چشموں میں ہوں گے۔" [2]

فرمان الٰہی ہے: ﴿اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ﴾

"بے شک متقی لوگ چھاؤں میں اور بہتے چشموں میں ہوں گے۔" [3]

خشیت الٰہی رکھنے والوں کے لیے جو دو دو باغات تیار کیے گئے ہیں، انھیں اس طرح بیان فرمایا:

﴿فِيْهِمَا عَيْنٰنِ تَجْرِيٰنِ﴾

"ان دونوں (باغوں) میں دو چشمے جاری ہوں گے۔" [4]

پھر اگلی آیات میں اس بات کو اس انداز میں بیان فرمایا:

﴿فِيْهِمَا عَيْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ﴾

"ان میں جوش مارتے دو چشمے ہیں۔" [5]

جنت میں دو چشمے ایسے ہیں جن کا خالص پانی بغیر کسی آمیزش کے مقرب لوگ نوش فرمائیں گے۔ نیک لوگوں کے لیے اس پانی میں مزید ذائقوں کی آمیزش بھی کی جائے گی۔ ایک چشمہ کافور ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا ۚ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا﴾

[1] محمد 15:47. [2] الحجر 45:15. [3] المرسلٰت 41:77. [4] الرحمٰن 50:55. [5] الرحمٰن 66:55.

''بے شک نیک لوگ ایسے جام سے پئیں گے جس میں کافور کی ملاوٹ ہوگی، (وہ) ایک چشمہ ہے جس سے اللہ کے بندے پئیں گے اور (جدھر چاہیں گے) اس کی شاخیں نکال لے جائیں گے۔''[1]

دوسرا چشمہ تسنیم ہے۔فرمان ربانی ہے:

﴿إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ۝ عَلَى الْأَرَائِكِ يَنظُرُونَ ۝ تَعْرِفُ فِي وُجُوهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيمِ ۝ يُسْقَوْنَ مِن رَّحِيقٍ مَّخْتُومٍ ۝ خِتَامُهُ مِسْكٌ ۚ وَفِي ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ ۝ وَمِزَاجُهُ مِن تَسْنِيمٍ ۝ عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُونَ ۝﴾

''بے شک نیک لوگ ضرور نعمتوں میں ہوں گے، مسہریوں پر (بیٹھے) دیکھ رہے ہوں گے، ان کے چہروں پر آپ نعمتوں کی تازگی محسوس کریں گے، انھیں مہر لگی خالص شراب پلائی جائے گی، اس پر کستوری کی مہر لگی ہوگی، لہٰذا شائقین کو اسی کا شوق کرنا چاہیے، اس میں تسنیم کی آمیزش ہوگی، (وہ) ایک چشمہ ہے جس سے (اللہ کے) مقرب بندے پئیں گے۔''[2]

جنت کے چشموں میں سے ایک کا نام سلسبیل ہے۔فرمان ربانی ہے:

﴿وَيُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنجَبِيلًا ۝ عَيْنًا فِيهَا تُسَمَّىٰ سَلْسَبِيلًا ۝﴾

''اور وہاں انھیں ایسے جام پلائے جائیں گے جن میں سونٹھ کی ملاوٹ ہوگی، (یہ) جنت میں ایک چشمہ ہے جسے سلسبیل کا نام دیا گیا ہے۔''[3]

جنت کے درخت: جنت کے بعض درختوں کے اوصاف قرآنی آیات کی روشنی میں درج ذیل ہیں:

---

1 الدھر 76:5،6۔ 2 المطففین 83:22-28۔ 3 الدھر 76:17،18۔

سدرۃ المنتہیٰ: اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اس درخت کا ذکر فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ اس درخت کے قریب ہی نبی کریم ﷺ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو ان کی اصلی شکل میں دیکھا ہے اور اسی درخت کے قریب ہی جنت الماویٰ ہے۔ اس درخت پر ایسی خوبصورتی طاری تھی کہ اس کی حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۝ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ۝ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ۝ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ۝ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ۝﴾

''اور البتہ تحقیق اس (رسول) نے اس (جبریل) کو ایک بار اور بھی اترتے دیکھا، سدرۃ المنتہیٰ (آخری حد کی بیری) کے قریب، اس کے نزدیک ہی جنت الماویٰ ہے، اس وقت بیری پر چھا رہا تھا جو کچھ چھا رہا تھا، نگاہ نہ تو بہکی اور نہ حد سے بڑھی۔'' [1]

شجر طوبیٰ: یہ ایک بہت بڑا درخت ہے جس سے اہل جنت کا لباس تیار ہوتا ہے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«طُوبٰى شَجَرَةٌ فِي الْجَنَّةِ مَسِيرَةُ مِائَةِ عَامٍ، ثِيَابُ أَهْلِ الْجَنَّةِ تَخْرُجُ مِنْ أَكْمَامِهَا»

''طوبیٰ جنت میں ایک درخت ہے جس کا سایہ ایک سو سال کی مسافت کے برابر ہے اہل جنت کا لباس اس کے شگوفوں سے تیار ہوگا۔'' [2]

اتنا بڑا درخت کہ ایک سوار اس کے سایے میں ایک سو سال تک چلتا رہے اس کی مقدار کا اندازہ اس کے خالق کے سوا اور کون کرسکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس درخت کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ اتنا بڑا ہوگا کہ اگر کوئی تیز رفتار شہسوار اس درخت کے سایے کو عبور کرنا چاہے تو اسے ایک سو سال درکار ہوں گے۔ صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

1 النجم 53:13-17. 2 سلسلة الأحاديث الصحيحة للألباني: 639/4، حديث: 1985.

«إِنَّ فِي الْجَنَّةِ لَشَجَرَةً يَّسِيرُ الرَّاكِبُ فِي ظِلِّهَا مِائَةَ سَنَةٍ، وَاقْرَؤُوا إِنْ شِئْتُمْ: ﴿وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ﴾»

''جنت میں اس قسم کا درخت ہے کہ اس کے سایے میں ایک سوار سو سال تک چلتا رہے گا۔'' اگر تم چاہتے ہو تو یہ آیت پڑھو: ''اور لمبے سایوں میں۔''[1]

اور یہ سب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی قدرت کاملہ اور اس کی حسن تخلیق کے دلائل ہیں۔

اہل جنت کی خوراک اور مشروبات: اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ جنت میں اہل جنت جس قسم کی خوراک اور مشروبات کی تمنا کریں گے وہ انھیں پیش کیے جائیں گے۔ فرمان ربانی ہے:

﴿وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ﴾

''اور (ان کے سامنے پیش کیے جائیں گے) ایسے پھل جن کا وہ انتخاب کریں گے۔''[2]

ایک اور مقام پر یوں فرمایا:

﴿يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَّاَكْوَابٍ ۚ وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ ۚ وَاَنْتُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾

''ان پر سونے کی رکابیوں اور ساغروں کے دور چل رہے ہوں گے، اور اس (جنت) میں جس شے کو ان کے دل چاہیں گے اور (ان کی) آنکھیں متلذذ ہوں گی (وہ موجود ہوگی) اور تم اس میں ہمیشہ رہو گے۔''[3]

اور اللہ تعالیٰ نے انھیں اجازت دے دی ہے کہ وہ جنت کی جس نعمت کو پسند کریں اور جس قسم کا کھانا اور مشروب انھیں پسند ہو وہ حاصل کرلیں۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ﴾

''(کہا جائے گا:) مزے سے کھاؤ اور پیو ان (اعمال) کے بدلے جو تم نے

1 صحيح البخاري، حديث:3252. 2 الواقعة20:56. 3 الزخرف71:43.

گزرے دنوں میں آگے بھیجے۔"[1]

اہل جنت کی شراب: اللہ تعالیٰ اہل جنت کو جن مشروبات سے نوازیں گے ان میں سے ایک شراب ہے۔ دنیا کی شراب اپنے اندر بے شمار خامیاں اور آفات لیے ہوتی ہے۔ اس سے عقل زائل ہوجاتی ہے، سر چکراتا ہے، پیٹ خراب ہوجاتا ہے، بدن بیماریوں کا مجموعہ بن جاتا ہے، کمزوریاں لاحق ہوجاتی ہیں، ذائقہ کڑوا ہوتا ہے، رنگ اور مہک ناپسندیدہ ہوتی ہے مگر جنت کی شراب ان تمام خامیوں سے پاک ہوگی۔ صاف وشفاف، مہکتی ہوئی اور دل نشین ہوگی۔[2] فرمان الٰہی ہے:

﴿يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَأْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ۝ بَيْضَآءَ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ۝ لَا فِيْهَا غَوْلٌ وَّلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُوْنَ ۝﴾

"ان کے لیے جاری چشمے سے شراب (طہور) کا بھرا جام پھرایا جائے گا، سفید رنگ (بالکل صاف شفاف) پینے والوں کے لیے لذت (والی ہوگی)، نہ اس سے سر چکرائے گا اور نہ وہ اس سے مدہوش ہوں گے۔"[3]

اللہ تعالیٰ نے اس کی رنگت کی خوبصورتی بیان فرمائی ہے اور بتایا ہے کہ یہ پینے میں لذیذ ہوگی۔ اس کے پینے سے اکتاہٹ نہیں ہوگی۔

اس شراب کی دو خوبیاں بیان ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ سیل بند ہوگی اور دوسری یہ کہ پینے کے بعد انھیں کستوری کی خوشبو محسوس ہوگی۔[4]

اہل جنت کا کھانا پینا کسی غلاظت کا سبب نہیں بنے گا: جنت ہر قسم کی آلودگی سے پاک ہوگی اور اہل جنت اس میل کچیل سے پاک ہوں گے جس سے اہل دنیا بچ نہیں سکتے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

---

1 الحاقّة 69:24. 2 اليوم الآخر في الجنة والنار لعمر الأشقر، ص: 23. 3 الصّٰفّٰت 37:45-47.

4 تفسير ابن كثير: 6/514.

«إِنَّ أَوَّلَ زُمْرَةٍ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ عَلٰى صُورَةِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ عَلٰى أَشَدِّ كَوْكَبٍ دُرِّيٍّ فِي السَّمَاءِ إِضَاءَةً، لَا يَبُولُونَ وَلَا يَتَغَوَّطُونَ، وَلَا يَتْفِلُونَ وَلَا يَمْتَخِطُونَ»

''میری امت میں سے سب سے پہلی جماعت جو جنت میں داخل ہوگی ان کے چہرے چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکتے ہوں گے۔ ان کے بعد وہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے جو آسمان کے سب سے زیادہ چمکدار ستارے کے مانند ہوں گے۔ نہ انھیں بول و براز کی حاجت ہوگی نہ بلغم اور تھوک آئے گا۔''[1]

جنت میں درجات کا فرق نور کی کمی اور زیادتی سے ہوگا جیسا کہ اس حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن آلودگی اور غلاظت سے پاک ہونے میں سب یکساں ہوں گے نہ انھیں بول و براز کی حاجت ہوگی نہ ان کے جسم سے بو آئے گی، نہ وہ تھوکیں گے اور نہ انھیں ناک صاف کرنی پڑے گی۔ کھانے پینے کا کچھ فضلہ خوشبو دار پسینے میں تبدیل ہو کر بہہ جائے گا اور کچھ ڈکار سے خارج ہو جائے گا لیکن اس ڈکار سے بڑی عمدہ خوشبو مہکے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ أَهْلَ الْجَنَّةِ يَأْكُلُونَ فِيهَا وَيَشْرَبُونَ، وَلَا يَتْفِلُونَ وَلَا يَبُولُونَ، وَلَا يَتَغَوَّطُونَ وَلَا يَمْتَخِطُونَ، قَالُوا: فَمَا بَالُ الطَّعَامِ، قَالَ: جُشَاءٌ وَّرَشْحٌ كَرَشْحِ الْمِسْكِ»

''اہل جنت کھائیں گے، پئیں گے مگر تھوکیں گے نہیں، نہ پیشاب کریں گے نہ پاخانہ، نہ ناک صاف کرنے کی ضرورت ہوگی۔'' صحابہ نے پوچھا: ''وہ کھانا کہاں جائے گا؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''ڈکار اور پسینہ بن جائے گا جن سے کستوری

1 صحيح البخاري، حديث: 3327، و صحيح مسلم، حديث: 2834.

کی خوشبو مہکے گی۔‘‘ [1]

اہل جنت کے ملبوسات، زیورات اور عود دان: اہل جنت اعلیٰ قسم کے لباس زیب تن کریں گے اور سونے، چاندی، ہیرے جواہرات کے خوبصورت زیورات سے آراستہ ہوں گے۔ ان کے ملبوسات ریشمی ہوں گے۔ کنگن سونے، چاندی اور جواہرات سے مرصع ہوں گے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۚ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ﴾

’’ہمیشہ رہنے کے باغ ہیں جن میں وہ داخل ہوں گے، وہاں انھیں سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے اور وہاں ان کا لباس ریشمی ہوگا۔‘‘ [2]

مزید فرمایا:

﴿عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّاِسْتَبْرَقٌ ۫ وَّحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ ۚ وَسَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا﴾

’’ان (کے تن) پر باریک، سبز اور دبیز ریشم کے کپڑے (لباس) ہوں گے اور انھیں چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے اور ان کا رب انھیں شراب طہور پلائے گا۔‘‘ [3]

ان کے لباس مختلف رنگوں کے ہوں گے، ان میں سے ایک رنگ سبز بھی ہوگا۔ وہ سبز رنگ کے باریک اور موٹے ریشم کے لباس پہنیں گے۔

رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی بتایا ہے کہ اہل جنت کی کنگھیاں سونے اور چاندی کی ہوں گی اور وہ عود دان میں خوشبودار عود جلا کر اپنے کمروں کو معطر کر رہے ہوں گے اور ان کے پاکیزہ جسموں سے کستوری کی خوشبو مہک رہی ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«آنِيَتُهُمُ الذَّهَبُ وَالْفِضَّةُ، وَأَمْشَاطُهُمُ الذَّهَبُ، وَوَقُودُ مَجَامِرِهِمِ

1 صحيح مسلم، حديث:2835. 2 فاطر 33:35. 3 الدهر 21:76.

الْأَلُوَّةُ، يَعْنِي الْعُودَ، وَرَشْحُهُمُ الْمِسْكُ»

''ان (اہل جنت) کے برتن سونے اور چاندی کے ہوں گے۔ ان کی کنگھیاں سونے کی ہوں گی۔ ان کے عود دان میں خوشبو دار لکڑی جل رہی ہوگی اور ان کا پسینہ کستوری کی طرح مہک رہا ہوگا۔''[1]

اہل جنت کے لباس اور زیورات نہ بوسیدہ ہوں گے اور نہ ختم۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ يَدْخُلِ الْجَنَّةَ يَنْعَمُ لَا يَبْأَسُ، لَا تَبْلَى ثِيَابُهُ وَلَا يَفْنَى شَبَابُهُ»

''جنت میں جانے والے ہمیشہ تروتازہ رہیں گے کبھی بدحال نہیں ہوں گے، نہ ان کے لباس بوسیدہ ہوں گے اور نہ ان کی جوانی ختم ہوگی۔''[2]

اہل جنت کی گفتگو اور محفلیں: اہل جنت ایک دوسرے سے ملاقاتیں کریں گے، پاکیزہ محفلوں میں اکٹھے ہوں گے، دنیا میں اپنے احوال یاد کر کے اللہ تعالیٰ کے انعامات اور جنت ملنے کا تذکرہ کریں گے۔ اہل جنت کی مجالس کے بارے میں فرمان الٰہی ہے:

﴿ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ۝ ﴾

''اور ان کے سینوں میں جو کینہ حسد ہوگا ہم نکال دیں گے، (وہ) تختوں پر آمنے سامنے (بیٹھے) بھائی بھائی ہوں گے۔''[3]

قرآن حکیم نے ہمیں بتایا کہ وہ اپنی محفلوں میں کس قسم کی گفتگو کریں گے:

﴿ وَ اَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ۝ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ۝ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَ وَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ۝ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ ۝ ﴾

''اور وہ (اہل جنت) ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر باہم (حال) پوچھیں گے،

[1] صحيح البخاري، حديث:3246، و صحيح مسلم، حديث:2834(17). [2] صحيح مسلم، حديث:2836. [3] الحجر 47:15.

وہ کہیں گے: بلاشبہ ہم (اس سے) پہلے اپنے اہل وعیال میں (اللہ سے) ڈرا کرتے تھے، پھر اللہ نے ہم پر احسان کیا اور اس نے ہمیں (جھلسا دینے والی) لو کے عذاب سے بچا لیا، بلاشبہ ہم پہلے ہی اس (اللہ) کو پکارا کرتے تھے، بے شک وہی خوب احسان کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔''[1]

اہل جنت ان شر پسندوں کا تذکرہ بھی کریں گے جو دنیا میں اہل ایمان کے دلوں میں شکوک وشبہات پیدا کرتے تھے اور انھیں کفر کی طرف بلاتے تھے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ○ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّيْ كَانَ لِيْ قَرِيْنٌ ○ يَّقُوْلُ اَئِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِيْنَ ○ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِيْنُوْنَ ○ قَالَ هَلْ اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ ○ فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِيْ سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ○ قَالَ تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِيْنِ ○ وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ○ اَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِيْنَ ○ اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰى وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ○ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○ لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ ○﴾

''وہ (جنتی) ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر باہم پوچھیں گے، ان میں سے ایک کہنے والا کہے گا: بے شک میں (دنیا میں) میرا ایک ہم نشین تھا، جو کہتا تھا: کیا بھلا تو بھی (قیامت کی) تصدیق کرنے والوں میں سے ہے؟ کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے تو کیا واقعی ہم (اٹھا کر) بدلہ دیے جائیں گے؟ وہ (جنتی ساتھیوں سے) کہے گا: کیا تم (جہنم میں) جھانک کر دیکھو گے؟ پھر وہ جھانکے گا تو اسے جہنم کے درمیان میں دیکھے گا۔ وہ (اس سے) کہے گا: اللہ کی قسم! یقیناً قریب تھا کہ تو مجھے ہلاک کر ڈالتا۔ اور اگر میرے رب کا فضل نہ ہوتا تو میں ضرور حاضر کیے ہوؤں (مجرموں) میں سے ہوتا۔ (جنتی ساتھیوں سے کہے گا:) تو کیا پس (اب) ہم مرنے والے نہیں۔ اپنے پہلی بار مرنے کے سوا اور نہ ہمیں عذاب

[1] الطور52:25-28.

ہی ہوگا۔ بلاشبہ یہ تو بہت بڑی کامیابی ہے۔ عمل کرنے والوں کو تو ایسی ہی (کامیابی) کے لیے عمل کرنے چاہئیں۔''[1]

اہل جنت کی بیویاں: دنیا میں مومن کی مومن بیوی آخرت میں بھی اس کی بیوی ہوگی۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ۝﴾

''جو کہ ہمیشہ کے باغ ہیں جن میں وہ داخل ہوں گے اور وہ بھی جو ان کے باپ دادا اور ان کی بیویوں اور ان کی اولاد میں سے صالح ہوئے۔ اور فرشتے (جنت کے) ہر دروازے سے ان کے پاس آئیں گے۔''[2]

اہل جنت سایے میں تکیے لگا کر بیٹھے ہوں گے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ فِيْ ظِلٰلٍ عَلَى الْاَرَآئِكِ مُتَّكِئُوْنَ ۝﴾

''وہ اور ان کی بیویاں سایوں میں تختوں پر ٹیک لگائے ہوں گے۔''[3]

فرمان ربانی ہے: ﴿اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ ۝﴾

''تم جنت میں داخل ہو جاؤ، تم اور تمھاری بیویاں خوش حال ہو گے۔''[4]

حیران کن حد تک حسین وجمیل عورتیں: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿كَذٰلِكَ ۣ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ۝﴾

''اسی طرح ہوگا۔ اور ہم غزال چشم (بڑی بڑی آنکھوں والی) حوروں کو ان کی بیویاں بنا دیں گے۔''[5]

حور، حوراء کی جمع ہے۔ (اردو میں ''حور'' بطور واحد مستعمل ہے) حوراء اس عورت کو کہتے ہیں جس کی آنکھوں کا سفید حصہ انتہائی سفید ہو اور سیاہ حصہ انتہائی سیاہ ہو۔ اور عین

[1] الصّٰفّٰت 37:50-61. [2] الرعد 13:23. [3] یٰسٓ 36:56. [4] الزخرف 43:70. [5] الدخان 44:54.

عَیناء کی جمع ہے جبکہ عَیناء موٹی آنکھوں والی عورت کو کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں حورعین کا یہ وصف بیان کیا ہے کہ وہ نوجوان اور ہم عمر ہوں گی۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ اِنَّ لِلۡمُتَّقِیۡنَ مَفَازًا ۝ حَدَآئِقَ وَ اَعۡنَابًا ۝ وَّ کَوَاعِبَ اَتۡرَابًا ۝﴾

''بے شک متقی لوگوں کے لیے کامیابی ہے، باغات اور انگور ہیں اور نوجوان ہم عمر عورتیں (ہیں)۔''[1]

فرمان ربانی ہے:

﴿ فَجَعَلۡنٰہُنَّ اَبۡکَارًا ۝ عُرُبًا اَتۡرَابًا ۝﴾

''پس ہم انھیں کنواریاں بنائیں گے، من موہنی، ہم عمر۔''[2]

ان کے کنوارا پن سے مراد یہ ہے کہ قبل ازیں کسی کی زوجیت میں نہیں گئی ہوں گی جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:

﴿فِیۡہِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرۡفِ ۙ لَمۡ یَطۡمِثۡہُنَّ اِنۡسٌ قَبۡلَہُمۡ وَ لَا جَآنٌّ ۝﴾

''ان میں جھکی نظروں والی (شرمیلی اور باحیا حوریں) ہوں گی، ان سے پہلے انھیں کسی انسان اور کسی جن نے ہاتھ نہیں لگایا ہوگا۔''[3]

قرآن کریم نے جنت کی عورتوں کا حسن و جمال اس طرح بیان کیا ہے:

﴿وَ حُوۡرٌ عِیۡنٌ ۝ کَاَمۡثَالِ اللُّؤۡلُوٴِ الۡمَکۡنُوۡنِ ۝﴾

''اور (ان کے لیے) غزال چشم حوریں (ہوں گی)، جیسے غلاف میں لپٹے ہوئے موتی۔''[4]

مکنون سے مراد محفوظ اور چھپا ہوا موتی ہے کہ سورج کی شعاعوں سے اس کا رنگ خراب نہ ہوا ہو اور نہ ہاتھوں کے لمس سے اس پر کوئی نشان پڑے ہوں۔ قرآن حکیم میں ایک اور مقام پر انھیں ہیرے اور جواہرات سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

1 النّبا 78:31-33. 2 الواقعة 56:36,37. 3 الرحمٰن 55:56. 4 الواقعة 56:22,23.

﴿كَأَنَّهُنَّ الْيَاقُوتُ وَالْمَرْجَانُ ۝﴾

''گویا وہ ہیرے اور موتی (مونگے) ہیں۔''[1]

جنت کی عورتیں دنیا کی عورتوں جیسی نہیں ہوں گی، انھیں حیض، نفاس، بول و براز اور تھوک و بلغم نہیں آئے گا۔[2]

نبی کریم ﷺ نے جنت کے مردوں اور عورتوں کے حسن و جمال کے بارے میں فرمایا ہے:

«أَوَّلُ زُمْرَةٍ تَلِجُ الْجَنَّةَ، صُورَتُهُمْ عَلٰى صُورَةِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ، لَا يَبْصُقُونَ فِيهَا وَلَا يَمْتَخِطُونَ وَلَا يَتَغَوَّطُونَ فِيهَا، آنِيَتُهُمْ وَأَمْشَاطُهُمْ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ، وَمَجَامِرُهُمْ مِّنَ الْأَلُوَّةِ وَرَشْحُهُمُ الْمِسْكُ، وَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمْ زَوْجَتَانِ، يُرٰى مُخُّ سُوقِهِمَا مِنْ وَّرَاءِ اللَّحْمِ مِنَ الْحُسْنِ»

''سب سے پہلی جماعت جو جنت میں داخل ہوگی وہ چودھویں رات کے چاند کی طرح (حسین وجمیل) ہوں گے۔ نہ وہ تھوکیں گے نہ انھیں بلغم آئے گا اور نہ بول و براز کی حاجت ہوگی۔ جنت میں ان کے برتن اور کنگھیاں سونے چاندی کے ہوں گے۔ ان کے عود دان میں خوشبو دار لکڑی جل رہی ہوگی۔ ان کا پسینہ کستوری کی طرح مہک رہا ہوگا۔ ان میں سے ہر ایک کی دو دو بیویاں ہوں گی۔ وہ اتنی حسین ہوں گی کہ ان کی پنڈلی کا گودا حسن کی وجہ سے گوشت کے باہر سے نظر آئے گا۔''[3]

رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابۂ کرام کو اہل جنت کے حسن و جمال کی جو جھلک دکھائی ہے، ذرا غور کریں کہ کہیں آپ کو اس کی مثال مل سکتی ہے۔ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

«وَلَوْ أَنَّ امْرَأَةً مِّنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ اطَّلَعَتْ إِلٰى أَهْلِ الْأَرْضِ لَأَضَاءَتْ مَا

---

1 الرحمٰن 55:58. 2 الوسطية في القرآن الكريم للصلابي، ص:433. 3 صحيح البخاري، حديث:3245، وصحيح مسلم، حديث:(17)2834.

بَيْنَهُمَا وَلَمَلأَتْهُ رِيحاً، وَلَنَصِيفُهَا عَلَى رَأْسِهَا خَيْرٌ مِّنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا»

''اگر اہل جنت کی کوئی ایک عورت زمین والوں پر ایک نگاہ ڈال دے تو زمین و آسمان کا درمیانی حصہ چمک اٹھے اور خوشبو سے معطر ہو جائے اور اس کے سر کا دوپٹہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔''[1]

اہل جنت کے لیے دیدار الٰہی کا عظیم انعام: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جب جنتی لوگ جنت میں داخل ہو جائیں گے تو اللہ تبارک وتعالیٰ فرمائیں گے: «تُرِيدُونَ شَيْئًا أَزِيدُكُمْ» ''تم مزید کسی چیز کی خواہش رکھتے ہو؟'' اہل جنت کہیں گے: (اے اللہ!) تو نے ہمارے چہروں کو منور فرما دیا ہے، ہمیں جنت میں داخل فرما دیا ہے اور جہنم سے ہمیں بچا لیا ہے (ہمیں اور کیا چاہیے؟) تب اللہ تعالیٰ اپنے حجاب کو ہٹائیں گے۔ اس طرح اہل جنت کو اپنے رب کے دیدار سے بہتر کوئی عطیہ زیادہ محبوب نہ ہوگا۔''[2]

ایک اور روایت میں ہے کہ اسے بیان کرنے کے بعد آپ ﷺ نے حسب ذیل آیت تلاوت فرمائی:

﴿لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ وَزِيَادَةٌ ۖ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوهَهُمْ قَتَرٌ وَلَا ذِلَّةٌ ۚ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾

''جن لوگوں نے نیک کام کیے ان کے لیے بھلائی ہے اور مزید (دیدارِ الٰہی) ہے اور ان کے چہروں کو سیاہی اور ذلت نہیں ڈھانپے گی، یہی لوگ جنتی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''[3]

اہل جنت کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا مندی بھی حاصل ہوگی۔ حضرت ابوسعید

1 صحيح البخاري، حديث: 2796. 2 صحيح مسلم، حديث: 181، و جامع الترمذي، حديث: 2555، وسنن ابن ماجه، حديث: 187، و مسند أحمد: 4/333,332. 3 يونس 10:26.

خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''بے شک اللہ تعالیٰ اہل جنت سے مخاطب ہو کر فرمائے گا: «يَا أَهْلَ الْجَنَّةِ!» ''اے اہل جنت!'' وہ جواب دیں گے: ''اے ہمارے پروردگار! ہم حاضر ہیں۔ بھلائی صرف تیرے پاس ہے۔'' اللہ پوچھے گا: «هَلْ رَضِيتُمْ؟» ''کیا تم خوش ہو؟'' وہ کہیں گے: اے ہمارے پروردگار! ہم کیسے خوش نہ ہوں تو نے تو ہمیں اتنا کچھ عطا کر دیا ہے، جو تو نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو عطا نہیں کیا۔ تب اللہ تعالیٰ فرمائے گا: «أَنَا أُعْطِيكُمْ أَفْضَلَ مِنْ ذٰلِكَ؟» ''کیا میں تمھیں اس سے بھی اچھی چیز دوں؟'' اہل جنت کہیں گے کہ اے پروردگار! اس سے عمدہ چیز کیا ہو سکتی ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: «أُحِلُّ عَلَيْكُمْ رِضْوَانِي فَلَا أَسْخَطُ عَلَيْكُمْ بَعْدَهُ أَبَدًا» ''میں تم سے راضی ہو گیا ہوں۔ آج کے بعد میں کبھی تم سے ناراض نہیں ہوں گا۔''[1]

اہل جنت کی دعاؤں کے اختتامی کلمات: اہل ایمان کو قیامت کے دن بڑی بڑی ہولناکیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ پل صراط پر سے گزرتے وقت وہ بڑا خوف اور رعب محسوس کریں گے، پھر اللہ تعالیٰ ان کے سب غم دور کر کے انھیں نعمتوں والے باغات میں داخل فرمائے گا۔ وہاں وہ اللہ تعالیٰ کی تیار کردہ بڑی بڑی نعمتوں کا مشاہدہ کریں گے تو بے ساختہ ان کی زبانوں سے اپنے رب کی تحمید و تقدیس کے کلمات جاری ہو جائیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے سب غم دور کر دیے ہوں گے اور اپنے تمام وعدوں کو پورا کرتے ہوئے انھیں جنت کا وارث بنا دیا ہو گا۔ فرمان ربانی ہے:

﴿دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○﴾

''اس (جنت) میں ان کی پکار ہو گی: اے اللہ! تو پاک ہے۔ اور اس میں ان کی

[1] صحیح البخاري، حدیث:6549، و صحیح مسلم، حدیث:2829.

دعا ہوگی: سلام۔ اور ان کی آخری پکار یہ ہوگی کہ تمام تعریفیں اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہیں۔"[1]

نبی کریم ﷺ اپنے صحابۂ کرام کی اسی بات پر تربیت فرماتے رہے کہ ان کی جدوجہد کا مقصد صرف اللہ تعالیٰ کو خوش کرنا ہے تاکہ وہ راضی ہوکر انھیں اعلیٰ ترین باغات میں داخل فرمائے۔ آپ ﷺ قرآنی اسلوب میں اپنے صحابہ کو جنت کے اوصاف بتایا کرتے تھے اور صحابۂ کرام اس وقت یوں محسوس کرتے گویا جنت ان کے سامنے ہے، وہ فوراً اس سے متاثر ہوتے گویا کہ وہ جنت کو حقیقتاً اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ قرآنی اسلوب کا اعجاز ہے کہ وہ آخرت جو ابھی آئی نہیں، کے حالات کو یوں بیان کرتا ہے کہ انسان خود کو عالم آخرت میں تصور کرتا ہے اور اس عالم دنیا کو جس میں عملاً زندگی گزار رہا ہے یوں سمجھتا ہے گویا وہ اسے چھوڑ چکا ہے اور اس سے جدا ہوئے صدیاں بیت چکی ہیں۔[2]

جنت کا اچھوتا تصور اور اس پر یقین کامل امت مسلمہ کی ترقی اور پیش قدمی کے لیے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ جب امت کے افراد کے دلوں میں جنت کے باغات کا تصور بیدار ہوجائے تو وہ (جنت کے مالک) اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے زیادہ جوش کے ساتھ عمل کریں گے اور اس کے حضور بہترین اور نفیس ترین اعمال پیش کریں گے۔ ان کے دلوں سے کمزوری اور موت سے کراہت ختم ہوجائے گی۔ ان کے دلوں میں ایسا جوش و جذبہ اور ولولہ پیدا ہوگا کہ وہ اللہ کے دین کے غلبے کے لیے صبر واستقامت اور عزیمت کے ساتھ اپنی تمام توانائیاں استعمال کریں گے۔

امت مسلمہ کی تاریخ کے سنہری اوراق میں جو فیصلہ کن معرکے اور عظیم فتوحات رقم ہیں وہ اس بات پر شاہد ہیں کہ ان عظیم کامیابیوں کے نمایاں اسباب یہ تھے کہ سپہ سالاروں اور مجاہدین کی انتہائی چاہت تھی کہ انھیں اللہ کی راہ میں شہادت کا اعزاز حاصل ہو جائے۔ وہ

1 یونس 10:10. 2 دراسات قرآنية لمحمد قطب، ص:81.

فریضۂ جہاد کی صورت میں عبادت میں مصروف رہتے اور اللہ تعالیٰ کی جنتوں کو حاصل کرنے کا ان کا شوق جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔

تاریخ اسلام میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں، مثلاً: اندلس میں عیسائیوں کے خلاف معرکۂ زلاقہ میں یوسف بن تاشفین کی قیادت میں کامیابی حاصل ہوئی، نیز معرکہ حطین میں صلاح الدین ایوبی کی فتح، عین جالوت میں تاتاریوں کے مقابلے میں سیف الدین قطز اور رکن الدین بیبرس کی کامیابی اور محمد الفاتح کی قیادت میں قسطنطنیہ کی فتح اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

قرآن کریم میں جہنم کا بیان اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر اس کے اثرات

صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کا خوف جاگزیں تھا۔ وہ اس کے مواخذے سے ڈرتے تھے مگر اس کی رحمت کی امید بھی رکھتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کا پورا اثر ان کے دلوں میں موجود تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنی اسلوب ہی اختیار فرمایا تھا اور یہ اسلوب صحابۂ کرام کے دلوں پر مختلف انداز میں اثر انداز ہوا۔

قرآن کریم نے قیامت کے دن کی ہولناکیوں اور اس کے اثرات کو بیان کیا ہے کہ کس طرح زمین اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی مٹھی میں ہوگی اور اسے ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا اور کس طرح آسمان کی بساط لپیٹ دی جائے گی اور پہاڑوں کو روئی کی طرح اڑا دیا جائے گا اور کس طرح سمندروں کو پھاڑ دیا جائے گا اور ان میں آگ بھڑکا دی جائے گی۔ آسمان تھرتھرا کر پھٹ جائے گا۔ سورج کو لپیٹ دیا جائے گا۔ چاند بے نور ہو جائے گا اور ستارے ٹوٹ جائیں گے۔

قرآن کریم نے قیامت کے دن کفار کی بھی منظر کشی کی ہے کہ وہ کس طرح ذلیل و رسوا اور حسرت و یاس کی تصویر بنے ہوئے ہوں گے، ان کے اچھے اعمال کسی کام نہ آئیں گے۔

جھوٹے معبود اور ان کے پجاری آپس میں لڑیں گے۔ گمراہی پھیلانے والے اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے آپس میں جھگڑا کریں گے۔ دنیا میں سرداروں نے جن لوگوں کو زبردستی اپنا ماتحت بنا رکھا تھا وہ ایک دوسرے سے جھگڑیں گے۔ کافر اپنے ساتھی شیطان سے الجھ رہا ہوگا، پھر اپنے جسم کے اعضاء کو موردِ الزام ٹھہرائے گا، روح اور جسم کا آپس میں جھگڑا ہوگا۔

قرآن کریم نے شفاعت کا تذکرہ بھی کیا ہے، اس کی شروط بیان کی ہیں اور بتایا ہے کہ کونسی شفاعت قبول ہوگی اور کون سی ردّ کردی جائے گی۔ حساب اور جزا وسزا کی وضاحت کی ہے اور بتایا ہے کہ حساب کس طرح ہوگا، کافروں سے جواب دہی ہوگی اور کیوں ہوگی؟

قرآن کریم نے بتایا ہے کہ تمام مخلوقات سے ظلم کا قصاص لیا جائے گا اور اس بات کا تفصیلاً ذکر کیا ہے کہ اس دن کس طرح قصاص لیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں انسانی خون کی عظمت بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ قیامت کے دن میزان (ترازو) نصب کیے جائیں گے جن کے ذریعے اعمال کا وزن کیا جائے گا۔ نبی کریم ﷺ نے حوض کے بارے میں خبر دی ہے اور بتایا ہے کہ کون کون سے لوگ اس حوض سے سیراب ہوں گے اور کن کن لوگوں کو اس حوض پر آنے سے روک دیا جائے گا۔

قرآن کریم نے بتایا ہے کہ کس طرح کافروں کو گھسیٹ کر جہنم میں گرایا جائے گا اور کس طرح مومن اور منافق پل صراط پر سے گزریں گے اور وہاں سے صرف مومنین ہی نجات پاسکیں گے۔[1]

قیامت کے بارے میں اس گفتگو کا صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں پر بڑا گہرا اثر تھا۔ قرآن کریم نے جہنم میں طرح طرح کے عذابوں کی تصویر کشی کی ہے۔ مسلمانوں کے اس ہراول دستے کی کیفیت یوں ہوگئی تھی گویا کہ وہ جہنم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

قرآن حکیم میں جہنم کے متعلق ان امور کی وضاحت موجود ہے:

[1] الوسطية في القرآن الكريم للصلابي، ص:402.

اہل جہنم کا کھانا پینا: قرآن کریم نے بتایا ہے کہ اہل جہنم کا کھانا ضَرِیع (کانٹے دار خشک جھاڑیاں) اور زَقُّوم (کڑوا، زہریلا تھوہر کا درخت) ہوگا اور ان کا مشروب حَمِیم (گرم کھولتا ہوا پانی)، غِسلین (زخموں کی پیپ) اور غسّاق (پیپ وغیرہ) ہوگا۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ۙ لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ ۝ ﴾

''ان کا طعام صرف خاردار جھاڑیاں ہوگا، جو نہ موٹا کرے گا نہ بھوک مٹائے گا۔'' [1]

اس قسم کا کھانا بھی ایک طرح کا عذاب ہے۔ نہ تو اس کے کھانے سے انھیں لذت حاصل ہوگی اور نہ ان کے جسموں کو کوئی فائدہ ہوگا۔

زَقُّوم (تھوہر) کے بارے میں فرمان ربانی ہے:

﴿ اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ۙ طَعَامُ الْاَثِيْمِ ۛ كَالْمُهْلِ ۚ يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ ۙ كَغَلْيِ الْحَمِيْمِ ۝ ﴾

''بے شک تھوہر کا درخت، گناہ گار کا کھانا ہے، پگھلے تانبے (یا تلچھٹ) کے مانند، وہ پیٹوں میں تیز گرم پانی کے کھولنے کی طرح کھولے گا۔'' [2]

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے زَقُّوم (تھوہر) کے متعلق فرمایا ہے:

﴿ اَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ ۝ اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِيْنَ ۝ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْٓ اَصْلِ الْجَحِيْمِ ۙ طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ ۝ ﴾

''کیا یہ مہمانی بہتر ہے یا (دوزخ میں) تھوہر کا درخت؟ بلاشبہ ہم نے اسے ظالموں کے لیے آزمائش بنایا ہے، بے شک وہ ایک درخت ہے جو دوزخ کی تہ میں اگتا ہے، اس کا پھل گویا کہ وہ شیطانوں کے سر ہیں۔'' [3]

اور یہ بھی فرمایا:

﴿ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ ؕ ﴾

[1] الغاشیة 88:6,7. [2] الدخان 44:43-46. [3] الصّٰفّٰت 37:62-65.

''اور اس درخت (زقوم) کو بھی جس پر قرآن میں لعنت کی گئی۔''[1]

ان آیات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ تھوہر (زقوم) انتہائی بدترین درخت ہے جس کا بیج جہنم کی گہرائی میں لگایا گیا ہے اور اس کی شاخیں جہنم میں ہر جانب پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کا پھل انتہائی ناپسندیدہ ہے۔ اسے شیطان کے سر سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اگرچہ لوگوں نے شیاطین کو دیکھا نہیں لیکن ان کی ڈراؤنی شکل کا تصور دلوں میں موجود ہے۔ اہل جہنم کی بھوک اس قدر بھڑکا دی جائے گی کہ وہ اس درخت اور اس کے پھل کی خباثت کے باوجود اسے کھانے پر مجبور ہو جائیں گے اور خوب پیٹ بھر کر کھائیں گے۔ جب ان کا پیٹ بھر جائے گا تو یہ ان کے پیٹ میں جوش مارنا شروع کردے گا جیسا کہ تیل کی تلچھٹ میں جوش پیدا ہوتا ہے۔ جس سے انتہائی تکلیف اور درد محسوس کریں گے۔ جب ان کی یہ کیفیت ہو جائے گی تو ان کو شدت سے کھولتے پانی کے پاس لایا جائے گا تو وہ اس اونٹ کی طرح پانی پیئیں گے جو پانی پیتا جاتا ہے مگر سیر نہیں ہوتا، پھر یہ گرم پانی ان کی انتڑیوں کو ریزہ ریزہ کردے گا۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ وَسُقُوا مَاءً حَمِيمًا فَقَطَّعَ أَمْعَاءَهُمْ ○﴾

''(کیا یہ لوگ) ان لوگوں کے مانند ہو سکتے ہیں جو آگ میں ہمیشہ رہنے والے ہیں اور انھیں گرم کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا تو وہ ان کی آنتیں ٹکڑے ٹکڑے کردے گا؟''[2]

یہ قیامت والے دن جہنمیوں کی ضیافت ہوگی۔[3]

﴿فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيمٌ ○ وَلَا طَعَامٌ إِلَّا مِنْ غِسْلِينٍ ○ لَّا يَأْكُلُهُ إِلَّا الْخَاطِئُونَ ○﴾

''لہٰذا آج یہاں کوئی اس کا غم خوار دوست نہیں اور زخموں کے دھوون کے سوا کوئی

1 بني إسراءيل 60:17. 2 محمد 15:47. 3 اليوم الآخر في الجنة والنار لعمر الأشقر، ص: 88.

کھانا نہیں۔ خطا کاروں کے سوا اسے کوئی نہیں کھائے گا۔''[1]

اسی طرح ''غساق'' کا یوں تذکرہ کیا گیا ہے:

﴿هٰذَا ۙ فَلْيَذُوْقُوْهُ حَمِيْمٌ وَّغَسَّاقٌ ۙ وَّاٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖٓ اَزْوَاجٌ﴾

''یہ ہے کھولتا ہوا پانی اور پیپ، اب وہ اس کو چکھیں، اوراس کے مانند کئی قسم کے دوسرے (عذاب) ہوں گے۔''[2]

غِسلین اور غسّاق ایک ہی چیز ہے، یعنی وہ پیپ اور غلاظت جو اہل جہنم کے جسموں اور زخموں سے بہے گی۔ بعض اہل علم نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ غلاظت ہے جو زانیہ عورتوں کی شرم گاہوں سے بہے گی اور کافروں کے گوشت اور کھالوں سے نکلے گی۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد ہر وہ غلاظت ہے جو اہل جہنم کے جسموں سے خارج ہوگی۔[3]

قرآن پاک میں اہل جہنم کے چار قسم کے مشروبات کا تذکرہ ہے:

① حَمِیم: انتہائی درجہ حرارت پر ابلتا ہوا پانی۔

② غَسَّاق: زخموں سے رستی ہوئی پیپ۔ اس کا ذکر خوراک اور مشروب دونوں میں کیا گیا ہے۔

③ صَدِید: کافروں کے گوشت اور کھالوں سے رستا ہوا آمیزہ۔

④ مُہْل: تلچھٹ۔ (تیل کی میل جو نیچے بیٹھ جائے)۔

جب یہ مشروبات جہنمی کے چہرے کے قریب آئیں گے تو چہرے کی کھال پگھل کر ان میں جا گرے گی۔[4]

اہل جہنم کے لباس: اہل جہنم کے لباس کے بارے میں فرمان ربانی ہے:

﴿سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ وَّتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ﴾

---

1 الحاقّة69:35-37. 2 صٓ38:57,58. 3 يقظة أولي الاعتبار مما ورد في ذكر الجنة والنار لصديق حسن، ص:86. 4 اليوم الآخر في الجنة والنار لعمر الأشقر، ص:90.

''ان کے کرتے گندھک کے ہوں گے اور آگ ان کے چہروں کو ڈھانپتی ہوگی۔'' [1]

''قَطِرَان'' کے معنی پگھلا ہوا تانبا بھی کیے گئے ہیں۔

اہل جہنم کو دیے جانے والے عذاب کی اقسام: فرمان الٰہی ہے:

﴿ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ﴾

''(وہ دوزخ کی) آگ ہے جس پر انھیں صبح و شام پیش کیا جاتا ہے۔'' [2]

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ ۝ ﴾

''جنھوں نے کفر کیا اور (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے روکا، ہم انھیں عذاب پر عذاب زیادہ دیں گے، اس لیے کہ وہ فساد کرتے تھے۔'' [3]

نبی کریم ﷺ نے اس شخص کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا جسے جہنم میں سب سے ہلکا عذاب دیا جائے گا:

«إِنَّ أَهْوَنَ أَهْلِ النَّارِ عَذَابًا يَّوْمَ الْقِيَامَةِ لَرَجُلٌ تُوضَعُ فِي أَخْمَصِ قَدَمَيْهِ جَمْرَةٌ يَّغْلِي مِنْهَا دِمَاغُهُ»

''قیامت کے دن اہل جہنم میں سے اس شخص کا عذاب سب سے ہلکا ہوگا جس کے دونوں قدموں کے نیچے آگ کا انگارا رکھا جائے گا جس کی وجہ سے اس کا دماغ کھول رہا ہوگا۔'' [4]

(اس سے معلوم ہوا کہ اہل جہنم کا عذاب یکساں نہ ہوگا، بعض کو سخت ترین عذاب ہوگا اور بعض کو اس سے کم ہوگا۔)

1 إبرٰهيم 14:50. 2 المؤمن 40:46. 3 النحل 16:88. 4 صحيح البخاري، حديث: 6561,6562، وصحيح مسلم، حديث: 213.

اہل جہنم کا چہروں کے بل اٹھایا جانا اور آگ کا چہروں کو جھلسانا: اللہ تعالیٰ اہل جہنم کو اس انداز میں بھی ذلیل ورسوا کرے گا کہ انھیں اندھا، بہرا اور گونگا بنا کر چہرے کے بل چلائے گا۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿ وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ ۚ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا ۚ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ۝ ﴾

''اور جسے اللہ ہدایت دے تو وہی ہدایت یافتہ ہے اور جسے وہ گمراہ کرے تو آپ ان کے لیے اس (اللہ) کے سوا کوئی دوست ہرگز نہ پائیں گے اور ہم انھیں روزِ قیامت چہرے کے بل، اندھے، گونگے اور بہرے اٹھائیں گے، ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔ جب بھی وہ بجھنے لگے گی تو ہم ان کے لیے اور بھڑکا دیں گے۔''[1]

پھر ان کو چہروں کے بل گھسیٹ کر جہنم میں گرایا جائے گا۔ فرمان ربانی ہے:

﴿ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ ﴾

''اور جو شخص برائی لائے گا تو ان کے منہ آگ میں اوندھے کر دیے جائیں گے (اور کہا جائے گا:) تم بس اسی کا بدلہ پاؤ گے جو تم عمل کرتے تھے۔''[2]

پھر آگ ان کے چہروں کو جھلسائے گی اور ہمیشہ انھیں اپنی لپیٹ میں لیے رکھے گی۔ انھیں کوئی ایسی چیز حاصل نہیں ہوگی جسے وہ اپنے اور آگ کے درمیان لا کر اس سے اپنا بچاؤ کر سکیں۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿ تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيْهَا كٰلِحُوْنَ ۝ ﴾

''آگ ان کے چہرے جھلسا دے گی اور وہ اس میں بدشکل ہوں گے۔''[3]

1 بني إسرآءيل 97:17. 2 النّمل 90:27. 3 المؤمنون 104:23.

(جھلسنے کی وجہ سے نچلے ہونٹ نیچے کی جانب اور اوپر والے ہونٹ اوپر کی جانب کھینچ دیے جائیں گے۔)

اہل جہنم کا گھسیٹا جانا: دردناک عذاب کی ایک صورت یہ بھی ہوگی کہ کافروں کو جہنم میں چہروں کے بل گھسیٹا جائے گا۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ ○﴾

''جس دن وہ آگ میں اپنے چہروں کے بل گھسیٹے جائیں گے (کہا جائے گا:) تم جہنم (کے عذاب) کا چھونا چکھو۔''[1]

جہنم میں گھسیٹتے وقت یہ چیز ان کی تکلیف میں مزید اضافے کا سبب بنے گی کہ ان کی گردنوں میں طوق اور پاؤں میں زنجیریں ہوں گی۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ ؕ يُسْحَبُوْنَ ۙ فِي الْحَمِيْمِ ۙ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُوْنَ ○﴾

''جب ان (جھٹلانے والوں) کی گردنوں میں طوق اور بیڑیاں ہوں گی (جن میں جکڑ کر) وہ گھسیٹے جائیں گے، کھولتے ہوئے پانی میں، پھر وہ آگ میں جھونک دیے جائیں گے۔''[2]

اہل جہنم کے چہروں کا سیاہ ہونا: اللہ تعالیٰ عالم آخرت میں اہل جہنم کے چہروں کو انتہائی سیاہ کردیں گے جیسے رات کی تاریکی نے ان کے چہروں پر بسیرا کیا ہوا ہو۔ فرمان ربانی ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍۢ بِمِثْلِهَا ۙ وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○﴾

[1] القمر 48:54. [2] المؤمن 40:71، 72.

''اور جن لوگوں نے برے کام کیے تو برائی کا بدلہ اس (برائی) کے برابر ہی ہے اور انھیں ذلت ڈھانپ لے گی۔ کوئی انھیں اللہ (کے عذاب) سے بچانے والا نہیں ہوگا، یوں لگے گا کہ ان کے چہروں پر تاریک رات کے ٹکڑے اوڑھا دیے گئے ہیں، یہی (لوگ) دوزخی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''[1]

آگ کا کافروں کو ہر جانب سے گھیر لینا: جب کافروں کی یہ صورت حال ہو کہ گناہوں اور معصیتوں نے ان کا یوں احاطہ کر لیا ہو جیسے کنگن کلائی کا احاطہ کر لیتا ہے تو انھیں بدلہ بھی پھر اسی طرح ملنا چاہیے، اس لیے جہنم کی آگ ان کو ہر جانب سے گھیر لے گی۔

فرمان الٰہی ہے:

﴿ لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ۚ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ۝﴾

''ان کے لیے جہنم ہی کا بچھونا ہوگا اور ان کے اوپر (اسی کا) اوڑھنا ہوگا اور ہم ظالموں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں۔''[2]

''مِہَادٌ'' ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو نیچے ہو اور غواش، غَاشِیَۃٌ کی جمع ہے۔ غَاشِیَہ وہ چیز ہے جو اوپر سے ڈھانپ لے۔ گویا آگ اہل جہنم کو اوپر نیچے ہر جانب سے گھیرے ہوئے ہوگی۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ يَوْمَ يَغْشٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ وَيَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝﴾

''اس دن، ان کے اوپر سے اور ان کے پاؤں کے نیچے سے، عذاب انھیں ڈھانپ لے گا اور اللہ فرمائے گا: جو کچھ تم کرتے تھے اس کا مزہ چکھو۔''[3]

ایک اور مقام پر فرمایا:

---

1 یونس 27:10. 2 الأعراف 41:7. 3 العنکبوت 55:29.

﴿ لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ۚ ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ ۚ يٰعِبَادِ فَاتَّقُوْنِ ﴾

''ان کے لیے ان کے اوپر آگ کے سائبان ہوں گے اور ان کے نیچے (بھی آگ کے) سائبان ہوں گے، یہی وہ (عذاب) ہے جس سے اللہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے، لہٰذا اے میرے بندو! تم مجھ ہی سے ڈرتے رہو۔''[1]

ایک اور مقام پر صراحت سے بیان کیا گیا ہے کہ آگ ان کو ہر طرف سے گھیرے گی۔ آگ کی دیواریں ہوں گی جو ہر طرف سے کافروں کا احاطہ کرلیں گی اور وہ ہزار کوشش کے باوجود اس سے باہر نہیں نکل سکیں گے۔

﴿ اِنَّاۤ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِیْنَ نَارًا ۙ اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ﴾

''بلاشبہ ہم نے ظالموں کے لیے ایسی آگ تیار کر رکھی ہے جس کی قناتوں نے ان کا احاطہ کر رکھا ہے۔''[2]

''سُرَادِق'' سے مراد آگ کی فصیل اور دیواریں ہیں جو ہر طرف سے جہنم کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔[3]

جہنم کی آگ کا دلوں تک پہنچ جانا: دنیا کی آگ میں اگر کوئی ذی روح جل جائے تو اس کے دل تک آگ پہنچنے سے پہلے ہی وہ موت سے ہمکنار ہو جاتا ہے مگر جہنم کی آگ اتنی شدید ہوگی کہ جسم میں سرایت کرتے ہی فوراً دل تک پہنچ جائے گی۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۝ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ۝ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۝ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ۝ ﴾

''ہرگز نہیں! اسے ضرور حُطَمَہ میں پھینکا جائے گا اور آپ کو کیا معلوم کہ حُطَمَہ کیا ہے؟ وہ اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے، جو دلوں تک پہنچے گی۔''[4]

---

1 الزمر 16:39. 2 الكهف 29:18. 3 اليوم الآخر في الجنة والنار لعمر الأشقر، ص: 102.
4 الهمزة 104:4-7.

اہل جہنم کو جکڑنے والی زنجیریں اور طوق: اللہ تعالیٰ نے اہل جہنم کے لیے زنجیریں، طوق اور ہتھوڑے تیار کر رکھے ہیں۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَاۡ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِيْرًا ۝﴾

''بلاشبہ ہم نے کافروں کے لیے زنجیریں اور طوق اور بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔''[1]

مزید فرمایا:

﴿اِنَّ لَدَيْنَآ اَنْكَالًا وَّجَحِيْمًا ۝ وَّطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّعَذَابًا اَلِيْمًا ۝﴾

''بے شک ہمارے پاس بیڑیاں اور بھڑکتی ہوئی آگ ہے اور گلے میں اٹکنے والا طعام اور دردناک عذاب ہے۔''[2]

ان کی گردنوں میں طوق ڈالے جائیں گے۔ فرمان ربانی ہے:

﴿وَجَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِيْٓ اَعْنَاقِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝﴾

''اور ہم ان لوگوں کی گردنوں میں طوق ڈال دیں گے جنھوں نے کفر کیا، انھیں صرف اسی کا بدلہ دیا جائے گا جو وہ عمل کرتے تھے۔''[3]

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ ۭ يُسْحَبُوْنَ ۝﴾

''جب ان کی گردنوں میں طوق اور بیڑیاں ہوں گی (جن میں جکڑ کر) وہ گھسیٹے جائیں گے۔''[4]

فرمان الٰہی ہے:

﴿اِنَّ لَدَيْنَآ اَنْكَالًا وَّجَحِيْمًا ۝﴾

1 الدھر 4:76. 2 المزمّل 13,12:73. 3 سبا 33:34. 4 المؤمن 71:40.

''بے شک ہمارے پاس بیڑیاں اور بھڑکتی آگ ہے۔''[1]

''اَنکال'' سے مراد زنجیریں ہیں۔ انھیں ''انکال'' کا نام اس لیے دیا گیا کیونکہ یہ عذاب کا سبب بنتی ہیں اور ان کے ذریعے گناہگاروں کو نشانِ عبرت بنایا جاتا ہے۔

قرآن حکیم کے بیان کردہ منظر پر ذرا غور کیجیے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ۝ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ۝ ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ۝﴾

''(حکم ہوگا:) اسے پکڑو، پھر طوق ڈال دو، پھر اسے جہنم (کی آگ) میں جھونک دو، پھر ایک زنجیر میں، جس کی پیمائش ستر گز ہے، اسے جکڑ (یا پرو) دو۔''[2]

اہل جہنم کی چیخ و پکار اور اظہارِ ندامت: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ؕ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝﴾

''اور اگر بلاشبہ ہر ظالم شخص کے پاس وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہے تو وہ اسے (عذاب سے بچنے کے لیے) ضرور فدیہ دے دے گا اور مجرم جب عذاب دیکھیں گے تو ندامت کو چھپائیں گے اور ان میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا اور وہ ظلم نہیں کیے جائیں گے۔''[3]

جب کافر اپنے نامۂ اعمال کو کفر و شرک سے بھرا دیکھے گا اور اسے یقین ہو جائے گا کہ اب ان اعمال کی وجہ سے اسے ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہنا پڑے گا تو وہ اپنے آپ کے لیے بددعائیں کرے گا کہ کاش! مجھے موت آجائے، میں ہلاک ہو جاؤں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ۝ فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا ۝ وَّيَصْلٰى سَعِيْرًا ۝﴾

[1] المزمل 12:73۔ [2] الحاۤقّۃ 69:30-32۔ [3] یونس 10:54۔

''اور جس شخص کو اس کا اعمال نامہ اس کی پیٹھ پیچھے دیا گیا تو وہ عنقریب تباہی کو دعوت دے گا اور وہ بھڑکتی آگ میں جا پڑے گا۔'' [1]

جب انھیں جہنم میں گرایا جائے گا اور وہ اس کی تپش سے جلنے لگیں گے تو اپنی ہلاکت و بربادی کا واویلا کریں گے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِذَآ أُلْقُوا۟ مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِينَ دَعَوْا۟ هُنَالِكَ ثُبُورًا۝﴾

''جب وہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے اس (جہنم) کی کسی تنگ جگہ میں جھونکے جائیں گے تو وہ وہاں ہلاکت کو پکاریں گے۔'' [2]

اور اس وقت مجرم اپنے کفر، گمراہی اور کم عقلی کا اعتراف کریں گے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَقَالُوا۟ لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِىٓ أَصْحَٰبِ ٱلسَّعِيرِ۝﴾

''اور وہ کہیں گے: کاش! ہم سنتے یا سمجھتے ہوتے تو ہم دوزخ والوں میں نہ ہوتے۔'' [3]

مجرم جہنم میں چیخ و پکار کریں گے اور شدت سے گریہ و زاری کریں گے اور اپنے رب کو اسی امید سے پکاریں گے کہ وہ انھیں دوزخ سے نکال دے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَهُمْ يَصْطَرِخُونَ فِيهَا رَبَّنَآ أَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَٰلِحًا غَيْرَ ٱلَّذِى كُنَّا نَعْمَلُ﴾

''اور وہ اس (جہنم) میں چلائیں گے (اور کہیں گے:) اے ہمارے رب! تو ہمیں (اس سے) نکال، (اب) ہم نیک عمل کریں گے نہ کہ وہ جو (پہلے) کرتے تھے۔'' [4]

لیکن ان کی درخواست سختی سے ردّ کر دی جائے گی اور انھیں اس انداز میں دھتکار دیا جائے گا جیسے حیوانوں کو دھتکارا جاتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قَالُوا۟ رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّينَ۝ رَبَّنَآ أَخْرِجْنَا مِنْهَا فَإِنْ عُدْنَا فَإِنَّا ظَٰلِمُونَ۝ قَالَ ٱخْسَـُٔوا۟ فِيهَا وَلَا تُكَلِّمُونِ۝﴾

''وہ کہیں گے: اے ہمارے رب! ہماری بدبختی ہم پر غالب آگئی اور (واقعی) ہم

1 الانشقاق 84:10-12۔ 2 الفرقان 25:13۔ 3 الملك 67:10۔ 4 فاطر 35:37۔

لوگ گمراہ تھے، اے ہمارے رب! ہمیں یہاں سے نکال، پھر اگر ہم لوٹیں (دوبارہ وہی کریں) تو بلاشبہ ہم ظالم ہوں گے، اللہ فرمائے گا: اسی (جہنم) میں ذلیل وخوار (پڑے رہو) اور مجھ سے کلام نہ کرو۔"[1]

جہنمیوں کے بارے میں جو فیصلہ ہو چکا وہ پورا ہو کر رہے گا۔ وہ اپنے اس انجام سے دوچار ہوں گے جس میں کوئی چیخ و پکار فائدہ نہیں دیتی اور نہ کوئی درخواست منظور ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے درخواست اور آہ و زاری کے بعد دوزخی لوگ دوزخ کے داروغے کی طرف رخ کریں گے اور اس سے درخواست کریں گے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ان کے لیے عذاب میں کمی کی سفارش کرے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ﴾

"اور وہ (سب) لوگ، جو آگ میں ہوں گے، جہنم کے دربانوں سے کہیں گے: تم اپنے رب سے دعا کرو کہ وہ ایک دن تو ہم سے کچھ عذاب ہلکا کر دے۔"[2]

اس موقع پر وہ جہنم کے داروغہ "مالک" کو بھی آواز دیں گے اور اس سے بھی درخواست کریں گے کہ وہ ان کی روح نکال کر انھیں عذاب سے نجات دلائے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

﴿وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ۭ قَالَ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ﴾

"اور وہ (داروغۂ جہنم کو) پکاریں گے: اے مالک! تیرا رب ہمارا کام ہی تمام کر دے، وہ کہے گا: بے شک تم تو ہمیشہ (اسی عذاب میں) رہو گے۔"[3]

ان ظالموں نے ایمان کو چھوڑ کر کفر کا راستہ اختیار کر کے اپنے آپ کو بھی نقصان پہنچایا اور اپنے اہل و عیال کو بھی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

1 المؤمنون 23:106-108۔ 2 المؤمن 40:49۔ 3 الزُّخرف 43:77۔

﴿قُلْ اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اَلَا ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ۝﴾

”کہہ دیجیے: بلاشبہ خسارہ اٹھانے والے تو وہ لوگ ہیں جنھوں نے روز قیامت اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو خسارے میں ڈالا، خبردار! یہی کھلا خسارہ ہے۔“ [1]

قرآن حکیم کی مکی آیات نے مسلمانوں کی اس طرح تربیت فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کی سزا کا ڈر اور مؤاخذے کا خوف ان کے دلوں میں پختہ کر دیا۔ ان آیات نے یہ بات واضح کی کہ آخرت کا عذاب حسی اور معنوی دونوں اقسام کا ہوگا۔ قرآن حکیم کی تشریح کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ کے سامنے اس انداز میں جہنم کی حقیقت پیش کی کہ ہر صحابی اوامر کو بجالاتا اور نواہی سے اجتناب کرتا۔ اس کے دل و دماغ میں ہر وقت جنت اور جہنم کا تصور بیدار رہتا اور وہ ہر لحہ موت کے استقبال کے لیے تیار رہتا۔ اسے یقین کامل رہتا کہ موت آ کر رہے گی اور اسے اپنے تمام اعمال کا حساب دینا ہے اور قبر جنت کا باغیچہ ہوگی یا آگ کا گڑھا۔ جب کوئی صحابی ان سب باتوں کو ذہن نشین کر لیتا تھا تو اس کا دل خوف الٰہی سے لبریز ہو جاتا اور وہ ہر جگہ اور ہر وقت اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں محسوس کرتا اور نیک اعمال کے لیے ایک نئے جوش اور جذبے کے ساتھ سرگرم عمل ہو جاتا، خواہ وہ کام دعوتِ دین کا ہو، جہاد فی سبیل اللہ کا ہو، حکومتِ الٰہیہ کے قیام کا ہو، یا نسل انسانی کو بگاڑ سے بچانے کے لیے اسلامی تہذیب وتمدن کے استوار کرنے کا ہو۔ اور وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ سے دعا گو رہتا کہ وہ اسے انبیاء، صدّیقین، شہداء اور اپنے نیک بندوں کی رفاقت عطا کر کے اس کی عزت افزائی کرے کیونکہ ان لوگوں سے اچھی رفاقت کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔

جنت، جہنم اور آخرت کی حقیقت کا تصور اور اس کا صحیح فہم ان لوگوں کے دلوں پر نہایت گہرے اثرات ڈالتا ہے جو امت مسلمہ کے روشن مستقبل کے لیے کام کر رہے ہوں یا ان کی عزت وعظمتِ رفتہ کے حصول کی جدوجہد کر رہے ہوں اور یہ چیز افراد امت کے اعتقادی

[1] الزُّمر 15:39.

نظریات کے لیے بھی بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔ نبی کریم ﷺ نے یہی اسلوب اختیار کیا اور ہمارے لیے بھی ضروری ہے کہ ہم بھی یہی اسلوب اختیار کریں۔

قضاء و قدر کا صحیح مفہوم اور صحابۂ کرام پر اس کے اثرات

قرآن حکیم نے مکی دور میں مسئلہ قضاء و قدر کو بھی کافی اہمیت دی ہے۔ فرمان ربانی ہے: ﴿اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ۝﴾

''بلاشبہ ہم نے ہر چیز ایک مقرر اندازے کے مطابق پیدا کی ہے۔''[1]

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ۝﴾

''وہی ذات جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور اس نے اپنے لیے کوئی اولاد نہیں بنائی اور نہ بادشاہی میں اس کا کوئی شریک ہے اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا، پھر اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کیا۔''[2]

مراتب قضاء و قدر: نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ کے دلوں میں قضاء و قدر کا مفہوم پختہ کیا اور قرآن حکیم کی روشنی میں اس کے مراتب واضح کیے۔ وہ مراتب درج ذیل ہیں:

پہلا مرتبہ: اللہ تعالیٰ کا علم ہر چیز کو شامل ہے۔ کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝﴾

[1] القمر 49:54. [2] الفرقان 2:25.

''اور (اے نبی!) آپ جس حال میں بھی ہوتے ہیں اور اللہ کی طرف سے (نازل شدہ) قرآن میں سے جو کچھ بھی پڑھتے ہیں اور تم لوگ جو بھی عمل کرتے ہو، اس وقت ہم تمھیں دیکھ رہے ہوتے ہیں جب تم اس میں مصروف ہوتے ہو۔ اور آپ کے رب سے ذرہ بھر کوئی چیز بھی چھپی نہیں ہوتی، زمین میں اور نہ آسمان میں اور نہ کوئی اس سے چھوٹی (چیز) اور نہ بڑی، مگر (وہ) واضح کتاب میں (درج) ہے۔''[1]

دوسرا مرتبہ: ظہور پذیر ہونے والی ہر چیز لکھی جا چکی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتَىٰ وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوا وَآثَارَهُمْ ۚ وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُّبِينٍ ۝﴾

''بلاشبہ ہم ہی مردوں کو زندہ کریں گے اور جو (اعمال) وہ آگے بھیج چکے انھیں ہم لکھ رہے ہیں اور ان کے آثار (نشاناتِ قدم) کو بھی اور ہم نے ہر شے کو واضح کتاب میں محفوظ کر رکھا ہے۔''[2]

تیسرا مرتبہ: اللہ تعالیٰ کی مشیت غالب ہوتی ہے اور اسے قدرت کاملہ حاصل ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَكَانُوا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۚ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعْجِزَهُ مِن شَيْءٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ ۚ إِنَّهُ كَانَ عَلِيمًا قَدِيرًا ۝﴾

''کیا وہ زمین میں چلتے پھرتے نہیں کہ وہ دیکھتے ان لوگوں کا انجام کیسا ہوا جو ان سے پہلے تھے جبکہ وہ ان سے زیادہ طاقتور تھے اور اللہ (ایسا) نہیں کہ اسے کوئی چیز آسمانوں میں اور زمین میں عاجز کر دے، بلاشبہ وہ خوب جاننے والا، بڑی قدرت والا ہے۔''[3]

1 یونس 61:10. 2 یٰسٓ 12:36. 3 فاطر 44:35.

چوتھا مرتبہ: ہر چیز کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ﴾

''یہ ہے اللہ، تمھارا رب، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے، چنانچہ تم اسی کی عبادت کرو اور وہ ہر چیز پر نگران ہے۔''[1]

صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دلوں میں قضاء و قدر کی حقیقت کا صحیح فہم اور اس کا پختہ عقیدہ بہت سے مفید ثمرات پیدا کرنے کا سبب بنا اور انھیں دنیا و آخرت کی بے شمار بھلائیاں حاصل ہوئیں، مثلاً:

① اللہ کی بندگی اختیار کرنا۔ تقدیر ان امور میں سے ہے جن پر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے امت کو ایمان لانے کی طرف دعوت دی ہے۔

② تقدیر پر ایمان شرک سے نجات کا ذریعہ ہے کیونکہ مومن کا یہ عقیدہ ہے کہ نفع و نقصان پہنچانے، عزت و ذلت دینے اور عروج و زوال سے ہمکنار کرنے والی ذات صرف ایک اللہ کی ہے۔

③ قضاء وقدر پر ایمان دلوں میں یہ یقین پیدا کرتا ہے کہ موت اللہ کے ہاتھ میں ہے اور ہر ذی روح کی موت کا وقت متعین ہے، اس لیے مومن دشمن کے مقابلے میں بزدلی کا مظاہرہ نہیں کرتا اور بہادری سے پیش قدمی کرتا ہے۔

④ مومن تکالیف و مصائب پر صبر کرتا اور اس پر اللہ تعالیٰ سے اجر کی امید رکھتا ہے۔

⑤ سکونِ دل، اطمینانِ قلب اور فکر و غم سے نجات قضاء و قدر پر ایمان رکھنے کے ثمرات ہیں۔ یہ متاع گم گشتہ ہے، روئے زمین پر رہنے والا ہر فرد ان کا طلب گار اور متلاشی ہے جبکہ صحابۂ کرام کو اس قدر وافر سکون و اطمینانِ قلب حاصل تھا جو آج ہمارے وہم و

1 الأنعام 102:6.

گمان اور تصور میں بھی نہیں آ سکتا۔

⑥ قناعت، عزت نفس اور غیروں کی غلامی سے نجات بھی عقیدۂ تقدیر کے ثمرات میں سے ہیں۔ تقدیر پر ایمان رکھنے والا شخص یہ بات بخوبی جانتا ہے کہ اس کی روزی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اسے یقینِ کامل ہوتا ہے کہ اللہ اس کا رازق ہے، کسی بھی معاملے میں اسے کسی اور کی ضرورت نہیں اور وہ سب امور میں اس کے لیے کافی ہے۔ اسے یہ بھی یقین ہوتا ہے کہ اپنی روزی پوری کیے بغیر وہ اس دنیا سے نہیں جائے گا اور اگر سب لوگ مل کر اسے کوئی چیز دینا چاہیں یا اس سے چھیننا چاہیں تو وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے سوائے اس کے جو اللہ تعالیٰ نے اس کی تقدیر میں لکھ دیا ہے۔

اس طرح مومن میں قناعت پیدا ہوگی۔ وہ کوئی ایسا عمل نہیں کرے گا جس سے اس کی عزت نفس مجروح ہو۔ وہ ہر چیز کے حصول کے لیے خوبصورت انداز اختیار کرے گا۔ دنیا کی حرص کو خیر باد کہہ دے گا، دوسروں کی غلامی برداشت نہیں کرے گا اور کسی مخلوق کے مال کو للچائی نگاہ سے نہیں دیکھے گا بلکہ اپنی خواہشوں اور چاہتوں کا مرکز رب العالمین کو بنائے گا۔

نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ کی تربیت کو محض ایمان کے مذکورہ چھ ارکان کی تعلیم تک محدود نہیں رکھا بلکہ انسان، کائنات اور زندگی اور ان کے باہمی ربط کے متعلق ان کے عقائد، نظریات اور تصورات کی درستگی بھی کی تاکہ ایک مسلمان اللہ تعالیٰ کی رہنمائی کے مطابق زندگی گزار سکے اور اپنے مقصد حیات کا ادراک کرتے ہوئے ان ذمہ داریوں کو بطریقِ احسن ادا کر سکے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے سپرد کی ہیں اور بے بنیاد باتوں اور خرافات سے خود کو محفوظ رکھ سکے۔[1]

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا انسان کی حقیقت کو جان لینا

قرآن کریم نے انسان کو اپنے رب اور قیامت کے دن کی معرفت دینے کے بعد اسے

1 أهمية الجهاد في نشر الدعوة الإسلامية لعلي العلياني، ص: 59.

اپنے آپ کی معرفت عطا کی، نیز فطری طور پر پیدا ہونے والے سوالات کے جوابات دیے کہ انسان کیسے وجود میں آیا اور اس کا انجام کیا ہوگا؟ ہر انسان کے دل میں یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں اور وہ ان سوالات کے جوابات کے لیے بڑا بے چین بھی ہوتا ہے۔[1]

قرآن حکیم نے صحابۂ کرام کے لیے یہ واضح کیا کہ نسلِ انسانی کی نشو ونما کیسے ہوتی ہے، اس کی حقیقت کیا ہے، اس کے اصل عناصر کیا ہیں، انسانی زندگی کا مقصد کیا ہے اور مرنے کے بعد ان کا انجام کیا ہوگا؟

صحابۂ کرام نے نبی کریم ﷺ کی وساطت اور قرآنی اسلوب سے انسان کی حقیقت معلوم کی کہ سب سے پہلے انسان کی تخلیق پانی اور مٹی کے مجموعے سے ہوئی اور پھر اس کی اولاد اور نسل ایک حقیر سے پانی کے ساتھ وجود میں آ رہی ہے۔ انسان کو اپنے رب کے ہاں کیا شرف و منزلت حاصل ہے، اس نے کس طرح انسان کو مسجود ملائک بنایا، اسے بے شمار مخلوقات پر فضیلت اور برتری عطا کی، یہ سب کچھ واضح کیا تا کہ انسان خود کو دو متضاد انتہاؤں اعلیٰ اور ادنیٰ کے درمیان محسوس کرے اور خالق کے ہاں اپنے شرف و منزلت کی وجہ سے خود کو باوقار سمجھے۔ اپنی تخلیق کے اسلوب کو سامنے رکھ کر تواضع اختیار کرے۔ اپنے اس خالق کی عظمت کا اعتراف کرے جس نے اسے اس کے اصل سے پیدا فرما کر حسین و جمیل شکل و صورت عطا کی اور اسے ایک بلند مقام پر فائز کیا تا کہ اس میں فخر اور غرور و تکبر پیدا نہ ہو اور اپنی عزت و کرامت کو ملحوظ رکھ کر وہ اپنے خالق کے سوا کسی اور کی غلامی اور بندگی اختیار نہ کرے۔[2]

اگر اللہ تعالیٰ انسان کو اس رہنمائی کے بغیر چھوڑ دیتا تو بہت سے لوگ اپنی حقیقت سے ناواقفیت کی بنا پر مشکلات کا شکار ہو جاتے بلکہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد اب بھی مشکلات میں گھری ہوئی ہے کیونکہ انھوں نے اپنے مخصوص نظریات کی وجہ سے اپنے آپ پر زیادہ

1 منهج التربية الإسلامية لمحمد قطب: 54/2. 2 أساليب التشريق في القرآن للدكتور الحسين جلو، ص: 134.

انحصار کیا جس کے نتیجے میں ان میں غرور وتکبر پیدا ہوا یا پھر وہ قعرِ مذلت میں گر گئے (کہ خود کو خالق کے سوا غیروں کے قدموں میں ڈال دیا۔)

انسان کا اپنے آپ پر غور وفکر اس کی تربیت کے موثر ترین ذرائع میں سے ہے۔ جب سے انسان اس دنیا میں آیا ہے اپنے بارے میں غلط فہمیوں کا شکار ہے۔ کبھی حدِ اعتدال سے اتنا بڑھ جاتا ہے کہ خود کو اس کائنات کی سب سے اعلیٰ اور عظیم ترین ہستی سمجھنے لگتا ہے اور فخر اور غرور وتکبر سے بھرے ہوئے بلند بانگ دعوے کرنے لگتا ہے جیسا کہ قوم عاد کے متعلق کہا گیا:

﴿فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَ قَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ؕ اَوَ لَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ؕ وَ كَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یَجْحَدُوْنَ ۝﴾

”پھر جو عاد تھے تو انھوں نے زمین میں ناحق تکبر کیا اور بولے: قوت میں ہم سے زیادہ سخت کون ہے؟ کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ بے شک اللہ جس نے انھیں پیدا کیا وہ قوت میں ان سے زیادہ سخت ہے۔ اور وہ ہماری آیات کا انکار کرتے رہے۔“ [1]

فرعون نے بھی یہ دعویٰ کیا تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰی ۝﴾

”تو کہا: میں تمھارا سب سے بڑا رب ہوں۔“ [2]

کبھی تو انسان خود کو اتنی بلندی پر لے جاتا ہے کہ خود کو کسی کے سامنے جوابدہ نہیں سمجھتا بلکہ خود معبود بن بیٹھتا ہے۔

اور کبھی انسان اس کے برعکس خود کو انتہائی ذلت اور پستی میں گرا دیتا ہے۔ خود کو اس کائنات کا حقیر ترین ذرہ سمجھتا ہے۔ کبھی شجر وحجر کے سامنے سر جھکاتا ہے، کبھی نہروں اور

1 حٰمٓ السجدة 15:41. 2 النّٰزِعٰت 24:79.

پہاڑوں کے سامنے ماتھا ٹیکتا ہے، کبھی حیوانات کے سامنے سربسجود ہو جاتا ہے اور کبھی خیال کرتا ہے کہ سورج اور چاند کو سجدہ کیے بغیر وہ زندہ و سلامت نہیں رہ سکتا۔[1]

قرآن حکیم نے بڑے واضح انداز میں اس حقیقت کو آشکارا کیا ہے کہ انسان کی پیدائش دو طرح سے ہوئی۔ سب سے پہلے انسان کو مٹی کے گارے سے بنا کر اس میں روح ڈالی گئی۔ اس کے بعد اس کی نسل کی پیدائش حقیر پانی کی ایک بوند سے ہوئی اور اب تک یہی طریقہ تسلسل سے جاری ہے۔[2] انسان کی تخلیق کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ○ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ○ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ○﴾

”جس نے ہر چیز کو اچھے طریقے سے پیدا کیا اور اس نے تخلیقِ انسان کی ابتدا مٹی سے کی، پھر اس کی نسل ایک حقیر پانی کے جوہر (نطفے) سے چلائی، پھر اس (کے اعضا) کو درست کیا اور اس میں اپنی روح پھونکی اور اس نے تمھارے کان، آنکھیں اور دل بنائے، تم کم ہی شکر کرتے ہو۔“[3]

قرآن حکیم میں اس مفہوم کو واضح کرنے والی بے شمار آیات ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت زیادہ قدر و منزلت اور شرف عطا فرمایا ہے۔ اُمّت مسلمہ کے اس ہراول دستے صحابۂ کرام کے قلوب و اذہان پر اس گفتگو کے بہت زیادہ اثرات تھے۔ قرآن حکیم نے انسان کی عزت و شرف کو کئی لحاظ سے بیان کیا ہے، مثلاً:

اللہ تعالیٰ کا انسان کو اپنے ہاتھوں سے تخلیق فرمانا: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

1 أصول التربية للنحلاوي، ص: 31. 2 أساليب التشويق في القرآن للدكتور الحسين جلو، ص: 134. 3 السجدة 32:7-9.

﴿اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ○ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِىْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ○ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ○ اِلَّآ اِبْلِيْسَ اسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ○ قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَىَّ ؕ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ ○﴾

''(یاد کیجیے) جب آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا: بے شک میں مٹی سے ایک انسان پیدا کرنے والا ہوں، چنانچہ جب میں اسے ٹھیک ٹھیک بنادوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں، تو تم اس کے آگے سجدہ کرتے ہوئے گر پڑنا، تب تمام فرشتوں نے (بیک وقت) اکٹھے سجدہ کیا، سوائے ابلیس کے، اس نے تکبر کیا اور وہ کافروں میں سے ہوگیا، اللہ نے فرمایا: اے ابلیس! تجھے کس چیز نے اس (آدم) کو سجدہ کرنے سے منع کیا جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا؟ کیا تو نے تکبر کیا یا تو اونچے درجے والوں میں سے ہے؟''[1]

وہ روح جو انسان میں داخل ہوئی، قرآن حکیم کی ان آیات نے واضح کیا ہے کہ وہ نہایت عالی مرتبت اور عالیشان ہے۔ اور پھر اس پہلے انسان کا ایسا والہانہ استقبال کیا گیا کہ فرشتے اس کے سامنے سجدہ ریز ہیں اور باری تعالیٰ انسان کی عظمتِ شان کا اعلان فرشتوں کو سجدہ کرانے کی صورت میں فرما رہے ہیں۔

متوازن جسم اور حسین صورت: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ○﴾

''اس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا اور تمھیں صورت دی تو تمھاری صورتیں بہت اچھی بنائیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔''[2]

1 صٓ 38:71-75. 2 التغابن 64:3.

ایک اور مقام پر فرمایا: ﴿ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيٓ أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ﴾
''ہم نے انسان کو بہترین شکل وصورت میں پیدا کیا ہے۔''[1]

انسان کے متوازن جسم کی تخلیق کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:
﴿ الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۝ فِيٓ أَيِّ صُورَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ۝ ﴾
''جس نے تجھے پیدا کیا پھر تجھے درست کیا اور تجھے معتدل بنایا، اس نے جس صورت میں چاہا تجھے جوڑ دیا۔''[2]

انسان کے لیے قوت گویائی اور عقل و دانش کا عطیہ: ارشاد باری تعالیٰ ہے:
﴿ اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝ ﴾
''(اللہ) رحمٰن نے قرآن سکھایا، اسی نے انسان کو پیدا کیا، اسے بولنا سکھایا۔''[3]

(دیگر مخلوقات کی نسبت انسان کو خالق نے یہ شرف عطا کیا کہ وہ دل کے جذبات کا احسن انداز میں اظہار کرسکتا ہے، پھر علم و دانش کی بدولت بے شمار گتھیوں کو سلجھاتے ہوئے ترقی کے زینے طے کرتا چلا جارہا ہے۔)

زمین و آسمان کی اشیاء کا انسان کے لیے مُسخّر ہونا: اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے کے بعد اسے بے حد و حساب اور بڑی بڑی نعمتیں عطا کیں۔ فرمان ربانی ہے:
﴿ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ۚ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۗ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ۝ ﴾
''اور اس نے تمھیں ہر وہ چیز دی جو تم نے اس سے مانگی اور اگر تم اللہ کی نعمتیں گنو تو انھیں شمار نہ کرسکو گے۔ بے شک انسان بڑا ظالم، نہایت ناشکرا ہے۔''[4]

اللہ تعالیٰ نے انسان کی عزت افزائی کے لیے آسمانی بادشاہت کو اس کے لیے مُسخّر کر دیا جس میں بے شمار ستارے، سورج اور چاند ہیں اور ان سب کو ایک ایسے منفرد نظام میں

---

1 التين 95:4. 2 الانفطار 82:7. 3 الرحمٰن 55:1-4. 4 إبراهيم 14:34.

سمو دیا جس سے دن رات اور مختلف موسم وجود میں آتے ہیں اور انسان ان سب سے مستفید ہوتا ہے۔فرمان الٰہی ہے:

﴿وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ○﴾

''اور اس نے تمھارے لیے مسخر کیے رات اور دن اور سورج اور چاند اور تمام تارے بھی اسی کے حکم کے پابند ہیں۔ بے شک اس میں عقل مند لوگوں کے لیے البتہ کئی نشانیاں ہیں۔''[1]

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○﴾

''اوراس نے اپنی طرف سے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے،سب تمھارے تابع کر دیا۔ بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو غور وفکر کرتے ہیں۔''[2]

انسان کی دیگر مخلوقات پر فضیلت: فرمان الٰہی ہے:

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ○﴾

''اور بلاشبہ یقیناً ہم نے بنی آدم کو عزت دی ہے اور انھیں بر و بحر میں سواریاں دیں اور انھیں پاکیزہ چیزوں میں سے رزق دیا اور انھیں اپنی کثیر مخلوقات پر جنھیں ہم نے پیدا کیا،فضیلت دی۔''[3]

انبیاء اور رسولوں کی بعثت کے ساتھ انسان کی عزت افزائی: اللہ تعالیٰ کی طرف سے

1 النحل 12:16. 2 الجاثية 13:45. 3 بني إسرآءيل 70:17.

انسان کی عزت افزائی کے بڑے بڑے مظاہر میں سے ایک مظہر انبیاء اور رسل کو انسانوں کی رشد و ہدایت کے لیے مبعوث فرمانا ہے جنھوں نے نوع انسانی کو حیات افزا تعلیمات سے بہرہ ور کیا اور ان تعلیمات پر عمل کرنے کی صورت میں دنیا و آخرت میں کامیابی کی ضمانت دے دی۔ تکریمِ انسان کے طور پر اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین نعمتیں اسلام، ایمان اور احسان کی نعمتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان نعمتوں سے بہرہ ور ہونے کی توفیق عطا فرمائے! آمین۔ فرمان ربانی ہے:

﴿قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ ۝﴾

”اس (اللہ) نے فرمایا: تم دونوں یہاں سے اکٹھے اتر جاؤ، تمھارے بعض، بعض کے دشمن ہیں، پھر جب تمھارے پاس میری ہدایت پہنچے تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی تو وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ مشقت میں پڑے گا۔“ [1]

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۝﴾

”کہہ دیجیے: اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں، جس کے پاس آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے، اس کے سوا کوئی معبود (برحق) نہیں، وہ زندہ کرتا اور مارتا ہے، لہٰذا تم اللہ پر اور اس کے رسول اُمی نبی پر ایمان لاؤ، جو (خود بھی) اللہ اور اس کے (تمام) کلمات پر ایمان لاتا ہے اور تم اس کی پیروی کرو تاکہ تم ہدایت پاؤ۔“ [2]

[1] طٰہٰ 123:20. [2] الأعراف 158:7.

انسان کی عزت وتکریم کا ایک مظہر جس کا صحابۂ کرام کو بھی بڑی شدت سے احساس تھا، وہ یہ ہے کہ انسان کو انسانوں کی اور معبودانِ باطلہ کی غلامی سے نجات دلا کر صرف ایک معبود حقیقی کی بندگی کا شرف بخشا گیا۔ارشاد ربانی ہے:

﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِىْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ۚ فَسِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝﴾

"اور یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو، پھر ان میں سے بعض کو اللہ نے ہدایت دی اور ان میں سے بعض پر ضلالت ثابت ہوگئی، لہٰذا تم زمین میں چلو پھرو، پھر دیکھو (رسولوں کو) جھٹلانے والوں کا انجام کیسا (عبرتناک) ہوا؟"[1]

اللہ تعالیٰ کی انسان سے محبت اور ملاء اعلیٰ میں اس کا تذکرہ: اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کی عزت وتکریم کے اعلیٰ ترین مظاہر میں سے ایک مظہر یہ ہے کہ اس نے انسان کو اپنی محبت و چاہت اور پسندیدگی کا اہل بنایا اور قرآن حکیم میں اسے وہ تمام طریقے بتا دیے جنھیں اختیار کر کے وہ حُبِ الٰہی کا حقدار بن سکتا ہے۔ اور اس کا سب سے پہلا طریقہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرنے اور آخرت میں جنت حاصل کرنے کے لیے جو تعلیمات و ہدایات دی ہیں ان کی مکمل اتباع کی جائے۔

اللہ تعالیٰ نے اتباعِ رسول کے لذیذ ترین ثمرات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝﴾

"جس نے نیک عمل کیے، مرد ہو یا عورت، جبکہ وہ مومن ہو تو ہم ضرور اسے پاکیزہ

[1] النحل 36:16.

زندگی بسر کرائیں گے اور ہم انھیں ضرور ان کا اجر و ثواب ان بہترین اعمال کے بدلے میں دیں گے جو وہ کرتے تھے۔"[1]

انسان کی حفاظت اور نگرانی: انسان کی عزت و تکریم کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ اسے شر سے محفوظ رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص تائید، سرپرستی اور حفاظت کا اہتمام ہوتا ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَ ۝﴾

"حالانکہ تم پر نگران (فرشتے) مقرر ہیں۔"[2]

اور انسان کی حفاظت کے لیے فرشتوں کو متعین کیا گیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿إِن كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ۝﴾

"کوئی جان ایسی نہیں جس پر کوئی نگہبان نہ ہو۔"[3]

اس طرح قرآن حکیم میں انسان کی عزت و تکریم کی بے شمار صورتوں کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔[4]

آدم علیہ السلام اور شیطان کی کشمکش کا صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہاں تصور

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآنی اسلوب کے ساتھ اپنے صحابہ کو بتایا کرتے تھے کہ شیطان کا آدم علیہ السلام کے ساتھ کیا طرز عمل تھا اور یہ کہ شیطان ہی انسان کا شدید ترین ازلی دشمن ہے جس نے ان کے باپ آدم علیہ السلام کو راہِ راست سے ہٹانے کی کوشش کی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَا بَنِي آدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطَانُ كَمَا أَخْرَجَ أَبَوَيْكُم مِّنَ الْجَنَّةِ يَنزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْآتِهِمَا ۗ إِنَّهُ يَرَاكُمْ هُوَ وَقَبِيلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۗ إِنَّا جَعَلْنَا الشَّيَاطِينَ أَوْلِيَاءَ لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ ۝﴾

1 النحل 16:97. 2 الانفطار 82:10. 3 الطارق 86:4. 4 موسوعة نضرة النعيم في مكارم أخلاق الرسول الكريم: 4/1136-1142.

''اے بنی آدم! کہیں شیطان تمھیں فتنے میں نہ ڈال دے جس طرح اس نے تمھارے ماں باپ کو جنت سے نکلوایا تھا جب اس نے ان دونوں کا لباس اتروایا تھا تاکہ ان کو ان کی شرم گاہیں دکھا دے۔ بے شک وہ اور اس کا قبیلہ تمھیں دیکھتا ہے جہاں سے تم انھیں نہیں دیکھ سکتے۔ بے شک ہم نے شیطانوں کو ان لوگوں کے دوست بنا دیا جو ایمان نہیں لاتے۔'' [1]

ایک اور مقام پر یوں فرمایا:

﴿قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ○ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ۖ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ○﴾

''وہ بولا: پس اس وجہ سے کہ تو نے مجھے گمراہ کیا تو میں ان (لوگوں کو گمراہ کرنے) کے لیے تیرے سیدھے راستے پر ضرور بیٹھوں گا، پھر میں ان کے سامنے سے اور ان کے پیچھے سے ان کے پاس ضرور آؤں گا اور ان کے دائیں سے اور ان کے بائیں سے بھی اور تو ان کی اکثریت کو شکر گزار نہیں پائے گا۔'' [2]

شیطان کے متعلق یہ گفتگو سُن کر، اس کے غیر مرئی ہونے کے باوجود، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم یہ محسوس کرنے لگے کہ شیطان ان کے تعاقب میں ہے۔ ان کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں سے انھیں اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کر رہا ہے، انھیں معصیت پہ ابھارنا چاہتا ہے اور ان کی خوابیدہ خواہشات کو بیدار کرنا چاہتا ہے، اس لیے وہ ہمیشہ کوشش کرتے تھے کہ اپنے دشمن شیطان کے حملوں سے آگاہ رہیں۔ وہ نیک اعمال میں مُسابقت اختیار کر کے شیطان کی چالوں کو ناکام بنا دیتے تھے۔ اس طرح انھیں بہکانے کے لیے شیطان کو کوئی راستہ نہ ملتا۔[3]

حضرت آدم علیہ السلام کا شیطان کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ قرآن حکیم میں کئی ایک

[1] الأعراف 27:7. [2] الأعراف 17,16:7. [3] واقعنا المعاصر لمحمد قطب، ص: 46.

مقامات پر مذکور ہے۔ بعض مقامات پر تفصیل سے اس کا تذکرہ کیا گیا ہے جیسا کہ سورۂ اعراف (25-11:7) میں ہے۔ کہیں اس واقعے کی کچھ تفصیلات بیان کی گئی ہیں جیسا کہ سورۂ حجر (42-26:15)، سورۂ بنی اسرائیل (65-61:17)، سورۂ طٰہٰ (123-116:20) اور سورۂ ص (85-71:38) میں ہے۔ اور کئی مقامات پر اس کی جانب محض اشارہ کیا گیا ہے اور یہ اسلوب قرآن حکیم میں کثرت سے پایا جاتا ہے۔

سورۂ ابراہیم میں بیان کیا گیا ہے کہ قیامت کے دن شیطان کا ان لوگوں کے بارے میں کیا موقف ہو گا جنھوں نے دنیا میں اس کی روش کو اپنایا اور کس طرح وہ ان سے بالکل لاتعلق ہو جائے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ مَاۤ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ؕ اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَاۤ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ؕ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ ﴾

''اور جب (جنت یا جہنم کے) معاملے کا فیصلہ کر دیا جائے گا تو شیطان کہے گا: بے شک اللہ نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا، اور میں نے تم سے جو وعدہ کیا تھا اس کی میں نے خلاف ورزی کی اور میرا تم پر کوئی زور نہ تھا مگر یہ کہ میں نے تمھیں دعوت دی تو تم نے میری بات مان لی، چنانچہ تم مجھے ملامت نہ کرو اور اپنے آپ کو ملامت کرو۔ میں تمھارا فریاد رس نہیں اور نہ تم میرے فریاد رس ہو۔ بلاشبہ میں تو اس کا انکار کرتا ہوں جو تم اس سے پہلے مجھے (اللہ کا) شریک ٹھہراتے تھے۔ بے شک ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے۔''[1]

سورۂ اعراف میں آدم علیہ السلام اور شیطان کا واقعہ یوں بیان کیا گیا ہے:

1 ابراھیم 14:22.

''اور اے آدم ! تو اور تیری بیوی جنت میں رہو اور تم دونوں جہاں سے چاہو کھاؤ اور تم دونوں اس درخت کے قریب مت جانا ورنہ تم دونوں ظالموں میں سے ہو جاؤ گے، پھر شیطان نے ان دونوں کو بہکانے کے لیے (ان کے دل میں) وسوسہ ڈالا تاکہ ان کے لیے ان کی شرم گاہیں ظاہر کر دے جو ان سے چھپائی گئی تھیں۔ اور شیطان نے کہا: تمھارے رب نے تمھیں صرف اس لیے روکا ہے کہ (کہیں) تم دونوں فرشتے نہ بن جاؤ، یا (کہیں) تم دونوں ہمیشہ رہنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ اور اس نے ان دونوں کے سامنے قسم کھائی کہ بے شک میں تم دونوں کے خیر خواہوں میں سے ہوں، چنانچہ شیطان نے ان دونوں کو دھوکا دے کر پھسلا دیا، پھر جب ان دونوں نے اس درخت کا پھل چکھا تو ان دونوں کی شرم گاہیں ان پر ظاہر ہو گئیں اور وہ دونوں اپنے اوپر جنت کے پتے چپکانے لگے (تاکہ ستر ڈھانک سکیں) اور ان کے رب نے ان کو آواز دی: کیا میں نے تمھیں اس درخت سے روکا نہیں تھا؟ اور میں نے تمھیں یہ (نہیں) کہا تھا کہ شیطان تم دونوں کا کھلا دشمن ہے؟ انھوں نے کہا: اے ہمارے رب! ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا اور اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور تو نے ہم پر رحم نہ فرمایا تو یقیناً ہم خسارہ پانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔''[1]

انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی تاریخ کی معرفت حاصل کرے۔ غم غلط کرنے کے لیے نہیں بلکہ حصولِ عبرت کے لیے۔ دیگر قرآنی واقعات کی طرح حضرت آدم علیہ السلام کے شیطان کے ساتھ پیش آنے والے واقعے میں بے شمار اسباق ہیں۔ یہ نوع انسانی کو بتاتا ہے کہ ان کی ابتدا کیا تھی اور انتہا کیا ہو گی، اس زمین میں ان کا کردار کیا ہو گا اور اس کردار کو ادا کرنے کے لیے کن اسالیب کو اختیار کرنا ہو گا۔ اس سفر میں کیا کیا رُکاوٹیں

1 الأعراف 7:19-23.

ہوں گی اور ان رُکاوٹوں سے کیسے بچنا ہو گا اور کس طرح انھیں عبور کیا جا سکے گا۔[1]

قرآن حکیم کی جن آیات میں آدم علیہ السلام اور شیطان کی کشمکش کا ذکر ہے ان آیات نے صحابۂ کرام کے لیے عقائد، نظریات اور اخلاق کے میدان میں بہت سے اہم امور کی نشاندہی کی تھی، مثلاً:

نسل انسانی کی ابتدا آدم علیہ السلام سے ہوئی: اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو مکمل انسانی شکل و صورت میں پیدا فرمایا اور اس سے نسلِ انسانی وجود میں آئی۔ آدم علیہ السلام کی تخلیق مٹی سے ہوئی۔ مٹی سے بنانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس میں روح پھونکی۔ اس طرح وہ گوشت پوست کا جیتا جاگتا انسان بن گیا۔ وہ ابتدا ہی سے مکمل انسانی شکل وصورت کا مالک تھا، کسی اور مخلوق سے ارتقائی منازل طے کرتا ہوا انسانی شکل میں نہیں آیا۔

صرف اللہ کی غیر مشروط اطاعت، اسلام کا بنیادی اصول: اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو، چنانچہ وہ بغیر کسی تردد اور ہچکچاہٹ کے ربِ ذوالجلال کا حکم بجا لاتے ہوئے اور آدم علیہ السلام کی عظمت و فضیلت کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے حضور سجدۂ تکریم کی صورت میں جھک گئے، حالانکہ فرشتوں کا تعلق اللہ تعالیٰ کی نہایت مقرب جماعت سے ہے۔ وہ ہر وقت رب العالمین کے حضور تسبیح و تقدیس اور عبادت میں مشغول رہتے ہیں، پھر بھی وہ فوراً آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے، جبکہ آدم علیہ السلام سے اس وقت کوئی ایسی عبادت بھی ظاہر نہ ہوئی تھی جو فرشتوں کی عبادت سے افضل ہوتی۔ دراصل سجدہ کرنے کا حکم رب العالمین کی طرف سے صادر ہوا تھا لہٰذا کسی تردد و توقف، نکتہ چینی اور حکمت جانے بغیر اس کی تعمیل انتہائی ضروری تھی۔

یہی اسلام کا اصول اور مسلمان کی شان ہے کہ وہ فوراً اپنے رب کی اطاعت کرتا ہے اور بغیر کسی تردّد کے اس کا حکم بجا لاتا ہے۔ اس کی یہ اطاعت غیر مشروط ہوتی ہے۔ حکم اس

1 دراسات قرآنية لمحمد قطب، ص: 114.

کی عقل اور چاہت کے مطابق ہو یا مخالف، وہ اس کا سبب یا حکمت جانے بغیر فوراً سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے۔

انسان خطا کا پتلا ہے: آدم علیہ السلام سے غلطی سرزد ہوئی، جس سے صحابۂ کرام نے یہ بات جان لی کہ انسان سے غلطی کا ارتکاب ہونا کوئی بعید نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق ایسے مزاج اور فطرت پر کی ہے کہ اس سے غلطی کا سرزد ہو جانا ممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت میں ایسے میلانات، رجحانات اور خواہشات رکھ دی ہیں جو اس کی کمزوریاں ہیں۔ ان کی وجہ سے شیطان نہایت آسانی سے انسان کو اپنے وسوسوں کا شکار بنا لیتا ہے اور اس کے لیے گناہ کا راستہ بہت خوشنما بنا دیتا ہے۔

انسان کی فطری اور پوشیدہ خواہشات میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ موت کو پسند نہیں کرتا اور لازوال زندگی کا خواہش مند ہوتا ہے یا کم از کم طویل ترین عمر پانے کی تمنا رکھتا ہے۔ اس کی یہ چاہت بھی ہوتی ہے کہ وہ اس مختصر زندگی میں لامحدود بادشاہت کا مالک بھی ہو۔[1]

ابلیس نے آدم علیہ السلام کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھیں اور ان کی زوجۂ محترمہ کو بہکایا اور انھیں ہمیشہ زندہ رہنے کا لالچ دیا۔

انسان کی فطرت میں ان چیزوں کے ہونے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ خود کو اپنی خواہشات، میلانات اور رجحانات کے حوالے کر دے بلکہ ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان پر کنٹرول حاصل کرے، انھیں لگام دے کر رکھے اور انھیں شرعی احکام کا پابند بنائے۔

یہ میلانات و رجحانات حقیقت میں دل کی خواہشات ہوتی ہیں جو اکثر بے لگام ہو جاتی ہیں اور حد سے تجاوز کر جاتی ہیں۔ انھیں صرف شرعی احکام کی پابندی ہی سے کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ قرآن حکیم نے مکروہ دلی خواہشات کی مذمت کی ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

1 تفسیر في ظلال القرآن لسید قطب: 1269/3.

﴿وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ ۝﴾

''لیکن جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈر گیا اور اپنے نفس کو خواہش سے روکا تو بے شک جنت ہی (اس کا) ٹھکانا ہے۔''[1]

بے لگام خواہشات قابل مذمت ہوتی ہیں، اس لیے وہ انسان قابلِ تعریف ٹھہرا جس نے اپنے نفس کو بے لگام خواہشات سے بچائے رکھا۔[2]

آدم علیہ السلام کا نِسیان توکل علی اللہ کی تعلیم ہے: آدم علیہ السلام سے غلطی کا صدور اس بات کو واضح کرتا ہے کہ انسان خطا کا پتلا ہے اور یہ بہت جلد خطا کا مرتکب بن جاتا ہے اور یہ دیکھ کر دل خوف اور گھبراہٹ سے لبریز ہو جاتے ہیں مگر اس سے یہ فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے کہ مسلمان کا اپنے رب پر اعتماد اور توکل مزید بڑھ جاتا ہے۔ وہ شیطان مردود کے شر سے بچنے کے لیے اسے ہی اپنا ملجأ و ماوٰی سمجھتا ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بات کے اظہار کے لیے کہ آدم علیہ السلام کا ان کے رب کے ہاں کتنا اعلیٰ مقام اور کس قدر فضیلت ہے، فرشتوں سے انھیں سجدہ کروایا اور انھیں سجدہ نہ کرنے پر ابلیس کو جنت سے نکال باہر کیا، پھر آدم علیہ السلام اور ان کی زوجۂ محترمہ کو جنت میں ٹھہرایا اور انھیں واضح طور پر حکم دیا کہ اس مخصوص درخت کے قریب نہ جانا۔ اس درخت کے سوا جنت کی تمام نعمتیں اور تمام قسم کے پھل استعمال کرنے کی اجازت دی۔

اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو شیطان اور اس کے مکر و فریب سے متنبہ فرمایا اور بتایا کہ وہ تم دونوں کو جنت سے نکلوانے کی کوشش کرے گا، لہٰذا اس کی چال میں نہ آنا۔ اس کے باوجود شیطان انھیں فریب دینے اور بہکانے میں کامیاب ہو گیا۔ ان دونوں نے اس درخت کا پھل کھا لیا اور معصیت کے مرتکب ٹھہرے۔ اس طرح شیطان انھیں جنت سے نکلوانے میں کامیاب ہو گیا۔

1 النّٰزعٰت 79:40,41. 2 المستفاد من قصص القرآن لعبد الکریم زیدان: 28/1.

آدم علیہ السلام کی اس غلطی کی وجہ سے صحابۂ کرام کے دلوں میں اس ناپاک دشمن ابلیس کا خوف پیدا ہو گیا اور اس خوف سے کہ کہیں یہ انھیں راہ راست سے بھٹکا نہ دے، ان کے دلوں میں یہ دائمی جذبہ پیدا ہو گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ پر بھروسا کریں۔ اس مردود شیطان کے شر سے بچنے کے لیے اللہ ہی کی مدد چاہیں اور اسی کی پناہ میں آجائیں کیونکہ اس شیطان کا ایک ہی مقصد ہے کہ وہ انسان کو گمراہ کرے اور اسے معصیت کی دلدل میں گرا دے۔

صحابۂ کرام نے یہ حقیقت ان آیات کریمہ سے اخذ کی:

﴿إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ ۚ وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ وَكِيلًا ۝﴾

''بے شک میرے بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں اور آپ کا رب کارساز کافی ہے۔''[1]

دوسرے مقام پر یوں ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۝﴾

''بے شک ان لوگوں پر اس کا کوئی زور نہیں (چلتا) جو ایمان لائے اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔''[2]

شیطان ان لوگوں کو گمراہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتا اور نہ ان پر اثر انداز ہو سکتا ہے جن کے دل اللہ پر ایمان سے لبریز ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو اپنی جانب متوجہ کر لیا ہے اور ان کے اعضاء کو اپنی اطاعت میں مشغول کر لیا ہے۔ اب ان کا تمام تر اعتماد اور انحصار ذات باری تعالیٰ پر ہے۔ ان پر شیطان کا زور نہیں چل سکتا کیونکہ وہ ہر وقت شیطانی خواہشات سے نبرد آزما رہتے ہیں اور اس کی تمام چالوں اور تدبیروں کو ناکام بنا دیتے ہیں۔ اللہ پر ایمان لانے سے انھیں ایسا نور حاصل ہوتا ہے جو ہر پریشانی کا ازالہ کرتا ہے۔ توکل علی اللہ سے انھیں قوت الٰہی حاصل ہو جاتی ہے جس کا شیطان مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس طرح ایمان باللہ اور توکل علی اللہ کی طاقت کے سامنے شیطان بے بس اور

1 بني إسرآءيل 65:17. 2 النحل 99:16.

ناکام ہو جاتا ہے۔[1]

توبہ و استغفار کی ضرورت و اہمیت: آدم علیہ السلام کے واقعے سے صحابۂ کرام نے یہ بات سیکھی کہ گناہ اور معصیت کے سرزد ہو جانے پر فوراً اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنی چاہیے اور گناہوں کے راستے سے پلٹ کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

آدم علیہ السلام اور ان کی زوجۂ محترمہ سے جب معصیت سرزد ہوئی تو انھوں نے فوراً ہی اپنے مہربان پروردگار سے مغفرت اور رحمت طلب کی۔ فرمان ربانی ہے:

﴿قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝﴾

''انھوں نے کہا: اے ہمارے رب! ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا اور اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور تو نے ہم پر رحم نہ فرمایا تو یقیناً ہم خسارہ پانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔''[2]

آدم و حوا نے ﴿ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا﴾ کہہ کر فوراً ہی اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا اور ساتھ ہی شدید قسم کی ندامت کا اظہار بھی کر دیا۔ سچے دل سے توبہ کرتے ہوئے اللہ کی رحمت کے امیدوار بن کر انھیں یہ خوف لاحق تھا کہ اگر اس کی رحمت و مغفرت حاصل نہ ہوئی تو ہم خائب و خاسر ہو جائیں گے۔

جب حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی زوجۂ محترمہ اپنے عالی مرتبت ہونے کے باوجود توبہ و استغفار سے مستغنی نہیں ہو سکے تو باقی اولادِ آدم کیونکر اس سے مستغنی ہو سکتی ہے! ان کو تو اس کی زیادہ ضرورت ہوگی۔[3]

حسد اور تکبر سے اجتناب: ابلیس نے آدم علیہ السلام کے معاملے میں جو کچھ بھی کیا اس کی بنیادی وجہ حسد اور تکبر تھا۔ گناہ کا آغاز تکبر سے ہوتا ہے۔ ابلیس نے بھی خود کو آدم علیہ السلام سے

---

1 المستفاد من قصص القرآن لعبد الكريم زيدان: 71/1. 2 الأعراف 23:7. 3 المستفاد من قصص القرآن لعبد الكريم زيدان: 30/1.

بڑا اور افضل سمجھتے ہوئے اپنے رب کے اس حکم کو ٹھکرا دیا کہ وہ آدم کو سجدہ کرے۔

چونکہ تکبر معصیت کا نقطۂ آغاز ہوتا ہے، اس لیے اسلام نے اس سے بچنے اور دور رہنے کا حکم دیا ہے اور تکبر کرنے والوں کے لیے سخت وعید بتائی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِّنْ كِبْرٍ»

''وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں ذرہ بھر بھی تکبر ہوگا۔''[1]

قرآن حکیم میں بھی بے شمار آیات ہیں جو تکبر اور تکبر کرنے والوں کی مذمت کرتی ہیں اور قیامت کے دن ان کے برے انجام سے خبردار کرتی ہیں۔

تکبر کی حقیقت: تکبر کا اطلاق دو چیزوں پر ہوسکتا ہے:

(i) حق کو ٹھکرا دینا، اسے حقیر سمجھتے ہوئے یا خود کو اس سے بالا خیال کرتے ہوئے یا اس سے دشمنی رکھتے ہوئے اسے تسلیم نہ کرنا اور اس کی اطاعت کرنے کے بجائے مخالفت کرنا۔

(ii) لوگوں کو حقیر جاننا۔ انھیں حقارت کی نگاہ سے دیکھنا۔[2]

حق کو ٹھکرانے کا سب سے خطرناک پہلو احکامِ الٰہی کو رد کر دینا ہے کیونکہ احکامِ الٰہی یقیناً حق ہیں۔ اس حق کو ٹھکرا دینا اور قبول نہ کرنا یقیناً تکبر ہے۔

صحابۂ کرام میں تو حسد اور تکبر کے جراثیم بھی نہ تھے، وہ سب لوگوں سے بڑھ کر ان خامیوں سے مُنَزَّہ تھے۔ خود پسندی اور خود ستائی ان میں نام کو نہ تھی۔ انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ یہ نہایت خطرناک چیزیں ہیں۔ شیطان نے بھی یہی کہا تھا کہ میں آدم سے بہتر ہوں۔ صحابۂ کرام نے یہ حقیقت جان لی تھی کہ ابلیس نے اپنی اصل پر فخر کرتے ہوئے کہا تھا:

﴿خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝﴾

''مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا اور اسے تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے۔''[3]

---

1 صحيح مسلم، حديث: 91. 2 صحيح مسلم، حديث: 91، والمستفاد من قصص القرآن لعبد الكريم زيدان: 33/1. 3 الأعراف 12:7.

لہٰذا وہ اپنی اصل کے لحاظ سے حقیر ہے اور میں اپنی اصل کے لحاظ سے اعلیٰ ہوں۔ یہی تکبر اس کی گمراہی کا سبب بنا، اس لیے اصل اور نسب پر فخر نہیں کرنا چاہیے۔

ابلیس بنی آدم کا پہلا دشمن ہے: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ملی آیات سے یہ بات معلوم کر لی تھی کہ شیطان ہی ان کا سب سے پہلا دشمن ہے کیونکہ ان کے جد امجد آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کرنے کے باعث اسے بارگاہ الٰہی سے دھتکار دیا گیا اور اللہ کی رحمتوں سے محروم اور اس کی لعنتوں کا مستحق ٹھہرایا گیا۔ یوں وہ آدم علیہ السلام، ان کی زوجۂ محترمہ اور ان کی اولاد کا پہلا اور ازلی دشمن بن گیا۔

اللہ تعالیٰ نے شیطان اور اس کے متبعین کے متعلق فیصلہ فرما دیا:

﴿وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝﴾

''اور یقیناً ان سب کے وعدے کی جگہ جہنم ہے۔''[1]

شیطان نے اولاد آدم سے اپنی دشمنی کا اعلان کر دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا تذکرہ یوں فرمایا ہے:

﴿قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ لَىِٕنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا ۝﴾

''کہنے لگا: بھلا دیکھ تو اسے جسے تو نے مجھ پر عزت دی ہے، اگر تو مجھے یوم قیامت تک ڈھیل دے تو تھوڑے لوگوں کے سوا میں اس کی تمام نسل کی جڑ کاٹ دوں گا۔''[2]

شیطان نے اولاد آدم کو بہکانے اور گمراہ کرنے کے لیے اپنے عزمِ صمیم کا اظہار کر دیا تھا اور اللہ تعالیٰ سے مہلت مانگی تھی کہ اسے قیامت تک زندہ رکھے تاکہ وہ اپنے عزم کی تکمیل کر سکے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ ابلیس آدم اور اولاد آدم کا شدید ترین دشمن ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

1 الحجر 43:15. 2 بني إسرآء يل 62:17.

﴿قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ○ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ○﴾

''اس نے کہا: میرے رب! مجھ کو تیرے گمراہ کرنے کے سبب یقیناً میں ان (لوگوں) کے لیے زمین میں (گناہ) خوش نما بنادوں گا اور ان سب کو گمراہ کروں گا، تیرے ان بندوں کے سوا جو ان میں سے چنے ہوئے ہیں۔'' [1]

قرآنی آیات کے اسلوب سے صحابۂ کرام کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ شیطان کا انسان کے ساتھ رشتہ صرف دشمنی کا ہے۔ نہ اس رشتے کو تبدیل کیا جا سکتا ہے اور نہ ان میں دشمنی ختم کر کے مصالحت کروائی جا سکتی ہے کیونکہ شیطان کا ایک ہی مقصد، ایک ہی کام اور ایک ہی نصب العین ہے کہ انسان کو راہِ راست سے بھٹکا دے اور گناہوں کو خوشنما بنا کر اسے اللہ کی معصیت پر مجبور کر دے۔

اس لیے صحابۂ کرام نے اس فرمان الٰہی پر عمل کرتے ہوئے شیطان کو اپنا سب سے بڑا دشمن قرار دیا تھا:

﴿اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ۭ اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ○﴾

''بے شک شیطان تمھارا دشمن ہے، لہٰذا تم اسے دشمن ہی جانو، بس وہ تو اپنے گروہ کو اس لیے بلاتا ہے کہ وہ جہنم والوں میں سے ہو جائیں۔'' [2]

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے شیطان کی کوئی بات نہیں مانی، اس سے عداوت اختیار کی اور خود بھی اس سے بچ کر رہے اور لوگوں کو بھی اس سے بچاتے رہے۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا آپس میں گفتگو کا انداز

شیطان کے شر سے بچنے اور اس کے مکر وفریب کو ناکام بنانے کے لیے صحابۂ کرام نے

1 الحجر 15:39، 40. 2 فاطر 35:6.

جو ذرائع اختیار کیے ان میں سے ایک ذریعہ اس فرمان ربانی پر عمل پیرا ہونا تھا:

﴿ وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ۝﴾

"اور میرے بندوں سے کہہ دیجیے کہ وہ بات کہیں جو احسن ہو، بے شک شیطان ان کے درمیان فساد ڈالتا ہے، بلاشبہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔"[1]

اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے رسول ﷺ سے فرمایا کہ وہ اہل ایمان کو یہ حکم دیں کہ وہ اپنی گفتگو میں عمدہ کلام اور پاکیزہ کلمات استعمال کریں۔ اگر انھوں نے ایسا نہ کیا تو پھر شیطان ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت اور بغض پیدا کر دے گا جس سے وہ ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے۔ شیطان تو انسان کا کھلا اور بدترین دشمن ہے۔ اس کا تو نصب العین یہی ہے کہ انسان ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں اور ان میں شر عام ہو جائے۔

صحابۂ کرام نے ہمیشہ باہمی معاملات میں اعلیٰ اخلاق اختیار کیا۔ ان کے سامنے ہمیشہ یہ فرمان الٰہی موجود رہا:

﴿ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ؕ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ۝ وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ۝ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ۝﴾

"برائی کو اس طریقے سے دور کیجیے جو احسن ہو، ہم اسے خوب جانتے ہیں جو وہ بیان کرتے ہیں اور آپ کہیں: اے میرے رب! میں شیطانوں کے وسوسوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور اے میرے رب! میں (اس سے بھی) تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس حاضر ہوں۔"[2]

دوسرے کی بدسلوکی اور بداخلاقی کے جواب میں درگزر سے کام لیتے ہوئے عمدہ

1 بنيٓ إسرآء يل 53:17. 2 المؤمنون23:96-98.

اخلاق اور اچھے برتاؤ کا مظاہرہ کیجیے۔ اس طرح اس کی دشمنی دوستی میں اور اس کی نفرت محبت میں بدل جائے گی۔[1]

﴿ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ۝﴾ کا مفہوم یہ ہے کہ اے میرے پروردگار! میں شیطانوں کے ان وسوسوں کے شر سے بچنے کے لیے تیری پناہ میں آتا ہوں جو کہ شروفساد اور باطل کی ترغیب دیتے ہیں اور راہِ حق سے دور کرتے ہیں کیونکہ شیاطین نہ خود کوئی اچھا کام کرتے ہیں نہ ان کی موجودگی میں کوئی نفع حاصل کیا جا سکتا ہے۔[2] اس لیے اے پروردگار! مجھے ان کے شر سے بچا کر اپنی پناہ میں لے لے۔ شیاطین میرے کسی بھی معاملے میں مداخلت نہ کریں، اس لیے ہر کام شروع کرتے وقت اللہ کی پناہ میں آنا مشروع ہے تاکہ شیطان کو دور کیا جا سکے۔ فرمان ربانی ہے:

﴿ وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ۝ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝﴾

''اور نیکی اور برائی برابر نہیں ہوسکتیں، آپ (برائی کو) ایسی بات سے ٹالیے جو احسن ہو تو (آپ دیکھیں گے) یکایک وہ شخص کہ آپ کے اور اس کے درمیان دشمنی ہے، (ایسا ہو جائے گا) جیسے گرم جوش جگری دوست ہو اور یہ (خصلت) انھی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو صبر کرتے ہیں اور یہ اسی کو نصیب ہوتی ہے جو بڑے نصیب والا ہو، اور اگر آپ کو شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ ابھارے تو اللہ کی پناہ مانگیے، یقیناً وہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔''[3]

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص آپ کے ساتھ برا سلوک کرے، آپ اس پر احسان

1 تفسير القاسمي: 100/12. 2 المستفاد من قصص القرآن الكريم لعبد الكريم زيدان: 85/1.
3 حٰم السجدة 41: 34-36.

کریں۔ آپ کا یہ احسان اسے آپ کے ساتھ محبت کرنے پر مجبور کر دے گا۔ وہ اپنی دشمنی ترک کر کے آپ کا انتہائی عقیدت مند اور پیارا دوست بن جائے گا۔ لیکن ان اوصاف کو پانے کے لیے انتہائی صبر وتحمل کا مظاہرہ کرنا ہو گا۔ دوسرے کی بدسلوکی فراموش کر کے اس پر احسان کرنے کے لیے اپنے نفس پر بھاری پتھر رکھنا ہو گا اور جو لوگ ایسا کر لیں وہ یقیناً دنیا و آخرت میں انتہائی خوش نصیب اور سعادت مند ہوں گے۔[1]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ رہنمائی بھی فرمائی ہے کہ اگر شیطان تمھارے دل میں یہ خیال ڈالے کہ دوسرے کی بد اخلاقی کا جواب بد اخلاقی سے دینا چاہیے اور اس کی بدسلوکی پر اس سے بدلہ لینا چاہیے تو آپ شیطان کے ان وسوسوں سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کریں۔ وہ آپ کی دلی کیفیت کو جانتا ہے اور آپ کی وہ دعائیں بھی سنتا ہے جس سے آپ اس کی پناہ کے طلبگار رہیں۔

شیطان کے ساتھ نرمی برتنے کا کوئی فائدہ نہیں، اس لیے اس کی برائی کا جواب احسان مندی سے نہیں دینا چاہیے کیونکہ شیطان تو اسی بات پر خوش ہو گا کہ آپ اس کی روش پر چلتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کریں۔ اس کے سوا وہ آپ سے کچھ نہیں چاہے گا۔

لیکن انسانوں میں سے جو آپ کا دشمن ہے، اس کے ساتھ اگر آپ احسان کریں گے تو اس کا فائدہ ہو گا۔ اسی طرح اگر آپ اس کی برائی کا جواب برائی سے نہ دیں، تب بھی یہ اسلوب فائدہ مند ہو گا، اسی لیے شریعت اسلامیہ نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ اگر کوئی انسان ہمارے ساتھ بُرا سلوک کرتا ہے تو ہم اس کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ لیکن اگر شیطان ہمارے ساتھ برائی کرتا ہے تو اس صورت میں صرف ایک ہی چیز مفید ثابت ہو سکتی ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی پناہ حاصل کریں تاکہ وہ ہمیں شیطان کے شر سے محفوظ رکھے۔[2]

قرآن حکیم نے بڑے واضح انداز میں بتا دیا ہے کہ

1 تفسیر ابن کثیر: 4/101,100۔ 2 المستفاد من قصص القرآن الكريم لعبد الكريم زيدان: 1/86.

انسان اور شیطان کا آپس میں کیا تعلق ہے؟

شیطان کے شر سے محفوظ رہنے کے کیا ذرائع ہیں؟

شیطان کس طرح اولادِ آدم کو بہکاتا ہے؟

قرآن حکیم نے یہ بھی بتا دیا کہ آخرت میں شیطان ان تمام لوگوں سے براءت کا اعلان کرے گا جن کو اس نے گمراہ کر کے راہِ حق سے دور کیا ہو گا۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ مَاۤ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ؕ اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَاۤ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ؕ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ ﴾

”اور جب (جنت یا جہنم کے) معاملے کا فیصلہ کر دیا جائے گا تو شیطان کہے گا: بے شک اللہ نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا اور میں نے تم سے جو وعدہ کیا تھا اس کی میں نے خلاف ورزی کی اور میرا تم پر کوئی زور نہ تھا مگر یہ کہ میں نے تمھیں دعوت دی تو تم نے میری بات مان لی، چنانچہ تم مجھے ملامت نہ کرو اور اپنے آپ کو ملامت کرو۔ میں تمھارا فریاد رس نہیں اور نہ تم میرے فریاد رس ہو۔ بلاشبہ میں تو اس کا انکار کرتا ہوں جو تم اس سے پہلے مجھے (اللہ کا) شریک ٹھہراتے تھے۔ بے شک ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے۔“[1]

یہ ایک مختصر سا خاکہ ہے کہ ابلیس کی حقیقت کیا ہے اور اس ملعون دشمن کے بارے میں صحابۂ کرام کا کیا تصور تھا؟

کائنات کے متعلق صحابہ کا نظریہ

رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کو مسلسل قرآن حکیم کی تعلیم دیتے رہے اور قرآن حکیم کی

[1] إبراهيم 14:22.

آیات کی روشنی میں انھیں صحیح عقائد و نظریات سمجھاتے رہے۔ اس کائنات اور فانی و لازوال زندگی کے بارے میں درست نقطۂ نظر بتاتے رہے۔ آپ نے انھیں بتایا کہ اس کائنات کا آغاز کیسے ہوا اور اس کا انجام کیا ہوگا۔ فرمان ربانی ہے:

﴿قُلْ اَىِٕنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِيْۤ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآىِٕلِيْنَ ۝ ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ قَالَتَاۤ اَتَيْنَا طَآىِٕعِيْنَ ۝ فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا ؕ وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ ۖ وَحِفْظًا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝﴾

''آپ کہہ دیجیے: کیا تم واقعی اس ذات کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں پیدا کیا اور تم اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو؟ وہ تو جہانوں کا رب ہے۔ اور اس نے اس (زمین) میں اس کے اوپر مضبوط پہاڑ بنائے اور اس میں برکتیں رکھیں اور اس میں (رہنے والوں کے لیے) اس کی غذاؤں کا (ٹھیک) اندازہ کیا، محتاجوں کے لیے یکساں طور پر (یہ سارا کام) چار دنوں میں (مکمل ہوا)، پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جبکہ وہ دھواں تھا، تب اللہ نے اس سے اور زمین سے کہا: تم دونوں خوشی یا ناخوشی سے آؤ تو ان دونوں نے کہا: ہم دونوں خوشی خوشی حاضر ہیں، پھر (اللہ نے) انھیں دو دنوں میں سات آسمان بنادیا اور ہر آسمان میں اس کا کام الہام کردیا اور ہم نے آسمان دنیا کو چراغوں (ستاروں) سے زینت دی اور (اس کی خوب) حفاظت کی، یہ نہایت غالب، خوب جاننے والے کی تدبیر ہے۔''[1]

ان آیات کریمہ نے اس کائنات کی تین حقیقتوں کی جانب اشارہ کیا ہے:

1 حٰمٓ السجدة 41:9-12.

(i) آسمان تخلیق سے قبل محض ایک دھواں تھا۔ زمین کی تخلیق اور اس میں سامانِ خوراک مہیا کرنے کا کام چار دنوں میں ہوا۔

(ii) اس کائنات کا اصل مادہ (ابتدائی حالت میں) دھواں تھا۔

(iii) زمین و آسمان کی تخلیق کے تمام تر مراحل چھ ایام پر مشتمل ہیں۔[1]

قرآن حکیم نے ایک اہم حقیقت کو واضح کر دیا کہ یہ کائنات ستاروں، سیاروں اور کہکشاں کی شکل میں آنے سے قبل کس حالت میں تھی۔ انسان اپنے وسائل سے محض اندازے ہی قائم کر سکتا تھا اور اس حقیقت تک کبھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۠ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا ○﴾

”میں نے انھیں نہ آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں گواہ بنایا اور نہ خود ان کے پیدا کرنے میں اور میں گمراہ کرنے والوں کو بازو (مددگار) بنانے والا نہیں۔“[2]

قرآن حکیم نے اشارہ کیا ہے کہ کائنات کا مادہ ایک ہی ہے اور پھر نہایت وضاحت کے ساتھ اس کی حقیقتوں کو بیان کیا ہے۔ فرمان ربانی ہے:

﴿اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ۭ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۭ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ○﴾

”کیا کافروں نے نہیں دیکھا (غور کیا) کہ بے شک آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے ان دونوں کو الگ الگ کر دیا اور ہم نے پانی سے ہر زندہ شے بنائی، کیا پھر وہ ایمان نہیں لاتے؟“[3]

صحابۂ کرام نے سورۂ حم السجدہ کی آیات سے یہی مفہوم حاصل کیا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کی تخلیق، اس میں سامانِ خوراک مہیا کرنے اور ان میں برکتیں رکھنے کا کام چار ایام

1 مباحث في إعجاز القرآن لمصطفىٰ مسلم، ص: 177. 2 الكهف 51:18. 3 الأنبيآء 30:21.

میں کیا اور یہ سب کچھ آسمان کی تشکیل اور اسے سات آسمان بنانے سے قبل ہوا۔ صحابۂ کرام نے یہ حقیقت خالق ارض وسما کی وحی سے معلوم کی۔[1]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

''(اللہ تعالیٰ نے) زمین کو دو ایام میں تخلیق فرمایا، پھر اس نے آسمان بنایا، پھر اس نے آسمان کی طرف متوجہ ہو کر اسے مزید دو دنوں میں درست فرمایا، پھر اس نے زمین کو بچھایا۔ زمین کو بچھانے سے مراد یہ ہے کہ اس نے زمین سے پانی نکالا اور نباتات پیدا کیں اور مزید دو ایام میں پہاڑ، اونٹ، ٹیلے اور جو کچھ بھی ان دونوں (زمین و آسمان) کے درمیان ہے پیدا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿دَحٰىهَا﴾ اور ﴿خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ﴾ کا یہی مفہوم ہے۔ زمین اور زمین میں جو کچھ ہے اسے چار دنوں میں بنایا گیا اور سارے آسمان دو ایام میں۔''[2]

قرآن کریم نے اپنی عظیم آیات میں صحابۂ کرام کے لیے یہ بات واضح کی کہ اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے آسمان بنائے، زمین میں بڑے بڑے پہاڑ رکھ دیے۔ قرآن حکیم نے سورج، چاند، ستاروں اور کائنات کے دیگر حقائق کے بارے میں گفتگو کی۔ پہاڑوں کے متعلق تفصیل سے روشنی ڈالی۔ ان کے فوائد بیان کیے۔ ان کی ضرب الامثال بیان کیں۔ ان پر غور و فکر کی دعوت دی اور یہ بھی بتایا کہ عنقریب اللہ تعالیٰ ان پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دے گا۔ قرآن حکیم نے سمندری دنیا کو موضوع گفتگو بنایا۔ سمندر میں چلنے والی کشتیوں کا تذکرہ کیا۔ سمندروں سے حاصل ہونے والی دولت کا ذکر کیا۔ قرآن حکیم نے فضا میں پائی جانے والی اشیاء، مثلاً: کڑکتی ہوئی بجلیوں، بادلوں، بارشوں اور ہواؤں کا تذکرہ کیا۔ فرمان ربانی ہے:

---

[1] مباحث في إعجاز القرآن لمصطفىٰ مسلم، ص: 177-179. [2] صحيح البخاري، حديث: 4816 تعليقا.

﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ وَيَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۝﴾

''اللہ وہ ذات ہے جو ہوائیں بھیجتا ہے، پھر وہ بادل اٹھاتی ہیں، پھر اللہ اسے آسمان میں جس طرح چاہتا ہے پھیلاتا ہے اور وہ اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے، پھر آپ بارش دیکھتے ہیں کہ اس کے اندر سے نکلتی ہے، پھر جب وہ اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے بارش برساتا ہے تو اس وقت وہ خوش ہو جاتے ہیں۔''[1]

قرآن حکیم نے جہاں ہر پہلو سے اس کائنات اور زندگی کی حقیقتوں کو آشکارا کیا ہے، وہاں حیوانات کے حقائق سے بھی پردہ اُٹھایا ہے کیونکہ حیوانات کی دنیا بھی اپنی اہمیت کے لحاظ سے کچھ کم نہیں۔ قرآن حکیم ہماری نگاہوں کو ان فوائد کی جانب متوجہ کرتا ہے جو کہ انسان ان حیوانات سے حاصل کرتا ہے۔ کبھی انھیں اپنا تابع فرمان بنا کر ان سے سواری کا کام لیتا ہے تو کبھی بوجھ اٹھانے کا۔ کبھی ان کے دودھ اور گوشت سے خوراک حاصل کرتا ہے تو کبھی ان کی اون اور کھالوں سے زیب و زینت کا سامان اور لباس بناتا ہے۔ ان حیوانات کو انسان کا تابع، مطیع اور خادم بنا دیا گیا ہے۔

نبی کریم ﷺ کی بعثت سے قبل انسان اس کائنات اور اس میں بسنے والی مخلوقات سورج، چاند اور ستاروں کو دیکھتا تو ضرور تھا لیکن ان کے بارے میں صحیح تصوّرات اور نظریات سے بے بہرہ تھا۔ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ اس کائنات میں خالق نے کون کون سے نظام وضع کیے ہوئے ہیں اور کن حکمتوں اور مقاصد کے لیے اس نے انھیں پیدا فرمایا ہے۔ اسے یہ بھی احساس نہ تھا کہ ہر چیز کس طرح اپنے بنانے والے کے بے عیب ہونے اور اوصاف عالیہ کے مالک ہونے کی شہادت دے رہی ہے۔ قرآن حکیم نے کائنات اور تمام مخلوقات پر غور و فکر اور تدبر کرنے کی دعوت دی اور انھیں بتایا کہ ہر چیز اپنے خالق کی

[1] الرُّوم 48:30.

تسبیح و تقدیس بیان کرتی ہے مگر تم ان کی تسبیح کو سمجھ نہیں پاتے۔ فرمانِ ربانی ہے:

﴿ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۚ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۗ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ○ ﴾

''ساتوں آسمان اور زمین اور جو (مخلوق) ان میں ہے اس (اللہ) کی تسبیح کرتے ہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ تسبیح نہ کرتی ہو لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے، بے شک وہ نہایت حوصلے والا، بہت بخشنے والا ہے۔''[1]

قرآن حکیم نے انھیں بتایا کہ حیوانات میں یہ وصف ہے کہ وہ انسان کے فرماں بردار اور مطیع ہوتے ہیں۔ اگر ان کی فطرت میں یہ وصف نہ ہوتا تو انسان کبھی ان پر تسلط حاصل نہ کرسکتا، اس لیے اس مُنعِم کا شکر ادا کرنا ضروری ہے جس نے ان حیوانات کی فطرت میں انسان کی فرماں برداری کا وصف پیدا فرمایا۔[2] ارشادِ ربانی ہے:

﴿ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ○ وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا يَاْكُلُوْنَ ○ وَلَهُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ ۚ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ○ ﴾

''کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اپنے ہاتھوں سے جو چیزیں بنائیں ان میں یقیناً ہم نے ان کے لیے چوپائے بھی پیدا کیے؟ پھر وہ ان کے مالک (بن گئے) ہیں۔ اور ہم نے انھیں ان کے تابع کر دیا، چنانچہ ان میں سے کچھ ان کی سواریاں ہیں، اور ان میں سے کچھ کو وہ کھاتے ہیں۔ اور ان کے لیے ان (چوپایوں) میں (اور بھی) فائدے اور پینے کی چیزیں ہیں، کیا پھر وہ شکر نہیں کرتے؟''[3]

قرآن حکیم نے حیوانات کی روزی کے معاملے میں غور وفکر کرنے کی دعوت دی ہے کہ انسان اپنی روزی اور معیشت کے لیے بڑی سوچ بچار اور منصوبہ بندی کرتا ہے، پھر اس

1 بني إسرآءيل 17:44. 2 مباحث في إعجاز القرآن لمصطفٰی مسلم، ص: 214. 3 يٰسٓ 36:71-73.

کے حصول کے لیے بڑے پاپڑ بیلتا ہے، پھر جس طریقے سے بھی ہاتھ لگ جائے اسے مستقبل کے لیے ذخیرہ کرنے کی فکر میں لگ جاتا ہے جبکہ حیوانات کے پاس نہ سوچ بچار کی قوت ہے نہ منصوبہ بندی کی صلاحیت، اس لیے اس ذات نے جو دانا بھی ہے اور ہر چیز سے باخبر اور بااختیار بھی، اسی نے ان کی روزی کے انتظامات فرمائے ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۖ اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝﴾

''اور کتنے ہی (زمین پر) چلنے پھرنے والے ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے، اللہ انھیں اور تمھیں بھی رزق دیتا ہے اور وہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔''[1]

پروردگار کا اپنی مخلوقات کے ساتھ یہی انداز ہونا چاہیے کہ وہ ہر بات سے باخبر ہو، ہر چیز اس کی دسترس میں ہو اور وہ ہر حال میں روزی کا ذمہ دار ہو۔

ہر ذی روح کو ہر جگہ روزی مل رہی ہے، خواہ وہ سمندروں کی گہرائی میں ہو، تپتے صحراؤں میں ہو، برف کے پہاڑوں (گلیشیرز) میں ہو، چٹانوں کی تہ میں ہو یا ہواؤں اور فضاؤں میں ہو۔ سب کا اندراج ایک رجسٹر میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی سے غافل نہیں۔ فرمان ربانی ہے:

﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۭ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝﴾

''اور زمین پر چلنے والے ہر جاندار کا رزق اللہ کے ذمے ہے اور وہ جانتا ہے اس کی قرارگاہ اور اس کے دفن ہونے کی جگہ کو۔ ہر چیز واضح کتاب میں (تحریر) ہے۔''[2]

جانور اور حشرات الارض جو شکل و صورت اور چال ڈھال میں ایک دوسرے سے مختلف

1 العنکبوت 60:29. 2 ھود 6:11.

ہیں، قرآن حکیم نے ان کی جانب توجہ دلاتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ انسان کی طرح ان کے بھی گروہ اور کنبے ہیں۔[1] ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّآ أُمَمٌ أَمْثَالُكُمْ ۚ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ۚ ثُمَّ إِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ○ ﴾

''اور زمین پر چلنے والا کوئی جانور اور اپنے دونوں پروں سے اڑنے والا کوئی پرندہ ایسا نہیں جو تمھاری طرح (الگ) امت نہ ہو، ہم نے کتاب میں کوئی چیز نہیں چھوڑی (جس کا ذکر نہ کیا ہو)، پھر وہ سب اپنے رب کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے۔''[2]

قرآن حکیم نے اس کائنات اور اس میں پائی جانے والی مخلوقات و عجائبات کے بارے میں صحابۂ کرام کے افکار و تصورات کو صحیح سمت عطا کی اور انھیں اس زوال پذیر زندگی کی حقیقت سے آگاہ کیا۔ نبی کریم ﷺ ہمیشہ ان کے دلوں میں یہ حقیقت جاگزیں کرتے رہے کہ دنیا کی زندگی کا انجام کیا ہوگا اور اس میں کامیابی کا راستہ کون سا ہے۔ آپ ﷺ کو یقین تھا کہ جو شخص بھی اپنے انجام سے واقف ہو جائے اور اسے نجات اور کامیابی کا راستہ مل جائے وہ اپنی تمام قوتوں اور وسائل کے ساتھ اس راستے پر گامزن ہونے کی جستجو کرے گا تاکہ کل کامیابی و کامرانی اس کے قدم چومے۔ آپ نے اس سلسلے میں درج ذیل امور کو نہایت اہتمام کے ساتھ واضح کیا:

(i) دنیاوی زندگی جس قدر بھی طویل ہو جائے انجام کار اس نے ختم ہونا ہے۔ اور دنیا کا سامان جتنا بڑھ جائے حقیقت میں وہ قلیل اور حقیر ہی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے اس بات کو یوں واضح فرمایا:

[1] مباحث في إعجاز القرآن لمصطفىٰ مسلم، ص: 216. [2] الأنعام 6:38.

﴿اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ اَتٰىهَآ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝﴾

''بے شک دنیاوی زندگی کی مثال تو اس پانی کی سی ہے جسے ہم نے آسمان سے اتارا، پھر اس کے ساتھ زمین کی نباتات مل جل گئیں جس میں سے انسان اور چوپائے کھاتے ہیں، حتی کہ جب زمین نے اپنی رونق پکڑی اور مزین ہوگئی اور زمین والوں نے سمجھا کہ بے شک وہ اس (فصل کاٹنے) پر قادر ہیں تو ہمارا حکم (عذاب) رات یا دن کو (اچانک) آ گیا، چنانچہ ہم نے اسے کٹی ہوئی کھیتی کی طرح کر دیا، گویا کل وہ تھی ہی نہیں، اسی طرح ہم (اپنی) آیتیں کھول کر بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔''[1]

اس آیت کریمہ میں دنیاوی زندگی کی مثال دس چیزوں کے مجموعے کے ساتھ تشبیہ کی صورت میں بیان کی گئی ہے، اگر ان میں سے ایک چیز بھی کم کر دی جائے تو تشبیہ مکمل نہیں ہوتی۔ دنیا کی زندگی، جو بہت جلد بیت جاتی ہے اور دنیا کی نعمتیں اور مال و دولت جو بہت جلد ختم ہو جاتا ہے، پھر بھی لوگ اس کے دھوکے میں آجاتے ہیں، اسے بارش کے پانی سے تشبیہ دی گئی جس سے طرح طرح کے پودے، پھل اور پھول پیدا ہوتے ہیں، لباس فاخرہ سے آراستہ دلہن کی طرح زمین بھی خوبصورت اور خوشنما بن جاتی ہے، پھر جب زمین والوں کی ساری اُمیدیں اس سے وابستہ ہو جاتی ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ اب فصل ہر قسم کی آفت سے محفوظ ہوگئی ہے تو اچانک اللہ کا عذاب آتا ہے اور سب کچھ تہس نہس ہو جاتا ہے جیسے اس سے قبل وہاں کوئی چیز تھی ہی نہیں۔[2]

1 يونس 24:10. 2 الإتقان للسيوطي: 70/2.

رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کو یہ فرمانِ ربانی بھی سنایا:

﴿وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا﴾

''اور ان کے لیے دنیاوی زندگی کی مثال بیان کیجیے: جیسے پانی (مینہ)، جسے ہم نے آسمان سے نازل کیا، پھر اس سے زمین کی نباتات خوب مل جل گئی، پھر وہ چورا چورا ہوگئی جسے ہوائیں اڑالے جاتی ہیں اور اللہ ہر شے پر بہت قدرت رکھنے والا ہے۔''[1]

زمین کی تمام پیداوار پھل، پھول، کلیاں اور ہر طرح کا سبزہ بالآخر خشک ہو کر ریزہ ریزہ بن جاتا ہے، ہوائیں جس طرح چاہیں اسے اڑائے پھرتی ہیں، کبھی دائیں طرف پھینکتی ہیں اور کبھی بائیں طرف، مگر لوگ بھول جاتے ہیں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ جو چاہے پیدا کرسکتا ہے اور جب چاہے اسے فنا بھی کرسکتا ہے۔[2]

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ؕ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطٰمًا ؕ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾

''تم جان لو کہ دنیاوی زندگی محض کھیل تماشا اور زینت ہے اور آپس میں فخر کرنا اور ایک دوسرے پر اموال و اولاد میں کثرت جتانا ہے۔ (اس کی مثال یوں ہے) جیسے بارش کہ اس سے (پیدا شدہ) نباتات کسانوں کو خوش کرتی ہیں، پھر وہ خشک ہوجاتی ہیں تو آپ اسے زرد شدہ دیکھتے ہیں، پھر وہ چورا چورا ہوجاتی ہیں۔ اور آخرت میں (کفار کے لیے) شدید عذاب ہے اور (مومنوں کے لیے) اللہ کی طرف

1 الكهف 18:45. 2 تفسير القاسمي: 11/49.

سے مغفرت اور رضامندی ہے اور دنیاوی زندگی تو بس دھوکے کا سامان ہے۔''[1]

دنیاوی زندگی کی حقارت بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دُنیا کی زندگی محض سامان تفریح ہے۔ دیکھنے میں بڑی خوشنما ہے مگر اس کی حقیقت کچھ نہیں۔ مال و اولاد میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی جستجو اور حسب ونسب میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے کا شوق ہے۔ جس طرح بارش برسنے کے بعد پیدا ہونے والی پیداوار کاشتکاروں کی خوشی کا باعث ہوتی ہے، اسی طرح دنیا کی زندگی کافروں کے لیے شادمانی کا سبب بنتی ہے۔ وہ دنیا کے بہت زیادہ حریص اور شوقین ہوتے ہیں مگر جس طرح زمین میں اُگی سرسبز و شاداب فصل خشک ہو کر زرد بن جاتی ہے اور چارے میں تبدیل ہو جاتی ہے، اسی طرح دنیا کا انجام بھی فنا اور زوال ہے۔ دنیا کے ختم ہونے پر آخرت کا آغاز ہو گا (اور آخرت کی زندگی اور نعمتیں بے مثال اور لازوال ہیں)، اس لیے رب ذوالجلال نے ہمیں دنیا کی محبت سے بچنے اور آخرت بہتر بنانے کی ترغیب دی ہے اور بتایا ہے کہ آخرت میں دو ہی چیزیں ہوں گی: عذابِ شدید یا رضوان و مغفرت۔ اور آخرت کے مقابلے میں دنیا کی ساری دولت بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ مگر دنیا کے طالب اور حریص اس کے فریب میں مبتلا ہیں اور آخرت کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ وہ سب کچھ دنیا اور دنیا کی دولت ہی کو سمجھ رہے ہیں۔[2]

ان آیات کریمہ نے دنیا کی حقیقت کو نہایت واضح کر دیا ہے کہ یہ دنیا اپنے تمام تر سامانِ زینت اور متاعِ زیست حتی کہ انسانی خواہشات کی مکمل تکمیل کے باوجود بھی آخرت کی نعمتوں کے مقابلے میں نہایت حقیر اور ادنیٰ ہے۔ صحابۂ کرام نے دنیا کی اس حقیقت کو جان لیا تھا اور رسول اللہ ﷺ بھی انھیں ہمیشہ یہ یاد دہانی کراتے اور سمجھاتے رہے کہ ان کا دنیا میں آنے کا مقصد اور ذمہ داری کیا ہے اور ان کا اللہ کے ہاں کیا مقام ہے یہاں

1 الحدید 20:57۔ 2 تفسیر ابن کثیر: 313,312/4۔

تک کہ یہ باتیں ان کے قلوب واذہان میں پختہ ہوگئیں۔ انھوں نے اپنی ذمہ داری پہچان لی۔ آپ ﷺ کی اعلیٰ تربیت کی بدولت ہی صحابہؓ کرام کے دلوں میں دلیری، بہادری اور عزیمت پیدا ہوئی۔ وہ دن رات اپنی تمام تر صلاحیتوں اورقوتوں کے ساتھ سرگرم عمل رہے۔ ان میں کوئی کمزوری اور لچک پیدا نہیں ہوئی۔ سستی اور کوتاہی ان کے قریب نہ پھٹکی۔ ایک اللہ کے سوا کسی کا خوف انھیں دامن گیر نہ ہوا۔ مال و دولت کا لالچ اور اقتدار کی کشش انھیں اپنی ذمہ داریوں اور فرائض سے غافل نہ کرسکی۔ وہ دنیا کی سعادت اور آخرت کی کامیابی ونجات کے حصول کی خاطر سرگرداں رہے۔[1]

دعوت کے میدان میں کام کرنے والوں کی اکثریت کے دل سے یہ حقیقت محو ہو چکی ہے۔ وہ اس دنیا کی زندگی اوراس کے سازو سامان میں غرق ہو چکے ہیں۔ دنیا کی محبت ان کے دلوں میں غالب آچکی ہے، وہ للچائی نظروں کے ساتھ اس کے پیچھے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ جب انھیں کوئی تھوڑی سی چیز مل جاتی ہے تو ان کی حرص و ہوس مزید بڑھ جاتی ہے۔ دنیا کے ساتھ چمٹے ہونے کی وجہ سے نہ وہ سیر ہوتے ہیں اور نہ ان کی خواہش کم ہوتی ہے۔ یہ چیز امت کی ترقی اور دعوتی امور کے لیے بہت بڑا المیہ ہے، جبکہ شریعت کی مقرر کردہ حدود میں رہتے ہوئے دنیا سے فائدہ اٹھانا اور اسے آخرت سنوارنے کے لیے ذریعہ اور وسیلہ بنانا کوئی عیب نہیں بلکہ یہ ایک پسندیدہ عمل ہے۔

1 منهج الرسول في غرس الروح الجهادية للسيد محمد نوح، ص:19-34.

باب 2

مکی دور میں عبادات اور اخلاق عالیہ کی تعلیم و تربیت

اُمت کے ہراول دستے کا عبادات کے ذریعے تزکیۂ نفس

ارشاد ربانی ہے:

﴿وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ ۖ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا﴾

''اور وہ آپ سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہیے: روح میرے رب کے حکم سے ہے اور تمھیں تو بہت ہی تھوڑا علم دیا گیا ہے۔''[1]

ایک اور مقام پر یوں فرمایا:

﴿فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ﴾

''چنانچہ جب میں اسے ٹھیک بنادوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں، تو تم اس کے آگے سجدہ کرتے ہوئے گر پڑنا۔''[2]

رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کی تربیت کے سلسلے میں تزکیۂ روح کا خاص خیال رکھا ہے اور قرآنی تعلیمات کی روشنی میں اس مقصد کے حصول کے تمام ذرائع ان کے لیے واضح کر دیے جن میں سے چند اہم درج ذیل ہیں:

کائنات پر غوروفکر: اللہ تعالیٰ کی کتاب (قرآن حکیم) پر غوروفکر کے ساتھ ساتھ اس کی

[1] بنیٓ إسرآء یل 85:17. [2] صٓ 72:38.

کائنات اور تمام مخلوقات پر بھی غور وفکر کیا جائے تا کہ خالق کائنات کی عظمتوں اور اس کی حکمتوں کا شعور حاصل ہو۔

فرمان ربانی ہے:

''بے شک تمھارا رب وہ اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر مستوی ہوگیا۔ وہ دن کو رات سے اس طرح ڈھانپتا ہے کہ وہ (رات) جلدی سے اس (دن) کو آلیتی ہے اور اس نے سورج، چاند اور تارے اس طرح پیدا کیے کہ وہ سب اس (اللہ) کے حکم کے پابند کر دیے گئے ہیں۔ آگاہ رہو! پیدا کرنا اور حکم صادر کرنا اسی کے لیے روا ہے، اللہ رب العالمین بہت بابرکت ہے۔''[1]

علم الٰہی پر غور وفکر: علم الٰہی کے بارے میں سوچ بچار کرنا کہ اس کی ہر چیز اس کے دائرۂ علم میں ہے، اس کا علم کائنات کی ہر چیز پر محیط ہے، ہر چیز جو نگاہوں سے اوجھل ہے یا نگاہوں میں آنے والی ہے، اس کے دائرۂ علم سے باہر نہیں۔ جب انسان اس بات کو اپنے تصور میں لاتا ہے تو اس کے قلب و روح عظمت الٰہی سے لبریز ہو جاتے ہیں اور دل کے تمام شکوک و شبہات ختم ہو جاتے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ۭ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ○ وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰٓى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○﴾

''اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں، انھیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا اور وہ جانتا ہے جو کچھ خشکی اور تری میں ہے اور کوئی پتا ایسا نہیں گرتا جسے وہ جانتا نہ ہو اور زمین کے اندھیروں میں کوئی دانہ (ایسا) نہیں (چھوٹتا جسے وہ جانتا نہ ہو) اور

1 الأعراف 54:7.

کوئی تر چیز اور کوئی خشک چیز ایسی نہیں جو واضح کتاب میں (لکھی ہوئی) نہ ہو اور وہی ہے (اللہ) جو رات کو تمھیں فوت کرتا ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم دن میں کرتے ہو، پھر (دوسرے) دن میں تمھیں اٹھاتا ہے تاکہ (زندگی کی) مقررہ مدت پوری کی جائے، پھر اسی کی طرف تمھاری واپسی ہے، پھر وہ تمھیں بتادے گا جو تم کرتے رہے ہو۔''[1]

اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کے مقاصد: روحانی تربیت کا سب سے بڑا اور اہم ترین ذریعہ عبادت الٰہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے آپ کو نہایت حقیر اور ذلیل ترین درجے تک لے جانا عبادت ہے اور ایسی عبادت ایک اللہ کے سوا کسی اور کے لیے جائز نہیں۔ اسی لیے رب ذوالجلال نے فرمایا:

﴿ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ﴾

''اور آپ کے رب نے فیصلہ کر دیا کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔''[2]

وہ عبادات جن سے روح نشو و نما پاتی ہے اور نفس آلودگیوں سے پاک ہو جاتا ہے، دو طرح کی ہیں:

پہلی قسم: فرض عبادت، مثلاً: طہارت (غسل، وضو)، نماز، روزہ، زکاۃ اور حج وغیرہ۔

دوسری قسم: وہ امور جو بندگی کے وسیع معنی میں داخل ہیں۔ انسان اپنے خالق و مالک اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے اور اسے خوش کرنے کے لیے جو کام کرتا ہے یا کسی کام کو چھوڑ دیتا ہے، اسی طرح کوئی نظریہ یا تصور اپنے دل میں پیدا کرتا ہے یا دل سے نکال باہر کرتا ہے، یہ سب امور عبادت میں شامل ہیں جن پر انسان کو اجر و ثواب بھی حاصل ہوگا اور اس کی بہترین روحانی تربیت بھی ہوگی۔[3]

---

1 الأنعام6:60,59. 2 بني إسرآء يل 23:17. 3 فقه الدعوة إلى الله لعبد الحليم محمود: 472,471/1.

اسلام میں یہ بات نہایت ضروری ہے کہ نماز، تلاوت قرآن، ذکر الٰہی اور تسبیح و تحمید کے ساتھ روح کا تزکیہ کیا جائے، اس لیے کہ نفسِ انسانی جب تک اپنی آلودگیوں سے پاک نہیں ہو جاتا اور اس کا اپنے خالق کے ساتھ تعلق قائم نہیں ہو جاتا اس وقت تک وہ اپنی شرعی ذمہ داریوں کو ادا نہیں کر سکتا۔ عبادت اور اس پر دوام کی وجہ سے روح بیدار رہتی ہے، اسے ہر قسم کی خوراک اور توانائی حاصل ہوتی ہے اور ایسی تحریک پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے اس کے لیے احکام الٰہیہ کو بجا لانا آسان ہو جاتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ترتیب نزولی کے لحاظ سے تیسری سورت میں رسول کریم ﷺ کو نماز، ذکر اور تلاوتِ قرآن کا حکم فرمایا ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ○ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ○ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ○ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ○ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ○ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ○ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ○ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ○﴾

”اے چادر میں لپٹنے والے! رات میں قیام کیجیے مگر تھوڑا سا، (یعنی) رات کا نصف، یا اس سے تھوڑا سا کم کیجیے، یا اس پر (کچھ) زیادہ کیجیے اور قرآن خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھیے، یقیناً ہم جلد آپ پر ایک بھاری بات ڈالیں گے، بلاشبہ رات کا اٹھنا (نفس کے) کچلنے میں زیادہ سخت اور دعا و ذکر کے لیے مناسب تر ہے، یقیناً دن میں آپ کے لیے بہت مصروفیت ہے اور اپنے رب کا نام ذکر کیجیے اور سب سے کٹ کر اسی کی طرف متوجہ ہو جائیے۔“ [1]

نہایت اہم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے اور مشکل مہم جوئی کی اہلیت حاصل کرنے کے لیے قیام اللیل، ذکر الٰہی اور تلاوتِ قرآن حکیم پر ہمیشگی بہت ضروری ہے، اس لیے

1 المزمّل 73:1-8.

رسول اللہ ﷺ صحابہ کے اسلام قبول کرتے ہی ارشاد ربانی کی روشنی میں عبادات کے ذریعے ان کی روحانی پاکیزگی اور تزکیہ وتربیت کا کام شروع کر دیتے تھے۔[1]

رسول اللہ ﷺ کے صحابہ نماز کی ادائیگی کے لیے پہاڑی گھاٹیوں کا رخ کرتے تھے اور (اسلام دشمنوں سے) اپنی نمازیں مخفی رکھتے تھے۔[2]

اسلام کے ابتدائی زمانے میں جب رسول اللہ ﷺ کو اپنے صحابہ کے بارے میں یہ خوف دامن گیر ہوا کہ کفار مکہ انھیں کھلے عام تلاوتِ قرآن اور نماز کی ادائیگی کی اجازت نہیں دیں گے (بلکہ ان پر تشدد کریں گے) تو آپ ﷺ ان کو دار ارقم (جیسی خفیہ پناہ گاہ میں) لے جاتے ہیں، وہاں انھیں نماز پڑھاتے ہیں اور قرآن حکیم کی تعلیم دیتے ہیں۔ اگر نماز، تلاوت قرآن اور عبادات کے ذریعے روحانی تزکیے کی اہمیت نہ ہوتی تو خوف کی وجہ سے آپ اپنے صحابہ کو یہ چیزیں چھوڑنے کی اجازت دے دیتے۔ لیکن اس کے باوجود کہ قریش کو اس جگہ کا علم ہوگیا تھا جہاں آپ اپنے صحابہ کو نماز پڑھاتے تھے، پھر بھی آپ نے نماز اور تلاوت قرآن کو ترک نہیں کیا۔[3]

مکی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اقامتِ صلاۃ کی بہت زیادہ ترغیب دی ہے اور ان لوگوں کی تعریف فرمائی ہے جو نمازوں میں خشیت اختیار کرتے ہیں، آرام دہ بستروں کو چھوڑ کر ساری ساری رات ذکر الٰہی میں گزارتے ہیں اور ان لوگوں کی بھی تعریف فرمائی جو اللہ کو پکارتے ہیں، اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں اور اسے ہر لحظہ یاد رکھتے ہیں۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ○﴾

”مومن یقیناً فلاح پا گئے، وہ جو اپنی نماز میں عاجزی کرنے والے ہیں۔“[4]

ایک اور مقام پر یوں فرمایا:

1 أهمية الجهاد في نشر الدعوة لعلي العلياني، ص: 69. 2 سبل الهدىٰ والرشاد للصالحي: 404/2. 3 أهمية الجهاد في نشر الدعوة لعلي العلياني، ص: 70. 4 المؤمنون 23:1، 2.

﴿تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ○﴾

''ان کے پہلو بستروں سے الگ رہتے ہیں (اور) وہ اپنے رب کو خوف اور امید سے پکارتے ہیں اور جو ہم نے انھیں رزق دیا ہے اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں۔''[1]

رسول اللہ ﷺ کو تاکید کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ۚ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ○﴾

''اور آپ نماز قائم کریں دن کی دونوں طرفوں (صبح و شام) اور رات کی کچھ گھڑیوں میں، بے شک نیکیاں برائیوں کو لے جاتی ہیں۔ یہ (اللہ کا) ذکر کرنے والوں کے لیے نصیحت ہے۔''[2]

اس کے علاوہ سورۂ بنی اسرائیل (79,78:17)، طٰہٰ (130:20 و 132) اور قٓ (40,39:50) میں بھی اس طرح کی آیات موجود ہیں۔

ان آیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جب راہِ نجات نظروں سے اوجھل ہو اور انسان مشکلات میں گھرا ہوا ہو تو اس وقت بہترین ہتھیار یہ ہوتا ہے کہ انسان کثرت سے نماز پڑھے، اپنے رب کو یاد کرے، تلاوتِ قرآن کرے، صرف ایک اللہ کے سامنے گڑگڑائے اور زیادہ سے زیادہ دعا کرے۔[3]

عبادات میں سب سے پہلا درجہ نماز کا ہے اور یہ ایک مسلمان کے روحانی تزکیہ میں بہت زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ صحابۂ کرام کی جماعت کو نماز کی وجہ سے جو نمایاں ترین فوائد حاصل ہوئے، ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

احکام الٰہیہ کی فوری تعمیل اور اظہار بندگی: اللہ تعالیٰ نے اپنے ان بندوں کی تعریف کی

---

1 السجدة 16:32. 2 هود 114:11. 3 أهمية الجهاد في نشر الدعوة لعلي العلياني، ص: 72.

ہے جو اس کے احکامات کو قبول کرتے ہیں اور فوراً ان کی تعمیل کرتے ہیں۔ فرمان ربانی ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝﴾

''اور وہ لوگ جنھوں نے اپنے رب (کے حکم) کو مانا اور نماز قائم کی اور ان کا (ہر) کام باہمی مشورے سے ہوتا ہے اور ہم نے انھیں جو کچھ دیا ہے وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔''[1]

اس وقت تک بندگی کا صحیح حق ادا نہیں ہو سکتا جب تک انسان ہر ایک سے کٹ کر صرف ایک اللہ کی طرف رجوع نہ کرے اور اس کا ہر عمل صرف اور صرف اللہ کے لیے نہ ہو۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ۝﴾

''کہہ دیجیے: بے شک میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت، (سب کچھ) اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی (بات یعنی توحید) کا حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں۔''[2]

صحابۂ کرام جانتے تھے کہ نماز کے مراحل میں سے ہر مرحلہ نمازی کی ذات پر ایک خاص اثر ڈالتا ہے اور اس کا روحانی تزکیہ کرتا ہے، اگر نمازی غور و تدبّر کے ساتھ سورۂ فاتحہ پڑھے تو یہ اسے اللہ کی بندگی کا مکمل شعور عطا کرتی ہے۔ جب بندہ یہ آیت پڑھتا ہے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ تو یہ اس شعور کو پختہ کرتی ہے کہ ہر قسم کے کمالات و اوصاف صرف اللہ کے لیے ہیں۔ اس کے پاس جو بھی نعمتیں ہیں وہ اُسی اللہ کی عطا کردہ ہیں۔ اسے اگر نیک اعمال کی توفیق ملی ہے تو وہ بھی اسی کی عطا کردہ ہے۔ پھر اس احساس

1 الشورٰی 38:42۔ 2 الأنعام 163,162:6۔

کے ساتھ بندہ اس کے اسمائے حسنیٰ اور صفات عالیہ کے ساتھ حمد وثنا بجا لاتا ہے۔[1]

پھر جب وہ یہ آیت پڑھتا ہے: ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ إِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ تو اس کے دل میں یہ عقیدہ پختہ ہو جاتا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے سوا کوئی ذات عبادت کے لائق نہیں۔ اور اس کے سوا کوئی مددگار نہیں۔ اگر اس کے علاوہ کسی سے مدد طلب کی گئی تو ذلت و رسوائی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔

پھر بندہ جب اس آیت تک پہنچتا ہے: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ۝﴾ تو گویا وہ اس بات کا اقرار کر رہا ہوتا ہے کہ میں جادۂ حق پر چلنے اور اس پر ثابت قدم رہنے کے لیے بھی تیرا محتاج ہوں اور مجھے اس بات کی ضرورت ہے کہ میری مزید رہنمائی کی جائے اور مجھے اس رہنمائی کے ثمرات بھی حاصل ہوں اور میں ان لوگوں کے طرز عمل سے دور رہوں جو راہِ حق سے بھٹکے ہوئے اور غضب الٰہی کا شکار ہیں۔[2]

پھر نمازی جب رکوع کے لیے جھکتا ہے تو اپنے رب کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے اللہ اکبر کہتا ہے کہ اللہ ہر چیز سے بڑا ہے، پھر اپنی زبان سے اس کی تسبیح بیان کرتا ہے کہ اس کے سوا ہر چیز میں عیب ہو سکتا ہے مگر اس کی ذات ہر عیب سے پاک ہے۔ رکوع میں انسان ہر لحاظ سے، جسمانی طور پر بھی اور قلبی طور پر بھی، اس کے سامنے جھک جاتا ہے، پھر جب سجدہ کرتا ہے تو اپنے جسم کا سب سے زیادہ افضل اور محترم حصہ اللہ کے سامنے عاجزی اور ذلت اختیار کرتے ہوئے اس کی بارگاہ میں رکھ دیتا ہے۔ جسم کے اس ظاہری انکسار کے ساتھ ساتھ دل بھی اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ دل اپنی ساری خواہشات اور چاہتوں کو ختم کر کے اس کے سامنے تواضع اختیار کرتا ہے۔[3]

سجدے کی اس حالت میں انسان اپنے رب کے بہت زیادہ قریب ہو جاتا ہے۔

---

1 منهج الإسلام في تزكية النفس للدكتور أنس أحمد كرزون: 221/1. 2 الموازنة لابن القيم، ص:35-40. 3 الموازنة لابن القيم، ص:43-46، والخشوع في الصلاة لابن رجب، ص:20-22.

سجدے میں جس قدر خشیت الٰہی زیادہ ہوگی اتنا ہی بندہ اپنے رب کے زیادہ قریب ہوگا۔

جیسا کہ فرمان الٰہی ہے: ﴿كَلَّا ۭ لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۝﴾

''ہرگز نہیں! آپ اس (ابوجہل) کی بات نہ مانیں اور سجدہ کریں اور اللہ کا قرب حاصل کریں۔''[1]

حدیث نبوی ہے:

«أَقْرَبُ مَا يَكُونُ الْعَبْدُ مِنْ رَّبِّهِ وَ هُوَ سَاجِدٌ، فَأَكْثِرُوا الدُّعَاءَ»

''بندہ سجدے کی حالت میں اپنے رب کے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے، لہٰذا (سجدہ کی حالت میں) کثرت سے دعا کیا کرو۔''[2]

سجدے کے بعد جب نمازی سیدھا ہوکر بیٹھ جاتا ہے تو گویا اپنے رب کے حضور دوزانو ہوکر اور اپنا آپ اس کے حوالے کرتے ہوئے اپنی زیادتیوں اور معصیتوں پر معذرت کرتا ہے۔ اور اس سے اس کی رحمت ومغفرت کی بھیک مانگتا ہے۔

نماز کے تمام افعال میں اللہ تعالیٰ کے لیے بندگی کا اظہار نمایاں ہوکر سامنے آجاتا ہے۔ اور یہ بات بخوبی نظر آتی ہے کہ بندہ اپنے رب کی جانب کس قدر متوجہ ہے اور اس کی وحدانیت کا اعتراف کرتے ہوئے کس طرح اپنے ایمان کو تقویت پہنچا رہا ہے۔ یہی تزکیۂ نفس کی بنیاد ہے۔

یہ نماز کے وہ عظیم ترین ثمرات ہیں جو ایک نمازی کے لیے زندگی کے تمام راستے روشن کردیتے ہیں اور اس کے دل کو پاکیزگی اور اطمینان بخشتے ہیں۔[3]

بندے کی اپنے رب سے مناجات: رسول اللہ ﷺ نے اس مناجات کی یوں منظر کشی کی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

[1] العلق 19:96. [2] صحيح مسلم، حديث: 482. [3] منهج الإسلام في تزكية النفس للدكتور أنس أحمد كرزون: 222/1.

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں نے نماز اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نصف نصف تقسیم کر دی ہے۔ میرے بندے نے جو کچھ مانگا میں نے عطا کر دیا۔ جب بندہ کہتا ہے: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے بندے نے میری حمد بیان کی۔ اور جب وہ یہ کہتا ہے: ﴿ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے بندے نے میری تعریف اور ثنا بیان کی ہے، پھر جب وہ یہ کہتا ہے: ﴿ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴾ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی ہے، پھر جب وہ یہ کہتا ہے: ﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ○ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ○ ﴾ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: یہ (نصف حصہ) میرے بندے کا ہے اس نے جو کچھ مانگا میں نے اسے عطا کر دیا۔'' [1]

صحابۂ کرام نے نبی کریم ﷺ کی تربیت سے یہ بات معلوم کر لی کہ یہ مناجات تزکیۂ نفس اور تقویتِ ایمان کا عظیم ترین ذریعہ ہے۔

جب بندہ اپنے آپ کو اس چیز کے لیے آمادہ کر لیتا ہے اور پورے اشتیاق کے ساتھ اپنے رب کے حضور کھڑا ہو کر اس سے لَو لگا لیتا ہے اور اس کے فضل و کرم اور اس کی رحمتوں کا امیدوار بن جاتا ہے تو پھر ہر کام اور ہر چیز میں اسے نصرت الٰہی حاصل ہوتی ہے۔

دلی اطمینان اور راحت وسکون: نماز کی وجہ سے انسان کی پریشانیاں ختم ہو جاتی ہیں اور اسے راحت و سرور حاصل ہوتا ہے۔ سنن ابوداود میں ایک حدیث ہے: «كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا حَزَبَهُ أَمْرٌ صَلّٰى» ''رسول اللہ ﷺ کو جب بھی کوئی پریشانی لاحق ہوتی تو آپ نماز پڑھتے۔'' [2]

اور آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

---

[1] صحيح مسلم، حديث:395، وسنن أبي داود، حديث:821. [2] سنن أبي داود، حديث:1319، و مسند أحمد:388/5.

«قَدْ جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلَاةِ»

''میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔''[1]

رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام کو (فرائض کے علاوہ) سنن اور نوافل کی بھی تعلیم دی تاکہ رب کے ساتھ ان کا تعلق مضبوط ہو اور ان کے دلوں کو امن و راحت نصیب ہو، نیز ان کی پریشانیوں اور مشکلات کو حل کرنے کے لیے نماز بہترین ہتھیار کا کردار ادا کرے۔

نماز گناہوں سے بچاتی ہے: فرمان ربانی ہے:

﴿إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ﴾

''یقیناً نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔''[2]

نماز کی ادائیگی سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو دلی راحت وسکون حاصل ہوتا تھا۔ نماز ان میں ایسی قوت اور جذبہ پیدا کر دیتی تھی جس کی وجہ سے وہ اچھے کام بڑے شوق سے کرتے اور برے کاموں سے دور رہتے تھے۔ نماز ان کے دلوں میں اس عقیدے کو مزید پختہ کرتی کہ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں ہیں، اس لیے انھیں اس کی قائم کردہ حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔ نماز ان میں ایسی ہمت پیدا کرتی کہ وہ اپنی شدید ترین خواہشات پر کنٹرول کر لیتے اور اپنے آپ کو مشکلات میں ڈالنے سے نہ گھبراتے۔

نماز ان کے لیے ایک مضبوط اور محفوظ قلعے کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو گناہوں اور معصیتوں سے بچا لیتے تھے۔[3]

صحابۂ کرام کا یہ بھی یقین تھا کہ نماز گناہوں کی معافی اور درجات کی بلندی کا سبب بنتی ہے۔

اس کے علاوہ بھی نماز کے روحانی اور تربیتی فوائد ہیں جو ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتے

---

1 المستدرك للحاكم: 160/2، امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے اور بتایا ہے کہ یہ امام مسلم کی شروط کے مطابق ہے، نیز امام ذہبی نے اس کی توثیق کی ہے۔ 2 العنكبوت 45:29. 3 منهج الإسلام في تزكية النفس للدكتور أنس أحمد كرزون: 227/1.

ہیں اور ایک نمازی آدمی کو یہ تمام فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اس طرح نماز روحانی تزکیہ و طہارت کے لیے بہترین کردار ادا کرتی ہے اور رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان حقیقت کا روپ دھار کر سامنے آجاتا ہے: «اَلصَّلَاةُ نُورٌ» ''نماز ایک نور ہے۔''[1]

نماز ایک ایسا نور ہے جو نمازی کے لیے ہدایت کے راستے کو روشن کر دیتا ہے، اسے معصیتوں سے بچاتا ہے اور نیک اعمال کی جانب رہنمائی کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا نور ہے جو نمازی کے دل کو منور کرتا ہے۔ اس کی وجہ سے اسے ایمان کی مٹھاس (حلاوت) محسوس ہوتی ہے اور وہ اپنے رب سے مناجات کی لذت سے محظوظ ہوتا ہے۔ نماز ایک ایسا نور ہے جس کی وجہ سے نفس ہر قسم کی آلودگی اور غلاظت سے پاک ہو جاتا ہے، اسے اطمینان قلب اور دلی راحت حاصل ہوتی ہے۔ وہ ہر خوف سے بے پروا اور پرسکون ہو جاتا ہے۔ نماز ایک ایسا نور ہے جو دنیا میں بھی نمازی کے چہرے پر نظر آتا ہے، اس کے چہرے پر حسن و جمال، رونق اور وجاہت نمایاں ہوتی ہے، جبکہ بے نماز کا چہرہ ان سب خوبیوں سے خالی ہوتا ہے۔[2] یہ نور قیامت کے دن بھی نمازی کے چہرے کو منور کر دے گا۔[3]

فرمان ربانی ہے:

﴿يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ يَسْعَىٰ نُورُهُم بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِم بُشْرَاكُمُ الْيَوْمَ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ○﴾

''اس دن آپ ایمان والوں اور ایمان والیوں کو دیکھیں گے کہ ان کا نور ان کے آگے اور ان کے دائیں دوڑتا ہوگا۔ (کہا جائے گا:) آج تمھیں ایسے باغات کی بشارت ہے جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، یہی تو

[1] صحيح مسلم، حديث: 223. [2] منهج الإسلام في تزكية النفس للدكتور أنس أحمد كرزون: 233/1. [3] شرح صحيح مسلم للنووي: 100/3، إشارتًا، وجامع العلوم والحكم لابن رجب، ص: 190.

بہت بڑی کامیابی ہے۔''[1]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کثرت سے دعائیں اور ذکر و اذکار کیا کرتے تھے۔ خود بھی تلاوتِ قرآن حکیم کرتے اور دوسروں سے بھی تلاوت سنا کرتے تھے اور اس مقصد کے لیے راتوں کی خلوت سے بھرپور فائدہ اٹھاتے۔ حضورِ قلب، غور و تدبر اور خشیت الٰہی کے حصول کے لیے خوب مجاہدہ کرتے۔ یہ تمام قربت الٰہی کے حصول کے عظیم ذرائع ہیں۔ تزکیہ نفس پر ان کے بہت گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور نفس اپنے کمال کی بلندیوں کی جانب محو پرواز ہوتا ہے، ان سے روحانی عظمت حاصل ہوتی ہے۔ صحابۂ کرام کو ان سب نیکیوں کا سب سے بڑا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ انھوں نے بندگی کے ان اعلیٰ مراتب کو حاصل کر لیا جن کی وجہ سے وہ اپنے رب کے بہت زیادہ قریب ہو گئے اور انھیں اپنے رب سے مناجات کا شرف حاصل ہوا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

«يَقُولُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ: أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِي بِي، وَأَنَا مَعَهُ حِينَ يَذْكُرُنِي إِنْ ذَكَرَنِي فِي نَفْسِهِ ذَكَرْتُهُ فِي نَفْسِي، وَإِنْ ذَكَرَنِي فِي مَلَإٍ، ذَكَرْتُهُ فِي مَلَإٍ هُمْ خَيْرٌ مِّنْهُمْ، وَإِنْ تَقَرَّبَ مِنِّي شِبْرًا تَقَرَّبْتُ إِلَيْهِ ذِرَاعًا، وَإِنْ تَقَرَّبَ إِلَيَّ ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ مِنْهُ بَاعًا، وَإِنْ أَتَانِي يَمْشِي، أَتَيْتُهُ هَرْوَلَةً»

''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرا بندہ میرے بارے میں جو گمان کرتا ہے میں اس کے ساتھ ویسا ہی طرز عمل اختیار کرتا ہوں۔ جب وہ مجھے یاد کرتا ہے تو میری معیت لیتا ہے۔ اگر وہ اپنے نفس میں مجھے یاد کرتا ہے تو میں بھی اپنے نفس میں اسے یاد رکھتا ہوں۔ اگر وہ میرا ذکر لوگوں کی کسی جماعت میں کرتا ہے تو میں اس کا تذکرہ

[1] الحدید 12:57.

اس سے بہتر جماعت میں کرتا ہوں۔ اگر وہ ایک بالشت میرے قریب آتا ہے تو میں ایک ہاتھ اس کے قریب آتا ہوں۔ اگر وہ ایک ہاتھ میرے قریب ہوتا ہے تو میں دونوں ہاتھوں کے پھیلاؤ کے برابر اس کے قریب آتا ہوں۔ اگر وہ میری جانب چل کر آتا ہے تو میں اس کی جانب دوڑ کر آتا ہوں۔'' [1]

تلاوتِ قرآن حکیم ذکر کی عظیم ترین اقسام میں سے ہے۔ صحابۂ کرام اس کا خاص اہتمام کیا کرتے تھے۔ اسی تلاوت نے ان کے دلوں میں حُبِ الٰہی اور خشیتِ الٰہی کوٹ کوٹ کر بھر دی۔ ان کے دلوں کو امراضِ قلب سے پاک کر دیا۔ اس طرح وہ قرآن حکیم کی ان آیات کا مصداق بن گئے:

﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ۝﴾

''اور ہم قرآن میں سے جو نازل کرتے ہیں وہ مومنوں کے لیے شفا اور رحمت ہے اور وہ ظالموں کو خسارے ہی میں زیادہ کرتا ہے۔'' [2]

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ ۭ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ۭ اُولٰۗىِٕكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ۝﴾

''کہہ دیجیے: وہ (قرآن مجید) ان کے لیے جو ایمان لائے، ہدایت اور شفا ہے اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں بوجھ ہے اور وہ ان کے حق میں اندھا پن ہے، یہ لوگ (جو حق بات نہیں سنتے گویا) دور دراز جگہ سے پکارے جا رہے ہوں۔'' [3]

1 صحيح البخاري، حديث:7405، وصحيح مسلم، حديث:2675. 2 بني إسرآءيل 17:82.
3 حٰمٓ السجدة 41:44.

دوسرے مقام پر فرمان الٰہی ہے:

﴿اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَىِٕنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ۝﴾

''جو لوگ ایمان لائے اور ان کے دل اللہ کے ذکر سے اطمینان پاتے ہیں، آگاہ رہو! اللہ کے ذکر ہی سے دل اطمینان پاتے ہیں۔'' [1]

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم دعا کے ساتھ نہایت گہرا شغف رکھتے تھے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں بتا دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ سے مناجات اور اس کی بندگی کا سب سے نمایاں مظہر دعا ہی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

«اَلدُّعَاءُ هِيَ الْعِبَادَةُ» ''دعا عبادت ہی ہے۔'' [2]

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے بندوں کو دعا کا حکم دیا ہے اور اس انسان کو ڈانٹ پلائی ہے جو دعا چھوڑ کر تکبر کا انداز اختیار کرتا ہے گویا اسے اپنے رب کی کوئی ضرورت ہی نہیں، وہ ہر لحاظ سے اس سے بے نیاز ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِیْنَ ۝﴾

''اور تمھارے رب نے کہا ہے: تم مجھے پکارو، میں تمھاری (دعائیں) قبول کروں گا، بلاشبہ جو لوگ میری عبادت سے سرکشی کرتے ہیں، وہ عنقریب ذلیل وخوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔'' [3]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ﴾ میں عبادت سے مراد دعا اور توحید ہے [4] (یعنی وہ میری توحید اور دعا کے سلسلے میں تکبر کا انداز اختیار کرتے ہیں۔)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کے لیے یہ بات واضح فرما دی تھی کہ دل کو ایک دائمی غذا

1 الرّعد 13:28. 2 سنن أبي داود، حديث: 1479. 3 المؤمن 40:60. 4 تفسير ابن كثير: 4/86.

کی ضرورت ہے اور یہ غذا ذکر الٰہی، دعا اور تلاوتِ قرآن حکیم ہے۔ یہ غذا دل کو ہر قسم کے اَمراض اور آفات سے محفوظ رکھتی ہے۔

آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ ایک مسلمان کے لیے صبح شام، گھر میں داخل ہوتے اور نکلتے وقت، بازار میں داخل ہوتے وقت، کھاتے پیتے اور لباس پہنتے وقت، اسی طرح دیگر روز مرہ کے اعمال کے وقت کی دعائیں پڑھنا مستحب ہے تاکہ وہ ہر بیماری سے محفوظ رہے۔ اگر اسے کوئی عارضی صدمہ، مثلاً: بے چینی، غمگینی اور عائلی پریشانی لاحق ہو بھی جائے تو یہ ذکر و اذکار اور دعائیں شفا بخش مرہم کا کام دیتی ہیں جن سے دل مطمئن ہوتے ہیں اور روح کو زندگی حاصل ہوتی ہے۔

ان مسنون ذکر و اذکار اور دعاؤں میں بے چینی اور تکلیف کے موقع کی ایک دعا جو رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کو سکھائی ہے وہ یہ ہے:

«لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ الْعَظِيمُ الْحَلِيمُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَرَبُّ الْأَرْضِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيمِ»

''اس اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو بڑی عظمتوں اور حلم والا ہے۔ اس اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو عرش عظیم کا رب ہے۔ اس اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو آسمانوں کا رب ہے اور زمین کا رب ہے اور مکرم عرش کا رب ہے۔''[1]

رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کو یہ بات سکھا دی تھی کہ مشکلات میں کس طرح اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر کے اس کی امان، پناہ، حفاظت اور سکینت حاصل کرنی ہے تاکہ انھیں کوئی گھبراہٹ اور بے چینی نہ ہو بلکہ انھیں یقین کامل ہو کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہے، ان کا حامی و مددگار ہے، ان کے معاملات کو سنبھالنے والا اور ان کی تائید و نصرت کرنے والا ہے اور انھیں اس بات کا پختہ یقین ہو کہ مجبور و لاچار کی پکار کو سننے والا اکیلا

1 صحيح البخاري، حديث:6346.

صرف وہی ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝﴾

''(کیا یہ بت بہتر ہیں) یا وہ (اللہ) جو مجبور و لاچار کی دعا قبول کرتا ہے جب وہ اسے پکارتا ہے اور وہ اس کی تکلیف دور کر دیتا ہے اور وہ تمھیں زمین میں جانشین بناتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی (اور) معبود ہے؟ تم کم ہی نصیحت حاصل کرتے ہو۔''[1]

بے شک ذکر و اذکار، دعا، تلاوتِ قرآن، قیام اللیل اور ہر قسم کی نفلی عبادات کا تزکیۂ نفس اور روحانی معراج پر گہرا اثر ہوتا ہے۔

اس موضوع پر ہم جس قدر لکھ لیں ناکافی ہے۔ یہ مذکورہ بالا بحث چشمے سے حاصل کردہ چند گھونٹ ہیں۔

عقلی تربیت

انسان روح، جسم اور عقل کا مجموعہ ہے۔ قرآن نے انسان کو اسی مجموعی حیثیت سے خطاب کیا ہے اور قرآنی تعلیمات ہی کی روشنی میں نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابۂ کرام کی ہر لحاظ سے تربیت فرمائی۔ آپ نے ہر صحابی کی تربیت کا اس طرح اہتمام کیا کہ اس کی نظر و فکر اور غور و خوض کی صلاحیتیں مزید اجاگر ہوں کیونکہ یہی چیز انھیں اس بات کا اہل بنا سکتی ہے کہ وہ دعوت الی اللہ کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ اور قرآن حکیم کا مقصود بھی یہی ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قرآن حکیم میں اس جانب یوں ہماری رہنمائی فرمائی ہے:

﴿ قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝﴾

''(اے نبی!) کہہ دیجیے: دیکھو (اور غور کرو) جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور

[1] النمل 27:62.

نشانیاں اور ڈراوے ان لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں دیتے جو ایمان نہیں لاتے۔''[1]

سورۂ عنکبوت میں یوں فرمایا:

﴿قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝﴾

''کہہ دیجیے: تم زمین میں چلو پھرو، پھر دیکھو اس نے مخلوق پہلی بار کیسے پیدا کی، پھر اللہ ہی (اسے) دوسری بار پیدا کرے گا، بلاشبہ اللہ ہر شے پر خوب قادر ہے۔''[2]

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝﴾

''(یہ قرآن) ایک کتاب ہے، ہم نے اسے آپ کی طرف نازل کیا، بڑی برکت والی ہے تاکہ وہ اس کی آیتوں پر غور کریں اور عقل منداس سے نصیحت حاصل کریں۔''[3]

سورۂ عبس میں اس طرح فرمایا:

﴿فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ ۝ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ۝ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ۝ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ۝ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ۝ وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ۝ وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ۝ وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ۝ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ۝﴾

''چنانچہ انسان کو چاہیے کہ اپنے کھانے کی طرف دیکھے، بے شک ہم نے خوب مینہ برسایا، پھر ہم نے زمین کو اچھی طرح پھاڑا، پھر ہم نے اس میں سے اناج اگایا اور انگور اور سبزیاں اور زیتون اور کھجوریں اور گھنے باغات اور میوے اور چارا، (جو) تمھارے اور تمھارے جانوروں کے لیے سامانِ زندگی (ہے)۔''[4]

عقل انسان کی اہم ترین قوتوں میں سے ایک قوت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عقل کی وجہ ہی

1 یونس 10:101. 2 العنکبوت 29:20. 3 صٓ 38:29. 4 عبس 80:24-32.

سے انسان کو مکلّف (ذمہ دار) بنایا ہے۔ جو انسان پاگل پن یا کسی اور وجہ سے عقل سے محروم ہو، شریعت کی نگاہ میں وہ غیر مکلّف ہے اس سے تمام ذمہ داریاں ساقط ہو جاتی ہیں۔ فرمان ربانی ہے:

﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ؀﴾

''اور جس بات کا آپ کو علم ہی نہیں اس کے پیچھے نہ لگیں، بے شک کان، آنکھ اور دل، ان میں سے ہر ایک کی بابت سوال کیا جائے گا۔'' [1]

عقل انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ عقل ہی کی بدولت وہ حصول علم کا اہل بنتا ہے اور پھر علم کی گہرائیوں تک پہنچتا ہے، اس لیے قرآن حکیم نے عقلی تربیت کے لیے ایک اسلوب وضع کیا ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کی تربیت کے لیے اختیار کیا۔ اس اسلوب کے اہم ترین نکات درج ذیل ہیں:

① عقل کو ان اصول وضوابط سے دور رکھا جائے جن کی بنیاد محض ظن، اندازہ، گروہی تعصب یا رسم ورواج ہو۔ قرآن حکیم نے اس سے دور رہنے کی تلقین کی ہے۔ فرمان ربانی ہے:

﴿وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ۚ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَـيْـــًٔا ؀﴾

''حالانکہ انھیں اس کا کوئی علم نہیں، وہ تو بس گمان کی پیروی کرتے ہیں اور بلاشبہ گمان حق کے مقابلے میں کچھ بھی فائدہ نہیں دیتا۔'' [2]

② عقل کے لیے ضروری ہے کہ تحقیق اور غور وفکر کے ساتھ ساتھ احتیاط کا دامن تھامے رکھے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَاۗءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰي مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ؀﴾

1 بنيٓ إسرآءيل 36:17. 2 النجم 28:53.

''اے ایمان والو! اگر کوئی نافرمان تمھارے پاس کوئی خبر لائے تو تحقیق کر لیا کرو (تاکہ) تم کسی قوم کو نادانی سے تکلیف (نہ) پہنچاؤ کہ پھر تم اپنے کیے پر پچھتاتے پھرو۔''[1]

③ قوانینِ قدرت پر غور وفکر اور تدبر کے لیے عقل کو استعمال کرنا چاہیے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿وَ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ ۝﴾

''اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو ان کے مابین ہے حق ہی کے ساتھ تخلیق کیا ہے۔ اور یقیناً قیامت آنے والی ہے تو (اے نبی!) آپ (کافروں سے) خوبصورت انداز سے درگزر کریں۔''[2]

④ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے جو کام مشروع قرار دیے ہیں، مثلاً: عبادات، معاملات، اخلاق و آداب، حالت امن و جنگ اور سفر و حضر میں زندگی گزارنے کا اسلوب، ان سب چیزوں کی حکمتوں پر غور و تدبر کرنے کے لیے عقل کو استعمال کرنا چاہیے۔ اس سے عقل کو نشو و نما اور پختگی حاصل ہوتی ہے۔ ان چیزوں کی معرفت حاصل ہونے کے بعد پھر انسان ان سے راہِ فرار اختیار نہیں کرتا بلکہ وہ احسن انداز میں تعلیمات الٰہی کو اپنی زندگی پر نافذ کرتا ہے کیونکہ اسی سے اطمینان وسکون اور بشری سعادتیں حاصل ہوتی ہیں اور ان کے حصول کے لیے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے ہمیں ضابطۂ حیات عطا فرمایا ہے۔ فرمان ربانی ہے:

﴿وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ ۝﴾

''اور تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اس (حلال جانور) کا گوشت نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام پڑھا گیا ہو؟ حالانکہ اللہ نے ان (سب جانوروں) کے بارے میں تفصیل

[1] الحجرات 49:6. [2] الحجر 15:85.

سے بتا دیا ہے جو اس نے تم پر حرام کیے ہیں، مگر جسے تم کھانے پر مجبور ہو جاؤ (تو وہ بھی حلال ہیں) اور بے شک اکثر لوگ اپنی خواہشات سے، بغیر علم کے دوسروں کو بہکاتے ہیں۔ بے شک آپ کا رب حد سے گزرنے والوں کو خوب جانتا ہے۔''[1]

⑤ انسانی تاریخ پر غور کرنے کے لیے عقل کو استعمال کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں سے کیا طرزِ عمل رہا ہے تاکہ انسان اپنے آباء و اجداد اور پیشرو لوگوں کے واقعات سے نصیحت و عبرت حاصل کرے اور اس بات پر غور و فکر کرے کہ اقوام و مِلل کے بارے میں سنت الٰہی کیا رہی ہے۔ فرمان ربانی ہے:

﴿اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا ۪ وَّجَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ○﴾

''کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ان سے پہلے ہم نے کتنی ہی قومیں ہلاک کر دیں جنھیں ہم نے زمین میں ایسی طاقت دی تھی جو تمھیں نہیں دی اور ہم نے ان پر موسلا دھار بارش نازل کی اور نہریں بنائیں جو ان کے نیچے بہتی تھیں، پھر ہم نے ان کے گناہوں کے باعث انھیں ہلاک کر دیا اور ان کے بعد دوسری قومیں پیدا کیں۔''[2]

یہی بات اللہ تعالیٰ نے سورۂ یونس اور سورۂ روم میں بھی بیان فرمائی ہے۔

ان آیات کریمہ نے صحابۂ کرام کو یہ بات سمجھائی کہ اپنی عقل کو اللہ تعالیٰ کی رہنمائی کے مطابق استعمال کریں، کہیں ان کی عقلیں اللہ کے بارے میں (غلط نظریات کی وجہ سے) گمراہ ہو کر بھول بھلیوں میں نہ پھنس جائیں، جس طرح بہت سے فلسفی بھٹک گئے تھے جنھوں نے عقل کو اس کے استحقاق سے بڑھ کر تقدس کا درجہ دے دیا تھا۔[3]

قرآن حکیم کی اس تربیت کے نتیجے میں بہت زیادہ عملی فوائد حاصل ہوئے۔

---

1 الأنعام 119:6. 2 الأنعام 6:6. 3 فقه التمكين في القرآن الكريم للصلابي، ص: 354.

جسمانی تربیت

نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ کی جسمانی تربیت کا بھی اہتمام فرمایا اور اس تربیت کے لیے اصول بھی قرآن حکیم سے اخذ کیے تاکہ جسم اپنی ان ذمہ داریوں کو ادا کر سکے جن کے لیے اس کی تخلیق کی گئی۔ نہ اس سلسلے میں اسراف اور بخل سے کام لیا جائے اور نہ جسم کی ایک توانائی کو دوسری توانائی پر فوقیت دی جائے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اپنے بندوں کے لیے واضح رہنمائی کر دی ہے کہ ان کے لیے کون کون سی پاکیزہ چیزیں حلال ہیں اور کون کون سی غیر پاکیزہ چیزیں حرام ہیں۔ اور ان لوگوں کی مذمت کی جو اپنے لیے (حلال کردہ) پاکیزہ چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۚ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ۝﴾

''(اے نبی!) کہہ دیجیے: جو زینت اور کھانے پینے کی پاکیزہ چیزیں اللہ نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہیں، وہ کس نے حرام کی ہیں؟ کہہ دیجیے: یہ (پاکیزہ چیزیں) دنیا کی زندگی میں ان لوگوں کے لیے بھی ہیں جو ایمان لائے، جبکہ قیامت کے دن یہ خالصۃً مومنوں ہی کے لیے ہوں گی، اسی طرح ہم آیات کو ان لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔''[1]

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان اپنی جسمانی ضروریات کو پورا کرنے کے بعد ہی اس قابل ہوتا ہے کہ اپنی ان ذمہ داریوں کو ادا کر سکے جن کا اللہ تعالیٰ نے اسے مکلّف بنایا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت بھی بجا لائے اور زمین میں خلافت کے فرائض بھی ادا کرے،

1 الأعراف 32:7.

اس زمین کو آباد کرے اور اپنے دینی بھائیوں کے ساتھ نیکی اور تقوے میں ہر قسم کا تعاون کرے، اس لیے قرآن حکیم نے انسانی جسم کی ضروریات کے لیے درج ذیل قواعد وضوابط وضع کیے ہیں:

① اللہ تعالیٰ نے اپنے اس فرمان کے ساتھ کھانے پینے کی ضروریات کے لیے ایک ضابطہ مقرر فرمایا:

﴿يَٰبَنِيٓ ءَادَمَ خُذُواْ زِينَتَكُمۡ عِندَ كُلِّ مَسۡجِدٖ وَكُلُواْ وَٱشۡرَبُواْ وَلَا تُسۡرِفُوٓاْۚ إِنَّهُۥ لَا يُحِبُّ ٱلۡمُسۡرِفِينَ﴾

''اے بنی آدم! تم ہر نماز کے وقت اپنی زینت اختیار کرو، اور کھاؤ اور پیو اور فضول خرچی نہ کرو، بے شک وہ فضول خرچی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''[1]

② لباس کی انسانی ضروریات کے لیے یہ ضابطہ متعین فرمایا کہ جسم کے وہ اعضاء جنھیں چھپانا ضروری ہے ان کے لیے مناسب لباس پہننا سب کے لیے ضروری ہے اور لباس ایسا ہو جو انسان کو سردی اور گرمی کے نقصانات سے محفوظ رکھے اور اس بات کو بھی مستحب قرار دیا کہ مسجد میں جاتے وقت ایسا لباس استعمال کیا جائے جو باعث زینت ہو۔

③ رہائش کی ضرورت کا ضابطہ اس فرمان میں بیان کیا گیا:

﴿وَٱللَّهُ جَعَلَ لَكُم مِّنۢ بُيُوتِكُمۡ سَكَنٗا وَجَعَلَ لَكُم مِّن جُلُودِ ٱلۡأَنۡعَٰمِ بُيُوتٗا تَسۡتَخِفُّونَهَا يَوۡمَ ظَعۡنِكُمۡ وَيَوۡمَ إِقَامَتِكُمۡ وَمِنۡ أَصۡوَافِهَا وَأَوۡبَارِهَا وَأَشۡعَارِهَآ أَثَٰثٗا وَمَتَٰعًا إِلَىٰ حِينٖ﴾

''اور اللہ نے تمھارے لیے تمھارے گھر جائے سکونت بنائے اور تمھارے لیے چوپایوں کی کھالوں سے ایسے گھر (خیمے) بنائے جنھیں تم ہلکا سمجھتے ہو اپنے کوچ کے دن اور اپنے قیام کے دن اور ان (بھیڑوں) کی اون سے اور ان (اونٹوں) کی

[1] الأعراف 31:7.

پشم سے اور ان (بکریوں) کے بالوں سے (گھریلو) اثاثے اور ایک مدت تک برتنے کی چیزیں (بنائیں)۔''[1]

④ تعمیرِ خاندان اور شریک حیات کی ضرورت پوری کرنے کے لیے یہ ضابطہ متعین کیا کہ اس مقصد کے لیے تمھارے لیے نکاح کرنا جائز ہے بلکہ خاص حالات میں اسے ضروری بھی قرار دیا۔ زنا، خفیہ راہ و رسم اور ہم جنس پرستی کو حرام قرار دیا۔ فرمان ربانی ہے:

﴿وَ الَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۙ﴿۵﴾ اِلَّا عَلٰۤی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ ۚ﴿۶﴾ فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۚ﴿۷﴾﴾

''اور وہ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، سوائے اپنی بیویوں یا ان (کنیزوں) کے جن کے مالک ہوئے ان کے دائیں ہاتھ تو بلاشبہ (ان کی بابت) ان پر کوئی ملامت نہیں، پھر جو شخص ان کے علاوہ (رستہ) تلاش کرے تو ایسے لوگ ہی حد سے گزرنے والے ہیں۔''[2]

⑤ مال و جائیداد کی ملکیت کے لیے ضابطہ بنایا کہ شرعی اصولوں کے مطابق مال اپنی ملکیت میں رکھا جا سکتا ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿وَ اَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِیْنَ فِیْهِ ؕ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ اَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِیْرٌ ﴿۷﴾﴾

''اور اس (مال) میں سے خرچ کرو جس میں اس نے تمھیں جانشین بنایا ہے، پھر تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے خرچ کیا ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔''[3]

⑥ اسلام نے سرداری اور حکمرانی کے لیے یہ ضابطہ بنایا کہ کسی پر ظلم و زیادتی کرنا اور سرکشی اختیار کرنا حرام ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰیٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۱﴾﴾

---

[1] النحل 16:80. [2] المؤمنون 23:5-7. [3] الحدید 57:7.

’’اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا اس کی آیات کو جھٹلائے؟ بے شک ظالم فلاح نہیں پائیں گے۔‘‘ [1]

⑦ محنت، جدوجہد اور اس میں کامیابی حاصل کرنا انسانی ضرورت ہے۔ اس کے لیے یہ ضابطہ متعین فرمایا کہ صرف وہی کام کیے جائیں جو شریعت میں جائز ہیں اور کسی دوسرے شخص کے لیے نقصان دہ نہیں ہیں اور تمام مسلمانوں کو اس بات کی ترغیب دی کہ اس دنیا میں وہ کام کریں جن سے ان کے دینی اور دعوتی امور آسان ہو جائیں اور وہ کام اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے لیے ذخیرۂ آخرت بن جائیں۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ۚ قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝﴾

’’انھوں نے (موسیٰ سے) کہا: ہمارے پاس تمھارے آنے سے پہلے بھی ہمیں تکلیفیں دی گئیں اور تمھارے آنے کے بعد بھی۔ موسیٰ نے کہا: امید ہے کہ تمھارا رب تمھارے دشمن کو ہلاک کر دے گا اور تمھیں زمین میں جانشین بنا دے گا، پھر دیکھے گا کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔‘‘ [2]

قرآن حکیم کی بہت سی آیات میں عمل کو ایمان سے مربوط کیا گیا ہے اور عمل کے لیے یہ شرط رکھی ہے کہ وہ عمل نیک ہو۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ۝﴾

’’بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، یقیناً ہم اس کا اجر ضائع نہیں کرتے جس نے اچھا عمل کیا۔‘‘ [3]

اللہ تعالیٰ نے اعمال میں حُسن (اچھا انداز و اسلوب) اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

1 الأنعام 21:6. 2 الأعراف 129:7. 3 الكهف 30:18.

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ○﴾

''بے شک اللہ عدل اور احسان اور قرابت داروں کو (امداد) دینے کا حکم دیتا ہے اور وہ بے حیائی، برے کام اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے۔ وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو۔''[1]

⑧ اللہ تعالیٰ نے ان باتوں سے سختی کے ساتھ منع کیا ہے کہ انسان دوسروں کو دھتکار دے، فخر و تکبر کا انداز اپنائے یا اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں پر اترائے اور غرور میں مبتلا ہو۔ فرمان ربانی ہے:

﴿وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا ۖ فَتِلْكَ مَسَاكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَن مِّن بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا ۖ وَكُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِينَ ○﴾

''اور ہم نے کتنی ہی بستیاں ہلاک کر دیں جو گزران زندگی (اپنے سامان زیست) پر اتراتی تھیں، چنانچہ ان کے یہ گھر (اجڑے پڑے) ہیں، ان کے بعد بہت تھوڑے ہی آباد ہوئے اور ہم ہی (ان سب کے) وارث ہوئے۔''[2]

یہ وہ بعض بنیادی امور ہیں جن پر نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابۂ کرام کی جسمانی تربیت کی اور انھیں اس بات کا اہل بنایا کہ وہ زندگی کی مشکلات، دعوتِ دین کی صعوبتیں اور جہادی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھا سکیں۔

یہ حقیقت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ کی بڑے عمدہ انداز میں تربیت فرمائی۔ ان کا روحانی تزکیہ فرمایا (انھیں ہر قسم کی اخلاقی و روحانی آلودگیوں سے پاک کیا)، ان کی عقلوں کو جلا بخشی اور ان کی جسمانی صلاحیتوں کو مزید اجاگر کیا تاکہ خالق کی پسندیدہ اور متوازن شخصیات تیار ہوں۔ یوں آپ ﷺ نے ایک کامیاب تربیتی سلسلہ بروئے کار لاتے ہوئے اپنے تمام مقاصد و اہداف کو حاصل کر لیا۔

[1] النحل 90:16. [2] القصص 58:28.

مکارم اور رذائل کے متعلق صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تربیت

اعلیٰ اور عمدہ اخلاق بھی عقیدے کا ایک اہم جز ہے۔ صحیح عقیدے کی تکمیل عمدہ اخلاق کے بغیر ممکن نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف اسالیب کے ساتھ اپنے صحابہ میں عمدہ اخلاق پیدا کیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں قرآن حکیم کی آیات سناتے۔ صحابہ سننے کے بعد ان پر غور وتدبر کرتے، پھر ان ارشادات وتعلیمات کے مطابق عمل کرتے۔

قرآن حکیم کی مکی آیات پر غور وفکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات عمدہ اخلاق سے آراستہ ہونے کی ترغیبات سے بھری پڑی ہیں اور ان میں ایسی بے شمار ہدایات ہیں کہ اپنے اخلاق وکردار کو ان آلودگیوں سے پاک اور صاف رکھا جائے جو اللہ کے دین پر چلنے میں خلل ڈالتی ہیں۔

رسولِ ہدایت جو کائنات کے لیے کامل ترین اسوہ اور امت کے لیے مخلص مُربّی تھے، خود خُلق عظیم کے مالک تھے۔ ارشادِ ربانی ہے:

"اور یقیناً آپ خُلقِ عظیم پر (کاربند) ہیں۔"[1]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے فرمایا: «إِنَّ خُلُقَ نَبِيِّ اللّٰهِ ﷺ كَانَ الْقُرْآنَ»

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق عین قرآن (کے مطابق) تھے۔"[2]

اللہ تعالیٰ نے اپنے اس فرمان میں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق عالیہ کو یکجا کر دیا۔

﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ○﴾

"آپ (ان سے) درگزر کیجیے اور نیک کام کا حکم دیجیے اور جاہلوں سے کنارہ کیجیے۔"[3]

امام مجاہد اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: "لوگوں کے اخلاق وکردار کے مقابلے

---

1 القلم 68:4. أهمية الجهاد في نشر الدعوة لعلي العلياني، ص:65,64. 2 صحيح مسلم، حديث:746. 3 الأعراف 7:199.

میں گھٹیا پن اختیار کرنے کے بجائے نرمی اور درگزر کا رویہ اختیار کریں، مثلاً: ان کا عذر قبول کر لیں، انھیں معاف کر دیں، انھیں سہولت دیں اور ان سے بحث میں نہ الجھیں اور ان کے پوشیدہ امور کا کھوج مت لگائیں۔''[1]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اس فرمان الٰہی کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ''اس سے مراد ہر اچھا کام ہے۔ اور سب سے اچھا کام توحید ہے۔ اس کے بعد بندگی کے حقوق اور بندوں کے حقوق ہیں۔''[2]

﴿وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ○﴾ سے مراد یہ ہے کہ کوئی جاہل آپ کے ساتھ بداخلاقی سے پیش آئے تو آپ اس کے جواب میں ویسا ہی انداز اختیار نہ کریں بلکہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو مدنظر رکھیں:

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ○﴾

''اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر آہستگی (وقار اور عاجزی) سے چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ ان سے بات کریں تو وہ کہتے ہیں: سلام ہے۔''[3]

صحیح بخاری میں آپ ﷺ کا اخلاق یوں بیان کیا گیا ہے: «كَانَ النَّبِيُّ ﷺ أَحْسَنَ النَّاسِ خُلُقًا» ''نبی کریم ﷺ سب لوگوں سے زیادہ اچھے اخلاق والے تھے۔''[4]

نبی کریم ﷺ اپنے صحابہ کو حُسنِ اخلاق کی تربیت دیا کرتے تھے۔ ایک موقع پر حسن اخلاق کی ترغیب دیتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا:

«مَا شَيْءٌ أَثْقَلَ فِي مِيزَانِ الْمُؤْمِنِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ خُلُقٍ حَسَنٍ، فَإِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى لَيُبْغِضُ الْفَاحِشَ الْبَذِيءَ»

1 تهذيب مدارج السالكين لابن القيم: 2/655. 2 تهذيب مدارج السالكين لابن القيم: 2/655.
3 الفرقان 25:63. 4 صحيح البخاري، حديث: 6203.

''قیامت کے دن مومن کی ترازو میں حُسنِ اخلاق سے زیادہ وزنی چیز کوئی نہیں ہو گی اور اللہ تعالیٰ بداخلاق اور بدزبان انسان کو انتہائی ناپسند کرتا ہے۔''[1]

ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ وہ کون سی چیز ہے جس کی وجہ سے لوگ کثرت کے ساتھ جنت میں جائیں گے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«تَقْوَى اللّٰهِ وَ حُسْنُ الْخُلُقِ» ''اللہ کا ڈر اور اخلاق حسنہ۔''

پھر آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ وہ کون سی چیز ہے جس کی وجہ سے لوگ کثرت کے ساتھ جہنم میں جائیں گے تو آپ ﷺ نے فرمایا:«اَلْفَمُ وَالْفَرْجُ»

''زبان اور شرمگاہ (کے غلط استعمال سے)۔''[2]

رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کو بتایا کہ حسن اخلاق کا اجر و ثواب بہت زیادہ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ مِنْ أَحَبِّكُمْ إِلَيَّ وَأَقْرَبِكُمْ مِّنِّي مَجْلِسًا يَّوْمَ الْقِيَامَةِ أَحَاسِنُكُمْ أَخْلَاقًا وَّإِنَّ مِنْ أَبْغَضِكُمْ إِلَيَّ وَأَبْعَدِكُمْ مِّنِّي مَجْلِسًا يَّوْمَ الْقِيَامَةِ الثَّرْثَارُونَ وَالْمُتَشَدِّقُونَ وَالْمُتَفَيْهِقُونَ»

''تم میں سے میرے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ اور قیامت کے دن سب سے زیادہ میرے قریب بیٹھنے والا شخص وہ ہے جو تم میں سے زیادہ عمدہ اخلاق والا ہے۔ اور تم میں میرے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ اور قیامت کے دن سب سے زیادہ مجھ سے دور رہنے والے اشخاص وہ ہوں گے جو بغیر کسی دینی فائدے کے بہت زیادہ باتیں کرتے ہوں گے یا اپنی فصاحت و بلاغت کے اظہار، اپنی عظمت اور بڑائی کا لوہا منوانے کے لیے یا خود کو دوسروں سے بالا ثابت کرنے کے لیے کلام (خطاب) کریں گے۔'' (نبی کریم ﷺ نے تین الفاظ ارشاد فرمائے

1 جامع الترمذي، حديث:2002. 2 جامع الترمذي، حديث:2004.

تھے: الثرثارون والمتشدقون والمتفیھقون تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! الثرثارون اور المتشدقون کا مفہوم تو ہم سمجھتے ہیں، المتفیھقون سے کون مراد ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "المتکبرون" تکبر کرنے والے۔" [1]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہٴ کرام کی اخلاقی تربیت کے لیے قرآنی اسلوب کو اختیار کیا۔ عبادات اور عقائد کے ساتھ بیک وقت اخلاقی تعلیمات بیان کی جاتی تھیں کیونکہ اخلاق اور عقیدے کا باہمی تعلق قرآن حکیم میں بہت واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور سب مسلمانوں کے لیے واضح کر دیا کہ ایمانی اخلاق کیا ہے جس سے ہر مومن کو آراستہ ہونا چاہیے اور جاہلی اخلاق کیا ہے جس سے ہر مومن کو دور رہنا چاہیے۔

یہ حقیقت ہے کہ جاہلی اخلاق سے متنفر کرنے اور ان سے الگ تھلگ کرنے کا کام ابتدا ہی سے شروع ہو گیا تھا، پھر اس کے ساتھ ساتھ ان کے باطل اعتقادی تصورات سے نفرت پیدا کی گئی اور یہ سلسلہ آخر تک جاری رہا۔

حسن خلق دین میں کوئی الگ چیز نہیں ہے اور نہ ہی یہ انسانی طرز عمل کے کسی خاص دائرے میں محصور ہے بلکہ حسن خلق دین کے جواہرات میں سے ایک جوہر ہے اور یہ انسانی زندگی کے ہر گوشے کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے اور مسلمان کے ہر طرز عمل کا ایک واضح اخلاقی رنگ ڈھنگ ہے۔ اخلاق حسنہ دراصل صحیح ایمان اور عقائد کی عملی تعبیر ہے کیونکہ ایمان محض دل میں پوشیدہ احساسات و جذبات کا نام نہیں بلکہ طرزِ عمل سے اس کا اظہار بھی ضروری ہے۔ ہمیں یہ حق ہے کہ جب ہم ایمان و اعتقاد کے مطابق ظاہری طرز عمل نہ دیکھیں یا ایمان و اعتقاد کے منافی طرز عمل دیکھیں تو پوچھیں کہ اب ایمان کہاں ہے؟ اور اس ایمان کا کیا فائدہ جو طرز عمل کو تبدیل نہ کرے؟ [2]

---

1 جامع الترمذي، حديث: 2018، الفاظ کے معانی کے لیے دیکھیے: تهذيب مدارج السالكين لابن القيم: 2/657. 2 دراسات قرآنية لمحمد قطب، ص: 130.

اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن حکیم نے عقیدے کے ساتھ اخلاق کا بڑا مضبوط ربط قائم کیا ہے۔ اس کی بے شمار مثالیں ہیں۔ فرمان ربانی ہے:

﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۙ اِلَّا عَلٰٓي اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۚ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَاۗءَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۚ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰي صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۘ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۙ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾

''مومن یقیناً فلاح پاگئے، وہ جو اپنی نماز میں عاجزی کرنے والے ہیں اور وہ جو لغو باتوں سے اعراض کرنے والے ہیں اور وہ جو زکاۃ ادا کرنے والے ہیں اور وہ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، سوائے اپنی بیویوں یا ان (کنیزوں) کے جن کے مالک ہوئے ان کے دائیں ہاتھ تو بلاشبہ (ان کی بابت) ان پر کوئی ملامت نہیں، پھر جو شخص ان کے علاوہ (رستہ) تلاش کرے تو ایسے لوگ ہی حد سے گزرنے والے ہیں اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کی حفاظت کرنے والے ہیں اور وہ جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں، یہی لوگ وارث ہیں جو فردوس کے وارث ہوں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''[1]

سورت کا آغاز اس بات سے ہوا کہ کامیابی یقیناً اہل ایمان کے لیے ہے، پھر ان اہل ایمان کے اوصاف بیان کیے جو ان کے اخلاقی پہلو کو واضح کرتے ہیں اور اس بات کی جانب واضح اشارہ کر رہے ہیں کہ یہ عمدہ اخلاق ایک لحاظ سے ایمان کا ثمرہ ہیں اور یہ کہ ایمان وہ ظاہری طرزِ عمل ہے جو دل میں موجود عقیدے کی ترجمانی کر رہا ہے۔

اہل ایمان کی سب سے پہلی صفت یہ ہے کہ وہ اپنی نمازوں میں اظہار عجز و نیاز کرتے

[1] المؤمنون 23:1-10۔

ہیں۔ نماز ایک ایسی عبادت ہے جس میں سعادت کے وہ لمحات ہوتے ہیں جن میں ایک مومن نہایت عاجز بندہ بن کر اپنے آقا و پروردگار کے سامنے دست بستہ کھڑا ہوتا ہے۔ دل اس کی یاد سے لبریز ہوتا ہے اور روح اس کے وصال کی لذتیں حاصل کر رہی ہوتی ہے۔ ایک سچے مومن کے ایمان کا سب سے پہلا مظہر یہی ہوتا ہے کہ اس کی نماز میں ایسا خشوع و خضوع ہو جو اس کے تعلق باللہ کی صداقت واضح کر دے اور حالت نماز میں اس تعلق کو مزید پُر جوش بنا دے۔

پھر یہ سورت دوسرے پہلو سے اہل ایمان کے طرزِ عمل کا ایک وصف بیان کرتی ہے کہ وہ بے ہودہ باتوں سے کنارہ کش رہتے ہیں۔ بے ہودگی تو کسی بھی سنجیدہ انسان سے سرزد نہیں ہو سکتی۔ صحیح ایمان انسان کو وہ متانت عطا کرتا ہے جو اس کے اندر ذمہ داریوں کا احساس اور سنجیدگی پیدا کرتی ہے۔ سنجیدگی اس بات کا نام نہیں کہ انسان ہر وقت تُرش رو بنا رہے، ہر وقت اس کے ماتھے اور چہرے پر شکنیں پڑی ہوں بلکہ جب انسان کو اس بات کا شعور حاصل ہو جائے کہ خالق کائنات نے کتنی بڑی امانت اس کے سپرد کی ہے تو وہ کسی قسم کی بے ہودگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

پھر اہل ایمان کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ ان کے دل ہر وقت اس احساس سے لبریز رہتے ہیں کہ ان کے اموال میں اللہ تعالیٰ کا بھی حق ہے جو زکاۃ کی صورت میں انھیں ادا کرنا ہے۔

اہل ایمان کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ جنسی امور میں اللہ تعالیٰ کے احکامات کی پابندی کریں اور اس کی متعین کردہ حدود سے تجاوز نہ کریں۔ اور ان کے لیے یہ بھی نہایت ضروری ہے کہ وہ معاشرتی تعلقات میں بھی احکام الٰہی ملحوظ رکھیں، امانتوں کی حفاظت کریں اور عہد و پیمان کی پاسداری کریں۔

اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک اخلاق کا کیا مفہوم تھا۔ عمدہ اخلاق جس طرح صحیح عقیدے کا ایک فطری نتیجہ ہیں، اسی طرح درست عقیدے

سے عبادات میں خشیت الٰہی پیدا ہوتی ہے۔ صحابۂ کرام نے اسی طرح سے قرآنی تعلیمات اور فرامین نبویہ کی حکمتوں کو حاصل کیا۔

قرآن حکیم نے ان کے سامنے ایک مومن شخص کا تفصیلی نقشہ کھینچ کر رکھ دیا جس میں ان کی سب سے پہلی اور نمایاں علامت بندگی کو قرار دیا۔ صحابہ کرام نے بھی یہ بات جان لی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا سب سے پہلا وصف نماز میں خشوع وخضوع اور عجز وانکسار اور آخری وصف نماز کی حفاظت قرار دیا اور بتایا کہ وہ زکاۃ کی ادائیگی پر کاربند رہتے ہیں۔ زکاۃ ایک ایسی عبادت ہے جو اپنے اندر بے شمار اخلاقی فضیلتوں کو لیے ہوئے ہے۔

قرآن حکیم موقع ومحل اور ضروریات کے لحاظ سے کبھی اس کی عبادت کے پہلو کو نمایاں کرتا ہے اور کبھی اخلاقی پہلو کو۔ سورۂ ذاریات میں متقین کے اوصاف میں عبادت کے پہلو کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اٰخِذِيْنَ مَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ۚ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ ○ كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ○ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ○ وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ○﴾

''جو کچھ ان کا رب انھیں دے گا، وہ اسے لے رہے ہوں گے۔ بلاشبہ وہ اس سے پہلے نیکوکار تھے، وہ رات کو بہت ہی تھوڑا سوتے تھے اور وہ سحری کے وقت مغفرت مانگا کرتے تھے اور ان کے مالوں میں سوالی اور محروم (نہ مانگنے والے) شخص کا حق (حصہ) ہوتا تھا۔''[1]

سورۂ رعد میں باشعور لوگوں کے اوصاف میں اخلاقی پہلو کو اہمیت دی گئی:

﴿اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ۚ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ○ الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ○ وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ....﴾

[1] الذّٰریٰت 51:16-19.

''کیا پھر وہ شخص جو جانتا ہے کہ یقیناً جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے وہی حق ہے، وہ اس شخص کے مانند (ہوسکتا) ہے جو اندھا ہے؟ بس عقل والے ہی نصیحت پکڑتے ہیں، وہ جو اللہ کا عہد پورا کرتے ہیں اور پختہ وعدہ نہیں توڑتے اور جو جوڑتے ہیں وہ چیز جسے اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا اور وہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور برے حساب سے گھبراتے ہیں اور جنھوں نے اپنے رب کے چہرے کی طلب کے لیے صبر کیا اور نماز قائم کی اور ہمارے دیے رزق میں سے پوشیدہ اور ظاہر طور پر خرچ کیا اور وہ برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں، انھی لوگوں کے لیے آخرت کا گھر ہے۔''[1]

دانشور اور باشعور لوگوں کی مناسبت سے اس مقام پر زیادہ تر اخلاقی اوصاف کا تذکرہ کیا گیا ہے، مثلاً: وفاداری، صلہ رحمی، صبر اور مال خرچ کرنا۔ لیکن یہاں یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ یہ محض معاشرتی خوبیاں نہیں بلکہ یہ وہ اوصاف ہیں جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں اور اسی کی خوشنودی کے لیے اختیار کیے گئے ہیں۔ اس طرح ان امور میں عبادت اور تقویٰ دونوں خوبیاں موجود ہیں۔ ان میں وفاداری ہے تو اللہ کے ساتھ عہد و پیمان کی وجہ سے، وہ ان تعلقات کو قائم رکھتے ہیں جنھیں اللہ نے قائم رکھنے کا حکم دیا ہے۔ وہ اپنے رب کے ڈر اور یوم حساب کو بُرے انجام کے خوف سے اچھے کام کرتے ہیں اور برے کاموں سے دور رہتے ہیں۔ ان کا صبر بھی صرف اپنے رب کی خوشنودی کے لیے ہوتا ہے۔ ان کے ہر قسم کے طرزِ عمل اور اخلاق و اوصاف سے مقصود صرف اللہ تعالیٰ کی رضا اور یوم آخرت کی جواب دہی کا احساس ہوتا ہے۔[2]

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تربیت اسی نکتے پر کی گئی کہ عبادت بھی اخلاق کی ایک قسم ہے کیونکہ اللہ سے ایفائے عہد، اس کی نعمتوں کی شکرگزاری، ہر خوبی کا اعتراف اور معززین و

[1] الرعد 13:19-22. [2] العبادة في الإسلام للقرضاوي، ص: 123.

اکابر کی توقیر و تعظیم یہ سب عبادات ہیں اور یہی اخلاق حسنہ بھی ہیں۔[1]

صحابۂ کرام اخلاق ربانی کے حامل تھے۔ ان اخلاق کو پیدا کرنے والی چیز ایمان باللہ تھی اور پروان چڑھانے والی چیز آخرت میں بخشش کی امید تھی اور ان سے مقصود محض اللہ کی رضا اور اس کے اجر و ثواب کا حصول تھا، اس لیے وہ گفتگو میں سچائی سے کام لیتے تھے، امانت میں خیانت نہیں کرتے تھے، عہد و پیمان کی پاسداری کرتے تھے، مصائب و تکالیف اور میدان جہاد میں صبر سے کام لیتے تھے، مظلوم کی مدد کرتے تھے، چھوٹوں پر رحم اور بڑوں کا احترام کرتے تھے اور اپنے ہر طرز عمل میں عمدہ اور بہترین اسلوب اختیار کرتے تھے۔ اور یہ سب کچھ صرف اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے اور اس سے اجر و ثواب لینے کے لیے ہوتا تھا اور یہی ان کا اوڑھنا اور بچھونا تھا۔ فرمان ربانی ہے:

﴿فَوَقٰىهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰىهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا ۝ وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ۝﴾

''پھر اللہ نے انھیں اس دن کے شر (عذاب) سے بچا لیا اور تازگی اور سرور سے نوازا۔ اور ان کے صبر کے عوض انھیں جنت اور ریشمی لباس کا بدلہ عطا فرمایا۔''[2]

مومن کا اخلاق سراسر عبادت ہے کیونکہ مومن کا معیار خیر اور شر ہے (وہ اسی کے ذریعے ہر چیز کو پرکھتا ہے) اور انتخاب و اجتناب میں اس کا مرجع اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی ہیں۔ (خیر و شر کے پرکھنے کے لیے ضمیر کافی نہیں ہوتا) کیونکہ ضمیر معصوم عن الخطا نہیں ہے۔ بہت سے لوگ اپنے ضمیر کے فیصلے کے مطابق برائیوں اور آلودگیوں میں پھنسے ہوئے ہیں مگر اس پر خوش اور مطمئن ہیں۔[3]

محض عقل کوئی معتمد علیہ چیز نہیں کیونکہ یہ ایک ماحول اور معاشرے تک محدود ہوتی ہے اور خواہشات اور اختلافات اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ علم

1 الوسطية في القرآن الكريم للصلابي، ص: 591. 2 الدهر 76:11-12. 3 الإيمان والحياة للقرضاوي، ص: 256.

اخلاق کے فلسفی آج تک فلسفۂ اخلاق کے کسی ایک معیار پر متفق نہیں ہو سکے۔ رسم و رواج نہ تو دائمی ہوتے ہیں اور نہ سب کے لیے قابلِ قبول۔ نئی نسل پرانی نسل کے رسوم و رواج کو بدل دیتی ہے۔ بعض اوقات ایک ہی قوم کے ایک ہی علاقے کے رسوم و رواج مختلف ہوتے ہیں، اس لیے مومن کو ایک ایسے قابل اعتماد اور محفوظ مصدر و مرکز کی ضرورت تھی جس کے بھٹکنے اور بہکنے کا اندیشہ نہ ہو۔ جو نہ کسی سے متاثر ہو اور نہ کسی پر زیادتی کرے۔[1]

تربیت نبوی میں اخلاق ایک وسیع مفہوم کا حامل لفظ ہے جو انسان کے تمام اعمال و حرکات، جذبات و احساسات اور فکر و نظر کا احاطہ کرتا ہے۔ نماز کے اپنے اخلاق و آداب ہیں کہ حالتِ نماز میں نمازی پر خشیت طاری ہو۔ گفتگو کے اخلاق و آداب یہ ہیں کہ لغو اور بے ہودہ باتوں سے اجتناب کیا جائے۔ جنسی معاملات کے اخلاق و آداب یہ ہیں کہ اللہ کی حدود و قیود کی پاسداری کی جائے۔ باہمی معاملات کے اخلاق و آداب یہ ہیں کہ بخل اور فضول خرچی کا درمیانی راستہ اختیار کیا جائے، معاشرتی زندگی کے اخلاق و آداب یہ ہیں کہ باہمی مشاورت سے معاملات طے کیے جائیں۔ اگر دشمن زیادتی کرے تو اس کے لیے بھی اخلاق و آداب ہیں کہ اس سے بدلہ لیا جائے مگر اس کی طرف سے ہونے والی زیادتی سے بڑھ کر زیادتی نہ کی جائے۔ غرض مسلمان کی زندگی کا کوئی ایسا گوشہ نہیں جس میں اسلام اس کی اخلاقی رہنمائی نہ کرتا ہو۔ ہر چیز کے لیے اخلاقی رہنمائی موجود ہے جو ایک مسلمان کو بتاتی ہے کہ یہ کام کس طرح انجام دینا چاہیے اور اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ قرآنی مفہوم میں تمام تر اخلاق خالصتاً ایک اللہ کے لیے ہوں۔ کسی انسان کی خوشنودی مقصود نہ ہو، صرف ایک اللہ کے حکم کی تعمیل اور اس کی رضا کا حصول مطلوب ہو۔ سچائی (لوگوں میں شہرت کے لیے نہیں) صرف اللہ کی رضا کے لیے ہو۔ عہد کی پاسداری

1 الوسطية في القرآن الكريم للصلابي، ص:592.

(اپنی ساکھ قائم کرنے کے لیے نہیں) صرف ایک اللہ کی خوشنودی کے لیے ہو۔ جنسی تعلقات میں حرام امور سے اجتناب صرف اللہ تعالیٰ کے احکامات کی تعمیل کے لیے ہو۔ دوسروں کی غلطیوں سے درگزر کرنا اور معاف کر دینا احسان جتلانے کے لیے نہ ہو بلکہ اللہ کی رضا مقصود ہو۔ ظالم سے ظلم کا بدلہ (جرأت و بہادری کے اظہار کے لیے نہیں) صرف اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہو۔ اعمال کی اچھے انداز میں انجام دہی دنیوی مفادات کے لیے نہیں بلکہ صرف اللہ کی رضا کے لیے ہو۔ یہ سب کچھ صرف ایک اللہ کی بندگی کے لیے ہو، اسی کے خوف اور ڈر کی بنیاد پر ہو اور صرف اس کی خوشنودی کے حصول کے لیے ہو۔ یہ کوئی انسانی سودے بازی نہیں جو نفع ونقصان کے لیے کی جاتی ہے بلکہ یہ ایک معاملہ ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہی ہونا چاہیے۔[1]

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝﴾

”کہہ دیجیے: آؤ میں پڑھ کر سناتا ہوں جو کچھ تمھارے رب نے تم پر حرام کیا ہے، یہ کہ تم اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور

1 دراسات قرآنية لمحمد قطب، ص: 139.

اپنی اولاد کو تنگ دستی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم تمھیں بھی اور انھیں بھی رزق دیتے ہیں اور بے حیائی کے کاموں کے قریب نہ جاؤ، خواہ وہ ظاہر ہوں یا چھپے ہوئے ہوں اور کسی ایسی جان کو قتل مت کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہو، سوائے اس کے جس کا قتل برحق ہو، ان ساری باتوں کی اللہ نے تمھیں تاکید کی ہے تاکہ تم عقل سے کام لو اور تم یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر اس طریقے سے جو سب سے اچھا ہو، یہاں تک کہ وہ پختگی کی عمر کو پہنچ جائے اور تم ناپ اور تول کو انصاف کے ساتھ پورا دو، ہم کسی جان کو اس کی طاقت سے بڑھ کر مکلف نہیں ٹھہراتے۔ اور جب تم کوئی بات کہو تو انصاف سے کام لو، اگرچہ (معاملہ تمھارے) قریبی رشتے دار (کا) ہو اور تم اللہ کا عہد پورا کرو۔ ان ساری باتوں کی اللہ نے تمھیں تاکید کی ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو اور یقیناً یہ میرا راستہ سیدھا ہے، لہٰذا تم اسی کی پیروی کرو اور تم دوسرے راستوں کی پیروی مت کرو، وہ تمھیں اللہ کے راستے سے الگ کر دیں گے۔ اللہ نے تمھیں اس کی تاکید کی ہے تاکہ تم پرہیزگاری اختیار کرو۔"[1]

یہ وہ عمومی میثاقِ اخلاق ہے جس کی پابندی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے لوگوں نے کی تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ سیدھی راہ پر گامزن رہیں۔ یوں اس میثاقِ اخلاق کا عقیدے کے ساتھ گہرا اور بنیادی تعلق ہے جو کسی بھی صورت میں اس سے جدا نہیں ہو سکتا۔

اخلاقی اعمال کا دائرہ نہایت وسیع ہے جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے۔ وحی الٰہی نے اسے نہایت اعلیٰ و ارفع مقام عطا کیا ہے کہ اسے دین اور عبادت قرار دیا اور بتایا کہ ان اخلاقی تعلیمات کو اختیار کرنے کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت زیادہ ثواب ہے اور ان تعلیمات کی مخالفت کی صورت میں المناک عذاب ہے۔[2]

1 الأنعام 6:151-153. 2 الوسطية في القرآن الكريم للصلابي، ص: 594.

جب ہم سورۂ انعام کی مذکورہ آیات کو بنظر غائر دیکھتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ یہ آیات پانچ ضروری اصولوں کو اہتمام کے ساتھ بیان کر رہی ہیں جن سے دین و دنیا کی مصلحتیں وابستہ ہیں۔ اگر ان اصولوں کو چھوڑ دیا جائے تو دنیا کے معاملات درست نہ رہیں بلکہ یہ فساد کی طرف بڑھ جائیں، خانہ جنگی کی صورت پیدا ہو جائے، انسانی زندگی غیر محفوظ ہو جائے، نجات کے راستے مفقود ہو جائیں اور ہر جانب محض خسارہ اور تباہی نظر آئے۔[1]

نبی کریم ﷺ کی دعوت کے مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی تھا کہ لوگوں کو شریعت کی جانب واپس لایا جائے کیونکہ شریعت ان پانچ ضروری اصولوں کی پاسداری کرتی ہے۔ ان آیات کریمہ میں جو پانچ ضروری اصول بیان کیے گئے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

حفاظت دین: یہ اصول اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے مستنبط ہے:

﴿ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ﴾

''اور یقیناً یہ میرا راستہ سیدھا ہے، لہٰذا تم اسی کی پیروی کرو اور تم دوسرے راستوں کی پیروی مت کرو، وہ تمھیں اللہ کے راستے سے الگ کر دیں گے۔''[2]

اسی طرح ارشاد فرمایا: ﴿ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـــًٔا ﴾ ''اور یہ کہ تم اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ۔''

چونکہ شرک کی موجودگی میں دین برقرار نہیں رہ سکتا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حکم دیا ہے کہ وہ صرف اسی کی عبادت کریں اور اس کے بتائے ہوئے سیدھے راستے کی اتباع کریں۔ اس راستے پر چلنے کی صورت میں کسی باطل قوت کا کوئی خوف نہیں ہوگا، نہ سامنے کی جانب سے نہ عقب سے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو شیطان کے راستوں پر چلنے سے منع کیا ہے کیونکہ شیطانی راستے سراسر گمراہی اور سرکشی کے راستے ہیں۔

1 الموافقات للشاطبي:2/8. 2 الأنعام6:153.

ان راستوں پر چلنے سے دین حق سے دوری پیدا ہوگی، نیز نفسانی خواہشات اور شیطانی وسوسوں کی اتباع جنم لے گی۔[1]

نبی کریم ﷺ نے دین کی حفاظت کا اتنا اہتمام کیا کہ اسے عملی زندگی میں اختیار کیا، دین کی خاطر جہاد کیا، دین کی جانب سب لوگوں کو دعوت دی، دین کے مطابق تمام امور اور فیصلے انجام دیے اور ہر دین مخالف قوت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔[2]

حفاظت نفس: ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ﴾

''اور تم اس جان کو قتل نہ کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہے، سوائے حق کے۔''[3]

اسلامی شریعت نے حفاظت نفس کے سلسلے میں ٹھوس اور تحفظ کے ضامن قوانین وضع کیے ہیں۔[4] ان احکامات میں کسی پر ظلم وزیادتی کو روکنا اور ان ذرائع کا سدباب کرنا شامل ہیں جو کسی کو قتل کرنے پر اکساتے ہوں، مثلاً: قصاص، اسی طرح کسی جان کو قتل کرنے کے لیے کسی واضح ثبوت اور شرعی دلیل کا پایا جانا، جان کی ضمانت، قصاص پر عمل درآمد میں اس غرض سے تاخیر کرنا کہ ہوسکتا ہے ملزم قاتل نہ ہو اور اسے معاف کرنا پڑے اور بحالت مجبوری کسی حرام چیز کی اباحت بھی انھی احکامات کا حصہ ہیں۔[5]

حفاظت نسل: ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ﴾

''اور بے حیائی کے کاموں کے قریب نہ جاؤ، خواہ وہ ظاہر ہوں یا چھپے ہوئے ہوں۔''[6]

اور سب سے بڑی بے حیائی زنا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے فرمان میں ''فاحشہ'' قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

1 مقاصد الشريعة للدكتور محمد سعد اليوبي، ص: 188. 2 مقاصد الشريعة للدكتور محمد سعد اليوبي، ص: 194. 3 بنيّ إسرآء يل 33:17. 4 الموافقات للشاطبي: 27/4. 5 مقاصد الشريعة للدكتور محمد سعد اليوبي، ص: 212. 6 الأنعام 151:6.

﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا ۝﴾

''اورتم زنا کے قریب مت جاؤ، یقیناً وہ بے حیائی اور بری راہ ہے۔''[1]

حفاظت نسل کا قانون زندگی کا اساسی جوہر اور زمین کی آباد کاری کا سبب ہے۔ اسی میں امت اسلامیہ کی طاقت کا راز مضمر ہے اور یہ عزت اور مال کی حفاظت کی ضمانت بھی ہے۔ اس لیے شریعت اسلامیہ نے حفاظت نسل کا قانون لاگو کیا اور ہر اس قانون کی مخالفت کی جو اس کے راستے میں رکاوٹ ہو اور اس سلسلے میں اہم ترین اصول وضوابط مقرر کیے۔[2]

حفاظت مال: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِىَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۠﴾

''اورتم یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ، سوائے اس کے جو احسن طریقہ ہو، حتی کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے۔''[3]

اس قانون کی پاسداری کے لیے کسی کا مال غصب یا ضائع کرنے سے شریعت نے منع کیا ہے۔ مدنی دور میں چوری، ڈاکہ زنی اور لوٹ مار پر حد مقرر کرنا، اِتلافِ مال کی ضمانت اور اپنے مال کے دفاع کو جائز ٹھہرانا، قرض کی توثیق اور اس پر گواہ مقرر کرنا اور کسی گری پڑی چیز اور اس سے متعلقہ قوانین بھی اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔[4]

حفاظت عقل: عقل کی حفاظت بھی ضروریات خمسہ کا اہم جز ہے کیونکہ تمام دینی امور کا مکلّف وہی شخص قرار پائے گا جس کی عقل سلامت ہوگی اور فاسد عقل والا کسی ذمہ داری کا اہل نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝﴾ ''تاکہ تم متقی بن جاؤ۔''[5]

اس میں اسی جانب اشارہ ہے (کہ عقلمند شخص اپنے فائدے کے لیے اللہ سے ڈرتے

1 بنيٓ إسرآء يل 32:17. 2 مقاصد الشريعة للدكتور محمد سعد اليوبي، ص: 257. 3 بني إسرآء يل 34:17. 4 مقاصد الشريعة للدكتور محمد سعد اليوبي، ص: 287. 5 البقرة 183:2.

ہوئے احکاماتِ الٰہی کے مطابق زندگی گزار کر رضائے الٰہی حاصل کرے) واللہ اعلم۔[1]

بلاشبہ اسلام نے عقل کو خراب کرنے اور اس میں خلل ڈالنے والی ہر چیز کو اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے۔[2]

قرآن کریم صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے عقائد، عبادات اور اخلاقیات میں تعلیم و تربیت کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھا اور اس کے ساتھ ساتھ وہ مقاصد شریعت کی طرف بھی رہنمائی کر رہا تھا۔ قرآن میں مذکور اخلاقِ ربانی توحید اور صرف اللہ کی بندگی کا اثبات کرتے دکھائی دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی قرآنی منہج کے اصول و حقائق پر بے حد زور دیا گیا ہے۔ جس سے دین کے بنیادی راستے کا سراغ ملتا ہے۔ مندرجہ بالا تحقیق سے ثابت ہوا:

① صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی تمام احکامات کے صادر ہونے کا مرکز ہے۔ وہ پختہ کار شارع ہے اور اسی نے اخلاقی معیارات و اقدار کو مشروع قرار دیا ہے جو فطرت کے عین مطابق اور عقل سلیم کے موافق ہیں۔

② بلاشبہ عمدہ اخلاق دین کا جزوِ لاینفک ہیں بلکہ ربانی منہج کی اصل ہیں۔ محض انفرادی فضائل، اجتماعی آداب یا شہری قوانین کا نام اخلاق نہیں ہے۔

③ حیات انسانی میں اخلاقیات کو بنیادی حیثیت حاصل ہے جس پر قائم و دائم رہ کر انسان کامیاب زندگی گزار سکتا ہے اور اخلاق ہی انسانی زندگی کو شیاطین کے حملوں سے محفوظ رکھتے اور ذاتی مصلحتوں اور خواہشات کے تابع ہونے سے بچاتے ہیں۔[3]

قرآن کریم بہت سے متنوع آداب کو بیان کرتا ہے جو فضائل کے حصول میں بہترین رہنما ہیں، چنانچہ کتاب الٰہی میں انفرادی اور اجتماعی آداب تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔

قرآنِ کریم کی بہت سی جامع آیات کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے قابل تعریف اخلاق کو اپنانے اور قابل مذمت عادات سے دور رہنے کے لیے احکامات صادر فرمائے ہیں۔

1 مقاصد الشريعة للدكتور محمد سعد اليوبي، ص: 189. 2 مقاصد الشريعة للدكتور محمد سعد اليوبي، ص: 236. 3 المنهاج القرآني في التشريع لعبد الستار سعيد، ص: 425-433.

اللہ تعالیٰ نے سورۂ بنی اسرائیل (15:23-38) میں جو ضابطۂ اخلاق بیان کیا اس میں سب سے پہلے توحید، یعنی صرف اللہ کی عبادت کا تذکرہ فرمایا۔ بعدازاں اس ضابطۂ اخلاق کے تحت اچھے اور برے اخلاق بیان فرمائے کیونکہ صرف اللہ تعالیٰ کو عبادت کے لائق تصور کرنا بھی ایک بنیادی اخلاقی اصول ہے۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار عدل و انصاف اور دلی سچائی سے عبارت ہے اور اس کی وحدانیت کا انکار درحقیقت بداخلاقی کے گڑھے میں گرنا ہے۔ حق کو قبول کرنے سے انکار، رسولوں کی اتباع سے متکبرانہ پہلوتہی، کبر وغرور، باطل کی سربلندی اور غلبے کے لیے بحث وتکرار، گمراہ کن اور بے بنیاد رسم و رواج کی تقلید اور ان پر جمے رہنا سب ایسے برے اخلاق ہیں جو انسان کو ہلاکت میں ڈال دیتے ہیں اور اسے راہ حق سے روکتے ہیں، باوجود اس کے کہ حق واضح ہو چکا ہے۔ اس طرح وہ سعادت دارین سے محروم ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کا یہ ایقان و ایمان بھی رخصت ہو جاتا ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کا طریق ہی وہ راستہ ہے جو انسان کو دنیا و آخرت کی سعادت سے بہرہ ور کرتا ہے۔ غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان آیات میں خاندانی نظام کے مختلف اخلاقی پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے۔ ان میں والدین سے نیک سلوک، ان کا احترام ملحوظ رکھنا اور ان سے احسان اور تاحیات اچھے طریقے سے پیش آنا اور عزیز و اقارب اور کمزور لوگوں سے حسنِ سلوک شامل ہیں۔ علاوہ ازیں ان آیات میں مالی امور اور اخراجات میں فضول خرچی سے منع کیا گیا ہے، نیز بہت زیادہ بخیلی اور انتہائی فضول خرچی کے درمیان راہِ اعتدال کو اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فضول خرچی سے نفرت دلانے کے لیے فضول خرچی کرنے والوں کو مخلوق کے سب سے برے بندے شمار کیا ہے۔

﴿إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ ۖ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا﴾

”بے شک فضول خرچ شیاطین کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا سخت ناشکرا ہے۔“ [1]

1 بني إسرآء يل 27:17.

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حرص اور بخل سے نفرت دلانے کے لیے اس کی مثال بیان فرمائی ہے:

﴿وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ﴾

''اور اپنا ہاتھ اپنی گردن کے ساتھ بندھا نہ رکھ۔''[1]

ان آیات میں اعلیٰ درجے کے اخلاق حسنہ کا درس دیا گیا ہے کہ اگر انسان کسی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے مال خرچ نہیں کرسکتا تو اسے کم از کم اچھی گفتگو تو ضرور کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَإِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَاءَ رَحْمَةٍ مِّن رَّبِّكَ تَرْجُوهَا فَقُل لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُورًا ۝﴾

''اور اگر تو اپنے رب کی رحمت تلاش کرنے کے لیے، جس کی تو امید رکھتا ہے، ان (عزیز و اقارب) سے اعراض ہی کرے تو تُو ان سے ایسی بات کہہ جس میں آسانی ہو۔''[2]

یہ ایک ایسی وصیت ہے جس کا لوگوں کے احسان پر مبنی تعلقات میں گہرا اثر نظر آتا ہے اور بعض اوقات تو اس کا اثر ان مادی نوازشات سے بڑھا ہوا نظر آتا ہے جنھیں احسان جتلانے اور اذیت پہنچانے سے آلودہ کر دیا جائے۔

سورۂ بنی اسرائیل کی آیات میں اطاعتِ الٰہی سے سرکشی، خود نمائی، قساوتِ قلبی، سنگدلی اور بے رحمی جیسے برے اخلاق کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے جن کے نتیجے میں قتل جیسا قبیح جرم خاص طور پر چھوٹی بچیوں کا قتل سرزد ہوتا ہے۔ قتل اگرچہ عظیم جرم ہے مگر یہ قوانین قصاص کا حصہ ہے۔ ان آیات میں اس کا ذکر اخلاقی پہلو سے کیا گیا جس کا مقصد قتل جیسے مذموم فعل کے ارتکاب سے روکنا اور درست منہج کی طرف رہنمائی کرنا، خصوصاً بچیوں کو قتل کرنے کے

1 بنيّ إسرآء يل 29:17. 2 بنيّ إسرآء يل 28:17.

نظریے کی اصلاح کرنا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ﴾
''ہم انھیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمھیں بھی۔'' [1]

ایسے مذموم کام سے روکنے کا مقصد معاشرے میں اس بے روک ٹوک پھیلنے والی برائی کا قلع قمع کرنا ہے جس کا وہ بلا سوچے سمجھے ارتکاب کرتے تھے۔

سورۂ بنی اسرائیل کی ان آیات میں زنا سے بھی روکا گیا ہے۔ زنا فی نفسہ ایک خطرناک اخلاقی جرم ہے جس میں سرکشی اور عزت و حرمت کی پامالی پائی جاتی ہے، پاکدامنی اور شرف انسانی کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے اور اعلیٰ انسانی اقدار کی توہین کی جاتی ہے۔

علاوہ ازیں ان آیات میں ایسے امور کا حکم یا نہی ہے جن کی بنیاد امانت یا خیانت، جدوجہد یا لہو و لعب اور انتہائی عاجزی یا غرور و تکبر ہے۔ امانت کے سلسلے میں جوانی تک پہنچنے سے پہلے یتیم کے مال کی حفاظت، ایفائے عہد اور ناپ تول میں انصاف کا حکم دیا گیا ہے اور خیانت کے حوالے سے ان احکام کے اضداد، یعنی یتیم کا مال کھانے، عہد شکنی اور کم تولنے کی ممانعت ہے۔ جدوجہد اور محنت و کوشش کے سلسلے میں انسان کو نفع بخش امور میں مشغول رہنے کا درس دیا گیا ہے اور جس چیز کا علم نہ ہو اس سے کنارہ کش رہنے کی تلقین کی گئی ہے:

﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا﴾

''اور جس بات کا آپ کو علم ہی نہیں اس کے پیچھے نہ لگیں، بے شک کان، آنکھ اور دل، ان میں سے ہر ایک کی بابت سوال کیا جائے گا۔'' [2]

جہاں تک بے فائدہ امور کا تعلق ہے تو ہر اس کام سے منع کر دیا گیا جو بے فائدہ اور لا حاصل ہو۔ انتہا درجے کی عاجزی یہ ہے کہ انسان کو اپنی حدود و قیود کا شعور ہو اور اپنی قدر و عزت جاننے اور اسے درست جگہ استعمال کرنے کی بصیرت حاصل ہو۔ اس کے

1 بني إسرآء يل 31:17۔ 2 بني إسرآء يل 36:17۔

مقابلے میں خود نمائی اور غرور و تکبر کی بنیاد جہالت، کم عقلی اور حماقت پر ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ إِنَّكَ لَن تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَن تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا ۝ ﴾

''بلاشبہ تُو نہ تو کبھی زمین پھاڑ سکتا ہے اور نہ کبھی لمبائی میں پہاڑوں تک پہنچ سکتا ہے۔''[1]

ان آیات میں مذکورہ احکامات انسانی زندگی کو سنوارنے والے ہیں۔ ان جامع و مانع احکام کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی وصیت ان الفاظ پر ختم فرمائی:

﴿ ذَٰلِكَ مِمَّا أَوْحَىٰ إِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ۗ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ فَتُلْقَىٰ فِي جَهَنَّمَ مَلُومًا مَّدْحُورًا ۝ ﴾

''یہ وہ حکمت کی باتیں ہیں جو آپ کے رب نے آپ کی طرف وحی کی ہیں۔ اور اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود نہ ٹھہراؤ، ورنہ جہنم میں ملامت زدہ، دھتکارے ہوئے ڈالے جاؤ گے۔''[2]

اللہ تعالیٰ نے ان احکامات کو حکمت قرار دیا اور آغازِ آیات کی طرح ان کا اختتام دعوتِ توحید پر اور شرک سے بچنے پر کیا کیونکہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا ہر بھلائی کی چابی ہے اور ایمان ہر بھلائی کا محافظ ہے، جبکہ کفر ہر برائی کی جڑ اور اس کا سبب ہے۔[3]

یہ ہے اہل ایمان کی ایک جماعت کی تربیت کرنے کا قرآنی انداز جو اچھے اخلاق اختیار کرنے اور برے اخلاق سے احتراز پر مبنی ہے۔

قرآنی قصص سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی عمدہ اخلاقی تربیت

قرآنی قصص مواعظِ حسنہ، حکمت و دانائی، عقائد، اخلاقی رہنمائی، تربیتی اسالیب اور سابقہ امتوں کے واقعات سے نصیحت حاصل کرنے سے بھرے پڑے ہیں۔ یہ قصص صرف تاریخی واقعات نہیں جو صرف مورخین کو فائدہ دیتے ہیں بلکہ یہ ان سے کہیں اعلیٰ و ارفع

1 بنيّ إسرآء يل 37:17. 2 بنيّ إسرآء يل 39:17. 3 المنهاج القرآني في التشريع لعبد الستار سعيد، ص:433.

ہیں۔قرآنی واقعات میں توحید،علم،عمدہ اخلاق،عقلی دلائل،بصیرت افروز حقائق،قابل عمل نصائح اور تعجب خیز مباحث پائے جاتے ہیں۔

بطور مثال ہم حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ بیان کرتے ہیں جس میں ہم اس بصیرت افروز واقعے کے اخلاقی پہلوؤں اور اس کے عمدہ مناظر پر روشنی ڈالیں گے۔

علمائے اخلاق اور حکماء کا کہنا ہے کہ امت اسلامیہ کا معاملہ اس وقت تک درست نہیں ہوسکتا جب تک اس امت میں اعلیٰ ترین اصلاح کرنے والے، دین پر قائم رہنے والے اور ایسے رہنما افراد جنم نہ لیں جن میں اچھے اوصاف اور عمدہ اخلاق پائے جائیں۔اگر یہ ذمہ داری کسی نبی کے سپرد ہوتو اس کے لیے چالیس اوصاف کا تذکرہ ملتا ہے جو تمام تر ایسے آداب وفضائل ہیں جن کی مدد سے پیغمبر امت کی بھلائی کی تدابیر کرتا ہے۔اور اگر یہ ذمہ داری نبی کے علاوہ کسی صاحب فضیلت سردار پر ہوتو اس کے لیے ان چالیس اوصاف سے کم پر اکتفا کیا جائے گا۔

حضرت یوسف علیہ السلام جو ایک کامل اور صاحب جمال نبی تھے۔ان کی سیرت کا گہرائی سے مطالعہ کر کے قائدین اور رہنما اہم معاملات کی ذمہ داری موزوں شخصیات کے سپرد کرسکتے ہیں۔

ہم یوسف علیہ السلام کے اعلیٰ منصبِ حکومت کا ذکر کرتے ہوئے ایسے بارہ فضائل کا تذکرہ کریں گے جو ہر اعلیٰ منصب پر فائز شخصیت میں ہونے چاہئیں تاکہ وہ قرآن کا مطالعہ کرنے والے ہر شخص کے لیے نصیحت اور فضائل کے متلاشی کے لیے لمحۂ فکریہ ثابت ہوں۔[1]

حکمران کے اوصاف

شہوتِ نفسانی سے بچنا: حکمران نفسانی خواہشات سے بچے تاکہ وہ اپنے نفس پر قابو رکھ سکے اور اس کی روحانی طاقت میں اضافہ ہو۔اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

1 تفسير القاسمي:310/9.

﴿كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ۭ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ○﴾

''اسی طرح (ہوا) تاکہ ہم اس سے برائی اور بے حیائی کو پھیر دیں، بے شک وہ ہمارے خالص کیے ہوئے بندوں میں سے تھا۔''[1]

بردباری: غیظ وغضب کے وقت بردباری سے ضبطِ نفس پیدا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿قَالُوْٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِيْ نَفْسِهٖ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ ○﴾

''انھوں (برادرانِ یوسف) نے کہا: اگر اس نے چوری کی ہے تو اس سے پہلے اس کے ایک بھائی نے بھی چوری کی تھی، چنانچہ یوسف نے یہ (بات) اپنے دل میں چھپائی اور ان پر ظاہر نہ کی (اور دل میں) کہا: تم بدترین درجے پر ہو اور اللہ خوب جانتا ہے جو تم بیان کرتے ہو۔''[2]

نرمی اور سختی کا درست استعمال: نرمی اور سختی کو اپنے اپنے مقام پر استعمال کرنے کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے اس طرح فرمایا:

﴿وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُوْنِيْ بِاَخٍ لَّكُمْ مِّنْ اَبِيْكُمْ ۚ اَلَا تَرَوْنَ اَنِّيْٓ اُوْفِي الْكَيْلَ وَاَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ○ فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِيْ بِهٖ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِيْ وَلَا تَقْرَبُوْنِ ○﴾

''اور جب اس نے ان کا سامان تیار کروایا تو کہا: میرے پاس اپنا پدری بھائی (بنیامین) لانا، کیا تم دیکھتے نہیں کہ میں پورا ماپ (غلہ) دیتا ہوں اور میں بہترین مہمان نواز ہوں، پھر اگر تم اسے میرے پاس نہ لائے تو تمھارے لیے میرے پاس کوئی ماپ (غلہ) نہیں اور نہ تم میرے قریب آنا۔''[3]

اپنے رب پر بھروسا کرتے ہوئے خود اعتمادی کا حصول: اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

---

1 یوسف 24:12۔ 2 یوسف 77:12۔ 3 یوسف 60,59:12۔

﴿قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ○﴾

''(یوسف علیہ السلام نے) کہا: مجھے زمین کے خزانوں (پیداوار) پر مقرر کر دیجیے، بے شک میں خوب نگہبانی کرنے والا خوب جاننے والا ہوں۔''[1]

قوت حافظہ: مضبوط یادداشت اس لیے ضروری ہے کہ انسان ان باتوں کو یاد رکھ سکے جنھیں مدت گزر چکی ہو، نیز لوگوں کی سرگرمیوں کو جان سکے اور ان کے مقابلے میں درست تدبیر کر سکے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ○﴾

''اور یوسف (علیہ السلام) کے بھائی (غلہ لینے) آئے اور اس کے پاس پہنچے تو اس نے انھیں پہچان لیا اور وہ اسے نہیں پہچانتے تھے۔''[2]

خیالات اور تصورات کی عمدگی: یہ اس لیے کہ تمام اشیاء کا تصور وضاحت سے ممکن ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ○﴾

''جب یوسف نے اپنے باپ سے کہا: اے میرے ابا جان! بے شک میں نے (خواب میں) دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے، سورج اور چاند میں نے انھیں دیکھا کہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔''[3]

استعداد، علم سے محبت اور اس میں پختگی: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۚ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۚ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ○﴾

---

1 یوسف 55:12۔ 2 یوسف 58:12۔ 3 یوسف 4:12۔

''اور میں نے اتباع کی ہے اپنے باپ دادا، ابراہیم اور اسحٰق اور یعقوب کے دین کی۔ ہمارے لیے (جائز) نہیں کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرائیں، یہ اللہ کا ہم پر اور (سب) لوگوں پر فضل ہے، لیکن اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔''[1]

مزید ارشاد فرمایا:

﴿رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۣ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ۝﴾

''اے میرے رب! تو نے مجھے کچھ حکومت دی ہے اور مجھے باتوں (خوابوں) کی تعبیر سکھائی ہے، اے آسمان اور زمین کے پیدا کرنے والے! تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا کارساز ہے تو مجھے اسلام پر موت دے اور مجھے صالحین کے ساتھ ملا۔''[2]

شفقت، عجز اور انکسار: حضرت یوسف علیہ السلام نے دو قیدی نوجوانوں سے عاجزانہ گفتگو فرمائی اور کہا:

﴿يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝﴾

''میرے قید کے دو ساتھیو! بھلا کئی جدا جدا معبود بہتر ہیں یا ایک زبردست اللہ؟''[3]

عفو و درگزر: ارشاد ہے:

﴿قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۭ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۡ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝﴾

''یوسف نے کہا: تم پر آج کوئی ملامت نہیں، اللہ تمھاری مغفرت کرے اور وہ ارحم الراحمین ہے۔''[4]

اپنے قبیلے کا اکرام کرنا: ارشاد ربانی ہے:

﴿اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰي وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ وَاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ

1 یوسف 38:12۔ 2 یوسف 101:12۔ 3 یوسف 39:12۔ 4 یوسف 92:12۔

اَجۡمَعِيۡنَ ۝﴾

''تم میری یہ قمیص لے جاؤ اور اسے میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو، وہ بینا ہو جائیں گے اور تم اپنے تمام اہل وعیال کو میرے پاس لے آؤ۔''[1]

قوت گویائی اور فصاحت: حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہ کے خواب کی عمدگی سے تعبیر کی اور بادشاہ، رعایا اور عوام کے دلوں کو اپنی طرف مائل کیا اور یہ سب کچھ حکمت وعلم سے بھرپور پالیسی سے ممکن ہوا۔

﴿فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الۡيَوۡمَ لَدَيۡنَا مَكِيۡنٌ اَمِيۡنٌ ۝﴾

''پھر جب اس نے یوسف سے گفتگو کی تو کہا: یقیناً آج تو ہمارے ہاں مرتبے والا، امین ہے۔''[2]

حسن تدبیر: ارشاد رب العالمین ہے:

﴿قَالَ تَزۡرَعُوۡنَ سَبۡعَ سِنِيۡنَ دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدۡتُّمۡ فَذَرُوۡهُ فِىۡ سُنۡۢبُلِهٖۤ اِلَّا قَلِيۡلًا مِّمَّا تَاۡكُلُوۡنَ ۝﴾

''اس (یوسف علیہ السلام) نے کہا: تم سات سال لگا تار کاشت کرو گے، چنانچہ تم جو (فصل) کاٹو تو وہ اس کی بالیوں ہی میں رہنے دو، سوائے تھوڑی (مقدار) کے جو تم کھاؤ۔''[3]

اللہ کی قسم! قرآن کتنا خوبصورت اور یہ علم کتنا شاندار ہے۔ بلاشبہ قرآنی قصص اور اخلاق کے مابین گہرا تعلق پایا جاتا ہے کیونکہ قرآن میں قصے بیان کرنے کا مقصد ایسے عمدہ اخلاق کی دعوت دینا ہے جو فرد، معاشرہ، جماعت، مملکت، امت اور تہذیب وتمدن کے لیے یکساں مفید ہیں۔ قرآنی قصص جس طرح عمدہ اخلاق کی دعوت دیتے ہیں اسی طرح مذموم اخلاق سے بچنے کی ترغیب بھی دیتے ہیں جن کے باعث بہت سی امتیں اور قبائل تباہی کا شکار ہوئے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی علیہ السلام کی طرف سے کی جانے والی تربیت اور اس منہج سے بھرپور استفادہ کیا جس پر نبی علیہ السلام خود کاربند تھے۔

1 یوسف 93:12. 2 یوسف 54:12. 3 یوسف 47:12.

یہ قرآن سے ماخوذ نبوی اخلاق کی چند مثالیں ہیں جو موضوع کا مکمل احاطہ نہیں کرتیں۔ نبی ﷺ کی سیرت اور سنت میں اس کی مزید وضاحت اور تفصیل سامنے آتی ہے۔

اخلاقیات کے بارے میں ربانی منہج جسے ہم نبوی اور قرآنی منہج بھی کہتے ہیں، ایک ایسا عمدہ اور یکتا طریقہ ہے جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی کیونکہ یہ تو خالص رب العالمین کی طرف سے ہے اور منفرد خصوصیات کا حامل ہے۔ جب یہ خصوصیات مذکورہ منہج پر ایک جگہ جمع ہو جائیں تو ان میں قوت و کمال کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ ان خصوصیات میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

① منہج ربانی کتاب و سنت کی شکل میں ایک قابل قدر اخلاقی مرجع ہے جس میں ہر قابل تعریف اور قابل مذمت چیز کی وضاحت کر دی گئی ہے۔

② منہج ربانی سے انسانی سلوک کی راہ متعین ہوتی ہے اور یہ علم کے حصول کا سبب بنتا ہے۔ چنانچہ اس سے اللہ کے دیدار اور اخروی کامیابی کی امید بندھتی ہے۔

③ منہج ربانی عملی نمونہ اور اخلاقی تربیت کی بنیاد ہے۔ اور یہ عمدہ اخلاق تمام تر خوبیوں کے ساتھ اللہ کے رسول کی ذات میں نظر آتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝﴾

''اور یقیناً آپ خُلقِ عظیم پر (کاربند) ہیں۔''[1]

اعلیٰ ترین نبوی منہاج جو کتاب اللہ پر مبنی ہے، اس نے اخلاق کو بڑی اہمیت دی اور مختلف طریقوں سے اس کے تمام تر فضائل حاصل کرنے کی ترغیب دی اور برے اخلاق اپنانے سے روکا ہے۔

قرآن کریم کا اخلاقی پیکج کائنات، زندگی اور انسان کو سامنے رکھتے ہوئے ترتیب دیا گیا ہے۔ عقائد کو اسلامی محل کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ اور شرعی احکامات کو اس محل کے کمروں، راہداریوں اور دروازوں کی حیثیت دی گئی ہے اور اخلاق کو اس کامل محل کی رونق،

1 القلم 68:4. الوسطية في القرآن الكريم للصلّابي، ص: 603.

خوبصورتی اور تروتازگی کا درجہ حاصل ہے جو اسے ربانی رنگ میں رنگ دیتا ہے۔ اسی طرح اسلامی عقائد ایک پھیلے ہوئے اسلامی درخت کی جڑوں اور تنے کی حیثیت رکھتے ہیں تو شرعی احکامات اس کی ٹہنیاں اور شاخیں ہیں اور عمدہ اخلاق اس درخت کے پکے ہوئے پھل، اس کے لمبے کشادہ سائے اور اس کے عمدہ اور تروتازہ منظر کی عکاسی کرتا ہے۔ [1]

نبوی منہاج میں اثر پذیری، قبولیت اور صحابہ کی تربیت میں پابندی اور ذمہ داری کے اسالیب اختیار کیے گئے تاکہ مخلوق کو نظریات کے دائرے سے نکال کر ٹھوس نافذ العمل شکل کی طرف لایا جائے اور وہ عملی زندگی میں انھیں بروئے کار لا سکیں، چاہے یہ نظریات اعتقادی ہوں جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات کی جستجو اور آخرت کی امید اور چاہے ان کا تعلق عبادت سے ہو، جیسے وہ شعائر جن کا دارومدار نفوس کی تربیت، ارادوں کی پختگی اور تزکیہ نفس پر ہو۔ اور جب اسلامی دعوت ترقی پذیر ہوئی اور ایک اسلامی ریاست معرض وجود میں آ گئی تو اہل ایمان پر چند خارجی ذمہ داریاں نافذ ہوتی چلی گئیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں:

قانون سازی: اس کا مقصد اخلاقی اقدار کی حفاظت کرنا تھا، چنانچہ حدود اور قصاص کا نظام پیش کیا گیا جو فرد اور معاشرے کو قتل اور چوری جیسے جرائم اور دوسروں کی عزتیں پامال کرنے والے زنا اور قذف جیسے گناہوں کے ارتکاب اور شراب اور دیگر منشیات استعمال کرنے سے روکتا ہے جو اس کی عقل کو سلب کر لیتی ہیں۔

معاشرتی استحکام: اس کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی طرف سے واجب کردہ امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور اہل ایمان کی باہمی خیر خواہی اور باہمی ذمہ داری پر تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس ذمہ داری کو زکاۃ، نماز اور اللہ و رسول کی اطاعت کے ساتھ نہ صرف بیان فرمایا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس فریضے کو اس امت کا بنیادی ڈھانچا قرار دیا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

1 المنهاج القرآني في التشريع لعبد الستار سعيد، ص:425.

﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ ۗ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۗ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ اَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○﴾

''تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی اصلاح) کے لیے پیدا کی گئی ہے، تم نیک کاموں کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو اور تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اگر اہل کتاب ایمان لے آتے تو ان کے حق میں بہت بہتر ہوتا۔ ان میں بعض ایمان والے بھی ہیں مگر ان کے اکثر نافرمان ہیں۔''[1]

یہ معاشرتی استحکام اور اس کا اثر مدنی دور میں ظاہر ہوا۔

ریاستی اقدار: ریاست میں رہتے ہوئے اعلیٰ اقدار کا قیام واجب قرار پایا۔ اس کی بنیاد مضبوط اخلاقی اساس پر ہے اور ریاست پر لازم آتا ہے کہ ان اخلاقی اقدار کی حفاظت کرے، انھیں تمام افراد اور معاشرے پر لاگو کرے اور اسے اپنے وجود کی بقا کے لیے سب سے زیادہ اہمیت دے۔[2]

اس طرح اسلامی اخلاق میں تمام کمالات جمع ہو گئے اور ربانی منہج پر قائم رہنے کے باعث یہ با اخلاق معاشرہ ایک مثالی عملی نظام کی صورت اختیار کر گیا۔

یہ مکی دور میں پائے جانے والے نظریاتی، روحانی اور اخلاقی کردار کے چند خدوخال تھے۔ بلاشبہ یہ تربیت بہت ثمر آور ثابت ہوئی۔

قبول اسلام میں سبقت لے جانے والے پچاس صحابۂ کرام میں بیس سے زائد ایسے تھے جنھوں نے نبی ﷺ کی زندگی اور وفات کے بعد دعوت اسلامی کی توسیع اور اسے عام کرنے کے لیے اس کی قیادت فرمائی اور امت اسلامیہ کے رہنما کہلائے۔ علاوہ ازیں بیس دیگر افراد کی اکثریت نبی علیہ السلام کی حیات مبارکہ ہی میں رتبۂ شہادت سے سرفراز ہو گئی۔

1 آل عمرٰن 3:110. 2 المنهاج القرآني في التشريع لعبد الستار سعيد، ص:433.

امت کے اس ابتدائی قافلے میں بڑی عظیم شخصیات تھیں اور انھی میں سے وہ صحابہ بھی تھے جو عشرہ مُبشرہ کہلائے۔ وہ نبی علیہ السلام کے بعد امت کے افضل ترین افراد تھے اور ان میں سے بعض ایسے بھی تھے جنھوں نے بڑی بڑی قربانیاں دے کر عظیم الشان اسلامی تہذیب کی تشکیل میں اپنا کردار ادا کیا۔ ان میں عمار بن یاسر، عبداللہ بن مسعود، ابوذر اور جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہم سرِفہرست ہیں۔

اس ہراول دستے میں بہت سی عورتیں بھی شامل تھیں۔ امت کی عورتوں میں عظیم ترین ہستی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور اسی طرح ام الفضل بنت الحارث ہیں۔ حضرت اسماء ذات النّطاقَین اور اسماء بنت عُمَیس ان فضیلت والی عورتوں میں سرفہرست تھیں۔

امت اسلامیہ کے اس ہراول دستے کو نظریاتی، روحانی اور اخلاقی تربیت کے اعلیٰ مواقع میسر آئے اور یہ تربیت بلا واسطہ سید البشر مُربِّی اعظم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک سے ہوئی۔ یہ لوگ قافلے کے حُدی خواں اور امت کے رہنما قرار پائے۔[1]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تربیت وتزکیہ کے ساتھ ساتھ انھیں جاہلی گندے اخلاق سے بھی پاک فرماتے۔ غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور پر ایک نگاہ ڈال کر خوش بخت قرار پاتا ہے تو اس آدمی کی سعادت کا درجہ تو بہت بلند ہوگا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حضر و سفر کا ساتھی ہو، آپ سے احادیث مبارکہ سنتا ہو، آپ کے نور ہدایت سے منور ہوتا ہو، آپ کے کلام سے مستفید اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں کے سامنے تربیت پاتا ہو۔[2]

---

[1] التربية القيادية للدكتور الغضبان:201/1. [2] التربية القيادية:203,202/1.

حصہ 5

علانیہ دعوت اور مشرکین کی چالیں

يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ

بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ

وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ

''اے رسول

پہنچا دیجیے جو کچھ آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے

اور اگر آپ نے ایسا نہیں کیا تو آپ نے حق پیغمبری ادا نہیں کیا

اور اللہ آپ کو لوگوں کے شر سے بچانے والا ہے۔''

(المآئدۃ 67:5)

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ

باب 1

علانیہ دعوت

نبی ﷺ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تربیت فرمائی اور عقائد، عبادات اور اعلیٰ اخلاق کی بنیاد پر اسلامی جماعت قائم کی۔ اس عظیم جماعت کی تیاری کے بعد علانیہ دعوت کا وقت قریب آن پہنچا تھا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۝ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝﴾

”اور آپ اپنے قریبی رشتے داروں کو ڈرائیں اور جو مومنوں میں سے آپ کی اتباع کریں، ان کے لیے اپنے (مشفقانہ) بازو جھکائے رکھیں، پھر اگر وہ آپ کی نافرمانی کریں تو کہہ دیجیے: بلاشبہ تم جو کچھ کر رہے ہو، میں اس سے بری ہوں۔“[1]

ان آیات کے نزول کے بعد نبی ﷺ نے اپنے قبیلے اور قرابت داروں کو ایک جگہ جمع کیا اور انھیں ایک معبود پر ایمان لانے کی علانیہ دعوت دی اور نافرمانی کی صورت میں سخت عذاب سے ڈرایا، انھیں اپنے آپ کو آگ سے بچانے کی تلقین کی اور ہر انسان کو اس کی ذمہ داری سے آگاہ کیا۔[2]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں، جب آیت: ﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ﴾ نازل ہوئی تو نبی ﷺ صفا پہاڑی پر تشریف لے گئے اور بلند آواز سے پکارنے لگے: «يَا بَنِي فِهْرٍ! يَا بَنِي عَدِيٍّ!» ”اے بنی فہر! اے بنی عدی!“ اور قریش کے دیگر قبائل کا

[1] الشعرآء 26:214-216. [2] رسالة الأنبياء لعمر أحمد عمر: 3/46.

نام لیا، یہاں تک کہ سب جمع ہو گئے۔ اگر کوئی آدمی مصروفیت کی بنا پر نہ پہنچ پایا تو اس نے اپنا سفیر بھیج دیا تا کہ حقیقت حال دریافت کر سکے۔ غرض قریش آ گئے۔ ابولہب بھی آ گیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: «أَرَأَيْتَكُمْ لَوْ أَخْبَرْتُكُمْ أَنَّ خَيْلًا بِالْوَادِي تُرِيدُ أَنْ تُغِيرَ عَلَيْكُمْ أَكُنْتُمْ مُّصَدِّقِيَّ؟» ''ذرا بتاؤ تو اگر میں تمھیں یہ خبر دوں کہ ادھر وادی میں شہسواروں کا ایک لشکر ہے جو تم پر دھاوا بولنا چاہتا ہے تو کیا تم مجھے سچا مانو گے؟'' لوگوں نے کہا: ''ہاں! ہم نے آپ میں سچ کے سوا کچھ نہیں پایا۔'' نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«فَإِنِّي نَذِيرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيدٍ»

''اچھا تو میں تمھیں ایک سخت عذاب سے پہلے خبردار کرنے کے لیے بھیجا گیا ہوں۔''

اس پر ابولہب نے کہا: ''تجھ پر سارے دن تباہی نازل ہو، تو نے ہمیں اس لیے جمع کیا تھا۔'' (معاذ اللہ!) اللہ تعالیٰ نے سورۂ لہب نازل فرمائی:

﴿تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۝.....﴾

''ٹوٹ جائیں دونوں ہاتھ ابولہب کے اور وہ ہلاک ہو گیا، نہ اس کے مال نے اسے کوئی فائدہ دیا اور نہ اس کی کمائی نے......۔''[1]

ایک روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے قریش کے ہر قبیلے کا نام لے کر آواز دی تھی اور ہر ایک سے فرمایا: «أَنْقِذُوا أَنْفُسَكُمْ مِّنَ النَّارِ» ''اپنے آپ کو جہنم سے بچاؤ'' پھر فرمایا: «يَا فَاطِمَةُ! أَنْقِذِي نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ فَإِنِّي لَا أَمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا، غَيْرَ أَنَّ لَكُمْ رَحِمًا سَأَبُلُّهَا بِبِلَالِهَا» ''اے فاطمہ! اپنے آپ کو جہنم سے بچا کیونکہ میں تم لوگوں کو اللہ کی گرفت سے بچانے کا کچھ بھی اختیار نہیں رکھتا، البتہ تم لوگوں سے نسب و قرابت کے تعلقات ہیں جنھیں میں باقی اور تازہ رکھنے کی کوشش کروں گا۔''[2]

1 صحيح البخاري، حديث:4770، وصحيح مسلم، حديث:208. 2 صحيح مسلم، حديث: 204.

تمام قریشی حقیقت پسند اور عملی تھے۔ جب انھوں نے نبی ﷺ کی شخصیت کی طرف دیکھا تو انھیں اس شخصیت کے روپ میں ایک سچا اور امانتدار انسان نظر آیا جو ان کے سامنے ایک پہاڑ پر کھڑا تھا اور نبی ﷺ اس وقت پہاڑ کے دونوں طرف دیکھ رہے تھے جبکہ قریش صرف اپنے سامنے دیکھ سکتے تھے۔ ان کی ذہانت اور انصاف نے یہی فیصلہ کیا کہ آپ کی بات کی تصدیق کی جائے۔ تب انھوں نے بیک آواز ہوکر ''ہاں'' کہا۔

اور جب یہ ابتدائی نفسیاتی مرحلہ مکمل ہوگیا اور تمام حاضرین کی شہادت مکمل ہوگئی تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«فَإِنِّي نَذِيرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيدٍ»

''میں تمھیں ایک سخت عذاب سے پہلے خبردار کرنے کے لیے بھیجا گیا ہوں۔''

یہی وہ الفاظ تھے جو مقام نبوت کے لائق تھے اور نبی ﷺ کے پاس جو غیبی امور اور وہبی حقائق کا علم تھا اس کے شایانِ شان اس وعظ میں دانائی و بلاغت کے ساتھ لوگوں کو جہنم کی آگ سے ڈرایا گیا تھا، یہ ایک ایسا انداز تھا جس کی سابقہ ادیان اور نبوتوں میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس سے زیادہ براہ راست اور اس سے زیادہ واضح اسلوب کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا، لہٰذا تمام حاضرین آپ ﷺ کی بات سن کر خاموش ہوگئے۔[1] صرف ابولہب نے جواباً سخت الفاظ کہے۔

نبی ﷺ نے امت کے لیے ذرائع ابلاغ (میڈیا) کے اصول مقرر فرما دیے۔ آپ ﷺ نے پہاڑ جیسے بلند مقام کو کھڑے ہونے کے لیے منتخب فرمایا اور تمام لوگوں کو آواز دی اور آپ کی آواز ہر خاص و عام تک پہنچی۔ آج کل پیغام رسانی کے جدید ادارے بھی اسی اسلوب پر عمل کرتے ہیں تاکہ خبر زیادہ دور تک پہنچائی جا سکے۔

پھر نبی ﷺ نے اپنی مضبوط دعوت کے لیے مضبوط اساس، یعنی سچائی کا انتخاب کیا تاکہ

1 السيرة النبوية لأبي الحسن الندوي، ص: 138.

اس بنیاد پر اپنا مدعا پیش کر سکیں۔ اس طرز عمل سے دعوت و پیغام رسانی سے منسلک افراد کو جان لینا چاہیے کہ لوگوں تک اطلاعات اور دعوت پہنچانے کی بنیاد پیغام بھیجنے اور وصول کرنے والے یا پیغام نشر ہونے کی جگہ اور اسے قبول کرنے والے کے درمیان باہمی اعتماد پر ہے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ گفتگو سچی ہو اس میں کسی قسم کا جھوٹ شامل نہ ہو۔[1]

یہ فطری بات تھی کہ نبی ﷺ نے اپنی علانیہ دعوت کی ابتدا اپنے قرابت داروں سے کی کیونکہ مکہ کی سرزمین قبائلی فضا کی حامل تھی، لہٰذا نبی ﷺ نے پہلے اپنے قرابت داروں کو دعوت پیش کی جو آپ کی نصرت و تائید اور حمایت میں معاون ہو سکتے تھے۔

اسی طرح مکہ کی سرزمین سے دعوت کی ابتدا اپنے اندر خاص اثرات لیے ہوئے تھی کیونکہ زمانۂ قدیم ہی سے یہ شہر دینی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت کا حامل تھا، لہٰذا اہل مکہ کا دائرۂ اسلام میں داخل ہونا دیگر قبائل پر گہرا اثر چھوڑ سکتا تھا۔

قرآن کریم کے سیاق سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے اپنی بلند پایہ دعوت کے سلسلے میں قریش سے آغاز کیا۔[2]

مکی دور میں نازل ہونے والی آیات دعوت اسلامی کے عالمگیر ہونے کا پتہ دیتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا ۝﴾

”وہ ذات بڑی ہی بابرکت ہے جس نے اپنے بندے پر فرقان (قرآن) نازل کیا تاکہ وہ جہان والوں کے لیے ڈرانے والا بنے۔“[3]

اللہ تعالیٰ نے مزید ارشاد فرمایا:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝﴾

1 الحرب النفسية ضد الإسلام للدكتور عبد الوهاب كحيل، ص:121. 2 دراسة في السيرة لعماد الدين خليل، ص:66. 3 الفرقان 1:25.

"اور (اے نبی!) ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر ہی بھیجا ہے۔" [1]

خفیہ دعوت کے بعد تبلیغ رسالت کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا جس میں نبی ﷺ ہر قبیلے اور ہر شہر کے سردار کو دعوت پیش کرتے اور لوگوں کی محافل، مجالس اور مجمعوں میں تشریف لے جاتے۔ خصوصی تہوار اور موسم حج میں لوگوں کے سامنے دعوت پیش کرتے اور ہر ملنے والے غلام، آزاد، کمزور، طاقتور اور امیر و غریب کو راہ حق دکھاتے۔ [2] اور یہ مرحلہ ان آیات کے نازل ہونے کے بعد شروع ہوا: ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝﴾

"چنانچہ آپ کو جو حکم دیا جاتا ہے کھول کر سنا دیں اور مشرکین سے بے رخی برتیں۔" [3]

اس علانیہ تبلیغ ہی کا نتیجہ تھا کہ نبی ﷺ کو تبلیغ دین کی راہ میں رکاوٹوں، لوگوں کی بے رخی، ٹھٹھا، مذاق، ایذا رسانی، تکذیب اور سوچی سمجھی مخالفانہ سازشوں کا سامنا کرنا پڑا اور آہستہ آہستہ نبی ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور بت پرست سرداروں کے درمیان معرکہ آرائی کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا اور لوگ مکہ سے اس محاذ آرائی کی خبروں کو جگہ جگہ پہنچانے لگے۔ اگرچہ بظاہر یہ محاذ آرائی تبلیغ رسالت کے خلاف تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ دعوت اسلامی پھیلنے کا ذریعہ بھی بن گئی، چنانچہ دنیا کے طول و عرض میں اس دعوت کو پہنچانے میں اس کے دشمنوں نے بھی حصہ ڈالا کیونکہ جب مخالف قبائل میں اس دعوت کی شدید مخالفت اور مذمت کی جاتی تو لوگ کفر و شرک کے ان سرداروں کی بات کو تسلیم نہ کرتے اور دعوت دین کی طرف کھچے چلے آتے۔

ان دنوں ابلاغ کا واحد ذریعہ براہ راست ایک دوسرے تک خبریں پہنچانا تھا تو اس طرح قریب اور دور رہنے والوں نے نبی ﷺ کی رسالت کی خبر سن لی۔ آپ ﷺ کے اعلانِ رسالت کا واقعہ اتنا زبان زد عام ہوا کہ یہ محافل و مجالس حتی کہ نجی گفتگو کا موضوع بنتا چلا گیا۔ [4]

---

1 الأنبياء 107:21. 2 رسالة الأنبياء لعمر أحمد عمر:3/49,48. 3 الحجر 94:15. 4 الغرباء الأولون للدكتور سلمان العودة، ص: 167.

مشرکین کے اہم اعتراضات

مشرک سرداروں کے اکثر اعتراضات اللہ کی وحدانیت، آخرت پر ایمان، نبی علیہ السلام کی رسالت اور قرآن کریم کے بارے میں تھے۔ مشرکین کے اعتراضات اور ان کا جواب درج ذیل ہے:

اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک: کفار اس بات کے منکر نہ تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اور ہر چیز کو پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾

"اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے۔ تو وہ ضرور کہیں گے: اللہ نے! آپ کہہ دیجیے: سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے لیکن ان کے اکثر نہیں جانتے۔"[1]

درحقیقت وہ لوگ بتوں کے پجاری تھے اور ان کا گمان تھا کہ یہ بت انھیں اللہ کے قریب کرنے کا وسیلہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ؕ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ﴾

"سنو! خالص اطاعت و بندگی اللہ ہی کے لیے ہے اور جن لوگوں نے اس کے سوا کارساز بنا رکھے ہیں، (وہ کہتے ہیں:) ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کے زیادہ قریب کر دیں۔"[2]

بت پرستی ان کی طرف ان کی ہمسایہ اقوام کی طرف سے منتقل ہوئی تھی، اس لیے انھوں نے توحید کا شدت سے انکار کیا اور اسے انتہائی عجیب خیال کیا۔[3] اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

[1] لقمٰن 31:25. [2] الزمر 39:3. [3] رسالة الأنبياء لعمر أحمد عمر: 3/52.

﴿وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ ۡ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ○ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ○ وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُّرَادُ ○ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۚ اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ○﴾

''اور انھوں نے اس بات پر تعجب کیا کہ ان کے پاس انھی میں سے ایک ڈرانے والا آ گیا اور کافروں نے کہا: یہ تو ایک جادوگر ہے بڑا جھوٹا، کیا اس نے سارے معبودوں کو ایک کر دیا؟ بے شک یہ تو یقیناً ایک بڑی عجیب وغریب چیز ہے اور ان کے سردار (آوازِ حق سن کر یہ کہتے ہوئے) چل دیے کہ چلو اور اپنے معبودوں پر جمے رہو، بے شک یہ چیز ہے جو کسی غرض سے (کہی جا رہی) ہے، ہم نے یہ بات کسی اور دین میں نہیں سنی، یہ تو بس گھڑی ہوئی بات ہے۔''[1]

مشرکین کا اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی مخلوق سے تعلق کے بارے میں عقیدہ درست نہیں تھا۔ وہ خیال کرتے تھے کہ نعوذ باللہ جنات میں سے اللہ تعالیٰ کی بیوی ہے اور اس سے فرشتے پیدا ہوئے ہیں، لہٰذا یہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ اس سلسلے میں مسلسل آیات نازل ہوتی رہیں جس میں واضح کیا گیا کہ اللہ عزوجل نے جنوں اور فرشتوں کو پیدا فرمایا ہے جس طرح انسانوں کو پیدا فرمایا ہے، نہ کوئی اس کی اولاد ہے اور نہ ہی اس کی بیوی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ۭ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ○﴾

''اور لوگوں نے جنوں کو اللہ کا شریک ٹھہرا دیا، حالانکہ اسی نے تو انھیں پیدا کیا ہے اور انھوں نے بغیر کسی علم کے اللہ کے بیٹے اور بیٹیاں گھڑ لیں، وہ پاک ہے اور ان

[1] صٓ 38:4-7.

باتوں سے بلند ہے جو وہ بیان کرتے ہیں، وہی آسمانوں اور زمین کا موجد ہے، اس کی اولاد کیسے ہوسکتی ہے جبکہ اس کی کوئی بیوی نہیں؟ اور اسی نے ہر چیز کو پیدا کیا اور وہی ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔"[1]

قرآنی آیات میں یہ بھی بیان کیا گیا کہ جنات تو اللہ تعالیٰ کی عبودیت کا اقرار کرنے والے ہیں اور وہ اس بات کا انکار کرتے ہیں کہ ان کے اور اللہ کے درمیان کوئی نسبی رشتہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ۭ وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ۝﴾

"اور انھوں نے اس (اللہ) کے اور جنوں کے درمیان رشتہ ٹھہرایا، حالانکہ بلاشبہ خود جنوں نے جان لیا کہ وہ (اللہ کے سامنے) ضرور حاضر کیے جائیں گے۔"[2]

نیز آیات قرآنی میں مشرکین سے حق کی اتباع کا مطالبہ کیا گیا ہے اور انھیں ہر قسم کے وہم و گمان سے منع کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰۗىِٕكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى ۝ وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ۚ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـــًٔا ۝﴾

"بلاشبہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے وہ فرشتوں کے نام عورتوں کے سے رکھتے ہیں، حالانکہ انھیں اس کا کوئی علم نہیں، وہ تو بس گمان کی پیروی کرتے ہیں اور بلاشبہ گمان حق کے مقابلے میں کچھ بھی فائدہ نہیں دیتا۔"[3]

قرآنی آیات میں یہ وضاحت بھی ہے کہ یہ کتنی غیر معقول بات ہے کہ اللہ اپنے لیے بیٹیاں پسند کرے اور انھیں بیٹے عطا فرمائے کیونکہ ان کی رائے کے مطابق بیٹیاں کم درجے کی حامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

[1] الأنعام101,100:6. [2] الصّٰفّٰت158:37. [3] النجم28,27:53.

﴿ اَفَاَصْفٰكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ۭ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ۝﴾

''کیا پھر تمھارے رب نے تمھیں بیٹوں کے لیے چن لیا اور (اپنے لیے) فرشتوں میں سے بیٹیاں بنا لیں؟ بلاشبہ تم بہت بڑی (نازیبا اور خطرناک) بات کہتے ہو۔''[1]

اور یہ آیات مشرکین کو ان کے قول بلا دلیل کا احساس دلاتی ہیں:

﴿ وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ۭ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ۭ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْـَٔــلُوْنَ ۝﴾

''اور انھوں نے فرشتوں کو، جو رحمٰن کے بندے ہیں، (رحمٰن کی) بیٹیاں ٹھہرایا ہے۔ کیا وہ ان کی پیدائش کے وقت حاضر تھے؟ ان کی شہادت ضرور لکھی جائے گی اور ان سے (اس چیز کی) پوچھ گچھ ہوگی۔''[2]

مشرکین کا آخرت سے انکار: رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ایمان بالآخرت کی دعوت کا مشرکین نے تمسخر اور تکذیب سے جواب دیا:

﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰي رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝ اَفْتَرٰى عَلَي اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ۭ بَلِ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ فِي الْعَذَابِ وَالضَّلٰلِ الْبَعِيْدِ ۝﴾

''اور کافروں نے کہا: کیا ہم تمھیں ایک ایسا شخص بتائیں جو تمھیں یہ خبر دیتا ہے کہ جب تم بالکل ہی پارہ پارہ کر دیے جاؤ گے تو بے شک تم البتہ از سر نو پیدا کیے جاؤ گے؟ کیا اس نے اللہ پر جھوٹ گھڑا ہے یا اسے جنون (لاحق) ہے؟ (قطعاً نہیں!) بلکہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے (وہ) عذاب اور دور کی گمراہی میں پڑے ہیں۔''[3]

---

1 بني إسرآءيل 40:17. 2 الزخرف 19:43. 3 سبا 34:7، 8.

مشرکین مُردوں کے دوبارہ زندہ ہونے کے منکر تھے:

﴿وَقَالُوْٓا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَ مَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ۝﴾

''اور وہ کہتے ہیں کہ زندگی تو بس ہماری دنیا ہی کی زندگی ہے اور ہمیں (دوبارہ) نہیں اٹھایا جائے گا۔''[1]

اور وہ اپنے اس نظریے پر مضبوط قسموں کا سہارا بھی لیتے تھے:

﴿وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ ۭ بَلٰى وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝﴾

''اور وہ اللہ کی پختہ قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ جو مر جاتا ہے اللہ اسے دوبارہ نہیں اٹھائے گا۔ کیوں نہیں! (بلکہ وہ اٹھائے گا) یہ اس کے ذمے سچا وعدہ ہے اور لیکن اکثر لوگ علم نہیں رکھتے۔''[2]

مشرکین اس دنیا کی زندگی کے علاوہ کسی دوسری زندگی کے قائل نہ تھے اور آخرت پر ایمان لانے کے لیے اپنے آباء واجداد کو دوبارہ زندہ کرنے کی شرط رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَ قَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ۝ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝﴾

''اور انھوں نے کہا: بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے، ہم مرتے اور زندہ ہوتے ہیں اور ہمیں بس زمانہ ہی ہلاک کرتا ہے۔ اور انھیں اس کا کوئی علم نہیں، وہ تو بس گمان کرتے ہیں اور جب ان پر ہماری آیات تلاوت کی جاتی ہیں جو واضح ہوتی ہیں تو ان کی دلیل بس یہی ہوتی ہے کہ وہ کہتے ہیں: اگر تم سچے ہو تو ہمارے باپ

1 الأنعام 29:6. 2 النحل 38:16.

دادوں کو لاؤ۔‘‘ [1]

ان مشرکین کی سمجھ میں یہ بات نہ آسکی کہ جس نے انھیں پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے وہ انھیں دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے۔ امام مجاہد اور دیگر ائمۂ تفسیر سے منقول ہے کہ ابی بن خلف اپنے ہاتھ میں بوسیدہ ہڈی لیے رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا۔ وہ ہڈی کو ریزہ ریزہ کرکے ہوا میں اڑا رہا تھا اور یہ کہہ رہا تھا: ’’اے محمد! (ﷺ) کیا تیرا گمان ہے کہ اللہ اس خاک سے دوبارہ انسان پیدا فرمائے گا؟‘‘ تو نبی ﷺ نے فرمایا: «نَعَمْ، يُمِيتُكَ اللّٰهُ تَعَالٰى، ثُمَّ يَبْعَثُكَ، ثُمَّ يَحْشُرُكَ إِلَى النَّارِ» ’’ہاں، اللہ تجھے مارے گا، پھر زندہ کرے گا اور پھر جہنم رسید کرے گا۔‘‘ اس وقت یہ آیات نازل ہوئیں:

﴿ اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ○ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ط قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ○ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ط وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ ○ ﴾

’’کیا انسان نے نہیں دیکھا کہ بے شک ہم نے اسے نطفے سے پیدا کیا ہے؟ پھر یکایک وہ کھلا جھگڑالو ہو گیا اور اس نے ہمارے لیے ایک مثال بیان کی اور وہ اپنی پیدائش کو بھول گیا، اس نے کہا: ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا جبکہ وہ گلی سڑی ہوں گی؟ آپ کہہ دیجیے: انھیں وہی (اللہ) زندہ کرے گا جس نے انھیں پہلی بار پیدا کیا اور وہ ہر طرح کے پیدا کرنے کو خوب جانتا ہے۔‘‘ [2]

لوگوں کو ایمان بالآخرت کا نظریہ سمجھانے کے لیے قرآن کریم میں عقلی اور فطرت سے میل کھانے والے اسالیب اختیار کیے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے کہا ہے کہ اس کی حکمت تقاضا کرتی ہے کہ لوگوں کو جزا اور سزا کے لیے دوبارہ پیدا کرے۔ اللہ تعالیٰ نے ساری مخلوق کو اپنی بندگی کے لیے پیدا فرمایا، رسول بھیجے اور کتابیں نازل فرمائیں تاکہ

1 الجاثیة 45:24، 25۔ 2 یٰسٓ 36:77-79، تفسیر ابن کثیر: 3/581. ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں عاص بن وائل کا نام ہے۔

لوگوں کے لیے عبادت و اطاعت کا طریقہ واضح کرے۔ لوگ اللہ کے حکم کی پابندی کریں اور اس کے منع کردہ افعال سے رک جائیں۔ لیکن بعض لوگوں نے اللہ کی اطاعت پر استقامت کے بجائے سرکشی اور بغاوت کا راستہ اختیار کیا۔ کیا اب عدل و انصاف کا تقاضا نہیں کہ جب اچھا اور برا دونوں دنیا چھوڑ جائیں تو اللہ اچھے کو اس کی نیکی کی جزا اور برے کو اس کی برائی کی سزا دے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ۝ مَا لَكُمْ ۣ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝ اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ ۝ اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ ۝ ﴾

”کیا پھر ہم مسلمانوں کو مجرموں کے برابر ٹھہرائیں گے؟ تمھیں کیا ہوا، تم کیسے فیصلے کرتے ہو؟ کیا تمھارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں تم پڑھ لیتے ہو؟ (کہ) یقیناً تمھارے لیے اس (کتاب) میں تمھاری من مانی باتیں ہوں؟“ [1]

اپنی جانوں پر ظلم کرنے والوں کا یہ خیال ہے کہ یہ کائنات عبث اور بے فائدہ پیدا کی گئی ہے اور اس میں کوئی حکمت نہیں ہے، مومن و مصلح اور کافر و فسادی کا انجام مختلف نہیں اور نہ ہی متقی اور گنہگار کے انجام میں کوئی فرق ہے۔ [2]

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ۚ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ۝ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ۝ ﴾

”اور ہم نے آسمان و زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، بے کار پیدا نہیں کیا، یہ ان لوگوں کا خیال ہے جنھوں نے کفر کیا تو جن لوگوں نے کفر کیا ان کے لیے آگ کی ہلاکت ہے۔ کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل

1 القلم68:35-38. 2 تفسیر ابن کثیر:124/2.

کیے، ان لوگوں کے مانند کردیں گے جو زمین میں فساد کرنے والے ہیں؟ یا ہم متقین کو بدکاروں کے مانند کردیں گے؟"[1]

قرآن کریم نے لوگوں کے سامنے زمین کو نباتات کے ذریعے زندہ کرنے کی مثالیں رکھیں اور یہ نتیجہ نکالا کہ جو ذات اس مردہ زمین کو زندہ کرنے پر قادر ہے وہ فوت شدگان کو زندہ کرنے اور بوسیدہ ہڈیوں میں دوبارہ جان ڈالنے پر کیونکر قادر نہیں ہوسکتی، چنانچہ فرمایا:

﴿ فَانْظُرْ اِلٰۤى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ ﴾

"چنانچہ آپ اللہ کی رحمت کے آثار کی طرف دیکھیں، وہ زمین کو اس کی موت (ویرانی) کے بعد کیسے زندہ (آباد) کرتا ہے، بے شک وہ ضرور مُردوں کو زندہ کرنے والا ہے۔ اور وہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔"[2]

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں چند ایسے واقعات کا تذکرہ فرمایا ہے کہ اس نے لوگوں کو اس دنیا میں مرنے کے بعد یہیں دوبارہ زندہ کیا۔ اللہ نے اصحاب کہف کا تذکرہ فرمایا کہ انھیں تین سو نو سال تک سلائے رکھا، پھر وہ اس مدتِ مَدید کے بعد اپنی خواب گاہ سے دوبارہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

اصحاب کہف کے قصے کے علاوہ بھی بہت سے ایسے براہین و دلائل موجود ہیں جنھیں اللہ کے رسول نے کفر و شرک کے سرغنوں کے ساتھ ہونے والے اپنے مناظروں میں پیش کیا۔

مشرکین کا رسول اللہ ﷺ کے بشر ہونے پر اعتراض: مشرکین نے نبی ﷺ کی شخصیت پر بھی اعتراضات کیے۔ وہ خیال کرتے تھے کہ رسول اُن جیسا بشر نہیں ہوسکتا۔ اسے یا تو بذاتِ خود فرشتہ یا ہر وقت فرشتوں کی معیت میں ہونا چاہیے:

﴿ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْۤا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰۤى اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْۤا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝ ﴾

1 صٓ 38:27،28۔ 2 الروم 30:50۔

''اور لوگوں کے پاس ہدایت آجانے کے بعد ان کو ایمان لانے سے صرف اس چیز نے روکا کہ انھوں نے کہا: کیا اللہ نے بشر رسول بھیجا ہے؟''[1]

سورۂ انعام میں ارشاد فرمایا:

﴿وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ۭ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ۝ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ۝﴾

''اور ان (کافر) لوگوں نے کہا کہ اس نبی پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا؟ اور اگر ہم کوئی فرشتہ اتارتے تو معاملے کا فیصلہ کر دیا جاتا، پھر ان کو ذرا مہلت نہ دی جاتی اور اگر ہم اس (نبی) کو فرشتہ بنا کر بھیجتے تو بھی ہم اسے انسان ہی کی شکل میں بھیجتے اور (تب بھی) ہم انھیں اسی شبہے میں ڈالتے جس میں وہ اب پڑے ہوئے ہیں۔''[2]

یعنی اگر ہم انسانیت کی طرف کسی فرشتے کو رسول بنا کر بھیجتے تو اسے بھی آدمی کی شکل میں بھیجتے تا کہ لوگوں سے گفتگو اور اس سے فائدہ حاصل کرنے میں آسانی ہو اور پھر بعینہ وہی اعتراض سامنے آتا جو اس وقت درپیش تھا کہ وہ بشر کی رسالت کس طرح قبول کر سکتے ہیں۔[3]

مشرکین تو ایسا رسول چاہتے تھے جو کھانا کھائے نہ بازاروں میں چلے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۝ اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ۭ وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ۝﴾

''اور انھوں نے کہا: اس رسول کو کیا ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا ہے؟ اس کی طرف فرشتہ کیوں نہ اتارا گیا جو اس کے ہمراہ (لوگوں کو) ڈرانے والا ہوتا؟ یا اس کی طرف کوئی خزانہ ڈالا جاتا، یا اس کا کوئی باغ ہوتا جس میں سے وہ

1 بنيٓ إسرآءيل 94:17. 2 الأنعام 9,8:6. 3 الوسطية في القرآن الكريم للصلابي، ص: 402.

(پھل) کھاتا اور ظالموں نے (مومنوں سے) کہا: تم تو بس ایک جادو مارے شخص ہی کی اتباع کرتے ہو۔" [1]

انھوں نے تو گویا یہ سنا ہی نہیں تھا کہ سابقہ انبیائے کرام علیہم السلام بھی تو کھانا کھاتے، بازاروں میں چلتے اور ضروریات زندگی میں مشغول رہتے تھے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ۭ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا ۝﴾

"اور (اے نبی!) ہم نے آپ سے پہلے جتنے بھی رسول بھیجے، بلاشبہ وہ کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے تھے اور ہم نے تمھیں ایک دوسرے کے لیے آزمائش بنایا، کیا تم صبر کرتے ہو؟ اور آپ کا رب (سب کچھ) خوب دیکھ رہا ہے۔" [2]

مشرکین کا یہ بھی خیال تھا کہ رسول کو ایک بڑا سردار اور مالدار ہونا چاہیے۔

﴿وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰي رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝﴾

"اور انھوں نے کہا: یہ قرآن ان دونوں شہروں میں سے کسی بڑے آدمی پر نازل کیوں نہیں کیا گیا؟" [3]

اور اس عظیم آدمی سے ولید بن مغیرہ، جو مکہ میں تھا یا عروہ بن مسعود ثقفی، جو طائف میں تھا، مراد لیتے تھے۔ [4]

انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دیوانگی منسوب کی:

﴿وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ۝ۭ لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰۗىِٕكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝﴾

"اور انھوں نے کہا: اے وہ شخص جس پر یہ ذکر (قرآن) نازل کیا گیا ہے! یقیناً تو

---

1 الفرقان 25:7، 8۔ 2 الفرقان 25:20۔ 3 الزخرف 43:31۔ 4 تفسیر ابن کثیر: 4/126، 127۔

تو مجنون ہے تو ہمارے پاس فرشتے کیوں نہیں لے آتا اگر تو سچوں میں سے ہے؟" [1]

اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے جواب میں ارشاد فرمایا:

﴿مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۝﴾

"(اے نبی!) آپ اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں۔" [2]

مشرکین نے نبی ﷺ سے کہانت (فال گوئی) اور شعر بھی منسوب کیے:

﴿فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ۝﴾

"تو (اے نبی!) آپ نصیحت کرتے رہیں کہ آپ اپنے رب کے فضل سے نہ تو کاہن ہیں اور نہ دیوانے، کیا وہ (کافر) کہتے ہیں: (یہ نبی) شاعر ہے اور ہم اس کے بارے میں حوادثِ زمانہ (موت) کا انتظار کررہے ہیں؟" [3]

مشرکین نبی ﷺ پر اس طرح الزامات لگاتے، حالانکہ وہ خوب جانتے تھے کہ آپ ﷺ نے کبھی شعر نہیں کہے بلکہ آپ سلیم العقل تھے اور آپ جو کچھ فرماتے تھے وہ کاہنوں کی مسجع گفتگو اور جادوگری کے منتروں سے کوسوں دور تھا۔ [4]

مشرکین نے رسول اللہ ﷺ سے جادو اور جھوٹ بھی منسوب کیا:

﴿وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ ۡ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۝﴾

"اور انھوں نے اس بات پر تعجب کیا کہ ان کے پاس انھی میں سے ایک ڈرانے والا آ گیا اور کافروں نے کہا: یہ تو ایک جادوگر ہے بڑا جھوٹا۔" [5]

نبی ﷺ پر آیات نازل ہوئیں جو ان کو مشرکین کے فرسودہ خیالات کا پتہ دیتیں اور بتاتیں کہ آپ سے قبل انبیاء کا بھی اسی طرح مذاق اڑایا گیا تھا اور ان مذاق اڑانے والوں کا انجام سخت عذاب ہے، ارشاد ربانی ہے:

---

[1] الحجر 7,6:14. [2] القلم 2:68. [3] الطور 30,29:52. [4] رسالة الأنبياء لعمر أحمد عمر: 57/3. [5] صٓ 4:38.

﴿ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ ﴾

''اور (اے نبی!) یقیناً آپ سے پہلے رسولوں سے بھی مذاق کیا گیا تھا، پھر ان میں سے جن لوگوں نے مذاق کیا تھا، انھیں اس عذاب نے آگھیرا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔''[1]

آیات ربانیہ نبی ﷺ کو بتاتی تھیں کہ یہ لوگ آپ کی شخصیت کو نہیں جھٹلاتے بلکہ وہ حق کے دشمن ہیں اور درحقیقت ایسی باتوں کے ساتھ آیات ربانی کو ٹھکراتے ہیں۔[2]

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝ ﴾

''(اے نبی!) تحقیق ہم جانتے ہیں کہ بے شک آپ کو وہ بات غمگین کرتی ہے جو وہ کہتے ہیں، پس بے شک وہ آپ کو نہیں جھٹلاتے بلکہ دراصل یہ ظالم تو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔''[3]

مشرکین کا قرآن کریم کے بارے میں نظریہ: مشرکین نے قرآن کریم کے اللہ کی وحی ہونے کا انکار کیا اور اسے شعراء کی تخلیق شدہ اشعار کی ایک قسم خیال کیا، حالانکہ قرآن اور شعر کے مابین مماثلت ڈھونڈنے والے ہر شخص نے یہ جان لیا تھا کہ قرآن اور شعر دو مختلف چیزیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّ قُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ۝ لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝ ﴾

''اور ہم نے اس (رسول) کو شعر کہنا نہیں سکھایا اور نہ (یہ) اس کے لائق ہی تھے،

1 الأنعام 10:6. 2 رسالة الأنبياء لعمر أحمد عمر: 58/3. 3 الأنعام 33:6.

یہ (کلام الٰہی) تو سراسر نصیحت اور واضح قرآن ہے تاکہ وہ اسے ڈرائے جو زندہ ہے اور کافروں پر (اللہ کے عذاب کی) بات ثابت ہو جائے۔"[1]

قرآن کریم شعر ہو بھی کیسے سکتا ہے کیونکہ اس میں تو لوگوں کو گمراہ کرنے اور حقیقت کے خلاف بولنے والے شعراء کی مذمت کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ؕ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِیْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۙ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ۙ﴾

"اور شاعروں کی پیروی گمراہ (لوگ) ہی کرتے ہیں، کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ بلاشبہ وہ (خیال کی) ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں اور بلاشبہ وہ (ایسی باتیں) کہتے ہیں جو کرتے نہیں۔"[2]

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغمبر ﷺ پر نازل شدہ کلام ہے اس میں شعراء یا کاہنوں کے کلام سے قطعاً کوئی مشابہت نہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۙ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ۙ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ؕ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾

"بلاشبہ یہ (قرآن) رسول کریم (جبریل) کا قول ہے اور یہ کسی شاعر کا قول نہیں، تم کم ہی ایمان لاتے ہو اور نہ (یہ) کسی کاہن کا قول ہے، تم کم ہی نصیحت پکڑتے ہو، (یہ تو) رب العالمین کی طرف سے نازل شدہ ہے۔"[3]

سب سے پہلے شعراء ہی نے یہ فیصلہ دے دیا تھا کہ یہ قرآن شعر نہیں ہے۔[4]

مشرکین کی طرف سے تکذیب وعناد اس قدر بڑھ چکا تھا کہ انھوں نے یہ بھی الزام لگایا کہ محمد (ﷺ) یہ قرآن ایک عجمی آدمی سے سیکھتے ہیں۔ جو قبیلہ قریش کے ایک خاندان کا غلام تھا اور صفا پہاڑی کے قریب اپنا سامان بیچا کرتا تھا۔ نبی ﷺ کبھی کبھار اس کے پاس

---

1 یٰسٓ 36:69، 70. 2 الشعرآء 26:224-226. رسالة الأنبياء لعمر أحمد عمر: 3/59. 3 الحآقة 69:40-43. 4 رسالة الأنبياء لعمر أحمد عمر: 3/59.

بیٹھ جاتے اور کسی موضوع پر گفتگو بھی کرتے۔ یہ لڑکا عجمی زبان بولتا تھا اور اسے معمولی عربی زبان کے علاوہ کچھ علم نہ تھا۔ وہ عربی میں بس ضرورت کی حد تک جواب دے سکتا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ۝﴾

''اور ہمیں بخوبی علم ہے کہ وہ کہتے ہیں: یقیناً اس (نبی) کو ایک آدمی سکھاتا ہے۔ اس شخص کی زبان عجمی ہے جس کی طرف یہ غلط نسبت کرتے ہیں، جبکہ یہ (قرآن تو) فصیح عربی زبان ہے۔''[1]

یعنی یہ کس طرح ممکن ہے کہ نبی ﷺ ایک عجمی سے فصاحت و بلاغت اور جامع ترین معانی رکھنے والا قرآن سیکھتے ہوں؟ ایسی بات تو کوئی کم عقل انسان بھی نہیں کر سکتا۔[2]

مشرکین نے قرآن کے طریقۂ نزول پر بھی اعتراض کیا۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ اسے یکبارگی اترنا چاہیے تھا، حالانکہ قرآن کا مختلف ٹکڑوں میں اترنا اہل ایمان کے دلوں کو مضبوط کرنے اور اس کے فہم، حفظ اور عمل کرنے کے اعتبار سے زیادہ مفید تھا۔ ارشاد ہے:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ ۖ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ۝﴾

''اور کافروں نے کہا: اس پر یہ قرآن ایک ہی بار اکٹھا کیوں نہیں نازل کیا گیا؟ اسی طرح (ہم نے نازل کیا) ہے تاکہ ہم اس سے آپ کا دل مضبوط کریں اور ہم نے اسے خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھ سنایا ہے۔''[3]

جب مشرکین نے قرآن اور حامل قرآن پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی تو اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کو اس جیسا قرآن لانے کا چیلنج کر دیا اور اعلان کر دیا کہ تمام جن و انس مل

1 النحل 103:16. تهذيب سيرة ابن هشام لعبدالسلام هارون: 114/1. 2 تفسير ابن كثير: 586/2.
3 الفرقان 32:25.

کر بھی ایسا قرآن نہیں لا سکتے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا﴾

''کہہ دیجیے: البتہ اگر تمام انسان اور جن اس (بات) پر جمع ہو جائیں کہ اس قرآن کی مثل لائیں تو وہ اس کی مثل نہ لا سکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں۔''[1]

بلکہ تمام لوگ قرآن جیسی دس سورتیں بنانے سے بھی عاجز ہوں گے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾

''کیا وہ کہتے ہیں کہ اس نے یہ (قرآن) خود گھڑ لیا ہے؟ کہہ دیجیے: پھر تم بھی اس جیسی گھڑی ہوئی دس سورتیں لے آؤ اور اللہ کے سوا جنھیں (مدد کے لیے) بلا سکتے ہو بلا لو، اگر تم سچے ہو۔''[2]

جب ایسا نہ ہو سکا تو اللہ تعالیٰ نے ایک سورت بنا لانے کا چیلنج بھی دیا کہ وہ یہ بھی بنا کر نہیں لا سکتے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾

''کیا وہ (کافر) کہتے ہیں کہ اس (رسول) نے اسے گھڑ لیا ہے؟ (اے نبی!) کہہ دیجیے: تو تم اس جیسی ایک ہی سورت لے آؤ اور (مدد کے لیے) اللہ کے سوا جن کو بلا سکتے ہو بلا لو، اگر تم سچے ہو۔''[3]

اگرچہ فصاحت عربوں کی طبیعت میں رچی بسی تھی اور ان کے اشعار و قصائد زور بیان کی بلندیوں کو چھو رہے تھے، اس کے باوجود قرآن کی سی ایک سورت بنا لانے سے بھی ان

1 بني إسرآءيل 88:17. 2 هود 13:11. 3 يونس 38:10.

کا عاجز آنا اس بات کی دلیل تھا کہ قرآن اس اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جس کی ذات و صفات اور افعال واقوال میں کوئی ثانی نہیں اور اس کا کلام کسی طور بھی مخلوق کے کلام کے مشابہ نہیں ہوسکتا۔[1]

مکی دور میں اسلامی دعوت ٹھکرانے کے اسباب

سیرت نگاروں نے مکی دور میں کفار کی طرف سے اسلامی دعوت کے ٹھکرانے کے مختلف اسباب بیان کیے ہیں جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

جزیرہ نمائے عرب میں نبوت کی عدم پذیرائی: جزیرہ نمائے عرب کے وہ لوگ جن میں نبی ﷺ مبعوث ہوئے آسمانی ادیان سے دور تھے۔ وہ کسی خاص دین کے پیروکار تھے نہ یہود ونصاریٰ کی طرح کسی خاص آسمانی کتاب کو مانتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو جزیرہ نمائے عرب میں مبعوث فرما کر ان پر اپنی حجت قائم کردی۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآىِٕفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ۝ اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا ۗ سَنَجْزِى الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ ۝﴾

”اور یہ (قرآن) ایک عظیم کتاب ہے، ہم نے اسے نازل کیا ہے، (یہ) برکت والی ہے، پس تم اس کی پیروی کرو اور پرہیزگاری اختیار کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ تاکہ تم یہ نہ کہو کہ صرف ہم سے پہلے دو گروہوں (یہود ونصاریٰ) پر کتاب نازل کی گئی تھی اور بے شک ہم تو ان کے پڑھنے پڑھانے سے بے خبر تھے، یا تم (یہ نہ) کہو

1 رسالة الأنبياء لعمر أحمد عمر: 3/66.

کہ اگر بے شک ہم پر کتاب نازل کی جاتی تو ہم ضرور ان سے زیادہ ہدایت یافتہ ہوتے، چنانچہ یقیناً تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے ایک واضح کتاب اور ہدایت اور رحمت آگئی ہے، پھر اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جس نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا اور ان سے منہ موڑا؟ جو لوگ ہماری آیات سے منہ موڑتے ہیں انھیں جلد ہم سخت عذاب کی شکل میں سزا دیں گے، اس لیے کہ وہ حق سے منہ موڑتے ہیں۔''[1]

عقیدۂ بت پرستی کا اہل عرب کی زندگی اور دل و دماغ پر گہرا اثر تھا جس کی وجہ سے وہ حق کے مقابلے میں ڈٹ گئے اور انھوں نے اسلام کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے علاوہ ان کا طبعی میلان کسی آسمانی مذہب کو قبول کرنے کا روادار نہ تھا، اس لیے وہ صحیح عقیدے اور خالص دین کے حامل نہ تھے۔ وہ تو صرف مادی اور محسوس کیے جانے والے معبودوں کی عبادت کے قائل تھے۔ وہ اپنے معبودوں سے اس قدر عقیدت رکھتے تھے کہ ان کی خاطر اپنی جان، مال اور بیٹوں تک کو نچھاور کر دیتے۔ اس سلسلے میں قوم کو پہنچنے والی تکالیف اور اموات کے باوجود وہ بتوں کی محبت و تعظیم میں آگے ہی بڑھتے چلے جاتے، ایک دوسرے کو اسی باطل عقیدے پر صبر کی تلقین کرتے اور اپنے بتوں کی نصرت و عبادت کے سلسلے میں ہر دکھ برداشت کرنے کا درس دیتے، حالانکہ وہ سابقہ امتوں کے قصے بھی سنتے رہتے تھے کہ کس طرح وہ بت پرستی میں گرفتار ہوئے اور اس کی پاداش میں ان پر دنیا ہی میں کون کون سے عذاب نازل ہوئے۔[2]

باپ دادا کی طرف سے حاصل ہونے والی عصبیت: انبیاء علیہم السلام کی دعوت سے ٹکرانے والی سب سے بڑی طاغوتی طاقت آباء و اجداد کی تقلید اور ان کے طے شدہ راستے کی اتباع تھی۔ اللہ کے دین کو قبول نہ کرنے میں اسی عصبیت کا سب سے بڑا دخل تھا جس کے

1 الأنعام6:155-157. 2 إغاثة اللهفان لابن القيم:225/2.

پھیلائے ہوئے نظریات سے نکلنا انسان کے لیے انتہائی مشکل ہوتا ہے، یہاں تک کہ انسان اس خول سے باہر نکلتے نکلتے اپنی جان تک ہار بیٹھتا ہے الا یہ کہ اللہ کی طرف سے اس کے دل میں ایسی سوچ پیدا ہو جس کے نتیجے میں اسے بت پرستی سے نجات مل جائے۔ قرآن کریم نے سابقہ امتوں میں بت پرستی کے فروغ کا سبب اپنے بڑوں کی تقلید کو قرار دیا ہے۔[1]

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا تھا:

﴿إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَا تَعْبُدُونَ ۝ قَالُوا نَعْبُدُ أَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عَاكِفِينَ ۝ قَالَ هَلْ يَسْمَعُونَكُمْ إِذْ تَدْعُونَ ۝ أَوْ يَنْفَعُونَكُمْ أَوْ يَضُرُّونَ ۝ قَالُوا بَلْ وَجَدْنَا آبَاءَنَا كَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ ۝﴾

''جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا: تم کیا پوجتے ہو؟ وہ کہنے لگے: ہم بت پوجتے ہیں اور ہم (ہمیشہ) انھی کے مجاور رہیں گے، اس (ابراہیم) نے کہا: کیا وہ تمھیں سنتے ہیں جب تم انھیں پکارتے ہو؟ یا وہ تمھیں نفع دیتے ہیں یا ضرر پہنچاتے ہیں؟ انھوں نے کہا: (نہیں) بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا، وہ اسی طرح کرتے تھے۔''[2]

یہی وہ طرز عمل تھا جو نسل در نسل مشرکین اور دینِ الٰہی کے دشمنوں نے اپنایا۔ جیسے ہی دعوت اسلام کے پیامبر نیک اور صالح لوگ انھیں نفسانی خواہشات اور فواحش میں منہمک رہنے سے روکتے اور اس پر کوئی سند طلب کرتے تو وہ جواب دیتے:

﴿وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا ۗ قُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ ۖ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝﴾

''اور جب وہ کوئی بے حیائی کا کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم نے اپنے باپ دادا کو یہی کرتے پایا اور اللہ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے۔ (اے نبی!) آپ کہہ دیجیے: اللہ قطعاً بے حیائی کا حکم نہیں دیتا، کیا تم اللہ کے ذمے ایسی باتیں لگاتے ہو

[1] الطريق إلى المدينة لمحمد العبدة، ص: 43. [2] الشعراء 26:70-74.

جو تم نہیں جانتے؟''[1]

وہ یہ سب کچھ دلیل نہ ہونے اور لاجواب ہو جانے کے وقت کہتے کیونکہ ان کے پاس نہ تو کوئی کتاب تھی جس سے وہ دلیل پکڑتے اور نہ وہ ایسی عقل و دانش کے مالک تھے کہ انھیں رہنمائی حاصل ہوتی، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ۭ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ○ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ○﴾

''کیا تم نے دیکھا نہیں کہ بے شک اللہ نے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، تمھارے مطیع و تابع فرمان کر دیا ہے اور اس نے تم پر اپنی ظاہری اور چھپی نعمتیں پوری کر دی ہیں اور بعض لوگ وہ ہیں جو اللہ کے بارے میں بغیر علم، بغیر ہدایت اور بغیر کسی روشن کتاب کے جھگڑا کرتے ہیں اور جب ان سے کہا جائے کہ تم اس کی اتباع کرو جو اللہ نے نازل کیا ہے تو وہ کہتے ہیں: ہم تو اسی (طریقے) کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا، کیا اگرچہ شیطان انھیں عذاب جہنم کی طرف بلاتا رہا ہو تب بھی؟''[2]

شیطان نے انسانی طبیعت کو مدنظر رکھتے ہوئے کفار کو اس گمراہ کن تقلید میں مبتلا کیا۔ شیطان لوگوں کو آباء و اجداد کے ساتھ وفاداری کا سبق دیتا ہے اور انھیں اپنی تاریخ اور تہذیبی ورثے سے وابستہ رہنے کا درس دیتا ہے۔ یہ شیطانی تدبیر کا سب سے بڑا حربہ ہے جو انسان کو اس کے فطری رجحان، یعنی وطن اور مال وغیرہ کی محبت کے ذریعے سے گمراہ کرتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «إِنَّ الشَّيْطَانَ قَعَدَ لِابْنِ آدَمَ بِأَطْرُقِهِ، فَقَعَدَ

[1] الأعراف 7:28. [2] لقمٰن 31:20،21.

لَهُ بِطَرِيقِ الْإِسْلَامِ فَقَالَ لَهُ: أَتُسْلِمُ وَتَذَرُ دِينَكَ وَدِينَ آبَائِكَ وَآبَاءِ أَبِيكَ؟ قَالَ: فَعَصَاهُ فَأَسْلَمَ، ثُمَّ قَعَدَ لَهُ بِطَرِيقِ الْهِجْرَةِ، فَقَالَ: أَتُهَاجِرُ وَتَذَرُ أَرْضَكَ وَسَمَاءَكَ؟ وَإِنَّمَا مَثَلُ الْمُهَاجِرِ كَمَثَلِ الْفَرَسِ فِي الطِّوَلِ! فَعَصَاهُ فَهَاجَرَ، ثُمَّ قَعَدَ لَهُ بِطَرِيقِ الْجِهَادِ، فَقَالَ: تُجَاهِدُ؟ فَهُوَ جَهْدُ النَّفْسِ وَالْمَالِ، فَتُقَاتِلُ فَتُقْتَلُ، فَتُنْكَحُ الْمَرْأَةُ وَيُقْسَمُ الْمَالُ فَعَصَاهُ فَجَاهَدَ» ''شیطان ابن آدم کے مختلف راستوں میں بیٹھتا ہے۔ وہ اس کے اسلام کے راستے میں بیٹھتا ہے اور کہتا ہے: ''کیا تو مسلمان ہوکر اپنے آباء و اجداد کا دین چھوڑنا چاہتا ہے؟'' ابن آدم اس کی بات نہیں مانتا اور مسلمان ہو جاتا ہے، پھر شیطان اس کے ہجرت کے راستے میں بیٹھتا ہے اور کہتا ہے: ''کیا تو ہجرت کرے گا اور اپنے زمین و آسمان کو چھوڑ دے گا؟ مہاجر کی مثال تو اس گھوڑے کی سی ہے جو اپنی رسی سے بندھا ہوا ہے (یعنی مہاجر بلاد غیر میں جا کر صرف اپنے گھر کے اندر بند ہو کر رہ جاتا ہے۔ صرف اپنے جاننے والوں ہی کے پاس جاتا آتا ہے)'' ابن آدم اس کی بات نہیں مانتا اور ہجرت کرتا ہے، پھر شیطان اس کے جہاد کے راستے میں بیٹھتا ہے اور کہتا ہے: ''کیا تو جہاد کرے گا اور اپنی جان اور مال قربان کرے گا؟ تو جہاد کرے گا اور مارا جائے گا؟ پھر تیری بیوی سے نکاح کیا جائے گا اور تیرا مال تقسیم کر دیا جائے گا'' ابن آدم اس کی یہ بات بھی نہیں مانتا اور جہاد کے لیے نکلتا ہے۔''

نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: «فَمَنْ فَعَلَ ذٰلِكَ كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ أَنْ يُّدْخِلَهُ الْجَنَّةَ، وَمَنْ قُتِلَ كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ أَنْ يُّدْخِلَهُ الْجَنَّةَ، وَإِنْ غَرِقَ كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ أَنْ يُّدْخِلَهُ الْجَنَّةَ أَوْ وَقَصَتْهُ دَابَّتُهُ كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ أَنْ يُّدْخِلَهُ الْجَنَّةَ» ''جو بھی شخص اس طرح کرے

گا اللہ تعالیٰ اسے ضرور جنت میں داخل فرمائے گا۔ اور جو اللہ کے راستے میں شہید ہوگیا، اللہ پر واجب ہے کہ اسے جنت میں داخل کرے۔ اور اسی طرح اگر کوئی پانی میں ڈوب گیا یا سواری سے گر کر مر گیا تو بھی اللہ تعالیٰ اسے ضرور جنت میں داخل فرمائے گا۔'' [1]

جب نبی ﷺ جزیرہ نمائے عرب میں مبعوث ہوئے تو آپ ﷺ پر یہ اعتراض کیا گیا تھا کہ آپ ایسا دین لے کر آئے ہیں جس پر ان کے آباء و اجداد کاربند نہ تھے۔ مشرکین سرداروں نے عامۃ الناس اور زیرک لوگوں کو اس دین سے نفرت دلانے کی کوشش کی اور دعوتِ اسلام کے گرد ایک عارضی حصار قائم کر دیا۔ [2]

بت پرستی کی تائید میں اہل کتاب کا کردار: اہل عرب کا بت پرست معاشرہ دعوتِ توحید سے نبرد آزما ہوا۔ انھوں نے اس دعوت کے منکر اہل کتاب کے کردار کو بطور مضبوط دلیل اختیار کیا۔ تورات و انجیل کے پیروکاروں نے، جو آسمانی کتب کے وارث خیال کیے جاتے تھے، نبی ﷺ کی پیش کردہ دعوت کا انکار کرتے ہوئے اسے رد کر دیا تھا اور جھٹلایا تھا۔ یہ لوگ چونکہ دین کو زیادہ سمجھنے والے خیال کیے جاتے تھے، اس لیے ان کی روش مشرکین کے موقف کے لیے مضبوط دلیل ٹھہری۔ ارشاد ہے:

﴿وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُّرَادُ ۚ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۚ اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ۝﴾

''اور ان کے سردار (آوازِ حق سن کر یہ کہتے ہوئے) چل دیے کہ چلو اور اپنے معبودوں پر جمے رہو، بے شک یہ چیز ہے جو کسی غرض سے (کہی جارہی) ہے، ہم نے یہ بات کسی اور دین میں نہیں سنی، یہ تو بس گھڑی ہوئی بات ہے۔'' [3]

گویا مشرکین کا اپنے جھوٹے معبودوں کی عبادت پر قائم رہنا اس وجہ سے تھا کہ انھوں

1 سنن النسائي، حديث: 3136، و مسند أحمد: 3/483، و صحيح ابن حبان، حديث: 4593.
2 الغرباء الأولون للدكتور سلمان العودة، ص: 83. 3 صٓ 38: 6,7.

نے نبی ﷺ کی دعوتِ توحید جیسی دعوت اس سے پہلے کے دین میں ہرگز نہ سنی تھی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، سدی، محمد بن کعب قرظی، قتادہ اور امام مجاہد کی تفسیر کے مطابق پہلے دین سے مراد نصرانیت ہے۔[1]

یوں نبی ﷺ کے خلاف اہل کتاب کی شہادت مشرکین کے لیے تقویت کا سبب بنی، وگرنہ عرب والے کسی آسمانی کتاب اور اس میں موجود حقائق اور معلومات سے قطعًا نا آشنا تھے۔[2]

قبائلی عادات و اطوار کا غلبہ: سرداری اور شرف و عزت کے حصول کے لیے قبائل کی باہمی رسہ کشی ان کے عادات و اطوار میں جڑیں پکڑ چکی تھی، اس لیے نبی ﷺ کے اپنے قبیلے والے آپ کے خلاف بطور حجت یہ دلیل پیش کرتے کہ آپ ان میں سرداری اور بلند مرتبے کے حامل نہیں اور دیگر قبائل قریش اپنے منصب اور سرداری کو بچانے کی غرض سے مخالفت پر تلے ہوئے تھے، جبکہ دیگر قبائلِ عرب اپنے اپنے قبیلے کی یکجہتی کا تحفظ کسی دوسرے قبیلے کے فرد کی اتباع سے گریز کرتے ہوئے اسلام سے انکار کی صورت میں کرتے تھے۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''پہلا دن جب میں نے رسول اللہ ﷺ کو جانا، وہ تھا جب میں اور ابوجہل مکہ کی ایک گلی میں چلے آرہے تھے۔ اچانک ہماری ملاقات رسول اللہ ﷺ سے ہوگئی۔ رسول اللہ ﷺ نے ابوجہل سے کہا: «يَا أَبَا الْحَكَمِ! هَلُمَّ إِلَى اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَ إِلٰى رَسُولِهِ، إِنِّي أَدْعُوكَ إِلَى اللّٰهِ» ''اے ابو الحکم! اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف آؤ، میں تمھیں اللہ کی طرف بلاتا ہوں۔'' ابوجہل نے کہا: ''اے محمد! کیا تو ہمارے معبودوں کو گالی دینے سے رک سکتا ہے؟ کیا تو صرف یہی چاہتا ہے نا کہ ہم گواہی دیں کہ تو نے اللہ کا دین پہنچا دیا؟ اللہ کی قسم! اگر مجھے یقین ہوجائے کہ تو سچا ہے تو بھی میں تیری اتباع نہیں کروں گا۔'' مغیرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ وہاں سے واپس آگئے تو ابوجہل مجھ سے کہنے لگا: ''اللہ کی قسم! مجھے علم ہے کہ وہ حق بات کہتے ہیں

1 تفسير الطبري: 126/23، والدر المنثور للسيوطي: 146/7. 2 الغرباء الأولون للدكتور سلمان العودة، ص: 86.

لیکن ذرا غور کرو، بنو قُصَیّ کہتے ہیں کہ ہم بیت اللہ کے دربان ہیں، ہم نے کہا: ٹھیک ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم مجلس مشاورت (ندوہ) کے نگران ہیں۔ ہم نے کہا: ہاں۔ انھوں نے کہا: ہمارے پاس پرچم (لواء) ہے۔ ہم نے کہا: ہم نے مان لیا۔ انھوں نے کہا: ہمارے پاس حاجیوں کو پانی پلانے کی ذمہ داری (سقایہ) ہے۔ ہم نے یہ بھی تسلیم کر لیا، پھر انھوں نے حج وعمرہ کے لیے آنے والے لوگوں کو کھانا کھلایا اور ہم نے بھی کھانا کھلایا یہاں تک کہ جب باہمی مقابلہ زوروں پر تھا تو انھوں نے دعویٰ کیا کہ ہم میں نبی ہے۔ نہیں، اللہ کی قسم! میں کبھی (ان کی برتری تسلیم) نہیں کروں گا۔"[1]

اہل مکہ کی عرب قبائل پر برتری: اہل مکہ ہر ممکن طور پر اپنے مقام و مرتبے اور شرف و برتری کو قائم رکھنا چاہتے تھے وہ دیگر تمام عرب قبائل پر اپنا مذہبی تقدّس برقرار رکھنے کے خواہاں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اسلام ان سے ان کا یہ امتیاز چھین لے گا، سارا عرب ان سے نبرد آزما ہو جائے گا اور ان کی منڈیوں میں اپنی پیداوار لانے سے رک جائے گا اور وہ یہ بھول گئے تھے کہ اللہ ہی امن اور رزق دینے والا ہے۔[2]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَقَالُوٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا ۚ اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝﴾

"وہ (مشرکین مکہ) کہتے ہیں: اگر ہم نے تیرے ساتھ ہدایت کی پیروی کی تو ہمیں ہماری زمین سے اچک لیا جائے گا، کیا ہم نے انھیں پرامن حرم میں جگہ نہیں دی جس کی طرف ہر قسم کے پھل ہماری طرف سے بطور رزق کھینچ کر لائے جاتے ہیں؟ لیکن ان کے اکثر نہیں جانتے۔"[3]

1 دلائل النبوة للبيهقي: 207/2، وصحيح السيرة النبوية للألباني: 162/1. 2 الغرباء الأولون للدكتور سلمان العودة، ص: 96-106. 3 القصص 57:28.

قریش کا یہ گمان تھا کہ اہل عرب جو بتوں کو مقدس جانتے ہیں، جب انھیں علم ہوگا کہ قریش نے ایک نیا دین اختیار کرلیا ہے اور اپنے آباء واجداد کے دین کو چھوڑ دیا ہے تو وہ ان کے خلاف کارروائی کریں گے اور اہل مکہ پر ٹوٹ پڑیں گے بلکہ اس ''جرم'' کی پاداش میں وہ موسم حج میں ان کی منڈیوں میں اپنی پیداوار بھی نہیں لائیں گے۔ لیکن افسوس کہ وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ اللہ اپنے فیصلے پر غالب آنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ۭ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَكْفُرُوْنَ ○ ﴾

''کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ بے شک ہم نے حرم (مکہ) کو پرامن بنایا ہے، جبکہ لوگ اس کے اردگرد سے اچک لیے جاتے ہیں۔ کیا پھر وہ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں۔'' [1]

1 العنکبوت67:29.

باب 2

قانونِ ابتلا

اپنی مخلوق کی ابتلا و آزمائش اللہ تعالیٰ کا ایسا رائج قانون ہے جس کا تذکرہ قرآن کریم میں جگہ جگہ کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَٰٓئِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَآ ءَاتَىٰكُمْ ۗ إِنَّ رَبَّكَ سَرِيعُ الْعِقَابِ وَإِنَّهُۥ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝﴾

''اور وہی ہے جس نے تمھیں زمین میں ایک دوسرے کا جانشین بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض پر اونچے درجے عطا کیے تاکہ وہ تمھیں ان نعمتوں میں آزمائے جو اس نے تمھیں دیں۔ بے شک آپ کا رب جلد سزا دینے والا ہے۔ اور بے شک وہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے مزید ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۝﴾

''بلاشبہ ہم نے جو کچھ روئے زمین پر ہے، اسے اس کی زینت بنایا ہے تاکہ ہم انھیں آزمائیں کہ ان میں عمل کے لحاظ سے کون زیادہ اچھا ہے۔''[2]

اس دنیا میں مراتب پانے کا ابتلا و آزمائش سے گہرا تعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ کسی امت کو اس وقت تک دنیا میں مقام و مرتبہ حاصل نہیں ہوتا جب تک کہ وہ مختلف

[1] الأنعام 165:6. [2] الكهف 7:18.

آزمائشی مراحل سے نہ گزر جائے اور اس کا جوہر حالات کی کٹھالی میں اچھی طرح پگھل کر کھوٹا اور کھرا الگ نہ ہو جائے۔

یہی قانون الٰہی امت اسلامیہ پر بھی نافذ العمل رہا۔ اللہ تعالیٰ کی یہ مشیت رہی کہ اہل ایمان کو آزمائش اور ابتلا سے گزارا جائے تاکہ ان کا ایمان خالص ہو جائے اور وہ زمین میں غلبہ حاصل کر لیں اور عزت و شرف کے مراتب پالیں۔

یہ مفہوم امام شافعی رحمہ اللہ کے ان الفاظ میں بھی پایا جاتا ہے جو انھوں نے ایک سائل کو جواب دیتے ہوئے کہے تھے۔ سائل نے سوال کیا تھا کہ آزمائش میں گھرا انسان بہتر ہے یا صاحب مرتبہ؟ اس پر امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا تھا: ''انسان پہلے آزمایا جاتا ہے، پھر اسے مقام و مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سیدنا نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ اور محمد علیہم السلام جیسے جلیل القدر انبیاء کو آزمایا جب انھوں نے صبر کیا تو اللہ نے انھیں مقام و مرتبہ عطا فرمایا، اس لیے کوئی انسان یہ خیال نہ کرے کہ وہ اس دنیا میں ہر قسم کے رنج و غم سے مکمل محفوظ رہے گا۔''[1]

اہل ایمان کو مقام و مرتبہ عطا کرنے سے پہلے کھرے کھوٹے کی پہچان کے لیے آزمائش و ابتلا لازمی امر ہے تاکہ ان کے اقتدار کی عمارت مضبوطی اور پختگی سے قائم ہو سکے اور ابتلا مومنوں کے لیے باعث رحمت ہوتا ہے نہ کہ باعث زحمت اور اس میں اللہ کا غضب نہیں بلکہ اس کی پسندیدگی شامل ہوتی ہے۔[2]

اسی طرح دعوتی میدان اور جنت کے راستے میں اللہ کا یہی قانون نافذ العمل ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

«حُفَّتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ وَ حُفَّتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ»

''جنت کا راستہ مشکلات اور جہنم کا خواہشات سے پُر کر دیا گیا ہے۔''[3]

1 الفوائد لابن القیم، ص: 283. 2 التمكين للأمة الإسلامية لمحمد السيد، ص: 235. 3 صحيح البخاري، حديث: 6487، و صحيح مسلم، حديث: 2822.

ابتلا کی حکمت اور اس کے فوائد

ابتلا کی بہت سی حکمتیں اور فوائد ہیں جن میں سے اہم ترین مندرجہ ذیل ہیں:

اچھے برے کا امتیاز: اللہ تعالیٰ نے ابتلا و آزمائش کو لوگوں کے درمیان امتیاز کرنے اور سچے مومن کو منافق سے الگ کرنے کا ذریعہ بنایا ہے کیونکہ انسان کا کردار بسا اوقات اچھے حالات میں واضح نہیں ہوتا اور سخت حالات میں کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿ أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ۝ ﴾

''کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ صرف یہ کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور انھیں آزمایا نہیں جائے گا۔''[1]

تربیت: امام سید قطب رحمہ اللہ اس سلسلے میں فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ کا قانون ابتلا ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے دعوتِ اسلام کی حامل اور اس راستے کی تکالیف برداشت کرنے والی جماعت تیار کی جاسکتی ہے۔ اور قانونِ ابتلا اس جماعت کی تربیت کا مؤثر ترین ذریعہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی بھلائی، قوت اور برداشت جیسی خوبیوں کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اللہ کا قانونِ ابتلا تکالیف برداشت کرنے کی عملی تربیت اور انسان کی حقیقت اور زندگی کا مقصد جاننے کا مرکزی ذریعہ ہے تاکہ اس کے نتیجے میں دعوت اسلامی کے علمبردار اور مضبوط کردار کے افراد ثابت قدمی سے آگے بڑھ سکیں اور یہی لوگ اس بار کو اٹھانے کے قابل سمجھے جاتے ہیں اور ان پر اعتماد کیا جاتا ہے۔''[2]

دلوں کے راز آشکار ہونا: اس سلسلے میں سید قطب رحمہ اللہ رقم طراز ہیں: ''انسان کی آزمائش سے قبل اس کے دل کی کیفیت اللہ تعالیٰ کے علم میں ہوتی ہے لیکن ابتلا و آزمائش کے ذریعے اس کا ہر خفیہ راز عالم دنیا میں آشکار ہو جاتا ہے جو پہلے سے اللہ کے علم میں ہے مگر لوگ اسے نہیں جانتے ہوتے، پھر لوگوں کے ظاہری عمل پر ان کا محاسبہ کیا جاتا ہے

1 العنکبوت 29:2۔ 2 تفسیر في ظلال القرآن لسید قطب: 180/2۔

نہ کہ صرف اللہ کے علم کی بنا پر۔ یہ ایک طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضل، دوسری طرح عدل اور تیسرے پہلو سے دیکھا جائے تو لوگوں کی تربیت کا ذریعہ ہے۔ لوگ آپس میں کسی کا محاسبہ اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک اس کا معاملہ واضح نہ ہو جائے اور اس کا جرم ثابت نہ ہو جائے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرح کسی کے دل کا راز نہیں جانتے۔''[1]

امانت کا بوجھ اٹھانے کی حقیقی تیاری: اس سلسلے میں سید صاحب فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ کا اہل ایمان کو تکلیف میں مبتلا کرنا محض آزمائش میں ڈالنے کے لیے نہیں بلکہ یہ عمل تو اللہ کی امانت کا بوجھ اٹھانے کی حقیقی تیاری ہے۔ اس کے لیے ایک خاص تیاری کی ضرورت ہوتی ہے جو عملی طور پر مشکلات سے گزرنے، خواہشات پر قابو پانے، مصائب پر صبر کرنے اور لمبے فتنے اور سخت ابتلا میں مبتلا ہونے کے باوجود اللہ سے مدد اور ثواب حاصل ہونے کے یقین کے ساتھ مکمل ہوتی ہے۔ انسان کو سختیاں پگھلا کر رکھ دیتی ہیں جس سے اس کے نفس کا میل کچیل اتر جاتا ہے۔ اس کی پوشیدہ ذخیرہ شدہ طاقت جوش مارتی ہوئی بیدار ہو کر یکجا ہو جاتی ہے اور جب اس میں سختی اور تندی پیدا ہو جاتی ہے تو اس کا جوہر مضبوط، ٹھوس اور پالش ہو جاتا ہے۔

سختیاں اور آزمائش بڑی بڑی جماعتوں کو تیار کرتی ہیں اور ہر فرد کی بنیاد مضبوط، طبیعت قوی اور اللہ کے ساتھ تعلق پختہ ہو جاتا ہے اور وہ فتح یا شہادت کی خوبیوں سے بہرہ ور ہو جاتا ہے۔ اس آزمائش و تربیت کے بعد ایسے ہی افراد اسلامی دعوت کا علم اٹھاتے ہیں اور ان پر اعتبار و اعتماد کیا جاتا ہے۔''[2]

حقیقت نفس کی پہچان: اس بارے میں سید قطب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ابتلا کا مرحلہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ داعی خود اپنی حقیقت سے آگاہ ہو سکیں کیونکہ انھیں زندگی اور جہاد سے عملی طور پر نبرد آزما ہونا ہوتا ہے اور اسی طرح وہ انسانی نفس کی حقیقت اور اس کے مخفی پہلوؤں سے

1 تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب: 387/6. 2 تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب: 389/6.

آگاہ ہوسکیں جن سے جماعتوں اور معاشروں کی حقیقت بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے۔

اس حقیقت کو پالینے کے بعد داعی حضرات جان لیتے ہیں کہ خواہشات کے باوجود کس طرح دعوت اسلامی خود ان کے اور لوگوں کے دلوں میں سرایت کرتی ہے اور وہ یہ بھی جان لیتے ہیں کہ شیطان کن کن راستوں سے لوگوں کے دلوں میں داخل ہوتا ہے اور راہِ حق کے کٹھن مراحل اور گمراہی کے طور طریقے کون کون سے ہیں۔''[1]

دعوت کی قدر و اہمیت کا شعور: اس بارے میں سید قطب کا کہنا ہے: ''ابتلا کا مرحلہ اس لیے بھی آتا ہے کہ جس قدر دعوت دین کے سلسلے میں مشقت اور مصائب کا سامنا ہو اور انسان اپنی قیمتی اور عزیز چیز کی قربانی دے، اسی قدر اس دعوت کی قدر و قیمت اور اہمیت ان پر آشکار ہوتی ہے۔ بعد ازاں حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں، وہ قربانی دینے میں کوئی کوتاہی نہیں کرتا۔''[2]

قبول اسلام کا سبب بننا: اہل ایمان کا آزمائش پر صبر اختیار کرنا بذات خود اس دین کی ایک خاموش دعوت ہے جو لوگوں کو اللہ کے دین میں داخل کر دیتی ہے۔ اگر اہل ایمان کمزوری یا بے ثباتی کا مظاہرہ کریں تو لوگ اس دین میں داخل ہونے سے انکار کر دیں گے۔

نبی ﷺ کے پاس کوئی شخص آتا اور اسلام قبول کر لیتا، پھر نبی ﷺ کی طرف سے اسے حکم ملتا کہ وہ اپنی قوم کو تبلیغ کرے، ان کے حق کو جھٹلانے اور تکالیف پہنچانے پر صبر کرے اور مسلسل کوشش جاری رکھے اور بالآخر وہ اپنی قوم کو دائرہ اسلام میں داخل کرنے کے لیے آپ کے پاس لے آتا۔[3]

بعض باا ثر افراد کا دعوت اسلامی کی طرف مائل ہونا: اہل اسلام کی پختگی اور قربانیوں کو دیکھ کر بڑی بڑی باا ثر شخصیات اس دین کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہیں۔ اگر ایمانی استقامت کا مظاہرہ کیا جائے تو ایسی باا ثر شخصیات کے سامنے دعوت اسلام اور

1 تفسیر في ظلال القرآن لسید قطب: 181/2. 2 تفسیر في ظلال القرآن لسید قطب: 180/7.
3 فقه السیرة النبویة للدکتور الغضبان، ص:193,192.

حاملین دعوت کی عظمت بڑھ جاتی ہے اور وہ بلا تردد اسلام کی طرف کھینچے چلے آتے ہیں۔ اسلامی تاریخ میں بہت سی عظیم شخصیات جن سے اسلام کو غلبہ ملا، اس راستے سے دائرۂ اسلام میں داخل ہوئیں۔[1]

اللہ تعالیٰ کے ہاں درجات کی بلندی اور گناہوں کا کفارہ: نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«مَا يُصِيبُ الْمُؤْمِنَ مِنْ شَوْكَةٍ فَمَا فَوْقَهَا، إِلَّا رَفَعَهُ اللّٰهُ بِهَا دَرَجَةً، أَوْحَطَّ عَنْهُ بِهَا خَطِيئَةً»

''کسی مومن کو کوئی بھی کانٹا چبھے یا اس سے بڑی تکلیف پہنچے تو اللہ تعالیٰ اس کا ایک درجہ بلند فرما دیتے ہیں یا اس کا ایک گناہ معاف کر دیتے ہیں۔''[2]

بندے کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک درجہ ہوتا ہے جہاں پر وہ اپنے عمل کی وجہ سے نہیں پہنچ سکتا۔ تب اللہ تعالیٰ اسے آزماتا ہے اور اس آزمائش کی وجہ سے اسے بلند درجے تک پہنچا دیتا ہے، اسی طرح ابتلا و آزمائش کی وجہ سے مسلمان کے گناہ بھی معاف ہوتے ہیں۔[3]

ابتلا کے دیگر فوائد: ان میں اللہ تعالیٰ کی شانِ ربوبیت اور صفت قہار کی معرفت، بندوں کا عجز و انکسار، اخلاص، اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور اس کی طرف متوجہ ہونا، دعا اور گریہ و زاری، مصیبت پہنچانے والے کو معاف کرنا، مصیبت پر صبر کرنا اور اجر کی امید رکھنا اور اس میں پوشیدہ فوائد کو سامنے رکھ کر اللہ کا شکر ادا کرنا، مصائب میں مبتلا افراد سے اچھا سلوک کرنا اور ان کی مدد کرنا، نعمتِ عافیت کی قدر دانی اور اس پر اللہ کا شکر ادا کرنا اور اس ابتلا و آزمائش کا سب سے بڑا فائدہ وہ آخرت کا ثواب ہے جو اللہ تعالیٰ اس آزمائش کی وجہ سے انسان کو عطا کرتا ہے۔ اور اس ثواب کے مختلف مراتب ہیں، جو شخص جتنا زیادہ صبر اور شکر سے کام لیتا ہے، اس کا ثواب بھی اسی نسبت سے زیادہ ہوتا ہے۔[4]

1 فقه السيرة النبوية للدكتور الغضبان، ص:194,193. 2 صحيح مسلم، حديث:2572. 3 التمكين للأمة الإسلامية لمحمد السيد، ص:224، و فقه الابتلاء لمحمد أبي صعيليك، ص:8-11. 4 فقه الابتلاء لمحمد أبي صعيليك، ص:15-28.

نبی ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے مختلف اقسام کی آزمائشوں کا سامنا کیا، مثلاً: ''قریش کی طرف سے ابو طالب کو نبی ﷺ کی حمایت سے باز رکھنے کی کوشش، اسلامی دعوت کا مذاق اڑانا، نبی ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو تکالیف دینا، دعوت ترک کرنے پر سودے بازی اور پیشکشیں، صفا پہاڑی کو سونے کی بنانے کا مطالبہ، نبی ﷺ کے خلاف یہودیوں سے مدد مانگنا، دعوت دین اور نبی ﷺ کی شخصیت کے خلاف اہم مواقع خصوصاً حج کے موقع پر پروپیگنڈہ، کفار مکہ کی طرف سے اقتصادی بائیکاٹ جس میں نبی ﷺ، بنو ہاشم اور بنو مطلب نے تکلیفیں اٹھائیں اور اس کے علاوہ جسمانی تکالیف وغیرہ شامل ہیں۔

آئندہ صفحات میں اسلام کے خلاف مشرکین کی حیلہ سازیوں کے تذکرے کے علاوہ یہ بتایا جائے گا کہ نبی ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے کس طرح کفار کی سازشوں کے مقابلے میں اپنا دفاع کیا، دنیاوی اسباب کے ساتھ اس دور ابتلا کا سامنا کیا اور دنیاوی اسباب کس حد تک اختیار فرمائے حتی کہ مدینہ میں ایک اسلامی ریاست قائم کرنے میں کامیابی ممکن ہوئی۔

باب 3

اسلامی دعوت کے خلاف مشرکین کی محاذ آرائی

مشرکین مکہ نے اسلامی دعوت کے خلاف محاذ آرائی کا متفقہ فیصلہ کرلیا تھا کیونکہ اس دعوت نے ان کے جاہلی عقیدے کی قلعی کھول دی تھی، ان کے معبودوں کو باطل ٹھہرایا تھا اور ان کی آراء و افکار اور اللہ تعالیٰ، زندگی، انسان اور کائنات کے بارے میں ان کے تصورات کو کم عقلی کا نتیجہ قرار دیا تھا، لہٰذا انھوں نے اس دعوت کو روکنے، حق کی آواز کو دبانے اور اسلام کے فروغ کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کے لیے مختلف ذرائع اور طریقے استعمال کیے:

ابوطالب کو نبی ﷺ کی حمایت سے دور رکھنے کی کوشش

قریش کے سردار ابوطالب کے پاس آئے اور کہا: ''اے ابوطالب! تیرے بھتیجے نے ہماری مجالس اور ہماری عبادت گاہ (مسجد حرام) میں آکر ہمیں تکلیف پہنچائی ہے۔ آپ اسے اس عمل سے روکیے۔'' اس پر ابوطالب نے نبی ﷺ سے کہا: ''یہ تیرے چچا زاد بھائی میرے پاس آئے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ تو انھیں ان کی مجالس اور حرم کعبہ میں تکلیف پہنچاتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو تو اس سے باز آجا۔'' نبی ﷺ نے اپنی نگاہ آسمان کی طرف اٹھائی اور ان سے فرمایا: «تَرَوْنَ هٰذِهِ الشَّمْسَ؟» ''کیا تم سب اس سورج کو دیکھتے ہو؟'' انھوں نے کہا: ''ہاں'' فرمایا: «فَمَا أَنَا بِأَقْدَرَ أَنْ أَدَعَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ عَلٰى أَنْ تَشْعَلُوا مِنْهَا بِشُعْلَةٍ» ''اگر تم اس سورج کا شعلہ لاکر میرے ہاتھ پر رکھ دو تو بھی میں یہ دعوت

کبھی نہیں چھوڑوں گا۔"

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "اللہ کی قسم! اگر کوئی اس سورج سے آگ کا شعلہ بھی لے آئے تو بھی میں اس دعوت کو نہیں چھوڑوں گا جسے پہنچانے کے لیے مجھے بھیجا گیا ہے۔"

ابو طالب نے قریش سے کہا: "میرے بھتیجے نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ تم بھلائی چاہتے ہو تو واپس چلے جاؤ۔"[1]

قریش نے کئی بار نبی ﷺ کو ان کے خاندان کے ذریعے دبانے کی کوشش کی لیکن ناکام ہوئے۔

ابو طالب کی طرف سے اپنے بھتیجے کی حمایت کی خبر پھیلتی جا رہی تھی اور ان کے نبی ﷺ کی نصرت وحمایت پر کمر بستہ ہونے اور انھیں تنہا نہ چھوڑنے کا معاملہ زبان زد خاص و عام تھا جس سے قریش میں غم، حسد اور مکر و فریب کی لہر دوڑ گئی۔ وہ عمارہ بن ولید بن مغیرہ کو لیے ابو طالب کے پاس آئے اور کہا: "اے ابو طالب! یہ عمارہ بن ولید قریش کا طاقتور اور خوبصورت ترین فرد ہے۔ اس کا نفع نقصان آپ سے متعلق رہے گا، اسے آپ اپنا بیٹا بنا لیجیے اور اس کے عوض اپنے اس بھتیجے کو ہمارے حوالے کر دیجیے جس نے آپ کے اور آپ کے بڑوں کے دین کی مخالفت کی، آپ کی قوم کا شیرازہ بکھیر دیا اور ہماری عقلوں کو بیوقوفی پر محمول کیا۔ ہم اسے قتل کرنا چاہتے ہیں۔ اور آپ کو ایک شخص کے بدلے ایک شخص دیا جا رہا ہے۔" ابو طالب نے کہا: "اللہ کی قسم! تم مجھ سے کتنا برا سودا کر رہے ہو۔ کیا تم اپنا بیٹا میرے حوالے اس لیے کرو کہ میں اسے کھلاؤں اور میں اپنا بیٹا تمھارے حوالے اس لیے کر دوں کہ تم اسے قتل کر ڈالو۔ اللہ کی قسم! ایسا کبھی نہیں ہوگا۔"[2]

1 التاريخ الكبير للبخاري: 51/1/4، ودلائل النبوة للبيهقي: 187/2، وصحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 78، وسلسلة الأحاديث الصحيحة: 194/1. 2 السيرة النبوية لابن هشام: 285/1، و البداية والنهاية: 48/3.

ایک شخص جب ابو طالب کی طرف سے نبی ﷺ کی پشت پناہی کا یہ انداز دیکھتا ہے تو وہ حیرت زدہ اور ہکا بکا رہ جاتا ہے کہ ابو طالب نے اپنا راستہ اپنے بھتیجے کے راستے کے ساتھ ملا لیا تھا بلکہ بنو ہاشم کا کفیل ہونے کے ناتے بنو ہاشم اور بنو مطلب کو تادمِ آخر نبی ﷺ کی تائید میں ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا۔ اس میں مسلم اور مشرک کا کوئی امتیاز نہ تھا۔[1]

ابو طالب نے اپنے بھتیجے محمد ﷺ کو کھلم کھلا پناہ دی جس میں کسی قسم کا تردد یا تامل شامل نہ تھا۔ ابو طالب کا یہ انداز جاہلی رسم و رواج اور عرب کی روایات کے عین مطابق تھا جس کی بنا پر نبی ﷺ کی حفاظت اور اسلام کی خدمت ممکن ہوئی۔

ابو طالب نے جب بنو ہاشم اور بنو مطلب کے بارے میں قریش کی کارستانیوں کو دیکھا تو انھیں نبی ﷺ کے دفاع کی دعوت دی، چنانچہ وہ سب ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے ہو گئے اور اللہ کے دشمن ابولہب کے سوا سب نے ابو طالب کی دعوت پر لبیک کہا۔

جب ابو طالب نے اپنی قوم کی یہ حالت دیکھی جو ان کے لیے مسرت کا سبب تھی، یعنی یہ کہ وہ سب ان کی سعی میں شریک اور ان کے ہمدرد ہیں تو ان کی مدح و ستائش کی اور انھیں پرانے واقعات یاد دلائے۔ رسول اللہ ﷺ کی فضیلت اور مرتبہ واضح کیا تاکہ ان لوگوں کی رائے پختہ ہو جائے اور وہ بھی رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے ساتھ محبت اور ہمدردی کا رویہ اختیار کریں، چنانچہ ابو طالب نے ایک قصیدہ کہا:

''جب کبھی قریش کسی قابل فخر کام کے لیے اکٹھے ہوتے تو ان میں بنی عبد مناف ان کی جان اور روح رواں رہے، پھر جب ان میں سے بنی عبد مناف کے شرفاء کا شمار کیا گیا تو ان میں سے بڑے مرتبے والے اور بنو ہاشم کے سرکردہ افراد بھی نکلے۔ اور جب کبھی بنو ہاشم نے فخر کیا تو ان میں سے محمد (ﷺ) ہی منتخب ہوئے جو اس قبیلے کی جان اور بڑے مرتبے والے نکلے۔ قریش کے اچھے اور برے تمام

[1] فقه السيرة النبوية للدكتور الغضبان، ص: 183.

لوگوں نے ایک دوسرے کو ہماری مخالفت پر ابھارا، تاہم انھیں کوئی کامیابی نصیب نہ ہوئی بلکہ ان کی متانت اور عقلیں چلی گئیں۔ ہمیشہ سے ہماری حالت یہ رہی ہے کہ ہم کسی ظلم کو جاری نہیں رہنے دیتے۔ جب کبھی لوگوں نے تکبر سے اپنے گال ٹیڑھے کیے تو ہم انھیں سیدھا کرتے رہے۔''[1]

جب ابوجہل نے ابو طالب کی اس پناہ کو توڑنا چاہا تو حمزہ (رضی اللہ عنہ) نے کمان مار کر اس کا سر پھوڑ دیا اور کہا: ''تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان میں نازیبا الفاظ کہتا ہے، حالانکہ میں اس کے دین پر ہوں۔ اگر تجھ میں ہمت ہے تو دوبارہ ایسی حرکت کر کے دکھا۔''

یہ عجیب واقعہ تھا کہ جاہلیت کے پرستار اس شخص کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے تھے جو ان کے معبودوں کو برا کہتا، ان کے دین میں عیب نکالتا اور انھیں بیوقوف گردانتا تھا، جبکہ وہ اس جاہلی جذبے کی بنا پر اپنی جانیں قربان کرنے اور جنگی معرکوں اور لڑائیوں میں کودنے کو تیار ہو جاتے تھے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کوئی تکلیف نہیں پہنچتی تھی۔

جب ابو طالب کو عرب کے عام لوگوں کا خوف ہوا کہ کہیں وہ آپ کے اور آپ کی قوم کے پیچھے نہ پڑ جائیں تو انھوں نے وہ قصیدہ کہا جس میں انھوں نے حرم مکہ، نیز اپنے اس رتبے کی پناہ لی جو انھیں وہاں کی سکونت کے سبب حاصل تھا اور اپنی قوم کے بلند مرتبہ لوگوں پر اپنی محبت جتائی اور اپنے اشعار میں یہ بھی بتایا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دشمن کے حوالے کرنے والے یا آپ کو کسی بڑے لالچ کے عوض کبھی چھوڑنے والے نہیں حتی کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت میں خود بھی ہلاک ہو جائیں۔ ابو طالب نے کہا:

''جب میں نے قوم کو دیکھا کہ ان میں محبت نہیں رہی اور انھوں نے تمام تعلقات اور رشتوں کو توڑ دیا ہے۔ انھوں نے ہم سے کھلی دشمنی اور ایذا رسانی شروع کی اور ہم سے الگ ہو جانے والے دشمن کی بات مانی۔ انھوں نے ہمارے خلاف تہمت زدہ

---

1 السيرة النبوية لابن هشام: 269/1.

لوگوں سے معاہدے کیے جو ہماری پیٹھ پیچھے غصے سے انگلیاں چباتے ہیں۔ میں بذات خود ایک لچکیلے نیزے اور گزرے ہوئے سرداروں کی وراثت سے ملی ہوئی ایک چمکیلی تلوار لے کر ان کے مقابلے میں ڈٹ گیا۔ اور میں نے اپنی قوم اور اپنے بھائیوں کو بیت اللہ کے پاس بلوایا اور اس کی سرخ دھاریوں والی چادریں پکڑ لیں۔''[1]

ابو طالب نے بیت اللہ اور اس کی دیگر مقدس اشیاء کے ساتھ اللہ کی پناہ پکڑی اور اللہ کے نام کی قسم اٹھا کر کہا کہ وہ کبھی محمد (ﷺ) کا ساتھ نہیں چھوڑے گا اگرچہ خون کی ندیاں بہہ جائیں اور تمام قبائل قریش سے نبرد آزما ہونا پڑے۔

''بیت اللہ کی قسم! تم نے غلط خیال کیا کہ ہم محمد (ﷺ) کے متعلق مغلوب ہو جائیں گے، حالانکہ ابھی تک ہم نے ان کے بچاؤ کے لیے نہ نیزہ زنی کی ہے اور نہ تیراندازی، تم نے غلط خیال کیا کہ ہم انھیں تمھارے حوالے کر دیں گے، ہرگز نہیں، حتی کہ ہم ان کے اردگرد پچھاڑ دیے جائیں گے اور اپنے بیوی بچوں کو بھول جائیں گے۔ تمھارے مقابلے کے لیے ہتھیار بند لوگ ایسے اٹھیں گے جیسے پانی لے جانے والی اونٹنیاں آواز پیدا کرنے والی پکھالوں (بڑے مشکیزوں) کا بوجھ لیے اٹھتی ہیں۔''

ابو طالب نے اپنے اشعار میں بنو عبد مناف کے زعماء کو ان کے نام لے کر دھمکایا اور لعن طعن کی، چنانچہ انھوں نے عتبہ بن ربیعہ سے کہا:

''اے عتبہ! ہم سے ایسی دشمنی رکھنے والے کی بات پر توجہ نہ دے جو بہت حاسد، بہت جھوٹا، بغض رکھنے والا اور فسادی ہے۔''

ابو طالب نے ابوسفیان بن حرب کے بارے میں کہا:

''ابوسفیان میرے پاس سے منہ پھیر کر یوں گزر گیا جیسے وہ یمن کے بڑے بڑے رئیسوں میں سے کوئی رئیس ہو۔ وہ اونچے مقامات اور سرد پانی کی جگہوں کی طرف

[1] السيرة النبوية لابن هشام:1/273.

بھاگ جاتا ہے اور دعویٰ یہ ہے کہ میں تم سے غافل نہیں۔''[1]

اور بنونوفل کے سردار مطعم بن عدی سے کہا:

''اے مطعم! میں نے تجھے کبھی بے یارومددگار نہیں چھوڑا، نہ خطروں کے وقت اور نہ بڑے اہم معاملوں میں۔ اے مطعم! لوگوں نے تجھ سے سخت برتاؤ کیا لیکن میں جب تن دہی سے تیرا پیچھا کروں گا تو تو چھوٹ نہ سکے گا۔ اللہ تعالیٰ ہماری طرف سے بنوعبدشمس اور بنونوفل کو ایسی بُری سزا دے کہ اس کی تکلیف فوری پہنچے، آئندہ کے لیے نہ چھوڑی جائے۔''[2]

نبی ﷺ نے اپنے چچا کو اپنے دفاع کے لیے اپنی طرف مائل کر کے ایک عظیم مدد حاصل کر لی جو عربوں کے قبائلی رسم و رواج کے مطابق تھی۔ آپ نے اپنے خاندان کی مکمل حمایت حاصل کر لی اور ہر قسم کی زیادتی سے محفوظ ہو گئے اور آپ ﷺ کو فکر و حرکت کی آزادی نصیب ہوئی۔

نبی ﷺ کے اس اقدام سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ جس معاشرے میں رہتے تھے وہاں کے عادات و اطوار سے خوب واقف تھے۔ آپ کے اس طریقے میں تمام داعیوں کے لیے سبق پوشیدہ ہے کہ وہ اپنے معاشرے اور قبائل سے ربط ضبط اور اللہ کے دین کی خدمت کے لیے ان کے قوانین اور سماجی ضابطوں سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

دعوت اسلامی میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کی کوشش اور نتائج

مکہ کے مشرک نبی ﷺ کی دعوت میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگے اور اس غرض سے انھوں نے ذرائع ابلاغ کی جنگ یا میڈیا وار کا آغاز کیا جس کا لیڈر ولید بن مغیرہ تھا۔ اس کے پاس قریش کے چند لوگ جمع ہوئے کیونکہ وہ ان سب میں سے عمر رسیدہ تھا۔ حج کا موسم قریب آچکا تھا، ولید نے ان سے کہا:

1 فقه السيرة النبوية للدكتور الغضبان، ص: 212. 2 فقه السيرة النبوية للدكتور الغضبان، ص: 212.

''اے گروہ قریش! حج کا موسم قریب آچکا ہے۔ عنقریب عرب کے مہمان تمھارے پاس آئیں گے۔ انھوں نے تمھارے اس ساتھی (محمد) کا حال سن رکھا ہے۔ پس تمھیں چاہیے کہ اس کے متعلق ایک متفقہ رائے قائم کرلو۔ ایسا نہ ہو کہ تم میں باہم اختلاف ہو اور تم ایک دوسرے کو جھٹلانے اور ایک دوسرے کی بات کا رد کرنے لگو۔''

قریش: ''اے ابوعبد شمس! تم ہی کچھ کہو اور ایسی رائے کا اظہار کرو کہ ہم سب وہی کہیں۔''

ولید: ''نہیں، تم کچھ کہو، میں سنتا ہوں۔''

قریش: ''ہم کہیں گے کہ وہ کاہن ہے۔''

ولید: ''نہیں، اللہ کی قسم! وہ کاہن نہیں، ہم نے کاہنوں کو دیکھا ہے۔ وہ کاہنوں کا گنگنانا یا ان کی قافیہ پیمائی نہیں۔''

قریش: ''پھر ہم اسے دیوانہ کہیں گے۔''

ولید: ''نہیں، وہ دیوانہ بھی نہیں۔ ہم نے جنون کو دیکھا ہے اور اسے جانتے ہیں۔ اس کی حالت محض گنگنانے کی نہیں ہے، نہ خلجان ہے اور نہ شیطانی وسوسہ ہے۔''

قریش: ''تب ہم اسے شاعر کہیں گے۔''

ولید: ''وہ شاعر بھی نہیں۔ ہم شعر کی تمام اقسام: رِجز، ہَزَج، قَرِیض، مَقْبُوض و مَبْسوط کو جانتے ہیں۔ وہ شعر بھی نہیں۔''

قریش: ''پھر جادوگر کہیں گے۔''

ولید: ''جادوگر بھی نہیں۔ ہم نے بڑے بڑے جادوگر اور ان کے جادو دیکھے ہیں۔ اس میں ان کا پھونکیں مارنا ہے نہ ان کا گرہیں دینا ہے۔''

قریش: ''اے ابوعبد شمس! پھر ہم کیا کہیں؟''

ولید: ''واللہ! اس کی بات میں ایک قسم کی شیرینی ہے۔ اس کی جڑیں بہت شاخوں والی ہیں اور زمین میں پیوست ہیں اور اس کی شاخیں پھلدار ہیں۔ تم اپنی ان تمام باتوں سے

جو کچھ کہو گے اس کا جھوٹا ہونا ظاہر ہو جائے گا۔ ہاں، زیادہ سے زیادہ تم یہی بات کہہ سکتے ہو کہ وہ ایسا جادوگر ہے جس کے ذریعے باپ، بیٹے، بھائی، میاں، بیوی، فرد اور خاندان کے درمیان جدائی پڑ جاتی ہے۔"[1]

اللہ تعالیٰ نے ولید بن مغیرہ کے بارے میں یہ آیات نازل فرمائیں:

﴿ذَرْنِيْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا ۝ وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ۝ وَّبَنِيْنَ شُهُوْدًا ۝ وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا ۝ ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَ ۝ كَلَّا ؕ اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا ۝ سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا ۝ اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ۝ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝ ثُمَّ نَظَرَ ۝ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ۝ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ۝ فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ۝ اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ۝ سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ ۝﴾

"مجھے اور اس کو (تنہا) چھوڑ دیجیے جسے میں نے اکیلا ہی پیدا کیا اور اسے مال وافر دیا اور حاضر باش بیٹے (دیے) اور اس کے لیے خوب فراخی کا سامان کیا، پھر وہ طمع رکھتا ہے کہ میں (اسے) مزید دوں، ہرگز نہیں! بلاشبہ وہ ہماری آیات سے سخت عناد رکھتا ہے، میں اسے جلد مشکل چڑھائی چڑھاؤں گا، بے شک اس نے غور و فکر کیا اور اندازہ لگایا پس وہ مارا جائے! کیسا اندازہ لگایا؟ پھر وہ مارا جائے! کیسا اندازہ لگایا؟ پھر اس نے دیکھا، پھر تیوری چڑھائی اور منہ بسورا، پھر پیٹھ پھیری اور تکبر کیا، پھر اس نے کہا: یہ (قرآن) تو صرف جادو ہے جو پہلے سے چلا آرہا ہے، یہ تو صرف ایک بشر کا قول ہے، میں جلد اسے سقر (جہنم) میں ڈالوں گا۔"[2]

مذکورہ قصے سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ کے خلاف اعصابی جنگ بلا سوچے سمجھے نہ تھی بلکہ اس منصوبے کو قریشی سرداروں نے بڑی دقت اور پختگی سے تیار کیا تھا۔ اس میں ابلاغیات

1 السير والمغازي لابن إسحاق: 151,150، و تهذيب السيرة: 65,64/1، و دلائل النبوة للبيهقي: 200/2، و السيرة النبوية لابن هشام: 289,288/1. 2 المدثّر 74/11-26.

کے مسلمہ اصولوں کا لحاظ رکھا گیا تھا جن کی آج کل کے جدید دور میں بھی پاسداری کی جاتی ہے جیسا کہ مناسب وقت، چنانچہ مشرکین نے پروپیگنڈے کے لیے موسم حج میں لوگوں کے جمع ہونے کا وقت چنا۔ اسی طرح آپس میں مکمل اتفاق اور عدم اختلاف وغیرہ بھی اس مہم کا حصہ تھا اور یہ سب اس لیے کہ اس میڈیا وار میں حملہ منظّم ہو اور حُجّاج کے وفود پر اس کے مکمل اثرات مرتب ہوں اور مطلوبہ نتائج حاصل کیے جاسکیں۔ مناسب وقت کے ساتھ ساتھ انھوں نے ایسی مناسب جگہ کا بھی انتخاب کیا جہاں تمام حجاج کے وفود پہنچتے ہوں۔

مذکورہ واقعے سے نبی ﷺ کی عظمت اور قرآن مجید کی اثر آفرینیوں کا پتہ بھی چلتا ہے۔ ولید بن مغیرہ قریش کا بڑا رہنما تھا مگر اکابر قریش کی متکبرانہ عادات کے باوجود وہ قرآن کریم سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کا دل نرم ہوا اور اس نے قرآن کی عظمت کا بڑے بلیغ انداز میں اعتراف کیا۔ وہ دین حق کی عقلی اپیل کو تسلیم کرنے کے قریب پہنچ چکا تھا۔[1]

پروپیگنڈے کی یہ منظّم جنگ نبی ﷺ کی دعوت کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکی بلکہ آپ ان دشمنوں کے اس حصار کو توڑنے میں کامیاب رہے جنھوں نے نہ صرف اہل مکہ کو آپ سے نفرت دلانے اور آپ کی شہرت کو داغدار کرنے کا ارادہ کیا ہوا تھا بلکہ وہ مکہ آنے والوں کو آپ کی تعلیمات سے متنفر کرنے، آپ کو ان تک اپنی بات پہنچانے سے روکنے اور آپ کی دعوت کا اثر ختم کرنے کے لیے ہر آنے والے سے آگے بڑھ کر ملاقات کرتے تھے۔

نبی ﷺ نے اپنے دعوتی مشن میں عظیم کامیابی حاصل کی۔ آپ اپنے ہر مخاطب کے دل میں عمدہ اثر پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے، آپ جس سے بھی ملاقات کرتے، اس سے گفتگو سے قبل ہی اس پر آپ کے رعب، عظمت اور وقار کا اثر نظر آنے لگتا، پھر جب آپ اس سے اپنی بلیغ گفتگو فرماتے تو وہ آپ کی عمدہ گفتگو سنتے ہی اس کا اسیر ہوجاتا جو عقل سلیم کے مطابق ہوتی اور اس میں محبت اور خلوص کا جذبہ اور وحی الٰہی کے مطابق

1 التاريخ الإسلامي للحميدي: 123/1.

خلوص نیت کے ساتھ امت کی ہدایت کا وافر سامان ہوتا۔[1]

نبی ﷺ کی اپنی پرتاثیر گفتگو کی طاقت اور عمدہ اخلاق سے کفارِ قریش کی قائم کردہ مضبوط دیواروں کے گرنے کی مثالیں اس وقت سامنے آتی ہیں جب ہم ضماد ازدی، طفیل بن عمرو دوسی، ابوذر اور عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہم جیسی شخصیات کا آپ ﷺ کی گفتگو سے متاثر ہوکر اسلام قبول کرنے کا ذکر سنتے ہیں۔ اس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

ضِمَاد اَزْدی رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام: ضِمَاد ازدی مکہ آئے اور نبی ﷺ کے خلاف مشرکین کے پروپیگنڈے کا شکار ہوگئے۔ یہاں تک کہ قریشی سرداروں کی طرف سے لگائی گئی جنون کی تہمت کی وجہ سے ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ نعوذ باللہ آپ کو دیوانگی کا مرض لاحق ہے۔ ضِمَاد ازد شنوءہ سے تعلق رکھتے تھے اور دیوانگی کا علاج جانتے تھے، جب انھوں نے مکہ کے ان کم عقلوں سے سنا کہ آپ کو نعوذ باللہ جنون کی بیماری ہے تو وہ بولے: ''کاش! اس آدمی سے میری ملاقات ہوجائے۔ ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ اسے میرے ہاتھوں شفایاب فرمادے۔''

ضِمَاد کہتے ہیں کہ ان کی ملاقات نبی ﷺ سے ہوگئی اور انھوں نے کہا: ''اے محمد! (ﷺ) میں اس بیماری کا علاج کرتا ہوں اور اللہ جسے چاہیں میرے ہاتھ سے شفا بھی عطا فرماتے ہیں۔ کیا تو چاہتا ہے کہ میں تجھے اس بیماری کا دم کروں؟'' نبی ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ، نَحْمَدُهُ وَ نَسْتَعِينُهُ، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ، وَ مَنْ يُّضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهُ، وَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ وَ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَ رَسُولُهُ، أَمَّا بَعْدُ»

''بلاشبہ تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں۔ ہم اسی کی تعریف کرتے ہیں اور اس سے مدد مانگتے ہیں۔ جسے اللہ ہدایت نصیب فرمائے اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا اور جسے

1 التاريخ الإسلامي للحميدي: 1/127-137.

اللہ گمراہ رکھے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اکیلا ہے اوراس کا کوئی شریک نہیں اور بلاشبہ محمد (ﷺ) اس کے بندے اور رسول ہیں، اما بعد۔''

ضِمَاد عرض کرنے لگا: ''آپ مجھے یہ کلمات دوبارہ سنائیے۔'' تب نبی ﷺ نے تین مرتبہ یہ کلمات دہرائے۔ ضِمَادْ نے کہا: ''میں نے کاہنوں، جادوگروں اور شعراء کے کلام سنے ہیں لیکن آپ کے ان کلمات جیسے الفاظ آج تک نہیں سنے۔ ان میں تو سمندر کی سی گہرائی اور گیرائی ہے۔'' پھر انھوں نے نبی ﷺ سے عرض کیا: ''اپنا ہاتھ بڑھائیے، میں آپ کے ہاتھ پر اسلام کی بیعت کرنا چاہتا ہوں۔'' جب ضِمَاد ازدی رضی اللہ عنہ نے بیعت کر لی تو نبی ﷺ نے فرمایا: «وَعَلٰى قَوْمِكَ؟» ''اپنی قوم کے بارے میں بیعت کرتے ہو؟'' ضِمَاد ازدی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ہاں، اپنی قوم کے بارے میں بھی بیعت کرتا ہوں۔''

مدینہ طیبہ میں جب اسلامی ریاست قائم ہوگئی اور نبی ﷺ کے لشکر مختلف اطراف میں روانہ ہونے لگے تو ایک لشکر ضماد رضی اللہ عنہ کی قوم پر سے گزرا، لشکر کے کمانڈر نے لشکر میں اعلان کیا: تم میں سے کسی نے اس قبیلے کی کوئی چیز تو نہیں اٹھائی؟ ایک آدمی نے کہا: میں نے ان کا ایک لوٹا اٹھایا ہے۔ اس پر کمانڈر نے کہا: ''وہ لوٹا انھیں واپس کردو۔ یہ تو ضِمَاد رضی اللہ عنہ کی قوم ہے۔''[1]

سیدنا ضماد رضی اللہ عنہ کے قصے سے حاصل شدہ اسباق و نتائج: ① قریشیوں کے پروپیگنڈے اور نبی ﷺ کی شخصیت کو متنازعہ بنانے کی کوشش اور آپ ﷺ پر دیوانگی کے الزام نے ضِمَاد ازدی رضی اللہ عنہ کو بغرض علاج آپ کے پاس پہنچا دیا اور یہ ملاقات ان کی اپنی روحانی تسکین کا ذریعہ بن گئی۔ یوں مکہ میں نبی ﷺ کے خلاف برپا ہونے والی سازش کی یہ جنگ ضماد ازدی اوراس کے قبیلے کے اسلام لانے کا سبب بنی۔

1 صحيح مسلم، حديث: 868، ومسند أحمد: 302/1.

② نبی ﷺ کے دو وصف صبر اور بردباری کا اظہار ہوتا ہے۔ ضماد ازدی رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ کو دیوانگی کے مرض کا علاج کرنے کی پیشکش کی اور یہ ناراضی کا مقام تھا لیکن رسول اللہ ﷺ نے نرمی اور بردباری کا مظاہرہ کیا جس سے ضماد ازدی رضی اللہ عنہ کے دل میں نبی ﷺ کا احترام پیدا ہوا۔

③ ان الفاظ کی اہمیت اجاگر ہوئی جو نبی ﷺ نے اپنی گفتگو سے پہلے استعمال کیے۔ یہ الفاظ اللہ تعالیٰ کی تعظیم و تمجید اور خالص اسی کی عبادت پر دلالت کرتے ہیں، چنانچہ نبی ﷺ سے منقول ہے کہ آپ اپنے اکثر خطبات اور مواعظ کی ابتدا میں یہی الفاظ ارشاد فرماتے تھے۔

④ ضماد ازدی رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی فصاحت اور زور بیان سے متاثر ہوئے کیونکہ یہ فرمودات عالیہ ایک ایسے دل سے صادر ہوئے تھے جو ایمان و یقین اور حکمت سے پر تھا، لہٰذا آپ کے الفاظ ضماد کے دل کی گہرائی تک پہنچے اور ان کے ایمان لانے کا سبب بن گئے۔

⑤ ضماد ازدی رضی اللہ عنہ کا اس قدر جلد اسلام لانے پر تیار ہوجانا اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام دین فطرت ہے اور جب دل کسی بھی داخلی یا خارجی دباؤ میں نہ ہوتو اکثر متاثر ہوکر قبولیت کے لیے مستعد ہوجاتا ہے اور اس میں دعوت پیش کرنے والے کی مؤثر بات یا اس کی عمدہ سیرت کا بھی دخل ہوتا ہے۔

⑥ اسلامی دعوت کے پھیلنے پر نبی ﷺ کے حرص کا اندازہ ہوا کیونکہ جب آپ ﷺ نے ضماد ازدی کا سچا ایمان، اسلام قبول کرنے کے لیے ان کی بیباکی اور ان کی طرف سے اسلام پر کامل اطمینان کا اظہار دیکھا تو ان سے ان کی قوم کی طرف سے بھی بیعت لے لی۔

⑦ دعوت اسلامی کی اہمیت اجاگر ہوئی۔ نبی ﷺ نے اس ملاقات کو دعوت اسلام پیش کرنے کا وسیلہ بنایا اور ضماد سے دین پر قائم رہنے کی بیعت لی اور اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان سے اپنی قوم کو اسلامی دعوت پیش کرنے پر بھی بیعت لی۔

⑧ اسلام میں سبقت حاصل کرنے والوں سے محبت اور حفظ مراتب کا سبق ملتا ہے، چنانچہ

اسلامی لشکر کے کمانڈر نے کہا تھا: ''اس لوٹے کو واپس کر دو یہ تو ضماد ازدی رضی اللہ عنہ کی قوم کے لوگ ہیں۔''[1]

⑨ مذکورہ قصے میں بعض ایسے تربیتی ذرائع کا تذکرہ بھی ہے جن کا رسول اللہ ﷺ نے استعمال فرمایا، مثلاً: گفتگو میں متانت، افہام و تفہیم کا اسلوب اور بلاواسطہ رہنمائی کا قرینہ۔

نبی ﷺ کی شخصیت کی چند عظیم صفات بھی ظاہر ہوئیں جن میں تربیت کا جذبہ، بردباری، صبر اور خیر کثیر کی طرف مائل ہونا سرفہرست ہیں۔

عَمرو بن عَبَسَہ رضی اللہ عنہ اسلام کی چھاؤں میں: عمرو بن عبسہ السُّلَمی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جاہلی دور میں میرا گمان تھا کہ لوگ گمراہی پر ہیں اور ان کے سامنے کوئی واضح ضابطۂ حیات نہیں۔ یہ لوگ بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ میں نے اس دوران میں ایک شخصیت کے بارے میں سنا جو لوگوں کو مختلف خبریں دیتا تھا۔ میں اپنی سواری پر سوار ہوا اور مکہ پہنچا تو دیکھتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کے خلاف ان کی قوم بڑی دلیر ہوئی ہے اور آپ ﷺ مخفی انداز اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔ میں مکہ میں بڑی لطافت اور ادب سے آپ ﷺ کی خدمت میں پہنچا اور سوال کیا: ''آپ کیا ہیں؟''

رسول اللہ ﷺ: «أَنَا نَبِيٌّ» ''میں نبی ہوں۔''

عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ: ''کیسا نبی؟''

رسول اللہ ﷺ: «أَرْسَلَنِي اللّٰهُ» ''مجھے اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے۔''

عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ: ''کس چیز کے ساتھ بھیجا ہے؟''

رسول اللہ ﷺ: «أَرْسَلَنِي بِصِلَةِ الْأَرْحَامِ وَكَسْرِ الْأَوْثَانِ وَأَنْ يُّوَحَّدَ اللّٰهُ لَا يُشْرَكُ بِهِ شَيْءٌ» ''مجھے اللہ تعالیٰ نے صلہ رحمی کرنے، بتوں کو ختم کرنے اور اللہ کی توحید کا ڈنکا بجانے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنانے کا پیغام دے کر بھیجا ہے۔''

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي: 133,132/1، و الوحي و تبليغ الرسالة للدكتور يحيٰى اليحيٰى، ص: 111-113.

عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ: ''اس عقیدے پر آپ کے ساتھ کون لوگ کاربند ہیں؟''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم: «حُرٌّ وَّ عَبْدٌ» ''ایک آزاد اور ایک غلام۔'' اور ان دنوں آپ پر ایمان لانے والے ابوبکر اور بلال رضی اللہ عنہما تھے۔

عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ: ''میں بھی آپ کی اتباع کرنا چاہتا ہوں۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: «إِنَّكَ لَا تَسْتَطِيعُ ذٰلِكَ يَوْمَكَ هٰذَا أَلَا تَرٰى حَالِي وَحَالَ النَّاسِ؟ وَلٰكِنِ ارْجِعْ إِلٰى أَهْلِكَ، فَإِذَا سَمِعْتَ بِي قَدْ ظَهَرْتُ فَأْتِنِي»

''تم اس وقت اس کی استطاعت نہیں رکھتے۔ کیا تم میرا اور لوگوں کا حال نہیں دیکھ رہے؟ اس لیے تم واپس چلے جاؤ، جب میرے بارے میں سنو کہ مجھے اللہ نے غلبہ عطا فرما دیا ہے تو میرے پاس آنا۔''

عَمر و بن عَبَسہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس وقت میں لوٹ آیا، پھر اللہ کے رسول مدینہ طیبہ تشریف لے آئے۔ دریں اثنا میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ مقیم رہا اور لوگوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھتا رہتا تھا یہاں تک کہ میرے پاس یثرب سے کچھ لوگ آئے۔ میں نے ان سے پوچھا: ''اس شخص کے بارے میں تم کیا جانتے ہو جو مدینہ میں آئے ہیں؟'' انھوں نے کہا: ''لوگ اس کی طرف دیوانہ وار لپک رہے ہیں۔ اس کی قوم نے اسے قتل کرنا چاہا لیکن کامیاب نہ ہوسکے۔'' عمرو رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''میں مدینہ پہنچا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا آپ نے مجھے پہچانا ہے؟'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «نَعَمْ! أَنْتَ الَّذِي لَقِيتَنِي بِمَكَّةَ» ''ہاں، تو وہی شخص ہے جو مجھ سے مکہ میں ملا تھا۔''

اسی حدیث میں ہے کہ عمرو رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز اور وضو کے بارے میں سوالات کیے۔[1]

1 صحیح مسلم، حدیث: 832، و مسند أحمد: 112/4.

قصۂ عمرو بن عبسہ سے حاصل ہونے والے نتائج: ① عَمرو بن عَبَسہ رضی اللہ عنہ دین حنیف کے پیروکار تھے اور زمانۂ جاہلیت میں بھی غیر اللہ کی عبادت کے منکر تھے۔

② مشرکین مکہ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف برپا کی جانے والی میڈیا وار کے نتیجے میں عمرو بن عَبَسہ رضی اللہ عنہ آپ کے بارے میں تفصیل حاصل کرنا چاہتے تھے۔

③ قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں بہت دلیر تھے اور بڑی سختی کرتے تھے۔ عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ نے مکہ میں دیکھا کہ آپ چھپ کر دین کی تبلیغ کرتے تھے اور آپ کی قوم آپ کے خلاف دیدہ دلیری کا مظاہرہ کررہی تھی۔

④ قدرومنزلت والوں کے پاس حاضری میں انتہائی ادب ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔ عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں بڑے ادب سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔

⑤ رسالت محمدیہ کی اساس دو چیزوں پر ہے: حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: اللہ تعالیٰ نے مجھے صلہ رحمی کرنے اور بتوں کو پاش پاش کرنے لیے مبعوث فرمایا ہے۔ آپ کا یہ فرمان صلہ رحمی کی اہمیت پر دلالت کرتا ہے کیونکہ صلہ رحمی جیسا عظیم وصف دعوت اسلامی کا ابتدا ہی سے حصہ رہا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان میں بتوں کی شدید مذمت پائی جاتی ہے، حالانکہ عرب کے ہاں یہ انتہائی مقدس سمجھے جاتے تھے۔ معلوم ہوا کہ جاہلیت کے نشانات کو ختم کرنا ضروری ہے اور اسلامی دعوت اس وقت تک قائم ہوسکتی ہے نہ پھیل سکتی ہے جب تک کفروشرک کی علامتیں مٹا نہ دی جائیں۔

⑥ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جلد از جلد بتوں کو ختم کرنے کا عندیہ ظاہر کیا، حالانکہ آپ اس وقت بتوں کو ختم کرنے کی قدرت بھی نہ رکھتے تھے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ کسی دینی امر کو لوگوں تک پہنچانے میں دیر نہیں ہوسکتی چاہے وقتی طور پر اس کے نفاذ میں رکاوٹ ہی کیوں نہ ہو۔ وہ داعی جو لوگوں کو صرف ان دینی امور سے آگاہ کرتے ہیں جن کا نفاذ ہوسکتا ہو اور ایسے امور سے آگاہ نہیں کرتے جس کے نفاذ میں جہاد اور ٹکراؤ کی ضرورت ہو ان کی دعوت ناقص ہے۔ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ سے ہٹے ہوئے ہیں کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو جاہلیت اور

اس کے بڑے بڑے سرکشوں کا مقابلہ کیا، حالانکہ اس وقت آپ کے مددگار بھی کم تھے اور مکہ شہر کی مکمل سرداری دشمن کے ہاتھ میں تھی۔[1]

⑦ نبی ﷺ اپنے صحابہ کی خیر خواہی کے حریص تھے، ان کے لیے پرامن فضا پیدا کرنا، امن والی سرزمین کی طرف انھیں لے جانا اور انھیں مشکلات سے دور رکھنا آپ کا مقصود تھا، چنانچہ نبی ﷺ نے عَمرو بن عَبَسہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ جب تو میرے غلبے کا سنے تب مجھے ملنا۔

⑧ نبی ﷺ اپنے اصحاب کی خبر گیری رکھتے تھے اور انھیں پیش آنے والے واقعات یاد رکھتے تھے۔ آپ ﷺ نے عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تو وہی آدمی ہے جو مجھ سے مکہ میں ملا تھا۔

⑨ نبی ﷺ ہر کسی کو اپنے پیروکاروں کی فہرست نہ دیتے تھے کیونکہ اس میں سائل کے لیے کوئی مصلحت بھی نہ تھی اور نہ یہ فہرست ہر ایک تک پہنچانا آپ کی ذمہ داری تھی، اس لیے جب عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ نے آپ کے پیروکاروں کے بارے میں سوال کیا تو آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا: ''ایک آزاد اور ایک غلام۔''

ابن کثیر رحمہ اللہ کے قول کے مطابق یہ تَوْرِیَہ (اشارتاً ذومعنی بات کہنا) تھا کیونکہ یہ الفاظ اسم جنس ہیں جنھیں عمرو بن عَبَسَہ نے اسم عین، یعنی متعین اشخاص سمجھ لیا۔[2]

⑩ نبی ﷺ کا یہ فرمان کہ تم واپس چلے جاؤ۔ جب سنو کہ مجھے غلبہ حاصل ہوا ہے تو میرے پاس آنا، سے ہم دعوت کے میدان میں ایک اہم سبق حاصل کر سکتے ہیں کہ مشقت اور ایذا رسانی کی فضا میں اسلام کے پیروکاروں اور ارکان جماعت کو جمع کر لینا دراصل مقصود نہیں، چنانچہ نبی ﷺ نے عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ کو اپنی قوم کی طرف واپس جانے کا حکم دیا، نیز آپ ﷺ نے صحابۂ کرام کو حبشہ کی طرف دو دفعہ ہجرت کرنے کی اجازت دی جس سے پتہ چلتا ہے کہ دعوت اسلامی کے دوران مسلمانوں کی مشکلات میں کمی، ان کا خطرے کی جگہوں سے دور رہنا، اسلامی قوت کو صیغۂ راز میں رکھنا، تحریک کے قائد کو بلاوجہ مشغول رکھنے سے اجتناب، راز داری

1 التاريخ الإسلامي للحميدي: 109/1. 2 الوحي و تبليغ الرسالة للدكتور يحيى اليحيى، ص: 106-109.

کا اہتمام، جس جگہ ہجرت کا حکم ہو اس سے استفادہ اور مستقبل کے لیے تیاری، دعوت اسلامی کے تسلسل کا لحاظ رکھنا اور پیروکاروں کا مجموعی استیصال سے بچاؤ جیسے امور کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔

طفیل بن عمرو دوسی رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام: اس میڈیا وار کی وجہ سے مسلمان ہونے والوں میں طُفَیل بن عمرو دَوْسی رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں جن کا مفصل قصہ کتب سیرت میں منقول ہے۔[1]

[1] حضرت طفیل بن عمرو رضی اللہ عنہ اپنے قبول اسلام کا واقعہ خود بیان کرتے ہیں۔ کہتے ہیں: ایک دفعہ میں مکہ مکرمہ آیا جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی مکہ ہی میں تھے۔ قریش کے چند لوگ میرے پاس آئے...... یاد رہے کہ حضرت طفیل رضی اللہ عنہ زبردست شاعر اور اپنی قوم کے نمائندہ تھے...... اور کہنے لگے: ''آپ ہمارے شہر میں آئے ہیں (اور آپ کی خیر خواہی ہمارا فرض ہے۔) یہ شخص (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے دین کو چھوڑ کر ہم سے علیحدہ ہو گیا ہے اور ہماری جماعت کے اتحاد کو پارہ پارہ کر رہا ہے۔ اس کی باتوں میں جادو ہے۔ یہ باپ بیٹے، بھائیوں اور میاں بیوی کے درمیان جدائی ڈالتا ہے۔ ہمیں آپ کے اور آپ کی قوم کے بارے میں خدشہ ہے۔ لہٰذا آپ اس شخص سے نہ تو ملاقات کریں اور نہ اس کی کوئی بات سنیں۔'' طفیل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''اللہ کی قسم! وہ لوگ مجھے اتنا ڈراتے رہے کہ میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ ان سے نہیں ملوں گا۔'' کہتے ہیں صبح جب میں مسجد حرام پہنچا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ کے قریب کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ میں آپ کے قریب کھڑا ہو گیا، اللہ تعالیٰ کی مشیت بھی یہی تھی کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام سنوں۔ میں نے سنا تو وہ ایک عمدہ کلام تھا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں ایک اچھا بھلا شاعر ہوں، مجھے اچھے اور گھٹیا کلام کا فرق معلوم ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ میں آپ کا کلام نہ سنوں۔ اگر اچھا ہوا تو لے لیں گے ورنہ چھوڑ دیں گے۔ کہتے ہیں: میں کچھ دیر کے لیے وہیں ٹھہرا رہا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر تشریف لے گئے تو میں بھی آپ کے پیچھے ہو لیا۔ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی: ''اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! آپ کی قوم نے تو مجھے بہت کچھ کہا لیکن اللہ کی مرضی تھی کہ میں آپ کا کلام سنوں، چنانچہ میں نے آپ کا عمدہ کلام سن لیا ہے۔ آپ مجھے بھی اپنی دعوت دیں۔'' طفیل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی اور قرآن پاک کی آیات پڑھ کر سنائیں۔ اللہ کی قسم! میں نے زندگی میں کبھی اس سے اچھا کلام نہیں سنا تھا اور نہ ہی اس دین سے کوئی اچھا دین میں نے دیکھا تھا۔ (أسد الغابة: 40/2)

دکتور اکرم ضیاء عمری فرماتے ہیں: ''ان کے بارے میں صرف اتنا منقول ہے کہ انھوں نے نبی ﷺ کو حفاظت کی غرض سے اپنے قبیلے دوس کا قلعہ پیش کیا تھا اور رسول اللہ ﷺ نے اس پیشکش کو مسترد کر دیا تھا۔[1]

صحیح روایات سے ثابت ہے کہ طفیل رضی اللہ عنہ نے اپنی قوم کو اسلامی دعوت پیش کی تھی جس پر انھیں قوم کی طرف سے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، یہاں تک کہ انھوں نے نبی ﷺ سے اپنی قوم کے خلاف بد دعا کرنے کی استدعا کی لیکن آپ ﷺ نے ان کے لیے ہدایت کی دعا فرمائی۔[2]

نبی ﷺ ان دنوں مدینہ منورہ میں تھے۔[3]

عمران رضی اللہ عنہ کے والد حصین رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام: قریش حصین رضی اللہ عنہ کی بڑی عزت کرتے تھے، وہ ان کے پاس آئے اور کہنے لگے: ''ہماری طرف سے اس آدمی سے گفتگو کیجیے، یہ ہمارے معبودوں کا اچھا ذکر نہیں کرتا اور انھیں برا بھلا کہتا ہے۔'' چنانچہ وہ حصین رضی اللہ عنہ کی معیت میں نبی ﷺ کے دروازے پر آئے۔

نبی ﷺ نے فرمایا: «أَوْسِعُوا لِلشَّيْخِ» ''اس بزرگ کے لیے جگہ بناؤ۔'' اس وقت حصین کے بیٹے عمران اور دیگر مسلمان وہاں موجود تھے۔

حصین نے کہا: ''اس خبر کی کیا حقیقت ہے جو ہمارے پاس پہنچی ہے کہ تو ہمارے بتوں کی برائی بیان کرتا ہے اور انھیں گالی دیتا ہے، حالانکہ تیرا باپ تو اپنے آباء و اجداد کے دین پر قائم تھا اور عقل مند آدمی تھا؟''

نبی ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ أَبِي وَأَبَاكَ فِي النَّارِ» ''اے حصین! میرا اور تیرا باپ دونوں آگ میں جائیں گے۔''

---

1 صحيح مسلم، حديث: 116. 2 صحيح البخاري، حديث: 2937، و صحيح مسلم، حديث: 2524. 3 السيرة النبوية لابن كثير: 76/2، و السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 146/1.

پھر آپ ﷺ نے سوال کیا: «كَمْ تَعْبُدُ مِنْ إِلٰهٍ؟»
''اے حصین! تو کتنے معبودوں کی عبادت کرتا ہے؟'' حصین رضی اللہ عنہ نے کہا: ''سات زمین میں اور ایک آسمان میں ہے۔''

نبی ﷺ نے پوچھا: «فَإِذَا أَصَابَكَ الضُّرُّ مَنْ تَدْعُو؟» ''جب تجھے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو کسے پکارتا ہے؟''

حصین رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اس خدا کو جو آسمان میں ہے۔''

نبی ﷺ نے پوچھا: «فَإِذَا هَلَكَ الْمَالُ مَنْ تَدْعُو؟» ''جب تیرے مال مویشی ہلاک ہو جائیں تب کس کو پکارتا ہے؟''

حصین رضی اللہ عنہ نے کہا: ''جو آسمان میں ہے۔''

نبی ﷺ نے فرمایا: «فَيَسْتَجِيبُ لَكَ وَحْدَهُ وَتُشْرِكُهُمْ مَعَهُ أَرَضِيتَهُ فِي الشُّكْرِ أَمْ تَخَافُ أَنْ يَغْلِبَ عَلَيْكَ» ''دیکھ تیری دعا کو وہ اکیلا قبول فرماتا ہے اور تو اس کے ساتھ غیروں کو شریک کرتا ہے۔ کیا تو دل سے اس کے شکر پر راضی ہے یا ڈرتا ہے کہ وہ تجھ پر غالب آجائے گا؟''

حصین نے کہا: ان دونوں میں سے کوئی بات بھی نہیں؟''

حصین رضی اللہ عنہ مزید کہنے لگے: ''مجھے اس وقت یقین ہو گیا کہ میں نے زندگی میں آپ جیسے شخص سے گفتگو نہیں کی۔''

نبی ﷺ نے فرمایا: «يَا حُصَيْنُ! أَسْلِمْ تَسْلَمْ» ''اے حصین! مسلمان ہو جا، سلامتی پائے گا۔'' حصین رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میری قوم اور خاندان ہے۔ میں انھیں کیا جواب دوں گا؟''

نبی ﷺ نے فرمایا:

«قُلْ: اَللّٰهُمَّ أَسْتَهْدِيكَ لِأَرْشَدَ أَمْرِي وَ زِدْنِي عِلْمًا يَنْفَعُنِي»

''اے اللہ! میں تجھ سے ہدایت کا طلب گار ہوں تاکہ مجھے میرے معاملے میں

راہنمائی حاصل ہو اور مجھے ایسا علم عطا فرما جو میرے لیے نفع مند ہو۔"

حصین رضی اللہ عنہ نے یہ کلمات ادا کر لیے تو ابھی وہ اپنی جگہ سے اٹھے بھی نہ تھے کہ مسلمان ہو گئے۔ اس وقت ان کے بیٹے عمران رضی اللہ عنہ فوراً اپنی جگہ سے اٹھے اور اپنے باپ حصین رضی اللہ عنہ کے سر، ہاتھ اور پاؤں کو بوسہ دیا۔ جب یہ منظر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو رو پڑے اور فرمایا:

«بَكَيْتُ مِنْ صَنِيعِ عِمْرَانَ، دَخَلَ حُصَيْنٌ وَّهُوَ كَافِرٌ، فَلَمْ يَقُمْ إِلَيْهِ عِمْرَانُ وَلَمْ يَلْتَفِتْ نَاحِيَتَهُ، فَلَمَّا أَسْلَمَ قَضٰى حَقَّهُ، فَدَخَلَنِي مِنْ ذٰلِكَ الرِّقَّةُ»

"میں عمران کے اس فعل پر آبدیدہ ہوا ہوں کہ اس کے باپ حصین جب یہاں آئے تو کافر تھے، عمران نے اس وقت اپنے باپ کا خیر مقدم نہیں کیا اور نہ اس کی طرف متوجہ ہوئے لیکن جب حصین مسلمان ہو گئے تو بیٹے نے اپنا حق ادا کیا، اس وجہ سے میرے دل میں رقت سی پیدا ہو گئی۔"

پھر جب حصین رضی اللہ عنہ جانے لگے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا: «قُومُوا فَشَيِّعُوهُ إِلٰى مَنْزِلِهِ» "اٹھو اور حصین رضی اللہ عنہ کو اس کے گھر تک چھوڑ کر آؤ۔" حصین رضی اللہ عنہ ابھی دروازے سے باہر نکلے ہی تھے کہ قریش نے دیکھتے ہی کہا: "یہ بے دین ہو گیا ہے اور سب اس سے دور چلے گئے۔" [1]

حصین رضی اللہ عنہ کو جس چیز نے اتنی جلدی اسلام لانے پر مجبور کیا وہ ان میں فطرتِ سلیمہ کی خوبی، قبول حق کی اچھی استعداد، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مضبوط دلائل اور آپ کی عمدہ گفتگو تھی۔ [2]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حصین رضی اللہ عنہ سے باہمی مکالمے کا انداز اپنایا تاکہ توحید ان کے دل کی

1 الإصابة لابن حجر: 337/1، امام ترمذی رحمہ اللہ نے بھی اسے مختصر بیان کیا ہے، دیکھیے: جامع الترمذي، حديث: 3483، علامہ البانی رحمہ اللہ نے ترمذی کی حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ 2 فقه الدعوة الفردية للدكتور السيد محمد نوح، ص: 104.

گہرائیوں تک اتر جائے اور ہر قسم کے باطل نظریات ختم ہو جائیں۔

ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ اسلام کے سایۂ عاطفت میں: ابوذر رضی اللہ عنہ جاہلیت کی فضا کو ناپسند کرتے اور بتوں کی عبادت کے منکر تھے اور اللہ کے ساتھ شرک کرنے والے ہر فرد کو برا خیال کرتے۔ اسلام لانے سے پہلے تین سال تک کسی قبلے کی تعیین کے بغیر نماز ادا کرتے رہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دین حنیف کے پابند تھے۔ جب انھوں نے مکہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر خیر سنا تو کسی سے تحقیق کرنے کے بجائے خود عازم مکہ ہوئے۔ وہ رات کو مکہ پہنچے اور لیٹ گئے۔ انھیں علی رضی اللہ عنہ نے دیکھا اور محسوس کیا کہ یہ کوئی اجنبی ہے۔ علی رضی اللہ عنہ نے ان کی مہمانی کی اور ان سے کسی قسم کا سوال نہ کیا، پھر انھیں صبح کے وقت مسجد حرام میں چھوڑ کر چلے گئے۔ ابوذر وہاں شام تک رہے۔ شام کے وقت علی رضی اللہ عنہ نے انھیں دوبارہ دیکھا اور ان کی مہمان نوازی کی، پھر تیسری رات بھی ایسا ہی ہوا۔ تیسری رات علی رضی اللہ عنہ نے ان سے آمد کا سبب دریافت کیا۔ جب سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ نے علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں اعتماد حاصل کر لیا تو بتایا کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے برحق رسول ہیں۔ آپ صبح کے وقت میرے پیچھے پیچھے چلتے آنا اور اگر مجھے آپ کے بارے میں کوئی خطرہ محسوس ہوا تو میں ٹھہر کر ایسا انداز اختیار کروں گا جیسے پانی انڈیل رہا ہوں اور اگر میں چل دوں تو میرے پیچھے چلتے رہنا۔“

ابوذر رضی اللہ عنہ علی رضی اللہ عنہ کے پیچھے چلتے ہوئے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ گئے۔ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو سنی اور دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اِرْجِعْ إِلٰى قَوْمِكَ فَأَخْبِرْهُمْ حَتّٰى يَأْتِيَكَ أَمْرِي»

”آپ اپنی قوم کی طرف واپس چلے جائیں۔ انھیں اپنے اسلام لانے کی خبر دیں اور میری طرف سے مزید حکم آنے کا انتظار کریں۔“

ابو ذر رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ”مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میں تو اپنے قبولِ اسلام کا مکہ والوں کے درمیان بیانگ دہل اعلان کروں گا۔“ ابو ذر رضی اللہ عنہ وہاں سے نکل کر مسجد حرام میں پہنچے اور بلند آواز سے بولے: ”میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔“ تمام لوگ یہ سن کر ان پر حملہ آور ہوئے یہاں تک کہ انھیں زمین پر گرا لیا۔ دریں اثنا عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ آئے اور لوگوں کو قبیلۂ غفار کے انتقام سے ڈرایا اور بتایا کہ شام کی طرف جانے والی تجارتی گزرگاہ، جو بنوغفار کے قریب سے گزرتی ہے، خطرے میں ہوگی، چنانچہ اس طرح عباس رضی اللہ عنہ نے ابو ذر رضی اللہ عنہ کو قریش کے پنجہ استبداد سے چھڑایا۔[1]

ابو ذر رضی اللہ عنہ نے خود مکہ آنے سے قبل اپنے بھائی کو مکہ روانہ کیا تھا تاکہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں آگاہی حاصل کرے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سنے اور واپس آئے۔ ان کا بھائی مکہ گیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو سنی اور واپس آکر ابو ذر رضی اللہ عنہ کو خبر دی کہ وہ اچھے اخلاق کا حکم دیتے ہیں اور ایسا کلام لائے ہیں جو شعر نہیں ہوسکتا۔ ابو ذر رضی اللہ عنہ نے کہا: ”تیری بات سے میری تسلی نہیں ہوئی۔“[2] اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے لیے مکہ روانہ ہوئے۔ اس وقت ان کے بھائی نے کہا: ”آپ مکہ والوں سے محتاط رہیے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سخت بغض رکھتے ہیں اور ان سے سختی سے پیش آتے ہیں۔“

قصۂ ابو ذر رضی اللہ عنہ سے حاصل ہونے والے نتائج اور فوائد: ① نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر خیر تمام قبائل میں عام ہوچکا تھا اور اس سلسلے میں سب سے زیادہ مشرکین مکہ نے کردار ادا کیا کیونکہ وہ لوگوں کو آپ سے بچنے اور آپ کی دعوت میں شک و شبہ ڈالنے کی غرض سے لوگوں تک آپ کی خبریں پہنچاتے۔ اس طرح یہ خبر قبیلہ غفار تک پہنچی۔

---

1 صحيح البخاري، حديث:3861، و صحيح مسلم، حديث:2474. 2 صحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص:83، و السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري:145/1.

② ابو ذر رضی اللہ عنہ مستقل مزاج تھے۔ ان پر قریش کی طرف سے پھیلائی جانے والی خبروں اور پروپیگنڈے کا کوئی اثر نہ ہوا، اس لیے انھوں نے اپنے بھائی کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ٹھوس معلومات حاصل کرنے کے لیے روانہ کیا۔ اور دوسرے ذرائع سے آنے والی خبروں سے متاثر نہ ہوئے۔

③ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ابو ذر رضی اللہ عنہ نے انتہائی حزم و احتیاط سے کام لیا، اس لیے انھوں نے اپنے بھائی اُنَیس سے ملنے والی عام معلومات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ خود مکہ جا کر مکمل تحقیق کرنے کا ارادہ کیا کیونکہ معاملہ صرف اتنا نہ تھا کہ وہ آدمی نیکی کا حکم دیتا ہے یا نہیں بلکہ معاملہ یہ تھا کہ وہ شخص اپنے آپ کو نبی کہتا تھا۔

ابوذر رضی اللہ عنہ نے بہت سے مصائب، مشکلات، تنگیاں اور راہ حق میں اپنے اہل و عیال اور وطن سے جدائی برداشت کی اور صرف ایک تھیلے میں اپنا زادِ راہ لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا حال جاننے کے لیے مکہ کو عازم سفر ہوئے۔[1]

④ مطلوبہ معلومات حاصل کرنے میں غور و فکر اور تحمل سے کام لینا چاہیے۔ ابو ذر رضی اللہ عنہ نے غور و فکر کے بعد اندازہ لگایا کہ قریش ہر اس آدمی سے نفرت کرتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے لیے آتا ہے، لہٰذا انھیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ اگر ابو ذر رضی اللہ عنہ کسی سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں سوال کر لیتے تو قریش کو ان کے مقصد کا علم ہو جاتا اور ممکن تھا انھیں نقصان پہنچتا اور مکہ سے بھی نکال دیا جاتا، پھر وہ اپنا مقصد حاصل نہ کر سکتے جس کے لیے انھوں نے اپنی قوم کو چھوڑا اور بہت سے مصائب اور سفر کی صعوبتیں برداشت کیں۔

⑤ معلومات دینے سے پہلے مکمل احتیاط و اعتماد لازم ہے۔ جب علی رضی اللہ عنہ نے ابو ذر رضی اللہ عنہ سے ان کی آمد کے متعلق سوال کیا تو باوجودیکہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ان کی تین راتیں مہمان نوازی کی تھی ابو ذر رضی اللہ عنہ نے احتیاطاً کچھ بتانے سے گریز کیا اور جب بات صیغۂ راز میں رہنے کا

1 الوحي و تبليغ الرسالة للدكتور يحيٰى اليحيٰى:91-93.

اعتماد حاصل ہو گیا تو علی رضی اللہ عنہ کو اپنے مقصد کے متعلق بتایا اور ساتھ ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک رہنمائی کی شرط ٹھہرائی۔ ابو ذر رضی اللہ عنہ کا یہ انداز انتہائی احتیاط پسندی اور اپنے مقصد کو پورا کرنے کا ثبوت ہے۔

⑥ ابو ذر رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچنے کے لیے پر امن اور خفیہ طریقہ استعمال کیا۔ علی رضی اللہ عنہ اور ابو ذر رضی اللہ عنہ کے مابین مخصوص اشارے یا معینہ حرکت مثلاً: جوتا درست کرنے یا پانی انڈیلنے پر اتفاق ہو گیا کہ چلتے ہوئے علی رضی اللہ عنہ کو تعاقب کا اندیشہ ہو گا تو وہ یہ کیفیت بنائیں گے یا اشارہ کریں گے۔ یوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دار ارقم میں پہنچنے کے لیے ایک پر امن اور خفیہ طریقے سے کام لیا گیا۔ اس دوران میں ابو ذر رضی اللہ عنہ، علی رضی اللہ عنہ کے پیچھے کچھ فاصلے پر چلے آرہے تھے۔ ان کا یہ طرزِ عمل حفظ ماتقدم کے طور پر تھا تاکہ اثنائے سفر میں اچانک پیش آنے والی صورتِ حال میں اپنا بچاؤ کیا جا سکے۔

⑦ ان اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی احتیاط پسندی کتنی اعلیٰ اور امن سکیورٹی کا شعور کتنا وافر اور دلوں میں سمایا ہوا تھا حتی کہ یہ ان کے ہر خاص و عام کی امتیازی علامت بن چکی تھی اور ان کے تمام اقدامات سوچے سمجھے اور منظّم ہوتے تھے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی اس خصوصیت پر عمل پیرا ہونے کی آج ہمیں بے حد ضرورت ہے، جبکہ اس دور میں قوموں کے عروج و زوال میں اس کی اہمیت ظاہر و باہر ہے۔[1]

آج کل سکیورٹی کے لیے جدید طریقے، مختلف ذرائع اور وسائل اور مستقل ساز و سامان کام میں لائے جاتے ہیں اور اس کے لیے خصوصی مراکز و انسٹیٹیوٹ کا قیام عمل میں آچکا ہے۔ اس کام کے لیے لمبے چوڑے بجٹ مختص کیے جاتے ہیں۔ سکیورٹی سے متعلقہ عمومی اور خصوصی نوعیت کی معلومات دیگر ممالک کے انٹیلی جنس اداروں کے ہاں بہت زیادہ قیمت پر فروخت ہوتی ہیں اور بسا اوقات بوقت ضرورت ایسی معلومات کے حصول کے

[1] السيرة النبوية للدكتور إبراهيم علي محمد أحمد، ص:59,58.

لیے جان تک کی بازی لگا دی جاتی ہے۔

اسوۂ نبوی اور سیرت صحابہ کی روشنی میں یہ سب کچھ جان لینے کے بعد مسلمانوں کو اپنا سکیورٹی کا نظام مضبوط تر بنانا چاہیے تاکہ دشمنوں کو ہمارے امور میں نقب لگانے کا موقع نہ ملے اور ہمارے راز ان تک نہ پہنچیں۔[1]

⑧ ابوذر رضی اللہ عنہ نے حق کی تلاش میں سچائی اور اپنی عقل وفہم کو ترجیح دی، چنانچہ وہ اس وقت اسلام لائے جب ان پر بلا واسطہ اسلام پیش کیا گیا۔

⑨ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے دفاع اور سلامتی کے لیے حریص اور فکر مند رہتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوذر رضی اللہ عنہ کو واپس اپنے گھر جانے کا مشورہ دیا اور اپنے اسلام کو صیغۂ راز میں رکھنے کا حکم دیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ دین اسلام کو غالب فرما دے۔

⑩ ابوذر رضی اللہ عنہ نے اعلائے کلمۂ حق کے لیے قوت وشجاعت کے اظہار سے بھی دریغ نہ کیا۔ انھوں نے قریش کی مجلسوں میں اپنے اسلام کا علانیہ اظہار کیا۔ اس طرح انھوں نے حق کا واشگاف اعلان بھی کیا اور مکہ والوں کو چیلنج بھی کیا۔[2]

گویا ابوذر رضی اللہ عنہ سمجھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان وجوب کے لیے نہیں بلکہ اسلام کو صیغۂ راز میں رکھنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ان پر مہربانی اور مصلحت کا تقاضا ہے، تاہم انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ انھیں اپنے اسلام کے اظہار میں قوت حاصل ہے، اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اس پر کوئی ملامت نہیں کی۔

مذکورہ قصے سے یہ مسئلہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اگر اظہار اسلام میں کسی کی طرف سے اذیت پہنچنے کا خدشہ ہو تو سکوت اختیار کیا جاسکتا ہے لیکن اس کا برملا اظہار کرنا بھی جائز ہے۔ اور راجح مسلک یہ ہے کہ ایمان کا اظہار یا اخفاء حالات اور مقاصد کے اعتبار سے ہوگا اور اسی حساب سے صاحب ایمان اجر یا سزا کا مستحق ٹھہرے گا۔[3]

---

1 دروس في الكتمان لمحمود شيت خطاب، ص: 9. 2 الوحي و تبليغ الرسالة للدكتور يحيىٰ اليحيىٰ، ص: 95. 3 فتح الباري، شرح الحديث: 3861.

⑪ ابوذر رضی اللہ عنہ کا کردار دعوت اسلامی کے لیے مفید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف قریش کی طرف سے جاری اعصابی جنگ میں کارگر ثابت ہوا۔ ابوذر رضی اللہ عنہ کی شجاعت و مردانگی اور تحمل مزاجی کی وجہ سے کفار مکہ پر ان کے اپنے مضبوط مرکز میں ایک کاری ضرب لگی۔ ابوذر رضی اللہ عنہ کے جسم سے خون بھی بہا لیکن وہ دوبارہ شہادت کی تمنا میں اسلام کا علانیہ اظہار کرنے لگے۔

⑫ عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کی طرف سے ابوذر رضی اللہ عنہ کی مدافعت اور انھیں قریش کے چنگل سے آزاد کرانا ان کی مسلمانوں کے بارے میں نرمی کا ثبوت ہے اور اس سلسلے میں ان کے طرزِ عمل سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کفار مکہ کی نفسیات سے بخوبی واقف تھے، چنانچہ انھیں ان خطرات سے آگاہ کیا جو ان کی تجارت کو بنو غِفار قبیلے کے قریب سے گزرتے ہوئے پیش آسکتے ہیں۔[1]

⑬ ابوذر رضی اللہ عنہ نے مکہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اختیار کردہ تمام دفاعی طریقے اختیار کیے۔ اگرچہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حد درجہ محبت اور ملاقات کا شوق رکھتے تھے لیکن اللہ کے رسول کے فرمان پر عمل کرتے ہوئے انھوں نے مکہ چھوڑا، اپنی قوم کے پاس پہنچے اور اپنے گھر والوں کی اصلاح اور ہدایت کے لیے سرگرم عمل ہوگئے۔ انھیں اسلام کی دعوت دی۔ سب سے پہلے اپنے بھائی، پھر ماں اور پھر اپنی ساری قوم کو اسلام کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی۔

⑭ ابوذر رضی اللہ عنہ اپنی قوم کی اسلام کی طرف راہ نمائی کرنے اور انھیں اسلامی تعلیمات سے آگاہ کرنے کی اثر آفریں صلاحیت رکھتے تھے۔ اس کے باوجود وہ امارت کے مستحق نہ ٹھہرے۔ صحیح مسلم میں ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ ابوذر رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: ”کیا آپ مجھے کوئی ذمہ داری نہیں سونپیں گے؟“ ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھا اور فرمایا: «يَا أَبَا ذَرٍّ! إِنَّكَ ضَعِيفٌ، وَّ إِنَّهَا أَمَانَةٌ، وَّ إِنَّهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ خِزْيٌ وَّنَدَامَةٌ، إِلَّا مَنْ أَخَذَهَا

1 الوحي و تبليغ الرسالة للدكتور يحيى اليحيى، ص:95,94.

بِحَقِّهَا وَ أَدَّى الَّذِي عَلَيْهِ فِيهَا» ''اے ابوذر! تو کمزور آدمی ہے اور منصب ایک امانت ہے جو قیامت کے دن رسوائی اور پشیمانی کا باعث ہوگا، سوائے اس آدمی کے جس نے اسے برحق حاصل کیا اور اس منصب کے متعلقہ تمام حقوق ادا کیے۔'' [1]

ہر انسان کا اپنا ایک دائرہ کار ہے جس کے لیے اللہ نے اسے صلاحیتوں سے نوازا ہے اور ایک خاص میدان ہے جس کا وہ شہسوار ہے۔ ابوذر رضی اللہ عنہ کی دعوت کے میدان میں کامیابی اور لوگوں کو مطمئن کر لینے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ہر منصب کے اہل ہو گئے تھے۔

⑮ ابوذر رضی اللہ عنہ نے منصب امامت قبیلۂ غِفار کے سردار ایماء بن رحضہ کے سپرد کر دیا باوجودیکہ وہ اسلام اور مرتبے کے لحاظ سے سب پر فائق تھے۔ یہ انتظامی امور میں ان کی مہارت کی دلیل ہے کہ انھوں نے تمام مناصب اپنے ہاتھ میں نہیں رکھے بلکہ ہر فرد کو اس کا مرتبہ عطا کیا۔ [2]

⑯ ابوذر رضی اللہ عنہ دعوت کے میدان میں نمایاں کامیابی سے ہمکنار ہوئے، چنانچہ قبیلہ غفار کی نصف آبادی اس وقت اور نصف ہجرت کے بعد دائرہ اسلام میں داخل ہوگئی۔ [3]

قریش کی طرف سے اسلام کے خلاف میڈیا وار ناکامی سے دوچار ہوگئی۔ اس طرح نظریاتی محاذ پر کفار کی اسلامی دعوت پر سنگباری بھی ناکام رہی کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز ان کی آواز سے قوی، آپ کے وسائل تبلیغ ان کے وسائل سے زیادہ دور رس اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے عظیم الشان اصولی موقف پر قائم رہنا ان کی توقعات سے کہیں زیادہ مضبوط ثابت ہوا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر یا مسجد حرام کے کسی کونے میں نہیں بیٹھے کہ اپنی دعوت کو لیے وہاں چھپے رہیں اور دشمن کے زہریلے تیروں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جان پر کھیل کر علم دعوت سربلند کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عرب قبائل کے مکہ پہنچنے سے قبل ہی ان کے خیموں تک پہنچتے، مسجد حرام میں بلند آواز سے تلاوت فرماتے تاکہ جن لوگوں کے دلوں

1 صحيح مسلم، حديث: 1825. 2 الوحي و تبليغ الرسالة للدكتور يحيى اليحيى، ص: 100.
3 السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 45/1.

میں زندگی کے ولولے اور آزادی کے جذبے موجزن ہوں وہ اس آواز کو سنیں اور ہدایت کی روشن کرنیں اپنے دل و دماغ کی گہرائیوں میں اتار لیں۔[1]

پیغام حق سے متاثر ہونے والوں میں ضماد ازدی، عمرو بن عبسہ، ابوذر غفاری، طفیل بن عمرو دوسی اور حصین رضی اللہ عنہم سرفہرست ہیں۔ ان کا قبول اسلام قریش کی طرف سے دین حق کے خلاف کی جانے والی گھناؤنی سازشوں اور نظریاتی حملوں کی ناکامی کا بین ثبوت ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ان کے قبول اسلام کے نتائج و نصائح سے استفادہ کریں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچنے والی تکالیف

جب سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کا برملا اظہار کیا تھا، اس وقت سے مشرکین مکہ آپ کو مسلسل تکلیفیں دے رہے تھے یہاں تک کہ آپ کو مکہ سے جلا وطن ہونا پڑا اور پھر اللہ نے آپ کو مشرکین پر غلبہ عطا فرمایا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر مظالم کے پہاڑ ٹوٹنے کا اندازہ ان آیات سے لگایا جاسکتا ہے جو اس دور ابتلا میں نازل ہوئیں جن میں آپ کو صبر کرنے اور اس کے اسباب اختیار کرنے کی تلقین کی گئی، غمزدہ ہونے سے روکا گیا اور سابق انبیاء کے قصص و امثال بیان کی گئیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا ۝﴾

''اور جو کچھ وہ کہتے ہیں اس پر صبر کیجیے اور انھیں اچھے طریقے سے چھوڑ دیجیے۔''[2]

اللہ تعالیٰ نے غم نہ کرنے کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُن فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ ۝﴾

''اور (اے نبی!) آپ ان پر غم نہ کریں اور نہ ہی جو وہ مکروفریب کر رہے ہیں (اس پر) تنگ دل ہوں۔''[3]

---
[1] التاريخ الإسلامي للحميدي:144/1. [2] المزمل 10:73. [3] النمل 70:27.

اللہ تعالیٰ نے دوسرے پیغمبروں کی مثال بیان کرتے ہوئے یوں تسلی دی:

﴿مَا يُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِيْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ ط اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ وَّذُوْ عِقَابٍ اَلِيْمٍ ۝﴾

''آپ سے بھی وہی کچھ کہا جارہا ہے جو آپ سے پہلے رسولوں سے کہا گیا، بے شک آپ کا رب معاف کردینے والا بھی ہے اور دردناک عذاب دینے والا بھی۔''[1]

نبی ﷺ کو پہنچنے والی تکالیف کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

① **ابوجہل کی ایک ناکام کوشش:** ایک دن ابوجہل نے کہا: ''کیا محمد سب کے سامنے اپنے خدا کو سجدہ کرتا ہے؟'' کسی نے کہا: ''ہاں!'' اس پر ابوجہل بولا: ''مجھے لات وعزیٰ کی قسم! اگر آئندہ میں نے اسے ایسا کرتے ہوئے دیکھا تو اس کی گردن روند ڈالوں گا یا اس کا چہرہ خاک آلود کردوں گا۔'' (نعوذ باللّٰه) پھر ایک دن نبی ﷺ نماز پڑھ رہے تھے کہ ابوجہل آپ کی گردن روندنے کے لیے آگے بڑھا، مگر اچانک وہ اپنی ایڑیوں کے بل پیچھے لوٹنے اور دونوں ہاتھوں سے اپنا بچاؤ کرنے لگا۔ اس سے پوچھا گیا کہ اس کا سبب کیا ہے تو اس نے کہا: ''میرے اور اس کے درمیان آگ کی خندق حائل ہوگئی تھی اور میرے سامنے بہت سے پر تھے اور ہولناکی تھی۔'' نبی ﷺ نے فرمایا: «لَوْ دَنَا مِنِّي لَاخْتَطَفَتْهُ الْمَلَائِكَةُ عُضْوًا عُضْوًا» ''اگر وہ میرے قریب آتا تو فرشتے اس کا ایک ایک عضو اچک لیتے۔''[2]

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ ایک دفعہ نماز ادا کررہے تھے کہ ابوجہل آیا اور کہنے لگا: ''کیا میں نے تجھے اس عمل سے منع نہیں کیا؟ کیا میں نے تجھے اس کام سے روکا نہیں تھا؟'' نبی ﷺ نماز سے سلام پھیرنے کے بعد اسے ڈانٹنے لگے، تو ابوجہل کہنے لگا: ''بے شک تو جانتا ہے کہ مکہ میں مجھ سے بڑی مجلس کسی کی نہیں۔'' تو اللہ تعالیٰ

1 حٰمٓ السجدة 43:41. 2 صحيح مسلم، حديث: 2797.

نے یہ آیات نازل فرمائیں:

﴿فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ ۝ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ۝﴾

''چنانچہ اسے چاہیے کہ وہ اپنی مجلس والوں کو بلا لے، یقیناً ہم بھی عذاب کے فرشتوں کو بلا لیں گے۔''[1]

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''اگر وہ اپنے مجلسی مددگاروں کو بلاتا تو اللہ کے زبانیہ فرشتے ان کا کام تمام کر دیتے۔''[2]

② **سجدے کی حالت میں آپ ﷺ پر گندگی کا بوجھ پھینکنا:** عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ نبی ﷺ کعبے کے پاس نماز ادا کر رہے تھے اور قریش کے لوگ اپنی مجالس میں براجمان تھے۔ ان میں سے ایک آدمی نے کہا: ''کیا تم اس ریاکار کی طرف نہیں دیکھتے؟'' (نعوذ باللہ) اتنے میں کسی نے کہا: ''کون ہے جو بنی فلاں کے اونٹوں کا گوبر، خون اور جیر (بچہ دانی کی جھلی) لائے اور جب محمد (ﷺ) سجدہ کریں تو ان کی پیٹھ پر ڈال دے۔'' اس پر قوم کا بدبخت ترین آدمی اٹھا، جب نبی ﷺ نے سجدہ کیا تو اس نے اونٹنی کی جیر آپ کی پیٹھ پر دونوں کندھوں کے درمیان ڈال دی، اس کے بعد وہ ہنسی کے مارے ایک دوسرے پر گرنے لگے۔ کسی نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو جا کر خبر دی وہ ان دنوں نوعمر تھیں۔ وہ دوڑتی ہوئی آئیں۔ رسول اللہ ﷺ سجدے کی حالت میں تھے۔ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے آپ کی پیٹھ سے جیر ہٹا کر پرے پھینکی اور سب کو برا بھلا کہنے لگیں۔ جب نبی ﷺ نے اپنی نماز مکمل فرمالی تو تین مرتبہ فرمایا: «اَللّٰهُمَّ! عَلَيْكَ بِقُرَيْشٍ» ''اے اللہ! تو قریش کو پکڑ لے۔'' پھر نبی ﷺ نے ہر ایک کا نام لے کر فرمایا کہ اے اللہ! تو عمرو بن ہشام، عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ولید بن عتبہ، امیہ بن خلف، عقبہ بن ابی مُعَیط اور عُمارہ بن ولید کو پکڑ لے۔''

1 العلق 96:17، 18. 2 جامع الترمذي، حديث: 3349.

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میں نے دیکھا جن لوگوں کے نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گن گن کر لیے تھے وہ سب بدر کے دن قتل ہوئے پڑے تھے، پھر انھیں بدر کے کنویں میں پھینک دیا گیا۔''

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «وَ أُتْبِعَ أَصْحَابُ الْقَلِيبِ لَعْنَةً»

''ان کنویں والوں پر لعنت کی گئی۔''[1]

دیگر روایات میں آتا ہے کہ گندگی پھینکنے والا عُقبہ بن ابی مُعَیط اور اس کام پر ابھارنے والا ابوجہل تھا۔[2]

مشرکین اپنے خلاف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا کے مؤثر ہونے پر خائف تھے۔ ان پر یہ معاملہ گراں گزرتا تھا کیونکہ وہ دیکھتے تھے کہ مکہ میں کی گئی دعا قبول ہوتی ہے۔[3]

③ قریشی سرداروں کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ آور ہونا: ایک دن قریش کے بڑے بڑے سردار حطیم میں اکٹھے ہوئے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ کرتے ہوئے کہنے لگے: ''ہم نے جتنا صبر اس آدمی کے بارے میں کیا ہے کبھی کسی کے متعلق نہیں کیا۔ یہ ہمیں بے وقوف گردانتا ہے اور ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہتا ہے۔ ہم نے بڑے اہم معاملے پر صبر کیا ہوا ہے۔'' اسی دوران میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تشریف لے آئے۔ قریشی سردار یکبارگی آپ کی طرف لپکے، انھوں نے آپ کو گھیرے میں لے لیا اور کہنے لگے: ''تو ہی وہ آدمی ہے جو ہمارے خداؤں اور دین کے بارے میں یہ یہ کہتا ہے۔ (کہ کچھ نہیں کر سکتے، ان کی پوجا مت کرو وغیرہ)۔'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «نَعَمْ، أَنَا الَّذِي أَقُولُ ذٰلِكَ» ''ہاں میں ہی وہ آدمی ہوں جو یہ کہتا ہوں۔'' پھر ان میں سے ایک آدمی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر بل دے کر کھینچی۔ اسی اثنا میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی آگئے۔ وہ روتے ہوئے کہہ رہے تھے:

1 صحيح البخاري، حديث: 520، و صحيح مسلم، حديث: 1794. 2 صحيح مسلم، حديث: 1794. 3 السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 149/1.

«أَتَقْتُلُونَ رَجُلًا أَنْ يَقُولَ: رَبِّيَ اللّٰهُ؟» ''کیا تم ایسے آدمی کو قتل کرنا چاہتے ہو جو یہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے؟'' [1]

④ نبی ﷺ کا چچا ابولہب آپ کا سخت دشمن تھا۔ اسی طرح اس کی بیوی ام جمیل بھی آپ کی عداوت میں اپنے شوہر سے پیچھے نہ تھی۔ وہ نبی ﷺ اور لوگوں کے درمیان چغلی سے فتنے کی آگ بھڑکانے کی کوشش کرتی، آپ کے راستے میں کانٹے ڈالتی اور دروازے پر گندگی پھینک دیتی، ان دونوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ اللھب نازل فرمائی:

﴿تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۝ سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝ وَّامْرَاَتُهٗ ۭ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝ فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝﴾

''ٹوٹ جائیں دونوں ہاتھ ابولہب کے اور وہ ہلاک ہو گیا، نہ اس کے مال نے اسے کوئی فائدہ دیا اور نہ اس کی کمائی نے، عنقریب وہ ضرور بھڑکتی آگ میں داخل ہوگا اور اس کی بیوی بھی جو لکڑیاں ڈھونے والی ہے، اس کی گردن میں چھال کی بٹی ہوئی رسی ہوگی۔'' [2]

جب ابولہب کی بیوی ام جمیل کو معلوم ہوا کہ اس کی اور اس کے شوہر کی مذمت میں قرآن نازل ہوا ہے تو وہ رسول اللہ ﷺ کو تلاش کرتی ہوئی آئی۔ آپ ﷺ خانہ کعبہ کے پاس مسجد حرام میں تشریف فرما تھے۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ وہ مٹھی بھر پتھر لیے ہوئے تھی۔ سامنے آکر کھڑی ہوئی (تو اللہ نے اس کی نگاہ پکڑ لی)۔ اس نے سوال کیا: ''ابوبکر! تمھارا ساتھی کہاں ہے؟ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ میری ہجو کرتا ہے۔ واللہ! اگر میں نے اسے پالیا تو اس کے منہ پر یہ پتھر دے ماروں گی۔'' اس کے بعد وہ واپس چلی گئی۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! کیا آپ کو اس نے نہیں دیکھا؟''

[1] صحيح البخاري، حديث: 3618 و3856 و4815، ودلائل النبوة للبيهقي: 274/2، وصحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 96، وصحيح السيرة النبوية للألباني: 149/1. [2] اللهب 111: 1-5.

آپ نے فرمایا: «لَقَدْ أَخَذَ اللّٰهُ بِبَصَرِهَا عَنِّي» ”نہیں، اللہ نے اس کی نگاہ پکڑ لی تھی وہ مجھے نہیں دیکھ پائی۔“ ام جمیل نے یہ شعر بھی پڑھے:

«مُذَمَّمٌ أَبَيْنَا، وَدِينَهُ قَلَيْنَا وَأَمْرَهُ عَصَيْنَا»

”ہم نے مُذَمَّم (جس کی مذمت کی جائے) کو تسلیم نہیں کیا، اس کے دین کو چھوڑ دیا اور اس کے امر کی نافرمانی کی۔“

نبی ﷺ اس کی یہ بات سن کر مسکراتے اور فرماتے: «أَلَا تَعْجَبُونَ كَيْفَ يَصْرِفُ اللّٰهُ عَنِّي شَتْمَ قُرَيْشٍ وَّ لَعْنَهُمْ يَشْتِمُونَ مُذَمَّمًا وَّيَلْعَنُونَ مُذَمَّمًا وَّ أَنَا مُحَمَّدٌ» ”کیا تم تعجب نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے قریش کی لعن طعن اور گالی گلوچ کس طرح مجھ سے پھیر دی۔ وہ مُذَمَّم کو لعن طعن کرتے اور گالی دیتے ہیں اور میں تو محمد ہوں۔“[1]

ابولہب تو بازاروں، مجمعوں اور حج کے موسم میں نبی ﷺ کے پیچھے لگا رہتا اور آپ کی تکذیب کرتا۔[2]

نبی ﷺ کو پہنچنے والی ان تکالیف کے علاوہ مکی دور کے آخر میں اس وقت ایذا رسانی کی انتہا کر دی گئی جب مشرکین نے آپ ﷺ کو قتل کرنے کی سازش کی۔[3]

نبی ﷺ قریش کی طرف سے اپنے پیروکاروں کو پہنچنے والی تکالیف سے پہلے خود کو پہنچنے والی ایذا کا تذکرہ اس طرح فرماتے: «لَقَدْ أُخِفْتُ فِي اللّٰهِ وَمَا يَخَافُ أَحَدٌ وَلَقَدْ أُوذِيتُ فِي اللّٰهِ لَمْ يُؤْذَ أَحَدٌ، وَلَقَدْ أَتَتْ عَلَيَّ ثَلَاثُونَ مِنْ بَيْنِ يَوْمٍ وَّلَيْلَةٍ وَّمَالِي وَلِبِلَالٍ طَعَامٌ يَّأْكُلُهُ ذُو كَبِدٍ إِلَّا شَيْءٌ يُّوَارِيهِ إِبْطُ بِلَالٍ» ”بلاشبہ مجھے اللہ کے راستے میں اتنا ڈرایا گیا کہ کسی کو اتنے خوف کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ بلاشبہ مجھے اللہ کے راستے میں اتنی اذیت دی گئی کہ کسی کو بھی اتنی اذیت سے دوچار نہیں ہونا پڑا۔ مجھ پر

1 صحيح البخاري، حديث: 3533. 2 السيرة النبوية لأبي شهبة: 293/1. 3 السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 153/1.

مسلسل تیس دن رات گزر جاتے اور میرے اور بلال کے لیے کوئی ایسا کھانا نہ ہوتا جسے کوئی جاندار کھا سکے، سوائے اس چیز کے جو بلال اپنی بغل میں چھپا کر لے آتے۔''[1]

نبی ﷺ قدر و منزلت کے اعلیٰ درجے پر فائز تھے۔ اس کے باوجود جب سے آپ ﷺ نے لوگوں کو علانیہ دعوت پیش کی تو انتہائی صبر و تحمل کے ساتھ تکالیف برداشت کیں اور لمبی مشقت اٹھائی۔ نبی ﷺ نے قریش کے ان ناسمجھ لوگوں کی طرف سے بے پناہ تکالیف اٹھائیں حتی کہ جب کبھی آپ مکہ میں ان کی مجالس کے قریب سے گزرتے تو وہ مذاق کرتے ہوئے کہتے: ''یہ ابو کبشہ[2] کا بیٹا ہے جو آسمانی باتیں کرتا ہے۔'' اور کوئی ان میں سے آپ کے قریب سے گزرتا تو یوں کہتا: ''کیا آج تیرے پاس آسمان سے کوئی خبر نہیں آئی؟''[3]

معاملہ صرف تمسخر و استہزا اور ذہنی اذیت پہنچانے تک ہی محدود نہ تھا بلکہ نوبت جسمانی تکلیف دینے تک پہنچ گئی تھی حتی کہ اُمَیَّہ بن خلف جیسے اللہ کے دشمن نے نبی ﷺ کے چہرۂ انور پر تھوکنے کی بھی جسارت کی۔[4]

ہجرت مدینہ کے بعد بھی نبی ﷺ پر اذیت اور ابتلا کا دور ختم نہ ہوا بلکہ ایک نیا انداز اختیار کیا گیا۔ نئے نئے دشمن پیدا ہوگئے، عداوت کی آگ مکہ والوں سے تجاوز کرتے ہوئے مدینہ کے قرب و جوار کے منافقوں، یہودیوں، ایرانیوں اور رومیوں اور ان کے حلیفوں تک پھیل گئی، مکہ میں دشمنی کا طریقہ کار جو استہزا، گالی گلوچ، گھیراؤ اور مار پیٹ تک محدود تھا، اب مسلح تصادم کی صورت اختیار کر گیا اور یہ جنگ اتنی تیزی اختیار کر گئی کہ اس میں بڑے کروفر سے تلواروں اور نیزوں کا استعمال ہوا۔ یہ ایک ایسی آزمائش ثابت ہوئی جس میں بکثرت اموال اور جانوں کا نقصان ہوا۔[5]

نبی ﷺ کی نبوت و رسالت کے سارے دور میں مشقت و ابتلا کا تسلسل رہا اور آپ نے اللہ کے راستے میں پہنچنے والی ان تکالیف پر صبر کیا اور اجر کی امید رکھی اور کسی قسم کی

1 جامع الترمذي، حديث: 2472. 2 ابو کبشہ آپ ﷺ کے رضاعی والد تھے۔ 3 الروض الأنف: 33/2 و ما بعدها. 4 الروض الأنف: 48/2. 5 زاد اليقين لأبي شنب، ص: 137.

کمزوری نہ دکھائی یہاں تک کہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔[1]

نبی ﷺ نے ایسی آزمائشوں، اذیتوں اور مشقتوں کا سامنا کیا جو کسی کے تصور میں بھی نہیں آسکتیں اور یہ تمام تکالیف آپ کے مرتبۂ رسالت کے مطابق تھیں، اس لیے آپ اپنے اللہ کے ہاں بلند مرتبے اور مقام محمود کے مستحق ٹھہرے۔ آپ نے یہ سب تکالیف اس لیے برداشت کرلیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ انھیں بھی سابقہ امتوں پر آنے والا عذاب گھیر لے اور سب تباہ و برباد ہوجائیں اور اس طرح آنے والے داعیوں اور مصلحین کے لیے اسوہ مہیا ہوجائے۔ اسی لیے نبی ﷺ کو پہنچنے والی تکالیف آزمائش و مشقت میں سب سے بڑھی ہوئی تھیں اور دعوت کے میدان میں اللہ تعالیٰ کا یہی طریقہ کار رہا ہے۔[2]

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے دریافت کیا:

اے اللہ کے رسول! سب سے زیادہ کون لوگ آزمائش میں مبتلا ہوئے ہیں؟

آپ ﷺ نے فرمایا: «اَلْأَنْبِيَاءُ ثُمَّ الْأَمْثَلُ فَالْأَمْثَلُ: يُبْتَلَى الرَّجُلُ عَلٰى حَسَبِ دِينِهِ، فَإِنْ كَانَ فِي دِينِهِ صُلْبًا اشْتَدَّ بَلَاؤُهُ، وَإِنْ كَانَ فِي دِينِهِ رِقَّةٌ ابْتُلِيَ عَلٰى قَدْرِ دِينِهِ، فَمَا يَبْرَحُ الْبَلَاءُ بِالْعَبْدِ حَتّٰى يَتْرُكَهُ يَمْشِي عَلَى الْأَرْضِ وَمَا عَلَيْهِ خَطِيئَةٌ»

''انبیاء، پھر ان کے بعد سب سے زیادہ مرتبے والے اور پھر ان کے بعد جو زیادہ مرتبہ و مقام والے ہوں۔ آدمی اپنی دینی استعداد کے مطابق آزمایا جاتا ہے۔ اگر وہ دین میں پختہ ہو تو اس کی آزمائش بھی سخت ہوتی ہے۔ اور اگر وہ دین میں نرم اور کمزور ہو تو آزمائش اس اعتبار سے ہوگی۔ انسان آزمائش میں مسلسل مبتلا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ زمین پر اس حالت میں چل رہا ہوتا ہے کہ اس پر کوئی گناہ باقی نہیں رہتا۔''[3]

1 التمكين للأمة الإسلامية لمحمد السيد، ص: 243. 2 محنة المسلمين في العهد المكي للدكتور سليمان السويكت، ص: 197. 3 جامع الترمذي، حديث: 2398، وسنن ابن ماجه، حديث: 4023، و مسند أحمد: 172/1.

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو پہنچنے والی تکالیف

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو پہنچنے والی تکالیف

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اتنی عظیم تکالیف برداشت کیں جن سے بڑے بڑے پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہل سکتے تھے۔ انھوں نے اپنے مال اور جانیں اللہ کے راستے میں قربان کیں اور انتہائی صبر وتحمل سے مصائب برداشت کیے حتی کہ مسلمانوں کے برگزیدہ افراد بھی ابتلا سے محفوظ نہ رہ سکے۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بھی اللہ کے راستے میں تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے سر پر مٹی ڈالی گئی اور انھیں مسجد حرام میں جوتوں سے زد وکوب بھی کیا گیا حتی کہ ان کا چہرہ پہچانا نہ جاتا تھا۔ وہ موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا تھے دریں اثنا انھیں ایک کپڑے میں لپیٹ کر گھر پہنچایا گیا۔[1]

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ایک جگہ جمع ہوئے اور ان کی تعداد اڑتیس (38) کے قریب تھی تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو علانیہ تبلیغ کرنے کا مشورہ دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «يَا أَبَا بَكْرٍ! إِنَّا قَلِيلٌ» ''اے ابوبکر! ابھی ہم تھوڑی تعداد میں ہیں۔'' ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اصرار کیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم باہر نکلے اور تمام اہل اسلام مسجد حرام کے کناروں پر پھیل گئے۔ ہر آدمی اپنے خاندان کے درمیان تھا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پاس ہی تشریف فرما تھے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف دعوت دینے والے پہلے خطیب تھے۔ مشرکین ابوبکر رضی اللہ عنہ اور تمام مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے اور انھیں مسجد حرام میں کعبہ کے آس پاس شدید زدوکوب کیا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو زمین پر لٹا کر روندا گیا اور ان کے چہرے پر ضربیں لگائی گئیں۔ فاسق عتبہ بن ربیعہ آگے بڑھا اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنے سلے ہوئے دونوں جوتوں سے مارنے لگا۔ وہ جوتوں کا رخ

1 التمكين للأمة الإسلامية لمحمد السيد، ص:243.

بدل بدل کر ان کے چہرے پر مارتا تھا، پھر ان کے پیٹ پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کا چہرہ تشدد کے باعث پہچانا نہ جاتا تھا۔ اتنے میں بنو تیم کے لوگ انھیں بچانے کے لیے آگے بڑھے۔ انھوں نے مشرکین کو ان سے پرے ہٹایا اور پھر انھیں ایک کپڑے میں لپیٹ کر ان کے گھر پہنچایا۔ انھیں ابوبکر رضی اللہ عنہ کی موت میں کوئی شک باقی نہ رہا تھا، چنانچہ وہ لوگ واپس مسجد حرام میں آئے اور اعلان کیا: ''واللہ! اگر ابوبکر ہلاک ہوگئے تو ہم عتبہ بن ربیعہ کو قتل کر دیں گے۔'' وہ دوبارہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے۔ ان کے والد ابوقحافہ اور بنو تیم کے لوگ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ہوش میں لانے کی کوشش کرتے رہے بالآخر دن کے آخری حصے میں وہ ہوش میں آئے اور بات کرنے کے قابل ہوئے تو انھوں نے سب سے پہلے یہی پوچھا: ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم خیریت سے ہیں؟''

بنو تیم نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہا اور ان کی ماں ام الخیر سے یہ کہہ کر چلے گئے کہ اسے کھانے پینے کے لیے کچھ نہ دینا۔ جب ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ان کی ماں اکیلے رہ گئے تو ماں نے کھانے پینے پر اصرار کیا اور ابوبکر رضی اللہ عنہ ابھی بھی یہی بات دہرا رہے تھے کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے؟'' ام الخیر بولیں: ''اللہ کی قسم! مجھے تیرے ساتھی کا کوئی علم نہیں۔'' تب انھوں نے والدہ سے کہا: ''آپ ام جمیل بنت خطاب کے پاس جائیں اور ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں سوال کریں۔'' وہ ام جمیل کے پاس آئیں اور کہا: ''ابوبکر تم سے محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق پوچھتا ہے۔'' اس نے کہا: ''میں کسی محمد بن عبداللہ اور ابوبکر کو نہیں جانتی اور اگر تو چاہے تو میں تیرے ساتھ تیرے بیٹے کے پاس جاسکتی ہوں۔'' ام الخیر نے کہا: ''ٹھیک ہے۔'' یوں ام جمیل اس کے ساتھ آئی اور دیکھا کہ ابوبکر قریب المرگ حالت میں پڑے تھے۔ ام جمیل قریب ہوئی اور بلند آواز سے کہا: ''واللہ! جن لوگوں نے آپ کا یہ حال کیا ہے، وہ اہل فسق اور اہل کفر ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اللہ ان سے ضرور انتقام لے گا۔'' ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنا سوال دہرایا کہ ''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے؟''

وہ بولی: ''تیری ماں سن رہی ہے۔'' اس پر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''تو ان سے کسی قسم کا خوف نہ کھا۔'' تب اس نے بتایا کہ وہ صحیح سلامت ہیں۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''وہ کہاں ہیں؟'' اس نے بتایا: ''وہ دارارقم میں ہیں۔''

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اللہ کی قسم! میں اس وقت تک نہ کھانا کھاؤں گا اور نہ پانی پیوں گا جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نہ پہنچ جاؤں۔''

ام الخیر اور ام جمیل دونوں کچھ دیر ٹھہری رہیں یہاں تک کہ جب لوگوں کا شور وغل ختم ہوگیا اور فضا پرسکون ہوگئی تو ابوبکر رضی اللہ عنہ ان دونوں کا سہارا لیے گھر سے نکلے اور انھوں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فوراً ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف لپکے اور انھیں بوسہ دیا، پھر دیگر مسلمان بھی ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان کی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم شدید رقت کی حالت میں آگئے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! آپ پر میرے ماں باپ قربان! اس فاسق نے جو میرے چہرے پر مارا، اس کے علاوہ کوئی تکلیف نہیں۔ اور یہ میری ماں ام الخیر ہیں جو میرے ساتھ اچھا سلوک کرتی ہیں۔ آپ بابرکت ہستی ہیں۔ آپ انھیں اللہ کی طرف دعوت دیجیے اور اللہ سے ان کے حق میں دعا کیجیے۔ ممکن ہے آپ کی وجہ سے اللہ انھیں آگ سے بچا لے۔'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اسلام کی دعوت دی اور اللہ سے ان کے حق میں دعا کی تو وہ مسلمان ہوگئیں۔[1]

نصائح اور نتائج

① ابوبکر رضی اللہ عنہ کا اسلام کا اعلان کرنا اور اسے کفار کے سامنے ظاہر کرنا ان کی ایمانی قوت اور شجاعت کا مظہر ہے۔ انھوں نے اس ضمن میں بڑی تکلیف اٹھائی یہاں تک کہ ان کے قبیلے والوں کو ان کی موت کا یقین ہو چلا تھا۔

② ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ محبت پوشیدہ تھی۔ وہ اتنی نازک حالت

[1] السيرة النبوية لابن كثير: 1/439-441، والبداية والنهاية: 3/30.

میں بھی رسول اللہ ﷺ کے بارے میں سوال کر رہے تھے اور ان کے سوال میں عجیب قسم کی دردمندی تھی، پھر انھوں نے قسم اٹھائی کہ جب تک وہ اللہ کے رسول کو دیکھ نہیں لیتے کچھ نہیں کھائیں پئیں گے، حالانکہ وہ اس وقت چلنا تو درکنار اپنی جگہ سے اٹھ بھی نہیں سکتے تھے۔ لیکن یہ محبت تو اللہ کے لیے تھی اور وہ پختہ ارادے جو مشکلات پر غالب آجاتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کی خاطر ہوتے ہیں اور ہر وہ مصیبت جو اللہ کے راستے میں ہو اور اللہ کے رسول کی خاطر ہو وہ ہلکی اور آسان ہوجاتی ہے۔

③ عقیدہ مختلف ہونے کے باوجود قبائلی عصبیت کا پیش آمدہ واقعات سے گہرا تعلق ہوتا تھا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے قبیلے والوں نے عتبہ کو دھمکی دی تھی کہ اگر ابوبکر رضی اللہ عنہ ہلاک ہوگئے تو وہ عتبہ کو قتل کر دیں گے۔[1]

④ ام جمیل رضی اللہ عنہا کی احتیاطی تدابیر جو ان کے مختلف طرزِ عمل سے واضح ہوتی ہیں، مندرجہ ذیل تھیں:

شخصیات اور معلومات کو پوشیدہ رکھنا: جب ام الخیر نے ام جمیل سے نبی ﷺ کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ اور محمد ﷺ کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا۔ یہ ایک محتاط اور حفاظتی انداز تھا کیونکہ اس وقت ام الخیر مسلمان نہ تھیں اور ام جمیل مسلمان تھیں اور اپنے اسلام کو مخفی رکھے ہوئے تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ام الخیر کو اس کی خبر ہو، چنانچہ انھوں نے ام الخیر سے نبی ﷺ کی جائے قیام پوشیدہ رکھی مبادا وہ قریش کی جاسوس ہوں۔[2]

معلومات فراہم کرنے کے لیے موقع کی تلاش: ام جمیل رضی اللہ عنہا نے بذات خود مطلوبہ معلومات ابوبکر رضی اللہ عنہ تک پہنچانے کا ارادہ کیا اور ام الخیر کو راز داری کی غرض سے کچھ نہ بتایا، البتہ موقع غنیمت سمجھتے ہوئے اس سے کہا: ''اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں آپ کے ساتھ آپ کے بیٹے کے پاس چلوں تو میں جا سکتی ہوں۔'' ام جمیل کی یہ پیشکش ان کی ذہانت

1 محنة المسلمين في العهد المكي للدكتور سليمان السويكت، ص: 79. 2 السيرة النبوية للدكتور إبراهيم علي محمد أحمد، ص: 50.

اور معاملہ فہمی کا نتیجہ تھی۔ انھوں نے یہ کہا: ''اگر آپ چاہتی ہیں۔'' ام الخیر ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ماں تھیں اور پھر کہا: ''آپ کے بیٹے کے پاس۔'' یہ نہیں کہا: ابوبکر کے پاس۔ یہ تمام الفاظ ام الخیر میں ماں ہونے کے ناتے نرمی پیدا کرنے کے لیے کافی تھے۔ عام طور پر ایسی پیشکش کا انکار نہیں کیا جاتا، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ام الخیر نے فوراً ہاں کہہ دی اور ام جمیل بذات خود معلومات ابوبکر رضی اللہ عنہ تک پہنچانے میں کامیاب ہوگئیں۔

ام الخیر کے جذبۂ شفقت کو ابھارنے کے لیے ام جمیل کا کردار: واقعے کی تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ ام جمیل نے ام الخیر کے جذبۂ شفقت کو ابھارنے کی کوشش کی اور انھوں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اس حالت کو سامنے رکھا جبکہ وہ قریب المرگ تھے۔ انھوں نے اونچی آواز میں گفتگو کی اور اس فعل کے ذمہ دار افراد کو برا بھلا کہتے ہوئے بولیں: ''بلاشبہ جن لوگوں نے آپ سے یہ سلوک کیا ہے وہ اہل فسق اور اہل کفر ہیں۔ مجھے امید ہے اللہ ان سے آپ کا انتقام لے گا۔''

ام جمیل کے اس طرز عمل سے ام الخیر کی قدرے تسلی و تشفی ہوئی اور ظلم کرنے والوں کے برے انجام کی بات سن کر اس کے دل کو سکون ہوا۔ ام جمیل ام الخیر کے دل میں محبت پیدا کرنا چاہتی تھیں۔ جس میں وہ کامیاب رہیں۔ انھوں نے ام الخیر کا اعتماد حاصل کرنے اور مطلوبہ معلومات ابوبکر رضی اللہ عنہ تک پہنچانے میں کامیابی پالی۔[1]

ام جمیل کی احتیاطی تدابیر: ام جمیل انتہائی محتاط تھیں کہ اسلامی دعوت کے قائد کے بارے میں معلومات غلط آدمی کے ہاتھ نہ لگیں۔ وہ ام الخیر کے بارے میں مطمئن نہ تھیں کیونکہ وہ ابھی تک مشرکہ تھیں، لہٰذا جب ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق سوال کیا تو وہ مُتَرَدِّد ہوئیں اور کہا کہ آپ کی ماں سن رہی ہے اور جب ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ ان کی فکر نہ کریں، تب ام جمیل نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحیح سلامت ہیں۔[2]

---

1 السيرة النبوية للدكتور إبراهيم علي محمد أحمد، ص: 50. 2 السيرة النبوية للدكتور إبراهيم علي محمد أحمد، ص: 51.

مزید برآں ام جمیل نے انتہائی حزم و احتیاط اور معاملے کو صیغۂ راز میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے نبی ﷺ کے مکان کے بارے میں نہیں بتایا اور جب ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا تو جواب دیا کہ وہ دارارقم میں ہیں۔

مہم سر کرنے کے لیے مناسب وقت کا انتظار: جب ابوبکر رضی اللہ عنہ نے دارِارقم جانے کی خواہش ظاہر کی تو ام جمیل اس کے لیے فوراً تیار نہ ہوئیں بلکہ انھوں نے لوگوں کا شوروغل ختم ہونے اور فضا پرسکون ہونے کا انتظار کیا، تب وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی والدہ کے ہمراہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو سہارا دیے وہاں سے نکلیں۔ اس مشکل مہم کا یہی مناسب وقت تھا کیونکہ اس دوران میں دعوت دین کے دشمنوں کی طرف سے جاسوسی اور بھید کھلنے کے مواقع کم ہوگئے تھے۔ یوں ام جمیل دشمنوں کو خبر ہوئے بغیر اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئیں یہاں تک کہ وہ اور ام الخیر ابوبکر رضی اللہ عنہ کو لیے دارارقم پہنچ گئیں۔[1]

مشقت کے بعد انعام کا ضابطہ: ابوبکر رضی اللہ عنہ کا نبی ﷺ سے اپنی ماں کے بارے میں دعا کروانے اور انھیں اسلام میں داخل کرنے کی خواہش ظاہر کرنے کے بعد ام الخیر کا دائرہ اسلام میں داخل ہونا اس ضابطے کا حصہ تھا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی ماں کے اچھے سلوک سے بہت متأثر تھے اور نبی ﷺ تو تمام لوگوں کی ہدایت کے لیے کوشاں رہتے تھے جبکہ ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی آپ ﷺ کے قریبی ساتھی تھے۔[2]

⑤ ابوبکر رضی اللہ عنہ کا نبی ﷺ سے خاص تعلق تھا اور ان کٹھن مراحل میں جب آپ ﷺ نے بہت سی تکالیف برداشت کیں، معیت رسول کے باعث سب سے زیادہ مشقت اور آزمائش ابوبکر رضی اللہ عنہ کو برداشت کرنی پڑی۔ وہ نبی ﷺ کے دفاع میں پیش پیش رہے اور آپ ﷺ پر اپنی جان نچھاور کرتے نظر آئے حتی کہ اپنی قوم کے ناسمجھ افراد کی طرف سے بہت سی تکالیف برداشت کیں۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ قریش کے معروف ترین عقل وفہم کے

1 السيرة النبوية للدكتور إبراهيم علي محمد أحمد، ص: 50-52. 2 محنة المسلمين في العهد المكي للدكتور سليمان السويكت، ص: 79.

مالک اور اچھا سلوک کرنے والوں میں سے تھے۔[1]

سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو پہنچنے والی تکالیف

معاشرتی لحاظ سے کمزور مسلمانوں کے بارے میں مشرکین نے اتنی سختی سے کام لیا جس کی نظیر نہیں ملتی۔ وہ انھیں ان کے عقیدے اور اسلام سے برگشتہ کرنا اور دیگر افراد کے لیے سامان عبرت بنانا چاہتے تھے۔ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ وہ انھیں بدترین ظلم وستم سے دوچار کر کے اپنے کینے اور غضب کو تسکین دینے کی کوشش کرتے تھے۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''سب سے پہلے جن لوگوں نے اپنے اسلام کا اظہار کیا وہ سات افراد تھے: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر، عمار، سمیہ، صہیب، بلال اور مقداد رضی اللہ عنہم'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے چچا اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنے قبیلے کی وجہ سے تحفظ مل گیا لیکن باقی ماندہ افراد کو مشرکین پکڑ کر لوہے کی زرہیں پہنا دیتے اور انھیں تیز دھوپ میں پھینک دیتے جس سے ان کی جلد جل جاتی۔ توحید کے نام لیوا ان تمام افراد میں بلال رضی اللہ عنہ کے سوا سب نے کفار کی باتیں مان لیں۔ بلال رضی اللہ عنہ نے اللہ کے راستے میں کسی تکلیف کی پروا نہ کی۔ مشرکین بلال رضی اللہ عنہ کو اپنے منچلے نوجوانوں کے حوالے کر دیتے جو انھیں مکہ کی گلیوں میں گھسیٹتے اور بلال رضی اللہ عنہ اپنی زبان سے أَحَدْ، أَحَدْ (اللہ ایک ہے، اللہ ایک ہے) کا نعرہ بلند کرتے۔''[2]

بلال رضی اللہ عنہ کا نہ کوئی مددگار تھا کہ وہ اس کا سہارا لیتے، نہ کوئی قبیلہ تھا جو ان کی حفاظت کرتا اور نہ کوئی تلوار تھی جو ان کا دفاع کرتی۔ ایسا انسان مکہ کے جاہلی معاشرے میں صرف گنتی میں شمار تو ہو سکتا تھا لیکن اس کی زندگی میں خدمت و اطاعت کے سوا اور کوئی کردار نہ تھا۔ وہ تو صرف جانوروں کی طرح خریدا اور بیچا جا سکتا تھا۔ اور اگر ایسا شخص اپنی رائے اور فکر کا مالک یا صاحب حیثیت یا صاحبِ دعوت ہو تو مکہ کے جاہلی معاشرے میں اسے بہت بڑا جرم سمجھا جاتا تھا کیونکہ اس سے جاہلی معاشرے کی بنیادیں ہل سکتی تھیں۔ لیکن جدید اسلامی دعوت

---

1 محنة المسلمين في العهد المكي للدكتور سليمان السويكت، ص: 75. 2 سنن ابن ماجه، حديث: 150، مسند أحمد: 1/404.

جس میں مکہ کے نوجوان جوق در جوق داخل ہو رہے تھے، جو اپنے آباء و اجداد کی اندھا دھند پیروی کے منکر ہو کر ان کے فرسودہ خیالات کو چیلنج کر رہے تھے، اس تحریک نے ایسے گرے پڑے انسان کو اہمیت دی اور اسے ایک نئے انسان کا وجود عطا کیا۔[1]

بلال رضی اللہ عنہ کے اسلام قبول کرنے کے بعد ایمان کے مطالب ان کے دل کی گہرائیوں میں اتر گئے اور وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے پیروکاروں کے اخوت پر مبنی عظیم ایمانی قافلے میں شامل ہو گئے۔ بلال رضی اللہ عنہ اپنے عقیدے اور دین کی وجہ سے تکالیف سے دوچار ہو رہے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وزیر ابوبکر رضی اللہ عنہ وہاں پہنچے۔ انھوں نے امیہ بن خلف سے اس سلسلے میں مذاکرات کیے اور کہا: ''کیا تو اس مسکین کے بارے میں اللہ سے نہیں ڈرتا اور کب تک یہ ظلم کرتا رہے گا؟'' اس نے کہا: ''تو نے ہی تو اس کا دین برباد کیا ہے۔ تو چاہتا ہے تو اسے بچا لے۔'' ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میرے پاس ایک سیاہ فام غلام ہے جو اس سے زیادہ طاقتور اور تیرے دین کا پیروکار ہے، وہ میں بلال کے عوض تجھے دے دوں گا۔'' امیہ نے رضا مندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا: ''مجھے قبول ہے۔'' اس پر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنا غلام اسے دے دیا اور بلال رضی اللہ عنہ کو آزاد کر دیا۔[2]

اور دوسری روایت میں ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسے سات یا چالیس اوقیہ سونے کے عوض خریدا۔[3]

بلال رضی اللہ عنہ عزم و یقین کے پیکر اور صبر و استقامت کے پہاڑ ثابت ہوئے۔ وہ اسلام میں سچے اور دل کے پاکیزہ تھے، اس لیے وہ اپنے دین میں ثابت قدم رہے اور درپیش چیلنجوں اور تکالیف کے سامنے متزلزل نہ ہوئے۔ ان کا صبر و استقامت مشرکین مکہ کے لیے مزید غیظ و غضب اور کینے میں اضافے کا سبب بنتا کیونکہ وہ اکیلے شخص تھے جو کمزور لوگوں میں سے اپنے دین پر ثابت قدم رہے اور مشرکین انھیں اس سے برگشتہ نہ کر سکے

1 التربية القيادية للدكتور الغضبان: 136/1۔ 2 السيرة النبوية لابن هشام: 394/1۔ 3 التربية القيادية للدكتور الغضبان: 140/1۔

تھے۔ بلال رضی اللہ عنہ نے کفار کے ارادوں کی تکمیل کرنے سے انکار کر دیا اور وہ ببانگ وہل کلمہ توحید پکارتے تھے اور اللہ کے راستے میں پہنچنے والی تکالیف کو وہ معمولی سمجھتے تھے۔[1]

ہر مشقت اور تنگی کے بعد انعام ہوتا ہے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے جذبۂ ایثار کے باعث بلال رضی اللہ عنہ نے سخت عذاب اور غلامی سے نجات پائی اور باقی زندگی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گزاری۔ اللہ کے رسول اپنی وفات تک ان سے راضی رہے اور انھیں جنت کی بشارت دی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا: «فَإِنِّي سَمِعْتُ اللَّيْلَةَ خَشْفَ نَعْلَيْكَ بَيْنَ يَدَيَّ فِي الْجَنَّةِ» ''میں نے آج رات اپنے آگے تیرے قدموں کی آہٹ جنت میں سنی ہے۔''[2]

بلال رضی اللہ عنہ کا صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاں بھی بڑا مرتبہ و مقام تھا۔ عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: ''ابوبکر رضی اللہ عنہ ہمارے سردار ہیں اور انھوں نے ہمارے ایک سردار کو آزاد کرا دیا۔'' اس سے وہ بلال رضی اللہ عنہ کو مراد لیتے تھے۔[3]

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کا غلاموں کو آزاد کروانا

ابوبکر رضی اللہ عنہ کا کمزور لوگوں کو آزاد کروانا اسلامی قیادت کے اس پروگرام کا حصہ بن گیا جس میں تکالیف اٹھانے والے کمزور مسلمانوں کو غلامی سے آزاد کرایا جاتا تھا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ بعد ازاں دین اسلام میں داخل ہونے والے غلاموں کی آزادی کے لیے مسلسل مال خرچ کرتے رہے۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ہجرت مدینہ سے قبل چھ غلاموں کو آزاد کروایا جو اسلام قبول کر چکے تھے بلال رضی اللہ عنہ کا ساتواں نمبر تھا۔ علاوہ ازیں عامر بن فہیرہ بھی انھی کے آزاد کردہ تھے جو بدر و احد میں شامل ہوئے اور جنھوں نے بئر معونہ کے دن شہادت پائی۔ ام عُبیس اور زِنّیرہ رضی اللہ عنہما کو بھی ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آزاد کرایا تھا۔ زِنّیرہ رضی اللہ عنہا کی نظر چلی گئی تو قریش نے کہنا شروع کر دیا کہ اس کی نظر لات و عزیٰ نے ختم کر دی۔ اس پر زِنّیرہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ''بیت اللہ کی قسم![4]

---

1 محنة المسلمين في العهد المكي للدكتور سليمان السويكت، ص: 92. 2 صحيح مسلم، حديث: 2458. 3 الطبقات الكبرىٰ لابن سعد: 232/3. 4 زنیرہ رضی اللہ عنہا کا بیت اللہ کی قسم کھانا دراصل اس معاشرے کی عام روش کا اظہار تھا۔ یہ بات بیت اللہ کی قسم کھانے کے لیے دلیل نہیں بن سکتی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت اللہ کی قسم کھانے سے منع فرمایا ہے، دیکھیے: سنن النسائي، حديث: 3804.

انھوں نے جھوٹ بولا ہے۔ لات وعزیٰ کسی نفع ونقصان کے مالک نہیں ہو سکتے۔'' اللہ تعالیٰ نے اس کی نظر لوٹا دی۔[1]

نَہدِیہ اور ان کی بیٹی بھی ان آزاد کردہ افراد میں شامل تھیں۔ وہ دونوں بنوعبدالدار کی ایک عورت کی ملکیت میں تھیں۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ وہاں سے گزر رہے تھے کہ ان کی مالکہ نے نہدیہ اوراس کی بیٹی کو آٹا پیسنے کے لیے دیا اور کہا: ''واللہ! میں تمھیں کبھی آزاد نہیں کروں گی۔''

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اے فلاں کی ماں! قسم توڑ دے اوراس کا کفارہ ادا کر دے۔''

وہ بولی: ''تم نے ہی انھیں بگاڑا ہے اب تمھی انھیں آزاد بھی کراؤ۔''

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''تو کتنے میں انھیں فروخت کرے گی؟''

اس نے کہا: ''اتنی رقم میں۔''

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں انھیں خرید کر آزاد کرتا ہوں'' پھر نَہدیہ اوراس کی بیٹی سے کہا: ''اس کا آٹا واپس کر دو۔''

انھوں نے کہا: ''اے ابوبکر! ابھی واپس کر دیں یا کام پورا کر کے؟'' فرمایا ''جیسے تم چاہو۔''[2]

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ اسلام نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور دونوں لونڈیوں کے درمیان کس قدر مساوات قائم کر دی یہاں تک کہ انھوں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے غلام اور آقا کے انداز کے بجائے برابری کی سطح پر گفتگو کی۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے مقام ومرتبہ اور جاہلیت اور اسلام میں بزرگی پانے کے باوجود ان کے اس لہجے کو بسر وچشم قبول فرمایا باوجودیکہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ان پر احسان تھا کہ انھوں نے ان دونوں کو آزادی دلائی۔ لونڈیوں نے اس وقت اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کیا جب انھوں نے آٹا پیس کر واپس کرنے کی بات کی۔[3]

ابوبکر رضی اللہ عنہ قبیلہ عدی بن کعب کی شاخ بنومُؤمَّل کی ایک لونڈی کے پاس سے گزرے جو مسلمان تھی اور عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اسے تکلیفیں دے رہے تھے کہ وہ اسلام چھوڑ دے۔ یہ

1 السيرة النبوية لابن هشام: 393/1. 2 السيرة النبوية لابن هشام: 393/1. 3 السيرة النبوية لأبي شهبة: 346/1.

عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام سے پیشتر کا واقعہ ہے۔ وہ اسے مارتے مارتے تھک گئے اور کہا: ''میں صرف اس لیے رک گیا ہوں کہ تھک چکا ہوں۔'' لونڈی نے کہا: ''اللہ تم سے بھی ایسا ہی سلوک کرے۔'' ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس لونڈی کو بھی خرید کر آزاد کر دیا۔[1]

یہ تھا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا اعلیٰ کردار۔ وہ آزادیوں کے سفیر، غلاموں کو آزاد کرنے والے اور اسلام کی باوقار شخصیت تھے جو اپنی قوم میں مشہور تھے کہ وہ مفلسوں کی خبر گیری کرتے ہیں، صلہ رحمی کرتے ہیں، قرضداروں کے بوجھ اٹھاتے ہیں، مہمانوں کی خدمت کرتے ہیں اور راہ حق میں پہنچنے والے مصائب و آلام میں لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔ وہ جاہلی دور میں بھی کسی گناہ کے مرتکب نہ ہوئے۔ انسانوں سے الفت رکھنے والے اور پسندیدہ شخصیت کے مالک تھے، ان کا دل کمزور اور غلاموں کے لیے نرم اور شفیق تھا۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اللہ کے لیے اور اللہ کے راستے میں غلاموں کی خریداری اور ان کی آزادی پر بہت سا مال خرچ کیا، حالانکہ ابھی آزادی دلانے اور اس پر عظیم اجروثواب والے احکامات بھی نازل نہ ہوئے تھے۔[2]

مکی معاشرے میں ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسے افراد خال خال ہی پائے جاتے تھے جنھوں نے اپنا سارا مال کمزور طبقے کے مسلمانوں کے لیے خرچ کر دیا۔ ان کی نظر میں تمام کمزور افراد اس نئے دین کی رو سے ان کے بھائی تھے اور اس کرۂ ارض پر بسنے والے تمام مشرک اور سرکش انسان مل کر بھی ایک کمزور مسلمان کے ہم پلہ نہیں ہو سکتے تھے۔ ایسے ہی افراد کی بدولت توحید پر مبنی اسلامی ریاست قائم ہو سکی اور اسلامی تہذیب پھل پھول سکی تھی۔[3]

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مقصد ہرگز یہ نہ تھا کہ ان کی تعریف ہو اور نہ وہ کسی دنیاوی مفاد یا مرتبے کے خواہش مند تھے۔ وہ تو صرف اللہ ذوالجلال والاکرام کی رضاجوئی کے خواہاں تھے۔ ایک دن ان کے والد نے کہا تھا: ''اے میرے پیارے بیٹے! میرا خیال ہے کہ تو

[1] السيرة النبوية لابن هشام:393/1. [2] السيرة النبوية لأبي شهبة:345/1. [3] التربية القيادية للدكتور الغضبان:347/1.

کمزور افراد کو آزادی دلاتا ہے۔ اگر تو نے آزادی دلانی ہے تو مضبوط اور طاقتور افراد کو آزادی دلا جو تیرے مددگار بن سکیں اور تیرا دفاع کریں؟'' اس پر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اے میرے ابا جان! میں تو یہ سب کچھ صرف اللہ کی رضا کے لیے کرتا ہوں۔''

یوں اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان میں قرآنی آیات نازل فرمائیں جو قیامت تک پڑھی جاتی رہیں گی۔[1]

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ○ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ○ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ○ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ○ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ○ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ○ وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى ○ اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ○ وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى ○ فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى ○ لَا يَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَى ○ الَّذِيْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ○ وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ○ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ○ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ○ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ○ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ○ ﴾

''پھر جس نے (اللہ کی راہ میں) دیا اور ڈرتا رہا اور اس نے نیک بات کی تصدیق کی تو یقیناً اسے عنقریب ہم آسان (راہ) کی توفیق دیں گے اور لیکن جس نے کنجوسی کی اور پروا نہ کی اور اس نے نیک بات کو جھٹلایا تو اسے عنقریب ہم تنگی کی (راہ کی) سہولت دیں گے اور جب وہ (دوزخ میں) گرے گا تو اسے اس کا مال کوئی فائدہ نہ دے گا، بے شک ہدایت دینا ہمارے ہی ذمے ہے اور بے شک آخرت اور دنیا ہمارے ہی اختیار میں ہے، بالآخر میں نے تمھیں بھڑکتی آگ سے ڈرا دیا ہے، اس میں بڑا بدبخت ہی داخل ہوگا، جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا اور بڑا متقی اس سے ضرور دور رکھا جائے گا، جو پاک ہونے کے لیے اپنا مال دیتا ہے اور اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں جس کا بدلہ اسے دیا جائے مگر صرف اپنے

1 السيرة النبوية لابن هشام: 319/1، و تفسير الآلوسي: 152/30.

رب برتر کا چہرہ (یعنی رضا) چاہتے ہوئے (مال خرچ کرتا ہے) اور یقیناً وہ (اللہ) جلد اس سے راضی ہوگا۔"[1]

اسلامی کارواں کے اس ہراول دستے کا آپس میں ایک دوسرے کا خیال رکھنا خیر خواہی، بھلائی اور مال خرچ کرنے کی یہ عظیم داستان ہے۔ یہی آزاد کردہ غلام عقیدۂ توحید اور نظریۂ اسلام کے عظیم سپوت بنے۔ وہ اسی نظریے کے بارے میں ایک دوسرے سے گفتگو کرتے، اسی کے دفاع کی فکر کرتے اور اسی نظریے پر جہاد کرتے تھے۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ کا غلاموں کو خریدنا اور آزاد کرنا اس دین کی عظمت اور اس عظمت کے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دل میں راسخ ہونے کا بین ثبوت ہے۔ آج بھی اہل اسلام کو ایسی مثالیں قائم کرنے اور اپنے بلند جذبات و احساسات کو بیدار رکھنے کی اشد ضرورت ہے تاکہ امتِ اسلامیہ دشمنان اسلام کی طرف سے عقیدۂ توحید کو نیست و نابود کرنے کی منظم کوششوں کے مقابلے میں باہمی تعاون اور ربط ضبط کے ساتھ ایک دوسرے سے کندھا ملا کر کھڑے ہوں۔

عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما اور ان کے والدین کی آزمائش

عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کے والد یاسر رضی اللہ عنہ یمنی قبیلہ بنو عَنس کے ایک فرد تھے جو یمن سے مکہ آئے تھے۔ وہ اور ان کے دو بھائی حارث اور مالک اپنے ایک بھائی کی تلاش میں مکہ آئے تھے۔ مالک اور حارث تو واپس یمن چلے گئے لیکن یاسر مکہ میں ٹھہر گئے اور انھوں نے ابو حذیفہ بن مغیرہ مخزومی سے عہد و پیمان کر لیا۔[2]

ابو حذیفہ نے یاسر کی شادی اپنی ایک کنیز سُمَیّہ بنت خَبّاط سے کر دی جن کے بطن سے عمار پیدا ہوئے، جنھیں ابو حذیفہ نے آزاد کر دیا اور ابو حذیفہ کچھ ہی دنوں کے بعد فوت ہو گیا، پھر جیسے ہی اسلام کا ظہور ہوا، یاسر، سمیہ، عمار اور اس کا بھائی عبداللہ بن یاسر سب مسلمان ہو گئے۔ ان کے اسلام لانے پر ان کے موالی بنو مخزوم سخت ناراض ہوئے اور ان

[1] اللّیل 92:5-21. [2] أنساب الأشراف للبلاذري: 1/100 و 157.

پر مصائب کے پہاڑ توڑ دیے۔ وہ انھیں سخت دوپہر کے وقت مکہ کی تپتی زمین پر لٹاتے اور ان کے پہلو بدل بدل کر اذیت دیتے۔[1] [2]

نبی ﷺ اس حالت میں ان کے قریب سے گزرتے تو فرماتے: «صَبْرًا آلَ يَاسِرٍ! فَإِنَّ مَوْعِدَكُمُ الْجَنَّةُ» ''اے آل یاسر! صبر کرو۔ بلاشبہ تمھارا مقام جنت ہے۔''[3]

ایک روز ابوجہل سمیہ رضی اللہ عنہا کے پاس آیا اور بولا: ''تو محمد پر صرف اس لیے ایمان لائی ہے کہ تو اس کے جمال پر فریفتہ ہوگئی ہے۔'' یہ سن کر سمیہ رضی اللہ عنہا نے اسے سخت جواب دیا تو اس نے سمیہ رضی اللہ عنہا کی اندام نہانی میں نیزہ مار کر انھیں قتل کر دیا۔ سمیہ رضی اللہ عنہا عورتوں میں پہلی شہید ہیں۔[4]

سمیہ رضی اللہ عنہا نے اپنے کردار سے ایسی اعلیٰ اور گرانقدر شجاعت کی داستان رقم کی جو کسی اور عورت کے حصے میں نہیں آئی۔ اس میں رہتی دنیا تک آنے والی ہر عورت کے لیے دعوت ہے کہ وہ ان کے نقش قدم پر چلے اور اس کا دل بے ساختہ ان کی پیروی کی طرف مائل ہو۔ سمیہ بنت خباط کی شہادت کے بعد ہر مسلمان عورت پر لازم ہے کہ وہ جان کا نذرانہ پیش کرنے سے پیچھے نہ ہٹے۔[5]

عثمان رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ روایت میں ہے: ''میں نبی ﷺ کے ساتھ بطحا میں چلا جا رہا تھا اور نبی ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا ہوا تھا یہاں تک کہ آپ ﷺ آل یاسر کے پاس پہنچے۔ ابوعمار رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! کیا ہم پر وقت ایسا ہی رہے گا؟'' نبی ﷺ نے فرمایا: «اِصْبِرْ» ''تم صبر سے کام لو۔'' پھر فرمایا: «اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِآلِ يَاسِرٍ وَّقَدْ فَعَلْتَ» ''اے اللہ! آل یاسر کو معاف فرما دے اور یقیناً تو ہی بخشنے والا ہے۔''[6]

1 السيرة النبوية لابن هشام: 68/2. 2 بهجة المحافل للعامري: 92/1. 3 المستدرك للحاكم: 383/3، والحلية الأولياء لأبي نعيم: 140/1، وصحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 98,97.
4 محنة المسلمين في العهد المكي للدكتور سليمان السويكت، ص: 99. 5 التربية القيادية للدكتور الغضبان: 217/1. 6 مسند أحمد: 62/1، و صحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 98، اس حدیث کی سند منقطع ہونے کی بنا پر ضعیف ہے۔

پھر چند ہی دنوں کے بعد یاسر رضی اللہ عنہ ظلم سہتے سہتے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس وقت آل یاسر کو حوصلہ دینے کے سوا کچھ نہ تھا۔ نہ وہ غلام تھے کہ انھیں خرید کر آزاد کر دیا جاتا اور نہ ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اتنی قوت تھی کہ آپ انھیں ظلم و تکالیف سے نجات دلا سکیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت صرف مغفرت اور جنت کی بھرپور خوشخبری سنا سکتے تھے اور صبر کی تلقین کر سکتے تھے تاکہ یہ مبارک خاندان آنے والی نسلوں کے لیے اسوہ بن جائے اور وہ اس نعرے کے ساتھ تاریخ کا حصہ بن جائیں:

''آل یاسر! صبر کرو۔ بلاشبہ تمھارا مقام جنت ہے۔''[1]

عمار رضی اللہ عنہ اپنے ماں باپ کے بعد ایک عرصہ کفار کی طرف سے مختلف عذاب سہتے رہے۔ ان کا شمار مکہ کے اس کمزور طبقے میں ہوتا ہے جن کا وہاں کوئی قبیلہ نہیں تھا جو ان کی حفاظت کرتا اور نہ خود ان کے پاس کوئی طاقت اور دفاعی صلاحیت تھی کہ وہ اپنے آپ کو بچاتے۔ قریش انھیں دوپہر کے وقت مکہ کی تپتی ریت پر لٹاتے تاکہ انھیں ان کے دین سے برگشتہ کیا جا سکے اور بسا اوقات عمار رضی اللہ عنہ کو بھی یہ احساس نہیں رہتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔[2]

ایک دفعہ مشرکین نے ان پر اتنا ظلم کیا کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی برا بھلا کہہ دیا اور ان کے جھوٹے خداؤں کا بھی ذکر خیر کر دیا، پھر جب وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ''معاملہ کیا ہے؟'' عمار رضی اللہ عنہ نے کہا: ''بہت برا ہے۔ واللہ، مجھے مشرکین نے اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک کہ میں نے آپ کی شان میں گستاخی نہیں کی اور ان کے جھوٹے خداؤں کی تعریف نہیں کی۔'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تیرے دل کی حالت کیسی تھی؟'' عمار رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''وہ تو ایمان پر مطمئن تھا۔'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر وہ پھر ایسا کریں تو تو بھی ایسا جواب دے دے۔''[3]

---

1 التربية القيادية للدكتور الغضبان: 218,217/1. 2 محنة المسلمين في العهد المكي للدكتور سليمان السويكت، ص: 100. 3 المستدرك للحاكم: 357/2، و نصب الراية للزيلعي: 158/4، و فقه السيرة للغزالي، ص: 103.

اللہ تعالیٰ کی طرف سے عمار رضی اللہ عنہ کے ایمان کی سچائی پر گواہی نازل ہوئی:

﴿مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَىِٕنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾

''جو شخص اپنے ایمان کے بعد اللہ سے کفر کرے، سوائے اس کے جس پر جبر کیا گیا اور اس کا دل ایمان پر مطمئن تھا لیکن جس نے کفر کے لیے (اپنا) سینہ کھول دیا (راضی خوشی کفر کیا) تو ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔''[1]

عمار رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمام غزوات میں شریک ہوئے۔[2]

بلال اور عمار رضی اللہ عنہما کے واقعات میں عزیمت اور رخصت دونوں کا ثبوت ملتا ہے۔ داعیوں کو چاہیے کہ وہ ان واقعات کا بالاستیعاب مطالعہ کریں اور ہر چیز کو اس کے صحیح مقام پر رکھیں اور افراط و تفریط کے بغیر ان کا باریک فرق قائم رکھیں۔

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی آزمائش

سعد رضی اللہ عنہ اپنی والدہ کی طرف سے آزمائش میں مبتلا ہوئے جو کھانے اور پینے سے اس لیے رک گئی تھی کہ سعد اپنے دین سے برگشتہ ہو جائے۔ امام طبرانی سعد رضی اللہ عنہ کی روایت بیان کرتے ہیں کہ میرے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی، اللہ نے فرمایا:

﴿وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ط﴾

''اور اگر وہ دونوں تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ اس چیز کو شریک ٹھہرائے جس کا تجھے علم نہیں تو ان دونوں کی اطاعت نہ کرنا۔''[3]

سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''میں اپنی والدہ کا فرمانبردار بیٹا تھا۔ جب میں دائرہ اسلام میں

1 النحل 106:16. 2 فقه السيرة للغزالي، ص: 103. 3 العنكبوت 8:29.

داخل ہوگیا تو اس نے کہا: ''اے سعد! یہ کیسا دین ہے جسے تو نے اختیار کرلیا ہے۔ تجھے یہ دین ضرور چھوڑنا پڑے گا، ورنہ میں کچھ کھاؤں گی نہ پیوں گی اور اسی حالت میں مرجاؤں گی اور لوگ تجھے میرا نام لے کر عار دلائیں گے۔ کہا جائے گا یہ اپنی ماں کا قاتل ہے۔'' میں نے کہا: ''میری اماں جان! آپ ایسا قدم نہ اٹھائیں میں کسی صورت اپنا دین نہیں چھوڑ سکتا۔''

سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''میری ماں نے ایک دن اور ایک رات کچھ نہ کھایا اور وہ پریشان نظر آئی، پھر دوسرے دن اور رات بھی نہ کھایا تو زیادہ نڈھال ہوگئی اور جب تیسرے دن اور رات بھی نہ کھایا تو وہ بہت زیادہ نڈھال ہوگئی، پھر اس وقت میں نے کہا: ''اے اماں جان! آپ جانتی ہیں، واللہ! اگر آپ کی سو جانیں بھی ہوتیں اور ایک ایک کرکے سب ختم ہوجاتیں تو بھی میں اپنے اس پیارے دین کو نہ چھوڑتا۔ اب آپ کی مرضی ہے آپ کھانا کھائیں یا نہ کھائیں۔'' یہ سن کر اس نے کھانا شروع کردیا۔''[1]

سیدنا سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''ام سعد نے قسم اٹھائی تھی کہ وہ سعد سے کبھی کلام نہ کرے گی اور نہ کچھ کھائے پیے گی۔ جب تک کہ وہ اپنے دین کا انکار نہ کردے۔ اس نے سعد رضی اللہ عنہ سے کہا تھا: ''تو سمجھتا ہے کہ اللہ نے تجھے اپنے والدین کے بارے میں نیک سلوک کرنے کا حکم دیا ہے اور میں تیری ماں ہوں اور میں تجھے یہ دین چھوڑنے کا حکم دیتی ہوں۔''

سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ تین دن کے بعد وہ نڈھال ہوکر بے ہوش ہوگئی، اس کے ایک اور بیٹے عمارہ نے بڑھ کر اسے پانی پلایا۔ وہ سعد رضی اللہ عنہ کو بددعا دینے لگی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی یہ آیت نازل فرمائی:

﴿ وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۖ وَإِن جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۚ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ○ ﴾

''اور ہم نے انسان کو اپنے والدین سے نیک سلوک کرنے کی وصیت کی اور اگر وہ

[1] صحیح مسلم، حدیث: 1748، وتفسیر ابن کثیر: 3/446.

دونوں تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ اس چیز کو شریک ٹھہرائے جس کا تجھے علم نہیں تو ان دونوں کی اطاعت نہ کرنا، میری ہی طرف تمھیں لوٹ کر آنا ہے، پھر میں تمھیں بتاؤں گا جو کچھ تم عمل کرتے تھے۔''[1]

اور والدین کے بارے میں فرمان باری ہے:

﴿وَ صَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا ﴾

''اور دنیا میں بھلے طریقے سے ان دونوں سے اچھا سلوک کر۔''[2]

سعد رضی اللہ عنہ مزید فرماتے ہیں: ''لوگ جب اسے کھانا کھلاتے تو اس کا منہ ایک چھڑی کی مدد سے کھولتے، پھر اس میں کھانا ڈالتے۔''[3]

سعد رضی اللہ عنہ کی آزمائش بڑی سخت اور ان کا کردار منفرد تھا جو ان کے ایمانی جوش کا پتہ دیتا ہے کہ نتیجہ چاہے کچھ بھی ہو، وہ کسی صورت اپنے ایمان پر سودے بازی نہیں کریں گے۔[4]

مکی دور میں نازل ہونے والی آیات مبارکہ میں اگرچہ ایک مسلم اور اس کے کافر قرابتداروں کے درمیان محبت و تعاون اور دلی دوستی ناجائز قرار دی گئی ہے مگر کفار کے ساتھ صلہ رحمی، اچھے سلوک اور احسان کا درس دیا گیا ہے، جبکہ دلی دوستی ممنوع ہے کیونکہ دلی دوستی تو صرف اللہ، اس کے رسول، دین اور اہل ایمان کے ساتھ ہوتی ہے۔[5]

مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی آزمائش

مصعب بن عمیر نازونعم میں پلنے والے بہت خوش پوش نوجوان تھے۔ ان کے ماں باپ ان سے حد درجہ محبت کرتے تھے۔ ان کی ماں ایک مالدار خاتون تھیں جو انھیں باریک اور بہت عمدہ لباس پہناتیں۔ وہ مکہ کے سب سے زیادہ خوشبو لگانے والے اور حضرمی جوتا

1 العنكبوت 29:8. 2 لقمٰن 31:15. 3 صحيح مسلم، حديث:(44)-1748 قبل الحديث: 2413. و جامع الترمذي، حديث: 3189. 4 محنة المسلمين في العهد المكي للدكتور سليمان السويكت، ص: 106. 5 الولاء و البراء لمحمد سعيد القحطاني، ص: 175,174.

پہننے والے تھے۔[1]

مصعب رضی اللہ عنہ کی والدہ ان کا حد درجہ خیال رکھتی۔ وہ سوئے ہوتے تو وہ کھجور، پنیر اور گھی سے تیار کردہ حلوہ ایک برتن میں تیار رکھتی جیسے ہی مصعب نیند سے بیدار ہوتے تو وہ حلوہ کھاتے۔[2]

جب مصعب رضی اللہ عنہ کو علم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دار ارقم میں تشریف فرما ہیں اور اسلام کی دعوت دے رہے ہیں تو وہ وہاں پہنچے۔ دین حق کی تعلیمات سن کر مسلمان ہوگئے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی تصدیق کی۔ انھوں نے اپنی ماں اور قوم کے ڈر سے اپنا اسلام مخفی رکھا لیکن مسلسل اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے۔ ایک دن عثمان بن طلحہ نے انھیں نماز پڑھتے دیکھ لیا تو ان کی ماں اور قبیلے والوں کو خبر کر دی۔[3]

قبیلے والوں نے مُصعَب رضی اللہ عنہ کو پکڑ کر قید میں ڈال دیا، وہ اسی حالت میں رہے حتی کہ موقع پا کر حبشہ کی طرف پہلی ہجرت میں شریک ہوگئے۔[4]

سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''میں نے مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ اسلام لانے کی وجہ سے سخت مصائب و مشکلات کا شکار رہے اور نڈھال ہوگئے تھے اور میں نے دیکھا ان کی جلد سانپ کی جلد کی طرح اڑی ہوئی تھی، پھر ہم انھیں پالان پر بٹھاتے تو بڑی مشکل سے بٹھا پاتے تھے۔[5]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی مصعب رضی اللہ عنہ کا تذکرہ فرماتے تو کہتے:

«مَا رَأَيْتُ بِمَكَّةَ أَحَدًا أَحْسَنَ لِمَّةً وَّلَا أَرَقَّ حُلَّةً، وَّلَا أَنْعَمَ نِعْمَةً مِّنْ مُّصْعَبِ بْنِ عُمَيْرٍ»

1 الطبقات الكبرى لابن سعد: 116/3. 2 الروض الأنف للسهيلي: 195/2. 3 سير أعلام النبلاء: 10/3-12. 4 محنة المسلمين في العهد المكي للدكتور سليمان السويكت، ص: 107. 5 السير و المغازي لابن إسحاق، ص: 193.

''میں نے مکہ میں عمدہ زلفوں، نرم و گداز لباس اور عمدہ ترین نعمتوں میں بسنے والا مصعب بن عمیر سے بڑھ کر کوئی نہیں دیکھا۔''[1]

مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ آزمائشیں اور مصائب جھیلنے، جسمانی کمزوری اور اپنوں کے ظلم کے باوجود صحابۂ کرام کے دوش بدوش بھلائی، فضیلت اور اللہ کے راستے میں جہاد جیسی عظمتوں کو حاصل کرتے رہے حتی کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں غزوۂ احد میں شہادت سے سرفراز فرمایا۔[2]

مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نعمتوں میں پلنے والے خوشحال نوجوانوں کے لیے اسلامی تربیت کا انمول اسوہ بنے۔ اسلام لانے کے بعد انھوں نے کمزوری اور سستی نہ دکھائی اور نہ انھیں نفسانی خواہشات دبا سکیں کہ وہ دھوکا دینے والی دنیا کے دوزخ میں جا گرتے۔[3]

مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے جب دین اسلام اختیار کرلیا تو اپنے ماضی کی ہر آسائش، لذت اور خوشگواری کو خیر باد کہہ دیا اور اسلام پر بیعت کرلی۔ راہ حق میں انھیں آزمائش کے راستے سے گزرنا پڑا تاکہ ان کا ایمان مضبوط اور یقین محکم ہو جائے۔

مصعب رضی اللہ عنہ اپنی زندگی سے انتہائی مطمئن اور خوش تھے، حالانکہ ان کے اردگرد مظالم اور خطرات منڈلا رہے تھے۔ ان پر فقر، تنگی اور ظلم وجور کا باب کھل چکا تھا اور وہ ہر قسم کی راحت اور فارغ البالی سے محروم ہو چکے تھے۔[4]

مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے فقر، مقام و مرتبہ سے محرومی، اہل خانہ، قریبی رشتہ داروں اور خاندان کی طرف سے مخالفت، بھوک، ظلم اور وطن سے دوری جیسی آزمائشوں کا مقابلہ کیا اور دین و ایمان کی بدولت کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ وہ دل کی گہرائیوں تک مطمئن اور پہاڑوں کی طرح مضبوط تھے۔[5]

---

1 المستدرك للحاكم: 221/3، امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کی سند کے متعلق سکوت اختیار کیا ہے۔ 2 محنة المسلمين في العهد المكي للدكتور سليمان السويكت، ص: 108. 3 مصعب بن عمير لمحمد حسن بريغش، ص: 105. 4 مصعب بن عمير لمحمد حسن بريغش، ص: 105-107. 5 مصعب بن عمير لمحمد حسن بريغش، ص: 126.

خَبّاب بن اَرَتّ رضی اللہ عنہ کا دورِ ابتلا

خباب رضی اللہ عنہ لوہار تھے۔ مکہ میں رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ابتدا ہی میں انھیں ہدایت سے سرفراز فرما دیا تھا۔ وہ دار ارقم (کے مرکز بننے) سے پہلے ہی مسلمان ہو چکے تھے۔[1]

وہ مکہ کے کمزور مسلمانوں میں سے تھے جنھیں ان کے دین سے برگشتہ کرنے کے لیے ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور یہ ظلم اس حد تک پہنچ گیا کہ مشرکین انھیں پشت کے بل گرم پتھر پر لٹا دیتے حتی کہ ان کی پیٹھ کی چربی پگھل گئی۔[2]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم خَبّاب سے محبت کرتے تھے اور ان کے مسلمان ہونے کے بعد ان کی خبر گیری کے لیے تشریف لے جاتے۔ جب خباب رضی اللہ عنہ کی مالکہ ام انمار خزاعیہ کو ان کے اسلام لانے کی خبر ہوئی تو اس نے لوہے کا ایک ٹکڑا گرم کیا اور خباب رضی اللہ عنہ کے سر پر رکھ دیا۔ خباب رضی اللہ عنہ نے اس کی شکایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «اَللّٰهُمَّ انْصُرْ خَبَّابًا» ”اے اللہ! خباب کی مدد فرما۔“

اس کے بعد اُم اَنمار کے سر میں تکلیف ہوگئی اور وہ کتوں کے ساتھ بھونکتی۔ اس سے کہا گیا کہ اپنے سر پر داغ لگاؤ۔ وہ خباب رضی اللہ عنہ کے پاس آئی اور داغ لگانے کو کہا۔ خباب رضی اللہ عنہ نے وہی لوہے کا ٹکڑا لیا جسے وہ گرم کر کے خباب رضی اللہ عنہ کو لگایا کرتی تھی، اسے گرم کیا اور اس کے سر پر لگایا۔ اس قصے میں صاحب بصیرت احباب کے لیے عبرت کا سامان ہے۔

اللہ تعالیٰ کی مدد اللہ کے صابر و ایماندار بندوں کے کس قدر قریب ہے! دیکھیں کس طرح وہ خود بخود خباب رضی اللہ عنہ کے پاس آئی کہ وہ اس کے سر پر گرم لوہے سے داغ لگائیں۔[3]

جب مشرکین کا کمزور مسلمانوں پر ظلم و تشدد انتہا کو پہنچ گیا اور انھیں سخت آزمائشوں کا

---

1 سير أعلام النبلاء: 479/2. 2 محنة المسلمين في العهد المكي للدكتور سليمان السويكت، ص: 95. 3 أسد الغابة: 315/1، ومحنة المسلمين في العهد المكي للدكتور سليمان السويكت، ص: 96.

سامنا کرنا پڑا تو خباب رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اس وقت آپ ﷺ کعبۃ اللہ کے سایے میں اپنی چادر کا سرہانہ بنائے (لیٹے) ہوئے تھے، چنانچہ خباب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''کیا آپ ہمارے لیے (اللہ کی) مدد طلب نہیں کریں گے؟ کیا آپ ہمارے حق میں دعا نہیں کریں گے؟'' نبی ﷺ اٹھ کر بیٹھ گئے، آپ کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا کہ فرمایا:

«كَانَ الرَّجُلُ فِيمَنْ قَبْلَكُمْ يُحفَرُ لَهُ فِي الْأَرْضِ، فَيُجْعَلُ فِيهِ، فَيُجَاءُ بِالْمِيشَارِ فَيُوضَعُ عَلٰى رَأْسِهِ فَيُشَقُّ بِاثْنَتَيْنِ، وَمَا يَصُدُّهُ ذٰلِكَ عَنْ دِينِهِ، وَيُمْشَطُ بِأَمْشَاطِ الْحَدِيدِ مَادُونَ لَحْمِهِ مِنْ عَظْمٍ أَوْ عَصَبٍ وَّمَا يَصُدُّهُ ذَالِكَ عَنْ دِينِهِ، وَاللّٰهِ! لَيَتِمَّنَّ هٰذَا الْأَمْرُ حَتّٰى يَسِيرَ الرَّاكِبُ مِنْ صَنْعَاءَ إِلٰى حَضْرَمَوْتَ لَا يَخَافُ إِلَّا اللّٰهَ أَوِ الذِّئْبَ عَلٰى غَنَمِهِ وَلٰكِنَّكُمْ تَسْتَعْجِلُونَ»

''تم سے پہلے لوگوں کے ساتھ تو یہ ہوتا تھا کہ ایک آدمی کو لایا جاتا اس کے لیے زمین میں گڑھا کھودا جاتا۔ اسے اس میں ڈال کر آرا لایا جاتا اور اس کے سر پر رکھ کر دو ٹکڑے کر دیا جاتا۔ یہ سارا ظلم اسے اس کے دین سے روک نہ سکا۔ اسی طرح لوہے کی کنگھیوں سے گوشت، ہڈیوں اور پٹھوں سے نوچ لیا جاتا، پھر بھی کسی کو اس کے دین سے روکا نہ جاسکا۔ اللہ کی قسم! یہ دین کا معاملہ ضرور مکمل ہوگا یہاں تک کہ ایک سوار صنعاء سے حضرموت کا سفر اس طرح طے کرے گا کہ وہ صرف اللہ سے ڈرے گا یا صرف بھیڑیے سے کہ اس کی بکری نہ پھاڑ کھائے لیکن تم جلد بازی سے کام لے رہے ہو۔''[1]

دکتور سلمان عودہ حفظہ اللہ اس حدیث میں ایک باریک نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''سبحان اللہ! کیا وجہ تھی کہ مصطفیٰ ﷺ کا چہرہ سرخ ہوگیا، آپ اٹھ کر بیٹھ گئے اور

[1] صحيح البخاري، حديث:3612، ومسند أحمد:5/109-111، وسنن أبي داود، حديث:2649.

اپنے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے پرزور اور مؤثر طریقے سے خطاب فرمایا، پھر ان کی جلد بازی پر سرزنش کی۔ کیا یہ سب اس لیے تھا کہ انھوں نے نبی ﷺ سے اللہ کے حضور مدد کی درخواست کے لیے کہا تھا؟ ہرگز نہیں! نبی ﷺ قطعاً سخت مزاج نہیں تھے۔ آپ تو اپنی امت کے لیے شفیق اور مہربان تھے۔ دراصل صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف سے سوالات کا یہ انداز کہ کیا آپ ہمارے لیے دعا نہیں کریں گے؟ کیا آپ ہمارے لیے مدد طلب نہیں کریں گے؟ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ ان کے دل کی گہرائیوں سے اٹھے تھے کیونکہ ظلم و تشدد نے انھیں نڈھال کر دیا تھا اور مسلسل جدوجہد اور آزمائش نے انھیں کمزور اور خستہ حال کر دیا تھا۔ وہ جلد از جلد مشکلات سے چھٹکارا چاہتے تھے اور اللہ کی مدد کو دور خیال کرتے ہوئے دعا کے طلبگار ہوئے، جبکہ نبی ﷺ خوب جانتے تھے کہ ہر کام اپنے وقت پر ہونے والا ہے اور اس کے خاص اسباب ہیں اور مدد سے پہلے آزمائش شرط ہے۔ رسولوں کی پہلے آزمائش ہوتی ہے، پھر اچھا انجام ان کے لیے مقدر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَآءُ ۭ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ۝﴾

”حتی کہ جب رسول مایوس ہو گئے اور وہ (لوگ) گمان کرنے لگے کہ انھیں خلاف واقعہ خبر دی گئی ہے تو ان (انبیاء و رسل) کے پاس ہماری مدد آ پہنچی، پھر نجات ملی اسے جسے ہم نے چاہا اور مجرم قوم سے ہمارا عذاب ٹالا نہیں جاتا۔“ [1]

نبی ﷺ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات و واقعات کی طرف دیکھ کر اندازہ لگایا کہ وہ ظلم کی چکی میں پسنے کی وجہ سے تنگ آ چکے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ دین سے برگشتہ ہو جائیں اور ان پر کافر غالب آ جائیں اور ممکن ہے ان میں سے بعض ظلم کی تاب نہ لاتے ہوئے ہلاک ہو جائیں۔

1 یوسف 110:12.

کسی بھی آدمی کے لیے یہ آسان نہیں کہ وہ صرف کتابوں سے پڑھ کر صحابہ کی حقیقتِ حال جان سکے کہ انھوں نے کن حالات میں دعا و مدد کی درخواست کی تھی یا پھر ان کے دل میں اٹھنے والے خیالات و احساسات کا اندازہ کر سکے۔ یہ صرف اس وقت ممکن ہے کہ وہ بھی ایسے حالات سے دوچار ہو اور انھی کی طرح اللہ کے راستے میں مصائب برداشت کرے۔

نبی ﷺ نے ان خطوط پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تربیت فرمائی:

اللہ تعالیٰ کے راستے میں مصائب برداشت کرتے ہوئے سابقہ انبیاء اور رسولوں اور ان کے پیروکاروں کی اقتدا کرنا۔ نبی ﷺ اس سلسلے میں سابقہ انبیاء کے قصص بیان فرماتے تھے۔

اہل ایمان کے دلوں میں جنت میں تیار نعمتوں کی رغبت پیدا کرنا اور کافروں کو میسر دنیاوی زیب و زینت کے دھوکے میں نہ آنا۔

مستقبل پر نگاہ رکھنا کہ اللہ اسلام کو دنیا میں اپنی مدد سے نوازے گا اور اہل کفر اور نافرمانوں کو رسوا کرے گا۔

یہاں یہ بات بطور خاص قابل ذکر ہے کہ مذکورہ تمام روحانی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ نبی ﷺ مختلف قسم کے مادی ذرائع بھی بروئے کار لاتے اور اس سلسلے میں مکمل منصوبہ بندی فرماتے تاکہ آپ کے پیروکار ظلم و اذیت سے چھٹکارا پائیں اور مشرکین کے فتنوں سے محفوظ رہیں اور ایک ایسی ریاست قائم ہو جائے جس میں ہر مسلمان کو اپنی مرضی کے مطابق اپنے رب کی عبادت کے مواقع میسر ہوں اور دعوت الی اللہ کے راستے میں حائل تمام رکاوٹیں دور ہو جائیں۔[1]

خباب رضی اللہ عنہ نے مشرکین کی طرف سے ملنے والی ایذاؤں، بدسلوکی اور حقوق چھیننے کا ذکر کیا۔ وہ یہ سب کچھ انھیں کفر کی طرف لوٹانے کے لیے کرتے تھے۔ خبّاب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''میں ایک لوہار پیشہ آدمی تھا۔ میری عاص بن وائل کے ذمے کچھ رقم تھی۔ میں اس کے

1 الغرباء الأولون للدكتور سلمان العودة، ص:145,146.

پاس گیا تا کہ اپنی رقم وصول کرسکوں۔ اس نے کہا: ''میں تجھے اس وقت تک تیری رقم ادا نہیں کروں گا جب تک کہ تو محمد (ﷺ کی رسالت) کا کفر نہ کرے۔'' میں نے جواب دیا: ''تو مر کر دوبارہ بھی زندہ ہو جائے، پھر بھی میں کفر نہ کروں گا۔'' اس نے کہا: ''کیا مجھے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جائے گا؟ اگر اس طرح ہوگا تو سن لے! اس وقت مجھے میرا مال اور میری اولاد لوٹائی جائے گی اور میں تیری رقم واپس کردوں گا۔'' عاص بن وائل کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ اَفَرَءَیْتَ الَّذِیْ كَفَرَ بِاٰیٰتِنَا وَقَالَ لَاُوْتَیَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا ۝ اَطَّلَعَ الْغَیْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ۝ كَلَّا ۚ سَنَكْتُبُ مَا یَقُوْلُ وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ۝ وَّنَرِثُهٗ مَا یَقُوْلُ وَیَاْتِیْنَا فَرْدًا ۝﴾

''پھر آپ اس شخص کے بارے میں بتلایئے جس نے ہماری آیات کا انکار کیا اور کہا: مجھے ضرور مال اور اولاد دی جائے گی، کیا اس نے غیب کی اطلاع پا لی یا رحمٰن کے ہاں کوئی عہد لے لیا ہے؟ ہرگز نہیں! ہم ضرور لکھیں گے جو کچھ وہ کہتا ہے اور ہم اس کے لیے عذاب بہت بڑھا دیں گے اور ان چیزوں کے ہم وارث ہوں گے جو وہ کہتا ہے اور وہ ہمارے پاس اکیلا آئے گا۔''[1]

کہا جاتا ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں خباب رضی اللہ عنہ سے اللہ تعالیٰ کے راستے میں پہنچنے والی تکالیف کے متعلق سوال کیا تو خباب رضی اللہ عنہ نے اپنی پشت سے کپڑا اٹھایا جو پھلبہری کی طرح ہو چکی تھی۔ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تو نے اس دن جیسا سخت دن نہ دیکھا ہوگا۔'' خباب رضی اللہ عنہ بولے: ''اے امیر المومنین! انھوں نے میرے سامنے آگ جلائی، پھر مجھے اس میں جھونک دیا اور ایک آدمی نے اپنا پاؤں میرے سینے پر رکھا۔ آگ میری چربی سے بجھی اور زمین میری پشت کی وجہ سے ٹھنڈی ہوگئی۔''[2]

1 مريم19:77-80 2 الروض الأنف للسهيلي:2/98.

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی آزمائش

تبلیغ کے لیے لوگوں سے میل جول میں نبی ﷺ کا طریقۂ کار حکیمانہ تھا۔ آپ بڑے لوگوں اور قبائلی سرداروں سے بڑی نرمی اور پیار سے گفتگو فرمایا کرتے تھے اور اسی طرح بچوں سے شفقت کے ساتھ پیش آتے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کے ساتھ ملاقات کا ایک عمدہ قصہ بیان فرماتے ہیں کہ میرے لڑکپن کا زمانہ تھا۔ میں عُقبہ بن ابی معیط کا غلام تھا اور اس کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔ ایک دن رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ میرے پاس آئے اور کہا: ''اے لڑکے! کیا تیرے پاس دودھ ہے؟ میں نے کہا، ہاں لیکن یہ تو میرے پاس امانت ہے۔'' نبی ﷺ نے فرمایا: «هَلْ مِنْ شَاةٍ لَّمْ يَنْزُ عَلَيْهَا فَحْلٌ؟» ''کیا تیرے پاس ایسی بکری ہے جس سے نر نے جفتی نہ کی ہو؟'' میں ایسی بکری آپ ﷺ کے پاس لے آیا۔ آپ نے اس کے تھن پر ہاتھ پھیرا تو دودھ اتر آیا اور انھوں نے اسے ایک برتن میں دوہ لیا، پھر آپ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے وہ دودھ پیا اور تھن سے کہا: «اِقْلِصْ» ''سکڑ جا۔'' تو وہ سکڑ گیا۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پھر میں ان کے پاس آیا اور کہا: ''اے اللہ کے رسول! مجھے بھی یہ مبارک کلام سکھا دیجیے۔'' آپ ﷺ نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا: «يَرْحَمُكَ اللّٰهُ، فَإِنَّكَ غُلَيِّمٌ مُّعَلَّمٌ» ''اللہ تجھ پر رحمت فرمائے۔ بلاشبہ تو چھوٹی سی عمر میں بڑا پڑھا لکھا بچہ ہے۔''[1]

اس طرح دو جملے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کا سبب بنے، پہلا وہ جو خود عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: ''یہ میرے پاس امانت ہے۔'' اور دوسرا وہ جو نبی ﷺ صادق ومصدوق نے ارشاد فرمایا: ''بلاشبہ تو چھوٹی سی عمر میں بڑا پڑھا لکھا بچہ ہے۔''

1 مسند أحمد: 379/1 و462، ومسند أبي يعلى، حديث: 4985، و مسند أبي داود الطيالسي، حديث: 353، وحلية الأولياء لأبي نعيم: 125/1، والبداية والنهاية: 32/3، وسير أعلام النبلاء: 465/1.

ان دو جملوں کا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی زندگی میں بڑا عمل دخل تھا۔ بعدازاں وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے جید علمائے کرام کی صف میں شمار ہوئے۔ وہ اہل ایمان کے قافلے میں شامل ہوگئے اور اس بتکدے میں شرک کا قلع قمع کرتے نظر آنے لگے۔ وہ ان ابتدائی ایمان لانے والوں میں سے تھے جن کی اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مدح سرائی فرمائی ہے۔[1]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرماتے ہیں: ''وہ اسلام میں مسابقت کرنے والوں میں سے ایک تھے، ابتدائی دور ہی میں مسلمان ہوئے اور دونوں ہجرتیں کیں۔ بدر اور دیگر تمام غزوات میں شرکت کی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ رہے اور وہ آپ کے نعلین مبارک اٹھانے والے تھے۔''[2]

سب سے پہلے بلند آواز سے قرآن مجید پڑھنے کی سعادت: باوجودیکہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کسی کے حلیف تھے، ان کا اپنا کوئی قبیلہ نہ تھا جو ان کی حفاظت کرتا اور وہ خود کمزور جسم اور باریک پنڈلیوں والے تھے، ان کی شجاعت اور قوت ارادی میں کوئی کمی نہ آئی۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے دعوتی سلسلے میں کارنامے قابل فخر ہیں۔ ان میں سے ایک کارنامہ وہ تھا جو مکہ میں دعوت اسلامی کے ظہور کے بعد پیش آیا اور قریش نے ان پر بہت ظلم کیا۔ وہ سرداران قریش کے پاس کھڑے ہوکر بلند آواز سے قرآن کی تلاوت کرنے لگے اور اس طرح انھوں نے ان کفار کے بند کانوں اور مُقفّل دلوں پر ضرب لگائی۔[3]

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مکہ میں سب سے پہلے بلند آواز سے قرآن کریم کی تلاوت کی۔ ہوا یوں کہ ایک دن سب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جمع تھے، انھوں نے کہا: ''واللہ! قریش نے آج تک بلند آواز سے قرآن نہیں سنا۔ کون ہے جو انھیں قرآن سنائے؟'' عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں: ''میں۔'' انھوں نے کہا: ''ہمیں آپ کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے ہم تو ایسا آدمی چاہتے ہیں جس کا کوئی اپنا خاندان ہو۔ اگر قریش اس سے

1 عبداللّٰہ بن مسعود لعبد الستار الشیخ، ص: 43. 2 الإصابة: 214/6. 3 عبداللّٰہ بن مسعود لعبد الستار الشیخ، ص: 45.

بدسلوکی کریں تو اس کا خاندان اس کا دفاع کر سکے۔'' عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: ''آپ مجھے چھوڑ دیں۔ میری اللہ حفاظت فرمائے گا۔'' عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ چاشت کے وقت مقام ابراہیم کے پاس پہنچے۔ قریشی اپنی مجلسوں میں بیٹھے تھے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے مقام ابراہیم کے پاس کھڑے ہوکر تلاوت شروع کی اور بلند آواز سے کہا:

﴿ اَلرَّحْمٰنُ ۙ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝ ﴾

''(اللہ) رحمٰن نے، قرآن سکھایا۔''[1]

پھر وہ کفار کی طرف بڑھے اور آیات پڑھتے چلے گئے۔ قریش نے ان کی آواز پر دھیان دیا اور کہنے لگے: ''یہ ابن ام عبد کیا کہہ رہا ہے؟'' پھر بولے: ''یہ تو اس کلام کی تلاوت کر رہا ہے جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) لے کر آیا ہے۔'' وہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرف بڑھے اور ان کے چہرے پر مارنا شروع کر دیا۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ مسلسل پڑھتے چلے گئے اور جتنا ممکن تھا پڑھا، پھر وہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس واپس آئے تو ان کے چہرے پر زخموں کے نشانات تھے۔ صحابہ نے کہا: ''اس بات سے ہم ڈرتے تھے۔'' عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''اب مجھے اللہ کے دشمنوں کی کوئی پروا نہیں۔ اگر تم چاہو تو میں کل دوبارہ اسی طرح کر سکتا ہوں۔'' انھوں نے کہا: ''نہیں، بس اتنا ہی کافی ہے۔ آپ نے کفار کو وہ کلام سنا دیا ہے جو وہ سننا نہیں چاہتے۔''[2]

اس طرح عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وہ شخص تھے جنھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مکہ میں سب سے پہلے بلند آواز سے قرآن کی تلاوت کی اور بلاشبہ ان کا یہ کارنامہ قریش کے لیے ایک عملی چیلنج تھا جس کا جواب دینے کے وہ متحمل نہ ہو سکے۔ دیکھا جائے تو کفار کی طرف سے اذیت پانے کے باوجود یہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی جرأت و دلیری کا بیّن ثبوت ہے۔[3]

---

1 الرحمٰن 55:1،2. 2 السيرة النبوية لابن هشام: 1/314،315، وأسد الغابة: 3/385،386. 3 محنة المسلمين في العهد المكي للدكتور سليمان السويكت، ص: 88.

خالد بن سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کی آزمائش

خالد رضی اللہ عنہ ابتدائی زمانے ہی میں مسلمان ہوگئے تھے۔ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے وقت خواب دیکھا تھا کہ وہ آگ کے گڑھے پر ہیں اور وہاں ایک آدمی انھیں آگ میں پھینکنا چاہتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم انھیں بچانا چاہتے ہیں۔ وہ گھبرا کر نیند سے اٹھے اور یقین کرلیا کہ یہ خواب برحق ہے۔ انھوں نے یہ خواب جب سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو سنایا تو انھوں نے ان سے فرمایا: ''میں تمھاری بھلائی کا ارادہ رکھتا ہوں یہاں اللہ کے رسول موجود ہیں۔ تم ان کی اتباع کرلو۔'' خالد وہاں پہنچے اور مسلمان ہوگئے۔ اپنے باپ سے ڈرتے ہوئے انھوں نے اپنا اسلام مخفی رکھا لیکن جب بکثرت گھر سے غائب رہنے لگے تو ان کے باپ کو علم ہوگیا، چنانچہ ایک روز اس نے اپنے دوسرے بیٹوں کو، جو ابھی اسلام نہیں لائے تھے، بھیجا تاکہ خالد رضی اللہ عنہ کو پکڑ کر لائیں۔ وہ انھیں لے کر آئے تو باپ نے انھیں ڈانٹا اور اس کے ہاتھ میں کوڑا یا لاٹھی جو بھی تھا اس سے اتنا مارا کہ لاٹھی ان کے سر پر ٹوٹ گئی، پھر انھیں مکہ میں قید کرلیا اور ان کے بھائیوں کو ان سے کلام کرنے سے منع کردیا اور ان کے عمل (قبول اسلام) سے بچنے کی تلقین کی، پھر اس نے خالد رضی اللہ عنہ کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی، انھیں بھوکا رکھا اور تین دن پانی نہ پینے دیا۔ لیکن خالد رضی اللہ عنہ نے صبر سے کام لیا اور اجر کی امید رکھی، پھر ان کے باپ نے کہا: ''واللہ! میں تیری خوراک بھی بند کردوں گا۔'' خالد رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''اگر آپ میری خوراک بند کردیں گے تو اللہ مجھے رزق عطا فرمائے گا جس سے میں زندہ رہوں گا۔'' آزادی پاتے ہی وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آگئے۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت کرتے تھے اور آپ کے ساتھ رہتے تھے، پھر جب مسلمان دوسری بار ہجرت کے لیے حبشہ جانے لگے تو انھوں نے ان کے ہمراہ ہجرت کی۔[1]

1 سیر أعلام النبلاء:260/1.

عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی آزمائش

جب عثمان رضی اللہ عنہ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تو ان کے قبیلے بنو جُمَح نے انھیں اذیتیں دیں۔ ان کا سب سے بڑا مخالف اور اذیتیں دینے والا امیہ بن خلف تھا، اسی لیے انھوں نے ہجرت حبشہ کے وقت امیہ بن خلف کو ڈانٹتے ہوئے یہ اشعار کہے تھے:

أَخْرَجْتَنِي مِنْ بَطْنِ مَكَّةَ آثِمًا ... وَأَسْكَنْتَنِي فِي صَرْحِ بَيْضَاءَ تَقْذَعُ

تَرِيشُ نِبَالًا لَا يُوَاتِيكَ رِيشُهَا ... وَتَبْرِي نِبَالًا رِيشُهَا لَكَ أَجْمَعُ

وَحَارَبْتَ أَقْوَامًا كِرَامًا أَعِزَّةً ... وَأَهْلَكْتَ أَقْوَامًا بِهِمْ كُنْتَ تَفْزَعُ

سَتَعْلَمُ إِنْ نَابَتْكَ يَوْمًا مُلِمَّةٌ ... وَأَسْلَمَكَ الْأَوْبَاشُ مَا كُنْتَ تَصْنَعُ

”کیا تو نے گناہ کرتے ہوئے مجھے وادی مکہ سے نکال دیا اور مجھے سفید محل میں رہنے پر مجبور کر کے گالیاں بک رہا ہے۔ تو تیروں کو پر لگاتا ہے اور تجھے تیرا یہ عمل موافق نہ آئے گا۔ تو تیر بناتا ہے جس کے سارے پر تیرے لیے ہیں۔ تو نے ایسی قوم سے لڑائی مول لی ہے جو عزت دار ہیں اور ایسی قوم سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے جن کی طرف تو پناہ لیتا تھا۔ اگر تجھے کسی دن کوئی مصیبت آئے تو تجھے کمینے لوگ اسی طرح چھوڑ کر چلے جائیں جس طرح تو کیا کرتا ہے۔“[1]

عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کچھ دیر حبشہ مقیم رہے، پھر ان لوگوں کے ساتھ وہ بھی واپس مکہ آ گئے جو پہلی ہجرت حبشہ کے بعد واپس لوٹ آئے تھے۔ مجبوراً وہ ولید بن مغیرہ کی پناہ لیے قلعے میں داخل ہوئے اور اس کی پناہ میں امن و سکون کے ساتھ رہنے لگے لیکن جب انھوں نے خود کو محفوظ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے دیگر اصحاب کو آزمائش میں مبتلا دیکھا تو انھیں اچھا نہ لگا، چنانچہ انھوں نے کہا:

1 السيرة النبوية للذهبي، ص: 112.

’’واللہ! میری صبح و شام تو مشرک آدمی کی پناہ کی وجہ سے محفوظ ہو اور میرے دوسرے دینی بھائی آزمائش اور تکالیف میں مبتلا ہوں۔ یہ تو میرے لیے بڑے عیب کی بات ہے۔‘‘ [1]

عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ ولید بن مغیرہ کے پاس گئے اور کہا: ’’اے ابوعبدشمس! تیرا ذمہ پورا ہوگیا۔ اب میں تیری پناہ واپس کرنا چاہتا ہوں۔‘‘ اس نے کہا: ’’میرے بھتیجے! آخر کیوں؟‘‘ تجھے کسی نے تکلیف دی ہے یا تیری عزت پامال کی ہے۔‘‘ عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: ’’نہیں، میں اب صرف اپنے اللہ کی پناہ پر راضی رہنا چاہتا ہوں اور اس کے سوا کسی کی پناہ میں نہیں آنا چاہتا۔‘‘ اس پر ولید نے کہا: ’’تو مسجد حرام میں جا اور لوگوں کے سامنے جس طرح میں نے تجھے پناہ میں لیا تھا، اس طرح میری پناہ واپس کردے۔‘‘ دونوں مسجد حرام میں پہنچے اور عثمان رضی اللہ عنہ نے ولید کی پناہ لوٹا دی، پھر عثمان ایک قریشی مجلس میں پہنچے، وہاں شاعر لَبید بن ربیعہ اپنے اشعار پڑھ کر سنا رہا تھا، لبید نے کہا:

«أَلَا كُلُّ شَيْءٍ مَّا خَلَا اللّٰهَ بَاطِلُ»

’’خبردار! اللہ کے سوا ہر چیز باطل ہے۔‘‘ تو عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: ’’تو نے سچ بولا۔‘‘ لبید شعر سناتا چلا گیا، اس نے کہا:

«وَكُلُّ نَعِيمٍ لَّا مَحَالَةَ زَائِلُ»

’’اور ہر نعمت آخر کار ضرور ختم ہونے والی ہے۔‘‘

عثمان رضی اللہ عنہ بولے: ’’تو نے جھوٹ کہا، جنت کی نعمتیں کبھی ختم نہ ہوں گی۔‘‘ لبید نے کہا: ’’اے قریشیو! اس سے پہلے تو تمھارے ہاں مہمان کی اس طرح تذلیل نہیں ہوتی تھی؟‘‘ ایک آدمی بولا: ’’دراصل یہ ان ناسمجھ لوگوں میں سے ہے جنھوں نے ہمارے دین کو چھوڑ دیا ہے۔ آپ اس کی بات کا برا نہ مانیں۔‘‘ لیکن عثمان رضی اللہ عنہ نے دوبارہ اپنی بات دہرائی

1 السيرة النبوية لابن هشام: 120/2.

اور معاملہ بگڑ گیا تو اسی آدمی نے بڑھ کر عثمان رضی اللہ عنہ کو تھپڑ مارا جس سے ان کی آنکھ سوج گئی۔ ولید، عثمان رضی اللہ عنہ کو قریب سے بیٹھا دیکھ رہا تھا، اس نے کہا: ''اے میرے بھتیجے! تیری یہ آنکھ اس چوٹ سے محفوظ تھی اور تو بلاشبہ ایک محفوظ پناہ گاہ میں تھا۔'' عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: ''واللہ! میری دوسری آنکھ بھی اللہ کے راستے میں ایسی ہی تکلیف برداشت کرنے کی خواہش مند ہے۔ ابو عبد شمس! میں اس ذات کی پناہ میں ہوں جو تجھ سے زیادہ طاقتور اور قدرت رکھنے والا ہے۔'' ولید نے دوبارہ اپنی پناہ کی پیشکش کی جسے عثمان رضی اللہ عنہ نے ٹھکرا دیا۔[1]

عثمان رضی اللہ عنہ کے کردار سے ان کی ایمانی قوت، اجر حاصل کرنے کا شوق اور اللہ کے ہاں ان کے ثواب کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، چنانچہ جب وہ انتقال کر گئے تو ام العلاء انصاریہ رضی اللہ عنہا نے خواب میں دیکھا کہ عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے ایک چشمہ ہے جو زور شور سے بہہ رہا ہے۔ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور خواب بیان کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «ذٰلِكَ عَمَلُهُ» ''یہ اس کے عمل کا صلہ ہے۔''

ام العلاء رضی اللہ عنہا وہ خاتون ہیں کہ جب مہاجرین کو مدینہ میں قرعہ اندازی کے ذریعے پناہ گاہیں فراہم کی گئیں تو عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ ان کے گھر ٹھہرے تھے۔[2]

علاوہ ازیں بہت سے دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی اللہ کے راستے میں اذیتیں برداشت کیں اور بہت سے قریشی نوجوان جنھوں نے اپنے آباء و اجداد اور دیگر رشتہ داروں کے سخت رویے کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو بسر و چشم قبول کیا، اس پر عمل کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع ہو گئے، انھوں نے اپنے متشدد آباء و اجداد اور عزیز و اقارب کے موقف کے برعکس اللہ سے اجر و ثواب کی امید پر اسلام لانے سے قبل دستیاب تمام سہولتوں کو خیرباد کہہ دیا اور آزمائش و ابتلا سے دوچار ہوئے اور اذیتیں برداشت کیں۔ جب ایمان دل کی گہرائیوں میں اتر جائے تو پھر ایسا ہی ہوتا ہے۔ مومن ہر قسم کی سختی اور محرومی کو

[1] السیر و المغازي لابن إسحاق، ص: 178-180. [2] صحیح البخاري، حدیث: 7003,7004.

برداشت کر لیتا ہے خصوصاً جب اسے اللہ کی رضا اور جنت سامنے نظر آ رہی ہو۔

مردوں کے علاوہ بہت سی عورتوں نے بھی آزمائش و ابتلا کا دور دیکھا اور اسلام لانے کی وجہ سے معتوب ٹھہریں، جن میں سمیہ بنت خیاط، فاطمہ بنت خطاب، بنو مومل کی کنیز لبیبہ، زنیرہ رومیہ، نہدیہ اور اس کی بیٹی، ام عُبَیس اور حمامہ ام بلال وغیرہ شامل ہیں۔[1]

مکہ میں قتال سے اجتناب کی حکمت اور کردار سازی کا اہتمام

مسلمان اپنا دفاع کرنے کے حق میں تھے اور خود کو محفوظ کرنے کی سوچ نے بعض لوگوں کو غصہ بھی دلایا جن میں نوجوان طبقہ پیش پیش تھا۔ عبدالرحمٰن بن عوف اور ان کے دیگر ساتھی رضی اللہ عنہم مکہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا: ''اے اللہ کے نبی! جب ہم مشرک تھے تو طاقتور تھے اور جب ایمان لے آئے تو بے حیثیت بن گئے۔'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِنِّي أُمِرْتُ بِالْعَفْوِ، فَلَا تُقَاتِلُوا الْقَوْمَ» ''مجھے ابھی درگزر کرنے کا حکم ہے، اس لیے تم کسی سے مت الجھو۔''[2]

بعض سیرت نگاروں نے مکہ میں قتال فرض نہ ہونے کی حکمت بیان کی ہے جن میں استاذ سید قطب رحمہ اللہ بھی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں: ''ہم یقین سے کوئی سبب یا علت بیان نہیں کر سکتے کیونکہ ایسا کرتے ہوئے ہم اللہ تعالیٰ کی طرف اپنی مرضی سے ایسی حکمت منسوب کریں گے جو اس نے ہمیں نہیں بتائی اور ہم ایسے ایسے اسباب وعلل بیان کر دیتے ہیں جو حقیقتاً اسباب وعلل نہیں ہوتے اور کبھی اتفاقاً ہو بھی سکتے ہیں۔

مومن کی شان تو یہ ہونی چاہیے کہ وہ ہر حکم الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کر دے کیونکہ صرف اللہ تعالیٰ ہی علیم وخبیر ہے اور ہم تو صرف اپنے اجتہاد اور احتمال سے یہ اسباب وعلل

---

1 محنة المسلمين في العهد المكي للدكتور سليمان السويكت، ص: 117,116. 2 السنن الكبرٰى للنسائي: 3/6، والسنن الكبرٰى للبيهقي: 11/9، والمستدرك للحاكم:2/67,66 و307، و السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري:1/158.

بیان کر دیتے ہیں کیونکہ کسی بھی حکم کی علت تو صرف اللہ ہی جانتا ہے اور اس مالک نے کسی واضح نص کے ساتھ انھیں متعین نہیں کیا اور نہ ہمیں اس سے مطلع کیا ہے۔''[1]

مکی دور میں قتال کی عدم فرضیت کے مندرجہ ذیل اسباب ہو سکتے ہیں:

① ایک سبب یہ ہو سکتا ہے کہ مکی دور مخصوص حالات میں ایک خاص قوم کی تربیت اور تیاری کا دور تھا۔ اس لیے اس میں ظلم پر صبر کرنے کی تلقین کی گئی کیونکہ عام عرب معاشرے میں صبر نہیں کیا جاتا تھا۔ یہ اس لیے تھا کہ تربیت حاصل کرنے والے شخص کی ذات دنیاوی اغراض سے پاک ہو جائے اور وہ کسی بھی جذبات ابھارنے والے عامل کو خاطر میں نہ لائے اور اس کی طبیعت اور معمولات میں اعتدال پیدا ہو جائے۔

عرب معاشرے میں صبر و تحمل کی تربیت کے ساتھ یہ بھی مقصود تھا کہ لوگ نئی قیادت کے احکامات کو تسلیم کرتے ہوئے ایک نئے معاشرے کے قیام کی طرف بڑھیں اور یہ اسی وقت ممکن تھا جب وہ نسل در نسل چلی آنے والی عادات و اطوار کو چھوڑ کر اس نئی قیادت کی پیروی کریں اور ایک مسلم تشخص کی ساخت اور نشو و نما کے لیے یہی تربیت سنگِ میل ثابت ہوئی۔

② مکی دور میں قتال کی عدم فرضیت کا سبب یہ بھی تھا کہ قریشی معاشرے میں ایک پر امن دعوت انتہائی موثر اور کامیاب ہو سکتی تھی کیونکہ وہ معاشرہ اکھڑ مزاج اور خود نمائی کا حامل تھا۔ ایسے حالات میں قتال کا حکم آپس میں مزید عناد اور سرکشی کا سبب بن جاتا، جاہلی جنگوں، داحس وغبراء اور بسوس کی طرز پر ایک نئی خونی جنگ کا آغاز ہو جاتا اور لوگ اسلام کے بنیادی نظریے کو بھول کر جدال اور قتال میں مصروف نظر آتے۔

③ مکی دور میں قتال کا حکم ہر گھر میں کشاکش اور معرکہ آرائی کا سبب بھی بن سکتا تھا کیونکہ وہاں کوئی منظّم ریاست نہیں تھی جو اسلامیان مکہ کو اذیتیں پہنچاتی تھی بلکہ جب کوئی فرد مسلمان ہو جاتا تو اس کے عزیز و اقارب ہی تھے جو اس پر ظلم کے پہاڑ توڑتے تھے، لہٰذا

---
1 تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب: 2/714.

حکم قتال ملنے پر ہر گھر میں قتل وخون کا دور دورہ ہوتا۔

اس صورت میں قریش کو اسلام کے خلاف منظّم پروپیگنڈہ کرنے کا موقع ہاتھ آجاتا۔ فی الحال تو وہ حج کے موسم میں یہ کہتے تھے کہ اے لوگو! محمد اپنی قوم اور خاندان کے علاوہ باپ بیٹے کے درمیان جدائی ڈال دیتا ہے اور اگر قتال فرض ہوتا تو وہ کہتے کہ محمد بیٹے کو باپ اور باپ کو بیٹے کے قتل کرنے کا حکم دیتا ہے۔

④ عدم قتال کا حکم اس لیے بھی تھا کہ آغاز میں جو لوگ اسلام کے سخت مخالف تھے اور مسلمانوں کو ان کے دین سے برگشتہ کرنے کے لیے اذیتیں دیتے اور آزمائشوں میں ڈالتے تھے، ہوسکتا ہے بعد میں وہ نہ صرف اسلام کے مخلص پیروکار بلکہ رہنما اور کمانڈر بن جاتے اور عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ایسے ہی لوگوں میں سے تھے۔

⑤ مکی دور میں عدم قتال کا حکم اس لیے بھی تھا کہ عرب معاشرہ اگرچہ قبائلی نظام میں جکڑا ہوا تھا اور ہر فرد اپنے قبیلے کی وجہ سے تکبر ونخوت کا شکار تھا لیکن ان کی عادت تھی کہ کسی بھی اذیتیں برداشت کرنے والے کی مدد کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے خصوصاً ان لوگوں کے لیے جو ان میں انتہائی باعزت خیال کیے جاتے تھے۔ جیسا کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ جو ایک کریم النفس انسان تھے، ان کی مکہ سے حبشہ کی طرف ہجرت اور جلا وطنی پر ابن دَغِنہ راضی نہ ہوا۔ اسے وہ اہل عرب کے لیے باعثِ عار سمجھتا تھا، چنانچہ اس نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنی پناہ اور حمایت دی۔ اس قسم کے بہت سے واقعات رونما ہوئے جن میں آخری واقعہ شعب ابی طالب میں بنو ہاشم کے مقاطعے کے بارے میں لکھے جانے والے صحیفے کا چاک کیا جانا تھا۔

⑥ یہ حکم اس لیے بھی ہوسکتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی تعداد تھوڑی تھی اور وہ مکہ ہی میں محصور تھے۔ اسلام کی دعوت ابھی جزیرہ نمائے عرب کے باقی قبائل تک پہنچی ہی نہ تھی یا پہنچی تھی تو غیر منظّم حالت میں پہنچی تھی اور قبائل عرب قریش اور اس نئی دعوت کے علمبرداروں کے درمیان جاری معرکے کو دیکھ رہے تھے تا کہ وہ اس کا انجام دیکھ کر کوئی رائے قائم کر

سکیں۔ اگر مکی دور میں قتال فرض ہو جاتا تو بالفرض مسلمان جو قلیل تعداد میں تھے، اپنے سے کہیں زیادہ افراد کو قتل کر ڈالتے لیکن وہ خود بھی تہہ تیغ ہو جاتے، شرک باقی رہ جاتا اور اللہ کی اس زمین پر اسلامی نظام ختم ہو جاتا اور اس دین کا کوئی تشخص قائم نہ ہو پاتا، حالانکہ یہ دین تو سب لوگوں کی دنیا و آخرت بہتر بنانے کے لیے آیا ہے۔

⑦ عدم قتال کا حکم اس لیے بھی تھا کہ اس وقت مذکورہ بالا اسباب کو نظر انداز کرتے ہوئے میدانِ جنگ میں کودنے اور تشدد کے مقابلے میں اجتماعی دفاع کرنے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ اس وقت اسلامی دعوت کو جو بنیادی معاملہ درپیش تھا وہ خود اس دعوت کا وجود برقرار رکھنا تھا جو کہ اس کے محرک محمد ﷺ کی شخصیت پر منحصر تھا جن کی حمایت میں بنو ہاشم کی تلواریں تھیں۔ آپ ﷺ کے خلاف اٹھنے والے ہاتھ کو یہ ڈر ہوتا تھا کہ وہ کاٹ دیا جائے گا، اس لیے آپ ﷺ کعبے کے اردگرد آراستہ قریش کی مجلسوں میں علانیہ اپنا موقف بیان فرماتے تھے۔ آپ ﷺ نے صفا پہاڑی پر اور دیگر عمومی اجتماعات میں بھی اپنی دعوت پیش کی اور کسی نے بھی آپ ﷺ کے خلاف کوئی بڑا یا انتہائی اقدام نہ کیا۔ وہ آپ ﷺ کو قید یا قتل نہ کر سکے حتی کہ آپ کی بات سر عام رد کرنے کی بھی ہمت نہ پا سکے۔

مندرجہ بالا اسباب ہی کی بنا پر اللہ تعالیٰ کی حکمت عالیہ متقاضی ہوئی کہ مسلمانوں کو عدم قتال کے ساتھ ساتھ نماز قائم کرنے اور زکاۃ ادا کرنے کا حکم دیا جائے تاکہ ان کی تربیت ہو سکے اور وہ آنے والے حالات کا مقابلہ کر سکیں، نیز اپنی قیادت کی طرف سے مناسب وقت پر حکم کے منتظر رہیں، تمام مسائل و مشکلات سے نبٹ سکیں اور ذاتی مفادات سے بالاتر ہو کر خالص اللہ کے راستے میں اپنی کاوشوں کو بروئے کار لائیں۔[1]

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے قرآن کریم سے مصالح اور مفاسد کی سوجھ بوجھ حاصل کی اور پیش آمدہ حالات میں اسے استعمال کرنے کا گُر بھی سیکھا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

[1] الولاء والبراء لمحمد سعيد القحطاني، ص: 169-171، وتفسير في ظلال القرآن لسيد قطب: 2/714.

﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝﴾

''اور مشرکین اللہ کو چھوڑ کر جنھیں پکارتے ہیں، تم انھیں گالی مت دو، پھر وہ بھی جہالت میں، حد سے گزرتے ہوئے اللہ کو گالی دیں گے۔ اسی طرح ہم نے ہر امت کے لیے ان کے عمل میں کشش پیدا کر دی ہے، پھر انھیں اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے، پھر وہ انھیں بتائے گا کہ وہ کیا کچھ کرتے رہتے تھے۔''[1]

اسی طرح صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ بھی جان لیا کہ کوئی مصلحت اختیار کرنے سے کسی بڑے فساد کا خطرہ ہو تو اسے ترک کر دینا چاہیے۔[2] قرآن کریم کے اس حکم میں اخلاقی شائستگی اور ایمان کی بلندی اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ حقائق سے بے خبر اور اللہ کی معرفت و تقدیس سے بے بہرہ افراد سے کنارہ کش ہونے کا سبق دیا گیا ہے۔

علمائے کرام کہتے ہیں کہ یہ حکم تا حال باقی ہے۔ آج بھی اگر کوئی کافر اپنے کسی محفوظ علاقے میں ہو۔ اسلام اور مسلمانوں کے تابع نہ ہو اور یہ ڈر ہو کہ اگر اس کی صلیب، دین اور گرجے کو برا کہا جائے تو وہ اسلام، اللہ کے رسول یا اللہ تعالیٰ کے بارے میں نازیبا الفاظ کہے گا تو اسے برا بھلا کہنا ناجائز ہوگا۔ اور نہ کوئی ایسا رویہ اختیار کیا جائے جو اس کی دشنام طرازی کا سبب بنے کیونکہ یہ فعل بھی مخالف کو گناہ پر ابھارنے کے مترادف ہوگا۔ یہ مصالحت کی ایک قسم اور اس بات کی دلیل ہے کہ برائی کا راستہ روکنے کے لیے ہر ممکن ذریعے کا استعمال ضروری ہے۔[3]

تیرہ سالہ مکی دور جو افراد کی تربیت، تیاری اور دلوں میں لا الہ الا اللہ کی جوت جگانے میں گزرا، اگر کوئی اس پر غور کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ صبر کے ساتھ وقت گزارنے کے طرزِ فکر

---

[1] الأنعام 108:6. [2] التفسير المنير للدكتور وهبة الزحيلي: 325/7. [3] التفسير المنير للدكتور وهبة الزحيلي: 326/7.

کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ پہلے عقیدۂ توحید کا بیج دلوں میں بونے اور پھر اس کی نگہبانی، پختگی اور اس پر مداومت کی ضرورت ہوتی ہے، اس میں کسی قسم کی جلد بازی اور ہنگامہ آرائی درکار نہیں ہوتی۔ اللہ کی طرف دعوت دینے والوں کو آج اشد ضرورت ہے کہ وہ نبی ﷺ کی اپنے اصحاب کو ''طویل وقفۂ انتظار'' کے نظریے پر تربیت دینے کی سنت کو اپنائیں۔ اس سے نصیحت اور عملی نمونہ حاصل کریں کیونکہ جاہلیت چاہے قدیم ہو یا جدید یا کسی بھی آنے والے دور کی ہو، اس کے مقابلے میں وہی افراد ثابت قدم رہتے ہیں جن کے دلوں میں اس عقیدۂ ربانیہ کی تروتازگی رچ بس گئی ہو اور توحید کے درخت کی جڑیں مضبوط ہو چکی ہوں۔[1]

نبی ﷺ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو ضبط نفس اور صبر سے بہرہ ور ہونے کا درس دیتے، ان کی اپنی آنکھوں کے سامنے تربیت فرماتے اور انھیں اللہ سے تعلق جوڑنے اور عبادت کے ذریعے اس کا قرب حاصل کرنے کا حکم دیتے جیسا کہ مکی دور میں سورۂ مزمل نازل ہوئی۔ ارشاد ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ○ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ○ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ○ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ○ ﴾

''اے چادر میں لپٹنے والے! رات میں قیام کیجیے مگر تھوڑا سا، (یعنی) رات کا نصف، یا اس سے تھوڑا سا کم کیجیے، یا اس پر (کچھ) زیادہ کیجیے اور قرآن خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھیے۔''[2]

سورۂ مزمل نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سبق دیا کہ داعیوں کو تہجد گزار، ہمیشہ اللہ کا ذکر کرنے والے، تمام امور میں اللہ پر بھروسا کرنے والے اور صابر ہونا چاہیے۔ کفار سے اچھی طرح کنارہ کشی اختیار کرنی چاہیے اور نیک اعمال کے ساتھ ساتھ اللہ سے بخشش طلب کرنا بھی ضروری ہے۔

1 الولاء والبراء لمحمد سعيد القحطاني، ص: 171. 2 المزمل 73: 1-4.

سورۂ مزمل کی ابتدائی آیات میں نبی ﷺ کو رات کا ایک حصہ نماز کے لیے مختص کرنے کا حکم ہے اور انھیں اختیار دیا گیا کہ وہ آدھی رات تک اس سے کچھ کم یا زیادہ قیام کر سکتے ہیں۔ نبی ﷺ اور صحابۂ کرام نے تقریباً ایک سال رات کا قیام کیا حتی کہ ان کے پاؤں سوج گئے۔ جب اللہ تعالیٰ نے دیکھ لیا کہ وہ اس کی رضا کے حصول اور اس کے ہر حکم اور خواہش کی تکمیل کے لیے ہمہ وقت تیار ہیں تو رحمت و شفقت فرماتے ہوئے ان کے لیے تخفیف فرما دی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآىِٕفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ؕ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ؕ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ؕ عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۙ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا ؕ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾

”یقیناً آپ کے رب کو علم ہے کہ آپ قریباً دو تہائی رات یا نصف رات یا ایک تہائی رات قیام کرتے ہیں اور آپ کے ساتھیوں میں سے ایک گروہ بھی۔ اور اللہ ہی رات اور دن کا (پورا) اندازہ کرتا ہے۔ اسے علم ہے کہ تم اسے نبھا نہیں سکو گے، چنانچہ اس نے تم پر مہربانی کی، پھر قرآن میں سے جتنا آسان ہو تم پڑھو۔ اسے علم ہے کہ تم میں کتنے بیمار ہوں گے اور کتنے دوسرے زمین میں اللہ کا فضل ڈھونڈتے پھریں گے اور کتنے اللہ کی راہ میں لڑیں گے، چنانچہ اس (قرآن) میں سے جتنا آسان ہو پڑھو اور نماز قائم کرو اور زکاۃ دو اور اللہ کو قرض حسنہ دو۔ اور تم اپنے آپ کے لیے جو نیکی آگے بھیجو گے تو اسے اللہ کے ہاں بہتر اور زیادہ

اجر والی پاؤ گے۔ اور اللہ سے استغفار کرو۔ بے شک اللہ خوب بخشنے والا، بہت رحم کرنے والا ہے۔"[1]

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا اپنی خواب گاہوں میں آرام اور نیند میں کمی کرنا اور دیگر جسمانی حقوق نظر انداز کرنا ان کی سخت کوشی کی تربیت کا حصہ تھا اور نفسانی خواہشات سے چھٹکارا پانا پورے عالم میں اسلامی قیادت اور زمامِ اقتدار سنبھالنے کے لیے ضروری تھا، چنانچہ اس مقصد کے لیے اعلیٰ درجے کی روحانیت درکار تھی اور اللہ تعالیٰ نے ان نفوس قدسیہ کو اپنی دعوت کا امین بنایا اور انھیں پیغام رسالت عام کرنے کے لیے منتخب فرمایا اور انھیں لوگوں پر گواہ بنایا۔ اس تاریخی دور میں دسیوں اہل ایمان تھے جن کے سامنے لوگوں کو دعوت توحید پیش کرنے اور انھیں شرک سے نجات دلانے جیسے اہم ترین امور تھے۔ بلاشبہ اتنے عظیم مقاصد کے لیے صحابہ رضی اللہ عنہم جیسے لوگ ہی مناسب تھے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا ز﴾

"ان کے پہلو بستروں سے الگ رہتے ہیں (اور) وہ اپنے رب کو خوف اور امید سے پکارتے ہیں۔"[2]

اللہ تعالیٰ نے رات کے قیام کی خصوصیت یوں بیان فرمائی کہ اس میں نماز پڑھی جائے اور قراءت قرآن کی جائے جو ادائیگی اور حسن بیان سے آراستہ ہو۔ ارشاد ہے:

﴿اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّ اَقْوَمُ قِيْلًا﴾

"بلاشبہ رات کا اٹھنا (نفس) کچلنے میں زیادہ سخت اور دعا و ذکر کے لیے مناسب تر ہے۔"[3]

رات کا قیام دل کی اثر پذیری کے لیے عمدہ وقت ہے کیونکہ اس وقت رات پر سکون

1 المزمل 20:73. 2 السجدة 16:32. 3 المزمل 6:73.

اور ساری مخلوق آرام کی غرض سے غیر متحرک ہوتی ہے۔ اس وقت دل ہر طرح کی مشغولیت سے خالی، دنیا کے تعلقات سے دور اور دن کے کاموں سے فارغ ہو کر ذکر و مناجات کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اس طرح وہ لازمی تربیت بروئے کار آ سکتی تھی جو وحی الٰہی کی برکات حاصل کرنے کے لیے ضروری تھی۔ ارشاد ہے:

﴿ اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ۝ ﴾

''یقیناً ہم جلد آپ پر ایک بھاری بات ڈالیں گے۔''[1]

آیت میں ''قول ثقیل'' سے مراد قرآن کریم ہے۔

صحابۂ کرام کی اس قدر کٹھن تربیت ہی کی وجہ سے ان کا میدان جہاد کی مشقتیں برداشت کرنا، مدینہ میں اسلامی ریاست قائم کرنا، اسلام کے لیے مخلص ہونا، پھر اس دین کو ساری دنیا میں عام کرنے کے لیے قربانیاں پیش کرنا اور اسے گھر گھر تک پہنچانا ممکن ہوا۔[2]

نبی ﷺ نے اس اندرونی محاذ (کردار سازی) پر خصوصی توجہ فرمائی۔ آپ ﷺ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں ایسا اسلامی عقیدہ راسخ کر دینا چاہتے تھے جو نہ متزلزل ہو اور نہ کمزور پڑے۔ اس سے ان کے دلوں میں ارفع روحانی طاقت پیدا ہو گئی، ان کے لیے دعوتی میدان میں اذیتیں برداشت کرنا اور اپنا دفاع ممکن ہوا اور امت اسلامیہ کا یہ ہراول دستہ اس قدر مربوط اور مضبوط شکل اختیار کر گیا کہ دشمنوں کا کوئی بھی نفسیاتی حملہ کارگر ثابت نہ ہوا اور ان کے باہمی بھائی چارے کی وجہ سے کسی کو دخل اندازی کا موقع نہ ملا۔ یہ اسلامی اخوت خونی اور نسبی تعلق پر بھی فوقیت حاصل کر گئی اور اسے دین اسلام میں بڑی فضیلت حاصل ہے۔ امت اسلامیہ کے اس ابتدائی کارواں کی روح رواں شاندار اسلامی اخوت تھی جو محبت و الفت اور ایثار کی بنیاد پر قائم ہوئی تھی۔

نبی ﷺ کے فرامین صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں اتر گئے اور ان فرامین کی وجہ سے

1 المزمل 5:73. 2 السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 160/1.

ان میں باہمی اخوت، ربط ضبط، تعاون اور مشکلات میں کام آنے کا جذبہ پیدا ہوا اور یہ سب کچھ کوئی دنیاوی صلہ حاصل کرنے کے لیے نہیں بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کے لیے ہوتا تھا۔ مسلمان یہ صرف اپنے رب کی خوشنودی کے لیے کرتا ہے۔ یہی بنیادی اصول اسلامی اخوت کے تسلسل اور بقا کا راز اور اسلامی معاشرے کے استحکام کا باعث بنا۔[1]

نبی ﷺ نے ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان اپنے صحابہ تک پہنچایا:

«اَلْمُتَحَابُّونَ فِي جَلَالِي لَهُمْ مَّنَابِرُ مِنْ نُّورٍ يَغْبِطُهُمُ النَّبِيُّونَ وَالشُّهَدَاءُ»

''میرے جلال کے لیے آپس میں محبت کرنے والوں کے لیے نور کے منبر ہوں گے جن پر پیغمبر اور شہید رشک کریں گے۔''[2]

اسی طرح قائم ہونے والی یہ سچی اخوت اور اللہ تعالیٰ کی خاطر پیدا ہونے والی محبت بلند ترین اور افضل اعمال کا حصہ بن گئی جسے اللہ کے ہاں عظیم مقام حاصل ہوا۔

نبی ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس رابطے کے کمزور ہو جانے سے خبردار کیا اور اس اخوت کی حفاظت کا بنیادی قانون بھی بیان فرما دیا:

«لَا تَبَاغَضُوا، وَلَا تَحَاسَدُوا، وَلَا تَدَابَرُوا، وَكُونُوا عِبَادَ اللّٰهِ إِخْوَانًا، وَ لَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يَّهْجُرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثِ لَيَالٍ»

''آپس میں ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو، ایک دوسرے سے حسد نہ کرو اور ایک دوسرے سے رخ نہ موڑو اور اے اللہ کے بندو! آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔ اور کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ ترکِ تعلق رکھے۔''[3]

1 الحرب النفسية ضد الإسلام للدكتور عبدالوهاب كحيل، ص: 128. 2 جامع الترمذي، حديث:2390، و مسند أحمد:239/5. 3 صحيح البخاري، حديث:6076، و صحيح مسلم، حديث:2559.

نبی ﷺ نے اس مقامی معاشرے کو مربوط اور یکجا رکھنے کے لیے تمام افراد کے درمیان مساوات قائم کی تاکہ مشرکین کی طرف سے چھیڑی گئی نفسیاتی جنگ کے خلاف یہ مورچہ مضبوط ترین رہے۔ آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو آزادی بھی عطا فرمائی کیونکہ وہ اس نئے اسلامی معاشرے میں آزادی کے بغیر داخل نہ ہو سکتے تھے۔ انھیں فکر، تعبیر اور مشورے کی آزادی حاصل تھی، نبی ﷺ نے تمام لوگوں، حاکم و محکوم، مالدار اور فقیر حتی کہ سارے طبقات کے درمیان مساوات کا قانون لاگو فرمایا۔ اس کا نبی ﷺ کے پیروکاروں کے دلوں میں گہرا اثر ہوا۔ انھوں نے آپس میں محبت کا ایسا تعلق قائم کرلیا کہ ایک دوسرے پر جان چھڑکنے لگے اور اپنی پوری طاقت و عزیمت سے نبی ﷺ کا دفاع کیا۔

نبی ﷺ نے ان کے درمیان قبیلے، علاقے، حسب و نسب، وراثت اور رنگ کا کوئی امتیاز باقی نہ رہنے دیا اور ان امتیازات کی بنا پر لوگوں کے حقوق، واجبات اور عبادات میں فرق نہ آنے دیا بلکہ سب کو اللہ تعالیٰ کے حضور برابری کا درجہ دے دیا۔

جب مکہ کے سرداروں نے نبی ﷺ سے مطالبہ کیا کہ ان کے لیے علیحدہ مجلس قائم کی جائے جس میں غلام اور کمزور طبقے کے افراد نہ ہوں تو نبی ﷺ نے انھیں بتایا کہ سب لوگ وحی اور ہدایت کو حاصل کرنے میں ایک جیسے ہیں۔ یہ سن کر قریشی سرداروں نے غلاموں اور کمزور طبقے کے لوگوں کے ساتھ مجلس میں بیٹھنے سے صاف انکار کر دیا۔ جو نبی ﷺ کے پیروکار تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس وقت یہ آیت نازل فرمائی:

> ’’اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ روک رکھیں جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں، وہ اس کی رضا چاہتے ہیں اور آپ کی آنکھیں ان سے تجاوز نہ کریں کہ دنیاوی زندگی کی زینت چاہنے لگیں اور اس شخص کی اطاعت نہ کریں جس کا دل ہم نے اپنے ذکر سے غافل کر دیا اور وہ اپنی خواہش کے پیچھے چلا اور اس کا معاملہ حد سے بڑھا ہوا ہے۔‘‘ [1]

1 الکہف 28:18.

یہی مضمون اللہ تعالیٰ نے سورۂ انعام، آیت: 52 میں بھی بیان کیا ہے۔

جب نبی ﷺ نے بعض سرداران مکہ سے گفتگو میں مشغولیت کے باعث عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ سے بے رخی برتی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو یوں تنبیہ فرمائی:

﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰٓی ○ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی ○ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓی ○ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰی ○ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی ○ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی ○ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰی ○ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰی ○ وَهُوَ يَخْشٰی ○ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰی ○ كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ○ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ○﴾

''(اس نے) ماتھے پہ شکن ڈالے اور منہ پھیر لیا، (اس لیے) کہ اس کے پاس ایک نابینا آیا اور (اے نبی!) آپ کو کیا خبر شاید کہ وہ پاکیزگی حاصل کرتا، یا نصیحت سنتا تو اسے نصیحت نفع دیتی لیکن جو شخص پروا نہیں کرتا ہے تو آپ اس کی فکر میں ہیں، حالانکہ اگر وہ نہیں سنورتا تو آپ پر (کوئی گناہ) نہیں اور جو شخص آپ کے پاس دوڑتا ہوا آیا اور وہ ڈرتا بھی ہے تو آپ اس سے بے رخی برتتے ہیں، ہرگز نہیں! بے شک یہ (صحیفہ) تو ایک نصیحت ہے، چنانچہ جو چاہے اسے یاد کرے۔''[1]

نبی ﷺ نے اسلامی معاشرے کو مربوط، متحد، طاقتور اور مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے جو ذرائع اختیار کیے ان میں سے اہم ذریعہ یہ تھا کہ آپ نے مسلمانوں کے درمیان باہمی مادی اور روحانی ہمدردی اور کفالت کا جذبہ پیدا کیا۔ تاکہ طاقتور کمزور کی اور مالدار ناداروں کی مدد کریں۔ نبی ﷺ نے کوئی ایسا رخنہ نہ چھوڑا جہاں سے ان ابتدائی اسلامی صفوں پر نفسیاتی جنگ اثر انداز ہو سکتی۔ تب یہ ہراول دستہ اتنی مضبوط چٹان ثابت ہوا جس کے خلاف کفار مکہ کی تمام تر کوششیں اور منصوبے ناکام رہے جو انھوں نے دعوتِ اسلامی کو نیست و نابود کرنے کے لیے اختیار کیے تھے۔[2]

1 عبس 80:1-12۔ 2 الحرب النفسية ضد الإسلام للدكتور عبد الوهاب كحيل، ص: 125-140.

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بلند ہمتی میں قرآن مجید کی اثر آفرینی

قرآن کریم نے ایک طرف اہل ایمان کی قوت مضبوط کرنے اور دوسری طرف کفار کو عذاب الٰہی سے ڈرانے میں، جس سے ان کے دلوں پر شعلے سے گرتے تھے، موثر کردار ادا کیا۔
قرآن کریم نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا جس طرح دفاع کیا اسے دو نکات میں بیان کیا جا سکتا ہے:

① قرآن کریم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابۂ کرام پر توجہ دینے، ان سے حسن سلوک اور خندہ پیشانی سے ملنے کا پابند بنایا اور دعوتی امور میں مصروف ہونے کی وجہ سے صحابہ کرام کی طرف توجہ نہ دینے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تنبیہ کی۔

② قرآن کریم نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے پیش آمدہ تکالیف کا بوجھ کم کرنے کے لیے ان کے سامنے سابقہ امتوں اور انبیاء کے قصے اور مثالیں بیان کیں اور بتایا کہ کس طرح ان انبیاء نے اپنی قوم سے ملنے والی اذیتوں کو برداشت کیا تاکہ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی صبر کر سکیں اور آنے والے مصائب کو برداشت کر سکیں۔

قرآن کریم نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بعض اقدامات کی تعریف کرتے ہوئے انھیں ثواب اور جنت میں مستقل نعمتوں کی نوید سنائی اور اسی طرح ان کے دشمنوں کو جو انھیں دکھ اور تکلیف دیتے تھے سخت عذاب کی وعید بھی سنائی۔[1]

پہلے نکتے کی وضاحت اس طرح ہے کہ ایک دفعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں اپنے کمزور ساتھیوں خباب، عمار، ابن فکیہہ، صفوان بن امیہ کے غلام یسار اور صہیب رضی اللہ عنہم جیسے دیگر صحابہ کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ جب قریش نے انھیں دیکھا تو بطور مذاق ایک دوسرے سے کہنے لگے: ”یہ اس کے ساتھی ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے ہم میں سے ہدایت اور حق کے لیے احسان فرمایا ہے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو لے کر آئے ہیں اگر وہ خیر اور بھلائی پر مشتمل ہوتا تو یہ

[1] الحرب النفسية ضد الإسلام للدكتور عبد الوهاب كحيل، ص: 269.

لوگ ہم پر سبقت نہ لے جاتے اور اللہ تعالیٰ ہمیں چھوڑ کر انھیں خاص مقام عطا نہ کرتا۔[1]

اللہ تعالیٰ نے کفار کے اس استہزا کو رد کرتے ہوئے ان پر واضح کیا کہ میری رضا میرے بندوں کو ان کے دنیاوی مقام و مرتبہ کے مطابق حاصل نہیں ہوتی اور نبی ﷺ کو اس کی تاکید فرمائی کہ آپ ﷺ کفار کی ان باتوں سے متاثر نہ ہوں جو وہ صحابہ کی شان گھٹانے کے لیے کرتے رہتے تھے، نیز اللہ تعالیٰ نے انھیں ان کے مقام و مرتبہ کو اس طرح بیان فرمایا:

﴿وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ۭ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ○ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَاۗءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ۭ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ○ وَاِذَا جَاۗءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ۭ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰي نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْۗءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○﴾

''اور ان لوگوں کو اپنے سے مت دور کریں جو اپنے رب کو صبح اور شام پکارتے ہیں، وہ اپنے رب کی رضا مندی چاہتے ہیں، ان کے حساب میں سے کسی چیز کا بوجھ آپ پر نہیں اور آپ کے حساب میں سے کسی چیز کا بوجھ ان پر نہیں، پھر (اگر) آپ ان کو اپنے سے دور کریں گے تو آپ ظالموں میں سے ہو جائیں گے۔ اور ہم نے اسی طرح لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعے سے آزمائش میں ڈالا ہے تاکہ وہ (انھیں دیکھ کر) کہیں: کیا ہم میں سے یہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے احسان کیا ہے؟ (ہاں) کیا اللہ اپنے شکر گزار بندوں کو (ان سے) زیادہ نہیں جانتا؟ اور جب وہ لوگ آپ کے پاس آئیں جو ہماری آیات پر ایمان رکھتے ہیں تو کہہ دیجیے: تم پر سلام ہو، تمھارے رب نے مہربانی کو اپنے اوپر لازم کرلیا ہے۔

1 الحرب النفسية ضد الإسلام للدكتور عبد الوهاب كحيل، ص:270، 271.

بے شک تم میں سے جو شخص جہالت سے برا عمل کرے، پھر اس کے بعد توبہ کرے اور اصلاح کرلے تو یقیناً وہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔''[1]

اس طرح اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو صحابہ کی شان اور قدر و منزلت سے آگاہ کیا جسے یا تو کفار جانتے ہی نہیں تھے یا جان بوجھ کر لاعلم بنتے اور انھیں اذیت پہنچانے کی کوشش کرتے تھے۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو انھیں اپنے سے دور کرنے سے منع کردیا اور انھیں اچھے طریقے سے سلام کرنے کا حکم دیا اور کہا کہ انھیں یہ بتادیں کہ اللہ نے توبہ کے بعد ان کے گناہوں کی بخشش کا وعدہ کیا ہے۔

اس کے بعد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ہمت اور حوصلہ کس قدر بلند ہوا ہوگا اور وہ کفار کی دی ہوئی اذیتوں کو کیسا محسوس کرتے ہوں گے؟ وہ تو ایسی اذیتیں بسروچشم قبول کرتے ہوں گے جن کے سبب انھیں یہ عظیم مراتب حاصل ہوئے۔[2]

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو کس طرح ان آیات میں تنبیہ فرمائی جن کی قیامت تک تلاوت ہوگی۔ یہ تنبیہ ایک نابینا صحابی کے بارے میں تھی جس سے نبی ﷺ نے صرف ایک مرتبہ بے رخی کی تھی اور بعض سرداران مکہ سے محو گفتگو ہونے کی وجہ سے اس کے سوال کا جواب نہ دیا تھا۔[3]

دعوتِ حق کے میدان میں کسی سے حسب و نسب یا مال و مرتبے کی بنیاد پر کوئی امتیازی سلوک روا نہیں رکھا جاتا۔ یہ دعوت تو انسان میں ایک خاص نکتہ راسخ کرتی اور اسے نسل انسانی کی وحدت کا سبق دیتی ہے جس میں برابری اور مساوات کا درس دیا گیا ہے۔ اس سے ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی ﷺ کو کی گئی تنبیہ سمجھ میں آتی ہے کہ آپ ﷺ نے عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں ابی بن خلف کی طرف زیادہ توجہ فرمائی تھی جبکہ

1 الأنعام6:52-54. 2 الحرب النفسية ضد الإسلام للدكتور عبدالوهاب كحيل، ص:270,271.

3 الحرب النفسية ضد الإسلام للدكتور عبد الوهاب كحيل، ص:271.

ابن ام مکتوم حق کی ترازو میں ابی بن خلف جیسے اربوں انسانوں سے کہیں زیادہ وزنی تھے۔[1]

اس قصے میں بہت سے پند ونصائح پائے جاتے ہیں جن سے امت اسلامیہ کے ہراول دستے اور بعد میں آنے والے مسلمانوں نے استفادہ کیا۔ ان میں اہم ترین نصیحت اہل ایمان کی طرف خصوصی توجہ دینا ہے کیونکہ اللہ کی طرف دعوت دینے والوں کا ذمہ تبلیغِ رسالت ہے نہ کہ ہدایت کو لوگوں کے دلوں میں داخل کرنا۔

اس قصے میں نبی ﷺ کی نبوت پر دلیل بھی ہے کہ اگر بالفرض نبی ﷺ اللہ کے رسول نہ ہوتے تو یہ واقعہ ضرور چھپا لیتے اور لوگوں کو خبر نہ دیتے کیونکہ اس میں آپ کو تنبیہ کی گئی تھی۔ پورے قرآن میں سے اگر اللہ کے رسول کچھ چھپانا چاہتے تو ایک یہ قصہ اور دوسرا زید وزینب رضی اللہ عنہما والا قصہ چھپا لیتے۔[2]

داعیوں پر لازم ہے کہ وہ اہل ایمان اور اہل خیر کو مقدم رکھیں۔[3]

دوسرے نکتے کی وضاحت اس طرح ہے کہ قرآن کریم نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو تسلی دی اور بتایا کہ انھیں پہنچنے والی اذیتیں نئی نہیں، یہ تو سابقہ امتوں میں سے اہل ایمان بھی برداشت کر چکے ہیں۔ قرآن کریم میں سیدنا نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام اور دیگر انبیاء کے واقعات اہل اسلام کو استقامت دینے اور ان میں صبر اور قربانی کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے بیان کیے گئے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے صحابۂ کرام کے سامنے گزشتہ زمانے کے انبیاء کا اسوہ پیش کیا ہے۔ قرآنی قصص میں بہت سی نصیحتیں، حکمتیں اور مثالیں پوشیدہ ہیں۔

اس طرح صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے دفاع اور ان کی تسکین کے لیے قرآن کریم نے ان کی اور ان کے کردار کی مدح سرائی کی ہے جس کی رہتی دنیا تک تلاوت کی جاتی رہے گی، جیسے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ذکر آیا ہے جنھوں نے سات ایسے کمزور افراد کو مشرکین سے نجات دلائی جو انھیں اذیتوں سے دوچار کرتے تھے اور یہی آیات بلال رضی اللہ عنہ پر ظلم کے پہاڑ توڑنے

---

1 السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 167/1. 2 تفسير ابن عطية: 316/15، و تفسير القاسمي: 54/17. 3 المستفاد من قصص القرآن لعبد الكريم زيدان: 89/2.

والے امیہ بن خلف کو ڈانٹ بھی پلاتی ہیں۔

قرآن کریم نے اپنے اخلاقی دستور کے مطابق جزا و سزا کے قوانین وضع کیے ہیں، اہل ایمان کو حوصلہ دیا اور مخالفین کو انجام بد سے ڈرایا ہے۔ قرآن کا یہ اسلوب گہرے مقاصد کا حامل ہے۔ اس نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے راستوں کو روشن کر دیا اور یہ بات کفار کے لیے کرب و غم کا سبب بنی۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى ۚ لَا يَصْلٰىهَآ اِلَّا الْاَشْقَى ۙ الَّذِيْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۭ وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۙ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۚ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ۙ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۚ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ۝﴾

”بالآخر میں نے تمھیں بھڑکتی آگ سے ڈرا دیا ہے، اس میں بڑا بدبخت ہی داخل ہو گا، جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا اور بڑا متقی اس سے ضرور دور رکھا جائے گا، جو پاک ہونے کے لیے اپنا مال دیتا ہے اور اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں جس کا بدلہ اسے دیا جائے مگر صرف اپنے رب برتر کی رضا چاہتے ہوئے (مال خرچ کرتا ہے) اور یقیناً وہ (اللہ) جلد اس سے راضی ہو گا۔“ [1]

اسی طرح قرآن کریم نے نجران کے عیسائی وفد کی اسلام پر استقامت کا ذکر کیا ہے جن کا کفار نے مذاق اڑایا اور انھیں اسلام سے دور رکھنے کی کوشش کی تھی۔ بعض مؤرخین کے مطابق انھی کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں:

﴿اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا

1 الیل 92:14-21.

رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ○ وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ ○﴾

''وہ لوگ جنھیں ہم نے اس (قرآن) سے پہلے کتاب دی تھی، وہی اس پر ایمان لاتے ہیں اور جب ان پر (قرآن) تلاوت کیا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں: ہم اس پر ایمان لائے، بے شک یہ ہمارے رب کی طرف سے حق ہے، بلاشبہ ہم تو اس سے پہلے ہی مسلمان تھے، ان لوگوں کو ان کا دوبار اجر دیا جائے گا کیونکہ انھوں نے صبر کیا اور وہ بھلائی کے ساتھ برائی کو دور کرتے ہیں اور جو ہم نے انھیں رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں اور جب وہ بیہودہ بات سنتے ہیں تو وہ اس سے اعراض کر لیتے ہیں اور کہتے ہیں: ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمھارے لیے تمھارے اعمال ہیں، تمھیں سلام ہو، ہم جاہلوں کو نہیں چاہتے۔''[1]

اس کے بعد قرآنی آیات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو بہت بڑے ثواب اور جنت کی مستقل نعمتوں کی نوید سناتی ہیں کہ یہ ان کے اعمال کی جزا ہے جو انھوں نے صبر کیا اور اذیتوں کو برداشت کیا اور ایک مقصد یہ بھی تھا کہ انھیں دعوت دین کا سلسلہ جاری رکھنے کی ترغیب ملے اور وہ کسی بات یا پیش آمدہ رکاوٹ کی پروا نہ کریں۔ آخر کار کامیابی اور غلبہ انھی کے حصے میں آئے گا جیسا کہ قرآن و حدیث میں اس مضمون کی وضاحت موجود ہے۔ قرآن کریم میں کفار مکہ کا انجام بد بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ○ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ○﴾

''بلاشبہ ہم اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی مدد دنیاوی زندگی میں بھی کرتے ہیں اور اس دن بھی (کریں گے) جب گواہ کھڑے ہوں گے، اس دن ظالموں کو ان کی معذرت کوئی نفع نہیں دے گی اور ان کے لیے لعنت ہے اور ان کے لیے

[1] القصص 28:52-55.

برا گھر ہے۔‘‘[1]

قرآن نے مومنوں کے قرآن پر ایمان لانے اور اس پر مضبوطی سے عمل کرنے کا تذکرہ بھی کیا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ ۝ لِيُوَفِّيَهُمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ۝﴾

’’بلاشبہ جو لوگ اللہ کی کتاب پڑھتے اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انھیں دے رکھا ہے اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں وہ ایسی تجارت کی امید رکھتے ہیں جو ہرگز تباہ نہیں ہوگی، تاکہ وہ (اللہ) انھیں ان کے اجر پورے دے اور انھیں اپنے فضل سے زیادہ دے، بے شک وہ بہت بخشنے والا، نہایت قدر دان ہے۔‘‘[2]

اذیتوں اور تشدد کے باوجود صحابۂ کرام اللہ تعالیٰ کی عبادت پر ڈٹے رہے، چنانچہ اللہ نے ان کی اس فضیلت اور اس پر صبر کی جزا کا تذکرہ اس طرح فرمایا:

﴿اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ؕ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ؕ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝﴾

’’کیا (یہ مشرک بہتر ہے یا وہ) جو رات کی گھڑیوں میں سجدہ کرتے اور قیام کرتے ہوئے عبادت (فرماں برداری) کرتا ہے، جبکہ وہ آخرت سے ڈرتا اور اپنے رب کی رحمت کی امید بھی رکھتا ہے؟ کہہ دیجیے: کیا جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں

[1] المؤمن 40:51,52. [2] فاطر 35:29,30.

رکھتے، برابر ہو سکتے ہیں؟ بس عقل والے ہی نصیحت پکڑتے ہیں۔ کہہ دیجیے: اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو! اپنے رب سے ڈرو، جنھوں نے اس دنیا میں اچھے عمل کیے ان کے لیے بھلائی ہے اور اللہ کی زمین وسیع ہے، بلاشبہ صبر کرنے والوں کو ان کا پورا پورا اجر بے حساب دیا جائے گا۔''[1]

قرآن کریم کا یہی وہ اسلوب تھا جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو تسلی دیتا، ان کا دفاع کرتا اور انھیں نفسیاتی جنگ کے حملے سے محفوظ رکھتا تھا، اس لیے قرآنی منہج اور پر حکمت نبوی راہِ عمل کی بدولت صحابۂ کرام پر کفار کے حملوں اور تعذیبی ہتھکنڈوں کا کوئی اثر نہ ہوا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور امت کے اس ہراول دستے یعنی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو صحیح عقیدے اور درست منہج سے ہٹانے کے لیے مشرکین کا کوئی بھی حربہ کامیاب نہ ہو سکا۔

مذاکرات کا اسلوب

ایک دن مشرکین ایک جگہ اکٹھے ہوئے اور کہا: ''تم جادو، کہانت اور شعر کو سب سے زیادہ جاننے والے آدمی کی تلاش کرو، پھر اسے اس آدمی کے پاس بھیجو جس نے ہماری جماعت کو منتشر کر دیا ہے، ہمارے اتفاق کو اختلاف میں بدل دیا ہے اور ہمارے دین میں عیب نکالے ہیں۔ وہ اس سے اس سلسلے میں مذاکرات کرے اور دیکھے اسے کیا جواب ملتا ہے؟'' سب نے کہا: ''عتبہ بن ربیعہ کے سوا کوئی دوسرا آدمی ایسی قابلیت نہیں رکھتا۔'' انھوں نے عتبہ سے کہا: ''اے ابوالولید! آپ اس کے پاس جائیں۔''

چنانچہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا: ''اے محمد! کیا تو بہتر ہے یا عبدالمطلب؟''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے۔

اس نے کہا: ''اگر تو سمجھتا ہے کہ یہ تمام اشراف تجھ سے بہتر تھے تو انھوں نے ایسے خداؤں کی عبادت کی ہے جن میں تو عیب نکالتا ہے اور اگر تو سمجھتا ہے کہ تو ان سے بہتر

[1] الزمر 39:9،10.

ہے تو ہم سے مذاکرات کر، ہم تیرا موقف سننا چاہتے ہیں۔ بخدا ہم نے کوئی بکری کا بچہ بھی اپنی قوم کے حق میں تیرے جیسا منحوس نہیں دیکھا۔ (نقل کفر، کفر نہ باشد) تو نے ہماری جماعت میں جدائی ڈال دی ہے، ہمارا شیرازہ منتشر کردیا ہے اور ہمارے دین میں عیب نکالے ہیں اور ہمیں سارے عرب میں ذلیل کردیا ہے۔ عرب میں یہ مشہور ہے کہ قریش میں ایک جادوگر اور ایک کاہن ہے۔ تمھاری وجہ سے قوم میں اس قدر دشمنی پیدا ہو چکی ہے کہ ہر لمحے خطرہ ہے کہ ہم میں ایک دوسرے کے خلاف تلوار چلے اور ہم ہمیشہ کے لیے صفحۂ ہستی سے نابود ہو جائیں۔ بھلے آدمی! اگر تو محتاجی سے تنگ ہے تو ہم تجھے اتنا مال جمع کر دیتے ہیں کہ تو سارے قریش سے زیادہ مالدار ہو جائے گا۔ اگر شادی کرنا چاہتا ہے تو قریش کی جس عورت کو پسند کرے گا ہم ایسی دس عورتوں سے تیری شادی کر دیتے ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «فَرَغْتَ» ''کیا تم اپنی بات ختم کر چکے ہو؟''

اس نے کہا: ''ہاں'' پھر نبی ﷺ نے یہ آیات تلاوت فرمائیں:

﴿حٰمٓ ۞ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۞ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۞﴾

''حٰمٓ، (یہ قرآن) بڑے مہربان، نہایت رحم کرنے والے کی طرف سے نازل کیا ہوا ہے، (یہ) ایسی کتاب ہے جس کی آیات کھول کر بیان کی گئی ہیں، درآں حالیکہ (یہ) قرآن عربی ہے، ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔''[1]

یہاں تک کہ آپ ﷺ اس آیت پر پہنچے:

﴿فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ ۞﴾

''پھر اگر وہ اعراض کریں تو کہہ دیجیے: میں نے تمھیں ایسی چیخ (آسمانی عذاب) سے ڈرا دیا ہے جو عاد اور ثمود کی چیخ (عذاب) کے مانند ہوگی۔''[2]

1 حٰمٓ السجدۃ41:1-3۔ 2 حٰمٓ السجدۃ41:13۔

یہ سن کر عتبہ ''بس، بس'' پکار اٹھا اور بولا: ''تمھارے پاس اس کے سوا اور کچھ نہیں؟''
آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں۔''

اتنی گفتگو کے بعد عتبہ قریش کی طرف لوٹ گیا۔ انھوں نے اس سے پوچھا: ''کیا خبر لائے ہو؟'' اس نے کہا: ''جو کچھ تم اس کے متعلق کہتے ہو، میں نے وہ سب کچھ اس سے کہا ہے۔'' بولے: ''پھر اس نے تمھیں کوئی جواب دیا ہے؟'' اس نے کہا: ''ہاں، جواب دیا ہے۔'' [1]

ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ جب تمام قریش عتبہ کے گرد جمع ہوئے اور انھوں نے پوچھا: ''کیا خبر لائے ہو؟'' تو اس نے کہا: ''خبر یہ ہے کہ میں نے ایسا کلام سنا ہے اللہ کی قسم! اس جیسا کلام پہلے کبھی نہیں سنا۔ اللہ کی قسم! میں نے جو کلام سنا ہے، وہ جادو، شعر یا کہانت نہیں۔ اے جماعتِ قریش! میری بات مانو اور اس کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔ اس شخص (محمد) کو اپنا مشن جاری رکھنے دو اور اسے کچھ نہ کہو۔ اللہ کی قسم! میں نے جو کلام اس سے سنا ہے، وہ کسی بڑی خبر کا پتا دیتا ہے۔ اگر عربوں نے اسے مار ڈالا تو تمھاری بلا ٹل گئی اور اگر وہ عربوں پر غالب آ گیا تو اس کی بادشاہت تمھاری بادشاہت ہے اور اس کی عزت تمھاری عزت ہے اور تم اس کی وجہ سے سب لوگوں سے زیادہ سعادت مند ہو گے۔''
یہ سن کر قریشی کہنے لگے: ''اے ابوالولید! واللہ! اس نے تم پر جادو پھونک دیا ہے۔'' وہ بولا: ''اس کے بارے میں میری یہی رائے ہے۔ اب جو تمھاری مرضی ہے وہ تم کرلو۔'' [2]

درس و عبرت

① نبی ﷺ نے اپنے باپ دادا یا اپنی فضیلت کے بارے میں عتبہ کو کوئی جواب اس لیے نہ دیا کہ بات ایک اور ہی رخ اختیار کر جائے گی اور عتبہ کوئی بات آپ کی زبان سے نہ سن سکے گا۔

② نبی ﷺ نے عتبہ کی تمام پیشکشیں اور غصہ دلانے والے الزامات کو سن کر ان تمام باتوں

[1] السيرة النبوية لابن هشام:314,313/1، والسنن الكبرٰى للبيهقي:204,203/2، والبداية والنهاية: 69,68/3. [2] السيرة النبوية لابن هشام:294/1.

سے پہلو تہی اختیار کی اور عظیم مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے باتوں میں الجھنا گوارا نہ کیا۔ آپ ﷺ نے عتبہ کو اپنی تمام بات کہنے دی اور اس کے ساتھ اخلاق کے ساتھ پیش آئے اور کہا: ''اے ابوالولید! کیا تم اپنی بات ختم کر چکے ہو؟''[1]

③ نبی ﷺ کا عتبہ کو جواب فیصلہ کن تھا۔ آپ کا سورۂ حٰم السجدہ ہی کی آیات تلاوت کرنا خاص حکمت کی وجہ سے تھا۔ ان آیات میں بڑے عظیم امور بیان کیے گئے ہیں کہ یہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، پھر کافروں کے طرزِ عمل اور ان کے قرآن سے منہ موڑنے کا ذکر ہوا، نیز نبی ﷺ کے مشن کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا کہ نبی بشر ہیں، زمین و آسمان کا خالق صرف اللہ ہے اور کس طرح سابقہ امتوں نے پیغمبروں کو جھٹلایا، پھر ان کے ساتھ کیسا سلوک ہوا اور ساتھ ہی قریشیوں کو عاد و ثمود پر آنے والی کڑک اور بجلی سے ڈرایا گیا۔[2]

④ مبلغین کے لیے مال، منصب اور عورتوں کا فتنہ: کتنے ہی داعی ایسے ہیں جو مال کی چمک کی وجہ سے اپنی ذمہ داری پوری نہ کر سکے اور کتنے ہی ایسے بھی ہیں جنھیں دعوت پیش کرنے سے روکنے کے لیے لاکھوں روپے خرچ کیے گئے اور جو لوگ مالی پیشکشوں کے سامنے ثابت قدم رہے، وہی نبی ﷺ کے سچے پیروکار ہیں۔

منصب کا فتنہ بھی واضح ہے جسے شیطان مزین کر کے لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے اور بڑی چالبازی اور برے طریقے سے گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ واللہ! مبلغ وہ ہوتا ہے جو اپنی حرکت، بات اور فعل میں نبی ﷺ کی پیروی کرتا ہے اور اپنے اس مقصد کو نہیں بھولتا جو اس کی زندگی اور موت کا مقصد ہے:

﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ لَا شَرِیْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ○﴾

''کہہ دیجیے: بے شک میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت،

1 التحالف السياسي في الإسلام للدكتور الغضبان، ص: 33. 2 من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 75.

(سب کچھ) اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی (بات، یعنی توحید) کا حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں۔'' [1]

اور عورت کے بارے میں نبی ﷺ کا فرمان ہے:

«مَا تَرَكْتُ بَعْدِي فِتْنَةً أَضَرَّ عَلَى الرِّجَالِ مِنَ النِّسَاءِ»

''میرے بعد مردوں کے لیے سب سے خطرناک فتنہ عورتوں کا ہے۔'' [2]

عورت چاہے بیوی ہو جو دعوت و جہاد کے سلسلے میں اس کی ہمت پست کر دے یا پھر فاحشہ اور پیشہ ور ہو جو اسے اپنے جال میں پھانس لے اور اسے گناہ، سرکشی اور بے حیائی میں مبتلا کر دے، کوئی بھی صورت ہو، عورت دین کے معاملے میں بہت بڑا فتنہ ہے۔

قریش نے نبی ﷺ کو پیشکش کی کہ اگر آپ چاہیں تو ان کے لیے بہترین اور خوبصورت ترین دس قریشی عورتوں کو آپ کے نکاح میں دیا جاسکتا ہے اور وہ عورت جو دیندار نہ ہو اور اللہ کے منہج سے دور ہو، اس کا فتنہ گردن پر سونتی ہوئی تلوار سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ [3]

اسلامی دعوت پیش کرنے والے مبلغین کو چاہیے کہ نبی ﷺ کا اسوہ ہمیشہ اپنے پیشِ نظر رکھیں اور حضرت یوسف علیہ السلام کی بات یاد رکھیں:

﴿قَالَ رَبِّ السِّجْنُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ ۖ وَإِلَّا تَصْرِفْ عَنِّي كَيْدَهُنَّ أَصْبُ إِلَيْهِنَّ وَأَكُن مِّنَ الْجَاهِلِينَ ۝ فَاسْتَجَابَ لَهُ رَبُّهُ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ۚ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝﴾

''یوسف نے کہا: اے میرے رب! مجھے قید خانہ اس سے زیادہ پسند ہے جس کی طرف وہ (عورتیں) مجھے بلاتی ہیں اور اگر تو نے ان کا مکر مجھ سے دور نہ کیا تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور میں جاہلوں میں سے ہوں گا، چنانچہ اس کے رب نے اس کی دعا قبول کر لی، پھر اس نے اس سے ان (عورتوں) کا مکر دور

1 الأنعام 6:162، 163. 2 صحيح البخاري، حديث: 5096، وصحيح مسلم، حديث: 2740، 2741. 3 فقه السيرة النبوية للدكتور الغضبان، ص: 169.

کر دیا، بے شک وہی خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔"[1]

⑤ عتبہ کا نبی ﷺ کے کردار سے متاثر ہونا: یہ اثر اتنا واضح تھا کہ اس کے ساتھیوں نے اسے دیکھتے ہی قسم اٹھا کر اس کا اظہار کر دیا تھا، حالانکہ ابھی اس نے نبی ﷺ کے متعلق انھیں کوئی بات نہیں بتائی تھی۔ اللہ کا دشمن عتبہ جو اس دعوت کو ختم کرنے کے لیے آگے بڑھا تھا، اب اچانک اسے معاملہ الٹ نظر آنے لگا۔ وہی اب قریش سے کہہ رہا تھا کہ تم اس کے اور اس کے مشن کے راستے سے ہٹ جاؤ۔[2]

⑥ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی ﷺ اور عتبہ کے مابین ہونے والے مذاکرات سنے اور دیکھا کہ کس طرح آپ ﷺ نے عتبہ کی یہ پیشکش ٹھکرا دی۔ یہ ایسا سبق تھا جو ان کے دل کی گہرائیوں میں اتر گیا۔ اس سے انھوں نے عقیدے کی پختگی، اپنے اصولی موقف پر استقامت اور ہر قسم کی پیشکش کو قدموں تلے روندنے کا سبق حاصل کیا۔

⑦ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا نبی ﷺ سے بردباری اور کشادہ ظرفی کی تعلیم حاصل کرنا: نبی ﷺ نے عتبہ بن ربیعہ کی تمام باطل باتیں سنیں اور اپنی ہتک بھی برداشت کی۔ "قریش میں ایک جادوگر ہے۔" "قریش میں ایک کاہن ہے۔" "ہم نے کوئی بکری کا بچہ بھی اپنی قوم کے لیے تمھارے جیسا منحوس نہیں دیکھا" اور "اگر تیرے پاس بڑا جن آتا ہے تو ہم اس کا علاج کرائے دیتے ہیں۔" اس کی یہ باتیں آپ ﷺ نے نظر انداز کر دیں اور اس کی بدتمیزی سے چشم پوشی کر لی تاکہ دعوت دین اور بنوعبدشمس کے سردار کے سامنے اسلام کی تبلیغ سے توجہ نہ ہٹنے پائے۔

نبی ﷺ کی زبان اطہر سے صادر ہونے والا ہر کلمہ قابلِ اتباع اور آپ کا ہر عمل قابلِ اقتدا ہے، نیز آپ کی ہر چشم پوشی آپ کا ایسا خلق ہے جو امت کے لیے اسوۂ حسنہ ہے۔[3]

1 يوسف12:33,34. 2 السيرة النبوية للدكتور إبراهيم علي محمد أحمد، ص: 87. 3 التربية القيادية للدكتور الغضبان:304/1.

سیرت کی بعض کتابوں میں منقول ہے کہ عتبہ کے مذاکرات کے بعد مکہ کے بہت سے سرداروں نے آپ سے مزید مذاکرات بھی کیے اور ایسی ایسی پیشکشیں کیں جنھیں سن کر ایسے انسان کا دل للچا جاتا جو دنیادار اور دنیاوی ساز وسامان کا طلبگار ہو۔ صرف نبی ﷺ کی ذات ہی وہ بلند ترین ہستی تھی جس نے کسی مداہنت اور سودے بازی یا سیاسی چالبازی کے بغیر کفار کی تمام پیشکشوں کے سامنے فیصلہ کن موقف اختیار کیا اور قریشی سرداروں سے رابطہ استوار کرنے یا تعلقات بہتر بنانے کی کوشش نہ کی۔[1]

نبی ﷺ نے فیصلہ کن موقف اس لیے اختیار کیا کہ یہ عقیدے کا مسئلہ تھا جو بالکل واضح اور اظہر من الشمس تھا جس میں کسی قسم کی مداہنت اور پیچھے ہٹنے کی گنجائش نہ تھی، اس لیے نبی ﷺ نے فرمایا تھا:

«مَا بِي مَا تَقُولُونَ، مَا جِئْتُكُمْ بِمَا جِئْتُكُمْ بِهِ أَطْلُبُ أَمْوَالَكُمْ، وَلَا الشَّرَفَ فِيكُمْ وَلَا الْمُلْكَ عَلَيْكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ بَعَثَنِي رَسُولًا، وَّأَنْزَلَ عَلَيَّ كِتَابًا، وَّأَمَرَنِي أَنْ أَكُونَ لَكُمْ بَشِيرًا وَّنَذِيرًا، فَبَلَّغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّي وَنَصَحْتُ لَكُمْ، فَإِنْ تَقْبَلُوا مِنِّي مَا جِئْتُكُمْ بِهِ فَهُوَ حَظُّكُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، وَإِنْ تَرُدُّوهُ عَلَيَّ أَصْبِرُ لِأَمْرِ اللّٰهِ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ»

''میرا ہرگز وہ مقصد نہیں ہے جو تم خیال کرتے ہو۔ میں جو چیز تمھارے پاس لایا ہوں اس کا مقصد یہ نہیں کہ تم سے مال طلب کروں یا مقام ومرتبہ اور بادشاہت کا سوال کروں۔ مجھے تو اللہ تعالیٰ نے تمھاری طرف رسول بنا کر بھیجا ہے۔ مجھ پر کتاب اتاری ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمھیں جنت کی خوشخبری دوں اور جہنم سے ڈراؤں۔

1 الوفود في العهد المكي لعلي الأسطل، ص: 37.

میں نے تمھیں اپنے رب کا پیغام پہنچا دیا اور تمھاری خیر خواہی کی۔ اگر تم میری دعوت قبول کرلو تو وہ تمھارا دنیا اور آخرت کا نصیب ہے اور اگر اسے ٹھکرا دو تو میں اس وقت تک صبر کروں گا جب تک کہ اللہ میرے اور تمھارے درمیان فیصلہ نہ فرما دے۔''[1]

نبی ﷺ کے اس پختہ ایمانی موقف کی وجہ سے قریش کے سرداروں کا مکروفریب ناکام ہوگیا اور اسلامی عقیدے کا اہم ترین مسئلہ ثابت ہوگیا کہ یہ عقیدہ ہر قسم کی بیرونی آلائشوں سے پاک ہے۔[2]

تمھارے لیے تمھارا دین اور میرے لیے میرا دین

مشرکین نے جب مسلمانوں کی استقامت، اپنے دین سے گہری وابستگی اور ہر باطل کے خلاف سینہ سپر ہونا دیکھا تو ان کے دلوں میں ناامیدی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ جان گئے کہ مسلمانوں کو ان کے دین سے برگشتہ کرنا ممکن نہیں۔ تب انھوں نے مسلمانوں کو غصہ دلانے اور اپنی بیوقوفی اور رعونت کا اظہار کرنے کے لیے ایک اور بیہودگی کا ارتکاب کیا۔ انھوں نے اسود بن عبدالمطلب، ولید بن مغیرہ، امیہ بن خلف اور عاص بن وائل کو نبی ﷺ کے پاس بھیجا۔ وہ کہنے لگے: ''اے محمد! آؤ جسے تم پوجتے ہو اسے ہم بھی پوجیں اور جسے ہم پوجتے ہیں اسے تم بھی پوجو، اس طرح ہم اور تم پوجا میں شراکت دار ہو جائیں۔ اگر تمھارا معبود ہمارے معبود سے بہتر ہے تو ہم اس سے اپنا حصہ (ثواب) حاصل کر چکے ہوں گے اور اگر ہمارے معبود تمھارے معبود سے بہتر ہوئے تو تم ان سے اپنا حصہ حاصل کر چکے ہو گے۔'' اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی:

﴿قُلْ يَٰٓأَيُّهَا ٱلْكَٰفِرُونَ ۝ لَآ أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ ۝ وَلَآ أَنتُمْ عَٰبِدُونَ مَآ أَعْبُدُ ۝ وَلَآ أَنَا۠ عَابِدٌ مَّا عَبَدتُّمْ ۝ وَلَآ أَنتُمْ عَٰبِدُونَ مَآ أَعْبُدُ ۝ لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِىَ دِينِ ۝﴾

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 197/1، والتربية القيادية للدكتور الغضبان: 305/1. [2] تاريخ صدر الإسلام لعبد الرحمٰن الشجاع، ص: 39.

''(اے نبی!) آپ کہہ دیجیے: اے کافرو! میں ان (بتوں) کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ اور نہ تم اس کی عبادت کرتے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ اور نہ میں عبادت کرنے والا ہوں جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔ تمھارے لیے تمھارا دین اور میرے لیے میرا دین۔''[1]

اس سورت جیسا مضمون کچھ دوسری آیات میں بھی نازل ہوا جن میں کفر اور اہل کفر سے براءت کا اعلان پایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقُلْ لِّي عَمَلِي وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۖ أَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔونَ مِمَّآ أَعْمَلُ وَأَنَا بَرِيٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ ○﴾

''اور اگر وہ آپ کو جھٹلائیں تو کہہ دیجیے: میرے لیے میرا عمل ہے اور تمھارے لیے تمھارا عمل۔ تم اس سے بری ہو جو میں عمل کرتا ہوں اور میں اس سے بری ہوں جو تم عمل کرتے ہو۔''[2]

اللہ تعالیٰ نے مزید ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ إِنِّي نُهِيتُ أَنْ أَعْبُدَ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ ۚ قُلْ لَّآ أَتَّبِعُ أَهْوَآءَكُمْ قَدْ ضَلَلْتُ إِذًا وَّمَآ أَنَا۠ مِنَ الْمُهْتَدِينَ ○ قُلْ إِنِّي عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّي وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ ۚ مَا عِنْدِي مَا تَسْتَعْجِلُونَ بِهٖ ۚ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۖ يَقُصُّ الْحَقَّ ۖ وَهُوَ خَيْرُ الْفَٰصِلِينَ ○﴾

''(اے نبی!) کہہ دیجیے: بے شک مجھے منع کیا گیا ہے کہ میں ان کی عبادت کروں جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، کہہ دیجیے: میں تمھاری خواہشات کے پیچھے نہیں چلتا، اس صورت میں، میں گمراہ ہو جاؤں گا اور میں ہدایت پانے والوں میں سے نہ ہوں گا۔ کہہ دیجیے: بے شک میں اپنے رب کی طرف سے واضح دلیل پر ہوں

1 الکٰفرون 109:1-6. 2 یونس 10:41.

اورتم نے اس دلیل کو جھٹلایا ہے، میرے پاس وہ چیز نہیں ہے جسے تم جلدی طلب کررہے ہو، فیصلے کا (سارا) اختیار اللہ ہی کو ہے، وہ حق بات بیان کرتا ہے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔'' [1]

سورۂ کافرون نے یہ وضاحت کردی کہ حق کا راستہ ایک ہی ہے جس میں کوئی ٹیڑھ پن نہیں ہے اور نہ اس سے ادھر اُدھر راستے نکلتے ہیں۔ وہ تو ایسی خالص عبادت کا نام ہے جو صرف رب العالمین کے لیے ہے۔

یہ سورت نبی ﷺ پر دو قسم کی عبادتوں، دو قسم کے مناہج، دو قسم کے نظریات اور دو راستوں کے درمیان حتمی اور قطعی فرق کو بیان کرنے کے لیے نازل ہوئی۔ اس میں مسلسل نفی، تاکید اور توثیق کے صیغے مکرر استعمال کیے گئے کہ حق و باطل اور روشنی و اندھیرے کے درمیان کوئی سمجھوتا نہیں ہوسکتا۔ یہ اختلاف مکمل طور پر بنیادی اختلاف ہے جس میں کوئی درمیانہ راستہ تلاش نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ایسا معاملہ ہے جس میں کسی قسم کی مداہنت یا فریب کاری کی گنجائش نہیں۔ اس میں ذاتی مصلحت اور دنیاوی رغبت کا دخل نہیں اور نہ یہ شہد میں زہر والا معاملہ ہے۔ اور یہ کہنا بھی درست نہیں ہے جیسے آج کے جاہلیت پسند کہتے ہیں یا منافق اور مغرب زدہ لوگ جو گمراہ اور قابلِ غضب لوگوں کے پیچھے چلتے ہیں، وہ خیال کرتے ہیں اور ہر جگہ بے دین لوگ بھی اس نظریے کو اپنائے ہوئے ہیں کہ ''دین اللہ کے لیے اور وطن عوام کے لیے۔''

یہاں مشرک قریشی سرداروں کی سوچ کے فیصلے کی تردید کی گئی ہے۔ اس میں کسی قسم کی سودے بازی، مشابہت، درمیانی راستے اور ذاتی پسند کا دخل نہیں۔ ہر جگہ اور ہر زمانے میں جاہلیت جاہلیت ہے اور اسلام اسلام ہے۔ دونوں کے درمیان بہت بڑا فرق ہے جس طرح سونے یا چاندی کی ڈلی اور مٹی کے مابین فرق ہوتا ہے۔ یہاں صرف ایک ہی راستہ

[1] الأنعام 6:56،57.

ہے کہ مکمل جاہلیت کو خیر باد کہہ کر مکمل اسلام کو اپنا لیا جائے، اس کی ہر عبادت کو اپنایا جائے اور ہر حکم کے سامنے سر تسلیم خم کیا جائے، وگرنہ حق و باطل کے درمیان ہر دور میں باہمی افتراق، قطعی دوری اور واضح فرق رہا ہے۔[1]

پہلے وفد کی ناکامی کے بعد عبداللہ بن ابی امیہ، ولید بن مغیرہ، مکرز بن حفص، عمرو بن عبداللہ بن ابی قیس اور عاص بن عامر پر مشتمل دوسرا وفد آپ ﷺ کے پاس آیا تاکہ آپ کو بعض قرآنی آیات سے دست بردار کر دیا جائے۔[2]

انھوں نے مطالبہ کیا کہ آپ قرآن کریم کی ان آیات سے دست بردار ہو جائیں جو ان کے خداؤں کو برا کہتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے یہ فیصلہ کن جواب نازل فرمایا:

﴿وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ ۙ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ ۚ قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي ۖ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ ۖ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ﴾

"اور جب ان پر ہماری واضح آیتیں تلاوت کی جاتی ہیں تو وہ لوگ، جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے، کہتے ہیں: تو اس کے علاوہ کوئی (دوسرا) قرآن لے آ، یا اسے (کچھ) بدل دے۔ کہہ دیجیے: مجھے اختیار نہیں کہ میں اسے اپنی طرف سے بدل دوں۔ میں تو اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے، بے شک اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے (سخت) دن کے عذاب سے ڈر لگتا ہے۔"[3]

نبی ﷺ کے پاس آنے والے وفود اور ان کے مذاکرات قریشی سرداروں کی ناکامی کا منہ بولتا ثبوت تھے کہ وہ نبی ﷺ کو اسلام سے دست بردار ہونے پر راضی نہ کر سکے۔ اسلام کے مسلسل فروغ نے انھیں مجبور کر دیا تھا کہ وہ نبی ﷺ کو قرآن کی بعض آیات

1 تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب: 3991/6. 2 أسباب النزول لأبي الحسن الواحدي، ص: 200، ونور اليقين لمحمد الخضري، ص: 61 بتصرف. 3 يونس 15:10.

سے دست بردار ہونے ہی پر آمادہ کرلیں۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ کفار کا آپ ﷺ سے دوسرا مطالبہ پہلے سے کم تھا گویا وہ ایک بڑے مطالبے سے چھوٹے مطالبے پر اتر آئے تھے، اس خیال سے کہ شاید اس دعوت کا قائد ان کی کوئی بات ہی تسلیم کرنے کے لیے تیار ہوجائے۔ علاوہ ازیں انھوں نے وفد کے ارکان بھی تبدیل کر کے دیکھ لیے۔ جنھوں نے پہلے وفد میں آپ سے ملاقات کی وہ ان افراد کے علاوہ تھے جو دوسرے وفد میں شریک ہوئے، سوائے ولید بن مغیرہ کے وہ دونوں وفود میں شریک ہوا۔ مقصد یہ تھا کہ ایک ہی قسم کی گفتگو بار بار نہ ہو اور مذاکرات کرنے والوں کی سوچ اور ان کے مراتب بھی مختلف ہوتے رہیں۔ ان کا خیال تھا کہ یہ طریقۂ کار مؤثر ہوسکتا ہے۔

اس سارے قصے میں قیامت تک آنے والے دعوت اسلامی کے مبلغین کے لیے سبق ہے کہ وہ ذرہ برابر بھی اپنے اسلامی موقف سے پیچھے نہ ہٹیں۔ اسلام ایک ربانی دعوت کا نام ہے۔ اسے ترک کرنے کے بظاہر کتنے ہی اسباب و وجوہات اور جواز کیوں نہ ہوں اس پر کسی طور سودے بازی نہیں ہوسکتی۔

دورِ حاضر کے اسلامی مبلغین اور داعیوں کو ایسی پیشکشوں سے اجتناب کرنا چاہیے۔ مادی ترغیبات بعض اوقات بلاواسطہ نہیں ہوتیں بلکہ بالواسطہ، مثلاً: خطیر وظائف یا ایسے معاہدات کی شکل میں ہوتی ہیں جن سے بہت بڑے مالی منافع وابستہ ہوتے ہیں اور بعض اوقات تو نہایت سودمند تجارت کی پیشکش بھی ہوتی ہے۔ آج کل بعض جرائم پیشہ (مشکوک) عالمی تنظیمیں اسلامی دعوت عام کرنے والوں بالخصوص ان کے قائدین کو روکنے کے لیے اسی طرح کی منصوبہ بندی کرتی ہیں۔ یہ تنظیمیں جو عالَم اسلامی کو نیست و نابود کرنے کی مسلسل سازشیں کرتی رہتی ہیں، آپس میں ہر قسم کی معلومات کا تبادلہ کرتی رہتی ہیں۔[1]

1 السيرة النبوية للدكتور إبراهيم علي محمد أحمد، ص: 89.

مشرق وسطیٰ میں اسلامی تحریک کے مطالعے پر مامور ایک بہت بڑا مغربی دانشور رچرڈ بی مائیکل اپنی ایک رپورٹ میں لکھتا ہے کہ ایک نئی منصوبہ بندی سے اسلامی تحریکوں کا مکمل صفایا کیا جاسکتا ہے۔ وہ دعوت اسلامی کے قائدین کو دنیاوی پیشکش کرنے کی راہ سجھاتے ہوئے مندرجہ ذیل مشورے دیتا ہے:

① ایسے افراد تلاش کیے جائیں جنھیں خطیر وظائف دے کر ان کے مقصد سے دور کیا جاسکے تاکہ وہ صرف کارروائی کے طور پر اپنی ذمہ داریاں انجام دیں۔ انھیں ایسے کاموں میں مشغول کر دیا جائے جن سے ان کی توانائیاں ضائع ہوں اور یہ اسی صورت ممکن ہے کہ ان پر منصبی اور مادی انعامات کی بارش کی جائے اور ان کے لیے بہت سی سہولتیں مہیا کی جائیں۔ اس طرح وہ مقامی طور پر بظاہر اپنی ذمہ داری پوری کرتے نظر آئیں گے مگر درحقیقت وہ ضائع ہو چکے ہوں گے اور اپنے بہت سے اصول وقواعد سے ہاتھ دھو بیٹھے ہوں گے۔

② اصحاب ثروت وتجارت کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے محنت کی جائے اور ان کی توجہ جزیرہ نمائے عرب میں ان مخفی منصوبوں کی طرف مبذول کرائی جائے جن کا فائدہ دشمن کو ہو اور ان کے ناپاک عزائم کی تکمیل ہو۔

③ عرب کے مالدار علاقوں کو ایسے کاموں میں مصروف رکھا جائے۔ اور ان سے مالی مفادات پر مبنی ایسے معاہدے کیے جائیں جو انھیں اسلامی سرگرمیوں سے دور کر دیں۔[1]

مندرجہ بالا تین نکات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب بلا واسطہ مادی پیشکشیں ہیں اور موجودہ عالم اسلام کا بنظر غائر جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ ان نکات پر بڑی تندہی سے عمل کیا جارہا ہے۔ اعلیٰ مناصب نے بعض داعیوں کو دین سے لاتعلق کر دیا ہے، قدرتی نعمتوں سے مالا مال عرب ممالک نے مبلغین کی بہت بڑی جماعت کو ضائع کر دیا ہے اور بعض داعیوں کو تجارت نے ہلاکت خیز غفلت میں مبتلا کر دیا ہے۔[2]

1 السيرة النبوية للدكتور إبراهيم علي محمد أحمد، ص: 89. 2 السيرة النبوية للدكتور إبراهيم علي محمد أحمد، ص: 91.

کفار کے ساتھ بحث و مباحثہ

نبی ﷺ نے اپنی پیش کردہ دعوت کی صحت پر بہت سے دلائل اور براہین پیش کیے۔ آپ مناسب موقع اور وقت سے فائدہ اٹھانے پر یقین رکھتے تھے اور دعوت اسلامی کے خلاف پیدا کیے جانے والے ہر قسم کے شبہات کا مکمل رد کرتے۔ آپ ﷺ نے کفار سے مجادلے کے لیے بہت سے اسالیب اختیار فرمائے جن کی بنیاد اللہ کی کتاب تھی۔ آپ ﷺ نے عقلی دلائل، منطقی قیاسات اور اپنی دماغی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ان شبہات کے جوابات دیے۔ نبی ﷺ نے جو اسالیب اختیار فرمائے مندرجہ ذیل تھے:

تقابلی انداز: یہ اسلوب معاملے کے دونوں پہلو سامنے رکھ کر اختیار کیا جاتا ہے۔ اول اس بھلائی کا تذکرہ ہوتا ہے جس کی ترغیب مطلوب ہو، دوسری طرف اس برائی کا تذکرہ ہوتا ہے جس سے لوگوں کو خبردار کرنا مقصود ہو، پھر عقل کو ان دونوں پہلوؤں پر غور کرنے کی دعوت دی جاتی ہے اور آخر کار ایک تقابلی جائزے کے بعد بھلائی اور اسے اختیار کرنے والوں کی فضیلت کو ثابت کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝﴾

”کیا ایک ایسا شخص جو مردہ تھا، پھر ہم نے اسے زندہ کیا اور ہم نے اس کے لیے نور بنا دیا، وہ اس کی روشنی میں لوگوں میں چلتا ہے، (کیا) وہ اس شخص جیسا (ہوسکتا) ہے جس کا حال یہ ہے کہ وہ اندھیروں میں پڑا ہے، ان سے نکلنے والا نہیں؟ اسی طرح کافروں کے لیے ان کاموں میں کشش رکھی گئی ہے جو وہ کرتے ہیں۔“[1]

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ”یہ ایک مثال ہے جسے اللہ تعالیٰ

1 الأنعام 6:122.

نے اس مومن کے لیے بیان فرمایا ہے جو مردہ تھا، یعنی گمراہی میں گرا ہوا، ہلاک ہونے والا تھا۔ اللہ نے اسے زندہ فرمایا، یعنی اس کے دل میں ایمان کا شعلہ روشن کر دیا اور اسے ہدایت بخشی اور اپنے پیغمبروں کی اتباع کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔''[1]

اقرار کروانا: اس اسلوب میں عقلی دلائل کے بعد لوگوں سے اپنا مطلوبہ موقف منوایا جاتا ہے اور یہی دعوت کا مقصد بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ۝ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ ۝ اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ ۝ اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ ۚ فَلْيَاْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝ اَمْ لَهُ الْبَنٰتُ وَلَكُمُ الْبَنُوْنَ ۝ اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ۝ اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ۝ اَمْ يُرِيْدُوْنَ كَيْدًا ۗ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا هُمُ الْمَكِيْدُوْنَ ۝ اَمْ لَهُمْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ ۚ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ وَاِنْ يَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا يَّقُوْلُوْا سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ ۝ فَذَرْهُمْ حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ فِيْهِ يُصْعَقُوْنَ ۝﴾

''کیا وہ بغیر کسی شے کے پیدا کیے گئے ہیں، یا وہی (خود اپنے) خالق ہیں؟ کیا انھوں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا؟ بلکہ وہ یقین نہیں رکھتے، کیا ان کے پاس آپ کے رب کے خزانے ہیں؟ یا وہ (ان پر) محافظ و نگران ہیں؟ کیا ان کے لیے کوئی سیڑھی ہے کہ وہ اس کے ذریعے سے (چڑھ کر آسمان کی باتیں) سن لیتے ہیں؟ پھر چاہیے کہ ان کا سننے والا کوئی واضح دلیل لے آئے، کیا اس (اللہ) کے لیے بیٹیاں ہیں اور تمھارے لیے بیٹے؟ کیا آپ ان سے کوئی اجر مانگتے ہیں کہ وہ (اس کے) تاوان سے بوجھ تلے دب گئے ہیں؟ یا ان کے پاس (علم) غیب ہے تو وہ لکھتے ہیں، کیا وہ کسی فریب کا ارادہ کرتے ہیں؟ تو جن لوگوں نے کفر کیا وہی

1 تفسیر ابن کثیر: 172/2۔

فریب خوردہ ہیں، کیا ان کے لیے اللہ کے سوا اور کوئی معبود ہے؟ اللہ پاک ہے اس سے جو وہ شریک ٹھہراتے ہیں اور اگر وہ آسمان سے گرتا ہوا کوئی ٹکڑا بھی دیکھیں تو وہ کہیں گے: (یہ) تہ بہ تہ بادل ہے، لہٰذا (اے نبی!) آپ انھیں (ان کے حال پر) چھوڑ دیجیے، حتی کہ وہ اپنے اس دن سے ملیں جس میں وہ بے ہوش کیے جائیں گے۔''[1]

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ ان آیات کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''قرآن کے اس مقام پر توحید ربوبیت اور توحید الوہیت کا اثبات کیا گیا ہے، یعنی وہ بغیر کسی پیدا کرنے والے کے معرض وجود میں آگئے ہیں یا پھر انھوں نے خود ہی اپنے آپ کو وجود عطا کیا ہے؟ یعنی ان دونوں میں سے کوئی بھی نظریہ درست نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ہی نے انھیں جب وہ کچھ نہ تھے، پیدا فرمایا اور وجود عطا کیا۔''[2]

یہ آیت کریمہ عقلی اعتبار سے ایک مضبوط دلیل ہے کیونکہ انسانوں کے اس طرح خود بخود معرض وجود میں آجانے کو عقل فطری طور پر تسلیم نہیں کرتی اور اس میں کسی قسم کی بحث کی ضرورت نہیں۔ جہاں تک ان کے خود کو پیدا کرنے کا تعلق ہے، وہ اس کے دعویدار ہی نہیں تھے اور نہ مخلوق یہ دعویٰ کرسکتی ہے۔ جب یہ دونوں مفروضے فطرتاً عقل کے مطابق نہیں تو اس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر چارہ کار نہیں، جیسے قرآن کریم نے بیان کیا ہے کہ سب اس ایک اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں جس میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔[3]

مفسر سعدی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اللہ کی ربوبیت و الوہیت کے اقرار کو لازم ٹھہراتے ہوئے لکھا ہے: ''یہ ایک ایسا استدلال ہے جس کے بعد لوگوں کو حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہی پڑے گا یا بصورت دیگر وہ عقل و دین سے عاری سمجھے جائیں گے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے منکر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو جھٹلانے والے

1 الطور 52:35-45. 2 تفسير ابن كثير: 244/4. 3 تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب: 3399/6.

ہیں اور یہ نظریہ اس لیے پیدا ہوا کہ وہ تسلیم نہیں کرتے کہ اللہ نے انھیں پیدا کیا ہے، حالانکہ عقلاً اور شرعاً یہ بات طے شدہ ہے کہ یہ معاملہ تین باتوں میں سے ایک کے درست ہونے پر دلالت کرتا ہے:

① ان کا کوئی خالق نہیں بلکہ وہ بغیر تخلیق کے پیدا ہوگئے ہیں اور انھیں کوئی وجود میں لانے والا نہیں۔ یہ بات یکسر محال ہے۔

② انھوں نے خود کو پیدا کرلیا ہے، یہ بھی محال ہے کیونکہ یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ کوئی اپنا ہی خالق ہو۔

③ جب یہ دونوں باتیں باطل قرار پائیں اور ان کا ناممکن ہونا ثابت ہوگیا تو تیسری بات مُسلَّم ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ ہی نے انھیں پیدا فرمایا ہے۔

جب یہ تیسری بات تسلیم کر لی گئی تو معلوم ہوا کہ معبود صرف اور صرف ایک اللہ ہے جس کے سوا کسی کی بندگی روا نہیں اور نہ یہ کسی کے شایان شان ہے۔[1]

مخالفین کے ثانوی دلائل نظر انداز کر کے ان کا ابطال کرنا: یہ ایک پرزور اسلوب ہے جو غرور اور تکبر میں مبتلا سرکشوں کے خلاف استعمال کیا جاتا ہے۔ اس میں ان کی معاندانہ باتوں سے چشم پوشی کی جاتی ہے اور ان کی باطل حجت بازی پر اعتراض نہیں کیا جاتا تاکہ بے مقصد جھگڑے اور نزاع سے بچا جاسکے۔ اس کے برعکس ان کے خلاف ایسے قطعی دلائل پیش کیے جاتے ہیں جو ان کے نظریے کا بودا پن ظاہر کردیتے ہیں اور ان کے باطل دلائل خود بخود ختم ہوتے چلے جاتے ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے قصے میں اسی اسلوب کا ایک مُفَصَّل نمونہ پایا جاتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے ہر اعتراض اور شبہے کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے دعوائے الوہیت کو باطل قرار دیا اور بہت سے واضح عقلی دلائل سے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت و الوہیت ثابت

1 تفسیر السعدي: 7/195،196۔

کی۔[1] سورۂ شعراء میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ○ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَآ ۭ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ○ قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ○ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَاۗىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ○ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ○ قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَآ ۭ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ○ قَالَ لَىِٕنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ○﴾

''فرعون نے کہا: اور رب العالمین کیا ہے؟ اس (موسیٰ) نے کہا: وہ آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، ان کا رب ہے، اگر تم یقین کرنے والے ہو۔ اس (فرعون) نے اپنے ارد گرد والوں (درباریوں) سے کہا: کیا تم سنتے نہیں ہو؟ اس (موسیٰ) نے کہا: (وہ) تمھارا اور تمھارے اگلے آباء و اجداد کا رب ہے۔ اس (فرعون) نے کہا: بلاشبہ تمھارا یہ رسول، جو تمھاری طرف بھیجا گیا ہے، یقیناً دیوانہ ہے۔ اس (موسیٰ) نے کہا: (وہ) مشرق و مغرب اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے ان کا رب ہے، اگر تم عقل رکھتے ہو۔ اس (فرعون) نے کہا: البتہ اگر تو نے میرے سوا کوئی اور معبود پکڑا تو میں ضرور تجھے قیدیوں میں سے کردوں گا۔''[2]

یہ وہ چند قرآنی اسالیب تھے جنھیں اللہ کے رسول ﷺ نے بنیادی طور پر مشرکین سے بحث مباحثے کے وقت اختیار فرمایا۔

جب مشرکین نے نبی ﷺ کی دعوت کو مشکوک سمجھ کر جھٹلایا اور آپ کی تصدیق میں پس و پیش سے کام لیا تو درحقیقت وہ پیغمبر کو نہیں جھٹلاتے تھے بلکہ اپنی سرکشی اور کفر ہی کا اظہار کررہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

---

1 مقومات الداعية الناجح للدكتور علي بادحدح، ص:59-69. 2 الشعرآء26:23-29.

﴿قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝﴾

''(اے نبی!) تحقیق ہم جانتے ہیں کہ بے شک آپ کو وہ بات غمگین کرتی ہے جو وہ کہتے ہیں، پس بے شک وہ آپ کو نہیں جھٹلاتے بلکہ دراصل یہ ظالم تو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔''[1]

کفار کی ٹیڑھی سوچ نے انھیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے ایسے مطالبات کریں جن کا مقصد نبی ﷺ کی صداقت کو تسلیم کرنا ہرگز نہ تھا۔ وہ تو سرکشی اختیار کرتے ہوئے آپ کو عاجز کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے نبی ﷺ سے مندرجہ ذیل مطالبات کیے:

① آپ ﷺ ان کے لیے زمین سے چشموں کی صورت میں پانی جاری کر دیں۔

② نبی ﷺ کے لیے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو جس میں نہریں جاری ہوں۔

③ وہ آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ان پر گرا دیں جس طرح قیامت کے دن ہوگا۔

④ وہ اللہ اور فرشتوں کو ان کے سامنے لا کھڑا کریں۔

⑤ نبی ﷺ کے لیے سونے کا ایک گھر ہو۔

⑥ آپ ﷺ آسمان پر چڑھ جائیں، یعنی ایک سیڑھی لیں اور ان کے سامنے آسمان پر جا چڑھیں۔

⑦ نبی ﷺ آسمان سے ان پر ایک کتاب اتار لائیں جسے وہ خود پڑھیں۔

امام مجاہد رحمہ اللہ اس کا مفہوم یہ بتاتے ہیں کہ ''ہر ایک کے نام ایک چٹھی ہو جس میں لکھا ہو کہ یہ اللہ کی طرف سے فلاں ابن فلاں کے لیے ایک کتاب ہے اور وہ ہر ایک کے سرہانے پڑی ہو۔''[2]

⑧ انھوں نے پیغمبر ﷺ سے یہ بھی مطالبہ کیا کہ وہ ان کے لیے اپنے اللہ سے دعا کریں

1 الأنعام 6:33. 2 المعوّقون للدعوة الإسلامية للدكتورة سميرة محمد، ص: 171، 172.

کہ یہ پہاڑ وہاں سے ہٹا دے اور زمین کو پھاڑ کر ان کے آباء واجداد کو زندہ کرے۔[1]

خرق عادت امور اور معجزات کے مطالبات عرصۂ دراز سے انسانی تاریخ کا حصہ رہے ہیں باوجودیکہ نبی ﷺ اپنی قوم کے ایمان لانے پر حریص تھے اور اس سلسلے میں آپ نے بڑی مشقتیں برداشت کیں لیکن اپنی قوم کے یہ مطالبات تسلیم نہ کیے کیونکہ قرآن کے حوالے سے آپ جانتے تھے کہ اگر وہ اپنے ان مطالبات کے پورا ہونے کے بعد بھی ایمان نہ لائے تو سخت عذاب میں مبتلا کیے جائیں گے، چنانچہ آپ ﷺ نے انھیں یہ جواب دیا:

«مَا بِهٰذَا بُعِثْتُ إِلَيْكُمْ، إِنَّمَا جِئْتُكُمْ مِّنَ اللّٰهِ بِمَا بَعَثَنِي بِهٖ، وَقَدْ بَلَّغْتُكُمْ مَّا أُرْسِلْتُ بِهٖ إِلَيْكُمْ، فَإِنْ تَقْبَلُوهُ فَهُوَ حَظُّكُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، وَإِنْ تَرُدُّوهُ عَلَيَّ، أَصْبِرْ لِأَمْرِ اللّٰهِ تَعَالٰى حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ»

”مجھے تو اللہ نے تمھاری طرف رسول بنا کر مبعوث کیا ہے اور میں نے تمھیں رب کا پیغام پہنچا دیا۔ اگر تم میری دعوت قبول کرلو تو تمھارا دنیا وآخرت کا نصیب ہے۔ اور اگر تم میری دعوت کو ٹھکرا دو تو میں اس وقت تک صبر کروں گا حتی کہ اللہ میرے اور تمھارے درمیان فیصلہ فرما دے۔“[2]

نبی ﷺ جب اپنی قوم کے بارے میں مطلوبہ نتائج حاصل نہ کرسکے اور دعوت پیش کرنے کے بعد انھیں خود سے دور ہوتے دیکھا تو غمزدہ اور افسردگی کی حالت میں واپس ہوئے۔[3]

اللہ تعالیٰ نے کفار کی سرکشیوں اور ان کے تمام مطالبات کا رد اپنے اس فرمان میں بیان کیا ہے:

---

1 التربية القيادية للدكتور الغضبان: 311/1. 2 السيرة النبوية لابن هشام: 459/1. 3 السيرة النبوية لأبي شهبة: 317/1.

﴿ وَقَالُوا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ○ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ○ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ○ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ○ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ○ قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ○ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًاۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًاۢ بَصِيْرًا ○ ﴾

”اور وہ بولے: ہم تجھ پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے، حتی کہ تو ہمارے لیے زمین سے چشمہ جاری کر دے، یا تیرے لیے کھجوروں اور انگور کا ایک باغ ہو، پھر تو اس (باغ) کے درمیان (جگہ جگہ) نہریں جاری کر دے، یا تو آسمان ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم پر گرا دے جیسے تو کہا کرتا ہے، یا اللہ کو اور فرشتوں کو سامنے لے آ، یا تیرے لیے سونے کا گھر ہو، یا تو آسمان میں چڑھ جائے اور ہم تیرے چڑھنے پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے حتی کہ تو ہم پر ایک کتاب اتار لائے جسے ہم پڑھیں، کہیے: میرا رب پاک ہے، میں تو بس ایک بشر رسول ہوں اور لوگوں کے پاس ہدایت آجانے کے بعد ان کو ایمان لانے سے صرف اس چیز نے روکا کہ انھوں نے کہا: کیا اللہ نے بشر رسول بھیجا ہے؟ کہہ دیجیے: اگر زمین میں فرشتے ہوتے جو یہاں مطمئن ہوکر چلتے پھرتے تو ہم ان پر آسمان سے کوئی فرشتہ ہی رسول بنا کر نازل کرتے، کہہ دیجیے: میرے اور تمھارے درمیان اللہ (بطور) گواہ کافی ہے۔ بے شک وہ اپنے بندوں سے خوب باخبر اور (انھیں) خوب دیکھنے والا ہے۔“[1]

1 بنيٓ إسرآءيل 17:90-96.

اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی نازل ہوا:

﴿وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ۗ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا﴾

''اور اگر بلاشبہ (قرآن ایسا ہوتا) کہ اس کے ذریعے سے پہاڑ چلائے جاتے یا اس سے زمین قطع کی جاتی یا اس سے مردے بلوائے جاتے (تو بھی کفار ایمان نہ لاتے) بلکہ سارا معاملہ (اختیار) اللہ ہی کے پاس ہے۔''[1]

کفار کے مطالبات تسلیم نہ کیے جانے کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے یہ مطالبات ہدایت پانے کے لیے اور معاملے کو سنجیدگی سے لیتے ہوئے نہ کیے تھے۔ انھوں نے تو صرف بطور استہزا و سرکشی یہ مطالبات کیے تھے اور اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ اگر ان کے مطالبات کو تسلیم کر بھی لیا جائے تو وہ اسے دیکھ کر بھی ایمان نہیں لائیں گے بلکہ وہ اپنی سرکشی میں مزید آگے بڑھیں گے اور کفر و ضلالت میں سرگرداں ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ۚ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۖ وَمَا يُشْعِرُكُمْ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○ وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ○ وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَ كَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَ حَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ○﴾

''اور انھوں نے اللہ کے نام کی پختہ قسمیں کھائیں کہ اگر ان کے پاس (مخصوص) نشانی آجائے تو وہ اس پر ضرور ایمان لے آئیں گے، (اے نبی!) کہہ دیجیے: نشانیاں تو صرف اللہ کے پاس ہیں اور تمھیں یہ بات کون سمجھائے کہ بے شک جب وہ نشانی آجائے گی تو بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے اور ہم (اسی طرح) ان کے دلوں اور نگاہوں کو پھیر دیتے ہیں جس طرح یہ پہلی بار اس (قرآن) پر ایمان نہیں لائے

[1] الرعد 31:13.

تھے اور ہم انھیں ان کی سرکشی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیں گے اور اگر بے شک ہم ان کی طرف فرشتے نازل کرتے اور ان سے مردے کلام کرتے اور ہم (ان کی) ہر (مطلوبہ) شے ان کے سامنے پیش کر دیتے تو بھی وہ ایمان نہ لاتے۔ ہاں اگر اللہ ایسا چاہتا (تو اور بات تھی) لیکن ان میں سے اکثر جہالت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔"[1]

یہی وہ حکمتِ الٰہی اور رحمت ربانی تھی کہ ان کے مطالبات پورے نہ کیے گئے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ جب کوئی قوم نشانیاں دیکھ لینے کے بعد ایمان نہ لائے تو ان پر جڑ سے اکھیڑ دینے والا عذاب آتا ہے جیسا کہ قوم فرعون، عاد اور ثمود پر آیا تھا۔

کفار مکہ نے سرکشی اختیار کی، حق کا مذاق اڑایا اور دعوت حق کی راہ میں روڑے اٹکائے اور غیر سنجیدہ رویہ اپنایا، حالانکہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن کریم کی شکل میں زندۂ جاوید معجزہ موجود تھا جو سب سے بڑی دلیل اور نبی ﷺ کی صداقت کا بین ثبوت ہے،[2] چنانچہ جب انھوں نے مذکورہ معجزات کا مطالبہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے انھیں یہ جواب دیا:

﴿ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ شَهِيْدًا ۚ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوْا بِاللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ ﴾

"آپ کہہ دیجیے: میرے اور تمھارے درمیان اللہ بطورِ گواہ کافی ہے، آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، وہ اسے جانتا ہے اور جو لوگ باطل پر ایمان لائے اور انھوں نے اللہ کے ساتھ کفر کیا، وہی خسارہ پانے والے ہیں۔"[3]

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں: "قریش نے نبی ﷺ سے مطالبہ کیا کہ آپ اپنے اللہ سے دعا کریں کہ وہ صفا پہاڑ کو سونے میں تبدیل کر دے، پھر ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: «وَتَفْعَلُونَ؟» "کیا تم واقعی ایمان لے آؤ گے؟"

1 الأنعام 6:109-111. 2 السيرة النبوية لأبي شهبة 1/320،321. 3 العنكبوت 29:52.

انھوں نے جواب دیا: ''ہاں!'' ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی تو جبریل علیہ السلام آئے اور کہا: «إِنَّ رَبَّكَ عَزَّوَجَلَّ۔ يَقْرَأُ عَلَيْكَ السَّلَامَ، وَيَقُولُ: إِنْ شِئْتَ أُصْبِحُ لَهُمُ الصَّفَا ذَهَبًا فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْهُمْ عَذَّبْتُهُ عَذَابًا لَّا أُعَذِّبُهُ أَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِينَ، وَإِنْ شِئْتَ فَتَحْتُ لَهُمْ أَبْوَابَ التَّوْبَةِ وَالرَّحْمَةِ» ''بلاشبہ آپ کا رب آپ کو سلام کہتا ہے اور فرماتا ہے: اگر آپ چاہیں تو میں ان کے لیے اس پہاڑ کو سونے میں تبدیل کر دوں گا لیکن اس کے بعد اگر کسی نے کفر کا رستہ اختیار کیا تو انھیں ایسا عذاب دوں گا جو آج تک کسی کو نہ دیا ہوگا اور اگر آپ چاہیں تو میں ان کے لیے توبہ و رحمت کا دروازہ کھول دیتا ہوں۔'' اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عرض کی:

«بَلْ بَابَ التَّوْبَةِ وَالرَّحْمَةِ!»

''باری تعالیٰ! میں تو رحمت و توبہ کا دروازہ کھلوانا چاہتا ہوں۔'' تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں:

﴿وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ۭ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ۭ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا ۝﴾

''اور ہمیں نشانیاں بھیجنے سے صرف اس چیز نے روکا ہے کہ پہلے لوگوں نے ان کو جھٹلایا تھا اور ہم نے ثمود کو ایک اونٹنی (بطور) واضح نشانی دی تھی، پھر انھوں نے اس پر ظلم کیا اور ہم تو صرف ڈرانے کے لیے نشانیاں بھیجتے ہیں۔''[1]

قریشی سرداروں کے ان مطالبات کا مقصد صرف پیغمبر اور ان کی دعوت کے خلاف ذرائع ابلاغ کی ایک جنگ کا آغاز کرنا اور حق کے خلاف آمرانہ رویے کا اظہار تھا تاکہ عرب قبائل نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دور رہیں کیونکہ وہ جانتے تھے کہ انھوں نے ایسے مطالبات کیے ہیں جو اس دعوت کے اسلوب کے خلاف ہیں، اسی لیے انھوں نے ان پر اصرار کیا، تاہم

1 بنيّ إسرآءيل 59:17.

انھوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ اگر ان کا کوئی مطالبہ پورا ہو بھی گیا تو بھی وہ ہرگز ایمان نہیں لائیں گے۔ یوں ان کی یہ ساری تگ و دو نبی ﷺ کو عاجز کرنے اور لوگوں کو آپ کی اتباع سے روکنے کے لیے تھی۔[1]

مکی دور میں یہود کا کردار اور مشرکین مکہ سے تعاون

قرآن کریم نے بہت سی سورتوں میں بنی اسرائیل کا مفصل تذکرہ کیا ہے۔ ان کا صرف مکی دور کا کردار تقریباً پچاس سورتوں میں ملتا ہے۔ ان کا مدنی دور اللہ کے نور کو بجھانے، اسلامی دعوت کو ختم کرنے اور نبی ﷺ کی جان لینے کی کوششوں میں گزرا۔ قرآن کریم نے کسی بھی امت کے کردار پر اتنی روشنی نہیں ڈالی جتنی تفصیل سے قوم یہود کا تذکرہ کیا ہے۔

قرآن مجید کے بیانات میں یہود کے حوالے سے ان تمام دعوتی مراحل کا تذکرہ کیا گیا ہے جن سے دعوت اسلامی گزر رہی تھی۔ قرآن کریم میں یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ مشرکین مکہ نے حق سے جو غفلت برتی اور رسول اللہ ﷺ کی دعوت کی کوئی پروا نہ کی، اس کی مثالیں پہلی امتوں میں بھی ملتی ہیں، مثلاً: عاد، ثمود، فرعون اور بنی اسرائیل، قوم تُبَّع اور اصحاب الرّس وغیرہ[2]

سورۂ مزمل میں اس بارے میں اشارات موجود ہیں جو قرآن کی ترتیب نزولی کے اعتبار سے تیسری سورت ہے:

﴿إِنَّآ أَرْسَلْنَآ إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَٰهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ أَرْسَلْنَآ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا ۝ فَعَصَىٰ فِرْعَوْنُ ٱلرَّسُولَ فَأَخَذْنَٰهُ أَخْذًا وَبِيلًا ۝﴾

''بے شک ہم نے تمھاری طرف ایک رسول بھیجا جو تم پر شاہد ہے جیسے ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا تھا، چنانچہ فرعون نے رسول کی نافرمانی کی تو ہم نے

1 الوفود في العهد المكي لعلي الأسطل، ص:40-51. 2 معالم قرآنية في الصراع مع اليهود لمصطفى مسلم، ص:31,30.

اسے نہایت سختی سے پکڑ لیا۔‘‘[1]

اسی طرح سورۂ اعلیٰ جو قرآن کی ترتیب نزولی کے لحاظ سے آٹھویں سورت ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کی بعض صفات جلیلہ بیان کرنے کے بعد ان دنیاوی اور اخروی نعمتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جو اللہ نے اپنے بندوں پر نازل فرمائیں۔ علاوہ ازیں دنیا میں راہ نجات متعین فرمائی گئی اور بتایا گیا ہے کہ آخرت سب سے بہتر اور ہمیشہ باقی رہنے والی ہے اور سورت کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے:

﴿إِنَّ هَٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ ۝ صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ ۝﴾

’’بے شک یہ (بات) پہلے صحیفوں میں بھی (کہی گئی) تھی، (یعنی) ابراہیم اور موسیٰ (علیہما السلام) کے صحیفوں میں۔‘‘[2]

سورۂ فجر میں بھی گزری ہوئی اقوام کے تذکرے میں قوم فرعون کا تذکرہ موجود ہے۔

سورۂ نجم میں بھی بنی اسرائیل کا تذکرہ ملتا ہے۔ وہاں اس حوالے سے ان کا ذکر کیا گیا ہے کہ ان پر بہت سی آزمائشیں آئیں اور ظلم ہوئے۔ ان میں سے بعض آزمائش کا مقابلہ نہ کر سکے اور گمراہ ہو گئے اور بعض ثابت قدم رہے اور کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ ارشاد ہے:

﴿أَمْ لَمْ يُنَبَّأْ بِمَا فِي صُحُفِ مُوسَىٰ ۝﴾

’’کیا اسے (منہ موڑنے والے کو) ان (باتوں) کی خبر نہیں دی گئی جو موسیٰ کے صحیفوں میں ہیں؟‘‘[3]

گویا یہ تمام اصول اور ضابطے موسیٰ علیہ السلام کے صحیفوں (الواح موسیٰ) میں موجود ہیں جو بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے۔ قریش کو چاہیے تھا کہ اگر انھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت میں شک تھا تو ان صحیفوں کی طرف رجوع کرتے اور اسی طرح ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں کی طرف رجوع کرتے کیونکہ قریش کا خیال تھا کہ وہ ابراہیم علیہ السلام سے نسبت رکھتے

[1] المزمل 73:15,16. [2] الأعلىٰ 87:18,19. [3] النجم 53:36.

ہیں اور ان کی شریعت کی تعظیم کرتے ہیں اور اس کے وارث بنتے چلے آرہے ہیں، جیسا کہ وہ کعبے کی تولیت اور حُجاج کی خدمت جیسے مناصب پر فائز ہیں۔[1]

سورۂ صٓ، یٰسٓ، مریم اور طٰہٰ میں بھی بہت سے انبیاء اور ان کی اقوام کے قصص اور انھیں پہنچنے والی آزمائشوں کا تذکرہ ملتا ہے اور یہ کہ کس طرح انھوں نے صبر کا مظاہرہ کیا، نیز اس دعوتِ حق کے حاملین کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی سنت کا ذکر بھی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ ○ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ ذُو الْاَوْتَادِ ○ وَثَمُوْدُ وَقَوْمُ لُوْطٍ وَّاَصْحٰبُ لْـَٔيْكَةِ ۭ اُولٰٓئِكَ الْاَحْزَابُ ○ اِنْ كُلٌّ اِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ ○ وَمَا يَنْظُرُ هٰٓؤُلَاۗءِ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً مَّا لَهَا مِنْ فَوَاقٍ ○ وَقَالُوْا رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ ○ اِصْبِرْ عَلٰي مَا يَقُوْلُوْنَ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَيْدِ ۚ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ○﴾

”(یہ تو) یہاں کے شکست خوردہ لشکروں میں سے ایک (معمولی سا) لشکر ہے، ان سے پہلے قومِ نوح اور عاد اور میخوں والے فرعون نے (حق کو) جھٹلایا اور قومِ ثمود اور قومِ لوط اور اصحابِ اَیکہ نے بھی (جھٹلایا) (واقعی) یہ بہت بڑے (اور طاقتور) لشکر تھے، (ان میں سے) ہر ایک نے رسولوں کو جھٹلایا، لہٰذا (ان پر) میرا عذاب ثابت ہوگیا۔ یہ لوگ تو بس ایک (ہولناک) چیخ کا انتظار کر رہے ہیں، جس میں کوئی وقفہ نہیں ہوگا۔ اور انھوں نے کہا: اے ہمارے رب! ہمیں ہمارا (عذاب کا) حصہ یومِ حساب سے پہلے جلد دے دے۔ (اے نبی!) جو کچھ یہ کہتے ہیں آپ اس پر صبر کیجیے اور ہمارے بندے داود کو یاد کیجیے جو صاحبِ قوت تھا، بے شک وہ بہت رجوع کرنے والا تھا۔“[2]

ان آیات میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے تربیتی رہنمائی تھی کہ ان لوگوں نے کس طرح

---

1 معالم قرآنية في الصراع مع اليهود لمصطفى مسلم، ص: 316. 2 صٓ 38:11-17.

دعوت حق کے خلاف محاذ آرائی کی اور پیغمبروں کو جھٹلایا اور کس طرح ان پر عذاب برحق نازل ہوا اور اہل حق کامیابی اور فلاح سے ہمکنار ہوئے۔

کوئی بھی پیغمبر چاہے اس کا مقام و مرتبہ اپنے معاشرے میں کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو اسے اپنی قوم کی طرف سے بڑی اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اگر ہم سیدنا نوح، موسیٰ، ہود، صالح، لوط اور شعیب علیہم السلام کو عامۃ الناس تصور کرلیں تو داوٗد علیہ السلام کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جو قوت وحشمت اور بادشاہت کے مالک تھے۔ ان کے معجزات اتنے واضح تھے کہ پہاڑ ان کے ساتھ تسبیح بیان کرتے، پرندے ان کی تلاوت اور آواز سننے کے لیے جمع ہوجاتے۔ بنی اسرائیل نے ان کے بارے میں کیا کہا اور ان کی سیرت کے متعلق کیسی کیسی باتیں اپنی کتابوں میں لکھی ہیں۔ انھوں نے داوٗد علیہ السلام کی ذات سے ہر عیب منسوب کیا، حالانکہ وہ ایک عبادت گزار اور اللہ کی طرف رجوع کرنے والے پیغمبر تھے۔

اسی طرح بنی اسرائیل نے مریم علیہا السلام کے بارے میں جو انتہائی برگزیدہ خاتون تھیں، بہت کچھ کہا، حالانکہ قرآن کریم نے ان کے حمل، ولادت اور ان کے اور ان کے بیٹے کے ساتھ پیش آنے والے خرق عادت امور کو اپنی نشانیاں قرار دیا:

﴿قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ۝﴾

”اس (فرشتے) نے کہا: اسی طرح ہوگا، تیرے رب نے کہا ہے کہ وہ مجھ پر بہت آسان ہے تاکہ ہم اسے لوگوں کے لیے نشانی اور اپنی طرف سے رحمت بنائیں اور یہ امر طے شدہ ہے۔“[1]

اگر بنی اسرائیل کے اہل کتاب ہونے کے باوجود اپنے پیغمبروں سے ان کا یہ سلوک رہا ہے، حالانکہ ان کے پاس تورات تھی جس میں ہدایت و نور تھا تو قریش کی طرف سے

1 مریم 21:19.

دعوت اسلامی کی مخالفت میں ایسے الفاظ استعمال کرنا جو خود ان کی ضلالت و جہالت کا مظہر تھے، انوکھی بات نہ تھی۔

دعوت اسلامی لوگوں کو حق قبول کرنے اور اللہ کے دشمنوں، مشرکین اور ایسے اہل کتاب جو اللہ کو جھٹلاتے اور اس پر بہتان طرازی کرتے ہیں، کے خلاف ثابت قدم رکھنے کی تربیت دیتی ہے۔

بنی اسرائیل نہ صرف دیگر انبیاء پر ایمان لانے کے بجائے ان کی تکذیب کرتے ہیں بلکہ اپنے سب سے بڑے نبی سیدنا موسیٰ علیہ السلام جن سے منسوب ہو کر نہ صرف فخر محسوس کرتے اور اپنے آپ کو ان کی کتاب اور شریعت کا حامل بتاتے ہیں، ان کے متعلق بھی ان کا برتاؤ بڑا تمسخر آمیز اور عجیب رہا ہے۔

سورۂ طٰہٰ میں بنی اسرائیل کا ان کے ساتھ سلوک واضح کرتے ہوئے یہ بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کی ناسمجھی، سرکشی اور جان بوجھ کر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کو برداشت کیا۔ موسیٰ علیہ السلام اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو بغرض اصلاح اپنی قوم میں چھوڑ کر خود اپنے رب سے ہم کلام ہونے کے لیے کوہ طور پر تشریف لے گئے تھے۔ پیچھے قوم نے ہارون علیہ السلام کے خلاف باغیانہ رویہ ظاہر کیا۔ ساری قوم نے اپنے زیورات اکٹھے کیے تاکہ سامری ان کے لیے ایسا بچھڑا تیار کر دے جس سے گائے کی آواز بھی آتی ہو اور لوگ اس کا بغرض عبادت طواف کریں اور زبان سے کہیں:

﴿ هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى فَنَسِيَ ۝ ﴾

''یہ تمھارا اور موسیٰ کا رب ہے پس وہ (موسیٰ) بھول گیا۔''[1]

جب موسیٰ علیہ السلام کو حقیقت سے آگاہی ہوئی تو انھوں نے سامری کو طلب کیا اور اس سے اس جاہلانہ حرکت کے بارے میں سوال کیا تو اس نے جواب دیا:

1 طٰہٰ 20:88.

﴿قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ۝﴾

''اس (سامری) نے کہا: میں نے وہ چیز دیکھی جو ان لوگوں نے نہ دیکھی، چنانچہ میں نے (مٹی کی) ایک مٹھی رسول (جبریل کے گھوڑے) کے نقش قدم سے بھر لی اور وہ اس میں ڈال دی اور اسی طرح میرے نفس نے (اسے) میرے لیے خوشنما بنا دیا۔''[1]

بلاشبہ ایک ایسی قوم جس کی کم عقلی گمراہی، فساد اور کج روی کو پہنچ چکی تھی، اب کیا اس کی طرف سے کسی اچھے سلوک یا بھلائی اور حق کے ساتھ تعاون کی امید کی جا سکتی تھی؟ بنی اسرائیل کے ان واقعات کی وجہ سے دعوت حق کے مکی مرحلے میں تمام مذاہب اور گروہوں سے الگ شان کی حامل اسلامی شخصی کردار سازی میں دور رس اثرات مرتب ہوئے۔[2]

قرآنی رموز اور ان کی عمدہ مناسبتوں کا تقاضا ہے کہ عالمی دعوت اسلامی کے بارے میں بحث کرتے ہوئے بنی اسرائیل سے لیے گئے اس عہد و پیمان کا ضرور تذکرہ کر دیا جائے جس میں انھیں اس دعوت کی آمد پر نبی ﷺ پر ایمان لانے کو کہا گیا ہے اور اس بات کا تذکرہ سورۂ اعراف میں موجود ہے۔

بنی اسرائیل کی کج روی کی داستان بیان کرنے کا مقصد اہل ایمان کو خبردار کرنا تھا کہ اگر یہود انھیں برا سمجھیں تو ان کی کسی بات سے متاثر نہ ہوں، یہ تو ایک بہتان طراز قوم ہے اور ان کا اپنے پیغمبروں سے بہت برا سلوک رہا ہے۔ یہود نے اپنی کتابوں میں نبی ﷺ کے اوصاف موجود ہونے کے باوجود اگر آپ ﷺ کو اور اسلامی دعوت کو جھٹلایا ہے تو ایک فسادی قوم سے اس طرح کا ارتکاب بعید نہیں۔[3]

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

---

1 طٰہٰ 96:20. 2 معالم قرآنية في الصراع مع اليهود لمصطفٰى مسلم، ص:40,39. 3 معالم قرآنية في الصراع مع اليهود لمصطفٰى مسلم، ص:54.

﴿الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۖ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ○﴾

”اور (ان کے لیے بھی رحمت ہے) جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں، (یعنی) وہ لوگ جو اس رسول اُمی نبی (محمد ﷺ) کی پیروی کرتے ہیں جس کا ذکر وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں، وہ انھیں اچھے کاموں کا حکم دیتا ہے اور انھیں برے کاموں سے روکتا ہے۔ اور وہ ان کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کرتا ہے اور ان پر ناپاک چیزیں حرام ٹھہراتا ہے اور ان پر سے ان کے بوجھ اور وہ طوق اتارتا ہے جو ان پر تھے، چنانچہ جو لوگ اس پر ایمان لائے اور انھوں نے اس کی تعظیم کی اور اس کی مدد کی اور اس نور (ہدایت) کی پیروی کی جو اس پر نازل کیا گیا، وہی فلاح پانے والے ہیں، کہہ دیجیے: اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں، جس کے پاس آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے، اس کے سوا کوئی معبود (برحق) نہیں، وہ زندہ کرتا اور مارتا ہے، لہٰذا تم اللہ پر اور اس کے رسول اُمی نبی پر ایمان لاؤ، جو (خود بھی) اللہ اور اس کے (تمام) کلمات پر ایمان لاتا ہے اور تم اس کی پیروی کرو تاکہ تم ہدایت پاؤ۔“[1]

[1] الأعراف 7:157، 158۔

جی ہاں! یہ پیغام مکہ کی گھاٹیوں اور پہاڑوں پر مشتمل سنگلاخ زمین سے نکل کر سارے عالم میں پھیلنے والا تھا۔ ایک عظیم روحانی انقلاب برپا ہونے والا تھا۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ یہ آیات اس عالمی دعوت کے خدوخال کی وضاحت کرتی ہیں کہ وہ مکہ سے نکل کر پورے عالم کی زینت بنے گی، نیز سورۂ اعراف کی یہ آیات امت محمدیہ کے لیے عظیم ترین اسباق کی حامل ہیں جو بنی اسرائیل کی تاریخ میں بیان کیے گئے بڑے بڑے واقعات سے حاصل ہوتے ہیں۔

یہی وہ واقعات ہیں جو ایک طرف رسول اللہ ﷺ کی امت اور اس کے لیے عالمی قیادت میں کردار و اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو دوسری طرف انھیں بنی اسرائیل کی کج رویوں سے کنارہ کشی کا حکم بھی دیتے ہیں۔

قرآن کریم میں یعقوب علیہ السلام اور ان کی اولاد سے تشکیل پانے والی اس قوم کا تذکرہ اس طرح آیا ہے کہ ان کی کھانے پینے کی تنگی دور کرکے زمین سے چشمے جاری کردیے گئے، مَنّ وسَلوٰی ان پر نازل ہوا، بادل کی مدد سے گھنے سایے کا اہتمام ہوا لیکن مقام غور یہ ہے کہ کیا انھوں نے ان نعمتوں کا شکر ادا کیا یا شرعی احکام کے بارے میں ان کا کیا رویہ رہا؟ وہ ہمیشہ حق کی مخالفت، احکامِ الٰہی میں تحریف اور حیلہ سازی اور سرکشی کی روش اختیار کیے رہے۔

انسانیت کی تکمیل خالق ارض و سماء کی طرف سے نازل شدہ وحی کی اتباع سے ہوتی ہے اور اللہ کی رضا کے لیے اعمال انسان کو درجۂ کمال تک پہنچا دیتے ہیں کیونکہ اس طرح اس کا مقصد تخلیق پورا ہوجاتا ہے۔ اس مقصد کے حصول میں کوتاہی اور وحی الٰہی سے دوری اسے اوج کمال تک پہنچنے سے روک کر جانور اور چوپاؤں کی صف میں کھڑا کردیتی ہے اور بسا اوقات وہ جانوروں کے درجے سے بھی نیچے گر جاتے ہیں کیونکہ وہ اپنی عقل کو مزید کمینگی اور پستیوں میں دھکیل دیتا ہے جبکہ جانور اس طرح نہیں کرسکتے۔ ان کی فطرت متعین کردی گئی ہے اور ان کے کام طے شدہ ہیں۔

سورۂ اعراف جو مکی دور میں نازل ہوئی بنی اسرائیل کے واقعات کے حوالے سے بہت سے تربیتی پہلو سامنے لاتی ہے اور ربانی مقاصد اور اللہ کے نافذ العمل قوانین کی نشاندہی کرتی ہے۔[1]

جب قریش نے دیکھا کہ وہ اس برحق دعوت کے سامنے عاجز آچکے ہیں اور یہ عاجزی نضر بن حارث کی اس بات سے عیاں ہوتی تھی جس نے بآواز بلند کہا تھا: ”اے قریشیو! اللہ کی قسم! تم پر ایک ایسی مصیبت نازل ہوئی ہے کہ تم کبھی اس کا مقابلہ نہ کرسکو گے، لہٰذا تم اپنی فکر کرو۔ اللہ کی قسم! تم پر ایک عظیم آفت اتری ہے۔“

بعد ازاں انھوں نے فیصلہ کیا کہ نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط کو مدینہ کے یہودی علماء کی طرف بھیجا جائے، اس لیے نہیں کہ وہ اس دعوت کی اتباع کرنے پر آمادہ تھے بلکہ وہ تو صرف اس دعوت کی حقیقت کو جاننا چاہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ یہود ان سے تعاون کریں اور انھیں ایسی باتیں بتائیں جو رسول اللہ ﷺ کو عاجز کردیں۔ مکہ کے سردار جانتے تھے کہ یہود تمام اہل حق اور انبیاء سے کینہ رکھتے ہیں اور نبی ﷺ کی بعثت یہود کے لیے بڑا صدمہ تھا۔ وہ تو جزیرہ نمائے عرب میں عرصۂ دراز سے اس امید پر رہے تھے کہ یہاں ایک نبی مبعوث ہوگا جو انھیں ان کے درمیان پیدا ہونے والے ہر افتراق اور اختلاف سے نجات دلائے گا اور وہ سمجھتے تھے کہ وہ نبی زمان و مکان کے لحاظ سے انھی میں سے ہوگا۔[2]

یہود اور اہل کفر وشرک اسلامی دعوت کی مخالفت کی وجہ سے مشترکہ مفادات رکھتے تھے، اس لیے مشرکین مکہ نے اپنا ایک وفد یہود کی طرف بھیجا تاکہ نبی ﷺ کو عاجز کرنے کے لیے کچھ سوالات تیار کیے جاسکیں۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: ”قریش نے نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی

1 معالم قرآنية في الصراع مع اليهود لمصطفٰى مسلم، ص:55-60. 2 اليهود في السنة المطهرة للدكتور عبدالله الشقاري:1/188.

معیط کو مدینہ میں یہودی علماء کی طرف بھیجا اور ان سے کہا: ''آپ ان سے محمد (ﷺ) کے بارے میں سوال کریں اور انھیں محمد (ﷺ) کے اوصاف اور ان کی باتوں سے بھی آگاہ کریں، وہ پرانے اہل کتاب ہیں جو آسمانی علم ان کے پاس ہے وہ ہمارے پاس نہیں ہے۔''

وہ دونوں مدینہ پہنچے اور یہود کو نبی ﷺ کے اوصاف اور اقوال کی خبر دی اور آپ کے بارے میں رائے دریافت کی تو علمائے یہود نے کہا: ''ہم آپ کو تین باتیں بتاتے ہیں۔ آپ اس (نبی) سے ان کے بارے میں سوال کریں۔ اگر وہ درست خبر دے تو سمجھ لیں کہ وہ سچا نبی ہے۔ وگرنہ وہ خودساختہ نبی ہے۔ اس کے بارے میں جو آپ کے جی میں آئے کر گزریں۔''

① اس سے اس جماعت کے متعلق سوال کرو جو زمانہ قدیم میں کہیں غائب ہوگئے تھے، ان کی حقیقت کیا ہے؟ ان کے ساتھ عجیب واقعہ پیش آیا تھا۔

② اس سے اس آدمی کے بارے میں سوال کرو جو ساری دنیا میں گھومتا تھا اور اس نے دنیا کے مشرق و مغرب تک رسائی حاصل کی تھی، اس کا قصہ کیا ہے؟

③ اور اس سے روح کی حقیقت کے متعلق سوال کرو کہ وہ کیا ہے؟ اگر وہ تمھیں یہ تمام خبریں بتا دے تو جان لو کہ وہ سچا نبی ہے۔ تم اس کی اتباع کرو ورنہ وہ جعلی نبی ہے، پھر تم اپنی مرضی کے مطابق کوئی فیصلہ کر سکتے ہو۔

نضر اور عقبہ واپس مکہ آئے اور کہا: ''اے قریشیو! ہم تمھارے اور محمد (ﷺ) کے درمیان فیصلہ کن معاملہ لے کر آئے ہیں۔ ہم سے یہودی علماء نے کہا ہے کہ ہم اس سے تین باتوں کا سوال کریں، پھر ساری بات کہہ سنائی۔''

اب وہ تمام لوگ نبی ﷺ کے پاس آئے اور کہا: ''اے محمد! ہمیں ان (تین) باتوں کی تفصیل سے آگاہ کیجیے۔'' نبی ﷺ نے فرمایا: ''میں تمھیں کل ان سوالات کے جواب دوں گا'' اور آپ ﷺ نے ان شاء اللہ نہ کہا۔ یہ سن کر قریشی واپس چلے گئے۔ دوسری طرف نبی ﷺ پندرہ دن تک وحی کا انتظار کرتے رہے، نہ تو جبریل علیہ السلام آئے اور نہ اللہ کی طرف

سے کوئی وحی آپ کے پاس آئی حتی کہ اہل مکہ نے خبریں پھیلانا شروع کر دیں کہ محمد (ﷺ) نے ہمارے ساتھ کل کا وعدہ کیا تھا اور اب پندرہ دن گزر چکے ہیں، اس نے ہمارے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔ ادھر نبی ﷺ وحی کی تاخیر پر غمگین تھے۔ آپ ﷺ اہل مکہ کی یہ باتیں سن کر مزید تنگ دل ہو جاتے، پھر جبریل علیہ السلام آئے اور سورۂ کہف کا نزول ہوا جس میں آپ کو قریش کی باتوں پر غمزدہ نہ ہونے کی تلقین کی گئی اور اصحاب کہف اور ذوالقرنین (رَجُل طَوَّاف دنیا میں گھومنے والا) کے بارے میں تفصیلات بتائی گئیں۔ اور روح کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ۝﴾

"اور وہ آپ سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہیے: روح میرے رب کے حکم سے ہے اور تمھیں تو بہت ہی تھوڑا علم دیا گیا ہے۔"[1]

جب یہود نے یہ آیت سنی تو کہنے لگے ہمارے پاس تورات ہے اور جسے تورات مل گئی، اسے تو خیر کثیر مل گئی۔ تب یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ۝﴾

"کہہ دیجیے: اگر میرے رب کی باتوں (کے لکھنے) کے لیے سمندر روشنائی ہو تو یقیناً میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جائے گا اور اگرچہ ہم اس کے مثل (اور سمندر) بطور مدد لے آئیں۔"[2]

سورۂ کہف میں مشرکین مکہ کے سوالوں کے جوابات تھے اور اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ غار اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک پناہ گاہ تھی۔ عنقریب اس جماعت کی طرح نبی ﷺ

1 بني إسرآءيل 85:17. 2 الكهف 109:18.

کے کمزور صحابہ بھی ایک پناہ گاہ کی طرف ہجرت کرنے والے ہیں جو انھیں پناہ دے گی بالکل اسی طرح جس طرح فتنے کے ڈر سے بھاگنے والے چند اہل ایمان کو غار نے پناہ فراہم کی تھی۔ عنقریب یہ لوگ یثرب میں اللہ کے دین کی مددگار قوم کے پاس چلے جائیں گے جو انھی لوگوں کے پاس آباد ہے جنھوں نے قریش سے ہمدردی ظاہر کر کے اسلام کے متعلق ان کے شک کو پختہ کیا، نورِ حق کو مٹانے کی کوشش کی اور نبوت کی تحقیق و توثیق کے لیے ایک ایسا منصوبہ پیش کیا جو ان کے خیال میں نبی ﷺ کو لاجواب کر دینے والا تھا۔ یہ ایک غلط طریقہ تھا۔ کسی بھی صاحب رسالت و نبوت کی رسالت جانچنے کا یہ کوئی طریقہ نہ تھا، اللہ کے نبی موسیٰ علیہ السلام ہی کو دیکھا جائے جو بنی اسرائیل کے سب سے برگزیدہ نبی تھے تو وہ بھی حضرت خضر علیہ السلام اور ان کے مابین پیش آنے والے واقعات کی تاویل سے بے خبر تھے۔ انھوں نے حضرت خضر علیہ السلام پر تنقید کی، حالانکہ انھوں نے کسی قسم کے سوال یا تنقید سے منع کیا ہوا تھا جب تک کہ وہ خود بیان نہ کریں، لہٰذا ان تمام باتوں کے باوجود جب موسیٰ علیہ السلام کی نبوت میں کسی قسم کا شک و شبہ پیدا نہ ہوا تو بنی اسرائیل نے نبی ﷺ کی صداقت کو جاننے کے لیے اس قسم کا رویہ کیوں اپنایا۔[1]

اللہ تعالیٰ نے ان سوالوں کے جواب میں اہل ایمان کے لیے اشارہ دے دیا کہ وہ عنقریب نوجوان مومنوں کے اس گروہ کی طرح ایک پناہ گاہ حاصل کر لیں گے اور اہل مدینہ خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کریں گے بعینہ جس طرح اصحاب کہف کا شہر والوں نے استقبال کیا تھا، پھر وہ ان کے مقام رہائش پر پہنچے تھے تا کہ ان کی تکریم کریں اور ان کی یاد قائم رکھیں۔[2]

قرآن کریم اس لیے نازل ہوا کہ ایک ایسی بہترین امت تشکیل دے جو لوگوں کی بھلائی کے لیے مامور کی گئی ہو اور اس کے اپنے اصول اور اپنی پہچان ہو۔ مکی دور کی ابتدا

1 الروض الأنف للسهيلي: 52/2، ومباحث في التفسير الموضوعي لمصطفٰى مسلم، ص: 189. 2 تأمّلات في سورة الكهف لأبي الحسن الندوي، ص: 46، ومعالم قرآنية في الصراع مع اليهود لمصطفٰى مسلم، ص: 61.

میں نازل ہونے والی سورت سورۂ فاتحہ تھی جس میں مومن کی رجوع الی اللہ کے ساتھ صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کی گئی ہے اور غضب الٰہی کے مستحق یہود اور گمراہ نصاریٰ کے راستے سے بچنے کا درس دیا گیا ہے اور یہی تفسیر عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کی حدیث میں بھی ہے کہ ''مغضوب علیهم'' سے مراد یہود اور ''الضالین'' سے مراد نصاریٰ ہیں۔[1]

سورۂ فاتحہ میں بیان کیے گئے اس منہج کی تعیین اور صراط مستقیم کا بیان دیگر تمام گمراہ راستوں کا علم حاصل کرنے کی دعوت دیتا ہے تاکہ ان تمام متفرق راستوں سے بچا جاسکے جو ہلاکت و گمراہی کا سبب بنتے ہیں۔

یہودیوں کے عقائد، تحریفات اور پیغمبروں سے ناروا سلوک، یہ سب کچھ ان اسباب اور ذرائع کا متقاضی ہے کہ اسلام کا امتیازی تشخص قائم دائم رہے۔ یہودیوں کے اور ہمارے درمیان معرکہ آج بھی برپا ہے جو درحقیقت اسی منہج اور صراط مستقیم اور ان جاہلی مناہج کے مابین معرکہ ہے جو اللہ کے کلمات کو بدلنے والے اور زمین میں فساد پیدا کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔[2]

1 جامع الترمذي، حديث: 2954، و مسند أحمد: 4/379,378. 2 معالم قرآنية في الصراع مع اليهود لمصطفى مسلم، ص: 79.

باب 4

اقتصادی و معاشرتی بائیکاٹ (شعب ابی طالب)

نبی ﷺ اور اہلِ اسلام کے صبر کے سامنے قریشی مشرکین کا ظلم بڑھتا چلا گیا جبکہ آپ ﷺ اور آپ کے پیروکار مسلسل اللہ کی طرف دعوت دیتے رہے۔ قبائل میں اسلام کے پھیلنے کے باعث قریش کی طرف سے اذیتوں کا سلسلہ دراز ہوتا گیا، یہاں تک کہ مسلمانوں کا مادی و سماجی بائیکاٹ شروع کر دیا گیا جس کا آغاز قریش نے ظلم اور دشمنی کی وجہ سے کیا تھا۔ اس کی زد میں اہل اسلام اور نبی ﷺ کی حمایت کرنے والے قرابتدار بھی آ گئے۔[1]

علامہ زہری رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''بعدازاں مشرکین نے اپنی پوری طاقت سے مسلمانوں پر سختیاں کیں یہاں تک کہ ان پر آزمائشوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور ان کی ہمت جواب دینے لگی، مزید برآں قریش نے علی الاعلان نبی ﷺ کے قتل پر اتفاق کر لیا۔ ابو طالب نے جب معاملہ سنگین ہوتا دیکھا تو بنوعبدالمطلب کو یکجا کیا اور انھیں حکم دیا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو شعب ابی طالب میں لے چلیں اور ان کا دفاع کریں۔ اس بات سے تمام بنوعبدالمطلب نے ،خواہ کافر ہوں یا مسلمان، اتفاق کیا۔ بعض نے قبائلی عصبیت اور بعض نے ایمان و یقین سے یہ کام کیا۔ جب قریش نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کی قوم ان کی حفاظت کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی ہے تو انھوں نے طے کیا کہ کوئی ان کے ساتھ میل جول نہ رکھے، نہ ان سے لین دین کرے اور نہ ان کی گھریلو تقریبات میں شرکت کرے جب تک کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو ان کے حوالے نہ کر دیں تا کہ انھیں قتل کر دیا جائے۔ انھوں نے مکرو

1 ظاهرة الإرجاء، للدكتور سفر الحوالي:1/50.

فریب سے کام لیتے ہوئے آپس میں ایک معاہدہ بھی تحریر کیا جس میں مختلف دفعات تھیں کہ وہ بنو ہاشم سے کبھی صلح کریں گے نہ ان کے بارے میں کوئی نرمی برتی جائے گی حتی کہ رسول اللہ ﷺ کو قتل کرنے کے لیے ان کے سپرد کر دیا جائے۔[1]

ایک اور روایت میں ہے کہ ان سے شادی بیاہ اور خرید و فروخت کے تعلقات قائم نہ کیے جائیں، ان کے پاس خوراک کا کوئی دانہ تک نہ پہنچنے دیا جائے، نہ ان سے صلح کی جائے، نہ ان کے بارے میں نرمی برتی جائے، نہ کوئی ان سے میل جول رکھے اور نہ ان کی مجلس میں بیٹھے۔ نہ کوئی ان سے کلام کرے اور نہ ان کے گھروں میں جائے یہاں تک کہ وہ رسول اللہ کو قتل کرنے کے لیے ان کے سپرد کریں۔ یہ معاہدہ طے کر کے انھوں نے ایک تحریر لکھی اور اعلان عام کے طور پر یہ دستاویز بیت اللہ کے اندر لٹکا دی گئی۔[2]

شِعْب ابی طالب میں جب سب لوگ سونے کے لیے جاتے تو جناب ابو طالب رسول اللہ ﷺ کو اپنے بستر کی طرف جانے کا کہتے اور خود قریش کی ہر قسم کی چالبازی اور اچانک حملے کا جائزہ لیتے، پھر جب لوگ سو جاتے تو اپنے کسی بیٹے، بھائی یا چچا زاد کو رسول اللہ ﷺ کے بستر پر لٹا دیتے اور رسول اللہ ﷺ سے کہتے کہ تم اس کے بستر پر لیٹ جاؤ، چنانچہ آپ وہاں آرام فرماتے۔[3]

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور بنو ہاشم و بنو مطلب کا بائیکاٹ اتنا سخت ہوتا چلا گیا کہ وہ درختوں کے پتے کھانے پر مجبور ہو گئے حتی کہ ان کی زندگی اتنی تنگ اور مشکل ہو گئی کہ ان میں سے کوئی پیشاب کرنے کے لیے جاتا اور اچانک اپنے پاؤں کے نیچے کھڑکھڑاہٹ کی آواز سنتا اور دیکھتا کہ وہاں اونٹ کی کھال کا ٹکڑا ہے تو وہ اسے اٹھاتا، پانی سے صاف کرتا، پھر اسے جلاتا

---

1 دلائل النبوة للبيهقي:2/80-85، و السيرة النبوية لابن كثير:2/43-72، و الروض الأنف للسهيلي: 2/101-129، والسيرة النبوية لابن هشام:1/375,376. 2 السيرة النبوية لابن هشام: 1/350، و زاد المعاد: 2/46، و الكامل في التاريخ: 2/87. 3 فقه السيرة النبوية للدكتور الغضبان: 180.

اور سفوف بنا لیتا اور تھوڑا تھوڑا پھانکتا رہتا، پھر پانی پی لیتا اور تین دن اس پر گزارا کرتا۔[1]

پھر یہ بائیکاٹ اتنا شدید ہوگیا کہ قریش گھاٹی کے باہر بچوں کے بلبلانے کی آوازیں سن سکتے تھے۔

یہ بائیکاٹ تین سال تک جاری رہا، پھر اللہ تعالیٰ نے چند قریشی سرداروں کو اس ظالمانہ دستاویز کو چاک کرنے پر لگا دیا۔ اس انقلابی سوچ کا روح رواں ہشام بن عمرو الہاشمی تھا۔ وہ زہیر بن ابو امیہ مخزومی کے پاس گیا جس کی ماں عاتِکہ بنت عبدالمطلب تھی۔ ہشام نے کہا: ''اے زہیر! کیا تو اس بات پر خوش ہے کہ تو پیٹ بھر کر کھائے، اچھے کپڑے پہنے، عورتوں سے نکاح کرے اور تیرے ننھیال سے جیسا کہ تو جانتا ہے نہ کوئی چیز خریدی جائے، نہ بیچی جائے، نہ وہ کسی سے نکاح کریں اور نہ ان سے کوئی نکاح کرے؟ بخدا اگر ابو الحکم بن ہشام کے ننھیال کا مسئلہ ہوتا، پھر تو اسے اس بات (بائیکاٹ) کی طرف بلاتا جس کی اس نے تجھے دعوت دی ہے تو وہ کبھی تیری آواز پر لبیک نہ کہتا۔'' زُہیر نے کہا: ''افسوس! میں کیا کرسکتا ہوں؟ میں تو تنہا ایک آدمی ہوں۔ ہاں، اگر میرے ساتھ کوئی اور آدمی ہوتا تو میں اس دستاویز کو پھاڑنے کے لیے یقیناً اٹھ کھڑا ہوتا۔'' اس نے کہا: ''اچھا تو ایک آدمی اور موجود ہے۔'' پوچھا: ''کون ہے؟'' کہا: ''میں ہوں۔'' اس پر زہیر نے کہا: ''اچھا تو اب تیسرا آدمی تلاش کرو۔''

ہشام مطعم بن عدی کے پاس پہنچا اور کہا: ''اے مطعم! کیا تو اس بات سے متفق ہے کہ بنو عبد مناف کے دو قبیلے ہلاک ہوجائیں اور تو دیکھتا رہے اور قریش کا ہمنوا بنا رہے؟'' اس نے کہا: ''افسوس! میں اکیلا کیا کرسکتا ہوں؟'' ہشام نے کہا: ''میں نے ایک اور آدمی تلاش کیا ہے۔'' اس نے کہا: ''وہ کون ہے؟'' ہشام نے کہا: ''میں'' اس پر مطعم نے کہا: پھر ہمیں تیسرا آدمی تلاش کرنا چاہیے۔'' ہشام نے کہا: ''یہ کام بھی میں نے کرلیا ہے۔''

1 الغرباء الأولون للدكتور سلمان العودة، ص: 148.

مطعم نے پوچھا: ''وہ کون ہے؟'' ہشام نے کہا: ''وہ زہیر بن ابو امیہ ہے'' پھر اس نے کہا: ''ہمیں چوتھا آدمی تلاش کرنا چاہیے۔'' اب ہشام ابو البختری بن ہشام کے پاس پہنچا اور اس سے مطعم بن عدی جیسی گفتگو کی۔ اس نے کہا: ''افسوس! کیا اس میں کوئی اور بھی ہماری تائید کرے گا؟'' ہشام نے کہا: ''ہاں زہیر بن ابو امیہ، مطعم بن عدی اور میں'' تب اس نے کہا: ''ہمیں پانچواں آدمی تلاش کرنا ہوگا۔'' اب ہشام اسود بن مطلب بن اسد کے پاس پہنچا اور اس سے اپنی قرابت اور محصورین کے حق میں بات کی۔ اس نے کہا: ''جس چیز کی تم مجھے دعوت دے رہے ہو کیا کوئی اور بھی اس سے متفق ہے؟'' ہشام نے کہا: ''ہاں'' پھر ان تمام افراد کے نام لیے جو ان سے متفق ہو چکے تھے، پھر سب نے رات کے وقت بالائی مکہ میں حَجُون کی چوٹی پر جمع ہو کر فیصلہ کیا کہ اس دستاویز کو چاک کیا جانا چاہیے۔ زہیر نے کہا: ''میں اس کی ابتدا کروں گا اور سب سے پہلے اس سلسلے میں بات کروں گا۔''

پھر جب صبح ہوئی اور سب اپنی اپنی محفلوں میں جا پہنچے تو زہیر بن ابو امیہ ایک حلہ زیب تن کیے وہاں آیا۔ پہلے اس نے بیت اللہ کے سات چکر لگائے، پھر لوگوں کی طرف متوجہ ہوا اور کہا: ''کیا ہم تو کھانا کھائیں، کپڑے پہنیں اور بنو ہاشم تباہ و برباد ہو جائیں، وہ کسی سے خرید و فروخت نہ کریں؟ واللہ! میں اس وقت تک چین سے نہ بیٹھوں گا جب تک کہ یہ ظالمانہ بائیکاٹ والی دستاویز چاک نہ کر دی جائے۔'' یہ بات سن کر ابو جہل جو مسجد کے ایک کونے میں بیٹھا تھا، بول اٹھا: ''تو جھوٹ کہتا ہے، اللہ کی قسم! یہ دستاویز چاک نہیں ہوگی۔'' اس پر زَمْعَہ بن اسود نے کہا: ''واللہ! تو سب سے بڑا جھوٹا شخص ہے۔ ہم تو اس کے لکھے جانے کے وقت بھی راضی نہ تھے۔'' ابو البختری نے کہا: ''زمعہ درست کہتا ہے۔ ہم اس دستاویز کے مندرجات سے راضی نہیں ہیں اور نہ اس کا اقرار کرتے ہیں۔'' مطعم بن عدی نے کہا: ''تم دونوں سچ کہتے ہو۔ جو اس سے ہٹ کر بات کرتا ہے، جھوٹ بولتا ہے۔ ہم اس دستاویز اور جو اس میں لکھا ہے اللہ کے حضور براءت کا اعلان کرتے ہیں۔''

ہشام بن عمرو نے بھی اس جیسی بات کہی تو ابوجہل بولا: ''یہ تو رات کی گھڑیوں میں طے کیا گیا پروگرام لگتا ہے جو کسی اور جگہ طے کیا گیا ہے۔''

اس وقت ابوطالب بھی مسجد کے ایک کونے میں خاموشی سے بیٹھے تھے۔ مطعم بن عدی دستاویز کو چاک کرنے کی غرض سے آگے بڑھا۔ دیکھا کہ اس کو دیمک نے کھا لیا ہے اور وہاں صرف باسمك اللّٰھم۔ (اے اللہ! تیرے نام سے) کے سوا کوئی لفظ باقی نہیں۔[1]

ابن ہشام کہتے ہیں کہ بعض اہل علم بیان کرتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ نے ابو طالب سے کہا: ''چچا جان! اللہ تعالیٰ نے قریش کی دستاویز پر دیمک مسلط کردی ہے۔ اس نے اس دستاویز میں اللہ کے نام کے سوا تمام الفاظ جو ظلم، بائیکاٹ اور بہتان طرازی پر مبنی تھے، کو چاٹ لیا ہے۔'' ابو طالب نے پوچھا: ''کیا تمھارے رب نے تمھیں یہ خبر دی ہے؟'' رسول اللہ نے فرمایا: ''ہاں۔'' تب ابو طالب نے کہا: ''واللہ! کوئی تمھارا بال بیکا نہیں کرسکے گا'' پھر جاکر اپنی قوم کو اس سے آگاہ کیا اور کہا: ''اے گروہ قریش! میرے بھتیجے نے مجھے یہ بتایا ہے، سو تم اپنی دستاویز لاؤ۔ اگر وہ اسی طرح ہے جس طرح میرے بھتیجے نے بتایا ہے تو تم ہمارا بائیکاٹ ختم کردو اور اس دستاویز میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے دستبردار ہوجاؤ اور اگر میرے بھتیجے نے خلاف حقیقت بات کہی ہے تو میں اسے تمھارے حوالے کر دوں گا۔'' سب اس بات سے متفق ہوگئے، پھر جب انھوں نے اس دستاویز کو دیکھا تو ویسا ہی نکلا جیسے نبی ﷺ نے بیان فرمایا تھا۔ اس پر بھی ان کے شر میں اضافہ ہی ہوا، پھر قریش کی اس دستاویز کی منسوخی میں جس نے جو کرنا تھا وہ کر گزرا۔[2]

دروس و نصیحتیں

① اس عہد و پیمان پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ قریش نے اس عہد نامہ کی دفعات کو اتنا

[1] السيرة النبوية لابن كثير: 2/43-50 و 67-69. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 1/377.

مضبوط بنایا تھا کہ کوئی ایسا رخنہ نہ چھوڑا تھا جس سے مقاطعے کی خلاف ورزی ممکن ہو۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ عہد نامہ وسیع پیمانے پر باہمی مشوروں اور افہام و تفہیم سے طے کیا گیا تھا اور اسے طے کرنے میں انتہائی سمجھ دار اور سرد و گرم چشیدہ افراد نے شرکت کی تھی۔

② اس دستاویز میں بنوعبدالمطلب سے شادی بیاہ کے تعلقات استوار کرنا ممنوع قرار دیا گیا تھا، لہٰذا یہ ایک سماجی بائیکاٹ تھا کیونکہ شادی بیاہ کی وجہ سے آپس میں نرمی، الفت، رحم، صلہ رحمی اور ایک دوسرے سے میل ملاپ ایک قدرتی امر تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ بائیکاٹ ناکام ہوکر رہ جاتا، اسی لیے اس دستاویز میں شادی بیاہ نہ کرنے کی شق پر اتفاق کیا گیا تھا۔

③ خرید و فروخت پر پابندی مؤثر اقتصادی بائیکاٹ کے لیے لگائی گئی تھی۔ قریش نے اس دفعہ کے تحت مسلمانوں کو بھوکا رکھنے کی کوشش کی جس میں وہ کامیاب بھی رہے۔ روایات میں ہے کہ ان کی ہمت تقریباً جواب دے گئی اور وہ درختوں کے پتے اور جانوروں کے چمڑے کھانے پر مجبور ہوگئے۔[1]

④ اقتصادی بائیکاٹ مزید موثر بنانے کے لیے انھوں نے دستاویز کی دفعات میں یہ اضافہ بھی کیا تھا کہ وہ بیرونی قافلوں سے مہنگے داموں غلہ خرید لیں گے تاکہ صحابۂ کرام ان سے کچھ بھی نہ خرید سکیں۔ یوں بیرونِ مکہ سے آنے والے تاجروں کے ساتھ لین دین کا راستہ بھی مسلمانوں کے لیے بند کر دیا گیا تھا، چنانچہ صحابہ واپس گھاٹی میں اس حالت میں پہنچتے کہ ان کے ہاتھ خالی ہوتے، ان کے بچے بھوک پیاس سے بلک رہے ہوتے اور بچوں کے رونے کی آواز دور تک سنائی دیتی تھی۔[2]

اور یہ تنگی اس شق کی وجہ سے پیدا ہوئی جس میں کہا گیا تھا کہ ''وہ کھانے پینے کی کوئی شے ان محصورین تک نہ پہنچنے دیں گے۔'' اگر کوئی شخص یہ کہہ کر محصورین تک غلہ پہنچانا

1 السيرة النبوية لابن هشام: 377/1، و الرحيق المختوم، ص: 129. 2 السيرة النبوية لابن هشام: 377/1، و السيرة النبوية لأبي الحسن الندوي، ص: 120.

چاہتا کہ وہ ان کے ساتھ خرید و فروخت نہیں کر رہا بلکہ انھیں ہدیہ دے رہا ہے تو بھی مذکورہ شق کی بنا پر ممکن نہ تھا۔ قریش نے پوری پوری کوشش کی تھی کہ کسی بھی نام سے کھانے پینے کی کوئی چیز ان تک پہنچنے نہ پائے، اسی لیے انھوں نے اس شق کا اضافہ کیا تھا۔[1]

⑤ اس کے بعد والی شق جس میں کہا گیا تھا کہ ''کوئی بھی ان محصورین سے صلح نہ کرے گا۔'' نبی ﷺ کو قریش کے سپرد کرنے کے سوا ہر اختیار کو باطل قرار دیتی تھی۔ اب کوئی بھی درمیانی راستہ نہیں نکال سکتا تھا۔

اور وہ شق جس میں کہا گیا تھا کہ کوئی بھی ان کے بارے میں اپنے دل میں نرمی نہ رکھے گا، اس کا مقصد یہ تھا کہ اس عہد نامے سے متفق ہونے والے کے دل میں اہل ایمان کے بارے میں کوئی نرمی اور الفت پیدا نہ ہو کیونکہ دلوں کی نرمی بائیکاٹ ختم ہونے کا سبب ہوسکتی تھی اور یوں قریش کی ساری کوشش پر پانی پھر جاتا لیکن قریش ایسا ہرگز نہ چاہتے تھے، لہٰذا اس احساس کو دبانے اور ختم کرنے کے لیے خصوصاً اس دفعہ کو دستاویزِ مقاطعہ کا حصہ بنایا گیا۔

⑥ محصورین کے ساتھ کلام کرنے، ان سے میل جول رکھنے اور ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے سے اس لیے منع کر دیا گیا تھا کہ باہمی میل جول، کلام اور نشست و برخاست سے ہوسکتا تھا کہ مسلمان اس عہد و پیمان میں شامل بعض افراد کو ان کی غلطی کا احساس دلانے میں کامیاب ہوجاتے کیونکہ مسلمانوں کے پاس حق اور ایسے دلائل موجود تھے جن سے وہ کسی کو بھی اپنی بے گناہی کا احساس دلا سکتے تھے تو ایسے حالات کو پیدا ہونے سے روکنے کے لیے ان سے میل جول، کلام اور ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے پر پابندی عائد کر دی گئی۔

⑦ بائیکاٹ کی دستاویز میں یہ شق کہ کوئی محصورین کے گھروں میں داخل نہ ہوگا، سابقہ دفعات کی طرح موثر نتائج کی حامل تھی کیونکہ ان کے گھروں میں داخل ہونے سے دلوں

[1] السيرة النبوية للدكتور إبراهيم علي محمد أحمد، ص: 96.

میں انسانی ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوسکتا تھا۔ جب کوئی آدمی کسی ایسے گھر میں داخل ہوتا جہاں زندگی کی بنیادی ضروریات بھی میسر نہ ہوں اور گھر والے بھوک اور بیماریوں کا شکار ہوں اوران کا گناہ صرف یہ ہو کہ انھوں نے قریش کا دین چھوڑ کر کوئی اور دین اختیار کرلیا ہے تو بلاشبہ اس کے دل میں انسانی احساسات بیدار ہوجاتے اور وہ اس شقاوت اور ظلم کو ختم کرنے کے درپے ہوجاتا، اس قسم کی صورت حال سے بچنے کے لیے قریش نے محصورین کے گھروں میں داخل ہونے سے منع کردیا تھا۔

⑧ دستاویز کو بیت اللہ میں لٹکانے کا مطلب اسے انتہائی مقدس خیال کرنا اوراس کی تمام دفعات کو اتنا عزت و احترام بخشنا تھا تاکہ ان پر عمل کرنا لازمی ہو اور سب اس کے پابند رہیں۔ تمام اہل عرب کعبے کی حددرجہ تعظیم کرتے تھے اوراسے حرمت و تقدس کا اعلیٰ مقام دیتے تھے، اس لیے قریش نے یہ ظالمانہ دستاویز بیت اللہ کے اندر لٹکا دی تھی۔[1]

⑨ بنو ہاشم اور بنو مطلب کے مشرکین نے نبی ﷺ کے ساتھ مکمل یکجہتی کا اظہار کیا اور جاہلی رواج کے تحت آپ کی مکمل حفاظت کی۔

اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان کفر کے ان قوانین سے مستفید ہوسکتا ہے جن سے اسلامی دعوت کو فائدہ ہوتا ہو بشرطیکہ اہل رائے کا صحیح فتویٰ موجود ہو۔[2]

⑩ آج کل کے جدید انسانی قوانین وحقوق مسلمانوں کو تحفظ فراہم کرتے ہیں اور اکثر علاقوں میں مذہبی آزادی کے انھی قوانین وحقوق کا نتیجہ ہے کہ دنیا بھر میں اہل اسلام کو دعوتی میدان میں بہت سے مواقع میسر ہیں، لہٰذا مسلمانوں کو چاہیے کہ باریک بینی سے تقابلی جائزہ لیں اور ایسے مواقع سے مستفید ہونے کی کوشش کریں۔[3]

⑪ ایک اہم بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے قریبی رشتے دار آپ کی حمایت وحفاظت

1 السيرة النبوية للدكتور إبراهيم علي محمد أحمد، ص:97,96. 2 الأساس في السنة لسعيد حوّى:264/1 . 3 الأساس في السنة لسعيد حوّى:264/1.

اس لیے نہیں کر رہے تھے کہ آپ رسول اللہ تھے بلکہ وہ آپ کی شخصی اور نسبی بنیاد پر حمایت کر رہے تھے۔ چنانچہ اگر کوئی حاکم و مقتدا مسلمانوں کی اس حمایت کو جہاد اور کافروں پر غلبے کے ایک وسیلے کے طور پر حاصل کر سکتا ہو جس کا مقصد کفار کی تدابیر اور ان کی دشمنی کا سد باب کرنا ہو تو یہ قابل صد شکریہ عمل ہے۔[1]

⑫ ابو طالب اس باغیانہ اور ظالمانہ معاہدے کا مقابلہ صرف سیاسی طریقے اور اس عہد نامہ کو چاک کرنے کی کوشش کی صورت میں کر سکے۔ انھوں نے اپنے لکھے ہوئے مشہور قصیدے لامیہ کی ابتدا میں کہا:

وَ لَمَّا رَأَيْتُ الْقَوْمَ لَا وُدَّ عِنْدَهُمْ　　　وَ قَدْ قَطَعُوا كُلَّ الْعُرَا وَالْوَسَائِلِ

وَ قَدْ حَالَفُوا قَوْمًا عَلَيْنَا أَظِنَّةً　　　يَعَضُّونَ غَيْظًا خَلْفَنَا بِالْأَنَامِلِ

”جب میں نے قوم کو دیکھا کہ ان میں محبت نہیں رہی اور انھوں نے تمام تعلقات اور رشتوں کو توڑ دیا ہے۔ انھوں نے ہمارے خلاف تہمت زدہ لوگوں سے معاہدے کیے جو ہماری پیٹھ پیچھے غصے سے انگلیاں چباتے ہیں۔“[2]

اس قصیدے کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ مکہ کی فضا میں ہلچل مچ گئی اور اس قصیدے نے بنو ہاشم کے قرابتداروں میں چھپی عصبیت کو جگا دیا۔ انھوں نے خفیہ طور پر مشورہ کیا اور عہد نامہ چاک کرنے کا فیصلہ کر لیا۔[3]

⑬ ابو طالب اپنے ضخیم قصائد کی وجہ سے قریشی معاشرے کی سوچ اور فکر کو متوجہ کرنے میں کامیاب ہو گئے جس نے ان کے وجود کو ہلا کر رکھ دیا اور اس ظالمانہ عہد نامے کو چاک کرنے کے لیے مذکورہ بالا پانچ افراد اٹھ کھڑے ہوئے جو بنو ہاشم اور بنو مطلب سے رشتے داری اور صلہ رحمی کا لحاظ کرتے ہوئے مسلمانوں اور ان کے حلیفوں اور مددگاروں پر

1 فقه السيرة للبوطي، ص: 88. 2 السيرة النبوية لابن هشام: 245/1. 3 التحالف السياسي للدكتور الغضبان، ص: 35-37.

ڈھائے جانے والے ظلم و ستم کو ختم کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جاہلی معاشرے کے علمبرداروں کے دلوں میں بھی ظلم و سرکشی کے خلاف نفرت موجزن تھی اور وہ ہر قسم کے ظلم کو ختم کرنے کے لیے مناسب موقع کی تلاش میں رہتے تھے۔

اہل اسلام کو ان تمام باتوں کی طرف توجہ کرنی چاہیے اور مسئلے کی تہ تک پہنچنا چاہیے۔ یہ باتیں قرآن کریم اور سنت رسول کی حقیقت کو واضح کرنے میں معاون ثابت ہوں گی اور بتائیں گی کہ مسلمانوں، یہود و نصاریٰ اور لادینیت کے علمبرداروں کے درمیان وجہ اختلاف کیا ہے اور ان لوگوں سے اسلام کے مفاد میں کہاں تک مدد لی جاسکتی ہے۔[1]

⑭ ابو لہب کا کردار انتہائی قابل توجہ اور سمجھنے کے لائق ہے۔ تاریخ اسلامی میں یہ کردار بار بار سامنے آیا ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ داعیوں کو ان کے قریبی حلیفوں سے سخت تکلیف اٹھانا پڑتی ہے اور وہ اپنی طرف داری بدل لیتے ہیں اور ان داعیان اسلام کے خلاف اتنے سرگرم نظر آتے ہیں کہ ان کا سخت ترین جھگڑالو دشمن بھی اتنا متشدد نہیں ہوتا۔[2]

⑮ نبی ﷺ کی مسلمانوں کو یہ ہدایات تھیں کہ وہ دشمن سے ٹکر نہ لیں اور اپنے جذبات قابو میں رکھیں۔ وہ کسی قسم کی جنگ بھڑکانے سے گریز کریں اور خود کسی جنگ کا ایندھن بننے سے اجتناب کریں۔

اس مرحلے میں نبی ﷺ کی تربیت کا عظیم الشان پہلو یہ بھی سامنے آتا ہے کہ اس دنیا کے عظیم بہادروں حمزہ، عمر، ابوبکر اور عثمان رضی اللہ عنہم وغیرہ نے بغیر کسی ٹکراؤ کے اعلیٰ صبر کا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے سمع و طاعت کو اپنا شعار بنائے رکھا، ہر قسم کی اذیت، دشمنی اور ظلم کو برداشت کیا اور اپنے ہاتھ روک کر رکھے۔ انھوں نے صبر کا مظاہرہ کسی ایک حادثے یا ایک دن پر نہیں کیا بلکہ انھوں نے تو خشک سالی والے تین سال صبر کا مظاہرہ کیا جس میں ان

1 فقه السيرة النبوية للدكتور الغضبان، ص: 185. 2 فقه السيرة النبوية للدكتور الغضبان، ص: 186.

کے اعصاب تک شل ہو گئے اور انھیں ایک بھی تیر پھینکنے یا کسی ایک شخص کا سر پھوڑنے کی بھی اجازت نہ ملی۔[1]

⑯ ان واقعات نے اہل ایمان کو اپنے قائد کے احکامات کی پابندی کرنے اور کسی بھی قسم کی جذباتی کارروائی نہ کرنے کی راہ دکھائی اور وہ اس پر کاربند رہے۔ وہاں ابوجہل پر حملہ کرنا یا سوچے سمجھے بغیر کوئی بھی غیر متوازن جنگ شروع کرنا بہت آسان تھا۔ ایسی جنگ کب تک جاری رہتی، یہ اللہ ہی جانتا تھا۔

⑰ اسلامی دعوت ان دنوں حبشہ، نجران، اَزْدشَنُوءَہ، یمن اور غفار میں ایک واضح اور درست سمت میں کامیابی سے ہمکنار ہو رہی تھی جو زمانہ مستقبل میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے سہارا بن سکتی تھی۔ ایسے قوی مراکز بھی قائم ہو رہے تھے جو فیصلہ کن مراحل کے وقت متحرک ہو سکتے تھے اور یہ کامیابی اسلامی دعوت کے مکہ جیسی سنگلاخ زمین اور اس کے اڑیل لوگوں سے تجاوز کر کے دیگر علاقوں میں پھیلنے کا سبب بن سکتی تھی۔

⑱ بائیکاٹ کے تین سال اسلام کے اس ہراول دستے کے لیے تربیت اور کردار سازی کے میدان میں عظیم توشہ ثابت ہوئے۔ ان میں بھوک، خوف، آزمائش میں صبر کرنے، اعصاب کو قابو میں رکھنے، اپنے دلوں اور خواہشات کو دبانے اور اپنے جذبات کو کنٹرول کرنے جیسے اوصاف راسخ ہو گئے۔

⑲ مشرکین کی صفوں میں بعض لوگ اپنے اندر نبوی تربیت اور آپ کی شخصیت کی عظمت کا اثر محسوس کر رہے تھے اور اس نئے دین کے پیش کردہ اصولوں کو دل کی گہرائیوں سے تسلیم کرتے تھے لیکن متکبر سرداروں کی وجہ سے وہ اس کا اظہار نہ کر سکتے تھے۔ ان کا دعوت سے یہ لگاؤ، تربیت کا اثر اور پھر اس مقاطعے کا اختتام ہمیں انھی حالات و کیفیات کی خبر دیتے ہیں۔[2]

⑳ مضبوط اور قطعی دلائل اور خرق عادت معجزات بھی اپنی خواہشات پر چلنے والوں اور دنیاوی

1 التربية القيادية للدكتور الغضبان:1/371. 2 التربية القيادية للدكتور الغضبان:1/385,384.

منافع کے پجاریوں پر اثر انداز نہیں ہوتے کیونکہ ایسے لوگ حق کے معاملے میں اپنی ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لاتے، عقل اور دل سے غور وفکر نہیں کرتے، کانوں کو حق سننے سے بند کر لیتے ہیں اور آنکھوں کو حق دیکھنے سے محروم رکھتے ہیں۔ وہ فکر و تدبر سے کام نہیں لیتے اور راہ حق سے دور رہتے ہیں، حالانکہ اس پر بہت سے دلائل قائم ہو چکے ہوتے ہیں۔

ابو طالب نے نبی ﷺ سے سنی ہوئی خبر قریشیوں کو بتائی کہ عہد نامے کو دیمک چاٹ چکی ہے اور صرف اللہ کا نام بایں الفاظ: باسمك اللّٰهم باقی رہ گیا ہے۔ انھوں نے خود اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ بھی لیا لیکن پھر بھی کوئی ایمان لانے کے لیے تیار نہیں ہوا۔ یہی تو وہ خواہشات ہیں جو لوگوں کو حق سے دور رکھتی اور ان کے کانوں کو حق سننے سے روک دیتی ہیں۔[1]

(21) اس اقتصادی اور معاشرتی بائیکاٹ نے اسلامی دعوت کے فروغ اور تمام قبائل عرب میں اس دعوت کا پیغام پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ حج کے موسم میں تمام عرب قبائل میں یہ خبریں عام ہوگئیں اور جزیرہ نمائے عرب کی نظریں اس دعوت پر مرتکز ہوگئیں جس کے لیے داعی اعظم ﷺ اور آپ کے صحابہ بھوک، پیاس اور بائیکاٹ جیسے ظلم برداشت کر رہے تھے اور ان خبروں نے سب کے دلوں میں یہ بات بٹھا دی کہ یہ دعوت برحق ہوگی کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو نبی ﷺ اور آپ کے پیروکار کبھی اتنی کٹھن مشکلات اور مصائب برداشت نہ کر پاتے۔

(22) اس بائیکاٹ نے کفار مکہ کے خلاف سارے عرب کو غصہ دلایا کہ وہ بنو ہاشم اور بنو مطلب پر اس قدر ظلم کر رہے ہیں اور دوسری طرف نبی ﷺ اور آپ کے رفقاء کے حق میں نرم گوشہ پیدا کر دیا، چنانچہ جیسے ہی یہ بائیکاٹ ختم ہوا لوگ اسلام کی طرف متوجہ ہوئے اور اسلامی دعوت کا پھیلاؤ تیز ہو گیا اور اس کی گونج پورے جزیرہ نمائے عرب میں سنائی دینے لگی۔ اس طرح بائیکاٹ کرنے والوں کی چال انھی پر الٹ گئی اور مشرکین کے ارادوں کے

1 السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 167.

برخلاف یہ بائیکاٹ دعوت اسلامی کے پھیلنے کا بہت بڑا سبب بن گیا۔[1]

(23) بنو ہاشم اور بنو مطلب کا نبی ﷺ کا ساتھ دینے اور اقتصادی اور معاشرتی بائیکاٹ میں ان کے ساتھ اذیتیں برداشت کرنے کی وجہ سے ان کے بارے میں اسلام کا یہ قانون بنا کہ خمس میں سے جو ذوی القربیٰ (قرابتداروں) کا حصہ ہوگا وہ بنو ہاشم اور بنو مطلب کو دیا جائے گا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝﴾

''اور (اے مسلمانو!) جان لو کہ تم جو کچھ بھی مال غنیمت حاصل کرو، اس میں سے پانچواں حصہ یقیناً اللہ کے لیے ہے اور رسول کے لیے اور (اس کے) رشتے داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔ اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو اور اس پر جو ہم نے اپنے بندے پر فیصلے کے دن اتارا جس دن دو فوجوں میں ٹکراؤ ہوا تھا اور اللہ ہر چیز پر خوب قدرت رکھتا ہے۔''[2]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''آیت میں مذکور قرابتداروں کا حصہ بنو ہاشم اور بنو مطلب کو ملے گا کیونکہ بنو مطلب نے جاہلیت اور ابتدائے اسلام دونوں ادوار میں بنو ہاشم سے تعاون کیا اور نبی ﷺ کی خاطر شعب ابی طالب میں محصور ہوئے۔ ان کے مسلمان تو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے جذبے سے معمور تھے اور ان کے کافر خاندانی عصبیت کی بنا پر محصور ہوئے جو صرف آپ ﷺ کے چچا ابو طالب کے حکم کے مطابق چل رہے تھے اور بنو عبد شمس اور بنو نوفل اگرچہ وہ بھی ان کے چچا زاد تھے لیکن انھوں نے ان کا ساتھ نہ دیا، وہ ان سے الگ ہو گئے اور کفارِ قریش کی ہمنوائی کرکے نبی ﷺ اور آپ کے تمام

1 الحرب النفسية ضد الإسلام للدكتور عبد الوهاب كحيل، ص:101. 2 الأنفال 8:41.

معاونین سے دشمنی مول لی، اس لیے ابو طالب نے اپنے قصیدہ لامیہ میں قرابتداری کی وجہ سے ان کے اس اقدام کی سخت مذمت کی۔

نبی ﷺ نے بنومطلب کے بارے میں ارشاد فرمایا:

«أَنَا وَ بَنُو الْمُطَّلِبِ لَا نَفْتَرِقُ فِي جَاهِلِيَّةٍ وَّلَا إِسْلَامٍ، وَ إِنَّمَا نَحْنُ وَ هُمْ شَيْئٌ وَّاحِدٌ»

''میں اور بنومطلب نہ تو جاہلیت میں علیحدہ ہوئے اور نہ اسلام میں۔ ہم اور وہ ایک ہی ہیں۔''[1]

اور جمہور علماء کے قول کے مطابق اس (خمس کے حقداروں) سے مراد بنو ہاشم اور بنومطلب ہیں۔[2]

㉔ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی مدد فرمائی، اپنے رسول کو عزت عطا فرمائی، مکہ فتح ہوگیا اور نبی ﷺ حجۃ الوداع ادا فرما رہے تھے تو آپ چاہتے تھے کہ وادی بنی کنانہ میں قیام کیا جائے تا کہ اس دور کے ظلم اور تنگیوں کا ذکر کریں اور اللہ کی طرف سے عطا کردہ عظیم احسانات فتح مکہ اور اس مکہ میں داخل ہونے پر اللہ کا شکر ادا کریں جہاں سے آپ کو نکال دیا گیا تھا۔ اور یہ بات ثابت کردیں کہ اللہ تعالیٰ حق کی ضرور مدد فرماتا ہے، اسے غلبے سے نوازتا ہے اور اللہ صبر کرنے والوں کو اس کائنات میں عظیم درجات و مراتب عطا فرماتا ہے۔[3]

حج کے دوران اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی: ''اے اللہ کے رسول! آپ کل کہاں قیام فرمائیں گے؟ نبی ﷺ نے فرمایا:

«وَ هَلْ تَرَكَ لَنَا عَقِيلٌ مَّنْزِلًا؟ ثُمَّ قَالَ: نَحْنُ نَازِلُونَ غَدًا بِخَيْفِ بَنِي

1 سنن أبي داود، حديث 2980، و مسند أحمد: 4/81. 2 تفسير ابن كثير 2/312.
3 الغرباء الأولون للدكتور سلمان العودة، ص: 149.

كِنَانَةَ الْمُحَصَّبِ حَيْثُ قَاسَمَتْ قُرَيْشٌ عَلَى الْكُفْرِ»

''کیا عقیل نے ہمارے لیے کوئی جگہ چھوڑی ہے؟'' پھر فرمایا: ''ہم کل بنو کنانہ کی اس وادی میں قیام کریں گے جسے محصب کہا جاتا ہے اور جہاں قریش نے کفر پر باہم قسمیں کھائی تھیں۔''

امام زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بنو کنانہ نے بنو ہاشم کے خلاف قریش سے معاہدہ کیا تھا کہ وہ بھی بنو ہاشم سے نہ خرید و فروخت کریں گے نہ انھیں جگہ دیں گے اور ''خَیف'' سے مراد وادی ہے۔''[1]

(25) قانون الٰہی کے نفاذ کے سلسلے میں کسی بھی موڑ پر اور کسی بھی وقت اہل باطل کی طرف سے بائیکاٹ اور مقاطعے کا اندیشہ ہوسکتا ہے کیونکہ کفر ایک ہی ملت ہے، لہٰذا قائدین امت اسلامیہ کو اس قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ جونہی ایسے حالات پیدا ہوں تو وہ اسوۂ رسول کو سامنے رکھتے ہوئے مناسب اقدامات کریں تا کہ کسی بھی قسم کے بائیکاٹ کے سامنے امت اسلامیہ ایک مضبوط چٹان بن جائے۔[2]

[1] صحيح البخاري، حديث: 1590و3058، وفتح الباري: 571/3، حديث: 1590. [2] السيرة النبوية للدكتور إبراهيم علي محمد أحمد، ص: 98.

حصہ 6

ہجرت حبشہ، سفرِ طائف اور معراج

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ؕ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ○

"اور جن لوگوں نے ظلم وستم سہنے کے بعد اللہ کی راہ میں ہجرت کی، البتہ ہم انھیں دنیا میں ضرور اچھا ٹھکانا دیں گے اور یقیناً آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے۔ کاش! وہ علم رکھتے۔"

(النحل 16:41)

سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا

"پاک ہے وہ اللہ جو اپنے بندے کو رات کے کچھ حصے میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا۔"

(بنی إسرائيل 17:1)

باب 1

آنحضرت ﷺ کا قانون ''اختیارِ ذرائع'' پر عمل

اسباب و ذرائع اختیار کرنے کا قانون اللہ تعالیٰ کے ان قوانین میں سے ہے جنھیں رسول اللہ ﷺ نے بھی اختیار کیا۔ اسباب، سبب کی جمع ہے جو ہر اس چیز پر بولا جاتا ہے جس کے ذریعے کسی منزل مقصود تک پہنچا جا سکے اور یہ قانون اللہ تعالیٰ کی اس عظیم کائنات میں واضح طور پر نافذ نظر آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو اپنی قدرتِ کاملہ سے پیدا فرمایا، پھر اس میں ایسے قوانین اور ضابطے بنائے جو اس کے قائم دائم رہنے کی ضمانت ہیں۔ اس نے اپنے ارادے نافذ العمل ہونے کے بعد نتائج کا تعلق اسباب سے قائم کر دیا، جیسے عرش الٰہی کو فرشتوں کا اٹھانا، زمین کی حرکت روکنے کے لیے اس میں پہاڑوں کو گاڑنا اور پانی کی مدد سے کھیتی اگانا وغیرہ۔

اور اگر اللہ چاہتا کہ دنیا کی تمام اشیاء کسی سبب یا ذریعے کے بغیر صرف اس کی قدرت کاملہ سے قائم رہتیں تو ایسا بھی ممکن تھا لیکن اس کی حکمت عالیہ کا تقاضا یہ تھا کہ اپنی مخلوق کو ذرائع اختیار کرنے کا قانون عطا فرمائے تا کہ زندگی اللہ کریم کے ارادے اور طریقے کے مطابق چلتی رہے۔ ہمیں اس کائنات میں ذرائع اختیار کرنے کا قانون واضح طور پر کارفرما نظر آتا ہے۔ کتاب اللہ میں بھی اس کے شواہد ملتے ہیں۔ اللہ عزوجل نے ہمیں اس قانون کو اپنے تمام دنیوی اور اخروی معاملات میں اختیار کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَقُلِ اعْمَلُوا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ وَالْمُؤْمِنُونَ﴾

''اور (اے نبی!) کہہ دیجیے: تم عمل کرو، پھر اللہ تمھارے عمل کو عنقریب دیکھے گا اور اس کا رسول اور مومنین بھی۔'' [1]

قرآن کریم کے حوالے ہی سے ہمیں علم ہوتا ہے کہ جب حضرت مریم علیہا السلام انتہائی کمزوری کی حالت میں تھیں تو اللہ تعالیٰ نے انھیں اسباب اختیار کرنے کا حکم فرمایا:

﴿وَهُزِّيٓ إِلَيۡكِ بِجِذۡعِ ٱلنَّخۡلَةِ تُسَٰقِطۡ عَلَيۡكِ رُطَبٗا جَنِيّٗا۝﴾

''اور تو کھجور کا تنا اپنی طرف ہلا، وہ تجھ پر تازہ پکی ہوئی کھجوریں گرائے گا۔'' [2]

گویا کہ اللہ ہمیں تمام معاملات و حالات میں اسباب و ذرائع اختیار کرنے کی تاکید فرماتا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے قانون ''اختیارِ ذرائع'' کی مکمل پاسداری کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی مملکت کے قیام کے لیے اٹکل پچو اور اندازوں سے کام لینے کے بجائے تمام ممکنہ اسباب و ذرائع اختیار کیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اسباب و ذرائع اختیار کرنے کی تلقین کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ وہ اپنے دنیوی اور اخروی امور میں اس قانون ربانی پر چلیں۔[3]

امت اسلامیہ کے ابتدائی دور میں، جو کہ اس امت کا سنہری دور تھا، یقین کیا جاتا تھا کہ ہمارا ایمان اللہ تعالیٰ کے فیصلے اور قدرت کاملہ کی بدولت عطا ہوا ہے جو کہ ظاہری اسباب و وسائل اختیار کرنے کے منافی نہیں اور وہ یقین رکھتے تھے کہ اس کائنات اور انسانی زندگی میں اللہ تعالیٰ کے ایسے قوانین نافذ العمل ہیں جو تبدیل نہیں ہو سکتے اور اس کے ساتھ ساتھ بعض قوانین مقتضائے عادت کے خلاف بھی پائے جاتے ہیں جن کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت و حکمت سے نظام کائنات کے لیے عمومی طور پر اسباب و ذرائع کا قانون مقرر کیا اور مقتضائے عادت کے خلاف قانون کو استثنائی صورت قرار دیا۔ اور حقیقت میں دونوں کا تعلق یہ

1 التوبة 105:9. 2 مریم 25:19. 3 التمكين للأمة الإسلامية لمحمد السيد حمد يوسف، ص: 248-250.

مشیّت الٰہی سے ہے، اس لیے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سمجھتے تھے کہ قانون اختیارِ ذرائع اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ ہے، لہٰذا جب وہ اپنی زندگی میں کسی خاص مقصد کو حاصل کرنا چاہتے تو اس کے مطابق ذرائع اور وسائل اختیار کرتے۔[1]

اگر دیکھا جائے کہ مسلمانوں سے عالمی شرف اور قیادت کیوں چھن گئی تو معلوم ہوگا کہ ان پر کوئی ظلم نہیں کیا گیا بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ ایک طرف تو انھوں نے شریعت کو بھلا دیا، اس کا مرتبہ کم کر دیا اور اس میں اپنی ادنیٰ خواہشات کی کثافتیں شامل کر لیں اور یوں ان کے علم و عمل اوہام کی نذر ہو گئے۔ دوسری طرف انھوں نے قوانین الٰہیہ سے پہلو تہی اختیار کرتے ہوئے یہ یقین کر لیا کہ شاید اسباب و ذرائع اختیار کیے بغیر صرف آرزؤں اور پراگندہ خوابوں ہی کی مدد سے شرف و عزت حاصل کی جاسکتی ہے، حالانکہ ایسا ناممکن ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ﴾

''یہ تمھارے ہاتھوں کی کمائی کا بدلہ ہے اور بے شک اللہ اپنے بندوں پر ہرگز ظلم کرنے والا نہیں۔''[2]

اور اگر کوئی سوال کرے کہ اہل ایمان تو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی وجہ سے عتاب کے مستحق ٹھہرے لیکن وہ کفار جنھوں نے اللہ تعالیٰ کا یکسر انکار کر دیا، اس کے باوجود انھیں جاہ و حشمت اور قیادت کیونکر حاصل ہوئی تو جواب یہ ہوگا کہ انھوں نے یہ مقام اس لیے حاصل نہیں کیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے مقرب ہیں اور اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہے یا وہ کسی جادو اور غیر عادی امور کے توسط سے یا کوئی انوکھی مخلوق ہونے کی وجہ سے اس مرتبے پر فائز ہوئے ہیں۔ انھوں نے جو صنعتی ترقی کی ہے اور سمندروں اور ہواؤں کو مُسخّر کیا ہے تو وہ اس لیے نہیں کہ ان کا عقیدہ سچا ہے یا ان کی فکر درست ہے۔ انھوں نے یہ کامیابیاں

1 مفاهيم ينبغي أن تصحح لمحمد قطب، ص: 262. 2 آل عمرٰن 3:182.

اس لیے حاصل کی ہیں کہ دنیا میں ترقی کا راستہ ہر ایک کے لیے کھلا ہے، چاہے مومن ہو یا کافر، نیک ہو یا برا، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ○﴾

''جو شخص دنیاوی زندگی اور اس کی زینت چاہتا ہے تو ہم انھیں ان کے اعمال کا پورا بدلہ اسی (دنیا) میں دے دیتے ہیں اور اس میں ان کی حق تلفی نہیں کی جاتی۔''[1]

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے شرف و عزت اور ترقی کے حصول کا ذریعہ اس کی محنت و طاقت کو قرار دیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے اس کائنات میں نافذ ہونے والے ایسے قوانین کے مطابق ہو جو ہر قسم کی تحریف اور تبدیلی سے محفوظ ہیں، لہٰذا جو شخص قانونِ الٰہی کے مطابق لگن سے محنت کرے گا اس کے مطابق اللہ عزوجل کی عطا کا مستحق ٹھہرے گا۔

معلوم یہ ہوا کہ قانون ''اختیارِ ذرائع'' اللہ تعالیٰ کی مشیّت و ارادے کے ساتھ منسلک ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کافر دنیا میں جتنی بھی ترقی کر لے اس کی بدولت جنت کے دروازے اس کے لیے نہیں کھل سکیں گے اور مسلمان اگر کوتاہی کرتا ہے تو گناہ ہے اور اس کا محاسبہ ہوگا۔[2]

اللہ تعالیٰ پر بھروسا اور ذرائع اختیار کرنا

اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرنا نظریہ اختیار ذرائع کے منافی نہیں۔ مومن اللہ تعالیٰ کا حکم مانتے ہوئے ذرائع تو اختیار کرتا ہے لیکن وہ یہ اعتقاد نہیں رکھتا کہ بس ذرائع ہی نتیجہ خیز ہیں بلکہ اس کا اعتقاد یہ ہوتا ہے کہ نتائج اللہ کریم کی مشیّت و ارادے سے وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ ایک مومن آدمی کی سمجھ کے مطابق ذریعے اور نتیجے میں کوئی تعلق نہیں۔ ذرائع اختیار کرنا اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہے اور نتیجے کا معرضِ وجود میں آنا صرف اللہ تعالیٰ کی طرف

[1] هود 11:15. [2] لقاء المؤمنين لعدنان نحوي: 124/2.

سے ہے، کوئی اور اس پر قادر نہیں ہے۔ اسی سوچ کے ساتھ مومن کا شعور اسباب و ذرائع کی پرستش اور ان کے ساتھ چمٹے رہنے سے آزاد ہو جاتا ہے اور وہ اطاعت الٰہی کے مطابق نتیجہ پالیتا ہے۔ یوں حصول نتیجہ کی شکل میں اسے اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کا ثواب مل جاتا ہے۔[1]

رسول اللہ ﷺ نے اپنے متعدد فرامین میں اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرنے کے ساتھ ساتھ اسباب و وسائل اختیار کرنے کا حکم بھی دیا ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی تعارض نہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک آدمی اپنی اونٹنی کے ہمراہ مسجد کے دروازے پر کھڑا تھا اور مسجد میں داخل ہونے سے پہلے اس نے اللہ کے رسول ﷺ سے دریافت کیا: "کیا میں اپنی سواری کو کھلا چھوڑ کر اللہ پر توکل کر سکتا ہوں؟" گویا وہ اختیارِ ذرائع کو اللہ پر بھروسے کے خلاف سمجھتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی تصحیح فرمائی کہ اسباب و ذرائع اختیار کرنا شریعت کا حکم ہے اور یہ کسی حال میں بھی اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرنے کے مخالف نہیں ہو سکتا بشرطیکہ وہ انھیں سچی نیت سے اختیار کرے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «اِعْقِلْهَا وَ تَوَكَّلْ» "اس کو باندھ، پھر اللہ پر بھروسا کر۔"[2]

مندرجہ بالا حدیث ان احادیث میں سے ایک ہے جو وضاحت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرنے کے ساتھ اسباب و ذرائع اختیار کرنا غلط نہیں بشرطیکہ ذرائع پر اتنا یقین اور اعتماد نہ ہو کہ توکل علی اللہ کو یکسر بھول جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کا فرمان نقل کرتے ہیں:

«لَوْ أَنَّكُمْ تَتَوَكَّلُونَ عَلَى اللّٰهِ حَقَّ تَوَكُّلِهِ لَرَزَقَكُمْ كَمَا يَرْزُقُ الطَّيْرَ، تَغْدُو خِمَاصًا وَّ تَرُوحُ بِطَانًا»

"اگر تم اللہ تعالیٰ پر کماحقہ بھروسا کرو تو وہ تمھیں پرندوں کی طرح رزق عطا

1 تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب: 1476/3. 2 جامع الترمذي، حديث: 2517، والمستدرك للحاكم: 623/3، ومجمع الزوائد: 291/10.

فرمائے جو بھوک کی حالت میں صبح کو جاتے ہیں اور شام کو سیر ہو کر لوٹتے ہیں۔"[1]

اس فرمان رسول میں اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرنے کی ترغیب کے ساتھ ساتھ اسباب و ذرائع اختیار کرنے کی اہمیت وضرورت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے، اس لیے فرمان نبوی میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رزق کی ضمانت کو پرندوں کے صبح جانے اور شام کو سیر ہو کر لوٹنے کے ساتھ منسلک کیا گیا ہے۔

شریعت کی نظر میں قانون اختیار ذرائع کا خلاصہ

① اسلام اختیارِ ذرائع کی تلقین کرتا ہے، وگرنہ شریعت و دیگر دنیاوی مصالح کو ترک کرنا لازم آتا ہے۔

② اللہ کریم پر بھروسا چھوڑ کر صرف اسباب ظاہری پر اعتماد کرنا شرک ہے۔

③ اسلام ہمیں سبق سکھاتا ہے کہ اسباب و ذرائع اختیار کرنا توحید ہے، اس یقین کے ساتھ کہ تمام اسباب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں۔

لہٰذا مسلمان سے مطلوب یہ ہے کہ وہ اللہ پر توکل کرتے ہوئے اسباب و ذرائع اختیار کرے۔[2]

امت اسلامیہ کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں کہ دنیا میں کھویا ہوا مقام حاصل کرنے کے لیے مادی ذرائع اختیار کرے، پھر اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے مطابق بہتر نتائج سامنے آئیں گے۔

مذکورہ قانون کے ضمن میں یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی استطاعت سے زیادہ اسباب و ذرائع اختیار کرنے کا مطالبہ نہیں

1 مسند أحمد: 30/1 و 52، و جامع الترمذي، حديث: 2344، و سنن ابن ماجه، حديث: 4164، و المستدرك للحاكم: 318/4، و مسند أبي يعلى، حديث: 247. 2 التمكين للأمة الإسلامية لمحمد السيد، ص: 254.

فرمایا۔ میدان جنگ میں دشمن کے مقابلے کی تیاری کے سلسلے میں ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ﴾

"اور ان (کافروں کے مقابلے) کے لیے تم مقدور بھر قوت تیار رکھو۔"[1]

گویا اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اپنی پوری طاقت صرف کرو اور حتی المقدور زیادہ سے زیادہ سامان حرب اکٹھا کرو اگرچہ وہ دشمن کے مقابلے میں کم ہی کیوں نہ ہو۔ پس زیادہ سے زیادہ کوشش کرنے کا نام استطاعت ہے۔ اس سے زیادہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمے لیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طاقت و قدرت بے انتہا ہے۔ زیادہ کوشش اخلاص کی دلیل اور یہی شرط مطلوب ہے جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ اپنی مدد نازل فرماتا ہے۔[2]

اس میں ساری امت اسلامیہ کے لیے درس ہے کہ وہ کمزوری اور حقارت کی زندگی چھوڑ کر قوت اور عزت کی زندگی اختیار کرے، خواب و خواہشات ترک کر کے اسباب و ذرائع اختیار کرے تاکہ اسلامی مملکت کا قیام ممکن ہو اور انسانی تہذیب کی تشکیل اس طرح ہو کہ مالک حقیقی سے انسان کا تعلق مضبوط ہو جائے۔ اور امت اسلامیہ کو چاہیے کہ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کے نافذ شدہ قوانین کو اپنائے اور قرآن کریم کے واضح احکامات کی پیروی کرے تاکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ روشنی میں ترقی کے راستے پر چل سکے۔

آنحضرت ﷺ نے بعثت سے وفات تک سنت الٰہی کے مطابق بغیر کوتاہی کے تمام ممکنہ اسباب و ذرائع اختیار کیے۔ آپ لوگوں کو راہ راست پر لانے، باطل کا مقابلہ کرنے، جماعت اور ریاست کی بتدریج تشکیل کرنے اور ابتلا برداشت کرنے میں اسباب و وسائل کے الٰہی قانون پر کاربند رہے۔ دنیا میں عزت و شرف کا مقام حاصل کرنے کے لیے آپ نے مناسب ذرائع اختیار کیے۔ ہجرتِ حبشہ، واقعہ طائف، قبائل کو دعوت اسلام، ہجرتِ مدینہ، پھر مملکت اسلامیہ کی تشکیل، اس کے استحکام کے لیے تمام ممکنہ ذرائع استعمال کیے،

1 الأنفال 8:60. 2 الإسلام في خندق لمصطفیٰ محمود، ص: 64.

بعدازاں اصحاب رسول ﷺ بھی اسی طریقے پر گامزن رہے اور انتہائی غور وفکر اور بصیرت کے ساتھ اسباب و ذرائع اختیار کرتے رہے اور اتنی ترقی حاصل کی کہ انسانی تاریخ میں آج تک اس کی مثال ناپید ہے۔

یقیناً رسول اللہ ﷺ کی تحریک امت اسلامیہ کی تربیت اور اسلامی مملکت کے حصولِ مقام کے سلسلے میں ایک ایسا نور ہے جس سے ہدایت ملتی ہے اور ایسی سنت ہے کہ ہلاکت خیز موجوں، تغیر پذیر حالات اور گہرے اندھیروں میں بھی اس سے رہنمائی حاصل ہوتی ہے اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اسے اختیار کرنا انتہائی آسان ہے۔



باب 2

ہجرت حبشہ

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ﴾

”اور جن لوگوں نے ظلم وستم سہنے کے بعد اللہ کی راہ میں ہجرت کی، البتہ ہم انھیں دنیا میں ضرور اچھا ٹھکانا دیں گے اور یقیناً آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے۔ کاش! وہ علم رکھتے۔“ [1]

امام قرطبی رحمہ اللہ حضرت قتادہ رحمہ اللہ کا قول نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مذکورہ بالا آیت کا مصداق محمد ﷺ کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ہیں جن پر مشرکین نے ظلم کیا اور انھیں مکہ سے نکال دیا۔ ان میں سے ایک گروہ نے حبشہ کی جانب ہجرت کی۔ بعدازاں اللہ تعالیٰ نے انھیں ہجرت مدینہ کی بھی توفیق دی اور سچے ایمانداروں (انصار) کے ذریعے ان کی مدد فرمائی۔“ [2]

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۭ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۭ وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ۭ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾

[1] النحل 16:41. [2] تفسیر القرطبي: 10/107.

''کہہ دیجیے: اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو! اپنے رب سے ڈرو، جنھوں نے اس دنیا میں اچھے عمل کیے ان کے لیے بھلائی ہے اور اللہ کی زمین وسیع ہے، بلاشبہ صبر کرنے والوں کو ان کا پورا پورا اجر بے حساب دیا جائے گا۔''[1]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''اس آیت کے مصداق حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھ حبشہ کی جانب ہجرت کرنے والے ہیں۔''[2]

ارشاد الٰہی ہے: ﴿يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ﴾

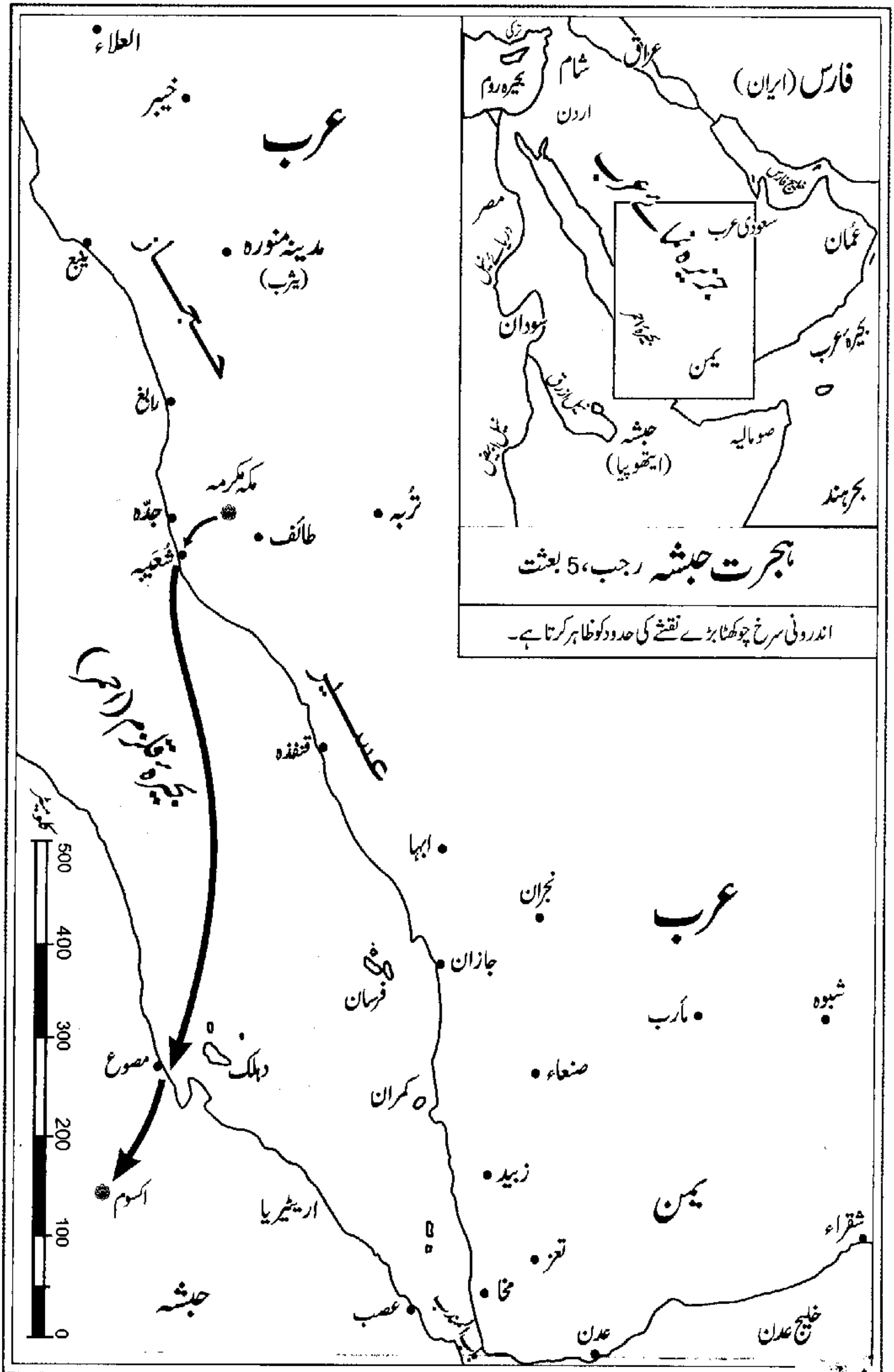
''اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو! بلاشبہ میری زمین وسیع ہے تو تم میری ہی عبادت کرو۔''[3]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''مندرجہ بالا آیت میں اللہ تعالیٰ کا اپنے ایماندار بندوں کو حکم ہے کہ وہ ایسے شہر سے ہجرت کر جائیں جہاں دین پر قائم رہنا مشکل ہو جائے اور ایسی زمین کی طرف ہجرت کریں جہاں وہ شریعت اسلامی کو آزادانہ اپنا سکیں۔ اللہ تعالیٰ کی زمین بہت کشادہ ہے، اس لیے جب اہل مکہ نے کمزور مسلمانوں پر ظلم کیے تو وہ اپنے دین کو بچانے کی غرض سے حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے، وہاں انھوں نے نجاشی اصحمہ رحمہ اللہ جیسا بہترین مہمان نوازی کرنے والا حبشہ کا بادشاہ پایا۔''[4]

ہجرت حبشہ کے اسباب

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں پر سخت مصائب ڈھائے جانے لگے اور کفار انھیں حبس بے جا اور مختلف قسم کی سزائیں دینے لگے، جیسے مارنا، بھوکا پیاسا رکھنا، مکہ کی گرم ریتلی زمین اور آگ پر لٹانا تاکہ انھیں ان کے دین سے برگشتہ کیا جا سکے۔ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سخت تکالیف برداشت کرتے رہے یہاں تک کہ بعض کو سولی پر لٹکا دیا گیا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے ایمان کو سلامت رکھا، جبکہ بعض کلمۂ کفر کہنے پر بھی مجبور ہوئے لیکن ان کا دل

[1] الزمر 10:39. [2] تفسير القرطبي:240/15. [3] العنكبوت 56:29. [4] تفسير ابن كثير:335/5.



ہجرت حبشہ رجب، 5 بعثت

اندرونی سرخ چوکھٹا بڑے نقشے کی حدود کو ظاہر کرتا ہے۔

نقشہ: 7

ایمان سے سرشار رہا۔ ایسی حالت میں نبی ﷺ نے غور فرمایا کہ وہ خود تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ مرتبے اور ابو طالب کے دفاع کی وجہ سے عافیت میں ہیں لیکن صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سخت امتحان میں مبتلا ہیں اور آپ ﷺ ان کی تکالیف کا مداوا بھی نہیں کر سکتے تو آپ ﷺ نے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے فرمایا:

«لَوْ خَرَجْتُمْ إِلٰى أَرْضِ الْحَبَشَةِ، فَإِنَّ بِهَا مَلِكًا لَّا يُظْلَمُ عِنْدَهُ أَحَدٌ، وَّ هِيَ أَرْضُ صِدْقٍ، حَتّٰى يَجْعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ فَرَجًا مِّمَّا أَنْتُمْ فِيهِ»

''اگر تم حبشہ کی طرف ہجرت کر جاؤ تو تمھارے لیے بہتر ہے کیونکہ وہاں ایک بادشاہ ہے جس کے ہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا اور حبشہ سچائی کی سرزمین ہے۔ تم وہاں رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تمھارے لیے کوئی کشادگی پیدا کر دے۔''[1]

چنانچہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین آزمائشوں سے بچنے اور اپنا دین بچانے کی غرض سے حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے۔ یہ اسلام میں پہلی ہجرت ہے۔

دینِ اسلام کی نشر و اشاعت: اسلام میں لوگ کثرت سے داخل ہو رہے تھے اور نظریہ اسلام کی حقانیت کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ ہر طرف لوگ اسی کا تذکرہ کرنے لگے۔ علامہ زُہری حضرت عُروہ سے ہجرت حبشہ کے سلسلے میں نقل فرماتے ہیں کہ مشرکوں نے اپنے قبائل میں سے ایمان لانے والوں کو قید و بند کی صعوبتیں اور مختلف تکالیف دینی شروع کر دیں اور انھیں ایمان سے برگشتہ کرنے کا ارادہ کیا۔ جب رسول اللہ ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ نے اہل ایمان سے فرمایا: «تَفَرَّقُوا فِي الْأَرْضِ» ''زمین میں پھیل جاؤ۔'' صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے دریافت کیا: ''اللہ کے رسول! ہم کہاں جائیں؟'' آپ نے ارشاد فرمایا: «هَاهُنَا» ''اس طرف'' اور یہ کہتے ہوئے سرزمین حبشہ کی طرف اشارہ کیا۔[2]

1 سلسلة الأحاديث الصحيحة، حديث: 3190، والسيرة النبوية لابن هشام: 344/1. 2 المصنف لعبد الرزاق: 159/5، والمغازي النبوية للزهري تحقيق سهيل زكار، ص: 96، روایت مرسل ہے۔

اپنے دین کو فتنے سے بچانا: اپنے دین کو فتنے میں مبتلا ہونے سے بچانا ہجرت حبشہ کا ایک اہم سبب ہے۔ ابن اسحاق لکھتے ہیں: ''پس سختیوں کے وقت اصحاب رسول ﷺ سرزمین حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے کہ کہیں وہ آزمائش میں نہ پڑ جائیں اور ان کے دین کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو۔'' [1]

بیرونِ مکہ دعوتِ دین کو پھیلانا: ہجرت حبشہ کا ایک سبب بیرون مکہ ایک دعوتی مرکز قائم کرنا تھا۔ سید قطب رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''ایسے حالات میں اللہ کے رسول ﷺ مکہ کے علاوہ کسی اور مرکز کے متلاشی تھے جہاں مسلمان عقیدۂ توحید کی حفاظت کر سکیں اور انھیں ایسی آزادی نصیب ہو کہ اسلامی دعوت عام ہو اور اہل اسلام کو ظلم اور فتنے سے چھٹکارا ملے۔ میری نظر میں ہجرت حبشہ کا سب سے اہم سبب یہی ہے اور یہ کہنا بلا دلیل ہے کہ صحابۂ کرام محض اپنی جان بچانے کی غرض سے حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے۔ اگر ایسا ہی ہوتا تو پھر وہ لوگ جو اپنی قوم میں کوئی اونچا مقام نہ رکھتے تھے اور نہ قوت و حشمت کے مالک تھے وہ ضرور حبشہ کی طرف ہجرت کرتے، حالانکہ ایسا نہیں ہوا، بلکہ ایسے کمزور لوگ اور غلاموں نے جو ظلم و سزا کی چکی میں پس رہے تھے، ہجرت نہ کی اور ہجرت کرنے والے وہ لوگ تھے جو اپنے قبائلی معاشرے میں اونچا مقام رکھتے تھے، نیز وہ اپنی جانوں کی حفاظت بھی کر سکتے تھے اور فتنے سے محفوظ بھی رہ سکتے تھے اور مہاجرین حبشہ میں سے اکثر لوگ قریشی تھے۔'' [2]

علامہ منیر غضبان بھی سید قطب کی موافقت کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''جس سبب کی طرف سید قطب رحمہ اللہ نے توجہ مبذول کرائی ہے سیرت النبی سے اس کے مزید شواہد بھی ملتے ہیں۔ میری رائے میں اس نظریے کو اس بات سے بھی تقویت حاصل ہوتی ہے کہ دیکھا جائے کہ مہاجرین حبشہ مدینہ طیبہ کب تشریف لائے۔ ہمیں کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اور نہ ہی اس کا ثبوت ملتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہجرت مدینہ کے بعد انھیں طلب کر لیا ہو،

---

1 السيرة النبوية لابن هشام:398/1. 2 تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب:29/1.

بلکہ غزوۂ بدر اور حدیبیہ بھی گزر گئے اور پانچ سال تک مدینہ سخت مشکلات کا شکار رہا۔ مکہ والوں کی طرف سے آخری خطرناک حملہ غزوۂ خندق کے موقع پر ہوا۔ بعدازاں جب آنحضرت ﷺ مطمئن ہو گئے کہ مدینہ طیبہ ایک محفوظ اسلامی مرکز کی شکل اختیار کر گیا ہے تو آپ نے مہاجرین حبشہ کو مدینہ بلا لیا کیونکہ اب اس احتیاطی مرکز کی ضرورت نہ رہ گئی تھی کہ اللہ نہ کرے اگر مدینہ طیبہ دشمنوں کے قبضے میں چلا جائے تو وہ حبشہ منتقل ہو سکیں۔''[1]

جناب استاد دروزہ کی رائے کے مطابق ہجرت حبشہ دعوتی سرگرمیوں میں وسعت پیدا کرنے کے لیے پیش آئی۔ وہ لکھتے ہیں: ''حبشہ میں عیسائیوں کی حکومت تھی، لہٰذا نبی ﷺ کے دل میں خیال آیا ہو گا کہ ممکن ہے وہاں اسلامی دعوت پھیل سکے اور اس خیال کی پیروی میں حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کو ذمہ داری سونپی گئی۔''[2]

شیخ ڈاکٹر سلمان بن حمد عودہ نے بھی اسی رائے کو اختیار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''نجاشی اور دیگر افرادِ حبشہ کا اسلام لانا اس سوچ کو تقویت دیتا ہے کہ ہجرتِ حبشہ اصل میں ایک دعوتی مشن تھا اور مہاجرینِ حبشہ کا ہجرتِ مدینہ کے بعد وہاں غزوۂ خیبر تک مقیم رہنا نبی ﷺ کے حکم اور مشورے سے تھا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ جب اشعری قبیلے کے لوگوں کی حضرت جعفر رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے فرمایا: ''بے شک رسول اللہ ﷺ نے ہمیں یہاں بھیجا ہے اور یہاں رکنے کا حکم دیا ہے، لہٰذا تم بھی ہمارے پاس ٹھہرو۔''[3]

اس سے معلوم ہوا کہ درحقیقت اصحابِ رسول ایک خاص مہم پر حبشہ گئے تھے اور جب یہ مہم مکمل ہوئی تو انھیں واپس بلا لیا گیا اور وہ اعلیٰ مہم دعوت دین کی مہم تھی۔''[4]

مسلمانوں کے لیے امن والی جگہ کی تلاش: ہجرت حبشہ کا ایک سبب مسلمانوں کے لیے جائے امن کا دریافت ہونا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے امن حاصل کرنے کے لیے جو پروگرام

---

1 المنهج الحركي للسيرة النبوية للدكتور الغضبان:1/68,67. 2 سيرة الرسول ﷺ للأستاذ محمد عزة دروزة:2/265، ومعين السيرة لصالح الشامي، ص:111. 3 صحيح البخاري، حديث: 4230. 4 الهجرة الأولىٰ في الإسلام للدكتور سلمان العودة، ص:34.

تشکیل دیا تھا اس کا مقصد ایک خالص اور ایمان کی حامل جماعت کو تحفظ فراہم کرنا تھا، لہٰذا آپ کی نظر میں سرزمین حبشہ اس اعتبار سے امن کا گہوارہ ثابت ہوسکتی تھی اور یہ جماعت اتنی دیر وہاں ٹھہر سکتی تھی کہ اسلام کی جڑیں مضبوط ہوجائیں اور باد مخالف بھی ٹھہر جائے، نتیجتاً ایسا ہی ہوا۔ سرزمین حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والے مہاجرین نے امن اور سکھ کا سانس لیا۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''جب ہم نے حبشہ کی سرزمین پر قدم رکھا تو نجاشی بادشاہ کو بہترین سلوک کرنے والا پایا۔ ہمیں دین کا تحفظ ملا اور ہم وہاں غم و تکلیف کے بغیر اپنے رب کی عبادت کرتے تھے۔''[1]

ہجرت کے لیے حبشہ کا انتخاب کیوں؟

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے لیے سرزمین حبشہ کو درج ذیل اسباب کی بنا پر اختیار کیا:

نجاشی کا عادل ہونا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کے عادل ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا: «لَوْ خَرَجْتُمْ إِلٰى أَرْضِ الْحَبَشَةِ، فَإِنَّ بِهَا مَلِكًا لَّا يُظْلَمُ عِنْدَهٗ أَحَدٌ» ''بہتر ہے کہ تم سرزمین حبشہ کی طرف ہجرت کر جاؤ کیونکہ وہاں کا بادشاہ کسی پر ظلم نہیں ہونے دیتا۔''[2]

نجاشی کا نیک ہونا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے:

«قَدْ تُوُفِّيَ الْيَوْمَ رَجُلٌ صَالِحٌ مِّنَ الْحَبَشَةِ، فَهَلُمَّ فَصَلُّوا عَلَيْهِ»

''آج حبشہ کا ایک نیک آدمی وفات پا گیا، پس آؤ اس کی نماز جنازہ ادا کریں۔''[3]

مسلمانوں کی حمایت، حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی زبان سے قرآن کریم سن کر متاثر ہونا اور عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اس کا صحیح العقیدہ ہونا بھی واضح دلیل ہے کہ وہ نیک اور

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام تحقيق: همام أبو صعيليك: 413/1. [2] سلسلة الأحاديث الصحيحة، حديث: 3190، والسيرة النبوية لابن هشام تحقيق: همام أبوصعيليك: 397/1. [3] صحيح البخاري، حديث: 1320، و صحيح مسلم، حديث: 952.

باصلاحیت انسان تھا۔

حبشہ کا قریش کے لیے مرکز تجارت ہونا: یقیناً تجارت کا پیشہ قریشی اقتصادیات کا ستون سمجھا جاتا تھا اور حبشہ جزیرہ نمائے عرب کا اہم تجارتی مرکز تھا۔ مسلمانوں کے سامنے یہ راز اس وقت کھلا جب وہ پہلے پہل تجارت کی غرض سے وہاں گئے یا پھر کچھ تاجروں کی معرفت انھیں یہ علم ہوا۔ علامہ طبری رحمہ اللہ ہجرت حبشہ کے اسباب ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''حبشہ قریش کا تجارتی مرکز تھا۔ قریش وہاں تجارت کی غرض سے جاتے اور قابل قدر نفع کماتے، لہٰذا یہ سرزمین ایک جائے امن اور تجارتی مرکز کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔'' [1]

حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جب رسول اللہ ﷺ شِعب ابی طالب میں تھے تو آپ نے اہل ایمان کو ہجرت حبشہ کا حکم دے دیا جو کہ قریش کا تجارتی مرکز تھا۔'' [2]

ابن حبان رحمہ اللہ اسباب ہجرت حبشہ ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''سرزمین حبشہ گرم تھی اور قریش سردیوں میں وہاں کا سفر اختیار کرتے تھے۔'' [3]

حبشہ کا پرامن ہونا: تاریخی تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں عرب قبائل قریش کے فرمانبردار اور ان کی سمع و طاعت پر کمربستہ رہتے تھے اور قریش ان پر برتری کے حامل تھے کیونکہ تمام قبائل حج، تجارت اور دیگر ضروریات میں قریش کی ضرورت محسوس کیا کرتے تھے حتی کہ نبی ﷺ کی دعوت کو ٹھکرانے میں بھی قریش کا ساتھ دیتے۔ ابن اسحاق نے اس سلسلے میں چند شواہد بھی ذکر کیے ہیں۔ [4] جزیرہ نمائے عرب کے باہر سب سے زیادہ پرامن علاقہ حبشہ کا تھا جو قریش کے غلبے سے محفوظ تھا اور اہل حبشہ دیگر قبائل عرب کی طرح قریش کی خوشنودی حاصل کرنے کی جستجو بھی نہیں کرتے تھے۔ [5]

---

1 مغازي رسول اللهﷺ لعروة بن الزبير، ص: 104. 2 الدرر في اختصار المغازي والسير لابن عبدالبر، ص: 27. 3 السيرة النبوية و أخبار الخلفاء لأبي حاتم التميمي، ص: 72. 4 السير والمغازي لابن إسحاق، تحقيق سهيل زكار، ص: 232. 5 هجرة الرسول و صحابته في القرآن و السنة لأحمد عبد الغني، ص: 97.

ابن اسحاق ہجرت حبشہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''وہ سچائی کی سرزمین تھی۔ وہاں کا بادشاہ کسی پر ظلم نہیں ہونے دیتا تھا۔''[1]

نبی ﷺ کی سرزمین حبشہ سے واقفیت و محبت: علامہ زہری رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''سرزمین حبشہ رسول اللہ ﷺ کو اس لحاظ سے پسند تھی کہ وہاں ہجرت کی جائے۔''[2]

نبی ﷺ کی حبشہ سے محبت کے چند اسباب مندرجہ ذیل تھے:

① ایک عادل بادشاہ نجاشی اس کا فرمانروا تھا۔

② حبشی لوگ عیسائی مذہب پر مضبوطی سے قائم تھے اور بت پرستی کی نسبت نصرانیت اسلام کے زیادہ قریب تھی۔ اور قرآن کریم کے حوالے سے ہمیں علم ہوا ہے کہ مکی دور میں جب نبوت کے آٹھویں سال عیسائی مجوسیوں پر غالب آئے تو مسلمان انتہائی خوش ہوئے۔[3]

③ آپ ﷺ اپنی دایہ ام ایمن رضی اللہ عنہا کے توسط سے حبشہ کے حالات سے واقف تھے۔ صحیح مسلم کے حوالے سے معلوم ہوتا ہے کہ ام ایمن رضی اللہ عنہا حبشیہ تھیں۔[4] ابن ماجہ میں ہے کہ جب حبشی طریقے سے آپ کے لیے کھانا تیار کرتیں تو آپ ان سے پوچھتے: «مَاھٰذَا؟» ''یہ کیا ہے؟'' وہ کہتیں: ''یہ کھانا سرزمین حبشہ میں کھایا جاتا ہے۔ میرا دل چاہا کہ آپ کے لیے بھی اسی انداز سے ایک روٹی بنادوں۔''[5]

ام ایمن رضی اللہ عنہا باوجود کوشش کے اپنا حبشی لہجہ تبدیل نہ کرسکیں تو رسول اللہ ﷺ نے انھیں حبشی لہجے کی رخصت عطا فرمائی، لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ ام ایمن رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ سے اپنے ملک کے خدوخال، معاشرے اور فرمانرواؤں کے بارے میں ضرور تبادلۂ خیال کیا ہوگا۔[6]

1 السيرة النبوية لابن هشام:1/397. 2 المغازي النبوية للزهري، ص:96. 3 صحيح السيرة النبوية للطرهوني:2/152. 4 صحيح مسلم، حديث:1771. 5 سنن ابن ماجه، حديث:3336.
6 الهجرة الأولى في الإسلام للدكتور سلمان العودة، ص:48.

ہجرتِ حبشہ کب ہوئی؟ اور مہاجرین کی تعداد کتنی تھی؟

مہاجرین صحابہ کا قافلہ بعثتِ نبوی کے پانچویں سال رجب میں راز داری سے عازمِ سفر ہوا۔ یہ قافلہ دس مردوں اور چار یا پانچ عورتوں پر مشتمل تھا۔ قریش انھیں واپس مکہ لانے کے لیے ان کے پیچھے نکلے اور ساحل تک پہنچے لیکن تب تک اہل حق کا یہ قافلہ سمندر میں خاصا دور چلا گیا تھا۔[1]

جب مہاجرین سرزمین حبشہ میں پہنچے تو نجاشی بادشاہ نے ان کی عزت افزائی اور بہتر انداز سے ان کا خیر مقدم کیا اور وہاں مہاجرین نے ایسا امن وسکون پایا جو اپنی سرزمین میں نہ پاسکے تھے۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ”جب ہم حبشہ پہنچے ہمیں بہترین ہمسائے، نجاشی کا ساتھ نصیب ہوا، ہمارے دین کو تحفظ ملا اور ہم نے اپنے رب کی عبادت کی، جبکہ ہمیں وہاں کوئی دکھ تکلیف نہ تھی اور نہ کوئی ناخوشگوار بات سننی پڑتی تھی۔“[2]

حبشہ کی جانب پہلی ہجرت کرنے والوں کے نام

اس قافلے میں شامل مرد حضرات مندرجہ ذیل تھے:

① عثمان بن عَفّان بن ابی العاص بن اُمَیَّہ بن عبد شمس۔

② عبداللہ بن عَوْف بن عوف بن عبد بن الحارث بن زہرہ۔

③ زُبَیر بن عوام بن خُوَیلد بن اَسَد۔

④ ابو حُذَیفہ بن عُتْبہ بن رَبیعہ بن عبد شمس۔

⑤ مُصْعَب بن عُمَیر بن ہاشم بن عبد مناف بن عبدالدار۔

⑥ ابو سَلَمہ بن عبدالاسد بن ہلال بن عبداللہ بن عمر بن مخزوم۔

⑦ عثمان بن مظعون بن حَبِیب بن وَہْب بن حُذَافہ بن جُمَح۔

---

1 الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص:291,290. 2 مسند أحمد:202,201/1.

⑧ عامر بن ربیعہ جو آل خطاب کے حلیف تھے اور ان کا تعلق عَنز بن وائل سے تھا۔

⑨ سُہیل بن وَہب بن رَبیعہ بن ہلال بن اُہَیب بن ضَبہ بن الحارث، المعروف سُہیل بن بیضاء۔

⑩ ابوسَبرہ بن ابی رُہم بن عبدالعزیٰ بن ابی قیس عبدِوُد بن نصر بن مالک بن حِسل بن عامر۔

مندرجہ بالا دس مرد اس قافلے میں شریک تھے جنھوں نے سب سے پہلے حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ مہاجر خواتینِ اسلام کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

① رُقَیہ بنت رسول اللہ ﷺ۔

② سہلہ بنت سُہیل بن عمرو۔ سہیل عامر بن لوی کی اولاد میں سے تھا۔ حضرت سہلہ نے اپنے خاوند ابوحذیفہ کے ساتھ ہجرت کی اور محمد بن ابی حذیفہ حبشہ ہی میں پیدا ہوئے۔

③ اُم سَلَمہ بنت ابی اُمَیہ بن مغیرہ بن عبداللہ بن عمر بن مخزوم، یہ ابوسلمہ کی بیوی تھیں۔

④ لَیْلیٰ بنت ابی حَثمہ بن حُذافہ بن غانم بن عامر بن عبداللہ بن عوف بن عُبَید ابن عُوَیج بن عدی بن کعب۔ یہ عامر بن ربیعہ کی بیوی تھیں۔

⑤ ام کلثوم بنت سہیل بن عمرو بن عبدشمس۔ یہ ابوسَبرہ بن ابی رُہم کی بیوی تھیں۔[1]

مندرجہ بالا افراد میں سے سب سے پہلے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کی بیوی رُقَیہ بنت رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کی۔ یعقوب بن سفیان روایت بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''عثمان وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے حضرت لوط علیہ السلام کے بعد اپنی بیوی کے ہمراہ ہجرت فرمائی۔''[2]

مندرجہ بالا افراد کے بارے میں اگر غور وفکر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ زیادہ تر مہاجرین کا تعلق ایسے قبائل سے تھا جو قریش میں سے حسب ونسب اور مقام و مرتبے کے

---

1 البداية والنهاية:97,96/3، والسيرة النبوية لابن هشام:352-344/1، والهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص:292-294. 2 البداية والنهاية: 67/3، و فتح الباري، شرح الحديث:3872، روایت ضعیف ہے۔

حامل سمجھے جاتے تھے اور ان غلاموں میں سے کوئی فرد دکھائی نہیں دیتا جنھوں نے سب سے زیادہ قریش کی طرف سے سزائیں اور تکالیف برداشت کیں۔ ظلم وستم کا نشانہ بننے والے ان افراد میں سرفہرست حضرت بلال، خباب اور عمار رضی اللہ عنہم کے نام ہیں۔

اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ اگر ہجرت حبشہ کا سبب صرف دکھوں اور تکالیف سے تحفظ کی فراہمی تھا تو سب سے پہلے ان غلاموں کو ہجرت کرنی چاہیے تھی۔ اسی نظریے کی تائید میں ابن اسحاق اور دیگر سیرت نگاروں نے مشرکوں کی طرف سے کمزور لوگوں پر ظلم کی داستانیں تو تحریر کی ہیں لیکن ان کی حبشہ کی طرف ہجرت کا ذکر نہیں کیا۔[1]

غرضیکہ ہجرت حبشہ صرف اپنی جانیں بچانے کے لیے عمل میں نہیں لائی گئی تھی، بلکہ بہت سے دوسرے اسباب بھی تھے جنھیں مدنظر رکھتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف قبائل سے صحابۂ کرام کی ایک جماعت تشکیل دی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب قریش نے اہل حبشہ کو مہاجرین کی واپسی پر رضامند کرنا چاہا تو کامیاب نہ ہوسکے۔ مہاجرین کو اہل حبشہ کی حمایت حاصل ہوئی اور قریش کے اکثر قبائل کے مسلمانوں میں ہجرت کا شوق پیدا ہوگیا کیونکہ اب اہل ایمان کو سرزمین مکہ تنگ محسوس ہونے لگی تھی۔

ایک اور پہلو سے اگر دیکھا جائے تو مہاجرین کو دنیا میں اللہ کا دین پھیلانے کا موقع میسر آیا اور حبشہ اس کے لیے بڑا موزوں اور بابرکت ثابت ہوا۔ جب کچھ قلوب واذہان پر تالے لگ جاتے ہیں جیسے کفار مکہ پر لگے تو بعض قلوب واذہان دعوت کو قبول کرنے کے لیے کھل بھی جاتے ہیں۔ جیسے اہل حبشہ۔[2]

قصۂ غرانیق

بعض مورخین ومفسرین مسلمانوں کی حبشہ سے واپسی کا سبب وہ قصہ قرار دیتے ہیں جو

[1] أنساب الأشراف للبلاذري: 1/156-198، و السيرة النبوية لابن هشام: 1/392-396. [2] الهجرة الأولى في الإسلام للدكتور سلمان العودة، ص: 37.

زبان زدعام ہو چکا ہے اور مستشرقین نے اس قصے کو پھیلانے کی غرض سے اسے اپنی کتابوں میں جگہ دی اور دعوتِ اسلامی کی تاریخ میں اسے حقیقت کا روپ دینے کی کوشش کی۔ دوسری طرف اس قصے کا تذکرہ کرنے والے مختلف خیالات کے حامل ہیں۔ بعض تو تذکرے کے بعد خاموشی اختیار کرتے ہوئے تردید یا تصدیق نہیں کرتے مگر کچھ لوگ اثبات یا نفی پر دلائل بھی پیش کرتے ہیں۔[1]

مختصر طور پر قصہ کچھ اس طرح ہے کہ ایک دفعہ نبی ﷺ بیت اللہ کے قریب تشریف فرما تھے اور سورۂ نجم کی تلاوت فرما رہے تھے۔ جب آپ اس آیت پر پہنچے:

﴿اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَ الْعُزّٰى ○ وَ مَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ○﴾

''کیا تم نے لات اور عزّیٰ کو دیکھا؟ اور تیسری (دیوی) مناۃ کو جو گھٹیا ہے۔''[2]

تو اس کے بعد آپ ﷺ نے پڑھا:

«تِلْكَ الْغَرَانِيقُ الْعُلٰى، وَ إِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى»

''یہ خوبصورت غرانیق مقدس ہستیاں اور یقیناً ان کی شفاعت کی امید کی جاتی ہے۔''

تو مشرکین نے کہا کہ آج سے قبل اس نے ہمارے معبودوں کا کبھی تذکرہ خیر نہیں کیا اور ہمیں تو یقین ہے کہ رزق، زندگی اور موت کے معاملات صرف اللہ ہی کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ ہم تو صرف یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ ہمارے معبود اللہ کے ہاں ہماری سفارش کریں گے۔ بعدازاں جب آپ نے آیتِ سجدہ کی تلاوت فرمائی تو مسلمانوں کے ساتھ مشرکوں نے بھی سجدہ کیا، سوائے قریش کے ایک بوڑھے آدمی کے جس نے صرف زمین سے مٹھی بھر کنکریاں اٹھا کر پیشانی سے لگانے پر اکتفا کیا۔[3]

اس قصے کے بعد مشرکین اللہ کے رسول ﷺ سے چاہت سے پیش آنے لگے اور

1 الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص:295. 2 النجم53:19,20. 3 مختصر سيرة الرسول ﷺ لمحمد بن عبدالوهاب، ص:84.

مسلمانوں کی ایذا رسانی سے بھی رک گئے۔ یہ قصہ اتنا عام ہوا کہ سرزمین حبشہ پر جب اس کی خبر پہنچی تو مہاجرین نے یہی خیال کیا کہ مسلمانوں کے حالات مکہ میں بہتر ہو چکے ہیں اور وہ اپنے رب کی عبادت امن وسکون سے کر سکتے ہیں، لہٰذا وہ مکہ واپس آ گئے۔

مذکورہ قصے میں مختلف خیال رکھنے کے باوجود مفسرین اسے بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب نبی ﷺ سے قریش مکہ نے کہا کہ تم نے ہمارے معبودوں کو تسلیم کر لیا ہے تو ہم تمھارے ساتھ ہیں۔ نبی ﷺ پر یہ بات اتنی گراں گزری کہ آپ شام تک اپنے گھر ہی میں رہے، پھر جبریل علیہ السلام نے آکر سورۂ نجم کی تلاوت سنائی اور دریافت کیا: کیا یہ کلمات «تِلْكَ الْغَرَانِيقُ الْعُلىٰ وَإِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجىٰ» میں آپ کے پاس لے کر آیا تھا؟ تو آپ اتنے غمگین ہوئے کہ اپنے اللہ کی ناراضی سے ڈرنے لگے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○﴾

''اور ہم نے آپ سے پہلے جو بھی رسول اور نبی بھیجا جب وہ تلاوت کرتا تو شیطان اس کی تلاوت میں (اپنی طرف سے کچھ) ڈال دیتا، پھر اللہ اسے زائل کر دیتا جو شیطان نے (وسوسہ) ڈالا ہوتا، پھر اللہ اپنی آیات کو محکم کر دیتا اور اللہ خوب جاننے والا، خوب حکمت والا ہے۔''[1]

بعد ازاں رسول اللہ ﷺ دوبارہ معبودان باطلہ کی خامیاں عام کرنے لگے اور قریش مکہ کو کم عقل گرداننے لگے نتیجتاً قریش مکہ پھر سے مسلمانوں کے درپے آزار ہو گئے۔

---

1 الحج 22:52، وفتح القدير: 416/3، و فتح الباري: 355/8، و أسباب النزول للسيوطي على هامش جلالين: 16/2، و الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 296.

من گھڑت قصے کا رد: مندرجہ بالا قصے کا خیر القرون کے علماء و محدثین رد کرتے ہیں۔ اگر عقلی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ پیغمبر ﷺ کی عصمت کو داغدار اور آپ کی نبوت کو مشکوک کرنے کی مذموم کوشش ہے اور تحقیقی اور علمی لحاظ سے بھی یہ قصہ بے وقعت نظر آتا ہے۔ اس کے باطل ہونے پر مندرجہ ذیل نقلی دلائل موجود ہیں:

قرآن کریم نے وضاحت کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ نبی ﷺ اللہ تعالیٰ کے کلام میں اپنی مرضی سے دخل اندازی نہیں کر سکتے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ ○ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ○ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ○﴾

''اور اگر یہ ہم پر کوئی بات گھڑ کر لگاتا۔ تو یقیناً ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے۔ پھر البتہ ہم اس کی شہ رگ کاٹ ڈالتے۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ میرے اس کلام میں کوئی کمی یا زیادتی یا تبدیلی نہیں ہو سکتی، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ○﴾

''بے شک ہم ہی نے یہ ذکر (قرآن) نازل کیا اور بے شک ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔''[2]

بالفرض مذکورہ قصہ صحیح تسلیم کیا جائے تو قرآن کریم میں مذکورہ کلمات کا اضافہ لازم آتا ہے اور یہ صریح نص کے خلاف ہے اور اس طرح قرآن کریم غیر محفوظ ٹھہرتا ہے۔

انبیائے کرام علیہم السلام سے بڑھ کر کوئی انسان ایمان میں سچا اور اللہ کریم پر بھروسا کرنے والا نہیں ہو سکتا اور خاص طور پر خاتم الانبیاء ﷺ کا معیار ایمان و توکل سب سے بلند ہے اور ابلیس نے تو اللہ تعالیٰ کے مخلص بندوں پر اپنے غلبے کی نفی کی ہے۔ ابلیس نے کہا:

---

[1] الحآقّة 69:44-46. [2] الحجر 15:9.

﴿ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ۝ ﴾
''تیری عزت کی قسم! میں ان سب کو ضرور گمراہ کروں گا، سوائے تیرے ان بندوں کے جو ان میں سے مخلص و برگزیدہ ہوں۔''[1]

انبیائے کرام اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ برگزیدہ اور مخلص بندے ہوتے ہیں اور ہمارے پیغمبر آخرالزمان تو سب سے زیادہ برگزیدہ اور مخلص ہیں۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''قصۂ غرانیق کو کسی مفسر یا محدث نے متصل سند کے ساتھ بیان نہیں کیا اور نہ ہی اسے کسی نے صحابی کی طرف سے مرفوع بیان کیا ہے، سوائے امام بزار کی روایت کے اور وہ بھی ضعف سے خالی نہیں۔''[2]

اور ابن حجر رحمہ اللہ کی رائے کی مطابق مذکورہ بالا قصے کے سبب مشرکین کے سجدہ کرنے میں کوئی عقلی اور نقلی صداقت نہیں۔[3]

ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ بہت سے مفسرین قصۂ غرانیق کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مہاجرین حبشہ قریش مکہ کو مسلمان خیال کرتے ہوئے مکہ واپس آ گئے، حالانکہ اس تمام قصے کی ایک بھی سند صحیح نہیں اور جتنے بھی طُرق ملتے ہیں سب مُرسَل ہیں۔[4]

عقلی اعتبار سے قصے کا باطل ہونا: عقلی اعتبار سے اجماع امت سے ثابت ہے کہ نبی ﷺ اس قسم کے الفاظ نہیں کہہ سکتے کیونکہ آپ ﷺ کا خلاف حقیقت بات کرنا محال ہے، لہٰذا مذکورہ قصہ بے بنیاد ہے اور آپ ﷺ سے اس قسم کے الفاظ کا صادر ہونا ناممکن ہے۔ اگر بالفرض آپ ﷺ نے عمداً یا سہواً اللہ کے کلام میں اپنی طرف سے اضافہ کیا ہے تو عصمت انبیاء باقی نہیں رہتی اور یہ قصہ عقیدۂ توحید، جو کہ بعثت انبیاء کا بنیادی مقصد ہے، کے بھی خلاف ہے۔

---

1 صٓ 38:82,83. 2 الشفا للقاضي عياض: 117/2. 3 فتح الباري، شرح الحديث: 4862.
4 تفسير ابن كثير: 600/6، وما بعدها.

لغوی اعتبار سے قصے کا باطل ہونا: لغوی اعتبار سے ''غرنوق'' کا لفظ ایک آبی پرندے پر بولا جاتا ہے جو سفید یا کالا ہوتا ہے۔ اسی طرح سفید رنگت والے خوبصورت نوجوان پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے اور تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ عرب نے کبھی اپنے کلام، شعر یا نثر میں اس لفظ کو اپنے معبودوں کے لیے استعمال نہیں کیا۔ [1]

اور فصیح کلام کو مدنظر رکھتے ہوئے غرانیق اور معبودان باطلہ کے درمیان کوئی وصف مشترک نہیں پایا جاتا تو کس طرح ممکن ہے کہ کفار ان کلمات کو سن کر خوش ہوئے ہوں گے اور اسے اپنے خداؤں کا ذکر خیر سمجھتے ہوں گے۔ [2]

نتیجہ یہ نکلا کہ یہ قصہ من گھڑت ہے جسے بے دین لوگوں نے مسلمانوں کے عقیدہ اور دین کو گدلا کرنے اور سید الانبیاء کی سیرت طیبہ کو داغدار کرنے کے لیے اپنی طرف سے گھڑ لیا ہے، نیز قرآن کریم اور عقلی اور لغوی دلائل بھی اس کی تردید کرتے ہیں۔ [3]

مہاجرینِ حبشہ کی واپسی کے حقیقی اسباب: ہجرت حبشہ کے بعد تقریباً تین ماہ کا عرصہ گزرا تھا کہ مکہ کے مسلمانوں کی زندگی میں بہت بڑی تبدیلی واقع ہوئی اور ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ مسلمانوں میں دعوتِ اسلامی پروان چڑھنے کی امید پیدا ہوگئی۔ ہوا یہ کہ اس دوران میں پہلے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ مسلمان ہوگئے جو نبی ﷺ کے چچا تھے۔ وہ اپنے بھتیجے کے دفاع کی خاطر دائرہ اسلام میں داخل ہوئے لیکن پھر اللہ تعالیٰ نے ان کا سینہ کھول دیا اور خالص اور پکے مسلمان بن گئے۔ وہ قریش میں سب سے زیادہ طاقتور نوجوان اور دادرسی کرنے والے تھے۔ ان کے اسلام لاتے ہی قریش نے سمجھ لیا کہ اب نبی ﷺ طاقتور اور مضبوط ہو چکے ہیں اور ان کا چچا ان کا دفاع کرسکتا ہے، اس لیے انھوں نے حتی المقدور آپ ﷺ کی ایذا رسانی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ [4]

1 القاموس المحيط: 281/3 مادة الغرنوق. 2 الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 299,298. 3 السيرة النبوية لأبي شهبة: 372/1. 4 مختصر سيرة الرسول ﷺ لمحمد بن عبد الوهاب، ص: 90.

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی مسلمان ہو گئے۔ عمر رضی اللہ عنہ بھی داد رسی کے وصف میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ یوں مسلمانوں کو حمزہ اور عمر رضی اللہ عنہما کی معیت اور تحفظ کا احساس ہوا اور قریش پر قدرے غلبہ حاصل ہو گیا۔[1]

مذکورہ بالا دو عظیم ہستیوں کے اسلام لانے کے واقعات ہجرت حبشہ کے بعد پیش آئے۔ ان کا اسلام مسلمانوں کے لیے باعث شرف اور مشرکین کے خلاف غلبے کا سبب بنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو کھلے عام اپنے عقیدے کے اظہار کا موقع ملا۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''عمر رضی اللہ عنہ کا اسلام لانا فتح، ان کی ہجرت مدد اور ان کی خلافت امت کے لیے رحمت ثابت ہوئی۔ ہم مکہ میں بیت اللہ کے پاس نماز نہیں پڑھ سکتے تھے لیکن جب عمر رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے تو وہ قریش سے ٹکرا گئے یہاں تک کہ ہم سب نے ان کے ساتھ مسجد حرام میں نماز ادا کی۔''[2]

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام لائے تو انھوں نے پوچھا: ''قریش میں سب سے زیادہ بات کی تشہیر کرنے والا کون ہوسکتا ہے؟'' جواب ملا کہ جمیل بن مَعمر جُمَحِی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کے پاس پہنچے، حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں بھی پیچھے پیچھے گیا تاکہ دیکھوں وہ کیا کرتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جمیل سے کہنے لگے: ''کیا تجھے علم ہوا کہ میں مسلمان ہوں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین اختیار کر چکا ہوں۔'' حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس نے کوئی جواب نہ دیا، جلدی سے اٹھا اور چل دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کے پیچھے اور میں اپنے والد کے پیچھے جا رہا تھا۔ اچانک وہ مسجد الحرام کے دروازے کے قریب کھڑا ہو کر کعبے کے اردگرد بیٹھے قریش سے مخاطب ہوا کہ ابن خطاب بے دین ہو چکا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ قریش سے بولے: ''یہ جھوٹ بولتا ہے۔ میں تو مسلمان ہوا ہوں اور گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے

[1] السيرة النبوية لابن هشام:294/1. [2] السيرة النبوية لابن هشام:365/1.

بندے اور رسول ہیں۔'' قریش مکہ نے یہ الفاظ سنتے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر حملہ کر دیا، پھر مسلسل لڑائی جاری رہی اور سورج کافی بلندی پر پہنچ گیا۔ حتی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھک کے بیٹھ گئے اور اپنے قریب کھڑے لوگوں سے کہنے لگے: ''جو تمھارے جی میں آئے کر گزرو، میں اللہ کی قسم اٹھاتا ہوں کہ اگر ہم تین سو افراد ہوتے تو ہم مکہ میں رہتے یا تم۔''[1]

اب مسلمانوں کی حیثیت وہ نہ رہی تھی جو ہجرت حبشہ سے پہلے تھی۔ سیدنا حمزہ اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہما کے اسلام لانے سے وہ محفوظ ہو چکے تھے۔ پہلے وہ مسجد حرام میں نماز نہیں پڑھ سکتے تھے، اب وہ دار ارقم سے علی الاعلان نکلتے اور مسجد حرام میں بیت اللہ کے سامنے نماز ادا کرتے اور قریش مکہ انھیں ناقابل برداشت تکالیف دینے سے بھی رک گئے جو ان دونوں کے اسلام لانے سے پہلے وہ مسلمانوں پر روا رکھتے تھے۔ اب مسلمان صاحب حیثیت ہو گئے تھے، حالات یکسر بدل گئے تھے اور بہتری کی طرف مائل تھے۔ یہ تمام حالات مہاجرینِ حبشہ سے کیسے مخفی رہ سکتے تھے؟ مکہ میں مسلمانوں کی زندگی میں پیش آنے والی تبدیلیاں ضرور ان تک پہنچی ہوں گی اور ہو سکتا ہے کہ ان ملاحوں کے ذریعے، جو اکثر جدہ کی بندرگاہ[2] سے گزرتے تھے، یہ خبریں مہاجرین تک پہنچی ہوں۔

بلاشبہ ایسا ہی ہوا کہ مہاجرین بہت خوش ہوئے اور یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں کہ طبعی تقاضوں کے مطابق انھیں اپنے وطن واپسی کا شوق چرایا، اپنے وطن عزیز ام القریٰ (مکہ) کی طرف پلٹنے کو دل چاہا اور وہاں ان کے خاندان اور قبیلے کے لوگ بھی تو تھے۔ یوں نئے حالات کے پیش نظر وہ مکہ لوٹ آئے، نیز حرم مکہ اور بیت اللہ کو دیکھنے کی بے قراری بھی

---

1 سبل الهدیٰ والرشاد للصالحي: 499,498/2. 2 ہجرت حبشہ کے زمانے میں اہل مکہ بحری سفر کے لیے شعیبہ کی بندرگاہ استعمال کرتے تھے جو مکہ سے جنوب مغرب میں تقریباً 100 کلومیٹر دور بحیرۂ قلزم کے ساحل پر واقع ہے۔ اور یہ جدہ سے تقریباً اتنے ہی فاصلے پر جنوب میں واقع ہے۔ تب جدہ نے بطور بندرگاہ ابھی ترقی نہ کی تھی۔ (اٹلس سیرت نبوی مطبوعہ دارالسلام، ص: 119)

واپسی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔[1]

گویا مہاجرین کی واپسی کا اصل سبب سیدنا حمزہ اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہما کا اسلام لانا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اب مسلمان طاقتور ہوں گے اور اسلام کی شان و شوکت مضبوط ہوگی لیکن دوسری طرف قریش نے اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے نئی تدابیر اختیار کیں جن میں ایک طرف مکر وفریب اور دوسری طرف سختی اور تعصب شامل تھے۔ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کو ڈرانے کے لیے اقتصادی بائیکاٹ کا ہتھیار بھی استعمال کیا اور جب مہاجرین حبشہ نے قریش کا یہ سخت رویہ دیکھا تو دوبارہ حبشہ کی طرف ہجرت کا ارادہ کرلیا اور بہت سے مزید مسلمان ان کے ساتھ ہو لیے۔[2]

دوسری ہجرتِ حبشہ

ابن سعد لکھتے ہیں کہ جب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم حبشہ سے پہلی ہجرت کے بعد مکہ آئے تو ان کی قوم نے ان پر بہت سختیاں کیں، ان کے خاندانوں پر حملے کیے اور سخت تکلیفیں پہنچائیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کو دوسری مرتبہ ہجرت حبشہ کا حکم دیا اور یہ دوسری ہجرت مہاجرین کے لیے پہلے سے زیادہ باعث مشقت ثابت ہوئی۔ نجاشی کی طرف سے مسلمانوں کے ساتھ حسن سلوک قریش پر بہت گراں گزرا تھا، لہٰذا ان کے عناد اور ایذارسانی میں اضافہ ہوگیا تھا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! ہم دوسری دفعہ حبشہ کی طرف ہجرت کر رہے ہیں اور آپ ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَنْتُمْ مُّهَاجِرُونَ إِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى وَإِلَيَّ، لَكُمْ هَاتَانِ الْهِجْرَتَانِ جَمِيعًا»

1 تأملات في سيرة الرسول ﷺ لمحمد سيد الوكيل، ص: 59، والهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 302. 2 القول المبين في سيرة سيدالمرسلين ﷺ للدكتور محمد النجار، ص: 111، والهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 302.

''تم اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرنے والے ہو۔ تمھارے لیے ان دونوں ہجرتوں کا ثواب ہے۔''

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ عرض کرنے لگے: ''اے اللہ کے رسول! ہم مطمئن ہیں۔''[1]

اس ہجرت میں پہلے سے زیادہ لوگ شامل تھے۔ ابن اسحاق اور دیگر کی رائے کے مطابق ان کی تعداد تراسی (83) تھی اور اگر عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کو شامل نہ کیا جائے تو تعداد بیاسی (82) ہوگی۔ سیرت نگاروں کے مطابق عورتوں کی تعداد اٹھارہ (18) تھی، علامہ سہیلی، واقدی اور ابن عقبہ کی بھی یہی رائے ہے۔ ان عورتوں میں گیارہ قریشی اور سات دیگر قبائل سے تھیں اور یہ مذکورہ تعداد ان بچوں کے علاوہ ہے جو ان کے ساتھ گئے یا ارض حبشہ میں پیدا ہوئے۔[2]

مہاجرین حبشہ کی واپسی کے لیے قریش کی کوشش

قریش نے دیکھا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سرزمین حبشہ میں امن وسکون سے رہ رہے ہیں۔ وہاں انھیں بہترین گھر، مستقل مرکز اور شاہ حبشہ نجاشی کا حسن سلوک حاصل ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں، جبکہ وہاں انھیں کوئی تکلیف دینے والا نہیں۔ اس پر انھوں نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کی واپسی کے لیے نجاشی کے پاس ایک وفد بھیج کر اسے مسلمانوں سے بدگمان کیا جائے لیکن اس وفد کا مسلمانوں کو وہ فائدہ پہنچا جو ان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھا۔ حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور نجاشی کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس سے کفار کی تدبیریں خاک میں مل گئیں، نجاشی کے اسلام کا انکشاف ہوا اور مہاجرین پہلے سے زیادہ محفوظ ہو گئے۔[3]

1 سبل الهدىٰ والرشاد للصالحي: 389/2، والطبقات الكبرىٰ لابن سعد: 207/1، والهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 303. 2 الروض الأنف للسهيلي: 228/3، والهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 303. 3 الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 304.

ام المؤمنین حضرت ام سَلَمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب ہم سرزمین حبشہ میں پہنچے تو نجاشی کے حسن سلوک سے ہمارا دین محفوظ ہوا، ہم وہاں بغیر کسی پریشانی کے اللہ کی عبادت کرتے تھے اور کوئی ناپسندیدہ بات سننے کو نہ ملتی تھی۔ جب قریش کو ہمارے حالات کا علم ہوا تو انھوں نے دو قوی اور باصلاحیت لوگوں کو نجاشی کی طرف بھیجنے کا فیصلہ کیا جو مکہ کے پسندیدہ تحائف خاص طور پر رنگا ہوا چمڑا ساتھ لے جائیں تاکہ بادشاہ اور اس کے پادریوں کو تحائف پیش کیے جاسکیں، چنانچہ دو آدمی عبداللہ بن ابی ربیعہ مخزومی اور عمرو بن عاص بن وائل سہمی رضی اللہ عنہ (جو اس وقت مسلمان نہیں تھے) خصوصی ہدایات کے ساتھ روانہ کیے گئے کہ پہلے ہر پادری اور پھر نجاشی کو تحائف پیش کیے جائیں اور اس کے بعد مہاجرین کی واپسی کا مطالبہ کیا جائے۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب قریش کے نمائندے وہاں پہنچے تو پروگرام کے مطابق سب سے پہلے ہر پادری کو تحفہ پیش کیا گیا اور ان سے کہا گیا کہ ہمارے کچھ ناسمجھ لڑکے بے دین ہوکر یہاں پناہ گزیں ہوئے ہیں وہ ہمارے دین کو تسلیم کرتے ہیں نہ آپ کے مذہب میں داخل ہیں بلکہ ہم اور آپ میں سے کوئی بھی اس دین کو نہیں پہچانتا۔ ہمیں ان کے آباء واجداد اور بڑوں نے، جو اشراف قوم ہیں، انھیں واپس لانے کے لیے بھیجا ہے۔ جب ہم بادشاہ سے گفتگو کریں تو آپ براہِ کرم ان کی واپسی کی سفارش کردیں۔ نجاشی کے پادریوں نے ان سے وعدہ کرلیا کہ ایسا ہی ہوگا۔

جب بادشاہ کو تحائف پیش کیے گئے اور قبول بھی کرلیے گئے تو نمائندۂ قریش یوں گویا ہوا: ''اے بادشاہ! ہمارے کچھ ناسمجھ نوجوان بے دین ہوکر آپ کے ہاں چلے آئے ہیں۔ نہ وہ اپنے بڑوں کے دین پر قائم رہے نہ آپ کے دین میں داخل ہوئے، بلکہ ایک نیا دین و مذہب اختیار کرچکے ہیں۔ ہمیں ان کے آباء اجداد اور بڑوں نے، جو اشراف قوم سمجھے جاتے ہیں، انھیں واپس لانے کے لیے بھیجا ہے اور ظاہر ہے وہی ان کے بارے میں بہتر جانتے ہیں۔''

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ عبد اللہ بن ابی ربیعہ اور عمرو بن عاص کو سب سے زیادہ خطرہ اس بات کا تھا کہ کہیں نجاشی مسلمانوں کی باتیں (دلائل) نہ سننے لگ جائے۔ وعدے کے مطابق پادریوں نے ان نمائندگان کی سفارش بھی کر دی اور ان کی بات کی تصدیق بھی کی لیکن نجاشی برہم ہوکر بولا: ''اللہ کی قسم! ایسے لوگ جنھوں نے ساری دنیا نظرانداز کر کے میرے پاس پناہ حاصل کی، میں انھیں واپس نہیں کروں گا اور نہ ان کے خلاف کوئی تدبیر کامیاب ہونے دوں گا۔ ہاں، ان سے گفتگو کے بعد فیصلہ ہوگا۔ اگر یہ نمائندگان سچے ہوئے تو انھیں واپس کر دوں گا، وگرنہ میں خود ان مہاجرین کا دفاع کروں گا اور وہ جب تک چاہیں میرے ملک میں رہ سکتے ہیں۔''[1]

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اور نجاشی کے درمیان گفتگو

نجاشی نے اصحابِ رسول کی طرف دربار میں حاضری کا پیغام بھیجا تو سب آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ وہاں کون سی بات کی جائے۔ آخر متفقہ فیصلہ ہوا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے ہم وہی بات کریں گے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی اور ہمیں اس کی تعلیم دی۔ دوسری طرف نجاشی نے علمائے نصاریٰ کو بلا رکھا تھا۔ انھوں نے اناجیل اپنے سامنے کھول رکھی تھیں۔ جب وہاں مہاجرین سے سوال کیا گیا: ''یہ کیسا دین ہے جس کی بدولت تم نے اپنی قوم کو خیرباد کہہ دیا، اسی طرح تم ہمارے دین میں بھی داخل نہیں ہوئے اور نہ ہی تمھارا دین یہاں کے کسی دوسرے مذہب سے میل کھاتا ہے؟''

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہمارے نمائندے حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ تھے، انھوں نے کہا: ''اے بادشاہ! ہم فرسودہ خیالات کی حامل قوم تھے، بتوں کی عبادت کرتے، مردار کھاتے اور بے حیائی کے کاموں میں ملوث تھے۔ قطع رحمی اور پڑوسیوں سے بدسلوکی ہمارا شعار تھا اور ہم جنگل کا قانون مانتے تھے۔ طاقتور کمزور کو ہڑپ کر جاتا تھا، پھر

[1] مسند أحمد: 290/5.

اللہ تعالیٰ نے ہمارے پاس ایسا رسول بھیجا جس کے حسب و نسب، صداقت، امانت اور پاکدامنی سے ہم واقف تھے۔ اس نے ہمیں غیر اللہ، یعنی پتھر اور بتوں کی عبادت سے روک کر ایک اللہ کی عبادت کا راستہ دکھایا۔ ہمیں سچ بولنے، امانت ادا کرنے، صلہ رحمی اور پڑوسیوں سے حسن سلوک کا حکم دیا اور ناحق قتل اور دیگر حرام کاموں سے روکا۔ بے حیائی، جھوٹ بولنے، یتیم کا مال کھانے اور پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے سے منع فرمایا۔ اس نے ہمیں صرف ایک اللہ کی عبادت کرنے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانے کا حکم دیا اور نماز ادا کرنے، روزہ رکھنے اور زکاۃ ادا کرنے کی تلقین کی۔"

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے بادشاہ کے سامنے اسلامی تعلیمات پیش کرتے ہوئے کہا: "ہم نے اس نبی کی تصدیق کی، اس پر ایمان لائے اور اس کے لائے ہوئے دین کی پیروی کی۔ اب ہم صرف ایک اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور اس کی حرام کردہ چیزوں سے بچتے ہیں اور اس کی حلال کردہ چیزوں کو حلال سمجھتے ہیں۔ لیکن ہماری قوم ہماری دشمن بن گئی۔ اس نے ہمیں تکلیفیں دیں، ہمیں اس دین سے برگشتہ کرنے کے لیے آزمائش میں ڈالا تاکہ ہم اللہ کی عبادت چھوڑ کر دوبارہ بتوں کی عبادت کرنے لگیں اور وہی گندے کام کریں جو پہلے کیا کرتے تھے۔ جب انھوں نے ہم پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی اور اتنی سختی کی کہ ہمارے دین کی راہ میں حائل ہونے لگے تو ہم نے آپ کے شہر میں پناہ حاصل کی، آپ کے سوا کسی پر اعتبار نہیں کیا۔ اے بادشاہ! اب ہم امید کرتے ہیں کہ ہمارے ساتھ ظلم نہیں ہوگا۔" [1]

ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس کے بعد نجاشی نے جعفر رضی اللہ عنہ سے پوچھا: "کیا تمھارے پاس تمھارے پیغمبر پر اللہ کی طرف سے نازل شدہ کوئی چیز ہے؟" حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "ہاں۔" نجاشی نے سننے کی خواہش ظاہر کی تو حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے سورۂ مریم کی

1 مسند أحمد: 203,202/1.

ابتدائی آیات تلاوت فرمائیں جس کے نتیجے میں نجاشی اتنا رویا کہ اس کی ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہوگئی اور علمائے نصاریٰ بھی رونے لگے حتی کہ ان کی انجیلیں بھی تر ہوگئیں، پھر نجاشی کہنے لگا: ''اللہ کی قسم! یہ کلام اور جسے موسیٰ لائے تھے ایک ہی مشعل کی کرنیں ہیں۔ اے قریش کے نمائندگان! تم واپس چلے جاؤ۔ نہ تو میں انھیں واپس کروں گا اور نہ ان کے خلاف کوئی تدبیر کامیاب ہونے دوں گا۔''[1]

نجاشی اور مہاجرین کے درمیان غلط فہمی پیدا کرنے کی ایک اور سازش

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''جب عمرو بن عاص اور عبداللہ بن ابی ربیعہ نجاشی کے دربار سے باہر آئے تو عمرو بن عاص کہنے لگا: ''کل میں ان مہاجرین کے خلاف ایسا حربہ استعمال کروں گا جو ان کی بیخ کنی کردے گا۔'' عبداللہ جو قدرے ہمارے حق میں تھا، اس نے کہا: ''ایسا نہ کرنا۔ اگرچہ وہ ہمارے مخالف ہیں، پھر بھی ہمارے رشتہ دار تو ہیں۔''

عمرو کہنے لگا: ''اللہ کی قسم! میں نجاشی کو ضرور بتاؤں گا کہ یہ لوگ عیسیٰ علیہ السلام کو بشر مانتے ہیں، پھر جب اگلا دن آیا تو عمرو بن عاص نے بادشاہ کو بتایا کہ یہ لوگ حضرت عیسیٰ کے بارے میں ناروا عقیدہ رکھتے ہیں۔ آپ انھیں بلا بھیجیں اور ان سے پوچھیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں وہ کیا کہتے ہیں۔ ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ نجاشی نے انھیں بلا بھیجا، وہ ان سے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق پوچھنا چاہتا تھا۔ ہمیں اس سے پہلے ایسی صورت حال سے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا، چنانچہ سب اکٹھے ہوئے اور باہم مشورہ کیا کہ جب بادشاہ نے تم سے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق پوچھا تو تم کیا کہو گے۔ سب نے اللہ کی قسم کھا کر کہا: ''ہم ان کے بارے میں وہی کہیں گے جو اللہ نے فرمایا ہے اور جو ہمارے نبی پر اترا ہے'' پھر ایسا ہی ہوا۔ جب نجاشی نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں سوال کیا تو حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''ہمارا نظریہ ان کے بارے میں وہی ہے جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

[1] مسند أحمد: 1/ 203,202.

وہ اللہ کے بندے، اس کے رسول اور اس کی پاکیزہ روح اور اس کا ایسا کلمہ ہیں جو اللہ نے پاکدامن کنواری مریم کی طرف القا کیا۔''

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''نجاشی اپنا ہاتھ نیچے لے گیا، اس نے زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور کہا: ''عیسیٰ ابن مریم کے بارے میں تمھارا جو عقیدہ ہے اس میں اس تنکے کے برابر بھی فرق نہیں۔'' نجاشی کی اس بات پر اس کے پادریوں نے غصے اور نفرت کا اظہار کیا، تاہم بادشاہ نے کہا: ''اللہ کی قسم! تم چاہے ناراض ہو جاؤ، میں یہی درست سمجھتا ہوں۔'' پھر وہ ہماری طرف متوجہ ہوا اور بولا: ''تم میری سرزمین میں امن سے رہو گے۔ تمھیں برا بھلا کہنے والا ہر بار نقصان اٹھائے گا۔ کوئی مجھے تمھارے بدلے میں سونے کا ڈھیر بھی دے دے تو قبول نہیں کروں گا اور میری طرف سے کسی کو کوئی تکلیف نہ ہوگی'' پھر اس نے اپنے اہلکاروں سے کہا کہ ان دونوں (نمائندگان قریش) کے تحائف واپس کردو ہمیں ان کی ضرورت نہیں۔ جب اللہ نے مجھے بادشاہت دی تھی تو کوئی رشوت نہ لی تھی، اس لیے میں بھی کوئی رشوت قبول نہیں کروں گا جو میرے خیرخواہ ہیں میں ان کا خیرخواہ رہوں گا۔''

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ دونوں قریشی بڑے بے آبرو ہو کر وہاں سے نکلے ان کے تحفے بھی واپس کر دیے گئے اور ہمیں نجاشی کے ہاں اچھا ٹھکانا اور اچھا پڑوس میسر آ گیا۔[1]

نجاشی کا اسلام لانا

بلاشبہ نجاشی مسلمان ہو گیا تھا اور اس نے نبی ﷺ کی نبوت کو درست تسلیم کر لیا تھا، تاہم جب اپنی قوم کو باطل پرست، گمراہی کی حریص اور عقل و نقل کے صریحًا خلاف اور غلط نظریات پر قائم پایا تو اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھا۔[2] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب نجاشی فوت ہوا تو نبی ﷺ نے ہمیں اس کی خبر دی، اپنے اصحاب کو لے کر جنازہ گاہ میں آئے، صفیں درست کیں اور چار تکبیرات سے جنازہ پڑھایا۔[3]

1 مسند أحمد: 203/1. 2 الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 309.
3 صحيح البخاري، حديث: 1333، و صحيح مسلم، حديث: 951.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب نجاشی فوت ہوا تو نبی ﷺ نے فرمایا:

«مَاتَ الْيَوْمَ رَجُلٌ صَالِحٌ، فَقُومُوا فَصَلُّوا عَلٰى أَخِيكُمْ أَصْحَمَةَ»

''آج ایک نیک آدمی انتقال کرگیا ہے۔ تم سب اپنے بھائی اصحمہ کی نماز جنازہ ادا کرو۔''[1]

نجاشی کی وفات اکثر مورخین کے نزدیک 9 ہجری کو ہوئی اور ایک قول 8 ہجری قبل از فتح مکہ بھی ہے۔[2]

درس وعبرت: ① مومن اگر شرپسندوں کی طرف سے ظلم اور تکلیف سہنے کے باوجود اپنے دین پر قائم رہیں تو یہ ان کے ایمان کی سچائی، عقیدے کے اخلاص اور قلب و روح کی بلندی کی علامت ہے۔ ان کا ضمیر، عقل اور دل مطمئن رہتا ہے کیونکہ انھیں پہنچنے والی تکالیف، محرومیاں اور ظلم سہنے کے مقابلے میں جو چیز ملتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی رضا ہے اور جیت ہمیشہ اللہ کے نیک بندوں اور مخلص طلبگاروں کی ہوتی ہے اور وہ ہمیشہ روحانی جیت کو جسمانی کامیابی پر ترجیح دیتے ہیں۔ وہ اپنی روحانی ترجیحات کو جسمانی ترجیحات پر فوقیت دیتے ہیں۔ اسلامی تحریکیں اسی جذبے سے کامیاب ہوتی ہیں اور لوگ جہالت اور اندھیروں سے چھٹکارا پاتے ہیں۔[3]

② ہجرت حبشہ سے نبی ﷺ کا اپنے اصحاب کے لیے شفقت و مہربانی کا جذبہ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ آپ ﷺ کا اپنے اصحاب کے لیے کوئی جائے امن تلاش کرنا اس کا بین ثبوت ہے۔ اسی جذبے کے تحت آپ ﷺ نے ایک عادل بادشاہ کے ملک کی طرف ہجرت کرنے کا مشورہ دیا جہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا تھا اور ایسا ہی ہوا کہ حبشہ میں مسلمانوں

1 صحيح البخاري، حديث:3877. 2 أسد الغابة لابن الأثير:99/1، و الإصابة لابن حجر:109/1.
3 السيرة النبوية للدكتور مصطفٰى السباعي، ص:57.

کا دین محفوظ ہو گیا اور انھیں بہترین ٹھکانا میسر آیا۔[1]

اگر بنظرِ عمیق دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ نبی ﷺ ہی نے صحابۂ کرام کی توجہ حبشہ کی طرف مبذول کرائی اور ایک پرامن سرزمین ان کے اور ان کی دعوت کے لیے منتخب فرمائی تاکہ حاملین دعوت تباہ ہونے سے بچ جائیں۔ اس سے ہر دور کے مسلمان قائدین کے لیے یہ رہنما اصول اخذ کیا جاسکتا ہے کہ دعوت اسلامی اور مسلمانوں کے لیے حکمت اور دور اندیشی سے منصوبہ بندی کی جائے اور ایک پرامن سرزمین تلاش کی جائے جو دعوت کے لیے محفوظ مرکز ثابت ہو تاکہ اگر بالفرض بڑے مرکز کو کوئی خطرہ درپیش ہو تو اس عارضی مرکز سے استفادہ کیا جاسکے۔

اصل میں حاملین دعوت ہی اسلام کا سرمایہ ہیں۔ انھی کی بقا اور حمایت کے لیے تمام کوششیں بروئے کار لائی جائیں اور انھیں روحانی ترقی اور امن کا ماحول فراہم کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی جائے۔ اور ایک مسلمان دنیا کے ان تمام انسانوں سے بہتر ہے جو اللہ تعالیٰ کے دین سے خارج اور اس کی توحید سے بے بہرہ ہیں۔[2]

③ ہجرت حبشہ کے متعدد مقاصد تھے۔ نبی ﷺ نے اقدامات طے کیے تاکہ مطلوبہ مقاصد کو حاصل کیا جاسکے، مثلاً: اسلامی نظریے اور اس کے متعلق قریش کے موقف کی تشریح و توضیح اور مسلمانوں کے مسائل کے بارے میں رائے عامہ کو ہموار کرنا، جیسے آج کل کے صاحب اقتدار لوگ کرتے ہیں کہ پہلے سیاسی تحریک اٹھائی جاتی ہے، پھر اپنا منشور پیش کیا جاتا ہے اور اس کے بعد رائے عامہ کو اپنا ہمنوا بنایا جاتا ہے۔[3]

اس سلسلے میں ایک نئی سرزمین کے دروازے دعوت اسلام کے لیے کھولنے کا مقصد بھی کارفرما تھا، اسی لیے شروع میں عظیم المرتبت صحابہ نے ہجرت فرمائی، پھر دیگر صحابہ ان سے

1 الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 312. 2 التربية القيادية للدكتور الغضبان: 333/1. 3 أضواء على الهجرة لتوفيق محمد سبع، ص: 427.

جا ملے اور دربار نجاشی میں ان کی نمائندگی کا فریضہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کو تفویض ہوا۔[1]

④ ہجرت حبشہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کا بیٹا جعفر، داماد عثمان اور بیٹی رقیہ رضی اللہ عنہم مہاجرین کی صف اول میں نظر آتے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ کسی بھی تحریک کے سربراہ کے اہل خانہ اور رشتہ دار خطرات کو قبول کرنے میں پیش پیش ہونے چاہئیں۔ اگر قائد تحریک کے خاص آدمی تو محفوظ رہیں اور عامۃ الناس خطرات میں گھرے رہیں تو یہ نبوی طریقہ نہیں۔[2]

⑤ ہجرت حبشہ سے واضح ہوتا ہے کہ اپنا دین بچانے کی خاطر ہجرت کرنے کی شریعت نے اجازت دی ہے، چاہے چھوڑا جانے والا شہر مکہ ہی کیوں نہ ہو اور جائے ہجرت دارالاسلام بھی نہ ہو۔ حبشہ کی مثال ہمارے سامنے ہے جہاں کے باشندے عیسائی تھے اور عیسیٰ علیہ السلام کے پجاری تھے۔

یہی وہ لوگ ہیں جو مہاجرین کہلائے اور دونوں ہجرتوں میں حصہ لینے کی وجہ سے قابل تعریف ٹھہرے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾

''اور مہاجرین اور انصار میں سے (قبول اسلام میں) سبقت کرنے والے اور وہ لوگ جنھوں نے احسان کے ساتھ ان کی پیروی کی، اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اس سے راضی ہو گئے اور اللہ نے ان کے لیے ایسے باغ تیار کیے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔''[3]

ایک تفسیر کے مطابق اس آیت کا مصداق بیعت رضوان والے صحابۂ کرام ہیں۔[4]

ایسے لوگوں کی شان کتنی بلند ہے جو اپنے دین کو بچانے اور اپنے رب کی امن وسکون

---

1 التربية القيادية للدكتور الغضبان: 333/1. 2 التربية القيادية للدكتور الغضبان: 333/1.

3 التوبة 9:100. 4 تفسير الطبري: 6/11، و تفسير ابن كثير: 2/331.

سے عبادت کرنے کی غرض سے حرم جیسے شہر کو بھی چھوڑ کر دارالکفر کی طرف ہجرت کر گئے اور یہی حکم ہمیشہ ہر اس آدمی کے لیے ہے جس کے شہر میں خلاف شریعت کام ہو رہے ہوں، مومن کو اختیارِ حق پر تکالیف کا سامنا ہو، باطل زبردستی حق کو دبا رہا ہو اور مومن کو کوئی ایسی سرزمین نظر آئے جہاں وہ اپنے دین پر قائم رہ سکے، اپنے رب کی عبادت کرسکے تو پھر چاہے دارالکفر ہی کیوں نہ ہو اسے اس سرزمین کی طرف ضرور ہجرت کرنی چاہیے۔ یہی وہ ہجرت ہے جو قیامت تک جاری وساری رہے گی۔[1]

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ وٰسِعٌ عَلِيْمٌ ۝﴾

"اور مشرق ومغرب اللہ ہی کے لیے ہیں، لہٰذا تم جس طرف بھی منہ کرو گے وہیں ہے اللہ کا چہرہ، بے شک اللہ وسعت والا، خوب جاننے والا ہے۔"[2]

⑥ مسلمانوں کے لیے جائز ہے کہ حالات کے پیش نظر غیر مسلموں کی پناہ حاصل کرلیں، چاہے پناہ دینے والے عیسائی ہوں جیسا کہ نجاشی تھا۔ بعد میں وہ مسلمان ہوا۔ اور چاہے پناہ دینے والے مشرک ہی کیوں نہ ہوں جیسے پہلی ہجرت حبشہ سے واپس آکر مسلمانوں نے مشرکین مکہ کی پناہ حاصل کی۔ نبی ﷺ ابو طالب اور مطعم بن عدی کی پناہ میں رہے۔[3]

یہاں یہ نکتہ بھی یاد رہے کہ غیر مسلم کی پناہ صرف اس صورت میں جائز ہے جب اسلامی دعوت کو نقصان نہ پہنچتا ہو، دین کے کسی حکم میں تبدیلی یا کسی حرام کردہ امر پر خاموشی لازم نہ آئے۔ بصورت دیگر مسلمانوں کے لیے ہرگز جائز نہیں کہ غیر مسلم کی پناہ لیں۔ اس کا ثبوت نبی ﷺ کا اپنے چچا کے سامنے دوٹوک الفاظ میں قریش کی باتوں کا انکار ہے۔ جبکہ ابو طالب نے کہا تھا: "آپ اپنی جان کی حفاظت کیجیے اور مجھ پر میری استطاعت

1 الروض الأنف للسهيلي: 92/2، والهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 312. 2 البقرة 115:2. 3 الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 316.

سے زیادہ بوجھ نہ ڈالیے۔ مشرکین کے معبودوں کو برا کہنے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔'' اس پر آپ اپنے چچا کی پناہ سے نکلنے کے لیے تیار ہو گئے اور آپ ﷺ نے دینِ حق کو کھول کھول کر بیان کرنے کی ذمہ داری ترک کرنے سے انکار کر دیا۔[1]

⑦ نبی ﷺ کا سرزمین حبشہ کو ہجرت کے لیے منتخب کرنا ایک اہم دفاعی نکتے کی طرف اشارہ کرتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ کی اپنے اردگرد کے شہر اور ممالک پر گہری نظر تھی۔ آپ ہر اچھی اور بری سرزمین، عادل اور ظالم حکمران کی پہچان رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے آپ ﷺ نے ہجرت کے لیے ایک دارالامن کو آسانی سے منتخب کر لیا اور ایک رہنما کے لیے یہ ضروری بھی ہے کہ وہ اپنے اردگرد پر نظر رکھے، قوموں اور حکومتوں کے احوال اور طور اطوار سے آگاہ رہے۔[2]

⑧ ہجرت حبشہ سے یہ بھی عیاں ہوتا ہے کہ تمام چلنے والی تحریکات حتی المقدور دشمن سے پوشیدہ رکھی جائیں تاکہ تحریک اور اس کے منشور کو نقصان نہ پہنچ سکے۔ پہلی ہجرت حبشہ میں آہستہ اور خفیہ انداز سے روانگی ہوئی تاکہ قریش کو علم نہ ہو، چھوٹے پیمانے پر صرف سولہ افراد کا ہجرت کرنا تاکہ اس مختصر قافلے کے کوچ پر کسی کی توجہ مبذول نہ ہو جبکہ وقت کے تقاضے کے مطابق تیزی سے سفر کرنا اسی اصول کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

حبشہ کا رخ کرنے والے مہاجرین سوچ رہے تھے کہ کسی بھی وقت ان کا پیچھا کیا جا سکتا ہے اور شاید ان کی راز داری کا پردہ فاش ہونے پر دشمن انھیں آ لے گا لیکن قریش کو اس ہجرت کا علم تاخیر سے ہوا۔ اس وقت انھوں نے مہاجرین کا پیچھا کیا لیکن ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ جب وہ ساحل سمندر پر پہنچے تو وہاں کسی کو نہ پایا۔ معلوم ہوا کہ مومن کو وقت کے تقاضے کے مطابق اپنی دعوتی تحریک کو بچانے کے لیے احتیاطی تدابیر اختیار کرنی

---

1 فقه السيرة للبوطي، ص: 126، و الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 317. 2 السيرة النبوية للدكتور إبراهيم علي محمد أحمد، ص: 101.

چاہئیں تاکہ دشمن ان کے رازوں کو جان سکے نہ دعوت کو نقصان پہنچا سکے۔[1]

⑨ ہجرت حبشہ سے ایک سبق یہ بھی ملتا ہے کہ ہمیں دشمن کے پروگراموں سے آگاہ رہنا چاہیے۔ اپنے دشمن کو کمزور سمجھنے کے بجائے ان کی طاقت کا صحیح اندازہ لگائیں تاکہ ان کی شاطرانہ چالوں کا مقابلہ کیا جا سکے۔

مسلمانوں کی ہجرت حبشہ پر قریش کسی طور پر خوش نہ تھے اور وہ محسوس کر رہے تھے کہ مستقبل میں ان کے مفادات کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اسلامی تحریک حبشہ میں پھلنے پھولنے لگے اور ان کے لیے خطرہ بن کے ابھرے، لہٰذا انھوں نے ایک ٹھوس منصوبہ بندی کے تحت مسلمانوں کو واپس لانے اور انھیں اس نئے دعوتی مرکز سے محروم کرنے کی کوشش کی۔ مکی سرداروں کی تیار کردہ اسکیم یہ تھی کہ نجاشی اور اس کے پادریوں کو تحائف پیش کرنے کے ساتھ ساتھ انھیں سفارتی مہارت سے متاثر کیا جائے، چنانچہ سفارتی وفد کی قیادت ذہین ترین سفیر عمرو بن عاص (رضی اللہ عنہ) کو سونپی گئی جو بہت سمجھدار اور نجاشی کے دوستوں میں شمار ہوتے تھے۔[2]

⑩ قریش نے پوری سمجھ داری سے پروگرام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا لیکن ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ نجاشی ایک نیک دل انسان تھا جس نے مسلمانوں کا موقف سننے سے پہلے انھیں قریش کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ اس طرح مسلمانوں کو اپنا جائز موقف اور دین قیم کی تعلیمات نجاشی کے سامنے پیش کرنے کا موقع میسر آیا۔

⑪ جس امر کا فیصلہ شورائی طریقے سے کیا جائے اس کی کامیابی کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس جب نجاشی کا ایلچی انھیں طلب کرنے آیا تو انھوں نے آپس میں مشورہ کر کے ایک متفقہ موقف طے کیا، چنانچہ ایسا فیصلہ کامیابی کا ضامن ہوتا ہے کیونکہ اس میں ایک سے زیادہ آراء شامل ہوتی ہیں۔

---

1 السيرة النبوية للدكتور إبراهيم علي محمد أحمد، ص: 101. 2 التربية القيادية للدكتور الغضبان: 317/1.

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے ہر حالت میں اسلام کے احکامات اسی طرح پیش کرنے کا عزم کیا جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کیے تھے۔ انھوں نے اختلاف کا شکار ہونے کے بجائے ایک متفقہ موقف اختیار کیا اور یہ طے کیا کہ وہ عزت و وقار کے ساتھ اسلام کو اسی طرح پیش کریں گے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے لائے، خواہ اس میں ہلاک ہی کیوں نہ ہو جائیں۔ اس سے ہمیں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی عظیم الشان تربیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔[1]

⑫ ہجرت حبشہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم موقع و محل کے مطابق قیادت کا منصب عطا کرتے تھے۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کو اس ہجرت میں قیادت سونپی گئی اور نجاشی کے دربار میں گفتگو کے لیے بھی متفقہ طور پر انھیں چنا گیا تاکہ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ جیسے عرب کے انتہائی ہوشیار آدمی کا مقابلہ کیا جاسکے۔ اس مقصد کے لیے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کا انتخاب مندرجہ ذیل امور کی وجہ سے ہوا:

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ترین رہنے والے آدمی تھے اور انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک ہی گھر میں زندگی بسر کی، لہٰذا وہ تمام مہاجرین میں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی دعوتی سرگرمیوں سے زیادہ واقف تھے۔

نجاشی کے سامنے گفتگو کرنے کے لیے فصاحت و بلاغت کی ضرورت تھی اور بنو ہاشم نسب اور فضیلت کے اعتبار سے فوقیت رکھنے والے تھے۔ جعفر رضی اللہ عنہ بنو ہاشم کے گل سرسبد تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ہاشم کو بنو کنانہ میں سے اور ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بنو ہاشم میں سے منتخب فرمایا، جو فصیح اللسان اور عالی نسب کے حامل تھے۔

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد تھے، اس لیے نجاشی کے لیے یہ بات قابل اطمینان ہوسکتی تھی کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں قابل اعتماد گفتگو کریں گے۔[2]

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی سیرت و اخلاق میں نبوی کمال نظر آتا ہے، اسی طرح بنو ہاشم کا

1 التاريخ الإسلامي للحميدي:2/92. 2 التربية القيادية للدكتور الغضبان:1/335.

خاندانی جمال بھی ان میں موجود تھا، آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«أَشْبَهْتَ خَلْقِي وَ خُلُقِي»

''اے جعفر! تو سیرت وصورت دونوں میں میرے مشابہ ہے۔''[1]

صدیاں گزرنے کے باوجود آج بھی حضرت جعفر رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے لیے سفارت کے میدان میں ایک نمونے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں وہ تمام صفات پائی جاتی تھیں جو ایک اسلامی سفیر میں ہونی چاہئیں، علم، فصاحت، حسن خلق، صبر، بہادری، دانائی، سیاسی بصیرت اور پرکشش شخصیت![2]

⑬ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ جو اس وقت مسلمان نہیں تھے، نہایت ذہین، عقل مند اور حیلہ ساز سمجھے جاتے تھے، انھوں نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے دربار میں پہنچنے سے پہلے ہی اپنے تمام دلائل نجاشی کے سامنے رکھ دیے جو مندرجہ ذیل نکات پر مشتمل تھے:

محمد ﷺ کی دعوت سے مکہ کی فضا بھڑک اٹھی ہے اور آپس میں نفرتیں پیدا ہوئی ہیں۔ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اس وقت اہل مکہ کے سفیر وترجمان تھے۔ نجاشی کے نزدیک وہ ثقہ آدمی تھے، لہٰذا شک کی گنجائش بھی نہ تھی۔

عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ کے پیروکاروں کے متعلق آگاہ کرتے ہوئے کہا کہ ہوسکتا ہے یہ آپ کی سلطنت پر قبضہ کرلیں جس طرح کہ انھوں نے مکہ کی فضا خراب کی ہے۔ اگر قریش کی آپ کے ساتھ محبت و دوستی نہ ہوتی تو ہم یہاں آنے کی مشقت نہ اٹھاتے۔ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے الفاظ کچھ اس طرح تھے: ''آپ سچ پر مبنی ہماری کوتاہیوں کی نشاندہی کرتے ہیں، ہمارے قبائل سے اچھا سلوک کرتے ہیں اور ہمارے تاجر آپ کے پاس امن سے رہتے ہیں، لہٰذا میں بھی آپ کے ساتھ خیر خواہی کرنا چاہتا ہوں اور اس

1 صحيح البخاري، حديث: 2699، و جامع الترمذي، حديث: 3765. 2 سفراء النبي ﷺ لمحمود شيت خطاب: 2/252-317.

خطرناک فتنے سے آپ کو بچانا چاہتا ہوں۔“

عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی گفتگو میں خطرناک ترین پہلو یہ تھا کہ اے شاہ حبشہ! مہاجرین آپ کے عقیدے کا انکار کرتے ہیں۔ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ”الٰہ“ نہیں مانتے۔ یہ لوگ ہمارے دین پر ہیں نہ آپ کے مذہب میں داخل ہیں بلکہ ایک نئے دین کے موجد ہیں جو کہ فتنہ ہے۔

مزید یہ بھی کہا گیا کہ یہ لوگ آپ کو حقیر اور ذلیل سمجھتے ہیں، اس لیے آپ کو حسب رواج سجدہ نہیں کیا، لہٰذا یہ آپ کے زیر سایہ رہنے کے مستحق نہیں۔

اس گفتگو سے عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے نجاشی اَصْحَمہ کے دل میں مہاجرین کی نفرت اجاگر کرنے کی سعی لا حاصل کی کہ جو لوگ آپ کا احترام نہیں کرتے وہ بھی لائق احترام نہیں ہو سکتے، بہر حال حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے ذمے تھا کہ وہ ان تمام باطل الزامات کا جواب دیں جو سفیر قریش نے ان پر لگائے تھے۔

⑭ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے نجاشی کے سوالوں کا جواب انتہائی سمجھداری، سیاسی مہارت اور دعوت و عقیدے سے لبریز گفتگو کے ساتھ پیش کیا جو کہ مندرجہ ذیل نکات پر مشتمل تھا:

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے جاہلیت کے عیوب اس طرح بیان فرمائے کہ سننے والا متنفر ہو جائے۔ ان کا مقصد نجاشی کے سامنے قریش کی برائی ظاہر کرنا تھا، چنانچہ ان کے ایسے عیوب کا تذکرہ کیا جن کا خاتمہ کوئی نبی ہی کر سکتا تھا۔

پھر انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو اس فاسد اور بری عادات والے معاشرے میں اس انداز سے پیش کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان تمام رذائل سے مُبَرَّا ہیں، آپ کا حسب ونسب، صداقت، امانت، پاک دامنی سب پر عیاں ہے، لہٰذا آپ مستحق رسالت ٹھہرے۔

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے اسلام کی خوبیاں اور خدوخال بیان فرمائے اور باور کرایا کہ یہی تمام انبیاء کی دعوت رہی ہے۔ تاکہ نجاشی اور اس کے حکّام جو عیسائیت کے حامل تھے، سمجھ

جائیں کہ سیدنا موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کے دور ہی سے انبیاء کی دعوت انھی خوبیوں کی حامل رہی ہے۔ اور وہ خوبیاں یہ ہیں: بتوں کی عبادت سے پہلو تہی، سچ بولنا، امانت ادا کرنا، صلہ رحمی، پڑوسی سے حسن سلوک، محارم اور قتل کے ارتکاب سے رکنا، نماز قائم کرنا اور زکاۃ ادا کرنا وغیرہ۔

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی کتاب پر ایمان لے آئے ہیں۔ ہم نے سیرت پیغمبر کو اپنی عملی زندگی میں اختیار کیا ہے اور بت پرستی ترک کر دی ہے، لہٰذا قریش ہمارے دشمن بن گئے ہیں۔

انھوں نے نجاشی کی توجہ حاصل کرنے کے لیے اس کی مناسب حد تک تعریف بھی کی کہ اپنی رعایا میں اس کا عدل بے مثال ہے اور اس کی سلطنت میں کسی پر ظلم نہیں کیا جاتا۔

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ ان لوگوں کے ظلم و تکالیف سے بچنے کے لیے ہم نے ساری دنیا چھوڑ کر آپ کے پاس پناہ حاصل کی ہے۔

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی طرف سے مندرجہ بالا واضح نکات پیش کرنے پر عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی فصاحت کا اثر ختم ہو گیا اور یوں جعفر رضی اللہ عنہ نجاشی اور دربار میں موجود فوجی افسران اور پادریوں کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جب نجاشی نے کتاب اللہ کی آیات سننے کی خواہش ظاہر کی تو حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے بڑی متانت، عمدگی اور مؤثر لہجے میں سورۂ مریم کی ابتدائی آیات پڑھ کر سنائیں حتی کہ نجاشی اور مذہبی پیشوا سب رونے لگے اور ان کی ڈاڑھیاں اور مذہبی کتابیں بھیگ گئیں۔

مہاجرین کے نمائندے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے دانشمندی سے کام لیتے ہوئے قرآن کی تلاوت کے لیے سورۂ مریم کو چنا کیونکہ اس میں قصۂ مریم و عیسیٰ علیہما السلام بیان کیا گیا ہے۔[1]

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے خدا داد صلاحیت سے کام لیتے ہوئے مناسب وقت پر کھلے دل سے بہتر موضوع گفتگو اختیار کیا اس سے نجاشی کے دل میں ان کے لیے نرم گوشہ پیدا ہو گیا۔[2]

1 السيرة النبوية للدكتور إبراهيم علي محمد أحمد، ص: 106. 2 التربية القيادية للدكتور الغضبان: 337/1.

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کا جواب ان کی دانائی اور فراست پر دلالت کرتا ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ ابن مریم کو معبود نہیں مانتے اور نہ جھوٹے لوگوں کی طرح مریم علیہا السلام کی عزت کو پامال کرتے ہیں بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو اللہ تعالیٰ کا کلمہ تھے، جسے اللہ تعالیٰ نے پاکیزہ اور کنواری مریم علیہا السلام کی طرف القا کیا اور نجاشی کے سامنے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے اسلامی عقیدے کی جو تشریح کی اس کے اور نجاشی کے عقیدے میں ایک تنکے کے برابر بھی فرق نہ تھا۔[1]

رہی یہ بات کہ مسلمانوں نے نجاشی کو سجدہ نہ کیا تو حقیقت میں مسلمان کسی کو اللہ کا شریک نہیں سمجھتے اور نہ غیر اللہ کو سجدہ کرنا جائز ہے۔ ہاں! نجاشی بادشاہ کی انھوں نے تحقیر نہیں بلکہ عزت کی۔ وہ اسے ایسے ہی سلام کہتے جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے تھے۔ اہل جنت آپس میں سلام کا جو تحفہ پیش کریں گے وہی تحفہ انھوں نے نجاشی کی خدمت میں پیش کیا۔

آخر کار نجاشی نے مہاجرین کی صداقت جان لی اور خواہش ظاہر کی کہ کاش! وہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو سکے جن کے پاس موسیٰ علیہ السلام پر آنے والا فرشتہ آتا ہے اور آپ کے ساتھیوں کی حمایت سے وہ اللہ کا قرب حاصل کر سکے۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو اس نے کہہ دیا کہ قریش کی تجارت، مالی لین دین حتی کہ تمام تعلقات منقطع ہونے کا اسے کوئی خوف نہیں۔[2]

⑮ قریش کو سیاسی، روحانی اور سفارتی محاذ پر شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ مسلمانوں کی کامیاب ثابت قدمی، طریق کار اور طے شدہ پروگرام کے سامنے ٹھہر نہ سکے۔

⑯ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کا موقف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے عین مطابق تھا:

«مَنِ الْتَمَسَ رِضَا اللّٰهِ بِسَخَطِ النَّاسِ كَفَاهُ اللّٰهُ مُؤْنَةَ النَّاسِ، وَ مَنِ الْتَمَسَ رِضَا النَّاسِ بِسَخَطِ اللّٰهِ وَكَلَهُ اللّٰهُ إِلَى النَّاسِ»

[1] التربية القيادية للدكتور الغضبان:342/1. [2] التربية القيادية للدكتور الغضبان:342/1.

''جو شخص لوگوں کی ناراضی کے باوجود اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل کرے اسے اللہ تعالیٰ لوگوں کی ضرورتوں سے آزاد کر دیتا ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ کو ناراض کر کے لوگوں کی رضا تلاش کرے اسے اللہ تعالیٰ لوگوں کے سپرد کر دیتے ہیں۔'' [1]

مہاجرینِ حبشہ نے اللہ تعالیٰ کی رضا کو ترجیح دی باوجودیکہ انھیں عیسائیوں کی ناراضی کا خطرہ تھا اور وہ فی الوقت ان کے محافظ بھی تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے نجاشی کا دل ان کی طرف مائل کر دیا اور اس نے دعوت نبوی کے مطابق شہادت دی، اگرچہ وہ ان کے اس تحریف شدہ عقیدے کے صریحاً خلاف تھی جس پر ان کی بادشاہت قائم تھی اور متعصب عیسائیوں کی جانب سے بادشاہ کے خلاف بغاوت کا خطرہ بھی موجود تھا۔ [2]

⑰ حبشہ میں کچھ عیسائی اپنے درست دین پر قائم تھے لیکن تحریف شدہ دین کے پیروکاروں کے غلبے سے ڈرتے ہوئے وہ اپنا دین چھپاتے تھے، ان میں حبشہ کا حکمران نجاشی بھی تھا۔ وہ اپنی قوم کی دلجوئی کرتا اور اپنی جان اور بادشاہت بچانے کی غرض سے اپنا نظریہ چھپائے رکھتا، جب اس کے لیے آزمائش کا یہ وقت آیا تو اس نے نتائج کی پروا کیے بغیر صرف اپنے رب کو راضی، اپنے ضمیر کو مطمئن اور اللہ کے مومن بندوں کی حمایت کرتے ہوئے اپنا ایمان ظاہر کر دیا اور ایسے لوگ ہی تاریخ میں عظیم لوگ خیال کیے جاتے ہیں۔ [3]

⑱ ہجرت حبشہ سے یہ مسئلہ بھی واضح ہے کہ کسی راجح مصلحت کی خاطر اسلام کے کسی حکم کو نظر انداز کرنا قابل مواخذہ نہیں۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ جہالت کی وجہ سے عذر کا اثبات کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب ہجرت مدینہ کے بعد حضر کی نماز سفر سے زیادہ کر دی گئی تو مہاجرینِ حبشہ اور اہل مکہ دو رکعت ہی پڑھتے رہے اور آپ نے انھیں نماز لوٹانے کا حکم نہیں دیا۔ [4]

علامہ ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''کوئی مسلمان لاعلمی میں اپنی کسی کوتاہی پر قابل مواخذہ نہیں

---

1 جامع الترمذي، حديث: 2414، و صحيح ابن حبان، حديث: 276، و الزهد لابن المبارك، حديث: 66. 2 التاريخ الإسلامي للحميدي: 105/2. 3 التاريخ الإسلامي للحميدي: 106/2.
4 الفتاوىٰ لابن تيمية: 43/22.

اور حجت قائم ہونے پر ہی گنہگار ٹھہرے گا۔ نبی ﷺ پر واجبات و محرمات کے احکام اترنے کے مہینوں بعد مہاجرین حبشہ تک پہنچے جو مدینہ سے بہت دور تھے، لہٰذا وہ لوگ عدمِ علم کی وجہ سے معذور سمجھے جائیں گے یہاں تک کہ ان کے پاس واضح نص آ جائے۔''[1]

⑲ ہجرت حبشہ کا ایک سبق یہ بھی ہے کہ حسب مقصد کبھی جہاد کا ثواب دوگنا ہو جاتا ہے۔ ہجرت مدینہ ایک جہاد تھا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مہاجرین مدینہ کا خصوصی مقام و مرتبہ اور فضیلت بیان فرمائی اور یہ فضیلت مہاجرین حبشہ کو بھی نصیب ہوگئی اگرچہ انھیں ہجرت مدینہ کا شرف فتح خیبر کے بعد حاصل ہوا اور وہ نبی ﷺ سے آ ملے کیونکہ ان کا حبشہ میں اس وقت تک ٹھہرنا ضروری تھا۔ اور یہ دوگنا ثواب رسول اللہ ﷺ سے اصحاب سفینتین، یعنی ہجرت حبشہ والوں کے لیے ثابت ہے۔[2]

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے ملاقات کی غرض سے آئیں اور وہ مہاجرینِ حبشہ میں شامل تھیں۔ دریں اثنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ اچانک وہاں تشریف لائے تو اسماء رضی اللہ عنہا کے بارے میں پوچھا۔ حضرت حفصہ نے کہا: ''ہاں، یہ اسماء بنت عمیس ہیں۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمانے لگے: ''کیا یہ وہ ہیں جنھوں نے سمندر کے راستے حبشہ کا سفر اختیار کیا تھا؟'' حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے ہاں میں جواب دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ہم نے آپ سے پہلے (مدینہ کی طرف) ہجرت کی۔ ہم آپ سے زیادہ رسول اللہ ﷺ کے قریب ہیں۔'' اس پر وہ ناراض ہوئیں اور کہا: ''ہرگز نہیں، اللہ کی قسم! آپ مکہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس تھے، آپ میں سے بھوکوں کو کھانا کھلایا جاتا اور آپ میں سے لاعلم کو بروقت نصیحت کی بات حاصل ہوتی جبکہ ہم اپنی سرزمین سے دور دشمنوں کی زمین حبشہ میں رہتے تھے اور یہ سب کچھ ہم نے اللہ اور اس کے رسول کی خاطر برداشت کیا۔ اللہ کی قسم! میں اس وقت تک کچھ کھاؤں گی نہ پیوں گی

1 الكبائر للذهبي، ص: 12. 2 الهجرة الأولى في الإسلام للدكتور سلمان العودة، ص: 205.

یہاں تک کہ آپ کی بات رسول اللہ ﷺ کے سامنے رکھ دوں۔ ہم تو حبشہ میں بڑی تکلیف اور خوف میں مبتلا تھے۔ میں تو نبی ﷺ سے ضرور اس بارے میں دریافت کروں گی۔ اور اللہ کی قسم! جھوٹ بولوں گی نہ توڑ مروڑ کر بات کروں گی اور نہ اضافہ کروں گی۔''

پھر جب رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حوالے سے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ نبی ﷺ نے پوچھا: «فَمَا قُلْتِ لَهُ؟» ''پھر تو نے اسے کیا کہا؟'' حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے وہ بھی بتا دیا۔ اس پر آپ نے فرمایا: «لَيْسَ بِأَحَقَّ بِي مِنْكُمْ، وَ لَهُ وَ لِأَصْحَابِهِ هِجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ، وَّلَكُمْ أَنْتُمْ أَهْلَ السَّفِينَةِ هِجْرَتَانِ» ''میرے ساتھ تمھارے جیسا تعلق کسی کا نہیں ہوسکتا۔ عمر اور اس کے ساتھیوں کے لیے ایک ہجرت ہے اور تم اے اہل سفینہ (کشتی والو!) دو ہجرتوں والے ہو۔''

پھر حضرت اسماء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھ اصحابِ سفینہ گروہوں کی شکل میں آیا کرتے تھے اور یہ حدیث سنا کرتے تھے۔ ان کے لیے رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان دنیا جہان کی خوشیوں سے زیادہ خوش کن اور عظیم تر تھا۔[1]

⑳ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ ارض حبشہ ہی میں اسلام کی طرف مائل ہوگئے تھے جس سے پتا چلتا ہے کہ ہجرتِ حبشہ کے کیا اثرات رونما ہوئے اور مہاجرین نے وہاں دعوتی میدان میں جو فوائد حاصل کیے یہ اس کا بیّن ثبوت ہے۔ اور بہت سی روایات بھی شاہد ہیں کہ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نجاشی کے ہاتھ پر اسلام لائے اور یہی مشہور ہے جیسا کہ ابن حجر رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔[2]

اور یہاں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ ایک صحابی تابعی کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے جیسا کہ علامہ زرقانی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔[3] اور بعض روایات کے مطابق وہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔

---

1 صحيح البخاري، حديث:4231,4230، و صحيح مسلم، حديث:2503,2502. 2 الهجرة الأولى في الإسلام للدكتور سلمان العودة، ص: 167. 3 شرح المواهب للزرقاني:271/1.

(21) نبی ﷺ کا حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کا بھی ہجرت حبشہ سے گہرا تعلق ہے۔ مہاجرین حبشہ میں سے ایک عورت کے ساتھ آپ ﷺ کا نکاح کرنا عظیم مقصد کا حامل تھا۔ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ آپ کا نکاح سرزمین حبشہ میں ہوا جس کی گواہی کتب احادیث سے ملتی ہے۔ امام ابوداود رحمہ اللہ صحیح سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''وہ (ام حبیبہ رضی اللہ عنہا) عبید اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں کہ وہ سرزمین حبشہ میں وفات پا گئے تو نجاشی نے چار ہزار درہم حق مہر کے عوض ان کا نکاح نبی ﷺ سے کردیا اور شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ کی معیت میں انھیں نبی ﷺ کی طرف بھیج دیا۔[1]

سیرت کا مطالعہ کرنے والا اس واقعے سے نتیجہ اخذ کرسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ مہاجرین کے احوال سے مسلسل واقفیت حاصل کرتے تھے، ان کے دکھ درد میں شریک ہوتے، صبر کرنے والوں کی دلجوئی فرماتے اور ثابت قدم رہنے والوں کو حوصلہ دیتے اور اسی طرح مہاجرات کے حالات پر بھی نظر رکھتے۔ صرف ام حبیبہ رضی اللہ عنہا ایسی خاتون نہ تھیں جن سے آپ ﷺ نے دلجوئی فرماتے ہوئے نکاح کیا بلکہ اس سے پہلے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کی بھی دلجوئی فرما چکے تھے۔[2]

حضرت سَودہ رضی اللہ عنہا جب اپنے خاوند کے ہمراہ حبشہ سے مکہ پہنچیں تو ان کے خاوند سکران بن عمرو رضی اللہ عنہ وفات پا گئے۔ جب ان کی عدت ختم ہوگئی تو آپ ﷺ نے پیغام نکاح بھیجا۔ وہ کہنے لگیں: ''میرے معاملے کا آپ کو اختیار ہے۔'' اس پر نبی ﷺ نے فرمایا: «مُرِي رَجُلًا مِّنْ قَوْمِكِ يُزَوِّجُكِ» ''اپنے خاندان میں سے کسی کو اپنا ولی مقرر کرو جو تمھاری شادی کرادے۔'' تو حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نے حاطب بن عمرو بن عبد شمس بن عبدود کو اپنا ولی مقرر کیا، پھر نبی ﷺ نے ان سے نکاح کرلیا اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بعد یہ سب سے پہلے آپ کے نکاح میں آئیں۔[3]

---

1 سنن أبي داود، حديث: 2107. 2 الهجرة الأولٰى في الإسلام للدكتور سلمان العودة، ص: 188. 3 الطبقات الكبرٰى لابن سعد: 3/8، وسير أعلام النبلاء: 267/2.

مذکورہ بالا نکاح کے دونوں واقعات بظاہر تعدد ازواج پر دلالت کرتے ہیں لیکن خصوصی طور پر ان میں مجاہد عورتوں کے خیال رکھنے کی حکمت اور دلالت بھی موجود ہے۔ اگرچہ عمومی طور پر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے آپ کا نکاح اصل میں بنی امیہ سے عداوت کم کرنے کے لیے تھا، بالخصوص ان کے والد ابوسفیان کی دشمنی ختم کرنا مقصود تھا جو اسے اسلام، پیغمبر اسلام اور عام مسلمانوں سے تھی لیکن پہلی توجیہ زیادہ قرین قیاس ہے۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں اسلام کی خاطر تالیف قلب کا نظریہ پایا جاتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کی بہتری کے لیے ہر طریقہ بشرطیکہ وہ اسلامی اقدار کے خلاف نہ ہو اختیار فرما لیتے تھے۔[2]

(22) بعض سیرت نگار خیال کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مختلف اسباب کے پیش نظر ہجرت حبشہ کے حق میں نہیں تھے، وہ اسباب مندرجہ ذیل تھے:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دار ہجرت کا مشاہدہ کرنا کہ وہ زمین دو حروں (کالے پتھر والی زمینوں) کے درمیان واقع ہے اور وہاں کھجوروں کے درخت ہیں، آپ نے اس سے ہجرت کے شہر کا اندازہ لگایا تھا۔

سرزمین حبشہ کا جغرافیائی محل وقوع ایسا تھا کہ وہ پورے عالم میں اسلامی دعوت کے فروغ اور اسلامی سلطنت کے پھیلاؤ کی راہ میں رکاوٹ بن سکتا تھا۔

جزیرہ نمائے عرب خصوصًا مکہ اور مدینہ کا نزول وحی اور دین پھیلانے کے لیے انتخاب کوئی اتفاقی حادثہ نہیں تھا بلکہ بہت سی خوبیوں کی بنا پر تھا۔[3]

اہل حبشہ نے اس پناہ گزین دعوتِ دین کو مسیحیت کے دوش بدوش پھیلنے سے روکے رکھا اور اس دور میں جبکہ رومی سلطنت کو پورے عالم میں مسیحیت کی محافظ سمجھا جاتا تھا، وہ حبشہ

1 السيرة النبوية للدكتور مهدي رزق الله، ص:707,706. 2 شرح المواهب للزرقاني:271/1.
3 الغرباء الأولون للدكتور سلمان العودة، ص:170,169.

میں دین اسلام پھیلانے کی کیسے اجازت دے سکتی تھی۔[1]

(23) ہجرت حبشہ کی وجہ سے قریش عرب میں اپنا مقام ومرتبہ کھو بیٹھے اور ان میں دعوت دین کی پہلی سی مخالفت کا یارا نہ رہا۔ کیونکہ عرب معاشرے میں اجنبی کو پناہ دینا، پڑوسی کی عزت کرنا اور اس سلسلے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنا فخر سمجھا جاتا تھا۔ اس کی خلاف ورزی کرنے والے کو قابل ملامت اور برا خیال کرتے تھے۔ دوسری طرف حبشی لوگ قریش پر سبقت لے گئے۔ جن لوگوں کو قریش نے دھتکارا اور ان سے برا سلوک کیا، اہل حبشہ نے انھیں پناہ دی۔ ان مہاجرین میں قریش کے معزز، کمزور اور غریب سب لوگ شامل تھے۔[2]

1 أضواء على الهجرة لتوفيق محمد سبع، ص: 156-161، والهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 320. 2 الغرباء الأولون للدكتور سلمان العودة، ص: 170,171.

باب 3

عام الحزن اور سفرِ طائف

ابو طالب کی وفات

جب ابو طالب کی وفات ہوئی تو بعثت نبوی کے دسویں سال کے آخری دن تھے اور بنو ہاشم شعب ابی طالب میں محصور رہنے کے بعد آزاد ہو چکے تھے۔[1]

ابو طالب نبی ﷺ کی حفاظت اور مدد کرتے تھے۔ قریش ان کا احترام کرتے تھے۔ جب ابوطالب کا آخری وقت آیا تو مشرکین کے سردار جمع ہوئے اور انھیں اپنے آبائی دین پر قائم رہنے کی تلقین کرنے لگے۔ وہ انھیں اسلام سے روکتے ہوئے کہتے: ''کیا تو عبدالمطلب کے دین سے پھر جانا چاہتا ہے؟'' دوسری طرف نبی ﷺ ان پر اسلام پیش کرتے ہوئے فرماتے: «قُلْ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ أَشْهَدُ لَكَ بِهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ» ''آپ لاالٰہ الا اللہ کا اقرار کر لیجیے، میں قیامت کے دن آپ کے ایمان کی گواہی دوں گا'' لیکن ابوطالب نے کہا: ''اگر مجھے قریش کی طرف سے عار دلانے کا ڈر نہ ہوتا کہ اب مرتے ہوئے کلمہ پڑھ رہا ہے تو میں ضرور تیری آنکھیں ٹھنڈی کر دیتا۔'' اس وقت یہ آیت نازل ہوئی:

﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ ۚ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ۝﴾

''(اے نبی!) بے شک جسے آپ چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے، بلکہ اللہ ہی جسے

[1] فتح الباري، شرح الحديث:3883.

چاہے ہدایت دیتا ہے اور وہ ہدایت پانے والوں کو خوب جانتا ہے۔''[1]

معلوم ہوتا ہے جاہلیت کے نظریات ابوطالب کے ذہن میں پختہ تھے اور اس بڑھاپے کی حالت میں اپنے آبائی دین اور فکر کو تبدیل کرنا ان کے لیے ممکن نہ تھا اور ان کے ساتھی بھی اس وقت پاس تھے۔ وہ اس بات سے خوفزدہ تھے کہ اگر لوگوں تک ابوطالب کے اسلام کی خبر پہنچ گئی تو وہ بھی دائرہ اسلام میں داخل ہو سکتے ہیں۔[2]

سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات

بعثت نبوی کے دسویں سال ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بھی وفات پا گئیں اور یہ وہی سال تھا جب ابوطالب فوت ہوئے۔[3]

ابوطالب اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی یکے بعد دیگرے وفات کے بعد آپ پر دکھ اور غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ درحقیقت دعوتی مشکلات میں یہ دونوں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مضبوط ستونوں کی حیثیت رکھتے تھے جن پر آپ اعتماد کرتے تھے۔ ابوطالب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قوم کے مقابلے میں دفاع کرتے اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا گھر کی چار دیواری میں آپ کی مشکلات اور دکھ کم کرنے کی کوشش کرتیں۔ اب ان دونوں کی وفات کے بعد کفار قریش اس دلیری سے آپ کی مخالفت کرنے لگے جو ابوطالب کی زندگی میں ممکن نہ تھی۔[4]

اب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ایک ایسے مشکل ترین مرحلے کی ابتدا ہوئی جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی مشکلات، کٹھن مراحل، تکالیف اور آزمائشوں کا سامنا کیا کیونکہ آپ اب میدان میں اکیلے تھے اور اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی یار و مددگار نہ تھا۔ اس مخالفت و اذیت کے باوجود آپ اپنے رب کا پیغام پوری دنیا تک پہنچانے کی کوشش کرتے رہے۔

---

1 القصص 28:56. صحيح مسلم، حديث:(42)25، وجامع الترمذي، حديث: 3188، ومسند أحمد:2/434. 2 السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري:1/184. 3 السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري:1/185. 4 محنة المسلمين في العهد المكي للدكتور سليمان السويكت، ص: 34.

نبی ﷺ نے اتنی تکالیف برداشت کیں کہ پہاڑ بھی برداشت نہ کر سکتے تھے اور اتنی مشقتیں اور آزمائشیں آئیں کہ وہ شہر، جہاں آپ پیدا ہوئے اور وہاں کا ہر چھوٹا بڑا آپ کو جانتا تھا، آپ کو چھوڑنا پڑا اور اسلامی دعوت پیش کرنے کے لیے کسی دوسرے شہر اور دوسری قوم کا انتخاب کرنا پڑا۔ یہی سوچتے ہوئے آپ مکہ کے قریب ترین شہر طائف کی طرف نکلے کہ ہوسکتا ہے وہ دعوتِ دین قبول کرلیں اور کچھ دادرسی بھی ہوسکے۔[1]

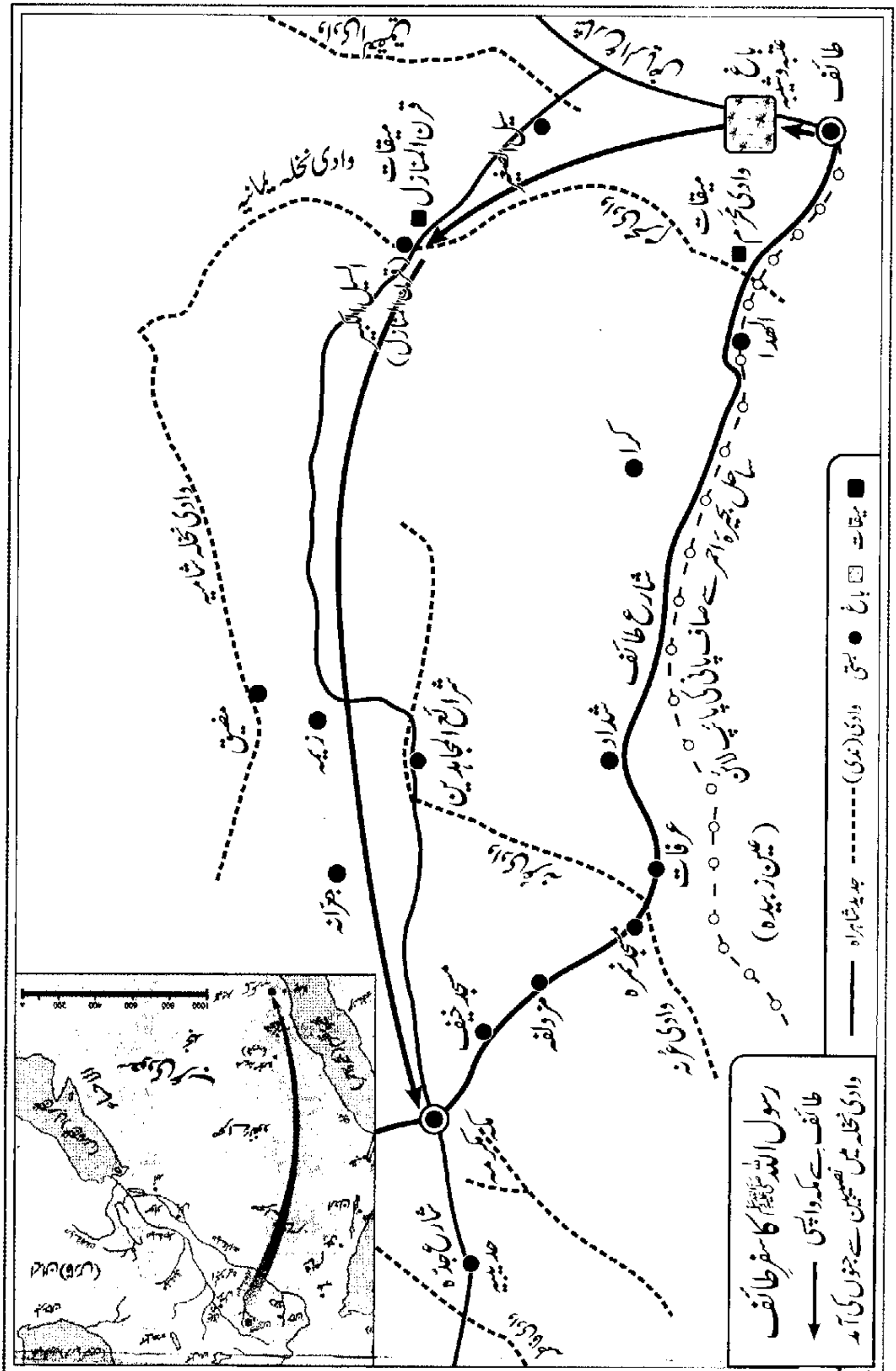
سفر طائف

نبی ﷺ دعوت کے میدان میں سابقہ انبیاء و مرسلین کی اقتدا کیا کرتے تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام بحیثیت داعی اپنی قوم میں ساڑھے نو سو سال تبلیغ کرتے رہے۔ اس طویل عرصے میں حضرت نوح علیہ السلام مسلسل اور مختلف انداز سے دعوت دین میں مصروف رہے۔ آپ نے قوم کو ہر انداز میں دعوت دی مگر قوم اپنی ضد اور تکبر پر اڑی رہی، اس کے باوجود نوح علیہ السلام نے دعوت کو روکا نہ تبلیغ رسالت میں کوئی کمزوری دکھائی اور نہ مختلف اوقات میں مختلف دعوتی اسلوب اختیار کرنے میں ان کی بصیرت متأثر ہوئی۔

علامہ آلوسی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو ایمان اور اطاعت الٰہی کی طرف بلاتوقف اور مسلسل دعوت پیش کی مگر قوم بے رخی اور غیر اللہ کی دعوت پر مصر رہی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے انھیں وقفے وقفے سے اور مسلسل، خفیہ و علانیہ ہر انداز میں دعوت پیش کی مگر قوم انکار پر اڑی رہی۔[2]

رسول اللہ ﷺ نے بھی دعوتِ دین میں مختلف اور نئے نئے انداز اختیار فرمائے۔ آپ ﷺ نے لوگوں کو پوشیدہ و علانیہ طور پر، نرمی و سختی سے، مجمع اور تنہائی میں سفر اور حضر میں اسلامی دعوت پیش کی۔ اسی طرح آپ ﷺ نے سابقہ امتوں کے واقعات بیان فرمائے، محاورات

1 محنة المسلمين في العهد المكي للدكتور سليمان السويكت، ص: 36-45. 2 تفسير الآلوسي: 10/89.



نقشہ: 8

کا استعمال بھی کیا اور توضیح وتشریح کے تمام ذرائع سے استفادہ کیا حتی کہ آپ نے زمین پر خط کھینچ کر بھی اپنی بات سمجھائی، نیز ترغیب وترہیب، خوشخبری اور ڈراوا بھی آپ کے اسالیب دعوت کا حصہ بنے، گویا آپ نے میدان دعوت میں ہر وقت اور ہر حال میں دعوت دی اور اس کے لیے ہر انداز اختیار فرمایا۔[1]

نبی ﷺ دعوت دین ہی کے سلسلے میں طائف گئے اور طائف کے ہر ہر قبیلے کے سامنے دعوت پیش کی، پھر نبی ﷺ نے ہجرت فرمائی اور دعوت الی اللہ کے مشن کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔

آپ ﷺ درحقیقت ایک نئے دعوتی مرکز کی تلاش میں تھے اور اس سلسلے میں آپ نے بنوثقیف سے مدد طلب کی لیکن انھوں نے مدد دینے کے بجائے اپنے منچلے نوجوانوں کو آپ ﷺ کے پیچھے لگادیا جنھوں نے آپ پر پتھر برسائے، واپسی پر آپ ﷺ کی عداس سے ملاقات ہوئی، پہلے یہ عیسائی تھا اب مسلمان ہوگیا۔

علامہ واقدی رحمہ اللہ نے یہ سفر بعثت کے دسویں سال شوال میں قرار دیا ہے جب ابوطالب اور سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا وفات پاچکے تھے اور طائف میں آپ ﷺ کی مدت اقامت بھی دس دن بتائی ہے۔[2]

رسول اللہ ﷺ نے طائف کو کیوں منتخب فرمایا؟: طائف کا علاقہ قریشی سرداروں کے لیے ایک دفاعی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا اور انتہائی توجہ کا حامل تھا۔ گزشتہ زمانے میں انھوں نے طائف کی سرزمین پر قبضہ کرنے کے لیے وادی ''وَجّ'' پر حملہ بھی کیا تھا تاکہ یہ درختوں اور کھیتوں سے بھرا زرخیز علاقہ ان کے زیرنگیں آجائے۔ بنوثقیف نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے آئندہ کے لیے قریش سے حلیفانہ معاہدہ کرلیا اور ان کے ساتھ بنو دَوس کو بھی شامل کرلیا۔[3]

1 مقومات الداعية الناجح للدكتور علي بادحدح، ص: 123. 2 الطبقات الكبرٰى لابن سعد: 221/1. 3 فتح الباري، شرح الحديث: 2294.

علاوہ ازیں بہت سے اصحاب ثروت نے طائف میں جائیدادیں خرید رکھی تھیں اور گرمیوں کا موسم وہیں گزارتے تھے۔ قبیلہ بنو ہاشم، بنو عبد شمس اور بنو مخزوم طائف سے مستقل رابطہ رکھتے تھے، مزید برآں بنو مخزوم کے بنو ثقیف کے ساتھ کچھ مالی مفادات بھی وابستہ تھے۔[1]

نبی ﷺ کا طائف کی طرف متوجہ ہونا ایک سوچا سمجھا پروگرام تھا۔ اگر آپ وہاں دعوتی مرکز قائم کرنے میں اور ایک مددگار جماعت تیار کرنے میں کامیاب ہوجاتے تو قریش چونک اٹھتے اور انھیں اپنی سلامتی اور اقتصادی مفادات براہ راست خطرے میں نظر آتے حتی کہ وہ محصور ہوجاتے اور بیرونی دنیا سے بھی کٹ جاتے۔

نبی ﷺ کے اس دعوتی، سیاسی اور دفاعی اقدام سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ظاہری اسباب بروئے کر لاکر اسلامی مملکت یا ایک جدید طاقتور جماعت کے قیام کے خواہاں تھے جو میدانِ کارزار میں دشمن کو پچھاڑ سکے کیونکہ اب ایک مملکت یا طاقتور جماعت کا قیام لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دینے کے سلسلے میں انتہائی ضروری تھا۔ جب نبی ﷺ طائف پہنچے تو آپ سیدھے ان کے مرکز اقتدار میں تشریف لے گئے جہاں سے سیاسی فیصلے صادر ہوتے تھے۔[2]

طائف کا مرکز اقتدار کہاں تھا؟: بنو مالک اور اَحلاف پرانے زمانے سے طائف کے رہائشی تھے۔ اسی وجہ سے انھی کا طائف پر غلبہ تسلیم کیا جاتا تھا۔ مذہبی اور سیاسی قیادت بھی انھی قبائل کو حاصل تھی۔ عبادت خانے کی دیکھ بھال کا مسئلہ ہو یا عمومی سیاست کا، خارجی تعلقات ہوں یا اقتصادی ترقی کا معاملہ درپیش ہو، ان دونوں قبائل ہی کا حکم مانا جاتا تھا لیکن سرزمین طائف، جو عرب کا سب سے زیادہ زرخیز اور خوبصورت علاقہ تھا، وہ اس علاقے کے دفاع کرنے کی سکت نہیں رکھتے تھے۔ اہل طائف ہَوازن، قریش اور بنو عامر سے خوفزدہ رہتے تھے کیونکہ مذکورہ قبائل طائف کو برباد کرنے یا اس پر قبضہ کرنے پر قادر تھے، اسی لیے سردارانِ طائف نے مصالحت کی پالیسی اختیار کی اور اپنی سیاسی پوزیشن کے

1 أصول الفكر السياسي للتجاني عبد القادر، ص: 173. 2 أصول الفكر السياسي للتجاني عبد القادر، ص: 174.

تحفظ کی غرض سے معاہدے کیے اور مفادات کی جنگ لڑی۔ یہ بعینہ وہی طریقہ تھا جسے قریش اپنائے ہوئے تھے، چنانچہ بنو مالک نے ہوازن سے اور اَحلاف نے قریش سے تعلقات قائم کیے تاکہ ان کے شر سے محفوظ رہ سکیں۔[1]

ایسی صورت حال میں جب رسول ﷺ نے طائف کا رخ کیا تو آپ ان دو طرفہ معاہدات اور تعلقات سے ہرگز غافل نہ تھے، بلکہ جانتے تھے کہ طائف والوں کی کوئی ایک مرکزی طاقت نہیں، وہ ایک اندرونی معاہدے کے تحت اپنی طاقت دو حصوں میں تقسیم کیے ہوئے ہیں۔ ان میں سے جسے کسی بیرونی قبیلے کی حمایت حاصل ہوتی وہی زیادہ طاقتور ہوتا۔ عمومی لحاظ سے نبی ﷺ دونوں میں سے کسی ایک کو اپنی طرف مائل کر لیتے تو آپ کی سیاسی قوت مضبوط ہو سکتی تھی۔

اگر آپ بالخصوص احلاف کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے تو آپ کا دعوتی پروگرام انتہائی کامیاب رہتا کیونکہ احلاف فوجی لحاظ سے قریش کے حلیف تھے اور یہ معاہدہ کسی مذہبی ہم آہنگی یا دینی دوستی پر مبنی نہ تھا، یہ تو صرف قریش کے ڈر کی وجہ سے معرضِ وجود میں آیا تھا، لہٰذا انھیں اپنی طرف مائل کرنا ناممکن نہ تھا۔ اس غرض سے نبی ﷺ جب سرزمین طائف میں پہنچے تو سیدھے بنو عُمرو بن عمیر کے ہاں گئے جو احلاف کے سردار اور قریش کے حلیف تھے اور بنو مالک کا رخ نہیں کیا جو بنو ہوازن کے تعلق دار تھے۔[2]

ابن ہشام رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”جب نبی ﷺ طائف پہنچے تو بنو ثقیف کے لیڈروں اور سرداروں کے گروہ سے ملے اور وہ تین بھائی تھے۔ عبد یالیل بن عمرو بن عمیر، مسعود بن عمرو بن عمیر اور حبیب بن عمرو بن عمیر۔ اور ان میں سے ایک نے قریش کے قبیلہ بنو جمح کی ایک عورت سے نکاح بھی کر رکھا تھا۔[3]

[1] أصول الفكر السياسي للتجاني عبد القادر، ص: 174. [2] أصول الفكر السياسي للتجاني عبد القادر، ص: 175. [3] السيرة النبوية لابن هشام: 78/2.

بنو عمرو ڈرے ہوئے تھے اور عدم تحفظ کا شکار تھے، اس لیے انھوں نے نبی ﷺ کی دعوت کو ٹھکرا دیا اور آپ کے ساتھ بے وقوفی اور بدتہذیبی کا معاملہ کیا۔ آپ ﷺ بنو ثقیف کے سرکردہ لوگوں سے ناامید ہو کر چل دیے اور یہ کہا: ''جو تمھیں سلوک کرنا تھا تم نے کیا لیکن اسے چھپا کر رکھنا۔'' [1]

آپ ﷺ نہیں چاہتے تھے کہ قریش کو خبر ہو اور وہ آپ کے خلاف مزید کمر بستہ ہو جائیں۔ آپ کی یہ خواہش تھی کہ یہ تعلقات خفیہ خفیہ قائم ہوں اور قریش کو آپ کے اس اقدام کی کانوں کان خبر نہ ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے سفر طائف میں بچاؤ کے لیے مندرجہ ذیل احتیاطی تدابیر اختیار فرمائیں:

آپ ﷺ مکہ سے پیدل عازمِ سفر ہوئے تاکہ قریش یہ نہ سوچ سکیں کہ آپ مکہ سے باہر جا رہے ہیں کیونکہ اگر آپ سوار ہو کر نکلتے تو شکوک وشبہات پیدا ہو سکتے تھے اور آپ کا ارادۂ سفر ان پر عیاں ہو جاتا۔ اس طرح وہ بغیر کسی رکاوٹ کے آپ کو اس سفر سے روک دیتے اور کسی کو اس پر اعتراض بھی نہ ہوتا۔

نبی ﷺ نے اپنے سفر میں حضرت زید رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے جانا پسند کیا کیونکہ اس میں سلامتی کے پہلو موجود تھے۔ ایک تو یہ کہ زید رضی اللہ عنہ آپ کے منہ بولے بیٹے تھے۔ کوئی دونوں کو اکٹھا دیکھ کر ان کے آپس میں تعلقات کے باعث کسی قسم کا اندیشہ نہیں کر سکتا تھا، دوسرا یہ کہ نبی ﷺ نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو بڑے قریب سے دیکھا تھا۔ ان میں اخلاص، امانت اور سچائی جیسے اوصاف نمایاں تھے۔ اس لحاظ سے آپ ﷺ حضرت زید رضی اللہ عنہ کی طرف سے مطمئن تھے کہ وہ کوئی راز افشا نہیں کرے گا اور آپ کا سچا رفیق ثابت ہوگا اور اس کا ثبوت اس وقت مل گیا جب نبی ﷺ کو پتھروں سے بچاتے ہوئے خود زید رضی اللہ عنہ کا سر زخمی ہو گیا۔

جب طائف کے سرداروں نے آپ کی دعوت کو انتہائی برے طریقے سے رد کر دیا جس

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 78/2.

میں استہزا اور حقارت شامل تھی تو آپ ﷺ نے اس طرزِ عمل کو برداشت کیا اور غضبناک نہیں ہوئے اور نہ ان پر حملہ آور ہوئے بلکہ ان سے اس معاملے کو چھپانے کا کہا۔ یہ انتہائی احتیاط کا پہلو تھا کیونکہ اگر قریش کو اس ملاقات کا علم ہو جاتا تو وہ آپ سے صرف استہزا پر اکتفا نہ کرتے بلکہ مزید ظلم و ستم کرنے لگتے اور آپ کی مکہ میں داخلی اور خارجی تمام سرگرمیوں پر پابندی لگا دیتے۔[1]

دعا اور گریہ وزاری

بنو عمرو بڑے لئیم ثابت ہوئے۔ انھوں نے نہ صرف رسول اللہ ﷺ کی خبر افشا کی بلکہ غلاموں اور منچلے جوانوں کو آپ ﷺ کی مخالفت پر ابھارا جو آپ کو گالی دیتے اور آپ پر پتھر برساتے یہاں تک کہ آپ کی دونوں ایڑیاں زخمی ہوگئیں اور دونوں جوتے خون سے بھر گئے اور سرزمین طائف پر آپ ﷺ کا پاکیزہ لہو نچھاور ہوا۔ نبی ﷺ اور حضرت زید رضی اللہ عنہ نے اسی اثنا میں عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ کے باغ میں پناہ لی اور ایک انگور کی بیل کے سایے میں تشریف فرما ہوئے۔ پیچھے آنے والے ثقیف کے منچلے واپس چلے گئے۔ آپ ﷺ اور زید رضی اللہ عنہ پہنچنے والے غم کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے کچھ دیر وہاں آرام کرتے رہے۔ اس دوران ربیعہ کے دونوں بیٹے اہل طائف سے نبی ﷺ کو پہنچنے والی تکالیف کا مشاہدہ کرتے رہے لیکن انھوں نے کسی قسم کی دخل اندازی نہ کی۔

اس انتہائی دکھ و غم اور نفسیاتی و جسمانی مصائب کی کیفیت میں رسول اللہ ﷺ نے اپنے اللہ کے سامنے جو دعا فرمائی وہ آپ ﷺ کے ایمان و یقین، اللہ کے راستے میں پہنچنے والی تکالیف پر صبر اور مزید رضائے الٰہی کے حصول پر دلالت کرتی ہے۔ دعا یہ ہے:

«اَللّٰهُمَّ! إِلَيْكَ أَشْكُو ضُعْفَ قُوَّتِي، وَ قِلَّةَ حِيلَتِي وَ هَوَانِي عَلَى النَّاسِ، يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِينَ! أَنْتَ رَبُّ الْمُسْتَضْعَفِينَ، وَ أَنْتَ رَبِّي،

1 السيرة النبوية للدكتور إبراهيم علي محمد أحمد، ص: 110,109.

إِلٰى مَنْ تَكِلُنِي؟ إِلٰى بَعِيدٍ يَّتَجَهَّمُنِي؟ أَمْ إِلٰى عَدُوٍّ مَّلَّكْتَهُ أَمْرِي؟ إِنْ لَّمْ يَكُنْ بِكَ عَلَيَّ غَضَبٌ فَلَا أُبَالِي، وَ لٰكِنْ عَافِيَتُكَ أَوْسَعُ لِي. أَعُوذُ بِنُورِ وَجْهِكَ الَّذِي أَشْرَقَتْ لَهُ الظُّلُمَاتُ، وَ صَلُحَ عَلَيْهِ أَمْرُ الدُّنْيَا وَ الْآخِرَةِ، مِنْ أَنْ تَنْزِلَ بِي غَضَبُكَ، أَوْ يَحِلَّ عَلَيَّ سَخَطُكَ، لَكَ الْعُتْبٰى، حَتّٰى تَرْضٰى، وَلَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِكَ»

''الٰہی! میں تجھی سے اپنی کمزوری و بے بسی اور لوگوں کے نزدیک اپنی بے قدری کا شکوہ کرتا ہوں۔ اے ارحم الراحمین! تو کمزوروں کا رب ہے اور تو میرا بھی رب ہے۔تو مجھے کس کے حوالے کررہا ہے؟ کیا کسی بیگانے کے حوالے جو میرے ساتھ تندی سے پیش آئے! یا کسی دشمن کے حوالے جسے تو نے میرے معاملے کا مالک بنا دیا ہے؟ اگر مجھ پر تیرا غضب نہیں تو مجھے کوئی پروا نہیں لیکن تیری عافیت میرے لیے زیادہ کشادگی کا باعث ہے۔ میں تیرے چہرے کے اس نور کی پناہ چاہتا ہوں جس سے تاریکیاں روشن ہوگئیں اور دنیا و آخرت کے معاملات درست ہوئے، کہ مجھ پر تیرا غضب اترے یا تیرا عتاب مجھ پر نازل ہو۔ مجھے تیری ہی رضا مطلوب ہے یہاں تک کہ تو راضی ہوجائے اور تیرے بغیر کوئی زور اور طاقت نہیں۔''[1]

اس دعا سے رسول اللہ ﷺ کے عقیدۂ توحید کی گہرائی اور تقرب الٰہی کا پتا چلتا ہے۔ آپ ﷺ مسلسل پہنچنے والے دکھوں کے باوجود اپنی جان سے تکالیف کی دوری چاہتے تھے نہ اپنے لیے سکون اور نعمتوں کے متلاشی تھے بلکہ آپ اللہ تعالیٰ کے راستے میں پیش آنے والی ہر تکلیف پر خوش ہوتے۔ آپ ﷺ سوچتے تھے کہ کہیں دعوت کے ابلاغ میں لاشعوری طور پر کوئی غلطی نہ ہوجائے جس سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوجائے۔ حقیقت یہ ہے کہ نبی ﷺ کا مقصود و مطلوب اللہ کریم کی رضامندی تھا جس کے سامنے دنیا کے تمام

1 السيرة النبوية لابن هشام: 62,61/2، وتفسير القرطبي: 195/16، والمعجم الكبير للطبراني: 346/25، و مجمع الزوائد: 35/6، روایت ضعیف ہے۔

مقاصد ہیچ نظر آتے ہیں۔ یوں اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی مومن پر مصائب آنے سے اس کی رضامندی حاصل ہو اور اس کی ناراضی دور ہوتی ہو تو ایسی مصیبت کا آنا برکت کا باعث اور نعمت و آسودگی کا حامل ہوگا۔

نبی ﷺ نے اپنی دعا کا اختتام ایک ایسے کلمے سے کیا جسے آپ خود بھی پڑھتے اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی مشکل وقت میں پڑھنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ مومن کی سختیوں اور مشکلات کا مقابلہ اور حالتِ خوف میں امن کا حصول صرف اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہی سے ممکن ہے۔ مصائب کی شدت کا مقابلہ اور مصیبتوں کو برداشت کرنے کی ہمت بھی اللہ عزوجل کے لطف و کرم ہی سے ممکن ہے۔[1]

بے شک دعا ایک بلند ترین عبادت ہے اور اسے انسانی تحفظ اور امن کے حصول کے لیے موثر ترین ہتھیار سمجھا جاتا ہے۔ انسانی عقل فہم و فراست کی کتنی ہی منزلیں طے کرلے، پھر بھی انسان لغزش و ناکامی سے دو چار ہوسکتا ہے اور بعض اوقات وہ ایسے مسائل میں گھر جاتا ہے کہ اس کی تمام تر سوچ اور تدبیر اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ تب بذریعہ دعا بارگاہ الٰہی میں گڑگڑانے کے سوا کوئی اور راستہ نظر نہیں آتا تاکہ انسان کشادگی اور آسانی پاسکے۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کو اہل طائف کی طرف سے اذیت، تمسخر اور حقارت کا سامنا کرنا پڑا تو آپ طائف میں حیران و پریشان تھے تب آپ ﷺ نے بواسطہ دعا اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہی۔ ابھی دعا ختم نہ ہوئی تھی کہ حضرت جبریل علیہ السلام اور پہاڑوں کا فرشتہ قبولیت کا ثبوت بن کر سامنے آگئے۔[2]

عفو و درگزر

بہت ہی مشکل مراحل میں رسول اللہ ﷺ کی رحمدلی اور بے پایاں مہربانی کا ظہور

1 التاريخ الإسلامي للحميدي: 20/3. 2 السيرة النبوية للدكتور إبراهيم علي محمد أحمد، ص: 113,112.

ہوا۔ آپ ﷺ نے اپنی زندگی میں سخت ترین مشکلات کا سامنا کیا جس میں آپ اپنے دل اور سینے کے قویٰ کو مجتمع کرتے تاکہ ان مشکلات کو برداشت کرسکیں اور ان کا مقابلہ کرنے کی عادت پڑ جائے۔ ان مواقع پر آپ کا بڑا پن اور عظیم رحم دلی ہمیشہ غالب نظر آتی۔[1]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ آپ پر جنگ اُحد سے زیادہ بھی کوئی مشکل دن گزرا؟ آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا: «لَقَدْ لَقِيتُ مِنْ قَوْمِكِ مَا لَقِيتُ، وَكَانَ أَشَدَّ مَا لَقِيتُ مِنْهُمْ يَوْمَ الْعَقَبَةِ، إِذْ عَرَضْتُ نَفْسِي عَلَى ابْنِ عَبْدِ يَالِيلَ بْنِ عَبْدِ كُلَالٍ فَلَمْ يُجِبْنِي إِلٰى مَا أَرَدْتُّ، فَانْطَلَقْتُ وَأَنَا مَهْمُومٌ عَلٰى وَجْهِي، فَلَمْ أَسْتَفِقْ إِلَّا وَأَنَا بِقَرْنِ الثَّعَالِبِ، فَرَفَعْتُ رَأْسِي، فَإِذَا أَنَا بِسَحَابَةٍ قَدْ أَظَلَّتْنِي، فَنَظَرْتُ فَإِذَا فِيهَا جِبْرِيلُ فَنَادَانِي، فَقَالَ: إِنَّ اللّٰهَ قَدْ سَمِعَ قَوْلَ قَوْمِكَ لَكَ وَمَا رَدُّوا عَلَيْكَ وَقَدْ بَعَثَ اللّٰهُ إِلَيْكَ مَلَكَ الْجِبَالِ لِتَأْمُرَهُ بِمَا شِئْتَ فِيهِمْ، فَنَادَانِي مَلَكُ الْجِبَالِ فَسَلَّمَ عَلَيَّ ثُمَّ قَالَ: يَا مُحَمَّدُ! فَقَالَ: ذٰلِكَ فِيمَا شِئْتَ، إِنْ شِئْتَ أَنْ أُطْبِقَ عَلَيْهِمُ الْأَخْشَبَيْنِ» ’’مجھے تیری قوم سے بہت سی تکالیف پہنچی ہیں لیکن زیادہ تکلیف اس وقت پہنچی جب مجھے (طائف کی) گھاٹی والے دن[2] ان کی طرف سے پریشانی آئی، جب میں نے اپنی دعوت ابن عبد یالیل بن عبد کُلال کے سامنے پیش کی۔ وہاں مجھے حسبِ خواہش قبولیت نہ ملی تو میں غمزدہ سر جھکائے وہاں سے چل دیا۔ اسی حالت میں قرن ثعالب پہنچا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ میرے اوپر بادل نے سایہ کیا ہوا ہے اور اس میں جبریل علیہ السلام ہیں۔ وہاں سے جبریل علیہ السلام نے مجھے آواز دی کہ اللہ تعالیٰ نے طائف والوں کی گفتگو سن لی ہے اور جو انھوں

---

1 مقومات الداعية الناجح للدكتور علي بادحدح، ص: 76. 2 يوم العقبة: اس کے متعلق مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رقم طراز ہیں: ...... ’’چنانچہ عقبہ‘‘ سے یہاں منیٰ کی گھاٹی مراد نہیں ہے۔ یہاں مراد طائف کی گھاٹی ہے۔ اور یہ طائف سے مکہ کے قدیم راستے پر طائف سے نکلتے ہی واقع تھی۔ (منة المنعم: 218,217/3)

نے آپ کے ساتھ سلوک کیا دیکھ لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کے نگران فرشتے کو آپ کی مدد کے لیے بھیجا ہے تاکہ آپ جو چاہیں اسے حکم دیں۔ پہاڑوں کے فرشتے نے مجھے پکارا، پھر سلام کیا اور کہا: ''اے محمد (ﷺ)! اگر آپ چاہیں تو میں ان دو پہاڑوں کو آپس میں ملا کر انھیں ہلاک کر دوں؟'' نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«بَلْ أَرْجُو أَنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ مِنْ أَصْلَابِهِمْ مَّنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ وَحْدَهُ لَا يُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا»

''بلکہ مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی نسلوں میں ایسے لوگ پیدا فرمائے گا جو صرف اللہ کی عبادت کریں گے اور کسی کو اس کا شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔''[1]

اگرچہ اُحد کے دن بھی آپ پر مشکلات آئیں لیکن وہ جسمانی تھیں اور یہ سخت ترین ذہنی مشقتیں تھیں کیونکہ یہاں ظلم کی انتہا ہوئی اور آپ کو اتنا ذہنی دھچکا لگا کہ اسی حالت میں آپ ﷺ قرن ثعالب پہنچ گئے۔[2]

دعوتی منصوبہ بندی میں تبدیلیاں

پہاڑوں کے فرشتے کا مشورہ کہ ان لوگوں پر دونوں پہاڑ ملا دیے جائیں، دراصل جڑ سے اکھیڑ دینے والے اس عذاب کی طرف اشارہ تھا جو قوم نوح، عاد، ثمود اور قوم لوط پر اترا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَّمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝﴾

''پھر ہم نے ہر ایک کو اس کے گناہ پر پکڑا، چنانچہ ان میں سے کوئی تو وہ تھے جن پر

1 صحيح البخاري، حديث: 3231، و صحيح مسلم، حديث: 1795. 2 التاريخ الإسلامي للحميدي: 3/27,26.

ہم نے پتھروں بھری آندھی بھیجی اور ان میں سے کوئی وہ تھے جنھیں چنگھاڑ نے آن پکڑا اور ان میں سے کوئی وہ تھے جنھیں ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور ان میں سے کوئی وہ تھے جنھیں ہم نے غرق کردیا اور اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہیں تھا بلکہ وہ خود ہی اپنے آپ پر ظلم کرتے تھے۔''[1]

یہاں ایک اور مشورہ بھی حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کی طرف سے سامنے آیا کہ آپ مکہ اور طائف کو پیچھے چھوڑتے ہوئے محوِ ہجرت رہیں کیونکہ مکہ والوں نے آپ کو نکال دیا اور طائف والوں نے رسوا کرنے کی کوشش کی۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا طائف میں کوئی مددگار نہ پایا تو آپ حضرت زید رضی اللہ عنہ کے ساتھ غمزدہ حالت میں مکہ کی طرف واپس چلے اور اپنے اللہ سے مذکورہ مشہور دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کے نگران فرشتے کو بھیجا تاکہ آپ کے حکم سے وہ دونوں پہاڑ جن کے درمیان طائف واقع ہے، آپس میں ملادے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں، بلکہ میں انھیں مہلت دینا چاہتا ہوں، ہوسکتا ہے ان کی نسلوں سے ایسے لوگ پیدا ہوں جو صرف ایک اللہ کی عبادت گزار ہوں اور کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہرائیں۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم وادی نخلہ میں کچھ دن ٹھہرے رہے۔ دریں اثنا حضرت زید رضی اللہ عنہ عرض کرنے لگے کہ آپ ایسے شہر میں کیسے داخل ہوں گے جہاں سے آپ کو نکالا گیا، پھر آپ مدد حاصل کرنے کے لیے طائف گئے لیکن وہاں سے کوئی تائید یا مدد نہ ملی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّ اللّٰهَ جَاعِلٌ لِّمَا تَرٰی فَرَجًا وَّ مَخْرَجًا وَّ إِنَّ اللّٰهَ نَاصِرٌ دِينَهٗ وَمُظْهِرٌ نَّبِيَّهٗ»

''اے زید! اللہ تعالیٰ ضرور کشادگی کا راستہ نکالے گا، یقیناً اللہ کو اپنے دین کی مدد کرنی ہے اور اپنے نبی کو ضرور غالب کرنا ہے۔''[2]

---

[1] العنکبوت29:40. [2] زاد المعاد:46/2.

اب نہ تو نبی ﷺ نے کفار کی تباہی کا راستہ منتخب کیا اور نہ اسلامی دعوت سے علیحدگی یا کسی اور طرف ہجرت کا مشورہ قبول کیا بلکہ واپس مکہ میں داخلے کا فیصلہ کیا کہ بابرکت جہاد کا سلسلہ وہیں سے قائم رکھا جائے اور دعوت توحید کی وجہ سے حاصل ہونے والے فوائد کو سمیٹا جائے، لہٰذا آپ ﷺ نے سابقہ طریق کار اختیار نہ کیا بلکہ پالیسی میں ترمیم کی۔ آپ کا نیا طریق کار اس سوچ پر مبنی تھا کہ مکہ میں داخل ہوا جائے پیچھے نہ ہٹا جائے اور اسی زمین پر دعوتی تحریک جاری رکھی جائے جہاں کافر رہتے ہیں۔ ان کے انتظامات اور ان کے علاقوں سے فائدہ حاصل کیا جائے اور ان کافروں کے مقاصد کو ناکام بنایا جائے تاکہ اہل ایمان کا ایسا معاشرہ پروان چڑھ سکے جو ان کے اندر سے جنم لے۔

اب نبی ﷺ کا منصوبہ یہ تھا کہ کفار کی نسل ہی سے مسلمانوں کی جماعت تیار کی جائے جو اللہ کے راستے میں جہاد کریں۔ آپ ﷺ کی یہ سوچ مستقبل کو سامنے رکھتے ہوئے واضح طور پر درست تھی اور اس سے پیچھے ہٹنا مناسب نہیں تھا۔[1]

اگر تجزیہ کیا جائے تو صورت حال کچھ یوں نظر آتی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ظاہری حالات کے مخالف ہونے کے باوجود مکہ واپسی کا ارادہ فرمایا۔ یہ کام نہ تو آسان تھا اور نہ سلامتی کا ضامن بلکہ قریش کی طرف سے احتمال تھا کہ وہ آپ سے غداری کرتے یا آپ کو (معاذ اللہ) قتل کر ڈالتے کیونکہ وہ آپ کے متعلق مزید صبر نہیں کر سکتے تھے۔ آپ ﷺ کا طائف جانا قریش کے خلاف خروج کی ایک صورت تھی۔ آپ دوسرے قبائل سے مدد کے لیے نکلے تھے۔ اس سے قریش اور ان کے حلیفوں کے درمیان پھوٹ پڑ سکتی تھی۔ اب اگر قریش سے آپ کو کوئی خطرہ نہ بھی ہوتا اور آپ مکہ میں حسب معمول داخل ہو بھی جاتے تو قریش اسے مسلمانوں کی شکست جان کر ان کے خلاف پہلے سے زیادہ دلیر ہو جاتے اور کوئی اور احمقانہ حرکت کرتے۔ اس لیے اب نبی ﷺ نے اہل مکہ پر باہر سے دباؤ ڈالنے کے بجائے اندرون مکہ ہی میں قریشی قبائل کے اندر دعوت پھیلانے کی کوشش کی تاکہ یہیں

[1] أصول الفكر السياسي للتجاني عبد القادر، ص: 176.

سے ہم خیال لوگ پیدا ہوں اور مکہ ہی سے ایک ایمان دار جماعت کا وجود ظاہر ہو۔[1]

ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''پھر جب نبی ﷺ طائف سے اس حال میں واپس آئے کہ وہاں کسی نے آپ کی تصدیق کی نہ مدد۔ اور آپ واپس حرا پہنچے تو اُخنَس بن شریق کی پناہ حاصل کرنے کے لیے پیغام بھیجا۔ اس نے جواب دیا کہ ہم حلیف ہیں اور حلیف کسی (حریف) کو پناہ نہیں دے سکتا، پھر سہیل بن عمرو کی طرف پیغام بھیجا تو جواب ملا کہ بنو عامر بنوکعب کے خلاف کسی کو پناہ نہیں دے سکتے۔ بعدازاں مطعم بن عدی، جو قبیلہ بنونوفل بن عبدمناف کے سردار تھے، کی طرف پناہ حاصل کرنے کے لیے بنوخزاعہ کا ایک آدمی بھیجا تو مطعم بن عدی نے آپ کو پناہ دی اور اپنے بیٹوں اور قوم کو ہتھیار پہننے اور بیت اللہ کے اطراف میں کھڑا ہونے کا حکم دیا اور انھیں بتایا کہ میں نے محمد (ﷺ) کو پناہ دی ہے۔ تب نبی ﷺ اور زید رضی اللہ عنہ مکہ میں داخل ہوئے اور مسجد حرام میں پہنچے تو مطعم بن عدی اپنی سواری پر سوار تھے اور کہہ رہے تھے: ''اے قریش کے لوگو! میں نے محمد (ﷺ) کو پناہ دی ہے، لہٰذا کوئی ان کے خلاف حرکت نہ کرے۔'' نبی ﷺ نے حجر اسود کو بوسہ دیا اور دو رکعت ادا کرنے کے بعد گھر پہنچے۔ مطعم اور اس کے بیٹے تلواروں سے لیس ہو کر نبی ﷺ کو گھر پہنچا کر لوٹے۔''[2]

علامہ زرقانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اخنس اور سہیل کے عذر قابل اعتراض ہیں کیونکہ اگر وہ پناہ دینے کے اہل نہ ہوتے تو رسول اللہ ﷺ ان سے پناہ ہی نہ مانگتے اور آپ اچھی طرح اپنی قوم کے احوال و عادات جانتے تھے۔ عامر اور کعب دونوں بھائی تھے، ان کا باپ لؤی تھا اور عامر سہیل کا جد امجد تھا، لہٰذا بنو عامر اور بنوکعب دونوں ایک دوسرے کو پناہ دے سکتے تھے۔''[3]

رسول اللہ ﷺ کے اس طریقۂ کار کی وجہ سے مکہ کی فضا مکمل طور پر تبدیل ہو چکی تھی۔ کجا یہ کہ آپ مکہ میں شکست خوردہ اور چھپ کر داخل ہوتے، آپ ایک سردار کی پناہ میں

---

1 أصول الفكر السياسي للتجاني عبدالقادر، ص: 176-178. 2 زاد المعاد: 47/2. 3 محمد رسول اللهﷺ لصادق عرجون: 324/2.

تلوار کی حفاظت میں گھر پہنچے اور سب دیکھ اور سن رہے تھے اور آپ نے پناہ حاصل کرنے کے لیے بنوخزاعہ کا آدمی منتخب کیا جسے بطور پیغام رساں مطعم کے پاس بھیجا۔ یوں مطعم اور اس آدمی کا انتخاب درحقیقت نبی ﷺ کی انتہائی اعلیٰ سیاسی بصیرت، تاریخی شعور اور شاندار سیاسی حکمت عملی پر مبنی تھا۔ اس حکمت و بصیرت سے آگاہی کے لیے اس تفصیل کو جاننا ضروری ہے۔ دراصل مطعم بن عدی ان دنوں بنونوفل کے سردار تھے اور بنونوفل کا جد اکبر نوفل تھا اور نوفل عبدالمطلب کا مخالف تھا۔ ایک دفعہ نوفل نے (اپنے بھتیجے) نبی ﷺ کے دادا عبدالمطلب کے محلے پر حملہ کیا اور ان کے گھروں اور زمینوں پر قبضہ کرلیا۔ عبدالمطلب نے پریشانی میں اپنی قوم سے مدد طلب کی مگر کوئی سردار مدد کے لیے نہ آیا۔ تب انھوں نے اپنے ماموں بنونجار کے قبیلہ خزرج کو قصیدہ لکھ بھیجا جس کے نتیجے میں خزرج کی ایک بڑی جماعت کعبے کے صحن میں آن اتری اور وہ گلے میں ڈھالیں آویزاں کیے اپنی کمانوں پر ٹیک لگا کر کھڑے ہوگئے۔ جب نوفل نے دیکھا تو بولا کہ یہ تو کسی لڑائی کے لیے آئے ہیں۔ جب اس نے ان سے گفتگو کی تو ڈر گیا اور عبدالمطلب کے مکانات اور زمینیں واپس کردیں۔ اس صورت حال کو دیکھ کر طاقتور اور عزت دار بنوخزاعہ والوں نے کہا: ''اللہ کی قسم! ہم نے اس وادی میں عبدالمطلب سے خوبصورت، صحت منداور بردبار شخص نہیں دیکھا، ان کے ننھیال خزرج نے ان کی مدد کی ہے۔ اور جس طرح خزرج ان کے ننھیال ہیں، اسی طرح ہم بھی ان کے ننھیال ہیں کیونکہ ان کے دادا عبد مناف ہمارے سردار حلیل بن حبشیہ کی بیٹی حُبّی کے بیٹے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ہم آپس میں حلیف بن جائیں، ایک دوسرے کی مدد کریں اور فائدہ حاصل کریں۔'' چنانچہ بنوخزاعہ کے سردار عبدالمطلب کے پاس آئے اور کہا: ''اے ابوالحارث! جس طرح بنونجار سے آپ کا تعلق ہے کہ وہ آپ کے ننھیال ہیں اسی طرح ہم بھی آپ کے ننھیال سے تعلق رکھتے ہیں اور پھر ہم ایک دوسرے کے پڑوسی بھی ہیں۔ پرانے دن گزر گئے اور دلوں سے کینے نکل گئے۔ آئیے! آپس میں

ایک دوسرے کے حلیف بن جائیں۔'' عبدالمطلب کو یہ بات پسند آئی اور انھوں نے اس مشورے کو فوراً قبول کرلیا۔ بنونوفل اور عبدشمس نے اس معاہدے میں شرکت نہ کی۔[1]

مندرجہ بالا تاریخی مطالعے سے خزاعہ اور قریش کے درمیان جاری رہنے والی جنگ کے اسباب کا پتا چلتا ہے کہ ایک زمانے میں جب بیت اللہ کا انتظام اور عرب کی سرداری خزاعہ کے پاس تھی، قصی بن کلاب نے مختلف مقامات سے قریش کو اکٹھا کیا اور خزاعہ کو وہاں سے نکال دیا اور مکہ کو چار عہدوں میں قریش پر تقسیم کردیا۔ اس دن سے خزاعہ قریش سے دشمنی اور نفرت رکھتے تھے۔ اب جبکہ قریش اور عبدالمطلب کے درمیان اختلاف پیدا ہوا تو خزاعہ نے عبدالمطلب سے حلیفانہ معاہدہ کرلیا اور اس کا مقصد قریش سے بدلہ لینا اور اپنی تعداد بڑھانا تھا اور ان کی یہ بات قطعاً درست نہیں تھی کہ قریش کے بارے میں ان کے دل صاف ہوچکے ہیں، بلکہ کینے موجود تھے اور جنگ جاری تھی کیونکہ بنونَوفل اور بنوعبدشمس اس معاہدے کو اپنے مفادات کے خلاف سمجھتے ہوئے، اس میں شریک نہ ہوئے۔

اب جبکہ نبی ﷺ نے بنوخزاعہ کا آدمی بنی نوفل کے سردار کے پاس بھیجنے کے لیے منتخب کیا تو یہاں درحقیقت مذکورہ تاریخی واقعات کی طرف اشارہ کرنا اور عبدالمطلب اور بنوخزاعہ کے درمیان معاہدے کی یاددہانی کرنا مقصود تھا جو بنونوفل اور بنوعبدشمس کے خلاف طے پایا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ لوگ سمجھ لیں کہ رسول اللہ ﷺ مکہ میں کمزور بن کر بیٹھے نہیں رہیں گے، بلکہ بنوخزاعہ سے تعلقات قائم کریں گے یا خزرج سے مدد مانگیں گے جیسے آپ کے دادا عبدالمطلب نے کیا تھا۔

رسول اللہ ﷺ درحقیقت مطعم بن عدی سے اس لیے پناہ حاصل کرنا چاہتے تھے کہ اس کی طرف سے آپ ﷺ کو ڈرانے اور دھمکانے کا سلسلہ رک جائے۔ اور مطعم بن عدی آپ ﷺ کی حمایت کسی مہربانی اور نیکی کے جذبے سے نہیں کررہا تھا بلکہ وہ تو صرف اپنے

1 أنساب الأشراف للبلاذري، تحقيق محمد حميد الله: 71/1.

مفاد اور پوزیشن مستحکم کرنے کے لیے کر رہا تھا اور قریش نبی ﷺ کو بنونوفل کے پہرے میں جاتے خاموشی سے اس لیے دیکھ رہے تھے کہ وہ بنونوفل کی تلواروں سے خائف نہ تھے، بلکہ وہ بنوخزاعہ کی تلواروں اور خزرج کے تیر کمانوں سے خائف تھے۔[1]

اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ مطعم بن عدی ہی وہ شخص تھا جس نے مقاطعے کے ظالمانہ عہدنامے کو چاک کرنے میں دیگر احباب کی مدد کی تھی اور یہ وہی تھا جسے ابو طالب نے دھمکایا تھا اور اس کے بعد سے اس کا رویہ بہتر ہو گیا تھا۔ ابوطالب نے کہا تھا:

> ''اے مطعم! کوئی ایسا دن جس میں تجھے مدد کی ضرورت ہو یا کوئی بڑا سانحہ پیش آئے، میں تجھے تنہا نہیں چھوڑوں گا۔ اللہ کریم عبد شمس اور نوفل کو جلد از جلد ہماری طرف سے بری سزا دے جس میں تاخیر نہ ہو۔''[2]

رسول اللہ ﷺ نے مطعم بن عدی کے اس احسان کو یاد رکھا اور آپ کو اس انتہائی خطرناک صورتحال کا احساس تھا جب اس نے اپنے آپ، اپنی اولاد اور قبیلے کو نبی ﷺ کی خاطر داؤ پر لگا دیا تھا، لہٰذا جب بدر کے ستر قیدیوں کا مسئلہ پیش آیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا: «لَوْ كَانَ الْمُطْعِمُ بْنُ عَدِيٍّ حَيًّا ثُمَّ كَلَّمَنِي فِي هٰؤُلَاءِ النَّتْنٰى لَتَرَكْتُهُمْ لَهٗ»

> ''اگر مطعم بن عدی زندہ ہوتے اور ان بدبودار قیدیوں کے بارے میں مجھ سے سفارش کرتے تو میں اس کے باعث ان سب کو چھوڑ دیتا۔''[3]

نظریاتی اختلاف اور دشمنی کے باوجود نبی ﷺ اسلامی نظریے سے دشمنی کرنے اور لڑائی مول لینے والوں اور مسلمانوں سے تعاون اور دوستی کا برتاؤ کرنے والوں کے مابین فرق روا رکھتے تھے، خواہ وہ کفار ہی کیوں نہ ہوں کیونکہ نبی ﷺ کی شان سے بعید تھا کہ آپ کسی

---

1 أصول الفكر السياسي للتجاني عبد القادر، ص: 180. 2 التحالف السياسي في الإسلام للدكتور الغضبان، ص: 36. 3 صحيح البخاري، حديث: 4024، وسنن أبي داود، حديث: 2689.

کا احسان نہ مانیں۔[1] رسول اللہ ﷺ کے شاعر حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے مطعم کے اس احسان پر اپنے اشعار میں اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا:

"اگر آج کسی شخص کو اس کی بزرگی اور نیک نامی نجات دے سکتی تو وہ مطعم بن عدی ہوتا۔ اے مطعم! تو نے رسول اللہ ﷺ کو لوگوں سے تحفظ دلایا تو سب تیرے ایسے مطیع ہوگئے کہ تیری اجازت کے بغیر کسی نے نہ تلبیہ پکارا اور نہ احرام باندھا۔

پس اگر مطعم کے بارے میں بنومعد، بنو قحطان اور بنو جرہم کے باقی ماندہ قبائل سے پوچھا جائے تو وہ کہیں گے: اپنے پڑوسی سے عہد نبھانے والا اور ذمہ داری عائد ہونے کی صورت میں اسے پورا کرنے والا تھا۔

اور اس سے زیادہ عزت و شرف کے مالک شخص پر آج تک روشن سورج طلوع نہیں ہوا۔ وہ عزت نفس اور اچھی طبیعت کا مالک ہے اور جب رات کا اندھیرا چھا جائے تو وہ پڑوسی سے برا سلوک نہیں کرتا۔"[2]

رسول اللہ ﷺ کا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کی طرف سے مطعم بن عدی کی تعریف پر اعتراض نہ کرنا بلکہ آپ ﷺ کا خود اس کے بارے میں اچھے کلمات کہنا اور یہ خواہش ظاہر کرنا کہ اگر مطعم بن عدی زندہ ہوتے اور بدر کے قیدیوں کے بارے میں سفارش کرتے تو میں تمام قیدیوں کو ان کے کہنے پر چھوڑ دیتا، یہ سب کچھ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اسلامی شریعت اہل فضیلت کو ان کا مقام دیتی ہے اور ان کی خوبیوں کی معترف ہوتی ہے اگر چہ وہ مسلمان نہ بھی ہوں۔[3]

اسی طرح نبی ﷺ دینی مصلحت کی خاطر معاشرے کے رواج اور عادات کو بھی اختیار فرما لیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ ایک جمے جمائے معاشرے کو مسلمہ تاریخی حقیقت خیال کرتے تھے اور ایک کافر انسان کو بھی معاشرے سے الگ شمار نہیں کرتے تھے بلکہ اسے اس

---

1 التحالف السياسي في الإسلام للدكتور الغضبان، ص:44. 2 البداية والنهاية:136/3. 3 التاريخ الإسلامي للحميدي:32/3.

معاشرے کے توسیع شدہ ڈھانچے کا حصہ سمجھتے جس میں افرادِ معاشرہ باہمی تعلقات اور ضروریات میں گندھے ہوئے ہیں۔

ہر انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ اسے جب بھی کوئی موقع میسر آئے تو وہ اپنے آپ کو بدل لے اور اپنے منشور کو ایک موثر معاشرتی قوت میں ڈھالنے کی کوشش کرے۔ وہ خودمختار ہے کہ اپنی اقدار کے مطابق معاہدے کرے یا توڑ دے۔ جہاں تک مطعم بن عدی کا تعلق ہے، وہ ایک فرد نہیں بلکہ ایک ادارہ تھا جس کے ڈانڈے عرب معاشرے کی پرانی تاریخ سے ملتے تھے جس میں توحید اور شرک آپس میں نبرد آزما نظر آتے تھے، اس لیے آج بھی اگر کوئی غیر مسلم تنظیم سامنے آئے تو اس سے فائدہ حاصل کرنے اور اسے توحید و ایمان کی طرف مائل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔[1]

سفر طائف کے دوران رسول اللہ ﷺ کو بہت بڑی دعوتی کامیابیاں بھی حاصل ہوئیں جن میں نصرانی غلام عدّاس کا قبول اسلام اور ان سات جنوں کا اسلام لانا شامل ہے جو مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد اپنی قوم کو شرک سے ڈرانے اور اسلام کی دعوت دینے کے لیے روانہ ہوگئے۔[2]

عدّاس کا قصہ قبولِ اسلام

جب نبی ﷺ کو اہل طائف نے اذیت پہنچائی اور آپ کو مجبوراً عتبہ و شیبہ کے باغ میں پناہ لینی پڑی اور ان دونوں نے آپ پر ترس کھایا اور اپنے غلام عدّاس نصرانی سے کہا کہ انگور کا ایک خوشہ تھال میں رکھ کر کھانے کے لیے انھیں دو تو عداس نے ایسے ہی کیا اور نبی ﷺ کو تناول کرنے کے لیے کہا۔ جب آپ نے اس تھال سے خوشہ اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو ''بسم اللہ'' کہا، پھر کھایا۔ عدّاس نے آپ کے چہرے کو دیکھ کر کہا: ''ایسا کلام تو اس علاقے میں کوئی بھی نہیں کہتا۔'' آپ ﷺ نے پوچھا: «وَمِنْ أَهْلِ أَيِّ الْبِلَادِ

[1] أصول الفكر السياسي للتجاني عبدالقادر، ص:181. [2] الرسول المبلغ للخالدي، ص:40,39.

أَنْتَ يَا عَدَّاسُ؟ وَمَا دِينُكَ؟» ''تم کس علاقے سے تعلق رکھتے ہو اے عداس! اور تمھارا دین کیا ہے؟'' عدّاس نے کہا: ''میں نینویٰ سے ہوں اور عیسائی ہوں۔'' یہ سنتے ہی آپ ﷺ نے فرمایا: «مِنْ قَرْيَةِ الرَّجُلِ الصَّالِحِ يُونُسَ بْنِ مَتّٰى؟» ''تم بلند کردار کی حامل شخصیت یونس بن متیٰ کی بستی سے ہو؟'' اس پر عدّاس بول اٹھا: ''آپ انھیں کیسے جانتے ہیں؟'' نبی ﷺ نے فرمایا: «ذَاكَ أَخِي، كَانَ نَبِيًّا وَّ أَنَا نَبِيٌّ» ''وہ میرا بھائی ہے، وہ نبی تھا اور میں بھی نبی ہوں۔'' تب عدّاس نے جھک کر آپ ﷺ کے سر، ہاتھوں اور پاؤں کو بوسہ دیا۔ یہ دیکھ کر ربیعہ کے ایک بیٹے نے دوسرے سے کہا: ''تیرے غلام کو اس نے برباد کر دیا'' پھر عدّاس کے واپس آنے پر انھوں نے کہا: ''تو ہلاک ہو، اس کے ہاتھ پاؤں پر بوسے کیوں دے رہا تھا؟'' عدّاس نے کہا: ''اے میرے آقا! اس سے بہتر آدمی آج روئے زمین پر اور کوئی نہیں کیونکہ اس نے مجھے جو خبر دی وہ سوائے نبی کے کوئی نہیں جانتا۔'' دونوں نے کہا: ''تیری تباہی ہو، اپنے دین سے کبھی نہ پھرتا۔ تیرا دین اس کے دین سے بہتر ہے۔''[1]

کھانے سے پہلے نبی ﷺ کا بسم اللہ پڑھنا اسلام کے واضح احکامات میں سے ایک ہے اور اس کی برکت سے ایک عیسائی غلام اسلام کی طرف مائل ہوا۔ جیسے ہی نبی ﷺ نے کھانے سے قبل اللہ کا نام لیا اس عیسائی غلام کے دل کی دنیا بدل گئی اور اس کے احساسات جوش مارنے لگے۔ اس نے رسول اللہ ﷺ کو بتایا کہ اس علاقے میں اللہ کے نام کا رواج ہی نہیں اور اسی وجہ سے مجھے تعجب ہوا ہے۔

تمام ظاہر سنتوں کی طرح کھانے سے قبل بسم اللہ پڑھنا مسلمانوں اور بت پرستوں کے درمیان حد فاصل ہے اور یہی فرق کافروں کو متوجہ کرتا ہے، پھر وہ اس بارے میں سوال کرتے ہیں اور یہی فرق انھیں دین اسلام کی طرف کھینچ کر لا سکتا ہے۔[2]

1 صحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 137,136، ودلائل النبوة للبيهقي: 288/2.

2 التاريخ الإسلامي للحميدي: 22/3.

عدّاس کو نبی ﷺ کی نبوت پر پکا یقین تھا، اس کا واضح ثبوت اس وقت ملا جب عتبہ و شیبہ نے بدر کے دن آپ کے خلاف جنگ کے لیے عدّاس کو تیاری کا حکم دیا تو اس نے کہا: ''اللہ کی قسم! اس آدمی (نبی ﷺ) کے مقابلے میں پہاڑ بھی نہیں ٹھہر سکتے۔'' اس پر ان دونوں نے کہا: ''تو تباہ ہو، محسوس ہوتا ہے اس نے تجھ پر جادو کر دیا ہے۔''[1]

عدّاس نے جب یہ کہا کہ ''اللہ کی قسم! روئے زمین پر اس سے بہتر کوئی شخص نہیں'' تو یہ جملہ نبی ﷺ کے لیے انتہائی غمگساری کے جذبات کا حامل تھا۔ اگر غور کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ یہ اپنا اپنا نصیب کہ قریب والے لوگوں نے آپ کو جھٹلایا اور دوسری طرف نینویٰ (عراق) سے آنے والا آدمی نبی ﷺ کی رسالت کا اقرار کرتے ہوئے آپ ﷺ کے ہاتھ اور پاؤں کو جھک کر بوسے دے رہا ہے۔ یہ محض اللہ کی توفیق سے ہے۔[2]

جنات کا مسلمان ہونا

جب رسول اللہ ﷺ سرداران بنوثقیف سے ناامید ہوکر واپس مکہ تشریف لا رہے تھے تو آپ ﷺ نے وادیِ نخلہ میں قیام کیا اور رات کو نماز کے لیے کھڑے ہوئے، اس وقت وہاں سے نُصیبین علاقے کے جنوں کا قافلہ گزرا۔ انھوں نے آپ ﷺ کی زبان سے قرآن سنا تو وہ مسلمان ہوگئے اور اسی وقت ڈرانے کی غرض سے اپنی قوم کی طرف روانہ ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو اس قصے سے آگاہ فرمایا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ○ قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○﴾

''اور (یاد کیجیے) جب ہم نے جنوں کی ایک جماعت کو آپ کی طرف متوجہ کیا،

1 سبل الهدىٰ والرشاد للصالحي:578/2. 2 التربية القيادية للدكتور الغضبان:347/1.

جبکہ وہ قرآن سنتے تھے، پھر جب وہ اس (کی تلاوت سننے) کو حاضر ہوئے، تو (ایک دوسرے سے) کہا: خاموش رہو، چنانچہ جب (تلاوت) ختم ہوگئی تو وہ اپنی قوم کی طرف ڈرانے والے بن کر پھرے۔ انھوں نے کہا: اے ہماری قوم! بے شک ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے، وہ ان کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے کی ہیں، وہ حق کی طرف اور صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔" [1]

یہ جنّ نبی ﷺ پر وادی نخلہ میں اترے۔ قرآن سنا تو ایک دوسرے کو خاموش رہنے کی تاکید کرنے لگے اور مسلمان ہوگئے۔ یہی وہ دعوت ہے جسے مشرکینِ طائف نے رد کردیا تو اس کی قبولیت عالم جنّ کی طرف منتقل ہوگئی، پھر وہ جنات یہ دعوت لے کر اپنی قوم کی طرف اس طرح روانہ ہوئے جس طرح ابوذر غِفاری، طُفَیل بن عمرو اور ضماد ازدی رضی اللہ عنہم اپنی اپنی قوم کی طرف گئے تھے۔ یوں جنات بھی اللہ کے داعیوں کی صفوں میں شامل ہوگئے۔ انھوں نے اپنی قوم سے کہا:

﴿ يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَ اٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ ﴾

"اے ہماری قوم! اللہ کے داعی کی بات کو قبول کرلو اور اس پر ایمان لے آؤ، وہ تمھارے لیے تمھارے (کچھ) گناہ بخش دے گا اور وہ تمھیں نہایت دردناک عذاب سے پناہ دے گا۔" [2]

اب نامِ محمد ﷺ صرف انسانوں کے دلوں کا مرکز نہیں، بلکہ جنات کے دلوں کا مرکز بھی بن گیا اور جنات میں سے بھی ایسے جاں نثار پیدا ہوگئے جنھوں نے علمِ توحید اٹھایا اور اپنے آپ کو دعوت الی اللہ کی طرف مائل کرلیا اور ان کے حق میں اترنے والا قرآن

[1] الأحقاف 46:29، 30. [2] الأحقاف 46:31.

سورۂ جن میں شامل آیات کی صورت میں قیامت تک پڑھا جاتا رہے گا۔

جب نبی ﷺ میدانِ دعوت میں اس ربانی فتح سے ہمکنار ہوئے، آپ وادی نخلہ میں تھے اور مکہ میں داخل ہونے سے عاجز تھے۔ اب کیا طائف اور مکہ کے سرکش لوگ ان ایماندار جنوں کو قید یا مختلف تکالیف سے دوچار کر سکتے تھے؟ ہرگز نہیں!

بعدازاں جب نبی ﷺ مطعم بن عدی کی پناہ میں آئے اور اپنے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو سورۂ جن پڑھ کر سنائی تو دعوت اسلامی کی اس عظیم فتح سے متاثر ہوکر ان کے دل جھومنے لگے اور اسلام کا جھنڈا بلند ہوتا دکھائی دینے لگا۔ کیونکہ اب اس جنگ میں صرف انسان ہی نہیں، ان کے بھائی بند جنات بھی شرک کا مقابلہ کرتے نظر آنے لگے تھے۔ پہلی ملاقات کے چند مہینے بعد جنّات کا ایک اور وفد آپ ﷺ کی زیارت کا شوق لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور انھوں نے اللہ کا کلام سنا۔

حضرت علقمہ رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے سوال کیا: کیا آپ میں سے کوئی جنات والی رات نبی ﷺ کے ساتھ تھا؟ انھوں نے فرمایا: ''نہیں بلکہ قصہ یوں ہے کہ ہم ایک رات آپ ﷺ کے ساتھ تھے کہ اچانک آپ مفقود ہوگئے۔ ہم نے وادیوں اور گھاٹیوں میں آپ ﷺ کو تلاش کیا لیکن آپ نہ ملے اور ہم کہہ رہے تھے کہ آپ کو کوئی اڑا کر یا اٹھا کر لے گیا ہے۔ یہ رات ہماری بدترین رات تھی، صبح کے وقت آپ ﷺ حرا کی طرف سے تشریف لائے تو ہم نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! ہم نے آپ کو نہ پاکر بہت تلاش کیا لیکن آپ نہیں ملے اور ہم نے رات بہت تکلیف میں گزاری۔'' آپ ﷺ یوں گویا ہوئے: «أَتَانِي دَاعِي الْجِنِّ فَذَهَبْتُ مَعَهُ، فَقَرَأْتُ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنَ» ''میرے پاس جنوں کا ایک داعی آیا تو میں اس کے ساتھ چلا گیا اور میں نے انھیں قرآن سنایا۔'' عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ ہمیں لے گئے اور ان کی بستیاں اور وہ جگہیں دکھائیں جہاں ان کی آگ جلتی

تھی۔ ان جنوں نے آپ ﷺ سے اپنے زادِ حیات کے بارے میں سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: «لَكُمْ كُلُّ عَظْمٍ ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ، يَقَعُ فِي أَيْدِيكُمْ أَوْفَرَ مَا يَكُونُ لَحْمًا وَكُلُّ بَعْرَةٍ عَلَفٌ لِدَوَابِّكُمْ» ''تمھارے لیے ہر وہ ہڈی ہے جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو جب وہ تمھارے ہاتھ میں آئے گی، گوشت سے بھری ہوگی اور گوبر تمھارے جانوروں کا چارہ ہے۔'' اس لیے آپ ﷺ نے انسانوں سے ارشاد فرمایا:

«فَلَا تَسْتَنْجُوا بِهِمَا، فَإِنَّهُمَا طَعَامُ إِخْوَانِكُمْ»

''ان دونوں (گوبر اور ہڈی) کے ساتھ استنجا مت کرو۔ یہ دونوں تمھارے بھائیوں (جنات) کا کھانا ہیں۔''[1]

جنات کی دنیا میں حاصل ہونے والی یہ عظیم فتح اور واضح مدد عالمِ انسان میں حاصل ہونے والی عظیم کامیابیوں کی تمہید اور اساس ثابت ہوئی۔ اس کے چند ہی مہینوں بعد انصار کے وفد سے ملاقات کا واقعہ پیش آیا۔

ڈاکٹر بوطی سفر طائف سے واپسی پر جنات کا واقعہ پیش آنے پر یوں اظہار خیال کرتے ہیں: ''جو چیز اس واقعے میں اہمیت کی حامل ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان جنات کے وجود کو مانیں اور تسلیم کریں کہ وہ بھی ایک جیتی جاگتی دنیا ہے، اللہ تعالیٰ نے انھیں بھی ہماری طرح مکلّف بنایا ہے۔ اگرچہ ہمارے احساسات اور عقلیں ان کا ادراک نہیں کرسکتیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہماری آنکھوں میں جو دیکھنے کی صلاحیت رکھی ہے وہ جنات کو نہیں دیکھ سکتی۔ ہماری آنکھیں تو موجودات کی چند مقررہ اقسام کو ایک خاص اندازے اور خاص شرائط کے دائرے میں رہ کر ہی دیکھ سکتی ہیں۔ ان مخلوقات کا وجود آیاتِ قرآن اور متواتر احادیث سے ثابت اور واجب التسلیم ہے اور ان کا انکار اللہ اور رسول کی طرف سے پہنچنے والے ارشاداتِ عالیہ کی نفی ہے۔ کسی سمجھدار آدمی کو انتہائی غفلت اور جہالت کا مظاہرہ کرتے ہوئے

[1] صحیح مسلم، حدیث: 450.

یہ نہیں کہنا چاہیے کہ میرا علم جنات کو تسلیم کرنے سے قاصر ہے کیونکہ جو چیز نظر نہ آئے اور محسوس بھی نہ ہو سکے تب بھی اس کے وجود کا عقیدہ رکھنا ممکن نہیں۔ یہ بات بھی واضح ہے کہ ایسا جاہل اور ظاہری علم کا دعویدار، نظر نہ آنے والی ہر چیز کا انکار کر دے گا، حالانکہ اہل علم کا کلیہ ہے کہ کسی چیز کا علم و شعور نہ ہونا اس کے عدم وجود کی دلیل نہیں ہوتا، یعنی اگر ایک چیز دکھائی نہ دے تو نظر نہ آنے والی اس چیز کا وجود اور عدم وجود لازم نہیں آتے۔''[1]

اس خدا داد عزت افزائی کے بعد کہ آپ ﷺ کی دعوت جن و انس میں پھیل گئی، وہ وقت آن پہنچا تھا کہ آپ آسمانوں تک پہنچیں اور فرشتوں کی دنیا سے ہوتے ہوئے رب جلیل تک آپ کی رسائی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو تمام مخلوقات میں سے منتخب فرمایا۔ آپ ﷺ آسمانوں پر تشریف لے گئے اور واپس آ کر اس بابرکت سفر کی سرگزشت سنائی اور آپ نے ایسی معلومات فراہم کیں کہ قیامت تک کوئی بھی ایسی معلومات فراہم نہ کر سکتا۔[2]

1 فقه السيرة للبوطي، ص:106,105. 2 التربية القيادية للدكتور الغضبان:1/446.

باب 4

اسراء ومعراج

پس منظر

ابو طالب کا وجود دراصل نبی ﷺ کے لیے مضبوط باڑ کی حیثیت رکھتا تھا جس سے آپ قریش کا دفاع کرتے تھے اور قریش ابو طالب کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتے تھے لیکن یہ رکاوٹ ابو طالب کی وفات کے بعد ختم ہوگئی۔ نبی ﷺ کو بہت زیادہ جسمانی اذیتوں سے گزرنا پڑا۔

اسی طرح آپ ﷺ کی زوجہ مطہرہ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا مشرکوں کی طرف سے پہنچنے والے روحانی زخموں کی مرہم پٹی کا کام انجام دیتی تھیں۔ جب وہ بھی وفات پاگئیں تو یہ زخم کھلے رہ گئے۔ بعد ازاں جب قریش نے آپ کو ناقابل برداشت اذیتیں دیں تو آپ ﷺ نے سفر طائف اختیار کیا اور سردارانِ طائف سے نصرت وحمایت طلب کی تاکہ اللہ کا دین لوگوں تک پہنچ سکے۔ انھوں نے نہ صرف انکار کیا بلکہ کفار مکہ کو خبر کردی کہ طائف میں آپ ﷺ پر کیا گزری تھی۔ تب کفار مکہ نے آپ کے خلاف بری نیت سے گھناؤنے منصوبے بنائے، چنانچہ آپ علیہ السلام ایک کافر آدمی کی پناہ میں مکہ میں داخل ہونے پر مجبور ہوگئے۔ چونکہ قریش نے نبی ﷺ سے بہت برا سلوک کیا تھا، لہٰذا آپ انتہائی غمزدہ تھے۔ اس وجہ سے اس سال کا نام ''غم کا سال'' پڑ گیا۔[1]

[1] دراسة تحليلية لشخصية الرسول ﷺ للدكتور قلعجي، ص: 128.

اسراء ومعراج کے مقاصد

اللہ تعالیٰ نبی ﷺ کے دل کو مضبوط اور اللہ پر اعتماد کو تقویت دینے کی غرض سے اپنی قدرت کی نشانیاں اسی طرح دکھلانا چاہتا تھا جس طرح اس نے موسیٰ علیہ السلام کو دکھائیں۔ تاکہ سرزمین عرب میں کفار کے غلبے کا مقابلہ کیا جاسکے۔

اسراء ومعراج کے سفر میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی آخرالزماں کو اپنے عجائبات قدرت دکھائے جو ہجرت مدینہ کا پیش خیمہ تھے اور ان میں کفر وضلالت اور فسق و فجور کی تاریخ کی سب سے بڑی معرکہ آرائی کے لیے تیاری کی طرف اشارہ تھا۔

جو عجائبات اور نشانیاں آپ ﷺ نے دیکھیں ان میں سے بیت المقدس جانا، آسمانوں کی سیر، انبیاء و مرسلین اور فرشتوں سے ملاقات، نیز جنت، دوزخ اور انعام و عذاب کے مشاہدات وغیرہ شامل ہیں۔

اسراء کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل میں اور معراج کا تذکرہ سورۂ نجم میں ہے۔ اسراء کی حکمت بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لِنُرِيَهُ مِنْ اٰيٰتِنَا ۚ﴾

''تاکہ ہم انھیں اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔''[1]

معراج کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا:

﴿لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ○﴾

''البتہ تحقیق انھوں (رسول ﷺ) نے اپنے رب کی بعض بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔''[2]

قصۂ اسراء ومعراج میں بہت سے علوم، راز، لطافتیں، اسباق اور نصیحت آموز باتیں شامل ہیں۔[3]

---

1 بنيٓ إسرآء يل 1:17۔ 2 النجم 18:53۔ 3 الأساس في السنة لسعيد حوّى: 292,291/1۔

مولانا ابو الحسن ندوی لکھتے ہیں: ''قصہ اسراء محض ایک انوکھا واقعہ ہی نہ تھا جس میں رسول اللہ ﷺ نے عجائبات قدرت کا مشاہدہ کیا اور آپ ﷺ پر زمین و آسمان کے راز عیاں ہوئے بلکہ یہ واقعہ بہت سی باریکیوں اور دوررس نتائج کا بھی حامل تھا۔ سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ نجم جن میں یہ قصہ مذکور ہے، ان میں بتایا گیا کہ آپ ﷺ دونوں قبلوں کے نبی، مشرق و مغرب کے امام، سابقہ انبیاء کے وارث اور بعد میں آنے والے لوگوں کے پیشوا ہیں۔ آپ کے سفر اسراء میں مکہ بیت المقدس سے اور بیت الحرام مسجد اقصیٰ سے جاملا اور تمام انبیاء نے آپ ہی کی اقتدا میں نماز ادا کی جہاں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ کی رسالت تمام انسانیت کے لیے، آپ کی امامت قیامت تک کے لیے اور آپ کی تعلیمات تمام انسانوں اور ہر زمانے اور ہر مقام کے لیے ہیں، نیز یہ بھی آگاہی حاصل ہوتی ہے کہ آپ ﷺ کی شخصیت کا تعارف کیا ہے، آپ کی قیادت و امامت کے اوصاف کیا ہیں اور آپ کی امت کا مقام و مرتبہ کیا ہے جس میں آپ مبعوث ہوئے اور جو آپ پر ایمان لائے۔ آپ کی رسالت اور آپ کے پیغمبرانہ کردار کا شعور حاصل ہوتا ہے جو دنیا اور اقوام و قبائل پر اپنے گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔'' [1]

اسراء و معراج احادیث کی روشنی میں

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''میرے پاس بُراق لایا گیا جو ایک سفید رنگ کا لمبا سا جانور تھا۔ جس کا قد گدھے سے بڑا اور خچر سے چھوٹا تھا۔ وہ اپنا ہر قدم نظر کی انتہا پر رکھتا تھا۔ میں اس پر سوار ہوگیا اور بیت المقدس جا پہنچا اور اسے اس حلقے سے باندھ دیا جہاں پیغمبر اپنی سواریاں باندھا کرتے تھے، پھر میں مسجد اقصیٰ میں داخل ہوا اور دو رکعت ادا کیں اور جب میں باہر نکلا تو جبریل میرے پاس دو پیالے لائے، ایک میں

1 الأساس في السنة لسعيد حوّى:292/1.

دودھ تھا اور دوسرے میں شراب تھی۔ میں نے دودھ لے لیا۔'' جبریل نے کہا:
''آپ نے فطرت کا انتخاب کیا ہے۔''[1]

حضرت مالک بن صَعْصَعہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قصۂ اسراء بیان کرتے ہوئے فرمایا:

''میں حطیم میں (ایک روایت میں حجر کے لفظ ہیں) بیٹھا تھا، ایک آنے والا (جبریل) آیا۔ اس نے مجھے یہاں سے یہاں تک چیر دیا۔'' ایک روایت میں شق (پھاڑنے) کا لفظ ہے۔

مالک کہتے ہیں: میرے پاس جارود بیٹھے ہوئے تھے میں نے اس اشارے (یہاں سے یہاں تک) کا مطلب پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ مراد حلق سے زیر ناف تک ہے۔

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''پھر اس نے میرا دل نکالا اور اسے سونے کے تھال میں جو ایمان سے بھرا ہوا تھا رکھ دیا، پھر میرے دل کو دھویا گیا اور ایمان سے بھر کر دوبارہ میرے سینے میں رکھ دیا گیا، پھر میرے پاس ایک جانور جو گدھے سے بڑا اور خچر سے چھوٹا تھا لایا گیا جس کا رنگ سفید تھا۔''

جارود کہنے لگے: ''اے ابوحمزہ! کیا وہ براق تھا؟''

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''ہاں۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وہ اپنا قدم انتہائے نظر پہ رکھتا تھا، پھر مجھے اس پر سوار کیا گیا اور جبریل علیہ السلام مجھے لے کر آسمان دنیا تک پہنچے اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ پوچھا گیا: ''کون ہے؟''

جبریل علیہ السلام نے کہا: ''میں ہوں۔''

پھر پوچھا گیا: ''آپ کے ساتھ کون ہے؟''

جبریل علیہ السلام نے بتایا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں۔

[1] صحیح مسلم، حدیث: 162.

پوچھا گیا: ''کیا انھیں بلایا گیا ہے؟''

جبریل علیہ السلام نے کہا: ''ہاں۔'' تب مرحبا اور خوش آمدید کہا گیا اور دروازہ کھل گیا۔

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:) جب میں پہلے آسمان پر پہنچا تو وہاں آدم علیہ السلام موجود تھے۔ کہا گیا کہ یہ آپ کے والد آدم علیہ السلام ہیں، آپ انھیں سلام کہیے۔ میرے سلام کہنے پر انھوں نے جواب دیا، پھر کہا: ''نیک بیٹے اور نیک نبی کا آنا مبارک ہو۔''

پھر مجھے دوسرے آسمان کی طرف لے جایا گیا۔ وہاں بھی دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔

پوچھا گیا: ''کون ہے؟''

جبریل علیہ السلام نے کہا: ''میں ہوں۔''

پوچھا گیا: ''آپ کے ساتھ کون ہے؟''

جبریل علیہ السلام نے کہا: ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔''

پوچھا گیا: ''کیا انھیں یہاں بلایا گیا ہے؟''

جبریل علیہ السلام نے کہا: ''ہاں'' پھر مرحبا اور خوش آمدید کہا گیا اور دروازہ کھل گیا۔ جب میں دوسرے آسمان پر پہنچا تو وہاں یحییٰ و عیسیٰ علیہما السلام کو پایا۔ وہ دونوں خالہ زاد ہیں۔

جبریل علیہ السلام نے کہا: ''یہ یحییٰ و عیسیٰ ہیں، انھیں سلام کیجیے۔''

میں نے انھیں سلام کیا۔

انھوں نے مجھے سلام کا جواب دیا اور کہا: ''نیک بھائی اور نیک نبی کو خوش آمدید۔''

پھر مجھے تیسرے آسمان کی طرف لے جایا گیا، جبریل علیہ السلام نے دروازہ کھٹکھٹایا تو پوچھا گیا: ''کون ہے؟''

جبریل علیہ السلام نے کہا: ''میں ہوں۔''

پھر پوچھا گیا: ''آپ کے ساتھ کون ہیں؟''

جبریل علیہ السلام نے بتایا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں۔

پوچھا گیا: ”کیا انھیں یہاں آنے کی دعوت دی گئی ہے؟“

جبریل علیہ السلام نے کہا: ”ہاں۔“ پھر مرحبا اور خوش آمدید کہا گیا اور دروازہ کھل گیا۔

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:) جب میں تیسرے آسمان پر پہنچا تو حضرت یوسف علیہ السلام کو وہاں پایا۔

جبریل علیہ السلام نے کہا: ”یہ یوسف علیہ السلام ہیں، انھیں سلام کیجیے۔“

میں نے انھیں سلام کیا اور انھوں نے سلام کا جواب دیا اور کہا: ”نیک بھائی، نیک نبی کا آنا مبارک ہو۔“

پھر مجھے چوتھے آسمان کی طرف لے جایا گیا۔ جبریل علیہ السلام نے دروازہ کھٹکھٹایا تو پوچھا گیا: ”کون ہے؟“

جبریل علیہ السلام نے کہا: ”میں۔“

پوچھا گیا: ”آپ کے ساتھ کون ہے؟“

جبریل علیہ السلام نے بتایا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں۔

پوچھا گیا: ”کیا انھیں یہاں بلوایا گیا ہے؟“

جبریل علیہ السلام نے بتایا: ”ہاں۔“

پھر مرحبا اور خوش آمدید کہا گیا اور دروازہ کھل گیا۔ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:) جب میں اندر پہنچا تو ادریس علیہ السلام کو وہاں پایا۔

جبریل علیہ السلام نے کہا: ”یہ ادریس علیہ السلام ہیں، انھیں سلام کہیے۔“

میں نے انھیں سلام کیا تو انھوں نے مجھے سلام کا جواب دیا اور کہا: ”اچھے بھائی اور اچھے نبی کا یہاں آنا مبارک ہو۔“

پھر مجھے پانچویں آسمان کی طرف لے جایا گیا۔ جبریل علیہ السلام نے دروازہ کھٹکھٹایا تو پوچھا گیا: ”کون ہے؟“

جبریل علیہ السلام نے کہا: ''میں ہوں۔''
پوچھا گیا: ''آپ کے ساتھ کون ہے؟''
جبریل علیہ السلام نے بتایا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔
پوچھا گیا: ''کیا انھیں یہاں آنے کی دعوت ملی ہے؟''
جبریل علیہ السلام نے بتایا: ''ہاں، پھر مرحبا اور خوش آمدید کہا گیا اور دروازہ کھل گیا۔
جب میں اندر پہنچا تو حضرت ہارون علیہ السلام کو وہاں پایا۔
جبریل علیہ السلام نے کہا: ''یہ ہارون علیہ السلام ہیں، انھیں سلام کیجیے۔'' میں نے انھیں سلام کیا۔
انھوں نے سلام کا جواب دیا اور کہا: ''صالح بھائی اور صالح نبی کا آنا مبارک ہو۔''
پھر مجھے چھٹے آسمان کی طرف لے جایا گیا۔ جبریل علیہ السلام نے دروازہ کھٹکھٹایا تو پوچھا گیا: ''کون ہے؟''
جبریل علیہ السلام نے کہا: ''میں ہوں۔''
پوچھا گیا: ''آپ کے ساتھ کون ہے؟''
جبریل علیہ السلام نے بتایا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں۔
پوچھا گیا: ''کیا انھیں بلایا گیا ہے؟''
جبریل علیہ السلام نے کہا: ''ہاں۔''
تب مرحبا اور خوش آمدید کہا گیا اور دروازہ کھل گیا۔
(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:) جب میں اندر پہنچا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وہاں پایا۔
جبریل علیہ السلام نے کہا: ''یہ موسیٰ ہیں، انھیں سلام کیجیے۔''
میں نے موسیٰ علیہ السلام کو سلام کیا۔ انھوں نے مجھے سلام کا جواب دیا اور کہا: ''اچھے بھائی اور صالح نبی کا آنا مبارک ہو۔''
جب میں آگے بڑھنے لگا تو وہ رو پڑے۔ پوچھا گیا کہ آپ کیوں رو رہے ہیں؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا: ''میں اس لیے روتا ہوں کہ ایک لڑکا جو میرے بعد نبی بن کر مبعوث ہوا، اس کی امت کے لوگ میری امت سے زیادہ جنت میں جائیں گے۔''

پھر مجھے ساتویں آسمان کی طرف لے جایا گیا۔ جبریل علیہ السلام نے دروازہ کھٹکھٹایا تو پوچھا گیا: ''کون ہے؟''

جبریل علیہ السلام نے کہا: ''میں ہوں۔''

پوچھا گیا: ''آپ کے ساتھ کون ہے؟''

جبریل علیہ السلام نے کہا: ''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں۔''

پوچھا گیا: ''کیا انھیں یہاں آنے کی دعوت دی گئی ہے؟''

جبریل علیہ السلام نے کہا: ''ہاں۔''

اس پر مرحبا اور خوش آمدید کہا گیا اور دروازہ کھل گیا۔

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:) میں اندر داخل ہوا تو وہاں ابراہیم علیہ السلام کو پایا۔

جبریل علیہ السلام نے کہا: ''یہ ابراہیم ہیں، انھیں سلام کیجیے۔''

میں نے انھیں سلام کیا۔ انھوں نے میرے سلام کا جواب دیا اور فرمایا: ''نیک بیٹے اور صالح نبی کا یہاں آنا مبارک ہو۔''

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:) پھر سدرۃ المنتہیٰ میرے قریب کر دیا گیا۔ اچانک دیکھتا ہوں کہ اس کے بیر ہَجَر [1] شہر کے مٹکوں جتنے بڑے تھے اور اس کے پتے ہاتھیوں کے کانوں کی طرح تھے۔

حضرت جبریل علیہ السلام نے فرمایا: ''یہ سدرۃ المنتہیٰ ہے۔''

پھر میں نے چار نہریں دیکھیں۔ دو باطنی (پوشیدہ) اور دو ظاہری تھیں۔

میں نے جبریل علیہ السلام سے ان کے بارے میں پوچھا تو جبریل علیہ السلام نے بتایا: ''پوشیدہ نہریں جنت میں جاتی ہیں اور ظاہری نہریں نیل اور فرات ہیں۔''

1 ہجر: یہ قدیم بحرین (سعودی عرب کا مشرقی علاقہ الاحساء) کا ایک قصبہ ہے۔

پھر بیت المعمور کو میرے قریب کر دیا گیا، پھر میرے پاس تین برتن لائے گئے، ایک میں شراب، دوسرے میں دودھ اور تیسرے میں شہد تھا۔ میں نے دودھ کو پسند کیا تو جبریل علیہ السلام نے کہا: ''آپ نے فطرت کو پسند کیا ہے جس پر آپ اور آپ کی امت کار بند ہیں۔''

نبی ﷺ نے فرمایا: ''پھر مجھ پر دن رات کے لیے پچاس نمازیں فرض کی گئیں۔ جب میں واپس آیا اور موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گزرا تو انھوں نے پوچھا: ''کیا حکم ملا؟''

میں نے بتایا ''روزانہ پچاس نمازوں کا حکم ہوا ہے۔''

موسیٰ علیہ السلام فرمانے لگے: ''آپ کی امت روزانہ پچاس نمازیں ادا نہیں کر سکتی۔ اللہ کی قسم! میں نے آپ سے قبل لوگوں کو آزمایا ہے اور بنی اسرائیل سے اس معاملے میں میری بہت زیادہ کشمکش رہی ہے، واپس اپنے رب کے پاس جا کر امت کے لیے تخفیف کا سوال کریں۔''

میں واپس گیا تو اللہ تعالیٰ نے دس نمازیں کم کر دیں۔ جب دوبارہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گزر ہوا تو انھوں نے پھر پہلے والی بات دہرائی۔ اب دس نمازیں اور کم ہو گئیں۔ تیسری دفعہ پھر موسیٰ علیہ السلام نے وہی بات دہرائی، اب دس نمازیں مزید کم ہو گئیں، پھر جب چوتھی مرتبہ موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گزرا تو انھوں نے پہلے والی بات دہرائی، میں واپس گیا تو (مزید دس نمازیں کم ہو گئیں) اب میری امت پر روزانہ دس نمازیں فرض ہو گئیں۔ پانچویں دفعہ پھر موسیٰ علیہ السلام نے وہی مشورہ دیا تو میں نے اپنے اللہ سے امت کے لیے تخفیف کا سوال کیا۔ یوں مجھے پانچ نمازوں کا حکم مل گیا۔ اب جب موسیٰ علیہ السلام کے پاس واپس آیا تو انھوں نے پوچھا: ''کیا حکم ہوا؟''

میں نے کہا: ''مجھے روزانہ پانچ نمازوں کا حکم ہوا ہے۔''

موسیٰ علیہ السلام گویا ہوئے: ''آپ کی امت روزانہ پانچ نمازیں بھی ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتی۔ میں نے لوگوں کا آپ سے پہلے تجربہ کیا ہے اور بنی اسرائیل کا میں نے سخت ترین تجربہ کیا ہے، آپ واپس جائیں اور امت کے لیے مزید آسانی کا سوال کریں۔''

اس پر نبی ﷺ نے فرمایا: ''میں نے اپنے رب سے اتنی بار سوال کیا ہے کہ اب مزید سوال کرتے ہوئے شرم محسوس کرتا ہوں۔ اب میں اس پر راضی ہوں اور تسلیم کرتا ہوں۔''

نبی ﷺ نے فرمایا: ''جب میں آگے بڑھا تو ایک پکارنے والے نے آواز دی کہ میں نے اپنا فرض کردہ حکم جاری کر دیا اور اپنے بندوں سے تخفیف کر دی۔''[1]

اسراء و معراج کا واقعہ ہجرت سے ایک سال پہلے پیش آیا۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ نے اپنی کتاب الشفاء میں اسی طرح ذکر کیا ہے۔[2]

جب رسول اللہ ﷺ اپنے اس سفر مبارک سے واپس آئے تو اپنی قوم کو اس کی خبر دی اور آپ ایک ایسی مجلس میں تشریف لائے جس میں مطعم بن عدی، ابو جہل (عَمرو بن ہِشَام) اور وَلید بن مغیرہ بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے انھیں بتایا کہ میں نے عشاء کی نماز مسجد حرام میں ادا کی تھی، پھر صبح کی نماز بھی یہاں ادا کی۔ اسی دوران میں بیت المقدس گیا اور بہت سے انبیائے کرام علیہم السلام سے بھی ملاقات ہوئی جن میں ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام سرفہرست ہیں۔ میں نے ان کی امامت بھی کی اور ان سے گفتگو بھی کی تو ابو جہل نے مزاحیہ انداز میں کہا: ''میرے سامنے ذرا ان کا حلیہ بیان کیجیے۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: ''عیسیٰ علیہ السلام درمیانہ قد سے ذرا بڑے تھے لیکن زیادہ لمبے نہ تھے۔ ان کا سینہ چوڑا اور بال لمبے گھنگھریالے تھے، رنگ سرخ سفیدی مائل تھا۔ ان کی شکل عُروَہ بن مسعود ثقفی سے مشابہت رکھتی تھی۔ اور موسیٰ علیہ السلام موٹے گندم گوں اور لمبے قد والے تھے جیسے شنوءہ علاقے کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کے دانت ملے ہوئے، ہونٹ سکڑے ہوئے اور قدرے ترش رو دکھائی دیتے تھے اور ابراہیم علیہ السلام، اللہ کی قسم! وہ سیرت اور صورت میں ہو بہو میرے جیسے تھے۔''[3]

---

1 صحيح البخاري، حديث: 3887. 2 الشفاء للقاضي عياض: 108/1. 3 التاريخ الإسلامي للحميدي: 37/3.

اب اہل مجلس نے کہا کہ آپ ہمیں بیت المقدس کی نشانیاں بتائیں۔ نبی ﷺ نے معذرت کرتے ہوئے کہا: ''میں رات کے وقت وہاں پہنچا اور رات ہی کو واپس آ گیا۔'' اسی اثناء میں حضرت جبریل علیہ السلام تشریف لائے اور آپ کے پہلو میں کھڑے ہو گئے۔ نبی ﷺ جبریل علیہ السلام کی رہنمائی میں بتانے لگے: ''بیت المقدس کا فلاں دروازہ فلاں جگہ ہے اور دوسرا دروازہ فلاں جگہ ہے۔''

پھر انھوں نے اپنے قافلے کے بارے میں سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں رَوحاء نامی مقام پر ایک قافلے کے پاس سے گزرا۔ ان کی ایک اونٹنی گم ہو گئی تھی اور وہ اسے تلاش کر رہے تھے۔ میں ان کے کجاووں کی طرف بڑھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا اور ایک پیالے میں پانی موجود تھا۔ میں نے وہ پانی بھی پیا تھا۔ اب آپ بطور تصدیق اس قافلے سے دریافت کر لیں۔''

قریش نے کہا: ''اللہ کی قسم! یہ نشانی ہو سکتی ہے۔''

آپ ﷺ نے مزید فرمایا: ''پھر میں ایک اور قافلے سے ملا۔ ان کے اونٹ بدکنے لگے اور ایک اونٹ بیٹھ گیا جس کا رنگ سرخ تھا۔ اس پر سفید دھاری دھار جھول بھی تھا۔ اب علم نہیں کہ ان کے اونٹ ملے یا نہیں۔ آپ ان قافلے والوں سے پوچھ لیں۔''

اس پر سب نے کہا: ''بالکل یہ نشانی ہو سکتی ہے۔''

اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: ''پھر میں ایک اور قافلے سے ابواء میں ملا۔ سب سے آگے ایک خاکستری اونٹ تھا اور وہ ابھی تنعیم گھاٹی سے تمھارے پاس پہنچنے والا ہے۔''

اب ولید بن مغیرہ نے کہا: ''یہ تو جادوگر محسوس ہوتا ہے'' پھر سب اٹھ کر نشانیاں دیکھنے کے لیے چل دیے۔ دیکھا تو ساری نشانیاں پوری ہو گئیں۔ بالآخر سب نے آپ ﷺ پر جادوگر ہونے کی تہمت لگائی اور کہنے لگے: ''وَلید بن مُغیرہ نے جو کہا سچ کہا۔''[1]

1 المطالب العالیة لابن حجر: 4/201-204، والسیرة النبویة لابن هشام: 2/11، و مجمع الزوائد: 1/75,76.

یہ واقعہ ایک طرف تو بعض لوگوں کے لیے جو (نئے نئے) دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے، آزمائش ثابت ہوا اور وہ مرتد ہو گئے۔ اور دوسری طرف کچھ لوگ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے اور کہا: ''کیا تجھے تیرے پیغمبر کی خبر ہے جو گمان کرتا ہے کہ رات ہی رات بیت المقدس کا سفر کر کے لوٹا ہے؟''

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''کیا فی الواقع انھوں نے اس طرح کہا ہے؟''

انھوں نے جواب دیا: ''ہاں۔''

اب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح ارشاد فرمایا ہے تو سچ فرمایا ہے۔''

لوگوں نے حیران ہو کر پوچھا: ''کیا آپ اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ وہ رات ہی رات صبح طلوع ہونے سے قبل بیت المقدس کا سفر کر کے آسکتے ہیں؟''

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''ہاں، میں ان کے بارے میں اس سے بڑی بات پر یقین رکھتا ہوں وہ یہ کہ صبح و شام ان پر آسمان سے خبریں آتی ہیں۔''

اور یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو صدیق کا لقب عطا ہوا۔[1]

دروس وعبرتیں

① ہر محنت اور مشقت کے بعد انعام ضرور ملتا ہے۔ جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو بہت سی مشقتیں اٹھائیں۔ کبھی قریش نے دعوت کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کیں تو کبھی بنوثقیف اور دیگر قبائل عرب نے مخالفت کی۔ گویا دعوت اسلامی اور اس دعوت کے پیروکاروں کے ارد گرد گھیرا تنگ کر دیا گیا جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے حمایتی ابوطالب بھی وفات پا گئے تھے، تاہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذمہ داری نبھاتے رہے، اپنے رب کا حکم پہنچانے کے لیے صبر سے کام لیتے رہے۔ نہ کسی ملامت گر یا لڑنے والے سے گھبرائے اور نہ کسی مذاق کرنے

1 المستدرك للحاكم: 62/3، والسلسلة الصحيحية: 615/1، حديث: 306.

والے کی تدبیر کو خاطر میں لائے۔

اب نبی ﷺ کو ایک بڑے انعام سے نوازنے کا وقت آ گیا تھا، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے مطابق آپ ﷺ کو اسراء و معراج سے نوازا گیا اور صرف آپ کو اس عظیم اکرام کے لیے منتخب کیا گیا تاکہ آپ ﷺ کو آپ کے صبر و جہاد کا صلہ دیا جا سکے، آپ کو عالمِ ملکوت کی سیر کروائی جائے اور آپ عجائبات قدرت کے نظارے کر سکیں، نیز آپ کی ملاقات آپ کے دیگر انبیاء بھائیوں سے ہو سکے تاکہ آپ ان کے امام اور پیشوا بنیں۔ بلاشبہ محمد ﷺ آخری نبی ہیں جن کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔[1]

② یقیناً اب نبی ﷺ ایک نئے مرحلے کی طرف جو کہ ہجرت مدینہ اور ایک نئی اسلامی مملکت کے قیام کا مرحلہ تھا، پیش قدمی کرنے والے تھے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ اس مملکت کے بنیادی پتھر صحیح سلامت، ٹھوس، ایک دوسرے کے قریب اور آپس میں مضبوطی سے جڑے ہونے چاہئیں۔ نبی ﷺ کو ایک صبر آزما امتحان و آزمائش سے گزارا تاکہ آپ کے پیروکاروں کا ہراول دستہ کمزوری، دلوں کی بیماری اور شک سے پاک ہو جائے اور طاقتور، مخلص اور ایماندار لوگ جنھوں نے آپ کی تصدیق کی، اب فی الواقع پیغمبر ﷺ کی صداقت کا پکا یقین کر سکیں اور اپنے محبوب مصطفیٰ ﷺ کا یہ عظیم اعزاز دیکھ کر اندازہ لگائیں کہ آپ کتنے عظیم بخت والے ہیں اور کتنی عظیم سعادتیں آپ پر سایہ فگن ہیں، جبکہ وہ نبی ﷺ کے ماننے والے، آپ پر ایمان لانے والے اور اپنی زندگیاں آپ اور آپ کے لائے ہوئے دین پر نچھاور کرنے والے ہیں۔ اور یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ قصۂ معراج جو طائف کی مشکلات، طائف کے شرپسندوں کی اذیت رسانی اور ایک کافر آدمی کی پناہ میں داخلے کے بعد پیش آیا، اس کی وجہ سے ان کا ایمان ان کے دلوں میں کس قدر راسخ ہو گیا ہوگا![2]

③ قصۂ معراج سے آپ ﷺ کی اعلیٰ شجاعت کا پتا چلتا ہے کہ آپ نے قریش کی مخالفت

[1] التربية القيادية للدكتور الغضبان:447/1. [2] التربية القيادية للدكتور الغضبان:451/1.

اور ان کی طرف سے بدسلوکی اور استہزاء کے اندیشے کے باوجود ان کے سامنے اسراء و معراج کے ایسے حقائق رکھے کہ ان کا انکار کرنا تو درکنار وہ اس کا تصور بھی محال سمجھنے لگے۔ گویا کہ نبی ﷺ نے اپنی امت کے لیے اہل باطل کے سامنے حق گوئی کی ایک عمدہ مثال قائم فرمادی، اگرچہ بظاہر قریش نے حق کے خلاف محاذ آرائی اور اپنی پوری طاقت سے مقابلے کی روش جاری رکھی۔ نبی ﷺ نے بڑی حکمت و دانائی سے کفار کے سامنے اسراء و معراج کی حقیقت رکھی اور فی الوقت اللہ تعالیٰ نے تمام علامات بیان کرنے کا موقع بھی فراہم کیا تاکہ کفار کے لیے تصدیق کے بغیر چارۂ کار نہ رہے اور عمومی طور پر مشرکین پر حجت بھی قائم فرمادی۔ وہ علامات مندرجہ ذیل ہیں:

رسول اللہ ﷺ کا بیت المقدس کا نقشہ بیان فرمانا: اللہ تعالیٰ نے مسجد اقصیٰ کو آپ ﷺ کے سامنے منکشف فرمادیا تاکہ آپ مشرکین کو وضاحت سے بتاسکیں۔ کیونکہ ان میں سے بعض شام کا سفر کرچکے تھے اور مسجد اقصیٰ بھی دیکھ چکے تھے، اس لیے انھوں نے اس کی تصدیق بھی کی۔

آپ ﷺ کا رَوحا نامی جگہ پر قافلے سے ملاقات، ان کے ایک اونٹ کا گم ہونا اور ان کے پیالے سے پانی پینے کی خبر دینا۔

نبی ﷺ کا دوسرے قافلے کی خبر دینا جس میں اونٹ منتشر ہوگئے تھے اور ایک اونٹ کا بالتفصیل حلیہ بیان فرمانا۔

نبی ﷺ کا تیسرے قافلے کی خبر دینا جو ابواء نامی جگہ پر آپ سے ملا اور ان کے پیشرو اونٹ کا حلیہ بتانا، پھر آپ کا ذکر کرنا کہ وہ اب تنعیم کی گھاٹیوں سے نکلنے ہی والا ہے۔ جب مشرکین نے تحقیق کی تو نبی ﷺ کی سب باتیں درست ثابت ہوئیں۔ گویا آپ ﷺ کے تمام دلائل بڑے واضح اور تسلی بخش تھے جنھیں وہ جھٹلا نہ سکے۔

درحقیقت معراج آپ ﷺ کی اللہ تعالیٰ کی جانب سے اعلیٰ تربیت کا حصہ تھا۔ اللہ

کے رسول ﷺ اتنے بلند مقام پر پہنچے جہاں سے کائنات اور اس کی تمام مخلوقات کا مشاہدہ کر سکتے تھے جبکہ کفار اس وسیع کائنات میں ایک نقطے کے مانند اور انتہائی کم حیثیت کے مالک تھے، لہٰذا وہ اس ہستی کے خلاف کس طرح کامیاب ہو سکتے تھے جسے اللہ تعالیٰ نے اس بلند اور مبارک سفر کے لیے ساری مخلوق میں سے منتخب فرمالیا، فرشتوں اور انبیاء سے ملاقات کروائی اور پھر سات آسمانوں، سدرۃ المنتہٰی اور بیت المعمور کا مشاہدہ کروانے کے ساتھ ساتھ بلا واسطہ کلام بھی فرمایا۔[1]

④ قصۂ معراج میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایمان بھی نکھر کر سامنے آگیا جب انھوں نے برملا کہا کہ اگر فی الواقع نبی ﷺ نے یونہی مشاہدۂ معراج کا دعویٰ کیا ہے تو بلاشبہ حق اور سچ ہے کیونکہ میں اس سے بڑے دعوے کی تصدیق کرتا ہوں کہ صبح و شام جبریل علیہ السلام آپ پر پیغام الٰہی لے کر اترتے ہیں۔ یہی وہ علم و یقین کی منزل ہے جس کے باعث آپ صدیق کہلانے کے مستحق ٹھہرے۔ انھوں نے قصۂ معراج کے دعوے اور نزول وحی کے دعوے کے درمیان موازنہ کرتے ہوئے لوگوں کو بتایا کہ عام آدمی کے لیے ایسا دعویٰ محال اور ناممکن ہے جبکہ نبی ایسا دعویٰ کر سکتا ہے۔[2]

⑤ سفر معراج میں شق صدر اور آپ ﷺ کے دل میں ایمان و حکمت بھرنے کا تذکرہ کیا گیا تاکہ آپ میں اسراء و معراج کے مشاہدے کی لیاقت پیدا ہو جائے۔ نہ تو شق صدر سے آپ نے کوئی تکلیف محسوس کی اور نہ دل نکالنے سے آپ کسی قسم کے خوف میں مبتلا ہوئے۔ ایسے خرق عادت واقعات کو تسلیم کرنا اور مبنی بر حقیقت ماننا ضروری ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے کوئی امر محال نہیں ہے۔[3]

⑥ آپ ﷺ کا دودھ اور شراب کے پیالوں میں سے دودھ والے پیالے کو پسند کرنا اور

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي: 42,41/3. [2] التاريخ الإسلامي للحميدي: 43/3. [3] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 189/1.

جبریل علیہ السلام کا یہ کہنا کہ آپ کی فطرت کی طرف رہنمائی کی گئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام ہی دین فطرت ہے اور فطرت سے ہم آہنگ ہے۔ فطرت اور دین دونوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اور یہ دین انسانوں کی ضروریات کو پورا اور مسائل کو حل کرتا ہے، جائز خواہشات کا احترام کرتا ہے اور خودسری کو لگام دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝﴾

''چنانچہ (اے نبی!) آپ یکسو ہوکر اپنا رخ دین کے لیے سیدھا رکھیں، اللہ کی فطرت (اختیار کرو) جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی تخلیق میں تبدیلی نہیں ہوسکتی، یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔''[1]

⑦ اس بات پر یقین رکھنا چاہیے کہ آپ ﷺ بیداری کی حالت میں یعنی روح اور جسد کے ساتھ بیت المقدس اور آسمانوں پر تشریف لے گئے۔ یہی جمہور سلف و خلف کی رائے ہے اور اس شخص کی رائے کو تسلیم نہیں کیا جائے گا جو اسراء و معراج کو روحانی اور نیند کی حالت میں قرار دیتا ہے۔ کیونکہ اگر ایسا ہی ہوتا تو اس میں معجزے والی کوئی بات نہ ہوتی اور کفار بھی اسے بعید از عقل سمجھتے نہ جھٹلاتے کیونکہ ایسے خوابوں کو تسلیم کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھا جاتا۔[2]

نیز فرمان الٰہی: ﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ﴾ میں ''عبد'' سے مراد سیدنا محمد ﷺ ہیں کیونکہ ''عبد'' کا لفظ روح اور جسد دونوں پر بولا جاتا ہے۔[3]

⑧ نبی ﷺ کا انبیاء کی امامت فرمانا اس بات کی دلیل ہے کہ انھوں نے نبی ﷺ کی قیادت اور پیشوائی کو تسلیم کر رکھا ہے اور شریعت اسلامی تمام شرائع کی ناسخ ہے۔ اب سابقہ انبیاء کی امتوں کو بھی چاہیے کہ آپ ﷺ کی قیادت اور رسالت کو تسلیم کریں جس میں

1 الروم 30:30. 2 المستفاد من قصص القرآن لعبد الكريم زيدان: 91/2. 3 تفسير ابن كثير: 23/3، وتفسير القاسمي: 189/10.

ذرہ بھر باطل شامل نہیں۔

اور جو لوگ ''وحدت ادیان'' کے موضوع پر کانفرنسیں منعقد کرتے ہیں، انھیں اس حقیقت کو سمجھنا چاہیے اور لوگوں کو قیادت نبوی تسلیم کرنے کی دعوت دینی چاہیے تاکہ وہ منحرف مذاہب سے کنارہ کشی اختیار کریں اور نبی کریم ﷺ کی رسالت پر ایمان لائیں۔ صاحبانِ علم کو چاہیے کہ وہ جاہلیت کے رسم ورواج پر مشتمل نظام کی حامل دعوت کا سختی سے رد کریں۔

اگر عقل کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک طرف الوہیت مسیح، مسیح ابن اللہ، اقانیم ثلاثہ، عزیر ابن اللہ اور تحریف کلام اللہ جیسے نظریات پائے جائیں اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی الوہیت جس میں کسی کی شراکت نہ ہو اور نہ اس کے باپ بیٹے یا بیوی کا نظریہ پایا جاتا ہو تو تقارب ادیان کی کوشش سرے سے لاحاصل اور بے فائدہ نظر آتی ہے۔[1]

⑨ مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کا سفر، اس میں بہت سی حکمتیں، راز اور فوائد پائے جاتے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

مسجد اقصیٰ کی اہمیت کو اجاگر کرنا تاکہ مسلمان اس سے محبت کریں اور اسے بابرکت اور مقدس خیال کریں، اسی لیے رسول اللہ ﷺ کو پہلے بیت المقدس لے جایا گیا، پھر مسجد اقصیٰ کو معراج کی ابتدا قرار دیا گیا اور یاد رہے کہ بیت المقدس ہی مکی دور کا قبلہ تھا۔

مسجد اقصیٰ اور مسجد حرام کا تعلق ہمیں یاد دہانی کرواتا ہے کہ جس طرح مسجد حرام کو شرک کے میل کچیل اور بتوں کی عبادت سے پاک کرنے کا حکم ہے اسی طرح مسجد اقصیٰ کی آزادی اور اسے شرک کی گندگی اور عقیدہ اقانیم ثلاثہ سے پاک کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔

اس سے یہ بھی عیاں ہوتا ہے کہ مسجد اقصیٰ پر تسلط گویا مسجد حرام اور مکہ پر تسلط ہے اور اگر کفار نے مسجد اقصیٰ پر چڑھائی کی ہو تو وہ مسجد حرام پر بری نظر ڈالنے کی تمہید ہے، گویا کہ مسجد اقصیٰ ہی وہ دروازہ ہے جہاں سے گزر کر مسجد حرام تک پہنچا جا سکتا ہے اور مسجد اقصیٰ

[1] السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 213.

کا مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل کر یہود کے قبضے میں چلے جانا اس امر کی دلیل ہے کہ حرم وحجاز کا امن خطرے میں ہے اور دشمن اسے ہڑپ کرنے کے لیے تیار ہے۔

تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ صلیبی جنگوں کی تاریخ میں قلعہ کَرَک پر قابض ارناط (ریجنالڈ Reginald) صلیبی نے رسول اللہ ﷺ کے روضہ مبارک کی بے حرمتی اور جسدِ اطہر نکال لے جانے کی غرض سے ایک دستہ روانہ کیا تھا۔ اسی طرح کیتھولک مسیحی پرتگالیوں نے سولھویں صدی عیسوی میں حرمین شریفین پہنچنے کی کوشش کی تھی جس میں وہ ناکام رہے۔ ممالیک اور عثمانیوں نے ان کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملا دیا۔

جون 1967ء میں یہودیوں کے بیت المقدس پر قبضے کے بعد ان کے رہنماؤں نے اعلان کیا تھا کہ ان کا اگلا ہدف حجاز پر قبضہ کرنا ہے اور مدینۂ رسول سے پہلے خیبر پر تسلط حاصل کیا جائے گا۔

اسرائیل کے پہلے وزیراعظم ڈیوڈ بن گورین (David ben Gurion) نے بیت المقدس پر قبضے کے بعد یہودی نوجوانوں اور سپاہیوں کو مسجد اقصیٰ کے قریب جمع کر کے پرجوش انداز میں کہا تھا: ''ہم نے قدس حاصل کرلیا ہے اور اب ہم یثرب کی طرف پیش قدمی کریں گے۔''[1]

اسرائیلی وزیراعظم مسز گولڈ مائیر (Gold meir) نے بیت المقدس پر قبضے کے بعد خلیج عقبہ کی بندرگاہ ایلات میں گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا: ''میں مدینہ اور حجاز سے اپنے آباء واجداد کی بُو سونگھ رہی ہوں۔ یہ ہماری ہی سرزمین ہے جسے ہم عنقریب واپس حاصل کرلیں گے۔''[2]

بعدازاں یہودیوں نے اپنے تصورات کی سرزمین کا نقشہ تیار کیا جس میں فرات سے نیل تک کا علاقہ شامل کیا اور جزیرہ نمائے عرب، اردن، شام، عراق، مصر، یمن، کویت اور خلیج عربی کے سارے علاقے کی نشاندہی کی، پھر 1967ء میں بیت المقدس پر قبضے کے

[1] السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 314. [2] السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 314.

بعد یہ نقشہ پورے یورپ میں تقسیم کیا گیا۔[1]

⑩ سورۂ بنی اسرائیل کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے قصۂ اسراء کا ایک ہی آیت میں ذکر فرمایا ہے:

﴿ سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ۝﴾

''پاک ہے وہ (اللہ) جو اپنے بندے کو رات کے ایک حصے میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا جس کے ماحول کو ہم نے برکت دی ہے تاکہ ہم اسے اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں۔ بے شک وہی خوب سننے والا، خوب دیکھنے والا ہے۔''[2]

پھر یہود کے جرائم اور برائیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ان پر واضح کیا گیا کہ قرآن کریم سب سے زیادہ سیدھی راہ دکھلانے والا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل کی آیات کا سیاق اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ عنقریب یہودی انسانیت کے منصب قیادت سے معزول کر دیے جائیں گے کیونکہ ان کے جرائم کی فہرست اتنی طویل ہے کہ وہ اس منصب کے اہل نہیں رہے۔ اب یہ منصب رسول اللہ ﷺ کو عطا ہونے والا ہے اور دونوں ابراہیمی مرکز آپ ﷺ کے زیر نگیں آنے والے ہیں۔

سورۂ بنی اسرائیل میں پہلے فلسطین پر اسرائیلی تسلط بیان کیا گیا ہے، پھر فارس (ایران)[3] اور روم کی دست برد سے نیست و نابود ہونے کا ذکر ملتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کو سفرِ اسراء میں عجائبات قدرت دکھانے کی حکمت بھی کچھ اس طرح سمجھ میں آتی ہے کہ دراصل مسجد اقصیٰ کے حوالے سے واضح ترین آیات الٰہی وہ تاریخی آیات ہیں جن میں قبل اسراء رومی ایرانی اسرائیلی کشمکش کا ذکر کیا گیا ہے۔[4]

---

1 السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 215. 2 بني إسرآءيل 1:17. 3 پہلی مرتبہ یہود کی تباہی و بربادی اہل فارس کے ہاتھوں عمل میں نہیں آئی تھی بلکہ یہ تباہی بابل (عراق) کا بادشاہ بخت نصر لایا تھا۔

4 أصول الفكر السياسي للتجاني عبدالقادر، ص: 149.

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ......مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ۝﴾

"اور ہم نے موسیٰ کو کتاب (تورات) دی اور ہم نے اسے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا (اور انھیں حکم دیا) کہ تم میرے سوا کسی کو کارساز نہ ٹھہراؤ، اے ان لوگوں کی اولاد جنھیں ہم نے نوح کے ساتھ (کشتی میں) سوار کیا تھا، بے شک وہ شکر گزار بندہ تھا اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب (تورات) میں فیصلہ سنا دیا کہ تم زمین میں دو بار ضرور فساد کرو گے اور ضرور بہت بڑی سرکشی کرو گے، پھر جب دونوں میں سے پہلا وعدہ آیا تو ہم نے تم پر اپنے سخت جنگجو بندے بھیج دیے، چنانچہ وہ (فساد انگیزی کے لیے) شہروں کے درمیان گھس (پھیل) گئے اور یہ وعدہ (پورا) کیا ہوا تھا، پھر ہم نے پھیر کر تمھیں ان پر غلبہ دیا اور تمھیں مال اور بیٹوں کے ساتھ مدد دی اور ہم نے تمھیں نفری میں خوب زیادہ کر دیا اگر تم بھلائی کرو گے تو اپنے ہی نفس کے لیے کرو گے اور اگر برائی کرو گے تو (وہ بھی) اسی کے لیے ہوگی، پھر جب آخری بار کا وعدہ آیا (تو ایک اور قوم تم پر غالب آئی) تا کہ وہ تمھارے چہرے بگاڑ دیں اور مسجد (اقصیٰ) میں داخل ہو جائیں جیسے پہلی بار اس میں داخل ہوئے تھے اور تا کہ وہ جس پر غلبہ پائیں اسے یکسر تباہ کر دیں۔" [1]

علامہ ابن کثیر البدایہ والنہایہ میں رقم طراز ہیں کہ "بخت نصر نے فارسی بادشاہ کے ایماء پر یہود کو تباہی سے ہمکنار کیا اور ان کی سرزمین میں اندر تک گھس گیا۔ مجبوراً انھیں یہ علاقہ چھوڑنا پڑا۔ ان میں سے کچھ حجاز، کچھ یثرب، کچھ وادی القریٰ اور تھوڑے مصر کی طرف چلے گئے۔ یہ تباہی و بربادی جو سلطنت فارس کی [2] طرف سے یہودیوں پر مسلط کی گئی، چھٹی

1 بنيّ إسرآئيل 17:2-7. 2 صنعاء یونیورسٹی (یمن) کے استاذ تاریخ فرست مرعی کی رائے ہے کہ "بخت نصر کلدانی تھا، فارسی نہیں تھا اور کلدانی بادشاہ کے حکم پر اس نے حملہ کیا تھا۔ جیسا کہ اس سے »

صدی قبل مسیح میں پیش آئی۔[1]

یہودی مملکت کی تعمیر نو کے بعد دوسری دفعہ ان کی بربادی کا سامان رومیوں کے ہاتھوں 70 عیسوی میں ہوا۔ رومی کمانڈر ٹائٹس نے ہیکل سلیمانی کو گرا دیا اور رومیوں کے سیاسی اور مذہبی ظلم وستم کی تاب نہ لاتے ہوئے یہودیوں نے راہ فرار اختیار کی، پھر ان کی ہجرتیں مسلسل ہوتی رہیں اور ان کے بعض گروہ جزیرہ نمائے عرب کے جنوب میں پہنچے جہاں پہلے سے ان کے آباء و اجداد موجود تھے۔[2]

جزیرہ نمائے عرب میں یہودیوں کا پہنچنا صرف ہجرت برائے تحفظ جان نہ تھا بلکہ یہ جزیرہ نما میں وسیع پیمانے پر فساد کے جراثیم پھیلانے کی سازش تھی۔ اور رسول اللہ ﷺ جہاں قریشی سازشوں کو جان کر ان کی پیش بندی کر چکے تھے، لازمی بات ہے کہ آپ کو اس خطرناک عنصر کی چالاکیوں پر بھی نظر رکھنے کی ضرورت تھی۔[3]

یہودی عاد و ثمود کی طرح صرف تاریخی قوم نہیں تھی کہ ان کے حالات باعث عبرت ہوں، بلکہ جزیرہ نمائے عرب میں جہاں رسول اللہ ﷺ بھی رہائش پذیر تھے، یہود کی خاصی کثیر تعداد موجود تھی اور نبی ﷺ وہاں اسلامی مملکت کے قیام کے خواہاں تھے۔ یہودی نہ صرف اقتصادیات پر قابض تھے بلکہ وہ مضبوط نظریے کے بھی حامل تھے۔ ان کی ایک تاریخ تھی۔ علماء اور ان کے پیغمبروں کی وراثت کتب کی شکل میں موجود تھی، لہٰذا وہ اتنی قابلیت

» پہلے حاشیے میں ذکر ہو چکا ہے، فلسطین کے اندر بنی اسرائیل کی ریاست ''یہودیہ'' کی تباہی سلطنت فارس کے ہاتھوں عمل میں نہیں آئی تھی اور نہ بخت نصر نے کسی فارسی بادشاہ کے ایماء پر یہ مہم سر کی تھی بلکہ محقق تاریخ کے مطابق بخت نصر بابل (عراق) کا خود مختار حکمران تھا اور اس کی فتوحات کا دائرہ ایران سے مصر تک پھیلا ہوا تھا۔ بخت نصر نے یہودیہ (فلسطین) پر پہلا حملہ 597 ق م میں کیا تھا اور دوسری بار 86-587 ق م میں اس نے بیت المقدس اور ہیکل سلیمانی کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ (محسن فارانی)

1 أصول الفكر السياسي للتجاني عبدالقادر، ص: 152,151. 2 تاريخ ابن خلدون: 206/2.

3 أصول الفكر السياسي للتجاني عبدالقادر، ص: 152.

کے مالک تھے کہ اوصاف نبوت کو جانچ سکیں۔ معجزات کا طلب کرنا، رسولوں کی سچائی کے لیے شرائط لگانا اور رسالت کی صحت کی پڑتال کرنا وہ جانتے تھے۔ قریش نے جس طرح بیت اللہ کی حرمت کی آڑ میں اسلام کا مقابلہ کیا، یہود تورات کی آڑ میں قرآن کریم کا مقابلہ کرنا چاہتے تھے، لہٰذا نبی ﷺ جہاں قریش کے خلاف معرکہ آرائی کی توقع رکھتے تھے، وہیں یہود کے خلاف ایک لمبی معرکہ آرائی کو بھی متوقع سمجھتے تھے۔[1]

سورۂ بنی اسرائیل جس میں فارس، روم اور یہودیوں کی باہمی معرکہ آرائیوں کا تذکرہ ہے، اس کے بعد سورۂ روم نازل ہوئی جس میں تقریباً ایسا ہی موضوع بیان کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿الٓمّٓ ۝ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۝ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ڛ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ۭ وَيَوْمَىِٕذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ بِنَصْرِ اللّٰهِ ۭ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝ وَعْدَ اللّٰهِ ۭ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ښ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ۝﴾

’’الٓمّٓ، رومی مغلوب ہوگئے، قریب ترین سرزمین (شام وفلسطین) میں اور وہ اپنے مغلوب ہونے کے بعد جلد غالب ہوں گے، چند برسوں میں، اقتدار واختیار اللہ ہی کے لیے ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی اور اس (غلبے والے) دن مومن بھی (اپنی فتح پر) خوش ہوں گے، اللہ کی مدد سے، وہ جسے چاہتا ہے مدد دیتا ہے اور وہ نہایت غالب، بہت رحم کرنے والا ہے، (یہ) اللہ کا وعدہ ہے، اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے، وہ دنیاوی زندگی کے ظاہر کو جانتے ہیں اور وہ آخرت سے تو بالکل ہی غافل ہیں۔‘‘[2]

---

[1] أصول الفکر السیاسي للتجاني عبدالقادر، ص: 153. [2] الروم 30:1-7.

مشرکین مکہ چاہتے تھے کہ اہل فارس رومیوں پر غالب آئیں کیونکہ وہ بھی بت پرست تھے جبکہ مسلمان رومیوں کے اہل فارس پر غلبے کے خواہاں تھے کیونکہ وہ اہل کتاب تھے۔ مفسرین نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور بعض مشرکوں کے درمیان لگائی جانے والی شرط کا ذکر کیا ہے جو فارس اور روم کے درمیان پیش آنے والی جنگ کے بارے میں تھی اور قرآن کریم میں اہل فارس کی شکست اور رومیوں کی فتح یابی کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔[1]

ابن عطیہ رومیوں کے غلبے کے سلسلے میں ایک قابل توجہ نظریے کو بیان کرتے ہیں کہ دراصل مسلمانوں کی خوشی اس بنیاد پر تھی کہ رومی جوان کے لیے چھوٹے دشمن تھے اور ان کا مقابلہ بھی آسان تھا وہ فارس پر غالب آگئے تھے اور اہل فارس اگر غالب آجاتے تو مسلمانوں کے لیے ڈر اور خوف کے آثار زیادہ نمایاں ہوجاتے کیونکہ اس صورت میں دین اور شریعت کے غلبے کی امید ختم ہوجاتی اور تمام امتوں پر غلبہ خواب بن کر رہ جاتا۔ کافر بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ اس بڑی طاقت کی حمایت کریں جو اس دین کو جڑ سے اکھیڑ دے اور ان کے لیے سبب راحت بن سکے۔[2]

ابن عطیہ کی رائے کچھ اس طرح سے ہے کہ مسلمانوں کے لیے خوشی کا سبب یہ نہ تھا کہ رومی اہل کتاب تھے اور نہ یہ کہ قرآنی صداقت کے لیے ایک واضح دلیل ملے گی بلکہ سبب یہ تھا کہ عنقریب رومی غلبے سے اہل اسلام کو جو ابھی کمزور تھے فائدہ حاصل ہونے والا تھا۔ وہ اس طرح کہ مستقبل میں اہل روم سلطنت فارس کے ٹکڑے کریں گے اور ان کی شان وشوکت ختم کردیں گے اور جنگ جیت جائیں گے لیکن اس ٹکراؤ سے دونوں کی قوت کمزور ہوچکی ہوگی اور مسلمانوں کے لیے عالم کفر کے خلاف کامیابیوں کے دروازے کھلیں گے اور اسلام کے لیے ان دونوں قوتوں کو پامال کرتے ہوئے ایک عالمی طاقت کے طور پر ابھرنے کا موقع فراہم ہوگا۔[3]

---

1 تفسير الطبري: 12/21. 3 تفسير ابن عطية: 425/11. 3 أصول الفكر السياسي للتجاني عبدالقادر، ص: 158.

⑪ قصۂ معراج سے نماز کی اہمیت و مرتبہ پر بھی روشنی پڑتی ہے اور صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ نماز امت مسلمہ پر معراج کی رات فرض ہوئی۔ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''فرضیت کے اس انداز میں نماز کے شرف و مرتبے کا لحاظ رکھا گیا ہے۔''[1]

اسلامی دعوت کا پرچار کرنے والوں کو خصوصی طور پر نماز کی اہمیت اور اس کی حفاظت کے سلسلے میں معراج کی رات فرضیت نماز ضرور بیان کرنا چاہیے، نیز نماز کا تاکیدی حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری لمحات کی وصیت میں بھی موجود ہے۔

⑫ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ کیا آپ نے اپنے رب کو دیکھا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «نُورٌ أَنّٰى أَرَاهُ» ''وہ نور ہے، میں کیسے دیکھ سکتا ہوں؟''[2]

⑬ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معاشرے میں پیدا ہونے والی خطرناک بیماریوں اور معراج کی رات دکھائی جانے والی ان کی سزاؤں کا بھی تذکرہ کیا جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:

چغلی اور چغل خوروں کی سزا بیان کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ مردار کھا رہے تھے تو جبریل علیہ السلام نے بتایا کہ یہ لوگ لوگوں کے گوشت کھایا کرتے تھے (چغل خور تھے)۔[3]

یتیموں کا مال ہڑپ کرنے والوں کی سزا کے بارے میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ آدمی دیکھے جن کے بڑے بڑے ہونٹ تھے جیسے اونٹوں کے ہونٹ ہوتے ہیں، ان کے ہاتھوں میں بڑے بڑے آگ کے ٹکڑے تھے جیسے پتھر ہوں جنھیں وہ نگل لیتے، پھر وہ ان کی پشتوں سے خارج ہوجاتے۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے بتایا کہ یہ یتیموں کا مال بطور ظلم ہڑپ کر جاتے تھے۔[4]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی قوم دکھائی گئی جن کے پیٹ بڑے بڑے گھڑوں کی طرح تھے جن میں باہر ہی سے سانپ نظر آرہے تھے۔ جبریل علیہ السلام نے بتایا کہ یہ سود خور ہیں۔[5]

1 تفسیر ابن کثیر: 23/3. 2 صحیح مسلم، حدیث: 178. 3 مسند أحمد: 257/1، اس روایت کی سند ضعیف ہے۔ 4 السیرة النبویة لابن هشام: 47/2. 5 مسند أحمد: 353/2، و سنن ابن ماجه، حدیث: 2273.

زنا کرنے والے، زکاۃ ادا نہ کرنے والے، فتنہ ڈالنے والے خطیب اور امانت میں خیانت کرنے والے۔ بہت سی روایات میں ان جرائم اوران کی سزاؤں کا تذکرہ ملتا ہے۔[1]

مجاہدین کا ثواب: معراج کی رات آپ ﷺ ایک ایسی قوم سے گزرے کہ وہ ایک ہی دن میں بیج ڈالتے ہیں اور پھر اسی دن اس کی فصل بھی کاٹتے ہیں۔ ایک دفعہ کاٹنے کے بعد دوبارہ اسی طرح کٹائی کے قابل ہوجاتی تھی۔ جبریل علیہ السلام نے فرمایا: ''یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرنے والے ہیں۔ ان کی نیکیاں سات سوگنا تک بڑھائی جارہی ہیں اور جو بھی خرچ کریں گے اللہ تعالیٰ اس کا نعم البدل عطا فرمائیں گے۔''[2]

⑭ قصۂ معراج سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے مسجد اقصیٰ کی اہمیت مزید اجاگر ہوتی ہے۔ اس طرح انھوں نے اپنی ذمہ داری کا احساس بھی کیا۔ مسجد اقصیٰ کسی زمانے میں رومیوں کے زیر تسلط تھی، پھر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اسے آزادی ملی اور تقریباً پانچ صدیوں تک امن و امان کی نعمت سے مالا مال رہی، پھر 492ھ/1099ء میں صلیبیوں نے اس پر دوبارہ قبضہ کرلیا اور تقریباً ایک صدی تک فساد برپا کرتے رہے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں نے 583ھ/1187ء میں صلاح الدین ایوبی کی سرکردگی میں اسے آزاد کروالیا اور اب 1967ء سے یہودی اس پر قابض ہیں۔ مقام فکر یہ ہے کہ اسے یہودیوں کے پنجوں سے کیسے آزاد کرایا جاسکتا ہے![3]

1 مسند أحمد: 120/3 و 180 و 231 و 239، و مسند عبد بن حميد، حديث: 1222. 2 مسند البزار، حديث: 55، ومجمع الزوائد: 67/1-72، والترغيب والترهيب للمنذري، حديث: 1129.
3 السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 220.

حصہ 7

دعوت اسلام اور صحابہ کی ہجرت مدینہ

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً

''اور جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں پناہ لینے
کی بہت جگہ بھی پائے گا اور کشادگی بھی۔''

(النسآء 4:100)

باب 1

قبائل کو دعوت اور نصرت وحمایت کی طلب

مختلف قبائل کے پاس طلبِ امداد کے لیے جانا

جب رسول اللہ ﷺ طائف سے واپس تشریف لائے تو مختلف قبائل کے سامنے موسمی تہواروں میں اسلامی دعوت پیش کرنے لگے۔ آپ ﷺ ان سے پناہ اور مدد کے طلب گار ہوئے تاکہ لوگوں تک کلام اللہ پہنچایا جا سکے۔ نبی ﷺ مختلف تجارتی میلوں اور حج کے موسم میں دعوتی سرگرمیوں میں مصروف رہتے اور اپنا سیاسی و دعوتی پروگرام قبائل کے سامنے پیش کرتے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جو عرب کے انساب اور تاریخ سے اچھی طرح واقف تھے، آپ کی معیت میں ہوتے، یہ دونوں مل کر ہر قبیلے کے لیڈر اور سرداروں سے ملاقات کرتے، حضرت نبی ﷺ کی دعوت سے پہلے ابوبکر رضی اللہ عنہ ان سے سوال کرتے: ''تمھاری تعداد کتنی ہے؟ تمھاری قوت و شوکت کی بنیاد کیا ہے؟ نیز تمھاری جنگوں کا کیا حال ہے؟''[1]

علامہ مَقریزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ نے مختلف تہواروں میں قبائل اور شخصیات کے سامنے اسلامی دعوت پیش کی۔ ان قبائل میں بنو عامر، غسان، بنو فزارہ، بنو مُرّہ، بنو حنیفہ، بنو سُلَیم، بنو عَبس، بنو نَصر، ثعلبہ بن عُکابہ، کِندہ، کلب، بنو الحارث بن کعب اور بنو عذرہ شامل ہیں اور شخصیات میں سے قیس بن خَطیم اور ابو الحیسر انس بن ابی رافع شامل ہیں۔ علامہ واقدی رحمہ اللہ نے ان تمام قبائل کی تاریخ پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ یوں

[1] الأنساب للسمعاني: 36/1.

کہا جاسکتا ہے کہ آپ ﷺ سب سے پہلے قبیلہ کندہ کے پاس گئے اور انھیں اسلام کی طرف دعوت دی، پھر کلب، پھر بنو حنیفہ اور پھر بنو عامر کے پاس تشریف لے گئے اور ہر ایک سے یہی فرمایا:

«مَنْ رَّجُلٌ يَحْمِلُنِي إِلٰى قَوْمِهِ، فَيَمْنَعُنِي، حَتّٰى أُبَلِّغَ رِسَالَةَ رَبِّي فَإِنَّ قُرَيْشًا قَدْ مَنَعُونِي أَنْ أُبَلِّغَ رِسَالَةَ رَبِّي؟»

”کوئی ہے جو مجھے اپنی قوم کی طرف لے جائے اور میرا دفاع کرے تاکہ میں اپنے رب کا پیغام لوگوں تک پہنچا سکوں کیونکہ قریش نے مجھے میرے رب کا پیغام پہنچانے سے روک رکھا ہے۔“

ادھر ابولہب آپ ﷺ کے پیچھے پیچھے لوگوں سے کہتا کہ اس کی بات نہ سننا یہ (نعوذ باللّٰہ) جھوٹا ہے۔[1]

رسول اللہ ﷺ نے اس میدان میں شدید تکالیف برداشت کیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ جب اپنی دعوت پیش فرماتے تو کہتے:

«أَلَا رَجُلٌ يَحْمِلُنِي إِلٰى قَوْمِهِ؟ فَإِنَّ قُرَيْشًا قَدْ مَنَعُونِي أَنْ أُبَلِّغَ كَلَامَ رَبِّي»

”کیا ہے کوئی آدمی جو مجھے اپنی قوم کی طرف لے جائے؟ میری قوم قریش نے مجھے اپنے رب کا پیغام پہنچانے سے روک دیا ہے۔“[2]

اسی طرح آپ ﷺ مختلف قبائل کے پاس جاتے اور دعوت پیش کرتے رہے۔ وہ لوگ آپ ﷺ کی بات کو بڑے برے انداز سے رد کر دیتے اور تکلیف بھی پہنچاتے اور

1 مسند أحمد:3/493,492، وجامع الترمذي، حديث: 2925، السيرة النبوية لابن هشام: 2/65,64. 2 جامع الترمذي، حديث:2925، وسنن أبي داود، حديث:4734، وسنن ابن ماجه، حديث:201، و مسند أحمد:3/390.

کہتے: ''اس کی قوم اسے خوب جانتی ہے۔ جب اس نے اپنی قوم میں فساد برپا کردیا ہے تو وہ ہماری اصلاح کیسے کرسکتا ہے؟'' لہٰذا وہ آپ کی دعوت رد کردیتے۔ [1]

علاوہ ازیں وہ افواہیں جو قریش حُجّاج میں پھیلا دیا کرتے تھے، وہ بڑی عام ہو جاتیں، مثلاً: آپ کو صابی کہنا اور یہ کہ بنو ہاشم کا ایک لڑکا جسے وہم ہوگیا ہے کہ وہ نبی ہے وغیرہ وغیرہ، نعوذ باللہ۔ اور ایسے ہتھکنڈوں سے آپ کو زور و شور سے رد کردیا جاتا اور آپ کا دکھ دگنا ہو جاتا۔ [2]

نبی ﷺ نے کچھ ایسے مصائب بھی برداشت کیے جو سخت ترین تھے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی تاریخ اور امام طبرانی رحمہ اللہ نے المعجم الکبیر میں منیب بن مدرک بن منیب ازدی رضی اللہ عنہ سے، انھوں نے اپنے باپ مدرک سے اور پھر اپنے دادا منیب ازدی رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ میں نے زمانۂ جاہلیت میں آپ ﷺ کو کہتے ہوئے سنا: «يَا أَيُّهَا النَّاسُ! قُولُوا لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ تُفْلِحُوا» ''لوگو! لا الہ الا اللہ پڑھ لو، کامیاب ہو جاؤ گے۔'' مگر ان میں سے بعض نے آپ ﷺ کے چہرۂ انور پر تھوکنے کی جسارت کی، بعض نے آپ ﷺ پر مٹی ڈالی اور بعض نے برا بھلا کہا یہاں تک کہ زوال کا وقت ہوگیا۔ اسی دوران ایک بچی اپنے ہاتھ میں پانی کا پیالہ لے کر آئی اور اس نے آپ کے ہاتھ اور منہ کو دھویا تو آپ ﷺ نے فرمایا: «يَا بُنَيَّةُ! لَا تَخْشَيْ عَلٰى أَبِيكِ غَلْبَةً وَّ لَا ذِلَّةً» ''اے میری پیاری بیٹی! اپنے باپ پر (کفار کے) غلبے اور ذلت کا خوف نہ کھا۔'' میں نے پوچھا: ''یہ کون ہے؟'' لوگوں نے بتایا: ''یہ رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی زینب رضی اللہ عنہا ہیں'' اور وہ ایک خوب رو بچی تھیں۔ [3]

ایک طرف نبی ﷺ کو کفار کی طرف سے انکارِ دعوت کی تکلیف برداشت کرنا پڑتی تو دوسری طرف ابوجہل اور ابولہب باری باری آپ ﷺ کو اس وقت اذیت پہنچاتے جب

---

1 الدرر في اختصار المغازي والسير لابن عبدالبر، ص: 35، والسيرة النبوية لابن كثير: 185/2.
2 محنة المسلمين في العهد المكي للدكتور سليمان السويكت، ص: 53. 3 التاريخ الكبير للبخاري: 14/2/4، و المعجم الكبير للطبراني: 342/20، و مجمع الزوائد: 21/6.

آپ ﷺ موسمی میلوں اور مختلف تہواروں میں لوگوں کو دعوت پہنچانے میں مصروف ہوتے، اس طرح آپ ﷺ کو انتہائی زیادہ مشقت اٹھانا پڑتی۔

قبائل کو دعوت اور ابوجہل و مشرکین کے ہتھکنڈوں کا دفاع

قبائل سے رات کے اندھیرے میں ملاقات: نبی ﷺ اپنی اعلیٰ دانائی بروئے کار لاتے ہوئے رات کے اندھیرے میں قبائل کے پاس جانے لگے تاکہ آپ اور ان کے درمیان کوئی مشرک حائل نہ ہوسکے۔[1] یوں آپ مخالفانہ پروپیگنڈے سے جو آپ کی دعوتی مصروفیات کے وقت پھیلایا کرتے تھے، نجات پاگئے، چنانچہ آپ ﷺ نے رات کے اندھیرے میں اوس وخزرج کے قبائل سے ملاقات کی اور بیعت عقبہ اولیٰ اور ثانیہ کے اہم واقعات بھی رات کو پیش آئے۔[2]

رسول اللہ ﷺ کا اہل قبائل کی رہائش گاہوں میں تشریف لے جانا: نبی ﷺ قبیلہ کلب، بنوحنیفہ اور بنو عامر کے پاس ان کی رہائش گاہوں میں تشریف لے گئے۔[3] غرض یہ تھی کہ آپ قریش کی مخاصمت سے محفوظ رہیں، قبائل سے مناسب طریقے سے گفتگو کرسکیں اور قریش کی طرف سے کوئی پریشانی یا فساد انگیزی بھی آڑے نہ آئے۔

مددگاروں کو ساتھ رکھنا: قبائل کے ساتھ گفتگو میں بعض اوقات سیدنا ابوبکر اور سیدنا علی رضی اللہ عنہما آپ کے ساتھ ہوتے تاکہ لوگ یہ نہ خیال کریں کہ آپ اس میدان میں اکیلے ہیں اور آپ کا کوئی قریبی یا قبیلے کا اہم شخص آپ کے ساتھ نہیں ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ معرفتِ انساب میں مہارت رکھنے والے تھے،[4] چنانچہ ان کے توسط سے آپ ﷺ ہر قبیلے اور ہر بڑے سردار کے پاس پہنچتے اور ان میں سے اچھے قبیلے کا انتخاب کرکے اپنی دعوت پیش کرتے تاکہ وہ قبیلہ دعوتی ذمہ داریاں قبول کرنے پر آمادہ ہوجائے۔

1 تاريخ الإسلام للنجيب آبادي: 129/1. 2 السيرة النبوية لابن هشام: 44/2 و 52. 3 البداية والنهاية: 140/3. 4 السيرة النبوية للدكتور إبراهيم علي محمد أحمد، ص: 116.

آپ ﷺ کا ہر قبیلے سے حمایت کا وعدہ لینا: نبی ﷺ امن وتحفظ کے نقطۂ نظر سے ہر قبیلے کی قوت و اہمیت کے بارے میں سوال کرتے، پھر دعوت پیش کرتے اور حمایت کے طلب گار ہوتے کیونکہ اسلامی دعوت کی حفاظت کے لیے اس کی شدید ضرورت تھی۔ اور اس لیے بھی کہ یہ قبیلہ دعوت کے خلاف ہر شر اور باطل کا مقابلہ کر سکے۔ اور وہ اخلاقی اور مادی وسائل کا حامل بھی ہو، جنھیں دیکھ کر دشمن ڈر جائیں اور اسلامی دعوت کو پناہ حاصل ہو، اس کے پھیلنے کے اسباب فراہم ہوں اور راستے کی ہر رکاوٹ دور جائے۔ [1]

بنو عامر سے مذاکرات

رسول اللہ ﷺ نے ایک طے شدہ منصوبے کے تحت بنو عامر سے مذاکرات کرنے کا فیصلہ فرمایا۔ آپ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ بخوبی جانتے تھے کہ بنو عامر کے جنگجو بہت زیادہ ہیں اور ان کی اہمیت قریش اور بنو خزاعہ کی طرح قابل داد ہے بلکہ وہ ان پانچ قبائل میں سے تھے کہ نہ کبھی ان کی کوئی عورت لونڈی بنی، نہ ہی وہ کسی کے زیر نگین رہے اور نہ انھوں نے کبھی تاوان ادا کیا۔

نبی ﷺ یہ بھی جانتے تھے کہ قبیلہ بنو عامر اور بنو ثقیف پرانے دشمن تھے۔ اب جبکہ بنو ثقیف نے اندرون حجاز آپ ﷺ کی تکذیب کی تو آپ ﷺ نے انھیں بیرونی جانب سے گھیرنے اور بنو عامر بن صعصعہ کا تعاون حاصل کرنے کا پروگرام بنایا کیونکہ اگر آپ بنو عامر کے حلیف بن جاتے تو بنو ثقیف خطرے سے دوچار ہوتے اور ان کی مخالفت دم توڑ دیتی۔ [2]

سیرت نگار لکھتے ہیں کہ جب آپ ﷺ بنو عامر کے پاس آئے اور دعوت پیش کی تو ان میں سے بَیْحَرَہ بن فِراس نامی آدمی کہنے لگا: ”اللہ کی قسم! اگر یہ قریشی جوان میرے ہاتھ آجائے تو میں پورے عرب کو نگل جاؤں۔“ پھر وہ آپ سے یوں مخاطب ہوا: ”اگر ہم

1 السيرة النبوية للدكتور إبراهيم علي محمد أحمد، ص: 117,116. 2 أصول الفكر السياسي للتجاني عبدالقادر، ص: 182.

آپ کے تابع ہوجائیں اور اللہ آپ کو دشمنوں پر فتح عطا فرما دے تو کیا آپ کے بعد سرداری ہمیں مل سکتی ہے؟'' آپ ﷺ نے جواب دیا: «اَلْأَمْرُ لِلّٰہِ یَضَعُہُ حَیْثُ یَشَاءُ» ''یہ معاملہ اللہ کا ہے وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔'' اس پر وہ کہنے لگا: ''پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ کی خاطر ہم سارے عرب سے ٹکر لیں اور جب اللہ تعالیٰ آپ کو غالب کردے تو قیادت کسی اور کو مل جائے! ہمیں اس دعوت کی کوئی ضرورت نہیں۔'' یوں انھوں نے دعوتِ حق کا انکار کردیا۔ [1]

بنوشیبان سے مذاکرات

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ اللہ کے حکم کے مطابق قبائل عرب کے سامنے دعوت پیش کرنے کی غرض سے روانہ ہوئے تو میں اور ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی آپ ﷺ کے ہمراہ تھے۔ ہم ایک ایسی مجلس میں پہنچے جو سکون اور وقار کی حامل تھی۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر سلام کیا اور پوچھا: ''تم کون لوگ ہو؟'' جواب ملا: ''شیبان بن ثعلبہ سے ہیں!'' ابوبکر رضی اللہ عنہ واپس آئے اور کہا: ''اللہ کے رسول! آپ پر میرے ماں باپ قربان! یہ انتہائی قابل قدر لوگ ہیں۔''

ان میں پیکر حسن اور زبان آور مفروق نامی آدمی بھی موجود تھا۔ اس کے گیسو سینے پر لٹک رہے تھے۔ وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''تمھاری تعداد کتنی ہے؟'' اس نے کہا: ''ہم ہیں تو ایک ہزار لیکن کوئی ہم پر غالب نہیں آسکتا۔'' ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سوال کیا: ''تمھاری قوت و طاقت کا راز کیا ہے؟'' اس نے جواب دیا: ''ہم سب سے زیادہ غضبناک حالت جنگ میں ہوتے ہیں اور ہماری لڑائی قابل دید ہوتی ہے۔ ہم اپنی اولاد کی حفاظت سے زیادہ گردنیں کٹوانے پر اور دودھ والی اونٹنی سے زیادہ اسلحے پر

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 66/2، ودلائل النبوة لأبي نعيم، حديث: 215، و تاريخ الطبري: 351,350/2، والطبقات الكبرىٰ لابن سعد: 216/1 مختصراً.

توجہ دیتے ہیں اور مدد جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے کبھی ہمارے حق میں اور کبھی مخالف کے حق میں ہوتی ہے۔ تم شاید قریش سے تعلق رکھتے ہو۔'' ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اگر تمھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کوئی خبر پہنچی ہے تو وہ رسول یہ ہیں۔'' مفروق نے کہا: کہ آپ کی دعوت کیا ہے؟ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم گویا ہوئے: ''میں تمھیں دعوت دیتا ہوں کہ تم اللہ کے ایک ہونے اور اس کا کوئی شریک نہ ہونے کو مان لو اور مجھے اللہ کا بندہ و رسول تسلیم کرلو اور مجھے تمھاری پناہ اور مدد کی ضرورت ہے کیونکہ قریش نے اللہ کے خلاف محاذ آرائی کی ہے، اس کے رسول کی تکذیب اور حق سے منہ موڑتے ہوئے باطل سے تعلقات قائم کیے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ بے پروا اور تعریف کے لائق ہے۔'' مفروق نے کہا کہ اپنی دعوت کے مزید خدوخال بیان کیجیے اور اللہ کی قسم! آپ کے اس کلام سے بہتر میں نے کوئی کلام نہیں سنا۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کلام اللہ کی تلاوت فرمائی:

﴿قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾

''کہہ دیجیے: آؤ میں پڑھ کر سناتا ہوں جو کچھ تمھارے رب نے تم پر حرام کیا ہے، یہ کہ تم اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور اپنی اولاد کو تنگ دستی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم تمھیں بھی اور انھیں بھی رزق دیتے ہیں اور بے حیائی کے کاموں کے قریب نہ جاؤ، خواہ وہ ظاہر ہوں یا چھپے ہوئے ہوں اور کسی ایسی جان کو قتل مت کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہو، سوائے اس کے جس کا قتل برحق ہو، ان ساری باتوں کی اللہ نے تمھیں تاکید کی ہے تاکہ تم عقل سے کام لو۔''[1]

[1] الأنعام 151:6.

مفروق نے کہا: ''اللہ کی قسم! آپ نے اچھے اخلاق اور بہترین اعمال کی دعوت دی ہے۔ قریش نے آپ کی ناجائز تکذیب اور آپ کے خلاف بے بنیاد محاذ آرائی کی ہے۔''

پھر مفروق نے ہانی بن قَبِیصَہ کی طرف بات بڑھاتے ہوئے کہا کہ یہ ہمارے بزرگ اور مذہبی پیشوا ہیں۔ وہ بولا: ''اے قریشی بھائی! میں نے تمھاری گفتگو سنی۔ میری رائے کے مطابق ہماری اس مختصر گفتگو کے بعد جس کی کوئی ابتدا اور انتہا نہ تھی ہمارا اپنا دین چھوڑ کر تمھاری اتباع کرنا ضعفِ رائے اور عاقبت نا اندیشی سمجھا جائے گا۔ جلد بازی سے لغزش پیدا ہوتی ہے۔ ہم اپنے قبیلے والوں کی مرضی کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتے۔ آپ بھی بے شک واپس چلے جائیں اور ہم بھی واپس چلتے ہیں اور پھر ہم مشورہ اور مزید غور کریں گے۔''

بعدازاں ہانی بن قَبِیصَہ نے بات آگے مُثنّیٰ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: ''یہ ہمارے بزرگ اور جنگی کمانڈر ہیں۔'' حضرت مثنی جو بعد میں مسلمان ہو گئے تھے انھوں نے کہا: ''اے قریشی بھائی! میں نے آپ کی بات سن لی ہے۔ میرا جواب بھی وہی ہے جو ہانی بن قَبِیصَہ کا تھا کہ اپنا دین چھوڑنا اور آپ کے دین کی اتباع کرنا جلد بازی ہے اور جنگی نقطۂ نظر سے ہم تو دو حدوں (صریان) کے درمیان بستے ہیں۔ ایک یمامہ اور دوسرا سمامہ!''

آپ ﷺ نے پوچھا: «مَا هٰذَانِ الصَّرْيَانِ» ''یہ صریان کیا ہیں؟'' مثنی نے کہا: ''ایک طرف کسریٰ کے دریا (دجلہ وفرات اور ان کی شاخیں) اور دوسری طرف عرب کے چشمے۔ انہارِ کسریٰ (عراق) کی صورت حال یہ ہے کہ کسریٰ کی مخالفت کرنے والا سزا پاتا ہے اور اس کا عذر ناقابل قبول ٹھہرتا ہے اور ہم نے کسریٰ سے یہ معاہدہ کر رکھا ہے کہ ہم اپنی طرف سے کوئی نیا کام نہیں کریں گے اور نہ کسی ایسے آدمی کو پناہ دیں گے جو نئے خیالات کا پرچار کرتا ہو۔ میرے خیال میں آپ کی دعوت بادشاہوں کو پسند نہیں آئے گی۔ ہاں! اگر آپ چاہیں تو عرب والوں سے ہم آپ کو پناہ دے سکتے اور آپ کی مدد کر سکتے ہیں۔''

نبی ﷺ نے فرمایا:

«مَا أَسَأْتُمْ فِي الرَّدِّ إِذْ أَفْصَحْتُمْ بِالصِّدْقِ، وَ إِنَّ دِينَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ لَنْ يَنْصُرَهُ إِلَّا مَنْ حَاطَهُ مِنْ جَمِيعِ جَوَانِبِهِ، أَرَأَيْتُمْ إِنْ لَّمْ تَلْبَثُوا إِلَّا قَلِيلًا حَتّٰى يُوَرِّثَكُمُ اللّٰهُ تَعَالٰى أَرْضَهُمْ وَ دِيَارَهُمْ وَ يَفْرِشَكُمْ نِسَائَهُمْ، أَتُسَبِّحُونَ اللّٰهَ وَ تُقَدِّسُونَهُ»

''تم نے سچ بولا اور کوئی برا جواب نہیں دیا۔ بے شک اللہ کے دین کا مددگار وہی ہوسکتا ہے جو ہر پہلو سے اس کی حفاظت کرے۔ کیا تم یہ نہیں خیال کرتے کہ تھوڑے ہی عرصے میں اللہ تمھیں ان (اہل فارس) کی سرزمین اور ان کے گھروں کا وارث بنادے گا اور ان کی عورتیں تمھاری لونڈیاں ہوں گی۔ کیا تم اپنے اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس نہیں کرتے؟''

نعمان بن شریک نے فوراً کہا: ''اے اللہ! تسبیح و تقدیس سب تیرے لیے ہے۔''[1]

درس وعبرت

رسول اللہ ﷺ نے عمائدین قبائل سے جو تعاون و مدد طلب فرمائی وہ مخصوص خصوصیات کی حامل اور مندرجہ ذیل نکات پر مشتمل تھی:

① نبی ﷺ کے چچا ابو طالب جو آپ کی حمایت ونصرت کرتے تھے، ان کی وفات کے بعد آپ ﷺ نے بیرون مکہ سے حمایت ونصرت طلب کی کیونکہ اس دوران قریش کی طرف سے ایذا رسانی میں پھر شدت آگئی تھی۔ بیرونی تعاون حاصل کرنے کا مقصد یہ تھا کہ حاملین دعوت اپنی دعوت پھیلانے میں جلد از جلد کامیاب ہوں اور لوگ زیادہ سے زیادہ اسلامی تعلیمات اپنے دل و دماغ میں اتار سکیں کیونکہ سختی، دباؤ اور ڈر کی فضا میں یہ امر ناممکن تھا۔

② نبی ﷺ کا قبائل سے مدد طلب کرنا اللہ تعالیٰ کے حکم سے تھا اور یہ آپ کی ذاتی سوچ نہیں

[1] دلائل النبوة لأبي نعيم، حديث: 214، البداية والنهاية:3/142-145، و سبل الهدىٰ والرشاد للصالحي:2/597,596.

تھی بلکہ یہ مکہ میں دعوت کے راستے میں پیش آمدہ حالات کا تقاضا تھا۔

③ رسول اللہ ﷺ نے صرف قبائلی سرداروں اور صاحب رتبہ افراد سے مدد طلب کی کیونکہ ان کے پیروکاران کی بات سنتے اور ان کے فرمانبردار تھے اور وہ لوگ آپ کی حمایت اور دعوت اسلامی کے پھیلاؤ میں مددگار بھی ثابت ہو سکتے تھے۔

④ جو لوگ دین اسلام کی نصرت و حمایت کے عوض ولی عہدی کی ضمانت کے طلب گار تھے، نبی ﷺ نے انھیں ایسی ضمانت دینے سے انکار کر دیا کیونکہ یہ اسلامی دعوت تو اللہ کی طرف دعوت ہے اور اس کی بنیادی شرط یہ ہے کہ جو شخص اسلام پر ایمان لائے اور اس کی مدد کرے، اسے اخلاص اور اللہ کی رضا کا طالب ہونا چاہیے اور یہی دو مقاصد ایسے ہیں جن کی خاطر ہر قسم کی مدد اور قربانی پیش کی جانی چاہیے، نہ کہ مطمح نظر حصول اقتدار یا سرداری کا شوق ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی چیز سے وابستہ مقصد ہی انسان میں اس کے حصول کا جذبہ پیدا کرتا ہے، چنانچہ یہ ضروری ہے کہ نصرت دین کے مقصد کے پیچھے کوئی مادی جذبہ کارفرما نہ ہو اور دعوتِ اسلامی کی مستقل تائید، ہر قسم کے انحراف سے بچ کر اس کا تحفظ اور ہر ممکن مدد اور اس کی اشاعت کے لیے ہر قربانی پیش کرنے کا جذبہ کسی مادی غرض سے آلودہ نہ ہو۔[1] اگر اس کی غرض طلبِ جاہ ہو تو یہ خرابیِ نیت کی نمایاں علامت ہے۔[2]

یحییٰ بن معاذ رازی فرماتے ہیں: ”جو شخص دعوت دین کی آڑ میں سرداری کا خواہش مند ہو وہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔“[3]

⑤ نبی ﷺ قبائلی سرداروں کی حمایت حاصل کرنے میں یہ امر ملحوظ رکھتے تھے کہ وہ ایسے معاہدات میں شریک نہ ہوں جن کی شرائط دعوت دین کے اصولوں کے منافی ہوں اور بعد میں ان سے خلاصی ممکن نہ ہو کیونکہ اس قسم کے سرداروں کی طرف سے دعوتِ دین کی مشروط حمایت کی وجہ سے ان بیرونی طاقتوں کی طرف سے خطرات لاحق ہو سکتے تھے جن سے

---

1 الجهاد والقتال لمحمد خير هيكل: 411/1. 2 وقفات تربوية من السيرة النبوية لعبد الحميد البلالي، ص: 72. 3 صفة الصفوة لابن الجوزي: 94/4.

ان کے معاہدے تھے۔ اور وہ طاقتیں اسلامی مقاصد کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی تھیں۔ [1]

اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو رسول اللہ ﷺ کے بنوشیبان سے مذاکرات ناکام ہو گئے تھے کیونکہ وہ کسریٰ کے خلاف جنگ کے حامی نہ تھے۔ بالفرض اگر کسریٰ کا لشکر آپ ﷺ اور آپ کے اصحاب پر حملہ آور ہوتا تو بنوشیبان ان سے معاہدات کے پیش نظر آپ ﷺ کی مدد سے انکاری ہوتے، لہٰذا نبی ﷺ کو اس جزوی اور مشروط حمایت کی ضرورت نہ تھی کیونکہ اس سے تکمیل مقاصد میں رکاوٹ پیدا ہوتی۔ [2]

⑥ ''بے شک اللہ کے دین کا مددگار وہی ہوسکتا ہے جو ہر پہلو سے اس کی حفاظت کرے۔''

نبی ﷺ نے مُثنّٰی بن حارثہ کو یہ جواب اس وقت دیا جب انھوں نے اہل فارس کے بجائے صرف اہل عرب کے خلاف آپ کی حمایت کا ارادہ ظاہر کیا۔ سیاسی امور میں درک رکھنے والا کوئی بھی شخص آپ ﷺ کی اس بے مثال دور اندیشی کو بخوبی محسوس کرسکتا ہے۔ [3]

⑦ بنوشیبان کے ساتھ مذاکرات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اچھے خصائل، عمدہ اخلاق اور مردانگی کے حامل تھے، انھوں نے نبی ﷺ کی بے حد تعظیم کی اور آپ نے وضاحت سے اپنا مدعا بیان فرمایا۔ ان لوگوں نے اپنی محدود حمایت کے سلسلے میں اپنی مجبوری بیان کی اور کہا کہ ایسی دعوت کو بادشاہ پسند نہیں کرتے۔

بعدازاں تقریباً دس سال بعد ان کے دل نور اسلام سے منور ہوئے اور سب سے پہلے بنوشیبان ہی ایرانی لشکروں کے سامنے صف آراء ہوئے۔ ان کے جنگجو رہنما مُثنّٰی بن حارثہ شیبانی رضی اللہ عنہ ہی تھے جنھوں نے قبولِ اسلام کے بعد خلافت صدیقی میں سرزمین عراق میں فتوحات کا سہرا اپنے سر سجایا۔ [4]

کل کے بنوشیبان جو اہل فارس سے خائف نظر آتے تھے آج شاہانِ فارس کے بڑے

[1] الجهاد والقتال لمحمد خير هيكل: 412/1. [2] التحالف السياسي في الإسلام للدكتور الغضبان، ص: 53. [3] التحالف السياسي في الإسلام للدكتور الغضبان، ص: 64. [4] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 20/2.

بڑے لشکروں کے سامنے ڈٹ گئے۔ یہی لوگ تھے جنھوں نے نبی ﷺ کی دعوت کو رد کر دیا تھا مبادا انھیں سلطنت فارس سے جنگ کرنی پڑے جس کے متعلق انھوں نے کبھی سوچا تک نہ تھا۔ ان تاریخی حقائق سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دین کتنا عظیم ہے اور اس کے حاملین کو کس طرح اس زمین کی خلافت و سیادت نصیب ہوئی اور آخرت میں انھیں ہمیشہ رہنے والی نعمتیں بھی حاصل ہوں گی۔ [1]

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي: 69/3.

باب 2

کاروانِ خیر و برکت اور نورانی دستے

حضرت جابر بن عبد اللہ انصاری رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (اعلان نبوت کے بعد) مکہ معظمہ میں دس سال تک اس طرح اقامت گزیں رہے کہ آپ لوگوں کے گھروں اور عُکاظ، مَجَنہ اور مِنیٰ کے تجارتی میلوں میں ان کے پاس جاتے اور کہتے:

«مَنْ يُؤْوِينِي، مَنْ يَنْصُرُنِي، حَتّٰى أُبَلِّغَ رِسَالَةَ رَبِّي وَلَهُ الْجَنَّةُ؟»

''کوئی ہے جو مجھے پناہ دے اور میری مدد کرے تاکہ میں اپنے رب کا پیغام لوگوں تک پہنچا سکوں؟ اور اس کے لیے جنت ہے۔''

جب یمن یا مُضَر قبیلے سے کوئی آدمی رختِ سفر باندھتا تو اس کی قوم کے لوگ آکر کہتے: ''قریشی جوان سے بچنا، کہیں وہ تمھیں فتنے میں مبتلا نہ کردے۔'' اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کے لوگوں میں جا رہے ہوتے تو وہ انگلیوں سے آپ کی طرف اشارے کرتے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پھر اللہ تعالیٰ نے ہمیں یثرب سے آپ کے پاس (مکہ) بھیج دیا، ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پشتیبان بن گئے اور آپ کی تصدیق بھی کی۔ اب ہمارے قبائل سے انفرادی طور پر لوگ آتے، آپ پر ایمان لاتے، قرآن سنتے، پھر جب واپس گھر آتے تو گھر والے بھی مسلمان ہو جاتے یہاں تک کہ انصار کا کوئی محلہ ایسا نہ رہا جس میں مسلمانوں کی ایک قابل قدر جماعت تیار نہ ہوگئی ہو جو کھل کر اسلام کا اظہار کرتے تھے۔[1]

[1] مسند أحمد: 3/322,323 و339,340.

انصار کے ساتھ ابتدائی تعلقات

سُوَید بن صامت رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام: نبی ﷺ اپنی عادت مبارکہ کے مطابق مکہ میں آنے والے ہر فرد سے اس کا نام و مرتبہ دریافت کرتے، پھر اسے اللہ کی طرف بلاتے اور اس کے سامنے دعوت حق پیش کرتے۔ ایک دفعہ سُوَید بن صامت جو بنو عَمرو بن عوف قبیلے سے تھے، حج یا عمرہ کی غرض سے مکہ آئے۔ سُوَید کو ان کی قوم نے مضبوط جسم، عمدہ اشعار اور شرف ونسب کی وجہ سے ''مرد کامل'' کا خطاب دے رکھا تھا۔ جب نبی ﷺ کو علم ہوا تو آپ اس کے پاس آئے اور دعوت پیش کی۔ سُوَید بولے: ''شاید جو کچھ آپ کے پاس ہے وہ میرے پاس بھی ہے۔''

نبی ﷺ نے پوچھا: «وَمَا الَّذِي مَعَكَ؟» ''تیرے پاس کیا ہے؟''

تو سوید بولے: ''میرے پاس حکمت لقمان ہے۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: «أَعْرِضْهَا عَلَيَّ» ''میرے سامنے بیان کرو۔'' جب سُوَید نے بات ختم کی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ هٰذَا الْكَلَامَ حَسَنٌ، وَّالَّذِي مَعِي أَفْضَلُ مِنْ هٰذَا، قُرْآنٌ أَنْزَلَهُ اللّٰهُ عَلَيَّ، وَ هُوَ هُدًى وَّ نُورٌ»

''یہ کلام منجملہ اچھا ہے لیکن جو میرے پاس ہے وہ اس سے کہیں افضل و بہتر ہے۔ وہ قرآن ہے جو ہدایت اور نور کی شکل میں مجھ پر اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے۔''

پھر آپ ﷺ نے قرآن کریم کا کچھ حصہ اسے پڑھ کر سنایا اور اسلام کی دعوت دی تو اس نے فوراً کہا: ''یہ بہت عمدہ کلام ہے۔''

پھر جب سوید واپس اپنی قوم کے پاس مدینہ پہنچے تو جنگِ بعاث میں مارے گئے۔ کچھ لوگوں نے اس بات کی گواہی دی کہ وہ ہمارے خیال میں مسلمان ہو چکا تھا۔[1]

---

1 السيرة النبوية لابن هشام: 2/67-69، و دلائل النبوة للبيهقي: 2/418، و تاريخ الطبري: 2/351,352.

بہر حال سوید بن صامت کا اپنی قوم کو دعوتِ اسلام دینا ثابت نہیں۔ [1]

اِیاس بن معاذ رضی اللہ عنہ اسلام کی چھاؤں میں

ایک دفعہ ابوالحیسر انس بن رافع نامی شخص مکہ گیا اور اس کے ساتھ بنو عبدالاشہل کے کچھ نوجوان بھی تھے۔ ان میں اِیاس بن معاذ بھی تھے جو دراصل خزرج کے خلاف قریش کے حلیف بنانا چاہتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کو جب علم ہوا تو آپ ان کے ہاں تشریف لے گئے، ان کے پاس بیٹھے اور کہا: «هَلْ لَّكُمْ فِي خَيْرٍ مِّمَّا جِئْتُمْ لَهُ؟» ''اگر تمھیں اس مقصد سے بہتر چیز مل جائے جسے حاصل کرنے کے لیے تم یہاں آئے ہو تو کیسا ہے؟'' انھوں نے پوچھا: ''وہ کیا ہے؟'' آپ ﷺ گویا ہوئے:

«أَنَا رَسُولُ اللّٰهِ، بَعَثَنِي إِلَى الْعِبَادِ، أَدْعُوهُمْ إِلٰى أَنْ يَّعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا يُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا، وَّ أُنْزِلَ عَلَيَّ الْكِتَابُ»

''میں اللہ کا رسول ہوں۔ مجھے اللہ نے لوگوں کی طرف بھیجا ہے تاکہ انھیں اس بات کی طرف بلاؤں کہ وہ ایک اللہ کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور مجھ پر کتاب بھی نازل کی گئی ہے۔''

پھر آپ ﷺ نے اسلام کی وضاحت فرمائی اور انھیں قرآن بھی پڑھ کر سنایا۔ اِیاس بن معاذ جو ایک نوجوان تھے، کہنے لگے: ''یہ تو واقعتاً اس مقصد سے بہتر ہے جس کے لیے تم یہاں آئے ہو۔'' اس پر ابوالحیسر نے مٹی کی ایک مٹھی بھری اور اِیاس کے منہ پر دے ماری، پھر کہا: ''ہمیں چھوڑ دیجیے ہم تو کسی اور کام سے آئے ہیں۔'' یوں اِیاس خاموش ہوگئے اور اللہ کے رسول وہاں سے اٹھ گئے اور وہ لوگ مدینہ لوٹ گئے۔ وہاں اوس و خزرج کے درمیان جنگ بعاث جاری تھی۔ اس جنگ میں اِیاس مارے گئے۔ ان کی قوم کے لوگ کہا کرتے تھے کہ وہ ہمیشہ تکبیر و تحمید اور تسبیح و تہلیل میں مصروف رہتے تھے یہاں تک کہ اسی

1 السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 195/1.

حالت میں فوت ہوئے اور وہ اس کے اسلام میں شک نہیں کرتے تھے۔ دراصل جس مجلس میں اِیاس نے آپ ﷺ سے قرآن سنا وہ اسی وقت اسلام کی حقانیت سمجھ چکے تھے۔ [1]

انصار میں اسلام کی ابتدا

نبی ﷺ کی وفد خزرج سے پہلی نتیجہ خیز ملاقات موسم حج میں منیٰ کی گھاٹی کے قریب ہوئی۔ آپ ﷺ نے ان سے سوال کیا: «مَنْ أَنْتُمْ؟» ''تم کون ہو؟'' انھوں نے جواب دیا: ''ہم خزرج کی ایک جماعت ہیں۔'' آپ ﷺ نے پھر سوال کیا: «أَمِنْ مَّوَالِي يَهُودَ؟» ''کیا تم یہود کے حلیف ہو؟'' انھوں نے ہاں میں جواب دیا۔ تب رسول اللہ ﷺ نے انھیں بیٹھنے اور بات سننے کو کہا۔ وہ بیٹھ گئے تو آپ ﷺ نے انھیں ایک اللہ کی عبادت کی طرف بلایا، اسلام پیش کیا اور قرآن کریم پڑھ کر سنایا۔ [2]

رسول اللہ ﷺ نے جب اس گروہ کو دعوت پیش کی تو وہ آپس میں گفتگو کرنے لگے: ''اے قوم! اللہ کی قسم! تم جانتے ہو کہ یہ وہی نبی ہے جس کا نام لے کر یہود تمھیں ڈراتے ہیں۔ کیوں نہ ہو کہ تم ان سے پہلے اس پر ایمان لے آؤ۔'' لہٰذا وہ مسلمان ہو گئے۔ انھوں نے آپ کا پیش کردہ دین مکمل طور پر قبول کر لیا اور کہا: ''ہم اپنے پیچھے ایک ایسی قوم چھوڑ کر آئے ہیں کہ باہمی عداوت اور جنگ کے سلسلے میں اس جیسی کوئی اور قوم نہیں، ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی برکت سے ان میں اتفاق پیدا کر دے۔ ہم ان کے پاس جا کر آپ کی دعوت پیش کریں گے اور جو دین ہم نے اختیار کیا ان کے سامنے بھی بیان کریں گے۔ اگر اللہ نے ان سب کو آپ کی رسالت پر جمع کر دیا تو آپ کی بہت زیادہ قدر افزائی ہو گی۔'' آخر کار وہ ایمان باللہ اور تصدیقِ رسالت کے ساتھ اپنے وطن روانہ ہو گئے۔ [3]

[1] السيرة النبوية لابن هشام:2/70,69، و مسند أحمد:5/427، و المعجم الكبير للطبراني، حديث:805. [2] السيرة النبوية لابن هشام:2/71,70، والطبقات الكبرٰى لابن سعد:1/219,218، ودلائل النبوة للبيهقي:2/433-435، وفقه السيرة للألباني:1/146. [3] البداية والنهاية:3/149,148.

مدینہ طیبہ کا یہ گروہ چھ اشخاص پر مشتمل تھا: ابو امامہ اَسْعَد بن زرارہ اور عوف بن حارث بنونجار سے تھے، علاوہ ازیں رافع بن مالک، قُطْبہ بن عامر، عُقْبہ بن عامر اور جابر بن عبداللہ بن رئاب رضی اللہ عنہم تھے۔[1]

حسب وعدہ جب وہ یثرب (مدینہ) میں اپنی قوم کے پاس پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ کیا اور دعوت اسلام پیش کی۔ یوں آہستہ آہستہ مدینے میں اسلام کا چرچا ہونے لگا اور تقریباً ہر محلے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر خیر ہونے لگا۔[2]

یثرب سے آنے والا یہ ایمان و خیر کا ہراول دستہ تھا جو نہ صرف ایمان لایا بلکہ انھوں نے تہیہ کرلیا کہ اپنی قوم کو بھی اپنے ساتھ شامل کریں گے۔ انھوں نے دین اسلام کے ساتھ وفاداری کا ثبوت دیا۔ وہ مدینہ واپس پہنچتے ہی دعوتِ دین میں سرگرم ہو گئے۔ لوگوں اور اپنے اہل خانہ وعزیز و اقارب کے سامنے پیغامِ ہدایت پیش کیا اور اب مدینے کے ہر گھر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہونے لگا۔ یقیناً جب اللہ چاہے تو قوم کی تاریخ میں ایک فیصلہ کن موڑ آن پہنچتا ہے۔ اب مذکورہ لوگ بظاہر اتفاقاً آپ سے ملے لیکن حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے اس کا انتظام فرمایا تھا تاکہ ایک نیا چشمۂ خیر جاری ہو، تاریخ کا دھارا بدلے اور پتھروں کی عبادت سے خلاصی کا وقت آن پہنچے۔ درحقیقت یہ تاریخ عالم کا ایک انتہائی اہم موڑ ثابت ہوا اور زندگی اندھیروں سے نکل کر روشنیوں میں پہنچ گئی۔ یہ تو سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا کہ تھوڑے ہی عرصے میں یہ متعصب بت پرست دعوت اسلامی کے مددگار، حق کے مخلص جاں نثار اور علانیہ دعوت کے پیامبر بن جائیں گے۔ وہ اپنی قوم کے پاس پہنچے، ان کے دلوں اور چہروں پر نور ہی نور تھا اور وہ ایک روشن عقیدے کے حامل ہو چکے تھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مشیّت تھی کہ دعوت اسلامی کو ایک زرخیز زمین اور محفوظ پناہ گاہ مل گئی۔

اب قحط سالی کا وہ دور، جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نیزوں کی انیوں پر مسلسل کشمکش میں رہ

---

[1] شرح المواهب للزرقاني:361/1. [2] البداية والنهاية:147/3.

کر حمایت طلب کرنے کے لیے قبائل کے چکر لگاتے ہوئے گزارا تھا، بدل چکا تھا۔ اب اسلام کو انتہائی طاقتور اور شجاعت سے بھرپور لشکر میسر آنے والا تھا۔ حق اور باطل کا ٹکراؤ ہونے والا تھا تاکہ گئے دنوں کی تلافی ممکن ہو اور بہتر انجام بلاشبہ متقین کے لیے ہوتا ہے۔ آج کے بعد مکہ معظمہ میں خیر اور بھلائی کے قافلے اور نورانی ہراول دستے اترنے والے تھے جنھیں اللہ تعالیٰ نے انسانی فلاح کے لیے منتخب فرمالیا تھا تاکہ وہ ہدایت پاسکیں، چشمہ نور سے سیراب ہوں اور جب یثرب لوٹیں تو خیر اور نور کے حامل ہوں۔ [1]

یاد رہے کہ اس ملاقات میں خزرج کے لوگ صرف مسلمان ہوئے لیکن بیعت نہ کی [2] کیونکہ یہ ایک چھوٹی جماعت تھی جو اسلام کے پیغام کے مخلص مبلغ تو بن گئے لیکن انھوں نے مدینہ میں اپنے قبائل سے مشورے کے بغیر کوئی معاہدہ کرنا ابھی مناسب نہ سمجھا۔ [3]

پہلی بیعت عقبہ

خزرج والوں سے پہلی ملاقات کے ایک سال بعد موسم حج میں انصار کے بارہ آدمی آکر نبی ﷺ سے عقبہ (گھاٹی) میں ملے اور آپ کی بیعت کی۔ ان میں دس خزرج اور دو اوس سے تعلق رکھتے تھے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ پچھلے سال مسلمان ہونے والے خزرجی دعوتی میدان میں سرگرم ثابت ہوئے۔ انھوں نے نہ صرف اپنے قبیلے کو دعوت پیش کی بلکہ اپنے مخالف قبیلے کے کچھ آدمیوں کو بھی اسلام کی طرف مائل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ ان کی یہ کاوش اوس و خزرج کے درمیان الفت و محبت کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور اس طرح پہلی بیعت عقبہ عمل میں آئی۔ [4]

حضرت عبادہ بن صامت خزرجی رضی اللہ عنہ اس بیعت کے بارے میں اظہار خیال کرتے

1 أضواء على الهجرة لتوفيق محمد سبع، ص:274,273. 2 هجرة الرسول ﷺ و صحابته لأحمد عبدالغني، ص: 143. 3 السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 197/1. 4 السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 197/1.

ہیں: ''میں اس بیعت میں شامل تھا اور ہم بارہ افراد تھے جنھوں نے بیعۃ النساء (یعنی انھی شرائط پر جن پر رسول اللہ ﷺ نے بعد میں عورتوں سے بیعت لی تھی) پر بیعت کی اور یہ واقعہ ہم پر جہاد فرض ہونے سے پہلے کا ہے، بہر حال ہم نے شرک نہ کرنے اور چوری، زنا اور اولاد کے ناحق قتل سے باز رہنے پر بیعت کی، نیز از خود گھڑ کر کوئی بہتان نہ لگانا اور بھلی بات میں اللہ کی نافرمانی نہ کرنا بھی اس بیعت کا حصہ تھا، پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

«فَمَنْ وَفٰى مِنْكُمْ فَأَجْرُهُ عَلَى اللّٰهِ، وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا فَعُوقِبَ فِي الدُّنْيَا فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهُ، وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا ثُمَّ سَتَرَهُ اللّٰهُ فَهُوَ إِلَى اللّٰهِ، إِنْ شَاءَ عَفَا عَنْهُ وَ إِنْ شَاءَ عَاقَبَهُ»

''اگر تم اس معاہدے کی پاسداری کرو تو تمھارا اجر اللہ پر ہے۔ اور اگر کوئی ان میں سے کسی بات کا ارتکاب کر بیٹھے اور اسے دنیا میں سزا مل جائے تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے اور جو کوئی ان میں سے کسی کا ارتکاب کرے، پھر اللہ دنیا میں اس کی پردہ پوشی فرمائے تو اس کا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے، چاہے تو بخش دے اور چاہے تو عذاب دے۔''[1]

مذکورہ دفعات دراصل وہی دفعات تھیں جن پر رسول اللہ ﷺ نے بعد ازاں عورتوں سے بیعت لی، اس لیے اس بیعت کو ''بیعۃ النساء'' کہا گیا۔[2]

اسلام کی بیعت کرنے والے ان پاکیزہ نفوس کے ساتھ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو بھیجا گیا تاکہ وہ انھیں دین سکھائیں اور قرآن کریم کی تعلیم دیں، اس لیے ان کا نام مدینہ میں ''المقریٔ'' (پڑھانے والا) مشہور ہوا اور وہ ان کی امامت بھی کرتے تھے۔

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نہ صرف دینی غیرت اور قوت ایمانی میں ممتاز تھے بلکہ

1 صحيح البخاري، حديث: 18، و صحيح مسلم، حديث: 1709. 2 الغرباء الأولون للدكتور سلمان العودة، ص: 185.

ایک منفرد شخصیت کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ وہ نبی ﷺ پر تا حال نازل شدہ قرآن کو فوراً حفظ کرنے والے بھی تھے۔ چونکہ وہ قوت ایمانی اور دینی جذبے کے ساتھ ساتھ ذہانت، خلق اور دانائی سے بہرہ ور تھے، اسی بنا پر نبی ﷺ نے انھیں اپنی سفارت کے لیے منتخب فرمایا اور پھر چند ہی مہینوں کے اندر مدینہ کے اکثر گھرانوں میں اسلام کا چرچا ہونے لگا۔ حضرت سعد بن معاذ اور اُسید بن حضیر رضی اللہ عنہما جیسے سردارانِ قوم دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے اور پھر ان کی قوم کے اکثر لوگ مشرف بہ اسلام ہوتے چلے گئے۔[1]

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ بطور سفیر کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ انھوں نے اس نئے دین کی مکمل تشریح و توضیح فرمائی، قرآن کریم کی قراءت و تفسیر لوگوں کے سامنے بیان کی اور علاوہ ازیں دعوتی سرگرمیوں کو آگے بڑھانے کی خاطر ایک پر امن مرکز کے حصول کے لیے کوشاں رہے۔ ایک طرف نئے مسلمانوں میں اسلامی اخوت کے روابط کو تقویت دیتے تو دوسری طرف رسول اللہ ﷺ اور مکہ میں بسنے والے صحابۂ کرام سے بھی رابطہ استوار رکھے ہوئے تھے۔

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ یثرب میں اَسعد بن زُرارہ کے گھر قیام پذیر ہوئے۔[2] اور ان کی رہنمائی میں تمام مسلمان دعوت الی اللہ کے میدان میں سرگرم ہو گئے۔ حضرت مصعب رضی اللہ عنہ نے اس جماعت کی قیادت کرتے ہوئے دعوتی میدان میں اپنے معلم حقیقی سے سیکھا ہوا قرآنی اسلوب اختیار کیا، وہ قرآن کریم کی آیات کی اس طرح شرح فرماتے کہ وہ خود اس آیت کی عملی تصویر بن گئے:

﴿ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ۖ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾

”(اے نبی!) اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھے وعظ کے ساتھ دعوت دیجیے اور ان سے احسن طریقے سے بحث کیجیے۔“[3]

[1] الغرباء الأولون للدكتور سلمان العودة، ص:187,186 [2] السيرة النبوية لأبي شهبة:441/1.
[3] النحل 125:16.

اُسید بن حضیر اور سعد بن معاذ رضی اللہ عنہما کا قبولِ اسلام

اسید اور سعد اوسی قبیلہ بنو عبد الاشہل کے افراد تھے اور اپنی قوم کے سردار تھے۔ وہ ابھی تک اپنی قوم کے دین بت پرستی پر کاربند تھے۔ جب انھیں مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اور ان کی دعوتی سرگرمیوں کا پتا چلا تو سعد بن معاذ نے اسید بن حضیر سے کہا کہ ہمارے محلے میں یہ دو شخص (مصعب اور اسعد رضی اللہ عنہما) ہمارے سادہ لوح افراد کو گمراہ کرنے کے لیے آئے ہیں۔ انھیں آپ ڈانٹ پلائیں اور یہاں آنے سے منع کریں، جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ اسعد بن زُرارہ میری خالہ کا بیٹا ہے، وگرنہ یہ کام میں خود کرتا۔ اسید بن حضیر اپنا نیزہ اٹھائے ان کی طرف چل دیے۔ جب اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ نے انھیں آتے دیکھا تو مصعب رضی اللہ عنہ سے کہا: ''یہ اپنی قوم کا سردار ہے جو آپ کی طرف آرہا ہے، اس کے سامنے دعوت پیش کریں۔''

حضرت مصعب رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اگر یہ بیٹھ جائے تو میں کلام کروں گا۔''

لیکن اسید آکر کھڑا کھڑا انھیں برا بھلا کہنے لگا: ''تم ہمارے سادہ لوح افراد کو کیوں گمراہ کرتے ہو؟ اگر جان کی خیر چاہتے ہو تو یہاں سے چلے جاؤ؟''

حضرت مصعب رضی اللہ عنہ نے پختہ کار ہدایت یافتہ مومن کی طرح نرم زبان سے کہا: ''آپ تشریف رکھیں۔ اگر آپ کو ہماری بات اچھی لگے تو قبول کر لیں، ورنہ ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔''

اُسید کہنے لگے: ''آپ نے انصاف کیا۔'' پھر اپنا نیزہ زمین میں گاڑ دیا اور بیٹھ گئے۔ حضرت مصعب رضی اللہ عنہ نے اسلامی تعلیمات پیش کیں اور قرآن پڑھ کر سنایا۔

اسعد اور مصعب رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں: ''اللہ کی قسم! ہم اس کے کلام سے پہلے اس کی نرم روی اور خندہ پیشانی ہی سے اس کا مسلمان ہونا بھانپ گئے تھے۔''

بہر حال اسید بن حضیر نے کہا: ''یہ کلام کتنا عمدہ اور حسین ہے، اب مجھے اس دین میں داخل ہونے کا طریقہ بتاؤ۔''

دونوں نے کہا کہ آپ غسل کریں، پھر صاف کپڑے پہنیں، بعد ازاں حق کی گواہی دیں اور دو رکعت نماز پڑھیں۔

پھر اُسَید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے ایسا ہی کیا اور کہا: ''ہمارے ہاں ایک معتبر شخص ہیں اگر وہ مسلمان ہوگئے تو ان کی ساری قوم دائرۂ اسلام میں داخل ہوسکتی ہے۔ میں انھیں آپ کی طرف بھیج رہا ہوں وہ ہیں سعد بن معاذ۔''

پھر اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے اپنا نیزہ اٹھایا اور واپس سعد کی طرف چل دیے جو اپنی قوم کی مجلس میں بیٹھے تھے۔ جب سعد رضی اللہ عنہ نے ان کے چہرے پر نظر ڈالی تو بھانپ گئے کہ اسید بن حضیر جیسا یہاں سے گیا تھا ویسا نہیں لگتا۔ حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ مجلس کے پاس آ کھڑے ہوئے۔ سعد بن معاذ نے پوچھا: ''کیا ہوا؟''

اسید کہنے لگے: ''میں نے ان دونوں آدمیوں سے گفتگو کی ہے۔ کوئی خطرناک مسئلہ نہیں، پھر بھی میں نے انھیں منع کر دیا ہے اور انھوں نے میری بات تسلیم کر لی ہے۔ ہاں! مجھے معلوم ہوا ہے کہ بنو حارثہ اسعد بن زرارہ کو قتل کرنے کی غرض سے نکلے ہیں کیونکہ وہ آپ کی خالہ کا بیٹا ہے اور بنو حارثہ آپ سے بدعہدی کرنا چاہتے ہیں۔''[1]

یہ سن کر سعد بن معاذ جلدی سے اٹھے، اپنا نیزہ ہاتھ میں لیا اور یہ کہتے ہوئے وہاں سے چل دیے کہ تو نے کوئی تسلی بخش کام نہیں کیا۔ وہ ان دونوں کے پاس پہنچے جو پر سکون بیٹھے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ دراصل اسید چاہتے تھے کہ میں دین کے بارے میں کچھ سن لوں۔

حضرت سعد کھڑے کھڑے انھیں برا بھلا کہنے لگے، پھر اسعد بن زُرَارہ سے کہا: ''اللہ کی قسم، اے ابوامامہ! اگر تمھارے ساتھ رشتے داری نہ ہوتی تو تم میری طرف سے اتنے نرم رویے کا مستحق نہ ٹھہرتے۔ کیا تم ہماری مرضی کے خلاف ہمارے محلے میں اپنے نظریات پھیلا رہے ہو؟''

[1] السيرة النبوية لابي شهبة:1/442.

حضرت مصعب رضی اللہ عنہ نے حضرت اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ کی یہ بات مدنظر رکھی کہ یہ اپنی قوم کا سردار ہے۔ اگر یہ مسلمان ہوگیا تو کوئی دو آدمی بھی قبول اسلام میں ان سے پیچھے نہیں رہیں گے، چنانچہ مصعب رضی اللہ عنہ نے بڑی نرمی سے کہا: ''آپ بیٹھ کر ہماری بات تو سنیں، اگر پسند آئے تو قبول کرلیں، وگرنہ ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔''

سعد بن معاذ نے کہا: ''تم نے انصاف کی بات کہی۔'' اور نیزہ گاڑ کر بیٹھ گئے۔

حضرت مصعب رضی اللہ عنہ نے اسلام پیش کیا اور قرآن پڑھ کر سنایا۔

موسیٰ بن عقبہ کہتے ہیں کہ سورۂ زخرف کا ابتدائی حصہ تلاوت کیا۔ اسعد اور مصعب رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ وہ اس کی نرم روی اور خندہ پیشانی ہی سے اس کا مسلمان ہونا بھانپ گئے تھے۔

پھر حضرت سعد نے ان سے کہا: ''جب آپ مسلمان ہونا اور اس دین میں داخل ہونا چاہتے ہیں تو کیا طریقہ اختیار کرتے ہیں؟''

ان دونوں نے کہا: ''آپ غسل کریں، پھر پاکیزہ کپڑے زیب تن کریں، حق کی گواہی دیں اور دو رکعت نماز پڑھیں۔''

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ایسا ہی کیا، پھر اپنا نیزہ پکڑا اور اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ اپنی قوم کے پاس آئے۔ قوم نے دیکھتے ہی کہا: ''ہم اللہ کی قسم اٹھاتے ہیں کہ سعد جس حالت میں گئے تھے اس حالت میں واپس نہیں آئے۔''

جب حضرت سعد ان کے پاس پہنچے تو سوال کیا: ''اے بنی عبدالاشہل! میرے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے؟''

انھوں نے جواب دیا: ''آپ ہمارے سردار اور بہترین سوچ کے مالک ہیں اور آپ کی قیادت بے مثال ہے۔''

اس پر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں تمھارے مردوں اور عورتوں سے کلام نہ کروں گا جب تک کہ تم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لے آؤ۔''

موسیٰ بن عقبہ کہتے ہیں: ''اللہ کی قسم! بنوعبد الاشہل کے تمام خواتین و حضرات دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔'' [1]

حضرت اسعد اور مصعب رضی اللہ عنہما واپس گھر لوٹ گئے اور وہیں لوگوں کو اسلام کی دعوت پیش کرتے رہے حتی کہ انصار کے ہر گھر میں مرد وزن دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے، سوائے اُصَیرِم کے جس کا پورا نام عمرو بن ثابت بن وَقْش تھا۔ وہ احد کے دن مسلمان ہوئے اور احد ہی میں شہادت سے سرفراز ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں خبر دی کہ وہ جنتی ہیں۔ ابن اسحاق حسن سند سے روایت کرتے ہیں کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''مجھے بتاؤ کہ کون شخص ہے جس نے کبھی نماز نہیں پڑھی لیکن وہ جنتی ہے۔'' جب لوگ جواب نہ دے سکے تو انھوں نے بتایا: ''وہ بنوعبدالاشہل کا اُصَیرِم عمرو بن ثابت بن وقش ہے۔'' [2]

درس و عبرت

① رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک منظّم پروگرام کے تحت یثرب پر خصوصی توجہ دی اور وہ چھ باشندے جو ابتدا میں مسلمان ہوئے۔ انھوں نے اسی سال دعوت اسلامی کو پھیلانے میں گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔

② چند اسباب ایسے رونما ہوئے کہ مدینہ طیبہ میں اسلام زور شور سے پھیلا۔ وہ اسباب مندرجہ ذیل تھے:

اوس وخزرج فطری طور پر نرم خو اور منکسر المزاج واقع ہوئے تھے، چنانچہ وہ متکبر اور حق کے منکر نہ ہوئے۔ دراصل یہ ان کے خونی اور نسلی اوصاف تھے جن کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت اشارہ کیا تھا جب یمن سے ایک آدمی آیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: «أَتَاكُمْ

1 تاريخ الطبري: 2/357-359، والطبقات الكبرىٰ لابن سعد: 3/421,420، ودلائل النبوة للبيهقي: 2/432,431، و المعجم الكبير للطبراني: 20/362. 2 مسند أحمد: 5/429,428، و مجمع الزوائد: 9/364، و السيرة النبوية لأبي شهبة: 1/444، و صحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 291.

أَهْلُ الْيَمَنِ، هُمْ أَرَقُّ أَفْئِدَةً وَّ أَلْيَنُ قُلُوبًا» ''تمھارے پاس اہل یمن آئے ہیں یہ فطرتاً نرم مزاج اور نرم دل ہیں۔''[1]

قحطانی نژاد اوس و خزرج بھی یمن کے علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔ پرانے زمانے میں ان کے آباء و اجداد نے اسی علاقے سے ہجرت کی تھی۔[2]

قرآن کریم میں انصار کی تعریف کچھ یوں ہے:

﴿وَ الَّذِيْنَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝﴾

''اور (مالِ فَے ان کے لیے ہے) جنھوں نے (مدینہ کو) گھر بنا لیا تھا اور ان (مہاجرین) سے پہلے ایمان لا چکے تھے، وہ (انصار) ان سے محبت کرتے ہیں جو ان کی طرف ہجرت کرے اور وہ اپنے دلوں میں اس (مال) کی کوئی حاجت نہیں پاتے جو ان (مہاجرین) کو دیا جائے اور اپنی ذات پر (ان کو) ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود انھیں سخت ضرورت ہو اور جو کوئی اپنے نفس کے لالچ سے بچا لیا گیا تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''[3]

اوس و خزرج کے درمیان بغض و عناد اور جنگوں کا سلسلہ زمانہ قدیم ہی سے جاری تھا اور بُعَاث جیسی خونریز جنگیں بھی ہو چکی تھیں جن میں ان کے بڑے بڑے سردار مارے جا چکے تھے جو مکہ اور طائف کے سرداروں کی طرح دعوت اسلامی کے راستے میں رکاوٹ بن سکتے تھے۔ لیکن اب صرف نوجوان قیادت باقی تھی جو قبول حق کے لیے تیار تھی۔ کوئی بڑا لیڈر نہ ہونے کی وجہ سے وہ کسی ایسے رہنما کے متلاشی تھے جو ان میں اتحاد پیدا کر سکے اور اس کے زیر سایہ وہ اپنے اختلافات ختم کر سکیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''بعاث کا معرکہ

---

1 صحيح البخاري، حديث:4388. 2 السيرة النبوية لأبي الحسن الندوي، ص:154. 3 الحشر 9:59.

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے پیغمبر کے لیے پیش بندی کے طور پر پیش آیا تھا۔ آپ ﷺ مدینہ طیبہ آئے تو ان لوگوں کا شیرازہ بکھرا ہوا تھا، ان کے سردار مارے جا چکے تھے اور انھیں شدید زخم لگے تھے۔ تب اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنے رسول ﷺ کے ہاتھوں مشرف بہ اسلام ہونے کا موقع عطا فرما دیا۔‘‘[1]

اوس و خزرج یہودیوں کی ہمسائیگی میں رہتے تھے، اس لیے وہ آسمانی ادیان اور پیغمبروں کے بارے میں کچھ نہ کچھ جانتے تھے۔ ان کے ہاں یہ معاملات روزانہ زیر بحث آیا کرتے تھے اور وہ قریش کی طرح نہ تھے کہ جن کے پاس اہل کتاب سکونت پذیر نہ تھے جس کی وجہ سے وہ صرف رسالت اور وحی الٰہی کے بارے میں سرسری طور پر مختلف باتیں سنا کرتے تھے، کوئی خاص آسمانی دین ان کے ہاں زیر بحث آتا نہ وہ اس سلسلے میں سنجیدگی سے غور و فکر کرتے تھے۔

یہودی اوس و خزرج کو ڈرایا کرتے تھے کہ ایک نبی مبعوث ہونے والا ہے اور ہم عنقریب اس کے پیروکار بن کر تمھیں قوم عاد اور عاد ارم کی طرح نیست و نابود کر دیں گے، حالانکہ اوس و خزرج یہود کی نسبت اکثریت کے حامل تھے۔[2]

یہودیوں کے اس قول کو اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

﴿وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۡ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ○﴾

’’اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے وہ کتاب آ گئی جو اس (کتاب) کی تصدیق کرتی ہے جو ان کے پاس ہے اور اس سے پہلے وہ ان لوگوں کے خلاف فتح مانگتے تھے جنھوں نے کفر کیا، پھر جب ان کے پاس وہ (حق) آ گیا جسے انھوں

1 صحيح البخاري، حديث: 3777، و مسند أحمد: 61/6، و دلائل النبوة للبيهقي: 421/2.
2 الغرباء الأولون للدكتور سلمان العودة، ص: 183.

نے پہچان لیا تو انھوں نے اس کا انکار کر دیا، لٰہذا کافروں پر اللہ کی لعنت ہے۔''[1]

اوس وخزرج زمانۂ جاہلیت میں یہود پر تا دیر غالب رہے اور وہ مشرک تھے، لٰہذا اہل کتاب، یعنی یہودی کہا کرتے تھے کہ ایک نبی کا زمانہ قریب آچکا ہے، ہم عنقریب تمھیں عاد اور عاد ارم کی طرح نیست و نابود کریں گے۔[2]

جب اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو غالب کرنے کا فیصلہ کر لیا تو مدینہ سے چھ افراد کو منتخب فرمایا جو رسول اللہ ﷺ سے منیٰ کی گھاٹی کے پاس ملے۔ آپ ﷺ نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور مسلمان ہوگئے اور پہچان لیا کہ درحقیقت یہی وہ نبی ہے جس کے بل بوتے پر یہود انھیں خوفزدہ کرتے ہیں۔ جب وہ مدینہ پہنچے تو ہر گھر میں ان کا ذکر خیر ہونے لگا اور سیرت نگاروں کی رائے کے مطابق یہی دن مدینہ میں ابتدائے اسلام کے دن تھے۔[3]

③ پہلی بیعت عقبہ میں قبیلۂ اوس کے دو فرد بھی شامل ہوئے اور یہ اسلام کے حق میں ایک اہم تبدیلی تھی۔ درحقیقت خزرج کے چھ نو مسلم افراد نے بُعاث جیسی سخت ترین جنگ کے بعد یہ کوشش جاری رکھی کہ وہ اوس وخزرج کی باہمی خانہ جنگی کو بھلا دیں اور ایک جھنڈے تلے جمع ہو جائیں۔ ان کی کوششوں سے مزید سات آدمی مسلمان ہوئے جن میں سے دو آدمی قبیلۂ اوس سے تھے جو خزرج کا مخالف تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان چھ افراد نے اپنی ذمہ داریاں پوری طرح ادا کیں اور مدینے میں اسلام کی ترویج کے لیے موزوں فضا تیار کی تاکہ پچھلی جنگوں کو بھول کر اوس اور خزرج کے سب لوگ حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں۔

④ بیعت عقبہ سے پیدا ہونے والی تبدیلی کے بعد مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ مدینہ طیبہ میں رسول اللہ ﷺ کے نمائندۂ خاص بن کر تشریف لے گئے۔ انھوں نے لوگوں کو قرآن سکھایا، اسلامی تعلیمات سے بہرہ ور کیا اور اپنی دانشمندی، دانائی اور سیاسی بصیرت سے اسلام کے

1 البقرة 2:89. 2 الدر المنثور للسيوطي 1/216. 3 السيرة النبوية لابن هشام 1/39-44.

لیے عظیم کامیابیاں حاصل کیں۔ [1]

⑤ سفیر رسول نے ایک ہی سال میں عظیم کارنامہ سرانجام دیا اور یہ صرف اللہ تعالیٰ کی توفیق اور مبلغ کی سچائی اور اخلاص کا نتیجہ تھا۔ اگر آج عالم اسلام پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو امت مسلمہ کا کوئی ایسا سفیر نظر نہیں آتا۔ اسلامی حکمرانوں کو چاہیے کہ ایماندار، باشرع اور عبادت گزار سفیر مقرر کریں جو اپنے ملک اور دین کی درست نمائندگی کر سکیں اور ان کا قول، عمل، سیرت اور کردار درست ہو تاکہ لوگ انھیں دیکھیں اور ان کی بات غور سے سنیں۔

⑥ سفیر رسول نے ایک عمدہ معاشرہ قائم کرنے کی کوشش کی تاکہ اسلامی حکومت کے لیے موزوں مرکز میسر آئے۔ سیدنا مصعب رضی اللہ عنہ نے پہلی بیعت عقبہ کی عملی تصویر بن کے دکھایا اور وہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ قوانین شریعت سے مکمل ہم آہنگی ہو۔ [2]

⑦ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں اسلامی اقتدار کے فروغ کے لیے انتھک محنت کی اور حتی المقدور اس سلسلے میں کوتاہی سے اجتناب کیا تاکہ ایک انتہائی مضبوط بنیاد فراہم ہو جس پر ایک جدید حکومت کی تشکیل ہونا تھی۔ دعوت کی اس کوشش میں مکمل دو سال صرف ہوئے۔ [3]

⑧ ایمانی جذبہ انصاری مسلمانوں کے دلوں میں داخل ہو گیا۔ انھوں نے سمجھ لیا کہ ایک نئی مملکت کے قیام کا وقت قریب آچکا ہے، جیسے حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے ایک طاقتور مملکت کے قیام کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کہا تھا: ''کب تک ہم اللہ کے رسول کو اس حالت میں رہنے دیں گے کہ آپ مکہ کے پہاڑوں میں جلاوطن رہیں اور ڈر اور خوف سے زندگی گزاریں۔'' [4]

⑨ بعثت نبوی کے تیرھویں سال حج کے موسم سے پہلے مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ مکہ پہنچے اور مدینہ میں مسلمانوں کے احوال اور آئندہ امکانات کا مکمل جائزہ پیش کیا اور بتایا کہ کس طرح اسلام اوس و خزرج کے تمام قبائل میں داخل ہو چکا ہے اور اب ساری قوم آپ سے

---

1 التحالف السياسي في الإسلام للدكتور الغضبان، ص:71. 2 دولة الرسول ﷺ من التكوين إلى التمكين للدكتور كامل سلامة، ص:356. 3 التحالف السياسي في الإسلام للدكتور الغضبان، ص:71. 4 التحالف السياسي في الإسلام للدكتور الغضبان، ص:72.

بیعت کرنے کے لیے تیار ہے اور آپ کی حمایت ونصرت کے لیے پر عزم ہے۔[1]

⑩ بعثت نبوی کے تیرھویں سال پیش آمدہ ملاقات نے تاریخ کا رخ موڑ دیا جب ستر سے زائد یثربی افراد حج کی ادائیگی کے لیے مکہ آئے۔ مکہ میں ان کے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان خفیہ رابطے قائم ہوئے اور ایام تشریق میں عقبۂ منیٰ میں ملاقات پر اتفاق رائے ہوا جو کہ جمرۂ اولیٰ کے قریب واقع تھی اور یہ بھی طے پایا کہ یہ ملاقات رات کے اندھیرے میں کامل راز داری سے ہوگی۔[2]

1 التحالف السياسي في الإسلام للدكتور الغضبان، ص: 72. 2 التحالف السياسي في الإسلام للدكتور الغضبان، ص: 73.

باب 3

بیعت عقبہ ثانیہ

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ہم کہا کرتے تھے: ''کب تک ہم اللہ کے رسول کو خوف کی حالت میں مکہ کے پہاڑوں میں جلاوطنی کی زندگی گزارتے دیکھتے رہیں گے'' اسی اثنا میں ہمارے تقریباً ستر آدمی موسم حج میں وہاں پہنچے اور رسول اللہ ﷺ سے عقبۂ منیٰ میں ملاقات کا وعدہ کیا۔ وہاں ہم ایک ایک دو دو کر کے پہنچے اور یوں آپ ﷺ سے ہماری ملاقات ہوئی۔ ہم نے پوچھا: ''اللہ کے رسول! ہم کن امور پر آپ کی بیعت کریں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا:

«تُبَايِعُونِي عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِي النَّشَاطِ وَالْكَسَلِ وَالنَّفَقَةِ فِي الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ وَ عَلَى الْأَمْرِ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّهْيِ عَنِ الْمُنْكَرِ، وَأَنْ تَقُولُوا فِي اللّٰهِ لَا تَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ، وَّ عَلَى أَنْ تَنْصُرُونِي، فَتَمْنَعُونِي إِذَا قَدِمْتُ عَلَيْكُمْ مِمَّا تَمْنَعُونَ مِنْهُ أَنْفُسَكُمْ وَأَزْوَاجَكُمْ وَأَبْنَاءَكُمْ وَ لَكُمُ الْجَنَّةُ»

''تم مجھ سے ہر اچھے اور برے وقت میں میری اطاعت پر کمربستہ رہنے، تنگی و آسانی میں خرچ کرنے، اچھائی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے، اللہ کے بارے میں حق بات کہنے پر کسی ملامت گر کی پروانہ کرنے اور جس طرح تم اپنی جانوں، بچوں اور بیویوں کی حفاظت کرتے ہو جب میں تمھارے پاس آجاؤں تو میری بھی اسی

طرح حفاظت کرنے پر بیعت کرو، اس کے بدلے میں تمھارے لیے جنت ہے۔“

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب ہم آپ کی بیعت کرنے کی غرض سے آگے بڑھے تو اَسْعَد بن زُرَارَہ رضی اللہ عنہ نے جو سب سے چھوٹے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑ لیا اور یوں گویا ہوئے: ”اے اہل یثرب! ذرا ٹھہر جاؤ۔ ہم نے اتنا لمبا سفر اس یقین پر کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں لیکن یہ سوچ لو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں سے (مدینہ کی طرف) ہجرت کرنے کا مطلب پورے عرب سے مکمل طور پر کٹ جانا، تمھارے سرداروں کا اپنی جان ہتھیلی پر رکھنا اور تمھیں تلواروں کا سامنا کرنا ہے۔ اگر تم صبر کرو گے تو تمھارا اجر اللہ کے ہاں ہے اور اگر بزدلی دکھانی ہے تو ابھی سے کہہ دو، اللہ کے ہاں تمھارا یہ عذر مقبول ہوگا۔“ اس پر سب نے بیک آواز کہا: ”اے اسعد! راستے سے ہٹ جائیے، ہم یہ بیعت کسی قیمت پر بھی ترک نہ کریں گے۔“ جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ”ہم سب نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت کی تمام شرائط کا تذکرہ کیا اور ہمیں جنت کی ضمانت دی۔“[1]

گویا کہ انصار نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اطاعت، نصرت اور جنگ پر بیعت کی، اس لیے عُبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ اسے بیعت حرب کہا کرتے تھے۔[2]

یہ قصہ بیان کرنے والے ایک صحابی حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ بھی ہیں جس میں مزید اہم تفصیلات موجود ہیں۔ کعب رضی اللہ عنہ خود اس بیعت میں شامل تھے، وہ فرماتے ہیں: ”ہم سب مشرکین کے ساتھ ہی حج کی غرض سے روانہ ہوئے اور ہم اسلامی تعلیمات جانتے تھے اور نمازی تھے، پھر جب مکہ پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایام تشریق کی درمیانی رات عقبہ منیٰ میں ملاقات کا وعدہ کرلیا۔ ہم نے اپنے قافلے کے مشرکین سے اپنے پروگرام کو خفیہ رکھا، چنانچہ وعدے والی رات ہم اپنے خیموں میں سوئے۔ جب رات کا تیسرا حصہ گزر گیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنے کے لیے کسی آہٹ کے بغیر آہستگی سے نکلے

[1] مسند أحمد: 322,323/3، و السیرة النبویة الصحیحة للدکتور العمري: 199/1. [2] مسند أحمد: 316/5.

اور خفیہ طور پر عقبۂ منیٰ میں جمع ہو گئے۔ ہم تقریباً ستر آدمی تھے اور دو عورتیں نسیبہ بنت کعب اور اسماء بنت عمرو رضی اللہ عنہما ہمارے ساتھ تھیں۔ ہم وہاں رسول اللہ ﷺ کا انتظار کر رہے تھے کہ آپ تشریف لے آئے اور آپ کے ساتھ حضرت عباس بن عبدالمطلب بھی تھے۔ وہ اگرچہ ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے لیکن اپنے بھتیجے کے معاملے میں پختہ عہد لینا چاہتے تھے، چنانچہ سب سے پہلے انھوں نے کلام کا آغاز کیا کہ دیکھو رسول اللہ ﷺ بنو ہاشم کی حفاظت میں ہیں اور اب وہ مدینہ ہجرت کرنا چاہتے ہیں، لہٰذا آپ سے میں حمایت کا مکمل وعدہ لینا چاہتا ہوں، ورنہ آپ ان کا راستہ چھوڑ دیں۔ انصار نے خواہش ظاہر کی کہ رسول اللہ ﷺ گفتگو فرمائیں اور آپ ﷺ اپنے اور اپنے رب کے حق میں جو بھی شرائط چاہیں طے کر سکتے ہیں۔ نبی ﷺ نے فرمایا: «أُبَايِعُكُمْ عَلٰى أَنْ تَمْنَعُونِي مِمَّا تَمْنَعُونَ مِنْهُ نِسَاءَ كُمْ وَ أَبْنَاءَ كُمْ» ''میں تم سے اس بات پر بیعت لینا چاہتا ہوں کہ تم میری اسی طرح حفاظت کرو گے جس طرح اپنے بیوی بچوں کی حفاظت کرتے ہو۔'' اس پر حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ نے آپ کا ہاتھ پکڑا اور کہا: ''ہم ضرور آپ کی اسی طرح حفاظت کریں گے جس طرح اپنے بیوی بچوں کی حفاظت کرتے ہیں تو آپ ہم سے بیعت لے لیجیے۔ اللہ کی قسم! ہم نسل در نسل آزمودہ کار جنگجو اور اسلحہ بردار ہیں۔'' ابوالہیثم بن تَیِّہان نے ان کی بات کاٹتے ہوئے سوال کیا: ''اے اللہ کے رسول! ہمارے یہودیوں سے معاہدات ہیں اور آپ کی خاطر ہم انھیں ختم کر رہے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ جب اللہ تعالیٰ آپ کو کامیابی عطا فرمائے تو آپ واپس اپنی قوم کے پاس آجائیں؟'' رسول اللہ ﷺ مسکرا دیے اور فرمایا: «بَلِ الدَّمُ الدَّمُ وَالْهَدْمُ الْهَدْمُ، أَنَا مِنْكُمْ وَ أَنْتُمْ مِنِّي، أُحَارِبُ مَنْ حَارَبْتُمْ وَ أُسَالِمُ مَنْ سَالَمْتُمْ» ''(نہیں ایسا نہیں ہوگا) بلکہ آج کے بعد میرا جینا اور مرنا تمھارے ساتھ ہوگا۔ تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں۔ میری اور تمھاری صلح اور جنگ مشترک ہوگی۔''

پھر اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: «أَخْرِجُوا إِلَيَّ مِنْكُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيبًا لِّيَكُونُوا

عَلٰی قَوْمِهِمْ بِمَا فِیهِمْ» ''اپنے افراد میں سے بارہ آدمی علیحدہ کرلو۔ میں انھیں اپنی اپنی قوم کا سربراہ بنانا چاہتا ہوں۔'' انھوں نے ایسا ہی کیا۔ نو افراد خزرج سے اور تین اوس سے منتخب ہوئے۔ اب آپ ﷺ نے انھیں واپس اپنی قیام گاہوں کی طرف جانے کا حکم دیا۔ سب نے یہ آواز سنی کہ شیطان قریش کو بلند آواز سے ڈرا رہا ہے۔ عباس بن عُبادہ بن نَضلہ نے کہا: ''اس اللہ کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا! اگر آپ چاہیں تو صبح ہم تمام اہل منٰی پر تلواروں سے حملہ کر دیں۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَمْ نُؤْمَرْ بِذٰلِكَ، وَلٰكِنِ ارْجِعُوا إِلٰی رِحَالِكُمْ» ''مجھے ابھی اس کا حکم نہیں ملا۔ بس تم واپس اپنی قیام گاہوں میں چلے جاؤ۔'' یوں وہ سب واپس چلے آئے۔

صبح کے وقت سرداران قریش ان کے خیموں میں پہنچے اور ان سے پوچھا کہ ہمیں نبی ﷺ سے ان کی بیعت اور آپ ﷺ کی ہجرت کے متعلق خبر ملی ہے؟ اوس و خزرج کے مشرکین نے حلف دیا کہ انھوں نے ایسا نہیں کیا اور مسلمان آپس میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔[1]

حضرت کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''قریش واپسی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور ان میں حارث بن ہشام بن مغیرہ مخزومی بھی تھا جس نے نئے جوتے پہنے ہوئے تھے۔ میں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جابر رضی اللہ عنہ کے والد عبد اللہ بن عمرو بن حرام رضی اللہ عنہ سے کہا: ''اے ابو جابر! آپ ہمارے سردار ہیں، کیا آپ کے پاس ایسے جوتے ہیں؟'' اور اس کلام سے میں صرف شریک گفتگو ہونا چاہتا تھا۔ یہ بات حارث نے سن لی اور اپنے جوتے اتار کر میری طرف پھینک دیے اور کہا: ''اللہ کی قسم! تو ضرور انھیں پہنے گا۔'' ابو جابر مجھ سے کہنے لگے: ''واللہ! تو نے اس جوان کو غصہ دلایا ہے۔ اس کے جوتے واپس کردو۔'' میں نے کہا: ''نہیں! اللہ کی قسم! جوتے واپس نہیں کروں گا، یہی تو نیک فال ہے، اگر سچ ثابت ہوئی تو میں ضرور اس کا سلب (سامان) حاصل کروں گا۔''[2]

1 مسند أحمد:3/460-462، والسيرة النبوية لابن هشام: 2/61، والسيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 1/201. 2 مسند أحمد:3/460-462، والمستدرك للحاكم: 2/424,425.

درس وعبرت

① بیعت عقبۂ ثانیہ اپنے اندر بہت سی خوبیاں، اسباب اور آثار سموئے ہوئے تاریخی حیثیت کی حامل ہے۔ یہ ایک عظیم فتح تھی کیونکہ بعدازاں تمام فتوحات اسلامیہ جو درجہ بدرجہ حاصل ہوئیں، ان کی کڑیاں اس بیعت سے ملتی ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اس موقع پر انصار کے اس ہراول دستے سے عہد و میثاق لیا جو اپنے عہد نبھانا بخوبی جانتے تھے اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کیے گئے معاہدے کی پاسداری میں ہر قسم کی قربانی پیش کر سکتے تھے اور حسب ضرورت اپنی جانیں، اموال اور عزتیں بھی داؤ پر لگا سکتے تھے۔ اگر سیاق پر نظر ڈالی جائے تو درحقیقت یہ حق اور اس کی نصرت و تعاون کی بیعت تھی اور یہ ایسی قوت تھی جس نے تمام فسادی قوتوں سے ٹکر لینی تھی اور ایسا ہی ہوا۔ انصار نے تمام جنگوں اور معرکوں میں اس کی قدر و منزلت کم نہ ہونے دی۔ اس بیعت کے نتیجے میں کلمۃ اللہ کے لیے تمام حاملین دعوت نے اپنے جہادی وسائل پیش کیے تاکہ اس سرزمین میں ہر متکبر کا خاتمہ ہو اور دین صرف اللہ کا نافذ ہو۔ تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ یہ دین سچائی، عدل، نصرت، شہادت اور اسلامی پیغام لوگوں تک پہنچانے کا نام ہے۔''[1]

② جب حقیقی ایمان دلوں میں اثر پذیر ہوتا ہے تو اس کے آثار قد آور قیادتوں کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں جو اپنی جان اور مال اللہ اور اس کے رسول کی رضا جوئی کی خاطر قربان کرتے ہیں اور اس سرزمین پر کسی جاہ و منصب، قیادت اور سرداری کے خواہاں نہیں ہوتے۔

اگر غور کیا جائے تو یہ وہی لوگ تھے جنھوں نے لمبا زمانہ حصول اقتدار اور طلب جاہ کے لیے جنگیں لڑیں لیکن آج اللہ پر ایمان کی برکت سے جو ان کے دلوں میں داخل ہو چکا تھا، وہ صرف اللہ کی رضا چاہتے تھے۔[2]

③ اس واقعے سے آپ ﷺ کی عظیم منصوبہ بندی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ انتہائی مشکل حالات

[1] محمد رسول اللہ ﷺ لصادق عرجون: 400/2. [2] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 103/2.

میں بیعت عقبۂ ثانیہ منعقد ہوئی جو کہ ایک جرأت مندانہ اقدام اور تمام مشرک طاقتوں کے لیے ایک چیلنج تھا، اس لیے آپ ﷺ نے اس منصوبے کی کامیابی کے لیے اس میں انتہائی درستی اور پختگی سے کام لیا جو کہ مندرجہ ذیل نکات پر مشتمل تھا:[1]

بیعت کرنے والوں کا اپنی سرگرمیوں کو پوشیدہ رکھنا تا کہ یہ راز کھل نہ جائے۔ اس بیعت میں شریک ستر آدمی اور دو عورتیں تھیں جو پانچ سو افراد کے قافلے میں شامل تھے، لہٰذا یہ کام بڑا مشکل تھا۔ ان کی نقل و حرکت آسان نہیں تھی۔ ایام تشریق کی درمیانی رات بیعت کے لیے موزوں خیال کی گئی کہ جب رات کا تہائی حصہ گزر چکا ہوگا، لوگ سو جائیں گے اور ان کا ازدحام کم ہو جائے گا تب گھاٹی میں جائیں گے۔ اس کے لیے ایک محفوظ گھاٹی کا انتخاب کیا گیا جو لوگوں کی نگاہوں سے دور تھی تا کہ اگر کوئی کسی ضرورت سے جاگے تو وہاں نہ پہنچ سکے۔[2]

اصحاب بیعت کا منظّم انداز اور چپکے چپکے چھپ کر، ایک ایک دو دو کی شکل میں مقررہ جگہ پر پہنچنا۔

مقررہ جگہ کو صیغۂ راز میں رکھنا جسے سوائے عباس بن عبدالمطلب، علی بن ابی طالب اور ابوبکر رضی اللہ عنہم کے کوئی نہ جانتا تھا۔ حضرت عباس آپ ﷺ کے لیے پختہ عہد لینے کے خواہاں تھے۔[3] حضرت علی رضی اللہ عنہ نے گھاٹی کے کنارے کھڑے ہو کر جاسوسی کے فرائض انجام دیے اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ گھاٹی کے راستے میں کھڑے یہ فریضہ انجام دے رہے تھے۔[4]

ان تین افراد کے سوا کوئی بھی اس واقعے کو نہ جانتا تھا اور اصحاب بیعت کو بھی حکم تھا کہ وہ اپنی آواز پست رکھیں اور لمبی گفتگو سے گریز کریں کہیں کوئی جاسوس ان کی آواز یا حرکت کو سن یا دیکھ نہ لے۔[5]

مسلسل راز داری کا اہتمام۔ جب شیطان نے بیعت کا راز فاش کر دیا تو آپ ﷺ

1 الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص:61. 2 الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبدالرحمٰن البر، ص:61. 3 الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص:62. 4 التربية القيادية للدكتور الغضبان: 109/2. 5 الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 62.

نے انھیں واپس اپنی قیام گاہوں پر جانے کا حکم دیا اور اسے مکمل صیغۂ راز میں رکھنے کا حکم دیا اور مسلح جدوجہد سے منع فرما دیا کیونکہ ایسے فوری اقدام کی ابھی ضرورت نہ تھی۔ اور جب قریش بغرض تفتیش وہاں پہنچے تو اصحاب بیعت نے یا تو خاموشی سے کام لیا یا پھر گفتگو کا رخ موڑنے کے لیے نئے کلام کا سہارا لیا۔[1]

موسم حج کی آخری رات کا انتخاب اور یہ ذوالحجہ کی تیرھویں رات تھی کیونکہ اگلے روز نماز ظہر کے فوراً بعد انھیں اپنے شہر روانہ ہو جانا تھا تاکہ بالفرض اگر بیعت کا راز کھل بھی جائے تو قریش انھیں اس امر سے باز رکھ سکیں نہ روک سکیں، جبکہ اس کا خدشہ موجود تھا۔[2]

④ بیعت کی پانچوں دفعات اتنی واضح اور ٹھوس تھیں کہ کسی صورت میں اسلام کمزور یا ناکام ہوتا دکھائی نہیں دیتا تھا اور وہ یہ دفعات تھیں: ''ہر اچھے اور برے وقت میں فرماں برداری، تنگی اور آسانی میں مال خرچ کرنا، بھلائی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا اور اللہ کے بارے میں کسی ملامت گر کی پروا نہ کرنا اور رسول اللہ ﷺ جب مدینہ تشریف لے آئیں آپ ﷺ کی نصرت کرنا۔''[3]

⑤ ابوالہیثم بن تیہان رضی اللہ عنہ نے کہا تھا کہ یہود سے ہمارے معاہدے ہیں جو ہم آپ کی خاطر ختم کر رہے ہیں۔ اگر آپ غالب آ گئے تو کیا واپس مکہ اپنی قوم میں تشریف لے جائیں گے اور ہمیں چھوڑ دیں گے؟ اس پر رسول اللہ ﷺ مسکرائے تھے اور فرمایا تھا: ''نہیں، اب جینا مرنا تمھارے ساتھ ہے۔ تم مجھ میں سے اور میں تم میں سے ہوں۔ میری اور تمھاری صلح اور جنگ مشترکہ ہے۔''

مذکورہ اعتراض سے اس کامل آزادی کی طرف اشارہ ملتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی بدولت مسلمانوں کو عطا فرمائی کیونکہ ابوالہیثم نے کامل آزادی سے کھل کر اظہار خیال کیا

[1] الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبدالرحمٰن البر، ص: 65. [2] الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبدالرحمٰن البر، ص: 67. [3] التحالف السياسي في الإسلام للدكتور الغضبان، ص: 82.

تھا۔[1] رسول اللہ ﷺ کا جواب بھی بہت شاندار تھا کہ آپ نے خود کو انصار کا اور انصار کو اپنا حصہ قرار دیا۔[2]

⑥ انصار کا بلا تردد دعوت قبول کرنا، براء بن مَعْرور نے فوراً کہا تھا: ''اس ذات کی قسم جس نے آپ کو برحق مبعوث فرمایا! ہم آپ کا تحفظ اپنے بیوی بچوں کی طرح کریں گے۔ آپ ہم سے بیعت لے لیں۔ اللہ کی قسم! ہم نسل در نسل جنگجو اور اسلحہ بردار لوگ ہیں۔'' گویا اس قافلے کا قائد اپنی قوم کی صلاحیتوں سے آپ ﷺ کو آگاہ کرتا ہے کہ وہ جنگجو لوگ ہیں۔[3]

براء بن معرور رضی اللہ عنہ کا بیت اللہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا

یہاں حضرت براء کے حوالے سے ایک اہم قصے کی طرف اشارہ بھی ضروری ہے کہ جب وہ اپنی قوم کے ہمراہ یثرب سے مکہ آ رہے تھے تو انھوں نے قوم سے کہا: ''میری ایک رائے ہے۔ مجھے نہیں علم کہ تم اس سے اتفاق کرو گے یا نہیں۔'' قوم نے پوچھا: ''وہ کیا ہے؟'' براء نے کہا: ''میرا دل چاہتا ہے کہ میں کعبے کی طرف پشت نہ کروں اور نماز میں رخ اُس کی طرف پھیرلوں۔'' سب نے کہا: ''ہمیں تو یہی خبر ملی ہے کہ نبی ﷺ شام، یعنی بیت المقدس کی جانب رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں اور ہمیں اس کی مخالفت نہیں کرنی چاہیے۔'' اب براء کعبے کی طرف اور باقی حضرات بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے اور اسی حالت میں مکہ پہنچے۔ وہ نبی ﷺ کو خبر دینے کے لیے مسجد حرام میں پہنچے۔ آپ ﷺ اپنے چچا عباس رضی اللہ عنہ کے ہمراہ تشریف فرما تھے۔ آپ نے عباس رضی اللہ عنہ سے کہا: «هَلْ تَعْرِفُ هٰذَيْنِ الرَّجُلَيْنِ يَا أَبَا الْفَضْلِ؟» ''ابوالفضل! کیا آپ ان دو آدمیوں کو جانتے ہیں؟'' عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ہاں، یہ براء بن معرور اپنی قوم کے سردار اور یہ کعب بن مالک ہیں۔'' نبی ﷺ نے پوچھا: «الشَّاعِرُ؟» ''کعب جو شاعر ہیں؟'' عباس رضی اللہ عنہ نے

---

1 التاريخ الإسلامي للحميدي:97/3. 2 التربية القيادية للدكتور الغضبان:67/2. 3 التحالف السياسي في الإسلام للدكتور الغضبان، ص:82.

کہا: ''ہاں!'' تب براء نے تمام قصہ کہہ سنایا کہ وہ سفر میں کعبے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے ہیں، پھر آپ ﷺ سے رائے دریافت کی۔ نبی ﷺ نے فرمایا: «قَدْ كُنْتَ عَلٰى قِبْلَةٍ لَّوْ صَبَرْتَ عَلَيْهَا» ''جس قبلے پر تم تھے کاش اسی پر کاربند رہتے۔''[1]

حضرت کعب رضی اللہ عنہ بتاتے ہیں کہ براء رضی اللہ عنہ نے دوبارہ نبی ﷺ کا قبلہ اختیار کر لیا اور ہمارے ساتھ شام (بیت المقدس) کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے لگے۔ انھوں نے مرض الموت میں اہل خانہ سے کہا کہ انھیں قبلہ رخ کر دیں۔ اسی دوران اپنے ایک تہائی مال کی وصیت نبی ﷺ کے لیے کی۔ براء نبی ﷺ کی مدینہ آمد سے قبل ہی ماہ صفر میں انتقال کر گئے تھے۔ آپ ﷺ نے ان کا ایک تہائی مال قبول فرمایا اور بعدازاں انھی کے بیٹے کو عطا کر دیا اور وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے اپنے مال میں سے ایک تہائی کی وصیت کی تھی۔[2]

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ کے فرامین اور آپ کی سیرت طیبہ پر عمل کا غایت درجہ التزام کیا، چنانچہ کوئی بھی تجویز چاہے اس کی بنیاد اپنی جگہ کتنی ہی مضبوط ہو مگر تعلیمات نبوی سے میل نہ کھائے تو وہ مسترد کر دی جائے گی۔ یہ اسلامی تعلیمات کا پہلا سبق تھا جس پر وہ زندگی بھر کاربند رہے، حالانکہ اس وقت وہ لوگ اسلام کی پیروی کے ابتدائی دور میں تھے۔

قیادت و سیادت صرف نبی ﷺ کے لائق ہے۔ صرف وہی انسان احترام کے قابل ہوسکتا ہے جو نبی ﷺ کے احکامات کی پابندی اور سیرت طیبہ اپنانے، جاہلی رسومات سے چھٹکارا حاصل کرنے اور ایمانی اقدار پر کاربند رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی وہ ٹھوس بنیاد ہے جس پر لوگوں کی تنظیم نو کی جا سکتی ہے۔[3]

⑦ نقیبوں کے انتخاب میں درج ذیل نکات قابل توجہ ہیں:

---

1 مسند أحمد: 461/3، والسيرة النبوية لأبي شهبة: 444/1. 2 السيرة النبوية لأبي شهبة: 445/1.

3 من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 135.

رسول اللہ ﷺ نے اپنی طرف سے نقیب مقرر نہیں کیے بلکہ یہ کام بیعت کرنے والوں پر چھوڑ دیا تاکہ منتخب افراد بہتر نمائندے اور ذمہ دار داعی ثابت ہوسکیں۔ انسان کے لیے بہتری بھی اسی میں ہے کہ وہ خود اپنے نمائندے اور مختارِ کار چنے۔ درحقیقت یہ شورائی معاملہ تھا اور آپ ﷺ نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھیں اس کی عملی تربیت دی۔

اس انتخاب میں اکثریت کو مدنظر رکھا گیا۔ خزرجی لوگ اوس کے مقابلے میں تین گنا زیادہ تھے، اس لیے ان میں سے نو اور اوس میں سے تین نقیب مقرر ہوئے۔ [1]

رسول اللہ ﷺ نے ایسے وقت نقیب مقرر فرمائے جب یثرب میں اسلام کی جڑیں مضبوط ہو رہی تھیں اور اسلام اختیار کرنے والے روز بروز بڑھ رہے تھے۔ آپ ﷺ انھیں احساس دلانا چاہتے تھے کہ وہ اجنبیوں کی حیثیت سے واپس نہیں جا رہے کہ اُن پر ان کے علاوہ کسی اور کو قائد مقرر کیا گیا ہو بلکہ وہ اسلامی برادری میں شامل ہو چکے ہیں اور اس دین کے حمایتی اور مددگار ہیں۔ [2]

⑧ بیعت عقبۂ ثانیہ کے بارے میں سرداران مکہ کو جب علم ہوا تو انھوں نے فوراً اہل یثرب کا تعاقب کیا اور دو افراد سعد بن عبادہ اور مُنذر بن عمرو رضی اللہ عنہما کو اذاخر نامی جگہ پر گھیرنے میں کامیاب ہوگئے۔ مُنذر رضی اللہ عنہ تو ان کے ہاتھ نہ لگے لیکن سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو انھوں نے پکڑ لیا اور کجاوے کی رسی سے باندھ لیا۔ یاد رہے یہ دونوں ان بارہ سرداروں میں سے تھے، بہر حال سعد رضی اللہ عنہ کو وہ مارتے ہوئے اور ان کے لمبے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے مکہ لے آئے۔ [3] بالآخر انھیں حارث بن امیہ اور جبیر بن مطعم کی سفارش سے رہائی ملی کیونکہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ اپنے شہر میں ان کی تجارت کے نگہبان ہوتے تھے، چنانچہ جاہلیت کے تعلقات ان کے کام آئے لیکن مسلمانوں کی تلواریں انھیں نہ چھڑا سکیں۔ سعد رضی اللہ عنہ

---

1 السيرة النبوية لأبي فارس، ص:209. 2 دراسات في السيرة النبوية للدكتور عماد الدين خليل، ص:132. 3 التاريخ الإسلامي للحميدي: 107/3.

نے اس سلسلے میں کسی ناراضی کا اظہار نہیں کیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مسلمان تو خود مکہ میں چھپتے پھر رہے ہیں اور اپنی حفاظت کرنے سے بھی عاجز ہیں۔[1]

اس موقع پر ضرار بن خطاب بن مرداس نے دو شعر کہے جو ہجرت کے سلسلے میں پہلے اشعار تھے۔ اس نے فخریہ انداز میں کہا تھا:

''میں نے سعد پر زبردستی قابو پالیا اور اسے پکڑ لیا۔ اگر منذر کو بھی پکڑ لیتا تو مجھے تسلی ہو جاتی۔'' ''اگر میں اسے پکڑ لیتا تو اس کا وہیں خون بہا دیا جاتا۔ اور وہ ذلت کا اور قتل ہونے ہی کا مستحق تھا۔''

ادھر حضرت حسان رضی اللہ عنہ جواب دینے کے لیے تیار تھے۔ انھوں نے برمحل چند اشعار کہے: جنھیں قافلے والے ایک دوسرے کو سنایا کرتے تھے:

''تو سعد کا ہم پلہ نہیں اور نہ کوئی آدمی مُنذر کا ہمسر ہے۔ جب قریش کے گھڑسواروں اور شتربانوں نے ان دونوں کو گھیرا۔''

''تو اس سوئے ہوئے شخص کی طرح نہ ہو جو خواب میں دیکھتا ہے کہ میں کسریٰ یا قیصر کے شہر میں ہوں۔''

''پس بے شک ہماری اور جو ہماری طرف قصیدے بھیجتا ہے اس کی مثال اس شخص کی طرح ہے جو کھجوروں کی سرزمین خیبر میں کھجوریں بیچنے چلا آئے، یعنی ''الٹے بانس بریلی کو'' والا معاملہ ہے۔''[2]

⑨ حضرت عباس بن عبادہ بن نضلہ رضی اللہ عنہ نے کہا تھا: ''اس ذات کی قسم جس نے آپ کو برحق نبی بنا کر مبعوث فرمایا! اگر آپ حکم دیں تو علی الصباح ہم اہل منیٰ پر تلواروں سے ٹوٹ پڑیں۔'' لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: ''مجھے ابھی اس کا حکم نہیں ملا، لہٰذا تم اپنی قیام گاہوں پر واپس چلے جاؤ۔'' یہ ایک عظیم تربیتی سبق تھا کہ اسلام کا دفاع اور دشمنوں سے سلوک کا

[1] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 116/2. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 65/2.

تعین مسلمانوں کی مرضی سے نہ ہوگا بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کے حکمت بھرے احکامات کے مطابق ہوگا، اب کسی امر کا جائزہ لیے یا آپس میں مشورہ کیے بغیر کوئی بھی اقدام یا حملہ درست نہ ہوگا۔[1] اس وقت ضرورت اس امر کی تھی کہ سیاسی منصوبہ بندی جتنی مضبوط ہوگی اتنی ہی زیادہ کامیابیوں کا امکان ہوگا اور اپنے طے شدہ منصوبوں پر عمل پیرا ہونے کے لیے جتنی بھی راز داری اختیار کی جائے گی اسی قدر کامیابی کا حصول ممکن ہوگا، اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم اپنی خواب گاہوں میں واپس چلے جاؤ۔''[2]

⑩ مرد حضرات سے بیعت کا طریقہ یوں ہوتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ اپنا دست مبارک پھیلاتے اور لوگ اس پر اپنا ہاتھ رکھ کر بیعت کرتے لیکن دو عورتیں جو اس بیعت میں شامل تھیں انھوں نے آپ سے ہاتھ نہیں ملایا بلکہ نبی ﷺ نے کبھی کسی اجنبی عورت کے ہاتھ کو چھوا تک نہیں، بہر حال ان دونوں نے بھی بیعت کی جسے ''بیعت حرب'' کہا جاتا ہے اور یہ عہد ساری عمر نبھایا۔ ام عمارہ نسیبہ بنت کعب مازنیہ رضی اللہ عنہا احد میں شدید زخمی ہوئیں اور تقریباً بارہ زخم کھائے۔ وہ درحقیقت اپنے شوہر زید بن عاصم بن کعب رضی اللہ عنہ کے ہمراہ وہاں پہنچی تھیں اور اپنے مشکیزے سے مسلمانوں کو پانی پلاتی تھیں۔ جب مسلمانوں کے قدم اکھڑے تو وہ جلدی سے آپ ﷺ کی طرف متوجہ ہوئیں، عملاً جنگ میں حصہ لیا اور تلوار سے رسول اللہ ﷺ کا دفاع کرتی رہیں اور انھیں ایک گہرا زخم لگا تھا۔ وہ بیعت رضوان میں بھی شریک ہوئیں۔[3]

مسیلمہ کذاب نے ان کے لخت جگر حبیب بن زید بن عاصم رضی اللہ عنہما کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے لیکن نہ وہ کمزور ہوئیں اور نہ ڈگمگائیں۔[4]

فتنۂ ارتداد میں جنگ یمامہ میں خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں باقاعدہ شریک ہوئیں

1 التاريخ الإسلامي للحميدي: 104/3. 2 التحالف السياسي في الإسلام للدكتور الغضبان، ص: 96. 3 المرأة في العهد النبوي للدكتورة عصمة الدين، ص: 108. 4 التحالف السياسي في الإسلام للدكتور الغضبان، ص: 87.

اور جنگ میں انھیں بارہ زخم آئے اور ایک بازو بھی کٹ گیا۔[1]

اور بیعت کرنے والی دوسری خاتون اسماء بنت عمرو بنوسلمہ سے تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی والدہ یا معاذ رضی اللہ عنہ کی پھوپھی کی بیٹی تھیں۔[2]

⑪ سیرت صحابہ رضی اللہ عنہم پر لکھی گئی کتب کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ عقبہ ثانیہ میں شریک قریباً تہتر افراد میں سے ایک تہائی افراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یا کچھ دیر بعد شہید ہوگئے اور تقریباً نصف تعداد ہر معرکے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو بہ پہلو شریک جنگ رہی اور جنگِ بدر میں ان میں سے تقریباً ستر افراد نے شرکت کی۔

بیعتِ عقبہ کے تمام حاضرین نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کیے وعدے کو پورا کیا۔ ان میں سے بعض آپ کی زندگی ہی میں رتبۂ شہادت سے سرفراز ہوگئے اور بعض نے امت اسلامیہ کی قیادت میں اہم کردار ادا کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عظیم معرکوں میں حصہ لیا۔ تاریخ اپنے تمام ادوار اور زمانے کھنگال ڈالے مگر اس کے صفحات میں ان افراد کی نظیر نہیں ملے گی۔ وہ لوگ ایسے تھے جنھوں نے لوگوں کو عطا کیا اور خود سوائے جنت کے کسی چیز کے طلبگار نہ ہوئے اور رہتی دنیا کے لیے ایک یادگار چھوڑ گئے۔[3]

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 80/2، و أسد الغابة: 395/5، و البداية والنهاية: 3/158-166، والإصابة: 8/8. [2] المرأة في العهد النبوي للدكتورة عصمة الدين، ص: 108. [3] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 140/2.

باب 4

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ہجرتِ مدینہ

ہجرت کی ابتدائی تیاریاں

ہجرت مدینہ سے قبل اللہ تعالیٰ کی توفیق اور مہربانی سے رسول اللہ ﷺ نے جو مکمل منصوبہ بندی اور تیاری فرمائی اس کے دو پہلو تھے: ایک طرف مہاجرین میں جذبہ پیدا کرنا اور دوسری طرف یثرب کی فضا اس ہجرت کے لیے سازگار بنانا۔

مہاجرین کی تیاری: ہجرت مدینہ کوئی سیر وتفریح کا سفر نہ تھا کہ لوگ اسے راحتِ جان کے لیے اختیار کرتے۔ یہ تو اپنی سرزمین، خاندان، قریبی تعلقات، دوستی ومحبت کے رابطے اور وسائل رزق کو اپنے عقیدے کی حفاظت کے لیے خیر باد کہنا تھا، اس لیے مہاجرین کو ایک اعلیٰ درجے کے جذبۂ قناعت وصبر کی اشد ضرورت تھی جس کے لیے سخت محنت درکار تھی۔ مندرجہ ذیل وسائل اس کے حصول کا سبب بنے:

- گہری ایمانی تربیت جسے گزشتہ صفحات میں ذکر کیا گیا۔
- مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم جن سے کفار کے ساتھ گزارا نہ ہونے کے خیال نے جنم لیا اور وہ اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔
- قرآن کریم کی مکی سورتوں میں قصدِ ہجرت کی ترغیب دی گئی اور اس بات کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی کہ اللہ کی زمین بڑی وسیع ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۗ وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ۗ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○﴾

”کہہ دیجیے: اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو! اپنے رب سے ڈرو، جنھوں نے اس دنیا میں اچھے عمل کیے ان کے لیے بھلائی ہے اور اللہ کی زمین وسیع ہے، بلاشبہ صبر کرنے والوں کو ان کا پورا پورا اجر بے حساب دیا جائے گا۔“ [1]

پھر اس کے بعد سورۂ کہف کا نزول ہوا جس میں ایمان دار نوجوانوں کی ایک جماعت کا تذکرہ ہے کہ وہ کس طرح ہجرت کر کے ایک غار میں پہنچے۔ اس سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ ہمیں بھی اپنے عقیدے کے تحفظ کے لیے عزیز و اقارب اور وطن کو چھوڑ دینا چاہیے۔

اس کے بعد سورۂ نحل میں صریحاً ہجرت مدینہ کا یوں تذکرہ کیا گیا:

﴿وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۖ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۚ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ○ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ○﴾

”اور جن لوگوں نے ظلم وستم سہنے کے بعد اللہ کی راہ میں ہجرت کی، البتہ ہم انھیں دنیا میں ضرور اچھا ٹھکانا دیں گے اور یقیناً آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے۔ کاش! وہ علم رکھتے، وہ لوگ جنھوں نے صبر کیا اور وہ اپنے رب ہی پر توکل کرتے ہیں۔“ [2]

اسی سورت کے آخر میں اس مفہوم کو پھر بطور تاکید بیان کیا گیا:

﴿ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا اِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○﴾

”پھر بے شک آپ کا رب ان لوگوں کے لیے (مہربان ہے) جنھوں نے آزمائش میں پڑنے کے بعد ہجرت کی، پھر جہاد کیا اور صبر کیا، بے شک آپ کا رب ان (آزمائشوں)

[1] الزمر 10:39. [2] النحل 42,41:16.

کے بعد (ان لوگوں کے لیے) البتہ بہت بخشنے والا، نہایت مہربان ہے۔''[1]

قبل ازیں ہجرت حبشہ میں بھی اعزہ واقربا اور وطن چھوڑنے کا عملی تجربہ ہو چکا تھا۔

یثرب میں حمایت اسلام: نبی ﷺ نے مکہ سے یثرب (مدینہ) انصار کے پاس منتقل ہونے میں جلد بازی سے کام نہیں لیا بلکہ دو سال انتظار کیا تاکہ مدینہ میں دعوت کی ایک وسیع بنیاد قائم ہو جائے اور کچھ مدت وہ لوگ قرآنی تعلیمات کی روحانی لذتوں سے فیض یاب ہوں۔ ان کی یہ تربیت حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی خصوصی توجہ سے عمل میں آئی۔

جب نبی ﷺ کو یقین ہو گیا کہ انصار کی قبول اسلام کی استعداد کمال کو پہنچ گئی ہے تو آپ ﷺ عازم سفر ہوئے۔ انصار کا آپ کو ہجرت کی دعوت دینا، بیعت عقبہ ثانیہ میں گفتگو اور تحفظات کی بات کرنا، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کیے گئے وعدے کو اپنی زندگی کا اہم میثاق سمجھنا، اہل منیٰ جنھوں نے نبی ﷺ کو اذیتیں دی تھیں، ان کے خلاف جنگ کے لیے تیار ہونا۔ اگرچہ آپ ﷺ نے اس سے منع فرما دیا کہ ہمیں ابھی اس کا حکم نہیں۔ یہ سب امور اس حقیقت کا منہ بولتا ثبوت تھے کہ انصارِ مدینہ اسلام کے دست و بازو بننے کے لیے پوری طرح آمادہ ہیں۔ گویا اہل یثرب کی تیاری مکمل ہو چکی تھی کہ وہ مہاجرین کا کما حقہ استقبال کر سکیں اور اس کے بعد پیش آنے والے مسائل کا خندہ پیشانی سے سامنا کر سکیں۔

سورۂ عنکبوت کے توجہ طلب مقامات

سورۂ عنکبوت مکی دور کے آخری ایام میں نازل ہونے والی سورت ہے جس میں دعوتی میدان میں پیش آمدہ آزمائشوں کا ذکر ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿الٓمٓ ○ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ○ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ○ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ۭ سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ○﴾

1 النحل 110:16.

''الٓمّٓ، کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ صرف یہ کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور انھیں آزمایا نہیں جائے گا اور البتہ تحقیق ہم نے ان لوگوں کو آزمایا ہے جو ان سے پہلے تھے، چنانچہ اللہ ان لوگوں کو ضرور ظاہر کرے گا جنھوں نے سچ بولا اور وہ ضرور ظاہر کرے گا ان کو جو جھوٹے ہیں، کیا جو لوگ برے عمل کرتے ہیں انھوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ ہم سے بچ کر نکل جائیں گے۔ بہت برا ہے جو وہ فیصلہ کرتے ہیں۔''[1]

سورۂ عنکبوت کے تین مقامات انتہائی غور طلب ہیں:

منافقین کا ذکر حالانکہ نفاق اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب مسلمانوں کا غلبہ ہو۔ تب کچھ لوگ اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے اسلام کا اظہار کرتے ہیں مگر دل سے بدستور شرک پر قائم رہتے ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو مکہ میں جاہلیت غالب تھی۔ اور مشرکین کو قوت اور غلبہ حاصل تھا، پھر منافقین کا ذکر کس بنا پر کیا گیا جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:

﴿ وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ○ ﴾

''اور اللہ انھیں ضرور ظاہر کرے گا جو ایمان لائے اور وہ منافقوں کو بھی ضرور ظاہر کرے گا۔''[2]

سورۂ عنکبوت مکی ہے۔ تو کیا اہل ایمان کو مستقبل قریب میں کوئی واضح مدد یا کشادگی کے آثار نظر آرہے تھے (جس کی وجہ سے بعض منافق لوگ ان میں شامل ہوگئے تھے)؟ یا مذکورہ بالا آیت مدنی ہے، جبکہ سورت مکی ہے جس طرح کہ بعض مفسرین کی یہ رائے ہے کیونکہ ابھی نفاق تو وجود میں نہیں آیا تھا؟[3]

اہل کتاب کے ساتھ افہام و تفہیم کا بہتر انداز اختیار کرنا: درحقیقت یہ حکم پیش آمدہ مرحلے

---

[1] العنکبوت 29:1-4۔ [2] العنکبوت 29:11۔ [3] اس کی وضاحت کے لیے ملاحظہ کیجیے المعجم المفهرس اس کے مؤلف محمد فواد عبدالباقی نے اس آیت کے ساتھ ''م'' کی رمز لگائی ہے جو کہ آیت کے مدنی ہونے کی علامت ہے۔ اور ملاحظہ کیجیے: تفسير القرطبي: 323/13.

کے حوالے سے تھا کہ عنقریب اہل کتاب سے واسطہ پڑے گا اور اے اہل ایمان! تمھیں اہل کتاب سے ٹکر لینے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔

اللہ کی وسیع زمین میں ہجرت کے لیے لوگوں کو تیار کرنا: دراصل پہلی بیعت عقبہ کے بعد ہی مہاجرین کے استقبال کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ جب سورۂ عنکبوت نازل ہوئی تو حالات دگرگوں تھے لیکن اس سورت میں واضح طور پر ہجرت مدینہ کا اشارہ دیا گیا کہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے جو ہر ایک کو ہر وقت اور ہر مقام پر رزق عطا کرتا ہے۔[1]

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ۝﴾

''اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو! بلاشبہ میری زمین وسیع ہے تو تم میری ہی عبادت کرو۔''[2]

مذکورہ بالا آیت اہل ایمان کو مکہ سے ہجرت کرنے پر ابھارتی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی زمین بہت وسیع ہے اور اس زمین میں رہنا درست نہیں جہاں کفار کی اذیتیں برداشت کرنا پڑیں بلکہ درست سوچ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے اچھے لوگ اور بہتر سرزمین منتخب کی جائے، گویا کہ آیت میں کہا گیا ہے: ''اے اہل ایمان! اگر مکہ میں اظہار ایمان مشکل ہے تو اظہار توحید کے لیے ہجرت کر جاؤ کیونکہ اللہ کی سرزمین بہت وسیع ہے۔''[3]

بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ فراوانیِ رزق کسی خاص خطۂ زمین سے منسلک نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق جہاں کہیں آباد ہوگی وہیں انھیں رزق پہنچایا جائے گا اور مہاجرین کا رزق مدینہ ہی میں مقدر تھا، چنانچہ وہاں انھوں نے پہلے سے زیادہ اور عمدہ رزق پایا، نیز تھوڑے ہی عرصے میں وہ بہت سے شہروں اور ملکوں کے حکام بن گئے۔[4]

---

1 معالم قرآنية في الصراع مع اليهود للدكتور مصطفى مسلم، ص:63,62. 2 العنكبوت56:29.
3 تفسير القرطبي:5073/6. 4 تفسير ابن كثير:360/3.

اسی لیے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ۖ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○﴾

''اور کتنے ہی (زمین پر) چلنے پھرنے والے ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے، اللہ انھیں اور تمھیں بھی رزق دیتا ہے اور وہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔''[1]

سورۂ عنکبوت میں اللہ تعالیٰ نے ہر ذی روح کی موت کی طرف یہ کہہ کر اشارہ فرمایا:

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآىِٕقَةُ الْمَوْتِ ۟ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ○﴾

''ہر جاندار موت کا مزہ چکھنے والا ہے، پھر تم ہماری ہی طرف لوٹائے جاؤ گے۔''[2]

گویا انسان موت کی تلخی اور کرب کو ایسے محسوس کرے گا جس طرح کوئی کھانے کا ذائقہ حاصل کرتا ہے تو فرمانِ الٰہی کا مطلب یوں ہوگا کہ تم سب مرنے والے ہو اور عنقریب دنیاوی اعمال کا بدلہ پانے والے ہو، لہٰذا ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ آخرت کے لیے پونجی جمع کرے۔[3]

اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو اس آیت کریمہ میں ہجرت کی رغبت دلائی گئی ہے کیونکہ جب یقینی موت کا تصور دل میں بیٹھ جائے تو وطن چھوڑنا آسان ہوجاتا ہے۔[4]

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ مذکورہ آیت کے ضمن میں فرماتے ہیں: ''فرمان الٰہی ہے کہ تم جہاں بھی ہوگے موت بہر صورت برحق ہے، اس لیے حکم الٰہی کے مطابق ہمیشہ اللہ کی فرماں برداری اختیار کرو اور یہی تمھارے لیے بہتر ہے کیونکہ موت سے کوئی انسان بھاگ نہیں سکتا۔ موت یقینی امر ہے اور اللہ کا فرمانبردار بندہ جب اس کے پاس لوٹے گا تو بہترین جزا کا مستحق قرار پائے گا۔''[5]

1 العنکبوت 60:29. 2 العنکبوت 57:29. 3 الکشاف للزمخشري: 310/3، وتفسیر أبي السعود: 45/7، وفتح القدیر للشوکاني: 210/4. 4 الأساس في التفسیر لسعید حوی: 4223/8.
5 تفسیر ابن کثیر: 359/2.

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ○ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ○﴾

''اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، ہم انھیں جنت کے بالاخانوں میں ضرور جگہ دیں گے، ان کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، (نیک) عمل کرنے والوں کا اجر بہت اچھا ہے، جن لوگوں نے صبر کیا اور وہ اپنے رب ہی پر توکل کرتے ہیں۔''[1]

اس آیت میں مومنین کی دین اسلام پر ثابت قدمی، ہجرت الی اللہ، دشمنوں کے خلاف تیاری اور اپنے اعزہ و اقربا کو چھوڑنے کا ذکر ہے، جبکہ وہ رضائے الٰہی کے خواہش مند اور اللہ کے حسب وعدہ ثواب کی امید رکھتے ہیں، نیز ان تمام امور میں وہ اللہ ہی پر بھروسا رکھتے ہیں۔[2]

مہاجرین کے قافلے

جب خیر و برکت سے معمور نورانی ہراول دستوں نے یثرب سے آکر نبی ﷺ کی اسلام اور آپ کے دفاع پر بیعت کر لی تو مشرکین مکہ بھڑک اٹھے اور مسلمانوں کو پہلے سے زیادہ اذیتیں دینے لگے۔ تب رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو ہجرت مدینہ کا حکم دیا جس کا مقصد وہاں ایک اسلامی مملکت کا قیام تھا جہاں دعوتِ اسلامی کو فروغ مل سکے اور اس کی اشاعت کے لیے مستقل محنت کی جا سکے یہاں تک کہ سارا فتنہ و فساد ختم ہو جائے اور دین الٰہی سب دینوں پر غالب آجائے۔[3]

نبی ﷺ کا حکم ہجرت رضائے الٰہی کے مطابق تھا۔ حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں: ''جب

1 العنكبوت29:58,59. 2 الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 325.
3 الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبدالرحمٰن البر، ص: 33، 34.

دوسری بیعت عقبہ ہوئی اور ستر انصارِ مدینہ واپس روانہ ہوئے تو نبی ﷺ کو خوشی اور اطمینان میسر آیا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی حفاظت کے لیے ایسی قوم پیدا فرما دی تھی جو جنگجو بھی تھے اور آپ کے لیے کمک اور بوقت ضرورت مدد بھی فراہم کر سکتے تھے۔ جب مشرکینِ مکہ کو علم ہوا تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر سختیاں بڑھ گئیں اور وہ انھیں بلاوجہ ستانے لگے اور پہلے سے زیادہ دشنام طرازی کرنے اور اذیتیں دینے لگے۔ اصحابِ رسول نے جب شکایت پیش کی اور ہجرت کی اجازت مانگی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«قَدْ أُرِيتُ دَارَ هِجْرَتِكُمْ، رَأَيْتُ سَبْخَةً ذَاتَ نَخْلٍ بَيْنَ لَابَتَيْنِ وَلَوْ كَانَتِ السَّرَاةُ أَرْضَ نَخْلٍ وَّ سِبَاخٍ، لَقُلْتُ: هِيَ هِيَ»

”مجھے تمھارا دار ہجرت دکھایا گیا ہے، وہ ایک شوریدہ اور کھجوروں والی زمین ہے جو دو سیاہ پتھریلی زمینوں کے درمیان واقع ہے[1] اور اگر ”سُراۃ“ کھجوروں والی زمین ہوتا تو میں اسے دار ہجرت سمجھتا۔“[2]

پھر کچھ ہی دنوں بعد آپ ﷺ اپنے اصحاب کے پاس خوشی خوشی تشریف لائے اور فرمایا:

«قَدْ أُخْبِرْتُ بِدَارِ هِجْرَتِكُمْ وَ هِيَ يَثْرِبُ فَمَنْ أَرَادَ الْخُرُوجَ فَلْيَخْرُجْ إِلَيْهَا»

”مجھے تمھارا دارِ ہجرت بتا دیا گیا ہے۔ وہ یثرب ہے۔ اب تم میں سے جو چاہے یثرب کی جانب ہجرت کر سکتا ہے۔“[3]

یوں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم یکے بعد دیگرے یثرب کی طرف ہجرت کرنے لگے۔ وہ آپس

[1] صحيح البخاري، حديث: 2297. [2] سبل الهدىٰ والرشاد للصالحي: 224/3. ”سراۃ“ عرفات یا طائف سے لے کر صنعاء (یمن) تک پھیلا ہوا پہاڑی علاقہ ہے، اس کے ایک طرف تہامہ اور دوسری طرف نجد ہے۔ اس میں سراۃ ثقیف، سراۃ ازد، سراۃ فہم وعدوان، سراۃ بنی شبابہ وغیرہ شامل ہیں۔ (معجم البلدان: 204/3) [3] سبل الهدىٰ والرشاد للصالحي: 224/3.

میں مشورہ کرتے، ایک دوسرے کی ڈھارس بندھاتے اور اتفاق رائے سے پوشیدہ طور پر عازم سفر ہو جاتے۔ سب سے پہلے مدینہ طیبہ تشریف لانے والے ابوسلمہ بن عبدالاسد تھے، پھر عامر بن ربیعہ اپنی بیوی لیلیٰ بنت ابی حثمہ کے ساتھ مدینہ پہنچے۔ یہ وہ پہلی خاتون تھیں جنھوں نے مدینہ کی طرف ہجرت کی، پھر قافلوں کی شکل میں لوگ پہنچنے لگے اور انصار مدینہ نے مہاجرین کو اپنے گھروں میں جگہ دی اور ان کی مدد اور غمخواری کی۔ ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کے غلام سالم رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے قبل قباء میں مہاجرین کی امامت فرماتے رہے۔

مسلمانوں کی ہجرت مدینہ کی خبر سنتے ہی قریش انتہائی غضبناک ہوئے۔ انھوں نے اپنے قبائل کے مسافر نوجوانوں سے مال و اسباب چھین کر غصہ اتارنے کی کوشش کی۔

یہاں اس قافلے کا ذکر ضروری ہے جنھوں نے دوسری بیعت عقبہ میں شرکت کی اور جب مہاجرین قباء پہنچنے شروع ہوئے تو وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مکہ پہنچ گئے اور مہاجرین صحابہ کے ساتھ مل کر عازمِ مدینہ ہوئے۔ اس لحاظ سے وہ بیک وقت مہاجرین بھی ہوئے اور انصاری بھی کہلائے۔ یہ ذکوان بن عبدقیس، عُقْبہ بن وہب بن کلدہ، عباس بن عبادہ بن نصلہ اور زِیَاد بن لَبِید رضی اللہ عنہم تھے۔

دریں اثنا تقریباً تمام مسلمان مکہ سے ہجرت کر چکے تھے اور وہاں صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر رضی اللہ عنہ اور علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ تھے یا کوئی مصیبت زدہ، بیمار یا ہجرت سے معذور ہی رہ گیا تھا۔[1]

ہجرتِ مدینہ اور قریش کی رکاوٹیں

ابوسلمہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی ہجرت: حضرت ام سلمہ ہند بنت ابوامیہ رضی اللہ عنہا اپنی اور اپنے خاوند کی ہجرت مدینہ کے سلسلے میں اپنے ایمانی جذبے اور یقین محکم کا تذکرہ اس طرح فرماتی ہیں: ''جب ابوسلمہ رضی اللہ عنہ نے ہجرت مدینہ کا فیصلہ کر لیا تو مجھے اور میرے بیٹے سلمہ بن

1 الطبقات الکبریٰ لابن سعد: 325/1.

ابی سلمہ کو اونٹ پر سوار کیا اور سفر شروع کیا۔ جب بنومغیرہ بن عبداللہ بن عمرو بن مخزوم کے لوگوں نے دیکھا تو وہ آکر کہنے لگے:

''جہاں تک تمھاری ذات کا تعلق ہے اس سلسلے میں ہم بے بس ہیں لیکن ہم اپنے گھر کی لڑکی کس لیے چھوڑ دیں کہ تم اسے شہر شہر گھماتے پھرو۔''

چنانچہ انھوں نے اونٹنی کی مہار ہاتھ میں لی اور مجھے پکڑ لیا۔ اس پر ابوسلمہ کے گھر والوں کو تاؤ آ گیا۔ انھوں نے کہا:

''جب تم لوگوں نے اس عورت کو ہمارے آدمی سے چھین لیا تو ہم اپنا بیٹا اس کے پاس نہیں رہنے دیں گے۔''

چنانچہ فریقین نے اس بچے پر کھینچا تانی کی جس سے اس کا بازو اکھڑ گیا اور ابوسلمہ کے قبیلے والے اسے لے گئے۔ مجھے بنومغیرہ اپنے ہاں لے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میرے خاوند ابوسلمہ رضی اللہ عنہ نے اکیلے یثرب کا سفر کیا۔ اس طرح میرے، میرے خاوند اور بیٹے کے درمیان جدائی پیدا ہوگئی۔

ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: ''میں ہر روز صبح ابطح نامی جگہ پر جاتی اور سارا دن وہاں رو رو کر گزار دیتی یہاں تک کہ تقریباً ایک سال گزر گیا، پھر اچانک ایک روز میرے خاندان کا ایک آدمی وہاں سے گزرا تو اسے مجھ پر رحم آ گیا۔ اس نے بنومغیرہ سے کہا: ''تم اس بیچاری کو جانے کیوں نہیں دیتے اور خواہ مخواہ اس کے شوہر اور بیٹے سے اسے جدا کر رکھا ہے۔''

تب انھوں نے کہا کہ اگر تو چاہے تو جا سکتی ہے اور بنوعبد الاسد نے میرا بیٹا بھی واپس کر دیا۔ میں اپنے اونٹ پر سوار ہوئی، بیٹا گود میں لیا اور اکیلی عازم سفر ہوئی۔ میں سوچ رہی تھی کہ جو کوئی راستے میں ملا، اس سے گزارش کروں گی کہ مجھے میرے خاوند کے پاس پہنچا دے۔ جب میں تنعیم پہنچی تو عثمان بن طلحہ بن ابی طلحہ سے ملاقات ہوگئی جو کہ بنوعبد الدار کے ایک فرد تھے، وہ بولے: ''اے بنت ابوامیہ! کہاں کا ارادہ ہے؟''

میں نے کہا: ”اپنے خاوند کے پاس مدینہ جانا چاہتی ہوں۔“

عثمان نے پوچھا: ”کیا تمھارے ساتھ کوئی ہے؟“

میں نے کہا: ”اللہ کی قسم! سوائے اللہ اور اس چھوٹے بیٹے کے کوئی نہیں۔“

اس پر عثمان نے کہا: ”اللہ کی قسم! تمھیں اس طرح اکیلا نہیں چھوڑا جا سکتا۔“

پھر انھوں نے اونٹ کی نکیل پکڑی اور میرے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

ام سلمہ فرماتی ہیں: ”اللہ کی قسم! میں نے عرب میں عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ سے زیادہ باحیا آدمی نہیں دیکھا۔ جب بھی کہیں پڑاؤ ڈالتے، اونٹ بٹھا دیتے اور خود دور چلے جاتے، جب میں نیچے اترتی تو اونٹ کو لے جاتے اور سامان نیچے اتارتے اور درخت سے اسے باندھ دیتے، پھر مجھ سے دور کسی درخت کے نیچے لیٹ جاتے۔ اور جب کوچ کا وقت آتا، اونٹ لیے میرے پاس پہنچتے اور اسے بٹھا دیتے اور خود دور جا کر آواز دیتے: ”سوار ہو جاؤ۔“ جب میں سوار ہو جاتی، اونٹ کی نکیل پکڑے چل دیتے۔ اس طرح وہ مجھے مدینہ تک لے آئے۔

جب قباء میں بنو عمرو بن عوف کے محلے میں پہنچے تو انھوں نے کہا: ”آپ کے خاوند ابوسلمہ اس بستی میں ہیں۔“ ابوسلمہ وہیں قیام پذیر تھے۔

پھر عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ”اللہ آپ کو برکت دے! قبا میں داخل ہو جائیں۔“ اور ان الفاظ کے ساتھ وہ مکہ واپس روانہ ہو گئے۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا اکثر فرمایا کرتی تھیں: ”میرے علم کے مطابق ہجرت کے سلسلے میں سب سے زیادہ تکلیف ابوسلمہ کے گھرانے کو پیش آئی اور عثمان بن طلحہ جیسا نیک سیرت انسان میں نے کبھی نہیں دیکھا۔“[1]

---

1 السيرة النبوية لابن هشام: 113,112/2، والسيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 203,202/1.

مندرجہ بالا قریشی طرزِ عمل شقاوت قلبی کا واضح ثبوت ہے کہ وہ کس طرح ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کو ہجرت سے روکنا چاہتے تھے کہ ایک آدمی کو اس کی بیوی اور دل کے ٹکڑے کو نظروں کے سامنے چھین لیا جائے تاکہ ہجرت مدینہ سے روکا جاسکے لیکن جب ایمان دلوں میں راسخ ہو جائے تو صاحبِ ایمان اپنے دین پر کسی کو بھی، چاہے وہ اس کا لخت جگر یا بیوی کیوں نہ ہو، ترجیح نہیں دیتا۔ اس لیے ابوسلمہ رضی اللہ عنہ بلا تردد مدینہ روانہ ہو گئے اور قریشی حربہ ناکام ہو گیا۔ اس میں اللہ کی طرف بلانے والے داعیوں کے لیے بہترین نمونہ ہے۔[1]

ایمانی حرارت جب دلوں میں داخل ہوتی ہے تو پھر اس کا اثر بھی ظاہر ہوتا ہے جس طرح کہ ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کا گھرانہ تھا کہ ان کا شیرازہ بکھیر دیا گیا۔ ایک طرف عورت زار و قطار روتی ہے تو دوسری طرف اس کے بیٹے کا بازو اکھڑ گیا اور اسے والدین سے جدا کر دیا گیا۔ خاوند اور باپ کی حیثیت رکھنے والے عظیم انسان نے اللہ کی راہ میں قربانی دینے اور اکیلے ہی سفر کرنے کی عظیم داستان رقم کی تاکہ سب سے پہلے مدینہ طیبہ پہنچے۔ انھوں نے اللہ کے راستے میں پہنچنے والی ہر تکلیف کو خندہ پیشانی سے قبول کیا، پختہ ارادے کے ساتھ اپنے ایمان پر کاربند رہے اور ہدایت یافتہ گروہ سے جا ملے۔ مقام غور یہ ہے کہ ایسے باہمت افراد کا مقابلہ کفار کیسے کر سکتے تھے!

عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ بعد میں (صلح حدیبیہ کے بعد اور) فتح مکہ سے پہلے مسلمان ہوئے، جبکہ اس وقت حالت کفر میں تھے، تاہم حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا ان کی طرف سے کریمانہ برتاؤ کی گواہی دیتی ہیں۔ یہ عربوں کے انتہائی خلوص، مردانگی اور کمزور طبقے کی حمایت جیسی خوبیوں کی واضح دلیل ہے۔[2]

حضرت عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ کی مردانگی اور خالص عربی کردار نے ایک شریف عورت کا

---

[1] السيرة النبوية للدكتور إبراهيم علي محمد أحمد، ص: 131,130. [2] الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 124.

خوفناک صحرا میں اکیلے سفر کرنا گوارا نہ کیا، حالانکہ وہ ابھی کفر پر تھے اور جانتے تھے کہ یہ عورت انھیں اور دیگر کفار قریش کو چھوڑ کر جا رہی ہے۔

امت مسلمہ کے لیے غور کا مقام ہے۔ وہ عربی اخلاق آج کہاں ہیں؟ آج بیسویں صدی کی اخلاقیات کا یہ عالم ہے کہ آزادیوں پر حملے ہوتے اور عزتوں پر ڈاکے پڑتے ہیں اور راہزنی کے واقعات عام ہو چکے ہیں۔ ہر روز اخبارات کے صفحات کی زینت بننے والی مسلح ڈکیتی، گینگ ریپ اور لوگوں کے اموال پر زبردستی قبضہ کرنے کی کارروائیاں انسانیت کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ ہیں۔

اس قصے سے اور اس جیسے دیگر واقعات سے عربوں کے نمایاں فضائل کا پتا چلتا ہے اور یہ کہ ان کی خوبیاں اور فضائل، ان کے عیوب اور گھٹیا حرکتوں سے زیادہ تھے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان میں سے آخری نبی اور رسول مبعوث فرمایا کیونکہ وہ رسالت کو قبول کرنے اور پوری دنیا تک پیغامِ رسالت پہنچانے کی قابلیت رکھنے والے تھے۔[1]

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء کی طرف کتنی توجہ فرماتا ہے اور انھیں دین کی سمجھ عطا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عثمان بن طلحہ کا دل حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے حق میں کس طرح نرم کر دیا اور پھر عثمان نے ان کی خاطر مشقت اٹھائی اور وقت کی قربانی بھی دی۔[2]

اس سے عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ کی فطرت سلیمہ کا علم بھی ہوتا ہے جس کی بنا پر وہ صلح حدیبیہ کے بعد مسلمان ہو گئے اور شاید ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی ہمراہی میں کیے ہوئے سفر کی وجہ سے ان کا دل ضبط حق کے لیے روشن ہو گیا تھا۔[3]

زبردستی مدینہ سے واپس لانا

قریشی قیادت نے مسلمانوں کو حدود مکہ میں ہجرت سے روکنے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ

1 السيرة النبوية لأبي شهبة: 461/1. 2 التاريخ الإسلامي للحميدي: 128/3. 3 السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 204/1.

مدینہ پہنچنے والے مہاجروں کو زبردستی واپس لانے کی کوششیں بھی کیں۔ وہ ایک مہاجر کو زبردستی واپس لانے میں کامیاب ہوگئے۔ [1]

اس تاریخی واقعے کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ یوں بیان کرتے ہیں: ''میں، عیاش بن ابی ربیعہ اور ہشام بن عاص بن وائل سہمی نے جب ہجرت مدینہ کا فیصلہ کیا تو مقام سَرِف [2] سے آگے اَضاۃ بنی غِفار [3] میں تَنَاضِب [4] نامی مقام پر جمع ہونے پر اتفاق کیا اور یہ طے پایا کہ جو بھی وہاں نہ پہنچ پایا تو سمجھا جائے گا کہ اسے مکہ والوں نے قید کر لیا ہے، لہٰذا باقی دونوں عازم سفر ہوجائیں گے۔'' پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''میں اور عیاش بن ابی ربیعہ تو اس جگہ پہنچ گئے لیکن ہشام قید کر لیا گیا اور آزمائش میں ڈالا گیا۔'' [5]

پھر ہم مدینہ طیبہ کے قریب قباء میں بنو عمرو بن عوف کے ہاں پہنچ گئے۔ دوسری طرف ابوجہل بن ہشام اور حارث بن ہشام جو عیاش کے چچا زاد تھے اور عیاش ان کا اخیافی بھائی تھا، عیاش کو واپس لینے مکہ سے نکلے اور ہمارے پاس پہنچ گئے جبکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ابھی تک مکہ ہی میں تھے۔ ان دونوں نے گفتگو اس طرح شروع کی کہ تیری ماں نے نذر مان رکھی ہے کہ تجھے دیکھے بغیر سر میں کنگھی نہیں کرے گی اور نہ سائے میں بیٹھے گی۔ یہ بات سن کر عیاش کا دل نرم پڑ گیا۔ میں نے عیاش سے کہا: ''دیکھو! یہ لوگ تمھیں تمھارے دین کے بارے میں آزمائش میں ڈالنا چاہتے ہیں، لہٰذا تم محتاط رہو۔ اللہ کی قسم! تمھاری ماں جوؤں کی تکلیف سے کنگھی کرنے اور مکہ کی گرمی سے تنگ آکر سایے میں بیٹھنے پر

---

1 السيرة النبوية للدكتور إبراهيم العلي ص: 132. 2 سرف: یہ مکہ کی ندیوں میں ایک متوسط طول کی ندی ہے، نیز مکہ سے چھ میل کے فاصلے پر ایک مقام کا نام سرف ہے۔ (معجم البلدان: 212/3) 3 اضاۃ بنی غِفار: یہ مکہ سے دس میل کے فاصلے پر تناضب کے قریب (سرف کے بالائی جانب) ایک مقام ہے۔ (معجم البلدان: 214/1) 4 تناضب: یہ مکہ کے قریب ایک مقام ہے۔ تناضب تنضیب کی جمع ہے اور یہ دراصل ایک درخت کا نام تھا۔ 5 الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 129.

خود بخود مجبور ہو جائے گی۔'' لیکن عیاش بن ابی ربیعہ نے کہا: ''نہیں، میں اپنی ماں کی قسم پوری کروں گا اور میرا کچھ مال مکہ میں ہے وہ بھی حاصل کرلوں گا۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا: ''اللہ کی قسم! تم جانتے ہو میں ایک مالدار قریشی ہوں۔ تم میرا آدھا مال لے لینا مگر واپس مت جاؤ۔'' لیکن عیاش رضی اللہ عنہ نہ مانے تو میں نے کہا: ''اگر تم نے واپسی کا ارادہ کر ہی لیا ہے تو میری سواری لے جاؤ کیونکہ یہ ایک عمدہ اور تجربہ کار اونٹنی ہے۔ اس پر سوار رہنا اور اگر کوئی خطرہ ہوا تو بھاگ نکلنا۔'' عیاش ان دونوں کے ساتھ واپس چل نکلے۔ راستے میں ابوجہل نے کہا کہ یہ میرا اونٹ تو بہت اکھڑ ہے، مجھے تم اپنی اونٹنی کے پیچھے بٹھالو۔

عیاش نے کہا: ''ٹھیک ہے۔'' یہ کہہ کر اونٹنی بٹھائی اور ان دونوں نے بھی اپنی اپنی سواریاں بٹھائیں، پھر اچانک وہ دونوں عیاش رضی اللہ عنہ پر ٹوٹ پڑے اور انھیں رسیوں سے باندھ لیا اور یوں وہ آزمائشوں میں ڈالے گئے۔[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''ہم دل میں کہا کرتے تھے کہ ایسے لوگ جنھوں نے اللہ کی معرفت حاصل کرلی اور پھر دوبارہ مکہ پلٹ گئے، ان سے اللہ تعالیٰ کبھی نہ فدیہ قبول کرے گا اور نہ توبہ، پھر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں:

﴿ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ۝ وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝ ﴾

''آپ کہہ دیجیے: (اللہ فرماتا ہے:) اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم و

1 السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري:205/1.

زیادتی کی ہے! تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، بے شک اللہ سب گناہ معاف کردیتا ہے، یقیناً وہی بڑا بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے اور تم اپنے رب کی طرف رجوع کرو اور اس کے فرماں بردار ہوجاؤ اس سے پہلے کہ تم پر عذاب آجائے، پھر تمھاری مدد نہ کی جائے گی۔''[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''میں نے یہ آیات لکھ کر ہشام بن عاص کے پاس مکہ روانہ کردیں۔'' ہشام رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''جب مجھے یہ آیات پہنچیں، میں ذی طویٰ میں ایک پہاڑ پر چڑھ رہا تھا اور انھیں درست پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا، پھر میں نے دعا کی: ''اے اللہ تعالیٰ! مجھے اس کا مطلب سمجھا دے۔'' تب اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں یہ خیال ڈال دیا کہ یہ آیات تو ہمارے بارے میں اور جو ہم دل میں ایک دوسرے کے متعلق سوچا کرتے تھے، اس کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، پھر میں جلدی سے اپنی سواری کے قریب پہنچا، اس پر بیٹھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مدینہ جا پہنچا۔''[2]

مندرجہ بالا واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دونوں ساتھیوں عیاش اور ہشام سے مل کر ہجرت مدینہ کے لیے ایک عمدہ پروگرام ترتیب دیا۔ یہ تینوں مختلف قبیلوں سے تعلق رکھتے تھے اور انھوں نے حدود حرم سے دور مدینہ کے راستے میں ایک جگہ اور وقت مقرر کیا اور یہ طے کرلیا کہ اگر کوئی وہاں نہ پہنچ سکا تو باقی افراد انتظار نہ کریں اور پھر ایسا ہی ہوا۔ ہشام بن عاص کو روک لیا گیا۔[3]

دوسری طرف قریش نے مہاجرین کے تعاقب کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ انھوں نے ایک پختہ منصوبہ تیار کیا جسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ابوجہل اور حارث بن ہشام مدینہ پہنچے۔ مذکورہ دونوں افراد عیاش رضی اللہ عنہ کے اخیافی بھائی بھی تھے، اس لیے اس نے ان پر اعتبار کرلیا۔

[1] الزمر 39:53-55. [2] دلائل النبوة للبيهقي 2/462,461، و مجمع الزوائد: 6/61، و مسند البزار، حديث: 1746، والهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 131. [3] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 2/159.

ابوجہل نے عیاش کو ان کی ماں کے حوالے سے ایک خودساختہ کہانی سنائی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ عیاش اپنی ماں کے لیے شفقت اور نرمی کا جذبہ رکھتے ہیں، لہٰذا وہ ان کے ساتھ لوٹنے کے لے تیار ہوگئے۔ اس واقعے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے امن و تحفظ کے اعلیٰ شعور کا بھی پتا چلتا ہے کہ عیاش کو زبردستی قیدی بنا لینے کا ان کا خدشہ درست نکلا۔[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اخوت اسلامی کا عظیم مظاہرہ کرتے ہوئے عیاش رضی اللہ عنہ کو آدھے مال کی پیشکش کی تاکہ ان کا بھائی سلامت رہے اور مشرکوں کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔ لیکن عیاش پر اپنی ماں کے حق میں نرمی اور شفقت کے جذبات غالب آ گئے۔ وہ اپنی ماں کی قسم پوری کرنے اور اپنا مال حاصل کرنے کی امید میں دھوکا کھا گئے۔ ادھر حضرت عیاش رضی اللہ عنہ نے بھی اخوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا آدھا مال لینے سے انکار کردیا، جبکہ ان کا اپنا مال مکہ میں موجود تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سوچ زیادہ گہری تھی جیسا کہ وہ عیاش کے مکہ واپسی کے سفر کو منحوس سمجھ کر انھیں آزمائش میں مبتلا ہوتے دیکھ رہے تھے۔ جب عیاش نہ مانے تو انھوں نے اپنی عمدہ اور سدھائی ہوئی سواری پیش کردی۔ اور پھر وہی ہوا جس کا عمر رضی اللہ عنہ کو ڈر تھا کہ مشرکین غداری پر اتر آئے۔[2]

مسلمانانِ مدینہ منورہ میں یہ بات عام تھی کہ جو لوگ جاہلی معاشرے میں رہنا پسند کرتے ہیں، آزمائشوں میں بھی مبتلا ہیں اور ہجرت نہ کرکے مصائب سے دوچار ہیں تو ایسے لوگوں سے فدیہ قبول نہیں کیا جائے گا۔ اس پر مذکورہ آیات نازل ہوئیں۔ ان آیات کا نازل ہونا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دلی دوست عیاش و ہشام کو لکھ بھیجا تاکہ وہ لشکر کفار سے نجات حاصل کریں۔ عمر رضی اللہ عنہ کتنے عظیم انسان تھے کہ پہلے تو اپنا نصف مال عیاش کو دینے کے لیے تیار ہوگئے تاکہ وہ واپس مکہ نہ جائے اور پھر اپنی تیز رو اونٹنی دے دی باوجودیکہ عیاش رضی اللہ عنہ نے عمر رضی اللہ عنہ کی رائے قبول نہ کی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بھائی کو

1 السيرة النبوية للدكتور إبراهيم العلي، ص: 134. 2 التربية القيادية للدكتور الغضبان:2/160.

برانہیں کہا، نہ اس کی خیر خواہی سے پہلو تہی اختیار کی اور نہ آئندہ اپنی رائے سے اجتناب کیا بلکہ ایک مسلمان بھائی کی اخوت ان پر غالب رہی اور جیسے ہی آیات مذکورہ نازل ہوئیں، فوراً اپنے دونوں بھائیوں ہشام وعیاش کو بالخصوص اور تمام ایمانداروں کو بالعموم روانہ کر دیں تا کہ وہ نئے سرے سے اہل ایمان کے ساتھ آ ملنے کی جدوجہد کریں۔ [1]

مومنین کو قید میں رکھنا

قریشیوں نے مسلمانوں کو ہجرت سے روکنے کے لیے انھیں قید میں ڈالنا شروع کر دیا۔ جو بھی ہجرت کرنا چاہتا اسے کسی ایک گھر میں ہاتھ اور پاؤں باندھ کر پھینک دیا جاتا اور بھاگنے کی کوشش ناکام بنانے کے لیے سخت پہرہ بٹھایا جاتا، کبھی ایسا ہوتا کہ بغیر چھت کے کسی باغ میں قید کیا جاتا جیسا کہ عیاش اور ہشام بن عاص رضی اللہ عنہما کے ساتھ کیا گیا۔ [2]

یوں قید کے دوران مکہ جیسے پہاڑی علاقے کی سخت گرمی بھی برداشت کرنا پڑتی۔

قریشی سرداروں کا اس طرز عمل سے ایک طرف ان قیدیوں کو ہجرت سے روکنا مقصود تھا تو دوسری طرف ہجرت کی سوچ رکھنے والوں کے لیے نصیحت آموز سبق تھا لیکن اس کے باوجود وہ ہجرت مدینہ کے راستے میں رکاوٹ نہ بن سکے، جیسا کہ عیاش اور ہشام رضی اللہ عنہما وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوگئے اور مدینہ طیبہ پہنچ گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں مکہ کے کمزور مسلمانوں کے لیے بالعموم اور کچھ دیگر افراد کے لیے بالخصوص قنوت فرماتے تھے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب آخری رکعت میں رکوع سے سر اٹھاتے تو دعا کرتے:

«اَللّٰهُمَّ أَنْجِ عَيَّاشَ بْنَ أَبِي رَبِيعَةَ، اَللّٰهُمَّ أَنْجِ سَلَمَةَ بْنَ هِشَامٍ، اَللّٰهُمَّ أَنْجِ الْوَلِيدَ بْنَ الْوَلِيدِ، اَللّٰهُمَّ أَنْجِ الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ،

[1] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 2/160. [2] السيرة النبوية للدكتور إبراهيم العلي، ص: 132.

اَللّٰهُمَّ اشْدُدْ وَطْأَتَكَ عَلٰى مُضَرَ، اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهَا سِنِينَ كَسِنِي يُوسُفَ»

''اے اللہ! عیاش بن ابی ربیعہ، سلمہ بن ہشام، ولید بن ولید اور دیگر کمزور مسلمانوں کو (کفار کی قید سے) نجات عطا فرما۔ اے اللہ! قبیلۂ مضر پر اپنی پکڑ سخت کر دے اور ان پر ایسی قحط سالی مسلط کر دے جیسی یوسف علیہ السلام کے زمانے میں تھی۔''[1]

مسلمانوں نے حضرت عیاش رضی اللہ عنہ کو زبردستی واپس لے جانے کے واقعے کو یکسر بھلایا نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ نے ایک ٹھوس منصوبہ بندی کے تحت ایک صحابی کو ان کی بازیابی کے سلسلے میں مکہ روانہ کیا۔ اس نے اپنی پوری صلاحیت اور سمجھ داری سے کام لیا اور ان کے پاس پہنچ گیا، پھر ان کی بیڑیاں توڑ ڈالیں اور انھیں مدینہ منورہ لانے میں کامیاب ہوگیا۔[2]

مسلمانوں سے مال واسباب چھین لینا

حضرت صہیب بن سنان النمری رضی اللہ عنہ قبیلہ نمر بن قاسط سے تعلق رکھتے تھے۔ رومیوں نے اس قبیلے پر حملہ کیا اور حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کو جو ابھی بچے تھے، قیدی بنالیا۔ انھوں نے رومیوں کے ہاں پرورش پائی اور ان کی زبان سیکھی۔ دریں اثنا ایک دن وہ عبداللہ بن جدعان کے ہاتھ فروخت ہوئے جس نے انھیں خرید کر آزاد کر دیا۔ صہیب اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما ایک ہی دن مسلمان ہوئے۔[3]

سیدنا صہیب رضی اللہ عنہ ایمانی پختگی کی عمدہ مثال اور اللہ کے راستے میں مال قربان کرنے کی عظیم داستان تھے کیونکہ انھوں نے توحید و ایمان کے علمبرداروں میں شامل ہونے کی خاطر اپنی ساری جائیداد اللہ اور اس کے رسول کے راستے میں نچھاور کر دی۔[4]

حضرت ابوعثمان نہدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ

1 صحيح البخاري، حديث: 1006، و مسند أحمد: 418/2. 2 السيرة النبوية للدكتور إبراهيم علي محمد أحمد، ص: 135. 3 الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 119.
4 الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 120.

نے جب ہجرت کا ارادہ کیا تو اہل مکہ نے کہا: ''جب تو مکہ میں آیا تھا تو تو حقیر اور فقیر تھا۔ ہماری سرزمین میں رہتے ہوئے تجھے مال نصیب ہوا اور تو پروان چڑھا۔ اب تو اپنے مال کے ہمراہ یہاں سے کیسے جاسکتا ہے؟ اللہ کی قسم! یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔'' صہیب رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''اگر میں اپنا مال تمھیں دے دوں تو کیا میرا راستہ چھوڑ دو گے؟'' انھوں نے کہا: ''ہاں!'' یوں صہیب رضی اللہ عنہ نے اپنا سارا مال انھیں دے دیا اور خود ہجرت کی۔ جب رسول اللہ ﷺ کو اس کی خبر ہوئی تو فرمایا: «رَبِحَ صُهَيْبٌ! رَبِحَ صُهَيْبٌ» ''صہیب نفع مند ہوا۔ صہیب نفع مند ہوا۔''[1]

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں: ''صہیب رضی اللہ عنہ بغرض ہجرت روانہ ہوئے تو اہل مکہ ان کے پیچھے ہو لیے۔ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے اپنے ترکش سے تقریباً چالیس تیر نکالے اور کہا: ''تم مجھ تک اس وقت تک نہیں پہنچ سکتے جب تک میرا ہر تیر ایک آدمی میں پیوست نہ ہوجائے، پھر میں تلوار سے مقابلہ کروں گا اور تم میری مردانگی کو بخوبی جانتے ہو۔ میری دو لونڈیاں مکہ میں ہیں وہ تم لے سکتے ہو۔''[2]

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''انھی کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ ۝﴾

''اور لوگوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو اللہ کی رضا مندی حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو (اس کے ہاتھ) بیچ ڈالتا ہے اور اللہ اپنے بندوں پر بہت شفیق ہے۔''[3]

جب انھیں رسول اللہ ﷺ نے دیکھا تو فرمایا: «أَبَا يَحْيٰ! رَبِحَ الْبَيْعُ!» ''اے ابویحییٰ! تیری تجارت فائدہ مند ہے۔''[4] پھر آپ ﷺ نے مذکورہ آیت تلاوت فرمائی۔''

1 السيرة النبوية لابن هشام: 121/2، والمطالب العالية لابن حجر، رقم: 4063، روایت مرسل ہے۔ 2 المستدرك للحاكم: 398/3. 3 البقرة 2:207. 4 المستدرك للحاكم: 398/3.

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کے اس عمل سے مادہ پرست لوگوں کی کم عقلی اور بے وقوفی کے خلاف دلیل ملتی ہے جو اسلامی تاریخ کو مادی پیمانوں سے جانچتے ہیں اور انھیں حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کا عمل نظر نہیں آتا جنھوں نے ہجرت کی خاطر اپنا سارا مال قربان کر دیا۔ کیا یہ سوچا جا سکتا ہے کہ اس عمل کے عوض اللہ کے رسول ﷺ انھیں کسی منصب یا مدینہ طیبہ میں شاندار زندگی کی نوید سنانے والے تھے؟ نہیں! بلکہ صہیب رضی اللہ عنہ نے ایمانداروں کی صف میں اس لیے شامل ہونا چاہا کہ اللہ تعالیٰ کو یہی پسند تھا۔ انھوں نے رضائے الٰہی کے حصول کے لیے ہر قسم کی قربانی دی۔ عالم اسلام کے نوجوانوں کے لیے بامقصد اور بلند مقام پانے کی غرض سے قربانیوں کی عظیم مثال قائم کی تاکہ وہ بھی اس راستے پر چلیں اور ان کے آثار کی پیروی کریں۔[1]

یقیناً یہ ایمان کی پختگی کی عمدہ مثال ہے لیکن ہجرت مدینہ میں صرف یہی عظیم مثال قائم نہیں کی گئی بلکہ اس سلسلے میں عظمت، قربانی اور اللہ و رسول کی خاطر مال و جان قربان کرنے کی عظیم داستانیں رقم کی گئیں جن سے امت اسلامیہ کے لیے عزت و عظمت حاصل کرنے کا عظیم سبق حاصل ہوتا ہے۔[2]

انصاری بابرکت گھرانے

انصار مدینہ کا منیٰ کی گھاٹی میں ایمان لانا، بیعت کرنا اور رسول اللہ ﷺ کی حمایت و نصرت کا پختہ عہد و پیمان کرنا یہ وہ اسباب تھے جنھیں مدنظر رکھ کر رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو ہجرت مدینہ کا حکم دیا۔ اس ہجرت کے نتیجے میں مسلمانوں کے درمیان نصرت و کفالت کا ماحول پیدا ہوا۔ انصار نے مہاجرین کے لیے اپنے دلوں اور گھروں کے دروازے کھول دیے اور تمام مرد اور عورتیں مہاجرین کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئے۔ مہاجر و انصار مرد ہوں یا عورتیں ایک ہی چھت تلے زندگی گزارنے لگے۔ مال، گھر اور کھانا تک تقسیم کر لیا گیا

1 الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 121. 2 الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص:119.

اوراسلامی ذمہ داریاں نبھائی جانے لگیں۔ مہاجرین کے خیرخواہ مندرجہ ذیل گھرانے تھے:

① قباء میں مُبَشِّر بن عبدالمنذر بن زنبر کا گھرانہ جہاں عورتوں اور مردوں پر مشتمل مہاجرین کا ایک گروہ تشریف لایا جن میں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، ان کی بیٹی حفصہ رضی اللہ عنہا اور ان کے خاوند خنیس بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ اور عیاش بن ابی ربیعہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ کچھ دیگر افراد قوم بھی شامل تھے۔

② بنونجار کے اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ کا گھرانہ وہاں سیدنا حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ نے قیام کیا۔

③ مقام سُنح (یثرب) میں بنوحارث بن الخزرج کے بھائی خُبَیب بن اِساف کا گھرانہ، وہاں طلحہ بن عبیداللہ بن عثمان، ان کی والدہ اور صہیب بن سنان رضی اللہ عنہم اقامت گزیں ہوئے۔[1]

④ بنونجار ہی سے تعلق رکھنے والے سعد بن خَیثمہ رضی اللہ عنہ کا گھرانہ جسے بیت العُزّاب (کنواروں کا گھر) بھی کہا گیا۔ وہاں مہاجرین کا ایک گروہ ٹھہرا جو سب کنوارے تھے۔

⑤ قبا ہی میں بلعجلان کے بھائی عبداللہ بن سلمہ رضی اللہ عنہ کا گھرانہ، جس میں عبیدہ بن حارث، ان کی والدہ محترمہ سُخیلہ، مِسطح بن اُثاثہ بن عباد بن مطلب، طُفیل بن حارث، طُلیب بن عُمیر اور حُصَین بن حارث رضی اللہ عنہم اقامت گزیں ہوئے۔

⑥ بنو جَحْجبي کا گھرانہ، وہاں زبیر بن عوام، ان کی بیوی اسماء بنت ابوبکر، ابوسبرہ بن ابورہم اوران کی بیوی ام کلثوم بنت سُہیل ٹھہرے، جبکہ ان کے کفیل منذر بن محمد بن عُقبہ تھے رضی اللہ عنہم۔[2]

⑦ بنوعبدالاشہل کا گھرانہ جن کے ذمہ دار اور کفیل حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ تھے۔ وہاں مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اوران کی بیوی حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا نے رہائش اختیار کی۔

⑧ بنونجار کا گھرانہ جن کے سربراہ و ذمہ دار اوس بن ثابت بن منذر رضی اللہ عنہ تھے۔ ان کے پاس عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اوران کی بیوی رقیہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ٹھہرے۔[3]

[1] المرأة في العهد النبوي للدكتورة عصمة الدين، ص: 116. [2] المرأة في العهد النبوي للدكتور عصمة الدين، ص: 117. [3] السيرة النبوية لأبي شهبة:469,468/1.

اِسی تقسیم اور باہمی تعاون ہی کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھ اور بعد میں آنے والے تمام مہاجرین کو ایک اچھی اقامت گاہ میسر آگئی اور باہمی ایثار اور سچی مومنانہ اخوت ومحبت کی فضا پیدا ہوگئی۔[1]

اعلیٰ روحانیت، پختہ ایمان اور معاملات میں صداقت کی فضا میں مہاجرین وانصار کے درمیان مواخات قائم ہوگئی اور سب اتفاق ومحبت سے زندگی گزارنے لگے۔لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کبھی سننے میں آیا یا کسی کتاب میں لکھا پایا کہ ان گھروں میں کبھی آپس میں اختلاف ہوا ہو یا کم ازکم عورتیں جن کی طبیعت میں تیزی ہوتی ہے ان کی آپس میں کوئی شکر رنجی ہوئی ہو؟

دراصل یہ دین برحق ہے جس کی بنیاد تقویٰ اور بلند پایہ اخلاقی اقدار پر ہے جن کی وجہ سے مسلمانوں کے درمیان اخوت اور دعوت دین کی مدد کا جذبہ اور رسول اللہ ﷺ کی بیعت اور اس کا اثر دلوں میں محسوس کیا گیا۔ یہ دین سچائی کا دین ہے جس میں اجتماعی مفاد مدنظر رکھنے،سزا کا خوف، آخرت کا ڈر،ثواب کی تمنا اور حصول جنت کی خواہش پائی جاتی ہے۔

یہ دین ایمان کی ترقی کے لیے گرمجوشی کے جذبات رکھتا ہے اور انسان کو صراط مستقیم پر گامزن رہنے کا درس اور نیتوں کو درست رکھنے کی ترغیب دیتا ہے۔ مرد ہو یا عورت، دائرہ اسلام میں داخل ہوکر اور اس کی بیعت کرکے وہ شریعت کا ہر حکم تسلیم کرتا ہے، اس کے ہر قول میں اخلاص ہوتا ہے اور تنہائی میں ہو یا سب کے سامنے، وہ صرف اپنے اللہ سے ڈرتا ہے۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں ایمان راسخ ہوگیا تھا، لہٰذا جب مہاجرین مدینہ پہنچے تو انصار نے ان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اٹھائی۔ ان سب کی سوچ ایک اجتماعی معاشرے کی بہتری کے لیے وقف تھی۔ یوں اسلامی معاشرے میں باہمی ذمہ داریاں نبھانے کی ایسی پاکیزہ فضا پیدا ہوئی کہ تمام صحابۂ کرام حصولِ ثواب کے متلاشی رہتے تھے، یہاں تک

[1] المرأة في العهد النبوي للدكتورة عصمة الدين، ص: 118.

کہ ان میں اکیلا آدمی سارا ثواب حاصل کرنے کے لیے بھی سرگرداں نظر آیا۔[1]

اس موقع پر اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کا ایسا مظاہرہ دیکھنے میں آیا جس سے موجودہ دور میں ہمیں قدم قدم پر رہنمائی ملتی ہے۔

ہجرت مدینہ کے تناظر میں اپنا جائزہ لیں تو یقیناً موجودہ حالات میں اور خصوصاً اسلامی معاشرے میں باہمی طور پر رہتے ہوئے چند ہی دنوں میں کئی قسم کے عیوب، تکلیف دہ باتیں اور بدگمانیاں ظاہر ہوتی ہیں مگر ایک وہ معاشرہ تھا کہ ابھی رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف نہیں لائے تھے لیکن اسلامی معاشرے کی تشکیل نو کا کام شروع ہو چکا تھا۔ نئے آنے والوں کے لیے گھروں کے دروازے کھلتے چلے گئے اور یہ ایک آدھ فرد کا معاملہ نہیں تھا بلکہ اجتماعی پیمانے پر امداد وتعاون کا سلسلہ چل نکلا تھا۔ یہ وہ اسلامی معاشرہ تھا جو باہمی ربط وضبط اور الفت ومحبت میں عروج کو پہنچ گیا تھا۔ مہاجرین نے مہینوں ان گھروں میں قیام کیا اور انصار مسلسل اپنا مال، محبت اور خدمات اپنے مہاجر بھائیوں کے لیے پیش کرتے رہے، حالانکہ مہاجرین بنیادی طور پر فقراء نہیں تھے۔ وہ بھی صاحب جائیداد اور گھروں کے مالک تھے، تاہم وہ صدقہ وخیرات کے میدان میں انصار کے لیے اسوہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ انھوں نے سب کچھ اللہ کی رضا کے لیے خرچ کر ڈالا اور مکہ چھوڑ آئے۔ قرآن کریم ان کے اوصاف اس طرح بیان کرتا ہے:

﴿لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝﴾

[1] المرأة في العهد النبوي للدكتورة عصمة الدين، ص: 132.

''(مالِ فَے) ان مہاجر فقراء کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور اپنی جائیدادوں سے نکالے گئے، وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضا ڈھونڈتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ سچے ہیں اور (ان کے لیے ہے) جنھوں نے (مدینہ کو) گھر بنا لیا تھا اور ان (مہاجرین) سے پہلے ایمان لا چکے تھے، وہ (انصار) ان سے محبت کرتے ہیں جو ان کی طرف ہجرت کرے اور وہ اپنے دلوں میں اس (مال) کی کوئی حاجت نہیں پاتے جو ان (مہاجرین) کو دیا جائے اور اپنی ذات پر (ان کو) ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود انھیں سخت ضرورت ہو اور جو کوئی اپنے نفس کے لالچ سے بچا لیا گیا تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''[1]

مدینہ طیبہ کا یہ جدید معاشرہ بارہ نقیبوں کی نگرانی میں ایمان اور تقویٰ کی بنا پر پروان چڑھ رہا تھا، جبکہ نبی ﷺ ابھی تک مدینہ نہیں پہنچے تھے۔ یہ نقیب اپنی اپنی قوم کے اسی طرح نگران تھے جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری نگران تھے۔ اس معاشرے کی نگرانی وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی کر رہے تھے جو ہجرت کر کے مدینہ پہنچ چکے تھے۔ وہ سب مل کر نبوی چشمے سے سیراب اور آپ ﷺ کی سیرت سے فیضیاب ہوئے۔[2]

اس جدید معاشرے کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ ان کی جاہلی عصبیت پگھل چکی تھی جیسا کہ امامت کے فرائض ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کے غلام سالم رضی اللہ عنہ سرانجام دیتے تھے کیونکہ دوسروں کی نسبت قرآن کریم کا زیادہ حصہ انھیں یاد تھا۔ اس معاشرے میں مہاجرین و انصار کے بلند مرتبہ افراد، قریشی سردار اور اوس و خزرج کے نمایاں افراد موجود تھے لیکن امامت کا شرف کتاب اللہ کے ایک قاری اور عالم کو حاصل ہوا۔ اسلامی معاشرے میں قاری قرآن امام ہونے کے ساتھ ساتھ غزوات میں جھنڈے کا حق دار بھی ٹھہرتا تھا۔ حفاظ قرآن اور مجاہدین کے درمیان جس فرق کا آج ہم مشاہدہ کر رہے ہیں وہ ان کے درمیان موجود نہیں

[1] الحشر 59:8، 9. [2] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 2/171، 172.

تھا۔ معرکۂ یمامہ میں ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ کے یہی غلام سالم رضی اللہ عنہ ہی جھنڈا تھامے ہوئے تھے اور اس دن ان کا کوڈ ورڈ تھا: «بِئْسَ حَامِلُ الْقُرْآنِ»

''اے اللہ کی راہ میں لڑنے والے! تو بھاگ گیا تو سمجھ لے تو برا حامل قرآن ہے۔''

پہلے ان کا دایاں ہاتھ کٹا تو انھوں نے بائیں ہاتھ سے جھنڈا تھام لیا اور جب وہ بھی کٹ گیا تو اپنی گردن سے تھام لیا یہاں تک کہ شہید ہوگئے۔[1]

اس جدید اسلامی معاشرے کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ مسلمانوں کو دعوتِ دین کی آزادی نصیب ہوئی۔ سب جانتے تھے کہ یثرب کے بڑے بڑے سردار اس دین میں داخل ہو چکے ہیں، لہٰذا عام نوجوان، عورتیں اور مرد سب دعوت اسلامی کے میدان میں سرگرم ہوگئے اور اب تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ آمد آمد بھی تھی۔

حبشہ میں قائم اسلامی معاشرے اور مدنی معاشرے میں فرق

یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم حبشہ میں قائم اسلامی معاشرے اور مدنی معاشرے کا تقابلی جائزہ لیں۔ حبشہ میں ایک مکمل اسلامی معاشرہ قائم نہ ہوا تھا بلکہ اس تحریک کو زیادہ سے زیادہ ایک سیاسی پناہ حاصل ہوئی تھی۔ اس اجنبی معاشرے میں غیر مسلموں کی اکثریت اتنی زیادہ تھی کہ اسلامی برادری کا نقش وہاں نہیں جم سکتا تھا، یہ درست ہے کہ وہ آزادی سے اپنے رب کی عبادت میں مصروف تھے لیکن وہ اس نصرانی معاشرے سے الگ تھلگ تھے اور ان میں قابل ذکر طور پر نفوذ نہیں کر سکے تھے۔ اگرچہ مکہ کے ماحول میں، جہاں دعوت و عبادت کی زیادہ آزادی نہیں تھی، ہجرت حبشہ آزادی کی طرف پہلا قدم تھا مگر حبشہ میں دعوت و عبادت کی آزادی بہر حال مدینہ کی نسبت کم تھی جہاں اسلامی برادری کثیر تعداد میں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب مہاجرین حبشہ نے ہجرت مدینہ کی خبر سنی تو فوراً مدینہ یا براستہ مکہ مدینہ پہنچنا شروع ہوگئے۔ مدینہ منورہ جو کئی صدیوں سے شرک و بت پرستی کے چنگل میں

[1] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 1/174، 175.

گرفتار رہنے کے بعد اب اسلام کے سایۂ عاطفت میں آ چکا تھا۔ اور حبشہ میں صرف وہ لوگ باقی رہ گئے جنھیں اعلیٰ قیادت (نبی ﷺ) کی طرف سے وہیں ٹھہرنے کا حکم دیا گیا تھا۔

بیعت عقبہ کے بعد بارہ مبارک نفوس کی محنت سے مدینہ اسلامی بنیادوں پر بالفعل اتنی ترقی کر گیا کہ ایک مکمل اسلامی معاشرے کی تشکیل شروع ہوگئی اور اس سلسلے میں سرفہرست جلیل القدر صحابی اَسْعَد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کا نام آتا ہے جنھوں نے شروع میں سیاسی رہنمائی اپنے ذمے نہیں لی بلکہ صرف دعوتی ذمہ داری اٹھائی۔ اور دعوتی میدان میں بھی انتہائی عروج حاصل کیا۔ جب ستر آدمی دوسری بیعت عقبہ کے بعد مدینہ لوٹے، جو مدینہ میں سیاسی اور معاشرتی امور کو کنٹرول کرتے تھے، تو انھوں نے طے کر لیا کہ ان کا شہر اس کرۂ ارض پر اسلام کا پہلا دارالحکومت بنے گا۔ اور انھوں نے ثابت کر دیا کہ وہ نبی ﷺ کے مدینہ تشریف لانے سے پہلے میسر قیادت کی رہنمائی میں ہر بیرونی دشمن کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے جس مستحکم اسلامی مرکز کے قیام اور تربیت کے لیے وقت اور محنت صرف کی تھی، آج وہ مدینہ طیبہ کے جدید معاشرے کی شکل اختیار کرنے کے بعد ثمر آور ہو چکا تھا اور عقیدے اور دینی اخوت کے رنگ میں رنگا جا چکا تھا، گویا نبی ﷺ نے پہلے افراد تیار کیے، پھر انھیں ایک جماعت کی شکل میں مضبوط کیا اور ایک مضبوط مرکز بنا دیا۔ بیعت عقبہ کے بعد ایک ایسے اسلامی معاشرے کی تشکیل شروع ہوگئی تھی جس پر اسلامی مملکت کا قیام عمل میں آنا تھا، اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی معاشرہ اس وقت قائم ہوا جب اس سرزمین میں حمایت دین کے لیے ایک مناسب قوت فراہم ہو چکی تھی۔[1]

یوں پہلے ایک مضبوط اور منظم جماعت مدینہ پہنچی اور پھر انصار سے مل کر اسلامی معاشرہ تشکیل دیا اور اب قائد اعلیٰ نبی ﷺ کا انتظار ہو رہا تھا کہ آپ تشریف لا کر ایک ایسی جدید مملکت کے قیام کا اعلان فرمائیں جو جلد از جلد ایک ایسا تمدن وجود میں لائے جس کی نظیر

1 التربية القيادية للدكتور الغضبان: 147,146/1.

تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔

دارالحکومت کے لیے مدینہ منورہ کا انتخاب؟

اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا تھا کہ مدینہ منورہ کو دارالحکومت اور دعوتی مرکز کی حیثیت حاصل ہو۔ ایک طرف تو مدینہ کا یہ مقام اہل مدینہ کے لیے شرف وعزت کا باعث تھا، دوسری طرف اس میں کئی اسرار و رموز پنہاں تھے۔ دراصل مدینہ طیبہ جنگی نقطۂ نظر سے ایسا مستحکم تھا کہ جزیرہ نمائے عرب میں ایسا کوئی اور مقام نہ تھا۔ مدینہ غربی جانب سے حرہ وبرہ اور شرقی جانب سے حَرَّہ واقم کے ذریعے قدرتی طور پر محفوظ تھا۔ صرف شمالی جانب ہی ایسی تھی کہ کوئی رکاوٹ موجود نہ تھی، اس لیے 5 ھ میں غزوۂ خندق کے موقع پر اسی جانب خندق کھودی گئی۔ دیگر اطرافِ مدینہ میں کھجور کے گھنے درخت اور کھیت تھے جہاں سے کوئی لشکر آسانی سے نہ گزر سکتا تھا اور نہ جنگی امور اور صفوں کی ترتیب ممکن تھی۔ وہاں موجود چھوٹے چھوٹے قدرتی مورچے عسکری یلغار کو ناکام بنانے کے لیے کافی تھے۔ ابن اسحاق رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''مدینہ کی ایک طرف کھلی اور باقی تمام اطراف میں آبادی اور کھجور کے باغات تھے اور دشمن کے لیے وہاں سے حملہ تقریباً ناممکن تھا۔''[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلے میں حکمت الٰہیہ کا ذکر کرتے ہوئے اپنے صحابہ کو بتایا: ''مجھے تمھارا دار ہجرت دکھایا گیا ہے۔ وہ دو سیاہ پتھریلی زمینوں کے درمیان واقع ہے۔''[2]

بعد ازاں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے مکہ سے مدینہ ہجرت فرمائی اور مہاجرین حبشہ کے اکثر افراد بھی مدینہ پہنچ گئے۔

مدینہ کی اکثر آبادی اوس وخزرج پر مشتمل تھی جو طبعاً فخر مند، اڑیل، شہسوار قوت اور غرور والے تھے۔ وہ ہمیشہ آزاد تھے نہ کسی کے مطیع ہوئے نہ کسی قبیلے یا حکومت کو تاوان یا ٹیکس ادا کیا۔ ابن خلدون کہتے ہیں: ''یہ دونوں قبیلے یثرب کی اکثر آبادی پر حاوی تھے۔

1 السيرة النبوية لأبي الحسن الندوي، ص: 157. 2 صحيح البخاري، حديث: 2297.

شان وشوکت اور قوت کے لحاظ سے معروف تھے اور ان کے اردگرد بسنے والے قبائل مضر بھی ان کے دین و مذہب کو اختیار کیے ہوئے تھے۔''[1] بنو عدی بن نجار رسول اللہ ﷺ کے ننھیال تھے کیونکہ عبد المطلب بن ہاشم کی والدہ بنو عدی بن نجار سے تعلق رکھتی تھیں۔ چنانچہ ہاشم نے عمرو کی بیٹی سلمیٰ سے شادی کی تھی اور عمرو کا تعلق بنو عدی بن نجار سے تھا۔ انھی سلمیٰ کے بطن سے عبد المطلب پیدا ہوئے۔ ہاشم نے اپنے بیٹے عبد المطلب کو ماں کے پاس رہنے دیا۔[2] جب وہ سن شعور کو پہنچے تو ان کے چچا مطلب انھیں مکہ لے آئے۔ عرب کے معاشرے میں اَرحام (ننھیال) کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ نبی ﷺ نے بھی ہجرت مدینہ کے موقع پر اپنے دادا عبد المطلب کے ننھیال کو اہمیت دی تھی۔ چنانچہ مدینہ پہنچنے پر انصار کے درمیان اختلاف ہو گیا۔ ہر شخص آپ ﷺ کی میزبانی کا شرف حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَنْزِلُ عَلٰى بَنِي النَّجَارِ، أَخْوَالِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ أُكْرِمُهُمْ بِذَالِكَ»

''میں اپنے دادا عبد المطلب کے ننھیال بنو نجار کے ہاں ٹھہروں گا۔ میں یہ شرف اور عزت انھیں دینا چاہتا ہوں۔''[3]

ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی اسی قبیلے بنو نجار سے تھے جن کے گھر نبی ﷺ نے قیام فرمایا۔

مدینہ طیبہ کے باسی اوس و خزرج قحطانی تھے جبکہ مہاجرین اور دیگر مکی مسلمان بنو عدنان سے تعلق رکھتے تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے مدینہ ہجرت فرمائی اور انصار نے آپ ﷺ کی نصرت و حمایت کی تو گویا کہ قحطان اور عدنان ایک جھنڈے تلے جمع ہو گئے اور ایک

---

1 تاریخ ابن خلدون: 289/2. 2 بلاذری لکھتے ہیں: ''ہاشم کے بیٹے شیبۃ الحمد (عبد المطلب) تھے۔ شیبہ کی ولادت سے پہلے ہاشم اپنی اہلیہ سلمیٰ کو وضع حمل کے لیے باپ کے پاس چھوڑنے گئے۔ بیوی کو یثرب چھوڑ کر وہ تجارت کے لیے شام چلے گئے اور وہیں غزہ (فلسطین) میں ان کا انتقال ہو گیا۔ سلمیٰ کے ہاں بیٹے کی ولادت ہوئی تو انھوں نے اس کا نام شیبۃ الحمد رکھا کیونکہ اس کے سر کے کچھ بال سفید تھے۔'' (أنساب الأشراف: 71/1) 3 صحیح مسلم، حدیث: 2009 بعد الحدیث: 3014.

جان ہوگئے۔ جاہلیت میں ان دونوں قبائل میں مسابقت کی جنگ جاری رہتی تھی مگر اب شیطان ان کے درمیان پرانے فتنے ابھارنے اور غیرت کے نام پر جاہلی زخم تازہ کرنے میں ناکام ہوگیا۔

اس لحاظ سے نبی ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے مدینہ طیبہ بہتر علاقہ ثابت ہوا جہاں انھیں سکونت بھی ملی اور ایسا مرکز نصیب ہوا جس سے اسلام کو تائید حاصل ہوئی اور اتنی ترقی ملی کہ نہ صرف جزیرہ نمائے عرب بلکہ اردگرد کی ترقی یافتہ سلطنتوں پر بھی فتح حاصل ہوگئی۔ [1]

فضائل مدینہ

مدینہ طیبہ کو نبی ﷺ کی ہجرت کی بدولت سوائے مکہ کے تمام کرۂ ارض پر فضیلت حاصل ہوئی۔ اس کے فضائل مندرجہ ذیل ہیں:

ناموں کی کثرت: کسی بھی خطۂ ارض کے زیادہ نام اس سرزمین کے باعزت ہونے پر دلالت کرتے ہیں اور جتنے نام مدینہ منورہ کے ہیں کسی اور شہر کے نہیں یہاں تک کہ ان ناموں کا نصف یا چوتھائی حصہ بھی کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ علماء نے اس دھرتی (مدینہ منورہ) کے تقریباً سو نام بیان کیے ہیں۔ [2]

ان ناموں کا تذکرہ امام زرکشی رحمہ اللہ نے إعلام الساجد بأحكام المساجد میں، مجد الدین محمد بن یعقوب فیروز آبادی نے القاموس المحیط میں، نورالدین السمہودی نے وفاء الوفاء بأخبار دارالمصطفیٰ میں اور محمد بن یوسف الصالحی نے سبل الهدیٰ والرشاد فی سیرة خیر العباد میں کیا ہے۔ [3]

مدینہ کے مشہور نام مندرجہ ذیل ہیں:

یثرب: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

---

1 الأساس في السنة لسعيد حوّى:1/333. 2 الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص:155. 3 الضوء اللامع للسخاوي:1/79-86.

﴿وَاِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰٓاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا﴾

''اور جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا تھا: اے اہل یثرب! (آج) تمھارے لیے (لشکر کے ساتھ) کوئی قیام گاہ نہیں، لہٰذا تم لوٹ چلو۔''[1]

شرعی طور پر مدینہ کو یثرب کہنا درست نہیں اور مذکورہ آیت میں صرف منافقین کا قول بیان کیا گیا ہے۔

طابہ: حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ سَمَّى الْمَدِينَةَ يَثْرِبَ فَلْيَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ، فَإِنَّمَا هِيَ طَابَةُ»

''جو مدینہ کو یثرب (خارزار، ویران جگہ) کہتا ہے وہ اللہ سے استغفار کرے وہ تو طابہ (پاکیزہ) ہے۔''[2]

ایک اور روایت میں تین دفعہ یہ الفاظ ہیں کہ وہ طابہ ہے، وہ طابہ ہے، وہ طابہ ہے۔

المدینہ: یہی اس کا مشہور نام ہے۔ جب مطلق طور پر المدینہ کا لفظ استعمال کیا جائے تو صرف اور صرف مدینہ منورہ ہی مراد ہوگا۔ اس نام کے ساتھ بہت سی آیات بھی موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۛ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ﴾

''اور تمھارے آس پاس جو دیہاتی ہیں ان میں بعض منافق ہیں اور بعض اہل مدینہ بھی نفاق پر اڑے ہوئے ہیں۔''[3]

مدینہ کو عموماً المبارکة (برکت والا)، المنوّرة (روشن)، المشرّفة (عزت والا) جیسے اوصاف حمیدہ سے متصف کیا جاتا ہے۔[4]

1 الأحزاب 13:33. 2 مسند أحمد: 285/4. موسوعہ حدیثیہ کے محققین نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے اور امام شوکانی رحمہ اللہ نے بھی اس حدیث کو ضعیف کہا ہے، دیکھیے: فتح القدیر: 268/4. 3 التوبة 101:9.
4 الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 156.

نبی ﷺ کی مدینہ سے محبت اور اس کی وبا دور کرنے کے لیے دعا: رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کی محبت کے لیے یوں دعا فرمائی:

«اَللّٰھُمَّ حَبِّبْ إِلَیْنَا الْمَدِینَةَ کَحُبِّنَا مَکَّةَ أَوْ أَشَدَّ!»

''اے اللہ! ہمارے دلوں میں مدینہ کی محبت مکہ جیسی یا اس سے بھی زیادہ ڈال دے۔''[1]

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب سفر سے واپس تشریف لاتے اور مدینہ طیبہ کے درو دیوار دیکھتے تو سواری تیز بھگاتے اور جس جانور پر سوار ہوتے اسے مدینہ کی محبت کی وجہ سے (تیز بھگانے کے لیے) حرکت دیتے۔[2]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''جب رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو ابوبکر اور بلال رضی اللہ عنہما دونوں کو بخار ہوگیا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو جب بخار ہوا تو انھوں نے یہ شعر کہے:

كُلُّ امْرِیءٍ مُّصَبَّحٌ فِي أَهْلِهِ وَالْمَوْتُ أَدْنٰی مِنْ شِرَاكِ نَعْلِهِ

''ہر آدمی اپنے گھر میں صبح (وشام) کرتا ہے، حالانکہ موت اس کے جوتے کے تسمے سے بھی زیادہ قریب ہے۔''

اور جب بلال رضی اللہ عنہ کو بخار ہوتا تو بلند آواز سے چند شعر کہتے اور (ایک موقع پر) انھوں نے دعا کی: ''اے اللہ! شیبہ بن ربیعہ، عتبہ بن ربیعہ اور امیہ بن خلف پر لعنت برسا جنھوں نے ہمیں ہماری زمین (مکہ) سے وبا والی زمین کی طرف نکال دیا۔'' تب اللہ کے رسول ﷺ نے دعا فرمائی:

«اَللّٰھُمَّ حَبِّبْ إِلَیْنَا الْمَدِینَةَ کَحُبِّنَا مَکَّةَ أَوْ أَشَدَّ! اَللّٰھُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي صَاعِنَا وَ فِي مُدِّنَا وَ صَحِّحْهَا لَنَا وَانْقُلْ حُمَّاهَا إِلَی الْجُحْفَةِ»

''اے اللہ! مدینہ کی محبت ہمارے دلوں میں مکہ کی محبت کی طرح یا اس سے بھی زیادہ

[1] صحیح البخاري، حدیث: 1889. [2] صحیح البخاري، حدیث: 1802.

ڈال دے۔ اے اللہ! ہمارے پیمانوں صاع اور مُد میں برکت عطا فرما اور مدینہ طیبہ کی فضا ہمارے لیے موافق فرما دے۔ اور اس کا بخار جحفہ منتقل کر دے۔''[1]

مدینہ کے لیے دوگنی برکت کی دعائے نبوی: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ بِالْمَدِينَةِ ضِعْفَيْ مَا جَعَلْتَ بِمَكَّةَ مِنَ الْبَرَكَةِ»

''اے اللہ! مدینہ میں مکہ مکرمہ سے دوگنی برکت عطا فرما۔''[2]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ جب لوگ (کھجور وغیرہ کا پکا ہوا) پہلا پھل دیکھتے تو وہ نبی ﷺ کے پاس لاتے، نبی ﷺ اسے اپنے ہاتھ میں لیتے اور دعا فرماتے:

«اَللّٰهُمَّ! بَارِكْ لَنَا فِي ثَمَرِنَا، وَبَارِكْ لَنَا فِي مَدِينَتِنَا وَ بَارِكْ لَنَا فِي صَاعِنَا وَ بَارِكْ لَنَا فِي مُدِّنَا، اَللّٰهُمَّ! إِنَّ إِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَبْدُكَ وَ خَلِيلُكَ وَ نَبِيُّكَ وَ إِنِّي عَبْدُكَ وَنَبِيُّكَ وَ إِنَّهُ دَعَاكَ لِمَكَّةَ وَ إِنِّي أَدْعُوكَ لِلْمَدِينَةِ بِمِثْلِ مَا دَعَاكَ لِمَكَّةَ وَ مِثْلِهِ مَعَهُ»

''اے اللہ! ہمارے شہر، پھل، صاع اور مد میں برکت عطا فرما۔ اے اللہ! ابراہیم علیہ السلام تیرے عاجز بندے، خلیل اور نبی تھے اور میں بھی تیرا عاجز بندہ اور نبی ہوں۔ انھوں نے مکہ کے لیے برکت کی دعا کی اور میں تجھ سے مدینہ کے لیے مکہ سے دوگنی برکت کی دعا کرتا ہوں۔''

پھر آپ ﷺ وہ پھل حاضرین میں سب سے چھوٹے بچے کو عطا فرماتے۔[3]

[1] صحيح البخاري، حديث: 1889. [2] صحيح البخاري، حديث: 1885، وصحيح مسلم، حديث: 1369. [3] صحيح مسلم، حديث: 1373، و جامع الترمذي، حديث: 3454، وسنن ابن ماجه: 3329، و عمل اليوم والليلة للنسائي، حديث: 302، و عمل اليوم والليلة لابن السني، حديث: 278.

نبی ﷺ کی برکت سے مدینہ طیبہ کا دجال اور طاعون سے محفوظ ہونا: اللہ تعالیٰ نے مدینہ طیبہ کی حفاظت کے لیے فرشتے مقرر فرمائے ہیں جو وہاں دجال اور طاعون کو داخل نہیں ہونے دیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «عَلٰى أَنْقَابِ الْمَدِينَةِ مَلَائِكَةٌ، لَا يَدْخُلُهَا الطَّاعُونُ وَلَا الدَّجَّالُ» ''مدینہ کے تمام راستوں پر اللہ کے فرشتے مقرر ہیں۔ طاعون اور دجال مدینہ میں داخل نہیں ہوسکیں گے۔''[1]

مدینہ کی سختی پر صبر کرنے کی فضیلت: رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کی شدت اور تنگی گزران پر صبر کرنے والے کو قیامت کے دن اپنی شفاعت کا مستحق قرار دیا۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«اَلْمَدِينَةُ خَيْرٌ لَّهُمْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ، لَا يَدَعُهَا أَحَدٌ رَغْبَةً عَنْهَا إِلَّا أَبْدَلَ اللّٰهُ فِيهَا مَنْ هُوَ خَيْرٌ مِّنْهُ، وَلَا يَثْبُتُ أَحَدٌ عَلٰى لَأْوَائِهَا وَجَهْدِهَا، إِلَّا كُنْتُ لَهُ شَفِيعًا، أَوْ شَهِيدًا، يَّوْمَ الْقِيَامَةِ»

''مدینہ لوگوں کے لیے بہتر ہے اگر وہ سمجھ سے کام لیں۔ کوئی آدمی جو مدینہ چھوڑ کر چلا جائے تو اللہ تعالیٰ مدینہ میں اس کا نعم البدل بھیج دیتا ہے اور جو بھی مدینہ کی سختی اور مفلسی پر ثابت قدمی دکھاتا ہے، میں قیامت کے دن اس کا سفارشی یا گواہ ہوں گا۔''[2]

مدینہ طیبہ میں موت کی فضیلت: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«مَنِ اسْتَطَاعَ أَنْ يَّمُوتَ بِالْمَدِينَةِ فَلْيَمُتْ بِهَا فَإِنِّي أَشْفَعُ لِمَنْ يَّمُوتُ بِهَا»

''جو شخص استطاعت رکھتا ہو کہ اسے مدینہ میں موت آئے تو اسے یہ کوشش کرنی

[1] صحيح البخاري، حديث: 1880، وصحيح مسلم، حديث: 1379. [2] صحيح مسلم، حديث: 1363.

چاہیے۔ میں اس کے لیے قیامت کے دن سفارش کروں گا جو مدینہ میں فوت ہوگا۔''[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ دعا کرتے تھے:

«اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِي شَهَادَةً فِي سَبِيلِكَ وَاجْعَلْ مَوْتِي فِي بَلَدِ رَسُولِكَ»

''اے اللہ! مجھے اپنے رسول کے شہر میں شہادت کی موت نصیب فرما۔''[2]

اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دعا قبول فرمائی، وہ مسجد نبوی میں نماز فجر پڑھا رہے تھے کہ انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محراب میں شہید کر دیا گیا۔

ایمان کی پناہ گاہ اور پلیدی سے پاک: ایمان چاہے دنیا کے ہر خطے میں ناپید ہو جائے لیکن مدینہ میں موجود رہے گا۔ کسی قسم کی وبا مدینہ میں آسکتی ہے نہ ٹھہر سکتی ہے اور کوئی بھی مدینہ چھوڑ کر چلا جائے تو اللہ تعالیٰ سچے مومنین میں سے اس کا نعم البدل عطا فرما دیتا ہے۔[3]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«إِنَّ الْإِيمَانَ لَيَأْرِزُ إِلَى الْمَدِينَةِ كَمَا تَأْرِزُ الْحَيَّةُ إِلٰى جُحْرِهَا»

''ایمان مدینہ میں اس طرح سمٹ آئے گا جس طرح سانپ اپنے بل کی طرف سمٹتا ہے۔''[4]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ! لَا يَخْرُجُ مِنْهَا أَحَدٌ رَغْبَةً عَنْهَا إِلَّا أَخْلَفَ اللّٰهُ فِيهَا خَيْرًا مِّنْهُ، أَلَا! إِنَّ الْمَدِينَةَ كَالْكِيرِ تُخْرِجُ الْخَبِيثَ، لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَنْفِيَ الْمَدِينَةُ شِرَارَهَا كَمَا يَنْفِي الْكِيرُ خَبَثَ الْحَدِيدِ»

① جامع الترمذي، حديث: 3917، وسنن ابن ماجه، حديث: 3112، وصحيح ابن حبان، حديث: 3733، وشعب الإيمان للبيهقي، حديث: 4184، و مسند أحمد: 74/2 و 104. ② صحيح البخاري، حديث: 1890. ③ الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 161. ④ صحيح البخاري، حديث: 1876، و صحيح مسلم، حديث: 147.

’’قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! کوئی آدمی مدینہ چھوڑ کر نہیں جاتا مگر اللہ تعالیٰ مدینہ میں اس سے بہتر آدمی بھیج دیتا ہے۔ خبردار! بے شک مدینہ بھٹی کے مانند ہے جو اپنا میل کچیل نکال باہر کرتا ہے۔ اور قیامت نہیں آئے گی جب تک کہ مدینہ اپنے برے لوگوں کو اس طرح نکال باہر نہ کرے جس طرح بھٹی لوہے کا میل باہر نکال دیتی ہے۔‘‘ [1]

مدینہ برے لوگوں کو ختم کرنے والا ہے: حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّهَا طَيْبَةُ تَنْفِي الْخَبَثَ كَمَا تَنْفِي النَّارُ خَبَثَ الْفِضَّةِ»

’’بے شک مدینہ پاکیزہ شہر ہے۔ یہ برے لوگوں کو اس طرح ختم کر دیتا ہے جس طرح آگ چاندی کا میل صاف کر دیتی ہے۔‘‘ [2]

اللہ تعالیٰ کا مدینہ طیبہ کو ہر برے آدمی کے شرّ سے محفوظ رکھنا: حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لَا يَكِيدُ أَهْلَ الْمَدِينَةِ أَحَدٌ إِلَّا انْمَاعَ، كَمَا يَنْمَاعُ الْمِلْحُ فِي الْمَاءِ»

’’اگر کوئی شخص اہل مدینہ سے مکر کرے گا تو اس طرح پگھل جائے گا جس طرح نمک پانی میں حل ہو جاتا ہے۔‘‘ [3]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اَلْمَدِينَةُ حَرَمٌ، فَمَنْ أَحْدَثَ فِيهَا حَدَثًا، أَوْ آوىٰ مُحْدِثًا فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ، لَا يُقْبَلُ مِنْهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَدْلٌ وَّلَا صَرْفٌ»

[1] صحيح مسلم، حديث: 1381، ومسند أحمد: 439/2. [2] صحيح البخاري، حديث: 4589، وصحيح مسلم، حديث: 1384. [3] صحيح البخاري، حديث: 1877، وصحيح مسلم، حديث: 1387.

"مدینہ حرمت والا ہے، پس جس نے وہاں کوئی بدعت ایجاد کی یا کسی بدعتی کو پناہ دی اس پر اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہے، قیامت والے دن اس کی کوئی فرضی یا نفلی عبادت قبول نہیں کی جائے گی۔"[1]

مدینہ طیبہ کی حرمت: رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے مدینہ کو حرم قرار دیا۔ وہاں نہ کسی کا خون بہایا جائے گا، نہ ہتھیار اٹھانے کی اجازت ہے، نہ کسی کو گھبراہٹ میں مبتلا کیا جائے گا، نہ درخت کاٹا جائے گا اور نہ کسی کی گری پڑی چیز اٹھانے کی اجازت ہے، سوائے اس شخص کے جو اس کا اعلان کرنا چاہتا ہو۔

مذکورہ بالا امور کے علاوہ بھی کچھ امور احترام مدینہ میں شامل ہیں جن کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«إِنَّ إِبْرَاهِيمَ حَرَّمَ مَكَّةَ وَ دَعَا لَهَا، وَ حَرَّمْتُ الْمَدِينَةَ كَمَا حَرَّمَ إِبْرَاهِيمُ مَكَّةَ وَ دَعَوْتُ لَهَا فِي مُدِّهَا وَ صَاعِهَا مِثْلَ مَا دَعَا إِبْرَاهِيمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ لِمَكَّةَ»

"بے شک ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرم قرار دیا اور اس کے لیے دعا کی اور میں نے مدینہ کو حرم قرار دیا اور میں نے اس کے صاع اور مد میں اسی طرح برکت کی دعا کی جس طرح ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کے لیے دعا فرمائی تھی۔"[2]

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«هٰذَا جَبَلٌ يُّحِبُّنَا وَ نُحِبُّهُ، اَللّٰهُمَّ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ حَرَّمَ مَكَّةَ وَ إِنِّي حَرَّمْتُ الْمَدِينَةَ مَا بَيْنَ لَا بَتَيْهَا»

"یہ احد کا پہاڑ ہم سے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔ اے اللہ! ابراہیم علیہ السلام نے

---

1 صحيح مسلم، حديث: 1371. 2 صحيح البخاري، حديث: 2129، وصحيح مسلم، حديث: 1360.

مکہ مکرمہ کو حرم قرار دیا اور میں دو حروں کی درمیانی زمین مدینہ کو حرم قرار دیتا ہوں۔"[1]

آپ ﷺ نے مزید ارشاد فرمایا:

«لَا يُخْتَلٰى خَلَاهَا، وَلَا يُنَفَّرُ صَيْدُهَا وَلَا تُلْتَقَطُ لُقَطَتُهَا إِلَّا لِمَنْ أَشَادَ بِهَا، وَلَا تُقْطَعُ مِنْهَا شَجَرَةٌ إِلَّا أَنْ يَّعْلِفَ رَجُلٌ بَعِيرَهُ، وَلَا يُحْمَلُ فِيهَا السِّلَاحُ لِقِتَالٍ»

"اس کی تر گھاس نہ اکھاڑی جائے، اس کا شکار نہ بھگایا جائے اور اس کی گری پڑی چیز سوائے اعلان کرنے والے کے نہ اٹھائی جائے۔ اور نہ اس کا کوئی درخت کاٹا جائے سوائے اونٹ کے چارے کے اور نہ اس میں کسی سے لڑائی کے لیے ہتھیار اٹھایا جائے۔"[2]

یہ وہ عظیم فضائل تھے جن کی وجہ سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم مدینہ سے شغف رکھتے تھے اور اس کی طرف ہجرت اور وہاں مستقل قیام کرنے کا عزم رکھتے تھے۔ یہاں امت مسلمہ کی قوت جمع ہوگئی اور شرک کی ہر قسم اور کفر کی ہر شکل کو ختم کر دیا گیا یہاں تک کہ کرۂ ارض کے مشرق و مغرب مسلمانوں کے زیر نگیں ہوگئے۔

——— الحمد للہ پہلی جلد مکمل ہوئی ———

[1] صحيح البخاري، حديث: 4084، وصحيح مسلم، حديث: 1362. [2] مسند أحمد: 119/1.

سیرت النبی ﷺ

جلد اوّل

نبی امی ﷺ کی سیرت مبارکہ کو امت نے ہر دور میں نئے سے نئے اسلوب میں پیش کیا ہے۔ سیرت کا موضوع ہر مؤلف، مترجم اور ناشر کے لیے حصول سعادت کا ذریعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیرت کی کتب اپنے اندر ندرت وحکمت کے کئی پہلو لیے ہوئے منصۂ شہود پر آتی اور دادِ تحسین وصول کرتی ہیں۔

زیرِ نظر کتاب بھی ندرت کے کئی پہلوؤں کی حامل ہے۔ سیرتِ مبارکہ اور قرآنِ مجید کے باہمی ربط کا اظہار، واقعاتِ سیرت کے بیان میں اختلاف کا حل، اسلوب میں ادبی چاشنی اور سطر سطر سے نبی کریم ﷺ سے محبت کے جھلکتے آثار اس کتاب کی نمایاں خوبیاں ہیں مگر اس میں جس پہلو کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے وہ ہے واقعاتِ سیرت کو متعدد قدیم مراجع سے اخذ کر کے انھیں موجودہ حالات پر منطبق کرنا اور ان سے دروس وعبر اور اسباق و نصائح کشید کر کے دورِ جدید سے ہم آہنگ کرنا ہے۔

علاوہ ازیں مؤلف کتاب ڈاکٹر علی محمد صلابی حفظہ اللہ سیرت طیبہ پر مستشرقین کے رکیک حملوں کا دندان شکن جواب دیتے ہیں اور اصولِ روایت کا دامن بھی نہیں چھوڑتے۔ اس طرح 350 قدیم وجدید مصادر ومراجع کی روشنی میں مرتب کردہ یہ کتاب سیرت اعلیٰ ترتیب، عمدہ اسلوب، دلکش پیرائے، انتہائی جامعیت، عبرتوں، حکمتوں اور اسباق سے لبریز، عمدہ طباعت کے ساتھ ایک عظیم شاہکار بن گئی ہے۔



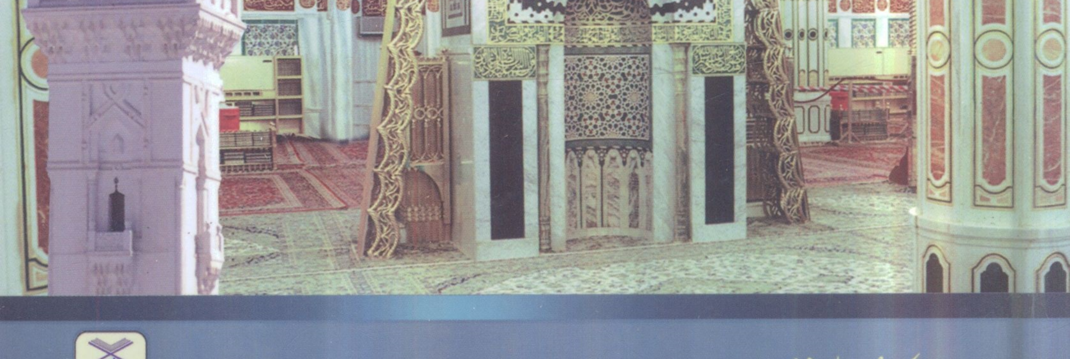
دار السلام
کتاب و سنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ
9 786035 000925

جلد دوم

ہادیِ عالم ﷺ کی سیرت سے ماخوذ، عصرِ حاضر کے
تقاضوں سے ہم آہنگ دروس و عِبر اور فوائد و ثمرات



سیرت النبی ﷺ



دکتور علی محمد صلابی

دار السلام
DARUSSALAM

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کے نام سے شروع جو نہایت رحم کرنے والا خوب مہربان ہے۔

مدحت النبی صلی اللہ علیہ وسلم

وَأَحْسَنُ مِنْكَ لَمْ تَرَ قَطُّ عَيْنِيْ

وَأَجْمَلُ مِنْكَ لَمْ تَلِدِ النِّسَاءُ

خُلِقْتَ مُبَرَّأً مِنْ كُلِّ عَيْبٍ

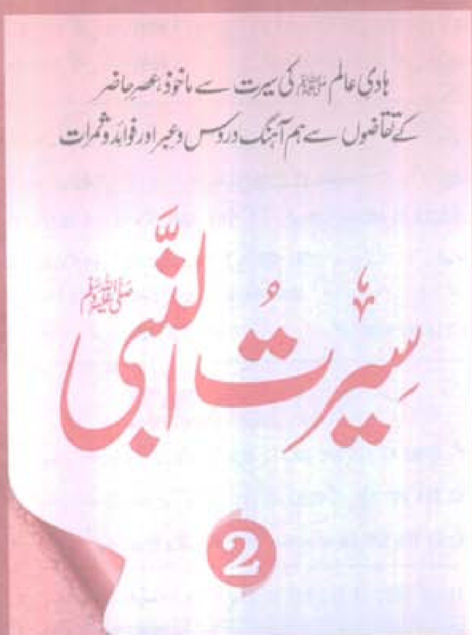
كَأَنَّكَ قَدْ خُلِقْتَ كَمَا تَشَاءُ

اور آپ کی ذاتِ اَقدس سے زیادہ حسین میری نگاہ نے کبھی کوئی دیکھا ہی نہیں

اور آپ سے زیادہ حسن و جمال والا کبھی کسی ماں نے جنا ہی نہیں

آپ ہر قسم کے عیب سے پاک صاف پیدا کیے گئے ہیں

گویا آپ کی ذاتِ اَقدس کو آپ کے منشا کے عین مطابق بنایا گیا ہے


ہادیٔ عالم ﷺ کی سیرت سے ماخوذ، عصرِ حاضر
کے تقاضوں سے ہم آہنگ دروس وعبر اور فوائد وثمرات
سیرت النبی ﷺ
2

© مكتبة دار السلام، ١٤٣٣ هـ
فهرسة مكتبة الملك فهد الوطنية أثناء النشر
الصلابي، علي محمد
سيرة النبي صلى الله عليه وسلم / علي محمد الصلابي - الرياض، ١٤٣٣ هـ
ص: ٨٤٠ مقاس: ٢١×١٤ سم
ردمك: ٨-٠٩١-٠٠٠-٥٠٠-٦٠٣-٩٧٨ (مجموعة)
٢-٠٩٣-٥٠٠-٦٠٣-٩٧٨ (ج ٢) (النص باللغة الاردية)
١. السيرة النبوية أ. العنوان
ديوي ٢٣٩ ١٤٣٣/٢٧٦٣
رقم الإيداع: ١٤٣٣/٢٧٦٣
ردمك: ٨-٠٩١-٠٠٠-٥٠٠-٦٠٣-٩٧٨ (مجموعة)
٢-٠٩٣-٠٠٠-٥٠٠-٦٠٣-٩٧٨ (ج ٢)

سعودی عرب (ہیڈ آفس)

شاہ عبدالعزیز بن جلاوی سٹریٹ پوسٹ بکس: 22743 الریاض: 11416 سعودی عرب
فون: 4033962-4043432 1 00966 فیکس: 4021659 www.darussalamksa.com
Email: darussalam@awalnet.net.sa info@darussalamksa.com

الریاض • [illegible] فون: 4614483 1 00966 فیکس: 4644945 • الملز فون: 4735220 1 00966 فیکس: 4735221
• [illegible] فون: 4286641 1 00966 • [illegible] فون/فیکس: 2860422 1 00966
جدہ فون: 6879254 2 00966 فیکس: 6336270 مدینہ منورہ فون: 8234446,8230038 4 00966 فیکس: 8151121 04
الخبر فون: 8692900 3 00966 فیکس: 8691551 3 00966 خمیس مشیط فون/فیکس: 2207055 7 00966
ینبع البحر فون: 0500887341 فیکس: 8691551 قصیم (بریدہ) فون: 0503417156 فیکس: 3696124 6 00966

امریکہ • نیویارک فون: 5925 625 718 001 • ہیوسٹن: 0419 722 713 001 کینیڈا • [illegible] فون: 4186619 416 001
لندن • [illegible] فون: 77252246 20 0044-85394885 20 0044 • [illegible]: 7739309 0121 0044
متحدہ عرب امارات • شارجہ فون: 5632623 6 00971 فیکس: 5632624 فرانس فون: 52928 480 01 0033 فیکس: 52997 480 01 0033
انڈیا • [illegible] فون: 45566249 44 0091 موبائل: 12041 98841 0091 • [illegible] فون: 4180 2373 22 0091
• [illegible] فون: 4892 2451 40 0091 موبائل: 30850 98493 0091 • [illegible] فون: 42157847 44 0091
سری لنکا • [illegible] فون: 358712 115 0094 • [illegible] فون: 2669197 114 0094

پاکستان ہیڈ آفس و مرکزی شوروم

لاہور 36-لوئر مال، سیکرٹریٹ سٹاپ لاہور فون: 00 4 32 372,24 400 372,34 240 373 42 0092 فیکس: 72 540 373 042
• غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور فون: 54 200 371 42 0092 فیکس: 03 207 373 042
• Y بلاک، گول کمرشل مارکیٹ، دکان: 2 (گراؤنڈ فلور) ڈیفنس، لاہور فون: 10 926 356 42 0092

کراچی مین طارق روڈ، آفس مال سے (بہادر آباد کی طرف) دوسری گلی کراچی فون: 36 939 343 21 0092 فیکس: 37 939 343 21 0092

اسلام آباد F-8 مرکز، اسلام آباد فون/فیکس: 13 815 22 51 0092

info@darussalampk.com | www.darussalampk.com

ہادیِ عالم ﷺ کی سیرت سے ماخوذ، عصرِ حاضر
کے تقاضوں سے ہم آہنگ دروس و عبر اور فوائد و ثمرات

سیرت النبی ﷺ

تالیف:

دکتور علی محمد صلابی

مترجمین:

مولانا محمد یونس بٹ

مولانا محمد ادریس سلفی
مولانا محمد ندیم شہباز

دار السلام
DARUSSALAM

اللهم صل على
محمد ﷺ
وعلى آل محمد كما صليت على ابراهيم
وعلى آل ابراهيم انك حميد مجيد
اللهم بارك على محمد وعلى آل محمد
كما باركت على ابراهيم وعلى آل ابراهيم
انك حميد مجيد

فہرست (جلد دوم)

حصہ :8 رسول اللہ ﷺ اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ہجرت

باب :1 مشرکین کا منصوبۂ قتل اور ہجرتِ مدینہ

حصہ: 10 | غزوۂ بدر کبریٰ

حصہ 11: غزوۂ بدر سے غزوۂ احد تک

حصہ: 12 | غزوۂ احد اور خندق کے درمیان کے اہم واقعات

اجمالی فہرست ونقشہ جات

رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ہجرت

باب : 1 مشرکین کا منصوبۂ قتل اور ہجرت مدینہ

باب : 2 مہاجرین کے اوصافِ حمیدہ، ان کا انعام و اکرام اور ہجرت سے پیچھے رہنے والوں کا انجام

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ؕ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ○

"اور (اے نبی! یاد کیجیے) جب وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا آپ کے بارے میں تدبیر کر رہے تھے تا کہ وہ آپ کو قید کر دیں یا آپ کو قتل کر دیں یا آپ کو (مکہ سے) نکال دیں اور وہ تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ بھی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔"

(الأنفال 8:30)

باب 1

مشرکین کا منصوبۂ قتل اور ہجرتِ مدینہ

رسول اللہ ﷺ کو (نعوذ باللہ) قتل کرنے کی ناکام کوشش

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ہجرتِ مدینہ کے راستے میں قریشیوں نے طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کیں مگر انھیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ جب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی اکثریت مدینہ ہجرت کر گئی تو قریش کو معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا۔ ان کے اقتصادی مفادات اور قبائل عرب پر ان کی معاشرتی برتری خطرے میں پڑ گئی، لہٰذا انھوں نے اسلامی تحریک کے سربراہ کو (نعوذ باللہ) ختم کرنے کے لیے دارالندوہ میں مجلس مشاورت کا انعقاد کیا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان نازل ہوا:

﴿وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ ۚ وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ ۖ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ ۝﴾

”اور (اے نبی! یاد کیجیے) جب وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا آپ کے بارے میں تدبیر کر رہے تھے تاکہ وہ آپ کو قید کر دیں یا آپ کو قتل کر دیں یا آپ کو (مکہ سے) نکال دیں اور وہ تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ بھی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔“[1]

ابن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ایک رات قریش نے مکہ میں مجلس

[1] الأنفال 30:8.

مشاورت قائم کی۔ ایک آدمی نے مشورہ دیا کہ اس (محمد رسول اللہ ﷺ) کو بیڑیوں میں جکڑ دیا جائے،[1] دوسرے نے قتل کرنے اور تیسرے نے جلاوطن کرنے کا مشورہ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس مجلس کی خبر رسول اللہ ﷺ کو بذریعہ وحی پہنچادی، چنانچہ آپ اسی رات مکہ سے روانہ ہو گئے اور آپ کے بستر پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رات بسر کی۔[2] صبح کے وقت جب قریش حملہ آور ہوئے تو بستر پر علی رضی اللہ عنہ کو پایا۔ انھیں اپنا منصوبہ ناکام ہوتا نظر آیا تو پوچھا: ''تمھارا ساتھی کہاں ہے؟'' علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''مجھے معلوم نہیں۔'' تب قریش نبی ﷺ کے آثار کا تعاقب کرتے ہوئے جبل ثور تک جا پہنچے۔ جب پہاڑ پر چڑھتے ہوئے غار پر سے گزرے تو غار کے دھانے پر مکڑی کا جالا نظر آیا۔ کہنے لگے کہ اگر کوئی اس غار میں داخل ہوتا تو یہ جالا یہاں نہ ہوتا۔ آنحضرت ﷺ غار ثور میں تین دن مقیم رہے۔[3]

سید قطب رحمہ اللہ مذکورہ آیت کی تفسیر میں مشرکین کے مکر اور قاتلانہ منصوبے کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''درحقیقت اس آیت مبارکہ میں مسلمانوں کے حالات کی تبدیلی سے پہلے کے مکی دور کا تذکرہ بھی ہے اور مستقبل میں احوال تبدیل ہونے کی یقین دہانی بھی جیسا کہ اللہ کی طے شدہ تدبیر اور حکمت کے بہتر اور موثر ہونے کا ذکر کیا گیا ہے، چنانچہ مسلمان جو قرآن کے اولین مخاطب تھے، ماضی اور مستقبل دونوں کے حالات جان گئے کیونکہ وہ ماضی قریب میں خود ان حالات سے گزر چکے تھے۔ اس میں ماضی کے خوفناک اور پرالم واقعات کی یاددہانی کے ساتھ ساتھ حق و باطل کی اس کشمکش کے نتیجے میں حاصل ہونے والے امن وسکون کی خوشخبری بھی دی گئی ہے۔ وہ یہ کہ نہ صرف مسلمانوں کو مشرکین کے ظلم وستم سے نجات ملے گی بلکہ نبی ﷺ کے خلاف کفار کا منصوبہ ناکام رہے گا اور بالآخر مسلمانوں کو ان پر غلبہ حاصل ہوگا۔ دوسری یہ کہ مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کے

---

1 السيرة النبوية لابن هشام: 124/2-126، ودلائل النبوة للبيهقي: 466/2-468. 2 مسند أحمد: 348/1. 3 البداية والنهاية: 181/3، و فتح الباري، شرح الحديث: 3905.

خلاف کیسی کیسی سازشیں کیں۔ اس آیت میں ان سازشوں سے نہ صرف چھٹکارا پانے کی نوید تھی بلکہ آئندہ زمانے میں ان پر غلبہ حاصل کرنے کا عندیہ بھی تھا۔

قریشی چاہتے تھے کہ (معاذ اللہ) کسی طرح مکروفریب سے نبی ﷺ کو قید کرلیا جائے اور قید ہی میں آپ کا انتقال ہوجائے یا آپ ﷺ کو قتل کر کے خلاصی حاصل کی جائے، یا پھر آپ کو مکہ سے کہیں دور جلاوطن کر دیا جائے، چنانچہ مشورے کے بعد آپ کے قتل کا منصوبہ اس طرح طے پایا کہ مختلف قبائل کے نوجوانوں پر مشتمل ایک جماعت تشکیل دی جائے جو یکبارگی آپ پر حملہ آور ہو۔ اس طرح آپ کا خون مختلف قبائل میں بٹ جائے گا اور بنو ہاشم پورے عرب کا مقابلہ نہ کرسکیں گے اور مجبوراً انھیں دیت قبول کرنی پڑے گی۔

اس آیت میں ایک طنز بھی پوشیدہ ہے، وہ یہ کہ ذات باری تعالیٰ کے قہر وغضب سے مخلوق کو ڈرنا چاہیے مگر یہاں کمزور ترین انسان (کفار) مضحکہ خیز طور پر اس قادرِ مطلق کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں جو عظیم طاقت کا مالک اور اپنے بندوں پر غالب ہے، ہر حال میں اپنے فیصلے نافذ کرنا جانتا ہے اور ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔'' ●

رسول اللہ ﷺ کے ہجرت کے پروگرام کی ترتیب

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ روزانہ ہمارے گھر صبح یا شام کو تشریف لایا کرتے تھے لیکن جس روز آپ ﷺ کو مکہ سے ہجرت کرنے اور اپنی قوم کو الوداع کہنے کا حکم ملا آپ ﷺ دوپہر کے وقت ہمارے گھر تشریف لائے، حالانکہ عموماً ایسے وقت میں آپ نہیں آیا کرتے تھے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے دیکھتے ہی کہہ دیا کہ آپ ﷺ کا اس وقت تشریف لانا ضرور کسی نئی بات کا پیش خیمہ ہے۔ جیسے ہی رسول اللہ ﷺ نے گھر میں قدم رکھا، ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی مسند آپ کے لیے خالی کر دی۔ گھر میں اس وقت میرے اور میری

● تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب: 1501/3.

بہن اسماء کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ آپ ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: «أَخْرِجْ عَنِّي مَنْ عِنْدَكَ» ''سب کو باہر نکال دو۔''

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''یہ دونوں میری بیٹیاں ہیں۔ آپ فکر نہ کریں۔ میرے ماں باپ آپ پر قربان! معاملہ کیا ہے؟''

آپ ﷺ نے فرمایا: «فَإِنِّي قَدْ أُذِنَ لِي فِي الْخُرُوجِ وَالْهِجْرَةِ» ''مجھے روانگی اور ہجرت کا حکم ملا ہے۔''

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سوال کیا: ''کیا مجھے بھی (اس سفر میں) آپ کا ساتھ نصیب ہوگا؟''

آپ ﷺ نے فرمایا: «نَعَمْ» ''ہاں۔'' صدیق اکبر رضی اللہ عنہ رونے لگے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس دن سے قبل میں نہیں جانتی تھی کہ کوئی خوشی سے بھی روسکتا ہے۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میرے پاس یہ دوسواریاں (اونٹنیاں) ہیں جو میں نے اسی سفر کے لیے تیار کر رکھی ہیں۔''

دونوں حضرات نے ایک آدمی عبداللہ بن اریقط سے راستے کی رہنمائی کے لیے اجرت طے کر لی۔ عبداللہ بنودیل بن بکر سے تھا۔ اور اس کی ماں بنوسہم بن عمرو سے تھی۔ وہ ابھی تک مشرک ہی تھا۔ انھوں نے دونوں اونٹنیاں اس کے سپرد کردیں۔ وہ اس کے پاس رہیں اور وہ نبی ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ سے طے شدہ وقت تک انھیں چراتا اور ان کی دیکھ بھال کرتا رہا۔ [1]

امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک لمبی روایت نقل کی ہے جس میں وہ فرماتی ہیں: ''ایک دن ہم دوپہر کے وقت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر میں بیٹھے تھے تو کسی نے کہا: ''دیکھو، اللہ کے رسول ﷺ سر پر کپڑا ڈالے ایسے وقت میں تشریف لا رہے ہیں کہ پہلے کبھی اس وقت نہیں آئے۔'' ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان! اللہ کی قسم! ضرور کوئی معاملہ پیش آیا ہے۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سب کو یہاں سے

[1] السيرة النبوية لابن كثير: 234,233/2، والسيرة النبوية لابن هشام: 129,128/2.

نکال دو۔'' ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اللہ کے رسول! یہ تو آپ کے اہل خانہ ہیں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا: ''مجھے ہجرت کا حکم ہوا ہے۔'' ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''میرے ماں باپ آپ پر قربان! کیا مجھے شرفِ صحبت حاصل ہونے والا ہے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں!'' ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان! یہ میری دو سواریاں ہیں، ان میں سے ایک آپ لے لیجیے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا قیمت لینے سے انکار کر دیا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''ہم نے دونوں سواریاں جلدی سے تیار کیں، زادِ راہ تیار کر کے چمڑے کے ایک تھیلے میں ڈال دیا۔ اسماء نے اپنے کمر بند سے ایک ٹکڑا کاٹ کر تھیلے کا منہ بند کر دیا، اس لیے اسے ذات النطاقین کا لقب ملا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر رضی اللہ عنہ غارِ ثور میں جا ٹھہرے۔ وہ وہاں تین راتیں چھپے رہے۔ عبداللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہما رات وہاں گزارتا اور سحری کے وقت مکہ پہنچ جاتا اور قریش سمجھتے کہ وہ مکہ ہی میں رات گزارتا ہے۔ عبداللہ رضی اللہ عنہ ایک ذہین اور سمجھدار نوجوان تھا۔ مکہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بارے میں جو بھی پروگرام بنتا اسے سمجھ لیتا اور رات کے اندھیرے میں غارِ ثور پہنچ کر ساری گفتگو ان سے کہہ دیتا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کا غلام عامر بن فہیرہ دن بھر بکریاں چراتا، جب رات کا ایک حصہ گزر جاتا تو بکریاں لے کر ان کے پاس پہنچ جاتا۔ اس طرح رات کو بکریوں کا دودھ پی کر دونوں آسودہ ہو جاتے، پھر صبح تڑکے ہی عامر بن فہیرہ بکریاں ہانک کر چل دیتا۔ تینوں راتیں اس نے ایسا ہی کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بنو دیل کے ایک آدمی کی خدمات اجرت پر حاصل کر رکھی تھیں۔ وہ راستوں کی رہنمائی کا بڑا ماہر تھا۔ عاص بن وائل سہمی کا حلیف تھا اور ابھی تک قریش کے دین پر تھا۔ اس پر اعتبار کرتے ہوئے دونوں سواریاں اسی کے سپرد کر دی گئی تھیں۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ تین راتوں کے بعد غارِ ثور کے پاس سواریاں لے کر آئے گا، چنانچہ جب وہ وہاں پہنچ گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ

کو لے کر اس نے ساحل کا راستہ اختیار کیا۔“[1]

مکہ سے غار ثور تک

رسول اللہ ﷺ مکہ سے نکلے تو علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، ابوبکر رضی اللہ عنہ اور آپ کے گھر والوں کے علاوہ کسی کو اس کا علم نہ تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پیچھے رہنے کا حکم تھا کہ وہ اہل مکہ کی امانتیں واپس کردیں۔ مکہ والے جب اپنی کسی چیز کے بارے میں تلف یا گم ہونے کا خطرہ محسوس کرتے تو آپ ﷺ کے پاس بطور امانت رکھ دیا کرتے تھے کیونکہ وہ آپ ﷺ کے صدق و امانت کے قائل تھے۔[2]

رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ طے شدہ وقت پر ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر کے پچھواڑے سے نکلے۔[3] تاکہ روانگی صیغہ راز میں رکھی جائے اور قریش ان کا تعاقب کرتے ہوئے کہیں انھیں اس بابرکت سفر سے روکنے میں کامیاب نہ ہوجائیں۔ انھوں نے عبداللہ بن اریقط کو تین راتوں کے بعد غار ثور پہنچنے کا کہا اور خود عازم سفر ہوئے۔[4]

نبی ﷺ کی مکہ سے نکلتے وقت دعا اور مکہ سے اظہار عقیدت و محبت

نبی ﷺ نے مکہ سے نکلتے ہی یہ دعا فرمائی:

«اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي خَلَقَنِي وَلَمْ أَكُ شَيْئًا، اَللّٰهُمَّ أَعِنِّي عَلٰى هَوْلِ الدُّنْيَا، وَبَوَائِقِ الدَّهْرِ، ومَصَائِبِ اللَّيَالِي وَ الْأَيَّامِ، اَللّٰهُمَّ اصْحَبْنِي فِي سَفَرِي، وَاخْلُفْنِي فِي أَهْلِي، وَلَكَ فَذَلِّلْنِي، وَذٰلِكَ عَلٰى خُلُقٍ صَالِحٍ فَقَوِّمْنِي وَإِلَيْكَ يَا رَبِّ فَحَبِّبْنِي، وَإِلَى النَّاسِ فَلَا تَكِلْنِي،

[1] صحيح البخاري، حديث: 3905. [2] السيرة النبوية لابن كثير: 234/2. [3] الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 334. [4] خاتم النبيّين لأبي زهرة: 659/1، و السيرة النبوية لابن كثير: 234/2.

رَبَّ الْمُسْتَضْعَفِينَ! فَأَنْتَ رَبِّي، أَعُوذُ بِوَجْهِكَ الْكَرِيمِ الَّذِي أَشْرَقَتْ لَهُ نُورَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ، وَكَشَفْتَ بِهِ الظُّلُمَاتِ، وَصَلَحْتَ بِهِ أَمْرَ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ، أَنْ تُحَلِّلَ عَلَيَّ سَخَطَكَ، أَوْ تُنَزِّلَ عَلَيَّ غَضَبَكَ، أَعُوذُبِكَ مِنْ زَوَالِ نِعْمَتِكَ وَفُجَاءَ ةِ نِقْمَتِكَ، وَتَحَوُّلِ عَافِيَتِكَ، وَجَمِيعِ سَخَطِكَ، لَكَ الْعُتْبٰى عِنْدِي مَا اسْتَطَعْتُ، لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ»

’’تمام تعریفیں اس ذات کے لائق ہیں جس نے مجھے پیدا کیا حالانکہ میں کچھ نہ تھا۔ اے اللہ! دنیا کی ہولنا کیوں، زمانے کی آفتوں اور شب و روز کے مصائب پر میری مدد فرما۔ اے اللہ! میرے اس سفر میں اپنا ساتھ نصیب فرما، میرے اہل خانہ کی حفاظت اور میری درست رہنمائی فرما دے اور مجھے اس پر کاربند رکھ۔ اے اللہ! مجھے اپنا محبوب بنالے اور لوگوں کے سپرد نہ کر۔ تو میرا اور کمزور لوگوں کا رب ہے۔ میں تیرے چہرے کے اس نور کی پناہ چاہتا ہوں جس سے تو نے زمین و آسمان اور تاریکیوں کو روشن کر دیا اور تو نے پہلے والے اور آخری لوگوں کے معاملے کو درست کر دیا کہ تو مجھ پر اپنا غضب نازل کرے یا تیرا عتاب مجھ پر وارد ہو۔ اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں کہ تیری نعمت زائل ہو یا تیری سزا اچانک وارد ہو۔ اے اللہ! میں تجھ سے مستقل تندرستی مانگتا ہوں اور تیری تمام تر ناراضی سے پناہ چاہتا ہوں۔ اور اپنی بساط کے مطابق تیری ہی رضا مطلوب ہے۔ اور تیرے بغیر کوئی زور اور طاقت نہیں۔‘‘ [1]

پھر نبی ﷺ مکہ کے بازار میں ایک بلند مقام پر کھڑے ہوئے اور فرمایا: «وَاللّٰهِ! إِنَّكِ

[1] السيرة النبوية لابن كثير:2/230-234، والمصنف لعبد الرزاق، حديث: 9234، روایت ضعیف ہے۔

لَخَيْرُ أَرْضِ اللّٰهِ، وَ أَحَبُّ أَرْضِ اللّٰهِ إِلَى اللّٰهِ، وَ لَوْلَا أَنِّي أُخْرِجْتُ مِنْكِ مَا خَرَجْتُ» ''اللہ کی قسم! (اے مکہ) یقیناً تو کائنات کی بہترین اور اللہ تعالیٰ کی محبوب ترین زمین ہے۔ اگر مجھے یہاں سے نکلنے پر مجبور نہ کیا جاتا تو میں یہاں سے کبھی نہ جاتا۔''[1]

پھر رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ محو سفر ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انھیں مشرکین کی پکڑ سے محفوظ فرما دیا اور وہ ناکام ہو کر لوٹ گئے۔

امام احمد رحمہ اللہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ مشرکین رسول اللہ ﷺ کے آثار پر چلتے ہوئے غار ثور تک جا پہنچے اور جب پہاڑ پر چڑھے تو غار کے قریب سے گزرے جس کے دہانے پر مکڑی کا جالا تھا اور کہنے لگے: ''اگر کوئی اس غار میں گیا ہوتا تو یہاں مکڑی کا جالا نہ ہوتا۔''[2]

یہ من جملہ اللہ تعالیٰ کے ان لشکروں میں سے ہیں جن کے ذریعے وہ باطل کو رسوا کرتا اور حق کی مدد فرماتا ہے۔ اللہ کے لشکر مادی ہوں یا غیر محسوس، بے شمار ہیں۔ بالفرض اگر مادی ہوں تو ضروری نہیں کہ وہ جسامت میں ضخیم ہوں۔ کبھی کبھی تو ایک جرثومہ جسے آنکھ بھی نہیں دیکھ سکتی، ایک بڑے لشکر کو ختم کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ۭ وَمَا هِيَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ ۝﴾

''اور آپ کے رب کے لشکروں کو بس وہی جانتا ہے۔ اور وہ (جہنم) بشر کے لیے نصیحت ہی تو ہے۔''[3]

یعنی آپ کے رب کے لشکر کثیر تعداد میں ہونے کے باعث صرف وہی جانتا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی طاقت و قدرت بے کنار ہے، اسی طرح اس کے لشکر بھی بے پناہ ہیں۔[4]

---

[1] جامع الترمذي، حديث: 3925، و سنن ابن ماجه، حديث: 3108، و مسند أحمد: 305/4 واللفظ له. [2] مسند أحمد: 348/1. موسوعہ حدیثیہ کے محققین نے اس کی سند کو ضعیف کہا ہے۔
[3] المدثر 31:74. [4] تفسير الرازي: 208/30.

کوئی آدمی نہ تو انھیں شمار کر سکتا ہے اور نہ ان کے حقائق اور صفات کو اجمالاً ہی جان سکتا ہے کجا یہ کہ ان کے مکمل کوائف مقدار، کیفیت اور تناسب سمیت جان سکے۔[1]

نبی ﷺ کی حفاظت کا الوہی اہتمام

نبی ﷺ نے تمام ممکنہ احتیاطی تدابیر اور اسباب اختیار کیے مگر کامل بھروسا اللہ تعالیٰ ہی پر کیا۔ آپ ﷺ ہمیشہ اپنے رب سے نصرت و حمایت انھی الفاظ میں طلب کرتے رہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو خصوصی طور پر سکھلائے تھے۔[2] وہ الفاظ اس طرح ہیں:

﴿رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا ۝﴾

''اور کہیے: اے میرے رب! داخل کر مجھے سچا داخل کرنا اور نکال مجھے سچا نکالنا اور مجھے اپنے پاس سے مدد دینے والا غلبہ عطا کر دے۔''[3]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو ہدایت فرمائی کہ آپ خود بھی یہی دعا کریں اور اپنی امت کو بھی یہ دعا سکھائیں اور انھیں اپنے رب کا قرب حاصل کرنے کا طریقہ بتائیں۔ یہ ایسی دعا ہے جس میں مکہ سے سچائی کے ساتھ نکلنے اور مدینہ میں سچائی کے ساتھ پہنچنے کی تمنا کا تذکرہ ہے اور یہ خیر و عافیت کا اشارہ ہے جو آخر تک سارے سفرِ ہجرت پر محیط ہے۔

﴿صِدْقٍ﴾ (سچائی) کا لفظ موقع کی مناسبت سے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ مشرکینِ مکہ آپ ﷺ کو وحی الٰہی کے حوالے سے آزمائش میں مبتلا کرنا چاہتے تھے کہ آپ اللہ کے بارے میں کذب بیانی سے کام لیں۔ اور سچائی کے کچھ فائدے بھی ہیں جیسے: دل کی پختگی، اطمینانِ قلب، پاکیزگی اور اخلاص۔

1 تفسير أبي السعود: 60/9. 2 الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبدالرحمٰن البر، ص: 72.
3 بني إسرآءيل 80:17.

اور﴿وَاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا﴾ میں ﴿سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا﴾ سے مراد قوت و ہیبت ہے جن کے ذریعے سے اقتدار اور مشرکین کی قوت پر غلبہ حاصل ہوا۔ اور ﴿مِنْ لَّدُنْكَ﴾ میں اللہ تعالیٰ کے قرب، اس سے براہِ راست مدد اور اس کی پناہ حاصل کرنے کی طرف اشارہ ہے۔

داعی صرف اپنے رب سے قوت کا طلبگار ہوتا ہے اور اس سے ڈرتا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ نہ کرے اور اس کے بجائے کسی حاکم یا صاحبِ جاہ و منصب سے مدد کا طلب گار ہو کہ وہ اس کی نصرت و حمایت کا بندوبست کرے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بادشاہوں کے دل میں دعوت اسلامی سرایت کر جاتی ہے اور وہ اس تحریک کے خادم بن جاتے ہیں اور اس کے غلبے کے لیے کوشش کرتے ہیں۔ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ درحقیقت غلبۂ اسلام من جانب اللہ ہے، اسے کسی صاحب جاہ وحشمت کی بھی ضرورت نہیں۔[1]

جب مشرکین نے غار ثور کا احاطہ کر لیا اور سامنے نظر بھی آنے لگے تو رسول اللہ ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اللہ کی معیت کا حوالہ دے کر دلاسا دیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے آپ ﷺ سے کہا اور ہم اس وقت غار ثور میں تھے: ''اگر ان مشرکین میں سے کوئی بھی نیچے دیکھے تو ہمیں دیکھ سکتا ہے۔'' اس پر نبی ﷺ نے فرمایا:

«مَا ظَنُّكَ يَا أَبَا بَكْرٍ بِاثْنَيْنِ اللّٰهُ ثَالِثُهُمَا؟»

''اے ابوبکر! تیرا ان دو آدمیوں کے بارے میں کیا خیال ہے جن کے ساتھ تیسرا ان کا اللہ ہے؟''[2]

اور ایک روایت کے الفاظ اس طرح ہیں:

[1] تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب: 2247/4. [2] صحيح البخاري، حديث: 3653، و صحيح مسلم، حديث: 2381.

«اُسْكُتْ يَا أَبَابَكْرٍ، اثْنَانِ اللّٰهُ ثَالِثُهُمَا»

''اے ابوبکر! خاموش ہو جائیے۔ دو آدمیوں کا تیسرا اللہ ہے۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے اس حقانیت کا تذکرہ اپنے اس فرمان میں کیا ہے:

﴿اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾

''اگر تم اس (نبی) کی مدد نہیں کرو گے تو تحقیق اللہ نے اس کی (اس وقت) مدد کی (تھی) جب کافروں نے اس کو (مکہ سے) نکال دیا تھا، (وہ) دو میں دوسرا تھا، جبکہ وہ دونوں غار (ثور) میں تھے، جب وہ (نبی) اپنے ساتھی (ابوبکر) سے کہہ رہا تھا: غم نہ کر، یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''[2]

علامہ طبری اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو خبر دی ہے کہ لوگ چاہے میرے نبی کی مدد کریں یا نہ کریں، میں اسلام دشمنوں کے خلاف اپنے پیغمبر کی ضرور مدد کروں گا اور غلبہ بھی عطا کروں گا، نیز کفار کو یاد دہانی کروائی گئی ہے کہ تم چاہے بظاہر کثیر تعداد میں ہو اور پیغمبر کی جماعت قلت میں ہے لیکن حقیقت میں وہ اللہ کے خصوصی لشکروں کی وجہ سے کثرت میں ہے۔ اللہ تعالیٰ ایمانداروں سے مخاطب ہے کہ اے ایماندارو! اگر تم میرے رسول کی مدد کے لیے نہ بھی نکلے تو اللہ اس کا ناصر و مددگار ہے۔

﴿اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ یعنی جب کفار مکہ نے اسے اس کے وطن اور گھر سے نکالا۔ یعنی جب قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے جلاوطن کر دیا تو وہ دو افراد میں سے ایک تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی وہ دو افراد ہیں جب مکہ والوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنا چاہا تو وہ دونوں قریش سے تنگ آ کر وہاں سے نکلے اور غار ثور میں چھپ گئے۔ ﴿اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ﴾ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر رضی اللہ عنہ جو کہ غار ثور میں تھے۔

[1] صحيح البخاري، حديث:3922. [2] التوبة9:40.

﴿اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ﴾ یعنی رسول اللہ ﷺ ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرما رہے تھے کہ غم نہ کر۔ اور یہ جملہ آپ نے اس لیے فرمایا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ ڈر رہے تھے کہ اگر کفار نے یہاں تلاش شروع کردی تو وہ دونوں پکڑے جاسکتے ہیں۔ ان کی اس گھبراہٹ کو دیکھتے ہوئے نبی ﷺ نے فرمایا تھا: ''غم نہ کر۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔'' وہ ہمارا مددگار ہے، اس لیے مشرکین ہمیں ڈھونڈ سکتے ہیں نہ پکڑ سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ گویا یاد دہانی کرا رہا ہے کہ جب تمھیں خوف اور قلت تعداد کا احساس تھا، اس وقت میں نے اپنے نبی کی مدد کی اور اب تو اس کے پاس انصار و مہاجرین کے لشکر بھی موجود ہیں تو کون اسے رسوا کرنے یا گزند پہنچانے کی جرأت کرسکتا ہے![1]

ڈاکٹر عبدالکریم زیدان آیت کریمہ میں وارد معیت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ سے مستفاد معیت اس معیت سے اعلیٰ و افضل ہے جو اللہ تعالیٰ نے متقین اور پرہیزگار لوگوں کے لیے اس آیت میں بیان فرمائی ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ۝﴾

''بلاشبہ اللہ ان کے ساتھ ہے جنھوں نے پرہیزگاری کی اور وہ احسان کرتے ہوں۔''[2]

اللہ تعالیٰ نے اپنی معیت کا تذکرہ اپنے نبی ﷺ کے حق میں فرمایا ہے۔ اس کا تعلق صرف ذات رسول ﷺ اور آپ کے ہم سفر ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ہے اور کسی خاص وصف کو یہاں بطور علت نہیں بیان کیا جس طرح کہ متقین کے لیے تقویٰ و احسان کا انعام معیت قرار دیا گیا، لہٰذا یہ معیت آپ کی ذات اور ابوبکر کے ساتھ خاص تھی جسے قرآن کی آیات بینات اور خرقِ عادت معجزاتِ نبوی کی حمایت حاصل تھی۔[3]

انھی آیات کی تفسیر میں سید قطب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جس طرح ایک ظالم قوت کلمہ حق

[1] تفسير الطبري: 136,135/10. [2] النحل 128:16. [3] المستفاد من قصص القرآن لعبد الكريم زيدان: 100/2.

کا مقابلہ نہ کر سکے تو وہ اپنے آپ کو ایسی مشکل حالت میں پاتی ہے کہ نہ اپنا دفاع کر سکتی ہے اور نہ اسے قرار آتا ہے تو کچھ ایسی ہی حالت قریش کی ہوئی کہ جب ان کے لیے نبی ﷺ کا وجود نا قابل برداشت ہوگیا تو انھوں نے باہم مشورہ کیا کہ اس نبی سے اب نجات حاصل کر لی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس منصوبے کو پیغمبر پر آشکارا فرمادیا اور حکم دیا کہ ابوبکر کو ساتھ لے کر مدینہ ہجرت کر جایئے۔ حالت یہ تھی کہ آپ ﷺ کے پاس کوئی لشکر تھا نہ پیروکاروں کی قابل ذکر تعداد تھی۔ اور دشمن کی تعداد اور قوت بہت زیادہ تھی، پھر کیا تھا کہ ایک طرف ساری مادی قوتیں تھیں اور دوسری طرف تنہا رسول اللہ ﷺ اپنے ساتھی ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہمراہ تھے مگر ان دیکھے ربانی لشکران کے مددگار تھے، لہٰذا شکست، ذلت اور رسوائی کفار کا مقدر بنی، ارشاد ربانی ہے:

﴿وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ﴾

''اور اس نے کافروں کی بات کو پست کر دیا۔''[1]

اور اللہ کی بات (توحید) اپنی جگہ برتر، غالب، قوی اور نافذ ہو کے رہی۔

اس آیت کریمہ میں رسول اللہ ﷺ اور دین اسلام کی مدد کا تذکرہ ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اگر لوگ آپ کی نصرت وحمایت سے پہلو تہی اختیار کریں تو اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کا رخ کسی دوسری قوم کی طرف بھی موڑ سکتے ہیں جو مشرکین مکہ کی طرح قبول حق میں سست اور پھسڈی نہ ہو۔''[2]

راہ ہجرت میں ام معبد کا خیمہ

غار ثور میں تین راتیں قیام کرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ غار سے نکلے تو آپ ﷺ کی تلاش کا کام ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ مشرکین آپ تک پہنچنے میں ناکام ہو چکے تھے۔

[1] التوبة 9:40. [2] تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب: 3/1656.

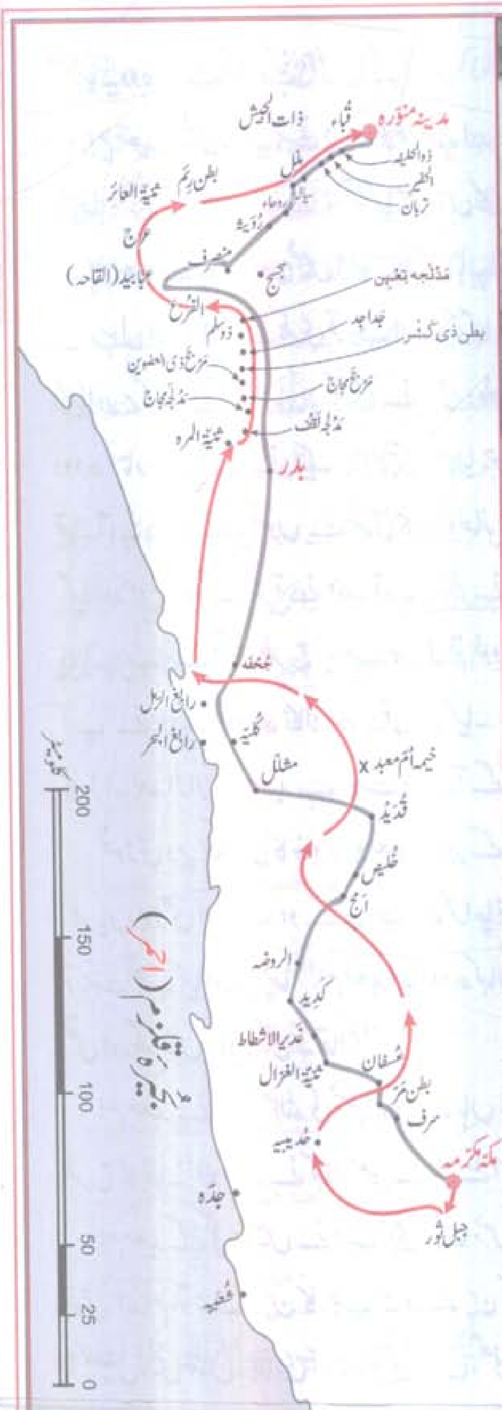
آپ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بنو دیل کے ایک آدمی عبداللہ بن اریقط کو اجرت پر راستے کی رہنمائی کے لیے تیار کیا تھا اگرچہ وہ مشرک ہی تھا لیکن اس پر اعتبار کیا اور اپنی دونوں سواریاں اس کے حوالے کردیں تاکہ وہ انھیں تین راتوں کے بعد غارِ ثور تک لے آئے۔ حسب وعدہ وہ سواریاں لے کر آیا۔ وہ، آپ ﷺ اور دوسرے ہمراہیوں کو لے کر ایک غیر معروف راستے پر چلنے لگا تاکہ کفارِ قریش سے مڈبھیڑ نہ ہو۔[1]

اس سفر میں آپ ﷺ کا گزر ام معبد کے خیمے پر ہوا جو علاقہ بنوخزاعہ کے قریب قدید نامی جگہ میں واقع تھا۔ ام معبد خنیس بن خالد خزاعی کی بہن تھیں اور خنیس نے اس قصے کو روایت کیا ہے اور پھر اسے مختلف راویوں اور سیرت نگاروں نے نقل کیا ہے۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ قصہ مشہور ہے اور کثیر طرق سے مروی ہے جو ایک دوسرے کو تقویت دیتے ہیں۔[2]

خالد اپنے باپ خنیس بن خالد خزاعی رضی اللہ عنہ سے بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب مکہ سے بغرضِ ہجرت روانہ ہوئے تو آپ ﷺ کے ساتھ ابوبکر رضی اللہ عنہ، ان کے غلام عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ اور بطور گائیڈ عبداللہ بن اریقط لیثی تھے۔ یہ سب لوگ راستے میں ام معبد کے خیمے سے گزرے۔ وہ ایک بوڑھی اور سمجھ دار خاتون تھی جو اپنے خیمے کے صحن میں دو زانو ہو کر بیٹھتی اور وہیں کھانے پینے کا انتظام کرتی۔ جب یہ تمام مسافر وہاں پہنچے تو اس سے گوشت اور کھجوروں کے بارے میں سوال کیا تاکہ اس سے خرید سکیں لیکن اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ وہ مسکین اور قحط زدہ قوم سے تعلق رکھتی تھی۔

اچانک رسول اللہ ﷺ نے خیمے کے پاس ایک بکری دیکھی تو پوچھا: «مَا هٰذِهِ الشَّاةُ يَا أُمَّ مَعْبَدٍ؟» ''اے ام معبد! یہ بکری یہاں کیسے؟'' ام معبد نے جواب دیا کہ یہ کمزوری کی وجہ سے ریوڑ کے ساتھ نہ جا سکی۔ آپ ﷺ نے پوچھا: «فَهَلْ بِهَا مِنْ لَّبَنٍ؟»

[1] المستفاد من قصص القرآن لعبد الكريم زيدان: 101/2. [2] البداية والنهاية: 188/3.





مسجد نبوی

ہجرت نبوی

* نبی ﷺ 12 ربیع الاوّل مطابق 24 ستمبر 622ء بروز پیر قباء پہنچے۔
* یکم محرم 1ھ 16 جولائی 622ء کے مطابق ہے اور یہی ہجری تقویم کی ابتدا ہے۔

ہجرت کا راستہ

قافلوں کا راستہ



کعبہ اور مسجد الحرام

''کیا یہ دودھ دے سکتی ہے؟''

ام معبد بولیں: ''یہ بہت زیادہ لاغر ہے اور دودھ نہیں دے سکتی۔'' تب نبی ﷺ نے پوچھا: «أَتَأْذَنِينَ أَنْ أَحْلِبَهَا؟» ''کیا میں اس کا دودھ دوہ سکتا ہوں؟''

ام معبد نے کہا: ''کیوں نہیں؟ میرے ماں باپ آپ پر قربان! اگر دودھ ہے تو نکال لیجیے۔''

رسول اللہ ﷺ نے بکری قریب لانے کو کہا، پھر اللہ کا نام لے کر اس کے تھن کو ہاتھ لگایا اور برکت کی دعا فرمائی۔ بکری نے اپنی دونوں ٹانگیں پھیلا دیں، جگالی کرنے لگی اور دودھ اتار دیا۔ آپ نے ایک بڑا برتن منگوایا جو ایک جماعت کو سیر کرنے کے لیے کافی تھا۔ آپ نے اپنے ہاتھوں سے بکری کا تیز دھار کے ساتھ دودھ نکالا یہاں تک کہ برتن بھر گیا اور اوپر جھاگ نظر آنے لگا۔ آپ ﷺ نے ام معبد اور اپنے تمام ساتھیوں کو دودھ پلایا۔ جب سب اچھی طرح سیراب ہوگئے تو خود پیا، پھر دوسری مرتبہ سب نے دودھ پیا۔ آپ نے دوبارہ دودھ نکالا اور برتن بھر گیا۔ یہ برتن آپ ﷺ نے ام معبد کے پاس چھوڑا۔ بعد ازاں ام معبد سے بیعت لی اور آگے چل دیے۔

تھوڑی دیر بعد اس کا خاوند ابومعبد دوپہر کے وقت کمزور بکریوں کا ریوڑ ہانکتا ہوا آیا اور بکریاں بوڑھی اور کمزور ہونے کی وجہ سے گرا چاہتی تھیں۔ اچانک اس کی نظر دودھ پر پڑی تو بہت تعجب کیا اور پوچھا: ''ام معبد! یہ دودھ کہاں سے آیا، بکری تو کمزور تھی، دودھ والی نہ تھی اور گھر میں دودھ بھی نہ تھا!؟''

ام معبد نے کہا: ''اللہ کی قسم! ہمارے ہاں ایک بابرکت آدمی آیا تھا جس کا حلیہ اس طرح کا تھا۔'' ابومعبد نے کہا: ''میرے سامنے اس کی تمام صفات بیان کرو۔''

ام معبد کہنے لگی: ''میں نے ایک آدمی دیکھا جس کا حسن و جمال جھلک رہا تھا، چہرہ تابناک، خوش اندام، توندلے پن کا عیب نہ دبلے پن کی خامی، حسن میں ڈھلا ہوا پیکر، سرگیں آنکھیں، لمبی پلکیں، بھاری آواز، لانبی گردن، گھنی ڈاڑھی، باریک اور باہم ملے ہوئے ابرو،

خاموش ہو تو باوقار، گفتگو کرے تو گردن اٹھا کر، چہرے کی رونق فزوں تر، حسن و جمال میں سب سے بڑھ کر، دور سے دیکھنے میں سب سے تابناک اور قریب سے شیریں ترین اور حسین ترین، گفتگو میں چاشنی، بات واضح اور دوٹوک، کم گو نہ بسیار گو، گفتگو ایسی گویا لڑی سے موتی جھڑ رہے ہوں، درمیانہ قد، نہ لمبا کہ ناگوار لگے، نہ ناٹا کہ نگاہ میں نہ جچے، دو شاخوں کے درمیان ایسی شاخ کی طرح جو تینوں میں سب سے خوش منظر اور سب سے شاندار ہو، رفقاء اس کے گرد حلقہ بنائے ہوئے تھے، وہ کوئی بات کہتا تو دھیان سے سنتے، کوئی حکم دیتا تو لپک کر بجالاتے، وہ مخدوم و مطاع تھا، ترش رو تھا نہ لغوگو!''

ابو معبد نے کہا: ''اللہ کی قسم! وہ تو وہی قریشی ہے جس کے معاملے (نبوت) کا ذکر مکہ سے ہمارے پاس پہنچتا رہا ہے۔ میرا تو بہت دل چاہتا ہے کہ اس کی صحبت اختیار کروں۔ اگر مجھے موقع ملا تو ضرور یہ کام کروں گا۔'' ادھر مکہ میں ایک بلند آواز سنی گئی جس کا کہنے والا معلوم نہ ہوسکا، وہ کہہ رہا تھا:

جَزَى اللّٰهُ رَبُّ النَّاسِ خَيْرَ جَزَائِهِ ... رَفِيقَيْنِ قَالَا خَيْمَتَيْ أُمِّ مَعْبَدِ

هُمَا نَزَلَا بِالْبِرِّ ثُمَّ تَرَوَّحَا ... فَقَدْ فَازَ مَنْ أَمْسٰى رَفِيقَ مُحَمَّدِ

فَيَا لَقُصَيٍّ مَّا زَوَى اللّٰهُ عَنْكُمْ ... بِهٖ مِنْ فِعَالٍ لَّا تُجَارٰى وَ سُؤْدُدِ

لِيَهْنِ بَنِي كَعْبٍ مَّكَانُ فَتَاتِهِمْ ... وَ مَقْعَدُهَا لِلْمُؤْمِنِينَ بِمَرْصَدِ

سَلُوا أُخْتَكُمْ عَنْ شَاتِهَا وَ إِنَائِهَا ... فَإِنَّكُمْ إِنْ تَسْأَلُوا الشَّاةَ تَشْهدِ

دَعَاهَا بِشَاةٍ حَائِلٍ فَتَحَلَّبَتْ ... عَلَيْهِ صَرِيحًا ضَرَّةُ الشَّاةِ مُزْبِدِ

فَغَادَرَهَا رَهْنًا لَّدَيْهَا لِحَالِبٍ ... يُّرَدِّدُهَا فِي مَصْدَرٍ ثُمَّ مَوْرِدِ

''اللہ تعالیٰ، لوگوں کا رب ان دونوں رفیقوں کو اپنی جناب سے بہترین جزا عطا

کرے جو ام معبد کے خیمے میں بغرض آرام تشریف لائے۔“

”وہ وہاں ٹھہرے تو نیکی کو ساتھ لیے ہوئے اور شام ہوتے ہی چلے گئے اور کامیاب وہی ہوا جو محمد ﷺ کا رفیق بنا۔“

”ہائے، بنو قصی! اللہ تعالیٰ نے جو عزتیں اور سرداریاں اس پیغمبر (کے یہاں سے جانے) کی بدولت تم سے سمیٹ لی ہیں، ان کا مداوا نہیں ہوسکتا۔“

”بنو کعب کو اپنے زنان خانوں اور دیوان خانوں سے خوش ہونا چاہیے کہ وہ مومنوں کے ٹھہرنے کے مقام ہیں۔“

”اپنی بہن سے اس کی بکری اور برتن کا حال پوچھو اور اگر تم اس کی بکری سے پوچھو تو وہ بھی گواہی دے گی۔“

”انھوں نے ام معبد سے ایک غیر حاملہ بکری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے دوہنے کی اجازت مانگی تو بکری کے تھن دودھ سے بھر گئے اور اس نے کثرت سے دودھ دیا۔“

”انھوں نے وہ بکری ام معبد کے پاس چھوڑی تاکہ دودھ دوہنے والا بار بار اس کا دودھ دوہتا رہے۔“ [1]

سراقہ بن مالک رسول اللہ ﷺ کے تعاقب میں

قریش مکہ نے مکہ کی تمام مجلسوں میں منادی کروا رکھی تھی کہ جو بھی نبی ﷺ یا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو زندہ یا مردہ لائے گا، اسے سو اونٹ انعام دیے جائیں گے اور جب یہ خبر مکہ کے مضافات میں بدوی قبائل تک پہنچی تو سراقہ بن مالک بن جُعْشُم نے قریش کی اس پیشکش کے لالچ میں تگ و دو شروع کردی لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت غالبہ نے سراقہ کی یوں کایا پلٹ دی کہ

[1] المعجم الكبير للطبراني، حديث: 3605، والأحاديث الطوال للطبراني، حديث: 30، ومجمع الزوائد:6/57,56.

وہ جو نبی ﷺ کو گرفتار یا قتل کرنے کے ارادے سے نکلا تھا، آپ ﷺ کا مطیع اور محافظ بن کر لوٹا۔

ابن شہاب کہتے ہیں کہ سراقہ کے بھتیجے عبدالرحمٰن بن مالک مدلجی بتاتے ہیں کہ سراقہ نے میرے والد گرامی سے مکمل قصہ اس طرح بیان فرمایا: ''میرے پاس کفار قریش کے منادی کرنے والے آئے اور بتایا کہ جو آپ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ میں سے کسی کو بھی زندہ یا فوت شدہ حالت میں لے آئے، سو اونٹ انعام کا مستحق قرار پائے گا۔ اسی دوران اس مجلس میں میری قوم بنومدلج کا ایک آدمی آیا اور کہنے لگا: ''اے سراقہ! میں نے ابھی ابھی ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ کچھ لوگوں کو جاتے دیکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ محمد اور اس کے ساتھی ہیں۔'' سراقہ نے کہا کہ میں نے اس وقت پہچان لیا تھا کہ وہ قریش کے مطلوبہ افراد ہیں لیکن میں نے کہا: ''نہیں تجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ تو کوئی دوسرے لوگ ہیں جو ابھی ابھی ہمارے سامنے اس طرف گئے ہیں۔'' سراقہ نے کہا: ''پھر میں تھوڑی دیر بعد مجلس سے اٹھا اور گھر پہنچا اور اپنی لونڈی کو ٹیلے کے پیچھے سے گھوڑا لانے اور اسے تیار کرنے کو کہا اور خود اپنا نیزہ لیے گھر کے پچھلے راستے سے نکل گیا۔ میں نے نیزے کو سرنگوں رکھا حتی کہ اس کی انی زمین سے چھو رہی تھی، پھر میں اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور تیزی سے مسافت طے کرنے لگا۔ جب میں ان کے قریب پہنچا تو میرا گھوڑا پھسلا اور میں زمین پر گر گیا۔ میں اٹھا اور فال کا تیر نکالا کہ کیا میں آپ کے قافلے کو گزند پہنچا سکوں گا یا نہیں؟ تیر میرے منشا کے خلاف نکلا لیکن میں نے تیر کی نہ مانی اور دوبارہ تعاقب کرنے لگا یہاں تک کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کی قراءت سنائی دینے لگی۔ آپ مسلسل بغیر مڑے پڑھتے جا رہے تھے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ مسلسل پیچھے دیکھ رہے تھے۔ اچانک میرے گھوڑے کے دونوں اگلے پاؤں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے، میں گرا، سنبھلا اور گھوڑے کو ڈانٹا۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنے دونوں پاؤں زمین سے نکالے۔ اس کے ساتھ ہی زمین سے دھویں

جیسا گرد و غبار بھی بلند ہوا۔ میں نے دوبارہ تیروں سے فال نکالی مگر فال میرے منشا و ارادے کے خلاف نکلی۔ میں نے بلند آواز سے قافلے والوں کو آواز دی اور امان طلب کی تو وہ ٹھہر گئے۔ اب میں گھوڑے پر سوار ہوکر ان کے پاس اس حالت میں پہنچا کہ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ عنقریب رسول اللہ ﷺ کی دعوت کامیاب ہونے والی ہے۔ میں نے کہا: ''آپ کی قوم نے آپ کی گرفتاری پر سو اونٹ انعام مقرر کیا ہے۔'' اور پھر باقی تمام خبریں بھی کہہ سنائیں۔ میں نے اپنا زادِ راہ اور سامان آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا لیکن آپ نے لینے سے انکار کر دیا۔ نبی ﷺ نے مجھ سے کچھ نہیں مانگا، صرف اتنا کہا کہ ہمیں لوگوں سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرنا۔ اور پھر میں نے نامۂ امن کی درخواست کی جو آپ ﷺ کے حکم سے عامر بن فہیرہ نے چمڑے کے ٹکڑے پر لکھ کر مجھے دے دیا، بعدازاں آپ ﷺ وہاں سے رخصت ہوئے۔''[1]

سراقہ بن مالک کے بارے میں وہ باتیں بھی مشہور ہیں جو حافظ ابن عبدالبر اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اور دیگر نے بیان فرمائی ہیں۔[2] ابن عبدالبر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''سفیان بن عیینہ ابوموسیٰ سے اور وہ حضرت حسن سے بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا: «كَيْفَ بِكَ إِذَا لَبِسْتَ سِوَارَيْ كِسْرٰى؟» ''اس وقت تیری کیسی حالت ہوگی جب تجھے کسریٰ کے کنگن پہنائے جائیں گے؟'' سراقہ کہتے ہیں کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس کسریٰ کے کنگن، شاہی پٹکا اور تاج لائے گئے تو انھوں نے سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ کو بلایا اور یہ سب کچھ انھیں پہنا دیا۔ سراقہ کی کلائیوں پر گھنے بال تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اپنے دونوں بازو بلند کرو اور پھر بلند آواز سے فرمایا: ''اللہ سب سے بڑا ہے اور شکر ہے اللہ تعالیٰ کا جس نے یہ سارا سامان کسریٰ سے چھینا جو

[1] صحیح البخاري، حدیث:3906، وصحیح مسلم، حدیث:(91)-2009. [2] الإصابة:35/3، والاستیعاب لابن عبد البر، رقم:916.

اپنے آپ کو لوگوں کا رب خیال کرتا تھا اور بنو مدلج کے ایک اعرابی سراقہ بن مالک کو پہنا دیا۔"[1] پھر سراقہ کو سوار کیا گیا اور مدینہ کی گلیوں سے اس حال میں گزارا گیا کہ لوگ اس کے اردگرد تھے اور سراقہ رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بات کو بار بار اونچی آواز سے دہرا رہے تھے کہ اللہ سب سے بڑا ہے اور شکر ہے اللہ تعالیٰ کا جس نے یہ سارا سامان کسریٰ سے چھین لیا اور بنو مدلج کے ایک گنوار سراقہ بن مالک کو پہنا دیا۔[2]

دلوں کو پھیرنے والی ذات پاکیزہ ترین ہے: سراقہ بن مالک گھر سے نبی ﷺ پر دسترس حاصل کرنے کی غرض سے روانہ ہوئے تھے تاکہ آپ ﷺ کو اہل مکہ کے حوالے کر کے سو اونٹ انعام حاصل کر سکیں لیکن تمام معاملات یکسر تبدیل ہو گئے۔ اب وہی سراقہ آپ ﷺ کے سفر کو لوگوں سے مخفی رکھنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ راستے میں جب کسی سے ملاقات ہوتی تو کہتے: "اس راستے میں آپ کے مطلوبہ افراد نہیں۔" اور جب سراقہ رضی اللہ عنہ مطمئن ہو گئے کہ اب رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ پہنچ چکے ہوں گے تو اپنا سارا ماجرا کہہ سنایا اور یہ قصہ اتنا مشہور ہوا کہ اہل مکہ کی ہر مجلس میں اس کا تذکرہ ہونے لگا۔ سردارانِ قریش کو خوف لاحق ہو گیا کہ کہیں یہ واقعہ اہل مکہ کے اسلام قبول کرنے کا سبب نہ بن جائے کیونکہ سراقہ اپنے قبیلے کے سربراہ تھے۔ ابوجہل نے بنو مدلج کو لکھا:

"اے بنو مدلج! مجھے ڈر ہے کہ تمھارا ایک کم عقل آدمی سراقہ، تمھارے خلاف محمد (ﷺ) کی مدد کرے۔ اور تمھیں ایسا گمراہ کرے کہ تمھارا شیرازہ بکھر جائے اور تمھاری جماعت عزت و سرداری کے بعد منتشر ہو جائے۔"

سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ نے ابوجہل کا جواب ان الفاظ میں لکھا:

"اے ابوالحکم! تجھے لات کی قسم! جب میرے گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس

---

[1] الروض الأنف للسهيلي: 218/4، والهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص:346. [2] السيرة النبوية لأبي شهبة:495/1.

رہے تھے تو اسے دیکھتا، تعجب کرتا اور یقین کر لیتا کہ محمد اللہ کے رسول ہیں۔ اس پر بہت سے دلائل موجود ہیں۔ اور کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔''

''تجھ پر لازم ہے کہ تو آپ ﷺ کا لوگوں سے دفاع کرے کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ آپ ﷺ کا معاملہ ضرور پھیلے گا۔ آپ ﷺ کے امر نبوت کو میں اس طرح پھیلتا ہوا دیکھ رہا ہوں کہ تمام لوگ اس سے صلح کرنے کے خواہاں ہیں۔'' [1]

رسول اللہ ﷺ کا مدینہ میں استقبال

جب مدینہ کے مسلمانوں نے نبی ﷺ کی مکہ معظّمہ سے کوچ کی خبر سنی تو روزانہ صبح سویرے حرہ کی طرف نکل جاتے اور آپ کا انتظار کرتے اور جب دوپہر کی گرمی شدت اختیار کرتی تو مجبورًا لوٹ جاتے۔ ایک دن اسی طرح طویل انتظار کے بعد اہل مدینہ گھروں کو لوٹ گئے۔ ایک یہودی نے ایک ٹیلے پر کھڑے ہو کر نگاہ دوڑائی تو اسے نبی ﷺ اور ان کے ساتھی سفید کپڑوں میں ملبوس آتے دکھائی دیے، وہ بے اختیار چلا اٹھا: ''اے عرب والو! تمھاری وہ مقدس ہستی جس کا تم انتظار کر رہے تھے پہنچ گئی۔'' مسلمان یہ آواز سنتے ہی جلدی سے اپنے ہتھیاروں کی طرف لپکے اور حرہ (کالے پتھر والی زمین) میں رسول اللہ ﷺ کے گرد آن جمع ہوئے اور پھر سارا قافلہ دائیں طرف مڑ کر بنو عمرو بن عوف کے محلے میں پہنچ گیا۔ یہ سوموار کا دن اور ربیع الاول کا مہینہ تھا۔ [2]

رسول اللہ ﷺ خاموشی سے تشریف فرما ہوئے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ لوگوں کے سامنے کھڑے رہے۔ جن لوگوں نے ابھی تک رسول اللہ ﷺ کو نہیں دیکھا تھا وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو سلام کہتے اور مبارکباد پیش کرتے اور پھر جب سورج کی کرنیں آپ ﷺ پر پڑنے لگیں تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ پر اپنی چادر سے سایہ کیا۔ یوں سب لوگوں نے آپ ﷺ کو پہچان لیا۔

[1] السيرة النبوية لأبي شهبة: 494/1، وفتح الباري، شرح الحديث: 3906. [2] فتح الباري، شرح الحديث: 3906، والهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 351.

نبی ﷺ بنو عمرو بن عوف (قباء) کے پاس دس سے اوپر کچھ راتیں قیام پذیر رہے۔ اسی اثنا میں وہاں ایک مسجد کی تعمیر کا آغاز تقوے کی بنیاد پر کیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے وہاں نماز بھی ادا فرمائی۔ پھر مدینہ کی جانب رختِ سفر باندھا۔[1]

قباء میں چند روز ٹھہرنے کے بعد آپ ﷺ نے انصارِ مدینہ کو پیغام بھیجا کہ وہ مدینہ میں داخل ہونا چاہتے ہیں، چنانچہ انصار مدینہ آئے، رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کو سلام کیا اور کہنے لگے: ''آپ بلا خوف سواری پر سوار ہوں ہم آپ کے فرمانبردار ہیں۔'' جب دونوں سوار ہو گئے تو انصار کے مسلح دستے نے آپ ﷺ کو گھیرے میں لے لیا۔ اور جب رسول اللہ ﷺ مدینہ کی گلیوں میں پہنچے تو لوگ آپ ﷺ کو دیکھتے ہی کہنے لگے: ''اللہ کے نبی آ گئے۔ اللہ کے نبی آ گئے۔''[2]

یہ ایک خوشگوار اور پر رونق دن تھا۔ مدینہ کو کبھی ایسا اچھا دن میسر نہ آیا تھا۔ لوگوں نے عمدہ کپڑے پہنے جیسے عید کے دن پہنے جاتے ہیں۔ درحقیقت ان کے لیے یہ دن عید سے کم نہ تھا کہ اس دن اسلام مکہ کی تنگ فضا سے ایسے کھلے ماحول میں منتقل ہو چکا تھا کہ اب پورے مدینہ بلکہ پوری دنیا میں اسلامی پرچم لہرانا تھا۔ اہل مدینہ نے اس نعمتِ الٰہی کا شکریہ ادا کیا اور اس شرف کا احساس کیا جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں منتخب فرمایا تھا کیونکہ رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے ان کے شہر کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ یہاں سے اسلام جیسے مکمل نظامِ حیات کو اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ پھیلنا تھا، اسی لیے اہل مدینہ خوشی اور سرور سے جھومتے، لا الٰہ الا اللہ کا ورد کرتے، آپ ﷺ کے استقبال کے لیے گھروں سے نکلے اور ان کی زبان پر ایک ہی کلمہ تھا: ''محمد ﷺ آ گئے، اللہ کے رسول آ گئے۔''[3]

---

1 صحيح البخاري، حديث: 3906، و فتح الباري، شرح الحديث: 3906، و الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 351. 2 صحيح البخاري، حديث: 3911.
3 الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص:353.

امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی سند سے اس روایت کو بیان کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ طیبہ میں داخل ہوئے، مرد اور عورتیں گھروں کی چھتوں پر چڑھ گئے۔ بچے اور غلام گلی کوچوں میں بکھر گئے اور یہی نعرے لگنے لگے: ”محمد ﷺ آگئے، اللہ کے رسول آگئے۔“ [1]

تاریخ انسانی کے اس فقید المثال استقبال کے بعد نبی ﷺ آگے روانہ ہوئے اور ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے گھر کے قریب پڑاؤ ڈالا۔ انس رضی اللہ عنہ کی طویل حدیثِ ہجرت میں بیان کیا گیا ہے: ”آپ ﷺ آئے اور چلتے گئے حتی کہ دار ابی ایوب کے پاس پہنچ گئے۔ آپ ﷺ ان کے گھر والوں سے گفتگو فرما رہے تھے کہ عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے بارے میں سنا، جبکہ وہ کھجوروں کے ایک باغ میں اپنے گھر والوں کے لیے ٹوکری میں کھجوریں ڈال رہے تھے۔ وہ جلدی سے وہاں پہنچے اور ٹوکری بھی ان کے پاس تھی اور اللہ کے رسول ﷺ کی باتیں سنیں، پھر اپنے گھر روانہ ہوگئے۔ اب نبی ﷺ نے پوچھا: «أَيُّ بُيُوتِ أَهْلِنَا أَقْرَبُ؟» ”یہاں ہمارے رشتہ داروں کا کون سا گھر قریب ہے؟“ ابوایوب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ”اللہ کے رسول! میرا گھر قریب ہے۔ یہ رہا میرا گھر اور یہ اس کا دروازہ۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: «فَانْطَلِقْ فَهَيِّئْ لَنَا مَقِيلًا» ”چلیے! ہمارے لیے استراحت کا بندوبست کیجیے۔“ [2]

پھر آپ ﷺ وہاں مقیم رہے یہاں تک کہ مسجد نبوی اور امہات المؤمنین کے حجروں کی تعمیر مکمل ہوگئی۔

اب رسول اللہ ﷺ کی ہجرت تو مکمل ہوچکی تھی لیکن ہجرت کے وسیع تر اغراض و مقاصد حاصل کرنے ابھی باقی تھے، جبکہ مدینہ طیبہ پہنچتے ہی آپ کو مشکلات اور نئے چیلنجوں کا سامنا کرنا تھا۔ نبی ﷺ اپنی امت کے روشن مستقبل کو سامنے رکھتے ہوئے تمام مصائب کو برداشت کرنے کا عزم کرچکے تھے کیونکہ اب ایک ایسی مملکت کا قیام معرض وجود میں آنے

1 صحيح مسلم، حديث: (75)-2009. 2 صحيح البخاري، حديث: 3911.

والا تھا جہاں سے انسانیت کی شاندار ترقی کا راستہ کھلنا تھا اور اس زمانے کی طاقتور سلطنتوں فارس اور روم کو زیرنگیں کر لینے کے بعد ایمان، تقویٰ، احسان اور عدل جیسے زریں اصول کی بنیاد پر ایک مضبوط مملکت وجود میں آنے والی تھی۔[1]

دروس وعبر اور پند ونصائح

حق و باطل کی جنگ زمانۂ قدیم سے جاری ہے

یہ اللہ تعالیٰ کا نافذ العمل قانون ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

﴿ اَلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ یُذْكَرُ فِیْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِیْرًا ؕ وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۝ ﴾

”وہ لوگ جنھیں ان کے گھروں سے ناحق نکال دیا گیا، صرف اس لیے کہ وہ کہتے ہیں: ہمارا رب اللہ ہے اور اگر اللہ لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعے سے دفع نہ کرتا تو بلاشبہ خانقاہیں اور گرجے اور (یہودی) عبادت خانے اور مسجدیں ڈھادی جاتیں جن میں اللہ کا نام بکثرت ذکر کیا جاتا ہے اور اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا جو اس (کے دین) کی مدد کرے گا، بے شک اللہ یقیناً بہت قوت والا، خوب غالب ہے۔“[2]

اور اس جنگ کا نتیجہ وانجام واضح ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے:

﴿ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۝ ﴾

”اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ میں اور میرے رسول ضرور غالب آئیں گے، بے شک اللہ

[1] الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص:355. [2] الحج 22:40.

قوی، بڑا زبردست ہے۔‘‘ [1]

اسلامی دعوت کے مخالفین کا مکروفریب

مخالفین اسلام کا مکر چاہے قید کرنے یا قتل کرنے یا جلاوطنی کی شکل میں ہو، داعی کو چاہیے کہ وہ صرف اللہ کی طرف توجہ کرے اور کامل بھروسا اسی پر رکھے اور یقین رکھے کہ حیلہ ساز خود اپنے جال میں پھنس جاتا ہے۔ [2] اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ ۚ وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ ۖ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ ○﴾

’’اور (اے نبی! یاد کیجیے) جب وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا آپ کے بارے میں تدبیر کر رہے تھے تاکہ وہ آپ کو قید کر دیں یا آپ کو قتل کر دیں یا آپ کو (مکہ سے) نکال دیں اور وہ تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ بھی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔‘‘ [3]

اہل باطل کا ایک داؤ اور مکر یہ بھی ہے کہ اسلامی دعوت اور اس کے حاملین کو ختم کرنے کے لیے کمزور طبقے کو مال کا لالچ دیتے ہیں اور اس خیال سے انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو زندہ یا مردہ لانے پر سو اونٹ بطور انعام مقرر کیے تھے، سراقہ بن مالک اور دیگر لالچی لوگ اسی مشن پر نکلے مگر سراقہ رضی اللہ عنہ اس مادی مشن کی ناکامی کے بعد کثیر نفع اور عمدہ رزقِ ایمان لے کر لوٹے اور انھوں نے دیگر تعاقب کرنے والوں کو بھی اس کام سے باز رکھنے کا حیلہ کیا۔ اللہ تعالیٰ اس طرح اپنے اولیاء اور داعیانِ اسلام کی مدد اور حفاظت فرماتا ہے۔ [4]

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۚ فَسَيُنْفِقُونَهَا

[1] المجادلة 21:58. [2] الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبدالرحمٰن البر، ص: 199. [3] الأنفال 30:8. [4] الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 200.

ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ ۬ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ ○﴾

''بے شک جن لوگوں نے کفر کیا وہ اپنے مال خرچ کرتے ہیں تاکہ وہ (لوگوں کو) اللہ کے راستے سے روکیں تو وہ ابھی (اور) مال خرچ کریں گے، پھر وہ ان کے لیے باعث حسرت ہوگا، پھر وہ مغلوب ہو جائیں گے اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ جہنم کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے۔'' [1]

ٹھوس منصوبہ بندی اور اسباب اختیار کرنا

ہجرت مدینہ کے سفر پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں کس قدر ٹھوس منصوبہ بندی کی گئی اور کس طرح شروع سے لے کر آخر تک تمام ممکنہ اسباب و ذرائع اختیار کیے گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام امور بذریعہ وحی طے پائے تھے۔ مختلف ذرائع اختیار کرنا سنتِ نبوی اور حکم الٰہی ہے اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ نہ تو یہ سنت ہے اور نہ اس کی ضرورت ہے، وہ غلطی پر ہیں اور اپنے آپ اور مسلمانوں کے گنہگار ہیں۔ [2]

جب ہجرت کا وقت قریب آ گیا تو رسول اللہ ﷺ نے پروگرام کے مطابق سفر کی ابتدا فرمائی۔ اس حوالے سے درج ذیل نکات ہمارے سامنے ہیں:

ایک ٹھوس پروگرام کی تشکیل جس میں باوجود مصائب اور رکاوٹوں کے آپ ﷺ کامیابی سے ہمکنار ہوئے کیونکہ اس پروگرام کا ہر جز مکمل سمجھداری سے ترتیب دیا گیا تھا، مثلاً:

❁ اللہ کے رسول ﷺ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر دوپہر کے وقت تشریف لائے، جبکہ عموماً آپ اس وقت نہیں آیا کرتے تھے اور نہ اس وقت کوئی گھر سے نکلتا تھا۔ اس کا مقصد مکمل راز داری کا اہتمام تھا۔

[1] الأنفال 8:36. [2] الأساس في السنة لسعيد حوّى:1/357.

❁ آپ ﷺ اپنے گھر سے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر تک آتے ہوئے سر اور چہرے پر کپڑا لپیٹے ہوئے تھے۔ اس طرح آدمی کا چہرہ قدرے انجان بن جاتا ہے۔[1]

❁ رسول اللہ ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ سب کو باہر نکال دو۔ اس کے باوجود آپ ﷺ نے صرف ہجرت کے بارے میں بات کی، مقام ہجرت کی نشاندہی نہ فرمائی۔

❁ رات کو اور پھر پچھلے دروازے سے نکلنا بھی رازداری کی غرض سے تھا۔

❁ سفر میں غیر معروف راستہ اختیار کرنا بھی احتیاطی تدابیر کا حصہ تھا۔ اس سلسلے میں آپ ﷺ نے ایک مشرک مگر صحرائی و جنگلی راستوں کے ماہر سے مدد لی۔ معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص بھی صاحب خلق اور سنجیدہ ہو تو اس سے مدد لی جاسکتی ہے کیونکہ نبی ﷺ معلومات حاصل کرلیا کرتے تھے، خواہ وہ کسی سے بھی حاصل ہوں۔

❁ صاحب فراست شخصیات کا انتخاب کیا گیا تاکہ امور ہجرت میں مکمل تعاون حاصل رہے۔ اور قابل غور بات یہ ہے کہ یہ تمام افراد آپس میں بہت قربت رکھتے تھے اور ایک ہی مہم سے وابستہ تھے۔ اس طرح ایک بڑے مقصد کو پانے کے لیے وہ ایک ایسی جماعت تھی جس کے ارکان کو ایک دوسرے کا مکمل تعاون حاصل تھا۔

❁ ہر فرد کو اس کے حسب حال کام پر متعین کیا گیا تاکہ وہ بہتر طریقے سے اسے اور اس کے ذیلی امور انجام دے سکے۔

❁ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا رسول اللہ ﷺ کے بستر پر سونا بھی ایک کامیاب سکیم تھی جس سے قریش مکمل طور پر دھوکا کھا گئے اور رسول اللہ ﷺ رات کے اندھیرے میں وہاں سے روانہ ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی حفاظت فرمائی اور کفار خواب غفلت میں رہے اور ان کی آنکھیں آپ ﷺ کے بستر پر لگی رہیں۔ وہ اس خیال میں رہے کہ آپ ﷺ اس طرح چادر اوڑھے آخر کتنی دیر سوئے رہیں گے، حالانکہ سونے والے تو علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ تھے۔

[1] السيرة النبوية للدكتور إبراهيم العلي، ص:141.

❁ عبد اللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہما دشمن کے منصوبوں اور ان کی نقل و حرکت کی ٹھیک ٹھیک خبریں رسول اللہ ﷺ تک پہنچاتے رہے۔

❁ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما ذات النطاقین مکہ سے راشن غارِ ثور میں پہنچاتی تھیں، حالانکہ مشرکین دیوانہ وار آپ ﷺ کو تلاش کر رہے تھے تاکہ آپ کو قتل کر سکیں۔

❁ عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ ایک خوش مزاج چرواہے تھے۔ وہ دودھ اور گوشت غار تک پہنچاتے اور آنے والوں کے قدموں کے نشانات پر بکریاں ہانکتے ہوئے واپس لے جاتے تاکہ قریشی غار تک نہ پہنچ سکیں۔ یہ چرواہا گویا ایک طرف کھانے پینے کا سامان اور دیگر امداد پہنچاتا اور دوسری طرف انھیں لوگوں کی نظروں سے بچانے کا اہتمام بھی کرتا۔

❁ عبد اللہ بن اریقط ہجرت کے سفر کا امانتدار راہبر اور صحرائی راستوں کو جاننے والا تھا۔ وہ اس انتظار میں رہا کہ جیسے ہی اسے اشارہ ملے وہ حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے سواریاں لے کر غار کے دہانے تک پہنچ جائے تاکہ سفر کا آغاز ہو سکے۔

یہ وہ تدابیر تھیں جنھیں بروقت، عمدگی اور دانائی سے اور حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اختیار کیا گیا تھا۔ ہر شخص سے مناسب کام لیا گیا، تمام رخنوں کو بند کیا گیا، سفر کی تمام ضروریات کسی زیادتی اور اسراف کے بغیر ٹھیک ٹھیک پوری کی گئیں اور صرف ضروری افراد کو ساتھ رکھا گیا۔

اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی استطاعت کے مطابق ٹھوس منصوبہ بندی سے تمام معقول اسباب و ذرائع اختیار فرمائے اور یوں متوقع طور پر اللہ تعالیٰ کی عنایت کاملہ حاصل رہی۔[1]

اسباب و ذرائع اختیار کرنا لازم ہے

بے شک حصولِ مقصد کے لیے مختلف ذرائع اور اسباب اختیار کرنا لازمی ہے لیکن اس کا

1 أضواء علی الهجرة لتوفیق محمد سبع، ص: 393-397.

مطلب یہ نہیں کہ ہمیشہ اسباب ہی نتیجہ خیز ثابت ہوتے ہیں، اس لیے کہ نتائج تو اللہ تعالیٰ کی مشیّت وارادے سے منسلک ہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرنا بہت ضروری ہے بلکہ یہ تو اختیارِ اسباب کی تکمیل ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے تمام ممکنہ اسباب و وسائل اختیار کیے لیکن ہمیشہ دعا گو رہے کہ اللہ ذوالجلال والاکرام اپنی مدد سے آپ کو کامیاب فرمائے۔ ایسے ہی مرحلے میں دعائیں قبول ہوتی ہیں، چنانچہ یہ مقبول دعا ہی کا نتیجہ تھا کہ قریش غار کے دہانے پر پہنچ کر واپس آ گئے اور سراقہ کا گھوڑا زمین میں دھنس گیا اور ہجرت کی ساری اسکیم مکمل کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ [1]

طبعی معجزات پر ایمان

سفر ہجرت میں بہت سے طبعی معجزات پیش آئے جو منجانب اللہ آپ ﷺ کی حفاظت و نصرت کا بین ثبوت ہیں جیسے مکڑی کا غار ثور کے دہانے پر جالا بُننا، ام معبد کے خیمے میں بکری کے تھنوں میں دودھ اترنا اور سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ کے ساتھ پیش آمدہ واقعہ اور انھیں کسریٰ کے کنگن پہننے کی بشارت دینا وغیرہ۔

داعیوں کو چاہیے کہ بجائے ان معجزات سے پہلوتہی اختیار کرنے کے انھیں بیان کریں کیونکہ یہ تمام سنت نبویہ سے ثابت شدہ ہیں اور بیان کرنے کا مقصد یہ ہو کہ لوگ ان خرقِ عادت امور کو جان سکیں کیونکہ یہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت و رسالت پر مضبوط دلائل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

قابل اعتماد غیر مسلم سے مدد لینے کا جواز

اگر کوئی قابل اعتماد آدمی میسر ہو تو میدان دعوت میں اس سے مدد لینے میں کوئی حرج نہیں اگرچہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو کیونکہ آپ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے راستے کی رہنمائی

[1] من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 148.

کے لیے اجرت پر مشرک کی خدمات حاصل کی تھیں۔ ان دونوں نے اپنی سواریاں اسے دے کر انھیں غار ثور پر لانے کا وعدہ لیا۔ معاملہ بہت نازک تھا، تاہم نبی ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس پر اعتماد کیا تھا، لہٰذا داعیانِ اسلام کسی بھی ایسے کافر اور مشرک سے تعاون لے سکتے ہیں اگر چہ بظاہر اس کا اہل ایمان سے کوئی تعلق نہ بھی ہو کیونکہ بعض اوقات آپس میں رشتے داری، پرانی جان پہچان یا پڑوسی کا رشتہ بھی ہوسکتا ہے یا پھر وہ شخص داعی کا احسان مند یا امانت دار اور نیک طینت ہو۔ یہ مسئلہ اجتہادی ہے اور داعی کی سمجھ بوجھ اور اس آدمی سے جان پہچان پر منحصر ہے جس سے مدد حاصل کرنی ہو۔[1]

ہجرت مدینہ میں عورت کا کردار

آسمان ہجرت پر بہت سے نام ستاروں کی طرح چمکتے نظر آتے ہیں جنھیں اس سلسلے میں نمایاں فضیلت حاصل ہوئی۔ ان میں ایک نام حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہے جنھوں نے یہ مکمل قصہ ہجرت ہم تک پہنچایا۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا انتہائی صابرہ خاتون تھیں، انھوں نے مشکل حالات میں ہجرت کی۔ اور اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا ذات النطاقین جنھوں نے پانی اور غذا کی شکل میں زاد راہ غار ثور میں پہنچایا۔ اس سلسلے میں وہ اپنی استقامت اور ستم سہنے کا تذکرہ یوں بیان فرماتی ہیں: ”جب رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ سفر ہجرت کے لیے روانہ ہوئے تو میرے پاس قریش کا ایک گروہ آیا جن میں ابوجہل بھی تھا۔ وہ ہمارے دروازے پر آن کھڑا ہوا۔ میں باہر نکلی تو بولا: ”اے ابوبکر کی بیٹی! تیرا باپ کہاں ہے؟“ میں نے کہا: ”اللہ کی قسم! مجھے معلوم نہیں کہ میرا باپ کہاں ہے؟“ تو اس پر ابوجہل نے، جو بے حیا اور گندا آدمی تھا، میرے چہرے پر اتنے زور سے تھپڑ مارا کہ میرے کان کی بالی نیچے گر گئی، پھر وہ سب واپس چلے گئے۔“[2]

1 المستفاد من قصص القرآن لعبد الكريم زيدان: 108/2. 2 السيرة النبوية لابن هشام: 132,131/2، و تاريخ الطبري: 380,379/2.

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے اس قصے سے قیامت تک آنے والی مسلمان عورتوں کو یہ سبق ملتا ہے کہ دشمنوں سے مسلمانوں کے راز کس طرح چھپائے جائیں اور وہ ظلم وزیادتی کے سامنے مضبوط چٹان کی طرح کیسے ٹھہر سکتی ہیں۔

اور دوسرا سبق واقعے کے اس حصے سے حاصل ہوتا ہے جب ابو قحافہ جو نابینا تھے، گھر آئے اور کہا کہ اللہ کی قسم! میرا خیال ہے کہ ابوبکر سارا مال لے گیا اور تمھیں مشکل میں چھوڑ گیا ہے تو حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا کہنے لگیں: ''ہرگز نہیں، اے ابا جان! آپ اپنا ہاتھ اس مال پر رکھیے۔'' فرماتی ہیں: ''ابو قحافہ نے اپنا ہاتھ ایک ڈھیر پر رکھا اور بولا کہ ٹھیک ہے اگر وہ کچھ مال چھوڑ گیا ہے تو بہتر ہے تمھارے کام آئے گا۔'' کہتی ہیں: ''اللہ کی قسم! ہمارے لیے وہاں کچھ نہ تھا۔ میں تو صرف اپنے بزرگوار دادا کو مطمئن کرنا چاہتی تھی۔''[1]

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے انتہائی سمجھداری سے معاملے پر پردہ ڈالا اور ایک عمر رسیدہ شخص کو بغیر کذب بیانی کے اطمینان دلایا، حالانکہ وہ ڈھیر تو صرف چند پتھروں کا تھا جو وہاں پڑے تھے۔ درحقیقت جو قیمتی چیز ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کے لیے چھوڑی وہ تھا ایسا مضبوط ایمان جسے نہ تو پہاڑ اور تند ہوائیں ہلا سکتی تھیں نہ مال کی قلت وکثرت سے اس میں کوئی فرق آسکتا تھا۔ یہ تو ایک ایسی پختگی تھی جس کا کوئی کنارہ نہ تھا اور ایسی ہمت تھی جس کے ذریعے پستیوں سے نکل کر بلندیوں کی طرف گامزن ہوا جاسکتا تھا۔ گویا کہ تاریخ میں ایسی مثال قائم ہوئی جس کا دوبارہ پایا جانا مشکل یا ناممکن نظر آتا ہے۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے عالمِ اسلام کی تمام عورتوں کے لیے ایسی مثال پیش کی اور ایسا اسوہ قائم کر دکھایا جس کی پیروی از حد ضروری ہے۔

بہر حال حضرت اسماء رضی اللہ عنہا اپنی بہنوں کے ساتھ مکہ اقامت پذیر رہیں، کسی تنگی کا شکوہ کیا نہ کسی حاجت کا اظہار کیا یہاں تک کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اور اپنے غلام

1 السيرة النبوية لابن هشام: 102/2.

ابورافع کو دوسواریاں اور پانچ سو درہم دے کر مکہ روانہ کیا تا کہ وہ آپ ﷺ کی بیٹیوں فاطمہ رضی اللہ عنہا، ام کلثوم رضی اللہ عنہا، ام المؤمنین سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا، اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما اور ان کی ماں برکہ (ام ایمن رضی اللہ عنہا) کو لے آئیں اور پھر عبد اللہ بن ابوبکر بھی ابو بکر رضی اللہ عنہ کے اہل کو لے کر ساتھ ہو لیے جن میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور اسماء رضی اللہ عنہا تھیں اور یہ قافلہ بحفاظت مدینہ پہنچا اور حارثہ بن نعمان رضی اللہ عنہ کے گھر رہائش پذیر ہوا۔[1]

نبی ﷺ کے پاس مشرکوں کی امانتیں

قریشی نبی ﷺ کے سخت مخالف تھے اور آپ ﷺ کے قتل کے درپے تھے اس کے باوجود امانتیں آپ ﷺ کے پاس رکھتے تھے اور یہ ان کی زندگی کا بڑا عجیب تضاد تھا کہ وہ جس آدمی کی توہین کرنے کی کوشش کرتے تھے اور اسے یہ کہہ کر جھٹلاتے کہ وہ جادوگر، دیوانہ یا نبوت کے معاملے میں جھوٹا ہے، اپنی امانتیں اسی کے پاس رکھتے تھے۔ انھیں اپنے گردو پیش نبی ﷺ کے علاوہ کوئی صاحب امانت یا سچا آدمی دکھائی نہ دیتا تھا جس کے پاس وہ اپنی امانتیں رکھیں اور ان کے اموال محفوظ رہ سکیں۔ معلوم ہوا کہ ان لوگوں کے کفر کا سبب آپ ﷺ کی صداقت و امانت میں شک نہ تھا بلکہ وہ حق کے خلاف غرور و تکبر میں مبتلا تھے اور انھیں خطرہ تھا کہ کہیں سرداری ان کے ہاتھ سے نہ چلی جائے۔[2] ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝﴾

”(اے نبی!) تحقیق ہم جانتے ہیں کہ بے شک آپ کو وہ بات غمگین کرتی ہے جو وہ کہتے ہیں، پس بے شک وہ آپ کو نہیں جھٹلاتے بلکہ دراصل یہ ظالم تو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔“[3]

1 الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 128. 2 فقه السيرة للبوطي، ص: 193.
3 الأنعام 6:33.

اگرچہ حالات انتہائی مشکل تھے لیکن ہجرتِ مدینہ کی اسکیم کو ہر ممکن طور پر پایۂ تکمیل تک پہنچانا ضروری تھا، لہٰذا آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ اہل مکہ کی امانتیں لوٹا کر آئیں۔ گویا جن کٹھن حالات میں انسان کو اپنے آپ کا ہوش نہیں ہوتا، ان حالات میں بھی رسول اللہ ﷺ کو لوگوں کی امانتیں واپس کرنے کی فکر دامن گیر تھی۔[1]

سواری قیمتاً خریدنا

نبی ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی سواری پر سوار ہونے سے انکار فرمایا جب تک کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اس کی قیمت طے نہ کر لی اور پھر جو قیمت طے پائی وہ آپ ﷺ کے ذمے رہی۔ یہ ایک واضح سبق ہے کہ حاملین دعوت کو کسی وقت بھی اللہ کے سوا کسی کا محتاج ہونا چاہیے نہ کسی پر بوجھ بننا چاہیے۔ وہ تو خود لوگوں کے لیے منبع خیر ہیں۔ اگر وہ کسی پر خرچ کرنے کی حالت میں نہ بھی ہوں تو کم از کم انھیں کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلانا چاہیے۔ آپ ﷺ نے بھی سواری بلا قیمت لینا گوارا نہ کی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے اس سلوک کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

﴿وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾

''اور میں تم سے اس (تبلیغ) پر کوئی اجر نہیں مانگتا، میرا اجر تو رب العالمین ہی کے ذمے ہے۔''[2]

ایک سچے عقیدے اور ایمان کے حاملین کے لائق نہیں کہ اللہ کے سوا کسی کے سامنے دست سوال دراز کریں کیونکہ یہ ان کی دعوت کے منافی ہے۔ لوگ داعیوں کے وعظ سے زیادہ ان کے کردار پر نظر رکھتے ہیں اور آج اہل اسلام کی پستی و ذلت اسی وجہ سے ہے کہ اسلامی دعوت کا واسطہ بننے والے اور حاملین دعوت مادیت پر انحصار کرنے لگے ہیں۔ ہر

[1] الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص:364. [2] الشعرآء 109:26.

کوئی جاہ و مرتبے کے حصول میں سرگرداں ہے اور ان کے ہر عمل پر مادی رنگ چڑھ چکا ہے جس سے روحانیت اور باطنی زندگی کی روشنی ختم ہوتی نظر آتی ہے۔ مسلمان امر بالمعروف اور امامت و خطابت کے میدان میں صرف تنخواہ دار ہی نظر آنے لگے ہیں اور منبر و محراب سے اٹھنے والی آواز جو اللہ کے خوف اور رضائے الٰہی کی حامل ہوا کرتی تھی اس کا مقصد صرف چند ٹکوں کا حصول رہ گیا ہے اور جیسے ہی یہ سکے ختم ہوتے ہیں آواز بھی بند ہو جاتی ہے، اس لیے کہا جاتا ہے: «لَيْسَتِ النَّائِحَةُ كَالثَّكْلٰى» ''نوحہ کرنے والی عورت اس عورت کی طرح نہیں ہو سکتی جس کا بچہ گم ہوا ہو۔''

یہی وجہ ہے کہ وعظ کی تاثیر کم ہو گئی اور لوگ سیدھے راستے سے ہٹنے لگے۔[1]

لوگوں کے مال سے احتراز

جب رسول اللہ ﷺ نے سراقہ بن مالک کو معاف فرما دیا تو سراقہ رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو تعاون کی پیشکش کرتے ہوئے کہا: ''یہ میرا ترکش ہے آپ (بطورِ علامت) جتنے چاہیں تیر لے لیجیے اور میرے اونٹ اور بکریاں فلاں جگہ پر آپ کو ملیں گے، اپنی ضرورت کے مطابق اُن میں سے لے لینا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «لَا حَاجَةَ لِي فِيهَا» ''مجھے ان کی ضرورت نہیں۔''[2]

جب داعیان اسلام لوگوں کے مال سے کنارہ کش رہتے ہیں تو لوگ ان سے محبت کرتے ہیں لیکن جب داعیوں کی نظر ان کے اموال پر ہوتی ہے تو لوگ ان سے نفرت کرتے ہیں اور یہ ان کے لیے ایک عظیم ترین سبق ہے۔[3]

اعلیٰ ترین مردانگی اور خوشی کے آنسو

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ میں تربیت نبوی کا اثر واضح دکھائی دیتا ہے۔

[1] من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 149,148. [2] صحيح مسلم، حديث: 2009، بعد الحديث: 3014، ومسند أحمد: 3/1. [3] الهجرة النبوية لأبي فارس، ص: 58.

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ہجرت مدینہ کا ارادہ کیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تھا: «لَا تَعْجَلْ لَعَلَّ اللّٰهَ يَجْعَلُ لَكَ صَاحِبًا» ”تو جلدی نہ کر شاید کہ اللہ تجھے کوئی ہمسفر عطا فرمادے۔“[1] اسی دن سے ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ہجرت کی تیاری اور مکمل منصوبہ بندی شروع کر دی تھی۔ انھوں نے دو سواریاں خریدیں اور گھر ہی میں چارہ ڈال کر انھیں سفر کے لیے تیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ صحیح بخاری کی روایت میں ہے: ”ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی دونوں سواریوں کو چار ماہ تک ببول کے پتے کھلائے۔“[2]

ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی روشن بصیرت سے سمجھ گئے تھے کہ ہجرت کا وقت مشکل بھی ہوگا اور اچانک آئے گا، لہٰذا انھوں نے ہجرت کا وسیلہ اور زادِ راہ تیار کر رکھا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس خدمت میں اپنے سارے گھرانے کو مصروف کر رکھا تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہجرت کا حکم ملنے کی خبر سنائی تو خوشی کی شدت سے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے آنسو بہہ پڑے۔

اس بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس دن سے پہلے مجھے احساس تک نہ تھا کہ کوئی خوشی کے آنسو بھی رو سکتا ہے یہاں تک کہ میں نے اپنے والد محترم ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خوشی کی بنا پر روتے ہوئے دیکھ لیا۔[3]

یہ انسانی خوشی کی انتہا ہے کہ خوشی آنسوؤں میں تبدیل ہوجائے۔ ایک شاعر نے کہا ہے:

وَرَدَ الْكِتَابُ مِنَ الْحَبِيبِ بِأَنَّهُ　　سَيَزُورُنِي فَاسْتَعْبَرَتْ أَجْفَانِي

غَلَبَ السُّرُورُ عَلَيَّ حَتّٰى إِنَّنِي　　مِنْ فَرْطِ مَا قَدْ سَرَّنِي أَبْكَانِي

يَا عَيْنُ صَارَ الدَّمْعُ عِنْدَكِ عَادَةً　　تَبْكِينَ مِنْ فَرَحٍ وَّمِنْ أَحْزَانِ

”مجھے اپنے پیارے دوست کی طرف سے خط ملا کہ وہ میری ملاقات کے لیے آئے

[1] الروض الأنف للسهيلي: 306/2. [2] صحيح البخاري، حديث: 3905. [3] السيرة النبوية لابن كثير: 234,233/2.

گا تو میری پلکیں بھیگ گئیں۔''

''مجھ پر خوشی غالب آ گئی یہاں تک کہ مجھے پہنچنے والی انتہائی خوشی نے رلا دیا۔''

''اے آنکھ! آنسو بہانا تو تیری عادت بن گئی ہے۔ خوشی ہو یا غم تو نے رونے کو شعار بنالیا ہے۔''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ سفر کی رفاقت کا مطلب یہ ہے کہ وہ بطور رفیق اکیلے کم از کم دس دن سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہیں گے اور اپنی جان اپنے آقا، قائد اور محبوب پر نچھاور کریں گے۔[1]

ابوبکر رضی اللہ عنہ کی محبت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ غار ثور میں مشرکین کی طرف سے دیکھ لیے جانے کے امکان پر کتنے گھبرا رہے تھے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے گویا کہ اسلامی دعوت کے ایک سچے مجاہد کا کردار پیش کیا کہ جب اس کا قائد اس کے ساتھ ہو، ہر طرف سے خطرات نے گھیرا ہوا ہو، جان خطرے میں ہو تو اس مجاہد کا کیا کردار ہونا چاہیے، حالانکہ اس وقت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی جان کو بھی سخت خطرہ تھا کہ اگر مشرکین نے انھیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دیکھ لیا تو انھیں مار دیا جائے گا لیکن وہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے مستقبل کے بارے میں پریشان تھے کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین کے ہاتھ لگ گئے تو مشکلات کھڑی ہوسکتی تھیں۔ اگر ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنی جان کی فکر ہوتی تو آپ کی مصاحبت اختیار ہی نہ کرتے۔[2]

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ہجرت کے سفر میں کمال احتیاطی تدابیر اختیار کی تھیں جیسے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے

---

[1] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 192,191/2. [2] السيرة النبوية للدكتور مصطفى السباعي، ص: 71. حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنی جان کی فکر نہیں تھی بلکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے فکر مند تھے۔ اس بات کی دلیل وہ واقعہ ہے جو راہ ہجرت میں پیش آیا۔ جب سراقہ بن مالک دو یا تین نیزوں کی دوری پر آگیا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ گھبرا گئے اور انھیں رونا آگیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: «لِمَ تَبْكِي؟» ''کیوں روتے ہو؟'' تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: ''اے اللہ کے رسول! میں اپنی جان کی فکر میں نہیں رو رہا، میں تو آپ کے لیے رو رہا ہوں (کہ کہیں دشمن آپ کو نقصان نہ پہنچا دے۔'') (مسند أحمد: 3/1)

سائل نے پوچھا تھا کہ یہ تمھارے آگے کون ہیں؟ تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا تھا: ''یہ آدمی مجھے راستہ دکھاتا ہے۔'' سائل نے یہی سمجھا کہ کوئی سفری رہنما ہے لیکن صدیق رضی اللہ عنہ کا مقصد تو راہ خیر کا راہنما تھا۔[1]

یوں ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پیش آمدہ مسائل کو بہتر انداز سے حل فرمایا اور اس میں انھوں نے خلاف حقیقت بات نہیں کی۔[2] سائل کا جواب دینے میں تو یہ (ذو معنی) اشارہ بھی تھا اور اس تربیت کا اثر بھی جو انھوں نے حصول تحفظ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی تھی کیونکہ ہجرت کا معاملہ مکمل طور پر پوشیدہ تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جواب پر انکار بھی نہیں فرمایا جو آپ کی رضامندی کی دلیل تھی۔[3]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کردار بھی ایک مخلص اور سچے مجاہد کا کردار تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے اس کردار میں اپنے قائد پر فدا ہوتے نظر آتے ہیں کیونکہ اگر قائد سلامت ہے تو دعوت بھی محفوظ ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہجرت کی رات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر گزاری اور عین ممکن تھا کہ قریشی نوجوانوں کی تلواریں ان کی گردن تک پہنچ جاتیں لیکن انھوں نے کوئی پروا نہ کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو صرف یہی فکر دامن گیر تھی کہ اسلامی دعوت کے قائد اور امت کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم محفوظ رہیں۔[4]

روحانی قیادت اور لوگوں کے ساتھ برتاؤ

دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حد درجہ محبت رکھتے تھے جس کا اظہار سفر ہجرت میں سامنے آیا۔ یہ ایک دلی محبت تھی جس کی بنیاد اخلاص پر تھی۔ اس میں کوئی نفاق تھا نہ اس کی بنیاد کسی دنیاوی مصلحت، لالچ یا ڈر پر تھی۔ اور اس

[1] صحيح البخاري، حديث: 3911. [2] الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 204. [3] السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 254. [4] السيرة النبوية للدكتور مصطفى السباعي، ص: 68.

سچی عقیدت کی اصل وجہ نبی ﷺ کی عمدہ قائدانہ صلاحیت تھی۔ آپ ﷺ نے خود جاگ کر لوگوں کو آرام فراہم کیا، خود محنت کی اور لوگوں کو آسانی دی، خود بھوکے رہے لوگوں کو کھانا کھلایا، ان کی خوشیوں کو اپنی خوشی سمجھا اور ان کے غم کو اپنا غم سمجھا، لہٰذا جو بھی شخص باہمی رویوں میں رسول اللہ ﷺ کی سنتوں پر عمل پیرا ہوگا، اپنے رفقاء کے غم کو اپنا غم سمجھے گا اور اپنی خوشی عامۃ الناس کے ساتھ مشترکہ رکھے گا، اپنی معاشرتی اور نجی زندگی میں لوگوں کے دکھ اور خوشیوں میں شریک ہوگا۔ اور یہ سب صرف اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے کرے گا تو ایسا شخص لیڈر ہو یا سردار یا امت کا کوئی اور ذمہ دار، اسے لوگوں کی محبت سے وافر حصہ نصیب ہوگا۔[1]

لیبیا کے ایک شاعر احمد رفیق مہدوی نے اس بات کو یوں بیان کیا ہے:

فَإِذَا أَحَبَّ اللّٰهُ بَاطِنَ عَبْدِهِ ظَهَرَتْ عَلَيْهِ مَوَاهِبُ الْفَتَّاحِ

وَ إِذَا صَفَتْ لِلّٰهِ نِيَّةُ مُصْلِحٍ مَّالَ الْعِبَادُ عَلَيْهِ بِالْأَرْوَاحِ

”جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت فرماتا ہے تو اس پر کامیابیوں کے دروازے کھل جاتے ہیں۔“

”اور جب کسی مصلح کی نیت خالص ہو تو لوگ دلی طور پر اس کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔“[2]

درست قیادت وہی ہو سکتی ہے جو سب سے پہلے روحانی رہنمائی پر توجہ اور لوگوں کی روحانی تربیت کا اہتمام کرے۔ جتنی اچھی قیادت ہوگی اس کے پیروکار بھی اتنے ہی فدائی ہوں گے اور قیادت جس قدر جذبۂ ایثار سے سرشار ہوگی اسی قدر متبعین میں محبت کا جذبہ ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے انتہائی رحیم اور مشفق تھے۔ آپ ﷺ نے اس وقت ہجرت فرمائی جب صحابہ رضی اللہ عنہم کی اکثریت ہجرت کر چکی تھی اور مکہ میں صرف کمزور،

[1] الهجرة النبوية لأبي فارس، ص: 54. [2] الحركة السنوسية في ليبيا للصلابي: 2/7.

آزمائش میں مبتلا اور ہجرت کے متعلق خاص ذمہ داری کے حامل افراد ہی رہ گئے تھے۔

سفر ہجرت میں بریدہ اسلمی رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام

بلاشبہ ایسا مسلمان جس کے دل میں اسلام پوری طرح داخل ہو چکا ہو، وہ لوگوں کو اسلامی دعوت پیش کرنے میں ذرہ بھر کوتاہی نہیں کرتا۔ حالات چاہے کتنے ہی ناسازگار اور پریشان کن ہوں اور امن مفقود ہو، پھر بھی ایک سچا مسلمان اسلامی دعوت پیش کرنے کے بہانے تلاش کر ہی لیتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام جنھیں جیل کی کوٹھریوں میں ڈال دیا گیا لیکن اس اندھیر نگری میں بھی وہ اپنی ذمہ داری کو نہیں بھولے۔ وہاں بھی اپنے ساتھ قید دیگر افراد کے سامنے دعوت توحید پیش کرتے رہے اور شرک، غیر اللہ سے بیزاری اور کسی بھی مخلوق کے سامنے جھکنے سے روکتے رہے۔[1]

سورۂ یوسف مکہ میں نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ وہ دعوتی میدان میں سابقہ انبیائے کرام علیہم السلام کی پیروی کریں، اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کے دوران بھی اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے رہے، حالانکہ حالات اتنے دگرگوں تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے نکال دیا گیا، آپ کا خون رائیگاں قرار دے دیا گیا اور جرائم پیشہ لوگوں کو خطیر انعامات کا لالچ دیا گیا کہ آپ کو زندہ یا مردہ پیش کریں (نعوذ باللہ)۔ راستے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک شخص بریدہ بن حصیب اسلمی ملا جو اپنی قوم کے ساتھ ایک قافلے میں تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اسلام کی دعوت پیش کی تو وہ تمام لوگ مسلمان ہوگئے۔[2]

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سفر ہجرت میں بریدہ بن حصیب بن عبداللہ بن حارث اسلمی سے ملے اور انھیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ وہ مسلمان

[1] دیکھیے یوسف 12:37-40. [2] الهجرة النبوية لأبي فارس، ص: 59، وشرح المواهب للزرقاني:1/405.

ہوئے اور انھوں نے تقریباً سولہ غزوات میں شرکت کی۔ [1]

مسلمان ہونے کے بعد بریدہ بن حصیب اسلمی رضی اللہ عنہ داعیان اسلام میں شامل ہو گئے اور ان کی قوم پر ہدایت کے راستے کھل گئے۔ وہ پکے مسلمان بنے اور ایسا نبوی منہج اختیار کیا جو ساری انسانیت کے لیے مشعلِ راہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: «أَسْلَمُ، سَالَمَهَا اللّٰهُ، وَ غِفَارُ غَفَرَ اللّٰهُ لَهَا، أَمَا إِنِّي لَمْ أَقُلْهَا وَ لٰكِنْ قَالَهَا اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ» ”قبیلۂ اسلم کو اللہ سلامت رکھے اور قبیلہ غفار کو اللہ بخش دے۔ یہ الفاظ میں نے اپنی مرضی سے نہیں بلکہ اللہ کے حکم سے کہے ہیں۔“ [2]

دو چوروں کا مسلمان ہونا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی سفر ہجرت میں تھے کہ مدینہ کے قریب قبیلہ اسلم کے دو چوروں سے ملاقات ہوئی جو ”مُہانان“ یعنی ”رسوائی والے/ بدنام زمانہ“ کہلاتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اسلام لانے کی دعوت دی تو وہ دونوں دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ان کے نام دریافت کیے تو انھوں نے کہا: ”ہمارا نام مہانان ہے۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «بَلْ أَنْتُمَا الْمُكْرَمَانِ» ”نہیں بلکہ تمھارا نام ”مکرمان“ (عزت والے) ہے۔“ پھر انھیں مدینہ آنے کی دعوت دی۔ [3]

اس واقعے سے دعوت کے سلسلے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تگ وتاز کا علم ہوتا ہے۔ آپ نے موقع غنیمت جانتے ہی دونوں چوروں کو اسلام کی دعوت دی اور وہ مسلمان ہو گئے۔ چور جو کہ لوٹ مار اور چوری سے تعلق رکھتے تھے ان کا اسلام قبول کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اگر خلوص اور سچائی سے حق پیش کیا جائے تو لوگ اسے جلد قبول کر لیتے ہیں۔ اور ان دونوں

1 الإصابة: 146/1. 2 صحيح البخاري، حديث: 3514، و صحيح مسلم، حديث: 2516، والمستدرك للحاكم: 92/4، حديث: 6981. 3 مسند أحمد: 74/4، روایت ضعیف ہے۔

کے نام تبدیل کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ مسلمانوں کی نیک نامی اور ان کے جذبات و احساسات کا خاص خیال رکھتے تھے تاکہ ان کی عزت افزائی ہو اور ان کا مورال بلند ہو۔ اور جب کسی فرد کو احساس کمتری سے نکال لیا جائے تو اس کی شخصیت مضبوط ہوجاتی ہے۔ اور وہ مزید ترقی حاصل کرنے کے لیے اپنی ساری قوت خیر وفلاح کے کاموں میں صرف کردیتا ہے۔[1]

سفر ہجرت میں زبیر وطلحہ رضی اللہ عنہما سے ملاقات

سفر ہجرت میں آپ ﷺ کی طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما سے ملاقات ہوئی جو کہ مسلمانوں کے ایک تجارتی قافلے میں شام سے واپس آرہے تھے۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کو سفید کپڑے پہنائے۔[2]

قبائلی دشمنی ختم کرنے میں دین کا کردار

درست عقیدہ اور عظیم دین اسلام دلوں سے دشمنی اور کینہ دور کرنے اور دلوں میں الفت پیدا کرنے میں عظیم کردار کا حامل ہے۔ یہ ایسا اثر آفریں دین ہے کہ کسی اور دین اور عقیدے میں اس جیسی مثال نہیں ملتی۔ تاریخ شاہد ہے کہ اسلامی عقیدے نے اوس و خزرج کے درمیان کس طرح محبت ڈال دی۔ سالہا سال سے جاری جنگوں کے آثار تک ختم کردیے اور مختصر وقت میں بڑے بڑے کشت وخون کے دروازے بند کردیے۔ مدینہ میں قبول اسلام اور بیعت نبوی کا سلسلہ ابھی ابتدائی مراحل میں تھا، اس کے باوجود انصار میں اسلامی عقیدہ اس قدر راسخ ہوگیا تھا کہ انھوں نے مہاجرین کا کھلے دل سے استقبال کیا اور بھائی چارے کی ایک عمدہ مثال قائم کی جو اسلام کے علاوہ کسی اور مذہب میں نظر

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي: 178/3. [2] صحيح البخاري، حديث: 3906، ودلائل النبوة للبيهقي:2/498.

نہیں آتی۔ یہی وجہ ہے کہ دشمن اسلامی عقیدے کو کمزور کرنے اور اہلِ اسلام کے دلوں سے اس کے اثرات مٹانے کی سرتوڑ سعی کر رہا ہے اور اس کے لیے علاقائی اور قومی عصبیتوں کو ہوا دی جا رہی ہے۔[1]

نبی ﷺ کی تشریف آوری پر مہاجرین و انصار کی خوشی

مدینہ کے باسی، خواہ مہاجر تھے یا انصار، آپ ﷺ کے صحیح سلامت مدینہ پہنچنے پر بہت خوش ہوئے۔ عورتیں اور بچے مارے خوشی کے گھروں سے نکل آئے۔ مردوں نے روزمرہ کے معمولات ترک کر دیے اور آپ ﷺ کے استقبال میں مگن ہوگئے۔ یہودِ مدینہ بھی بظاہر لوگوں کے ساتھ تھے لیکن ایک نئے رئیس کی آمد پر دلوں میں نفرت رکھتے تھے۔

مسلمانوں کی خوشی کوئی حیرت انگیز بات نہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ ﷺ نے انھیں جہالت کے اندھیروں سے نکال کر روشنیاں عطا فرمائی تھیں۔ ادھر یہود اپنے دلوں میں ان لوگوں کے بارے میں سخت کینہ و بغض اور نفاق رکھتے تھے جن کی وجہ سے ان کی سرداری ختم ہوگئی، مختلف قبائل پر ان کا غلبہ متاثر ہوا، قرض کے ذریعے لوگوں کے اموال ہضم کرنے کا راستہ بند ہوگیا اور انھوں نے خیر خواہی اور مشاورت کے نام پر جو خون ریزی کروائی تھی اس کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا۔ یہودیوں نے ہمیشہ اس شخص سے کینہ و بغض رکھا جس نے قبائل کو یہود کے غلبے سے نجات دلانے کی کوشش کی، چنانچہ انھوں نے ہمیشہ اہل اسلام کے خلاف سازشوں کا جال بچھائے رکھا اور موقع ملنے پر ان پر حملہ آور بھی ہوتے رہے۔ یہی ان کی فطرت اور یہی ان کا دین ہے۔[2]

مہاجرین و انصار کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کے اس استقبال سے امراء اور علمائے کرام کا گرمجوشی اور عزت و اکرام سے استقبال کا جواز ملتا ہے۔

---

[1] الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبدالرحمٰن البر، ص: 405. [2] السيرة النبوية للدكتور مصطفى السباعي، ص: 43، والهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 367.

اسی طرح بھلائی کے کاموں میں سبقت لے جانے اور صاحبان علم وشرف کے اکرام کا سبق بھی ملتا ہے جیسا کہ مدینہ کا ہر قبیلہ نبی ﷺ کی میزبانی کی سعادت حاصل کرنا چاہتا تھا اور آپ ﷺ کی حفاظت کی ذمہ داری لینا چاہتا تھا۔[1]

ہجرت اور سفر اسراء ومعراج میں تقابل

ہجرت نبوی عوامی سطح پر عمل میں آئی اور مسلمانوں کے لیے ایک مثال بن گئی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اسی معروف طریقے سے مکہ سے مدینہ آئے۔ اللہ تعالیٰ نے سفر معراج کی طرح یہاں کوئی براق ارسال نہیں کیا، حالانکہ اس سفر میں آپ ﷺ کو براق کی اشد ضرورت تھی اور لوگ مدینہ میں آپ ﷺ کی آمد کے منتظر بھی تھے۔ بفرض محال اگر تو قریشی آپ ﷺ کو ڈھونڈ نکالتے تو آپ ﷺ کی جان جانے کا خطرہ بھی تھا۔

اگر تقابلی جائزہ لیا جائے تو اس امر کی حکمت کچھ اس طرح عیاں ہوتی ہے کہ دراصل ہجرت مدینہ صرف آنحضرت ﷺ کے ساتھ خاص نہ تھی بلکہ تمام مومنین بھی مہاجر ہوئے۔ اور وہ تو اسلامی دعوت کی ترقی کے مراحل میں سے ایک مرحلہ اور اس کی اشاعت کے لیے اہم وسیلہ تھا۔ اس وقت عام مسلمانوں پر ہجرت فرض تھی یہاں تک کہ قدرت کے باوجود ہجرت نہ کرنے والوں کے درمیان مقاطعہ ہوا۔[2]

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَا لَكُم مِّن وَلَايَتِهِم مِّن شَيْءٍ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا﴾

''اور جو لوگ ایمان تو لے آئے مگر انھوں نے ہجرت نہیں کی، ان کی دوستی سے تمھیں کوئی غرض نہیں حتی کہ وہ ہجرت کریں۔''[3]

[1] السيرة النبوية لأبي فارس، ص:359,358. [2] الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص:365. [3] الأنفال 8:72.

اب اگر سفر معراج کا جائزہ لیا جائے تو وہ آپ ﷺ کی عزت افزائی اور شرف و عزت کی بڑھوتری کے لیے پیش آیا تا کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ پر غائب امور واضح فرمائیں اور اپنی عجائبات قدرت کا مشاہدہ کرائیں۔ یہ تمام سفر معجزات اور خرق عادت امور کا مجموعہ تھا۔ انھی امور کے پیش نظر سواری بھی خرق عادت ہی اختیار کی گئی۔ نیز یہ سفر رسول اللہ ﷺ کی خصوصیت تھی کہ کوئی بشر ایسا فضل حاصل نہیں کرسکتا اور نہ ہی ہمیں اس سلسلے میں اقتداء کا حکم ہے۔[1]

بتدریج حصولِ مقصد کا اصول

نبی ﷺ نے انصار مدینہ سے اپنی ابتدائی ملاقات میں انھیں اسلام کی ترغیب دی اور قرآن کریم پڑھ کر سنایا اور آئندہ سال بیعت نساء (عقبہ اولی) لی جو کہ عبادات، اخلاقیات اور فضائل کے بارے میں تھی اور پھر اگلے سال دوسری بیعت عقبہ ہوئی جو جہاد اور تحریک اسلامی کی مدد وحمایت کے سلسلے میں تھی۔[2]

قابل توجہ امر یہ ہے کہ دوسری بیعت پورے دو سال بعد عمل میں آئی، یعنی اس کی تیاری اور مناسب فضا تیار کرنے میں دو سال کا عرصہ بیت گیا۔ یہ وہ نبوی منہج ہے جو دعوت کے ابتدائی دن ہی سے اختیار کیا گیا، یہ بتدریج حصول مقصد کے اصول پر مبنی تھا۔[3]

رسول اللہ ﷺ نے اسی منہج ربانی کا التزام فرمایا۔ نو مسلم انصار سے اسلام پر جو پہلی بیعت لی گئی اس میں عقیدے، طریق کار اور تربیت کا اہتمام کیا گیا تھا اور دوسری بیعت عقبہ میں اسلامی دعوت کی حمایت اور اسلامی معاشرے کی تائید ونصرت پر بیعت لی گئی جو بارآور ہو چکا تھا اور جس کی بنیادیں ٹھوس اور مضبوط ہو چکی تھیں۔ یہ دونوں بیعتیں درحقیقت دعوت اسلامی کے تربیتی منہج کا حصہ تھیں اور ایک دوسرے کی تکمیل تھیں۔

---

1 تأملات في سيرة الرسول لمحمد سيد الوكيل، ص: 104,103. 2 الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 202. 3 بناء المجتمع الإسلامي لمحمد توفيق رمضان، ص: 119.

پہلی بیعت عقیدۂ توحید کی پابندی کا عہد تھی۔ دوسری بیعت اگرچہ دو سال بعد قوم انصار کے متعدد افراد کے اسلام لانے کے بعد عمل میں آئی لیکن یہ ''بیعتِ حرب'' دراصل وہ باڑھ تھی جسے عقیدۂ توحید کی حفاظت کرنا تھی۔ یہاں یہ امر قابل توجہ ہے کہ ایسی بیعت پہلی دفعہ انصار کے ساتھ ہوئی اور جس سرزمین سے ان کا تعلق تھا وہ اسلامی دعوت کے لیے ایک اچھی پناہ گاہ ثابت ہوسکتی تھی جہاں سے مجاہدین پیش قدمی کرسکتے تھے، جبکہ مکہ مکرمہ اس وقت جنگ کے لیے مناسب نہ تھا۔[1]

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر رحمت کرتے ہوئے اس وقت تک جہاد کی ذمہ داری نہ ڈالی تھی جب تک کہ انھیں ایک ایسا دارالاسلام میسر نہ آجائے جو ان کی پناہ گاہ بن سکے، چنانچہ مدینہ منورہ پہلا دارالاسلام قرار پایا۔[2]

پہلی بیعت اللہ اور رسول ﷺ پر ایمان کے بارے میں تھی، جبکہ دوسری بیعت ہجرت و جہاد کے سلسلے میں تھی۔ ان تینوں عناصر ایمان باللہ، ہجرت اور جہاد ہی سے اسلام کا وجود تشکیل پاتا ہے۔ اگر انصار جیسا حمایتی گروہ میسر نہ آتا تو ہجرت ممکن نہ تھی۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ۚ وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝﴾

''بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جنھوں نے (مہاجروں کو اپنے ہاں)

---

[1] بناء المجتمع الإسلامي لمحمد توفيق رمضان، ص: 123,122. [2] فقه السيرة للبوطي، ص: 172.

جگہ دی اور (ان کی) مدد کی، وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اور جو لوگ ایمان تو لے آئے مگر انھوں نے ہجرت نہیں کی، ان کی دوستی سے تمھیں کوئی غرض نہیں حتی کہ وہ ہجرت کریں۔ اور اگر وہ تم سے دین (کے معاملے) میں مدد مانگیں تو تم پر مدد لازم ہے مگر اس قوم کے خلاف نہیں کہ جن کے اور تمھارے درمیان کوئی معاہدہ ہو اور تم جو کام کرتے ہو اللہ دیکھ رہا ہے۔''[1]

مزید فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ۚ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾

''اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور تمھارے ساتھ (مل کر) جہاد کیا تو وہ بھی تمھی میں سے ہیں اور اللہ کی کتاب میں (خون کے) رشتے دار آپس میں ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں۔ بے شک اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔''[2]

دوسری بیعت نبی ﷺ اور صحابۂ کرام کی ہجرت مدینہ کی آخری تمہید تھی۔ اس سے اسلام کو ایک ایسا مرکز نصیب ہوگیا جہاں سے حق کے علمبردار دانائی اور مواعظ حسنہ لے کر نمودار ہوئے اور دین حق پھیلانے کی کوششوں کا آغاز ہوا اور آخر کار ایک ایسی مملکت وجود میں آئی جہاں اللہ کی شریعت نافذ العمل ہوئی۔[3]

ہجرت اللہ کی راہ میں عظیم قربانی

نبی ﷺ اور صحابہ کرام کی مکہ سے مدینہ ہجرت ایک عظیم قربانی تھی جسے رسول اللہ ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا:

1 الأنفال 8:72. 2 الأنفال 8:75. 3 الغرباء الأولون للدكتور سلمان العودة، ص: 199,198.

«وَاللّٰهِ إِنَّكِ لَخَيْرُ أَرْضِ اللّٰهِ وَ أَحَبُّ أَرْضِ اللّٰهِ إِلَى اللّٰهِ، وَ لَوْلَا أَنِّي أُخْرِجْتُ مِنْكِ مَا خَرَجْتُ»

''اللہ کی قسم! اے مکہ! یقیناً تو سب سے بہترین اور اللہ کی محبوب سرزمین ہے۔ اگر مجھے یہاں سے نکالا نہ جاتا تو میں کبھی نہ نکلتا۔''[1]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو یہاں بخار کی وبا تھی اور مدینہ کی وادی میں گندا پانی بہتا تھا جس سے صحابۂ کرام بیمار ہوگئے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم محفوظ رہے۔ حضرت ابوبکر، عامر بن فہیرہ اور بلال رضی اللہ عنہم ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ جب انھیں بخار آیا تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے ان کی عیادت کے لیے گئی، ابھی حجاب کا حکم نازل نہ ہوا تھا۔ میں وہاں پہنچی تو وہ تینوں بخار کی تکلیف میں مبتلا تھے اور ان کی تکلیف اللہ کے سوا کوئی نہ جانتا تھا۔ میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کے قریب ہوئی اور سوال کیا: ''ابا جان! آپ کیسے ہیں؟'' انھوں نے کہا:

كُلُّ امْرِئٍ مُّصَبَّحٌ فِي أَهْلِهِ   وَالْمَوْتُ أَدْنٰى مِنْ شِرَاكِ نَعْلِهِ

''ہر آدمی اپنے گھر میں صبح (اور شام) کرتا ہے، حالانکہ موت اس کے جوتے کے تسمے سے بھی زیادہ قریب ہے۔''

عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے کہا: ''میرے باپ کو علم نہیں وہ کیا کہہ رہے ہیں''، پھر میں عامر بن فہیرہ کی طرف متوجہ ہوئی اور پوچھا: ''عامر! تم اپنے آپ کو کیسا محسوس کرتے ہو؟'' اس نے کہا:

لَقَدْ وَجَدْتُ الْمَوْتَ قَبْلَ ذَوْقِهِ   إِنَّ الْجَبَانَ حَتْفُهُ مِنْ فَوْقِهِ

كُلُّ امْرِئٍ مُّجَاهِدٌ بِطَوْقِهِ   كَالثَّوْرِ يَحْمِي جِلْدَهُ بِرَوْقِهِ

[1] جامع الترمذي، حديث: 3925.

''میں نے موت کا مزہ چکھنے سے پہلے اسے پا لیا اور بزدل کی موت تو اس کے اوپر سے آ گرتی ہے۔''

''ہر شخص اپنی قوت کے مطابق بچاؤ کی کوشش کرتا ہے جس طرح بیل اپنے آپ کو سینگوں کے ذریعے سے محفوظ رکھتا ہے۔''

عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: ''میں نے کہا: اللہ کی قسم! عامر کو علم نہیں وہ کیا کہہ رہا ہے۔''

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو جب بخار سے افاقہ ہوتا تو گھر کے صحن میں لیٹ جاتے اور بلند آواز سے کہتے:

أَلَا لَيْتَ شِعْرِي هَلْ أَبِيتَنَّ لَيْلَةً بِوَادٍ وَّ حَوْلِي إِذْخِرٌ وَّ جَلِيلُ

وَ هَلْ أَرِدَنْ يَوْمًا مِّيَاهَ مَجَنَّةٍ وَّ هَلْ يَبْدُوَنْ لِّي شَامَةٌ وَّ طَفِيلُ

''کاش! میں جانتا کہ کوئی رات وادی مکہ میں گزار سکوں گا اور میرے گرد اذخر اور جلیل گھاس ہوگی۔''

''اور کیا کسی دن مجنہ کے چشمے پر وارد ہو سکوں گا اور مجھے شامہ اور طفیل پہاڑ دکھائی دیں گے؟''

عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی: «اَللّٰهُمَّ حَبِّبْ إِلَيْنَا الْمَدِينَةَ كَحُبِّنَا مَكَّةَ أَوْ أَشَدَّ، اَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي صَاعِنَا وَ فِي مُدِّنَا، وَ صَحِّحْهَا لَنَا، وَ انْقُلْ حُمَّاهَا إِلَى الْجُحْفَةِ» ''اے اللہ! ہمارے دل میں مدینہ کی محبت اس طرح ڈال دے جس طرح مکہ کی محبت ہے یا اس سے بھی زیادہ، اے اللہ! ہمارے (وزن کے پیمانے) صاع اور مد میں برکت فرما دے۔ اے اللہ! مدینہ طیبہ کی فضا ہمارے لیے موافق کر دے۔ اور اس زمین کا بخار جحفہ منتقل فرما دے۔''[1]

1 صحيح البخاري، حديث: 1889، وصحيح مسلم، حديث: 1376، والسيرة النبوية لابن هشام: 2/588,589.

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی دعا کو شرف قبولیت بخشا اور مسلمان اس کے بعد بخار سے نجات پاگئے اور سرزمین مدینہ تمام مہاجرین اور دوسرے آنے والے وفود کے لیے پرکشش بن گئی۔ مختلف علاقوں اور معاشروں سے تعلق رکھنے کے باوجود تمام لوگ مدینہ میں امن و سکون سے زندگی بسر کرنے لگے۔[1]

نبی ﷺ کا ام معبد کو احسان کا بدلہ دینا

روایات میں آیا ہے کہ ام معبد کی بکریاں بہت زیادہ ہوگئیں وہ ان میں سے ایک ریوڑ مدینہ بھی لائیں۔ وہاں ان کے بیٹے نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو دیکھا اور کہا: ''اے اماں! یہ تو وہی آدمی ہے جو اس بابرکت آدمی کے ساتھ تھا۔'' ام معبد نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ''اے اللہ کے بندے! تیرے ساتھ وہ آدمی کون تھا؟'' ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''کیا تو انھیں نہیں جانتی؟'' اس نے کہا: ''نہیں۔'' ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''وہ اللہ کے نبی تھے'' پھر ابوبکر رضی اللہ عنہ انھیں اپنے ہمراہ لیے رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے۔ رسول اللہ ﷺ نے انھیں کھانا بھی کھلایا اور تحائف بھی عطا کیے۔

اور ایک روایت میں ہے: وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ چلی اور رسول اللہ ﷺ کو پنیر اور دیگر دیسی اشیاء پیش کیں تو آپ ﷺ نے بھی انھیں لباس اور دیگر تحائف عطا فرمائے اور وہ مسلمان ہوگئیں۔

''الوفاء'' کے مؤلف نے ذکر کیا ہے کہ ام معبد رضی اللہ عنہا اور اس کے خاوند نے ہجرت بھی کی اور اس کا بھائی خنیس مسلمان ہوا اور اس نے فتح مکہ کے دن شہادت پائی۔[2]

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ اور یادگار لمحات

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''جب اللہ کے رسول ﷺ ہمارے گھر

[1] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 310/2. [2] السيرة النبوية لأبي شهبة: 490,489/1.

ٹھہرے تو نچلی منزل میں تھے اور میں اور ام ایوب اوپر والی منزل میں تھے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ آپ پر میرے ماں باپ قربان! یہ انتہائی نامناسب ہے کہ ہم آپ کے اوپر اور آپ نیچے قیام فرمائیں، آپ براہ کرم اوپر رہائش اختیار فرمایئے اور ہم نچلی منزل میں رہیں گے تو نبی ﷺ نے فرمایا: «يَا أَبَا أَيُّوبَ! إِنَّ أَرْفَقَ بِنَا وَ بِمَنْ يَّغْشَانَا أَنْ نَّكُونَ فِي سُفْلِ الْبَيْتِ» ''اے ابوایوب! ہمارے لیے اور ہر آنے جانے والے کے لیے نچلی منزل میں سہولت ہے۔'' ابوایوب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''ایک دن ہم سے پانی کا مٹکا ٹوٹ گیا اور پانی بہہ گیا۔ ہمارے پاس ایک ہی لحاف تھا ہم نے اس لحاف سے پانی خشک کرنا شروع کر دیا کہ مبادا رسول اللہ ﷺ پر کوئی قطرہ گرے اور اذیت کا باعث بنے۔''[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہجرت

حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اہل مکہ کی امانتیں واپس کرنے کے بعد سوئے مدینہ عازم سفر ہوئے۔ نبی ﷺ کے قباء پہنچنے کے دو یا تین راتیں بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی قباء پہنچ گئے اور تقریبًا دو راتیں وہاں قیام کیا، پھر نبی ﷺ کے ہمراہ جمعہ کے دن مدینہ میں داخل ہوئے۔[2]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قباء میں اقامت کے دوران ایک غیر شادی شدہ عورت کو دیکھا کہ رات کے اندھیرے میں اس کے دروازے پر ایک آدمی آیا، وہ نکلی تو اس شخص نے اسے کوئی چیز دی جو عورت نے وصول کر لی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے اس کے بارے میں شک گزرا تو (صبح کے وقت) پوچھا: ''اللہ کی بندی! یہ کون آدمی ہے جو رات تیرے دروازے پر آیا۔ اور تجھے کچھ دے کر واپس چلا گیا، حالانکہ وہ تیرا خاوند نہیں۔'' وہ بولی: ''یہ سہل بن حنیف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ میں یہاں اکیلی رہتی ہوں۔ شام کے وقت

[1] السيرة النبوية لابن هشام:499,498/2، و السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 220/1. [2] السيرة النبوية لأبي شهبة:497/1.

اس نے اپنی قوم کے بت توڑے تو چند ٹکڑے میرے پاس لے آیا اور کہا کہ انھیں چولہے میں جلا لو۔''

جب حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ سرزمین عراق میں فوت ہوئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ لوگوں سے یہ قصہ بیان کیا کرتے تھے۔[1]

ہجرت نبوی ایک اہم تاریخی موڑ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مکہ سے مدینہ ہجرت کرنا ایک ایسا عظیم تاریخی موڑ تھا جس نے زندگی کا رخ پھیر دیا اور وہ تمام طریقے جن کے تحت لوگ زندگی گزار رہے تھے یکسر تبدیل کر دیے۔ ان کے خود ساختہ قوانین، رسوم و رواج، عادات، اخلاق، معاملات، عقائد، عبادات، علم وفن، جہالت اور کم عقلی، ہدایت و گمراہی اور عدل و انصاف کے سب ضابطے بدل ڈالے گئے۔[2]

ہجرت انبیائے کرام علیہم السلام کی سنت ہے

اللہ کے راستے میں ہجرت کا عمل قدیم دور سے چلا آرہا ہے۔ انبیائے کرام علیہم السلام اپنے عقائد کے تحفظ کے لیے ہجرت کرتے رہے تھے۔ اس لیے حیات انبیاء میں ہجرت کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی دعوت کے تحفظ کے لیے اور ایک ایسا زرخیز معاشرہ قائم کرنے کے لیے جو دعوت کو قبول کرے، اپنے وطن اور اس سرزمین سے ہجرت کی جہاں آپ کی ولادت ہوئی تھی۔ بعینہ انھی اسباب کی بنا پر دیگر انبیاء علیہم السلام نے بھی ہجرت کی تھی۔ ایک ایسی بنجر زمین جو دعوتِ حق کو قبول کرنے کے بجائے اس کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرتی اور اسے روکنے کی کوشش کرتی رہی بلکہ وہاں اس دعوت کو انتہائی تنگ دائرے

[1] محمد رسول اللہ لصادق عرجون: 421/2. [2] محمد رسول اللہ ﷺ لصادق عرجون: 423/2.

میں محصور کر دیا گیا تھا۔ اس سرزمین سے ہجرت کے نتیجے میں دعوت کے باقی رہنے سے اللہ تعالیٰ کی یہ سنت واضح ہو کر مومنوں کے سامنے آتی ہے کہ جب ان کے اور ان کے عقیدے کے درمیان رکاوٹیں کھڑی کی جائیں، ان کے وجود اور بقا کو خطرہ ہو اور ان کی غیرت وعزت کو پامال کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ اس سنت الٰہی پر عمل کرتے ہوئے وہاں سے ہجرت کر جائیں۔ اس کی مثالیں قرآن کریم نے اقوام ماضی کے انبیائے کرام علیہم السلام اور ان کے پیروکاروں کی ہجرتوں کی صورتوں میں بیان کی ہیں۔[1]

1 الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 175.

باب 2

مہاجرین کے اوصاف حمیدہ، ان کا انعام و اکرام اور ہجرت سے پیچھے رہنے والوں کا انجام

ہجرتِ مدینہ اسلامی دعوت کی تاریخ کا سنگ میل ہے۔ اس ہجرت سے مسلمانوں کی کایا پلٹ گئی۔ وجہ یہ ہے کہ اس ہجرت سے پہلے مسلمانوں کی حیثیت ایک ''امت دعوت'' کی سی تھی جو لوگوں کو اللہ کا پیغام تو سناتی تھی لیکن اس کا کوئی سیاسی مقام نہیں تھا جو مسلمانوں کو تحفظ فراہم کرتا اور دشمن کے مقابلے میں ان کا دفاع کرتا۔

ہجرت کے بعد اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آیا تو اسلام جزیرہ نمائے عرب کے اندرون و بیرون میں تیزی سے پھیلتا چلا گیا۔ داعیان اسلام آس پاس کے علاقوں میں جاتے اور دعوتِ دین کا فریضہ انجام دیتے۔ اسلامی ریاست نے ان مبلغین کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا اور دشمن کی ہر زیادتی کا منہ توڑ جواب دیا۔ چاہے اس کے لیے جنگ و جدال کی بھٹی ہی میں کیوں نہ کودنا پڑے۔[1]

قرآن فہمی اور علوم قرآن میں ہجرت کا کردار

ہجرتِ مدینہ کا قرآن فہمی اور علومِ قرآن کی تدوین میں بھی نمایاں کردار ہے۔ علمائے کرام نے اسی ہجرت کو مدنظر رکھتے ہوئے مکی اور مدنی سورتوں کی تقسیم کی ہے۔ جو سورت

1 الهجرة النبوية لأبي فارس، ص: 13.

ہجرت سے پہلے، خواہ مکہ سے باہر ہی نازل ہوئی ہو اسے مکی سورت کہا گیا اور جو ہجرت کے بعد خواہ مدینہ سے باہر ہی نازل ہوئی ہو اُسے مدنی سورتوں کے زمرے میں شمار کیا گیا۔ قرآنی سورتوں کی اس تقسیم سے حسب ذیل اہم ترین فوائد حاصل ہوئے:

① قرآن کریم کے گوناگوں اسالیبِ بیانی کا ذائقہ لینا اور دعوت دین کے میدان میں ان سے استفادہ کرنا۔

② قرآنی آیات کے توسط سے سیرت نبوی کے واقعات اور ان کی تاریخوں سے واقفیت بہم پہنچانا۔[1]

ہجرتِ نبوی کی اہمیت کے پیشِ نظر قرآنِ کریم نے مختلف طریقوں سے اہلِ ایمان کو ہجرت کرنے کا شوق دلایا ہے۔ اس ضمن میں قرآنِ کریم نے نہایت عمدگی سے مہاجرین کی تعریف کی، اُن کے لیے اجر وثوب کا وعدہ کیا اور ہجرت سے کنارہ کشی اختیار کرنے والوں کو انجامِ بد کی وعید سنائی ہے۔[2]

مہاجرین کے اوصافِ حمیدہ

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں مہاجرین کی تعریف بیان کی، ان کے غیر معمولی اوصاف کا تذکرہ کیا اور بتایا ہے کہ انھیں ظلم وزیادتی کا نشانہ بنایا گیا اور اپنے گھروں سے بے دخل کر کے مال و متاع سے بھی محروم کر دیا گیا اور ان کے عزیز و اقارب بھی ان کے لیے اجنبی بن گئے۔ ان کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ اللہ ہی کو اپنا رب مانتے تھے۔

مہاجرین کی اہم ترین صفات یہ ہیں:

اخلاص: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيٰرِهِمْ وَاَمْوٰلِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا

---

1 مباحث في علوم القرآن للقطان، ص: 59. 2 الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 84.

﴿مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝﴾

''(مالِ فَے) ان مہاجر فقراء کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور اپنی جائیدادوں سے نکالے گئے، وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضا ڈھونڈتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ سچے ہیں۔'' [1]

﴿يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا﴾ کا ٹکڑا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ مہاجرین کو ان کے گھروں اور مال و متاع سے بے دخل کیے جانے کا سبب ایک ہی تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے مخلص اور اس کی رضا کے طالب تھے۔ [2]

صبر: اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کے خاص وصف ''صبر'' کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝﴾

''اور جن لوگوں نے ظلم و ستم سہنے کے بعد اللہ کی راہ میں ہجرت کی، البتہ ہم انھیں دنیا میں ضرور اچھا ٹھکانا دیں گے اور یقیناً آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے۔ کاش! وہ علم رکھتے۔ وہ لوگ جنھوں نے صبر کیا اور وہ اپنے رب ہی پر توکل کرتے ہیں۔'' [3]

نیز اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾

''پھر بے شک آپ کا رب ان لوگوں کے لیے (مہربان ہے) جنھوں نے آزمائش میں پڑنے کے بعد ہجرت کی، پھر جہاد کیا اور صبر کیا، بے شک آپ کا رب ان (آزمائشوں) کے بعد (ان لوگوں کے لیے) البتہ بہت بخشنے والا، نہایت مہربان ہے۔'' [4]

---

[1] الحشر 8:59. [2] الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 86. [3] النحل 42,41:16. [4] النحل 110:16.

سچائی: سچائی بھی مہاجرین کا امتیازی وصف تھا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيٰرِهِمْ وَاَمْوٰلِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ ﴾

''(مالِ فَے) ان مہاجر فقراء کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور اپنی جائیدادوں سے نکالے گئے، وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضا ڈھونڈتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ سچے ہیں۔''[1]

علامہ بغوی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں لکھا: '' ﴿ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ ﴾ کا مطلب ہے کہ وہ اپنے ایمان میں سچے تھے۔'' قتادہ کا قول ہے: ''یہ وہ مہاجر ہیں جنھوں نے گھربار، مال و متاع اور خاندان اللہ اور اس کے رسول کی محبت پر قربان کر دیا۔ ناسازگار حالات کے باوجود اسلام کا دامن تھامے رکھا۔ روایات میں ہے کہ انھیں بھوک کی شدت میں کمر سیدھی رکھنے کے لیے پیٹ پر پتھر باندھنے پڑتے اور اوڑھنے کے لیے لحاف نہ ہوتا تو چٹائی اوڑھ کر ہی سردیوں کی رات بسر کر لیتے۔''[2]

جہاد اور قربانی: ارشادِ ربانی ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوٰلِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝ ﴾

''وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کیا، اللہ کے ہاں درجے میں (وہ) سب سے بڑھ کر ہیں اور وہی مراد پانے والے ہیں۔''[3]

انبیاء علیہم السلام کی دعوتِ دین میں قربانی اور جاں نثاری کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس سچی دعوت کو ہمیشہ سرکشی، تکذیب اور سخت دشمنی جیسے چیلنجوں کا سامنا رہا ہے

[1] الحشر 8:59. [2] تفسير البغوي: 318/4. [3] التوبة 20:9.

جن سے نمٹنے کے لیے جفاکشی، زبردست ایمانی قوت، عقیدے کی پختگی اور بے جگری کی ضرورت ہوتی ہے۔ عقیدۂ توحید ہی وہ عقیدہ ہے جو انسان کو باطل سے ٹکرانے کی ہمت عطا کرتا ہے۔

ابتدائے نبوت میں جبریل علیہ السلام کا وحی لے کر اترنا گویا اس بات کا اعلان تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قوم کی طرف سے ایذا رسانی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ورقہ بن نوفل نے (پہلی وحی کے نزول کے موقع پر) کہا تھا: ''یہ وہی فرشتہ ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا کرتا تھا۔ کاش میں اس وقت مضبوط جوان ہوں اور تب تک زندہ رہوں جب آپ کی قوم آپ کو (شہر سے) نکال باہر کرے گی۔'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حیرت سے پوچھا: «أَوَ مُخْرِجِيَّ هُمْ؟» ''کیا یہ لوگ مجھے (مکہ سے) بے دخل کر دیں گے؟'' ورقہ بن نوفل نے جواب دیا: ''ہاں! جو بھی آدمی یہ دعوت لے کر آیا جیسی آپ لائے ہیں تو اس سے ضرور دشمنی روا رکھی گئی۔ میرے ہوتے وہ دن آ گیا تو میں آپ کی بھرپور مدد کروں گا۔''[1]

ہجرت مدینہ قربانی اور جاں نثاری کی داستان تھی۔[2]

یہ امر غور طلب ہے کہ قربانی اور جہاد فی سبیل اللہ لازم و ملزوم ہیں۔ قربانی کے بغیر جہاد کا تصور ناممکن ہے۔[3]

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيٰرِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝﴾

''(مالِ فے) ان مہاجر فقراء کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور اپنی جائیدادوں سے نکالے گئے، وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضا ڈھونڈتے ہیں اور اللہ اور اس کے

[1] صحيح البخاري، حديث: 3، وصحيح مسلم، حديث: 160. [2] الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 104. [3] الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 106.

رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ سچے ہیں۔‘‘ [1]

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کی تعریف بیان کی ہے کہ وہ مکہ چھوڑ کر مدینہ صرف اللہ اور اس کے رسول کی نصرت و حمایت کے لیے آئے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی مدد کرنے سے جنگ میں مدد ملتی اور ثابت قدمی عطا ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ○ ﴾

’’اے ایمان والو! اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کرو گے تو وہ تمھاری مدد کرے گا اور تمھارے قدم ثابت رکھے گا۔‘‘ [2]

سید قطب لکھتے ہیں: ’’اہل ایمان اللہ تعالیٰ کی کیونکر مدد کریں کہ وہ اس کی نصرت و حمایت سے سرفراز ہوں اور انھیں ثابت قدمی نصیب ہو؟‘‘

اس سوال کا جواب وہ خود ہی دیتے ہیں: ’’اہل ایمان پر اللہ کا یہ حق ہے کہ وہ ہر قسم کے ظاہری و باطنی شرک سے بچیں، اللہ کو اپنی ذات اور ہر خواہش سے بڑھ کر محبوب رکھیں۔ زندگی کی تمام رغبتوں اور تمناؤں میں، حرکات و سکنات میں، پوشیدہ طور پر بھی اور علانیہ بھی، معاشرے کی تمام سرگرمیوں میں اور افکار و نظریات میں اللہ کی حکومت تسلیم کریں۔ اپنی ذات کی حد تک اللہ کی مدد یہ ہے۔ اس بات کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی حیات کے لیے ایک مکمل ضابطہ وضع کیا جسے شریعت کہا جاتا ہے۔ شریعت کی عمارت چند مضبوط بنیادوں پر استوار ہے۔ یہ کسوٹی خاص اقدار کی حامل ہے۔ انسانی زندگی اور کائنات کے بارے میں اس کا جداگانہ تصور ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مدد کا حصول اس شریعت و منہج کی مدد کیے بغیر ممکن نہیں۔ وہ اس طرح کہ بلاامتیاز زندگی کے تمام شعبوں میں اسے نافذ کرنے کی سعی کی جائے اور اسے قولِ فیصل مانا جائے۔ دنیاوی معاملات میں اللہ کی مدد کرنے کا طریقِ کار یہ ہوا۔‘‘ [3]

---

[1] الحشر 8:59. [2] محمد 7:47. [3] تفسیر في ظلال القرآن لسید قطب: 3288/6.

اللہ تعالیٰ پر کامل اعتماد: ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝﴾

''اور جن لوگوں نے ظلم وستم سہنے کے بعد اللہ کی راہ میں ہجرت کی، البتہ ہم انھیں دنیا میں ضرور اچھا ٹھکانا دیں گے اور یقیناً آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے۔ کاش! وہ علم رکھتے۔ وہ لوگ جنھوں نے صبر کیا اور وہ اپنے رب ہی پر توکل کرتے ہیں۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے تعریف کے پیرائے میں مہاجرین کے اللہ پر اعتماد کرنے کا تذکرہ فرمایا۔

اللہ پر توکل ایمان کی خاصیت، علامت، اس کا مقصد اور تقاضا ہے۔ قرآنِ کریم میں ہے:

﴿قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ڬ وَعَلَي اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝﴾

''ان میں سے دو آدمی جن پر اللہ کا فضل تھا، وہ بولے: تم ان کے مقابلے کے لیے دروازے میں داخل ہو جاؤ، پھر جب تم دروازے میں داخل ہو گئے تو بے شک تم غالب آ جاؤ گے اور اگر تم مومن ہو تو تمھیں اللہ ہی پر بھروسا کرنا چاہیے۔''[2]

ایک اور موقع پر فرمایا:

﴿وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ۝﴾

''اور موسیٰ نے کہا: اے میری قوم! اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو تو اسی پر توکل کرو اگر تم فرماں بردار ہو۔''[3]

ایک اور مقام پر فرمایا:

[1] النحل 16:41، 42. [2] المآئدۃ 5:23. [3] یونس 10:84.

﴿قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝﴾

''ان کے رسولوں نے ان سے کہا: واقعی ہم تمھارے جیسے بشر ہی ہیں اور لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس پر احسان کرتا ہے۔ اور ہمیں یہ اختیار نہیں کہ اللہ کے حکم کے بغیر ہم تمھارے پاس کوئی نشانی (یا دلیل) لاسکیں اور مومنوں کو اللہ ہی پر توکل کرنا چاہیے۔''[1]

نبی علیہ السلام اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے ہجرت مدینہ میں توکل علی اللہ کی ایسی مثال قائم کی جو رہتی دنیا تک قابلِ اتباع رہے گی یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی ستائش کی۔[2]

رحمتِ الٰہی کی امید: مہاجرین کی ایک نمایاں صفت، جس پر اللہ تعالیٰ نے اُن کی ستائش کی ہے، رحمتِ الٰہی کا امیدوار ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾

''بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا، وہی لوگ اللہ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اللہ بہت بخشنے والا، بہت رحم کرنے والا ہے۔''[3]

اللہ تعالیٰ نے لفظ ﴿يَرْجُوْنَ﴾ کے ذریعے سے مہاجرین کی ستائش کی ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ دنیا میں کوئی انسان اطاعت وفرماں برداری کی کتنی ہی منزلیں طے کرے، اسے جنتی ہونے کا علم نہیں ہوسکتا کیونکہ اول تو اسے یہ پتا نہیں کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ دوسرا اس لیے بھی کہ انسان کہیں عمل نہ چھوڑ بیٹھے۔ مہاجرین کو اللہ نے اپنی بخشش

---

1 إبراهيم 11:14. 2 الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 114-117.
3 البقرة 2:218.

سے نواز دیا تھا، اس کے باوجود وہ اللہ کی رحمت کے طلبگار تھے۔ یہ ان کے پختہ ایمان کی نشانی ہے۔[1]

اتباع رسول ﷺ: ہجرت مدینہ کے عظیم المرتبت ہونے کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے مہاجرین و انصار کے متعلق بیان فرمایا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾

”یقیناً اللہ نے نبی اور ان مہاجرین و انصار پر مہربانی فرمائی جنھوں نے تنگی کی گھڑی میں آپ کی پیروی کی، بعد اس کے کہ ان میں سے ایک گروہ کے دل بہک جانے کو تھے، پھر اللہ نے ان پر مہربانی فرمائی۔ بے شک وہ ان پر بہت شفقت کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔“[2]

مہاجرین و انصار نے مشکل کی ہر گھڑی میں نبی ﷺ کی فرماں برداری کی جو اس امر کی دلیل ہے کہ یہ لوگ عظیم درجات پر فائز کیے جانے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی کے مستحق تھے۔

یہ آیت غزوۂ تبوک کے بارے میں نازل ہوئی۔ صحابۂ کرام قحط سالی اور شدید گرمی کے موسم میں، پانی اور زادراہ کی کمی کے باوجود جہاد پر روانہ ہوئے تھے۔

قتادہ رحمہ اللہ کا بیان ہے: ”صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم آگ برساتی گرمی میں غزوۂ تبوک کے لیے شام کی طرف روانہ ہوئے۔ انتہائی کٹھن حالات تھے۔ کہا جاتا ہے کہ دو دو آدمی ایک ایک کھجور پر گزارا کرتے اور بعض اوقات چند آدمی صرف ایک کھجور پر اس طرح گزارا

[1] تفسير القرطبي: 50/3، و تفسير أبي السعود: 218/1. [2] التوبة 9:117.

کرتے کہ ہر فرد کھجور چوستا اور پانی پی لیتا۔ اللہ نے ان کی محنتوں کو قبول کر کے انھیں معاف کر دیا۔ اور وہ غزوے سے صحیح سلامت واپس ہوئے۔''[1]

بلاشبہ اتباع رسول ﷺ دین و ایمان کی حقیقت ہے۔ یہ کفر و ایمان کے درمیان حد فاصل اور حُبّ الٰہی کا بیّن ثبوت ہے۔ حُبّ الٰہی زبانی دعوے یا وجدانی کیفیت کا نام نہیں بلکہ یہ رسول اللہ ﷺ کی فرماں برداری، ہدایت کی راہ پر چلنے اور اسلام کو زندگی کے ہر شعبے میں نافذ کرنے کا نام ہے۔ ایمان خالی خولی الفاظ، بھڑکتے جذبات یا محض ظاہری علامات کو نہیں کہتے بلکہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اور اللہ کی طرف سے عطا کردہ ضابطۂ حیات کی پابندی کا نام ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے ہم تک پہنچایا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۝﴾

''آپ کہہ دیجیے: اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمھارے گناہ بخش دے گا اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔ آپ کہہ دیجیے: تم اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، پھر اگر وہ منہ موڑیں تو بے شک اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔''[2]

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا ہے: ''اس آیت کریمہ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کی محبت کا دم تو بھرتا ہے لیکن محمدی منہج اختیار نہیں کرتا وہ اپنے دعوے میں جھوٹا ہے۔ تا آنکہ وہ شریعتِ محمدی کو زندگی کا ضابطہ بنا لے۔''[3] نبی ﷺ نے فرمایا: «مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَّيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ» ''جس نے کوئی ایسا عمل کیا جس

[1] تفسیر ابن کثیر: 397/2. [2] آل عمرٰن 3: 32,31. [3] تفسیر ابن کثیر: 466/3.

کے بارے میں ہم نے کوئی حکم نہیں دیا تو وہ مسترد ہے۔''[1]

ایمان و عمل میں سبقت: اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾

''اور مہاجرین اور انصار میں سے (قبول اسلام میں) سبقت کرنے والے اور وہ لوگ جنھوں نے احسان کے ساتھ ان کی پیروی کی، اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اس سے راضی ہو گئے اور اللہ نے ان کے لیے ایسے باغ تیار کیے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔''[2]

امام رازی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں: ''یہ سبقت فضیلت کا باعث ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اسلام لانے اور ہجرت کرنے میں سبقت کی، اس لیے بعد کے لوگوں پر لازم ہے کہ ان کی اتباع کریں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً، فَلَهُ أَجْرُهَا، وَ أَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا، إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ»

''جس نے اسلام میں اچھا طریقہ جاری کیا اسے قیامت تک اپنا اور اس پر عمل کرنے والوں کا ثواب ملتا رہے گا۔''[3]

ذاتی معاملہ ہو یا دین کا، اپنے جیسوں کو دیکھ کر لوگوں میں کام کرنے کا جذبہ بڑھتا ہے۔ اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مہاجرین مسلمانوں کے سردار اور رؤسا ہیں۔''[4]

1 صحيح البخاري، حديث: 2697، و صحيح مسلم، حديث: (18)-1718. 2 التوبة 9:100.
3 صحيح مسلم، حديث: 1017، و جامع الترمذي، حديث: 2675، و سنن النسائي، حديث: 2555، و سنن ابن ماجه، حديث: 203، ومسند أحمد: 4/358,357، و فتح الباري: 12/193.
4 تفسير الرازي: 10/208.

اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کو ایسی منفرد صلاحیتوں سے نوازا تھا جن کی بدولت انھوں نے ہر قسم کے دباؤ، آزمائش، بھوک اور غریب الوطنی جیسی تکالیف کو ہنسی خوشی برداشت کیا اور موت تک کو گلے لگا لیا۔ یوں پہلے مکہ اور پھر مدینہ میں اسلام کو ان کی شکل میں نہایت ٹھوس بنیادیں فراہم ہوئیں۔ انصار اگرچہ مہاجرین کے بعد دائرہ اسلام میں آئے تھے لیکن ان کی بیعت عقبہ میں شمولیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی طبیعتیں بھی خالص اور کھری تھیں جو اس دین کے مزاج سے مکمل طور پر میل کھاتی تھیں۔

مہاجرین و انصار کے باہمی تعلق و ارتباط سے اسلام کے لیے ایسی ٹھوس بنیاد تشکیل پائی جس کے قوام میں عربی معاشرے کے مضبوط اور مستحکم ترین عناصر شامل تھے۔ کچھ عناصر جو قلیل تعداد میں تھے ان تکالیف کو برداشت نہ کر سکے اور دین سے مرتد ہو کر جاہلیت کی طرف پلٹ گئے۔ دین اسلام کا معاملہ کھلی کتاب کے مانند تھا۔ جاہلیت سے نکل کر دائرۂ اسلام میں آنے اور اس دشوار گزار راستے کو طے کرنے کی ہمت وہی عناصر کرتے تھے جو غیر معمولی مزاج اور مصمم ارادے کے مالک ہوتے۔[1]

یوں مہاجرین و انصار کی فضیلت اور ان کا مرتبہ واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ایسے حالات میں روپیہ پیسہ خرچ کیا اور جہاد کیا جب ان کے مددگار بھی کم تھے، عقیدۂ توحید کی مخالفت بھی زوروں پر تھی اور آسودگی، نفع یا غلبہ کی توقع بھی نہیں تھی۔ ایسے مشکل حالات میں انفاق اور جہاد اتنے عظیم اعمال تھے کہ ان کا کوئی ثانی نہیں۔[2]

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ لِلّٰهِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ لَا یَسْتَوِیْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً

---

[1] تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب: 1703/3. [2] الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 124.

مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ۭ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ○﴾

''اور تمھیں کیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے؟ جبکہ آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ ہی کے لیے ہے۔ تم میں سے جن لوگوں نے فتح (مکہ) سے پہلے خرچ کیا اور جہاد کیا یہ (ان لوگوں کے) برابر نہیں ہیں (جنھوں نے فتح مکہ کے بعد یہی کام کیے۔) یہ (پہلے کرنے والے) لوگ درجے میں ان لوگوں سے عظیم تر ہیں جنھوں نے اس (فتح) کے بعد خرچ کیا اور لڑائی کی اور اللہ نے ہر ایک سے نیک جزا کا وعدہ کیا ہے اور اللہ اس سے خوب باخبر ہے جو تم عمل کرتے ہو۔''[1]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ ایمان و عمل میں سبقت لے جانے والے مہاجرین و انصار کے متعلق لکھتے ہیں: ''اللہ کریم نے مہاجرین و انصار میں سے سب سے پہلے سبقت کرنے والوں ﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ﴾ کو اپنی رضامندی کی سند عطا فرمائی ہے۔ ان لوگوں کی بربادی ہو جو ان تمام یا کسی ایک سے بغض رکھتے ہیں۔ یا انھیں برا بھلا کہتے ہیں بالخصوص اس شخص کو جو سب سے افضل، قابل قدر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد امت کا پیشوا بنا۔ میری مراد سید الصحابہ، خلیفۃ الرسول سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ راندۂ درگاہ گروہ رافضیوں کا ہے جو صحابۂ کرام سے بغض رکھتے ہیں اور ان پاکباز ہستیوں کو گالیاں دے کر اپنا منہ کالا کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی عقل الٹی اور دل ٹیڑھے ہیں کیونکہ وہ امت کی ان ہستیوں کو برا جانتے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ راضی ہے۔

اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ ان تمام افراد کے متعلق دل صاف رکھا جائے جن سے اللہ راضی ہو اور انھیں برا سمجھا جائے جنھیں اللہ اور اس کا رسول برا سمجھیں۔ دوستی اور دشمنی کا یہی معیار ہے۔ ایسے لوگ ہی اتباع اور اقتدا کی راہ اپناتے ہیں نہ کہ بدعت کی۔ یہی لوگ

[1] الحدید 57:10۔

اللہ تعالیٰ کا کامیاب گروہ اور اس کے مومن بندے ہیں۔'' [1]

کامیابی: اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝﴾

''وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کیا، اللہ کے ہاں درجے میں (وہ) سب سے بڑھ کر ہیں اور وہی مراد پانے والے ہیں۔'' [2]

علامہ ابوسعود اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''﴿هُمُ الْفَآئِزُوْنَ﴾ سے مراد وہ افراد ہیں جو خاص طور پر کامیابی سے ہمکنار ہوئے، گویا اس کامیابی کی نسبت دوسرے لوگوں کی کامیابیاں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔'' [3]

مذکورہ بالا آیت میں اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کو عظیم کامیابی کا مستحق قرار دے کر ان کی تعریف کی۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے والی کامیابی عظیم ہی ہوگی۔ اللہ جسے آگ سے بچا لے اور جنت میں لے جائے اس سے بڑی کامیابی اور کیا ہوسکتی ہے! اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝﴾

''ہر کوئی موت کا ذائقہ چکھنے والا ہے، بے شک قیامت کے دن تمھیں پورے پورے اجر دیے جائیں گے، پھر جسے آگ سے دور رکھا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا تو وہ یقیناً کامیاب ہوگیا اور دنیا کی زندگی دھوکے ہی کا سامان تو ہے۔'' [4]

[1] تفسیر ابن کثیر: 332/2. [2] التوبۃ 20:9. [3] تفسیر أبي السعود: 53/4. [4] آل عمرٰن 185:3.

سچا ایمان: قرآن کریم میں مہاجرین کا ایک وصف ان کے ایمان کی سچائی بھی بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۚ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ﴾

''اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جنھوں نے (مہاجرین کو) جگہ دی اور (ان کی) مدد کی، وہی لوگ سچے مومن ہیں، ان کے لیے مغفرت اور باعزت روزی ہے۔''[1]

یہ اللہ علیم وخبیر کی شہادت ہے کہ مہاجرین سچے مومن تھے جو نبی علیہ السلام کے بعد امت کے لیے نمونے کی حیثیت اختیار کر گئے۔ انھی صفات کی بدولت وہ اللہ تعالیٰ کی مدح وستائش کے مستحق ٹھہرے کہ دراصل یہی مومن ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۚ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝﴾

''(سچے) مومن تو صرف وہ لوگ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب ان پر اس کی آیتوں کی تلاوت کی جائے تو وہ ان کا ایمان بڑھا دیتی ہیں اور وہ اپنے رب ہی پر توکل کرتے ہیں۔ وہ لوگ جو نماز قائم کرتے ہیں اور ہم نے انھیں جو رزق دیا ہے اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں، یہی لوگ سچے مومن ہیں، ان کے لیے اپنے رب کے ہاں درجے ہیں اور بخشش ہے اور باعزت رزق ہے۔''[2]

[1] الأنفال 8:74. [2] الأنفال 8:2-4.

یہ صفات مہاجرین کی زندگیوں میں واضح طور پر نظر آتی ہیں اور انھی صفات کے حامل افراد ہی درحقیقت اہلِ ایمان ہیں۔

مہاجرین کے انعامات

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں مہاجرین کو ملنے والے انعامات کا تذکرہ فرمایا ہے۔ ان میں سے چند انعامات یہ ہیں:

دنیا میں فراخی رزق: اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ۚ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝﴾

”اور جو شخص اللہ کی راہ میں ہجرت کرے وہ زمین میں پناہ لینے کے لیے بہت جگہ اور فراخی پائے گا۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرنے کی خاطر اپنے گھر سے نکلے، پھر اسے راستے میں موت آجائے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے واجب ہو گیا۔ اور اللہ نہایت بخشنے والا، بہت رحم کرنے والا ہے۔“ [1]

دنیا میں ان کا رزق یوں فراخ کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے فَے اور غنیمت کا مال ان کے لیے بھی خاص کر دیا، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝﴾

”(مالِ فَے) ان مہاجر فقراء کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور اپنی جائیدادوں سے نکالے گئے، وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضا ڈھونڈتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ سچے ہیں۔“ [2]

---

[1] النسآء 100:4. [2] الحشر 8:59.

مہاجرین ان اموال کے اس لیے مستحق ٹھہرے کہ انھیں ناحق اپنے گھروں اور مالوں سے بے دخل کیا گیا تھا۔ [1]

مہاجرین کے لیے رزق میں فراخی یوں بھی کی گئی کہ انصار سے بخیلی دور کر کے ان کے سینے مہاجرین کے لیے کشادہ کر دیے گئے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ الَّذِيْنَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْإِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ ﴾

''اور (مالِ فَے ان کے لیے ہے) جنھوں نے (مدینہ کو) گھر بنا لیا تھا اور ان (مہاجرین) سے پہلے ایمان لا چکے تھے، وہ (انصار) ان سے محبت کرتے ہیں جو ان کی طرف ہجرت کرے اور وہ اپنے دلوں میں اس (مال) کی کوئی حاجت نہیں پاتے جو ان (مہاجرین) کو دیا جائے اور اپنی ذات پر (ان کو) ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود انھیں سخت ضرورت ہو اور جو کوئی اپنے نفس کے لالچ سے بچا لیا گیا تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔'' [2]

اللہ تعالیٰ نے مہاجرین سے دنیا میں فراخی رزق کا وعدہ فرمایا۔ یہ وعدہ پورا ہوا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہجرت کرنے والوں کو واضح طور پر تمام ممکنہ خطرات سے آگاہ کیا اور راہ ہجرت میں پیش آنے والے تمام مصائب حتیٰ کہ موت کا ذکر بھی کر دیا۔ اس کے ساتھ چند ایسے حقائق بھی سامنے رکھ دیے جن سے اطمینان قلب اور ہجرت کے سلسلے میں اللہ کی طرف سے ضمانت حاصل ہوتی ہے۔ اور ہجرت وہی ہے جو اللہ کے راستے میں ہو۔ اسلام میں یہی ہجرت معتبر ہے نہ کہ وہ ہجرت جو حصولِ مال، دکھوں سے

[1] تفسير ابن كثير: 295/4، و تفسير أبي السعود: 228/8، و فتح القدير للشوكاني: 200/5.
[2] الحشر 9:59.

نجات، لذتوں کے حصول یا دنیا کے سازوسامان اکٹھا کرنے کی غرض سے ہو۔ مذکورہ ہجرت ہی اللہ کے ہاں مقبول ہے اور ایسا مہاجر زمین میں کشادگی، نجات اور رزق پائے گا کیونکہ اللہ اس کا مددگار ہوگا اور اس کی راہنمائی کرے گا۔[1]

گناہوں کی مغفرت: گناہوں کی مغفرت بھی مہاجرین کا خصوصی انعام تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ ۖ بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ ۖ فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ثَوَابًا مِّنْ عِندِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عِندَهُ حُسْنُ الثَّوَابِ ۝﴾

”پھر ان کے رب نے ان کی دعا قبول کی کہ تم میں سے میں کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کروں گا، خواہ کوئی مرد ہو یا عورت، تم آپس میں ایک دوسرے کے ہم جنس ہو، پھر جن لوگوں نے ہجرت کی اور انھیں ان کے گھروں سے نکال دیا گیا اور انھیں میری راہ میں تکلیفیں دی گئیں اور انھوں نے جہاد کیا اور وہ قتل ہوئے تو میں ضرور ان کی برائیاں ان سے دور کردوں گا اور یقیناً انھیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ یہ اللہ کی طرف سے ثواب ہوگا اور اللہ ہی کے پاس بہترین ثواب ہے۔“[2]

رسول اللہ ﷺ کے متعدد فرامین اس امر کے شاہد ہیں کہ ہجرت گناہوں کی مغفرت کا اہم ذریعہ ہے۔ شماسہ مہری رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ ہم سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، وہ نزع کے عالم میں تھے۔ سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے زاروقطار روتے

[1] تفسیر في ظلال القرآن لسید قطب: 745/2. [2] آل عمران 195:3.

ہوئے اپنا چہرہ دیوار کی طرف پھیر لیا۔ ان کا بیٹا کہنے لگا: ''ابا جان! آپ کیوں روتے ہیں؟ اللہ کے رسول نے آپ کو فلاں فلاں خوشخبری نہیں سنائی؟'' اس پر انھوں نے اپنا رخ سیدھا کیا اور کہا: ''ہم نے جو کچھ تیار کیا ہے اس میں سب سے افضل عمل اللہ کی وحدانیت کا اقرار اور رسول اللہ کی رسالت کی گواہی ہے۔ میری زندگی تین مراحل سے گزری۔ (پہلے مرحلے میں) میں رسول اللہ ﷺ سے سخت بغض رکھتا تھا۔ میری انتہائی کوشش تھی کہ آپ کو قتل کر دوں۔ اگر میں اسی حالت میں مر گیا ہوتا تو جہنمی قرار پاتا، پھر جب اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں ایمان کی شمع روشن کی، میں نبی ﷺ کی خدمت میں آیا اور کہا: ''دایاں ہاتھ بڑھایئے۔ میں آپ سے بیعت کرنا چاہتا ہوں۔'' آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ بڑھایا تو میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ نبی ﷺ نے وجہ دریافت کی تو میں نے عرض کیا: ''میں شرط لگانا چاہتا ہوں۔'' آپ ﷺ نے پوچھا: «تَشْتَرِطُ بِمَاذَا؟» ''کیا شرط لگانا چاہتے ہیں؟'' میں نے عرض کی کہ میرے گناہ معاف ہو جائیں۔ فرمایا: «أَمَا عَلِمْتَ يَا عَمْرُو! أَنَّ الْإِسْلَامَ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ؟ وَ أَنَّ الْهِجْرَةَ تَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهَا وَ أَنَّ الْحَجَّ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ؟» ''کیا آپ کو علم نہیں کہ اسلام پچھلے تمام گناہوں کو مٹا دیتا ہے؟ ہجرت اور حج بھی سابقہ تمام گناہوں کو ختم کر دیتے ہیں۔''

''پھر (دوسرے مرحلے کے دوران) یہ حالت ہو گئی کہ رسول اللہ ﷺ سے زیادہ مجھے کوئی محبوب نہیں تھا، نہ میری نظر میں آپ سے بڑھ کر کسی کی عظمت تھی۔ آپ ﷺ کی بارعب شخصیت کے سبب میں نظر بھر کر آپ کی طرف نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اگر کوئی مجھ سے رسول اللہ ﷺ کا حلیہ بیان کرنے کو کہے تو میں بیان نہیں کر پاؤں گا کیونکہ میں آپ ﷺ کو کبھی نظر بھر کر نہیں دیکھ سکا۔ میں اسی حالت میں مر جاتا تو امید تھی کہ جنتی ہوتا، پھر (تیسرے مرحلے میں) ہمیں چند ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ میں نہیں جانتا کہ میں ان ذمہ داریوں سے کہاں تک عہدہ برآ ہو سکا۔ میں مر جاؤں تو کوئی نوحہ کرنے والی میرے (جنازے کے)

ساتھ نہ جائے اور نہ کوئی آگ لے کر (جنازے کے ساتھ) چلے، جب تدفین کر چکو تو قبر پر بکھیر بکھیر کر مٹی ڈالنا، پھر قبر کے پاس اتنی دیر کھڑے رہنا جتنی دیر اونٹ ذبح کر کے اس کا گوشت تقسیم کر دیا جاتا ہے تاکہ تمھاری موجودگی میں (وہاں) میرا دل لگ جائے اور دیکھوں کہ اپنے رب کے پیغامبروں (فرشتوں) کو کیا جواب دیتا ہوں۔''[1]

علامہ نووی رحمہ اللہ نے اس روایت کی شرح میں لکھا: ''اس حدیث میں اسلام، ہجرت اور حج کی عظمت بیان کی گئی ہے، ان میں سے ہر ایک سابقہ گناہوں کو منہدم کر دیتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ قریب المرگ انسان کو یہ تلقین کرنی چاہیے کہ وہ اللہ سے حسنِ ظن رکھے۔ اسے امید و بیم کی آیات اور معافی کی احادیث پڑھ کر سنانی چاہئیں۔ اسے اس کے نیک اعمال یاد دلائے جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کی مہمانی کے لیے جو سامان تیار کر رکھا ہے اس کے متعلق بتایا جائے تاکہ اس کی موت اللہ سے حسن ظن پر آئے۔ قریب المرگ کی عیادت میں یہ آداب ملحوظ رکھنا بالاتفاق مستحب ہے۔''[2]

اللہ کے ہاں مراتب و درجات کی بلندی: اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے عظیم درجات کا وعدہ کیا ہے جنھوں نے ایمان، ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ کے سلسلے میں اپنا مال اور اپنی جانیں قربان کیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ۝﴾

''وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کیا، اللہ کے ہاں درجے میں (وہ) سب سے بڑھ کر ہیں اور وہی مراد پانے والے ہیں۔''[3]

---

1 صحيح مسلم، حديث: 121. 2 شرح صحيح مسلم للنووي، شرح الحديث: 121. 3 التوبة 20:9.

امام فخر الدین رازی لکھتے ہیں: ''آیت کریمہ میں جن افراد کو چار صفات سے متصف بیان کیا گیا ہے وہ عظمت کے مینار ہیں۔ انسان کے پاس بنیادی طور پر تین ہی چیزیں ہیں: روح، بدن اور مال و متاع۔ مہاجرین کی روح اسلام لانے کے بعد اوج کمال تک جا پہنچی۔ بدن اور مال انھوں نے ہجرت اور جہاد پر قربان کر دیے، حالانکہ یہ دونوں چیزیں انسان کی محبوب ترین چیزیں ہیں۔ وہ انھیں اس صورت میں چھوڑ سکتا ہے جب ان سے زیادہ محبوب شے پا لے۔ مہاجرین کے ہاں اللہ کی رضا جان و مال سے زیادہ محبوب نہ ہوتی تو کبھی آخرت کو دنیا پر ترجیح نہ دیتے اور نہ جان و مال کی قربانی پیش کرتے۔ چنانچہ ثابت ہوا کہ ان چار صفات سے متصف انسان انسانیت کے اعلیٰ معیار اور فرشتوں کے ابتدائی درجے تک پہنچ جاتا ہے۔ یوں مہاجرین مطلق طور پر ساری انسانیت پر فائق تھے۔ جو صفات ان میں پائی جاتی تھیں وہ انھیں سعادت و فضیلت کے اسی درجے پر پہنچانے والی تھیں۔''[1]

کچھ مسلمانوں کی رائے تھی کہ سقایت (حاجیوں کو پانی پلانا) اور عمارت (مسجد حرام کی آبادکاری) اسلام لانے کے بعد سب سے بڑے عمل ہیں لیکن اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ اہلِ ایمان مہاجرین جنھوں نے جان و مال سے اللہ کے راستے میں جہاد کیا، وہ سب سے افضل ہیں اور ثواب کے زیادہ مستحق ہیں۔ ہجرت کرنے والے اور جان و مال کی قربانی دینے والے ہی عزت کے لحاظ سے ان تمام افراد سے اعلیٰ و افضل ہیں جن میں یہ صفات نہیں پائی جاتیں۔ اہلِ سقایت و عمارت بھی انھی افراد میں شامل ہیں جو فضیلت کے اعتبار سے مہاجرین سے فروتر ہیں۔[2]

اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کو اہلِ سقایت و عمارت ہی سے افضل نہیں گردانا۔ ایسا ہوتا تو وہ صرف انھی سے افضل ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے مطلق طور پر ان کی برتری ثابت کی ہے جو

[1] تفسير الرازي: 13/16. [2] تفسير المراغي: 78/10.

تمام لوگوں سے ان کے افضل ہونے کی دلیل ہے۔[1]

﴿اَعْظَمُ دَرَجَةً﴾ میں صیغہ اسم تفضیل سے یہ نہ سمجھا جائے کہ جن میں مہاجرین کی صفات نہ ہوں گی وہ ان سے کم درجہ کے حامل ہوں گے بلکہ مہاجرین کی فضیلت مطلق طور پر بتائی ہے کہ ان کا درجہ سب سے بلند ہے۔ جبکہ ان کے مقابلے میں جن لوگوں کا ذکر ہے ان کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اُولٰٓىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ۝﴾

''انھی لوگوں کے (سب) اعمال برباد ہو گئے اور وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔''[2]

لہٰذا دوسرے لوگوں کو مومن و مجاہد مہاجرین سے کسی درجے میں کوئی نسبت ہی نہیں۔[3]

جنت کا استحقاق اور اس میں ہمیشہ کا قیام: قرآن کریم میں مہاجرین کے لیے انعامات بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے جنت کے استحقاق اور اس میں ہمیشہ کے قیام کا ذکر بھی کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ۝ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ۝﴾

''وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کیا، اللہ کے ہاں درجے میں (وہ) سب سے بڑھ کر ہیں اور وہی مراد پانے والے ہیں، ان کا رب انھیں اپنی طرف سے رحمت اور رضامندی اور ایسے باغوں کی خوشخبری دیتا ہے جن میں ان کے لیے ہمیشہ رہنے

[1] تفسیر الرازي: 14/16. [2] التوبة 9:17. [3] تفسیر في ظلال القرآن لسید قطب: 3/1614.

والی نعمتیں ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے ابد تک۔ بے شک اللہ کے ہاں بہت بڑا اجر ہے۔''[1]

امام شوکانی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''آیت میں ﴿رَحْمَةٍ﴾، ﴿رِضْوٰنٍ﴾ اور ﴿وَّجَنّٰتٍ﴾ کے الفاظ کو تعظیم جتانے کی غرض سے نکرہ لایا گیا ہے۔ معنی یہ ہیں: یہ جنتیں بیان کرنے والوں کے بیان اور تصور کرنے والوں کے تصور سے بالاتر ہیں۔ انسانی عقل ان کا ادراک کرنے سے قاصر ہے۔ ہمیشہ رہنے والی نعمتوں سے مراد یہ ہے کہ وہ کبھی ختم ہوں گی نہ ساتھ چھوڑیں گی۔ لفظ ﴿اَبَدًا﴾ کو خلود کے بعد ذکر کرنا تاکید کے لیے ہے۔[2]

یہ ایسی خوش خبری ہے کہ اس کے بعد کوئی خوش خبری ہو ہی نہیں سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان خواتین و حضرات سے جنتوں میں ہمیشہ کے قیام کا وعدہ کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝﴾

''اللہ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے ایسے باغوں کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے اور سدا بہار باغوں میں پاکیزہ محلات کا (وعدہ ہے) اور اللہ کی رضامندی سب سے بڑھ کر (نعمت) ہوگی، یہی عظیم کامیابی ہے۔''[3]

اللہ کی رضا اور عظیم کامیابی: اللہ تعالیٰ نے مہاجرین سے جن انعامات کا وعدہ کیا ہے ان میں سے ایک انعام یہ ہے کہ وہ عظیم کامیابی سے ہمکنار ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

[1] التوبة9:20-22. [2] فتح القدير للشوكاني:345/2. [3] التوبة9:72.

﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝﴾

’’وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کیا، اللہ کے ہاں درجے میں (وہ) سب سے بڑھ کر ہیں اور وہی مراد پانے والے ہیں۔‘‘ [1]

اللہ تعالیٰ کی رضا ان کے لیے تمام نعمتوں سے بڑی اور عظیم نعمت ہے۔ یہ اچھائی کی انتہا، اعلیٰ ترین نعمت اور پورا پورا بدلہ ہے۔ [2]

قرآنِ مجید میں ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ۭ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝﴾

’’اللہ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے ایسے باغوں کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے اور سدا بہار باغوں میں پاکیزہ محلات کا (وعدہ ہے) اور اللہ کی رضامندی سب سے بڑھ کر (نعمت) ہوگی، یہی عظیم کامیابی ہے۔‘‘ [3]

مہاجرین کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے حاصل ہونے والی رضامندی ایسی رضا ہے جس کے بعد انھیں اجر وثواب ملتا ہے، حالانکہ اللہ کی رضا بذاتِ خود اعلیٰ درجے کا ثواب ہے۔

مہاجرین کے اللہ تعالیٰ سے راضی ہونے کا مطلب اللہ تعالیٰ کے انعامات پر شکر اور آزمائشوں پر صبر کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ اور مہاجرین کے آپس میں راضی ہونے سے رضا کی وسیع وعریض اور نہایت خوبصورت فضا قائم ہوئی جس کی وجہ سے ان چنیدہ ہستیوں کی شان بلند ہوئی اور

1 التوبة 9:20. 2 تفسیر ابن کثیر: 2/320، وتفسیر المراغي: 10/79. 3 التوبة 9:72.

وہ ایسے اعلیٰ و ارفع مقام پر فائز ہوئے کہ باوجود مخلوق ہونے کے اپنے خالق سے رضا کا تبادلہ کرنے لگے۔ یہ ایسا عمدہ ماحول ہے کہ انسانی الفاظ اس کی تعبیر کرنے سے قاصر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی نے اپنے بے مثال کلام میں اسے ذکر خیر بخشا ہے۔ [1]

یہ تھا اس اجر و ثواب کا مختصر تذکرہ جو اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کو ان کی سخت جدوجہد کے بدلے میں عطا کیا۔

مہاجرین نے ایمانِ راسخ اور یقینِ محکم کی بدولت اسلامی دعوت کو جو ابھی ابتدائی مراحل میں تھی، جاہلیت کے ہاتھوں زندہ درگور ہونے سے بچالیا۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ پر نازل ہونے والی وحی کی تعلیمات پر مستقل مزاجی سے عمل کیا۔ قریش کی شدید مخالفت نے ان کی استقامت میں اضافہ ہی کیا۔ جاہلیت ظلم و ستم میں حد سے بڑھ گئی تو اللہ تعالیٰ نے صابر مومنین کو ہجرت کی اجازت دی۔ انھوں نے گھر بار، مال و متاع کو خیر باد کہا اور مدینہ روانہ ہو گئے۔ یہ ہجرت کفر کے ڈر سے نہیں تھی، نہ اس میں دنیاوی اغراض کا شائبہ تھا۔ مسلمان اس ہجرت کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کی رحمت کے طلبگار اور اس کی رضا و فضل کے متلاشی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دنیا میں فضلِ الٰہی کے مستحق ٹھہرے اور قیامت کے دن ثوابِ عظیم سے بہرہ مند ہوں گے۔ [2]

ہجرت نہ کرنے والوں کو وعید

جزا و سزا کے معاملات میں قرآن کریم نے جو اسلوب اختیار کیا ہے اس کا ہدف یہ ہے کہ دلوں میں خشیت و رجا (امید و بیم) کے جذبات بیک وقت پیدا ہوں۔ رجا (امید) جو دلوں کو طاعت و استقامت کی طرف لے جائے اور خشیت (بیم) جو گناہ سے روکے اور تیزی سے توبہ و استغفار کے راستے پر چلا دے۔ مومن امید و بیم کے درمیان اعتدال کی راہ

[1] تفسیر في ظلال القرآن لسید قطب: 1705/3. [2] هجرة الرسول و صحابته في القرآن و السنة لأحمد عبدالغني، ص:333,332.

پر چلتا ہے۔ وہ امید کا دامن ہاتھ سے چھوڑ کر مایوسی کا شکار ہوتا ہے نہ اللہ کی قائم کردہ حدوں کو پھلانگنے کی جرأت کرتا ہے نہ احکام الٰہی کی تعمیل میں سستی کرتا ہے۔ قرآن کریم نے خشیت و رجا جیسے اسلحے کے ذریعے سے فرد کی شخصیت اور جان، مال و متاع، عقل و شعور، عزت اور دین کی نسبت سے معاشرے کے اجزائے ترکیبی کو تحفظ فراہم کیا ہے۔ اسلامی ریاست انسانی زندگی کو ان پانچ پہلوؤں سے تحفظ فراہم کرتی ہے جو شریعتِ اسلامیہ کے مقاصد میں شامل ہے۔ یہ پانچ بنیادیں ہی ہیں جن پر قابل فخر زندگی کا دارومدار ہے۔ قرآنِ کریم نے انسانی حیات کو نسل در نسل خشیت و رجا ہی کی بدولت روشنی سے ہمکنار کیا۔ جب یہ نور قرآن کریم سے دوری کے سبب مدھم پڑ گیا تو فرد کا اپنی فطرت سے اور معاشرے کا اپنی حقیقت سے تصادم ہوا جس کے نتیجے میں اعلیٰ اخلاقی اقدار نے اپنی قدر و قیمت کھو دی۔ زندگی کے معاملات و مقاصد اور تمام تصورات تہ و بالا ہو گئے۔ یقینی بات ہے کہ اس امت کے آخری زمانے کے معاملات بھی اسی طریقے سے درست ہوں گے جس ذریعے سے اس کے ابتدائی زمانے کے معاملات درست ہوئے۔ اور یہ اس وقت تک ناممکن ہے جب تک خشیت و رجا (امید و بیم) کے سارے رشتے اللہ سے نہیں جوڑے جاتے۔[1]

ہجرت سے پیچھے رہنے والوں کا برا انجام قرآن کریم نے یوں بیان کیا ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنْتُمْ ۖ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ ۚ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا ۚ فَأُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ○﴾

''جن لوگوں کی اس حالت میں فرشتے جان قبض کرتے ہیں کہ وہ (جان بوجھ کر کافروں میں رہ کر) اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہے ہوں تو فرشتے پوچھتے ہیں کہ تم کس حال میں تھے؟ وہ کہتے ہیں: ہم زمین میں کمزور تھے۔ تب فرشتے کہتے ہیں:

1 تفسير سورة فصلت للدكتور محمد صالح علي، ص: 98.

کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے؟ چنانچہ یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔''[1]

امام بخاری رحمہ اللہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت لائے ہیں کہ مکہ کے کچھ مسلمان مشرکین کا لشکر بڑھانے کی غرض سے ان کے ساتھ جنگوں میں نکلتے۔ اچانک کوئی تیر آتا یا تلوار لگتی تو ان میں سے کوئی مارا جاتا۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔[2]

ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی کی ایک روایت میں ہے کہ مکہ کے کچھ لوگ مسلمان ہوئے۔ وہ اسلام کے معاملے کو چھپاتے تھے۔ بدر کے دن مشرکین انھیں اپنے ہمراہ لائے۔ ان میں سے چند افراد مارے گئے تو مسلمانوں نے کہا: ''ہمارے یہ ساتھی مسلمان تھے اور انھیں مجبور کیا گیا تھا۔'' پھر یہ آیت لکھ کر مکہ روانہ کر دی گئی کہ اب تمھارے لیے کوئی عذر نہیں رہا، وہ یہ آیت پڑھ کر ہجرت کا عزم لیے گھروں سے روانہ ہوئے۔ مشرکین نے انھیں جا لیا اور تحفظ دینے کا وعدہ کیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ۭ وَلَىِٕنْ جَاۗءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ۭ اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ ○﴾

''اور لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے، پھر جب اللہ کی راہ میں انھیں ایذا دی جاتی ہے تو وہ لوگوں کے ستانے کو اللہ کے عذاب کے برابر ٹھہراتے ہیں اور اگر آپ کے رب کی طرف سے مدد آجائے تو وہ ضرور کہیں گے: بے شک ہم تمھارے ساتھ تھے، کیا جو کچھ جہان والوں کے سینوں میں ہے اللہ اُسے خوب جاننے والا نہیں۔''[3]

مسلمانوں نے یہ آیت بھی لکھ کر مکہ روانہ کر دی اب مکہ کے مسلمان عازم مدینہ ہوئے

[1] النسآء 4:97. [2] صحيح البخاري، حديث: 4596. [3] العنكبوت 29:10.

اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾

''پھر بے شک آپ کا رب ان لوگوں کے لیے (مہربان ہے) جنھوں نے آزمائش میں پڑنے کے بعد ہجرت کی، پھر جہاد کیا اور صبر کیا، بے شک آپ کا رب ان (آزمائشوں) کے بعد (ان لوگوں کے لیے) البتہ بہت بخشنے والا، نہایت مہربان ہے۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے ہجرت نہ کرنے والوں کو ظالم قرار دیا۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو دار کفر میں اسلام لائے اور مدینہ کی طرف ہجرت نہ کی، گویا مکہ میں اقامت گزیں رہنا اور ہجرت نہ کرنا ظلم تھا۔[2] یہ لوگ دارالاسلام سے دور رہے اور ایک بلند پایہ، باعزت اور آزاد زندگی سے محروم ہو گئے۔ انھوں نے دار الکفر میں ذلت آمیز، حقیرانہ اور بے چارگی کی زندگی گزاری۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں جہنم اور برے ٹھکانے کی وعید سنائی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے مکہ ٹھہرے رہے۔[3]

اس آیتِ کریمہ میں ہجرت سے کنارہ کشی کرنے والوں کو سنگین انجام کی وعید سنائی گئی۔ اس کا بہتر نتیجہ یہ نکلا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم حکم الٰہی کے پابند بنے اور عذاب سے بچنے کے لیے فوراً مدینہ میں قائم نئے اسلامی معاشرے کی طرف ہجرت کر گئے۔ اس وعید کا صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں پر گہرا اثر پڑا۔

ضمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ نے مکہ میں جب یہی (سابقہ) آیت سنی تو اپنے بیٹوں سے کہا: ''مجھے اٹھا کر لے چلو۔ میں بے بس اور کمزور نہیں ہوں۔ مجھے راستہ سجھائی دیتا ہے۔ میں یہ رات مکہ میں نہیں گزاروں گا۔'' انھوں نے والد کو چارپائی پر اٹھایا اور مدینہ کو عازم سفر

1 النحل 110:16، وزاد المسير لابن الجوزي: 97/2، و تفسير القاسمي: 399/3. 2 الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 161. 3 تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب: 744/2.

ہوئے۔ ضمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ خاصے عمر رسیدہ بزرگ تھے۔ تنعیم تک پہنچے تھے کہ ان کی وفات ہوگئی۔ نزع کے عالم میں انھوں نے اپنا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھا اور کہا: ''اے اللہ! ایک تیرا اور دوسرا تیرے رسول کا ہاتھ ہے۔ میں ان باتوں پر تجھ سے بیعت کرتا ہوں جن پر تیرے رسول نے بیعت کی۔'' جب یہ خبر مدینہ پہنچی تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: ''کاش وہ مدینہ میں وفات پاتے۔'' اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ۭ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُھَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَي اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾

''اور جو شخص اللہ کی راہ میں ہجرت کرے وہ زمین میں پناہ لینے کے لیے بہت جگہ اور گنجائش پائے گا۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرنے کی خاطر اپنے گھر سے نکلے، پھر اسے راستے میں موت آجائے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے واجب ہوگیا۔ اور اللہ نہایت بخشنے والا، بہت رحم کرنے والا ہے۔''[1]

ضمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کے واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حالات جیسے بھی ہوں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم حیلے بہانے تراشتے تھے نہ رعایتوں اور سہولتوں کی تلاش میں رہتے تھے بلکہ تنگی اور آسانی ہر صورت میں حکمِ الٰہی کی تعمیل کرنے کے لیے مستعد رہتے تھے۔[2]

بعض روایات میں ہے کہ ضمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ اس وقت بیمار تھے۔ مگر ان کا خیال تھا کہ وہ مالدار ہیں اور ہجرت مدینہ کی استطاعت رکھتے ہیں، اس لیے ان کا عذر قابلِ قبول نہیں۔ یہ قرآنی فہم ایمان کا الہام کردہ ہے جسے اخلاص و یقین نے صیقل کیا ہے۔[3]

اللہ تعالیٰ نے ہجرت نہ کرنے والوں کی سزا کا تذکرہ فرمایا اور بوڑھے، کمزور و بے بس

---

1 النسآء 4:100، و تفسير الآلوسي: 129,128/5، و أسباب النزول للواحدي، ص: 181.

2 الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 124. 3 الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 126,125.

افراد، عورتوں اور بچوں کو مستثنیٰ قرار دے دیا جو دارالاسلام کی پرامن زندگی سے محروم رہتے ہیں اور دارالکفر میں قیام پذیر رہنے اور دین کے معاملے میں فتنے کا شکار ہونے کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ یہ لوگ اپنے عذر کی وجہ سے معافی اور رحمت کے مستحق ہیں۔[1] اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ○ فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ○﴾

”مگر وہ مرد، عورتیں اور بچے جو واقعی بے بس ہوں اور وہ اس جگہ سے نکلنے کا کوئی وسیلہ اور کوئی راستہ نہیں پاتے، اس لیے ان لوگوں کے بارے میں امید ہے کہ اللہ انھیں معاف کر دے گا اور اللہ بہت معاف کرنے والا، نہایت بخشنے والا ہے۔“[2]

1 الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 167. 2 النسآء 4:98,99.

حصہ 9

مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست کے اولین اقدامات

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ

"البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد اول روز ہی سے تقوے پر رکھی گئی ہے اس کی زیادہ حق دار ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں۔"

(التوبۃ 9:108)

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا

"اور تم اپنے آپ پر اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، پھر اس نے تمھارے دلوں میں الفت ڈال دی اور تم اس کے احسان سے بھائی (بھائی) بن گئے۔"

(آل عمران 3:103)

رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو مضبوط اور مستحکم بنیادوں پر نئی اسلامی ریاست کے قیام کی خاطر سرگرم عمل ہو گئے۔ آپ ﷺ نے ترجیحی بنیادوں پر امت کے بنیادی ستونوں کی تعمیر کا آغاز کیا۔ مسجد نبوی کی تعمیر اور مہاجرین وانصار کے مابین اسلامی بھائی چارے کا قیام، شہر میں اسلامی دستور کا نفاذ، مسلمانوں، یہود اور مشرکینِ مدینہ کے درمیان معاہدۂ امن، مملکت اسلامیہ کی حفاظت اور دفاع کے لیے اسلامی فوج کی تشکیل، نو آموز اسلامی معاشرے کی مشکلات کا حل تلاش کرنا اور اسے زندگی کے تمام مراحل میں قانونِ الٰہی کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرنا رسول اللہ ﷺ کے اہداف و مقاصد کے اہم نکات تھے۔

دوسری طرف بھی جاری رہی۔ مدنی دور میں نازل ہونے والی سورتوں یا آیات میں اللہ تعالیٰ کی عظمت کو اجاگر کیا گیا۔ کائنات کی حقیقت بتائی گئی۔ جنت کی رغبت دلائی گئی اور جہنم سے ڈرایا گیا۔ پیش آمدہ حالات کے متعلق قانون سازی کی گئی اور اسلامی ریاست جس نے اسلامی دعوت کی اشاعت اور جہاد فی سبیل اللہ میں نمایاں کردار ادا کرنا تھا، اس کے اجزائے ترکیبی کو مستحکم کیا گیا۔ اسلامی دعوت کے ارتقا، اسلامی معاشرے کی تمدنی ترقی اور ریاست کے قیام کے ساتھ ساتھ امت کا علمی اور تربیتی سفر بھی اپنے مراحل طے کرتا رہا۔ رسول اللہ ﷺ نے تجارت اور لین دین کے احکام نافذ کر کے مدینہ کے اقتصادی بحران پر قابو پایا۔ تربیت کے میدان میں مسلم معاشرے کی بنیادیں یوں استوار ہوئیں کہ روزے فرض کیے گئے اور زکاۃ کا نظام جاری کیا گیا۔ یوں مسلم معاشرہ پھلنے پھولنے لگا اور نہایت مضبوط بنیادوں پر قائم اسلامی ریاست استحکام سے ہمکنار ہو گئی۔

باب 1

مسجد نبوی کی تعمیر

رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ میں پہلا کام مسجد نبوی کی تعمیر کا کیا تا کہ اسلامی شعائر، جواب تک مخالفت کا شکار رہتے تھے، اجاگر ہوں۔ نماز کی ادائیگی کا اہتمام ہوتا کہ رب سے تعلق مضبوط ہو اور دل دنیاوی آلائشوں سے پاک ہو جائے۔ [1]

امام بخاری رحمہ اللہ روایت لائے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنی سواری پر سوار مدینہ منورہ میں داخل ہوئے۔ لوگ آپ ﷺ کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ سواری مسجد نبوی کے مقام پر جا بیٹھی۔ ان دنوں وہاں مسلمانوں کے چند آدمی نماز پڑھا کرتے تھے۔ یہ احاطہ کھجور سکھانے کے کام آتا تھا۔ یہ جگہ سہل اور سہیل دو یتیم بچوں کی ملکیت تھی جو سیدنا اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کی زیر کفالت تھے۔ سواری بیٹھ گئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «هٰذَا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ الْمَنْزِلُ» ”ان شاء اللہ! یہی منزل ہے۔“ پھر آپ ﷺ نے دونوں یتیم بچوں کو طلب فرمایا اور ان سے اس احاطے کی قیمت طے کرنا چاہی تا کہ وہاں مسجد کا قیام عمل میں لایا جائے۔ دونوں نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! ہم یہ جگہ مسجد کے لیے وقف کرتے ہیں۔“ آپ ﷺ نے اسے وقف کے طور پر لینے سے انکار کر دیا اور ان سے یہ جگہ خرید کر ہی لی۔ [2]

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ وہاں کھجوروں کے درخت اور مشرکین کی (چند پرانی) قبریں تھیں اور کچھ جگہ ویران تھی۔ آپ ﷺ نے کھجور کے درخت کاٹنے، قبریں اکھاڑنے

1 فقه السيرة للغزالي، ص: 191، و فقه السيرة للبوطي، ص: 151. 2 صحيح البخاري، حديث: 3906.

اور ویران جگہ کو ہموار کرنے کا حکم دیا۔ درخت کاٹ کر قبلہ رخ قطار میں نصب کر دیے گئے اور چوکھٹ کے دونوں بازو پتھر کے بنائے گئے۔ اس دوران رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام یہ رجز پڑھ رہے تھے:

اَللّٰهُمَّ لَا خَيْرَ إِلَّا خَيْرُ الْآخِرَه   فَانْصُرِ الْأَنْصَارَ وَالْمُهَاجِرَه

''اے اللہ! زندگی تو بس آخرت کی زندگی ہے۔ تو انصار اور مہاجرین کی مدد فرما۔''[1]

رسول اللہ ﷺ نے اس مبارک تعمیر کی ابتدا اپنے دست مبارک سے فرمائی۔ آپ ﷺ نے کدال پکڑی اور بنیاد کھودنے کے لیے پہلی ضرب لگائی جس کے بعد تمام صحابۂ کرام سرگرمی سے مصروف عمل ہو گئے۔ تین ہاتھ گہری بنیاد کھودی گئی۔ دیواریں گارے اور کچی اینٹوں سے تیار کی گئیں جو درمیانے آدمی کے قد سے ذرا بلند تھیں۔[2] مسجد کے شمالی گوشے میں کھجور کے تنوں پر ایک چھپر کھڑا کیا گیا جس پر کھجور کی ٹہنیاں ڈالی گئیں۔ اس چھپر کو ''صفہ'' کہا جاتا تھا۔ باقی ساری مسجد بغیر چھت کے کھلی چھوڑ دی گئی۔[3]

مسجد نبوی کے تین دروازے بنائے گئے۔ ایک مسجد کی پچھلی جانب جنوبی سمت میں، دوسرا عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے کے بالمقابل مشرقی جانب جس سے گزر کر رسول اللہ ﷺ مسجد میں آتے جاتے تھے۔ تیسرا دروازہ مغربی جانب رکھا گیا جسے باب الرحمہ یا باب عاتکہ کہا جاتا ہے۔[4]

مسجد نبوی کے پہلو میں ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے حجرے

مسجد نبوی کے گردا گرد چند کمرے تعمیر کیے گئے تاکہ ان میں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اہلِ خانہ رہائش پذیر ہوں۔ یہ گھر قیصر و کسریٰ اور بادشاہوں کے محلات جیسے نہیں تھے

1 صحيح البخاري، حديث: 428، و صحيح مسلم، حديث: 524. 2 البداية والنهاية: 303/3.
3 البداية والنهاية: 303/3. 4 التاريخ السياسي والعسكري للدكتور علي معطي، ص: 157.

یہ تو اس ہستی کی رہائش گاہیں تھیں جو دنیا اور اس کی زیب و زینت سے کنارہ کش اور آخرت کی طلبگار تھی۔ یہ گھر بھی مسجد کی طرح کچی اینٹ، گارے اور پتھروں سے تیار کیے گئے تھے۔ ان کی چھتیں کھجور کے تنے اور ٹہنیوں کی تھیں۔ چھوٹی عمارت اور مختصر صحن پر مشتمل یہ حجرے اتنے اونچے تھے کہ لمبا لڑکا بآسانی چھتوں کو چھو سکتا تھا۔ حسن بصری رحمہ اللہ جو ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی لونڈی خیرہ کے بطن سے تھے، بتاتے ہیں کہ میں ان کمروں کی چھت چھو لیتا تھا۔[1]

مدینہ ان دنوں بلند و بالا قلعہ نما عمارتوں پر مشتمل تھا جنھیں مدینے کی اشرافیہ نے امن کے دنوں میں فخر کے طور پر اور جنگ کے ایام میں حفاظت کی غرض سے تعمیر کیا تھا۔ انھوں نے ان قلعوں کے مختلف نام بھی رکھے ہوئے تھے، چنانچہ عبداللہ بن ابی ابن سلول کے قلعے کا نام مزاحم (مزاحمت کار) اور حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے قلعے کا نام فارع (بلند و بالا) تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر سادگی اور عجز کا خوبصورت نمونہ تھے۔ آپ چاہتے تو بلند و بالا محلات تعمیر کروا سکتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک اشارۂ ابرو پر انصار ان کی تعمیر میں جت جاتے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ آپ ریاست کے خزانے (مالِ فے وغیرہ) کی مدد سے یہ محلات کھڑے کر لیتے لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے لیے ترکِ دنیا اور سادگی کی نہایت عظیم مثال قائم کی اور یہ سبق دیا کہ انسان اپنی ساری توانائیاں موت کے بعد پیش آنے والے حالات کو بہتر بنانے میں صرف کرے۔[2]

مدینہ منورہ میں اذان کی ابتدا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا کہ نماز کا وقت بتانے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ بعض نے نماز کے وقت علم بلند کرنے کا مشورہ دیا کہ لوگ اسے دیکھ کر نماز کے لیے آ جائیں گے۔ اس رائے پر یہ اعتراض کیا گیا کہ سونے والا اور غافل اس سے مستفید نہیں ہو سکیں گے۔ چند ایک نے کہا کہ کسی بلند ٹیلے پر آگ روشن کی جائے۔

[1] السيرة النبوية لأبي شهبة: 36/2. [2] التاريخ الإسلامي للحميدي: 13/4.

یہ رائے بھی مسترد کر دی گئی۔ دیگر افراد نے بگل بجانے کا مشورہ دیا جسے یہود نمازوں کے اوقات بتانے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہود کی مشابہت کے باعث یہ مشورہ رد کر دیا۔ بعض نے ناقوس بجانے کو کہا جسے نصاریٰ استعمال کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے بھی ناپسند کیا۔ آخر یہ تجویز سامنے آئی کہ نماز کا وقت ہو تو ایک آدمی لوگوں میں جا کر پکار لگایا کرے کہ نماز کے لیے جمع ہو جاؤ۔ یہ تجویز مان لی گئی۔ پکار لگانے والوں میں عبداللہ بن زید انصاری رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ ایک دن غنودگی کے عالم میں اُنھوں نے خواب دیکھا کہ ایک شخص ان کے سامنے آیا اور بولا: ''کیا میں آپ کو چند الفاظ نہ سکھاؤں جنھیں آپ نماز کی پکار لگاتے ہوئے کہیں؟'' عبداللہ نے جواب دیا: ''کیوں نہیں، ضرور سکھایئے۔'' اس آدمی نے کہا: ''آپ چار مرتبہ الله أكبر، دو مرتبہ أشهد أن لا إله إلا الله اور دو مرتبہ أشهد أن محمدا رسول الله، پھر دو مرتبہ حي على الصلاة اور دو مرتبہ حي على الفلاح، پھر دو مرتبہ الله أكبر اور پھر ایک مرتبہ لا إله إلا الله کہا کریں۔''

عبداللہ رضی اللہ عنہ بیدار ہوئے تو سیدھے نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا خواب کہہ سنایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّهَا لَرُؤْيَا حَقٌّ» ''واقعی یہ سچا خواب ہے۔'' آپ ﷺ نے عبداللہ رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ یہ الفاظ بلال رضی اللہ عنہ کو سکھا دیں۔ ان کی آواز آپ کی نسبت زیادہ بلند ہے۔ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ جب یہ اذان دے رہے تھے تو عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ (جلدی میں) اپنی چادر گھسیٹتے ہوئے حاضر ہوئے اور عرض کیا: ''اللہ کے رسول! اللہ کی قسم! میں نے بھی خواب میں یہی دیکھا ہے۔''[1]

سیدنا بلال بن رباح اور عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہما مؤذن مقرر ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ

---

1 سنن أبي داود، حديث: 499، و جامع الترمذي، حديث: 189، و سنن ابن ماجه، حديث: 706، و مسند أحمد: 43/4 واللفظ له.

نے حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کو اذان سکھائی تو فرمایا فجر کی اذان میں حی علی الفلاح کے بعد دو مرتبہ الصلاۃ خیر من النوم کہا کرو۔ [1] ابتدا میں اذان بلند مقام پر کھڑے ہو کر کہی جاتی تھی۔ بعد ازاں اس مقصد کے لیے مینار معرضِ وجود میں آیا۔

مدینہ منورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا خطاب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں پہلا خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

«أَمَّا بَعْدُ! أَيُّهَا النَّاسُ فَقَدِّمُوا لِأَنْفُسِكُمْ، تَعْلَمُنَّ وَاللّٰهِ لَيُصْعَقَنَّ أَحَدُكُمْ، ثُمَّ لَيَدَعَنَّ غَنَمَهُ لَيْسَ لَهَا رَاعٍ، ثُمَّ لَيَقُولَنَّ لَهُ رَبُّهُ لَيْسَ لَهُ تَرْجُمَانٌ وَّ لَا حَاجِبٌ يَّحْجُبُهُ دُونَهُ: أَلَمْ يَأْتِكَ رَسُولِي فَبَلَّغَكَ، وَ آتَيْتُكَ مَالًا، وَّ أَفْضَلْتُ عَلَيْكَ، فَمَا قَدَّمْتَ لِنَفْسِكَ فَلَيَنْظُرَنَّ يَمِينًا وَّشِمَالًا فَلَا يَرٰى شَيْئًا، ثُمَّ لَيَنْظُرَنَّ قُدَّامَهُ فَلَا يَرٰى غَيْرَ جَهَنَّمَ، فَمَنِ اسْتَطَاعَ أَنْ يَّقِيَ وَجْهَهُ مِنَ النَّارِ وَ لَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ فَلْيَفْعَلْ، وَ مَنْ لَّمْ يَجِدْ فَبِكَلِمَةٍ طَيِّبَةٍ، فَإِنَّ بِهَا تُجْزَى الْحَسَنَةُ عَشْرَ أَمْثَالِهَا إِلٰى سَبْعِمِائَةِ ضِعْفٍ، وَالسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَ بَرَكَاتُهُ»

''اما بعد! لوگو! اپنے لیے اچھے کام کر لو۔ واللہ! تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم میں سے ہر ایک موت کا نشانہ بن کر رہے گا، پھر وہ اپنی بکریوں کو ضرور ایسی حالت میں چھوڑے گا کہ ان کا کوئی چرواہا نہیں ہوگا، پھر اس کا رب اس سے کہے گا جبکہ اس کا کوئی ترجمان ہوگا نہ درمیان میں کوئی پردہ حائل ہوگا: ''کیا تیرے پاس میرا رسول نہیں آیا تھا اور اس نے تجھے میرا پیغام نہیں پہنچایا تھا؟ میں نے تجھے مال دیا

[1] سنن أبي داود، حديث: 500، البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیے صحیح سنن ابو داود میں مذکورہ حدیث۔

اور تجھ پر اپنا فضل کیا۔ تو نے اپنے لیے کون سے عمل آگے بھیجے؟'' وہ (بندہ) دائیں بائیں دیکھے گا لیکن کچھ نہیں پائے گا، پھر سامنے دیکھے گا اسے صرف جہنم نظر آئے گی، لہٰذا جس سے ہو سکے اپنا چہرہ آگ سے بچائے، خواہ کھجور کے ٹکڑے کے ذریعے سے جسے کھجور کا ٹکڑا بھی میسر نہ ہو وہ اچھی بات ہی کہہ دے۔ اتنی سی نیکی کا عوض بھی دس سے سات سو گنا تک ہوگا۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ۔''[1]

آپ ﷺ لوگوں سے دوسری مرتبہ یوں مخاطب ہوئے:

«إِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ، أَحْمَدُهُ وَ أَسْتَعِينُهُ وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ، وَ مَنْ يُّضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيكَ لَهٗ. إِنَّ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابُ اللّٰهِ، قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَيَّنَهُ اللّٰهُ فِي قَلْبِهِ وَ أَدْخَلَهُ فِي الْإِسْلَامِ بَعْدَ الْكُفْرِ وَاخْتَارَهُ عَلٰى مَا سِوَاهُ مِنْ أَحَادِيثِ النَّاسِ إِنَّهٗ أَحْسَنُ الْحَدِيثِ وَ أَبْلَغُهٗ، أَحِبُّوا مَنْ أَحَبَّ اللّٰهُ، أَحِبُّوا اللّٰهَ مِنْ كُلِّ قُلُوبِكُمْ وَلَا تَمَلُّوا كَلَامَ اللّٰهِ وَ ذِكْرَهٗ وَ لَا تَقْسُ عَنْهُ قُلُوبُكُمْ فَإِنَّهٗ مِنْ كُلِّ مَا يَخْلُقُ اللّٰهُ يَخْتَارُ وَ يَصْطَفِي، فَقَدْ سَمَّاهُ خَيْرَتَهٗ مِنَ الْأَعْمَالِ، وَ مُصْطَفَاهُ مِنَ الْعِبَادِ، وَالصَّالِحَ مِنَ الْحَدِيثِ، وَ مِنْ كُلِّ مَا أَتَى النَّاسَ مِنَ الْحَلَالِ وَالْحَرَامِ، فَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَ لَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا وَّاتَّقُوهُ حَقَّ تُقَاتِهٖ، وَاصْدُقُوا اللّٰهَ صَالِحَ مَا تَقُولُونَ بِأَفْوَاهِكُمْ، وَ تَحَابُّوا بِرَوْحِ اللّٰهِ بَيْنَكُمْ. إِنَّ اللّٰهَ يَغْضَبُ أَنْ يُّنْكَثَ

[1] السيرة النبوية لا بن هشام:2/146، و دلائل النبوة للبيهقي:2/524. روایت ضعیف ہے۔

عَهْدُهُ، وَالسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَ بَرَكَاتُهُ»

”بلاشبہ سب تعریف اللہ کے لیے ہے۔ میں اس کی حمد بیان کرتا ہوں اور اس سے مدد طلب کرتا ہوں۔ ہم اپنے نفوس کے شر اور اعمال کی برائیوں سے اللہ کی پناہ میں آتے ہیں۔ جسے اللہ ہدایت دے اسے گمراہ کرنے والا کوئی نہیں اور جسے وہ گمراہ کرے اس کا کوئی رہنما نہیں۔ اور میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ یکتا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ بے شک بہترین بات اللہ تبارک و تعالیٰ کی بات ہے۔ اللہ نے اس کتاب کی خوبی جس کے دل میں بٹھا دی اور کفر کے بعد اسے اسلام میں داخل کر لیا اور جس نے لوگوں کی باتوں پر اس کتاب کو ترجیح دی بلاشبہ وہ فلاح پا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ بہترین اور نہایت بلیغ کلام ہے۔

جس چیز سے اللہ کو محبت ہے تم بھی اس سے محبت کرو۔ دل کی گہرائیوں سے اللہ کو چاہو۔ اللہ کے کلام اور اس کی یاد سے بیزار نہ رہو۔ تمھارے دل اس سے ہٹ کر سخت نہ ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ جن چیزوں کو پیدا کرتا ہے ان میں سے بعض کو منتخب کر لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اچھے اعمال، اچھی باتوں اور اپنے برگزیدہ بندوں کے متعلق وضاحت سے بتا دیا ہے۔ جو اشیاء لوگوں کو دی گئی ہیں ان میں حلال بھی ہے اور حرام بھی۔ پس اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور اس سے یوں ڈرو جس طرح ڈرنے کا حق ہے۔ جو باتیں تم اپنے منہ سے کہتے ہو ان میں اللہ سے سچ بولو (نہایت سچائی اختیار کرو۔) اللہ کی رحمت کے سبب آپس میں ایک دوسرے سے محبت رکھو۔ اللہ اس بات سے ناراض ہوتا ہے کہ اس سے عہد شکنی کی جائے۔ والسلام علیکم۔“[1]

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 147,146/2، ودلائل النبوة للبيهقي: 525,524/2.

مسجد نبوی سے متصل اصحاب صفہ رضی اللہ عنہم کا چبوترا

مدنی زندگی کے ابتدائی سولہ مہینے بیت المقدس قبلہ رہا۔ جب بیت اللہ کو قبلہ قرار دیا گیا تو مسجد نبوی کی پچھلی جانب سابقہ قبلے کی دیوار بدستور قائم تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس پر سائبان ڈالنے کا حکم دیا۔ اس کا نام صفہ یا ظلہ (چھپر) رکھا گیا۔ اس چھت کے علاوہ اس کے گرد کوئی دیوار وغیرہ نہیں تھی۔ [1]

قاضی عیاض رحمہ اللہ نے لکھا: ''صفہ چھپر کو کہا جاتا ہے جو مسجد نبوی کی پچھلی جانب ڈالا گیا تھا۔ یہاں مساکین پناہ لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں اہل صفہ کہا گیا۔'' [2]

ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کی پچھلی جانب شمال کی طرف واقع جگہ ''صفہ'' کہلاتی تھی۔'' [3]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ رقم طراز ہیں: ''صفہ مسجد نبوی کی پچھلی جانب ایک جگہ تھی جسے سائبان سے ڈھانپا گیا تھا۔ جن مسافروں کا کوئی گھر یا ٹھکانا نہ ہوتا وہ وہاں قیام کرتے تھے۔'' [4]

اصحاب صفہ رضی اللہ عنہم: سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا کہنا ہے: ''اہلِ صفہ اسلام کے مہمان تھے۔ ان کا کوئی گھر بار، مال و متاع نہیں تھا اور نہ ہی وہ کسی کی زیرِ کفالت تھے۔'' [5]

رسول اللہ ﷺ سے پہلے، آپ کے ہمراہ یا آپ کے بعد ہجرت کرنے والے مہاجرین کو انصار مدینہ نے اپنے گھروں میں پناہ دی اور ان کے اخراجات بھی برداشت کیے۔ غزوۂ بدر سے پہلے تقریباً یہی انداز رہا۔ جب بعدازاں مہاجرین کی تعداد میں اضافہ ہوا اور ان کی کفالت کرنا انصار کے بس کی بات نہ رہی تو بہت سے بے گھر لوگ آ کر صفہ میں قیام پذیر

1 وفاء الوفاء للسمهودي: 321/1. 2 نظام الحكومة النبوية لعبد الحي الكتاني: 474/1.
3 الفتاوى لابن تيمية: 38/11. 4 فتح الباري، شرح الحديث: 3581. 5 صحيح البخاري، حديث: 6452.

ہو گئے۔[1]

اسلام جب اپنی حقانیت کے سبب پھیلنے لگا اور لوگ گروہ در گروہ دائرۂ اسلام میں داخل ہونے لگے تو فقراء، اغنیاء، خاندانوں کے خاندان اور دیگر افراد مدینہ پہنچے۔ اگر کسی کو رہائش میسر نہ آتی تو وہ مسجد نبوی میں مقامِ صفہ میں قیام کرتا۔[2]

جیسے ہی کوئی مہاجر مدینہ پہنچتا اور رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کرتا، آپ ﷺ اسے کسی انصاری کی کفالت میں دے دیتے۔ وقتی طور پر اگر کوئی انتظام نہ ہو پاتا تو وہ صفہ میں قیام کرتا۔[3]

عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کا بیان ہے: ''رسول اللہ ﷺ مدینہ میں بہت مصروف ہوتے تھے۔ جب کوئی مہاجر آتا تو اسے ہم میں سے کسی کی کفالت میں دے دیتے جو اسے قرآن کی تعلیم دیتا۔ مجھے بھی ایک مہاجر کا کفیل بنایا گیا۔ میں اسے قرآن پڑھاتا اور اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ کھانے میں بھی شریک کرتا۔''[4]

صفہ میں سب سے پہلے مہاجرین قیام پذیر ہوئے تھے، اس لیے اسے صفة المهاجرين کہا گیا۔[5] مسلمان ہو کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے والے پردیسی لوگوں کے وفود بھی یہاں قیام کیا کرتے تھے۔

اسی طرح کوئی مسلمان مدینہ پہنچتا اور وہاں اس کا کوئی جاننے والا نہ ہوتا تو وہ بھی صفہ میں قیام کرتا۔[6]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ صفہ میں ٹھہرنے والے تمام مستقل یا عارضی قیام پذیر افراد کے واقف کار تھے۔ نبی ﷺ نے جب کبھی اصحاب صفہ کی دعوت کرنا ہوتی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو پیغام

---

1 السيرة النبوية لصالح الشامي، ص: 175. 2 الفتاوى لابن تيمية:41,40/11. 3 السيرة النبوية لصالح الشامي، ص: 175. 4 مسند أحمد: 324/5. 5 وفاء الوفاء للسمهودي: 323/1.
6 السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري:259,258/1.

بھیج دیتے تو وہ انھیں بلا لاتے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اصحاب صفہ کی شخصیات اور ریاضت و عبادت میں ان کے مراتب سے بھی بخوبی آگاہ تھے۔[1]

مہاجرین کے علاوہ بعض انصار بھی علم کے حصول، زہد، مجاہدے اور فقیرانہ زندگی کے شوق میں وہاں قیام پذیر تھے، حالانکہ مدینہ میں ان کے اپنے گھر موجود تھے۔ کعب بن مالک انصاری، غسیل الملائکہ حنظلہ بن ابی عامر انصاری اور حارثہ بن نعمان انصاری رضی اللہ عنہم جیسے صحابۂ کرام ان افراد میں شامل تھے۔[2]

اہل صفہ کے اخراجات اور ان کے لیے نبی ﷺ اور صحابہ کرام کی سرپرستی:

رسول اللہ ﷺ بنفس نفیس اہل صفہ کی خبر گیری کیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ ان سے ملاقات کرتے، ان کے حالات دریافت کرتے اور ان کے مریضوں کی بیمار پرسی کے لیے جاتے۔ آپ ﷺ اکثر ان کے درمیان بیٹھا کرتے، ان کی رہنمائی کیا کرتے، دلجوئی کرتے، تعلیم دیتے، نصیحت کرتے، تلاوتِ قرآن اور اس کی تعلیم و تعلّم کی رغبت دلاتے، ذکر اور فکرِ آخرت کا درس دیتے تھے۔[3]

اہلِ صفہ کے اخراجات پورے کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کے پاس حسبِ ذیل وسائل تھے:

① صدقے کی کوئی چیز آتی تو آپ ﷺ ان کی طرف بھیج دیتے۔ تحفہ آتا تو اس میں سے خود بھی لیتے اور انھیں بھی بھیجتے۔[4]

② بسا اوقات رسول اللہ ﷺ انھیں اپنے گھر میں کھانے پر مدعو کرتے۔ آپ ﷺ ان سے کبھی تغافل نہ برتتے اور ان کے طعام و قیام کی فکر کرتے تھے۔ عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: ''اصحابِ صفہ ضرورت مند لوگ تھے۔ ایک دفعہ نبی ﷺ نے فرمایا: «مَنْ كَانَ

[1] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 259/1. [2] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 259/1. [3] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 266/1. [4] صحيح البخاري، حديث: 6452.

عِنْدَهُ طَعَامُ اثْنَيْنِ فَلْيَذْهَبْ بِثَالِثٍ، وَ مَنْ كَانَ عِنْدَهُ طَعَامُ أَرْبَعَةٍ فَلْيَذْهَبْ بِخَامِسٍ أَوْ بِسَادِسٍ» ''جس کے پاس دو آدمیوں کا کھانا ہو وہ تیسرے کو اور جس کے پاس چار آدمیوں کا کھانا ہو وہ پانچویں یا چھٹے کو اپنے ساتھ شریک کرے۔'' ابوبکر رضی اللہ عنہ تین جبکہ رسول اللہ ﷺ اصحابِ صفہ میں سے دس آدمیوں کو اپنے ہمراہ لے گئے۔[1]

یعیش بن طخفہ بن قیس غفاری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے: ''میرے والد بھی اصحابِ صفہ میں سے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن سب کو جمع کیا اور ایک ایک دو دو کر کے لوگوں کے ساتھ روانہ کر دیا۔ میرے والد کہتے ہیں: ''ہم پانچ آدمی باقی بچ گئے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: «اِنْطَلِقُوا» ''چلو!'' ''ہم سب آپ کے ہمراہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر چلے گئے۔''[2]

③ رسول اللہ ﷺ لوگوں سے کہتے تھے کہ وہ اپنے صدقات اصحابِ صفہ کو بھیجا کریں۔ روایت ہے کہ جب حسن رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ اس کا سر مونڈ دو اور بالوں کے برابر چاندی اہل صفہ پر صدقہ کرو۔[3]

④ نبی ﷺ اصحابِ صفہ کی ضروریات ہمیشہ مقدم رکھتے تھے۔ ایک دفعہ چند قیدی آئے۔ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ سے ایک خادم طلب کیا۔ آپ ﷺ نے جواب دیا: «وَاللّٰهِ! لَاأُعْطِيكُمَا وَ أَدَعُ أَهْلَ الصُّفَّةِ تُطْوٰى بُطُونُهُمْ مِّنَ الْجُوعِ، لَا أَجِدُ مَا أُنْفِقُ عَلَيْهِمْ، وَ لٰكِنْ أَبِيعُهُمْ وَ أُنْفِقُ عَلَيْهِمْ أَثْمَانَهُمْ» ''اللہ کی قسم! اہلِ صفہ فاقے کر رہے ہیں اور میرے پاس ان پر خرچ کرنے کے لیے کچھ نہیں، اس لیے تمھیں خادم نہیں ملے گا۔ میں قیدیوں کو فروخت کروں گا اور ان کی قیمت سے اہلِ صفہ کے اخراجات پورے کروں گا۔''[4]

⑤ نبی ﷺ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو اہلِ صفہ پر صدقہ کرنے کی وصیت کی تھی، چنانچہ وہ

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 3581، وصحيح مسلم، حديث: 2057. [2] مسند أحمد: 430,429/3، ومسند الطيالسي، حديث: 1339. [3] مسند أحمد: 391,390/6. [4] صحيح البخاري، حديث: 3113، و مسند أحمد: 106/1.

حسبِ استطاعت اہلِ صفہ سے صلہ رحمی کرتے اور صاحبِ حیثیت لوگ ان کے لیے کھانے کا انتظام کرتے تھے۔[1]

اہلِ صفہ کا علم، عبادت اور جہاد کے لیے وقف ہونا: اہل صفہ مسجد نبوی میں عبادت کرنے میں مشغول رہتے تھے۔ دنیا سے بے رغبتی ان کے مزاج کا حصہ تھی اور فقیرانہ زندگی سے انھیں الفت تھی۔ وہ خلوتوں میں نوافل پڑھتے، قرآن کی تلاوت کرتے، آیاتِ الٰہی پر غور وفکر کرتے اور اللہ کے ذکر میں مصروف رہتے تھے۔ بعض لکھنا پڑھنا بھی سیکھتے تھے۔ ان میں سے کسی نے عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کو اپنی کمان تحفے کے طور پر پیش کی تھی کیونکہ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ انھیں قرآن پڑھاتے اور لکھنا پڑھنا سکھاتے تھے۔[2]

ان میں سے چند افراد نے علم اور حفظِ حدیث کے میدان میں غیر معمولی ناموری حاصل کی۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کثرت سے احادیث بیان کرنے میں معروف ہوئے۔ حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہما نے فتنوں کی احادیث ازبر کر رکھی تھیں۔

اصحاب صفہ جہاد فی سبیل اللہ میں بھی شرکت کرتے تھے۔ صفوان ابن بیضاء، خریم بن فاتک اسدی، خبیب بن یساف، سالم بن عمیر اور حارثہ بن نعمان رضی اللہ عنہم بدر میں شہادت سے سرفراز ہوئے۔ غسیل الملائکہ حنظلہ رضی اللہ عنہ نے احد میں جامِ شہادت نوش کیا۔ جرہد بن خویلد اور ابوسریحہ غفاری رضی اللہ عنہ حدیبیہ میں شریک ہوئے۔[3]

ثقیف بن عمرو خیبر میں، عبداللہ ذوالبجادین تبوک میں اور سالم مولیٰ ابی حذیفہ (ابوحذیفہ کے آزاد کردہ غلام) اور زید بن خطاب رضی اللہ عنہم جنگ یمامہ میں شہید ہوئے۔ یہ لوگ اگر زاہد اور شب زندہ دار تھے تو میدانِ کارزار کے شہسوار بھی تھے۔[4]

[1] حلية الأولياء لأبي نعيم: 340/1و 378، و السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 267/1. [2] سنن أبي داود، حديث: 3416. [3] حلية الأولياء لأبي نعيم: 353/1-357. [4] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 264/1.

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ جیسے بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شوقیہ طور پر بھی اصحاب صفہ کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ فتح خیبر کے بعد 7 ھ میں مدینہ آئے تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں زیادہ سے زیادہ وقت گزاریں اور تاخیر سے مدینہ آنے کی وجہ سے جو علمی کمی رہ گئی تھی اسے پورا کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیادہ سے زیادہ باتیں سننا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رہن سہن اور حال احوال سے واقفیت بہم پہنچانا اور آپ کی خدمت کر کے دنیا و آخرت کی برکات سمیٹنا تبھی ممکن تھا جب وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے قریب رہتے اور صفہ ہی وہ واحد جگہ تھی جو اس مقصد کے حصول کے لیے موزوں ترین تھی۔

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا اپنا بیان ہے: ''آپ لوگ کہتے ہیں کہ ابوہریرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت حدیثیں بیان کرتا ہے، جبکہ مہاجرین و انصار اتنی روایات بیان نہیں کرتے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میرے مہاجر بھائی بازاروں میں تجارت کی غرض سے مصروف رہتے تھے، میں قوتِ لایموت پر گزارا کرتا اور رسول اللہ کی صحبت میں رہتا، چنانچہ لوگ غیر حاضر ہوتے مگر میں حاضر ہوتا۔ وہ بھول جاتے مگر میں یاد رکھتا۔ میرے انصاری بھائی اپنے کھیتوں کھلیانوں کی دیکھ بھال میں مشغول رہتے اور میں ٹھہرا مساکین صفہ میں سے ایک مسکین۔ میرے پاس تھا بھی کیا جس کی میں فکر کرتا، اس لیے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں بھول جاتے اور مجھے یاد رہ جاتیں۔''[1]

گویا سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اختیار کرنے کے لیے اصحاب صفہ کے ساتھ رہتے تھے، حالانکہ مدینہ میں ان کا اپنا گھر موجود تھا جہاں ان کی والدہ بھی رہتی تھیں جن کی ہدایت کے لیے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کی درخواست بھی کی تھی۔[2]

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بالکل ہی مفلوک الحال و نادار نہیں

1 صحيح البخاري، حديث:2047، وصحيح مسلم، حديث:2492. 2 صحيح مسلم، حديث: 2491، و مسند أحمد:320/2.

تھے۔ وہ خیبر سے مدینہ آئے تو پہلے ہی دن نبی ﷺ نے انھیں مالِ غنیمت سے بکریوں کا ایک ریوڑ دیا تھا۔ ایک خدمت گار غلام بھی ان کے ہمراہ تھا۔ وہ چاہتے تو صفہ میں قیام نہ کرتے لیکن وہ نبی ﷺ کی صحبت میں رہ کر آپ ﷺ کے فرامین سے فیض یاب ہونا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے فقیرانہ زندگی اختیار کی۔[1]

اہلِ صفہ کی تعداد میں نت نئے حالات کے پیشِ نظر کمی بیشی ہوتی رہتی تھی۔ کسی کو گھر میسر آ گیا تو کوئی شادی کر لیتا۔ کوئی آسودہ حال ہو گیا تو کسی کو شہادت مل جاتی۔ ان کے فقر و فاقہ کا سبب یہ نہیں تھا کہ وہ محنت کرنے سے جی چراتے تھے۔ زمخشری نے لکھا ہے کہ اہلِ صفہ دن میں کھجور کی گٹھلیاں کوٹ کر معاش کا بندوبست کیا کرتے تھے۔[2]

اہلِ صفہ کی تعداد: اصحاب صفہ کی تعداد حسبِ حالت کم و بیش ہوتی رہتی تھی۔ مدینہ میں وفود آتے تو ان کی تعداد بڑھ جاتی اور جب مہمان کم ہوتے تو تعداد بھی کم ہو جاتی۔ عام طور پر ان کی تعداد ستر کے قریب رہتی تھی۔[3]

بعض اوقات اصحابِ صفہ کی تعداد بہت زیادہ ہو جاتی، یہاں تک کہ اکیلے سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ اسّی آدمیوں کی مہمانی کرتے۔ دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مہمان بننے والے افراد ان کے علاوہ ہوتے۔[4]

اصحاب صفہ رضی اللہ عنہم کے اسمائے گرامی: اصحاب صفہ کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

① ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، جنھوں نے اپنے شوق سے اصحاب صفہ کی صحبت اختیار کر رکھی تھی۔

② ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ، یہ بھی اپنی مرضی سے صفہ میں رہتے تھے۔

③ واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ۔

④ قیس بن طخفہ غفاری رضی اللہ عنہ، یہ بھی اپنی خوشی سے وہاں ٹھہرے۔

1 السيرة النبوية لصالح الشامي، ص: 184. 2 المدينة النبوية لمحمد حسن شُرّاب: 222/1.
3 حلية الأولياء لأبي نعيم: 339/1-341. 4 حلية الأولياء لأبي نعيم: 341/1.

⑤ کعب بن مالک انصاری رضی اللہ عنہ۔

⑥ سعید بن عامر بن حذیم جمحی رضی اللہ عنہ۔

⑦ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ۔

⑧ اسماء بن حارثہ بن سعید اسلمی رضی اللہ عنہ۔

⑨ حنظلہ بن ابی عامر انصاری غسیل الملائکہ رضی اللہ عنہ۔

⑩ حازم بن حرملہ رضی اللہ عنہ۔

⑪ حارثہ بن نعمان انصاری نجاری رضی اللہ عنہ۔

⑫ حذیفہ بن اَسِید ابوسریحہ انصاری رضی اللہ عنہ۔

⑬ حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہما۔

⑭ جاریہ بن حُمیل بن نُشبہ بن قرط رضی اللہ عنہ۔

⑮ جعیل بن سراقہ ضمری رضی اللہ عنہ۔

⑯ جرہد بن خویلد اسدی رضی اللہ عنہ۔

⑰ ابولبابہ رفاعہ انصاری رضی اللہ عنہ۔

⑱ عبداللہ ذوالبجادین رضی اللہ عنہ۔

⑲ دکین بن سعید مزنی یا خثعمی رضی اللہ عنہ۔

⑳ خبیب بن یساف بن عنبہ رضی اللہ عنہ۔

㉑ خُریم بن اوس طائی رضی اللہ عنہ۔

㉒ خُریم بن فاتک اسدی رضی اللہ عنہ۔

㉓ خُنیس بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ۔

㉔ خبّاب بن ارتّ رضی اللہ عنہ۔

㉕ حکم بن عمیر ثُمالی رضی اللہ عنہ۔

㉖ حرملہ بن ایاس یا حرملہ بن عبداللہ عنبری رضی اللہ عنہ۔

㉗ زید بن خطاب رضی اللہ عنہ۔

㉘ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ۔

㉙ طفاوی دوسی رضی اللہ عنہ۔

㉚ طلحہ بن عمرو نضری رضی اللہ عنہ۔

㉛ صفوان ابن بیضاء فہری رضی اللہ عنہ۔

㉜ صہیب بن سنان رومی رضی اللہ عنہ۔

㉝ شداد بن اسید رضی اللہ عنہ۔

㉞ شقران رضی اللہ عنہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام۔

㉟ سائب بن خلاد رضی اللہ عنہ۔

㊱ سالم بن عمیر اوسی جو بنو ثعلبہ بن عمرو بن عوف سے تعلق رکھتے تھے۔

㊲ سالم بن عبید اشجعی رضی اللہ عنہ۔

㊳ سالم رضی اللہ عنہ، یہ ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام ہیں۔

㊴ سفینہ رضی اللہ عنہ، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام ہیں۔

㊵ ابو رزین رضی اللہ عنہ۔

㊶ اغر مزنی رضی اللہ عنہ۔

㊶ بلال بن رباح رضی اللہ عنہ۔

㊸ براء بن مالک رضی اللہ عنہ۔

㊹ ثوبان رضی اللہ عنہ، یہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام ہیں۔

㊺ ثابت بن ودیعہ انصاری رضی اللہ عنہ۔

㊻ ثقف بن عمرو بن سمیط اسدی رضی اللہ عنہ۔

47. سعد بن مالک ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ۔

48. عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ۔

49. غرفہ ازدی رضی اللہ عنہ۔

50. عبدالرحمٰن بن قُرط رضی اللہ عنہ۔

51. عبادہ بن خالد غفاری رضی اللہ عنہ۔ [1]

بعض ٹیڑھے صوفیاء نے اہلِ صفہ کے طرزِ عمل کو دلیل بنا کر معاش کی تگ و دو ترک کردی اور رہبانیت و گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کرلی، حالانکہ ان کا یہ استدلال بالکل غلط ہے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ جو صفہ کے اراکین میں سے تھے، ہمیشہ صفہ میں نہیں رہے۔ انھوں نے زندگی کی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیا۔ وہ عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں بحرین کے گورنر مقرر ہوئے۔ ان کی طبیعت میں کوئی کھردراپن یا خشکی نہیں تھی۔ [2] اہلِ صفہ مردمیدان اور مجاہد لوگ تھے۔ ان میں سے چند ایک نے جامِ شہادت بھی نوش کیا۔

فوائد و مسائل، اخلاقی اسباق اور اہم نکات

اسلامی معاشرے میں مسجد کا کردار

اسلامی معاشرے کی عمارت میں مساجد کی حیثیت مضبوط ستون کی ہے۔ اسلامی معاشرے کی پختگی اور یکجہتی کا انحصار اسلامی نظام اختیار کرنے، عقیدۂ توحید اپنانے اور اسلامی آداب کو دائرۂ عمل میں لانے پر ہے۔ یہ خصوصیات مسجد کی روحانی فضا ہی میں پروان چڑھتی ہیں۔ [3] اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿لَاتَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ۚ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ

---

[1] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 263/1. [2] السيرة النبوية لصالح الشامي، ص: 188,186. [3] فقه السيرة للبوطي، ص: 203.

﴿تَقُوْمَ فِيْهِ ۚ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۚ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ○﴾

''(اے نبی!) آپ اس مسجد (ضرار) میں کبھی بھی کھڑے نہ ہوں، البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد اول روز ہی سے تقوے پر رکھی گئی ہے اس کی زیادہ حق دار ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں۔ اس میں ایسے لوگ ہیں جو (اس بات کو) پسند کرتے ہیں کہ وہ پاک صاف ہوں اور اللہ پاک صاف رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''[1]

ایک اور موقع پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ○ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصٰرُ ○ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۗ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○﴾

''یہ (چراغ اور قندیلیں) ان گھروں میں ہیں (جن کی بابت) اللہ نے حکم دیا ہے کہ ان کو بلند کیا جائے اور ان میں اللہ کا نام ذکر کیا جائے (اور) وہ وہاں صبح و شام اس کی تسبیح کرتے ہیں، وہ لوگ جنھیں تجارت اور خرید و فروخت، اللہ کے ذکر اور نماز قائم کرنے اور زکاۃ دینے سے غافل نہیں کرتی، وہ اس دن سے ڈرتے ہیں جس میں دل اور آنکھیں الٹ پلٹ جائیں گے، (وہ یہ کام کرتے ہیں) تاکہ اللہ انھیں ان کے اعمال کی بہترین جزا دے اور انھیں اپنے فضل سے زیادہ دے اور اللہ جسے چاہے بے حساب رزق دیتا ہے۔''[2]

مسجد اسلامی جامعیت کی علامت ہے

مسجد کا قیام نماز ادا کرنے، اللہ کا ذکر کرنے، اس کی تسبیح و تقدیس بیان کرنے اور اس

[1] التوبة 108:9. [2] النور 24:36-38.

کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے لیے عمل میں آتا ہے۔ مسلمان وہاں نماز پڑھتا اور دیگر عبادات بجالاتا ہے۔ جب تک وہ مسجد کا تقدس ملحوظ خاطر رکھے اور اس کے احترام کا حق ادا کرتا رہے، کوئی اسے گزند نہیں پہنچا سکتا۔

❁ مسجد نبوی کے قیام کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ نبی ﷺ اور صحابۂ کرام کے لیے ملاقات کا مرکز ہو اور بیرونِ مدینہ سے آنے والے بھی یہیں رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کریں۔ [1]

❁ مسجد نبوی اس لیے بھی قائم کی گئی کہ وہ ان عقلی ونقلی علوم کی یونیورسٹی ثابت ہو جن کے متعلق قرآن کریم میں غور وخوض کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور وہ ایسا مدرسہ بنے جس میں اہل ایمان اسلامی احکامات کی تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری کریں، نیز دنیا کے ہر گوشے سے تشنگانِ علم اس ادارے میں پہنچیں اور علمی پیاس بجھائیں، پھر واپس جا کر اپنی قوم کو اللہ کی طرف بلائیں اور یہ سلسلہ نسل در نسل چلتا رہے۔

❁ مسجد نبوی کے قیام کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اجنبی مسافر کسی کا احسان لینے کے بجائے وہاں قیام کرے اور اپنی عقلی ونفسیاتی استعداد کے مطابق رشد و ہدایت کی کرنوں سے بہرہ ور ہو اور اسے کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ کتنے ہی عظیم لیڈر اس ادارے کے فیض یافتہ ہوئے اور اس کی دیواروں کے سایے تلے ان کے جوہر کھلے۔ اس کی آغوش میں کتنے ہی علماء علم کا سمندر بنے، پھر لوگوں کی علمی پیاس بجھاتے رہے۔ داعی اور مبلغین وہاں سے دعوت الی اللہ کا سبق سیکھ کر نکلے اور دنیائے اسلام کے داعیوں اور مبلغین کے لیے اسوہ (Role Model) بنے۔ ایسا بھی ہوتا کہ اکھڑ مزاج، کھردرا اور ان پڑھ اعرابی (بدو) اس مسجد میں آتا، صحابہ کرام کو نبی ﷺ کے گرد حلقہ بنائے دیکھتا کہ وہ آپ کی باتیں سر جھکائے غور سے سن رہے ہیں گویا ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں وہ بدو بھی ان کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی باتیں سماعت کرتا۔ جاہلیت کے پردوں میں چھپی عقل سے پردہ ہٹ جاتا، وہ دین کی سمجھ حاصل

[1] محمد رسول اللہ ﷺ لصادق عرجون: 33/3.

کرتا اور ہدایت و روشنی پاتا، پھر وہ واپس اپنی قوم کے پاس جاتا، اپنے علم و کردار کی قوت سے ان کی تربیت کرتا، سب لوگ اس کی دعوت پر ایمان لے آتے، اس کی رہنمائی میں اسلام کے راستے پر چلتے اور تاریخ اسلامی کی کتب میں اپنے لیے سنہری سطریں تحریر کرا لیتے۔[1]

❁ مسجد نبوی کی حیثیت ایک قلعے کی تھی جہاں مجاہدین جہاد پر روانگی سے قبل جمع ہوتے، یہیں قائدین کے لیے جہادی عَلَم باندھے جاتے جن کے زیر سایہ اللہ کے سپاہی فتح یا شہادت کی طلب میں روانہ ہوتے تھے۔

❁ مسجد نبوی سے ہسپتال کی خدمات بھی لی جاتی تھیں۔ وہاں زخمی مجاہدین کا علاج کیا جاتا۔ نبی ﷺ ان کی عیادت کو گاہے گاہے وہاں تشریف لاتے اور ان کے لیے دوا دارو کا بندوبست کرتے۔

❁ مسجد نبوی پیغام رساں ادارے کا کام بھی دیتی تھی۔ یہاں سے خبریں اور خطوط ارسال کیے جاتے۔ صلح یا جنگ کی سیاسی خبریں بھی یہیں موصول ہوتی تھیں۔ کمک کی طلب یا فتح و نصرت کے پیغامات بھی یہیں ملتے۔ شہید ہونے والے افراد کے ناموں کا اعلان بھی یہیں کیا جاتا تھا۔

❁ مسجد نبوی رصد گاہ کا کام بھی دیتی تھی جہاں سے دشمن کی حرکات و سکنات کا پتا چلتا تھا۔ خاص طور پر یہود، منافقین اور ان مشرکین کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جاتا تھا جو شرک میں ڈوبے ہوئے تھے اور اسے چھوڑنا ان کے بس میں نہیں تھا۔ اس نگرانی اور خبر گیری کا یہ فائدہ ہوتا تھا کہ مسلمان ایسے لوگوں کی تدابیر اور مکر و فریب سے محفوظ رہنے اور ان کی طرف سے عہد شکنی یا خیانت کا شکار ہونے سے بچ جاتے۔[2]

رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو اولین فرصت میں مسجد تعمیر کی تاکہ ان تمام مقاصد کا حصول بآسانی ممکن ہو اور گھروں کی تعمیر میں لوگ سادگی کے اس نمونے کی پیروی کریں۔[3]

[1] محمد رسول اللہ ﷺ لصادق عرجون:3/34,35. [2] محمد رسول اللہ ﷺ لصادق عرجون: 3/34-36. [3] محمد رسول اللہ ﷺ لصادق عرجون:3/33.

کردار کے ذریعے سے تعلیم و تربیت

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ نبی ﷺ نے صحابۂ کرام کے ہمراہ مسجد نبوی کی تعمیر میں عملی طور پر حصہ لیا۔ آپ ﷺ اپنے سینے اور کندھوں پر پتھر اور اینٹیں ڈھوتے اور عام لوگوں کے ساتھ مل کر ہاتھوں سے زمین کھودتے تھے۔ یوں آپ ﷺ نے حاکمِ عادل کی ایک خوبصورت مثال قائم کی۔ ایک ایسا حاکم جو امیر و مامور، قائد و کارکن اور غنی و فقیر میں کوئی فرق روا نہیں رکھتا۔ اللہ کے حضور سبھی ایک ہیں۔ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان پر سوائے تقویٰ کے اور کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ اسلام عدل اور مساوات کا نام ہے۔ بلند درجہ اس شخص کو حاصل ہے جو رفاہ عامہ کے کاموں میں مال و متاع خرچ کرتا ہے۔ اسی بلند درجے سے اللہ کا ثواب وابستہ ہے۔ نبی ﷺ بھی دیگر مسلمانوں کی طرح اللہ کے ثواب ہی کے طلبگار تھے۔ [1]

رسول اللہ ﷺ نے عام لوگوں کی طرح مسجد کی تعمیر میں حصہ لیا۔ صرف یہ نہیں کہ ریشمی فیتہ کاٹنے یا کدال کی افتتاحی ضرب لگانے پر اکتفا کیا ہو بلکہ عملی طور پر تعمیر میں حصہ لیا۔ رسول اللہ ﷺ مٹی میں لت پت تھے۔ مسلمان آپ کو دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔

سیدنا اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ یہ منظر دیکھ کر آگے بڑھے تاکہ آپ کا بوجھ اٹھا لیں اور عرض کی: ''اے اللہ کے رسول! یہ پتھر مجھے دے دیجیے۔'' نبی ﷺ نے جواب دیا: «اِذْهَبْ فَاحْتَمِلْ غَيْرَهُ، فَإِنَّكَ لَسْتَ بِأَفْقَرَ إِلَى اللّٰهِ مِنِّي» ''آپ مجھ سے بڑھ کر اللہ کی رحمت کے محتاج نہیں، آپ دوسرا پتھر پکڑ لیں۔'' [2] یہ جواب سن کر مسلمان زیادہ تندہی سے تعمیر کے کام میں مصروف ہو گئے۔ [3]

---

[1] التاريخ السياسي والعسكري للدكتور علي معطي، ص: 158. [2] سبل الهدىٰ والرشاد للصالحي: 337/3. [3] التاريخ السياسي والعسكري للدكتور علي معطي، ص: 158.

یہ اپنی نوعیت کا انوکھا طرز عمل ہے جس کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ حکمران طبقے کے افراد کبھی کبھار عام لوگوں کے ساتھ صرف اس وقت کام میں شریک ہوتے ہیں جب ٹیلی ویژن اور دیگر ذرائع ابلاغ انھیں کوریج دینے کو تیار ہوں تاکہ لوگ ان کے اخلاق و انکسار کے گن گائیں۔ ادھر نبی کریم ﷺ کو اپنا بوجھ کسی اور کے سر ڈالنا گوارا نہیں تھا اور نہ دکھاوا مقصود تھا بلکہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں بھی اللہ کی رحمت کا محتاج اور اس کے ثواب کا امیدوار ہوں۔ مسجد کی تعمیر میں صحابۂ کرام نے رسول اللہ ﷺ سے گہری ہم آہنگی کا مظاہرہ کیا۔ کام کے دوران وہ درج ذیل رجزیہ اشعار گنگناتے رہتے تھے:

لَئِنْ قَعَدْنَا وَالنَّبِيُّ يَعْمَلُ   لَذَاكَ مِنَّا الْعَمَلُ الْمُضَلَّلُ

”رسول اللہ ﷺ کام کریں اور ہم بیٹھے رہیں تو یہ ایک گمراہ کن عمل ہوگا۔“[1]

یہ عملی تربیت خالی خولی وعظ یا چرب زبانی سے نہیں ہوتی۔ اس کے لیے عمل پیہم کی زندہ مثال قائم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ مکہ کی ہولناک فضاؤں میں ایسی مثال قائم کرنا ناممکن تھا جہاں مسلمان شدید دباؤ کا شکار تھے۔ یہ مثال اس نئے معاشرے اور جدید ریاست ہی میں قائم ہو سکی۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کام میں مصروف ہوتے اور ہم آہنگ ہو کر پکارتے:

اَللّٰهُمَّ! إِنَّهُ لَا خَيْرَ إِلَّا خَيْرُ الْآخِرَه   فَانْصُرِ الْأَنْصَارَ وَالْمُهَاجِرَه

”اے اللہ! آخرت کی زندگی ہی اصل زندگی ہے تو انصار و مہاجرین کی مدد فرما۔“

وہ یک زبان ہو کر کہتے:

لَئِنْ قَعَدْنَا وَالنَّبِيُّ يَعْمَلُ   لَذَاكَ مِنَّا الْعَمَلُ الْمُضَلَّلُ

”رسول اللہ ﷺ کام کریں اور ہم بیٹھے رہیں تو یہ ایک گمراہ کن عمل ہوگا۔“

1 السيرة النبوية لابن هشام: 496/1، و فتح الباري، شرح الحديث: 3906.

تیسری آواز یہ تھی:

هٰذَا الْحِمَالُ لَا حِمَالَ خَيْبَرْ هٰذَا أَبَرُّ لِرَبِّنَا وَأَطْهَرْ

''یہاں ہم جو کچھ اٹھا رہے ہیں وہ (تجارت کی) ان اشیاء سے مختلف ہے جو خیبر سے لائی جاتی ہیں۔ یہ ہمارے رب کے نزدیک ان اشیاء سے بہتر اور زیادہ پاکیزہ ہے۔''[1]

دراصل کھجور اور منقیٰ جو بطور تجارت خیبر سے مدینہ لایا جاتا، مدینہ میں اس کی بڑی قدر تھی لیکن اب خیبر سے کھجور اور منقیٰ اٹھا لانے کے بجائے ان اینٹوں کا تذکرہ ہونے لگا جو مسجد نبوی کی تعمیر کے لیے اٹھائی جاتی تھیں، گویا لوگوں نے یقین کرلیا تھا:

﴿مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ﴾

''جو کچھ تمھارے پاس ہے وہ فنا ہو جائے گا اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ (ہمیشہ) باقی رہنے والا ہے۔''[2]

چوتھا نعرہ یہ تھا:

لَا يَسْتَوِي مَنْ يَعْمُرُ الْمَسَاجِدَا يَدْأَبُ فِيهَا قَائِمًا وَّقَاعِدًا

وَمَنْ يُّرٰى عَنِ الْغُبَارِ حَائِدًا

''مساجد تعمیر کرنے والے اور ان میں ہمیشہ قیام و قعود کرنے والے اور مٹی سے بچنے کے لیے دور بھاگنے والے برابر نہیں ہیں۔''[3]

کارکنان کے تجربے اور پیشہ ورانہ مہارت کی پہچان

طلق بن علی یمامی حنفی رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے، انھوں نے بتایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مسجد نبوی کی تعمیر میں حصہ لیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «قَرِّبُوا الْيَمَامِيَّ مِنَ

[1] صحيح البخاري، حديث: 3906 و 3932، والسيرة النبوية لابن هشام: 25/3. [2] النحل 96:16. [3] فتح الباري، شرح الحديث: 3906، والسيرة النبوية لابن هشام: 142/2.

الطِّينِ، فَإِنَّهُ أَحْسَنُكُمْ لَهُ مَسِيسًا» ''یمامی کو گارے کے قریب کرو۔ یہ تم لوگوں سے اچھا گارا بناتا ہے۔''[1] ایک اور روایت میں ہے: طلق بن علی یمامی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم مسجد نبوی کی تعمیر میں مصروف تھے۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ آپ کو ان کا کام پسند نہیں آ رہا، میں نے بیلچا اٹھایا اور گارا ملانے لگا۔ آپ کو میرا کام پسند آیا تو فرمایا کہ گارے کا کام حنفی کے سپرد کرو یہ تم لوگوں سے بہتر گارا بناتا ہے۔''[2]

ابن حبان طلق کی روایت لائے ہیں کہ انھوں نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا: ''کیا میں بھی ان کی طرح پتھر ڈھوؤں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں! تم گارے کا کام سنبھالو کیونکہ تم اس کے ماہر ہو۔''[3]

نبی ﷺ نے مدینہ میں نووارد کو اہمیت دی جو نومسلم بھی تھا اور گارے کے کام میں اس کے تجربے سے فائدہ اٹھایا۔ آپ کے اس طرزِ عمل سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہنر مند افراد کی صلاحیتوں کو سراہنے کے ساتھ ساتھ ان سے استفادہ بھی کریں۔ مذکورہ حدیث سے اس کے متعلق بھی بابرکت نبوی رہنمائی ملتی ہے کہ ایسے ہنر مند افراد سے کیسا معاملہ کیا جائے۔ آج ہمیں اس گہری سمجھ بوجھ کی ضرورت بھی بہت ہے۔[4]

اذان اسلامی ریاست کا شعار

اذان پہلی عالمی اسلامی ریاست کا شعار ہے۔ اللّٰہ أکبر کا مطلب ہے کہ اللہ تمام سرکشوں اور اقامت دین کے راستے میں رکاوٹ ڈالنے والوں سے برتر ہے۔ وہ اپنا کام کر کے رہتا ہے۔ أشهد أن لا إله إلا اللّٰه کا مطلب یہ ہے کہ حاکمیت، سیادت اور اختیار صرف اللہ رب العالمین کا ہے۔ فرمان باری تعالیٰ ہے: ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ ''حاکمیت صرف

[1] مجمع الزوائد: 9/2. [2] المعجم الكبير للطبراني، حديث: 8254، و مجمع الزوائد: 9/2.
[3] صحيح ابن حبان، رقم: 1122. [4] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 252/2.

اللہ کی ہے۔'' چنانچہ لا إلٰه إلا اللّٰه کے معنی یہ ہوئے کہ حاکم اور شارع صرف اللہ ہے۔

أشهد أن محمدا رسول اللّٰه کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو قیادت عطا فرمائی ہے جسے ان سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ یہ الفاظ اس امر کا اعتراف ہیں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، امت مسلمہ کی دینی و دنیاوی قیادت آپ ﷺ کے ہاتھ میں ہے اور زندگی کے ہر معاملے میں آپ ہی کی بات قولِ فیصل مانی جائے گی۔ [1]

حی علی الصلاۃ، حی علی الفلاح کا مطلب یہ ہے کہ اے انسان! اسلامی ریاست کے جھنڈے تلے آ جاؤ جو اللہ کے لیے مخلص ہے اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کی بنیاد پر مسلمان کا اپنے رب اور دیگر مسلمانوں کے ساتھ تعلق مضبوط کرنا اس کے اہداف میں شامل ہے۔

قد قامت الصلاۃ کا مطلب یہ ہے کہ نماز کو جملہ عبادات پر فوقیت حاصل ہے کیونکہ یہ دین کا ستون ہے۔ اس میں رکوع وسجود اور قیام جیسے ارکان عبادت کا بڑا روپ ہیں۔ ان ارکان میں عبادت اپنے وسیع ترین مفہوم کے ساتھ آ گئی ہے۔

عبادت کے مفہوم میں خشوع وخضوع، عجز و انکسار، درماندگی اور جھکاؤ کے مطالب شامل ہیں۔ نماز میں ایسا انکسار پایا جاتا ہے جس سے اوپر کوئی انکسار نہیں۔ اللہ کی اطاعت کا ہر وہ عمل عبادت ہے جو خشوع وخضوع اور عجز و انکسار کے طور پر انجام دیا جائے۔ اس کی صورت حال وہی ہے جس میں غلام اپنے آقا کی اطاعت کرتا ہے اور عجز و انکسار اور اطاعت کے جذبات دل میں بسائے اس کے حضور خود سپردگی کے عالم میں دست بستہ کھڑا ہوتا ہے۔ کتاب اللہ میں مرقوم ہے:

﴿قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا جَآءَنِیَ الْبَیِّنٰتُ مِنْ رَّبِّیْ وَاُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾

1 دولة الرسول من التكوين إلى التمكين للدكتور كامل سلامة، ص:438.

''آپ کہہ دیجیے: بے شک مجھے اس سے روک دیا گیا ہے کہ میں ان کی عبادت کروں جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو جبکہ میرے پاس میرے رب کی طرف سے واضح نشانیاں آگئیں اور مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں رب العالمین کا فرماں بردار رہوں۔''[1]

اذان کے الفاظ اسلامی ریاست کا شعار بنے، یہ ریاست کو اللہ کی حاکمیت اور شریعت کی بالادستی سے جوڑتے ہیں۔ یہ الفاظ طاغوت اور اس کے نظام کے اختتام کا اعلان کرتے ہیں۔ حی علی الفلاح اور قد قامت الصلاۃ سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ نماز کا کما حقہ اہتمام اسلامی ریاست کے زیر سایہ ہی ممکن ہے۔ مسلمان مکہ کی گھاٹیوں میں چھپ کر نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ انصار کے تعاون سے اس اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آیا تو کھلے عام اذان واقامت کہی جانے لگی اور لوگ بلا خوف وخطر رب العالمین کے حضور سربسجود ہوئے۔

تاریخی حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کا حق صرف اور صرف ایک مضبوط ریاست کے زیر سایہ ہی ادا ہوسکتا ہے جو رعایا کو دشمنوں کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رکھے۔

اذان کے الفاظ دہرانے سے مقصود یہ ہے کہ اس کے مطالب کی تاکید ہو۔[2]

ہمیں اذان اور اس کے معانی کے فہم وادراک کی بہت ضرورت ہے تاکہ ہم اس کی عملی تصویر بن کر اللہ کے راستے میں جہاد کریں اور کفر کے نعرے مٹا کر ایمان کے نعرے بلند کریں۔ توحید کی بنیاد پر اسلامی ریاست قائم ہو اور قوانین الٰہی نافذ العمل ہوں۔

مساجد کو چونا گچ کرنے اور اُن کی تزئین وآرائش کا شرعی حکم

علمائے کرام نے مساجد کو چونے وغیرہ سے پلستر کرنے کی اجازت دی ہے اور اسے اچھا عمل قرار دیا ہے۔ حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما نے مسجد نبوی کو از سرنو پختہ انداز

[1] المؤمن 40:66. [2] دولة الرسول من التكوين إلى التمكين للدكتور كامل سلامة، ص:439.

سے تعمیر کیا اور اس کی توسیع و تزئین بھی کی تھی۔

مساجد میں نقش و نگار بنانے کو جمہور علماء نے مکروہ جانا ہے۔ بعض نے اس عمل کو حرام قرار دیا ہے اور بعض اس کے مکروہ تنزیہی ہونے کے قائل ہیں، البتہ یہ دونوں فریق اس بات پر متفق ہیں کہ مساجد کی تعمیر کے لیے خاص فنڈ نقش و نگار اور تزئین و آرائش کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔[1]

سب سے پہلے مساجد کی زیبائش ولید بن عبدالملک نے کی تھی۔ اس دن سے لوگ مساجد کی تزئین و آرائش میں مبالغہ آرائی سے کام لے رہے ہیں، حتی کہ بعض مساجد نے عجائب گھروں اور سیر گاہوں کی صورت اختیار کر لی ہے۔ یہ صورت حال رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات سے لگا نہیں کھاتی۔[2]

آج کل مساجد کی تعمیر و ترقی کے ذمے دار اپنی پوری کوشش اُن کی تزئین و آرائش اور نقش و نگار بنانے میں صرف کرتے نظر آتے ہیں۔ جو ایک بڑی غلطی ہے۔ مسجد میں آنے والا بندگی کے تقاضے بھول کر جدید انداز تعمیر اور زیبائش و آرائش میں کھو جاتا ہے۔ فقراء و مساکین بھی دنیاوی جھمیلوں سے نکل کر کہیں پناہ حاصل نہیں کر سکتے۔ پہلے لوگ مساجد کا رخ کرتے اور دنیا کے تفکرات سے پیچھا چھڑا کر اللہ کی یاد اور فکرِ آخرت میں لگے رہتے تھے۔ مساجد میں دنیاوی شان وشوکت کا ایسا سامان فراہم ہو چکا ہے جو مساجد میں بھی اس طبقے کی حوصلہ شکنی کرنے اور اسے کم مائیگی کا احساس دلانے کے لیے کافی ہے۔ مسلمانوں کی حالت قابل رحم ہے کہ وہ اسلامی حقائق پسِ پشت ڈال کر ایسے مناظر میں کھو چکے ہیں جو بظاہر تو دین سے متعلق ہیں لیکن در پردہ دنیا اُن میں اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ موجود ہے۔[3]

---

1 فقه السيرة للبوطي، ص: 145. 2 السيرة النبوية لأبي شهبة: 33/2. 3 فقه السيرة للبوطي، ص: 146.

مسجد نبوی کے فضائل

نبی ﷺ نے مسجد نبوی کے فضائل بیان کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے دل اس مسجد میں اٹکے رہتے تھے۔ ان فضائل کی تلخیص ذیل میں پیش کی جاتی ہے:

مسجد نبوی کی بنیاد تقوی پر: ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ہاں آیا اور سوال کیا: ''اے اللہ کے رسول! وہ کون سی مسجد ہے جس کی تاسیس تقوی پر ہوئی؟'' اس پر آپ ﷺ نے کنکریوں کی مٹھی بھری اور زمین پر مارتے ہوئے کہا: «هُوَ مَسْجِدُكُمْ هٰذَا» ''وہ آپ کی یہ مسجد ہے۔''[1]

بعض علمائے کرام نے اُن احادیث میں کلام کیا ہے جن کے مطابق مسجد نبوی ہی وہ مسجد ہے جس کی تاسیس تقویٰ پر ہوئی تھی۔ اُن کا کہنا ہے کہ یہ احادیث قرآن کی اس آیت کے خلاف ہیں:

﴿لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ۚ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ۚ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۚ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ۝﴾

''(اے نبی!) آپ اس مسجد (ضرار) میں کبھی بھی کھڑے نہ ہوں، البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد اول روز ہی سے تقوے پر رکھی گئی ہے اس کی زیادہ حق دار ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں۔ اس میں ایسے لوگ ہیں جو (اس بات کو) پسند کرتے ہیں کہ وہ پاک صاف ہوں اور اللہ پاک صاف رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''[2]

سورۂ توبہ کی اس آیت میں تقویٰ پر قائم ہونے والی مسجد سے مراد کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ مسجد نبوی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ وہ مسجد قباء ہے۔ طبری رحمہ اللہ نے علماء کے اقوال درج کر کے لکھا: ''میرے نزدیک راجح قول

[1] صحيح مسلم، حديث: 1398، و جامع الترمذي، حديث: 3099، و مسند أحمد: 8/3، و السنن الكبرىٰ للنسائي: 36/2. [2] التوبة 108:9.

یہ ہے کہ اس مسجد سے مراد ''مسجد نبوی'' ہے کیونکہ یہ صحیح روایت سے ثابت ہے۔''[1]

درحقیقت یہ حدیث اور آیت کی اس تفسیر کے درمیان کہ تقویٰ کی بنیاد پر قائم ہونے والی مسجد ''مسجد قباء'' ہے، کوئی اختلاف نہیں۔[2] شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے لکھا: ''آیت مسجد قباء کے بارے میں نازل ہوئی تھی لیکن اس سے مراد مسجد قباء بھی ہے اور اس سے زیادہ تقویٰ کی حامل مسجد نبوی بھی۔ یہ صفت دونوں مساجد پر صادق آتی ہے۔ یوں وہ حدیث بھی صحیح سلامت رہتی ہے جو صحیح سند سے ثابت ہے جس میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''وہ میری یہ مسجد ہے۔''[3]

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ ایک اور موقع پر لکھتے ہیں: ''تو معلوم ہوا کہ دونوں مسجدیں تقویٰ پر قائم ہوئی ہیں۔ لیکن مسجد نبوی اس وصف میں زیادہ کامل ہے، چنانچہ وہ اس نام کی حق دار بھی مسجد قباء سے بڑھ کر ہے۔ ہاں نزولِ آیت کا سبب مسجد قباء ہی ہے۔''[4]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ رقم طراز ہیں: ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی مسجد کے لیے تقویٰ پر قائم ہونے کی صفت بیان کرنا دراصل اس خیال کی نفی تھی کہ یہ وصف صرف مسجد قباء میں پایا جاتا ہے۔''[5]

مسجد نبوی میں نماز ادا کرنے کی فضیلت: ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «صَلَاةٌ فِي مَسْجِدِي هٰذَا خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ صَلَاةٍ فِيمَا سِوَاهُ إِلَّا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ» ''میری مسجد میں پڑھی ہوئی نماز مسجد حرام کے سوا کہیں بھی پڑھی ہوئی ایک ہزار نمازوں سے افضل ہے۔''[6]

مسجد نبوی تین مساجد میں سے ایک ہے: سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلَّا إِلٰى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ: اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، وَمَسْجِدِ الرَّسُولِ، وَمَسْجِدِ الْأَقْصٰى» ''کجاوے باندھ کر (حصولِ برکت

[1] تفسير الطبري:14/476-479. [2] الأحاديث الواردة في فضائل المدينة لصالح الرفاعي، ص: 372. [3] منهاج السنة النبوية لابن تيمية:7/74. [4] الفتاوىٰ لا بن تيمية:27/406. [5] فتح الباري: 7/245. [6] صحيح البخاري، حديث: 1190، و صحيح مسلم، حديث:(507,506)- 1394.

اور زیادتِ ثواب کی نیت سے) صرف تین مساجد کا سفر کیا جاسکتا ہے: مسجد حرام، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ۔'' [1]

جنت کا ایک باغ: سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: «مَا بَيْنَ بَيْتِي وَ مِنْبَرِي رَوْضَةٌ مِّنْ رِّيَاضِ الْجَنَّةِ، وَ مِنْبَرِي عَلٰى حَوْضِي» ''میرے گھر اور منبر کی درمیانی جگہ جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے اور میرا منبر حوض پر ہوگا۔'' [2]

مسجد نبوی میں تعلیم و تعلم کی فضیلت: سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا: «مَنْ دَخَلَ مَسْجِدَنَا هٰذَا لِيَتَعَلَّمَ خَيْرًا أَوْ لِيُعَلِّمَهُ، كَانَ كَالْمُجَاهِدِ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ، وَ مَنْ دَخَلَهُ لِغَيْرِ ذٰلِكَ كَانَ كَالنَّاظِرِ إِلٰى مَا لَيْسَ لَهُ» ''جو شخص ہماری اس مسجد میں آیا اور بھلائی کی بات سیکھی یا سکھلائی وہ (مقام و مرتبے میں) مجاہد فی سبیل اللہ کی طرح ہے۔ اور جو کسی اور غرض سے آیا وہ اُس شخص کی طرح ہے جو ایسی شے پر نگاہ ڈالتا ہے جو اُس کی نہیں۔'' [3]

اہل صفہ اور حاجت مند مہاجرین کے متعلق نازل ہونے والی آیت

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 1189، و صحيح مسلم، حديث: (511)-1397. [2] صحيح البخاري، حديث: 1196، و صحيح مسلم، حديث: 1391. [3] سنن ابن ماجه، حديث: 227، و مسند أحمد: 350/2، و المستدرك للحاكم: 91/1.

وضاحت: جو شخص مسجد نبوی میں داخل ہو اور کسی قسم کی بھلائی کی بات نہ سیکھے اور نہ سکھائے تو اس کی مثال اس شخص کی طرح ہے جو بازار میں داخل ہوتا ہے، نہ تو کچھ خریدتا ہے اور نہ کچھ بیچتا ہے بلکہ لوگوں کا سامان دیکھ کر چلا جاتا ہے۔ اس سے اسے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ دیکھیے: (حاشية السندي على سنن ابن ماجة: 211/1)

الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا ۗ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ○﴾

''(صدقات تو) ان ضرورت مندوں کے لیے ہیں جو اللہ کے کاموں میں ایسے مشغول ہوں کہ (اپنے روزگار کے لیے) زمین میں دوڑ دھوپ نہ کر سکتے ہوں، ناواقف شخص ان کے سوال نہ کرنے کی وجہ سے انھیں مال دار خیال کرے، تم انھیں ان کے چہروں سے پہچان لو گے، وہ لوگوں سے چمٹ کر سوال نہیں کرتے اور تم اپنے مال میں سے جو کچھ خرچ کرتے ہو، بے شک اللہ اسے خوب جاننے والا ہے۔''[1]

ابن سعد رحمہ اللہ اپنی سند سے ابن کعب قرظی سے روایت کرتے ہیں کہ ''فقراء'' (حاجت مندوں) سے مراد اصحابِ صفہ ہیں۔''[2]

امام طبری رحمہ اللہ مجاہد اور سدی کا قول نقل کرتے ہیں کہ آیت کا مصداق حاجت مند مہاجرین ہیں۔[3]

دیگر کئی احکامات بھی مسجد نبوی کی تعمیر سے متعلق ہیں جن میں یتیموں کے حقوق کی پاسداری، پرانی قبریں اکھاڑنا اور زمین پاک صاف ہوجائے تو وہاں مسجد کے قیام کا جواز وغیرہ شامل ہیں۔ طوالت کے خوف سے انھی فوائد و مسائل اور اخلاقی اسباق کے تذکرے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

1 البقرة2:273. 2 الطبقات الكبرىٰ لابن سعد:1/255. 3 تفسير الطبري:5/591.

باب 2

مواخاتِ مدینہ

نبی ﷺ نے امت مسلمہ اور اسلامی ریاست کی ترقی کے لیے جو پروگرام مرتب کیا اُس میں دعوت توحید جاری رکھنا، قرآن کی راہنمائی میں آگے بڑھنا، مسجد نبوی کی تعمیر اور مہاجرین و انصار کے درمیان بھائی چارے کا قیام شامل تھا۔ مواخات کا عمل ایک ایسا اقدام تھا جو اہمیت میں مسجد نبوی کی تعمیر سے کم نہ تھا۔ اس کا مقصد اسلامی معاشرے میں باہمی الفت کو فروغ دینا اور اس جدید ڈھانچے کے خدوخال اجاگر کرنا تھا۔[1]

صحابۂ کرام کے درمیان عام بھائی چارے کا ماحول تو مکی دور میں دعوت اسلامی کے آغاز ہی سے پیدا ہو چکا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ہر اس حرکت سے منع کر رکھا تھا جو اہلِ اسلام کی صفوں میں انتشار پھیلنے اور حسد و بغض پیدا ہونے کا سبب بنے۔ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: «لَا تَبَاغَضُوا، وَ لَا تَحَاسَدُوا، وَ لَا تَدَابَرُوا، وَ كُونُوا عِبَادَ اللّٰهِ إِخْوَانًا، وَ لَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يَهْجُرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ» ”آپس میں بغض اور حسد نہ رکھو۔ ایک دوسرے سے چہرہ مت پھیرو۔ اور اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ۔ اور کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ تین دن سے زیادہ اپنے (مسلمان) بھائی سے ناراض رہے۔“[2]

ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: «اَلْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ، لَا يَظْلِمُهُ

1 الإدارة الإسلامية في عصر عمر بن الخطاب للدكتور مجد لاوي، ص:53,52. 2 صحيح البخاري، حديث:6065و6076، وصحيح مسلم، حديث:2559.

وَلَايُسْلِمُهُ، وَمَنْ كَانَ فِي حَاجَةِ أَخِيهِ، كَانَ اللّٰهُ فِي حَاجَتِهِ، وَ مَنْ فَرَّجَ عَنْ مُّسْلِمٍ كُرْبَةً، فَرَّجَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِّنْ كُرُبَاتِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ» ''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ وہ اس پر ظلم نہیں کرتا، نہ اسے دشمن کے سپرد کرتا ہے۔ جو اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرے اللہ اس کی ضرورت پوری کرتا ہے۔ اور جو مسلمان اپنے بھائی کو کسی مشکل سے نکالتا ہے اللہ تعالیٰ اسے روز قیامت کی مشکلات میں سے کسی مشکل سے نکالے گا۔ اور جو اپنے بھائی کے عیبوں پر پردہ ڈالے اللہ قیامت کے دن اس کے عیبوں پر پردہ ڈالے گا۔''[1]

خود قرآن کریم نے ابنائے امت کے درمیان اخوت اور بھائی چارے کی ضرورت پر زور دیا ہے چنانچہ فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۚ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۗ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾

''اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور جدا جدا نہ ہو اور تم اپنے آپ پر اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، پھر اس نے تمھارے دلوں میں الفت ڈال دی اور تم اس کے احسان سے بھائی (بھائی) بن گئے۔ اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے، پھر اس نے تمھیں اس میں گرنے سے بچا لیا، اللہ تعالیٰ اسی طرح تمھارے لیے اپنی آیتیں بیان کرتا ہے شاید کہ تم ہدایت پاؤ۔''[2]

ایک اور موقع پر فرمایا:

---

[1] صحيح البخاري، حديث:2442، و صحيح مسلم، حديث:2580. [2] آل عمرٰن 3:103.

﴿وَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ ۚ لَوْ أَنفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَّا أَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ أَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۚ إِنَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾

''اور اس نے ان (مومنوں) کے دلوں میں الفت ڈال دی اگر آپ دنیا بھر کے سب خزانے خرچ کر دیتے تو بھی ان کے دلوں میں الفت پیدا نہ کر سکتے لیکن اللہ ہی نے ان میں الفت ڈالی۔ بے شک وہ زبردست (اور) خوب حکمت والا ہے۔''[1]

ان آیات میں عام طور پر قائم ہونے والی مواخات کا تذکرہ تھا۔ مدنی دور میں قائم ہونے والی مواخات خاص تھی جو شرعی حکم کے تحت تھی اور اس کے نتیجے میں اہل ایمان پر کچھ حقوق و فرائض عائد ہوتے جن کی اہمیت تمام مسلمانوں کے عام حقوق و فرائض سے کہیں زیادہ تھی۔[2]

بعض علمائے کرام اس خاص مواخات کا وجود عہد مکی میں بھی ثابت کرتے ہیں۔ بلاذری رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ نبی ﷺ نے ہجرت سے قبل مکہ میں مسلمانوں کے مابین حق اور غمخواری کی بنیاد پر مواخات قائم کی تھی، چنانچہ آپ ﷺ نے ایک طرف حمزہ اور زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما، ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما اور عثمان اور عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہما کو مواخات کی لڑی میں پرو دیا۔ دوسری طرف زبیر بن عوام اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما، عبیدہ بن حارث اور بلال حبشی رضی اللہ عنہما اور مصعب بن عمیر اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہما کو بھائی بھائی بنایا۔ ابوعبیدہ بن جراح اور سالم مولیٰ ابی حذیفہ رضی اللہ عنہما اور سعید بن زید بن عمرو بن نفیل اور طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہما اور خود اپنے اور علی رضی اللہ عنہ کے درمیان اخوت کے تعلقات قائم کیے۔''[3]

بلاذری (المتوفی 276ھ) وہ پہلے فرد ہیں جنھوں نے مکی مواخات کا تذکرہ کیا ہے۔ بعد ازاں علامہ ابن عبدالبر (المتوفی 463ھ) نے بھی اُن کا نام لیے بغیر مکی مواخات کا ذکر

---

[1] الأنفال 63:8. [2] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري:240/1. [3] أنساب الأشراف للبلاذري:270/1، والسيرة النبوية لابن هشام:150/2-152.

کیا اور ان دونوں ائمہ کے بعد ابن سید الناس نے بلاذری یا ابن عبدالبر کا حوالہ دیے بغیر مکی زندگی کی مواخات کے بارے میں لکھا ہے۔ [1]

امام حاکم نے جمیع بن عمیر کی سند سے ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت نقل کی کہ انھوں نے بتایا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر و عمر، طلحہ و زبیر، عبدالرحمن بن عوف اور حضرت عثمان میں سے ہر دو کے درمیان بھائی چارہ قائم کر دیا تھا۔'' [2] اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی یہ روایت نقل کی ہے: ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زبیر اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کے درمیان مواخات کا رشتہ قائم کیا تھا۔'' [3]

ابن قیم اور ابن کثیر رحمہ اللہ مواخات مکہ کے قائل نہیں۔ ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں مہاجرین کو مواخات کے رشتے میں گانٹھا تھا۔ علی رضی اللہ عنہ کو آپ نے اپنا بھائی بنایا تھا اور جو مواخات مدینہ میں ہوئی وہ دوسری مواخات تھی، جبکہ درست یہ ہے کہ مواخات کا سلسلہ صرف ایک دفعہ مدینہ میں پیش آیا تھا۔ مہاجرین کو وطن اور اسلام کی اخوت اور خون کے رشتوں کی وجہ سے آپس میں مواخات کی ضرورت نہیں تھی۔'' [4]

ابن کثیر رحمہ اللہ نے تحریر کیا: ''ابن قیم رحمہ اللہ کی بیان کردہ علّت کے باعث علمائے کرام نے مکی بھائی چارے کی روایت کو درست نہیں مانا۔'' [5]

فن سیرت پر لکھی جانے والی بنیادی کتب میں مکہ کی مواخات کا تذکرہ نہیں ملتا۔ بلاذری نے «قالوا» (مورخین کا کہنا ہے) کے لفظ سے یہ روایت نقل کی ہے۔ یہ انداز اس کے ضعیف ہونے کی چغلی کھاتا ہے۔ خود بلاذری کو بھی ناقدین حدیث نے ضعیف قرار دیا ہے۔ بالفرض اس مواخات کے وقوع کو صحیح تسلیم کر بھی لیا جائے تو یہ مواخات ایک

[1] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 1/240. [2] المستدرك للحاكم: 3/314.
[3] المستدرك للحاكم: 3/314. [4] زاد المعاد: 2/79. [5] السيرة النبوية لابن كثير، ص: 228.

دوسرے کی مدد اور خیر خواہی پر قائم ہوئی تھی۔ اس کے نتیجے میں بھائی چارے کے زمرے میں آنے والے افراد کو ایک دوسرے کی وراثت کے حقوق حاصل نہیں ہوتے تھے۔ [1]

مدینہ منورہ میں باقاعدہ مواخات کا اہتمام

مواخات کے نظام نے امت کو یکجا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ تعلق مکمل بھائی چارے کی مضبوط بنیادوں پر استوار کیا جس نے جاہلیت کے تعصّبات مٹادیے۔ اب غیرت وحمیت صرف اسلام کے لیے تھی۔ خون، رنگ ونسل اور وطن کے امتیازات ختم ہوگئے۔ اسلام کی نظر میں ترقی وتنزلی کا معیار تقویٰ اور انسانیت ٹھہرا۔

رسول اللہ ﷺ نے اس بھائی چارے کو ایک نافذ العمل معاہدے کی شکل دی تھی۔ یہ خالی خولی الفاظ کی سوداگری نہیں تھی۔ اس عمل کے ڈانڈے جان و مال کی قربانی سے ملے ہوئے تھے۔ یہ حروف سپاس نہیں تھے جو بارہا زبانوں پر جاری ہوتے ہیں لیکن اُن میں کوئی تاثیر نہیں ہوتی۔ مواخات کے اس عظیم عمل میں ایثار وقربانی اور محبت و ہمدردی کے بیش قیمت جذبات کی آمیزش تھی جس نے جدید اسلامی معاشرے کو عمدہ طرزِ عمل کے بہترین نمونوں سے بھر دیا تھا۔ [2]

مہاجرین و انصار کے درمیان قائم ہونے والی مواخات کی تقویت کا باعث وہ دین تھا جو انھوں نے دل و جان سے اختیار کیا تھا۔ اس دین کا پہلا سبق یہ تھا کہ جو کہو وہ کر کے بھی دکھاؤ۔ اس دین نے ایمان اور عمل دونوں کی یکساں تعلیم دی۔ وہ لوگ معاشرے میں رائج کھوکھلے نعروں سے کوسوں دور تھے۔ اُن کی حالت وہی تھی جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے کیا ہے:

﴿اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾

”بس مومنوں کی تو بات ہی یہ ہے جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے

---

[1] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 241/1. [2] فقه السيرة للغزالي، ص: 194,193.

جاتے ہیں تاکہ وہ ان کے مابین فیصلہ کرے تو وہ کہتے ہیں: ہم نے سنا اور اطاعت کی اور وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔" [1]

مسلمان جب علم و عمل کی تصویر بنے تو یہ اخوت مضبوط اور دیرپا ثابت ہوئی اور اس کی بدولت اللہ کے دین اور اس کے نبی ﷺ کو تقویت ملی جس کے مثبت اثرات دعوت دین کے تمام مراحل میں نمایاں طور پر نظر آئے۔ مواخات کا خوش کن اثر اس وقت بھی ظاہر ہوا جب نبی مکرم ﷺ کی وفات کے بعد سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ چنا گیا تھا۔ انصار کو اُن کے نفوس نے اس بات کی اجازت نہیں دی کہ وہ غلبے اور تسلط کے فطری جذبات اور حکمرانی کی خواہش کے زیر اثر امت کا شیرازہ بکھیرنے کا باعث بنیں، چنانچہ جلد ہی صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر مہاجرین و انصار کے دونوں گروہوں کا اتفاق ہو گیا۔

مواخات مدینہ کا عمل ایک عظیم تر سیاسی سوچ کا نتیجہ تھا جس سے رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین و انصار کے دلوں میں الفت ڈال دی اور اُن کے اندر محبت کے جذبات راسخ کر دیے۔ صحابۂ کرام نے بھی اس بے مثال بھائی چارے اور الفت و محبت کے سلسلے کو دوام بخشنے کے لیے انتھک محنت کی بلکہ وہ مواخات کی شقوں پر عمل درآمد کرنے اور کرانے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ [2]

اس عمل میں انصار کا کردار بہت نمایاں تھا جسے بیان کرنے میں سیرت نگاروں نے زبان و بیان کی سحر آفرینیوں سے کیسا ہی فائدہ اٹھایا ہو لیکن وہ اس دلکشی اور جمال آفرینی کو نہیں پا سکے جو اللہ تعالیٰ کے بیان میں ہے: [3]

﴿وَالَّذِينَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْإِيمَانَ مِن قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝﴾

[1] النور 51:24. [2] فصول في السيرة النبوية لعبد المنعم السيد، ص:200. [3] هجرة الرسول و صحابته في القرآن والسنة لأحمد عبد الغني، ص:245.

''اور (مالِ فَے ان کے لیے ہے) جنھوں نے (مدینہ کو) گھر بنا لیا تھا اور ان (مہاجرین) سے پہلے ایمان لا چکے تھے، وہ (انصار) ان سے محبت کرتے ہیں جو ان کی طرف ہجرت کرے اور وہ اپنے دلوں میں اس (مال) کی کوئی حاجت نہیں پاتے جو ان (مہاجرین) کو دیا جائے اور اپنی ذات پر (ان کو) ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود انھیں سخت ضرورت ہو اور جو کوئی اپنے نفس کے لالچ سے بچا لیا گیا تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''[1]

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے انصار کے حق میں پانچ باتوں کی شہادت دی ہے:

① انصار کا مہاجرین کی آمد سے قبل مدینہ میں جگہ بنانا اور ایمان لانا۔

② مہاجرین کے لیے محبت کے جذبات۔

③ مہاجرین کو جو کچھ دیا جائے انصار اس کی حاجت نہیں پاتے یا ان کے دلوں میں اس سے حسد پیدا نہیں ہوتا۔

④ مہاجرین کو اپنی ذات پر ترجیح دینا گو خود تنگی کا سامنا کرنا پڑے۔

⑤ یہ لوگ اپنے نفوس کے لالچ سے محفوظ رکھے گئے ہیں۔ نتیجتاً یہ فلاح پانے والے ہیں۔[2]

یہ آیت سبق آموز اور حکمت بھری باتوں سے پر ہے جن میں سے چند ایک کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

① مدینہ منورہ کو الدّار یعنی خاص گھر کے لفظ سے اس لیے تعبیر کیا گیا کہ اس امر کا اظہار ہو کہ یہ وہاں کے باشندوں اور بیرون شہر سے آ کر رہائش اختیار کرنے والے ہر فرد کا ذاتی گھر ہے جس کے اندر امن و امان اور صلح و آشتی کا دور دورہ ہوتا ہے۔ الدار کے لفظ سے اس امر کے اظہار میں ایک نوع کی نفسانی طمانیت کا احساس پایا جاتا ہے۔ انصار اپنے اس گھر میں ایمان کی دولت سے مالا مال امن و امان اور مادی استحکام کی زندگی گزار رہے

---

1 الحشر 9:59. 2 التربیة القیادیة للدکتور الغضبان: 284/2.

تھے۔ان پر سکینت نازل ہو رہی تھی جس نے انھیں اپنے نور کے ہالے میں لے رکھا تھا۔ رحمت کی چار دیواری ان کے ارد گرد قائم تھی جس کے ہوتے ہوئے انھیں کوئی خطرہ نہیں تھا اور نہ پریشانی و اضطراب ہی وہاں دم مارتے تھے۔

② ﴿مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ میں ھُمْ کی ضمیر سے مراد مہاجرین ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ انصار نے مہاجرین کی آمد سے قبل مدینہ منورہ کو گھر بنایا اور ایمان لائے۔ اگرچہ مہاجرین ان سے پہلے مسلمان ہوئے لیکن انصار کی طرح انھیں کوئی ایسا گھر نصیب نہ ہوا تھا جس میں مادی استحکام نصیب ہو اور وہ دشمن کے حملوں سے اپنے جان و مال اور ایمان کو محفوظ سمجھتے ہوں۔ مہاجرین نے ایمان اپنایا تھا لیکن انھیں پر امن خطۂ ارض میسر نہ آیا تھا جبکہ انصار کو دونوں چیزیں حاصل تھیں۔

③ ایک نکتے کی بات یہ ہے کہ قرآن نے انصار کی تعریف سے پہلے مہاجرین کی تعریف کی ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيٰرِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝﴾

”(مالِ فَے) ان مہاجر فقراء کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور اپنی جائیدادوں سے نکالے گئے، وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضا ڈھونڈتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ سچے ہیں۔“ [1]

اپنے دارو بلاد میں دوسروں کو ٹھہرانے پر انصار کی تعریف کی اور دارو بلاد کے چھن جانے پر مہاجرین کی مدح و ستائش کی کیونکہ انھوں نے اللہ کے فضل اور اس کی رضا کی تلاش میں گھر گنوایا تھا۔ انھوں نے اللہ کے دین کی مدد کی تو اللہ نے ان کی مدد کی۔ رسول اللہ ﷺ کی رسالت مان کر اور اس کی دعوت پر لبیک کہہ کر انھوں نے رسول کی مدد کی۔ اللہ نے

[1] الحشر 8:59.

انھیں سچائی کے گراں قدر وصف سے نوازا اور بتایا کہ لوگ اس دین کی حمایت کرنے اور صاف گوئی میں ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں۔ اللہ نے مہاجرین کی یہ بلند ترین خصوصیات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿أُولَٰٓئِكَ هُمُ ٱلصَّٰدِقُونَ ۝﴾

''یہی لوگ سچے ہیں۔''[1]

دوسری طرف عام مسلمانوں کو حکم دیا کہ سچے لوگوں کی ہمراہی میں آ جاؤ۔

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَكُونُوا۟ مَعَ ٱلصَّٰدِقِينَ ۝﴾

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو اور سچ بولنے والوں کے ساتھ ہو جاؤ۔''[2]

﴿مِن قَبْلِهِمْ﴾ میں جس اولیت کو انصار کی مدح قرار دیا گیا ہے اس میں اشارہ تھا کہ وہ مہاجرین کے حقوق پہچانیں جنھوں نے اللہ کے فضل اور اس کی رضا کے لیے اپنے گھر بار اور مال و متاع کی قربانی دی۔ اللہ کے دین اور پیغمبر کی مدد کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ صرف اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے مکہ جیسے گھر کو خیر باد کہا جہاں ان کی جائیدادیں اور قریبی رشتے دار تھے۔ وہ انصار سے پہلے ایمان لائے اور ان کے ساتھ دارِ امن مدینہ میں آ کر رہنے لگے۔ یوں مہاجرین کے لیے ایمان اور مدینہ میں رہائش اختیار کرنے کا عمل پورا ہو گیا۔ پہلے پہل ایمان قبول کرنے کی فضیلت میں ان کا کوئی ہمسر نہیں۔ سچی محبت کی بنیاد پر قائم ہونے والے بھائی چارے (مواخات) کی عمارت کو انصار نے مدد اور پناہ کے دو مضبوط ستونوں کا سہارا دیا۔ ان کی یہ خوبی بیان کرتے ہوئے کہا گیا: ﴿يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ﴾ کہ وہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے ان کی طرف آئیں۔ انصار میں یہ خوبی اللہ کی محبت کی وجہ سے پیدا

[1] الحشر 8:59. [2] التوبة 119:9.

ہوئی، جسے اللہ نے ان کی فضیلت اور مہاجرین کے مقابلے میں انصار کا امتیازی وصف قرار دیا۔ مہاجرین جو اپنے گھر بار اور جائیدادوں سے بے دخل کر دیے گئے، صرف اس لیے کہ وہ اللہ کی رضا کے متلاشی تھے اور اس کے فضل کی موسلا دھار اور پیہم بارش سے سیراب ہونا چاہتے تھے۔ وہ اپنے پہلوؤں میں ایسے دل اٹھائے پھرتے تھے جو انصار کی محبت سے آباد تھے۔ انصار جو اخلاصِ محکم سے بہرہ ور تھے اور اخلاص بھی وہ جو اللہ کی خاطر محبت کا ثمرہ تھا۔ ان کے متعلق کہا گیا: ﴿وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ أُوتُوا﴾ یعنی ان کے مہاجر بھائیوں کو ایمان میں سبقت، گھر بار کے سلسلے میں قربانیاں اور نصرت دین پر کمر بستہ ہونے کی وجہ سے جو فضیلت ملی ہے اس کی طرف وہ جھانکتے ہیں نہ اس میں سے کسی چیز کے حصول یا اس میں شراکت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

④ ﴿يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ﴾ میں انصار کی مہاجرین سے محبت پر مبنی صفت کی جس احسن پیرائے میں مدح سرائی کی گئی ہے وہ قیامت تک ہوتی رہے گی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایمان باللہ اور مال و منال اور گھر بار کی قربانی جیسے اعمال ہی بقا کی ضمانت ہیں، جبکہ دنیاوی مال و متاع تو قابل فنا ہیں۔

﴿وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ أُوتُوا﴾ میں انصار کی جس محبت اور اخلاص کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ اس صفت کی وجہ سے اعلیٰ درجے پر فائز ہیں۔ یہ اسی محبت کا اثر ہے کہ انھوں نے مہاجرین کے لیے سب کچھ قربان کر دیا اور ایثار کی اعلیٰ مثال قائم کی۔

⑤ ﴿وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ یہ محبت سے حاصل ہونے والے نتیجے کا بیان ہے۔ یہ محبت ایمان کے چشمے سے جاری ہوئی تھی۔ اس محبت نے انصار کو اتنی بلندی پر فائز کر دیا کہ قدیم و جدید تاریخ میں کوئی اس مقام پر نہ پہنچ سکا۔

⑥ اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کو پچھلی آیت میں سچائی کے لقب سے اور انصار کو اس آیت میں فلاح و کامیابی کے لقب سے نوازا۔ انصار کی سابقہ صفات کو بیان کرنے کے بعد اللہ نے

ان سے بخیلی کی نفی کرتے ہوئے انھیں جود وسخا کے عظیم مرتبے پر فائز کردیا، چنانچہ فرمایا:
﴿ وَمَنْ يُّوقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ ﴾ [1]

مواخات میں شریک چند مہاجرین اور ان کے بھائی بند انصار کے اسمائے گرامی

مہاجرین	انصار
ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ	خارجہ بن زہیر رضی اللہ عنہ
عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ	عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ
ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ	سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ
عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ	سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ
زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ	سعد بن سلامہ بن وقش رضی اللہ عنہ
طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ	کعب بن مالک رضی اللہ عنہ
سعید بن زید رضی اللہ عنہ	ابی بن کعب رضی اللہ عنہ
مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ	ابوایوب خالد بن زید رضی اللہ عنہ
ابوحذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ رضی اللہ عنہ	عباد بن بشر بن وقش رضی اللہ عنہ
عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما	حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہما
ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ	منذر بن عمرو رضی اللہ عنہ
حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ	عویم بن ساعدہ رضی اللہ عنہ
سلمان فارسی رضی اللہ عنہ	ابودرداء رضی اللہ عنہ
بلال (موذن رسول) رضی اللہ عنہ	ابورویحہ عبداللہ بن عبدالرحمن خثعمی رضی اللہ عنہ [2]

[1] ملخص از محمد رسول اللہ ﷺ لصادق عرجون: 3/94-98. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 2/109-111، و السيرة النبوية لابن كثير: 2/324.

اسباق، دروس اور فوائد ومسائل

عقیدے کا رشتہ مضبوط تعلقات کی بنیاد ہے

مدینے کا معاشرہ خالص عقیدے کی بنیاد پر قائم ہوا تھا۔ یہ معاشرہ اللہ اور اس کے رسول کی حمایت اور اہل ایمان کی خیر خواہی وطرفداری کے سوا کچھ نہیں جانتا تھا۔ یہ تعلق وارتباط کی نہایت اعلیٰ اور ارفع قسم ہے اور اس کی روح فکر اور عقیدے کی وحدت سے منسلک تھی۔[1]

اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے کہ ابنِ نوح اگرچہ پیغمبر کا بیٹا تھا لیکن جب وہ حق سے پھرا اور اللہ کے نبی نوح علیہ السلام کی حکم عدولی کر کے کفر کا مرتکب ہوا تو سیدنا نوح علیہ السلام سے اس کی نسبت ختم کر دی گئی، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: ﴿قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ﴾ ''اللہ نے کہا: اے نوح! بے شک وہ تیرے اہل میں سے نہیں، بے شک اس کا عمل نیک نہیں۔''[2] اسلامی تعلیمات کے مطابق اہلِ ایمان ہی ایک دوسرے کے دوست اور بھائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝﴾ ''مومن تو (ایک دوسرے کے) بھائی ہیں، لہٰذا تم اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کرادو اور تم اللہ سے ڈرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔''[2]

اہلِ ایمان اور مشرکین و یہود ونصاریٰ کے آپس کے دوستانہ تعلقات کی اور خونی رشتوں کی نفی کرنا اور یہود ونصاریٰ ومشرکین سے تعلقات بڑھانے والے مسلمان کو ظالم قرار دینا اس بات کی دلیل ہے کہ اہلِ ایمان کی کافروں سے دوستی و رشتہ داری بڑا گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝﴾

[1] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 252/1. [2] هود 46:11. [3] الحجرات 10:49.

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تمھارے باپ اور بھائی ایمان پر کفر کو پسند کریں تو تم (ہرگز) انھیں دوست نہ بناؤ۔ اور تم میں سے جو ان کو دوست بنائیں گے تو وہی لوگ ظالم ہیں۔''[1] اللہ تعالیٰ نے ایک اور موقع پر فرمایا:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهٰدًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَيْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ وَمَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ○ اِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَآءً وَّيَبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ وَاَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْٓءِ وَوَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ○﴾

''اے ایمان والو! تم میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ، تم ان کی طرف دوستی کا پیغام بھیجتے ہو، حالانکہ وہ (اس) حق (سچے دین) کے منکر ہوئے ہیں جو تمھارے پاس آیا ہے، وہ رسول کو اور تمھیں بھی جلاوطن کرتے ہیں، اس لیے کہ تم اپنے رب اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ اگر تم میرے راستے میں جہاد کرنے اور میری رضا ڈھونڈنے کے لیے نکلے ہو، (تو کفار کو دوست نہ بناؤ)، تم ان کو دوستی کا خفیہ پیغام بھیجتے ہو اور میں خوب جانتا ہوں جو تم چھپاتے ہو اور جو ظاہر کرتے ہو اور تم میں سے جو کوئی ایسا کرے گا تو یقیناً وہ سیدھی راہ سے بھٹک گیا۔ اگر وہ تمھیں (کہیں) پائیں تو تمھارے دشمن ہو جائیں اور اپنے ہاتھ اور اپنی زبانیں تمھاری طرف دراز کریں برائی (کی نیت) سے اور وہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تم بھی (دین حق کے) منکر ہو جاؤ۔''[2]

ان آیات میں اہلِ ایمان کے لیے کفار کی طرف قلبی میلان رکھنے کا حکم امتناعی جاری

[1] التوبة 9:23. [2] الممتحنة 60:1,2.

کیا گیا ہے۔ دوسری طرف خاص طور پر اہلِ کتاب کی اطاعت، ان سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے اور ان کی طرف میلان رکھنے سے روکا گیا ہے۔[1] ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۭ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۭ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاۗءَھُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ﴾

’’اور یہودی اور عیسائی آپ سے ہرگز راضی نہ ہوں گے یہاں تک کہ آپ ان کی ملت کی پیروی کریں۔ کہہ دیجیے: بے شک اللہ کی ہدایت ہی حقیقی ہدایت ہے اور آپ کے پاس جو علم آ گیا اس کے بعد اگر آپ نے ان کی خواہشات کی پیروی کی تو آپ کو اللہ (کی پکڑ) سے (بچانے والا) نہ کوئی حمایتی ہو گا اور نہ کوئی مددگار۔‘‘[2]

ایک اور موقع پر فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّھَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ﴾

’’اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تم اہل کتاب کے ایک فریق کی بات مانو گے تو وہ تمھارے ایمان لانے کے بعد تمھیں کافر بنا کر چھوڑیں گے۔‘‘[3]

ارشادِ ربانی ہے:

﴿يٰٓاَيُّھَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَاۗءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾

[1] الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 417. [2] البقرة 2:120. [3] آل عمران 100:3.

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یہودیوں اور عیسائیوں کو دوست نہ بناؤ، وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تم میں سے جو کوئی ان سے دوستی رکھے گا تو بے شک وہ انھی میں سے ہوگا۔ یقیناً اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''[1]

سید قطب رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''سابقہ آیت میں خطاب اگرچہ مدنی مسلمانوں کو ہے لیکن بیک وقت یہ خطاب قیامت تک دنیا کے اطراف و اکناف میں بسنے والے ہر مسلمان کو ہے۔ جب یہ حکم نازل ہوا تو اہل ایمان کو اس علیحدگی کی فوری ضرورت تھی کیونکہ مسلمان یہود و نصاریٰ سے گھل مل کر رہتے تھے اور ان کے آپس میں دوستی، تعاون، تجارت اور ہمسائیگی کے تعلقات تھے جو زمانۂ قدیم سے عرب اور یہود کے درمیان استوار چلے آ رہے تھے۔ ایسے حالات میں یہود کو بآسانی موقع ملتا تھا کہ وہ دین کے خلاف سازشوں کا جال بچھانے میں اپنا مکارانہ کردار ادا کریں۔ مسلمانوں کے لیے قرآن کریم کا یہی پیغام تھا کہ وہ نئے معاشرے کی تشکیل میں عقیدۂ توحید پر قائم رہیں اور اہلِ کفر سے مکمل طور پر علیحدگی اختیار کریں۔

ایک سچے مسلمان کا فرض ہے کہ وہ یہود و نصاریٰ اور دیگر کفار کے معاملے میں اخلاقی اقدار کو ملحوظ خاطر رکھے لیکن قلبی رجحانات صرف اللہ، اس کے رسول اور اہلِ ایمان کی طرف ہوں۔ مسلمانوں میں نسل در نسل یہ شعور اجاگر ہونا چاہیے اور علیحدگی و امتیاز قائم کرنے کی تحریک ہر علاقے میں اٹھنی چاہیے۔

﴿بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ﴾ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا کسی خاص زمانے سے کوئی تعلق نہیں۔ دراصل یہ حقیقت متعلقہ اشیاء کی فطرت سے پھوٹتی ہے۔ عالم کفر کسی علاقے میں اور تاریخ کے کسی موڑ پر عالم اسلام کا کبھی خیر خواہ نہیں رہا۔ صدیوں پر گزرتی صدیاں اس امر کی سچائی پر گواہ ہیں۔ یہ قاعدہ (یہود و نصاریٰ ایک دوسرے کے دوست

1 المآئدة 5:51.

ہیں) ایک بار بھی نہیں ٹوٹا اور اس زمین میں ہمیشہ وہی ہوتا آیا ہے جسے قرآن نے زور دار الفاظ میں بیان کیا ہے۔

قرآن نے یہود و نصاریٰ کی اس دائمی سرشت کا اظہار جملہ اسمیہ کے ذریعے سے کیا ہے جو دوام پر دلالت کرتا ہے۔ ﴿بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ﴾ یہ محض ایک تعبیر نہیں بلکہ دائمی اور حقیقی وصف بیان کرنے کے لیے واضح الفاظ کا بہترین چناؤ ہے۔[1]

اللہ تعالیٰ نے منافقین سے دوستانہ تعلقات رکھنے کی بھی ممانعت فرمائی ہے۔ یہ طبقہ اللہ کے دین کا دشمن اور کفار کا دلی دوست ہوتا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۝﴾

''(اے نبی!) منافقوں کو خبردار کر دیجیے کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے، جو مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بناتے ہیں، کیا وہ ان کافروں کے ہاں عزت تلاش کرتے ہیں؟ پھر بے شک عزت تو ساری اللہ ہی کے لیے ہے۔''[2]

مدنی آیات میں بھی منافقین سے علیحدگی اختیار کرنے کا اشارہ ملتا ہے۔ فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جٰهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۚ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝﴾

''اے نبی! کافروں اور منافقوں سے جہاد کیجیے اور ان پر سختی کیجیے اور ان کا (اصل) ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ لوٹ کر جانے کی بدترین جگہ ہے۔''[3]

اللہ تعالیٰ نے ان کی نماز جنازہ ادا کرنے اور ان کی قبروں کے قریب (بغرضِ دعا) ٹھہرنے سے منع فرمایا ہے۔ ارشاد ہے:

[1] تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب: 911/2. [2] النسآء 139,138:4. [3] التوبة 73:9.

﴿وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ مَاتُوْا وَ هُمْ فٰسِقُوْنَ ۝﴾

''اور (اے نبی!) ان میں سے جو مرجائے آپ اس کی نماز (جنازہ) ہرگز نہ پڑھیں اور نہ کبھی اس کی قبر پر کھڑے ہوں۔ بے شک انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا اور وہ حالت فسق میں مرے۔''[1]

اللہ نے مومنین کے لیے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کے سلسلے میں درست سمت کا تعین کیا ہے جو ایمان کی صفت سے مطابقت رکھتی ہے اور وضاحت سے بتایا ہے کہ اہل ایمان کو کیسے لوگ دوست بنانے چاہئیں، چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّمَا وَلِیُّكُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ یُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ هُمْ رٰكِعُوْنَ ۝ وَ مَنْ یَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝﴾

''تمھارے دوست تو صرف اللہ اور اس کا رسول اور وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے، جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکاۃ دیتے ہیں اور وہ رکوع کرنے والے ہیں۔ اور جو کوئی اللہ سے اور اس کے رسول سے دوستی رکھتا ہے اور ان لوگوں سے دوستی رکھتا ہے جو ایمان لائے ہیں تو (وہ اللہ کا گروہ ہیں اور) یقیناً اللہ کا گروہ ہی غالب آنے والا ہے۔''[2]

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے جان لیا تھا کہ ان کی تمام تر وفاداری مسلم قیادت ہی کے لیے ہو گی۔ ان کے اخلاص کا محور و مرکز عقیدہ اور ان کا جہاد صرف اعلائے کلمۃ اللہ (اللہ کے دین کی سربلندی) کے لیے ہوگا۔ اپنے طور پر انھوں نے ان تمام مقاصد کی تکمیل کی اور ان کے حصول کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیا۔ وہ اللہ، اس کے رسول اور اہلِ ایمان کے

[1] التوبة 9:84. [2] المآئدة 5:55,56.

وفادار تھے۔ ان کی درخشاں تاریخ ایسے سنہرے واقعات سے پُر ہے جو اس امر کی دلیل ہیں کہ انھوں نے ولاء (وفاداری، حمایت، محبت، جاں نثاری) کے معانی گہرائی سے سمجھے تھے۔

مہاجرین و انصار کے درمیان قائم ہونے والے بھائی چارے کی بنیاد ایک عقیدہ تھا جس پر اتفاق ہو چکا تھا اور سب اس پر ایمان لے آئے تھے۔ عقیدہ ہی وہ بنیاد ہے جس پر یہ عمارت استوار کی جا سکتی تھی کیونکہ متضاد نظریات یا عقائد کے حامل دو افراد کو بھائی بھائی بنا کر ایک کر دینا اور یہ سمجھ لینا کہ وہ عقیدے یا نظریے کی اس تفریق کے باوجود ایک ہو جائیں گے، بے تکی بات اور خیالی پلاؤ پکانے کے مترادف ہے۔ خاص طور پر جب اس فکر یا عقیدے کا اثر اس کے حامل کی عملی زندگی پر ایک خاص طرزِ عمل کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی عقیدہ مواخات کے عمل میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ عقیدے نے تقویٰ اور عملِ صالح کے سوا تمام امتیازات مٹا کر سب انسانوں کو اللہ کے عبادت گزار و خاکسار بندوں کی صف میں لا کھڑا کیا تھا۔[1]

الحب فی اللہ مدنی معاشرے کی بنیاد

اللہ کے لیے محبت کی بنیاد پر قائم ہونے والا بھائی چارہ امت مسلمہ کی تعمیر و ترقی میں بڑا نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔[2] یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نئے اسلامی معاشرے کے اندر الحب فی اللہ کی روح پھونکنے کے سلسلے میں غیر معمولی جدوجہد کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی يَقُولُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ: أَيْنَ الْمُتَحَابُّونَ بِجَلَالِي؟ اَلْيَوْمَ أُظِلُّهُمْ فِي ظِلِّي، يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلِّي»

''بلاشبہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ''میرے جلال کی خاطر محبت کرنے والے کہاں ہیں؟ آج میں انھیں اپنے سایے میں جگہ دیتا ہوں۔ آج کے دن

[1] فقه السيرة للبوطي، ص: 156. [2] محمد رسول الله ﷺ لصادق عرجون: 129/3.

میرے سایے کے سوا کوئی سایہ نہیں۔''[1]

ایک اور موقع پر نبی ﷺ نے فرمایا:

«قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى: حَقَّتْ مَحَبَّتِي لِلْمُتَحَابِّينَ فِيَّ، وَ حَقَّتْ مَحَبَّتِي لِلْمُتَوَاصِلِينَ فِيَّ، وَحَقَّتْ مَحَبَّتِي لِلْمُتَبَاذِلِينَ فِيَّ: اَلْمُتَحَابُّونَ فِيَّ عَلٰى مَنَابِرَ مِنْ نُّورٍ، يَّغْبِطُهُمُ النَّبِيُّونَ، وَالصِّدِّيقُونَ وَالشُّهَدَاءُ»

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''میری خاطر آپس میں محبت، صلہ رحمی اور خرچ کرنے والوں کے لیے میری محبت لازم ہوگئی ہے۔ میری خاطر محبت کرنے والے نور کے منبر پر براجمان ہوں گے۔ نبی، صدیق اور شہداء ان پر رشک کریں گے۔''[2]

نبی ﷺ کے متعدد فرامین لوگوں کو آپس میں محبت، باہمی تعاون اور ایک دوسرے کا احترام کرنے کا درس دیتے ہیں تاکہ کوئی مالدار فقیر پر، حاکم محکوم پر اور طاقتور کمزور پر برتری کا اظہار نہ کرے۔

اس نئے قائم شدہ معاشرے میں اللہ کی خاطر محبت کا اچھا اور نمایاں اثر ظاہر ہوا۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے پاس کھجوروں کے باغ سب انصار سے زیادہ تھے۔ بیرحاء نامی باغ جو مسجد نبوی کے بالمقابل تھا، انھیں بہت پسند تھا۔ نبی ﷺ وہاں تشریف لے جاتے اور اس کا خوش گوار پانی نوش فرماتے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی:

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۚ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝﴾

''تم ہرگز بھلائی نہ پاسکو گے جب تک ان چیزوں میں سے اللہ کی راہ میں خرچ نہ

[1] صحيح مسلم، حديث: 2566، و مسند أحمد: 237/2 و 535. [2] جامع الترمذي، حديث: 2390، و مسند أحمد: 229/5 و 239.

کرو جنھیں تم پسند کرتے ہو اور تم جو بھی چیز خرچ کرو گے تو بے شک اللہ اسے خوب جاننے والا ہے۔''[1]

تو ابوطلحہ رضی اللہ عنہ عرض پرداز ہوئے: ''اے اللہ کے رسول! اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے اور میرا سب سے زیادہ پسندیدہ مال بیرحاء باغ ہے۔ میں اسے اللہ کی راہ میں صدقہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں ثواب اور اللہ کے ہاں اس کے ذخیرہ ہونے کی توقع رکھتا ہوں۔ اب آپ اسے جہاں چاہیں صرف کریں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «ذٰلِكَ مَالٌ رَّابِحٌ! ذٰلِك مَالٌ رَّابِحٌ! وَّ قَدْ سَمِعْتُ مَا قُلْتَ، وَ إِنِّي أَرٰى أَنْ تَجْعَلَهَا فِي الْأَقْرَبِينَ» ''یہ نفع بخش مال ہے، یہ نفع بخش مال ہے۔ میں نے تمھاری بات سن لی ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ تم اسے اپنے ضرورت مند اقربا میں تقسیم کر دو۔'' ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں اسی طرح کروں گا۔'' انھوں نے وہ باغ اپنے چچا زاد بھائیوں اور دیگر اقارب میں تقسیم کر دیا۔[2]

سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ الحب فی اللہ اور باہمی تعاون کی ایک عمدہ مثال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''جب ہم مدینہ پہنچے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے اور سعد بن ربیع کے درمیان بھائی چارہ قائم کر دیا۔ سعد نے کہا: ''میں انصار کا سب سے مالدار آدمی ہوں۔ میں آپ کے لیے اپنا آدھا مال پیش کرتا ہوں اور میری جو بیوی آپ کو پسند ہو اسے طلاق دے دوں گا اور جب وہ عدت گزار چکے تو آپ اس سے نکاح کر لینا۔'' میں نے کہا: ''مجھے ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے کسی بازار کا رستہ بتائیں۔'' سعد رضی اللہ عنہ نے انھیں قینقاع کے بازار کا پتہ بتا دیا۔ عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ وہاں گئے، کچھ پنیر اور گھی خرید کر لے آئے۔ روزانہ اسی طرح کرتے رہے۔ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر زرد رنگ کے نشانات دیکھے اور پوچھا: «تَزَوَّجْتَ؟» ''کیا تم نے شادی کر لی ہے؟'' عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے

---

[1] آل عمرٰن 3:92. [2] صحيح البخاري، حديث: 1461، و صحيح مسلم، حديث: 998، و السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 254/1.

عرض کیا: ''جی!'' آپ ﷺ نے پوچھا: «وَمَنْ؟» ''کس سے؟'' عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''ایک انصاری خاتون سے۔'' آپ ﷺ نے حق مہر کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ ایک گٹھلی برابر سونا دیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَوْلِمْ وَلَوْ بِشَاةٍ» ''ولیمہ کرو خواہ ایک بکری ہی ہو۔''[1]

اس روایت میں ایک طرف سعد رضی اللہ عنہ کی طرف سے بھرپور تعاون کا اظہار ہوا تو دوسری طرف عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی طرف سے خودداری اور عزت نفس کا مظاہرہ دیکھنے کو ملا۔ یہ صرف عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ ہی کی سوچ نہیں تھی بلکہ اکثر مہاجرین اپنے انصاری بھائیوں کے گھر رہے، پھر محنت مزدوری کرنے لگے حتیٰ کہ اس آمدنی سے گھر خرید لیے اور خود کفیل ہو گئے۔ ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم وغیرہ انھی مہاجرین میں سے تھے۔

خیر خواہی

بھائی چارے نے مسلمانوں کو ایک دوسرے کا خیر خواہ اور ہمدرد بنا دیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے سلمان فارسی اور ابودرداء رضی اللہ عنہما کے مابین مواخات قائم کی۔ ایک دن سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ابودرداء رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لائے۔ ام درداء کو پراگندہ حالت میں دیکھا تو وجہ دریافت کی۔ ام درداء رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ آپ کے بھائی کسی قسم کی دنیاوی حاجت نہیں رکھتے۔ اسی دوران ابودرداء رضی اللہ عنہ بھی آ گئے۔ کھانا تیار ہوا تو ابودرداء رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں تو روزے سے ہوں، اس لیے کھانا نہیں کھاؤں گا۔'' سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں اس وقت تک کھانا نہیں کھاؤں گا جب تک آپ بھی میرے ساتھ نہ کھائیں گے۔'' ابودرداء رضی اللہ عنہ نے کھانا کھا لیا۔ رات ہوئی تو ابودرداء قیام اللیل کے ارادے سے بیدار ہوئے۔ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''سو جاؤ۔'' وہ سو گئے۔ تھوڑی دیر بعد دوبارہ قیام کے ارادے سے بیدار ہوئے۔

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 2048 و 3780، و صحيح مسلم، حديث: (79)-1427.

سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے دوبارہ سو جانے کو کہا۔ رات کا آخری پہر ہوا تو سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اب اٹھ جاؤ'' اور دونوں نے اکٹھے تہجد کی نماز پڑھی۔ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے نصیحت کی: ''ابودرداء! تمھارے رب کا تم پر حق ہے۔ اسی طرح تمھاری جان اور تمھارے گھر والوں کا بھی تم پر حق ہے۔ ہر حق دار کو اس کا حق دیا کرو۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب یہ خبر پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «صَدَقَ سَلْمَانُ» ''سلمان نے درست کہا۔''[1]

انصار کا ذکر خیر اور اُن کے لیے دعا

انصار نے نہ صرف مہاجرین کی صدق دل سے غمخواری کی تھی بلکہ دنیا کی ہر بھلائی میں انھیں فوقیت دی تھی۔ ان کے سچے ایمان اور خالص محبت کی یہی نشانی تھی۔ اس سلسلے میں انصار کی طرف سے کیے جانے والے اقدامات کا مہاجرین کے دلوں پر گہرا اثر ہوا۔

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ انصار نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے گزارش کی کہ ہمارے کھجوروں کے باغات ہیں۔ آپ انھیں ہمارے اور مہاجرین بھائیوں کے درمیان تقسیم فرما دیجیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکار کر دیا۔ انھوں نے مہاجرین سے کہا: ''آپ ہمارے باغات میں کام کریں۔ ہم آپ کو پیداوار کا حصہ دیں گے۔'' سب نے یہ بات تسلیم کی۔[2]

معلوم ہوا کہ انصار نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے اموال، جو ان دنوں کھجوروں کے باغات پر مشتمل تھے، اپنے اور مہاجرین کے درمیان تقسیم کرنے کی درخواست کی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تقسیم کے بجائے کوئی ایسا طریقہ تلاش کیا جس میں انصار کو نقصان نہ ہو اور اموال سے ان کی ملکیت بھی زائل نہ ہو۔ اسی دوران جب انصار نے کام اور پیداوار میں شراکت کی بات کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پسند فرمایا کیونکہ اس میں مہاجرین کی ضرورتوں کو پورا کرنے

[1] صحيح البخاري، حديث: 1968 و 6139، وجامع الترمذي، حديث: 2413. [2] صحيح البخاري، حديث: 2325.

کا سامان بھی تھا اور انصار کی ملکیت بھی برقرار تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین کو انصار کے ساتھ باغات کو پانی دینے اور نگہبانی کے معاملات میں لگا دیا اور انصار نے انھیں باغات کی پیداوار میں شریک کرلیا۔ یہی وجہ تھی کہ سب نے یہ بات تسلیم کی۔[1]

مہاجرین انصار کا ہاتھ بٹانے لگے اس کے باوجود زیادہ تر کام انصار خود اپنے ہاتھوں انجام دیتے۔ مہاجرین نے انصار کی کرم فرمائی اور ایثار کا شکریہ ادا کیا اور نبی ﷺ سے عرض کیا: ''ہم نے انصار جیسے لوگ آج تک نہیں دیکھے۔ جو کام تھوڑا لیتے ہیں اور خرچ زیادہ کرتے ہیں۔ ہم باغبانی میں ان کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ وہ ہمیں پیداوار سے وافر حصہ دیتے ہیں۔ اب تو ہمیں یہ احساس بھی ہونے لگا ہے کہ وہ سارا ثواب حاصل کر لیں گے۔'' نبی ﷺ نے فرمایا: «لَا، مَا أَثْنَيْتُمْ عَلَيْهِمْ وَ دَعَوْتُمُ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ لَهُمْ» ''نہیں، جب تک تم ان کا ذکر خیر کرتے رہو گے اور اللہ تعالیٰ سے ان کے حق میں دعا کرتے رہو گے۔''[2]

مہاجرین کے اس اخروی اجر و ثواب کی طرف اشارہ کرنے سے ان کے اخروی زندگی کے تصور اور اپنی تمام سوچوں پر اس تصور کے غلبے کا پتا چلتا ہے۔[3]

نبی ﷺ نے انصار کی اس عزت افزائی کا بدلہ دینے کا ارادہ فرمایا۔

---

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي: 30/4. [2] جامع الترمذي، حديث: 2487، و مسند أحمد: 201,200/3، والمصنف لابن أبي شيبة: 68/9. تحفۃ الاحوذی میں اس حدیث کی شرح کے تحت امام طیبی رحمہ اللہ کا قول قابل دید ہے۔ وہ فرماتے ہیں: ''جب مہاجرین نے یہ کہا کہ انصار نے ہم پر اتنے احسان کیے حتی کہ ہمیں خدشہ ہوا کہ وہی سارا اجر لے جائیں گے اور ہم ان کے احسانات کا بدلہ نہیں چکا سکیں گے تو رسول اللہ ﷺ نے گویا یوں فرمایا: ''یہ بات نہیں ہے۔ کیونکہ جب تم ان کی اچھائیوں کے بدلے میں ان کا ذکر خیر اور ان کے لیے دعا کرتے رہو گے تو گویا تم ان کے احسانات کا بدلہ چکا رہے ہو اور اس طرح تم ان کے برابر نیکیاں حاصل کر رہے ہو۔'' (تحفة الأحوذي: 279/6)

[3] التاريخ الإسلامي للحميدي: 406/4.

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی علیہ السلام نے انصار کو بلایا کہ بحرین کا علاقہ انھیں عطا فرما دیں۔ انصار نے یہ کہہ کر انکار کر دیا: ''پہلے ہمارے مہاجر بھائیوں کو بھی ایسا علاقہ عنایت فرمائیں۔'' اس پر نبی علیہ السلام نے فرمایا: «إِمَّا لَا، فَاصْبِرُوا حَتّٰى تَلْقَوْنِي، فَإِنَّهٗ سَيُصِيبُكُمْ بَعْدِي أَثَرَةٌ» ''اگر تم انکار ہی کرتے ہو تو سنو! تم ہمیشہ صبر کرنا، یہاں تک کہ مجھے حوض کوثر پر ملو۔ میرے بعد دوسروں کو تم پر ترجیح دی جائے گی۔ [1]

بھائی چارے نے مہاجرین کی اجنبیت ختم کرنے، مہاجرین کا اپنے گھر کے افراد اور خاندان سے دوری کی وجہ سے ان کے لیے ہمدردی کا سامان فراہم ہونے، تعلقات کی مضبوطی اور ایک نئی ریاست کے قیام جیسے مقاصد پورے کر لیے۔ بلاشبہ کوئی بھی ریاست یا قبیلہ بھائی چارے اور باہمی محبت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا اور نہ اس میں مساوات اور باہمی تعاون کی فضا قائم ہو سکتی ہے۔ [2]

مواخات کی بنیاد پر وراثت کی تقسیم

انصار نے مہاجرین کا جس فراخدلی، محبت اور سچے جذبات سے استقبال کیا، انھیں قیام گاہ فراہم کی اور ان کے لیے دیگر آسانیاں پیدا کیں، تاریخ انسانی میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہ بھائی چارہ عملی طور پر ان کی زندگیوں میں رچ بس گیا تھا۔ یہ مواخات کوئی علامتی نہیں تھی بلکہ یہ تو ایک جیتی جاگتی حقیقت اور انصار و مہاجرین کے درمیان طے پانے والے عملی تعلقات کا نام تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میثاق اخوت کو سب کے لیے ایک اہم ذمہ داری قرار دیا جس کے نہایت مثبت نتائج برآمد ہوئے۔

اللہ تعالیٰ نے قرابت داروں سے صرف نظر کرتے ہوئے سلسلۂ وراثت کو بھی اسی مواخات کی بنیاد پر قائم فرما دیا تاکہ اصل اسلام کے تصورات میں یہ عمل ایک جیتی جاگتی

[1] صحيح البخاري، حديث:3794. [2] تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب:3526/6.

حقیقت بن کر ابھرے۔ مطلب یہ کہ مواخات اور آپس میں محبت صرف الفاظ یا کوئی علامتی چیز نہیں تھی۔ یہ ایسا مضبوط بندھن تھا جس کے اثرات وفوائد معاشرے میں واضح طور پر محسوس کیے گئے اور یہ آگے چل کر معاشرتی نظامِ انصاف کی بنیاد بنا۔

مواخات کی اساس پر قائم ہونے والا نظامِ وراثت ایک عرصے بعد منسوخ کر دیا گیا، جس کی حکمت یہ تھی کہ حکم ناسخ کی بنیاد بھی اسلامی اخوت پر تھی کیونکہ مختلف مذاہب کے حامل دو افراد ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔ ہجرت کے فوری بعد ابتدائی مرحلے میں انصار و مہاجرین کے درمیان اخوت کے تعلقات قائم کرنے اور مہاجرین سے ہمدردی کی ضرورت تھی۔ مہاجرین اپنے گھربار اور اہل وعیال مکہ میں چھوڑ کر مدینہ میں انصاری بھائیوں کے ہاں آئے تھے۔ ایسے حالات میں ایک خاص ذمہ داری کا احساس اجاگر کرنے کی اشد ضرورت تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سلسلے میں اخوت کے مضبوط رشتے کی بنیاد رکھی۔ وقت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ آپس کے دینی تعلقات اور مواخات کا ناتا تمام رشتہ داریوں کی نسبت مضبوط ہو، چنانچہ وراثت کا نظام اس مواخات کی بنیاد پر قائم کر دیا گیا۔ جب مہاجرین کی زندگیاں معمول پر آ گئیں اور ایک اسلامی ریاست معرض وجود میں آ گئی تو اس جدید اسلامی معاشرے میں سلسلہ وراثت عام قوانین پر قائم کر دیا گیا اور پہلا حکم منسوخ ہو گیا۔

یوں جب مہاجرین مدینہ کی فضا کے عادی ہو گئے، اجنبیت ختم ہو گئی، سلسلۂ روزگار چل نکلا اور بدر کے غنائم کے سبب کچھ خوشحالی میسر آ گئی تو وراثت کا نظام بشری تقاضوں کے مطابق طبعی وضع پر لوٹ آیا جس کی اساس صلہ رحمی پر تھی اور بھائی چارے کی اساس پر قائم نظام وراثت ختم کر دیا گیا۔ اس ضمن میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ۚ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾

”اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور تمھارے ساتھ (مل کر) جہاد کیا تو وہ بھی تمھی میں سے ہیں اور اللہ کی کتاب میں (خون کے) رشتے دار آپس میں ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں۔ بے شک اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔“ [1]

یہ آیت کریمہ اخوت کی بنیاد پر قائم نظامِ وراثت کے لیے ناسخ ثابت ہوئی اور باہمی تعاون و خیر خواہی کا جذبہ بدستور برقرار رہا۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان:

﴿وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ ۚ وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدًا﴾

”ماں باپ اور قریبی رشتہ دار جو مال چھوڑ جائیں اس میں ہم نے ہر ایک کے لیے وارث بنائے ہیں اور جن سے تمھارا عہد بندھ چکا ہو انھیں ان کا حصہ دو، بے شک اللہ ہر چیز پر گواہ ہے۔“ [2]

کی تفسیر کرتے ہوئے کہا: ﴿مَوَالِيَ﴾ سے مراد ورثاء ہیں، چنانچہ مہاجرین جب مدینہ تشریف لائے تو مواخات کے تحت مہاجر انصاری کا وارث بنتا اور اصلی رشتہ دار کو کچھ نہ ملتا، پھر اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ﴾ نازل ہوا تو وراثت کا یہ نظام ختم کر دیا گیا۔“ انھوں نے مزید کہا: ”اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ﴾ سے مراد ایک دوسرے کی مدد، ہمدردی اور خیر خواہی ہے، لہٰذا اب وراثت ختم ہو چکی ہے، البتہ ان کے حق میں وصیت کی جا سکتی ہے۔“ [3]

انسانی اقدار اور مثالی اصول

مہاجرین و انصار کے مابین قائم بھائی چارے کی وجہ سے ایسی انسانی اور معاشرتی اقدار

[1] الأنفال 8:75. [2] النسآء 4:33. [3] صحيح البخاري، حديث:2292و4580و6747، وسنن أبي داود، حديث:2922، والسنن الكبرى للنسائي، حديث:11037.

وجود میں آئیں جو اس سے قبل کسی بھی قبائلی معاشرے میں ناپید تھیں۔ یہ اقدار صرف اسی جدید اور قابلِ رشک اسلامی معاشرے کا حصہ بنیں۔ ان میں سرفہرست اپنے ہاتھ سے کسبِ رزق کے وسائل مہیا کرنا تھا۔ مہاجرین نے ابتدا میں انصار بھائیوں کی مہمان نوازی قبول کی، پھر مستقل طور پر انصار کے کندھوں پر بوجھ بننے کے بجائے روزگار کے مواقع تلاش کیے۔ ان میں بعض تجارت اور بعض کھیتی باڑی کے پیشے سے وابستہ ہوگئے۔ وہ اس بات پر خوش تھے کہ کسی پر بوجھ بننے اور کسی سے کچھ لینے کے بجائے خود محنت کر رہے ہیں اور یہ کہ لینے کے بجائے دینے والا ہاتھ اللہ کے نزدیک زیادہ پسندیدہ اور بہتر ہے۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اسلامی تعلیمات سے یہ سبق سیکھا کہ اپنے ہاتھوں سے کمایا ہوا رزق عین عبادت ہے۔ یہ ایسا مرتبہ و مقام ہے جہاں انسان کی صرف مادی ضرورتوں کو پورا کرنے والا دور حاضر کا کوئی نظام نہ پہنچ سکا۔ ان اسلامی راہنما اصولوں کی روشنی میں ہم بخوبی یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ بھائی چارہ اور محنت مزدوری مدنی معاشرے کے بنیادی امتیازات تھے۔ آگے چل کر یہی امتیازات اس معاشرے کی ترقی کا ضامن بنے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیرنگرانی قائم ہونے والا معاشرہ اوج ثریا پر جا پہنچا اور اتنا پھلا پھولا کہ سارے عالم کے لیے سایہ دار درخت کی حیثیت اختیار کر گیا۔[1]

علاقائی اور قبائلی برتری کا خاتمہ

جاہلی معاشرہ، جہاں تعصب کو بنیادی حیثیت حاصل تھی، اس میں پائے جانے والے علاقائی اور قبائلی تعصب کو ختم کرنا آسان کام نہ تھا۔ بھائی چارے کا عمل اسی تعصب کو ختم کرنے کا خواہاں تھا۔

آج کل مسلمانوں کی صفوں میں موجود بعض نادان داعی حضرات کے دلوں میں علاقائی

[1] الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص: 411.

تعصب نے جگہ بنا رکھی ہے۔ یہ ایک ایسا مرض ہے جس کے سبب نہ صرف اسلام مغلوب ہوا ہے بلکہ امتِ اسلامیہ کی وحدت پارہ پارہ ہوتی اور شیرازہ بکھرتا نظر آ رہا ہے۔ امت اپنے اصل مقاصد کو بھول کر انھی تعصّبات میں جکڑ کر رہ گئی۔ شہر شہر اور بستی بستی پھیلی ہوئی اسلامی تحریکیں علاقائی تعصب کا شکار نظر آتی ہیں۔[1]

دیکھا جائے تو دلوں میں پیدا ہونے والے ان تعصّبات کا سبب قرآنی تعلیمات اور سنت رسول ﷺ سے دوری ہے۔ نہ اسلامی تعلیمات کو اپنایا جا رہا ہے اور نہ ان کے مطابق تربیت ہو رہی ہے۔ نتیجہ باہمی بغض و عناد کی صورت میں سامنے آ رہا ہے۔

آج عالم اسلام مہاجرین و انصار کے مابین قائم ہونے والے آئیڈیل بھائی چارے کا محتاج ہے۔ عالم اسلام کو ان کریمانہ اوصاف کی اشد اور فوری ضرورت ہے جو صرف اس مواخات میں پائے جاتے ہیں۔ ایسے اوصاف کے بغیر عزت و وقار کا حصول تقریباً ناممکن نظر آتا ہے۔ آج بلند پایہ ایمان اور عظیم قربانیوں کی ضرورت ہے جس کا حصول میدانِ عمل میں ممکن ہے۔ صرف زبانی نعرے ذرہ برابر سودمند نہیں ہو سکتے۔

آج کل کا دور جس میں امت اسلامیہ مسائل کا شکار ہے، اس میں ایک مسلمان جب خود کو ایسے بھائیوں کے درمیان پائے گا جو محبت اور تعاون کرنے والے ہوں گے تو اس کا حوصلہ بڑھ جائے گا اور وہ اعلیٰ اقدار کا حامل ہو جائے گا۔ وہ اپنے اندر ایک عجیب قسم کا جوش اور ولولہ محسوس کرے گا۔ بصورت دیگر اسلامی صفوں میں کمزوری کے آثار نظر آئیں گے۔ ہر فرد عدمِ تحفظ کا شکار ہو گا اور خود کو اکیلا اور کینہ پرور دشمنوں میں گھرا ہوا محسوس کرے گا۔ وہ ایسے مادی اور نفسیاتی دباؤ کو بھلا کیسے برداشت کر سکتا ہے؟[2]

مورخین نے اسلامی معاشرے کی وحدت اور اس جہاد کا خصوصی تذکرہ کیا ہے جو ہمیشہ جاری رہے گا اور بڑھتا چلا جائے گا۔ دشمنانِ اسلام نے مسلمانوں کی صفوں میں انتشار

1 التربية القيادية للدكتور الغضبان:2/286. 2 الطريق إلى المدينة لمحمد العبده، ص: 10 و101.

پھیلانے کے لیے بہت سی تدابیر اختیار کیں۔ ان کی یہ تمام کاوشیں اس لیے ناکامی سے دوچار ہوئیں کہ مدمقابل ایمانی قوت کا حامل ایسا معاشرہ تھا جس کے اجزائے ترکیبی اتنے مضبوط اور آپس میں جڑے ہوئے تھے کہ نہ تو انھیں جدا کیا جا سکتا تھا اور نہ ان کے باہمی تعلقات کو ختم کیا جا سکتا تھا۔[1]

بھائی چارہ داخلی مضبوطی کا سبب

اسلامی معاشرے کی مضبوطی کے اسباب میں افرادِ امت کی ربانی منہج پر تربیت کرنا، نیک سیرت لوگوں کی قیادت، فرقہ بندی سے اجتناب اور وحدت امت جیسے اصولوں پر کاربند رہنا شامل تھا۔[2]

امت مسلمہ کی ترقی کا باعث عقیدۂ توحید پر یقین، اسلام کے ساتھ سچا تعلق، تلاش حق اور جذبۂ اخوت کو فروغ دینا تھا۔ اسی مضبوط بھائی چارے کی وجہ سے اسلامی صفوں میں اتحاد، ہم آہنگی اور یکجہتی جیسی خوبیاں پیدا ہوئیں۔

بھائی چارے کا عمل ربانی تحفہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے مخلص، پرہیز گار اور قابل قدر بندوں کو عطا فرمایا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ۭ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ۭ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝﴾

”اور اگر وہ آپ کو دھوکا دینا چاہیں تو بے شک آپ کے لیے اللہ کافی ہے، وہی تو ہے جس نے اپنی مدد سے اور مومنوں سے آپ کی تائید کی اور اس نے ان (مومنوں) کے دلوں میں الفت ڈال دی، اگر آپ دنیا بھر کے سب خزانے خرچ کر دیتے تو

---

1 محمد رسول اللهﷺ لصادق عرجون: 152/3. 2 فقه التمكين في القرآن الكريم للصلابي، ص: 253.

بھی ان کے دلوں میں الفت پیدا نہ کر سکتے لیکن اللہ ہی نے ان میں الفت ڈالی۔
بے شک وہ زبردست (اور) خوب حکمت والا ہے۔''[1]

اخوت ایک ایسی ایمانی قوت کا نام ہے جو مسلمان میں جذبۂ صادق، محبت واحترام کا احساس اور ایسا اعتماد پیدا کرتی ہے جس کی بنیاد خالص اسلامی منہج پر ہو، پھر تعاون، ایثار، شفقت، درگزر، ہمدردی اور امداد باہمی کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ گویا ایمان اور اخوت لازم و ملزوم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ○﴾

''مومن تو (ایک دوسرے کے) بھائی ہیں، لہٰذا تم اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کرادو اور تم اللہ سے ڈرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔''[2]

ایمان کی مٹھاس بھی اخوت کے جذبات سے سرشار مسلمان ہی محسوس کر سکتا ہے۔
رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«ثَلَاثٌ مَّنْ كُنَّ فِيهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْإِيمَانِ: أَنْ يَّكُونَ اللّٰهُ وَ رَسُولُهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا، وَ أَنْ يُّحِبَّ الْمَرْءَ لَا يُحِبُّهُ إِلَّا لِلّٰهِ، وَ أَنْ يَّكْرَهَ أَنْ يَّعُودَ فِي الْكُفْرِ كَمَا يَكْرَهُ أَنْ يُّقْذَفَ فِي النَّارِ»

''تین وصف جس آدمی میں پائے جائیں وہ ایمان کی حلاوت محسوس کرے گا۔ اللہ اور اس کے رسول کو ساری دنیا سے زیادہ محبوب رکھنا، آپس میں صرف اللہ کی رضا کے لیے محبت کرنا اور کفر کی طرف لوٹنا ایسا ہی ناپسند ہو جس طرح آگ میں داخل ہونا۔''[3]

[1] الأنفال8:62، 63. [2] الحجرٰت49:10. [3] صحيح البخاري، حديث: 16، و صحيح مسلم، حديث: 43.

قرآن ہمارے سامنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا انتہائی دلنشین تصور پیش کرتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ؗ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۚ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝﴾

”محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں، وہ کافروں پر بہت سخت ہیں، آپس میں نہایت مہربان ہیں، آپ انھیں رکوع و سجود کرتے دیکھیں گے، وہ اللہ کا فضل اور (اس کی) رضامندی تلاش کرتے ہیں، ان کی خصوصی پہچان ان کے چہروں پر سجدوں کا نشان ہے، ان کی یہ صفت تورات میں ہے اور انجیل میں ان کی صفت اس کھیتی کے مانند ہے جس نے اپنی کونپل نکالی، پھر اسے مضبوط کیا اور وہ (پودا) موٹا ہوگیا، پھر اپنے تنے پر سیدھا کھڑا ہوگیا، کسانوں کو خوش کرتا ہے، (اللہ نے یہ اس لیے کیا) تاکہ ان (صحابۂ کرام) کی وجہ سے کفار کو خوب غصہ دلائے، اللہ نے ان لوگوں سے جو ان میں سے ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، مغفرت اور بہت بڑے اجر کا وعدہ کیا ہے۔“[1]

قرآنِ کریم نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ تصویر پیش کر کے گویا اس امر کا اعلان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں عزت بخشی ہے، یعنی یہ لوگ کافروں کے لیے سخت ہیں، خواہ کافروں کے درمیان ان کے آباء و ابناء و اخوان ہی کیوں نہ موجود ہوں۔ اخوت کی جو منظر کشی اس

[1] الفتح 29:48.

آیت میں کی گئی ہے وہ درحقیقت دینی اخوت کا اصلی تصور ہے۔

دینی اخوت کے اسی مستحکم جذبے نے مسلمانوں کو درپیش چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کی ہمت عطا کی۔ دینی بھائی چارے کے احساس نے مسلمانوں کی صفوں میں ہم آہنگی پیدا کی۔ یہ خوشگوار احساس ان کی قوت و سطوت میں اضافے کا باعث بنا اور اسی کے سبب انھیں بالادستی نصیب ہوئی۔[1]

انصار کے مناقب

انصار کی پہلی اور سب سے بڑی خوبی تو یہی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول نے انھیں انصار (مددگار) کا نام دیا۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ انھوں نے اسلام کی بیعت کے بعد اہلِ ایمان کو پناہ دی اور یوں اللہ، اس کے رسول اور دین کی مدد کی۔ اس سے قبل وہ اس نام سے نہیں جانے جاتے تھے۔[2] غیلان بن جریر کہتے ہیں: ''میں نے انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ ''انصار'' کا لقب آپ لوگوں نے خود اختیار کیا تھا یا اللہ تعالیٰ نے منتخب فرمایا؟ انھوں نے جواب دیا: ''نہیں بلکہ ہمارا یہ نام اللہ نے رکھا تھا۔''[3]

انصار کے اجتماعی و انفرادی فضائل بے شمار ہیں۔ اجتماعی فضائل جو قرآن کریم میں بیان ہوئے ہیں، ان کی تفصیل یہ ہے:

اللہ تعالیٰ نے انصار کے متعلق بیان کیا ہے کہ وہ سچے مومن ہیں۔ فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۚ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ﴾

''اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جنھوں نے (مہاجرین کو) جگہ دی اور (ان کی) مدد کی، وہی لوگ سچے مومن ہیں،

---

[1] شرح رسالة التعليم للدكتور محمد عبد الله الخطيب، ص: 296. [2] الهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 131-135. [3] صحيح البخاري، حديث: 3776.

ان کے لیے مغفرت اور باعزت روزی ہے۔'' [1]

اللہ تعالیٰ نے انصار کو خوشخبری دی ہے کہ وہ ان سے راضی ہے اور اس بات پر ان کی ستائش کی ہے کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ سے راضی ہیں۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۚ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾

''اور مہاجرین اور انصار میں سے (قبول اسلام میں) سبقت کرنے والے اور وہ لوگ جنھوں نے احسان کے ساتھ ان کی پیروی کی، اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اس سے راضی ہو گئے اور اللہ نے ان کے لیے ایسے باغ تیار کیے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔'' [2]

یہی نہیں، اللہ تعالیٰ نے انصار کا ذکر کرتے ہوئے کامیابی اور فلاح کا حوالہ دیا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾

''اور (مالِ فَے ان کے لیے ہے) جنھوں نے (مدینہ کو) گھر بنا لیا تھا اور ان (مہاجرین) سے پہلے ایمان لا چکے تھے، وہ (انصار) ان سے محبت کرتے ہیں جو ان کی طرف ہجرت کرے اور وہ اپنے دلوں میں اس (مال) کی کوئی حاجت نہیں پاتے جو ان (مہاجرین) کو دیا جائے اور اپنی ذات پر (ان کو) ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود انھیں سخت ضرورت ہو اور جو کوئی اپنے نفس کے لالچ سے بچا لیا گیا تو

1 الأنفال 8:74. 2 التوبة 9:100.

وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''[1]

انصار کے فضائل میں جو احادیث ہم تک پہنچی ہیں، ان میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں:

انصار کے لیے نبی ﷺ کی محبت: انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: ''نبی ﷺ نے بچوں اور عورتوں کو آتے دیکھا (راوی کا خیال ہے کہ انس رضی اللہ عنہ نے یہ بھی بتایا تھا کہ یہ لوگ کسی شادی سے آ رہے تھے) تو ان کی عزت افزائی کے لیے کھڑے ہو گئے اور تین بار کہا: «اَللّٰهُمَّ أَنْتُمْ مِّنْ أَحَبِّ النَّاسِ إِلَيَّ» ''اللہ کی قسم! تم میرے محبوب ترین لوگوں میں سے ہو۔''[2]

انصار سے محبت ایمان اور ان سے بغض نفاق کی علامت: براء بن عازب رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، کہتے ہیں: ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: «اَلْأَنْصَارُ لَا يُحِبُّهُمْ إِلَّا مُؤْمِنٌ، وَّ لَا يُبْغِضُهُمْ إِلَّا مُنَافِقٌ، فَمَنْ أَحَبَّهُمْ أَحَبَّهُ اللّٰهُ وَ مَنْ أَبْغَضَهُمْ أَبْغَضَهُ اللّٰهُ» ''انصار سے صرف مومن محبت کرتا ہے اور صرف منافق ہی ان سے بغض رکھتا ہے، لہٰذا جو ان سے محبت کرے گا اللہ اس سے محبت کرے گا اور جو ان سے بغض رکھے گا اللہ بھی اس سے بغض رکھے گا۔''[3]

حب الٰہی اور بغض الٰہی کی علامت: جو انصار سے محبت کرے گا، وہ اللہ کی محبت سے ہمکنار ہو گا اور جو ان سے بغض رکھے گا اس پر اللہ کی پھٹکار برسے گی۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ أَحَبَّ الْأَنْصَارَ أَحَبَّهُ اللّٰهُ، وَ مَنْ أَبْغَضَ الْأَنْصَارَ أَبْغَضَهُ اللّٰهُ» ''جس نے انصار سے محبت کی اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرے گا اور جس نے انصار سے بغض رکھا اللہ تعالیٰ اس سے بغض رکھے گا۔''[4]

[1] الحشر 9:59. [2] صحیح البخاري، حدیث: 3785، و صحیح مسلم، حدیث: 2508. [3] صحیح البخاري، حدیث: 3783، و صحیح مسلم، حدیث: 75. [4] مسند أحمد: 501/2 و527، ومجمع الزوائد: 39/10، و مسند أبي یعلٰی، حدیث: 7367، و مسند البزار، حدیث: 2793,2792.

انصار کی عفت و پاکدامنی اور ان کے صبر کی شہادت: عفت و پاکدامنی اور صبر دو کریمانہ خصلتیں ہیں جو آدمی کے سلیم الفطرت ہونے اور اچھے خاندان سے تعلق رکھنے پر دلالت کرتی ہیں۔ ایسا باہمت انسان جوانمردی اور وقار جیسی بیش قیمت خوبیوں کا حامل ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے انصار کے لیے ان دونوں خوبیوں کی گواہی دی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی گواہی سے بڑھ کر کسی کی عظیم المرتبی کا ثبوت اور کیا ہوگا، چنانچہ عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَا يَضُرُّ امْرَأَةً نَّزَلَتْ بَيْنَ بَيْتَيْنِ مِنَ الْأَنْصَارِ، أَوْ نَزَلَتْ بَيْنَ أَبَوَيْهَا»

''جو عورت کسی انصاری کے گھر ہو یا اپنے والدین کے گھر ہو اسے کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔''[1]

نبی ﷺ کا خود کو انصار کی طرف منسوب کرنے کا شوق: ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: ''نبی ﷺ نے فرمایا تھا:

«لَوْ أَنَّ الْأَنْصَارَ سَلَكُوا وَادِيًا، أَوْ شِعْبًا لَّسَلَكْتُ فِي وَادِي الْأَنْصَارِ وَلَوْلَا الْهِجْرَةُ لَكُنْتُ امْرَأً مِّنَ الْأَنْصَارِ»

''انصار جو راہ اپنائیں میں بھی اسی راہ پر چلنا پسند کروں گا۔ ہجرت نہ ہوتی تو میں بھی انصار ہی کا ایک فرد ہوتا۔''[2]

انصار کے لیے نبی ﷺ کی دعا: نبی ﷺ نے انصار اور ان کے اہل و عیال اور ان کی پوری نسل کے لیے دعا کی۔ بلاشبہ رسول اللہ ﷺ کی دعا اللہ کے ہاں درجۂ قبولیت پر فائز تھی اور انصار کو یہ بے پایاں فضیلت حاصل ہوئی کہ آپ نے ان کے لیے دعا کی۔ امام بخاری رحمہ اللہ

[1] مسند أحمد: 257/6، ومجمع الزوائد: 40/10، والمستدرك للحاكم: 83/4، و مسند البزار، حديث: 2806، وصحيح ابن حبان، حديث: 7267. [2] صحيح البخاري، حديث: 3779و 7244، ومسند أحمد: 410/2، والسنن الكبرٰى للنسائي، حديث: 8261.

عبداللہ بن فضیل رحمہ اللہ کی روایت لائے ہیں کہ انھوں نے انس رضی اللہ عنہ کو کہتے ہوئے سنا: ''مجھے حرہ کے واقعے کا بہت رنج ہوا۔''[1]

اس پر زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے، جو ان دنوں کوفہ میں تھے، مجھے تسلی بھرا خط لکھا۔ زید بن ارقم کو جب یہ اطلاع ملی کہ اس واقعے کی وجہ سے مجھے شدید غم لاحق ہوا ہے تو انھوں نے مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا لکھ کر ارسال کی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دعا مانگا کرتے تھے: «اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِلْأَنْصَارِ وَ لِأَبْنَاءِ الْأَنْصَارِ» ''اے اللہ! انصار اور ان کے بیٹوں کی مغفرت فرما۔'' عبداللہ بن فضیل رحمہ اللہ کو انصار کے بیٹوں کے بیٹوں کے بارے میں شک ہے کہ وہ بھی اس دعا میں شامل تھے یا نہیں۔[2]

انس رضی اللہ عنہ کے قریب بیٹھے ایک شخص نے ان سے زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کے متعلق پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ اس پر انھوں نے بتایا کہ یہ وہی ہیں جن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ یہ وہ انسان ہے جس کے کانوں کی سنی بات اللہ نے سچ ثابت کی۔[3]

1 واقعۂ حرہ 63 ہجری میں پیش آیا۔ اس کا باعث یہ بنا کہ اہلِ مدینہ کو یزید بن معاویہ کی منفی سرگرمیوں کے متعلق پتہ چلا (جس میں جھوٹ سچ سبھی شامل تھا) تو انھوں نے یزید بن معاویہ کی بیعت توڑ دی اور اس کے خلاف بغاوت پر اتر آئے۔ یزید بن معاویہ نے مسلم بن عقبہ مری کو ایک لشکر جرار دے کر یہ بغاوت فرو کرنے بھیجا۔ اہلِ مدینہ نے شکست کھائی اور مسلم بن عقبہ مری کی فوج نے مدینہ میں قتل عام کیا جس کے نتیجے میں انصار کی بڑی تعداد تہِ تیغ ہوئی۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ ان دنوں بصرہ میں مقیم تھے۔ آپ کو اس سانحے کی خبر ملی تو انصار کے قتلِ عام پر بے حد رنجیدہ خاطر ہوئے۔ 2 صحیح مسلم میں انصار کے بیٹوں کے بیٹوں کے بارے میں بھی حسبِ ذیل الفاظ موجود ہیں: [...... وَ أَبْنَاءِ أَبْنَاءِ الْأَنْصَارِ] ''اور انصار کے بیٹوں کے بیٹوں کی بھی مغفرت فرما۔'' دیکھیے: صحیح مسلم، حدیث: 2506. 3 صحيح البخاري، حديث: 4906. حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں حضرت زید رضی اللہ عنہ کا واقعہ نقل کیا ہے۔ ابن شہاب زہری فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ ایک منافق نے کہا: اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سچا ہے تو پھر ہم گدھوں سے بھی بدتر ہیں۔ یہ بات حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے سن لی تو انھوں نے کہا: ''اللہ کی قسم! محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بات میں سچے ہیں اور تم واقعی گدھے سے بھی بدتر ◄◄

انصار کے بارے میں نبی ﷺ کی وصیت: نبی ﷺ نے وصیت فرمائی کہ انصار سے اچھا سلوک کیا جائے اور انھیں عدمِ تحفظ کا شکار نہ کیا جائے۔ انصار نے اللہ تعالیٰ کے دین کی نشر و اشاعت کی خاطر بڑی جدو جہد کی۔ دین کے دفاع میں بھی انھوں نے کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ اس راہ میں انھوں نے زمانے کی سرد و گرم ہواؤں کی پروا نہ کی اور دین کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی دریغ نہ کیا۔ قرآن کے سنہری حروف میں انصار کی اس بے مثال تگ و دو کا تذکرہ کیا گیا:

﴿لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ۚ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾

''یقیناً اللہ نے نبی اور ان مہاجرین و انصار پر مہربانی فرمائی جنھوں نے تنگی کی گھڑی میں آپ کی پیروی کی، بعد اس کے کہ ان میں سے ایک گروہ کے دل بہک جانے کو تھے، پھر اللہ نے ان پر مہربانی فرمائی۔ بے شک وہ ان پر بہت

◄ ہو۔ یہ بات اللہ کے رسول ﷺ تک پہنچی تو منافق اپنی بات سے مکر گیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کی تصدیق کے لیے درج ذیل آیت نازل فرمائی: ﴿يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ۭ وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا ۚ وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝﴾ ''وہ (منافقین) اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ انھوں نے (کوئی بات) نہیں کہی، حالانکہ انھوں نے ضرور کلمۂ کفر کہا تھا اور وہ اسلام لانے کے بعد کافر ہو گئے۔ اور انھوں نے وہ کچھ کرنے کا ارادہ کیا جو وہ نہ کر سکے۔ اور انھوں نے غصہ نہیں نکالا، مگر اس بات پر کہ اللہ اور اس کے رسول نے اپنے فضل سے انھیں غنی کر دیا، پھر اگر وہ توبہ کر لیں تو ان کے لیے بہتر ہو گا اور اگر وہ پھر جائیں تو اللہ انھیں دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب دے گا اور ان کا زمین میں کوئی حمایتی اور کوئی مدد گار نہ ہو گا۔'' (التوبة 74:9) دیکھیے: فتح الباري: 651/8، روایت مرسل ہے۔

شفقت کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔''[1]

یہی وجہ ہے کہ نبی ﷺ نے انصار کے متعلق یہ وصیت کی تھی کہ ان میں سے نیکی کرنے والوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے اور خطا کاروں کو معاف کر دیا جائے۔ آپ ﷺ نے تاکید کی تھی کہ ان سے معاملہ کرتے ہوئے ڈرانے دھمکانے کا اسلوب اختیار نہ کیا جائے۔ یوں آپ ﷺ نے ان کے بارے میں بھلائی اور اچھے رویے کی وصیت فرمائی۔

چنانچہ انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انھوں نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «اَلْأَنْصَارُ كَرِشِي وَعَيْبَتِي، وَالنَّاسُ سَيَكْثُرُونَ وَيَقِلُّونَ، فَاقْبَلُوا مِنْ مُّحْسِنِهِمْ وَتَجَاوَزُوا عَنْ مُّسِيئِهِمْ» ''انصار میرے مخلص ساتھی اور ہم راز ہیں۔ لوگ عنقریب کثرت سے دائرۂ اسلام میں داخل ہوں گے اور انصار کی تعداد کم ہوتی جائے گی۔ تم ان کے نیکوکاروں کی نیکی تسلیم کرو اور خطا کاروں سے صرفِ نظر کرو۔''[2]

انس رضی اللہ عنہ ہی روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ نبی ﷺ گھر سے نکلے۔ راستے میں انصار

[1] التوبة 9:117. [2] صحيح البخاري، حديث:3801، و صحيح مسلم، حديث: 2510. ابن حجر رحمہ اللہ اس حدیث کے ذیل میں لکھتے ہیں: ''مطلب یہ ہے کہ انصار کی تعداد کم ہو جائے گی۔ دراصل یہ اس طرف اشارہ ہے کہ قبائلِ عرب و عجم یکے بعد دیگرے اسلام قبول کریں گے اور ظاہر ہے ان کی تعداد قبیلۂ انصار کی تعداد سے کئی گنا زیادہ ہے۔ افزائشِ نسل کا جو سلسلہ انصار میں جاری ہے وہ قبائلِ عرب و عجم میں بھی جاری رہے گا۔ یوں انصار کی تعداد دوسروں کی نسبت ہمیشہ کم ہی رہے گی۔ یہ بھی عین ممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو وحی کے ذریعے سے بتا دیا گیا ہو کہ انصار کی تعداد گھٹ جائے گی، چنانچہ آپ ﷺ کی پیش گوئی پوری ہوئی۔ آج اکنافِ عالم میں سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی ثابت شدہ اولاد کی تعداد انصار کے دونوں قبائل اوس و خزرج کی ثابت شدہ نسل سے کئی گنا زیادہ ہے۔ یہ بات میں نے ان کثیر افراد سے قطع نظر کرتے ہوئے کہی ہے جن کا دعویٰ ہے کہ وہ انصار کی اولاد ہیں جبکہ ان کے پاس اس امر کی کوئی دلیل نہیں۔'' دیکھیے: فتح الباري، شرح الحديث:3801.

سے ملاقات ہوئی تو فرمایا: «وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ! إِنِّي لَأُحِبُّكُمْ، وَ إِنَّ الْأَنْصَارَ قَدْ قَضَوْا مَا عَلَيْهِمْ، وَ بَقِيَ الَّذِي لَهُمْ، فَأَحْسِنُوا إِلٰى مُحْسِنِهِمْ وَتَجَاوَزُوا عَنْ مُّسِيئِهِمْ» ''قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے! واقعتاً میں تم لوگوں سے محبت کرتا ہوں۔ انصار نے بلاشبہ اپنی ذمہ داری خوب نبھائی ہے۔ اب ان کا حق باقی رہ گیا ہے۔ لوگو! تم ان کے نیکوکاروں سے اچھا سلوک کرنا اور ان کے خطا کاروں سے درگزر کرنا۔'' [1]

ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر انصار کے حق میں یہ کہتے سنا:

«...... فَمَنْ وَّلِيَ الْأَنْصَارَ فَلْيُحْسِنْ إِلٰى مُحْسِنِهِمْ وَلْيَتَجَاوَزْ عَنْ مُّسِيئِهِمْ، وَ مَنْ أَفْزَعَهُمْ فَقَدْ أَفْزَعَ هٰذَا الَّذِي بَيْنَ هٰذَيْنِ وَأَشَارَ إِلٰى نَفْسِهٖ»

''جو انصار کا والی بنے وہ ان کے نیکوکار سے اچھا برتاؤ کرے اور ان کے خطا کار سے درگزر کرے اور جو انھیں ڈرائے دھمکائے تو وہ جان لے کہ اس نے اسے دھمکایا، یہ کہہ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف اشارہ کیا۔'' [2]

---

1 مسند أحمد: 187/3، والسنن الكبرٰى للنسائي، حديث: 8270، و صحيح ابن حبان، حديث: 7266و 7271، و مسند أبي يعلٰى، حديث: 3770. 2 المستدرك للحاكم: 79/4، والهجرة النبوية المباركة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 151.

باب 3

میثاقِ مدینہ

نبی ﷺ مدینہ تشریف لائے تو اس کے باشندوں کے باہمی تعلقات منظم کرنے اور انھیں بہتر بنانے کے لیے ایک دستاویز تیار کی جس کا تذکرہ کتب تاریخ میں ملتا ہے۔ اس تاریخ ساز عہد نامے میں مدینہ کے بلدیاتی قوانین مرتب کیے گئے اور اہل مدینہ کے حقوق و فرائض کا تعین کیا گیا۔ قدیم کتب تاریخ میں اس عہد نامے کو تحریر یا صحیفہ کہا گیا ہے۔ معاصر مورخین نے اسے دستور یا میثاق کے نام سے یاد کیا ہے۔ ڈاکٹر اکرم ضیاء عمری نے اپنی کتاب السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ میں اسی وثیقے کی تمام اسانید کا جائزہ لینے کے بعد لکھا ہے کہ تمام اسانید مل کر صحیح روایت کے مرتبے کو پہنچ جاتی ہیں۔[1]

وثیقے کا اسلوبِ تحریر بھی اس کے درست ہونے کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس کے تمام الفاظ اور تعبیریں نبوی دور میں رائج تھیں۔ بعد ازاں ان کا استعمال کم ہو گیا اور ایسا وقت بھی آیا کہ یہ الفاظ ان مورخین کے علاوہ جو خاص اسی دور کی تحقیق سے متعلق تھے، دیگر تمام اصحابِ علم وفن کے لیے اجنبی بن کر رہ گئے۔ وثیقے کے اصل اور ثقہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس میں کسی خاص فرد یا گروہ کی مدح سرائی نہیں کی گئی اور نہ کسی خاص فرد یا جماعت پر تنقید یا الزام تراشی کے تیر برسائے گئے ہیں۔[2] وثیقے کے اسلوبِ تحریر اور رسول اللہ ﷺ کے خطوط کی انشا پردازی میں بڑی حد تک جو مشابہت پائی جاتی ہے وہ

[1] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 275/1. [2] تنظيمات الرسول الإدارية في المدينة لصالح العلي، ص: 5,4.

بھی اس کی درستی اور اصلیت کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔

میثاق مدینہ کی دفعات

① یہ تحریر اللہ کے رسول و نبی محمد ﷺ کی طرف سے ہے جو قریش اور اہل یثرب سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں اور ان افراد کے درمیان طے پائی جنھوں نے ان کی پیروی کی، ان میں آ ملے اور ان کی ہمراہی میں جہاد کیا۔

② سب لوگوں سے قطع نظر یہ لوگ (مسلمان) ایک امت (سیاسی وحدت) ہیں۔

③ قریش کے مہاجرین (قبل از اسلام کے) دستور کے مطابق آپس کا خون بہا ادا کریں گے۔ اہلِ ایمان کے درمیان عدل و انصاف کی بنیاد پر عام طریقے سے وہ اپنے اسیروں کا فدیہ دیں گے۔

④ بنوعوف (قبل از اسلام کے) دستور کے مطابق اپنے پہلے خون بہا ادا کریں گے اور ہر طائفہ اپنے اسیروں کا فدیہ اہل ایمان کے درمیان عدل و انصاف کی بنیاد پر عام طریقے سے دے گا۔

⑤ بنو حارث (بنوخزرج) دستور کے مطابق اپنے پہلے خون بہا ادا کریں گے اور ہر طائفہ اپنے اسیروں کا فدیہ اہل ایمان کے درمیان عدل و انصاف کی بنیاد پر عام طریقے سے ادا کرے گا۔

⑥ بنوساعدہ دستور کے مطابق اپنے پہلے خون بہا ادا کریں گے اور ہر طائفہ اپنے اسیروں کا فدیہ اہل ایمان کے درمیان عدل و انصاف کی بنیاد پر عام طریقے سے ادا کرے گا۔

⑦ بنوجشم دستور کے مطابق اپنے پہلے خون بہا ادا کریں گے اور ہر گروہ اپنے اسیروں کا فدیہ اہلِ ایمان کے درمیان عدل و انصاف کی بنیاد پر عام طریقے سے دے گا۔

⑧ بنونجار دستور کے مطابق اپنے پہلے خون بہا ادا کریں گے اور ہر جماعت اپنے اسیروں

کا فدیہ اہلِ ایمان کے درمیان عدل و انصاف کی بنیاد پر رائج طریقے سے دے گی۔

⑨ بنو عمرو بن عوف دستور کے مطابق اپنے پہلے خون بہا ادا کریں گے اور ہر فریق اپنے اسیروں کا فدیہ اہلِ ایمان کے درمیان عدل و انصاف کی بنیاد پر عام اور معروف طریقے سے دے گا۔

⑩ بنو عبیت دستور کے مطابق اپنے پہلے خون بہا ادا کریں گے اور ہر گروہ اپنے قیدیوں کا فدیہ اہلِ ایمان کے درمیان عدل و انصاف کی بنیاد پر رائج طریقے سے دے گا۔

⑪ بنو اوس دستور کے مطابق اپنے پہلے خون بہا ادا کریں گے اور ہر گروہ اپنے قیدیوں کا فدیہ اہلِ ایمان کے درمیان عدل و انصاف کی بنیاد پر مروجہ طریقے سے دے گا۔

⑫ اہلِ ایمان کسی مفلس یا مقروض کو بے یارو مددگار نہیں چھوڑیں گے بلکہ قاعدے کے مطابق فدیہ، دیت اور تاوان ادا کرنے میں اس کی مدد کریں گے اور کوئی مومن دوسرے مومن کے معاہداتی بھائی سے اس کی اجازت کے بغیر حلیفانہ معاہدہ نہیں کرے گا۔

⑬ تقویٰ شعار اہلِ ایمان ہر اس آدمی کے خلاف کمربستہ رہیں گے جو سرکشی کرے یا ظلم و زیادتی اور گناہ کا مرتکب ہو یا اہلِ ایمان میں فتنہ و فساد پھیلانے کی سعی کرے۔ ان سب کے ہاتھ ایسے شخص کی مخالفت پر ایک ساتھ اٹھیں گے، خواہ وہ ان میں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

⑭ کوئی مومن کسی مومن کو کافر کی خاطر قتل نہیں کرے گا اور نہ کسی مومن کے خلاف کافر کی مدد کرے گا۔

⑮ اللہ کا عہد و پیمان (ضمانت) ایک (اور سب کے لیے) ہے۔ مسلمانوں کا ادنیٰ سے ادنیٰ فرد بھی کسی کو پناہ دے کر سب کو اس کا پابند کر سکتا ہے۔ لوگوں کے بالمقابل اہلِ ایمان ایک دوسرے کے حلیف اور ضامن ہیں۔

⑯ یہود کا کوئی فرد ہمارا ساتھ دیتا ہے تو اسے مکمل تعاون اور مساویانہ حقوق حاصل ہوں

گے۔ اس پر ظلم نہیں ہوگا اور نہ اس کے خلاف کسی کی مدد کی جائے گی۔

⑰ اہلِ ایمان کی صلح ایک ہے۔ اللہ کی راہ میں کوئی مومن کسی دوسرے مومن کو چھوڑ کر دشمن سے صلح نہیں کرے گا جب تک کہ صلح سب کے لیے برابر نہ ہو۔

⑱ ہر جنگجو گروہ جو ہماری معیت میں لڑے گا، اس کے افراد آپس میں ایک دوسرے کی جانشینی کریں گے۔

⑲ اہلِ ایمان اللہ کی راہ میں قتل ہونے والوں کا انتقام لیں گے۔

⑳ بلاشبہ متقی اہل ایمان بہترین اور سیدھے راستے پر ہیں۔ کوئی مشرک قریش کے کسی فرد یا جائیداد کو اپنی تحویل یا نگرانی یا ذمہ داری میں نہیں لے گا اور نہ اس سلسلے میں کسی مسلمان کے آڑے آئے گا۔

㉑ جو شخص کسی مومن کو ناحق قتل کرے اور اس کا ثبوت بھی مل جائے تو اس سے قصاص لیا جائے گا، بجز اس کے کہ مقتول کے ورثاء خون بہا لینے پر راضی ہو جائیں۔ تمام اہلِ ایمان قاتل کے خلاف ہوں گے اور اس کے سوا ان کے لیے کوئی صورت درست نہیں ہو گی۔

㉒ کسی مسلمان کے لیے جو اس نوشتہ کے مندرجات (کی تکمیل) کا اقرار کر چکا اور اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لایا ہے، جائز نہیں کہ وہ کسی قانون شکن کی مدد کرے یا اسے پناہ دے۔ جو ایسے مجرم کی مدد کرے گا یا اسے پناہ دے گا قیامت کے دن اللہ کی لعنت اور اس کے غضب کا مستحق ٹھہرے گا اور اس سے کوئی فدیہ یا عوض قبول نہیں کیا جائے گا۔

㉓ جب بھی تم لوگ کسی معاملے میں اختلاف کرو گے، اس معاملے میں اللہ اور اس کے رسول محمد ﷺ کی طرف رجوع کیا جائے گا۔

㉔ یہود اس وقت تک مسلمانوں کے ساتھ اخراجات برداشت کریں گے جب تک ان کے ہمراہ جنگ کریں گے۔

㉕ بنو عوف کے یہود مومنین کے ساتھ ایک امت (سیاسی وحدت) تسلیم کیے جاتے ہیں۔

یہود کے لیے ان کا دین ہے اور مسلمانوں کے لیے ان کا دین۔ موالی (آزاد کردہ غلام) ہوں کہ اصل۔ ہاں جو ظلم اور گناہ کا ارتکاب کرے وہ اپنی ذات اور گھرانے کے سوا کسی کو ہلاکت میں نہیں ڈالے گا۔

(26) یہودِ بنونجار کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو یہود بنوعوف کو حاصل ہیں۔

(27) یہودِ بنو حارث کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو یہود بنوعوف کو حاصل ہیں۔

(28) یہودِ بنوساعدہ کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو یہود بنوعوف کو حاصل ہیں۔

(29) یہودِ بنوجشم کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو یہود بنوعوف کو حاصل ہیں۔

(30) یہودِ بنواوس کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو یہود بنوعوف کو حاصل ہیں۔

(31) یہودِ بنوثعلبہ کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو یہود بنوعوف کو حاصل ہیں، البتہ جو ظلم اور گناہ کا ارتکاب کرے گا تو وہ اپنی ذات یا گھرانے ہی کو ہلاکت میں ڈالے گا۔

(32) بنو جفنہ بنوثعلبہ کی شاخ ہے۔ انھیں بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنوثعلبہ کو حاصل ہیں۔

(33) بنوشطیبہ کو بھی وہی مراعات حاصل ہوں گی جو بنوعوف کو حاصل ہیں۔ وفاشعاری ہوگی نہ کہ عہد شکنی۔

(34) ثعلبہ کے موالی بھی انھی حقوق کے حامل ہوں گے جن سے بنوثعلبہ بہرہ مند ہوں گے۔

(35) یہود کے حامی اور دوست قبائل کو بھی وہی حقوق دیے جائیں گے جو خود یہود کو حاصل ہوں گے۔

(36) ان میں سے کوئی بھی محمد ﷺ کی اجازت کے بغیر معاہدے سے نہیں نکلے گا۔

(37) یہود اپنے اخراجات کے ذمہ وار ہوں گے اور مسلمان اپنے اخراجات کے۔ جو کوئی اس معاہدے کے شرکاء سے جنگ کرے گا، تمام شرکاء اس کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔ انھیں باہمی مشاورت اور خیر خواہی سے کام لینا ہوگا اور وہ وعدے کا پاس

کریں گے، عہد شکنی کے مرتکب نہیں ہوں گے۔

38 کوئی شخص اپنے حلیف کی بدعملی کا ذمہ دار نہیں ہوگا اور مظلوم کی مدد ہر حال میں کی جائے گی۔

39 یہود اس وقت تک مسلمانوں کے ساتھ مصارف برداشت کرتے رہیں گے جب تک وہ ان کی ہمراہی میں جنگ کریں گے۔

40 معاہدے کے شرکاء کے لیے سرزمینِ یثرب کی حیثیت حرم (مقدس مقام اور جنگ کے لیے ممنوعہ علاقہ) کی ہوگی۔

41 پناہ گزیں سے وہی برتاؤ ہوگا جو عام باشندے سے ہوتا ہے۔ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا اور نہ وہ خود عہد شکنی کرے گا۔

42 کسی کی زیرِ کفالت شے کو اس کی اجازت کے بغیر پناہ نہیں دی جائے گی۔

43 معاہدے کے شرکاء کے درمیان کوئی بات یا جھگڑا ہو جائے جس کے نتیجے میں فساد برپا ہونے کا خدشہ ہو تو اس کے متعلق اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) سے رجوع کیا جائے گا اور اس دستاویز میں اللہ تعالیٰ کو وہ چیز قبول ہے جو نیکی اور بھلائی کے زیادہ قریب ہے۔

44 قریش کو پناہ دی جائے گی نہ ان کے حامیوں کو اور اگر کوئی باہر سے یثرب پر حملہ آور ہو گا تو معاہدے کے شرکاء اس کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔

45 اگر انھیں (یہود کو) صلح کرنے کی دعوت دی جائے تو وہ قبول کریں گے اور اگر وہ اسی قسم کا مطالبہ مسلمانوں سے کریں تو اسے ضرور پورا کیا جانا چاہیے، بجز اس کے کہ اس صورت میں ہر ایک اپنے مدمقابل کا سامنا کرے گا، وہ حلیف دین (اسلام) سے برسرپیکار نہ ہوں۔

46 اوس کے یہود کو، وہ موالی ہوں کہ اصل باشندے، شرکائے معاہدہ کے حقوق حاصل ہوں گے۔ شرکائے معاہدہ ان سے وفاداری کرنے کے پابند ہوں گے۔ عہد کا پاس کیا

جائے گا، پیمان شکنی نہیں کی جائے گی۔ ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔ اس دستاویز میں اللہ تعالیٰ کو وہ چیز قبول ہے جو نیکی اور سچائی کے زیادہ قریب ہے۔

47 یہ دستاویز کسی مجرم یا ظالم کو تحفظ نہیں دے گی۔ جو شخص جنگ کے لیے جائے گا وہ محفوظ ہے اور جو گھر میں بیٹھا رہے وہ بھی محفوظ ہے، سوائے اس کے جو ظلم یا جرم کا ارتکاب کرے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نیک اور متقی شخص کا حامی و محافظ ہے اور محمد اللہ کا رسول ہے۔ ﷺ [1]

اخلاقی اسباق، دروس اور فوائد و مسائل

امت کے مفہوم کا تعین

میثاق مدینہ میں ان تمام اصولوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جو آج کل کی جدید ترقی یافتہ اقوام کے دستوروں میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں مبدا کے طور پر امت کے مفہوم کا تعین کیا گیا ہے۔ دستاویز کے مطابق امت کے مفہوم میں تمام مہاجرین و انصار، ان کے پیروکار اور ان کے ساتھ مل کر جہاد کرنے والے لوگ شامل ہیں۔ یہ لوگ اقوامِ عالم سے الگ ایک امت کہلائیں گے۔[2]

جزیرہ نمائے عرب کی سیاسی تاریخ میں یہ نظریہ انوکھا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اہلِ اسلام کو قبائلی نسبتوں سے نکال کر امت کا خطاب دیا۔ اس لفظ میں نیا دین (اسلام) قبول کرنے والے ہر فرد کو شامل کر لیا گیا۔ دستاویز کی پہلی اور دوسری شق میں اس کا تذکرہ ہے۔ قرآن کریم نے بھی اہلِ اسلام کو امت کا لقب عطا کیا اور فرمایا:

﴿إِنَّ هَٰذِهِۦٓ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَٰحِدَةً وَأَنَا۠ رَبُّكُمْ فَٱعْبُدُونِ ۝﴾

[1] مجموعة الوثائق السياسية لمحمد حميد الله، ص:41-47. [2] التاريخ السياسي والعسكري للدكتور علي معطي، ص:169.

''بلاشبہ یہ تمھاری امت ایک ہی امت ہے اور میں تمھارا رب ہوں، لہٰذا تم میری ہی عبادت کرو۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے اس امت کو سب سے بہتر قرار دیتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ﴾

''اور (جیسے تمھیں ہدایت دی) اسی طرح ہم نے تمھیں افضل اُمت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہوں۔''[2]

اللہ تعالیٰ نے واضح کیا کہ یہ امت مثبت سوچ کی حامل ہے جو معاشرتی مسائل سے بھاگنے کے بجائے نیکی کا حکم دیتی اور برائی سے روکتی ہے، اچھے اخلاق کی دعوت دیتی اور گھٹیا اقدار کی حوصلہ شکنی کرتی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۗ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ اَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ ﴾

''تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی اصلاح) کے لیے پیدا کی گئی ہے، تم نیک کاموں کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو اور تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اگر اہل کتاب ایمان لے آتے تو ان کے حق میں بہت بہتر ہوتا۔ ان میں بعض ایمان والے بھی ہیں مگر ان کے اکثر نافرمان ہیں۔''[3]

اہلِ یثرب میں موجود مسلمانوں کی جماعت پر بولے گئے اس نئے نام کی بدولت مختلف قبائل سے تعلق رکھنے والے جمیع مسلمان اسلامی رشتے کی بنیاد پر اس جماعت کے پرچم تلے آ گئے۔ وہ ایک دوسرے کا سہارا بنے، انھوں نے ظالم کے خلاف مظلوم کی مدد کا شعار

---

1 الأنبیآء 92:21. 2 البقرۃ 143:2. 3 اٰل عمرٰن 110:3، دستور للأمة للدکتور عبدالناصر العطار، ص: 9.

اپنایا اور محبت، قرابت اور ہمسائیگی کے حقوق کی پاسداری کی۔[1]

اوس وخزرج کے دونوں قبائل انصار میں تبدیل ہو گئے اور انصار ومہاجرین نے باہم مل کر مسلمانوں کی جماعت تشکیل دی۔ یوں وہ امتِ واحدہ کی صورت اختیار کر گئے۔[2] اس امت کے افراد خاندانی تعلقات اور خونی رشتوں کے بجائے عقیدۂ توحید کی بنا پر متحد ہوئے۔ ان کے افکار ونظریات میں زبردست ہم آہنگی پیدا ہو گئی، ان کے جذبات و احساسات ایک ہو گئے اور زندگی کے سفر میں وہ سب ایک درست سمت کی طرف چل پڑے۔ اس سے قبل ان کی وفاؤں کا مرکز ومحور ان کا قبیلہ تھا لیکن اب ان کی تمام تر وفاداری اور حمایت اللہ کے لیے تھی۔ ان کا سر رائج الوقت نظام کے آگے جھکنے کے بجائے شریعتِ اسلامی کے سامنے جھکا۔ وہ عامۃ الناس کے مقابلے میں امتیازی حیثیت اختیار کر گئے۔ اب امت کا یہ لفظ صرف مسلمانوں کے لیے ہے۔ یہود اور ان کے حلیف اس کے مفہوم میں شامل نہیں رہے۔

دراصل اس دینی جماعت کو الگ حیثیت دینا وقت کا ایک اہم تقاضا تھا۔ اس سے مقصود بھی یہی تھا کہ امت کی باہمی ہم آہنگی اور خود اعتمادی میں اضافہ ہو۔[3]

مسلم امت کے امتیاز کا ایک مظہر تحویل قبلہ ہے کہ سولہ یا سترہ ماہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرنے کے بعد بیت اللہ کو قبلہ قرار دے دیا گیا۔[4]

نبی ﷺ نے بھی کئی ایک معاملات میں اپنے پیروکاروں کو دوسروں سے نمایاں کرنے کی کوشش کی اور وضاحت سے بتایا کہ میں ان امور میں اپنے لوگوں کو یہود سے مختلف اور ممتاز دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے کا عملی اقدام یہ تھا کہ یہود جوتا پہن کر عبادت نہیں کرتے تھے نبی ﷺ نے اپنے اصحاب کو جوتا پہن کر نماز ادا کرنے کی اجازت دی۔ یہود سفید بالوں کو

---

[1] التاريخ السياسي والحضاري للدكتور السيد عبد العزيز، ص: 100. [2] قيادة الرسول لأحمد راتب، ص: 93. [3] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 293/1. [4] تاريخ خليفة بن خياط، ص: 24,23، والسيرة النبوية لابن هشام: 550/1.

رنگتے نہیں تھے۔ مسلمانوں نے سر کے سفید بالوں کو مہندی وغیرہ سے رنگنا شروع کر دیا۔ یہودی عاشورا کا روزہ رکھتے تھے۔ نبی ﷺ نے بھی یہ روزہ رکھا لیکن زندگی کے آخری ایام میں عزم کیا کہ آئندہ یہود کی مخالفت میں ”تاسوعا“ یعنی نویں محرم کا روزہ بھی رکھیں گے۔[1]

اس ضمن میں رسول اللہ ﷺ نے اہلِ اسلام کو دیگر اقوام وملل سے نمایاں نظر آنے کی خاطر اصولی فیصلہ کرتے ہوئے فرمایا: «مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ» ”جو کسی قوم سے مشابہت کرے وہ انھی میں سے ہے۔“[2] مزید فرمایا: «لَا تَشَبَّهُوا بِالْيَهُودِ» ”یہود سے مشابہت نہ کرو۔“[3]

بہت سی احادیث میں اہل ایمان کو دیگر اقوام کے مقابلے میں امتیازی حیثیت اختیار کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ بلاشبہ غیر مسلموں کی نقالی اسلامی شان وشوکت اور خود اعتمادی کے منافی ہے۔ لیکن نمایاں حیثیت اختیار کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمان اپنے آپ کو دیگر اقوام سے بالکل الگ تھلگ کر لیں اور اُن سے کسی قسم کا رابطہ نہ رکھیں۔ نہیں بلکہ امت مسلمہ میں شمولیت کے دروازے کھلے ہیں اور اس میں توسیع کی گنجائش موجود ہے۔ عقیدۂ توحید کے زیور سے آراستہ ہو کر ہر انسان اس کے زیر سایہ آ سکتا اور یہ امتیازی شان حاصل کر سکتا ہے۔[4]

میثاق میں یہود کو اسلامی ریاست کے باشندے کہا گیا اور انھیں ریاست کا ایک عنصر تسلیم کیا گیا ہے، چنانچہ معاہدے کی سولھویں شق میں لکھا گیا کہ یہود میں سے جس نے ہمارا ساتھ دیا اسے مسلمانوں کی مدد حاصل ہوگی اور اس سے مساویانہ سلوک کیا جائے گا۔ ان پر ظلم ہوگا اور نہ ان کے خلاف کسی سے تعاون کیا جائے گا۔ اس اصول کی مزید وضاحت پچیسویں شق میں کی گئی کہ بنوعوف کے یہود مومنین کے ساتھ مل کر ایک امت ہیں۔ یوں

1 السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 293/1. 2 مسند أحمد: 50/2 و 92، و سنن أبي داود، حديث: 4031. 3 مسند أحمد: 165/1، و السنن الكبرى للنسائي: 137/8، و مسند أبي يعلى، حديث: 681. 4 السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 293/1.

اسلام نے اہل کتاب کو جو مدینہ کے بیچوں بیچ اور اطراف و جوانب میں آباد تھے، معاہدے کی پاسداری کی شرط پر مسلمانوں کے ساتھ ایک امت تسلیم کیا۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی انسان کے لیے دین یا مذہب کا اختلاف وطنیت سے محرومی کا باعث نہیں بن سکتا۔[1]

اقتدار اعلیٰ صرف اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے

اس دستور کے مطابق مدینہ منورہ میں تمام داخلی و خارجی معاملات کا حتمی فیصلہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ہوگا۔ معاہدے کی تیئسویں شق میں بیان کیا گیا کہ جب کبھی تم کسی چیز کے بارے میں اختلاف کرو تو اُس کے متعلق اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ اس شق کا واضح مقصد یہ تھا کہ اقتدار اعلیٰ کا تعین کیا جائے جو مدینہ کے داخلی و خارجی امور کا نگران ہو اور اختلافات میں اُس کی بات کو قول فیصل کا درجہ دیا جائے تا کہ شہر کے اندر مختلف قیادتوں کے نتیجے میں پھیلنے والی ممکنہ سیاسی انارکی اور اضطراب کا حفظِ ماتقدم کے طور پر سدباب ہو۔اس شق میں ضمنی طور پر یہ بات بھی کھول دی گئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس نئی ریاست کے فرماں رواہوں گے۔[2]

دستاویز میں یہ تعین بھی کیا گیا تھا کہ سیاسی نوعیت کے تین بنیادی عدالتی، قانون سازی اور نفاذ قوانین کے اختیارات کا سرچشمہ کیا ہوگا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے احکامات کو اس نئی ریاست میں نافذ کرنے کی شدید خواہش رکھتے تھے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ زمین پر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت باور کرانا اور اس کے نفاذ کی کوشش کرنا اس کی بندگی کا مظہر ہے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۚ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ○﴾

---

[1] نظام الحكم لظافر القاسمي: 37/1. [2] التاريخ السياسي والحضاري للدكتور السيد عبدالعزيز، ص: 102.

"اللہ کے سوا کسی کا حکم نہیں۔ اس نے حکم دیا ہے کہ تم صرف اسی کی عبادت کرو یہی سیدھا دین ہے مگر اکثر لوگ علم نہیں رکھتے۔"[1]

یعنی عقائد، عبادات اور معاملاتِ زندگی میں حقیقی حکومت اللہ تعالیٰ ہی کی ہے، وہ اپنے چنیدہ بندوں پر یہ احکام نازل فرماتا ہے۔ کسی بشر کے لائق نہیں کہ وہ ان معاملات میں اپنی رائے، خواہش، عقل، قیاس، اجتہاد یا استحسان وغیرہ سے کام لے۔ یہ قاعدہ اللہ کے دین کی اساس ہے جو تمام پیغمبروں نے بیان کیا۔ زمان و مکان کا ہیر پھیر اس میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکتا۔[2]

قرآنِ کریم نازل کرنے کا اصل مقصد یہی ہے کہ بندوں پر واضح کر دیا جائے کہ بندگی صرف اللہ تعالیٰ کی ہے اور اقتدارِ اعلیٰ بھی اسی کے پاس ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلْكِتَٰبَ بِٱلْحَقِّ فَٱعْبُدِ ٱللَّهَ مُخْلِصًا لَّهُ ٱلدِّينَ ○ أَلَا لِلَّهِ ٱلدِّينُ ٱلْخَالِصُ ۚ وَٱلَّذِينَ ٱتَّخَذُوا۟ مِن دُونِهِۦٓ أَوْلِيَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَآ إِلَى ٱللَّهِ زُلْفَىٰٓ ۖ إِنَّ ٱللَّهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِى مَا هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۗ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَهْدِى مَنْ هُوَ كَٰذِبٌ كَفَّارٌ ○﴾

"بے شک ہم نے یہ کتاب آپ کی طرف حق کے ساتھ نازل کی ہے، لہٰذا آپ اللہ کے لیے بندگی کو خالص کرتے ہوئے اسی کی عبادت کیجیے۔ سنو! خالص اطاعت و بندگی اللہ ہی کے لیے ہے اور جن لوگوں نے اس کے سوا کارساز بنا رکھے ہیں، (وہ کہتے ہیں:) ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کے زیادہ قریب کر دیں، یقیناً اللہ ان کے درمیان ان باتوں کا فیصلہ فرمائے گا جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں، بے شک اللہ اسے ہدایت نہیں دیتا جو جھوٹا، ناشکرا ہو۔"[3]

[1] يوسف 40:12. [2] تفسير المنار لمحمد رشيد رضا: 309/12. [3] الزمر 39:2،3.

ایک اور موقع پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۭ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَاۗىِٕنِيْنَ خَصِيْمًا ۝﴾

''(اے نبی!) بے شک ہم نے آپ کی طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے تا کہ آپ کو اللہ نے جو سیدھی راہ دکھائی ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں اور آپ خیانت کرنے والوں کے حمایتی نہ بنیں۔''[1]

چنانچہ قرآن کریم کے نزول کا مقصد بندوں کو اللہ کی بندگی باور کرانا اور اس کی حاکمیت کا نفاذ ہے۔عبادت کا سرچشمہ صرف وحی ہوسکتا ہے تو باقی تمام فیصلے بھی نازل شدہ قوانین یا ایسے قانون کے مطابق ہوں گے جس کی اساس قانونِ الٰہی پر ہو۔[2]

دراصل اللہ کی حاکمیت کا قیام اس کی بندگی ہی کو مستحکم کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اسی کے واسطے سے وہ مقصد بھی پورا ہوتا ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے جن و انس کی تخلیق فرمائی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝﴾

''اور میں نے جن اور انسان اسی لیے تو پیدا کیے ہیں کہ وہ میری ہی عبادت کریں۔''[3]

میثاقِ مدینہ میں یہود نے اگرچہ اس عدالت عالیہ کو تسلیم کرلیا جس سے اہلِ مدینہ اپنے مسائل کے سلسلے میں رجوع کریں گے۔ اس کا تذکرہ وثیقے کی تینتالیسویں شق میں کیا گیا ہے۔ لیکن یہود پر یہ لازم نہیں تھا کہ ہر مسئلے کے بارے میں اسلامی عدالت سے فیصلہ کرائیں بلکہ انھیں صرف ان کے اور مسلمانوں کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات کے وقت حکم تھا کہ اسلامی عدالت سے رجوع کریں۔ ذاتی معاملات میں یہود کو تورات کی

1 النسآء 4:105. 2 الحکم والتحاکم لعبد العزیز کامل:1/433. 3 الذّٰریٰت 51:56.

طرف رجوع کرنے کی مکمل آزادی تھی۔ اور ان کے ''احبار اور ربی'' ان کے درمیان تورات کے مطابق فیصلہ کرنے کے پابند تھے۔ ہاں اگر وہ اپنی خوشی سے رسول اللہ ﷺ کی عدالتِ عالیہ میں مقدمہ پیش کرنا چاہتے تو بھی ان کی مرضی پر منحصر تھا۔ نبی ﷺ کو بھی ان کا فیصل بننے یا ان کے مسائل احبار کی طرف لوٹانے کا اختیار دیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ۚ فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْـًٔا ۭ وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝﴾

''وہ جھوٹی باتیں سننے کے عادی ہیں اور جی بھر کر حرام کھانے والے ہیں۔ پھر اگر وہ آپ کے پاس آئیں تو آپ (کو اختیار ہے کہ) ان کے درمیان فیصلہ کر دیں یا ان سے اعراض کریں اور اگر آپ ان سے منہ موڑ لیں گے تو بھی وہ آپ کو قطعاً کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ اور اگر آپ ان کے درمیان کوئی فیصلہ کریں تو انصاف کے ساتھ کریں۔ بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''[1]

یہود نے جن مسائل میں نبی ﷺ کو ثالث تسلیم کیا ان میں سے ایک بنونضیر اور بنوقریظہ کے درمیان مقتولین کی دیت کا مسئلہ تھا۔ بنونضیر بنوقریظہ پر فوقیت رکھتے تھے، چنانچہ وہ اپنے مقتولین کی دیت بڑھا چڑھا کر وصول کرتے۔ اسلام مدینہ میں پہنچا تو بنوقریظہ نے مقررہ مقدار سے زیادہ دیت دینے سے انکار کر دیا اور اس سلسلے میں مساوات کے طلبگار ہوئے۔[2]

اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ۭ فَمَنْ تَصَدَّقَ

[1] المآئدۃ 42:5. [2] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 291/1.

بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝﴾

’’اور ہم نے تورات میں ان کے لیے لکھ دیا تھا کہ بے شک جان کے بدلے جان ہے اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور تمام زخموں کا قصاص ہے، پھر جو شخص اسے معاف کردے تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے۔ اور جو لوگ اللہ کے نازل کیے ہوئے کے مطابق فیصلے نہ کریں وہی ظالم ہیں۔‘‘[1]

دستور کی تینتالیسویں شق میں کہا گیا کہ اہلِ میثاق کے درمیان کوئی معاملہ یا جھگڑا ہو جائے جس کے نتیجے میں فساد کا اندیشہ ہو تو اس کے متعلق اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف رجوع کیا جائے۔ اس شق کے مطابق رسول اللہ ﷺ کو فیصلہ کرنے کا مرکزی اختیار حاصل ہو گیا۔ تمام اہلِ مدینہ کو اسی عدالت سے رجوع کرنے کو کہا گیا۔ اسی مرکزی اختیار کو قانون کے نفاذ کا اختیار بھی دیا گیا کیونکہ قوانین الٰہیہ کی اطاعت واجب اور ان کا نفاذ لازم ہے۔ نبی ﷺ کے جاری کردہ احکامات بھی اللہ کی طرف سے وحی کی صورت میں نازل ہوئے تھے جنھیں تسلیم کرنا اور ان کا پابند ہونا ضروری ہے۔[2]

یوں رسول اللہ ﷺ اس ریاست کے سربراہ قرار پائے اور آپ کو قانون سازی، عدالتی اور مرکزی نفاذ قانون کے تینوں اختیارات بیک وقت حاصل ہو گئے، چنانچہ کلام اللہ کا مفسر اور شریعتِ اسلامی کا مبلغ ہونے کی حیثیت سے آپ ﷺ نے مرکزی نوعیت کے یہ تینوں اختیارات سنبھال لیے۔ آپ ﷺ کی سربراہی وثیقے کی دفعات کے تحت اور مدینہ میں موجود تمام سیاسی گروہوں کے اتفاق سے عمل میں آئی۔ رسول اللہ ﷺ کی اسی مرکزی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے وثیقے کی چھتیسویں شق میں کہا گیا: ’’ان میں سے کوئی بھی محمد ﷺ

[1] المآئدة 5:45. [2] دولة الرسول من التكوين إلى التمكين للدكتور كامل سلامة، ص: 418.

کی اجازت کے بغیر معاہدے سے نہیں نکلے گا۔''

یہ بات بھی نہایت اثر انگیز تھی کہ اہلِ میثاق میں سے کسی کو قریش اور اس کے حمایتی قبائل سے حلیفانہ تعلقات قائم کرنے کی اجازت نہیں۔ چوالیسویں شق میں جو اصول مقرر کیا گیا وہ کہیں زیادہ دور رس، دوٹوک اور واضح تھا کہ قریش اور اس کے ہم نواؤں کو پناہ نہیں دی جائے گی۔ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ صحیفے میں رسول اللہ ﷺ کے سوا کسی شخص کا نام نہیں آیا۔[1]

ریاست کا دارالحکومت

دستاویز کی چالیسویں شق میں کہا گیا: ''شرکائے معاہدہ کے لیے سرزمینِ یثرب کی حیثیت حرم (مقدس مقام اور جنگ کے لیے ممنوعہ علاقہ) کی ہوگی۔''

حرم قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ نہ یہاں کا درخت کاٹا جائے گا اور نہ یہاں آباد یا موجود کسی پرندے کو مارا جائے گا۔ نباتات و پرند کو یہ تحفظ دیا گیا تو انسانی جان و مال کے تقدس کا عالم کیا ہوگا، اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔[2]

یوں اس دستاویز میں ریاست کے خدوخال کی وضاحت آ گئی ہے کہ ایک امت کا تصور، اسلامی ریاست کی سرزمین اور حاکمانہ اختیارات کا حامل ایک ادارہ جس کی طرف مسائل کے سلسلے میں رجوع کیا جائے اور وہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق فیصلہ کرے۔

مدینہ اسلامی ریاست کی ابتدائی سرزمین تھی۔ یہ نقطۂ آغاز تھا۔ یہ اس دائرے کا مرکز تھا جہاں سے یہ مملکت پھیلتی چلی گئی۔

رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام کو حرمِ مدینہ کی حدود کو جھنڈے گاڑ کر نشان زدہ کرنے

1 دولة الرسول من التكوين إلى التمكين للدكتور كامل سلامة، ص: 420. 2 نظام الحكم لظافر القاسمي: 38/1.

کے لیے بھیجا تھا۔ مدینہ کی مشرقی اور مغربی جانب دو حروں (سیاہ پتھریلے میدانوں) کی درمیانی زمین اور شمالی جانب جبل ثور اور جنوبی جانب جبل عیر حرم کی حدود قرار دی گئیں۔ ارشادِ نبوی ہے:

«اَلْمَدِينَةُ حَرَمٌ مَّا بَيْنَ عَيرٍ إِلٰى ثَوْرٍ، فَمَنْ أَحْدَثَ فِيهَا حَدَثًا، أَوْ آوٰى مُحْدِثًا، فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ......»

''جبل عیر اور جبل ثور کے درمیان کا مدینہ حرم ہے۔جس شخص نے یہاں دین میں کوئی نئی چیز شامل کی یا کسی بدعتی کو پناہ دی اس پر اللہ کی لعنت ہے......۔''[1]

فتوحات بڑھیں اور مفتوحہ علاقوں کی قومیں اسلام میں داخل ہوئیں تو ریاست اسلامی کی سرزمین بھی وسیع تر ہوتی چلی گئی اور اسلامی سلطنت کا دائرۂ عمل اس قدر وسعت اختیار کر گیا کہ اس کی سرحدیں مغرب میں بحر اوقیانوس، سپین اور فرانس تک، مشرق میں وسطی ایشیا اور چین تک اور جنوب میں صومالیہ و زنجبار اور افریقہ کے وسط تک پھیل گئیں۔[2]

اسلامی ریاست کھلی اور غیر محدود ہے۔ اس کی کوئی جغرافیائی یا سیاسی حد نہیں۔ یہ اپنے دارالخلافہ مدینہ سے شروع ہو کر پوری زمین پر پھیلی ہوئی ہے اور پوری زمین ہی اس کی حدود میں شامل ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۗ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ۝﴾

''موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: تم اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو، بے شک زمین تو اللہ ہی کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے اور (اچھا) انجام تو پرہیز گاروں ہی کے لیے ہے۔''[3]

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 6755، و صحيح مسلم، حديث: 1370. [2] دولة الرسول من التكوين إلى التمكين للدكتور كامل سلامة، ص: 411. [3] الأعراف 128:7.

ریاست کی طرح امت کا لفظ بھی وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ یہ لفظ کسی ایک گروہ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ پوری انسانیت کو محیط ہے۔ زمین پر بسنے والا ہر وہ انسان جو اللہ کے پسندیدہ دین (اسلام) کو اختیار کر لے، امت کا فرد ہے۔ یوں ریاستِ اسلامی عالمگیر رسالت کی عالمگیر ریاست ہے اور دنیا کے ہر گوشے میں بسنے والے مسلمان کا اس میں حصہ ہے اور یہ ریاست جہاد کے ذریعے وسعت اختیار کر گئی ہے۔[1]

آزادی اور انسانی حقوق

دستاویز کی تمام دفعات نبی ﷺ کی بلند پایہ اور وسیع سوچ کی آئینہ دار ہیں۔ اس کا مربوط اور جامع انداز آپ ﷺ کی عبقریت کا شاہدِ عادل ہے۔ مدینہ کے اس وقت کے حالات کے لیے یہ تحریر بہت مناسب تھی۔ اس میں ایسے قوانین وضع کر دیے گئے تھے جو بنی نوع انسان کے درمیان عدل و انصاف اور مساوات کے ضامن تھے۔ مختلف رنگ و نسل، زبان، متفاوت ادیان سے تعلق رکھنے والے تمام افراد کو اس تحریر کی رو سے وہ جمیع حقوق اور آزادیاں حاصل تھیں جن کا ذکر اس کے مندرجات میں کیا گیا تھا۔[2]

پروفیسر محمد سلیم العوا کہتے ہیں: ''اس دستور کے تمام قوانین پر ہمیشہ سے عمل رہا ہے۔ غالباً آج تک جتنے سیاسی دستور نافذ العمل رہے ہیں، اس تحریر کی بنیادی باتیں ان کا حصہ رہی ہیں۔ دنیا کے لوگ صدیوں کی تگ و دو کے بعد جس قانون تک پہنچے رسول اللہ ﷺ نے اسے آج سے چودہ سو برس پیشتر پہلے سیاسی وثیقے کی شکل میں مدون فرما دیا تھا۔''[3]

اس دستور نے اعلان کیا تھا کہ ہر قسم کی آزادی کا حق محفوظ ہے، چاہے وہ عقیدے کی آزادی ہو، عبادت کی آزادی یا امن کا حق۔ مذہب کی آزادی کا ذمہ بھی یہ کہہ کر

[1] دولة الرسول من التكوين إلى التمكين للدكتور كامل سلامة، ص:421. [2] دولة الرسول من التكوين إلى التمكين للدكتور كامل سلامة، ص: 420. [3] النظام السياسي في الإسلام لأبي فارس، ص:65.

اٹھایا گیا تھا کہ مسلمانوں کے لیے ان کا دین ہے اور یہود کے لیے ان کا دین۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۖ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾

”دین میں کوئی زبردستی نہیں، ہدایت، گمراہی سے واضح ہو چکی ہے، پھر جو شخص طاغوت کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لے آئے تو یقیناً اس نے ایک مضبوط کڑا تھام لیا جو ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔“ [1]

تحریر میں اس بنیادی اصول کی خلاف ورزی کرنے والے کو سنگین نتائج کی وعید بھی سنائی گئی ہے۔

اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان نظامِ عدل و انصاف قائم کرے اور لوگوں کے لیے حصولِ انصاف کے راستے آسان بنائے۔ [2]

اسلامی ریاست کی یہ ذمہ داری بھی ہے کہ وہ حق دار کے راستے کی ہر رکاوٹ دور کرے۔ اسلام نے حکمرانوں کے لیے ضروری قرار دیا ہے کہ وہ علاقے، زبان اور معاشرتی مقام کی تمیز کے بغیر لوگوں کو فوری اور صحیح انصاف مہیا کریں اور حق کا ساتھ دیں۔ دوست، دشمن، امیر، غریب، رشتہ دار، عدل و انصاف کی راہ میں رکاوٹ نہ بنیں۔ [3]

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۖ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۚ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴾

[1] البقرة 2:256. [2] النظام السياسي في الإسلام لأبي فارس، ص: 58. [3] النظام السياسي في الإسلام لأبي فارس، ص: 52.

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم اللہ کے لیے (حق پر) قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو اور کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل نہ کرو، عدل کرو، یہی بات تقویٰ کے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرو، بے شک تم جو عمل کرتے ہو اللہ اس سے خوب آگاہ ہے۔'' [1]

ارشادِ ربانی ہے:

﴿فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَّاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۚ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ۚ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝﴾

''لہٰذا آپ اسی (دین) کی طرف (سب کو) بلائیں اور ثابت قدم رہیں جیسے آپ کو حکم دیا گیا ہے اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کریں اور کہہ دیجیے: اللہ نے جو کتاب بھی نازل کی ہے، میں اس پر ایمان لایا ہوں اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمھارے درمیان انصاف کروں، اللہ ہی ہمارا رب ہے اور تمھارا بھی رب ہے، ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمھارے لیے تمھارے اعمال، ہمارے اور تمھارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں، اللہ (روز قیامت) ہم سب کو جمع کرے گا اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔'' [2]

مولانا مودودی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''مطلب یہ کہ مجھے دشمنی کا نہیں بلکہ انصاف کا حکم ہے۔ میری شان کے لائق نہیں ہے کہ تعصب سے کام لوں۔ میرا تعلق سب لوگوں سے یکساں ہے جو عدل و انصاف پر مبنی ہے۔ میں حق دار کا مددگار اور ظالم کا مخالف ہوں اور میرے دین میں کسی سے امتیازی سلوک کی گنجائش نہیں۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ

[1] المآئدة 5:8. [2] الشورٰی 42:15.

میرے اقربا کے لیے ایک قانون ہو اور دیگر افراد کے لیے دوسرا قانون۔ میرے نزدیک چھوٹے کے مقابلے بڑے کو امتیازی حیثیت حاصل نہیں۔ امیر کبیر اور نچلے طبقے کے لوگ میرے نزدیک برابر ہیں۔ حقوق سب کے لیے ایک سے ہیں۔ جرم سب کے لیے جرم ہے۔ حرام سب کے لیے حرام ہے اور حلال سب کے لیے حلال ہے۔ فرض سب پر فرض ہے حتیٰ کہ میں خود قانونِ الٰہی کی دسترس سے باہر نہیں ہوں۔"[1]

بلاشبہ مسلم معاشرے کی تربیت اور اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ جو اس کے تربیتی طریقِ کار میں موجود ہیں، بنی نوعِ انسان کی قیادت کے لیے اس معاشرے کی تیاری کا تمام تر انحصار اس امر پر ہے کہ عدل و انصاف کی بالادستی اور افرادِ ملت کے درمیان اس کا قیام ہو، اس لیے کہ عدل و انصاف ایک راست باز قیادت کی عمارت کا بنیادی رکن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۖ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ○﴾

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم انصاف کے لیے ڈٹ جانے والے اور اللہ کے لیے سچی گواہی دینے والے بن جاؤ، خواہ وہ تمھارے اپنے خلاف یا تمھارے والدین اور رشتہ داروں کے خلاف ہو، (معاملے کا فریق) امیر ہو یا غریب، دونوں صورتوں میں تمھاری نسبت اللہ زیادہ ان کا خیر خواہ ہے۔ پس تم نفسانی خواہش کے پیچھے پڑ کر انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو۔ اور اگر تم نے توڑ مروڑ کر بات کی یا (گواہی دینے سے) منہ موڑا تو بے شک تم جو بھی عمل کرتے ہو اللہ

[1] الحكومة الإسلامية للمودودي، ص:202.

اس سے خوب باخبر ہے۔'' [1]

قرآن کریم کی صریح نص کے مطابق اسلامی معاشرہ کامل ترین عدل و انصاف کا مظہر ہونا چاہیے۔ اپنے لیے اور عزیز و اقارب کے لیے عدل و انصاف کے جو پیمانے ہیں وہی دوسروں کے لیے بھی ہونے چاہئیں۔

﴿كُونُوا﴾ کا لفظ مسلم معاشرے کے تمام افراد کو، خواہ وہ دنیا میں جہاں بھی موجود ہوں، عدل کا حکم سنا رہا ہے۔ اس لفظ کا مادہ و ماخذ زندگی میں عدل و انصاف کے ضوابط کو لازماً قائم کرنے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ﴿قَوّٰمِيْنَ﴾ مبالغے کا صیغہ ہے، جس کا مطلب ہے کہ اسلامی معاشرے کو اپنے تمام تر مادی یا روحانی وسائل کے ساتھ عدل و انصاف قائم کرنے کے لیے پوری طاقت صرف کرنی چاہیے اور اجتماعی عدل و انصاف کے ارکان کے استحکام کے سلسلے میں ہمت اور حوصلے سے کام لینا چاہیے۔

قرآن کریم اسلامی معاشرے کا دستور ہے جو انسانی زندگی میں قوانین عدل کے برائے نام نفاذ کا خواہاں نہیں۔ قرآن کریم انسانی ضمیر کی گہرائیوں میں داخل ہوتا ہے اور فرد کو ایسے جذبات کے زیرِ اثر آنے سے روکتا ہے جن میں امیر کی دولت کے دباؤ میں آنے یا غریب کی غربت کی وجہ سے اس پر رحم کھانے کا شائبہ ہو۔ امیر کی دولت کے دباؤ میں آ کر یا غریب کی غربت پر ترس کھا کر عدل و انصاف کے تقاضے پورے نہ کرنا قرآنی تعلیمات کے منافی ہے۔

قرآن کریم میں اس آیت کی مثل ایک اور آیت تقریباً انھی الفاظ کے ساتھ سورۂ مائدہ میں بھی وارد ہوئی ہے اور یہاں بھی ﴿كُونُوا﴾ کے لفظ سے مخاطب کر کے حکم دیا گیا ہے کہ عدل و انصاف اسلامی معاشرے کے افراد کے مزاج کا حصہ بن جانا چاہیے۔ [2]

ان دونوں آیات میں قیامت تک قائم رہنے والی اسلامی شریعت کے لازوال اصول

---

1. النسآء 4:135. 2. محمد رسول اللہ ﷺ لصادق عرجون: 3/142-144.

"عدل و انصاف کی بالادستی" کا تذکرہ کیا گیا ہے۔
دونوں آیات کا مقصد اسلامی معاشرے کو ایسا قطعی حکم دینا ہے جس میں نرمی کی کوئی گنجائش نہ ہو بلکہ جہاں تک ممکن ہو وہ علَمِ انصاف بلند کیے رہیں۔

مساوات

مساواتِ انسانی کے حوالے سے میثاقِ مدینہ میں وضاحت سے باتیں کی گئی ہیں۔
پندرھویں شق میں کہا گیا ہے: "اللہ کا عہد و پیمان (ضمانت) ایک ہے۔ مسلمانوں کا ادنیٰ سے ادنیٰ فرد بھی کسی کو پناہ دے کر سب کو اس کا پابند کر سکتا ہے۔ اہلِ ایمان دوسرے لوگوں کے بالمقابل آپس میں ایک دوسرے کے حلیف اور ضامن ہیں۔" حلیف و ضامن ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تنگدستی ہو یا خوشحالی، وہ ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔
انیسویں شق میں کہا گیا ہے: "اہلِ ایمان اللہ کی راہ میں قتل ہونے والوں کا بدلہ لیں گے۔"
سیرت ابن ہشام کے شارح سہیلی اپنی کتاب "الروض الانف" میں لکھتے ہیں: "شق میں مذکور لفظ يبيئ بواء سے ماخوذ ہے جس کے معنی مساوات کے ہیں۔"[1]
مساوات کا اصول ایک عام اصول ہے جسے اسلام نے برقرار رکھا۔ یہ ان بنیادوں میں سے ایک ہے جو مسلم معاشرے کی تعمیر و ترقی میں نمایاں کردار ادا کرتی ہیں۔
اسلام کے علاوہ سابقہ شریعتوں اور جدید آئین میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مبدائے مساوات کے متعلق فرمایا:

﴿يَآيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۚ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ۝﴾

[1] الروض الأنف للسهيلي: 17/2.

''اے لوگو! بلاشبہ ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور ہم نے تمھارے خاندان اور قبیلے بنائے تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، بلاشبہ اللہ کے ہاں تم میں سے زیادہ عزت والا (وہ ہے جو) تم میں سے زیادہ متقی ہے، بلاشبہ اللہ بہت علم والا، خوب باخبر ہے۔''[1]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«يَا أَيُّهَا النَّاسُ! أَلَا إِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ، وَّ إِنَّ أَبَاكُمْ وَاحِدٌ، أَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى أَعْجَمِيٍّ، وَّلَا لِأَعْجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ، وَّلَا لِأَحْمَرَ عَلٰى أَسْوَدَ، وَلَا لِأَسْوَدَ عَلٰى أَحْمَرَ إِلَّا بِالتَّقْوٰى»

''اے لوگو! آگاہ رہو کہ بلاشبہ تمھارا رب ایک ہے اور تمھارا باپ ایک ہے۔ سنو! کسی عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر، سرخ کو کالے پر اور کالے کو سرخ پر کوئی فوقیت حاصل نہیں سوائے تقویٰ کے۔''[2]

مساوات ایسا اصول ہے جس کے سبب لوگ زمانۂ قدیم سے اس کی طرف کھچے چلے آرہے ہیں اور اسی کی بدولت خیر القرون کے مسلمانوں کو قوت نصیب ہوئی تھی۔[3] غلط فہمی کے شکار بعض لوگ مساوات سے مراد یہ لیتے ہیں کہ زندگی کے تمام شعبوں میں سب افراد برابر ہیں۔ وہ اسی برابری اور مساوات کو عدل و انصاف کا قرین سمجھتے ہیں۔[4] حالانکہ انسانی صلاحیتوں کا تفاوت و اختلاف اور لوگوں کی مختلف طبقات میں تقسیم بھی تخلیقِ کائنات کے اہداف میں شامل ہے۔[5]

میثاقِ مدینہ کی تحریر میں بیان کردہ مساوات کا تعلق ان مخصوص معاملات سے ہے جن

1 الحجرٰت 13:49. 2 مسند أحمد: 411/5. 3 مبادئ نظام الحكم في الإسلام لعبد الحميد متولي، ص: 385. 4 الأخلاق الإسلامية لعبدالرحمٰن الميداني: 624/1. 5 فلسفة التربية الإسلامية لماجد عرسان الكيلاني، ص: 179.

میں مساویانہ حقوق ضروری اور شریعتِ اسلامی کا مطلوب ہیں۔ اس سے مراد زندگی کے تمام شعبوں میں سب انسانی طبقوں اوراجناس کے درمیان عام مساوات قائم کر دینا نہیں۔ [1]

یہاں مساوات کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں سے شریعت، عدل و انصاف اور اسلامی احکامات کے تقاضوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے رنگ ونسل اور طبقاتی تفریق کی تمیز کیے بغیر تعامل کیا جائے۔

اسلام کی نظر میں حاکم ومحکوم، مرد وعورت، عرب وعجم، کالے گورے سب انسان برابر ہیں۔ اسلام نے لوگوں کے درمیان رنگ ونسل اور خاندانی و طبقاتی تقسیم کے امتیازات ختم کردیے ہیں۔ [2]

ہر طبقے کے لوگ شریعت کی نظر میں برابر ہیں۔ اسلامی ریاست نے اپنے ابتدائی دور میں مساوات کے اسی قانون کو لاگو کیا تھا۔ ریاست نے حسبِ ذیل امور پیشِ نظر رکھے تھے:

- مساوات کا اصول عبادت کا درجہ رکھتا ہے جس پر خالقِ کائنات کی طرف سے اجر و ثواب دیا جاتا ہے۔
- انسانی مساوات کے منافی تمام طبقاتی، مروجہ قبائلی، نسلی، قومی، وطنی اور علاقائی معیار ختم کرنا اوران کی جگہ فضیلت کے واحد معیارِ ربانی ''تقویٰ'' کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔
- حسب ونسب اور مراتب کونظر انداز کرتے ہوئے ہر خاص و عام کے لیے یکساں مواقع فراہم کرنا تاکہ ہرفرد اپنی صلاحیتوں کے مطابق ان مواقع سے استفادہ کرسکے۔
- اسلامی ریاست میں جاری مساوات کا اصول اہلِ ریاست کی یکجہتی کا باعث ہے۔ اس کے نتیجے میں مربوط اور رحمدل معاشرہ جنم لیتا ہے جو ایک خاص عقیدے اور سرچشمۂ حیات کا حامل ہوتا ہے اور ایک منفرد منہج پرعمل پیرا ہوتا ہے۔ [3]

[1] مبادئ علم الإدارة لمحمد نورالدين عبدالرزاق، ص: 116. [2] فقه التمكين في القرآن الكريم للصلابي، ص:463. [3] فقه التمكين في القرآن الكريم للصلابي، ص: 466.

وثیقے میں وہ تمام اجزا بدرجۂ اتم موجود ہیں جن سے ریاست کا دستوری و انتظامی ڈھانچا تشکیل پاتا ہے اور ریاست کے افراد سے ریاست کے تعلقات کی نوعیت متعین ہوتی ہے۔ قرآن کریم دس سال تک مدینہ میں نازل ہوتا رہا۔ اس دوران اس نے مسلمانوں کے لیے زندگی گزارنے کے طور طریقے بیان کیے۔ حکومت و سیاست کے اصول وضوابط مقرر کیے۔ معاشرتی مسائل کا شافی حل پیش کیا۔ حلال وحرام کے احکامات واضح کیے۔ عدل وقضاء کی بنیادیں رکھیں اور نئی مسلم ریاست کے داخلی و خارجی امور کے متعلق پالیسیاں وضع کیں۔

سنت رسول ﷺ نے نور و بصیرت کے آئینے میں قرآنی احکامات کی تائید کی، ان کے نقوش گہرے کیے اور قرآن میں جہاں جہاں اجمال تھا، اس کی تفصیل بیان کی۔

اس وثیقے نے دستوری اقدامات کے سلسلے میں وسیع وعریض لائحہ عمل پیش کیا۔ یہ تحریر ان معاہدوں میں گلِ سرسبد کی حیثیت رکھتی ہے جو نہایت رواداری سے عدل وانصاف اور مساوات کے تقاضوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے مسلمانوں کے درمیان رہائش پذیر دیگر غیر مسلم اقوام کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کی حد بندی کرتے ہیں۔

یہ پہلا اسلامی وثیقہ ہے جو ایسے افراد کے لیے تحریر کیا گیا جن پر اسلام سے قبل قبائلی تعصب کا قبضہ رہا اور جنھیں اپنے وجود کا احساس لوگوں پر تسلط اور ان کے شوق کی پامالی ہی سے ہوتا تھا۔[1]

وثیقے میں ایسے تہذیبی عناصر بڑی تعداد میں ملتے ہیں جنھیں دورِ حاضر میں ''حقوقِ انسانی'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

معاہدے کے شرکاء پر لازم تھا کہ وہ اس کی دفعات کا احترام کریں اور اس کے مندرجات پر سختی سے عمل پیرا ہوں۔ تو کیا شرکائے معاہدہ کی طرف سے اس بات کا اہتمام

[1] صور و عبر من الجهاد النبوي في المدينة للدكتور فوزي فيض الله، ص:30,29.

کیا گیا؟ اس سوال کا جواب آئندہ سطور میں دیا جاتا ہے۔[1]

یہودِ مدینہ کا نقطۂ نظر

محمد ﷺ کی رسالت کی سچائی پر قوی اور روشن دلائل میسر آ جانے کے باوجود یہودِ مدینہ کے دل محمد ﷺ اور آپ کے ہمراہیوں کے خلاف بغض و عناد اور حسد و عداوت کے جذبات سے مملو تھے۔ اہلِ کتاب ہونے کے گھمنڈ نے انھیں راہِ راست پر آنے سے روک لیا تھا۔

ام المومنین صفیہ بنت حیی بن اخطب رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ میں اپنے والد کی چہیتی اولاد تھی اور چچا ابو یاسر بھی مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ بچوں میں کھیلتے ہوئے وہ دونوں مجھی کو گود لیتے اور پیار کرتے۔ نبی ﷺ مدینہ تشریف لائے اور قبا میں بنو عمرو بن عوف کے ہاں ٹھہرے تو میرے والد حیی بن اخطب اور چچا ابو یاسر بن اخطب منہ اندھیرے ان سے ملنے گئے اور سارا دن وہاں گزار کر غروب آفتاب پر لوٹے۔ وہ دونوں بوجھل قدم اٹھاتے، آہستہ خرامی سے چلتے ہوئے آئے۔ میں حسب عادت چہکتی ہوئی ان کی طرف بڑھی تو اللہ کی قسم! مارے غم کے دونوں میں سے کوئی بھی میری طرف متوجہ نہ ہوا، پھر میں نے چچا ابو یاسر کو والد حیی بن اخطب سے سوال کرتے ہوئے سنا کہ کیا یہ وہی ہے؟ وہ بولے: ''ہاں اللہ کی قسم! یہ وہی ہے۔'' چچا نے پوچھا: ''کیا آپ اسے اچھی طرح پہچانتے ہیں؟'' والد نے جواب دیا: ''ہاں'' اس پر چچا نے دریافت کیا: ''پھر اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟'' والد نے دانت پیس کر کہا: ''عداوت، اللہ کی قسم! جب تک زندہ ہوں۔ اس شخص سے عداوت رکھوں گا۔''[2]

یہود نے پیغمبر ﷺ اور اہل ایمان کے خلاف پروپیگنڈا مہم شروع کر دی تاکہ آپ ﷺ

[1] هجرة الرسول و صحابته لأحمد عبدالغني، ص: 261. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 519,518/1.

کی رسالت کو مشکوک بنا کر لوگوں کو اس سے متنفر کیا جائے اور انھیں نبی ﷺ کی ذات پر جو اعتماد ہے اسے بد اعتمادی میں بدل دیا جائے۔

درحقیقت یہود اس دین کی ترقی و ترویج کے پسِ منظر میں اپنے ذاتی اور مذہبی مفادات پامال ہوتے دیکھ رہے تھے۔ اسلام کا عقیدۂ توحید ان کے کھوکھلے اور ان گمراہ کن عقائد کا قاتل تھا جن کی بنیاد پر اور نسلی برتری کے سبب وہ اقوامِ عالم پر استوار تھے۔ اسلام نے آتے ہی پکارا کہ اللہ ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ وہی ایک عبادت کے لائق ہے۔ اس نے کسی کو جنم نہیں دیا، نہ وہ خود جنا گیا ہے جبکہ یہود کہتے تھے کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے۔

اسلام نسلِ انسانی کے تمام افراد کی برابری اور مساوات کا داعی تھا۔ اس کا اعلان تھا کہ کوئی قوم کسی قوم سے اور کوئی گروہ کسی گروہ سے برتر و بالا نہیں جبکہ یہود اپنے کو اللہ کی پسندیدہ قوم اور دوسری اقوام سے برتر سمجھتے اور اُنھیں اپنے سے فروتر خیال کرتے تھے۔[1]

انھی اسباب کی بنا پر یہودیوں نے میثاق مدینہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی نبوت و رسالت کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ وہ لوگ نبی ﷺ کو عاجز کرنے کے لیے کئی سوال لے آئے۔ انھوں نے مومنین کو دھوکا دینے اور اجتماعی معاملات میں ہیرا پھیری کرنے کی کوشش کی اور مکر و فریب کے جال بچھاتے رہے۔[2]

یہود کی طرف سے داخلی محاذ آرائی کی مذموم کوشش: یہودِ مدینہ اسلام کے خلاف محاذ آرا تھے۔ اس محاذ آرائی کے ضمن میں ان کی انتہائی کوشش تھی کہ مدینہ میں فتنہ و فساد کا بازار گرم ہو اور اہلِ شہر، بالخصوص مسلمانوں کا امن و سکون برباد کر دیا جائے۔ ان کی نظر میں اس ہدف تک پہنچنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ جاہلیت کے خوابیدہ نعروں کو بلند آہنگ سے بیدار کر کے قبائلی تعصب کی بجھی ہوئی چنگاریوں کو پھر سے بھڑکا دیا جائے۔ وہ گہری

[1] الصراع مع اليهود لأبي فارس: 31/1. [2] الصراع مع اليهود لأبي فارس: 1/31-46.

سازشوں کا جال بچھا کر اسلامیانِ مدینہ کے درمیان پھوٹ ڈالنا اور ان کی جمعیت کا شیرازہ بکھیر دینا چاہتے تھے۔ مسلمانوں کی یکجہتی کا تو یہ حال تھا کہ وہ اس ایک جسم کی طرح تھے جس کے کسی ایک عضو کو تکلیف ہو تو سارے اعضاء اس کا درد محسوس کرتے ہیں۔[1]

ایک کائیاں اور سالخوردہ یہودی نے ایک دفعہ انصار کے درمیان پھوٹ ڈالنے کی غرض سے منصوبہ تراشا۔ اس سلسلے میں یہودی کا ارادہ تھا کہ انصار کی صفوں میں گھس کر قبائلی تعصب کو ہوا دی جائے۔ یوں وہ جاہلیت کی طرف لوٹ کر ایک بار پھر باہم دست و گریباں ہو جائیں اور رسول اللہ ﷺ حمایتیوں کی اس طاقتور اور مضبوط ترین جماعت سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔[2]

ابن اسحاق کا بیان ہے کہ شاس بن قیس نامی ایک بوڑھا یہودی کافر جسے مسلمانوں سے بے پناہ خار تھی، اوس و خزرج کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی مجلس کے قریب سے گزرا جو مل بیٹھ کر باتوں میں مصروف تھے۔ وہ انصار کے درمیان اسلامی بھائی چارے کی بنیاد پر استوار ہونے والی محبت و الفت دیکھ کر غصے سے پیچ و تاب کھانے لگا کہ یہ وہی اوس و خزرج ہیں جو جاہلیت میں کبھی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ شاس بن قیس بولا: ''بنو قیلہ (اوس و خزرج کی والدہ) اس علاقے میں یوں باہم شیر و شکر نظر آئیں! نہیں، اللہ کی قسم! ایسی صورتحال میں تو ہمارا ان کے ساتھ گزارا ممکن نہیں۔'' اس نے اپنے ساتھ آئے ایک یہودی نوجوان سے کہا: ''ان کی محفل میں جا بیٹھو اور جنگ بعاث وغیرہ کے قصے چھیڑو اور انھیں وہ اشعار سناؤ جو ان لڑائیوں کے دوران کہے گئے تھے۔''

بعاث کی لڑائی میں اوس و خزرج ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار آئے تھے۔ اس جنگ میں کامیابی اوس کو ملی تھی۔ ان دنوں اوس ابو اسید حضیر بن سماک اشہلی کی قیادت میں لڑتے تھے۔ خزرج کا سردار عمرو بن نعمان بیاض تھا۔ یہ دونوں سردار بعاث کی جنگ میں

[1] الصراع مع اليهود لأبي فارس: 44/1. [2] التاريخ الإسلامي للحميدي: 37/4.

مارے گئے۔

ابن اسحاق کا بیان ہے کہ یہودی نوجوان نے شاس کے حکم کی تعمیل کی جس کے سبب اصحاب مجلس میں تو تو میں میں ہونے لگی۔ جھگڑے نے یہاں تک طول کھینچا کہ اوس کے قبیلے بنو حارثہ کا اوس بن قیظی اور خزرج کے قبیلے بنی سلمہ کا جبار بن صخر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ایک دوسرے کے لتے لینے لگے۔ ایک نے کہا: ''اگر تم چاہو تو ہم اسے (جنگ کو) ابھی جوان کر دیتے ہیں۔'' اس پر دونوں فریق طیش میں آ گئے اور بولے: ''ٹھیک ہے، حرہ میں جنگ ہوگی۔'' ہر طرف سے ہتھیار اٹھاؤ، ہتھیار اٹھاؤ کی آوازیں آنے لگیں اور سب حرہ کی طرف کھڑے ہوئے۔

رسول اللہ ﷺ کو اس واقعے کی خبر ہوئی تو آپ چند مہاجرین کے ہمراہ فوراً پہنچے اور فرمایا:

«يَا مَعْشَرَ الْمُسْلِمِينَ! اَللّٰهَ اللّٰهَ! أَبِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ وَ أَنَا بَيْنَ أَظْهُرِكُمْ بَعْدَ أَنْ هَدَاكُمُ اللّٰهُ لِلْإِسْلَامِ، وَ أَكْرَمَكُمْ بِهٖ وَ قَطَعَ بِهٖ عَنْكُمْ أَمْرَ الْجَاهِلِيَّةِ وَاسْتَنْقَذَكُمْ بِهٖ مِنَ الْكُفْرِ وَ أَلَّفَ بِهٖ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ؟!»

''اے مسلمانوں کی جماعت! اللہ سے ڈرو۔ اللہ سے ڈرو۔ جاہلیت کی پکار لگائی جاتی ہے؟ جبکہ میں تمھارے درمیان موجود ہوں اور اللہ نے تم لوگوں کو اسلام کی ہدایت سے نوازا، اسلام کے ذریعے سے اس نے تمھیں عزت بخشی اور جاہلیت سے تمھاری جان چھڑائی، کفر سے نجات دی اور اسلام ہی کے واسطے سے اس نے تمھارے دل ملا دیے ہیں؟!'' [1]

رسول اللہ ﷺ کی باتیں سن کر لوگوں کے اوسان بحال ہوئے۔ انھیں احساس ہوا کہ

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 2/211-214.

یہ شیطانی چکر تھا اور دشمن کی چال تھی۔ وہ زاروقطار رو دیے اور ایک دوسرے سے گلے ملے۔ اللہ تعالیٰ نے شاس بن قیس یہودی کی لگائی آگ بجھا دی۔ سب نے دوبارہ نبی ﷺ سے سمع و طاعت کا پیمان باندھا اور لوٹ آئے۔ اللہ تعالیٰ نے شاس بن قیس اور اس کی سازش کا بھانڈا ان آیات میں پھوڑ دیا:

﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ۝ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝﴾

''(اے نبی!) کہہ دیجیے: اے اہل کتاب! تم اللہ کی آیتوں کا انکار کیوں کرتے ہو؟ اللہ اس پر گواہ ہے جو کچھ تم کرتے ہو، کہہ دیجیے: اے اہل کتاب! تم اس شخص کو اللہ کے راستے سے کیوں روکتے ہو جو ایمان لے آیا؟ تم اس میں ٹیڑھ پن چاہتے ہو، حالانکہ تم خود اس (کے سیدھی راہ پر ہونے) کے گواہ ہو اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے اوس بن قیظی، جبار بن صخر اور ان کے ہمنواؤں کے متعلق جو شاس بن قیس کی دسیسہ کاری کا شکار ہونے چلے تھے، فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ۝﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تم اہل کتاب کے ایک فریق کی بات مانو گے تو وہ تمھارے ایمان لانے کے بعد تمھیں کافر بنا کر چھوڑیں گے۔''[2]

اس واقعے سے ہم رسول اللہ ﷺ کی قائدانہ صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آپ ﷺ نے یہود کی طرف سے اہل اسلام کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے کے پروگرام

[1] آل عمرٰن 3:98,99. [2] آل عمرٰن 3:100. مزید وضاحت کے لیے آیت:105 تک دیکھیے۔

کو بطریق احسن ناکام بنایا۔ آپ اس طرح مسلمانوں کے تمام امور کی نگرانی کرتے اور ان کے مصائب و آلام کا تدارک کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ فی الفور انصار کے پاس پہنچے اور انھیں اللہ کی یاد دلائی۔ آپ نے نصیحت کی کہ یہ اقدامات جاہلیت سے تعلق رکھتے ہیں، پھر انھیں یاد دلایا کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کی بدولت تمھاری دشمنیاں ختم کر دیں اور تمھارے دل کینوں سے پاک کر کے انھیں ایمان کا گہوارہ بنا دیا۔

اس گفتگو نے انصار کے دلوں پر گہرا اثر کیا اور ان کے اندر گویا ایک نئی روح پھونک دی۔ اللہ کی توفیق سے جاہلیت کے آثار مٹ گئے اور نبی ﷺ کے پُر تاثیر خطاب، روح پرور جذبات اور تیز ترین اہتمام نے انھیں باور کرا دیا کہ ان کا یہ جذباتی اقدام شیطانی وسوسہ اور دشمن کی سازش تھی۔ اس فعل پر وہ شرمندہ ہوئے اور باہمی محبت و ہم آہنگی کا ثبوت دیتے ہوئے روتے ہوئے ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔[1]

ذات باری تعالیٰ پر حملہ: کئی ایک سیرت نگاروں اور مفسرین نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ یہود کے معبد بیت المدراس میں گئے۔ وہاں انھوں نے بہت سے لوگوں کو ایک آدمی فِنحاص کے گرد جمع دیکھا جو اُن کا ایک عالم تھا۔ اُس کے ساتھ ایک اور عالم اشیع بھی موجود تھا۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فِنحاص سے کہا: ”دیکھو! اللہ سے ڈرو اور مسلمان ہو جاؤ۔ اللہ کی قسم! تم جانتے ہو کہ محمد ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں۔ وہ اللہ کی طرف سے حق لے کر آئے ہیں جو تم تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہو۔“

فِنحاص نے کہا: ”ابوبکر! اللہ کی قسم! ہمیں تو اللہ کی محتاجی نہیں بلکہ اللہ ہمارا محتاج ہے۔ جس طرح وہ ہمارے آگے گڑگڑاتا ہے، ہم نہیں گڑگڑاتے۔ ہم اُس سے بے نیاز ہیں وہ ہم سے بے نیاز نہیں۔ اگر وہ بے نیاز ہوتا تو ہم سے ہمارے اموال کا قرض کیوں مانگتا، جیسا کہ تمھارے صاحب کہتے ہیں۔ اللہ تمھیں سود سے منع کرتا ہے اور خود ہمیں سود

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي: 4/ 42،41.

دیتا ہے۔ اگر وہ ہم سے بے نیاز ہوتا تو سود پر قرض طلب نہ کرتا۔ (معاذ اللہ)''

سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ یہودی کی یہ بات سن کر سخت غصے میں آ گئے، آپ نے اس کے چہرے پر زور کا طمانچہ رسید کیا اور کہا: ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! مجھے اس عہد کا پاس نہ ہوتا جو تمھارے اور ہمارے درمیان ہے تو اے اللہ کے دشمن! میں تیری گردن مار دیتا۔''

فِنحاص بھاگم بھاگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آیا اور کہا: ''اے محمد! دیکھیے، آپ کے ساتھی ابو بکر نے میرا کیا حشر کیا ہے!'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو بکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

«مَا حَمَلَكَ عَلٰى مَا صَنَعْتَ؟» ''آپ نے ایسا کیوں کیا؟''

انھوں نے جواب دیا: ''اے اللہ کے رسول! اس اللہ کے دشمن نے بڑی سنگین بات کہی کہ اللہ محتاج ہے اور ہم بے نیاز و غیر محتاج ہیں۔'' اس کی بات سن کر میں صرف اللہ کے لیے غصے میں آیا اور اسے تھپڑ مار دیا۔'' فِنحاص نے جھوٹ بولا کہ میں نے یہ بات نہیں کہی۔ اللہ تعالیٰ نے فِنحاص یہودی کے خلاف ابو بکر رضی اللہ عنہ کے حق میں یہ آیت نازل فرمائی:

﴿لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝﴾

''اللہ نے ان لوگوں کی بات سن لی جنھوں نے کہا کہ اللہ فقیر ہے اور ہم مالدار ہیں۔ یقیناً ان کی یہ بات ہم لکھ لیں گے اور جو وہ نبیوں کو ناحق قتل کرتے رہے (وہ بھی ان کے اعمال نامے میں درج ہے) اور (قیامت کے دن) ہم ان سے کہیں گے: اب جلانے والے عذاب کا مزہ چکھو۔''[1]

یہودی عالم کی بات سُن کر ابو بکر رضی اللہ عنہ کو جو صدمہ ہوا، اُس کے بارے میں یہ آیت

[1] آل عمرٰن 181:3۔

نازل ہوئی:

﴿لَتُبْلَوُنَّ فِیۡۤ اَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْۤا اَذًی کَثِیْرًا ؕ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ○﴾

''البتہ تمھیں تمھارے مالوں اور تمھاری جانوں کے بارے میں ضرور آزمایا جائے گا اور تم ان لوگوں سے جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور ان لوگوں سے جنھوں نے شرک کیا، ضرور تکلیف دینے والی باتیں سنو گے اور اگر تم صبر کرو اور پرہیز گاری اختیار کرو تو بے شک یہ بڑی ہمت کا کام ہے۔''[1]

قرآن کریم نے بہت سے مقامات پر یہود کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی اور اس کی جناب میں بے ادبی کا ذکر کیا ہے۔ اُس نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ یہود باری تعالیٰ کو نقائص سے پاک نہیں سمجھتے تھے اور نہ اُس کے متعلق بات کرتے ہوئے شایانِ شان پیرایۂ بیان اختیار کرتے تھے۔ یہود کا یہ طرزِ عمل بے شرمی اور بے ادبی کی بدترین مثال ہے۔ قرآن فرماتا ہے:

﴿وَقَالَتِ الْیَهُوْدُ یَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ؕ غُلَّتْ اَیْدِیْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۘ بَلْ یَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ یُنْفِقُ کَیْفَ یَشَآءُ ؕ وَلَیَزِیْدَنَّ کَثِیْرًا مِّنْهُمْ مَّاۤ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ طُغْیَانًا وَّکُفْرًا ؕ وَاَلْقَیْنَا بَیْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ ؕ کُلَّمَاۤ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۙ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا ؕ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ ○﴾

''اور یہودیوں نے کہا: ''اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے۔'' بندھ گئے انھی کے ہاتھ اور لعنت پڑی ان پر ان کے اس قول (ان کی اس بکواس) کی وجہ سے بلکہ اللہ کے تو

1 آل عمرٰن 186، تفسیر القرطبي: 295/4، و السیرة النبویة لابن هشام: 559,558/1، وسبل الهدیٰ والرشاد للصالحي: 583/3-585، و تفسیر مجاهد، ص: 140.

دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں، وہ جیسے چاہے خرچ کرتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ (قرآن) جو آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے، اُن میں سے اکثر لوگوں کی سرکشی اور کفر میں ضرور اضافے کا باعث بنے گا۔ اور ہم نے قیامت کے دن تک ان کے درمیان دشمنی اور بغض ڈال دیا ہے۔ جب کبھی وہ لڑائی کی آگ بھڑکاتے ہیں تو اللہ اسے بجھا دیتا ہے اور وہ زمین میں فساد کرنے کو دوڑتے ہیں اور اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔'' [1]

آیت کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کا یہ نقطۂ نظر اُس ناراضی اور غیظ وغضب کا نتیجہ تھا جو نبی ﷺ کے مدینہ میں پاؤں جمانے اور دعوت اسلامی کے پھیلاؤ کو دیکھ کر اُن کے سینوں میں پیدا ہوا۔ اس کے ساتھ اس امر کا اضافہ کر لیا جائے کہ مسلمان یہود کی مکارانہ چالوں کے پیش نظر ان سے متنفر ہو کر اللہ کے حکم کی تعمیل میں ان سے مقابلہ کر چکے تھے جس کے باعث یہود اقتصادی طور پر مفلوج ہو کر رہ گئے۔ اُن کا یہی غم وغصہ اللہ کی جناب میں اُن کی بے ادبی اور رسول اللہ ﷺ کو ناموزوں جواب دینے کا سبب بنا۔[2]

اگلی آیت کا مضمون میرے اس موقف کی تائید کرتا ہے:

﴿وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ۚ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ۗ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ۝﴾

''اور اگر اہل کتاب ایمان لے آئیں اور پرہیز گاری اختیار کر لیں تو یقیناً ہم ان سے ان کی برائیاں دور کر دیں گے اور انھیں نعمت والے باغوں میں ضرور داخل کریں گے اور اگر یقیناً وہ تورات اور انجیل اور اپنے رب کی طرف سے نازل کی

1 المآئدة 5:64. 2 الصراع مع اليهود لأبي فارس: 51/1.

گئی (دوسری) کتابوں کے احکام پر ٹھیک ٹھیک عمل کرتے تو وہ اپنے اوپر سے اور اپنے پاؤں کے نیچے سے (وافر رزق) کھاتے، ان میں سے ایک گروہ درمیانی راہ چلنے والا ہے۔ اور ان میں سے زیادہ تر لوگ جو کچھ کررہے ہیں وہ برا ہے۔''[1]

رسول اللہ ﷺ، دیگر انبیائے کرام اور قرآن کریم کی شان میں گستاخی: یہود رسول اللہ ﷺ سے مخاطب ہوتے ہوئے بے ادبی سے پیش آتے۔ وہ آپ پر طعنہ زنی کرتے اور سلام کرنے کا تکلیف دہ طریقہ اپناتے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ چند یہودی رسول اللہ ﷺ کے ہاں آئے اور کہا: «اَلسَّامُ عَلَيْكَ يَا أَبَالْقَاسِمِ!» ''(نعوذ باللّٰه) اے ابوالقاسم! تمھیں موت آئے۔'' میں نے جواب میں کہا: «اَلسَّامُ عَلَيْكُمْ وَ فَعَلَ اللّٰهُ بِكُمْ» ''تمھیں موت آئے اور اللہ تمھارا برا کرے۔'' اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: «مَهْ يَا عَائِشَةُ! فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفُحْشَ وَلَا التَّفَحُّشَ» ''عائشہ! ایسا مت کہو۔ اللہ بیہودگی اور بیہودہ گو بننے کو پسند نہیں کرتا۔'' میں نے کہا: ''اللہ کے رسول! جو انھوں نے کہا وہ آپ دیکھ رہے ہیں؟'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «أَلَسْتِ تَرِينِي أَرُدُّ عَلَيْهِمْ مَّا يَقُولُونَ؟ وَ أَقُولُ: وَ عَلَيْكُمْ» ''تم مجھے نہیں دیکھ رہی کہ میں نے اُن کا کہا انھیں لوٹا دیا ہے؟ اور کہہ دیا ہے: تمھیں (موت آئے)۔''[2] پھر یہ آیت نازل ہوئی:[3]

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَيَتَنٰجَوْنَ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ ۡ وَاِذَا جَآءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ وَيَقُوْلُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ ؕ حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمَصِيْرُ۝﴾

''کیا آپ نے ان لوگوں کی طرف نہیں دیکھا جنھیں سرگوشیاں کرنے سے روکا گیا

1 المائدة 5:66،65. 2 صحيح البخاري، حديث: 2935، و صحيح مسلم، حديث: 2165-(11). 3 زاد المسير لابن الجوزي: 189/8.

تھا، پھر وہ اس چیز کی طرف لوٹتے ہیں جس سے انھیں روکا گیا تھا اور وہ گناہ، زیادتی اور رسول کی نافرمانی کی سرگوشیاں کرتے ہیں۔ اور جب وہ آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ کو اس (کلمے) کے ساتھ سلام کہتے ہیں کہ اللہ نے اس کے ساتھ آپ کو (کبھی) سلام نہیں کہا اور وہ اپنے دل میں کہتے ہیں: اللہ ہمیں اس کی وجہ سے کیوں عذاب نہیں دیتا جو ہم کہتے ہیں؟ ان کے لیے جہنم کافی ہے، وہ اس میں داخل ہوں گے، پس وہ برا ٹھکانا ہے۔"[1]

آیت کریمہ نے واضح کیا ہے کہ یہود کے دلوں میں بیٹھے ہوئے کینے اور حسد ہی نے انھیں آمادہ کیا تھا کہ وہ اسلام کو مٹانے، مسلمانوں پر تسلط جمانے اور رسالت مآب ﷺ کو (نعوذ باللہ) ختم کرنے کی غرض سے ہر حربہ آزمائیں اور اس سلسلے میں ہر ممکن طریقہ بروئے کار لائیں۔ بددعا کی صورت میں سلام کہنا دراصل اُن کی اُس نفسیاتی کمزوری کی طرف اشارہ ہے جس کے طاری ہونے پر وہ ایسی حرکتیں کیا کرتے تھے۔ اس مذموم فعل کا تجزیہ کرنے سے پتا چلے گا کہ یہود شدید نفسیاتی بحران کا شکار تھے جو نام نہاد عزت کے فقدان کی پیداوار تھا۔ وہ اپنے آپ کو عزوشرف کی بلندیوں پر دیکھتے تھے، جبکہ درحقیقت ذلت کی پستیوں میں گرے پڑے تھے۔ چند نئی قوتیں اُن کے ماضی و حال پر غلبہ پا کر اُسے فتح کر چکی تھیں اور وہ فاتح کے تقاضوں کے مطابق ڈھلنے اور اُس سے ہم آہنگ ہونے کی سکت اپنے میں نہیں پاتے تھے۔ جھوٹی غیرت اور حسد نے یہود کو نئے دین کے سایے میں آنے سے روک لیا تھا۔ انھوں نے اسلام اور اہل اسلام کے خلاف اپنے بے پناہ وسائل استعمال کر کے ناکامی کا منہ دیکھ لیا تو ان کے نفسیاتی بحران میں مزید اضافہ ہوگیا اور وہ اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے۔ حریف کو سلام کی صورت میں بددعا دینا بے بس کا ہتھیار، ناکام آدمی کا وسیلہ اور کینہ پرور کا تریاق دل ہے جس کے ذریعے وہ سینے

[1] المجادلۃ 8:58.

کا ابال نکالنے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔[1]

نبی کریم ﷺ نے عائشہ رضی اللہ عنہا کا جواب سنا تو انھیں نرمی اختیار کرنے کی تلقین فرمائی اور سمجھایا کہ مسلمان حالت غضب میں بے لگام نہیں ہوتا۔ یہ وصف حسن خلق ہی سے پیدا ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نرم (رفیق) ہے اور نرمی (رفق) کو پسند کرتا ہے۔ نرم گو آدمی کو اللہ تعالیٰ اپنے ان انعامات سے نوازتا ہے جو سخت گیر کو میسر نہیں آتے۔[2]

دیگر انبیائے کرام علیہم السلام کی شان میں یہود کی گستاخی یوں ہے کہ چند یہودی سردار جن میں ابو یاسر بن اخطب، نافع بن ابو نافع اور عازر بن ابو عازر وغیرہ شامل تھے، رسول اللہ ﷺ کے ہاں آئے اور سوال کیا کہ کون کون سے پیغمبر پر ایمان لانا ضروری ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

«نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ إِلٰى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَ يَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسٰى وَعِيسٰى وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِنْ رَّبِّهِمْ، لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ وَ نَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ»

''ہم اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور اس پر جو ہماری طرف نازل کیا گیا اور جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولاد کی طرف نازل کیا گیا اور جو موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اور جو نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا۔ ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق روا نہیں رکھتے۔ اور ہم اسی (اللہ) کے فرماں بردار ہیں۔''

آپ ﷺ نے جب عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا تو یہود نے کہا: ''ہم عیسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان نہیں لاتے اور نہ اس پر ایمان لانے والوں کو تسلیم کرتے ہیں۔'' اس پر اللہ تعالیٰ نے درج ذیل

1 حوار الرسول مع اليهود للدكتور محسن الناظر، ص: 101. 2 حوار الرسول مع اليهود للدكتور محسن الناظر، ص: 87.

آیت نازل فرمائی:

﴿قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَاۤ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ وَ اَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ۝﴾

''(اے نبی!) کہہ دیجیے: اے اہل کتاب! کیا تم ہم سے صرف اس وجہ سے ناراض ہوتے ہو کہ ہم اللہ پر اور جو (چیز) ہماری طرف نازل کی گئی اور (ہم سے) پہلے نازل کی گئی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور بے شک تم میں سے اکثر نافرمان ہیں۔''[1]

قرآن سے بے ادبی کے بارے میں یہود کی طرف سے بے جا سوالوں اور بحث و تکرار کی نشستوں کا ایک طویل سلسلہ چلا ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے: ''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو یہودی علماء نے آ کر کہا: ''اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ جو آپ نے کہا کہ

﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَاۤ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا۝﴾

''اور وہ آپ سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہیے: روح میرے رب کے حکم سے ہے، اور تمھیں تو بہت ہی تھوڑا علم دیا گیا ہے۔''[2]

اس سے آپ کی مراد ہم ہیں یا آپ کی قوم؟'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «كُلًّا» ''سبھی مراد ہیں۔'' بولے: ''اگر ایسا ہے تو آپ (قرآن میں) یہ بھی تو پڑھتے ہیں کہ تورات میں ہر چیز کی وضاحت ہے؟'' اس پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِنَّهَا فِي عِلْمِ اللّٰهِ قَلِيلٌ وَّ عِنْدَكُمْ فِي ذٰلِكَ مَا يَكْفِيكُمْ لَوْ أَقَمْتُمُوهُ» ''یہ اللہ کے علم کے اعتبار سے قلیل

[1] المآئدة 5:59. والسيرة النبوية لابن هشام: 567/1، وتفسير الطبري: 442/1. [2] بني إسرآءيل 85:17.

ہے، البتہ اگر تم اس کے مطابق زندگی گزارو تو تمھارے لیے اتنا علم ہی کافی ہے۔“ [1]

راوی حدیث عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: ”اس حوالے سے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿ وَلَوْ اَنَّمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○ ﴾

”اور بلاشبہ اگر زمین میں جتنے درخت ہیں سب قلم بن جائیں اور سمندر کی روشنائی بن جائے اور اس کے بعد سات سمندر (اس میں مزید روشنائی شامل کریں) تو بھی اللہ کے کلمات ختم نہ ہوں، بے شک اللہ نہایت غالب، بہت حکمت والا ہے۔“ [2]

منافقین کی مدد اور اُن سے مل کر سازشوں کے جال بننا: قرآن کریم نے ہمیں بتایا ہے کہ منافقین کو یہود کی فکری رہنمائی حاصل تھی۔ منافقین کے انھی پیشواؤں کو قرآن کریم نے ”شیاطین“ کے لقب سے یاد کیا ہے۔ یہ رذیل لوگ منافقین کے لیے منصوبہ سازی کرتے، انھیں ہدایات دیتے اور دھوکا دہی، مکر و فریب اور فتنہ انگیزی کرنے کے مختلف طریقے سکھاتے تھے، فرمان الٰہی ہے:

﴿ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ○ ﴾

”اور جب وہ ان سے ملتے ہیں جو ایمان لائے تو کہتے ہیں: ہم ایمان لے آئے اور جب وہ اپنے شیطانوں کے پاس تنہا ہوتے ہیں تو کہتے ہیں: یقیناً ہم تمھارے ساتھ ہیں ان لوگوں سے تو ہم صرف مذاق کرتے ہیں۔“ [3]

امام نسفی رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا: ”آیت میں شیاطین سے مراد یہود ہیں جو

---

1 تفسیر ابن کثیر، سورۃ الإسراء، آیت: 85، والیھود في السنة المطھرة للدکتور عبداللّٰہ الشقاري:241/1. 2 لقمٰن31:27. 3 البقرۃ2:14.

سرکشی اور ہٹ دھرمی میں شیاطین کے مماثل ہیں۔"[1]

مدینہ میں یہود منافقین سے مل کر مسلمانوں کے خلاف دسیسہ کاری کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے اس گٹھ جوڑ کا پول کھول دیا:

﴿بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۝﴾

"(اے نبی!) منافقوں کو خبردار کر دیجیے کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے، جو مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بناتے ہیں، کیا وہ ان کافروں کے ہاں عزت تلاش کرتے ہیں؟ پھر بے شک عزت تو ساری اللہ ہی کے لیے ہے۔"[2]

پروفیسر محمد عزت دروزہ نے لکھا: "جمہور مفسرین اس امر پر متفق ہیں کہ آیت میں ﴿الْكٰفِرِيْنَ﴾ سے مراد یہود ہیں۔ اس آیت اور اس کے بعد والی آیت میں اس کے واضح قرائن موجود ہیں۔"

ظاہر ہے کہ منافقین کا یہود کو دوست بنانا اور ان کے ساتھ باہمی اعتماد کی فضا قائم کرنا دونوں گروہوں کے درمیان اُس مضبوط اتحاد کا نتیجہ تھا جو انھوں نے دعوت اسلامی کے خاتمے اور مسلم فوج کے مقابلے کے لیے تشکیل دیا۔[3]

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰٓي اَدْبَارِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى الشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ ۭ وَاَمْلٰى لَهُمْ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيْعُكُمْ فِيْ بَعْضِ الْاَمْرِ ښ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ ۝﴾

"بے شک جو لوگ، بعد اس کے کہ ان پر ہدایت ظاہر ہوگئی، اپنی پیٹھوں کے بل

---

[1] تفسير النسفي: 21/1. [2] النسآء 4:138,139. [3] سيرة الرسول لأستاذ محمد عزة دروزة: 2/179,180.

پلٹ گئے، شیطان نے ان کے لیے (ان کے عمل) مزین وخوشنما بنا دیے اور (اللہ نے) انھیں ڈھیل دے دی، یہ اس لیے کہ بے شک انھوں نے ان لوگوں (یہود) سے، جنھوں نے اس چیز (قرآن) کو ناپسند کیا جو اللہ نے نازل کی، کہا کہ بعض امور میں ہم آپ کی بات مانیں گے اور اللہ ان کے راز جانتا ہے۔''[1]

جمہور مفسرین کے نزدیک پہلی آیت میں منافقین کا تذکرہ ہے۔ اور ﴿كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ﴾ سے مراد یہود ہیں۔ دوسری آیت میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف منافقین اور یہود کے باہمی گٹھ جوڑ کا ذکر ہے۔ دوسری آیت کے مفہوم پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ منافقین کی طرف سے یہود کی اتباع اور ان کے تشکیل کردہ پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ ان آیات میں منافقین کے اندر یہودیوں کے اثر ورسوخ کی ہلکی سی تصویر کشی کی گئی ہے۔[2]

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مَّا هُمْ مِّنْكُمْ وَلَا مِنْهُمْ وَيَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ○ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ○﴾

''کیا آپ نے ان لوگوں (منافقین) کو نہیں دیکھا جنھوں نے اس قوم (یہود) سے دوستی کی جن پر اللہ غصے ہوا۔ نہ وہ تم میں سے ہیں اور نہ ان میں سے۔ اور وہ جھوٹ پر قسمیں کھاتے ہیں، حالانکہ وہ جانتے ہیں، اللہ نے ان کے لیے شدید عذاب تیار کیا ہے۔ بے شک یہ (لوگ) برے ہیں جو وہ عمل کرتے رہے ہیں، انھوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا لیا ہے، پھر انھوں نے اللہ کی راہ سے روکا، لہٰذا

1 محمد 47:25، 26. 2 سیرۃ الرسول لأستاذ محمد عزۃ دروزۃ: 2/180.

ان کے لیے رسوا کن عذاب ہے۔‘‘ [1]

مفسر ماوردی رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا: ’’مطلب یہ ہے کہ منافقین نے ایک قوم سے دوستی کی جن پر اللہ کو غصہ آیا تھا، جو یہود ہیں۔‘‘ ماوردی نے اللہ کے راستے سے روکنے کو یہود کی خوشنودی کے لیے منافقین کا جہاد سے رکنا قرار دیا ہے۔ [2]

یہود منافقین کو رسول اللہ ﷺ کے خلاف جنگ کرنے پر اکساتے تھے۔ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کا کہنا ہے: ’’غزوۂ بدر سے پہلے کا ذکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ گدھے پر فدک کی بنی ہوئی جھالر دار چادر ڈالے سوار تھے، میں آپ کے پیچھے سوار تھا۔ آپ بنو حارث بن خزرج کے ہاں سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی عیادت کرنے جارہے تھے۔ آپ ﷺ ایک مجلس کے قریب سے گزرے جس میں عبداللہ بن ابی منافق بھی بیٹھا تھا۔ ابھی اس نے مسلمان ہونے کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ مجلس میں مسلمان، بت پرست مشرک اور یہودی سبھی بیٹھے ہوئے تھے۔ عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ بھی وہاں موجود تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی سواری کے قدموں سے اٹھنے والا غبار مجلس پر پڑا تو عبداللہ بن ابی نے چادر سے ناک ڈھانپ کر کہا: ’’ہمیں غبار آلود نہ کرو۔‘‘ نبی ﷺ نے سب کو سلام کیا، ٹھہرے، اترے، اصحاب مجلس کو اسلام کی دعوت دی اور قرآن پڑھ کر سنایا۔ عبداللہ بن ابی کہنے لگا: ’’اے آدمی! اگر یہ حق ہے تو تمھاری بات سے بہتر کوئی بات نہیں۔ لیکن تم ہماری مجلس میں آکر ہمیں پریشان نہ کیا کرو۔ گھر جا کے بیٹھو۔ جو تمھارے پاس آئے اُسے یہ بیان سناؤ۔‘‘ اس پر عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ بولے: ’’کیوں نہیں اے اللہ کے رسول! آپ یہ پیغام لے کر ہماری مجالس میں ضرور تشریف لایا کریں۔ ہم اسے پسند کرتے ہیں۔‘‘ اس کے بعد مجلس میں موجود مسلمان، مشرکین اور یہود کے درمیان تو تو میں میں ہونے لگی اور قریب تھا کہ وہ ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑتے۔ رسول اللہ ﷺ نے انھیں سمجھایا یہاں تک کہ وہ خاموش ہوگئے۔

[1] المجادلة 58:14-16. [2] النكت والعيون للماوردي: 4/203.

پھر آپ اپنی سواری پر بیٹھے اور انصار کے سردار سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے ہاں پہنچے۔ آپ نے اُن سے شکایت کرتے ہوئے کہا: «يَا سَعْدُ! أَلَمْ تَسْمَعْ مَا قَالَ أَبُو حُبَابٍ؟۔ يُرِيدُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ أُبَيٍّ۔ قَالَ كَذَا وَ كَذَا» ''سعد! آپ نے نہیں سُنا کہ ابوحباب (عبداللہ بن ابی) نے کیا کہا؟ اُس نے یہ اور یہ بات کہی ہے۔''

سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ بولے: ''اے اللہ کے رسول! اسے معاف کر دیجیے۔ اس سے درگزر فرمائیے۔ اس ذات کی قسم جس نے آپ پر کتاب نازل کی، جن دنوں اللہ تعالیٰ نے اس شہر کو حق کی روشنی سے منور کیا، اہل شہر اس کی تاج پوشی و دستار بندی پر اتفاق کر چکے تھے لیکن اللہ کو منظور نہیں تھا۔ اُس نے ہمیں حق سے بہرہ مند کر دیا۔ تب سے یہ شخص غصے سے سرخ ہوا پھرتا ہے۔ اس نے مارے حسد کے ایسا کیا ہے۔'' سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی یہ باتیں سُن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے معاف کر دیا۔[1]

یہود کی عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ پر طعن و تشنیع: عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کو جو یہود کے بہت بڑے عالم تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ آمد کی اطلاع ملی تو دوسرے افراد کے ساتھ وہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور کہا: ''میں آپ سے تین باتیں پوچھتا ہوں کہ جنھیں نبی کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

① قیامت کی پہلی علامت کیا ہے؟

② اہل جنت سب سے پہلے کیا کھائیں گے؟

③ بچے کی مشابہت ماں یا باپ سے کیونکر ہوتی ہے؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «خَبَّرَنِي بِهِنَّ آنِفًا جِبْرِيلُ» ''مجھے ان باتوں کی جبرئیل علیہ السلام نے ابھی ابھی خبر دی ہے۔'' اس پر عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ فوراً بولے: ''یہ فرشتہ یہود کا دشمن ہے۔''

1 صحيح البخاري، حديث:4566.

آپ ﷺ نے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

«أَمَّا أَوَّلُ أَشْرَاطِ السَّاعَةِ، فَنَارٌ تَحْشُرُ النَّاسَ مِنَ الْمَشْرِقِ إِلَى الْمَغْرِبِ، وَ أَمَّا أَوَّلُ طَعَامٍ يَأْكُلُهُ أَهْلُ الْجَنَّةِ فَزِيَادَةُ كَبِدِ حُوتٍ، وَ أَمَّا الشَّبَهُ فِي الْوَلَدِ، فَإِنَّ الرَّجُلَ إِذَا غَشِيَ الْمَرْأَةَ فَسَبَقَهَا مَاؤُهُ، كَانَ الشَّبَهُ لَهُ وَ إِذَا سَبَقَ مَاءُ هَا كَانَ الشَّبَهُ لَهَا»

''قیامت کی پہلی علامت ایک آگ ہے جو لوگوں کو مشرق سے ہانک کر مغرب کی طرف لے جائے گی۔ اہل جنت کا پہلا کھانا مچھلی کی کلیجی کا بڑھا ہوا حصہ ہوگا اور جب مرد عورت سے ہم بستر ہو اور اس کا پانی عورت کے پانی سے پہل کر جائے تو مشابہت باپ سے ہوتی ہے، ورنہ ماں سے ہوتی ہے۔''

جواب سُن کر عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے بے ساختہ کہا: ''میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔'' پھر بولے: ''اے اللہ کے رسول! یہود انتہائی جھوٹی قوم ہے۔ انھیں میرے بارے میں آپ کے دریافت کرنے سے قبل میرے اسلام لانے کی خبر ہوگئی تو آپ کی موجودگی میں مجھ پر طرح طرح کی تہمتیں دھرنی شروع کر دیں گے۔'' چنانچہ یہودی آئے تو عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اندر چلے گئے۔ نبی ﷺ نے یہود سے دریافت کیا: «أَيُّ رَجُلٍ فِيكُمْ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ سَلَامٍ» ''عبداللہ بن سلام تم میں کیسے آدمی ہیں؟'' سب نے کہا: ''وہ ہم میں سب سے بڑے عالم اور سب سے اچھے ہیں اور سب سے بڑے عالم اور سب سے اچھے انسان کے فرزند ارجمند ہیں۔'' پوچھا: «أَفَرَأَيْتُمْ إِنْ أَسْلَمَ عَبْدُ اللّٰهِ!» ''اگر عبداللہ مسلمان ہو جائیں تو؟'' یہود بولے: ''اللہ انھیں اس سے محفوظ رکھے۔'' اس پر عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کلمۂ شہادت پڑھتے ہوئے باہر تشریف لے آئے۔ یہود نے یہ سن کر فوراً کہا: ''یہ ہم میں بدترین شخص ہے اور بدترین باپ کا بیٹا ہے۔'' انھوں

نے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کو سخت طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا۔[1]

یوں یہود مسلمان ہونے والے یہودی علماء کو اذیت دیتے، ان کی شخصیت مشکوک بنانے کی کوشش کرتے اور اُن پر بے بنیاد الزامات دھرتے۔ قرآن کریم نے یہود کے اس بیہودہ اور منفی طرزِ عمل کو اپنے بے نظیر الفاظ میں بیان کیا ہے اور ان مومنین کا دفاع کیا ہے جن کی ذات پر یہود نے ایسے رکیک اور ظالمانہ حملے کیے۔[2]

قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے:

﴿لَيْسُوا سَوَآءً ۗ مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ أُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ○ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ ۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ○﴾

”وہ سب برابر نہیں ہیں، اہل کتاب میں سے ایک گروہ حق پر قائم ہے، وہ رات کی گھڑیوں میں اللہ کی آیتیں تلاوت کرتے ہیں اور وہ سجدہ کرتے ہیں، وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور وہ نیکی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں اور وہ بھلائی کے کاموں میں سبقت کرتے ہیں اور وہی نیکوکاروں میں سے ہیں، وہ جو بھی بھلائی کریں گے اس کی ناقدری نہیں کی جائے گی اور اللہ پرہیز گاروں کو خوب جانتا ہے۔“[3]

واحدی نے ”اسباب النزول“ میں لکھا: ”عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور مقاتل رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ عبداللہ بن سلام، ثعلبہ بن سعیہ، اُسید بن سعیہ، اُسید بن عبید رضی اللہ عنہم اور دیگر یہودی علماء ایمان لائے تو یہود کے دوسرے علماء نے کہا: ”محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ہمارے بدترین لوگ ایمان لائے ہیں۔ اگر وہ ہم میں اچھے ہوتے تو آباء و اجداد کا دین نہ چھوڑتے۔“ انھوں

1 صحيح البخاري، حديث: 3329. 2 الصراع مع اليهود لأبي فارس: 59/1. 3 آل عمرٰن 3:113-115.

نے اسلام قبول کر لینے والے یہودی علماء سے کہا: ''تم لوگوں نے اپنا دین بدل کر بڑے گھاٹے کا سودا کیا۔'' اس پر اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت نازل فرمائی۔ [1]

رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کی تکلیف پر خوشی کا اظہار اور ان کے بارے میں بدگمانیاں پھیلانا: یہود مسلمانوں کو ہر ممکن نقصان پہنچانے اور ان کا شیرازہ بکھیرنے کی کوشش میں رہتے تھے۔ اس قسم کا ایک موقع انھیں ابو امامہ اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کی وفات پر ہاتھ آیا۔ اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ بیعت عقبہ میں شامل ہونے والے وفد کے اہم رکن تھے۔ موت سے قبل ان کا جسم سرخی مائل ہونا شروع ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ ان کی عیادت کو تشریف لائے اور دو مرتبہ فرمایا: «بِئْسَ الْمَيِّتُ لِيَهُودَ، سَيَقُولُونَ: لَوْلَا دَفَعَ عَنْهُ صَاحِبُهُ، وَلَا أَمْلِكُ لَهُ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا، وَّلَأَتَمَحَّلَنَّ لَهُ» ''وفات پانے والا یہ آدمی یہود کے لیے اچھا نہیں۔ وہ کہیں گے کہ پیغمبر نے اس کی بیماری دور کیوں نہ کر دی جبکہ میں اس کے نفع و نقصان کا مالک نہیں ہوں، البتہ میں اس کی شفایابی کے لیے کوئی حیلہ ضرور کروں گا۔'' آپ ﷺ نے ان کے سر پر دو لمبے داغ لگوائے لیکن وہ جانبر نہ ہو سکے اور انتقال کر گئے۔ [2]

ایک اور روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کی گردن پر گولائی میں داغ لگوایا لیکن وہ جانبر نہ ہوئے اور انتقال کر گئے۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

«بِئْسَ الْمَيِّتُ لِلْيَهُودِ، يَقُولُونَ: قَدْ دَاوَاهُ صَاحِبُهُ، أَفَلَا نَفَعَهُ!»

''یہ وفات پانے والا آدمی یہود کے لیے اچھا نہیں۔ وہ کہیں گے: ''اس کے پیغمبر نے اسے دوا دی لیکن یہ جانبر نہ ہوا۔'' [3]

[1] أسباب النزول للواحدي، ص: 114. [2] مسند أحمد: 4/138، والمستدرك للحاكم: 4/214، ومجمع الزوائد: 5/98. [3] المعجم الكبير للطبراني، حديث: 5584، والمصنف لعبد الرزاق، حديث: 19515، ومجمع الزوائد: 5/98.

کینہ پروری کا صرف یہی ایک واقعہ نہیں۔ ہجرت کے ابتدائی ایام میں یہود نے مشہور کر دیا تھا کہ ہم نے مسلمانوں پر جادو کر دیا ہے۔ اب ان کی اولاد نہیں ہو گی۔ اس کا مقصد صرف مسلمانوں کو ذہنی اذیت دینا، ان کی خوشگوار زندگیوں میں زہر گھولنا اور محبت و الفت کی فضا کو مکدر کرنا تھا۔ مسلمانوں پر اس افواہ کی تاثیر اور اس کی وجہ سے ان کی پریشانی کا اندازہ اس واقعے سے ہوتا ہے کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی پیدائش پر مہاجرین خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔[1]

اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما بتاتی ہیں: ''میں مکہ مکرمہ میں امید سے تھی۔ ہجرت کے لیے نکلی تو مدت حمل تقریباً مکمل ہو چکی تھی۔ مدینہ پہنچی۔ قبا میں قیام کیا اور وہاں بچے کی پیدائش ہوئی۔ میں اسے گود میں اٹھائے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور آپ کی گود میں دے دیا۔ آپ نے ایک کھجور منگوائی، اسے چبایا، اپنا لعاب مبارک بچے کے منہ میں ڈالا۔ یوں سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بابرکت لعاب بچے کے پیٹ میں گیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنے دہن مبارک سے چبائی ہوئی کھجور کی گھٹی دی اور برکت کی دعا کی۔ یہ کسی مسلمان کا پہلا مولود تھا جو مدینہ میں پیدا ہوا۔ مسلمانوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔

دراصل مسلمانوں کے متعلق یہ بات مشہور ہو چکی تھی کہ ان پر یہود نے جادو کر رکھا ہے، اس لیے ان کی کوئی اولاد نہیں ہو گی۔''[2]

مسلم کی روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بچے کا نام عبداللہ رکھا۔ بعد ازاں وہ تقریباً سات یا آٹھ برس کی عمر میں زبیر رضی اللہ عنہ کے حکم پر بیعت کرنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے دیکھ کر مسکرا دیے اور اس سے بیعت لی۔

---

1 اليهود في السنة المطهرة للدكتور عبد الله الشقاري: 1/265. 2 صحيح البخاري، حديث: 5469، و صحيح مسلم، حديث: (26,25)-2146.

رسول اللہ ﷺ کی مدینہ آمد کے بعد اسلام کا یہ پہلا مولود تھا۔ یہود کہا کرتے تھے: ''ہم نے مسلمانوں کو سزا دی ہے (اور ان پر جادو کر دیا ہے۔) مدینہ میں ان کی نرینہ اولاد نہیں ہوگی'' پھر جب عبداللہ پیدا ہوا تو مسلمانوں نے خوشی سے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔[1]

تحویل قبلہ کے بارے میں یہود کا نقطۂ نظر: تحویل قبلہ کا حکم نو آموز مسلم ریاست کی بنیادیں ہلانے کی غرض سے جاری یہود کی سرد جنگ اور عام جنگ یا عملی طور پر دخل اندازی کے درمیان حد فاصل تھا۔[2]

براء بن عازب رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ نبی ﷺ مدینہ تشریف لائے تو اپنے ننھیال کے ہاں ٹھہرے اور سولہ یا سترہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ آپ ﷺ کی دیرینہ خواہش تھی کہ بیت اللہ قبلہ قرار پا جائے۔ بیت اللہ کے قبلہ مقرر ہونے پر سب سے پہلی نماز جو رسول اللہ ﷺ نے بیت اللہ کے رخ پر ادا کی، عصر کی نماز تھی۔ آپ ﷺ کے ساتھ کئی افراد نے نماز ادا کی۔ انھی میں سے ایک آدمی نماز کے بعد وہاں سے نکلا اور ایک مسجد کے قریب سے گزرا۔ لوگ رکوع کی حالت میں تھے، اس نے کہا: ''میں اللہ کے نام پر گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی معیت میں بیت اللہ کے رخ پر نماز پڑھی ہے۔'' یہ سن کر تمام نمازی نماز ہی میں بیت اللہ کی طرف پھر گئے۔ یہود کو پسند تھا کہ مسلمانوں کا رسول بھی اہلِ کتاب کی طرح بیت المقدس کے رخ پر نماز ادا کرتا ہے، چنانچہ قبلے کی تبدیلی انھیں بہت ناگوار گزری۔[3]

تحویل قبلہ کے سلسلے میں عظیم الشان آیات نازل ہوئیں، جن میں مسلمانوں سے بہت سی حکمت کی باتیں بیان کی گئی تھیں اور انھیں مفید اسباق کا درس دیا گیا تھا، چنانچہ ارشاد ہوا:

﴿وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِن

---

1 المستدرك للحاكم:3/548. 2 اليهود في السنة المطهرة للدكتور عبدالله الشقاري:1/258.
3 صحيح البخاري، حديث:40، و صحيح مسلم، حديث:525.

رَبِّكَ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ○ كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ○ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ○﴾

’’اور (اے نبی!) آپ جہاں سے بھی نکلیں، اپنا منہ مسجد حرام کی جانب پھیر لیں اور بے شک وہ آپ کے رب کی طرف سے حق ہے اور اللہ اس سے غافل نہیں جو تم عمل کرتے ہو۔ آپ جہاں سے بھی نکلیں، اپنا منہ مسجد حرام کی جانب پھیر لیں اور (اے مسلمانو!) تم جہاں کہیں بھی ہو، اپنے منہ اسی کی جانب پھیر لو تاکہ تمھارے خلاف لوگوں کے لیے کوئی حجت نہ رہے۔ ہاں، ان میں سے جنھوں نے ظلم کیا (وہ باتیں کرتے رہیں گے)، پس تم ان سے مت ڈرو اور صرف مجھ سے ڈرو تاکہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کروں اور شاید کہ تم ہدایت پاؤ۔ جیسے ہم نے تمھارے لیے تمھی میں سے ایک رسول بھیجا، وہ تم پر ہماری آیتیں تلاوت کرتا ہے اور تمھیں پاک کرتا ہے اور تمھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمھیں وہ (باتیں) سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے، چنانچہ تم مجھے یاد کرو، میں تمھیں یاد کروں گا اور تم میرا شکر کرو اور میری ناشکری نہ کرو۔‘‘ [1]

① ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا﴾

’’جلد ہی بے وقوف لوگ (یہ) کہیں گے کہ ان (مسلمانوں) کو ان کے اس قبلے

1 البقرۃ2:149-152.

سے کس چیز نے پھیر دیا جس پر یہ تھے؟"[1]

اللہ تعالیٰ نے تحویل قبلہ کے سلسلے میں یہود کی طرف سے شکوک وشبہات پیدا کرنے اور اُلٹے سیدھے سوال اٹھانے کا تذکرہ پہلے ہی کر دیا۔ یہ امر بھی رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر دلالت کرتا ہے۔ آپ ﷺ نے ایک واقعہ پیش آنے سے پہلے اس کی خبر دی اور وہ ہوبہو وقوع پذیر ہوا۔ اس سے پتا چلا کہ محمد ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں اور نبی ہیں اور بذریعۂ وحی مستقبل کی خبریں دیتے ہیں۔ رسول کی سچائی کے دلائل میں سے ایک دلیل یہ بھی ہے کہ وہ مستقبل میں پیش آمدہ واقعات کی خبر دے جو بعینہٖ وقوع پذیر ہو جائیں۔

آئندہ پیش آنے والی مشکلات کا شافی حل بھی ان آیات میں پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے آپ کو ان مسائل کا سامنا کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کر لیں۔

بلاشبہ اچانک سر اٹھانے والی مشکل طبیعت کے لیے زیادہ گراں ہوتی ہے اور حادثے کی پیشگی اطلاع قدرے اطمینان کا باعث ہوتی ہے۔ آدمی اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو جاتا ہے۔[2]

ابوالسعود رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ مذکورہ آیت میں ایک واقعے کی خبر اس کے وقوع سے پیشتر دی گئی ہے تاکہ نفس مطمئن اور اس کا مقابلہ کرنے کو تیار رہے۔ اچانک پیش آنے والا ناخوشگوار واقعہ طبیعت پر زیادہ شاق گزرتا ہے اور تیار شدہ جواب ہٹ دھرم مدمقابل کا منہ بند کرنے کے لیے زیادہ موثر ہوتا ہے۔[3]

اللہ تعالیٰ نے تحویل قبلہ پر اعتراض کرنے اور رسول اللہ ﷺ کے خلاف سازش کرنے کی وجہ سے یہود کو بے وقوف کہا ہے۔

ابوالسعود لکھتے ہیں کہ ﴿السُّفَهَآءُ﴾ سے مراد وہ لوگ ہوتے ہیں جو بے وقوف اور کم عقل ہوں۔ ایسے لوگ بھیڑ چال چلتے ہیں اور عقل سے کام نہیں لیتے۔ عرب غلط

---

[1] البقرة 2:142. [2] الصراع مع اليهود لأبي فارس: 102/1. [3] تفسير أبي السعود: 171/1.

طریقے سے یا کچے دھاگے سے بنے گئے کپڑے پر ''سفیہ'' کا لفظ بولتے ہیں۔ آیت میں سفہاء سے مراد یہود ہیں۔''[1]

② ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾

''اور (جیسے تمھیں ہدایت دی) اسی طرح ہم نے تمھیں افضل اُمت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہوں۔''[2]

ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا: ''مطلب یہ کہ ہم نے تمھیں ابراہیم علیہ السلام کے قبلے کی طرف پھیر دیا ہے۔ یہ قبلہ اس لیے پسند کیا کہ تم سب سے بہتر امت قرار پاؤ اور قیامت کے دن دوسری امتوں کی گواہ بن جاؤ۔ وجہ یہی ہے کہ تمام لوگ تمھاری فضیلت کے معترف ہیں۔ ''وسط'' کے معنی بہترین اور عمدہ کے ہیں۔ قریش کو خاندانی شرف کی بنا پر اوسط العرب (بہترین یا افضل ترین عرب) کہا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی قوم میں ''وسط'' یعنی بہترین تھے۔ نماز عصر کو بھی اسی لیے صلاۃِ وسطیٰ کہا گیا ہے کہ وہ افضل ترین نماز ہے۔''[3]

گویا امت محمدیہ کرۂ ارض کے بہترین حصے میں عمدہ ترین عقیدے، اعلیٰ فکر ونظر، اچھے نظم ونسق اور تعلقات میں افضلیت کی حامل ہے۔

③ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ۭ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ﴾

''اور (اے نبی!) جس قبلے (بیت المقدس) پر آپ پہلے تھے، اسے تو ہم نے

[1] تفسير أبي السعود:170/1. [2] البقرة2:143. [3] تفسير ابن كثير:430/2.

صرف یہ جاننے کے لیے مقرر کیا تھا کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاتا ہے اور بے شک یہ (قبلہ کی تبدیلی) بہت بھاری ہے (کافروں پر) مگر اُن لوگوں پر (نہیں) جنھیں اللہ نے ہدایت دی۔'' [1]

یہ آیت بتاتی ہے کہ ابتدا میں بیت المقدس کے رخ پر نمازوں کی ادائیگی اور پھر بیت اللہ کی طرف قبلہ کی تبدیلی بڑی آزمائش تھی۔ قاضی بیضاوی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''ہم نے پہلے بیت المقدس کو قبلہ اس لیے مقرر کیا تھا کہ دیکھیں کون رسول کی اتباع کرے گا اور کون اپنی ایڑیوں پر پھرے گا، یعنی اس لیے کہ ہم لوگوں کا امتحان لیں یا اس لیے کہ ہم جان لیں کہ نماز میں کون رسول کی اتباع کرتا ہے اور کون قبائلی تعصب کی بنا پر اس طریقے سے انحراف کرتا ہے۔'' [2]

ابتدا میں بیت اللہ اور بیت المقدس اور پھر دوبارہ بیت اللہ کی طرف رخ کرنا اور جب تک اللہ کا حکم ہو اس پر کاربند رہنا کوئی حرج والی بات نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر حال میں قبلہ رخ ہونا عبادت ہی ہے۔ اور لوگوں پر صرف اللہ تعالیٰ کا حکم ماننا لازم ہے، اسی لیے جو شخص تحویل قبلہ کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا حکم بجا لاتا اور اطاعت شعاری کا ثبوت دیتا ہے وہی امتحان میں کامیاب سمجھا جائے گا۔ اس کے برعکس جو آدمی اپنے دل میں شرعی حکم کے متعلق تنگی پاتا ہے وہ ناکام و نامراد ہوگا۔ سچا ایمان وہی ہے جو صاحبِ ایمان کو خواہشِ نفس کی پیروی سے روکے اور اتباع کی راہ پر گامزن کرے۔ [3]

④ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ ﴾

''اور اللہ ایسا نہیں کہ تمھارا ایمان ضائع کر دے۔ بے شک اللہ لوگوں پر بہت نرمی

---

1 البقرة 2:143. 2 الصراع مع اليهود لأبي فارس: 101/1. 3 الصراع مع اليهود لأبي فارس: 101/1.

کرنے والا، بڑا رحم کرنے والا ہے۔"[1]

آیت کے اس حصے میں اپنے بھائیوں کے لیے اہل ایمان کے نیک جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔ تحویل قبلہ کی آیت نازل ہوئی اور بیت اللہ قبلہ قرار دیا گیا تو مومنین کو اپنے ان اسلامی بھائیوں کی عبادت کے ضائع ہونے کا ڈر ہوا جو انھوں نے بیت المقدس کے رخ پر ادا کی تھی۔ اس فکر مندی کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ ان کی گزشتہ تمام نمازیں قبول ہیں۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بیت اللہ کے رخ پر نماز ادا کرنے کا حکم ہوا تو لوگوں نے دریافت کیا: "اے اللہ کے رسول! ہمارے ان بھائیوں کا کیا ہوگا جو وفات پا چکے ہیں اور انھوں نے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نمازیں ادا کی تھیں؟" اس پر اللہ تعالیٰ نے یہی آیت نازل فرمائی۔[2]

⑤ ارشاد ربانی ہے:

﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ۝ وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَاۤ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اَيْنَ

---

[1] البقرة2:143. [2] سنن أبي داود، حديث: 4680، و جامع الترمذي، حديث:2964، و مسند أحمد: 1/295 و304و 322و 347.

مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

''ہم آپ کے چہرے کا بار بار آسمان کی طرف اُٹھنا دیکھ رہے ہیں تو ہم ضرور آپ کو اس قبلے کی طرف پھیر دیں گے جسے آپ پسند کرتے ہیں، پھر آپ اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں اور جہاں کہیں بھی تم ہو اپنے منہ اس کی طرف پھیر لو اور بے شک وہ لوگ جنھیں کتاب دی گئی وہ ضرور جانتے ہیں کہ بے شک یہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے اور اللہ اس سے غافل نہیں جو وہ عمل کرتے ہیں۔ اور (اے نبی!) اگر آپ ان لوگوں کے پاس ہر قسم کی نشانی لے آئیں جنھیں کتاب دی گئی تو بھی وہ آپ کے قبلے کی پیروی نہیں کریں گے اور نہ آپ ان کے قبلے کی پیروی کرنے والے ہیں۔ اور ان میں سے کوئی گروہ دوسرے گروہ کے قبلے کی پیروی کرنے والا نہیں۔ اور اگر آپ نے ان کی خواہشات کی پیروی کی، اس علم کے بعد جو آپ کے پاس آچکا ہے تو یقیناً اس وقت آپ ظالموں میں سے ہو جائیں گے۔ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ اس (رسول) کو ایسے پہچانتے ہیں جیسے وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ اور بے شک ان میں سے ایک گروہ ضرور حق کو چھپاتا ہے، حالانکہ وہ جانتے ہیں۔ یہ حق ہے تمھارے رب کی طرف سے، لہٰذا (اس کے متعلق) تم ہرگز شک میں نہ پڑنا۔ اور ہر ایک کے لیے ایک سمت ہے جس کی طرف وہ منہ پھیرتا ہے، لہٰذا تم نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھو۔ تم جہاں کہیں بھی ہو گے، اللہ تم سب کو لے آئے گا، بے شک اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔''[1]

رسول اللہ ﷺ کی دیرینہ خواہش تھی کہ نماز میں اپنے والد ابراہیم (علیہ السلام) کے قبلے کا رخ کیا کریں۔ آپ ﷺ ابراہیم علیہ السلام کے تعلق دار ہونے کے لحاظ سے اس قبلے کے سب

[1] البقرۃ 2:144-148.

سے زیادہ مستحق تھے۔ آپ ابراہیم علیہ السلام کی دعاؤں کا ثمرہ تھے اور انھی کی طرح توحید کے علمبردار تھے۔ آپ چاہتے تھے کہ یہود و نصاریٰ اور دیگر اہلِ ادیان سے ممتاز حیثیت اختیار کریں جو دین کی کتابوں میں تحریف اور تبدیلیِ مطالب کے مرتکب ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ یہود و نصاریٰ کی تقلید کرنے اور مشابہت اختیار کرنے سے روکتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ آپ ان کی مخالفت کرنے کا حکم دیتے اور ان بے ضابطگیوں سے پرہیز کرنے کو کہتے جن میں پڑ کر یہود و نصاریٰ گمراہی اور انحراف کا شکار ہوئے تھے۔ اس بسا آرزو کا تقاضا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نمازوں کے لیے مستقل طور پر قبلۂ ابراہیم کی طرف رخ کر لیں جو روئے زمین پر اللہ کا اولین گھر تھا۔[1]

تحویل قبلہ کا واقعہ نہایت دور رس سیاسی و عسکری اور دینی و تاریخی نتائج کا حامل تھا۔ سیاسی اعتبار سے دیکھا جائے تو اس نے جزیرہ نمائے عرب کو مختلف واقعات و حوادث کا محور و مرکز بنا دیا۔ تاریخی لحاظ سے اس نے دنیا کو ابراہیم علیہ السلام کی عربی وراثت سے منسلک کر دیا اور عسکری طور پر اس واقعے نے فتح مکہ کا راستہ ہموار کیا اور مسجد حرام کے مرکزِ توحید کو ناپسندیدہ صورتحال سے باہر نکالا جو ایک بت کدہ بن چکا تھا۔ دینی حوالے سے اس واقعے نے لوگوں کو دین حنیف سے جوڑ دیا اور امت مسلمہ کو دیگر ادیان و مذاہب کے مقابلے میں امتیازی حیثیت عطا کر دی۔[2]

⑥ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِن رَّبِّكَ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ○ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي

1 الصراع مع اليهود لأبي فارس: 100/1. 2 الأساس في السنة لسعيد حوّى: 440/1.

عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ○ كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ○ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ○﴾

"اور (اے نبی!) آپ جہاں سے بھی نکلیں، اپنا منہ مسجد حرام کی جانب پھیر لیں اور بے شک وہ آپ کے رب کی طرف سے حق ہے اور اللہ اس سے غافل نہیں جو تم عمل کرتے ہو اور آپ جہاں سے بھی نکلیں، اپنا منہ مسجد حرام کی جانب پھیر لیں اور (اے مسلمانو!) تم جہاں کہیں بھی ہو، اپنے منہ اسی کی جانب پھیر لو تاکہ تمھارے خلاف لوگوں کے لیے کوئی حجت نہ رہے۔ ہاں، ان میں سے جنھوں نے ظلم کیا (وہ باتیں کرتے رہیں گے)، پس تم ان سے مت ڈرو اور صرف مجھ سے ڈرو تاکہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کروں اور شاید کہ تم ہدایت پاؤ۔ جیسے ہم نے تمھارے لیے تمھی میں سے ایک رسول بھیجا، وہ تم پر ہماری آیتیں تلاوت کرتا ہے اور تمھیں پاک کرتا ہے اور تمھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمھیں وہ (باتیں) سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ تم مجھے یاد کرو، میں تمھیں یاد کروں گا اور تم میرا شکر کرو اور میری ناشکری نہ کرو۔"[1]

رسول اللہ ﷺ جیسی شخصیت کی قیادت اور آپ کا مبارک وجود مسلمانوں کے لیے بلاشبہ خوش قسمتی کی بات تھی کہ جو افراد کی تربیت کا ذمہ دار تھا وہ لوگوں کی طبائع سے خوب واقف تھا۔ وہ ان کا روحانی طبیب اور ان کے قلب و نظر کا نور تھا۔ ﴿يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا﴾ امت محمدیہ کی تربیت کا بنیادی نصاب کتاب اللہ کی صورت میں موجود ہے۔ قرآن کریم بوقت نزول ملائمت اور تروتازگی سے بھرپور تھا، چنانچہ ایک بڑی جماعت قرآن سن کر متاثر ہوئی اور انسانی تاریخ میں ایک ممتاز قوم کی حیثیت سے ابھری۔

[1] البقرة2:149-152۔

﴿وَيُزَكِّيكُمْ﴾ لوگوں کی تعلیم و تربیت کے ذمہ دار معلم و مربی نبی ﷺ تھے جن کی سیرت و اخلاق اور الٰہی احکامات کے نفاذ کو اللہ تعالیٰ نے ایسے جامع و مانع وصف سے بیان کیا ہے جو صرف آپ ﷺ ہی کا خاصہ ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيمٍ ○﴾

''اور یقیناً آپ خُلقِ عظیم پر (کاربند) ہیں۔''[1]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کے اخلاق کو اتنے خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہے کہ اس سے زیادہ خوبصورتی سے اسے اور کوئی آدمی بیان نہیں کر سکتا۔ فرماتی ہیں:

«كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ»

''اللہ کے نبی کا اخلاق قرآن تھا۔''[2]

چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی ﷺ کی لسان اطہر سے قرآن کریم کی تلاوت سنتے اور آپ ﷺ کے مبارک وجود کی صورت میں قرآن کو چلتا پھرتا دیکھتے۔

﴿وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ یہ رسول اللہ ﷺ کا تیسرا وصف ہے کہ آپ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے تھے۔ قرآن کریم امت پر بہتر انداز میں اثرانداز ہو، اس کے لیے ضروری تھا کہ ایک معلمِ ربانی ہو جو نفوس کا تزکیہ کرے، قلوب کو پاک کرے اور امت کو قرآن کریم اور سنتِ نبوی کے ذریعے سے شریعت کے احکام بتلائے۔ وہ قرآن کریم کی مشکلات حل کر کے بتائے، اس کے احکام بیان کرے، اجمال کی تفصیل کرے، اُس سے اس کی تطبیق کے بارے میں سوال کیا جائے اور وہ قرآنِ کریم کے متعلق فکر و نظر کی گمراہیاں اور غلط فہمیاں دور کرے۔

رسول اللہ ﷺ نے اس ذمہ داری کو بطریقِ احسن نبھایا۔ آپ ﷺ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم

---

1 القلم 68:4. 2 الأدب المفرد للبخاري: 308، و مسند أحمد: 91/6، و السنن الكبرٰى للنسائي: 11287.

کی تعلیم و تربیت ربانی منہج کے مطابق کی تا کہ آئندہ نسلوں میں یہ سلسلہ اسی انداز سے جاری رہے۔ صحابۂ کرام نے نبی ﷺ سے تعلیم و تربیت، دعوت اور امت کی قیادت کا طریق کار سیکھا۔ یوں نبی ﷺ ایک ایسی جماعت تیار کرنے میں کامیاب ہوئے جو انسانیت کی قیادت سنبھالنے کی پوری اہلیت رکھتی تھی۔ صحابہ کرام تعلیم و تربیت کے قرآنی و نبوی منہج کو لیے دنیا کے ہر گوشے میں پہنچے اور تمام لوگوں پر حجت قائم کر دی۔

﴿ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴾ وحی و رسالت سے قبل لوگ کیسے تھے اور بعد میں ان کے اندر کیا تبدیلی واقع ہوئی۔ وحی و رسالت سے پہلے لوگ جنگ و جدل اور اندھا دھند جاہلیت میں پڑے تھے۔ وحی و رسالت کی روشنی آ جانے کے بعد اللہ کے فضل و کرم سے وہ ایک عظیم امت کے روپ میں سامنے آئے جن کی زندگی کا ایک نصب العین تھا اور جو خدائی پیغام کے حامل تھے۔

اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور خوشنودی ان کی زندگی کا مطمحِ نظر ٹھہری۔ بندگی و اطاعت شعاری کا محور و مرکز انھوں نے اللہ تعالیٰ کی ذات کو قرار دیا۔ ذاتی مفادات و انا پرستی کے گمراہ کن جذبات اور خواہشِ نفس کے مضبوط شکنجے سے نکل کر وہ امت کی اجتماعی تعمیرِ نو اور اس کی تہذیبی و تمدنی ترقی کی راہ پر آ گئے۔ یوں وہ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کے فضل و کرم سے دو اعلیٰ ترین تمغوں کے مستحق قرار پائے۔[1]

پہلا تمغا یہ تھا:

﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ﴾

’’تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی اصلاح) کے لیے پیدا کی گئی ہے، تم نیک کاموں کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو اور تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔‘‘[2]

---

[1] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 2/438-442. [2] اٰل عمرٰن 3:110.

اور دوسرا انعام یہ تھا:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾

''اور (جیسے تمھیں ہدایت دی) اسی طرح ہم نے تمھیں افضل اُمت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہوں۔''[1]

⑦ ارشاد ربانی ہے:

﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ۝﴾

''چنانچہ تم مجھے یاد کرو، میں تمھیں یاد کروں گا اور تم میرا شکر کرو اور میری ناشکری نہ کرو۔''[2]

یہ تمام احسانات اور یہ انعامات اور یہ بھلائیاں اس امر کی متقاضی ہیں کہ صبح و شام اللہ کا ذکر کیا جائے اور اس کا شکر بجا لایا جائے۔ مولیٰ عزوجل نے مسلمانوں کو اپنی یاد کی ترغیب دلائی ہے اور بتایا ہے کہ ان کا ذکر فرشتوں کی اعلیٰ ترین مجلس میں کیا جاتا ہے اور وہ غیر معمولی امتیاز حاصل کر چکے ہیں، جبکہ اس سے قبل ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں تھا اور وہ کسمپرسی کے عالم میں دشتوں اور صحراؤں کو ناپتے پھرتے تھے، چنانچہ ان نعمتوں کی بدولت اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کا حق ہے کہ نہایت انکسار سے اس کا شکر ادا کیا جائے۔[3]

قرآنِ کریم نے ایسے ہی عظیم واقعات کے حوالے سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تربیت کی اور ان میں مضبوط ایمانی تشخص ابھارا۔ اسلام کے سوا ان کی نگاہوں میں اب اور کوئی دین نہیں جچتا تھا۔ قرآنِ حکیم ہی کے ذریعے سے انھوں نے یہودیوں کا مزاج سمجھا۔ وہ بنظرِ غائر ان کے اطوار کا مطالعہ کرتے رہے۔ آخر کار اسی نتیجے پر پہنچے جس تک ان کی رہنمائی قرآنِ مجید نے کی تھی اور یہودیوں کی وہی تصویر ابھر کر ان کے سامنے آئی جو خود قرآنِ پاک نے

[1] البقرة 2:143. [2] البقرة 2:152. [3] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 2/442.

پیش کی تھی، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۭ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۭ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاۗءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ﴾

”اور یہودی اور عیسائی آپ سے ہرگز راضی نہ ہوں گے یہاں تک کہ آپ ان کی ملت کی پیروی کریں۔ کہہ دیجیے: بے شک اللہ کی ہدایت ہی حقیقی ہدایت ہے اور آپ کے پاس جو علم آ گیا اس کے بعد اگر آپ نے ان کی خواہشات کی پیروی کی تو آپ کو اللہ (کی پکڑ) سے (بچانے والا) نہ کوئی حمایتی ہوگا اور نہ کوئی مددگار۔“[1]

قرآن کریم میں بیان کردہ یہود کی بدعادتیں

یہود کی تاریخ اور نبیِ اسلام کے بارے میں ان کے خیالات ونظریات کا مطالعہ کرنے سے ان کی بدباطنی اور بہیمانہ سرشت آشکار ہوتی ہے اور ان کے گہرے سازشی ذہن کا پتا چلتا ہے۔ اور اس پر تعجب بھی نہیں ہونا چاہیے کہ وہ آدمی جو درست عقائد پر مشتمل دین صحیح سے الگ ہو چکا ہو، انھی صفات کا حامل ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ہمنواؤں کو یہود کی طرف سے سخت تکلیف دہ برتاؤ کا سامنا کرنا پڑا۔ قرآن کریم نے جستہ جستہ اس کا ذکر کیا ہے جبکہ احادیث، تاریخ اور سیرت کی کتابیں یہود کے منفی رویے کے متعلق واقعات سے بھری پڑی ہیں۔ قرآن و حدیث میں یہود کی جن صفات کا تذکرہ ملتا ہے ان میں منافقت، اللہ اور رسول کی شان میں گستاخی، دھوکا، فریب، چاپلوسی اور مفاد پرستی، علم سے عدم استفادہ، کینہ پروری، ناگواری، حسد، لالچ، بخیلی، احسان فراموشی، بے حیائی، غرور وتکبر، خود نمائی، شرک، انبیاء و صالحین کے خلاف محاذ آرائی، اندھی تقلید، کتمانِ علم، مسخِ حقائق، حرام اشیاء اپنانے کے لیے حیلہ جوئی، فرقہ واریت، قوانین کے نفاذ میں طبقاتی اونچ نیچ کا

[1] البقرۃ 2:120۔

لحاظ، رشوت خوری، جھوٹ اور غلاظت پسندی جیسی گھناؤنی عادات شامل ہیں۔

یہود کے جن مذموم اوصاف کا ذکر قرآنِ کریم نے کیا ہے، انھیں یہاں قدرے تفصیل سے پیش کیا جاتا ہے۔

① شرک: یہود کی عبادات باطل پرستی اور شرک پر مبنی ہیں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اللہ کی بھی اولاد ہے۔ وہ عبادات میں اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ قرآن کریم نے ان کے شرکیہ طرزِ عمل کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا:

﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ ۖ ذَٰلِكَ قَوْلُهُم بِأَفْوَاهِهِمْ ۖ يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَبْلُ ۚ قَاتَلَهُمُ اللَّهُ ۚ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ○ اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلَٰهًا وَاحِدًا ۖ لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ سُبْحَانَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ○﴾

''اور یہودیوں نے کہا: عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائیوں نے کہا: عیسیٰ اللہ کا بیٹا ہے، یہ ان کے مونہوں کی بات ہے، یہ اس سے پہلے کے کافروں کی بات کی ریس کرتے ہیں، اللہ انھیں ہلاک کرے یہ کہاں پھرے جاتے ہیں، انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء اور درویشوں کو (اپنا) رب بنالیا اور مسیح ابن مریم کو (بھی)، حالانکہ انھیں یہی حکم دیا گیا تھا کہ وہ صرف ایک معبود (اللہ) کی عبادت کریں، جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اس شرک سے پاک ہے جو وہ کرتے ہیں۔''[1]

معلوم ہوا کہ یہود صرف شرک کی باتیں ہی نہیں کرتے تھے بلکہ انبیاء اور صالحین کی پوجا بھی کرتے تھے۔ انھوں نے انبیاء و صالحین کی قبروں کو سجدہ گاہیں اور آستانے بنا لیا تھا جن کی وہ اللہ کو چھوڑ کے پوجا کرتے تھے۔[2]

1 التوبة9:31,30. 2 اليهود في السنة المطهرة للدكتور عبد الله الشقاري:2/507.

نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«قَاتَلَ اللّٰهُ الْيَهُودَ اتَّخَذُوا قُبُورَ أَنْبِيَاءِهِمْ مَسَاجِدَ»

”اللہ یہود کو تباہ کرے۔ انھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا تھا۔“ [1]

② **انبیاء و صالحین کے خلاف محاذ آرائی:** یہودیوں نے ایک طرف تو اپنے علماء و مشائخ کو معبود کا درجۂ تقدس دے رکھا تھا اور دوسری طرف ان کے خلاف محاذ آرائی سے بھی گریز نہ کرتے اور مختلف وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے ان پر حملے کرتے رہے۔ انھوں نے انبیائے کرام علیہم السلام کو قتل کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ زکریا اور یحییٰ علیہما السلام سے انھوں نے یہی ظالمانہ سلوک کیا۔ [2] اللہ تعالیٰ نے ان کا یہ سفاکانہ عمل ریکارڈ کیا ہے، چنانچہ ان پر نازل کردہ عذابوں کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا:

﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۗ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝﴾

”اور ان پر ذلت اور محتاجی مسلط کر دی گئی اور وہ اللہ کے غضب کے ساتھ لوٹے۔ یہ اس لیے ہوا کہ بے شک وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے اور قتل کرتے تھے نبیوں کو ناحق یہ اس سبب سے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے بڑھ جانے والے تھے۔“ [3]

③ **کتمانِ علم اور حقائق میں تحریف:** کتمانِ علم اور حقائق میں ردوبدل کرنا قدیم زمانے سے یہود کی صفات چلی آتی ہیں۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «قِيلَ لِبَنِي إِسْرَائِيلَ: ﴿وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُولُوا حِطَّةٌ﴾، فَبَدَّلُوا،

[1] صحيح البخاري، حديث: 437، و صحيح مسلم، حديث: 530. [2] اليهود في السنة المطهرة للدكتور عبد الله الشقاري:2/509. [3] البقرة 2:61.

وَ دَخَلُوا يَزْحَفُونَ عَلٰى أَسْتَاهِهِمْ، وَ قَالُوا: حَبَّةٌ فِي شَعْرَةٍ»

''بنی اسرائیل سے کہا گیا: ''دروازے سے جھک کر داخل ہو جاؤ اور ''حطہ'' (مغفرت) کا کلمہ کہتے جاؤ۔''

انھوں نے کلمے کو بدل ڈالا اور دروازے سے سرین کے بل گھسٹتے ہوئے داخل ہوئے اور ''سٹے (بالی) میں دانہ'' کہتے رہے۔''[1]

سب سے بڑا علم جسے یہودی علماء نے چھپانے اور اس کی حقیقت مخفی رکھنے کی کوشش کی، نبی ﷺ کی نبوت و رسالت کا علم تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ہاں رافع بن حارثہ، سلام بن مشکم، مالک بن صیف اور رافع بن حریملہ آئے اور کہا: ''اے محمد! کیا آپ یہ نہیں سمجھتے کہ آپ ابراہیم (علیہ السلام) کے دین پر ہیں اور ہماری کتاب تورات پر بھی ایمان رکھتے ہیں کہ وہ اللہ کی طرف سے برحق ہے؟'' آپ نے فرمایا: «بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ أَحْدَثْتُمْ وَ جَحَدْتُّمْ مَّا فِيهَا، مِمَّا أَخَذَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْمِيثَاقِ فِيهَا، وَكَتَمْتُمْ مِّنْهَا مَا أُمِرْتُمْ أَنْ تُبَيِّنُوهُ لِلنَّاسِ فَبَرِئْتُ مِنْ إِحْدَاثِكُمْ» ''ہاں، بالکل۔ مگر تم نے اپنی طرف سے نئی باتیں ایجاد کر لی ہیں اور یہ کتاب جس پر عمل کرنے کا اللہ نے تم سے پکا وعدہ لیا تھا، اس کی خلاف ورزی کی۔ اور تم نے اس معاملے کو چھپا لیا جس کے متعلق حکم تھا کہ اسے واضح طور پر لوگوں کے سامنے لے آئیں، لہٰذا میں تمھارے اس فعل سے بری ہوں۔'' یہود ڈھٹائی سے کہنے لگے: ''ہمارے پاس اس وقت جو کچھ ہے ہم اسی کو تھامے رکھیں گے۔ بلاشبہ ہم ہدایت اور حق پر ہیں۔ ہم آپ پر ایمان نہیں لائیں گے اور نہ آپ کی اتباع کریں گے۔''[2] اس پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

---

[1] صحيح البخاري، حديث:3403، و صحيح مسلم، حديث:3015. [2] السيرة النبوية لابن هشام:217/2، و تفسير الطبري:310/6.

﴿قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَیْءٍ حَتّٰى تُقِیْمُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِیْلَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَ لَیَزِیْدَنَّ كَثِیْرًا مِّنْهُمْ مَّاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْیَانًا وَّ كُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ ۝﴾

''(اے نبی!) کہہ دیجیے: اے اہل کتاب! تم ہرگز اصل دین پر کاربند نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ تم تورات وانجیل اور اپنی طرف، اپنے رب کی طرف سے نازل کی گئی (دوسری) کتابوں کے احکام پر ٹھیک ٹھیک عمل کرنے لگو۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ (قرآن) جو آپ کے رب کی طرف سے نازل ہوا ہے، ان میں سے اکثر لوگوں کی سرکشی اور کفر میں اضافے کا باعث بنے گا اور آپ کافروں کی قوم کا غم نہ کھائیں۔''[1]

④ فرقہ واریت: یہودی آپس میں ہمیشہ سے مختلف افکار و نظریات کے حامل اور احکامِ شریعت کے بارے میں فرقہ واریت کا شکار رہے ہیں۔ وہ بظاہر ایک نظر آتے ہیں لیکن، جیسا کہ قرآن نے بتایا، ان کے دل الگ الگ ہیں۔ ارشاد ہے:

﴿لَا یُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِیْعًا اِلَّا فِیْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ ؕ بَاْسُهُمْ بَیْنَهُمْ شَدِیْدٌ ؕ تَحْسَبُهُمْ جَمِیْعًا وَّ قُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَعْقِلُوْنَ ۝﴾

''وہ سب مل کر بھی تم سے نہیں لڑ سکیں گے مگر ایسی بستیوں میں جو قلعہ بند ہیں یا دیواروں کی اوٹ سے، ان کی آپس کی لڑائی (دشمنی) بہت سخت ہے، آپ انھیں اکٹھے سمجھتے ہیں جبکہ ان کے دل جدا جدا ہیں، یہ اس لیے کہ بے شک وہ ایسے لوگ ہیں جو عقل نہیں رکھتے۔''[2]

⑤ رشوت خوری: یہودیوں کی ایک خاص معاشرتی علامت یہ تھی کہ وہ اپنے مقاصد کے

[1] المآئدة 5:68. [2] الحشر 59:14.

حصول کے لیے ہر ممکن ذریعہ استعمال کرتے تھے۔ اس ذریعے کے استعمال سے خواہ ان کی شریعت نے روکا ہی ہو مگر وہ اس کی مطلق پروانہ کرتے تھے۔ انھی ذرائع میں سے ایک ذریعہ ان کے ہاں رشوت اور حرام خوری کا بھی تھا جسے کام میں لانا ان کی سرشت میں شامل تھا۔ حق تعالیٰ شانہ نے ان کی یہ عادت صراحت سے بیان کی ہے، فرمایا:

﴿سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ﴾

''وہ جھوٹی باتیں سننے کے عادی ہیں اور جی بھر کر حرام کھانے والے ہیں۔''[1]

⑥ منافقت: بعض یہودی زعماء نے مدینہ میں اسلامی شان وشوکت کو پروان چڑھتے دیکھا تو نمائشی طور پر اسلام قبول کرلیا اور منافقت کا لبادہ اوڑھ کر اندر کی بات چھپالی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ منافقانہ روش بھی نوٹ کی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ○ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ○﴾

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ جیسے اور لوگ ایمان لائے ہیں تو وہ کہتے ہیں: کیا ہم ایمان لائیں جیسے بیوقوف ایمان لائے ہیں؟ سن لو! بے شک وہی بیوقوف ہیں لیکن وہ نہیں جانتے۔ اور جب وہ ان سے ملتے ہیں جو ایمان لائے تو کہتے ہیں: ہم ایمان لے آئے اور جب وہ اپنے شیطانوں کے پاس تنہا ہوتے ہیں تو کہتے ہیں: یقیناً ہم تمھارے ساتھ ہیں ان لوگوں سے تو ہم صرف مذاق کرتے ہیں۔''[2]

⑦ چاپلوسی اور مفاد پرستی: یہود ہمیشہ ہوا کا رخ دیکھ کر اپنی ترجیحات کا تعین کرتے تھے۔ وہ برائی پر اعتراض نہیں کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں ملعون قرار دیا:

---

[1] المآئدة 42:5. [2] البقرة 2:13،14.

﴿لُعِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَ عِیْسَى ابْنِ مَرْیَمَ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا یَعْتَدُوْنَ ۝ كَانُوْا لَا یَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ۝﴾

''بنی اسرائیل میں سے جو لوگ کافر ہوئے ان پر داود اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی، یہ اس وجہ سے ہوا کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے گزر جاتے تھے، وہ ایک دوسرے کو برے کام سے منع نہیں کرتے تھے کیونکہ انھوں نے وہ خود کیا ہوتا تھا، بہت برا تھا جو وہ کرتے تھے۔''[1]

⑧ علم سے عدمِ استفادہ: اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی اس مذموم صفت کی بڑی صحیح تصویر کھینچی ہے۔[2] ارشاد فرمایا:

﴿مَثَلُ الَّذِیْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ یَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۝﴾

''ان لوگوں کی مثال، جنھیں حاملِ تورات بنایا گیا، پھر انھوں نے اسے نہیں اٹھایا (یعنی اس پر عمل نہیں کیا) اس گدھے کی سی ہے جو کتابیں اٹھاتا ہے، بری مثال ہے اس قوم کی جنھوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا اور اللہ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔''[3]

⑨ کینہ پروری اور ناگواری: یہود کے دلوں کی گہرائی میں اتری ہوئی ایک صفت کینہ پروری اور ناگواری تھی۔ وہ ہر اس چیز سے کینہ رکھتے جس کا ان سے کوئی تعلق نہ ہوتا اور یہ اس آدمی کو ناپسند کرتے جو یہودی نہ ہوتا، اس بات سے قطع نظر وہ کیسا آدمی ہے اور کس مرتبے کا ہے۔ خاص طور پر جو چیز نبی ﷺ سے متعلق ہوتی، اس سے تو انھیں خدا واسطے کا بیر ہوتا تھا۔ تحویلِ قبلہ اور حرمتِ شراب کے واقعات اس امر کے شاہد ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

---

1 المآئدة 5:78,79. 2 الیهود في السنة المطهرة للدكتور عبد الله الشقاري: 2/463-482.
3 الجمعة 62:5.

کہتے ہیں کہ حرمتِ شراب کے متعلق آیت نازل ہوئی تو یہود نے کہا کہ کیا تمھارے فوت شدگان شراب نہیں پیتے تھے؟ اس سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی:

﴿لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝﴾

"جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرنے لگے، انھوں نے جو کچھ (پہلے) کھایا، اس پر انھیں کوئی گناہ نہیں جبکہ وہ (آئندہ) پرہیز گاری اختیار کریں اور ایمان پر قائم رہیں اور نیک عمل کریں، پھر وہ پرہیز گار ہی رہیں اور ایمان پر جمے رہیں، پھر وہ پرہیز گاری ہی اپنائیں اور نیکی کریں اور اللہ نیکی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔"[1]

⑩ حسد: یہودیوں کو نبی ﷺ اور آپ کی رسالت سے شدید حسد تھا۔ ان کا گمان تھا کہ آئندہ نبی یہود میں سے ہوگا جس کے ارد گرد وہ جمع ہوں گے اور اس کے زیر قیادت دشمنوں سے لڑیں گے لیکن جب محمد ﷺ مبعوث ہوئے تو یہودی مارے حسد کے دیوانے ہو گئے۔ وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو کر نبی ﷺ کی اندھا دھند مخالفت پر اڑ گئے۔ اصحابِ کرام سے انھیں یہ چڑ تھی کہ اللہ نے انھیں ایمان و ہدایت کی دولت سے کیوں نواز رکھا ہے اور ان کے سینے اسلام کے لیے کیوں کھول دیے ہیں۔[2] اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ۝﴾

"اور (اللہ کی پناہ میں آتا ہوں) حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرے۔"[3]

فرمانِ الٰہی ہے:

1 المآئدة 5:93. المستدرك للحاكم: 4/143،144. 2 الصراع مع اليهود لأبي فارس: 1/70.
3 الفلق 113:5.

﴿وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۗ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝﴾

''اہل کتاب میں سے بہت سے یہ چاہتے ہیں کاش کہ وہ تمھارے ایمان لانے کے بعد تمھیں پھیر کر کافر بنا دیں، اپنے دلوں میں حسد کرتے ہوئے، اس کے بعد کہ ان کے سامنے حق واضح ہو چکا، پس معاف کر دو اور جانے دو، یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لے آئے، بے شک اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔''[1]

⑪ غرور و تکبر: غرور و تکبر یہودیوں کی پرانی عادت ہے۔ وہ خود کو تمام انسانوں سے بلند و برتر خیال کرتے اور کہتے تھے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ قوم ہیں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جنت یہودیوں کے لیے ہے اور دنیا میں یہودیت ہی ہدایت کا واحد راستہ ہے۔ اس کے علاوہ ہر طرف گمراہی ہی گمراہی ہے۔[2] مولیٰ عزوجل نے قرآن مجید میں ان کی اس بری خصلت کو یوں بیان کیا ہے:

﴿وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ۗ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ۗ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝﴾

''اور انھوں نے کہا: جنت میں صرف وہی جائے گا جو یہودی یا نصرانی ہوگا۔ یہ ان کی (باطل) آرزوئیں ہیں، (اے نبی!) کہہ دیجیے: لاؤ تم اپنی دلیل، اگر تم سچے ہو۔''[3]

یہود نے نبی ﷺ کے خلاف اس مذموم خصلت کا اظہار مختلف طریقوں سے کیا۔[4]

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے ہاں نعمان بن اَضاء، بحری بن عمرو اور شاس بن عدی آئے، انھوں نے آپ ﷺ سے گفتگو کی۔ آپ ﷺ نے ان سے گفتگو فرمائی، انھیں اللہ کی طرف بلایا اور اس کے عذاب سے ڈرایا۔ یہودیوں نے کہا:

---

1 البقرة 2:109. 2 اليهود في السنة المطهرة للدكتور عبد الله الشقاري: 2/495,496.
3 البقرة 2:111. 4 تفسير الطبري: 6/105.

”اے محمد! (ﷺ) ہمیں کوئی خوف نہیں، ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔“ اس پر اللہ تعالیٰ نے یوں تبصرہ فرمایا:

﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ﴾

”اور یہودیوں اور عیسائیوں نے کہا: ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔ (اے نبی!) کہہ دیجیے: پھر وہ تمھیں تمھارے گناہوں کی سزا کیوں دیتا ہے؟ (نہیں) بلکہ تم بھی اس کی مخلوق میں سے انسان ہو۔“ [1]

⑫ بخیلی: بخیلی زمانۂ قدیم سے یہود کے طور اطوار میں شامل ہے۔ وہ نیکی اور رفاہِ عامہ کے کاموں میں مال خرچ نہ کرتے اور اس باب میں کنجوسی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ وہ انصار سے کہا کرتے تھے کہ تم بھی اپنے اموال خرچ نہ کیا کرو۔ ہمیں ڈر ہے کہ کہیں تم کنگلے نہ ہو جاؤ اور اخراجات میں احتیاط سے کام لو، نامعلوم آئندہ حالات کیسے ہوں۔ [2]

ان کے اس غیر اخلاقی رویے کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا:

﴿اَلَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ○﴾

”ایسے لوگ (بھی اللہ کو پسند نہیں) جو کنجوسی کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی کنجوسی کرنے کا حکم دیتے ہیں اور اللہ نے اپنے فضل سے جو کچھ انھیں دیا ہے اسے چھپاتے ہیں اور ہم نے کافروں کے لیے رسوا کر دینے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔“ [3]

”چھپانے“ سے مراد یہ ہے کہ وہ محمد ﷺ اور آپ کے دین کے متعلق تورات کے تصدیقی و تائیدی بیانات پوشیدہ رکھتے ہیں اور انھیں لوگوں کے سامنے نہیں لاتے۔ مزید

[1] المآئدة 18:5. [2] اليهود في السنة المطهرة للدكتور عبد الله الشقاري:488,487/2.
[3] النسآء 37:4.

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ۝﴾

''اور ان لوگوں کا کیا جاتا، اگر وہ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لے آتے اور اللہ نے انھیں جو مال دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے؟ اور اللہ انھیں خوب جاننے والا ہے۔''[1]

⑬ **بغض وعناد:** محمد ﷺ کے سچے نبی ہونے پر واضح اور دوٹوک دلائل میسر آ جانے کے باوجود یہود اپنے بغض وعناد کے باعث ایمان لانے سے باز رہے اور کفر وتکذیب کی دلدل میں دھنستے چلے گئے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ بغض وعناد اور سرکشی نے عقل پر خواہشات نفس کے تالے لگا دیے ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۗ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝﴾

''اور (اے نبی!) اگر آپ ان لوگوں کے پاس ہر قسم کی نشانی لے آئیں جنھیں کتاب دی گئی تو بھی وہ آپ کے قبلے کی پیروی نہیں کریں گے اور نہ آپ ان کے قبلے کی پیروی کرنے والے ہیں۔ اور ان میں سے کوئی گروہ دوسرے گروہ کے قبلے کی پیروی کرنے والا نہیں۔ اور اگر آپ نے ان کی خواہشات کی پیروی کی، اس علم کے بعد جو آپ کے پاس آ چکا ہے تو یقیناً اس وقت آپ ظالموں میں سے ہو جائیں گے۔''[2]

یعنی اے محمد! آپ ان کے سامنے ایک ہزار ایک دلیل لے آئیں تب بھی وہ نہیں

[1] النسآء 39:4. [2] البقرة 145:2.

مانیں گے اور نہ اپنی روش میں ذرہ برابر تبدیلی کریں گے۔[1] اللہ تعالیٰ کا یہ قول ان پر صادق آتا ہے:

﴿ قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ○﴾

''(اے نبی!) کہہ دیجیے: دیکھو (اور غور کرو) جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور نشانیاں اور ڈراوے ان لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں دیتے جو ایمان نہیں لاتے۔''[2]

یہ چند صفات کی تفصیل تھی جو یہودی قوم کا خاصہ تھیں اور غالباً اب بھی ہیں۔ قرآن کریم نے ان کے ان خصائص پر روشنی ڈالی ہے تاکہ مسلمان یہودیوں کی حقیقت جانیں اور کسی وقت، کسی جگہ ان سے دھوکا نہ کھائیں۔

فسادیوں کی اصلاح نہیں ہوتی

میثاق مدینہ اس امر پر شاہد عادل ہے کہ نبی ﷺ نے یہود کے ساتھ حسنِ معاملہ میں عدل و انصاف کے تقاضوں کا کس درجہ خیال رکھا تھا۔ اس وثیقے نے اسلامی ریاست کے باشندوں کو مذہبی آزادی کا حقیقی مفہوم سمجھایا۔ اس تحریر دلپذیر نے افکار و نظریات اور عقائد میں معاندانہ رویے اور تعصب پروری کا سختی سے رد کیا۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ رسول اللہ ﷺ بیرونی دشمنوں سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے مہلت چاہتے تھے تاکہ ان کا صفایا کر کے اندرونی دشمنوں کا خاتمہ شروع کر دیں جن سے آپ نے معاہدہ کیا ہے۔ ہرگز نہیں! بلکہ یہ بے نظیر اقدام سیاستِ اسلامی کے اصولوں کے عین مطابق تھا جس کے سوتے شریعتِ ربانی کے منبع سے پھوٹے تھے۔[3]

رسول اللہ ﷺ نے یہود کو اہلِ ذمہ قرار دے کر ان سے معاہدہ کیا کہ وہ اسلامی ریاست

[1] دراسات في السيرة النبوية للدكتور عماد الدين خليل، ص:151. [2] يونس 101:10. [3] العهد و الميثاق في القرآن الكريم للدكتور ناصر العمري، ص:121.

کے سایے تلے پر امن اور خوشگوار زندگی گزار سکیں۔ لیکن یہود جو فطری طور پر غدار، خائن اور بدعہد واقع ہوئے تھے، انھوں نے معاہدہ توڑ دیا۔ آخر کار ان کا انجام بھی وہی ہوا جو پیمان شکن لوگوں کا ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بنوقینقاع اور بنونضیر کے یہودی قبائل کو مدینہ سے جلاوطن کر دیا اور بنوقریظہ کے جنگجو مردوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ [1]

یہود کی جلاوطنی اور قتل کے واقعات آئندہ اپنے مقام پر آئیں گے۔ قرآن کریم نے یہودیوں کی وعدہ شکن طبیعت اور بدنہادی کو بایں الفاظ بیان کیا ہے:

﴿اَلَّذِیْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِیْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا یَتَّقُوْنَ ۝﴾

''وہ جن سے آپ نے معاہدہ کیا، پھر وہ ہر بار اپنا عہد توڑ ڈالتے ہیں اور وہ (اللہ سے ذرا) نہیں ڈرتے۔'' [2]

آیت میں عہد سے مراد باہمی جنگ و جدل نہ کرنا اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا ہے اور یہی جمہور مفسرین کی رائے ہے۔

یہودیوں نے نبی ﷺ اور اہلِ ایمان کے خلاف مکر و فریب کے کئی جال بچھائے اور مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے مختلف تدابیر اختیار کیں مگر ان کی کوئی تدبیر کارگر ثابت نہ ہوئی اور وہ مطلوبہ نتائج حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ ان کا مقصد دراصل مسلمانوں کی جمعیت کا شیرازہ بکھیرنا، ان کی ریاست تباہ کرنا اور ان کا سیاسی تشخص پامال کرنا تھا۔

اپنے گھناؤنے مقاصد کے حصول میں یہود کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تربیت سیدھے سادھے نبوی منہج کے مطابق ہوئی تھی جس نے ان کے دلوں میں ایمان کا بیج بویا، انھیں صرف اللہ کی بندگی کا ڈھنگ سکھایا اور شرک سے برسرپیکار ہونے کی ہمت عطا کی۔ نبوی تعلیم و تربیت ہی کے سبب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم روحانی و مادی

[1] تفسیر الطبري: 30/8، والتحریر والتنویر لابن عاشور: 48/10. [2] الأنفال 8:56.

ترقی کا راز جان پائے۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام کی تربیت مردانگی، عزت نفس کے تحفظ، بڑے پن، بہادری، ترکِ اسبابِ ذلت، ظلم کا مقابلہ اور یہودی سازشوں کے آگے گردن خم نہ کرنے کے اصولوں پر کی تھی۔ صحابۂ کرام نے اسی تربیت کے پیشِ نظر اسلام کے اصولوں پر استقامت اختیار کی اور دشمنوں پر غلبہ پایا۔[1]

یہودیوں کے مکر وفریب اور چالاکی کی شدت کا یہ عالم تھا کہ پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہل جاتے لیکن نبی ﷺ کی قیادت اور منہجِ ربانی کی رہنمائی کے باعث اسلام کا ہراول دستہ یہودی مکر وفریب کے دام میں نہ آیا۔[2]

آج کے مسلمان یہودی سازشوں اور حیلہ سازیوں کے آگے بے بس ہیں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ مسلمان امت کی تربیت اور یہودیوں سے معاملہ کرنے کے سلسلے میں منہاجِ نبوی سے دور جا چکے ہیں۔ امت مسلمہ کو ایسی دانش مندانہ قیادت کی فوری اور سخت ضرورت ہے جو اللہ تعالیٰ کے ودیعت کردہ علم وحکمت سے بہرہ مند ہو اور یہود کے اخلاق و کردار اور عادات و اطوار سے بخوبی واقف ہو۔ یہ قیادت یہودیوں سے معاملہ کرنے میں جن اصول وقوانین پر عمل کرے وہ سیاست نبوی سے ماخوذ ہوں۔

دورِ حاضر میں مختلف ممالک واقوامِ عالم کے ہر معاملے میں یہود کی ناروا پالیسیاں دخل اندازی کرتی نظر آتی ہیں۔ ان کا مقصد ایک ہی ہے جسے قرآنِ کریم نے یوں بیان کیا ہے:

﴿وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا﴾

''اور وہ زمین میں فساد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔''[3]

آیت میں صیغۂ مضارع اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اُن کا یہ عمل جاری وساری ہے۔ یہود کی فتنہ انگیزیاں کسی ایک تاریخی مرحلے کے ساتھ خاص نہیں تھیں بلکہ فساد فی الارض کا

[1] الصراع مع اليهود لأبي فارس:80/1. [2] الصراع مع اليهود لأبي فارس:79/1. [3] المآئدة 64:5.

خاصہ رہتی دنیا تک ان کی فطرت میں شامل رہے گا۔ یہود سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اقوام عالم کے وسائل پر قبضہ کرنے کے خواہش مند ہیں۔ انھیں یہ جرأت اسلامی تشخص کے ناپید ہونے کی وجہ سے ہوئی جو ان کے مکروفریب کا جال کاٹنے اور اُن کی ناروا پالیسیوں کو ناکام بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

فتنہ انگیزی اور تخریب کاری میں یہودیوں کی مہارت اور ہنرمندی شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ اپنی اسی عبقریت کی بدولت وہ مواقع سے بھرپور فائدہ اٹھاتے اور انھیں اپنے مذموم مفادات کے حصول کا ذریعہ بناتے ہیں۔ دنیا کے بڑے ممالک میں یہودیوں کا سیاسی و اقتصادی اثر و رسوخ قائم ہے۔ وہ ان ممالک کے ذرائع ابلاغ پر قابض ہیں۔ دو بڑے عالمی اقتصادی نظاموں سرمایہ داری و اشتراکیت میں اُن کا برابر کا حصہ رہا ہے۔ دنیا کے بڑے انقلابات سے بھی وہ پیچھے نہیں رہے۔ اس وقت کئی ایک بین الاقوامی تنظیمیں یہودی مقاصد کے لیے کام کر رہی ہیں جن میں فری میسن، انٹرنیشنل ایسوسی ایشن آف لائنز، روٹری کلب اور وِڈنس آف یہوہ سرفہرست ہیں۔

باب 4

تعلیم و تربیت کا تسلسل

مدنی دور میں پہلے پہل جو قرآنِ کریم نازل ہوا وہ سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات پر مشتمل تھا۔ اس حصے میں اہلِ ایمان، اہلِ کفر اور منافقین کی صفات بیان کی گئی ہیں اور یہود و نصاریٰ کے کردار و اطوار کا جائزہ لیا گیا ہے۔ بالخصوص یہود کی جبلت و حقیقت کو نہایت وضاحت سے زیرِ بحث لایا گیا ہے، اس لیے کہ اسلامی دعوت مدینہ پہنچی تو سب سے پہلے یہی گروہ اُس کی دشمنی کے درپے ہوا تھا۔[1]

یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ سورۂ بقرہ نے جو مدنی دور کے اوائل میں نازل ہوئی تھی، سب لوگوں کو دینِ الٰہی کی طرف آنے اور عبادتِ الٰہی کی طرف متوجہ ہونے کی دعوت دی تھی۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ○ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۖ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَندَادًا وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ○﴾

’’اے لوگو! تم اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمھیں پیدا کیا اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔ وہ (رب) جس نے تمھارے لیے زمین کو بچھونا بنایا اور آسمان کو چھت (بنایا) اور اس نے آسمان سے پانی نازل کیا،

[1] تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب: 27/1.

پھر اس کے ذریعے سے (کئی قسم کے) پھلوں سے تمھارے لیے رزق نکالا، پس تم اللہ کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ، اس حال میں کہ تم جانتے ہو۔''[1]

عہد مدنی میں نازل ہونے والی آیاتِ قرآنی نے مسلمانوں کو انتباہ کیا تھا کہ وہ منافقین کی صفات نہ اپنائیں۔ ان آیات نے نئے اسلامی معاشرے اور نو آموز اسلامی ریاست کے لیے نفاق کی سنگینی کو نہایت وضاحت سے بیان کیا تھا۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ مسلم معاشرے کے خلاف تحریکِ نفاق کا آغاز عہد مدنی ہی میں ہوا تھا۔ مکہ میں مسلمان ایسی پوزیشن میں نہیں تھے اور نہ وہاں اُنھیں اتنا اثر و رسوخ حاصل تھا کہ کسی گروہ کو اُن کے دباؤ میں آکر چاپلوسی یا خوشامد کرنے اور بظاہر اسلام قبول کر لینے کی ضرورت پیش آتی۔

ان آیات میں منافقین کے اوصاف، حالات و کردار اور اُن کے نقطہ ہائے نظر پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ عہد مدنی کی کوئی متوسط اور طویل سورت اُن کے تذکرے سے خالی نہیں۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ منافقین کی سرگرمیاں تقریباً پورے مدنی دور میں جاری رہیں، اگرچہ عہد مدنی کے آخر نصف میں اُن کا جوش ماند پڑ گیا تھا۔[2]

عہد مدنی میں نازل شدہ آیات قرآنی نے جن معاملات کو موضوع بحث بنایا اُن میں عظمتِ الٰہی، حقیقتِ کائنات اور ترغیب و ترہیب کے مضامین شامل ہیں۔ تربیتِ امت اور ریاست کے لوازم کی تکمیل کے لیے قانون سازی بھی اسی مرحلے میں کی گئی تھی۔ جوں جوں دعوت و تبلیغ، تعمیرِ معاشرہ اور تاسیس ریاستِ اسلامی کے مراحل طے ہوتے رہے، امتِ مسلمہ اپنے علمی سفر میں بھی نئی نئی منزلوں سے روشناس ہوتی رہی۔ قرآن کریم نے تحصیلِ علم پر زور دیا اور اس راہ میں تگ و دو کرنے والوں کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بیشتر احادیث میں حصولِ علم کی ترغیب دلائی ہے۔ کتبِ حدیث میں بھی علم کے فضائل کے متعلق علیحدہ طور پر ابواب قائم کیے گئے ہیں۔

---

[1] البقرۃ 2:21، 22۔ [2] دراسات في عهد النبوة للدكتور عبدالرحمٰن الشجاع، ص: 172۔

امت مسلمہ نے اس حقیقت کو باور کیا تھا کہ اقوام عالم میں نمایاں مقام اور خطے میں بالادستی حاصل کرنے کے لیے علم کا حصول ناگزیر ہے۔ اللہ تعالیٰ دنیا کی زمام اقتدار جاہل اور علم و ہنر کے اعتبار سے پس ماندہ قوموں کے ہاتھ میں نہیں دیتا۔ قرآن کریم کی بیشتر آیات میں حصول علم کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ اُس نے کفر کے مقابلے میں علم کو پیش کیا ہے۔[1] کفر جو جہالت اور گمراہی کا دوسرا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۗ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ﴾

''کیا جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے، برابر ہو سکتے ہیں؟ بس عقل والے ہی نصیحت پکڑتے ہیں۔''[2]

علم ہی وہ واحد شے ہے جس کے متعلق رب تعالیٰ نے اپنے رسول کو حکم دیا کہ وہ اُس میں اضافے کی دعا کیا کریں۔ ارشاد فرمایا:

﴿وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا﴾

''اور کہیں: اے میرے رب! مجھے علم میں زیادہ کر۔''[3]

آدم علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے جن خصوصیات سے نوازا اور ممتاز کیا تھا اُن میں علم کی خصوصیت سرفہرست ہے۔ ارشاد فرمایا:

﴿وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَائِكَةِ فَقَالَ أَنبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هَٰؤُلَاءِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ﴾

''اور اس نے آدم کو سب کے سب نام سکھا دیے، پھر انھیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا: اگر تم سچے ہو تو مجھے ان چیزوں کے نام بتاؤ۔''[4]

---

1 التمكين للأمة الإسلامية لمحمد السيد، ص: 62. 2 الزمر 9:39. 3 طٰهٰ 114:20. 4 البقرة 31:2.

نبی ﷺ نے اپنے مخصوص انداز میں صحابۂ کرام کی تعلیم و تربیت جاری رکھی۔ آپ اُنھیں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا خوف دلاتے، مکارمِ اخلاق پر کاربند رہنے کی تلقین کرتے، احکامِ شریعت کی تشریح بتاتے اور مبادیاتِ اسلامی کی وضاحت فرماتے تھے۔ صحابۂ کرام کی بہتر تعلیم و تربیت کے سلسلے میں آپ ﷺ ابلاغ کے مختلف وسائل و ذرائع استعمال میں لاتے تھے۔ [1]

تربیت کے اہم وسائل اور اصول وقواعد

سطورِ ذیل میں ان وسائل اور اصول وقواعد کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جاتا ہے:

بات دُہرانا

متکلم اس اصول پر عمل کرے تو سامعین کے لیے بات سمجھنا، اُس کی تہ تک پہنچنا اور اُسے یاد رکھنا آسان ہوجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اکثر اوقات اپنی بات دُہرا دیا کرتے تھے۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے بتایا کہ نبی ﷺ کوئی بات کرتے تو اُسے تین بار دہراتے تھے تاکہ خوب سمجھ میں آجائے۔ جب لوگوں کی محفل میں آتے اور اُنھیں سلام کرتے تو سلام کے الفاظ تین بار کہتے تھے۔ [2]

گفتگو میں ٹھہراؤ

رسول اللہ ﷺ ٹھہر ٹھہر کر اطمینان سے بات کرتے تھے۔ ہر لفظ الگ الگ سمجھ میں آتا تھا۔ یوں بات کو یاد رکھنا آسان ہوجاتا اور اُسے آگے پہنچانے میں کسی قسم کی تحریف یا تبدیلی کا شائبہ نہیں رہتا تھا۔ نبی ﷺ تو اس امر کا اتنا اہتمام کرتے تھے کہ سننے والا چاہتا تو آپ کے الفاظ بآسانی گن سکتا تھا۔ [3]

---

1 مناهج و آداب الصّحابة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 60,59. 2 صحيح البخاري، حديث: 95. 3 صحيح البخاري، حديث: 3567.

میانہ رو گفتگو، اکتاہٹ سے اجتناب اور مناسب وقت کا انتخاب

رسول اللہ ﷺ گفتگو کی مقدار، اُس کی نوعیت اور وقت کے انتخاب میں میانہ روی اختیار کیا کرتے تھے تاکہ صحابۂ کرام اکتاہٹ کا شکار نہ ہوں اور بات سمجھ کر یاد رکھنے کے لیے تیار رہیں۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، اُنھوں نے کہا: ”نبی ﷺ اس اندیشے سے کہ ہم اکتاہٹ کا شکار ہو جائیں گے، موقع و محل کی مناسبت سے وعظ و نصیحت فرمایا کرتے تھے۔“ [1]

مثال بیان کرنا

بات کو دل میں اتارنے کے لیے مثال بیان کرنے کی بڑی عجیب تاثیر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مثال غیر محسوس کو محسوس شکل میں پیش کرتی اور موجودہ صورتحال سے اُس کا ربط قائم کر کے اُسے ذہن کے قریب لے آتی ہے۔ مثال کی گوناگوں صورتوں میں ایسی زبردست بلاغت پائی جاتی ہے جو دلوں کے تار چھیڑتی اور عقل کو لبھاتی ہے۔ بالخصوص عرب کہ فصاحت و بلاغت جن کے گھر کی لونڈی تھی، تفہیم کا یہ طریق کار اُن کے دلوں پر براہِ راست اثر انداز ہوتا تھا۔ یہی باعث ہے کہ قرآنِ کریم نے مثال بیانی کے اسلوب کو جابجا استعمال کیا ہے اور کئی آیات میں اس طرزِ بیان کی حکمت پر بھی روشنی ڈالی ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ۝﴾

”اور یہ مثالیں ہم لوگوں (کو سمجھانے) کے لیے بیان کرتے ہیں اور انھیں بس علم والے ہی سمجھتے ہیں۔“ [2]

اور فرمایا:

1 صحيح البخاري، حديث: 68. 2 العنكبوت 43:29.

﴿وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ○﴾

''اور یہ مثالیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں شاید کہ وہ غور وفکر کریں۔''[1]

رسول اللہ ﷺ نے یہی دلکش پیرایۂ بیان اختیار کیا اور جابجا ضرب الامثال سے کام لیا۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: ''میں نے ایک ہزار ضرب الامثال رسول اللہ ﷺ سے سُن کر یاد کیں۔''[2]

احادیث نبویہ میں جو ضرب الامثال استعمال ہوئی ہیں اُن پر کئی کتب لکھی گئی ہیں۔ اُن میں قدیم ترین کتاب ''امثال الحدیث'' کے نام سے ہے جسے قاضی ابو محمد حسن بن عبدالرحمٰن بن خلاد رامہرمزی (متوفی 360ھ) نے تالیف کیا تھا۔[3]

آزمائشی سوال

آزمائشی سوال کرنا تعلیم و تربیت کے اہم ترین وسائل میں شامل ہے۔ اس طریق کار کے ذریعے سے استاد اور طالب علم کے درمیان گہرا تعلق استوار ہونے میں مدد ملتی ہے، طالب علم کا ذہن کھلتا ہے، اسے یکسوئی میسر آتی ہے اور وہ ذہنی طور پر ہوشیار ہوجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی ﷺ صحابۂ کرام کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں آزمائشی سوال و جواب کی متعدد صورتیں استعمال میں لاتے تھے۔

بعض اوقات سوال کرنے کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ کسی کام کی ترغیب دلائی جائے اور عنانِ توجہ اُس جانب موڑ دی جائے۔ اس صورت میں سوال کا آغاز عام طور پر أَلَا کے کلمۂ تنبیہ سے ہوتا تھا۔ جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، اُنھوں نے کہا کہ ایک دفعہ نبی ﷺ نے صحابۂ کرام سے مخاطب ہو کر فرمایا: «أَلَا أَدُلُّكُمْ عَلٰى مَا يَمْحُو اللّٰهُ بِهِ الْخَطَايَا وَ يَرْفَعُ بِهِ الدَّرَجَاتِ»

[1] الحشر 21:59. [2] مناهج و آداب الصحابة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 65. [3] مناهج و آداب الصحابة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 65.

''میں آپ کو ایسے عمل نہ بتاؤں جن کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ خطائیں مٹاتا اور درجات بلند فرماتا ہے؟''

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے جواب دیا: ''ضرور بتائیے، اے اللہ کے رسول!''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِسْبَاغُ الْوُضُوءِ عَلَى الْمَكَارِهِ، وَكَثْرَةُ الْخُطَا إِلَى الْمَسَاجِدِ، وَانْتِظَارُ الصَّلَاةِ بَعْدَ الصَّلَاةِ، فَذٰلِكُمُ الرِّبَاطُ» ''تنگی اور مشقت میں کامل وضو کرنا، مساجد کی طرف زیادہ سے زیادہ چل کر آنا جانا اور نماز کے بعد نماز کا انتظار کرنا، یہی (نفس کی) پہریداری ہے۔''[1]

بعض دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابۂ کرام سے ایسا سوال کرتے تھے جس کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہوتا تھا کہ صحابۂ کرام اس کا جواب نہیں جانتے اور وہ یہی کہیں گے کہ اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ اس سے بھی آپ کی غرض یہی ہوتی تھی کہ صحابۂ کرام کا دھیان اس موضوع کی طرف ہو اور وہ اُس کے مختلف پہلوؤں پر غور کریں۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَتَدْرُونَ مَا الْمُفْلِسُ؟» ''کیا تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے؟''

صحابہ نے جواب دیا: ''ہم میں مفلس وہ ہے جس کے پاس مال و دولت اور ساز و سامان نہ ہو۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّ الْمُفْلِسَ مِنْ أُمَّتِي، مَنْ يَّأْتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِصَلَاةٍ وَّ صِيَامٍ وَّزَكَاةٍ، وَّ يَأْتِي قَدْ شَتَمَ هٰذَا وَ قَذَفَ هٰذَا وَ أَكَلَ مَالَ هٰذَا وَ سَفَكَ دَمَ هٰذَا، وَ ضَرَبَ هٰذَا، فَيُعْطٰى هٰذَا مِنْ حَسَنَاتِهِ وَ هٰذَا مِنْ حَسَنَاتِهِ، فَإِنْ فَنِيَتْ

---

1 صحيح مسلم، حديث: 251، و جامع الترمذي، حديث: 51، و سنن ابن ماجه، حديث: 428، و الموطأ للإمام مالك: 161/1، و السنن الكبرٰى للنسائي: 89/1.

حَسَنَاتُهُ قَبْلَ أَنْ يُقْضٰى مَا عَلَيْهِ، أُخِذَ مِنْ خَطَايَاهُمْ فَطُرِحَتْ عَلَيْهِ ثُمَّ طُرِحَ فِي النَّارِ»

''میری امت میں سے مفلس وہ ہے جو روز قیامت نماز، روزوں اور زکاۃ کا سرمایہ لیے آئے گا لیکن اُس نے کسی کو گالی دی ہوگی تو کسی پر الزام تراشی کی ہوگی، کسی کا مال ہتھیایا ہوگا تو کسی کا خون بہایا ہوگا اور کسی کو زدوکوب کیا ہوگا۔ اب (مظلوم افراد میں سے) ہر ایک کو اُس (ظالم) کی نیکیوں میں سے حصہ دیا جائے گا۔ لوگوں کا حساب چکانے سے پیشتر اگر اُس کی نیکیاں ختم ہوجائیں گی تو لوگوں کی خطائیں اُس (ظالم) پر ڈال دی جائیں گی۔ بعدازاں اُسے آگ کے حوالے کردیا جائے گا۔''[1]

کبھی یوں بھی ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ سوال سامنے رکھتے اور صحابۂ کرام میں سے کوئی ایک درست جواب دیتا تو آپ ﷺ اُس کی ستائش اور حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

«يَا أَبَا الْمُنْذِرِ! أَتَدْرِي أَيُّ آيَةٍ مِّنْ كِتَابِ اللّٰهِ مَعَكَ أَعْظَمُ؟»

''ابو المنذر! کیا آپ جانتے ہیں کہ آپ کے پاس کتاب اللہ کی سب سے عظیم آیت کون سی ہے؟''

میں نے کہا: ''اللہ اور اُس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ نے دوبارہ دریافت فرمایا:

''ابو المنذر! کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے پاس کتاب اللہ کی سب سے جلیل القدر آیت کون سی ہے؟''

میں نے جواب دیا: ﴿ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ﴾

[1] صحيح مسلم، حديث: 2581، و جامع الترمذي، حديث: 2418.

اس پر آپ ﷺ نے خوشی سے میرے سینے پر ہاتھ مار کر فرمایا: «وَاللّٰهِ! لِيَهْنِكَ الْعِلْمُ أَبَا الْمُنْذِرِ!» ''ابوالمنذر! آپ کو یہ علم مبارک ہو۔''[1]

ستائش اور حوصلہ افزائی کا یہ انداز طالب علم کے دل پر خوش کن اثرات چھوڑتا ہے۔ اُس میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے اور وہ طلب علم کی راہ میں آگے تک جانے کا آرزومند رہتا ہے۔[2]

توجہ طلب اور انوکھے مطالب کا بیان

اس سلسلے کی بہترین مثال وہ واقعہ ہے جسے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ بالائی راستے سے ہوتے ہوئے بازار سے گزرے۔ آپ ﷺ کے ساتھ صحابہ کرام بھی تھے۔ چلتے چلتے چھوٹے چھوٹے کانوں والے بکری کے ایک مردہ بچے پر نظر پڑی تو ٹھہر گئے۔ آگے بڑھ کر اُسے کان سے پکڑا اور پوچھا: «أَيُّكُمْ يُحِبُّ أَنَّ هٰذَا لَهُ بِدِرْهَمٍ؟» ''آپ میں سے کون پسند کرے گا کہ یہ مردار اُسے ایک درہم میں مل جائے؟''

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے جواب دیا: ''ہم اسے کسی بھی شے کے عوض نہیں لینا چاہیں گے، ہم اس کا کریں گے کیا؟''

آپ ﷺ نے دریافت کیا: «أَتُحِبُّونَ أَنَّهُ لَكُمْ؟» ''کیا آپ پسند کرتے ہیں کہ یہ مردار آپ کا ہو؟''

اصحاب النبی کہنے لگے: ''یہ زندہ بھی ہوتو اس میں عیب ہے کہ کان چھوٹے چھوٹے ہیں۔ اب تو یہ مردہ ہے۔ اس حالت میں تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «فَوَاللّٰهِ! الدُّنْيَا أَهْوَنُ عَلَى اللّٰهِ مِنْ هٰذَا عَلَيْكُمْ»

1 صحيح مسلم، حديث: 810، و سنن أبي داود، حديث: 1460، و مسند أحمد: 142/5.

2 مناهج و آداب الصحابة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 69.

''اللہ کی قسم ! یہ مردار آپ کے نزدیک جتنا بے وقعت ہے اُس سے کہیں زیادہ یہ دنیا اللہ کے نزدیک بے وقعت ہے۔''[1]

تعلیم و تربیت کے جدید اسالیب کا استعمال

رسول اللہ ﷺ تعلیمی و تربیتی جدید اسالیب بھی استعمال کرتے تھے۔ ان اسالیب و ذرائع کو طلبہ کی توجہ ایک نقطے پر مرکوز کرنے اور بات کو اُن کے ذہن میں بٹھانے کی خاطر استعمال میں لایا جاتا ہے۔ ان تعلیمی اسالیب کی تفصیل حسب ذیل ہے:

اشاروں کی زبان: رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کے باہمی تعلق کی نوعیت بیان کرتے ہوئے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو باہم دگر ملایا تھا۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«اَلْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهُ بَعْضًا»

''مومن آپس میں عمارت کی طرح ہیں جس کا ایک حصہ دوسرے کو مضبوط کرتا ہے۔'' یہ کہہ کر آپ ﷺ نے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو باہم دگر ملایا تھا۔''[2]

خاکہ اتارنا: رسول اللہ ﷺ مطالب کی تشریح کے لیے زمین پر خاکہ اتارتے اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو اُس کی جزئیات سے آگاہ فرماتے تھے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا: ''رسول اللہ ﷺ نے ہاتھ سے (زمین پر) ایک خط کھینچا اور فرمایا:

«هٰذَا سَبِيلُ اللّٰهِ مُسْتَقِيمًا» ''یہ اللہ کا راستہ ہے، سیدھا سیدھا۔''

پھر اُس خط کی دائیں اور بائیں جانب چند مزید خط کھینچے اور فرمایا:

«وَهٰذِهِ سُبُلٌ - قَالَ يَزِيدُ: مُتَفَرِّقَةٌ - عَلٰى كُلِّ سَبِيلٍ مِّنْهَا شَيْطَانٌ

[1] صحیح مسلم، حدیث: 2957. [2] صحیح البخاري، حدیث: 2446، و صحیح مسلم، حدیث: 2585.

يَدْعُو إِلَيْهِ»

’’اور یہ راستے (یزید نے کہا:) علیحدہ علیحدہ ہیں۔ ان میں سے ہر راستے پر ایک شیطان ہے جو اُس کی طرف بلا رہا ہے۔‘‘

پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت کی:

﴿وَأَنَّ هَٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَن سَبِيلِهِ ۚ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُم بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾

’’اور یقیناً یہ میرا راستہ ہے سیدھا، لہٰذا تم اسی کی پیروی کرو اور تم دوسرے راستوں کی پیروی مت کرو، وہ تمھیں اللہ کے راستے سے الگ کر دیں گے۔ اللہ نے تمھیں اس کی تاکید کی ہے تاکہ تم پرہیزگاری اختیار کرو۔‘‘ [1]

متعلقہ اشیاء کو ناظرین کے سامنے پیش کرنا: سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، اُنھوں نے بتایا: ’’اللہ کے نبی ﷺ نے تھوڑا ریشم لیا اور اپنے دائیں ہاتھ میں رکھا، تھوڑا سونا اٹھایا اور اسے اپنے بائیں ہاتھ میں رکھا، پھر فرمایا: «إِنَّ هٰذَيْنِ حَرَامٌ عَلٰى ذُكُورِ أُمَّتِي» ’’یہ دونوں اشیا میری امت کے مردوں پر حرام ہیں۔‘‘ اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ «حِلٌّ لِإِنَاثِهِمْ» ’’یہ چیزیں امت کی عورتوں کے لیے حلال ہیں۔‘‘ [2]

رسول اللہ ﷺ نے سونے اور ریشم کے بارے میں اپنے فرمان کے ساتھ ساتھ ان دونوں کی شکل وصورت کو بھی لوگوں کے سامنے واضح اور نمایاں کیا تاکہ بات بالکل واضح ہو جائے اور یاد رکھنے میں بھی مددگار ثابت ہو۔

عملی نمونہ پیش کرنا: حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، اُنھوں نے کہا: ’’میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ منبر پر کھڑے ہوئے، منہ قبلے کی طرف کیا اور

---

1 الأنعام 6:153. مسند أحمد: 1/435، و سنن الدارمي، حديث: 208، و مسند الطيالسي، حديث: 244، و صحيح ابن حبان، حديث: 6,7. 2 سنن أبي داود، حديث: 4057، والسنن الكبرٰى للنسائي: 8/160.

تکبیر کہی۔ لوگوں نے صفیں باندھ لیں۔ آپ ﷺ نے قراءت کی اور رکوع کیا۔ لوگوں نے بھی رکوع کیا۔ آپ ﷺ نے رکوع سے سر اٹھایا اور الٹے پاؤں زمین پر آ کر سجدہ کیا۔ سجدے کے بعد دوبارہ منبر پر تشریف لے گئے۔ قراءت کی۔ رکوع کیا۔ رکوع سے سر اٹھایا اور الٹے پاؤں زمین پر آ کر سجدہ کیا۔ آپ ﷺ جب نماز پڑھ چکے تو لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

«أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّمَا صَنَعْتُ هٰذَا لِتَأْتَمُّوا بِي وَ لِتَعَلَّمُوا صَلَاتِي»

''لوگو! میں نے یہ سب اِس لیے کیا کہ تم میری اقتدا کرو اور میری نماز اچھی طرح سیکھ لو۔''[1]

سخنِ نازک تر: سخنِ نازک تر کا استعمال دلوں کو ملاتا، اُنھیں حق کی طرف مائل کرتا اور سامعین کو اکساتا ہے کہ وہ بات یاد رکھیں۔ رسول اللہ ﷺ گفتگو کے آغاز میں تمہید کے طور پر نازک اور پاکیزہ وشستہ الفاظ استعمال میں لاتے تھے۔ بالخصوص جب کوئی ایسا معاملہ ہو جس کے ذکر سے حیا مانع ہو تو آپ ﷺ صاف، شگفتہ اور واضح الفاظ میں اُس کی تعلیم دیتے اور آغاز سے قبل تمہید کے طور پر کہتے کہ میں مومنین کے لیے والد کی طرح ہوں جو بچوں پر شفقت کرتے ہوئے اُنھیں تعلیم دیتا اور اُن کی غلطیوں کی اصلاح کرتا ہے۔[2]

چنانچہ ایک موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «إِنَّمَا أَنَا لَكُمْ بِمَنْزِلَةِ الْوَالِدِ أُعَلِّمُكُمْ، فَإِذَا أَتٰى أَحَدُكُمُ الْغَائِطَ فَلَا يَسْتَقْبِلِ الْقِبْلَةَ وَلَا يَسْتَدْبِرْهَا وَلَا يَسْتَطِبْ بِيَمِينِهِ» ''میں تو تمھارے لیے والد کے مقام پر ہوں۔ تمھیں تعلیم دیتا ہوں۔ تم میں سے کوئی قضائے حاجت کو آئے تو قبلہ رُو نہ بیٹھے، نہ قبلہ کی طرف پشت کرے اور نہ دائیں ہاتھ سے استنجا کرے۔''[3]

---

1 صحيح البخاري، حديث: 917. 2 مناهج و آداب الصحابة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 74.
3 سنن أبي داود، حديث: 8.

معلم اوّل ﷺ نے تعلیم و تربیت کے میدان میں تعلیمی اصول و قواعد کا پورا پورا خیال رکھا جو اخلاقی لحاظ سے بلند تر اور عقلی اعتبار سے جامع ترین مبادیات پر مشتمل تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی ہدایات صحابۂ کرام کے دلوں میں گھر کر گئیں اور اُنھوں نے اُن معروضات کی روشنی میں اپنی زندگیوں کو خوب خوب سنوارا۔[1]

تعلیمی و تربیتی مبادیات

ذیل میں اُن عظیم الشان مبادیات کو قدرے تفصیل سے پیش کیا گیا ہے جنھیں رسول اللہ ﷺ بروئے کار لائے:

اچھائی کرنے والے کی حوصلہ افزائی: رسول اللہ ﷺ میدان علم و عمل میں صحابۂ کرام کی خوب حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے اُنھیں مخاطب کر کے فرمایا:

«لَوْ رَأَيْتَنِي وَ أَنَا أَسْتَمِعُ لِقِرَائَتِكَ الْبَارِحَةَ! لَقَدْ أُوتِيتَ مِزْمَارًا مِّنْ مَّزَامِيرِ آلِ دَاوُدَ»

”کاش! آپ دیکھتے جب رات میں آپ کی قراءت سُن رہا تھا۔ (سبحان اللہ!) آپ کو تو آلِ داود کے سُروں میں سے ایک سُر دیا گیا ہے۔“[2]

غلطی کرنے والے پر شفقت: رسول اللہ ﷺ لوگوں کے حال احوال کی خبر رکھتے اور اُن سے معاملہ کرنے میں اس امر کا لحاظ کرتے تھے۔ آپ ﷺ کی عادت تھی کہ (کم علمی یا) جہالت کی وجہ سے کسی سے غلطی سرزد ہو جاتی تو اس کا عذر قبول کرتے اور غلطی کا ازالہ کرتے وقت نرمی اور شفقت سے کام لیتے تھے۔ آپ ﷺ کے اسی طرز عمل کی بدولت

---

1 مناهج و آداب الصحابة في التعليم و التعلم للدكتور عبدالرحمٰن البر، ص: 85. 2 صحيح البخاري، حديث: 5048، و صحيح مسلم، حديث: 793.

لوگوں کے دل آپ ﷺ کی محبت سے معمور رہتے اور وہ آپ کی ہدایات پر جہاں خود عمل کرتے وہاں دوسروں تک بھی پہنچاتے تھے۔ حاضرین محفل بھی ایسے واقعات خصوصیت سے یاد رکھتے تھے۔[1]

حضرت معاویہ بن حکم سُلمی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے: ''میں رسول اللہ ﷺ کی اقتدا میں نماز پڑھ رہا تھا، ایک آدمی کو چھینک آئی۔ میں نے یرحمك الله (اللہ تم پر رحم کرے) کہہ دیا۔لوگوں نے مجھے خشمگیں نگاہوں سے تاڑا۔ میں بولا: ''افسوس! میری ماں کا مجھے گم پانا تم لوگ میری طرف کیا دیکھتے ہو؟'' اب لوگ اپنے ہاتھ اپنی رانوں پر مارنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ وہ مجھے خاموش ہونے کو کہہ رہے ہیں تو میں چپ ہوگیا۔ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھ کر فارغ ہوئے۔ میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں! میں نے آپ سے قبل یا آپ کے بعد ایسا معلم نہیں دیکھا جو اتنے اچھے طریقے سے تعلیم دیتا ہو۔ واللہ! آپ ﷺ نے مجھے ڈانٹا نہ مارا اور نہ بُرا بھلا کہا۔ بس اتنا فرمایا:

«إِنَّ هٰذِهِ الصَّلَاةَ لَا يَصْلُحُ فِيهَا شَيْءٌ مِّنْ كَلَامِ النَّاسِ، إِنَّمَا هُوَ التَّسْبِيحُ وَالتَّكْبِيرُ وَ قِرَاءَةُ الْقُرْآنِ»

''نماز میں باتیں کرنا مناسب نہیں۔ یہ تو تسبیح و تکبیر اور تلاوتِ قرآن کا محل ہے۔''[2]

سبحان اللہ! رسول اللہ ﷺ کے حُسنِ تعلیم کے کیا ہی کہنے! معاویہ بن حکم رضی اللہ عنہ نے اس عمدہ برتاؤ کا جو مسرت انگیز تاثر لیا وہ آخر کیوں نہ لیا جاتا؟!

مذمت کے لیے نام لیے بغیر اشارے پر اکتفا: مذمت کا یہ انداز اپنانے سے بیچارے غلطی کرنے والے کے چہرے کی کچھ نہ کچھ آب باقی رہتی ہے اور انتباہ کا تقاضا بھی پورا ہو جاتا ہے۔

اس ضمن میں بہترین مثال حضرت عبداللہ بن لُتْبِیَّہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے

[1] مناهج و آداب الصحابة للدكتور عبد الرحمٰن البر، ص: 86. [2] صحيح مسلم، حديث: 537، و سنن أبي داود، حديث: 930، 931، و مسند أحمد: 447/5.

اُنھیں صدقات و زکاۃ کا عامل بنایا تو اُنھوں نے اہل زکاۃ کی طرف سے تحفے تحائف قبول کر لیے تھے، چنانچہ سیدنا ابو حُمید ساعدی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنوسلیم کی زکاۃ پر ایک آدمی کو عامل بنایا جسے ابن لُتْبِیَّہ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ وہ زکاۃ کی وصولی کر کے واپس آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس سے حساب مانگا۔ وہ بولا: ''یہ رہا آپ کا مال اور یہ تحائف ہیں۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خفا ہو کر فرمایا:

«فَهَلَّا جَلَسْتَ فِي بَيْتِ أَبِيكَ وَ أُمِّكَ حَتّٰى تَأْتِيَكَ هَدِيَّتُكَ إِنْ كُنْتَ صَادِقًا؟»

''تم واقعی ان تحفوں کے حق دار تھے تو اپنے ماں باپ کے گھر کیوں نہ بیٹھ رہے کہ یہ تحفے تمھیں وہاں پہنچ جاتے؟''

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے خطاب کیا اور حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

«أَمَّا بَعْدُ! فَإِنِّي أَسْتَعْمِلُ الرَّجُلَ مِنْكُمْ عَلَى الْعَمَلِ مِمَّا وَلَّانِيَ اللّٰهُ فَيَأْتِي فَيَقُولُ: هٰذَا مَالُكُمْ وَ هٰذَا هَدِيَّةٌ أُهْدِيَتْ لِي، أَفَلَا جَلَسَ فِي بَيْتِ أَبِيهِ وَ أُمِّهِ حَتّٰى تَأْتِيَهُ هَدِيَّتُهُ؟ وَاللّٰهِ! لَا يَأْخُذُ أَحَدٌ مِّنْكُمْ شَيْئًا بِغَيْرِ حَقِّهِ إِلَّا لَقِيَ اللّٰهَ يَحْمِلُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، فَلَأَعْرِفَنَّ أَحَدًا مِّنْكُمْ لَقِيَ اللّٰهَ يَحْمِلُ بَعِيرًا لَّهُ رُغَاءٌ، أَوْ بَقَرَةً لَّهَا خُوَارٌ، أَوْ شَاةً تَيْعَرُ»

''امابعد۔ اللہ نے مجھے جن امور کا ذمہ دار بنایا ہے اُن میں سے کوئی کام میں ایک آدمی کے سپرد کرتا ہوں۔ وہ کام نمٹا کر آتا اور کہتا ہے: ''یہ رہا آپ کا مال اور یہ تحائف ہیں جو مجھے پیش کیے گئے ہیں۔'' وہ اپنے ماں باپ کے گھر کیوں نہ بیٹھ رہا کہ یہ تحفے اُسے وہاں پہنچتے؟ واللہ! تم میں سے جو کوئی ایک چیز ناحق قبول کرے گا، وہ روز قیامت اُس شے کا بوجھ کندھوں پر اٹھائے اللہ کے روبرو آئے

گا۔ میں اُس شخص کو ضرور پہچان لوں گا جو ایک بلبلاتا اونٹ یا ڈکراتی گائے یا منمناتی بکری کندھوں پر اٹھائے اللہ کے دربار میں آئے گا۔'' یہ کہہ کر آپ ﷺ نے دونوں ہاتھ اس قدر بلند کیے کہ بغلوں کی سفیدی دکھائی دی۔ آپ ﷺ نے پکارا: «اَللّٰهُمَّ! هَلْ بَلَّغْتُ؟» ''اے اللہ! کیا میں نے (تیرا پیغام) پہنچا دیا؟'' (راوی کہتا ہے:) میری آنکھ نے دیکھا اور میرے کان نے سُنا۔''[1]

ضرورت پڑنے پر اظہار ناراضی: مثال کے طور پر صاحبِ حیثیت افراد ایسی غلطی کا ارتکاب کریں جس سے شریعت کے احکامات پر زد پڑتی ہو یا غلطی کا دائرۂ اثر وسیع ہو جائے اور وہ فتنے کی صورت اختیار کرنے لگے۔ ایسی صورتحال میں رسول اللہ ﷺ خفگی کا اظہار کیا کرتے تھے لیکن اس طرح کہ کسی فرد یا جماعت کے حق میں اسراف یا زیادتی کا عنصر شاملِ توبیخ نہ ہونے پائے۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے ہاں آئے۔ اُن کے ہاتھ میں تورات کی ایک تحریر تھی۔ آتے ہی کہنے لگے: ''اے اللہ کے رسول! یہ ایک تحریر ہے جو تورات سے ماخوذ ہے۔'' رسول اللہ ﷺ خاموش رہے اور کوئی جواب نہ دیا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ وہ تحریر پڑھنے لگے۔ رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ انور کے تاثرات بدلنے لگے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو ٹوکا: ''تجھے تیری ماں گم پائے! رسول اللہ ﷺ کا چہرہ نہیں دیکھتا؟'' عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ مبارک کی طرف دیکھا تو عرض کیا: ''میں اللہ اور اُس کے رسول کی ناراضی سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔ ہم اللہ کے رب ہونے، اسلام کے دین ہونے اور محمد ﷺ کے نبی ہونے پر راضی ہیں۔'' اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ! لَوْ بَدَا لَكُمْ مُّوسٰى فَاتَّبَعْتُمُوهُ وَتَرَكْتُمُونِي لَضَلَلْتُمْ عَنْ سَوَاءِ السَّبِيلِ، وَ لَوْ كَانَ حَيًّا وَّ أَدْرَكَ

[1] صحيح البخاري، حديث:6979، و صحيح مسلم، حديث:(27)-1832.

نُبُوَّتِي لَاتَّبَعَنِي»

''اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے! اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام تمھارے سامنے آ جائیں اور تم مجھے چھوڑ کر اُن کے پیچھے چل پڑو تو تم یقیناً سیدھے راستے سے بھٹک جاؤ گے۔ اور اگر وہ زندہ ہوتے اور میری نبوت کا زمانہ پا لیتے تو میری ہی پیروی کرتے۔''[1]

رسول اللہ ﷺ سے بعض ائمہ مساجد کے متعلق شکایت کی گئی کہ وہ لمبی لمبی نمازیں پڑھاتے ہیں اور نمازی نماز چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ آپ ﷺ کو اس بات کا سخت صدمہ ہوا۔

ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ ایک آدمی نے بارگاہِ رسالت میں آ کر شکایت کی: ''اے اللہ کے رسول! فلاں صاحب بہت لمبی نمازیں پڑھاتے ہیں۔ میرے لیے نماز باجماعت پڑھنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔''

ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو نصیحت کے وقت اس دن سے زیادہ غصے میں نہیں دیکھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَيُّهَا النَّاسُ، إِنَّكُمْ مُنَفِّرُونَ، فَمَنْ صَلّٰى بِالنَّاسِ فَلْيُخَفِّفْ، فَإِنَّ فِيهِمُ الْمَرِيضَ وَالضَّعِيفَ وَ ذَا الْحَاجَةِ»

''اے لوگو! تم متنفر کرتے ہو۔ جو شخص لوگوں کو نماز پڑھائے وہ ہلکی نماز پڑھائے کیونکہ نمازیوں میں بیمار، کمزور اور حاجت مند افراد بھی ہوتے ہیں۔''[2]

تقدیر کے متعلق صحابۂ کرام کی بحث و تکرار پر بھی رسول اللہ ﷺ ناراض ہوئے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ صحابۂ کرام کی محفل میں

---

1 سنن الدارمي: 126/1، وكنز العمال: 201/1. 2 صحيح البخاري، حديث: 90، و صحيح مسلم، حديث: 466.

تشریف لائے۔ وہاں تقدیر کے موضوع پر گرما گرم بحث ہو رہی تھی۔ آپ ﷺ کا چہرہ غصے سے یوں سرخ ہوگیا گویا اُس پر انار نچوڑا گیا ہو۔ دریافت فرمایا:

«بِهٰذَا أُمِرْتُمْ أَوْ لِهٰذَا خُلِقْتُمْ؟ تَضْرِبُونَ الْقُرْآنَ بَعْضَهُ بِبَعْضٍ، بِهٰذَا هَلَكَتِ الْأُمَمُ قَبْلَكُمْ»

''کیا تمھیں اس بات کا حکم دیا گیا ہے، کیا تمھیں اسی لیے پیدا کیا گیا ہے کہ تم قرآن کے بعض حصے کو بعض سے ٹکراتے ہو؟ تم سے پہلے والی امتیں اسی وجہ سے ہلاک ہوئی تھیں۔''[1]

رسول اللہ ﷺ نے اُس وقت بھی غصے کا اظہار فرمایا تھا جب بعض صحابۂ کرام نے نبی ﷺ کی حکم عدولی کرتے ہوئے اپنے آپ کو مشقت میں ڈالنے کی ٹھانی تھی اور گمان کیا تھا کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں افضل ہے اور اللہ کے نزدیک زیادہ مقرب ہے۔

ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے: ''رسول اللہ ﷺ لوگوں کو صرف اُن اعمال کا حکم دیتے تھے جنھیں وہ آسانی سے انجام دے سکیں۔ لوگوں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! ہمارے احوال تو آپ کے سے نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو آپ کے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف کردیے ہیں۔'' لوگوں کی یہ بات سن کر رسول اللہ ﷺ کو غصہ آیا۔ ناراضی کے آثار آپ کے چہرہ مبارک پر ظاہر ہوئے اور فرمایا: «إِنَّ أَتْقَاكُمْ وَ أَعْلَمَكُمْ بِاللّٰهِ أَنَا»

''تم سب سے زیادہ اللہ کو جاننے اور اُس سے ڈرنے والا میں ہی ہوں۔''[2]

ان مواقع پر رسول اللہ ﷺ کی ناراضی تربیتی عمل کا حصہ تھی۔ ناراضی کے اِس عمل میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے گویا یہ پیغام تھا کہ وہ آنکھیں کھلی رکھیں اور آئندہ ایسی غلطیوں کا ارتکاب نہ کریں۔ واعظ کے لیے ضروری ہے کہ غصہ اس کے چہرے سے عیاں ہو۔ وہ جس جگہ کھڑا ہے اُس کا تقاضا ہے کہ وہ بے چینی و بے قراری کا اظہار کرے۔ اُس

1 سنن ابن ماجه، حديث: 85. 2 صحيح البخاري، حديث: 20.

کی حیثیت قافلے کے پیش رو کی ہے جو اہل قافلہ کو راستے کی ممکنہ دشواریوں سے پیشگی آگاہ کرتا رہتا ہے۔ معلم کے لیے بھی یہی ہدایت ہے کہ طلبہ کے منفی اقدامات پر اُسے اظہار ناراضی کرنا چاہیے۔ غصے کی حالت میں کی گئی نصیحت کبھی کبھار بڑی موثر ثابت ہوتی ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ معلم اپنے ہر طالب علم سے یہی سلوک روا رکھے۔ اُسے طلبہ کے مختلف مزاج کے موافق مختلف برتاؤ کا انتخاب کرنا چاہیے۔[1]

خاص مطالب کی تعلیم کے لیے تازہ ترین صورتحال کو بنیاد بنانا: کوئی خاص واقعہ پیش آتا یا آنکھیں کسی خاص عمل کو دیکھتیں تو نبی ﷺ صحابۂ کرام کو اُس واقعے یا عمل کی نسبت سے کوئی خاص مطلب سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ اس طریقِ کار کا فائدہ یہ ہوتا کہ مطلب بہت اچھی طرح سمجھ میں آجاتا تھا۔ مثال کے طور پر عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: ''چند جنگی قیدی نبی ﷺ کی خدمت میں لائے گئے۔ اُن میں سے ایک عورت اپنے گم شدہ بیٹے کو تلاش کر رہی تھی۔ اس کی چھاتی دودھ سے بھری ہوئی تھی۔ وہ اِدھر اُدھر بے چین پھرتی تھی۔ قیدیوں میں جو بچہ نظر آتا اُسے سینے سے لگا کر دودھ پلانے لگتی۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام کو مخاطب کر کے دریافت کیا: «أَتُرَوْنَ هٰذِهِ طَارِحَةً وَّلَدَهَا فِي النَّارِ؟»

''کیا خیال ہے یہ عورت اپنے بچے کو آگ میں پھینک سکتی ہے؟''

ہم نے جواب دیا: ''نہیں، اگر اس کے بس میں ہو تو وہ کبھی بچے کو آگ میں نہیں پھینکے گی۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: «لَلّٰهُ أَرْحَمُ بِعِبَادِهِ مِنْ هٰذِهِ بِوَلَدِهَا» ''جس قدر یہ عورت اپنے بچے کے لیے رحمدل ہے، اللہ اُس سے کہیں بڑھ کر اپنے بندوں پر رحم فرمانے والا ہے۔''[2]

یوں رسول اللہ ﷺ نے پیش آمدہ صورتحال کو بنیاد بنا کر صحابۂ کرام کو رحمتِ الٰہی کی

---

1 فتح الباري: 187/1. 2 صحيح البخاري، حديث: 5999، و صحيح مسلم، حديث: 2754.

وسعت کا ایک گونہ تصور دے دیا۔[1]

سماعتِ حدیث کے سلسلے میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا طرزِ عمل

مکمل خاموشی اور حُسنِ سماعت: صحابۂ کرام کی نظر میں رسول اللہ ﷺ کی قدر ومنزلت اتنی تھی کہ وہ آپ ﷺ کی گفتگو کے دوران میں شور شرابا یا فضول گوئی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ آپ بات کر رہے ہوں اور وہ دھیان نہ دیں۔ صحابۂ کرام آپ کی محفل میں پورے ہوش وحواس کے ساتھ گوش بر آواز ہو کر بیٹھا کرتے تھے۔سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے سیرت طیبہ کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے بیان کیا کہ آپ ﷺ جب بات کرتے تو ہم نشیں یوں سر جھکائے خاموش رہتے گویا سروں پر پرندے بیٹھے ہیں۔آپ ﷺ خاموش ہوتے تب وہ بولتے۔''[2]

عبدالفتاح ابو غدہ نے اس روایت کے ذیل میں لکھا: ''اس محاورے کی حقیقت یہ ہے کہ کوا اونٹ کے سر پہ آکے بیٹھتا اور اس کی جوئیں اور چیچڑیاں چن لیتا ہے۔ اس دوران میں اونٹ حرکت نہیں کرتا کہ مبادا کوا مارے ڈر کے اُڑ جائے اور چیچڑیاں وہیں کی وہیں رہ جائیں اور اذیت کا باعث بنیں۔ اسی سے یہ محاورہ نکلا کہ فلاں تو یوں سر جھکائے خاموش ہے گویا سر پہ پرندے بیٹھے ہیں۔''[3]

قطع کلامی سے گریز: آدابِ محفل کا تقاضا ہے کہ قطع کلامی سے گریز کیا جائے۔ اس سے ایک تو حاضرین محفل پُرسکون رہتے ہیں اور دوسرا بات کا مطلب سمجھنے میں سہولت رہتی ہے۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے:''صحابۂ کرام محفل رسول میں قطع کلامی سے گریز کرتے۔ سب لوگ متکلم کی بات آخر تک نہایت توجہ اور خاموشی سے سنتے۔ بات اُسی کی ہوتی جو پہلے بات شروع کرتا۔''[4]

---

[1] الرسول المعلّم ﷺ لعبد الفتاح أبي غدة، ص: 160. [2] الشمائل للترمذي، حديث: 351.
[3] الرسول المعلم ﷺ لعبد الفتاح أبي غدة، ص: 30. [4] الشمائل للترمذي، حديث:351.

رفع اشکال کے لیے رسول اللہ ﷺ سے رجوع: صحابۂ کرام کو رسول اللہ ﷺ کی عظمت کا شدت سے احساس تھا۔ اُن کے قلوب پر آپ کی بارعب شخصیت کا پروقار اور گہرا اثر تھا۔ اس کے باوجود انھیں دین کے معاملے میں کوئی اشکال پیش آتا تو فوراً آپ ﷺ سے رجوع کرتے اور تشفی پاتے تھے۔ ام المومنین حفصہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ ایک دفعہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«إِنِّي لَأَرْجُو أَنْ لَّا يَدْخُلَ النَّارَ أَحَدٌ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ، مِمَّنْ شَهِدَ بَدْرًا وَّ الْحُدَيْبِيَةَ»

''مجھے قوی امید ہے کہ بدر اور حدیبیہ کے شرکاء میں سے کوئی بھی آگ میں نہیں جائے گا۔''

میں نے اشکال ظاہر کیا: ''اے اللہ کے رسول! کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا:

﴿وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا﴾

''اور تم میں سے جو بھی ہے وہ اس (جہنم) پر وارد ہونے والا ہے، یہ آپ کے رب کے ذمے حتمی (اور) طے شدہ بات ہے۔''[1]

آپ ﷺ نے جواب دیا: «أَلَمْ تَسْمَعِيهِ يَقُولُ: ﴿ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا﴾» ''تم نے یہ آیت نہیں سنی، فرمایا: ''پھر ہم متقی لوگوں کو نجات دیں گے اور ہم ظالموں کو اس میں گھٹنوں کے بل گرے ہوئے چھوڑ دیں گے۔''[2]

حضرت عبداللہ بن اُنیس رضی اللہ عنہ کی روایت بھی اس ضمن میں بطور مثال پیش کی جاسکتی ہے جسے حاصل کرنے کے لیے سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے لمبا سفر اختیار کیا تھا۔

ابن اُنیس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: «يَحْشُرُ اللّٰهُ الْعِبَادَ۔ أَوْ قَالَ: النَّاسَ۔ عُرَاةً غُرْلًا بُهْمًا» ''اللہ تعالیٰ لوگوں کو میدان حشر میں

1 مریم 71:19. 2 مریم 72:19. سنن ابن ماجه، حديث:4281، و مسند أحمد:285/6.

اکٹھا کرے گا۔ وہ عریاں، بے ختنہ اور خالی ہاتھ ہوں گے۔''

ہم نے کہا: ''«بُهْمًا» سے کیا مراد ہے؟'' فرمایا: «لَيْسَ مَعَهُمْ شَيْءٌ، ثُمَّ يُنَادِيهِمْ بِصَوْتٍ يَّسْمَعُهُ مَنْ بَعُدَ كَمَا يَسْمَعُهُ مَنْ قَرُبَ: أَنَا الْمَلِكُ، أَنَا الدَّيَّانُ، لَايَنْبَغِي لِأَحَدٍ مِّنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ أَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ، وَ لَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ مِّنْ أَهْلِ النَّارِ أَنْ يَّدْخُلَ النَّارَ وَ عِنْدَهُ مَظْلِمَةٌ، حَتّٰى أَقُصَّهُ مِنْهُ حَتَّى اللَّطْمَةُ» ''ان کے پاس کوئی چیز نہیں ہوگی۔ پھر اللہ تعالیٰ ان سے ایسی آواز سے مخاطب ہو گا جسے دور کھڑے لوگ بھی اُسی وضاحت سے سنیں گے جس طرح قریب کھڑے لوگوں کو وہ آواز صاف طور پر سنائی دے گی، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ''میں ہوں بادشاہ۔ بدلے چکانے والا زبردست حاکم۔ اہل جنت و اہل دوزخ کا کوئی فرد جس نے ظلم کیا ہو، خواہ ایک طمانچہ ہی مارا ہو، جنت و دوزخ میں نہیں جا سکتا، قبل اس سے کہ میں اُس سے قصاص دلوا دوں۔''

ہم نے پوچھا: ''ایسا کیسے ہوگا (قصاص میں کیا دیں گے) جبکہ ہم عریاں، بے ختنہ اور خالی ہاتھ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوں گے؟''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «بِالْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ» ''نیکیوں اور گناہوں کے ذریعے سے (بدلے چکائے جائیں گے)۔'' پھر رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت تلاوت کی:

﴿ اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ ۚ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ ﴾

''آج ہر نفس کو اس کا بدلہ دیا جائے گا جو اس نے کمایا۔ آج کوئی ظلم نہیں ہوگا، بلاشبہ اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔''[1]

احادیث کی دہرائی: صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نبی ﷺ سے کوئی بات (حدیث) سنتے یا علم حاصل

[1] المؤمن 40:17. الأدب المفرد للبخاري: 970، و مسند أحمد: 495/3، والمستدرك للحاكم: 438,437/2، و مجمع الزوائد: 133/1.

کرتے تو بیٹھ کر اُسے آپس میں دہراتے تھے تاکہ وہ اچھی طرح ذہن میں اتر جائے۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہوتے اور آپ سے حدیث سنتے، پھر جب خدمت نبوی سے واپس آتے تو حدیث کو آپس میں دہراتے تھے تاکہ خوب یاد ہو جائے۔''[1]

صحابۂ کرام کے حلقوں میں علم کی دہرائی اور مذاکرے کا اصول وفات نبوی کے بعد بھی جاری رہا۔ ابونضرہ منذر بن مالک بن قطعہ رحمۃ اللہ علیہ بتاتے ہیں کہ اصحابِ رسول کسی جگہ اکٹھے ہوتے تو علم کی باتیں ایک دوسرے کو سناتے اور قرآن کی سورتیں پڑھتے تھے۔[2]

حصولِ علم اور اشتیاقِ عمل کی غرض سے سوال کرنا: صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سوال حصول علم اور شوق عمل کی غرض سے ہوتے تھے۔ اُن میں فضولیت کا شائبہ تک نہیں ہوتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بے مقصد اور فضول سوالات کو ناپسند کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کثرتِ سوال سے بھی منع کیا تھا، چنانچہ سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کرنے کو ناپسند کیا اور اُس امر پر نکتہ چینی بھی کی۔''[3]

امام نووی رحمہ اللہ نے لکھا: ''سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کی روایت سے مراد یہ ہے کہ ایسے سوال کرنا مکروہ (ناپسندیدہ) ہیں جو غیر ضروری ہوں۔ خاص کر وہ سوالات جن کا مقصد ایک مسلمان کی پردہ دری اور بے عزتی یا فحاشی کا فروغ ہوتا ہے۔ علمائے کرام کا کہنا ہے: ''البتہ اگر سوال ایسے شرعی مسئلے کے متعلق ہے جو واقعی پیش آیا ہے اور اُس کا حل معلوم کرنا بھی ضروری ہے تو اہل علم سے دریافت کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔''[4]

بال کی کھال اتارنے اور متشابہ آیات کے متعلق سوال سے اجتناب: صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم

---

[1] الجامع لأخلاق الراوي وآداب السامع للخطيب البغدادي: 364,363/1. اس کی سند میں یزید رقاشی نامی ایک راوی ضعیف ہے۔ [2] الجامع لأخلاق الراوي وآداب السامع للخطيب البغدادي: 86/2، وأدب الإملاء والاستملاء للسمعاني، ص: 48. [3] صحيح البخاري، حديث: 5259، وصحيح مسلم، حديث: 1492. [4] شرح النووي على صحيح مسلم: 741/3، طبعة الشعب.

نے یہ اصول یوں اپنایا کہ نبی ﷺ نے ایسے لوگوں کی شدید مذمت کی تھی جو بال کی کھال اتارتے اور غیر ضروری مسائل کو تختۂ مشق بنائے رکھتے ہیں۔ آپ ﷺ نے ایسے لوگوں کی صحبت اختیار کرنے سے بھی منع فرمایا تھا۔ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا بتاتی ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت پڑھی:

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ؕ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا یَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ۝﴾

”وہی ہے جس نے آپ پر کتاب نازل کی جس میں کچھ آیات محکم (واضح) ہیں جو اس کتاب کی اصل بنیاد ہیں اور کچھ دوسری متشابہات (غیر واضح) ہیں، پھر جن لوگوں کے دل میں ٹیڑھ ہے وہ ان میں سے انھی آیتوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں جو متشابہ (غیر واضح) ہیں، ان کا مقصد محض فتنے اور تاویل کی تلاش ہوتا ہے، حالانکہ اللہ کے سوا کوئی بھی ان کی تاویل نہیں جانتا اور جو لوگ علم میں پختہ ہیں وہ کہتے ہیں: ہمارا ان (متشابہات) پر ایمان ہے، یہ سب ہمارے رب ہی کی طرف سے ہیں اور نصیحت تو عقل مند ہی حاصل کرتے ہیں۔“ [1]

پھر آپ ﷺ نے فرمایا: «فَإِذَا رَأَيْتِ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ، فَأُولٰئِكَ الَّذِينَ سَمَّى اللّٰهُ فَاحْذَرُوهُمْ!» ”چنانچہ جب تو ایسے لوگوں کو دیکھے جو متشابہ آیات کا پیچھا کرتے ہیں تو (سمجھ لے کہ) یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے مراد لیا ہے۔ سو اُن سے دامن بچالے۔“ [2]

---

1 آل عمرٰن 3:7. 2 صحيح البخاري، حديث: 4547، و صحيح مسلم، حديث: 2665.

جہاں شارع نے خاموشی اختیار کی وہاں سوال سے احتراز: صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے ادب کے اس قرینے کو بھی بخوبی اپنایا تھا۔ شارع نے جہاں خاموشی اختیار کی وہاں سے یہ پاکباز و مطیع افراد بھی سر جھکائے خاموشی سے گزر گئے اور چون و چرا سے پرہیز کیا کہ مبادا اُن کے سوال سے جو چیز حرام نہیں اُسے حرام قرار دے دیا جائے اور جو کام واجب نہیں وہ واجب ٹھہرے۔ یوں اُن کا سوال مسلمانوں کے لیے پریشانی اور مشقت کا باعث بنے۔ صحابۂ کرام اللہ تعالیٰ کے درج ذیل ارشاد پر پوری طرح کار بند تھے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ وَإِنْ تَسْأَلُوا عَنْهَا حِينَ يُنَزَّلُ الْقُرْآنُ تُبْدَ لَكُمْ عَفَا اللَّهُ عَنْهَا وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ۝ قَدْ سَأَلَهَا قَوْمٌ مِنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ أَصْبَحُوا بِهَا كَافِرِينَ ۝﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ایسی باتوں کے بارے میں سوال نہ کرو کہ اگر وہ تم پر ظاہر کردی جائیں تو تمھیں بری لگیں اور اگر تم ان کے متعلق سوال کرو گے جبکہ قرآن نازل کیا جا رہا ہو تو وہ تم پر ظاہر کردی جائیں گی، اللہ نے (تمھاری) اس حرکت کو معاف کردیا ہے اور اللہ بہت بخشنے والا، بہت حوصلے والا ہے۔ ان کے بارے میں تم سے پہلے بھی ایک قوم نے سوال کیا تھا، پھر ان (باتوں) کی وجہ سے وہ کافر ہو گئے۔''[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایسے سوال و جواب سے منع کیا تھا۔ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّ أَعْظَمَ الْمُسْلِمِينَ جُرْمًا مَّنْ سَأَلَ عَنْ شَيْءٍ لَّمْ يُحَرَّمْ فَحُرِّمَ مِنْ أَجْلِ مَسْأَلَتِهِ»

''مسلمانوں میں سب سے بڑا مجرم وہ ہے جس نے ایسی شے کے متعلق سوال کیا

[1] المآئدة 5:101، 102.

جو حرام نہیں تھی اور اُس کے سوال کی وجہ سے حرام قرار دے دی گئی۔“ [1]

فرصت کے لمحات سے استفادہ اور مناسب وقت کا لحاظ: صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سوالات کے لیے مناسب وقت کا لحاظ رکھتے تھے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے فرصت کے لمحات سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ یہ اہتمام اس لیے کرتے تھے کہ بے وقت کے سوالات رسول اللہ ﷺ کی پریشانی اور دقت کا باعث نہ بنیں۔

سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: ”نبی ﷺ فجر کی نماز پڑھا کر فارغ ہوتے تو ہم جا کر آپ ﷺ کے پاس بیٹھ جاتے۔ کوئی قرآن کے متعلق سوال پوچھتا تو کوئی فرائض (علم میراث) کے بارے میں استفسار کرتا اور کوئی خواب کی تعبیر دریافت کرتا تھا۔“ [2]

باصرار سوال کرنے سے پہلوتہی: صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو سوال کرنے سے منع کر دیا گیا تو اُنھوں نے اس امر کا اہتمام خاص طور پر کیا کہ باصرار سوال کرنے سے پہلوتہی کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سوال کرنے کے لیے اعرابیوں (بادیہ نشینوں) کو آگے کرتے اور اُن کے عقل مند اور باشعور افراد کی آمد کا انتظار کرتے رہتے تاکہ وہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کریں اور صحابۂ کرام آپ ﷺ کے جوابات سے استفادہ کریں۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ”ہمیں منع کر دیا گیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ سے کوئی سوال نہ کریں۔ ہمیں بہت اچھا لگتا تھا کہ اہل بادیہ (صحرانشینوں) کا کوئی عقل مند آدمی آئے اور ہماری موجودگی میں آپ سے سوال کرے، چنانچہ ایک روز ایک بادیہ نشیں آیا اور اُس نے سوال کیا: ”اے محمد (ﷺ)! تمھارا قاصد ہمارے ہاں آیا اور اُس نے بتایا کہ تمھارا دعویٰ ہے کہ اللہ نے تمھیں رسول بنا کر بھیجا ہے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: «صَدَقَ» ”اُس نے سچ کہا۔“ [3]

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 7289، و صحيح مسلم، حديث: 2358. [2] مجمع الزوائد: 159/1. [3] صحيح مسلم، حديث: 12، و جامع الترمذي، حديث: 619، و مسند أحمد: 143/3 و 193، و السنن الكبرىٰ للنسائي: 122,121/4.

یوں نئے مسلم معاشرے میں موثر عملی اقدامات کے ذریعے سے تربیتی تعمیر و ترقی کا عمل جاری رہا جس نے اس جدید معاشرے کے افراد میں فریضۂ تعلیم و تعلم کی انجام دہی اور اُس کے گہرے احساس کی روح پھونک دی تھی۔ ان ہدایات پر عمل درآمد نے مسلم فرد، امت اور اسلامی ریاست کی تیاری و تشکیل میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس مختصر جائزے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مسلم امہ میں علمی و تربیتی تعمیر و ترقی کا تسلسل نہایت ضروری ہے۔

باب 5

اصلاحات اور قانون سازی

اقتصادی بُحران کا حل

مسلمانوں کی ہجرت مدینہ کے نتیجے میں نو آموز اسلامی ریاست کی اقتصادی و معاشی ذمے داریوں میں اضافہ ہوا تھا۔ مسلمانوں کی اعلیٰ قیادت نے مختلف طریقوں سے اس بُحران کا حل نکالا۔ مہاجرین و انصار کے درمیان بھائی چارے (مواخات) کا قیام اور مسجدِ نبوی کے ایک گوشے میں فقراء مہاجرین کی رہائش کے لیے صفہ کی تعمیر انھی اقدامات کے سلسلے میں ہوئی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کے معاشی حالات کا بنظر غائر جائزہ لیا تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آئی کہ شہر کی معاشی باگ ڈور یہود کے ہاتھ میں ہے اور بازارِ مدینہ کی تجارت اور اُس کے مال و متاع پر بھی وہی قابض ہیں۔ اور وہ جب جی میں آئے قیمتیں گھٹاتے بڑھاتے رہتے ہیں، مزید برآں ذخیرہ اندوزی کرتے اور لوگوں کی ضروریات سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ صورتحال سنگین تھی۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ مسلمانانِ مدینہ الگ سے اپنا بازار قائم کریں، یہود کے بالمقابل خم ٹھونک کر میدانِ معیشت میں اتر آئیں اور تجارت کے سرچشموں سے اپنا قرار واقعی حصہ پائیں۔ یوں نمونے کا ایک ایسا بازار معرض وجود میں آئے جس میں اسلام کے معاشی اصول پوری طرح کارفرما ہوں اور وہ بازار اپنی اعلیٰ تجارتی اقدار کی بدولت عام معیشت میں نمایاں مقام حاصل کرے۔ بنا بریں رسول اللہ ﷺ نے مسجد نبوی کی مغربی جانب بازار کے لیے

جگہ کا انتخاب کیا اور اپنے پاؤں سے خط کھینچ کر اُس کی حدود کی نشاندہی کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «هٰذَا سُوقُكُمْ، فَلَا يُنْتَقَصَنَّ وَ لَا يُضْرَبَنَّ عَلَيْهِ خَرَاجٌ»

''یہ آپ لوگوں کا بازار ہے۔ اب (ناپ تول میں کمی کر کے) اس کا دائرہ کار محدود نہ کیا جائے اور نہ اس پر کوئی ٹیکس لگایا جائے۔''[1]

عہد نبوی میں اس بازار نے بہت ترقی کی۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے اپنی خصوصی توجہ کا مرکز ٹھہرایا۔ آپ تواتر سے بازار کا دورہ کرتے اور اشیائے خور ونوش کا جائزہ لیتے تھے۔ مدینہ کے اس منفرد بازار میں اسلام کی لازوال معاشی اصلاحات عمل میں لائی گئیں اور دور جاہلیت کے طریق ہائے تجارت کو جو غبن، دھوکا دہی اور فریب کاری پر مبنی تھے، اس بازار میں ان سب طریقوں پر پابندی تھی۔ بازار مدینہ نے آزاد تجارت کو فروغ دیا اور عوام کے تمام طبقوں کو خرید وفروخت کے یکساں مواقع فراہم کیے۔[2]

تجارت کے اسلامی احکام و آداب

رسول اللہ ﷺ نے بازاروں میں تجارت اور خرید و فروخت کے متعلق جو آداب و اصول مقرر کیے، اُن کی تفصیل ذیل میں پیش کی جاتی ہے:

❁ جو شخص بازار جائے اُسے چاہیے کہ اللہ کا ذکر کرے اور اُس کے حضور حمد وثنا کا نذرانہ پیش کرے۔ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ دَخَلَ السُّوقَ فَقَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَحْدَهُ، لَا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ، وَلَهُ الْحَمْدُ، يُحْيِي وَيُمِيتُ، وَهُوَ حَيٌّ لَّا يَمُوتُ، بِيَدِهِ الْخَيْرُ، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ كَتَبَ اللّٰهُ لَهُ أَلْفَ أَلْفِ حَسَنَةٍ

[1] سنن ابن ماجه، حديث: 2233، حدیث ضعیف ہے۔ [2] أحكام السوق في الإسلام لأحمد الدرويش، ص:36,35.

وَّ مَحَا عَنْهُ أَلْفَ أَلْفِ سَيِّئَةٍ وَّ رَفَعَ لَهُ أَلْفَ أَلْفِ دَرَجَةٍ وَّ بَنٰى لَهُ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ»

''جو آدمی بازار میں داخل ہوتے ہوئے یہ الفاظ کہتا ہے: ''اللہ کے سوا کوئی معبود (برحق) نہیں۔ وہ یکتا ہے۔ اُس کا کوئی شریک نہیں۔ اُسی کی بادشاہت ہے۔ اور اُسی کی حمد ہے۔ وہ زندہ کرتا اور مارتا ہے جبکہ وہ خود زندہ ہے، نہیں مرے گا۔ ساری خیر اُسی کے ہاتھ ہے۔ اور وہ ہر شے پر بخوبی قادر ہے۔'' اللہ اُس کی دس لاکھ نیکیاں لکھتا ہے، دس لاکھ گناہ مٹا دیتا ہے، دس لاکھ درجے بلند کرتا ہے اور جنت میں اُس کے نام کا ایک گھر بنا دیتا ہے۔''[1]

بازار میں خاص طور سے اللہ کے ذکر کی ترغیب دی گئی ہے کہ بازار غفلت کی جگہ ہے۔ وہاں لوگ تجارت اور لین دین میں مشغول ہوتے ہیں۔ شیطان اور اُس کے سپاہی بازاروں میں بے حد سرگرم ہوتے ہیں اور بنی آدم کو اپنے جال میں پھانسنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں اور اکثر کامیاب رہتے ہیں۔ یہاں اللہ کے ذکر سے شیطان اور اُس کی فوج کو شکست دینے میں مدد ملتی ہے کہ شیطان اللہ کے ذکر سے بھاگتا ہے۔ بازار میں ذکرِ الٰہی کا ثواب بھی اسی لیے زیادہ رکھا گیا ہے کہ وہاں اس پر کاربند رہنا مشکل ہے اور جو آدمی بازار میں بھی اللہ کو نہ بھولے اُسے تو یہ ثواب ملنا ہی چاہیے۔[2]

❁ بازاروں میں لین دین کرتے وقت شور شرابے اور بیہودہ گوئی کو ناپسند کیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ نمایاں وصف (تورات میں یوں) بیان کیا گیا ہے: ''آپ اکھڑ نہیں، نہ تندخو ہیں اور نہ بازاروں میں شور مچانے والے ہیں۔ برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے بلکہ درگزر سے کام لیتے اور معاف کردیتے ہیں۔''[3]

---

[1] جامع الترمذي، حديث: 3428، و سنن ابن ماجه، حديث: 2235، والمستدرك للحاكم: 538/1. [2] تحفة الأحوذي شرح جامع الترمذي: 386/9. [3] صحيح البخاري، حديث: 2125.

شور و غوغا یوں بھی مذموم ہے اور بازاروں میں غل اٹھانا تو اور ہی ناپسندیدہ ہے۔[1]

❁ بازاروں کی صفائی ستھرائی کا خیال رکھنا ضروری ہے اور وہاں گندڈالنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔اس سے ایک تو چلنے پھرنے میں زحمت نہیں ہوگی، دوسرا اذیت ناک بدبو سے بچت رہے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے عام راستوں اور بازاروں کو خاص طور سے صاف ستھرا رکھنے کی تاکید کی ہے، چنانچہ فرمایا: «اِتَّقُوا اللَّعَّانَيْنِ» ''لعنت کے دو کاموں سے بچو۔'' لوگوں نے پوچھا: ''اے اللہ کے رسول! لعنت کے دو کام کون سے ہیں؟

آپ ﷺ نے جواب دیا: «اَلَّذِي يَتَخَلّٰى فِي طَرِيقِ النَّاسِ، أَوْ فِي ظِلِّهِمْ» ''لوگوں کے راستے میں یا سایے میں (بیٹھنے کی جگہ) پاخانہ پھرنا اور گندڈالنا۔''[2]

❁ بازاروں میں اسلحہ لے جانے یا اُس کی نمائش سے احتراز برتنا چاہیے۔ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں سے مخاطب ہوکر فرمایا: «إِذَا مَرَّ أَحَدُكُمْ فِي مَسْجِدِنَا أَوْ فِي سُوقِنَا وَ مَعَهُ نَبْلٌ فَلْيُمْسِكْ عَلٰى نِصَالِهَا۔ أَوْ قَالَ: فَلْيَقْبِضْ بِكَفِّهِ۔ أَنْ يُّصِيبَ أَحَدًا مِّنَ الْمُسْلِمِينَ مِنْهَا بِشَيْءٍ» ''آپ میں سے کوئی تیر اٹھائے ہوئے ہماری مسجد یا ہمارے بازار سے گزرے تو وہ تیروں کے پھل ہاتھ میں رکھے۔ ایسا نہ ہو کہ تیر کسی مسلمان کی تکلیف کا باعث بنیں۔''[3]

آج کل کے جدید اسلحے کے حوالے سے اسی حدیث پر قیاس کرنا چاہیے کہ اس جدید ترین اسلحے سے بے احتیاطی میں کی گئی معمولی چھیڑ چھاڑ بھی بڑے اور یقینی نقصان کا باعث بن سکتی ہے۔[4]

❁ لین دین کے دوران میں طے پانے والے معاہدوں کو ہر صورت پورا کرنا چاہیے۔ یہ لازمی امر ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

---

1 أحكام السوق في الإسلام لأحمد الدرويش، ص:41. 2 صحيح مسلم، حديث: 269، و سنن أبي داود، حديث: 25. 3 صحيح البخاري ، حديث: 7075، و صحيح مسلم، حديث: 2615. 4 أحكام السوق في الإسلام لأحمد الدرويش، ص:44.

﴿وَأَوْفُوا بِعَهْدِ اللَّهِ إِذَا عَاهَدتُّمْ وَلَا تَنقُضُوا الْأَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللَّهَ عَلَيْكُمْ كَفِيلًا ۚ إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ ۝﴾

''اور اللہ کا عہد پورا کرو جب تم آپس میں عہد کر لو اور قسمیں پکی کرنے کے بعد نہ توڑو جبکہ تم نے اللہ کو اپنا کفیل بنایا ہو۔ بے شک اللہ جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔''[1]

❁ خرید و فروخت کے معاملات میں رواداری برتنی اور آسانی پیدا کرنی چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «رَحِمَ اللّٰهُ عَبْدًا سَمْحًا إِذَا بَاعَ، سَمْحًا إِذَا اشْتَرٰى، سَمْحًا إِذَا اقْتَضٰى» ''اللہ اُس بندے پر رحم فرمائے جو خرید و فروخت میں اور (قرض وغیرہ کی واپسی کا) تقاضا کرنے میں وسعتِ قلبی اور نرمی کا مظاہرہ کرے۔''[2]

❁ لگی لپٹی رکھے بغیر صاف اور سیدھی بات کرنا معاملاتِ تجارت کا اہم ترین اصول ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایسے تاجر کی تعریف کی ہے جو بات کا پکا، قول کا سچا اور لین دین میں امانت دار ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «اَلتَّاجِرُ الصَّدُوقُ الْأَمِينُ مَعَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ» ''سچا اور ایمان دار تاجر انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔''[3] اور ابن ماجہ میں: «يَوْمَ الْقِيَامَةِ» ''قیامت کے دن'' کے الفاظ بھی ہیں۔[4]

❁ جھوٹی قسموں سے دور رہنا بھی لازم ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«اَلْحَلِفُ مَنْفَقَةٌ لِّلسِّلْعَةِ، مَمْحَقَةٌ لِّلرِّبْحِ»

''قسم کھانے سے سامان تو جلد بک جاتا ہے لیکن منافع سے برکت اُڑ جاتی ہے۔''[5]

ایک موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «إِيَّاكُمْ وَ كَثْرَةَ الْحَلِفِ فِي الْبَيْعِ فَإِنَّهُ يُنَفِّقُ ثُمَّ يَمْحَقُ» ''لین دین کے معاملات میں بکثرت قسم کھانے سے پرہیز کریں۔ یہ

[1] النّحل 91:16. [2] صحيح البخاري، حديث: 2076، و جامع الترمذي، حديث: 1320، و سنن ابن ماجه، حديث: 2203. [3] جامع الترمذي، حديث: 1209. [4] سنن ابن ماجه، حديث: 2139. [5] صحيح البخاري، حديث: 2087، و صحيح مسلم، حديث: 1606.

بکری ضرور بڑھاتی ہے لیکن برکت اڑا دیتی ہے۔''[1]

قسم کھانے والا اپنا سامان تو بیچ لیتا ہے مگر وہ برکت سے خالی ہوتا ہے اور یہ مالک چوری چکاری، بیماری، جلاؤ گھیراؤ، غرق اور غصب جیسے عوارض کی وجہ سے تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔[2]

یہ تجارت اور خرید و فروخت کے آداب و اصول ہیں جن کی وجہ سے اسلامی بازار ترقی پذیر ہوا اور یہودیوں کا بازار مندا پڑ گیا۔ اسی وجہ سے مسلمانوں نے مدینہ میں اقتصادی ترقی حاصل کی اور معاشی باگ ڈور سنبھال کر یہودیوں کو ان کی ممتاز خوبی میں مات دے دی۔[3]

اسلامی ریاست کی وسعت اور نزولِ شریعت نے علم اقتصادیات کو بتدریج ترقی دے کر ایک مستقل علم بنا دیا جو اپنے اصول و قواعد اور فقہ و مبادیات کا حامل ہے۔ اسی کی طرف سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول اشارہ کرتا ہے: «لَا يَبِيْعُ فِي سُوقِنَا إِلَّا مَنْ تَفَقَّهَ فِي الدِّينِ» ''ہمارے بازاروں میں صرف وہی تجارت کرے جو دین (خصوصاً اصول اقتصادیات) کی سمجھ رکھتا ہو۔''[4]

لوگوں کے مال اور تجارت کے پیش نظر اسلام نے بازاروں کو حد درجہ اہمیت دی ہے کیونکہ یہ لوگوں کے کاروباری معاملات اور لین دین کی جگہ ہے۔ ہر فرد یہاں سے اپنی تمام ضروریات کی چیزیں حاصل کرتا ہے، اس لیے بازاروں کو اہمیت بھی دی گئی اور انھیں نبوی منہج پر چلایا بھی گیا۔[5]

قرآن کریم نے ایک خطرناک اجتماعی اور اقتصادی آفت ''ناپ تول میں کمی'' کا تذکرہ بھی کیا ہے جو لوگوں کے دین و دنیا دونوں پر گہرے اثرات چھوڑتی ہے۔ یہ کام ایسے دستور اور منہج کی سراسر مخالفت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

---

[1] صحيح مسلم، حديث: 1607. [2] شرح السيوطي على سنن النسائي: 246/7. [3] الهجرة النبوية لأبي فارس، ص: 70. [4] أحكام السوق في الإسلام لأحمد الدرويش، ص: 53.
[5] أحكام السوق في الإسلام لأحمد الدرويش، ص: 586,585.

﴿اَللّٰهُ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِیْزَانَ ؕ وَمَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِیْبٌ ۝﴾

''اللہ ہی ہے جس نے حق کے ساتھ کتاب اور ترازو نازل کی اور آپ کو کیا معلوم شاید قیامت قریب ہی ہو۔'' [1]

میزان سے مراد عدل ہے۔ [2]

موازین اور مکیال سے مراد ایسے آلات ہیں جن سے ناپ تول اور وزن کیا جاتا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان پیمانوں کو پورا کرنے کا حکم دیا اور کمی کوتاہی سے منع فرمایا ہے:

﴿وَ اَوْفُوا الْكَیْلَ وَالْمِیْزَانَ بِالْقِسْطِ﴾

''اور تم ناپ اور تول کو انصاف کے ساتھ پورا دو۔'' [3]

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿وَاَوْفُوا الْكَیْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِیْمِ ؕ ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا ۝﴾

''اور جب ماپ کر دو تو تم ماپ پورا کرو اور سیدھی ترازو سے تولو، یہ بہترین اور انجام کار کے لحاظ سے بہت اچھا ہے۔'' [4]

کم تولنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے یوں وعید سنائی:

﴿وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ ۝ الَّذِیْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ ۝ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ یُخْسِرُوْنَ ۝ اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝ لِیَوْمٍ عَظِیْمٍ ۝﴾

''ڈنڈی مارنے والوں کے لیے تباہی ہے، وہ کہ جب وہ لوگوں سے ناپ کر لیں تو پورا لیتے ہیں اور جب وہ انھیں ناپ کر یا تول کر دیں تو کم دیتے ہیں، کیا یہ لوگ

[1] الشوریٰ 17:42. [2] زاد المسیر لابن الجوزي: 77/7. [3] الأنعام 152:6. [4] بني إسرآء یل 35:17.

یقین نہیں رکھتے کہ بے شک وہ (قبروں سے) اٹھائے جائیں گے، ایک عظیم دن کے لیے۔''[1]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضرت شعیب علیہ السلام کے قصے سے یقین کر لیا کہ ناپ تول میں کمی کوتاہی، منہج الٰہی کو چھوڑنے اور امر ربانی کی مخالفت، رب جبار کی ناراضی اور دنیا و آخرت میں اس کے عذاب کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ ناپ تول کی کمی سے آسانی کی جگہ تنگی اور ارزانی کی جگہ مہنگائی لے لیتی ہے جس سے معیشت پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں، اسی لیے مدینہ منورہ میں اس کی کھل کر مخالفت کی گئی۔[2]

ناپ تول کی کمی قوم شعیب کی ہلاکت کے اسباب میں ایک بڑا سبب تھا۔ ان کی ہلاکت کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿كَأَن لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا ۗ أَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُودُ ۝﴾

''جیسے وہ ان (گھروں) میں کبھی بسے ہی نہ تھے۔ سنو! پھٹکار ہے (اہل) مدین پر جیسے ثمود پر پھٹکار پڑی۔''[3]

قوم شعیب کی تباہی کا تذکرہ دراصل صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تربیت کے لیے تھا، اس لیے انھوں نے یہ بات اچھی طرح سمجھ لی کہ منہج ربانی کی مخالفت کا نتیجہ تباہی و بربادی ہے اور دین زندگی کے ہر گوشے کا حصہ بننا ضروری ہے۔ منہج ربانی نے اقتصادی مشکلات کا علاج قرآنی قصوں کے ذریعے کیا تاکہ لوگ گئی گزری اقوام کے حالات سے عبرت اور ان کے انجام کار سے سبق حاصل کریں اور ان قصوں میں ان شرعی اور تعبدی پہلوؤں کو بھی مدنظر رکھا گیا جو امت کی تربیت و تنظیم میں کارفرما ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس امت کی ہر حال میں نگہبانی فرمائی اور اسے امانت کا بوجھ اٹھانے اور پیغامِ رسالت دنیا تک پہنچانے کے قابل بنانے کے لیے قدم بقدم ترقی پذیر فرمایا۔

[1] المطففين 83:1-5. [2] أسباب هلاك الأمم السّالفة لسعيد محمد، ص:446. [3] هود 11:95.

اسلامی ریاست کے لیے چھوٹے اور بڑے امور میں کوئی فرق نہیں ہوتا کیونکہ یہ تمام امور اس کی ترقی کے ضامن ہوتے ہیں، اسے بلندیوں پر فائز کرتے ہیں اور آنے والے زمانے میں پیش آمدہ چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے معاون ثابت ہوتے ہیں۔ قرب الٰہی کی تلاش کے لیے ہجرت کے بعد پہلے دو سالوں میں زکاۃ، صدقات اور روزے جیسے احکامات نازل ہوئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ اوامر اسلامی معاشرے میں لوگوں کی حقیقت حال کی رعایت رکھتے ہوئے، بغیر جلدی وسختی کے اپنے اپنے وقت پر آہستہ آہستہ منتقل کیے گئے۔ [1]

2 ہجری میں بعض احکام کی مشروعیت وفرضیت

روزوں کی فرضیت

شعبان 2 ھ کو سابقہ امتوں کی طرح امت محمدیہ پر بھی روزے فرض قرار دیے گئے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝﴾

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم پر روزہ رکھنا اسی طرح فرض کیا گیا ہے جس طرح ان لوگوں پر فرض کیا گیا تھا جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم متقی بن جاؤ۔“ [2]

روزوں کی فرضیت کے موقع پر سابقہ امتوں کے ذکر سے روزوں کی اہمیت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ماہ رمضان کی فضیلت اجاگر فرمائی، چونکہ رمضان نزول قرآن کا مہینہ ہے، اس لیے اسے تمام مہینوں میں سے امتیازی حیثیت عطا فرمائی، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِنَ

---

[1] دراسات في عهد النبوة للدكتور عبدالرحمٰن الشجاع، ص: 166-168. [2] البقرة 2:183.

الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۗ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝﴾

''رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسانوں کے لیے ہدایت ہے اور اس میں ہدایت کی واضح اور حق کو باطل سے جدا کرنے والی دلیلیں ہیں، پھر تم میں سے جو شخص اس مہینے کو پائے تو اسے چاہیے کہ اس کے روزے رکھے اور جو شخص بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے۔ اللہ تمھارے لیے آسانی چاہتا ہے اور وہ تمھارے لیے تنگی نہیں چاہتا اور تاکہ تم گنتی پوری کرو اور اس پر اللہ کی بڑائی بیان کرو کہ اس نے تمھیں ہدایت دی اور تاکہ تم شکر کرو۔''[1]

مخلص روزے دار کو بطور انعام تقویٰ حاصل ہوگا۔ اس کا تذکرہ حسب ذیل آیت میں ہے:

﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝﴾

''تاکہ تم متقی بن جاؤ۔''[2]

روزہ اور تزکیۂ نفس

روزے سے مسلمان بہت کچھ سیکھتا ہے۔ روزہ پاکیزگی اور بالیدگی کی عملی مشق ہے جس کے ذریعے سے لوگ روحانی بیماریوں سے چھٹکارا حاصل کرتے، اپنے آپ کو خوبیوں سے آراستہ کرتے اور تقویٰ و اصلاحِ نفس کے بلند درجات پر فائز ہوتے ہیں۔[3]

مسلم معاشرے کی تربیت اور تزکیۂ نفس میں رمضان المبارک کے اثرات واضح ہیں، بنا بریں شارع علیہ السلام نے نفلی طور پر بھی مختلف دنوں اور تاریخوں میں روزہ رکھنے اور اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب حاصل کرنے کی ترغیب دلائی ہے اور روزے کی برکت حاصل کرنے کے لیے

[1] البقرة 2:185. [2] البقرة 2:183. [3] السيرة النبوية لأبي شهبة: 106/2، ومنهج الإسلام في تزكية النفس للدكتور أنس أحمد كرزون: 252,251/1.

سارا سال یہ مشق جاری رکھی جاسکتی ہے تا کہ جیسے ہی کوئی مسلمان اپنی نفسانی خواہشات کو کنٹرول اور دل کی سختی کو دور کرنے کی ضرورت محسوس کرے تو اللہ تعالیٰ سے اجر وثواب کے حصول کے لیے روزہ رکھ سکتا ہے۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ صَامَ يَوْمًا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ بَعَّدَ اللّٰهُ وَجْهَهُ عَنِ النَّارِ سَبْعِينَ خَرِيفًا»

''جس آدمی نے اللہ کی راہ میں ایک دن روزہ رکھا اللہ تعالیٰ اس کے چہرے کو جہنم کی آگ سے ستر سال کی مسافت کے بقدر دور فرما دیں گے۔''[1]

فطرانہ کی فرضیت

رمضان المبارک 2 ھ میں اللہ تعالیٰ نے صدقہ (فطرانہ) فرض فرمایا۔ یہ مسلمانوں میں سے ہر آزاد، غلام، مرد، عورت، چھوٹے اور بڑے پر فرض قرار دیا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اس کی حکمت بیان فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ فطر روزہ دار کو کوتاہیوں سے پاک کرنے اور غریبوں اور مسکینوں کے لیے رزق کی فراہمی کی غرض سے فرض قرار دیا ہے۔ جس شخص نے اسے نماز عید سے پہلے ادا کیا وہ صدقہ فرض اور جس نے بعد میں ادا کیا وہ عام نفلی صدقہ کہلائے گا۔[2]

فطرانہ کے فوائد: اس حدیث میں صدقہ فطر کی فرضیت کی حکمت میں دو باتیں بیان کی گئی ہیں:[3]

- **کوتاہیوں سے پاکیزگی:** اس پہلی بات کا تعلق رمضان سے ہے۔ انسان فطرتاً غلطی، کوتاہی اور بے فائدہ یا نقصان دہ گفتگو وغیرہ کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔ یہ وہ برائیاں ہیں

[1] صحيح البخاري، حديث: 2840، و صحيح مسلم، حديث: 1153. [2] سنن أبي داود، حديث: 1609، و سنن ابن ماجه، حديث: 1827. [3] منهج الإسلام في تزكية النفس للدكتور أنس أحمد كرزون، ص: 269,268.

جن سے عام طور پر کوئی بھی انسان بچ نہیں سکتا تو رمضان کے اختتام پر روزے دار کو ان آلائشوں سے پاک کرنے کے لیے اس پر فطرانہ فرض کر دیا گیا۔

❁ **مساکین کے لیے فراہمی رزق:** اس دوسری بات کا تعلق رمضان کے بعد آنے والی عید، عید الفطر کے ساتھ ہے۔ اس دن محتاجوں کے لیے رزق کی فراہمی سے اس دن کی خوشیاں تمام افرادِ امت تک پہنچ جاتی ہیں اور سارا مسلم معاشرہ خوش اور مسرور نظر آتا ہے۔ شریعتِ اسلامیہ نے اس مبارک دن میں کسی محتاج کو سوال اور کسی سے عطیہ مانگنے کی عار سے بچنے کے لیے ہر ایک مسلمان پر صدقہ فطر واجب کر دیا۔ اور یہ فقراء اور مساکین کے علاوہ کسی کا حق نہیں ہے۔ گزشتہ حدیث میں بھی اسی طرف اشارہ ہے کہ یہ «طُعْمَةً لِّلْمَسَاكِينِ» ''مساکین کے لیے بطور خوراک ہے۔''

نبی ﷺ نے صدقہ فطر کی مقدار زیادہ مقرر نہیں فرمائی مبادا لوگ ادا کرنے سے قاصر رہ جائیں بلکہ مقدار اتنی کم رکھی کہ ہر فرد سہولت سے اسے ادا کر سکے۔ اور یہ صدقہ فطر علاقے کی عام استعمال ہونے والی خوراک سے دینا مشروع ہے۔

بظاہر معمولی نظر آنے والی اس خوراک سے فقراء کم از کم عید کا دن تو بے فکری سے گزار سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ دین کتنا عظیم ہے۔[1]

صدقہ فطر کی دیگر تفصیلات کتب احادیث اور کتب فقہ میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

نماز عید کی مشروعیت

اسی سال 2 ھ میں رسول اللہ ﷺ نے نماز عید ادا فرمائی۔ یہ وہ پہلی نماز عید تھی جسے نبی علیہ السلام نے اپنے صحابہ کے ہمراہ اللہ تعالیٰ کی مسلسل نازل ہونے والی نعمتوں پر شکرانے کے طور پر ادا فرمایا۔ آپ ﷺ تکبیر و تہلیل اور اللہ کی عظمت بیان کرتے ہوئے عید گاہ کی

1 المال في القرآن الكريم لسليمان الحصين، ص: 334.

طرف تشریف لے گئے۔

عید اہل اسلام کا ایسا تہوار ہے جس میں خیر و برکت، اتحاد و یگانگت، نرم دلی اور محبت جیسے جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نماز عید سے فارغ ہو کر خطبہ عید ارشاد فرماتے اور مواعظ حسنہ سے نوازتے، اللہ کے عذاب سے ڈراتے، نیکی کی رغبت اور گناہ سے بچنے کا درس دیتے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دیتے۔ بعدازاں مرد، عورتیں، چھوٹے اور بڑے سب بڑھ چڑھ کر اللہ کے راستے میں خرچ کرتے تھے حتیٰ کہ عورتیں اپنے زیورات اتار کر اللہ کی راہ میں دے دیتیں۔[1]

زکاۃ کی فرضیت

2 ھ ہی میں اہل اسلام پر زکاۃ فرض ہوئی۔ زکاۃ کو اسلام کا اہم رکن قرار دیا گیا۔ زکاۃ رمضان 2 ھ کے بعد فرض ہوئی کیونکہ اس امر پر اتفاق ہے کہ زکاۃ صدقہ فطر کے بعد فرض ہوئی اور صدقۂ فطر صیام رمضان کے بعد اور عید الفطر سے پہلے فرض ہوا تھا۔ جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے۔ امام ابن خزیمہ، نسائی، ابن ماجہ اور حاکم کی حضرت قیس بن سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے مروی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے زکاۃ کا حکم نازل ہونے سے پہلے ہمیں صدقہ فطر کا حکم دیا جبکہ زکاۃ کا حکم بعد میں نازل ہوا۔ بعد ازاں آپ ﷺ نے صدقہ فطر کے بارے میں نہ ہمیں حکم دیا اور نہ ہی منع کیا لیکن ہم مسلسل یہ صدقہ ادا کرتے رہے۔[2]

جمہور علمائے کرام متقدمین ہوں یا متاخرین اس بات پر متفق ہیں کہ زکاۃ مدینہ طیبہ میں 2 ھ کو فرض ہوئی۔[3]

---

[1] صحیح مسلم، حدیث: 885، والسیرة النبویة لأبي شهبة: 2/109. [2] صحیح سنن النسائي، حدیث: 2506، و صحیح ابن خزیمه، حدیث: 2394، والمستدرك للحاكم: 1/568، و سنن ابن ماجه حدیث: 1828. [3] السیرة النبویة لأبي شهبة: 2/111.

مکی دور میں انفاق: مکی دور میں اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کا حکم ہر قسم کی قید سے آزاد تھا۔ وہاں یہ حکم مسلمانوں کی ایمانی قوت، ان کی دلی خوشی اور اس میں رشتہ اخوت کو سامنے رکھ کر تھا جس میں تھوڑا مال خرچ کرنا بھی کفایت کر جاتا، کبھی ضرورت کے تحت اس سے زیادہ، بسا اوقات بہت زیادہ بھی خرچ کرنا پڑتا تھا۔[1]

مکی آیات میں زیادہ تر اصلاحی اور تربیت پر مشتمل احکامات پائے جاتے ہیں جن میں مختلف اسالیب میں فقراء و مساکین کی نگہداشت کا حکم بھی ہے۔ سورہ مدثر، جو قرآن کریم کی ابتدائی نازل ہونے والی سورت ہے، اس میں مساکین کو کھانا کھلانا ایمان کا جز قرار دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اس سورت میں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے دائیں طرف کھڑے ہونے والے اہل ایمان کی منظر کشی بھی کی گئی ہے۔ اہل ایمان جنت کے باغوں میں ہوں گے اور عذاب میں گرفتار کافروں کے بارے میں سوال کریں گے کہ انھیں عذاب دیے جانے کا سبب کیا ہے۔ انھیں جواب ملے گا کہ وہ مسکینوں کے حق کا خیال رکھتے تھے نہ انھیں بھوک میں مبتلا اور بے لباس دیکھ کر ان کی اعانت کرتے تھے اور ہر طرح سے ان سے اعراض برتتے تھے۔[2]

جنتیوں اور جہنمیوں کے اس مکالمے کو اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا ہے:

﴿كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ۝ إِلَّآ أَصْحَٰبَ ٱلْيَمِينِ ۝ فِى جَنَّٰتٍ يَتَسَآءَلُونَ ۝ عَنِ ٱلْمُجْرِمِينَ ۝ مَا سَلَكَكُمْ فِى سَقَرَ ۝ قَالُوا۟ لَمْ نَكُ مِنَ ٱلْمُصَلِّينَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ ٱلْمِسْكِينَ ۝ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ ٱلْخَآئِضِينَ ۝ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ ٱلدِّينِ ۝﴾

''ہر نفس نے جو کیا اس کے بدلے وہ گروی ہے، دائیں (ہاتھ) والوں کے سوا، وہ باغاتِ بہشت میں ہوں گے، باہم سوال کریں گے، مجرموں کے بارے میں، (ان

[1] فقه الزكاة للقرضاوي:1/77. [2] فقه الزكاة للقرضاوي:1/70.

سے پوچھیں گے:) تمھیں کس چیز نے جہنم میں ڈالا؟ وہ کہیں گے: ہم نمازیوں میں سے نہیں تھے اور ہم مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے اور ہم (باطل میں) مشغول ہونے والوں کے ساتھ مشغول ہوتے تھے اور ہم روزِ جزا کی تکذیب کرتے تھے۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں اپنے بندوں کو باغ والوں کا قصہ بھی سنایا جنھوں نے اپنے باغ کا پھل راتوں رات اتارنے کا فیصلہ کیا تاکہ غرباء و مساکین کو کچھ نہ دیا جائے جو وہ کٹائی کے وقت وصول کرتے تھے، پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر عذاب نازل ہوا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ نَآئِمُوْنَ ○ فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ ○ فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ ○ اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰرِمِيْنَ ○ فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ ○ اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِّسْكِيْنٌ ○ وَّغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ ○ فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْٓا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ○ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ○ قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ ○ قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ○ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ ○ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ ○ عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ ○ كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ○﴾

''تو آپ کے رب کی طرف سے کوئی پھرنے والا (عذاب) اس (باغ) پر پھر گیا، جبکہ وہ سو رہے تھے، پھر وہ (باغ) کٹی کھیتی کی طرح ہو گیا، پھر صبح ہوتے ہی انھوں نے ایک دوسرے کو پکارا، کہ تم اپنی کھیتی پر صبح سویرے چلو اگر تمھیں پھل توڑنا ہے، چنانچہ وہ چل پڑے اور آپس میں چپکے چپکے کہہ رہے تھے، کہ آج تمھارے پاس باغ میں کوئی مسکین داخل نہ ہونے پائے اور وہ صبح سویرے (یہ سوچ کر) لپکتے گئے

[1] المدثر 74:38-46.

کہ وہ (مسکینوں کو) روکنے پر قادر ہیں، پھر جب انھوں نے باغ دیکھا تو کہا: یقیناً ہم (راہ) بھول گئے ہیں، (نہیں) بلکہ ہم تو محروم کر دیے گئے ہیں، ان کا بہترین کہنے لگا: کیا میں نے تمھیں نہیں کہا تھا کہ تم تسبیح کیوں نہیں کرتے؟ انھوں نے کہا: پاک ہے ہمارا رب، بے شک ہم ہی ظالم تھے، پھر وہ ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے ملامت کرنے لگے، (اور) کہنے لگے: ہائے ہم پر افسوس! بے شک ہم ہی سرکش تھے، شاید ہمارا رب بدلے میں اس سے بہتر ہمیں دے، بے شک ہم اپنے رب کی طرف رغبت کرنے والے ہیں۔'' [1]

مکی دور میں نازل ہونے والی آیات مساکین کے ساتھ شفقت، مہربانی اور ان کی خوراک ولباس کا خیال رکھنے کا درس دیتی ہیں اور قرآن نہ صرف ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا حکم دیتا ہے بلکہ وہ تو حکم دیتا ہے کہ تمام مسلمان ایک دوسرے کو مسکینوں کا حق یاد دلائیں اور اس پر ابھاریں اور سب ان کے کھانے کا انتظام کریں اور مکمل دیکھ بھال کریں۔ اللہ تعالیٰ نے اس ذمہ داری سے عہدہ برآ نہ ہونے کو کفر کے ساتھ ملا کر بیان فرمایا ہے اور اس جرم کو اپنی ناراضی کا سبب اور آخرت میں عذاب کا موجب قرار دیا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بائیں ہاتھ والوں کے بارے میں ارشاد فرمایا:

﴿خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ○ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ○ ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ○﴾

''(حکم ہوگا:) اسے پکڑو، پھر طوق ڈال دو، پھر اسے جہنم (کی آگ) میں جھونک دو، پھر ایک زنجیر میں، جس کی پیمائش ستر گز ہے، اسے جکڑ (یا پرو) دو۔'' [2]

پھر اس جرم کے سبب اس کی سرعام رسوائی کا تذکرہ اس طرح فرمایا:

﴿اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ○ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ○﴾

[1] القلم 68:19-33. [2] الحآقّة 69:30-32.

”بے شک وہ اللہ عظیم پر ایمان نہیں لاتا تھا اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے پر شوق دلاتا تھا۔“ [1]

یہی وہ دل ہلا دینے اور عذاب سے ڈرانے والی آیات ہیں جن کے سبب حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی سے کہا تھا: ”اے ام درداء! اللہ تعالیٰ نے جب سے جہنم کو پیدا کیا ہے اس وقت سے ایک زنجیر کو پیدا کیا ہے جو جہنم میں گرم کی جا رہی ہے، اسے قیامت کے دن لوگوں کی گردن میں ڈالا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ایمان لانے کی وجہ سے ہمیں اس کے آدھے حصے سے نجات عطا کر دی ہے۔ اے ام درداء! اب تو مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیا کر۔“ [2]

مدنی دور میں فرضیتِ زکاۃ کا سبب: قرآنِ کریم کی مدنی سورتیں ایسے حالات میں نازل ہوئیں جب مسلمان ایک امت بن چکے تھے، اپنی ریاست تھی، اپنا تشخص اور اپنا خطۂ ارض تھا، اس لیے مدنی آیات میں وارد احکامات حالات کے عین مطابق نازل ہوئے۔ ان آیات میں مطلق احکامات کی تقیید اور عمومی احکامات کی تخصیص کر دی گئی، جبکہ مکی احکامات صرف دعوتی اور اصلاحی امور پر مشتمل تھے۔ مدنی احکامات لازمی اور ضروری حیثیت کے حامل تھے، لہٰذا ایمان و یقین کی موجودگی میں انھیں قوانین کی شکل میں نافذ کیا گیا۔

زکاۃ اسی مدنی دور میں فرض ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نصابِ زکاۃ کی حد بندی کی اور اس کی شرائط، واجب مقدار، مصارف زکاۃ اور زکاۃ وصول کرنے اور دیگر انتظامی امور کے سلسلے میں استعمال ہونے والے قوانین سے آگاہ فرمایا۔ [3]

زکاۃ کی اہمیت: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زکاۃ ادا کرنے کی تاکید فرمائی، اللہ کے دین میں

---

1 الحاقّة69:33,34. 2 الأموال لأبي عبيد، ص: 35، بحواله فقه الزكاة للقرضاوي: 70/1.
3 فقه الزكاة للقرضاوي:78/1.

اس کی اہمیت بیان کی کہ وہ دین اسلام کا بنیادی رکن ہے۔ آپ ﷺ نے اس کی بروقت ادائیگی کی ترغیب دی اور مختلف اسالیب سے زکاۃ نہ دینے سے ڈرایا۔

نبی ﷺ نے فرمایا کہ اسلام کے پانچ رکن ہیں: پہلا رکن اللہ کی توحید اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی گواہی ہے۔ دوسرا رکن نماز اور تیسرا رکن زکاۃ ہے۔[1]

قرآن وسنت میں زکاۃ کو اسلام کا تیسرا ستون قرار دیا گیا ہے جس کے بغیر اسلام کی عمارت قائم نہیں رہ سکتی۔[2]

اہل ایمان نے اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے مطابق زکاۃ جیسے اہم رکن کو اہمیت دی اور نظام زکاۃ کو عملی شکل دی تو عمومی طور پر معاشرے میں اس کے گرانقدر فوائد سامنے آئے اور لوگوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی بہتر ہوتی چلی گئی۔

ادائے زکاۃ کے فوائد: زکاۃ کے فوائد درج ذیل ہیں:

❁ بخیلی سے نجات: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْإِيْمٰنَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ أُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○﴾

''اور (مالِ فَے ان کے لیے ہے) جنھوں نے (مدینہ کو) گھر بنا لیا تھا اور ان (مہاجرین) سے پہلے ایمان لا چکے تھے، وہ (انصار) ان سے محبت کرتے ہیں جو ان کی طرف ہجرت کرے اور وہ اپنے دلوں میں اس (مال) کی کوئی حاجت نہیں پاتے جو ان (مہاجرین) کو دیا جائے اور اپنی ذات پر (ان کو) ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود انھیں سخت ضرورت ہو اور جو کوئی اپنے نفس کے لالچ سے بچا لیا گیا تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''[3]

[1] صحيح البخاري، حديث: 8. [2] فقه الزكاة للقرضاوي: 79/1. [3] الحشر 9:59.

❁ **مال میں اضافہ اور برکت:** اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَیَقْدِرُ لَهٗ ؕ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ یُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ ۝﴾

''کہہ دیجیے: بے شک میرا رب اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہے رزق کشادہ کرتا ہے اور تنگ کرتا ہے جس کے لیے (چاہے) اور تم کوئی چیز بھی خرچ کرتے ہو تو وہ اس کا عوض دیتا ہے اور وہ سب سے بہتر رزق دینے والا ہے۔''[1]

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے مزید ارشاد فرمایا:

﴿وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ ۝﴾

''اور جب تمھارے رب نے آگاہ کر دیا کہ اگر تم شکر کرو گے تو یقیناً میں تمھیں مزید دوں گا اور اگر تم کفر کرو گے تو بلاشبہ میرا عذاب بہت شدید ہے۔''[2]

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِیْمٍ ۝﴾

''اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے گناہ گار کو پسند نہیں کرتا۔''[3]

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِّنْ مَّالٍ» ''صدقہ کرنے سے مال میں کمی واقع نہیں ہوتی۔''[4]

نبی ﷺ نے مزید ارشاد فرمایا: «مَا مِنْ یَّوْمٍ یُّصْبِحُ الْعِبَادُ فِیهِ إِلَّا مَلَكَانِ یَنْزِلَانِ، فَیَقُولُ أَحَدُهُمَا: اَللّٰهُمَّ أَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا، وَّ یَقُولُ الْآخَرُ: اَللّٰهُمَّ

[1] سبا 39:34. [2] إبراهيم 7:14. [3] البقرة 276:2. [4] صحيح مسلم، حديث: 2588، و جامع الترمذي، حديث: 2029، والموطأ للإمام مالك: 1000/2.

أَعْطِ مُمْسِكًا تَلَفًا» ''روزانہ صبح کے وقت دو فرشتے آسمان سے اترتے ہیں۔ ان میں سے ایک کہتا ہے: ''اے اللہ! ہر خرچ کرنے والے کو بہتر بدلہ عطا فرما۔'' اور دوسرا کہتا ہے: ''اے اللہ! ہر بخیل کا مال تباہ کر دے۔'' [1]

صدقہ و خیرات کرنے سے مسلمان کا دل بخل اور حرص جیسے برے خیالات سے پاک ہو جاتا ہے اور وہ اللہ کی طرف سے دیے گئے وسیع رزق اور حصول خیر و برکت کے وعدے پر یقین رکھتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اس کی راہ میں خرچ کرتا چلا جاتا ہے۔ [2]

❁ **دنیا و آخرت میں امن کا حصول:** اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوٰلَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝﴾

''جو لوگ اپنے مال خرچ کرتے ہیں رات اور دن میں، چھپا کر اور ظاہر، ان کے رب کے ہاں ان کے لیے اجر ہے، نہ انھیں کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔'' [3]

زکاۃ ادا کرنے والا امن اور خوش بختی میں رہتا اور سکونِ قلب محسوس کرتا ہے کیونکہ وہ اللہ کا حکم تسلیم کرنے والا اور منع کردہ امور سے اجتناب کرنے والا ہوتا ہے۔

❁ **معاشرے پر زکاۃ کے اثرات:** معاشرے پر قائم ہونے والے نظام زکاۃ کے اثرات بڑی اہمیت کے حامل ہیں جس سے امیر اور غریب کے درمیان رابطہ رہتا ہے اور محبت بڑھتی ہے۔ لوگوں کے درمیان کوئی خلیج حائل نہیں ہوتی اور ہر سو امن و آشتی کی فضا قائم ہوتی ہے اور سب یکجان ہو جاتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی اسی مسلم معاشرے کی عکاسی کرتا ہے: «مَثَلُ الْمُؤْمِنِينَ فِي تَوَادِّهِمْ وَ تَرَاحُمِهِمْ وَ تَعَاطُفِهِمْ مَثَلُ الْجَسَدِ الْوَاحِدِ، إِذَا اشْتَكَى مِنْهُ

[1] صحيح البخاري، حديث: 1442، و صحيح مسلم، حديث: 1010. [2] منهج الإسلام في تزكية النفس للدكتور أنس أحمد كرزون: 249/1. [3] البقرة 2:274.

عُضْوٌ، تَدَاعٰى لَهُ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهَرِ وَالْحُمّٰى» ”مسلمانوں کی باہمی محبت، رحمت اور الفت کی مثال ایک جسم کی سی ہے جیسے ہی جسم کا کوئی حصہ تکلیف زدہ ہوتا ہے تو سارا جسم بے قراری اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔“ [1]

زکاۃ کا نظام کچھ اس طرح سے ہے کہ یہ ہر صاحب نصاب سے وصول کی جائے اور شریعت کی طرف سے مقرر کردہ مصارف میں صرف کی جائے۔

یہی وجہ تھی کہ ابتدائے اسلام میں اس نظام پر چلتے ہوئے معاشرہ فارغ البالی، اطمینان اور بہتر رزق سے مستفید ہوا۔ دراصل یہی اس معاشرے کی خصوصیت تھی کہ اخوت والفت کے ساتھ ساتھ فارغ البالی بھی میسر آئی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ خلیفہ خامس عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے دور خلافت میں لوگ اتنے خوش حال ہو گئے کہ انھیں زکاۃ ادا کرنے کے لیے کسی مستحق شخص کو تلاش کرنے میں سخت دشواری کا سامنا کرنا پڑتا اور غلام خرید کر آزاد کرنے کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ نہ ہوتا۔

اسلام کے ابتدائی دور میں اسلامی معیشت اتنی مستحکم ہو گئی کہ اس کی نظیر ناپید نظر آتی ہے اور یہ سب نظام زکاۃ رائج کرنے کی برکت سے ممکن ہوا۔ [2]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نکاح

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت سے قبل حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد مکہ ہی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے چھ سال کی عمر میں نکاح کیا تھا اور شوال 1 ھ کو مدینہ طیبہ میں نو سال کی عمر میں ان کی رخصتی عمل میں آئی۔ [3]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مبارک دور میں دعوت و جہاد، تعلیم و تربیت اور اسلامی ریاست کی ترقی کا عمل بدستور جاری ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی ازدواجی زندگی کا نظام

[1] صحيح مسلم، حديث: 2586، و مسند أحمد: 270/4. [2] السيرة النبوية لأبي شهبة: 115/2.
[3] من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 168.

قائم و دائم تھا۔ نکاح اور تعدد ازواج ان کی زندگی میں اس طرح داخل تھے جیسے کھانے پینے جیسے امور داخل ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دینِ اسلام عین دین فطرت ہے اور فطری تقاضوں سے ہم آہنگ ہے، اس لیے نکاح کا عمل اسلامی معاشرے کا اہم ترین رکن قرار پایا۔ [1]

رسول اللہ ﷺ کا جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا اس وقت آپ ﷺ کی عمر مبارک چون (54) برس تھی۔ عموماً اتنی عمر بڑھاپے، کمزوری اور بزرگی کی نشاندہی کرتی ہے۔ بلاشبہ وقت کا گزرنا عمر جانچنے کا پیمانہ ہے اور یہ ایک عمومی ضابطہ ہے لیکن اصل معیار جسم میں دوڑنے والی تروتازگی اور پھرتی ہے۔ بسا اوقات ہم تیس سال کی عمر والے شخص کو پچاس اور پچاس برس والے شخص کو تیس برس والا خیال کر لیتے ہیں اور صحیح اندازہ نہیں کر پاتے۔ نبی ﷺ پچاس برس میں بھی عزم و ہمت، پیش قدمی اور مردانگی کے اعتبار سے بھرپور جوان نظر آتے تھے اور آپ کا کوئی ثانی نہ تھا۔

حسب ذیل واقعات رسول اللہ ﷺ کے اس وصف پر دلالت کرتے ہیں:

❁ نبی علیہ السلام مختلف قبائل کے پاس تبلیغ دین کے ضمن میں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ اسی سلسلے میں آپ بنو عامر بن صعصعہ کے پاس پہنچے۔ اپنی آمد کا مقصد بیان فرمایا تو ان میں سے بَیحرہ بن فراس نے کہا:

«وَاللهِ! لَوْ أَنِّي أَخَذْتُ هٰذَا الْفَتٰى لَأَكَلْتُ بِهِ الْعَرَبَ» ”اگر میں اس قریشی نوجوان کو قابو کر لوں تو پورے عرب کو مغلوب کر سکتا ہوں۔“ [2]

بَیحرہ کا قول قابل التفات ہے کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کو ”فتی“ کہا جس کا اطلاق ایسے نوجوان پر ہوتا ہے جو عنفوان شباب میں ہو اور قوت حیات سے مالا مال ہو۔ اسی طرح بَیحرہ کی عرب پر غالب آنے کی سوچ ظاہر کرتی ہے کہ اس نے نبی ﷺ میں ایک جوش،

[1] الأساس في السنة لسعيد حوّى:420/1. [2] السيرة النبوية لابن هشام:424/1.

ہمت اور ولولہ محسوس کیا تھا جس کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔

یہ بحیرہ کا تجزیہ تھا جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان دنوں پچاس برس کے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر، باطن، شکل وصورت، روحانیت اور عزم وہمت کے اعتبار سے کامل جوان نظر آتے تھے۔[1]

❁ امام بخاری رحمہ اللہ نے ہجرت نبوی کے بارے میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب عازم سفر ہوئے تو ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سواری پر سوار تھے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ بوڑھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم جوان نظر آ رہے تھے۔ جب کوئی شخص ابوبکر رضی اللہ عنہ سے سوال کرتا کہ آپ کے آگے کون سوار ہے؟ تو آپ فرماتے: ''یہ آدمی مجھے راستہ دکھلاتا ہے۔'' سوال کرنے والا خیال کرتا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ زمینی راستوں کی بات کر رہے ہیں لیکن وہ تو بھلائی اور جنت کا راستہ مراد لیتے تھے۔[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمر میں ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بڑے تھے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بڑھاپے کے آثار نہ تھے۔[3]

حضرت انس رضی اللہ عنہ کے فرمان سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی حقیقی عمر کے اعتبار سے بوڑھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ عمر رکھنے کے باوجود جوان نظر آتے تھے۔

مذکورہ حوالوں کی روشنی سے یہ معلوم ہوا کہ اس اعتبار سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے درمیان زیادہ بعد نہ تھا۔ اسی طرح ایک روایت میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دوڑ لگائی، ایک بار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور دوسری مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سبقت لے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «هٰذِهِ بِتِلْكَ» ''میری یہ سبقت تیری اس سبقت کے عوض ہے۔''[4]

ہر صاحب فکر ونظر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نکاح میں پنہاں حکمتوں کا ادراک کر سکتا ہے جو نکاح

---

[1] من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 171. [2] صحيح البخاري، حديث: 3911، و مسند أحمد: 287/3. [3] شرح المواهب اللدنية للزرقاني: 355/1. [4] مسند أحمد: 264/6، و سنن أبي داود، حديث: 2578، و سنن ابن ماجه، حديث: 1979.

آپ ﷺ نے مدنی زندگی کے ابتدائی دور میں کیا جو کہ ابھی ابتدائی تشریعی مراحل کا دور تھا۔

بلاشبہ انسان اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اپنے گھر اور خاندان میں بسر کرتا ہے۔ نبی علیہ السلام نے بھی اپنے گھر ہی میں یہ حصہ گزارا اور آپ ﷺ کی گھریلو زندگی سے آگاہی انتہائی ضروری تھی تا کہ لوگ اپنی گھریلو زندگی میں آپ ﷺ کے اسوہ پر چل سکیں۔ گھریلو زندگی کو امت کے سامنے رکھنے کی یہ ذمہ داری تمام امہات المومنین رضی اللہ عنہن نے بالعموم اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بالخصوص اٹھائی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنی خداداد صلاحیت اور فہم وفراست سے یہ فریضہ بخوبی انجام دیا۔

سیرت طیبہ کی کوئی بھی کتاب ہو بنظرِ غائر مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کی یہی حکمت تھی اور اس فریضے کی انجام دہی کے لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں نبی علیہ السلام کی وفات کے بعد تقریباً پچاس برس عطا فرمائے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس بابرکت عمر نے لوگوں تک آپ ﷺ کی گھریلو زندگی کے مختلف پہلوؤں کو واضح کرنے اور جملہ فرامین امت تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔[1]

[1] من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 173.

باب 6

سنتِ مزاحمت اور جنگی مہمات کی تحریک

وہ جاری قوانین جنھیں نبی ﷺ نے اختیار کیا اور ان کے ساتھ معاملہ کیا، ان میں سے ایک ''سنت مزاحمت'' ہے۔ اس طریقۂ کار کا اظہار واضح طور پر مدنی دور میں ہوا جب رسول اللہ ﷺ نے مشرکین کے خلاف مزاحمتی تحریک کا آغاز کیا تھا۔ غلبۂ دین سے اس ربانی سنت کا گہرا تعلق ہے۔ جسے کتاب عزیز نے یوں بیان کیا ہے:

﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾

''اور اگر اللہ انسانوں کے ایک (گروہ) کو دوسرے (گروہ) کے ذریعے سے ہٹاتا نہ رہتا تو یقیناً ساری زمین کا نظام بگڑ جاتا لیکن اللہ دنیا والوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔''[1]

اور فرمایا:

﴿اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۭ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۭ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ﴾

''وہ لوگ جنھیں ان کے گھروں سے ناحق نکال دیا گیا، صرف اس لیے کہ وہ کہتے

[1] البقرۃ 2:251.

ہیں: ہمارا رب اللہ ہے اور اگر اللہ لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعے سے دفع نہ کرتا تو بلاشبہ خانقاہیں اور گرجے اور (یہودی) عبادت خانے اور مسجدیں ڈھا دی جاتیں جن میں اللہ کا نام بکثرت ذکر کیا جاتا ہے اور اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا جو اس (کے دین) کی مدد کرے گا، بے شک اللہ یقیناً بہت قوت والا، خوب غالب ہے۔''[1]

یہاں یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ سورۂ بقرہ کی مذکورہ آیت سے قبل طالوت و جالوت کی شکل میں کشاکشِ حق و باطل کی مثال پیش کی گئی ہے جس کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے بات ختم کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾

''لیکن اللہ دنیا والوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔''[2]

معلوم ہوا کہ ''سنت مزاحمت'' کے ذریعے سے فساد کا خاتمہ اہلِ دنیا کے لیے بڑا انعام ہے۔[3]

آیتِ حج سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ نے اعلان کیا ہے کہ وہ اپنے مومن دوستوں کا وفاع کرتا ہے۔ اس آیت میں حق تعالیٰ نے مومنین کو دشمنوں سے قتال کی اجازت دینے کے بعد بات ایک بنیادی قاعدے پر ختم کی، چنانچہ فرمایا:

﴿وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝﴾

''اور اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا جو اس (کے دین) کی مدد کرے گا، بے شک اللہ یقیناً بہت قوت والا، خوب غالب ہے۔''[4]

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اس سنت الٰہی کا بخوبی ادراک کیا اور جان لیا کہ باطل کا قلع قمع کرنے کے لیے ایک امت کی ضرورت ہے جو اعلیٰ قیادت، خاص منہج اور قوت کی حامل ہو

[1] الحج 40:22. [2] البقرة 251:2. [3] مفاتيح الغيب للرازي: 514/3 . [4] الحج 40:22.

جس کی مدد سے اللہ تعالیٰ باطل کو نیست و نابود کرے۔ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ حق کو کامیابی کی منزل تک پہنچنے کے لیے بلند عزائم، وفادار ساتھیوں، محبت کرنے والے دلوں اور مضبوط اعصاب کی ضرورت ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام کو اس سنت الٰہی کے ساتھ حسن معاملہ کی تعلیم دی، چنانچہ انھوں نے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں جہاد کا فریضہ سرانجام دیا۔

حق تعالیٰ نے جہاد کو امت مسلمہ کے لیے تا قیامت جاری رہنے والا فریضہ قرار دیا جسے کسی ظالم کا ظلم اور عادل کا عدل کالعدم نہیں کر سکے گا۔ جس قوم نے اسے چھوڑا وہ ذلیل ہوئی اور باری تعالیٰ نے اس پر اس کا دشمن مسلط کر دیا۔ اللہ رب العزت نے جہاد فی سبیل اللہ کو مرحلہ وار فرض بنایا تاکہ انسانی نفس کو اس سے مانوس ہونے میں زیادہ دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے، طبیعت اسے آسانی سے قبول کر لے اور دعوتی عمل اور جہاد دوش بدوش آگے بڑھیں۔ [1]

فرضیت جہاد کے مراحل

عدمِ اجازت: مسلمان جب مکہ میں تھے، نبی ﷺ سے جہاد کی اجازت طلب کرتے تو آپ ﷺ جواب دیتے: «اِصْبِرُوا! فَإِنِّي لَمْ أُؤْمَرْ بِالْقِتَالِ»

''صبر کرو! ابھی مجھے قتال کا حکم نہیں دیا گیا۔'' [2]

اجازت: جہاد کرنے کی اجازت دی گئی لیکن اسے واجب قرار نہیں دیا گیا اور یہ آیت نازل ہوئی:

﴿اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰي نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُۨ ﴾

1 الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص:438. 2 الكشاف للزمخشري: 4/199.

''جن لوگوں سے لڑائی کی جاتی ہے انھیں (جہاد کی) اجازت دی گئی ہے، اس لیے کہ ان پر ظلم ہوا اور یقیناً اللہ ان کی مدد پر ضرور قادر ہے۔''[1]

اُن لوگوں سے جنگ کرنے کا واجبی حکم جو مسلمانوں سے لڑیں: ارشاد ربانی ہوا:

﴿ وَقٰتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقٰتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ ﴾

''اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو (جہاد کرو) جو تم سے لڑتے ہیں اور تم زیادتی نہ کرو، بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''[2]

فرضیت: اس مرحلے میں مسلمانوں پر تمام کافروں سے لڑنا فرض قرار دے دیا گیا۔ فرمایا:

﴿ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَاۗفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَاۗفَّةً ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝ ﴾

''اور تمام مشرکین سے لڑو جیسے وہ سارے تم سے لڑتے ہیں۔ اور جان لو کہ بے شک اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔''[3]

فرضیت جہاد کا بتدریج واقع ہونا نو آموز اسلامی ریاست کے حالات کا تقاضا تھا جس کی فوج تعداد، اسلحہ اور تربیت کے لحاظ سے بالکل ابتدائی مراحل طے کر رہی تھی۔ اس صورت حال میں ضروری تھا کہ جہاد اختیاری رکھا جائے، تاوقتیکہ اسلامی فوج استحکام حاصل کر لے اور اگر کفر کی قوتیں یکبارگی بھی حملہ کر دیں تو اُن کے سامنے ڈٹ جانے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہو۔ جہاد کو اختیاری رکھنے کے مقاصد پورے ہوئے تو اسے فرض قرار دے دیا گیا۔ لیکن یہ بھی اُس صورت میں جبکہ مسلمانوں پر اُن کے علاقے میں حملہ کیا جائے۔ جارحیت اب بھی واجب نہیں ہوئی تھی۔ بیعت عقبہ ثانیہ نے جو بعد میں بیعتِ حرب کہلائی، انصار پر واجب کر دیا تھا کہ وہ اسلامی دعوت اور نبی ﷺ کے دفاع کی خاطر

[1] الحج 39:22. [2] البقرة 190:2. [3] التوبة 36:9.

ساری دنیا سے ٹکرا جائیں۔[1]

قتال کی اجازت ملتے ہی رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام کے لیے فنون حرب وضرب کی تربیت کا اہتمام کیا اور جنگی مشقوں میں بنفس نفیس شریک ہوتے رہے۔ آپ ﷺ نے میدانِ جہاد میں سرگرمی دکھانے کو مقدس ترین عبادت شمار کیا۔ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی پوری تعمیل کی:

﴿وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِنْ دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ ○﴾

”اور ان (کافروں کے مقابلے) کے لیے تم مقدور بھر قوت اور بندھے ہوئے گھوڑے تیار رکھو جن سے تم اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو اور ان کے علاوہ دوسروں کو ڈرائے رکھو جنھیں تم نہیں جانتے (مگر) اللہ انھیں جانتا ہے اور تم اللہ کی راہ میں جو کچھ خرچ کرو گے تمھیں (اس کا) پورا پورا ثواب دیا جائے گا۔ اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔“[2]

تربیت مسلم

مسلمان مجاہد کی تعلیم وتربیت کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا طریق کار دو متوازی پہلوؤں پر مشتمل تھا۔ ایک روحانی تربیت اور دوسرا عملی مشق۔

① روحانی تربیت: رسول اللہ ﷺ مجاہدین اسلام کا حوصلہ بلند رکھنے اور اُن میں خود اعتمادی پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کرتے تھے۔ آپ نے انھیں یقین دلایا تھا کہ جنگ کے اختتام پر فتح حاصل ہوگی یا شہادت کی صورت میں جنت ملے گی۔ تب سے اب تک یہی خوشگوار

---

[1] الجهاد و القتال لمحمد هيكل: 464,463/1. [2] الأنفال 60:8.

یقین مسلمان مجاہد کو میدان قتال میں لاتا اور اسے آخری دم تک اپنی جسمانی ونفسیاتی اور فنی طاقتوں کو آزمانے پر اُکساتا رہا ہے۔[1]

اس سلسلے کے چند نبوی ارشادات ذیل میں دیے جاتے ہیں:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ! لَوْلَا أَنَّ رِجَالًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ لَا تَطِيبُ أَنْفُسُهُمْ أَنْ يَّتَخَلَّفُوا عَنِّي وَلَا أَجِدُ مَا أَحْمِلُهُمْ عَلَيْهِ مَا تَخَلَّفْتُ عَنْ سَرِيَّةٍ تَغْدُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ، وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ! لَوَدِدْتُّ أَنِّي أُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ، ثُمَّ أُحْيَا، ثُمَّ أُقْتَلُ، ثُمَّ أُحْيَا، ثُمَّ أُقْتَلُ، ثُمَّ أُحْيَا، ثُمَّ أُقْتَلُ»

''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر مومنین کی جماعت کے کچھ افراد ایسے نہ ہوتے جن کا دل مجھے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتا اور مجھے خود اتنی سواریاں میسر نہیں کہ انھیں سوار کر کے اپنے ساتھ لے چلوں تو میں کسی لشکر سے پیچھے نہ رہتا جو اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلے۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میری دلی تمنا ہے کہ اللہ کی راہ میں شہید کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر شہید کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر شہید کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر شہید کیا جاؤں۔''[2]

رسول اللہ ﷺ نے دوسرے موقع پر ارشاد فرمایا:

«مَا أَحَدٌ يَّدْخُلُ الْجَنَّةَ يُحِبُّ أَنْ يَّرْجِعَ إِلَى الدُّنْيَا وَ لَهُ مَا عَلَى الْأَرْضِ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا الشَّهِيدُ يَتَمَنّٰى أَنْ يَّرْجِعَ إِلَى الدُّنْيَا فَيُقْتَلَ

1 دراسات في السيرة النبوية للدكتور عماد الدين خليل، ص: 161. 2 صحيح البخاري، حديث: 2797، و السنن الكبرٰى للنسائي: 8/6 .

عَشْرَ مَرَّاتٍ لِّمَا يَرٰى مِنَ الْكَرَامَةِ»

”جو شخص جنت میں جائے گا وہ دنیا میں آنا پسند نہیں کرے گا، چاہے اسے دنیا کی ساری دولت مل جائے، البتہ شہید نے (جنت میں) جس عزت واکرام کا مشاہدہ کیا اس بنا پر وہ دنیا میں آنے کی اور اللہ کی راہ میں دس بار قتل ہونے کی آرزو کرے گا۔“ [1]

② **عملی مشق:** اس ضمن میں رسول اللہ ﷺ نے امت کے تمام افراد کی ممکنہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی بھرپور کوشش کی اور نیزہ بازی، تیراندازی، شمشیرزنی اور گھڑ سواری جیسے فنونِ حرب وضرب کی عملی مشق کا اہتمام کیا۔ آپ ﷺ نے عسکری تربیت کے مختلف پہلوؤں پر پوری توجہ صرف کی اور فوج کی جسمانی تربیت کے علاوہ اُنھیں فتح یا شہادت کے حصول کا یقین دلایا، اُن کا حوصلہ بلند کیا اور مجاہدین کے دلوں میں یہ جذبہ پیدا کیا کہ وہ میدانِ قتال میں خوب خوب دادِ شجاعت دیں گے۔ آپ ﷺ نے مسلمانوں کو فنونِ حرب وضرب میں کامل مہارت بہم پہنچانے کی تاکید کی اور فرمایا:

«مَنْ عَلِمَ الرَّمْيَ ثُمَّ تَرَكَهُ فَلَيْسَ مِنَّا، أَوْ قَدْ عَصٰى»

”جس نے نشانہ بازی سیکھی، پھر اسے ترک کر دیا وہ ہم میں سے نہیں، یا فرمایا: اس نے نافرمانی کی۔“ [2]

یہ کہہ کر گویا رسول اللہ ﷺ نے بلا استثنا تمام افرادِ امت کو اس امر کی دعوت دی تھی کہ وہ نشانہ بازی کی عملی مشق کا اہتمام کریں، جسمانی طور پر چاق و چوبند رہیں اور سستی و کاہلی چھوڑ کر چستی اور سرگرمی کو اپنی عادت بنائیں۔ بلاشبہ اسلام اپنے پیروکاروں کو قوتیں مجتمع رکھنے اور بلندیوں کے سفر پر کمربستہ رہنے کی تعلیم دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ مسلمانوں کو موقع محل کی مناسبت سے جنگی تیاری کرنے کی تلقین کرتے اور انھیں ابھارتے کہ وہ اس

1 صحيح البخاري، حديث: 2817. 2 صحيح مسلم، حديث: 1919، وسنن ابن ماجه، حديث: 2814، و مسند أحمد: 4/148.

سلسلے کے تمام وسائل و ذرائع استعمال میں لا کر اپنے تئیں فنونِ حرب کو ترقی دینے کی سعی کریں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ﴾ أَلَا إِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْيُ! أَلَا إِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْيُ! أَلَا إِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْيُ!»

''اور ان کے مقابلے کو مقدور بھر قوت تیار کر رکھو۔ اور خوب جان لو کہ قوت نشانہ بازی میں ہے۔ ہاں ہاں! قوت نشانہ بازی میں ہے۔ بلاشبہ قوت نشانہ بازی میں ہے۔''[1]

قرآن کریم اور سنت نبوی نے مسلمانوں کو نفسیاتی و مادی دونوں محاذوں پر بھرپور طریقے سے تیاری کا درس دیا اور انتباہ کیا ہے کہ اپنے بچاؤ کا سامان تیار رکھیں۔ قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا ○﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم اپنے بچاؤ کا سامان لے لو، پھر تم الگ الگ دستوں کی شکل میں یا اکٹھے ہو کر نکلو۔''[2]

یہ قرآنی حکم نہایت وضاحت سے اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ مسلمانوں کے لیے دشمن کی چالوں سے بچاؤ کا سامان کرنا ضروری ہے۔ اسلحے کی تیاری، فوج کے لیے اُس کے استعمال کی مشق اور جسمانی تربیت سب اسی بچاؤ کے سامان کا حصہ ہیں۔ یہاں یہ نکتہ قابلِ بیان ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نے اسلحے اور قوت کی تیاری کا عام حکم دیا ہے جس میں کسی قید یا شرط کا شائبہ نہیں۔ آیت میں خاص نوع کے اسلحے یا خاص قسم کے حالات کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ حالات مختلف ہو سکتے ہیں، ہتھیاروں کی نوعیت بدل سکتی ہے، دشمن کی تعداد اور قوت میں کمی بیشی کا امکان بھی ہے لیکن مسلمانوں کو ہر قسم کی صورتحال سے نمٹنے کے لیے تیار رہ کر میسر اسلحے کو کام میں لانا چاہیے۔

[1] صحیح مسلم، حدیث: 1917، و سنن أبي داود، حدیث: 2514، و جامع الترمذي، حدیث: 3083، و سنن ابن ماجه، حدیث: 2813. [2] النسآء 71:4 .

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک جہاد کی حیثیت ایک عظیم روحانی درس گاہ کی تھی جس میں انھیں تزکیۂ نفس کی تربیت دی جاتی تھی۔ انھیں اس امر کا بخوبی ادراک تھا کہ جہاد کے مطلوبہ ثمرات حاصل کرنے کے لیے اللہ کی خاطر مخلص ہونا اور اُن تعلیمات پر عمل کرنا پڑے گا جنھیں وہ دل و جان سے تسلیم کر چکے تھے اور انھوں نے لوگوں کو اُن روشن آیات پر ایمان لانے کی دعوت دی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے انھیں اعمال میں ریا کاری کی سنگین نوعیت سے پوری طرح آگاہ کر دیا تھا۔ آپ ﷺ نے انھیں صاف صاف بتا دیا تھا:

«إِنَّ أَوَّلَ النَّاسِ يُقْضٰى يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَيْهِ، رَجُلٌ اسْتُشْهِدَ، فَأُتِيَ بِهِ فَعَرَّفَهُ نِعْمَتَهُ فَعَرَفَهَا، قَالَ: فَمَا عَمِلْتَ فِيهَا؟ قَالَ: قَاتَلْتُ فِيكَ حَتَّى اسْتُشْهِدْتُّ، قَالَ: كَذَبْتَ، وَ لٰكِنَّكَ قَاتَلْتَ لِأَنْ يُّقَالَ جَرِيءٌ، فَقَدْ قِيلَ، ثُمَّ أُمِرَ بِهِ فَسُحِبَ عَلٰى وَجْهِهِ حَتّٰى أُلْقِيَ فِي النَّارِ، وَرَجُلٌ تَعَلَّمَ الْعِلْمَ وَ عَلَّمَهُ وَ قَرَأَ الْقُرْآنَ، فَأُتِيَ بِهِ، فَعَرَّفَهُ نِعَمَهُ فَعَرَفَهَا. قَالَ: فَمَا عَمِلْتَ فِيهَا؟ قَالَ: تَعَلَّمْتُ الْعِلْمَ وَ عَلَّمْتُهُ وَقَرَأْتُ فِيكَ الْقُرْآنَ. قَالَ: كَذَبْتَ وَ لٰكِنَّكَ تَعَلَّمْتَ الْعِلْمَ لِيُقَالَ عَالِمٌ، وَّ قَرَأْتَ الْقُرْآنَ لِيُقَالَ هُوَ قَارِئٌ، فَقَدْ قِيلَ، ثُمَّ أُمِرَ بِهِ فَسُحِبَ عَلٰى وَجْهِهِ حَتّٰى أُلْقِيَ فِي النَّارِ، وَ رَجُلٌ وَسَّعَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ أَعْطَاهُ مِنْ أَصْنَافِ الْمَالِ كُلِّهِ، فَأُتِيَ بِهِ فَعَرَّفَهُ نِعَمَهُ فَعَرَفَهَا، قَالَ: فَمَا عَمِلْتَ فِيهَا؟ قَالَ: مَا تَرَكْتُ مِنْ سَبِيلٍ تُحِبُّ أَنْ يُّنْفَقَ فِيهَا إِلَّا أَنْفَقْتُ فِيهَا لَكَ، قَالَ: كَذَبْتَ، وَ لٰكِنَّكَ فَعَلْتَ لِيُقَالَ هُوَ جَوَادٌ، فَقَدْ قِيلَ، ثُمَّ أُمِرَ بِهِ فَسُحِبَ عَلٰى وَجْهِهِ، ثُمَّ أُلْقِيَ فِي النَّارِ»

"روزِ قیامت سب سے اوّل جس آدمی کا حساب چکتا کیا جائے گا وہ ایک شہید ہوگا۔ اُسے لایا جائے گا۔ رب تعالیٰ اُسے اپنے انعامات یاد دلائے گا۔ وہ اقرار کرے گا۔ اللہ رب العزت دریافت فرمائے گا: "تو نے اس کے بدلے میں کیا عمل کیا؟" شہید جواب دے گا: "میں نے تیری راہ میں جنگ کی اور شہید کردیا گیا۔" حق تعالیٰ شانہٗ فرمائے گا: "جھوٹ بولتے ہو تم۔ بلکہ تم اس لیے لڑتے رہے کہ تمھیں جری اور بہادر کے القابات دیے جائیں۔ اور یہ ہوچکا۔ تمھیں لوگوں کی طرف سے یہ خطاب مل گیا۔" پھر اُس کے متعلق حکم دیا جائے گا اور اُسے منہ کے بل گھسیٹ کر آگ میں پھینک دیا جائے گا۔

اس کے بعد دوسرا آدمی لایا جائے گا جس نے قرآن پڑھا اور علم سیکھا اور سکھایا تھا۔ اللہ تعالیٰ اُس کے سامنے اپنی نعمتوں کا ذکر فرمائے گا۔ پس وہ اعتراف کرے گا۔ اب اللہ تعالیٰ پوچھے گا: "اس کے بدلے میں تو نے کیا عمل کیا؟" قاریِ قرآن جواباً کہے گا: "میں نے علم سیکھا اور سکھایا اور تیرے لیے قرآن کی تلاوت کرتا رہا۔"

اللہ تعالیٰ فرمائے گا: "تو نے جھوٹ بولا۔ تو نے تو علم اس لیے حاصل کیا کہ عالم کہلایا جائے اور قرآن اس واسطے پڑھا کہ تمھیں قاری کہا جائے۔ پس یہ کہہ دیا گیا۔" پھر حکم ہوگا اور اُسے بھی چہرے کے بل کھینچ کر دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔

اب تیسرا شخص حاضر کیا جائے گا جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے مال و دولت فراواں کردیا تھا۔ رب تعالیٰ اُسے اپنے انعام و اکرام یاد دلائے گا۔ وہ سرِتسلیم خم کرے گا۔ حق تعالیٰ شانہ دریافت فرمائے گا: "اس کے بدلے میں تم نے کیا عمل کیا؟" وہ بولے گا: "میں نے اپنا مال ہر اُس مد میں صرف کیا جس میں خرچ کرنا تجھے پسند ہے۔" اللہ تعالیٰ فرمائے گا: "تم غلط کہتے ہو۔ تم تو بس اتنا چاہتے تھے کہ

تمھاری سخاوت کے چرچے ہوں۔ اور یہ ہو چکا۔'' رب تعالیٰ کے اذن سے اُسے بھی منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔''[1]

یہی باعث تھا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جہاد کی راہ میں اخلاص کے خوشنما زیور سے آراستہ تھے۔ اُن کی گفتار اللہ تعالیٰ کے لیے تھی۔ رضائے الٰہی کی خاطر وہ اپنا مال بے دریغ لٹاتے تھے۔ اعلائے کلمۃ اللہ اور دین اسلام کے دفاع میں انھوں نے اپنا تن من دھن نچھاور کر دیا تھا۔ تزکیۂ نفس کے باب میں جہاد فی سبیل اللہ نے صحابۂ کرام کے قلوب پر گہرے اثرات مرتب کیے تھے۔ درج ذیل سطور میں ان اثرات کے مختلف پہلوؤں کا تذکرہ قدرے تفصیل سے کیا جاتا ہے:

جہاد فی سبیل اللہ کے اثرات

دنیاوی محبت اور اُس کے علائق سے نجات: جہاد فی سبیل اللہ زہد و تقویٰ، فکر آخرت اور جنت کی ہمیشہ رہنے والی نعمتوں کے شوق کی عملی مشق کا نام ہے۔ تزکیۂ نفس کے سلسلے میں منہج اسلامی کا مطمحِ نظر بھی یہی ہے۔ مجاہد حصول رضائے الٰہی کی خاطر اپنی متاع گراں مایہ ''جان'' کا سودا کرتا ہے اور اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ جو جاں آفریں ہے، اُس کی نوازشوں کے بھی کیا کہنے! وہ اپنے مجاہد بندوں کا یوں اکرام کرتا ہے کہ وہی شے اُن سے خرید لیتا ہے جو خود اُنھیں بخشی تھی۔ جبکہ بندے اُسے فروخت کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾

''بے شک اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال جنت کے بدلے میں خرید لیے ہیں۔''[2]

تزکیہ نفس، صبر اور جاں نثاری کی تربیت: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ تعلیم و تربیت سے

---

1 صحیح مسلم، حدیث: 1905، و مسند أحمد: 322/2، و السنن الکبری للنسائي: 23/6.

2 التوبة 111:9. منهج الإسلام في تزكية النفس للدكتور أنس أحمد كرزون: 293/1.

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو گہرا احساس تھا کہ جنت کا راستہ مشکلات و مصائب کے کانٹوں سے پُر ہے۔ اُنھیں علم تھا کہ ایسی پر خار راہ گزر پر چل کر منزل مقصود تک رسائی پانا اس کے بغیر ناممکن ہے کہ راحت و آرام کی قطعی پروانہ کی جائے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ نفس و بدن کو مشقت برداشت کرنے اور کٹھن راہوں پر چلتے رہنے کا عادی بنایا جائے تا کہ اُس کی عمارت مضبوط ہو، وہ سستی، کاہلی اور سہل انگاری ترک کر دے اور آزمائشوں اور صعوبتوں کے طوفان میں جم کر کھڑے رہنے کی صلاحیت سے بہرہ یاب ہو۔

صحابۂ کرام نے قرآن مجید سے یہ سبق سیکھا تھا کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی بے پایاں حکمت کا تقاضا ہے کہ انسانی نفس کو ابتلاء و آزمائش کی بھٹی سے گزار کر کندن کیا جانا چاہیے اور یہ کہ جانچ پرکھ کی اس کارروائی کے لیے میدان جہاد سب سے زیادہ موزوں ہے۔[1]

ارشاد ربانی ہے:

﴿إِن يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهُ ۚ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَاءَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ۝ وَلِيُمَحِّصَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَمْحَقَ الْكَافِرِينَ ۝ أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنكُمْ وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ ۝ وَلَقَدْ كُنتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِن قَبْلِ أَن تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَأَيْتُمُوهُ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ ۝﴾

''اگر تمھیں (احد میں) زخم لگے ہیں تو ایسے ہی زخم (بدر میں) کافروں کو بھی لگ چکے ہیں۔ ہم ان دنوں کو لوگوں کے درمیان ادل بدل کرتے رہتے ہیں۔ اور (تمھیں یہ زخم اس لیے لگے کہ) اللہ جاننا چاہتا تھا کہ کون ایمان والے ہیں؟ اور وہ تم میں سے بعض کو شہادت کا مرتبہ دینا چاہتا تھا اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

1 منهج الإسلام في تزكية النفس للدكتور أنس أحمد كرزون: 294/1.

اور (ایک وجہ یہ تھی کہ) اللہ ایمان والوں کو پاک صاف کر دینا اور کافروں کو مٹا دینا چاہتا تھا۔ کیا تم یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ تم (سیدھے) جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون لوگ اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور صبر کرنے والے ہیں، تحقیق تم جنگ سے پہلے ہی موت (شہادت) کی خواہش کرتے تھے، چنانچہ پس اب تم نے اسے اپنی آنکھوں سے اپنے سامنے دیکھ لیا ہے۔'' [1]

جہاد عزت نفس کا محافظ: صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے نبوی تعلیمات کی روشنی میں یہ علم حاصل کیا کہ جہاد فی سبیل اللہ مسلمان کی عزت نفس کی بڑھوتری، تقویت اور اسے ذلت و حقارت کے احساس سے نکالنے کا باعث ہے۔ یہ امر شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ احساس کمتری فرد اور معاشرے کے لیے زہر قاتل کا درجہ رکھتا ہے، چنانچہ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے اپنی کتابِ عزیز میں اعلان کیا ہے کہ ایک مسلمان عزت نفس کے معاملے میں غیور ہوتا ہے، اس لیے کہ اُس نے یہ عزت اپنے ایمان اور دین حق پر اپنی ثابت قدمی کی بدولت حاصل کی ہوتی ہے۔ کتابِ عزیز میں صاف صاف ارشاد ہے:

﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝﴾

''اور عزت اللہ ہی کے لیے ہے اور اس کے رسول کے لیے اور مومنوں کے لیے لیکن منافق (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔'' [2]

لیکن نہایت تاسف سے کہنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں نے جہاد سے کنارہ کشی کر لی اور آخرت کی فکر چھوڑ کر دنیا کی رنگینیوں میں کھو گئے جس کا لازمی اور بھیانک نتیجہ یہ نکلا کہ سارے جہان کی ذلت و رسوائی اُن کا مقدر ٹھہری اور اُن کا قومی مورال اس حد تک گر گیا کہ وہ ذلت و پستی کے خوگر ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسی کیفیت کی پیش گوئی کرتے

[1] آل عمرٰن 3:140-143. [2] المنٰفقون 63:8.

ہوئے فرمایا تھا:

«إِذَا تَبَايَعْتُمْ بِالْعِينَةِ وَ أَخَذْتُمْ أَذْنَابَ الْبَقَرِ وَ رَضِيتُمْ بِالزَّرْعِ وَتَرَكْتُمُ الْجِهَادَ سَلَّطَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ ذُلًّا، لَا يَنْزِعُهُ حَتّٰى تَرْجِعُوا إِلٰى دِينِكُمْ»

''جب تم عینہ [1] کی بیع کرنے لگو گے، بیلوں کی دُمیں پکڑ لو گے، کھیتی باڑی ہی پر مطمئن ہو جاؤ گے اور جہاد چھوڑ بیٹھو گے تو اللہ تم پر ایسی ذلت مسلط کر دے گا جو کسی طرح زائل نہیں ہوگی حتی کہ تم اپنے دین کی طرف لوٹ آؤ۔'' [2]

جو آدمی حصولِ دنیا کو اپنا نصب العین قرار دے اور متاعِ دنیا ہی اُس کی علمی و عملی جدوجہد کا مرکز ومحور ٹھہرے تو وہ کتاب اللہ کی اس آیت کا صحیح مصداق ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝﴾

''بے شک وہ لوگ جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے اور وہ دنیاوی زندگی پر راضی اور اسی پر مطمئن ہیں اور وہ لوگ جو ہماری نشانیوں سے غافل ہیں، وہی ہیں جن کا ٹھکانا دوزخ ہے ان (عملوں) کی وجہ سے جو وہ کماتے تھے۔'' [3]

اور اسی طرح ارشادِ نبوی بھی ہے:

«مَنْ مَّاتَ وَ لَمْ يَغْزُ، وَ لَمْ يُحَدِّثْ بِهِ نَفْسَهُ، مَاتَ عَلٰى شُعْبَةٍ مِّنْ نِّفَاقٍ»

[1] بیع عینہ کی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کو ادھار قیمت پر مال حوالے کر دے مگر قیمت وصول کرنے سے پہلے ہی اس سے وہی مال دوبارہ خرید لے اور اپنی قیمت فروخت سے کم میں خرید لے اور پھر زائد قیمت وصول کر لے۔ [2] سنن أبي داود، حديث: 3462، و مسند أحمد: 42/2 و 84. [3] يونس 10:7، 8.

''جو شخص اس حال میں مرا کہ اس نے جہاد نہ کیا، نہ دل میں کبھی جہاد کا خیال آیا، وہ نفاق کی ایک شاخ پر مرا۔'' [1]

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے جہادِ فی سبیل اللہ کا راستہ اختیار کیا اور اس عظیم خوشخبری کے مستحق ہوئے:

﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝﴾

''اور جو لوگ ہماری راہ میں جہاد کریں ہم انھیں اپنی راہیں ضرور دکھاتے ہیں اور یقیناً اللہ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔'' [2]

جہادِ فی سبیل اللہ کے اہداف و مقاصد

اسلامی عقیدے کی آزادی کا تحفظ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ۭ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝﴾

''اور تم ان سے لڑو حتی کہ فتنہ (شرک) نہ رہے اور (ہر کہیں) سارے کا سارا دین اللہ ہی کا ہو، پھر اگر وہ (کافر) باز آجائیں تو بے شک اللہ ان کے کاموں کو خوب دیکھ رہا ہے۔ اور اگر وہ پھریں تو جان لو کہ یقیناً اللہ ہی تمھارا کارساز ہے، وہ بہترین کارساز اور بہترین مددگار ہے۔'' [3]

سید قطب اس آیت کریمہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''مسلم امہ کے لیے ایک اور بات بھی ضروری ہے کہ وہ اسلامی دعوت کی راہ میں حائل ہر قوت کا قلع قمع کرے جو دینِ حق

---

1 صحیح مسلم، حدیث: 1910، وسنن أبي داود، حدیث: 2502، ومسند أحمد: 374/2، والسنن الکبرٰی للنسائي: 8/6. 2 العنکبوت 69:29. 3 الأنفال 8:39، 40.

کی آزادانہ تبلیغ میں رکاوٹ بنتی ہو یا اس نے عوام الناس کو دین حق کی قبولیت سے روک رکھا ہو اور لوگ اس کے ڈر سے دین اسلامی کے فیوض و برکات سے محروم ہوں۔ یہ امر یقینی بنانے کے لیے لازم ہے کہ مسلمان جہاد کرتے رہیں، حتی کہ روئے زمین پر کسی باطل قوت کے لیے ممکن نہ ہو کہ وہ اہلِ ایمان کو دین کی تبلیغ یا اُس کے احکامات نافذ کرنے سے روک دے یا عامۃ الناس کو دین میں داخل ہونے سے منع کر دے۔ یوں ہر سُو اسلام کا بول بالا ہوگا۔ لیکن بالادستی ان معنوں میں نہیں ہونی چاہیے کہ لوگوں کو دین اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے بلکہ ان معنوں میں ہو کہ زمین پر اللہ کا دین سربلند ہو، اس طرح کہ جو آدمی دین کے دائرے میں آنا اور اس پر ثابت قدم رہنا چاہے اُسے زمین کی کسی جھوٹی قوت کا خوف نہ ہو۔ اور کرۂ ارض پر کوئی قانون اور نظام ایسا باقی نہ رہے جو اللہ کے نور ہدایت کو پھیلنے سے روکے اور لوگوں کو حق کے راستے سے بھٹکانے کی کوشش کرے۔ اسلام کا تصورِ جہاد انھی اصول و مبادی کے تابع ہے۔ یہ جہاد عقیدۂ اسلامی کے تحفظ و بقا کی خاطر ہے۔ یہ جدوجہد شریعتِ اسلامی کے نفاذ کے لیے ہے۔ یہ تگ ودو زمین پر دین اسلامی کا پرچم سربلند کرنے کی غرض سے ہے۔ اس دوڑ دھوپ کی غایت یہ ہے کہ شیطانی قوتوں کو دینِ حق اور اس کے پیروکاروں سے دست درازی کرنے کی ہمت نہ ہو۔ جو شخص دین کے سایے تلے آنے کا آرزومند ہو اُسے زمین کی کسی قوت سے یہ خدشہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اس کے آڑے آئے گی یا قبولیت دین کے بعد اُسے اذیت رسانی کا نشانہ بنائے گی۔

یہ ہے وہ جہاد جس کا اسلام پرچار کرتا ہے۔ اسی پر وہ قائم ہے اور اسی کا حکم دیتا ہے۔ اسی جہاد میں جان دینے والے ''شہداء'' کے رتبے پر فائز ہوتے ہیں اور اسی کا بار اٹھانے والے اُس کے دوست ہیں۔[1]

[1] تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب: 187/1.

عبادات اور مقاماتِ مقدسہ کا تحفظ

ارشادِ الٰہی ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ يُدَافِعُ عَنِ الَّذِينَ آمَنُوا ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُورٍ ○ أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ○ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ۗ وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ○ الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ ۗ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ ○﴾

”یقیناً اللہ ایمان والوں کا دفاع کرتا ہے، بے شک اللہ ہر خائن (اور) ناشکرے کو پسند نہیں کرتا۔ جن لوگوں سے لڑائی کی جاتی ہے انھیں (جہاد کی) اجازت دی گئی ہے، اس لیے کہ ان پر ظلم ہوا اور یقیناً اللہ ان کی مدد پر ضرور قادر ہے۔ وہ لوگ جنھیں ان کے گھروں سے ناحق نکال دیا گیا، صرف اس لیے کہ وہ کہتے ہیں: ہمارا رب اللہ ہے اور اگر اللہ لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعے سے دفع نہ کرتا تو بلاشبہ خانقاہیں اور گرجے اور (یہودی) عبادت خانے اور مسجدیں ڈھادی جاتیں جن میں اللہ کا نام بکثرت ذکر کیا جاتا ہے اور اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا جو اس (کے دین) کی مدد کرے گا، بے شک اللہ یقیناً بہت قوت والا، خوب غالب ہے۔ (یہ) وہ لوگ (ہیں) کہ جنھیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں (تو) وہ نماز قائم کریں اور زکاۃ دیں اور نیکی کا حکم دیں اور برائی سے روکیں اور تمام امور کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔“ [1]

[1] الحج 22:38-41.

مفسر نسفی رحمہ اللہ نے اِن آیات کی تفسیر میں لکھا: ''مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جہاد کے ذریعے سے مسلمانوں کو کافروں پر غالب نہ کرتا تو ہر دور کے مشرکین دیگر اہل مذاہب پر تسلط جما لیتے اور اُن کی عبادت گاہیں پامال کر دیتے۔ وہ نصاریٰ کا کوئی گرجا، اُن کے راہبوں کی کوئی خانقاہ اور یہود کا کوئی معبد باقی نہ چھوڑتے اور نہ مسلمانوں کی مساجد کھڑی رہنے دیتے۔

یا پھر مراد ہے کہ امت محمدیہ کے مشرکین اہل ذمہ اور توحید پرست مسلمانوں پر غالب آجاتے اور اُن کی عبادت گاہیں مسمار کر دیتے۔

آیت میں خانقاہوں، گرجوں اور یہود کے عبادت خانوں کا ذکر مساجد سے پہلے کیا گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ یہ عبادت گاہیں مساجد سے قبل موجود تھیں یا پھر یہ کہ وہ مساجد سے پہلے منہدم ہوئی تھیں۔''[1]

فساد فی الارض کا خاتمہ

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾

''اور اگر اللہ انسانوں کے ایک (گروہ) کو دوسرے (گروہ) کے ذریعے سے ہٹاتا نہ رہتا تو یقیناً ساری زمین کا نظام بگڑ جاتا لیکن اللہ دنیا والوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔''[2]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''اگر اللہ تعالیٰ ایک قوم کے ذریعے دوسروں کو نہ ہٹاتا تو وہ تباہ و ہلاک ہوجاتے جیسے اس نے بنی اسرائیل سے ان کے دشمن کو

1 تفسير النسفي: 106/3، و الكشاف للزمخشري: 16/3، و تفسير المراغي: 119/6. 2 البقرة 251:2.

طالوت کے جہاد اور داود علیہ السلام کی شجاعت سے دور ہٹایا۔"[1]

اسی آیت کی تفسیر صاحب کشاف علامہ زمخشری نے یوں کی ہے: "اگر ایسا نہ ہوتا کہ حق تعالیٰ شانہٗ بعض لوگوں کے ذریعے سے دوسروں کو ہٹاتا اور بعض کے واسطے سے بعض کی فساد انگیزی کا خاتمہ کرتا ہے تو دنیا پر فسادی چھا جاتے، زمین بگاڑ کا شکار ہوجاتی اور اُس کی منفعت جاتی رہتی۔ کھیت کھلیان ویران ہوجاتے، مخلوقات کی نشوونما متاثر ہوتی، افزائش نسل کا سلسلہ رک جاتا اور زمین کی سرسبزی و شادابی ختم ہوکر رہ جاتی۔"[2]

مفسر عبدالرحمٰن سعدی رحمہ اللہ نے آیت کے اہم نکات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا:

"اس آیت میں امت کے لیے کئی اسباق پوشیدہ ہیں۔ آیت میں جہاد کی فضیلت اور اُس کے فوائد و ثمرات کی ہلکی سی جھلک دکھائی گئی اور یہ بتایا گیا ہے کہ جہاد دین، وطن، جسم و جاں اور مال و متاع کے تحفظ کا واحد ذریعہ ہے۔ اس امر کا اظہار بھی کیا گیا ہے کہ مجاہدین اگرچہ کٹھن راہوں کی جادہ پیمائی کرتے ہیں لیکن بالآخر کامیابی اُن کے قدم چومتی ہے اور وہ اچھے انجام سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جہاد سے کنارہ کشی کرنے والے بزدل لوگ وقتی طور پر آرام ضرور کرتے ہیں لیکن آخر میں نہ ختم ہونے والی تھکن اور پشیمانی اُن کا مقدر ٹھہرتی ہے۔"[3]

آزمائش، تربیت اور اصلاح

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ذٰلِكَ ۛ وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَاۡ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ۗ وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝﴾

"(حکم) یہی ہے اور اگر اللہ چاہتا (تو خود ہی) ان سے بدلہ لے لیتا لیکن (اس

[1] تفسير ابن كثير:262/1. [2] تفسير الكشاف للزمخشري:382/1، وتفسير أبي السعود:245/1.
[3] تفسير السعدي:309/1.

نے تمھیں حکم دیا ہے) تاکہ وہ تمھیں ایک دوسرے سے آزمائے اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل (شہید) کیے گئے تو اللہ ان کے اعمال ہرگز ضائع نہیں کرے گا۔''[1]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے ﴿وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَاْ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ﴾ کی تفسیر میں لکھا ہے:
''مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاد و قتال کو احکام شریعت کی فہرست میں شامل کیا تاکہ تمھارا امتحان کرلے اور تمھیں آزمائے۔ باری تعالیٰ نے دین میں جہاد کو فرض قرار دینے کی حکمت اس آیت میں بھی بیان فرمائی ہے:

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ۝﴾

''کیا تم یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ تم (سیدھے) جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون لوگ اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور صبر کرنے والے ہیں۔''[2]

سید قطب رقم طراز ہیں: ''اللہ رب العزت نے اہل ایمان کو یہ حکم دیا کہ وہ کافروں کی گردنیں مارنے اور اچھی طرح خونریزی کرنے کے بعد اُنھیں قیدی بنائیں تو گویا اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اہل ایمان کو اپنی قدرت کے لیے حجاب بنایا۔ وہ چاہتا تو کافروں سے بذات خود انتقام لے لیتا لیکن وہ اپنے مومن بندوں کی بہتری اور بھلائی کا ارادہ کرتا ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝﴾

''تم پر جہاد فرض کر دیا گیا ہے اور وہ تمھارے لیے ناگوار ہے اور ممکن ہے کہ تم کسی

[1] محمد 4:47. [2] آل عمرٰن 142:3، و تفسیر ابن کثیر: 154/4.

چیز کو ناپسند کرو اور وہ تمھارے لیے بہتر ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمھارے لیے بری ہو اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔'' [1]

دراصل رب تعالیٰ شانہٗ اپنے بندوں کو آزماتا، اُن کی تربیت و اصلاح کرتا اور اُن کے لیے کار ہائے نمایاں انجام دینے کی راہیں ہموار کرتا ہے۔ اس اجمال کی قدرے تفصیل ذیل میں لکھی جاتی ہے:

آزمائش: اللہ تعالیٰ آزمائش کے ذریعے سے مومنین کے دلوں میں ایک ایسا جذبہ پیدا کرنا چاہتا ہے جس سے عظیم تر جذبہ کسی انسان کے دل میں پیدا نہیں ہوسکتا۔ اس سے بڑھ کر پُرعظمت جذبہ اور کیا ہوگا کہ آدمی جس بات کو حق جانتے ہوئے اُس پر ایمان لے آئے، وہ اُس کی زندگی میں ایسی اہمیت اختیار کر جائے کہ آدمی اُس کی بقا کے لیے مرنے مارنے پر اتر آئے۔ اُس کے علاوہ اور کوئی بات آدمی کی نظروں میں نہ جچے۔ وہ اُس پر دل و جان سے نچھاور ہو اور اُس کے بغیر زندگی کا تصور محال ہو۔

تربیت: اللہ تعالیٰ مومنین کے دلوں سے فانی دنیا کے مال و متاع کی رغبت اور نفسانی خواہش نکال باہر کرتا ہے۔ یوں اُن کے قلوب تمام نقائص سے پاک ہوجاتے ہیں اور حالت یہ ہو جاتی ہے کہ میزان کے ایک پلڑے میں اُن کی آرزوئیں رکھی جائیں اور دوسرے میں شوق جہاد، حصول رضائے الٰہی کے جذبے اور اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی تمنا کو رکھا جائے تو یقیناً دوسرا پلڑا ہی بھاری ہوگا۔ اُنھیں نیکی اور بدی کے دونوں راستے دکھائے گئے ہیں لیکن انھوں نے نیکی کے راستے کا انتخاب کیا۔ اُنھیں یہ عرفان تربیت الٰہی کے طفیل حاصل ہوا ہے۔ اب وہ بنا سوچے سمجھے ایک راہ پر نہیں چل پڑیں گے بلکہ اوّل غور وفکر کریں گے، تدبر سے کام لیں گے، پھر انتخاب کریں گے۔

اصلاح: جہاد فی سبیل اللہ میں موت سے پنجہ آزمائی کا عمل نفسِ انسانی کو خطرات سے

[1] البقرۃ 2:216.

کھیلنے کا عادی بنا دیتا ہے۔ جنگ کی خوفناکیاں اُس کے نزدیک بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ معرکہ آرائی کے نازک لمحوں میں اللہ کی مدد کا خیال قلب و روح کو بالیدگی بخشتا اور انھیں صدق و صفا اور اخلاص کے نئے سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔

یہ بات طے ہے کہ نوعِ انسانی کی اصلاح کے لیے یہی طریقے کارگر ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ قیادت مجاہدین کے ہاتھ میں ہو جن کے قلوب دنیا اور اُس کے مال و متاع کی محبت سے خالی ہوتے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں چلتے ہوئے موت کی وادیوں میں اترتے ہیں۔ اُن کے دل اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہوتے۔ اُس کی رضا جوئی اُن کا مطمحِ نظر ٹھہرتی ہے۔ بنی آدم کی قیادت ایسے افراد کے ہاتھوں میں آئے گی تو روئے زمین پر اصلاح اور فلاح و بہبود کا عمل جاری و ساری ہوگا اور لوگوں کے حالات میں بہتری آئے گی۔ ایسے قائدین کو کسی طرح گوارا نہیں ہوگا کہ وہ زمامِ اقتدار کافروں اور گمراہانِ ملت کے ہاتھوں میں جانے دیں جبکہ اُنھوں نے اُسے نقدِ جاں کی قربانی دے کر حاصل کیا تھا۔'' [1]

کافروں کو دہشت زدہ، مرعوب و رسوا کرنا اور اُن کی تدابیر کو ناکارہ کرنا

ارشادِ ربانی ہے:

﴿ وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِن دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ ۚ وَمَا تُنفِقُوا مِن شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لَا تُظْلَمُونَ ○ ﴾

''اور ان (کافروں کے مقابلے) کے لیے تم مقدور بھر قوت اور بندھے ہوئے گھوڑے تیار رکھو جن سے تم اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو اور ان کے علاوہ دوسروں کو ڈرائے رکھو جنھیں تم نہیں جانتے (مگر) اللہ انھیں جانتا ہے اور تم اللہ کی راہ میں جو کچھ خرچ

[1] تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب:3286/6.

کرو گے تمھیں (اس کا) پورا پورا ثواب دیا جائے گا۔اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔'' [1]

اللہ جل شانہٗ نے دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿قٰتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ۗ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝﴾

''ان سے (خوب) لڑائی کرو، اللہ انھیں تمھارے ہاتھوں سے عذاب دے گا اور انھیں رسوا کرے گا اور ان کے خلاف تمھاری مدد کرے گا اور مومنوں کے سینوں کو شفا (ٹھنڈک) بخشے گا۔ اور وہ ان کے دلوں کا غصہ دور کرے گا اور اللہ جس پر چاہے توجہ فرماتا ہے۔ اور اللہ خوب جاننے والا، خوب حکمت والا ہے۔'' [2]

مزید ارشادِ الٰہی ہے:

﴿فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۚ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ۚ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ۝﴾

''چنانچہ تم نے انھیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ ہی نے انھیں قتل کیا اور (اے نبی!) جب آپ نے (مٹھی بھر خاک ان کی طرف) پھینکی تو وہ آپ نے نہیں پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی اور تاکہ وہ مومنوں کو اپنی طرف سے اچھے انعام سے نوازے، بے شک اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔ یہ تھی بات (ہماری حکمت) اور بے شک اللہ کافروں کی چال کمزور کرنے والا ہے۔'' [3]

منافقین کی پردہ دری

رب تعالیٰ نے فرمایا:

---

[1] الأنفال 8:60. [2] التوبة 9:14,15. [3] الأنفال 8:17,18.

﴿مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِىْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ﴾

''اللہ مومنوں کو اس حالت میں ہرگز نہ رہنے دے گا جس میں تم اس وقت ہو، یہاں تک کہ وہ پاک کو ناپاک سے علیحدہ کر دے اور اللہ کا یہ طریقہ نہیں کہ وہ تم پر غیب ظاہر کرے لیکن اللہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے (غیب کی باتیں بتانے کے لیے) چن لیتا ہے، پس تم ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسولوں پر اور اگر تم ایمان لاؤ گے اور پرہیزگاری اختیار کرو گے تو تمھارے لیے بہت بڑا اجر ہے۔''[1]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''مطلب یہ ہے کہ ابتلاء و آزمائش کا سلسلہ قائم کرنا ضروری ہے تاکہ اللہ کے دوست اور دشمن کھل کر سامنے آ جائیں۔ باصبر مومن اور منافق فاجر بھی آشکار ہو جائیں۔ اس سے مراد یوم احد ہے جس روز اللہ تعالیٰ نے مومنین کا امتحان لیا۔ یوں اُن کا ایمان اور صبر و ثبات ظاہر ہو گیا اور معلوم ہوا کہ یہی سعادت مند افراد اللہ تعالیٰ کے سچے اطاعت گزار ہیں۔ اُس دن حق تعالیٰ شانہٗ نے منافقین کا پردہ چاک کیا، چنانچہ دین کے لیے اُن کے مخالفانہ عزائم عیاں ہو گئے اور یہ بات شیشہ ہوئی کہ وہ جہاد سے کنی کتراتے ہیں اور اللہ و رسول سے مخلص نہیں ہیں۔''[2]

اقامتِ دین

زمین پر اللہ کے دین کی حکمرانی قائم کرنا جہاد کے اہداف میں شامل ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ﴾

[1] آل عمرٰن 3:179۔ [2] تفسیر ابن کثیر: 1/371۔

وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا۝﴾

''(اے نبی!) بے شک ہم نے آپ کی طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے تاکہ آپ کو اللہ نے جو سیدھی راہ دکھائی ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں اور آپ خیانت کرنے والوں کے حمایتی نہ بنیں۔''[1]

کافروں کے ظلم وستم کا خاتمہ

اسلام میں جہاد کی ایک غرض وغایت یہ بھی ہے کہ کافروں کے ظلم وستم کا خاتمہ کیا جائے۔

(ا) اُن کے ظلم وستم کی ایک جہت یہ ہے کہ وہ اپنے علاقے میں رہنے والی مجبور وبے بس مسلم اقلیت پر ظلم ڈھاتے ہیں۔ بالخصوص جبکہ مسلم اقلیت کے لیے ممکن نہ ہو کہ وہ ہجرت کرکے کسی اور علاقے میں منتقل ہو جائے جہاں اُس کا دین وایمان سلامت رہے۔ ایسی صورتحال میں اسلامی ریاست کا فریضہ ہے کہ وہ ظالموں سے جہاد کرے اور مسلم اقلیت کو اُن کے چنگل سے چھڑائے۔[2] ارشادِ الٰہی ہے:

﴿فَلْيُقَاتِلْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ؕ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا۝ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا۝﴾

''پھر جو لوگ آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی بیچ چکے ہیں، انھیں چاہیے کہ وہ اللہ کے راستے میں لڑیں اور جو شخص اللہ کے راستے میں لڑے، پھر وہ قتل کر دیا جائے یا غالب آجائے تو ہم جلد اسے بہت بڑا اجر دیں گے۔ اور (اے مسلمانو!) تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کے راستے میں کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کی

1 النسآء 4:105. 2 الجهاد في سبيل الله للدكتور عبدالله القادري: 2/162.

خاطر نہیں لڑتے، جو کہتے ہیں: ”اے ہمارے رب! ہمیں اس بستی سے نکال کہ اس کے باشندے ظالم ہیں اور ہمارے لیے اپنی طرف سے کوئی حمایتی بھیج اور ہمارے لیے اپنی طرف سے کوئی مددگار بھیج۔“ [1]

امام قرطبی رحمہ اللہ نے آیت کے ذیل میں لکھا: ”یہ جہاد کی ترغیب ہے۔ کمزور و بے بس افراد کو کافروں اور مشرکین کے خونیں پنجے کی گرفت سے آزاد کرانا بھی اسی میں شامل ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اعلائے کلمۃ اللہ، غلبۂ دین اور بے بس مسلمانوں کو ظالم کافروں کے ستم سے بچانے کے لیے جہاد فرض قرار دیا۔ ہر چند اس راہ میں جانیں تلف ہوتی ہیں، امت مسلمہ پر واجب ہے کہ وہ مسلم قیدیوں کی بازیافت کے سلسلے میں کوشش کرے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے جنگ کرنی پڑے تو دریغ نہ کیا جائے، مال خرچ کرنا پڑے تو تردد نہ ہو، ویسے بھی انسانی جان کے مقابلے میں مال و متاع کی حیثیت ہی کیا ہے؟“ [2]

(ب) اور یہ کہ کافروں کے لشکر مسلم علاقوں پر حملہ آور ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ○ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ۗ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ○ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○﴾

”اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو (جہاد کرو) جو تم سے لڑتے ہیں اور تم زیادتی نہ کرو، بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور تم انھیں جہاں بھی پاؤ ان کو قتل کر دو اور تم انھیں نکال دو جہاں سے انھوں نے تمھیں نکالا اور فتنہ قتل سے زیادہ سخت (گناہ) ہے اور تم ان سے مسجد حرام کے پاس نہ لڑو یہاں تک کہ

[1] النسآء 4:74، 75. [2] تفسیر القرطبي: 5/279.

وہ اس میں تم سے لڑیں، پھر اگر وہ تم سے لڑیں تو تم انھیں قتل کرو، ایسے کافروں کی یہی سزا ہے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو بے شک اللہ بہت بخشنے والا، بہت رحم کرنے والا ہے۔''[1]

فقہاء کا کہنا ہے کہ کافروں کے لشکر مسلم علاقوں پر حملہ آور ہوں تو اپنی سرزمین کے دفاع میں مسلمانوں پر جہاد فرضِ عین قرار پاتا ہے۔ اس لیے کہ اگر دشمن مسلم علاقوں پر قابض ہو گیا تو وہاں کے باسیوں پر ظلم کرے گا، کفر کی حکومت قائم کرے گا اور مسلمانوں کو مجبور کرے گا کہ وہ باطل نظام قبول کریں۔ یوں دارالاسلام، دارالکفر کی حیثیت اختیار کر جائے گا۔

فقیہ ابن قدامہ رحمہ اللہ نے لکھا: ''تین موقعوں پر جہاد فرض عین ہو جاتا ہے۔...... دوسرا موقع: کافروں کی فوجیں مسلم علاقے پر دھاوا بول دیں تو اہل علاقہ پر فرض ہے کہ وہ جنگ کرکے اُنھیں وہاں سے دفع کریں۔''[2]

احناف کے ایک عالم لکھتے ہیں: ''ہر وہ جگہ جہاں دشمن کے حملے کا خطرہ ہو، خلیفہ پر یا اُس جگہ کے مکینوں پر فرض ہے کہ اُس کی حفاظت کریں۔ اگر وہ اس پر قادر نہ ہوں تو قریب ترین علاقے کے لوگوں پر واجب ہے کہ اُن کی مدد کریں تاکہ وہ ڈٹ کر دشمن کا مقابلہ کرسکیں۔''[3]

(ج) اور یہ کہ دشمن اپنی رعایا کو، خواہ وہ غیر مسلم ہی ہو، تعذیب کا نشانہ بنائے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنے بندوں پر ظلم کو حرام قرار دیا ہے۔ عدل و انصاف انسان کا بنیادی حق ہے۔ مسلم امہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ مظلوموں کی دادرسی کرے اور انھیں ظلم و ستم سے نجات دلائے۔ ورنہ سب مسلمان گناہ گار ہوں گے۔ جہاد کرنے کا حکم بھی اسی وجہ سے دیا گیا ہے کہ روئے زمین پر عدل و انصاف کا دور دورہ ہو، ظلم کا خاتمہ ہو، حق غالب آئے اور باطل مٹ جائے۔ امتِ مسلمہ کے لیے دنیا و آخرت کی کامیابی کا راز جہاد ہی میں مضمر ہے۔

[1] البقرة2:190-192. [2] المغني لابن قدامة:279/9. [3] حاشية ابن عابدين:124/4.

یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ایک صورت ہے۔ مسلمان جب تک یہ فریضہ انجام نہیں دیتے، بہترین امّت کے منصب پر فائز نہیں ہو سکتے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝﴾

''تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی اصلاح) کے لیے پیدا کی گئی ہے، تم نیک کاموں کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو اور تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اگر اہل کتاب ایمان لے آتے تو ان کے حق میں بہت بہتر ہوتا۔ ان میں بعض ایمان والے بھی ہیں مگر ان کے اکثر نافرمان ہیں۔''[1]

اسی طرح ایک اور مقام پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ؗ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ؗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم اللہ کے لیے (حق پر) قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو اور کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل نہ کرو، عدل کرو، یہی بات تقویٰ کے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرو، بے شک تم جو عمل کرتے ہو اللہ اس سے خوب آگاہ ہے۔''[2]

غیر مسلم مظلوم کو ظلم سے نجات دلانا بھی عدل و انصاف کے تقاضوں میں شامل ہے۔

فقیہ سرخسی نے تحریر کیا: ''غیر مسلم سلطنت (جو مسلمانوں کے زیر نگیں آ چکی ہو) کا بادشاہ یہ اجازت چاہے کہ اُسے اپنی رعایا کے متعلق کھلی چھٹی دے دی جائے اور وہ اُن سے

1 اٰل عمرٰن 110:3. 2 المآئدة 8:5.

جیسا چاہے سلوک کرے تو اس کا مطالبہ منظور نہیں کیا جائے گا۔ ظلم کو روکنے کی طاقت ہو تو اُسے دیکھ کر خاموش تماشائی بنے رہنا حرام ہے۔''[1]

(د) اور یہ کہ کافر مملکتیں داعیانِ اسلام کو دین کی تبلیغ سے روکیں اور اُن کی سرگرمیوں میں خلل انداز ہونے کی کوشش کریں۔ رب تعالیٰ شانہٗ نے مسلمانوں پر واجب کیا ہے کہ وہ اُس کا پاک پیغام ساری دنیا تک پہنچائیں۔ ارشاد فرمایا:

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○﴾

''اور تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو خیر کی طرف بلائے اور نیک کاموں کا حکم دے اور برے کاموں سے روکے۔ اور وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''[2]

اللہ کے دشمن اُس کے دوستوں کو لوگوں تک دین کا پیغام پہنچانے سے روکتے ہیں۔ وہ اُن کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ لوگ اللہ کا پیغام سنیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ نے اپنے مومن بندوں پر یہ ذمہ داری عائد کی ہے کہ وہ اس قوت سے جنگ کریں جو لوگوں کو دین کے راستے پر چلنے سے روکے۔[3] ارشادِ الٰہی ہے:

﴿اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ○ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ ○ ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَاَنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ ○ فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰٓى اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ۚ ذٰلِكَ ۛ

1. المبسوط للسّرخسي: 85/10. 2. آل عمرٰن 3:104. 3. فقه التمكين في القرآن الكريم للصلابي، ص: 488.

وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَاْ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ؕ وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ○﴾

''جن لوگوں نے کفر کیا اور (دوسروں کو) اللہ کی راہ سے روکا، اللہ نے ان کے عمل ضائع کر دیے۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے اور وہ اس (قرآن) پر بھی ایمان لائے، جو محمد (ﷺ) پر نازل کیا گیا اور وہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے، اللہ نے ان سے ان کی برائیاں دور کر دیں اور ان کے حال کی اصلاح کر دی۔ یہ اس لیے کہ بے شک جن لوگوں نے کفر کیا انھوں نے باطل کی پیروی کی اور بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے انھوں نے اپنے رب کی طرف سے حق کی پیروی کی، اللہ اسی طرح لوگوں کے لیے ان کی مثالیں بیان کرتا ہے۔ چنانچہ جب تم (جہاد میں) ان لوگوں سے ملو جنھوں نے کفر کیا تو (ان کی) گردنیں مارو، حتی کہ جب تم انھیں خوب قتل کر چکو تو (قیدیوں کو) بیڑیوں میں مضبوطی سے باندھ دو، پھر یا تو اس کے بعد ان پر احسان کرنا ہے یا فدیہ (تاوان) لینا ہے، حتی کہ لڑائی اپنے ہتھیار ڈال دے، (حکم) یہی ہے اور اگر اللہ چاہتا (تو خود ہی) ان سے بدلہ لے لیتا لیکن (اس نے تمھیں حکم دیا ہے) تاکہ وہ تمھیں ایک دوسرے سے آزمائے اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل (شہید) کیے گئے تو اللہ ان کے اعمال ہرگز ضائع نہیں کرے گا۔''[1]

درج بالا نکات سے واضح ہوا کہ جہاد عظیم تر اہداف و مقاصد کا حامل ہے۔ مسلمان تو مسلمان غیر مسلم بھی اُس کے فوائد و ثمرات سے محروم نہیں رہتے۔ جہاد ہجرت کے چند ضروری نتائج میں سے ایک ہے۔ یہ اسلامی ریاست کی پرشکوہ عمارت کا مضبوط اور ناقابلِ شکست ستون ہے۔ اسلام کے دیگر ارکان اُس کے سہارے اپنا وجود قائم رکھتے ہیں۔[2]

1 محمد47:1-4. 2 الهجرة في القرآن الكريم لأحزمي سامعون جزولي، ص:453.

اس امر کی سچائی میں دو رائیں نہیں کہ دنیا کی کوئی قوم توانا فوج کے بغیر اپنی ساکھ برقرار نہیں رکھ سکتی۔ سپاہ کی عدم موجودگی میں وہ دشمن کی سازشوں کا نشانہ بنی رہے گی اور لوگ اُس پر چڑھ دوڑنے کو تیار رہیں گے۔ جس قوم کے ہاں معقول تعداد میں فوج دستیاب ہو، دنیا کی نظروں میں اُس کا احترام بڑھ جاتا ہے اور دشمن کو اُس سے دست درازی کی جرأت نہیں ہوتی۔[1]

جنگِ بدر کبریٰ سے قبل اہم سَرَایا اور فوجی مہمات

مدینہ میں رسول اللہ ﷺ کے زیر قیادت مسلمانوں کو استحکام ملا اور جدید معاشرے میں اہل ایمان کی جماعت تشکیل پا گئی۔ اب مسلمانوں کے لیے ضروری تھا کہ وہ چوکنے رہیں، اردگرد کے حالات اور دشمن کی حرکات وسکنات پر کڑی نظر رکھیں۔ یہ بھی ضروری تھا کہ دعوت کا سفر جاری رہے۔ رب تعالیٰ نے محمد ﷺ اور آپ کے اصحاب کے کندھوں پر جو ذمہ داری ڈالی تھی، اُس سے کما حقہ عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی جائے۔

مدینہ کی قیادت پر سب سے پہلے یہ لازم تھا کہ وہ قریش مکہ کے حالات سے درست طور پر واقف ہو۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے اوّلین دشمن وہی تھے اور وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ اسلام کی عمارت اپنی بنیادوں پر استوار ہو۔ اسلام کی عمارت کی تعمیر ان کی اپنی عمارت کی تباہی کا پیش خیمہ تھی۔ اُنھیں معلوم تھا کہ اسلام کے قیام کا مطلب ہے جاہلیت اور اُس کے تمام لوازمات کا اختتام۔ اور یہ خسارہ وہ کسی صورت برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

اہلِ مکّہ نے بہت کوشش کی تھی کہ رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ نہ پہنچ پائیں۔ اسلام کا دائرہ اثر تنگ کرنے اور مسلمانوں کا خاتمہ کرنے کے لیے اُنھوں نے نہایت ظالمانہ

1 الحركات العسكرية للرسول الأعظم ﷺ لسيف الدين، ص: 62.

اقدامات کیے تھے۔[1] ہجرتِ نبوی کے بعد بھی اُن کی عداوت میں کمی نہ آئی بلکہ بغض و حسد کی آگ اور ہی بھڑکی۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے متعلق بیان کیا ہے کہ امیہ بن خلف سے اُن کی گہری دوستی تھی۔ امیہ جب کبھی مدینہ آتا، سعد رضی اللہ عنہ کے ہاں ٹھہرتا اور سعد رضی اللہ عنہ جب مکہ جاتے تو امیہ کے ہاں قیام کرتے تھے۔ ہجرتِ نبوی کے بعد سعد رضی اللہ عنہ عمرہ کرنے مکہ گئے اور حسب معمول امیہ کے پاس ٹھہرے۔ اُنھوں نے امیہ سے کہا:

''مجھے تنہائی کا ایسا وقت بتانا کہ بیت اللہ کا طواف کرسکوں۔'' امیہ سعد رضی اللہ عنہ کو لیے دوپہر کے وقت باہر نکلا۔ راستے میں اُن کی ملاقات ابوجہل سے ہوئی۔ اُس نے امیہ کو مخاطب کر کے کہا: ''ابوصفوان! یہ کون ہے آپ کے ساتھ؟'' امیہ نے جواب دیا: ''یہ سعد ہیں۔'' اُس نے سعد کی طرف دیکھا اور نتھنے پُھلا کر کہا: ''اچھا تو تم مکہ میں بڑے آرام سے طواف کررہے ہو۔ اُدھر تم نے بے دینوں کو پناہ دے رکھی ہے اور سمجھتے ہو کہ اُن کی مدد کررہے ہو؟ واللہ! اگر تم ابوصفوان (امیہ کی کنیت) کے ہمراہ نہ ہوتے تو صحیح سلامت گھر نہ لوٹتے۔''

سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے ابوجہل کی دھونس کا ذرّہ برابر اثر نہ لیا اور الٹا غصّے سے چلّا کر کہا: ''کان کھول کر سن لو، اگر تم نے مجھے یہاں آنے اور طواف کرنے سے روکا تو میں تم سے ایسا بدلہ لوں گا جو تمھارے لیے بہت زیادہ سخت ہے۔ میں تمھارے لیے مدینے کی شاہراہ بند کردوں گا۔''

اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

''واللہ! اگر تم نے مجھے بیت اللہ کا طواف کرنے سے روکا تو میں شام کی طرف تمھاری تجارت کا راستہ کاٹ دوں گا۔''[2]

---

[1] مرويات غزوة بدر لأحمد باوزير، ص:79. [2] صحيح البخاري، حديث:3950و3632.

اس واقعے سے پتا چلتا ہے کہ ابو جہل، سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو قریش کا دشمن سمجھتا تھا۔ اُن کی مکہ آمد سردار قریش امیہ بن خلف کی امان میں نہ ہوتی تو یقیناً اُن کی جان خطرے میں پڑ جاتی۔ اہلِ مدینہ کے معاملے میں رؤسائے مکہ کا یہ برتاؤ بالکل نیا تھا۔ ہجرتِ نبوی سے قبل مکہ میں اہلِ مدینہ سے کبھی یہ سلوک نہیں ہوا تھا۔ اس سے پہلے یثرب کے باشندوں کو مکہ میں داخلے کے لیے اجازت یا امان کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اس نئی صورتحال سے پیشتر اہل مکہ، یثرب والوں سے دشمنی کرنا تو درکنار، اُس کی بابت سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اُنھوں نے اہل یثرب سے کہہ رکھا تھا: ''ہمیں جس قدر آپ لوگوں سے جنگ ناپسند ہے، اُس قدر کسی اور سے نہیں۔'' [1]

سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اور ابو جہل کے اس مکالمے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس سے قبل قریش کے تجارتی قافلے بلا خوف وخطر شام کی طرف جاتے تھے اور اسلامیانِ مدینہ اُن کے راستے میں نہیں آئے تھے، نہ اُنھوں نے قریشِ مکہ سے عداوت کا معاملہ رکھا تھا۔ مسلمانوں نے اُن کا اقتصادی گھیراؤ نہیں کیا تھا۔ ایک بھی تجارتی قافلے کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ اس کا سیدھا سادا مطلب یہ ہے کہ مکہ کے اصحابِ بست وکشاد ہی نے پہل کرتے ہوئے مدینہ کی اسلامی ریاست کے خلاف اعلانِ جنگ کیا اور اُنھیں اپنا دشمن گردانا تھا کہ مکہ میں آنے کے لیے اُنھیں اجازت یا امان لینی ہوگی۔ [2]

اعلان جنگ کرنے میں پہل رؤسائے مکہ ہی نے کی، اس کی ایک اور دلیل وہ واقعہ ہے جو سنن ابی داود میں عبدالرحمٰن بن کعب بن مالک کی روایت سے بیان ہوا ہے۔ ایک صحابی نے بتایا کہ قریشِ مکہ نے عبداللہ بن ابی اور اوس وخزرج سے تعلق رکھنے والے دوسرے بت پرستوں کو خط لکھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ پہنچ چکے تھے اور یہ غزوہ بدر سے پہلے کی بات ہے۔ اُنھوں نے لکھا کہ تم لوگوں نے ہمارے آدمی کو پناہ دے

1 الروض الأنف للسهيلي: 192/2. 2 الجهاد والقتال لمحمد هيكل: 476/1.

رکھی ہے۔ ہم اللہ کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ تمھیں اُس سے لڑائی کرنی ہوگی یا اُسے یثرب سے نکال باہر کرنا ہوگا، ورنہ ہم یکبارگی تم پر حملہ آور ہوں گے، تمھارے جنگجو افراد کو قتل کردیں گے اور تمھاری عورتوں کو اپنے قبضے میں لے آئیں گے۔

عبداللہ بن اُبی اور اُس کے بت پرست ساتھیوں کو یہ خط ملا تو وہ نبی ﷺ سے لڑائی کرنے کے لیے جمع ہوگئے۔ رسول اللہ ﷺ کو اطلاع ملی تو آپ فوراً وہاں پہنچے اور اُن سے مخاطب ہوکر فرمایا: «لَقَدْ بَلَغَ وَعِيدُ قُرَيْشٍ مِّنْكُمُ الْمَبَالِغَ مَا كَانَتْ تَكِيدُكُمْ بِأَكْثَرَ مِمَّا تُرِيدُونَ أَنْ تَكِيدُوا بِهِ أَنْفُسَكُمْ، تُرِيدُونَ أَنْ تُقَاتِلُوا أَبْنَائَكُمْ وَإِخْوَانَكُمْ!» ''قریش کی دھمکی سے تم لوگ بہت زیادہ متاثر ہوگئے ہو اور وہ تمھارا اس سے زیادہ نقصان نہیں کرسکتے جتنا کہ تم اپنے ہاتھوں خود کر بیٹھنا چاہتے ہو۔ کیا تم اپنے بیٹوں اور اپنے بھائیوں سے لڑنا چاہتے ہو؟''

رسول اللہ ﷺ کی یہ باتیں سُن کر اُن کے ہوش ٹھکانے آئے اور وہ تتر بتر ہوگئے۔[1]

اس نازک موقع پر عظمتِ رسالت کا خوب اظہار ہوا اور قائد و مربی حضرت محمد ﷺ کی عبقریت ابھر کر سامنے آئی۔ آپ نے فتنے کو وہیں دبا دیا جہاں سے وہ پھوٹا تھا۔ اس مقصد کے لیے آپ نے قبائلی حمیت اور عزت نفس کے تاروں کو ذرا سا چھیڑا تھا۔ آپ کا ادراک بلاشبہ نفس کی گہرائیوں میں اترا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مشرکین یثرب کے دلوں پر آپ کی رقت انگیز باتوں کا عجیب اثر ہوا۔ آج ہمیں اس طریق کار کو اپنانے کی جتنی ضرورت ہے اُتنی شاید پہلے کبھی نہ تھی۔ مسلمانوں کی وحدت پارہ پارہ کرنے اور اسلام کی عمارت ہلا کر گرا دینے کے سلسلے میں مشرکین کی فضول کوشش کو اسی طریقے سے ناکام بنانا ہوگا۔

اب جبکہ قریش مکہ مدینے کی اسلامی سلطنت کے خلاف اعلانِ جنگ کر چکے تھے اور

[1] سنن أبي داود، حديث: 3004، و المصنف لعبد الرزاق، حديث: 9733، و دلائل النبوة للبيهقي: 180,179/3.

اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکمِ قتال نازل ہو چکا تھا، یہ ناگزیر تھا کہ ریاستِ مدینہ قریش سے معاملہ کرنے میں حالت جنگ کے تقاضوں کو پیش نظر رکھے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اسلامی ریاست کا عام تاثر درست رکھنے کی خاطر اور مشرکین کے اعلان جنگ کے ردعمل میں اپنی سرگرمیوں کا رخ فوجی مہمات کی طرف موڑ دیا۔[1]

غزوۂ بدر کبریٰ سے قبل کی فوجی مہمات (سَرَایا) اور غزوات کی تفصیل حسب ذیل ہے:

غزوۂ ابواء

پہلا غزوہ جس میں نبی کریم ﷺ نے شرکت کی، غزوۂ ابواء ہے۔ یہ معرکہ غزوۂ ودّان کے نام سے بھی معروف ہے۔ ابواء اور ودّان دو ہمسایہ علاقے ہیں۔ دونوں کا درمیانی فاصلہ چھ یا آٹھ میل ہے (ابواء مدینے سے جنوب مغرب کی طرف تہامہ والے علاقے میں 23 میل کے فاصلے پر واقع ہے۔) اس غزوے میں لڑائی کی نوبت نہیں آئی اور مسلمانوں نے کنانہ کے قبیلے بنوضمرہ سے صلح کر لی۔ غزوۂ ابواء صفر 2 ہجری میں پیش آیا۔ مسلمان سوار و پیادہ سپاہیوں کی تعداد دوسو (200) تھی۔[2]

سریۂ عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ

رسول اللہ ﷺ نے اس مہم کے سالار کو اسلام کا پہلا عَلَم باندھ کر دیا۔[3] مجاہدین کی تعداد ساٹھ تھی جو تمام مہاجرین تھے۔ (200) مشرک سوار و پیادہ سپاہیوں سے اُن کی ڈبھیڑ ہوئی جو ابوسفیان بن حرب کی سرکردگی میں آئے تھے۔ وادیِ رابغ (یہ بحیرۂ قلزم کے ساحل پر جدہ سے ینبع کے تقریباً وسط میں ہے۔ مدینہ منورہ سے رابغ کا فاصلہ تقریباً 240 کلومیٹر ہے۔ (اٹلس سیرت نبوی (اردو) ص:194) کے ایک چشمے پر فریقین کے

[1] الجهاد والقتال لمحمد هيكل: 477/1. [2] جيش النبي ﷺ لمحمود شيت خطاب، ص: 54.
[3] الطبقات الكبرىٰ لابن سعد: 7/2.

درمیان جھڑپیں ہوئیں۔ اس لڑائی کے دوران سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے اسلام کا اولین تیر برسایا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مہم غزوۂ ابواء سے واپسی پر روانہ کی تھی۔ [1]

سریۂ حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ

ابن اسحاق کا بیان ہے: ”نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ ابواء سے لوٹ کر مدینہ پہنچے تو حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کو تیس مہاجر شہ سواروں کے ہمراہ عیص کی جانب ساحلِ قلزم پر بھیجا۔ (یہ مقام رابغ کے شمال میں 30 کلومیٹر کے فاصلے پر ینبع کی طرف واقع ہے۔ اٹلس سیرت نبوی (اردو) ص:194) ساحل پر ابوجہل بن ہشام سے اُن کا ٹاکرا ہوا جس کے ساتھ تین سو گھڑ سوار تھے۔ مجدی بن عمرو جہنی آڑے آیا جو فریقین کا حلیف تھا۔ اُس نے دونوں لشکروں میں صلح کرادی اور وہ بغیر کسی کشاکش کے واپس آ گئے۔ [2]

غزوۂ بواط

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ماہ ربیع الاوّل 2 ہجری میں اپنے دوسو (200) اصحاب کو لیے بواط کی طرف روانہ ہوئے۔ (یہ مقام مدینہ سے ینبع کی طرف تقریباً 100 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اٹلس سیرت نبوی (اردو) ص:204) مقصد یہ تھا کہ قریش کے ایک قافلے کو جالیں۔ قافلے کا سردار امیہ بن خلف تھا۔ سو آدمی اُس کے ہمراہ تھے۔ یہ قافلہ خوراک سے لدے پھندے ڈھائی ہزار اونٹوں پر مشتمل تھا لیکن لڑائی نہیں ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ لوٹ آئے۔

غزوۂ عُشَیرہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کی ذمہ داری ابوسلمہ بن عبدالاسد کو سونپی اور خود قریش سے

---

1 حديث القرآن عن غزوات الرسول لأبي بدر محمد بكر آل عابد: 40/1. 2 السيرة النبوية لابن هشام: 595/1.

دو دو ہاتھ کرنے عشیرہ کی جانب چل پڑے۔ (عُشَیرہ مکہ اور مدینہ کے درمیان ینبع کی جانب بحیرہ احمر کے ساحل پر واقع ہے۔مراصد الاطلاع:943/2، یہ مدینہ سے 130 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔اٹلس سیرت نبوی (اردو) ص:208) وہاں آپ ﷺ نے جمادی الاولیٰ کا پورا مہینہ اور جمادیٰ الثانیہ کی چند راتیں قیام کیا۔ اس دوران آپ نے بنومدلج اور اُن کے دوست قبیلے بنوضمرہ سے حلیفانہ معاہدے کیے اور مدینہ واپس آ گئے۔ جنگ وجدل سے واسطہ نہیں پڑا۔ وجہ یہ ہوئی کہ سامان تجارت اٹھائے شام کی طرف جانے والا قافلہ جس کا آپ ﷺ نے قصد کیا تھا، چند دن پہلے یہاں سے گزر چکا تھا۔ واپسی پر قافلے نے ساحلِ سمندر کا راستہ اپنایا۔

قریش کو خبر ہوئی کہ قافلہ مسلمانوں کی گرفت میں آنے ہی والا ہے تو وہ اُس کے دفاع کے لیے نکلے اور رسول اللہ ﷺ سے اُن کا آمنا سامنا ہوگیا۔ بدر کی بڑی لڑائی اسی موقع پر ہوئی۔ [1]

سریۂ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ

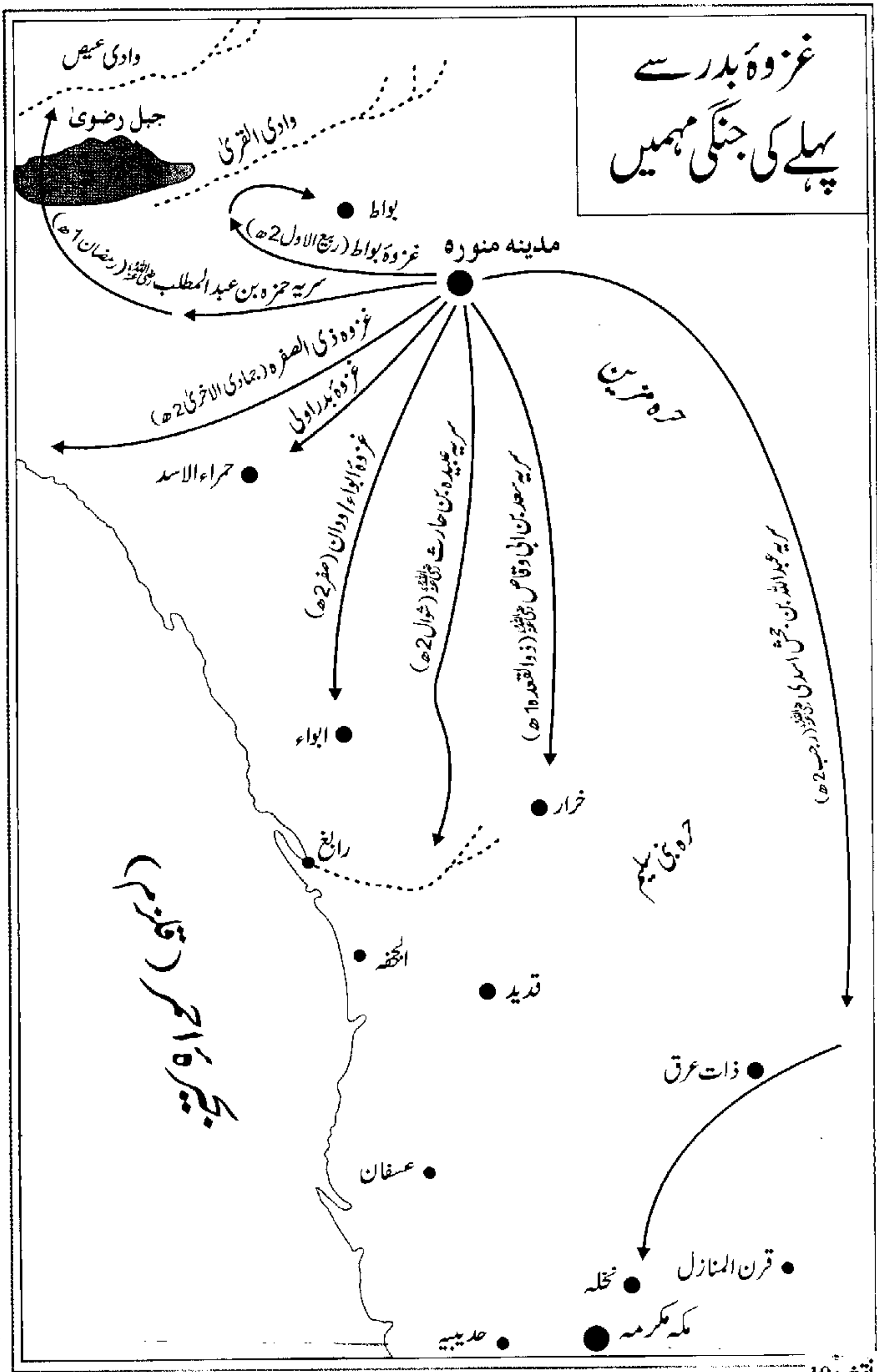
غزوۂ عشیرہ کے بعد نبی کریم ﷺ نے سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو آٹھ مہاجرین کی کمان دے کر ایک فوجی مہم پر روانہ کیا۔ وہ سرزمین حجاز میں خرار تک گئے تھے۔ (یہ جحفہ کے نزدیک ایک جگہ کا نام ہے۔)، پھر واپس آئے اور جھڑپ نہیں ہوئی۔ [2]

غزوۂ بدر اولیٰ

اس غزوے کا باعث یہ ہوا کہ کرز بن جابر فہری نے مدینے کی چراگاہ پر ڈاکا ڈالا اور کچھ اونٹ اور مویشی ہانک کر لے گیا۔ رسول اللہ ﷺ اُس کے تعاقب میں بدر کی طرف وادی سفوان تک گئے۔ (جو مدینہ سے 150 کلومیٹر کی مسافت پر ہے) لیکن کرز بن جابر

[1] الطبقات الکبریٰ لابن سعد: 11/2. [2] السیرۃ النبویۃ لابن ہشام:600/2.

غزوۂ بدر سے پہلے کی جنگی مہمیں



نقشہ: 10

فہری ہاتھ نہ آیا۔ آپ ﷺ وہاں سے مدینہ لوٹ آئے۔ [1]

سریۂ عبداللہ بن جحش اسدی رضی اللہ عنہ

رسول اللہ ﷺ نے ماہِ رجب کے آخری روز عبداللہ بن جحش اسدی رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں آٹھ مہاجرین کو جنوبی مکہ میں وادیِ نخلہ کی جانب بھیجا کہ قریش کے حالات کا پتہ لگائیں۔ (یہ وادی مکہ سے طائف کے راستے پر واقع ہے۔ اٹلس سیرت نبوی (اردو) ص: 212) گئے تو یہ لوگ اسی کام سے تھے لیکن راستے میں قریش کے ایک تجارتی قافلے سے ٹکر ہوگئی۔ عبداللہ بن جحش اور اُن کے ساتھیوں نے قافلے کے سردار عمرو بن حضرمی کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور قافلے کا سامان لوٹ لیا۔ واپسی پر دو آدمیوں عثمان بن عبداللہ اور حکم بن کیسان کو قیدی بنا کر ساتھ لیتے آئے۔ مدینہ پہنچے تو رسول اللہ ﷺ نے غنائم کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھا، یہاں تک کہ اُن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا اذن اترا:

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝﴾

''(اے نبی!) لوگ آپ سے حرمت والے مہینے کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ اس میں لڑائی کیسی ہے؟ کہہ دیجیے: اس میں لڑائی کرنا بہت بڑا گناہ ہے اور لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکنا اور اللہ کے ساتھ کفر کرنا اور مسجد حرام سے (روکنا)

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 601/2.

اور حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بھی بڑا (گناہ) ہے اور فتنہ انگیزی قتل سے کہیں بڑا گناہ ہے۔ اور وہ (کافر) تو ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ اگر ان کا بس چلے تو وہ تمھیں تمھارے دین سے پھیر دیں اور تم میں سے جو شخص اپنے دین سے پھر جائے، پھر وہ حالت کفر ہی پر مر جائے تو انھی لوگوں کے اعمال دنیا اور آخرت (دونوں) میں برباد ہو گئے اور وہ لوگ دوزخی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''[1]

حکم الٰہی نازل ہوا تو نبی ﷺ نے قافلے کا سامان اور دونوں قیدی قبضے میں لے لیے۔ اس مہم میں مسلمانوں کو پہلی بار مالِ غنیمت حاصل ہوا۔ عمرو بن حضرمی اہل ایمان کی طرف سے قریش کا پہلا مقتول تھا۔ عثمان بن عبداللہ اور حکم بن کیسان بھی اسلامیانِ مدینہ کے اولین قیدی تھے۔[2]

یہ مہم حرمت کے مہینے رجب میں روانہ کی گئی تھی۔ رجب کا آخری دن تھا۔ اچانک قافلہ اُن کے سامنے آ گیا تو اُنھوں نے مشاورت کی کہ آج رجب کا آخری دن ہے۔ ہم ان سے لڑتے ہیں تو حرمت کے مہینے کی بے حرمتی ہوتی ہے اور اگر چھوڑ دیتے ہیں تو یہ لوگ حرم میں داخل ہو جائیں گے۔ بہر حال سب کا اتفاق اسی پر ہوا کہ لڑائی کی جائے، چنانچہ اُنھوں نے قافلے پر ہلا بول دیا اور لڑائی کی اور قیدی بھی بنا لائے۔ رسول اللہ ﷺ نے عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ اور اُن کے ساتھیوں کی اس کارروائی کو درست نہ جانا اور فرمایا:

«مَا أَمَرْتُكُمْ بِقِتَالٍ فِي الشَّهْرِ الْحَرَامِ»

''میں نے تمھیں حرمت والے مہینے میں لڑائی کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔''

اس پر مذکورہ آیت نازل ہوئی۔[3]

1 البقرة 217:2. 2 السيرة النبوية لابن هشام: 604/2. 3 السيرة النبوية لابن هشام: 604/2، ودلائل النبوة للبيهقي: 19/3.

دروس اور حکمتیں

جہاد کو حکم شریعت کا درجہ کب ملا؟

ڈاکٹر ابوشہبہ کے بقول جہاد کو 2 ھ کے اوائل میں فرض کا درجہ ملا تھا۔ اُن کا کہنا ہے کہ ہجرت کے پہلے سال مسلمانانِ مدینہ اپنے دینی و دنیاوی امور کو منظّم کرنے میں مصروف رہے۔ اُنھوں نے مسجد نبوی تعمیر کی۔ اُن کا پورا دھیان مدینے کے سماجی و سیاسی استحکام کی طرف رہا۔ مواخات عمل میں آئی اور مدینہ کے یہودی مکینوں کے شر سے محفوظ رہنے کے لیے اُن سے معاہدے کیے گئے۔[1]

اس کے برعکس پروفیسر صالح شامی نے لکھا: ''جہاد کی اجازت 1 ہجری کے اواخر میں دی گئی تھی۔''[2]

سَرِیّہ اور غزوہ میں فرق

تقریباً تمام سیرت نگاروں نے مسلمانوں کی اُس فوجی مہم کو ''غزوہ'' کا نام دیا ہے جس کی عنان قیادت رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ دشمن سے ٹکراؤ چاہے ہوتا یا نہ ہوتا اور مجاہدین کی تعداد بھی تھوڑی ہوتی یا زیادہ، اسے غزوہ ہی کہا جاتا تھا۔

اور اکثر سیرت نگاروں نے مسلمانوں کی اُس فوجی مہم کو ''سریّہ'' یا ''بعث'' لکھا ہے جسے رسول اللہ ﷺ روانہ کرتے اور اُس میں بنفس نفیس شریک نہیں ہوتے تھے۔ اس میں کبھی لڑائی ہوتی اور کبھی نہ ہوتی۔ بعض اوقات ایسے دستے دشمن کے حالات معلوم کرنے کے لیے بھی روانہ کیے جاتے تھے۔ عربی میں ''سریّہ'' کی جمع ''سرایا'' آتی ہے۔ سرایا میں شمولیت کرنے والے سپاہیوں کی تعداد عموماً تھوڑی ہوتی تھی۔

[1] السيرة النبوية لأبي شهبة: 76,75/1. [2] من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 175.

دراصل سرایا میں کوئی باقاعدہ جنگ نہیں لڑی جاتی تھی۔ اُن کا مقصد اتنا ہوتا تھا کہ دشمن سے نوک جھونک کر کے اُسے الجھن میں ڈالا جائے اور ڈرایا دھمکایا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے ستائیس غزوات کی قیادت کی اور اڑتیس فوجی مہمیں (سرایا) روانہ کیں۔ یہ تمام غزوات و سرایا دس برس کے قلیل عرصے میں وقوع پذیر ہوئے جو قوموں کی زندگی میں نہایت مختصر وقت شمار ہوتا ہے۔[1]

اہلِ مدینہ کی مردم شماری اور سرایا سے اُس کا تعلق

ہجرت کے پہلے سال مواخات کے فوراً بعد رسول اللہ ﷺ نے اہل مدینہ کی مردم شماری کرائی۔ صرف مسلمانوں کو شمار کیا گیا۔ روایت کے مطابق آپ ﷺ نے حکم دیا تھا: «اُكْتُبُوا لِي مَنْ تَلَفَّظَ بِالْإِسْلَامِ مِنَ النَّاسِ» ''جن افراد نے اسلام کا کلمہ پڑھا ہے اُن کے نام لکھ دیں۔''[2] جنگ کے قابل افراد کی تعداد پندرہ سو (1500) نفوس تک پہنچی۔[3] مردم شماری مکمل ہوئی تو مسلمانوں کی محفلوں میں ایک سوال کا بڑا چلن ہوا۔ مسلمان حیرت کا اظہار کرتے ہوئے ایک دوسرے سے پوچھا کرتے: ''ارے واہ! ہم پندرہ سو ہیں اور پھر بھی خوفزدہ ہیں؟''

اس سے قبل مسلمان اسلحے کے بغیر نہیں سوتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اُنھیں منع کر رکھا تھا کہ کوئی آدمی رات کو اکیلا باہر نہ نکلے۔[4]

مردم شماری کے فوراً بعد سرایا کا سلسلہ شروع ہوا۔ مردم شماری کا عمل اُن انتظامی اقدامات کا حصہ تھا جو نوآموز ریاست کی ترقی وتطویر کے لیے عمل میں لائے گئے تھے۔[5]

1 في ظلال السيرة النبوية، غزوة بدر، لأبي فارس، ص: 12. 2 ملاحظہ کیجیے: صحيح مسلم، حديث: 149. 3 مجموعة الوثائق السياسية لمحمد حميد الله، ص: 65. 4 الروض الأنف للسهيلي: 43/5. 5 دراسات في عهد النبوة للدكتور عبدالرحمٰن الشجاع، ص: 163.

نبی ﷺ کی حفاظت کے لیے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا پہرہ

صحابۂ کرام نبی ﷺ کی حفاظت کے لیے پہرہ دیا کرتے تھے۔ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا بتاتی ہیں: ''ایک رات نبی ﷺ کو بے چینی کے باعث نیند نہیں آئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «لَيْتَ رَجُلًا صَالِحًا مِّنْ أَصْحَابِي يَحْرُسُنِي اللَّيْلَةَ» ''کاش! میرے اصحاب میں سے کوئی مردِ صالح آج رات یہاں پہرہ دے۔'' ابھی یہ بات ہو رہی تھی کہ باہر سے ہمیں اسلحے کی آواز سنائی دی۔ رسول اللہ ﷺ نے دریافت کیا: «مَنْ هٰذَا» ''یہ کون ہے؟'' باہر سے آواز آئی: ''یارسول اللہ! سعد ہوں۔ آپ کا پہرہ دینے آیا ہوں۔'' اب نبی ﷺ ایسے مطمئن ہو کر سوئے کہ خراٹے لینے لگے۔[1]

یہ غزوۂ بدر کبریٰ سے پہلے کا واقعہ ہے۔[2] ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس روایت سے حسب ذیل فقہی نکات پر روشنی پڑتی ہے:

① دشمن کے ناگہانی حملوں سے محفوظ رہنے کے لیے پہرے (حراسہ) کا نظام قائم کرنا شرعی اعتبار سے درست ہے۔

② جہاں احتیاط کی ضرورت ہو وہاں غفلت سے احتراز کرنا ضروری ہے۔

③ رعایا پر لازم ہے کہ وہ حاکم وقت کے تحفظ کی خاطر پہرے کا انتظام کرے۔

④ کارِ خیر میں رضا کارانہ طور پر حصہ لینے والے شخص کی تعریف کرنا اور اُس کا نام بتا دینا درست ہے۔[3]

⑤ بنوضمرہ سے طے شدہ معاہدۂ صلح کی تحریر اور اُس پر تبصرہ

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ محمد رسول اللہ (ﷺ) کی جانب سے بنوضمرہ بن بکر بن عبدمنات بن کنانہ کے لیے ایک تحریر ہے کہ اُن کے جان و مال محفوظ ہیں۔ جو

---

1 صحيح البخاري، حديث: 2885و 7231، و صحيح مسلم، حديث: 2410. 2 تفسير القرطبي:230/6. 3 ولاية الشرطة في الإسلام لنمر بن محمد الحميداني، ص:63.

شخص اُن پر حملہ آور ہوگا اُس کے خلاف اُن کی مدد کی جائے گی، الا یہ کہ وہ اللہ کے دین سے جنگ کریں۔ یہ معاہدہ تا ابد قائم رہے گا۔ نبی (ﷺ) اُنھیں جب بھی مدد کے لیے پکاریں گے وہ اُن کی آواز پر لبیک کہیں گے۔ اس کے بدلے میں اُنھیں اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی ضمانت حاصل رہے گی۔ مسلمانوں کا ہر وہ فرد جو نیکی اور تقویٰ اختیار کرے، اُس پر لازم ہے کہ ضرورت پڑنے پر اُن کی مدد کو آئے۔''[1]

رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ ابواء کے سنہری موقع سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے بنوضمرہ کے سردار سے سیاسی اتحاد کر لیا۔ بنوضمرہ کا علاقہ تزویراتی (سٹرٹیجک، جنگی حکمتِ عملی) اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ اہل مکہ اور اہل مدینہ کی سرد جنگ میں اس علاقے کی اہمیت دو چند ہوگئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اوّلین فرصت میں اس امر کو یقینی بنایا کہ اہل مدینہ اور اہل مکہ کا مسلح تصادم ہو تو بنوضمرہ غیر جانبداری کا مظاہرہ کریں۔ غزوۂ بدر کبریٰ سے پہلے تک رسول اللہ ﷺ کی حکمت عملی یہی رہی کہ مجاہدین اپنی کارروائیوں کے ذریعے سے قریش کے تجارتی قافلوں کو زچ کیے رکھیں۔ بالخصوص جبکہ تجارتی قافلوں کے ہمراہ فوج کے حفاظتی دستے نہیں ہوتے تھے اور قریش نے قافلوں کی حفاظت کے لیے اب تک کوئی موثر اقدام نہیں کیا تھا۔[2]

بنوضمرہ اور اُن کے حلیفوں کی آبادیاں مدینہ سے قریب تھیں اور بازارِ مدینہ اُن کے لیے واحد تجارتی منڈی کی حیثیت رکھتا تھا جہاں وہ اپنی معاش کا بندوبست کرنے آیا کرتے تھے۔ اُن کے سامنے سوائے اس کے اور کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ مدینہ میں قائم نوآموز اسلامی ریاست کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائیں۔ اصطلاح جدید میں اس معاہدے

[1] مجموعة الوثائق السياسية لمحمد حميد الله، ص: 220. [2] نشأة الدولة الإسلامية للدكتور عون الشريف قاسم، ص: 43.

کو ''معاہدۂ عدمِ جارحیت'' کہتے ہیں۔ [1]

مدینہ اور بنوضمرہ کے درمیان دوستی کے اس معاہدے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بعض حالات میں مسلم ریاست کا دیگر طاقتوں سے سیاسی یا اقتصادی اتحاد کر لینا سیاستِ شرعی کے اصولوں کا تقاضا ہے۔ شریعت اسلامی میں غیر مسلم قوتوں سے سیاسی اتحاد کرنے کی بنیاد موجود ہے۔ موجودہ یا ممکنہ نقصان کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہنے کے لیے بھی سیاسی اتحاد ایک ضرورت بن جاتی ہے۔ [2]

اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ سیاسی اتحاد کا عمل فریقین کے مشترکہ مفادات اور عدمِ ایذارسانی کے اصول پر مبنی ہو۔ سیاسی اتحاد کے اہداف و مقاصد معلوم و متعین اور شرعی قوانین کے مطابق ہونے چاہئیں۔ یہ بھی لازم ہے کہ اتحاد میں مسلمانوں کی رائے یا تجویز کا برابری کی سطح پر پورا پورا احترام کیا جائے۔ اس کے برعکس سیاسی اتحاد میں مسلمانوں کی حیثیت ثانوی ہو، جیسے کہ عصر حاضر کے سیاسی اتحادوں میں ہوتا ہے اور اُن کا کردار دوسروں کے کیے ہوئے فیصلے نافذ کرنے تک محدود ہو تو یہ طرزِ عمل شریعت کے کسی قاعدے قانون کے تحت نہیں آتا۔ شریعت کے مبادی ایسے سیاسی اتحاد کی تائید نہیں کرتے۔ امت کی قیادت پر فرض ہے کہ وہ سیاسی سرگرمیوں میں نبوی تعلیمات کو پیش نظر رکھے اور شریعت کے عام قاعدے: لَا ضَرَرَ وَ لَا ضِرَارَ [3] پر عمل درآمد کو یقینی بنائے، جس سے مراد یہ ہے کہ اپنے فائدے کے لیے کسی کو ضرر پہنچانا اور تکلیف دینا درست نہیں۔

شیخ مصطفیٰ زرقانے حدیث کی تشریح میں اس اصول کے متعلق لکھا: ''یہ اصول شریعت کے ارکان میں سے ہے۔ کتاب و سنت کی بیشتر نصوص اس قاعدے کی تائید کرتی ہیں۔

[1] الفقه السياسي لخالد الفهداوي، ص: 119. [2] الفقه السياسي لخالد الفهداوي، ص: 124.

[3] سنن ابن ماجه، حديث: 2340، و مسند أحمد: 313/1، و المعجم الأوسط للطبراني، حديث: 3789.

حدیث میں جس ''ضرر'' کا ذکر ہے اُس سے مراد انفرادی ضرر بھی ہے اور اجتماعی بھی۔ ضرر کو واقع ہونے سے روکنا اور واقع ہو جائے تو اُس کا مناسب تدارک اور آئندہ کے لیے سدباب کرنا ضروری ہے۔ یہ مبدا اس امر پر بھی دلالت کرتا ہے کہ اگر کسی صورت میں ضرر کو اختیار کرنا پڑے تو ہلکے ترین ضرر کا انتخاب کرنا چاہیے۔'' [1]

مسلمانوں کے لیے یہ معاہدہ عسکری اور سیاسی اعتبار سے بے حد مفید ثابت ہوا۔

اللہ کی راہ میں برسایا گیا پہلا تیر

سرایا کی تاریخ میں سریۂ عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ پہلی فوجی مہم ہے جس میں مسلمانانِ مدینہ اور مشرکین مکہ کے درمیان دو بدو لڑائی ہوئی۔ لڑائی کے دوران میں فریقین ایک دوسرے پر تیر برساتے رہے۔ اس معرکے میں جو زیادہ دیر جاری نہ رہا، سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ پہلے عرب تھے جنھوں نے اللہ کی راہ میں تیر برسایا۔ [2] معرکے کے دوران ہی میں فریقین نے میدانِ جنگ سے پسپائی اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، تاہم مسلمانوں کی پسپائی نہایت منظّم طریقے سے ہوئی جس کا سہرا حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے سر ہے۔ اُنھوں نے تیروں کی بارش کر دی اور دشمن کو اس قابل نہ چھوڑا کہ وہ جوابی حملہ کر سکے۔ یوں اُنھوں نے مسلمانوں کے لیے محفوظ اور منظّم پسپائی کی راہ ہموار کی۔ اُس روز عتبہ بن غزوان اور مقداد بن اسود رضی اللہ عنہما مسلمانوں کے کیمپ میں بھاگ آئے۔ یہ دونوں مسلمان ہو چکے تھے۔ اس ناقابلِ فراموش مہم میں اسلامیان مدینہ کی طرف سے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بازی لے گئے۔ اس کارنامے نے اُن کی عسکری تاریخ کے سنہرے اوراق میں نمایاں جگہ پائی۔ اس شاندار سریہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگی پالیسی مزید واضح کر دی جس کے مطابق آپ نے بیعت عقبہ ثانیہ کے معاہدے کی پاسداری میں غزوۂ بدر سے پہلے صرف

---

1 المدخل الفقهي للشيخ الزرقا، ص:972. 2 السرايا والبعوث النبوية للدكتور بريك محمد بريك، ص:91.

مہاجرین کی سپاہیانہ صلاحیتوں سے فائدہ اٹھالیا۔ [1]

سریہ حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ سے ماخوذ دروس وعبرتیں

جہینہ سے طے پانے والے معاہدۂ صلح کی تحریر درج ذیل ہے:

''جُہینہ کے جان و مال محفوظ ہیں۔ جو اُن پر ظلم کرے گا یا اُن سے برسر پیکار آئے گا، اُس کے خلاف اُنھیں مدد حاصل رہے گی، الا یہ کہ وہ دین (اسلام) یا اہلِ ایمان کے خلاف جنگ کریں۔ اُن کے خانہ بدوشوں میں سے جو شخص نیکی اور تقویٰ اختیار کرے گا، اُس سے بھی صلح کا ویسا ہی عہد کیا جاتا ہے جیسا اُن کے اہل شہر سے کیا گیا ہے۔'' [2]

اس مفید معاہدے کے نیک اثرات اُس وقت ظاہر ہوئے جب مجدی بن عمرو جہنی حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کے فوجی دستے اور قریشی قافلے کے بیچ میں آ پڑا جس کی کمان ابوجہل بن ہشام کے ہاتھ میں تھی اور قریش کے تین سو شہ سوار جس کی حفاظت کے لیے مامور تھے۔ [3]

''عیص'' کے ایک گوشے میں دونوں جنگجو گروہوں کا آمنا سامنا ہوا جو جہینہ کی عمل داری میں واقع تھا اور لڑائی کے لیے صف بندی ہوئی۔ [4] قبل اس سے کہ فریقین گتھم گتھا ہوجاتے، سردار جہینہ مجدی بن عمرو جو دونوں جماعتوں کا دوست تھا، صلح کا پھریرا لہرائے آڑے آ گیا۔ اُس کی صلح جویانہ مساعی رنگ لائیں اور دونوں گروہ کسی تاخت و تاز کے بغیر اپنے اپنے علاقوں کو واپس ہو گئے۔ [5]

---

[1] السرایا والبعوث النبویة للدکتور بریك محمد بریك، ص: 92. [2] مجموعة الوثائق السیاسیة لمحمد حمید اللّٰه، ص: 62. [3] المواهب اللدنیة للزرقاني: 75/1. [4] الطبقات الکبرٰی لابن سعد: 6/2، والسرایا والبعوث النبویة للدکتور بریك محمد بریك، ص: 85. [5] السرایا والبعوث النبویة للدکتور بریك محمد بریك، ص: 86.

معاہدے سے پتہ چلتا ہے کہ اسلامی ریاست کے نزدیک معاہداتِ صلح کو فوجی کارروائیوں کے مقابلے میں اوّلیت حاصل تھی۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ قریشِ مکہ کے خلاف تحریک سرایا کے آغاز سے قبل ریاست مدینہ اور بحیرۂ احمر کے ساحل پر آباد قبیلۂ جُہینہ کے درمیان صلح کا معاہدہ طے پا چکا تھا۔ جُہینہ کی طرف سے مدینہ اور مکہ کے درمیان جنگ بندی کی کوششیں اسی معاہدے کے بل بوتے پر کی گئی تھیں۔

اہل مدینہ اور جہینہ کے درمیان طے پانے والے اس معاہدۂ صلح سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسلامی ریاست ایسے ملک سے معاہدۂ صلح کر سکتی ہے جو اسلامی ریاست کے دشمنوں سے مصالحانہ تعلقات رکھتا ہو۔ شرط یہ ہے کہ مسلمان اپنے دشمنوں سے برسرپیکار ہوں تو یہ ملک اُن کے دشمنوں سے تعاون نہ کرے۔ اسلامی ریاست کے لیے جائز ہے کہ وہ معاہدہ کیے گئے ملک کی بات مان کر جنگ سے ہاتھ کھینچ لے جبکہ اس اقدام سے مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو۔[1]

سیدنا حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کی فوجی مہم لشکرِ قریش کے لیے نہایت نقصان دہ ثابت ہوئی۔ اس سریہ نے قریش کو اندر سے ہلا کر رکھ دیا اور اُن کے بہادروں کے دلوں پر ایسا رعب جمایا جس کی نظیر اس سے قبل نہیں ملتی۔ اب جا کے اُن کی آنکھیں کھلیں اور اُنھیں خطرے کی سنگینی کا اندازہ ہوا جو اُن کی تجارت اور معاشی قوت کا راستہ روکنے کے درپے تھا۔[2]

ابوجہل لشکر حمزہ رضی اللہ عنہ کا سامنا کر کے مکہ واپس آیا تو اُس نے رجال قریش کو مخاطب کر کے کہا: ''اے معشرِ قریش! محمد یثرب میں پاؤں جما چکا ہے۔ اُس نے اپنے دستے ہر طرف پھیلا دیے ہیں۔ اُس کا ارادہ صرف تمھیں گزند پہنچانا ہے۔ اُس کے قریب بھی نہ پھٹکیں اور نہ اُس کا راستہ اپنائیں۔ وہ خونخوار شیر کی مانند بپھرا ہوا ہے۔ تم پر اُسے غصہ بھی

1 الجهاد والقتال لمحمد هيكل: 479,478/1. 2 السرايا والبعوث النبوية للدكتور بريك محمد بريك، ص: 86.

بہت ہے کہ تم نے اُسے شہر سے نکال باہر کیا تھا۔ واللہ! اُس کے پاس بڑے ماہر جادوگر ہیں۔ میں نے اُس کے اور اُس کے اصحاب کے ہمراہ جنوں کو دیکھا ہے۔ بنوقیلہ (اوس و خزرج) کی عداوت سے تو تم واقف ہی ہو۔ یہ (محمد ﷺ) ایسا دشمن ہے جس نے دوسرے دشمن سے تعاون لیا ہے۔''[1]

سریۂ عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ سے ماخوذ دروس اور عبرتیں

سریۂ عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے نہایت اچھے نتائج برآمد ہوئے۔ مسلمانوں کے لیے اس مہم میں کئی اہم اسباق اور نکات پنہاں ہیں جن کی قدرے تفصیل ذیل میں پیش کی جاتی ہے:

(ا) روایات میں آتا ہے کہ نبی ﷺ نے اس دستے کے امیر کو ایک تحریر لکھ کر دی تھی اور کہا تھا کہ اسے دو دن کی مسافت طے کرنے کے بعد کھول کر پڑھیں۔

رسول اللہ ﷺ کی یہ بات ایک اہم جنگی اصول پر عمل درآمد کی عمدہ مثال ہے۔ اور وہ اصول یہ ہے جنگی منصوبوں کو صیغۂ راز میں رکھنا اور لشکر کی پیش قدمی کا راستہ پوشیدہ رکھنا بھی اسی میں شامل ہے۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ لشکر دشمن کی گھات سے محفوظ رہے۔ اُن دنوں مدینہ میں یہود اور مشرکین بھی آباد تھے۔ عین ممکن تھا کہ یہ لوگ بھاگم بھاگ اہلِ مکہ کو باخبر کرتے کہ اُن کے خلاف روانہ کیے گئے دستے کا رخ فلاں طرف ہے۔ سریہ روانہ ہو گیا اور خود اُس کے سپاہیوں کو بھی علم نہیں تھا کہ کہاں جانا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو اب یہ خوف نہیں رہا تھا کہ لشکر کی منزلِ مقصود کے متعلق کسی کو خبر ہو جائے گی۔[2]

اس مبارک مہم میں تربیتِ نبوی کا خوش کن اثر بھی صاف نظر آتا ہے کہ مجاہدین نے رسول اللہ ﷺ کی بات سنی اور اُس پر عمل کرتے ہوئے دشمن کے علاقے تک چلتے چلے گئے بلکہ اُسے پیچھے چھوڑ دیا۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ طرزِ عمل اُن کے مضبوط ایمان اور اللہ تعالیٰ

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 219,218/1. [2] التاريخ الإسلامي للحميدي: 71/4.

کی راہ میں موت سے بے خوفی کی علامت ہے۔[1]

(ب) اہل سریہ کی طرف سے دشمن کو حرمت کے مہینے میں قتل کر دیا گیا تھا۔ قریش نے مسلمانوں کی اس غلطی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے ریاستِ مدینہ کے خلاف زور دار پروپیگنڈا مہم کا آغاز کر دیا۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے ابراہیمی تعلیمات کا سہارا لیا جن کی چند باقیات جاہلی معاشرے میں ابھی تک موجود تھیں۔ ابراہیمی تعلیمات کے مطابق حرمت کے مہینوں میں لڑائی حرام قرار پاتی تھی۔ قریش نے اس بات کا خوب ڈھنڈورا پیٹا کہ محمد (ﷺ) اور اُن کے ساتھی دینِ ابراہیمی کی حدود سے تجاوز کرنے والے لوگ ہیں جو مقدس مہینوں کی پروا بھی نہیں کرتے۔[2]

قریش نے بڑا شور مچایا کہ محمد (ﷺ) اور اُن کے ساتھیوں نے حرمت کے مہینوں کو حلال سمجھ لیا ہے۔ اُنھوں نے حرمت کے مہینے میں خون کیا، مال لوٹا اور لوگوں کو قیدی بنایا ہے۔[3]

بظاہر قریش اپنے منصوبے میں کامیاب رہے تھے۔ اُن کے پروپیگنڈے کی گونج سے عرب کے در و دیوار لرز اٹھے تھے۔ اور تو اور خود مدینہ بھی اُس کے زہریلے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا تھا۔ مسلمان حلقوں میں اس معاملے کے متعلق خوب بحث ہوئی۔ اُن کی طرف سے اہل سریہ پر سخت نکتہ چینی کی گئی کہ انھوں نے ماہ حرام میں خونریزی کیوں کی ہے۔ یہود نے صورتحال کی سنگینی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فتنہ برپا کرنے کی ناکام کوشش کی۔[4] اُنھوں نے کہا: ''اب تو قریش مکہ اور مسلمانوں کے درمیان لڑائی ہو کر رہے گی۔ اور قریش ہی پہ کیا موقوف، ان مسلمانوں کو تو سارے عرب سے جنگ مول لینی پڑے گی۔ اُنھوں نے ماہِ حرام کی حرمت کو جو پامال کیا ہے!'' یہودیوں نے اس بات کو اپنی طرف سے نئے معنی پہنا لیے۔ وہ کہنے لگے:

---

1 التاریخ الإسلامي للحمیدي: 71/4. 2 مكة والمدينة لأحمد الشريف، ص:445. 3 السيرة النبوية لابن هشام: 254/2، والسنن الكبرى للبيهقي: 59/9، و دلائل النبوة للبيهقي: 19/3.
4 مكة والمدينة لأحمد الشريف، ص:445.

''واقد بن عبداللہ نے عمرو بن حضرمی کو قتل کیا ہے۔ عمرو کا مطلب ہے کہ جنگ بھڑک اٹھی۔ حضرمی کے معنی ہیں جنگ حاضر ہوئی اور واقد سے مراد یہ ہے کہ جنگ کو وقود (ایندھن) فراہم کیا گیا۔''[1]

یہود کی یہ باتیں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اُن کے سینے میں چھپے ہوئے شدید اور ناقابل علاج حسد اور خباثت بھرے کینے کی آئینہ دار ہیں۔[2]

اہل سریہ اپنے کیے پر بہت پشیمان اور نہایت افسردہ ہوئے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے قریش و یہود کے پروپیگنڈے کا ایسا منہ توڑ جواب دیا گیا جس نے مشرکین کے دانت کھٹے کر دیے اور اُن کی زبانیں کاٹ ڈالیں۔ قرآن کریم نے مجرمانِ قریش کا بھانڈا بیچ چوراہے میں پھوڑ دیا اور اُن کے دلائل کو باطل قرار دیتے ہوئے کہا کہ اللہ کی راہ پر چلنے سے روکنا، اُس کی وحدانیت اور رسول اللہ کی رسالت کا انکار کرنا اور مسجد حرام کے باسیوں کو وہاں سے نکال باہر کرنا ماہِ حرام میں لڑائی کرنے سے کہیں بڑے جرائم ہیں۔ آدمی کو اُس کے دین کے متعلق آزمائش میں ڈال دینا بھی بڑا گناہ ہے۔ قریش نے ان جرائم کا ارتکاب کیا ہے لیکن وہ ان گناہوں کو جان بوجھ کر بھلا چکے ہیں یا انھیں معمولی سمجھتے ہیں اور صرف ماہِ حرام کی بے حرمتی کا رونا روتے ہیں، جبکہ وہ ماہِ حرام کے لیے بھی مخلص نہیں ہیں۔ اُن کے شور شرابے کا ہدف بس یہی ہے کہ عرب کے لوگ اکٹھے ہو کر مسلمانوں پر چڑھ آئیں اور اُن کا خاتمہ کر دیں۔ لیکن قریش اس مقصد میں کامیاب نہیں ہوں گے، اس لیے کہ اصل مجرم وہ خود ہیں نہ کہ مسلمان۔[3]

(ج) سپاہ کے متعلق سپہ سالار کی فکر مندی: واپسی کے سفر پر سعد بن ابی وقاص اور عتبہ بن غزوان رضی اللہ عنہما ایک گمشدہ اونٹ کی تلاش میں لشکر سے پیچھے رہ گئے۔ اس دوران میں قریش

---

1 السيرة النبوية لابن هشام:604,603/1. 2 التاريخ الإسلامي للحميدي: 72/4. 3 السرايا والبعوث النبوية للدكتور بريك محمد بريك، ص: 100.

اپنے دو قیدی بازیاب کرانے مدینہ آئے۔ رسول اللہ ﷺ کو سعد اور عتبہ رضی اللہ عنہما کی فکر ہوئی۔ آپ ﷺ نے قریش کو انکار کرتے ہوئے کہا: «أَخَافُ أَنْ تَكُونُوا قَدْ أَصَبْتُمْ سَعْدَ بْنَ مَالِكٍ وَّ عُتْبَةَ بْنَ غَزْوَانَ» ''مجھے خوف ہے کہ کہیں تم لوگوں نے سعد اور عتبہ کو گزند نہ پہنچایا ہو۔'' چنانچہ جب تک سعد اور عتبہ رضی اللہ عنہما واپس نہ آئے، آپ نے قیدی اُن کے حوالے نہیں کیے۔[1] دونوں قیدیوں میں سے حکم بن کیسان رضی اللہ عنہ مسلمان ہو گئے اور رسول اللہ ﷺ کے پاس رہے، جبکہ عثمان بن عبداللہ بن مغیرہ نے اسلام قبول نہ کیا اور قریش کے ہمراہ مکہ لوٹ گیا۔[2]

منہج نبوی سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ سپہ سالار کے لیے ضروری ہے کہ وہ سپاہیوں کی سلامتی اور حفاظت کا بندوبست کرے اور اُن کے لیے فکر مند رہے، اس لیے کہ یہ سپاہی تو ہوتے ہیں جو اقامت دین کی راہ میں نقد جاں کے نذرانے پیش کرتے ہیں۔

عصر حاضر کی فوجی درس گاہوں میں بھی یہ سبق دیا جاتا ہے کہ سپاہی جب دیکھتا ہے کہ قیادت اُس کے لیے فکر مند اور اُس کی سلامتی کی خواہاں ہے تو وہ میدانِ کارزار میں بڑی بے جگری سے فن حرب کا مظاہرہ کرتا ہے۔[3]

(د) میدان جنگ میں راز داری کی تربیت: سریہ عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے اپنے اہداف حاصل کر لیے تھے۔ چھاپہ مار کارروائیوں کے سلسلے میں اہل سریہ کی صلاحیتیں اُبھر کر سامنے آئی تھیں۔ اُن کے اس فداکارانہ طریقِ کار نے قریش کے ہاتھوں کے طوطے اڑا دیے تھے۔ جس راز داری اور احتیاط سے سریہ نے اپنی مہم انجام دی تھی اُس نے قریش کی پریشانی اور بدحواسی میں بھرپور اضافہ کر دیا تھا، قریشِ مکہ کے جاسوسوں نے چاہا تھا کہ سریہ ابن جحش کی گھات میں بیٹھیں لیکن وہ اپنے ارادوں میں کامیاب نہیں ہوئے۔ اُنھیں

1 دلائل النبوة للبيهقي:2/496. 2 السرايا والبعوث النبوية للدكتور بريك محمد بريك، ص: 100. 3 غزوة بدر الكبرٰى لأبي فارس، ص: 23.

یہ تک معلوم نہ ہوسکا کہ سریہ کا رخ کس طرف ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی بھی یہی خواہش تھی جوحسب توقع پوری بھی ہوئی۔ اس ضمن میں آپ نے رازداری کا انوکھا طریقہ اختیار کیا اور لشکر کو مہر بند تحریر کی صورت میں اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ یوں دشمن کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ سریہ کی پیش قدمی کی رفتار کیا ہے اور اُس نے کس علاقے کا قصد کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چھاپہ مار کارروائیوں میں ''رازداری'' کے اصول کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ [1]

سریہ عبداللہ بن جحش نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ رسول اللہ ﷺ نے جو سرایا روانہ کیے تھے وہ نہایت زور آور تھے۔ اُنھوں نے مشکل ترین محاذوں پر کامیابی کے جھنڈے گاڑے اور ایسے ایسے کارنامے انجام دیے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اہل سرایا اعلیٰ سپاہیانہ صلاحیتوں کے مالک تھے جنھیں بھرپور طریقے سے کام میں لاتے ہوئے وہ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوئے۔

بلند پایہ فوجی نظم ونسق جس سے اہل سریہ اور اُن کا قائد بہرہ یاب تھے، اُس میں بھی نبوی تربیت کے اثرات نظر آئے۔ انھوں نے نبوی احکامات کی بے چون و چرا تعمیل کی۔ سپہ سالار نے نبوی تحریر پڑھتے ہی سر تسلیم خم کر دیا اور سپاہیوں کے لیے اپنی ذات کا نمونہ پیش کرتے ہوئے کہا: ''آپ میں سے جو شہادت کی تڑپ رکھتا اور اُس کا شائق ہے وہ میرے ساتھ چلے۔ اور جسے یہ امر اچھا نہیں لگتا وہ لوٹ جائے۔ میں تو رسول اللہ ﷺ کے احکامات کے مطابق آگے چلوں گا۔'' [2]

سرایا کے اغراض و مقاصد

غزوۂ بدر سے قبل کی تحریکِ سرایا کا بنظر غائر مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں شرکت کرنے والے تمام سپاہی مہاجرین کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ انصار کے کسی فرد

[1] الرسول القائد ﷺ لمحمود شيت خطاب، ص: 94. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 602/2.

نے اس میں حصہ نہیں لیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ قریش مکہ کے ظلم و ستم کی وجہ سے مہاجرین کے لیے جو مسائل پیدا ہوئے تھے، ملکی سطح پر اُن مشکلات کا شعور اجاگر ہو۔ تحریکِ سرایا نے جو اہداف حاصل کیے اُن میں سے چند اہم نکات کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

(ا) دشمنانِ دین کو مسلمانوں کی قوت کا اندازہ ہوا اور اُن کے دلوں پر اہل مدینہ کی دھاک بیٹھ گئی۔ اب مشرکین عرب اور یہود میں سے ہر ایک مدینہ کا رخ کرنے سے پہلے ہزار بار اپنے انجام پر غور کرتا تھا۔ قریش کی تجارت و معیشت پر ضرب پڑی اور تجارتی قافلوں کے لیے پہرے داروں کی فراہمی سے اُن کے اخراجات میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔[1]

(ب) رسول اللہ ﷺ نے قبیلۂ جہینہ اور بعض دیگر جنگجو قبائل سے حلیفانہ معاہدے کیے تا کہ وہ مکہ و مدینہ کی جنگ میں غیر جانبدارانہ رویہ اپنائیں۔ یہ قبائل قریش کے پرانے حلیف تھے۔ قرآن نے اُن کے حلیفانہ تعلقات کو ''ایلاف'' کے نام سے یاد کیا ہے، ان معاہدوں سے قریش کی تجارت کو مستقل خطرات لاحق ہوئے اور علاقائی سطح پر مسلمانوں کا اثر و رسوخ بڑھا۔[2] تحریک سرایا کے ذریعے سے اعرابی قزاقوں کا ناطقہ بند کیا گیا جنھوں نے عرب کی تجارتی شاہراہوں پر اودھم مچا رکھا تھا۔ وہ قافلوں کو لوٹتے اور ہر آنے جانے والے سے بھتا وصول کرتے تھے۔ مدینہ کی چراگاہ پر حملہ کر کے اُنھوں نے اس شہر کے نئے باسیوں سے بھی اپنا حصہ وصول کرنا چاہا لیکن رسول اللہ ﷺ نے اعرابی ڈاکو کرز بن جابر فہری کا بدر کے مضافاتی علاقے سفوان تک تعاقب کیا جو مدینہ سے تقریباً 150 کلومیٹر کی مسافت پر ہے۔ اہل سیر نے اس تعاقب کو غزوۂ بدر صغریٰ کا نام دیا ہے، چنانچہ اعرابی قزاقوں کو کان ہو گئے اور اُنھیں عافیت اسی میں نظر آئی کہ یثرب کے نئے باشندوں سے حلیفانہ تعلقات استوار کر لیے جائیں۔ یوں مسلمان اُن ڈاکوؤں کی شرارتوں سے محفوظ ہو گئے۔[3]

---

1 دولة الرسول من التكوين إلى التمكين للدكتور كامل سلامة، ص: 532. 2 دراسات في السيرة لمؤنس، ص: 19. 3 دراسات في عهد النبوة للدكتور عبدالرحمٰن الشجاع، ص: 131.

(ج) تحریکِ سرایا مسلم سپاہ کے لیے ایک طرح سے جنگی مشقوں کا سلسلہ تھا جس میں انھیں مستقبل کی فوجی سرگرمیوں کے لیے تیاری کے مواقع میسر آئے۔ رسول اللہ ﷺ کی قیادت میں مسلمانانِ مدینہ چھتے میں شہد کی مکھیوں کے مانند جہدِ مسلسل کی زندہ تصویر تھے۔ تحریکِ سرایا نے مسلمانوں کو ایسے رجالِ کار فراہم کیے جنھوں نے فتوحاتِ اسلامی کے دائرے کو وسعت دینے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ سپہ سالار فتوحاتِ شام امین الامہ ابوعبیدہ بن جراح، فاتح قادسیہ و مدائن سعد بن ابی وقاص، فاتح یرموک خالد بن ولید اور فاتح مصرو لیبیا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم کے اسمائے گرامی قائدین اسلام کی فہرست میں شامل ہوئے۔

سرایا کے اہداف و مقاصد حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ بدلتے رہے۔ ابتدائی سرایا جاسوسی مقاصد کے پیش نظر روانہ کیے جاتے رہے۔ پھر اُن کی حیثیت چھاپہ مار کارروائیوں کی ہوگئی۔ مسلمانوں کو شان وشوکت حاصل ہوئی تو چیدہ چیدہ بدمعاشوں کا صفایا سرایا کا مطمح نظر قرار پایا۔ کعب بن اشرف، عصماء بنت مروان اور ابوعفک کا قتل اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ غزوۂ احد کے بعد حالات ناسازگار ہوئے تو اعرابی قزاقوں کو ایک بار پھر مدینہ کی طمع ہوئی اور وہ اس قدر دلیر ہوگئے کہ انھوں نے مسلمانوں کے پُر امن تبلیغی مشن پر حملہ کرنے سے دریغ نہ کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے جنگی حکمتِ عملی تبدیل کرتے ہوئے عنانِ سرایا قریشِ مکہ سے اعراب کی طرف موڑ دی اور انھیں خوب سبق سکھایا۔

فتح مکہ کے بعد آپ ﷺ نے عزیٰ، منات، لات، سواع، ذی خلصہ اور شرک و بت پرستی کے دیگر مظاہر کو نیست و نابود کرنے کی خاطر صحابۂ کرام کے دستے (سرایا) روانہ کیے تھے۔

غرضیکہ جزیرہ نمائے عرب میں اسلامی تحریکِ سرایا کے نہایت مثبت اور فوری نتائج سامنے آئے۔ اس تحریک نے مستقبل کی فتوحاتِ اسلامی کے لیے مستحکم بنیاد فراہم کی جن کے سبب اسلام کی روشنی چاردانگِ عالم میں پھیل گئی۔ [1]

[1] السرایا والبعوث النبویة للدکتور بریك محمد بریك، ص:61-66.

حصہ 10

غزوۂ بدر کبریٰ

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَ اِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ○ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَ هُمْ يَنْظُرُوْنَ ○ وَ اِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآىِٕفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ

"جیسے (بدر کے موقع پر) آپ کے رب نے آپ کو آپ کے گھر (مدینہ) سے حق (بہترین تدبیر) کے ساتھ نکالا تھا اور بے شک (اس وقت) مومنوں کا ایک گروہ (اس نکلنے کو) ناپسند کرتا تھا، وہ آپ سے حق (کے معاملے) میں اس کے واضح ہو جانے کے بعد جھگڑتے تھے، گویا کہ انھیں موت کی طرف ہانکا جا رہا تھا اور وہ (اسے) دیکھ رہے تھے اور جب اللہ تم سے دو گروہوں میں سے ایک کا وعدہ کر رہا تھا کہ یقیناً وہ تمھارے لیے ہے اور تم چاہتے تھے کہ جو غیر مسلح (تجارتی قافلہ) ہے وہی تمھارے ہاتھ لگے اور اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ وہ اپنے فرامین کے ساتھ حق کو ثابت کر دکھائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے تاکہ وہ حق کو حق کر دکھائے اور باطل کو باطل کر دکھائے اگرچہ مجرم لوگ (اسے) ناپسند ہی کریں۔"

(الأنفال 8:5-8)

باب 1

میدانِ کارزار میں پہنچنے سے پہلے کے حالات

غزوۂ بدر کا پس منظر و اسباب

مسلمانوں کو قریش کے ایک تجارتی قافلے کے بارے میں علم ہوا جو ابوسفیان (رضی اللہ عنہ) کی قیادت میں تجارتی ساز و سامان سے لیس شام سے مکہ روانہ ہو چکا تھا اور اتنے بڑے قافلے کے لیے صرف تیس سے چالیس افراد پر مشتمل حفاظتی دستہ متعین تھا۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بسبس[2] بن عمرو رضی اللہ عنہ کو قافلے کی معلومات حاصل کرنے کے لیے روانہ فرمایا۔ وہ جب مصدقہ خبر لے کر واپس پہنچے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کو کوچ کا حکم دیا اور فرمایا: «هٰذِهِ عِيرُ قُرَيْشٍ فِيهَا أَمْوَالُهُمْ فَاخْرُجُوا إِلَيْهَا لَعَلَّ اللّٰهَ يُنْفِلُكُمُوهَا»

''یہ قریش کا تجارتی قافلہ ہے جس میں ان کا تجارتی ساز و سامان ہے۔ اس کی طرف نکلو، ممکن ہے اللہ تمھیں بطور غنیمت وہ قافلہ عطا فرما دے۔''[3]

نبی علیہ السلام بارہ (12) رمضان المبارک 2 ھ میں مدینہ طیبہ سے عازم سفر ہوئے اور بلاشبہ وہ اس وقت قطعاً لڑائی کی نیت سے روانہ نہیں ہوئے تھے۔ وہ تو صرف قریش کے تجارتی

1 جوامع السيرة لابن حزم، ص: 107. 2 مسلم میں یہ نام بُسیسہ ذکر کیا گیا ہے دیکھیے: صحيح مسلم، حديث: 1901، علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مسلم کے تمام نسخوں میں اسی طرح ہے لیکن سیرت کی کتب میں بسبس کا لفظ ملتا ہے۔ ہوسکتا ہے ایک اس کا نام اور دوسرا اس کا لقب ہو۔ 3 السيرة النبوية لابن هشام: 61/2.

قافلے کو روکنے کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ مسلمانوں اور کفار کے درمیان دشمنی کی فضا بدستور قائم تھی۔ ایسے حالات میں دشمن کے مال اور خون مباح سمجھے جاتے ہیں اور خصوصاً جب یہ علم ہو کہ اس تجارتی قافلے میں وہ اموال بھی شامل تھے جو مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنے والے مسلمانوں کی ملکیت تھے اور مشرکین نے ظلم و زیادتی سے ان پر قبضہ جما رکھا تھا۔ [1]

اس سفر میں نبی ﷺ نے عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں امام مقرر فرمایا اور ابولبابہ کو روحاء سے واپس لوٹا کر مدینہ کا امیر مقرر فرمایا۔ [2]

نبی ﷺ نے دو آدمی تجارتی قافلے کی جاسوسی کے لیے روانہ فرمائے اور وہ قافلے کی خبر لے کر واپس پہنچے۔ [3]

شرکائے بدر کی تعداد

غزوۂ بدر میں شرکت کرنے والوں کی تعداد کے بارے میں مصادر صحیحہ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے براء بن عازب رضی اللہ عنہما کے حوالے سے شرکائے بدر کی تعداد تین سو دس سے کچھ زائد بتائی ہے۔ [4]

امام مسلم رحمہ اللہ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی طویل روایت کے حوالے سے یہ بیان کیا ہے کہ ان کی تعداد تین سو انیس (319) تھی۔ [5]

اور بعض دیگر مصادر تین سو چالیس (340) کی تعداد کا تذکرہ کرتے ہیں۔ [6]

---

1 حديث القر ن عن غزوات الرسول ﷺ لأبي بدر محمد بكر آل عابد: 43/1. 2 البداية والنهاية: 260/3، و المستدرك للحاكم: 632/3. 3 الطبقات الكبرٰى لابن سعد: 42/1. 4 صحيح البخاري، حديث: 3958,3957. 5 صحيح مسلم، حديث: 1763. 6 البداية والنهاية: 314/3. بہر حال تین سو دس (310) سے کچھ اوپر اور تین سو انیس (319) میں کوئی تضاد نہیں کیونکہ صحیح بخاری کی حدیث میں "بِضْعَۃَ عَشَرَ" کے الفاظ ہیں اور یہ تیرہ سے انیس تک کے لیے بولے جا سکتے ہیں اور جن مصادر میں تین سو چالیس کا تذکرہ ہے وہ اس پائے کے نہیں ہیں۔

بدر میں شریک ہونے والے یہ افراد اسلامی ریاست کی مکمل عسکری قوت نہ تھے کیونکہ وہ تو صرف قافلے کو روکنے اور گھیرنے کی غرض سے روانہ ہوئے تھے اور انھیں قطعاً یہ علم نہ تھا کہ انھیں قریش اور ان کے حلیفوں کا سامنا کرنا پڑے گا جن کی تعداد ایک ہزار تھی۔[1]

کفار قریش کے ساتھ دو سو گھوڑے تھے جو ان کے اونٹوں کے پہلو بہ پہلو رواں دواں تھے اور گلوکارائیں دف بجا بجا کر اشعار میں نبی ﷺ اور صحابہ کرام کی ہجو کر رہی تھیں۔[2]

جبکہ مسلمانوں کے پاس صرف دو گھوڑے اور ستر اونٹ تھے جس پر وہ باری باری سوار ہوتے۔[3]

بدر کی طرف سفر کے دوران پیش آنے والے واقعات

اس سفر کے دوران میں چند ایسے واقعات پیش آئے جن میں بہت سے پند و نصائح پائے جاتے ہیں:

بعض نوعمر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا واپس کیا جانا: رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب ابوسفیان (رضی اللہ عنہ) کے لشکر کا سامنا کرنے کے لیے مدینہ سے عازم سفر ہوئے تو مدینہ سے باہر ''بیوت سقیا'' جگہ پر فروکش ہوئے۔ یہاں آپ ﷺ نے قافلے میں شریک ہر فرد کا جائزہ لیا اور ان میں سے انھیں واپس بھیج دیا جو اسلامی لشکر کے ساتھ سفر کرنے اور لڑائی کی نوبت آنے پر اس میں شرکت کرنے کی بظاہر ہمت نہ رکھتے تھے، چنانچہ حضرت براء بن عازب اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو کم عمر ہونے کی وجہ سے واپس لوٹا دیا گیا۔[4] حالانکہ وہ بڑے ذوق وشوق سے نکلے تھے اور جذبے سے سرشار تھے۔

مشرک سے عدم استعانت: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی ﷺ بدر کی جانب روانہ ہوئے اور ابھی حرہ وبرہ ہی پہنچے تھے کہ ایک آدمی آیا جس کی بہادری اور جرأت کے

1 صحيح مسلم، حديث: 1763. 2 البداية والنهاية: 260/3. 3 مسند أحمد: 411/1، و مجمع الزوائد: 69/6. 4 صحيح البخاري، حديث: 3956,3955.

چرچے زبان زد عام تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب اسے دیکھا تو بہت خوش ہوئے۔ وہ جب آپ ﷺ کے پاس پہنچا تو بولا: ''میں بھی آپ کے ساتھ شریک ہونا چاہتا ہوں تاکہ کچھ مال حاصل کر سکوں؟'' نبی ﷺ نے اس سے سوال کیا: «تُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ رَسُولِهٖ؟» ''کیا تو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہے؟'' اس نے کہا: ''نہیں۔'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: «فَارْجِعْ فَلَنْ أَسْتَعِينَ بِمُشْرِكٍ» ''لوٹ جا! میں مشرک سے ہرگز مدد نہیں لیتا۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ نبی ﷺ آگے بڑھ گئے۔ جب مقامِ شجرہ کے قریب پہنچے تو وہی شخص دوبارہ آپ ﷺ کے پاس آیا اور اپنی بات دہرائی۔ جواب میں نبی ﷺ نے پھر وہی سوال دہرا دیا۔ تیسری دفعہ وہ بیداء نامی جگہ میں سامنے آیا تو رسول اللہ ﷺ نے اس سے پھر دریافت فرمایا کہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہے؟ اس نے عرض کیا: ''جی ہاں۔'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: «فَانْطَلِقْ» ''اب تو ہمارے ساتھ شریک ہو سکتا ہے۔''[1]

مشکل گھڑی میں باہمی تعاون: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''بدر کے دن ایک ایک اونٹ پر ہمارے تین تین آدمی باری باری سوار ہوتے تھے۔ ابولبابہ اور علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما نبی ﷺ کے ساتھ تھے (ابولبابہ رضی اللہ عنہ کو مدینہ کا امیر بنا کر واپس لوٹانے سے پہلے کی بات ہے)۔ دونوں فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ کے پیدل چلنے کی باری تھی۔ ہم نے عرض کیا: ''آپ سوار ہو جائیں ہم پیدل چلتے ہیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا:

«مَا أَنْتُمَا بِأَقْوٰى مِنِّي، وَلَا أَنَا بِأَغْنٰى عَنِ الْأَجْرِ مِنْكُمَا»

''نہ تم مجھ سے زیادہ طاقتور ہو اور نہ ہی میں تمھاری نسبت اجر و ثواب سے

[1] صحيح مسلم، حديث: 1817، و سنن أبي داود، حديث: 2732، و سنن الترمذي، حديث: 1558، و مسند أحمد: 3/149,148.

مستغنی ہوں۔'' [1]

کفار کی مسلمانوں سے جنگ کرنے کی ضد

قریش کے تجارتی قافلے کے قائد ابوسفیان (رضی اللہ عنہ) کو جب خبر ملی کہ نبی ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تجارتی قافلے کو روکنے کی غرض سے روانہ ہو چکے ہیں تو اس نے فوراً قافلے کا رخ ساحل سمندر کی طرف موڑ دیا اور اس وقت ضمضم بن عمرو غفاری کو قافلے کی حفاظت کی غرض سے نفری طلب کرنے کے لیے مکہ روانہ کر دیا۔ [2]

ابوسفیان (رضی اللہ عنہ) سمجھدار اور ہوشیار آدمی تھے۔ وہ لحہ بہ لحہ مسلمانوں کی پیش قدمی سے باخبر تھے اور بذات خود جاسوسی کر رہے تھے۔ خود بدر کے مقام تک پہنچے اور وہاں کے لوگوں سے سوال کیا: ''کیا تم نے یہاں کسی کو دیکھا ہے؟'' انھوں نے کہا: ''ہاں، دو آدمیوں کو دیکھا ہے۔'' ابوسفیان نے کہا: ''مجھے ان کے پڑاؤ کی جگہ دکھاؤ۔'' انھوں نے اسے وہ جگہ دکھا دی۔ ابوسفیان نے وہاں پڑا اونٹ کا مینگنا اٹھایا اور اسے توڑا تو اندر سے کھجور کی گٹھلی نکلی۔ بولا: ''اللہ کی قسم! یہ تو یثرب کا چارہ ہے۔'' [3]

ابوسفیان نے مسلمانوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کی بھرپور کوشش کی یہاں تک کہ اس نے اسلامی ہراول دستے کی معلومات ان کے جانوروں کی غذا سے حاصل کر لیں اور یہ اطلاع اونٹوں کے فضلات سے نکلنے والی گٹھلی سے حاصل ہوئی۔ یہ دونوں مدینہ کے مسلمان تھے۔ ابوسفیان نے محسوس کر لیا کہ اس کا قافلہ خطرے میں ہے۔ اس نے فوراً ضمضم بن عمرو کو قریش کی طرف مکہ روانہ کیا اور احتیاطاً قافلے کا رخ تبدیل کر کے ساحل سمندر کی طرف موڑ دیا۔ [4]

قافلۂ تجارت کو پیش آنے والے ممکنہ حادثے کی خبر قریش پر انتہائی گراں گزری۔ تمام

---

1 مسند أحمد: 411/1، احمد شاکر رحمہ اللہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔ 2 نضرة النعيم: 287/1. 3 السيرة النبوية لابن هشام: 230/2. 4 غزوة بدر الكبرٰى لأبي فارس، ص: 34,33.

سردارانِ قریش غصے میں آ گئے کیونکہ یہ ان کی رسوائی کا باعث تھا۔ اور ان کے اقتصادی مفادات کو چیلنج کرنے کے ساتھ ساتھ دیگر قبائل کے ہاں ان کے مقام و مرتبہ کو ختم کرنے کے مترادف تھا، اس لیے وہ اپنی پوری جنگی طاقت کے ساتھ ان سنگین حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے فوراً نکل کھڑے ہوئے۔[1]

ضمضم بن عمرو غفاری اشتعال انگیز حالت میں مکہ پہنچا۔ ہر دیکھنے والا اور اس کی بات سننے والا متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے اپنے اونٹ کی ناک کاٹ ڈالی تھی، کجاوے کا رخ الٹا کیا ہوا تھا اور اپنی قمیص سامنے اور پیچھے سے پھاڑ رکھی تھی۔ اور چیختا چلاتا اور یہ کہتا ہوا مکہ میں داخل ہوا: ''اے قریش کی جماعت! اپنے تجارتی قافلے کی خبر لو! اسے بچا لو! تمھارے اموال جو ابوسفیان لے کر آ رہا تھا اسے محمد (ﷺ) اور اس کے ساتھیوں نے گھیر لیا ہے۔ میرا نہیں خیال کہ تم بروقت وہاں پہنچ سکو! جلدی مدد کو پہنچو، جلدی مدد کو پہنچو۔''[2]

ابوسفیان جب جحفہ پہنچا اور قافلہ خطرے سے نکل آیا تو اس نے قریشی سرداروں کو پیغام بھیجا کہ وہ اور قافلہ بچ نکلے ہیں، لہٰذا آپ سب واپس مکہ چلے جائیں۔ اس سے قریشی زعماء کے درمیان اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ اکثریت نے مسلمانوں کی سرکوبی کو مستقبل کے خطرات سے اپنے تجارتی راستوں کو محفوظ بنانے اور دیگر عرب قبائل میں اپنی ساکھ برقرار رکھنے کی غرض سے مقام بدر کی طرف آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا۔ بنو زہرہ نے اس کی مخالفت کی اور مکہ کی جانب واپس پلٹ آئے۔

بہر حال قریش اور ان کے حلیفوں کی اکثریت آگے بڑھتی چلی گئی تا آنکہ انھوں نے مقام بدر میں پڑاؤ کیا۔[3]

رسول اللہ ﷺ کا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ

جب نبی ﷺ کو تجارتی قافلے کے بچ نکلنے اور قریشی سرداروں کی لڑائی پر ضد کرنے کی

[1] نضرة النعيم:1/287. [2] السيرة النبوية لابن هشام:2/221. [3] نضرة النعيم:1/287.

خبر پہنچی تو آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ طلب فرمایا۔[1]

بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قریش کے ساتھ مسلح تصادم سے بچنے کا مشورہ دیا کیونکہ انھیں ایسی کسی پیش آنے والی صورت حال کی قطعی توقع نہ تھی اور نہ ہی وہ اس کے لیے تیار ہو کر آئے تھے۔ انھوں نے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق رسول اللہ ﷺ کو جنگ نہ کرنے پر قائل کرنے کی کوشش کی۔ قرآن کریم نے ان چند لوگوں کی اس رائے اور ان کے علاوہ دیگر تمام اہل ایمان کے احوال کی یوں منظر کشی کی ہے:

﴿ كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ○ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ○ وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ○ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ○ ﴾

”جیسے (بدر کے موقع پر) آپ کے رب نے آپ کو آپ کے گھر (مدینہ) سے حق (بہترین تدبیر) کے ساتھ نکالا تھا اور بے شک (اس وقت) مومنوں کا ایک گروہ (اس نکلنے کو) ناپسند کرتا تھا، وہ آپ سے حق (کے معاملے) میں اس کے واضح ہو جانے کے بعد جھگڑتے تھے، گویا کہ انھیں موت کی طرف ہانکا جا رہا تھا اور وہ (اسے) دیکھ رہے تھے اور جب اللہ تم سے دو گروہوں میں سے ایک کا وعدہ کر رہا تھا کہ یقیناً وہ تمھارے لیے ہے اور تم چاہتے تھے کہ جو غیر مسلح (تجارتی قافلہ) ہے وہی تمھارے ہاتھ لگے اور اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ وہ اپنے فرامین کے

[1] صحيح البخاري، حديث: 3952، تفصیل کے لیے فتح الباری میں مذکورہ حدیث کے ذیل میں ملاحظہ کیجیے۔

ساتھ حق کو ثابت کر دکھائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے تاکہ وہ حق کو حق کر دکھائے اور باطل کو باطل کر دکھائے اگرچہ مجرم لوگ (اسے) ناپسند ہی کریں۔''[1]

ایسی صورت حال میں مہاجرین کی قیادت دشمن سے مقابلہ کرنا چاہتی تھی اور آگے بڑھنے کے لیے تیار تھی۔[2]

اس وقت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ نے دوٹوک موقف اختیار کیا، چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''میں نے مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ کا ایک ایسا اعزاز دیکھا ہے اگر وہ اعزاز مجھے حاصل ہو جاتا تو دنیا کی کوئی قیمتی چیز بھی اس کے عوض قبول نہ کرتا۔ وہ اعزاز یہ تھا کہ حضرت مقداد مشرکین کو بددعائیں دیتے ہوئے نبی علیہ السلام کے پاس حاضر ہوئے اور عرض گزار ہوئے: ''ہم اس طرح نہیں کہیں گے جس طرح موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے کہا تھا:

﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝﴾

''تو اور تیرا رب جائے، پھر تم دونوں ان سے لڑو، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔''[3]

بلکہ ہم تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے سے آپ کا دفاع کرتے ہوئے مشرکین سے جنگ کریں گے۔'' نبی علیہ السلام کا چہرۂ مبارک مقداد رضی اللہ عنہ کی یہ بات سن کر خوشی سے دمکنے لگا۔''[4]

ایک اور روایت میں ہے: ''حضرت مقداد رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! ہم آپ سے وہ بات نہیں کریں گے جو بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے کی تھی کہ ''آپ اور آپ کا رب جائیں اور لڑائی کریں ہم یہاں بیٹھے ہیں۔'' بلکہ آپ قدم بڑھائیے ہم آپ کے ساتھ ہیں۔'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا محسوس ہوا جیسے بہت بڑا بوجھ سر سے اتر گیا ہو۔''[5]

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ فرمایا: «أَشِيرُوا عَلَيَّ أَيُّهَا النَّاسُ!» ''اے لوگو!

[1] الأنفال 8:5-8. [2] نضرة النعيم: 288/1. [3] المآئدة 5:24. [4] صحيح البخاري، حديث: 3952. [5] صحيح البخاري، حديث: 4609.

مجھے مشورہ دو۔'' آپ کا اشارہ انصار کی طرف تھا کیونکہ لشکر کا اکثر حصہ انصار پر مشتمل تھا اور بیعت عقبہ ثانیہ میں بظاہر کوئی ایسی شق موجود نہ تھی کہ انصار مدینہ سے باہر بھی آپ ﷺ کی نصرت وحمایت کریں گے۔

انصار کے علمبردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے نبی علیہ السلام کے اشارے کو سمجھا اور عرض کرنے لگے: ''اللہ کی قسم! شاید آپ ہم انصار کی طرف اشارہ کر رہے ہیں؟'' نبی ﷺ نے فرمایا: «أَجَلْ» ''ہاں'' تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''بلا شبہ اے اللہ کے رسول! ہم آپ پر ایمان لائے، آپ کی تصدیق کی اور گواہی دی کہ جو پیغام آپ لے کر آئے ہیں وہ برحق ہے۔ اسی طرح ہم نے سمع و طاعت پر آپ سے عہد و میثاق کیے۔ اے اللہ کے رسول! آپ اپنی مرضی کے مطابق آگے قدم بڑھایئے ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو برحق مبعوث فرمایا! اگر ہمارے راستے میں سمندر بھی آجائے تو ہم آپ کے ساتھ اس میں کود جانے سے بھی گریز نہ کریں گے۔ ہمارا کوئی آدمی بھی پیچھے نہ رہے گا۔ ہم دشمن کے ساتھ جنگ کرنے کو برا خیال نہیں کرتے۔ ہم تو جنگ میں ڈٹ جانے والے اور دشمن کے مقابلے میں ثابت قدم رہنے والے ہیں۔ ممکن ہے اللہ ہم سے ایسا کام لے جس سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں۔ آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر و برکت پر آگے بڑھیے۔''[1]

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی یہ گفتگو نبی ﷺ کے لیے انتہائی خوش کن تھی۔ اس سے آپ کے اندر تروتازگی کی لہر دوڑ گئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «سِيرُوا وَ أَبْشِرُوا، فَإِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَدْ وَعَدَنِي إِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ، وَاللّٰهِ! لَكَأَنِّي الْآنَ أَنْظُرُ إِلٰى مَصَارِعِ الْقَوْمِ» ''آگے بڑھو اور خوش ہو جاؤ یقیناً اللہ تعالیٰ نے مجھ سے (کفار کے

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 267/2، اس سے ملتے جلتے الفاظ سے امام مسلم رحمہ اللہ نے بھی اس واقعے کو بیان کیا ہے، دیکھیے: صحيح مسلم، حديث: 1779.

تجارتی قافلے یا جنگی گروہ) دونوں میں سے ایک کا وعدہ فرمایا ہے۔ اللہ کی قسم! مجھے اب ایسا لگ رہا ہے کہ میں کفار کی قتل گاہیں دیکھ رہا ہوں۔'' [1]

سیدنا سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی یہ باتیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ولولہ انگیز اور حوصلہ افزا ہونے کے ساتھ ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے ہمت اور جوش کا باعث تھیں۔ ان جذبات سے صحابہ کرام کا حوصلہ بلند ہوا اور ان میں دشمن سے تصادم کا جذبہ پیدا ہوا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جہاد کے میدانوں میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ طلب کرنا مشورے کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ جنگیں قوموں کی منزل متعین کرتی ہیں یا تو انھیں بلندیوں پر فائز کر دیتی ہیں یا پستیوں میں دھکیل دیتی ہیں۔ [2]

دشمن سے متعلقہ معلومات کی فراہمی اور پیش قدمی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کے جذبۂ اطاعت، شجاعت اور لڑائی کرنے پر اتفاق کا بخوبی جائزہ لیا اور پھر صفوں کو ترتیب دی۔ جنگ کے لیے سفید رنگ کا جھنڈا مقرر فرمایا اور جھنڈا مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو عطا کیا۔ علاوہ ازیں دو سیاہ جھنڈے تیار فرمائے۔ ایک سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اور دوسرا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو عطا فرمایا اور پیچھے والے دستے پر قیس بن ابی صعصعہ رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا۔ [3]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ساتھ لیے اس علاقے کا جائزہ لے رہے تھے اور قریشی لشکر کے بارے میں معلومات بھی فراہم کر رہے تھے۔ اسی دوران ان کی ملاقات ایک بوڑھے آدمی سے ہوئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے قریشی لشکر اور اسلامی لشکر دونوں کے بارے میں سوال کیا۔ اس نے جواب دیا: ''میں اس وقت تک تمھیں کچھ نہیں بتاؤں گا جب تک تم مجھے اپنے بارے میں نہ بتاؤ گے کہ تم کون ہو۔'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِذَا أَخْبَرْتَنَا،

1 دلائل النبوة للبيهقي: 34/3، والسيرة النبوية لابن هشام: 267/2، وفقه السيرة للألباني: 223/1. 2 غزوة بدر الكبرٰى لأبي فارس، ص: 37. 3 زاد المعاد: 172/3.

أَخْبَرْنَاكَ» ''پہلے تم ہمیں معلومات فراہم کرو، پھر ہم بھی تمھیں اپنے بارے میں بتا دیں گے۔'' اس نے کہا: ''گویا کہ یہ تبادلہ ایک دوسرے کے عوض ہو گا؟'' نبی ﷺ نے فرمایا: «نَعَمْ» ''ہاں'' وہ کہنے لگا: ''مجھے یہ خبر ملی ہے کہ محمد (ﷺ) اور اس کے ساتھی فلاں دن مدینہ سے روانہ ہوئے تھے۔ اگر خبر دینے والے نے مجھ سے سچ بولا ہے تو وہ لوگ آج فلاں مقام پر ہوں گے۔ اور اس شخص نے بعینہ اس جگہ کی نشاندہی کی جہاں اسلامی لشکر خیمہ زن تھا۔ اور مجھے خبر ملی ہے کہ قریشی لشکر فلاں دن مکہ سے روانہ ہوا اور اگر بتانے والے نے مجھے صحیح بتایا ہے تو وہ آج فلاں جگہ پر ہوں گے۔'' اور بعینہٖ اس جگہ کی نشاندہی کی جہاں مشرکین نے پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔

اب بوڑھے نے کہا: ''میں نے تمھاری ضرورت کے مطابق معلومات فراہم کر دیں اب تم بتاؤ کہ تم کون ہو؟'' نبی ﷺ نے فرمایا: «نَحْنُ مِنْ مَّاءٍ» ''ہم پانی سے ہیں۔'' نبی ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ یہ کہہ کر فوراً واپس چل دیے۔ وہ بوڑھا یہی الفاظ دہرا رہا تھا کہ کون سا پانی؟ کیا عراق کے پانیوں سے؟ [1]

اسی رات آپ ﷺ نے علی بن ابی طالب، زبیر بن عوام اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم پر مشتمل صحابہ کرام کی مختصر جماعت کو بدر کے کنویں کی طرف روانہ کیا تاکہ قریشی لشکر کے بارے میں مزید معلومات اکٹھی کی جائیں۔ وہاں انھوں نے دو لڑکوں کو دیکھا جو قریشی لشکر کے لیے پانی لینے آئے تھے۔ وہ ان دونوں کو پکڑ کر نبی ﷺ کے پاس لے آئے۔ آپ ﷺ نے ان دونوں سے پوچھا: «أَخْبِرَانِي عَنْ جَيْشِ قُرَيْشٍ» ''مجھے قریش کے لشکر کے بارے میں خبر دو!'' انھوں نے کہا: ''اللہ کی قسم! وہ اُس دور والے کنارے پر واقع ٹیلے کے پیچھے ہیں۔'' نبی علیہ السلام نے دریافت فرمایا: «كَمِ الْقَوْمُ؟» ''کتنے لوگ ہیں؟'' انھوں نے کہا: ''وہ بہت زیادہ ہیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: «مَا عِدَّتُهُمْ؟» ''ان کی تعداد

1 السيرة النبوية لابن هشام: 2/268,269.

کتنی ہے؟'' ان دونوں نے کہا: ''تعداد ہمیں معلوم نہیں۔'' نبی ﷺ نے پھر فرمایا: «كَمْ يَنْحَرُونَ كُلَّ يَوْمٍ؟» ''وہ روزانہ کتنے اونٹ ذبح کرتے ہیں؟'' دونوں نے جواب دیا: ''کبھی نو اور کبھی دس۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: «اَلْقَوْمُ مَا بَيْنَ التِّسْعِ مِئَةٍ وَّالْأَلْفِ» ''ان کی تعداد نو سو سے ہزار تک ہے۔'' پھر نبی ﷺ نے پوچھا: «فَمَنْ فِيهِمْ مِّنْ أَشْرَافِ قُرَيْشٍ؟» ''ان میں قریش کے بڑے سردار کون کون سے ہیں؟'' انھوں نے ربیعہ کے بیٹے عتبہ اور شیبہ، ابوجہل اور امیہ بن خلف کے علاوہ چند دیگر سردارانِ قریش کا نام لیا۔ آپ ﷺ صحابہ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

«هٰذِهِ مَكَّةُ قَدْ أَلْقَتْ إِلَيْكُمْ أَفْلَاذَ كَبِدِهَا»

''مکہ نے تمھارے سامنے اپنے جگر گوشے ڈال دیے ہیں۔''[1]

غزوات میں رسول اللہ ﷺ کا طریقہ کار یہ ہوتا تھا کہ پہلے آپ ﷺ دشمن کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کرتے اور ان کے تمام مقاصد و اہداف جاننے کی کوشش فرماتے تاکہ کوئی مناسب اور مربوط منصوبہ بندی کی جا سکے۔

غزوۂ بدر میں نبی ﷺ نے بلاواسطہ اور بالواسطہ دونوں طریقوں سے قریش کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیا اور اپنی خبر کو حد درجہ چھپائے رکھا۔ یہ ایک جنگی اصول ہے۔ قرآن کریم میں اس قانون کی اہمیت اجاگر کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَإِذَا جَآءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِۦ ۖ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰٓ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنۢبِطُونَهُۥ مِنْهُمْ ۗ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُۥ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَٰنَ إِلَّا قَلِيلًا ۝﴾

''اور جب ان کے پاس کوئی امن یا خوف کی خبر آتی ہے تو اسے مشہور کر دیتے ہیں، حالانکہ اگر وہ اسے رسول اور اپنے میں سے کسی ذمہ دار حاکم کے حوالے کر

[1] صحيح مسلم، حديث: 1779، والسيرة النبوية لابن هشام: 269/2.

دیتے تو ایسی باتوں کی تہہ تک پہنچنے والے اس کی حقیقت جان لیتے اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو چند ایک کے سوا تم ضرور شیطان کے پیچھے لگ جاتے۔''[1]

رسول اللہ ﷺ نے عمومی طور پر تمام غزوات میں اپنی خبروں اور ارادوں کو چھپائے رکھا۔ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی غزوے کا ارادہ فرماتے تو جس طرف جانا ہوتا اس کے سوا کسی اور طرف جا کر ظاہر کرتے کہ ہم اس طرف جا رہے ہیں۔[2]

غزوۂ بدر میں نبی ﷺ نے دشمن کی سرگرمیوں سے آگاہ ہونے اور اپنے سے متعلقہ تمام خبروں کو چھپانے کے جو اقدامات کیے وہ مندرجہ ذیل تھے:

- بدر میں ملنے والے بوڑھے شخص سے اپنے لشکر اور قریشی لشکر کے بارے میں سوال کرنا۔
- اس بزرگ کے سوال: ''تم کون ہو؟'' کے جواب میں آپ ﷺ کا فرمان کہ ہم پانی سے ہیں۔ یہ توریہ تھا اور یہی جواب موقع کے مطابق تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس طریقے سے دشمن سے اسلامی لشکر کے حالات مخفی رکھے۔
- بوڑھے آدمی کو جواب دینے کے بعد فوراً واپس پلٹنا بھی رازداری کا ایک انداز تھا اور آپ ﷺ کی حکمت و دانائی کا ثبوت تھا۔ اگر بالفرض آپ ﷺ اس جواب کے بعد وہاں رکتے تو وہ بزرگ لازمی طور پر آپ کے جواب: ''ہم پانی سے ہیں۔'' کی تفصیل طلب کرتا۔
- اونٹوں کی گردنوں سے گھنٹیاں اتارنے کا حکم: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''نبی علیہ السلام

1 النسآء 4:83. 2 صحیح البخاري، حدیث: 2948,2947. اس حدیث میں بیان کردہ اس فعل کو ''توریہ'' کہا جاتا ہے۔

نے بدر کے دن اونٹوں کی گردنوں سے گھنٹیاں اتارنے کا حکم صادر فرمایا تھا۔"[1]

❁ بدر کی طرف روانگی کے وقت منزل مقصود کو مکمل صیغۂ راز میں رکھنا جیسا کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا تھا: «إِنَّ لَنَا طَلِبَةً، فَمَنْ كَانَ ظَهْرُهُ حَاضِرًا فَلْيَرْكَبْ مَعَنَا»

"ہم کسی کی طلب میں جارہے ہیں جس کے پاس سواری ہو وہ ہمارے ساتھ چلے۔"[2]

علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین سے جنگ میں "توریہ" کرنے کا ثبوت ملتا ہے جسے استحباب پر محمول کیا جائے گا کہ امام اپنے لشکروں کی پیش قدمی کی اطلاع اور منزلِ مقصود کی نشاندہی نہ کرے تاکہ یہ خبر عام نہ ہو اور خبر پا کر دشمن متنبہ نہ ہو جائے۔[3]

سیرت طیبہ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں سری اور جہری دعوت کا دور ہو یا مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست کے وجود کے بعد کا، ہر جگہ حفاظتی اقدامات کو ملحوظ خاطر رکھا گیا جو وقت کے ساتھ ساتھ خصوصاً غزوات میں ترقی کرتا چلا گیا۔

حباب بن منذر رضی اللہ عنہ کا مشورہ

لشکر کفار کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر لینے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مقام بدر کی طرف پیش قدمی کا حکم فرمایا تاکہ دشمن سے پہلے بدر کے چشمے پر قبضہ کر لیں اور مشرکین کو اس پر قبضہ نہ کرنے دیں، چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے چشمے کے قریب پڑاؤ ڈالا۔ اس موقع پر حباب بن منذر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! کیا آپ اللہ کے حکم سے اس مقام پر ٹھہرے ہیں کہ اب ہمارے لیے اس سے آگے یا پیچھے ہونے کی گنجائش نہیں ہے یا محض جنگی حکمت عملی اختیار فرمائی ہے؟" نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «بَلْ هُوَ الرَّأْيُ وَالْحَرْبُ وَالْمَكِيدَةُ» "یہ جگہ محض جنگی نقطہ نظر سے اختیار کی

---

1 مسند أحمد: 150/6، و صحيح ابن حبان، حديث: 4699و 4702، و مجمع الزوائد: 174/5. 2 صحيح مسلم، حديث: 1901. 3 شرح صحيح مسلم للنووي، تحت الحديث: 1901.

گئی ہے۔'' حباب بن منذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! پھر یہ جگہ مناسب معلوم نہیں ہوتی۔ آپ مزید کچھ آگے تشریف لے جائیں اور جو چشمہ قریش کی جانب بالکل قریب ہے وہاں فروکش ہوں، پھر ہم باقی تمام چشمے پاٹ دیں گے اور اپنے والے چشمے پر حوض بنالیں گے اور پانی بھرلیں گے۔ جب جنگ ہوگی تو ہمارے لیے پانی میسر ہوگا اور دشمن کو پانی نہ مل سکے گا۔'' نبی ﷺ نے حباب بن منذر رضی اللہ عنہ کا مشورہ قبول فرمایا۔ آپ ﷺ تمام لشکر کے ساتھ آگے بڑھے اور دشمن کے قریب ترین چشمے پر پڑاؤ فرمایا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے وہاں حوض بنایا اور باقی تمام چشموں کو بند کر دیا۔[1]

حباب بن منذر رضی اللہ عنہ کا مشورہ دینا اور آپ ﷺ کا اسے قبول کرنا نبی ﷺ کی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ تعلقات کی عمدہ مثال تھی۔ حالات چاہے کیسے ہی کیوں نہ ہوں معاشرے کے ہر فرد کو اظہار رائے کا حق حاصل تھا۔ رائے کا اظہار کرنے والے کو اپنے سالارِ اعلیٰ کی ناراضی کا کوئی اندیشہ نہ تھا۔ اسی طرح اس پر مرتب ہونے والے امور جیسے قائد کی رائے کے خلاف مشورہ دینے والے کی اچھی شہرت کو داغدار کرنا، اس کے مرتبے کو کم کرنا یا قائد کی طرف سے اُس کے جان و مال کو ضرر پہنچنا وغیرہ اسے اِن میں سے کسی بات کا کوئی اندیشہ تک نہ ہوتا تھا۔

یہی وہ آزادیِ اظہار تھا جس پر نبی ﷺ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تربیت فرمائی۔ اسی تربیت کے سبب معاشرے کے تمام معقول رائے رکھنے والے اور باشعور افراد کی ذہانت و فطانت سے استفادہ ممکن ہوا۔ اور معلوم ہوا کہ سالارِ اعلیٰ شورائی نظام کی بدولت عظیم کامیابی حاصل کرسکتا ہے۔ قائد کو چاہیے کہ وہ صرف اپنی یا کسی ایسے خاص طبقے کی طرف سے مسلّط کردہ رائے پر نہ چلے جس سے ان کے ذاتی مفادات کا مسئلہ کھڑا ہو جائے۔ جس میں عوام الناس کی مصلحتوں کا خیال نہ رکھا گیا ہو۔ قائد تو اپنے تمام سپاہیوں اور

[1] السيرة النبوية لابن هشام:272/2، ودلائل النبوة للبيهقي: 35/3.

کارکنوں کی رائے کا احترام کرنے والا ہوتا ہے۔ چاہے کوئی درست مشورہ دینے والا گمنام اور کم درجے کا حامل ہی کیوں نہ ہو۔ ایسے آدمی اور سالارِ اعلیٰ کے درمیان کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے۔[1]

حضرت حباب بن منذر رضی اللہ عنہ کے اس مشورے میں ہم ان کی شخصیت میں نبوی تربیت کا گہرا اثر بھی محسوس کر سکتے ہیں۔ حباب بن منذر رضی اللہ عنہ نے انتہائی مؤدبانہ انداز اختیار کیا۔ وہ اگرچہ طلب کیے بغیر مشورہ دینے کے لیے آگے بڑھے تھے لیکن انھوں نے اظہارِ رائے سے پہلے ایک شاندار سوال کیا: ''اے اللہ کے رسول! کیا اس مقام پر ٹھہرنے کا حکم اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے کہ ہم آگے یا پیچھے نہیں ہو سکتے یا آپ نے اسے محض جنگی مصلحت کی خاطر اختیار فرمایا ہے؟''

ایسا سوال کسی بھی آدمی کی انفرادیت اور اعلیٰ قیادت سے متعلقہ ادبی صلاحیتوں کا پتا دیتا ہے کہ اپنے عظیم قائد کے سامنے گفتگو کب اور کیسے کی جاتی ہے۔

حضرت حباب رضی اللہ عنہ کا مقصد یہ تھا کہ اگر یہ مقام بذریعہ وحی منتخب ہوا ہے تو زبان سے ایک لفظ بولنے سے بہتر ہے کے جان چلی جائے لیکن اگر یہ بشری تقاضوں کے مطابق ہے تو جنگی نقطہ نظر سے ان کے پاس اس سے زیادہ مناسب لائحہ عمل موجود ہے۔

بلاشبہ اس بلند پایہ مشورے نے اظہار رائے کے نئے اور عمدہ اصول متعارف کروائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سمع و طاعت، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے کے خلاف رائے کی حدود کو متعین کیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم قائدانہ صلاحیتوں کا ظہور بھی ہوا کہ آپ نے اس نئی رائے کو بغور سنا اور اپنے اس عظیم فوجی کمانڈر کی پیش کردہ تجویز کو عملی شکل دی۔[2]

قرآن کریم میں مشرکین کی پیش قدمی کا تذکرہ

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي: 110/4. [2] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 21/3.

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِم بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ۝﴾

''اور ان لوگوں کی طرح مت ہو جاؤ جو اپنے گھروں سے اتراتے اور لوگوں کو دکھلاتے اور اللہ تعالیٰ کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہوئے نکلے، حالانکہ اللہ تعالیٰ ان کے سب کاموں کو گھیرے ہوئے ہے۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو ان کافروں کی مشابہت اختیار کرنے سے روکا ہے جو اپنے گھروں سے تکبر اور دکھلاوے کی غرض سے روانہ ہوئے۔ آیتِ مذکور کی تفسیر حسب ذیل ہے:

﴿بَطَرًا﴾ علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ لغت میں ''بطر'' تقویت کو کہا جاتا ہے، یعنی اللہ عزوجل کی نعمتوں اور عطا کردہ عافیت کی بدولت اسی کی معاصی کو تقویت دینا۔[2]

﴿وَرِئَاءَ﴾ سے مراد ہر وہ قول اور فعل ہے جو اخلاص سے خالی ہو اور اس کا مقصد صرف نمود ونمائش اور تعریف کا حصول ہو۔

﴿وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۚ﴾ اس کا عطف ﴿بَطَرًا﴾ پر ہے۔ ﴿سَبِيلِ﴾ کا لفظ ہر اس راستے پر بولا جاتا ہے جس میں آسانی ہو اور سبیل اللہ سے مراد اللہ کا دین اور اس کا راستہ ہے جس میں لوگوں کی بھلائی اور اصلاح مضمر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں مشرکین کے تین عیب بیان فرمائے ہیں:

① اترانا۔ ② ریاکاری۔ ③ اللہ کے راستے سے روکنا۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے تکبر اور اترانے کو صیغۂ اسم ﴿بَطَرًا وَرِئَاءَ﴾ سے بیان فرمایا ہے جو ثبوت اور دوام پر دلالت کرتا ہے اور اللہ کے راستے سے روکنے کو صیغۂ فعل ﴿وَيَصُدُّونَ﴾ سے بیان فرمایا ہے جس میں دوام نہیں ہوتا بلکہ وہ کسی کام کے بار بار

1 الأنفال 8:47. 2 تفسير القرطبي: 8/25.

واقع ہونے پر دلالت کرتا ہے۔[1]

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یقیناً ابوجہل اور اس کا گروہ فطرتاً خود پسندی اور تکبر میں مبتلا تھے۔ اور ان کی طرف سے اللہ کے راستے سے روکنے والی خرابی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد شروع ہوئی تھی، اس لیے تکبر اور ریاکاری کو صیغۂ اسم اور اللہ کے راستے سے روکنے کو صیغۂ فعل سے بیان فرمایا گیا ہے۔ واللہ أعلم.[2]

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ابوجہل اور اس کے دیگر رفقاء بدر کے دن اپنے تجارتی قافلے کی مدد کے لیے آئے اور اپنے ساتھ گانے بجانے کا سامان اور گانے والیاں بھی لے کر آئے تھے۔ جب وہ جحفہ پہنچے تو خُفاف الکنانی، جو ابوجہل کا دوست تھا، اس نے اپنے بھائی کو تحائف دے کر ابوجہل کی طرف روانہ کیا اور کہلا بھیجا: ''اگر تم پسند کرو تو میں تمھاری مدد کے لیے کچھ آدمی بھیج دیتا ہوں یا خود اپنی قوم کے ہمراہ تمھاری مدد کے لیے آجاتا ہوں؟'' ابوجہل نے جواب دیا: ''اللہ کی قسم! اگر ہم، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گمان کے مطابق، اللہ سے جنگ کر رہے ہیں تو اس ذات سے مقابلہ کرنے کی ہم میں طاقت نہیں اور اگر ہم لوگوں سے لڑتے ہیں تو اللہ کی قسم! ہمارے پاس ان سے لڑنے کی طاقت موجود ہے۔ اللہ کی قسم! ہم کبھی بھی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے لڑائی کے میدان میں پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ ہم ہر حال میں مقام بدر تک پہنچیں گے۔ وہاں ہم شراب پییں گے۔ گلوکارائیں گانا گائیں گی۔ بلاشبہ مقامِ بدر عرب کا میلہ ٹھہرے گا اور عرب کا ایک بڑا بازار ہو گا۔ سارا عرب ہمارے مکہ سے یہاں آنے کا حال سنے گا اور ہمیشہ کے لیے ان پر ہماری دھاک بیٹھ جائے گی۔''[3]

روانگی کے وقت مشرکین کے خیالات

اللہ تعالیٰ نے روانگی کے وقت مشرکین کے خیالات کو اس طرح بیان فرمایا ہے:

---

[1] حديث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ لأبي بدر محمد بكر آل عابد: 1/66,65. [2] تفسير الرازي: 15/173. [3] تفسير القرطبي: 8/25.

﴿اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَاِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَوْ كَثُرَتْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾

''(کافروں سے کہہ دیجیے:) اگر تم فیصلہ مانگتے تھے تو فیصلہ تمھارے سامنے آ گیا۔ اور اگر تم باز آ جاؤ تو وہ تمھارے حق میں بہتر ہے اور اگر تم دوبارہ (پہلے کی طرح) کرو گے تو ہم بھی پھر اسی طرح کریں گے (تمھیں سزا دیں گے) اور تمھاری جماعت اگرچہ زیادہ ہی ہو وہ تمھیں ہرگز کچھ فائدہ نہ دے گی اور بے شک اللہ مومنوں کے ساتھ ہے۔''[1]

امام احمد رحمہ اللہ عبداللہ بن ثعلبہ سے بیان فرماتے ہیں کہ ابوجہل نے معرکۂ بدر کے بارے میں یہ دعا کی: ''اے اللہ! ہم میں سے جو بہت زیادہ قطع رحمی کرنے والا اور ہمارے پاس غیر معروف (اجنبی) چیزیں لانے والا ہے اسے تو کل کو ہلاک کر دینا۔ ابوجہل ہی وہ شخص تھا جو فیصلہ مانگنے والا تھا۔''[2]

آیت کریمہ کا مطلب یوں ہوگا: ''اگر تم محمد ﷺ کے خلاف اللہ سے مدد مانگتے ہو تو سن لو تمھارے پاس اس کا فیصلہ آ گیا۔ مکہ سے روانہ ہوتے وقت انھوں نے اللہ سے دعا کی تھی کہ جو جماعت حق پر ہو اے اللہ! اس کی مدد فرما۔ اللہ تعالیٰ نے بطور استہزا مدد آنے کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ اور ان پر نازل ہونے والی ہلاکت کو مدد سے تعبیر کیا ہے۔ اور اس بنا پر باقی ماندہ آیت کا ترجمہ یوں ہوگا: ﴿وَاِنْ تَنْتَهُوْا﴾ ''اور اگر تم کفر اور پیغمبر کی عداوت سے باز آ گئے'' ﴿فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ﴾ ''تو یہ رکنا اور باز آنا تمھارے لیے بہتر ہوگا۔'' ﴿وَاِنْ تَعُوْدُوْا﴾ ''اور اگر تم دوبارہ کفر و عناد کی طرف پلٹ گئے تو'' ﴿نَعُدْ﴾ ''ہم بھی

1 الأنفال 19:8. 2 مسند أحمد: 431/5، والسيرة النبوية لابن هشام: 280/2، و دلائل النبوة للبيهقي: 74/3.

اہل ایمان کو تم پر دوبارہ مسلط کر دیں گے۔ اور ان کی تمھارے خلاف مدد کریں گے جس طرح بدر میں کی تھی۔ ﴿وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْـًٔا وَّلَوْ كَثُرَتْ﴾ ''چاہے تمھاری جماعت کتنی ہی کثرت میں کیوں نہ ہو، کسی حالت میں بھی تمھارے کام نہ آسکے گی۔'' ﴿وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ ''اور یقیناً اللہ مومنوں کے ساتھ ہے۔'' اور اللہ جس کے ساتھ ہو گویا وہ اللہ کی طرف سے مدد کیا گیا ہے اور جس کے خلاف ہو وہ رسوا ہو گا۔[1]

مکی لشکر میں پھوٹ: مکی لشکر جب مقام بدر میں خیمہ زن ہوا تو ان کا آپس میں اختلاف ہو گیا اور ان کی صفوں میں دراڑیں پیدا ہو گئیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب مسلمان مقامِ بدر میں پہنچے اور مشرکین بھی وہاں خیمہ زن ہو گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عتبہ بن ربیعہ کو سرخ اونٹ پر سوار دیکھا تو فرمایا: «إِنْ يَّكُنْ عِنْدَ أَحَدٍ مِّنَ الْقَوْمِ خَيْرٌ فَهُوَ عِنْدَ صَاحِبِ الْجَمَلِ الْأَحْمَرِ، إِنْ يُّطِيعُوهُ يَرْشُدُوا» ''اگر آج کے دن ان لوگوں میں سے کسی کے پاس بھلائی ہے تو وہ سرخ اونٹ والے کے پاس ہے۔ اگر لوگ اس کی بات مان لیں تو فائدے میں رہیں گے۔'' دراصل عتبہ بن ربیعہ یہ کہہ رہا تھا: ''اے میری قوم کے لوگو! ان کے بارے میں میری بات مان لو! اگر تم نے ان سے جنگ کی تو ساری عمر تمھارے دل میں یہ لڑائی کھٹکتی رہے گی۔ ہر آدمی اپنے بھائی یا باپ کے قاتل کو بھی دیکھتا رہے گا۔ اس معرکے کا بوجھ میرے سر چھوڑو اور واپس چلے جاؤ۔'' ابوجہل نے کہا: ''اللہ کی قسم! یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اس کے ساتھیوں کو دیکھ کر بزدل ہوا جا رہا ہے، حالانکہ یہ لوگ جب ہمارے مقابل آئیں گے تو اونٹنی کا لقمہ ثابت ہوں گے۔'' عتبہ نے کہا: ''عنقریب تجھے علم ہو جائے گا کہ کون بزدل اور اپنی قوم کو ہلاکت میں ڈالنے والا ہے۔ اللہ کی قسم! میں دیکھ رہا ہوں وہ تمھیں بہت زیادہ مار رہے ہیں۔ کیا تمھیں نظر نہیں آرہا کہ ان کے سر سانپوں کی طرح اٹھے ہوئے اور چہرے تلواروں کی طرح چمک

[1] حديث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ لأبي بدر محمد بكر آل عابد: 68/1.

رہے ہیں۔"[1]

حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "اسلام لانے سے قبل بدر کے دن میں مشرکوں کی صفوں میں تھا۔ ہم مکہ سے آئے اور اس کنارے پر پڑاؤ کیا جس کا قرآن نے تذکرہ کیا ہے۔ میں عتبہ بن ربیعہ کے پاس آیا اور کہا: "اے ابو ولید! کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ ایک ایسا کام کریں کہ آپ کا ذکر خیر تاحیات جاری رہے؟" عتبہ نے پوچھا: "وہ کون سا کام ہے؟" میں نے کہا: "آپ لوگ محمد (ﷺ) سے عمرو بن حضرمی کا قصاص لینا چاہتے ہو کیونکہ وہ تمھارا حلیف تھا۔ ایسے کرو کہ تم اس کی دیت اپنے ذمے لے لو اور لوگوں کو واپس لے جاؤ۔" عتبہ نے کہا: "مجھے منظور ہے۔ میری طرف سے اس کی ضمانت لے لو میں اس کی دیت کا ذمہ دار ہوں۔ اب تم ابن حنظلیہ (ابوجہل) کے پاس جاؤ اور اسے کہو: "کیا تم اپنے چچیرے بھائی کے خون سے دستبردار ہو کر لوگوں کو واپس نہیں لوٹا سکتے؟" اس وقت ابوجہل کے پاس بہت سے لوگ جمع تھے اور عمرو بن حضرمی کا بھائی عامر بن حضرمی اس کے قریب ہی کھڑا تھا۔ ابوجہل کہنے لگا: "میں عبدشمس اور بنو مخزوم سے اپنا معاہدہ توڑتا ہوں۔" میں نے اس سے کہا: "میں تیرے لیے عتبہ بن ربیعہ کا پیغام لے کر آیا ہوں کہ کیا تو اپنے چچیرے بھائی کے خون سے دستبردار ہو کر لوگوں کو واپس نہیں لوٹا سکتا؟" وہ بولا: "کیا تیرے علاوہ اسے کوئی سفیر نہیں ملا؟" میں نے کہا: "نہیں، میں کسی اور کا سفیر بننا بھی نہیں چاہتا" پھر میں جلدی سے عتبہ کی طرف واپس گیا تاکہ مجھے اس معاملے کی باقی خبریں بھی حاصل ہوسکیں۔"[2]

قریشی سردار عتبہ بن ربیعہ محمد ﷺ کے ساتھ جنگ کی کوئی وجہ خیال نہیں کرتا تھا۔ اس نے محمد ﷺ کے خلاف جنگ نہ کرنے کی نصیحت کرتے ہوئے لوگوں سے کہا: "اگر وہ اپنی

1 مجمع الزوائد: 76/6، و مسند البزار: 176/2. 2 السيرة النبوية لابن هشام: 275,274/2، و دلائل النبوة للبيهقي: 66,65/3.

دعوت میں سچا ہے تو اس کی عزت قریش کی عزت اور اس کی حکمرانی قریش کی حکمرانی ہو گی اور اس وجہ سے قریش سب سے زیادہ خوش بخت بن سکتے ہیں اور اگر وہ بالفرض جھوٹا ہوا تو خود بخود عرب میں پگھل کر ختم ہو جائے گا۔

لیکن جاہلیت کا تکبر اور ہٹ دھرمی ہمیشہ ہی سے حق کو پنپتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی کیونکہ حق کا ساتھ دینے کا واضح مطلب تھا کہ آج کے بعد جاہلیت اور اس کا تکبر و غرور ختم ہو گیا اور اس کی جگہ حق نے لے لی۔[1]

قریش نے اسلامی قوت کا اندازہ لگانے کے لیے عمیر بن وہب جمحی کو روانہ کیا۔ عمیر نے گھوڑے پر سوار ہو کر لشکر کا چکر لگایا، پھر واپس آ کر اطلاع دی کہ اسلامی لشکر میں تین سو سے کچھ کم یا زیادہ افراد ہیں۔ لیکن میں پھر بھی دیکھ لوں کہ ان کی کوئی کمین گاہ یا کمک تو نہیں؟ وہ وادی میں گھوڑا دوڑاتا ہوا دور نکل گیا لیکن اسے کچھ دکھائی نہ پڑا۔ اس نے واپس آ کر بتایا کہ مجھے تو کچھ نظر نہیں آیا لیکن اے قریش کے لوگو! میں نے بلائیں دیکھی ہیں جو موت کی نشاندہی کرتی ہیں اور یثربی اونٹ اپنے اوپر یقینی اور دائمی موت لادے ہوئے ہیں۔ یہ ایسے لوگ ہیں جن کا ملجاو ماویٰ اور مکمل دفاع خود ان کی تلواریں ہیں۔ اور میں یہ خیال کرتا ہوں کہ ان کا کوئی آدمی بھی تمھارے آدمی کو قتل کیے بغیر نہیں مرے گا۔ اور بالفرض اگر انھوں نے تمھارے چیدہ افراد کو مار لیا تو اس کے بعد جینے کا مزہ نہیں رہے گا، اس لیے ذرا اچھی طرح سوچ بچار کر لو۔[2]

امیہ بن خلف نے مکہ سے جنگ کے لیے روانہ ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ ابوجہل اس کے پاس آیا اور بولا: ''اے ابوصفوان! تو اس علاقے کا سردار ہے۔ لوگ جب سنیں گے کہ تو نے جنگ میں شریک ہونے سے انکار کر دیا ہے تو وہ بھی انکار کر دیں گے۔'' پھر ابوجہل نے اس قدر اصرار کیا کہ امیہ کہنے لگا: ''اگر تو یہ لازمی سمجھتا ہے تو پھر میں مکہ کا سب سے

1 مرويات غزوة بدر لأحمد باوزير، ص:155. 2 البداية والنهاية:3/269.

عمدہ اونٹ اس سفر کے لیے خریدوں گا۔'' بعدازاں اپنی بیوی سے مخاطب ہوا: ''اے ام صفوان! میرا سامان سفر تیار کر دے۔'' اس نے کہا: ''اے ابوصفوان! شاید آپ کو اپنے یثربی بھائی سعد بن معاذ (رضی اللہ عنہ) کے الفاظ بھول گئے ہیں؟ اس نے کہا تھا: ''میں نے نبی ﷺ سے سنا ہے کہ تجھے مسلمان قتل کر دیں گے۔'' امیہ نے کہا: ''میں تو صرف ان کے ہمراہ تھوڑی دور تک جاؤں گا۔'' جب وہ روانہ ہوا تو ہر منزل پر اپنے اونٹ کا گھٹنا باندھ دیتا۔ چلتے چلتے اسی طرح آگے بڑھتا گیا تا آنکہ اللہ کے حکم سے بدر میں قتل ہو گیا۔[1]

ابوجہل نے ایک چالاکی یہ بھی دکھائی کہ عقبہ بن ابی معیط سے امیہ بن خلف کو جنگ پر ابھارنے کا کام لیا۔ عقبہ ایک انگیٹھی میں عود رکھے اور آگ روشن کیے اس کے پاس پہنچا اور انگیٹھی اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہنے لگا: ''تو عورتوں کی طرح بزدل ہے۔ یہاں بیٹھا رہ اور عود کی خوشبو لے۔'' امیہ نے کہا: ''تجھے اور جو تو لایا ہے اسے اللہ برباد کرے، پھر وہ اٹھا، سفر کی تیاری کی اور لشکر کے ساتھ روانہ ہوا۔'[2]

مکی لشکر اگرچہ بظاہر طاقت، عزم اور پختگی سے لبریز نظر آتا تھا لیکن ان کے دلوں میں خوف اور بزدلی ثبت ہو کر رہ گئی تھی اور وہ اندر سے بری طرح تذبذب کا شکار تھے۔[3]

عاتکہ بنت عبدالمطلب کا خواب: عاتکہ بنت عبدالمطلب کے خواب نے اہل مکہ پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ اس کا خواب یہ تھا کہ ایک آدمی نے قریش کو مدد کے لیے پکارا اور جبل ابوقبیس کی چوٹی سے ایک بڑا پتھر نیچے پھینکا۔ وہ پتھر ریزہ ریزہ ہو کر تمام قریش کے گھروں میں گرا۔ اس خواب کی وجہ سے عباس اور ابوجہل کے درمیان کچھ تکرار بھی ہوئی، پھر ضمضم آیا اور اس نے قافلہ تجارت کے بارے میں خبر دی۔ عاتکہ مکہ ہی میں رہیں حتی کہ اس خواب کی تعبیر اپنی آنکھوں سے دیکھی۔[4]

---

1 صحيح البخاري، حديث: 3950، و دلائل النبوة للبيهقي: 3/25-27. 2 السيرة النبوية لابن هشام: 2/610. 3 مرويات غزوة بدر لأحمد باوزير، ص: 138. 4 المجتمع المدني في عصر النبوة للدكتور العمري، ص: 138، و السيرة النبوية لابن هشام: 2/607,608.

جہیم بن صلت کا خواب: جب قریش جحفہ پہنچے تو جہیم بن صلت بن مطلب بن عبد مناف نے بھی ایک خواب دیکھا کہ ایک گھڑ سوار آدمی آیا۔ اس کے ساتھ ایک اونٹ بھی تھا۔ وہ آکر وہاں رکا اور کہا: عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ابوالحکم بن ہشام، امیہ بن خلف اور فلاں فلاں سردار سب مارے گئے، پھر اس نے اپنے اونٹ کے حلق میں تیر مارا اور اسے لشکر کی طرف ہانک دیا۔ اور اس کے خون کے چھینٹے ہر خیمے میں پہنچ گئے۔

جب ابوجہل کو اس خواب کا علم ہوا تو کہنے لگا: ''محسوس ہوتا ہے بنو مطلب سے کوئی دوسرا نبی مبعوث ہو گیا ہے۔ جب ہم کل میدان میں اتریں گے اسے معلوم ہو جائے گا۔''[1]

اس خواب نے درحقیقت مشرکین کو اندر سے کھوکھلا اور کمزور کر دیا تھا۔

مسلمانوں اور مشرکوں کے ٹھکانوں کا قرآن میں ذکر

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ۭ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ ۙ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ڏ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝﴾

''جبکہ تم (میدان بدر کے) قریب والے کنارے پر تھے اور وہ (کافر) دور والے کنارے پر تھے اور (قریش کا تجارتی) قافلہ تم سے بہت نیچے (بحیرہ قلزم کے ساحل کی طرف) تھا۔ اور اگر تم (دونوں فریق جنگ کے لیے) آپس میں وعدہ کرتے تو مقررہ وقت پر ضرور اختلاف کرتے اور لیکن (ہوا یہ کہ دونوں گروہ آمنے سامنے آگئے) تا کہ اللہ اس کام کو پورا کر دے جو ہونے والا تھا تا کہ جو ہلاک ہو وہ

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 618/2.

حجت (قائم ہونے) سے ہلاک ہو اور جو زندہ رہے وہ دلیل سے (حق پہچان کر) زندہ رہے اور بے شک اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔''[1]

اس آیت کریمہ میں غزوۂ بدر کے دونوں لشکروں کی تفصیل ہے۔ اور یہ ان کی حالت کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو اپنی نعمت یاد دلائی اور فرمایا: ﴿اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا﴾ (اے اہل ایمان) وہ وقت یاد کرو جب تم مدینہ سے روانہ ہوئے اور سفر طے کرتے ہوئے وادی کے مدینہ منورہ سے قریب والے کنارے پر پہنچے۔ جبکہ کفار دور والے کنارے پر تھے۔ اسے دور والا کنارہ اس لیے کہا گیا کیونکہ یہ مدینہ کی نسبت دور تھا۔ اور ابوسفیان (رضی اللہ عنہ) کا قافلۂ تجارت اور قافلے کے شرکا تم سے تین میل کے فاصلے پر بحر احمر کے ساحل پر تھے۔ یہ قافلہ تمھارے پڑاؤ سے نیچے کی جانب تھا۔

آیت میں غزوۂ بدر کے مقاصد کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ اور ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے کی جانے والی تدبیر کا تذکرہ بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا﴾ تا کہ اللہ اپنے دین کو عزت اور کلمے کو سربلندی سے نوازے۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے ساتھ دو گروہوں میں سے ایک کا وعدہ فرمایا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مدینہ طیبہ سے قافلۂ تجارت حاصل کرنے کی غرض سے روانہ ہوئے تھے۔ قریش کو مسلمانوں کے اس اقدام نے مضطرب کر دیا جس کے نتیجے میں وہ مکہ سے قافلے کی حفاظت کے لیے نکلے، پھر اللہ نے ایسے اسباب فراہم کر دیے کہ مسلمان وادی کے ایک کنارے اور کفار دوسرے کنارے پر خیمہ زن ہوئے اور قافلہ ان سے ہٹ کر تھا جس کی حفاظت کے لیے وہ آئے تھے اور معرکہ بدر پیش آیا۔[2]

[1] الأنفال 42:8. [2] تفسير الكشاف للزمخشري: 160/2.

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ﴾

’’اور اگر تم (دونوں فریق جنگ کے لیے) آپس میں وعدہ کرتے تو مقررہ وقت پر ضرور اختلاف کرتے۔‘‘

اس میں حکمت والی ذات کی تدبیر اور اس کے لامحالہ نافذ ہونے والے ارادے کا بیان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم اور کفار پہلے سے جنگ کے لیے کوئی وقت اور جگہ متعین کرتے تو متفق نہ ہو پاتے کیونکہ تم قلتِ تعداد اور جنگی ساز وسامان کی عدم دستیابی اور ساری توجہ کا انحصار تجارتی قافلے کی طرف کرنے کی وجہ سے جنگ کرنے کو ناپسند کرتے تھے۔

اسی طرح قریش کے اکثر افراد کا ارادہ بھی بغیر جنگ کے محض قافلے کی حفاظت تھا کیونکہ وہ درحقیقت رسول اللہ ﷺ سے جنگ کرنے سے گریز کرتے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ اللہ اپنے رسول کی مدد ضرور فرمائے گا۔ وہ تو صرف تکبر اور سرکشی کی وجہ سے نبوت کے منکر بنے تھے نہ یہ کہ ان کا اعتقاد بھی یہی تھا۔

﴿ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ﴾

’’اور لیکن (ہوا یہ کہ دونوں گروہ آمنے سامنے آگئے) تاکہ اللہ اس کام کو پورا کردے جو ہونے والا تھا تاکہ جو ہلاک ہو وہ حجت (قائم ہونے) سے ہلاک ہو اور جو زندہ رہے وہ دلیل سے (حق پہچان کر) زندہ رہے۔‘‘ [1]

یعنی تمھارا تصادم بنا کسی پیشگی چیلنج یا بغیر کسی لڑائی کے ارادے کے پیش آیا تاکہ اللہ تعالیٰ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دے جو اس کے علم اور حکمت کے مطابق لامحالہ ہونے والا تھا۔ اور یہ کام کفار کی رسوائی، مسلمانوں کی مدد، اسلام کا غلبہ اور اللہ کے رسول سے کیے ہوئے وعدے کا ایفاء تھا۔ [2]

1 الأنفال 42:8. 2 تفسير الطبري: 11/10.

﴿لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ﴾

''تاکہ جو ہلاک ہو وہ حجت (قائم ہونے) سے ہلاک ہو اور جو زندہ رہے وہ دلیل سے (حق پہچان کر) زندہ رہے۔''

علامہ آلوسی ؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت کا مطلب یہ ہوگا: ''جو مرے اور اپنی جان دے تو کسی ایسی حجت سے مرے جسے وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے اور جو زندہ رہے وہ بھی بصیرت پر زندہ رہے اور اسے یقین ہو کہ کثرت تعداد ہی صرف کامیابی کا راز نہیں ہے۔ معرکہ بدر اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح، نمایاں اور روشن برہان تھا۔''[1]

﴿وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○﴾ آیت کا یہ حصہ خاتمے کی حیثیت رکھتا ہے جس میں ایمان لانے کی ترغیب اور کفر سے اجتناب کا درس دیا گیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کے تمام اقوال سے واقف ہے اور ان کے دل جو سوچتے ہیں اللہ وہ سب جانتا ہے۔ اور عنقریب اللہ تعالیٰ اپنے علم کے سبب ہر انسان کو جزا یا سزا میں سے جس کا بھی وہ مستحق ہوگا اسے عطا فرمائے گا۔[2]

[1] تفسير الآلوسي: 10/7. [2] تفسير الآلوسي: 10/7.

باب 2

رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میدانِ کارزار میں

نبی ﷺ کے لیے چھپر کی تعمیر

جب نبی ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بدر کے چشمے پر قرآن کریم کے ذکر کردہ کنارے "عدوۃ دنیا" پر پڑاؤ کیا تو سعد رضی اللہ عنہ نے تجویز پیش کی کہ آپ ﷺ کے لیے علیحدہ ایک چھپر تعمیر کیا جائے۔ وہ سب کے لیے مرکزی قیادت گاہ کی حیثیت کا حامل ہو جس میں آپ ﷺ دشمن سے محفوظ ہوں گے۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: "اے اللہ کے نبی! کیوں نہ ہم آپ کے لیے ایک چھپر تعمیر کر دیں جس میں آپ تشریف فرما ہوں۔ وہاں آپ کے پاس سواری بھی مہیا ہو گی۔ بعدازاں ہم دشمن سے ٹکرائیں گے۔ اگر اللہ نے ہمیں عزت بخشی اور دشمن پر غلبہ عطا فرمایا تو یہی ہمارا مطلوب ہے اور اگر بالفرض کوئی دوسری صورت سامنے آئی تو آپ سواری پر سوار ہو کر قوم کے ان لوگوں میں تشریف لے جانا جو پیچھے رہ گئے ہیں۔ آپ کے پیچھے (مدینہ منورہ میں) ایسے لوگ ہیں کہ ہم آپ کی محبت میں ان سے بڑھ کر نہیں ہیں۔ انھیں اگر اندازہ ہوتا کہ جنگ کی نوبت پیش آئے گی تو وہ ہرگز پیچھے نہ رہتے۔ آپ ان کے پاس چلے جانا۔ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے سے آپ کی حفاظت فرمائے گا۔ وہ آپ کے سچے خیر خواہ ثابت ہوں گے اور آپ کے ہمراہ جہاد کریں گے۔"

یہ بات سن کر نبی ﷺ نے سعد رضی اللہ عنہ کی تعریف اور دعائے خیر فرمائی۔ مسلمانوں نے

ایک اونچے ٹیلے پر چھپر تعمیر کیا جہاں سے میدانِ کارزار کی منظر کشی ہو رہی تھی۔ آپ ﷺ کے ساتھ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ تھے۔ اس مرکزی قیادت کے دفاع اور حفاظت کے لیے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی زیر قیادت انصاری نوجوانوں کا ایک دستہ متعین ہوا۔[1]

چھپر کی تعمیر سے ماخوذ دروس درج ذیل ہیں:

① سالارِ اعلیٰ کے لیے ایک ایسا مرکز ہونا چاہیے جہاں سے وہ میدان جنگ کا مشاہدہ کر سکے تاکہ جنگ کے انتظامی امور میں دشواری نہ ہو۔

② مرکز قیادت کے لیے مناسب پہرے کا انتظام ہو تاکہ مرکزِ قیادت محفوظ رہ سکے۔

③ سالارِ اعلیٰ کی جان کی فکر کرنا اور ہر ممکنہ خطرے سے اسے تحفظ فراہم کرنا۔

④ سالارِ اعلیٰ کے لیے ایک احتیاطی عسکری قوت کا ہونا تاکہ اگر مبادا جنگ میں نقصان ہو تو قیادت کی نگرانی میں اس کی تلافی کی جا سکے۔[2]

شرکائے بدر پر اللہ تعالیٰ کے انعامات

بدر کے دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہل ایمان پر چند نعمتوں کا ظہور ہوا جن میں دشمن کے ساتھ لڑائی سے پیشتر اونگھ کا طاری ہونا اور بارش کا نزول وغیرہ شامل ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ۝﴾

”(یاد کرو) جب وہ (اللہ) اپنی طرف سے تمھیں امن وسکون دینے کے لیے تم پر اونگھ طاری کر رہا تھا اور آسمان سے تم پر بارش برسا رہا تھا تاکہ تمھیں اس کے ذریعے

1 السيرة النبوية لابن هشام: 273,272/2، ودلائل النبوة للبيهقي: 44/3. 2 غزوة بدر الكبرىٰ لأبي فارس، ص: 66.

سے پاک کر دے اور تم سے شیطانی وسوسوں کو لے جائے اور تا کہ تمھارے دلوں کو مضبوط کر دے اور تا کہ اس کی وجہ سے (تمھیں) ثابت قدم رکھے۔“ [1]

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”معرکہ بدر سے ایک رات پہلے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر اونگھ طاری ہوگئی۔ اگرچہ جنگ کے بادل منڈلا رہے تھے۔ لیکن اللہ نے ان پر اونگھ طاری کر کے ان کے دلوں کو تقویت بخشی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”غزوۂ بدر کے موقع پر مقداد رضی اللہ عنہ کے سوا کسی کے پاس گھوڑا نہ تھا۔ ان کا گھوڑا سفید اور سیاہ رنگ کا تھا۔ میں نے غور کیا کہ ہم سب سوئے ہوئے تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم جاگ رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک درخت کے نیچے روتے ہوئے نماز ادا کر رہے تھے اور اسی حالت میں صبح ہوگئی۔“

اس رات اونگھ طاری ہونے کے فوائد یہ تھے:

① اس لیے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اگلی صبح پیش آنے والے معرکے کے لیے تازہ دم ہو جائیں۔

② اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں سے رعب ختم کرنے کے لیے کیونکہ مثل مشہور ہے: «اَلْأَمْنُ مُنِيمٌ، وَالْخَوْفُ مُسْهِرٌ» ”امن نیند اور خوف بیداری کا موجب ہے۔“ [2]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میں نے ایک خاص موقع پر اہل ایمان پر بارش نازل کر کے عزت بخشی جبکہ وہ دن برسات کے نہیں تھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی کرم نوازی تھی۔ نزول کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنا اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ اللہ کا خصوصی فضل تھا۔

علامہ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”طبعی طور پر مومن جنابت کی حالت کو ناپسند خیال کرتا ہے اگر اسے پانی میسر نہ آئے تو رنجیدہ خاطر ہو جاتا ہے اور اس کا دل مضطرب رہتا ہے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے انھیں پانی عطا فرمایا اور طہارت کے مواقع بہم پہنچائے۔ اور اسے اپنا خصوصی انعام قرار دیا۔“ [3]

[1] الأنفال 11:8. [2] تفسير القرطبي: 327/7. [3] تفسير الرازي: 133/15.

﴿وَ يُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ﴾ کی تفسیر میں علامہ ابن جریر رحمہ اللہ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا: ''جب نبی ﷺ اور مسلمان غزوۂ بدر کے دن مقام بدر کی طرف بڑھے تو ان کے اور پانی کے درمیان ریت کا بہت بڑا تودہ حائل ہوگیا۔ جس کی وجہ سے انھیں بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ شیطان نے مسلمانوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالا کہ تم اللہ کے پسندیدہ ہو، پیغمبر بھی تمھارے ساتھ ہیں اور پانی کا ایک قطرہ بھی تمھیں میسر نہیں۔ تم جنابت کی حالت میں نماز پڑھتے ہو۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان پر موسلا دھار بارش نازل فرمائی۔ مسلمانوں نے پانی پیا اور طہارت حاصل کی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے انھیں شیطان کے پراگندہ خیالات سے نجات دی۔ بارش کی وجہ سے ریتلی زمین پختہ ہوگئی۔ صحابۂ کرام اور ان کے جانوروں کے پاؤں جم گئے اور بآسانی پیش قدمی ممکن ہوئی۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے وضاحت فرمائی کہ میں نے معرکہ پیش آنے سے قبل اپنے مومن بندوں پر بارش نازل فرمائی جس سے انھوں نے ظاہری اور باطنی دونوں طہارتیں حاصل کر لیں اور ان کے دلوں میں یکسوئی اور قدموں میں مضبوطی پیدا ہوگئی۔

مقام بدر کا مشاہدہ کرنے والا آج بھی دیکھ سکتا ہے کہ وہاں ریت کے ذرے اڑتے رہتے ہیں اور اتنی غبار ہوتی ہے کہ چلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بدر کے دن جب بارش نازل ہوئی تو ریت کے یہ ذرے تھم گئے، غبار بیٹھ گئی اور اس پر چلنا آسان ہوگیا۔ اور یہ سب اللہ کا اپنے بندوں پر احسان تھا۔[2]

نبی ﷺ کی جنگی حکمت عملی

نبی ﷺ نے بدر کے دن دشمن کے خلاف ایسی حکمت عملی اور طریقہ اختیار فرمایا جو اس

[1] تفسیر الطبري: 195/9. [2] حدیث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ لأبي بدر محمد بكر آل عابد: 91/1.

سے قبل عرب میں متعارف نہ تھا۔ آپ ﷺ نے صف بندی کا اسلوب اپنایا۔[1] قرآن کریم نے اس اسلوب کی طرف اشارہ کیا ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُم بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ ۝﴾

''بے شک اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اس کی راہ میں صفیں باندھے لڑتے ہیں، گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی عمارت ہیں۔''[2]

تفصیل اس کی اس طرح ہو گی کہ پورا لشکر نماز کی طرح صف بندی کرے جبکہ صفوں کی کثرت یا قلت تعداد پر منحصر ہو گی۔ پہلی صف میں نیزہ باز ہوں گے جو گھڑسواروں کے حملے کو روکنے کے لیے ہوں گے۔ باقی دوصفوں میں تیر انداز ہوں گے جو دور سے حملہ آور کو روکیں گے تاکہ حملہ آوروں کے حملے سے صفوں میں انتشار پیدا نہ ہو۔ غزوۂ بدر میں یہ اسلوب اختیار کر کے مندرجہ ذیل فوائد حاصل کیے:

① مسلمانوں کے عمدہ عسکری نظام اور بہترین تربیت کی وجہ سے دشمن کا مرعوب ہونا۔

② ایسی حکمت عملی سے چیف کمانڈر کے پاس ریزرو فوجی دستے باقی رہتے ہیں جو پلٹ کر حملہ کرنے والوں اور گھات لگا کر حملہ کرنے والوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اور عمومی طور پر دشمن کے پیادہ اور شہسواروں کی طرف سے لشکر کے مختلف اطراف میں پیش آنے والے ممکنہ خطرات سے نبٹنے کے لیے بھی کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔

یہ طریقۂ کار جنگ بدر میں پہلی مرتبہ اپنایا گیا۔ اسلامی تربیت گاہ کی بدولت متعارف ہونے والے اس طریقۂ جنگ کو چودہ صدیاں بیت جانے کے بعد بھی امتیازی حیثیت حاصل ہے۔[3]

---

[1] القيادة العسكرية للدكتور محمد الرشيد، ص:401. [2] الصف4:61. [3] الرسول القائد ﷺ لمحمود شيت خطاب، ص: 111 و 117,116.

سیرت طیبہ کا مطالعہ کرنے والا یہ بات بھی بخوبی جانتا ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ بعض اوقات جدید ترین جنگی حکمت عملی کے تحت دشمن پر اچانک حملہ کرتے۔ خصوصاً وہ طریقہ کار اختیار فرماتے جو عرب میں متعارف نہ ہوتا۔ بدر و احد اور دیگر غزوات میں نبی ﷺ نے اسی طرح کی حکمت عملی اختیار فرمائی تھی۔

عرب والے یکبارگی حملہ کرنے اور پھر پلٹ کر دوبارہ حملہ کرنے کا اسلوب اختیار کیے ہوئے تھے۔ جنرل محمود شیت خطاب ان دونوں جنگی اسالیب کی وضاحت اس طرح فرماتے ہیں: ''عرب کا اسلوبِ جنگ یہ تھا کہ تیرانداز، نیزہ باز اور تلوار سے لڑنے والے خواہ پیادہ ہوں یا گھڑ سوار، سارا لشکر یکبارگی مدمقابل لشکر پر حملہ آور ہوتا۔ اگر مدمقابل گروہ کے پاؤں جمے رہتے یا ان حملہ آوروں کو اپنے اندر کچھ کمزوری نظر آتی تو دوبارہ پلٹتے اور تنظیم نو کے ساتھ دوبارہ حملہ کرتے اور یہ تسلسل برقرار رہتا تا آنکہ فتح یا ہزیمت کا فیصلہ ہو جاتا۔ جبکہ صف بندی کے اسلوب میں سارے لشکر کی پہلے صف بندی کی جاتی اور سب کو تعداد کے مطابق تین یا اس سے زیادہ صفوں میں تقسیم کر دیا جاتا۔ پہلی صف میں نیزہ بازوں کو کھڑا کیا جاتا تاکہ گھڑ سواروں کے حملے کو روک سکیں اور باقی تمام صفوں میں تیرانداز ہوتے جو مسلسل دشمنوں پر تیر برساتے۔''

اس حکمت عملی کی بدولت سارا لشکر سالار اعلیٰ کی قیادت اور اس کے کنٹرول میں ہوتا۔ تا آنکہ دشمن کی حکمت عملی مکمل ناکام ہو جاتی اور ان کی شدت میں کمی واقع ہو جاتی۔ کمزوری کو دیکھتے ہی نیزوں والی صف پے در پے دشمن پر حملہ کرتی یا دشمن کے ہزیمت کھانے پر ان کا تعاقب کرتی۔

محمود شیت خطاب کا نظریہ یہ ہے کہ صف بندی کا اسلوب عرب میں رائج جنگی اسلوب سے کہیں بہتر ہے۔ کیونکہ اس اسلوب میں لشکر ترتیب میں رہتا ہے اور ایک ریزرو فوج ہمیشہ سالارِ اعلیٰ کے کنٹرول میں رہتی ہے جس کے ساتھ وہ غیر متوقع پیش آنے والے

حالات جیسے دشمن کا اچانک حملہ، گھات لگا کر حملہ کرنے والوں کا مقابلہ، دشمن کے پیادہ اور گھڑ سوار لشکر کا اسلامی لشکر میں گھبراہٹ پیدا کرنا اور دشمن کے تازہ دم لشکر، ان سب کا مقابلہ کرتا ہے۔ اس طرح ریزرو فوج سے کامیابی کا حصول ممکن ہو جاتا ہے۔ [1]

علامہ ابن خلدون رحمہ اللہ رسول اللہ ﷺ کی اس غیر متعارف جنگی حکمت عملی کے بارے میں فرماتے ہیں: ''ابتدائے اسلام میں جنگی اسلوب مکمل طور پر مربوط اور اجتماعی تھا نہ کہ پلٹ کر دوبارہ حملہ کرنے کا وہ انداز جو عرب کے ہاں متعارف تھا۔'' [2]

علامہ ابن خلدون نبی ﷺ کی اس جدید جنگی حکمت عملی کے بارے میں فرماتے ہیں: ''اجتماعی طور پر صف بندی کے ساتھ پیش قدمی زیادہ مربوط اور واپس آکر دوبارہ حملہ کرنے سے زیادہ مؤثر ثابت ہوتی ہے۔ اس طریقہ جنگ میں صفوں کو مرتب و منظّم کیا جاتا ہے اور انھیں تیر کی طرح یا نماز کی صفوں کی طرح سیدھا رکھا جاتا ہے، پھر سارا لشکر صفوں کی شکل میں آگے بڑھتا ہے، اس لیے یہ جنگی اسلوب تصادم کے وقت زیادہ مؤثر، لڑائی میں کارگر اور دشمن کے دل میں رعب پیدا کرنے والا ہوتا ہے کیونکہ فوج ایک لمبی اور مضبوط دیوار یا قلعے کے مانند ہو جاتی ہے جسے توڑنا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔'' [3]

آج کل کے جنگی اسالیب کے تناظر میں رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی کا مشاہدہ کرنے سے آپ کی اعلیٰ عسکری قابلیت اور جنگی مہارت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ کیونکہ آج جدید اسلحہ کے دور میں بھی وہی قوانین استعمال ہو رہے ہیں جو آپ ﷺ نے دوران معرکہ نافذ اور صادر فرمائے تھے۔ [4]

اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ نبی علیہ السلام نے قریش کے لشکر پر چڑھائی نہیں کی بلکہ دفاعی انداز اختیار فرمایا۔ آپ ﷺ کی میدان کارزار میں بہترین جنگی پلاننگ، جسے صحابۂ کرام

[1] غزوۃ بدر الکبرٰی لمحمود شیت خطاب، ص:24,23. [2] المقدمۃ لابن خلدون، ص:273.
[3] المقدمۃ لابن خلدون، ص:271. [4] المدخل إلی العقیدۃ والإستراتیجیۃ العسکریۃ لمحمد جمال الدین، ص:121.

نے من وعن نافذ کیا تھا، نے دشمن کی مرکزی قیادت کو ہلا کر رکھ دیا اور انھیں ذہنی طور پر انتہائی کمزور کر دیا۔ اور اللہ کی توفیق سے دشمن کے خلاف ایک فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی، حالانکہ دیکھا جائے تو ایک مسلمان مجاہد کا مقابلہ مشرکین کے تین آدمیوں سے تھا۔[1]

رسول اللہ ﷺ دوران معرکہ ہر مرحلے میں حسب مصلحت حکم صادر فرماتے کیونکہ جنگ میں حالات و واقعات مختلف ہوتے رہتے ہیں۔ نبی ﷺ نے اپنی قائدانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے حالات کی مناسبت سے خصوصی راہنمائی فرمائی۔

رسول اللہ ﷺ اپنی افواج کو اعتماد میں لینے کے لیے مختلف اقدامات فرماتے جیسا کہ آپ ﷺ نے غزوۂ بدر میں تمام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے جنگ کے بارے میں مشورہ کیا۔ نبی ﷺ برابری اور خود اعتمادی کی فضا میں کمان فرماتے نہ کہ زبردستی ان پر احکامات صادر فرماتے۔ آپ ﷺ اپنی رائے مسلط کرنے کے بجائے مشاورت کے نتیجے میں سامنے آنے والی قابل عمل رائے اور تجویز پر عمل فرما لیتے۔

نبی ﷺ نے غزوۂ بدر میں مجاہدین کو راہ نمائی دیتے ہوئے جنگی حکمت عملی میں اصلاحات کا تسلسل جاری رکھا۔ بطور سالار اعلیٰ آپ ﷺ نے جو ارشادات فرمائے ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

- نبی علیہ السلام نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ حکم فرمایا کہ تیر اس وقت چلائیں جب دشمن قریب آجائے۔ کیونکہ ایسی حالت میں تیراندازی سود مند ثابت ہوتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِنْ دَنَا الْقَوْمُ مِنْكُمْ، فَانْضِحُوهُم بِالنَّبْلِ»

''اگر دشمن تمھارے قریب آرہا ہوتو اپنے تیروں سے انھیں دور رکھو۔''[2]

- صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے آپ ﷺ کا دوسرا فرمان یہ تھا کہ جب تک گھمسان کی جنگ

---

1 مقومات النصر للدكتور أحمد أبي الشباب: 154/2. 2 السيرة النبوية لابن هشام: 278/2، و دلائل النبوة للبيهقي: 81/3، اسی مفہوم کی ایک دوسری روایت میں۔

”بے شک وہ اللہ عظیم پر ایمان نہیں لاتا تھا اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے پر شوق دلاتا تھا۔“ [1]

یہی وہ دل ہلا دینے اور عذاب سے ڈرانے والی آیات ہیں جن کے سبب حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی سے کہا تھا: ”اے ام درداء! اللہ تعالیٰ نے جب سے جہنم کو پیدا کیا ہے اس وقت سے ایک زنجیر کو پیدا کیا ہے جو جہنم میں گرم کی جا رہی ہے، اسے قیامت کے دن لوگوں کی گردن میں ڈالا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ایمان لانے کی وجہ سے ہمیں اس کے آدھے حصے سے نجات عطا کر دی ہے۔ اے ام درداء! اب تو مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیا کر۔“ [2]

مدنی دور میں فرضیتِ زکاۃ کا سبب: قرآنِ کریم کی مدنی سورتیں ایسے حالات میں نازل ہوئیں جب مسلمان ایک امت بن چکے تھے، اپنی ریاست تھی، اپنا تشخص اور اپنا خطۂ ارض تھا، اس لیے مدنی آیات میں وارد احکامات حالات کے عین مطابق نازل ہوئے۔ ان آیات میں مطلق احکامات کی تقیید اور عمومی احکامات کی تخصیص کر دی گئی، جبکہ مکی احکامات صرف دعوتی اور اصلاحی امور پر مشتمل تھے۔ مدنی احکامات لازمی اور ضروری حیثیت کے حامل تھے، لہٰذا ایمان و یقین کی موجودگی میں انھیں قوانین کی شکل میں نافذ کیا گیا۔

زکاۃ اسی مدنی دور میں فرض ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نصابِ زکاۃ کی حد بندی کی اور اس کی شرائط، واجب مقدار، مصارف زکاۃ اور زکاۃ وصول کرنے اور دیگر انتظامی امور کے سلسلے میں استعمال ہونے والے قوانین سے آگاہ فرمایا۔ [3]

زکاۃ کی اہمیت: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زکاۃ ادا کرنے کی تاکید فرمائی، اللہ کے دین میں

---

1 الحآقّة 69:33,34. 2 الأموال لأبي عبيد، ص: 35، بحواله فقه الزكاة للقرضاوي: 70/1.
3 فقه الزكاة للقرضاوي: 78/1.

’’رسول اللہ ﷺ لشکر سے پہلے صبح سویرے ہی میدان جنگ میں اتر آئے۔ آپ ﷺ نے طلوع شمس کے وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی صف بندی فرمائی۔ صحابہ کے چہرے مغرب کی طرف کیے اور سورج کو ان کے پیچھے کی جانب رکھا جبکہ کفار کا رخ سورج کی طرف تھا۔[1]

آپ ﷺ کا یہ اقدام آپ کی حسن تدبیر اور بہتر قدرتی وسائل سے فائدہ اٹھانے کی بھرپور صلاحیتوں پر دلالت کرتا ہے۔ مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ نے بھی اس حسنِ تدبیر کا ذکر کیا ہے۔[2]

معلوم ہوا کہ قدرتی وسائل، مثلاً: سورج، ہوا اور جغرافیائی طور پر ناہموار زمین ان سب کا جنگ میں اہم کردار ہوتا ہے۔ یہ ان اسباب میں شامل ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم فرمایا ہے کہ اگر تم اللہ کی نصرت اور کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہو تو انھیں اختیار کرو۔[3]

سواد بن غَزِیَّہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ

رسول اللہ ﷺ جنگ کے لیے صف بندی فرما رہے تھے تاکہ صفیں سیدھی اور سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح مضبوط ہو جائیں۔ نبی ﷺ کے ہاتھ میں بغیر پر کے ایک تیر تھا جس سے آپ مجاہدین کی صفیں درست فرما رہے تھے کہ سواد بن غزیہ رضی اللہ عنہ صف سے کچھ آگے بڑھے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے تیر ان کے پیٹ پر رکھا اور فرمایا: «اِسْتَوِ یَاسَوَّادُ!» ’’سواد برابر ہو جاؤ۔‘‘ سواد نے عرض کیا: ’’اے اللہ کے رسول! آپ نے مجھے تکلیف پہنچائی ہے، مجھے اس کا قصاص دیں۔‘‘ نبی ﷺ نے اپنے بطن مبارک سے کپڑا ہٹایا اور فرمایا: «اِسْتَقِدْ» ’’بدلہ لے لو۔‘‘ سواد بن غزیہ رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے بطن مبارک سے چمٹ گئے اور پیٹ کو بوسہ دیا۔ نبی ﷺ نے فرمایا: «مَا حَمَلَكَ عَلٰى هٰذَا يَا سَوَّادُ؟» ’’سواد تمھیں اس ادا پر کس نے ابھارا؟‘‘ سواد نے عرض کیا: ’’اے اللہ کے رسول! حالات

1 القيادة العسكرية للدكتور محمد الرشيد، ص:453. 2 تحفة الأحوذي شرح جامع الترمذي: 175/7. 3 القيادة العسكرية للدكتور محمد الرشيد، ص:454.

آپ دیکھ رہے ہیں، میری خواہش تھی کہ ایسے موقع پر میرا جسم آپ کے مبارک جسم سے لگنے کی سعادت حاصل کر لے۔'' یہ سن کر آپ ﷺ نے ان کے حق میں دعا فرمائی۔[1]

قصۂ مذکور سے حاصل ہونے والے فوائد درج ذیل ہیں:

① اسلام نظم ونسق کا داعی ہے۔

② بلاتفریق عدل وانصاف کا قیام۔ نبی ﷺ خود قصاص دینے کے لیے تیار ہو گئے۔

③ ایک مجاہد اور فوجی کی سالارِ اعلیٰ سے وارفتگی۔

④ رتبۂ شہادت پانے کا جذبہ۔

⑤ نبی ﷺ کا جسد مبارک بابرکت تھا، اسی لیے حضرت سواد نے آپ ﷺ کے جسد اطہر کو چھونے کا بہانا کیا۔

⑥ مرد کے پیٹ کا پردہ نہیں ہے۔ نبی ﷺ نے اس موقع پر بطن مبارک سے کپڑا ہٹایا۔ اگر پیٹ پردے کی جگہ ہوتا تو آپ ﷺ ہرگز کپڑا نہ ہٹاتے۔[2]

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو جنگ پر ابھارنا

رسول اللہ ﷺ کی انتہائی کوشش تھی کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تربیت ایسے نہج پر فرمائیں کہ وہ بلند و بالا اور مضبوط چٹانوں کی طرح ٹھوس ارادے کے حامل بن جائیں۔ ان کے دل بہادری اور دلیری سے لبریز اور دشمن کے خلاف اللہ تعالیٰ کی نصرت و حمایت سے سرشار ہوں۔ آپ ﷺ نے اس مقصد کے حصول کے لیے ترغیب و ترہیب کا اصول اپنایا۔ آپ ﷺ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو ثابت قدمی پر اجر اور غنیمت کی نوید سناتے۔ پیٹھ پھیرنے اور لڑائی کے دن میدان جنگ سے بھاگنے والے کو برے انجام سے ڈراتے۔ آپ ﷺ ان کے سامنے نصرت الٰہی کے حصول کے اسباب و ذرائع بیان فرماتے تاکہ انھیں اختیار کیا جا سکے۔ اسی طرح شکست کے اسباب سے ڈراتے تاکہ ان سے مکمل طور پر اجتناب

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 279,278/2. [2] غزوة بدر الكبرىٰ لأبي فارس، ص: 52.

کیا جائے۔[1]

نبی ﷺ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جہاد پر ابھارتے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ﴾

''اے نبی! مومنوں کو جہاد پر ابھاریں۔''[2]

مزید ارشاد فرمایا:

﴿فَقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا تُكَلَّفُ إِلَّا نَفْسَكَ ۚ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ ۖ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَكُفَّ بَأْسَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ وَاللَّهُ أَشَدُّ بَأْسًا وَأَشَدُّ تَنْكِيلًا ۝﴾

''چنانچہ (اے نبی!) آپ اللہ کی راہ میں لڑیں، آپ کو اپنی ذات کے سوا کسی کا ذمہ دار نہیں بنایا گیا۔ اور آپ مومنوں کو (لڑائی پر) آمادہ کریں۔ امید ہے کہ اللہ ان لوگوں کو لڑائی سے روک دے جنھوں نے کفر کیا اور اللہ لڑائی میں بہت سخت ہے اور سزا دینے میں بہت سخت ہے۔''[3]

غزوۂ بدر کے دن نبی ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا: «قُومُوا إِلَى جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ» ''تم ایسی جنت کے حصول کے لیے اٹھ کھڑے ہو جاؤ جس کی پہنائیاں آسمان و زمین کے برابر ہیں۔'' عمیر بن حمام انصاری رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''اے اللہ کے رسول! کیا اس کی چوڑائی آسمان اور زمین جتنی ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: «نَعَمْ» ''ہاں!'' عمیر رضی اللہ عنہ نے خوشی سے تعجب کا اظہار کیا۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: «مَا يَحْمِلُكَ عَلٰى قَوْلِكَ: بَخٍ بَخٍ؟!» ''تمھارے اس طرح اظہار تعجب کا سبب کیا ہے؟'' عمیر رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ''اللہ کی قسم! اے اللہ کے رسول! صرف یہ امید کرتے ہوئے کہ میں بھی ان جنت والوں سے ہو جاؤں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: «فَإِنَّكَ مِنْ أَهْلِهَا» ''تم ان میں سے ہی ہو۔'' پھر عمیر رضی اللہ عنہ نے اپنے توشہ دان سے چند کھجوریں نکالیں

[1] المدرسة النبوية العسكرية لأبي فارس، ص: 140. [2] الأنفال 8:65. [3] النسآء 4:84.

اور کھانے لگے، پھر بولے: ''اگر میں کھجوریں کھانے کے لیے زندہ رہا تو زندگی بڑی لمبی ہو جائے گی۔'' انھوں نے کھجوریں وہیں چھوڑیں اور لڑنا شروع کر دیا حتی کہ لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔[1]

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''عمیر رضی اللہ عنہ نے کھجوریں چھوڑیں اور یہ کہتے ہوئے میدان جنگ میں کود پڑے:

رَكْضًا إِلَى اللّٰهِ بِغَيْرِ زَادِ   إِلَّا التُّقٰى وَعَمَلَ الْمَعَادِ
وَالصَّبْرَ فِي اللّٰهِ عَلَى الجِهَادِ   وَكُلُّ زَادٍ عُرْضَةُ النَّفَادِ
غَيْرَ التُّقٰى وَالبِرِّ وَالرَّشَادِ

''اللہ کے راستے میں بغیر توشے کے نکلنا ہے مگر تقوی اور اخروی عمل کا توشہ ساتھ ہونا چاہیے، اسی طرح اللہ کے راستے میں جہاد پر صبر کرنے کی صورت میں بھی توشہ ساتھ ہونا چاہیے، جبکہ تقویٰ، نیکی اور بھلائی کے سوا ہر توشہ آخر کار ختم ہونے والا ہے۔''

اور عمیر رضی اللہ عنہ آخر کار لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔''[2]

اسلامی فوج کا مورال بلند کرنے اور ان کی ذہن سازی کرنے اور ان کے جوش و خروش میں اضافہ کرنے کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین کے سرداروں کے مارے جانے کی پیشگی خوشخبری بھی سنا رہے تھے اور مزید اطمینان کے لیے ان کی قتل گاہوں کی نشاندہی بھی فرما رہے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدر سے ایک رات قبل ہمارے سامنے اہل بدر کی قتل گاہوں کی نشاندہی فرمائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «هٰذَا مَصْرَعُ

1 صحيح مسلم، حديث: 1901. 2 صفة الصفوة لابن الجوزي: 488/1، و زاد المعاد: 182/3.

فُلَانٍ غَدًا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ» ”ان شاء اللہ کل یہ فلاں کی اور یہ فلاں کی قتل گاہ ہو گی۔“ عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو برحق نبی بنا کر مبعوث فرمایا! نبی ﷺ نے ان کی قتل گاہوں کی جو نشاندہی کی تھی اس سے کوئی بھی آگے یا پیچھے نہ ہٹا۔“ [1]

نبی ﷺ نے جنگ سے قبل تائید الٰہی کی بشارت دیتے ہوئے اہل ایمان سے فرمایا: «أَبْشِرْ أَبَابَكْرٍ» ”ابوبکر! خوش ہو جاؤ۔“ بعدازاں سب لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: «وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ! لَا يُقَاتِلُهُمُ الْيَوْمَ رَجُلٌ، فَيُقْتَلُ صَابِرًا مُّحْتَسِبًا، مُقْبِلًا غَيْرَ مُدْبِرٍ إِلَّا أَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ» ”اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! آج کے دن جو شخص جم کر، اجر وثواب کی امید رکھتے ہوئے، آگے بڑھ کر اور پیچھے نہ ہٹتے ہوئے لڑے گا اور شہید ہو جائے گا اللہ تعالیٰ ضرور اسے جنت میں داخل فرمائے گا۔“ [2]

اس روحانی جوش وخروش نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر اور ان کے بعد انھی کے راستے پر چلنے والوں پر گہرا اثر چھوڑا۔ [3]

رسول اللہ ﷺ جب تک خود آگے نہ بڑھتے کسی کو پیش قدمی کی اجازت نہ دیتے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مقام بدر میں مشرکین سے پہلے پہنچ گئے جبکہ مشرکین بعد میں پہنچے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَا يَتَقَدَّمَنَّ أَحَدٌ مِّنْكُمْ إِلٰى شَيْءٍ حَتّٰى أَكُونَ أَنَا دُونَهُ»

”تم میں سے کوئی بھی کسی طرف کوئی پیش قدمی نہ کرے جب تک میں خود آگے نہ بڑھوں۔“

اور جب مشرکین اسلامی صفوں کی طرف بڑھے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

1 صحيح مسلم، حديث: 2873. 2 السيرة النبوية لابن هشام: 279/2. 3 المدرسة النبوية العسكرية لأبي فارس، ص: 143.

«قُومُوا إِلٰی جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ»

''اس جنت کے حصول کے لیے کمربستہ ہو جاؤ جس کی پہنائیاں آسمان و زمین کے برابر ہیں۔''[1]

نصرتِ الٰہی کے لیے گریہ وزاری

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُم بِأَلْفٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ ۝﴾

''(یاد کرو) جب تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے تو اس نے تمھاری فریاد قبول کر لی (اور کہا) کہ بے شک میں ایک دوسرے کے پیچھے آنے والے ایک ہزار فرشتوں سے تمھاری مدد کروں گا۔''[2]

رسول اللہ ﷺ جب صف بندی کرا چکے، مناسب حال احکامات جاری فرما چکے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جنگ پر ابھار چکے تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ چھپر کی صورت میں بنے ہوئے مرکزِ قیادت میں تشریف لے آئے۔ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ چھپر کے دروازے پر تلوار سونتے پہرہ دے رہے تھے۔ آپ ﷺ اللہ کی طرف متوجہ ہو کر نصرت الٰہی کا وعدہ یاد دلاتے ہوئے ان الفاظ سے دعا کرنے لگے:

«اَللّٰهُمَّ! أَنْجِزْ لِي مَا وَعَدْتَنِي، اَللّٰهُمَّ! آتِ مَا وَعَدْتَنِي، اَللّٰهُمَّ! إِنْ تَهْلِكْ هٰذِهِ الْعِصَابَةُ مِنْ أَهْلِ الْإِسْلَامِ لَا تُعْبَدْ فِي الْأَرْضِ»

''اے اللہ! تو نے مجھ سے جو وعدہ فرمایا تھا وہ پورا فرما۔ اے اللہ! تو نے مجھ سے جس چیز کا وعدہ فرمایا تھا وہ عطا فرما۔ اے اللہ! اگر آج اہل اسلام کا یہ مٹھی بھر گروہ

[1] صحیح مسلم، حدیث:1901. [2] الأنفال 8:9.

ہلاک ہو گیا تو زمین پر تیری عبادت نہ کی جائے گی۔"

نبی ﷺ قبلہ رخ ہو کر، ہاتھ پھیلائے ہوئے اللہ کے سامنے گڑگڑا رہے تھے۔ اسی دوران آپ ﷺ کے دونوں کندھوں سے چادر گر گئی، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے چادر درست کی اور عرض کی: "اے اللہ کے رسول! بس کیجیے! آپ نے اپنے رب سے بڑے اصرار اور تضرع سے دعا فرما لی ہے۔ اب اللہ ضرور اپنا وعدہ پورا فرمائیں گے۔"[1]

پھر مذکورہ آیت مبارکہ نازل ہوئی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے بدر کے دن یہ دعا فرمائی تھی:

«اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَنْشُدُكَ عَهْدَكَ وَوَعْدَكَ، اَللّٰهُمَّ إِنْ شِئْتَ لَمْ تُعْبَدْ بَعْدَ الْيَوْمِ»

"اے اللہ! بے شک میں تجھے تیرے عہد اور وعدے یاد دلاتا ہوں۔ اے اللہ! اگر تو چاہے تو آج کے بعد تیری عبادت نہ کی جائے؟"

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے دست مبارک کو پکڑا اور عرض کی: "آپ کو اتنا ہی کافی ہے۔" پھر آپ ﷺ چھپر سے باہر تشریف لائے اور زبان پر یہ کلمات جاری تھے:

﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ﴾

"عنقریب یہ جتھا شکست کھا جائے گا اور پیٹھ پھیر کر بھاگ جائے گا۔"[2]

ابن اسحاق رحمہ اللہ کی روایت کے مطابق نبی ﷺ نے ان الفاظ سے دعا فرمائی:

«اَللّٰهُمَّ هٰذِهِ قُرَيْشٌ، قَدْ أَقْبَلَتْ بِخُيَلَائِهَا وَ فَخْرِهَا، تُحَادُّكَ وَ تُكَذِّبُ رَسُولَكَ، اَللّٰهُمَّ فَنَصْرُكَ الَّذِي وَعَدْتَنِي، اَللّٰهُمَّ أَحِنْهُمُ الْغَدَاةَ!»

"اے اللہ! یہ قریش تکبر اور غرور کا اظہار کرتے ہوئے تیری دشمنی پر اتر آئے ہیں،

1 صحيح مسلم، حديث: 1763، و جامع الترمذي، حديث: 3081، و مسند أحمد: 30/1.

2 القمر 45:54. صحيح البخاري، حديث: 3953، و مسند أحمد: 329/1.

تیرے رسول کو جھٹلاتے ہیں۔ اے اللہ! میں تجھ سے وہ مدد مانگتا ہوں جس کا تو
نے وعدہ فرمایا ہے، اے اللہ صبح انھیں ہلاک کر دینا۔'' [1]

دنیا کے ہر مسلمان قائد، حاکم اور سردار حتی کہ ہر فرد کے لیے شرعی حکم ہے کہ وہ اپنے آپ پر کلی اعتماد کرنے کے بجائے خالص نیت کرتے ہوئے اللہ وحدہ لاشریک کی پناہ میں آئے، اس کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھے اور سجدہ ریز ہو تاکہ مالک الملک کی مدد شامل حال ہو۔ نبی ﷺ کے کندھوں سے چادر مبارک گر گئی اور آپ ﷺ ہاتھ پھیلائے انتہائی عاجزی سے اللہ سے مدد طلب کر رہے تھے۔ آپ ﷺ کی یہ حالت ہمارے تصور اور دل و دماغ میں سرایت کر جانی چاہیے۔ اور ہمیں ایسے حالات، مواقع اور اوقات میں آپ ﷺ کے اسوہ کو اختیار کرنا چاہیے اور یہی ہم سب کی ذمہ داری اور قیادت کا تقاضا ہے۔ [2]

رسول اللہ ﷺ جب اللہ کے سامنے التجاؤں سے فارغ ہو گئے اور اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کر لی تو چھپر سے باہر تشریف لائے اور مٹھی بھر کنکریاں اٹھائیں اور مشرکین کے چہروں کی طرف پھینک دیں اور فرمایا: «شَاهَتِ الْوُجُوهُ» ''چہرے بگڑ جائیں۔'' [3]

بعدازاں آپ ﷺ نے فوراً دجمعی سے حملے کا حکم فرمایا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فوراً عمل کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کنکریوں کے ذرات ہر مشرک کی آنکھ تک پہنچا دیے جس سے ان کی توجہ لڑائی سے قدرے ہٹ گئی۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ﴾

''اور (اے نبی!) جب آپ نے (مٹھی بھر خاک ان کی طرف) پھینکی تو وہ آپ
نے نہیں پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی۔'' [4]

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے کنکریاں پھینکنے کا جو اثبات فرمایا ہے

1 السيرة النبوية لابن هشام:273/2، ودلائل النبوة للبيهقي: 110/3، والبداية والنهاية:267/3.
2 التربية القيادية للدكتور الغضبان: 36/3. 3 السيرة النبوية لابن هشام:280/2. 4 الأنفال 17:8.

اس سے مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ نے پھینکنے کا آغاز کیا۔ اور پھینکنے کی جو نفی کی گئی ہے اس سے مراد مشرکین کی آنکھوں تک کنکریوں کے پہنچانے کی نفی ہے جو محض آپ ﷺ کے پھینکنے سے حاصل نہیں ہوئی تھی۔''[1]

یہ بات قابل ذکر ہے کہ نبی ﷺ نے تمام مادی اور روحانی اسباب اختیار کیے اور بعدازاں اللہ پر بھروسا کیا جس کے نتیجے میں اللہ کی طرف سے نصرت وحمایت کا نزول ہوا۔

غزوۂ بدر میں حتی المقدور جملہ اسباب اختیار کیے گئے، پھر اللہ کی توفیق سے پے در پے نصرت حاصل کرنے کے تمام اسباب فراہم ہوتے گئے۔ اس معرکے میں خرق عادت باتوں اور چند غیبی امور کا ظہور بھی ہوا۔

اسباب اختیار کرنے کے سلسلے میں کسی بھی غزوے میں میدان جنگ اور اس کے موسمی حالات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اسی طرح قیادت کا مضبوط ہونا، پھر اس کا قابل اعتماد ہونا اور روحانی طاقت کا موجود ہونا جنگ میں ثابت قدمی کے لیے ضروری سمجھے جاتے ہیں۔

بدر کی سرزمین مسلمانوں کے لیے جنگ کے اعتبار سے موزوں اور حالات اور موسم کے لحاظ سے خوشگوار ثابت ہوئی۔ اس کے ساتھ ساتھ روحانیت کے نقطہ عروج کی حامل قیادت بھی موجود تھی۔

غزوۂ بدر میں بعض چیزیں اللہ کی توفیق سے بلاواسطہ میسر آئیں اور بعض نبی ﷺ کی طرف سے ظاہری اسباب اختیار کرنے سے حاصل ہوئیں، الغرض اللہ تعالیٰ کی توفیق سے مسلسل نعمتوں اور معجزوں کا ظہور ہوتا رہا جس کا نتیجہ سب کے سامنے ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہل ایمان کو دیے جانے والے انعامات کا ایک نمونہ تھا۔ اہل ایمان آج بھی یہ انعامات حاصل کر سکتے ہیں بشرطیکہ فوج اور قائد کی نیت خالص ہو اور اللہ کے حکم پر قائم دائم رہتے ہوئے ظاہری اسباب بھی اختیار کیے گئے ہوں۔[2]

1 المستفاد من قصص القرآن لعبد الكريم زيدان: 125/2. 2 الأساس في السنة و فقهها لسعيد حوّى: 474/1.

باب 3

گھمسان کی جنگ اور فتح کے بعد کے حالات

انفرادی مقابلے

فریقین کے درمیان لڑائی کی ابتدا انفرادی مقابلوں سے ہوئی۔ مشرکین کی طرف سے عتبہ بن ربیعہ، اس کا بھائی شیبہ بن ربیعہ اور عتبہ کا بیٹا ولید تینوں میدان میں اترے اور دعوت مبارزت دی۔ مسلمانوں کی طرف سے انصار کے تین نوجوان فوراً مقابلے کے لیے میدان میں آئے لیکن نبی ﷺ نے ان تینوں کو واپس بھیج دیا کیونکہ آپ ﷺ چاہتے تھے کہ ان کے مقابلے میں خود انھی کے رشتے دار آئیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «قُمْ يَا عُبَيْدَةُ بْنَ الْحَارِثِ! وَقُمْ يَا حَمْزَةُ! وَقُمْ يَا عَلِيُّ!» ''عبیدہ بن حارث! اٹھو، حمزہ! آپ بھی اٹھیے، علی! تم بھی اٹھو۔''[1] حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے شیبہ کا مقابلہ کیا اور اسے فوراً مار گرایا۔ علی رضی اللہ عنہ نے ولید کا کام تمام کیا اور عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ نے عتبہ کا مقابلہ کیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو گہرا زخم لگایا لیکن اسی اثنا میں حضرت حمزہ اور علی رضی اللہ عنہما عتبہ پر پلٹے اور اس کا کام تمام کر دیا اور حضرت عبیدہ کو اٹھائے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ عبیدہ رضی اللہ عنہ اسی طرح زخمی حالت میں رہے تا آنکہ شہادت پا گئے۔[2]

آغازِ جنگ کے انفرادی مقابلوں میں شریک ان چھ افراد کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

1 سنن أبي داود، حديث: 2665، اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔ 2 المستفاد من قصص القرآن لعبد الكريم زيدان: 126/2.

﴿هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ ۡ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ ۭ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ۝ يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ ۝ وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ۝ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ۤ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝ اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۭ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ۝ وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ښ وَهُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ۝﴾

”یہ دو جھگڑنے والے (گروہ) ہیں جنھوں نے اپنے رب کے بارے میں جھگڑا کیا، چنانچہ جن لوگوں نے کفر کیا ان کے لیے آگ کے کپڑے کاٹے جائیں گے، ان کے سروں کے اوپر سے کھولتا پانی انڈیلا جائے گا، اس سے وہ سب کچھ گل جائے گا جو ان کے پیٹوں میں ہے اور (ان کی) کھالیں بھی، ان (کو مارنے) کے لیے لوہے کے ہتھوڑے ہوں گے اور وہ جب بھی مارے غم کے اس سے باہر نکلنے کا ارادہ کریں گے، اسی میں لوٹا دیے جائیں گے اور (کہا جائے گا:) بے شک جلانے والا عذاب چکھو! جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے یقیناً اللہ ان کو (ایسے) باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہاں انھیں سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے اور وہاں ان کا لباس ریشم کا ہوگا اور (دنیا میں) انھیں پاکیزہ بات (توحید) کی ہدایت دی گئی اور قابل تعریف (اللہ کی) راہ دکھائی گئی۔“[1]

گھمسان کا رن

مشرکین نے جب اپنے تین سرداروں کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھا تو غصے سے

1 الحج 22:19-24. صحيح البخاري، حديث:3966.

بھڑک اٹھے اور یکبارگی مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے۔ مسلمانوں نے دفاعی انداز اختیار کیا اور اپنے قدموں پر جمے رہے اور رسول اللہ ﷺ کے حکم کے پیش نظر ضرورت کے مطابق تیر پھینکتے رہے۔ غزوۂ بدر کے موقع پر مسلمانوں کا شعار (کوڈورڈ Code Word) [أَحَد، أَحَد] تھا۔

بعدازاں اللہ کے رسول ﷺ نے جوابی حملے کا حکم صادر فرمایا کہ اب تم فوراً دشمن پر چڑھائی کردو۔ نبی ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو لڑائی پر ابھار رہے تھے اور فرما رہے تھے کہ جو آدمی جم کر اور ثواب کے حصول کی نیت سے لڑتے ہوئے شہید ہو گیا تو اس کے لیے جنت ہو گی۔ آپ ﷺ کا یہ فرمان صحابہ کے لیے مزید گرمجوشی کا سبب بنا اور لڑائی میں تیزی آگئی، اسی طرح مدد کے لیے فرشتوں کا نزول، مشرکین کو مسلمانوں کی آنکھ میں تھوڑا دکھانا اور نبی ﷺ کا زرہ میں ملبوس ہو کر لشکر کی قیادت کرنا باعث ہمت ثابت ہوا۔ آپ ﷺ دوسرے مسلمانوں کی نسبت مشرکین سے قریب تر تھے اور یہ آیت تلاوت فرما رہے تھے: ﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ﴾ ''عنقریب لشکر شکست کھائے گا اور لوگ پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔''[1]

جس وقت رسول اللہ ﷺ نے جوابی حملے کا حکم صادر فرمایا، دشمن کے حملوں کی تیزی جا چکی تھی اور ان کا جوش و خروش سرد پڑ رہا تھا، اس لیے یہ مبنی برحکمت منصوبہ مسلمانوں کی پوزیشن مضبوط کرنے میں بہت موثر ثابت ہوا کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جب حملہ آور ہونے کا حکم ملا اور ابھی ان کا جوشِ جہاد شباب پر تھا تو انھوں نے سخت تند اور صفایا کن حملہ کیا۔ وہ صفوں کی صفیں درہم برہم کرتے اور گردنیں کاٹتے آگے بڑھے۔ ان کے جوش و خروش میں یہ دیکھ کر مزید تیزی آگئی کہ رسول اللہ ﷺ بنفسِ نفیس زرہ پہنے تیز تیز چلتے تشریف لا رہے ہیں۔[2]

1 القمر 45:54. صحیح البخاري، حدیث: 4875، والرحیق المختوم، ص: 116-118. 2 الرحیق المختوم (اردو)، ص: 298.

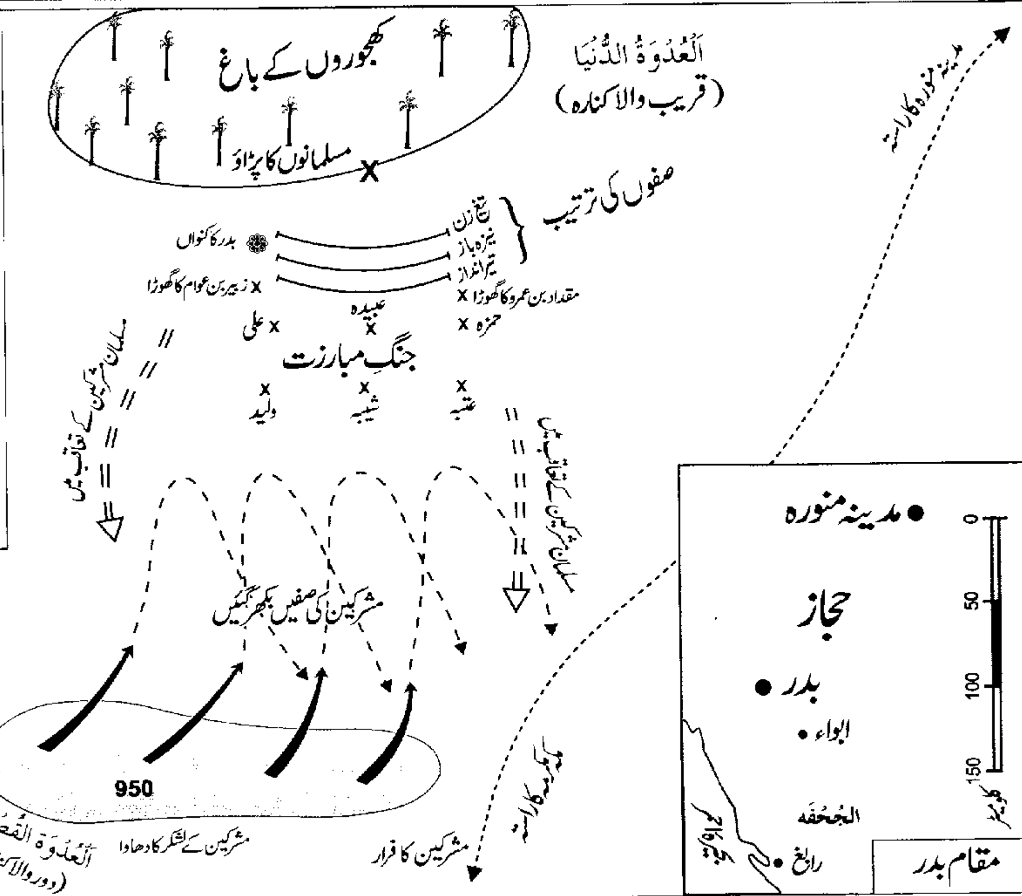
غزوۂ بدر الکبریٰ

(یوم الفرقان، یوم التقی الجمعان)

17 رمضان 2ھ، 13 مارچ 624ء

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُم بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ﴾ "یقیناً اللہ پسند کرتا ہے ان لوگوں کو جو لڑتے ہیں اس کی راہ میں صف بستہ گویا کہ وہ ایک دیوار ہیں سیسہ پلائی ہوئی۔" (الصف 4:61)

﴿وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ وَأَنتُمْ أَذِلَّةٌ فَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾ "اور البتہ تحقیق مدد کی تمہاری اللہ نے بدر میں جب کہ تم کمزور تھے پس ڈرو تم اللہ سے تاکہ تم شکر کرو۔" (آل عمران 123:3)



نقشہ: 11

تفسیر طبری (209/11) میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ بدر کی رات خواب میں مشرکین کو قلیل مقدار میں دیکھا۔ جب آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ خواب سنایا تو سب نے اسے نیک شگون خیال کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿إِذْ يُرِيكَهُمُ اللَّهُ فِي مَنَامِكَ قَلِيلًا ۖ وَلَوْ أَرَاكَهُمْ كَثِيرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ سَلَّمَ ۗ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ﴾

''(اے نبی! یاد کریں) جب اللہ نے آپ کے خواب میں آپ کو ان کی تعداد کم دکھائی اور اگر وہ آپ کو ان کی تعداد زیادہ دکھاتا تو آپ ضرور ہمت ہار دیتے اور اس معاملے میں آپس میں اختلاف کرتے لیکن اللہ نے (تمھیں) بچا لیا۔ بے شک وہ سینوں کے بھید خوب جانتا ہے۔''[1]

آیت کا مطلب یوں ہو گا کہ بلاشبہ نبی ﷺ نے خواب میں مشرکین کی تعداد تھوڑی دیکھی۔ اور یہ خواب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سنایا تو یہ خواب ان کے لیے مزید استقامت کا باعث بنا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر اللہ کے رسول ﷺ مشرکین کو خواب میں کثیر تعداد میں دیکھتے تو یہ سن کر صحابہ کرام گھبرا جاتے، ہمت ہار جاتے اور سستی دکھاتے۔ اور یہ بحث شروع ہو جاتی کہ لڑائی ہونی چاہیے یا نہیں؟ آیت میں ذکر کردہ مضارع کا صیغہ ماضی کے معنی میں ہو گا کیونکہ یہ آیت خواب دیکھ لینے کے بعد نازل ہوئی تھی۔ ﴿وَلَٰكِنَّ اللَّهَ سَلَّمَ﴾ ''لیکن اللہ نے (تمھیں) بچا لیا'' یعنی اللہ نے انھیں پھسلنے اور جنگ کرنے یا نہ کرنے کی بحث میں پڑنے سے بچا لیا اور نبی ﷺ کو ان کی تعداد تھوڑی دکھائی۔[2]

جب رسول اللہ ﷺ نے اپنا خواب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سنایا تو یہ خواب بلاشبہ ان کے لیے ثابت قدمی، بہادری اور دشمن کے خلاف جرأت مندی کا سبب بنا لیکن لڑائی کا وقت آیا تو دونوں گروہوں ہی نے ایک دوسرے کو قلیل تعداد میں دیکھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ

1 الأنفال 43:8. 2 المستفاد من قصص القرآن لعبد الكريم زيدان: 125/2.

نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّيُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴾

''اور (اے مسلمانو یاد کرو!) جب تم (کافروں کے) آمنے سامنے ہوئے تو اللہ نے انھیں تمھاری نظروں میں تھوڑا دکھایا اور تمھیں ان کی نظروں میں تھوڑا دکھایا تاکہ اللہ اس کام کو پورا کردے جو ہونے والا تھا۔ اور سب کام اللہ ہی کی طرف لوٹتے ہیں۔''[1]

اہل ایمان کو جنگ کے وقت کفار کی تعداد کم نظر آئی جس سے ایک طرف تو نبی ﷺ کا خواب حقیقت بن کر سامنے آیا، دوسری طرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یقینِ محکم حاصل ہوا اور انھوں نے جاں نثاری سے قدم آگے بڑھائے اور ثابت قدم رہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے پہلو میں کھڑے ایک شخص سے دریافت کیا کہ تمھارے خیال کے مطابق ان کفار کی تعداد ستر کے قریب ہوگی؟ تو اس نے کہا: ''نہیں بلکہ سو کے قریب ہوگی۔'' بعدازاں ہم نے ایک آدمی کو قید کیا تو اس سے سوال کیا کہ تمھاری تعداد کتنی ہے؟ تو اس نے بتایا کہ ہم ایک ہزار ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَّيُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ ﴾ ''اور تمھیں ان کی نظروں میں تھوڑا دکھلاتا تھا۔'' اسی لیے تو کفار میں سے ایک کہنے والے نے کہہ بھی دیا تھا کہ یہ مسلمان تو ایک اونٹنی کا نوالہ ہیں۔

اہل ایمان کے لیے مشرکین کی تعداد کم ظاہر کرنے میں حکمت اور نکتے کی بات یہ تھی کہ مسلمان مستعد ہو جائیں اور ثابت قدم رہیں اور ایسا ہی ہوا کہ مسلمانوں کے دلوں سے مشرکین کا خوف جاتا رہا اور وہ ان کے خلاف لڑائی پر آمادہ ہو گئے۔

1 الأنفال 8:44.

مشرکین کے لیے اہل ایمان کی تعداد کم ظاہر کرنے میں حکمت یہ تھی کہ وہ جب مسلمانوں کو قلیل تعداد میں دیکھیں گے تو بلاخوف پیش قدمی کریں گے اور کسی کی پروا بھی نہ کریں گے، نتیجتاً وہ قدرے بے احتیاط ہو جائیں گے۔ اور اپنی استعداد اور حاضر دماغی کو بالائے طاق رکھ کر پیش قدمی کریں گے لیکن جب وہ آگے بڑھے تو ان کو مسلمانوں کی تعداد زیادہ نظر آنے لگی۔ وہ ششدر رہ گئے اور ڈر گئے اور ان کا اندازہ غلط ثابت ہوا اور اس وجہ سے ان کا غرور و تکبر خاک میں مل گیا۔ اور وہ رسوا ہوئے اور مسلمان نصرت الٰہی سے سرفراز ہوئے۔[1]

مسلمانوں کی مدد کے لیے فرشتوں کا نزول

قرآن کریم، احادیثِ مبارکہ اور بہت سے بدری صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کے دل میں رعب ڈالنے کے لیے فرشتوں کا نزول فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا ۚ سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ۝﴾

”(اے نبی!) جب آپ کا رب فرشتوں کی طرف وحی کر رہا تھا کہ بے شک میں تمھارے ساتھ ہوں، چنانچہ تم ان کو ثابت (قدم) رکھو جو ایمان لائے ہیں، میں جلد ہی ان لوگوں کے دلوں میں رعب ڈال دوں گا جنھوں نے کفر کیا، چنانچہ تم (ان کی) گردنوں پر وار کرو اور ان کے ہر (ہر) پور پر ضرب لگاؤ۔“[2]

اللہ تعالیٰ نے مزید ارشاد فرمایا:

---

1 تفسير الكشاف للزمخشري: 225/2، وتفسير ابن كثير: 315/2. 2 الأنفال 12:8.

﴿ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ○ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ○ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ۗ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ○﴾

''اور اللہ نے بدر میں عین اس وقت تمھاری مدد کی جب تم کمزور تھے۔ پس تم اللہ سے ڈرو تاکہ تمھیں شکر ادا کرنے کی توفیق ہو، (اے نبی!) جب آپ مومنوں سے کہہ رہے تھے: کیا تمھارے لیے کافی نہ ہوگا کہ اللہ آسمان سے تین ہزار فرشتے اتار کر تمھاری مدد کرے؟ کیوں نہیں! اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور دشمن تم پر فوراً چڑھ آئے تو اسی لمحے تمھارا رب پانچ ہزار فرشتوں سے تمھاری مدد کرے گا جو (خاص) نشان والے ہوں گے۔ اور اللہ نے اسے تمھارے لیے خوشخبری بنا دیا تاکہ اس سے تمھارے دلوں کو تسلی ہو۔ اور مدد تو اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے جو بہت زبردست، نہایت حکمت والا ہے۔''[1]

صحیح بخاری و مسلم اور مسند احمد بن حنبل میں بہت سی صحیح احادیث موجود ہیں جن میں معرکۂ بدر میں مسلمانوں کے ساتھ فرشتوں کے شریک ہونے اور بالفعل مشرکین کے خلاف جنگ کرنے کا تذکرہ اور ان کے ذریعے مشرکوں کے قتل ہونے کا اشارہ بھی پایا جاتا ہے۔[2]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''ایک مسلمان بدر کے دن اپنے آگے جانے والے مشرک کے تعاقب میں بھاگ رہا تھا۔ اچانک اس نے اوپر سے کوڑے کی آواز سنی اس کے ساتھ ہی ایک گھڑ سوار کی آواز بھی سنی جو یہ کہہ رہا تھا: ''حیزوم! آگے بڑھو۔'' مسلمان نے اچانک دیکھا کہ وہ مشرک چت گرا ہوا تھا۔ مسلمان نے لپک کر دیکھا

1 آل عمرٰن 3:123-126. 2 نضرۃ النعیم: 291/1.

تو اس کی ناک زخمی اور چہرہ پھٹا ہوا تھا۔ جیسے کسی نے کوڑا مارا ہو اور (کوڑے کے زہر آلود ہونے کی وجہ سے) اس کا سارا جسم سبز ہو چکا تھا۔ اس انصاری مسلمان نے یہ قصہ نبی ﷺ کے گوش گزار کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: «صَدَقْتَ، ذٰلِكَ مِنْ مَّدَدِ السَّمَاءِ الثَّالِثَةِ» ''تم سچ کہتے ہو یہ تیسرے آسمان سے مدد آئی تھی۔'' [1]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے بدر کے دن ارشاد فرمایا: «هٰذَا جِبْرِيلُ آخِذٌ بِرَأْسِ فَرَسِهِ عَلَيْهِ أَدَاةُ الْحَرْبِ» ''یہ جبریل ہیں جو اپنے گھوڑے کو سر سے پکڑے ہوئے ہیں اور ہتھیار بند ہیں۔'' [2]

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک انصاری صحابی حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو اس دن قید کر کے لایا۔ عباس رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ''اللہ کی قسم! اس نے مجھے قید نہیں کیا۔ مجھے تو ایک ایسے خوبصورت آدمی نے قید کیا ہے جس کے سر کے سامنے کی طرف سے دونوں طرفوں کے بال نہیں تھے اور وہ ایک چتکبرے گھوڑے پر سوار تھا۔ اب وہ مجھے ان لوگوں میں نظر بھی نہیں آ رہا۔'' انصاری کہنے لگا: ''نہیں، اللہ کے رسول! اسے میں نے ہی قید کیا ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: «اُسْكُتْ، فَقَدْ أَيَّدَكَ اللّٰهُ بِمَلَكٍ كَرِيمٍ» ''تم چپ رہو۔ اللہ نے ایک معزز فرشتے سے تمھاری مدد فرمائی ہے۔'' [3]

ابو داود مازنی رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ میں ایک مشرک کے تعاقب میں تھا کہ اسے مار گراؤں مگر میری تلوار کے اس تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کا کام تمام ہو گیا۔ اس کا سر تن سے جدا ہو کر گر گیا۔ میں سمجھ گیا کہ اسے میرے سوا کسی اور ہی نے قتل کیا ہے۔ [4]

بلاشبہ معرکہ بدر میں فرشتوں کا نزول یقینی امر ہے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اس امداد کی حکمت یہ تھی کہ مسلمانوں کے لیے کامیابی کے اسباب مہیا ہوں، چنانچہ

---

[1] صحيح مسلم، حديث: 1763. [2] صحيح البخاري، حديث: 3995. [3] مسند أحمد: 117/1.
[4] مسند أحمد: 450/5.

فرشتوں نے یہ اسباب فراہم کیے، مثلاً: مدد آنے کی خوشخبری دینا، ان کے دلوں میں مدد کی آمد کا احساس پیدا کرنا تاکہ انھیں جنگ میں ثابت قدمی حاصل رہے اور لڑائی میں جوش و خروش پیدا ہو۔

بعض فرشتوں نے بالفعل لڑائی میں حصہ بھی لیا اور بلاشبہ اس شراکت سے صحابہ کرام کے دل مضبوط ہو گئے اور لڑائی میں تیزی اور گرمجوشی آ گئی۔ اس پر بہت سی آیات اور احادیث دلالت کرتی ہیں۔[1]

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کئی ایک فرشتوں سے مسلمانوں کی امداد کی کیا حکمت ہے، حالانکہ یہ کام تو ایک فرشتہ بھی کر سکتا تھا، جیسے جبرئیل علیہ السلام ہیں، وہ اکیلے ہی کفار کو برباد کر سکتے تھے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے استاد عبدالکریم زیدان فرماتے ہیں کہ ازل سے حق کا باطل سے اور اہل حق کا اہل باطل سے تصادم رہا ہے۔ غلبہ ہمیشہ اہل حق کو حاصل ہوا لیکن اس کائنات میں اسباب اختیار کرنے کا قانون جاری اور ساری ہے، لہٰذا مدد حاصل کرنے کے لیے اسی طرح کوشش کرنا لازمی ہے جس طرح حق پر کاربند رہنا اور اس کے تمام تقاضے پورے کرنا ضروری ہے جس سے اللہ کی تائید و نصرت حاصل ہوتی ہے۔

یاد رہے کہ حق و باطل کا ٹکراؤ اسباب اختیار کرنے کے قدرتی قانون کا حصہ ہے اور اس میں وہ جانب ہی کامیاب ہوتی ہے جو ہمہ اسباب کو اختیار کرنے والی ہو۔

غزوۂ بدر میں فرشتوں کی امداد مجاہدین کے ایمان محکم کے نتیجے میں آئی جس کی بنا پر غلبہ ممکن ہوا۔ علاوہ ازیں اہل ایمان کا بالفعل لڑائی کرنا، شہادت پانا، جنگ میں ثابت قدمی دکھانا، اللہ پر کامل بھروسا اور یقین کرنا، مادی اسبابِ جنگ کی تیاری، افراد کی فراہمی اور جنگی فنون سے واقفیت حاصل کرنا جیسے ظاہری اسباب کا ہونا بھی ضروری تھا اور یہی وہ امور ہیں جنھیں اختیار کرنے پر اللہ تعالیٰ نے کامیابی کی ضمانت دی ہے۔

---

1 المستفاد من قصص القرآن لعبد الكريم زيدان: 132,131/2.

اہل ایمان کو ان کا دین دعوت دیتا ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور باطل اور باطل پرستوں کا قلع قمع کرنے میں اپنا کردار ادا کریں۔ کامیابی اور اللہ کی مدد حاصل کرنے کے لیے مادی اور ایمانی اسباب اختیار کریں۔ اس طرح اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو باطل کے پرستار اپنے انجام کو پہنچ جائیں گے۔[1]

اسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿قَٰتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللَّهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِينَ ۝ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوبِهِمْ ۗ وَيَتُوبُ اللَّهُ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝﴾

''ان سے (خوب) لڑائی کرو، اللہ انھیں تمھارے ہاتھوں سے عذاب دے گا اور انھیں رسوا کرے گا اور ان کے خلاف تمھاری مدد کرے گا اور مومنوں کے سینوں کو شفا (ٹھنڈک) بخشے گا اور وہ ان کے دلوں کا غصہ دور کرے گا اور اللہ جس پر چاہے توجہ فرماتا ہے۔ اور اللہ خوب جاننے والا، خوب حکمت والا ہے۔''[2]

آسمان سے فرشتوں کا نزول اور اہل ایمان کی نصرت ایک عظیم واقعہ ہے۔ فرشتوں کا نزول اہل ایمان کے لیے ثابت قدمی کا باعث تھا کیونکہ انھیں یقین ہو گیا تھا کہ وہ اس میدان میں اکیلے نہیں ہیں۔ انھوں نے حصول مدد کے تقاضے پورے کیے ہیں اور راستے کی ہر رکاوٹ کو دور کیا ہے جس کے نتیجے میں وہ آسمانی مدد کے مستحق ٹھہرے ہیں۔ اس احساس نے انھیں بلاخوف وخطر دشمن کی صفوں میں داخل کر دیا، حالانکہ دیکھا جائے تو دونوں لشکروں کے درمیان کوئی تناسب نہ تھا۔ کفار کا لشکر تعداد میں (تین گنا) زیادہ اور اسلحہ میں خود کفیل تھا، جبکہ اسلامی لشکر تعداد میں کم اور جنگی ساز وسامان میں تہی دامن تھا۔

فرشتوں کا نزول دوسری طرف کفار کے حوصلوں کو پست اور ان کے یقین کو متزلزل کر

[1] المستفاد من قصص القرآن لعبد الكريم زيدان: 2/131، 132. [2] التوبة 9:14، 15.

رہا تھا کیونکہ ان کی صفوں میں مسلمانوں کے لیے نزول ملائکہ کا مسلسل تذکرہ ہو رہا تھا۔ اور بعض کفار ملائکہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ مسلمانوں کی تعداد اور طاقت کے مقابلے میں وہ کتنے ہی طاقتور اور مسلمانوں کو ختم کرنے کی دسترس کیوں نہ رکھتے ہوں لیکن ایک نظر نہ آنے والی طاقت کے تصور نے انھیں ہلا کر رکھ دیا تھا اور ان کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب بیٹھ گیا۔ اور انھیں اس غیبی لشکر کی تعداد کا علم ہو سکا نہ استعداد کا اندازہ۔ مسلمانوں کا یہ رعب و دبدبہ عہد نبوی، خلافت راشدہ اور بعد کے کئی ادوار تک جنگ میں قائم رہا اور دشمن پر ہونے والے مسلسل اور فیصلہ کن حملوں میں یہ احساس بھی کارفرما رہا۔[1]

اہل ایمان کی فتح اور کنویں میں پڑے کفار کو سرزنش

معرکۂ بدر اہل ایمان کی فتح پر ختم ہوا۔ مشرکین کے مقتولین کی تعداد ستر تھی اور ستر ہی قید ہوئے۔ ان مقتولوں اور قیدیوں کی اکثریت قریش کے لیڈروں اور سرداروں پر مشتمل تھی، جبکہ مسلمانوں کے کل چودہ افراد شہید ہوئے۔ ان میں سے چھ مہاجرین اور آٹھ انصاری تھے۔ جب مکمل طور پر فتح ہوگئی اور دشمن کو شکست فاش کا سامنا کرنا پڑا تو نبی ﷺ نے مدینہ میں موجود مسلمانوں کو فتح کی خوشخبری اور مشرکین کی ہزیمت کی خبر دینے کے لیے عبداللہ بن رواحہ اور زید بن حارثہ رضی اللہ عنہم کو روانہ فرمایا۔[2]

رسول اللہ ﷺ نے تین دن تک مقام بدر میں قیام فرمایا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ ابوطلحہ سے بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ جب کسی قوم پر فتح یاب ہوتے تو میدان جنگ میں تین راتیں قیام فرماتے۔[3]

تین دن تک میدانِ جنگ میں قیام کی مندرجہ ذیل حکمتیں ہوسکتی ہیں:

❁ میدان جنگ سے دشمن کا مکمل صفایا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی باقی ماندہ قوت بھاگنے

1 التاريخ الإسلامي للحميدي: 4/145. 2 المستفاد من قصص القرآن لعبد الكريم زيدان: 2/133. 3 صحيح البخاري، حديث: 3976.

والے شکست خوردہ دشمن کا سہارا بن سکے۔

❁ شہیدوں کی تدفین۔ کم و بیش ہر معرکے میں اہلِ ایمان شہادت سے سرفراز ہوتے ہیں۔ بدر کے دن بھی شہدائے معرکہ کو مقام بدر میں دفن کیا گیا۔ اوران پر نماز جنازہ یا کسی شہید کو بدر سے باہر دفن کرنے کا تذکرہ نہیں ملتا۔[1]

❁ مال غنیمت اکٹھا کرنا اور اسے کسی محافظ کے سپرد کرنا یہاں تک کہ مکمل طور پر اسے حق داروں کے درمیان تقسیم کر دیا جائے۔ بدر کے دن مال غنیمت عبداللہ بن کعب رضی اللہ عنہ کے سپرد ہوا جو بنو مازن سے تعلق رکھتے تھے۔[2]

❁ اسلامی لشکر کو آرام کا موقع فراہم کرنا۔ جسمانی اور روحانی جدوجہد کے بعد راحت و آرام حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس دوران زخمیوں کی مرہم پٹی بھی کر لی جاتی ہے، اسی طرح اس موقع پر اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ایسی زبردست مدد پر اس کا شکر بھی ادا کرلیا جائے جو بظاہر ناممکن نظر آرہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ انفرادی اور اجتماعی طور پر معرکہ میں پیش آمدہ ان واقعات و مسائل کا تذکرہ بھی کیا جاسکے جن کی وجہ سے مدد کا حصول ممکن ہوا۔

علاوہ ازیں انفرادی طور پر بہادری اور فدا کاری کے تذکرے، مشکل حالات میں پیش قدمی کرنے والوں کا تذکرہ، پلٹنے اور حملہ کرنے کے سلسلے میں حاصل ہونے والے اسباق، دشمن کی منصوبہ بندی پر نظر، اس سے حاصل ہونے والے فوائد کا احاطہ، سالارِ اعلیٰ کی راہ نمائیوں کے ان مٹ نقوش، اعلیٰ قیادت کی جنگی حکمت عملی کا تذکرہ اور بالفعل ان کے جنگ میں شریک ہونے کا تذکرہ کرنا بھی اس تین روزہ قیام کی حکمت میں داخل ہوتا ہے۔

ان تمام امور کو زیر بحث لانے کا مقصد یہی ہوتا کہ مستقبل میں پیش آنے والے ممکنہ حالات میں تجربوں سے فائدہ اٹھایا جائے اور انتہائی کٹھن جہادی راہوں کے لیے ایسے اصول اخذ کیے جائیں جن کی بدولت نصرتِ الٰہی شامل حال ہو اور ہر طرف سے کامیابیاں

[1] نضرة النعيم:291/1. [2] محمد رسول الله ﷺ لصادق عرجون:453/3.

قدم چومیں۔

❁ مقتول اور میدان کارزار میں پڑے ہوئے زخم خوردہ دشمنوں کی پہچان۔ اس دوران کیفرِ کردار تک پہنچنے والے دشمنوں کا مکمل تعارف اور قوم میں ان کا مقام و مرتبہ بھی پہچانا جاتا اور زخمی افراد کا پتا بھی چلایا جاتا کہ دشمن کا جو فرد ابھی موت و حیات کی کشمکش میں ہے سالار اعلیٰ کے حکم کے مطابق اس کے شر سے محفوظ رہنے کی غرض سے اسے ختم کرنا، اسی طرح دشمن کے مقتولین کو کہیں ٹھکانے لگانا۔ اس سلسلے میں امت کے فرعون ابوجہل، عالم کفر کے لیڈر امیہ بن خلف اور ان جیسے دیگر سرکردہ ناپاک افراد کو بدر کے ایک پرانے گندے کنویں میں پھینکوا دیا گیا،[1] پھر آپ ﷺ اس کنویں کے کنارے پر کھڑے ہوئے اور ایک روایت کے مطابق ان مقتولین کے قریب کھڑے ہوئے اور فرمایا:

«بِئْسَ عَشِيرَةُ النَّبِيِّ كُنْتُمْ لِنَبِيِّكُمْ، كَذَّبْتُمُونِي وَصَدَّقَنِي النَّاسُ وَخَذَلْتُمُونِي وَنَصَرَنِي النَّاسُ، وَأَخْرَجْتُمُونِي وَآوَانِي النَّاسُ»

''تم لوگ اپنے نبی کے لیے کتنا برا خاندان ثابت ہوئے۔ تمھاری بدقسمتی کہ تم نے مجھے جھٹلایا جبکہ دیگر لوگوں نے میری تصدیق کی۔ تم نے مجھے بے یارومددگار چھوڑا جبکہ دوسرے لوگوں نے میری تائید کی اور تم نے مجھے ہجرت پر مجبور کر دیا، جبکہ انصار نے مجھے پناہ دی۔''[2]

صحیح بخاری کی ایک روایت ہے کہ نبی ﷺ کے حکم کے مطابق ان سب کفار کو گھسیٹ کر ایک کنویں میں پھینک دیا گیا، پھر آپ ﷺ وہاں کھڑے ہوکر ان سے یوں گویا ہوئے:

«يَا عُتْبَةُ بْنُ رَبِيعَةَ! وَيَا شَيْبَةُ بْنُ رَبِيعَةَ! وَيَا أُمَيَّةُ بْنُ خَلْفٍ! وَيَا أَبَاجَهْلِ بْنَ هِشَامٍ! وَّيَا فُلَانُ! وَيَا فُلَانُ! هَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَكُمْ

1 صحيح البخاري، حديث: 3976، معاً. 2 السيرة النبوية لابن هشام: 293,292/2، و زادالمعاد: 187/3.

رَبُّكُمْ حَقًّا؟ فَإِنِّي وَجَدْتُّ مَا وَعَدَنِي رَبِّي حَقًّا»

''اے عتبہ بن ربیعہ! اے شیبہ بن ربیعہ! اے امیہ بن خلف! اے ابو جہل بن ہشام! اے فلاں! اے فلاں! کیا تم سے تمھارے رب نے جو وعدہ کیا تھا تم نے اسے برحق پایا؟ مجھ سے میرے رب نے جو وعدہ کیا تھا میں نے تو اسے برحق ہی پایا۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: ''اے اللہ کے رسول! آپ ایسے جسموں سے باتیں کر رہے ہیں جن میں روح نہیں؟''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ! مَا أَنْتُمْ بِأَسْمَعَ لِمَا أَقُولُ مِنْهُمْ، غَيْرَ أَنَّهُمْ لَايَسْتَطِيعُونَ أَنْ يَّرُدُّوا عَلَيَّ شَيْئًا» ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے! میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اسے تم ان سے زیادہ نہیں سن رہے لیکن یہ لوگ جواب نہیں دے سکتے۔''[1]

حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے انھیں زندہ کر دیا تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو بطور سرزنش اور پشیمانی ان کو سنوائی تھی۔''[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس گفتگو سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ایک نئی زندگی، یعنی عالم برزخ میں داخل ہو چکے ہیں جہاں وہ زندہ لوگوں کا کلام سن تو سکتے ہیں لیکن جواب دے سکتے ہیں نہ کلام کر سکتے ہیں۔ اس برزخی زندگی پر ایمان رکھنا اہل ایمان کا عقیدہ ہے۔

قبر کی نعمتیں اور سزائیں صحیح احادیث سے ثابت ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ دو قبروں کے قریب سے گزرے اور فرمایا: «إِنَّهُمَا لَيُعَذَّبَانِ، وَ مَا يُعَذَّبَانِ فِي كَبِيرٍ، أَمَّا أَحَدُهُمَا فَكَانَ لَا يَسْتَتِرُ مِنَ الْبَوْلِ، وَ أَمَّا الْآخَرُ فَكَانَ يَمْشِي بِالنَّمِيمَةِ» ''بلاشبہ یہ دونوں قبر والے عذاب میں مبتلا ہیں اور انھیں یہ عذاب کسی بڑی بات کی وجہ

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 3976، وصحيح مسلم، حديث: 2874,2873. [2] صحيح البخاري، حديث: 3976.

سے نہیں ہو رہا۔ ان میں سے ایک پیشاب کی چھینٹوں سے نہیں بچتا تھا اور دوسرے کا جرم یہ تھا کہ وہ چغلی کھاتا تھا۔''[1]

رسول اللہ ﷺ کے واضح فرامین کی موجودگی میں اس جیسی ان دیکھی حقیقتوں کو تسلیم کرنا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آل فرعون کو عالم برزخ میں عذاب ہونے کی نشاندہی فرمائی ہے:

﴿اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۗ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ۝﴾

''(وہ دوزخ کی) آگ ہے جس پر انھیں صبح و شام پیش کیا جاتا ہے اور جس دن قیامت قائم ہوگی (کہا جائے گا:) آل فرعون کو سخت ترین عذاب میں داخل کرو۔''[2]

اسی طرح شہداء کے لیے عالم برزخ میں نعمتوں کا ذکر ہے، چنانچہ شہداء کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝﴾

''ان لوگوں کو مردہ خیال نہ کرو جو اللہ کے راستے میں مارے گئے ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں، انھیں ان کے رب کے ہاں رزق دیا جاتا ہے۔''[3]

سردارانِ کفار کا قتل اور مسلمان شہیدوں کے یادگار واقعات

سرکشوں کی ہلاکتیں

ابو جہل بن ہشام مخزومی کی ہلاکت: حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں غزوۂ بدر کے دن صف میں کھڑا تھا کہ میں نے اپنے دائیں اور بائیں دو نوعمر لڑکوں کو

1 صحيح البخاري، حديث: 218، و صحيح مسلم، حديث: 292. 2 المؤمن 40:46.
3 آل عمرٰن 3:169.

دیکھا۔ میرے دل میں خیال آیا: ''کاش! میں مضبوط اور جوان آدمیوں کے درمیان ہوتا۔'' اسی اثنا میں ان میں سے ایک نے مجھ سے کہا: ''چچا جان! آپ ابوجہل کو جانتے ہیں؟'' میں نے کہا: ''ہاں! تم اسے کیا کرو گے؟'' وہ کہنے لگا: «أُخْبِرْتُ أَنَّهُ يَسُبُّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ، وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ! لَئِنْ رَأَيْتُهُ لَا يُفَارِقُ سَوَادِي سَوَادَهُ حَتّٰى يَمُوتَ الْأَعْجَلُ مِنَّا» ''میں نے سنا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں نازیبا الفاظ کہتا ہے۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر میں نے اسے دیکھ لیا تو میرا وجود اس کے وجود سے الگ نہیں ہوگا تا آنکہ ہم میں سے جس کی موت پہلے لکھی ہے وہ مر نہ جائے۔'' عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے اس کی بات سن کر تعجب ہوا۔ اتنے میں دوسرے نوجوان نے مجھ سے یہی سوال کیا۔ میں نے دیکھا کہ ابوجہل لوگوں کے درمیان چکر لگا رہا ہے۔ میں نے کہا: ''ارے! دیکھو، یہ رہا تمھارا شکار جس کے بارے میں تم پوچھ رہے تھے۔'' یہ کہنے کی دیر تھی وہ دونوں اپنی اپنی تلوار لے کر اس پر جھپٹ پڑے اور اسے قتل کر دیا۔ اور پلٹ کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «أَيُّكُمَا قَتَلَهُ؟» ''تم میں سے کس نے اسے قتل کیا ہے؟'' دونوں نے کہا: ''میں نے اسے قتل کیا ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: «هَلْ مَسَحْتُمَا سَيْفَيْكُمَا» ''کیا تم اپنی تلواریں صاف کر چکے ہو؟'' وہ بولے: ''نہیں۔'' نبی ﷺ نے ان دونوں کی تلواریں دیکھیں اور فرمایا: «كِلَاكُمَا قَتَلَهُ» ''تم دونوں نے اسے قتل کیا ہے۔'' البتہ ابوجہل کا سامان معاذ بن عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ کے لیے ہے۔ دونوں حملہ آور نوجوانوں کے نام معاذ بن عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ اور معاذ ابن عفراء رضی اللہ عنہ تھے۔[1]

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے بدر کے دن اعلان فرمایا: «مَنْ يَنْظُرُ لَنَا مَا صَنَعَ أَبُو جَهْلٍ؟» ''کون ہے جو ہمیں ابوجہل کے بارے میں آگاہ کرے

[1] صحيح البخاري، حديث: 3141 و 3988، وصحيح مسلم، حديث: 1752.

کہ اس کا کیا بنا؟'' حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس کام کے لیے روانہ ہوئے۔ انھوں نے اسے اس حال میں پایا کہ عفراء کے دونوں بیٹوں [1] نے اسے مار گرایا تھا لیکن ابھی اس میں زندگی کی رمق موجود تھی۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسے ڈاڑھی سے پکڑا اور کہا: ''تو ہی ابوجہل ہے؟'' اس نے کہا: ''کیا جس شخص کو اس کی قوم نے قتل کیا، یا تم نے قتل کیا، اس سے بلند رتبے والا آدمی کوئی اور بھی ہے؟'' [2]

ایک اور روایت میں ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میں نے بدر کے دن ابوجہل کو زخمی حالت میں گرا ہوا پایا۔ میں نے کہا: ''او اللہ کے دشمن! آخر اللہ نے تجھے رسوا کردیا۔'' وہ کہنے لگا: ''مجھے کاہے کو رسوا کردیا۔ کیا جس شخص کو تم نے قتل کیا اس سے بلند پایہ آدمی بھی کوئی ہے؟'' حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے پاس اپنی تلوار تھی، میں بلاخوف آگے بڑھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کا ہاتھ اس کی تلوار پر ہے۔ میں

1 ابوجہل کے قتل کے سلسلے میں پیچھے یہ گزرا ہے کہ اسے معاذ بن عمرو بن جموح اور معاذ ابن عفراء رضی اللہ عنہما نے قتل کیا تھا جبکہ یہاں یہ ذکر ہے کہ عفراء کے دونوں بیٹوں نے اسے قتل کیا اور یہ بھی آرہا ہے کہ انجام کار ابوجہل کو موت کے گھاٹ اتارنے والے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تھے۔ ان اقوال کے درمیان تطبیق دیتے ہوئے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ممکن ہے صحیح بخاری کی (گزشتہ) روایت کے مطابق معاذ ابن عفراء کے ساتھ حملے میں معاذ بن عمرو بن جموح شریک ہوئے ہوں۔ اور بعد میں معوذ ابن عفراء نے بھی ضرب لگائی اور اسے ڈھیر کردیا ہو۔ (لیکن ابھی کچھ رمق باقی تھی) انجام کار ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس کا سر کاٹ دیا۔ (فتح الباري: 369/7) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوجہل کا سامان اکیلے معاذ بن عمرو بن جموح کو اس لیے عطا فرمایا کیونکہ اس نے قتل کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا تھا، جبکہ اس کا دوسرا ساتھی صرف ضرب لگانے میں شریک ہوا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کی دلجوئی کے لیے فرمایا تھا کہ تم دونوں نے اسے قتل کیا ہے کیونکہ وہ بھی اس قتل میں شریک تو تھا۔ معوذ ابن عفراء رضی اللہ عنہ اسی معرکے میں شہید ہو گئے تھے، نیز معاذ ابن عفراء رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بارے میں اختلاف ہے، جبکہ معاذ بن عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور تک زندہ رہے۔ (أسد الغابة: 190/5، 194 و 231) 2 صحیح البخاري، حديث: 3962 و 3963، وصحيح مسلم، حديث: 1800.

نے اس کے ہاتھ پر وار کیا تو اس کی تلوار دور جا گری جو میں نے قبضے میں لے لی، پھر اس کا خود اتارا اور اس کی گردن کاٹ لی اور نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور آپ ﷺ کو خبر دی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «اَللّٰهُ الَّذِي لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ!» ''تجھے اللہ وحدہ لا شریک کی قسم (کیا واقعی تو نے اسے قتل کیا ہے؟'') میں نے عرض کیا: ''مجھے اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں! (میں نے واقعی اسے قتل کیا ہے۔'') آپ ﷺ نے فرمایا کہ جاؤ اور تحقیق کرو۔ میں پرندے کی طرح اڑتا ہوا گیا اور اسی طرح اڑتا ہوا اور ہنستا ہوا واپس آیا اور اطلاع دی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «اِنْطَلِقْ» ''میرے ساتھ چلو۔'' میں آپ ﷺ کے ساتھ روانہ ہوا اور آپ ﷺ کو دکھایا۔ آپ ﷺ نے اسے دیکھتے ہی فرمایا: «كَانَ هٰذَا فِرْعَوْنَ هٰذِهِ الْأُمَّةِ» ''یہ اس امت کا فرعون تھا۔''[1]

دونو عمر انصاری نوجوانوں کو ابوجہل کے قتل پر ابھارنے کا باعث یہ بنا کہ ابوجہل نبی ﷺ کی شان میں ہرزہ سرائیاں کرتا تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انصاری نوجوان اللہ کے رسول ﷺ سے کس حد تک محبت کرتے تھے۔ اور جو بھی بدنصیب آپ ﷺ کو ایذا رسانی کی کوشش کرتا اس سے بدلہ لینے کی خاطر وہ اپنی جان کی بازی بھی لگا دیتے تھے۔

ابوجہل جب اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا، اس دوران حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور ابوجہل کے درمیان ہونے والی گفتگو میں عبرت کا عظیم پہلو ہے۔ سرزمین مکہ میں مسلمانوں کو سخت تکالیف سے دوچار کرنے والا یہ سرکش انسان اسی شخص کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچا جسے وہ اذیتیں دیا کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یہی فیصلہ فرمایا تھا کہ اسے آخری لمحات میں ان لوگوں میں سے ایک شخص ختم کرے گا جن پر اہل مکہ ابوجہل کی سرکردگی میں ظلم کے پہاڑ توڑا کرتے تھے۔

ابوجہل ایک متکبر اور خودغرض انسان تھا جس کا ثبوت اُس کے اُن الفاظ سے ملتا ہے

[1] مسند أحمد: 403/1 و444، ومعجم الکبیر للطبراني: 477/7. روایت ضعیف ہے۔

جو اس نے مرنے سے پہلے کہے تھے۔[1] ابن اسحاق کی ایک روایت کے مطابق جب عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس کا سر اتارنا چاہا تو اس نے کہا: ''او بکریوں کے حقیر سے چرواہے! تو بڑی اونچی اور مشکل جگہ چڑھ گیا ہے۔''[2]

ابو جہل کے قتل کے اسی واقعے کی وضاحت کرتے ہوئے سیرت نگار صادق عرجون کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابو جہل کو دو انصاری نوجوانوں کے ہاتھوں شدید زخمی کروایا مگر اس کی موت واقع نہیں ہونے دی۔ وہ ابدی ہلاکت کے کنارے پہنچ چکا تھا لیکن اس کی دماغی صلاحیت تا حال کام کر رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ تھا کہ وہ اپنی ذلت و رسوائی اور قتل کو اپنی آنکھوں سے دیکھے کہ ایسا شخص جسے وہ مکہ میں کمزور اور ناتواں خیال کرتے ہوئے تکالیف دیتا اور ظلم کرتا رہا وہی آج اس کا خاتمہ کر رہا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا شمار ان خوش نصیب افراد میں ہوتا ہے جنھوں نے آغازِ اسلام ہی میں اسلام کے سایۂ عاطفت میں جگہ پائی اور اپنے عقیدے کو پاک کیا اور اللہ کے نازل کردہ شفقت بھرے پاکیزہ احکامات پر عمل پیرا ہو کر اللہ کا قرب حاصل کیا۔ یہی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس موقع پر ابو جہل کے سینے پر چڑھ گئے۔ اسے اپنے قدموں تلے روندا، اسے مزید حقارت سے دوچار کرنے کے لیے اس کی داڑھی پکڑی اور سخت الفاظ کہے جن سے اس کا سارا غرور اور تکبر خاک میں مل گیا۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے تلوار ہاتھ میں لی اور اسے غصہ دلانے کے لیے خبر دی کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام اور اسلامی لشکر کو فتح سے نوازا ہے اور ایک ذلت آمیز شکست کی صورت میں رسوائی اور عار اس مغرور لشکر کے حصے میں آئی ہے جس کی قیادت ابو جہل جیسا خبیث النفس آدمی کر رہا تھا۔[3]

امیہ بن خلف کا قتل: حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے امیہ بن خلف

---

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي: 4/158-160. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 2/289. [3] محمد رسول الله ﷺ لصادق عرجون: 3/431,432.

سے ایک تحریری معاہدہ کر رکھا تھا کہ وہ مکہ میں میرے اہل اور مال کی حفاظت کرے گا اور میں مدینہ میں اس کے اہل اور مال کی حفاظت کروں گا۔ جب میں نے معاہدے میں اپنے نام کا ایک حصہ ''الرحمٰن'' لکھنا چاہا تو اس نے کہا: ''میں رحمٰن کو نہیں جانتا، میرے ساتھ معاہدہ اپنے جاہلی نام ''عبد عمرو'' کو لکھ کر کرو۔'' میں نے اس کی بات مان لی۔

بدر کے دن جب سب لوگ سو گئے تو میں اسے لیے ایک پہاڑ کی طرف بڑھا تا کہ اسے محفوظ مقام تک پہنچاؤں۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اسے دیکھ لیا۔ وہ انصار کی ایک مجلس کے پاس پہنچے اور بلند آواز سے بولے: ''وہ رہا امیہ بن خلف! اب یا تو میں رہوں گا یا امیہ۔'' یہ سن کر انصار کے ایک گروہ نے ہمارا تعاقب شروع کر دیا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ہم تک پہنچ جائیں گے تو میں نے اس کے بیٹے کو پیچھے چھوڑ دیا تا کہ وہ اسی میں مگن ہو جائیں اور ہمارا تعاقب نہ کریں لیکن انصاریوں نے اسے فوراً قتل کر ڈالا اور دوبارہ ہمارا پیچھا شروع کر دیا۔

امیہ بن خلف بھاری بھرکم آدمی تھا۔ جب انھوں نے ہمیں آلیا تو میں نے اس سے کہا کہ تم گھٹنوں کے بل بیٹھ جاؤ۔ وہ بیٹھ گیا۔ میں رضی اللہ عنہ نے اس کی حفاظت کی غرض سے اپنے آپ کو امیہ پر ڈال دیا لیکن پھر بھی لوگوں نے نیچے سے تلواریں مار مار کر اسے قتل کر دیا حتی کہ اسی اثنا میں کسی کی تلوار سے میرا پاؤں بھی زخمی ہو گیا۔

راوی کہتے ہیں کہ عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ اپنے پاؤں کا زخم ہمیں دکھلایا کرتے تھے۔[1]

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ ایک دوسری روایت میں فرماتے ہیں کہ مکہ میں امیہ بن خلف میرا گہرا دوست تھا۔ میرا نام عبد عمرو تھا۔ جب میں مسلمان ہوا تو میں نے اپنا نام عبدالرحمٰن رکھ لیا۔ مکہ قیام کے دوران امیہ مجھ سے ملتا رہتا تھا اور اکثر مجھ سے کہا کرتا تھا: ''اے عبد عمرو! کیا تم نے اس نام سے منہ پھیر لیا ہے جو تمھارے ماں باپ نے تجویز کیا

[1] صحيح البخاري، حديث:2301.

تھا؟'' میں جواب دیتا: ''ہاں'' تو وہ کہتا: ''میں کسی رحمٰن کو نہیں جانتا۔ کوئی دوسرا ایسا نام بتاؤ جس سے میں تمھیں بلا لیا کروں کیونکہ ''عبد عمرو'' پکارنے سے تم مجھے جواب نہیں دیتے اور اس نئے غیر معروف نام سے میں تمھیں نہیں آواز دے سکتا۔'' حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''وہ جب بھی مجھے میرے پرانے نام سے آواز دیتا تو میں اس کی طرف متوجہ ہی نہ ہوتا تھا۔'' ایک دن میں نے اس سے کہا: ''اے ابو علی! جو تیرے جی میں آئے میرا نام تجویز کر لے۔'' تو اس نے کہا: ''پھر تو عبدالالٰہ ہے۔'' میں نے تسلیم کر لیا کہ یہ ٹھیک ہے۔ اس کے بعد جب وہ میرے قریب سے گزرتا اور مجھے عبدالالٰہ کہہ کر پکارتا تو میں اس کا جواب دیتا اور پھر وہ میرے ساتھ گفتگو کا آغاز کرتا۔

بدر کے دن میں اس کے قریب سے گزرا تو دیکھا کہ وہ اور اس کا بیٹا علی بن امیہ کھڑے ہیں۔ میرے پاس کچھ زرہیں تھیں جو میں دشمن سے چھین کر لا رہا تھا۔ جب امیہ نے مجھے دیکھا تو بولا: ''اے عبدِ عمرو!'' میں نے کوئی جواب نہ دیا، پھر اس نے کہا: ''اے عبدالالٰہ!'' تو میں متوجہ ہوا۔ وہ کہنے لگا: ''کیا تمھیں میری ضرورت نہیں ہے؟ کیا میں تمھاری ان زرہوں سے بہتر نہیں ہوں؟'' میں نے کہا: ''اللہ کی قسم! ہاں'' پھر میں نے زرہیں وہیں پھینک دیں اور اسے اور اس کے بیٹے کو لے کر چل دیا۔ وہ کہہ رہا تھا: ''آج جیسا منظر تو میں نے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ کیا تمھیں دودھ کی حاجت نہیں ہے؟'' حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''پھر میں ان دونوں کو لیے چل دیا۔'' ابن ہشام فرماتے ہیں: ''دودھ سے مراد یہ تھا کہ جو مجھے قید کرے گا اسے فدیے میں خوب دودھ والی اونٹنیاں دوں گا۔''[1]

اس واقعے سے مندرجہ ذیل حقائق واضح ہیں:

❁ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے جب اپنے سخت جانی دشمن امیہ بن خلف کو عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی قید میں دیکھا تو بلند آواز سے کہا: ''اب یا تو میں زندہ رہوں گا یا امیہ۔'' کیونکہ امیہ

1 السيرة النبوية لابن هشام: 284,283/2.

سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو مکہ میں انتہائی سخت اور کربناک تکالیف سے دوچار کیا کرتا تھا۔

سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کا یہ طرز عمل اللہ کے دشمنوں کو ملیا میٹ کر کے کامل اطمینان حاصل کرنے کے لیے تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ دنیا کی زندگی میں بڑے بڑے کافروں سے نجات مل جائے اور سکون حاصل ہو جائے۔ اس احسان کی بدولت اللہ تعالیٰ نے سرکش کفار کے ہاتھوں ظلم و جبر کی چکی میں پیسے جانے والے اور حقارت و ذلت کا نشانہ بننے والے مومنوں کو راحت بخشی۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللَّهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُؤْمِنِينَ ۝ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوبِهِمْ ۗ وَيَتُوبُ اللَّهُ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝﴾

''ان سے (خوب) لڑائی کرو، اللہ انھیں تمھارے ہاتھوں سے عذاب دے گا اور انھیں رسوا کرے گا اور ان کے خلاف تمھاری مدد کرے گا اور مومنوں کے سینوں کو شفا (ٹھنڈک) بخشے گا اور وہ ان کے دلوں کا غصہ دور کرے گا اور اللہ جس پر چاہے توجہ فرماتا ہے۔ اور اللہ خوب جاننے والا، خوب حکمت والا ہے۔''[1]

❁ امیہ بن خلف کا دردناک انجام متکبر اور سرکش لوگوں کے لیے درسِ عبرت اور ایسے لوگوں کے لیے عمدہ نصیحت ہے جو اپنی طاقت کے نشے میں چُور اور مقام و مرتبہ کی غلط فہمیوں کا شکار ہو کر کمزور لوگوں پر ظلم کرتے اور ان کے حقوق سلب کرتے ہیں۔ ان کا آخرت میں انتہائی برا انجام ہونے والا ہے۔ اور کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کمزور افراد کو ان ظالموں پر قدرت عطا فرما دیتے ہیں جیسا کہ امیہ بن خلف اور اس جیسے دیگر کفر کے سرغنے تھے جن پر اللہ تعالیٰ نے کمزور اہلِ اسلام کو تسلط عطا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ ۝﴾

1 التوبة 9:14,15.

''اور ہم چاہتے تھے کہ ان لوگوں پر احسان کریں جنھیں زمین میں ضعیف جان (کر دبا) لیا گیا تھا اور انھیں پیشوا بنائیں اور انھیں (ملک مصر کے) وارث بنائیں۔'' [1]

❁ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ نے انصاری صحابہ سے مدد لے کر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی مزاحمت بھی کی اور ان کے قیدی بھی چھین لیے اس کے باوجود حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے یہ ریمارکس: ''اللہ تعالیٰ بلال رضی اللہ عنہ پر رحم فرمائے میری زرہیں بھی ضائع ہوئیں اور میرے قیدی کے بارے میں بھی انھوں نے مجھے تڑپا دیا۔'' ان کے آپس کے تعلقات اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی باہمی اخوت ایمانی کا عظیم مظہر ہیں۔ [2]

❁ امیہ بن خلف کی بیوی ام صفوان رضی اللہ عنہا اسلام لانے کے بعد ایک دن مکہ مکرمہ میں حباب بن منذر رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھ رہی تھیں کہ ان سے کہا گیا: یہ ''حباب وہی شخص ہیں جنھوں نے بدر کے دن آپ کے لخت جگر علی کے پاؤں کاٹ ڈالے تھے۔'' وہ کہنے لگیں: ''ہمیں حالت شرک میں مرنے والوں کے تذکرے سے کیا حاصل؟ اللہ تعالیٰ نے میرے بیٹے علی کو حباب بن منذر کے وار سے ذلت سے دوچار اور اسی سے حباب کو عزت سے نوازا۔ علی درحقیقت جب مکہ سے نکلا تو اس کا دل مسلمان تھا لیکن افسوس کہ اس نے جان کسی اور دین پر فدا کر دی۔'' [3]

ام صفوان رضی اللہ عنہا کے یہ الفاظ ان کی ایمانی قوت اور یقین کامل کا پتا دیتے ہیں کہ وہ ولاء اور براء کا نظریہ پختگی سے اپنائے ہوئے تھیں۔ اب وہ مسلمانوں سے محبت رکھتی تھیں اگرچہ وہ ان کے قبیلے سے نہیں تھے اور کافروں سے نفرت کرتی تھیں اگرچہ وہ ان کے قبیلے کے لوگ تھے۔

ام صفوان رضی اللہ عنہا کا یہ کہنا کہ علی جب مکہ سے نکلا تو مسلمان تھا مگر اس نے جان کسی اور

[1] القصص 5:28. [2] التاريخ الإسلامي للحميدي: 153/4. [3] التاريخ الإسلامي للحميدي: 154/4.

دین پر فدا کر دی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ علی بن امیہ بھی ان لوگوں میں سے تھا جن کے بارے میں یہ معروف ہو چکا تھا کہ وہ مسلمان ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے جنھیں کفار بدر کے دن زبردستی اپنے ساتھ لائے تھے، پھر جب غزوۂ بدر کے دن دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے تو ان مجبوراً ہمرکاب ہونے والوں نے مسلمانوں کو تعداد میں کم سمجھا تو یہ فتنے میں مبتلا ہو گئے اور کہنے لگے کہ ان مسلمانوں کو ان کے دین نے دھوکے میں مبتلا کر رکھا ہے، لہٰذا ان کے بارے میں اللہ کا یہ فرمان نازل ہوا:

﴿اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ ۗ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝﴾

''جب منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ تھا، یہ کہتے تھے کہ ان (مسلمانوں) کو ان کے دین نے دھوکے میں ڈال دیا ہے۔ اور جو کوئی اللہ پر بھروسا کرے تو بے شک اللہ زبردست خوب حکمت والا ہے۔''[1]

عبیدہ بن سعید بن عاص کی ہلاکت: حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بدر کے دن میں عبیدہ بن سعید بن عاص کے مقابلے میں آیا۔ عبیدہ کا سارا بدن دفاعی اسلحے میں چھپا ہوا تھا صرف اس کی آنکھیں نظر آرہی تھیں۔ اس کی کنیت ابو ذات الکرِش تھی۔ اس نے کہا کہ میں ابو ذات الکرش ہوں۔ میں نے تاک کر اس کی آنکھ میں نیزہ مارا جس سے وہ ہلاک ہو گیا۔

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا: ''میرا نیزہ اس کی زرہ میں پھنس گیا۔ میں نے اپنا پاؤں اس کی گردن پر رکھا اور نیزے کو زور سے کھینچنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھائے اور بمشکل اس سے اپنا نیزہ نکالا۔ اس سے نیزے کی دونوں دھاریں مڑ گئی تھیں۔''[2]

عروہ بن زبیر فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ نیزہ ان سے طلب فرمایا تو انھوں نے وہ

1 الأنفال8:49. تفسير ابن كثير:76/4. 2 التاريخ الإسلامي للحميدي:154/4.

نیزہ آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ نبی ﷺ کی وفات کے بعد انھوں نے یہ نیزہ واپس لے لیا، پھر سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اسے طلب کیا تو انھوں نے نیزہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے حوالے کر دیا۔ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے انتقال کے بعد نیزہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مانگا تو انھوں نے نیزہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دے دیا۔ جب وہ بھی شہید ہو گئے تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے وہ نیزہ واپس لے لیا، پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اسے طلب کیا تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے یہ یادگار نیزہ ان کے حوالے کر دیا اور ان کی شہادت کے بعد یہ نیزہ آل علی کے پاس رہا، پھر یہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے قبضے میں آ گیا اور یہ نیزہ انھی کے پاس رہا تا آنکہ وہ فتنہ حجاج بن یوسف میں شہید ہو گئے۔[1]

مذکورہ قصے سے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی نشانہ بازی میں مہارت کا پتا چلتا ہے۔ انھوں نے ناممکن نظر آنے والا ہدف حاصل کیا اور نیزہ دشمن کی آنکھ میں اتار دیا، حالانکہ ان کی صلاحیت میدانِ کارزار میں رزم آرائی اور اپنے دفاع پر بھی برابر صرف ہو رہی تھی۔ اسلحہ سے لیس اس انسان کو قتل کرنا انتہائی مشکل تھا۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی یہ ضرب بہت گہری تھی۔ اس سے زبیر رضی اللہ عنہ کی نشانہ بازی میں مہارت کے ساتھ ساتھ ان کی جسمانی قوت کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔[2]

اسود مخزومی کی ہلاکت: ابن اسحاق کہتے ہیں کہ اسود مخزومی ایک بدخلق اور اڑیل مزاج آدمی تھا۔ وہ یہ کہتے ہوئے میدان میں نکلا کہ میں ان کے حوض کا پانی پی کر رہوں گا یا اسے پاٹ دوں گا چاہے جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ جب وہ اپنے ارادے کی تکمیل کے لیے آگے بڑھا تو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اس کے سامنے آئے جب دونوں نے ایک دوسرے پر وار کیا تو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے تلوار کی ایسی ضرب لگائی کہ اس کی ٹانگ نصف پنڈلی سے کٹ گئی۔ وہ ابھی حوض سے پیچھے تھا اور اس کے پاؤں سے اسی کے ساتھیوں کی

1 صحيح البخاري، حديث:3998. 2 التاريخ الإسلامي للحميدي:4/163.

جانب خون کا فوارہ پھوٹ رہا تھا اس کے باوجود وہ گھٹنوں کے بل گھسٹ کر حوض کی طرف بڑھا اور اپنی قسم پوری کرنے کے لیے حوض میں داخل ہو گیا۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے اس کا تعاقب کیا اور ایک اور کاری ضرب لگائی اور اسے حوض ہی میں ڈھیر کر دیا۔ [1]

امیہ بن خلف نے عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے سوال کیا تھا کہ آپ میں سے وہ کون تھا جو اپنے سینے پر شتر مرغ کا پر لگائے ہوئے تھا؟ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''وہ حمزہ رضی اللہ عنہ تھے۔'' امیہ نے کہا: ''یہی وہ شخص ہے جس نے بڑے عجیب و غریب انداز سے ہمارے لشکر میں تباہی مچائی تھی۔'' [2]

یہ جنگ بدر میں شریک کافروں کے ایک سرغنے کی گواہی تھی اور امیہ کی اس گواہی سے مراد یہ تھی کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے قتل کر کے دشمنوں کا خون بھی خوب بہایا تھا اور ان کا شیرازہ بھی بکھیر دیا تھا۔ [3]

اللہ کے شیر حمزہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں قتل ہونے والا معرکے کا پہلا ایندھن یہی اسود مخزومی تھا۔ یہ بدخلق اور اڑیل آدمی مسلمانوں کو چیلنج دیتے ہوئے آگے بڑھا۔ سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ نے اس کا مقابلہ کیا اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اور اس کی موت بہت سے اسلام دشمن، کینہ پرور اور متکبر لوگوں کے لیے درس عبرت بن گئی۔ [4]

عتبہ بن ربیعہ کی ہلاکت اور بیٹے کے جذبات: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب مشرکین کی لاشوں کو کنویں میں ڈالنے کا حکم دیا گیا اور عتبہ بن ربیعہ کو کنویں کی طرف گھسیٹ کر لایا جانے لگا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بیٹے ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ کے چہرے کی طرف دیکھا تو اس پر ناپسندیدگی کے اثرات نمایاں تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «يَا أَبَا حُذَيْفَةَ! وَاللّٰهِ لَكَأَنَّهُ سَائَكَ مَا كَانَ فِي أَبِيكَ» ''اے ابو حذیفہ! شاید اپنے باپ کے بارے

1 السيرة النبوية لابن هشام: 237/2. 2 التاريخ الإسلامي للحميدي: 151/4. 3 التاريخ الإسلامي للحميدي: 152/4. 4 التاريخ الإسلامي للحميدي: 121/4.

میں تمھارے دل میں کچھ ناگوار احساسات ہیں؟'' انھوں نے عرض کیا: ''نہیں، اللہ کی قسم اے اللہ کے رسول! مجھے اللہ اور اس کے رسول کے بارے میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں ہے۔ ہاں البتہ میں اپنے باپ کو سوجھ بوجھ کا حامل، دور اندیش اور صاحب رائے خیال کرتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ خوبیاں ان کی وفات سے پہلے ضرور ان کے لیے اسلام کی راہ ہموار کریں گی لیکن اب ان کا انجام سامنے دیکھ کر اور خلاف توقع کفر پر ان کا خاتمہ دیکھ کر مجھے افسوس ہوا ہے۔'' یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کے حق میں دعائے خیر فرمائی۔[1]

ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کا ایمان یقین کی بلندیوں کو چھو رہا تھا اور وہ نبی ﷺ کے ساتھ حد درجہ وفادار تھے۔ بشری تقاضوں کے مطابق کچھ احساسات ان میں دیکھے گئے۔ ایمان بشری تقاضوں کو ختم نہیں کرتا بلکہ انھیں مہذب بنا دیتا ہے۔ ایمان لوگوں کو جاہلی تعصب سے نکال کر وفا کا ایسا پیکر بنا دیتا ہے جو عملی صورت میں قانونِ الٰہی کی ہرگز مخالفت نہیں کرتا۔

ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کا ایمان اتنا پختہ تھا کہ حوادثاتِ زمانہ اسے ہلا نہیں سکے اور جب انھوں نے اپنے باپ کو مقتولین کے درمیان پایا اور اسے بھی ان کے ساتھ گھسیٹ کر کنویں میں پھینکا جانے لگا تو باپ ہونے کے ناطے بشری احساسات جاگ اٹھے لیکن ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کا ایمان بلندترین پہاڑوں کی طرح مضبوط تھا۔ صرف اپنی توقع کے خلاف اپنے باپ کی کفر پر موت کا انھیں رنج ہوا۔[2]

یہ عظیم مقصد جس کی بنا پر سیدنا ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کے چہرے پر غم و حزن کے اثرات نمایاں ہونے لگے تھے انھیں ہلکا کرنے کے لیے نبی ﷺ نے ان کے حق میں دعائے خیر فرمائی۔[3]

1 المستدرك للحاكم: 224/3. 2 محمد رسول الله ﷺ لصادق عرجون: 446/3. 3 التاريخ الإسلامي للحميدي: 174/4.

غزوۂ بدر کے شہداء

حارثہ بن سراقہ رضی اللہ عنہ کی شہادت: حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حارثہ رضی اللہ عنہ ابھی چھوٹی عمر کے تھے کہ بدر میں شہید ہو گئے۔ ان کی ماں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کرنے لگی: ''اے اللہ کے رسول! آپ بخوبی جانتے ہیں کہ حارثہ سے مجھے کتنا پیار تھا اگر وہ جنت میں ہے تو میں صبر کرتی ہوں اور ثواب کی امید رکھتی ہوں اور اگر وہ کسی اور جگہ ہے تو آپ دیکھیں کہ میں کیا کرتی ہوں؟'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «وَيْحَكِ! أَوَ هَبِلْتِ! أَوَجَنَّةٌ وَّاحِدَةٌ هِيَ؟ إِنَّهَا جِنَانٌ كَثِيرَةٌ، وَّ إِنَّهُ فِي جَنَّةِ الْفِرْدَوْسِ» ''اللہ تجھ پر رحم کرے! کیوں دیوانی ہوئی جارہی ہے؟ محض ایک جنت نہیں کئی جنتیں ہیں۔ اور تیرا بیٹا تو جنت الفردوس میں ہے۔''[1]

ایک روایت میں ہے: «يَا أُمَّ حَارِثَةَ! إِنَّهَا جِنَانٌ فِي الْجَنَّةِ، وَ إِنَّ ابْنَكَ أَصَابَ الْفِرْدَوْسَ الْأَعْلٰى» ''اے ام حارثہ! حقیقت یہ ہے کہ جنت میں بہت سے باغات ہیں اور تیرا بیٹا تو فردوسِ بریں میں ہے۔''[2]

عوف بن حارث رضی اللہ عنہ کی شہادت: ابن اسحاق بیان کرتے ہیں کہ مجھے عاصم بن عمرو بن قتادہ نے بیان کیا کہ عفراء کے بیٹے عوف بن حارث نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے کون سے عمل پر مسکراتا ہے؟'' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «غَمْسَةُ يَدِهِ فِي الْعَدُوِّ حَاسِراً» ''جب بندہ بغیر زرہ پہنے دشمن سے ٹکرا جائے۔'' یہ سن کر عوف بن حارث رضی اللہ عنہ نے اپنی زرہ اتار پھینکی، اپنی تلوار پکڑی اور دشمن سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔[3]

معلوم ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا آخرت سے کتنا گہرا تعلق اور اللہ کی رضا حاصل کرنے

---

[1] صحيح البخاري، حديث:3982. [2] الأساس في السنة لسعيد حوّى:475/1. [3] صحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص:245، والمصنف لابن أبي شيبة:338/5. روایت منکر ہے۔

کی کتنی تمنا تھی۔ یہی وجہ تھی کہ عوف بن حارث رضی اللہ عنہ زرہ کے بغیر تیر کی طرح دشمن کی صفوں میں گھس گئے اور لڑتے لڑتے دشمنوں کا خون بہاتے رہے، بالآخر اللہ تعالیٰ نے انھیں شہادت کے رتبے سے سرفراز فرمایا۔

اسلامی معاشرے نے لوگوں کے خیالات تبدیل کر دیے تھے اور انھیں آخرت سے منسلک کر دیا تھا۔ اب وہ صرف رضائے الٰہی کے طلبگار بن گئے تھے جبکہ اس سے قبل ان کی خواہش صرف یہی تھی کہ ان کی بہادری کے قصے عورتوں کی زبان پر ہوں، ان کے قبیلے کا سرداران سے راضی ہو اور ان کی شجاعت و دلیری پر اشعار کہے جائیں۔[1]

سعد رضی اللہ عنہ کی بدر میں اور ان کے والد خیثمہ رضی اللہ عنہ کی احد میں شہادت: حافظ ابن حجر رحمہ اللہ موسیٰ بن عقبہ اور ابن شہاب رحمہما اللہ سے بیان فرماتے ہیں کہ بدر کے دن سعد رضی اللہ عنہ اور ان کے والد گرامی خیثمہ رضی اللہ عنہ نے بدر میں شریک ہونے کے لیے آپس میں قرعہ اندازی کی۔ قرعہ سعد کے نام نکلا۔ باپ نے کہا: ''اے میرے پیارے بیٹے! آج تو بدر میں شریک نہ ہو بلکہ میرے حق میں دستبردار ہو جا۔'' سعد رضی اللہ عنہ نے عرض کی: ''اے میرے ابا جان! اگر جنت کے علاوہ کوئی اور معاملہ ہوتا تو میں ضرور آپ کو ترجیح دیتا۔''

حضرت سعد رضی اللہ عنہ بدر میں شریک ہوئے اور شہادت سے سرفراز ہوئے۔ اس کے بعد ان کے والد خیثمہ رضی اللہ عنہ غزوۂ احد میں شریک ہوئے اور جام شہادت نوش فرمایا۔[2]

یہ قصہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے گھریلو حالات کی روشن مثال پیش کرتا ہے کہ ان کے گھروں میں اللہ کے راستے میں جہاد کرنے کی کس قدر رغبت اور مسابقت پائی جاتی تھی۔ سعد بن خیثمہ رضی اللہ عنہما اور ان کے والد گرامی دونوں اکٹھے بدر میں شریک نہ ہو سکتے تھے کیونکہ دونوں میں سے ایک کا گھر کی دیکھ بھال کے لیے گھر رہنا ضروری تھا۔ کوئی بھی دوسرے کے حق میں دستبردار ہونے کے لیے تیار نہ ہوا۔ نوبت قرعہ اندازی تک جا پہنچی، بالآخر یہ

---

1 التربية القيادية للدكتور الغضبان: 31/2. 2 الإصابة: 24,23/2، رقم: 3118.

سعادت بیٹے کے حصے میں آئی، حالانکہ وہ اپنے باپ کا غایت درجہ احترام کرتے تھے لیکن حصولِ جنت کے شوق نے انھیں یہ جواب دینے پر مجبور کردیا: ''ابا جان! اگر جنت کے علاوہ کوئی اور معاملہ ہوتا تو میں ضرور آپ کو ترجیح دیتا۔''[1]

عمیر بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی شہادت: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مقام بدر کی طرف روانہ ہونے لگے تو اسلامی لشکر کے شرکاء آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمیر بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو کم عمر ہونے کی بنا پر ساتھ لے جانے سے منع فرما دیا۔ حضرت عمیر رضی اللہ عنہ رونے لگے تو آپ نے اجازت مرحمت فرما دی اور اس کی تلوار کا پرتلا اپنے دست مبارک سے باندھا۔

عمیر رضی اللہ عنہ لشکر میں چھپنے کی کوشش کر رہے تھے مبادا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ ان پر نہ پڑ جائے۔ عمیر رضی اللہ عنہ کے بھائی سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے عمیر کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہونے سے پہلے چھپتے ہوئے دیکھا تو پوچھا: ''میرے بھائی! تمھیں کیا ہوا ہے؟'' تو اس نے کہا: ''میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر مجھے دیکھ لیا تو مجھے کم عمر خیال کر کے واپس نہ لوٹا دیں، جبکہ میں اللہ کی راہ میں نکلنا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے اللہ مجھے شہادت سے سرفراز فرما دے۔'' اور بالآخر عمیر رضی اللہ عنہ غزوۂ بدر میں شہید ہو گئے۔[2]

غنیمت اور قیدیوں کے بارے میں اختلاف

غنائم میں اختلاف اور سورۂ انفال کا نزول

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلے اور میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بدر میں شریک ہوا۔ مسلمانوں اور کفار کے مابین رزم آرائی

1 التاريخ الإسلامي للحميدي: 87/4. 2 السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 317، بحواله صفة الصفوة لابن الجوزي: 294/1، والمستدرك للحاكم: 188/3، والإصابة: 35/3.

ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے دشمن کو شکست سے دوچار کیا۔ لشکر کا ایک حصہ دشمن کو قتل کر کے شکست دینے میں مشغول تھا جبکہ ایک گروہ دشمن کے لشکریوں کو قابو میں لا کر قیدی بنا رہا تھا اور ایک جماعت رسول اللہ ﷺ کی نگرانی کر رہی تھی کہ کہیں دشمن اچانک آپ ﷺ کو نقصان نہ پہنچا دے۔ اسی اثنا میں رات چھا گئی اور تمام مسلمان شرکائے جنگ اکٹھے ہو گئے۔ ان میں سے غنیمتیں جمع کرنے والوں نے کہا: ”یہ ہم نے اکٹھی کی ہیں، لہٰذا ان پر ہمارے سوا کسی کا حق نہیں۔“ جو گروہ دشمن کی سرکوبی کرتے ہوئے اس کا پیچھا کر رہا تھا اس نے کہا: ”تم ہرگز ہم سے زیادہ حق دار نہیں ہو، ہم نے ہی تو دشمن کو غنیمت سے دور بھگایا اور اسے مات دی۔“ رسول اللہ ﷺ کی حفاظت پر مامور دستہ کہنے لگا: ”تم ہرگز ہم سے زیادہ حق نہیں رکھتے۔ آپ ﷺ کی حفاظت ہم نے کی اور ہم آپ ﷺ پر دشمن کے اچانک حملوں سے بچاؤ کے لیے حفاظت پر مامور تھے۔“ اس دوران قرآن پاک کی یہ آیت نازل ہوئی:

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۪ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○﴾

”(اے نبی!) وہ آپ سے مال غنیمت کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دیجیے: مال غنیمت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہے، لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور باہمی تعلقات درست کرو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اگر تم مومن ہو۔“ [1]

بعد ازاں آپ ﷺ نے غنیمتیں ہم میں برابر تقسیم فرما دیں۔ [2]

ایک حدیث میں اس طرح ہے کہ جب حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے سورۂ انفال کے متعلق پوچھا گیا تو وہ کہنے لگے: ”یہ آیات ہمارے، یعنی اصحاب بدر کے متعلق ہی اتری تھیں۔ جب ہم نے غنیمتوں کے متعلق اختلاف کیا اور اس میں اخلاقی پستی کا مظاہرہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ غنیمتیں ہم سے لے کر رسول اللہ ﷺ کے اختیار میں دے دیں، تب

[1] الأنفال 1:8. [2] مسند أحمد: 324/5، و تفسیر ابن کثیر: 283/2.

آپ ﷺ نے وہ غنیمتیں ہم میں برابر تقسیم فرمادیں۔[1]

سورۂ انفال میں غزوۂ بدر کا تذکرہ فرما کر اللہ تعالیٰ نے اسے دوام بخش دیا ہے۔ اس سورت میں یہ واقعہ اسباب و نتائج کے ساتھ مکمل طور پر مذکور ہے۔ آیات مبارکہ نے نفسِ انسانی کا علاج، گہرے ایمان پر اس کی تربیت اور بڑے لطیف انداز سے اس کی کردار سازی فرمائی ہے۔ مال غنیمت کا پایا جانا چونکہ جنگ کا نتیجہ ہے، لہٰذا اس کے متعلق احکام سے کلام کا آغاز کیا اور واضح فرما دیا کہ یہ غنیمتیں اللہ تعالیٰ اور رسولِ مکرم ﷺ کے لیے ہیں۔ ہر چیز کا مالک اللہ تعالیٰ ہے اور رسول اللہ ﷺ اس کے حکم کے تابع ہیں۔

بعدازاں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو تین احکام صادر فرمائے:

① تقویٰ

② باہمی جھگڑوں کی اصلاح

③ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت

جہاد کے موضوع سے متعلق یہ تینوں اہم ترین احکام ہیں کیونکہ جہاد کی بنیاد اگر تقویٰ پر نہیں تو جہاد، جہاد ہی نہیں۔ اسی طرح جہاد اتحاد و یگانگت کا متقاضی ہے، لہٰذا آپس کے جھگڑوں اور اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔ اور اسی طرح احکام اور قوانین کی پابندی جہاد کی روح اور اساس ہے۔ اس کے بغیر جہاد کا وجود ناممکن ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے واضح فرمادیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اتباع ہی ایمان کی علامت ہے۔

سورۂ انفال کے تناظر میں مومنوں کی صفات: اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں مومنوں کی بنیادی صفات کا تذکرہ بھی فرمایا ہے اور مومنوں کی ان صفات کا تذکرہ اور ان کی حد بندی یہ دونوں اسلامی جہاد کے باب میں بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ دراصل حقیقی ایمان ہی وہ بنیاد ہے جس پر جہادِ اسلامی کی عمارت استوار ہوسکتی ہے۔

[1] مسند أحمد: 322/5.

اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی صفات کی حد بندی کرتے ہوئے فرمایا ہے:

① مومن وہ ہیں جن کے پاس اللہ تعالیٰ کا تذکرہ ہو تو ان کے دل سہم جاتے ہیں، خوف زدہ ہوتے ہیں اور ان پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔

② مومنوں کی دوسری صفت یہ ہے کہ جب کلام الٰہی کی تلاوت ہوتی ہے تو ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔

③ مومنوں کی تیسری صفت توکل بیان کی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے امید نہیں لگاتے اور نہ ہی کسی کا قصد کرتے ہیں۔ اسی کی جناب میں پناہ ڈھونڈتے اور اسی سے اپنی ضروریات کا تقاضا کرتے ہیں۔ ان کی رغبت و چاہت بھی اسی سے ہے۔ وہ یہ بات خوب سمجھتے ہیں:

«مَاشَاءَ اللّٰہُ کَانَ وَ مَالَمْ یَشَأْ لَمْ یَکُنْ»

''جو اللہ تعالیٰ چاہے وہ ہوتا ہے اور جو نہ چاہے وہ ہرگز نہیں ہوتا۔''

اس کا حکم بلاشرکتِ غیرے مخلوق میں کارفرما ہے۔ اس کے فیصلے پر کوئی گرفت کرنے والا نہیں، وہ جلد حساب چکانے والا ہے۔

④ چوتھی صفت نماز قائم کرنا ہے۔ جو وقت کی پابندی کرتے ہوئے مکمل طہارت، وضو، تلاوت قرآن، رکوع و سجود، تشہد اور آپ ﷺ پر درود و سلام کے ساتھ ساتھ تمام امورِ نماز کو سنت کے عین مطابق ادا کرنے کا نام ہے۔

⑤ اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے رزق میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا تذکرہ بھی بطور صفت شامل ہے۔ اس میں زکاۃ کی ادائیگی اور بندوں کے تمام حقوق شامل ہیں، خواہ وہ مستحب ہوں یا واجب۔ ساری مخلوق خالق کی ہے، لہٰذا اس کے ہاں زیادہ پسندیدہ وہی ہے جو اس کی مخلوق کو سب سے زیادہ نفع پہنچائے۔

ان صفات کا تذکرہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان صفات کے حاملین کو حقیقی طور پر ایمان سے متصف قرار دیا ہے اور یہی ہیں جن کے لیے جنت میں اعلیٰ مقام اور درجات ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں کی قدر کرتا ہے اور کوتاہیوں سے صرفِ نظر فرماتا ہے۔

اس سورۂ مبارکہ نے اطاعت اور ایمان کامل کی اعلیٰ منازل تک رسائی کی دعوت دیتے ہوئے جہاد کے تمام لوازمات کو اختیار کرنے کے لیے ارادوں کو مہمیز لگائی ہے۔ اور غنیموں کے بارے میں اختلاف یا کسی بھی حکم کی ممانعت کے نتیجے میں حاصل ہونے والی رسوائی کے عوامل کی نفی کی ہے۔ اور اسی پر اس سورت کا مقدمہ اختتام پذیر ہوا ہے۔[1]

ارشاد ربانی ہے:

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ۭ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۠ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ○ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ○ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۭ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ○﴾

”(اے نبی!) وہ آپ سے مال غنیمت کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دیجیے: مال غنیمت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہے، لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور باہمی تعلقات درست کرو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اگر تم مومن ہو، (سچے) مومن تو صرف وہ لوگ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب ان پر اس کی آیتوں کی تلاوت کی جائے تو وہ ان کا ایمان بڑھا دیتی ہیں اور وہ اپنے رب ہی پر توکل کرتے ہیں، وہ لوگ جو نماز قائم کرتے

[1] الأساس في التفسير لسعيد حوّى: 2114,2113/4.

ہیں اور ہم نے انھیں جو رزق دیا ہے اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں، یہی لوگ سچے مومن ہیں، ان کے لیے اپنے رب کے ہاں درجے ہیں اور بخشش ہے اور باعزت رزق ہے۔‘‘ [1]

سورۂ مبارکہ کے آغاز میں غنیمتوں کا تذکرہ، ان کی تقسیم میں باہمی اختلاف اور انھی کے بارے میں صحابہ کے سوال کا ذکر ہے۔ اس سیاق کی مسلسل چار آیات نے مومنوں کو اس اختلاف سے بھی پاک کردیا ہے جو دولت کی محبت و چاہت اور دیگر مادی اشیا پر نظر رکھنے سے دل میں پیدا ہوجاتا ہے۔ [2]

اہل ایمان کی زندگیوں میں باہمی اتفاق و اتحاد کی اہمیت کے پیش نظر اسی بات سے سورت کی ابتدا ہوئی ہے وگرنہ یہ مسئلہ بدر کی طرف نکلنے اور کفار سے قتال کے بعد پیش آیا تھا۔ قرآن مجید کا اسلوب یہ ہے کہ اس میں واقعات و حقائق کو بیان کرنے کے لیے ان کی زمانی ترتیب کو پیش نظر نہیں رکھا گیا بلکہ اہمیت اور ضرورت کے تحت ان میں تقدیم و تاخیر کی گئی ہے۔ [3]

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ ﴾ ’’اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔‘‘ اس موقع پر پہلی اطاعت تو یہی تھی کہ غنیمتوں کے معاملے میں اللہ کے فیصلے کے سامنے سر جھکایا جائے۔ اس فیصلے کی رو سے غنیمتیں مجاہدین کے قبضے سے باہر ہوگئیں۔ اور ان کی ملکیت ابتدائی طور پر اللہ اور پھر اس کے رسول کے لیے ثابت ہوگئی اور ان میں تصرف کا حق اللہ اور اس کے رسول کو حاصل ہوگیا۔ مومنوں کے ہاں اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں کہ وہ اللہ کے حکم اور رسول اکرم ﷺ کی تقسیم کو خوش دلی سے تسلیم کریں، باہمی تعلقات کی اصلاح کریں اور ایک دوسرے کے جذبات کا خیال رکھیں اور اپنے دلوں میں

[1] الأنفال 8:1-4. [2] من هدي سورة الأنفال لمحمد أمين المصري، ص: 67. [3] من هدي سورة الأنفال لمحمد أمين المصري، ص: 68,67.

ایک دوسرے کا احترام اور مقام و مرتبہ بڑھائیں۔[1]

یہ اندازِ ربانی اس حقیقت کو واضح کر رہا ہے کہ مشرکوں پر فتح سے بھی اہم چیز آپس میں اختلافات اور جھگڑے ختم کرنا ہے۔ اسی طرح دل میں پیدا ہونے والے خیالات و رجحانات پر کنٹرول حاصل کرنا اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں گراں تر ہے۔ بے فائدہ ہے ایسی فتح جس کے نتیجے میں وحدت پارہ پارہ ہو جائے اور دل جدا جدا ہو جائیں۔ آیاتِ مبارکہ نے یہ بات واضح فرمادی ہے کہ ایمان و تقویٰ کو ایک مسلمان کی مکمل زندگی میں کارفرما رہنا چاہیے۔ یہیں سے زندگی کی شاہراہ پر کامیابی کی تحریکیں اٹھتی اور دین کی سربلندی کے لیے جہاد کی راہیں پھوٹتی ہیں۔[2]

صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس ربانی نصیحت و رہنمائی پر لبیک کہا اور ساتھ ہی رسول ﷺ کو تقسیمِ غنیمت کا طریقہ کار بتا دیا گیا۔ جب یہ طے پا چکا کہ غنائم اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کا حق ہیں تو ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے ان کی تقسیم کا طریقہ اور مدات واضح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿وَاعْلَمُوٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾

''اور (اے مسلمانو!) جان لو کہ تم جو کچھ بھی مال غنیمت حاصل کرو، اس میں سے پانچواں حصہ یقیناً اللہ کے لیے ہے اور رسول کے لیے اور (آپ ﷺ کے) رشتے داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔ اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو اور اس پر جو ہم نے اپنے بندے پر فیصلے کے دن اتارا جس دن دو فوجوں میں ٹکراؤ ہوا تھا اور اللہ ہر چیز پر خوب قدرت رکھتا ہے۔''[3]

1 تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب: 3/1473، 1474. 2 المنهج التربوي للسيرة النبوية للدكتور الغضبان: 1/52. 3 الأنفال 8:41.

یہ ربانی توجیہ تب نازل ہوئی جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دل علام الغیوب کی اطاعت و فرماں برداری قبول کر چکے تھے اور ان میں خالصتاً اللہ تعالیٰ کی عبودیت کا جذبہ بھر گیا تھا۔ غنیمتوں کے متعلق صاف صاف بتا دیا گیا کہ پانچ میں سے چار حصے تمھارے ہیں اور پانچواں حصہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے۔ اور یہ پانچواں حصہ بھی بالآخر تمھیں لوٹا دیا جائے گا۔ اور آیت میں مذکورہ اقسام و اصناف میں اسے تقسیم کیا جائے گا، جیسا کہ اس کی مکمل تفصیل حدیث میں مذکور ہے۔

غنیمتوں کے متعلق سوال کے جواب کو فوراً نازل نہیں کیا گیا بلکہ اسے مؤخر کیا گیا۔ اس میں اس تربیتی پہلو کی طرف اشارہ ہے کہ شرعی احکام کے لیے پہلے مناسب روحی و قلبی فضا پیدا کرنا ضروری ہے تاکہ یہ احکام عقل و ضمیر میں مناسب مقام پا کر جاگزیں ہوسکیں اور ان کا عمدہ نتیجہ حاصل ہو۔

اللہ تعالیٰ نے اولاً مسلمانوں کی عبادت کو تعلق بالغیر سے پھیرا اور ثانیاً مال غنیمت کے ساتھ تعلق سے پھیرا تاکہ یہ لوگ مخلص بن کر اس کی مدد و حمایت اور مکمل نعمت کے حقدار بن جائیں، پھر جب وہ صرف اپنے خالق کے ہوگئے اور جہاد میں اخلاص سے کام لیا تو اس نے انھیں اپنی خاص مدد سے نوازا اور ان کی چاہت سے بڑھ کر ان پر اپنا فضل فرمایا۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اور غنائم کی تقسیم

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں کہ بدر کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم 315 رفقاء کے ہمراہ نکلے اور مقام بدر پر پہنچ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی: «اَللّٰهُمَّ! إِنَّهُمْ حُفَاةٌ فَاحْمِلْهُمْ، اَللّٰهُمَّ! إِنَّهُمْ عُرَاةٌ فَاكْسُهُمْ اَللّٰهُمَّ! إِنَّهُمْ جِيَاعٌ فَأَشْبِعْهُمْ» ”اے میرے اللہ!

1 صور و عبر من الجهاد النبوي في المدينة للدكتور فوزي فيض الله، ص:62,61.

یہ ننگے پاؤں (پیادہ) ہیں تو انھیں سوار فرما، یہ ننگے جسم ہیں تو انھیں پہنا۔ یہ بھوکے ہیں تو انھیں سیر فرما۔'' تو اللہ تعالیٰ نے بدر کے دن فتح عطا کی، لہٰذا جب لوٹے تو ہر کسی کے پاس ایک یا دو اونٹ تھے اور سب نے پہن لیا اور سیر ہو گئے۔''[1]

عدلِ رسول ﷺ کی ایک زندہ مثال یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ نے غنیمتوں میں انھیں بھی شریک رکھا جنھیں آپ ﷺ نے جنگ کے علاوہ کوئی اہم کام سونپ رکھا تھا، لہٰذا انھیں غنیمت واجر میں برابر شریک قرار دیا، گویا کہ وہ جنگ میں حاضر ہی تھے۔[2]

رسول اللہ ﷺ نے ان مجاہدین کی مجبوریوں کا مکمل خیال رکھا جو جنگ میں شرکت سے معذور تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسانی طاقت سے بڑھ کر اپنے بندوں کو مکلّف ہی نہیں ٹھہرایا۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾

''اللہ کسی کو اس کی طاقت سے بڑھ کر مکلّف نہیں ٹھہراتا۔''[3]

جنگ ہو یا امن رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام کو ان کی استطاعت سے بڑھ کر کوئی حکم نہ دیتے۔ جنگ بدر کے موقع پر بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ناگزیر گھریلو مجبوریاں تھیں آپ ﷺ نے انھیں جنگ میں شرکت سے معذور قرار دیا۔ جیسا کہ حضرت عثمان کی زوجہ محترمہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا مریضہ تھیں۔ ان کی تیمار داری کے لیے آپ ﷺ نے انھیں رخصت مرحمت فرما دی۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت بیان کی ہے جس میں انھوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے غزوۂ بدر سے غیر حاضر رہنے کا سبب ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے عقد میں رسول گرامی ﷺ کی لختِ جگر تھیں جو اس موقع پر بیمار تھیں، لہٰذا آپ ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

«إِنَّ لَكَ أَجْرَ رَجُلٍ مِّمَّنْ شَهِدَ بَدْرًا وَّ سَهْمَهُ»

[1] سنن أبي داود، حديث:2747. [2] من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 215. [3] البقرة 2:286.

”تمھارے لیے بدر میں شریک ہونے والے کے برابر اجر اور غنیمت کا حصہ ہے۔“ [1]

اسی طرح آپ ﷺ نے حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کو اپنی والدہ کے پاس رہنے کی اجازت دی جو بیمار تھیں اور انھیں بیٹے کی طرف سے دیکھ بھال کی ضرورت تھی۔ ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو بدر کی طرف نکلنے کی اطلاع دی تو خود ابوامامہ رضی اللہ عنہ نے بھی آپ ﷺ کے ساتھ نکلنے کا پورا عزم کیا۔ انھیں ان کے ماموں جان ابوبردہ بن نیار رضی اللہ عنہ نے کہا: ”میرے بھانجے! یہاں رہ کر اپنی والدہ کی خبر گیری کرو۔“ ابوامامہ نے کہا: ”بلکہ آپ اپنی بہن کا خیال رکھیں۔“ جب یہ معاملہ آپ ﷺ کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ ﷺ نے ابوامامہ کو اپنی والدہ کے پاس رہنے کا حکم دیا۔ جب آپ ﷺ واپس تشریف لائے تو وہ فوت ہو چکی تھیں، چنانچہ آپ ﷺ نے ان کی نماز جنازہ ادا کی۔ [2]

اخلاقِ عالیہ کا یہ مظاہرہ اور مجاہدین کے احساسات اور خاندانی معاملات کا خیال رکھنا لشکر اور سپہ سالار کے مابین تعلق کو مضبوط کر دیتا ہے اور ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھنے کا موقع فراہم کرتا ہے، جس کا آپ ﷺ نے مکمل پاس رکھا۔

علاوہ ازیں درج ذیل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو خاص مجبوری، کسی اہم معاملے یا راستے میں پیش آمدہ مشکلات کے باعث واپس بھیج دیا گیا:

① ابولبابہ رضی اللہ عنہ: انھیں آپ ﷺ نے مدینہ منورہ پر اپنا نائب مقرر فرمایا تھا۔

② عاصم بن عدی رضی اللہ عنہ: مدینہ منورہ میں عوالی کے علاقے کے مسکینوں کی ضرورت کے پیش نظر انھیں رسول اللہ ﷺ نے ان کی طرف روانہ فرمایا۔

③ حارث بن حاطب رضی اللہ عنہ: کسی ضروری کام کے لیے بنو عمرو بن عوف کی طرف بھیجا۔

④ حارث بن صِمّہ رضی اللہ عنہ: راستے میں گرنے کی وجہ سے ہڈی ٹوٹ گئی، لہٰذا انھیں واپس بھیج دیا گیا۔

[1] صحیح البخاري، حدیث: 3699. [2] المعجم الکبیر للطبراني: 273,272/1، حدیث: 792، و مجمع الزوائد: 32,31/3.

⑤ خوّات بن جبیر رضی اللہ عنہ: دوران سفران کی پنڈلی پر پتھر لگنے سے زخم آ گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صفراء کے مقام سے انھیں واپس بھیج دیا۔[1]

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہداء کے ورثا اور اقارب کو غنیمت میں سے حصہ دیا، گویا تقریباً 1400 سال سے شہداء کی عزت افزائی، ان کی اولاد اور خاندانوں کی نگرانی اور حفاظت صرف اسلام کا طرۂ امتیاز ہے۔[2]

غزوۂ بدر کے قیدی

قیدیوں کے بارے میں مشورہ اور حکمِ الٰہی: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ذکر کرتے ہیں کہ جب قیدی قید کر لیے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے دریافت فرمایا:

«مَا تَرَوْنَ فِي هٰؤُلَاءِ الْأُسَارٰی؟»

''ان قیدیوں کے متعلق تمھاری کیا رائے ہے؟''

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اے اللہ کے نبی! یہ برادری کے لوگ اور خاندان والے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان سے فدیہ لے کر انھیں رہا کر دیں جس سے ہمیں کافروں پر قوت حاصل ہو۔ شاید انھیں اللہ تعالیٰ اسلام کی ہدایت بھی دے دے۔'' اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَا تَرٰی یَا ابْنَ الْخَطَّابِ؟!»

''ابن خطاب! تمھاری کیا رائے ہے؟''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''میں نے عرض کیا: ''نہیں، اللہ کی قسم! میری وہ رائے نہیں جو ابوبکر کی ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ آپ انھیں ہمارے حوالے کر دیں ہم ان کی گردنیں مار دیں۔ عقیل کو حضرت علی کے حوالے کیجیے وہ اس کی گردن ماریں اور میرا فلاں عزیز مجھے

[1] من معین السیرة لصالح الشامي، ص: 215. [2] السیرة النبویة لأبي شهبة: 2/176.

دیجیے۔ میں اسے قتل کروں۔ یہ کفر کے سرغنے اور سردار ہیں۔'' لیکن آپ ﷺ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے کی طرف مائل ہو گئے اور میری رائے پسند نہ فرمائی۔''

دوسرے دن میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا کہ آپ ﷺ اور ابوبکر دونوں بیٹھے رو رہے تھے۔ میں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! آپ ﷺ اور آپ کے دوست کس بنا پر رو رہے ہیں؟ آپ دونوں کے رونے کی وجہ سے اگر مجھے بھی رونا آئے گا تو رولوں گا، ورنہ کم از کم رونے جیسی صورت تو بنالوں گا۔'' آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَبْكِي لِلَّذِي عَرَضَ عَلَيَّ أَصْحَابُكَ مِنْ أَخْذِهِمُ الْفِدَاءَ، لَقَدْ عُرِضَ عَلَيَّ عَذَابُهُمْ أَدْنٰى مِنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ»

''میں اس واقعے پر رو رہا ہوں جو تمھارے ساتھیوں کے مشورے پر قیدیوں کا فدیہ لینے کی وجہ سے پیش آیا۔ (آپ ﷺ نے ایک قریبی درخت کی طرف اشارہ کر کے فرمایا:) میرے سامنے ان کا عذاب اس درخت سے بھی زیادہ نزدیک لایا گیا۔''

پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری:

﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ۭ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ڰ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○ فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ڮ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○﴾

''کسی نبی کے لائق نہیں کہ اس کے پاس قیدی ہوں یہاں تک کہ وہ زمین میں خوب خون ریزی (انھیں قتل) کرے۔ (مسلمانو!) تم سامان دنیا چاہتے ہو اور اللہ (تمھاری) آخرت چاہتا ہے اور اللہ زبردست، خوب حکمت والا ہے، اگر اللہ کی طرف سے پہلے ہی (ایک بات) لکھی ہوئی نہ ہوتی تو تم نے (بدر کے قیدیوں سے) جو (فدیہ) لیا اس کے بدلے تمھیں بڑا عذاب آ پکڑتا، پھر جو حلال، پاکیزہ

غنیمت تم نے حاصل کی ہے اس میں سے کھاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔"[1]

لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے غنیمت حلال کر دی۔[2]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ بدر کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیدیوں کے متعلق دریافت فرمایا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! آپ ہی کی قوم اور آپ ہی کے اہل ہیں۔ ان کو باقی رکھیے اور مہلت دیجیے، کیا عجب اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول کر لے!" اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! انھوں نے آپ کو نکال باہر کیا اور آپ کی تکذیب کی۔ ان کی گردنیں اڑا دیجیے۔" حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے: "اے اللہ کے رسول! وافر ایندھن والی وادی دیکھیے پھر انھیں اس میں داخل کر کے آگ لگا دیجیے۔" عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: "آپ نے تو قطع رحمی والی بات کی ہے!" اس دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے اور انھیں کوئی جواب نہ دیا۔ کچھ لوگ کہنے لگے: "آپ صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر کی رائے اختیار فرمائیں گے۔" کچھ نے کہا: "عمر رضی اللہ عنہ کی رائے لیں گے۔" کسی نے کہا: "عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کی بات مانیں گے۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اور فرمایا:

«إِنَّ اللّٰهَ لَيُلَيِّنُ قُلُوبَ رِجَالٍ فِيهِ حَتّٰى تَكُونَ أَلْيَنَ مِنَ اللَّبَنِ، وَ إِنَّ اللّٰهَ لَيَشُدُّ قُلُوبَ رِجَالٍ فِيهِ حَتّٰى تَكُونَ أَشَدَّ مِنَ الْحِجَارَةِ، وَ إِنَّ مَثَلَكَ يَا أَبَا بَكْرٍ، كَمَثَلِ إِبْرَاهِيمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ، إِذْ قَالَ: ﴿فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ وَمَثَلَكَ يَا أَبَا بَكْرٍ كَمَثَلِ عِيسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ، إِذْ قَالَ: ﴿اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ وَإِنَّ مَثَلَكَ يَا عُمَرُ كَمَثَلِ نُوحٍ عَلَيْهِ

1 الأنفال8:67-69. 2 صحيح مسلم، حديث:1763، و سنن أبي داود، حديث:2690.

السَّلَامُ، إِذْ قَالَ: ﴿رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝﴾ وَإِنَّ مَثَلَكَ يَا عُمَرُ! كَمَثَلِ مُوسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ، إِذْ قَالَ: ﴿رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ۝﴾

''اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کے دلوں کو اتنا نرم کر دیتا ہے حتی کہ وہ دودھ سے بھی زیادہ نرم ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بعض کے دلوں کو اتنا سخت کر دیتا ہے یہاں تک کہ وہ پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو جاتے ہیں۔ ابوبکر! تمھاری مثال ابراہیم علیہ السلام کی سی ہے۔ انھوں نے کہا تھا: ''پس جو کوئی میری پیروی کرے تو تحقیق وہ مجھ سے ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو تو بخشنے والا مہربان ہے۔''[1] اور تمھاری مثال اے ابوبکر! عیسیٰ علیہ السلام جیسی ہے، جب انھوں نے کہا تھا: ''اگر تو انھیں عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو ان کو بخش دے تو یقیناً تُو غالب، حکمت والا ہے۔''[2] اور تمھاری مثال اے عمر! نوح علیہ السلام جیسی ہے۔ انھوں نے کہا تھا: ''اے میرے رب! زمین پر بسنے والا کافروں میں سے کوئی نہ چھوڑ۔''[3] اور تمھاری مثال اے عمر! حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سی ہے جب انھوں نے کہا: ''اے ہمارے رب! مٹا دے ان کے مال اور ان کے دلوں کو سخت کر دے پس اس وقت تک ایمان نہ لائیں جب تک تکلیف دینے والا عذاب نہ دیکھیں۔''[4]

پھر فرمایا: «أَنْتُمْ عَالَةٌ، فَلَا يَنْفَلِتَنَّ مِنْهُمْ أَحَدٌ إِلَّا بِفِدَاءٍ، أَوْ ضَرْبَةِ عُنُقٍ»

''تم اس وقت کنگال ہو، تمھیں ضرورت ہے، لہٰذا ان میں سے کوئی بھی ہرگز بلا فدیہ رہا نہ ہو یا پھر اس کی گردن ماری جائے۔''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! سہیل بن

[1] إبراهيم 36:14. [2] المآئدة 118:5. [3] نوح 26:71. [4] يونس 88:10.

بیضاء کو اس سے مستثنیٰ کرلیا جائے۔ میں نے اسے اسلام کا تذکرہ کرتے سنا ہے۔'' (یہ سن کر) آپ ﷺ خاموش ہوگئے۔ ابن مسعود کہتے ہیں: ''اس دن سے زیادہ مجھے اپنے اوپر آسمان سے پتھر گرائے جانے کا کبھی ڈر نہیں لگا۔'' یہاں تک کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ٹھیک ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمادی:

﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ ؕ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝﴾

''کسی نبی کے لائق نہیں کہ اس کے پاس قیدی ہوں یہاں تک کہ وہ زمین میں خوب خون ریزی (انھیں قتل) کرے۔ (مسلمانو!) تم سامان دنیا چاہتے ہو اور اللہ (تمھاری) آخرت چاہتا ہے اور اللہ زبردست، خوب حکمت والا ہے۔''[1]

یہ آیت مبارکہ حکومت سازی کا ایک اہم ترین قاعدہ فراہم کررہی ہے۔ جب حکومت ابھی ابتدائی اور اساسی مراحل میں ہو اور وہ خواہ کتنی ضرورت مند کیوں نہ ہو اسے ایسا نرم پہلو نہیں رکھنا چاہیے کہ دشمن اسے مرعوب کرسکیں۔ اس آیت میں اس قاعدہ کلیہ کی جزئیات تک بیان کردی گئی ہیں۔[2]

جب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے مشرکین کو قیدی بنانا شروع کیا تو حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو یہ بات ناگوار گزری۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے چہرے پر ناگواری کے اثرات دیکھے تو فرمایا: «وَاللّٰهِ! لَكَأَنَّكَ يَا سَعْدُ! تَكْرَهُ مَا يَصْنَعُ الْقَوْمُ؟»

''اے سعد! لوگوں کا یہ عمل شاید تمھیں اچھا محسوس نہیں ہورہا؟''

عرض کیا: ''اللہ کی قسم! ایسا ہی ہے۔ اے اللہ کے رسول! اہل شرک پر (غلبے کا) اللہ تعالیٰ نے پہلا موقع عطا کیا ہے، لہٰذا میرے نزدیک مشرکین کو زندہ رکھنے کے

1 الأنفال 8:67. مسند أحمد: 384,383/1، و تفسیر ابن کثیر: 325/2، و جامع الترمذي، حدیث: 1714 و 3084. اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔ 2 من معین السیرة لصالح الشامي، ص: 209.

بجائے انھیں قتل کرنا زیادہ پسندیدہ ہے۔''[1]

مطعم بن عدی کی پناہ کی پاسداری: رسول اللہ ﷺ نے اسیرانِ بدر کے متعلق فرمایا:

«لَوْ كَانَ مُطْعِمُ بْنُ عَدِيٍّ حَيًّا، ثُمَّ كَلَّمَنِي فِي هٰؤُلَاءِ النَّتْنٰى لَأَطْلَقْتُهُمْ لَهُ»

''اگر مطعم بن عدی زندہ ہوتا اور ان بدبودار لوگوں کی رہائی کے لیے مجھ سے سفارش کرتا تو میں اس کی خاطر انھیں چھوڑ دیتا۔''[2]

یہ حدیث احسان کے اعتراف اور وفاداری کی اعلیٰ مثال پیش کرتی ہے۔ مطعم بن عدی وہ شخص تھا جس نے کئی ایک موقعوں پر قابل تحسین موقف اپنایا تھا۔ طائف سے واپسی پر آپ ﷺ اسی کی پناہ میں مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔ بنو ہاشم اور مسلمانوں کے خلاف قریش نے جو معاہدہ کیا تھا اسے توڑنے کے لیے بھی اس نے سخت موقف اختیار کیا تھا۔[3]

ایسے معاملات لوگوں کے ساتھ وفا کی اعلیٰ مثال قائم کرنے پر دلالت کرتے ہیں، خواہ وہ مشرک ہی کیوں نہ ہوں۔[4]

عقبہ بن ابی معیط اور نضر بن حارث کا قتل

جہاں مطعم بن عدی جیسے شخص کے ساتھ وفا کا یہ انداز اپنایا گیا وہاں عقبہ اور نضر جیسے فتنہ پردازوں اور جنگی مجرموں سے احتیاط بھی از حد لازمی تھی۔ یہ دونوں اسلام کے خلاف جنگ کی آگ بھڑکانے والوں اور مسلمانوں پر مصائب و آلام کے پہاڑ توڑنے والے

1 السيرة النبوية لابن هشام:281,280/2، و المنهج التربوي للسيرة النبوية للدكتور الغضبان: 141/1. 2 صحيح البخاري، حديث:4024، و سنن أبي داود، حديث:2689. 3 من معين السيرة لصالح الشامي، ص:208. 4 التربية القيادية للدكتور الغضبان:54/3.

سرغنوں میں سے تھے۔ ان دونوں کا باقی رہنا اسلام کے خلاف ریشہ دوانیوں کو جاری رہنے دینے کے مترادف تھا۔ خاص طور پر ان حالات میں جب اسلامی دعوت پُرخطر حالات سے گزر رہی تھی، اگر ان دونوں کو آزاد چھوڑ دیا جاتا تو یہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مکارانہ رویہ اختیار کرنے سے بالکل گریز نہ کرتے۔ دعوت اسلام ان ایام میں جس انداز سے جاری وساری تھی مصلحت کا تقاضا تھا کہ انھیں راستے سے دور ہٹا دیا جائے۔ [1]

عقبہ بن ابی معیط نے اپنے متعلق قتل کا فیصلہ سنا تو کہنے لگا: ''میرے لیے تباہی ہو، اے گروہ قریش! ان موجود لوگوں میں سے مجھے ہی کیوں قتل کیا جا رہا ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: «لِعَدَاوَتِكَ لِلّٰهِ وَلِرَسُولِهِ» ''اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے تیری عداوت اور دشمنی کی بنا پر۔'' اس نے کہا: ''مجھ پر آپ کا احسان بہتر ہوگا۔ مجھے بھی میری قوم کا ایک فرد سمجھیے۔ اگر ان کو قتل کریں تو مجھے بھی قتل کر دینا اور اگر ان پر احسان کریں تو مجھ پر بھی احسان کر دینا۔ اگر ان سے فدیہ قبول کریں تو مجھے بھی ان جیسا شمار کریں۔ اے محمد ﷺ! میرے بچوں کے لیے کون ہوگا؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: «اَلنَّارُ، قَدِّمْهُ يَا عَاصِمُ! فَاضْرِبْ عُنُقَهُ» ''آگ ہوگی، عاصم! اسے آگے کرو اور اس کی گردن مار دو۔'' [2]

عاصم رضی اللہ عنہ نے اسے آگے کیا اور اس کی گردن اڑا دی۔ [3]

نضر بن حارث قریش کے سرکشوں اور شیاطین میں سے تھا۔ رسول اللہ ﷺ کو رنج پہنچانا اور علمِ عداوت بلند رکھنا اس کا شیوہ تھا۔ یہ حیرہ کے علاقے میں سے ایرانی حکمرانوں کے قصے اور رستم واسفند یار کی کہانیاں یاد کر آیا، لہٰذا جس جگہ بھی آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی یاد دلانے کی مجلس کا اہتمام فرماتے اور اپنی قوم کو سابقہ امم پر اللہ تعالیٰ کے غضب کی بنا پر عذاب سے ڈراتے تو جب آپ ﷺ وہاں سے تشریف لے جاتے یہ اسی جگہ پہنچ جاتا اور

[1] غزوۃ بدر الکبریٰ لأحمد باشمیل، ص: 162. [2] مجمع الزوائد: 89/6، والمستدرك للحاکم: 124/2. [3] التربیة القیادیة للدکتور الغضبان: 60/3.

کہتا: ''اے قریشیو! اللہ کی قسم! میں اس شخص سے بہتر بات کر سکتا ہوں۔ میرے قریب آؤ میں اس سے اچھی بات سناتا ہوں۔'' اور پھر ایرانی حکمرانوں رستم و اسفندیار کے بارے میں باتیں شروع کر دیتا۔ بعدازاں کہتا: ''محمد (ﷺ) کی باتیں میری باتوں سے بھلا کس بنا پر اچھی ہو سکتی ہیں؟''[1]

یہ اللہ تعالیٰ پر غرور و تکبر کرنے والا شخص، اللہ تعالیٰ کے متعلق قسمیں اٹھانے والا، جس کا گمان یہاں تک پہنچا ہوا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب سے بہتر لائے گا۔ اس کے جی کا خیال تھا کہ اس کا کلام محمد (ﷺ) کے کلام سے بہتر ہے۔ جو شخص اس طرح کے خیالات و نظریات کا حامل ہو اور اب رسول اللہ ﷺ کے سامنے موجود ہو، اس سے بدلہ لینا رسول اللہ ﷺ کے لیے ضروری ٹھہرتا ہے۔ اس بنا پر آپ ﷺ نے اسے ان قیدیوں میں شمار نہیں فرمایا جن کے بارے میں مشورہ ہو رہا تھا۔[2]

آپ ﷺ نے اس کے قتل کا حکم جاری فرمایا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے قتل کر دیا۔[3]

ان دونوں مجرموں کے قتل سے مسلمان یہ بات اچھی طرح سمجھ گئے کہ ایسے سرکشوں کے ساتھ نرمی کا کوئی جواز نہیں۔ یہ شر کے محافظ اور گمراہی کے سرغنے ہیں۔ ان کے ساتھ شفقت اور نرمی کا کوئی پہلو روا نہیں۔ یہ اپنی بے ہودہ سرگرمیوں کی وجہ سے معافی اور درگزر کی تمام حدود پار کر چکے ہیں۔ یہ دونوں ساری مخلوق میں سب سے زیادہ بدطینت، کفر و عناد اور بغاوت میں حد سے بڑھے ہوئے اور اسلام اور مسلمانوں کی ہجو اور مذمت میں پیش پیش تھے۔[4]

قیدیوں سے حسنِ سلوک کی وصیت اور فدیہ

قیدیوں کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا سلوک رحمت، عدل، احتیاط اور دعوتی مقاصد کے

1 السيرة النبوية لابن هشام:440,439/1. 2 التربية القيادية للدكتور الغضبان:57/3. 3 السيرة النبوية لابن هشام:255/2. 4 البداية والنهاية:306/3.

مرہون منت تھا۔ اسی بنا پر آپ ﷺ نے اس بارے میں مختلف انداز اختیار فرمائے۔ کچھ کو قتل کیا، کچھ سے فدیہ قبول کیا۔ کسی کو احسان کا مستحق گردانا اور بعض قیدیوں پر احسان کرتے ہوئے مسلمانوں کے دس، دس بچوں کو تعلیم دینے کی شرط عائد فرمائی۔[1]

رسول اللہ ﷺ جب بدر سے مدینہ منورہ واپس پہنچ گئے تو آپ ﷺ نے قیدیوں کو صحابہ کرام میں تقسیم کردیا اور ساتھ ہی فرمایا: «اِسْتَوْصُوا بِهِمْ خَيْرًا» ''ان کے متعلق بھلائی کی وصیت قبول کرو!''[2]

یہ نبوی نصیحت قرآن کے ان الفاظ کی عکاسی کرتی ہے:

﴿وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا﴾

''اور وہ کھانا، اس کی محبت کے باوجود، مسکینوں اور یتیموں اور قیدیوں کو کھلاتے ہیں۔''[3]

مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے بھائی ابوعزیز بن عمیر رضی اللہ عنہ اپنا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے ہیں: ''میں بدر کے قیدیوں میں سے تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «اِسْتَوْصُوا بِالْأُسَارَىٰ خَيْرًا» ''قیدیوں کے ساتھ بھلائی اختیار کرنے کے بارے میں میری وصیت قبول کرو۔'' میں انصار کے ایک گروہ کی قید میں تھا، وہ جب صبح و شام کھانا پیش کرتے تو خود کھجور کھاتے مگر مجھے گندم (کی روٹی) دیتے کیونکہ قیدیوں کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے وصیت فرمائی تھی۔''[4]

ایک اور قیدی ابوالعاص بن ربیع بیان کرتے ہیں: ''میں انصار کے ایک گروہ میں تھا، اللہ تعالیٰ انھیں بہتر بدلہ عطا فرمائے۔ صبح یا شام جب بھی کھانا کھاتے وہ مجھے روٹی دیتے خود کھجور کھاتے جبکہ روٹی بہت کم پائی جاتی تھی اور مدینہ میں عموماً کھجور ہی میسر ہوتی تھی۔

1 التربية القيادية للدكتور الغضبان:74/3. 2 البداية والنهاية:307/3. 3 الدهر76:8. 4 المعجم الصغير للطبراني، حديث:401، والمعجم الكبير للطبراني:393/22، و تاريخ الطبري:460/2، و مجمع الزوائد:86/6.

بلکہ کبھی کبھار ایسا بھی ہوا کہ کسی کے حصے میں روٹی کا ٹکڑا آگیا تو اس نے وہ بھی مجھے عطا کردیا۔

ولید بن ولید بن مغیرہ بھی بدر کے قیدیوں میں سے تھے۔ ان کا بیان بھی اس سے ملتا جلتا ہے۔ مزید ان کا کہنا ہے کہ جن کے پاس ہمیں بطور قیدی رکھا گیا تھا وہ خود پیدل چلتے اور ہمیں سواری کی سہولت فراہم کرتے۔[1]

یہ کریمانہ خلق تھا جس کی بنیاد قرآن نے مسلمانوں کی تعریف کرتے ہوئے رکھی اور آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اسی کی تذکیر کی اور انھوں نے اسی خلق کو اپنالیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قیدی سرداروں کی اکثریت بہت جلد حلقہ بگوشِ اسلام ہوگئی، مثلاً: ابوعزیز بن عمیر رضی اللہ عنہ قیدیوں کے بارے میں آپ ﷺ کی وصیت کا نفاذ دیکھ کر قیدیوں کے مدینہ منورہ پہنچنے کے کچھ عرصہ بعد ہی اسلام کی دولت سے مالا مال ہوگئے اور ان کے ساتھ ہی سائب بن عبید رضی اللہ عنہ اپنا فدیہ دینے کے بعد مسلمان ہوگئے۔[2]

جب قیدی اپنے اپنے شہروں اور گھروں کو واپس آئے تو اسلام کی دعوت ان کے قلوب میں سرایت اور اذہان پر اثر انداز ہوچکی تھی، لہٰذا رسول اللہ ﷺ کی اعلیٰ سیرت، بلند اخلاق، محبت اور کرم نوازی کا تذکرہ اور آپ ﷺ کی دعوت اور اس میں پائی جانے والی صفات، مثلاً: نیکی، تقویٰ، اصلاحِ عامہ اور بھلائی ان سب کے ذکر سے وہ رطب اللسان رہنے لگے۔[3]

قیدیوں کے ساتھ یہ مشفقانہ سلوک اسلام کی اخلاقی برتری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اسلام کے دشمن بھی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے عمدہ سلوک سے کیسے متاثر ہوئے۔ یہ سلوک پیار و محبت کا بہترین عکس تھا۔[4]

---

[1] المغازي للواقدي: 119/1. [2] محمد رسول اللهﷺ لصادق عرجون: 474/3. [3] محمد رسول اللهﷺ لصادق عرجون: 474/3. [4] التاريخ الإسلامي للحميدي: 175/4، 176.

رسول اللہ ﷺ کے چچا عباس رضی اللہ عنہ کا فدیہ

قریش نے اپنے قیدیوں کا فدیہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں روانہ کیا۔ ہر کسی کا فدیہ اس کی قوم کی رضامندی کے مطابق تھا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! میں تو پہلے ہی مسلمان تھا۔'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «اَللّٰهُ أَعْلَمُ بِإِسْلَامِكَ، فَإِنْ يَّكُنْ كَمَا تَقُولُ، فَإِنَّ اللّٰهَ يُجْزِيكَ، وَ أَمَّا ظَاهِرُكَ فَقَدْ كَانَ عَلَيْنَا، فَافْتَدِ نَفْسَكَ وَابْنَيْ أَخَوَيْكَ» ''اللہ تعالیٰ آپ کے اسلام کو خوب جانتا ہے۔ اگر بات ایسے ہی ہے جیسا کہ آپ کہہ رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا بدل عطا فرمائے گا۔ رہا آپ کا ظاہر (جس کے مطابق ہمیں فیصلہ کرنا تھا) تو وہ ہمارے خلاف تھا، لہٰذا اپنا اور اپنے دونوں بھتیجوں (نوفل بن حارث اور عقیل بن ابی طالب اور اپنے حلیف عتبہ بن عمرو) کا بھی فدیہ ادا کرو۔'' حضرت عباس رضی اللہ عنہ عرض پرداز ہوئے: ''اے اللہ کے رسول! مال تو میرے پاس نہیں ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا:

«فَأَيْنَ الْمَالُ الَّذِي دَفَنْتَهُ أَنْتَ وَأُمُّ الْفَضْلِ، فَقُلْتَ لَهَا: إِنْ أُصِبْتُ فِي سَفَرِي هٰذَا فَهٰذَا الْمَالُ الَّذِي دَفَنْتُهُ لِبَنِيَّ الْفَضْلِ وَ عَبْدِ اللّٰهِ وَ قُثَمَ؟»

''جو مال آپ نے ام فضل کے ساتھ مل کر دفن کیا تھا وہ کہاں ہے؟ جسے زمین میں چھپانے کے بعد آپ نے کہا تھا: ''اگر میں اس سفر میں کام آؤں تو یہ مال فضل، عبداللہ اور قثم کا ہے؟'' عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اللہ کی قسم، اے اللہ کے رسول! میں خوب جانتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں کیونکہ اس دفینے کا میرے اور ام فضل کے سوا کسی کو علم نہ تھا۔ میرے پاس جو مال تھا وہ آپ کو مل چکا ہے، اس میں سے 20 اوقیے شمار کر کے رکھ لیجیے!'' آپ ﷺ نے فرمایا: «ذَاكَ شَيْءٌ أَعْطَانَاهُ اللّٰهُ تَعَالٰى مِنْكَ» ''یہ تو وہ مال ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمھاری طرف سے ہمیں دیا ہے۔'' پھر عباس رضی اللہ عنہ نے اپنا، دونوں

بھتیجوں اور حلیف کا فدیہ ادا کیا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیات اتاریں:

﴿يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○﴾

''اے نبی! جو قیدی تمھارے ہاتھوں گرفتار ہیں، آپ ان سے کہہ دیں: اگر اللہ تمھارے دلوں میں بھلائی جان لے گا تو تمھیں اس (فدیے) سے کہیں بہتر عطا کرے گا جو تم سے لیا گیا ہے اور تمھیں بخش دے گا اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے اور (اے نبی!) اگر وہ آپ سے خیانت (دغا) کرنا چاہیں تو وہ پہلے ہی اللہ سے خیانت کر چکے ہیں، پھر اس نے انھیں تمھارے قبضے میں دے دیا اور اللہ خوب جاننے والا، خوب حکمت والا ہے۔''[1]

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''پھر اللہ تعالیٰ نے اسلام میں مجھے بیس اوقیہ کی جگہ بیس غلام عطا کر دیے۔ ہر غلام کے پاس اتنا مال تھا کہ وہ اس سے تجارت کرتا تھا۔ مزید یہ کہ میں اللہ عزوجل سے بخشش کی امید بھی رکھتا ہوں۔''[2]

یہ آیات کریمہ اگرچہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے متعلق اتری تھیں لیکن «اَلْعِبْرَةُ بِعُمُومِ اللَّفْظِ لَا بِخُصُوصِ السَّبَبِ» ''قرآن مجید کے الفاظ کا اعتبار ہوتا ہے نہ کہ کسی خاص سبب نزول کا۔'' اس قاعدے کے تحت لفظ کے عمومی مفہوم کے اعتبار سے یہ حکم تمام قیدیوں سے متعلق تھا۔

بعض انصار نے رسول اللہ ﷺ سے اجازت طلب کی کہ ہمیں اپنے بھانجے (آپ ﷺ

---

1 الأنفال 8:70، 71۔ 2 دلائل النبوة للبيهقي: 3/142، 143۔ اس سے ملتی جلتی روایت امام احمد رحمہ اللہ نے بھی ذکر کی ہے، دیکھیے: مسند أحمد: 1/353، اس حدیث کی شرح فتح الباري، شرح الحديث: 4018 میں ملاحظہ کیجیے۔

کے چچا) عباس رضی اللہ عنہ کا فدیہ چھوڑنے کی اجازت دیجیے، آپ ﷺ نے فرمایا: «وَاللّٰهِ! لَاتَذَرُونَ مِنْهُ دِرْهَمًا» ''اللہ کی قسم! عباس کے فدیے سے ایک درہم بھی نہ چھوڑنا۔''[1]

انصار کے ہاں رسول اللہ ﷺ کے ادب اور مقام کا اندازہ اس بات سے بخوبی ہورہا ہے کہ انھوں نے کہا: ''ہمارا بھانجا'' نہ کہ یہ کہا: ''آپ ﷺ کے چچا'' تاکہ فدیہ لیے بغیر چھوڑنا نبی ﷺ کے بجائے ان (انصار) پر احسان خیال کیا جائے۔ اگر وہ کہتے: ''آپ ﷺ کے چچا'' تو گویا آپ ﷺ پر احسان ظاہر ہوتا۔ حسنِ ادب اور عقل مندی کا یہ کیسا عمدہ نمونہ ہے۔ آپ ﷺ نے ان کا یہ مطالبہ قبول نہ فرمایا تھا کہ دین میں کسی اور نوعیت کے انداز محبت کی مثال قائم نہ ہو۔[2]

یہاں قیدیوں کے لیے اور ان کے ساتھ مسلمانوں کے لیے ایک جامع پیغام بھی قابل ذکر ہے کہ انھوں نے رشتہ داروں سے محبت قائم نہیں رکھی بلکہ معاملہ اس کے برعکس تھا۔ آپ ﷺ نے اپنے چچا کا فدیہ اور زیادہ گراں کردیا تھا۔[3]

حضرت عباس رضی اللہ عنہ مکہ واپس آئے۔ اپنا اور اپنے دونوں بھتیجوں کا فدیہ دیا، تاہم اپنا اسلام پوشیدہ رکھتے ہوئے بڑی مہارت سے بے مثال صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے مکہ میں قائم ہونے والی اسلامی حکومت کے لیے تانا بانا تیار کرتے رہے۔ آخر کار فتح مکہ کے موقع پر یہ کردار اختتام پذیر ہوا۔ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے فتح مکہ سے تھوڑی مدت قبل اسلام کا اعلان کردیا۔[4]

زینب بنت النبی کے خاوند ابوالعاص بن الربیع کا فدیہ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جب اہل مکہ نے اپنے قیدیوں کا فدیہ بھیجا تو آپ ﷺ کی بیٹی زینب نے بھی ابوالعاص کا فدیہ بھیجا۔ اس میں سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کا وہ ہار

1 صحيح البخاري، حديث: 4018. 2 سبل الهدٰى والرشاد للصالحي: 135/4. 3 السيرة النبوية لأبي شهبة: 176/2. 4 التربية القيادية للدكتور الغضبان: 68/3.

بھی تھا جو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ابوالعاص سے عقد کے وقت زینب رضی اللہ عنہا کو دیا تھا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہار دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان پر انتہائی ترس آیا اور فرمانے لگے:

«إِنْ رَأَيْتُمْ أَنْ تُطْلِقُوا لَهَا أَسِيرَهَا وَ تَرُدُّوا عَلَيْهَا الَّذِي لَهَا»

''اگر تمھاری رائے ہو تو زینب کا قیدی آزاد کر دو اور اس کا بھیجا ہوا فدیہ بھی واپس کر دو۔''

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ بالکل بجا اور ابوالعاص کو آزاد کر دیا اور فدیہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو لوٹا دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوالعاص پر شرط عائد کی تھی یا عہد لیا تھا کہ وہ زینب کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے کی اجازت دے دیں، پھر انھیں لانے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کے ساتھ ایک انصاری کو روانہ کیا اور فرمایا:

«كُونَا بِبَطْنِ يَأْجِجَ حَتّٰى تَمُرَّ بِكُمَا زَيْنَبُ فَتَصْحَبَاهَا حَتّٰى تَأْتِيَا بِهَا»

''تم دونوں یأجج وادی میں جا ٹھہرو! وہاں تمھارے پاس زینب آئے گی۔ تم اسے ساتھ لے آنا۔''[1]

ابوالعاص نے کسی بھی طریقے سے کبھی اسلامی دعوت کا راستہ روکنے کی جسارت نہیں کی تھی۔ انھوں نے اپنی زبان اور ہاتھ سے اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی اذیت نہیں پہنچائی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیا اور اپنی تجارت میں مشغولیت کی وجہ سے ابوالعاص قریش کی طرح دعوتِ اسلام کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کرنے سے کنارہ کش رہے۔ معرکہ بدر میں دامادِ پیغمبر ابوالعاص ان قیدیوں میں سے ایک تھے جنھوں نے معرکے میں کوئی خاص مشورہ دیا نہ ہی کوئی خاص کردار ادا کیا۔

قریش نے جب اپنے قیدیوں کا فدیہ ارسال کرنا شروع کیا تو سیدہ زینب رضی اللہ عنہا

---

1 سنن أبي داود، حديث: 2692، و مسند أحمد: 276/6، و صحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 261.

نے بھی بطورِ فدیہ مال بھیجا۔ اس فدیے میں سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کا اپنی بیٹی کو عقد کے موقع پر دیا ہوا ہار بھی تھا۔ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنی پیاری بیٹی کا ہار دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان پر بہت ترس آیا۔ یہ قابل قدر ہار پدری محبت، باوفا بیوی اور خاندانی یادوں کا ایک بہتا ہوا مظہر بن گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک باپ ہیں۔ اور انسانیت میں پائی جانے والی پدری محبت و عاطفت کے بلند تر وصف کے حامل ہیں۔ اب تو گویا رحمت و شفقت کے درپردہ زاویے بھی نمایاں ہونے لگے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر میں شفقت و محبت کی موجیں بے کنار ہونے لگیں اور ایک انتہائی معزز و محترم شخص کے انداز میں شفقت طلب نگاہیں صحابہ کی جانب امیدیں لیے اٹھیں۔ ایسی امیدیں جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو عطا و سخا پر ابھار رہی تھیں لیکن صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو جو فدیے کا حق حاصل تھا اس طلب میں اس کی نفی بھی نہ تھی، یعنی اگر وہ حقِ فدیہ استعمال کرنا چاہتے تو انھیں کوئی مانع نہیں تھا، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنْ رَأَيْتُمْ أَنْ تُطْلِقُوا لَهَا أَسِيرَهَا وَ تَرُدُّوا عَلَيْهَا الَّذِي لَهَا»

''اگر تم پسند کرو تو اس کا قیدی آزاد اور فدیہ واپس کر دو۔''

یہ شریف النفس انسانوں کے دلوں میں گھر کر جانے والا ایک عمدہ اسلوب ہے جو انھیں برضا و رغبت ماننے پر ابھارتا ہے اور دلوں میں خوشی و راحت کو بھی جنم دیتا ہے۔[1]

بیٹی کے لیے یہ شفقت بھرا لہجہ درپردہ کچھ اور بھی مقاصد لیے ہوئے تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا داماد ایک عمدہ اور صائب رائے رکھنے والا انسان تھا۔ باوجود اس کے کہ وہ مشرک تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے عمدہ سلوک کو بارہا سراہا تھا اور اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اسلام کی طرف راغب کرنے کی کوشش بھی کی۔ ابو العاص بن ربیع رضی اللہ عنہ 6 ھ میں مسلمان ہو گئے۔[2]

ابو عزہ عمرو بن عبد اللہ جُمَحی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت اور احتیاط کی کشمکش میں

عمرو بن عبد اللہ غریب ہونے کے ساتھ ساتھ متعدد بیٹیوں کا باپ بھی تھا۔ عرض کرنے

1 محمد رسول اللہ ﷺ لصادق عرجون: 3/480-487. 2 التاريخ الإسلامي للحميدي: 4/183.

لگا: ''اے اللہ کے رسول! آپ بخوبی جانتے ہیں کہ میں محتاج، قلاش اور پھر بڑے کنبے والا ہوں۔ مجھ پر احسان فرمائیے۔'' رحمۃ للعالمین ﷺ نے احسان فرماتے ہوئے یہ وعدہ لیا کہ آئندہ ہمارے خلاف کسی سے تعاون نہ کرنا۔ ابوعزہ اس پر آپ ﷺ کی تعریف میں لب کشا ہوا:

«مَنْ مُّبْلِغٌ عَنِّي الرَّسُولَ مُحَمَّدًا ... بِأَنَّكَ حَقٌّ وَّ الْمَلِيكُ حَمِيدُ
وَ أَنْتَ امْرُؤٌ بُوِّئْتَ فِينَا مَبَائَةً ... لَّهَا دَرَجَاتٌ سَهْلَةٌ وَّ صُعُودُ
فَإِنَّكَ مَنْ حَارَبْتَهُ لَمُحَارَبٌ ... شَقِيٌّ وَّ مَنْ سَالَمْتَهُ لَسَعِيدُ
وَ لٰكِنْ إِذَا ذُكِّرْتُ بَدْرًا وَّ أَهْلَهُ ... تَأَوَّبَ مَا بِي حَسْرَةٌ وَّ قُعُودُ

''محمد رسول اللہ ﷺ کو میری طرف سے یہ بات کون پہنچائے گا کہ آپ سچے اور قابلِ ستائش حاکم ہیں۔''

''آپ ہماری نسبت ایسے بلند مقام پر فائز ہیں جو بلند درجات اور عظمت و عروج کا حامل ہے۔''

''آپ جس سے جنگ کرتے ہیں وہ دشمن بڑا بدبخت ٹھہرتا ہے اور جس سے صلح کرلیں وہ خوش قسمت ہوتا ہے۔''

''لیکن میرے سامنے جب بھی جنگ بدر اور اس میں شریک ہونے والوں کا تذکرہ ہوگا تو حسرت و افسوس میں میرے تمام خیالات ختم ہو جائیں گے۔''

ابن کثیر رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ مشرکین نے ابوعزہ کو جھانسا دیا اور اس نے رسول اللہ ﷺ سے کیا ہوا عہد توڑ ڈالا، لہٰذا وہ ان میں واپس لوٹ گیا اور غزوۂ احد میں دوبارہ قیدی بنا۔ اب وہ ایک بار پھر آپ ﷺ سے احسان کا سوال کرنے لگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَا أَدَعُكَ تَمْسَحُ عَارِضَيْكَ بِمَكَّةَ وَ تَقُولُ: خَدَعْتُ مُحَمَّدًا مَرَّتَيْنِ»

''کہیں ایسا نہ ہو کہ تو مکہ جا کر منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے یہ بات کہے:''میں نے محمد (ﷺ) کو دوبارہ دھوکا دیا۔ میں تمھیں ہرگز ایسا نہیں کرنے دوں گا۔''

اس کے بعد آپ ﷺ نے حکم صادر فرمایا تو اس کی گردن تن سے جدا کر دی گئی۔[1]

ابوعزہ نے جب اپنے فقر اور بیٹیوں کی کفالت کا تذکرہ کیا تو آپ ﷺ نے اس پر رحم کرتے ہوئے درگزر فرمایا اور فدیہ لیے بغیر ایک وعدہ لے کر اسے چھوڑ دیا۔ لیکن جب وہ صلح پر کاربند رہا نہ ہی جنگ میں عدم شرکت کے وعدے پر پورا اترا، لہٰذا غزوۂ احد میں قیدی بنا تو آپ ﷺ نے محتاط رویہ اپناتے ہوئے اس کے قتل کا حکم صادر فرمایا۔

سہیل بن عمرو کا قید میں آنا اور حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کی گفتگو

عبدالرحمٰن بن اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب بدر کے قیدیوں کو مدینہ منورہ لایا گیا تو اس وقت ام المؤمنین حضرت سودہ رضی اللہ عنہا آل عفراء کے محلے میں تھیں، یہ بات احکام پردہ سے پہلے کی ہے۔ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:''میں وہیں تھی کہ قیدیوں کی آمد کا پتا چلا، چنانچہ میں گھر واپس آئی۔ رسول اللہ ﷺ تشریف فرما تھے۔ میں نے دیکھا کہ ابویزید سہیل بن عمرو کے ہاتھ گردن سے بندھے ہوئے ہیں اور وہ کمرے کے ایک کونے میں پڑا ہے۔ ابویزید کی یہ حالت دیکھ کر میری زبان سے بے ساختہ کلمات نکلے:

''اے ابویزید! اس قید کے بجائے عزت کی موت کیوں نہ مر گئے؟''

اسی وقت مجھے اچانک آپ ﷺ کی آواز سنائی دی:

«يَا سَوْدَةُ! أَعَلَى اللهِ وَرَسُولِهِ تُحَرِّضِينَ؟»

''اے سودہ! اسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے خلاف ابھار رہی ہو؟''

میں نے عرض کیا:''اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا!

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 110/3، ودلائل النبوة للبيهقي: 281,280/3، والبداية والنهاية: 313/3.

ابو یزید کو اس حال میں دیکھ کر بے ساختہ زبان سے یہ الفاظ نکل گئے ہیں۔'' [1]

سہیل بن عمرو کے فدیے کے لیے مکرز بن حفص بن اخیف آگیا اور مسلمانوں سے سہیل کے فدیے کے متعلق بات چیت کرنے لگا حتی کہ مسلمانوں نے رضامندی کا اظہار کر دیا۔ اب مسلمانوں نے اس سے کہا: ''طے شدہ فدیہ پیش کرو۔'' مکرز نے کہا: ''اس کی جگہ مجھے بیڑیاں ڈال دو اور اسے چھوڑ دو تاکہ یہ اپنا فدیہ بھیج سکے۔'' مکرز کو قید کر کے سہیل بن عمرو کو چھوڑ دیا گیا۔

ایک مرسل روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سہیل کے سامنے کے دانت نکالنے کی اجازت طلب کی تاکہ اس کی زبان بے قابو ہو جائے اور وہ کبھی بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بیان نہ کر سکے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لَا أُمَثِّلُ بِهٖ فَيُمَثِّلَ اللّٰهُ بِي وَ إِنْ كُنْتُ نَبِيًّا»

''میں اس کا مثلہ نہیں کروں گا کہ کہیں اللہ تعالیٰ میرا مثلہ نہ کر دے اگرچہ میں نبی ہوں۔'' [2]

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: «إِنَّهٗ عَسٰى أَنْ يَّقُومَ مَقَامًا لَّا تَذُمُّهٗ»

''امید ہے یہ کبھی ایسا کردار بھی ادا کرے گا جسے تم ناپسند نہیں کرو گے۔'' [3]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''یہ وہی کردار ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے موقع پر سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہ نے مکہ مکرمہ میں اس وقت ادا کیا جب عرب عموماً ارتداد کا شکار ہو گئے تھے اور مدینہ اور گردونواح میں نفاق بھڑک اٹھا تھا۔ سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہ نے مکہ میں دینِ حنیف پر قائم دائم رہنے پر خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے کہا:

1 السنن الكبرىٰ للبيهقي: 89/9، و المستدرك للحاكم: 22/3، و السيرة النبوية لمحمد الصوياني: 200/2. 2 البداية والنهاية: 311/3. امام ابن کثیر کے بقول یہ روایت مرسل بلکہ معضل (ضعیف) ہے۔ 3 البداية والنهاية: 311/3.

''اے قریشیو! تم ایسے نہ بنو کہ اسلام لانے میں تو تم نے تاخیر کی مگر ارتداد کا شکار ہونے میں تم سبقت لے جاؤ۔ جس شخص نے ہمیں اپنے دین کے متعلق شک و شبہ میں ڈالا ہم اس کی گردن اڑا دیں گے۔''[1]

رسول اللہ ﷺ نے سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہ کے دانت اکھاڑنے سے انکار فرمایا اور اس بات کا اظہار فرمایا کہ یہ انسان کی طبعی صورت بگاڑنے اور مثلہ کرنے کے مترادف ہے۔

یہ آپ ﷺ کے منہاج نبوت کا ایک نمونہ ہے جسے آپ ﷺ نے اپنی امت کو دشمن پر غلبہ پانے کے لیے بطورِ چراغ عنایت فرمایا۔[2]

تعلیم بمقابلہ فدیہ

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ بدر کے دن کئی قیدیوں کے پاس فدیہ نہیں تھا، لہٰذا آپ ﷺ نے ان کا فدیہ یہ قرار دیا کہ انصار کے بچوں کو لکھائی سکھائیں۔[3] چنانچہ قیدی مدینہ منورہ کے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے لگے۔ جو قیدی بھی دس بچوں کو تعلیم دے دیتا وہ آزاد ہو جاتا۔[4]

اس وقت رسول اللہ ﷺ کو مال کی اشد ضرورت تھی اس کے باوجود آپ ﷺ کا تعلیم کو فدیہ کے طور پر قبول کر لینا اسلام کی عالی نظر میں تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ اور یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی، قرآن کریم کی پہلی وحی تعلیم ہی کے متعلق تھی۔ ارشادِ باری ہے:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ ○ خَلَقَ الْاِنْسٰنَ مِنْ عَلَقٍ ○ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ○ الَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ○﴾

---

1 التاريخ الإسلامي للحميدي: 181/4. 2 محمد رسول الله ﷺ لصادق عرجون: 474/3.
3 مسند أحمد: 247/1، وصحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 261. 4 التربية القيادية للدكتور الغضبان: 74/3.

''اپنے رب کے نام سے پڑھیے جس نے پیدا کیا۔ اس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا۔ پڑھیے اور آپ کا رب بڑا کریم ہے۔ وہ ذات جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔''[1]

علم کی ترغیب اور علماء کی فضیلت کے بارے میں قرآن وسنت میں ان گنت ارشادات موجود ہیں۔ اس لحاظ سے آپ ﷺ پہلی ہستی ہیں جنھوں نے جہالت مٹانے اور تعلیم عام کرنے کی بنیاد رکھی۔ اس باب میں بھی اسلام ہی کو سبقت حاصل ہے۔[2]

قیدیوں کا حکم

اسلام میں قیدیوں کا معاملہ حاکم وقت کے اختیار میں ہے۔ وہ چار امور میں سے جو چاہے اختیار کرلے، البتہ امام کی ذمہ داری ہے کہ مصلحتِ عامہ کا خیال رکھے۔ وہ چار امور درج ذیل ہیں:

① قتل: آپ ﷺ نے عقبہ بن ابی معیط اور نضر بن حارث کے قتل کا حکم صادر فرمایا۔

② احسان: یعنی بغیر کسی عوض کے قیدی آزاد کرنا جیسا کہ آپ ﷺ نے ابوعزہ جمحی پر احسان فرمایا تھا۔

③ فدیہ: مال یا کسی بھی صورت میں فدیے لے کر قیدی آزاد کرنا جیسا کہ آپ ﷺ کے چچا عباس رضی اللہ عنہ، نوفل بن حارث اور عقیل بن ابی طالب وغیرہ سے معاملہ ہوا۔

④ غلام بنا لینا: جیسا کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے قریظہ کے متعلق فیصلہ سنایا تھا کہ جنگجوؤں کو قتل کردیا جائے، بچوں اور عورتوں کو قیدی بنا لیا جائے اور اموال بانٹ دیے جائیں۔[3]

---

1 العلق 96:1-4. 2 السيرة النبوية لأبي شهبة: 2/164,165. 3 غزوة بدر الكبرىٰ لأبي فارس، ص: 101.

غزوۂ بدر کے نتائج اور رسول اللہ ﷺ پر اچانک حملے کا پروگرام

جنگ بدر کے نتائج

اسلام کی شان و شوکت: غزوۂ بدر کا نتیجہ یہ نکلا کہ کفار پر مسلمانوں کا رعب و دبدبہ بیٹھ گیا۔ مدینہ منورہ اور اس کے اردگرد کے لوگ سہم گئے۔ مدینہ منورہ یا مسلمانوں پر حملے کا ارادہ رکھنے والے سوچنے پر مجبور ہوگئے۔ اور کسی بھی عملی اقدام سے قبل اس کا بھرپور جائزہ لینے لگے۔ مدینہ منورہ میں رسولِ گرامی ﷺ کی عظمت کا پھریرا لہرانے لگا اور ہر سُو اسلام کا بول بالا ہونے لگا۔ اس نئی تحریک کے متعلق شک و شبہ میں مبتلا رہنے والے کفار و مشرکین اسلام کے خلاف اپنی دشمنی اور کفر کے اظہار کی جرأت سے باز آ گئے۔ اسی لیے مدینہ میں نفاق، دھوکے اور مکاری نے جنم لیا۔ وہ آپ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے اسلام کا اظہار کر کے بظاہر مسلمانوں میں شمار ہونے لگے مگر باطنی طور پر کفر اختیار کیے رکھا اور اسی لحاظ سے وہ کفار میں سے شمار ہوئے۔ یہ نہ تو مسلمان تھے کہ اسلام میں مخلص ہوں اور نہ کافر تھے کہ کفر و عداوت سامنے نظر آئے، ارشادِ الٰہی ہے:

﴿مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ۝﴾

”وہ کفر اور ایمان کے درمیان ڈانواں ڈول ہیں، نہ (پورے) اس طرف نہ (پورے) اس طرف اور (اے نبی!) جسے اللہ گمراہ کرے، آپ اس کے لیے ہرگز کوئی راہ نہیں پائیں گے۔“ [1]

ان کے اس متردد موقف کی اللہ تعالیٰ نے انتہائی مذمت فرمائی اور متعدد آیات کریمہ میں ان کا یہ قبیح موقف واضح کیا ہے اور سخت ترین عذاب کی وعید سنائی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

1 النسآء 143:4.

﴿إِنَّ ٱلۡمُنَٰفِقِينَ فِي ٱلدَّرۡكِ ٱلۡأَسۡفَلِ مِنَ ٱلنَّارِ وَلَن تَجِدَ لَهُمۡ نَصِيرًا﴾

''بے شک منافقین دوزخ کے سب سے نچلے طبقے میں جائیں گے اور وہاں آپ ان کے لیے ہرگز کوئی مددگار نہیں پائیں گے۔''[1]

جنگ بدر کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ پر مسلمانوں کے ایمان میں مزید پختگی آ گئی، ہر لحاظ سے استحکام ملا اور قوت میں اضافہ ہوا۔ قریش کے کئی ایک سرداروں نے اسلام قبول کیا جس سے مکہ مکرمہ میں موجود کمزور مسلمانوں کو حوصلہ اور ولولہ ملا۔ انھیں اللہ تعالیٰ کی نصرت پر دلی خوشی نصیب ہوئی۔ عقیدے کی پختگی اور ایمان میں اضافے کے ساتھ ساتھ یہ یقین مستحکم ہونے لگا کہ مشکل دن ختم ہونے کو ہیں۔

مزید یہ کہ مسلمانوں کو جنگی مہارت حاصل ہوئی۔ جنگ کے نئے اسلوب سامنے آئے۔ جزیرہ نمائے عرب اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں مسلمانوں کا چرچا ہونے لگا کیونکہ مسلمان بلادِ عرب میں ایک نمایاں اور ایک نامور قوت بن کر ابھرے تھے جو قریش ہی نہیں بلکہ عرب میں پھیلے ہوئے تمام قبائل کی چودھراہٹ کو چیلنج کر سکتے تھے۔ اسی طرح نئی قائم ہونے والی اسلامی حکومت کو جہاد کی بدولت غنیمت کے طور پر آمدنی کا ایک مؤثر ذریعہ حاصل ہوا جس کی بنا پر مسلمانوں کی مادی و اقتصادی حالت بہتر ہوئی اور انیس ماہ کی مسلسل تنگی پر اچھا اثر پڑا۔[2]

قریش کا اقتصادی نقصان: قریش کو اس جنگ سے اتنا نقصان ہوا کہ ان کی کمر ٹوٹ گئی۔ ابوجہل بن ہشام، امیہ بن خلف، عتبہ بن ربیعہ وغیرہ جو کفر کے سرغنے اور جنگ اور بہادری میں اپنی نظیر آپ تھے، ان کا قتل ہونا صرف جنگی خسارہ نہ تھا بلکہ معنوی طور پر بھی گھاٹا تھا۔ وہ اس طرح کہ مدینہ منورہ کی اس صورتِ حال سے نہ صرف قریش کی تجارت کو خطرہ لاحق تھا بلکہ انھیں پورے حجاز میں اپنی سرداری اور اس کے اثر و رسوخ کا مسئلہ

---

1 النسآء 4:145. 2 التاريخ السياسي والعسكري للدكتور علي المعطي، ص: 274,275.

بھی درپیش تھا۔ [1]

مکہ مکرمہ میں جنگِ بدر کی شکست کی خبر: اہل مکہ پر شکست کی خبر بجلی بن کر گری۔ ابتدائی طور پر جب شکست کی خبر مکہ پہنچی تو کسی نے بھی اس کی تصدیق نہ کی۔ ابن اسحاق کا بیان ہے: ''مکہ مکرمہ میں سب سے پہلا قریشی حیسُمان بن عبداللہ الخزاعی [2] ہزیمت کی خبر لے کر پہنچا تو لوگوں نے پوچھا کہ میدانِ کارزار کی صورتِ حال کیا ہے؟ اس نے کہا: ''عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ابوالحکم بن ہشام، امیہ بن خلف، زمعہ بن اسود، نُبَیہ بن حجاج، منبہ بن حجاج اور ابوالبختری بن ہشام یہ سب قتل ہو چکے ہیں۔'' جب حیسُمان نے قریش کے سارے سردار شمار کر ڈالے تو صفوان بن امیہ نے کہا: ''اللہ کی قسم! اگر اس کے ہوش وحواس قائم ہیں تو اس سے میرے متعلق دریافت کرو۔'' لوگوں نے پوچھا کہ صفوان بن امیہ نے کیا کردار ادا کیا؟ وہ کہنے لگا: ''وہ ادھر حطیم میں بیٹھا ہے۔ اللہ کی قسم! میں نے اس کے باپ اور بھائی کو دیکھا، دونوں قتل ہو چکے ہیں۔'' [3]

رحمت عالم ﷺ کے آزاد کردہ غلام ابورافع رضی اللہ عنہ اس شکست کا ابولہب پر اثر یوں بیان کرتے ہیں: ''میں حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کا غلام تھا۔ ان کے گھرانے سے ام الفضل اور میں مسلمان ہو چکے تھے۔ عباس رضی اللہ عنہ اپنی قوم سے بچتے تھے۔ وہ ان کی مخالفت مول لینا نہیں چاہتے تھے لیکن اسلام چھپائے ہوئے تھے۔ اپنی قوم میں ان کا خاصا مال بکھرا ہوا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا دشمن ابولہب غزوۂ بدر سے پیچھے رہ گیا تھا اور اپنی جگہ پر اس نے عاص بن ہشام بن مغیرہ کو بھیج دیا تھا۔ جب بدر میں قریش کو انتہائی صدمہ پہنچا اور اس کی خبریں مکہ میں پہنچیں تو اللہ تعالیٰ نے اسے ذلیل ورسوا کر دیا، جبکہ ہم نے دلی طور پر قوت وعزت محسوس کی۔''

---

1 التاریخ السیاسي والعسكري للدكتور علي المعطي، ص:276,275. 2 سیرت ابن ہشام میں ''حیسُمان'' ہے۔ 3 السيرة النبوية لابن هشام:246/2، و صحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص:275.

ابورافع رضی اللہ عنہ مزید کہتے ہیں کہ میں ایک کمزور شخص تھا۔ اس وقت حجرۂ زمزم میں بیٹھا اپنے پیشے کے مطابق پتھر سے پیالے گھڑ رہا تھا۔ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ ام الفضل میرے پاس تشریف فرما تھیں۔ اس خبر پر ہم شاداں و فرحاں تھے۔ اسی دوران شریر فطرت ابولہب پاؤں گھسیٹتا ہوا آیا اور حجرے کی ایک جانب میری پیٹھ کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گیا۔ اسی وقت لوگوں کی آواز سنائی دی کہ ابوسفیان بن حارث بن عبد المطلب آ گیا ہے۔ ابولہب نے کہا: ''میری طرف آؤ، تمھارے پاس یقیناً معلومات ہوں گی۔'' لہٰذا وہ بھی اس کے پاس بیٹھ گیا۔ لوگ اردگرد کھڑے تھے۔ ابولہب نے کہا: ''بھتیجے! مجھے بتاؤ کیسے واقعہ پیش آیا؟'' اس نے کہا: ''اللہ کی قسم! مڈھ بھیڑ ہوتے ہی ہم پیٹھ پھیر گئے۔ وہ جسے چاہتے قتل کرتے اور جسے چاہتے قید کرتے تھے۔ لیکن اللہ کی قسم! اس پر بھی میں اپنے لوگوں کو ملامت نہیں کرتا۔ ہمارا واسطہ ہی ایسے سفید آدمیوں سے پڑا جو آسمان و زمین کے وسط میں چتکبرے گھوڑوں پر سوار تھے۔ اللہ کی قسم! وہ کسی چیز کو نہ چھوڑتے اور نہ ان کے سامنے کوئی چیز ٹھہر سکتی تھی۔''

ابورافع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''میں نے خیمے کی رسیوں کو اپنے ہاتھ سے اوپر اٹھا کر کہا: ''اللہ کی قسم! وہ فرشتے تھے!'' یہ سننا تھا کہ ابولہب نے میرے منہ پر زوردار تھپڑ مارا۔ میں اس پر کود پڑا۔ اس نے مجھے اٹھایا اور زمین پر پٹخ دیا۔ میں کمزور تھا، چنانچہ وہ میرے اوپر بیٹھ گیا اور مارنے لگا۔ یہ دیکھ کر ام الفضل اٹھیں اور خیمے کی ایک لکڑی پکڑ کر اس کے سر پر ایسے زور سے ماری کہ وہ گر پڑا اور اس کے سر پر گہرا زخم آ گیا، پھر ام الفضل کہنے لگیں: ''اس کے مالک (عباس رضی اللہ عنہ) کی عدم موجودگی پر اسے کمزور سمجھتے ہو۔'' اب وہ ذلیل ہو کر وہاں سے چلتا بنا۔ اس کے بعد سات راتیں ہی گزری تھیں کہ طاعون نما پھنسی سے مر گیا۔''[1]

غزوۂ بدر نے مشرکین مکہ کے دلوں میں شکست، مقتولین اور قیدیوں کی بنا پر انتہائی

1 السيرة النبوية لابن هشام:258/2.

رنج وغم اور حزن و ملال چھوڑا، مثلاً: ابولہب چند ہی دن بعد بیماری کی لپیٹ میں آگیا۔ ابوسفیان (رضی اللہ عنہ) کا ایک بیٹا قید اور ایک قتل ہوگیا۔ مکہ مکرمہ کے ہر گھر میں صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔ کسی کا رشتے دار قتل ہوا تھا اور کسی کا عزیز یا قریبی گرفتار تھا۔ ایسی صورتِ حال میں مشرکین کے اندر بدلہ چکانے کا عزم پیدا ہونا بعید از قیاس نہ تھا۔ بعض نے تو اپنے وڈیروں اور سرداروں کے قاتلوں سے بدلہ لیے بغیر اپنے اوپر غسل کرنا حرام قرار دے لیا۔ (ابوسفیان بن حرب (رضی اللہ عنہ) نے نذر مانی کہ مسلمانوں سے جنگ تک غسل جنابت کی نوبت نہ آئے گی۔)

اب اہل مکہ مسلمانوں سے ٹکرانے اور ان سے بدلہ لینے کے منتظر رہنے لگے۔ جنگ احد اسی کے نتیجے میں بپا ہوئی۔[1]

یہودیوں کی اسلام دشمنی: جہاں تک یہودیوں کا تعلق ہے انھیں بدر میں مسلمانوں کی فتح کا بڑا قلق ہوا۔ مسلمانوں کی ابھرتی ہوئی طاقت، اسلام کی شان وشوکت اور یہودیت پر اس کا غالب ہونا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوش بختی اور بلند مقام و مرتبہ یہ سب باتیں انھیں پریشان کررہی تھیں، لہٰذا انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمدِ مدینہ کے موقع پر کیے ہوئے معاہدے کو توڑنے کا پختہ عزم کرلیا اور دلوں میں چھپی دشمنی کا علی الاعلان اظہار کرنے لگے۔ اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف ہوگئے۔ اور اپنے تمام تر وسائل بروئے کار لاتے ہوئے فیصلہ کن مرحلے تک پہنچنے کے لیے کوشاں ہوگئے۔[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف دشمنوں کو ابھارنے لگے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہود کی منفی سرگرمیاں پوشیدہ نہیں تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بڑے محتاط انداز اور حاضر دماغی سے ان پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ بالآخر یہود نے مسلمانوں میں رائج

---

[1] السيرة النبوية لأبي شهبة: 171/2. [2] التاريخ السياسي والعسكري للدكتور علي المعطي، ص: 274.

اخلاقی قدروں اور وہ امور، جن کی بدولت مسلمانوں کو عزت ملی تھی، انھیں حقارت کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ اور علانیہ دشمنی پر اتر آئے۔ ایسے حالات میں یہود سے جنگ اور مدینہ سے ان کی جلاوطنی کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ اس کی تفصیل بعد والے صفحات میں آئے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔[1]

رسول اللہ ﷺ پر اچانک حملے کا پروگرام اور عمیر بن وہب کا قبولِ اسلام

حضرت عروہ بن زبیر بیان کرتے ہیں کہ بدر میں شکست پہنچنے کے چند دن بعد عمیر بن وہب جمحی حطیم میں صفوان بن امیہ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ عمیر قریش کے ان شر پسند عناصر میں سے ایک تھا جو آپ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اذیت پہنچاتے تھے۔ مکہ مکرمہ میں مسلمانوں کو اس کے ہاتھوں بڑا دکھ پہنچا تھا، اب عمیر کا بیٹا وہب[2] بدر کے قیدیوں میں سے تھا۔ بہر حال صفوان اور عمیر کی مجلس میں بدر کے کنویں میں ڈالے گئے کفار مقتولین اور پہنچنے والے دیگر نقصانات کا تذکرہ چل نکلا۔ صفوان نے کہا: ''اللہ کی قسم! ان کے بعد زندگی میں کوئی لطف باقی نہیں رہا!'' عمیر نے کہا: ''سچ کہتے ہو لیکن اللہ کی قسم! اگر مجھ پر ان قرضوں کا بوجھ نہ ہو جن کی ادائیگی کے لیے میرے پاس کچھ نہیں اور ان بچوں کا غم بھی نہ ہو، میرے بعد جن کے ضائع ہونے کا خدشہ ہے تو میں سفر کر کے (نعوذ باللہ) محمد ﷺ کو قتل کر دوں کیونکہ وہاں جانے کے لیے میرے پاس بہانہ بھی موجود ہے کہ ان کے ہاں میرا بیٹا قیدی ہے۔''

عروہ کہتے ہیں کہ صفوان نے یہ موقع غنیمت جانا اور فوراً کہا: ''تیرا قرض میرے ذمے رہا۔ رہے تیرے بچے تو میں تا زندگی ان کی کفالت کا ذمہ اٹھاتا ہوں کہ جو چیز مجھے میسر ہو گی وہ قطعاً اس سے محروم نہ ہوں گے۔'' عمیر نے کہا: ''یہ معاملہ راز میں رکھو۔'' اس نے کہا: ''ایسا ہی کروں گا۔''

1 السيرة النبوية لأبي شهبة: 171/2. 2 یاد رہے عمیر کے بیٹے اور باپ دونوں کا نام وہب تھا۔

بقول عروہ، پھر عمیر نے اپنی تلوار تیز اور زہر آلود کرنے کے بعد سفر کا آغاز کیا اور مدینہ منورہ جا پہنچا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسلمانوں کی مجلس میں تشریف فرما تھے۔ اس مجلس میں بدر اور اس موقع پر اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی اور دشمنوں کی ذلت کا تذکرہ چل رہا تھا۔ اسی دوران عمر رضی اللہ عنہ کی نگاہ عمیر پر پڑی۔ اس نے گلے میں ننگی تلوار ڈالے ہوئے مسجد کے دروازے پر اپنی سواری بٹھا دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بولے: ''اللہ کی قسم! اللہ کا دشمن، یہ درندہ لازماً برے ارادے سے پہنچا ہے! اس نے بدر کے موقع پر ہماری تعداد کم بتا کر دشمن کو ہمارے خلاف بھڑکایا تھا۔'' عمر رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگے: ''میرے آقا! یہ اللہ کا دشمن عمیر بن وہب گلے میں تلوار لٹکائے ہوئے آیا ہے۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «فَأَدْخِلْهُ عَلَيَّ» ''اسے میرے پاس لے آؤ۔''

عمر رضی اللہ عنہ نے واپس آ کر اس کی گردن میں لٹکے تلوار کے پرتلے سے پکڑا اور اپنے ساتھ بیٹھے انصاریوں سے کہا: ''آپ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں چلے جائیں اور وہیں بیٹھ جائیں اور اس خبیث سے محتاط رہیں کہ کہیں یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی نقصان نہ پہنچائے کیونکہ اس پر کوئی اعتبار نہیں۔'' پھر عمیر کو پکڑے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں چلے آئے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ اس پر پڑی کہ عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے گلے میں لٹکے ہوئے تلوار کے پرتلے سے پکڑ رکھا ہے تو فرمایا: «أَرْسِلْهُ يَا عُمَرُ! اُدْنُ يَا عُمَيْرُ!» ''عمر! تم اسے چھوڑ دو اور عمیر! تم نزدیک آ جاؤ۔''

عمیر نے قریب ہوتے ہوئے کہا: ''صبح بخیر'' یہ اہل جاہلیت کا آپس میں سلام (دعائیہ کلمہ) تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً فرمایا: «أَكْرَمَنَا اللّٰهُ بِتَحِيَّةٍ خَيْرٍ مِّنْ تَحِيَّتِكَ يَا عُمَيْرُ! بِالسَّلَامِ تَحِيَّةِ أَهْلِ الْجَنَّةِ» ''اے عمیر! اللہ تعالیٰ نے ہمیں تمھارے اس سلام سے بہتر سلام سے نوازا ہے، یعنی ''السلام'' جو اہل جنت کا سلام ہے۔''

عمیر کہنے لگا: ''اللہ کی قسم! مجھے اس کا پہلے علم نہ تھا۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «فَمَا جَاءَ بِكَ يَا عُمَيْرُ؟» ''عمیر! کیسے آنا ہوا؟''

عمیر: ''آپ کے پاس ایک قیدی ہے اس کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ اس پر احسان فرمائیے۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «فَمَا بَالُ السَّيْفِ فِي عُنُقِكَ؟» ''یہ تمھارے گلے میں تلوار کیسی ہے؟''

عمیر: ''اللہ اسے ضائع کرے، یہ گھٹیا تلواروں میں سے ہے۔ یہ ہمارے کسی کام کی نہیں۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «اُصْدُقْنِي، مَاالَّذِي جِئْتَ لَهُ؟» ''میرے سامنے سچ بولو، کس کام کے لیے آئے ہو؟''

عمیر: ''صرف اپنا قیدی چھڑانے ہی کے لیے حاضر ہوا ہوں۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«بَلْ قَعَدْتَّ أَنْتَ وَ صَفْوَانُ بْنُ أُمَيَّةَ فِي الْحِجْرِ، فَذَكَرْتُمَا أَصْحَابَ الْقَلِيبِ مِنْ قُرَيْشٍ، ثُمَّ قُلْتَ: لَوْلَا دَيْنٌ عَلَيَّ وَ عَيَالٌ عِنْدِي، لَخَرَجْتُ حَتّٰى أَقْتُلَ مُحَمَّدًا فَتَحَمَّلَ لَكَ صَفْوَانُ بْنُ أُمَيَّةَ بِدَيْنِكَ، وَ عَيَالِكَ عَلٰى أَنْ تَقْتُلَنِي لَهُ، وَاللّٰهُ حَائِلٌ بَيْنَكَ وَ بَيْنَ ذٰلِكَ»

''بلکہ تم اور صفوان حطیم میں بیٹھے بدر کے کنویں میں پھینکے گئے قریشیوں کا تذکرہ کر رہے تھے، پھر تم نے کہا: ''مجھ پر اگر قرض اور بچوں کا بوجھ نہ ہو تو میں جا کر محمد (ﷺ) کو لازماً قتل کر دوں۔'' تب صفوان نے میرے قتل کے بدلے تمھارے قرض اور بچوں کی کفالت کی ضمانت دی۔ اللہ نے تمھارے اور تمھارے اس منصوبے کے درمیان رکاوٹ ڈال دی ہے۔''

عمیر: ''میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اے اللہ کے رسول! آپ جو آسمانی خبریں ہمارے پاس لاتے رہے ہم ان کا انکار کرتے تھے اور وحی کے بھی منکر تھے۔ مگر اس مشورے میں میرے اور صفوان کے علاوہ کوئی موجود ہی نہ تھا۔ اللہ کی قسم! مجھے

یقین ہے کہ یہ خبر آپ کو صرف اور صرف اللہ ہی نے دی ہے۔ تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہیں جس نے مجھے اسلام کی ہدایت عطا کی اور مجھے اس مقام پر لے آیا۔'' یہ کہتے ہی عمیر رضی اللہ عنہ نے کلمۂ شہادت پڑھ کر حق کی گواہی دے دی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «فَقِّهُوا أَخَاكُمْ فِي دِينِهِ، وَ أَقْرِئُوهُ الْقُرْآنَ، وَ أَطْلِقُوا لَهُ أَسِيرَهُ» ''اپنے بھائی کو دین سکھاؤ، قرآن پڑھاؤ اور اس کے قیدی کو رہا کر دو۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس پر عمل درآمد شروع کر دیا۔

عمیر رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ''اے اللہ کے رسول! میں دین کی شمع گل کرنے کی کوشش کرتا رہا، اللہ تعالیٰ کا دین اختیار کرنے والوں کو سخت تکلیف پہنچاتا رہا۔ میری آرزو ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اجازت دیں میں مکہ مکرمہ جاؤں اور وہاں کے باسیوں کو اللہ تعالیٰ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی طرف دعوت دوں۔ ممکن ہے اللہ تعالیٰ انھیں ہدایت عطا فرمائے۔ بصورت دیگر میں انھیں اس طرح تکالیف سے دوچار کروں جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کو ان کے دین کی بنا پر اذیتیں پہنچایا کرتا تھا۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اجازت دے دی۔ اس کے بعد عمیر رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ کی طرف چل دیے۔ دوسری طرف عمیر کی مکہ مکرمہ سے روانگی کے بعد صفوان نے لوگوں سے یہ کہنا شروع کر رکھا تھا کہ چند دنوں میں تمھیں ایک بڑے کارنامے کی خوشخبری ملنے والی ہے جو تمھیں بدر کا غم بھلا دے گی۔ اور ہر آنے والے قافلے سے اس کے متعلق پوچھتا رہتا۔ بالآخر وہ دن آ گیا جب وہ مسافر (عمیر بن وہب رضی اللہ عنہ) آ گئے۔ اور انھوں نے اپنے بارے میں بتایا کہ میں اسلام قبول کر چکا ہوں۔ یہ سننا تھا کہ صفوان نے قسم اٹھالی کہ عمیر سے نہ کبھی کلام کروں گا اور نہ اسے کسی قسم کا نفع پہنچاؤں گا۔ [1]

[1] المعجم الكبير للطبراني: 58/17، ومجمع الزوائد: 286/8، وصحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 260.

عمیر رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام کے واقعے سے ماخوذ اسباق اور نصیحتیں: اس قصے کے نتائج اور اسباق درج ذیل ہیں:

❁ **مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے کفار کی ہر ممکن کوشش:** مشرکین داعیانِ اسلام کا نسلی صفایا چاہتے تھے۔ صفوان اور عمیر کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کرنے پر اتفاق بتاتا ہے کہ مشرکین صرف دعوت ترک کرنے، اس میں طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کرنے اور لوگوں کو اس سے دور رکھنے ہی پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ داعیان اسلام کو اچانک قتل کرنے کے منصوبے بھی بناتے اور ان کے خلاف گٹھ جوڑ بھی کیے ہوئے تھے۔ اور وہ اس گھٹیا مقصد کے لیے اجرتی قاتل بھی حاصل کر لیتے تھے۔[1] اسی طرح مالدار لوگ فقراء کی ضرورت اور مجبوری سے فائدہ اٹھاتے۔ انھیں اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے گرانقدر دولت کا لالچ دیتے، بھلے اس میں ان کی اپنی جان بھی خطرے میں پڑے۔ صفوان نے عمیر رضی اللہ عنہ کے ضرورت مند، مجبور اور مقروض ہونے سے فائدہ اٹھا کر کیسے اسے ہلاکت کی راہ پر ڈالا تھا؟[2]

❁ **امن و سلامتی کے متعلق صحابہ کا شعور:** امن و سلامتی اور تحفظ سے متعلق شعور اور دور اندیشی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا خصوصی وصف تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، عمیر کے آنے پر انتہائی محتاط ہو گئے اور بآواز بلند کہہ دیا کہ یہ شر پسند ہے اور شر ہی کے لیے آیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے اس کا ماضی گواہ تھا کہ مکہ مکرمہ میں یہ مسلمانوں کو اذیت دیتا تھا۔ بدر میں مسلمانوں کے خلاف جنگ پر ابھارنے والا بھی یہی شخص تھا۔ اور اسی نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اعداد و شمار اہل مکہ کو فراہم کیے تھے، اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کا بندوبست شروع کر دیا تھا اور اس کی گردن میں پڑا تلوار کا پرتلہ بھی اسی لیے زور سے تھام لیا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تلوار کا ممکنہ استعمال ناممکن بنا دیا جائے۔ اس سلسلے میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کی ایک جماعت کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کا کہہ دیا تھا۔

1 المستفاد من قصص القرآن لعبد الكريم زيدان: 159/2. 2 غزوة بدر الكبرىٰ لأبي فارس، ص:82.

❁ اسلام کی تعلیمات اور اقدار کی روشنی میں عزت و وقار کا حصول: رسول اللہ ﷺ نے زمانۂ جاہلیت کے دعائیہ کلمات کو ٹھکرا دیا، جیسا کہ جب عمیر نے ''صبح بخیر'' کہا تو آپ ﷺ نے اس کا جواب نہ دیا بلکہ بتا دیا کہ میں اہل جاہلیت کے دعائیہ طریقے پر دعا نہیں دیتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اہل جنت کے دعائیہ کلمات سے مشرف فرمایا ہے۔

❁ معلم انسانیت ﷺ کے اخلاق عالیہ: رسول اللہ ﷺ نے عمیر سے اچھا برتاؤ کیا، درگزر فرمایا اور معاف کیا، حالانکہ وہ آپ ﷺ کو قتل کرنے آیا تھا۔[1] بلکہ اس کے اسلام لانے کے بعد اس کے بیٹے کو بھی آزاد کر دیا اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ وہ اپنے بھائی کو دین سمجھائیں، قرآن سکھائیں اور اس کے قیدی کو آزاد کر دیں۔[2]

❁ عمیر بن وہب رضی اللہ عنہ کی ایمانی قوت: عمیر رضی اللہ عنہ نے سارے مکہ میں اپنے اسلام کے اظہار کا پختہ عزم کیا تو آپ ﷺ نے انھیں اظہار کی اجازت دے دی، چنانچہ انھوں نے مکہ مکرمہ پہنچ کر ایسا ہی کیا۔ سب کے سامنے اعلان کیا اور چیلنج دیا جس کی صدائے بازگشت مدینہ منورہ تک بھی پہنچی۔ مکہ میں کافی لوگ ان کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ جب لوگوں کا موازنہ ہوتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ انھیں ان لوگوں میں شمار کرتے جو ایک ہزار کے قائم مقام سمجھے جاتے تھے۔ حضرت عمیر رضی اللہ عنہ ان چار آدمیوں میں سے تھے جن کے ذریعے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی مدد کی۔ وہ چاروں ہی ایک ایک ہزار کے بالمقابل سمجھے جاتے تھے۔[3]

---

1 غزوة بدر الكبرىٰ لأبي فارس، ص: 83. 2 صحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 260.
3 التربية القيادية للدكتور الغضبان: 73/3.

باب 4

غزوۂ بدر کے بعض اسباق، نصائح اور فوائد

مدد حقیقت میں اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے

بدر میں اصل مدد اللہ تعالیٰ ہی کی جانب سے تھی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بات واضح فرمائی ہے کہ اصل مدد تو اس کی جانب سے ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَىِٕنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ۚ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ﴾

"اور اللہ نے اسے تمھارے لیے خوشخبری بنا دیا تا کہ اس سے تمھارے دلوں کو تسلی ہو۔ اور مدد تو اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے جو بہت زبردست، نہایت حکمت والا ہے۔"[1]

یہی ارشاد سورۂ انفال (آیت: 10) میں بھی موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں آیات میں یہ بات تاکید سے واضح فرما دی کہ مدد صرف اللہ تعالیٰ ہی کی جانب سے ہوتی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا سے مدد ناممکن ہے۔ اور ﴿الْعَزِيْزِ﴾ کے معنی ہیں: ایسا غالب جسے زیر کرنے کا قصد بھی نہ کیا جائے۔[2] ﴿الْحَكِيْمِ﴾ سے یہاں مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کفار کو ملیامیٹ کرنے اور ہلاک کرنے کی طاقت رکھتا ہے اس کے باوجود اس نے کفار کو مٹانے کا حکم دے رکھا ہے، لہٰذا وہ بڑا حکیم و دانا ہے۔[3]

ان دونوں آیات میں یہ عقیدہ سمجھایا گیا ہے کہ مومنوں کو صرف اکیلے اللہ تعالیٰ پر اعتماد

[1] آل عمرٰن 3:126. [2] تفسیر ابن کثیر: 1/411. [3] تفسیر ابن کثیر: 2/303.

کرنا چاہیے، اپنے معاملات اس کے سپرد کرنے چاہئیں اور یہ مدد فرشتوں وغیرہ سے نہیں بلکہ اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔

مسلمانوں کے لیے اسباب اختیار کرنا ضروری ہے لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ ان اسباب سے دھوکے میں مبتلا نہ ہو جائیں بلکہ اعتماد صرف مسبب الاسباب پر ہونا چاہیے کہ وہی اپنی خاص توفیق سے مدد فرماتا ہے۔ بعدازاں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر اپنے فضل و کرم کی بارش کا تذکرہ فرمایا اور یہ بات واضح کی کہ بدر کے دن ان کی مدد، مشرکوں کا قتل اور آپ ﷺ کا مشرکین پر مٹی پھینکنا یہ سب اللہ تعالیٰ کی توفیق، فضل اور اسی کی نصرت سے تھا۔ اس آیت کریمہ کے ساتھ قرآن پاک مسلمانوں کی تربیت اور اللہ تعالیٰ پر اعتماد کی تعلیم دے رہا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۠ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ۚ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝﴾

''چنانچہ تم نے انھیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ ہی نے انھیں قتل کیا اور (اے نبی!) جب آپ نے (مٹھی بھر خاک ان کی طرف) پھینکی تو وہ آپ نے نہیں پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی اور تاکہ وہ مومنوں کو اپنی طرف سے اچھے انعام سے نوازے، بے شک اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔''[1]

اور جب یہ بات واضح فرمائی کہ نصرت اسی کی طرف سے تھی تو اس مدد کی کچھ حکمتیں بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ۝ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝﴾

[1] الأنفال 17:8.

''اس (اللہ) کا مقصد یہ تھا کہ وہ کافروں کے ایک گروہ کو ہلاک کر دے یا انھیں ذلیل کر دے، پھر وہ نامراد ہو کر لوٹ جائیں، (اے نبی!) آپ کا اس معاملے میں کچھ اختیار نہیں، اللہ چاہے تو ان کی توبہ قبول کرے، چاہے تو انھیں عذاب دے کیونکہ وہ ظالم ہیں۔''[1]

اور اس عظیم نعمت کو ہمیشہ یاد رکھنے کا حکم دیتے ہوئے نصیحت فرمائی کہ بدر میں مدد کی فراہمی سے پہلے کی زبوں حالی کبھی دل و دماغ سے نہ اترنے پائے، لہٰذا ارشاد ہے:

﴿وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○﴾

''اور یاد کرو جب تم بہت تھوڑے تھے، زمین میں کمزور سمجھے جاتے تھے، تم اس بات سے ڈرتے تھے کہ کہیں لوگ تمھیں اچک (نہ) لے جائیں تو اللہ نے تمھیں ٹھکانا دیا اور اپنی نصرت کے ساتھ تمھاری تائید کی اور تمھیں پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا تاکہ تم (اس کا) شکر کرو۔''[2]

یوم الفرقان (فیصلہ کن دن)

بدر کے دن کا نام ''یوم الفرقان'' رکھا گیا۔ مسلمانوں کی زندگی میں اسے اس نام سے موسوم کرنے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○﴾

''اور (اے مسلمانو!) جان لو کہ تم جو کچھ بھی مال غنیمت حاصل کرو، اس میں سے

[1] آل عمرٰن 3:127، 128. [2] الأنفال 8:26.

پانچواں حصہ یقیناً اللہ کے لیے ہے اور رسول کے لیے اور (اس کے) رشتے داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔ اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو اور اس پر جو ہم نے اپنے بندے پر فیصلے کے دن اتارا جس دن دو فوجوں میں ٹکراؤ ہوا تھا اور اللہ ہر چیز پر خوب قدرت رکھتا ہے۔''[1]

اس آیت میں یوم بدر کو اللہ تعالیٰ نے یوم الفرقان قرار دیا ہے۔ اس کے متعلق سید قطب رقمطراز ہیں: ''غزوۂ بدر جس کی ابتدا و انتہا اللہ تعالیٰ کی تدبیر، رہنمائی، نگرانی اور مدد سے ہوئی، یہ معرکہ حق و باطل میں فرق کر دینے والا تھا مگر فرقان کے معنی صرف وہ اجمالی نہیں جیسا کہ بالعموم مفسرین کا خیال ہے۔ بلکہ یہاں فرقان اس عمومی معنی سے زیادہ شامل، زیادہ لطیف، زیادہ وسیع اور زیادہ گہرائی کا حامل ہے۔

یہ معرکہ عملاً حق و باطل میں فرق کر دینے والا تھا مگر اس معرکے نے اس حق کو باطل سے ممتاز کیا جو حقیقی اور بنیادی طور پر حق ہے جس پر آسمان و زمین قائم ہیں۔ جو ہر ذی روح اور دیگر اشیا کی بنیاد ہے، وہ حق جو اللہ تعالیٰ کی الوہیت، بادشاہی اور تدبیر و تقدیر میں یکتائی کی صورت میں ہے۔ وہ حق جو تمام جہاں بشمول ارض و سما، جاندار و بے جان سب کی عبودیت کو شامل ہے۔ ایسی الوہیت و عبودیت جو بلا شراکت ہو اور اس بلا شریک بادشاہ کے لیے ہو جس کا کوئی حصہ دار ہو اور نہ فیصلے کو چیلنج کرنے والا۔ اور وہ کھوٹا، ڈگمگاتا اور پھسلنے والا باطل جو اُس وقت ساری زمین کو لپیٹ میں لیے ہوئے تھا اور اصل حق کو ڈھانپ چکا تھا، انسانوں پر ان کی زندگیوں میں مرضی کرنے والے شیاطین کو ساری زمین میں تسلط فراہم کر چکا تھا، انسانوں اور زندگیوں پر باطل خواہشات کو غالب کر چکا تھا، یہی وہ بدر کے دن عظیم اور فیصلہ کن معرکہ تھا جس نے حق اور حد سے متجاوز باطل کے درمیان لکیر کھینچ دی تاکہ اس کے بعد کبھی بھی کسی بھی صورت میں حق کے ساتھ باطل کا اختلاط و التباس ناممکن ہو جائے۔

[1] الأنفال 41:8.

غزوۂ بدر اسی وسیع و عمیق مفہوم کو شامل حق و باطل کے درمیان فیصلہ کن معرکہ تھا۔

غزوۂ بدر اپنی تمام تر پہنائیوں، گہرائیوں اور درازیوں کے ساتھ حق و باطل کے درمیان ''فرقان'' ہے۔ یہ معرکہ ضمیر و شعور کی اتھاہ گہرائیوں، توحید کی تمام حقیقی صورتوں، شعور کی بالیدگی، مخلوق و خالق کی بندگی کے ساتھ ساتھ شرک کی تمام غیر حقیقی علامتوں اور صورتوں، خواہشات پرستی، بندوں اور ضمیر کی غلامی، معاملات و علامات اور شعائر کے مقابلے میں رسوم و رواج کے درمیان واضح اور صریح حق اور باطل میں تمیز کنندہ تھا۔

یہ فرقان تھا شخصی غلامی، خواہش پرستی، رسوم پرستی، خودساختہ قوانین و عادات میں اور ان تمام امور کو اس اللہ معبودِ برحق کے لیے خالص کردینے میں جس کے سوا کوئی معبود اور حاکم و شارع نہیں ہے۔ اس دن وہ سربلند ہوگئے جو غیر اللہ کے لیے جھکتے نہ تھے۔ اس دن وہ سرقدر و قیمت والے ہوگئے جو اللہ تعالیٰ کی حاکمیت و قانون کے علاوہ کسی کے لیے پست نہ ہوتے۔ انسانوں کے وہ گروہ جو شیاطین نے غلام بنا رکھے تھے اس دن آزاد ہوگئے۔ یہ فیصلہ کن دن تھا۔

اسلامی تحریک کی تاریخ میں یہ واقعہ ایک یادگار عہد ہے۔ یہ تاریخ ہے باہم صبر کی تلقین و رضا کی، خاص گروہ بندی و انتظار کی، قوت و تحریک اور ایک سفر کے آغاز کی، انقلابی بہاؤ اور اسلام کے زیر سایہ زندگی گزارنے کے نئے ڈھنگ کی۔ انسانیت کے لیے ایک نئے نظام کے وجود میں آنے کی، زمین میں انسانوں کی گردن سے طوقِ غلامی اتارنے کی اور خالصتاً اللہ وحدہ لاشریک کی الوہیت و حاکمیت قائم کرنے کی۔ اور یہ الوہیت پر غاصبانہ قبضہ جما رکھنے والے طاغوتوں اور شیطانوں کو مار بھگانے اور ذلت و رسوائی ان کا مقدر بنانے کی تاریخ ہے۔''[1]

سید صاحب مزید لکھتے ہیں: ''بلاشبہ غزوۂ بدر ایک اور انداز سے بھی فرقان تھا جس کا

[1] تفسیر في ظلال القرآن لسید قطب:1522,1521/3.

اشارہ اس آیت کریمہ میں موجود ہے:

﴿وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ○ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبٰطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ○﴾

''اور جب اللہ تم سے دو گروہوں میں سے ایک کا وعدہ کر رہا تھا کہ یقیناً وہ تمھارے لیے ہے اور تم چاہتے تھے کہ جو غیر مسلح (تجارتی قافلہ) ہے وہی تمھارے ہاتھ لگے اور اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ وہ اپنے فرامین کے ساتھ حق کو ثابت کر دکھائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔ تاکہ وہ حق کو حق کر دکھائے اور باطل کو باطل کر دکھائے اگرچہ مجرم لوگ (اسے) ناپسند ہی کریں۔''[1]

جو مسلمان معرکے کے لیے گئے وہ درحقیقت ابوسفیان کے تجارتی قافلے کے ارادے سے نکلے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ تھا کہ ابوسفیان کی سرکردگی میں تجارتی قافلہ (بے ہتھیار) ان سے نکل جائے اور لشکرِ ابوجہل (ہتھیار والا) سے مٹھ بھیڑ ہو جائے تاکہ جنگ، قتل اور قیدی بنانا وقوع پذیر ہو، نہ کہ قافلے پر ہاتھ ڈال کر محض غنیمت حاصل ہو اور پُر امن سفر ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ بھی یہی ہے: ﴿لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبٰطِلَ﴾ ''تاکہ اللہ سچ کو سچ اور باطل کو جھوٹا کر دے۔''

اس میں ایک بہت بڑی حقیقت ذہن نشین کرانے کی طرف اشارہ تھا کہ معاشرے میں حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل قرار پانا صرف حق و باطل کے متعلق استدلالی وضاحت اور استدلالی عقیدے سے حق ہونا یا باطل ہونا قرار نہیں پاجاتا بلکہ حق کا غالب ہونا اور باطل کا غلط ہونا اور دنیا سے مٹنا، باطل کی بیخ کنی اور حق کی سربلندی قائم کیے بغیر ناممکن ہے۔ یہ تمام صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ حق پرست لشکر غالب آئیں اور فتح پائیں

[1] الأنفال 8:7،8.

اور اسی طرح باطل کا لشکر شکست خوردہ ہو اور دھتکار دیا جائے۔ یہ دین محض منفی اعتقادات اور معرفت و استدلالات کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک حقیقت پسند، متحرک اور واضح رستہ ہے۔

بلاشک وشبہ میدان میں حق واضح اور باطل غلط قرار پایا۔ اس اعتبار سے یہ عملی و فعلی مدد واقعی حق و باطل میں فرقان وفیصل تھی۔ جس کی طرف فرمانِ الٰہی نے اس واقعے کا مقصد بیان کرتے ہوئے اشارہ کیا ہے۔ اور رسول گرامی کو گھر سے حق کے ساتھ نکالنے، تجارتی قافلہ چھڑانے اور لشکر سے ملاقات کرانے میں یہی حکمت بیان کی گئی ہے۔ بلاشک وشبہ یہ سب اس دین کے واضح رستے کی تمیز و وضاحت ہے جس سے اس منہج کی اصلیت و حقیقت مسلمانوں کے شعور و احساس میں واضح ہو جاتی ہے۔

یہی فرقان ہے جس کی ضرورت ہم آج محسوس کر رہے ہیں۔ مسلمان کہلوانے والوں کے دلوں میں آج کس طرح اس کے اصل مفہوم کو پارہ پارہ کر دیا گیا ہے۔ اس سے بھی بڑی آفت یہ ہے کہ دین کی طرف بلانے والوں کے ذہن بھی معاشرتی بہاؤ کی نذر ہو گئے ہیں۔

بدر کا دن انھی گوناں گوں، متنوع، عمیق اور پھیلے ہوئے مفاہیم کے اعتبار سے یوم الفرقان تھا۔

﴿ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴾ ”اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔“ اس دن میں اللہ تعالیٰ کی قدرت شاملہ کی ایک جھلک تھی جس میں کوئی اس کے ساتھ نہ جھگڑا کھڑا کرنے والا اور نہ شک و شبہ میں پڑنے والا تھا۔ ایسی جھلک جس کا ہر کسی نے مشاہدہ کیا۔ اور اس کی ”قدرت الٰہی“ کی اس تعبیر اور تفسیر کے علاوہ کوئی تعبیر و تفسیر نہ تھی۔[1]

دوستی و دشمنی کا ضابطہ ایمان کی سمجھ بوجھ سے ہے

غزوۂ بدر نے مسلم اقوام کے لیے دوستی و دشمنی کا ایک واضح اصول متعین کر کے حق و باطل کے درمیان واضح خط کھینچ دیا ہے۔ اس اعتبار سے غزوۂ بدر روحانیت اور مادیت کے

[1] تفسیر في ظلال القرآن لسید قطب:3/1523,1524.

درمیان حد فاصل تھا۔ اس نے حق و باطل میں مکمل تمیز کر دی اور ان حقائق کا عملی مشاہدہ ہوا۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اس معیار ایمان کو دلی طور پر قبول کیا اور عملی جامہ پہنایا۔ دورِ جاہلیت کی قدریں دم توڑ گئیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام کو اولیت دیتے ہوئے بیٹا باپ کے اور بھائی بھائی کے مقابل آ کھڑا ہوا۔ دوستی اور دشمنی کے اس اسلامی معیار کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیے:

① ابو حذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ رضی اللہ عنہ بدر کے دن مسلمانوں کی جماعت میں شامل تھے جبکہ ان کا بھائی ولید بن عتبہ، باپ عتبہ بن ربیعہ اور چچا شیبہ بن ربیعہ مشرکین کے گروہ میں تھے۔ یہ تینوں جنگ کے آغاز ہی میں انفرادی رزم آرائی میں قتل ہو گئے تھے۔

② سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مسلمانوں کی جماعت اور ان کا بیٹا عبدالرحمٰن مشرکین مکہ کے گروہ میں تھا۔

③ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے علمبردار تھے جبکہ ان کا بھائی ابوعزیز بن عمیر مشرکوں کے جتھے میں تھا۔ وہ ایک انصاری صحابی کے ہاتھوں قید ہوا تو حضرت مصعب رضی اللہ عنہ نے انصاری بھائی سے کہا: ''اس کی والدہ مالدار ہے، اس لیے تم اس کے عوض وافر دولت لینا۔''

ابوعزیز نے کہا: ''میرے برادر! میرے متعلق آپ کا یہ مشورہ؟'' حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تم نہیں، یہ انصاری میرا بھائی ہے۔'' یہ محض باتیں نہیں حقائق تھے کہ ''یہ میرا بھائی ہے تم نہیں۔''[1]

یہ ہیں وہ اقدار جنھیں امت کے سامنے رکھا گیا تا کہ ان پر انسانیت کی عمارت استوار ہو۔ اس سے واضح ہوا کہ عقیدہ ہی نسب اور رشتے داری کو ملانے والا ہے اور یہی اجتماعیت کا بندھن ہے۔[2]

[1] البداية والنهاية:3/307. [2] من معين السيرة لصالح الشامي، ص:213.

④ بدر میں مسلمانوں کا شعار (آپس میں پہچان کا کوڈ ورڈ) ''اُحد، اُحد'' تھا۔ اس کا مفہوم یہ تھا کہ جنگ ایک ہی اللہ کی عبودیت کا عقیدہ اپنانے کی عملی صورت ہے۔ یہ جنگ نہ ہی عصبیت اور برادری ازم کا شاخسانہ ہے اور نہ ہی کسی دشمنی اور کینے کا نتیجہ اور نہ کوئی اور بدلہ ہی اس کا محرک بنا بلکہ صرف اللہ وحدہ لاشریک پر ایمان ہی اس کا محرک و مقصد تھا۔

مشرکین کے لشکر میں شامل مسلمانوں کا مواخذہ: ایمان کے اس وسیع مفہوم کی بنا پر مختلف اوقات میں مختلف اسالیب اختیار کیے گئے، جبکہ مقصد ایک ہی تھا۔[1] ایمان بہت زیادہ سمجھ بوجھ اور عقل و دانش کا متقاضی ہے، اس لیے جب آپ ﷺ نے مدینہ منورہ ہجرت کی تو اسی دور اندیشی کی بدولت ہر وہ مسلمان جو ہجرت کرسکتا تھا اس نے بھی مکہ مکرمہ سے ہجرت کر لی۔ اور صرف وہ مسلمان مکہ مکرمہ میں رہ گئے جنھیں قید میں رکھ کر ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جارہا تھا۔ اور وہ ہجرت نہ کر سکتے تھے۔ ان میں سے کئی ایک بدر کے دن مشرکین کے لشکر میں شامل تھے، مثلاً: عبداللہ بن سہیل بن عمرو، حارث بن زمعہ بن اسود، ابوقیس بن فاکہ، ابوقیس بن ولید بن مغیرہ، علی بن امیہ بن خلف اور عاص بن منبّہ۔

حضرت عبداللہ بن سہیل رضی اللہ عنہ تو لشکرِ کفر سے الگ ہوکر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوگئے اور جنگ میں شریک ہوئے اور ان صحابہ میں سے بن گئے جنھیں بدر میں شریک ہونے کا عظیم شرف حاصل ہوا۔[2]

حضرت عبداللہ بن سہیل رضی اللہ عنہ کے سوا باقی تمام ہجرت نہ کرنے والے مسلمان مشرکین کے لشکر میں شامل ہوئے اور سب کے سب قتل ہوگئے۔

علمِ کفر کے تحت قتل ہونے پر درج ذیل آیت مبارکہ نازل ہوئی:

﴿إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنتُمْ ۖ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ ۚ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا

---

1 من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 213. 2 من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 217.

فِيهَا ۚ فَأُولَٰٓئِكَ مَأْوَىٰهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَسَآءَتْ مَصِيرًا ○﴾

''جن لوگوں کی اس حالت میں فرشتے جان قبض کرتے ہیں کہ وہ (جان بوجھ کر کافروں میں رہ کر) اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہے ہوں تو فرشتے پوچھتے ہیں کہ تم کس حال میں تھے؟ وہ کہتے ہیں: ''ہم زمین میں کمزور تھے۔'' تب فرشتے کہتے ہیں: ''کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے؟'' چنانچہ یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔''[1]

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ کچھ مسلمان اسلام کو چھپائے ہوئے مکہ مکرمہ میں رہائش پذیر تھے۔ بدر کے دن مشرکوں نے انھیں بھی ساتھ لیا۔ ان میں سے بعض معرکے میں کام آ گئے تو مسلمانوں نے کہا: ''یہ ہمارے مسلمان ساتھی تھے جنھیں کفار نے اپنے ساتھ نکلنے پر مجبور کیا۔'' تو یہ آیت نازل ہوئی۔

ان کا عذر اس لیے قبول نہیں کیا گیا کہ ان کے پاس مسلمانوں کے لشکر میں شامل ہونے کے امکانات وافر تھے اور پھر دونوں لشکروں میں کوئی زیادہ فاصلہ بھی نہ تھا۔ اور اگر وہ چاہتے تو عبد اللہ بن سہیل رضی اللہ عنہ کی طرح بآسانی مسلمانوں کے لشکر سے مل سکتے تھے۔[2]

ایمان کے کچھ تقاضے ہیں جن کی بدولت اسلام کی صداقت اور قوت کا اظہار ہوتا ہے۔ ان تقاضوں میں سے ایک یہ ہے کہ باقی تمام قدروں اور تہذیبوں سے اسے بلند مقام دیا جائے۔ اور جب ایسا ہوگا تو ایسے حامل ایمان کا بڑا مؤثر کردار ہوگا، اسے نیکی اور بھلائی کے کاموں کی قوت میسر آئے گی جس کا اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا ہے کیونکہ ایمان کی یہ خوبی ہے کہ مسلمان کے طرز عمل پر اس کا نمایاں رنگ ہوتا ہے، اس کے اعمال و کردار سے ایمان کی جھلک نظر آتی ہے، اس کی گفتار حتی کہ مسکراہٹ سے بھی ایمان کی عکاسی ہوتی ہے، ایک ایک ادا سے ایمان جھلکتا ہے اور اثر قبول کرنے کا جذبہ دکھائی دیتا ہے۔ یہی

1 النسآء 4:97. 2 من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 217.

وجہ ہے کہ مشرکوں کی صفوں میں شامل ہونے والے مسلمانوں کا عذر غیر مقبول ہوا کیونکہ جس ایمان کے وہ مدعی تھے اس کے تقاضوں سے وہ عاری تھے، اس لیے وہ ایمان کے ثمرات و نتائج سے بھی بہرہ ور نہ ہو سکے۔[1]

ایمان کے اس نظریے کی گہرائی میں اتر کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے صداقتِ ایمان کی عالی مثالیں قائم کیں، جو اس بات کی قطعی دلیل تھیں کہ انھوں نے خاندان، قبیلہ، باپ اور بیٹے کی محبت پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا کو مقدم رکھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس سچے طرزِ عمل پر اللہ تعالیٰ کا مدح فرمانا کوئی تعجب خیز بات نہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ۭ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ اُولٰۗىِٕكَ حِزْبُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ ﴾

”(اے نبی!) آپ (ایسی) کوئی قوم نہیں پائیں گے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہوں، کہ وہ ان سے دوستی کریں جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہوں، اگرچہ وہ ان کے باپ یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا ان کا کنبہ قبیلہ ہو۔ یہی لوگ ہیں کہ اللہ نے ان کے دلوں میں ایمان لکھ دیا ہے اور ان کی تائید کی ہے اپنی طرف سے ایک روح کے ساتھ اور وہ انھیں ایسی جنتوں میں داخل کرے گا کہ جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہے اور وہ اس سے راضی ہیں، یہی لوگ اللہ کا گروہ ہیں، جان لو! بے شک (جو) اللہ کا گروہ ہے، وہی فلاح پانے والا ہے۔“[2]

[1] من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 218. [2] المجادلة 22:58.

بدر سے متعلقہ معجزات نبوی

بدر کے موقع پر رسول اللہ ﷺ سے کئی ایک معجزات رونما ہوئے۔ ان میں سے ایک آپ ﷺ کا غیبی امور کی خبر دینا ہے۔ اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ علم غیب اللہ تعالیٰ ہی کا خاصہ ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اسے کئی ایک آیات میں صرف اپنی طرف منسوب فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ۝﴾

''کہہ دیجیے: آسمانوں اور زمین میں اللہ کے سوا کوئی بھی غیب (کی بات) نہیں جانتا اور وہ (خود ساختہ معبود) تو یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ (قبروں سے) کب اٹھائے جائیں گے۔''[1]

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۚ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝﴾

''اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں، انھیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا اور وہ جانتا ہے جو کچھ خشکی اور تری میں ہے اور کوئی پتا ایسا نہیں گرتا جسے وہ جانتا نہ ہو اور زمین کے اندھیروں میں کوئی دانہ (ایسا) نہیں (پھوٹتا جسے وہ جانتا نہ ہو) اور کوئی تر چیز اور کوئی خشک چیز ایسی نہیں جو واضح کتاب میں (لکھی ہوئی) نہ ہو۔''[2]

اور یہ بات بھی مسلّمہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام غیب نہیں جانتے اور نہ ہی انھیں اس میں سے کسی بات کی خبر ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

[1] النمل 27:65. [2] الأنعام 6:59.

﴿قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّیْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَیَّ ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِی الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ؕ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ۝﴾

''(اے نبی!) کہہ دیجیے: میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں، میں تو اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ کہہ دیجیے: کیا نابینا اور بینا برابر ہو سکتے ہیں؟ پھر کیا تم غور نہیں کرتے؟''[1]

جس طرح اس کے متعلق دلائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے علم غیب اپنے ہی لیے مخصوص فرمایا ہے اور کسی مخلوق کو یہ عطا نہیں فرمایا، ایسے ہی اس کے متعلق دلائل بھی وارد ہوئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے کئی ایک پیغمبروں کو مستثنیٰ کرتے ہوئے انھیں جس قدر چاہا وحی کے ذریعے سے غیبی امور کے متعلق باخبر کیا۔ اور اسے ان کے لیے معجزہ بنا دیا تاکہ وہ ان کی نبوت کی صداقت پر دلیل بن جائے۔ اس بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِیْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۚ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝﴾

''اللہ مومنوں کو اس حالت میں ہرگز نہ رہنے دے گا جس میں تم اس وقت ہو، یہاں تک کہ وہ پاک کو ناپاک سے علیحدہ کر دے اور اللہ کا یہ طریقہ نہیں کہ وہ تم پر غیب ظاہر کرے لیکن اللہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے (غیب کی باتیں بتانے کے لیے) چن لیتا ہے، پس تم ایمان لاؤ، اللہ اور اس کے رسولوں پر اور اگر تم ایمان لاؤ گے اور پرہیزگاری اختیار کرو گے تو تمھارے لیے بہت بڑا اجر ہے۔''[2]

[1] الأنعام 6:50. [2] آل عمرٰن 3:179.

دوسرے مقام پر اسی بات کو یوں بیان فرمایا:

﴿عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ○ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ○﴾

''(وہی) عالم الغیب ہے، وہ اپنا غیب کسی پر ظاہر نہیں کرتا، سوائے کسی رسول کے جسے وہ پسند کرے، پھر بے شک وہ اس (رسول) کے آگے اور پیچھے نگہبان لگا دیتا ہے۔''[1]

ہم اس کا یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک پر جو کوئی غیبی خبر کا اظہار ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی وحی کی بدولت ہے جس کا مقصد نبوت و رسالت کی صداقت پر دلیل فراہم کرنا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی اطلاع پر آپ ﷺ کی متعدد امورِ غیبیہ کی خبر دینے کی وجہ سے شہرت ہوگئی۔[2]

ان غیبی معجزات میں سے چند ایک کا ظہور غزوۂ بدر کے موقع پر یا غزوۂ بدر کے بارے میں کسی اور موقع پر ہوا تھا جو حسب ذیل ہیں:

امیہ بن خلف کے قتل کی پیشگوئی: حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ عمرہ کرنے کی غرض سے مکہ پہنچے اور امیہ بن خلف کے ہاں اترے۔ امیہ کی بھی عادت تھی کہ وہ جب کبھی شام جاتے ہوئے مدینہ سے گزرتا تو سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے ہاں ٹھہرتا۔ امیہ نے (طواف کے بارے میں) سعد رضی اللہ عنہ سے کہا: ''آپ نصف النہار تک انتظار کرلیں۔ جب لوگ بے خبر ہوجائیں گے تو آپ جا کر طواف کر لینا۔'' عین اس وقت جب حضرت سعد رضی اللہ عنہ طواف کر رہے تھے ابوجہل آ پہنچا اور کہنے لگا: ''یہ کون شخص کعبے کا طواف کر رہا ہے؟''

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: ''سعد۔''

ابوجہل: ''محمد (ﷺ) اور اس کے ساتھیوں کو جگہ دے کر بے خوف کعبے کا طواف کر رہے ہو؟''

[1] الجنّ 72:26،27. [2] نضرۃ النعیم:1/453.

سعد رضی اللہ عنہ: ''ہاں۔''

پھر دونوں آپس میں ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے لگے۔ اسی اثنا میں امیہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے کہا: ''ابوالحکم سے آواز بلند نہ کرو، وہ اس وادی کا سردار ہے۔''

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اگر تم مجھے کعبے سے روکو گے تو میں ملک شام سے تمھاری تجارت (کا راستہ) روک دوں گا۔''

اتنے میں امیہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو پکڑ لیا اور کہنے لگا: ''آواز پست رکھو۔''

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو غصہ آ گیا اور وہ کہنے لگے: ''امیہ بس کر۔ میں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ وہ تجھے قتل کریں گے۔''

امیہ: ''مجھے؟'' سعد رضی اللہ عنہ: ''ہاں۔''

امیہ: ''اللہ کی قسم! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جب بات کرتا ہے تو جھوٹ نہیں بولتا۔''

امیہ فوراً بیوی سے جا کر کہنے لگا: ''تمھیں معلوم ہے میرے یثربی بھائی (سعد رضی اللہ عنہ) نے کیا کہا؟''

بیوی: ''کیا کہا ہے؟''

امیہ: ''اس کا کہنا ہے کہ اس نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ کہتے سنا ہے کہ وہ مجھے قتل کر دے گا۔''

بیوی: ''اللہ کی قسم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کبھی جھوٹ نہیں بولتا!''

راوی کا کہنا ہے کہ جب مکہ میں اعلان عام ہوا اور لوگ بدر کی طرف چلنے لگے تو امیہ کی بیوی نے کہا: ''آپ کو اپنے یثربی بھائی کی بات یاد ہے؟'' تو (یہ سوچ کر) امیہ نے جنگ سے پیچھے رہنے کا ارادہ کر لیا۔ ابوجہل اس سے کہنے لگا: ''تم یہاں کے سردار ہو، لہٰذا ایک دو دن ہمارے ساتھ چلو۔'' وہ دو دن کے لیے ساتھ ہو لیا تو اللہ تعالیٰ نے (بدر میں) اسے ہلاک کر دیا۔[1]

1 صحيح البخاري، حديث:3632.

سرکشوں کے مقتل کی نشاندہی: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم مکہ و مدینہ کے درمیان حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ جا رہے تھے اس دوران ہم چاند دیکھنے لگے۔ میری نگاہ تیز تھی، لہٰذا میں نے چاند دیکھ لیا۔ میرے سوا کسی کو نظر نہ آیا۔ میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے عرض کرنے لگا: ''آپ چاند کو نہیں دیکھ پا رہے؟'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسے دیکھ ہی نہیں رہے تھے۔ بلکہ انھوں نے یہ کہا: ''(اسے دیکھنا اب کونسا ضروری ہے بعد میں کبھی) اپنے بستر پر سیدھا لیٹ کر اسے دیکھ لوں گا۔'' بعد ازاں وہ اہل بدر کے متعلق ہمیں بتانے لگے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدر سے ایک دن پہلے ہمیں جنگ کا ایندھن بننے والے کفار کی قتل گاہوں سے آگاہ کر دیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے:

«هٰذَا مَصْرَعُ فُلَانٍ غَدًا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ»

''کل ان شاء اللہ یہاں فلاں شخص قتل ہو کر گرے گا۔''

پھر عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اللہ کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نشاندہی فرمائی تھی مشرکین ان سے ذرا بھی ادھر ادھر نہ گرے۔''[1]

سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کو ان کے مدفون مال کی اطلاع: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ سے فدیے کا تقاضا کیا تو عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! میرے پاس تو رقم نہیں ہے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا:

«أَيْنَ الْمَالُ الَّذِي دَفَنْتَهُ أَنْتَ وَأُمُّ الْفَضْلِ فَقُلْتَ لَهَا: إِنْ أُصِبْتُ فِي سَفَرِي هٰذَا، فَهٰذَا الْمَالُ الَّذِي دَفَنْتُهُ لِبَنِيَّ الْفَضْلِ وَ عَبْدِ اللّٰهِ وَ قُثَمَ؟»

''کہاں گیا وہ مال جو تم نے اور ام الفضل نے زمین میں دبایا تھا اور تم نے ام الفضل سے کہا تھا: ''اس سفر میں اگر میں مارا جاؤں تو یہ مال جو میں نے دفن کیا ہے میرے بیٹوں فضل، عبداللہ اور قثم کے لیے ہے۔''

[1] صحیح مسلم، حدیث: 2873.

عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اللہ کی قسم! اے اللہ کے رسول! مجھے یقین آ گیا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اس دفن شدہ مال کا میرے اور ام الفضل کے سوا کسی کو علم نہ تھا۔''[1]

عمیر بن وہب کو اس کے بُرے ارادے کی اطلاع: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمیر بن وہب کو اس وقت اطلاع دی جب وہ یہ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ بارگاہِ رسالت میں اپنے بیٹے کی رہائی کے لیے آیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اس کی سازش کی مکمل تفصیل بتا دی۔ اور یہی اطلاع اس کے اسلام اور سچے ایمان کا سبب بن گئی۔[2]

کچھ دیگر معجزات: امام ابن قیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد میں ذکر کیا ہے کہ بدر کے دن عکاشہ بن محصن رضی اللہ عنہ کی تلوار ٹوٹ گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں لکڑی کی ایک چھڑی مرحمت فرمائی اور کہا: «دُونَكَ هٰذَا» ''اسے اچھی طرح پکڑ لو۔''

عکاشہ رضی اللہ عنہ نے جب اسے مضبوطی سے پکڑ کر لہرایا تو یہ لکڑی ان کے ہاتھ میں ایک طویل اور انتہائی چمکدار تلوار کی شکل اختیار کر گئی۔ یہ تلوار ان کے پاس رہی اور وہ اس سے جنگیں کرتے رہے یہاں تک کہ وہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں فتنۂ ارتداد میں شہید ہو گئے۔[3]

رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ بدر کے دن مجھے تیر آ لگا جس سے میری آنکھ زخمی ہو گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں لعاب مبارک ڈالا اور دعا فرمائی تو مجھے اس تیر سے ذرہ برابر بھی تکلیف نہ ہوئی۔[4]

ڈاکٹر ابو شہبہ کہتے ہیں: ''یہ خیال مناسب نہیں کہ قرآن پاک کے بعد حسی معجزات کی اب ضرورت نہیں۔ کیونکہ معجزات کے واضح اثرات نظر آ رہے ہیں۔ کچھ لوگ تو ان کا مشاہدہ کر کے ایمان کی دولت سے آراستہ ہوتے ہیں تو کچھ کا ایمان قوت و استحکام سے

---

1 دلائل النبوة للبيهقي: 143,142/3، و مسند أحمد: 353/1، و فتح الباري شرح الحديث: 4018. 2 المعجم الكبير للطبراني: 58/17، و مجمع الزوائد: 286/8، و السيرة النبوية لأبي شهبة: 178/2. 3 زاد المعاد: 186/3. محقق کے بقول یہ واقعہ ابن اسحاق نے بلا سند ذکر کیا ہے، دیکھیے: السيرة النبوية لابن هشام: 637/2. 4 زاد المعاد: 186/3.

مالا مال ہوتا ہے۔ ان معجزات سے یہ عقیدہ بھی پختہ ہوگیا کہ رسول اللہ ﷺ برحق پیغمبر ہیں جن کی طرف وحی آتی تھی۔ آپ ﷺ نے ایسے غیبی امور کی اطلاع دی جن کی اطلاع آسمانی وحی کے بغیر ناممکن تھی۔

کسی شخص کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی لکڑی یا کھجور کی چھڑی کا قاطع تلوار بن جانا اس کے ایمان و یقین میں کتنا بڑا انقلاب بپا کردے گا! وہ کسی تردد اور بزدلی کے بغیر جہاد کرے گا اور اس کی مکمل چاہت ہوگی کہ وہ اس خلاف عادت تلوار کو لے کر میدانِ جنگ میں کود پڑے اور اس دور کے لوگوں اور بعد میں آنے والوں کے لیے ایک مثال اور یادگار بن جائے۔ (یہ معجزات کا کوئی کم فائدہ و حکمت نہیں ہے۔)[1]

مشرک سے تعاون لینے کا حکم

بدر کا معرکہ شروع ہونے سے قبل کے واقعات میں یہ بھی تھا کہ ایک مشرک نے مسلمان لشکر کے ساتھ ملنا چاہا اور رسول اللہ ﷺ سے موافقت طلب کی کہ آپ ﷺ جس مہم پر جارہے ہیں میں بھی اس میں شریک ہوجاؤں؟ ارشاد ہوا:

«اِرْجِعْ فَلَنْ أَسْتَعِينَ بِمُشْرِكٍ»

''واپس ہوجاؤ میں ہرگز مشرک سے مدد نہ لوں گا۔''[2]

حدیث نے یہ بات واضح کردی ہے کہ شرعی اصول اور قاعدہ یہی ہے کہ عمومی معاملات میں مشرک سے تعاون لینا جائز نہیں لیکن اس قاعدے کا ایک استثنائی پہلو بھی ہے کہ معینہ شروط کے تحت غیر مسلم سے تعاون لینا درست ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے:

غیر مسلم سے استعانت اس صورت میں درست ہے جب کوئی مصلحت پیشِ نظر ہو یا کم از کم مصلحت کے امکانات پائے جاتے ہوں۔ لیکن یہ بات یاد رہے کہ یہ استعانت اسلامی

[1] السيرة النبوية لأبي شهبة: 178/2. [2] صحيح مسلم، حديث: 1817.

دعوت اور اس کی معنویات پر اثر انداز نہ ہو۔ اسی طرح جس سے معاونت مطلوب ہو وہ مکمل طور پر قابل اعتماد ہو، پھر وہ اسلامی قیادت کے تابع ہو نہ کہ اس کی تابع داری کی جارہی ہو۔ وہ مسلمان قیادت کے تحت ہو نہ کہ قائد ہو۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس استعانت سے مسلمانوں میں شبہات نہ جنم لے رہے ہوں۔ اور جس سے مدد لی جارہی ہو اور جو مدد مطلوب ہو اس کی واقعی ضرورت محسوس کی جارہی ہو۔ یہ جملہ شروط موجود ہوں تو استثنائی صورت میں غیر مسلم سے مدد لی جاسکتی ہے۔ بصورت دیگر نہیں۔ اس اصول کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ نے قریش کے تجارتی قافلے کی طرف سفر کے دوران مسلمانوں کے ساتھ مشرک کی شمولیت کو ٹھکرادیا، جبکہ مذکورہ استثنائی صورت اور اس کی شروط کی موجودگی میں رسول اللہ ﷺ نے ایک مشرک گائیڈ عبداللہ بن اُریقط سے مدد لی تھی۔ اسے آپ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ہجرت مدینہ کے وقت اجرت پر ساتھ لیا تھا تاکہ مدینہ کا راستہ بتائے۔

اس استثنائی صورت اور شروط کے پائے جانے کی صورت میں آپ ﷺ نے اپنے چچا ابوطالب کی تحفظ فراہم کرنے کی پیشکش کو قبول فرمایا، جیسا کہ آپ ﷺ نے طائف سے واپسی پر مطعم بن عدی کے امان کی پیشکش قبول فرمائی۔ اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی ان مشرکوں کی امان قبول کی تھی جو انھیں تکلیف پہنچانے والوں سے تحفظ فراہم کرتے تھے۔[1]

زندگی کے کسی بھی موقع پر اس قاعدے کو اپنی تمام شرطوں سمیت عملی جامہ پہنانے کے لیے گہری سمجھ بوجھ اور راسخ ایمان کی ضرورت ہے۔

ایفائے عہد اور جذبات کی قدر

حذیفہ رضی اللہ عنہ اور ان کے والد گرامی یمان رضی اللہ عنہ کا وعدہ: حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم بدر میں صرف اس لیے شریک نہ ہوسکے کہ میں اور میرے والد گرامی

[1] المستفاد من قصص القرآن لعبد الکریم زیدان: 2/145,144.

رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے آرہے تھے۔ راستے میں ہمیں کفار مکہ نے پکڑ لیا اور کہنے لگے: ''تم محمد (ﷺ) کا قصد کیے ہوئے ہو!'' ہم نے کہا: ''ان کے پاس نہیں مدینہ جانا چاہتے ہیں۔'' انھوں نے ہم سے اللہ تعالیٰ کا عہد لے لیا کہ مدینہ جانا اور محمد (ﷺ) کے ساتھ مل کر جنگ نہ کرنا۔ ہم کفار مکہ سے آگے آگے چلے آئے اور آپ ﷺ کی خدمت میں حاضری دی اور اپنی اور مشرکوں کی گفتگو آپ ﷺ کے سامنے رکھ کر آپ ﷺ کی رائے طلب کی۔

آپ ﷺ نے فرمایا: «نَسْتَعِينُ اللّٰهَ عَلَيْهِمْ، وَ نَفِي بِعَهْدِهِمْ» ''ہم ان کے خلاف اللہ تعالیٰ کی مدد کے خواستگار ہیں اور ان کا عہد پورا کرتے ہیں۔'' پھر ہم مدینہ کی جانب چل دیے۔ یہ ہے وہ سبب جس نے ہمیں بدر میں حاضری سے روک دیا۔[1]

یہ ایفائے عہد کی ایک درخشندہ مثال ہے۔ رسول اللہ ﷺ عہد کی پاسداری کا انتہائی خیال فرماتے۔ اور اسی اخلاقِ عالیہ پر اپنے ساتھیوں کی تربیت فرماتے، خواہ اس میں مسلمانوں کو نقصان اٹھانا پڑے اور اپنے ہی بعض مجاہدین کو جنگ میں شمولیت سے محروم رہنا پڑے۔

سیدنا اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کے جذبات: غزوۂ بدر کے بعد جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ واپس تشریف لا رہے تھے تو ''روحاء'' مقام پر مختلف قبائل کے نمائندے فتح کی مبارک باد دینے کے لیے آپ ﷺ سے ملے تو اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! حمد وستائش اس ذات الٰہی کے لیے ہے جس نے آپ کو فتح سے ہمکنار کیا اور آپ کی آنکھیں ٹھنڈی فرمائیں۔ اللہ کی قسم! اے اللہ کے رسول! میں اس لیے آپ سے پیچھے نہ رہا کہ آپ دشمن سے جنگ کریں گے بلکہ اس لیے پیچھے رہ گیا کہ میرا خیال تھا کہ بس آپ کا ارادہ تجارتی قافلے ہی کا ہے اور اگر میرے وہم میں بھی ہوتا کہ دشمن (سے مقابلہ) ہے تو ہرگز پیچھے نہ رہتا۔''

[1] المستدرك للحاكم: 3/201، 202.

آپ ﷺ نے فرمایا: «صَدَقْتَ» ''تم نے سچ کہا۔''[1]

بدر کی ابلاغی جنگ (میڈیا وار)

حضرت حسان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

فَمَا نَخْشٰى بِحَوْلِ اللّٰهِ قَوْمًا   وَإِنْ كَثُرُوا وَأَجْمَعَتِ الزُّحُوفُ
إِذَا مَا أَلَّبُوا جَمْعًا عَلَيْنَا   كَفَانَا حَدَّهُمْ رَبٌّ رَؤُوفُ
سَمَوْنَا يَوْمَ بَدْرٍ بِالْعَوَالِي   سِرَاعًا مَّا تُضَعْضِعُنَا الْحُتُوفُ
فَلَمْ تَرَ عُصْبَةً فِي النَّاسِ أَنْكٰى   لِمَنْ عَادُوا إِذَا لَقِحَتْ كُشُوفُ
وَلٰكِنَّا تَوَكَّلْنَا وَقُلْنَا   مَآثِرُنَا وَمَعْقِلُنَا السُّيُوفُ
لَقِينَاهُمْ بِهَا لَمَّا سَمَوْنَا   وَنَحْنُ عِصَابَةٌ وَّهُمْ أُلُوفُ

''اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہم کسی قوم سے نہیں ڈرتے اگرچہ وہ زیادہ ہوں اور ان کے لشکر جمع ہوں۔

جب کسی گروہ کو انھوں نے ہمارے خلاف ابھارا تو مہربان پروردگار ہمارے لیے ان کے غیظ وغضب کے مقابلے میں کافی ہوگیا۔

ہم بدر کے دن بلند سے بلند نیزے لے کر تیزی سے چھاگئے اس حالت میں کہ اموات ہمیں کمزور نہ کرسکیں۔

جب خواہش نہ رکھنے والی اونٹنی حاملہ ہوگئی (ان کی مرضی کے خلاف نتیجہ نکلا) تو جن لوگوں سے انھوں نے دشمنی کی تھی وہ اتنے مقہور ومغلوب ہوئے کہ تو نے اتنا مقہور کسی کو نہ دیکھا ہوگا۔

[1] دلائل النبوة للبيهقي: 33/3، و البداية والنهاية: 305/3.

اور ہم نے اللہ تعالیٰ پر بھروسا کیا اور کہا: ''ہمارے قابل تعریف کام اور ہماری پناہ گاہ تلواریں ہیں۔''

جب ہم نے انھیں دور سے دیکھا تو ان سے مقابلہ کیا، حالانکہ ہم ایک چھوٹی سی جماعت اور وہ ہزاروں تھے۔''[1]

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

وَمَا حَامَتْ فَوَارِسُكُمْ بِبَدْرٍ وَّلَا صَبَرُوا بِهٖ عِنْدَ اللِّقَاءِ

وَرَدْنَاهُ بِنُورِ اللّٰهِ يَجْلُو دُجَى الظَّلْمَاءِ عَنَّا وَالْغِطَاءِ

رَسُولُ اللّٰهِ يَقْدُمُنَا بِأَمْرٍ مِّنْ أَمْرِ اللّٰهِ أُحْكِمَ بِالْقَضَاءِ

فَمَا ظَفِرَتْ فَوَارِسُكُمْ بِبَدْرٍ وَمَا رَجَعُوا إِلَيْكُمْ بِالسَّوَاءِ

فَلَا تَعْجَلْ أَبَا سُفْيَانَ وَارْقُبْ جِيَادَ الْخَيْلِ تَطْلُعُ مِنْ كَدَاءِ

بِنَصْرِ اللّٰهِ رُوحُ الْقُدُسِ فِيهَا وَمِيكَالٌ، فَيَا طِيبَ الْمَلَاءِ

''اور بدر میں تمھارے سواروں نے تمھاری کوئی مدد نہ کی اور نہ جنگ کے وقت وہ ڈٹ کر دشمن سے لڑ سکے۔

ہم وہاں اللہ تعالیٰ کے نور کے ساتھ پہنچے جو اندھیری رات کی تاریکی اور پردے دور کر رہا تھا۔

اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہمارے آگے چل رہے تھے جن کا فیصلہ مستحکم کر دیا گیا تھا۔

تمھارے سواروں نے بدر میں نہ فتح پائی اور نہ تمھاری جانب صحیح وسالم واپس ہوئے۔

ابوسفیان! جلدی نہ کرو بلکہ کداء مقام سے بہترین گھوڑوں کے چڑھ آنے کا انتظار کرو!

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 26/3.

وہ سوار اللہ تعالیٰ کی مدد ساتھ لیے ہوئے ہوں گے ان میں روح القدس اور میکائیل بھی ہوں گے۔ غرض یہ کیسی بہترین جماعت ہے!''[1]

رسول اللہ ﷺ مسلسل شعرائے اسلام کو ابھارتے کہ وہ اشعار سے مسلمانوں کا دفاع کریں اور دشمن کو مرعوب کرنے کا فریضہ انجام دیں۔ عرب دنیا میں شعر میڈیائی جنگ کا ایک موثر ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ شعر ہی کئی اقوام کی بلندی اور کئی کی پستی کا سبب بن جاتا۔ جنگوں کی آگ جلانا بجھانا اسی کی بدولت عام تھا۔[2]

میڈیا وار کی چنگاریاں تو ہجرت کے ساتھ ہی بھڑک اٹھی تھیں لیکن غزوۂ بدر سے قبل چھوٹے چھوٹے فوجی دستوں کی روانگی کے ساتھ ساتھ اس میں بھی تیزی آتی گئی۔ اور بدر کے بعد تو یہ لاوے کی طرح پھوٹ پڑی۔

دونوں کے پڑوس میں واقع قبائل فریقین کے مابین میڈیا وار کا اہم ہدف تھے۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی طرف آنے جانے والے قافلوں کے ساتھ یہ قصائد بھی بڑی تیزی سے فریقین کے پاس پہنچتے اور فریق مخالف کی طرف سے فوراً جواب آ جاتا۔ فتح پر فاتح گروہ کے اشعار اور مفتوح کے مرثیے زور پکڑتے۔ مسلمانوں میں کعب بن مالک رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ جیسے ماہر شعراء، جبکہ کفار پر کوہِ گراں بن کر گرنے والے شاعر حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔[3]

1 السيرة النبوية لابن هشام: 30/3. 2 التاريخ الإسلامي للحميدي: 199/4. 3 المنهج الحركي للسيرة النبوية للدكتور الغضبان، ص: 355,354.

حصہ 11

غزوۂ بدر سے غزوۂ احد تک

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ
حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ
مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ

”اور تحقیق سچا کر دکھایا تم سے اللہ نے اپنا وعدہ جب کاٹتے تھے تم ان کو ساتھ اس کے حکم کے یہاں تک کہ جب تم پست ہمت ہو گئے اور باہم جھگڑا کیا تم نے حکم (رسول) میں اور نافرمانی کی تم نے بعد اس کے کہ دکھلایا اس نے تم کو وہ جسے تم پسند کرتے تھے۔“

(آل عمران 3:152)

إِنْ رَأَيْتُمُونَا تَخْطَفُنَا الطَّيْرُ، فَلَا تَبْرَحُوا مَكَانَكُمْ هٰذَا حَتّٰى أُرْسِلَ إِلَيْكُمْ، وَإِنْ رَأَيْتُمُونَا هَزَمْنَا الْقَوْمَ وَأَوْطَأْنَاهُمْ فَلَا تَبْرَحُوا حَتّٰى أُرْسِلَ إِلَيْكُمْ

”اگر تم دیکھو کہ پرندے ہمیں اچک رہے ہیں تو بھی اپنی جگہ نہ چھوڑنا یہاں تک کہ میں تمھیں بلا بھیجوں اور اگر تم دیکھو کہ ہم نے دشمن کو شکست دے دی ہے اور انھیں کچل دیا ہے تو بھی میرا پیغام آنے تک وہیں رہنا۔“

(صحیح البخاری، حدیث: 3039)

باب 1

بدر اور احد کے مابین رونما ہونے والے اہم واقعات

غزوۂ بدر میں کامیابی سے جزیرہ نمائے عرب کی وسعتوں میں مسلمانوں کی مایۂ ناز جنگی ہیبت پھیل گئی۔ کمزور مشرکین خطرہ محسوس کرنے لگے۔ جبکہ طاقتور مشرک بھی اسلام کے غلبے کو محسوس کر رہے تھے۔ عام دلوں میں اسلام کی طرف رغبت پیدا ہوگئی اور اسلام میں داخل ہونے والوں کا دائرہ وسیع ہونے لگا۔ بہت سے لوگوں نے چاہا کہ ہم نفاق یا دھوکے سے اسلام میں داخل ہو جائیں۔ ان احوال میں یہ نئی اسلامی حکومت مکر و فریب اور دشمنوں کے باہمی اکٹھ اور ریشہ دوانیوں کی زد میں آگئی۔ لیکن اس کے بالمقابل اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت اور اس کے بعد حکومت کی چاک و چوبند تحفظ پالیسی نے اسلام دشمنوں کے تمام داؤ پیچ ناکام بنا دیے۔[1]

بدر و احد کے مابین رسول اللہ ﷺ کی زیر قیادت ہونے والے غزوات درج ذیل ہیں:

غزوۂ ماء الکدر

ماء الکدر نجد میں بنو سُلیم کے ایک چشمے کا نام ہے۔ غزوۂ بدر سے مدینہ واپسی کے سات دن بعد رسول اللہ ﷺ اس جنگی مہم پر روانہ ہوئے۔ بنو سلیم کے علاقے میں ''ماء الکدر'' پر پہنچے۔ آپ ﷺ بنو سلیم کے ارادے سے وہاں گئے مگر جنگ کی نوبت نہ آئی۔ آپ ﷺ اس چشمے پر تین دن تک فروکش رہے اور پھر مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔[2]

1 الأساس في السنة لسعيد حوّى: 512/1. 2 نضرة النعيم: 296/1.

اس غزوے کا سبب یہ تھا کہ جنگ بدر کے فوراً بعد بنو سلیم کے جنگجو اکٹھے ہو کر مسلمانوں پر چڑھائی کا پروگرام بنا رہے تھے لیکن رسول اللہ ﷺ غیر متوقع طور پر تیز رفتاری سے اچانک وہاں پہنچ گئے تو بنو سلیم بھاگ کھڑے ہوئے اور پہاڑوں میں بکھر گئے۔ ''یسار'' نامی چرواہے کے پاس ان کے اونٹ تھے۔ آپ ﷺ نے اونٹ بمع چرواہا ساتھ لیے اور مدینہ منورہ سے تین میل پہلے ''صرار'' مقام پر پہنچ کر یہ اونٹ، جن کی تعداد پانچ سو تھی، اپنے ساتھیوں میں تقسیم فرما دیے۔ ہر ایک کو دو دو اونٹ ملے جبکہ آپ ﷺ نے غنیمت کا پانچواں حصہ لیا اور یسار چرواہا بھی آپ کے حصے میں آیا لیکن بعد ازاں آپ ﷺ نے اسے آزاد کر دیا۔[1]

غزوۂ سویق

ابوسفیان دو سو جنگجو لے کر نجد کے راستے رات کے وقت یہودِ بنو نضیر کے پاس پہنچا۔ بنو نضیر کے سردار سلام بن مِشکم نے ان کا استقبال کیا۔ انھیں کھلایا پلایا اور مسلمانوں کے راز افشا کیے، پھر ان کے ساتھ مل کر مسلمانوں کو ایذا رسانی پہنچانے کے بارے میں مذاکرات کیے۔ اور ان مذاکرات کے نتیجے میں ابوسفیان مدینہ منورہ سے قریب ''عُرَیض''[2] کی جانب حملے کے لیے چل نکلا۔ یہاں اس نے دو آدمی قتل کیے، کھجور کے کچھ درخت جلائے اور دوڑتا ہوا واپس مکہ جا پہنچا۔ رسول اللہ ﷺ نے انصار و مہاجرین کے دو سو افراد پر مشتمل دستے کے ساتھ اس کا تعاقب کیا مگر ابوسفیان ساتھیوں سمیت انتہائی تیزی سے بھاگ گیا، اس طرح ابوسفیان اور اس کے ساتھی آپ ﷺ کے ہاتھ نہ لگ سکے۔ وہ بھاگتے ہوئے اپنا ساز و سامان اور وہ ستو بھی راستے میں گراتے جا رہے تھے جو وہ کھانے کے لیے ساتھ لائے تھے۔ مسلمان ان کا تعاقب کرتے ہوئے ستو کے یہ تھیلے جمع کرتے

[1] التاریخ السیاسي والعسكري للدكتور علي المعطي، ص: 277. [2] عریض: حرۂ واقم کی طرف مدینہ منورہ کی ایک وادی ہے۔

رہے اور کافی مقدار میں ستو ساتھ لے آئے۔ اس بنا پر اس غزوے کا نام ہی "غزوۂ سویق" (ستو والا غزوہ) پڑ گیا۔ آپ ﷺ جنگ کیے بغیر واپس تشریف لے آئے۔ اس مہم کا مکمل دورانیہ 5 دن پر مشتمل تھا۔[1]

غزوۂ ذی امر

رسول اللہ ﷺ کو اپنے خبر رساں افراد کی طرف سے یہ اطلاعات موصول ہوئیں کہ ثعلبہ اور محارب قبیلے کے کچھ لوگ دُعثور بن حارث محاربی کی قیادت میں ذی امر جگہ میں اکٹھے ہوئے ہیں اور وہ رسول اللہ ﷺ سے جنگ اور مدینہ منورہ پر حملہ آور ہونا چاہتے ہیں۔ آپ ﷺ نے مدینہ منورہ پر سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب مقرر کیا اور چار سو پچاس سواروں اور پیادہ افراد کے ساتھ اس سفر کا آغاز کیا۔ آپ کو ذی القصہ مقام پر بنو ثعلبہ کا ایک آدمی "جُبار" ملا جو در پردہ مسلمان تھا اور اپنی قوم کے راز آپ ﷺ کو پہنچایا کرتا تھا، یہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہولیا تا کہ دین کے معاملات سمجھ سکے۔[2]

دونوں قبائل کے مشرکین کو جب مسلمانوں کی آمد کا علم ہوا تو وہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر بھاگ گئے۔ آپ ﷺ وہاں نجد میں تقریباً ایک ماہ رہے لیکن کسی جانب سے بھی دشمن کو کسی جنگی یا مشکوک سرگرمی میں ملوث نہ پایا تو مدینہ منورہ لوٹ آئے۔[3]

اس غزوے میں رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں معجزے کا ظہور دیکھ کر ایک قابل قدر سردار دُعثور بن حارث مسلمان ہوا۔ دعثور بن حارث رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کا واقعہ اس طرح ہے کہ اس غزوے میں سخت بارش ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ کے کپڑے بھیگ گئے۔ آپ ﷺ نے ایک درخت تلے اتر کر کپڑے خشک کرنے کے لیے پھیلا دیے۔ اسی دوران دعثور اپنی

1 السيرة النبوية لابن هشام: 51/3، و التاريخ السياسي والعسكري للدكتور علي المعطي، ص: 279,278. 2 البداية والنهاية: 3/4، والتاريخ السياسي والعسكري للدكتور علي المعطي، ص: 279. 3 التاريخ السياسي والعسكري للدكتور علي المعطي، ص:279.

تلوار لیے آپ ﷺ کے پاس ایسی حالت میں پہنچا کہ آپ اکیلے تھے، اور کہنے لگا: ''اے محمد (ﷺ)! آج تجھے مجھ سے کون بچائے گا؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ'' اور ساتھ ہی جبریل امین نے اس کے سینے کو دھکیلا تو اس کے ہاتھ سے تلوار گر گئی، تب آپ نے اس تلوار کو پکڑا اور فرمایا: «مَنْ يَّمْنَعُكَ مِنِّي» ''تجھے مجھ سے کون بچائے گا؟'' اس نے کہا: ''کوئی نہیں «وَ أَنَا أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللّٰهِ»'' اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔'' اللہ کی قسم! میں آپ کے خلاف کبھی کوئی گروہ اکٹھا نہ کروں گا۔'' آپ ﷺ نے اس کی تلوار اسے دے دی۔ اس واقعے کے بعد جب وہ اپنے ساتھیوں کی طرف لوٹا تو انھوں نے کہا: ''تو ہلاک ہو! کیا ہوا تجھے؟'' وہ بولا: ''میں نے ایک طویل القامت آدمی دیکھا اس نے مجھے سینے سے دھکیلا تو میں سرین کے بل گر پڑا۔ میں نے پہچان لیا کہ یہ فرشتہ ہے اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ کی قسم! میں کبھی آپ ﷺ کے خلاف کوئی گروہ اکٹھا نہ کروں گا۔'' بعدازاں وہ اپنی قوم کو اسلام کی طرف دعوت دینے لگا۔[1]

اس واقعے کے پس منظر میں حسبِ ذیل فرمانِ باری تعالیٰ نازل ہوا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے اوپر اللہ کی نعمت یاد کرو، جب ایک قوم نے ارادہ کیا تھا کہ تمھاری طرف اپنے ہاتھ بڑھائیں تو اللہ نے انھیں تم پر ہاتھ ڈالنے سے روک دیا اور اللہ سے ڈرو اور ایمان والوں کو چاہیے کہ اللہ ہی پر بھروسا کریں۔''[2]

---

1 البداية والنهاية: 3/4، و صحيح البخاري، حديث:4136,4135. اس کا آخری حصہ فتح الباری میں ہے۔ اس آیت کا شان نزول تفسیر ابن کثیر میں بھی ہے۔ 2 المآئدة 11:5.

غزوۂ بُحران

یہ غزوہ جمادی الأولی 3 ھ میں وقوع پذیر ہوا۔ رسول اللہ ﷺ تین سو مسلمانوں کا لشکر لے کر نکلے اور مکہ و مدینہ کے راستے میں مقام ''بحران'' [1] پہنچے۔ آپ ﷺ بنو سلیم سے جنگ کرنا چاہتے تھے مگر وہ بکھر چکے تھے، لہٰذا آپ ﷺ مدینہ منورہ سے دس دن باہر رہنے کے بعد واپس تشریف لے آئے۔ [2]

ان غزوات سے یہ بات ہمارے سامنے آتی ہے کہ اسلامی قیادت دشمن کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے، ان کی استعداد سے آگاہ رہنے، ان کے منصوبوں سے باخبر رہنے اور ان کی نقل و حرکت کی کڑی نگرانی کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اس نئی اسلامی حکومت کے خلاف اٹھنے والے عناصر کو ایک خطرہ بننے اور باہم متحد ہونے سے قبل ہی پارہ پارہ کردیا جائے۔

وسیع و عریض صحرا میں یہ غزوات گویا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے جنگی مشقیں تھیں جنھیں نبی مکرم ﷺ جیسے سپہ سالار کی سعادت حاصل تھی۔ یہ عملی، تربیتی اور جنگی مشقیں مسلسل جاری رہتی تھیں جن کا دورانیہ پانچ دن سے ایک ماہ تک ہوتا تھا۔ ان میں معاشرتی اور قومی زندگی کے لیے اسباق، لشکر کو سمع و اطاعت کا جذبہ اور بڑی ماہرانہ تربیت فراہم کی جاتی تھی۔ اسی سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم باطل کا سر کچلنے اور حق کو غالب کرنے کے نت نئے تجربے حاصل کرتے رہتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ ساتھیوں کی میدانِ کارزار میں اترنے کی تربیت کے ساتھ ساتھ دلوں کو جلا بخشنے، شعور کو بیدار کرنے اور اخلاق سنوارنے والی مسجد نبوی میں قائم کردہ تربیتی نشستوں کی طرف بھرپور توجہ دیتے تھے۔ اور یہ عظیم مربی کی موجودگی کا لازمی حصہ ہوتا ہے۔

---

1 بحران: اسے ''باء'' پر زبر یا پیش دونوں طرح سے پڑھا گیا ہے۔ 2 المجتمع المدني للدکتور العمري، ص:61، و التاریخ السیاسي والعسکري للدکتور علي المعطي، ص:280.

خشوع وخضوع سے اللہ تعالیٰ کی عبادت اور عملی نمونہ ہونے کے اعتبار سے آپ ﷺ کی تعلیمات معاشرے میں روشنی کی طرح پھیل رہی تھیں۔ آپ کے اس طریقۂ کار نے مسجد کی تربیتی حیثیت اور مضبوط جنگی مشقوں کی اہمیت کو یکجا کر دیا تا کہ یہ نیا معاشرہ مضبوط اور سیسہ پلائی دیوار کی طرح قوی بن کر نئے تجربات حاصل کر کے چہار دانگِ عالم میں اسلام کا ڈنکا بجا سکے۔[1]

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کی قیادت میں ''قَردہ'' کی طرف مہم جوئی

بدر میں شکست کے بعد مشرکین مکہ شام کے ساتھ تجارت کے لیے کسی دوسرے راستے کی تلاش میں تھے۔ کچھ لوگوں نے نجد عراق کے راستے کو اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ مکہ کے تاجر، جن میں ابوسفیان بن حرب، صفوان بن امیہ، حویطب بن عبد العزّی بھی تھے، ایک لاکھ درہم کی چاندی اور دیگر ساز و سامان لے کر اس مشورے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس راہ پر چل نکلے۔ اسلامی حکومت کے شعبۂ امن و سلامتی کے ذمہ داران میں سے ایک شخص سُلَیط بن نعمان رضی اللہ عنہ کے ذریعے سے رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع مل گئی۔[2]

رسول اللہ ﷺ نے اس قافلے کا راستہ روکنے کے لیے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کو ایک سو (100) اہلکاروں پر مشتمل افراد کا دستہ دے کر روانہ فرمایا۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے انھیں نجد کے ''قَردہ'' نامی چشمے پر پالیا۔ قافلے کے تمام افراد مارے خوف کے بھاگ کھڑے ہوئے۔ مسلمانوں نے قافلے کو ساز و سامان سمیت قبضے میں کر لیا اور ان کے گائیڈ (راستے کی نشاندہی کرنے والے فرد) فرات بن حیان کو قید کر لیا جو آپ ﷺ کی خدمت میں پہنچ کر مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ اس طرح حضرت زید رضی اللہ عنہ ساتھیوں سمیت واپس آ گئے۔ آپ ﷺ نے اس غنیمت کا پانچواں حصہ لے لیا۔ اور بقیہ ساز و سامان اس جنگی مہم کے شرکاء میں تقسیم کر دیا۔[3]

---

[1] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 119,118/3. [2] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 132/3.
[3] السيرة النبوية لابن هشام: 56/3.

غزوۂ بنی قَینُقاع

غزوۂ بنی قینقاع امام زہری رحمہ اللہ کے بیان کے مطابق دو ہجری میں وقوع پذیر ہوا۔ واقدی اور ابن سعد نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ غزوہ دو ہجری، نصف شوال بروز ہفتہ وقوع پذیر ہوا تھا۔[1]

سیرت نگار اور اہلِ مغازی اس پر متفق ہیں کہ یہ بدر کے بعد اس وقت واقع ہوا جب یہود کے قبیلے بنو قینقاع نے رسول اللہ ﷺ کے عہد کا خیال نہ رکھا اور ان شروط پر پورے نہ اترے جو ان سے طے ہو چکی تھیں بلکہ انھوں نے رحمتِ عالم ﷺ اور مسلمانوں کے متعلق خفیہ طور پر دشمنی پر مبنی پالیسی اپنائے رکھی۔ جب بدر میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی تو انھوں نے غیظ و غضب اور حسد و کینہ کا برملا اظہار شروع کر دیا اور علانیہ دشمنی پر اتر آئے۔[2]

نبی اکرم ﷺ نے انھیں مدینہ منورہ کے ایک بازار میں جمع کر کے نصیحت کی اور اسلام کی طرف دعوت دی اور بدر میں قریش جیسے انجام سے باخبر کیا۔[3]

یہود کو چاہیے تو یہ تھا کہ اطاعت کو اپنا شعار بنا لیتے یا کم از کم اس عہد کی دفعات کی پاسداری کرتے جس کی بنا پر وہ نبی ﷺ کی سربراہی میں رہ رہے تھے مگر وہ چیلنج اور دھمکیاں دیتے ہوئے مقابلے پر اتر آئے اور یہ جواب آپ ﷺ کے سامنے رکھا:

> ''اے محمد (ﷺ)! لڑائی سے ناواقف اور ناتجربہ کار قریش کے کچھ لوگوں کو قتل کرنا تم کو دھوکے میں مبتلا نہ کر دے۔ اگر تم ہم سے لڑو گے تو تم جان لو گے کہ ہم کیسے لوگ ہیں اور تم پر یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ ہم جیسے کسی جنگجو سے تمھیں واسطہ نہیں پڑا۔''[4]

اس طرح رفتہ رفتہ یہ بحران شدت اختیار کرتا چلا گیا کیونکہ ان کے جواب میں عہد کی

---

1 السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري:1/299. 2 نضرة النعيم:1/269. 3 اليهود في السنة المطهرة للدكتور عبد الله الشقاري:1/276. 4 اليهود في السنة المطهرة للدكتور عبدالله الشقاري:1/276.

پاسداری یا اسے نبھانے کا کوئی اشارہ تک نہ تھا۔ اس کے برعکس انھوں نے دشمنی پر مبنی ذہنیت، مقابلے کی دعوت، اپنی برتری اور لڑائی کی تیاری کا اظہار کر دیا۔ تب اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق یہ آیات نازل فرمائیں:

﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ۚ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ○ قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ۚ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ۚ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۚ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ○﴾

"(اے نبی!) جن لوگوں نے کفر کیا، ان سے کہہ دیجیے: عنقریب تم مغلوب ہو جاؤ گے اور تم جہنم کی طرف اکٹھے کیے (ہانکے) جاؤ گے اور وہ برا ٹھکانا ہے، تحقیق تمھارے لیے ان دو گروہوں میں ایک بڑی نشانی ہے جو (بدر میں) باہم ٹکرائے۔ ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا گروہ کافر تھا۔ مسلمان ظاہری آنکھوں سے اُن کو اپنے سے دوگنا دیکھ رہے تھے اور اللہ اپنی مدد سے جس کو چاہتا ہے قوت دیتا ہے، بے شک اس میں بصیرت والوں کے لیے عبرت ہے۔"[1]

غزوۂ بنی قینقاع کے اسباب: جب مسلمانوں کو بدر میں فتح حاصل ہوئی اور آپ ﷺ نے یہود سے گفتگو فرمائی تو بنو قینقاع نے مسلمانوں کے ساتھ کیے ہوئے عہد کو توڑنے کا خفیہ ارادہ کر لیا اور مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے موزوں وقت اور بہانے کی تلاش میں رہنے لگے۔ بالآخر ایک انتہائی گھٹیا بہانہ ان کے ہاتھ آ گیا۔ عرب ہی کے کسی علاقے سے آئی ہوئی عورت نے اپنا سامان تجارت بنو قینقاع کے بازار میں فروخت کیا۔ اور ایک یہودی سنار کے پاس بیٹھ گئی۔ یہودیوں نے اس کا چہرہ ننگا کرنا چاہا مگر عورت نے ایسا نہ کرنے دیا۔ سنار نے اس کے کپڑے کا ایک کنارہ اس کی پیٹھ کے ساتھ باندھ دیا۔ وہ جب

1 آل عمرٰن 3:12، 13.

کھڑی ہوئی تو اس کی شرمگاہ ننگی ہوگئی۔ یہود اس پر قہقہے لگانے لگ گئے۔ عورت زور سے چلائی تو ایک مسلمان نے اس سنار پر حملہ کرکے اسے قتل کر دیا۔ وہ سنار یہودی تھا۔ یہود اس مسلمان پر چڑھ دوڑے اور اسے شہید کر دیا۔ اس مسلمان کے ساتھیوں نے یہود کے خلاف مسلمانوں کو مدد کے لیے پکارا۔ مسلمانوں کا پیمانہ صبر لبریز ہوا اس طرح بنو قینقاع اور ان کے درمیان لڑائی ٹھن گئی۔[1]

رسول اللہ ﷺ کو علم ہوا تو آپ ﷺ مہاجرین و انصار کے لشکر کے ہمراہ ان کی طرف چلے۔ یہ دو ہجری نصف شوال، ہفتے کا دن تھا۔[2]

مسلمانوں کے علم بردار حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ تھے، آپ نے مدینہ منورہ پر ابولبابہ بشیر بن عبد المنذر العمری رضی اللہ عنہ کو نائب مقرر کیا۔[3] اور نکلتے وقت ان سے معاہدہ ختم کر دیا جیسا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا تھا:

﴿وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِن قَوْمٍ خِيَانَةً فَانبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ ۝﴾

”اور اگر آپ کو کسی قوم کی طرف سے خیانت (بدعہدی) کا خوف ہو تو برابری (کی سطح) پر ان کا عہد ان کے منہ پر دے ماریں۔ بے شک اللہ خیانت (بدعہدی) کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔“[4]

یہود کا محاصرہ: یہود کو رسول اللہ ﷺ کی آمد کا علم ہوا تو وہ قلعہ بند ہوگئے۔ ابن ہشام کے بیان کے مطابق آپ ﷺ نے پندرہ راتوں تک ان کا محاصرہ جاری رکھا۔[5]

محاصرہ جاری تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے فیصلے پر قلعے سے اترنے پر مجبور ہوگئے۔ در اصل آپ ﷺ نے انھیں اچانک گھیر لیا۔

---

1 السيرة النبوية لابن هشام:54/3. 2 المغازي للواقدي:176/1، والطبقات الكبرىٰ لابن سعد: 29,28/2. 3 تاريخ الطبري:481/2، و اليهود في السنة المطهرة للدكتور عبد الله الشقاري: 279/1. 4 الأنفال8:58. 5 السيرة النبوية لابن هشام:55/3.

اس طرح ان کے طے شدہ امور و معاملات میں ایسی گڑ بڑ پیدا ہوگئی کہ وہ حیرت زدہ ہوگئے کہ کیا کریں۔ آپ ﷺ نے ان کی ہر قسم کی خارجی امداد روک دی۔ ان کی نقل وحرکت معطل ہو کر رہ گئی، الغرض وہ جیل کی سی زندگی گزارنے پر مجبور ہوگئے۔ بالآخر ان حالات نے انھیں ڈٹ جانے اور مقابلہ کرنے سے مایوس کر دیا۔ یہی یہودی کچھ دن پہلے تک آپ ﷺ کو دھمکیاں دے رہے تھے کہ ہم قوت، جنگ اور بہادری میں قریشی مشرکوں سے مختلف ہیں لیکن اب آپ ﷺ کے حکم پر قلعے سے اترنے پر مجبور تھے۔[1]

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کے حکم پر انھیں باندھ دیا گیا۔ ان کی مشکیں کس دی گئیں۔ اس کام کے لیے آپ ﷺ نے منذر بن قدامہ سلمی اوسی رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا۔[2]

بنوقینقاع کے یہود کا انجام: منافقوں کے سرغنے عبداللہ بن ابی ابن سلول نے چاہا کہ اپنے حلیفوں کو رہائی دلوائے، چنانچہ وہ منذر بن قدامہ رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہنے لگا: ''انھیں کھول دو۔'' منذر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ان لوگوں کی رہائی کا مطالبہ کر رہے ہو جنھیں رسول اللہ ﷺ نے باندھ رکھنے کا حکم فرمایا ہے۔ اللہ کی قسم! جو شخص انھیں کھولنے کی کوشش کرے گا میں اس کی گردن اڑا دوں گا۔''[3]

یہ صورت حال دیکھ کر عبداللہ بن ابی واپس ہولیا اور انھیں قید سے چھڑوانے کے لیے آپ ﷺ سے حکم جاری کروانے پر مجبور ہوگیا۔[4]

پھر وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور عرض کرنے لگا: ''اے محمد (ﷺ)! میرے دوستوں کے ساتھ احسان کیجیے۔'' دراصل بنوقینقاع قبیلۂ خزرج کے حلیف تھے۔ آپ ﷺ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے پھر کہا: ''اے محمد (ﷺ)! میرے دوستوں کے متعلق احسان برتیے۔'' راوی کہتا ہے کہ آپ ﷺ نے اس سے منہ پھیر لیا۔ اب ابن ابی نے

[1] الصراع مع اليهود لأبي فارس:144/1. [2] اليهود في السنة المطهرة للدكتور عبد الله الشقاري: 280/1. [3] التاريخ الإسلامي للحميدي:33,32/5. [4] التاريخ الإسلامي للحميدي:33,32/5.

آپ ﷺ کی زرہ کے گریبان میں ہاتھ ڈالا تو آپ ﷺ نے فرمایا: «أَرْسِلْنِي» ”مجھے چھوڑ دے۔“ آپ ﷺ سخت ناراض ہوئے حتی کہ آپ ﷺ کے چہرۂ انور پر غصے کے آثار نمایاں ہونے لگے۔

آپ ﷺ نے پھر فرمایا: «وَيْحَكَ أَرْسِلْنِي» ”تو تباہ ہو مجھے چھوڑ دے۔“ اس نے کہا: ”ہرگز نہیں، اللہ کی قسم! جب تک آپ میرے ساتھیوں پر احسان نہیں کریں گے آپ کو نہیں چھوڑوں گا۔ یہ چار سو زرہ پوش اور تین سو بغیر زرہ افراد ہی نے تو مجھے ہر سیاہ و سرخ سے محفوظ کر رکھا ہے۔ آپ انھیں ایک ہی صبح میں ختم کر دینا چاہتے ہیں؟ اللہ کی قسم! میں حوادثِ زمانہ سے ڈرتا ہوں۔“ تب آپ ﷺ نے فرمایا: «هُمْ لَكَ» ”یہ سب تیرے لیے (آزاد چھوڑے)۔“[1]

رسول اللہ ﷺ نے انھیں آزاد کر کے جلاوطنی کا حکم دے دیا۔ ان کے اموال بطور غنیمت آپ ﷺ اور مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔ ان کے اموال کی نگرانی اور اعداد و شمار محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کے سپرد تھے۔

اب پھر ابن ابی نے بنوقینقاع کو اپنی جگہ بحال اور برقرار رکھنے کے لیے رسول اللہ ﷺ سے بات چیت کرنا چاہی۔ دیکھا تو رسول اللہ ﷺ کے دروازے پر حضرت عویم بن ساعدہ انصاری اوسی رضی اللہ عنہ بطور دربان موجود تھے۔ حضرت عویم رضی اللہ عنہ نے اسے واپس کرتے ہوئے کہا: ”بغیر اجازت داخل نہیں ہو سکتے۔“ تو ابن ابی نے انھیں دھکا دیا۔ جواباً حضرت عویم رضی اللہ عنہ نے بھی سختی سے کام لیا حتی کہ ابن ابی کا چہرہ دیوار سے لگ کر زخمی ہو گیا اور خون بہنے لگا۔[2]

اس واقعے سے نبی ﷺ کی عظیم سیاسی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نے ابن ابی کے مطالبے کو تسلیم کر لیا کہ شاید یہ مشفقانہ سلوک اس کے دل کو صاف کر کے گمراہی

---

1 اليهود في السنة المطهرة للدكتور عبد الله الشقاري: 281/1. 2 التاريخ الإسلامي للحميدي: 30/5.

کے پردے زائل کردے اور اسے ہدایت نصیب ہو جائے۔ آپ ﷺ نے اس سے فرمایا: «هُمْ لَكَ» ''یہ تمام تیرے لیے (آزاد ہیں)۔'' ابن ابی کے راہ راست پر آنے سے شاید وہ لوگ بھی سدھر جائیں جو ابن ابی کی چودھراہٹ کا دم بھرتے ہیں، نتیجتاً مسلمانوں کو دشمنانِ اسلام کے مکروفریب کی زد میں آنے کے بجائے اتفاق واتحاد حاصل ہو سکے گا۔[1]

یہاں آپ ﷺ کی ایک اور دور اندیشی بھی کارفرما تھی کہ اسلامی معاشرے میں ممکنہ طور پر وقوع پذیر ہونے والے فتنے کی روک تھام کے لیے کسی چیز کی قربانی دے دیں۔ وہ فتنہ یوں سر اٹھاتا نظر آرہا تھا کہ بعض انصار جو ابھی نئے نئے اسلام لائے تھے ابن ابی اپنے اثرورسوخ سے ان پر اثر انداز ہو سکتا تھا۔[2]

رسول اللہ ﷺ نے اس کی بدسلوکی کے باوجود نرمی اور صبر کا انداز اپنایا تاکہ فتنے سے تحفظ مل جائے اور جنھیں ناواقفیت کی بنا پر اس سے ہمدردی ہے وہ اس کے برے کردار سے آگاہ ہو جائیں اور اس سے نرمی کے بجائے نفرت کا اظہار کر کے علیحدہ ہو جائیں۔ آپ ﷺ کے اس اسلوب نے عملی طور پر بھرپور کامیابی حاصل کی اور سب لوگ ابن ابی کی اصلیت جان گئے۔ اس کے انتہائی قریبی ساتھی جن میں اس کے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ اس واقعے کے بعد جب کبھی ابن ابی گفتگو کرتا تو وہ اسے خاموش کرا دیتے۔ اور اس گفتگو سن کر بیزاری ظاہر کرتے۔[3]

بلکہ انھوں نے اسے قتل کرنے کا ارادہ بھی کر لیا تھا۔ جس کی تفصیل ان شاء اللہ آئندہ آرہی ہے۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کا یہود سے اظہار براءت: جب بنوقینقاع نے معاہدہ توڑ دیا تو حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرفداری میں اپنے حلیفوں سے بیزاری کا اعلان کیا اور ان

---

1 المنهج الحركي للسيرة النبوية للدكتور الغضبان، ص: 247. 2 التاريخ الإسلامي للحميدي: 32/5. 3 الصراع مع اليهود لأبي فارس: 148/1.

کی دوستی کو اتار پھینکا۔ ان کا تعلق بنوعوف سے تھا۔ بنوعوف کا بھی بنوقینقاع سے ایسا ہی معاہدہ تھا جیسا ابن ابی کا تھا۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ عرض پرداز ہوئے: ''اے اللہ کے رسول! میں اللہ، اس کے رسول اور مومنوں سے دوستی رکھتا ہوں اور ان کفار کے حلف، معاہدے اور دوستی سے بیزاری کا اظہار کرتا ہوں۔''[1]

جب بنوقینقاع کی جلاوطنی کا فیصلہ ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کو انھیں جلاوطن کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ بنوقینقاع کہنے لگے: ''اے ابو ولید! اوس و خزرج میں سے آپ کا ہمارے ساتھ یہ سلوک؟ حالانکہ ہم آپ کے حلیف ہیں۔'' حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تم نے جب جنگ کی ابتدا کی تھی میں نے اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا تھا: اے اللہ کے رسول! میں ان سے اور ان کے عہد و پیمان سے اظہارِ لاتعلقی کر کے آپ سے ناطہ جوڑتا ہوں۔'' ابن ابی اور عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ دونوں کا ان سے ایک ہی طرح کا معاہدہ تھا۔ یہ سن کر عبداللہ بن ابی کہنے لگا: ''اپنے حلیفوں سے بیزاری کرتے ہو؟ تمھارے ساتھ ان کا ایسا سلوک نہ تھا۔'' پھر اس نے مشکل اوقات میں بنوقینقاع کے آزمائشوں میں پورے اترنے کے مواقع حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کو یاد دلائے۔ حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ نے جواباً فرمایا: ''اے ابوالحباب! اب دل پہلے سے نہیں رہے اور اسلام نے سابقہ معاہدے مٹا دیے ہیں۔ رہے تم تو اللہ کی قسم! ایسے معاملے پر اڑے ہوئے ہو جس کی قباحت ہم مستقبل قریب میں دیکھ لیں گے۔''

بنوقینقاع نے کہا: ''اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! لوگوں کے ساتھ ہمارا لین دین اور قرض وغیرہ باقی ہے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «تَعَجَّلُوا وَ ضَعُوا» ''جلدی کرو اور کمی کرو۔'' حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ نے انھیں نکالنا اور جلاوطن کرنا شروع کر دیا تو وہ کچھ مہلت کا تقاضا کرنے لگے۔ حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تمھارے لیے تین دن ہیں۔ ان سے زیادہ تمھیں ایک

1 اليهود في السنة المطهرة للدكتور عبد الله الشقاري:1/283,282.

لمحے کی مہلت بھی نہیں ملے گی۔ اور یہ رخصت نبی ﷺ کی طرف سے تھی۔ اگر یہ بات میرے اختیار میں ہوتی تو قطعاً یہ مہلت نہ دیتا۔ جب تین دن کی مہلت گزر گئی تو حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ ان کے پیچھے چلے یہاں تک کہ وہ شام کا راستہ اختیار کر گئے۔ آپ ان سے کہہ رہے تھے: ''کہیں دور اونچی جگہ اختیار کرلو۔'' یہ کہتے ہوئے خلف الزباب تک ان کے پیچھے گئے، پھر واپس آگئے جبکہ یہود ''اذرعات'' چلے گئے۔[1]

بنوقینقاع مدینہ سے اس طرح ذلیل وخوار ہوکر نکلے کہ اپنا مال اور اسلحہ مسلمانوں کے لیے غنیمت کے طور پر چھوڑ گئے۔ جبکہ یہ یہودی قبائل میں سے سب سے بہادر اور جنگجو ہونے کے ساتھ ساتھ جنگی سامان اور زیادہ نفری کے مالک تھے، اس لیے اس اعصاب شکن سزا کے بعد کافی عرصہ تک یہودی قبائل پر سناٹا طاری رہا، ان کے دلوں پر مسلمانوں کا رعب چھایا رہا اور ان کا سارا غرور خاک میں مل گیا۔

یہود دوستی اور یہود بیزاری پر اترنے والی آیات: عبداللہ بن ابی بن سلول کی یہود دوستی اور حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے یہود بیزاری پر یہ آیات نازل ہوئیں:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ ؔ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ○ فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰۤى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَاۤ اَسَرُّوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ○ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَهٰۤؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ؕ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ○ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗۤ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى

[1] اليهود في السنة المطهرة للدكتور عبدالله الشقاري:1/285,284.

الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ○ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ○ وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ○﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یہودیوں اور عیسائیوں کو دوست نہ بناؤ، وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تم میں سے جو کوئی ان سے دوستی رکھے گا تو بے شک وہ انھی میں سے ہوگا۔ یقیناً اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ (اے نبی!) پس آپ ان لوگوں کو دیکھتے ہیں جن کے دلوں میں (منافقت کا) روگ ہے کہ وہ دوڑ کر ان (یہودیوں) میں جاتے ہیں اور (ان سے) کہتے ہیں: ہم ڈرتے ہیں کہ ہمیں کوئی مصیبت (نہ) پہنچے، پھر قریب ہے کہ اللہ (تمھیں) فتح عطا کرے یا اپنی طرف سے کوئی اور بات ظاہر کرے تو یہ لوگ (اپنی منافقت پر) پچھتائیں گے جسے وہ اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں۔ اور (اس وقت) وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں، کہیں گے: کیا یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے بڑی شدومد سے اللہ کی قسمیں کھائی تھیں کہ بے شک وہ تمھارے ساتھ ہیں؟ ان کے عمل برباد ہوگئے، چنانچہ وہ خسارہ اٹھانے والوں میں ہوگئے۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے تو پھر اللہ جلد ایسے لوگ لائے گا کہ وہ ان سے محبت کرتا ہوگا اور وہ اس سے محبت کرتے ہوں گے، وہ مومنوں پر نرمی کرنے والے ہوں گے اور کافروں پر سختی کرنے والے، وہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے، یہ اللہ کا فضل ہے، وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ اور اللہ (بڑی) وسعت والا، خوب جاننے والا ہے۔ تمھارے

دوست تو صرف اللہ اور اس کا رسول اور وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے، جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکاۃ دیتے ہیں اور وہ رکوع کرنے والے ہیں۔ اور جو کوئی اللہ سے اور اس کے رسول سے دوستی رکھتا ہے اور ان لوگوں سے دوستی رکھتا ہے جو ایمان لائے ہیں تو (وہ اللہ کا گروہ ہیں اور) یقیناً اللہ کا گروہ ہی غالب آنے والا ہے۔''[1]

ان آیات کے متعلق ابن عطیہ کہتے ہیں: ''جب بدر کا معاملہ اپنے اختتام کو پہنچا تو بنوقینقاع کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ آپ ﷺ نے انھیں قتل کرنے کا ارادہ فرمالیا تو عبداللہ بن ابی انھیں بچانے کے لیے آگے بڑھا۔ یہ ان کا حلیف تھا۔ ابن ابی کے حلف جیسا حلف ان کے ساتھ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کا بھی تھا۔ تو جب عبادہ رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہود سے ہاتھ کھینچ لیا ہے اور یہود نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے معاندانہ رویہ اختیار کر رکھا ہے تو انھوں نے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! میں اللہ تعالیٰ کی طرفداری کرتے ہوئے یہود کے معاہدے اور دوستی سے بیزاری کا اظہار کرتا ہوں۔'' اور عبداللہ بن ابی نے کہا: ''میں تو یہود کی دوستی وتعلق سے قطعاً بیزار نہیں ہوں۔ میرا تو ان کے بغیر گزارہ نہیں۔ میرے لیے تو وہ ضروری ہیں کیونکہ مجھے گردش ایام کا ڈر ہے۔''[2]

ایک طرف ابن سلول تھا جو نفاق میں ڈوبا ہوا تھا اور دوسری طرف عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ تھے جنھوں نے نبوی طریقے پر تربیت پائی تھی۔ دونوں میں بڑا واضح فرق ہے۔ سیدنا عبادہ رضی اللہ عنہ کا دل پاک، روح شفاف، ایمان مضبوط اور عقل روشن تھی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ یہ دورِ جاہلیت کی عصبیت کے اثرات، خواہشات اور ذاتی مصلحتوں سے مبرّا تھے اور خالص عقیدہ رکھنے والے سچے مسلمان کے لیے ایک زندہ مثال تھے۔[3]

[1] المآئدة 5:51-56. [2] المحرر الوجيز لابن عطية: 1/478,477. [3] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 1/302.

اسلامی حکومت کے خلاف اکسانے والوں کا صفایا

فتنہ و جنگ پر ابھارنے والوں سے خطرہ علانیہ طور پر مسلمانوں سے جنگ کرنے والوں اور تلوار لہرانے والوں سے کسی صورت بھی کم نہیں کیونکہ اگر مسلمانوں کے خلاف یہ برانگیختہ کرنے والے نہ ہوتے تو فتنہ بپا ہی نہ ہوتا۔ اسی لیے حق کو غالب کرنے اور فتنے کی آگ بجھانے کے لیے رسول اللہ ﷺ نے ایسے شر پسند عناصر کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کرنا شروع کر دیا۔ جنگ بدر کے بعد ان فتنہ پردازوں کی خاصی تعداد قتل ہوئی۔[1]

ان شر پسند عناصر میں سے چند ایک یہ ہیں:

عصماء بنت مروان: یہ اسلام کی عیب جوئی کرتی اور رسول اللہ ﷺ کے خلاف ابھارا کرتی تھی۔ اسے عمیر بن عدی الخطمی رضی اللہ عنہ نے ٹھکانے لگا دیا۔ بعد ازاں انھوں نے اس (قتل) کے بارے میں نبی ﷺ سے دریافت کیا کہ مجھ پر اس کا کوئی گناہ تو نہیں؟ آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: «نَصَرْتَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ يَا عُمَيْرُ!» ''عمیر! تم نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی مدد کی ہے۔'' اور پھر فرمایا: «لَا يَنْتَطِحُ فِيهَا عَنْزَانِ» ''اس عورت کے (قتل کے) معاملے میں قطعاً دو رائے نہیں ہو سکتیں۔ (تم نے درست کیا ہے)''[2]

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بنو خطمہ سے کئی لوگ مسلمان ہو گئے اور جو اسلام چھپائے بیٹھے تھے وہ اسلام ظاہر کرنے لگے۔[3]

ابو عفک یہودی کا قتل: یہ بنو عمرو بن عوف کا ایک بوڑھا یہودی شاعر تھا جو لوگوں کو رسول اللہ ﷺ کے خلاف اکساتا تھا۔ آپ ﷺ نے اس کے بارے میں فرمایا: «مَنْ لِّي بِهٰذَا الْخَبِيثِ؟» ''اس خبیث سے مجھے کون محفوظ کرے گا؟'' حضرت سالم بن عمیر رضی اللہ عنہ اس مہم پر روانہ ہوئے اور اسے قتل کر دیا۔[4]

[1] قراءة سياسية للسيرة النبوية للدكتور قلعجي، ص: 138. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 285/4، اور دیکھیے: تاريخ بغداد: 99/13. [3] نضرة النعيم: 295/1. [4] نضرة النعيم: 296/1.

کعب بن اشرف کا قتل: غزوۂ بدر و احد کے درمیانی عرصے میں اسلامی حکومت کے خلاف ابھارنے والوں کو قتل کرنے کے واقعات میں سے ایک اہم ترین واقعہ کعب بن اشرف کے قتل کا ہے۔

کعب بن اشرف کا تعلق قبیلۂ طے کی شاخ بنونبہان سے تھا۔ زمانۂ جاہلیت میں اس کا والد ایک شخص کو قتل کرنے کے بعد مدینہ آ کر یہود بنونضیر کا حلیف بن گیا۔ اور ابوالحقیق کی بیٹی عقیلہ سے شادی رچالی جس نے کعب کو جنم دیا۔[1]

کعب بن اشرف شاعر تھا اور اسلام دشمنی میں پیش پیش تھا۔ معرکۂ بدر میں مسلمانوں کی فتح یابی سے اس کے اندر غیظ و غضب کی آگ بھڑکنے لگی۔ یہ فوراً مکہ پہنچا اور رسول اللہ ﷺ کی شان میں ہرزہ سرائی کے ساتھ ساتھ قریش کو اپنے مقتولین کا بدلہ لینے پر ابھارنے لگا۔ اپنے اشعار میں ان کا نوحہ کرتا اور انھیں اسلام اور مسلمانوں پر فیصلہ کن وار کی دعوت دیتا۔[2]

بدر میں قتل کیے گئے مشرکوں پر کہے گئے کعب کے چند اشعار کا ترجمہ ملاحظہ کریں:

''بدر کی چکی (جنگ) نے اہل بدر کو خوب پیس دیا ہے۔ بدر جیسے حادثات ہی پر چیخا چلایا جاتا ہے اور آنسو بہائے جاتے ہیں۔

لوگوں کے سردار اپنے ہی حوضوں پر قتل کر دیے گئے۔ اسے انوکھا نہ جانو، بلا شبہ حکمران ایسے ہی گرا کرتے ہیں۔

اس میدان میں روشن چہروں والے کتنے ہی بزرگ قتل کر دیے گئے جن کے ہاں زمانے کے مارے پناہ لیتے تھے۔

جن لوگوں کی ناراضی میرے لیے خواری و رسوائی کا باعث ہے وہ کہہ رہے ہیں کہ اشرف کا بیٹا کعب بے صبری کا مظاہرہ کر رہا ہے۔

---

1 السيرة النبوية لابن هشام:3/58. 2 نضرة النعيم:1/298.

انھوں نے سچ کہا ہے، کاش! جب وہ قتل ہوئے تھے زمین اپنے پر موجود لوگوں کو اپنے اندر دھنسا لیتی اور انھیں نگل جاتی۔

مجھے خبر دی گئی ہے کہ تمام بنو کنانہ نے ابو ولید کی بات کو تسلیم کرلیا اور انھوں نے اپنے اعضا کٹوا لیے۔'' [1]

کعب بن اشرف قریش کو مسلسل رسول اللہ ﷺ کے خلاف ابھارتا، مسلمانوں سے جنگ پر اکساتا اور آپ ﷺ کی ہجو کر کے اذیت دیتا رہا۔ ابوسفیان (رضی اللہ عنہ) نے اس سے پوچھا: ''میں تمھیں اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ تم بتاؤ کیا ہمارا دین اللہ کو زیادہ پسند ہے یا محمد (ﷺ) اور اس کے ساتھیوں کا؟'' وہ کہنے لگا: ''تم ان کی نسبت زیادہ صحیح راہ پر ہو۔'' بعدازاں وہ اس حال میں مکہ سے نکلا کہ اس نے آپ ﷺ کی دشمنی کا اظہار اور آپ (ﷺ) کی توہین کرتے ہوئے مشرکین کو مسلمانوں کے ساتھ جنگ پر آمادہ کرلیا تھا۔ [2]

جب کعب مدینہ آگیا تو کھلم کھلا رسول اللہ ﷺ سے دشمنی کا اظہار کرنے لگا اور آپ کی ہجو شروع کردی۔ اس کی کمینگی اور تکبر کا یہ عالم تھا کہ مسلمان عورتوں کے متعلق بھی زبان درازی کرنے لگا۔ حتی کہ آپ کے چچا جان عباس رضی اللہ عنہ کی بیوی ام فضل بنت حارث رضی اللہ عنہا کے محاسن کہہ ڈالے، ان کے متعلق اس نے یہ اشعار کہے:

''کیا تم جا رہے ہو تمھیں کوئی مقام و مرتبہ میسر نہ ہو (تم نے کوئی شرف پایا ہی نہیں) جبکہ تم ام فضل کو حرم میں چھوڑے جا رہے ہو۔

وہ زعفرانی رنگ و خوشبو والی زرد (عورت) اگر تو اسے شیشی میں نچوڑنا چاہے تو نچڑ جائے وہ مہندی اور کتم کے رنگ والی۔

وہ بنو عامر کی یکتا عورت جس کی بنا پر دل بے قرار ہے اور اگر وہ چاہے تو کعب کو اس (عشق کی) بیماری سے شفایاب کردے۔

---

1 تاریخ الإسلام للذهبي: 158/2، والسيرة النبوية لابن هشام: 57/3. 2 تاريخ الإسلام للذهبي: 158/2.

میں نے اس سے قبل رات کے وقت سورج طلوع ہوا نہیں دیکھا یہاں تک کہ یہ رات کی تاریکی میں ہم پر ظاہر ہوئی۔''[1]

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کعب بن اشرف کی گھات میں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حسان رضی اللہ عنہ کو کعب کا سامنا کرنے پر ابھارتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم حسان رضی اللہ عنہ کو برابر مکہ میں کعب کے میزبانوں کی اطلاع پہنچا رہے تھے۔ جب کعب مکہ میں مطلب بن ابی وداعہ بن ضبیرہ سہمی اور اس کی بیوی عاتکہ بنت اسید بن ابوالعیص کے گھر آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسان رضی اللہ عنہ کو اس سے باخبر کیا۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے ابن اشرف کو اپنے گھر جگہ دینے پر ان میزبانوں کی خوب مذمت کی۔ جب عاتکہ کو اس مذمت کی خبر پہنچی تو وہ کعب بن اشرف یہودی کا ساز و سامان باہر پھینکتے ہوئے اپنے خاوند سے کہنے لگی: ''ہمارا اس یہودی سے کیا تعلق؟ تم دیکھتے نہیں حسان ہمارے ساتھ کیا کر رہا ہے؟'' اب کعب انھیں چھوڑ کر دوسرے لوگوں کا رخ کرنے لگا۔ وہ جب بھی کسی قوم کے پاس جاتا نبی صلی اللہ علیہ وسلم حسان رضی اللہ عنہ کو بلاتے اور اس کی اقامت گاہ سے باخبر فرماتے، حسان رضی اللہ عنہ ان کی مذمت کر دیتے تو اس کے میزبان بھی اسے دھتکار دیتے، یہ اسی طرح نقل مکانی کرتا رہا حتی کہ ہر گھر نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے سامنے کشادہ راہیں تنگ ہونے لگیں اور وہ ذلیل و خوار ہو کر مدینہ لوٹ آیا۔ اور اپنے حتمی انجام اور سزا، جس کا وہ مستحق تھا، اس کا انتظار کرنے لگا۔[2]

کعب کے خلاف حضرت حسان رضی اللہ عنہ کی تشہیری جنگ اپنے مقاصد پورے کر رہی تھی۔

حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے اس کے رد میں کہے گئے چند اشعار کا ترجمہ یوں ہے:

''کیا کوئی کعب پر رویا ہے، پھر اس پر آنسو بہائے گئے ہیں، جبکہ کعب نے ایسی ذلت آمیز زندگی گزاری کہ اس کی سنی ہی نہیں جاتی تھی۔

میں نے بدر کی وادی میں ان کے ایسے مقتولین دیکھے ہیں جن کے لیے آنکھیں

[1] تاریخ الإسلام للذهبي: 160/2. [2] الصراع مع اليهود لأبي فارس: 111/1.

لگا تار بہہ رہی ہیں اور آنسو بہا رہی ہیں۔

تو نے کمینے غلاموں کو خوب رلایا ہے اب تو خود رو جس طرح چھوٹا کتا چھوٹی کتیا کے پیچھے آواز نکالتا ہے۔

بلاشبہ رحمٰن نے ہمارے سردار اور قائد ﷺ کو مطمئن کر دیا ہے اور جن لوگوں نے ان سے جنگ کی انھیں ذلیل وخوار کر دیا اور وہ قتل کر کے زمین پر گرائے گئے۔

اور ان میں سے وہ شخص نجات پا گیا اور بچ نکلا جسے ان کے ساتھ قلبی لگاؤ ہے اور اس کے ڈر کے مارے اس کا دل پھٹا جا رہا ہے۔''[1]

کعب بن اشرف کا انجام: اس یہودی نے رسول اللہ ﷺ، عام مسلمانوں اور عزت مآب، اطاعت شعار اور عبادت گزار مسلم خواتین کے متعلق کئی ایک جرائم، خیانتوں اور قباحتوں کا ارتکاب کیا۔ جن میں سے ایک ایک جرم اپنی اپنی جگہ عہد کی خلاف ورزی میں شمار ہوتا اور قتل کی سزا کا مستوجب تھا، جبکہ اس فتنہ انگیز یہودی میں تو یہ تمام جرائم یکجا ہو چکے تھے۔[2]

کعب بن اشرف آپ ﷺ کی ہجو، دشمنانِ اسلام سے نرمی کا اظہار اور ان کے مقتولین کی مرثیہ خوانی کر کے انھیں مسلمانوں کے خلاف ابھار کر معاہدے کی خلاف ورزی کا مرتکب ہو چکا تھا۔ ان جرائم کی بنا پر یہ حربی کافر بن چکا تھا اور اس لائق ہو چکا تھا کہ اس کا خون رائیگاں قرار دیا جائے، چنانچہ آپ ﷺ نے اس کے قتل کا حکم جاری فرما دیا۔[3]

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کے قتل کا واقعہ تفصیلی طور پر بیان کیا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ لِّكَعْبِ بْنِ الْأَشْرَفِ فَإِنَّهُ قَدْ اٰذَى اللّٰهَ وَرَسُولَهُ» ''کعب بن اشرف کی خبر کون لے گا؟ اس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو اذیت دی ہے۔''

---

1 السيرة النبوية لابن هشام:3/59. 2 الصراع مع اليهود لأبي فارس: 1/111. 3 السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري:1/304.

محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کھڑے ہو کر عرض کرنے لگے: ''یا رسول اللہ! آپ پسند فرمائیں گے کہ میں اسے قتل کر دوں۔''

فرمایا: «نَعَمْ!» ''ہاں!''

محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''مجھے اجازت دیجیے میں جو مناسب سمجھوں کہہ لوں؟''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «قُلْ» ''کہہ لینا (اجازت ہے)۔''

محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کعب بن اشرف کے پاس آئے اور کہا: ''اس شخص (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہم سے زکاۃ و صدقہ مانگا ہے اور ہمیں مشکل میں ڈال دیا ہے۔ میں تمھارے پاس کچھ قرض کے لیے حاضر ہوا ہوں۔''

کعب نے کہا: ''اللہ کی قسم! مستقبل میں تم اس سے اور بھی اکتا جاؤ گے۔''

محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ: ''ہم نے اس کی پیروی کی ہے اور انجام دیکھنے سے قبل اسے چھوڑنا بھی نہیں چاہتے۔ اور اب ہم چاہتے ہیں کہ تم ہمیں ایک یا دو وسق (غلّہ) بطور قرض دے دو۔''

کعب: ''ٹھیک ہے۔ کچھ نہ کچھ میرے پاس گروی رکھو۔''

محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ: ''تم کیا چیز گروی چاہتے ہو؟''

کعب: ''اپنی عورتیں میرے پاس گروی رکھ دو۔''

محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ: ''تم سارے عرب سے خوبصورت ہو، ہم تمھارے پاس عورتیں کیسے گروی رکھ دیں۔''

کعب: ''تو پھر اپنے بیٹے میرے پاس گروی رکھ دو۔''

محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ: ''اپنے بیٹے کیسے تمھارے پاس گروی رکھیں۔ لوگ انھیں ساری زندگی طعنہ دیں گے کہ یہ ایک یا دو وسق کے عوض گروی رکھے گئے تھے۔ یہ تو ہمارے لیے بڑی شرم کی بات ہے۔ اس کے بجائے ہم تمھارے پاس اپنے ہتھیار گروی رکھتے ہیں۔''

اب محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے اس سے وعدہ کر لیا کہ میں پھر آؤں گا۔ ایک رات محمد بن

مسلمہ رضی اللہ عنہ آئے۔ ان کے ساتھ ابو نائلہ رضی اللہ عنہ بھی تھے جو کعب کے رضاعی (دودھ شریک) بھائی تھے۔ کعب نے انھیں قلعے کے پاس بلالیا اور خود قلعے سے نیچے اترنے لگا تو اس وقت اس کی بیوی بولی: ''اس وقت باہر کہاں جارہے ہیں؟''

کعب: ''یہ محمد بن مسلمہ اور میرا بھائی ابو نائلہ ہے۔''

وہ کہنے لگی: ''مجھے ایسی آواز سنائی دے رہی ہے جس سے خون ٹپک رہا ہے۔''

کعب: ''میرے بھائی محمد بن مسلمہ اور دودھ شریک ابو نائلہ کے سوا کوئی نہیں۔ باعزت انسان کو اگر رات کے وقت نیزہ مارنے کے لیے بلایا جائے تو وہ ضرور جائے گا۔''

ادھر محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ دو آدمی ساتھ لے کر آئے۔[1] اور ان سے کہنے لگے: ''جب کعب آئے گا میں اس کے بال تھام کر سونگھوں گا۔ تم جب دیکھو کہ میں نے اچھی طرح اس کے سر کو پکڑ لیا ہے تم اپنا کام کر دکھانا اور اسے قتل کر دینا۔'' کعب چادر اوڑھے اترا، اس سے خوشبو مہک رہی تھی۔

محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں نے آج کی طرح عمدہ خوشبو کبھی نہیں محسوس کی۔ مجھے اپنا سر سونگھنے کی اجازت دیتے ہو۔''

کعب: ''ہاں۔''

محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے اسے سونگھا اور پھر اپنے ساتھیوں کو بھی سونگھایا، پھر کعب سے کہا: ''مجھے دوبارہ اجازت ہے؟'' کہنے لگا: ''ہاں!'' اب جب محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے اسے اچھی طرح زور سے تھام لیا تو اپنے ساتھیوں سے کہا: ''پکڑ لو۔'' تو انھوں نے اسے قتل کر دیا۔

---

1 سیرت کی کتابوں میں کعب کو قتل کرنے والے پانچ اشخاص کا تذکرہ ہے: محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ۔ سِلکان بن سلامہ بن وقش ابو نائلہ رضی اللہ عنہ جن کا تعلق بنو عبد الاشہل سے تھا۔ یہ کعب کے دودھ شریک بھائی تھے۔ عباد بن بشر بن وقش رضی اللہ عنہ ان کا تعلق بھی بنو عبد الاشہل سے تھا اور اسی طرح حارث بن اوس بن معاذ رضی اللہ عنہ یہ بھی بنو عبد الاشہل سے تھے، بنو حارثہ میں سے ابو عبس بن جبر رضی اللہ عنہ تھے۔ انھوں نے ابو نائلہ کو کعب سے گفتگو کرنے کے لیے آگے کیا۔

بعدازاں وہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو اس کی خبر دی۔[1]

سیرت ابن ہشام میں ہے کہ جب محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کعب کو قتل کرنے کی تیاری کر چکے تو اس کے بعد تین دن تک انتہائی معمولی خوراک لے رہے تھے جس سے زندگی بحال رہ سکے۔ آپ ﷺ کو اس کی اطلاع ملی تو اسے بلا کر دریافت فرمایا:

«لِمَ تَرَكْتَ الطَّعَامَ وَالشَّرَابَ؟» ''تم نے کھانا پینا کیوں چھوڑ دیا ہے؟''

عرض کیا: ''یارسول اللہ! میں نے آپ سے کعب کو قتل کرنے کے سلسلے میں جو بات کی ہے مجھے معلوم نہیں اسے پورا بھی کرسکوں گا یا نہیں؟''

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «إِنَّمَا عَلَيْكَ الْجَهْدُ» ''تم پر تو صرف کوشش کرنا لازم ہے۔''

عرض کیا: ''ہمیں ضرور کچھ نازیبا الفاظ کہنے پڑیں گے؟''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «قُولُوا مَا بَدَا لَكُمْ» ''تمھارے احوال جو تقاضا کریں کہہ لینا۔''[2]

سیرت ابن اسحاق میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے حسن سند سے منقول ہے کہ آپ ﷺ ان کے ساتھ بقیع الغرقد تک تشریف لے گئے، پھر انھیں اس مہم پر روانہ کرتے ہوئے فرمایا: «اِنْطَلِقُوا عَلَى اسْمِ اللّٰهِ، اللّٰهُمَّ أَعِنْهُمْ» ''اللہ تعالیٰ کے نام سے اپنے اس سفر کا آغاز کرو۔ اے اللہ! ان کی نصرت و اعانت فرما۔''[3]

اسباق اور عبرتیں: کعب کے قصۂ قتل میں متعدد عبرتیں، اسباق اور حکمتیں ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اسلام اور حکومت اسلامیہ کے دشمنوں سے کیسا سلوک کیا۔ اس سے یہ بات تو روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ عہد شکن انسان کی سزا قتل ہی ہے۔ اور آپ ﷺ نے یہی فیصلہ فرمایا۔ اور یہ بھی ثابت ہوا کہ جو شخص معاہد ہو کر پیغمبر علیہ السلام کو گالی گلوچ کرے

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 4037، و صحيح مسلم، حديث: 1801. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 58/3. [3] السيرة النبوية لابن هشام: 59/3.

اور پیغمبر ﷺ کی ہجو کر کے آپ ﷺ کی دل آزاری کرے اس کی سزا قتل ہی ہے۔ اور کعب کے ساتھ یہی سلوک ہوا۔ اس سے یہ نتیجہ بھی بآسانی نکالا جاسکتا ہے کہ شاتم رسول، خواہ معاہد ہو یا کوئی اور اس کی گردن بطور سزا کاٹ دی جائے گی۔ ان احکام کی عمدہ تفصیل شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''الصارم المسلول علی شاتم الرسول ﷺ'' میں کی ہے۔

❁ کعب بن اشرف کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کے حکم کو اس انداز سے عملی جامہ پہنانے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ بعض امور کو مصلحتِ عامہ کے تحت مخفی طور پر بھی بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔ خاص طور پر جب کسی حکم کو ظاہری طور پر ادا کرنے میں مسلمانوں کو کسی فتنے کا ڈر یا کوئی خطرہ لاحق ہو جو مسلمانوں کے لیے کسی بڑی مشقت کا پیش خیمہ بن جائے۔[1]

❁ اس واقعے نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ دشمنانِ اسلام اور حکومت مخالف عناصر سے میدانِ جنگ کے علاوہ بھی نپٹا جاسکتا ہے اور گناہ سے بچتے ہوئے ہر طریقے سے دشمن کو زچ بھی کیا جاسکتا ہے۔ مسلمانوں کے خلاف جنگ کے شعلے بھڑکانے اور انھیں جگر سوز مظالم اور زبردست نقصانات سے دوچار کرنے والا شخص خود ہی اپنے خلاف فیصلے کا حق دے دیتا ہے۔

یہ سب ایسی صورت ہی میں روا ہے جب فتنے کا خوف نہ ہو، یعنی مسلمانوں کو غلبہ، قوت اور حکومت میسر ہو تاکہ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کی پکڑ دھکڑ، داعیانِ دین کا غیر ممالک سے انخلا اور ان کے معاشرے میں فتنہ وفساد کا اندیشہ نہ رہے۔[2]

❁ اس طرح کے واقعات کو لے کر بعض مسلمانوں نے جلد بازی سے مسلم ممالک میں مسلح تصادم کا رستہ اپنا لیا ہے، حالانکہ ان کا اس سے استدلال غلط ہے کیونکہ یہ مدینہ کا واقعہ ہے اور وہاں اس وقت مسلمانوں کی شان و شوکت اور حکومت تھی، جبکہ ان کے پاس حکومت

---

[1] الصراع مع اليهود لأبي فارس: 115/1. [2] التاريخ الإسلامي للحميدي: 54/5.

ہے نہ تسلط۔ پھر یہ بھی واضح رہے کہ اس واقعے میں دین کی بالادستی، اس کا استحکام اور کفار کو مرعوب کرنا مقصود تھا اور یہ سب مصالح ہی تھے۔ ان کے ہوتے ہوئے کسی خرابی کا خطرہ نہ تھا۔ لیکن موجودہ کمزور صورتِ حال میں اس جیسے جو واقعات رونما ہوتے ہیں ان کا نتیجہ ہر ذی شعور اور صاحب بصیرت دیکھ رہا ہے کہ اموال پر قبضہ کرلیا جاتا ہے، ان کے بدلے میں مسلمانوں کا ناحق خون ہوتا ہے، عزت پامال کردی جاتی ہے اور شر و فساد کا لامتناہی سلسلہ چل پڑتا ہے۔[1]

❁ رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ میں قیام کے دوران مشرکین میں سے کسی کو ملیامیٹ کرنے کی کوشش نہیں کی باوجود اس کے کہ آپ ﷺ شرک کے پرستاروں، مثلاً: ابوجہل، امیہ بن خلف اور عتبہ وغیرہ کو قتل کرنے کی طاقت رکھتے تھے۔ اگر آپ ﷺ سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ یا سیدنا عمر رضی اللہ عنہ یا اپنے اصحاب میں سے کسی کو اشارہ فرماتے تو ان میں ہر کوئی یہ فریضہ سرانجام دے سکتا تھا لیکن سیرت طیبہ اس بارے میں ہماری رہنمائی کرتی ہے کہ کفر کے ستون گرانے کے لیے طاقت و غلبہ کی ضرورت ہے۔ اس سے ضمناً یہ بھی سمجھ آتا ہے کہ اہل حل و عقد اور علم میں راسخ علماء، جو اس بارے میں مصالح اور مفاسد پر دقیق نگاہ رکھتے ہوں، وہی اس مسئلے کی چھان بین کرکے فتویٰ جاری کریں تو ایسا اقدام کرنا چاہیے۔

اس وقت تو یہ معاملہ اور زیادہ پیچیدگی اختیار کر گیا ہے کیونکہ اس زمانے میں مصالح اور مفاسد آپس میں خلط ملط ہو چکے ہیں۔ اور ملکی سطح پر رائے عامہ کا لحاظ رکھتے ہوئے قانون تشکیل دیا جاتا ہے اور اس طرح نقصانات پہنچانے کے ذرائع اور امکانات بہت وسیع ہو چکے ہیں۔[2]

❁ اس واقعے میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاں اپنی بات کی کتنی قدر و قیمت ہوتی تھی! ہم محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کا شاندار طرز عمل دیکھتے ہیں کہ انھوں نے جب نبی ﷺ

[1] وقفات تربوية مع السيرة النبوية لأحمد فريد، ص:205. [2] الأساس في السنة لسعيد حوّى: 537/2.

سے یہودی کے قتل کرنے کا عہد کرلیا اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے مشکلیں سر کرتے ہوئے تاخیر ہوئی تو کھانا پینا چھوڑ دیا اور ان پر غم سوار رہنے لگا۔ کیونکہ زبان سے ایک بات کہہ دی تھی جس کے متعلق انھیں خطرہ لاحق تھا کہ کہیں نامکمل ہی نہ رہ جائے۔ ہم موجودہ زمانے میں اپنے معاشرے کو دیکھتے ہیں کہ اکثر لوگ پکے وعدے تو کر لیتے ہیں مگر وعدے کی قدر و قیمت سے ناآشنا ہیں۔ ہم عہد شکنی کرتے اور وعدے کرکے بآسانی ان سے پس و پیش کرجاتے ہیں۔ وعدہ تو بس کاغذ پر سیاہی کی حد تک ہی باقی رہ جاتا ہے۔ ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اصول کے احترام کے بجائے نظریۂ ضرورت کے پجاری ہوتے ہیں۔ جن کی طرف سے ہر وقت اسی نظریے کو معبود قرار دیے جانے کا خدشہ رہتا ہے۔ جبکہ پختہ عزم کے حامل لوگ گردن کے کٹ جانے، جسم کے کمزور ہوجانے اور روح کے بدن کا ساتھ چھوڑ جانے کو اپنی بات سے پھر جانے اور اپنے عہد و پیثاق کو توڑ دینے پر ترجیح دیتے ہیں۔ وہ اسلام اور اس کے عقائد و نظریات کی خاطر ہر قسم کی سزا حتی کہ موت کو گلے لگا کر بھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ [1]

❁ فرمانِ رسول ﷺ: «إِنَّمَا عَلَيْكَ الْجَهْدُ» ''تیرا کام تو فقط خوب محنت کرنا ہے۔'' میں آپ ﷺ کی طرف سے اس بات کی رہنمائی ہے کہ نصرت الٰہی صرف جدو جہد اور مشکل کے وقت صبر کی مرہون منت ہوتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛ فَاصْبِرْ ۛ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ○﴾

''(اے نبی!) یہ کچھ غیب کی خبریں ہیں، ہم انھیں آپ کی طرف وحی کرتے ہیں، اس سے پہلے نہ آپ انھیں جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم، اس لیے آپ صبر کریں، بے شک (بہترین) انجام متقین ہی کے لیے ہے۔'' [2]

---

[1] الصراع مع اليهود لأبي فارس: 119/1. [2] هود 11:49.

مسلمان کے ذمے ہے کہ اپنی حتی المقدور توانائی، فکری صلاحیتیں اور جسمانی طاقتیں ایفائے عہد پر صرف کردے، بعد ازاں ان کے نتائج اللہ تعالیٰ کے سپرد کرے۔ [1]

❀ یہ فرمانِ رسول ﷺ: «قُولُوا مَا بَدَا لَكُمْ» ''جو ضرورت ہو کہہ لینا۔'' [2] آپ ﷺ کی عمدہ اور گہری سوجھ بوجھ کی غمازی کرتا ہے کیونکہ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے ایسی گفتگو کرنی تھی جو عام حالات میں دائرۂ کفر میں شمار ہوتی ہے۔

یہاں یہ نکتہ بھی سامنے آتا ہے کہ اہم جنگی ضروریات کے پیش نظر گفتگو میں شرعی پابندیوں کو ملحوظ نہ رکھنے کا جواز ہے۔ لیکن یہاں ایک اور مسئلہ سامنے آتا ہے کہ اگر جنگی مشاغل کچھ غیر شرعی اعمال و افعال کا تقاضا کریں یا فرائض چھوڑنے کی نوبت آجائے تو کیا صورت اختیار کی جائے؟ صحیح بات تو یہ ہے کہ کفر و شرک سے بڑا کوئی گناہ نہیں تو جب کفر کا اظہار درست ہے تو دیگر امور بطریقِ اولیٰ جائز ٹھہرے لیکن یہ اس صورت میں ہے جب مقصود تک رسائی یقینی نظر آرہی ہو یا کم از کم کامیابی کا غالب امکان ہو۔ اور پھر کسی فرض کے ترک یا اسے مؤخر کرنے کی نوبت پیش آئے تو ضروری ہے کہ ایسی اجازت کو اسی حد تک روا رکھا جائے جس کے بغیر کوئی چارہ ہی نہ ہو۔ ایسی صورتِ حال میں حدود سے بڑھنے اور ممنوع افعال کے ارتکاب میں سے جس کی بھی نوبت آئے اس کو اہل فتویٰ کی رہنمائی کے بغیر ہرگز نہ کیا جائے۔ جبکہ کچھ شرعی محرمات و ممنوعات ایسی بھی ہیں، مثلاً: زنا کاری اور ہم جنس پرستی وغیرہ جو کسی بھی صورت جائز نہیں ہیں۔ [3]

اور کچھ معاملات ایسے بھی ہیں جن کے لیے باصلاحیت اور ماہر اہل فتویٰ کے فتوے کی ضرورت ہوتی ہے۔ خاص طور پر جب کوئی ایسی استثنائی یا اضطراری، سیاسی یا عسکری صورت سامنے آجائے جس کی ہر کوئی استطاعت نہیں رکھتا۔ بنیادی احکام تو نامعلوم نہیں ہوتے لیکن استثنائی صورت حال میں استثنائی فتوے کی ضرورت ہوتی ہے جس کے لیے راسخ فقہاء

---

[1] الصراع مع اليهود لأبي فارس: 120/1. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 61/3. [3] الأساس في السنة لسعيد حوّى: 538,537/2.

اور ربانی علماء کی ضرورت پیش آتی ہے جنھیں شریعت کے مقاصد سمجھنے کی قدرت اور لوگوں کے رہن سہن اور اس معاشرے کا جس میں وہ زندگی بسر کر رہے ہیں مکمل ادراک ہو۔[1]

❁ اور فرمانِ رسول ﷺ: «قُولُوا مَا بَدَا لَكُمْ» ''جس کا تقاضا ہو کہہ لینا۔'' میں بڑی حکمت و دانائی ہے جس کی وضاحت یہ فرمانِ رسول ﷺ کرتا ہے: «اَلْحَرْبُ خُدْعَةٌ» ''جنگ چالبازی کا نام ہے۔''[2]

❁ فرمانِ رسول ﷺ ہے: «اِنْطَلِقُوا عَلَى اسْمِ اللّٰهِ، اَللّٰهُمَّ أَعِنْهُمْ» ''اللہ تعالیٰ کے نام سے سفر کا آغاز کرو۔ اے اللہ! ان کی مدد فرما۔'' جہاد میں اس فرمان سے اخلاص کی یاددہانی ہوئی۔ اور ان کے لیے مدد اور توفیق کی دعا بھی ہے۔

یہ فرامین ثابت قدمی اور بلند حوصلے کا باعث بنے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے کعب بن اشرف کی طاقت وقوت اور اس کے اردگرد موجود لوگوں کی کوئی پروانہ کی کیونکہ انھیں اللہ تعالیٰ کی معیت کا بھرپور یقین تھا اور یہ ادراک بھی تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے لیے رب تعالیٰ کی نصرت اور مقصد پورا ہونے کی دعا کی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ مبارکہ میں ہمیں یہ چیز نظر آتی ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے دعا کے ساتھ ساتھ تمام مادی اسباب اور درست منصوبہ بندی کو بھی اختیار کیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے مقصد میں کامیابی کا باعث بننے والے اسباب سے ہرگز بے خبر نہیں رہے اور مسلمان کو اللہ پر توکل اور تمام جائز اسباب اختیار کرنے کا حکم ملا ہے۔[3]

اس لیے حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے اپنے دیگر ساتھیوں کے ساتھ بڑا شاندار منصوبہ تشکیل دیا۔ دراصل انھوں نے اسباب اختیار کرنے کے پہلو کو خوب سمجھ لیا تھا۔

کعب بن اشرف کے قتل کے منصوبے کی تکمیل میں جو اسباب بروئے کار لائے گئے وہ درج ذیل ہیں:

---

1 الأساس في السنة لسعيد حوّى: 538,537/2. 2 صحيح مسلم، حديث: 1740. 3 التاريخ الإسلامي للحميدي: 56/5.

❁ ابو نائلہ رضی اللہ عنہ کعب کا دودھ شریک بھائی تھا جس سے وہ مطمئن تھا اور اسے ان کی طرف سے کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔

❁ بعض روایات میں ہے کہ ابو نائلہ رضی اللہ عنہ نے اس سے کلام کرنے سے قبل اس کے ساتھ اشعار کا تبادلہ کیا اور اس طرح اس کو اطمینان دلایا اور اس کے ہاں اپنا مقام بنالیا۔

❁ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے کعب سے اس وقت تک گفتگو نہ کی جب تک کعب کو قلعے سے باہر نہ نکلوا لیا اور کچھ دیر تک اس سے گفتگو کرتے رہے حتی کہ وہ ان سے مانوس اور مطمئن ہو گیا۔ یہ سب کچھ کامیابی کے ذرائع بروئے کار لانے کے لیے تھا، وگرنہ اگر وہ وہاں ہی رہتے تو راز کھل بھی سکتا تھا، لہٰذا ان کا اسے تنہا کر کے اس سے گفتگو کرنا انتہائی اہمیت کا حامل تھا۔

❁ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے جنگی چال کے تحت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اکتاہٹ کا اظہار، آپ کی طرف ظلم وزیادتی کی نسبت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عیب جوئی نے کعب کو مطمئن کر دیا۔

❁ اسلحہ گروی رکھنے کی رائے انتہائی مناسب تھی تاکہ اسلحہ ساتھ لانے سے وہ شک وشبہ میں مبتلا نہ ہو جائے۔ اس طرح وہ کعب کے پاس اسلحہ بطور گروی لا سکتے تھے اور جب بھی اس سے ملاقات ہوتی یہ اسلحہ استعمال کر سکتے تھے۔

❁ کعب سے وقت طے کر لینا بھی اس منصوبے کو استحکام بخشنے کا باعث تھا کیونکہ اس طرح اب وہ بغیر شک میں ڈالے رات کے کسی بھی حصے میں اس کے پاس آکر دستک دے سکتے تھے۔

❁ کعب ابو نائلہ اور محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہما سے اتنا مطمئن ہو چکا تھا کہ اچانک اور غفلت میں اپنے اوپر حملہ ہونے کو بھلا کر ایسے وقت میں گھر سے نکل آیا جس وقت میں آدمی عام طور پر باہر نہیں نکلتا۔[1]

❁ کعب کو گھر سے اتنی دور لے جانا کہ جس جگہ وہ بغیر کسی مددگار اور نگران کے ہو بڑا کارگر منصوبہ تھا۔

1 الصراع مع اليهود لأبي فارس: 122/1.

❀ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ [1] کا کعب کو الّو بنانا، اس کے سر کی خوشبو سونگھنا، پھر بالوں کو سونگھنے کے بہانے مضبوطی سے پکڑنا بڑا کامیاب حیلہ اور اس شر انگیز سر پر مکمل گرفت کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اس ملعون یہودی پر اللہ کے حکم کی تنفیذ کا یہ نادر موقع ہاتھ سے جانے نہ پائے۔

❀ اس سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی اپنے راز کو محفوظ رکھنے کی اعلیٰ صلاحیت کا بھی پتا چلتا ہے۔ وہ اس طرح کہ مدینہ میں یہود اور منافقین خاصی تعداد میں موجود تھے، علاوہ ازیں اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتے کئی دن لگے تھے۔ یہ بات بھی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ معاملہ صحابۂ کرام کے سامنے پیش کیا۔ اس کے متعلق مشورہ بھی ہوا مگر راز راز ہی رہا۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی قوت ایمانی اور اپنے دین کے ساتھ اخلاص کی یہ نمایاں دلیل ہے۔ [2]

میدانِ جنگ کے ان شہسواروں نے طے شدہ منصوبے کے ہر پہلو کو عمدہ طور پر پورا کیا اور اپنا عظیم مقصد پالیا، جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی مکمل احساسات اور جذبات کے ساتھ ان کے پہلو بہ پہلو تھے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم منصوبے کو عملی شکل اپنے فہم کے مطابق جسمانی توانائیوں کے ذریعے سے دیتے تھے۔ جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لیے نصرت اور اعانت کی دعا فرماتے

---

[1] مؤلف نے یہاں محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کے بجائے ابونائلہ رضی اللہ عنہ کا تذکرہ کیا ہے، جبکہ اس واقعے کو امام بخاری رحمہ اللہ کے حوالے سے بیان کرتے ہوئے مؤلف ہی نے اس جگہ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کا نام لکھا تھا۔ دراصل صحیحین میں اس مقام پر محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ ہی کا تذکرہ ہے۔ (دیکھیے: صحيح البخاري، حديث: 4037، و صحيح مسلم، حديث: 1801) مگر بعض اصحاب مغازی اور اہل سیر نے اس جگہ پر ابونائلہ رضی اللہ عنہ کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ یوں رقمطراز ہیں: ''اس صحیح روایت میں آیا ہے کہ جنھوں نے اس موقع پر کعب بن اشرف سے گفتگو کی تھی وہ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ ہی تھے، جبکہ ابن اسحاق اور ان کے علاوہ اصحاب مغازی نے ابونائلہ رضی اللہ عنہ کا نام لکھا ہے۔ اور دمیاطی رحمہ اللہ نے اسے ہی ترجیح دی ہے۔ بہر کیف یہ احتمال موجود ہے کہ ان دونوں ہی نے اس بارے میں کعب سے کوئی بات کی ہو، اس لیے کہ ابونائلہ رضی اللہ عنہ اس کے دودھ شریک بھائی تھے اور محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کعب کے بھانجے تھے۔'' (فتح الباري: 423,422/7) [2] التاريخ الإسلامي للحميدي: 56/5.

اور اللہ تعالیٰ سے تعلق برقرار رکھ کر قائدانہ فریضہ انجام دیتے تھے۔[1]

یہود کے سرغنے کعب بن اشرف کے قتل کا یہودیوں پر اثر: کعب بن اشرف کے قتل کی خبر مدینہ میں چہار سو پھیل گئی۔ علمائے یہود انتہائی سرعت سے رسول اللہ ﷺ کے پاس شکایت لے کر آ گئے اور صحابہ کے اس فعل پر ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے اعتراض کرنے لگے۔ آپ ﷺ نے ان کی کوئی پروانہ کی بلکہ اسے اس کے معاندانہ کردار کا لازمی نتیجہ قرار دیا۔

اس واقعے نے تمام یہود کے دلوں میں رعب بھر دیا۔ اب تو ان کے بڑوں میں سے کوئی بھی قلعے سے باہر آنے کی جرأت ہی نہ کرتا۔ اسی طرح مدینے کا ہر یہودی مسلمانوں سے خوف زدہ رہنے لگا اور یہود اپنے عہد کی تجدید کرنے پر مجبور ہو گئے۔ کعب کے قتل کا ان پر انتہائی گہرا اثر پڑا اور وہ اسلام کے خلاف گھناؤنی سازشیں کرنے کے درپے ہو گئے، جیسا کہ آنے والے واقعات اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کعب کے جرم کی پاداش میں بنو نضیر کا مواخذہ نہیں کیا بلکہ اس کی بدعہدی کے پیش نظر اسی کے قتل پر اکتفا کیا۔ اور یہود کے ساتھ معاہدے کی تجدید کی۔[2]

رسول اللہ ﷺ کا یہود کے ساتھ یہ معاملہ آپ کی اعلیٰ بصیرت کی غمازی کرتا ہے کیونکہ یہودی طبعی طور پر شرپسند تھے۔ شرارتوں سے باز رہنا یا ان سے کنارہ کشی ان کے بس کی بات نہیں تھی، لہٰذا آپ ﷺ نے ان کے سرغنے کو قتل اور کچھ کو جلاوطن کر کے ان کو رعب تلے رکھنے کا مناسب حل تجویز فرمایا۔[3]

کچھ اجتماعی مناسبات (تعلق داریاں و روابط)

رسول اللہ ﷺ کا حفصہ رضی اللہ عنہا سے نکاح: حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب میری

---

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي: 57/5. [2] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 304/1.
[3] الصراع مع اليهود لأبي فارس: 126/1.

بیٹی حفصہ کے خاوند خُنَیس بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ، جو کہ شرکائے بدر میں سے تھے، مدینہ منورہ میں فوت ہوگئے تو میں نے عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو اس سے نکاح کی پیش کش کی تو وہ کہنے لگے: ''میں اپنے بارے میں ذرا سوچ بچار کرلوں۔'' کچھ دن گزرنے کے بعد وہ مجھ سے ملے اور کہنے لگے: ''میرا خیال ہے کہ میں ان دنوں شادی نہ کروں۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ بعدازاں میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملا اور ان سے کہا: ''اگر آپ چاہیں تو میں اپنی بیٹی کا عقد آپ کے ساتھ کردوں۔'' ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خاموشی اختیار کرلی اور کوئی جواب نہ دیا۔ یہ صورت حال دیکھ کر مجھے ابوبکر رضی اللہ عنہ پر عثمان رضی اللہ عنہ سے بھی زیادہ دکھ ہوا۔ چند ہی دن گزرے ہوں گے کہ حفصہ رضی اللہ عنہا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کا پیغام بھیج دیا۔ میں نے اس کا نکاح آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کردیا تو اب مجھے ابوبکر رضی اللہ عنہ ملے اور کہنے لگے: ''آپ نے جب مجھے حفصہ رضی اللہ عنہا کے متعلق کہا اور میں نے کوئی جواب نہ دیا تو شاید آپ کو غصہ آیا ہو؟'' حضرت عمر نے کہا: ''جی ہاں۔'' ابوبکر رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ''میں آپ کی اس پیش کش کا جواب ضرور دیتا مگر مجھے معلوم ہوچکا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حفصہ کا تذکرہ کیا ہے۔ اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک راز تھا جسے میں افشا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہاں! اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارادہ ترک فرماتے تو میں ضرور اسے قبول کرتا۔''[1]

سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے عقد میں: حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نکاح کا پیغام موصول ہوا تو ایک لونڈی نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا تمھیں معلوم ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فاطمہ رضی اللہ عنہا کے متعلق نکاح کا پیغام پہنچا ہے؟ میں نے کہا: ''نہیں۔'' لونڈی بولی: ''انھیں پیغام موصول ہوا ہے۔ مگر تمھارے سامنے کیا رکاوٹ ہے کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو جاؤ اور وہ تمھارے ساتھ اس کا عقد کردیں؟'' میں نے کہا: ''میرے پاس کچھ ہے کہ شادی

[1] صحيح البخاري، حديث: 5122.

کروں!'' وہ کہنے لگی: ''تم اگر نبی ﷺ کے پاس جاؤ تو آپ ﷺ ضرور تمھارے ساتھ اس کا عقد کردیں گے۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''وہ مسلسل مجھے امید دلاتی رہی حتی کہ میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ جب میں آپ ﷺ کے سامنے بیٹھا تو اللہ کی قسم! آپ کے رعب و دبدبہ اور ہیبت کے مارے کوئی بات نہ کرسکا۔''

آپ ﷺ نے خود فرمایا: «مَا جَاءَ بِكَ؟ أَلَكَ الْحَاجَةُ؟» ''کیسے آنا ہوا؟ کوئی کام ہے؟''

میں خاموش رہا تو آپ ﷺ نے فرمایا: «لَعَلَّكَ جِئْتَ تَخْطُبُ فَاطِمَةَ» ''شاید تم فاطمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کے متعلق بات کرنے آئے ہو؟''

میں نے عرض کیا: ''ایسا ہی ہے۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: «وَ هَلْ عِنْدَكَ مِنْ شَيْءٍ تَسْتَحِلُّهَا بِهِ» ''کیا تمھارے پاس حق مہر میں دینے کے لیے کچھ ہے؟''

میں نے عرض کیا: ''نہیں، اللہ کی قسم! اے اللہ کے رسول!۔''

پھر آپ ﷺ نے فرمایا: «مَا فَعَلَتْ دِرْعٌ سَلَّحْتُكَهَا؟» ''میں نے تمھیں جو زرہ اسلحے کے طور پر دی تھی اس کا کیا بنا؟''

سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں علی کی جان ہے! وہ واقعی مضبوط اور بھاری زرہ تھی لیکن اس کی قیمت چار درہم بھی نہ تھی۔''

میں نے عرض کیا: ''وہ میرے پاس ہے۔''

فرمایا: «قَدْ زَوَّجْتُكَهَا، فَابْعَثْ إِلَيْهَا بِهَا، فَاسْتَحِلَّهَا بِهَا» ''میں نے اس پر فاطمہ سے تیرا عقد کردیا۔ یہ زرہ فاطمہ کو دے دو اور گھر بساؤ۔''

یہی رحمت عالم ﷺ کی صاحبزادی سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کا حق مہر تھا۔[1]

1 دلائل النبوة للبيهقي: 160/3.

اس کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ایک دھاری دار چادر، مشکیزہ اور ایک چمڑے کا تکیہ، جس میں گھاس بھری ہوئی تھی، عنایت کیا۔[1]

یہی ان کا انداز زندگی تھا جس میں انتہائی سادگی اور بے تکلفی تھی اور وہ تکلفات اور پیچیدگیوں سے کوسوں دور تھے۔ وہ اسباب زندگی کی بہتات کی نسبت انتہائی محدود وسائل اختیار کرتے تھے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے قیدیوں میں سے ایک خادم کی درخواست کے جواب میں رسول اللہ ﷺ کا موقف، جو درج ذیل واقعے میں آرہا ہے، سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی دشوار گزار زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔

مسند احمد میں روایت ہے کہ ایک دن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کہا: ''اللہ کی قسم! کنویں کا پانی کھینچ کھینچ کر میرے سینے میں تکلیف ہوگئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمھارے والد گرامی کو قیدیوں سے نوازا ہے۔ تم ان کے پاس جاؤ اور کسی خادم کا مطالبہ کرو۔'' حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کہنے لگیں: ''اللہ کی قسم! آٹا پیس پیس کر میرے ہاتھوں پر بھی آبلے پڑ گئے ہیں۔'' لہٰذا میں آپ ﷺ کے پاس آئی۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: «مَا جَاءَ بِكِ أَيْ بُنَيَّةُ؟!» ''میری بیٹی! کیسے آنا ہوا؟''

میں نے عرض کیا: ''آپ کو سلام کرنے حاضر ہوئی ہوں۔'' اور مارے شرم کے کچھ کہہ ہی نہ سکی اور سوال کیے بغیر ہی واپس چلی آئی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''کیا کر کے آئی ہو؟'' جواباً کہا: ''مجھے شرم آرہی تھی میں سوال ہی نہ کر سکی۔'' اس کے بعد ہم دونوں حاضر ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! اللہ کی قسم! کنویں سے پانی نکال نکال کر سینہ دکھنے لگا ہے۔'' اور فاطمہ رضی اللہ عنہا نے عرض گزاری: ''میرے ہاتھوں پر آبلے پڑ گئے ہیں۔ اللہ کے فضل سے آپ کو قیدی ملے ہیں۔ اب فراخی ہوگئی ہے، لہٰذا ہمیں کوئی خادم عنایت کیجیے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا:

[1] صحيح السيرة النبوية للدكتور العمري، ص: 267.

«وَاللّٰهِ! لَا أُعْطِيكُمَا، وَأَدَعُ أَهْلَ الصُّفَّةِ تَطْوٰى بُطُونُهُمْ، لَا أَجِدُ مَا أُنْفِقُ عَلَيْهِمْ وَلٰكِنِّي أَبِيعُهُمْ وَأُنْفِقُ عَلَيْهِمْ أَثْمَانَهُمْ»

''اللہ کی قسم! میں تمھیں نہیں دوں گا۔ کیا میں اہل صفہ کو چھوڑ دوں جو بھوک کے مارے لاغر ہورہے ہیں۔ میرے پاس ان کے اخراجات کے لیے کچھ نہیں۔ ان قیدیوں کو بیچ کر ان کی قیمت ان پر خرچ کروں گا۔''

چنانچہ حضرت علی اور فاطمہ رضی اللہ عنہما دونوں واپس آگئے۔ اب رسول اللہ ﷺ ان دونوں کے پاس تشریف لائے۔ دونوں چادریں اوڑھے لیٹے ہوئے تھے۔ چادریں بھی اتنی چھوٹی تھیں کہ سرڈھانپتے تو پاؤں ننگے ہوجاتے اور پاؤں ڈھانپتے تو سر ننگے ہوجاتے۔ آپ ﷺ کو دیکھ کر دونوں اٹھ بیٹھے۔

آپ ﷺ نے فرمایا: «مَكَانَكُمَا» ''اپنی جگہ پر رہو۔''

پھر فرمایا: «أَلَا أُخْبِرُكُمَا بِخَيْرٍ مِّمَّا سَأَلْتُمَانِي؟» ''تم دونوں جو طلب کرنے آئے تھے تمھیں اس سے بہتر بات نہ بتاؤں؟''

دونوں نے عرض کیا: ''کیوں نہیں!''

فرمایا: «كَلِمَاتٌ عَلَّمَنِيهِنَّ جِبْرِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ، فَقَالَ: تُسَبِّحَانِ فِي دُبُرِ كُلِّ صَلَاةٍ عَشْرًا، وَّتَحْمَدَانِ عَشْرًا، وَّتُكَبِّرَانِ عَشْرًا، وَّإِذَا أَوَيْتُمَا إِلٰى فِرَاشِكُمَا فَسَبِّحَا ثَلَاثًا وَّثَلَاثِينَ وَاحْمَدَا ثَلَاثًا وَّثَلَاثِينَ وَكَبِّرَا أَرْبَعًا وَّ ثَلَاثِينَ» ''مجھے جبریل علیہ السلام نے یہ کلمات سکھائے ہیں'' پھر فرمایا: ''ہر نماز کے بعد تم دونوں دس دفعہ سبحان اللہ، دس مرتبہ الحمدللہ اور دس بار اللہ اکبر کہا کرو۔ اور جب بستر پر آؤ تو تینتیس بار سبحان اللہ، تینتیس دفعہ الحمد للہ اور چونتیس بار اللہ اکبر کہا کرو۔''[1]

رسول اللہ ﷺ کا اہل بیت اور عزیز واقارب کی تربیت کا یہ انداز تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ

[1] مسند أحمد: 107,106/1، اس حدیث کی اصل صحيح البخاري، حدیث: 3113 میں بھی ہے۔

اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے غلام حاصل کرنے کی کوشش بے سود گئی کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قیدیوں کو فروخت کر کے بھوک سے لاچار اہل صفہ پر خرچ کرنا چاہتے تھے۔ اور پھر حضرت علی اور فاطمہ رضی اللہ عنہما کی طرح اہل صفہ سے بھی آپ کا خصوصی تعلق تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کو خدمت کی ضرورت تھی، جبکہ اصحاب صفہ کو کھانے کی ضرورت تھی اور ظاہر ہے خدمت پر کھانے کو اولیت حاصل ہے۔[1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس نبوی تربیت کا گہرا اثر قبول کیا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا عہد شباب رفتہ رفتہ گزرتا چلا گیا۔ ایک وقت آیا کہ وہ مسلمانوں کے خلیفہ مقرر ہوئے۔ ان پر ابھی تک نبوی تربیت کے آثار موجود تھے۔ زمین کے خزانے اور بھلائیاں ہاتھ میں آگئیں مگر دنیا کی زیب و زینت سے کوسوں دور رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُس وصیت کا اثر ابھی تک چلا آرہا ہے اور دل و جان ذکر الٰہی سے معمور ہیں۔ خود بیان کرتے ہیں کہ اللہ کی قسم! جب سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ وظیفہ سکھایا ہے اسے میں نے کبھی نہیں چھوڑا۔ ایک شخص (ابن الکوّاء) نے دریافت کیا: ''جنگ صفین کی رات بھی نہ چھوڑا؟'' فرمانے لگے: ''ہاں! صفین کی رات بھی ترک نہیں کیا تھا۔''[2]

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی مجلس میں ضرار بن ضمرہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سیرت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا: ''وہ دنیا اور اس کی نمود و نمائش سے انتہائی متنفر، رات اور اس کی تاریکی سے مانوس تھے۔ اللہ کی قسم! وہ بہت روتے رہتے، خاصی دیر تک سوچ بچار کرتے اور اپنی ہتھیلیاں الٹ پلٹ کرتے، اپنے نفس کو جھنجھوڑتے، مختصر لباس پسند کرتے اور موٹا جھوٹا کھانا (غریبوں کی طرح سادہ سا کھانا) مرغوب رکھتے تھے۔''[3]

---

1. التربية القيادية للدكتور الغضبان: 100/3. 2 مسند أحمد: 107,106/1، و الإصابة: 159/8.
3 صفة الصفوة لابن الجوزي: 84/1.

باب 2

میدانِ احد سے پہلے کے حالات

غزوۂ احد کے اسباب

جنگ احد کے کئی ایک اسباب تھے جن میں سے کچھ دینی، چند ایک معاشرتی، بعض اقتصادی اور کچھ سیاسی تھے، ان کی وضاحت درج ذیل ہے:

دینی سبب: اللہ تعالیٰ نے باخبر فرمایا ہے کہ مشرکین اپنے مال اللہ کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے، اسلامی دعوت کے آگے مشکلات کھڑی کرنے، لوگوں کو اسلام سے روکنے، اسلام اور مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے اور دنیا کے نقشے پر ابھرنے والی نئی اسلامی ریاست کے وجود کو ختم کرنے کے لیے خرچ کرتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۚ فَسَيُنْفِقُونَهَا ثُمَّ تَكُونُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُونَ ۗ وَالَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ يُحْشَرُونَ ○﴾

”بے شک جن لوگوں نے کفر کیا وہ اپنے مال خرچ کرتے ہیں تا کہ وہ (لوگوں کو) اللہ کے راستے سے روکیں تو وہ ابھی (اور) مال خرچ کریں گے، پھر وہ ان کے لیے باعث حسرت ہوگا، پھر وہ مغلوب ہو جائیں گے اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ جہنم کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے۔“ [1]

1 الأنفال 36:8.

امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں باخبر فرمایا ہے کہ کفار اپنے مال راہ حق کی اتباع میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے خرچ کرتے ہیں۔''[1]

امام طبری رحمہ اللہ کا کہنا ہے: ''وہ اپنے مال کا لین دین اور خرچ اس لیے کرتے ہیں کہ لوگوں کو اسلام میں داخل ہونے سے روکیں۔''[2]

امام شوکانی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ اموال خرچ کرنے سے ان کفار کی غرض راہ حق سے روکنا ہے اور یہ آپ ﷺ سے جنگ اور لشکر اکٹھے کرنے کی صورت میں ہے۔''[3]

یہاں یہی بات سامنے آتی ہے کہ جنگ احد کے اسباب میں سے اہم ترین سبب دینی تھا۔ قریش کا اصل مقصد اللہ کے دین سے اور راہِ حق کی اتباع سے روکنا، قبولِ اسلام کے راستے میں حائل ہونا، آپ ﷺ سے جنگ کرنا اور اسلامی تحریک و دعوت کو سبوتاژ کرنا تھا۔[4]

معاشرتی سبب: بدر میں قریش مکہ کی شکستِ فاش اور ان کی قیادت اور سرداروں کا قتل ان کے لیے بڑی ذلت و ندامت کا سبب بنا۔ انھیں ہر دم اس ذلت اور شکست کا احساس رہتا تھا، لہٰذا انھوں نے بدر سے واپسی کے فوراً بعد رسول اللہ ﷺ سے جنگ کرنے کے لیے اموال اکٹھے کرنے شروع کر دیے اور اپنی حتی الوسع کوشش میں لگ گئے تاکہ کسی نہ کسی طرح اس ذلت و اہانت کو، جو ان کے مقدر میں لکھی جا چکی تھی، دھو سکیں۔

ابن اسحاق کہتے ہیں: ''بدر کے دن سردارانِ قریش قتل ہو گئے اور ان کے باقی ماندہ افراد مکہ واپس ہوئے۔ ابوسفیان بھی اپنا تجارتی قافلہ لے کر مکہ پہنچ چکا تھا۔ اپنے دستور کے مطابق انھوں نے مکمل قافلہ ''دارالندوہ'' میں ٹھہرائے رکھا۔ نہ تو اسے تقسیم کیا اور نہ ہی قافلے کی کوئی چیز وہاں سے ہلنے دی۔ سردارانِ قریش نے اس قافلے کی ساری مالیت رسول اللہ ﷺ سے جنگ کی تیاری میں اپنے دل کی خوشی سے لٹا دی۔''

1 تفسیر ابن کثیر آیت مذکورہ کے ذیل میں۔ 2 غزوة أحد لمحمد عيطة بن سعيد، ص:71. 3 فتح القدیر مذکورہ آیت کی تفسیر کے تحت۔ 4 غزوة أحد لمحمد عيطة بن سعيد، ص:71.

عبد اللہ بن ابی ربیعہ، عکرمہ بن ابی جہل، حارث بن ہشام، حویطب بن عبد العزیٰ، صفوان بن امیہ اور قریش کے دیگر وہ لوگ جن کے باپ، بیٹے اور بھائی بدر کے دن مارے گئے تھے یہ سب جمع ہو کر ابوسفیان اور قافلے کے دیگر مالکوں کے پاس آئے اور ان سے کہنے لگے: ''اے خاندانِ قریش! محمد (ﷺ) نے تمھیں تباہ کر دیا اور تمھارے سردار قتل کر دیے ہیں، تم اس مال سے اس کے خلاف ہماری مدد کرو۔ ہوسکتا ہے ہم اپنے مقتولین کا بدلہ لے لیں۔'' ابوسفیان کہتے ہیں کہ سب سے پہلے میں نے یہ بات تسلیم کی۔ [1]

جبیر بن مطعم نے اپنے حبشی غلام ''وحشی'' کو بلایا۔ اسے حبشہ میں رائج انداز سے نیزہ پھینکنے کا ایسا طریقہ آتا تھا جس میں وہ بہت کم ہی غلطی کرتا تھا، چنانچہ جبیر نے اس سے کہا: ''تم لوگوں کے ساتھ جاؤ۔ اگر تم نے میرے چچا طعیمہ بن عدی کے بدلے میں محمد (ﷺ) کے چچا حمزہ کو قتل کر دیا تو تم آزاد ہو۔'' [2]

اقتصادی سبب: اسلامی حکومت کے متحرک جنگی دستوں نے قریش کی اقتصادی حالت پر گہرا اثر چھوڑا۔ ان پر ایک انتہائی تنگ اقتصادی دائرہ کھینچ دیا۔ مکی معیشت کی بنیاد ان دنوں گرمی اور سردی کے دو تجارتی سفروں پر قائم تھی۔ موسم سرما میں یمن کا سفر کرتے، اس میں شام کی اشیاء اور پیداوار اپنے ساتھ لے جاتے اور گرمیوں میں شام کی طرف سفر کرتے تھے جس میں یمنی پیداوار اور اشیاء ادھر لے جاتے تھے۔ ان دونوں سفروں میں سے ایک کا ختم ہونا دوسرے کے لیے بھی نقصان دہ تھا کیونکہ شام کی تجارت کا دارومدار یمن کے سامان پر اور یمن کی تجارت کی بنیاد شام سے آئے ہوئے سامان پر تھی۔ [3]

ارشادِ ربانی ہے:

﴿لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ۝ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ ۝ فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ ۝ الَّذِیْۤ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۝﴾

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 68/3. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 79/3. [3] غزوة أحد لمحمد عيظة بن سعيد، ص: 74.

’’قریش کے مانوس ہونے کی وجہ سے، (یعنی) ان کے سردی اور گرمی کے سفر سے مانوس ہونے کی وجہ سے، لہٰذا انھیں چاہیے کہ وہ اس گھر (کعبہ) کے مالک کی عبادت کریں، جس نے انھیں بھوک میں کھانا کھلایا اور انھیں خوف سے امن دیا۔‘‘ [1]

صفوان بن امیہ کی حسبِ ذیل صراحت سے ان کی مذکورہ صورتِ حال واضح ہے:

’’محمد (ﷺ) اور اس کے ساتھیوں نے ہماری تجارتی منڈیوں کے راستے روک دیے ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ان کا کیا علاج کریں؟ جو ساحل سمندر پر بھی مقیم ہیں ان سے محمد (ﷺ) نے مصالحت کر رکھی ہے۔ ان کی اکثریت اس کے دین میں داخل ہو چکی ہے۔ ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ ہم کہاں چلے جائیں۔ اگر یہیں بیٹھے ہم اپنے اصل زر کھاتے رہے تو ہماری گزران اور بقا مشکل ہو جائے گی۔ ہمارا تو یہاں رہنا گرمی میں شام کی طرف تجارت اور سردی میں حبشہ کی طرف تجارت پر منحصر ہے۔‘‘ [2]

سیاسی سبب: جنگ بدر کے بعد رفتہ رفتہ قریش کی قیادت دم توڑ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ قبائل میں اس کی مرکزی حیثیت کو خطرناک دھچکا لگ چکا تھا، لہٰذا اس عہدے کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے انھیں زیادہ محنت کرنے اور جان و مال داؤ پر لگانے کی اشد ضرورت تھی۔

یہ وہ اہم وجوہات تھیں جنھوں نے قریش کو مدینہ کی اسلامی حکومت کے خلاف بہت جلد جنگی معرکے پر مجبور کر دیا۔ [3]

قریش کا مکہ سے مدینہ کی طرف کوچ

ہجرت کے تیسرے سال، 7 شوال بروز ہفتہ قریش نے اپنی طرف سے جنگ کی تیاری مکمل کر لی۔ [4]

اس موقع پر قریش نے تین ہزار جنگجوؤں کا لشکر تیار کیا۔ ان کی عورتیں اور خدم و حشم

1 القریش 106:1-4. 2 المغازي للواقدي:1/195,196. 3 غزوة أحد لمحمد عيظة بن سعيد، ص:75. 4 البداية والنهاية: 4/11، والمغازي للواقدي:1/199.

ہمراہ تھے۔ پڑوس عرب قبائل سے جو بھی ساتھ ملتا گیا اسے بھی بھرتی کرتے گئے۔ قریش اپنے کیل کانٹے سمیت نکلے۔ ان کے ساتھ ان غیر عرب قبائل کے افراد بھی تھے جو قبائل عرب سے آملے تھے، علاوہ ازیں کنانہ اور اہل تہامہ میں سے کئی لوگ ان کے ساتھ تھے۔ انھوں نے اپنے ساتھ عورتوں کو بھی لیا، جو ہودج میں سوار تھیں۔ یہ اس لیے تھا کہ اپنے دستور کے مطابق عورتوں کی حفاظت کو یقینی بنانے کے لیے کوئی بھی شخص جنگ سے راہ فرار اختیار نہ کرے۔

ابوسفیان جو ان کا سپہ سالار تھا اس نے ہند بنت عتبہ بن ربیعہ کو ساتھ لیا، [1] اسی طرح صفوان بن امیہ بن خلف نے برزہ بنت مسعود ثقفیہ کو، عکرمہ بن ابی جہل نے ام حکیم بنت حارث بن ہشام بن مغیرہ کو، حارث بن ہشام بن مغیرہ نے فاطمہ بنت ولید بن مغیرہ کو ساتھ لیا۔ [2]

یہ لشکر وادیِ قناۃ کے کنارے بنجر زمین پر مدینہ کی جانب خیمہ زن ہوا۔ [3]

قریشی لشکر کے اخراجات اور سامان کی تیاری کے لیے بڑے وسیع پیمانے پر تشہیری مہم چلائی گئی تھی جس کے سرکردہ لوگوں میں ابوعزہ عمرو بن عبداللہ جُمَحی، عمرو بن العاص، ہبیرہ مخزومی اور ابن زبعریٰ وغیرہ شامل تھے۔ اور ان کے لیے اس کے بڑے حوصلہ افزا نتائج بھی برآمد ہوئے۔ [4]

قریشی لشکر کا جنگی بجٹ پچاس ہزار طلائی دینار تک پہنچ چکا تھا۔ [5]

دشمن کی نقل و حرکت پر رسول اللہ ﷺ کی کڑی نظر

حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ قریش کی جنگی تیاری اور نقل و حرکت کی نگرانی کر رہے تھے۔ جب یہ لشکر مکہ سے روانہ ہوا تو عباس رضی اللہ عنہ نے لشکر کی تمام تر تفصیلات پر مشتمل خط بڑی تیزی سے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ارسال کر دیا جسے ایلچی نے انتہائی کم مدت میں پہنچایا۔ اس نے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کا باہمی فاصلہ جو کم و بیش

[1] الإصابة: 346/8، رقم: 11860. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 70/3. [3] غزوة أحد دراسة دعوية، ص: 78. [4] غزوة أحد لأبي فارس، ص: 17. [5] غزوة أحد لأبي فارس، ص: 16.

500 کلومیٹر پر مبنی ہے، صرف تین دن میں طے کیا۔ جب ایلچی نے وہ خط آپ ﷺ کے سپرد کیا۔ آپ ﷺ اس وقت مسجد قبا میں تشریف فرما تھے۔[1]

رسول اللہ ﷺ اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ذریعے قریش کی ایک ایک خبر پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ ابن عبد البر کا بیان ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ مشرکوں کی خبریں لکھ کر آپ ﷺ کی طرف ارسال کر رہے تھے۔ مکی مسلمان عباس رضی اللہ عنہ کو اپنا سہارا خیال کرتے تھے، جبکہ عباس رضی اللہ عنہ چاہتے تھے میں مدینہ میں آپ ﷺ کے پاس چلا جاؤں۔ آپ ﷺ نے انھیں لکھا کہ آپ کا مکہ میں رہنا زیادہ بہتر ہے۔[2]

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی ارسال کردہ خبریں بڑی تفصیلی ہوتی تھیں۔ ایک خط میں وہ لکھتے ہیں: ''قریش کا لشکر آپ کی طرف روانہ ہو چکا ہے۔ ان کے پہنچنے تک ان سے مقابلے کی حتی المقدور تیاری کر لیجیے۔ یہ کل تین ہزار کا لشکر ہے جس کے آگے دو سو گھڑ سوار ہیں، ان میں سات سو زرہ پوش ہیں اور تین ہزار اونٹ ہیں اور وہ اپنا تمام تر اسلحہ ساتھ لا رہے ہیں۔''[3]

اس خط میں اہم معلومات درج تھیں جن میں سے کچھ یہ ہیں:

① مشرکین کی مدینہ منورہ کی جانب پیش قدمی کی یقینی خبر۔

② لشکر کی مکمل معلومات اور اس کی جنگی استعداد۔ اس کی تفصیل اس ٹڈی دل لشکر کے مقابلے کی مکمل تیاری میں معاون بنی۔

مگر رسول اللہ ﷺ نے مکی خبر رسانوں ہی پر اکتفا نہ کیا بلکہ آپ ﷺ چاہتے تھے کہ دشمن کے متعلق تازہ ترین معلومات ہر روز حاصل ہوتی رہیں۔ آپ ﷺ کے اس نظام میں مسلمان قائدین کے لیے رہنمائی ہے کہ تازہ معلومات حاصل کرنا کتنا اہم ہے! تاکہ اس کے مطابق آئندہ مناسب لائحۂ عمل اور سیاسی حکمت عملی اختیار کی جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے قریش کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے حضرت حباب

1 الرحيق المختوم، ص: 250. 2 الاستيعاب: 812/2. 3 المغازي للواقدي: 204/1.

بن منذر بن جموح رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا۔ وہ مکی لشکر کے اندر گھس کر اس کی نفری، اسلحہ اور تیاری کا اندازہ لگا کر واپس آ گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: «مَا رَأَيْتَ؟» ''تم نے کیا دیکھا؟'' عرض کی: ''اے اللہ کے رسول! میرے اندازے کے مطابق کم و بیش تین ہزار (3000) آدمی، دو سو گھوڑے اور سات سو (700) دوہری زرہیں تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: «هَلْ رَأَيْتَ ظُعُنًا؟» ''کیا تم نے ان کے ساتھ عورتیں بھی دیکھیں؟'' عرض کیا: ''جی ہاں، عورتیں بھی ہیں جن کے پاس دف اور طبلے ہیں۔'' فرمایا: «أَرَدْنَ أَنْ يُحَرِّضْنَ الْقَوْمَ وَيُذَكِّرْنَهُمْ قَتْلٰى بَدْرٍ، هٰكَذَا جَاءَنِي خَبَرُهُمْ. لَا تَذْكُرْ مِنْ شَأْنِهِمْ حَرْفًا، حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ، اَللّٰهُمَّ! بِكَ أَجُولُ وَبِكَ أَصُولُ» ''مجھے اطلاعات پہنچی ہیں کہ مقتولین بدر کی یاد تازہ کرانے اور جنگ پر ابھارنے کے لیے ان کے ساتھ عورتیں بھی آئی ہیں۔ بہرحال تم کسی کے سامنے ان کے متعلق کچھ نہ کہنا۔ ہمیں اللہ تعالیٰ ہی کافی ہے، وہ بہترین کارساز ہے، اے اللہ! میں تیری توفیق ہی سے پھرتا اور دشمن پر حملہ آور ہو کر غالب آتا ہوں۔''[1]

اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فضالہ کے دونوں بیٹوں انس اور مونس کو چپکے سے قریش کی خبریں سننے کے لیے بھیجا۔ انھوں نے قریش کو مدینہ کے بالکل قریب پایا۔ انھوں نے اپنے گھوڑے اور اونٹ مدینہ کے اردگرد کی چراگاہوں میں چرنے کے لیے چھوڑ رکھے تھے۔ دونوں نے واپس آ کر قریش کے احوال ذکر کیے۔[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام معلومات اکٹھی کر کے چاہا کہ یہ معلومات اور خبریں صرف اعلیٰ قیادت تک ہی رہیں تاکہ تیاری سے پہلے ہی مسلمانوں پر یہ خبریں ذہنی دباؤ کا باعث نہ بنیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا ارسال کردہ خط حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قباء میں پڑھ کر سنایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں معاملہ پوشیدہ رکھنے کا حکم دیا

[1] المغازي للواقدي: 1/207،208. [2] السيرة النبوية لأبي شهبة: 2/187.

اور خود تیزی سے مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔ اور اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے مہاجرین و انصار کے ذمہ داران سے تبادلہ خیالات فرمایا۔

رسول اللہ ﷺ نے انصاریوں کے سردار حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کو حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی تحریر کردہ معلومات سے آگاہ کیا اور فرمایا: «وَاللّٰهِ! إِنِّي لَأَرْجُو أَنْ يَّكُونَ خَيْراً فَاسْتَكْتِمْهُ إِيَّاهُ» ''اللہ کی قسم! مجھے توقع ہے کہ اچھا ہی ہوگا مگر ابھی اس بات کو پوشیدہ ہی رکھو۔'' آپ ﷺ جب سعد رضی اللہ عنہ کے پاس سے تشریف لے گئے تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی بیوی نے کہا: ''نبی ﷺ نے آپ سے کیا گفتگو کی ہے؟'' حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: ''تمھارا ستیاناس! تمھیں ان باتوں سے کیا غرض؟'' وہ بولیں: ''نبی ﷺ نے آپ کے ساتھ جو بات کی ہے میں نے وہ ساری سن لی ہے۔'' پھر انھوں نے نبی ﷺ کی ساری راز دارانہ گفتگو کہہ سنائی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے «إنا لله و إنا إليه راجعون» پڑھا (پھر نبی ﷺ کے پاس گئے) اور عرض پرداز ہوئے: ''اے اللہ کے رسول! مجھے خدشہ ہے کہ بات پھیل جائے گی۔ آپ سمجھیں گے کہ یہ بات تو میں نے تمھارے ساتھ ہی کی تھی، لہٰذا تمھی نے پھیلائی ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: «خَلِّ عَنْهَا» ''اس عورت کی بات چھوڑو۔''[1]

اس پیش آمدہ واقعے میں جنگی حکام کے لیے اہم پیغام ہے اور ان کے لیے واضح تنبیہ ہے کہ جنگی رازوں، منصوبوں اور معاملات سے بیویوں کو بالکل بے خبر رکھنا چاہیے۔ اور اس جیسے راز عام کرنے سے باز رہنا چاہیے کیونکہ ایسے رازوں کا افشا کسی قوم کے لیے ہولناک واقعے کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ بڑی بڑی ناکامیاں، مشکلیں اور پریشانیاں خائن بیویوں یا پھر دوستوں کے لبادے میں دشمن یا ظاہراً قریبی اور حقیقت میں مخالف قسم کے لوگوں کی طرف سے راز فاش ہونے کی بنا پر واقع ہوئیں۔[2]

[1] السيرة الحلبية:2/489. [2] غزوة أحد لأبي فارس، ص:22.

رسول اللہ ﷺ کی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے عمومی مشاورت

کفارِ قریش کے متعلق تمام معلومات جمع کرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ طلب کیا کہ مدینہ میں رہتے ہوئے قلعہ بند ہو رہیں یا مشرکوں سے باہر نکل کر پنجہ آزمائی کریں۔ آپ ﷺ کا خیال یہی تھا کہ مدینہ میں رہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّا فِي جُنَّةٍ حَصِينَةٍ، فَإِنْ رَأَيْتُمْ أَنْ تُقِيمُوا، وَتَدَعُوهُمْ حَيْثُ نَزَلُوا، فَإِنْ أَقَامُوا، أَقَامُوا بِشَرِّ مُقَامٍ، وَإِنْ دَخَلُوا عَلَيْنَا قَاتَلْنَاهُمْ فِيهَا»

"مدینہ ہمارے لیے ایک محفوظ ڈھال ہے۔ اگر تم چاہو تو یہیں رہو اور انھوں نے جہاں پڑاؤ ڈالا ہے انھیں وہاں ہی رہنے دو۔ اگر وہ وہاں رہیں گے تو انتہائی نامناسب جگہ رہیں گے اور اگر وہ یہاں تک پہنچ گئے تو ہم مدینہ میں رہتے ہوئے ان سے جنگ کریں گے۔"[1]

عبداللہ بن ابی کی رائے بھی آپ ﷺ کے ساتھ تھی۔[2]

لیکن وہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جو جنگِ بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے، عرض کرنے لگے:

"اے اللہ کے رسول ﷺ! ہمیں ہمارے دشمن کی طرف لے چلیے۔"

ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: "بہت سے لوگ مدینہ سے باہر نکل کر دشمن سے نبرد آزما ہونے پر مصر تھے اور رسول اللہ ﷺ کی رائے اور فرمان پر اکتفا نہیں کر رہے تھے، اگر آپ کے حکم پر راضی ہو جاتے تو اچھا ہوتا لیکن تقدیر غالب آ کر رہی۔ مدینہ منورہ سے باہر جا کر دشمن سے ٹکرانے کا مشورہ دینے والوں کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل تھی جو بدر میں شریک نہیں ہو سکے تھے کیونکہ وہ اہل بدر کی فضیلت سے بخوبی آگاہ تھے۔"[3]

---

[1] تاريخ الطبري: 60/2. [2] غزوة أحد لمحمد عيظة بن سعيد، ص: 82. [3] البداية والنهاية: 14/4.

ابن اسحاق رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ جو لوگ دشمن سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتے تھے وہ رسول اللہ ﷺ کو برابر کہتے رہے حتی کہ آپ ﷺ خانۂ نبوت میں تشریف لے گئے اور اپنا جنگی لباس پہن لیا۔ اب لوگ ایک دوسرے کو کہنے لگے: ''نبی ﷺ نے ایک رائے دی مگر تم نے اس کے خلاف رائے کا اظہار کردیا، چنانچہ حمزہ رضی اللہ عنہ! آپ جائیں اور نبی ﷺ سے عرض کریں کہ آپ کا فیصلہ ہی ہمارا فیصلہ ہے۔'' حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے آکر عرض کیا: ''اے اللہ کے نبی! لوگ نادم ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ کا فیصلہ ہی ہمارا فیصلہ ہے۔''

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«إِنَّهُ لَيْسَ لِنَبِيٍّ إِذَا لَبِسَ لَأْمَتَهُ أَنْ يَّضَعَهَا حَتّٰى يُقَاتِلَ»

''کسی نبی کے لیے مناسب نہیں کہ جب ہتھیار پہن لے، پھر بغیر جنگ کیے انھیں اتار دے۔''[1]

جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم مدینہ سے باہر نکل کر دشمن سے نبرد آزما ہونا چاہتے تھے ان کی یہ رائے درج ذیل امور کی بنیاد پر تھی:

① انصار نے ''بیعتِ عقبۂ ثانیہ'' کے وقت ہر موڑ پر رسول اللہ ﷺ کی مدد کا عہد کیا تھا۔ اب اکثر کا خیال تھا کہ (جنگ مسلط ہونے کے باوجود) مدینہ میں رہنا اس عہد سے پیچھے ہٹنے کے مترادف ہوگا۔

② کچھ مہاجرین کا خیال تھا کہ انصار کی نسبت ان کا زیادہ حق بنتا ہے کہ مدینہ منورہ کا دفاع کریں، قریش سے ان کی رزم آرائی بھی ہو اور وہ مدینہ منورہ کے آس پاس انصار کے کھیت کھلیان وغیرہ کو بھی تحفظ فراہم کریں۔

③ غزوۂ بدر سے پیچھے رہ جانے والے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم دشمن سے مڈھ بھیڑ کے لیے بے تاب تھے اور ان کی آرزو یہ تھی کہ شاید اس طرح انھیں اللہ کی راہ میں شہادت نصیب

1. السيرة النبوية لابن هشام: 71/3.

ہوجائے گی۔

④ مدینہ سے باہر جنگ لڑنے والوں کی اکثریت کا خیال تھا کہ مدینہ منورہ کا محاصرہ قریش کی فتح متصور ہوگی، لہٰذا یہ ایسا خواب ہے جسے کسی صورت شرمندۂ تعبیر نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ خدشہ بھی تھا کہ محاصرہ طویل ہوسکتا ہے جس کی بنا پر مسلمانوں کو ہر قسم کی امداد سے محروم ہونے کا خطرہ لاحق رہے گا۔[1]

مدینہ منورہ میں رہ کر دشمن کا مقابلہ کرنے والوں کی رائے درج ذیل حکمت عملی پر استوار تھی:

① مکی لشکر مختلف گروہوں پر مشتمل ہے، لہٰذا اس کے لیے زیادہ دیر پڑاؤ ڈالنا یا محاصرہ کرنا ممکن نہیں۔ ان میں اس بارے میں کبھی نہ کبھی اختلاف لازماً پھوٹ پڑے گا۔

② جو شہر اس انداز سے تعمیر ہوں کہ وہاں کے حوض، قلعے اور مقامات دفاعی لحاظ سے مستحکم ہوں ایسے شہروں کا گھیراؤ امیدوں کو کبھی پورا نہیں ہونے دیتا۔ خاص طور پر جبکہ دونوں لشکروں کا اسلحہ بھی تقریباً ایک جیسا ہو، جبکہ اُحد میں ایسا ہی تھا۔

③ دفاع کرنے والے جب اپنے گھر والوں میں موجود ہوں گے تو اپنے بیٹوں، بیٹیوں، بیویوں اور عزتوں کی حفاظت جوانمردی سے کریں گے۔

④ عورتوں اور بچوں کے جنگ میں شریک ہونے کی وجہ سے لڑنے والوں کی تعداد دوگنی ہوجائے گی۔

⑤ دفاع کرنے والے دشمن پر پتھر اور اس جیسا دیگر اسلحہ استعمال کرسکیں گے۔ اور اسی طرح گھیرا ڈالنے والے ان کی دسترس میں ہوں گے۔[2]

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ساتھیوں کو مشورے کے وقت بلاخوف و خطر اپنی اپنی رائے دینے کا عادی بنا رکھا تھا، خواہ ان کی رائے آپ ﷺ کی رائے کے خلاف ہی ہو۔ جو معاملات عمومی نوعیت کے ہوتے اور ان میں کوئی واضح نص بھی نہ ہوتی

[1] غزوۃ أحد لأحمد عزالدین، ص:52,51. [2] القیادۃ العسکریۃ للدکتور محمد الرشید، ص:374.

آپ ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم کو ان میں غور وخوض کرنے اور امت کو لاحق مشکلات کا حل ڈھونڈنے کا عادی بنانا چاہتے تھے۔ مشورے کا فائدہ ہی کیا جب اظہارِ رائے کی آزادی نہ ہو۔ یہ بات کہیں نہیں مل سکتی کہ آپ ﷺ نے غلط رائے یا غلط سوچ پر کسی کو ملامت کی ہو۔ اسی طرح حاکم کے لیے ضروری ہے کہ وہ شوریٰ کے نظام کو اپنائے۔

اور حسب ذیل قرآنی رہنمائی کی عملی تنفیذ کا آپ ﷺ سے بڑھ کر اور کون اہل ہوسکتا ہے:

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ۝﴾

”پس (اے نبی!) آپ اللہ کی رحمت کے باعث ان کے لیے نرم ہوگئے۔ اگر آپ تند خو اور سخت دل ہوتے تو وہ سب آپ کے پاس سے چھٹ جاتے، چنانچہ آپ ان سے درگزر کریں اور ان کے لیے بخشش مانگیں اور ان سے (اہم) معاملات میں مشورہ کریں، پھر جب آپ پختہ ارادہ کرلیں تو اللہ پر بھروسا کریں، بے شک اللہ بھروسا کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔“[1]

یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ آپ ﷺ کی امت شورائی نظام کی عادی بن جائے۔

یہاں یہ بات بھی واضح معلوم ہورہی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایسے سیاسی شعور کے حامل تھے کہ وہ اپنی رائے کا اظہار تو کرسکتے ہیں مگر انھیں اپنی رائے کو قائد پر ٹھونسنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ وہ رائے کا اظہار کردیں قائد آزادی سے جو بھی رائے چاہے اختیار کرے۔ آپ ﷺ نے ان کے اصرار پر باہر نکل کر دشمن سے مقابلہ کرنے کا ارادہ فرمایا تو وہ فوراً معذرت کے لیے حاضر ہوگئے۔ لیکن آپ ﷺ پھر انھیں ایک اور نکتہ سمجھانا چاہتے تھے کہ مثالی قیادت کا یہی وصف ہوتا ہے کہ جب وہ کوئی ارادہ کرکے اس کے مطابق

1 آل عمرٰن 3:159.

عملدرآمد کا آغاز کردے تو اس کے بعد وہ کسی قسم کے تردد کا شکار نہیں ہوتی کیونکہ اس سے اعتماد کو سخت ٹھیس پہنچتی ہے اور ماتحت لوگ انتشار اور افراتفری کا شکار ہو جاتے ہیں۔[1]

رسول اللہ ﷺ نے باہر نکل کر مقابلہ کرنے کا پختہ ارادہ کرلیا اور ہنگامی صورت حال کا اعلان فرما دیا۔ سب مسلمان جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔ اور رات بھی بڑے محتاط انداز پر گزاری۔ ہر کوئی ہتھیار بند رہنے لگا حتی کہ سوتے وقت بھی ہتھیار ساتھ رکھے۔ آپ ﷺ نے مدینہ منورہ کی نگرانی کا حکم دیا اور اس کام کے لیے محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں پچاس مضبوط ترین مجاہد علیحدہ کر دیے۔ چند ایک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کی نگرانی پر متعین ہو گئے۔ حضرت سعد بن معاذ، اسید بن حضیر، سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہم اور کچھ دیگر صحابہ نے جمعے کی رات مسلح ہو کر مسجد کے دروازے پر آپ ﷺ کی حفاظت میں گزاری۔[2]

اسلامی لشکر کی احد کی جانب پیش قدمی اور بعض واقعات

دشمن کی طرف پیش قدمی کے وقت آپ ﷺ نے چند اہم اسباب اختیار فرمائے:

لشکر کے خروج کے لیے مناسب وقت اور راستہ: رسول اللہ ﷺ نے روانگی کے لیے مناسب وقت اور مناسب راستے کا انتخاب فرمایا، چنانچہ آپ آدھی رات کے بعد روانہ ہوئے۔ جب فضا پرسکون تھی، نقل و حرکت نہ ہونے کے برابر تھی اور سفر سے تھکا ماندہ دشمن خواب خرگوش میں تھا۔

تھکاوٹ کے بعد سونے والا عموماً گہری نیند سوتا ہے اور اٹھنے والی بلند آوازوں اور ہر قسم کی نقل و حرکت سے بھی بے خبر ہو جاتا ہے۔

سیرت نگار واقدی کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ رات گئے تک سوئے رہے اور جب سحری کا وقت ہوا تو فرمایا: «أَيْنَ الْأَدِلَّاءُ؟» ''رہبر کہاں ہیں؟''[3]

---

[1] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري:380/2. [2] غزوة أحد لأبي فارس، ص:35,34.
[3] المغازي للواقدي:217/1.

علاوہ ازیں آپ ﷺ نے میدان جنگ کا مناسب راستہ اپنایا۔ یہ ایسا مخفی اور پوشیدہ راستہ تھا کہ مسلمانوں کا رواں دواں لشکر دشمن کی نگاہ سے اوجھل تھا۔ آپ ﷺ نے ساتھیوں سے فرمایا:

«مَنْ رَّجُلٌ يَّخْرُجُ بِنَا عَلَى الْقَوْمِ مِنْ كَثَبٍ مِّنْ طَرِيقٍ لَّا يَمُرُّ بِنَا عَلَيْهِمْ؟»

''کون ہے جو مختصر اور محفوظ راستے سے ہمیں دشمن تک لے جائے اور وہ راستہ ایسا ہو کہ ہم دشمن کے قریب سے نہ گزریں؟'' یہ سن کر ابوخیثمہ رضی اللہ عنہ نے اپنی استعداد کا اظہار کرتے ہوئے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! میں حاضر ہوں۔'' بعدازاں وہ رسول اللہ ﷺ کو حرۂ بنی حارثہ اور ان کے کھیتوں سے گزارتے ہوئے لے چلے۔ اس راستے سے جاتے ہوئے لشکر کا گزر ربعی بن قیظی (ابن ہشام کے مطابق مربع بن قیظی) کے کھیت سے ہوا۔ یہ شخص منافق اور نابینا تھا۔ اس نے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھ مسلمانوں کی آمد محسوس کی تو ان کے چہروں پر دھول پھینکنے لگا اور کہنے لگا: ''اگر آپ اللہ کے رسول ہیں تو آپ کو میری زمین میں آنے کی اجازت نہیں۔'' یہ بھی منقول ہے کہ اس نے مٹی کی لپ اپنے ہاتھ میں لی اور بولا: ''اللہ کی قسم! اگر مجھے معلوم ہوجائے کہ اے محمد (ﷺ)! یہ کسی اور کے بجائے تجھ ہی پہ گرے گی تو میں یہ لپ ضرور تیرے چہرے پر مارتا۔'' (معاذ اللہ) لوگ اسے قتل کرنے کے لیے لپکے مگر آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَا تَقْتُلُوهُ، فَهٰذَا الْأَعْمٰى أَعْمَى الْقَلْبِ، أَعْمَى الْبَصَرِ»

''اسے قتل نہ کرو، یہ دل اور آنکھ دونوں کا اندھا ہے۔''

لیکن آپ ﷺ کے منع کرنے سے پہلے ہی بنوعبدالاشہل کے سعد بن زید رضی اللہ عنہ اس کے سر پر کمان مار کر اسے زخمی کر چکے تھے۔[1]

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 69/3، وتاريخ الطبري: 218/1.

بلاشبہ رسول اللہ ﷺ کا درختوں اور باغوں کے درمیان سے گزرنا بتاتا ہے کہ آپ اثنائے رستہ احتیاط پر مبنی تدابیر اختیار کرنا چاہتے تھے کیونکہ عام رستے سے دشمن مسلمانوں کی قوت کا بآسانی اندازہ لگا سکتا تھا۔ اور یہ انتہائی خطرناک ہوتا۔ اس طرح آپ ﷺ نے امت کو وقت اور جگہ کی راز داری اختیار کرنے کا سبق دیا تاکہ دشمن قوت کا اندازہ لگا کر مقابلے کے لیے حسبِ ضرورت منصوبہ بندی نہ کر لے، وگرنہ راز فاش ہونے پر تو سپہ سالار کا نظم و ضبط اور لشکر کی جنگی تیاری دھری کی دھری رہ جائے گی۔

ربعی بن قیظی کے اس واقعے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر دو مصلحتیں بالمقابل ہوں تو مصلحت عامہ کو خاص افراد کی مصلحت پر فوقیت دی جائے گی۔ آپ ﷺ ربعی بن قیظی منافق کی کھیتی سے تباہ ہونے کی پروا نہ کرتے ہوئے گزر گئے کیونکہ لشکر کے لیے مختصر رستہ اپنانے کی ایک حکمت تھی۔ گویا آپ بتا رہے ہیں کہ دینی مصلحت دیگر مصلحتوں سے بہر صورت مقدم ہے۔ یہاں مصلحت عامہ اور انفرادی مصلحت مدمقابل تھیں، نیز دینی مصلحت ہی مصلحت عامہ تھی جسے بعض افراد کی محض مالی مصلحت پر مقدم رکھا گیا۔[1]

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے منفعتوں کے حصول کی خاطر شرعی مصلحتوں کو ایک خاص ترتیب سے رکھا ہے، مثلاً: دین، جان، عقل، نسل اور مال ہر ایک کا اسی ترتیب سے ایک مقام ہے جسے واضح کیا گیا ہے۔[2]

جب ہم دین کی پانچ بنیادی مصلحتوں اور ان کی اہمیت کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ پانچوں مصلحتیں اور قواعد آپس میں اہمیت کے لحاظ سے خاص ترتیب رکھتے ہیں اور وہ ترتیب یہ ہے: دین، جان، عقل، نسل اور مال۔ دین کو تحفظ فراہم کرنے والی مصلحت اور جان کو تحفظ فراہم کرنے والی مصلحت ایک دوسرے کے مدمقابل آجائیں تو دینی مصلحت مقدم ہوگی۔ اسی طرح جان کو تحفظ فراہم کرنے والی مصلحت اور عقل کو تحفظ

[1] غزوة أحد لمحمد عيظة بن سعيد، ص: 168. [2] ضوابط المصلحة للبوطي، ص: 23.

فراہم کرنے والی مصلحت میں تعارض ہوجائے تو جان سے متعلقہ مصلحت کو اولیت حاصل ہوگی۔ اسی طرح نسل کو تحفظ فراہم کرنے والی مصلحت تعارض کی صورت میں مالی مصلحت سے فوقیت رکھے گی۔ ان قواعد و مقاصد کی اس ترتیب پر تمام اہل علم کا اتفاق ہے۔ [1]

امام شاطبی رحمہ اللہ اور عزبن عبد السلام جیسے ارباب تحقیق جن کی سیرت نبوی پر گہری نظر ہے انھوں نے مصلحت عامہ کو مصلحتِ خاصہ پر مقدم رکھنے کے سلسلے میں کئی ایک اہم قواعد کا استنباط کیا ہے، چنانچہ امام شاطبی رقمطراز ہیں: ''مصلحت و مفسدت میں اصل قانون باہمی موازنہ ہی ہے، لہٰذا جو بھی ان میں سے راجح ہوگی اسے مقدم (خیال) کیا جائے گا۔'' [2]

عزبن عبد السلام کا بیان ہے کہ راجح مصلحتوں کو مرجوح مصلحتوں پر مقدم کرنا بہتر اور قابل تعریف ہے اور اسی طرح زیادہ خرابیوں کو کم خرابیوں سے دور کرنا بہتر اور قابل تعریف ہے۔ اس پر اصول کے ماہر علماء کا اتفاق ہے۔ شرعی احکام کا حکم بھی اسی طرح ہے اگر مراتب برابر ہیں تو اختیار ہے۔ ہاں! اگر درجہ بندی معلوم ہوجائے تو راجح و مرجوح کا قاعدہ استعمال کریں گے۔ [3]

دوسری جگہ فرماتے ہیں: ''اصل قانون یہ ہے کہ اگر مصلحت بلا مفاسد واضح ہو رہی ہے تو اسے کوشش کرکے حاصل کیا جائے گا۔ اور اگر خرابی بلا مصلحت صاف نظر آ رہی ہے تو اسے حتی المقدور کوشش کرکے دور کیا جائے۔'' [4]

عبد اللہ بن ابی کی تہائی لشکر سمیت واپسی: مسلمانوں کا لشکر جب ''شوط'' [5] مقام پر پہنچا تو رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی ابن سلول تین سو منافقین کو ساتھ لے کر یہ کہتا ہوا چل دیا کہ مشرکین کے ساتھ جنگ نہیں ہوگی اور یہ اعتراض بھی کیا کہ مدینہ کے باہر جنگ

1 المقاصد العامة للشريعة ليوسف حامد العالم، ص: 166. 2 الموافقات للشاطبي: 2/651.

3 قواعد الأحكام لأبي محمد عزالدين: 1/7,6. 4 قواعد الأحكام لأبي محمد عزالدين: 1/47.

5 شوط: مدینہ منورہ اور جبل احد کے درمیان واقع ایک باغ کا نام ہے۔

کا فیصلہ کیوں کیا گیا۔ اس کا کہنا تھا: ''نبی ﷺ نے بے سمجھ لوگوں اور بچوں کی رائے تسلیم کی ہے اور میری رائے کی خلاف ورزی کی ہے، لہٰذا ہم خواہ مخواہ کیوں اپنی جان دیں۔''[1]

اس سرکشی سے عبداللہ بن ابی کا اصل مقصد اسلامی لشکر میں اضطراب و انتشار کی کیفیت پیدا کرنا تھا تاکہ ان کے حوصلے پست ہو جائیں اور دشمنانِ اسلام کے حوصلے بڑھیں اور وہ بلند ہمت ہو جائیں۔ اس کی کوشش اور تدبیر بڑی خطرناک خیانت اور اسلام اور اس کے چاہنے والوں کے ساتھ سراسر بغض و عناد پر مبنی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا تھا کہ مخلص مسلمانوں پر مشتمل لشکر ہی آگے بڑھے تاکہ مخلص لوگ منافقوں سے الگ ہو سکیں۔ اور اخلاص کی دولت سے مالا مال مسلمان مفاد پرستوں کے ٹولے سے نکھر جائیں۔[2]

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ ﴾

''اللہ مومنوں کو اس حالت میں ہرگز نہ رہنے دے گا جس میں تم اس وقت ہو، یہاں تک کہ وہ پاک کو ناپاک سے علیحدہ کر دے اور اللہ کا یہ طریقہ نہیں کہ وہ تم پر غیب ظاہر کرے، لیکن اللہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے (غیب کی باتیں بتانے کے لیے) چن لیتا ہے، پس تم ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسولوں پر اور اگر تم ایمان لاؤ گے اور پرہیزگاری اختیار کرو گے تو تمھارے لیے بہت بڑا اجر ہے۔''[3]

منافقوں کے اس طرز عمل سے بزدلی اور کفر کی جانب ان کی واپسی سامنے آ گئی۔ اور قبل اس کے کہ قرآن ان کی رسوائی کا چرچا کرتا انھیں اپنے ضمیر اور لوگوں کے سامنے

[1] البداية والنهاية: 14/4. [2] غزوة أحد لمحمد عيطة بن سعيد، ص: 84. [3] آل عمرٰن 3:179.

رسوائی کا سامنا کرنا پڑ گیا۔[1]

منافقوں کی واپسی پر عبداللہ بن عمرو بن حرام رضی اللہ عنہ کا موقف: حضرت عبداللہ بن حرام رضی اللہ عنہ نے منافقین کو اس نازک صورتِ حال میں ساتھ چھوڑنے سے روکنے کی بھرپور کوشش کی مگر انھوں نے انکار کردیا تو وہ فرمانے لگے: ''لوگو! میں تمھیں اللہ (کا عہد) یاد دلاتا ہوں۔ دشمن سر پر ہے، لہٰذا اپنی قوم اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تعاون سے ہاتھ نہ کھینچو۔'' وہ بولے: ''اگر ہم جانتے کہ تم لوگ جنگ کروگے تو قطعاً تمھیں دشمن کے حوالے نہ کرتے لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ لڑائی کی نوبت نہیں آئے گی۔'' جب انھوں نے بات نہ مانی اور ہر صورت واپس جانے ہی کو پسند کیا تو عبداللہ بن حرام رضی اللہ عنہ فرمانے لگے: ''اللہ کے دشمنو! تم پر اللہ کی مار پڑے عنقریب اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو تم سے مستغنی کردے گا۔''[2]

انھی رسوا ترین لوگوں کے متعلق یہ ارشاد باری تعالیٰ نازل ہوا:

﴿وَمَآ اَصٰبَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ۚ وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ۭ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّااتَّبَعْنٰكُمْ ۭ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَىِٕذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ○﴾

''اور جس (احد کے) دن دونوں لشکر باہم ٹکرائے تو تمھیں جو (نقصان) پہنچا وہ اللہ کے حکم سے تھا اور اس لیے تھا کہ اللہ جان لے کہ مومن کون ہیں اور یہ بھی جان لے کہ منافق کون ہیں اور ان منافقوں سے کہا گیا تھا: آؤ! اللہ کے راستے میں لڑو یا (شہر کا) دفاع کرو۔ انھوں نے کہا: اگر ہمیں جنگ ہونے کا یقینی علم ہوتا تو ہم ضرور تمھارے ساتھ چلتے۔ وہ اس روز ایمان کی نسبت کفر کے زیادہ قریب تھے۔ وہ اپنے مونہوں سے وہ بات کہہ رہے تھے جو ان کے دلوں میں نہیں تھی اور

[1] مرويات غزوة أحد لحسين أحمد الباكري، ص: 71. [2] صحيح السيرة النبوية، ص: 277.

اللہ وہ بات خوب جانتا ہے جسے وہ چھپاتے ہیں۔''[1]

بنوسلمہ اور بنو حارثہ کا تردد اور اس کے بعد دلجمعی: جب عبداللہ بن ابی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ واپس ہوا تو بنوسلمہ اور بنو حارثہ نے بھی پسپائی کا ارادہ کرلیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انھیں محفوظ فرمایا اور ثابت قدم رکھا۔ ان کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا:

﴿ اِذْ هَمَّتْ طَّآىِٕفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴾

''جب تمھارے دوگروہوں نے کم ہمتی دکھانے کا ارادہ کیا اور اللہ ان دونوں کا دوست تھا اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسا کرنا چاہیے۔''[2]

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں یہ آیت ہمارے قبیلے بنوسلمہ اور بنو حارثہ کے متعلق نازل ہوئی، اس کا ہمارے بارے میں اترنا مجھے ناپسند نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے بارے میں فرمایا: ﴿ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ﴾ ''اللہ ان دونوں کا دوست ہے۔''[3]

مسلمانوں کی ان دونوں جماعتوں پر منافقین کے اس گھٹیا طرزِ عمل کا گہرا اثر ہوا۔ انھوں نے بھی شروع میں واپسی کا قصد کیا لیکن جلد ہی اپنی کمزوری پر قابو پالیا۔ اللہ تعالیٰ کی مدد سے انھوں نے اپنے نفوس پر غلبہ پایا اور کمزوری و سستی دور کی اور مومنوں کے ساتھ جانے پر ڈٹ گئے۔

ابن سلول کے اس رویے پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں دو آرا پیدا ہوگئیں:

① لشکر میں تفریق پیدا کرکے واپس جانے والے منافقین جنھوں نے مسلمانوں کا ساتھ چھوڑا انھیں قتل کردیا جائے۔

② کچھ صحابہ کا خیال تھا کہ انھیں قتل نہ کیا جائے۔

قرآن پاک نے فریقین کے موقف کا اس آیت میں تذکرہ فرمایا:[4]

---

1 آل عمرٰن 3:166، 167. 2 آل عمرٰن 3:122. 3 صحيح البخاري، حديث: 4051. 4 السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 3/382.

﴿فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ۚ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ۗ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا﴾

''پھر تمھیں کیا ہوا ہے کہ منافقوں کے بارے میں دو گروہوں میں بٹ گئے ہو؟ حالانکہ اللہ نے ان کے اعمال کی وجہ سے انھیں الٹا کر دیا ہے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ ان لوگوں کو ہدایت دو جنھیں اللہ نے گمراہ کیا ہو؟ اور جسے اللہ گمراہ کرے، پھر اس کے لیے آپ ہرگز کوئی راستہ نہیں پائیں گے۔''[1]

غیر مسلموں سے مدد: جب رسول اللہ ﷺ شیخان[2] مقام پر پہنچے تو آپ ﷺ نے ایک قافلے کا شور وغل سنا۔ ان آوازوں میں سے ہتھیاروں کی آواز بھی سنائی دی۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: «مَاهٰذِهٖ؟» ''یہ کیسی آواز ہے؟ بتلایا گیا کہ یہ عبداللہ بن اُبی کے حلیف یہود ہیں۔ ارشاد فرمایا: «لَا نَسْتَنْصِرُ بِأَهْلِ الشِّرْكِ عَلٰى أَهْلِ الشِّرْكِ» ''ہم اہل شرک کے خلاف مشرکوں ہی سے تعاون نہیں لیتے۔''[3]

یہ ایک بنیادی قاعدہ ہے جس کی آپ ﷺ نے وضاحت فرمادی کہ مدد کے لیے اسلام دشمن عناصر کی طرف مائل ہونا اچھا نہیں۔[4]

رسول اللہ ﷺ کا بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کو کم سنی کی بنا پر واپس کرنا: رسول اللہ ﷺ نے ''شیخان'' مقام ہی سے کچھ نوجوانوں کو کم عمر ہونے کی بنا پر واپس کر دیا۔ وہ تمام نوعمر چودہ برس یا اس سے کم عمر کے حامل تھے۔ ان میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں:

عبداللہ بن عمر بن خطاب، زید بن ثابت، اُسامہ بن زید، زید بن ارقم، براء بن عازب اور ابوسعید خدری رضی اللہ عنہم یہ کل چودہ نوعمر لڑکے تھے۔ معتبر روایت کے مطابق ابن عمر رضی اللہ عنہما انھی میں سے تھے۔[5]

[1] النسآء 4:88. [2] **شیخان:** مدینہ اور احد کے درمیان ایک جگہ کا نام ہے۔ [3] صحیح السیرة النبویة لإبراهيم العلي، ص: 278. [4] محمد رسول الله ﷺ لصادق عرجون: 561/3. [5] السیرة النبویة الصحیحة للدکتور العمري: 383/2.

جب رسول اللہ ﷺ کو بتایا گیا کہ رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ ماہر تیر انداز ہیں تو آپ ﷺ نے انھیں اجازت دے دی۔ یہ بات سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کو پہنچی تو وہ اپنے سوتیلے باپ مرّی بن سنان بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ کے پاس گئے۔ یہ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے چچا تھے اور سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ نے انھی کے ہاں پرورش پائی تھی، چنانچہ سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ روتے ہوئے اپنے سوتیلے باپ سے کہنے لگے: ''میرے ابوجان! نبی ﷺ نے رافع کو اجازت دے دی ہے اور مجھے واپس کردیا ہے، حالانکہ میں رافع کو پچھاڑ سکتا ہوں۔'' حضرت مرّی بن سنان رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر اس بات کا تذکرہ کیا۔ آپ ﷺ رافع اور سمرہ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: ''دونوں کشتی کرو۔'' تب سمرہ رضی اللہ عنہ نے رافع رضی اللہ عنہ کو پچھاڑ دیا۔ آپ ﷺ نے سمرہ رضی اللہ عنہ کو بھی اجازت دے دی اور انھیں اپنے لشکر میں شامل فرمایا۔ ان دونوں جوانوں میں سے ہر ایک کا اپنا امتیاز اور مقام و مرتبہ تھا۔[1]

ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ ﷺ نے رافع رضی اللہ عنہ اور سمرہ رضی اللہ عنہ کو ان کے دوسرے ہم عمر لڑکوں کی نسبت خصوصی طور پر اجازت دی تھی کیونکہ وہ دونوں جنگی صلاحیت میں دوسروں سے ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے دیگر کم عمر نوجوانوں کو اس لیے واپس کردیا کہ جب تلواریں ٹکرائیں گی، تیر چلیں گے، نیزے مارے جائیں گے اور عین گھمسان کی جنگ جاری ہوگی کہیں یہ موقع پر راہ فرار اختیار کرکے مسلمانوں کی صفوں میں اضطراب و انتشار کا باعث نہ بن جائیں۔[2]

ان واقعات سے اسلامی معاشرے میں آگے بڑھنے کی تمنا اور شوق شہادت سے لبریز ہونے کی بھرپور عکاسی ہو رہی ہے۔ بوڑھے ہوں یا جوان حتی کہ چھوٹے بچے بہادری کے ساتھ شہادت گاہ کی طرف رواں دواں ہیں۔ حیرانی کا مقام ہے کہ وہ جذبۂ شہادت سے

---

[1] محمد رسول اللہ ﷺ لصادق عرجون:572,571/3. [2] محمد رسول اللہ ﷺ لصادق عرجون: 572,571/3.

کیسے سرشار تھے، جبکہ فوجی بھرتی کا کوئی جبری قانون تھا نہ میدانِ جنگ میں جھونک دینے والی کوئی قیادت۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ سب نبوی طریقۂ تربیت کا اثر تھا جو امت کے کم عمر یا پختہ عمر افراد میں کارفرما رہا اور یہ دنیا کے معاملات سے بالاتر آخرت کی محبت و چاہت پر مبنی تھا۔

کفارِ مکہ سے مقابلے کے لیے نبی ﷺ کی منصوبہ بندی

دستوں کی تقسیم: رسول اللہ ﷺ نے قریشی مشرکوں کا مقابلہ کرنے کے لیے بڑی شاندار منصوبہ بندی کی۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے لیے مناسب مقام کا چناؤ کیا۔ جنگجو افراد کا انتخاب فرمایا۔ جن میں قابلیت نہ تھی انھیں واپس بھیج دیا۔ پچاس ماہر تیرانداز منتخب کیے اور انھیں بڑی سختی سے اپنی ذمہ داری نبھانے کا حکم دیا۔ آپ ﷺ نے لشکر کو تین گروہوں میں تقسیم فرمایا اور ہر گروہ کے ایک ایک فرد کو پرچم عطا کیا۔ وہ تین گروہ اس طرح تھے:

① مہاجرین کا دستہ: اس کا پرچم حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو دیا۔

② انصار سے قبیلۂ اوس کا دستہ: ان کا پرچم اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کو دیا۔

③ انصار سے قبیلۂ خزرج کا دستہ: ان کا علم حضرت حباب بن منذر رضی اللہ عنہ کو عطا کیا۔[1]

پر جوش خطبہ: رسول اللہ ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ دشمن سے مقابلے کے لیے اپنے ساتھیوں کو جوش دلاتے اور میدان جنگ میں دشمن کے مقابلے میں ڈٹ جانے کی تلقین فرماتے تاکہ ان کے حوصلے بلند ہوں اور دشمن سے ٹکراؤ کے وقت ثابت قدمی کا مظاہرہ کریں، جنگ احد کے دن بھی آپ ﷺ نے ایسا ہی کیا۔

واقدی کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے اور لوگوں سے ان الفاظ میں مخاطب ہوئے: «يَا أَيُّهَا النَّاسُ! أُوصِيكُمْ بِمَا أَوْصَانِي اللّٰهُ فِي كِتَابِهِ، مِنَ الْعَمَلِ بِطَاعَتِهِ، وَالتَّنَاهِي عَنْ مَحَارِمِهِ، ثُمَّ إِنَّكُمُ الْيَوْمَ بِمَنْزِلِ أَجْرٍ، وَذُخْرٍ،

1 غزوة أحد لمحمد عيطة بن سعيد، ص:89.

لِمَنْ ذَكَرَ الَّذِي عَلَيْهِ، ثُمَّ وَطَّنَ نَفْسَهُ لَهُ عَلَى الصَّبْرِ، وَالْيَقِينِ، وَالْجِدِّ، وَالنَّشَاطِ، فَإِنَّ جِهَادَ الْعَدُوِّ شَدِيدٌ كَرْبُهُ، قَلِيلٌ مَّنْ يَّصْبِرُ عَلَيْهِ إِلَّا مَنْ عَزَمَ اللّٰهُ رُشْدَهُ، فَإِنَّ اللّٰهَ مَعَ مَنْ أَطَاعَهُ، وَإِنَّ الشَّيْطَانَ مَعَ مَنْ عَصَاهُ، فَافْتَتِحُوا أَعْمَالَكُمْ بِالصَّبْرِ عَلَى الْجِهَادِ، وَالْتَمِسُوا بِذٰلِكَ مَا وَعَدَكُمُ اللّٰهُ، وَعَلَيْكُمْ بِالَّذِي أَمُرُكُمْ، فَإِنِّي حَرِيصٌ عَلَى رُشْدِكُمْ، فَإِنَّ الْإِخْتِلَافَ، وَالتَّنَازُعَ، وَالتَّثْبِيطَ مِنْ أَمْرِ الْعِجْزِ، وَالضَّعْفِ، مِمَّا لَا يُحِبُّ اللّٰهُ، وَلَا يُعْطِي عَلَيْهِ النَّصْرَ، وَلَا الظَّفَرَ» ’’اے لوگو! میں تمھیں اس بات کی وصیت کرتا ہوں جس کی اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی کتاب میں وصیت فرمائی ہے، وہ یہ ہے کہ اس کے حکم کے مطابق عمل ہو۔ ممنوعہ اور حرام کردہ امور سے مکمل اجتناب کیا جائے، پھر آج جس نے اپنا فریضہ واجب سمجھ کر، اپنے آپ کو اس پر صبر و یقین اور محنت و سنجیدگی سے ثابت رکھا تو وہ آج اجر و ثواب کے مقام پر کھڑا ہے۔ دشمن سے لڑائی ایک مشکل اور کڑا معاملہ ہے اس پر صرف وہی استقامت دکھا سکتا ہے جسے اللہ تعالیٰ بھلائی عنایت فرما دیں۔ اطاعت شعاروں کے ساتھ اللہ تعالیٰ اور نافرمانوں کا ساتھی شیطان ہے۔ میدانِ جہاد میں صبر و استقامت کا دامن تھامے رکھو اور معبود برحق نے جو سچا وعدہ کیا ہے اسے پانے کی جستجو کرو۔ لوگو! میں تمھاری رشد و ہدایت کا انتہائی متمنی ہوں، لہٰذا میرے حکم پر لبیک کہو اور باہمی اختلاف، جھگڑا اور ہٹ دھرمی، شکست اور کمزوری کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نہ انھیں پسند فرماتے ہیں اور نہ ہی اللہ تعالیٰ ان خامیوں کے ہوتے ہوئے نصرت و فتح عنایت فرماتے ہیں۔‘‘[1]

اس خطبے سے کئی مقاصد سامنے آتے ہیں، مثلاً:

① میدان جہاد میں بھرپور کوشش کرنے اور مستعد رہنے پر ابھارنا۔

② معرکے میں دشمن کے مقابلے میں ڈٹ جانے کی تلقین۔

[1] المغازي للواقدي:222,221/1.

③ جھگڑے اور اختلافات کے نقصانات۔[1]

رسول اللہ ﷺ کی بابرکت رہنمائی ہمیں کئی ایک طے شدہ حقائق کی تعلیم دیتی ہے، مثلاً: جب شرکائے لشکر میں ایسے مضبوط ارادوں اور قوی دل کے حامل افراد نہ ہوں جنھیں زندگی ہی کی طرح موت بھی عزیز لگے تو تمام تر اسلحہ اور ساری منصوبہ بندی دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ اور یہ چیز لشکر کو وعظ ونصیحت، ان کی ذہن سازی اور ان میں جہاد کی محبت اور شہادت کی تڑپ پیدا کرنے ہی سے حاصل ہوسکتی ہے۔

جبل احد کی جنگی اہمیت: رسول اللہ ﷺ نے لشکر کی حفاظت کے لیے احد پہاڑ کی اہمیت کو بھانپ لیا تھا، لہٰذا مسلمان لشکر جونہی احد کے پاس پہنچا تو آپ ﷺ نے انھیں احد کی طرف پشت کرنے اور مدینہ منورہ کی طرف رخ کرنے کی تلقین فرمائی۔ اور حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کی قیادت میں پچاس تیر انداز عَینَین پہاڑی پر، جو احد کے بالمقابل ہے، مقرر فرما دیے تاکہ کفار مسلمانوں کا محاصرہ نہ کرسکیں۔ آپ ﷺ نے ان 50 تیر اندازوں کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا:

«إِنْ رَأَيْتُمُونَا تَخْطَفُنَا الطَّيْرُ، فَلَا تَبْرَحُوا مَكَانَكُمْ هٰذَا حَتّٰى أُرْسِلَ إِلَيْكُمْ، وَإِنْ رَأَيْتُمُونَا هَزَمْنَا الْقَوْمَ وَأَوْطَأْنَاهُمْ فَلَا تَبْرَحُوا حَتّٰى أُرْسِلَ إِلَيْكُمْ»

''اگر تم دیکھو کہ پرندے ہمیں اچک رہے ہیں تو بھی اپنی جگہ نہ چھوڑنا یہاں تک کہ میں تمھیں بلا بھیجوں اور اگر تم دیکھو کہ ہم نے دشمن کو شکست دے دی ہے اور انھیں کچل دیا ہے تو بھی میرا پیغام آنے تک وہیں رہنا۔''[2]

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے ان تیر اندازوں کو چھوڑ کر باقی لشکر سے فرمایا:

«لَا تَبْرَحُوا حَتّٰى أُوذِنَكُمْ» ''جب تک میں تمھیں اجازت نہ دوں اپنی جگہ پر رہنا۔''

---

[1] القيادة العسكرية في عهد الرسول ﷺ، ص:469. [2] صحيح البخاري، حديث:3039.

اور فرمایا: «لَا یُقَاتِلَنَّ أَحَدٌ حَتّٰی اٰمُرَہٗ بِالْقِتَالِ» ''جب تک میں حکم نہ دوں کوئی بھی جنگ کا آغاز نہ کرے۔''

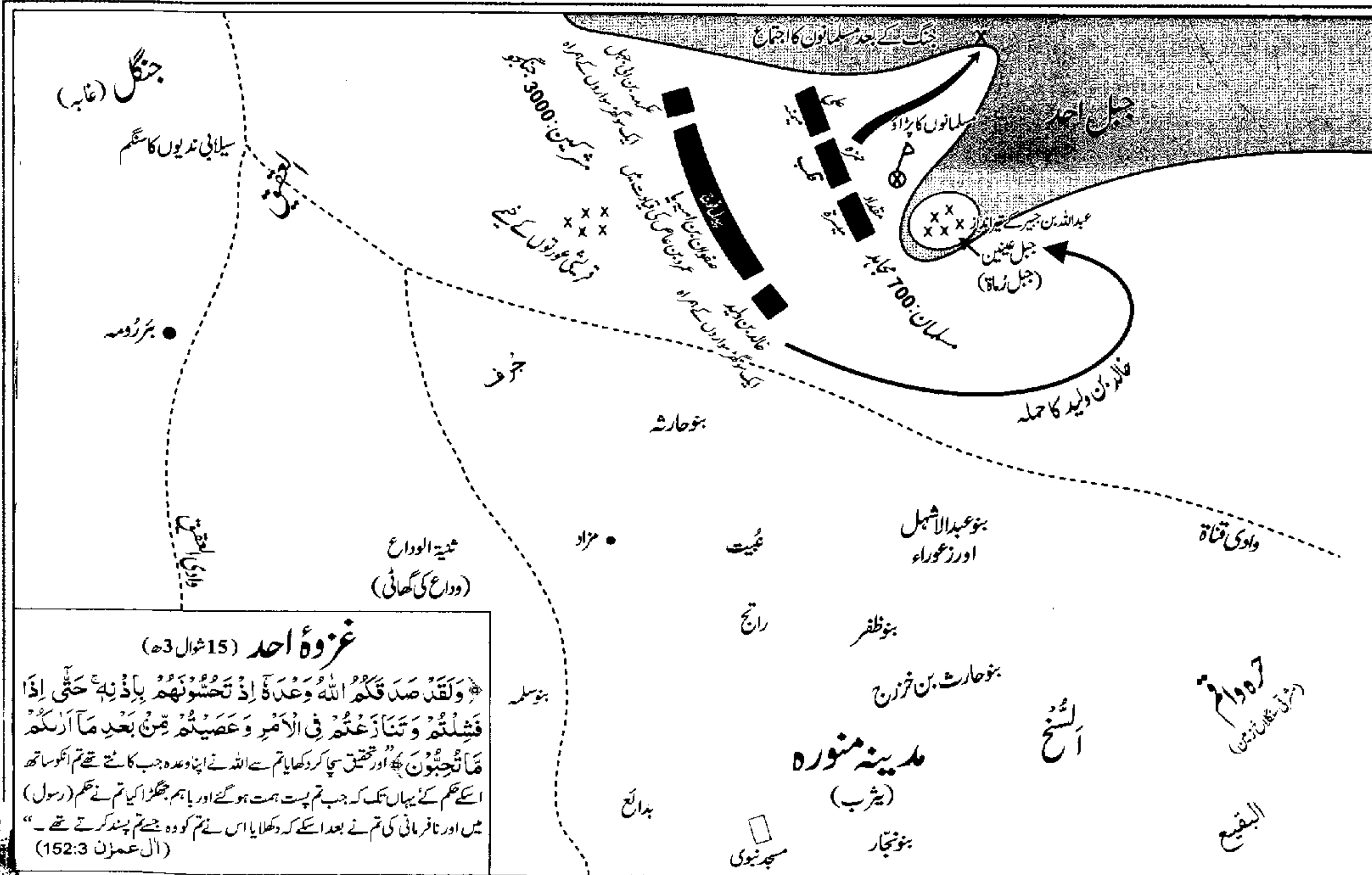
آپ ﷺ نے تیراندازوں کے کمانڈر سے یہ بھی فرمایا: «اِنْضَحِ الْخَیْلَ عَنَّا بِالنَّبْلِ، لَا یَأْتُونَا مِنْ خَلْفِنَا، وَاثْبُتْ مَکَانَكَ إِنْ کَانَتْ لَنَا أَوْعَلَیْنَا» ''شہسواروں کو تیر مار کر ہم سے دور رکھنا تاکہ وہ ہمارے پیچھے سے نہ آنے پائیں۔ ہم جیتیں یا ہاریں تم اپنی جگہ پر رہنا۔''[1]

تیراندازوں سے آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: «اِلْزَمُوا مَکَانَکُمْ، لَاتَبْرَحُوا مِنْهُ، فَإِذَا رَأَیْتُمُونَا نَهْزِمُهُمْ حَتّٰی نَدْخُلَ عَسْکَرَهُمْ، فَلَا تُفَارِقُوا مَکَانَکُمْ، وَإِنْ رَأَیْتُمُونَا نُقْتَلُ، فَلَاتَغِیثُونَا وَلَا تَدْفَعُوا عَنَّا، وَارْشُقُوهُمْ بِالنَّبْلِ، فَإِنَّ الْخَیْلَ لَا تُقْدِمُ عَلَی النَّبْلِ، إِنَّا لَنْ نَزَالَ غَالِبِینَ مَا مَکَثْتُمْ مَکَانَکُمْ، اَللّٰهُمَّ! إِنِّي أُشْهِدُكَ عَلَیْهِمْ» ''تم نے اپنی جگہ نہیں چھوڑنی۔ جب تم دیکھو کہ ہم انھیں شکست دیتے ہوئے ان کے لشکر میں گھس گئے ہیں تو بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹنا۔ اور اگر تم دیکھو کہ ہم قتل ہو رہے ہیں تو بھی ہماری مدد کے لیے نہ آنا اور نہ ہمارا دفاع کرنا۔ انھیں تیر مار مار کر ہم سے پرے رکھنا کیونکہ گھوڑا تیروں کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ تم اپنی جگہ قائم رہے تو ہم غالب ہی غالب ہیں۔ اے اللہ! میں تجھے ان پر گواہ بناتا ہوں۔''[2]

مسلمانوں نے بلند اور اہم جنگی مقامات قبضے میں لے لیے اور مکی لشکر کو وادی میں رکھا ان کا منہ احد کی جانب اور پشت مدینہ کی جانب تھی۔ اب تیراندازوں کے ذمے یہ کام تھے کہ موقع پر نگاہ رکھیں، مسلمانوں کی پشت محفوظ رکھیں اور دشمن کے شہسواروں کو مسلمانوں کے پاس نہ آنے دیں۔[3]

---

[1] السیرة الحلبیة: 496/2، وتاریخ الطبري: 507/2، ودلائل النبوة للبیهقي: 227/3، والسیرة النبویة لابن هشام: 70/3. [2] السیرة الحلبیة: 496/2، و السیرة النبویة لابن هشام: 70,69/3، وتاریخ الطبري: 507/2. [3] غزوة أحد لمحمد عیظة بن سعید، ص: 90.



غزوۂ احد (15 شوال 3ھ)

﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ﴾ "اور تحقیق سچا کردکھایا تم سے اللہ نے اپنا وعدہ جب کاٹتے تھے تم انکو ساتھ اسکے حکم کے یہاں تک کہ جب تم پست ہمت ہوگئے اور باہم جھگڑا کیا تم نے حکم (رسول) میں اور نافرمانی کی تم نے بعد اسکے کہ دکھلایا اس نے تم کو وہ جسے تم پسند کرتے تھے۔"
(آل عمران 152:3)

صف بندی اور لشکر کی تنظیم: رسول اللہ ﷺ نے آگے بڑھ کر نماز کی صفوں کی طرح صفیں ترتیب دیں۔ آپ ﷺ خود پیادہ چل کر صفیں درست فرما رہے تھے اور جنگ کے لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مورچہ بندی کر رہے تھے۔ آپ ﷺ صفیں سیدھی کرتے ہوئے فرماتے: «تَقَدَّمْ يَا فُلَانُ وَتَأَخَّرْ يَا فُلَانُ» ”فلاں! تم آگے ہو جاؤ! فلاں، تم پیچھے ہو جاؤ۔“ اس طرح صفیں سیدھی کر لیں۔[1] آپ ﷺ نے صفوں کے آگے زیادہ قوی اور جری افراد منتخب فرمائے تاکہ وہ پیچھے والوں کے لیے رستہ بنائیں۔ آپ ﷺ نے یہ اسلوب اس لیے اپنایا کہ دشمن سے جنگ میں یہ مؤثر ترین طریقہ ہے۔[2]

سپہ سالار کی اجازت کے بغیر جنگ کا آغاز کرنے کی ممانعت: امام طبری کا کہنا ہے کہ آپ ﷺ نے لشکر کی پشت احد کی جانب کی اور فرمایا:

«لَا يُقَاتِلَنَّ أَحَدٌ حَتّٰى نَأْمُرَهُ بِالْقِتَالِ»

”ہمارے حکم کے بغیر کوئی جنگ (کا آغاز) نہ کرے۔“[3]

اور اس میں اہم نکتہ یہ تھا کہ اس طرح ذمہ داری اور قیادت صرف ایک شخص کے ہاتھ میں رہے گی اور آپ ﷺ مصلحت کے تقاضے خوب جانتے تھے۔

1 المغازي للواقدي: 219/1. 2 العبقرية العسكرية لمحمد فرج، ص:356,355. 3 تاريخ الطبري:507/2.

باب 3

میدانِ احد کی تفصیلات

جنگ کا آغاز اور مسلمانوں کا غلبہ

مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش: جنگ کی ابتدا میں ابوسفیان نے مسلمانوں کی مضبوط صفوں میں شگاف ڈالنے کی بھرپور کوشش کی، اس سلسلے میں اس نے انصار کو پیغام بھیجا: ''آپ لوگ ہمارے اور ہمارے چچیرے بھائی کے درمیان حائل نہ ہوں۔ اس کے نتیجے میں ہم بھی آپ سے کنارہ کش ہو جائیں گے کیونکہ آپ کے ساتھ ہمیں لڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' مگر انصار نے اس کی پیشکش کے عین خلاف جواب دیا۔[1]

اس کوشش کے ناکام ہونے پر قریش نے دوسرا پتہ پھینکا، چنانچہ ابو عامر راہب جو اہل مدینہ کا خائن تھا وہ اہل مکہ کا آلۂ کار بن کر سامنے آیا۔ اس نے کچھ انصار کو پسپائی اختیار کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی اور کہنے لگا: ''اے خاندانِ اوس! میں ابو عامر ہوں۔'' آگے سے جواب آیا: ''ارے فاسق! اللہ کرے تیری اور تجھے بھیجنے والوں کی سازشیں خاک میں ملیں۔'' یہ جواب سن کر وہ بولا: ''میری قوم میرے بعد شر سے دوچار ہوگئی ہے۔'' پھر اس نے مسلمانوں سے پرزور لڑائی کی اور ان پر پتھر برسائے۔[2]

انفرادی لڑائی یا مبارزت: جنگ کا آغاز حضرت علی رضی اللہ عنہ اور مشرکین کے علمبردار طلحہ

[1] إمتاع الأسماع للمقريزي: 120/1. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 71/3، و السيرة النبوية لأبي شهبة: 192/2.

بن عثمان کے درمیان مبارزت سے ہوا۔ سیرتِ حلبیہ کے مولف کا بیان ہے کہ طلحہ بن عثمان مشرکین کا علم اٹھائے سامنے آیا اور بار بار مبارزت کا تقاضا کیا مگر کوئی بھی سامنے نہ آیا۔ وہ کہنے لگا:

''محمد (ﷺ) کے ساتھیو! تمھارا خیال ہے کہ اللہ تمھاری تلواروں سے ہمیں بہت جلد آگ اور ہماری تلواروں سے تمھیں بہت جلد جنت میں پہنچا دیتا ہے۔ تو کیا تم میں سے کوئی ایسا شخص ہے جو جلدی سے اپنی تلوار لے اور مجھے آگ میں پہنچا دے یا میں اسے اپنی تلوار سے جلد از جلد جنت میں پہنچا دوں؟''

یہ سن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ سامنے آئے اور فرمایا:

''اللہ کی قسم! جب تک میری تلوار کے ذریعے اللہ تجھے بہت جلد آگ میں نہ پہنچا دے یا تیری تلوار کے ذریعے اللہ مجھے جلد جنت میں نہ پہنچا دے میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔''

یہ کہنے کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس پر تلوار سے وار کیا اور اس کا ایک پاؤں کاٹ دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ زمین پر گرا اور ننگا ہو گیا اور التجا کرنے لگا: ''اے میرے چچیرے بھائی! تمھیں اللہ کی قسم اور رشتہ داری کا واسطہ دیتا ہوں۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب یہ سنا تو اسے زندہ چھوڑ کر واپس لشکر میں آ گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے (یہ منظر دیکھتے ہوئے) نعرۂ تکبیر بلند فرمایا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کسی ساتھی نے ان سے دریافت کیا کہ آپ نے اس کا کام تمام کیوں نہ کر دیا؟ فرمایا: ''میرے چچیرے بھائی نے رشتہ داری کا واسطہ اس وقت دیا جب وہ ننگا ہو چکا تھا تو مجھے بھی شرم محسوس ہونے لگی۔''[1]

[1] السيرة الحلبية: 2/498,497، و تفسير الطبري: 7/218. غزوۂ احد میں مبارزت کے متعلق صحیح بخاری میں بھی حدیث موجود ہے۔ وحشی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: لوگوں نے جب لڑائی کے لیے صف بندی کر لی تو سباع نے مبارزت کی دعوت دی تو حمزہ رضی اللہ عنہ مقابلے کے لیے نکلے اور کہا: ''او سباع! او شرمگاہ کی چمڑی کاٹنے (عورتوں کا ختنہ کرنے) والی عورت کے بیٹے! اللہ اور اس کے رسول سے مخالفت مول لیتے ہو؟'' یہ کہتے ہوئے اس پر ٹوٹ پڑے۔ وہ ایسے ہو گیا جیسے گزرا ہوا کل ہو۔ (صحيح البخاري، حديث:4072) مولف رحمہ اللہ بھی اپنی کتاب میں یہ روایت لائے ہیں، تفصیل کے لیے دیکھیے اس کتاب کے صفحہ 598 پر۔

گھمسان کا رن پڑنا اور نبی ﷺ کی حوصلہ افزائی: دونوں لشکروں میں گھمسان کی جنگ شروع ہوگئی۔ لڑائی کے شعلے ہر طرف بھڑک اٹھے۔ رسول اللہ ﷺ ساتھیوں کو ہمت، ولولے اور جنگی جذبے پر ابھارنے لگے اور ان کے جذبوں کو تازگی دینے کے لیے آپ ﷺ نے ایک تلوار پکڑی اور فرمایا:

«مَنْ يَأْخُذُ مِنِّي هٰذَا؟» ''یہ تلوار مجھ سے کون لے گا؟''

کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ہاتھ پھیلاتے ہوئے عرض کیا: ''میں لوں گا، میں تھاموں گا۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ يَأْخُذُهُ بِحَقِّهِ؟» ''کون ہے جو یہ تلوار مجھ سے لے کر اس کا حق ادا کرے گا؟''

اب لوگ کچھ رک گئے تو حضرت ابودجانہ سماک بن خرشہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:

''اے اللہ کے رسول! اس کا حق کیا ہے؟''

فرمایا: «أَنْ تَضْرِبَ بِهِ الْعَدُوَّ حَتّٰى يَنْحَنِيَ» ''اس تلوار کو دشمن پر اتنا چلاؤ کہ یہ ٹیڑھی ہو جائے۔''

انھوں نے کہا: ''میں اس تلوار کو لے کر اس کا حق ادا کروں گا۔''

آپ ﷺ نے تلوار انھیں دے دی۔ حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ بڑے بہادر انسان تھے۔ لڑائی کے وقت سینہ تان کر چلتے تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے انھیں مسلمانوں اور مشرکوں کی صفوں کے درمیان سینہ تان کر چلتے دیکھا تو فرمایا: «إِنَّهَا لَمِشْيَةٌ يُبْغِضُهَا اللّٰهُ إِلَّا فِي مِثْلِ هٰذَا الْمَوْطِنِ» ''اس جیسے موقعوں کے سوا یہ چال اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے۔''

حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ نے وہ تلوار تھام لی اور اس کے ساتھ مشرکوں کی کھوپڑیاں اڑانے لگے۔[1]

1. صحیح مسلم، حدیث: 2470، و السيرة النبوية لابن هشام: 71/3، و دلائل النبوة للبيهقي: 232/3.

حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ جنگ احد میں ابودجانہ رضی اللہ عنہ کے عمدہ کردار پر ان الفاظ سے لب کشاں ہیں: ”جب میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تلوار مانگی اور آپ نے مجھے نہ دی اور ابودجانہ رضی اللہ عنہ کو دے دی تو میرے دل پر اس کا اثر ہوا اور میں نے دل میں سوچا کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی صفیہ کا بیٹا ہوں، قریشی ہوں اور میں نے ابودجانہ رضی اللہ عنہ سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تلوار مانگی لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابودجانہ رضی اللہ عنہ کو دے دی اور مجھے نہ دی۔ اللہ کی قسم! میں دیکھوں گا وہ اس سے کیا کام لیتے ہیں، چنانچہ میں ابودجانہ کے پیچھے لگا رہا۔ انھوں نے اپنی سرخ پٹی نکالی اور سر پر باندھی تو اس پر انصار نے کہا: ”ابودجانہ رضی اللہ عنہ نے سر پر کفن باندھ لیا ہے۔“ ابودجانہ جب یہ پٹی باندھتے لوگ اس طرح کہا کرتے تھے، پھر وہ یہ کہتے ہوئے میدان جنگ میں کود پڑے:

أَنَا الَّذِي عَاهَدَنِي خَلِيلِي وَ نَحْنُ بِالسَّفْحِ لَدَى النَّخِيلِ
أَلَّا أَقُومَ الدَّهْرَ فِي الْكَيُّولِ أَضْرِبْ بِّسَيْفِ اللّٰهِ وَالرَّسُولِ

”میں وہی ہوں جس سے دامنِ کوہ کے نخلستان میں میرے خلیل صلی اللہ علیہ وسلم نے عہد و پیمان لیا تھا کہ کبھی صفوں کے پیچھے نہ رہوں گا۔

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی (عطا کردہ) تلوار کیا ہی خوب چلتی ہے بلکہ میں کھڑے ہوکر آخری صف تک برابر مقابلہ کرتا رہوں گا۔“

اس کے بعد انھیں جو بھی دشمن نظر آتا اسے قتل کردیتے۔ ادھر مشرکین میں ایک شخص تھا جو ہمارے زخمیوں کو قتل کرنے جارہا تھا۔ اب ابودجانہ رضی اللہ عنہ اور وہ قاتل مشرک دونوں آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے قریب ہورہے تھے۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ دونوں کا آمنا سامنا ہوجائے اور ایسا ہی ہوا۔ دونوں نے ایک دوسرے پر وار کیا۔ مشرک نے ابودجانہ رضی اللہ عنہ پر تلوار چلائی جس سے ابودجانہ رضی اللہ عنہ نے ڈھال سے بچاؤ کیا۔ مشرک کی تلوار اس ڈھال میں الجھ کر رہ گئی۔ اب ابودجانہ رضی اللہ عنہ نے اس پر تلوار چلائی اور اس کا کام تمام

کر دیا، پھر میں نے دیکھا کہ انھوں نے تلوار ہند بنت عتبہ کے سر کے وسط پر اٹھائی اور پھر اسے ہٹا لیا۔ میں نے سوچا کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں۔''

ابن اسحاق کا بیان ہے کہ ابودجانہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک انسان کو دیکھا، وہ لوگوں کو بڑے زور شور سے جوش وولولہ دلا رہا تھا۔ میں اس کی طرف بڑھا، میں نے جب اس پر تلوار اٹھائی تو اس نے چیخ مار کر واویلا کیا۔ اب پتا چلا کہ یہ تو عورت ہے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کی تلوار کو محترم جانا کہ اس سے کسی عورت کو ماروں۔ [1]

تیر اندازوں کی حکم عدولی اور جنگ کا پانسہ پلٹنا

مشرکین کے ساتھ جنگ میں مسلمانوں نے بہادری کے جوہر دکھائے۔ ان کا جنگی شعار اس دن «أَمِتْ، أَمِتْ» ''مارو، مارو'' تھا۔ جری مجاہدین جنگی شہسواروں اور سپوتوں کو موت کی آغوش میں دھکیل رہے تھے۔ اسلام کے شیروں نے بہادری اور جوانمردی کی تاریخ از سرنو مرتب کر دی۔ حضرت حمزہ، مصعب بن عمیر، ابودجانہ، ابوطلحہ انصاری، سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم اور دیگر جوانمردوں نے شجاعت و بہادری کی داستانیں رقم کیں۔ اور پہلے ہی حملے میں جنگ کا توازن مسلمانوں کے حق میں ہو گیا۔ [2]

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس طرف اشارہ فرمایا ہے:

﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ﴾

''یقیناً اللہ نے تم سے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا جب تم (احد میں) اس کے حکم سے

1 البداية والنهاية: 17/4، والسيرة النبوية لابن هشام: 73/3، ودلائل النبوة للبيهقي: 233/3.

2 نضرة النعيم: 303/1.

کافروں کو قتل کر رہے تھے، یہاں تک کہ جب تم نے کم ہمتی اختیار کی اور اپنی ذمہ داری کے بارے میں جھگڑنے لگے اور جونہی اللہ نے تمھیں وہ چیز (مال غنیمت کی جھلک) دکھائی جس سے تم محبت کرتے تھے تو تم نے نافرمانی کی، (اس لیے کہ) تم میں سے کچھ لوگ دنیا چاہتے تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے، پھر اللہ نے تمھیں کافروں کے مقابلے میں پسپا کر دیا تاکہ تمھاری آزمائش کرے۔ بلا شبہ (پھر بھی) اس نے تمھیں معاف کر دیا۔ اور اللہ مومنوں پر فضل کرنے والا ہے۔''[1]

عینین پہاڑ پر مامور تیر اندازوں نے جب قریشی لشکر کو شکست خوردہ پایا اور میدان جنگ میں مال غنیمت پڑا دیکھا تو اس کی چاہت میں وہ مورچہ چھوڑ بیٹھے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ جنگ تو ختم ہو چکی ہے، چنانچہ وہ اپنے امیر عبد اللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ سے کہنے لگے: ''غنیمت! لوگو غنیمت! تمھارے ساتھی جیت چکے ہیں اب کیا انتظار کر رہے ہو؟'' حضرت عبد اللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''کیا تم بھول گئے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم سے کیا کہا تھا؟'' وہ کہنے لگے: ''اللہ کی قسم! ہم بھی لوگوں کے پاس جائیں گے اور کچھ غنیمت حاصل کریں گے۔''[2] یہ کہتے ہوئے وہ اپنے امیر کی اجازت کے بغیر مال غنیمت سمیٹنے لگے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما تیر اندازوں کی اس صورت حال کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں: ''جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فتح حاصل ہو گئی اور مشرکین کا لشکر شکست سے دوچار ہو چکا تو اس دوران تیر انداز اکٹھے ہی میدان جنگ میں آدھمکے اور غنیمت جمع کرنے لگے۔ تمام اسلامی لشکر کی صفیں اکٹھی ہو چکیں۔ ایسے جمع ہو گئے جس طرح ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسری میں گھس جاتی ہیں۔ تو جب تیر اندازوں نے اپنا مورچہ خالی کر دیا وہیں سے دشمن کے شہسوار مسلمانوں پر پل پڑے۔ اس کے نتیجے میں خود مسلمان عدم شناخت کی وجہ سے ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے۔ اس طرح مسلمانوں میں سے خاصی تعداد شہید ہو گئی۔''[3]

---

[1] آل عمرٰن 152:3. [2] صحیح البخاري، حدیث:3039. [3] مسند أحمد:487/1.

خالد بن ولید، مشرکوں کے گھڑ سواروں کے کمانڈر تھے، انھیں مسلم سپاہ نرغے میں لینے کا سنہری موقع ہاتھ آ گیا۔ مشرکین نے جب یہ صورتِ حال دیکھی تو اب دوبارہ جنگ کی طرف لپکے اور دونوں اطراف سے مسلمانوں کو گھیرے میں لے لیا۔ مسلمانوں کی جنگی منصوبہ بندی درہم برہم ہوگئی اور وہ بغیر کسی قیادت، وحدت اور قاعدے کے بے ہنگم لڑ رہے تھے۔ حتی کہ اپنوں کو بھی پہچان نہیں رہے تھے۔ اسی دوران حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے والد گرامی حضرت یمان رضی اللہ عنہ کو غلطی سے شہید کر دیا گیا۔[1]

مسلمان شہداء میدان جنگ میں گرنے لگے اور ان کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رابطہ ٹوٹ گیا اور مشہور ہو گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو چکے ہیں۔[2]

سارا نظام ہی درہم برہم ہو گیا۔ جنگ کی بھٹی گرم ہوگئی جو بھی مسلمان مشرکوں کے ہاتھ لگتا اسے مار دیتے۔ ایک موقع پر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتہائی قریب پہنچ گئے۔ مشرکین نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھر پھینکا جس سے چہرۂ مبارک پر زخم آ گیا۔ سامنے والے دو دانتوں کے ساتھ والا نچلا دایاں دانت مبارک ٹوٹ گیا اور ناک مبارک پر چوٹ آ گئی۔ طبیعت بوجھل ہونے لگی اور خاصا خون بہہ نکلا۔[3]

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ احد کے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رباعی دانت ٹوٹ گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مبارک زخمی ہو گیا۔ اس دوران آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چہرے سے خون پونچھتے جا رہے تھے اور یہ کہتے جا رہے تھے:

«كَيْفَ يُفْلِحُ قَوْمٌ شَجُّوا نَبِيَّهُمْ وَكَسَرُوا رَبَاعِيَتَهُ وَهُوَ يَدْعُوهُمْ إِلَى اللّٰهِ»

”وہ قوم کیسے نجات پا سکتی ہے جس نے اپنے نبی کے چہرے کو زخمی کر دیا اور دانت

[1] صحيح البخاري، حديث: 4065. [2] غزوة أحد لمحمد عيطة بن سعيد، ص: 98. [3] فقه السيرة للغزالي، ص: 294.

توڑ دیا، جبکہ وہ انھیں اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دیتا ہے۔‘‘[1]

اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَٰلِمُونَ﴾

’’(اے نبی!) آپ کا اس معاملے میں کچھ اختیار نہیں، اللہ چاہے تو ان کی توبہ قبول کرے، چاہے تو انھیں عذاب دے کیونکہ وہ ظالم ہیں۔‘‘[2]

رسول اللہ ﷺ کی شہادت کی افواہ

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے بہت مشابہت رکھتے تھے، چنانچہ ابن قمئہ نے ان پر حملہ کر کے انھیں شہید کر دیا۔ اور قریش سے کہا: ’’میں نے محمد (ﷺ) کو قتل کر دیا ہے۔‘‘[3]

یہ افواہ پھیل گئی کہ رسول اللہ ﷺ شہید کر دیے گئے ہیں۔ یہ سنتے ہی مسلمان بکھرنے لگے اور کچھ تو مدینہ منورہ چلے گئے۔ ایک جماعت پہاڑ کا رخ اختیار کر گئی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حیران و ششدر تھے، انھیں کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ اس جان لیوا خبر کے بعد کیا کریں۔[4]

مسلمانوں کا ایک گروہ میدان جنگ سے بھاگ نکلا۔ کچھ میدان کے کنارے (ہتھیار پھینک کر) بیٹھ گئے۔ کچھ مسلمانوں نے اسی خیال کے بعد کہ آپ ﷺ تو شہید ہو چکے اب زندگی کا کیا لطف، شہادت کو ترجیح دی۔ انھی میں سے حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ بھی تھے جو بدر میں عدم شمولیت کی بنا پر افسوس کیا کرتے تھے اور کہتے تھے: ’’اللہ کی قسم! مجھے رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ جنگ کی فرصت ملی تو اللہ تعالیٰ دیکھیں گے کہ میں کیا کرتا ہوں۔‘‘ چنانچہ اس موقع پر انھوں نے اپنا وعدہ سچا کر دیا۔

---

1 صحیح مسلم، حدیث: 1791. 2 آل عمرٰن 3:128. 3 السیرة النبویة لابن هشام: 3/81. 4 غزوة أحد لمحمد عيظة بن سعيد، ص: 100.

انس بن نضر رضی اللہ عنہ کی جرأت و بہادری

حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ نے احد کے دن کچھ پریشان حال صحابہ سے جو ہتھیار پھینک کر بیٹھے تھے، دریافت کیا: ''کس لیے بیٹھے ہو؟'' کہنے لگے: ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو چکے ہیں۔'' انس بن نضر رضی اللہ عنہ نے جواب دیتے ہوئے کہا: ''لوگو! اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رب تو شہید نہیں ہو گیا۔ تم بھی اس پر جان دے دو جس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جان قربان کر دی ہے۔'' پھر کہنے لگے: ''اے اللہ! میں اپنے ساتھیوں کے اس موقف سے بری ہوں اور مشرکین کے کردار سے لاتعلقی کا اظہار کرتا ہوں۔'' بعد ازاں حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ سے ملتے ہیں اور کہتے ہیں: ''اے سعد! میں احد کے پاس جنت کی خوشبو پا رہا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ میدانِ کارزار میں کود پڑے اور شہادت سے ہمکنار ہونے تک برسرِ پیکار رہے۔ معرکے کے بعد انس بن نضر رضی اللہ عنہ کے جسم پر تلوار، نیزے اور تیر کے اسی (80) سے زیادہ زخم موجود تھے، حتی کہ شناخت ناممکن ہو رہی تھی، چنانچہ ان کی بہن نے انگلی کے پوروں سے انھیں پہچانا تھا۔[1]

یقیناً ان جیسے بہادر ہی حسبِ ذیل فرمان باری تعالیٰ کے مصداق ہو سکتے ہیں:

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ ۖ فَمِنْهُم مَّن قَضَىٰ نَحْبَهُ وَمِنْهُم مَّن يَنتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا﴾

''مومنوں میں سے کچھ وہ لوگ بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے جو عہد کیا تھا وہ سچ کر دکھایا، چنانچہ ان میں سے بعض نے اپنا عہد پورا کیا (شہادت پا گئے) اور ان میں سے بعض منتظر ہیں اور انھوں نے (عہد میں) کوئی تبدیلی نہیں کی۔''[2]

---

1 صحيح البخاري، حديث: 4048، و السيرة النبوية لابن هشام: 88/3، وغزوة أحد لمحمد عيظة بن سعيد، ص: 101. 2 الأحزاب 23:33.

میدانِ جنگ سے بھاگنے والے اور ان کی معافی

مگر جو لوگ ثابت قدم رہنے کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی تلقین کے باوجود میدان چھوڑ گئے ان کے متعلق درج ذیل ارشاد نازل ہوا:

﴿ إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلْوُنَ عَلَىٰٓ أَحَدٍ وَٱلرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِىٓ أُخْرَىٰكُمْ فَأَثَٰبَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوا۟ عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ أَصَٰبَكُمْ ۗ وَٱللَّهُ خَبِيرٌۢ بِمَا تَعْمَلُونَ ○ ﴾

''جب تم بھاگے چلے جا رہے تھے اور کسی کی طرف پلٹ کر نہ دیکھتے تھے اور رسول (ﷺ) تمھارے پیچھے سے تمھیں آوازیں دے رہے تھے، پھر اللہ نے تمھیں غم پر غم دیے تاکہ تمھیں یہ سبق ملے کہ جو کچھ تمھارے ہاتھ سے جائے یا جو مصیبت تم پر نازل ہو اس پر تمھیں غمگین نہیں ہونا چاہیے اور تم جو عمل کرتے ہو اللہ اس کی خبر رکھتا ہے۔''[1]

قرآن پاک نے ان صحابہ کا تذکرہ کیا ہے جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کی شہادت کی افواہ سن کر بھاگنے میں عافیت جانی۔ سب سے قبل جس شخص نے رسول اللہ ﷺ کو پہچان کر لوگوں کو خوشخبری دی کہ آپ ﷺ زندہ ہیں وہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ تھے۔ انھوں نے خوشی میں بآواز بلند اعلان کیا تو آپ ﷺ نے انھیں خاموش کرا دیا کہ مبادا مشرکین تک یہ بات نہ پہنچ جائے۔[2]

میدانِ جنگ چھوڑ کر جانے والے گروہ کو اللہ تعالیٰ نے معافی عطا فرما دی، چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿ إِنَّ ٱلَّذِينَ تَوَلَّوْا۟ مِنكُمْ يَوْمَ ٱلْتَقَى ٱلْجَمْعَانِ إِنَّمَا ٱسْتَزَلَّهُمُ ٱلشَّيْطَٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا۟ ۖ وَلَقَدْ عَفَا ٱللَّهُ عَنْهُمْ ۗ إِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ○ ﴾

[1] آل عمرٰن 153:3. [2] مجمع الزوائد: 112/6، والسيرة النبوية لابن هشام: 88/3.

''بے شک جب دو لشکر (احد میں) آپس میں ٹکرائے تھے تو تم میں سے جن لوگوں نے پسپائی اختیار کی یقیناً وہ اپنی بعض کوتاہیوں کے سبب شیطان کے بہکاوے میں آگئے تھے اور بلا شبہ اللہ نے انھیں معاف کردیا، بے شک اللہ نہایت بخشنے والا، بہت حوصلے والا ہے۔''[1]

رسول اللہ ﷺ کے ارد گرد بہادری کے مناظر

ابتدائی فتح کے بعد جب مشرکین مسلمانوں پر پل پڑے جس میں ان کا اصل ہدف رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی تھی۔ آپ ﷺ اپنے مقام سے پیچھے نہیں ہٹے۔ جاں نثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک ایک کر کے آپ پر جان نچھاور کر رہے تھے۔ جس وقت آپ ﷺ کا گھیراؤ ہوا آپ ﷺ کے ساتھ صرف نو ساتھی تھے جن میں سے سات انصاری تھے۔[2]

رسول اللہ ﷺ مشرکین کا حصار توڑ کر پہاڑ پر موجود اپنے لشکر میں جانا چاہتے تھے۔ ادھر انصار دیوانہ وار آپ ﷺ کے دفاع میں یکے بعد دیگرے جانیں قربان کر رہے تھے۔[3]

بعد ازاں حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ نے اس قدر لڑائی کی کہ جسم لہولہان تھا اور تیر لگنے سے دایاں ہاتھ شل ہوگیا۔[4]

رسول اللہ ﷺ نے ایک چٹان پر چڑھنا چاہا مگر نہ چڑھ سکے، پھر حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نیچے بیٹھے تو آپ ﷺ ان پر اپنے قدم مبارک رکھ کر چٹان پر چڑھ گئے۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ فرمارہے تھے: «أَوْجَبَ طَلْحَةُ» ''طلحہ نے جنت واجب کرلی۔''[5]

اس دن حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے بھی رسول اللہ ﷺ کے سامنے جرأت و بہادری کے جوہر دکھائے، آپ ﷺ انھیں تیر پکڑاتے اور فرماتے: «اِرْمِ يَا سَعْدُ! فِدَاكَ أَبِي وَ أُمِّي» ''اے سعد! تیر پھینکو تم پر میرے ماں باپ قربان!''[6]

---

1 آل عمرٰن 155:3. 2 صحيح مسلم، حديث: 1789. 3 نضرة النعيم: 304/1. 4 صحيح البخاري، حديث: 4060-4064. 5 مسند أحمد: 137/1، و جامع الترمذي، حديث: 1692.
6 صحيح البخاري، حديث: 4055.

اسی طرح اس دن رسول اللہ ﷺ کے دفاع میں ماہر تیر انداز حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ نے بھی خوب جوہر دکھائے۔ آپ ﷺ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے متعلق فرما رہے تھے: «لَصَوْتُ أَبِي طَلْحَةَ فِي الْجَيْشِ أَشَدُّ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مِنْ فِئَةٍ» ''لشکر میں (اکیلے) ابوطلحہ کی آواز مشرکین پر ایک بڑی جماعت سے بھی زیادہ گراں ہے۔''[1]

حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ اپنی ڈھال لے کر رسول اللہ ﷺ کے سامنے سپر بن گئے۔ آپ بڑے مایہ ناز تیر انداز تھے۔ بہت کھینچ کر تیر چلاتے تھے، چنانچہ اس دن آپ نے دو یا تین کمانیں توڑ ڈالیں۔ آپ ﷺ کے پاس سے کوئی بھی آدمی ترکش لیے گزرتا تو آپ ﷺ اس سے فرماتے: «اُنْثُرْهَا لِأَبِي طَلْحَةَ» ''اپنے تیر ابوطلحہ کے لیے بکھیر دو۔'' پھر آپ ﷺ لوگوں کی طرف سر اٹھا کر دیکھتے تو ابوطلحہ رضی اللہ عنہ عرض کرتے: ''اے اللہ کے نبی! میرے ماں باپ آپ پر قربان! آپ سر اٹھا کر نہ جھانکیں، کہیں دشمن کا کوئی تیر آپ کو نہ لگ جائے۔ میرا سینہ آپ کے سینۂ مبارک کا دفاع کر رہا ہے۔''[2]

حضرت نُسیبہ بنت کعب مازنیہ رضی اللہ عنہا بھی آپ ﷺ کے دفاع میں تلوار اور تیر چلاتی ہیں حتی کہ ان کے جسم پر کئی ایک نمایاں زخم بھی آ گئے۔

حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ نے تو اپنے جسم کو آپ ﷺ کے سامنے ڈھال بنا لیا۔ اس کے باعث ان کی کمر تیروں سے چھلنی ہوگئی۔[3]

پھر ان نازک ترین لمحات میں رسول اللہ ﷺ کے گرد جاں نثار پہنچنے لگے، چنانچہ ابوبکر اور ابوعبیدہ رضی اللہ عنہما آ گئے۔ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے چہرۂ انور سے اپنے دانتوں کے ساتھ خود کی دو کڑیاں نکالیں۔ پھر آہستہ آہستہ تیس جاں نثار آپ ﷺ کے دفاع کے لیے جمع ہوگئے۔ جن میں حضرت قتادہ، ثابت بن دحداح، سہل بن حنیف، عمر بن خطاب،

[1] مسند أحمد:203/3، و مسند عبد بن حميد، حديث:1384. [2] صحيح البخاري، حديث: 4064. [3] البداية والنهاية:36,35/4، والسيرة النبوية لابن هشام:87/3.

عبدالرحمٰن بن عوف اور زبیر بن عوام رضی اللہ عنہم اور دیگر صحابۂ کرام شامل تھے۔

اب خالد بن ولید کی قیادت میں مشرکین کا ایک دستہ پہاڑ پر چڑھ آیا جسے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے نیچے دھکیلا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ دیگر صحابہ نے اس تازہ حملے کو پسپا کرنے کے لیے جان کی بازی لگادی اور حالات ایک دفعہ پھر قابو میں آ گئے۔[1]

مشرکین حتمی فتح سے مایوس ہوکر اعصاب شکن طویل جنگ اور مسلمانوں کی جان فروش بہادری کی بنا پر پیچھے ہٹنے لگے۔ آپ ﷺ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ احد کی ایک گھاٹی کی طرف چلے گئے۔ تمام مسلمان مشرکین کو واپس لوٹانے کے باوجود اپنے اور آپ ﷺ کے احوال کی بنا پر انتہائی دکھ، غم اور پریشانی کے عالم میں تھے۔[2]

اونگھ کا طاری ہونا

چنانچہ اسی حالت میں اللہ تعالیٰ نے تھوڑی دیر کے لیے مجاہدین پر اونگھ طاری کر دی جس کے بعد وہ اطمینان بخش حالت میں بیدار ہوئے۔ ارشاد باری ہے:

﴿ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ۭ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ۭ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ۭ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ۭ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ۭ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ○﴾

''پھر اس نے غم کے بعد تم پر سکون نازل کیا جو ایک اونگھ تھی۔ وہ تمھارے ایک گروہ پر چھا رہی تھی۔ اور دوسرا گروہ جس کے نزدیک ساری اہمیت اپنی ذات ہی

1 السيرة النبوية للدكتور الغضبان، ص: 468-470. 2 نضرة النعيم:1/305.

کی تھی، وہ اللہ کے بارے میں ناحق جاہلانہ طور پر گمان کرنے لگا۔ وہ کہتے تھے: کیا اس معاملے میں ہمارا بھی کوئی اختیار ہے؟ کہہ دیجیے: سب اختیار اللہ ہی کا ہے۔ وہ اپنے دلوں میں وہ بات چھپاتے ہیں جو آپ (ﷺ) کے سامنے ظاہر نہیں کرسکتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر اس معاملے میں ہمارا بھی کچھ اختیار ہوتا تو ہم یہاں نہ مارے جاتے۔ کہہ دیجیے: اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے تو بھی جن کی قسمت میں قتل ہونا لکھا تھا وہ اپنی قتل گاہوں کی طرف ضرور نکل آتے اور یہ اس لیے ہوا کہ جو کچھ تمھارے سینوں میں ہے اللہ اسے آزمائے اور تاکہ تمھارے دلوں میں سے وسوسے صاف کردے اور اللہ سینوں کے بھید خوب جانتا ہے۔"[1]

تمام مفسرین کے بقول ﴿وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ﴾ سے مراد منافقین ہیں۔[2]

ادھر قریش اب حتمی فتح سے مایوس اور طویل جنگ سے اکتا چکے تھے۔ اور وہ اس وقت تو بالکل ہی ناامید ہو چکے تھے جب مسلمان اونگھ سے اطمینان پانے کے بعد آپ ﷺ کے اردگرد اکٹھے ہو رہے تھے، لہٰذا اب انھوں نے مسلمانوں کا پیچھا کرنے اور مجتمع قوت میں رخنہ ڈالنے کے بجائے واپسی کی راہ لی۔

شہدائے احد

سید الشہداء حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ: اللہ کے شیر سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ نے دشمن کو خاک و خون میں تڑپایا اور خون کی ندیاں بہادیں اور مشرکین کے علم بردار قبیلے عبد الدار کے یکے بعد دیگرے کئی آدمی قتل کیے۔ سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ اسی طرح جرأت و بہادری کی تاریخ رقم کررہے تھے، جبکہ وحشی آپ کی گھات لگائے بیٹھا تھا۔ جونہی حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اس کے نشانے پر آگئے تو اس نے نیزہ پھینکا جس سے آپ شہید ہوگئے۔

[1] آل عمرٰن3:154. [2] نضرة النعيم:305/1.

ہم وحشی کی زبانی سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ نقل کرتے ہیں۔ اس کا بیان ہے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے طعیمہ بن عدی بن خیار کو بدر میں قتل کیا تھا تو مجھ سے میرے مالک جبیر بن مطعم نے کہا: ''اگر تم میرے چچا کے بدلے میں حمزہ (رضی اللہ عنہ) کو قتل کر دو تو تم آزاد ہو۔'' چنانچہ جب لوگ جنگ احد کے لیے نکلے میں بھی لوگوں کے ساتھ نکلا۔ لوگوں نے جب لڑائی کے لیے صف بندی کر لی تو سباع نے مبارزت کی دعوت دی۔ تو حمزہ رضی اللہ عنہ اس کے مقابلے کے لیے نکلے اور اسے پکار کر اس کی ماں کے پیشے کی عار دلائی اور کہا: ''اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مخالفت مول لیتے ہو؟'' پھر اس پر ٹوٹ پڑے۔ وہ ایسے ہو گیا جیسے گزرا ہوا کل ہو۔ اور میں ایک چٹان کے نیچے حمزہ رضی اللہ عنہ کے قتل کے ارادے سے چھپ گیا۔ جب وہ میرے نزدیک آگئے تو میں نے اپنا نیزہ ان پر پھینکا وہ ان کی ناف کے نیچے لگا اور دونوں سرینوں کے درمیان سے پار ہو گیا اور اسی حالت میں وہ شہادت سے سرفراز ہو گئے۔ بعد ازاں لوگ واپس ہوئے تو میں بھی ان کے ساتھ واپس مکہ آگیا۔ میں مکہ ہی میں رہا، پھر جب مکہ میں اسلام پھیل گیا تو میں طائف کی طرف نکل گیا۔

اہل مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کئی پیغام رساں بھیجے۔ مجھے بھی مشورہ ملا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایلچیوں کی گرفت نہیں کرتے۔ تو میں بھی لوگوں کے ساتھ چلا آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیکھ کر فرمایا: «أَنْتَ وَحْشِيٌّ؟!!» ''کیا تو وحشی ہے؟'' میں نے عرض کیا: ''میں ہی ہوں۔'' فرمایا: «أَنْتَ قَتَلْتَ حَمْزَةَ؟» ''حمزہ کو تو نے شہید کیا تھا؟'' میں نے عرض کیا: ''آپ کو جو بات پہنچی ہے ایسے ہی ہوا۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «فَهَلْ تَسْتَطِيعُ أَنْ تُغَيِّبَ وَجْهَكَ عَنِّي» ''کیا تو میرے سامنے سے جا سکتا ہے؟'' تو میں وہاں سے چلا گیا۔ جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے تو مسیلمہ کذاب نے شورش بپا کی۔ میں نے سوچا کہ میں ضرور اس کی طرف جاؤں گا، ممکن ہے اس طرح میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کا بدلہ چکا سکوں، لہٰذا میں بھی لوگوں کے ساتھ چلا، پھر یہ ہوا کہ میں نے خاکستری

رنگ کے اونٹ کی طرح قد آور اور پراگندہ بالوں والے ایک شخص کو دیوار کی ٹوٹی ہوئی جگہ میں کھڑا دیکھا، تو میں نے اسے اپنا نیزہ مارا۔ وہ اس کے سینے پر لگا اور کندھوں کے درمیان سے آر پار ہوگیا۔ ساتھ ہی ایک انصاری صحابی اس پر جھپٹے اور اس کے سر پر تلوار ماردی۔ عبداللہ بن فضل کہتے ہیں: ''مجھے سلیمان بن یسار نے بتایا کہ انھوں نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو کہتے سنا کہ اسی وقت کسی گھر کی چھت سے ایک بچی پکار رہی تھی: ''ہائے امیرالمؤمنین (مسیلمہ کذاب)! ایک کالے غلام نے انھیں مار ڈالا۔''[1]

❁ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی جائے شہادت پر تشریف آوری: جب جنگ احد ختم ہوگئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ساتھیوں سے پوچھا: «مَنْ رَّأَى مَقْتَلَ حَمْزَةَ؟» ''حمزہ کی جائے شہادت کس نے دیکھی ہے؟'' ایک آدمی نے عرض کیا: ''میں نے وہ مقام دیکھا ہے۔'' فرمایا: «فَانْطَلِقْ أَرِنَاهُ» ''تو چلو ہمیں دکھاؤ۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم چل دیے اور کچھ دیر بعد سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش کے پاس جا پہنچے۔ دیکھا کہ ان کا پیٹ پھاڑ دیا گیا ہے اور مثلہ بھی کیا گیا ہے۔ اس آدمی نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! ان کا مثلہ کیا گیا ہے۔''[2]

ایک روایت میں ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سیدالشہداء حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کی اطلاع ملی تو آپ کے آنسو رواں ہوگئے اور جب انھیں دیکھا تو ہچکی بندھ گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم شہداء کے درمیان کھڑے ہوئے اور فرمایا:

«أَنَا شَهِيدٌ عَلٰى هٰؤُلَاءِ، كَفِّنُوهُمْ فِي دِمَائِهِمْ فَإِنَّهُ لَيْسَ جُرْحٌ يُّجْرَحُ فِي اللّٰهِ إِلَّا جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَدْمٰى، لَوْنُهُ لَوْنُ الدَّمِ، وَرِيحُهُ رِيحُ الْمِسْكِ، قَدِّمُوا أَكْثَرَهُمْ قُرْآنًا، فَاجْعَلُوهُ فِي اللَّحْدِ»

1 صحيح البخاري، حديث: 4072، و دلائل النبوة للبيهقي: 3/241-243، و تاريخ الطبري: 2/516,517. 2 المعجم الكبير للطبراني: 19/82، و مجمع الزوائد: 6/119.

''میں ان پر گواہ ہوں۔ انھیں ان کے خون ہی میں کفن دے دو کیونکہ جو بھی زخم اللہ کے راستے میں آتا ہے قیامت کے دن وہ ایسی حالت میں ہوگا کہ خون بہہ رہا ہوگا۔ اس کا رنگ تو خون کا سا ہوگا مگر خوشبو کستوری کی طرح ہوگی۔ جسے قرآن زیادہ یاد تھا اسے لحد میں آگے کرو۔''[1]

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شہادت سے وہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احد کی جانب آنے سے قبل اپنے ساتھیوں کو یوں سنایا تھا: «رَأَيْتُ فِي سَيْفِي ذِي الْفَقَارِ فَلًّا، فَأَوَّلْتُهُ فَلًّا يَكُونُ فِيكُم (أَيْ: اِنْهِزَامًا)، وَرَأَيْتُ أَنِّي مُرْدِفٌ كَبْشًا، فَأَوَّلْتُهُ كَبْشَ الْكَتِيبَةِ، وَرَأَيْتُ أَنِّي فِي دِرْعٍ حَصِينَةٍ، فَأَوَّلْتُهَا الْمَدِينَةَ، وَرَأَيْتُ بَقَرًا تُذْبَحُ، فَبَقَرٌ وَّاللّٰهُ خَيْرٌ! فَبَقَرٌ وَّاللّٰهُ خَيْرٌ!» ''میں نے خواب میں اپنی تلوار ذوالفقار پر کچھ شکستگی دیکھی تھی جس کی تعبیر میں نے نکالی تھی کہ تم میں کچھ شکست واقع ہوگی۔ اور میں نے دیکھا کہ میں نے اپنے پیچھے مینڈھا سوار کر رکھا ہے۔ جس کی تعبیر میں نے لشکر کے سردار سے کی ہے۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں محفوظ زرہ میں ہوں۔ اس کی تعبیر میں نے مدینہ سے کی ہے۔ اور میں نے دیکھا بہت سی گائیں ذبح کی جارہی ہیں۔ پس گائیں، اور اللہ خیر (اللہ کا کرنا بہتر ہے۔) پس گائیں، اور اللہ خیر (اللہ کا کرنا بہتر ہے)۔'' تو جیسے جیسے آپ نے کہا تھا ویسے ہی ہوگیا۔[2]

❁ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا اپنے بھائی سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کی المناک شہادت پر صبر:

حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ احد کے دن ایک عورت بھاگتی ہوئی آئی قریب تھا کہ وہ شہداء ومقتولین تک پہنچ جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں چاہتے تھے کہ وہ شہداء کی حالت دیکھے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آواز دی: «اَلْمَرْأَةَ ...... اَلْمَرْأَةَ» ''عورت کو روکو!

---

1 صحيح البخاري، حديث: 4079، وسنن أبي داود، حديث: 3138، وجامع الترمذي، حديث: 1036. 2 جامع الترمذي، حديث: 1561، ومسند أحمد: 271/1، والسيرة النبوية لابن هشام: 67,66/3. اور دیکھیے: صحيح البخاري، حديث: 7035.

عورت کو روکو!'' حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''میں نے پہچان لیا کہ وہ صفیہ رضی اللہ عنہا ہیں، چنانچہ میں بھاگتا ہوا ان کی جانب گیا اور ان کے مقتولین تک پہنچنے سے قبل انھیں جالیا۔ انھوں نے میرے سینے کو زور دار دھکا دیا۔ وہ مضبوط عورت تھیں اور ساتھ ہی کہنے لگیں: ''پرے ہٹ جاؤ۔ تمھارے لیے کوئی جگہ نہ رہے۔'' میں نے کہا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو آگے جانے سے قطعاً منع کیا ہے۔'' یہ سن کر وہ اسی جگہ ٹھہر گئیں۔ اور اپنے پاس موجود دو کپڑے نکال کر کہنے لگیں: ''مجھے میرے بھائی کی شہادت کی خبر ملی تھی، چنانچہ میں یہ دونوں کپڑے ان کے کفن کے لیے لائی ہوں۔ انھیں ان میں کفن دے دینا۔'' ہم نے وہ دونوں کپڑے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو کفن دینے کے لیے لے لیے۔ ہم نے دیکھا تو حمزہ رضی اللہ عنہ کے پہلو میں ایک انصاری شہید موجود تھے اور ان کے ساتھ بھی حمزہ رضی اللہ عنہ جیسا سلوک کیا گیا تھا۔ ہمیں اچھا نہ لگا کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو تو دو کپڑوں میں کفن دیا جائے اور انصاری کے لیے کفن ہی نہ ہو۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ ایک کپڑا حمزہ رضی اللہ عنہ اور دوسرا انصاری کے لیے ہوگا۔ کپڑا دیکھا تو ایک چھوٹا اور ایک بڑا تھا، چنانچہ اس میں قرعہ ڈالا گیا اور جس کا قرعہ نکلا اسے اس میں کفن دے دیا گیا۔[*]

❁ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے غم میں حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے اشعار: حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں:

''میری بہنو! کیا تم اصحابِ احد کے بارے میں ڈرتی ڈرتی پوچھ رہی ہو، خواہ ان میں سے کوئی حالات سے واقف ہو یا ناواقف؟

پس واقف شخص نے تو بتادیا ہے کہ حمزہ رضی اللہ عنہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وزیر اور بہترین وزیر تھے، شہید ہوگئے ہیں۔

* مسند أحمد: 165/1، ومسند البزار، حديث: 1797، ومسند أبي يعلى، حديث: 686، والسنن الكبرى للبيهقي: 290/3، ومجمع الزوائد: 118/6، وصحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 285، و السيرة النبوية لابن هشام: 103/3.

انھیں عرش عظیم والے معبود حقیقی نے جنت کی طرف بلا لیا ہے، وہاں وہ زندہ ہیں اور سرور کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

یہ تو وہ چیز ہے جس کی ہم سب آرزو کرتے اور دوسروں کو بھی اسی کی خواہش کرنے کا کہتے ہیں۔ حشر کے دن حمزہ رضی اللہ عنہ کے لیے بہترین واپسی کی جگہ ہوگی۔

پس اللہ کی قسم! جب تلک بادِ صبا چلتی رہے گی میں آپ کو نہ بھولوں گی بلکہ سفرو حضر میں غمزدہ رہ کر ہمیشہ روتی رہوں گی۔

اللہ تعالیٰ کے اس شیر پر جو قوم کا حامی تھا اور ہر کافر سے اسلام کی مدافعت کرنے والا تھا۔

اے کاش! اس وقت میرے جسم کے ٹکڑے اور ہڈیاں بھی ان بجوؤں اور کرگسوں کی خوراک بن جاتے جو انسانی گوشت کھانے کے عادی ہیں۔

جس وقت موت کی خبر دینے والے نے میرے خاندان میں یہ خبر پہنچائی تو میں پکار اٹھی: ''میرے مددگار بھائی! تجھے اللہ تعالیٰ بہتر جزا دے۔''

❁ حمزہ رضی اللہ عنہ پر کوئی آنسو بہانے والی نہیں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احد سے واپس تشریف لائے اور انصار کی عورتوں کو روتے ہوئے دیکھا تو فرمانے لگے: «لٰكِنْ حَمْزَةُ لَا بَوَاكِيَ لَهُ» ''لیکن حمزہ پر تو کوئی آنسو بہانے والی نہیں؟'' یہ بات انصار کی عورتوں کو پہنچی تو وہ حمزہ رضی اللہ عنہ پر رونے لگیں۔ آپ سو کر اٹھے تو بھی وہ رو رہی تھیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «يَا وَيْحَهُنَّ! أَنْتُنَّ هٰهُنَا تَبْكِينَ حَتَّى الْآنِ، مُرُوهُنَّ فَلْيَرْجِعْنَ وَلَا يَبْكِينَ عَلٰى هَالِكٍ بَعْدَ الْيَوْمِ» ''افسوس! تم اس وقت سے اب تک رو رہی ہو؟ (اپنے گھر والوں سے) انھیں کہو کہ یہ واپس چلی جائیں اور آج کے بعد کسی مرنے والے پر نہ روئیں۔''[1]

[1] مسند أحمد: 40/2، و سنن ابن ماجه، حديث: 1591، و المعجم الكبير للطبراني: 238/3، حديث: 2875، و مسند أبي يعلىٰ، حديث: 3576، ومجمع الزوائد: 120/6. علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو حسن کہا ہے دیکھیے: صحيح سنن ابن ماجه، حديث: 1303، 42/2.

اس کے ساتھ ہی میت پر نوحہ حرام کر دیا گیا۔ اور کچھ مدت بعد اس کی حرمت وحی کے ذریعے سے اور زیادہ پختہ کردی گئی۔ اور اسے کبائر میں شامل کر دیا گیا۔ اس طرح جاہلیت کے رسوم و رواج ایک ایک کر کے جڑ سے اکھیڑ دیے اور ان کی جگہ اسلامی تعلیمات بو دی گئیں۔[1]

نوحہ کی ممانعت پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: «اَلنِّيَاحَةُ عَلَى الْمَيِّتِ مِنْ أَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ، وَإِنَّ النَّائِحَةَ إِذَا لَمْ تَتُبْ قَبْلَ أَنْ تَمُوتَ، فَإِنَّهَا تُبْعَثُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَيْهَا سَرَابِيلُ مِنْ قَطِرَانٍ، ثُمَّ يُعْلَى عَلَيْهَا بِدُرُوعٍ مِّنْ لَّهَبِ النَّارِ» ''نوحہ امورِ جاہلیت سے ہے۔ نوحہ کرنے والی عورت اگر توبہ کیے بغیر فوت ہوگئی تو قیامت کے روز ایسی حالت میں اٹھائی جائے گی کہ اس پر تارکول کا ازار بند ہوگا پھر اس پر آگ کے شعلے قمیص کی صورت میں بھڑکیں گے۔''[2]

دوسری حدیث میں ارشاد ہے: «اِثْنَتَانِ فِي النَّاسِ هُمَا بِهِمْ كُفْرٌ: اَلطَّعْنُ فِي النَّسَبِ، وَالنِّيَاحَةُ عَلَى الْمَيِّتِ» ''مسلمانوں میں دو کفریہ خصلتیں ہوں گی: نسب میں عیب جوئی اور میت پر نوحہ کرنا۔''[3]

الغرض نوحہ کرنے والیوں کو روک دیا گیا مگر آنسوؤں کی اجازت ہے۔

❁ **انصار کے نومولود کا نام حمزہ رکھنا:** حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ہم انصاریوں میں سے ایک شخص کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تو انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے مشورہ طلب کیا کہ ہم اس کا نام کیا رکھیں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «سَمُّوهُ بِأَحَبِّ الْأَسْمَاءِ إِلَيَّ حَمْزَةَ بْنِ عَبْدِالْمُطَّلِبِ» ''مجھے سب سے پیارا نام حمزہ لگتا ہے یہی رکھ دو۔''[4]

گویا کہ حمزہ رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے دل و دماغ میں جاگزیں تھے۔

بعدازاں اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی اپنے نبی ﷺ سے اپنے ہاں پسندیدہ نام بیان

1 السيرة النبوية لمحمد الصوياني: 90/3. 2 سنن ابن ماجه، حديث: 1582، وصحيح الجامع الصغير للألباني: 1151/2. 3 صحيح مسلم، حديث: 67. 4 المستدرك للحاكم: 196/3.

کردیے، چنانچہ آپ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا: «إِنَّ أَحَبَّ الْأَسْمَاءِ إِلَى اللّٰهِ عَبْدُاللّٰهِ وَعَبْدُ الرَّحْمٰنِ» ”تمھارے ناموں میں سے اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پسندیدہ نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں۔“ [1]

❁ کیا ایسا ممکن ہے کہ تم میرے سامنے نہ آؤ؟ رسول اللہ ﷺ نے وحشی رضی اللہ عنہ سے جو یہ فرمایا تھا: «فَهَلْ تَسْتَطِيعُ أَنْ تُغَيِّبَ وَجْهَكَ عَنِّي؟» ”کیا ہوسکتا ہے کہ تم میرے سامنے نہ آؤ؟“ [2]

اس مشفقانہ اسلوبِ کلام میں وحشی کا نہ مؤاخذہ ہے نہ اسے گناہگار ٹھہرانا مقصود ہے بلکہ صرف یہ بات ہے کہ وحشی رضی اللہ عنہ کے سامنے آنے کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کے زخم تازہ ہوجائیں گے جس سے رسول اللہ ﷺ کے دل میں اپنے چچا سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کے واقعۂ شہادت کا منظر اور نامناسب انداز سے انھیں مثلہ کرنے کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ [3]

لہٰذا آپ ﷺ نے وحشی رضی اللہ عنہ کو چلے جانے کا مشورہ دیا تاکہ اس المناک واقعے کی یاد ہی محو ہو جائے۔ [4]

ایک روایت میں ہے: وحشی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوا۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: ”تم وحشی ہو؟“ میں نے عرض کیا: ”جی ہاں۔“ فرمایا: ”تم نے حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا۔“ عرض کیا: ”جی ہاں! اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میرے ہاتھ سے انھیں عزت بخشی اور مجھے ان کے ہاتھوں ذلیل ہونے (حالتِ کفر میں مرنے) سے بچایا۔“ قریش کے لوگوں نے کہا: ”اس نے حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا اس کے باوجود بھی آپ اس سے محبت رکھتے ہیں؟“ میں نے عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول! میرے لیے بخشش کی دعا فرما دیجیے۔“

---

1 صحيح مسلم، حديث: 2132، و سنن أبي داود، حديث: 4949، و جامع الترمذي، حديث: 2833، و سنن ابن ماجه، حديث: 3728. 2 صحيح البخاري، حديث: 4072. 3 محمد رسول اللهﷺ لصادق عرجون: 603/3. 4 التاريخ الإسلامي للحميدي: 141/5.

آپ ﷺ نے تین بار زمین پر تھوکا اور تین بار میرے سینے کو دھکیلا اور فرمایا: «يَا وَحْشِيُّ، أُخْرُجْ فَقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ، كَمَا قَاتَلْتَ لِتَصُدَّ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ» ''وحشی! جاؤ اللہ کی راہ میں ایسے ہی لڑو جس طرح اللہ کے راستے سے روکنے کے لیے لڑے تھے۔''[1]

آپ ﷺ نے اس طرح گزشتہ گناہ کی تلافی کا رستہ دکھایا ہے کہ جب حالتِ کفر میں اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت مول لے کر کفر کیا ہے تو جہاد فی سبیل اللہ ہی گزشتہ گناہوں کا بہترین مداوا ہے۔ آپ ﷺ نے اسے جہاد کا پرچم بلند کرنے پر ابھارا۔ شاید وحشی رضی اللہ عنہ کا یمامہ جا کر مسیلمہ کذاب کو قتل کرنا آپ ﷺ کے اس مشورے کا نتیجہ تھا جس میں آپ ﷺ نے اسے گناہ دھوڈالنے والے، غلطیوں کو کھرچ دینے والے اور آلائشوں سے پاک صاف کرنے والے کام کی طرف اشارہ فرمایا تھا۔

بذاتِ خود وحشی رضی اللہ عنہ کو بھی اس کا مکمل ادراک تھا، چنانچہ مسیلمہ کذاب کو قتل کرنے کے بعد انھوں نے یہ تاریخی الفاظ کہے: ''میں نے اسلام لانے سے پہلے بہترین انسان، یعنی سید الشہداء حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا اور اب (اسلام لانے کے بعد) بدترین انسان مسیلمہ کذاب کو بھی واصل جہنم کیا ہے۔''[2]

مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی شہادت: حضرت خباب رضی اللہ عنہ کا بیان ہے: ''ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رضائے الٰہی کے لیے ہجرت کی، یقیناً اللہ تعالیٰ ہمیں اجر سے نوازے گا۔ اب ہم میں سے کچھ لوگ تو دنیا سے رخصت ہوگئے۔ انھوں نے (دنیا میں) اپنی محنت کا کچھ بھی صلہ نہیں پایا۔ انھی میں سے مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ تھے۔ وہ جنگ احد میں شہید ہوئے اور

---

1 المعجم الكبير للطبراني: 139/22، ومجمع الزوائد: 127/6، علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو منکر کہا ہے۔ دیکھیے: سلسلة الأحاديث الضعيفة: 870/12، حديث: 5938. 2 محمد رسول اللّٰه ﷺ لصادق عرجون: 602/3. اور دیکھیے: صحيح البخاري، حديث: 4072. یہاں وحشی رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ بھی ہیں: «لَأَخْرُجَنَّ إِلٰى مُسَيْلِمَةَ لَعَلِّي أَقْتُلُهُ فَأُكَافِئَ بِهِ حَمْزَةَ» ''میں مسیلمہ کذاب کی طرف ضرور جاؤں گا۔ شاید میں اسے قتل کردوں اور اس طرح سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کا بدلہ اتار سکوں۔''

صرف ایک دھاری دار چادر چھوڑ گئے۔ جب ہم (کفن کے لیے) ان کا سر ڈھانپتے تو پاؤں نظر آنے لگتے، پاؤں ڈھانپتے تو سر دکھائی دینے لگتا۔ تب آپ ﷺ نے فرمایا:

«غُطُّوا رَأْسَهُ، وَاجْعَلُوا عَلٰى رِجْلَيْهِ الْإِذْخِرَ»

''ان کا سر ڈھانپ دو اور پاؤں پر اذخر گھاس رکھ دو۔''

اور ہم میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن (کی محنت) کا پھل پک چکا ہے اور وہ اسے چُن چُن کر کھا رہے ہیں۔''[1]

حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی حدیث میں حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی شہادت کا تذکرہ اس طرح آیا ہے کہ عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ روزے سے تھے۔ (افطار کے لیے) ان کا کھانا لایا گیا تو کہنے لگے: ''مصعب بن عمیر مجھ سے بہت بہتر تھے وہ شہید ہوگئے۔ ان کے لیے سوائے ایک دھاری دار چادر کے کفن بھی نہ مل سکا۔ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ یا کسی اور شخص کا نام لیا کہ وہ شہید ہوئے اور وہ بھی مجھ سے بدر جہا بہتر تھے، ان کے لیے بھی ایک چادر کے سوا کفن میسر نہ آیا۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں ہماری بھلائیاں ہمیں دنیا ہی میں جلد نہ دے دی گئی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ رونے لگے حتی کہ کھانا بھی چھوڑ دیا۔[2]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کا تذکرہ یوں مروی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ احد سے پلٹے تو مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ راستے میں شہید پڑے تھے۔ آپ ﷺ ان کے پاس کھڑے ہوگئے اور ان کے لیے دعا کی، پھر یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا﴾

''مومنوں میں سے کچھ وہ لوگ بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے جو عہد کیا تھا وہ سچ کر دکھایا، چنانچہ ان میں سے بعض نے اپنا عہد پورا کیا (شہادت پاگئے) اور ان میں

1 صحيح البخاري، حديث: 3897. 2 صحيح البخاري، حديث: 1275,1274.

سے بعض منتظر ہیں اور انھوں نے (عہد میں) کوئی تبدیلی نہیں کی۔“[1]

پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَشْهَدُ أَنَّ هٰؤُلَاءِ شُهَدَاءُ عِنْدَاللّٰهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَائْتُوهُمْ وَزُورُوهُمْ، وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهٖ! لَايُسَلِّمُ عَلَيْهِمْ أَحَدٌ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ إِلَّا رَدُّوا عَلَيْهِ»

”میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے ہاں شہداء ہوں گے۔ ان کے پاس آیا کرو اور ان کی زیارت کیا کرو۔ مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! قیامت تک جو بھی ان کو سلام کرے گا اس کے سلام کا جواب لوٹائیں گے۔“[2]

حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کی شہادت اور رسول اللہ ﷺ سے والہانہ عقیدت:

حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ وہ شخص ہیں جنھیں رسول اللہ ﷺ نے قریش کے مکہ سے روانہ ہونے کی خبر کو پوشیدہ رکھنے کا کہا تھا۔ آپ ﷺ کو ان سے بڑی محبت تھی۔ جب جنگِ احد ہوچکی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ رَّجُلٌ يَّنْظُرُ مَا فَعَلَ سَعْدُ بْنُ الرَّبِيعِ، أَفِي الْأَحْيَاءِ هُوَ أَمْ فِي الْأَمْوَاتِ؟»

”کون ہے جو سعد بن ربیع کو دیکھے، آیا وہ زندوں میں سے ہیں یا شہداء میں سے؟“ آپ ﷺ نے ان پر نیزے پڑتے دیکھے تھے۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ”میں ان کی خبر لاتا ہوں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: «إِنْ رَّأَيْتَ سَعْدَ بْنَ الرَّبِيعِ، فَاقْرَئْهُ مِنِّي السَّلَامَ وَقُلْ لَّهٗ: يَقُولُ لَكَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: كَيْفَ تَجِدُكَ؟» ”اگر

---

[1] الأحزاب 23:33. [2] المستدرك للحاكم: 200/3، ودلائل النبوة للبيهقي: 284/3. علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے، دیکھیے: السلسلة الضعيفة: 365/11، حديث: 5221.

تم سعد بن ربیع کو پاؤ تو میری طرف سے انھیں سلام کہنا۔ اور یہ بھی کہنا: ''رسول اللہ ﷺ دریافت فرما رہے ہیں کہ تم اپنے آپ کو کیسا پا رہے ہو؟'' ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے انھیں دیکھا تو ایسی حالت میں پایا کہ زخمی ہیں اور آخری سانسیں لے رہے ہیں۔ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ ان سے کہنے لگے: ''مجھ سے نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ میں دیکھوں کہ آپ زندوں میں سے ہیں یا شہادت سے سرفراز ہونے والوں میں سے۔'' حضرت سعد رضی اللہ عنہ بولے: ''مجھے نیزوں کے بارہ زخم آئے ہیں جو جان لیوا ہیں۔''

ایک صحیح روایت میں ہے کہ انھوں نے جواب دیا: ''رسول اللہ ﷺ پر اور آپ پر سلام ہو۔ میری طرف سے رسول اللہ ﷺ سے عرض کرنا: ''اے اللہ کے رسول! میں جنت کی خوشبو پا رہا ہوں۔'' اور میری قوم انصار سے کہنا: ''اگر تم میں سے کسی ایک میں زندگی کی کوئی رمق باقی رہی اور دشمن رسول اللہ ﷺ تک پہنچ گئے تو تمھارے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی عذر باقی نہ رہے گا۔''[1]

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ اس کے ساتھ ہی ان کی روح پرواز کر گئی۔[2]

جان کنی کے وقت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے خیر خواہی کے یہ جذبات قوت ایمانی کا بین ثبوت اور بیعت کی وفاداری پر مر مٹنے کی علامت ہیں۔ اور اس بات کی دلیل ہیں کہ یہ جذبہ زخموں کی تکالیف اور موت سے بھی ماند نہیں پڑا۔

سیدنا عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ: حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جنگ احد کے دن مجھ سے عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے کہا: ''تم اللہ تعالیٰ سے دعا نہیں کرتے!'' تو وہ ایک طرف ہو گئے اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے دعا شروع کر دی: ''اے میرے پروردگار! جب میں دشمن سے ملوں تو میری ملاقات کسی جنگجو اور سورما سے ہو۔ میں اس سے نبرد آزما ہوں اور

1 السيرة النبوية لابن هشام: 100/3. 2 المستدرك للحاكم: 201/3، ودلائل النبوة للبيهقي: 285/3، والسيرة الحلبية: 532/2، وصحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 294.

وہ مجھ سے لڑے، پھر مجھے اس پر ایسا غلبہ عنایت فرما کہ میں اسے قتل کردوں اور اس کا سب مال و متاع میرے قبضے میں آئے۔'' تو عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے اس دعا پر آمین کہی، پھر عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ نے ان الفاظ سے دعا مانگی: ''اے اللہ! میں کسی جنگجو اور دلیر انسان سے ٹکراؤں۔ میں تیری راہ میں اس سے لڑوں وہ مجھ سے لڑے، پھر وہ مجھے قابو کر لے اور میری ناک اور کان کاٹ ڈالے، پھر جب کل قیامت کے دن میں تجھ سے ملوں تو تُو دریافت فرمائے: ''تیرا ناک کان کس نے کاٹا ہے؟'' میں عرض کروں: ''تیرے اور تیرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ میں کٹا ہے۔'' تب تو فرمائے: ''تو سچ کہتا ہے۔'' یہ قصہ بیان کرتے ہوئے حضرت سعد رضی اللہ عنہ اپنے بیٹے سے کہنے لگے: ''میرے بیٹے! عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کی دعا میری دعا سے بہتر تھی۔ میں نے اس دن کے آخر میں انھیں دیکھا تو ان کا ناک اور کان (دشمن کی طرف سے) ایک لڑی میں پرو دیے گئے تھے۔[1]

اس سے معلوم ہوا کہ آدمی اللہ کی راہ میں شہادت کی دعا اور تمنا کرسکتا ہے اور یہ دعا موت کی منع کردہ تمنا کے زمرے میں ہرگز نہیں آتی۔[2]

غسیل الملائکہ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ: مشرکین جب مسلمانوں کے آمنے سامنے ہوئے تو حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ نے ابوسفیان کے گھوڑے کو تلوار ماری۔ ابوسفیان زمین پر گرتے ہوئے چیخا چلایا۔ حنظلہ رضی اللہ عنہ اسے ذبح کرنے ہی والے تھے کہ اسی وقت شداد بن اسود پہنچ گیا۔ اسے ابن شعوب بھی کہتے تھے۔ اس نے آتے ہی حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ پر نیزہ مارا اور اسے آر پار کردیا۔ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ نیزہ تانے اس پر لپکے۔ تب اس نے دوسرا وار کردیا جس سے وہ شہید ہوگئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع دی گئی تو فرمایا: «إِنِّي رَأَيْتُ الْمَلَائِكَةَ تُغَسِّلُهُ

[1] سبل الهدى والرشاد للصالحي: 241/10، وصحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 293. [2] زاد المعاد: 212/3.

بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ بِمَاءِ الْمُزْنِ فِي صِحَافِ الْفِضَّةِ» ''میں نے دیکھا کہ فرشتے حنظلہ رضی اللہ عنہ کو چاندی کے برتنوں میں بادلوں کے پانی سے آسمان و زمین کے درمیان غسل دے رہے ہیں۔'' پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «فَاسْئَلُوا أَهْلَهُ مَاشَانُهُ؟» ''ان کی بیوی سے پوچھو کہ کیا معاملہ ہے؟'' ان کی بیوی سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے بتایا کہ انھوں نے جب جنگ کی پکار سنی تو حالتِ جنابت ہی میں نکل کھڑے ہوئے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «فَلِذٰلِكَ غَسَّلَتْهُ الْمَلَائِكَةُ» ''اس لیے انھیں فرشتوں نے غسل دیا ہے۔''[1]

واقدی کا بیان ہے کہ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ نے جمیلہ بنت عبد اللہ بن ابی ابن سلول رضی اللہ عنہا سے شادی کی اور اگلے ہی روز جنگ احد تھی۔ انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے رات گھر گزارنے کی اجازت طلب کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی۔ صبح کی نماز کے بعد وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب جانے لگے تو بیوی نے پیچھا نہیں چھوڑا اور وہ کچھ دیر کے لیے بیوی کے ساتھ رک گئے اور حقوقِ زوجیت ادا کیے۔ اس حال میں جب جانے لگے تو جمیلہ رضی اللہ عنہا نے اپنے قبیلے کے چار آدمی بلا کر انھیں گواہ بنایا کہ میرے خاوند نے مجھ سے ہم بستری کی ہے۔ بعدازاں ان سے پوچھا گیا: ''یہ گواہ قائم کرنے کا کیا مقصد تھا؟'' جمیلہ نے کہا: ''میں نے (خواب) دیکھا تھا گویا آسمان پھٹا اور حنظلہ اس میں داخل ہوئے تو وہ پھر مل گیا۔ میں سمجھ گئی کہ یہ شہادت ہی ہے، اس لیے میں نے گواہ طلب کیے کہ وہ میرے خاوند بن چکے تھے۔'' یہی ملاپ عبد اللہ بن حنظلہ کا سبب بنا تھا۔ اس کے بعد ان سے حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ نے شادی کر لی جس سے محمد بن ثابت پیدا ہوئے۔[2]

❁ **حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کی شہادت سے ماخوذ نصیحتیں وعبرتیں:** ① حضرت جمیلہ رضی اللہ عنہا نے خواب دیکھ کر خود ہی تعبیر نکالی کہ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ شہید ہوں گے۔ ایسی صورتِ حال میں

---

1 المستدرك للحاكم 205,204/3، والسنن الكبرىٰ للبيهقي: 15/4، والمعجم الكبير للطبراني: 12094، ومجمع الزوائد: 23/3. 2 المغازي للواقدي: 273/1.

عورت چاہتی ہے کہ مرد سے دور رہے تا کہ (تعبیر صحیح نکلنے پر یہ بیوہ ہو بھی جائے تو) کسی اور منگیتر کے لیے اس میں کشش باقی رہے لیکن اس کے برعکس یہ اس خواہش سے خاوند کے پاس گئیں کہ ممکن ہے اللہ تعالیٰ انھیں شہید ہونے والے سعادت مند شخص کے بیٹے کی ماں بنادے۔ وہ بیٹا بعدازاں اس شہید باپ کی طرف منسوب ہو جو نیکی میں بلند مراتب تک رسائی پا چکا تھا اور اب اس کے بارے میں شہادت سے سرفراز ہونے کی امید ہے۔ تو ایسا ہی ہوا اور ان کی یہ خواہش پوری ہوئی۔ جمیلہ رضی اللہ عنہا سیدنا حنظلہ رضی اللہ عنہ سے حاملہ ہوئیں اور ان کا بیٹا پیدا ہوا جس کا نام عبد اللہ رکھا گیا۔ اس بچے نے بھی بڑا نام کمایا۔ وہ اپنے لیے فخر یہ طور پر کہا کرتا تھا: «أَنَا ابْنُ غَسِيلِ الْمَلَائِكَةِ» ”میں فرشتوں کے ذریعے غسل دیے جانے والے شہید باپ کا بیٹا ہوں۔“

② حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ اللہ کے دشمنوں سے مقابلہ آرائی کے کتنے متمنی و حریص تھے۔ انھوں نے اتنی جلدی کی کہ غسل جنابت کا موقع بھی نہ مل سکا۔

③ ان کی کمال بہادری کی علامت ہے کہ انھوں نے فرداً مشرکین کے سپہ سالار ابوسفیان بن حرب کو جالیا، حالانکہ سپہ سالار عموماً محافظوں کی حصار میں ہوتا ہے ویسے بھی حنظلہ رضی اللہ عنہ پیدل تھے اور ابوسفیان گھوڑے پر سوار تھا۔

④ اللہ تعالیٰ نے انھیں کمال شرف سے نوازا کہ فرشتے صاف ستھرے پانی کے ساتھ چاندی کے برتنوں میں غسل دے رہے ہیں۔

⑤ رسول اللہ ﷺ کا معجزہ کہ آپ ﷺ نے صحابہ کو فرشتوں کے غسل دینے کی خبر دی۔ آپ نے فرشتوں کو غسل دیتے دیکھا، جبکہ صحابہ انھیں نہیں دیکھ رہے تھے۔[1]

⑥ فرشتوں نے حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کو غسل دیا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ شہید اگر جنبی ہو تو اسے غسل دینا چاہیے۔[2]

1 التاريخ الإسلامي للحميدي:5/129,130. 2 زاد المعاد:3/214.

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن حرام رضی اللہ عنہ کی شہادت اور ان کا ایک منفرد اعزاز:

حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے غزوۂ احد کے لیے جانے پر اصرار کرتے ہوئے اپنے بیٹے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے کہا: ''اے جابر! ہمارے اس معرکے کے نتیجے تک تم مدینہ ہی میں رہنا۔ اللہ کی قسم! اگر یہ بات نہ ہوتی کہ میں پیچھے متعدد بیٹیاں چھوڑے جا رہا ہوں تو میں پسند کرتا کہ تم میرے سامنے (مجھ سے پہلے) شہید کر دیے جاؤ۔''[1]

حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے سے مزید کہا: ''میں دیکھ رہا ہوں کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں میں سے پہلے پہلے شہید ہونے والوں میں سے ہوں گا۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا سب لوگوں سے زیادہ تمھیں اپنا پیارا سمجھتا ہوں۔ مجھ پر کچھ قرض ہے اسے ادا کر دینا اور میں تمھیں تمھاری بہنوں کے متعلق بھلائی کی وصیت کرتا ہوں، اس وصیت کا خیال رکھنا۔''[2]

سیدنا عبد اللہ بن عمرو بن حرام رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے ہمراہ چلے اور اللہ کے راستے میں شہادت کے رُتبے پر فائز ہوئے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ اس طرح قصہ بیان کرتے ہیں: ''جب میرے والد گرامی عبد اللہ رضی اللہ عنہ احد والے دن شہید ہوئے تو میں بار بار ان کے منہ سے کپڑا ہٹاتا اور مسلسل رو رہا تھا۔ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم مجھے رونے سے منع کر رہے تھے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع نہیں فرمایا۔ میری پھوپھی بھی ان پر رونے لگیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «تَبْكِينَ أَوْلَا تَبْكِينَ، مَا زَالَتِ الْمَلَائِكَةُ تُظِلُّهُ بِأَجْنِحَتِهَا حَتّٰى رَفَعْتُمُوهُ» ''آپ روئیں یا خاموش رہیں جب تک تم لوگ انھیں اٹھاتے نہیں فرشتے اپنے پروں سے ان پر سایہ فگن رہیں گے۔''[3]

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے ملے اور فرمانے لگے:

---

1 مسند أحمد: 398,397/3، و مجمع الزوائد: 135/4. 2 صحيح البخاري، حديث: 1351.

3 صحيح البخاري، حديث: 1244.

«يَا جَابِرُ! مَالِي أَرَاكَ مُنْكَسِرًا؟» ''جابر! کیا بات ہے، تم مجھے غمگین نظر آرہے ہو؟'' عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! میرے والد شہید ہوگئے اور انھوں نے پیچھے میری بہنیں اور قرضہ چھوڑا ہے۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «أَلَا أُبَشِّرُكَ بِمَا لَقِيَ اللّٰهُ بِهِ أَبَاكَ؟» ''کیا میں تمھیں خوشخبری نہ دوں کہ اللہ تعالیٰ نے تمھارے باپ سے کیا سلوک کیا ہے؟''

میں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! ضرور بتائیں!'' آپ ﷺ نے فرمایا:

«مَا كَلَّمَ اللّٰهُ أَحَدًا قَطُّ إِلَّا مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ وَّكَلَّمَ أَبَاكَ كِفَاحًا، يَّاجَابِرُ! أَمَا عَلِمْتَ أَنَّ اللّٰهَ أَحْيَا أَبَاكَ، فَقَالَ: يَاعَبْدِي! تَمَنَّ عَلَيَّ أُعْطِيكَ، قَالَ: يَارَبِّ! تُحْيِينِي فَأُقْتَلُ فِيكَ ثَانِيَةً، فَقَالَ الرَّبُّ سُبْحَانَهُ: إِنَّهُ سَبَقَ مِنِّي أَنَّهُمْ إِلَيْهَا لَا يُرْجَعُونَ، قَالَ: يَارَبِّ فَابْلُغْ مَنْ وَّرَائِي»

''اللہ تعالیٰ نے جس سے بھی کلام فرمایا پردے کے پیچھے سے فرمایا لیکن تمھارے باپ سے آمنے سامنے بات چیت کی ہے۔ جابر! تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے تمھارے والد کو زندہ کیا اور فرمایا: ''اے میرے بندے! مجھ سے مانگ میں تجھے دوں۔'' تمھارے والد نے عرض کیا: ''اللہ عزوجل! مجھے دوبارہ دنیا میں بھیج دے تاکہ میں تیری راہ میں ایک بار پھر شہید کیا جاؤں۔'' تب اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا: ''یہ بات تو میں پہلے ہی مقرر کر چکا ہوں کہ کوئی بھی لوٹ کر دوبارہ دنیا میں نہیں جائے گا۔'' تمھارے والد عرض پرداز ہوئے: ''اے میرے رب! میرے بعد والوں کو (شہادت سے لطف اندوز ہونے اور شہید کے درجات کے متعلق) خبر پہنچا دے۔'' چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما دی:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝﴾

''اور ان لوگوں کو مردہ خیال نہ کرو جو اللہ کے راستے میں مارے گئے ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں، انھیں ان کے رب کے ہاں رزق دیا جاتا ہے۔'' [1]

جنگ احد سے پہلے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے خواب دیکھا جسے وہ خود بیان کرتے ہیں کہ احد سے پہلے مجھے خواب میں حضرت مبشر بن عبدالمنذر رضی اللہ عنہ ملے جو مجھ سے کہہ رہے تھے: ''تم چند دن کے اندر اندر ہمارے پاس آنے والے ہو۔'' میں نے کہا: ''تم کہاں ہو؟'' وہ بولے: ''ہم جنت میں ہیں۔ اپنی مرضی سے کھاتے پیتے اور آتے جاتے ہیں۔'' میں نے پوچھا: ''تم بدر میں شہید نہیں ہو چکے تھے؟'' وہ کہنے لگے: ''کیوں نہیں، مگر مجھے دوبارہ زندہ کر دیا گیا ہے۔'' حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے یہ خواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے: «هٰذِهِ الشَّهَادَةُ يَا أَبَا جَابِرٍ!» ''ابوجابر! یہ تو شہادت ہے۔'' [2]

اور یہ خواب اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے شرمندۂ تعبیر ہوا۔

ابوسعد حضرت خیثمہ رضی اللہ عنہ کا شوق شہادت: ابوسعد خیثمہ رضی اللہ عنہ کا بیٹا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں معرکۂ بدر میں شریک ہو کر شہید ہو چکا تھا، وہ کہتے ہیں کہ میں جنگ بدر میں شریک نہ ہو سکا، حالانکہ مجھے اس کی بڑی خواہش تھی۔ حتی کہ میں نے شرکت کے لیے اپنے بیٹے سے قرعہ اندازی کی تو اس کا قرعہ نکل آیا اور اسے شہادت نصیب ہوئی۔ گزشتہ شب میں نے اپنے بیٹے کو خواب میں بڑی اچھی صورت میں دیکھا۔ وہ جنت کے باغوں اور نہروں سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور مجھ سے کہہ رہا تھا: ''ہم سے آملیے! ہمارے جنت کے ساتھی بن جائیے۔ میں نے اللہ تعالیٰ کے کیے ہوئے وعدے کو سچا پایا ہے۔'' یہ کہہ کر حضرت خیثمہ رضی اللہ عنہ عرض کرنے لگے: ''اے اللہ کے رسول! میں جنت میں اس کا ساتھی بننے کے لیے بیتاب ہوں۔ میں عمر رسیدہ ہوں، ہڈیاں کمزور ہو چکی ہیں۔ مجھے اپنے رب سے

1 آل عمرٰن 3:169. جامع الترمذي، حديث: 3010، و سنن ابن ماجه، حديث: 190 و 2800.

2 المستدرك للحاكم: 3/204، و دلائل النبوة للبيهقي: 3/249، وزاد المعاد: 3/208.

ملاقات کا شوق پیدا ہوگیا ہے۔ اے اللہ کے رسول! آپ اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیے کہ وہ مجھے شہادت اور سعد کا ساتھ نصیب فرمائے۔'' رسول اللہ ﷺ نے ان کے لیے ان کی چاہت کے مطابق دعا مانگی، آپ ﷺ کی دعا قبول ہوئی اور وہ احد میں شہید ہوگئے۔[1]

سیدنا وہب مزنی رضی اللہ عنہ اور ان کے بھتیجے حارث بن عقبہ رضی اللہ عنہ کی مایہ ناز شہادت:

وہب بن قابوس مزنی اور ان کے بھتیجے حارث بن عقبہ بن قابوس رضی اللہ عنہما مزینہ کے پہاڑوں سے اپنی بکریاں لے کر مدینہ پہنچے تو دیکھا کہ مدینہ منورہ سُونا سُونا ہے۔ دونوں نے دریافت کیا: ''یہاں کے باشندے کہاں ہیں؟'' جواب ملا کہ رسول اللہ ﷺ مشرکین مکہ سے جنگ کے لیے جبلِ احد کے پاس گئے ہیں۔ دونوں نے طے کیا کہ اب مزید تحقیق کی ضرورت نہیں۔ دونوں آپ ﷺ کی خدمت میں اس وقت پہنچے جب لڑائی جاری تھی اور مسلمانوں کا پلہ بھاری تھا۔ دونوں جنگ اور غنیمت جمع کرنے میں لگ گئے۔ اتنے میں خالد بن ولید اور عکرمہ بن ابی جہل گھڑسواروں کے ہمراہ پیچھے سے آگئے۔ ان سے مڈبھیڑ ہوئی تو ان دونوں نے خوب جوہر دکھائے۔ مشرکین کا ایک گروہ (لڑنے کے لیے) سامنے ہوا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ لِّهٰذِهِ الْفِرْقَةِ؟» ''مشرکین کے اس گروہ کو کون سنبھالے گا؟'' وہب بن قابوس رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! میں۔'' پھر انھوں نے تیراندازی کرتے ہوئے مشرکوں کو بھگا دیا اور خود واپس آگئے۔ اب مشرکین کا دوسرا گروہ لڑنے کے لیے آیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ لِّهٰذِهِ الْكَتِيبَةِ؟» ''اس گروہ سے کون نمٹے گا؟'' سیدنا مزنی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! میں۔'' پھر انھوں نے شمشیرزنی کرتے ہوئے مشرکین کو پسپائی پر مجبور کر دیا اور خود واپس آگئے۔ اب تیسرا گروہ سامنے آیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ يَّقُومُ لِهٰؤُلَاءِ؟» ''انھیں کون بھگائے گا؟'' سیدنا وہب مزنی نے پھر عرض کیا: ''میں اے اللہ کے رسول!'' آپ ﷺ نے فرمایا: «قُمْ وَأَبْشِرْ

[1] دلائل النبوة للبيهقي:3/249، وزاد المعاد:3/208.

بِالْجَنَّةِ» ''جاؤ اور جنت کی بشارت سے خوش ہو جاؤ۔'' مزنی رضی اللہ عنہ پھر خوشی خوشی یہ کہتے ہوئے کھڑے ہوئے کہ اللہ کی قسم! میں چین سے بیٹھوں گا نہ اپنے عہد سے سبکدوش ہوں گا۔ اور یہ کہہ کر مشرکین کی صفوں میں گھس گئے اور تلوار چلانے لگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو دیکھ رہے تھے۔ مزنی لڑتے لڑتے مشرکین کے لشکر کے آخر تک چلے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا مانگ رہے تھے: «اَللّٰهُمَّ ارْحَمْهُ» ''اے اللہ! اس پر رحم فرما۔'' سیدنا وہب مزنی رضی اللہ عنہ دوبارہ مشرکین کے لشکر کی طرف پلٹے۔ مشرکین ان کی تاک میں تھے۔ یہ جیسے ہی سامنے آئے تو اچانک مل کر تلواروں اور نیزوں سے ان پر ٹوٹ پڑے۔ اور انھیں شہید کر دیا۔ انھیں بیس جان لیوا زخم آئے اور ان کا بدترین مثلہ کیا گیا۔ ان کے بعد ان کے بھتیجے حارث بن عقبہ رضی اللہ عنہ اٹھے تو وہ بھی انھی کی طرح دیوانہ وار لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے: ''مجھے سب شہادتوں سے پسندیدہ شہادت، جس کی مجھے آرزو ہے، وہ ہے جس حالت اور مشن پر مزنی رضی اللہ عنہ نے جامِ شہادت پیا۔''[1]

بلال بن حارث مزنی بیان کرتے ہیں کہ ہم سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے ساتھ جنگ قادسیہ میں شریک تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں فتح عطا کی، غنائم تقسیم ہو چکیں تو اس تقسیم میں مزینہ قبیلے کے خاندان قابوس کا ایک نوجوان غنیمت سے محروم رہ گیا۔ جب حضرت سعد رضی اللہ عنہ بیدار ہوئے تو میں ان کے پاس آیا۔ انھوں نے پوچھا: ''بلال ہے؟'' میں نے کہا: ''جی ہاں۔ بلال ہوں۔'' حضرت سعد رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ''خوش آمدید۔ یہ ساتھ کون ہے؟'' میں نے کہا: ''میری قوم آل قابوس کے ایک فرد ہیں۔'' حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا: ''نوجوان! جنگ احد میں شہید ہونے والے مزنی صحابی سے تمھارا کیا رشتہ ہے؟'' اس نے کہا: ''میں ان کا بھتیجا ہوں۔'' حضرت سعد نے کہا: ''خوش آمدید! اللہ تمھاری آنکھ ٹھنڈی فرمائے۔ میں نے اس مزنی کا جو کارنامہ احد کے دن دیکھا آج تک کبھی کسی شخص کا نہیں

[1] المغازي للواقدي:1/277.

دیکھا۔ ہم اس دن مشرکین کی رنج میں تھے اور انھوں نے ہمیں گھیرا ہوا تھا۔ اور رسول اللہ ﷺ ہمارے وسط میں تھے۔ دشمن کے گروہ ہر طرف سے ہم پر چڑھائی کر رہے تھے۔ آپ ﷺ نے لوگوں کو دیکھا اور دریافت فرمایا: ''اس گروہِ مشرکین سے کون نمٹے گا؟'' اس طرح کے نئے نئے لشکر نبرد آزما ہونے کے لیے بار بار آتے رہے اور آپ ﷺ نے جب پوچھا کہ ان سے کون نمٹے گا؟ تو وہی صحابی فوراً کہتے: ''اے اللہ کے رسول! میں۔'' جب وہ مزنی صحابی آخری مرتبہ کمر بستہ ہوئے وہ منظر میں کبھی نہ بھول سکوں گا، تب آپ ﷺ نے انھیں بشارت دیتے ہوئے فرمایا: ''(مزنی!) اٹھو تمھارے لیے جنت کی خوشخبری ہے۔''

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''میں ان کے بعد اٹھا۔ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ میں بھی اسی طرح شہادت کا طالب تھا۔ ہم مشرکین کے گروہ میں گھس گئے اور آخر تک جانے کے بعد دوبارہ اس میں گھسے۔ بالآخر دشمن نے انھیں شہید کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے۔ اللہ کی قسم! میری بڑی خواہش تھی کہ کاش! میں بھی ان کے ساتھ شہادت کے درجے پر فائز ہوتا لیکن میری شہادت وہاں لکھی نہیں تھی۔'' اس کے بعد حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اس وقت ان کا حصہ منگوا کر انھیں دیا بلکہ کچھ زائد بھی دیا۔ اور کہا: ''تم چاہو تو یہاں ہمارے پاس رہو چاہو تو اپنے گھر جا سکتے ہو۔'' بلال نے کہا: ''یہ واپس ہی جانا چاہتے ہیں۔'' چنانچہ ہم واپس آ گئے۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو مزنی کے شہید ہونے کے بعد ان کے پاس کھڑے دیکھا، آپ ﷺ فرما رہے تھے: «رَضِيَ اللّٰهُ عَنْكَ فَإِنِّي عَنْكَ رَاضٍ» ''اللہ تعالیٰ تجھ سے راضی ہو۔ میں تو تجھ پر راضی ہو چکا ہوں۔'' میں نے رسول اللہ ﷺ کو زخموں سے چور ہونے کے باوجود مزنی کی قبر کے پاس کھڑے دیکھا۔ آپ ﷺ لحد میں اتارنے تک وہیں کھڑے رہے۔ حضرت وہب مزنی رضی اللہ عنہ کی میت پر سبز دھاری دار چادر تھی۔ آپ ﷺ نے چادر کے ساتھ ان کا سر ڈھانپ دیا، پھر انھیں طولاً

لحد میں اتارا گیا۔ وہ چادر آدھی پنڈلی تک پہنچ رہی تھی۔ آپ ﷺ نے اس کے پاؤں پر حرمل بوٹی رکھنے کا حکم دیا، چنانچہ ہم نے لحد ہی میں ان کے پاؤں پر گھاس رکھ دیا۔ بعدازاں آپ ﷺ وہاں سے تشریف لے گئے۔ میری بڑی چاہت ہے کہ میں بھی اس مزنی کی طرح شہید ہوکر اللہ تعالیٰ سے ملوں۔''[1]

ایمان اہل ایمان کو اسی طرح بیتاب کرتا ہے۔ سیدنا وہب مزنی رضی اللہ عنہ اور ان کے بھتیجے مدینہ میں بکریاں چھوڑتے ہیں اور مسلمانوں کے لشکر میں شامل ہوجاتے ہیں۔ انھیں شہادت کی انتہائی چاہت ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے انھیں مشرف فرمادیا۔ وہب مزنی رضی اللہ عنہ کا گھمسان کی جنگ کا وہ معرکہ صحابہ کے دل میں محفوظ ہے۔ سعد رضی اللہ عنہ اس واقعے کو تقریباً 13 برس بعد دہرا رہے ہیں۔ مُزینہ کے ایک آدمی کا نام کان میں پڑا تو سارا واقعہ آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ وہب مزنی رضی اللہ عنہ کی طرز پر شہادت سے سرفراز ہوکر اللہ تعالیٰ سے شرف ملاقات کی تمنا کررہے ہیں۔

حضرت عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ: حضرت عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ کا لنگڑا پن بڑا واضح تھا اور ان کے شیروں جیسے چار بیٹے بھی تھے۔ حضرت خلاد، معوّذ، معاذ، ابو ایمن رضی اللہ عنہم۔ اور یہ تمام جنگوں میں رسول اللہ ﷺ کے شانہ بشانہ رہتے۔ جنگ احد کے موقع پر اپنے باپ کو مدینہ میں رکھنا چاہتے تھے، چنانچہ وہ اپنے والد سے عرض کرنے لگے: ''اللہ تعالیٰ نے آپ کا عذر قبول کررکھا ہے، لہٰذا آپ جنگ میں نہ جائیں۔'' عمرو رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ''میرے بیٹے مجھے آپ کے ساتھ میدانِ کارزار میں جانے سے روک رہے ہیں۔ اللہ کی قسم! میں چاہتا ہوں جنت میں اسی طرح لنگڑاتا ہوا چلا جاؤں۔'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «أَمَّا أَنْتَ فَقَدْ عَذَرَكَ اللّٰهُ تَعَالٰى فَلَا جِهَادَ عَلَيْكَ» ''آپ کا عذر اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول ہے آپ پر جہاد نہیں۔'' اور ان کے بیٹوں سے فرمایا:

1 المغازي للواقدي:277/1.

«مَا عَلَيْكُمْ أَلَّا تَمْنَعُوهُ، لَعَلَّ اللّٰهَ أَنْ يَرْزُقَهُ الشَّهَادَةَ» ''انھیں نہ روکو! عین ممکن ہے اللہ تعالیٰ انھیں شہادت عنایت فرما دے۔'' چنانچہ عمرو رضی اللہ عنہ نے وہاں سے نکلتے ہوئے قبلے کی طرف رخ کر کے دعا کی: «اَللّٰهُمَّ! لَا تَرُدَّنِي إِلٰى أَهْلِي خَائِبًا» ''اے میرے اللہ! مجھے میرے گھر نامراد واپس نہ لانا۔'' بالآخر اپنی خواہش کے مطابق وہ شہادت سے سرفراز ہوئے۔'' ایک روایت میں ہے کہ عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! اگر میں شہادت تک اللہ تعالیٰ کے راستے میں جنگ کرتا رہوں تو کیا جنت میں میرا یہ لنگڑا پن ختم ہوجائے گا؟ فرمایا: «نَعَمْ!» ''ہاں'' چنانچہ خود عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ، ان کا بھتیجا اور دونوں کا ایک آزاد کردہ غلام شہادت سے ہمکنار ہوئے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے۔ان تینوں کو ایک ہی قبر میں اتارا گیا۔[1]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جنھیں اللہ تعالیٰ نے مریض یا معذور ہونے کی بنا پر جہاد سے رخصت دے رکھی ہے اگر وہ چاہیں تو شریکِ جہاد ہو سکتے ہیں مگر ان پر شرکت واجب نہیں ہے جیسا کہ عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ ٹانگ سے معذور ہونے کے باوجود جنگ میں شریک ہوئے۔[2]

ابو حذیفہ حضرت یمان اور ثابت بن وقش رضی اللہ عنہما: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب احد کے لیے چلے تو حذیفہ رضی اللہ عنہ کے والد حُسَیل بن جابر المعروف یمان اور ثابت بن وقش رضی اللہ عنہم کو بچوں اور عورتوں کے ساتھ قلعوں میں بٹھادیا۔ یہ دونوں بہت بوڑھے تھے، لہٰذا ایک نے دوسرے سے کہا: ''تمھارا برا ہو! انتظار کس چیز کا کر رہے ہو؟ اللہ کی قسم! ہم دونوں قبر میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ ہماری موت آنے ہی والی ہے۔کیوں نہ ہم تلواریں لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہولیں۔ممکن ہے اللہ تعالیٰ ہمیں شہادت کا درجہ عطا فرما دے۔'' دونوں نے تلواریں لیں اور جا کر مسلمانوں کے لشکر میں شریک ہوگئے۔اور کسی مسلمان کو ان کے

---

[1] مسند أحمد: 299/5، و دلائل النبوة للبيهقي: 246/3، والسيرة النبوية لابن هشام: 96/3، ومجمع الزوائد: 315/9. [2] زاد المعاد: 218/3.

متعلق کوئی اطلاع نہ تھی۔ ثابت بن وقش رضی اللہ عنہ کو تو مشرکین نے شہید کر دیا۔ رہے یمان رضی اللہ عنہ تو ان پر مسلمانوں ہی کی تلواریں ٹوٹ پڑیں اور اس طرح انھوں نے بے خبری میں انھیں شہید کر دیا۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے آواز دی: ''یہ میرے والد ہیں۔'' مسلمانوں نے کہا: ''اللہ کی قسم! ہم انھیں پہچان نہیں سکے۔'' اور یہ حقیقت تھی کہ وہ پہچان نہیں سکے تھے۔

اس پر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اللہ تعالیٰ آپ سب کو معاف فرمائے۔ وہ بڑا رحم کرنے والا ہے۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ انھیں خون بہا دیا جائے مگر انھوں نے خون بہا مسلمانوں پر صدقہ کر دیا (معاف کر دیا) تو اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں ان کا درجہ اور بھی زیادہ بلند ہو گیا۔[1]

اس واقعے سے عمر رسیدہ لوگوں کے دلوں میں قوت ایمانی کا اثر نمایاں طور پر نظر آتا ہے جنھیں اللہ تعالیٰ نے جہاد کی رخصت دے رکھی ہے۔ انھوں نے کیسے قلعوں کو چھوڑا اور شہادت کی چاہت اور اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے شوق میں میدان کارزار جا پہنچے۔ اس طرح اس واقعے سے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا عظیم کردار سامنے آتا ہے کہ اپنے والد گرامی کا خون بہا مسلمانوں پر صدقہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی اس غلطی پر ان کے لیے مغفرت کی دعا بھی کر رہے ہیں۔ اس سے یہ مسئلہ بھی سامنے آیا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں میدان جنگ میں اگر کوئی مسلمان کافر سمجھ کر قتل ہو جائے تو اس کی دیت حاکم کو بیت المال سے ادا کرنی چاہیے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو حضرت یمان رضی اللہ عنہ کا خون بہا دینے کا ارادہ فرمایا تھا مگر حذیفہ رضی اللہ عنہ نے اسے لینے سے انکار کیا اور اسے مسلمانوں کو بخش دیا۔[2]

جس عقیدے اور عمل پر موت آئے اعتبار اسی کا ہوتا ہے: دنیا سے رخصت ہونے سے قبل جس نظریے یا عمل کو اختیار کیا جائے وہی معتبر ہوگا۔ دو واقعے پیش آئے جو اسلام کے

---

1 صحيح البخاري، حديث: 3824 و 4065، (اس حدیث کی مزید شرح فتح الباری میں دیکھیے) والسيرة النبوية لابن هشام: 92/3. 2 زاد المعاد: 218/3.

اس اہم قاعدے کو ثابت کرتے ہیں۔ ان واقعات میں نصیحت قبول کرنے والے اور عبرت حاصل کرنے والے ہر مسلمان کے لیے بڑے اسباق ہیں۔ وہ دونوں واقعات یہ ہیں:[1]

❁ حضرت اصیرم رضی اللہ عنہ کا واقعۂ شہادت: ان کا اصل نام عمرو بن ثابت بن وقش ہے۔ ان پر اسلام پیش کیا گیا مگر اسلام نہ لائے۔ ان کا واقعہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اصیرم اپنی قوم کے سامنے اسلام کا انکار کرتے تھے۔ ایک دن آیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے ساتھ اُحد کے پاس تھے۔ یہ پوچھنے لگے: ''سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کہاں ہیں؟'' جواب ملا: ''میدانِ احد میں۔'' کہنے لگے: ''ان کے بھتیجے؟'' جواب ملا: ''وہ بھی وہاں ہیں'' پھر پوچھا: ''میری قوم کے لوگ کہاں ہیں؟'' جواب ملا: ''وہ بھی احد کے پاس گئے ہوئے ہیں۔'' اب ان کے دل میں قبول اسلام کے شوق نے انگڑائی لی اور وہ مسلمان ہوگئے۔ اس کے ساتھ ہی اپنی تلوار، نیزہ اور زرہ لی، گھوڑے پر سوار ہوئے اور چل دیے حتی کہ لوگوں کے ایک بڑے جتھے میں جا داخل ہوئے۔ جب مسلمانوں نے انھیں دیکھا تو کہنے لگے: ''اے عمرو! ہم سے الگ رہو۔'' وہ بولے: ''میں ایمان لا چکا ہوں'' پھر جنگ میں شریک ہوئے اور زخموں سے لہولہان ہوگئے۔ بنوعبد الأشہل جنگ میں کام آنے والے اپنے مقتولین تلاش کرتے کرتے اچانک ان تک جا پہنچے۔ انھیں دیکھا تو کہنے لگے: ''اللہ کی قسم! یہ تو اصیرم ہے۔ یہ یہاں کیا لینے آیا تھا؟ ہم تو اسے اس حال میں چھوڑ آئے تھے کہ یہ اس دین کا انکاری تھا۔'' انھوں نے ان سے دریافت کیا: ''تم یہاں کیسے؟ اپنی قوم کی محبت میں آئے ہو یا اسلام کی رغبت تمھیں یہاں کھینچ لائی ہے؟'' کہنے لگے: ''اسلام کی رغبت لیے ہوئے آیا ہوں۔ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا چکا ہوں۔ اسلام لانے کے بعد میں نے تلوار تھامی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ صبح ہی آگیا تھا، پھر میں نے جنگ کی اب جو میری حالت ہے تمھارے سامنے ہے۔ اگر میں مر جاؤں تو میرا مال آپ صلی اللہ علیہ وسلم

[1] غزوة أحد لأبي فارس، ص: 117.

کا ہے آپ جیسے چاہیں کام میں لائیں۔'' انھوں نے آ کر یہ قصہ رسول اللہ ﷺ کے گوش گزار کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّهُ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ» ''وہ اہل جنت میں سے ہے۔''

یہاں ایک سوال پیدا ہوا کہ اصیرم رضی اللہ عنہ نے ایک بھی نماز نہیں پڑھی، پھر وہ جنت میں کیسے داخل ہو گئے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: «عَمِلَ يَسِيرًا وَّ أُجِرَ كَثِيرًا» ''عمل تھوڑا کیا مگر اجر بہت پایا۔''[1]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے: ''بتاؤ وہ کون ہے جس نے کبھی نماز نہ پڑھی مگر جنت میں داخل ہو گیا۔'' لوگ لاعلمی کا اظہار کرتے اور ان سے پوچھتے کہ وہ کون ہیں؟ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے: ''وہ اصیرم بن عبدالأشہل ہے۔''[2]

❁ **مخیریق کا واقعہ:** جب جنگ احد ہوئی اور رسول اللہ ﷺ مشرکوں سے جنگ کے لیے نکلے تو مخیریق نے اپنی قوم یہود کو اکٹھا کر کے کہا: ''اے گروہ یہود! اللہ کی قسم! تمھیں معلوم ہے کہ محمد (ﷺ) کی مدد کرنا تم پر واجب ہے۔'' انھوں نے کہا: ''آج تو یوم السبت (ہفتے کا دن) ہے۔'' مخیریق نے کہا: ''تمھیں ''سبت'' (راحت وسکون) نصیب نہ ہو۔''

اس کے بعد مخیریق نے اپنی تلوار اور ساز وسامان لیا اور کہا: ''اگر میں مارا گیا تو میرا مال محمد (ﷺ) کا ہے۔ آپ ﷺ اسے جس طرح چاہیں کام میں لائیں۔'' اگلی صبح وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچا اور آپ ﷺ کے ساتھ جنگ میں حصہ لیا تا آنکہ قتل ہو گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «مُخَيْرِيقُ خَيْرُ يَهُودَ» ''مخیریق سب سے بہتر یہودی ہے۔''[3]

اس کے اسلام لانے کے متعلق اختلاف ہے۔ امام ذہبی نے التجرید اور حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں واقدی کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ مخیریق حالتِ اسلام میں فوت ہوا تھا۔[4]

---

1 صحيح البخاري، حديث: 2808. 2 السيرة النبوية لابن هشام: 101,100/3، و فتح الباري، شرح الحديث: 2808. 3 المغازي للواقدي: 263/1، وتاريخ الطبري: 531/2، والطبقات الكبرٰى لابن سعد: 501/1. 4 تجريد أسماء الصحابة للذهبي: 70/2، والإصابة لابن حجر: 393/3.

اسی طرح سُہیلی نے ''الروض الأنف'' میں ذکر کیا ہے کہ وہ مسلمان تھا۔ سہیلی نے ابن اسحاق کی اس روایت پر کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مخيريق خير يهود» پر تبصرہ اور بحث کرتے ہوئے کہا کہ مخریق مسلمان تھا۔ جبکہ کسی مسلمان کے بارے میں کہنا کہ هو خير النصارىٰ یا خير اليهود (جو کہ اضافت بیانیہ ہے اور بتقدیر من ہوتی ہے جو جزئیت اور بعضیت کا افادہ کرتی ہے) ''نصاریٰ میں سے سب سے بہتر یا یہود میں سے سب سے بہتر ہے۔'' درست نہیں ہے۔ اگر کہا جائے کہ یہ کہنا (جو رسول اللہ ﷺ نے کہا ہے) کیسے درست ہے؟ ہم کہیں گے کیونکہ آپ ﷺ نے فرمایا: «خَيْرُ يَهُودَ» ''قبیلۂ یہود میں سے بہتر انسان ہے۔'' یہ نہیں فرمایا: «خير اليهود» ''یہودیوں میں سے اچھا یہودی ہے۔'' (لفظ) یہود ثمود کی طرح اسم علم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہود یہوذ ابن یعقوب کی طرف منسوب ہیں، پھر ''ذال'' کو ''دال'' سے بدل دیا گیا۔[1]

ڈاکٹر عبداللہ الشقاری نے اپنی کتاب «اليهود في السنة المطهرة» میں اس مسئلے کی اچھی تحقیق پیش کی ہے۔ ان کا بھی یہی خیال ہے کہ مخیریق اسلام لا چکا تھا اور اسی بنا پر وہ مسلمانوں کے ہمراہ مشرکین سے جنگ کرنے پر آمادہ ہوا تھا اور اسی بنا پر اس نے سارا سامان وقف کر دیا تھا، حالانکہ وہ بہت مالدار تھا، جبکہ یہود مال کی محبت اور اس کی انتہائی درجے کی حرص رکھنے میں معروف ہیں۔[2]

❁ **اعمال کا دارو مدار نیتوں پر ہے:** مسلمانوں کے ہمراہ جنگ کرنے والوں میں سے ایک شخص قُزمان بھی تھا۔ اس کی بہادری کی بڑی دھوم تھی۔ رسول اللہ ﷺ کے سامنے جب کبھی اس کا ذکر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّهُ مِنْ أَهْلِ النَّارِ» ''یہ شخص دوزخیوں میں سے ہے۔'' جنگ احد سے پیچھے رہا تو بنوظفر کی عورتوں نے اسے شرم دلائی، چنانچہ آپ ﷺ

---

[1] الروض الأنف للسهيلي: 408/4. [2] اليهود في السنة المطهرة للدكتور عبدالله الشقاري: 306/1.

ابھی صفیں درست فرما رہے تھے کہ یہ پہلی صف میں آ کھڑا ہوا۔ سب سے پہلا تیر بھی (احد کے دن) مسلمانوں کی جانب سے اسی نے پھینکا، بعد ازاں ایسی تیر اندازی کی گویا وہ تیر (تیرتے ہوئے) نیزے ہوں۔ وہ ساتھ ساتھ اونٹ کی طرح آواز نکالتا رہا اور اس نے تلوار سے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ یوں اس نے 7 یا 9 آدمی قتل کیے۔ اور خود بھی زخمی ہوگیا اور گر پڑا۔ حضرت قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ نے باآواز بلند اسے کہا: ''اے ابوغیداق! تجھے شہادت مبارک ہو!'' عام مسلمانوں نے یہ کہنا شروع کر دیا: ''قزمان! آج تو تم نے بہادری کے خوب جوہر دکھائے ہیں تمھیں جنت کی خوشخبری ہو۔'' وہ بولا: ''کس چیز کی بشارت! میں نے تو اللہ کی قسم! اپنی قوم کے شرف کے لیے جنگ کی ہے۔ یہ بات نہ ہوتی تو میں ہرگز اس میں حصہ نہ لیتا۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات بتائی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِنَّهُ مِنْ أَهْلِ النَّارِ» ''یہ شخص جہنمیوں میں سے ہے۔''[1]

یہاں یہ فرمان نبوی بھی مدنظر رہے: «إِنَّ اللّٰهَ يُؤَيِّدُ الدِّينَ بِالرَّجُلِ الْفَاجِرِ» ''یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے دین کو کبھی فاجر شخص کے ہاتھوں بھی تقویت دیتا ہے۔''[2]

اس واقعے سے واضح ہوجاتا ہے کہ جہاد میں نیت کی کتنی اہمیت ہے اور یہ کہ جو شخص اپنی قوم کی حمیت یا بہادر کہلانے کی خاطر لڑے اور اس کے اعمال رضائے الٰہی کے لیے نہ ہوں، اس سے اللہ تعالیٰ جہاد جیسی نیکی بھی قبول نہیں فرماتے۔

غزوۂ احد سے متعلقہ چند دلائلِ نبوت کا تذکرہ

قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ کی آنکھ: حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کی آنکھ پر ضرب لگی تو وہ نکل کر رخسار پر لٹکنے لگی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ مبارک سے ان کی آنکھ کو اس کی جگہ لوٹا دیا۔ وہ آنکھ قتادہ کی دوسری آنکھ سے بہتر اور تیز ہوگئی۔[3]

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 99/3، و غزوة أحد لمحمد عيطة بن سعيد، ص: 113. [2] صحيح البخاري، حديث: 4204، و صحيح مسلم، حديث: 112,111. [3] المستدرك للحاكم: 295/3، والمعجم الكبير للطبراني: 8/19، ودلائل النبوة للبيهقي: 252,251/3.

جب کبھی آشوبِ چشم ہوتا تو یہ آنکھ نہ دکھتی۔ [1]

حضرت قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ کا صاحبزادہ خلیفہ مسلمین سیدنا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے ہاں آیا۔ انھوں نے دریافت کیا: ''تم کون ہو؟'' تو اس نے فی البدیہہ اشعار میں اپنا تعارف کرایا:

''میں اس شخص کا بیٹا ہوں جس کی آنکھ رخسار پر آپڑی تھی۔ اور مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں بہتر طور پر اپنی جگہ لوٹادی گئی۔

اور وہ پہلے جیسی ہوگئی۔ کیا ہے خوبصورتی آنکھ کی اور کتنے ہی خوبصورت انداز سے اسے اپنی جگہ فٹ کردیا گیا۔''

اس پر حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے بھی یہ شعر کہا:

''یہ ہیں قابل قدر مکارم نہ کہ دودھ اور ایسے دودھ بھرے پیالے جن میں پانی ملا ہو اور بعدازاں دونوں پیشاب بن جاتے ہیں۔'' (یعنی عزت وتکریم یہی ہے جو قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ کو حاصل تھی، کھانے پینے کی چیزیں بڑھا لینے سے تو کوئی تکریم حاصل نہیں ہوتی)۔

بعد ازاں عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے ان کے ساتھ صلہ رحمی کی اور بہت اچھی تکریم و عطیات سے نوازا۔ [2]

ابی بن خلف کے قتل کی پیش گوئی: مکہ مکرمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ابی بن خلف ملتا اور کہتا: ''اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! میرے پاس ایک جائے پناہ ہے یہ جائے پناہ وہ گھوڑا ہے جسے میں روزانہ ایک ''فرق'' (تقریباً پونے پانچ کلو) دانہ کھلاتا ہوں۔ میں اس پر سوار ہوکر تجھے قتل کروں گا۔'' (نعوذ باللہ)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے: «بَلْ أَنَا أَقْتُلُكَ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ» ''بلکہ ان شاء اللہ تجھے میں قتل کروں گا۔''

---

[1] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 388/2. [2] البداية والنهاية: 35/4.

جب جنگ احد کا دن آیا اور رسول اللہ ﷺ گھاٹی پر چڑھ گئے۔ وہاں ابی بن خلف بھی آ پہنچا اور کہنے لگا: ''اے محمد! اگر تم بچ گئے تو میں نہ رہوں گا۔'' مسلمانوں نے دریافت کیا: ''یارسول اللہ! کیا ہم میں سے کوئی شخص اس کا منہ توڑ جواب دے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: «دَعُوهُ» ''اسے چھوڑ دو'' پھر جب ابی بن خلف قریب آیا تو رسول اللہ ﷺ نے حارث بن صمہ رضی اللہ عنہ سے نیزہ لیا۔ اور اس سے نیزہ لے کر اسے ایسی حرکت دی کہ ہم سب آن واحد میں ادھر اُدھر بکھرنے پر مجبور ہو گئے۔ پھر رسول اللہ ﷺ ابی بن خلف کی طرف بڑھے اور اس کی گردن پر ایک ایسا نیزہ مارا کہ وہ گھوڑے سے لڑھکتا ہوا واپس پلٹا۔ ابی بن خلف گردن میں ہلکی سی خراش آنے کے بعد واپس قریش کے پاس پہنچا تو خون بہنے کے بجائے رکا ہوا تھا۔ کہنے لگا: ''خدا کی قسم مجھے محمد (ﷺ) نے قتل کر دیا۔'' قریش نے اس سے کہا: ''تو دل چھوڑ بیٹھا ہے اتنی کونسی بات ہے۔ اللہ کی قسم! تجھے کوئی خاص چوٹ نہیں۔'' ابی بن خلف نے بتایا: ''محمد (ﷺ) نے مکہ میں مجھ سے کہا تھا کہ میں تجھے قتل کروں گا۔ پس خدا کی قسم! اگر وہ مجھ پر تھوک بھی دیتا تو بھی میں مرجاتا۔'' جب قریش مکہ کی جانب اس کے ساتھ واپس ہو رہے تھے تو اللہ کا یہ دشمن مقام ''سَرِف''[1] تک پہنچ کر مر گیا۔[2]

اس واقعے سے رسول اللہ ﷺ کی مایہ ناز بہادری کا پتا چلتا ہے۔ ابی بن خلف اس وقت اسلحے سے لیس اور حفاظتی زرہ اوڑھے ہوئے تھا۔ اس کے باوجود آپ ﷺ اس کی زرہ اور خود کے درمیان گردن کے انتہائی مشکل ہدف پر نیزہ لگانے میں کامیاب ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ آپ ﷺ اعلیٰ جنگی قابلیت اور نشانے کی نزاکت پر کس قدر عبور رکھتے تھے۔ اس واقعے میں آپ ﷺ کے معجزے کا پتا بھی چلتا ہے کہ آپ ﷺ نے ابی بن خلف کو پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ میں تجھے قتل کروں گا اور ایسے ہی ہوا۔ اس واقعے سے یہ بات

---

1 سرف: مکہ سے 6 میل کے فاصلے پر ایک مقام ہے۔ 2 السيرة النبوية لابن هشام:3/93,94، وتاريخ الطبري:2/518,519، و دلائل النبوة للبيهقي: 3/211.

بھی عیاں ہوتی ہے کہ مشرکین آپ ﷺ کی صداقت کا یقین رکھتے تھے۔ اور انھیں اس کا مکمل علم تھا کہ آپ ﷺ جو کہتے ہیں وہ یقیناً ہو جاتا ہے۔ ابی بن خلف کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ اس نیزے کے لگنے ہی سے مر جائے گا لیکن اپنی اسلام دشمنی وضد اور خواہش پرستی کی بنا پر اسلام میں داخل نہ ہو سکا۔[1]

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ ۝ ﴾

''پس بے شک وہ آپ کو نہیں جھٹلاتے بلکہ دراصل یہ ظالم تو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔''[2]

حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے اس واقعے کو اپنے شعروں میں یوں دوام بخشا ہے:

''ابی بن خلف کو گمراہی اپنے باپ سے وراثت میں ملی تھی۔ جس دن رسول اللہ ﷺ اس سے برسرِ پیکار ہوئے۔

اے ابی! تو اپنی بوسیدہ ہڈیاں اٹھائے رسول اللہ ﷺ کی طرف آ رہا تھا۔ اور آپ ﷺ کی حقیقت سے واقف ہوتے ہوئے بھی انھیں دھمکیاں دے رہا تھا؟''[3]

---

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي: 169/5. [2] الأنعام 33:6. [3] السيرة النبوية لابن هشام: 94/3.

باب 4

غزوۂ احد کے بعد کے حالات و واقعات

رسول اللہ ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے ابوسفیان کا زوردار مکالمہ

حضرت براء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''ابوسفیان (غزوۂ احد کے اختتام پذیر ہونے کے بعد) نمودار ہوا اور پوچھنے لگا: ''کیا تم میں محمد (ﷺ) ہیں؟''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَا تُجِیبُوهُ» ''اسے جواب نہ دو۔''

اس نے پھر سوال کیا: ''کیا تم میں ابن ابی قحافہ (حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ) ہیں؟''

آپ ﷺ نے فرمایا: «لَا تُجِیبُوهُ» ''اسے جواب نہ دو۔''

اس نے پھر پوچھا: ''تم میں خطاب کے بیٹے ہیں؟'' پھر خود کہنے لگا: ''یہ لوگ تو قتل ہو چکے کیونکہ اگر زندہ ہوتے تو ضرور جواب دیتے۔''

یہ سن کر عمر رضی اللہ عنہ بے قابو ہو گئے اور بولے: ''او اللہ کے دشمن! تو جھوٹ بولتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے تیری رسوائی کے لیے انھیں باقی رکھا ہے۔''

اس کے بعد ابوسفیان نے نعرہ لگایا: أُعْلُ هُبَلُ! ''ہبل بلند ہو۔''

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «أَجِیبُوهُ» ''اسے جواب دو۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: ''ہم کیا کہیں؟''

فرمایا: «قُولُوا: اَللّٰهُ أَعْلٰى وَأَجَلُّ» ''تم یہ جواب دو: ''اللہ تعالیٰ ہی بلند و بالا اور عظمت و جلال کا مالک ہے۔''

یہ سن کر ابوسفیان بولا: ''ہمارا عُزّٰی ہے مگر تمھارا کوئی عُزّٰی نہیں۔''

نبی ﷺ نے فرمایا: «أَجِيبُوهُ» ''اسے جواب دو۔''

صحابہ عرض کرنے لگے: ''کیا کہیں؟''

فرمایا: «قُولُوا: اَللّٰهُ مَوْلَانَا وَلَا مَوْلٰى لَكُمْ» ''کہو: اللہ ہمارا آقا ہے اور تمھارا کوئی آقا ہی نہیں۔''

اس کے بعد ابوسفیان نے کہا: ''آج کا دن جنگ بدر کے دن کا بدلہ ہے۔ اور لڑائی میں ہار جیت ہوتی رہتی ہے۔ تمھارے مقتولین کا مثلہ ہوا ہے۔ میں نے اس کا حکم نہیں دیا تھا اور نہ ہی مجھے برا لگا۔''[1]

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''کاہے کی برابری! ہمارے شہداء جنت میں ہیں اور تمھارے مقتولین جہنم میں ہیں۔''[2]

ابوسفیان (رضی اللہ عنہ) نے رسول اللہ ﷺ، ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ اس میں واضح دلالت ہے کہ مشرکین کے ہاں بھی ان شخصیات کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ وہ جانتے تھے یہ اسلام کے پرچارک ہیں۔ اسلام کی عالی شان عمارت انھی پر استوار ہے اور یہ اسلامی ریاست کے رکن رکین ہیں۔ مشرکین کو یقین تھا کہ ان کی شہادت کے بعد اسلام قائم نہیں رہ سکتا۔ آپ ﷺ نے ابتدا میں ابوسفیان کے جواب میں خاموشی کا حکم دیا تاکہ اسے مزید ذلیل کیا جائے۔ یہاں تک کہ جب وہ غرور کے نشے میں مست ہوجائے تب اسے حقیقت حال سے باخبر کریں اور بہادری سے اس کا جواب دیں۔

ابن قیم رحمہ اللہ اس مکالمے پر اپنی رائے ان الفاظ میں دیتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس وقت جواب دینے کا حکم دیا جب اس نے اپنے معبودوں کا اور انھیں

[1] صحيح البخاري، حديث:4043، ودلائل النبوة للبيهقي:268/3. [2] مسند أحمد:463/1، ومجمع الزوائد: 110/6، و السيرة النبوية لابن هشام:99/3.

شریک ٹھہرانے کا فخریہ طور پر اظہار کیا۔ اس سے آپ ﷺ کا مقصد یہ تھا کہ توحید کی عظمت کا ڈنکا بجایا جائے اور بتایا جائے کہ مسلمان جس کی عبادت کرتے ہیں وہ درحقیقت عزت کا مالک اور انتہائی طاقتور ہے اور اسے مغلوب نہیں کیا جا سکتا اور ہم مسلمان اسی کا گروہ اور اسی کی فوج ہیں۔

اور جب اس نے کہا: ''کیا تم میں محمد ﷺ ہیں؟ ابو قحافہ کے بیٹے (ابوبکر) ہیں؟ عمر ہیں؟'' تو آپ ﷺ نے جواب نہ دینے کا حکم دیا۔ بلکہ روایات میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے جواب سے منع کر دیا اور فرمایا: «لَا تُجِیبُوهُ» ''اسے جواب نہ دو۔'' کیونکہ مسلمان قوم کو زخم خوردہ کرنے کے باوجود وہ مسلمانوں کی تلاش میں ابھی ٹھنڈے نہیں ہوئے تھے، ان کے غیظ و غضب کی آگ تاحال بھڑک رہی تھی۔ لیکن جب اس نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ تمھارے ہاتھوں ان کا کام تمام کیا جا چکا ہے۔ تو عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جوش میں آگئے۔ ان کے غصے میں شدت آگئی اور انھوں نے جواب دیا: ''او اللہ کے دشمن! تم جھوٹ بکتے ہو۔'' دراصل اس اطلاع میں کافروں کی رسوائی کا سامان اور اپنی بہادری جتلانا مقصود تھا اور اس وقت دشمن کو باخبر کرنا تھا کہ ہم لوگ اب بھی تم سے ٹکرانے کی تب و تاب رکھتے ہیں اور ہم کمزوری اور کاہلی کا شکار نہیں ہوئے۔ میں اور میرے ساتھی تم سے ہرگز خوف زدہ نہیں ہوئے۔ ہمیں زندہ رکھ کر اللہ تعالیٰ نے تمھاری رسوائی کا سامان باقی رکھا ہے۔ اور ان تینوں شخصیات کے متعلق بتانا کہ وہ بقید حیات ہیں دشمن کو گھبراہٹ اور خوف میں مبتلا کرنے کے مترادف تھا۔ کیونکہ انھیں یقین ہو چکا تھا کہ یہ تینوں وفات پا چکے ہیں۔ اس موقع پر ایک ایک کے بجائے تینوں کی بقا کا اکٹھا جواب دے کر ابوسفیان اور اس کی قوم کو ذلیل اور کمزور کرنا مقصود تھا اور ایسا الگ الگ جواب دینے سے ممکن نہ تھا۔

ابوسفیان (رضی اللہ عنہ) کا ان کے متعلق پوچھنا اور اپنی قوم کو ان کی وفات کی اطلاع دینا دشمن کی چالبازیوں کے ترکش کا آخری تیر تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی اس چال کے ممکن

ہونے تک صبر کیا جب انھوں نے اپنی سازش کو عملی جامہ پہنا لیا تو عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا اور ان کے فریب کے تیر انھی کی طرف لوٹا دیے۔ پہلے جواب نہ دینا بہتر اور اب کی بار جواب دینا مفید تھا۔ اسی طرح آغاز گفتگو میں جب اس نے ان کے متعلق دریافت کیا تو اسے سرے سے جواب ہی نہ دینا اس کی ذلت و حقارت کا باعث تھا۔ تو جب وہ اپنے ہی من میں خوش ہونے لگا کہ وہ قتل ہو چکے ہیں اور اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی اور وہ اس سے انتہائی غرور و تکبر کی سراب میں کھو گیا۔ تو اب اسے جواب دینا انتہائی مناسب تھا کیونکہ اس میں اس کے لیے حقارت و ذلت پوشیدہ تھی۔ اب جواب دینا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان: «لَا تُجِيبُوهُ» کے خلاف بھی نہ تھا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عدم جواب کا حکم صرف اس وقت دیا تھا جب اس نے پوچھا: ''کیا تم میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے؟ کیا تم میں فلاں فلاں ہیں؟'' لیکن جب اسی نے کہا: ''یہ تینوں تو قتل ہو چکے۔'' اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب دینے سے منع نہیں فرمایا۔ بہر حال ابوسفیان کو پہلے جواب نہ دینا اور اب جواب دینا ہی بہتر تھا۔''[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شہداء کی خبر گیری کرنا

ابوسفیان کے میدان جنگ چھوڑنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کی خبر گیری کے لیے تشریف لے گئے اور چند ایک شہداء کے پاس کھڑے ہوئے۔ ان میں سے حضرت حمزہ بن عبدالمطلب، مصعب بن عمیر، حنظلہ بن ابی عامر، سعد بن ربیع، اصیرم رضی اللہ عنہم اور دیگر صحابہ شامل ہیں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہدائے احد کو دیکھا تو فرمایا:

«أَنَا شَهِيدٌ عَلٰى هٰؤُلَاءِ، إِنَّهٗ مَا مِنْ جَرِيحٍ يُجْرَحُ فِي اللّٰهِ إِلَّا وَاللّٰهُ يَبْعَثُهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَدْمٰى جُرْحُهٗ، اَللَّوْنُ لَوْنُ دَمٍ، وَّالرِّيحُ رِيحُ

[1] زاد المعاد: 203,202/3.

الْمِسْكِ، أُنْظُرُوا أَكْثَرَ هٰؤُلَاءِ جَمْعًا لِّلْقُرْآنِ فَاجْعَلُوهُ أَمَامَ أَصْحَابِهِ فِي الْقَبْرِ»

''میں ان سب پر گواہ ہوں۔ جو بھی شخص اللہ تعالیٰ کے راستے میں زخمی کیا جائے گا اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے روز اس طرح اٹھائے گا کہ اس کے زخم سے خون بہہ رہا ہوگا جس کا رنگ تو خون ہی والا ہوگا مگر خوشبو مشک جیسی ہوگی۔ دیکھو! جسے قرآن زیادہ یاد تھا اسے دوسروں سے پہلے لحد میں رکھو۔''[1]

امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی روایت بیان کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دو دو شہیدوں کو ایک ہی کپڑے میں لپیٹتے اور پوچھتے: «أَيُّهُمْ أَكْثَرُ أَخْذًا لِّلْقُرْآنِ؟» ''ان دونوں میں سے قرآن کس کو زیادہ یاد تھا؟'' جب اشارہ کیا جاتا کہ فلاں کو تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے لحد میں آگے کرتے اور فرماتے: «أَنَا شَهِيدٌ عَلٰى هٰؤُلَاءِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ» ''قیامت کے دن ان لوگوں پر میں گواہ ہوں گا۔'' اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ان لوگوں کو خون سمیت دفن کر دو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر نماز جنازہ پڑھی نہ ہی انھیں غسل دیا گیا۔''[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ انھیں ان کی شہادت گاہوں میں دفن کیا جائے، لہٰذا جن شہدا کو دفن کرنے کے لیے مدینہ منتقل کیا جا چکا تھا انھیں دوبارہ ان کی شہادت گاہوں کی طرف منتقل کر دیا گیا۔[3]

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کا مثلہ کیا ہوا دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی غمگین ہو گئے اور روتے ہوئے سسکیاں بھرنے لگے، قریب تھا روتے روتے بے ہوش ہو جاتے۔[4]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

1 السيرة النبوية لابن هشام: 109/3. 2 صحيح البخاري، حديث: 4079. 3 سنن النسائي، حديث: 2006. 4 مختصر سيرة الرسول ﷺ لمحمد بن عبد الوهاب، ص: 331.

«لَوْلَا أَنْ تَحْزَنَ صَفِيَّةُ، وَيَكُونَ سُنَّةً مِّنْ بَعْدِي لَتَرَكْتُهُ حَتّٰى يَكُونَ فِي بُطُونِ السِّبَاعِ، وَحَوَاصِلِ الطَّيْرِ، وَلَئِنْ أَظْهَرَنِي اللّٰهُ عَلٰى قُرَيْشٍ فِي مَوْطِنٍ مِّنَ الْمَوَاطِنِ لَأُمَثِّلَنَّ بِثَلَاثِينَ رَجُلًا مِّنْهُمْ»

''اگر مجھے اس بات کا خیال نہ ہوتا کہ صفیہ کو صدمہ پہنچے گا اور یہ کہ میرے بعد یہ ایک سنت بن جائے گی تو میں انھیں ایسے ہی رہنے دیتا تاکہ وہ درندوں کے پیٹوں اور پرندوں کے پوٹوں میں پہنچ جائے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے کسی موقع پر قریش پر غلبہ عطا فرمایا تو میں ان کے تیس آدمیوں کا مثلہ کروں گا۔''

مسلمانوں نے آپ ﷺ کے چچا جان کے ساتھ اس قسم کا سلوک کرنے والوں پر رسول اللہ ﷺ کا غم وغصہ دیکھا تو کہنے لگے: ''اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان پر کسی زمانے میں بھی فتح نصیب کی تو ہم ان کا ایسا مثلہ کریں گے کہ عرب میں کسی بھی شخص کا ایسا مثلہ نہ کیا گیا ہوگا۔''[1]

اس وقت اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا:

﴿وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُم بِهِ ۖ وَلَئِن صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِينَ ۝﴾

''اور اگر تم بدلہ لو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنی تمھیں تکلیف دی گئی ہو اور اگر تم صبر کرو تو وہ صابرین کے لیے بہت بہتر ہے۔''[2]

مشرکوں نے مسلمان شہداء کا مثلہ کر کے مقتولین کے پیٹ پھاڑ کر ناک، کان اور بعض

[1] سنن أبي داود، حديث: 3136، وجامع الترمذي، حديث: 1016، ومسند أحمد: 128/3، والسيرة النبوية لابن هشام: 106/3، والمستدرك للحاكم: 196/3، والمصنف لابن أبي شيبة: 391/14، 392. علامہ البانی ؒ نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے، دیکھیے: السلسلة الضعيفة: 27/2، حديث: 549. [2] النحل 126:16. سنن دار قطني: 204/5، ودلائل النبوة للبيهقي: 286/3. علامہ البانی ؒ نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے، دیکھیے: السلسلة الضعيفة: 26/2، حديث: 548.

کی شرمگاہیں کاٹ کر انتہائی وحشت کا مظاہرہ کیا۔[1]

اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے صبر سے کام لیا۔ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی نصیحت کو قبول کرتے ہوئے درگزر اور صبر سے کام لیا۔ اپنی قسم کا کفارہ ادا کیا اور مثلہ کرنے سے منع کر دیا۔

ابن اسحاق نے سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے اپنی سند کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ایسا کبھی نہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ ایک جگہ کھڑے ہوں اور اسے چھوڑنے سے پہلے پہلے ہمیں صدقہ و خیرات کا حکم نہ دیا یا مثلہ سے منع نہ فرمایا ہو۔[2]

احد کے دن رسول اللہ ﷺ کی دعا

رسول اللہ ﷺ نے بہت زیادہ خون بہہ جانے کی بنا پر احد کے دن ظہر کی نماز بیٹھ کر پڑھائی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی آپ ﷺ کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ نماز کے بعد آپ ﷺ نے اللہ کی حمد و ثنا کی اور درپیش آزمائش اور مشقت کے متعلق اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی، چنانچہ آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا: «اِسْتَوُوا حَتّٰى أُثْنِيَ عَلٰى رَبِّي عَزَّوَجَلَّ» ”برابر ہو جاؤ۔ ذرا میں اپنے پروردگار کی حمد و ثنا کر لوں۔“ اس حکم پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ کے پیچھے صفیں باندھ لیں تو آپ ﷺ نے ایمان سے معمور ان کلمات سے یوں دعا کی:

«اَللّٰهُمَّ! لَكَ الْحَمْدُ كُلُّهُ، اَللّٰهُمَّ! لَا قَابِضَ لِمَا بَسَطْتَّ، وَلَا بَاسِطَ لِمَا قَبَضْتَ، وَلَا هَادِيَ لِمَا أَضْلَلْتَ، وَلَا مُضِلَّ لِمَنْ هَدَيْتَ، وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ، وَلَا مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ، وَلَا مُقَرِّبَ لِمَا بَاعَدْتَّ، وَلَا مُبْعِدَ لِمَا قَرَّبْتَ، اَللّٰهُمَّ! ابْسُطْ عَلَيْنَا مِنْ بَرَكَاتِكَ، وَرَحْمَتِكَ، وَفَضْلِكَ، وَرِزْقِكَ، اَللّٰهُمَّ! إِنِّي أَسْأَلُكَ النَّعِيمَ الْمُقِيمَ الَّذِي لَا يَحُولُ،

[1] غزوة أحد لأبي فارس، ص: 104. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 102/3.

وَلَا يَزُولُ، اَللّٰهُمَّ! إِنِّي أَسْأَلُكَ النَّعِيمَ يَوْمَ الْغَلَبَةِ، وَالْأَمْنَ يَوْمَ الْخَوْفِ، اَللّٰهُمَّ! عَائِذٌ بِكَ مِنْ شَرِّمَا أَعْطَيْتَنَا، وَشَرِّمَا مَنَعْتَنَا، اَللّٰهُمَّ! حَبِّبْ إِلَيْنَا الْإِيمَانَ، وَزَيِّنْهُ فِي قُلُوبِنَا، وَكَرِّهْ إِلَيْنَا الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ، وَالْعِصْيَانَ، وَاجْعَلْنَا مِنَ الرَّاشِدِينَ، اَللّٰهُمَّ! تَوَفَّنَا مُسْلِمِينَ، وَأَحْيِنَا مُسْلِمِينَ، وَأَلْحِقْنَا بِالصَّالِحِينَ غَيْرَ خَزَايَا، وَلَا نَادِمِينَ، وَلَا مَفْتُونِينَ. اَللّٰهُمَّ! قَاتِلِ الْكَفَرَةَ الَّذِينَ يُكَذِّبُونَ رُسُلَكَ، وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِكَ، وَاجْعَلْ عَلَيْهِمْ رِجْزَكَ، وَعَذَابَكَ، اَللّٰهُمَّ! قَاتِلِ الْكَفَرَةَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ، إِلٰهَ الْحَقِّ »

’’اے اللہ! تیرے ہی لیے سب تعریفیں ہیں۔ اے اللہ! تو جس کے لیے کشادگی فرما دے اسے کوئی تنگ نہیں کرسکتا۔ اور جسے تو تنگی میں مبتلا کردے اسے کوئی کشادگی سے نہیں نواز سکتا۔ اور جس شخص کو تو گمراہ کردے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ اور جس شخص کو تو ہدایت دے دے اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا۔ جس سے تو روک لے اسے کوئی دے نہیں سکتا۔ اور جسے تو دے اس سے کوئی رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ اور جسے تو دور کردے اسے کوئی قریب نہیں کرسکتا۔ اور جسے تو قریب کردے اسے کوئی دور نہیں کرسکتا۔ اے اللہ! ہم پر اپنی برکتوں، رحمتوں اور فضل ورزق کے دہانے کھول دے۔ اے اللہ! میں تجھ سے برقرار رہنے والی نعمت کا سوال کرتا ہوں۔ جو نہ ٹلے اور نہ ختم ہو۔ اے اللہ! میں تجھ سے فقر کے دن مدد کا اور خوف کے دن امن کا سوال کرتا ہوں۔ اے اللہ! جو کچھ تو نے ہمیں دیا ہے اس کے شر سے اور جو کچھ نہیں دیا ہے اس کے بھی شر سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ اے اللہ! ہمارے نزدیک ایمان کو محبوب بنا دے اور اسے ہمارے دلوں میں خوشنما

بنا دے اور کفر وفسق اور نافرمانی کو ناگوار بنا دے اور ہمیں ہدایت یافتہ لوگوں میں کر دے۔ اے اللہ! اسلام کی حالت میں ہمیں موت دینا اور اسلام ہی پر زندہ رکھنا اور رسوائی اور فتنے سے دوچار کیے بغیر ہمیں صالحین میں شامل فرما۔ اے اللہ! تو ان کافروں کو ہلاک کر، ان پر سختی کر اور ان پر عذاب نازل فرما جو تیرے پیغمبروں کو جھٹلاتے اور تیری راہ سے روکتے ہیں۔ اے اللہ! اہل کتاب کو نیست و نابود کر دے۔ اے سچے الٰہ (ہماری دعا قبول فرما!)۔''[1]

پھر آپ ﷺ اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے اور مدینہ منورہ کا رُخ کیا۔[2]

رسول اللہ ﷺ نے یہ اعلیٰ نمونہ اپنی امت کے سامنے رکھا تا کہ وہ نصرت اور توفیق جہانوں کے پروردگار ہی سے طلب کریں۔ نبی ﷺ نے اپنی امت کے لیے یہ بات واضح فرمادی کہ فتح و نصرت ہو یا شکست ہر صورت میں دعا مطلوب ہے کیونکہ دعا عبادت کا مغز ہے۔ اسی طرح دعا ناگوار حالات کو ٹالنے اور اعلیٰ مقاصد کے حصول کا قوی ترین ذریعہ ہے۔

دعا دلوں کو اپنے خالق سے جوڑ دیتی ہے جس کے نتیجے میں سکون و اطمینان اور ثابت قدمی حاصل ہوتی ہے۔ یہ دلوں کو بہت بڑی روحانی قوت سے بہرہ ور کرتی ہے اور اس طرح احساسات و خیالات بلندیوں کو چُھوتے اور انعاماتِ الٰہیہ کی طرف شوق سے بڑھتے رہتے ہیں۔

اختتامِ معرکہ پر آپ ﷺ نے تیاری کی اور مسلمانوں کی صف بندی کی تا کہ رب تعالیٰ کی ثنا بیان کریں۔ یہ راسخ ایمان کی روشن دلیل ہے جو رب العالمین کی بلاشراکت غلامی کے عظیم موقف کو واضح کرتی ہے۔ اور اسی سے یہ اظہار ہوتا ہے کہ وہ جو چاہے کرے، وہی ہے جو تنگی و ترشی میں مبتلا کرنے والا ہے اور کشادگی پیدا کرنے والا ہے، وہی ہے عطا کرنے والا اور روک لینے والا۔ اس کے حکم کو نہ کوئی رد کر سکتا ہے اور نہ کوئی ٹال سکتا ہے۔

یہ عبادت گزاروں کو عبودیت کی اعلیٰ منازل طے کروانے کے لیے بہترین طرز عمل ہے جو

---

[1] مسند أحمد: 424/3، و المعجم الكبير للطبراني: 47/5، حديث: 4549، ومسند البزار، حديث: 1800. [2] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 394/2.

معبود کی بے پایاں عظمت اور کبریائی دلوں میں بٹھاتا ہے۔ اسی طرح عظمت و جلالت کا واضح ترین اظہار حمد و ثنا کے ذریعے سے ہوتا ہے۔[1]

دشمن کے مکروہ عزائم سے باخبر رہنا

مشرکوں کا لشکر میدانِ جنگ سے سمٹ گیا تو رسول اللہ ﷺ نے جنگ کے فوراً بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا تاکہ معلوم کیا جائے کہ دشمن کا اب کہاں کا ارادہ ہے۔ آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: «أُخْرُجْ فِي آثَارِ الْقَوْمِ، وَانْظُرْ مَاذَا يَصْنَعُونَ، وَمَا يُرِيدُونَ؟ فَإِنْ كَانُوا جَنَّبُوا الْخَيْلَ وَامْتَطَوُا الْإِبِلَ فَإِنَّهُمْ يُرِيدُونَ مَكَّةَ، وَإِنْ رَكِبُوا الْخَيْلَ وَسَاقُوا الْإِبِلَ فَهُمْ يُرِيدُونَ الْمَدِينَةَ، وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ! إِنْ أَرَادُوهَا لَأَسِيرَنَّ إِلَيْهِمْ فِيهَا ثُمَّ لَأُنَاجِزَنَّهُمْ» ''ان کے پیچھے پیچھے جاؤ اور معلوم کرو کہ ان کے عزائم کیا ہیں۔ اگر کفار گھوڑوں کو اپنے ساتھ لے کر چل رہے ہیں اور خود اونٹوں پر سوار ہیں تو وہ واپس مکہ جانا چاہتے ہیں اور اگر وہ اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر اونٹوں کو ہانک رہے ہیں تو پھر سمجھ لو کہ ان کا ارادہ مدینے کا ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر ان کا مدینے پر حملے کا ارادہ ہوا تو میں خود ان کی طرف بڑھ کر ان سے ضرور جنگ کروں گا۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں ان کے پیچھے گیا تاکہ دیکھوں کہ ان کے عزائم کیا ہیں۔ جب میں نے دیکھا تو انھوں نے گھوڑوں کو اپنے پہلو میں رکھا ہوا تھا اور اونٹوں پر سوار تھے۔ اور ان کا رخ مکہ کی جانب تھا۔[2]

نصیحتیں اور عبرتیں: اس خبر میں متعدد اسباق اور نصائح ہیں: آپ ﷺ دشمن کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے اور ان کی سرگرمیوں سے باخبر تھے۔ آپ ﷺ کی

1 صور و عبر من الجهاد النبوي في المدينة للدكتور فوزي فيض الله، ص:133,132. 2 البداية والنهاية: 41/4، والسيرة النبوية لابن هشام: 100/3.

سنگینی حالات کا اندازہ لگانے کی صلاحیت اور معاملات کو بھانپنے کی دسترس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر دشمن مدینہ کی طرف پلٹتا تو آپ ﷺ مشرکوں سے پنجہ آزمائی کے لیے بالکل تیار تھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ ﷺ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر بھرپور اعتماد تھا اور آپ بڑے مردم شناس تھے۔ اسی طرح یہ واقعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شجاعت کی بھی دلیل ہے کیونکہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اس نازک مرحلے میں تھے کہ لشکر کی نگاہ آپ پر پڑ جاتی تو مشرکین مکہ آپ کو شہید کرنے کی کوشش سے ہرگز اجتناب نہ کرتے۔[1]

یہ بات ہمارے سامنے ہے کہ رسول اللہ ﷺ جنگ کے بعد زخمی اور شہداء کے احوال دریافت کرنے کے لیے کچھ دیر میدان جنگ میں قیام پذیر رہے، شہداء کے دفن کا حکم دیا، اپنے پروردگار کی ثنا کی اور دعا فرمائی۔ اسی دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دشمن کے احوال دریافت کرنے کو بھیجا۔ ان تمام تر سرگرمیوں سے مقصود یہ تھا کہ اس جنگ میں مسلمانوں نے جو کامیابی حاصل کی ہے اس کی حفاظت کی جا سکے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں فتح و شکست کے اسباب مقرر فرما رکھے ہیں، چنانچہ جو بھی فتح و نصرت کے اسباب اختیار کرتا اور اللہ تعالیٰ پر سچا بھروسا رکھتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے نصرت کا حقدار ٹھہرتا ہے جیسا کہ ارشاد باری ہے:

﴿سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِیْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۖۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا ۝﴾

”یہ اللہ کا طریقہ ہے جو پہلے سے چلا آ رہا ہے اور آپ اللہ کے طریقے میں ہرگز کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے۔“[2]

غزوۂ حمراء الاسد، جس کا تذکرہ ذیل میں آ رہا ہے، سے یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ آپ ﷺ کس انداز سے اسباب اختیار فرماتے تھے۔

1 غزوة أحد لأبي فارس، ص:96,95. 2 الفتح23:48.

غزوۂ حمراء الأسد

بعض روایات سے آگاہی ہوتی ہے کہ نبی ﷺ اپنے بہی خواہوں کے ذریعے سے مشرکوں کے بارے میں مسلسل مطلع رہنے کے لیے کوشاں رہے حتی کہ یہ تسلسل ان کے مکہ پہنچنے کے بعد بھی جاری رہا۔ آپ ﷺ کو ابوسفیان کی یہ بات بھی پہنچی کہ وہ اپنے لشکر کو ملامت کر رہا تھا کہ محمد ﷺ اور ان کے ساتھیوں کی طرف سے ابھی ان کے غصے کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ابوسفیان اور مشرکین جب احد سے واپسی پر روحاء[1] پہنچے تو ابوسفیان نے کہا: ''تم لوگوں نے کچھ نہیں کیا نہ تو محمد (ﷺ) کو قتل کیا اور نہ ہی جوان عورتوں کو ساتھ قیدی بنا کر لائے۔'' یہ بات رسول اللہ ﷺ تک پہنچ گئی۔[2]

اس روایت سے عیاں ہے کہ جنگ ختم ہونے کے باوجود رسول اللہ ﷺ دشمن کی سرگرمیوں پر کس قدر نظر رکھے ہوئے تھے۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ دشمن کے اچانک حملہ آور ہونے کا خطرہ ٹل جائے۔ اور جب آپ ﷺ نے سنا کہ قریش واپس مدینے کا ارادہ کر رہے ہیں تو آپ ﷺ عام مسلمانوں کو چھوڑ کر صرف غزوۂ احد میں شریک ساتھیوں کی معیت میں حمراء الأسد تک گئے۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ جنگ احد 15 شوال ہفتہ کے روز ہوئی تھی، پھر جب اگلا دن اتوار 16 شوال آیا تو رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اعلان کرنے والے نے دشمن کا تعاقب کرنے کا اعلان کیا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ جو لوگ کل ہمارے ساتھ جنگ میں شریک نہیں ہوئے وہ ہمارے ساتھ نہ نکلیں۔ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر ساتھ نکلنے کی اجازت طلب کی تو آپ ﷺ نے انھیں اجازت مرحمت

---

[1] روحاء: یہ مقام مدینہ سے مکہ مکرمہ کی طرف 73 کلومیٹر پر واقع ہے۔ [2] مجمع الزوائد: 121/6.

فرما دی۔ آپ ﷺ کی اس پیش قدمی کا مقصد دشمن کو خوفزدہ کرنا اور اس پر واضح کرنا تھا کہ جنگ احد میں جو صورت حال پیش آئی ہے اس کی بنا پر انھیں دشمن سے مقابلہ کرنے اور اس کی گرفت کرنے میں کسی قسم کی کمزوری کا سامنا نہیں ہے۔[1]

رسول اللہ ﷺ کے جاں نثار ساتھیوں نے جہاد کی پکار پر دوبارہ لبیک کہا۔ حتی کہ زخموں سے چور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی اس مہم سے پیچھے نہ رہے۔ بنو عبد الأشہل سے تعلق رکھنے والے ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ میں اور میرا بھائی دونوں جنگ احد میں شریک ہوئے۔ جب جنگ سے لوٹے تو زخموں سے نڈھال تھے، دریں اثنا اعلان کرنے والے نے دشمن کا تعاقب کرنے کی صدا دی۔ ہم دونوں میں سے ایک نے دوسرے سے کہا: ''کیا رسول اللہ ﷺ کی معیت میں ہم غزوے میں شریک ہونے کی سعادت سے محروم رہ جائیں گے؟ اللہ کی قسم! ہمارے پاس تو کوئی سواری بھی نہیں ہے، جبکہ ہم دونوں میں سے ہر ایک کو خاصا گہرا زخم بھی آیا ہے، پھر بھی ہم دونوں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نکل ہی پڑے۔ میں بھائی کی نسبت ذرا کم زخمی تھا۔ میرا بھائی جب زیادہ شکستہ حالت ہو جاتا تو میں اسے کچھ وقت کے لیے اٹھا لیتا اور کچھ دیر وہ پیدل چلتا۔ آخر ہم دونوں مسلمانوں کے ساتھ منزلِ مقصود تک پہنچ گئے۔''[2]

رسول اللہ ﷺ حمراء الأسد تک گئے اور مشرکوں کے لشکر کے قریب پہنچ گئے۔ تین دن تک مشرکوں کو چیلنج کے طور پر وہاں قیام پذیر رہے مگر دشمن کو سامنا کرنے اور مقابلے میں آنے کی جرأت نہ ہوئی۔ آپ ﷺ نے صحابہ کو خوب آگ جلانے کا حکم دیا جس کے نتیجے میں وہ بیک وقت پانچ سو (500) الاؤ روشن کر دیتے تھے۔[3]

1 البداية والنهاية: 50/4، والسيرة النبوية لابن هشام: 107/3، ودلائل النبوة للبيهقي: 314/3.
2 البداية والنهاية: 50/4. 3 غزوة أحد لأبي فارس، ص: 144، بحوالہ الطبقات الكبرٰى لابن سعد: 43/2.

معبد بن ابو معبد خزاعی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر مسلمان ہوئے تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ وہ ابوسفیان کے پاس جائیں اور اس کی حوصلہ شکنی کریں۔ حضرت معبد رضی اللہ عنہ اسے روحاء میں جا ملے۔ اسے معبد رضی اللہ عنہ کے مسلمان ہونے کا علم نہ تھا۔ ابوسفیان نے معبد سے پوچھا: ''انھیں پیچھے کس حال میں چھوڑ کر آئے ہو؟'' انھوں نے کہا: ''محمد (ﷺ) اور اس کے ساتھی تم لوگوں پر سخت تاؤ میں ہیں اور وہ اپنے ساتھیوں کی ایک کثیر تعداد کے ساتھ، جس کی مثال اب تک دیکھنے میں نہیں آئی، نکلے ہیں۔ احد میں پیچھے رہ جانے والے بھی اب آ گئے ہیں اور جنگ سے پیچھے رہ جانے پر بڑے سخت نادم ہیں۔'' ابوسفیان بولا: ''تو پھر آپ کی کیا رائے ہے؟'' معبد نے جواب دیا: ''مجھے امید نہیں کہ ان کے سواروں کی پیشانیاں اس ٹیلے کے پیچھے سے نمودار ہونے سے بیشتر تم یہاں سے کوچ کر سکو گے۔''[1]

ابوسفیان کہنے لگا: ''اللہ کی قسم! اب تو ہم نے ان پر دوبارہ حملہ کرنے کا عزم کر لیا ہے تاکہ ان کی جڑ کاٹ کر رکھ دیں۔'' معبد نے جواباً کہا: ''میں تمھیں اس سے باز رہنے کا مشورہ دیتا ہوں۔ اللہ کی قسم! جو کچھ میں نے دیکھا میں نے اس (سے مرعوب ہوکر اس) کے بارے میں چند شعر بھی کہے ہیں۔'' ابوسفیان نے پوچھا: ''آپ نے کیا شعر کہے ہیں؟'' معبد نے یہ شعر سنائے:

''قریب تھا کہ آوازوں کے شوروغل سے میری سواری خوف زدہ ہوکر گر جائے
جب زمین پر گروہ در گروہ گھوڑوں کا سیلاب اُمڈ آیا۔
یہ گھوڑے جنگ کے موقع پر اپنے ان سواروں کو نہایت تیزی سے لے جانے والے
تھے جو لمبے قد والے ہیبت ناک شیروں کی طرح ہیں جو بزدل ہیں نہ غیر مسلح۔
جب یہ گھوڑے شکست نہ کھانے والے سردار کی معیت میں آگے بڑھ رہے تھے۔

1 زاد المعاد:3/245.

میں تیزی سے دوڑا، جبکہ زمین مجھے ہلتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔

جب بطحاء کی سرزمین ان گروہوں سے جوش کھا رہی تھی تو میں نے کہا: ''ابن حرب کا برا ہو کہ وہ تم سے جنگ کرے۔''

میں ہر صاحبِ عقل و خرد کو احمد (ﷺ) کے اس لشکر سے ڈراتا ہوں جو لشکر حقیر و قصیر لوگوں پر مشتمل نہیں۔ اور میں جس چیز سے ڈرا رہا ہوں اسے محض زبانی جمع خرچ نہ سمجھا جائے۔''[1]

یہ سن کر ابوسفیان اپنے ساتھیوں سمیت اپنے ارادے سے پلٹ گیا۔

ابوسفیان نے واپس پلٹ جانے کی خفت مٹانے اور مسلمانوں کو مرعوب کرنے کے لیے ان پر ایک اعصابی جنگ مسلط کرنے کی کوشش کی، چنانچہ اس وقت مکی لشکر کے پاس سے تجارت کی غرض سے مدینہ آنے والا عبدالقیس کا ایک قافلہ گزر رہا تھا۔ ابوسفیان نے ان کے ذریعے رسول اللہ ﷺ کی طرف پیغام بھیجا کہ انھیں خبردار کر دو کہ ہم نے محمد (ﷺ) اور آپ کے ساتھیوں پر دوبارہ حملہ آور ہونے کا عزم کر لیا ہے تاکہ ان کا نام و نشان مٹا دیں۔ اس پیغام پہنچانے پر ابوسفیان نے اس وفد سے وعدہ کیا کہ جب وہ اس کے پاس عکاظ آئیں گے تو وہ انھیں اس کے بدلے میں کِشمِش دے گا۔

یہ قافلہ آپ ﷺ کو حمراء الاسد میں ملا اور قافلے والوں نے ابوسفیان کا پیغام پہنچا دیا۔

آپ ﷺ نے اور مسلمانوں نے سن کر کہا:

«حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيلُ»

''اللہ ہمارے لیے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔''[2]

مسلمان حمراء الاسد میں مقیم رہے، جبکہ قریش نے جنگ سے بچاؤ اور واپسی کو ترجیح دی اور واپس مکہ چلے گئے، بعدازاں مسلمان بھی فخر سے سربلند کیے، ہلکے پھلکے مدینہ واپس

---

1 البداية والنهاية: 51/4. 2 تاريخ الإسلام للذهبي: 226/2.

آ گئے (گویا اس اقدام سے انھوں نے) شکست کی عار کو کسی حد تک کم کر لیا، چنانچہ باعزت سر اٹھائے ہوئے، مشرکوں کی فتح کو خاک میں ملائے ہوئے اور اعصابی جنگ میں انھیں شکست سے دوچار کیے ہوئے مدینہ منورہ میں داخل ہوئے۔ اور اس طرح منافقینِ مدینہ اور یہود کی ساری خوشی خاک میں ملا دی۔

قرآن پاک نے درج ذیل آیات مبارکہ میں اسی سرد جنگ کے اثرات کا تذکرہ فرمایا ہے، ارشاد ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖۗ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ ۝ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ۝ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۪ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ ﴾

”یہی لوگ ہیں جنھوں نے جنگ میں زخم لگنے کے بعد اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانا، ان میں سے جو لوگ نیکو کار اور پرہیز گار ہیں، ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔ انھی سے لوگوں نے کہا تھا کہ تمھارے خلاف ایک بڑی فوج جمع ہوئی ہے، پس تم ان سے ڈرو، تب اس بات نے ان کے ایمان میں اضافہ کر دیا اور انھوں نے کہا: ”ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ بہت اچھا کارساز ہے۔ پھر وہ اللہ کی نعمت اور فضل کے ساتھ لوٹے، انھیں کوئی نقصان نہ پہنچا اور انھوں نے پیروی کی اللہ کی رضا کی اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے۔ یہ تو شیطان ہی ہے جو اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے، پس تم ان سے نہ ڈرو اور صرف مجھ سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔“[1]

[1] آل عمرٰن 3:172-175۔

مدینہ واپسی سے پہلے شاعر ابوعزہ جُمَحی رسول اللہ ﷺ کی گرفت میں آ گیا۔ اسے باندھ کر قتل کر دیا گیا۔ یہ وہ شخص تھا جسے آپ ﷺ نے جنگ بدر میں بلامعاوضہ احسان کرتے ہوئے اس شرط پر چھوڑ دیا تھا کہ وہ آپ ﷺ کے خلاف کسی سے تعاون نہیں کرے گا مگر وہ وعدہ خلافی کرتے ہوئے پھر جنگ احد میں شریک ہو گیا۔ اس نے اب پھر بچ نکلنے کی کوشش کی، وہ کہنے لگا: ”اے اللہ کے رسول! میری لغزش سے درگزر کریں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: «لَا وَاللّٰهِ! لَا تَمْسَحُ عَارِضَيْكَ بِمَكَّةَ وَتَقُولُ: خَدَعْتُ مُحَمَّدًا مَرَّتَيْنِ، اِضْرِبْ عُنُقَهُ يَا زُبَيْرُ!» ”اب ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا مبادا تم مکہ جا کر اپنے رخسار پر ہاتھ پھیرو اور کہو میں نے محمد (ﷺ) کو دو مرتبہ دھوکا دیا۔ اے زبیر! اس کی گردن اڑا دو۔“ تو انھوں نے اس کی گردن ماردی۔[1]

اس موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: «لَا يُلْدَغُ الْمُؤْمِنُ مِنْ جُحْرٍ وَّاحِدٍ مَّرَّتَيْنِ» ”مومن ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جاتا۔“[2]

یہ جملہ قبل ازیں متعارف نہ تھا لیکن بعد میں یہ ضرب المثل بن گیا۔ رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ شرعی سیاست کا حصہ تھا کیونکہ یہ شاعر فسادی اور فتنہ پرور تھا۔ اس پر دوبارہ احسان کرنا گویا مسلمانوں کے خلاف اسے جنگ اور فتنے کا ایک اور موقع فراہم کرنا تھا۔ ابوعزہ جمحی کے سوا مشرکوں میں سے کوئی بھی قید نہ ہوا تھا۔[3]

جنگ احد میں ستر شہداء کو شہادت نصیب ہوئی، یہ فرمان اس کی تائید کرتا ہے:

﴿ اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ۭ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝﴾

1 الطبقات الكبرىٰ لابن سعد: 43/2، والسنن الكبرىٰ للبيهقي: 65/9، والسيرة النبوية لابن هشام: 116/3. 2 صحيح البخاري، حديث: 6133، وصحيح مسلم، حديث: 2998.
ملحوظہ: صحیحین میں اس حدیث مبارکہ کے اس موقع پر وارد ہونے کا ذکر نہیں ہے، البتہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ابن اسحاق کی مغازی اور سیرۃ ابن ہشام کے حوالے سے سعید بن مسیّب کی مرسل روایت ذکر کی ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے: فتح الباري، شرح الحديث: 6133. 3 البداية والنهاية: 53/4.

”کیا جب تمھیں (احد میں) مصیبت پہنچی تو تم کہنے لگے کہ یہ کہاں سے آئی ہے؟ حالانکہ (بدر میں) تم نے اس سے دگنی مصیبت کافروں کو پہنچائی تھی۔ کہہ دیجیے کہ یہ مصیبت تمھاری اپنی لائی ہوئی ہے، بے شک اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔“ [1]

یہ آیت شہدائے احد کے بارے میں مسلمانوں کو تسلی دینے کے لیے نازل ہوئی۔ ابنِ عطیہ کہتے ہیں: ”مشرکوں نے احد کے معرکے میں ستر مسلمان شہید کیے۔ مسلمانوں نے بھی بدر کے موقع پر ستر مشرک قتل اور ستر ہی قید کیے تھے۔“ [2]

معرکۂ احد میں مشرکین کے مقتولین کی تعداد بائیس تھی۔ [3]

غزوۂ حمراء الاسد کے اہم مقاصد: غزوۂ حمراء الاسد میں مشرکوں کا پیچھا کرنے میں درج ذیل کئی ایک اہم مقاصد پنہاں تھے:

① غزوۂ احد کے شرکاء کے دلوں پر شکست کا جو احساس ہوا تھا وہ احساس ان کے دلوں میں نہ بیٹھ جائے۔

② مسلمانوں کو یہ باور کرانا تھا کہ جب بھی وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے کمزوری اور بزدلی کا لباس اتار پھینکیں گے تو وہی دشمن پر غالب ہوں گے۔

③ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اپنے دشمن کے خلاف جنگ پر جرأت دلانا۔

④ انھیں بتانا مقصود تھا کہ معرکے میں جو کچھ ہوا وہ اللہ کی حکمت اور ارادے کا تقاضا تھا جو صرف آزمائش اور امتحان کے لیے تھا، جبکہ درحقیقت وہی طاقتور ہیں اور ان کے مخالفین محض ظاہری غلبہ پا سکے ہیں، حالانکہ وہی دراصل کمزور ہیں۔ [4]

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے حمراء الاسد تک پیش قدمی سے اعصابی جنگ بپا کرنے کی اہمیت واضح ہوتی ہے کہ اس کا مخالف پر کتنا نفسیاتی اثر پڑتا ہے۔ آپ ﷺ بمع لشکر

---

1 آل عمرٰن 165:3. 2 المحرر الوجيز لابن عطية: 411/3. 3 مرويات غزوة أحد لحسين أحمد الباكري، ص:367-369. 4 تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب:519/1.

حمراء الاسد تک گئے۔ وہاں تین دن ٹھہرے۔ آگ کے الاؤ روشن کرنے کا حکم دیا، وہ آگ دور سے نظر آتی تھی اور پورا علاقہ روشن ہو جاتا۔ حتی کہ قریش سمجھنے لگے کہ مسلمانوں کا لشکر بہت بڑی تعداد میں ہے جس کا مقابلہ اس کے بس کی بات نہیں، چنانچہ وہ ایسی کیفیت میں پلٹے کہ وہ انتہائی مرعوب تھے۔ [1]

ابن سعد کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ صحابہ سمیت حمراء الاسد جا خیمہ زن ہوئے۔ مسلمان وہاں آنے والی راتوں میں پانچ سو الاؤ روشن کرتے تاکہ دور سے نظر آئیں۔ اس طرح ان کے لشکر کی آوازیں اور آگ کی روشنی ہر جانب پھیل گئی تو اللہ تعالیٰ نے اس سے مسلمانوں کے دشمن کو رسوا اور نامراد فرما دیا۔ [2]

جنگِ احد میں مسلمان عورتوں کی شرکت

غزوۂ احد وہ پہلا معرکہ تھا جس میں مسلمان عورتیں بھی شریک ہوئیں، چنانچہ متعدد بہادر عورتیں اور ان کی ایمانی صداقت اس جنگ میں سامنے آئی۔ وہ پیاسوں کو پانی پلانے اور زخمیوں کی دیکھ بھال کے لیے گھروں سے نکلیں۔ کئی ایک نے تو رسول اللہ ﷺ پر مشرکوں کے حملے کو آگے بڑھ کر روکا۔ جنگ احد میں شریک مسلمان عورتوں میں ام المومنین عائشہ صدیقہ بنت صدیق، ام عمارہ، حمنہ بنت جحش اسدیہ، ام سلیط، ام سُلَیم رضی اللہ عنہن اور کچھ انصار کی عورتیں شامل تھیں۔ [3]

ثعلبہ بن ابو مالک بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کچھ چادریں مدینہ کی عورتوں کو تقسیم کیں۔ ایک عمدہ چادر بچ گئی۔ ان کے پاس بیٹھے چند لوگوں نے کہا: ”اے امیر المومنین! یہ چادر نبی کریم ﷺ کی نواسی کو دے دیجیے۔ وہ آپ کی بیوی بھی ہیں۔“ اس سے ان کی مراد ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہما تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ”نہیں ام سلیط رضی اللہ عنہا

1 غزوة أحد لأبي فارس، ص: 51. 2 الطبقات الكبرىٰ لابن سعد: 49/2. 3 صحيح مسلم، حديث: 1809-1811، یہاں چند مذکورہ صحابیات رضی اللہ عنہن کا تذکرہ نہیں ہے۔

اس کی زیادہ حق دار ہے۔'' ام سلیط ایک انصاری خاتون تھیں جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کی بیعت کی ہوئی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''یہ ام سلیط رضی اللہ عنہا احد کے دن پانی کی مشکیں بھر بھر کر ہمارے لیے اٹھا کر لاتی تھیں۔''[1]

خواتین کا مجاہدین کو پانی پلانا: حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب احد کی جنگ ہوئی تو مسلمان شکست کھا کر نبی اکرم ﷺ سے جدا ہو گئے مگر میں نے حضرت عائشہ صدیقہ اور ام سلیم رضی اللہ عنہما کو دیکھا تو وہ دونوں کپڑوں کو سمیٹے ہوئے بڑی تندہی سے جلدی جلدی پانی کی مشکیں اپنی پیٹھ پر لا رہی تھیں۔ وہ مسلمانوں کو پانی پلا کر پھر لوٹ جاتیں اور مشکیں بھر کر لاتیں اور مسلمانوں کو پلا دیتیں۔ مجھے ان کے پاؤں کی پازیب بھی نظر آئی تھی۔[2]

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا اور عائشہ رضی اللہ عنہا کو دیکھا کہ انھوں نے احد کے دن اپنی پیٹھوں پر مشکیزے اٹھا رکھے تھے۔ اور حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا پیاسوں کو پانی بھی پلا رہی تھیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی بھی کر رہی تھیں، جبکہ ام ایمن رضی اللہ عنہا زخمیوں کو پانی پلانے میں مصروف تھیں۔[3]

خواتین اسلام کی طرف سے زخمیوں کی مرہم پٹی اور غمخواری: حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب بھی کسی جنگ میں تشریف لے جاتے آپ ام سلیم رضی اللہ عنہا اور انصار کی کچھ دیگر عورتوں کو ساتھ لے جاتے جو مجاہدین کو پانی پلاتیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتیں۔[4]

امام عبدالرزاق امام زہری سے بیان کرتے ہیں کہ عورتیں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جنگ میں شریک ہوتیں اور جنگجوؤں کو پانی پلاتیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔[5]

حضرت ربیع بنت معوذ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ہم (غزوات میں) رسول اللہ ﷺ کے ساتھ

---

1 صحيح البخاري، حديث:2881 و4071. 2 صحيح البخاري، حديث:2880. 3 المغازي للواقدي:249/1. 4 صحيح مسلم، حديث:1810. 5 فتح الباري، شرح الحديث:2880.

ہوتیں اور لوگوں کو پانی پلاتیں، زخمیوں کی مرہم پٹی کرتیں اور جو خوش نصیب شہید ہو جاتے انھیں مدینہ منتقل کرتیں۔[1]

ایک روایت میں ہے: ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جہاد میں شریک ہوتیں، پھر ہم لوگوں کو پانی پلاتیں، ان کی خدمت کرتیں اور زخمیوں اور شہید ہونے والوں کو مدینہ منورہ لے آتیں۔[2]

حضرت ابو حازم فرماتے ہیں کہ میں نے سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کو اس وقت کہتے ہوئے سنا جب ان سے رسول اللہ ﷺ کے زخمی ہونے کا حال پوچھا گیا۔ انھوں نے کہا: ''دیکھو، اللہ کی قسم! میں خوب جانتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کا زخم کون دھو رہا تھا اور کون پانی ڈال رہا تھا۔ اور کون سی دوا لگائی گئی؟'' پھر وہ کہنے لگے: ''آپ ﷺ کی صاحبزادی سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا زخم دھو رہی تھیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ڈھال سے پانی ڈال رہے تھے۔ جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے دیکھا کہ جوں جوں پانی ڈالتے ہیں خون زیادہ ہو رہا ہے تو انھوں نے بوریے کا ایک ٹکڑا لیا اور اس کو جلا کر زخم پر چپکا دیا۔ تو خون اسی وقت رک گیا۔''[3]

اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کا تلوار کے ذریعے دفاع: غزوۂ احد کے موقع پر خواتین میں سے صرف ام عمارہ نُسیبہ بنت کعب مازنیہ رضی اللہ عنہا ہی لڑائی میں شریک ہوئیں۔ حضرت ضمرہ بن سعید اپنی دادی جان کی اس شرکت کا حال خود بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''ام عمارہ رضی اللہ عنہا غزوۂ احد میں شریک ہوئیں اور پانی پلا رہی تھیں۔'' وہ کہتی ہیں: ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ آج نُسیبہ بنت کعب کی کارکردگی کئی ایک مردوں سے بہتر رہی ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ان کا مشاہدہ کیا تھا کہ وہ اپنی کمر پر پٹکا باندھے سخت جنگ لڑ رہی تھیں۔ یہاں تک کہ انھیں تیرہ (13) زخم آئے۔ وہ جب فوت ہوئیں انھیں غسل دینے والوں میں سے میں بھی تھا۔ میں نے ایک ایک زخم گنا تو (مکمل

---

[1] صحيح البخاري، حديث:2882. [2] صحيح البخاري، حديث:2883. [3] صحيح البخاري، حديث:4075.

تیرہ زخم تھے۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ ابن قمۂ کے میرے کندھے پر تلوار مارنے کی صورت اب بھی میری نظروں کے سامنے ہے۔ یہ باقی زخموں کی نسبت گہرا زخم تھا جس کا علاج وہ ایک سال تک کرتی رہیں۔

جب آپ ﷺ نے حمراء الاسد جانے کا اعلان فرمایا تو انھوں نے اپنے کپڑے باندھے لیکن زیادہ خون بہہ جانے کی بنا پر ساتھ نہ جا سکیں۔ ہم رات بھر زخموں کی ٹکور کرتے رہے۔ آپ ﷺ جب غزوۂ حمراء الاسد سے واپس تشریف لائے تو گھر پہنچنے سے پہلے ہی ان کے بھائی حضرت عبداللہ بن کعب مازنی رضی اللہ عنہ کو ان کے متعلق دریافت کرنے کے لیے آپ ﷺ نے بھیجا۔ انھوں نے واپسی پر اپنی بہن سیدہ نسیبہ رضی اللہ عنہا کی صحت و سلامتی کی خبر پہنچائی تو آپ ﷺ اس سے خوش ہو گئے۔''[1]

استاذ حسین باکری حضرت نُسَیبہ بنت کعب رضی اللہ عنہا کے جنگ میں شریک ہونے پر ان الفاظ میں تبصرہ کرتے ہیں کہ مردوں کے ساتھ جنگ میں شریک ہونے کے لیے حضرت نُسَیبہ کے واقعے کے علاوہ کوئی مثال نہیں ملتی۔ ان کا لڑنا بھی اضطراری اور مجبوری کی حالت میں تھا۔ وہ اس طرح کہ جب انھوں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ لوگوں کے ادھر ادھر ہونے کی بنا پر خطرے میں گھر گئے ہیں تو ایسی صورتِ حال میں مرد ہو یا عورت ہر ایک کے لیے اسلحہ اٹھانا ضروری ہو گیا تھا۔[2]

غزوۂ احد کے موقع پر عورتوں کی جنگ میں شرکت کے حوالے سے مروی روایات پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اکرم ضیاء عمری رقمطراز ہیں: ''یہ روایات اس امر کی دلیل ہیں کہ ضرورت و مجبوری کے وقت عورتوں سے مدد لی جا سکتی ہے، مثلاً: زخمیوں کی دیکھ بھال اور ان کی خدمت خاطر کرنا لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ پردے کا مکمل اہتمام ہو اور

---

1 سير أعلام النبلاء: 278/2، والمغازي للواقدي: 270,269/2. 2 مرويات غزوة أحد لحسين أحمد الباكري، ص: 254.

انھیں تحفظ فراہم کیا جائے اور ان کے حوالے سے کسی قسم کے فتنے کا ڈر بھی نہ ہو۔ اسی طرح اگر دشمن ان کے مقابلے میں آجائے تو انھیں دفاع کا مکمل حق ہے۔ یہ بات مسلم ہے کہ جہاد صرف مردوں پر فرض ہے، سوائے اس حالت کے کہ دشمن مسلم علاقوں پر دھاوا بول دے تو ایسی حالت میں مردوزن ہر ایک پر قتال واجب ہوجاتا ہے۔''[1]

استاذ محمد احمد باشمیل کا خیال ہے کہ غزوۂ احد پہلی جنگ تھی جس میں کسی مسلمان عورت نے مشرکوں سے جنگ کی ہو۔ اور یہ بات بھی ثابت شدہ ہے کہ صرف ایک خاتون ہی اس معرکے میں شامل ہوئی تھیں اور وہ بھی رسول اللہ ﷺ کے دفاع کے لیے اور یہ بات بھی واضح ہے کہ جو عورت جنگ میں شریک ہوئی وہ جنگ کی غرض سے نہیں نکلی تھی اور نہ ہی وہ مردوں کی طرح اسلحے سے لیس تھی۔ بلکہ وہ تو صرف یہ مشاہدہ کرنے کے لیے گئی تھیں کہ دیکھیں لوگ کس حالت میں ہیں تاکہ وہ ممکنہ حد تک مسلمانوں کا تعاون کرسکیں، مثلاً: زخمیوں کو پانی پلانا وغیرہ۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رہے کہ جنگ احد میں شریک ہونے والی یہ خاتون ادھیڑ عمر تھیں اور جنگ میں اپنے خاوند اور دو بیٹوں کے ہمراہ روانہ ہوئی تھیں جو اس لشکر کا حصہ تھے جنھوں نے قتال میں حصہ لیا تھا۔

علاوہ ازیں اس صحابیہ کی اخلاقی اور دینی اعتبار سے اعلیٰ تربیت بھی پیشِ نظر رہنی ضروری ہے۔ ان سب اوصاف کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس جلیل القدر صحابیہ پر اس زمانے کی فوجی عورتوں کو قطعاً قیاس نہیں کیا جاسکتا جو جنگی لباس زیب تن کرتی ہیں اور فتنے اور برائی پر برانگیختہ کرنے کا باعث بنتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انھیں ہر دم مردوں کے سامنے اپنے اظہار کی چاہت رہتی ہے۔ کہاں یہ انتہائی پستی اور کہاں وہ انتہائی بلندی۔

چہ نسبت خاک را بہ عالمِ پاک؟

اسی طرح اُس زمانے کے مردوں کی ذکاوت، استقامت، پاکدامنی اور مردانگی پر اس

[1] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 391/2.

زمانے کے مردوں کو بھی قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

جنگ احد میں شریک جملہ جنگجو جن کے ساتھ یہ خاتون شریک جنگ تھیں وہ اس امت کے ایسے منتخب کردہ اشخاص تھے جو امت کی عظمت کی دلیل، خودداری اور وقار کی علامت اور استقامت کے انمٹ نقوش تھے، لہٰذا اس ایک صحابیہ کو مثال بنا کر مطلقاً اس زمانے میں عورت کا فوج میں شراکت کے جواز کا شرعاً قانون نہیں بنایا جاسکتا کہ وہ مرد کے شانہ بشانہ لشکر کا حصہ بن کر جنگ لڑے۔ اس صورت میں یہ قیاس مع الفارق ہے اور قطعی طور پر باطل ہے۔[1]

صحابیات رضی اللہ عنہن کے صبر کی نادر مثالیں

حضرت صفیہ بنت عبد المطلب رضی اللہ عنہا: جب ان کے بھائی حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ جنگِ احد میں شہید ہوگئے تو یہ انھیں دیکھنے کے لیے آگے بڑھیں۔ مشرکوں نے سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کا مثلہ کر دیا تھا۔ ان کی ناک کاٹ دی، بطن پھاڑ دیا، کان الگ کر دیے اور شرمگاہ بھی کاٹ دی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صفیہ رضی اللہ عنہا کے فرزند حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ سے کہا:

«اِلْقَهَا، فَارْجِعْهَا لَا تَرَىٰ مَا بِأَخِيهَا»

''حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے آگے بڑھ کر ملو اور انھیں واپس کر دو۔ جو کچھ ان کے بھائی کے ساتھ ہوا ہے اسے وہ نہ دیکھیں۔''

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنی والدہ صاحبہ سے عرض کیا: ''اماں جان! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو حکم دیتے ہیں کہ آپ واپس چلی جائیں۔'' انھوں نے دریافت کیا: ''ایسا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس بنا پر فرمایا ہے؟ مجھے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ میرے بھائی کا مثلہ کیا گیا ہے اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے راستے میں ہوا ہے جو کچھ بھی ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس پر رضا کی توفیق بخشی ہے۔ اللہ نے چاہا تو میں ضبط اور تحمل سے کام لوں گی اور صبر کا دامن نہیں چھوڑوں

[1] غزوة أحد لأحمد باشميل، ص: 171-173.

گی۔" حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر ساری بات آپ ﷺ کے گوش گزار کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «خَلِّ سَبِيلَهَا» "ان کا راستہ چھوڑ دو۔" حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش کے پاس آئیں۔ ان کی طرف دیکھتی رہیں، ان کے لیے اللہ سے دعا مانگی اور إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ پڑھا اور اللہ سے ان کے لیے بخشش مانگتی رہیں۔[1]

حضرت حمنہ بنت جحش اسدیہ رضی اللہ عنہا: رسول اللہ ﷺ شہداء کی تدفین سے فارغ ہو کر اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے اور اپنے جاں نثار ساتھیوں کے ہمراہ مدینہ منورہ کا رُخ فرمایا۔ راستے میں آپ ﷺ کو حضرت حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا ملیں۔ آپ ﷺ نے ان سے فرمایا:

«يَا حَمْنَةُ! احْتَسِبِي!» "اے حمنہ! اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب کی امید رکھو۔"

انھوں نے عرض کی: "کس کے متعلق؟"

فرمایا: «أَخَاكِ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ جَحْشٍ» "اپنے بھائی عبداللہ بن جحش کے بارے میں۔"

حمنہ رضی اللہ عنہا نے إِنَّا لِلّٰهِ وَ إِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ پڑھا اور دعائے مغفرت کی۔

آپ ﷺ نے انھی سے پھر فرمایا: «يَا حَمْنَةُ! احْتَسِبِي!» "حمنہ! اجر و ثواب کی امید رکھو۔"

وہ عرض کرنے لگیں: اے اللہ کے رسول! "کس کے متعلق؟"

فرمایا: «خَالُكِ حَمْزَةُ بْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ» "اپنے ماموں حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کے متعلق۔"

کہنے لگیں: إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔ اللہ تعالیٰ انھیں معاف فرمائے۔ انھیں شہادت مبارک ہو۔

آپ ﷺ تیسری بار گویا ہوئے: «يَا حَمْنَةُ! احْتَسِبِي» "اے حمنہ! اجر و ثواب کی

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 108/3.

امید رکھو۔“ عرض کی: ”کس کے بارے میں اے اللہ کے رسول؟“

فرمایا: «زَوْجُكِ مُصْعَبُ بْنُ عُمَيْرٍ» ”اپنے خاوند مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے بارے میں۔“

اب انھوں نے انتہائی غم کا اظہار کیا، چیخنے لگیں اور آہ و بکا کرنے لگیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ زَوْجَ الْمَرْأَةِ مِنْهَا لَبِمَكَانٍ» ”عورت کے نزدیک اس کا شوہر ایک خصوصی درجہ رکھتا ہے۔“

کیونکہ آپ ﷺ نے دیکھا کہ حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا اپنے بھائی اور ماموں کی شہادت کی اطلاع پر تو صبر وثبات کا پیکر بنی رہیں مگر اپنے خاوند کی شہادت کی اطلاع پر بلند آواز سے رونے لگیں۔ بعدازاں آپ ﷺ نے حمنہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟

عرض کی: ”اے اللہ کے رسول! مجھے ان کے بیٹوں کی یتیمی یاد آئی تو مجھے بہت غم لگا۔“

یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے ان کے لیے اور ان کی اولاد کے لیے بہتر بدل کی دعا فرمائی۔[1]

بعد ازاں حضرت حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا نے طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ سے شادی کر لی۔ ان سے محمد اور عمران پیدا ہوئے۔ یہی طلحہ بن عبید اللہ ان کی سابقہ اولاد سے انتہائی صلہ رحمی سے پیش آتے تھے۔[2]

بنو دینار سے تعلق رکھنے والی صحابیہ کا واقعہ: حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بنو دینار کی ایک عورت کے پاس سے گزرے۔ ان کے شوہر، بھائی اور والد جنگ احد میں آپ ﷺ کی رفاقت میں شہید ہو چکے تھے۔ انھیں ان تینوں کی شہادت کی خبر سنائی گئی تو انھوں نے پوچھا: ”یہ تو بتاؤ رسول اللہ ﷺ کا کیا حال ہے؟“

---

1 سنن ابن ماجه، حديث: 1590، علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ وتاريخ الطبري: 532/2، و البداية والنهاية: 47/4، والسيرة النبوية لابن هشام: 104/3، ودلائل النبوة للبيهقي: 301/3، وغزوة أحد لمحمد عيظة بن سعيد، ص: 236. 2 الإصابة: 88/8، وغزوة أحد لأبي فارس، ص: 109.

جواب دیا گیا: ''اے ام فلاں! آپ ﷺ اللہ کے فضل سے خیریت سے ہیں۔ جیسا کہ آپ کی آرزو ہے۔'' خاتون کہنے لگیں: ''رسول اللہ ﷺ کہاں ہیں؟ ذرا میں اپنی آنکھوں سے آپ ﷺ کا دیدار کرلوں۔'' چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی طرف اشارہ کر کے انھیں بتا دیا گیا۔ انھوں نے چہرۂ انور دیکھا تو پکار اٹھیں:

«كُلُّ مُصِيبَةٍ بَعْدَكَ جَلَلٌ» ''آپ کے ہوتے ہوئے ہر مصیبت ہیچ ہے۔''[1]

اہل اسلام کے دلوں میں ایمان ایسے ہی اثرات چھوڑتا ہے۔

ام سعد بن معاذ سیدہ کبشہ بنت عبید خزرجیہ رضی اللہ عنہا: حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی والدہ رسول اللہ ﷺ کی طرف دوڑتی ہوئی آئیں۔ اس وقت آپ ﷺ گھوڑے پر سوار تھے جس کی لگام حضرت سعد رضی اللہ عنہ تھامے ہوئے تھے۔ حضرت سعد عرض کرنے لگے: ''اے اللہ کے رسول! میری والدہ ہیں۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: «مَرْحَبًا بِهَا» ''انھیں مرحبا ہو۔''

وہ قریب آئیں، آپ ﷺ کو غور سے دیکھا اور کہنے لگیں:

«أَمَّا إِذْ رَأَيْتُكَ سَالِمًا فَقَدْ أَشْوَتِ الْمُصِيبَةُ»

''جب آپ کو سلامت دیکھ لیا تو میرے لیے ہر مصیبت کمتر ہے۔''

آپ ﷺ نے ان کے بیٹے عمرو بن معاذ رضی اللہ عنہ کی شہادت پر تعزیت کے کلمات ادا فرماتے ہوئے صبر کی تلقین کی۔ بعدازاں آپ ﷺ نے فرمایا:

«يَا أُمَّ سَعْدٍ! أَبْشِرِي وَبَشِّرِي أَهْلِيهِمْ، أَنَّ قَتْلَاهُمْ قَدْ تَرَافَقُوا فِي الْجَنَّةِ جَمِيعًا۔ وَهُمُ اثْنَا عَشَرَ رَجُلًا۔ وَقَدْ شُفِّعُوا فِي أَهْلِيهِمْ»

''اے ام سعد! تم خوش ہوجاؤ اور شہداء کے گھر والوں کو خوشخبری سنا دو کہ ان کے

[1] دلائل النبوة للبيهقي: 302/2، والبداية والنهاية: 48/4، والسيرة النبوية لابن هشام: 105/3، والمغازي للواقدي: 292/1، وتاريخ الطبري: 533/2.

شہداء سب کے سب جنت میں ہیں۔ وہ بارہ آدمی تھے۔ اور اپنے گھر والوں کے بارے میں ان کی شفاعت قبول کر لی گئی ہے۔''

ام سعد کہنے لگیں: ''اے اللہ کے رسول! ہم راضی ہیں۔ اس عظیم خوشخبری کے بعد ان پر کون روئے گا؟''

پھر عرض کی: ''اے اللہ کے رسول! پسماندگان کے لیے بھی دعا فرمایئے۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: «اَللّٰهُمَّ اذْهَبْ حُزْنَ قُلُوبِهِمْ وَاجْبُرْ مُصِيبَتَهُمْ وَ أَحْسِنِ الْخَلَفَ عَلٰى مَنْ خُلِّفُوا» ''اے اللہ! ان کے دلوں کا غم دور فرما، ان کی مصیبت کی تلافی فرما اور پسماندگان کو بہترین بدل سے نواز دے۔''[1]

[1] المغازي للواقدي:1/316,315.

باب 5

غزوۂ احد سے متعلق بعض حکمتیں، عبرتیں اور فوائد

قرآن پاک نے اس معرکے کے ایک ایک پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ غزوۂ احد کے متعلق روایات کی نسبت قرآنی تعبیر ووضاحت بہت دقیق انداز سے کی گئی ہے۔ قرآن پاک کی ان اطمینان بخش، خوش کن، ملامت آمیز، باعث تسکین اور وعظ ونصیحت سے بھرپور آیات کا اسلوب انتہائی عمدہ اور قوی ہے۔ قرآن مجید نے لشکر نبوی کے دلی خیالات کی ترجمانی کی ہے۔ غزوۂ احد کے بیان میں قرآن مجید کا یہ وہ یگانہ اسلوب ہے جس سے کتب سیرت خالی ہیں۔ قرآن کریم نے دلوں میں پوشیدہ ایسے رازوں پر روشنی ڈالی ہے جو بسا اوقات انسان کے تحت الشعور میں چلے جانے کی بنا پر ذہن سے اتر جاتے ہیں۔ قرآن مجید میں غور وفکر کرنے والا اس میں بیان کردہ غزوۂ احد پر تبصرہ پڑھ کر لطافت، گہرائی اور ہمہ جہتی محسوس کرتا ہے۔

سید قطب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”غزوۂ احد کے بیان میں ہر ایک کے طرز عمل کا اظہار، ہر ایک نقل وحرکت کی اطلاع اور ہر ایک اندیشے اور کھٹکے کی خبر ہے اور اس میں ایسی گہرائی ہے جو دل میں جاگزیں ہو جاتی ہے اور اس میں دل میں چھپے خیالات، پنپنے والے احساسات اور دل پر وارد ہونے والے تصورات کا احاطہ ہے۔ ہم اس منظر کشی میں زندگی کو جلا بخشنے والی قوت، اثر انگیزی اور موزونیت محسوس کرتے ہیں جیسا کہ احساسات کے ساتھ ساتھ ان کی تعبیر اور عکاسی انتہائی حساسیت اور گہرائی سے برابر چل رہی ہے۔ آپ لمبے لمبے

کی اس عکاسی، تعبیر اور تبصرے کو دیکھ کر قطعاً بے حرکت و ساکت نہیں رہ سکتے کیونکہ یہ ایک زندہ تعبیر ہے۔ عین جنگ کے لمحہ بہ لمحہ حالات و واقعات پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اب وقوع پذیر ہو رہی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے آس پاس اثر آفریں سرگرمیاں، بڑی تیز روشنی اور پر اثر الہامات بھی پھیلتے رہتے ہیں۔'' [1]

امت کی تربیت کے لیے رسول اللہ ﷺ کی سرگرمیاں، اسلامی حکومت کا قیام، اللہ تعالیٰ کے دین کو سربلند کرنے کے اقدامات یہ سب کچھ دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دنیاوی زندگی کے قیام و انصرام کے لیے قرآن پاک کے مفاہیم کا وہ عکس ہے جو آپ ﷺ کے احساسات، افکار اور شعور پر مکمل طور پر حاوی ہو چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جنگ احد میں ہونے والی شکست کا اثر زائل کرنے کے لیے قرآن کریم کے منہج کی پیروی کر رہے ہیں۔ اس قرآنی منہج کے متعلق بعض امور و نکات پر ہم روشنی ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں:

غزوۂ احد کے متعلق نازل شدہ آیات کا اسلوب بیان

ان آیات میں سابقہ انبیائے کرام کے پیروکاروں کے حالات کی یاددہانی اور مومنوں کو ایمان کی طرف دعوت دی گئی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عٰقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ○ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ○ وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○﴾

''تم سے پہلے بھی ایسے واقعات گزر چکے ہیں، چنانچہ تم زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ (نبیوں کو) جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا؟ یہ (قرآن) لوگوں کے لیے وضاحت اور پرہیزگاروں کے لیے ہدایت اور نصیحت ہے۔ اور تم سستی نہ کرو اور

[1] تفسیر في ظلال القرآن لسید قطب: 532/1.

نہ غم کھاؤ، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔"[1]

ان آیات مبارکہ پر غور کرنے والا یہ بات ضرور پائے گا کہ غزوۂ احد کے امتحان میں شریک ہونے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے شیطانی وسوسوں کی کوئی جگہ نہیں چھوڑی بلکہ ان آیات میں انھیں اس انداز سے مخاطب فرمایا، جس سے ان کے دلوں میں امید کی کرن پھوٹی اور انھیں ثابت قدم اور پختہ عزم رہنے کی رہنمائی میسر آئی۔ اور اس رہنمائی سے ان کی اشک شوئی کی اور ان کے غم ہلکے کر دیے۔[2]

امام قرطبی کا بیان ہے کہ ان آیاتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے مومنوں کو تسلی دی گئی ہے۔[3]

سابقہ آیات میں گزشتہ اقوام کے انجام کے متعلق غور وفکر کی دعوت ہے۔ وہ اقوام جنھوں نے اللہ تعالیٰ کی دعوت کو جھٹلایا اور اس کی نافرمانی کی تو ان کے ظلم اور کفر کی پاداش میں اللہ تعالیٰ کا قانونِ فطرت ان میں کیسے جاری ہوا اور انھیں تہس نہس کر کے رکھ دیا۔

قرآن مجید میں یہاں ﴿ كَيْفَ ﴾ کا لفظ آیا ہے جو استفہام کے لیے مستعمل ہے۔ اس سے جھٹلانے والی قوموں کی حالت کی تصویر کشی کرنا مقصود ہے۔ ان کی یہ حالت حیرت اور تعجب کا باعث بھی ہے اور مومنوں کے لیے عبرت و موعظت کا سامان بھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان جھٹلانے والوں کو اللہ تعالیٰ نے زمین پر جگہ و قدرت عنایت فرمائی، بہت سی نعمتوں سے نوازا مگر انھوں نے ان کی قدر نہ کی تو اللہ تعالیٰ نے انھیں اس سرکشی اور طغیانی کی بنا پر ہلاک کر دیا۔[4]

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴾

---

1 آل عمرٰن 3:137-139. 2 حديث القرآن الكريم عن غزوات الرسول ﷺ لأبي بدر محمد بكر آل عابد: 190/1. 3 تفسير القرطبي: 216/4. 4 حديث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ لأبي بدر محمد بكر آل عابد: 191/1.

''اور تم سستی نہ کرو اور نہ غم کھاؤ، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔''[1]

اس فرمان میں مسلمانوں کو سستی دور کرنے، بزدلی سے نفرت کرنے، کمزوری سے کنارہ کشی اختیار کرنے اور غم نہ کرنے کی تلقین فرمائی ہے کیونکہ اپنے ایمان کے سبب وہی غالب ہونے والے ہیں۔

مومنوں کو تسلی اور جنگ میں پیدا ہونے والے ناگہانی حالات کی حکمت: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ۚ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ○ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ○ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ○ وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ○﴾

''اگر تمھیں (احد میں) زخم لگے ہیں تو ایسے ہی زخم (بدر میں) کافروں کو بھی لگ چکے ہیں۔ ہم ان دنوں کو لوگوں کے درمیان ادل بدل کرتے رہتے ہیں۔ اور (تمھیں یہ زخم اس لیے لگے کہ) اللہ جاننا چاہتا تھا کہ کون ایمان والے ہیں؟ اور وہ تم میں سے بعض کو شہادت کا مرتبہ دینا چاہتا تھا اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اور (ایک وجہ یہ تھی کہ) اللہ ایمان والوں کو پاک صاف کر دینا اور کافروں کو مٹا دینا چاہتا تھا۔ کیا تم یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ تم (سیدھے) جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون لوگ اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور صبر کرنے والے ہیں۔ تحقیق تم جنگ سے پہلے ہی (شہادت کی) موت کی خواہش کرتے تھے، چنانچہ پس اب تم نے اسے اپنی آنکھوں سے

[1] آل عمرٰن 3:139۔

اپنے سامنے دیکھ لیا ہے۔"[1]

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمادیا ہے کہ شہادتوں اور آنے والے زخموں کو دشمن کے خلاف جہاد کی کوششوں میں اثر انداز نہیں ہونا چاہیے۔ وہ اس لیے کہ جس طرح انھیں زخم پہنچے ہیں دشمن کو بھی تو اسی طرح پہلے سے زخم پہنچ چکے ہیں، لہٰذا اگر وہ اپنی گمراہی اور برے انجام کے باوجود جنگ سے کنارہ کش نہیں ہوئے تو تم حق پر قائم ہونے اور بہتر انجام کی امید رکھتے ہوئے جنگ سے پیچھے نہ ہٹنے یا جنگ میں سستی کا مظاہرہ نہ کرنے کے زیادہ حقدار ہو۔[2]

صاحبِ "کشاف" امام زمخشری رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ آیت مبارکہ کا مفہوم یہ ہے کہ اگر انھوں نے احد کے دن تمھیں نقصان پہنچایا ہے تو تم نے بھی اس سے پہلے بدر کے دن انھیں نقصان پہنچایا تھا۔ بدر کے دن پہنچنے والے نقصان نے ان کے دلوں کو نہ کمزور کیا اور نہ ہی تمھارے ساتھ جنگ میں دو دو ہاتھ کرنے سے روکا ہے، لہٰذا تم تو کمزوری نہ دکھانے کے زیادہ حقدار ہو۔[3]

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: "احد کا دن بدر کے دن کا بدلہ تھا۔ احد کے دن کئی مومن شہید ہوئے جنھیں اللہ تعالیٰ نے شہادت کے لیے چن لیا اور بدر کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشرکوں پر غالب آئے تھے۔ اور مشرکوں کو زیر کرلیا تھا۔"[4]

اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿إِنْ يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ ......﴾ کا جوابِ شرط محذوف ہے، عبارت اس طرح ہے: «إِنْ يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَاصْبِرُوا عَلَيْهِ وَاعْقِدُوا عَزْمَكُمْ عَلٰى قِتَالِ أَعْدَائِكُمْ، فَقَدْ مَسَّهُمْ قَرْحٌ مِّثْلُهُ قَبْلَ ذَالِكَ» "اگر تمھیں زخم آیا ہے تو اس پر صبر کرو۔ اور دشمن کے خلاف جنگ کے لیے پختہ عزم رہو۔ انھیں بھی تو اس سے پہلے ایسا ہی زخم پہنچ چکا ہے۔"

1 آل عمرٰن 3:140-143. 2 تفسير الرازي: 14/9. 3 تفسير الكشاف: 465/1. 4 تفسير الرازي: 105/4.

جنگ احد میں مسلمانوں کو پہنچنے والا دکھ زمانۂ حال کے قریب ہی تھا، اس کی بنا پر فعل مضارع ﴿يَمْسَسْكُمْ﴾ سے تعبیر کیا گیا ہے اور مشرکوں کو چونکہ بدر میں شکست ہوئی تھی اور اسے سال سے اوپر عرصہ گزر چکا تھا، لہٰذا اسے فعل ماضی ﴿مَسَّ﴾ سے تعبیر فرمایا گیا۔

اور ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ﴾ دنیا میں اللہ تعالیٰ کے جاری و ساری قانون کی وضاحت ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ احد میں مومنوں کو پہنچنے والے دکھ پر تسلی بھی دی گئی ہے۔[1]

اور ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا﴾ کے مفہوم کو امام قرطبی یوں بیان کرتے ہیں: ''یہ حالات کا الٹ پھیر مومن کو منافق سے ممتاز کر کے واضح کرنے کے لیے تھا۔''[2]

اور ارشاد ربانی: ﴿وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَاءَ﴾ کے متعلق امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل کیے جاتے ہیں اور اس کی خوشنودی کے لیے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کرتے ہیں۔[3]

پھر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آیت مبارکہ کو ان الفاظ پر ختم فرمایا: ﴿وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ﴾ ''اور اللہ تعالیٰ ظالموں سے محبت نہیں کرتا۔''

بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے جنگ احد میں وقوع پذیر ہونے والی مومنوں سے متعلقہ دو حکمتوں کا تذکرہ فرمایا ہے، چنانچہ ارشاد ہے: ﴿وَلِيُمَحِّصَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَمْحَقَ الْكَافِرِينَ﴾ اس آیت میں لفظ: ﴿لِيُمَحِّصَ﴾ کو المحص سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں: ''پاک صاف کرنا، چن لینا۔'' یا پھر یہ لفظ تمحیص بمعنی آزمانا اور امتحان لینا سے ہے۔ ﴿يَمْحَقَ﴾ المحق سے ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی چیز کو مٹانا اور ختم کر دینا۔

1 حديث القرآن الكريم عن غزوات الرسول ﷺ لأبي بدر محمد بكر آل عابد: 195/1. 2 تفسير القرطبي: 218/4. 3 تفسير ابن كثير: 408/1.

امام طبری رحمہ اللہ نے اس کے معنی یہ ذکر کیے ہیں: ''تاکہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے مخلصانہ تعلق رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کا امتحان لے، چنانچہ مشرکین کو ان پر غالب کر کے اللہ تعالیٰ نے ان کی آزمائش کی تاکہ مخلص اور صحیح معنوں میں ایمان لانے والے مومن منافقوں سے واضح ہو جائیں۔''[1]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''ارشاد ربانی: ﴿وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ سے مراد یہ ہے کہ اگر مومنوں کے گناہ ہیں تو انھیں مٹا دے بصورت دیگر انھیں جتنا دکھ پہنچا اس قدر ان کے درجات بلند کر دے۔ اور ارشاد ربانی: ﴿وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جب کفار فتح یاب ہوتے ہیں تو سرکشی اور تکبر پر اتر آتے ہیں اور ان کا یہی کردار ان کے نیست و نابود ہونے، ہلاکت سے دوچار ہونے اور تباہ و برباد ہونے کا سبب بن جاتا ہے۔''[2]

اس کا مفہوم یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے غزوۂ احد میں جو کیا وہ مومنوں کو گناہوں سے پاک صاف کرنے کے لیے کیا۔ اور اس میں یہ بھی حکمت تھی کہ وہ منافق جو مومنوں میں گھس چکے ہیں اللہ تعالیٰ انھیں نکال باہر کرے۔ اسی طرح اس میں یہ حکمت بھی شامل تھی کہ کافروں کو ان کے تکبر و غرور اور بغاوت کی بنا پر ہلاک کر دے۔

غزوۂ احد میں اہل ایمان جن حالات سے دوچار ہوئے اللہ تعالیٰ نے اس کی چار حکمتیں ذکر فرمائی ہیں، جو درج ذیل ہیں:

① اس معاملے کا مشاہداتی طور پر اللہ کے علم میں آجانا اور مومنوں کے سامنے اس کا اظہار۔

② بعض سعادت مندوں کو شہادت سے سرفراز کرنا۔ شہادت شہید ہونے والے کو بلند ترین مقام تک پہنچا دیتی ہے۔

③ مومنوں کی تطہیر اور گناہوں سے صفائی اور منافقوں کو ان سے الگ کرنا۔

④ کفار کو مٹانا اور آہستہ آہستہ ان کی بیخ کنی کرنا۔[3]

---

1 تفسير الطبري: 107/4. 2 تفسير ابن كثير: 408/1. 3 حديث القرآن الكريم عن غزوات الرسول ﷺ لأبي بدر محمد بكر آل عابد: 199/1.

بعد ازاں فرمایا:

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ○﴾

”کیا تم یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ تم (سیدھے) جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون لوگ اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور صبر کرنے والے ہیں۔“[1]

اس کے معنی یہ ہیں کہ جنگ احد میں پسپا ہونے والو! کیا تمھارا خیال ہے کہ تم بھی اس جنگ میں زخم کی تکلیف برداشت کر کے شہید ہونے والوں کی طرح جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ تم نے نہ ان کا راستہ اپنایا نہ ان جیسا عظیم صبر کیا؟ ایسا ہرگز نہ ہوگا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ شہادت پر فائز ہونے والوں کو ظاہر کر دے تاکہ اس پر جزا مل سکے اور وہ صبر کرنے والوں کو واضح فرما دے۔[2]

ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ تمھیں اس وقت تک جنت نہیں مل سکتی جب تک تمھاری آزمائش نہ ہو جائے اور جب تک اللہ تعالیٰ تم میں سے اپنی راہ میں جہاد کرنے والوں کو ظاہر نہ کر دے اور انھیں بھی واضح نہ کر دے جو صبر وثبات کا پیکر بن کر دشمن کے مقابلے میں ڈٹ جاتے ہیں۔[3]

پھر ارشاد فرمایا:

﴿وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ○﴾

”تحقیق تم جنگ سے پہلے ہی (شہادت کی) موت کی خواہش کرتے تھے، چنانچہ پس اب تم نے اسے اپنی آنکھوں سے اپنے سامنے دیکھ لیا ہے۔“[4]

[1] آل عمرٰن 3:142. [2] تفسیر القرطبی: 4/220. [3] تفسیر ابن کثیر: 1/409. [4] آل عمرٰن 3:143.

امام ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''اس کا مفہوم یہ ہے کہ اے مسلمانو! تم آج سے پہلے دشمن سے ملاقات کی آرزو رکھتے تھے اور اس کے لیے بیتاب تھے اور چاہتے تھے کہ کفار کے سامنے اپنی بہادری کا مظاہرہ کرو اور ان کے مقابلے میں ڈٹ جاؤ۔ لو اب تمھاری چاہت کے مطابق تمھاری آرزو بر آئی ہے، لہٰذا تم اب جنگ کرو اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کرو۔''[1]

کمزوریوں کا مداوا: جنگ احد کے موقع پر مسلمان جن حالات سے دوچار ہوئے قرآن کریم نے اس پر غزوۂ بدر کے برعکس بڑا نرم لہجہ اختیار فرمایا ہے۔ بدر کے قیدیوں کے متعلق آراء میں کمی بیشی پر محاسبہ غزوۂ احد میں شکست خوردہ ہونے پر محاسبے کی نسبت سخت تھا، چنانچہ غزوۂ بدر میں قیدیوں سے فدیہ لینے کے فیصلے کے متعلق فرمایا:

﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَى حَتَّى يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ○ لَوْلَا كِتَابٌ مِنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ○﴾

''کسی نبی کے لائق نہیں کہ اس کے پاس قیدی ہوں یہاں تک کہ وہ زمین میں خوب خون ریزی (انھیں قتل) کرے۔ (مسلمانو!) تم سامان دنیا چاہتے ہو اور اللہ (تمھاری) آخرت چاہتا ہے اور اللہ زبردست، خوب حکمت والا ہے۔ اگر اللہ کی طرف سے پہلے ہی (ایک بات) لکھی ہوئی نہ ہوتی تو تم نے (بدر کے قیدیوں سے) جو (فدیہ) لیا اس کے بدلے تمھیں بڑا عذاب آ پکڑتا۔''[2]

اور جنگ احد اور اس میں شکست کے متعلق فرمایا:

﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللَّهُ وَعْدَهُ إِذْ تَحُسُّونَهُمْ بِإِذْنِهِ حَتَّى إِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا أَرَاكُمْ مَا تُحِبُّونَ مِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ ○﴾

[1] تفسیر ابن کثیر: 409/1. [2] الأنفال 8:67,68.

''یقیناً اللہ نے تم سے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا جب تم (احد میں) اس کے حکم سے کافروں کو قتل کر رہے تھے، یہاں تک کہ جب تم نے کم ہمتی اختیار کی اور اپنی ذمہ داری کے بارے میں جھگڑنے لگے اور جونہی اللہ نے تمھیں وہ چیز (مال غنیمت کی جھلک) دکھائی جس سے تم محبت کرتے تھے تو تم نے نافرمانی کی، (اس لیے کہ) تم میں سے کچھ لوگ دنیا کو چاہتے تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے، پھر اللہ نے تمھیں کافروں کے مقابلے میں پسپا کر دیا تا کہ تمھاری آزمائش کرے۔ بلا شبہ (پھر بھی) اس نے تمھیں معاف کر دیا۔ اور اللہ مومنوں پر فضل کرنے والا ہے۔''[1]

سابقہ قوموں کے مجاہدین کا بطور مثال تذکرہ: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ○ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ○ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ○﴾

''اور کتنے ہی نبی گزرے جن کے ساتھ مل کر بہت سے اللہ والوں نے جہاد کیا، انھیں اللہ کی راہ میں جو تکلیفیں پہنچیں انھوں نے ہمت نہ ہاری اور نہ کمزوری دکھائی اور نہ وہ (کافروں سے) دبے اور اللہ صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اور ان کا کہنا یہی تھا کہ اے ہمارے رب! ہمارے گناہ بخش دے اور ہمارے کاموں میں ہم سے جو زیادتیاں ہوئیں وہ معاف کر دے۔ اور ہمیں ثابت قدم رکھ اور کافر قوم کے مقابلے میں ہماری مدد فرما، چنانچہ اللہ نے انھیں دنیا میں ثواب دیا اور آخرت میں بہت اچھا ثواب دیا۔ اور اللہ نیکو کاروں کو پسند کرتا ہے۔''[2]

[1] آل عمرٰن 3:152. [2] آل عمرٰن 3:146-148.

امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے ان آیات اور سابقہ آیات میں جنگ احد میں پسپائی اختیار کرنے والوں کو ڈانٹ پلائی ہے جنھوں نے چلّانے والے (شیطان) کی اس چیخ پر کہ محمد (ﷺ) قتل ہو چکے ہیں جنگ چھوڑی تھی۔ ان کے راہِ فرار اختیار کرنے اور جنگ چھوڑنے پر اللہ تعالیٰ نے انھیں (سخت) ملامت فرمائی۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے ان کے سامنے گزشتہ امتوں میں سے ان کے مجاہد بھائیوں کی مثال بیان فرمائی ہے کہ وہ جہاد فی سبیل اللہ میں اپنے انبیاء کے نقشِ قدم پر چلتے رہے اور اس راہ میں انھیں جو بھی مشکلات آئیں وہ ان پر کبھی کمزور دکھائی نہ دیے، نہ زخم آنے پر انھوں نے جہاد سے منہ موڑا اور نہ ہی دشمن کے سامنے جھکے بلکہ جہادی راہوں میں ثابت قدم رہے۔

مذکورہ آیات میں پسِ پردہ ان مومنوں کی جانب اشارہ ہے جنھیں رسول اللہ ﷺ کے قتل کی جھوٹی افواہ سن کر بزدلی اور کمزوری لاحق ہوگئی تھی۔ نتیجتاً انھوں نے مشرکوں سے جہاد میں کمزوری، سستی اور کوتاہی کا اظہار کیا، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے سابقہ ادوار میں ہوگزرنے والے اہل اللہ کی اس موقع پر گفتگو نقل فرمائی ہے تاکہ مسلمان ان سے اور ان کے حسب ذیل قول سے ثابت قدمی کا درس لیں، ارشاد ہوا:

﴿وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّآ أَنْ قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِيٓ أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِينَ۝﴾

''اور ان کا کہنا یہی تھا کہ اے ہمارے رب! ہمارے گناہ بخش دے اور ہمارے کاموں میں ہم سے جو زیادتیاں ہوئیں وہ معاف کردے۔ اور ہمیں ثابت قدم رکھ اور کافر قوم کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔''[2]

سابقہ قوموں کے مجاہدین نے گناہوں اور زیادتیوں کی نسبت اپنی طرف کی ہے باوجود اس کے کہ وہ حزب اللہ تھے، یہ اپنے نفس کو کچل دینے کے مترادف ہے اور اپنی کمی کوتاہی کا

1 تفسیر ابن کثیر: 410/1. 2 آل عمرٰن 3:147.

اعتراف بھی ہے۔ اور اسی طرح ان کی طرف سے دشمن کے مقابلے میں ثابت قدمی کی درخواست سے قبل گناہوں کی بخشش کی دعا اس لیے ہے تاکہ اپنے رب سے نصرت کی طلب خشوع وخضوع کے ساتھ اور گناہوں سے پاک صاف ہوکر کی جائے۔ اس میں مسلمانوں کو یہ سمجھانا بھی مقصود ہے کہ عجز وانکسار، استغفار اور توبہ کا ہونا ازحد ضروری ہے۔ اس کی اہمیت دشمن کے خلاف مدد فراہم کرنے سے اور بھی واضح ہوجاتی ہے، جیسا کہ ارشاد باری ہے:

﴿فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝﴾

''چنانچہ اللہ نے انھیں دنیا میں ثواب دیا اور آخرت میں بہت اچھا ثواب دیا۔ اور اللہ نیکوکاروں کو پسند کرتا ہے۔''[1]

یعنی اس کی بنا پر انھوں نے دونوں جہانوں کا ثواب پالیا۔ دنیا میں غنیمت اور مدد و نصرت اور آخرت میں بہتر ثواب۔ یہ انعامات اللہ سے دعا میں خلوص اور بھرپور توجہ کے ساتھ ساتھ راہ جہاد میں مخلصانہ کاوشوں کے نتیجے کے طور پر حاصل ہوئے، مزید برآں وہ مثال بھی بن گئے جسے اللہ تعالیٰ بطور نمونہ مسلمان مجاہدین کے لیے بیان بھی فرما رہا ہے۔ آخرت کے بدلے کے ساتھ خاص طور پر اللہ تعالیٰ نے لفظ ﴿حُسْنَ﴾ کا اضافہ فرمایا ہے جو دنیا کے بدلے سے عمدہ، بہتر اور مقدم ہونے کی دلیل ہے۔ اور اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اصل بدلہ وہی ہے۔[2]

امیر کی مخالفت لشکر کی شکست کا سبب بنتی ہے: تیر اندازوں کی طرف سے نبی ﷺ کی حکم عدولی اور اس فحش غلطی کے ارتکاب نے جنگ کا پانسہ ہی بدل دیا اور یہ چیز مسلمانوں کے لیے بہت بڑے خسارے کا باعث بن گئی۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ امیر کی مخالفت لشکر کی شکست کا باعث بن جایا کرتی ہے۔

[1] آل عمرٰن148:3. [2] المستفاد من قصص القرآن لعبد الكريم زيدان:204/2.

ہم حاکم کی اطاعت کی مزید اہمیت کا مشاہدہ اس سے بھی کر سکتے ہیں کہ عبد اللہ بن ابی اور دیگر منافقین کا عین جنگ کے موقع پر ساتھ چھوڑ جانا مسلمانوں پر اثر انداز نہیں ہوا لیکن جب ان تیر اندازوں نے نبی ﷺ کی حکم عدولی کی جنھیں آپ ﷺ نے بڑی مناسب جگہ دے کر اہم ذمہ داری سونپی تھی تو اس کا نقصان تمام مسلمانوں کو اٹھانا پڑا۔ وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دشمن کو ان پر مسلط کر دیا۔ سارا معاملہ ہی الٹ پلٹ ہو گیا۔ لشکر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا اور قریب تھا کہ اسلام کی دعوت اپنے آغاز ہی میں دم توڑ جاتی۔

غزوۂ احد کے حالات سے بخوبی اندازہ ہو رہا ہے کہ جب تک تیر انداز رسول اللہ ﷺ کے فرامین اور اپنے امیر حضرت عبد اللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کے حکم پر کاربند رہے تو وہ فتح یاب تھے مگر جس وقت رسول اللہ ﷺ کے حکم کی پروا نہ کرتے ہوئے تیر انداز دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ مل کر مال غنیمت سمیٹنے کے لیے گھاٹی سے نیچے اتر آئے تو شکست سے دوچار ہو گئے۔[1]

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰۤى اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْۤ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَاۤ اَصَابَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝﴾

”جب تم بھاگے چلے جا رہے تھے اور کسی کی طرف پلٹ کر نہ دیکھتے تھے اور رسول (ﷺ) تمھارے پیچھے سے تمھیں آوازیں دے رہے تھے، پھر اللہ نے تمھیں غم پر غم دیے تاکہ تمھیں یہ سبق ملے کہ جو کچھ تمھارے ہاتھ سے جائے یا جو مصیبت تم پر نازل ہو اس پر تمھیں غمگین نہیں ہونا چاہیے اور تم جو عمل کرتے ہو اللہ اس کی خبر رکھتا ہے۔“[2]

[1] غزوة أحد لمحمد عيظة بن سعيد، ص:207-209. [2] آل عمرٰن 3:153.

حکم عدولی کے نتائج بھی برے ہی برآمد ہوتے ہیں جیسا کہ جنگ احد کے موقع پر چند ایک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کا نتیجہ نکلا، جبکہ وہ اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے جہاد میں مشغول تھے۔ اسی سبب کی طرف اللہ تعالیٰ اشارہ فرما رہے ہیں جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿وَعَصَيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ .....﴾

''اور جونہی اللہ نے تمھیں وہ چیز (مال غنیمت کی جھلک) دکھائی جس سے تم محبت کرتے تھے تو تم نے نافرمانی کی ......۔''[1]

یہ ایک غلطی تھی جس کی وجہ سے وہ فتح جس کے مبادیات و آثار سامنے آچکے تھے، شکست میں بدل گئی۔ یہ تو صرف ایک کوتاہی تھی، جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس وہاں موجود تھے، اسی سے اندازہ لگایئے کہ ایک نہیں بلکہ لاتعداد گناہوں کا ارتکاب ہو رہا ہو تو نتائج کیا ہوں گے؟ اس لیے تو ہم کہتے ہیں کہ یہ گناہوں کا نتیجہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض ظالموں کو بعض دیگر پر ان کے اعمال کی وجہ سے مسلط کر دیتے ہیں۔ اور ان پر جس قدر ظلم و زیادتی ہوتی ہے، اس قدر نصرت و غلبہ اور عزت و وقار دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔[2]

حکمرانوں کی اطاعت: حکمرانوں کی اطاعت ایک اہم فریضہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے بعد اس کا شمار ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ؀﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں، پھر اگر تم باہم کسی چیز میں اختلاف

1 آل عمرٰن 3:152۔ 2 غزوة أحد لمحمد عيظة بن سعيد، ص:211۔

کرو تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو، اگر تم واقعی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے بہت اچھا ہے۔''[1]

علماء کا کہنا ہے کہ یہ آیت مبارکہ رعایا کے بارے میں نازل ہوئی ہے، خواہ ان کا تعلق فوج سے ہو یا وہ سویلین ہوں۔ ان پر لازم ہے کہ وہ تقسیم کے معاملات میں، فیصلوں میں اور جنگی معاملات کے ساتھ ساتھ تمام معاملات میں اپنے حکام کی فرماں برداری کریں۔ وہ حکام جو یہ فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔[2]

یقیناً حکام کی اطاعت ہمارے دینی فرائض میں سے ایک اہم فریضہ ہے حتی کہ ائمہ کرام نے اسے عقائد میں شمار کیا ہے۔[3]

حکومت کے قیام اور امت کی تربیت کے لیے حکام کی اطاعت کی اپنی اہمیت ہے۔ حکام کی اطاعت کی اسی اہمیت کو ہم اختصار سے چند نکات میں یوں بیان کر سکتے ہیں:

① امراء اور حکام کی اطاعت احکامِ الٰہی کی بجا آوری میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝ ﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں، پھر اگر تم باہم کسی چیز میں اختلاف کرو تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا دو، اگر تم واقعی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے بہت اچھا ہے۔''[4]

---

1 النسآء 59:4. 2 الفتاوی لابن تیمیة: 246/28. 3 بدائع السالك في طبائع الممالك لأبي عبداللّٰه بن الأزرق: 77/1. 4 النسآء 59:4.

② حکام کی اطاعت زمین میں اللہ تعالیٰ کی شریعت کے نافذ کرنے کا، حق کو حق ثابت کرنے کا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے قیام کا وسیلہ و ذریعہ ہے۔ یہ بذات خود مقصود و مطلوب نہیں ہے۔ یہ تو صرف اس امت کے بہترین امت ہونے کے احقاق، کلمۂ توحید اور محض اللہ تعالیٰ کی ذات کو عبادت کے لیے خاص کرنے کا ذریعہ ہے۔

③ اطاعتِ حکام سے مسلمانوں کے اندر یکجہتی کی لہر دوڑتی ہے کیونکہ باہمی اختلاف و انتشار کی صورت میں ان کے دنیوی اور اخروی احوال کی تباہی اور بربادی لازم آتی ہے۔[1]

④ اس سے مسلمان اپنے دین کو غالب کرتے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت گزاری پر مدد حاصل کرتے ہیں۔

⑤ حکام کی اطاعت ہی میں دنیا کی سعادت مندی ہے۔

لہٰذا اہل سنت والجماعت کے بنیادی اصولوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہم حکمرانوں کی عوام پر ظلم و زیادتی کے باوجود ان کے خلاف خروج کا نظریہ نہیں رکھتے اور نہ ہی ان کی اطاعت سے ہاتھ کھینچتے ہیں۔ اور جب تک وہ اللہ کی نافرمانی کا نہ کہیں ہم ان کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت خیال کرتے ہیں اور یہ ایک فرض کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور ہم ان کے لیے بارِ الٰہ سے درستگی اور درگزر کرنے کا سوال کرتے ہیں۔[2]

آخرت پر دنیا کو ترجیح دینے کا انجام: متعدد آیات و احادیث میں اللہ تعالیٰ کے ہاں دنیا کی وقعت کا ذکر ہے۔ ان نصوص میں دنیا کی حرص سے متنبہ کیا گیا ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ اس کی زیب و زینت اور ملمع سازی کا انسان پر کتنا برا اثر پڑتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَ الْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ وَ الْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ○ ﴾

1 غزوة أحد لمحمد عيطة بن سعيد، ص: 220. 2 شرح العقيدة الطحاوية لابن أبي العز الحنفي: 540/2.

''لوگوں کے لیے خواہشات نفس کی محبت مزین (پرکشش) کر دی گئی ہے، یعنی عورتوں سے، بیٹوں سے، سونے اور چاندی کے جمع کیے ہوئے ڈھیروں سے، نشان لگے (عمدہ) گھوڑوں سے، مویشیوں سے اور کھیتی سے، یہ سب دنیاوی زندگی کا سامان ہے اور اچھا ٹھکانا اللہ ہی کے پاس ہے۔''[1]

سورۂ لقمان میں ارشاد ربانی ہے:

﴿فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝﴾

''لہٰذا دنیاوی زندگی تمھیں دھوکے میں نہ ڈال دے اور کوئی دھوکے باز تمھیں اللہ کے متعلق دھوکے میں نہ ڈالے۔''[2]

معلم انسانیت ﷺ نے بارہا اپنی امت کو دنیا کی شدید حرص اور اس سے فریب خوردہ ہونے پر تنبیہ فرمائی ہے کیونکہ حرص وطمع کا پوری امت پر عموماً اور دعوت کے علمبرداروں پر خصوصاً برا اثر مرتب ہوتا ہے۔ اس موضوع پر چند احادیث ملاحظہ فرمائیے:

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کا فرمان نقل کرتے ہیں:

«إِنَّ الدُّنْيَا حُلْوَةٌ خَضِرَةٌ، وَّإِنَّ اللّٰهَ مُسْتَخْلِفُكُمْ فِيهَا، فَيَنْظُرُ كَيْفَ تَعْمَلُونَ، فَاتَّقُوا الدُّنْيَا وَاتَّقُوا النِّسَاءَ، فَإِنَّ أَوَّلَ فِتْنَةِ بَنِي إِسْرَائِيلَ كَانَتْ فِي النِّسَاءِ»

''دنیا بہت ہی میٹھی اور سرسبز ہے اور اللہ تعالیٰ تمھیں اس میں خلیفہ بنا کر تمھیں دیکھنے والا ہے کہ تم کیسے اعمال بجالاتے ہو، لہٰذا تم دنیا سے بھی بچو اور عورتوں سے بھی بچو کیونکہ بنی اسرائیل میں پہلا فتنہ عورتوں کی بنا پر وقوع پذیر ہوا تھا۔''[3]

اور غزوۂ احد میں دنیا کی حرص کا جو نتیجہ برآمد ہوا تھا وہ کسی بھی مطالعہ کرنے والے سے

1 آل عمرٰن 14:3. 2 لقمٰن 33:31. 3 صحیح مسلم، حدیث:2742، ومسند أحمد: 22/3، وصحیح ابن حبان، حدیث:3221.

مخفی نہیں ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ذکر کرتے ہیں کہ احد کے دن جب مشرکوں کو اللہ تعالیٰ نے شکست سے دوچار کر دیا تو تیر اندازوں نے آپس میں کہا: ''اللہ کے نبی ﷺ اور جنگ میں شریک لوگوں سے جا ملو۔ وہ تم سے پہلے غنیمتوں کی طرف نہ بڑھنے پائیں کہ تمھیں ان سے کم غنیمتیں حاصل ہوں۔'' دوسرے شرکا نے یہ رائے دی کہ نبی اکرم ﷺ کی اجازت تک ہم یہیں جمے رہیں گے۔ تب یہ آیتِ مبارکہ نازل ہوئی:

﴿مِنكُم مَّن يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنكُم مَّن يُرِيدُ الْآخِرَةَ ۚ﴾

''تم میں سے کچھ لوگ دنیا کو چاہتے تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے۔''[1]

امام طبری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے مراد غنیمت ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں خیال نہیں کرتا تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے بھی کوئی دنیا کا ارادہ رکھتا ہوگا، یہاں تک کہ احد کے دن ہمارے متعلق یہی آیت نازل ہوئی۔[2]

جنگ احد میں جو کچھ ہوا اس میں دعوت کے علمبرداروں کے لیے بڑی عبرت و نصیحت ہے۔ انھیں متنبہ کیا گیا ہے کہ دنیا کی محبت آہستہ آہستہ غیر محسوس انداز سے اہل ایمان کے دلوں میں سرایت کرتی رہتی ہے۔ آخر کار نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ دنیا اور اس کے فوائد کو آخرت اور اس کی نعمتوں سے ہمکنار ہونے پر ترجیح دینے لگتے ہیں۔ اور شریعت کے واضح اور صریح احکام کی نافرمانی شروع کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ تیر اندازوں نے دنیا کی محبت اور نفس کی چاہت (ترجیح) کی بنا پر رسول اللہ ﷺ کا صریح حکم پسِ پشت ڈال دیا تھا، چنانچہ انھوں نے حکم نبوی کی مخالفت کی اور احکام و اوامر بھلا بیٹھے۔

ایک مومن سے اس طرح کے امور سرزد ہو جاتے ہیں اور اسے ان کے مخفی اسباب کا پتا ہی نہیں چلتا۔ ان مخفی اسباب میں سرِفہرست دنیا کی محبت اور اسے آخرت اور ایمان کے

1 آل عمرٰن 152:3، تفسیر الطبري:474/3. 2 تفسیر الطبري:474/3.

تقاضوں پر ترجیح دینا ہے۔ یہی امور دعوت کا علم بلند کرنے والوں سے تقاضا کرتے ہیں کہ وہ اپنے دلوں میں پنپنے والے پوشیدہ اسباب اور دنیا کی محبت کو جڑ سے اکھیڑتے رہیں تاکہ یہ ان کے اور احکام شریعت کے درمیان حائل نہ ہونے پائیں۔ اور نفسانی خواہشات میں ڈوبی ہوئی تاویلات اور دنیا اور اس کے ساز و سامان کی طرف التفات انھیں شرع کی مخالفت پر ہرگز ہرگز نہ ابھارے۔[1]

دین کے ساتھ مضبوط رابطہ اور گہرا تعلق: امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''غزوۂ احد کے دن جب کچھ مسلمان شہید اور کچھ شکست خوردہ ہو گئے تو شیطان بآواز بلند چلایا: ''محمد (ﷺ) قتل ہو چکے ہیں!'' ادھر ابن قمۂ مشرکوں کے پاس آ کر کہنے لگا: ''میں نے محمد (ﷺ) کو قتل کر دیا ہے۔'' اس نے رسول اللہ ﷺ کے سر مبارک پر پتھر مار کر زخمی کر دیا تھا، چنانچہ بہت سے لوگوں کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی اور وہ یقین کر گئے کہ رسول اللہ ﷺ شہید ہو چکے ہیں۔ قرآن پاک نے انبیاء علیہم السلام کے اس دنیا سے چلے جانے کے متعلق جو فرمایا ہے اس کے پیش نظر وہ آپ ﷺ کے شہید ہونے کو بعید خیال نہ کر رہے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان کمزوری اور بزدلی میں مبتلا ہو گئے اور جنگ سے پیچھے ہٹنے لگے۔ اسی کے متعلق ارشاد ربانی نازل ہوا:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَا۟ىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَـيْـــًٔـا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝﴾

''اور محمد (ﷺ) ایک رسول ہی تو ہیں۔ ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔ اگر ان کا انتقال ہو جائے یا یہ شہید ہو جائیں تو کیا تم اسلام سے اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے؟ اور جو کوئی اپنی ایڑیوں کے بل پھر جائے تو وہ اللہ کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکے گا۔ اور اللہ شکر ادا کرنے والوں کو اچھی جزا دے گا۔''[2]

1 المستفاد من قصص القرآن لعبد الكريم زيدان: 197/2. 2 آل عمرٰن 144:3.

یعنی نبوت ورسالت اور جوازِ شہادت میں سابقہ انبیائے کرام علیہم السلام رسول اللہ ﷺ کے لیے نمونہ ہیں۔[1]

مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں یہ بھی منقول ہے کہ انبیاء و رسل علیہم السلام اپنی قوموں میں ہمیشہ نہیں رہتے۔ ہر ایک نے موت کا مزا چکھا ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ کی ذمہ داری یہ تھی کہ آپ کی طرف جو پیغام بھیجا گیا ہے اسے دوسروں تک پہنچادیں اور وہ آپ ﷺ کر چکے ہیں۔ رسالت کے لوازم میں سے یہ قطعاً نہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمیشہ اپنی قوم کے ساتھ ہی رہیں کیونکہ اس جہاں میں ہمیشہ رہنا کسی کے لیے بھی نہیں ہے۔

بعدازاں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی شہادت یا وفات (کی افواہ کی خبر) سے کمزوری کا شکار ہونے والوں پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ﴾

"اگر ان کا انتقال ہو جائے یا یہ شہید ہو جائیں تو کیا تم اسلام سے اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے؟"[2]

یعنی تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے اور جہاد سے ہاتھ کھینچ لوگے؟ ایڑیوں کے بل پھرنے سے مراد جہاد اور فرامینِ نبویہ کی روشنی میں اس کے تقاضوں سے روگردانی ہے۔ اور فرمایا:

﴿ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝ ﴾

"اور جو کوئی اپنی ایڑیوں کے بل پھر جائے تو وہ اللہ کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکے گا۔ اور اللہ شکر ادا کرنے والوں کو اچھی جزا دے گا۔"[3]

شکر کرنے والوں سے یہاں وہ لوگ مراد ہیں جنھوں نے روگردانی نہیں کی یا وہ مراد ہیں جو اپنے دین پر ثابت قدم رہنے والے اور رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ میں بھی

[1] تفسیر ابن کثیر:1/441. [2] آل عمرٰن3:144. [3] آل عمرٰن3:144.

اور آپ ﷺ کے بعد بھی آپ ﷺ ہی کی اتباع کرنے والے ہیں۔ [1]

غزوۂ احد کے موقع پر مسلمانوں کو لاحق ہونے والی مصیبت و آزمائش کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی تھا کہ انھوں نے اپنے ایمان، عقیدے اور اعلائے کلمۃ اللہ کی دعوت کو رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ عالیہ سے مربوط کر رکھا تھا، چنانچہ اللہ کے رب اور معبود یکتا ہونے کے عقیدے کے درمیان اور جذباتِ محبت سے مغلوب ہوکر رسول اللہ ﷺ کے ہمیشہ زندہ رہنے کے درمیان وہ واضح فرق نہ کر پائے۔

دراصل رسول اللہ ﷺ کی ہمیشہ کے لیے رسالت اور آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی، جنھیں موت کے عوارضات لاحق ہونے تھے، اسے وہ باہم مربوط خیال کر بیٹھے کہ جیسے آپ ﷺ کی رسالت ہمیشہ کے لیے ہے ویسے ہی آپ ﷺ کی ذات بھی ہمیشہ کے لیے ہے۔ یہ ان اسباب میں سے ایک سبب تھا جن کی بنا پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بے چینی، پریشانی اور ان حالات سے دوچار ہونا پڑا جن کی انھیں توقع نہ تھی۔

رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی کو اسوہ بنانے کا جو وجوب ہے وہ آپ ﷺ کی مکمل اتباع کیے بغیر ممکن نہیں۔ آپ ﷺ کی اتباع مشکلات پر صبر کا مظاہرہ کرنے سے، دین کا پیغام پھیلانے کے لیے سرتوڑ اور مسلسل کوششوں سے، دعوت کو دوسروں تک پہنچانے سے اور دین حق کی نصرت و حمایت ہی سے ممکن ہے۔ اور یہ پیروی پیغامِ اسلام کے منہج کا روشن پہلو ہے۔ اسی طرح بقائے دین اور دوامِ جہاد کو نبی ﷺ کی ذات مبارکہ کے بقا کے ساتھ باہم مربوط نہ سمجھنا اور فکری اور عملی طور پر آپ ﷺ کی پیروی کا وجوب یہ دونوں باتیں دعوت کے علمبرداروں کے لیے بالخصوص اسلامی معاشرے کے اتحاد کے سلسلے کی بنیادی کڑیاں ہیں۔ [2]

---

[1] المستفاد من قصص القرآن لعبد الکریم زیدان: 200/2. [2] محمد رسول اللّٰہ ﷺ لصادق عرجون: 616/3.

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''غزوۂ احد رسول اللہ ﷺ کی وفات سے قبل ایک تمہید اور اشارہ تھا جس کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے انھیں ثابت قدمی اختیار کرنے کی تلقین فرمائی۔ اور رسول اللہ ﷺ کی وفات یا شہادت کی صورت میں ایڑیوں کے بل پھر جانے پر ڈانٹ پلائی۔ اللہ تعالیٰ نے مومنین کو سمجھایا کہ ان پر اللہ کی طرف سے فرض عائد ہوتا ہے کہ اسی کے دین اور توحید پر جمے رہیں اور اسی راہ پر انھیں موت یا شہادت نصیب ہونی چاہیے کیونکہ وہ نبی کریم ﷺ کی نہیں بلکہ اُن کے رب کی عبادت کررہے ہیں اور ان کے رب پر موت ممکن نہیں۔ اور اگر محمد ﷺ فوت یا شہید ہوجائیں تو یہ مسلمانوں کے شایاں نہیں کہ آپ ﷺ کی وفات انھیں آپ ﷺ کے دین و پیغام سے برگشتہ کردے۔ اللہ کے سوا ہر کسی کو موت کا جام نوش کرنا ہے۔ نہ کوئی اور انسان اور نہ ہی حضرت محمد ﷺ ہمیشہ رہنے کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ انھیں موت اسلام اور توحید پر آئے۔ رسول اللہ ﷺ فوت ہو گئے ہوں یا ابھی مزید زندہ رہیں موت تو ایک حتمی فیصلہ ہے۔ اسی لیے شیطان نے جب بآوازِ بلند چیخ کر کہا کہ حضرت محمد (ﷺ) شہید ہوچکے ہیں تو جن مسلمانوں نے میدانِ جنگ چھوڑا اللہ تعالیٰ نے انھیں زجروتوبیخ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَـيْـــًٔـا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ○﴾

''اگر ان کا انتقال ہوجائے یا یہ شہید ہوجائیں تو کیا تم اسلام سے اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے؟ اور جو کوئی اپنی ایڑیوں کے بل پھر جائے تو وہ اللہ کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکے گا۔ اور اللہ شکر ادا کرنے والوں کو اچھی جزا دے گا۔''[1]

شکر گزار وہ لوگ ہیں جنھوں نے اسلام کی قدر ومنزلت پہچانی اور موت یا شہادت تک

[1] آل عمرٰن 3:144.

اسی پر ثابت قدم رہے۔

اللہ تعالیٰ کے اس موقع پر عتاب اور اس خطاب کی معنویت کا حقیقی اثر اس وقت سامنے آیا جب رسول اللہ ﷺ 11 ہجری کو اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ اس وقت کئی لوگ ارتداد کا شکار ہو گئے، جبکہ شکر گزار اپنے دین پر ثابت قدم رہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد فرمائی، انھیں عزت سے نوازا، دشمن کے مقابلے میں انھیں کامیاب کیا اور بہتر انجام ان کے حق میں کر دیا۔''[1]

امام قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''یہ آیتِ کریمہ غزوۂ احد میں شکست سے دوچار ہونے والوں کو سرزنش کے سلسلے کی آخری کڑی ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ انھیں لائق نہ تھا کہ اگرچہ محمد ﷺ شہید ہی کر دیے جائیں کہ وہ شکستہ دل ہو بیٹھیں۔ نبوت موت کے راستے میں رکاوٹ نہیں ہے۔ اور نہ ہی انبیاء علیہم السلام کی وفات سے دین زائل ہوا کرتے ہیں۔''[2]

امام قرطبی رحمہ اللہ کا کلام بڑا عمدہ ہے۔ جن لوگوں نے اس سے پہلے یہ خیال کر لیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات سے اسلام ختم ہو چکا ہے اور اسی طرح وہ لوگ جن کا خیال یہ تھا کہ غلبۂ اسلام اور اس کی دعوت آپ ﷺ کی ذات گرامی پر موقوف ہے، ان دونوں گروہوں کا نقطۂ نظر درست نہیں تھا۔ انھوں نے نہ تو اس دین کا مقام و مرتبہ پہچانا اور نہ ہی اس کا حق پورا کیا۔ کیونکہ اس دین کا غلبہ اور تمام ادیان پر اس کی برتری اللہ تعالیٰ کے ہاں طے شدہ ہے اور تم اللہ تعالیٰ کے اس طریقے کو ہرگز بدلا ہوا نہ پاؤ گے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝﴾

''وہی (اللہ) ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے سب دینوں پر غالب کرے، خواہ مشرکین کو برا ہی لگے۔''[3]

---

[1] زاد المعاد: 224/3. [2] تفسير القرطبي: 222/4. [3] التوبة 33:9. مرض النبي ﷺ ووفاته لخالد أبي صالح، ص: 20 بحوالہ غزوة أحد لمحمد عيظة بن سعيد، ص: 191.

جنگ احد میں جو کچھ وقوع پذیر ہوا اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے زجر و توبیخ پر مشتمل احکام نازل ہوئے۔ ان کی عملی شکل رسول اللہ ﷺ کی وفات کے وقت سامنے آئی جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ فوت ہوئے تو ابوبکر رضی اللہ عنہ مقام سنح میں واقع اپنے گھر سے ایک گھوڑے پر سوار ہو کر آئے اور گھوڑے سے اتر کر مسجد میں داخل ہو گئے اور کسی سے کوئی بات نہ کی، پھر میرے حجرے میں آئے اور رسول اللہ ﷺ کی طرف بڑھے۔ آپ ﷺ کو یمن کی قیمتی چادر سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے وہ چادر آپ ﷺ کے چہرۂ مبارک سے ہٹائی، پھر جھک کر بوسہ دیا اور رو پڑے، پھر کہنے لگے: ''آپ پر میرے ماں باپ قربان! اللہ تعالیٰ آپ پر دو موتیں جمع نہیں کرے گا۔ بس ایک موت جو آپ پر لکھی گئی تھی وہ آپ پر طاری ہو چکی۔''[1]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ باہر تشریف لائے۔ اس وقت عمر رضی اللہ عنہ لوگوں سے باتیں کر رہے تھے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: ''عمر! بیٹھ جائیے۔'' مگر عمر رضی اللہ عنہ نہ بیٹھے۔ آخر سب لوگ عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے توجہ ہٹا کر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس وقت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے خطبہ ارشاد فرمایا: ''اما بعد! تم میں سے جو کوئی حضرت محمد ﷺ کی عبادت کرتا تھا تو حضرت محمد ﷺ تو فوت ہو چکے۔ اور تم میں سے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا تھا تو اللہ تعالیٰ ہمیشہ زندہ ہے اسے کبھی موت لاحق نہیں ہو گی۔'' اللہ تعالیٰ قرآن میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَا۟ىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَـيْـــًٔا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝﴾

''اور محمد (ﷺ) ایک رسول ہی تو ہیں۔ ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے

[1] صحيح البخاري، حديث:4453.

ہیں۔ اگر ان کا انتقال ہو جائے یا یہ شہید ہو جائیں تو کیا تم اسلام سے اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے؟ اور جو کوئی اپنی ایڑیوں کے بل پھر جائے تو وہ اللہ کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکے گا۔ اور اللہ شکر ادا کرنے والوں کو اچھی جزا دے گا۔''[1]

ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوا جیسے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اس آیت کی تلاوت کرنے سے قبل لوگ یہ جانتے ہی نہ تھے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری ہوئی ہے، پھر تو سب نے یہ آیت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے سیکھ لی۔ میں نے جس کو بھی دیکھا وہ یہی آیت پڑھ رہا تھا۔

امام زہری کہتے ہیں کہ مجھے سعید بن مسیّب رحمہ اللہ نے بتایا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے تھے: ''مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں نے یہ آیت سنی ہی نہ تھی۔ جب ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی تو میں نے سنی۔ میں اس وقت سہم گیا اور میرے پیروں نے جواب دے دیا۔ میں زمین پر جا پڑا۔ جونہی میں نے یہ آیت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے سنی تو مجھے یقین ہو گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو چکی ہے۔[2]

تیر اندازوں اور منافقوں کا معاملہ

تیر انداز: جن تیر اندازوں نے غزوۂ احد میں اجتہادی غلطی کی تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اپنی صفوں میں شامل رکھا۔ اور انھیں یہ نہ کہا کہ تم جنگ کے لیے موزوں نہیں ہو۔ کیونکہ تجربے کے دوران تم سے کمزوری اور کوتاہی سامنے آئی ہے۔ بلکہ رحمت، شفقت اور فیاضی سے ان کی کمزوری سمیت انھیں قبول کیا۔ بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے (بھی) اپنی کمال مہربانی اور معافی تمام شرکائے جنگ پر عام کر دی، باوجودیکہ ان میں سے بعض افراد سے فاش غلطیاں سرزد ہوئی تھیں جن کی بنا پر تمام مسلمانوں کو اجتماعی طور پر زبردست نقصانات اٹھانے پڑے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں معاف کرتے ہوئے ان کی کوتاہیوں کو دھو ڈالا اور غلطیوں کے نشانات تک مٹا دیے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

1 آل عمرٰن 3:144. 2 صحيح البخاري، حديث:4454.

﴿ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۗ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ○ ﴾

"بلا شبہ (پھر بھی) اس نے تمھیں معاف کر دیا۔ اور اللہ مومنوں پر فضل کرنے والا ہے۔"[1]

اللہ تعالیٰ کے عفو و درگزر کے ساتھ ساتھ یہاں ایک اہم پہلو اور بھی تھا جو صحابہ کرام کے دلوں میں ایسا اثر چھوڑ سکتا تھا جو عفو و درگزر کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا۔ اور وہ تھا صحابہ رضی اللہ عنہم سے سرزد ہونے والے کردار کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا موقف۔ صحابہ کو یہ معلوم تھا کہ ان کی حکم عدولی اور کوتاہیوں کا نتیجہ آپ ﷺ ہی نے بھگتا، لہٰذا ان کی دلی مسرت اسی میں تھی کہ آپ ﷺ کی جانب سے بھی معافی مل جائے، چنانچہ اس طرح اللہ تعالیٰ کی نعمت کاملہ انھیں میسر آ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو بھی صحابہ کو معاف کرنے کا حکم دیا اور آپ ﷺ کو ابھارا کہ ان کے لیے بخشش طلب کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حکم دیا کہ ان کی یہ کوتاہی ان کے تجربات اور مشوروں کی راہ میں حائل نہ ہو بلکہ ان کی رائے کا احترام کرنے اور توجہ سے ان کے مشورے سننے کا حکم صادر فرمایا ہے۔[2] ارشاد ربانی ہے:

﴿ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ○ ﴾

"پس (اے نبی!) آپ اللہ کی رحمت کے باعث ان کے لیے نرم ہو گئے۔ اگر آپ تند خو اور سخت دل ہوتے تو وہ سب آپ کے پاس سے چھٹ جاتے، چنانچہ آپ ان سے درگزر کریں اور ان کے لیے بخشش مانگیں اور ان سے (اہم) معاملات میں مشورہ کریں، پھر جب آپ پختہ ارادہ کر لیں تو اللہ پر بھروسا کریں، بے شک اللہ بھروسا کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔"[3]

---

1 آل عمرٰن 152:3. 2 غزوة أحد لمحمد عيظة بن سعيد، ص: 218. 3 آل عمرٰن 159:3.

ابن سلول منافق کا عین وقت پر ساتھ چھوڑ جانا: عبداللہ بن ابی تین سو منافقوں کو کو علیحدہ کر کے اسلامی لشکر میں اضطراب کی کیفیت پیدا کرنا اور کھلبلی مچانا چاہتا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی لشکر کے حوصلے پست ہوں اور دشمن دلیر ہو جائے اور ان کے حوصلے بلند ہوں۔ اس کا یہ گھناؤنا کردار اسلام کے مستقبل کو کمزور کرنے اور انتہائی کٹھن حالات میں مسلمانوں کو دھوکا دینے کے زمرے میں آتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن حرام رضی اللہ عنہ نے انھیں پسپائی سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر منافقوں نے ان کی بات پر کان نہ دھرے۔[1]

انھی کے متعلق ارشاد ہے:

﴿وَمَآ اَصٰبَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ۚ وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ۭ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنٰكُمْ ۭ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَىِٕذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ۝﴾

''اور جو مصیبت تمھیں اس (احد کے) دن پہنچی جب دونوں لشکر باہم ٹکرائے تو تمھیں جو (نقصان) پہنچا وہ اللہ کے حکم سے تھا اور اس لیے تھا کہ اللہ جان لے کہ مومن کون ہیں۔ اور یہ بھی جان لے کہ منافق کون ہیں اور ان منافقوں سے کہا گیا تھا: آؤ! اللہ کے راستے میں لڑو یا (شہر کا) دفاع کرو۔ انھوں نے کہا: اگر ہمیں جنگ ہونے کا یقینی علم ہوتا تو ہم ضرور تمھارے ساتھ چلتے۔ وہ اس روز ایمان کی نسبت کفر کے زیادہ قریب تھے۔ وہ اپنے مونہوں سے وہ بات کہہ رہے تھے جو ان کے دلوں میں نہیں تھی اور اللہ وہ بات خوب جانتا ہے جسے وہ چھپاتے ہیں۔''[2]

1 غزوة أحد لمحمد عيطة بن سعيد، ص: 219. 2 آل عمرٰن3:166,167.

قریش کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعداد خاصی کم تھی، اس لیے مسلمانوں کو افرادی قوت بھی درکار تھی۔ اس کے باوجود منافقین کے رویے کو بالائے طاق رکھتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے انھیں ان کی حالت پر چھوڑ دیا اور ان کی مطلق پروا نہ کی۔ اور لوگوں کے روبرو ان کی رسوائی ہی کو کافی خیال کیا۔[1]

رسول اللہ ﷺ کے اس انداز نے ابن سلول کی اہانت و سرزنش کا گہرا اثر چھوڑا۔ اس کا اندازہ امام زہری کی حسبِ ذیل وضاحت سے ہوتا ہے۔ عبداللہ بن ابی کی عادت تھی کہ وہ ہر جمعہ کے روز خطبے کے دوران میں، جبکہ رسول اللہ ﷺ بیٹھ جاتے، کھڑا ہوتا اور قوم سے کہتا: ''یہ رسول اللہ ﷺ ہیں جو تمھارے درمیان موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعے سے تمھیں عزت دی اور تمھارا اکرام کیا، اس لیے ان کی مدد کرو، انھیں تقویت دو، ان کی بات سنو اور اطاعت کرو۔'' یہ کہہ کر وہ بیٹھ جاتا تھا۔ ایک تو وہ بذاتِ خود بہت پراعتماد تھا، دوسرا قوم میں بھی اس کی بڑی قدرومنزلت تھی۔ اور واقعی وہ تھا بھی قوم کا معتبر کہ اسے کوئی نہیں ٹوکتا تھا۔

غزوۂ احد کے موقع پر عبداللہ بن ابی اور اس قماش کے لوگوں کا جو گھناؤنا کردار سامنے آیا اس سے ان کے مکروہ چہرے واضح ہوگئے۔ حسب سابق غزوۂ احد کے بعد جب ابن سلول وعظ کے لیے کھڑا ہوا تو مسلمانوں نے ہر طرف سے اس کے کپڑے پکڑ کر اسے کھینچا اور کہنے لگے: ''ارے! اللہ کے دشمن! بیٹھ جا۔ اپنے برے کردار کی بنا پر تو اس کام کا اہل نہیں رہا۔'' یہ دیکھ کر ابن سلول لوگوں کی گردنیں پھلانگتا ہوا نکل گیا اور کہتا جا رہا تھا: ''اللہ کی قسم! گویا میں نے تو کوئی غلط اور بری بات کہی ہے، میں تو انھی کا معاملہ مضبوط کرنے کھڑا ہوا تھا۔'' مسجد کے دروازے پر اسے انصار کے کچھ لوگ ملے۔ انھوں نے اس سے پوچھا: ''تیرا برا ہو، تجھے کیا ہوا؟'' کہنے لگا: ''میں نبی ﷺ کا معاملہ مضبوط کرنے

[1] غزوة أحد لمحمد عيطة بن سعيد، ص:220.

کھڑا ہوا تھا مگر آپ ﷺ کے کچھ ساتھی میرے درپے ہو گئے اور میرے کپڑے کھینچنے لگے اور برا بھلا کہنے لگے۔ ایسا لگا کہ میں نے کوئی بری بات کہی ہے۔ میں تو صرف آپ ﷺ کو تقویت دینے کے لیے کھڑا ہوا تھا۔'' انھوں نے جواب دیا: ''تیرا برا ہو، واپس آ جا، ہم رسول اللہ ﷺ سے تیرے لیے معافی طلب کرتے ہیں۔'' وہ کہنے لگا: ''اللہ کی قسم! مجھے معافی طلب کرنے کی حاجت نہیں۔''[1]

احد پہاڑ کی مسلمانوں سے محبت

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو خیبر سے واپسی پر احد پہاڑ دکھائی دیا تو آپ ﷺ فرمانے لگے: «هٰذَا جَبَلٌ يُحِبُّنَا وَنُحِبُّهٗ» ''یہ وہ پہاڑ ہے جو ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔''[2]

یہ بات رسول اللہ ﷺ کے شعور کی لطافت پر دلالت کرتی ہے۔ آپ ﷺ نے مسلمانوں کے احد پہاڑ کو اپنا دفاعی ذریعہ بنانے اور اللہ تعالیٰ کی اس پہاڑ کو ودیعت کردہ خوبی اور صلاحیت کے درمیان باہم گہرا ربط قائم کر دیا۔ اور اسے دوستی و تعلق کے بلند ترین احساسات، یعنی لفظِ محبت سے تعبیر کیا۔ برملا کہا جا سکتا ہے کہ جو ہستی ایک بے جان ٹھوس پتھر کی فضیلت کی معترف ہے اور اس کے متعلق ایسے بلند تر اخلاق کا اظہار کر رہی ہے تو لازماً بنی نوعِ انسان کے کمتر احسان کی بھی معترف ضرور ہو گی۔ جب جمادات سے آپ ﷺ کی وفا اور پاسداری اتنی بلند تر ہے کہ بڑے لطیف اور بلند تر کلمات ادا کر رہے ہیں تو بنی نوعِ انسان میں سے وفاداروں کے ساتھ اور خصوصاً جن کے ساتھ آپ کا اللہ کے لیے بھائی چارہ تھا، ان کے ساتھ آپ کے اخلاقِ عالیہ کا کیا کہنا ہو گا!![3]

اس حدیث شریف میں کئی ایک مفاہیم پنہاں ہیں۔ کچھ کا تذکرہ حمیدی نے کیا ہے اور

---

[1] البداية والنهاية: 53/4، والسيرة النبوية لابن هشام: 111/3. [2] صحيح البخاري، حديث: 2889، وصحيح مسلم، حديث: 1365. [3] التاريخ الإسلامي للحميدي: 198/5.

کچھ وہ ہیں جو استاد صالح الشامی یوں بیان کرتے ہیں: ''انسان کی عادت ہے کہ وہ کسی پہنچنے والی مصیبت اور اس کی جگہ اور وقت میں تعلق جوڑ لیتا ہے۔ یہ فرمانِ عالی مقام حق کی وضاحت کے طور پر تھا کہ اسلام آنے کے بعد بھی یہ عادت ساتھ ساتھ جاری و ساری نہ رہے۔

اس میں یہ خدشہ لاحق تھا کہ معرکے کے بعد بھی مسلمان احد پہاڑ پر کھڑے اس گزشتہ معرکے کو یاد کریں گے، لہٰذا آپ ﷺ نے واضح کر دیا کہ جگہ اور وقت اللہ تعالیٰ کی مخلوقات ہیں تاکہ ان کے ذہنوں میں کوئی ایسا وہم پیدا نہ ہو اور انھیں یہ یقین ہو جائے کہ زمان و مکان اور ان میں ہونے والے امور و افعال کا کوئی باہمی تعلق نہیں ہوتا۔ تمام تر معاملات تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہادت صاحب شہادت کے لیے عزت کا مقام ہے نہ کہ مصیبت کا۔ ایمان کے تقاضے کے مطابق مفاہیم و مطالب اس طرح دلوں میں جاگزیں ہوتے ہیں۔ اسی مفہوم کے تحت ''اُحد'' قابل تکریم اور محبت کا مرکز خیال کیا جانے لگا۔ اور وہ کیوں نہ قابل ستائش ہوا سے اللہ تعالیٰ نے سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کی جائے قرار کے طور پر پسند فرمایا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنھیں اللہ تعالیٰ نے اس دن کے لیے منتخب فرمایا تو انھوں نے اس کی رضا و چاہت کی تمنا میں اپنی جانوں تک کا نذرانہ پیش کر دیا۔''[1]

غزوۂ احد میں فرشتوں کی آمد

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے احد کے دن رسول اللہ ﷺ کی دائیں اور بائیں طرف دو آدمیوں کو دیکھا جو سفید کپڑے پہنے ہوئے آپ ﷺ کی طرف سے خوب لڑ رہے تھے۔ میں نے ان دونوں کو اس سے پہلے دیکھا تھا نہ بعد میں، یعنی انھوں نے حضرت جبریل علیہ السلام اور حضرت میکائیل علیہ السلام کو دیکھا۔[2]

[1] من معين السيرة لصالح الشامي، ص:427. [2] صحيح البخاري، حديث:4054، و صحيح مسلم، حديث:2306.

جنگ احد میں فرشتوں نے صرف آپ ﷺ کے دفاع کے لیے شرکت کی تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی حفاظت کی ضمانت لے رکھی تھی۔ نبی ﷺ کے دفاع میں فرشتوں کی اس جنگ کے علاوہ غزوۂ احد میں کسی صحیح حدیث سے فرشتوں کا قتال ثابت نہیں۔ ہاں! اللہ تعالیٰ نے مدد کا وعدہ ضرور کیا تھا مگر وہ وعدہ تین امور سے مشروط تھا: ① صبر ② تقویٰ ③ دشمن اگر اچانک آجائے۔ نہ یہ شرائط پوری ہوئیں اور نہ ہی امداد حاصل ہوئی۔[1]

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ○ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ○﴾

”(اے نبی!) جب آپ مومنوں سے کہہ رہے تھے: کیا تمھارے لیے کافی نہ ہوگا کہ اللہ آسمان سے تین ہزار فرشتے اتار کر تمھاری مدد کرے؟ کیوں نہیں! اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور دشمن تم پر فوراً چڑھ آئے تو اسی لمحے تمھارا رب پانچ ہزار فرشتوں سے تمھاری مدد کرے گا جن کے (خاص) نشان لگے ہوں گے۔“[2]

سورۂ انفال اور آل عمران کی روشنی میں فتح و شکست کے قوانین

سورۂ انفال میں غزوۂ بدر کے متعلق قدرے تفصیل ذکر کی گئی ہے۔ اور سورۂ آل عمران میں غزوۂ احد کے متعلق وضاحت ہے۔ ان کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ امتِ مسلمہ وہ مطالب و مفاہیم بخوبی جان سکے جن کا تعلق قضاء و قدر، موت و حیات، فتح و شکست، نفع و نقصان اور ایمان و نفاق سے ہے۔ علاوہ ازیں انھیں ابتلاء و آزمائش میں کامیاب اور دشمن کے عزائم خاک میں ملانے کے طریقے سے آگاہی بھی ہوجائے، چنانچہ واقعاتِ بدر و احد اور سورۂ انفال و آل عمران سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان آیات کی روشنی میں فتح و شکست کے مفاہیم

[1] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 391/2. [2] آل عمرٰن 3: 125,124.

اچھی طرح سمجھ لیے۔ ان مفاہیم کو خلاصتاً درج ذیل نکات میں بیان کیا جاسکتا ہے:

❁ اول و آخر مدد صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور اس پر کسی بھی مخلوق کا کنٹرول نہیں ہے۔ وہ جسے چاہے عنایت فرمائے، جس سے چاہے اپنی نصرت و اعانت پھیر لے۔ یہ بھی رزق، موت اور دیگر اعمال ہی کی طرح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝﴾

''اور اس (مدد) کو اللہ نے خوشخبری بنا دیا تاکہ اس سے تمھارے دلوں کو تسلی ہو جائے اور مدد تو اللہ ہی کے پاس ہے۔ بے شک اللہ غالب ہے، خوب حکمت والا۔''[1]

❁ جب اللہ تعالیٰ (فتح) مدد کا فیصلہ فرمالے تو زمین کی جملہ قوتیں اس میں رکاوٹ نہیں بن سکتیں۔ اس طرح جب وہ شکست مقدر کر دے تو زمین کی تمام قوتیں مل کر بھی امت کو شکست سے دوچار ہونے سے نہیں بچا سکتیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ۭ وَعَلَي اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝﴾

''اگر اللہ تمھاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا اور اگر وہ تمھیں بے یار و مددگار چھوڑ دے تو پھر کون ہے جو اس کے بعد تمھاری مدد کر سکے؟ اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسا کرنا چاہیے۔''[2]

❁ اللہ تعالیٰ کے ہاں فتح و نصرت کے طے شدہ مقدس قوانین ہیں جنھیں سمجھنے کی ضرورت ہے، لہٰذا خدائی لشکر کہلانے والوں کی کشور کشائی خالصتاً اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہو۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ۝﴾

1 الأنفال 10:8. 2 آل عمرٰن 160:3.

''اے ایمان والو! اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کرو گے تو وہ تمھاری مدد کرے گا اور تمھارے قدم ثابت رکھے گا۔''[1]

اللہ تعالیٰ کی مدد اس کے احکام پر لبیک کہنے، اس کے بیان کردہ منہج پر قائم دائم رہنے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے کی صورت ہی میں مل سکتی ہے۔

❁ باہمی یک جہتی اور یگانگت مدد کی بنیاد ہے، جبکہ اختلاف رائے اور انتشار ہلاکت و شکست کا باعث ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝﴾

''اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو ورنہ تم ہمت ہار بیٹھو گے اور تمھاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ اور صبر کرو، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''[2]

❁ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا دم بھرنا اور اس سے روگردانی نہ کرنا فتح ونصرت کی بنیاد ہے، جبکہ نافرمانی شکست کی جانب لے جاتی ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝﴾

''اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو ورنہ تم ہمت ہار بیٹھو گے اور تمھاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ اور صبر کرو، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''[3]

❁ دنیا کی محبت اور دیوانگی امت کو اللہ تعالیٰ کی نصرت سے محروم کر دیتی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

[1] محمد 7:47. [2] الأنفال 46:8. [3] الأنفال 46:8.

﴿حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ﴾

''یہاں تک کہ جب تم نے کم ہمتی اختیار کی اور اپنی ذمہ داری کے بارے میں جھگڑنے لگے اور جونہی اللہ نے تمھیں وہ چیز (مالِ غنیمت کی جھلک) دکھائی جس سے تم محبت کرتے تھے تو تم نے نافرمانی کی، (اس لیے کہ) تم میں سے کچھ لوگ دنیا کو چاہتے تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے۔''[1]

❁ تعداد کی کمی اور سامانِ جنگ کی قلت شکست کا سبب نہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝﴾

''اور اللہ نے بدر میں عین اس وقت تمھاری مدد کی جب تم کمزور تھے۔ پس تم اللہ سے ڈرو تاکہ تمھیں شکر ادا کرنے کی توفیق ہو۔''[2]

❁ ہاں، دشمن سے نبرد آزما ہونے کے لیے وسائل کی تیاری اور شعور کی بیداری ضروری چیز ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝﴾

''اور ان (کافروں کے مقابلے) کے لیے تم مقدور بھر قوت اور بندھے ہوئے گھوڑے تیار رکھو جن سے تم اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو اور ان کے علاوہ دوسروں کو ڈرائے رکھو جنھیں تم نہیں جانتے (مگر) اللہ انھیں جانتا ہے اور تم اللہ کی راہ میں جو کچھ خرچ کرو گے تمھیں (اس کا) پورا پورا ثواب دیا جائے گا۔ اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔''[3]

[1] آل عمرٰن 3:152. [2] آل عمرٰن 3:123. [3] الأنفال 8:60.

❁ دشمن سے رزم آرائی کے وقت صبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے ثابت قدم رہنا بھی نصرت کے حصول کے بنیادی اسباب میں سے ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَٱثْبُتُواْ وَٱذْكُرُواْ ٱللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝﴾

''اے ایمان والو! جب کسی گروہ سے تمھارا آمنا سامنا ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت یاد کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔''[1]

اور فرمایا:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِذَا لَقِيتُمُ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوهُمُ ٱلْأَدْبَارَ ۝﴾

''اے ایمان والو! جب تمھارا ان لوگوں کے لشکر سے مقابلہ ہو جنھوں نے کفر کیا تو تم ان سے پیٹھیں نہ پھیرو۔''[2]

❁ دشمن سے مڈبھیڑ کے وقت ثابت قدمی اور صبر کے حصول کے لیے کثرت سے ذکر و اذکار معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اور اللہ کی یاد کے لیے ضروری ہے کہ دل اسی کی طرف متوجہ ہو کیونکہ وہی مدد اتارنے والا ہے، اسی سے مدد طلب کی جائے، اسی پر بھروسا کیا جائے اور اپنی طاقت وقوت سے تہی دامن ہونے کا اظہار کیا جائے اور محض اپنی تعداد، استعداد اور اپنی ذات پر اعتماد نہ کیا جائے۔ یہ سب کچھ نصرت کے عوامل میں سے ہے۔[3]

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَٱثْبُتُواْ وَٱذْكُرُواْ ٱللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝﴾

''اے ایمان والو! جب کسی گروہ سے تمھارا آمنا سامنا ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ

---

1 الأنفال 8:45. 2 الأنفال 8:15. 3 فقه السيرة النبوية للدكتور الغضبان، ص: 463.

کو بہت یاد کرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔‘‘[1]

شہداء کا مقام و مرتبہ اور فضیلت

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

«لَمَّا أُصِيبَ إِخْوَانُكُمْ بِأُحُدٍ، جَعَلَ اللّٰهُ أَرْوَاحَهُمْ فِي أَجْوَافِ طَيْرٍ خُضْرٍ، تَرِدُ أَنْهَارَ الْجَنَّةِ، وَتَأْكُلُ مِنْ ثِمَارِهَا، وَ تَأْوِي إِلٰى قَنَادِيلَ مِنْ ذَهَبٍ فِي ظِلِّ الْعَرْشِ، فَلَمَّا وَجَدُوا طِيبَ مَشْرَبِهِمْ، وَ مَأْكَلِهِمْ، وَ حُسْنَ مَقِيلِهِمْ، قَالُوا: يَا لَيْتَ إِخْوَانَنَا يَعْلَمُونَ مَا صَنَعَ اللّٰهُ بِنَا لِئَلَّا يَزْهَدُوا فِي الْجِهَادِ، وَلَا يَنْكُلُوا عَنِ الْحَرْبِ! فَقَالَ عَزَّوَجَلَّ: أَنَا أُبَلِّغُهُمْ عَنْكُمْ، فَأَنْزَلَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ عَلٰى رَسُولِهِ ﷺ هٰذِهِ الْآيَاتِ»

’’جنگِ احد میں جب تمھارے بھائی شہید ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی روحوں کو سبز پرندوں کے قالبوں میں رکھا۔ وہ جنت کی نہروں پر آتی اور جنت کے باغوں کے پھل کھاتی ہیں۔ اور عرش کے سایے میں سونے کی قندیلوں میں بسیرا کرتی ہیں، پھر جب ان روحوں نے اپنے کھانے پینے کی اشیا کے مزے اور اپنی آرام گاہ کی خوبیوں کا نظارہ کیا تو وہ کہنے لگیں: ’’کاش! ہمارے بھائیوں کو یہ بات معلوم ہوجاتی کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کس قدر اعزاز سے نوازا ہے تا کہ وہ جہاد سے بے رغبتی کریں نہ میدانِ جنگ سے گریزاں ہوں۔‘‘ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ’’تمھاری جانب سے یہ پیغام میں پہنچا دیتا ہوں۔‘‘ لہٰذا اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ پر یہ آیات نازل فرمائیں:

[1] الأنفال 8:45.

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ○ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا ھُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ○﴾

''ان لوگوں کو مردہ خیال نہ کرو جو اللہ کے راستے میں مارے گئے ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں، انھیں ان کے رب کے ہاں رزق دیا جاتا ہے۔ جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انھیں دیا اس پر وہ خوش ہیں اور ان (مومنوں) کے بارے میں بھی خوشی محسوس کرتے ہیں جو ابھی تک ان سے نہیں ملے اور ان کے پیچھے (دنیا میں) رہ گئے ہیں کہ انھیں نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ وہ اللہ کی نعمت اور اس کے فضل (کے عطا ہونے) پر خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اور بے شک اللہ مومنوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔''[1]

امام واحدی نے حضرت سعید بن جبیر سے سابقہ آیات کی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ جب حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ اور حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ احد کے دن شہادت سے نوازے گئے۔ اس کے نتیجے میں انھوں نے جو مقام و مرتبہ پایا تو اسے دیکھ کر وہ یہ خواہش کرنے لگے: ''کاش! ہمارے بھائی ہمارے مقام و مرتبہ کو جان لیں تاکہ ان میں جہاد کی چاہت اور رغبت اور زیادہ ہو جائے۔'' تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''انھیں تمھاری طرف سے یہ بات میں پہنچاتا ہوں۔'' تب اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیات اتاریں۔[2]

امام مسلم رحمہ اللہ نے مسروق کے واسطے سے بیان کیا ہے کہ ہم نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ان مذکورہ آیات کے متعلق دریافت کیا تو ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ''ہم نے ان کے

---

1 آل عمرٰن 3:169-171. مسند أحمد: 266/1، وسنن أبي داود، حديث: 2520، ومسند أبي يعلٰى: 219/4، حديث: 2331، وتفسير الطبري: 170/4. 2 أسباب النزول للواحدي، ص: 125، و تفسير الطبري: 269/4.

متعلق رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَرْوَاحُهُمْ فِي جَوْفِ طَيْرٍ خُضْرٍ، لَّهَا قَنَادِيلُ مُعَلَّقَةٌ بِالْعَرْشِ تَسْرَحُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ شَائَتْ، ثُمَّ تَأْوِي إِلٰى تِلْكَ الْقَنَادِيلِ، فَاطَّلَعَ إِلَيْهِمْ رَبُّهُمُ اطِّلَاعَةً، فَقَالَ: هَلْ تَشْتَهُونَ شَيْئًا؟ قَالُوا: أَيَّ شَيْءٍ نَّشْتَهِي؟ وَنَحْنُ نَسْرَحُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ شِئْنَا، فَفَعَلَ ذٰلِكَ بِهِمْ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، فَلَمَّا رَأَوْا أَنَّهُمْ لَنْ يُّتْرَكُوا مِنْ أَنْ يُّسْأَلُوا، قَالُوا: يَارَبِّ! نُرِيدُ أَنْ تَرُدَّ أَرْوَاحَنَا فِي أَجْسَادِنَا حَتّٰى نُقْتَلَ فِي سَبِيلِكَ مَرَّةً أُخْرٰى، فَلَمَّا رَأٰى أَنْ لَّيْسَ لَهُمْ حَاجَةٌ تُرِكُوا»

''شہیدوں کی روحیں سبز پرندوں کے قالب میں ہوتی ہیں۔ ان کے لیے عرش کے ساتھ قندیلیں لٹک رہی ہیں۔ وہ جنت میں جہاں چاہتی ہیں چرتی پھرتی ہیں، پھر اپنی قندیلوں میں راحت و آرام کرتی ہیں۔ ایک بار ان کے پروردگار نے انھیں دیکھا اور فرمایا: ''تم کچھ چاہتی ہو؟'' انھوں نے کہا: ''اب ہم کیا چاہیں گی ہم تو جنت میں جہاں چاہتی ہیں چگتی پھرتی ہیں۔'' اللہ تعالیٰ نے ان سے اسی طرح تین بار پوچھا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ ان سے یہ سوال ہونا ہی ہونا ہے تو وہ کہنے لگیں: ''اے ہمارے پروردگار! ہم یہ چاہتی ہیں کہ ہمیں ہمارے جسموں میں پھیر دے تاکہ ہم دوبارہ تیری راہ میں شہید کی جائیں۔'' جب اللہ تعالیٰ نے دیکھ لیا کہ ان کی کوئی خواہش نہیں تو ان سے مزید سوال نہیں کیا گیا۔''[1]

مشرکین کے خلاف میڈیا وار

عہد نبوی میں میڈیا کی جنگ شعر گوئی پر مبنی تھی۔ بدر میں مشرکوں کے شعراء کا انداز

[1] صحیح مسلم، حدیث: 1887.

دفاعی اور مرثیہ خوانی پر مبنی تھا۔ احد کے موقع پر قریش کے شعراء نے اپنی ظاہری جیت کو بہت بڑی فتح کی صورت میں پھیلانے کی ٹھان لی، چنانچہ انھوں نے اسے رائی کا پہاڑ بنا دیا۔ ان کے اس غرور اور گھمنڈ کا مقابلہ کرنے کے لیے حضرت حسان بن ثابت، حضرت کعب بن مالک اور حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم سامنے آئے تاکہ وہ مشرکوں کی اس میڈیا وار کا منہ توڑ جواب دیں۔ مشرکین کی طرف سے میڈیا وار ان کے شعراء ہبیرہ بن ابووہب، عبداللہ بن زبعریٰ، ضرار بن خطاب اور عمرو بن عاص کر رہے تھے۔ [1]

حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے اشعار مشرکین پر میزائل بن کر گرتے رہے۔ جنگ میں مسلمانوں نے مشرکوں کے تمام علم برداروں کا صفایا کر دیا تھا، لہٰذا علَم تھامنے والا ان کا کوئی سردار باقی نہ بچا حتی کہ ایک عورت نے ان کا علَم تھاما۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے اس معاملے میں مسلمانوں کی شجاعت کے قصیدے پڑھے اور مشرکین کو بزدلی کا طعنہ دیتے رہے۔ مشرکوں نے جنگ کے آغاز میں جس بزدلی اور ذلت کا سامنا کیا تھا انھیں وہ یاد کرا کے ان کی برابر مذمت کی تاکہ جنگ کے اختتام پر مسلمانوں کو جس صورت حال کا سامنا کرنا پڑا اس پر مشرکین غرور نہ کریں۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے تو اس وقت گویا مشرکوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جب انھیں شرم دلائی کہ وہ جنگ میں علَم تھامنے کے قابل نہ رہے بالآخر ایک عورت نے آگے بڑھ کر اسے تھاما۔ دراصل اس طرح در پردہ انھیں سخت بزدلی کا طعنہ دینا مقصود تھا۔ [2]

عمرہ بنت علقمہ حارثیہ اور اس کے علَم تھامنے پر تبصرہ کرتے ہوئے حضرت حسان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

''جب عضل جال میں جکڑے ہوئے ایسے ہرنوں کی طرح ہماری طرف لائے گئے جن کے ابروؤں پر نشان لگے ہوں۔

1 من معين السيرة لصالح الشامي، ص:253,252. 2 التاريخ الإسلامي للحميدي: 21/5.

اس وقت ہم نے ان پر نہایت ہلاکت خیز اور عبرتناک نیزہ بازی کی اور ہر طرف سے تلواریں مار مار کر لاشوں کے انبار لگا دیے۔

اگر عمرہ حارثیہ جھنڈا نہ اٹھاتی تو وہ بازاروں میں سامانِ تجارت کی طرح فروخت کیے جاتے۔'' [1]

اور جب عمرہ حارثیہ سے جھنڈا بنو طلحہ کے ایک حبشی غلام صؤاب نے تھام لیا اور وہ انتہائی پامردی و بہادری سے لڑا تو حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے اس مناسبت سے بھی اشعار کہے:

''تم نے اپنے جھنڈے پر فخر کیا ہے، حالانکہ تمھارا یہ فخر گھٹیا ترین فخر ہے کیونکہ بالآخر یہ جھنڈا صؤاب (غلام) کے ہاتھ میں پہنچ گیا تھا۔

جھنڈے کے بارے میں تم نے یہ فخر ایک غلام کے بل پر حاصل کیا ہے۔ اور اس شخص کے ہاتھوں تم نے یہ فخر حاصل کیا ہے جو روئے زمین پر بسنے والوں میں سے گھٹیا ترین ہے۔

تم نے گمان سے کام لیا ہے اور احمقوں کا گزارہ گمانوں ہی پر ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ گمان درستگی سے دور ہی ہوتا ہے۔''

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے قریش کے کسی شاعر کا رد کرتے ہوئے کہا:

''قریش کو میرا یہ پیغام پہنچا دو اور سب سے بہتر قول وہ ہوتا ہے جو سب سے سچا ہو اور اہل دانش کے نزدیک سچائی ہی مقبول ہے۔

ہم نے اپنے شہداء کے عوض تمھارے علمبرداروں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے، لہٰذا بتاؤ لوگوں میں کس معاملے کا زیادہ تذکرہ ہوتا ہے؟

جنگ بدر میں ہماری تمھاری رزم آرائی ہوئی۔ ہمیں کمک حاصل تھی جس میں ساتھ ساتھ میکائیل اور جبرائیل بھی تھے۔

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 87/3.

تم اگر ہمیں قتل بھی کردو گے تو کیا، دینِ حق ہماری فطرت ہے اور حق کے معاملے میں شہید ہوجانا اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑی فضیلت کا باعث ہے۔

اور اگر تم اپنی رائے کے مطابق یہ سمجھتے ہو کہ ہمارا معاملہ بے وقوفی پر مبنی ہے تو سمجھ لو کہ اسلام مخالف شخص کی رائے سراسر گمراہی اور بے راہ روی پر مشتمل ہے۔''[1]

مشرکوں اور مسلمانوں کے درمیان میڈیا کی اس جنگ میں ضرار بن خطاب کے اشعار بھی بڑے تعجب خیز ہیں۔ یہ اشعار انھوں نے اسلام لانے سے قبل رسول اللہ ﷺ اور مہاجرین کی بدر میں فتح پر فخریہ انداز سے کہے تھے:

فَإِنْ تَظْفَرُوا فِي يَوْمِ بَدْرٍ فَإِنَّمَا ... بِأَحْمَدَ أَمْسٰى جَدُّكُمْ وَهُوَ ظَاهِرُ

وَبِالنَّفَرِ الْأَخْيَارِ هُمْ أَوْلِيَاؤُهُ ... يُحَامُونَ فِي اللَّأْوَاءِ وَالْمَوْتُ حَاضِرُ

يُعَدُّ أَبُو بَكْرٍ وَحَمْزَةُ فِيهِمْ ... وَيُدْعٰى عَلِيٌّ وَسْطَ مَنْ أَنْتَ ذَاكِرُ

وَيُدْعٰى أَبُو حَفْصٍ وَعُثْمَانُ مِنْهُمْ ... وَسَعْدٌ إِذَا مَا كَانَ فِي الْحَرْبِ حَاضِرُ

أُولٰئِكَ لَا مَنْ نَتَّجَتْ مِنْ دِيَارِهَا ... بَنُو الْأَوْسِ وَالنَّجَّارِ حِينَ تُفَاخِرُ

''تم بدر کے دن فتح یاب ہوئے تو ظاہر ہے کہ یہ صرف احمد (ﷺ) کی بنا پر ہوا۔

اور وہ فتح اس کے بہترین ساتھیوں کی بنا پر تھی جو سختی و رنج کے وقت جب موت سامنے نظر آ رہی تھی، اس کا دفاع کر رہے تھے۔

ابوبکر اور حمزہ (رضی اللہ عنہما) انھی بہترین رفقاء میں شمار ہوتے ہیں۔ تو اس باب میں جن کا بھی تذکرہ کرے ان میں علی (رضی اللہ عنہ) کا نام بھی واضح طور پر لے۔

ان کے ساتھ ساتھ ابوحفص عمر، عثمان اور سعد (رضی اللہ عنہم) بھی جنگ میں شریک تھے۔

یہ مذکورہ لوگ وہ ہیں جن کی وجہ سے فتح حاصل ہوئی۔ اس علاقے کے لوگوں کی

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 164/3.

وجہ سے فتح حاصل نہیں ہوئی جہاں بنو اوس اور بنو نجار پیدا ہوئے۔ جب تو فخر کرے (تو اس حقیقت کا خیال رکھ)''[1]

ان اشعار میں شاعر نے آہستہ آہستہ خاندانی عصبیت والا جاہلی انداز اختیار کرلیا جس کا حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے اس طرح جواب دیا:

وَفِينَا رَسُولُ اللّٰهِ وَالْأَوْسُ حَوْلَهُ ۔۔۔ لَهُ مَعْقِلٌ مِّنْهُمْ عَزِيزٌ وَنَاصِرُ

وَجَمْعُ بَنِي النَّجَّارِ تَحْتَ لِوَائِهِ ۔۔۔ يُمَشُّوْنَ فِي الْمَاْذِي وَالنَّقْعُ ثَائِرُ

''ہم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہیں جن کے اردگرد اوس ہیں۔ ان کی صورت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو محفوظ اور مضبوط پناہ گاہ میسر ہے۔ اور بنو نجار کا سارا لشکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جھنڈے تلے ایسی تکلیف دہ حالت میں شام کررہے ہیں کہ جنگ کا غبار اڑ رہا ہے۔''

کعب رضی اللہ عنہ مزید کہتے ہیں:

وَكَانَ رَسُولُ اللّٰهِ قَدْ قَالَ أَقْبِلُوا ۔۔۔ فَوَلُّوا وَقَالُوا: إِنَّمَا أَنْتَ سَاحِرُ

لِأَمْرٍ أَرَادَ اللّٰهُ أَنْ يَّهْلِكُوا بِهِ ۔۔۔ وَلَيْسَ لِأَمْرٍ حَمَّهُ النَّارُ زَاجِرُ

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا تھا: آجاؤ! (اسلام قبول کرلو!) تو وہ یہ کہتے ہوئے پیٹھ پھیر گئے کہ آپ تو جادوگر ہیں۔

یہ اس لیے ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ وہ اپنے اسی انکار کی وجہ سے ہلاک ہوں، جس معاملے کو دھکانے والی آگ نے گرمایا ہوا سے کوئی ٹھنڈا کرنے والا نہیں ہوتا۔''

اسی طرح ایک اور شعر میں اسے جواب دیا جس کا ترجمہ یہ ہے:

''اور بدر کے دن سے، جب ہم ان کے چہرے بدل رہے تھے، اس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور جبریل بھی ہمارے جھنڈے تلے تھے۔''

صاحبِ عقد الفرید کے بقول یہ شعر عرب کے تمام اشعار سے زیادہ فخر والا ہے۔[2]

---

[1] من معين السيرة لصالح الشامي، ص:252. [2] من معين السيرة لصالح الشامي، ص:252.

حصہ 12

غزوۂ احد اور خندق کے درمیان کے اہم واقعات

هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ۭ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا ....

''وہی ہے جس نے اہلِ کتاب کے کافروں کو پہلی جلاوطنی کے وقت ان کے گھروں سے نکال دیا، تم نے کبھی یہ خیال نہیں کیا تھا کہ وہ (وہاں سے) نکلیں گے، اور انھوں نے سمجھا تھا کہ بے شک ان کے قلعے انھیں اللہ (کے عذاب) سے بچالیں گے، پھر ان کے پاس اللہ (کا عذاب) آیا جہاں سے انھوں نے گمان بھی نہیں کیا تھا، اور اس نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا، وہ اپنے گھر اپنے ہاتھوں اجاڑتے تھے اور مومنوں کے ہاتھوں بھی، تو اے آنکھوں والو! عبرت پکڑو۔''

(الحشر 2:59)

اِنَّ الَّذِيْنَ جَاۗءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ۭ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ۭ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ لِكُلِّ امْرِﺉٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ ۚ

''بے شک جو لوگ (ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر) بہتان گھڑ لائے وہ تمھی میں سے ایک گروہ ہیں، تم اسے اپنے لیے برا نہ سمجھو، بلکہ وہ تمھارے لیے بہتر ہے، ان میں سے ہر شخص کے لیے اتنا ہی گناہ ہے جو اس نے کمایا۔''

(النور 11:24)

باب 1

حکومتِ اسلامیہ کو کمزور کرنے کی کوششیں اور چند متفرق واقعات

غزوۂ احد کے نتائج کے پیشِ نظر اسلامی حکومت کے دشمنوں کو اس کے خلاف سازشیں کرنے اور لوگوں کو اس کے خلاف ابھارنے کا موقع ہاتھ آگیا۔ بدوی مشرکین میں یہ احساس ابھرا کہ مسلمانوں پر غلبہ پانا اور انھیں زیر کرنا بھی ممکن ہے۔ دوسرے مشرکین مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے اور ان کی شان و شوکت کو ختم کرنے کے لیے مدینہ منورہ پر چڑھائی کا سوچنے لگے، اسی طرح بنو اسد کی نگاہیں اسلامی حکومت کی طرف اٹھنے لگیں۔

ادھر خالد بن سفیان ہذلی نے بکھری ہوئی اسلام دشمن طاقتوں کو جمع کر کے مدینہ پر حملہ کرنے کا پروگرام تشکیل دیا۔ قبیلہ عضل اور قارہ نے مسلمانوں کو دھوکا دے کر بدعہدی کرنے کی جرأت کی۔ عامر بن طفیل اٹھا اور اس نے اسلام کے پُر امن داعی قرائے کرام کو شہید کر دیا۔ بنو نضیر کے یہود نے تو رسول اللہ ﷺ پر اچانک بے خبری میں حملہ کر کے شہید کر دینے کی ناپاک جسارت بھی کی۔ ان تمام سازشوں اور اوچھے ہتھکنڈوں کا مقابلہ حبیب کبریا ﷺ نے بڑی بہادری، دانشمندانہ سیاسی پالیسی اور پُر امن منصوبہ بندی سے کیا۔

مملکتِ اسلامیہ کے خلاف بنو اسد کی ریشہ دوانیاں اور اس کا نتیجہ

بنو اسد طلیحہ اسدی کی سرکردگی میں مدینہ منورہ پر چڑھائی کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس حملے کے مذموم مقاصد یہ تھے کہ مدینہ منورہ کی نعمتیں اور بھلائیاں ان کے ہاتھ لگ جائیں اور کفر و شرک کی حمایت کے ساتھ ساتھ وہ مسلمانوں کے خلاف قریش کی طرفداری کر سکیں۔

بنو اسد کے اس قسم کی تیاریوں میں مگن ہونے کی اطلاع رسول اللہ ﷺ کو جزیرۂ عرب میں پھیلائے ہوئے جاسوسوں کی بدولت مل چکی تھی، چنانچہ آپ ﷺ نے انتہائی مستعدی سے ابوسلمہ بن عبدالاسد مخزومی کی قیادت میں ایک سو پچاس مہاجرین و انصار پر مبنی لشکر ترتیب دیا۔ اور انھیں علَم تھماتے ہوئے فرمایا کہ تم بنو اسد کے علاقے میں جاؤ اور اس سے پہلے کہ وہ تمھارے خلاف اکٹھے ہو جائیں، ان پر اچانک حملہ کر دو۔[1]

حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ ان کی جانب ماہِ محرم میں گئے۔[2]

وہاں پہنچ کر ابوسلمہ رضی اللہ عنہ نے ان کے چوپاؤں پر اچانک حملہ کیا تو وہ جدھر منہ آیا بھاگ کھڑے ہوئے۔ مسلمانوں نے ان کے جانوروں کو قابو کر لیا، اس طرح انھیں دشمنانِ اسلام کو بکھیرنے میں کوئی مشقت نہ اٹھانی پڑی اور وہ کامیاب مدینہ منورہ پلٹ آئے۔ حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کا شمار سابقین اولین میں سے ہوتا ہے۔ ابوسلمہ رضی اللہ عنہ اس غزوے سے تھکے ماندے واپس ہوئے تو احد میں لگا زخم اچانک ہرا ہو گیا اور وہ تھوڑے ہی عرصے میں فوت ہو گئے۔[3]

سریہ ابوسلمہ رضی اللہ عنہ سے حاصل ہونے والے اہم اسباق: رسولِ گرامی ﷺ کی جنگی منصوبہ بندی کی عمدگی اور لطافت کا اظہار کہ دشمن کے اکٹھے ہونے سے پہلے ہی انھیں منتشر کر دیا۔ ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کے چھوٹے سے لشکر کے آنے سے وہ گھبراہٹ میں پڑ گئے، جبکہ ان کا خیال یہ تھا کہ جنگ احد نے مسلمانوں کو اس قدر کمزور کر دیا ہے کہ وہ اپنا آپ بھی بھول چکے ہیں مگر اس کارروائی سے مشرکوں پر مسلمانوں کا رعب طاری ہو گیا اور ان کے عزائم خاک میں مل گئے اور مدینے پر حملہ کرنے کے بجائے انھیں اپنی ہی فکر دامن گیر ہو گئی۔ اس کارروائی سے مسلمانوں کی جنگی امور کی نگرانی اور اس میں کامل مہارت عیاں ہوتی ہے۔ جیسا کہ اس مہم جوئی کے لیے مسلمانوں نے مناسب وقت اور صحیح راستے کا انتخاب کیا۔ وہ اس طرح کہ طویل سفر ہونے کے باوجود یہ لشکر دشمن تک جا پہنچا اور انھیں کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

---

[1] قراءة سياسية للسيرة النبوية للدكتور قلعجي، ص:163,162. [2] زاد المعاد:243/3. [3] فقه السيرة للغزالي، ص:274.

اس کارروائی میں مسلمانوں کی کامیابی کا یہ ایک اہم سبب تھا۔ اس جنگ نے دشمنوں کے خیالات پر گہرا اثر چھوڑا۔ انھیں یہ بات ذہن نشین ہوگئی کہ مسلمان پوشیدہ طور پر حملہ کرنے اور ہنگامی کارروائیوں کی مکمل قدرت رکھتے ہیں۔ اس سے دشمن مرعوب ہوگیا اور اسے ہر وقت مسلمانوں کی جانب سے حملے کا اندیشہ رہنے لگا۔ اس فکر نے انھیں مسلمانوں کی قوت کو تسلیم کرنے اور ان کے ساتھ صلح صفائی کرنے پر مجبور کردیا۔[1]

حضرت عبداللہ بن اُنیس رضی اللہ عنہ کی کارروائی

خالد بن سفیان ہذلی عرفات میں ہذیل اور آس پاس کے دیگر جنگجو اکٹھے کرنے لگا۔ اس کا ارادہ مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کا تھا۔ اس حملے سے اس کے مقاصد یہ تھے کہ قریش کا قرب حاصل ہو، ان کی طرفداری کا اظہار ہو، اپنے غلط عقائد ونظریات کا دفاع بھی ہو اور پھر مدینہ منورہ سے دولت بھی ہاتھ آئے۔ اس کے خطرناک عزائم کے پیشِ نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قتل کرنے کا عندیہ دے کر حضرت عبداللہ بن اُنیس جہنی رضی اللہ عنہ کو اس کی جانب روانہ فرمایا۔[2] تو لیجیے حضرت عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ اپنا واقعہ خود بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلایا اور فرمایا:

«إِنَّهُ قَدْ بَلَغَنِي: أَنَّ خَالِدَ بْنَ سُفْيَانَ بْنِ نُبَيْحٍ يَّجْمَعُ لِي النَّاسَ لِيَغْزُوَنِي وَهُوَ بِعُرَنَةَ، فَأْتِهِ فَاقْتُلْهُ»

”مجھے اطلاعات ملی ہیں کہ خالد بن سفیان بن نبیح لوگوں کو میرے خلاف جنگ کے لیے جمع کررہا ہے۔ اور وہ اس وقت عرنہ میں ہے۔ تم اس تک پیش قدمی کرو اور اسے موت کے گھاٹ اتاردو۔“

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول! اس کی شکل و

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي: 23/6. [2] نضرة النعيم: 313/1.

صورت بتا دیجیے تا کہ میں اسے پہچان سکوں۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: «إِذَا رَأَيْتَهُ وَجَدْتَّ لَهُ قُشَعْرِيرَةً» ''تم جب اسے دیکھو گے تو تم پر کپکپی طاری ہوگی۔''

چنانچہ میں تلوار گلے میں لٹکائے نکل کھڑا ہوا اور میں نے اسے عرنہ میں بوقتِ عصر اس حال میں دیکھا کہ وہ اپنے ساتھ موجود عورتوں کے لیے جگہ ڈھونڈ رہا تھا۔ جب میں نے اسے دیکھا تو آپ ﷺ کے بیان کے مطابق کپکپی محسوس کی۔ میں سیدھا اس کی جانب متوجہ ہوا۔ اس دوران میں نے سوچا کہ میرے اور اس کے درمیان معرکہ آرائی میں نماز رہ نہ جائے، لہٰذا میں نے اس کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے اشارے ہی سے نماز ادا کرلی۔ اس کے پاس پہنچا تو اس نے پوچھا: ''تم کون ہو؟'' میں نے کہا: ''عرب ہی کا ایک باشندہ ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ اس شخص (رسول اللہ ﷺ) سے لڑنے کے لیے لشکر جمع کررہے ہیں۔ اسی سلسلے میں میں حاضر ہوا ہوں۔'' اس نے کہا: ''بالکل میں یہی کام کررہا ہوں۔'' میں تھوڑی دیر اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا جب مجھے موقع مل گیا تو میں نے تلوار کے وار سے اسے ڈھیر کردیا۔ اور وہاں سے چل دیا۔ عورتیں اس پر نوحہ کرنے لگیں۔ میں واپس مدینہ پہنچا تو آپ ﷺ نے دیکھتے ہی فرمایا:

«أَفْلَحَ الْوَجْهُ» ''چہرا کامیاب ہوا۔''

میں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول میں نے اسے قتل کردیا ہے۔''

آپ ﷺ فرمانے لگے: «صَدَقْتَ» ''سچ کہہ رہے ہو؟''

پھر آپ ﷺ مجھے لے کر کھڑے ہوئے اور مجھے اپنے گھر لے گئے اور اپنا عصا مبارک دیا اور فرمایا:

«أَمْسِكْ هٰذِهِ عِنْدَكَ يَا عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ أُنَيْسٍ» ''عبداللہ! یہ اپنے پاس محفوظ رکھنا۔''

میں وہ عصا لیے لوگوں کے پاس گیا تو وہ پوچھنے لگے: ''یہ لاٹھی کیسی ہے؟''

میں نے کہا: ”یہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے عنایت فرمائی ہے اور ساتھ یہ بھی فرمایا ہے کہ اسے اپنے پاس محفوظ رکھنا۔“

انھوں نے کہا: ”واپس جاکر پوچھو تو سہی کہ اس کا مقصد کیا ہے؟“

میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہوا اور عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول! آپ نے یہ لاٹھی مجھے کس مقصد کے لیے عنایت فرمائی ہے؟“

آپ ﷺ نے فرمایا:

«آيَةٌ بَيْنِي وَبَيْنَكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، إِنَّ أَقَلَّ النَّاسِ الْمُتَخَصِّرُونَ يَوْمَئِذٍ»

”یقیناً قیامت کے دن بہت کم لوگ ہی اپنے اپنے نیک اعمال کے سہارے حاضر ہوں گے اس دن یہ لاٹھی میرے اور تیرے درمیان نشانی ہوگی۔“[1]

چنانچہ عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ نے وہ لاٹھی اپنی تلوار کے ساتھ ملالی اور وہ ان کے پاس ہی رہی اور ان کی وصیت کے مطابق کفن کے ساتھ ہی قبر میں رکھ دی گئی۔“[2]

دروس و عبرتیں: اس واقعے میں کئی ایک حکمتیں، عبرتیں اور اسباق ہیں:

❁ **جنگی منصوبہ بندی میں اعلیٰ مہارت:** رسول اللہ ﷺ امن و سلامتی کے معاملے پر بڑی توجہ دیتے تھے۔ اور ایسے بحرانوں کا بروقت اور مناسب حل تلاش کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ خالد بن سفیان کو لشکر جمع کرنے کا موقع ہی نہیں دیا کہ وہ طاقت بن کے ابھرے بلکہ بڑی دانشمندی کے ساتھ اس فتنے کو سر اٹھانے سے قبل کچل دیا۔ اس سے امت کو متعدد فوائد حاصل ہوئے۔ اور مدینہ منورہ پر خالد بن سفیان کی لشکر کشی کے نتیجے میں ہونے والے

---

1 اس عبارت کا ایک مفہوم یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ”بہت کم لوگ ہوں گے جنھیں کوئی سہارا میسر ہوگا۔“

2 مسند أحمد: 496/3، و مسند أبي يعلى، حديث: 905، وسنن أبي داود، حديث: 1249 مختصراً.

ممکنہ نقصانات کا پیشگی بندوبست ہوگیا۔ یہ سب کچھ اس صورت میں ممکن ہوسکتا ہے جب جنگی خبر رسانی کا نظام بھی عمدہ ترین ہو اور طے شدہ تجویز پر انتہائی مستعدی سے عمل درآمد بھی ہو سکے۔

❁ **نبی مکرم ﷺ کی مردم شناسی میں مہارت تامہ:** رسول اللہ ﷺ انتہائی مردم شناس تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی خداداد صلاحیتوں سے خوب واقف تھے۔ کسی مہم کے لیے ایسے شخص کا انتخاب فرماتے جو اس مہم کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہوتا۔ قیادت کے لیے ایسا شخص چنتے جو بہادر، زیرک اور ملنسار ہو۔ تبلیغ و تعلیم کے لیے اسے مقرر فرماتے جو وسیع علم کے ساتھ ساتھ اخلاقِ عالیہ کا مالک اور نرم طبیعت رکھتا ہو اور لوگوں کو اپنی جانب مائل کرنے کی خوبی بھی اس میں موجود ہو۔ سفارت کے لیے اس کا چناؤ کرتے جو جسمانی طور پر عمدہ ڈیل ڈول والا، فصیح زبان اور فی البدیہہ کلام پر قادر ہو۔ فدا کاری کے لیے اس کا انتخاب فرماتے جو بہادری میں نمایاں، مضبوط اور اپنے جذبات کو قابو میں رکھنے کی طاقت رکھتا ہو۔[1]

حضرت عبداللہ بن اُنیس رضی اللہ عنہ مضبوط دل، یقین کامل اور گہرے ایمان سے متصف تو تھے ہی مگر انھیں اس مہم جوئی کا اہل قرار دینے کی ایک اور وجہ بھی تھی اور وہ وجہ یہ تھی کہ ان کا تعلق جہینہ قبیلے سے تھا۔ اس وجہ سے وہ وہاں کے آس پاس کے قبائل اور علاقوں سے خوب واقف تھے۔[2]

❁ **اس مہم کا اخروی پہلو:** اس انتہائی جرأت مندانہ اقدام کا صلہ اور مقصد دنیاوی زر کی صورت میں نہ تھا جیسا کہ قدیم تاریخ اور جدید دور میں بھی بڑے انوکھے کارنامے انجام دینے والا ایسی آرزوئیں رکھتا ہے بلکہ اس مہم سے ان کا مقصد بہت عظیم اور بلند تر تھا۔ اور وہ آخرت میں ملنے والا اعلیٰ مقام اور مرتبہ تھا جس کے آرزومند تھوڑے ہی لوگ ہوتے ہیں۔[3]

---

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي: 27/6. [2] محمد رسول الله ﷺ لصادق عرجون: 51,50/4، وغزوة أحد لأحمد باشميل، ص: 31. [3] السرايا والبعوث النبوية للدكتور بريك محمد بريك، ص: 160,159.

متقی اور پرہیزگار لوگ دنیا میں بدلے کے منتظر نہیں ہوتے۔ اس حوالے سے انھیں اگر کچھ سامان دنیا میسر آ بھی جائے تو وہ ان کا مطمح نظر نہیں ہوتا۔ وہ تو صرف آخرت کے بدلے کے منتظر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عبداللہ بن اُنیس رضی اللہ عنہ کا بدلہ وہ عصا ہی تھا جو ان کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان روز قیامت ایک نشانی (علامت) ہوگا۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ آخرت میں ان کا کتنا بلند درجہ ہوگا۔[1]

❁ بعض فقہی احکام: اس واقعے سے کچھ فقہی احکام بھی حاصل ہوتے ہیں، مثلاً: دشمن کی تلاش میں مشغول ہونے والے مجاہد کی نماز۔ امام خطابی کہتے ہیں: ''دشمن کا تعاقب اور تلاش کرنے والے شخص کی نماز کے متعلق اختلاف ہے۔ عام اہل علم کہتے ہیں: ''اگر دشمن اس کی کھوج میں ہو اور مسلمان مطلوب ہو تو اسے اشارتاً نماز پڑھ لینی چاہیے لیکن اگر خود دشمن کی تلاش اور تتبع میں ہو تو رکوع و سجود کے ساتھ نماز پڑھے۔ اور اگر سوار ہے تو سواری سے اتر کر نماز پڑھے۔'' ابن منذر کا بھی یہی خیال ہے۔[2]

امام شافعی رحمہ اللہ نے دوسرے علماء سے الگ ایک شرط لگائی ہے، وہ کہتے ہیں: ''جب مسلمان دشمن کی تلاش میں ہوں اور ان کی تعداد بھی دشمن سے کم ہو، نیز دشمن کے تعاقب میں یہ لشکر سے بچھڑ چکے ہوں۔ انھیں اگر یہ اندیشہ ہو کہ دشمن پلٹ کر ان پر حملہ کر سکتا ہے تو ایسی صورت میں وہ اشارے سے نماز پڑھ سکتے ہیں۔'' امام خطابی کہتے ہیں: ''اس مسئلے کے کچھ متعلقات اس قصے میں بھی موجود ہیں۔''[3]

علامہ عینی نے عمدۃ القاری میں اس مسئلے کے متعلق فقہاء کے مذاہب بیان کیے ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا خیال ہے کہ اگر آدمی دشمن کو مطلوب ہے تو چلتے پھرتے نماز درست ہے لیکن اگر خود دشمن کے تعاقب میں ہے تو ایسا درست نہیں ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ اور ان

1 التاریخ الإسلامي للحمیدي: 29/6. 2 السرایا والبعوث النبویة للدکتور بریك محمد بریك، ص: 160. 3 معالم السنن للخطابي: 42/2.

کے کچھ اصحاب کا خیال ہے کہ مسلمان دشمن کے تعاقب میں ہو یا دشمن اس کا تعاقب کر رہا ہو دونوں صورتوں میں حکم ایک سا ہے، یعنی ہر ایک اپنی سواری پر نماز پڑھ سکتا ہے۔ امام اوزاعی رحمہ اللہ، امام شافعی رحمہ اللہ اور دیگر علماء بھی یہی نظریہ رکھتے ہیں۔ اور یہی قول حضرت عطاء، حسن، ثوری، احمد اور ابوثور رحمہم اللہ کا بھی ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ”دشمن کا پیچھا کرنے والے کو ڈر ہو کہ دشمن کہیں دور نہ نکل جائے تو وہ اشارتاً نماز پڑھ لے، وگرنہ نہیں۔“[1]

❁ **نبی مکرم ﷺ کے زمانے میں اجتہاد کا جواز:** نبی مکرم ﷺ کے زمانے میں بھی اجتہاد کرنا درست تھا۔ حضرت عبد اللہ بن اُنیس رضی اللہ عنہ نے اجتہاد کرتے ہوئے نماز ادا کی اور آپ ﷺ نے انکار نہ کیا۔ اور یہ انتہائی خوف کے وقت اشارتاً نماز ادا کرنے کے جواز کی دلیل ہے۔[2]

یہ استدلال بالکل صحیح ہے کیونکہ عبد اللہ بن اُنیس رضی اللہ عنہ نے یہ کام آپ ﷺ کی مبارک زندگی میں کیا۔ جو وحی کا زمانہ تھا اور یہ ممکن نہیں کہ آپ ﷺ اس سے باخبر نہ ہوں۔[3]

❁ **نبوت کے دلائل:** رسول اللہ ﷺ نے خالد بن سفیان کو دیکھے بغیر اس کی شناخت سے عبد اللہ بن اُنیس رضی اللہ عنہ کو مطلع کر دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اس کی نشانی یہ ہے کہ جب تم اسے دیکھو گے تو ڈر جاؤ گے اور تمھیں شیطان دکھائی دے گا۔“ حضرت عبد اللہ بن اُنیس رضی اللہ عنہ نے تعجب کرتے ہوئے عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول! میں تو کبھی کسی چیز سے ڈرا ہی نہیں؟“ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«بَلٰى، آيَةُ مَا بَيْنِي وَبَيْنَهُ أَنْ تَجِدَ لَهُ قُشَعْرِيرَةً إِذَا رَأَيْتَهُ»

”کیوں نہیں، اس کی نشانی ہی یہ ہے کہ جب تم اسے دیکھو گے تو تم پر لرزہ طاری

---

1 عمدة القاري شرح صحيح البخاري: 263/6. 2 السرايا والبعوث النبوية للدكتور بريك بن محمد بريك، ص: 161. 3 عون المعبود: 129/4.

ہو جائے گا۔''[1]

حضرت عبد اللہ بن اُنیس رضی اللہ عنہ نے خالد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ شناخت ہی پر پایا۔ عبد اللہ بن اُنیس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جب میں نے اسے دیکھا تو میں ڈر گیا اور مجھ پر رعب طاری ہوگیا۔ یہ دیکھ کر میں نے دل میں کہا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین کس قدر سچے ہوتے ہیں۔[2]

❁ حضرت عبد اللہ بن اُنیس رضی اللہ عنہ کے خالد ہذلی کے قتل پر کہے گئے اشعار:

''میں نے ابن ثور کو اونٹنی کے شیر خوار بچے کی طرح کر کے اس حال میں چھوڑا کہ اس کے اردگرد نوحہ کرنے والی عورتیں گریبان تار تار کر رہی تھیں۔

میرے پیچھے اور اس کے پیچھے بھی سوار عورتیں تھیں۔ میں نے اسے ہندوستانی لوہے کی بنی عمدہ تلوار سے جالیا۔

جب تلوار اس کے سر کو کاٹ رہی تھی تو میں نے اس سے کہا: ''میں شرافت اور شہرت رکھنے والا شہسوار ابن اُنیس ہوں۔''

میں نے اس سے یہ بھی کہا: ''ایک ایسے قابل قدر شخص کی چوٹ کو برداشت کر جو صرف اور صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین پر کاربند ہے۔''

جب نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کسی کافر کی گرفت کا ارادہ فرماتے ہیں تو میں سب سے آگے بڑھ کر ہاتھ اور زبان سے اس کافر کی طرف پیش قدمی کرتا ہوں۔''

قبیلہ عضل اور قارہ کی غداری اور رجیع کا الم ناک واقعہ

واقعۂ رجیع اور اس کے اسباب کے متعلق کئی قسم کی روایات منقول ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جماعت کس مقصد کے لیے اور کب روانہ فرمائی؟ امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت بیان

[1] المغازي للواقدي:2/532. [2] دلائل النبوة للبيهقي:4/41.

کی ہے کہ آپ ﷺ نے انھیں دشمن سے متعلقہ معلومات اکٹھی کرنے اور جاسوسی کے لیے بھیجا تھا۔[1]

جبکہ دیگر صحیح روایات میں اس واقعے کا ذکر یوں ہے کہ قبیلہ عضل اور قبیلہ قارہ کا ایک گروہ مدینہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: ''ہم میں اسلام تو موجود ہے (مگر ہم دین سے پوری طرح آگاہ نہیں، لہٰذا) اپنے کچھ آدمیوں کو ہمارے ساتھ بھیجیے تاکہ وہ ہمیں ہمارا دین سمجھائیں، ہمیں قرآن پڑھائیں اور شریعت اسلامیہ کی تعلیم دیں۔''[2]

معلوم ہوتا ہے کہ قبیلہ ہذیل نے مسلمانوں سے خالد بن سفیان ہذلی کا بدلہ لینے کی کوشش میں دھوکا دہی اور بدعہدی کا سہارا لیا تھا۔ واقدی نے تو بالیقین یہ سبب ذکر کیا ہے کہ قبیلہ ہذیل کے ذیلی قبیلے بنولحیان سے کچھ افراد بنوعضل اور قارہ کے پاس گئے اور انھیں اس ضمن میں معاوضے کی پیش کش کی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس جائیں، اور دعوتِ اسلام اور دین میں سمجھ بوجھ حاصل کرنے کے لیے ان سے کچھ لوگ طلب کریں، جبکہ ہم ان کی گھات میں رہیں گے اور انھیں قید کرکے اہل مکہ کو فروخت کرکے ان سے مال وصول کریں گے۔[3]

رسول اللہ ﷺ نے 10 افراد پر مشتمل ایک دستہ تشکیل دیا اور ان پر عاصم بن ثابت بن ابو افلح کو امیر بنا کر روانہ فرمایا۔[4]

---

1 صحيح البخاري، حديث: 4086. 2 المغازي للواقدي: 355,354/1، مؤلف نے یہاں صحیح روایات کا لکھ کر بعد میں واقدی کا حوالہ دیا ہے، جبکہ واقدی خود بھی اصول حدیث کی رو سے نااہل ہیں۔ علاوہ ازیں واقدی نے اس بحث کے آغاز میں سب سے پہلے وہی سبب ذکر کیا ہے جسے امام بخاری رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔ دیکھیے: (المغازي للواقدي: 301/1) بہر حال صحیح بخاری کی روایت کو ہر لحاظ سے ترجیح حاصل ہے۔ 3 نضرة النعيم: 314/1، والمغازي للواقدي: 355,354/1. 4 صحيح البخاري، حديث: 3989، (البتہ یہاں یہ صراحت ہے کہ یہ جاسوسی دستہ تھا جیسا کہ مؤلف نے قبل ازیں خود بھی وضاحت کی ہے۔)

یہ جب عسفان اور مکہ کے درمیان پہنچے تو بنولحیان کے تقریباً دو سو جنگجوؤں نے ان پر حملہ کر دیا۔ اور ہر طرف سے گھیرے میں لے کر ایک ٹیلے پر انھیں محصور کر دیا، پھر انھیں قتل نہ کرنے کی امان دی لیکن مسلمانوں کے امیر عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کفار کی امان کو ٹھکرا کر ٹیلے سے اترنے سے انکار کر دیا۔[1]

حضرت عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ نے واضح الفاظ میں کہا کہ میں نے تو نذر مان رکھی ہے کہ کبھی مشرک کی امان قبول نہیں کروں گا، چنانچہ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ ان سے لڑتے ہوئے یہ اشعار کہنے لگے:

"مجھ میں کیا کمی ہے! میں تو ایک ماہر تیرانداز ہوں۔ تیر موجود ہیں اور قوس میں سخت تانت لگی ہوئی ہے۔

اس سے تیز دھار اور طویل وعریض تیر تیزی سے نکل سکتے ہیں۔ موت تو برحق ہے مگر زندگی ایک ناپائیدار چیز ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جو بھی مقدر کر رکھا ہے وہ آدمی پر نازل ہو کر رہے گا اور انسان کو بہرصورت اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

اگر میں تم سے مقابلہ نہ کروں تو میری ماں بچے کو گم پانے کا صدمہ اٹھائے۔"[2]

یہ اشعار کہتے ہوئے انھوں نے دشمن پر تیر برسائے حتی کہ تمام تیر ختم ہو گئے، پھر نیزے سے لڑے حتی کہ نیزہ ٹوٹ گیا۔ اور صرف تلوار بچی تو دعا کرنے لگے: "اے میرے اللہ! میں دن کے آغاز سے تیرے دین کی حفاظت میں مصروف ہوں۔ میری دعا ہے کہ اب دن کے آخر میں تو میرے جسم کو محفوظ فرما۔" یہ دعا انھوں نے اس لیے کی کہ دشمن ہر مقتول کو ننگا کر دیتے تھے۔ اس دعا کے بعد انھوں نے اپنی تلوار کا نیام توڑ دیا اور شہادت تک لڑتے رہے۔ شہادت سے پہلے انھوں نے دو مشرکوں کو زخمی اور ایک کو قتل کیا۔ آپ

1 نضرة النعيم:1/314. 2 المغازي للواقدي:1/355.

لڑتے جاتے اور ساتھ ساتھ یہ کہتے جاتے تھے:

''میں ابوسلیمان ہوں اور مجھ جیسا تیر انداز کون ہے؟ اور میری قوم شریف لوگوں کی قوم ہے۔''

بالآخر سب مشرکوں نے ان میں اپنے نیزے گاڑ دیے اور انھیں شہید کر دیا۔

جنگ احد میں سلافہ بنت سعد بن شُہید کا خاوند اور چار بیٹے قتل ہوئے تھے۔ ان میں سے حارث اور مسافع کو حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے قتل کیا تھا۔ اس پر اس عورت نے نذر مانی تھی کہ اگر میں عاصم بن ثابت کا سر حاصل کر سکی تو اس کا کاسہ بنا کر اس میں شراب پیوں گی۔ اور سر لانے والے کو ایک سو اونٹنیاں انعام دوں گی۔ یہ بات عام عرب اور بنولحیان کو بھی معلوم تھی، چنانچہ انھوں نے چاہا کہ ان کا سر کاٹ کر لے جائیں اور سلافہ بنت سعد سے انعام وصول کریں۔ ادھر اللہ تعالیٰ نے شہد کی مکھیوں کا غول بھیج دیا جس نے انھیں میت کے قریب نہ آنے دیا۔ وہ اتنی تعداد میں تھیں کہ کوئی میت کے قریب ہی نہ آ سکا۔ کوئی کوشش بھی کرتا تو وہ اس کے چہرے پر ڈنک مارتیں۔ یہ صورت حال دیکھ کر انھوں نے کہا کہ شام ہونے دو، اس وقت تک مکھیاں چلی جائیں گی۔ رات ہونے لگی تو اللہ تعالیٰ نے پانی کا ریلا بھیجا، حالانکہ اس وقت کسی جانب بھی بادل نہ تھے۔ وہ سیلاب عاصم رضی اللہ عنہ کی میت بہا لے گیا۔ اور وہ نامراد رہ گئے۔ [1]

بنولحیان کی تیراندازی سے عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ سمیت سات آدمی شہید ہوئے۔ بعدازاں ان بدوؤں نے تین باقی رہ جانے والے اصحاب کو از سرِ نو پناہ دی۔ جسے ان تینوں نے قبول کر لیا مگر انھیں قابو میں کر لینے کے بعد ان سے بدعہدی کی تو عبداللہ بن طارق رضی اللہ عنہ نے ان سے مقابلہ کیا اور ان کے ہاتھوں وہ بھی شہید ہو گئے۔ دیگر دو حضرات

[1] المغازي للواقدي: 356/1، والسيرة النبوية لابن هشام: 180/3، ودلائل النبوة للبيهقي: 328/3.

خبیب اور زید بن دثنہ رضی اللہ عنہما کو مکہ لے جا کر انھوں نے قریش کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔[1]

یہ واقعہ صفر 4 ھ کو پیش آیا۔[2]

حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو حارث بن عامر بن نوفل کے بیٹوں نے خریدا تاکہ انھیں اپنے باپ حارث کے بدلے میں قتل کریں جسے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے بدر کے دن قتل کیا تھا۔ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ ایک مدت تک ان کی قید میں رہے۔ جب وہ خبیب رضی اللہ عنہ کے قتل کا فیصلہ کر چکے تو خبیب رضی اللہ عنہ نے حارث کی ایک بیٹی زینب سے صفائی کے لیے استرا مانگا۔ اس نے دے دیا۔ اس دوران زینب کی توجہ اپنے بیٹے سے ہٹ گئی تو وہ بچہ خبیب رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر ان کی ران پر بیٹھ گیا۔ زینب گھبرائی کہ کہیں یہ انتقامی طور پر بچے کو قتل نہ کر دے! حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے کہا: ''کیا تجھے خدشہ ہے کہ میں اس بچے کو مار ڈالوں گا؟ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ایسا کام مجھ سے کبھی نہ ہوگا۔'' زینب کہا کرتی تھی: ''میں نے خبیب سے زیادہ نیک کوئی نہیں دیکھا۔ میں اپنی آنکھوں سے دیکھتی کہ خبیب رضی اللہ عنہ انگور کا خوشہ کھا رہے ہوتے تھے، حالانکہ ان دنوں مکہ میں میوے کا نام تک نہ تھا۔ ویسے بھی وہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے (خود پھل لانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔) وہ تو اللہ تعالیٰ کا رزق تھا جو اس نے انھیں عطا کیا۔'' وہ لوگ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کے لیے حرم سے باہر لے گئے تو خبیب رضی اللہ عنہ نے کہا: ''مجھے دو رکعت نماز پڑھنے کی مہلت دے دو۔'' پھر نماز پڑھ کر ان سے کہنے لگے: ''اگر تم یہ خیال نہ کرو کہ میں موت سے گھبرا رہا ہوں تو میں اور نماز پڑھتا۔'' حضرت خبیب رضی اللہ عنہ ہی وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے تختۂ دار پر لٹکتے وقت دو رکعت نماز کا طریقہ جاری کیا۔[3]

پھر حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے یوں دعا کی:

---

1 تفصیل کے لیے دیکھیے: صحيح البخاري، حديث: 4086. 2 جوامع السيرة لابن حزم، ص: 176. 3 صحيح البخاري، حديث: 4068، و السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 399/1.

«اَللّٰهُمَّ! أَحْصِهِمْ عَدَدًا وَّاقْتُلْهُمْ بَدَدًا وَّلَا تُبْقِ مِنْهُمْ أَحَدًا»

”اے میرے اللہ! ان سب کو گن گن کر علیحدہ علیحدہ کر کے مار اور ان میں سے کسی کو باقی نہ چھوڑ۔“

بعدازاں انھوں نے یہ اشعار کہے:

”لشکروں کے لشکر میرے اردگرد جمع ہوگئے ہیں اور انھوں نے اپنے قبائل کو بھی جمع کر کے بھرپور اکٹھا کرلیا ہے۔

سب کے سب مجھ پر اپنی دشمنی ظاہر کررہے ہیں اور میرے ساتھ زور آزمائی کررہے ہیں کیونکہ میں زنجیروں میں بندھا ہوا بے بس ہوں۔

اور انھوں نے اپنے بیٹوں اور عورتوں کو اکٹھا کرلیا ہے۔ اور میں ایک لمبے تنے کے قریب کردیا گیا ہوں۔

اپنی غریب الوطنی، درپیش مشکل اور جن لشکروں کو انھوں نے مجھے پھانسی دینے کے وقت جمع کرلیا ہے، میں ان سب کا شکوہ اللہ تعالیٰ ہی کے سامنے رکھتا ہوں۔

اے عرش والے! ان کے ناپاک عزائم پر مجھے صبر کی توفیق عطا فرما۔ انھوں نے میرے گوشت کے ٹکڑے کرڈالنے کا ارادہ کیا ہے اور میری ہر امید مایوسی میں بدل گئی ہے۔

انھوں نے مجھے کفر اختیار کرنے کا موقع دیا ہے اور دوسری صورت میں موت کی دھمکی دی ہے۔ میری آنکھوں نے آنسو بہائے ہیں مگر وہ گھبراہٹ کے نہیں۔

اور مجھے موت کا کوئی خوف نہیں۔ میں تو مرنے ہی والا ہوں اور بلاشبہ میرا لوٹنا اور واپسی تو میرے پروردگار ہی کی طرف ہے۔

جب میں حالتِ اسلام میں جامِ شہادت پی رہا ہوں تو راہِ الٰہ میں شہید ہوکر جس پہلو پر بھی گروں مجھے اس کی کوئی پروانہیں۔

یہ سب اللہ تعالیٰ کی راہ میں پیش آرہا ہے وہ اگر چاہے تو کٹے ہوئے، بکھرے

پڑے اور الگ الگ اعضاء میں بھی برکت ڈال دے۔
میں دشمن کے سامنے کسی قسم کی عاجزی اور گھبراہٹ ظاہر کرنے والا نہیں ہوں۔
میں تو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹ کر جا رہا ہوں۔‘‘[1]

اس وقت ابوسفیان (رضی اللہ عنہ) نے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ سے کہا: ’’کیا تمھیں یہ بات پسند آئے گی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے پاس ہوں تو ان کی گردن مار دی جائے اور تم اپنے اہل و عیال میں خوش و خرم رہو؟‘‘ انھوں نے جواب دیا: ’’اللہ کی قسم! مجھے تو یہ بھی گوارا نہیں کہ میں اپنے اہل و عیال میں رہوں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم جہاں ہیں وہاں رہتے ہوئے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی کانٹا چبھ جائے اور اس سے آپ تکلیف محسوس کریں۔‘‘[2]

اس کے بعد سیدنا خبیب رضی اللہ عنہ کو سولی پر لٹکا دیا گیا اور ان کی لاش کی نگرانی کے لیے آدمی مقرر کر دیے گئے۔ رات کے وقت حضرت عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ آئے، لاش اٹھا کر لے گئے اور دفن کر دی۔[3]

جن تین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مشرک بدوؤں نے پناہ دی تھی ان میں تیسرے حضرت زید بن دثنہ رضی اللہ عنہ تھے۔ انھیں صفوان بن امیہ نے خرید کر اپنے باپ کے بدلے میں قتل کر دیا کیونکہ اس کا باپ امیہ بدر میں مارا گیا تھا۔

ابوسفیان نے قتل کرنے سے پہلے ان سے پوچھا: ’’زید! تمھیں اللہ کی قسم! سچ سچ کہنا کیا تمھیں یہ بات پسند آئے گی کہ تمھاری جگہ اس وقت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے پاس ہوتے اور ان کی گردن مار دی جاتی اور تم اپنے اہل و عیال میں مزے سے رہ رہے ہوتے؟‘‘ انھوں نے کہا: ’’اللہ کی قسم! مجھے تو یہ بھی گوارا نہیں کہ میں اپنے اہل و عیال میں رہوں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جہاں آپ ہیں وہیں رہتے ہوئے کوئی کانٹا بھی چبھے جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف ہو۔‘‘ ابوسفیان بولا: ’’میں نے لوگوں میں کسی کو کسی سے اتنی محبت کرتے نہیں دیکھا

---

[1] زاد المعاد: 245/3، وفتح الباري، شرح الحديث: 4086، والسيرة النبوية لابن هشام: 185/3.
[2] زاد المعاد: 246,245/3. [3] زاد المعاد: 246,245/3.

جتنی محبت محمد (ﷺ) کے ساتھی محمد (ﷺ) سے کرتے ہیں۔‘‘ [1]

بعدازاں انھیں نسطاس نے شہید کردیا۔ [2]

یہ دردناک داستان چشمۂ ’’رجیع‘‘ کے پاس رقم ہوئی اس بنا پر اس کا یہی نام معروف ہوا۔

سانحۂ رجیع سے ماخوذ دروس و عبرتیں: چند اہم دروس درج ذیل ہیں:

❁ **حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے ذکر کردہ نکات:** حدیث سے یہ بات ثابت ہوئی کہ مسلمان قیدی اگر چاہے تو خود داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہ کہیں اس پر کافر کا بس نہ چلے، کافر کی امان قبول نہ کرے، اسی طرح اگر چاہے تو محاصرے کی صورت میں بھی گرفتاری نہ دے، خواہ اسے قتل کردیا جائے لیکن یہ اس صورت میں ہے جب وہ رخصت پر عمل نہ کرنا چاہے۔ بصورتِ دیگر رخصت پر عمل کرتے ہوئے اس کی امان میں آ بھی سکتا ہے۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ اس میں حرج نہیں ہے، جبکہ حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ اسے ناپسند کرتے تھے۔

اس واقعے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مشرکین کے ساتھ بھی عہد کی پاسداری کا خیال رکھنا چاہیے۔ ان کی اولاد کو مارنے یا قتل کرنے سے احتراز ضروری ہے۔ اور جسے قتل کرنا ہے اس کے ساتھ بھی نرمی کے برتاؤ کا حکم ہے۔ اسی طرح اس واقعے سے حسبِ ذیل احکام بھی معلوم ہوتے ہیں:

❁ اولیاء کی کرامات برحق ہیں۔

❁ مشرکین پر بلاتعیین بددعا درست ہے۔

❁ تختۂ دار پر لٹکتے وقت نماز پڑھنا۔

❁ موت سے قبل شعر گوئی درست ہے۔

---

1 السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 400/2، والسيرة النبوية لابن هشام: 181/3.

2 السيرة النبوية لابن هشام: 181/3.

❁ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کے یقین محکم اور دین کے ساتھ ان کی گہری وابستگی کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

❁ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اجروثواب سے نوازنے کے لیے اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو آزمائش سے گزارتا ہے۔ وہ آزمائش اس کے قدیم علم میں پہلے ہی سے طے ہوچکی ہوتی ہے کیونکہ اگر پروردگار نہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرسکتے۔

❁ اس قصے سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مسلمان کی دعا قبول ہوتی ہے، نیز زندگی میں اور موت کے بعد بھی مسلمان کی عزت وتکریم کرنی چاہیے۔ اس طرح اس پر غور کرنے سے دیگر فوائد ومسائل بھی معلوم ہوسکتے ہیں۔

❁ اللہ تعالیٰ نے شہادت کے شرف سے نوازنے کے لیے انھیں قتل ہونے سے تو نہیں بچایا، البتہ ان کے جسم کو مشرکین سے محفوظ رکھنے کی دعا قبول فرمالی اور اسی طرح ان کی لاش مبارک گوشت کاٹے جانے کی بے حرمتی سے بچ گئی۔[1]

❁ سپرداری یا موت تک لڑنے کا عزم: سابقہ واقعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ دشمن کے نرغے میں آجانے والے قیدی کو ان کی امان سے انکار کا حق حاصل ہے، اپنے بارے میں کافر کا حکم جاری ہونے سے بچنے کے لیے اس پر اپنی برتری کا اظہار کرتے ہوئے کافروں کی دسترس میں نہ آئے، خواہ قتل ہی کردیا جائے جیسا کہ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے کیا تھا۔ لیکن اگر رخصت سے فائدہ اٹھانا چاہے تو اسے ان کی امان قبول کرنے کا بھی حق حاصل ہے جیسا کہ حضرت خبیب اور حضرت زید رضی اللہ عنہما نے کیا تھا۔ لیکن مسلمان قیدی کو بھاگ نکلنے کا موقع مل جائے تو صحیح بات یہی ہے کہ اسے ان سے اپنی جان چھڑانی ضروری ہے، خواہ ان میں رہتے ہوئے اسے دین کے اظہار کا موقع بھی حاصل ہو کیونکہ قیدی بہرکیف کفار کے قبضے میں بے بس، لاچار اور ان کے زیر تسلط ہوتا ہے، لہٰذا اسے قید

[1] فتح الباري، شرح الحديث:4086.

اور غلامی کی اس حالت سے اپنے آپ کو چھٹکارا دلانا ضروری ہے۔[1]

نئے پیش آمدہ حالات وواقعات سے نپٹنے کے لیے یہ حدیث مسلمانوں کے لیے کئی ایک راہیں کھول رہی ہے کہ جب وہ مظلومانہ طور پر قید کر لیے جائیں تو انھیں قید میں رہنے کا اختیار ہے اور اگر قید کرنے والے سے انصاف کی توقع نہ ہو اور تسلط و حکمرانی بھی غیر اسلامی ہو تو مرتے دم تک کفار سے جنگ بھی ان کے اختیار میں ہے۔[2]

❁ **سنت نبوی کی عظمت اور مقام:** اس واقعے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سنت نبوی کی کس قدر تعظیم کرتے تھے۔ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ مشرکوں کی قید میں ہونے اور کسی صبح یا شام شہید کر دیے جانے کا علم رکھنے کے باوجود غیر ضروری بالوں کی صفائی کے متعلق طریقہ نبوی اپنانے کے کس قدر حریص تھے۔ جو لوگ امت کو درپیش حالات کا بہانہ بنا کر بہت سی سنتوں کو معمولی سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ایسے حالات میں سنتوں کو اپنانا مناسب نہیں ایسے لوگوں کے لیے سیدنا خبیب رضی اللہ عنہ کے طرزِ عمل میں نصیحت کا سامان موجود ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شریعت میں مکمل طور پر داخل ہونا، جس کے متعلق اکثر و بیشتر کہا جاتا ہے اور سنت پر عمل کرنے کا اہتمام یہ دونوں ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔[3]

❁ **منتہائے حیات تک اسلامی قوانین پر عملداری:** حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے حارث کی بیٹی سے صفائی کے لیے استرا مانگا تو اس نے انھیں وہ دے دیا۔ اس کا بیان ہے کہ میں بچے سے بے خبر ہوگئی اور وہ آہستہ آہستہ خبیب رضی اللہ عنہ کے پاس جا پہنچا۔ انھوں نے اسے اپنی ران پر بٹھا لیا۔ جب میں نے بچے کو اس حالت میں دیکھا تو میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی کیونکہ خبیب رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں استرا (بھی) تھا۔ میری یہ حالت دیکھ کر خبیب رضی اللہ عنہ کہنے

---

1 فقه السيرة للبوطي، ص: 189,188. 2 الأساس في السنة لسعيد حوّى: 622/2. 3 وقفات تربوية مع السيرة النبوية لأحمد فريد، ص: 234.

لگے: ''تمھیں ڈر ہے کہ میں اسے قتل کردوں گا؟ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ایسا ہرگز نہ ہوگا۔'' [1]

یہ عمدہ کردار روح کی بالیدگی، دل کی صفائی اور اسلامی منہج کے ساتھ گہرے تعلق کی علامت ہے، اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرَىٰ ﴾

''اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔'' [2]

صحیح اور سیدھی راہ پر قائم رہنا مسلمان کے کردار کا وہ فطرتی تقاضا ہے جس پر وہ دکھ اور سکھ، دونوں حالتوں میں قائم رہتا ہے۔ [3]

حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کی یہ بات: «مَا كُنْتُ لِأَفْعَلَ ذٰلِكَ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ» ''میں ایسا کام ان شاء اللہ ہرگز نہ کروں گا۔'' عربی ادب میں یہ اسلوب اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ یہ فعل ان سے سرزد ہونا تھا نہ ہی ان کے حاشیۂ خیال میں یہ بات تھی اور نہ ہی ان کی طرف سے اس کا کوئی امکان تھا، حالانکہ وہ بڑے کٹھن حالات سے گزر رہے تھے۔ اگرچہ ایسے پریشان کن حالات میں بسا اوقات ''ان شاء اللہ'' جان محفوظ کرنے یا ضرورت پوری کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اصل بنیاد دین سے وفاداری کرنا اور اپنے آپ کو مجرموں کی صف میں شامل ہونے سے بچانا ہے۔ ان خوبیوں کے سامنے اس قسم کے مفروضے اور خیالات کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ [4]

یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عظمت کی بلند ترین دلیل ہے کہ وہ جان کے دشمنوں اور ظلم و ستم ڈھانے والوں سے برتاؤ کرتے وقت بھی اخلاقِ عالیہ کا مظاہرہ کرتے تھے۔ یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کمالِ ایمان اور فہمِ اسلام کی واضح دلیل ہے۔ [5]

1 صحيح البخاري، حديث: 4086، وصحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 320.

2 بنيٓ إسرآءيل 15:17. 3 من معين السيرة لصالح الشامي، ص:259. 4 صور و عبر من الجهاد النبوي للدكتور فوزي فيض الله، ص: 153. 5 التاريخ الإسلامي للحميدي: 38/6.

❁ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نبی ﷺ سے والہانہ عقیدت: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نبی ﷺ سے کمال درجے کی محبت و عقیدت تھی۔ محبت دراصل کسی کی پوری معرفت کا ثمرہ ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ کی قدر و منزلت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خوب واقف تھے اور انھیں آپ ﷺ کی پوری معرفت حاصل تھی۔ اسی وجہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو آپ ﷺ سے محبت بھی بڑی لاجواب اور باکمال تھی۔[1]

واقعۂ رجیع میں ابوسفیان اور زید بن دثنہ رضی اللہ عنہ میں ہونے والی سنجیدہ گفتگو سے صحابہ کی نبی ﷺ سے محبت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ جب ابوسفیان نے ان سے پوچھا: ''کیا تم پسند کرتے ہو کہ اس وقت تمھاری جگہ ہمارے پاس محمد (ﷺ) ہوں اور تمھاری بجائے ان کی گردن ماری جائے اور تم اپنے گھر والوں کے ساتھ بخوشی رہو؟'' یہ سن کر حضرت زید بن دثنہ رضی اللہ عنہ گویا ہوئے:

«وَاللّٰهِ! مَا أُحِبُّ أَنَّ مُحَمَّدًا الْآنَ فِي مَكَانِهِ الَّذِي هُوَ فِيهِ تُصِيبُهُ شَوْكَةٌ وَّ إِنِّي جَالِسٌ فِي أَهْلِي»

''اللہ کی قسم! مجھے تو یہ بھی گوارا نہیں کہ میں اپنے اہل و عیال میں رہوں اور محمد ﷺ جہاں بھی ہوں وہاں آپ ﷺ کو کوئی کانٹا بھی چبھ جائے۔''[2]

رسول اللہ ﷺ سے محبت ایمان کا حصہ ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

«ثَلَاثٌ مَّنْ كُنَّ فِيهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْإِيمَانِ: مَنْ كَانَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا، وَمَنْ أَحَبَّ عَبْدًا لَّا يُحِبُّهُ إِلَّا لِلّٰهِ وَمَنْ يَّكْرَهُ أَنْ يَّعُودَ فِي الْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْقَذَهُ اللّٰهُ كَمَا يَكْرَهُ أَنْ يُّلْقٰى فِي النَّارِ»

''جس میں تین خوبیاں ہوں گی وہ ان کے باعث ایمان کی مٹھاس اور حلاوت

---

1 حقوق النبي ﷺ على أمته للدكتور محمد بن خليفة التميمي: 314/1. 2 صور و عبر من الجهاد النبوي للدكتور فوزي فيض الله، ص: 154.

پالے گا: ① جسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے سب سے بڑھ کر محبت ہو۔ ② جو اللہ تعالیٰ ہی کے لیے کسی شخص سے محبت رکھے۔ ③ جسے اللہ تعالیٰ نے کفر سے بچالیا ہے وہ کفر کی طرف لوٹنے کو ایسے ہی ناپسند سمجھے جیسے وہ آگ میں گر جانے کو ناپسند کرتا ہے۔''[1]

❁ بنولحیان کی مذمت میں حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے اشعار: رجیع میں شہید ہونے والوں کا مسلمانوں کو زبردست صدمہ پہنچا۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ اپنے اشعار کے ذریعے سے مسلمانوں کے احساسات واحوال کی تعبیر کرتے تھے۔ انھوں نے قابلِ مذمت لوگوں کی مذمت اور تعریف کے قابل لوگوں کی تعریف کی۔ بنولحیان کی مذمت میں حضرت حسان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

''اگر تمھیں بغیر کسی لگی لپٹی کے دھوکا دہی اور غداری کے اصل مفہوم سے آشنائی کا شوق ہو تو رجیع کے مقام پر جاؤ اور لحیان کی حویلی کے متعلق دریافت کرو۔

وہ ایسی قوم ہے جس نے اپنے قرب و جوار میں رہنے والوں کو ملیامیٹ کرنے کی ٹھان لی ہے، لگتا ہے ان کے نزدیک کتا، بندر اور انسان سب برابر ہیں۔

اگر کبھی کسی سانڈھ کو قوت گویائی حاصل ہو جائے تو کھڑا ہو کر وہ انھیں اسی قسم کی پٹیاں ہی پڑھائے گا اور وہ ان میں زیادہ شرف اور شان والا ثابت ہوگا۔''[2]

عامر بن طفیل کی ریشہ دوانیاں اور بئر معونہ کا دردناک واقعہ (4 ھ)

عامر بن طفیل بنو عامر کے سرداروں میں سے ایک نہایت متکبر اور خود پسند سردار تھا۔ یہ بادشاہی کی امید لگائے بیٹھا تھا۔ یہ دیکھ رہا تھا کہ عنقریب نبی اکرم ﷺ کو جزیرۂ عرب پر غلبہ اور اقتدار حاصل ہو جائے گا۔ یہی سوچ لے کر وہ آپ ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا: ''میں آپ کو تین امور کا اختیار دیتا ہوں: ① دیہی علاقوں پر آپ کی اور شہروں میں میری حکومت ہو۔ ② آپ کے بعد میں آپ کا خلیفہ اور جانشین بنوں۔ ③ یا پھر میں غطفان

1 صحيح البخاري، حديث: 21. 2 البداية والنهاية: 4/70.

کے ایک ہزار سرخ و زرد گھوڑوں اور ایک ہزار اونٹنیوں کے ساتھ آپ سے لڑوں گا۔"[1]

رسول اللہ ﷺ نے زمانۂ جاہلیت کے ان تمام مطالبات کو ٹھکرا دیا۔ انھی دنوں مدینہ منورہ میں بنو عامر کا سردار اور عامر بن طفیل کا چچا ابو براء عامر بن مالک، جو «ملاعبُ الأسنّة» (برچھیوں سے کھیلنے والا) کے نام سے معروف تھا، نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں ایک ہدیہ پیش کرنے کے لیے حاضر ہوا۔ آپ ﷺ نے اس پر اسلام کی دعوت پیش کی۔ اس نے قبول تو نہ کی مگر اس سے نفرت اور دوری کا اظہار بھی نہ کیا اور عرض کرنے لگا: "اے محمد (ﷺ)! اگر آپ اپنے ساتھیوں کو اہلِ نجد کے پاس بھیج دیں تو مجھے امید ہے کہ وہ آپ کا پیغام ضرور قبول کر لیں گے۔" آپ ﷺ نے فرمایا: «إِنِّي أَخْشٰى عَلَيْهِمْ أَهْلَ نَجْدٍ» "مجھے اپنے ان آدمیوں کے متعلق اہل نجد سے خدشہ ہے۔" ابو براء بولا: "میں ان کا حمایتی ہوں۔ آپ (فکر نہ کریں) جسے چاہتے ہیں اہل نجد کی طرف بھیج دیں۔"

آپ ﷺ نے ان کی طرف منذر بن عمرو رضی اللہ عنہ کے ساتھ دیگر صحابۂ کرام بھیج دیے۔ منذر رضی اللہ عنہ کو «الْمُعْنِقُ لِيَمُوتَ» یا «أَعْنَقَ الْمَوْتَ» (جذبۂ شہادت سے سرشار) کہا جاتا تھا۔ اسی اثنا میں عامر بن طفیل نے بنو عامر کو ان پر حملہ کرنے کے لیے پکارا مگر انھوں نے ابو براء کی طرف سے دی گئی پناہ کے پیشِ نظر اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ اس ناکامی کے بعد اس نے بنو سلیم کو حملہ کے لیے پکارنا شروع کر دیا۔ انھوں نے اسے قبول کر لیا۔ اور ان کے تقریباً ایک سو تیر انداز ان صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے پیچھے لگ گئے۔ انھوں نے بئر معونہ پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو جا لیا۔ وہاں انھیں تہ تیغ کرنا شروع کر دیا۔ صرف حضرت عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ ہی بچ سکے۔[2]

---

[1] صحيح البخاري، حديث:4091، و مسند أحمد:210/3. [2] صحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص:322، و صحيح مسلم، حديث:677، والسيرة النبوية لابن هشام:194,193/3، وصحيح البخاري، حديث:4088-4096. اور فتح الباری میں اس کی شرح دیکھنا نہ بھولیے۔ وہاں بڑی تفصیلات اور کام کی باتیں ہیں۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ اس واقعے کو ان الفاظ سے بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ لوگ آئے اور کہنے لگے: ''ہمارے ساتھ چند آدمی بھیج دیں جو ہمیں قرآن وسنت کی تعلیم دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ساتھ انصار کے ستر (70) آدمیوں کو روانہ فرمایا۔ انھیں قراء کہا جاتا تھا۔ ان میں میرے ماموں حرام بن ملحان رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ وہ لوگ قرآن مجید پڑھا کرتے تھے اور رات کے وقت ایک دوسرے سے اس کا مذاکرہ کرتے اور سیکھتے تھے۔ دن کو پانی لا کر مسجد میں رکھتے۔ لکڑیاں اکٹھی کر کے فروخت کرتے اور اس سے اہل صفہ اور فقراء کے لیے کھانا خریدتے۔ انھیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ان لوگوں کی درخواست پر) ان کی طرف تبلیغ کے لیے بھیج دیا۔ مگر مطلوبہ مقام تک پہنچنے سے پہلے ہی انھوں نے ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو شہید کر دیا، تو ان صحابہ نے دعا کی: ''اے اللہ! ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہماری طرف سے یہ پیغام پہنچا دے کہ ہم تجھ سے ملے اور تجھ سے راضی ہو گئے اور تو بھی ہم سے راضی ہے۔''

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص حرام رضی اللہ عنہ کے پاس پیچھے سے آیا اور انھیں نیزہ مارا جو ان کے آر پار ہو گیا، تب حضرت حرام رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ربّ کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہو گیا!''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے کہا:

«إِنَّ إِخْوَانَكُمْ قَدْ قُتِلُوا وَ إِنَّهُمْ قَالُوا: اَللّٰهُمَّ بَلِّغْ عَنَّا نَبِيَّنَا أَنَّا قَدْ لَقِينَاكَ فَرَضِينَا عَنْكَ وَ رَضِيتَ عَنَّا»

''تمھارے بھائی (جنھیں بھیجا گیا تھا وہ) شہید کر دیے گئے ہیں۔ انھوں نے یہ دعا کی تھی: ''اے اللہ تعالیٰ! ہمارے نبی کو ہماری جانب سے یہ بات پہنچا دے کہ ہم تجھ (اللہ تعالیٰ) سے ملے ہیں اور تجھ سے راضی ہو گئے اور تو ہم سے راضی ہو گیا ہے۔''[1]

حادثۂ بئر معونہ سے ماخوذ دروس وعبرتیں: اس الم ناک اور دکھ انگیز واقعے میں کئی نصیحتیں، عبرتیں اور حکمتیں ہیں:

1 صحیح مسلم، حدیث: 677، و مسند أحمد: 416/1، و دلائل النبوة للبیهقي: 344/3.

❁ **تبلیغ کے لیے قربانیاں ضروری ہیں:** ہم نے دیکھا کہ بئر معونہ کے حادثے میں شہید ہونے والے قراء سے ہذیل کے حلیفوں نے کس طرح دھوکا کیا۔ ان قراء کو آپ ﷺ نے تعلیم دینے اور دین سمجھانے کے لیے بھیجا تھا۔ اس موقع پر عامر بن طفیل نے ستر قراء کے ساتھ دھوکا کیا، جبکہ انھیں صرف اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت اور اس کا دین سمجھانے کے لیے بلایا گیا تھا۔ بئر معونہ کے دن بڑے ہولناک انداز سے انھیں ذبح کر دیا گیا۔ ان مصائب نے آپ ﷺ کے دل پر گہرا اثر چھوڑا یہاں تک کہ آپ ﷺ فجر کی نماز میں ایک ماہ تک سُلَیم کے قبائل پر، جنھوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کی تھی، قنوت نازلہ پڑھتے رہے۔[1]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مہینے تک مسلسل ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور صبح کی نماز میں قنوت پڑھی۔ آپ ﷺ ہر نماز کی آخری رکعت میں جب ''سمع اللہ لمن حمدہ'' کہتے تو بنوسلیم کے قبائل رِعل، ذکوان اور عُصَیَّہ کے خلاف بددعا کرتے اور مقتدی اس پر آمین کہتے۔[2]

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس سے پہلے ہم قنوت نہیں کرتے تھے۔ اس واقعے پر قنوت شروع ہوئی۔[3]

یہ واقعہ انتہائی المناک اور دلخراش تھا۔ اس کے باوجود اس سے مسلمانوں کی قوت میں کوئی کمی واقع ہوئی نہ دعوت الی اللہ کے بارے میں ان کے جوش اور ولولے میں کوئی فرق آیا۔ اور نہ ہی ایسے واقعات دین کی خدمت اور دعوت و عزیمت کی راہ میں رکاوٹ بنا کرتے ہیں کیونکہ دعوت کے اثرات اور فوائد کے سامنے خونوں اور جانوں کی حیثیت کچھ بھی نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دعوت کو نصرت اسی صورت میں ملتی ہے کہ اس راہ میں

---

1 صور و عبر من الجهاد النبوي للدكتور فوزي فيض الله، ص:151. 2 سنن أبي داود، حديث: 1443، و مسند أحمد:1/302,301، و صحيح ابن خزيمة، حديث: 618. 3 صحيح البخاري، حديث:4088.

جانیں کھپادی جائیں۔ ایسی مشکلات کے سامنے عزم و ہمت کی دیوار بن کر ڈٹ جانا اور دعوت کے لیے قربانیاں پیش کرنا ہی دعوت کے پھلنے پھولنے اور اسے غالب کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔

دعوت کے اس میدان میں قوت کا اظہار اور قربانیوں کے پیش کیے بغیر فقط نعرے اور کھوکھلے دعوے زبانی جمع خرچ اور بکھرے خیالات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ خیالات اور فلسفے کتابوں میں بند ہوتے ہیں، کہانیوں کی زینت بنتے ہیں اور بالآخر قصۂ پارینہ بن جاتے ہیں۔

رجیع اور بئر معونہ کے حادثات ہمیں اللہ کے دین اور اس کی طرف دعوت کے متعلق بھاری ذمہ داری کا سبق یاد دلاتے ہیں۔ علاوہ ازیں ان واقعات سے ان عظیم قربانیوں کی منظر کشی بھی ہمارے سامنے آجاتی ہے جنھیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے عقیدے، دین اور رضائے الٰہی کی خاطر پیش کرتے تھے۔

راحت، سعادت، بزرگی اور غلبے کی کچھ نہ کچھ قیمت ادا کرنا ہوتی ہے، جبکہ اس دعوت کی قیمت وہ پاکیزہ خون ہے جو اللہ کی راہ میں بہایا جاتا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کا نظام و شریعت نافذ ہو اور ہر طرف دین کا سکہ بٹھا دیا جائے۔[1]

❁ ربِّ کعبہ کی قسم میں کامیاب ہوگیا! یہ جملہ حضرت حرام بن ملحان رضی اللہ عنہ سے اس وقت صادر ہوا جب نیزہ ان کی پشت کو چیرتا ہوا سینے سے نکل گیا اور وہ اپنے خون آلود ہاتھوں سے اپنا چہرہ اور سر رنگ رہے تھے۔ اور کہہ رہے تھے: «فُزْتُ وَ رَبِّ الْكَعْبَةِ!» ’’رب کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہوگیا۔‘‘[2]

یہ منظر بڑے بڑے بہادر، حوصلہ مند اور جگر والے افراد پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ وہ بھی

1 صور و عبر من الجهاد النبوي للدكتور فوزي فيض الله، ص: 152. 2 صحيح البخاري، حديث: 4092،4091.

اپنے آپ کو ان عظیم اور قدآور شخصیات کے سامنے چھوٹا محسوس کرتے ہیں جن کے چہروں پر موت کی گھبراہٹ کے اثرات دور دور تک بھی نظر نہیں آتے۔ بلکہ ایسی حالت میں ان پر خوشی اور سرور کے جذبات اور سکون و اطمینان کے آثار واضح طور پر جھلک رہے ہوتے ہیں۔ [1]

اس کے متعلق سیدنا حرام بن ملحان رضی اللہ عنہ پر نیزے سے حملہ کرنے والا شخص جبار بن سلمی اپنا چشم دید واقعہ خود بیان کرتا ہے: ''مجھے جس چیز نے اسلام کی طرف راغب کیا وہ یہ تھی کہ بئر معونہ کے موقع پر میں نے ایک مسلمان کے کندھوں کے درمیان نیزہ مارا اور جب نیزے کی نوک اس کے سینے سے باہر نکلی تو میں نے اسے یہ کہتے ہوئے سنا: «فُزْتُ وَ رَبِّ الْکَعْبَةِ!» ''رب کعبہ کی قسم! میں مراد پا گیا۔'' یہ سن کر میں نے دل میں سوچا کہ اسے کون سی مراد مل گئی؟ کیا میں نے اسے قتل نہیں کر دیا؟ پھر میں نے اسی قول کے بارے میں دریافت کیا تو مجھے بتایا گیا کہ یہ کامیابی شہادت کے درجے پر فائز ہونے کی وجہ سے سمجھی جاتی ہے تو میں نے کہا: ''پھر تو واقعی اللہ کی قسم! وہ مراد پا گیا۔'' یہی بات جبار بن سلمی کے اسلام قبول کرنے کا سبب بن گئی۔ [2]

سیدنا حرام بن ملحان رضی اللہ عنہ کا یہ منفرد اور یگانۂ روزگار کردار ہمارے لیے ایک سوال چھوڑتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کیا شہید موت کی تکلیف محسوس کرتا ہے؟ اس سوال کا شافی جواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ان الفاظ میں ملتا ہے:

«مَا یَجِدُ الشَّهِیدُ مِنْ مَسِّ الْقَتْلِ إِلَّا کَمَا یَجِدُ أَحَدُکُمْ مِّنْ مَسِّ الْقَرْصَةِ»

''شہید ہونے والا شخص قتل ہونے کی صرف اتنی ہی تکلیف محسوس کرتا ہے جس قدر تم میں سے کوئی شخص چیونٹی کے کاٹنے سے درد محسوس کرتا ہے۔'' [3]

---

1 التاریخ الإسلامي للحمیدي: 50/6. 2 السیرة النبویة لابن هشام: 196/3، و دلائل النبوة للبیهقي: 353/3. اور ملاحظہ کیجیے: فتح الباري، شرح الحدیث: 4092,4091. 3 جامع الترمذي، حدیث: 1668، و السنن الکبریٰ للنسائي: 36/6، و سنن ابن ماجه، حدیث: 2802.

اللہ تعالیٰ کے ہاں شہید کے لیے خاص مقام و مرتبہ ہے۔ جیسے اللہ کی راہ میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے شہید گراں قیمت ادا کرتا ہے ایسے ہی اللہ تعالیٰ، جو انتہائی عدل پسند ہے، اس نے بھی بدلہ دینے میں ہرگز کوئی کمی نہیں فرمائی بلکہ اسے چھ انعامات سے نوازا ہے جن میں سے ایک انعام دنیا و مافیہا کے برابر ہے، چنانچہ حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لِلشَّهِيدِ عِنْدَ اللّٰهِ سِتُّ خِصَالٍ: يُغْفَرُ لَهُ فِي أَوَّلِ دُفْعَةٍ مِّنْ دَمِهِ، وَيُرٰى مَقْعَدَهُ مِنَ الْجَنَّةِ وَيُجَارُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ، وَيَأْمَنُ مِنَ الْفَزَعِ الْأَكْبَرِ، وَيُحَلّٰى حُلَّةَ الْإِيمَانِ وَيُزَوَّجُ مِنَ الْحُورِالْعِينِ وَيُشَفَّعُ فِي سَبْعِينَ إِنْسَانًا مِّنْ أَقَارِبِهِ»

''اللہ تعالیٰ کے ہاں شہید کے لیے چھ انعام ہیں: ① خون جاری ہوتے ہی اس کے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔ ② اسے جنت میں اس کا ٹھکانا دکھا دیا جاتا ہے۔ ③ اسے عذاب قبر سے محفوظ کر دیا جاتا ہے اور وہ بڑی گھبراہٹ سے بھی محفوظ رہے گا۔ ④ اسے ایمان کا جوڑا پہنایا جاتا ہے۔ ⑤ اس کا عقد موٹی موٹی خوبصورت آنکھوں والی حور سے کر دیا جاتا ہے۔ ⑥ اسے اپنے خاندان کے ستر اشخاص کی شفاعت کا حق عطا ہوتا ہے۔''[1]

یہ اعزازات اس واضح اور امتیازی نشان کے علاوہ ہیں جس کے ساتھ شہید روز قیامت آئے گا۔ اس وقت اس کا زخم اس دن کی طرح تازہ ہوگا جس دن وہ اسے لگا تھا۔ اس کا رنگ تو بظاہر خون کی طرح ہوگا مگر خوشبو کستوری جیسی ہوگی۔[2]

اسی طرح شہداء کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ ان کی زندگی ان کی شہادت کے ساتھ ہی

---

1 جامع الترمذي، حديث: 1663، و سنن ابن ماجه، حديث: 2799. 2 جامع الترمذي، حديث: 1656.

ختم نہیں ہو جاتی بلکہ وہ زندہ ہوتے ہیں اور رب کے پاس انھیں رزق پہنچایا جاتا ہے اور وہ نعمتوں سے مستفید ہوتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝﴾

"اور ان لوگوں کو مردہ خیال نہ کرو جو اللہ کے راستے میں مارے گئے ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں، انھیں ان کے رب کے ہاں رزق دیا جاتا ہے۔"[1]

* نبی مکرم ﷺ عالم الغیب نہیں تھے: بئر معونہ، رجیع اور اس قسم کے دیگر واقعات سے پتا چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ غیب نہیں جانتے تھے۔ جیسا کہ دیگر دلائل بھی اس حقیقت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَاۗءَ اللّٰهُ ۭ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْۗءُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝﴾

"کہہ دیجیے: میں اپنی جان کے لیے نفع اور نقصان کا اختیار نہیں رکھتا مگر جو اللہ چاہے اور اگر میں غیب جانتا ہوتا تو بہت سی بھلائیاں حاصل کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی، میں تو ڈرانے والا اور خوشخبری سنانے والا ہوں ان لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں۔"[2]

غیب صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، جبکہ انبیاء اور رسل علیہم السلام صرف اسی قدر ہی جانتے ہیں جس قدر انھیں اللہ تعالیٰ بتلا دیں۔[3] ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰي غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۝﴾

[1] آل عمرٰن 3:169۔ [2] الأعراف 7:188۔ [3] وقفات تربوية مع السيرة النبوية لأحمد فريد، ص: 237۔

''(وہی) عالم الغیب ہے، وہ اپنا غیب کسی پر ظاہر نہیں کرتا۔ سوائے کسی رسول کے جسے وہ پسند کرے، پھر بے شک وہ اس (رسول) کے آگے اور پیچھے نگہبان لگا دیتا ہے۔''[1]

❁ **عہد کی پاسداری:** حضرت عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ بئر معونہ کے موقع پر قید ہو گئے۔ جب عامر بن طفیل کو معلوم ہوا کہ وہ مُضَر قبیلے سے ہیں تو اس نے انھیں قید سے رہا کیا اور ان کی پیشانی کے بال کاٹ دیے۔ اور اس کی اپنی والدہ کے ذمے غلام آزاد کرنے کی جو نذر تھی اسے پورا کرنے کے لیے انھیں آزاد کر دیا۔ حضرت عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ جب مدینہ کا ارادہ کیے ہوئے راستے میں سایے تلے ٹھہرے تو وہاں بنو عامر کے دو آدمی بھی آ گئے۔ ان دونوں کے ہمراہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے امان نامہ موجود تھا۔ مگر عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ کو اس کا علم نہ تھا۔ وہ دونوں جب وہاں پڑاؤ کے لیے آ گئے تو وہ ان سے پوچھنے لگے: ''تم کس قبیلے سے تعلق رکھتے ہو؟'' دونوں نے جواب دیا: ''بنو عامر سے۔'' حضرت عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ نے انھیں کچھ نہ کہا مگر جب وہ سو گئے تو ان پر حملہ کر کے دونوں کو قتل کر دیا۔ ان کے دل میں خیال یہ تھا کہ میں نے ان دونوں کو قتل کر کے بنو عامر سے صحابہ رضی اللہ عنہم کے قتل کا بدلہ لے لیا ہے۔ جب عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر اس کی اطلاع دی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَقَدْ قَتَلْتَ قَتِيلَيْنِ لَأَدِيَنَّهُمَا»

''یقیناً تم نے دو آدمیوں کو (ناجائز) قتل کیا ہے، لہٰذا میں ان کی دیت ضرور ادا کروں گا۔''[2]

یہ کتنا بلند کردار ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو عامر کے ان دونوں آدمیوں کی دیت ادا کی جنھیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے امان نامہ مل چکا تھا مگر یہ بات عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ کے علم

---

1 الجن72:26، 27. 2 صحيح البخاري، حديث:4093، والسيرة النبوية لابن هشام:3/206.

میں نہ تھی تو انھوں نے دونوں کو قتل کر دیا تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ دھوکا بنو عامر کے دیگر لوگوں نے کیا تھا، اس وجہ سے آپ ﷺ نے انھیں مجرم نہیں ٹھہرایا اور دوسروں کا بدلہ ان سے نہ لیا۔ یہ ایفائے عہد کی بلند ترین مثال اور بڑا اعلیٰ نمونہ ہے۔

یہ عین ممکن تھا کہ رسول اللہ ﷺ حضرت عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ کے اس اقدامِ قتل کو اپنے شہداء کے انتقام کا ایک حصہ قرار دے دیتے کیونکہ مجرموں اور ظلم وستم کرنے والوں سے ایسا سلوک روا ہے لیکن آپ ﷺ نے کسی قوم کے کچھ لوگوں کے ظلم وستم کو دیگر بے گناہ افراد کے کھاتے میں ڈال کر انھیں مجرم نہیں ٹھہرایا۔ اسلام کی روشن اور اعلیٰ تعلیمات ہی نے آپ ﷺ اور مسلمانوں کی ان اخلاق عالیہ کی طرف رہنمائی کی ہے جن کی مثال بنی نوعِ انسان سے ملنا مشکل ہے۔[1]

عظمت کا نشان عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ: جب بئر معونہ کے موقع پر متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم شہید ہوگئے اور عمرو بن امیہ ضمری قید ہوئے تو عامر بن طفیل نے ان سے ایک شہید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا: ''یہ کون ہے؟'' عمرو رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ''یہ عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ ہیں۔'' عامر بولا: ''میں نے قتل ہوجانے کے بعد دیکھا کہ انھیں آسمان کی طرف اٹھالیا گیا ہے حتی کہ وہ بالکل آسمان کے قریب ہوگئے۔ اور پھر انھیں نیچے رکھ دیا گیا۔''[2]

حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا عامر بن طفیل کو قتل کرنے پر ابھارنا: شاعر رسول حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ عامر بن طفیل کے قتل پر ابھارتے ہیں، حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا تعلق خبر رساں ادارے سے تھا۔

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ دشمن پر اعصابی جنگ برپا رکھتے تھے۔ حضرت کعب بن مالک اور عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہما جیسے دیگر شعراء بھی ان کے ساتھ تھے۔ انھوں نے کافروں کے ہر قصیدے کا منہ توڑ جواب دیا۔ ان شعراء نے رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ کے

1 التاريخ الإسلامي للحميدي: 50/6. 2 صحيح البخاري، حديث: 4093.

ہر واقعے پر شعر کہے۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے یہودی سردار کعب بن اشرف کی تردید میں کہے گئے اشعار مشہور و معروف ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسلامی ریاست کے شعراء کا دھیان رکھتے اور جہاد کے شعبے میں ان کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ عصر حاضر کے مسلمان علماء، فقہاء، قائدین، سیاسی ذمے داروں اور عوامی حلقوں کا فرض بنتا ہے کہ اپنے ہاں کے شعراء کی کفالت کریں اور جہاد کے اس عظیم شعبے میں حصہ لینے پر ان کی حوصلہ افزائی کریں۔ [1]

حضرت حسان رضی اللہ عنہ کو بئر معونہ والوں کی خبر ہوئی تو انھوں نے ایسے اشعار کہے جنھیں بڑی شہرت ملی۔ ان شعروں میں انھوں نے ربیعہ بن عامر بن مالک کو عامر بن طفیل کے خلاف برانگیختہ کیا کہ اس نے تمھارے والد ابو براء عامر بن مالک کے عہد کو پامال کیا ہے۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے کہا:

"ہاں! کون میرا یہ پیغام ربیعہ کو پہنچائے گا جو تم نے میرے بعد زمانے میں نئی (بدعہدی) پیدا کی ہے۔

تمھارا والد ابو براء جو کردار کا غازی اور بڑے شرف والا ہے۔ تمھارا ماموں حکم بن سعد ہے۔

ام بنین کے بیٹو! کیا تمھیں کچھ خیال نہ آیا، حالانکہ تم اہل نجد کے سرداروں میں شمار ہوتے ہو۔

ابو براء کا عہد وفا توڑنے کے لیے عامر بن طفیل کی یہ زبردستی! اور غلطی سے جو کچھ ہو جائے وہ ارادتاً کرنے کی طرح نہیں ہوتا۔" [2]

عرب کے ہاں شعر تیروں، نیزوں اور تلواروں سے بھی زیاد موثر سمجھے جاتے تھے۔ یہ اشعار ربیعہ بن ابی براء کو پہنچے تو وہ اسی وقت اپنے باپ کا بدلہ لینے اٹھ کھڑا ہوا۔ جاتے ہی عامر بن طفیل پر اس نے ایسا حملہ کیا کہ وہ مرا تو نہیں مگر لہولہان ضرور ہو گیا۔ قوم اس پر ٹوٹ پڑی اور انھوں نے عامر سے کہا: "اس سے بدلہ لیجیے۔" عامر نے کہا: "میں درگزر کرتا ہوں۔ اور اگر زندہ رہا تو اس کے متعلق خود فیصلہ کروں گا۔" [3]

1 الأساس في السنة لسعيد حوّى: 656/2. 2 محمد رسول الله لصادق عرجون: 64/4.
3 صحيح البخاري، حديث:4091، وفتح الباري، شرح الحديث:4096.

حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے بئر معونہ کے شہداء بالخصوص منذر بن عمرو رضی اللہ عنہ پر اظہار تاسف کرتے ہوئے جو اشعار کہے تھے ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

''اپنی آنکھوں سے بے شمار آنسو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان شہ سواروں پر بہاؤ جو بئر معونہ میں شہید کر دیے گئے۔

جس روز وہ موت کا استقبال کر رہے تھے اور موت تقدیر کے فیصلے پر ان کا استقبال کر رہی تھی۔

بئر معونہ والوں کو موت ایسے لوگوں کی بدعہدی کی بنا پر آئی جن کے عہد و وفا کی رسی غداری سے بندھی ہوئی ہے۔

سخت افسوس ہے کہ منذر ہم سے منہ موڑ گیا۔ وہ بڑی تیزی اور نہایت صبر و استقلال سے موت کی جانب بڑھ گیا۔''[1]

❁ **عامر بن طفیل کی موت:** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عامر بن طفیل کے لیے بددعا کی جسے اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: «اَللّٰهُمَّ اكْفِنِي عَامِراً» ''اے میرے اللہ! مجھے عامر سے بے فکر کر دے۔''[2]

تب اس سرکش کو لاعلاج مرض لاحق ہوا جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے «غُدَّةٌ كَغُدَّةِ الْبَعِيرِ» ''اونٹ کی گلٹی جیسی گلٹی'' سے تعبیر کیا اور طاعون کا نام دیا۔[3]

یہ گلٹی کے طاعون کی خاص صورت تھی جس میں دوسری اقسام کی بنسبت درجہ حرارت بڑھ جاتا ہے۔ متاثرہ عضو کے آس پاس یا بغل کے نیچے گلٹیاں سی بن جاتی ہیں اور تلی بھی بڑی ہو جاتی ہے۔[4]

عامر بن طفیل کو یہ مرض اس کی قوم کی ایک عورت کے گھر لاحق ہوا اور وہ وہیں کا ہو کر رہ گیا۔

---

1 السيرة النبوية لابن هشام:209/3. 2 المعجم الكبير للطبراني، رقم الحديث:5724، ومجمع الزوائد:126,125/6. 3 فتح الباري، شرح الحديث:4091. 4 تعليق الدكتور قلعجي على دلائل النبوة للبيهقي:346/2.

یوں عامر بن طفیل کا جزیرۂ عرب پر حکمرانی کا خواب بکھر گیا۔ وہ لشکر جن کی اس نے نبی اکرم ﷺ کو دھمکی دی تھی، اس کے گلے میں موت کا ہار بن گئے۔ وہ اسے ایک عورت کے گھر میں بند کر کے اس خدشے سے ادھر ادھر ہو گئے کہ یہ متعدی مرض ہے کہیں انھیں بھی لاحق نہ ہو جائے۔ عامر بن طفیل کی عقل میں خلل آ گیا۔ وہ اپنے پاس موجود لوگوں کو چیخ چلا کر کہنے لگا: «غُدَّةٌ كَغُدَّةِ الْبَكْرِ فِي بَيْتِ امْرَأَةٍ مِنْ آلِ بَنِي فُلَانٍ إِئْتُونِي بِفَرَسِي» ”فلاں خاندان کی ایک عورت کے گھر میں اونٹ کی گلٹی جیسی گلٹی، میرا گھوڑا لاؤ۔“ چنانچہ گھوڑے کی پیٹھ پر اس کا دم نکل گیا۔[1]

یہ سرکش ضدی انسان پاگل ہو کر مر گیا۔ لوگ متعدی مرض کے خوف سے اسے چھوڑ کر جا چکے تھے۔[2]

نبی مکرم ﷺ کا زینب رضی اللہ عنہا اور ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے عقد اور دیگر واقعات

زینب بنت خزیمہ ام المساکین رضی اللہ عنہا سے عقد

یہ ہیں زینب بنت خزیمہ بن حارث ہلالیہ جو بنو عبد مناف بن ہلال بن عامر بن صعصعہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ زمانۂ جاہلیت میں مساکین کو بکثرت کھانا کھلانے کی بنا پر ام المساکین کہلائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ہجرت سے اکتیس ماہ بعد (3 ھ) رمضان المبارک میں ان سے عقد فرمایا۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا قریباً آٹھ ماہ آپ ﷺ کی رفاقت میں رہیں اور آپ ﷺ کی زندگی ہی میں، انتالیسویں ماہ، ربیع الثانی کے آخر میں وفات پا گئیں۔ مدینۃ الرسول ﷺ میں مدفون ہیں۔[3]

حضرت زینب رضی اللہ عنہا قبل ازیں حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے عقد میں تھیں۔ وہ جنگ

1 صحيح البخاري، حديث:4091. 2 السيرة النبوية للصوياني، ص:131. 3 تفسير القرطبي: 166/14.

احد میں شہید ہوگئے تو رسول اللہ ﷺ نے زینب رضی اللہ عنہا سے عقد فرمالیا۔ گویا آپ ﷺ نے ان کی عظمت کے اعتراف میں ان سے شادی کرلی۔[1]

ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح

یہ ہیں ہند بنت ابی امیہ حذافہ بن مغیرہ قریشیہ مخزومیہ۔ پہلے اپنے چچا زاد ابوعبداللہ بن عبدالاسد کے نکاح میں تھیں۔ ابوسلمہ بن عبدالاسد رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی برّہ بنت عبدالمطلب کے بیٹے اور آپ ﷺ کے رضاعی بھائی تھے۔ حضرت ابوسلمہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے دین و ایمان کی حفاظت کے لیے پہلے ہجرتِ حبشہ کی، پھر واپس مکہ مکرمہ آگئے اور جب نبی ﷺ نے اور دیگر مسلمانوں نے مدینہ ہجرت کی تو انھوں نے بھی مدینہ کا رخ کیا۔[2]

ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کا ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے ایک یادگار مکالمہ: حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا ایک روز جناب ابوسلمہ رضی اللہ عنہ سے کہنے لگیں: ''مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ کسی عورت کا خاوند فوت ہوجائے اور وہ عورت اس کے بعد عقد نہ کرے تو اللہ تعالیٰ انھیں جنت میں ضرور جمع فرما دے گا، آیئے ہم آپس میں عہد کریں کہ ایک دوسرے کے بعد عقد نہیں کریں گے۔''

حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''کیا تم میری بات تسلیم کروگی؟'' بولیں: ''بالکل'' حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''جب میں فوت ہو جاؤں تو تم عقد کر لینا۔'' انھوں نے پھر دعا مانگی:

«اَللّٰهُمَّ ارْزُقْ أُمَّ سَلَمَةَ بَعْدِي رَجُلًا خَيْرًا مِّنِّي لَا يَحْزُنُهَا وَلَا يُؤْذِيهَا»

''اے اللہ! میرے بعد ام سلمہ کو مجھ سے بہتر شوہر عطا کرنا جو اسے دکھ اور تکلیف نہ دے۔''

ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ جب ابوسلمہ رضی اللہ عنہ وفات پا گئے تو میں نے سوچا: ''ابوسلمہ سے بہتر کون ہوگا؟'' پھر زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے، دروازے

---

1 المفصل في أحكام المرأة للدكتور عبدالكريم زيدان: 469/11. 2 سير أعلام النبلاء: 202/2.

پر کھڑے ہوئے اور ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے چچا زاد یا بیٹے سے ان کا ہاتھ مانگا۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ''(کیا کروں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات تسلیم نہ کروں یا اولاد سمیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلی جاؤں۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگلے روز دوبارہ شادی کا پیغام لے کر آ گئے۔[1]

خاوند کی وفات پر ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی دعا: حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو اپنے خاوند سے بے حد محبت تھی۔ جب مشرکین سے جنگ[2] میں آنے والے زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے ابوسلمہ رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے تو ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! ابوسلمہ وفات پا گئے ہیں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«قُولِي: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِي وَلَهُ، وَأَعْقِبْنِي مِنْهُ عُقْبٰى حَسَنَةً»

''تم یوں دعا کیا کرو: ''اے اللہ مجھے اور اسے بخش دے اور مجھے اس سے اچھا بدلہ عطا فرما۔''

کہتی ہیں کہ میں نے یہ دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے مجھے ان سے اچھا بدلہ عطا کیا، یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم (کے نکاح میں آ گئی)۔[3]

ارادۂ نکاح کے وقت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات چیت: عمر بن ابوسلمہ رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی عدت پوری ہو گئی تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پیغام نکاح بھیجا۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے قبول نہ کیا، پھر عمر رضی اللہ عنہ نے پیغام بھیجا۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے اسے بھی قبول نہ کیا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچا تو مرحبا کہا اور پیغام لانے والے سے کہا کہ

1 سير أعلام النبلاء: 203/2. محقق کے بقول ابن سعد کی یہ روایت ہے اور اس کے رجال بھی ثقہ ہیں۔ 2 حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ غزوۂ بدر اور احد میں شریک ہوئے تھے۔ غزوۂ احد میں انھیں گہرے زخم آئے تھے۔ بعد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں بنو اسد کے خلاف ایک معرکہ میں بھیجا جہاں ان کے پرانے زخم تازہ ہو گئے اور زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے شہید ہو گئے۔ (الإصابة في تمييز الصحابة: 154/4)

3 صحيح مسلم، حديث: 919، ومسند أحمد: 291/6.

رسول اللہ ﷺ کو یہ بتا دیں: ''میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ غیرت مند بھی ہوں اور اس وقت یہاں میرا کوئی ولی بھی موجود نہیں۔'' آپ ﷺ نے جواباً فرمایا: «أَمَّا قَوْلُكِ: إِنِّي مُصْبِيَةٌ فَإِنَّ اللّٰهَ سَيَكْفِيكِ صِبْيَانَكِ وَأَمَّا قَوْلُكِ: إِنِّي غَيْرٰى، فَسَأَدْعُو اللّٰهَ أَنْ يُّذْهِبَ غَيْرَتَكِ، وَأَمَّا الْأَوْلِيَاءُ فَلَيْسَ أَحَدٌ مِّنْهُمْ إِلَّا سَيَرْضٰى بِي» ''تمھارا یہ کہنا کہ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں تو ان کے لیے اللہ تعالیٰ کافی ہے۔ تمھارا یہ خیال کہ میں بڑی باغیرت ہوں تو میں اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کروں گا۔ رہے ولی تو میرے متعلق تمھارے سب ولی رضامندی کا اظہار ہی کریں گے۔''[1]

ایک روایت میں ہے کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی: ''میں ادھیڑ عمر ہوں۔'' آپ ﷺ نے جواب دیا: «وَأَمَّا السِّنُّ فَأَنَا أَكْبَرُ مِنْكِ» ''میں عمر میں تم سے بڑا ہوں۔''[2] یہ جواب آپ ﷺ نے بڑا اچھا دیا اور آپ ﷺ تو تھے ہی بڑے اچھے بلکہ سب سے اچھے۔[3]

اس پر ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بیٹے عمر سے کہا: ''چلیے! رسول اللہ ﷺ سے عقد کا انتظام کیجیے۔''[4]

ابن کثیر رحمہ اللہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی اس بات: ''چلیے، عقد کا انتظام کیجیے۔'' پر کہتے ہیں: ''اس کا مقصود یہ تھا کہ میں اس کے لیے راضی ہوں اور اجازت دیتی ہوں۔ اس سے کچھ علماء نے سمجھ لیا کہ شاید وہ اتنے چھوٹے بچے کو نکاح طے کرنے کی ذمہ داری سونپ رہی ہیں۔ وہ بچہ تو بہت چھوٹا تھا اور اس کا اہل نہیں تھا۔'' امام ابن کثیر رحمہ اللہ مزید کہتے ہیں: ''میں نے اس کی تحقیق پر ایک کتابچہ لکھا ہے۔ میں نے اس میں وضاحت کی ہے کہ معاملات نکاح کی ذمہ داری ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے بڑے بیٹے سلمہ نے نبھائی تھی۔''[5]

---

1 مسند أحمد: 6/313، 314، والسنن الكبرىٰ للنسائي: 6/81، 82، وسير أعلام النبلاء: 2/203، 204. 2 الطبقات لابن سعد: 8/90 رجال ثقہ ہیں۔ 3 المفصل في أحكام المرأة للدكتور عبدالكريم زيدان: 11/470. 4 سير أعلام النبلاء: 2/203، 204. 5 البداية والنهاية: 4/92.

نکاح کے لیے گھریلو سامان کی تیاری اور ان سے معاملہ: نکاح کا معاملہ طے پا گیا تو آپ ﷺ نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے کہا:

«أَمَا إِنِّي لَا أَنْقُصُكِ شَيْئًا مِّمَّا أَعْطَيْتُ أُخْتَكِ فُلَانَةً، رَحَيَيْنِ وَجَرَّتَيْنِ وَ وِسَادَةً مِّنْ أَدَمٍ حَشْوُهَا لِيفٌ»

''میں نے تمھاری فلاں بہن کو جو کچھ دیا تھا تمھیں اس سے کم نہیں دوں گا، یعنی دو چکیاں، دو مٹکے اور کھجور کے پتوں سے بھرا ایک تکیہ۔''[1]

ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی تھی۔ اب رسول اللہ ﷺ سے نکاح ہو چکا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ جب آپ ﷺ تشریف لاتے تو ام سلمہ رضی اللہ عنہا اپنی بیٹی زینب کو دودھ پلانا شروع کر دیتیں۔ آپ ﷺ نہایت مہربان اور بڑے شرمیلے تھے۔ آپ واپس تشریف لے جاتے۔ ایسا ہوتا رہا۔ ام سلمہ کے ماں جائے بھائی عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما ان معاملات کو بھانپ گئے۔ انھوں نے اپنے ہاں یا کسی اور عورت کے ہاں بھانجی کی رضاعت کا انتظام کر دیا۔ نبی ﷺ تشریف لائے تو پوچھا: «أَيْنَ زُنَابُ» ''چھوٹی بچی کہاں ہے؟'' ام سلمہ کے پاس قریبہ بنت ابو امیہ کھڑی تھیں، وہ کہنے لگیں: ''اسے عمار بن یاسر نے لے لیا ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِنِّي آتِيكُمُ اللَّيْلَةَ» ''تو میں آج رات آؤں گا۔''

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے پسا ہوا آٹا جمع کرنے کی چادر چکی تلے بچھائی۔ مٹکے سے کچھ جو نکالے اور انھیں چربی میں ملایا۔ آپ ﷺ نے شب بسری کے بعد فرمایا: «إِنَّ بِكِ عَلٰى أَهْلِكِ كَرَامَةً فَإِنْ شِئْتِ سَبَّعْتُ لَكِ وَإِنْ أُسَبِّعْ لَكِ سَبَّعْتُ لِنِسَائِي وَإِنْ شِئْتِ ثَلَّثْتُ ثُمَّ دُرْتُ!» ''تم میرے نزدیک قابل احترام ہو، تم چاہو تو میں تمھارے پاس سات دن قیام کروں لیکن پھر دیگر ازواج کے پاس بھی سات دن ہی

[1] سير أعلام النبلاء: 204/2.

رہوں گا۔ اور اگر تم چاہو تو میں تمھارے پاس تین دن قیام کروں اور پھر معمول کے مطابق آؤں گا۔'' ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ''تین دن تک رہیے۔''[1]

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لِلْبِكْرِ سَبْعٌ وَّلِلثَّيِّبِ ثَلَاثٌ»

''غیر شادی شدہ (کنواری) کے لیے سات اور بیوہ کے لیے تین دن ہیں (اتنے ایام ان کے پاس رہا جائے)۔''[2]

شادی کرنے والے کی اگر پہلے سے بیوی موجود ہے تو وہ اپنی اس بیوی کے پاس اسی حساب سے قیام کرے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تین خوشگوار دن ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس رہے اور اس کے بعد معمول کے مطابق آنے لگے۔

برّہ بنت ابوسلمہ کے نام کی تبدیلی: اس یتیم بچی برّہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شادی کے بعد ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے تو وہ مجھے برّہ کے نام سے پکارتی تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَاتُزَكُّوا أَنْفُسَكُمْ، فَإِنَّ اللّٰهَ هُوَ أَعْلَمُ بِالْبَرَّةِ مِنْكُنَّ وَالْفَاجِرَةِ سَمِّيهَا زَيْنَبَ»

''اپنے آپ کی پاکیزگی نہ بیان کیا کرو، اللہ تعالیٰ نیک و بد کو خوب جانتا ہے۔ اس کا نام زینب رکھو۔'' ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ''یہ آج سے زینب ہے۔''[3]

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ آپ اچھے نام پسند فرماتے تھے۔ نہ صرف بچوں کے ناگوار نام تبدیل کر دیتے بلکہ مرد و خواتین اور بوڑھی عورتوں تک کے نام بھی تبدیل کر دیتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک آدمی کو شہاب (دہکتا ہوا انگارا) کے نام سے

---

1 صحيح مسلم، حديث: 1460، وسنن أبي داود، حديث: 2122. 2 صحيح مسلم، حديث: 1460. 3 صحيح مسلم، حديث: (19) 2142، والأدب المفرد، رقم: 821.

پکارا جا رہا تھا آپ نے فرمایا: «بَلْ أَنْتَ هِشَامٌ» ''نہیں بلکہ تم ہشام (سخاوت) ہو۔''[1]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف فرما تھے کہ ایک بڑھیا آئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: «مَنْ أَنْتِ؟» ''تم کون ہو؟'' اس نے بتایا: ''جثامہ مزنیہ ہوں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «بَلْ أَنْتِ حَسَّانَةُ الْمُزَنِيَّةُ! كَيْفَ أَنْتُمْ؟ كَيْفَ حَالُكُمْ؟ كَيْفَ كُنْتُمْ بَعْدَنَا؟» ''بلکہ تم حسانہ مزنیہ ہو، تم لوگ کیسے ہو؟ تمھارا کیا حال ہے؟ ہمارے بعد (ہجرت مدینہ کے بعد) کیسے رہے؟'' اس نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! آپ پر میرے ماں باپ قربان! ہم بہت اچھے رہے ہیں۔ اس دوران (پکا ہوا) گوشت آپ کی خدمت میں لایا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم (اپنے مبارک ہاتھوں سے) اس کی مہمان نوازی کرنے لگے۔ اس نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! آپ کے مبارک ہاتھ چکناہٹ والے نہ ہو جائیں!'' سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ جب وہ چلی گئیں تو میں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! ایک بڑھیا پر اتنی نوازش؟'' فرمایا: «إِنَّهَا كَانَتْ تَأْتِينَا زَمَنَ خَدِيجَةَ، وَإِنَّ حُسْنَ الْعَهْدِ مِنَ الْإِيمَانِ» ''جب خدیجہ زندہ تھیں تو یہ ہمارے پاس آیا کرتی تھیں۔ گزرے ہوئے اچھے وقت کی یاد تازہ کرنا بھی تو ایمان ہے۔''[2]

ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے شادی کی حکمت: تفسیر المنار کے مولف نے لکھا ہے کہ اس شادی کی حکمت صرف یہی نہیں تھی کہ جائز خواہش کو پورا کر لیا جائے بلکہ اس کی حکمت تب واضح ہو گی جب آدمی ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی اس صائب رائے پر غور کرے جو انھوں نے ''حدیبیہ'' کے روز دی تھی۔ علاوہ ازیں انھوں نے خاوند کی وفات پر صبر جمیل کیا تھا جو اللہ تعالیٰ کو بہت پسند آیا۔[3]

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا قریش کی معزز شاخ بنو مخزوم سے تعلق رکھتی تھیں۔ قریش میں حرب و ضرب کے معاملات بنو مخزوم کے سپرد تھے۔ یوں وہ آپ سے جنگ

1 مسند أحمد: 75/6، والأدب المفرد، رقم: 825، ومجمع الزوائد: 51/8. 2 شعب الإيمان للبيهقي، رقم: 9122، والمستدرك للحاكم: 16/1، والسلسلة الصحيحة: 424/1، حديث: 216.
3 تفسير المنار: 372/4.

کرنے اور دشمنی کے اظہار میں پیش پیش رہتے تھے۔ اس شادی سے بنومخزوم کا کینہ فرو ہوا اور ان کے دل قریب ہو گئے۔ یہ شادی ان کی محبت کی بنیاد بنی تا کہ آپ ﷺ کے سسرال بننے کا شرف حاصل کرنے کے بعد وہ اسلام میں بھی داخل ہو جائیں۔ [1]

اس شادی سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ مجموعی طور پر امت کی اندرونی حالت بہت اچھی تھی۔ رسول اللہ ﷺ شہداء کی ازواج کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ازواج شہداء کا حق تھا کہ نور نبوت سے فیض یابی کے بعد انھیں پیغام رسالت کے پہنچانے کا موقع دیا جاتا۔ [2]

امہات المومنین رضی اللہ عنہن میں ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے سب سے آخر میں (61 ہجری میں) وفات پائی۔ ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے 388 مرفوع احادیث مروی ہیں، جبکہ صحیح بخاری میں 3 اور صحیح مسلم میں 13 احادیث ہیں۔ [3]

ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے علم و حکمت کی ترویج و اشاعت میں نمایاں کردار ادا کیا اور اسلامی تعلیمات کی روشنی پھیلانے میں دوسرے راویوں کے ہمراہ بھرپور حصہ لیا۔ نور ہدایت اور علم و حکمت کا یہ آخری چراغ ان کی وفات کے ساتھ ہی بجھ گیا۔ [4]

حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کی پیدائش

امام قرطبی کا بیان ہے کہ حسن رضی اللہ عنہ 4 ھ شعبان میں پیدا ہوئے۔ یوں حضرت حسین رضی اللہ عنہ، حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بعد ایک سال کے اندر اندر تولد ہوئے۔ اسے واقدی کے اس بیان سے بھی تائید ملتی ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا جناب حسن رضی اللہ عنہ کی پیدائش کے پچاس دن بعد دوبارہ حاملہ ہوئیں۔ امام نووی نے التہذیب میں صراحت کی ہے کہ حضرت حسن 5 شعبان 4 ھ کو پیدا ہوئے۔ [5]

1 التربية القيادية للدكتور الغضبان: 356/3. 2 التربية القيادية للدكتور الغضبان: 357/3.
3 سيرأعلام النبلاء: 210/2. 4 السيرة النبوية لأبي شهبة: 249,248/2. 5 شذرات الذهب لابن العماد الحنبلي: 10/1.

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جب حسن پیدا ہوا تو میں نے اس کا نام حرب رکھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا: «أَرُونِي ابْنِي! مَا سَمَّيْتُمُوهُ؟» ''مجھے میرا بیٹا تو دکھاؤ، نام کیا رکھا ہے اس کا؟'' میں نے عرض کیا: ''حرب (جنگ) نام رکھا ہے۔'' فرمایا: «بَلْ هُوَ حَسَنٌ» ''نہیں، اس کا نام ''حسن'' ہے۔''[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت اور شدید نام کے بجائے خوش کن اور فرحت انگیز نام رکھ دیا۔ یوں بچے کو خوبصورت نام ملا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسن کو اٹھایا اور بوسہ دیا۔ ابو رافع بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسن کے دونوں کانوں میں نماز والی اذان کہی۔[2]

عقیقہ کے متعلق ان کا بیان ہے کہ جب حسن رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: ''میں اپنے بیٹے کا عقیقہ نہ کروں؟'' آپ نے فرمایا: «لَا وَلٰكِنِ احْلِقِي رَأْسَهُ وَتَصَدَّقِي بِوَزْنِ شَعْرِهِ مِنْ فِضَّةٍ عَلَى الْمَسَاكِينِ وَالْأَوْفَاضِ» ''نہیں، اس کا سر مونڈ دو اور بالوں کے ہم وزن چاندی مساکین اور ''اوفاض'' پر صدقہ کر دو۔'' ''اوفاض'' چند ضرورت مند صحابہ کرام تھے جو مسجد یا صفہ میں رہتے تھے، چنانچہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: میں نے ایسا ہی کیا۔[3]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کا عقیقہ خود کرنا چاہتے تھے، چنانچہ آپ نے دو مینڈھے ذبح کیے۔[4]

عقیقہ سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

---

[1] مسند أحمد: 98/1و118، والأدب المفرد، رقم: 823، والمعجم الكبير للطبراني، رقم: 2773، والمستدرك للحاكم: 180/3، وصحيح ابن حبان، رقم: 6958. [2] مسند أحمد: 9/6و392، وسنن أبي داود، حديث: 5105، وجامع الترمذي، حديث: 1514، علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو حسن کہا ہے، دیکھیے: (صحيح سنن أبي داود: 5105، وصحيح سنن الترمذي: 1514) [3] مسند أحمد: 391,390/6. [4] السنن الكبرىٰ للنسائي: 166/7، والسيرة النبوية للصوياني: 106/3.

«كُلُّ غُلَامٍ مُّرْتَهَنٌ بِعَقِيقَتِهِ، يُذْبَحُ عَنْهُ يَوْمَ سَابِعِهِ وَيُحْلَقُ رَأْسُهُ وَيُسَمّٰى»

''ہر بچہ اپنے عقیقہ کے عوض گروی رکھا ہوا ہے۔ ساتویں دن اس کی طرف سے جانور ذبح کیا جائے، سر مونڈا جائے اور نام رکھا جائے۔''[1]

یہود کی زبان سیکھنا

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ 4 ہجری میں یہود کی زبان سیکھتے ہیں۔ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے حوالے سے بیان کرتے ہیں: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں یہود کی زبان سیکھنے کا حکم دیا تاکہ جب یہود آپ کو خط لکھیں تو زید بن ثابت رضی اللہ عنہ خط پڑھ کر سنائیں۔''[2]

زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے یہ زبان پندرہ دن میں سیکھ لی۔ ایک روایت میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو زید کو آپ کی خدمت میں لایا گیا۔ لوگوں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! یہ بنو نجار کا نوجوان ہے۔ اسے آپ پر اترنے والی تقریباً انیس سورتیں یاد ہیں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر بڑی خوشی ہوئی۔ ان کی لیاقت دیکھ کر فرمایا: ''زید تم میرے لیے یہود کی زبان سیکھو۔ اللہ کی قسم! مجھے ان پر اعتبار نہیں۔'' حضرت زید رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ پھر پندرہ دن نہیں گزرے تھے کہ میں نے یہود کی زبان سیکھ لی اور اس میں ماہر ہو گیا، چنانچہ جب وہ آپ کو خط لکھتے تو میں ہی خط پڑھ کر سناتا اور آپ ان کا جواب دینا چاہتے تو میں آپ کے کہنے پر جواب لکھ دیتا۔[3]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت میں ترجمان کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ اسے معاملات

[1] مسند أحمد: 7/5و8و12و17و22، وسنن أبي داود، حديث: 2838,2837، وجامع الترمذي، حديث: 1522، وسنن ابن ماجه، حديث: 3165. [2] صحيح البخاري، حديث: 7195. [3] سنن أبي داود، حديث: 3645، ومسند أحمد: 186/5، والمستدرك للحاكم: 75/1.

حکومت کے اسرار سے باخبر ہونا ہے۔ یوں وہ حکومت کی طرف سے خطوط کا جواب دیتا ہے۔ یہ درست نہیں کہ حکومتی مراسلات کی اطلاع ہر کسی کو ہو مبادا اسرار حکومت کے فاش ہو جانے سے حکومتی امور میں گڑبڑ پیدا ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے زید رضی اللہ عنہ کو یہود کی بولی سیکھنے کا حکم دیا تھا۔ صرف پندرہ دن میں یہود کی بولی سیکھ جانا ان کے قوی حافظے اور ذہین و فطین ہونے کی واضح دلیل ہے۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ عہد نبوی ہی میں مکمل قرآن پاک حفظ کر چکے تھے اور وحی کے مشہور کاتبین میں شمار ہوتے تھے۔ عہد صدیقی میں بھی کتابت قرآن پاک کی ذمہ داری انھی کے سپرد ہوئی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں مصحف سے مزید نسخے تیار کرنے والوں میں ایک یہ بھی تھے۔

رسول اللہ ﷺ کی طرف سے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو یہود کی زبان سیکھنے کا حکم دینا اس امر کی دلیل ہے کہ اسلام مسلمانوں کو اغیار کے علوم و فنون اور زبانیں سیکھنے کی ترغیب دیتا ہے بالخصوص جبکہ اس کی ضرورت بھی ہو۔[1]

1 السيرة النبوية لأبي شهبة:249/2.

باب 2

یہود بنو نضیر کی جلاوطنی

یہود مدینہ نے کعب بن اشرف کے قتل اور معرکۂ احد کی درمیانی مدت بڑی مرعوبیت میں گزاری تھی، تاہم احد میں مسلمانوں کی شکست سے ان کی امیدیں پھر سے بر آئیں۔ یہود کے دلوں میں انجام بد کا خوف نہیں رہا تھا۔ بئر معونہ کا واقعہ بھی ان کی مرعوبیت اور گھبراہٹ کم کرنے کا سبب بنا تھا۔ یہود کی مرعوبیت زیادہ دیر نہ رہی اور وہ مکروفریب کے نئے انداز پھر سے اپنانے لگے۔ انھوں نے اپنے قلعے اسلحے سے بھر لینے اور مسلمانوں پر کاری ضرب لگانے کا ارادہ کرلیا۔[1]

غزوۂ بنو نضیر کی تاریخ اور اس کے اسباب

غزوۂ بنو نضیر کی تاریخ: اہل تحقیق کا خیال ہے کہ غزوۂ بنو نضیر غزوۂ احد کے بعد ربیع الاول 4 ہجری میں پیش آیا۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ غزوۂ بدر کے 6 ماہ بعد پیش آیا۔[2]

امام ابن قیم رحمہ اللہ اس کی تردید میں لکھتے ہیں: ''محمد بن شہاب زہری رحمہ اللہ کا خیال ہے کہ غزوۂ بنو نضیر بدر کے 6 ماہ بعد پیش آیا، تاہم ان کا یہ خیال درست نہیں۔ درست یہ ہے کہ غزوۂ بنو نضیر غزوۂ احد کے بعد پیش آیا۔ غزوۂ بدر کے 6 ماہ بعد غزوۂ بنو قینقاع پیش آیا تھا۔ غزوۂ بنو قریظہ، غزوۂ خندق کے بعد اور غزوۂ خیبر حدیبیہ کے بعد پیش آیا۔''[3] امام

1 التاريخ السياسي والعسكري للدكتور علي المعطي: 189,188. 2 صحيح البخاري، قبل الحديث: 4028. 3 زادالمعاد: 249/3.

ابن العربی کے بقول درست یہ ہے کہ غزوۂ بنونضیر غزوۂ احد کے بعد پیش آیا تھا۔ امام ابن کثیر کی رائے بھی یہی ہے۔[1]

غزوۂ بنونضیر کے اسباب: نبی مکرم ﷺ کئی ایک اسباب کی بنا پر اس جنگ کے لیے آمادہ ہوئے۔ ان میں سے چند اہم اسباب حسب ذیل ہیں:

❁ بنونضیر کی عہد شکنی: معاہدے کی رو سے بنونضیر پر لازم تھا کہ مسلمانوں کے دشمن کو جگہ نہ دیں، یہود نے نہ صرف معاہدے کی خلاف ورزی کی بلکہ دشمن کو مسلمانوں کے کمزور پہلوؤں سے بھی آگاہ کیا۔ ان کی بدعہدی غزوۂ سویق میں بھی سامنے آئی تھی۔ بدر کے بعد ابوسفیان نے نذر مانی تھی کہ مدینہ پر حملہ کرنے سے پہلے وہ غسل جنابت نہیں کرے گا۔ جب وہ دو سو سواروں کے ہمراہ مدینہ روانہ ہوا تو بنونضیر کے سردار سلام بن مشکم نے اس کی حمایت اور مہمان نوازی کی اور پوشیدہ امور سے مطلع کیا۔ مدینہ کے اسرار پر مامور عہدہ داران سے ہرگز بے خبر نہیں تھے۔[2]

صاحب مغازی موسیٰ بن عقبہ کہتے ہیں کہ بنونضیر نے قریش کو مسلمانوں کے راز فراہم کیے، آپ کے خلاف جنگ پر ابھارا اور کمزور پہلوؤں کی نشاندہی کی۔[3]

❁ رسول اللہ ﷺ پر اچانک حملے کا منصوبہ: رسول اللہ ﷺ چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہمراہ قباء کے راستے بنونضیر کی طرف روانہ ہوئے تاکہ ان دونوں عامریوں کی دیت میں ان سے تعاون حاصل کریں جو عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ کی بھول سے مارے گئے تھے۔ عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ کو یہ علم نہ تھا کہ انھیں تو رسول اللہ ﷺ پناہ دے چکے ہیں۔ آپ ﷺ اس معاہدے کی بنا پر بنونضیر کی طرف گئے جو دیت کی ادائیگی کے لیے آپ کے اور ان کے درمیان طے شدہ تھا۔

---

1 أحكام القرآن لابن العربي: 1765/4، وحديث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ للدكتور محمد بكر آل عابد: 254/1. 2 تاريخ الطبري: 284/2. 3 فتح الباري: 332/7.

بنونضیر نے رسول اللہ ﷺ کا بڑا پرتپاک اور مکارانہ استقبال کیا اور آپ ﷺ کو دھوکے سے قتل کرنے کی ناپاک سازش کی۔ ان کا ارادہ یہ تھا کہ آپ جس دیوار کے سایے میں تشریف فرما تھے اسی چھت سے آپ پر بڑا پتھر گرا دیا جائے۔ آپ چونکہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں تھے، اس لیے ان کے ارادۂ بد کی اطلاع آپ کو آسمان سے مل گئی۔ آپ فوراً اٹھے اور مدینہ منورہ تشریف لے آئے، بعد ازاں صحابہ کرام بھی پہنچ گئے۔[1]

صرف ذات رسول ﷺ بنونضیر کی سعی نامشکور کا ہدف نہ تھی بلکہ انھوں نے حکومت مدینہ اور اسلامی دعوت کو بھی نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے بنونضیر سے نمٹنے کا پختہ ارادہ کرلیا۔ آپ ﷺ نے جنگ کی تیاری کا حکم دیا اور کوچ کا اعلان کردیا۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر اس امر کا احسان جتایا کہ اس نے انھیں شر سے محفوظ رکھا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ ﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے اوپر اللہ کی نعمت یاد کرو، جب ایک قوم نے ارادہ کیا تھا کہ تمھاری طرف اپنے ہاتھ بڑھائیں تو اللہ نے انھیں تم پر ہاتھ ڈالنے سے روک دیا اور اللہ سے ڈرو اور ایمان والوں کو چاہیے کہ اللہ ہی پر بھروسا کریں۔''[2]

مفسرین نے اس آیت مبارکہ کی شان نزول کے سلسلے میں کئی روایات بیان کی ہیں، چند ایک حسب ذیل ہیں:

❁ مفسر طبری نے ابو زیاد کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ابوبکر، عمر اور علی رضی اللہ عنہم کے ہمراہ اپنے ساتھیوں کی دیت میں تعاون کی غرض سے بنونضیر کے ہاں تشریف

---

1 المغازي للواقدي: 365/1، والتاريخ السياسي والعسكري للدكتور علي المعطي، ص: 190.
2 المآئدة 11:5.

لے گئے۔ آپ نے انھیں فرمایا کہ اس ناگہانی دیت پر مجھ سے تعاون کریں تو انھوں نے کہا: ”ہاں ابو القاسم! آپ کا حق ہے کہ آپ ضرورت پڑنے پر ہمارے پاس آئیں۔ آپ تشریف رکھیے، پہلے کھانا کھایئے۔“ آپ صحابہ کے ساتھ انتظار میں بیٹھ گئے۔ ان کا لیڈر بھی آیا، (پھر وہ اپنے لوگوں کے پاس چلا گیا اور) اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا: آج یہ تمھارے قابو میں ہے۔ اس پر پتھر پھینکو اور قتل کر دو (نعوذ باللہ)۔ اس کے بعد تمھارا کوئی اندیشہ باقی نہیں رہے گا۔

وہ ایک بڑی چکی کا پاٹ اٹھا لائے کہ آپ پر گرا دیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں کو اس فعل بد سے روک رکھا۔ اتنے میں جبریل امین پہنچ گئے اور آپ کو وہاں سے اٹھا دیا۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ [1]

❁ ابن اسحاق، مجاہد اور عکرمہ کے علاوہ کئی ایک کا خیال ہے کہ یہ آیت مبارکہ بنو نضیر کے متعلق نازل ہوئی۔ [2]

نبی ﷺ عامریوں کی دیت کے حوالے سے تعاون کی غرض سے بنو نضیر کے ہاں گئے۔ انھوں نے عمرو بن جحاش کے سپرد یہ کام کیا تھا کہ اگر رسول اللہ ﷺ دیوار کے پاس بیٹھیں اور ہم ان کے پاس جمع ہوں تو تم اوپر سے چکی پھینک دینا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ان کے برے ارادے سے مطلع فرما دیا۔ آپ فوراً مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔ بعد میں صحابہ کرام بھی آ گئے۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ [3]

❁ ابن جریر طبری نے آیت مبارکہ کی شان نزول میں اسی واقعے کو ترجیح قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ آیت مبارکہ کے مفہوم کی وضاحت میں سب سے صحیح قول یہ ہے کہ اس آیت میں نعمت سے مراد وہ نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو اور صحابہ کو بنی نضیر کے ارادۂ بد سے

---

1 تفسير الطبري:6/145,144. 2 ان روایات میں قدرے ضعف ہے مگر مجموعی طور پر قابل حجت ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: المجتمع المدني في عهد النبوة للدكتور العمري، ص: 145. 3 تفسير ابن كثير: 2/31.

محفوظ رکھنے کے سلسلے میں مطلع فرمایا۔ اس روز رسول اللہ ﷺ عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں قتل ہونے والے دو آدمیوں کی دیت کے لیے بنونضیر کے ہاں گئے تھے۔ ان مقتولوں کی دیت آپ نے اپنے ذمے لی تھی۔ آیت مبارکہ کی شان نزول میں اسی واقعے کو ہم نے اس لیے زیادہ صحیح کہا ہے کہ آیت کے متصل بعد اللہ تعالیٰ نے یہود کے برے کردار، قبیح افعال، اللہ تعالیٰ اور دیگر انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ان کی خیانت کا تذکرہ فرمایا ہے۔[1]

ڈاکٹر محمد آل عابد نے بھی مفسر طبری کی تائید کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''بعید نہیں کہ یہ آیت مبارکہ پیش آمدہ تمام واقعات پر نازل ہوئی ہو کیونکہ جیسا کہ علماء کا خیال ہے، حوادث مختلف ہیں مگر مقصود ایک ہی ہے۔''

آیت کا مفہوم یہ ہوگا: ''تم پر اللہ تعالیٰ کا جو احسان ہے اسے یاد کرو، اس کا بڑا مظہر یہ ہے کہ اس نے یہود کے ہاتھوں کو تم تک پہنچنے سے روک رکھا۔ وہ اپنے ہاتھوں کو برے ارادے سے تمھاری طرف دراز کرنا چاہتے تھے اور قریب تھا کہ وہ اپنے برے ارادے کو عملی جامہ پہنا لیتے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی تدبیر کو ناکام کر دیا۔ اور تمھارے پیغمبر کو ان کے شر سے محفوظ رکھا۔''[2]

بعدازاں اللہ تعالیٰ نے تقویٰ اور اپنے اوپر کامل بھروسا و اعتماد کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور مومنوں کو اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرنا چاہیے۔

یعنی اے مومنو! اللہ تعالیٰ کے حقوق کی ادائیگی کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو۔ اور شکر گزاری میں کمی نہ آنے دو، اس نے تمھیں اپنی قدرت کا نظارہ کرا دیا ہے۔ اس اکیلے پر بھروسا رکھو۔ اس نے تمھیں اپنی کمال حفاظت دکھائی ہے اور مومنوں کو اس اکیلے پر بھروسا رکھنا چاہیے۔[3]

---

1 تفسير الطبري:145,144/6. 2 حديث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ للدكتور محمد بكر آل عابد:251/1. 3 حديث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ للدكتور محمد بكر آل عابد:252/1.

بنونضیر کا محاصرہ اور ان کی جلاوطنی

بنونضیر کو انتباہ: سیرت نبوی کی تمام معتبر کتب نے اس امر کا تذکرہ کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بنونضیر کو دس دن کے اندر اندر جلاوطن ہونے کا حکم دے دیا تھا۔ آپ ﷺ نے محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو ان کی طرف یہ حکم دے کر بھیجا کہ بنونضیر سے کہو: ''مجھے رسول اللہ ﷺ نے تمھاری طرف یہ پیغام دے کر بھیجا ہے کہ میرے علاقے سے نکل جاؤ، تم نے دھوکا دہی کی بنا پر اس عہد کو ختم کر دیا ہے جو میں نے تم سے کیا تھا۔ میں تمھیں دس دن کی مہلت دیتا ہوں۔ دس دن کے بعد تم میں سے جو بھی نظر آیا اس کی گردن اڑا دی جائے گی۔''[1]

رسول اللہ ﷺ کی بات کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ انھوں نے محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ سے صرف یہ کہا کہ ہمیں توقع نہیں تھی کہ قبیلہ اوس کا کوئی شخص اب یہ پیغام لے کر آئے گا۔ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''دل بدل چکے ہیں۔ اسلام نے (جاہلیت میں ہونے والے) تمام معاہدے ختم کر دیے ہیں۔'' انھوں نے کہا کہ ہم یہ برداشت کریں گے۔ (چلے جائیں گے)۔ اس کے بعد وہ چند دن تک کوچ کی تیاری کرتے رہے۔[2]

اس دوران میں عبداللہ بن ابی نے بنونضیر کو پیغام بھیجا کہ اپنی جگہ ٹھہرے رہو اور مت جاؤ، ہم تمھیں ان کے رحم و کرم پر ہرگز نہیں چھوڑیں گے۔ اور اگر تم پر جنگ مسلط کی گئی تو ہم تمھارے ساتھ مل کر لڑیں گے۔ تمھیں نکالا گیا تو ہم بھی تمھارے ساتھ نکل جائیں گے۔[3] تم مت جاؤ۔ میرے ساتھ عرب اور میری قوم کے دو ہزار افراد موجود ہیں۔ تم اپنی جگہ قائم رہو۔ وہ بھی تمھارے ساتھ تمھارے قلعوں میں رہیں گے۔ تم تک پہنچنے کے لیے انھیں ان دو ہزار افراد کی لاشوں سے گزرنا ہوگا۔[4]

اس پر یہود کو حوصلہ ملا۔ ان کے سردار حُیی بن اخطب نے ڈینگ مارتے ہوئے جُدَیّ

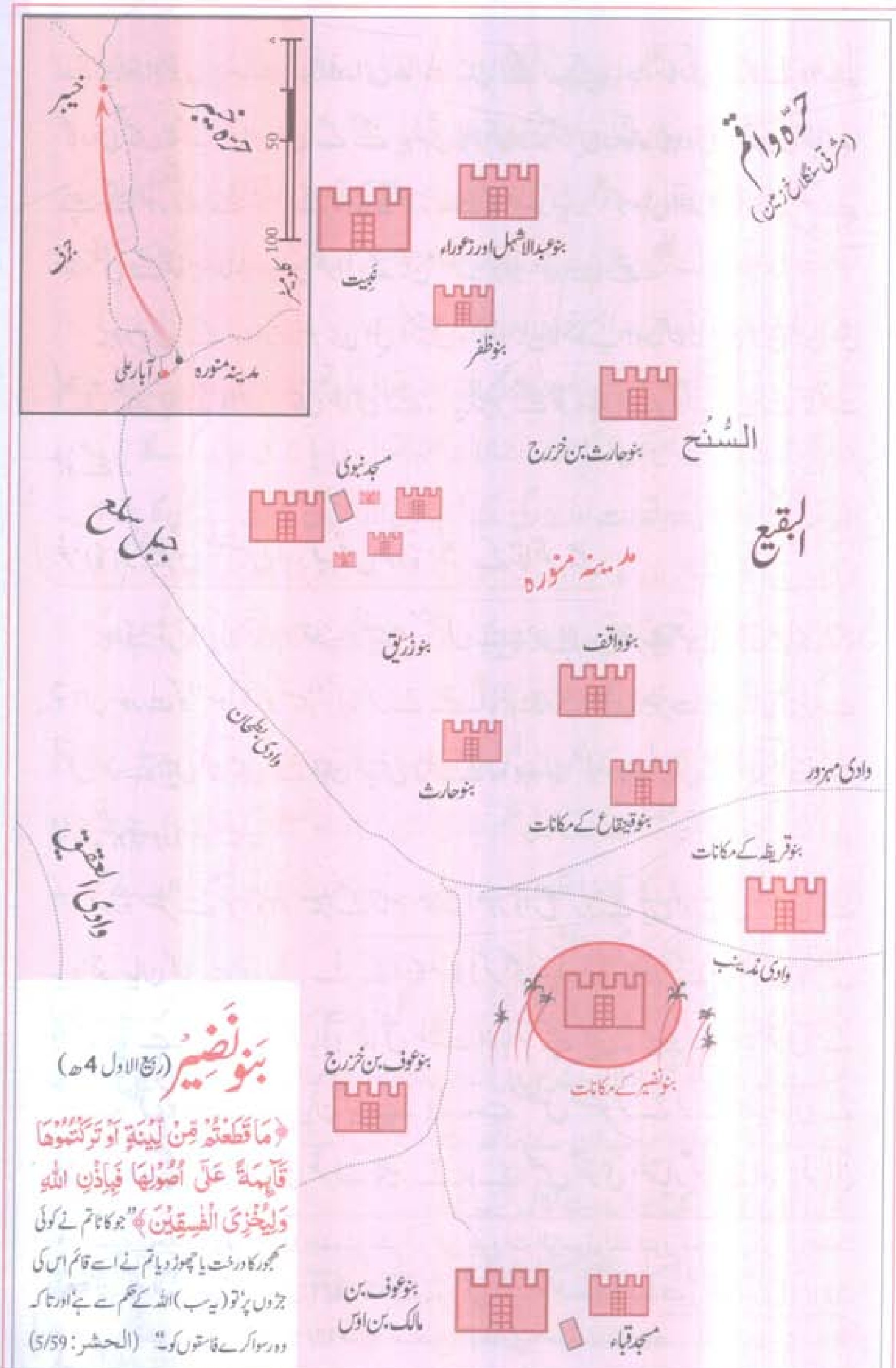
1 الطبقات لابن سعد: 57/2، والمغازي للواقدي: 1/363-370. 2 تاريخ الطبري: 552/2.
3 السيرة النبوية لابن هشام: 212/3. 4 تاريخ الطبري: 553/2.

بن اخطب کے ہاتھ نبی ﷺ کو پیغام بھیجا کہ ہم اپنے گھروں کو بالکل نہیں چھوڑیں گے۔ تم سے جو ہوسکتا ہے کرلو۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے بآواز بلند اللہ اکبر کہا اور صحابہ کرام نے بھی آپ کا ساتھ دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «حَارَبَتْ يَهُودُ» ''یہود جنگ کریں گے۔''[1]

محاصرہ اور جلاوطنی: دس دن گزر گئے لیکن بنونضیر اپنے گھروں سے نہ نکلے۔ اسلامی لشکر نے پیش قدمی کی اور پندرہ دن تک ان کا محاصرہ کیے رکھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے کھجوروں کے درخت جلانے کا حکم دیا اور ان کی جنگ کے وسائل و اموال پر کاری ضرب لگائی۔ یوں ان کی جنگی قوت کمزور پڑنے لگی۔ وہ گھبرا اٹھے اور چیخنے لگے: ''اے محمد (ﷺ)! آپ تو فساد سے منع کرتے اور فساد کرنے والے کو معیوب سمجھتے تھے۔ تو کیا کھجوروں کا کاٹنا فساد نہیں؟'' اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔ بنونضیر سمجھ گئے کہ جلا وطنی کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ناامیدی ان کے دلوں میں بیٹھ گئی۔ خاص طور پر جب عبداللہ بن ابی نے وعدہ تعاون کی خلاف ورزی کی اور دیگر یہود بھی ان کے کسی کام نہ آئے، چنانچہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ انھیں پرامن جلاوطنی کا موقع دیا جائے۔ آپ نے ان کا یہ مطالبہ تسلیم کرتے ہوئے فرمایا: «اُخْرُجُوا مِنْهَا، وَلَكُمْ دِمَائُكُمْ وَمَا حَمَلَتِ الْإِبِلُ إِلَّا الْحَلَقَةَ» ''مدینہ سے نکل جاؤ۔ تمھاری جانیں محفوظ رہیں گی۔ تمھارے اونٹ جتنا مال اٹھا سکیں وہ بھی لے جاؤ سوائے اسلحہ کے۔'' یہود کو سر تسلیم خم کرنا پڑا۔[2]

یہودیوں نے گھروں کی چھتیں، ستون اور دیواریں سب توڑ دیں تاکہ مسلمان ان سے فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ اپنے ساتھ وافر مقدار میں سونا چاندی لے گئے۔ سلام بن ابی الحقیق ایک بیل کے چمڑے میں سونا چاندی بھر کے لے گیا۔ وہ کہا کرتا تھا: ''ہم نے یہ سونا زندگی کے نشیب وفراز کے لیے رکھ چھوڑا تھا۔ کھجوریں خیبر میں بھی بہت ہیں۔''[3] یہودیوں

1 السيرة النبوية لابن كثير: 146/3. 2 حديث القرآن عن غزوات الرسول للدكتور محمد بكر آل عابد: 257/1. 3 السيرة الحلبية: 566/2.



بنو نَضِیر (ربیع الاول 4ھ)

﴿مَا قَطَعْتُم مِّن لِّينَةٍ أَوْ تَرَكْتُمُوهَا قَآئِمَةً عَلَىٰٓ أُصُولِهَا فَبِإِذْنِ اللَّهِ وَلِيُخْزِيَ الْفَٰسِقِينَ﴾ ”جو کاٹا تم نے کوئی کھجور کا درخت یا چھوڑ دیا تم نے اسے قائم اس کی جڑوں پر تو (یہ سب) اللہ کے حکم سے ہے اور تا کہ وہ رسوا کرے فاسقوں کو۔“ (الحشر: 5/59)

نے چھ سو اونٹوں پر سامان لادا اور اس حالت میں نکلے کہ پیچھے باجا، سارنگی اور گانے والیاں گا رہی تھیں تاکہ مسلمان ان کے نکلنے پر خوشی کا اظہار نہ کریں۔ کچھ یہودی تو خیبر کی جانب چلے گئے اور کچھ نے شام کے علاقے اذرعات کا قصد کیا۔[1] رسول اللہ ﷺ کے حکم سے جلاوطنی کے تمام معاملات کی نگرانی محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کر رہے تھے۔[2]

یہودیوں کے سردار سلام بن ابی الحقیق، حیی بن اخطب اور کنانہ بن ربیع بن ابی الحقیق خیبر جانے والوں میں شامل تھے۔ یہ خیبر گئے تو وہاں کے لوگ ان کے ماتحت ہو گئے۔[3]

غزوۂ بنو نضیر کی حکمتیں اور عبرتیں سورۂ حشر کے تناظر میں

سورۂ حشر تمام کی تمام واقعۂ بنو نضیر پر مشتمل ہے۔ حبر الامہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما تو اس سورت کو ''سورۂ بنو نضیر'' کہا کرتے تھے۔ امام بخاری رحمہ اللہ حضرت سعید بن جبیر سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے روبرو کہا: ''سورۃ الحشر'' انھوں نے کہا: ''بلکہ کہو: سورۂ بنو نضیر۔''[4]

سورۂ حشر نے غزوۂ بنو نضیر کے تمام متعلقہ امور واضح کر دیے ہیں اور بڑی تفصیل سے یہ واقعہ بیان کیا ہے اور مال فے کے احکام کا ذکر بھی کیا ہے۔ یہود سے منافقوں کا تعلق واضح کیا ہے۔ یہود کے نفسیاتی حقائق طشت از بام کیے ہیں۔ یہود سے منافقوں کے گہرے تعلق کو مثالوں سے بیان کیا ہے۔ جنگ سے متعلق گفتگو کرتے کرتے اللہ تعالیٰ نے خطاب کا رخ مسلمانوں کی طرف پھیرتے ہوئے انھیں تقویٰ اختیار کرنے اور نافرمانی

1 السيرة الحلبية: 565/2، وحديث القرآن عن غزوات الرسول للدكتور محمد بكر آل عابد: 257/1. 2 المغازي للواقدي: 374/1، واليهود في السنة المطهرة للدكتور الشقاري: 321/1.
3 السيرة النبوية لابن هشام: 212/3. 4 صحيح البخاري، حديث: 4029.

سے اجتناب کرنے کا حکم دیا ہے۔ بعدازاں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی بلند شان اور اپنے لائق بعض بلندوبالا صفات کا تذکرہ فرمایا ہے۔

مسلم معاشرہ واقعات وحوادث کے دوران اس طرح توحید، اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور روزِ قیامت کی تیاری کے منہج پر تربیت پا رہا تھا۔ سورۂ حشر پر غوروفکر کرنے سے کئی ایک حکمتیں اور عبرتیں سامنے آتی ہیں۔ اہم ترین درج ذیل ہیں:

اللہ تعالیٰ کی بزرگی کا تذکرہ: سورت کی ابتدا اللہ تعالیٰ کی تعریف سے ہوئی ہے اور یہ کہ تمام مخلوقات انسان، حیوان، نباتات، جمادات اللہ تعالیٰ کی پاکیزگی بیان کرتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، قدرت اور بزرگی کے شاہد ہیں اوراس کی عظمت کے گن گاتے ہیں۔ ارشاد ہے: ﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝﴾

”اللہ کے لیے تسبیح کرتی ہے جو چیز آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور وہی غالب ہے، خوب حکمت والا۔“[1]

ابتدا ہی میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ بڑی حکمت والا ہے وہ کوئی چیز بے فائدہ پیدا نہیں کرتا اور بغیر مصلحت کے کوئی حکم جاری نہیں کرتا۔ بنونضیر کے خلاف اپنے پیغمبر کی مدد کرنا بھی حکمت ہی کا تقاضا تھا۔ جب انھوں نے بدعہدی کی تو انھیں ان کے محبوب گھروں سے نکال باہر کیا گیا۔“[2]

رعب و دبدبہ بھی اللہ تعالیٰ کا ایک لشکر ہے: اگلی آیات مبارکہ پر غوروفکر کرنے سے پتا چلتا ہے کہ یہود بنونضیر کو ان کے گھروں سے مقام حشر کی جانب نکالنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے، جبکہ تمام مادی اسباب ان کے ساتھ تھے اور انھیں اپنے مضبوط قلعوں کی بنا پر یقین کامل تھا کہ کوئی انھیں یہاں سے نکال نہیں سکتا۔

لیکن اللہ تعالیٰ اسباب اور مسببات کا خالق ہے۔ اس نے انھیں ایسے پکڑا کہ ان کے

[1] الحشر 59:1. [2] تفسیر السعدي، ص:849,848.

وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا، وہ اپنے ہاتھوں اپنے گھر گرانے لگے۔ حوادث و واقعات پر اس انداز سے امت کی تربیت منفرد قرآنی اسلوب ہے جو عام سیرت نگاروں سے بالکل جدا ہے۔ یہ اسلوب اس لحاظ سے بھی ممتاز ہے کہ یہ حقائق کو کھولتا اور مخفی امور کو واضح کرتا ہے اور حوادث کا تعلق ان واقعات کے حقیقی فاعل اللہ رب العالمین سے جوڑتا ہے۔ اسی لیے یہاں واضح کر دیا کہ بنونضیر کو نکالنے والا درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

آیات مبارکہ نے تسلسل سے یہود بنونضیر کے تمام خیالات کو ظاہر کیا ہے اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ وہ تمام زمینی اسباب سے مالا مال تھے۔ لیکن انھیں شکست ایسی جگہ سے ملی جس سے وہ بالکل بے خوف تھے، یعنی اپنے ہی دلوں سے۔ رعب و دبدبہ ان کو اندر سے کھا گیا۔ اور وہ اچانک پستی میں گر گئے۔ لہٰذا ہر عقل مند انسان کو اس غزوے سے عبرت حاصل کرنی چاہیے اور اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ معاملات کا حقیقی تصرف محض اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ اس کی عظیم قدرت کے سامنے اسباب ٹھہر سکتے ہیں نہ مسببات۔ وہ تو ہر چیز پر قادر ہے۔ لوگوں پر لازم ٹھہرتا ہے کہ وہ اس عظیم ہستی کو دل سے تسلیم کریں۔ انھیں چاہیے کہ اپنے معاملات کی اصلاح کریں۔ یوں جب وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو بجا لائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے لیے تمام معاملات درست کر دے گا اور ان کے دشمنوں کو ایسی جگہ سے نکال باہر کر دے گا کہ انھیں وہم و گمان بھی نہ ہوگا۔

غزوۂ بنونضیر ہر دور میں امت کے لیے ایک سبق لیے ہوئے ہے کہ مدد کا رستہ انتہائی قریب ہے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ سے رجوع اور اسی پر اعتماد۔ اس کے احکام کو تسلیم کرنا اور اس کے حق کو تسلیم کرنا۔ مومن جب یہ بات جان لیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی ضرور مدد فرمائے گا، خواہ ان کا دشمن کتنا ہی قوی اور تعداد میں زیادہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کو تو کوئی چیز ہرا نہیں سکتی۔ اس امر کا ثبوت بنونضیر کا بے دخل ہونا ہے۔ یہ عبرت کی جا ہے۔ عقل مند وہی ہے جو غیر سے عبرت حاصل کرے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا کہ اگر وہ انھیں جلا وطنی کی سزا نہ دیتا تو قتل کی سزا سے دوچار کرتا۔ رہا معاملہ آخرت کا تو وہاں ان کے لیے آگ کا عذاب ہے۔[1]

دشمن کی مملوکہ اشیاء کو تباہ کرنا: رسول اللہ ﷺ لشکر کے ہمراہ بنونضیر کی جانب روانہ ہوئے تو وہاں پہنچ کر ان کا محاصرہ کر لیا۔ بنونضیر قلعہ بند ہوگئے تب آپ نے کھجوریں کاٹنے اور انھیں نذر آتش کرنے کا حکم دیا۔ انھوں نے آوازیں دیں: ''اے محمد (ﷺ)! آپ تو فساد سے منع کرتے اور فساد کرنے والے کو معیوب سمجھتے تھے تو یہ کھجوروں کا کاٹنا اور جلانا کیسا ہے؟'' تب اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک اتارا:

﴿مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ ۝﴾

''تم نے جو بھی کھجور کا درخت کاٹا یا اسے اس کی جڑوں پر کھڑا چھوڑ دیا تو (یہ) اللہ کے حکم سے ہے تاکہ وہ نافرمانوں کو رسوا کرے۔''[2]

الشیخ ابوزہرہ نے اسی آیت کے متعلق سیر حاصل بحث کی ہے۔ فقہاء کی آراء کا ذکر کرنے کے بعد انھوں نے لکھا: ''اصل تو یہ ہے کہ دوران جنگ درختوں کو نہ کاٹا جائے اور نہ عمارتوں کو خراب کیا جائے۔ جنگ کا اصل مقصد یہ نہیں ہوتا کہ عوام کو تکلیف میں مبتلا کیا جائے بلکہ صرف عوام کو ظالم حکمرانوں سے نجات دلانا مقصود ہوتا ہے۔ متعدد آیات و احادیث سے یہی چیز واضح ہوتی ہے۔

جب درخت کاٹنا اور عمارت گرانا جنگی ضرورت بن جائے جس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو، مثلاً: دشمن اس کے پیچھے چھپا ہو اور اسلامی لشکر کو ایذا رسانی کے لیے اسے وسیلہ بنا رہا ہو تو ایسی صورت حال میں درختوں کے کاٹنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا، اس لیے کہ اب وہ جنگی ضرورت کا حصہ بن چکا ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بنونضیر اور ثقیف کے محاصرے

[1] حديث القرآن عن غزوات الرسول للدكتور محمد بكر آل عابد: 1/270-271. [2] الحشر 59:5.

میں یہی طرز عمل اختیار کیا تھا۔

جن فقہاء نے عمارتیں گرانے یا درخت اکھاڑنے کی اجازت دی ان کے قول کو اس پر محمول کیا جائے گا۔ اس کی بنیاد محض دشمن کو تکلیف دینا یا فساد نہیں ہے۔ دشمن عوام نہیں بلکہ صرف وہ لوگ ہیں جو جنگ کے لیے ہتھیار اٹھائے ہوئے ہیں۔

اسلامی حکومت کے لیے مال کا بندوبست: بنونضیر کی جلاوطنی کے بعد مسلمانوں نے جو اموال قبضے میں لیے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کا حکم واضح کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○﴾

''اور اللہ نے ان سے اپنے رسول کی طرف جو مال لوٹایا تو اس کے لیے تم نے گھوڑے اور اونٹ نہیں دوڑائے لیکن اللہ اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے غلبہ دیتا ہے۔ اور اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے واضح کیا ہے کہ سخت جنگ لڑے بغیر بنونضیر سے حاصل شدہ اموال محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ مسلمان دشمن کی طرف صرف بڑھے تو تھے مگر نہ گھوڑے پر سوار ہوئے نہ اونٹ پر۔ مسلمانوں نے انھیں بغیر جنگ کے مغلوب کرلیا اور جلاوطن کر کے اموال غنیمت قبضے میں لے لیے۔ اور جہاں اللہ تعالیٰ نے چاہا رسول اللہ ﷺ نے یہ اموال صرف کیے۔

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«كَانَتْ أَمْوَالُ بَنِي النَّضِيرِ مِمَّا أَفَاءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُولِهِ ﷺ، مِمَّا لَمْ يُوجِفْ عَلَيْهِ الْمُسْلِمُونَ بِخَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ، فَكَانَتْ لِلنَّبِيِّ خَاصَّةً، فَكَانَ يُنْفِقُ عَلٰى أَهْلِهِ نَفَقَةَ سَنَةٍ وَّمَا بَقِيَ جَعَلَهُ فِي الْكُرَاعِ وَالسِّلَاحِ عُدَّةً فِي سَبِيلِ اللّٰهِ»

[1] الحشر 6:59.

"اللہ تعالیٰ نے بنونضیر کے مال اپنے رسول کو دیے، جبکہ مسلمانوں نے گھوڑوں اور اونٹوں سے ان کے خلاف چڑھائی نہیں کی تھی۔ ایسے اموال صرف رسول اللہ ﷺ کے تھے۔ آپ ان سے گھر کا سالانہ خرچ چلاتے اور جو بچ رہتا وہ ہتھیار اور گھوڑوں کی مد میں صرف کر دیتے۔"[1]

پھر اللہ تعالیٰ نے کافروں کی عام بستیوں سے حاصل شدہ مال فے کے احکام واضح فرما دیے۔ ارشاد ہوا:

﴿مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ﴾

"اللہ اپنے رسول کی طرف بستیوں والوں (کے مال) سے جو کچھ لوٹا دے، تو وہ اللہ کے لیے اور اس کے رسول کے لیے اور (اس کے) قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔"[2]

بنونضیر کے اموال فے صرف رسول اللہ ﷺ کے لیے تھے۔ آپ ان میں مرضی سے تصرف فرماتے، چنانچہ آپ ﷺ نے یہ اموال مسلمانوں پر احسان کرتے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ مصارف کی مد میں خرچ کر دیے۔ بنونضیر کے اموال ہاتھ آئے تو رسول اللہ ﷺ نے ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کو بلایا اور فرمایا: «اُدْعُ لِي قَوْمَكَ» "اپنی قوم کو میرے پاس بلاؤ۔" ثابت رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: "خزرج؟" فرمایا: «الْأَنْصَارُ كُلُّهَا» "تمام انصار کو۔" انھوں نے اوس و خزرج سب کو بلا لیا۔ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی شایان شان تعریف کی، انصار اور مہاجرین کے ساتھ ان کے حسن سلوک، گھروں اور مالوں میں حصہ دار بنانے اور انھیں اپنے اوپر ترجیح دینے کا تذکرہ فرمایا، پھر فرمایا: «إِنْ أَحْبَبْتُمْ قَسَمْتُ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الْمُهَاجِرِينَ مَا أَفَاءَ اللّٰهُ عَلَيَّ مِنْ بَنِي النَّضِيرِ وَكَانَ الْمُهَاجِرُونَ

1 صحيح مسلم، حديث: 1757. 2 الحشر 59:7.

عَلٰى مَا هُمْ عَلَيْهِ من السُّكْنٰى فِي مَنَازِلِكُمْ وَأَمْوَالِكُمْ، وَإِنْ أَحْبَبْتُمْ أَعْطَيْتُهُمْ وَخَرَجُوا مِنْ دُورِكُمْ» ''اگر تم چاہو تو میں بنونضیر سے حاصل شدہ مال فے تم میں اور مہاجرین میں تقسیم کردوں اور مہاجرین تمھارے جن گھروں اور اموال میں اس وقت حصے دار ہیں وہ ویسے ہی رہیں۔ اور اگر تم چاہو تو یہ اموال انھیں اس شرط پر دے دوں کہ وہ تمھارے گھروں سے الگ ہو جائیں۔''

تب حضرت سعد بن عبادہ اور حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہما نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! بلکہ یہ اموال ہم مہاجرین میں تقسیم کرتے ہیں اس پر کہ وہ ہمارے گھروں ہی میں رہیں جیسا کہ پہلے رہتے تھے۔'' تمام انصار نے تائیداً کہا: ''اے اللہ کے رسول! ہم اس پر راضی ہیں اور تسلیم کرتے ہیں۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مال فے مہاجرین میں تقسیم کیا اور دو انصاریوں ابو دجانہ اور سہل بن حنیف کے سوا کسی انصاری کو حصہ نہ دیا۔ انھیں بھی صرف ان کی ضرورت کی بنا پر دیا۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو علم تھا کہ مال فے میں تصرف کا حق صرف آپ ہی کو حاصل ہے، پھر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو جمع کیا اور ان کی رائے لی تاکہ اموال کی تقسیم کے متعلق ان کے دل مطمئن رہیں۔ سیاسی امور کے سلسلے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی عمدہ طرزِ عمل ہے۔

اس تقسیم کا مطلب صرف یہ تھا کہ انصار کے بوجھ کو کم کیا جائے۔ یوں مہاجرین بنونضیر کے گھروں میں جا بسے اور انصار کے گھر مالکوں کو واپس کر دیے گئے۔ بعض مہاجرین نے اپنے آپ کو غنی سمجھتے ہوئے اس تقسیم سے حصہ نہ لیا۔ مطلب یہ کہ مہاجرین کے معاشی حالات میں بتدریج بہتری آرہی تھی۔[2]

بنونضیر کے اموال کی تقسیم نے اسلامی حکومت کی مالی پالیسی میں اچھے اور مستحسن اقدام کا اضافہ کیا۔ اس سے پہلے جنگی غنیمتیں قرآن کے متعین کردہ خمس کے علاوہ صرف مجاہدین

1 السيرة النبوية لابن هشام:202,201/3. 2 فتح الباري، شرح الحديث:4030.

میں تقسیم ہوتی تھیں لیکن بنونضیر کے اس غزوے کے بعد غنائم کے متعلق نئی مالی پالیسی کا اضافہ ہوا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جنگی غنیمتیں نئی سیاسی پالیسی کے تحت دو اقسام کی ہو گئیں:

- وہ غنائم جو مجاہدین نے تلوار کے زور پر حاصل کی تھیں۔ یہ مال خمس کے سوا سارے کا سارا مجاہدین میں تقسیم ہونا قرار پایا۔
- وہ غنائم جو اللہ تعالیٰ نے بغیر جنگ کے مجاہدین کے ہاتھ میں دی تھیں، اس قسم کے مال کا مکمل اختیار اسلامی حکومت کے سربراہ کو حاصل ہے کہ وہ بتقاضائے مصلحت جہاں چاہے خرچ کرے، چاہے تو ملک کی اقتصادی حالت درست کرنے کے لیے خرچ کرے، فقرا کو فقیری کی دلدل سے نکالنے، اسلحہ خریدنے، نئے شہر آباد کرنے یا راستے درست کرنے پر خرچ کرے۔ مقصد یہ ہے کہ حاکم وقت کے پاس خاص بجٹ موجود ہے جو وہ خاص مصلحت کے تحت فی الفور خرچ کر سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بنونضیر کے اموال کی تقسیم کی حکمت واضح کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اس تقسیم میں کسی کو دیا گیا اور کسی کو محروم رکھا گیا تھا تاکہ مال صرف اغنیا ہی کے درمیان نہ گھومتا رہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ اموال کے متعلق اسلامی شریعت کی سیاست اسی قانون کے تابع ہے اور اسی مقصد کے حصول کے لیے ہے۔ اقتصاد سے متعلق اسلامی شریعت کی جملہ کتب اور ابحاث ایسا ہی معاشرہ قائم کرنے کی جستجو میں ہیں جو لوگوں کے مختلف طبقات کو قریب کرے اور جماعتوں میں اتحاد قائم کر سکے۔ اور ان اسباب کو ختم کرنے کی کوشش کرے جو رخنہ اندازی کا باعث بنتے اور انصاف کے عملی نفاذ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ اگر مال سے متعلق اسلامی شریعت کے احکام عملاً نافذ کر دیے جائیں، مثلاً: زکاۃ کا نظام، سود کی ممانعت، ذخیرہ اندوزی کے مختلف طریقوں کا انسداد تو بلاشبہ لوگ بڑی عمدہ گزر بسر کر سکیں۔ اس میں رزق کی اونچ نیچ تو ہو سکتی ہے مگر سب آسانی سے گزارہ کر

1 قراءة سياسية للسيرة النبوية للدكتور قلعجي، ص: 169۔

سکتے ہیں اور کوئی کسی پر بوجھ نہ بنے۔ اگر چہ سب آپس میں تعاون ضرور کریں گے۔[1]

اموال کی تقسیم میں اصل سبب و علت کا تذکرہ فرمانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے احکام بجالائیں اور جس سے آپ ﷺ منع کریں، رک جائیں۔ یہ ایمان کا لازمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں تقویٰ کا بھی حکم دیا کیونکہ نافرمانوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی سزا بڑی سخت اور دردناک ہوتی ہے۔ ارشاد ہے:

﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝﴾

''اور اللہ کا رسول تمھیں جو کچھ دے تو وہ لے لو اور جس سے منع کرے تو اسے چھوڑ دو اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔''[2]

یعنی رسول اللہ ﷺ نے تمھیں جو بھی حکم دیا ہے اس کو مانو اور جس سے منع کیا اس سے بچو کیونکہ وہ تمھیں اچھائی و بھلائی کا کہتے ہیں اور شر و فساد ہی سے روکتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ سے خوف کا اظہار اس کے احکام بجالانے کے ساتھ اور منہیات سے اجتناب کر کے کرو۔

اس ارشاد باری تعالیٰ سے یہ بھی واضح ہے کہ اس کی سزا بڑی سخت ہوتی ہے۔ نافرمان اور مخالف کے لیے اس کا عذاب بڑا سخت ہوتا ہے۔ مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ آیت اگرچہ اموال فے سے متعلق ہے لیکن یہ آپ ﷺ کے تمام اوامر اور منہیات سے متعلق ہے، خواہ اس کا تعلق واجب سے ہو، مندوب سے ہو، مستحب یا حرام سے ہو، اس میں فے کے علاوہ دیگر تمام احکامات بھی شامل ہیں۔[3]

بہت ساری آیات امت کی تربیت اس انداز سے کرتی ہیں کہ تمام معاملات میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام تسلیم کرنے ضروری ہیں:

---

1 فقه السيرة للبوطي، ص: 194. 2 الحشر 59:7. 3 تفسير الرازي: 28/29، و صفوة التفاسير: 3/351.

ارشاد ہے:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝﴾

”چنانچہ (اے نبی!) آپ کے رب کی قسم! وہ مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں آپ کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر آپ کے کیے ہوئے فیصلے پر ان کے دلوں میں کوئی تنگی نہ آنے پائے اور وہ اسے دل و جان سے مان لیں۔“[1]

آپ ﷺ کا فرمان ہے:

«مَا نَهَيْتُكُمْ عَنْهُ فَاجْتَنِبُوهُ، وَمَا أَمَرْتُكُمْ بِهِ فَافْعَلُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ، فَإِنَّمَا أَهْلَكَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَثْرَةُ مَسَائِلِهِمْ وَاخْتِلَافُهُمْ عَلٰى أَنْبِيَائِهِمْ»

”میں جس کام سے تم کو منع کر دوں اس سے باز رہو اور جس کام کا حکم دوں اس کو بجالاؤ جہاں تک تم سے ہو سکے کیونکہ تم سے پہلے لوگ اپنے انبیاء سے بہت زیادہ پوچھنے اور ان سے اختلاف کرنے کی وجہ سے ہلاک ہوئے۔“[2]

مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کی فضیلت: سورۂ حشر میں دیگر صحابہ پر مہاجرین کی فضیلت کا تذکرہ ہے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ درجۂ اول مہاجرین کو حاصل ہے۔ متعدد آیات ان کے عمدہ عمدہ اوصاف پر مشتمل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے صدق کی گواہی دی ہے۔ فرمایا:

﴿لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيٰرِهِمْ وَأَمْوٰلِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوٰنًا وَّيَنصُرُونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهٗ ۚ أُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُونَ ۝﴾

”(مالِ فَے) ان مہاجر فقراء کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور اپنی جائیدادوں سے

[1] النسآء 4:65. [2] صحيح مسلم، حديث: 1337، ومسند أحمد: 2/247.

نکالے گئے، وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضا ڈھونڈتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ سچے ہیں۔‘‘[1]

اس سورت میں انصار کی فضیلت بھی بیان کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْإِيْمٰنَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ أُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝﴾

’’اور (مال فے ان کے لیے ہے) جنھوں نے (مدینہ کو) گھر بنا لیا تھا اور ان (مہاجرین) سے جو پہلے ایمان لا چکے تھے، وہ (انصار) ان سے محبت کرتے ہیں جو ان کی طرف ہجرت کرے اور وہ اپنے دلوں میں اس (مال) کی کوئی حاجت نہیں پاتے جو ان (مہاجرین) کو دیا جائے اور اپنی ذات پر (ان کو) ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود انھیں سخت ضرورت ہو اور جو کوئی اپنے نفس کے لالچ سے بچا لیا گیا تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔‘‘[2]

انصار و مہاجرین کے نقشِ قدم پر چلنے والوں کی فضیلت بھی اس سورت میں بیان کی گئی ہے۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو انصار و مہاجرین کے اچھے اوصاف اپنانے اور ان کے نقشِ پا پر چلنے والے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے سابقہ مومن بھائیوں کے لیے تنہائی میں بھی دعا کرتے ہیں اور علانیہ بھی۔ ارشاد ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوٰنِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْإِيْمٰنِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ إِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾

’’اور (فے ان کے لیے ہے) جو ان (مہاجرین و انصار) کے بعد آئے، وہ کہتے

[1] الحشر 59:8. [2] الحشر 59:9.

ہیں: ''اے ہمارے رب! ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو بخش دے جنھوں نے ایمان میں ہم سے پہل کی اور ہمارے دلوں میں اہل ایمان کے لیے کوئی کینہ نہ رکھ۔ اے ہمارے رب! بے شک تو بہت نرمی والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔''[1]

الغرض سورۂ حشر نے مہاجرین و انصار اور ان کے تابعین (شاگردانِ صحابہ) کی بڑی خوبصورت تصویر کشی کی ہے۔

مدینہ منورہ میں منافقین کا موقف: قرآن مجید نے منافقین کی حالت بیان کرتے ہوئے اور ان کے یہودیوں سے گٹھ جوڑ کو خوب واضح کیا ہے، نیز مسلمانوں کے متعلق ان کا جو موقف ہے اسے بھی نمایاں کیا ہے۔ قرآن مجید نے یہود کے موقف اور ان کی نفسیات کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ سورۂ حشر میں بھی ان منافقین کی یہود دوستی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں منافقین کے متعلق بتایا ہے کہ عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں نے بنونضیر کو پیغامات بھیجے اور انھیں مدد دینے کا وعدہ کیا۔

سورۂ حشر میں ﴿ لِاِخْوَانِهِمُ ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں کہ منافقوں اور ان کے درمیان کفر کا بھائی چارہ ہے۔ مراد بنونضیر کے یہود ہیں چونکہ انھیں منافقین سے کفر نے آپس میں اکٹھا کر رکھا تھا، اس لیے بھائی قرار دیا۔ تاہم دونوں کے کفر کی نوعیت جدا جدا تھی۔

اور اسی آیت میں ﴿ لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ کی قسم! اگر تم اپنے گھروں سے نکالے گئے ﴿ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ ﴾ ہم بھی اپنے گھروں سے تمھارے ساتھ نکل کھڑے ہوں گے ﴿ وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ ﴾ اور تمھارے متعلق کسی کی بات نہیں سنیں گے۔ ﴿ اَحَدًا ﴾، یعنی کوئی بھی ہو جو ہمیں تمھارے ساتھ نکلنے سے روکے۔ پھر کہنے لگے: ﴿ وَّاِنْ قُوْتِلْتُمْ ﴾ اگر مسلمان تم سے جنگ کریں گے ﴿ لَنَنْصُرَنَّكُمْ ﴾ تو ہم (ان کے خلاف جو تم سے جنگ کریں گے) تمھاری مدد کریں گے۔

[1] الحشر 10:59.

اللہ تعالیٰ نے منافقین کو جھوٹا قرار دیا اور ارشاد فرمایا: ﴿ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴾
''اور اللہ گواہ ہے کہ وہ بلاشبہ جھوٹے ہی ہیں۔''

بنونضیر کے ساتھ وعدے میں منافقین کے جھوٹ کو پہلے اللہ تعالیٰ نے اجمالاً بیان کیا، پھر ان کے سفید جھوٹ کو تفصیل سے بیان کیا۔ اور ان کی تردید میں تاکیداً فرمایا: ﴿ لَئِنْ اُخْرِجُوْا لَا يَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ ﴾ یعنی اگر مسلمانوں نے یہود کو نکال دیا تو منافقین ہرگز ان کے ساتھ نہیں نکلیں گے۔

مزید فرمایا: ﴿ وَلَئِنْ قُوْتِلُوْا لَا يَنْصُرُوْنَهُمْ ﴾ اگر مسلمانوں نے یہود سے جنگ کی تو منافق ہرگز ان کی مدد نہیں کریں گے۔

ارشاد ربانی ہے: ﴿ وَلَئِنْ نَّصَرُوْهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ○﴾ یعنی اگر بفرض محال منافقین نے یہود کی مدد کی بھی تو اُن کی مدد مسلمانوں کو ہرگز نقصان نہیں دے گی۔ یہود اور منافقین دونوں مسلمانوں کے بالمقابل بھاگ کھڑے ہوں گے اور پھر اللہ تعالیٰ بنونضیر کی مدد بھی نہیں فرمائے گا۔

بعدازاں اللہ تعالیٰ نے یہود اور منافقین کے دلوں کی حقیقی کیفیت آشکارا کی اور ارشاد فرمایا:

﴿ لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ○﴾

''(اے مسلمانو!) یقیناً ان کے سینوں میں اللہ کی نسبت تمھارا ڈر زیادہ ہے، یہ اس لیے کہ بے شک وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھتے نہیں۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے ان کی حقیقت کو دیگر صفات بیان کر کے مزید واضح کر دیا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿ لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ ﴾

''وہ سب مل کر بھی تم سے نہیں لڑ سکیں گے، مگر ایسی بستیوں میں جو قلعہ بند ہیں یا

1 الحشر 13:59. المستفاد من قصص القرآن لعبد الكريم زيدان: 283/2.

دیواروں کی اوٹ سے۔"[1]

اس کے بعد قرآن مجید نے ان کے بزدلی کے اسباب بیان کیے ہیں، فرمایا:

﴿ بَأْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيدٌ ۚ تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَّقُلُوبُهُمْ شَتّٰى ﴾

"ان کی لڑائی تو آپس میں بہت سخت ہے گو آپ انھیں متحد سمجھتے ہیں لیکن ان کے دل دراصل ایک دوسرے سے جدا ہیں۔"[2]

یہ بے عقل لوگ بظاہر مسلمانوں کے خلاف معلوم ہوتے ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ آپس میں ان کی سخت عداوت ہے۔ یعنی اس لیے کہ وہ لوگ نہ حق سمجھتے ہیں نہ اس کا ساتھ دیتے ہیں بلکہ وہ تو باطل کے ہم رکاب رہتے ہیں۔"[3]

آیت مبارکہ میں مسلمانوں کو یہود کے خلاف حوصلہ دلایا جا رہا ہے۔ انھیں رب العالمین کی طرف سے بتا دیا گیا ہے کہ یہود بزدل ہیں۔

بعدازاں اللہ تعالیٰ نے واضح کیا کہ بنونضیر پر یہ آفت ان کی مکارانہ سرشت کی بنا پر آئی ہے۔ ان کے بھائیوں بنوقینقاع پر بھی ایسی ہی آفت آچکی ہے۔ انھوں نے بھی غرور اور خیانت کا مزا چکھا تھا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ كَمَثَلِ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيبًا ذَاقُوا وَبَالَ أَمْرِهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ ﴾

"ان کی مثال ان لوگوں کی سی ہے جو ان سے پہلے قریب ہی اپنی بداعمالی کا وبال چکھ چکے ہیں اور اُن کے لیے دردناک عذاب ہے۔"[4]

پھر اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی ایک اور مثال بیان کی۔ منافقین نے پہلے تو بنونضیر کو مقابلے پر ابھارا اور پھر مشکل کے وقت مدد سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

---

1 الحشر 14:59. 2 الحشر 14:59. 3 حديث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ للدكتور محمد بكر آل عابد: 294,293/1. 4 الحشر 15:59.

﴿ كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسٰنِ اكْفُرْ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ○ ﴾

''ان کی مثال شیطان کی سی ہے جب وہ انسان سے کہتا ہے کہ کفر کر، پھر جب وہ کفر کرتا ہے تو شیطان کہتا ہے بے شک میں تجھ سے بری الذمہ ہوں۔ میں تو اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔''[1]

یعنی یہود جو منافقین کے وعدے سے دھوکا کھا گئے لیکن جب حقائق سامنے آئے اور ان پر محاصرے کے بادل چھا گئے تو منافقین ان سے الگ ہو گئے اور انھیں ہلاکت کے سپرد کر دیا، ان کی مثال شیطان کی سی ہے۔ شیطان جب ان کو کفر پر آمادہ کر کے ارتکاب کفر کرا لیتا ہے تو خود بری الذمہ اور لاتعلق ہو جاتا اور کہتا ہے کہ میں تو اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ان کی اخروی سزا پر دلالت کرتا ہے:

﴿ فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ جَزٰۗؤُا الظّٰلِمِيْنَ ○ ﴾

''لہٰذا ان دونوں کا انجام یہی ہوگا کہ بے شک وہ ہمیشہ (دوزخ کی) آگ میں رہیں گے اور ظالموں کی سزا یہی ہے۔''[2]

⑦ اہل ایمان کو آخرت کی یاد دہانی اور یہ کہ اہل جنت اور اہل جہنم میں بڑا فرق ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ○ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○ لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۭ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ○ ﴾

1 الحشر 16:59. 2 الحشر 17:59. المستفاد من قصص القرآن لعبد الکریم زیدان:284/2.

”اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور (ہر) شخص کو دیکھنا چاہیے کہ اس نے کل کے لیے آگے کیا بھیجا ہے اور تم اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ کو خوب خبر ہے جو تم عمل کرتے ہو۔ اور ان کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے اللہ کو بھلا دیا، تو اللہ نے انھیں اپنا آپ بھلوا دیا، یہی لوگ نافرمان ہیں۔ آگ والے (دوزخی) اور باغ والے (جنتی) کبھی برابر نہیں ہو سکتے، جنتی ہی کامیاب ہیں۔“[1]

یہ آیات محاسبۂ نفس کے سلسلے میں اصول کی حیثیت رکھتی ہیں انسان کو چاہیے کہ اپنا محاسبہ کرتا رہے۔

مسلمانوں کو بنونضیر کے خلاف شاندار فتح حاصل ہوئی۔ صحابہ کرام معاشی طور پر آسودہ حال ہوئے۔ فے کی زمین اسلامی اراضی میں شامل ہوئی تو حکومتی آمدنی میں خاطرخواہ اضافہ ہوا، تاہم قرآن مجید نے اسی واقعے کے ذریعے سے عقائد کی تعلیم دی۔ آخرت کی یاد دہانی کرائی اور حیات بعد الموت کے لیے تیاری کا حکم دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسلامی معاشرے کے افراد کو حکم دیا ہے کہ وہ ایمان کے تقاضے پورے کریں۔ ظاہراً و باطناً تقویٰ اختیار کریں اور حدود کا پاس کریں۔ نیز اپنے حقوق وفرائض کا خیال رکھیں۔ اور اصلاح اعمال کی روش پر قائم رہیں۔

اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اہل ایمان آخرت کی زندگی کو پیش نظر رکھیں۔ اسے زندگی کا نصب العین بنائیں۔ آخرت کی فکر کریں اور حصول رضائے الٰہی کے لیے کوشاں رہیں۔ حصول رضائے الٰہی کی تمام رکاوٹیں دور کریں اور رضائے الٰہی ہی کو مطمحِ نظر بنائیں۔[2]

قرآن مجید نے قیامت کے لیے «غَدٌ» ”کل“ کا لفظ استعمال کر کے بتایا ہے کہ قیامت بہت قریب ہے۔ بالکل ایسے جیسے کل آج سے قریب ہے، اس لیے کہ کل تو آ کر ہی رہے گا اور ہر آنے والا قریب ہی ہوتا ہے۔[3]

1 الحشر 59:18-20. 2 تفسیر السعدي: 340/7. 3 المحرر الوجیز: 390/14.

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو باخبر کیا ہے کہ وہ ان کے اعمال سے بخوبی واقف ہے۔ ان کے اعمال اللہ سے مخفی نہیں، نیز اس کے ہاں اعمال ضائع نہیں ہوتے۔ مطلب یہ کہ وہ سنجیدگی سے محنت کریں۔[1]

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو انتباہ کیا ہے کہ ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل ہوگئے۔ نتیجے کے طور پر اللہ نے انھیں اپنا آپ بھلوا دیا۔ انھیں اپنے نفع و نقصان کی خبر نہ رہی۔ یوں وہ نافرمان قرار پائے اور دین کی حدود سے کنارہ کش ہوگئے۔

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اہل جنت اور اہل جہنم کے برابر ہونے کی نفی کی اور واضح فرمایا ہے کہ اہل جنت اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچنے والے اور ہمیشہ کے لیے اس کی نعمتوں سے ہمکنار ہونے والے ٹھہرے ہیں، جبکہ جہنمی اصل خسارہ پانے والے لوگ ہیں۔[2]

یہ تفصیل، یاد دہانی اور وعظ آخرت کو ذہنوں اور دلوں کے قریب کر دینے اور اہل ایمان کے لیے نیکیوں میں سبقت لے جانے کا باعث ہیں۔

قرآن کریم کی عظمت اور اللہ تعالیٰ کی بعض صفات عالیہ: ارشاد ربانی ہے:

﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ○﴾

”(اے نبی!) اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو آپ دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے دب جاتا (اور) پھٹ جاتا اور یہ مثالیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں شاید کہ وہ غور وفکر کریں۔“[3]

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اے لوگو! اگر ہم پہاڑ میں تم جیسی عقل رکھ دیتے اور پھر اس پر قرآن پاک نازل کرتے تو پہاڑ لازماً ڈر جاتا، جھک جاتا اور اللہ تعالیٰ کے ڈر سے ریزہ ریزہ

[1] تفسير السعدي: 4/342. [2] تفسير السعدي: 3/342. [3] الحشر 59:21.

ہوجاتا۔ یہ ہے قرآن پاک کے بلند و بالا مقام کی مثال۔ اور اس کے وعظ میں جو تاثیری قوت پائی جاتی ہے۔ اس کا تذکرہ ہے۔ انسان کے سخت دل ہونے پر اسے ایک طرح کی ڈانٹ بھی پلائی گئی ہے۔ اور یہ کہ انسان کتنا بے خوف و نڈر ہے۔ قرآن پاک کے زور دار انداز سے تو جبے ہوئے پہاڑ بھی پست ہوجائیں۔[1]

اس کے بعد اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ وہ لوگوں کے لیے مثالیں بیان کرتا ہے۔ حلال و حرام کی وضاحت کرتا ہے تاکہ وہ اس کی آیات پر غور و فکر کریں اور سوچ بچار سے کام لیں۔ قرآن پر غور و فکر سے انسان کے لیے علم کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ یہ نیکی بدی کے راستے واضح کرتا ہے۔ انسان کو اچھے اخلاق پر ابھارتا ہے اور عمدہ عادات اپنانے کی ترغیب دیتا ہے اور برے اخلاق سے منع کرتا ہے، لہٰذا قرآن پاک پر غور و فکر اور تدبر کرنے سے زیادہ نفع مند بات انسان کے لیے کوئی نہیں۔[2]

❁ سورۃ الحشر کے اختتام پر اللہ تعالیٰ کی چند صفات عالیہ کا تذکرہ ہے، ارشاد ہے:

﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ○ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ○ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ؕ یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ○﴾

''وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ غیب اور حاضر کا جاننے والا ہے، وہ رحمٰن ہے، رحیم ہے۔ اللہ وہ ہستی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ بادشاہ ہے، نہایت پاک، سلامتی والا، امن دینے والا، نگہبان، زبردست، زور آور، بڑائی والا، پاک ہے اللہ اس سے جو وہ شرک کرتے ہیں۔ وہ اللہ ہے، خالق ہے، موجد،

[1] تفسیر المراغي: 57/28. [2] تفسیر السعدي: 344/7.

صورت گر، اسی کے لیے ہیں اسمائے حُسنٰی، اسی کی تسبیح پڑھتی ہے جو چیز آسمانوں اور زمین میں ہے اور وہ غالب ہے، خوب حکمت والا۔''[1]

یوں یہ سورت اللہ تعالیٰ کی چند صفاتِ عالیہ کے بیان پر اختتام کو پہنچتی ہے تاکہ اسلامی معاشرہ اللہ تعالیٰ ہی کی عبودیت اپنائے اور اسی روش پر پروان چڑھے۔ اس کے اسمائے حسنٰی اور صفاتِ عالیہ کے ذکر سے اس کی پہچان حاصل کرے۔

ایسا اللہ تعالیٰ کے عظیم کمال، عام احسان اور زبردست تدبیر کی بنا پر ہوا ہے۔ اللہ کے علاوہ ہر الٰہ باطل ہے اور ذرہ برابر عبادت کا مستحق نہیں کیونکہ وہ تو خود محتاج، عاجز اور ناقص ہے، نہ اپنے لیے کسی چیز کا مالک ہے اور نہ غیر کے لیے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات بابرکات کے بارے میں واضح کیا ہے کہ اس کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ خواہ وہ مخلوق سے پوشیدہ ہو یا مخلوق کے سامنے۔ اور اپنی بے کراں رحمت کا ذکر کیا جو ہر چیز پر چھائی ہے اور ہر آدمی تک پہنچی ہوئی ہے۔ اس کے بعد دوبارہ اپنی عام الوہیت اور یکتائی کا تذکرہ فرمایا اور بتایا کہ وہ اکیلا تمام کائنات کا مالک ہے۔ جہانِ بالا ہو یا جہانِ اسفل تمام جہانوں کے رہنے والے اس کے غلام اور محتاج ہیں۔

﴿الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ﴾ یعنی پاکیزہ۔ ہر عیب سے اور ہر نقص سے پاک۔ عظمت اور بزرگی والا۔ لفظ قدوس ہر نقص سے پاک ہونے پر دلالت کرتا ہے اور اللہ کے صفات عالیہ سے متصف ہونے کا پتا دیتا ہے۔

﴿الْمُؤْمِنُ﴾ یعنی اپنے انبیاء اور رسولوں کے شرائع واحکام، دلائل واضحہ اور براہین قاطعہ کی تصدیق کرنے والا۔

﴿الْعَزِیْزُ﴾ وہ جس پر غلبہ نہ پایا جاسکے، نہ اس کی پکڑ سے محفوظ رہا جاسکے۔ وہ خود ہر چیز پر غالب ہے اور ہر چیز اس کے تابع ہے۔

1 الحشر 59:22-24۔

﴿الْجَبَّارُ﴾ جس کا غلبہ تمام انسانوں پر ہے۔ ساری مخلوقات نے اس غلبے کا اقرار کر رکھا ہے۔ وہ جو ٹوٹے پھوٹے کو درست اور فقیر کو غنی کر دے۔

﴿الْمُتَكَبِّرُ﴾ جس کے لیے عظمت اور کبریائی ہے اور جو تمام عیوب سے مبرا ہے۔

﴿سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴾ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی عام پاکیزگی کا بیان ہے۔ وہ ان عیوب سے پاک ہے جو مشرکین ومخالفین بیان کرتے ہیں۔

﴿هُوَ اللّٰهُ الْخٰلِقُ﴾ تمام مخلوقات کا اکیلا خالق ہے۔

﴿الْبَارِئُ﴾ ہر پیدا ہونے والی چیز کا موجد۔

﴿الْمُصَوِّرُ﴾ صورتیں بنانے والا۔

یہ تمام اسماء اللہ کی تخلیق، تدبیر اور تقدیر سے متعلق ہیں اور اس امر کا اظہار کرتے ہیں کہ ان تمام امور میں وہ یکتا ہے، ان میں اس کا کوئی حصے دار نہیں۔

﴿لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کے بہت سارے نام ہیں جنھیں نہ کوئی شمار کرسکتا ہے نہ کوئی ان تمام ناموں کا علم رکھتا ہے۔ اسی کثرت کے باوجود وہ تمام نام سب سے اچھے ہیں، یعنی صفات کمال ہیں۔ بلکہ وہ کامل اور عظیم ترین صفات پر دلالت کرتے ہیں۔ ان میں کسی قسم کا کوئی نقص نہیں۔

اسمائے حسنیٰ کی خوبی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں پسند کرتا ہے اور جو انھیں محبوب رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرتا ہے۔ اور اپنے بندوں سے چاہتا ہے کہ وہ اسے ان اسماء کے ساتھ پکاریں اور اس سے ان کے ساتھ سوال کریں۔ اللہ تعالیٰ کے کمال کا یہ عالم ہے کہ اس کے سب سے اچھے نام بلند تر صفات کے حامل ہیں اور آسمان و زمین کی تمام مخلوق ہمیشہ اس کی محتاج ہے۔ اس کی حمد کے ساتھ تسبیح بیان کرتی ہے۔ اس سے اپنی ضروریات مانگتی ہے اور وہ اپنے فضل وکرم سے اپنی حکمت ورحمت کے تقاضے کے مطابق عطا کرتا ہے۔

﴿وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ وہ ذات جو کچھ بھی چاہے ہو جائے اور جو بھی ہوتا ہے اس کی حکمت ومصلحت کے تابع ہے۔[1]

اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور صفات عالیہ کا علم تینوں قسم کی توحید پر مشتمل ہے۔ توحید ربوبیت، توحید الوہیت اور توحید اسماء وصفات۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کے مطابق عمل پر پروان چڑھے۔ توحید کی جملہ اقسام ایمان کی روح اس کا اصل اور نتیجہ ومقصود ہیں۔ انسان اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کی جس قدر معرفت حاصل کرتا ہے اس کا ایمان اسی قدر زیادہ ہوتا اور یقین اتنا ہی پختہ ہوجاتا ہے۔ یہی علم تھا جو صحابہ کے دلوں میں جاگزیں تھا۔ اس کا نتیجہ اللہ تعالیٰ کے ڈر اور اس کی کما حقہ معرفت کے طور پر سامنے آیا، لہٰذا انھوں نے اس کے مطابق عمل کیا۔[2]

شراب کی حرمت

ربیع الاول 4 ھ میں بنونضیر کے محاصرے کے دوران میں شراب حرام کردی گئی۔[3] شراب کی حرمت بھی قاعدۂ تدریج کے مطابق عمل میں آئی۔ مطلب یہ کہ شراب یکبارگی نہیں بلکہ بتدریج حرام کی گئی بالآخر سورۂ مائدہ کی آیات حرمت میں اسے قطعی حرام قرار دیا گیا۔[4]

ارشاد ربانی ہے:

﴿يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۖ قُلْ فِيهِمَآ إِثْمٌ كَبِيرٌ وَّمَنَٰفِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَآ أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا ۗ وَيَسْـَٔلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ ۖ قُلِ الْعَفْوَ ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْأٓيَٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ۝﴾

''(اے نبی!) لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں سوال کرتے ہیں؟

1 تفسير السعدي: 347,346/7. 2 الوسطية في القرآن الكريم للصلابي، ص: 228. 3 حديث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ للدكتور محمد بكر آل عابد: 253/1، وتفسير القرطبي: 10/18.
4 الخصائص العامة للإسلام للقرضاوي: 181.

کہہ دیجیے: ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے (کچھ) فائدہ بھی ہے اور ان دونوں کا گناہ ان کے فائدے سے بہت بڑا ہے اور وہ آپ سے پوچھتے ہیں: کیا خرچ کریں؟ کہہ دیجیے: جو ضرورت سے زائد ہو۔ اللہ تمھارے لیے اپنے احکام اسی طرح بیان کرتا ہے تاکہ تم غور وفکر کرو۔''[1]

سید قطب رحمہ اللہ نے اس آیت کے متعلق لکھا: حرمت شراب کے متعلق یہ پہلا اقدام تھا، کئی امور خالص شر نہیں ہوتے بلکہ کبھی خیر شر سے مل چکی ہوتی ہے اور کبھی شر خیر کے ساتھ مل جاتا ہے۔ لیکن حرمت و حلت کا دارومدار خیر یا شر کے غالب ہونے پر ہوتا ہے، چنانچہ جب شراب اور جوئے میں گناہ نفع سے زیادہ تھا تو یہی ان دونوں کی حرمت کا سبب بنا۔

یہاں اسلامی تربیت اور ربانی حکمت کا ایک نادر پہلو سامنے آتا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ یہ منہج اکثر شرائع، فرائض اور توجیہات میں بھی ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ یہاں شراب اور جوئے کی مناسبت سے بات کرتے ہوئے ہم منہج اسلامی کے اسی قاعدے کے بارے میں اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ جب امر و نہی کا تعلق اعتقادی مسئلے سے ہو تو اسلام وہاں نہی کی ابتدا ہی میں قطعی فیصلہ صادر کر دیتا ہے۔ لیکن جب امر و نہی کا تعلق عبادت، رسم و رواج، عادت یا طے شدہ اجتماعی قانون سے ہو تو اسلام وہاں مہلت دیتا اور آسانی کو پیش نظر رکھتا ہے۔ اور ایسے حالات پیدا کرتا ہے جن میں سہولت کو اس کے نفاذ میں مدنظر رکھا جا سکے۔

چنانچہ جب توحید و شرک کا مسئلہ تھا تو اسلام نے اپنا قطعی حکم ابتدا ہی میں صادر فرما دیا۔ جس میں نہ تردد کی گنجائش تھی نہ مڑ کر دیکھنے سوچنے کی، اس میں نہ درمیانہ رستہ اختیار کرنے کا موقع دیا نہ خوش اسلوبی کو مانع بننے دیا۔ کچھ لو کچھ دو والا معاملہ ہی نہ ہوا۔ یہ مسئلہ اسلام کے بنیادی تصور کا مسئلہ تھا۔ جس کے بغیر نہ ایمان باقی رہتا ہے نہ اسلام قائم۔

لیکن شراب اور جوئے کا معاملہ عادت، پسند اور چاہت کا معاملہ تھا۔ اور عادت کی

[1] البقرۃ 2:219.

تبدیلی علاج معالجہ کی محتاج ہوتی ہے، لہٰذا اسلام مسلمانوں کے دلوں میں ایک دینی اور فطری تصور اجاگر کرنے لگا کہ شراب و جوئے میں گناہ نفع کی نسبت زیادہ ہے، جس میں یہ اشارہ تھا کہ انھیں چھوڑنا ہی بہتر ہے۔

اس کے بعد دوسرا اقدام سورۂ نساء کی اس آیت کی شکل میں کیا۔ ارشاد ہوا:

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَوٰةَ وَأَنتُمْ سُكَارَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ ﴾

''اے ایمان والو! جب تم نشے میں مست ہو نماز کے قریب بھی نہ جاؤ جب تک کہ اپنی بات کو سمجھنے نہ لگو۔'' [1]

نماز روزانہ پانچ بار ادا کی جاتی ہے جس کا درمیانی وقفہ اکثر نمازوں میں برابر ہے۔ اس وقفے میں نشہ اور پھر اس سے افاقہ ممکن نہیں۔ اس سے اصل مقصود شراب نوشی کو انتہائی دشوار بنانا اور اکثر و بیشتر جن اوقات میں اسے استعمال کیا جاتا تھا ان پر ہمیشگی کی عادت کو ختم کرنا تھا۔ کیونکہ نشے کا عادی انسان اپنی عادت پوری کرنے کی ضرورت اس وقت محسوس کرتا ہے جس وقت اس کی روٹین بنی ہو، خواہ عادت شراب کی ہو یا ہلکے نشے کی۔ تب وہ نشہ آور چیز بے قراری سے طلب کرتا ہے، پھر جب وہ وقت گزر جائے اور اس طرح وہ وقت بار بار گزارا جائے تو عادت بڑی حد تک کمزور پڑ جاتی ہے اور اس پر غلبہ پانا ممکن ہو جاتا ہے۔ جب یہ دونوں اقدام مکمل ہو گئے تو شراب اور جوئے کی حتمی حرمت کا حکم نازل ہو گیا اور قطعی ممانعت کر دی گئی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَن يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَن ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَوٰةِ ۖ فَهَلْ أَنتُم مُّنتَهُونَ ۝ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَاحْذَرُوا ۚ فَإِن تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ۝ ﴾

[1] النسآء 43:4.

''بے شک شیطان چاہتا ہے کہ تمھارے درمیان شراب اور جوئے کے ذریعے سے دشمنی اور بغض ڈال دے اور تمھیں اللہ کے ذکر اور نماز سے روکے، پھر کیا تم ان (شیطانی کاموں) سے باز آتے ہو؟ اور تم اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور احتیاط کرو، پس اگر تم حق سے پھر جاؤ تو جان لو کہ ہمارے رسول پر تو صرف کھول کر پہنچا دینا لازم ہے۔''[1]

انجامِ یہود سے عبرت

بری تدبیر کرنے والے خود اس کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے متعلق یہود کی سازشیں اور مدینہ پر تسلط حاصل کرنے کی مساعی انتہائی نامشکور تھیں۔ وہ مکر و فریب کے ذریعے سے عزت، بلندی اور غلبہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ اور مسلمانوں کو یہودیوں کے مکر و فریب سے نجات دی۔ انھیں ذلیل و رسوا کیا اور ان کی برتری ختم ہوئی۔ غلبہ ختم ہو گیا۔ گھر برباد ہوئے۔ انھیں گھروں سے چلتا کیا۔ ان تمام امور میں مسلمانوں کو مسلح تصادم کی تکلیف بھی نہ دی اور نہ کشت و خون کی نوبت آنے دی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔ وہ انتہائی پست ہو گئے۔ انھیں جان کے لالے پڑ گئے۔ بیش بہا دولت چھوڑ گئے جسے مسلمانوں نے مفت میں وصول کیا۔ اللہ تعالیٰ انھی کے متعلق فرماتے ہیں:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ۔ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا ۙ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۙ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ ۝﴾

''وہی ہے جس نے اہلِ کتاب کے کافروں کو پہلی جلا وطنی کے وقت ان کے

[1] المآئدة5:91,92. تفسیر في ظلال القرآن لسید قطب:229/1.

گھروں سے نکال دیا، تم نے کبھی یہ خیال نہیں کیا تھا کہ وہ (وہاں سے) نکلیں گے اور انھوں نے سمجھا تھا کہ بے شک ان کے قلعے انھیں اللہ (کے عذاب) سے بچا لیں گے، پھر ان کے پاس اللہ (کا عذاب) آیا جہاں سے انھوں نے گمان بھی نہیں کیا تھا اور اس نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا، وہ اپنے گھر اپنے ہاتھوں اجاڑتے تھے اور مومنوں کے ہاتھوں بھی، تو اے آنکھوں والو! عبرت پکڑو۔''[1]

بری سوچ اور دھوکا دہی کا یہی نتیجہ ہے۔ دیکھیے اس کے بعد قرآن پاک نے اس واقعے میں عبرت کے مقامات کی طرف کیسے اشارہ فرمایا ہے اور کس احسن انداز سے علانیہ اس زجر وتوبیخ کا ذکر کیا ہے جو ہر اس انسان کو آسکتی ہے جو بھی تکلیف دہ مکر وفریب اور مہلک بغض وکینہ کا رستہ اختیار کرے گا۔ ارشاد ربانی ہے کہ اے آنکھوں والو! عبرت حاصل کرو۔

اس آیت میں میرے سامنے عبرت کا بہت سا سامان ہے:

① ہر وہ شخص جو حق کے رستے میں رکاوٹ بنتا ہے، لوگوں کو اس سے روکتا ہے، داعیانِ حق کو دور ہٹاتا ہے بالآخر وہ شکست کھاتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ۗ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝﴾

''کافروں سے کہہ دیجیے! تم عنقریب مغلوب کیے جاؤ گے۔ اور جہنم کی طرف جمع کیے جاؤ گے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔''[2]

② حق و باطل کی کشمکش کبھی تھمنے والی نہیں یہ سلسلہ تا قیامت جاری رہے گا۔ مستقبل میں کبھی حق اور کبھی باطل کو عروج ہوگا لیکن بالآخر نتائج حق کے حق میں ہوں گے۔

③ یہود کی خیانت اور دھوکا دہی سے عبرت حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس طرز عمل سے اجتناب کیا جائے تاکہ بصورت دیگر جو ذلت، رسوائی اور شکست ان کا مقدر بنی اس سے بچا جاسکے۔

[1] الحشر 2:59. [2] آل عمرٰن 12:3.

دین میں جبر نہیں ہے

بنونضیر میں انصار کے کچھ بیٹے تھے جو یہود کے زیر تربیت رہ کر یہودیت اختیار کر چکے تھے۔ ان کے مسلمان اہل خانہ نے انھیں جلاوطنی سے روکنا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۖ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾

''دین میں کوئی زبردستی نہیں، ہدایت، گمراہی سے واضح ہو چکی ہے، پھر جو شخص طاغوت کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لے آئے تو یقیناً اس نے ایک مضبوط کڑا تھام لیا جو ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔''[1]

امام ابوداود اپنی سنن میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت لائے ہیں کہ ''بسا اوقات ایسا ہوتا کہ کسی عورت کی اولاد زندہ نہ رہتی تو وہ نذر مان لیتی کہ اگر اس کا بچہ زندہ رہا تو وہ اسے یہودی بنا دے گی۔ جب بنونضیر کو جلاوطن کیا گیا۔ تو ان میں انصار کے کئی بیٹے تھے۔ انصار نے کہا: ''ہم اپنے بیٹوں کو نہیں چھوڑیں گے۔'' تب اللہ تعالیٰ نے قرآنی آیات اتاریں کہ دین میں قطعی جبر نہیں۔''[2]

[1] البقرۃ 2:256. [2] سنن أبي داود، حدیث: 2682، والسنن الکبریٰ للنسائي، رقم: 10982، 10983.
علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے، دیکھیے: (صحیح سنن أبي داود: 2682)

باب 3

غزوۂ ذات الرقاع، طے شدہ غزوۂ بدر اور دومۃ الجندل

غزوۂ ذات الرقاع کی تاریخ، اسباب اور وجہ تسمیہ

سیرت نگار اور اہل مغازی اس غزوے کی تاریخ کے متعلق اختلاف کرتے ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا خیال ہے کہ یہ غزوہ، غزوۂ خیبر کے بعد پیش آیا تھا۔[1] ابن اسحاق کے مطابق یہ غزوہ، غزوۂ بنونضیر کے بعد پیش آیا تھا۔[2]

ایک یہ بھی خیال ہے کہ غزوۂ ذات الرقاع، غزوۂ خندق کے بعد 4 ھ میں پیش آیا۔ واقدی اور ابن سعد کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ غزوۂ ذات الرقاع محرم 5 ھ میں پیش آیا۔[3] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے امام بخاری رحمہ اللہ کے نقطۂ نظر کو ترجیح دی ہے۔

وجہِ ترجیح دراصل یہ ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ غزوۂ ذات الرقاع میں شامل تھے۔ وہ فتح خیبر کے فوراً بعد حبشہ سے آگئے تھے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بھی اس غزوے میں شریک تھے۔ وہ فتح خیبر کے موقع پر اسلام لائے تھے۔ اس غزوۂ ذات الرقاع میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلاۃ الخوف ادا کی تھی۔ صلاۃ الخوف غزوۂ خندق کے موقع پر شریعت کا حصہ نہیں بنی تھی بلکہ غزوۂ حدیبیہ کے موقع پر عسفان میں مقرر ہوئی تھی۔ غزوۂ حدیبیہ 6 ھ میں پیش آیا۔

ڈاکٹر سعید رمضان بوطی نے لکھا ہے کہ غزوۂ ذات الرقاع یقیناً غزوۂ خندق سے پہلے

---

1 صحيح البخاري، قبل الحديث: 4125. 2 السيرة النبوية لابن هشام: 225/3. 3 المغازي للواقدي: 395/1، والطبقات لابن سعد: 61/2.

پیش آیا۔[1] انھوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی وہ صحیح روایت بطور دلیل پیش کی ہے جس میں ذکر ہے کہ جابر رضی اللہ عنہ نے غزوۂ خندق میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے گھر آنے کی اجازت طلب کی۔ اور واپس آکر اپنی اہلیہ سے تذکرہ کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت بھوک لگی ہے۔ روایت میں کھانے کا ذکر بھی ہے جس کی دعوت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام لشکر کو دی تھی۔ کھانا جابر رضی اللہ عنہ نے تیار کرایا تھا۔ جابر رضی اللہ عنہ کے کھانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت کا معجزہ ظاہر ہوا تھا۔ اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی اہلیہ سے فرمایا تھا: ''یہ کھانا کھاؤ اور اسے تحفے کے طور پر ہمسایوں میں بھی دو، اس لیے کہ لوگ بھوکے ہیں۔''[2]

صحیحین کی ایک روایت میں ہے کہ غزوۂ ذات الرقاع میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا تھا کہ تم نے شادی کرلی ہے؟ جابر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا تھا: جی ہاں![3] اس کا مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی شادی کا علم نہیں تھا۔

ڈاکٹر سعید رمضان بوطی، ابن حجر رحمہ اللہ کے غزوۂ ذات الرقاع کے غزوۂ خیبر کے بعد وقوع پذیر ہونے والے نقطۂ نظر کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''ابن حجر کا استدلال کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ احزاب میں صلاۃ الخوف نہیں پڑھی تھی بلکہ قضا کی تھی، اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان مقابلہ جاری رہنے کی وجہ سے نماز نہ پڑھ سکے اور یہ امکان ہے کہ دشمن قبلے کی جانب تھا۔ یہ بھی امکان ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رہ جانے والی نمازوں کی قضا کے جواز کے بیان کے لیے ایسا کیا ہو۔

سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی روایت سے استدلال کا جواب بھی دیا جاسکتا ہے جو اکثر سیرت نگاروں اور اہل مغازی نے دیا ہے کہ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کی مراد کوئی اور غزوہ ہے جس کا نام بھی ذات الرقاع تھا۔ دراصل وہ اس کے متعلق کہتے ہیں کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے

---

[1] فقه السيرة للبوطي، ص: 210. [2] صحيح البخاري، حديث: 4101. [3] صحيح البخاري، حديث: 2097، وصحيح مسلم، حديث: [3636](54)-715، ومسند أحمد: 376,375/3.

ہمراہ جنگ کے لیے روانہ ہوئے۔ چھ چھ آدمیوں کے پاس باری باری سواری کے لیے ایک ایک اونٹ تھا۔ [1]

جس غزوۂ ذات الرقاع کی بات ہم کر رہے ہیں اس میں تعداد اس سے بھی زیادہ تھی۔ [2]

ڈاکٹر حکمی اور ڈاکٹر اکرم ضیاء عمری کا میلان امام بخاری اور ابن حجر کی طرف ہے۔ [3]

ڈاکٹر مہدی رزق اللہ احمد نے ڈاکٹر سعید رمضان بوطی کی تائید کی ہے۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ ڈاکٹر بوطی کی یہ دلیل کہ جابر رضی اللہ عنہ کی شادی غزوۂ خندق سے پہلے ہو چکی تھی، صحیحین کی روایت ہے جسے مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ امام بخاری رحمہ اللہ اپنی رائے کی تائید میں معلق روایت لائے ہیں۔ ان کی دلیل صرف یہ ہے کہ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی آمد فتح خیبر کے بعد ہوئی تھی۔ ڈاکٹر بوطی کے بقول اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ (ذات الرقاع) کے نام سے ایک سے زائد غزوے پیش آئے تھے۔ [4] بوطی نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ غزوہ 4ھ میں پیش آیا، جبکہ بنونضیر کو جلاوطن ہوئے تقریباً ڈیڑھ ماہ گزر چکا تھا۔ اکثر سیرت نگاروں کی یہی رائے ہے۔ [5] میری رائے بھی یہی ہے۔

عرب (نجد) کے قبائل کی طرف سے مسلمانوں کے ساتھ اتنا بڑا دھوکا کبھی نہیں کیا گیا تھا جو ان ستر (70) مبلغین کی شہادت کی صورت میں سامنے آیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنوثعلبہ اور محارب کے انھی قبائل کے ارادے سے روانہ ہوئے۔ ڈاکٹر محمد ابو فارس نے بیان کیا ہے کہ ایک مخبر مدینہ منورہ آیا اور مسلمانوں کو اطلاع دی کہ بنومحارب اور بنوثعلبہ جن کا تعلق غطفان سے ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ کے لیے بڑی فوجیں اکٹھی کر چکے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم 400 اور بعض کے مطابق 700 مجاہدین کے ہمراہ ان کے ہاں جا پہنچے۔ وہ

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 4128. [2] السيرة النبوية للدكتور مهدي رزق الله، ص: 425. [3] مرويات غزوة الحديبية للدكتور حافظ حكمي، ص: 73-86، والمجتمع المدني للدكتور العمري، ص: 130. [4] السيرة النبوية للدكتور مهدي رزق الله، ص: 425. [5] فقه السيرة النبوية للدكتور البوطي، ص: 194.

لوگ اس قدر خائف ہوئے کہ اپنی عورتوں اور بچوں کو چھوڑ کر پہاڑوں میں جا چھپے۔ نماز کا وقت آیا، مسلمان ڈرتے تھے کہ اچانک حملہ نہ ہو جائے، چنانچہ آپ ﷺ نے صلاۃ الخوف ادا کی اور مدینہ منورہ واپس تشریف لے آئے۔[1]

اس جنگی مہم نے اپنا مقصود پالیا۔ مسلمان غطفان کے ان قبائل کو بکھیرنے میں کامیاب رہے جو مدینہ پر حملہ آور ہونے کے لیے پر تول رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان قبائل کو مرعوب کر کے یہ پیغام دیا کہ مسلمان نہ صرف مدینہ پر حملہ آور ہونے کا منصوبہ بنانے والوں کو دور ہٹانے پر قادر ہیں بلکہ وہ دشمن کے گھر جا کر لڑنے اور اسے اس کے علاقے میں سبق سکھانے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔[2]

غزوے کا نام ذات الرقاع یوں پڑا کہ صحابہ کرام نے گرمی سے بچنے کے لیے پیروں پر چیتھڑے باندھ رکھے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انھوں نے جھنڈوں میں پیوند لگا رکھے تھے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہاں ذات الرقاع نامی ایک درخت تھا۔[3]

یہ قول بھی ہے کہ مسلمانوں نے جس جگہ ڈیرے ڈالے تھے وہاں سیاہ وسفید پہاڑ تھے۔[4]

درست ترین یہ ہے کہ صحابہ کرام نے قدم زخمی ہونے کے سبب پیروں پر چیتھڑے باندھ رکھے تھے۔ صحیحین میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جنگ کے لیے روانہ ہوئے۔ چھ چھ آدمیوں کو ایک ایک اونٹ میسر تھا جس پر وہ باری باری سوار ہوتے۔ یوں ہمارے قدم زخمی ہو گئے۔ میرے دونوں پاؤں زخمی ہو گئے۔ ناخن بھی گر گئے۔ ہم نے پاؤں پر چیتھڑے باندھ لیے۔ یوں غزوے کا نام غزوۂ ذات الرقاع پڑ گیا۔[5] (عربی میں چیتھڑوں کو رقاع کہتے ہیں۔)

1 غزوة الأحزاب لأبي فارس، ص: 14. 2 غزوة الأحزاب لمحمد أحمد باشميل، ص: 78,77. 3 حديث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ للدكتور محمد بكر آل عابد: 309/1. 4 صور وعبر من الجهاد النبوي للدكتور فوزي فيض الله، ص: 170. 5 صحيح البخاري، حديث: 4128، وصحيح مسلم، حديث: 1816.

صلاۃ الخوف

اللہ تعالیٰ نے غزوۂ ذات الرقاع میں صلاۃ الخوف کا حکم نازل فرمایا اور دشمن کے روبرو ادائے نماز کا طریقہ واضح ہوا۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَإِذَا كُنتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلَوٰةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُم مَّعَكَ وَلْيَأْخُذُوٓا۟ أَسْلِحَتَهُمْ ۖ فَإِذَا سَجَدُوا۟ فَلْيَكُونُوا۟ مِن وَرَآئِكُمْ وَلْتَأْتِ طَآئِفَةٌ أُخْرَىٰ لَمْ يُصَلُّوا۟ فَلْيُصَلُّوا۟ مَعَكَ وَلْيَأْخُذُوا۟ حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ ۗ وَدَّ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ لَوْ تَغْفُلُونَ عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيلُونَ عَلَيْكُم مَّيْلَةً وَٰحِدَةً ۚ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِن كَانَ بِكُمْ أَذًى مِّن مَّطَرٍ أَوْ كُنتُم مَّرْضَىٰٓ أَن تَضَعُوٓا۟ أَسْلِحَتَكُمْ ۖ وَخُذُوا۟ حِذْرَكُمْ ۗ إِنَّ ٱللَّهَ أَعَدَّ لِلْكَٰفِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا ۝﴾

''اور (اے نبی!) جب آپ مومنوں کے درمیان ہوں، پھر انھیں نماز پڑھانے کے لیے کھڑے ہوں تو ان میں سے ایک گروہ اپنے ہتھیار لگائے ہوئے آپ کے ساتھ جماعت میں کھڑا ہو، پھر جب وہ سجدہ کرلے تو پیچھے چلا جائے اور دوسرا گروہ جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی وہ آپ کے ساتھ نماز ادا کرے اور اپنا بچاؤ ساتھ لے اور اپنے ہتھیار (لگائے رکھے۔) کافر چاہتے ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامان کی طرف سے ذرا غافل ہوجاؤ تو وہ تم پر یکبارگی دھاوا بول دیں۔ اور اگر تمھیں بارش سے تکلیف ہو یا تم بیمار ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ اپنے ہتھیار (ایک طرف) رکھ دو اور اپنا بچاؤ ساتھ لو۔ بے شک اللہ نے کافروں کے لیے رسوا کردینے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔''[1]

چنانچہ مسلمانوں نے دورانِ جنگ صلاۃ الخوف ادا کی۔ طریقہ یہ تھا کہ لشکر کے ایک حصے نے آپ ﷺ کے ساتھ صف بنالی اور دوسرا حصہ دشمن کے سامنے رہا۔ آپ ﷺ نے

[1] النسآء 4:102.

پہلے گروہ کو ایک رکعت پڑھائی اور کھڑے رہے۔ پہلے گروہ نے اپنی نماز خود مکمل کی، پھر یہ جماعت دشمن کے سامنے چلی گئی وہاں موجود دوسری جماعت اقتدائے نبوی میں آ گئی۔ آپ ﷺ نے بقیہ رکعت انھیں پڑھائی، پھر آپ بیٹھے رہے۔ انھوں نے اپنی نماز خود مکمل کر لی تو آپ ﷺ نے ان کے ساتھ سلام پھیر دیا۔[1]

ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک گروہ کو دو رکعتیں پڑھائیں۔ وہ پیچھے ہٹ گئے تو دوسرے گروہ کو آپ نے پھر دو رکعتیں پڑھا دیں۔ آپ ﷺ کی چار اور لوگوں کی دو دو رکعتیں ہوئیں۔[2]

ڈاکٹر بوطی دونوں روایات میں مطابقت پیدا کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو کئی مرتبہ صلاۃ الخوف پڑھائی ہے۔ کبھی پہلے طریقے کے مطابق اور کبھی دوسرے طریقے کے مطابق۔ آپ نے یہ نماز مدینہ منورہ سے دو دن کی مسافت پر واقع ''نخل''[3] نامی جگہ میں پڑھائی۔[4]

صلاۃ الخوف کی مشروعیت نماز کی اہمیت پر دلالت کرتی ہے کہ عین جنگ میں بھی نماز کے متعلق سستی و کوتاہی ناروا ہے۔ حالات جیسے بھی ہوں، نماز کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ کتاب اللہ سے ماخوذ منہج نبوی میں امت کی تربیت اسی نہج پر کی گئی کہ جہاد اور عبادت ایک دوسرے سے الگ تھلگ نہ ہوں۔[5]

سرحدوں کی حفاظت

صحابہ کرام نے ذات الرقاع سے واپسی پر کسی مشرک کی ایک بیوی کو قیدی بنا لیا۔ اس

1 صحیح البخاري، حدیث: 4129، وصحیح مسلم، حدیث: 842. 2 صحیح مسلم، حدیث: 843. 3 وادی نخل مدینہ منورہ کے مشرق میں تقریباً سو (100) کلومیٹر دور ہے۔ غزوۂ ذات الرقاع وادی نخل میں موجودہ قصبہ الحناکیہ کے قریب پیش آیا تھا۔ (معجم المعالم الجغرافیه في السیرة النبویة، ص: 317) 4 فقه السیرة النبویة للبوطي، ص: 207. 5 التربیة القیادیة للدکتور الغضبان: 304,303/3.

کے خاوند نے نذر مانی کہ میں محمد (ﷺ) کے ساتھیوں کا خون بہائے بغیر گھر نہ لوٹوں گا۔ آپ ﷺ نے حضرت عباد بن بشر اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کو پہرے پر مقرر فرما رکھا تھا۔ وہ مشرک رات کے وقت آیا تو عباد بن بشر رضی اللہ عنہ کو، جو پہرے پر کھڑے نماز ادا کر رہے تھے، تیر مارا۔ انھوں نے تیر کھینچ کر نکال دیا۔ اس نے پے در پے تین تیر مارے مگر حضرت عباد رضی اللہ عنہ نے نماز پوری کر کے اپنے ساتھی کو بیدار کیا، اس نے کہا: ''سبحان اللہ! آپ نے مجھے پہلے ہی کیوں نہ بیدار کر دیا۔'' وہ کہنے لگے: ''میں ایک سورت پڑھ رہا تھا جسے ختم کیے بغیر میں چھوڑنا نہ چاہتا تھا مگر جس وقت دشمن نے مسلسل تیر برسائے تو میں نے نماز مختصر کر کے سلام پھیر کر آپ کو مطلع کیا۔ اللہ کی قسم! اگر سرحد کی حفاظت کا مسئلہ نہ ہوتا جس پر آپ ﷺ نے میرا تعین فرمایا تھا تو جان چلی جاتی مگر میں سورت مکمل کر کے رہتا۔''[1]

اس واقعے سے ہمیں کئی باتیں معلوم ہوتی ہیں، مثلاً:

* نبی ﷺ لشکر کی حفاظت کے سلسلے میں انتہائی اہتمام فرمایا کرتے تھے۔
* پہرے داری کی تقسیم: جن دو صحابہ کی ڈیوٹی پہرے پر لگائی گئی تھی انھوں نے ازخود رات دو حصوں میں تقسیم کر لی تھی۔ آدھی رات آرام کے لیے اور آدھی رات پہرے داری کے لیے۔
* قرآن پاک سے صحابہ کرام کا گہرا تعلق اور تلاوت قرآنی سے محبت: تلاوت کی محبت نے صحابی کو ان تیروں کی تکلیف بھلا دی جو اس کے جسم میں پیوست ہو رہے تھے اور خون کا فوارہ پھوٹ رہا تھا۔
* پہرے کے سلسلے میں احساس ذمہ داری: حضرت عباد رضی اللہ عنہ نے تکلیف کے احساس پر نماز مختصر نہیں کی بلکہ اس جوابدہی کے شعور پر نماز مختصر کر دی جس کی انھیں ذمہ داری سونپی گئی تھی۔

[1] المستدرك للحاكم: 156/1، وسنن أبي داود، حديث: 198.

❁ پہرے داری کی جگہ زمینی حقائق کے عین مطابق تھی: رسول اللہ ﷺ نے پہرہ داری کے لیے گھاٹی کی تنگ جگہ (دہانے) کا انتخاب فرمایا تھا۔ یہ جگہ پہرے کی متقاضی تھی۔ سکیورٹی کے حوالے سے خدشہ تھا کہ دشمن وہیں سے حملہ آور ہوگا۔

❁ محافظ کے آرام کی جگہ اس کے بالکل قریب ہونی چاہیے تاکہ ہنگامی صورت میں وہ اپنے ساتھی کو بیدار کر سکے۔ مذکورہ واقعہ میں محافظ اپنے سوئے ہوئے ساتھی کو بروقت بیدار کر سکا۔ لیکن اگر وہ جگہ دور ہوتی تو سوئے ہوئے ساتھی کو بروقت بیدار نہ کر سکتا اور انجام بد سے دوچار ہوتا۔[1]

تجھے مجھ سے کون بچائے گا

غزوۂ ذات الرقاع سے واپسی پر نبی ﷺ نے کانٹوں سے پُر ایک وادی میں قیلولہ کیا۔ تمام لوگ درختوں کا سایہ ڈھونڈنے ادھر ادھر پھیل گئے۔ آپ ﷺ نے بھی ایک درخت تلے پڑاؤ ڈالا اور تلوار درخت سے لٹکا دی۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کا بیان ہے:

''ہم کچھ دیر کے لیے سو گئے۔ اچانک آپ ﷺ ہمیں بلا رہے تھے۔ ہم آپ ﷺ کے پاس پہنچے تو وہاں ایک بدو بیٹھا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ هٰذَا اخْتَرَطَ سَيْفِي وَأَنَا نَائِمٌ، فَاسْتَيْقَظْتُ وَهُوَ فِي يَدِهِ صَلْتًا، فَقَالَ لِي: مَنْ يَّمْنَعُكَ مِنِّي؟ فَقُلْتُ لَهُ: اَللّٰهُ! فَهَاهُوَ ذَا جَالِسٌ» ''میں سو رہا تھا کہ اس نے میری تلوار مجھ پر سونت لی۔ میں بیدار ہوا تو تلوار اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے مجھ سے کہا: ''تجھے مجھ سے کون بچائے گا؟'' میں نے کہا: ''اللہ!'' اب یہ بیٹھا ہوا ہے۔'' آپ ﷺ نے اسے سزا نہ دی۔ اس بدو کا نام غورث بن حارث تھا۔''[2]

[1] غزوة الأحزاب لأبي فارس، ص: 32. [2] صحيح البخاري، حديث: 4136،4135، وصحيح مسلم، حديث: 843.

غورث نے آپ ﷺ سے وعدہ کیا کہ وہ مسلمانوں سے کبھی نہیں لڑے گا نہ ایسے لوگوں کا ساتھ دے گا جو مسلمانوں سے لڑیں۔ آپ ﷺ نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا تو کہنے لگا:

«جِئْتُكُمْ مِنْ عِنْدِ خَيْرِ النَّاسِ»

''میں بہترین آدمی کے پاس سے تمھارے ہاں آیا ہوں۔''[1]

یہ واقعہ نبی اکرم ﷺ کی نبوت، آپ کی غیر معمولی شجاعت، یقین کامل، صبر وثبات اور نادانوں سے درگزر کرنے کی واضح دلیل ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خوف وخطرہ نہ ہو تو اہل لشکر نیند اور پڑاؤ کرنے کے لیے علیحدہ علیحدہ ہو سکتے ہیں۔ اس واقعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کی حفاظت کرتا تھا، پھر یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ نبی ﷺ کے ہاتھوں خرق عادت واقعات رونما ہوتے تھے۔ یہ امر رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر کامل یقین اور نبوت کی روشن دلیل ہے۔ رسول اللہ ﷺ گہری نیند سو چکے تھے۔ صحابہ سے الگ تھلگ تھے۔ تلوار مشرک کے ہاتھ میں تھی۔ گویا آپ ﷺ کو شہید کرنے کے تمام ظاہری اسباب اسے میسر تھے، تبھی تو خود اس نے کہا: «مَنْ يَّمْنَعُكَ مِنِّي» ''تجھے مجھ سے کون بچائے گا؟'' پھر وہ کون تھا جس نے اسے قتل کرنے سے روک دیا؟[2]

یہ صرف خدائی مہربانی اور خالقِ کائنات کا وہ اعجاز ہے جو قوانینِ عالم اور تصرفات کائنات سے برتر ہے۔ یہ دعوت اسلامی کی مدافعت ہے۔[3]

اللہ تعالیٰ کی مہربانی اس مشرک کو مرعوب کرنے کا باعث بنی۔ اللہ ہی کی مہربانی سے مشرک کے بدن پر کپکپی طاری ہوئی۔ تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی اور وہ آپ ﷺ کے روبرو سر جھکائے بیٹھ گیا۔ جو کچھ ہوا اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق ہوا:

---

1 فتح الباري، شرح الحديث: 4136. 2 فقه السيرة للبوطي، ص: 200. 3 دروس و عبر من الجهاد النبوي للدكتور فوزي فيض الله، ص: 178.

﴿يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝﴾

''اے رسول! آپ کے رب کی طرف سے آپ پر جو نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دیجیے۔ اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو گویا آپ نے اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا اور اللہ آپ کو لوگوں (کے شر) سے بچائے گا اور بلاشبہ اللہ کافر قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔''[1]

اس آیت مبارکہ میں عصمت سے مراد یہ نہیں کہ آپ کو تکلیف اور قوم کو اذیت سے واسطہ نہیں پڑے گا۔ یہ تو اپنے بندوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کی عام روش ہے۔ عصمت سے مراد یہ ہے کہ کوئی ایسا ہاتھ آپ ﷺ تک رسائی نہ پاسکے گا جو اچانک دھوکا دے کر یا قتل کر کے دعوتِ اسلامیہ کی راہ میں رکاوٹ بن جائے۔[2]

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کے ساتھ آپ ﷺ کا معاملہ

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ وادی نخل میں غزوہ ذات الرقاع کے لیے میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اپنے ایک کمزور اونٹ پر بیٹھ گیا۔ جب آپ ﷺ واپس ہوئے تو میرے ساتھی آگے نکلتے جارہے تھے اور میں پیچھے رہتا جارہا تھا۔ اتنے میں رسول اللہ ﷺ نے مجھے آلیا اور فرمایا: «مَالَكَ يَا جَابِرُ؟» ''جابر تمھیں کیا ہوا ہے؟''

میں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! اونٹ نے مجھے پیچھے کر دیا ہے۔''

فرمایا: «أَنِخْهُ» ''اسے بٹھاؤ۔''

میں نے اونٹ کو بٹھا دیا اور خود رسول اللہ ﷺ نے بھی اپنا اونٹ بٹھا دیا، پھر فرمایا: «أَعْطِنِي هٰذِهِ الْعَصَا مِنْ يَدِكَ أَوِ اقْطَعْ لِي عَصًا مِّنْ شَجَرَةٍ» ''اپنے ہاتھ والی

1 المآئدة 5:67. 2 فقه السيرة للبوطي، ص: 200.

چھڑی مجھے دو یا کسی درخت سے چھڑی کاٹ لاؤ۔"

جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے ایسا ہی کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے چھڑی سے اونٹ کو کچوکے لگائے، پھر فرمایا: «وَارْكَبْ» "اب سوار ہو جاؤ۔"

میں سوار ہو گیا۔ اور اب جو چلا تو اللہ کی قسم! میرا اونٹ آپ ﷺ کی ناقہ کے برابر چل رہا تھا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ سے باتیں کرتا چلا جا رہا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «أَتَبِيعُنِي جَمَلَكَ هٰذَا يَا جَابِرُ؟» "جابر! کیا تم اپنا اونٹ میرے ہاتھ فروخت کرتے ہو؟"

میں نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! بلکہ میں اسے آپ کو ہبہ کرتا ہوں۔"

فرمایا: «لَا وَلٰكِنْ بِعْنِيهِ» "نہیں! بلکہ اسے میرے ہاتھ فروخت کر دو۔"

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! آپ اس کی قیمت لگایئے۔"

فرمایا: «قَدْ أَخَذْتُهُ بِدِرْهَمٍ» "میں اسے ایک درہم کے عوض لیتا ہوں۔"

میں نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! اس میں تو آپ مجھے گھاٹے میں ڈال رہے ہیں۔"

فرمایا: «فَبِدِرْهَمَيْنِ» "اچھا دو درہم کے عوض میں۔"

جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: "نہیں۔"

جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے اونٹ کی قیمت بڑھاتے بڑھاتے ایک اوقیہ[1] کر دی۔ جابر کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: "کیا آپ واقعی رضا مند ہیں۔"

فرمایا: «نَعَمْ!» "ہاں" میں نے عرض کیا: "اچھا تو یہ اونٹ آپ کا ہو گیا۔"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «قَدْ أَخَذْتُهُ» "میں نے اسے لے لیا۔"

پھر فرمایا: «يَا جَابِرُ! هَلْ تَزَوَّجْتَ بَعْدُ؟» "جابر! تم نے شادی کر لی ہے؟"

[1] ایک اوقیہ میں چالیس درہم ہوتے ہیں اور یہی اہل حجاز کا اوقیہ ہے۔

میں نے جواب دیا: ''ہاں، اے اللہ کے رسول!''

فرمایا: «أَثَيِّبًا أَمْ بِكْرًا؟» ''شوہر دیدہ سے یا کنواری سے؟''

میں نے جواب دیا: ''نہیں شوہر دیدہ سے۔''

فرمایا: «أَفَلَا جَارِيَةً تُلَاعِبُهَا وَتُلَاعِبُكَ؟» ''کنواری سے کیوں نہیں شادی کی کہ تم دونوں ایک دوسرے سے کھیلتے؟''

اس پر میں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! جنگ احد میں میرے والد شہید ہو گئے تھے۔ انھوں نے سات لڑکیاں چھوڑی ہیں۔ میں نے ایسی عورت سے نکاح کیا ہے جو ان لڑکیوں کی نگہداشت کرے، بال سنوارے۔''

فرمایا: «أَصَبْتَ، أَمَا إِنَّا لَوْ قَدْ جِئْنَا صِرَارًا، أَمَرْنَا بِجَزُورٍ فَنُحِرَتْ وَأَقَمْنَا عَلَيْهَا يَوْمَنَا ذَاكَ وَسَمِعَتْ بِنَا فَنَفَضَتْ نَمَارِقَهَا» ''تم نے اچھا کیا۔ اب جو ہم لوگ مقام صرار [1] پر پہنچیں گے تو اونٹ ذبح کرنے کے لیے کہیں گے اور ایک روز وہاں ٹھہریں گے اور جب وہ (جابر رضی اللہ عنہ کی بیوی) سنے گی تو تکیے جھاڑ کر صاف کرے گی۔''

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! ہمارے گھر میں تکیے نہیں ہیں۔''

فرمایا: «إِنَّهَا سَتَكُونُ، فَإِذَا قَدِمْتَ فَاعْمَلْ عَمَلًا كَيِّسًا» ''تکیے بھی آ جائیں گے۔ ہاں، جب تم گھر پہنچو تو (بیوی سے جماع کے حوالے سے ہوشیاری اور) سمجھداری کا مظاہرہ کرنا (کہیں وہ حالت حیض میں نہ ہو)۔''

چنانچہ جب ہم لوگ صرار پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا اور اونٹ ذبح کر دیا گیا، وہاں ہم نے ایک روز قیام کیا۔ شام ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے اور ہم اپنے گھروں کو چلے گئے۔ اور میں نے سارا قصہ بیوی سے کہہ سنایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو

[1] صرار: مدینہ منورہ سے تین میل کے فاصلے پر ایک مقام ہے۔

کچھ مجھے فرمایا تھا وہ بھی کہہ دیا۔ اس پر بیوی نے کہا: ''آپ کو سمع و طاعت سے کام لینا چاہیے۔'' صبح ہوئی تو میں نے اونٹ پکڑا اور اسے لے کر مسجد کے دروازے پر پہنچ گیا اور اسے رسول اللہ ﷺ کے دروازے کے پاس بٹھا دیا اور میں خود رسول اللہ ﷺ کے پاس مسجد میں جا بیٹھا۔ آپ ﷺ مسجد سے باہر نکلے۔ اونٹ دیکھ کر فرمایا: «مَا هٰذَا؟» ''یہ کیا ہے؟''

لوگوں نے جواب دیا: ''یہ اونٹ جابر رضی اللہ عنہ لائے ہیں۔''

فرمایا: «أَيْنَ جَابِرٌ؟» ''جابر کہاں ہے؟''

مجھے بلایا گیا تو آپ ﷺ فرمانے لگے: «يَا ابْنَ أَخِي، خُذْ بِرَأْسِ جَمَلِكَ، فَهُوَ لَكَ» ''بھتیجے! یہ اونٹ لے جا، یہ تیرا ہی ہے۔''

آپ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو بلا کر فرمایا: «اِذْهَبْ بِجَابِرٍ فَأَعْطِهِ أُوقِيَّةً» ''جابر کو لے جاؤ اور اسے ایک اوقیہ دے دو۔''

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں ان کے ساتھ ہو لیا۔ انھوں نے مجھے ایک اوقیہ دیا بلکہ کچھ زیادہ ہی دیا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا کہنا ہے: ''اللہ کی قسم! یہ اوقیہ برابر بڑھتا رہا اور ہمارے گھر میں اس کی موجودگی واضح طور پر محسوس ہوتی رہی۔''[1]

اس قصے میں صحابہ کرام کے ساتھ معاملات میں رسول اللہ ﷺ کے بلند پایہ اخلاق کی تصویر سامنے آتی ہے۔ آپ ﷺ نے جابر رضی اللہ عنہ سے بلا تکلف باتیں کیں۔ بلند پایہ اخلاق کا مظاہرہ کیا۔ نرم خوئی اور خوش طبعی سے کام لیا۔ آپ ﷺ اپنے صحابہ کے نجی معاملات سے باخبر رہتے ہوئے ان کی مادی، معنوی اور اجتماعی مشکلات کا ازالہ کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے محسوس کیا کہ جابر رضی اللہ عنہ کا قافلے سے پیچھے رہ جانا کمزور اونٹ کی وجہ سے ہے۔ اور جابر رضی اللہ عنہ کے پاس غربت کے سبب اس کے علاوہ اور کوئی سواری نہیں تھی۔

1 صحيح البخاري، حديث: 2097، وصحيح مسلم، حديث: [1401،4100] (111،110)-715، ومسند أحمد: 3/376،375.

ان کے والد جنگ احد میں شہید ہوئے تو کئی بیٹیاں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی کفالت میں چھوڑ گئے جو بذات خود نادار تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی موقع کو غنیمت جانتے ہوئے بھائی چارہ سے کام لیا اور حسب استطاعت اپنا بابرکت روپیہ پیش کیا۔[1] کرم نوازی و غمخواری کا یہ کیسا شاندار نمونہ ہے! حسنِ صحبت اور آپس میں صاف دلی کی کیسی یادگار تصویر ہے! بے تکلفی ایسی کہ غزوے سے واپسی پر سابقہ طے شدہ پروگرام کے بغیر حسنِ سلوک! معجزانہ طور پر اونٹ کو ایسی چھڑی لگائی کہ کمال ہوگیا۔ پھر اس کی قیمت بھی دی اور اونٹ بھی نہ لیا اور جابر رضی اللہ عنہ کی شادی کی خوشی میں تحفہ دے کر شرکت کی۔ اونٹ ذبح کیے گئے تاکہ بیویاں استقبال کے لیے تیار ہوسکیں۔ ساتھ ہی مستقبل میں جناب جابر رضی اللہ عنہ کو تونگری کی بشارت بھی دی۔

یہ ان اخلاق عالیہ کا ایک نمونہ ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مرحمت فرمائے گئے تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں عمدہ اخلاق کی تکمیل فرما دیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عمدہ اور دھیمے انداز، دلی دوست کے سے رہن سہن، سچے بھائی چارے اور دوستی جیسے اوصاف سیکھتے رہتے تھے۔[2]

طے شدہ غزوۂ بدر اور غزوۂ دومۃ الجندل

طے شدہ غزوۂ بدر

جنگ احد کے بعد ابوسفیان کی طرف سے طے پانے والی جنگ کی تنفیذ اور وعدے کی پاسداری کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ سے 1500 مجاہدین اور دس گھڑ سواروں کی معیت میں ذوالقعدہ 4 ھ میں روانہ ہوئے۔

1 فقه السيرة للبوطي، ص: 213,212/3، والسيرة النبوية للدكتور مهدي رزق الله، ص: 429.
2 صور و عبر من الجهاد النبوي للدكتور فوزي فيض الله، ص: 181.

لشکر کا علم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھا۔ آپ ﷺ بدر میں حسب وعدہ قریش کے لشکر کی آمد کا آٹھ دن تک انتظار کرتے رہے۔ مگر اہل مکہ کا کوئی ایک بھی فرد بدر میں نہ پہنچا۔ ادھر ابوسفیان نے قریش اور ان کے حلیفوں کو ملا کر 2000 کا لشکر تیار کیا۔ لشکر میں 20 گھڑسوار تھے۔ قریش کے لشکر نے مرالظہران کے پاس مکہ سے چالیس (40) میل دور مجنہ کے پانی پر پڑاؤ ڈالا۔ ابوسفیان درج ذیل خطبہ دینے کے بعد واپس مکہ چلا گیا:

''اے گروہِ قریش! (جنگ کے لیے) ہریالی اور شادابی کا سال ہی تمھارے لیے بہتر ہوسکتا ہے۔ اس میں تم اونٹوں کو درختوں کے پتے بھی کھلا سکو گے اور ان کا دودھ بھی پی سکو گے۔ یہ سال قحط سالی والا ہے، اس لیے میں واپس جارہا ہوں، تم بھی واپس چلو۔''[1]

اس دوران مخشی بن عمرو ضمری آیا۔ اس نے غزوہ ودّان میں بنوضمرہ کی طرف سے مصالحت کی تھی۔ اس نے بدر میں رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کی اور کہا: ''اے محمد (ﷺ)! کیا اس (جگہ) پانی پر قریش سے لڑنے آئے ہو۔'' فرمایا: «نَعَمْ! يَا أَخَا بَنِي ضَمْرَةَ! وَإِنْ شِئْتَ مَعَ ذٰلِكَ رَدَدْنَا إِلَيْكَ مَا كَانَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ، ثُمَّ جَادَلْنَاكَ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ» ''ہاں، اے ضمری! اور اگر تمھارا منشا ہو تو میں اس عہد کو جو ہمارے تمھارے درمیان طے پایا تھا، واپس لے لوں اور تم سے بھی جنگ کروں، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارا تمھارا فیصلہ کردے۔'' مخشی نے کہا: ''نہیں نہیں، بخدا! مجھے آپ (ﷺ) سے جنگ کی کوئی ضرورت نہیں۔''[2]

اس ملاقات میں رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کی قوت کا مظاہرہ کیا اور واضح کیا کہ فریقین کے درمیان جنگ بندی کا معاہدہ مسلمانوں کی قوت سے طے پایا ہے نہ کہ کمزوری پر اور یہ بھی کہ جنگ بندی کا معاہدہ مخالف فریق کے مطالبے پر طے پایا ہے۔ یوں مسلمانوں

[1] نضرة النعيم:319,318/1، وغزوة الأحزاب لمحمد أحمد باشميل، ص:88. [2] السيرة النبوية لابن هشام:220/3.

کی قوت کا مظاہرہ ہوا اور دشمن پر مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی۔[1]

اسلامی لشکر بڑی شان و شوکت کے ساتھ مدینہ سے بدر تک چلا اور بدر میں اسلامی لشکر کی موجودگی مدینہ اور بیرون مدینہ بلکہ مکمل جزیرۃ العرب کے لیے واضح پیغام تھا کہ اسلامی لشکر زبردست قوت اور رعب و دبدبہ کی علامت بن چکا ہے۔ اس امر کی اس سے بڑی کوئی دلیل نہیں تھی کہ مکی لشکر، جزیرۃ العرب میں کثرت تعداد، نظم و ضبط اور اعلیٰ پایے کے اسلحے کے باوجود، اسلامی لشکر کے خوف سے رستے ہی سے واپس چلا گیا، جبکہ جنگ کا معاہدہ جنگ احد میں مکی لشکر ہی کے قائد نے طے کیا تھا۔[2]

جنگ احد میں مشرکین کا پلہ بھاری ہونا اور ان کی فتح کی تشہیر ان کے گلے کا طوق بن گیا اور وہ تمام عرب کے لیے مضحکہ بن گئے۔ تمام لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ احد میں مسلمانوں کا پھندے میں آجانا اور ان کے افراد کا قتل کسی کمزوری یا شکست کی دلیل نہیں ہے۔[3]

اس غزوے نے مسلمانوں کی جنگی شہرت کو نمایاں کیا اور انھیں بغیر جنگ کے دشمن پر بہت بڑی نفسیاتی فتح سے ہمکنار کیا، نیز وہ بدر کے تجارتی میلے میں شریک ہوئے اور تجارت میں خاصا نفع کمایا۔[4]

قریش کی عہد شکنی مسلمانوں کے مقام و مرتبے کو بلند کرنے اور سابقہ غلبہ و ہیبت دوبارہ قائم کرنے میں بڑی موثر ثابت ہوئی۔[5]

غزوۂ دومۃ الجندل

غزوۂ دومۃ الجندل بھی اسلامی حکومت کی اساس مضبوط کرنے کی ایک کوشش تھی۔

غزوۂ بدر صغریٰ کے بعد اسلامی سپاہ رسول اللہ ﷺ کی قیادت میں بنوقضاعہ کی جانب

1 من معين السيرة لصالح الشامي، ص:265,264. 2 غزوة الأحزاب لمحمد أحمد باشميل، ص: 89,88. 3 التاريخ الإسلامي للحميدي: 66/6. 4 التربية القيادية للدكتور الغضبان: 463/3. 5 المجتمع المدني في عهد النبوة للدكتور العمري، ص:91.

چلی۔ قضاعہ سے مراد وہ علاقہ ہے جو قبائل اسد و غطفان کے بائیں جانب غسانی ریاست کی حدود پر واقع ہے جو رومیوں کی ''بازنطینی'' حکومت کے زیرِنگیں تھا۔ مدینہ منورہ کے شمال میں 450 کلو میٹر کے فاصلے پر منعقد ہونے والے دومۃ الجندل کے مشہور میلے پر انھی کا کنٹرول تھا۔

یہ پہلا قبیلہ تھا جس سے مسلمانوں نے ٹکر لی۔ غزوۂ ''دومۃ الجندل'' ربیع الاول 5 ھ / اگست 626ء میں پیش آیا۔ مدینہ منورہ میں یہ خبریں پہنچ رہی تھیں کہ دومۃ الجندل کے پاس کچھ قبائل اکٹھے ہو رہے ہیں تاکہ قریب سے گزرنے والے قافلوں کو لوٹ سکیں۔ اور اہل قافلہ پر ظلم و زیادتی کر سکیں۔ یہ خبریں بھی گرم تھیں کہ یہ قبائل مدینہ منورہ کی اینٹ سے اینٹ بجانے کے متعلق سوچ رہے ہیں۔[1]

دومۃ الجندل مدینہ منورہ سے طویل مسافت پر واقع تھا۔ یہ حجاز اور شام کی سرحد پر مدینہ منورہ سے 16 دن کے مسلسل سفر پر، بحیرۂ اُحمر اور خلیجِ فارس (خلیج عربی) کے درمیان واقع ہے، لہٰذا اگر مسلمان دومۃ الجندل میں دشمن کے اکٹھ سے بے پروائی کرتے اور خاموش رہتے تو کوئی بھی انھیں قابل ملامت نہ سمجھتا اور نہ مستقبل قریب میں وہ نقصان پہنچانے کی استطاعت رکھتے تھے۔ لیکن مسلمانوں کی سیاسی دور اندیشی اور تزویراتی سوچ بچار نے انھیں اس گروہ کی حرکات و سکنات اور اس کے بڑھنے پھولنے سے پہلے ہی کاری ضرب لگانے پر مجبور کیا تاکہ درج ذیل نتائج برآمد ہو سکیں:

① ایسے اجتماعات کے متعلق خاموشی انھیں حد سے بڑھنے کا موقع دے گی۔ نتیجتاً مسلمان کمزور ہو جائیں گے۔ اور دشمن کے دلوں سے ان کا رعب جاتا رہے گا۔ دشمن کی خواہش یہی ہوتی ہے۔

② شام کے رستہ پر اس قسم کے اجتماعات مسلمانوں کے اقتصادی پروگرام کو بھی متاثر کر

[1] تأملات في سيرة الرسول ﷺ لمحمد الوكيل، ص: 169.

سکتے تھے۔ لہٰذا اگر مسلمان اس گروہ سے چشم پوشی کرتے تو یہ اور اس طرح کہ دیگر قبائل اسلامی قافلوں کو لوٹتے رہتے اور نتیجہ معاشی و اقتصادی بدحالی اور سیاسی عدم استحکام کی صورت میں نکلتا۔

③ سابقہ حکمت سے بھی بڑھ کر اس کا مقصد تمام علاقے میں مسلمانوں کا اثر و رسوخ قائم کرنا تھا۔ علاقے کے باشندے اچھی طرح سمجھ لیں کہ وہ مسلمانوں کی حفاظت میں ہیں، اس لیے راستوں کا محفوظ رکھنا ان کا فرض ہے۔ تاکہ وہ ان کی تجارت کا تحفظ کریں اور ان کے لیے خطرہ بننے والی ہر قوت سے نبرد آزما ہوں۔[1]

④ قریش کو اس کی تجارت محفوظ رکھنے والے کسی بھی طرفدار سے محروم کرنا۔ قریش کا اس اہم تجارتی مرکز کو خیر باد کہنا اور ان کے مقابلے میں اسلامی حکومت کا اس شان و شوکت سے سامنے آنا مسلمانوں کے اولین دشمن کی نفسیات پر گہرا اثر ڈالے گا اور وہ اپنی تجارت کے متعلق مسلمانوں سے ہمیشہ مرعوب رہے گا۔[2]

⑤ عربوں کی نفسیاتی مرعوبیت کو دور کرنا کہ وہ کبھی روم سے جنگ نہیں کر سکتے۔ انھیں عملاً یقین دہانی کرانا مقصود تھا کہ ان کا پیغام عالمی پیغام ہے، صرف عرب تک محدود نہیں۔ بعض مؤرخین، مثلاً: ذہبی، واقدی اور محمد باشمیل وغیرہ کا خیال یہ ہے کہ اس غزوے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ رومیوں کو ان کی سرحد پر لشکر کشی کر کے مرعوب رکھا جائے۔ وہاں سے روم کا صوبائی دارالحکومت دمشق صرف پانچ دن کی مسافت پر تھا۔[3]

الغرض رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو ساتھ چلنے کا حکم دیا۔ آپ ﷺ 1000 مجاہدین کے ہمراہ روانہ ہوئے۔ رات کو سفر کرتے اور دن کو چھپ جاتے تاکہ آپ کی آمد مخفی رہے۔[4]

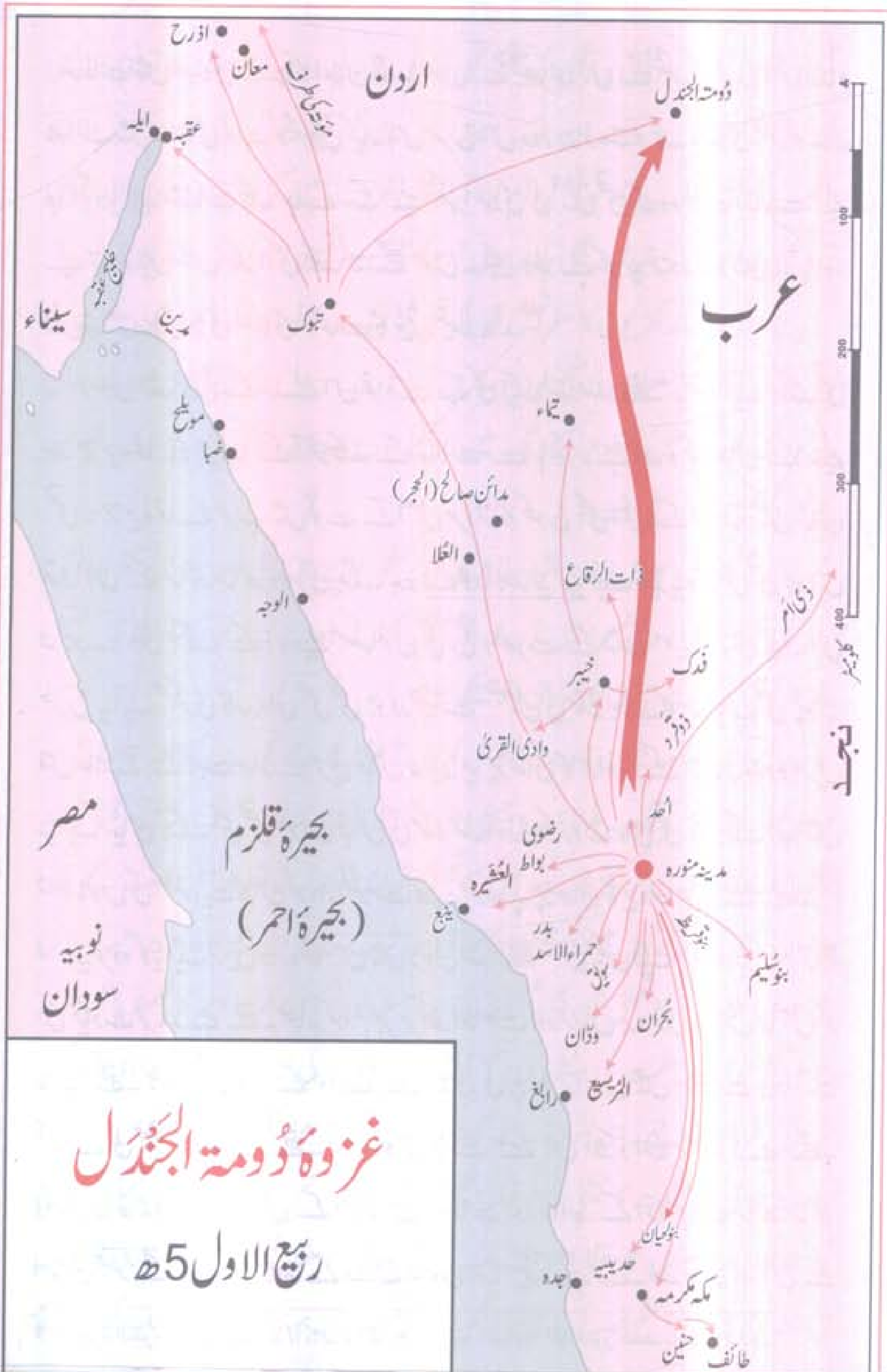
1 تأملات في سيرة الرسول ﷺ لمحمد الوكيل، ص: 169. 2 دراسات في عهد النبوة للدكتور عبدالرحمٰن الشجاع، ص: 144. 3 غزوة الأحزاب لمحمد أحمد باشميل، ص: 93، وتاريخ المغازي للذهبي، ص: 258. 4 تأملات في سيرة الرسول ﷺ لمحمد الوكيل، ص: 170، وغزوة الأحزاب لأبي فارس، ص: 40.

رسول اللہ ﷺ نے بنو عذرہ کا ''مذکور'' نامی صحرائی رہبر ساتھ لیا اور دشمن کے سر پر پہنچ گئے۔ دشمن بکھر گیا۔ آپ کے ہاتھ کوئی نہ لگا۔ وہ اپنے جانور اور بکریاں وغیرہ مسلمانوں کے لیے چھوڑ گئے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان کے ایک شخص کو پکڑ کر آپ ﷺ کے سامنے پیش کیا۔ آپ ﷺ نے اس سے دریافت کیا تو وہ کہنے لگا: ''جب میری قوم کے لوگوں کو معلوم ہوا کہ آپ نے ان کے جانور قابو کر لیے ہیں تو وہ سب بھاگ کھڑے ہوئے۔'' آپ ﷺ نے اس پر اسلام پیش کیا تو وہ مسلمان ہو گیا اور کئی دن وہیں رہا۔ آپ ﷺ نے مجاہدین کے دستے ہر طرف پھیلا دیے مگر کوئی ہاتھ نہ لگا۔ مدینہ واپسی پر عیینہ بن حصن فزاری آپ سے ملا۔ اس نے دشمنی ترک کرتے ہوئے مدینہ منورہ سے چھتیس (36) میل کے فاصلے پر اپنے اونٹ اور بکریاں چرانے کی اجازت طلب کی۔

دومۃ الجندل تک اسلامی سپاہ کا مدینہ منورہ سے اتنی دور کی مسافت پر چلے جانا، عیینہ بن حصن کا دشمنی ترک کر کے مسلمانوں سے رابطہ اور ایسی زمین میں اونٹ اور بکریاں چرانے کی اجازت طلب کرنا جو مدینہ منورہ سے چھتیس (36) میل کے فاصلے پر ہے، یعنی تقریباً 58 کلومیٹر کے فاصلے پر۔ یہ امور مسلمانوں کی انتہائی قوت وسطوت ظاہر کرتے ہیں۔ اور یہ بھی کہ انھیں اس علاقے کے مسلمانوں کے لیے پرامن زندگی مہیا کرنے کا مکمل احساس ہے۔ یہ دور دراز علاقے حکومت کا حصہ تھے اور حکومت اسلامیہ مستحکم حکومت کی شکل اختیار کر چکی تھی جس پر چڑھائی کرنا کسی کے بس کی بات نہ تھی، تاہم اگر کسی کو اس کی ہمت ہوتی بھی تو وہ عیینہ بن حصن فزاری تھا جس کے اعلانِ جنگ پر دس ہزار نوجوان بھڑک اٹھنے پر تیار ہو جاتے تھے۔[1]

غزوۂ دومۃ الجندل مدینہ منورہ سے بہت دور شام کی جانب پیش آیا۔ اس کے اور دمشق کے درمیان صرف پانچ دن کی مسافت ہے۔ گویا یہ شمالی بستیوں میں اور شام کے جنوبی

[1] تأملات في سيرة الرسول ﷺ لمحمد الوكيل، ص: 170.


اذرح
معان
اردن
دومۃ الجندل
ایلہ
عقبہ
تبوک
عرب
سیناء
تیماء
مدائن صالح (الحجر)
العلا
ذات الرقاع
الوجہ
ذی امر
فدک
خیبر
وادی القری
احد
رضوی
بواط
العشیرہ
مدینہ منورہ
ینبع
مصر
بحیرۂ قلزم
(بحیرۂ احمر)
نوبیہ
سودان
بدر
حمراء الاسد
بنوسلیم
بحران
ودان
المریسیع
رابغ
غزوۂ دُومۃ الجندل
ربیع الاول 5ھ
بنولحیان
حدیبیہ
جدہ
مکہ مکرمہ
حنین
طائف

نقشہ: 14

مضافات میں اسلامی دعوت کا اعلان تھا۔ انھوں نے قیصر اور اس کے لشکر کی طرح اطراف و جوانب میں اسلامی قوت کو محسوس کیا۔ اس طرح اس دور دراز مقام تک اسلامی لشکر کو لے جانا گویا بعید مقامات تک جانے کے لیے لشکر اسلامی کی مشق تھی کہ وہ ایسے مقامات کے لیے تیار رہیں جس جگہ ابھی تک نہ گئے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ غزوہ بعد میں ایشیا اور افریقہ میں بڑی بڑی اسلامی فتوحات کا پیش خیمہ بنا۔[1]

رسول اللہ ﷺ کے سامنے اس غزوے کے کئی ایک مقاصد تھے۔ یہ خود ایک جنگ تھی اور جزیرہ نمائے عرب کے آخر تک کے حالات سے باخبر رہنے اور دیکھ بھال کے لیے تھی۔ جزیرہ نمائے عرب میں قوت کے اصل مراکز کا کھوج بھی اس کے اہداف میں شامل تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ دوسری جنگ بدر کے فوراً بعد یہ گویا ایک میڈیا وار بھی تھی جو اس نہ ہونے والی جنگ کے ذریعے مسلمانوں کی فتح و نصرت کے نتائج سمیٹ رہی تھی۔ اسی طرح یہ ایک عسکری کارروائی بھی تھی جو درحقیقت مستقبل کی ممکنہ جنگ کا سدباب تھی کیونکہ اس علاقے کے بہت سارے عربی قبائل مدینہ پر چڑھائی کا ارادہ رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں یہ ایک سیاسی جنگ بھی تھی جو ان قبائل کی ممکنہ حملہ آوری کو روک رہی تھی جو جنگ احد میں مسلمانوں کی مغلوبیت کا سن کر دارالحکومت مدینہ منورہ پر چڑھائی کا پروگرام بنا سکتے تھے۔[2]

یہ غزوہ گویا ایک تربیتی دورہ تھا جس میں رسول اللہ ﷺ بنفس نفیس ایک ہزار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قیادت فرما رہے تھے۔ صحابہ کرام ہر ہر لحظہ اطاعت اور فرماں برداری کا سبق حاصل کر رہے تھے۔ جسمانی جنگ کے حوالے سے زندگی کی پرخطر راہوں میں مشکلات برداشت کرنے کی مشق کر رہے تھے۔ حلال و حرام کے سلسلے میں فقہ و احکام سیکھ رہے تھے۔ دوسرے خاندانوں اور قبائل کے افراد سے تعلقات اور روابط کے احکام کے ساتھ ساتھ اسلامی لشکر کے اصول وضوابط کے سامنے سرنگوں ہونا سیکھ رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے

[1] السيرة النبوية لأبي شهبة:2/251,252. [2] التربية القيادية للدكتور الغضبان:3/372.

رسول ﷺ کے لیے دوستی و دشمنی کی مشق تھی جس کے لیے وہ قبائلی تعصب و تعلقات پس پشت ڈالنا سیکھ رہے تھے۔ ان سب امور سے بڑھ کر قیادت کو نئے میسر آنے والے ساتھیوں کی تعلیم و تربیت کا موقع فراہم کیا گیا۔ اس غزوے میں کمزور طبع ساتھیوں اور باہمی برتاؤ میں ان لوگوں کی حالت بھی ظاہر ہوئی جن کا تعلق منافقین کے گروہ سے تھا۔

یہ چند دن یا کچھ گھڑیوں کا سفر نہیں تھا بلکہ تقریباً ایک ماہ کا دورہ تھا۔ جس میں ہر ایک کی طبیعت کا رجحان اور میلان واضح طور پر سامنے آجاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ اس صورت حال سے واقف ہو کر انھیں اسلام کے رنگ میں رنگتے اور چیدہ چیدہ لوگوں کو سیاست و قیادت کے فن روشناس کرتے تھے۔

یہ ایک خاموش معرکہ اور پرسکون تربیت تھی۔ لشکر اپنے قائد کی معیت میں تقریباً ایک ہزار میل کا سفر لق و دق صحرا میں تربیت اور مشق کرتے ہوئے طے کر رہا تھا تاکہ مستقبل کے معرکوں کے لیے تیاری کا سامان ہو سکے۔

رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ دومۃ الجندل کو جاتے ہوئے نئے تجربے کے طور پر سباع بن عرفطہ غفاری رضی اللہ عنہ کو مدینہ کا نائب، یعنی والی مقرر فرمایا جو نہ تو اوس سے تعلق رکھتا تھا نہ خزرج سے اور نہ ہی قریش سے۔ اس کا تعلق قبیلۂ غفار سے تھا جو اہل عرب کے ہاں حاجیوں کے چور سمجھے جاتے تھے۔ یوں اسلامی معاشرے کے ذہن میں اطاعت امیر کا درس پختہ ہو رہا تھا۔ امیر کا تعلق کسی بھی گروہ سے ہو، مسلمانوں کو اطاعت امیر کا حکم دیا گیا تھا۔ یہ امر منہج نبوی کی عظمت کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ امت کی تربیت کیسے عمدہ اور بلند پایہ طریق پر فرما رہے تھے۔ اسی طرح یہ امر بھی واضح ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاں قیادت و فراست نبوی کی عظمت کا کتنا مقام تھا۔ انھیں آپ ﷺ پر کس قدر اعتبار تھا اور آپ ﷺ کی خداداد صلاحیتوں کا کتنا اعتراف تھا۔ آپ ﷺ کو سباع بن عرفطہ غفاری رضی اللہ عنہ کی قائدانہ صلاحیتوں کا علم تھا۔ آپ ﷺ گویا مدینہ منورہ میں عدم موجودگی پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم

کی تربیت فرما رہے تھے کہ رب العالمین کے منہج و قانون کو کیسے نافذ کرنا ہے اور اس سے ایسی امت کیسے تشکیل دینی ہے جو کتاب اللہ اور سنت رسول کی تعلیمات کے آگے سر جھکا دیا کرے۔[1]

الحشر 59:2

[1] التربية القيادية للدكتور الغضبان:3/374.

غزوۂ بنوالمصطلق اور واقعۂ افک

بنوالمصطلق

بنوالمصطلق خزاعہ کی ایک شاخ ہے۔ مصطلق ان کا کوئی بڑا تھا۔ اس کا نسب یہ ہے:

''جذیمہ بن سعد بن عمرو بن ربیعہ بن حارثہ بن عمرو بن عامر ماء السماء۔''[1]

خزاعہ کے متعلق کئی آرا ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ خزاعہ عدنانی قبیلہ ہے، جبکہ بعض کے مطابق یہ قبیلہ یمنی قحطانی ہے۔ اور یہی زیادہ راجح ہے۔ زیادہ تر علماء کی رائے بھی یہی ہے۔[2]

غزوے کی تاریخ

غزوۂ بنوالمصطلق کی تاریخ کے متعلق علمائے سیرت کے تین اقوال ہیں:

① امام المغازی ابن اسحاق، خلیفہ بن خیاط، ابن جریر طبری، ابن حزم، ابن عبدالبر، ابن العربی، ابن الاثیر اور ابن خلدون کی رائے یہ ہے کہ غزوۂ بنوالمصطلق شعبان چھ 6 ہجری میں پیش آیا۔[3]

② مسعودی اور ابن العربی مالکی کی رائے یہ ہے کہ یہ غزوہ شعبان 4 ہجری میں واقع ہوا۔

③ مؤرخین کی کثیر تعداد، مثلاً: موسیٰ بن عقبہ، ابن سعد، ابن قتیبہ، بلاذری، ذہبی، ابن قیم،

---

1 حدیث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ للدکتور محمد بکر آل عابد: 311/1. 2 مرویات غزوۃ بني المصطلق لإبراهيم القريبي، ص: 45-51. 3 صحیح السیرۃ النبویۃ لإبراهيم العلي، ص: 329، حدیث القرآن عن غزوات الرسول للدکتور محمد بکر آل عابد، ص: 312،313.

ابن حجر عسقلانی اور ابن کثیر رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ غزوہ بنی المصطلق شعبان 5 ہجری میں پیش آیا۔ دور حاضر کے سیرت نگاروں میں سے محمد خضری بک، محمد غزالی، سعید رمضان بوطی، ابو شہبہ، ساعاتی، محمد ابوزہرہ، سید قطب، حسن مشاط، محمد علی صابونی، محمد بکر آل عابد، مہدی رزق اللہ احمد کی بھی یہی رائے ہے۔[1] میرے نزدیک یہی رائے حسب ذیل اسباب کی بنا پر راجح ہے:

❁ جمہور اہل سیرت اور مرتبین غزوات کے علاوہ معاصر سیرت نگاروں کی اکثریت کی بھی یہی رائے ہے۔

❁ شعبان 4 ھ میں تو پہلے سے طے شدہ غزوۂ بدر لڑا گیا تھا۔ یوں قدرتی بات ہے کہ غزوۂ بنوالمصطلق اس برس پیش نہیں آیا۔

❁ غزوۂ بنی المصطلق میں حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی موجودگی بھی اس امر کو تقویت دیتی ہے کہ یہ 5 ھ میں ہوا 6 میں نہیں کیونکہ اس غزوے کے فوراً بعد واقعہ اِفک پیش آیا جس میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا تذکرہ موجود ہے۔ صحیح بخاری کی روایت میں ہے: حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے......۔[2]

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی وفات غزوۂ بنو قریظہ کے بعد ہوئی تھی، جبکہ غزوۂ بنوقریظہ راجح قول کے مطابق 5 ہجری ذی القعدہ میں پیش آیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ غزوۂ بنی المصطلق اس سے پہلے پیش آیا تھا۔[3]

غزوۂ بنی المصطلق کے اسباب

غزوۂ بنی المصطلق کے اہم اسباب درج ذیل ہیں:

❁ قبیلۂ بنی المصطلق نے جنگ احد میں مسلمانوں کے خلاف قریش کی حمایت کی تھی۔ یہ

[1] حديث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ للدكتور محمد بكر آل عابد: 312/1. [2] صحيح البخاري، حديث: 4750. [3] مزید دیکھیے: مرويات غزوة بني المصطلق لإبراهيم القريبي، ص: 97.

لوگ احابیش [1] کے گروہ میں شامل تھے جو قریش کی حمایت میں جنگ احد میں شریک ہوا تھا۔

❁ مکہ مکرمہ جانے والی شاہراہ پر ان لوگوں کا کنٹرول تھا۔ یہ لوگ مکہ میں مسلمانوں کے عمل دخل کو روکنے کے لیے مضبوط رکاوٹ کی حیثیت رکھتے تھے۔ [2]

❁ رسول اللہ ﷺ کو بنو مصطلق کے اکٹھے ہونے کی اطلاعات مل رہی تھیں، ان کے منتشر گروہوں کو جمع کرنے والا قائد حارث بن ابی ضرار تھا جو انھیں منظّم کر رہا تھا۔ آپ ﷺ نے ان کے اکٹھے ہونے کے متعلق سنا تو خود ان کی جانب روانہ ہوئے اور ''مریسیع'' کے چشمے پر انھیں زبردست شکست دی۔ یہ چشمہ قدید کی طرف سے ساحل سمندر پر واقع ہے۔ [3]

مسلمانوں کا اچانک حملہ اور دیگر واقعات

رسول اللہ ﷺ کو جب ان کی مشکوک حرکتوں کا علم ہوا تو آپ ﷺ نے ان کا ارادہ جاننے کے لیے حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا۔ بریدہ رضی اللہ عنہ نے ظاہر کیا کہ وہ ان کی مدد کے لیے آئے ہیں۔ اس دوران میں انھوں نے صورت حال کا بخوبی جائزہ لیا اور واپس مدینہ پہنچ کر رسول اللہ ﷺ کو خبر دی۔

5 ہجری 2 شعبان بروز پیر رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ سے 700 جنگجوؤں اور تیس گھڑسواروں کے ہمراہ ان کی جانب روانہ ہوئے۔ [4] اسلام کی دعوت انھیں پہلے ہی پہنچ چکی تھی اور وہ جنگ احد میں قریش کا ساتھ بھی دے چکے تھے۔ مزید برآں مسلمانوں سے

---

1 احابیش: اس سے مراد وہ قبائل ہیں جن کا تعلق بنیادی طور پر قریش سے نہیں تھا لیکن وہ قریش میں ضم ہو گئے تھے۔ اور قریش کے حلیف تھے۔ غزوۂ احد میں مشرکین کے ساتھ شامل تھے۔ احابیش کے مشہور قبائل یہ ہیں: بنو حارث، بنو ہون بن خزیمہ اور بنو مصطلق۔ انھیں احابیش اس لیے کہا جاتا ہے کہ انھوں نے مکہ کی نچلی جانب وادی احبش میں قریش کے ساتھ معاہدہ کیا تھا۔ 2 صحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 332. 3 حديث القرآن عن غزوات الرسول للدكتور محمد بكر آل عابد: 315/1. 4 تاريخ الإسلام للذهبي، ص: 259، والمغازي للواقدي: 405/1.

جنگ کے لیے جمعیت اکٹھی کر رہے تھے۔ امام بخاری و مسلم ؒ نے روایت کیا ہے کہ مسلمانوں نے ان پر اچانک دھاوا بول دیا۔ وہ چشمے پر جانوروں کو پانی پلا رہے تھے۔ آپ ﷺ نے ان کے جنگجوؤں کو قتل کرنے کا حکم دیا اور بچوں کو قیدی بنا لیا۔ جویریہ بنت حارث بن ابوضرار ؓ بنو المصطلق کے قیدیوں میں شامل تھیں۔[1]

حضرت جویریہ بنت حارث ؓ سے رسول اللہ ﷺ کا عقد

رسول اللہ ﷺ نے بنو المصطلق کے قیدی تقسیم کیے۔ قیدیوں میں سیدہ جویریہ بھی شامل تھیں۔ وہ اپنی قوم کے لیے باعث برکت ثابت ہوئیں۔ آیئے ان کا واقعہ سیدہ عائشہ ؓ کی زبانی سنتے ہیں:

سیدہ عائشہ ؓ کا بیان ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے بنو المصطلق کے قیدی تقسیم کیے تو جویریہ بنت حارث، حضرت ثابت بن قیس بن شماس ؓ یا ان کے چچا زاد کے حصے میں آئیں، جویریہ نے ان سے آزادی کے لیے مکاتبت کر لی۔ یہ بڑی میٹھی طبیعت کی مالک، صاحب جمال خاتون تھیں۔ تاوانِ غلامی کی ادائیگی کے سلسلے میں مدد طلب کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئیں۔ سیدہ عائشہ کا بیان ہے کہ واللہ! میں نے اسے اپنے حجرے کے دروازے پر دیکھا تو مجھے اس کی موجودگی ناگوار گزری۔ مجھے معلوم تھا کہ جس طرح یہ مجھے بھلی لگی ہے رسول اللہ ﷺ کو بھی اچھی لگے گی۔ اتنے میں وہ آپ ﷺ کے پاس پہنچی اور عرض کرنے لگی: ''اے اللہ کے رسول! میں حارث بن ضرار کی بیٹی ہوں۔ حارث بن ضرار اپنے قبیلے کا سردار تھا۔ میں جس امتحان میں پڑی ہوں، آپ واقف ہیں۔ میں ثابت بن قیس (یا اس کے چچا زاد) کے حصے میں آئی ہوں۔ میں نے اس سے مکاتبت کر لی ہے اور رقم کی ادائیگی کے سلسلے میں مدد لینے کے لیے حاضر ہوئی ہوں۔''

[1] صحيح البخاري، حديث:2541، وصحيح مسلم، حديث:1730، والسيرة النبوية في ضوء المصادر الأصلية للدكتور مهدي رزق الله، ص:433.

آپ ﷺ نے فرمایا: «فَهَلْ لَّكِ فِي خَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكَ؟» ''اس سے بھی بہتر صورت چاہتی ہو؟'' جویریہ نے پوچھا: ''وہ کیا ہے اے اللہ کے رسول!؟''

فرمایا: «أَقْضِي عَنْكِ كِتَابَتَكِ وَأَتَزَوَّجُكِ» ''میں تمھاری طرف سے مکاتبت کی رقم ادا کر دوں اور تم سے شادی کر لوں۔''

جویریہ نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! میں راضی ہوں۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ یہ بات تمام لوگوں میں پھیل گئی کہ رسول اللہ ﷺ نے جویریہ سے عقد فرما لیا ہے۔ لوگوں نے کہا: ''اب تو بنومصطلق رسول اللہ ﷺ کے سسرالی رشتہ دار ہو گئے ہیں۔'' چنانچہ بنومصطلق کے تمام قیدی آزاد کر دیے گئے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جویریہ کو اپنی زوجیت میں لیا تو لوگوں نے بنومصطلق کے 100 قیدی آزاد کر دیے۔ میری نظر میں ایسی کوئی عورت نہیں جو اپنی قوم کے لیے جویریہ سے بڑھ کر باعث برکت ثابت ہوئی ہو۔[1]

غزوۂ بنومصطلق ان منفرد اور مبارک غزوات میں سے ہے جن کے بعد قبیلے کا قبیلہ اسلام لے آیا۔ وجہ یہی تھی کہ صحابہ کرام نے بنومصطلق کے تمام قیدی آزاد کر دیے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے سسرالیوں کو قیدی بنا کر رکھنا ان پر بہت شاق گزرتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام کے اعلیٰ اخلاق سے متاثر ہو کر قبیلے کا قبیلہ مسلمان ہو گیا۔[2]

بنومصطلق کی آزادی کے تاریخی واقعے کا اصل سبب یہ تھا کہ صحابۂ کرام رسول اللہ ﷺ سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ ان کے دلوں میں آپ ﷺ کی عظیم شخصیت کا جو احترام تھا وہی اس واقعے کی بنیاد بنا۔ محبت نبوی کی برکت سے ایسے ہی عمدہ نتائج برآمد ہوئے اور اسی نوع کے بے مثال تاریخی واقعات جنم لیتے رہے۔

1 سنن أبي داود، حديث:3931، ومسند أحمد:277/6، وصحيح ابن حبان، رقم: 4055,4054، والسيرة النبوية لابن هشام:308,307/3. 2 حديث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ للدكتور محمد بكر آل عابد:317/1.

حضرت جویریہ بنت حارث رضی اللہ عنہا سے عقد کے دور رس مقاصد تھے۔ جو ان کی قوم کے اسلام لانے کی صورت میں سامنے آئے۔ ان کے ساتھ عقد سے رسول اللہ ﷺ کا مقصد یہی تھا کہ آپ کو ان کی قوم کے اسلام لانے کی امید تھی۔ یوں مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور اسلام کو مزید عزت ملی۔ اسلام کے لیے یہ بڑی نتیجہ خیز مصلحت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس عقد مبارک کے ذریعے اس مصلحت کا حصول آسان کر دیا۔ علاوہ ازیں جو مقاصد مطلوب تھے انھیں پورا فرمایا۔ جویریہ رضی اللہ عنہا اور ان کے والد اسلام لائے تو ان کے ساتھ ہی قبیلہ بھر مسلمان ہو گیا۔ یوں اس عقد مبارک سے اسلام اور مسلمانوں کو برکت و قوت ملی اور دیگر مادی وسائل بھی میسر آئے۔[1]

حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا اب سید المرسلین کی زوجہ محترمہ اور ام المؤمنین تھیں۔ موصوفہ رسول اللہ ﷺ کی جو سنتیں یاد کرتیں ان پر عمل پیرا ہوتیں۔ بڑی عبادت گزار، پرہیز گار، تقویٰ شعار، دین کے معاملات کی سمجھ رکھنے والی، صاف دل اور روشن دماغ خاتون تھیں۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے بہت محبت کرنے والی اور مسلمانوں کی انتہائی خیر خواہ تھیں۔ احادیث نبوی کی عظیم راویہ ہیں۔ مخزن رشد و ہدایت اور منبع وحی سے حقائق دین نقل کرتیں۔ جلیل القدر صحابۂ کرام نے آپ سے حدیث روایت کی ہے۔[2]

ابن عباس، عبید بن سباق، کریب مولیٰ ابن عباس، مجاہد اور ابو ایوب یحییٰ بن مالک ازدی رضی اللہ عنہم نے ام المومنین جویریہ رضی اللہ عنہا سے روایات نقل کی ہیں۔ مسند بقی بن مخلد میں آپ کے واسطے سے سات روایات مرقوم ہیں جن میں سے چار روایات سنن میں ہیں۔[3]

صحیح بخاری میں ایک اور صحیح مسلم میں دو روایات ہیں۔ ام المومنین جویریہ رضی اللہ عنہا کی روایات میں جمعہ کو روزہ کے ساتھ خاص نہ کرنے کی روایت،[4] دعا کے باب میں تسبیح

---

1 صور و عبر من الجهاد النبوي في المدينة للدكتور محمد فوزي فيض الله، ص:200,199.

2 محمد رسول الله ﷺ لصادق عرجون: 250/4. 3 دورالمرأة في خدمة الحديث لآمال قرداش، ص: 88. 4 صحيح البخاري، حديث: 1986، ومسند أحمد: 324/6.

(سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ، عَدَدَ خَلْقِهٖ وَرِضَا نَفْسِهٖ......) کے ثواب کے متعلق ایک حدیث [1] اور زکاۃ کے باب سے متعلقہ روایات میں نبی مکرم ﷺ کے لیے ہدیے کی اباحت (اگرچہ ہدیہ دینے والے کو وہ ہدیہ خود صدقے میں ملا ہو) [2] کی روایات موجود ہیں۔ آپ نے غلام آزاد کرنے کے متعلق بھی ایک روایت بیان کی ہے۔ [3]

ان سات احادیث کے ذریعے سے ام المؤمنین جویریہ بنت حارث رضی اللہ عنہا نے اپنا نام روایات کی دنیا میں ہمیشہ کے لیے زندۂ جاوید کرلیا ہے تاکہ صحبت نبوی اور ام المؤمنین کے شرف کے ساتھ حتی المقدور آپ ﷺ کی سنتوں کی تبلیغ کرنے کی فضیلت بھی حاصل ہو۔ [4]

ام المؤمنین جویریہ بنت حارث رضی اللہ عنہا پابندی اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرنے والی، پرہیزگار خاتون تھیں۔ ام المؤمنین جویریہ خود اپنا واقعہ بیان کرتی ہیں: ”رسول اللہ ﷺ صبح سویرے ان کے ہاں سے نکلے، آپ ﷺ نے صبح کی نماز پڑھی تو وہ مصلے پر تھیں۔ آپ ﷺ چاشت کے وقت واپس تشریف لائے تو دیکھا کہ وہ وہیں بیٹھی تھیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «مَازِلْتِ عَلَى الْحَالِ الَّتِي فَارَقْتُكِ عَلَيْهَا؟» ”جب سے میں گیا ہوں کیا اسی حالت میں ہو؟“ جویریہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا: ”جی ہاں!“ آپ ﷺ نے فرمایا: «لَقَدْ قُلْتُ بَعْدَكِ أَرْبَعَ كَلِمَاتٍ، ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، لَوْ وُزِنَتْ بِمَا قُلْتِ مُنْذُ الْيَوْمِ لَوَزَنَتْهُنَّ: سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ عَدَدَ خَلْقِهٖ وَرِضَا نَفْسِهٖ، وَزِنَةَ عَرْشِهٖ، وَمِدَادَ كَلِمَاتِهٖ»

”میں نے تمھارے بعد تین بار چار کلمات کہے ہیں اگر ان کلمات کا موازنہ ان کلمات کے ساتھ کیا جائے جو تم نے صبح سے اب تک کہے ہیں تو میرے کہے کلمات یقیناً بھاری ہوں گے۔ وہ کلمات یہ ہیں: «سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ، عَدَدَ خَلْقِهٖ، وَرِضَا نَفْسِهٖ،

1 صحيح مسلم، حديث: 2726، ومسند أحمد: 324/6، یہ حدیث چند سطور بعد آرہی ہے۔
2 صحيح مسلم، حديث: 1073، ومسند أحمد: 429/6. 3 السنن الكبرٰى للنسائي: 23/5.
4 دور المرأة في خدمة الحديث لآمال قرداش، ص: 89,88.

وَزِنَةَ عَرْشِهِ، وَمِدَادَ كَلِمَاتِهِ»[1]

ام المؤمنین جویریہ رضی اللہ عنہا نے 50 ھ اور بعض کے بقول 56 ھ میں وفات پائی۔[2]

غزوۂ بنو مصطلق میں منافقین کی انصار و مہاجرین کو باہم لڑانے کی کوشش

غزوۂ بنو مصطلق میں منافقین بھی خاصی تعداد میں شریک ہوئے۔ اس سے پہلے کی جنگوں میں وہ اکثر پیچھے رہتے تھے۔ اس غزوے میں انھیں مسلمانوں کی فتح نظر آرہی تھی۔ یوں وہ غنیمت کے لالچ میں ساتھ ہو لیے۔[3]

مریسیع کے چشمے پر پہنچے تو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف منافقین کا کینہ ظاہر ہو گیا۔ اسلام کو جہاں بھی فتح ملتی منافقین مارے غیظ وغضب کے جل بھن جاتے۔ وہ منتظر رہتے تھے کہ مسلمان شکست خوردہ ہوں تاکہ ان کے سینے ٹھنڈے ہوں۔ مگر جب مریسیع میں بھی مسلمان فتح سے ہمکنار ہوئے تو منافقین نے مہاجرین و انصار کے درمیان جاہلی تعصب کو ہوا دینے کی کوشش کی، تاہم وہ بری طرح ناکام ہوئے۔ تب انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے اہل بیت کو اذیت دینی چاہی۔ انھوں نے واقعہ ''اِفک'' گھڑا اور انتہائی مہلک نفسیاتی جنگ بھڑکائی۔ آئیے یہ واقعہ زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کی زبانی سنتے ہیں۔ وہ اس کے عینی شاہد تھے۔[4]

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک غزوے میں شریک تھا۔ میں نے عبداللہ بن ابی کی آواز سنی۔ وہ کہہ رہا تھا: ''تم ان لوگوں کو کچھ مت دو جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ ہیں یہاں تک کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر بھاگ نکلیں۔ اور یقیناً اگر ہم مدینہ

1 صحيح مسلم، حديث: 2726، وسنن أبي داود، حديث: 1503، ومسند أحمد: 258/1، والسنن الكبرىٰ للنسائي، رقم:1277و9912. 2 الطبقات لابن سعد: 121/8، وتاريخ خليفة بن خياط، ص: 234. 3 حديث القرآن عن غزوات الرسول للدكتور محمد بكر آل عابد: 318/1. 4 السيرة النبوية الصحيحة للعمري: 408/2.

واپس گئے تو مدینہ کے معزز افراد وہاں کے ذلیل لوگوں کو نکال باہر کریں گے۔'' زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں واپس آیا اور اپنے چچا جان کو یہ بات بتائی۔ انھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتا دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلا کر پوچھا تو میں نے تصدیق کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن ابی اور اس کے ساتھیوں کو بلا بھیجا۔ انھوں نے قسم کھائی کہ ہم نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن ابی کو سچا اور مجھے جھوٹا قرار دیا۔ مجھے ایسا سخت صدمہ ہوا کہ کبھی نہ ہوا تھا۔ میں گھر میں بیٹھ گیا۔ چچا نے کہا: ''کیا تم نے یہی چاہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمھیں جھٹلاتے اور تم سے ناراض ہوتے۔'' اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی:

﴿اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَ اللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۝﴾

''(اے نبی!) جب منافق آپ کے پاس آتے ہیں تو وہ کہتے ہیں: ہم شہادت دیتے ہیں کہ بے شک آپ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ بے شک آپ اس کے رسول ہیں۔ اور اللہ شہادت دیتا ہے کہ یقیناً منافق البتہ جھوٹے ہیں۔''[1]

یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلا بھیجا۔ یہ فرمان الٰہی سنایا اور فرمایا:

«إِنَّ اللّٰهَ قَدْ صَدَّقَكَ يَا زَيْدُ!» ''زید! اللہ تعالیٰ نے تمھیں سچا قرار دیا ہے۔''[2]

مریسیع کے چشمے پر پیش آمدہ واقعہ جس نے منافقین کی طرف سے اسلامی وحدت پارہ پارہ کرنے اور جاہلی تعصب بیدار کرنے کی صورت اختیار کر لی تھی، اس کے ایک اور عینی شاہد حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم ایک غزوے میں شریک تھے۔ ایک مہاجر نے کسی انصاری کے لات مار دی۔ انصاری نے دہائی دی: ''ہائے انصار!'' مہاجر نے بھی پکارا: ''ہائے مہاجرین!'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا: «مَا بَالُ دَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ؟»

---

1 المنافقون 63:1. 2 صحيح البخاري، حديث: 4900، وصحيح مسلم، حديث: 2772، والسيرة النبوية الصحيحة للعمري: 408/2.

''یہ جاہلیت کی پکار کیا ہے؟'' لوگوں نے بتایا کہ ایک مہاجر نے کسی انصاری کے لات ماری ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «دَعُوهَا فَإِنَّهَا مُنْتِنَةٌ» ''چھوڑو! یہ گندی بات ہے۔'' عبداللہ بن ابی کو اس کی خبر ہوئی تو کہنے لگا: ''کیا واقعی (مہاجرین نے) ایسا کیا ہے؟ اللہ کی قسم! ہم مدینہ لوٹیں گے تو ہم میں سے عزت والا ذلیل کو وہاں سے نکال باہر کرے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! مجھے اس منافق کی گردن مارنے کی اجازت دیجیے۔ فرمایا: «دَعْهُ، لَايَتَحَدَّثُ النَّاسُ أَنَّ مُحَمَّدًا يَقْتُلُ أَصْحَابَهُ» ''رہنے دو! لوگ کہیں گے کہ محمد (ﷺ) اپنے ساتھیوں کو قتل کرتا ہے۔''[1]

ایک روایت میں ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی وہیں تھے۔ انھوں نے کہا: ''عباد بن بشر رضی اللہ عنہ کو حکم دیجیے کہ جا کر اسے قتل کر دے۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «فَكَيْفَ يَا عُمَرُ! إِذًا تَحَدَّثَ النَّاسُ أَنَّ مُحَمَّدًا يَقْتُلُ أَصْحَابَهُ؟ لَا وَلٰكِنْ أَذِّنْ بِالرَّحِيلِ» ''اے عمر! یہ کیونکر ہو سکتا ہے تب تو لوگ کہیں گے محمد (ﷺ) اپنے ساتھیوں کو قتل کرتا ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہاں! کوچ کا اعلان کر دو۔'' اس وقت آپ عموماً کوچ نہیں کیا کرتے تھے مگر لوگ یہ اعلان سن کر کوچ کر گئے۔[2]

ابن ابی کو جب معلوم ہوا کہ زید بن ارقم نے جو باتیں سنی تھیں وہ رسول اللہ ﷺ کو پہنچا دی ہیں تو وہ دوڑا دوڑا آیا اور قسم کھائی کہ جو زید نے آپ کو بتایا ہے میں نے ایسا ہرگز نہیں کہا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ موقع پر موجود انصار صحابہ نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! ممکن ہے لڑکے کو ابن ابی کی بات سننے میں غلطی لگی ہو۔'' آپ ﷺ چل پڑے تو اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ سے ملے۔ سلام کیا اور عرض کیا: ''اے اللہ کے نبی! آپ شام کے ناپسندیدہ وقت چل پڑے ہیں۔ ایسے وقت تو آپ سفر نہیں کیا کرتے؟''

1 صحيح البخاري، حديث: 3518، وصحيح مسلم، حديث: 2584، والسيرة النبوية الصحيحة للعمري: 409/2. 2 السيرة النبوية لابن هشام: 303/3، وتفسير الطبري: 116,115/28.

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «أَوَمَا بَلَّغَكَ مَا قَالَ صَاحِبُكُمْ؟» ''کیا تمھارے ساتھی نے جو کہا ہے وہ تمھیں معلوم نہیں؟''

اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! کون سا ساتھی؟''

فرمایا: «عَبْدُاللّٰهِ بْنُ أُبَيٍّ» ''عبداللہ بن ابی۔''

عرض کیا: ''کیا کہا ہے اس نے؟''

فرمایا: «زَعَمَ إِنْ رَّجَعَ إِلَى الْمَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ» ''اس کا خیال ہے کہ جب وہ واپس مدینہ لوٹے گا تو جو معزز ہے وہ ذلیل کو نکال باہر کرے گا۔''

حضرت اسید رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''آپ چاہیں گے تو اللہ کی قسم! خود آپ ہی اسے مدینہ سے نکال دیں گے، اے اللہ کے رسول! آپ صاحب عزت ہیں۔ ذلیل تو وہی ہے۔'' پھر عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! اس سے نرمی برتیے۔ اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ آپ کو ہمارے پاس اس وقت لایا جب قوم اس کے لیے موتی پرو رہی تھی کہ اسے (بادشاہی کا) تاج پہنا دیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ آپ نے اس کی بادشاہت چھین لی ہے۔''

رسول اللہ ﷺ تمام لوگوں کے ساتھ دن بھر چلتے رہے، یہاں تک کہ شام ہو گئی، پھر رات بھر چلے اور صبح ہو گئی۔ دوسرے دن کا بیشتر حصہ گزر گیا اور دھوپ نے لوگوں کو پریشان کر دیا تو آپ ﷺ نے لوگوں کو ٹھہرایا۔ سب لوگ تھکاوٹ سے چور تھے۔ اترتے ہی نیند آ گئی۔ ایسا آپ ﷺ نے اس لیے کیا تھا کہ لوگ عبداللہ بن ابی کی بات پر چہ میگوئیاں نہ کریں۔ عبداللہ بن ابی اور دیگر منافقوں کے بارے میں سورت نازل ہوئی۔ سورت کے نازل ہوتے ہی رسول اللہ ﷺ نے زید بن ارقم کا کان پکڑا اور فرمایا: «هٰذَا الَّذِي أَوْفَى اللّٰهُ بِأُذُنِهِ» ''یہی ہے وہ جس کی کان سنی بات کو اللہ تعالیٰ نے سچ قرار دیا ہے۔''[1]

1 السيرة النبوية لابن هشام: 305/3، وتفسير الطبري: 116/28.

دروس و نصیحتیں: سیرت نبوی کے اس واقعے سے ہمیں کئی سبق ملتے اور کئی حکمتوں کا پتا چلتا ہے۔ ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

❁ اپنی صفوں کو متحد رکھنا اور سیاسی شہرت کو داغدار ہونے سے بچانا: رسول اللہ ﷺ نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی پیشکش کے جواب میں فرمایا تھا:

''عمر! تب کیا ہوگا جب لوگ کہیں گے کہ محمد (ﷺ) اپنے ساتھیوں کو قتل کر دیتا ہے؟''

رسول اللہ ﷺ کے فرمان گرامی سے یہ سبق ملتا ہے کہ جہاں تک بس چلے سیاسی شہرت کو داغدار ہونے سے بچانا چاہیے۔ ایک طرف لوگ یہ کہیں کہ محمد ﷺ کے ساتھی آپ ﷺ سے بہت محبت کرتے ہیں جیسا کہ ایک بڑے سپہ سالار ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی زبانی اس کی تصدیق بھی ہوگئی انھوں نے اسلام قبول کرنے سے پہلے کہا تھا:

«مَارَأَيْتُ أَحَدًا يُحِبُّ أَحَدًا كَحُبِّ أَصْحَابِ مُحَمَّدٍ مُّحَمَّدًا»

''میں نے کسی کو کسی سے اتنی محبت کرتے نہیں دیکھا جتنی محبت محمد ﷺ کے ساتھی خود اُن سے کرتے ہیں۔''

دوسری طرف لوگ یہ کہیں کہ محمد (ﷺ) اپنے ساتھیوں کو قتل کر دیتا ہے، ان دونوں باتوں کے تاثر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اور بلاشبہ اگر ایسا ہو جاتا یا ایسی کوئی بات پھیل جاتی تو دشمن کو مسلمانوں کی صفوں میں گھسنے کا موقع مل جاتا۔ مسلمانوں کے دشمن تھے بھی اسی کوشش میں، تاہم رسول اللہ ﷺ کے حکیمانہ طرز عمل نے انھیں مایوس کر دیا اور وہ ایسا کوئی موقع نہیں پا سکے۔[1]

مسلمانوں کی صفیں توڑنے اور جاہلی تعصب کو ہوا دینے کے سلسلے میں ابن ابی نے جو کوشش کی تھی رسول اللہ ﷺ نے اس کے جواب میں درج ذیل نہایت مثبت اقدامات کیے:

[1] التربية القيادية للدكتور الغضبان:3/463.

﷽ رسول اللہ ﷺ تمام لوگوں کے ساتھ دن بھر چلتے رہے، پھر رات بھر چلتے رہے۔ اگلے دن کا بیشتر حصہ گزر گیا اور دھوپ نے لوگوں کو پریشان کر دیا تو آپ ﷺ نے پڑاؤ کیا۔ سب لوگ تھکاوٹ سے چور تھے۔ پڑاؤ ڈالتے ہی سو گئے۔[1]

آپ ﷺ نے صاف ستھری سیاست اور انتہائی دانش مندی کے ساتھ فتنے کو جڑ سے اکھاڑ دیا اور لوگوں کو ابن ابی کی بات پر چہ میگوئیاں کرنے کا موقع نہ دیا۔

﷽ رسول اللہ ﷺ کو مسلمانوں کی وحدت کا تحفظ مقصود تھا۔ یوں آپ ﷺ نے عبداللہ ابن اُبی کی سازش کو بزور بازو ناکام کرنے کی کوشش نہیں کی۔ چند فریب خوردہ مسلمان اس کے طرفدار بھی تھے۔ آپ ﷺ عبداللہ بن ابی کو سزا دیتے تو ان بیوقوفوں کی رگ حمیت پھڑک اٹھتی اور وہ بے سوچے سمجھے اٹھ کھڑے ہوتے۔ نتیجتاً اسلامی وحدت پارہ پارہ ہو جاتی۔ اسلام اور مسلمانوں کو اس سے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ یہ تو حکمت سے بھرپور شرعی سیاست تھی۔ اس کی مدد سے تعصب کے امراض کا پوری احتیاط، دانش مندی اور دور اندیشی سے علاج کیا گیا۔ حکمت و سیاست اور معاملات کے حسن تدبیر کی یہ خوبی اس امر کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ اللہ کے سچے نبی اور رسول تھے۔ معاملات میں بھی امت کو آپ ﷺ کی پیروی کرنی چاہیے۔[2]

منافقین کے سرغنے سے نرمی برتنے اور درگزر کرنے کا نتیجہ بہت اچھا نکلا۔ اب ابن ابی کوئی شرارت کرتا تو اس کی قوم کے لوگ بھی اسے ڈانٹ پلاتے اور سرزنش کرتے تھے۔ وہ آپ ﷺ سے اس کے قتل کی اجازت مانگتے لیکن آپ ﷺ انکار کرتے اور درگزر فرماتے۔ آپ ﷺ نے اسی سیاسی پالیسی کی حکمت بیان کرتے ہوئے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

1 السيرة النبوية لأبي شهبة:2/255. 2 فقه السيرة للبوطي، ص:409، وصور و عبر من الجهاد النبوي للدكتور فوزي فيض الله، ص:202.

«كَيْفَ تَرىٰ يَا عُمَرُ؟ أَمَا وَاللّٰهِ! لَوْ قَتَلْتُهُ يَوْمَ قُلْتَ لِي لَأُرْعِدَتْ لَهُ أُنُوفٌ لَّوْ أَمَرْتُهَا الْيَوْمَ لَقَتَلَتْهُ»

''عمر! اب بتاؤ؟ اللہ کی قسم! اگر میں اس روز اسے قتل کر دیتا جب تم نے کہا تھا تو اس کے لیے ان لوگوں کی ناک بھوں ضرور چڑھ جاتی جنھیں اگر آج اس کے قتل کا حکم دوں تو وہ خود اسے قتل کر دیں گے۔''

اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اللہ کی قسم! مجھے معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان میری بات سے کہیں زیادہ بابرکت ہے۔''[1]

❁ **اتحاد کے لیے نرمی اور حسن سلوک کا حکم:** عبداللہ بن ابی کے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ بڑے مخلص مومن تھے۔ انھیں جب ان واقعات کا اور ان کے متعلق سورت کے نزول کا علم ہوا تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! مجھے پتا چلا ہے کہ آپ ابن ابی کے قتل کا ارادہ رکھتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں تو میں خود اس کا سر کاٹ کر آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ اللہ کی قسم! سارے خزرج کو معلوم ہے کہ قبیلے کا کوئی آدمی مجھ سے بڑھ کر اپنے والد کا خدمت گار نہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ آپ نے کسی اور کو اس کے قتل کا حکم دیا تو شاید میں برداشت نہ کر پاؤں۔ عبداللہ بن ابی کے قاتل کو لوگوں میں چلتا پھرتا دیکھوں گا تو کافر کے بدلے مسلمانوں کو قتل کر بیٹھوں اور جہنم کا مستحق ٹھہروں!''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «بَلْ نَتَرَفَّقُ بِهِ وَنُحْسِنُ صُحْبَتَهُ مَا بَقِيَ مَعَنَا»

''بلکہ ہم اس سے نرمی کا برتاؤ کریں گے اور جب تک وہ ہمارے ساتھ ہے، اس سے اچھا سلوک کریں گے۔''[2]

---

1 السيرة النبوية لابن هشام: 305/3، وتفسير الطبري: 117,116/28. 2 السيرة النبوية لابن هشام: 305/3، والمعجم الأوسط للطبراني، رقم: 231، ومسند البزار، رقم: 2708، ومجمع الزوائد: 318/9، وتفسير الطبري: 116/28.

مسلمان مدینہ منورہ کے قریب پہنچے تو ابن ابی کے بیٹے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ باپ کے راستے میں کھڑے ہوگئے اور کہنے لگے: ''رک جائیے۔ اللہ کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر آپ یہاں سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے۔ ابن ابی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کی تو آپ نے اجازت دے دی۔ تب عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اسے مدینہ جانے دیا۔

❁ **ایمان کی بلند ترین مثال:** باپ کے متعلق عبداللہ رضی اللہ عنہ کا مضبوط موقف، اللہ اور اس کے رسول کے لیے اخلاص، اللہ اور اس کے رسول کی محبت و رضا کو باپ کی محبت و رضا پر مقدم کرنا عبداللہ رضی اللہ عنہ کے ایمان کامل کی دلیل ہے۔ نیک بخت بیٹے نے باپ کی محبت قربان کر کے مثال قائم کر دی۔ اس کا جواب بھی کشادہ دل اور خلق عظیم کے مالک نے درگزر، شفقت اور حسن سلوک کے ساتھ یوں دیا:

''بلکہ ہم اس کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کریں گے اور جب تک وہ ہمارے ساتھ ہے اس سے اچھا سلوک کریں گے۔''

ایسے درگزر کے کیا کہنے!! عظمت نبوی کے جاہ و جلال کی کیا بات ہے![1]

❁ **جاہلیت کے تعصب کی بیخ کنی:** مکروہ تعصب جسے ہم جاہلیت سے تعبیر کرتے ہیں، ایک قبیلے یا ایک خاندان تک محدود نہیں رہتا بلکہ کسی ایک صفت میں مشترک ہونے اور تعاون کرنے پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ وہ اس صفت سے متصف تمام لوگوں کی مدد کرتے ہیں، خواہ وہ حق پر ہوں یا باطل پر۔ ان کی دوستی اسی قدرِ مشترک کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ جب ایک مہاجر نے ایک انصاری کو مارا تو انصاری نے فوراً دہائی دی: ''ہائے انصار!'' اور مہاجر نے بھی پکارا: ''ہائے مہاجرین!'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا: ''یہ جاہلیت کی پکار کیسی ہے؟'' لوگوں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! ایک مہاجر نے ایک انصاری

1 محمد رسول اللّٰہ لصادق عرجون: 163/3.

کے لات ماردی ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا:

''اسے چھوڑو۔ یہ گندی (اور بدبودار) بات ہے۔''

رسول اللہ ﷺ نے ایسی پکار کو ناپسند جانا کیونکہ اس سے تعصب کا اظہار ہوتا تھا، اگرچہ آواز دینے والے نے جو کلمہ استعمال کیا تھا، یعنی ''مہاجرین''، ''انصار'' اسے خود قرآن مجید نے بھی استعمال کیا ہے۔ مہاجر نے مدد کے لیے مہاجرین کو آواز دی، حالانکہ خود اس نے تو لات ماری تھی، گویا یوں پکارنے سے اس کا مقصود ان کی مدد حاصل کرنا تھا کیونکہ وہ خود اور جنھیں ندا دی گئی تھی وہ ''مہاجر'' ہونے کے لحاظ سے ایک تھے۔ انصاری نے مدد کے لیے انصار کو پکارا کیونکہ وہ اور دیگر انصار ''انصار'' کے مفہوم میں مشترک تھے۔ اگر مدد لینی ہی تھی تو اسے چاہیے تھا کہ تمام مسلمانوں کو پکارتا۔ رسول اللہ ﷺ کا اصل مقصود یہ تھا کہ ہر قسم کے تعصب کو دور بھگا دیا جائے، خواہ وہ قبیلے کے ایک ہونے کی بنا پر ہو یا کسی اور بنا پر، مثلاً: شہر، مذہب، گروہ، خاندان، رنگ، خون یا جنس کے اشتراک کی بنا پر ہو۔ اس کے بالمقابل دوستی اور ایک دوسرے کی مدد اخوت اسلامی کی قدر مشترک پر ہونی چاہیے جسے خود اللہ تعالیٰ نے قائم فرمایا اور مسلمانوں میں راسخ کرنے کا حکم فرمایا تھا، چنانچہ فرمایا: ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ﴾ ''مومنین تو بھائی بھائی ہی ہیں۔''[1]

امداد باہمی نیکی اور تقوے کی بنیاد پر ہونی چاہیے نہ کہ گناہ اور زیادتی کی بنیاد پر مطلب یہ ہے کہ انھیں چاہیے اہل حق کی مدد کریں اور انھی کا ساتھ دیں نہ کہ ظالم اور حق سے تجاوز کرنے والے کا۔[2]

رسول اللہ ﷺ نے واضح طور پر فرما دیا کہ تعصب پروری جاہلیت کی روایت ہے۔ ارشاد نبوی ہے: «اُنْصُرْ أَخَاكَ ظَالِماً أَوْ مَظْلُوماً»

''اپنے بھائی کی مدد کر خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔'' ایک شخص نے عرض کیا: ''اگر وہ

[1] الحجرات 10:49. [2] المستفاد من قصص القرآن لعبدالكريم زيدان: 302,301/2.

مظلوم ہے تو مدد کروں گا لیکن وہ ظالم ہے تو کیسے مدد کروں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: «تَحْجُزُهُ۔ أَوْ تَمْنَعُهُ۔ مِنَ الظُّلْمِ فَإِنَّ ذٰلِكَ نَصْرُهُ» ''اسے ظلم سے روکو یہی اس کی مدد ہے۔''[1]

رسول اللہ ﷺ نے ''مدد کر اس کی ظالم ہو یا مظلوم۔'' فرما کر حق اور انصاف کے معاملات میں ایک دوسرے کی مدد کرنے کا حکم دیا ہے اور زمانۂ جاہلیت کے مفہوم کی نفی کر دی ہے۔ داعیانِ اسلام، علماء وطلبہ اور فقہاء کا فرض ہے کہ تعصب سے کنارہ کشی کریں اور رسول اللہ ﷺ کے حکم کو بجالاتے ہوئے مسلمانوں کو بھی اسے ترک کرنے کی دعوت دیں۔ یہ کام مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں اور اس کی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر اہل علم پر فرض ہے کہ اسے دلوں سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے مقدور بھر طاقت صرف کر دیں۔[2]

غزوۂ بنو مصطلق کے بعد اسلامی معاشرے کے لیے قرآنی رہنمائی

مسلمان غزوۂ بنو مصطلق سے واپس آرہے تھے کہ سورۂ منافقون نازل ہوئی۔ امام ترمذی رحمہ اللہ کی روایت میں ہے کہ صبح ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے سورۂ منافقون کی تلاوت فرمائی۔[3]

اس سورت نے منافقوں کے متعلق بڑی تفصیل بیان کی ہے۔ ان سے متعلق کئی واقعات و اقوال اور ان کے معاملات اور ان کے جھوٹے بیانات کا ذکر کر کے انھیں رسوا کیا گیا ہے۔ سورت کے اختتام پر مومنوں کو دنیا کی زیب و زینت میں مشغول ہونے سے منع کیا اور انفاق فی سبیل اللہ کا حکم دیا ہے۔ سورۂ منافقون کا مطالعہ کرنے سے کئی ایک مقاصد کا پتا چلتا ہے۔ ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

سورت نے ابتدا میں منافقوں کے اخلاق بیان کیے ہیں، جھوٹ بولنے کی قباحت کا تذکرہ کیا اور ان کی عام حالت کی عکاسی کی ہے۔

---

1 صحیح البخاري، حدیث:6952، وجامع الترمذي، حدیث:2255، ومسند أحمد: 201/3.

2 المستفاد من قصص القرآن لعبدالکریم زیدان: 302/2. 3 جامع الترمذي، حدیث: 3313.

ان کی مذموم صفات کے تذکرے سے سورت کی ابتدا ہو رہی ہے۔ خاص طور پر ان کا دعوائے ایمان میں جھوٹ بولنا، جھوٹی قسمیں کھانا، بزدلی کا مظاہرہ کرنا، نبی اکرم ﷺ اور مومنوں کے خلاف سازشیں کرنا اور لوگوں کو اللہ کے دین سے روکنا۔

بعد کی آیات نے ان کی ہٹ دھرمی اور ان کے عناد کا ذکر کیا اور یہ بیان کیا کہ وہ حق کی دعوت دینے والوں کی نافرمانی کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی نہایت بیہودہ باتیں مفصل بیان کی گئی ہیں۔ خاص طور پر جو انھوں نے غزوہ بنو مصطلق کے موقع پر کی تھیں کہ وہ رسول گرامی قدر ﷺ اور دیگر مومنوں کو مدینہ سے نکال دیں گے اور عزت صرف انھی کو حاصل ہے۔[1]

مومنوں کو دنیا کی زینت میں مشغولیت اور منافقین کی مشابہت کے متعلق انتباہ پر سورت کا اختتام ہوتا ہے۔ مومنوں کو زندگی کی فرصت ختم ہونے سے پہلے پہلے صدقہ کر لینے کی ترغیب دی گئی ہے۔ صدقہ ہی تو ایمان بالآخرت کی دلیل ہے۔[2]

آخری آیات اسلامی معاشرے کو اطاعت الٰہی، قراءتِ قرآن، ہمیشہ ذکر الٰہی، نمازوں کی ادائیگی اور تمام فرائض کی بجا آوری کی ترغیب دلاتی ہیں اور اموال میں مشغولیت، حقوق اللہ کو پس پشت ڈال کر گھریلو معاملات میں مشغول ہونے سے باز رہنے کا درس دے رہی ہیں کہ یہ تو منافقین کا کردار ہے۔ انھوں نے بخل ہی کی بنا پر کہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کا ساتھ دینے والوں پر خرچ نہ کرو۔ جو بھی رب تعالیٰ کی اطاعت کے بجائے مال و اولاد میں مشغول ہو گیا وہی خسارہ پانے والا ہے۔

سورت کا اختتام مومنوں کو دنیا کی زینت میں عدم مشغولیت کی ترغیب سے ہوا کہ یہ تو منافقین کے اخلاقِ رذیلہ ہیں۔ اس معاشرے میں اسی طرح کے واقعات رونما ہو رہے

---

[1] حديث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ للدكتور محمد بكر آل عابد: 327/1. [2] حديث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ للدكتور محمد بكر آل عابد: 327/1.

تھے اور یوں مومنوں کی تربیت کا بندوبست بھی ہو رہا تھا۔ قرآن کریم اسلامی معاشرے کی رہنمائی و تعلیم کا فریضہ انجام دے رہا تھا اور رسول اللہ ﷺ اس کی نگرانی فرما رہے تھے۔

واقعۂ افک

منافقین کی طرف سے ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگا کر نبی مکرم ﷺ کی عزت داغدار کرنے کی ناکام کوشش کی گئی جو واقعۂ افک کے نام سے مشہور ہے۔ منافقوں نے جاہلی تعصب بیدار کرنے کی کوشش ناکام ہونے پر غزوۂ بنو مصطلق میں واقعہ افک گھڑ لیا۔ نبی مکرم ﷺ کے گھرانے پر بہت بڑی آزمائش ٹوٹ پڑی جس کے پس پردہ آپ ﷺ اور آپ کے پاکیزہ اہل بیت کی پامالی عزت مقصود تھی۔ تمام مؤرخین اور سیرت نگاروں کا اتفاق ہے کہ واقعہ افک غزوۂ بنو مصطلق کے بعد پیش آیا۔ یہی خیال مفسرین اور محدثین کا بھی ہے۔[1]

امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ نے یہ واقعہ اپنی اپنی کتاب میں بیان کیا ہے۔ صحیح بخاری میں یہ واقعہ یوں ہے:

خود ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ جب آپ ﷺ سفر پر روانہ ہوتے تو اپنی ازواج میں قرعہ ڈالتے۔ قرعہ میں جس زوجہ کا نام نکلتا اس کو سفر میں ساتھ لے جاتے۔ آپ ایک غزوے پر روانہ ہو رہے تھے۔ آپ ﷺ نے قرعہ ڈالا تو قرعہ میرے نام نکلا۔ میں آپ ﷺ کے ہمراہ روانہ ہوئی۔ یہ واقعہ حجاب کا حکم اترنے کے بعد کا ہے۔ میں ہودج (اونٹ پر رکھا جانے والا قبہ نما کپڑوں سے ڈھانپا ہوا کیبن سا جس میں عورتیں سوار ہوتی تھیں) میں سوار تھی۔ ہودج سمیت مجھے (اونٹ

1 مؤرخین اور سیرت نگاروں میں سے واقدی، ذہبی، طبری، ابن سعد اور ابن حزم، جبکہ مفسرین میں سے ابن کثیر، رازی، طبری اور محدثین میں سے ابن حجر اور امام نووی رحمہ اللہ کا اتفاق ہے کہ واقعہ افک غزوۂ بنو مصطلق کے بعد پیش آیا۔

سے) اتارا جاتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ جنگ سے فارغ ہو کر واپس روانہ ہوئے تو ہم لوگ مدینہ کے قریب پہنچ گئے۔ ایک رات ایسا اتفاق ہوا کہ کوچ کا حکم دے دیا گیا۔ کوچ کے حکم پر میں اٹھی اور چل کر لشکر سے باہر نکل گئی۔ قضائے حاجت سے فارغ ہوئی اور اپنے ٹھکانے پر واپس آئی تو معلوم ہوا کہ ظفار[1] کے نگینوں کا ہار ٹوٹ کر گر چکا ہے۔ میں اسے تلاش کرنے چلی گئی۔ اتنے میں وہ لوگ آ پہنچے جو میرا ہودج اٹھا کر اونٹ پر رکھتے تھے۔ انھوں نے ہودج اٹھا کر اونٹ پر لاد دیا۔ وہ سمجھے کہ میں ہودج میں ہوں۔ اس زمانے میں عورتیں ہلکی پھلکی ہوا کرتی تھیں۔ جو تھوڑا بہت کھانا ملتا تھا اسی سے پیٹ بھر جاتا تھا ویسے بھی میں ان دنوں نو عمر لڑکی تھی۔ یوں ان لوگوں کو ہودج کے ہلکے پن کا کچھ خیال نہ آیا اور قافلہ چل دیا۔ میرا ہار مل گیا۔ جب میں لشکر کے پڑاؤ کی جگہ آئی تو وہاں نہ کوئی بلانے والا تھا نہ جواب دینے والا، پھر میں اسی جگہ چلی گئی جہاں میں پہلے تھی۔ میں نے سوچا کہ جب لشکر کے لوگ مجھ کو نہ پائیں گے تو میری تلاش میں یہیں آئیں گے۔ میں اسی جگہ بیٹھ گئی اور بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگی اور مجھے نیند آ گئی۔ صفوان بن معطل سلمی رضی اللہ عنہ لشکر کے پیچھے تھے۔ وہ پچھلی رات سے چلے آ رہے تھے۔ صبح اس جگہ پہنچے جہاں میں تھی۔ انھیں سوتا ہوا انسان نظر آیا تو وہ میرے پاس آئے۔ انھوں نے حجاب سے قبل مجھے دیکھا تھا، لہٰذا وہ مجھے پہچان گئے۔ انھوں نے انا للّٰہ و انا الیہ راجعون پڑھا تو میں بیدار ہو گئی۔ میں نے اپنی چادر سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ اللہ کی قسم! انھوں نے مجھ سے کوئی بات کی نہ میں نے انا للّٰہ و انا الیہ راجعون کے سوا ان کے منہ سے کوئی بات سنی۔ پھر وہ جلدی سے آگے بڑھے اور اپنا اونٹ بٹھایا اور اونٹ کی اگلی ٹانگ پر کھڑے ہو گئے (تاکہ آسانی سے بیٹھا جا سکے) تو میں اونٹ پر سوار ہو گئی۔ وہ اپنی اونٹنی کو آگے سے پکڑے چلتے رہے۔ ہم لشکر میں اس وقت پہنچے جب عین دوپہر کو گرمی کی شدت میں قافلہ پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ اب (الزام

---

[1] ظفار: یمن کے ایک شہر کا نام ہے۔ وہاں کے نگینے سیاہ ہوتے ہیں مگر ان میں کچھ کچھ سفیدی بھی ہوتی ہے۔

لگا کر) تباہ ہونے والے تباہ ہوگئے۔ اس معاملے (واقعۂ افک) کا سرغنہ ابن ابی تھا۔

مدینہ منورہ میں افواہ کا پھیلنا

بہر حال ہم مدینہ پہنچے۔ وہاں پہنچ کر میں بیمار ہوگئی۔ ایک مہینا بیمار رہی۔ لوگ جھوٹا قصہ جوڑنے والوں کی باتوں کا چرچا کرتے رہے لیکن مجھے کچھ خبر نہ ہوئی۔ مجھے صرف ایک وہم سا ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی وہ مہربانی جو اس سے پہلے بیمار ہونے پر میں پاتی تھی اب وہ نہیں تھی۔ فقط اتنا تھا کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لاتے اور پوچھتے: «كَيْفَ تِيكُمْ؟» ''کیسی ہو؟'' پھر چلے جاتے۔ اس سے مجھے شک سا ہوا مگر مجھے اس طوفان کی کوئی خبر نہیں تھی۔ ابھی میں ناتواں ہی تھی کہ میرے ساتھ ام مسطح مناصع کی طرف گئی جو جائے قضائے حاجت تھی۔ ہماری عادت تھی کہ ہم رات ہی کو قضائے حاجت کے لیے باہر جاتی تھیں۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب گھروں میں ایسا کوئی انتظام نہیں تھا۔ اور جیسے پہلے زمانے کے لوگوں کی عادت تھی ہم بھی اسی طرح قضائے حاجت کے لیے ویرانے میں جاتی تھیں۔ دراصل گھروں کے قریب لیٹرین بنانے سے بہت بدبو آتی تھی۔ خیر میں اور ام مسطح (جو ابو رہم بن عبد مناف کی بیٹی تھیں اور ان کی ماں صخر بن عامر کی بیٹی اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خالہ تھیں) دونوں حاجت سے فراغت کے بعد گھر آرہی تھیں کہ ام مسطح کا پاؤں چادر میں الجھ کر پھسلا تو وہ کہنے لگیں: ''مسطح برباد ہو'' میں نے کہا: ''غلط کہتی ہیں۔ مسطح بدری صحابی ہیں۔ آپ انھیں کوس رہی ہیں؟'' انھوں نے کہا: ''اری پگلی! تو نے مسطح کی باتیں نہیں سنیں؟'' میں نے پوچھا: ''کون سی باتیں؟'' تو انھوں نے مجھے اہل افک کے بارے میں بتایا۔ یہ سن کر میری بیماری بڑھ گئی اور میں اپنے حجرے میں لوٹ آئی۔ آپ ﷺ تشریف لائے اور سلام کر کے پوچھا: «كَيْفَ تِيكُمْ؟» ''اب کیسی ہو؟'' میں نے عرض کیا: ''آپ مجھے اجازت دیں تو میں اپنے ماں باپ کے پاس چلی جاؤں؟'' میرا

مطلب یہ تھا کہ ان سے اس بارے میں تحقیق کروں گی۔ رسول اللہ ﷺ نے مجھے اجازت دے دی۔ میں اپنے والدین کے ہاں چلی گئی۔ میں نے والدہ سے پوچھا: ''اماں جان! یہ لوگ کیا باتیں کر رہے ہیں؟'' انھوں نے کہا: ''بیٹی رنج مت کر۔ اللہ کی قسم! بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کسی مرد کے پاس کوئی خوب صورت عورت ہو جس سے وہ محبت کرتا ہو اور اس کی سوکنیں بھی ہوں اور وہ اس عورت کے متعلق بے جا باتیں نہ کریں۔'' میں نے کہا: ''سبحان اللہ! کیا واقعی لوگوں نے ایسی باتیں کی ہیں؟'' میں رات بھر روتی رہی، صبح ہو گئی مگر آنسو تھمے نہ نیند آئی۔

وحی کی تاخیر پر رسول اللہ ﷺ کا بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ

چونکہ وحی اترنے میں دیر ہو گئی تھی لہٰذا آپ ﷺ نے حضرت علی اور اسامہ بن زید رضی اللہ عنہم کو بلوایا تاکہ مجھے چھوڑنے کے متعلق ان سے مشورہ لیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما نے آپ ﷺ کو وہی مشورہ دیا جو وہ جانتے تھے کہ آپ ﷺ کی اہلیہ اس الزام سے بری ہیں۔ انھوں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! آپ کے گھر والے ہیں اور ہم ان کے متعلق اچھی معلومات ہی رکھتے ہیں۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! آپ پر اللہ تعالیٰ نے کوئی تنگی نہیں رکھی اور بہت سی عورتیں موجود ہیں۔ آپ اگر لونڈی (بریرہ) سے پوچھیں گے تو وہ سچ بتائے گی۔'' آپ ﷺ نے بریرہ کو بلوایا اور فرمایا: «أَيْ بَرِيرَةُ! هَلْ رَأَيْتِ مِنْ شَيْءٍ يُرِيبُكِ؟» ''بریرہ! تو نے عائشہ میں کوئی ایسی بات دیکھی جس سے تجھ کو کوئی شبہ ہوا ہو؟'' بریرہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: ''قسم اس ذات کی جس نے آپ کو سچا پیغمبر بنا کر بھیجا ہے! میں نے تو کوئی بات عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایسی نہیں دیکھی جس پر عیب لگا سکوں۔ اتنی بات ہے کہ وہ ابھی کم سن ہے۔ گھر کا آٹا گندھا ہوتا ہے اور وہ سو جاتی ہے۔ اور بکری آٹا کھا جاتی ہے۔''

رسول اللہ ﷺ اس دن منبر پر خطبے کے لیے کھڑے ہوئے اور عبداللہ بن ابی کے مقابل مدد چاہی اور فرمایا:

«يَا مَعْشَرَ الْمُسْلِمِينَ! مَنْ يَّعْذِرُنِي مِنْ رَّجُلٍ قَدْ بَلَغَنِي أَذَاهُ فِي أَهْلِ بَيْتِي؟ فَوَاللّٰهِ مَاعَلِمْتُ عَلٰى أَهْلِي إِلَّا خَيْرًا. وَلَقَدْ ذَكَرُوا رَجُلًا مَّاعَلِمْتُ عَلَيْهِ إِلَّا خَيْرًا وَّمَا كَانَ يَدْخُلُ عَلٰى أَهْلِي إِلَّا مَعِي»

''مسلمانو! کون میری حمایت و مدد کرتا ہے ایسے شخص کے بالمقابل جس نے میرے گھر والوں پر تہمت لگا کر مجھے اذیت دی ہے؟ اللہ کی قسم! میں تو اپنے گھر والوں کو نیک ہی سمجھتا ہوں۔ اور جس شخص پر تہمت لگائی گئی اس کو بھی نیک ہی سمجھتا ہوں، وہ کبھی میرے گھر میں اکیلا نہیں آیا۔ ہمیشہ میرے ساتھ ہی آیا کرتا تھا۔''

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے: ''اے اللہ کے رسول! میں اس شخص کے مقابل آپ کی مدد کو تیار ہوں۔ اگر یہ شخص اوس قبیلے کا ہے تو ابھی اس کی گردن مارتا ہوں اور اگر ہمارے خزرجی بھائیوں سے ہے تو آپ جو حکم دیں گے ہم بجالائیں گے۔''

فتنۂ افک کے اثرات

ادھر خزرج کے سردار حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے۔ وہ اچھے نیک بخت آدمی تھے مگر انھیں قبائلی عصبیت نے آدبوچا۔ وہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ سے کہنے لگے: ''اللہ کی قسم! تو جھوٹ کہتا ہے۔ تو نہ اس کو مارے گا نہ مار سکے گا۔ اگر وہ تیرے قبیلے سے ہوتا تو تو کبھی اس کے قتل کو پسند نہ کرتا۔'' اتنے میں حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ جو سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے چچا زاد بھائی تھے کھڑے ہو گئے اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے کہنے لگے: ''اللہ کی قسم! تو جھوٹا ہے۔ ہم اس شخص کو ضرور قتل کریں گے۔ تو منافق ہے اور منافقوں کی طرف داری کرتا ہے۔'' اس گفتگو پر اوس اور خزرج دونوں قبائل کے لوگ کھڑے ہو گئے اور آپس میں

لڑنے ہی والے تھے۔ ادھر رسول اللہ ﷺ منبر ہی پر تھے۔ آپ ﷺ ان کو برابر پرسکون کر رہے تھے حتی کہ وہ خاموش ہو گئے۔ آپ ﷺ نے بھی خاموشی اختیار کی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ دن بھر میرا یہ حال رہا کہ نہ آنسو تھمتے تھے نہ نیند آتی تھی۔ صبح کو میرے والدین بھی میرے پاس موجود تھے۔ میرا دو راتیں اور ایک دن سے یہی حال تھا کہ نہ نیند آتی نہ آنسو رکتے۔ میرے والدین یہ سمجھے کہ روتے روتے میرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔

میرے والدین میرے پاس بیٹھے تھے۔ میں رو رہی تھی۔ اتنے میں ایک انصاری عورت نے اندر آنے کی اجازت مانگی۔ میں نے اجازت دے دی۔ وہ بھی میرے ساتھ بیٹھ کر رونے لگی۔ اس حالت میں رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے۔ آپ ﷺ نے سلام کیا اور بیٹھ گئے۔ جب سے یہ باتیں کہی جارہی تھیں آپ ﷺ میرے پاس اس سے پہلے نہیں بیٹھے تھے۔

رسول اللہ ﷺ کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے استفسار

ایک ماہ تک آپ ﷺ انتظار کرتے رہے لیکن میرے متعلق کوئی وحی نہ آئی۔ جب آپ ﷺ تشریف فرما ہوئے تو آپ ﷺ نے خطبہ پڑھا اور اس کے بعد فرمایا: «يَاعَائِشَةُ! فَإِنَّهُ قَدْ بَلَغَنِي عَنْكِ كَذَا وَكَذَا، فَإِنْ كُنْتِ بَرِيئَةً فَسَيُبَرِّئُكِ اللّٰهُ، وَإِنْ كُنْتِ أَلْمَمْتِ بِذَنْبٍ، فَاسْتَغْفِرِي اللّٰهَ وَتُوبِي إِلَيْهِ، فَإِنَّ الْعَبْدَ إِذَا اعْتَرَفَ بِذَنْبِهِ ثُمَّ تَابَ إِلَى اللّٰهِ، تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ» ''عائشہ! مجھے تیرے متعلق ایسی ایسی بات پہنچی ہے۔ اب اگر تو پاک صاف ہے تو اللہ تعالیٰ تیری پاک دامنی عنقریب بیان کر دے گا۔ اور اگر واقعی تجھ سے کوئی قصور ہو گیا ہے تو تو اللہ تعالیٰ سے اپنے قصور کی بخشش مانگ اور توبہ کر کیونکہ بندہ جب اپنے گناہ کا اقرار کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ

کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا گناہ معاف کر دیتے ہیں۔''

آپ ﷺ یہ گفتگو کر چکے تو میرے آنسو ایسے رک گئے کہ آنسو کا ایک بھی قطرہ مجھے محسوس نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اپنے والد صاحب سے کہا: ''رسول اللہ ﷺ کو جواب دیں۔'' انھوں نے کہا: ''اللہ کی قسم! میں نہیں جانتا کہ رسول اللہ ﷺ کو کیا جواب دوں۔'' پھر میں نے والدہ سے کہا: ''آپ رسول اللہ کو جواب دیں۔'' انھوں نے کہا: ''میں نہیں جانتی کہ کیا جواب دوں۔'' میں ایک کم عمر عورت تھی قرآن بھی زیادہ نہیں پڑھا تھا، بہر حال میں نے کہا: اللہ کی قسم! یہ بات جو آپ نے مسلسل سنی ہے یہ آپ کے دلوں میں بیٹھ گئی ہے۔ اور آپ اسے سچ سمجھنے لگے ہیں۔ اب اگر میں یہ کہوں کہ میں پاک ہوں اور اللہ خوب جانتا ہے کہ میں پاک ہوں، آپ مجھے سچا نہ سمجھیں گے اور اگر میں آپ کے سامنے گناہ کا اقرار کر لوں اور اللہ جانتا ہے کہ میں اس سے بری ہوں تو آپ مجھے سچا سمجھیں گے۔ اللہ کی قسم! میں اس وقت اپنی اور آپ کی مثال ایسی سمجھتی ہوں جو حضرت یوسف علیہ السلام کے والد کی تھی، انھوں نے یہی کہا تھا: ﴿فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ۖ وَاللَّهُ الْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ ۝﴾

''لہٰذا صبر ہی بہتر ہے اور اس پر اللہ ہی سے مدد مطلوب ہے جو تم بیان کرتے ہو۔''[1]

یہ کہہ کر میں اپنے بستر پر لیٹ گئی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ مجھ کو یقین تھا کہ میں پاک ہوں اور اللہ تعالیٰ میری براءت ضرور بیان کرے گا مگر اللہ کی قسم! مجھ کو ہرگز یہ گمان نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ میرے متعلق قرآن کی ایسی آیات اتارے گا جو قیامت تک پڑھی جائیں گی۔ میں اپنے آپ کو اس سے حقیر سمجھتی تھی کہ میرے متعلق اللہ تعالیٰ اپنا ایسا کلام اتارے جسے لوگ ہمیشہ پڑھتے رہیں گے۔ ہاں یہ امید ضرور تھی کہ آپ ﷺ کو کوئی خواب دکھائی دے گا جس میں اللہ تعالیٰ میری براءت بیان کر دے گا۔

[1] یوسف 18:12۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی پاک دامنی پر وحی کا اترنا

عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اللہ کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس جگہ بیٹھے تھے وہاں سے ابھی ادھر ادھر نہ ہوئے اور نہ میرے گھر والوں میں سے کوئی باہر گیا کہ وحی آنا شروع ہو گئی۔ آپ پر حسب معمول شدت وحی والی کیفیت طاری ہو گئی۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بدن مبارک سے پسینہ موتیوں کی طرح ٹپکنے لگا، حالانکہ سردی کا دن تھا۔ جب وحی موقوف ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرا رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی بات یہ فرمائی: «يَا عَائِشَةُ! أَمَّا اللّٰهُ۔ عَزَّوَجَلَّ۔ فَقَدْ بَرَّأَكِ» ”عائشہ! اللہ تعالیٰ نے تجھے بے گناہ قرار دیا ہے۔“ یہ سنتے ہی میری والدہ کہنے لگیں: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بڑھو۔“ میں نے کہا: ”اللہ کی قسم! نہیں اٹھوں گی۔ میں تو صرف اللہ کا شکر ادا کروں گی جو عزت اور بزرگی والا ہے۔“

اس وقت اللہ تعالیٰ نے سورۂ نور کی آیات نازل فرمائیں۔ اور پوری دس آیات۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ؕ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ؕ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ ۚ وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○ لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا وَّقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ ○ لَوْلَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ۚ فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ○ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِيْ مَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○ اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا ۖ وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ○ وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۖ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ○ يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ وَيُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ۚ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○ اِنَّ الَّذِيْنَ

يُحِبُّونَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ○﴾

''بے شک جو لوگ (ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر) بہتان گھڑ لائے وہ تمھی میں سے ایک گروہ ہیں، تم اسے اپنے لیے برا نہ سمجھو، بلکہ وہ تمھارے لیے بہتر ہے، ان میں سے ہر شخص کے لیے اتنا ہی گناہ ہے جو اس نے کمایا، اور ان میں سے وہ شخص جس نے اس (گناہ) کا بڑا بوجھ اٹھایا، اس کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔ جب تم نے یہ (جھوٹ) سنا تو کیوں نہ مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے نفسوں میں اچھا گمان کیا اور (کیوں نہ) کہا کہ یہ تو صریح بہتان ہے۔ وہ اس (الزام) پر چار گواہ کیوں نہ لائے؟ پھر جب وہ گواہ نہیں لائے تو وہی لوگ اللہ کے ہاں جھوٹے ہیں۔ اور اگر تم پر دنیا و آخرت میں اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم جن باتوں میں پڑ گئے تھے اس پر تمھیں بہت بڑا عذاب آلیتا۔ جب تم اسے ایک دوسرے سے اپنی زبانوں کے ساتھ لیتے تھے اور اپنے مونہوں سے (وہ بات) کہہ رہے تھے جس کا تمھیں علم نہ تھا، اور تم اسے معمولی سمجھ رہے تھے، جبکہ وہ اللہ کے ہاں بہت بڑی بات ہے۔ اور جب تم نے اسے سنا تھا تو کیوں نہ کہا: یہ ہمارے لائق نہیں کہ ہم اس کے متعلق بولیں (یا اللہ!) تو پاک ہے، یہ بہت بڑا بہتان ہے۔ اللہ تمھیں نصیحت کرتا ہے کہ اگر تم مومن ہو تو دوبارہ کبھی بھی اس جیسی بات نہ کرنا۔ اور اللہ تمھارے لیے (اپنی) آیات بیان کرتا ہے اور اللہ بڑا جاننے والا، خوب حکمت والا ہے۔ بے شک جو لوگ یہ پسند کرتے ہیں کہ ایمان لانے والوں میں بے حیائی پھیلے، ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ

ہوتی (تو اللہ بہتان لگانے والوں کو فوراً عذاب دیتا) اور یہ کہ بلاشبہ اللہ نہایت شفقت کرنے والا، بڑا رحم کرنے والا ہے۔"[1]

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا شوق مغفرت

ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: جب میری براءت والی آیات نازل ہوئیں تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جو پہلے مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ پر رشتہ داری اور غربت کی بنا پر خرچ کرتے تھے یہ کہہ کر خرچ بند کر دیا: "اللہ کی قسم! اب میں مسطح کو کبھی کچھ نہ دوں گا۔ اس نے عائشہ کے متعلق ایسی ایسی باتیں کی ہیں۔" تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ أَن يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾

"اور تم میں سے فضل اور وسعت والے، قرابت داروں اور مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو (مالی مدد) دینے سے قسم نہ کھائیں اور چاہیے کہ وہ معاف کر دیں اور درگزر کریں۔ کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمھاری مغفرت فرمائے اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔"[2]

اس پر ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: "کیوں نہیں واقعتاً مجھے یہ پسند ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے بخش دے۔" پھر وہ مسطح رضی اللہ عنہ پر اسی طرح خرچ کرنے لگے جس طرح پہلے کرتے تھے۔ اور کہنے لگے: "اللہ کی قسم! میں مسطح رضی اللہ عنہ کا یہ خرچ کبھی بند نہیں کروں گا۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے میرے متعلق حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے بھی پوچھا تھا: «يَا زَيْنَبُ، مَاذَا عَلِمْتِ أَوْ رَأَيْتِ؟» "زینب! تم

[1] النور 24:11-20. صحيح البخاري، حديث:4141، وصحيح مسلم، حديث:2770. [2] النور 22:24.

عائشہ کے متعلق کیا جانتی ہو یا تم نے کیا دیکھا ہے؟'' انھوں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! میں اپنے کان اور آنکھ کی حفاظت کرتی ہوں۔ میں تو عائشہ کو اچھا ہی سمجھتی ہوں۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج میں سے زینب رضی اللہ عنہا ہی میرے برابر تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی پرہیز گاری کی بنا پر انھیں بچا لیا اور ان کی بہن حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا اپنی بہن کے لیے لڑتی ہوئی (کوشش کرتی ہوئی کیونکہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا ہی عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہم پلہ تھیں) دیگر بہتان لگانے والوں کی طرح ہلاک ہوئی۔ [1]

دشمنانِ دین کی طرف سے تکالیف اور آزمائشوں کی ایک کڑی واقعۂ افک بھی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنوں پر اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی تھی کہ اس کے غلط اور جھوٹا ہونے کو واضح فرما دیا۔ تاریخ نے متعدد صحیح روایات کی روشنی میں اس کے متعلق اہل ایمان کا موقف نقل کیا ہے۔ خاص طور پر حضرت ابوایوب اور ام ایوب رضی اللہ عنہما کا کردار، [2] یہ ایسے کردار ہیں جن سے اہل ایمان رہنمائی لے سکتے ہیں۔ وحی کا سلسلہ اب منقطع ہو چکا ہے مگر قیامت تک آنے والی انسانی نسلوں کے لیے قرآن میں اسباق، نصائح اور عبرتیں موجود ہیں۔ [3]

آیات افک سے ماخوذ اہم احکام و مسائل

علماء نے واقعہ افک سے متعلق نازل شدہ آیات سے کئی ایک احکام و مسائل استنباط کیے ہیں، چیدہ چیدہ حسب ذیل ہیں:

[1] صحيح البخاري، حديث: 2661 و 4141. [2] واقعۂ افک کے سلسلے میں حضرت ابوایوب اور ام ایوب رضی اللہ عنہما کا کردار نہایت ہی قابل ستائش ہے۔ اس موقع پر ام ایوب رضی اللہ عنہا نے حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ سے کہا: ''ابوایوب! کیا آپ نے وہ باتیں سنی ہیں جو لوگ عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں کہہ رہے ہیں؟'' ابوایوب رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''جی ہاں! میں نے یہ باتیں سنی ہیں اور یہ سب جھوٹ ہے، اچھا یہ بتاؤ کیا تم ایسا (برا) کام کرسکتی ہو؟'' ام ایوب نے کہا: ''ہرگز نہیں، اللہ کی قسم! میں ایسا ہرگز نہیں کرسکتی۔'' سیدنا ابوایوب رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اللہ کی قسم! عائشہ تو تم سے کہیں بہتر ہیں (وہ ایسا گھناؤنا کام کیسے کرسکتی ہیں۔'') (السيرة النبوية لابن هشام: 268/4) [3] السيرة النبوية للدكتور مهدي رزق الله، ص: 440.

① قرآن پاک، جس کی تلاوت تا قیامت ہوتی رہے گی، میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت کا اعلان: ارشاد ربانی ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ جَاءُوا بِالْإِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنكُمْ ۚ لَا تَحْسَبُوهُ شَرًّا لَّكُم ۖ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُم مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْإِثْمِ ۚ وَالَّذِي تَوَلَّىٰ كِبْرَهُ مِنْهُمْ لَهُ عَذَابٌ عَظِيمٌ ○﴾

''بے شک جو لوگ (ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر) بہتان گھڑ لائے وہ تمھی میں سے ایک گروہ ہیں، تم اسے اپنے لیے برا نہ سمجھو، بلکہ وہ تمھارے لیے بہتر ہے، ان میں سے ہر شخص کے لیے اتنا ہی گناہ ہے جو اس نے کمایا اور ان میں سے وہ شخص جس نے اس (گناہ) کا بڑا بوجھ اٹھایا، اس کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔''[1]

② اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا تھا کہ شر میں سے خیر پھوٹے۔ واقعۂ افک میں خاندان ابوبکر رضی اللہ عنہ کا امتحان ان کے لیے باعث خیر بن گیا۔ ان کے صبر اور ایمانی قوت پر ان کے لیے اجر عظیم لکھ دیا گیا۔

③ اہل ایمان کی اچھی شہرت اور باہمی حسنِ ظن کا انتہائی خیال، ارشاد الٰہی ہے:

﴿لَّوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنفُسِهِمْ خَيْرًا وَقَالُوا هَٰذَا إِفْكٌ مُّبِينٌ ○﴾

''جب تم نے یہ (جھوٹ) سنا تو کیوں نہ مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے نفسوں میں اچھا گمان کیا اور (کیوں نہ) کہا کہ یہ تو صریح بہتان ہے۔''[2]

④ اس بہتان میں ملوث ہونے والوں کو جھوٹا قرار دینا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَّوْلَا جَاءُوا عَلَيْهِ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ ۚ فَإِذْ لَمْ يَأْتُوا بِالشُّهَدَاءِ فَأُولَٰئِكَ عِندَ اللَّهِ هُمُ الْكَاذِبُونَ ○﴾

[1] النور 11:24. [2] النور 12:24.

''وہ اس (الزام) پر چار گواہ کیوں نہ لائے؟ پھر جب وہ گواہ نہیں لائے تو وہی لوگ اللہ کے ہاں جھوٹے ہیں۔''[1]

⑤ مومنوں پر اللہ تعالیٰ کے فضل اور ان کے ساتھ اللہ کی شفقت کا بیان، ارشاد ہے:

﴿وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِيْ مَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾

''اور اگر تم پر دنیا و آخرت میں اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم جن باتوں میں پڑ گئے تھے اس پر تمھیں بہت بڑا عذاب آلیتا۔''[2]

⑥ بات پھیلانے سے پہلے اس کی تحقیق کر لینی چاہیے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ﴾

''اور تم نے ایسی بات کو سنتے ہی کیوں نہ کہہ دیا کہ ہمیں ایسی بات منہ سے نکالنی بھی لائق نہیں۔ اے اللہ! تو پاک ہے۔ یہ تو بڑا بہتان ہے۔''[3]

⑦ ایسے بڑے بڑے گناہوں کے ارتکاب کی ممانعت اور دوبارہ ایسی بات سے اجتناب کا حکم، ارشاد فرمایا:

﴿يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾

''اللہ تمھیں نصیحت کرتا ہے کہ اگر تم مومن ہو تو دوبارہ کبھی بھی اس جیسی بات نہ کرنا۔''[4]

⑧ مومنوں میں بے حیائی پھیلانے کی ممانعت، ارشادِ الٰہی ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾

''بے شک جو لوگ یہ پسند کرتے ہیں کہ ایمان لانے والوں میں بے حیائی پھیلے، ان

[1] النور 13:24. [2] النور 14:24. [3] النور 16:24. [4] النور 17:24.

کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔"[1]

⑨ بندوں پر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا بیان، اسے اللہ تعالیٰ نے بطور تاکید مکرر بیان فرمایا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾

"اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی (تو اللہ بہتان لگانے والوں کو فوراً عذاب دیتا) اور یہ کہ بلاشبہ اللہ نہایت شفقت کرنے والا، بڑا رحم کرنے والا ہے۔"[2]

⑩ شیطان کے نقش قدم پر چلنے کی ممانعت کیونکہ وہ ہلاکت میں ڈالتا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ وَمَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ﴾

"اے ایمان والو! تم شیطان کے قدموں کی اتباع نہ کرو اور جو کوئی شیطان کے قدموں کی اتباع کرتا ہے، تو بلاشبہ وہ (شیطان) تو بے حیائی اور برے کام ہی کا حکم دیتا ہے۔"[3]

⑪ رشتہ دار اگرچہ بدسلوکی کریں تب بھی ان پر خرچ کرنے کی ترغیب،[4] ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْۤا اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ؕ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾

"اور تم میں سے فضل اور وسعت والے، قرابت داروں اور مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو (مالی مدد) دینے سے قسم نہ کھائیں اور چاہیے کہ وہ معاف کردیں اور درگزر کریں۔ کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمھاری مغفرت

1 النور 19:24. 2 النور 20:24. 3 النور 21:24. 4 حديث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ للدكتور محمد بكر آل عابد: 386,385/1.

فرمائے اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔''[1]

⑫ سچے مومن بندوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کی حمیت (غیرت)، ان کا دفاع اور جو کوئی ان پر بے حیائی کی تہمت لگائے اسے دنیا و آخرت میں لعنت کی ڈانٹ، ارشاد ربانی ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ يَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ يَوْمَئِذٍ يُّوَفِّيْهِمُ اللّٰهُ دِيْنَهُمُ الْحَقَّ وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ ۝ ﴾

''بلاشبہ جو لوگ پاک دامن، بے خبر مومن عورتوں پر (زنا کی) تہمت لگاتے ہیں، ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔ جس دن ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پیر ان کے خلاف، ان اعمال کی گواہی دیں گے جو وہ کرتے تھے۔ اس دن اللہ انھیں پورا پورا، ان (کے حساب کتاب) کا ٹھیک بدلہ دے گا (جس کے وہ مستحق ہیں) اور وہ جان لیں گے کہ بے شک اللہ ہی واضح حق ہے۔''[2]

مذکورہ آیات کی تفسیر میں صاحب کشاف کا بیان ہے: پورے قرآن پاک کی ورق گردانی کر جائیے آپ کو گناہ گاروں کے متعلق اللہ تعالیٰ کی اتنی شدید وعید کہیں اور نظر نہیں آئے گی جتنی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگانے والوں کے متعلق کی گئی ہے۔ اس ضمن میں واقعے کے مرکزی کرداروں کو اور ان کے طرز عمل کو بے حد قبیح سمجھا گیا ہے۔[3]

⑬ اللہ تعالیٰ کے ابدی قانون کا بیان کہ اللہ تعالیٰ نیک اور پاکیزہ مردوں کو پاکیزہ عورتوں کے نصیب میں کرتا ہے اور پاکدامن عورتوں کو پاکیزہ مردوں کے نصیب میں کرتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

---

1 النور 22:24. 2 النور 24:23-25. 3 حدیث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ للدکتور محمد بکر آل عابد: 386/1.

﴿ اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ۗ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴾

''خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لیے ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لیے اور پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے ہیں اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لیے، یہ (پاکیزہ) لوگ ان باتوں سے بری ہیں جو وہ (خبیث لوگ ان کی بابت) کہتے ہیں، ان کے لیے مغفرت اور بہت اچھا رزق ہے۔''[1]

⑭ واقعہ افک کے باعث لوگ چار گروہوں میں تقسیم ہو گئے: اس سلسلے میں ڈاکٹر شعبۃ الحمد حدیثِ اِفک پر حاشیہ آرائی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب ام المؤمنین صدیقہ بنت صدیق رضی اللہ عنہا پر تہمت لگی تو لوگ حسب ذیل چار گروہوں میں بٹ گئے:[2]

- لوگوں کی اکثریت نے زبانوں اور کانوں پر کنٹرول کر لیا اور خاموشی اختیار کی۔ بات کی تو اچھی وگرنہ تصدیق کی نہ تکذیب۔
- کچھ لوگ وہ تھے جنھوں نے فوراً اس کو جھوٹ اور بہتان سمجھا۔ ان میں ابو ایوب اور ام ایوب رضی اللہ عنہما تھے۔ انھوں نے سنتے ہی اسے جھوٹ کہا۔
- دیگر مسلمانوں نے اسے نہ سچا کہا نہ جھوٹا۔ نہ اس کی نفی کی لیکن وہ اہل اِفک کی باتوں کی طرح باتیں کرتے اور سمجھتے کہ اس معاملے پر باتیں کرنا اتنا سنگین نہیں کہ اللہ تعالیٰ گرفت فرمائے گا، اس لیے کہ نقل کفر کفر نہ باشد۔ واقعہ افک کو بیان کرنا تو بہتان تراشی نہیں۔ حمنہ بنت جحش، حسان بن ثابت اور مسطح بن اثاثہ انھی میں شامل تھے۔
- چوتھے وہ لوگ تھے جنھوں نے طوفان کھڑا کیا۔ ان کا سرغنہ اللہ کا دشمن عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین تھا، یہی شخص واقعۂ افک کا ماسٹر مائنڈ تھا۔

ان میں دوسری قسم کے لوگوں کی فضیلت کے متعلق جل شانہ نے فرمایا کہ تمام مومنوں

---

[1] النور 26:24. [2] حدیث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ للدکتور محمد بکر آل عابد: 387/1.

کو یہی موقف اختیار کرنا چاہیے تھا۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا وَّقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ ﴾

"جب تم نے یہ (جھوٹ) سنا تو کیوں نہ مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے نفسوں میں اچھا گمان کیا اور (کیوں نہ) کہا کہ یہ تو صریح بہتان ہے۔"[1]

تیسری قسم کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایسی باتیں کرنا اُن کے لائق نہیں تھا۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ○ وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ○﴾

"جب تم اسے ایک دوسرے سے اپنی زبانوں کے ساتھ لیتے تھے اور اپنے مونہوں سے (وہ بات) کہہ رہے تھے جس کا تمھیں علم نہ تھا اور تم اسے معمولی سمجھ رہے تھے، جبکہ وہ اللہ کے ہاں بہت بڑی بات ہے۔ اور جب تم نے اسے سنا تھا تو کیوں نہ کہا: یہ ہمارے لائق نہیں کہ ہم اس کے متعلق بولیں (یا اللہ!) تو پاک ہے، یہ بہت بڑا بہتان ہے۔"[2]

اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے اعمال کی فضیلت کا تذکرہ فرمایا، مثلاً مسطح کی ہجرت اور ایمان کا بطور خاص اس وقت اثبات کیا جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے مسطح کے رشتہ دار ہونے کے باوجود اس پر اس وقت صدقہ اور انفاق نہ کرنے کی قسم کھائی تو ارشاد ہوا:

﴿وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ۗ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○﴾

---

1 النور 12:24. 2 النور 16,15:24.

''اور تم میں سے فضل اور وسعت والے، قرابت داروں اور مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو (مالی مدد) دینے سے قسم نہ کھائیں اور چاہیے کہ وہ معاف کردیں اور درگزر کریں۔ کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمھاری مغفرت فرمائے اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔''[1]

اس چوتھی قسم یعنی ابن ابی کا گروہ جنھوں نے یہ طوفان بدتمیزی برپا کیا تھا، ان کے خاتمہ بالکفر، مستقبل میں توبہ کے نامقبول ہونے اور دنیا و آخرت میں ان پر لعنت کا اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ○ یَّوْمَ تَشْهَدُ عَلَیْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَیْدِیْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ○ یَوْمَىِٕذٍ یُّوَفِّیْهِمُ اللّٰهُ دِیْنَهُمُ الْحَقَّ وَیَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِیْنُ ○﴾

''بلاشبہ جو لوگ پاک دامن، بے خبر مومن عورتوں پر (زنا کی) تہمت لگاتے ہیں، ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔ جس دن ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پیر ان کے خلاف، ان اعمال کی گواہی دیں گے جو وہ کرتے تھے۔ اس دن اللہ انھیں پورا پورا، ان (کے حساب کتاب) کا ٹھیک بدلہ دے گا (جس کے وہ مستحق ہیں) اور وہ جان لیں گے کہ بے شک اللہ ہی واضح حق ہے۔''[2]

واقعۂ افک سے ماخوذ حکمتیں اور فوائد

بشریت رسول ﷺ: واقعۂ افک کے امتحان کی گھڑی اللہ تعالیٰ کی متعدد حکمتوں کو ساتھ لے کر آئی جن کا مقصود رسول گرامی ﷺ کی شخصیت کو نکھارنا تھا اور آپ کی شخصیت کو تمام

[1] النور 22:24. [2] النور 23:24-25، فقه الإسلام شرح بلوغ المرام لعبدالقادر شيبة الحمد: 5/9.

عیوب سے مبرا کر کے پیش کرنا تھا۔ مثلاً: اگر وحی پیغمبر ﷺ کے اختیار میں ہوتی تو آپ ﷺ پورا ایک ماہ کڑی آزمائش میں نہ گزارتے۔ اس سے آپ ﷺ کی بشریت اور نبوت ثابت ہو گئی۔ لہٰذا جب وحی نے ام المؤمنین کے گرد اٹھنے والے اس طوفانِ بدتمیزی کو ختم کیا تو ام المؤمنین اور آپ ﷺ کے باہمی معاملات پہلی سطح پر واپس آ گئے۔ عسرت کی گھڑی کے بعد سب کے چہروں پر رونق لوٹ آئی۔ اس واقعے نے وحی کی حقیقت سے بھی پردہ کشائی کی۔ اگر یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ ہوتا تو اس کے تاریک پہلو رسول گرامی ﷺ کے دل میں ہمیشہ کے لیے جگہ پکڑ لیتے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ معاملات میں اس کی جھلک ضرور نظر آتی۔ اللہ تعالیٰ کی یہی مشیت تھی کہ یہ آزمائش محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی بہت بڑی دلیل بن جائے۔[1]

حد قذف اور مسلمانوں کی عزتوں کی حفاظت میں اس کی اہمیت: واقعات و حوادث پیش آ رہے تھے اور اسلامی معاشرے کی تربیت ہو رہی تھی۔ "واقعۂ افک" پیش آیا تو اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسے احکام مقرر فرما دیے جو مسلمانوں کی عزت و ناموس کی حفاظت کے سلسلے میں ممد و معاون ثابت ہوئے۔ لہٰذا سورۂ نور نازل ہوئی۔ اس میں بدکار مرد و عورت کی سزا بتائی گئی، بدکاری کی قباحت بیان کی گئی اور یہ بتایا گیا کہ خاوند بیوی ایک دوسرے پر تہمت لگا دیں تو حاکم کی کیا ذمہ داری ہے اور یہ کہ جب کچھ لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگا دیں اور پھر ان کے پاس چار گواہ بھی نہ ہوں تو کیا کیا جائے۔ اس کے علاوہ دیگر احکام بھی اس سورت میں نازل ہوئے۔[2]

اسلام نے زنا کو حرام اور زنا کرنے والے کو سزا کا مستحق قرار دیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ زنا کا باعث بننے والے اسباب و ذرائع کا سد باب کیا، فحاشی کی تشہیر اور تہمت کو بھی

1 السيرة النبوية للدكتور مهدي رزق الله، ص:441. 2 حديث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ للدكتور محمد بكر آل عابد:357/1.

حرام قرار دیا تا کہ معاشرے کو ایسی قباحتوں سے پاک رکھا جائے۔ کیونکہ بدکاری کے متعلق چہ میگوئیاں اور ہر وقت ایسی باتیں کرنا سننا اس معاملے کو سامعین کے لیے آسان کر دیتا ہے۔ اور کمزور دل افراد بھی اس کے ارتکاب کی جرأت کر دکھاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت نے بدکاری کی تہمت حرام قرار دی اور جو کسی پاک دامن مرد عورت، طاہر مرد عورت، بے گناہ مرد، عورت پر تہمت لگائے اس کے لیے "حد قذف" یعنی 80 کوڑے کی سزا مقرر کر دی۔ اور جب تک وہ پکی سچی توبہ نہ کرے اس کی شہادت بھی نامقبول قرار دی۔[1]

رسول اللہ ﷺ نے مسطح، حسان اور حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہم پر حد قائم کی۔ محمد بن اسحاق وغیرہ کا خیال ہے کہ آپ ﷺ نے تہمت پر دو مردوں اور ایک عورت مسطح، حسان اور حمنہ رضی اللہ عنہم پر حد لگائی۔ اسے ترمذی نے نقل کیا ہے۔[2] امام قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ علماء کے ہاں مشہور و معروف یہی ہے کہ حضرت حسان، مسطح اور حمنہ رضی اللہ عنہم کو حد لگائی گئی تھی، جبکہ عبداللہ بن ابی کے متعلق حد کا تذکرہ نہیں آیا۔[3]

چند ضعیف اور ناقابل یقین روایات ایسی بھی ہیں جن میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ابن ابی کو حد لگائی گئی تھی مگر وہ جملہ روایات اثبات مسئلہ کے لیے ناکافی ہیں۔[4] امام ابن قیم رحمہ اللہ ابن ابی پر حد نہ لگانے کی حکمت بیان کرتے ہیں:

- کہا گیا ہے کہ حدود جس پر نافذ کی جائیں اس کے لیے تخفیف اور کفارے کا سبب بنتی ہیں، جبکہ خبیث انسان اس لائق ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے آخرت میں عذاب عظیم کا وعدہ کر رکھا ہے جو بذات خود حد قذف سے کفایت کر رہا ہے۔
- کہا گیا ہے کہ حد صرف شہادت، دلیل یا اقرار پر لگتی ہے، جبکہ اس نے نہ تو قذف کا

---

1 آثار تطبيق الشريعة للدكتور محمد الزاحم، ص: 117. 2 جامع الترمذي، حديث: 3181، امام ترمذی رحمہ اللہ نے ناموں کی صراحت نہیں کی۔ ناموں کی صراحت کے لیے دیکھیں: سنن أبي داود، حدیث: 4475. 3 تفسير القرطبي: 12/197 و 201. 4 مرويات غزوة بني المصطلق لإبراهيم القريبي، ص: 242.

اقرار کیا اور نہ کسی نے اس کے خلاف گواہی دی۔ وہ اپنے ساتھیوں میں تذکرہ تو کرتا تھا مگر انھوں نے اس کے خلاف گواہی نہیں دی، جبکہ اہل ایمان میں وہ گفتگو ہی نہیں کرتا تھا۔

❁ کہا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مصلحت کے تحت اس پر حد قائم نہ کی جو حد لگانے سے بھی اہم تھی جیسا کہ آپ ﷺ نے اس کی طرف سے نفاق کے ظہور اور بار بار ایسی گفتگو ہونے کے باوجود جس کی سزا صرف قتل تھی، اسے قتل نہ کیا۔ یہ صرف اس لیے تھا کہ اس کی قوم کو اسلام سے محبت ہو اور وہ اسلام سے نفرت نہ کرنے لگیں۔ آخر میں امام ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ عین ممکن ہے کہ انھی اسباب کے پیش نظر آپ ﷺ نے اسے سزا نہ دی ہو۔[1]

ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے حضرت حسان رضی اللہ عنہ کی معذرت

روایات نے اس کی توضیح کر دی ہے کہ ابن ابی کے علاوہ جس کسی نے بھی واقعہ افک میں حصہ لیا سب نے توبہ کر لی۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے فعل سے معذرت کر لی تھی۔ انھوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے شایان شان یہ اشعار بھی کہے تھے:[2]

”میں نے آپ کو آزاد عورت پایا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو معاف فرمائے۔ آپ
پاک دامنوں میں سے ہیں نہ کہ گمراہی اختیار کرنے والیوں سے۔
عفیفہ باوقار اور باعصمت ہیں۔ انھیں کسی شبہ پر متہم نہیں کیا جاسکتا۔ وہ بے خبر
مومن عورتوں کی غیبت سے بالکل پاک صبح کرتی ہیں۔
بلاشبہ جو بات کہی گئی ہے آپ قطعاً اس سے مبرا ہیں۔ وہ ایسے شخص کی بات ہے جو
چغلی کرنے والا ہے (میری جانب سے ایسے اشعار نقل کرنے والا ہے جو میرے نہیں)
اگر میں آپ کی مذمت کر چکا ہوں جیسا کہ (چغل خوروں نے) آپ تک بات
پہنچائی ہے تو (خدا کرے) میری انگلیاں میرا کوڑا (رسی) ہی نہ اٹھا سکیں (اپنا
دفاع نہ کرسکوں)

1 زاد المعاد:3/264,263. 2 زاد المعاد:3/264,263.

یہ کیونکر ہوسکتا ہے، جبکہ میری محبت اور میری حمایت، جب تک زندہ ہوں، آلِ رسول کے لیے ہے جو محافل و مجالس کی زینت ہے۔

خاندانِ رسول کے لیے ایسی عزت اور مقام ہے کہ اس کے بالمقابل تمام لوگ بونے (چھوٹے) نظر آتے ہیں۔''[1]

غزوۂ بنو مصطلق سے مستنبط احکام و مسائل

❁ جنھیں اسلام کی دعوت پہنچ چکی ہے ان پر بلا انتباہ شب خون مارنا جائز ہے۔

❁ آزادی کو بھی حق مہر قرار دیا جاسکتا ہے جیسا کہ آپ ﷺ نے غزوۂ بنو مصطلق میں جویریہ بنت حارث رضی اللہ عنہا کی آزادی کو اُن کا حق مہر ٹھہرایا تھا۔

❁ سفر میں متعدد بیویوں میں سے کسی ایک کو ہمراہ رکھنا ہو تو ان کے بیچ قرعہ اندازی درست ہے۔

❁ عرب کو بھی غلام بنایا جاسکتا ہے جیسا کہ اس غزوے میں ہوا، جمہور علماء کا بھی یہی نقطۂ نظر ہے۔[2]

علمائے امت کا اجماع ہے کہ نص قرآنی سے ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا کی پاک دامنی کے ثبوت کے بعد کوئی انھیں برا کہے یا جو تہمت ان پر لگی، پھر لگائے تو وہ قرآن پاک کا معاندو مخالف ہونے کی وجہ سے کافر ہے۔[3]

اس غزوے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سوال اور آپ ﷺ کی اجازت سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں سے عزل کرنا درست ہے۔ آپ ﷺ نے جواباً فرمایا تھا:

«مَا عَلَيْكُمْ أَلَّا تَفْعَلُوا، مَا مِنْ نَسَمَةٍ كَائِنَةٍ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ إِلَّا وَهِيَ كَائِنَةٌ»

1 تاريخ الإسلام (المغازي) للذهبي، ص: 281، والسيرة النبوية لأبي شهبة: 263/2. 2 الأم للشافعي: 186/4. 3 شرح النووي: 643/5.

”عزل کرنے میں کیا حرج ہے؟ اللہ کے علم میں قیامت تک جو جان آنے والی ہے وہ ضرور آئے گی۔“ [1]

جمہور کا خیال ہے کہ آزاد عورت کی اجازت کے ساتھ اس سے عزل کرنا جائز ہے۔ [2]

نماز کا مقام و مرتبہ واضح کرنے اور اس کی اہمیت جتانے کے لیے آیت تیمّم اس غزوے میں اتری۔ یہ بات واضح کردی گئی ہے کہ پانی کی عدم دستیابی بھی ادائیگی نماز میں مانع نہیں ہوسکتی، حالانکہ پانی ہی طہارت کا ذریعہ ہے اور طہارت نماز کی اہم شرط ہے۔ اسی طرح خوف اور بے امنی بھی اقامت نماز میں رکاوٹ نہیں۔ [3]

——— الحمد للہ دوسری جلد مکمل ہوئی ———

1 صحيح البخاري، حديث: 5210، وصحيح مسلم، حديث:1438، ومسند أحمد: 68/3 و 72. 2 نيل الأوطار للشوكاني:6/222-224. 3 صور و عبر من الجهاد النبوي للدكتور فوزي فيض الله، ص:211,210.

سیرت النبی ﷺ

جلد دوم

نبی امی ﷺ کی سیرت مبارکہ کو امت نے ہر دور میں نئے سے نئے اسلوب میں پیش کیا ہے۔ سیرت کا موضوع ہر مؤلف، مترجم اور ناشر کے لیے حصول سعادت کا ذریعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیرت کی کتب اپنے اندر ندرت و حکمت کے کئی پہلو لیے ہوئے منصۂ شہود پر آتی اور داد و تحسین وصول کرتی ہیں۔

زیر نظر کتاب بھی ندرت کے کئی پہلوؤں کی حامل ہے۔ سیرتِ مبارکہ اور قرآن مجید کے باہمی ربط کا اظہار، واقعاتِ سیرت کے بیان میں اختلاف کا حل، اسلوب میں ادبی چاشنی اور سطر سطر سے نبی کریم ﷺ سے محبت کے جھلکتے آثار اس کتاب کی نمایاں خوبیاں ہیں مگر اس میں جس پہلو کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے وہ ہے واقعاتِ سیرت کو متعدد قدیم مراجع سے اخذ کر کے انھیں موجودہ حالات پر منطبق کرنا اور ان سے دروس و عبر اور اسباق و نصائح کشید کر کے دورِ جدید سے ہم آہنگ کرنا ہے۔

علاوہ ازیں مؤلف کتاب ڈاکٹر علی محمد صلابی ﷾ سیرت طیبہ پر مستشرقین کے رکیک حملوں کا دندان شکن جواب دیتے ہیں اور اصولِ روایت کا دامن بھی نہیں چھوڑتے۔ اس طرح 350 قدیم و جدید مصادر و مراجع کی روشنی میں مرتب کردہ یہ کتاب سیرت اعلیٰ ترتیب، عمدہ اسلوب، دلکش پیرائے، انتہائی جامعیت، عبرتوں، حکمتوں اور اسباق سے لبریز، عمدہ طباعت کے ساتھ ایک عظیم شاہکار بن گئی ہے۔



دار السلام
کتاب و سنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ

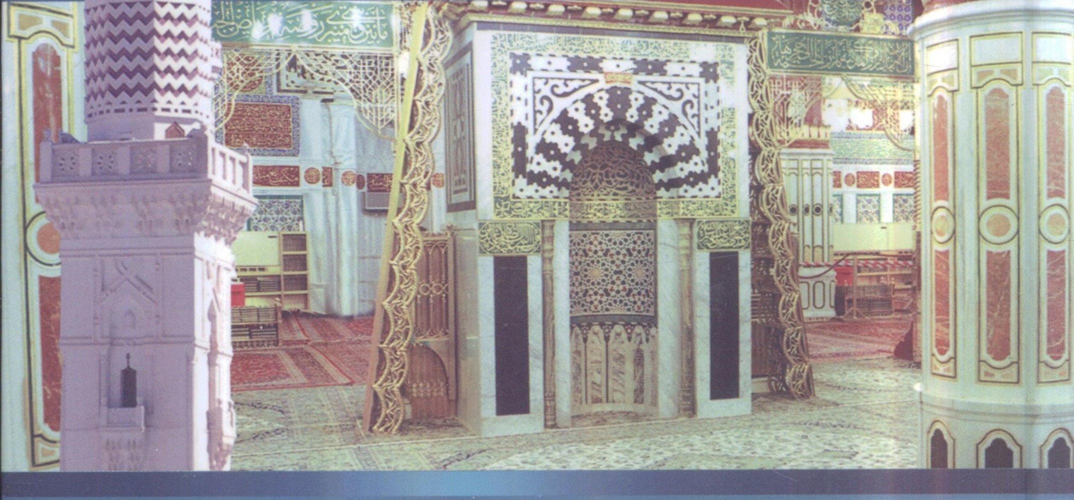
9 786035 000932

جلد سوم

ہادیِ عالم ﷺ کی سیرت سے ماخوذ، عصرِ حاضر کے
تقاضوں سے ہم آہنگ دروس و عبر اور فوائد و ثمرات

سیرت النبی ﷺ





دار السلام
DARUSSALAM

دکتور علی محمد صلابی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

www.KitaboSunnat.com

اللہ کے نام سے شروع جو نہایت رحم کرنے والا خوب مہربان ہے۔

مدحت النبی صلی اللہ علیہ وسلم

وَأَحْسَنُ مِنْكَ لَمْ تَرَ قَطُّ عَيْنِي

وَأَجْمَلُ مِنْكَ لَمْ تَلِدِ النِّسَاءُ

خُلِقْتَ مُبَرَّأً مِنْ كُلِّ عَيْبٍ

كَأَنَّكَ قَدْ خُلِقْتَ كَمَا تَشَاءُ

اور آپ کی ذاتِ اقدس سے زیادہ حسین میری نگاہ نے کبھی کوئی دیکھا ہی نہیں
اور آپ سے زیادہ حسن و جمال والا کبھی کسی ماں نے جنا ہی نہیں
آپ ہر قسم کے عیب سے پاک صاف پیدا کیے گئے ہیں
گویا آپ کی ذاتِ اقدس کو آپ کے منشا کے عین مطابق بنایا گیا ہے

ہادی عالم ﷺ کی سیرت سے ماخوذ، عصرِ حاضر
کے تقاضوں سے ہم آہنگ دروس وعبر اور فوائد وثمرات

سیرت النبی ﷺ

3

© مكتبة دار السلام، ١٤٣٣ هـ
فهرسة مكتبة الملك فهد الوطنية أثناء النشر
الصلابي، علي محمد
سيرة النبوي صلى الله عليه وسلم / علي محمد الصلابي - الرياض، ١٤٣٣ هـ
ص: ٦٧٠ مقاس: ٢١×١٤ سم
ردمك: ٨-٠٩١-٠٠٠-٥٠٠-٦٠٣-٩٧٨ (مجموعة)
٩-٠٩٤-٥٠٠-٦٠٣-٩٧٨ (ج ٣) (النص باللغة الاردية)
١. السيرة النبوية أ. العنوان
ديوي ٢٣٩ ١٤٣٣/٢٧٦٣
رقم الإيداع: ١٤٣٣/٢٧٦٣
ردمك: ٨-٠٩١-٠٠٠-٥٠٠-٦٠٣-٩٧٨ (مجموعة)
٩-٠٩٤-٠٠٠-٥٠٠-٦٠٣-٩٧٨ (ج ٣)

سعودی عرب (ہیڈ آفس)

شاہ عبدالعزیز بن جلاوی سٹریٹ پوسٹ بکس: 22743 الریاض: 11416 سعودی عرب
فون: 4033962-4043432 1 00966 فیکس: 4021659 www.darussalamksa.com
Email: darussalam@awalnet.net.sa info@darussalamksa.com

الریاض • [illegible] فون: 4614483 1 00966 فیکس: 4644945 • [illegible] فون: 4735220 1 00966 فیکس: 4735221
• [illegible] فون: 4286641 1 00966 • [illegible] فون/فیکس: 2860422 1 00966

جدہ فون: 6879254 2 00966 فیکس: 6336270 مدینہ منورہ فون: 8234446,8230038 4 00966 فیکس: 04 8151121
الخبر فون: 8692900 3 00966 فیکس: 8691551 3 00966 خمیس مشیط فون/فیکس: 2207055 7 00966
ینبع البحر فون: 0500887341 فیکس: 8691551 قصیم (بریدہ) فون: 0503417156 فیکس: 3696124 6 00966

امریکہ • نیویارک فون: 5925 625 718 001 • [illegible]: 0419 722 713 001 کینیڈا • [illegible] فون: 4186619 416 001
لندن • [illegible] فون: 77252246 20 0044-85394885 20 0044 • [illegible]: 7739309 0121 0044
متحدہ عرب امارات • [illegible] فون: 5632623 6 00971 فیکس: 5632624 فرانس فون: 52928 480 01 0033 فیکس: 52997 480 01 0033
انڈیا • [illegible] فون: 45566249 44 0091 موبائل: 12041 98841 0091 • [illegible] فون: 4180 2373 22 0091
• [illegible] فون: 4892 2451 40 0091 موبائل: 30850 98493 0091 • [illegible] فون: 42157847 44 0091
سری لنکا • [illegible] فون: 358712 115 0094 • [illegible] فون: 2669197 114 0094

پاکستان ہیڈ آفس و مرکزی شوروم

لاہور 36-لوئر مال، سیکرٹریٹ سٹاپ لاہور فون: 00 4 32 372,24 400 372,34 240 373 42 0092 فیکس: 72 540 373 042
• غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور فون: 54 200 371 42 0092 فیکس: 03 207 373 042
• Y بلاک، گول کمرشل مارکیٹ، دکان: 2 (گراؤنڈ فلور) ڈیفنس، لاہور فون: 10 926 356 42 0092

کراچی مین طارق روڈ، ڈاکٹر مال کے سامنے (بہادر آباد کی طرف) دوسری گلی کراچی فون: 36 939 343 21 0092 فیکس: 37 939 343 21 0092

اسلام آباد F-8 مرکز، اسلام آباد فون/فیکس: 13 815 22 51 0092

ہادیِ عالم ﷺ کی سیرت سے ماخوذ، عصرِ حاضر
کے تقاضوں سے ہم آہنگ دروس وعبر اور فوائد وثمرات

سیرت النبی ﷺ

تالیف:

دکتور علی محمد صلابی

مترجمین:

مولانا محمد یونس بٹ

مولانا محمد ادریس سلفی
مولانا محمد ندیم شہباز

دارالسلام
DARUSSALAM

اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى
مُحَمَّدٍ ﷺ
وَعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ
وَعَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ
اللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ
كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ
اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ

فہرست (جلد سوم)

حصہ 13: غزوۂ اُحزاب 5ھ

حصہ 16: صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیان کے اہم واقعات

حصہ: 17 | غزوۂ فتح مکہ 8ھ

حصہ: 18 | غزوۂ حنین و طائف 8ھ

حصہ 20: حجۃ الوداع سے قبل تا وفاتِ نبوی

اجمالی فہرست ونقشہ جات

13

غزوۂ اُحزاب 5ھ

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا
وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۡ
وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ۝

”اور مومنوں نے جب لشکر دیکھے تو کہا:
یہ تو وہی ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا
اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا تھا اور اس (چیز) نے
ان کے ایمان اور فرماں برداری کو اور زیادہ کر دیا۔“

(الأحزاب 33:22)

غزوے کی تاریخ اور اسباب و واقعات

غزوۂ احزاب کی تاریخ

جمہور مورخین اور سیرت نگاروں کا کہنا ہے کہ غزوۂ احزاب شوال 5 ھ میں پیش آیا۔[1] واقدی کے بقول یہ غزوہ بروز منگل 8 ذوالقعدہ 5 ہجری کو پیش آیا۔[2] ابن سعد کہتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی دعا قبول فرمائی اور بروز بدھ ذوالقعدہ 5 ہجری میں احزاب کو شکست دے دی۔''[3] جبکہ امام زہری، مالک بن انس اور موسیٰ بن عقبہ سے منقول ہے کہ غزوۂ احزاب 4 ھ میں واقع ہوا تھا۔[4]

علماء کا خیال ہے کہ غزوۂ احزاب 4 ھ میں ہونے کے قائل حضرات ہجرت کے بعد والے محرم سے تاریخ کا تعین کرتے ہیں۔ اور اس سے پہلے ربیع الاول تک آنے والے مہینوں کو شمار نہیں کرتے۔[5]

ابن حزم نے زور دے کر کہا ہے کہ یہ غزوہ 4 ھ ہی میں پیش آیا تھا۔[6] کیونکہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کا کہنا ہے کہ آپ ﷺ نے انھیں احد کے دن جنگ سے واپس کر دیا تھا اور (اگلے سال خندق کے موقع پر شرکت کی اجازت دی) اور یاد رہے! جنگ احد بالاتفاق 3 ھ میں

---

1 السيرة النبوية للدكتور مهدي رزق الله، ص: 443. 2 المغازي للواقدي: 440/2، بلا سند ہے۔ 3 الطبقات لابن سعد: 65/2و73، متصل سند سے ذکر کیا ہے۔ 4 البداية والنهاية: 105/4. 5 السيرة النبوية للدكتور مهدي رزق الله، ص: 443. 6 سبل الهدىٰ والرشاد للصالحي: 106/9، وجوامع السير لابن حزم، ص: 185.

ہوئی تھی۔ اور ابن عمر رضی اللہ عنہما اس وقت 14 برس کے تھے۔ [1]

لیکن امام بیہقی رحمہ اللہ [2] اور ابن حجر رحمہ اللہ [3] نے اس کے بارے میں یوں وضاحت کی ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما اُحد کے دن اپنی عمر کے چودھویں سال کی ابتدا اور خندق کے دن پندرھویں سال کے آخر میں تھے اور یہی بات جمہور کی رائے کے موافق ہے۔ [4]

میرے نزدیک بھی جمہور کی رائے راجح ہے۔ ابن قیم رحمہ اللہ بھی اس کی طرف میلان رکھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: ''دونوں اقوال میں صحیح ترین قول یہ ہے کہ غزوۂ خندق شوال 5 ہجری میں پیش آیا۔ جنگ احد بلا اختلاف شوال 3 ہجری میں واقع ہوئی تھی۔ اس موقع پر مشرکین نے آئندہ سال جنگ کی دھمکی دی تھی، تاہم انھوں نے خشک سالی کی بنا پر وعدے کی خلاف ورزی کی اور واپس چلے گئے۔ 5 ہجری میں پھر مسلمانوں سے جنگ کرنے آ گئے۔'' [5]

غزوۂ احزاب کے اسباب

بنونضیر مدینہ منورہ سے جلا وطن ہو کر خیبر چلے گئے۔ مسلمانوں کے خلاف کینہ و بغض ان کے دلوں میں باقی رہا۔ خیبر میں پاؤں جماتے ہی مسلمانوں سے انتقام کی تدبیریں سوچنے لگے۔ بالآخر ان کا اس پر اتفاق ہوا کہ مختلف عربی قبائل کو مسلمانوں کے خلاف جنگ پر آمادہ کیا جائے۔ شیطانی چال کو عملی شکل دینے کے لیے سلام بن ابی الحقیق، حیی بن اخطب، کنانہ بن ربیع بن ابی الحقیق، ہوذہ بن قیس اور ابو عمار کا ایک گروہ تشکیل دیا گیا۔ [6]

یہ وفد سفارت کاری میں بہت حد تک کامیاب ہوا۔ قریش جنھیں مسلمانوں کی طرف سے اقتصادی گھیراؤ کا خدشہ تھا، ان کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو گئے۔ مدینہ کے غلے پر

---

1 السيرة النبوية للدكتور مهدي رزق الله، ص:444. 2 دلائل النبوة للبيهقي:296/2. 3 فتح الباري لابن حجر:396/3. 4 السيرة النبوية للدكتور مهدي رزق الله، ص:444. 5 زاد المعاد: 288/2. 6 السيرة النبوية لابن هشام:237/3.

قابض ہونے اور لوٹ مار کے لالچ میں غطفان نے بھی ہاں میں ہاں ملالی اور دیگر قبائل بھی ان کے ساتھ ہو لیے۔

یہودی وفد نے مشرکین مکہ سے کہا: ''تمھارا دین محمد کے دین سے بہتر ہے اور تم ان کی بہ نسبت حق کے زیادہ قریب ہو۔''[1] اس کے متعلق قرآن پاک کا کہنا ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۭ وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا ۝﴾

''کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھیں کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا، (ان کا حال یہ ہے کہ) وہ بتوں اور شیطان پر ایمان رکھتے ہیں اور کافروں کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ لوگ ایمان لانے والوں سے زیادہ ہدایت والے ہیں؟ وہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی اور جس پر اللہ لعنت کرے تو اس کے لیے آپ قطعاً کوئی مددگار نہیں پائیں گے۔''[2]

پروفیسر ولفنسون اسی گفتگو کے متعلق اشارہ کرتے ہوئے یہود کی اس فاش غلطی کا تذکرہ کرتا ہے۔ اس نے لکھا: ''یہود نے بت پرست قریشی مذہب کو اس اسلام سے افضل سمجھا جو ایک معبود کی عبادت کی دعوت دیتا ہے۔'' اس نے مزید لکھا: ''ایک خدا پر ایمان لانے والے یہود اور مومنین کو اس بات کا زیادہ دکھ ہے کہ یہودِ خیبر نے اسلامی شریعت کے حامل دین پر قریش کے مذہب کو ترجیح دی تھی۔''[3]

قریش نے اپنے مذہب کی تعریف پر خوشی کا اظہار کیا۔ وہ یہود کی طرف داری اور حمایت میں ایک قدم اور آگے بڑھ گئے۔ ان کا مسلمانوں سے جنگ کا ارادہ مزید پختہ

1 التاريخ السياسي والعسكري للدكتور علي معطي، ص: 310. 2 النسآء 4:51,52. 3 تاريخ اليهود في بلاد العرب لولفنسون، ص: 142.

ہوا۔ انھوں نے یہود کی حمایت اور مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کے لیے پیش بندی کے طور پر ان سے شراکت کا برسر عام اعلان کر دیا اور وعدہ بھی دے دیا۔[1]

یہودی وفد نے غطفان کے سرکردہ لوگوں سے مسلمانوں کے خلاف یہودی عربی معاہدے کی توثیق کر دی۔ معاہدے کی اہم شقیں حسب ذیل ہیں:

(ا) متحدہ لشکر میں غطفان کے چھ ہزار جنگجو شامل ہوں گے۔

(ب) یہود تعاون کے صلے میں خیبر کی ایک سال کی کھجوریں غطفانی قبائل کو دیں گے۔[2]

یہودی وفد دس ہزار جنگجو اپنے ساتھ مدینہ لانے میں کامیاب ہو گئے۔ چار ہزار قریشی اور ان کے حلیف، چھ ہزار غطفانی اور ان کے حلیف۔ لوگوں کے اس ہولناک ہجوم نے مدینہ منورہ کے قریب آ ڈیرہ لگایا۔

مسلمانوں کی ان لشکروں کے متعلق باخبری

حکومت اسلامیہ کا نظام امن و امان دشمن کی حرکات و سکنات سے مکمل طور پر باخبر تھا۔ وہ احزاب کی خبروں اور آنے جانے والے راستوں پر کڑی نگاہ رکھتے تھے۔ یہودی وفد کے خیبر سے مکہ جانے پر بھی ان کی نظر تھی۔ انھیں یہود و قریش اور پھر یہود و غطفان میں طے پانے والے معاہدے کا بخوبی علم تھا۔ دشمن کے متعلق ان معلومات کی فراہمی پر ہی رسول اللہ ﷺ نے جنگی دفاع کے لوازم مہیا کیے اور جنگ کی تیاری شروع کر دی۔ آپ ﷺ نے جنگی قائدین کا ہنگامی اجلاس طلب کیا۔ اجلاس میں یہود کی چال کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورت حال پر بحث ہوئی۔[3]

سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے احزاب کو روکنے کے لیے خندق کھودنے کا مشورہ دیا۔ آپ ﷺ نے اسے بہت سراہا۔

---

1 تاريخ اليهود في بلاد العرب لولفنسون، ص: 310. 2 غزوة الأحزاب لمحمد أحمد باشميل، ص: 141. 3 غزوة الأحزاب لمحمد أحمد باشميل، ص: 144،145.

واقدی کا بیان ہے کہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! فارس میں جب ہمیں دشمن کے حملے کا خطرہ ہوتا تو ہم علاقے کے اردگرد خندق کھود لیتے تھے۔'' مسلمانوں کو سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی رائے بڑی پسند آئی۔[1]

جب مشورے کے بعد یہ طے پا گیا کہ خندق کھودی جائے تو رسول اللہ ﷺ چند صحابہ کے ہمراہ جگہ کی نشاندہی کے لیے تشریف لے گئے۔

واقدی کا بیان ہے کہ آپ ﷺ گھوڑے پر سوار ہوئے۔ چند مہاجرین وانصار آپ کے ہمراہ تھے۔ آپ کو یہ بات بڑی پسند آئی کہ سلع پہاڑ کو اپنے پیچھے رکھیں اور مذاد سے ذباب اور وہاں سے راتج تک خندق کھودیں۔ سلع کو بطور دفاع اور تحفظ اختیار کر کے آپ ﷺ نے صحابۂ کرام کی پشت بالکل محفوظ کر لی۔[2]

خندق کے لیے اس جگہ کا انتخاب بڑا اچھا ثابت ہوا۔ کیونکہ مدینہ منورہ کا شمال دشمن کے لیے کھلا رستہ تھا جس سے وہ بآسانی مدینہ منورہ میں داخل ہوسکتا تھا۔ دیگر اطراف محفوظ اور ناقابل دخول تھیں۔ ان اطراف سے دشمن کے درآنے میں خاصی رکاوٹیں موجود تھیں۔ جنوب کی جانب ملے ہوئے مسلسل گھروں کا سلسلہ محفوظ دیوار کی شکل اختیار کیے ہوئے تھا، جبکہ مشرقی جانب حرۂ واقم اور حرۂ وبرہ قدرتی قلعہ کی صورت اختیار کیے ہوئے تھے۔ جنوب مشرق میں بنو قریظہ کے ٹیلے مسلمانوں کی پشت محفوظ رکھنے کے لیے کافی تھے۔ رسول اللہ ﷺ اور بنو قریظہ کے درمیان معاہدہ تھا کہ وہ آپ ﷺ کے خلاف دشمن کا ساتھ نہیں دیں گے۔ اور نہ انھیں مدد فراہم کریں گے۔[3]

---

1 المغازي للواقدي:444/2، والطبقات الكبرى لابن سعد: 6/2. 2 ذباب: مدینہ کی ایک چھوٹی گھاٹی کا نام ہے۔ اس کے اور سلع پہاڑ کے درمیان ثنیۃ الوداع واقع ہے۔ راتج: مدینہ منورہ میں یہود کا ایک قلعہ تھا۔ سلع: مدینہ کے مشہور پہاڑ کا نام ہے۔ معجم البلدان:236/3. 3 العبقرية العسكرية في غزوات الرسول ﷺ لمحمد فرج، ص:442.

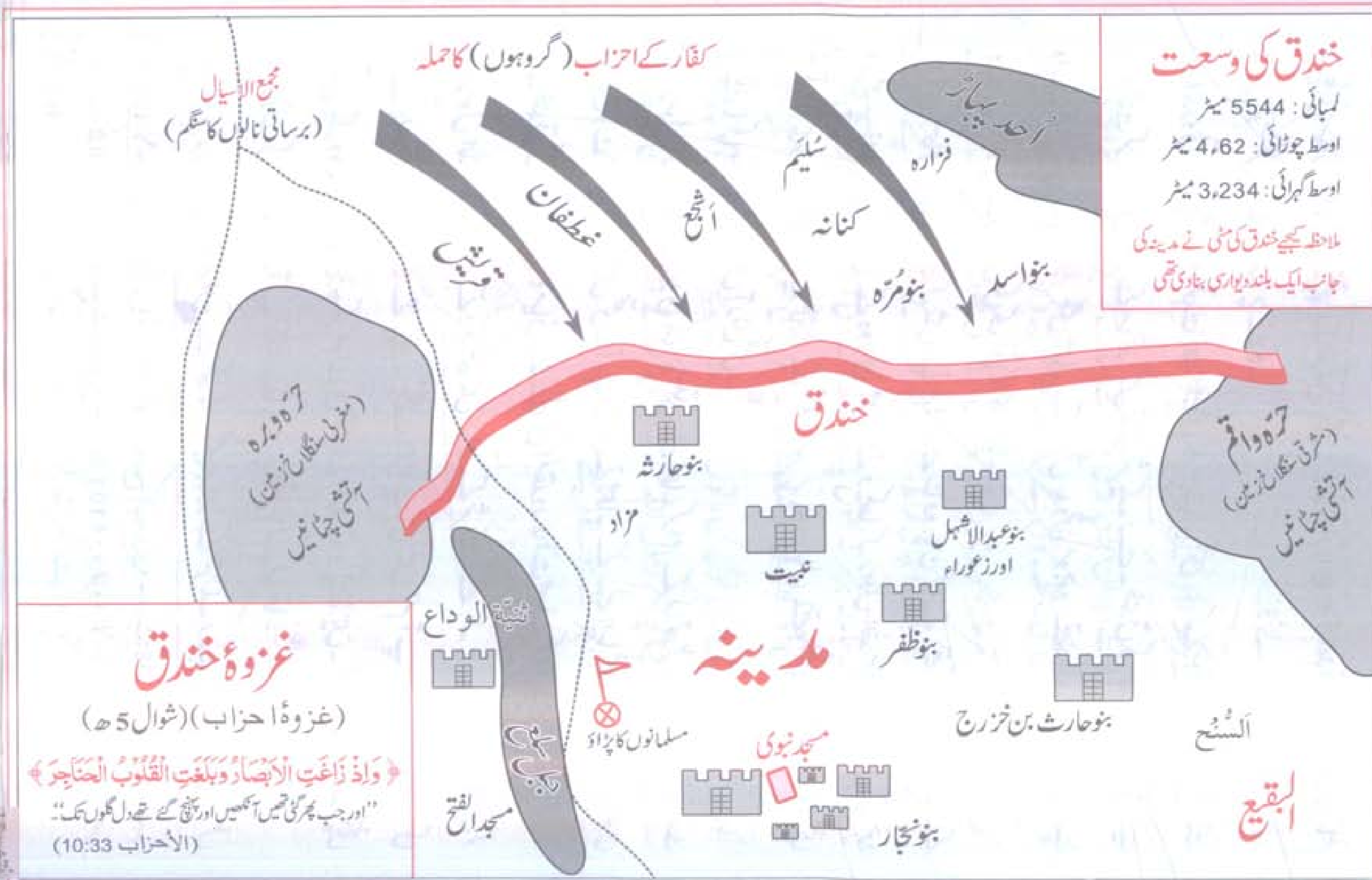
رسول اللہ ﷺ کی طرف سے لشکر کے قیام کے لیے مناسب مقام کے انتخاب سے لشکر کے لیے قیام گاہ کی اہمیت کا پتا چلتا ہے۔ اور یہ بھی کہ اس کے لیے بنیادی شرط یعنی لشکر کی مکمل حفاظت کا پایا جانا نہایت ضروری ہے۔ یہ امر جنگ اور اس کے نتائج پر واضح طور پر اثر انداز ہوتا ہے۔[1]

خندق کی منصوبہ بندی نیا اقدام تھا۔ خندق کی کھدائی ایسی جنگی چال تھی جو عرب کے ہاں غیر معروف تھی۔ گویا عرب اور اسلام کی تاریخ میں رسول اللہ ﷺ نے پہلی بار خندق کا (ہتھیار) استعمال کیا۔ خندق کا معاملہ دشمنانِ اسلام کے لیے بڑا پریشان کن معاملہ تھا۔ اس نے ان کے طے شدہ پروگرام کو خاک میں ملا دیا۔ اس انوکھی تدبیر کی کامیابی میں مسلمانوں کی غیر معمولی چستی اور راز داری نے بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔ احزاب کو نفسیاتی طور پر ناکارہ کرنے اور ان کی قوت منتشر کرنے میں اس نئی پیش بندی اور جدید اسلوب جنگ کا بڑا ہاتھ تھا۔

نبی اکرم ﷺ کی طرف سے اندرونی محاذ جنگ کا اہتمام

① رسول اللہ ﷺ کو جب لشکروں کی آمد کا علم ہوا اور آپ ﷺ نے خندق کی طرف پیش قدمی کا ارادہ فرمایا تو مسلمانوں کے بچوں اور عورتوں کو بنو حارثہ کے قلعے میں محفوظ کیا تاکہ وہ دشمن کے حملے سے محفوظ رہیں۔ ایسا اس لیے کیا گیا تھا کہ بچوں اور عورتوں کا محفوظ ہونا جنگجوؤں پر مثبت نفسیاتی اثر ڈالتا ہے۔ فوجی بیوی بچوں کے متعلق مطمئن ہو تو اس کے اعصاب پرسکون رہتے ہیں۔ تب معمولات زندگی کا کوئی بھی معاملہ اس کی سوچ کو منتشر نہیں کرسکتا۔ وہ جنگ میں نئی سے نئی تدابیر اختیار کرنے کے سلسلے میں تمام ذہنی توانائیاں صرف کر دے گا لیکن اگر معاملہ اس کے برعکس ہو تو فوجی کا ذہن منتشر ہوگا اور اس پر

1 القيادة العسكرية في عهد الرسول ﷺ، ص: 426.


غزوۂ خندق
(غزوۂ احزاب)(شوال 5ھ)
﴿ وَإِذْ زَاغَتِ الْأَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ ﴾
''اور جب پھر گئی تھیں آنکھیں اور پہنچ گئے تھے دل گلوں تک۔''
(الأحزاب 10:33)
خندق کی وسعت
لمبائی: 5544 میٹر
اوسط چوڑائی: 4،62 میٹر
اوسط گہرائی: 3،234 میٹر
ملاحظہ کیجیے خندق کی مٹی نے مدینہ کی جانب ایک بلند دیوار بنادی تھی
کفار کے احزاب (گروہوں) کا حملہ
مجمع الاسیال
(برساتی نالوں کا سنگم)
قریش
غطفان
اشجع
سُلیم
کنانہ
فزارہ
بنومُرّہ
بنواسد
اُحد پہاڑ
خندق
حرّہ وبرہ
(مغربی سنگلاخ زمین)
آتش چٹانیں
حرّہ واقم
(مشرقی سنگلاخ زمین)
آتش چٹانیں
بنوحارثہ
مزاد
عبیت
بنوعبدالاشہل
اورزعوراء
بنوظفر
مدینہ
ثنیۃ الوداع
جبل سلع
مسلمانوں کا پڑاؤ
مسجد نبوی
بنوحارث بن خزرج
السُّنح
مسجد الفتح
بنونجار
البقیع

پریشانی سوار رہے گی۔ نتیجے کے طور پر جنگ سے روگرداں ہوگا اور اس کی وجہ سے تمام لوگوں کو مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا۔[1]

② اندرونی محاذ جنگ کی قوت اور مضبوطی کا سبب یہ بھی بنا کہ رسول اللہ ﷺ مشقت برداشت کرنے میں لشکر کے ساتھ بنفس نفیس شریک رہے۔ خندق کی کھدائی کے تھکا دینے والے کام میں آپ ﷺ بھی صحابہ کے دوش بدوش موجود تھے۔ آپ ﷺ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے خندق کی کھدائی کا کام کیا۔

ابواسحاق کا بیان ہے کہ میں نے براء سے سنا وہ بیان کرتے تھے کہ غزوۂ احزاب کے موقع پر خندق کی کھدائی کے دوران میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ خندق کی مٹی خود منتقل فرما رہے تھے۔ آپ ﷺ کے جسم اطہر پر بہت بال تھے، بطن مبارک کی جلد مٹی (لگنے) کی وجہ سے نظر نہیں آرہی تھی۔[2]

رسول اللہ ﷺ نے بڑی بلند حوصلگی سے صحابہ کرام کے ساتھ مل کر کام کیا۔ اکتاہٹ اور تھکاوٹ نام کی بھی نہیں تھی۔ آپ ﷺ نے صحابہ کے لیے ایسا نمونہ پیش کیا کہ انھوں نے خندق کی کھدائی میں کامیابی کے لیے حتی المقدور طاقت صرف کردی۔

③ رسول اللہ ﷺ صحابہ کے دکھ سکھ میں برابر کے شریک تھے بلکہ بڑے بڑے مصائب کو آگے بڑھ کر خود گلے لگاتے تھے۔ جنگ احزاب ہی میں ہم آپ ﷺ کو دوسروں کی طرح بلکہ دوسروں سے بڑھ کر بھوک کی تکلیف اٹھاتے دیکھتے ہیں۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ بھوک کی شدت سے آپ ﷺ نے پیٹ پر پتھر باندھ لیا تھا۔[3]

اسی طرح آپ ﷺ ان کے سکھ میں بھی برابر کے شریک رہے۔ تین دن کی مسلسل

---

[1] غزوة الأحزاب لأبي فارس، ص: 98. [2] صحيح البخاري، حديث: 4106، وصحيح مسلم، حديث: 1803. [3] صحيح البخاري، حديث: 4101، وغزوة الأحزاب لأبي فارس، ص: 116,117.

بھوک کے بعد ''قوت لایموت'' میسر آئی تو خود کو ساتھیوں پر ترجیح نہ دی۔ اس واقعے کا بیان آگے فوائد میں آئے گا۔

لشکر کے حوصلے بلند رکھنا اور انھیں خوشی کا موقع فراہم کرنا

خندق کی کھدائی کے دوران بڑی بڑی مشکلات سامنے آئیں، مثلاً: موسم انتہائی سرد تھا۔ بہت تیز ہوا چلتی تھی۔ تنگ دستی کے ساتھ ساتھ متوقع دشمن کی آمد کا ہر لحظہ خوف اور کھدائی کا تکلیف دہ مرحلہ جس میں صحابہ ہاتھوں سے مٹی کھودتے اور پشت پر ڈھوتے تھے۔ حالات و واقعات بلاشبہ انتہائی محتاط، سنجیدگی اور محنت کے متقاضی تھے۔ ایسے حالات میں رسول اللہ ﷺ یہ بات ہرگز نہ بھول پائے کہ یہ لوگ بھی آخر دوسرے لوگوں کی طرح انسان ہی ہیں۔ انھیں بھی کام کی مشقت کے بعد سکون کی ضرورت ہے۔ انھیں انتہائی کوفت کے حالات میں ایسی خوش کن باتوں کی ضرورت ہے جو ان کے دکھ درد کو کچھ وقت کے لیے بھلوا دیں، چنانچہ ہم رسول اللہ ﷺ کو مٹی اٹھاتے وقت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے ان رجزیہ اشعار کو دہراتے ہوئے دیکھتے ہیں:

اَللّٰهُمَّ لَوْلَا أَنْتَ مَا اهْتَدَيْنَا
وَلَا تَصَدَّقْنَا وَلَا صَلَّيْنَا
فَأَنْزِلَنْ سَكِينَةً عَلَيْنَا
وَثَبِّتِ الْأَقْدَامَ إِنْ لَّاقَيْنَا
إِنَّ الْأُلٰى قَدْ بَغَوْا عَلَيْنَا
وَإِنْ أَرَادُوا فِتْنَةً أَبَيْنَا

''تو ہدایت گر نہ کرتا تو کہاں ملتی نجات

کیسے پڑھتے ہم نمازیں کیسے دیتے ہم زکاۃ
اب اتار ہم پہ تسلی اے شہ عالی صفات!
پاؤں جما دے ہمارے لڑائی میں دے ثبات
بے سبب ہم پر یہ دشمن ظلم سے چڑھ آئے ہیں
جب وہ بہکائیں ہمیں سنتے نہیں ہم ان کی بات

اور آخری شعر پکار کر ذرا لمبا کر کے پڑھتے۔" [1]

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی خندق کے دن یوں کہتے:

نَحْنُ الَّذِينَ بَايَعُوا مُحَمَّدًا
عَلَى الْإِسْلَامِ مَا بَقِينَا أَبَدًا

"ہم تو پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کر چکے کہ جب تک جان میں جان ہے اسلام پر ثابت قدم رہیں گے۔"

یا "اسلام" کی جگہ "جہاد" کہتے۔ اس کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرماتے:

اَللّٰهُمَّ لَا عَيْشَ إِلَّا عَيْشُ الْآخِرَه
فَاغْفِرْ لِلْأَنْصَارِ وَالْمُهَاجِرَه

"اے اللہ! زندگی تو آخرت کی زندگی ہے، بخش دے انصار اور مہاجرین کو۔" [2]

صحابہ کرام جن مشکل حالات سے گزر رہے تھے ایسا انبساط اور اچھا سلوک ان کے لیے بڑی حد تک غم غلط کرنے کا باعث بن رہا تھا۔ ہمت افزائی کے سلسلے میں بھی یہ طرزِ عمل بڑا معاون ثابت ہو رہا تھا۔ [3]

---

1 صحيح البخاري، حديث: 4106. 2 صحيح البخاري، حديث: 2834، وصحيح مسلم، حديث: 1805. 3 القيادة العسكرية في عهد الرسول ﷺ للدكتور محمد الرشيد، ص:482.

لشکر کی ضروریات کا خیال رکھنا اور بوقت ضرورت اجازت دینا

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت ادب کرتے تھے، چنانچہ جب کوئی ضرورت پیش آتی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کرتے اور ضرورت پوری ہونے پر کام میں مصروف ہو جاتے۔ یہ کام وہ اللہ کی خاطر کر رہے تھے اور اس میں ان کی نیک نیتی، خوش خصالی اور نیکی کی رغبت کارفرما تھی۔ انھی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی تھی:

﴿ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِذَا كَانُوا مَعَهُ عَلَىٰ أَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوا حَتَّىٰ يَسْتَأْذِنُوهُ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ۚ فَإِذَا اسْتَأْذَنُوكَ لِبَعْضِ شَأْنِهِمْ فَأْذَن لِّمَن شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴾

''بس مومن تو صرف وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور جب وہ رسول کے ساتھ کسی اجتماعی کام پر ہوتے ہیں تو آپ سے اجازت لیے بغیر (وہاں سے) چلے نہیں جاتے، (اے نبی!) بلاشبہ جو لوگ آپ سے اجازت مانگتے ہیں وہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں، چنانچہ جب وہ اپنے کسی کام کے لیے آپ سے اجازت مانگیں تو آپ ان میں سے جسے چاہیں اجازت دیں اور ان کے لیے اللہ سے مغفرت مانگیں، بے شک اللہ بہت بخشنے والا، نہایت مہربان ہے۔''[1]

آیت کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ اے نبی! جب آپ سے وہ لوگ اجازت طلب کریں جو پیش آمدہ ضروریات کے سلسلے میں آپ سے اجازت لیے بغیر نہیں جاتے تو ان میں سے جسے چاہیں اجازت دے دیں تاکہ وہ اپنی ضرورت پوری کر لے۔ اس کے ساتھ ان کے لیے دعائے مغفرت بھی کریں۔[2]

1 النور 62:24. 2 صفوة التفاسير للصابوني: 351/2.

یوں رسول اللہ ﷺ کو یہ اختیار تھا کہ اجازت طلب کرنے والے کو واقعی ضرورت ہو تو اجازت دے دیں، جبکہ اجازت دینے کی وجہ سے جماعت کو نقصان کا اندیشہ نہ ہو، چنانچہ آپ حالات اور مصلحت کے تقاضے سے اجازت دیتے اور کبھی اجازت نہ دیتے۔[1]

پہرے کے لیے باری مقرر کرنا

نبی مکرم ﷺ نے حفاظت کے پیش نظر اور خندق کو پار کرنے کا ارادہ رکھنے والوں کا مقابلہ کرنے کے لیے صحابہ کرام کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ مسلمان خندق کی نگرانی کے ساتھ ساتھ اپنے محبوب پیغمبر کی حفاظت کی ذمہ داری بھی نبھا رہے تھے۔ انھوں نے مشرکین کے حملے کو روکے رکھا۔ وہ پوری تیاری سے ڈٹے ہوئے تھے۔ ایک روز طلوع فجر سے آدھی رات تک پوری طرح چوکس رہے۔ اسی دوران میں ان کی چار نمازیں قضا ہو جاتی ہیں۔ جنگ کے دوران میں لمحہ بھر کی فرصت نہ ہونے کی صورت میں ان نمازوں کی قضا ادا کرتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دیگر ساتھیوں کے ہمراہ عکرمہ بن ابی جہل کی خندق پار کرنے کی کوشش ناکام بنائی اور قریش کے پہلوان کے سامنے آکر اسے قتل کر دیا۔[2]

حضرت عباد بن بشر رضی اللہ عنہ کی قیادت میں انصار کی ایک جماعت ہر رات رسول اللہ ﷺ کی حفاظت پر مامور تھی۔ آپ ﷺ بذاتِ خود قائد اعلیٰ اور میدان جنگ کے بلاواسطہ نگران تھے۔ خود ہی لائحہ عمل بناتے اور اسے بروئے کار لانے کی نگرانی بھی فرماتے۔ تفصیل حسب ذیل ہے:

- مشورہ طے پانے کے بعد آپ ﷺ نے خود خندق کھودنے کا حکم دیا۔ اس کے لیے مناسب جگہ کا انتخاب کیا۔ یہ مدینہ منورہ کے شمال کا میدانی علاقہ تھا۔ مدینہ میں داخلے کا صرف یہ کھلا راستہ تھا۔

[1] أحكام القرآن لابن العربي: 3/1410. [2] فقه السيرة للدكتور الغضبان، ص: 504.

❁ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں خندق کی کھدائی کا کام تقسیم فرمایا۔ دس دس افراد کو چالیس چالیس ہاتھ جگہ کھودنے کے لیے دی۔

❁ کام کی نگرانی کی۔ کوئی آدمی آپ ﷺ کی اجازت کے بغیر وہاں سے نہیں جا سکتا تھا۔

❁ خندق کے پاس رہنے کی ذمہ داریاں بھی خود لگائیں۔ اس کا ایسا بندوبست فرمایا کہ خندق کی بالشت بھر جگہ بھی رات دن نگرانی میں تھی۔

❁ تمام معاملات کی ذمہ داری اپنے ہاتھ میں رکھنے پر آپ پوری طرح قادر رہے۔ جب مدینہ منورہ کے اردگرد خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھیں اور احزاب کی یلغار ہوئی تو اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو انتہائی کٹھن حالات سے بڑے احسن انداز سے نکال لیا۔[1]

رسول اللہ ﷺ کی قیادت میں تمام مسلمان یکجا ہو چکے تھے۔ انھی اسباب کی بنا پر جنگ کا نتیجہ مسلمانوں کے ہاتھ رہا اور انھیں زبردست کامیابی ملی۔

1 القيادة العسكرية في عهد الرسول ﷺ للدكتور محمد الرشيد، ص:11.

باب 2

مسلمانوں کی کڑی آزمائش

مسلمانوں نے داخلی محاذ جنگ پر امن و امان برقرار رکھنے کے لیے حتی الامکان احتیاط برتی تھی۔ انھوں نے اسلام اور مدینہ کے دفاع کی بھرپور کوشش کی تھی مگر یہ اللہ تعالیٰ کا ازلی قانون ہے کہ فتح ہمیشہ امتحان اور آزمائش کے بعد ہی ملتی ہے۔ فتح جس قدر قریب ہو آزمائش میں اسی قدر شدت آجاتی ہے۔ جنگ خندق کے موقع پر مسلمانوں کو کڑی آزمائش کا سامنا کرنا پڑا۔

بنو قریظہ کی بدعہدی

مسلمانوں کو مدینہ منورہ کے جنوب میں آباد یہودی قبیلہ بنو قریظہ کی بدعہدی کا خدشہ تھا۔ بنو قریظہ کی طرف سے بدعہدی کی صورت میں مسلمانوں کو دوہری آگ میں جلنا پڑتا۔ پچھلی جانب سے یہود اور احزاب (عربی قبائل کی خوفناک تعداد) کا خطرہ تھا۔ آگے کی طرف بنو قریظہ تھے۔ آخر کار بنو نضیر کے سرغنہ نے بنو قریظہ کے سردار کعب بن اسد کو مسلمانوں کے خلاف احزاب کا ساتھ دینے پر آمادہ کر لیا۔

مسلمانوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ بنو قریظہ نے معاہدہ توڑ دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو بھی یہی خدشہ تھا کہ یہود بنو قریظہ معاہدہ توڑ دیں گے۔ یہودیوں کے ہاں ایفائے عہد کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ آپ ﷺ نے حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کو جو کٹھن مہمات سر کرنے کے عادی اور بہادر آدمی تھے، ان کے متعلق معلومات لانے کو بھیجا۔ زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ گئے،

حالات کا جائزہ لیا اور واپس آ گئے۔ عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول! وہ قلعوں اور راستوں کی مرمت کر رہے ہیں۔ انھوں نے مویشی بھی ایک جگہ جمع کر لیے ہیں۔“[1]

بنو قریظہ کی عہد شکنی کے شواہد ملنے پر رسول اللہ ﷺ نے سعد بن معاذ، سعد بن عبادہ، عبداللہ بن رواحہ اور خوات بن جبیر رضی اللہ عنہم کو بھیجا اور فرمایا:

«اِنْطَلِقُوا حَتّٰى تَنْظُرُوا أَحَقٌّ مَّا بَلَغَنَا عَنْ هٰؤُلَاءِ الْقَوْمِ أَمْ لَا؟ فَإِنْ كَانَ حَقًّا فَالْحِنُوا لِي لَحْنًا أَعْرِفُهُ وَلَا تَفُتُّوا فِي أَعْضَادِ النَّاسِ وَإِنْ كَانُوا عَلَى الْوَفَاءِ فِيمَا بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ فَاجْهَرُوا بِهِ لِلنَّاسِ»

”جا کر دیکھو کہ ان لوگوں کے متعلق ہمیں جو خبر ملی ہے، صحیح ہے کہ نہیں۔ اگر صحیح ہے تو صرف اشارے سے بتانا جسے میں ہی سمجھوں۔ سب کے سامنے بتا کر لوگوں کے حوصلے پست نہ کرنا۔ ہاں اگر وہ عہد کی پاسداری کرتے ہیں تو اسے برملا بیان کر دینا۔“[2]

چاروں حضرات بنو قریظہ کی طرف گئے اور دیکھا کہ وہ واقعی وعدہ توڑ چکے ہیں۔ یہ لوگ واپس آئے اور سلام عرض کرنے کے بعد اشارتاً کہا: «عَضَلٌ وَّالْقَارَةُ» یعنی جس طرح قبیلہ عضل اور قارہ نے عہد شکنی کی تھی اس طرح یہ بھی غداری پر اتر آئے ہیں۔ آپ ﷺ ان کا مطلب سمجھ گئے۔[3]

نبی مکرم ﷺ نے بنو قریظہ کی بدعہدی پر بڑی ثابت قدمی اور احتیاط سے کام لیا۔ آپ ﷺ نے ہر وہ ذریعہ اپنایا جو مسلمانوں کے حوصلوں کو بلند اور سرکشوں کے محاذ کو کمزور کر سکے۔ آپ ﷺ نے اسی وقت حضرت سلمہ بن اسلم رضی اللہ عنہ کو دو سو اور حضرت زید بن

---

1 المغازي للواقدي: 2/457، اس حدیث کا ابتدائی حصہ صحیح بخاری: 4113، میں بھی ہے۔ 2 السيرة النبوية لابن هشام: 3/232، ودلائل النبوة للبيهقي: 3/429، والسيرة النبوية لابن كثير: 3/199.
3 البداية والنهاية: 4/95.

حارثہ رضی اللہ عنہما کو تین سو مجاہدین کے ہمراہ مدینہ کے پہرے پر مامور کیا اور انھیں باآواز بلند تکبیر کے نعرے لگانے کا حکم دیا تاکہ بنوقریظہ مرعوب ہوں۔ بنوقریظہ دشمن کا ساتھ دینے کو تیار ہو گئے اور اسے بیس اونٹ، کھجور، جو اور انجیر بطور امداد روانہ کیے۔ یہ اونٹ مع سازوسامان مسلمانوں کے ہاتھ لگ گئے جو انھیں ہانک کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے آئے۔[1]

سخت محاصرہ

احزاب کو بنوقریظہ کا ساتھ ملا تو ان کا محاصرہ اور سخت ہو گیا۔ مسلمانوں کی مشکلات میں اضافہ ہوا اور حالات نے گھمبیر صورت اختیار کر لی۔ قرآن مجید نے مسلمانوں کو پہنچنے والی تنگی اور دل گرفتگی کا تذکرہ کیا ہے۔ مسلمان جس گھبراہٹ اور بے چینی کا شکار تھے قرآن مجید نے اس کی بڑی سچی تصویر کشی کی ہے۔ فرمایا:

﴿اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ۝ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ۝﴾

”جب دشمن تم پر تمھارے اوپر (کی طرف) سے اور تمھارے نیچے (کی طرف) سے چڑھ آئے اور جب آنکھیں (خوف و ہراس کی وجہ سے اصل جگہ سے) ہٹ گئیں اور کلیجے حلقوں کو پہنچ گئے اور تم اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ وہاں مومن آزمائے گئے اور شدت سے ہلا مارے گئے۔“[2]

مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ پر مکمل بھروسا تھا جسے قرآن مجید نے یوں بیان فرمایا ہے:

﴿وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۡ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ۝﴾

”اور مومنوں نے جب لشکر دیکھے تو کہا: یہ تو وہی ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول

[1] السيرة الحلبية: 2/323. [2] الأحزاب 33:10، 11.

نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا تھا اور اس (چیز) نے ان کے ایمان اور فرماں برداری کو اور زیادہ کر دیا۔''[1]

رہے منافق تو وہ اسلامی لشکر سے کھسک گئے اور مزید خوف میں مبتلا ہو گئے۔ معتب بن قشیر جس کا تعلق بنو عمرو بن عوف سے تھا، اس نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ محمد (ﷺ) تو ہم سے وعدہ کرتے تھے کہ ہم قیصر و کسریٰ کے خزانے پائیں گے مگر ہماری حالت تو یہ ہے کہ کوئی شخص اطمینان سے قضائے حاجت کے لیے بھی نہیں جا سکتا۔ کئی افراد نے واپس گھروں کو جانے کی اجازت چاہی کہ ان کے گھر محفوظ نہیں ہیں۔ ان کا یہ کردار سراسر بزدلی پر مبنی تھا جو اندرونی اضطراب اور مسلمانوں کو دشمن کے حوالے کرنے کی غمازی کرتا تھا۔ چند ضعیف روایات میں ان کے مذاق کرنے، اندر سے خوف میں مبتلا ہونے اور مسلمانوں کو بے یارو مددگار چھوڑ دینے کا ذکر بھی ہے۔[2]

قرآن کریم نے ان حالات کی بے مثال عکاسی کی ہے۔[3] ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِذْ قَالَتْ طَّائِفَةٌ مِّنْهُمْ يَا أَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوا ۚ وَيَسْتَأْذِنُ فَرِيقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُولُونَ إِنَّ بُيُوتَنَا عَوْرَةٌ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۖ إِن يُرِيدُونَ إِلَّا فِرَارًا ۝ وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِم مِّنْ أَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَآتَوْهَا وَمَا تَلَبَّثُوا بِهَا إِلَّا يَسِيرًا ۝ وَلَقَدْ كَانُوا عَاهَدُوا اللَّهَ مِن قَبْلُ لَا يُوَلُّونَ الْأَدْبَارَ ۚ وَكَانَ عَهْدُ اللَّهِ مَسْئُولًا ۝ قُل لَّن يَنفَعَكُمُ الْفِرَارُ إِن فَرَرْتُم مِّنَ الْمَوْتِ أَوِ الْقَتْلِ وَإِذًا لَّا تُمَتَّعُونَ إِلَّا قَلِيلًا ۝ قُلْ مَن ذَا الَّذِي يَعْصِمُكُم مِّنَ اللَّهِ إِنْ أَرَادَ بِكُمْ سُوءًا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً ۚ وَلَا يَجِدُونَ لَهُم مِّن دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ۝ قَدْ يَعْلَمُ اللَّهُ الْمُعَوِّقِينَ مِنكُمْ وَالْقَائِلِينَ لِإِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ إِلَيْنَا ۖ وَلَا يَأْتُونَ الْبَأْسَ إِلَّا قَلِيلًا ۝ أَشِحَّةً عَلَيْكُمْ ۖ فَإِذَا جَاءَ الْخَوْفُ

1 الأحزاب33:22. 2 المعجم الكبير للطبراني:376/11، ومجمع الزوائد: 131/6. 3 السيرة النبوية الصحيحة:424/2.

رَاَیْتَهُمْ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْكَ تَدُوْرُ اَعْیُنُهُمْ كَالَّذِیْ یُغْشٰی عَلَیْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۚ فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ اَشِحَّةً عَلَی الْخَیْرِ ۚ اُولٰٓئِكَ لَمْ یُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ ۚ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَی اللّٰهِ یَسِیْرًا ○ یَحْسَبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ یَذْهَبُوْا ۚ وَاِنْ یَّاْتِ الْاَحْزَابُ یَوَدُّوْا لَوْ اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِی الْاَعْرَابِ یَسْئَلُوْنَ عَنْ اَنْۢبَآئِكُمْ ۚ وَلَوْ كَانُوْا فِیْكُمْ مَّا قٰتَلُوْٓا اِلَّا قَلِیْلًا ○﴾

''اور جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا تھا: اے اہل یثرب! (آج) تمھارے لیے (لشکر کے ساتھ) کوئی قیام گاہ نہیں، لہٰذا تم لوٹ چلو اور ان میں سے ایک گروہ نبی سے اجازت مانگ رہا تھا، وہ کہتے تھے: بے شک ہمارے گھر کھلے پڑے (غیر محفوظ) ہیں، حالانکہ وہ کھلے (غیر محفوظ) نہیں تھے، وہ تو صرف (جنگ سے) فرار چاہتے تھے۔ اور اگر اس (مدینہ) کے اطراف سے ان پر (کفار کے) لشکر داخل کیے جاتے، پھر اِن سے فتنہ وفساد (خانہ جنگی یا شرک) کے بارے میں پوچھا جاتا تو وہ (فوراً) اس میں کود پڑتے اور اس (شرکتِ فتنہ) میں بس تھوڑا ہی توقف کرتے۔ اور بلاشبہ اس سے پہلے انھوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ وہ پیٹھ نہیں پھیریں گے اور اللہ کے عہد کی پوچھ گچھ تو ہونی ہے۔ آپ کہہ دیجیے: اگر تم موت سے یا قتل ہونے سے بھاگو تو تمھارا بھاگنا تمھیں ہرگز نفع نہیں دے گا اور تب تم بہت کم فائدہ اٹھاؤ گے۔ کہہ دیجیے: کون ہے جو تمھیں اللہ سے بچا سکے اگر وہ تمھارے ساتھ کسی سختی کا ارادہ کرے یا وہ تم پر رحمت کا ارادہ کرے؟ اور وہ اللہ کے سوا اپنے لیے نہ کوئی حمایتی پائیں گے اور نہ کوئی مددگار۔ بے شک اللہ انھیں جانتا ہے جو تم میں سے (جہاد میں) رکاوٹیں ڈالنے والے ہیں اور انھیں بھی جو اپنے بھائیوں سے کہتے ہیں: ہمارے پاس آجاؤ اور وہ جنگ میں کم ہی آتے ہیں۔ اس حال میں کہ وہ تمھارا ساتھ دینے میں سخت بخیل ہیں، چنانچہ جب خوف (کا وقت) آئے تو آپ انھیں دیکھتے ہیں کہ وہ آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں، ان کی

آنکھیں (اس طرح) گھومتی ہیں جیسے وہ شخص جس پر موت کی غشی طاری ہو، پھر جب خطرہ دور ہوجائے تو مال (غنیمت) کے انتہائی حریص بن کر تیز زبانوں کے ساتھ تمھارے بارے میں زبان درازی کرنے لگتے ہیں، یہ لوگ ایمان لائے ہی نہیں، لہٰذا اللہ نے ان کے اعمال ضائع کردیے اور یہ اللہ کے لیے نہایت آسان ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ (ابھی تک) لشکر گئے نہیں اور اگر یہ لشکر چڑھ آئیں تو وہ تمنا کرتے ہیں کاش! وہ صحرانشین دیہاتیوں میں جا بسے ہوتے اور (وہاں) تمھاری خبریں دریافت کیا کرتے اور اگر وہ تم میں موجود ہوتے تو وہ (دشمن سے) لڑائی میں کم ہی حصہ لیتے۔''[1]

ان آیات نے نفاق اور اس کے اثر سے دلوں میں پیدا ہونے والے ہیجان وقلق، بزدلی اور مشکلات کی گرانی کے وقت اللہ تعالیٰ پر عدم اعتماد کا تذکرہ کیا ہے۔ آزمائش کے وقت اللہ تعالیٰ سے رجوع کرنے کے بجائے بدزبانی کرنے کی مذمت کی گئی ہے۔ وہ رسول اللہ ﷺ سے اجازت طلب کرنے لگتے ہیں کہ میدان عمل سے واپسی کی رخصت دی جائے۔ بودے دلائل کے سہارے جنگ سے فرار چاہتے ہیں۔ کہتے کہ ان کے گھر دشمن سے محفوظ نہیں جبکہ بات صرف اتنی ہے کہ خوف و ہراس اور کمزور ایمان کی وجہ سے راہ فرار چاہتے ہیں۔ دیگر افراد کو بھی یہی موقف اختیار کرنے اور گھروں کو واپس چلے جانے پر آمادہ کرتے ہیں۔ وہ ایسا کرتے ہوئے ایمان و اسلام کے عہد کا بھی پاس نہیں کرتے۔[2]

ادھر خندق عبور کرنے کے لیے مشرکین کی کوششیں بڑھ گئیں، ان کے گھڑسوار دستے بھاری نفری کے ساتھ رات بھر خندق کے آس پاس پھرنے لگے۔ خالد بن ولید نے چند شاہسواروں کے ساتھ خندق کی تنگ جگہ سے مسلمانوں پر اچانک حملے کا ارادہ کیا مگر حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ دو سو صحابہ کے ہمراہ ان کی حرکتوں پر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ دشمن

[1] الأحزاب33:13-20. [2] السيرة النبوية الصحيحة للعمري:2/425.

کے ساتھ نوک جھونک ہوئی اور اس دوران وحشی (قاتل حمزہ رضی اللہ عنہ) کی برچھی سے حضرت طفیل بن نعمان رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے۔[1]

مشرکین کی جانب سے حبان بن عرقہ نے موقع پا کر حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے تیر مارا جو ان کے بازو پر لگا اور ان کی رگِ اکحل کٹ گئی۔ اس نے تیر برساتے ہوئے کہا: ''اسے ابن عرقہ کی طرف سے وصول کر۔'' تیر لگنے پر حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے دعا کی:

''اے اللہ! اگر قریش سے مزید جنگ ہے تو تو مجھے زندہ رکھ کیونکہ مجھے یہی پسند ہے کہ میں ان سے جہاد کروں جنھوں نے تیرے رسول ﷺ کو اذیت دی، جھٹلایا اور گھر سے نکالا۔ اے اللہ! اگر ہمارے اور ان کے درمیان جنگ ختم ہو چکی ہے تو تو مجھے شہادت عطا کر اور اس وقت تک موت نہ دے جب تک میں بنو قریظہ کے انتقام سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی نہ کر لوں۔''[2]

مرد صالح سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی دعا قبول ہوگئی۔ بنو قریظہ کے متعلق فیصلہ بھی عنقریب انھی کو سنانا تھا۔ بعد ازاں مشرکین نے سورماؤں کا ایک دستہ رسول اللہ ﷺ کی قیام گاہ کی طرف بھیجا۔ مسلمان ان سے دن بھر نبرد آزما رہے۔ نماز عصر کے وقت یہ گروہ آپ ﷺ کے انتہائی قریب پہنچ گیا، جس کی وجہ سے آپ اور آپ کے ہمراہ صحابہ نمازِ عصر نہ پڑھ سکے۔ رات گئے یہ گروہ واپس ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«مَلَأَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ بُيُوتَهُمْ وَقُبُورَهُمْ نَارًا كَمَا شَغَلُونَا عَنِ الصَّلَاةِ الْوُسْطٰى حَتّٰى غَابَتِ الشَّمْسُ»

''اللہ تعالیٰ ان سمیت ان کے گھروں اور قبروں کو آگ سے بھر دے انھوں نے ہمیں (صلاۃ وسطی) نماز عصر پڑھنے سے روک دیا حتی کہ سورج غروب ہو گیا۔''[3]

---

1 حديث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ للدكتور محمد بكر آل عابد: 424/2. 2 مسند أحمد: 142,141/6، وصحيح ابن حبان، رقم: 7028. 3 صحيح البخاري، حديث: 2931، وصحيح مسلم، حديث: 627.

غطفان سے بات چیت کی کوشش اور سرداران مدینہ کا موقف

رسول اللہ ﷺ کی حسن سیاست، دانش مندی اور تجربہ کاری کا مظاہرہ اس وقت بھی ہوا جب آپ ﷺ نے قبیلہ غطفان سے صلح کا ارادہ فرمایا۔ رسول اللہ ﷺ بخوبی جانتے تھے کہ اس جنگ میں قبیلۂ غطفان کی شرکت نہ سیاسی مقصد کے لیے تھی نہ مذہبی تعصب کی بنا پر۔ ان کا مقصد صرف اتنا تھا کہ اس بہت بڑی جنگ میں شریک ہو کر مال و متاع ہاتھ آئے گا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے متحدہ دشمن میں سے نہ تو حیی بن اخطب اور کنانہ بن ربیع سے مصالحت کی کوشش کی اور نہ قریش کے قائد ابوسفیان بن حرب سے صلح کی بات کی۔ ان دونوں گروہوں کا مقصد مال و متاع کا حصول نہیں تھا۔ ان کا مقصد سیاسی اور دینی تھا۔ وہ مدینہ منورہ کی اسلامی حکومت کو گرانا چاہتے تھے۔ یوں رسول اللہ ﷺ نے صرف غطفان کی قیادت سے رابطہ کیا۔[1]

دونوں غطفانی سرداروں عیینہ بن حصن اور حارث بن عوف نے بغیر کسی پس و پیش کے رسول اللہ ﷺ کی پیش کش قبول کر لی۔ ان کے ساتھ ان کے بعض دیگر طرفدار بھی خدمت نبوی میں حاضر ہوئے۔ خندق سے پرے فریقین کے درمیان بات چیت ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ نے غلے کے عوض مصالحت کی۔ معاہدۂ صلح کی اہم شقیں حسب ذیل تھیں:

(ا) یہ معاہدہ مسلمانوں اور غطفان کے درمیان طے پایا جو اس وقت فریق مخالف کے ساتھ ہیں۔

(ب) قبیلۂ غطفان مسلمانوں سے صلح کرے گا اور کسی جنگ میں ان کے خلاف نہیں لڑے گا۔ بالخصوص موجودہ صورت حال میں دشمن کا ساتھ نہیں دے گا۔

(ج) غطفانی مدینہ سے محاصرہ اٹھا کر فی الفور واپس چلے جائیں گے۔

1 غزوة الأحزاب لمحمد أحمد باشميل، ص:201.

(۵) اس کے بدلے میں مسلمان مدینہ منورہ کے پھل کا تیسرا حصہ انھیں دیں گے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاہدہ ایک سال کے لیے طے پایا تھا۔[1]

واقدی کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غطفانی قیادت سے کہا تھا کہ دیکھو اگر میں مدینہ کے پھل کا ایک تہائی تمھارے حوالے کر دوں تو کیا تم دونوں اپنی فوج واپس لے جاؤ گے اور ان اوباشوں سے کنارہ کش ہو جاؤ گے؟

دونوں سردار کہنے لگے کہ آپ ہمیں مدینہ منورہ کی آمدن کا نصف دیں۔ رسول اللہ ﷺ ایک تہائی سے زیادہ کے لیے رضا مند نہ ہوئے تو وہ دونوں اس پر راضی ہو گئے۔ جب معاملہ طے پانے لگا تو وہ دونوں قوم کے دس سرکردہ افراد کی معیت میں حاضر خدمت ہوئے۔[2]

غطفانی قیادت نے صلح کی پیش کش مان لی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غطفانی جنگ کے لیے کیوں آئے تھے۔ وہ حصولِ مال و متاع کے لیے آمادۂ قتال ہوئے تھے۔ فریق مخالف کے دل میں ایسے خیالات کا پایا جانا اس کی ایک تہائی جنگی قوت ختم ہونے کے مترادف ہے۔ یوں مدمقابل کو ختم کرنے کا جذبہ کمزور پڑ جاتا ہے۔ مسلمانوں نے ان کی اسی کمزوری کا فائدہ اٹھایا اور معاہدہ صلح کر کے انھیں غیر جانبدار بنا دیا۔[3]

رسول اللہ ﷺ کے اس طرز عمل سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ مشکلات یکبارگی ٹوٹ پڑیں تو ان سے نمٹنے کے لیے حوصلے اور تحمل سے کام لینا چاہیے۔ یہ بھی پتا چلتا ہے کہ مشکلات کے حل کے سلسلے میں آسان ترین راہ اختیار کرنی چاہیے اور دشمن کی طرف وقتی طور پر دوستی کا ہاتھ بھی بڑھانا پڑے تو دریغ نہیں کرنا چاہیے۔[4]

صلح نامے پر دستخط کرنے سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام سے مشورہ کیا۔

---

1 غزوة الأحزاب لمحمد أحمد باشميل، ص:202,201. 2 المغازي للواقدي:477/2.
3 القيادة العسكرية في عهد الرسول للدكتور محمد الرشيد، ص:413. 4 محمد رسول الله ﷺ لصادق عرجون:146/4.

صحابۂ کرام کی رائے تھی کہ غطفان کو مدینہ منورہ کا غلہ ہرگز نہ دیا جائے۔ سردارانِ انصار سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! کیا یہ آپ کی ذاتی رائے ہے یا اللہ تعالیٰ کا حکم ہے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«بَلْ شَيْءٌ أَصْنَعُهُ لَكُمْ، وَاللّٰهِ مَا أَصْنَعُ ذٰلِكَ إِلَّا لِأَنِّي رَأَيْتُ الْعَرَبَ رَمَتْكُمْ عَنْ قَوْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّكَالَبُوكُمْ۔ أَيْ: اِشْتَدُّوا عَلَيْكُمْ۔ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ فَأَرَدْتُّ أَنْ أَكْسِرَ عَنْكُمْ مِّنْ شَوْكَتِهِمْ إِلٰى أَمْرٍ مَّا»

''نہیں! یہ میری ذاتی رائے ہے۔ میں ایسا صرف اس لیے کرنا چاہتا ہوں کہ تمام عرب تم پر ایک ہی کمان سے تیروں کی بارش کر رہے ہیں۔ وہ ہر سمت سے تم پر چڑھ آئے ہیں۔ یوں میں نے ارادہ کیا کہ جہاں تک ہو سکے ان کی قوت توڑ دوں اور تمھیں اس کے نقصانات سے بچا لوں۔''

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! ہم سب بت پرستی پر قائم تھے۔ اللہ کی عبادت نہیں کرتے تھے، نہ اسے پہچانتے تھے۔ ضیافت اور خریداری کی تو بات اور ہے۔ اس کے علاوہ یہ لوگ مدینہ کی کسی کھجور پر للچائی ہوئی نظر نہیں ڈال سکتے تھے۔ اب اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسلام کی دولت سے سرفراز فرمایا ہے۔ اس کے ذریعے سے ہمیں سیدھے رستے پر چلایا ہے۔ آپ کی اور اسلام کی برکت سے ہمیں یہ اعزاز حاصل ہوا ہے۔ اب کیا ہم انھیں اپنا مال دے دیں؟ اللہ کی قسم! ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ ہماری طرف سے انھیں تلوار کے سوا کوئی عطیہ نہ ملے گا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ کر دے۔''

یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَنْتَ وَ ذَاكَ» ''اچھا پھر تم جانو اور تمھارا کام۔''

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے وہ پرچہ لیا اور اس میں جو تحریر تھی اسے مٹا ڈالا اور کہا کہ اب وہ چاہیں تو ہم پر طبع آزمائی کر لیں۔[1]

سردارانِ انصار سعد بن عبادہ اور سعد بن معاذ رضی اللہ عنہما کا جواب اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری پر مبنی تھا۔ اس ضمن میں انھوں نے آدابِ نبوت کو پوری طرح ملحوظ خاطر رکھا۔ انھوں نے غطفان کے ساتھ معاہدۂ صلح کو تین حصوں میں تقسیم کیا:

① اگر یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے تو انھیں رائے دہی کا کوئی اختیار نہیں۔ امرِ الٰہی کے آگے سرِ تسلیم خم ہے۔

② یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بحیثیت رسول رائے ہے تو بھی آپ کی رائے سب سے مقدم ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل بھی کی جائے گی۔

③ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے یہ رائے اپنائی تھی۔ اور یہ آپ کی اپنی ذاتی رائے تھی۔ یوں صحابۂ کرام کے لیے بھی رائے دہی کی گنجائش نکلتی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب سے سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہما پر یہ انکشاف ہوا کہ آپ محض تیسری بات کے لیے معاہدۂ صلح کرنا چاہتے ہیں تو سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے جچی تلی رائے پیش خدمت کی۔ غطفان کی قیادت روسیاہ ہو گئی۔ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے واضح کیا کہ انصار تو ان ظالموں کے آگے جاہلیت میں بھی نہیں جھکے تھے۔ اب جبکہ اسلام نے انھیں عزت بخشی ہے تو وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ سعد رضی اللہ عنہ کی رائے چونکہ صائب تھی، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی رائے پسند آئی اور آپ نے اظہارِ مسرت کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انصار کی بلند حوصلگی کا اندازہ ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غطفان سے معاہدہ صلح کا ارادہ ملتوی کر دیا۔[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان کہ تمام عرب تم پر ایک کمان سے تیر برسا رہے ہیں۔ اس

---

1 السيرة النبوية لابن هشام: 234/3، والبداية والنهاية: 106/4، والمعجم الكبير للطبراني، رقم: 5409، ومجمع الزوائد للهيثمي: 131/6. 2 التاريخ الإسلامي للحميدي: 125/6.

سے پتا چلتا ہے، رسول اللہ ﷺ کا مقصود یہ تھا کہ تمام عرب مسلمانوں کے خلاف متحد نہ رہیں۔ اس سے مسلمانوں کو یہ رہنمائی ملتی ہے:

❁ مسلمانوں کو چاہیے کہ دشمن کی کمزوری کا پتا چلانے کی کوشش کریں۔

❁ دوران جنگ مسلم قیادت کا تزویراتی ہدف یہ ہونا چاہیے کہ وہ مخالف فریقوں میں سے جس کسی کو غیر جانبدار کر سکے تو ضرور کرے۔ نیز مسلم قیادت کو مشاورت سے کام لینا چاہیے۔ پیش آمدہ مسائل کے سلسلے میں علمائے دین سے رجوع کرنا اور اسلام کے وقتی اور دائمی مفادات کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔ [1]

رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے جو مشاورت کی، اس سے آپ ﷺ کے طرز قیادت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ آپ ﷺ حربی و غیر حربی معاملات میں ہمیشہ مشاورت فرماتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تمام معاملات میں مشاورت کا حکم دیا ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ کی ذات کو بھی مشاورت سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا۔ معاملہ مختلف آراء کی روشنی میں طے پاتا اگر اس کے متعلق اللہ کی طرف سے وحی نہ آئی ہوتی۔ [2]

ترک صلح کے سلسلے میں صحابۂ کرام کی رائے قبول کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ کامیاب قائد کا ماتحتوں سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ ماتحت، قائد کے مقام و مرتبے کے معترف ہوتے ہیں اور قائد ماتحتوں کا قدر دان ہوتا ہے۔ قائد ان کی آراء کا احترام کرتا ہے اور وہ اس کی رائے کو معتبر جانتے ہیں۔ قائدینِ غطفان کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی مصالحت شرعی سیاست کا حصہ ہے جس میں قومی مفادات کا پورا پورا خیال رکھا گیا تھا۔ [3]

اس معاہدۂ صلح کے سلسلے میں صحابۂ کرام کا موقف تین مفاہیم کا حامل ہے:

(ا) یہ موقف اظہارِ رائے میں مسلمانوں کی ادیبانہ شجاعت کو واضح کرتا ہے اور یہ کہ حسب

---

[1] الأساس في السنة لسعيد حوّى: 287/2. [2] العبقرية العسكرية في غزوات الرسول ﷺ لمحمد فرج، ص: 414. [3] القيادة العسكرية في عهد الرسول ﷺ للدكتور محمد الرشيد، ص: 414.

ضرورت جماعت کے جملہ امور میں مشورے کا امکان موجود ہوتا ہے۔

(ب) یہ موقف مسلمانوں کی نفسیات سے پردہ اٹھاتا اور اللہ تعالیٰ، اس کے رسول اور اسلام سے ان کے گہرے تعلق کو واضح کرتا ہے۔

(ج) یہ موقف واضح کرتا ہے کہ مسلمان نفسیاتی طور پر کتنے مضبوط تھے۔ اور یہ کہ وہ صبر آزما حالات کا مقابلہ کتنے حوصلے سے کرتے تھے۔ دشمن کیسی ہی تیاری کے ساتھ اور کیسا ہی لاؤلشکر لے کر آیا ہو، وہ اس سے قطعی مرعوب نہیں ہوتے تھے۔[1]

دشمن کی صفوں میں افواہیں پھیلانا

رسول اللہ ﷺ نے دشمن کے اتحادو اتفاق کو توڑنے اور باہمی اعتماد کو ختم کرنے کے لیے ان کے خلاف پروپیگنڈے کا ہتھیار استعمال کیا۔ آپ کو لشکروں کے ذہنی خلفشار کا بخوبی علم تھا۔ آپ نے ان کے باہمی اختلافات کو نمایاں کرنے اور ان کے درمیان پڑی دراڑوں کو مزید بڑھانے کی کوشش کی۔ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غلے کا لالچ دے کر غطفان کو ان کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش فرمائی تھی۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے نعیم بن مسعود غطفانی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ایمان لے آئے۔ ایمان لانے کے بعد عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول! میری قوم کو میرے اسلام لانے کی خبر نہیں۔ آپ مجھے کوئی خدمت سونپ دیں!“ آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّمَا أَنْتَ فِينَا رَجُلٌ وَّاحِدٌ، فَخَذِّلْ عَنَّا إِنِ اسْتَطَعْتَ فَإِنَّ الْحَرْبَ خُدْعَةٌ»

”تم ہمارے درمیان اکیلے آدمی ہو۔ اگر کر سکو تو ہماری طرف سے مشرکین میں تفرقہ ڈال دو کیونکہ جنگ چالبازی کا نام ہے۔“[2]

---

[1] القيادة العسكرية في عهد الرسول ﷺ للدكتور محمد الرشيد، ص: 416,415. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 240/3، ودلائل النبوة للبيهقي: 446,445/3، والبداية والنهاية: 113/4.

حضرت نعیم رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق یہود اور مشرکین میں شک کا بیج بونے لگے۔ انھوں نے یہود بنوقریظہ کو ابھارا کہ قریش سے (چند سرداروں) کے گروی رکھنے کا تقاضا کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ محاصرہ اٹھا کر تمھیں اکیلا چھوڑ جائیں۔ اور ادھر قریش سے کہا: ''یہود تمھارے کچھ سردار اس لیے بطور گروی طلب کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کے ساتھ صلح میں وہی گروی رکھے ہوئے سردار عوضانے کے طور پر دیں۔'' نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ شرعی سیاست کے اصولوں کے خلاف نہیں تھا کیونکہ ''جنگ دھوکا دہی اور چالبازی کا نام ہے۔''[1]

حضرت نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ منصوبہ بہت کامیاب رہا۔ قائدین احزاب کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے شکوک وشبہات پیدا ہو گئے۔ نتیجہ ان کی قوت کے ٹوٹنے اور عزم کے متزلزل ہونے کی صورت میں نکلا۔ حضرت نعیم رضی اللہ عنہ کی کوشش یوں کامیاب ہوئی:

(ا) انھوں نے ہر پہلو سے اپنے اسلام کو مخفی رکھا۔ یوں انھوں نے جس گروہ کو بھی بظاہر خیرخواہانہ مشورہ پیش کیا، اس نے قبول کر لیا۔

(ب) انھوں نے بنوقریظہ کو بنوقینقاع اور بنونضیر (یہودی قبائل) کا انجام یاد دلایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ جاری رکھنے کی صورت میں مستقبل کے بھیانک انجام سے ڈرایا۔ ان کی کوشش نظریات وافکار بدلنے اور ان کی تدبیریں الٹنے کا سبب بنی۔

(ج) وہ یوں بھی کامیاب رہے کہ ہر گروہ نے ان کے مشورے کو دوسرے سے مخفی رکھا کیونکہ اس کے پوشیدہ رکھنے ہی میں ان کی بقا تھی۔ فریقین میں سے کسی بھی گروہ پر ان کا معاملہ کھل جاتا تو ساری کوشش رائیگاں جاتی۔ یوں نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جنگ احزاب کی کامیابی میں نمایاں کردار ادا کیا۔[2]

1 السيرة النبوية الصحيحة للعمري: 430/2. 2 القيادة العسكرية في عهد الرسول ﷺ للدكتور محمد الرشيد، ص: 477.

باب 3

نصرتِ الٰہی کی آمد اور غزوۂ احزاب کی قرآنی عکاسی

رسول اللہ ﷺ کی گریہ وزاری اور نصرت الٰہی کی آمد

رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے حضور ہمیشہ دعا کیا کرتے تھے۔ بالخصوص حالتِ جنگ میں بہت دعا کیا کرتے۔ غزوۂ احزاب میں مسلمانوں کو سخت مصیبت نے آلیا اور کلیجا منہ کو آنے لگا تو مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کوئی دعا بتایئے۔ کلیجا منہ کو آنے لگا ہے۔'' نبی ﷺ نے فرمایا: ''ہاں یہ دعا مانگو: «اَللّٰهُمَّ اسْتُرْ عَوْرَاتِنَا وَآمِنْ رَّوْعَاتِنَا» ''اے اللہ! ہماری کمزوریاں چھپا لے اور ہمیں خوف و ہراس سے محفوظ رکھ۔''[1]

صحیحین میں عبداللہ بن ابی اوفی کے واسطے سے احزاب کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کی یہ دعا مروی ہے:

«اَللّٰهُمَّ! مُنْزِلَ الْكِتَابِ، سَرِيعَ الْحِسَابِ، هَازِمَ الْأَحْزَابِ، اَللّٰهُمَّ اهْزِمْهُمْ وَزَلْزِلْهُمْ»

''اے اللہ! اے کتاب اتارنے والے، جلد حساب لینے والے، فوجوں کو شکست دینے والے، اے اللہ! ان کو شکست دے، ان کے قدم اکھاڑ دے۔''[2]

1 مسند أحمد: 3/3، ومجمع الزوائد: 136/10، ومسند البزار، رقم: 3119. 2 صحيح البخاري، حديث: 2933، وصحيح مسلم، حديث: (22,21)-1742.

اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب پیغمبر کی دعا قبول فرمائی۔ مصائب کے بادل چھٹ جانے کی خوشخبریاں آگئیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت و طاقت سے انھیں واپس پلٹا دیا۔ ان کی جماعتیں تتر بتر کر دیں۔ اللہ تعالیٰ نے سخت ٹھنڈی ہوا ان پر مسلط کر دی، ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا اور اپنے ہاں سے خاص لشکر نازل فرمائے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَاءَتْكُمْ جُنُودٌ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا وَجُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا ○﴾

''اے ایمان والو! تم اپنے اوپر اللہ کا احسان یاد کرو، جب تمھیں (کفار کے) لشکروں نے آلیا تھا، پھر ہم نے ان پر آندھی اور (فرشتوں کے) ایسے لشکر بھیجے جنھیں تم نے دیکھا نہیں اور تم جو عمل کرتے ہو، اللہ اسے خوب دیکھ رہا ہے۔''[1]

امام قرطبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ تند و تیز ہوا رسول اللہ ﷺ کا معجزہ تھا۔ خود رسول اللہ ﷺ اور اہل ایمان اس ہوا کے قریب تھے۔ ہوا اور مسلمانوں کے درمیان صرف خندق تھی۔ اس کے باوجود مسلمان ہوا کی زد میں نہیں آئے اور انھیں اس کی خبر تک نہ ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے دشمنان اسلام کے خلاف فرشتے نازل فرمائے جنھوں نے خیموں کے کھونٹے اکھاڑ دیے اور رسیاں توڑ دیں۔ آگ بجھا دی، ہانڈیاں الٹ دیں، گھوڑے باہم گتھم گتھا ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر رعب ڈال دیا۔ لشکر کے اردگرد فرشتوں نے بکثرت تکبیر کے نعرے بلند کیے۔ ہر خیمے کا سردار اپنے افراد کو پکارتا: ''اے بنو فلاں! ادھر آؤ۔'' وہ سب اکٹھے ہو جاتے تو کہتا: ''اپنے بچاؤ کا سامان کرو۔'' دراصل اللہ تعالیٰ نے ان پر رعب طاری کر دیا تھا۔[2]

رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام کو یہ باور کرا دیا تھا کہ دس ہزار (10,000) سے زائد کے لشکر نے مسلمانوں کی سپاہیانہ مساعی سے شکست نہیں کھائی بلکہ دشمنانِ اسلام کو صرف اللہ تعالیٰ نے شکست دی ہے۔

[1] الأحزاب 9:33. [2] تفسير القرطبي: 144/14.

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے:

«لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ، أَعَزَّ جُنْدَهُ، وَنَصَرَ عَبْدَهُ، وَغَلَبَ الْأَحْزَابَ وَحْدَهُ، فَلَا شَيْءَ بَعْدَهُ»

''اکیلے اللہ کے سوا کوئی سچا معبود نہیں۔ اس نے اپنی فوج کو عزت دی، اپنے بندے کی مدد فرمائی اور احزاب پر وہ اکیلا غالب آیا۔ اس جیسی ہستی کسی کی نہیں۔''[1]

رسول اللہ ﷺ کا رب تعالیٰ سے دعا کرنا اس کی ذاتِ اقدس پر اعتماد اور مدد و نصرت کے انسانی ذرائع اختیار کرنے کے منافی نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس جنگ میں اسباب اختیار کرنے کا طریقہ اپنایا۔ لشکروں کو جدا جدا کرنے اور محاصرہ توڑنے کے لیے پوری کوششیں صرف کیں۔ اس کے علاوہ دیگر ذرائع بھی اختیار کیے جو پہلے بیان ہوئے ہیں۔[2]

رسول اللہ ﷺ اس طرح ہمیں اسباب اختیار کرنے کا طریقہ اپنانے، اللہ تعالیٰ کے سامنے التجا کرنے اور صرف اسی کی بندگی کرنے کا سبق دے رہے ہیں۔ کیونکہ اسباب کسی کام کے نہیں جب تک ان کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا اور طلب نصرت کا وسیلہ نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کے حضور گریہ وزاری اور دائمی دعا، ایسے کام ہیں جن پر رسول اللہ ﷺ زندگی بھر عمل پیرا رہے۔[3]

احزاب کی واپسی کا مشورہ

رسول اللہ ﷺ دشمن کے گروہوں پر مسلسل نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ اور تازہ بہ تازہ صورت حال سے باخبر رہنا پسند کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَلَا رَجُلٌ يَأْتِينَا بِخَبَرِ الْقَوْمِ، جَعَلَهُ اللّٰهُ مَعِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ؟»

1 صحيح البخاري، حديث: 4114، وصحيح مسلم، حديث: 2724. 2 فقه السيرة للدكتور الغضبان، ص: 503. 3 فقه السيرة للبوطي، ص: 222.

"کوئی ہے جو احزاب کی خبر لائے، اسے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز میرا ساتھ نصیب کرے گا۔"[1]

آپ ﷺ نے اس طرح ترغیب کا انداز اختیار فرمایا اور تین بار یہی بات دہرائی مگر جب یہ اسلوب کارگر نہ ہوا تو بذات خود آدمی کا تعین کیا اور پختہ لہجے میں حکم دیا:

«قُمْ يَا حُذَيْفَةُ! فَأْتِنَا بِخَبَرِ الْقَوْمِ وَلَا تَذْعَرْهُمْ عَلَيَّ»

"حذیفہ! اٹھو۔ ان لوگوں کی خبر لاؤ لیکن کوئی ایسی حرکت نہ کرنا کہ وہ میرے خلاف بھڑک اٹھیں۔"[2]

اس میں ایک تربیتی پہلو ہے کہ کامیاب قیادت وہی ہے جو ماتحتوں سے مطلوبہ مقاصد کے حصول کے لیے ترغیب کا طریقہ اپناتی ہے اور حکم کا انداز صرف مجبوراً اختیار کرتی ہے۔

حذیفہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جب میں ان کی طرف روانہ ہوا مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ گویا میں گرم حمام میں چل رہا ہوں (ذرا سردی نہیں لگی)۔ میں نے دیکھا کہ ابوسفیان کمر کو آگ سے سینک رہا ہے۔ میں نے تیر کمان پر چڑھایا اور برسانے کا ارادہ کیا۔ یکایک مجھے رسول اللہ ﷺ کا فرمان یاد آیا کہ "انھیں میرے خلاف نہ بھڑکانا۔" اگر میں ابوسفیان پر تیر برساتا تو یقیناً اسے مار ہی ڈالتا۔ میں فوراً واپس ہوا اور واپسی پر بھی یہی محسوس کیا کہ گویا میں گرم حمام میں چل رہا ہوں۔ جب رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچا تب سردی کا احساس ہوا۔ میں نے آکر رسول اللہ ﷺ کو ساری بات بتائی۔ آپ ﷺ جس چادر کو اوڑھے نماز پڑھ رہے تھے اس کا کچھ حصہ مجھ پر ڈال دیا۔ اس کو اوڑھ کر میں ایسا سویا کہ صبح ہو گئی۔ صبح ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: «قُمْ يَا نَوْمَانُ» "اٹھ اے بہت سونے والے!"[3]

---

[1] صحيح مسلم، حديث: 1788. [2] صحيح مسلم، حديث: 1788. [3] صحيح مسلم، حديث: 1788.

حذیفہ رضی اللہ عنہ کے واقعے سے ماخوذ اسباق: ① رجال کار کی صلاحیتوں سے پوری واقفیت ہونا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو احزاب کی جاسوسی کا فریضہ سونپا کیونکہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ غیر معمولی طور پر بہادر انسان تھے اور ایسے کام بہادری میں ممتاز شخص ہی انجام دے سکتا ہے۔ وہ چھریرے بدن کے ذہین وفطین آدمی تھے۔ پیچیدہ صورت حال پر بہت جلد قابو پالیا کرتے تھے۔

② حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اصول حرب سے بخوبی واقف تھے۔ انھیں سپہ سالارِ قریش کو قتل کرنے کا پورا پورا موقع ملا بلکہ انھوں نے اسے قتل کرنے کا ارادہ بھی کر لیا لیکن فوراً ذہن میں آیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ''انھیں بھڑکانا مت'' تمھارا کام صرف ان کی خبر لانا ہے، چنانچہ انھوں نے تیر کمان سے علیحدہ کر لیا۔[1]

③ کرامات اولیاء: حذیفہ رضی اللہ عنہ جب دشمن کی خبر لانے گئے تو بہت سردی تھی، شدید بارش اور سردی کے باوجود انھیں سردی کا احساس تک نہ ہوا اور وہ اپنے آپ کو گویا گرم حمام میں چلتا ہوا محسوس کر رہے تھے۔ وہ جب تک وہاں رہے، انھیں سردی نہیں لگی۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے اپنے مومن بندوں پر خاص فضل وکرم ہی کا مظہر ہے۔[2]

④ واپسی پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے لطافت آمیز رویہ اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں سے ہمیشہ دوستانہ تعلق رکھتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس چادر میں نماز ادا کر رہے تھے وہی حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو اوڑھا دی۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر اوڑھے محو خواب رہے۔ فرض نماز کا وقت ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں بڑے پیار سے بیدار کیا اور فرمایا: ''اٹھ اے بہت سونے والے!'' یہ بڑا محبت بھرا انداز ہے۔ اس

---

[1] فقه السيرة للدكتور الغضبان، ص: 505، والسيرة النبوية لأبي فارس، ص: 367. [2] السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 367.

سے مٹھاس اور لطافت ٹپک رہی ہے۔ یہ نرمی و شفقت کا بے مثال نمونہ ہے جو رسول اللہ ﷺ نے ہمارے سامنے پیش کیا۔[1] اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے:

﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۝﴾

''(لوگو!) یقیناً تمھارے پاس تمھی میں سے ایک رسول آ گیا ہے، اس پر تمھارا تکلیف میں مبتلا ہونا گراں (گزرتا) ہے، وہ تمھارے لیے (بھلائی کا) حریص ہے، مومنوں پر نہایت شفیق، بہت رحم کرنے والا ہے۔''[2]

⑤ جلیل القدر صحابی کا نہایت تیزی اور ہوشمندی سے پیچیدہ صورت حال پر قابو پانا تعجب میں ڈالتا ہے۔ زرقانی کی روایت میں ہے کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ دشمنوں میں بیٹھے تھے کہ ابوسفیان نے کہا: ''ہر شخص پاس بیٹھے ساتھی کا ہاتھ تھام لے اور اسے پہچانے۔'' حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے اپنا ہاتھ دائیں بیٹھے شخص کے ہاتھ پر مارا اور پوچھا: ''تم کون ہو؟'' اس نے کہا: ''معاویہ بن ابوسفیان۔'' پھر میں نے بایاں ہاتھ اپنے بائیں طرف بیٹھے شخص کے ہاتھ پر مارا اور پوچھا تم کون ہو؟'' اس نے کہا: ''عمرو بن عاص۔''[3] یوں انھوں نے خود پوچھ کر ساتھ والوں کو دریافت کرنے کا موقع ہی نہ دیا کہ وہ ان سے پوچھ سکیں اور وہ اس خطرناک صورت حال سے صاف بچ نکلے جو بصورت دیگر ان کے لیے جان لیوا ثابت ہو سکتی تھی۔[4]

غزوۂ احزاب پر قرآنی تبصرہ اور اس کے نتائج کا محاکمہ

قرآن کریم نے غزوۂ احزاب کے متعلق گفتگو کی ہے۔ قرآن کا عام اسلوب یہ ہے کہ اس کا تبصرہ زمان و مکان کی وسعتوں کو شامل ہوتا ہے۔ مسلمان بعد کے ادوار میں بھی

1 صور و عبر من الجهاد النبوي للدكتور فوزي فيض الله، ص:246. 2 التوبة 9:128. 3 شرح الزرقاني:2/120. 4 من معين السيرة لصالح الشامي، ص:293.

مبتلائے جنگ ہو سکتے تھے۔ ان کے علاقوں پر چڑھائی ممکن تھی۔ یہ احتمال بھی باقی تھا کہ دشمن مل کر ان پر ٹوٹ پڑیں گے۔ قرآن پاک نے اسی تناظر میں احزاب اور قریظہ دونوں غزوات کا تذکرہ کیا ہے۔[1]

مسلمان خاص طور پر ان حادثات و واقعات سے سبق حاصل کریں جو قرآن کریم میں مذکور ہیں۔ جنگ احزاب کے متعلق قرآن کریم کی آیات پر غور وفکر کرنے والا ان میں درج ذیل امور پائے گا:

① اللہ تعالیٰ کا مومنوں پر اپنے انعامات کا تذکرہ۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ۚ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ۝﴾

''اے ایمان والو! تم اپنے اوپر اللہ کا احسان یاد کرو، جب تمھیں (کفار کے) لشکروں نے آلیا تھا، پھر ہم نے ان پر آندھی اور (فرشتوں کے) ایسے لشکر بھیجے جنھیں تم نے دیکھا نہیں اور تم جو عمل کرتے ہو، اللہ اسے خوب دیکھ رہا ہے۔''[2]

② احزاب کی طرف سے مدینہ منورہ کے محاصرے پر مسلمانوں کو لاحق اندیشوں کی عمدہ اور انوکھی تصویر کشی:

﴿اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ۝﴾

''جب دشمن تم پر تمھارے اوپر (کی طرف) سے اور تمھارے نیچے (کی طرف) سے چڑھ آئے اور جب آنکھیں (خوف و ہراس کی وجہ سے اصل جگہ سے) ہٹ گئیں اور کلیجے حلقوں کو پہنچ گئے اور تم اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔''[3]

1 الأساس في السنة لسعيد حوّى:2/662. 2 الأحزاب33:9. 3 الأحزاب33:10.

③ منافقین کی بری نیت، گھٹیا اخلاق، بزدلانہ رویے، جھوٹے عذر بہانے اور عہد شکنی کی پردہ کشائی۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَإِذْ يَقُولُ الْمُنٰفِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُولُهُ إِلَّا غُرُورًا ۝ ﴾

''اور جب منافق اور جن لوگوں کے دلوں میں مرض تھا، کہہ رہے تھے: اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے نہیں وعدہ کیا مگر دھوکے فریب کا۔''[1]

④ ہر زمان و مکان کے اہل ایمان کو تمام مسائل کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ سے رہنمائی لینے کی ترغیب دلانا، فرمان الٰہی ہے:

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيرًا ۝ ﴾

''یقیناً تمھارے لیے رسول اللہ (کی ذات) میں بہترین نمونہ ہے، ہر اس شخص کے لیے جو اللہ (سے ملاقات) اور یوم آخرت کی امید رکھتا ہے اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرتا ہے۔''[2]

⑤ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے اچھے کردار کی تعریف کی ہے جس میں وہ سچے ایمان کے ساتھ لشکروں کا سامنا کر رہے تھے اور اللہ تعالیٰ نے ایفائے عہد پر بھی ان کی تعریف کی ہے۔ فرمایا:

﴿ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۖ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا ۝ ﴾

''مومنوں میں سے کچھ وہ لوگ بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے جو عہد کیا تھا وہ سچ کر دکھایا، چنانچہ ان میں سے بعض نے اپنا عہد پورا کیا (شہادت پا گئے) اور ان میں

1 الأحزاب 12:33. 2 الأحزاب 21:33.

سے بعض منتظر ہیں اور انھوں نے (عہد میں) کوئی تبدیلی نہیں کی۔''[1]

⑥ اللہ تعالیٰ کی ابدی و ازلی سنت کا ذکر ہوا ہے اور یہ بھی بیان ہوا ہے کہ اچھا انجام مومنوں کا اور شکست ان کے دشمنوں کا نصیب ہے۔ ارشاد ہے:

﴿ وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ۚ وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا ۝﴾

''اور (غزوۂ احزاب میں) اللہ نے کافروں کو ان کے (ناکامی کے) غصے میں لوٹا دیا، وہ کوئی خیرو بھلائی نہ پاسکے اور (اس) لڑائی میں اللہ مومنوں کے لیے کافی ہوگیا اور اللہ بڑی قوت والا، نہایت غالب ہے۔''[2]

⑦ اللہ تعالیٰ نے مومن بندوں پر اپنے احسان کا تذکرہ فرمایا کہ اس نے بنو قریظہ کے خلاف مومنوں کی مدد کی اور بغیر لڑائی ان پر غلبہ دے دیا، حالانکہ بنو قریظہ اپنے محفوظ قلعوں میں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایسا رعب ڈالا کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے حکم پر خود ہی قلعوں سے اتر آئے۔[3]

ارشاد الٰہی ہے:

﴿ وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ۝ وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَـُٔوْهَا ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ۝﴾

''اور اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے کافروں کی مدد کی تھی انھیں اللہ نے ان کے قلعوں سے اتارا اور ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا، تم ان (بنو قریظہ) کے ایک گروہ کو قتل کر رہے تھے اور دوسرے گروہ کو قیدی بنا رہے تھے۔ اور اللہ نے تمھیں ان کی زمینوں، ان کے گھروں، ان کے مالوں اور اس زمین کا وارث بنا دیا

1 الأحزاب 23:33. 2 الأحزاب 25:33. 3 حديث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ للدكتور محمد بكر آل عابد: 491,490/2.

جسے تم نے پامال نہیں کیا تھا اور اللہ ہر شے پر خوب قادر ہے۔“ [1]

غزوۂ احزاب اہم ترین جنگ تھی۔ اس سے مسلمانوں نے کئی اچھے نتائج حاصل کیے۔ چند ایک کی تفصیل حسب ذیل ہے:

- مسلمانوں کی فتح اور دشمنان اسلام کی شکست فاش اور پسپائی۔ ان کی واپسی ایسی حالت میں ہوئی کہ نامراد اور غصے میں بھرے ہوئے تھے۔ ان کی امیدیں خاک میں مل چکی تھیں۔

- حالات مسلمانوں کے حق میں خوشگوار ہو گئے۔ اب وہ دفاع کے بجائے جارحیت کی پوزیشن میں تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:

«اَلْآنَ نَغْزُوهُمْ وَلَا يَغْزُونَنَا نَحْنُ نَسِيرُ إِلَيْهِمْ»

”اب ہم ان سے قتال کریں گے وہ ہم سے نہیں کریں گے۔ ہم ان کی طرف پیش قدمی کریں گے۔“ [2]

- غزوۂ خندق میں یہود بنو قریظہ کا معاملہ بھی کھل گیا۔ جو کینہ وہ دلوں میں چھپائے بیٹھے تھے اور مسلمانوں پر جس طرح آفات کے ٹوٹ پڑنے کے خواہش مند تھے، سب واضح ہو گیا۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے عہد و پیمان کو بڑے خطرناک حالات میں توڑا۔
- غزوۂ خندق نے مسلمانوں کے ایمان کی صداقت بھی نمایاں کر دی۔ منافقین اور یہود کی حقیقت بھی سامنے آ گئی، گویا جنگ احزاب کی آزمائشی گھڑی مسلمانوں کے امتحان اور خلوص، جبکہ منافقین و یہود کی بھیانک حقیقت و اصلیت کے اظہار کی گھڑی تھی۔

- غزوۂ بنو قریظہ جنگ احزاب کا نتیجہ تھا۔ اس میں بنو قریظہ کا محاسبہ ہو گیا جنھوں نے شدید ترین حالات میں رسول اللہ ﷺ کے عہد و پیمان کو توڑا تھا۔ [3]

---

1 الأحزاب33:26,27. 2 صحيح البخاري، حديث: 4110. 3 حديث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ للدكتور محمد بكر آل عابد:442/2.

بنو قریظہ سے چھٹکارا

خندق سے واپسی اور اسلحہ رکھ دینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر ﷺ کو بنو قریظہ سے جنگ کرنے کا حکم دیا۔ آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ان کی جانب پیش قدمی کا حکم دیا۔ آپ ﷺ نے انھیں بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریل علیہ السلام کو یہود کی طرف بھیج دیا ہے تاکہ ان کے قلعوں کو متزلزل کریں، ان کے دلوں میں رعب ڈال دیں۔

آپ ﷺ نے مسلمانوں کو وصیت فرمائی:

«لَا يُصَلِّيَنَّ أَحَدٌ الْعَصْرَ إِلَّا فِي بَنِي قُرَيْظَةَ»

''تم میں سے ہر شخص عصر کی نماز بنو قریظہ میں پڑھے۔''[1]

مسلمانوں نے پچیس روز تک بنو قریظہ کا محاصرہ کیے رکھا۔[2]

محاصرہ ان پر گراں ہوا اور سخت مشکل ہوگئی تو یہود اس شرط پر قلعے سے باہر آئے اور اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ کے حوالے کیا کہ آپ ﷺ ان کا فیصلہ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیں گے۔ یوں وہ لوگ قلعے سے اتر آئے۔ ان کا خیال تھا کہ حضرت سعد کے قبیلے سے ان کا بھائی چارہ ہے، اس لیے وہ ان سے نرمی برتیں گے۔ حضرت سعد کے بازو میں غزوۂ خندق کے روز تیر آ لگا تھا، اس لیے انھیں اٹھا کر لایا گیا۔ انھوں نے فیصلہ دیا کہ بنو قریظہ کے جنگجوؤں کو قتل کر دیا جائے، عورتوں اور بچوں کو قیدی بنایا جائے اور اموال تقسیم کر دیے جائیں۔ آپ ﷺ نے ان کے فیصلے کو پسند کرتے ہوئے فرمایا:

«قَضَيْتَ بِحُكْمِ اللّٰهِ»

''تم نے حکم الٰہی کے مطابق فیصلہ کیا ہے۔''[3]

---

1 صحيح البخاري، حديث: 4119، وصحيح مسلم، حديث: 1770. 2 صحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 373. 3 صحيح البخاري، حديث: 3043و4122، وصحيح مسلم، حديث: 1768.

مدینہ منورہ کے بازار میں گڑھا کھودا گیا اور چار سو (400) افراد قتل کر کے اس گڑھے میں پھینک دیے گئے۔

چند لوگ عہد کی وفاداری اور اسلام میں داخل ہونے کے سبب بچ گئے۔ ان کے اموال اور اولادیں مسلمانوں میں تقسیم کر دی گئیں۔ دھوکا کرنے والوں اور مسلمانوں کے عہد کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے یہ بدلہ عادلانہ تھا۔ یہ سزا ان کے کردار کے عین مطابق تھی۔[1]

بنو قریظہ کی صرف ایک عورت کو قتل کیا گیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس عورت کے متعلق بیان کیا کہ وہ عورت میرے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھی اور کھلے دل سے ہنس رہی تھی۔ ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنو قریظہ کے آدمیوں کو بازار مدینہ میں قتل کرا رہے تھے، اتنے میں کسی پکارنے والے نے اس کا نام پکارا: ''اے فلانی؟'' اس نے جواب دیا: ''اللہ کی قسم! میں موجود ہوں۔'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''میں نے اس سے کہا: ''تیرا برا ہو، تجھے کیا ہوگیا۔'' اس نے کہا: ''میں قتل کی جاؤں گی۔'' میں نے پوچھا: ''کیوں؟'' بولی: ''ایک معاملے کی بنا پر جو میں نے کیا تھا (اس عورت نے حضرت خلاد بن سوید رضی اللہ عنہ پر چکی پھینک کر انھیں قتل کر دیا تھا)'' پس اسے لے جایا گیا اور اس کی گردن تلوار سے اڑا دی گئی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرمایا کرتی تھیں: ''اللہ کی قسم! تعجب انگیز بات یہ تھی جسے میں کبھی نہیں بھولوں گی۔ اسے معلوم تھا کہ قتل کی جاؤں گی، اس کے باوجود وہ ہشاش بشاش تھی اور کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔''[2]

بنو قریظہ کا فیصلہ ہو جانے پر مدینہ منورہ یہود کے ناپاک وجود سے بالکل پاک ہو گیا۔ اب مدینہ میں صرف مسلمان مقیم تھے۔ داخلی محاذ کا خطرہ ٹل گیا۔ یوں گویا قریش کے خواب

[1] السيرة النبوية الصحيحة: 1/315-317. [2] مسند أحمد: 6/277، وسنن أبي داود، حديث: 2671.

بھی چکنا چور ہو گئے کیونکہ انھیں مسلمانوں کے خلاف یہود مدینہ سے امید لگی رہتی تھی۔ [1]

رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو گویا یہ پیغام دیا کہ اسلامی ممالک کو داخلی خطرات سے محفوظ رکھنے کے لیے ہر ممکن طریقہ استعمال کرنا چاہیے۔

[1] سيرة الرسول ﷺ للأستاذ محمد عزت دروزة: 76/2 نقلًا عن دراسات في عهد النبوة للدكتور عبدالرحمٰن الشجاع، ص: 153.

باب 4

فوائد، اسباق اور حکمتیں

نبوی معجزات

خندق کی کھدائی کے دوران رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں چند معجزات کا ظہور ہوا جن میں سے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کے تیار کردہ کھانے میں اضافہ ہونا بھی شامل ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم خندق کھود رہے تھے کہ ایک سخت چٹان سامنے آگئی۔ لوگ نبی ﷺ کے پاس آئے اور عرض کیا کہ ایک سخت چٹان آڑے آگئی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: «أَنَا نَازِلٌ» ''میں خود اترتا ہوں۔'' پھر آپ ﷺ کھڑے ہوئے۔ بھوک کی وجہ سے آپ کے پیٹ پر پتھر بندھا ہوا تھا۔ ہم لوگوں نے بھی تین دن سے کوئی کھانے کی چیز نہ چکھی تھی۔ آپ ﷺ نے کدال ہاتھ میں لی اور اس چٹان پر ماری تو وہ بھربھری ریت کا ٹیلا سا بن گئی۔

جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! مجھے ذرا گھر جانے کی اجازت دیجیے۔'' گھر جا کر میں نے اپنی بیوی سے کہا: ''میں نے رسول اللہ ﷺ کی وہ حالت دیکھی ہے جس پر صبر نہیں ہو سکتا۔ تیرے پاس کچھ کھانے کو ہے؟'' اس نے کہا: ''ہاں تھوڑے جَو ہیں اور ایک بکری کا بچہ ہے۔'' میں نے بکری کا بچہ ذبح کیا اور میری بیوی نے جَو پیسے۔ جب ہم گوشت ہانڈی میں ڈال چکے اور آٹا خمیر ہو گیا، ہانڈی چولہے پر تھی اور گوشت پک جانے کے قریب تھا تو اس وقت میں آیا اور چپکے سے عرض کیا: ''اے

اللہ کے رسول! میرے ہاں تھوڑا سا کھانا تیار ہے۔ آپ تشریف لے چلیں اور ایک یا دو آدمی ساتھ لے لیں۔ آپ ﷺ نے پوچھا: «كَمْ هُوَ؟» ''کھانا کتنا ہے؟'' میں نے بتایا تو آپ ﷺ نے فرمایا: «كَثِيرٌ طَيِّبٌ» ''بہت ہے اور عمدہ ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا:

«قُلْ لَّهَا: لَا تَنْزِعِ الْبُرْمَةَ وَلَا الْخُبْزَ مِنَ التَّنُّورِ حَتّٰى آتِيَ»

''اپنی بیوی سے کہو، جب تک میں نہ آؤں ہانڈی چولہے سے نہ اتارے اور روٹی تنور میں سے نہ نکالے۔'' پھر آپ ﷺ نے (صحابۂ کرام سے) فرمایا: «قُومُوا» ''کھڑے ہو جاؤ۔'' یہ سن کر مہاجرین و انصار اٹھے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے بیوی سے کہا: ''تیرے لیے خرابی ہو! نبی مکرم ﷺ سب لوگوں کو لے کر تشریف لے آئے ہیں۔'' بیوی نے پوچھا: ''رسول اللہ ﷺ نے آپ سے کچھ پوچھا تھا؟'' میں نے کہا: ''ہاں، پوچھا تھا۔''

اسی اثنا میں آپ ﷺ صحابہ سے فرمانے لگے: «اُدْخُلُوا وَلَا تَضَاغَطُوا» ''لوگو! اندر آجاؤ اور دھکم پیل نہ کرنا۔'' آپ ﷺ روٹیاں اتار اتار کر ان پر گوشت رکھ رکھ کر لوگوں کو دینے لگے۔ جب ہانڈی اور تنور میں سے کچھ لے لیتے تو ان کو ڈھانپ دیتے۔ آپ ﷺ برابر روٹیاں اتار اتار کر دیتے رہے اور ہانڈی میں سے گوشت لیتے رہے یہاں تک کہ سب سیر ہو گئے اور تھوڑا کھانا بچ رہا۔ آپ ﷺ نے جابر رضی اللہ عنہ کی بیوی سے فرمایا:

«كُلِي هٰذَا وَأَهْدِي، فَإِنَّ النَّاسَ أَصَابَتْهُمْ مَّجَاعَةٌ»

''تم خود بھی کھاؤ اور لوگوں کو ہدیہ بھی دو کیونکہ لوگوں کو فاقہ ہے۔''[1]

حضرت بشیر بن سعد کی بیٹی بیان کرتی ہیں کہ میری ماں عمرہ بنت رواحہ نے مجھے بلایا، دونوں ہاتھوں سے کھجوریں بھر کر میرے دامن میں ڈالیں اور کہا: ''بیٹی! یہ ناشتہ اپنے والد اور اپنے ماموں عبداللہ بن رواحہ کو پہنچا دے۔'' میں نے وہ کھجوریں لیں اور چل پڑی۔ وہاں اپنے والد اور ماموں کو تلاش کرتے ہوئے میرا گزر رسول اللہ ﷺ کے پاس سے

[1] صحيح البخاري، حديث:4101، ودلائل النبوة للبيهقي:3/423.

ہوا۔ مجھے دیکھ کر آپ ﷺ نے فرمایا: «تَعَالَيْ يَا بُنَيَّةُ مَا هٰذَا مَعَكِ؟» ''میری بیٹی! ادھر آؤ، یہ تمھارے پاس کیا ہے؟'' میں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! یہ کھجوریں ہیں۔ میری ماں نے مجھے یہ دے کر میرے والد بشیر بن سعد اور ماموں عبداللہ بن رواحہ کے پاس بھیجا ہے کہ وہ ناشتہ کرلیں۔'' فرمایا: «هَاتِيهِ!» ''یہاں لاؤ۔'' میں نے آپ ﷺ کے دونوں ہاتھوں میں کھجوریں انڈیل دیں جس سے آپ ﷺ کے دونوں ہاتھ بھی نہ بھرے، پھر آپ ﷺ نے ایک کپڑا طلب فرمایا اور اسے بچھا دیا گیا، آپ ﷺ نے کھجوریں اس کپڑے پر ڈال دیں۔ کھجوریں سارے کپڑے پر بکھر گئیں، پھر قریب بیٹھے شخص سے کہا: «اُصْرُخْ فِي أَهْلِ الْخَنْدَقِ أَنْ هَلُمَّ إِلَى الْغَدَاءِ» ''خندق کھودنے والوں کو آواز دو کہ وہ آکر ناشتہ کرلیں۔'' تمام لوگ آگئے اور کھجوریں کھانے لگے۔ کھجوریں برابر بڑھتی جاتی تھیں حتی کہ تمام لوگ سیر ہو کر چلے گئے۔ بعد میں کھجوریں کپڑے کے اطراف سے گرتی رہیں۔[1]

ان دونوں واقعات میں رسول اللہ ﷺ کے حسی معجزات کا ذکر ہے۔ ان واقعات سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مسلمان عورت دیگر مسلمانوں کے ہمراہ جہاد میں حصہ لے سکتی ہے۔ مسلمان خندق کھودنے میں مصروف تھے۔ روٹی کمانے کی فرصت نہیں تھی۔ لوگوں کو بھوک کا سامنا تھا۔ شدت بھوک سے رسول اللہ ﷺ اور اکثر مسلمان پیٹوں پر پتھر باندھے ہوئے تھے۔ ایک عورت اٹھ کر اپنی طاقت وحیثیت کے مطابق ان کے کھانے میں ہاتھ بٹاتی ہے۔[2]

خندق کھودتے وقت صداقتِ نبوت کا اظہار یوں بھی ہوا کہ آپ ﷺ نے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کو خندق کھودتے ہوئے مطلع کیا کہ تجھے حق سے متجاوز گروہ قتل کرے گا۔[3]

1 السيرة النبوية لابن هشام: 229,228/3، ودلائل النبوة للبيهقي: 427/3. 2 المرأة في العهد النبوي للدكتورة عصمة الدين، ص: 175. 3 صحيح البخاري، حديث: 447، وصحيح مسلم، حديث: 2915.

حضرت عمار رضی اللہ عنہ جنگ صفین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رفاقت میں لڑتے ہوئے شہید کر دیے گئے۔[1]

جب خندق کھودتے وقت صحابہ کے سامنے ایک سخت چٹان آگئی تو رسول اللہ ﷺ نے اس پر تین کاری ضربیں لگائیں، وہ چٹان ریزہ ریزہ ہوگئی۔ آپ ﷺ نے پہلی ضرب لگائی تو فرمایا:

«اَللّٰهُ أَكْبَرُ، أُعْطِيتُ مَفَاتِيحَ الشَّامِ، وَاللّٰهِ! إِنِّي لَأُبْصِرُ قُصُورَهَا الْحُمْرَ مِنْ مَّكَانِي هٰذَا»

''اللہ اکبر! مجھے شام کی کنجیاں (فتوحات) دی گئیں، اللہ کی قسم! میں یہیں سے اس کے سرخ محلات دیکھ رہا ہوں، پھر آپ ﷺ نے دوسری چوٹ لگائی اور فرمایا: «اَللّٰهُ أَكْبَرُ، أُعْطِيتُ مَفَاتِيحَ فَارِسَ، وَاللّٰهِ إِنِّي لَأُبْصِرُ الْمَدَائِنَ وَأُبْصِرُ قَصْرَهَا الْأَبْيَضَ مِنْ مَّكَانِي هٰذَا» ''اللہ اکبر! مجھے فارس کی کنجیاں دے دی گئیں۔ اللہ کی قسم! میں یہیں سے مدائن کے سفید محلات دیکھ رہا ہوں۔''

تیسری بار ضرب لگانے پر آپ ﷺ نے فرمایا: «اَللّٰهُ أَكْبَرُ! أُعْطِيتُ مَفَاتِيحَ الْيَمَنِ، وَاللّٰهِ إِنِّي لَأُبْصِرُ أَبْوَابَ صَنْعَاءَ مِنْ مَّكَانِي هٰذَا » ''اللہ اکبر! یمن کی کنجیاں مجھے تھما دی گئیں۔ اللہ کی قسم! میں یہاں کھڑا صنعاء (شہر) کے دروازے دیکھ رہا ہوں۔''[2]

مدینہ منورہ میں مسلمانوں کو گھیراؤ، سخت مشقت، خوف، بھوک اور جان لیوا ٹھنڈک کے دوران رسول اللہ ﷺ نے جن اسلامی فتوحات کی بشارت دی تھی، وہ بالکل پوری ہوئی۔[3]

---

[1] أسد الغابة: 344/1، وتاريخ الإسلام للذهبي: 579/3. [2] مسند أحمد: 303/4، ودلائل النبوة للبيهقي: 421/3، ومجمع الزوائد للهيثمي: 130/6. [3] نضرة النعيم: 325/1.

حقیقت اور خیال کا فرق

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہما کو اہل کوفہ کے ایک شخص نے کہا: ''اے ابوعبداللہ: آپ کو رسول اللہ ﷺ کے دیدار اور رفاقت کی سعادت حاصل رہی۔'' فرمایا: ''بھتیجے بالکل ایسا ہوا۔'' اس نے دریافت کیا: ''آپ لوگ کیا کرتے تھے؟'' فرمایا: ''اللہ کی قسم! ہم پوری کوشش، محنت اور لگن سے کام کرتے تھے۔''

اس نے کہا: ''اللہ کی قسم! اگر ہم رسول اللہ کو پاتے تو کندھوں پر بٹھائے پھرتے اور آپ ﷺ کو زمین پر قدم نہ رکھنے دیتے۔'' حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! میں نے آپ ﷺ کے ساتھ صحابۂ کرام کو جنگ خندق کے وقت دیکھا تھا۔'' پھر آپ نے غزوۂ خندق کا پورا قصہ بیان کیا۔[1]

یہ تابعی صحابیٔ رسول سے مل کر اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ اگر وہ رسول اللہ ﷺ کا ساتھ پاتے تو وہ ایسا کارنامہ انجام دیتے جو صحابہ نہ دے سکے، جبکہ حقیقت اور خیال میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم انسان ہیں، ان کی بھی انسانوں جیسی طاقت و قدرت ہے۔ انھوں نے آپ ﷺ کے لیے مال و دولت قربان کیا، محنت و کوشش کی حتی کہ جان بھی بطور نذرانہ پیش کر دی۔ آپ ﷺ نے بھی ان کے کردار کو اس کا جائز مقام عطا کرتے ہوئے فرمایا: «خَيْرُ الْقُرُونِ قَرْنِي» ''بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے۔''[2] گویا آپ ﷺ نے وضاحت فرما دی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مقام کو کوئی نہیں پا سکتا۔[3]

سلمان ہمارے اہل بیت میں سے ہے

خندق کے دن مہاجرین کہنے لگے: ''سلمان ہمارے ہیں۔'' اور انصار نے کہا: ''نہیں

1 السيرة النبوية لابن هشام: 255/3. 2 صحيح البخاري، حديث: 6429، وصحيح مسلم، حديث: 2533. 3 من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 291.

وہ ہمارے ہیں۔'' تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«سَلْمَانُ مِنَّا أَهْلَ الْبَيْتِ»

''سلمان ہمارے اہل بیت میں سے ہے۔''[1]

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کے لیے آپ ﷺ کی طرف سے جاری کردہ یہ دائمی تمغہ ونشان واضح کرتا ہے کہ سلمان رضی اللہ عنہ مہاجرین میں سے ہیں کیونکہ اہل بیت کا تعلق بھی مہاجرین سے ہے۔[2]

بہترین نماز

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَلَأَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ بُيُوتَهُمْ وَقُبُورَهُمْ نَارًا، كَمَا شَغَلُونَا عَنِ الصَّلَاةِ الْوُسْطٰى حَتّٰى غَابَتِ الشَّمْسُ»

''اللہ تعالیٰ ان مشرکوں سمیت ان کے گھروں اور قبروں کو آگ سے بھر دے انھوں نے ہمیں (صلاۃ الوسطیٰ) نمازِ عصر پڑھنے سے روک رکھا یہاں تک کہ سورج غروب ہوگیا۔''[3]

علماء کے ایک گروہ نے اس حدیث سے دلیل لی ہے کہ ''صلاۃ وسطیٰ'' سے مراد نمازِ عصر ہے جیسا کہ یہاں نصاً واضح ہوگیا ہے۔ اس بارے میں واضح اور صحیح حدیث کی بنا پر قاضی ماوردی نے اسے شافعی مذہب پر نقد قرار دیا ہے۔ (کیونکہ ان کے نزدیک صلاۃ وسطیٰ نمازِ عصر نہیں ہے) مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: تفسیر ابن کثیر، سورۂ بقرہ، آیت: 238)

1 المستدرك للحاكم: 598/3، ومجمع الزوائد للهيثمي: 130/6، والسيرة النبوية لابن هشام: 235/3. 2 التاريخ الإسلامي للحميدي: 108/6. 3 صحيح البخاري، حديث: 2931، وصحيح مسلم، حديث: 627.

علماء کی ایک جماعت نے اس واقعے سے یہ استدلال کیا ہے کہ اگر قتال جیسا عذر مانع ہو تو نماز کا موخر کرنا جائز ہے۔ امام مکحول اور اوزاعی کا بھی یہی نظریہ ہے۔[1]

ڈاکٹر بوطی کہتے ہیں: انتہائی مصروفیت کی بنا پر نمازِ عصر رہ گئی جسے آپ ﷺ نے سورج غروب ہونے کے بعد ادا کیا۔ بخاری و مسلم کے علاوہ دیگر روایات میں ایک سے زیادہ نمازیں رہ جانے کا ذکر ہے جنھیں آپ ﷺ نے وقت نکل جانے کے بعد موقع ملنے پر ترتیب سے ادا کیا۔ اس سے فوت شدہ نمازوں کی ادائیگی کی دلیل ملتی ہے۔ اور جو بعض علماء نے کہا ہے کہ نماز کو مصروفیت کی بنا پر موخر کرنا اس وقت درست تھا جب ابھی "صلاۃ الخوف" مشروع نہ ہوئی تھی، علماء کا یہ نظریہ فوت شدہ نمازوں کی ادائیگی کے خلاف نہیں۔ کیونکہ بفرض محال اگر مان بھی لیا جائے کہ نسخ کا ثبوت ملتا ہے تو نسخ فوت شدہ نماز کی قضائی پر واقع نہ ہوگا بلکہ صرف مصروفیت کی بنا پر نماز موخر نہ کرنے کا نسخ ہوگا۔ اور تاخیر کا نسخ فوت شدہ نمازوں کی قضائی کا نسخ ہرگز نہیں۔ فوت شدہ نمازوں کی قضائی کا مسئلہ اپنی جگہ بحال ہے۔[2]

حلال وحرام

قریش نے (اپنے مقتول) عمرو بن عبدِ وُد کی لاش کا فدیہ پیش کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: «اِدْفَعُوا إِلَيْهِمْ جِيفَتَهُ فَإِنَّهُ خَبِيثُ الْجِيفَةِ، خَبِيثُ الدِّيَةِ» "ان کو اس کی لاش دے دو کیونکہ یہ گندی لاش ہے، اس کی دیت خبیث ہے۔"[3] چنانچہ آپ ﷺ نے اس کے عوض کچھ بھی لینا قبول نہ فرمایا۔

یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب مسلمان انتہائی تنگ دست تھے لیکن حلال ہر صورت حلال اور حرام، حرام ہی ہے۔ حلال وحرام کے متعلق اسلام کا یہی قانون ہے۔ کہاں یہ اور

1 الأساس في السنة لسعيد حوّى: 682/2. 2 فقه السيرة للبوطي، ص: 223. 3 مسند أحمد: 248/1، والسيرة النبوية لابن هشام: 265/3.

کہاں ان لوگوں کی حالت جو ہر وقت مسلمانوں کی تاک میں رہتے ہیں اور نت نئی سکیموں سے ان کا اصل مقصد سود اور دیگر ذرائع سے منافع کمانا ہوتا ہے۔[1]

رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی بہادری

رسول اللہ ﷺ نے عورتوں اور بچوں کو حفاظتی نقطۂ نظر سے ایک خالی مضبوط قلعے میں رکھا کیونکہ مسلمان لشکروں کا سامنا کرنے کی بنا پر ان کا دھیان نہیں کر سکتے تھے۔ جب یہود بنو قریظہ نے عہد شکنی کی تو انھوں نے عورتوں اور بچوں کے قلعے کا جائزہ لینے کے لیے ایک یہودی بھیجا جسے آپ ﷺ کی پھوپھی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے دیکھ لیا۔ انھوں نے خیمہ کی چوب پکڑی اور قلعے سے نیچے اتر کر اسے اس طرح مارا کہ وہ مر گیا۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا یہ کردار ان یہود کے لیے پیغام اجل ثابت ہوا جو عورتوں اور بچوں کے قلعے پر حملہ کرنے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ بنو قریظہ سمجھ گئے کہ یہ قلعہ اسلامی لشکر کی حفاظت میں ہے یا کم از کم اس میں اتنے آدمی موجود ہیں جو اس کی حفاظت کر سکیں۔[2]

اس میں یہ بھی دلیل ہے کہ عورت اگر دفاع کرنے والا کوئی شخص نہ پائے تو اسے اپنے دفاع کا پورا پورا حق ہے۔[3]

حضرت حسان رضی اللہ عنہ کی بزدلی کے متعلق منقول قصہ باطل ہے

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے یہودی کو قتل کرنے کے سلسلے میں مروی ایک روایت ضعیف سند سے یوں بھی ہے: حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ سے کہا: ”دیکھو! یہ یہودی قلعے کے گرد چکر لگا رہا ہے، مجھے ڈر ہے کہ یہ ہماری کمزوری کے متعلق رپورٹ لے جا کر دیگر یہود کو بتا دے گا۔ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھی ہمارے بجائے دیگر امور

[1] من معين السيرة لصالح الشامي، ص:294. [2] الرحيق المختوم، ص:284,283. [3] المستفاد من قصص القرآن لعبد الكريم زيدان :246/2.

میں مشغول ہیں، لہٰذا نیچے اترو اور اس کا کام تمام کر دو۔'' انھوں نے جواب دیا: ''عبدالمطلب کی بیٹی، اللہ تجھے معاف فرمائے، اللہ کی قسم! تجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں اس کام کا آدمی نہیں ہوں۔'' صفیہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: ''حسان نے جب مجھ سے یہ کہا (اور میں نے دیکھا کہ ان کے پاس کچھ نہیں) تو میں نے کمر کس کر لکڑی اٹھائی اور قلعے سے نیچے اتر گئی، پھر آگے بڑھ کر یہودی کو قتل کر دیا اور قلعے میں واپس آ گئی، پھر حسان سے کہا: ''اے حسان! نیچے جا کر اس کا سامان تو نکال لاؤ۔ میں خود یہ سامان لے آتی مگر اس کا مرد ہونا مانع ہوا۔'' حسان رضی اللہ عنہ نے کہا: ''عبدالمطلب کی بیٹی! مجھے اس کے سامان کی ضرورت نہیں۔''[1]

مذکورہ روایت کے ضعف کے حسب ذیل اسباب ہیں:

① یہ روایت سند کے اعتبار سے غیر متصل، ناقابل اعتبار اور غیر صحیح ہے۔ اسے بیان کرنا بھی درست نہیں۔ اسی طرح اس صحابی رسول کی عیب جوئی ہو رہی ہے جو عمر بھر اسلام کی مدافعت کرتا رہا۔

② اگر حسان رضی اللہ عنہ بزدل ہوتے جیسا کہ یہاں بتایا گیا ہے تو ان کے دشمن اس مذموم خصلت کی بنا پر ان کی مذمت ضرور کرتے۔ خاص طور پر وہ شعراء جن کی وہ ہجو کرتے تھے۔ جاہلیت کے سرداروں میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کی آپ نے مذمت نہ کی ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حسان رضی اللہ عنہ کو دعا دیتے اور انھیں مدد فراہم کرتے تھے۔ اور مشرک قیادت کی مذمت پر ان کی حوصلہ افزائی کرتے۔[2]

پہلا اسلامی جنگی ہسپتال

غزوۂ احزاب میں مسلمانوں نے پہلا جنگی ہسپتال قائم کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کے دوران مسجد نبوی میں زخمیوں کے لیے خیمہ نصب کرایا اور حضرت رُفیدہ اسلمیہ

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 239/3، ودلائل النبوة للبيهقي: 443,442/3، وصحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 365. [2] غزوة الأحزاب لأبي فارس.

انصاریہ رضی اللہ عنہا کو اس جنگی ہسپتال کا نگران مقرر فرمایا۔ یوں خواتین اسلام میں رفیدہ رضی اللہ عنہا نے پہلی نرس ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔[1]

سیرت ابن ہشام میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو مسجد نبوی میں اسلم قبیلے کی ایک عورت کے خیمے میں ٹھہرایا جسے رفیدہ کہا جاتا تھا۔ یہ عورت زخمیوں اور بے گھر بیماروں کا علاج اللہ کی رضا کے لیے کرتی تھی۔ غزوۂ خندق کے موقع پر حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو تیر لگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی قوم سے کہا: «اِجْعَلُوهُ فِي خَيْمَةِ رُفَيْدَةَ حَتّٰى أَعُودَهُ فِي قَرِيبٍ......» ''انھیں ''رفیدہ'' کے خیمے میں رکھو تاکہ میں قریب سے ان کی عیادت کرسکوں ......''[2]

سابقہ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی ایسے مسلمان کو زخم پہنچتا جس کا گھر بار ہے تو اس کا خیال گھر والے کرتے۔ اگر کسی کا گھر بار نہ ہوتا تو اسے مسجد میں لاکر خیمے میں رکھا جاتا۔ یہاں بے گھر مسلمانوں کے لیے خیمہ نصب تھا۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ گھر بار والے تھے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش تھی کہ ان کی خبر گیری کرتے رہیں۔ یوں انھیں مسجد میں بے آسرا اور بے گھر افراد کے خیمے میں لایا گیا۔ یہ لوگ (مسجد میں خیمہ والے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگہداشت میں تھے، اس لیے خیمہ مسجد میں لگایا گیا ورنہ اسے کسی اور جگہ نصب کیا جاسکتا تھا۔

سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اپنی شرافت، بزرگی اور راہ الٰہی میں سخاوت کی بنا پر قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ انھیں بے آسرا لوگوں والے خیمے میں رکھنا بھی اس عزت افزائی ہی کا حصہ تھا۔ اہل سیادت اور قوم کے شرفاء جب (قوم و ذات سے) برتر ہو جاتے ہیں تو انھیں ان غیر معروف افراد کی صف میں رکھا جاتا ہے جنھوں نے اپنے اعمال کو صرف اللہ تعالیٰ

1 المستشفيات الإسلامية للدكتور عبدالله العيد، ص: 43. 2 السيرة النبوية لابن هشام: 250/3، وتفسير الطبري:152/21.

کی رضا کے لیے خالص کر لیا ہے۔ اس کے سبب وہ نبی ﷺ کی نگہداشت و سرپرستی کے مستحق ہو جاتے ہیں۔[1]

یہی رسالت مآب کا بہترین منہج ہے جو ماضی میں عرصہ دراز تک مسلمانوں کا منشور رہا۔

گناہ ہو جانے پر توبہ کی طرف جلدی کرنا

بنوقریظہ نے رسول اللہ ﷺ کے حکم سے اپنے حلیف ابولبابہ بن عبدالمنذر رضی اللہ عنہ کو قلعہ چھوڑنے کے متعلق مشورے کے لیے بلایا۔ انھوں نے حلق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ تمھارے بارے میں قتل کا فیصلہ کیا جا چکا ہے۔ لیکن انھیں فوراً ندامت ہوئی اور انھوں نے توبہ قبول ہونے تک اپنے آپ کو مسجد نبوی میں باندھ لیا۔ آپ چھ راتیں مسجد میں کھجور کے تنے سے بندھے رہے۔ نماز کے وقت آپ کی بیوی آتی اور نماز کے لیے کھول دیتی۔ اس کے بعد آپ پھر اسی تنے سے بندھ جاتے۔[2]

ابولبابہ نے کہا تھا کہ جب تک اللہ تعالیٰ میرے اس فعل کی توبہ قبول نہیں فرماتے میں یہیں بندھا رہوں گا۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے فجر سے قبل رسول اللہ ﷺ کو ہنستے دیکھا تو عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! اللہ آپ کو ہنستا ہی رکھے، آپ کیوں ہنس رہے ہیں؟'' نبی ﷺ نے فرمایا: «تِيبَ عَلٰى أَبِي لُبَابَةَ» ''ابولبابہ کی توبہ قبول ہو گئی ہے۔'' میں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! کیا اسے خوشخبری دے دوں۔'' فرمایا: «بَلٰى! إِنْ شِئْتِ» ''کیوں نہیں! اگر چاہو تو۔'' چنانچہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا اپنے حجرے کے دروازے پر کھڑی ہوئیں (یہ واقعہ پردے کا حکم آنے سے پہلے کا ہے) اور کہا: ''اے ابولبابہ! تمھارے لیے خوشخبری ہے، اللہ تعالیٰ نے تمھاری توبہ قبول فرمالی ہے۔'' حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ یہ سنتے ہی لوگ دیوانہ وار ابولبابہ کی طرف دوڑ پڑے کہ انھیں رہا

1 من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 294. 2 المستفاد من قصص القرآن لعبد الكريم زيدان: 2/286.

کر دیں۔ ابولبابہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ”نہیں نہیں! میں اس وقت تک رہا نہیں ہوں گا جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود آ کر اپنے دستِ مبارک سے مجھے رہا نہ فرمائیں۔“ چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز کے لیے ان کے پاس سے گزرے تو انھیں کھول کر رہا کر دیا۔[1]

اس واقعے میں نصیحت کا اصل مقام یہ ہے کہ حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ سے جب خطرناک جنگی راز فاش کرنے کی غلطی ہوئی تو انھوں نے جلد بازی میں ہونے والی اس کوتاہی کو چھپایا نہیں۔ کسی مسلمان کو اس بات کا علم نہیں تھا اور وہ اسے خود بھی پوشیدہ رکھ سکتے تھے اور یہود کو بھی معاملہ مخفی رکھنے کے لیے کہہ سکتے تھے لیکن انھیں اللہ تعالیٰ کی نگہبانی کا احساس تھا، پھر انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے اوپر عظیم حق بھی یاد آ گیا جنھوں نے اس راز کو مخفی رکھنے کا حکم دیا تھا لیکن انھیں امین جانتے ہوئے مطلع کیا تھا، لہٰذا وہ اس کوتاہی پر بہت گھبرا گئے۔[2] اپنے گناہ کا اقرار و اعتراف کیا۔ فوراً خود کو سزا دی بغیر اس کے کہ معاملے کی تحقیق ہو اور انھیں قرار واقعی سزا دی جائے۔ یہی ہے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی عملی صورت جس میں ارشاد ہے:

﴿ إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوٓءَ بِجَهَٰلَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُولَٰٓئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝ ﴾

”اللہ تو صرف ان لوگوں کی توبہ قبول کرتا ہے جو نادانی سے برا کام کرتے ہیں، پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں، چنانچہ اللہ ان کی توبہ قبول کر لیتا ہے اور اللہ بہت جاننے والا، بڑی حکمت والا ہے۔“[3]

اپنی سزا خود تجویز کر کے اسے نافذ کرنے کی یہ نادر مثال ہے۔ یہ اعزاز بھی اہل ایمان ہی کو حاصل ہوا۔ یہ پختہ ایمان کی علامت ہے۔ ایسا ایمان جو مومن سے گناہ اور غلطی کے

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 248,247/3، ودلائل النبوة للبيهقي: 17,16/4. [2] التاريخ الإسلامي للحميدي: 165/6. [3] النسآء 17:4.

سرزد ہونے پر راضی نہیں۔

خود نبی مکرم ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بھی ابو لبابہ کی توبہ پر خوش تھے۔ صحابہ انھیں بڑھ چڑھ کر مبارکباد دے رہے تھے۔ ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے نبیٔ کریم ﷺ کی اجازت سے آگے بڑھ کر توبہ قبول ہونے کی خوشخبری دی۔[1]

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو لبابہ رضی اللہ عنہ کے متعلق ارشاد فرمایا:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾

''اے ایمان والو! تم اللہ اور رسول سے خیانت نہ کرو اور نہ تم آپس کی امانتوں میں خیانت کرو جبکہ تم جانتے ہو۔''[2]

ان کی توبہ کے متعلق یہ فرمانِ الٰہی بھی نازل ہوا:

﴿وَآخَرُونَ اعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا عَسَى اللَّهُ أَنْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾

''اور کچھ دیگر لوگ ہیں جنھوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا، انھوں نے ملا جلا عمل کیا، ایک اچھا اور دوسرا برا، امید ہے کہ اللہ ان کی توبہ قبول فرمائے گا، یقیناً اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔''[3]

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے فضائل

غزوۂ خندق میں حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے کئی فضائل سامنے آئے جو ان کے اللہ تعالیٰ کے ہاں صاحب مرتبہ ہونے کی علامت ہیں، چند ایک فضائل درج ذیل ہیں:

سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے درج ذیل دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے اسے شرفِ قبولیت سے نوازا:

1 صور و عبر من الجهاد النبوي في المدينة للدكتور فوزي فيض الله، ص:261. 2 الأنفال 27:8. 3 التوبة 102:9. السيرة النبوية لابن هشام:262/3.

«اَللّٰهُمَّ إِنَّكَ تَعْلَمُ أَنَّهُ لَيْسَ أَحَدٌ أَحَبَّ إِلَيَّ أَنْ أُجَاهِدَهُمْ فِيكَ مِنْ قَوْمٍ كَذَّبُوا رَسُولَكَ وَأَخْرَجُوهُ، اَللّٰهُمَّ! فَإِنْ بَقِيَ مِنْ حَرْبِ قُرَيْشٍ شَيْءٌ فَأَبْقِنِي لَهُ حَتّٰى أُجَاهِدَهُمْ فِيكَ»

''اے اللہ! اگر قریش سے مزید جنگ ہونے والی ہے تو مجھے اس کے لیے زندہ رکھ کیونکہ تو یہ جانتا ہے کہ مجھے سب سے زیادہ یہ پسند ہے کہ ان لوگوں سے جہاد کروں جنھوں نے تیرے رسول ﷺ کو جھٹلایا اور اسے اپنے وطن سے نکالا۔''[1]

ان کی یہ دعا قبول ہوئی، زخم خشک ہو گیا اور وہ روبصحت رہے۔

غزوۂ بنوقریظہ تک زخم صحیح رہا، رسول اللہ ﷺ نے انھیں بنوقریظہ کے معاملے میں ''فیصل'' تسلیم کیا۔ انھوں نے صحیح صحیح فیصلہ کیا اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت ان کے قریب نہ پھٹکی۔ یہ ان کے خلوص کی دلیل ہے۔[2]

رسول اللہ ﷺ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی عزت افزائی اس طرح فرمائی کہ جب وہ بنوقریظہ کے متعلق فیصلہ سنانے کے لیے تشریف لائے تو آپ ﷺ نے انصار سے کہا:

«قُومُوا إِلٰى سَيِّدِكُمْ»

''کھڑے ہو کر اپنے سردار کی طرف بڑھو۔''[3]

یہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی تکریم کے لیے تھا۔ اس میں ان کی شجاعت کا اعتراف بھی ہے۔ آپ ﷺ نے انھیں ''سید'' کے لقب سے نوازا اور ان کے استقبال کے لیے کھڑے ہونے کا حکم دیا۔[4]

---

1 فقه السيرة للبوطي، ص: 228. 2 التاريخ الإسلامي للحميدي: 170/6. 3 صحيح البخاري، حديث: 3043 و4122,4121، و صحيح مسلم، حديث: 1768، والسيرة النبوية لابن هشام: 263/3، والتاريخ الإسلامي للحميدي: 170/2، وفقه السيرة للبوطي، ص: 228. 4 صور و عبر من الجهاد النبوي للدكتور فوزي فيض الله، ص: 265.

بنو قریظہ کے متعلق اللہ تعالیٰ کے فیصلے کا نفاذ ہو چکا تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے دوبارہ دعا کے لیے ہاتھ بلند کر دیے۔ وہ عرض کر رہے تھے:

«اَللّٰهُمَّ فَإِنِّي أَظُنُّ أَنَّكَ قَدْ وَضَعْتَ الْحَرْبَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ۔ قُرَيْشًا وَّالْمُشْرِكِينَ۔ فَإِنْ كُنْتَ قَدْ وَضَعْتَ الْحَرْبَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ فَافْجُرْ جُرْحِي وَاجْعَلْ مَوْتَتِي فِيهَا»

''اے میرے اللہ! میرا خیال ہے کہ تو نے ہمارے اور قریش کے درمیان جنگ ختم کر دی ہے۔ اگر واقعی تو نے جنگ ختم کرنے کا ارادہ فرما لیا ہے تو میرا زخم جاری کر دے اور اسی کے باعث مجھے موت آجائے۔''[1]

ہم پہلی اور دوسری دعا میں سے ان کی یہ عجیب دعا دیکھ رہے ہیں۔ یہ ان ہستیوں کی دعا ہے جو جانتے ہیں کہ ان کی زندگی کا مقصد صرف شہادت نہیں بلکہ زندگی کے آخری لمحے تک جہاد جاری رکھنا ہے۔ وہ اسلام کی تائید و نصرت کا اپنے آپ کو ذمہ دار سمجھتے ہیں۔[2]

ہم سیدنا سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی سیرت میں دیکھتے ہیں کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ پر قسم بھی ڈال دیں تو اللہ تعالیٰ اسے سچا کر دکھائے۔ وہ آسمانوں اور زمینوں میں قابل احترام ہیں، اللہ تعالیٰ کی مشیت تھی کہ بنو قریظہ کا تمام معاملہ ان کے ہاتھ میں آئے اور وہ خود ان کو فیصل بنانے کا تقاضا کریں۔

اختتامِ جہاد اور اپنی قوم کی ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کے بعد انھیں زندگی کی چاہت نہ رہی۔ جنگ ختم ہو گئی، معاملہ ٹھنڈا ہو گیا اور بنو قریظہ کے متعلق فیصلے سے دل کو سکون ملا، اسلام کے لیے اچھے نتائج سامنے آنے لگے تو ان کے ہاں ''شہادت'' سے بڑا پھل کوئی نہ تھا، لہٰذا دعا فرمائی: ''میرا زخم جاری فرما دے اور اس کے سبب مجھے موت عطا کر۔''[3]

1 صحيح البخاري، حديث: 4122. 2 التربية القيادية للدكتور الغضبان: 70/3. 3 التربية القيادية للدكتور الغضبان: 71/4.

واقعی ان کی امیدیں بر آئیں، بنو قریظہ جو کل کے دوست اور آج کے دشمن تھے، ان کا انجام دیکھ لیا، ان کے متعلق فیصلہ سنایا۔ ادھر زخم پھوٹ پڑا۔ جب زخم پھوٹ پڑا تو ان کی قوم نے انھیں ان کے گھر منتقل کر دیا۔ آپ ﷺ صحابہ کے ہمراہ ان کے گھر گئے۔ آپ ﷺ اتنی تیزی سے چلے کہ اوپر والی چادریں گرا چاہتی تھیں اور جوتوں کے تسمے ٹوٹ گئے۔ صحابہ نے (تیز رفتاری کی) شکایت کی تو فرمایا: «إِنِّي أَخَافُ أَنْ تَسْبِقَنَا الْمَلَائِكَةُ فَتَغْسِلَهُ كَمَا غَسَلَتْ حَنْظَلَةَ» ''ڈر ہے کہ حنظلہ کی طرح اسے ہم سے پہلے فرشتے آ کر غسل دے دیں گے۔ (اور ہم سعد رضی اللہ عنہ کو غسل دینے کے اعزاز سے محروم ہو جائیں گے۔) آپ ﷺ جب گھر پہنچے تو انھیں غسل دیا جا رہا تھا اور ان کی والدہ رو رہی تھیں اور کہتی جا رہی تھیں ؎

وَيْلُ أُمِّ سَعْدٍ سَعْدًا
حَزَامَةً وَّ جَدًّا

''سعد کی ماں کو سعد کی ہلاکت کا افسوس ہے۔
وہ دور اندیشی، مستقل مزاجی اور سنجیدگی کا مجسمہ تھا۔''

آپ ﷺ نے فرمایا:

«كُلُّ نَائِحَةٍ تَكْذِبُ إِلَّا أُمَّ سَعْدٍ»

''ام سعد کے علاوہ ہر رونے والی جھوٹ کہتی ہے۔''

میت کو باہر لے جایا گیا۔ کچھ لوگوں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! ان سے زیادہ ہلکا پھلکا جنازہ ہم نے کبھی نہیں اٹھایا۔'' آپ نے فرمایا:

«وَمَا يَمْنَعُهُ أَنْ يَّخِفَّ، وَقَدْ هَبَطَ مِنَ الْمَلَائِكَةِ كَذَا وَكَذَا لَمْ يَهْبِطُوا قَطُّ قَبْلَ يَوْمِهِمْ، قَدْ حَمَلُوهُ مَعَكُمْ»

''جنازہ کیوں نہ ہلکا ہو، آسمان سے آج اتنی زیادہ تعداد میں فرشتے اترے ہیں کہ آج سے پہلے نہیں اترے تھے، انھوں نے بھی میت کو تمھارے ساتھ اٹھایا ہوا ہے۔''[1]

سنن نسائی میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی روایت میں ان فرشتوں کی تعداد بتائی گئی ہے جو سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے جنازے میں شریک ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

«هٰذَا الْعَبْدُ الصَّالِحُ الَّذِي تَحَرَّكَ لَهُ الْعَرْشُ وَفُتِحَتْ لَهُ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَشَهِدَهُ سَبْعُونَ أَلْفاً مِّنَ الْمَلَائِكَةِ لَمْ يَنْزِلُوا إِلَى الْأَرْضِ قَبْلَ ذٰلِكَ، لَقَدْ ضُمَّ ضَمَّةً ثُمَّ أُفْرِجَ عَنْهُ»

''یہ نیک بندہ ہے جس کے لیے عرش خوشی سے جھوم اٹھا، آسمان کے دروازے کھول دیے گئے اور اس کے جنازے میں ستر ہزار (70,000) فرشتے شریک ہوئے۔ وہ فرشتے اس سے قبل کبھی زمین پر نہ اترے تھے۔ (اس کے باوجود) اس پر قبر ایک مرتبہ تنگ ہوئی، پھر کشادہ کر دی گئی۔''[2]

آیئے ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو الوداع کیسے کہا۔ عبداللہ بن شداد رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حالت نزع میں ان کے پاس گئے اور فرمایا:

«جَزَاكَ اللّٰهُ خَيْراً مِّنْ سَيِّدِ قَوْمٍ، فَقَدْ أَنْجَزْتَ مَا وَعَدْتَّهُ وَلَيُنْجِزُكَ اللّٰهُ مَا وَعَدَكَ»

''اے سردارِ قوم! اللہ تعالیٰ تجھے بہترین جزا دے۔ تو نے اپنا وعدہ نبھایا اور یقیناً اللہ تعالیٰ بھی اپنا وعدہ نبھائے گا۔''[3]

1 السيرة النبوية لابن هشام: 264/3، والسلسلة الصحيحة، رقم: 1158، وسير أعلام النبلاء: 287/1. 2 السنن الكبرىٰ للنسائي: 101/4، وسير أعلام النبلاء: 295/1. 3 المصنف لابن أبي شيبة: 322/5 و145/5، وسير أعلام النبلاء: 288/1.

رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کے سامنے اس نیک صالح انسان کی وفات کے بعد اکثر تعریف ہی کی ہے تاکہ لوگ ان جیسے اعمال صالحہ کو اپنائیں اور اس کو اپنے لیے نمونہ سمجھیں۔[1]

رسول اللہ ﷺ نے انھیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا:

«اِهْتَزَّ عَرْشُ الرَّحْمٰنِ لِمَوْتِ سَعْدِ بْنِ مُعَاذٍ»

''سعد بن معاذ کی موت پر رحمٰن کا عرش جھوم اٹھا۔''[2]

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو ریشم کا ایک جوڑا ہدیہ ملا، صحابۂ کرام اسے چھوتے اور اس کی ملائمت پر تعجب کر رہے تھے، تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَتَعْجَبُونَ مِنْ لِّينِ هٰذِهِ؟ لَمَنَادِيلُ سَعْدِ بْنِ مُعَاذٍ فِي الْجَنَّةِ خَيْرٌ مِّنْهَا وَأَلْيَنُ»

''تم اس کی ملائمت پر تعجب کرتے ہو؟ جنت میں سعد بن معاذ (رضی اللہ عنہ) کے رومال اس سے کہیں بہتر اور زیادہ ملائم ہیں۔''[3]

ان تمام خوبیوں، نیکیوں اور اللہ تعالیٰ کے دین کی خدمت میں گراں قدر خدمات پیش کرنے کے باوجود انھیں قبر کے دباؤ سے واسطہ پڑا۔ چار آدمی انھیں قبر میں اتارنے کے لیے ان کی قبر میں اترے: حارث بن اوس، اسید بن حضیر، ابو نائلہ سلکان اور سلمہ بن سلامہ بن وقش رضی اللہ عنہم، جبکہ رسول اللہ ﷺ (وہیں) کھڑے تھے۔ جب انھیں قبر میں دفنا دیا گیا تو رسول اللہ ﷺ کا چہرہ انور متغیر ہوا، آپ ﷺ نے تین بار سبحان اللہ کہا۔ تمام مسلمانوں نے بھی سبحان اللہ کہا حتی کہ (قبرستان) بقیع گونج اٹھا، پھر آپ ﷺ نے تین بار اللہ اکبر

---

1 التاريخ الإسلامي للحميدي: 171/6. 2 صحيح البخاري، حديث: 3803، وصحيح مسلم، حديث: (124)-2466. 3 صحيح البخاري، حديث: 3802، وصحيح مسلم، حديث: 2468.

کہا، صحابہ کرام نے بھی اللہ اکبر کہا۔ آپ ﷺ سے (اس اچانک تسبیح و تکبیر کے متعلق) دریافت کیا گیا تو فرمایا:

«تَضَايَقَ عَلٰى صَاحِبِكُمُ الْقَبْرُ وَ ضَمَّ ضَمَّةً لَّوْ نَجَا مِنْهَا أَحَدٌ لَّنَجَا هُوَ ثُمَّ فَرَّجَ اللّٰهُ عَنْهُ»

''قبر تمھارے ساتھی پر تنگ ہوئی اور انھیں دبایا۔ اگر کوئی شخص قبر کے اس دبانے سے بچ پاتا تو یہ ضرور بچ نکلتے، البتہ پھر اللہ تعالیٰ نے قبر کو کشادہ فرما دیا ہے۔''[1]

یہ جلیل القدر صحابی عین جوانی میں شہید ہو گئے، موت کے وقت عمر صرف سینتیس (37) سال تھی۔ یوں انھوں نے اپنی قوم کی قیادت صرف تیس (30) برس کی عمر میں کی، تیس برس سے بھی پہلے ان کی قائدانہ صلاحیتیں قابلِ دید تھیں، حالانکہ عموماً انسان کی خوابیدہ طاقتیں اور صلاحیتیں چالیس برس کے بعد بیدار ہوتی ہیں جو جوانی اور توانائی کی آخری عمر ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَوَصَّيْنَا الْإِنْسٰنَ بِوٰلِدَيْهِ إِحْسٰنًا ۭ حَمَلَتْهُ أُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا ۭ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ۭ حَتّٰٓى إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهٗ وَبَلَغَ أَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۙ قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِيْٓ أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وٰلِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صٰلِحًا تَرْضٰىهُ وَأَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ ۭ إِنِّيْ تُبْتُ إِلَيْكَ وَإِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ ﴾

''اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا، اس کی ماں نے اسے تکلیف سے پیٹ میں اٹھائے رکھا اور تکلیف سے جنا اور اس کا حمل اور دودھ چھڑانا تیس ماہ (کی مدت) ہے، حتی کہ جب وہ اپنی قوت و طاقت (کمال

[1] السنن الکبریٰ للنسائي: 101/4، ومسند أحمد: 377/3، والتربیة القیادیة للدکتور الغضبان: 77/4.

جوانی) کو پہنچا اور چالیس برس کا ہوگیا تو اس نے دعا کی: اے میرے رب! تو مجھے توفیق دے کہ میں تیری اس نعمت کا شکر کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کی اور یہ کہ میں نیک عمل کروں جو تو پسند کرے اور تو میرے لیے میری اولاد میں اصلاح کر، بلاشبہ میں نے تیری طرف توبہ کی اور بلاشبہ میں مسلمانوں میں سے ہوں۔"[1]

سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کا رنگ سفید تھا۔ دراز قد، حسین وجمیل اور خوب رو تھے، آنکھیں بڑی بڑی اور داڑھی بھی خوبصورت تھی۔[2]

حیی بن اخطب کا قتل

امام عبدالرزاق نے اپنی مصنف میں حضرت سعید بن مسیّب کے واسطے سے با سند بیان کیا ہے۔ سعید بن مسیّب احزاب اور قریظہ کے کچھ واقعات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب اللہ رب العزت نے لشکروں کو دور کر دیا تو حیی بن اخطب بھی چلا گیا۔ لیکن جب روحاء پہنچا تو اسے بنوقریظہ کا عہد یاد آیا۔ وہیں سے واپس ہوا اور بنوقریظہ کے ساتھ قلعہ بند ہوگیا۔ جب بنوقریظہ کو حاضر کیا گیا تو اسے بھی اس حالت میں لایا گیا کہ اس کے ہاتھ کندھوں سے بندھے ہوئے تھے۔ اس نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: "بخدا! میں نے اپنے نفس کو تمھاری عداوت پر کبھی ملامت نہیں کی لیکن بات یہ ہے کہ جو اللہ کی نصرت چھوڑ دے اللہ تعالیٰ بھی اسے بے یارومددگار چھوڑ دیتا ہے۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے اس کی گردن اڑا دی گئی۔[3]

قتل ہونے سے پہلے حیی بن اخطب لوگوں کی طرف متوجہ ہوا اور بولا: "لوگو! اللہ کے حکم پر کوئی دکھ نہیں، یہ تو وہ قتل و غارت ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر لکھ رکھی ہے۔"

---

1 الأحقاف 46:15. 2 سیرأعلام النبلاء: 290/1. 3 المصنف لعبدالرزاق، رقم: 9737، والسیرة النبویة لابن هشام: 252/3، ودلائل النبوة للبیهقي: 23/4.

بعدازاں وہ بیٹھ گیا اور اس کی گردن اڑا دی گئی۔[1]

حیی بن اخطب کے قتل میں کئی اسباق اور عبرتیں ہیں، چند ایک یہ ہیں:

بری تدبیر خود تدبیر کرنے والے کو گھیر لیتی ہے: تمام عربی اور یہودی قبائل اسلام اور پیغمبر اسلام سے جنگ کے لیے اکٹھے ہو گئے اور بنو قریظہ کو عہد شکنی اور پشت سے حملہ کرنے پر آمادہ کر لیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی تدبیر الٹی کر دی اور رسوا کر دیا اور بالآخر حیی بن اخطب کی کوششیں اسے اپنے انجام تک لے آئیں۔

اللہ تعالیٰ ظالموں کو نہیں چھوڑتا وہ انھیں مہلت دیتا ہے اور بتدریج انجام کے قریب کرتا ہے اور آخر میں جب پکڑتا ہے تو غالب، قدرت رکھنے والے کی سی گرفت فرماتا ہے، لہٰذا اس کا مواخذہ انتہائی سخت ہوتا ہے۔ ارشاد نبوی ہے:

«إِنَّ اللّٰهَ لَيُمْلِي لِلظَّالِمِ حَتّٰى إِذَا أَخَذَهُ لَمْ يُفْلِتْهُ»

''اللہ ظالم کو ڈھیل دیتا رہتا ہے لیکن جب اسے پکڑنے پر آتا ہے تو بچ کر نکلنے نہیں دیتا۔''[2]

پھر آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان تلاوت فرمایا:

﴿وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظٰلِمَةٌ ۭ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ۝﴾

''اور (اے نبی!) آپ کے رب کی پکڑ ایسی ہی ہے جب وہ بستیوں کو پکڑتا ہے جبکہ وہ ظالم ہوتی ہیں۔ بے شک اس کی پکڑ نہایت درد ناک (اور) شدید ہے۔''[3]

حیی بن اخطب کی طرف سے جھوٹی دلیری کا اظہار: حیی بن اخطب نے دلیری کا اظہار کرنے کی کوشش کی اور خود آگے بڑھا کہ گردن ماردی جائے تاکہ اس پر کوئی خوش ہونے

1 السيرة النبوية لابن هشام:265/3. 2 صحيح البخاري، حديث:4686. 3 هود 102:11.

والا خوش نہ ہو۔ حالانکہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ باطل پر ہے، اپنی جان پر اسی نے ظلم کیا ہے، اسے اس نے ہلاکت کے گڑھے میں اتارا ہے، اس کے باوجود وہ باطل پر مر رہا تھا۔ گناہ کا غرور اسے جہنم اور برے انجام تک لے جا رہا تھا کیونکہ وہ اپنے پروردگار کے بجائے خواہش کی عبادت کر رہا تھا، ارشاد ربانی ہے:

﴿ اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّ خَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَ جَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ○﴾

''کیا پھر آپ نے اسے دیکھا جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود بنا لیا اور اللہ نے اسے گمراہ کر دیا، جبکہ اسے (حق کا) علم تھا اور اس کے کانوں اور اس کے دل پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا، پھر کون ہے جو اللہ کے بعد اسے ہدایت دے؟ کیا پھر تم نصیحت نہیں پکڑتے؟'' [1]

اللہ جس کی مدد نہ کرے وہ بے یارومددگار ہو جاتا ہے: جب اللہ تعالیٰ کسی کو بے آسرا کر دے تو اس کی حفاظت و مدافعت کرنے والا کوئی نہیں رہتا۔ ارشاد الٰہی ہے:

﴿ اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَ اِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ○﴾

''اگر اللہ تمھاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب نہیں آ سکتا اور اگر وہ تمھیں بے یارومددگار چھوڑ دے تو پھر کون ہے جو اس کے بعد تمھاری مدد کر سکے؟ اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسا کرنا چاہیے۔'' [2]

چونکہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حیی بن اخطب کی عداوت کا سبب صرف حسد اور کینہ تھا، اس لیے اس نے علانیہ اقرار کیا کہ اللہ تعالیٰ کسی بھی موقع پر میرے ساتھ نہ تھا۔ حیی

1 الجاثیة 23:45۔ 2 آل عمرٰن 160:3۔

رحمٰن کے دوستوں سے دشمنی کر کے شیطان کے گروہ میں شامل تھا۔ اور اللہ تعالیٰ سے ضد کر کے دشمنی مول لے رہا تھا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ بھی اسے بے یارو مددگار چھوڑنے والا اور تکلیف میں ڈالنے والے کے سپرد کرنے والا تھا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت بالآخر نافذ ہو کر رہتی ہے۔ اس کے فیصلے کو کوئی ٹالنے والا نہیں، آسمان و زمین میں اسے کوئی عاجز نہیں کر سکتا۔ [1]

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِنْ يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ وَإِنْ يَمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾

''اور اگر اللہ آپ کو کوئی تکلیف پہنچائے تو اس کے سوا کوئی اسے دور کرنے والا نہیں۔ اور اگر وہ آپ کو کوئی بھلائی پہنچائے، تو وہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔'' [2]

کعب بن اسد قرظی کا قتل

بنو قریظہ کے سردار کعب بن اسد کو لایا گیا۔ قتل سے پہلے اس کے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان حسب ذیل باتیں ہوئیں:

آپ ﷺ نے فرمایا: «كَعْبُ بْنُ أَسَدٍ؟» ''تم کعب بن اسد ہو؟''

کعب بن اسد: ''ہاں، اے ابو القاسم!''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَا انْتَفَعْتُمْ بِنُصْحِ ابْنِ خَرَاشٍ لَكُمْ وَكَانَ مُصَدِّقًا بِي، أَمَا أَمَرَكُمْ بِاتِّبَاعِي، وَإِنْ رَأَيْتُمُونِي تُقْرِؤُنِي مِنْهُ السَّلَامَ؟»

''کیا تمھیں ابن خراش کی نصیحت نے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا، وہ میری تصدیق کرتا تھا۔ کیا اس نے تمھیں میری پیروی کے لیے نہیں کہا تھا اور یہ نہیں کہا تھا کہ جب تم مجھے ملو تو اس کی طرف سے مجھے سلام کہنا؟''

---

1 الصراع مع اليهود لأبي فارس: 2/ 114,113. 2 الأنعام 6:17.

کعب: ''تورات کی قسم! اے ابو القاسم ایسا ہی ہے۔ اگر یہ خوف نہ ہوتا کہ یہود مجھے تلوار کے ڈر کی عار دلاتے رہیں گے تو میں ضرور آپ کی اتباع کر لیتا لیکن (اب تو) میں یہودیت ہی پر ہوں۔''

آپ ﷺ کے حکم پر اس کی گردن ماردی گئی۔[1]

سیرت نبوی پر لکھی گئی کتب یہود بنو قریظہ کے متعلق بیان کرتی ہیں کہ جب وہ ایک گروہ کو دوسرے کے بعد قتل کے لیے بھیج رہے تھے تو وہ اپنے سردار کعب بن اسد سے پوچھتے تھے۔[2]

کعب بن اسد کے قصۂ قتل سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ یہودیت کے باطل ہونے کے باوجود انتہائی متعصب تھا۔ اسے ہمارے رسول ﷺ کی رسالت کے سچا ہونے کا علم تھا۔ لیکن اس لیے ایمان نہ لایا اور اسلام قبول نہ کیا کہ یہود اس کے ایمان کو تلوار کے خوف سے اسلام قبول کرنا سمجھیں گے۔ ایمان قبول نہ کرنا اور کفر پر جمے رہنا اس کی ریاکاری، تعریف وثنا کی محبت اور مذمت و عار کے ڈر کا نتیجہ تھا۔ یہی دلیل ہے اس کی بیوقوفی، حماقت اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے دھوکے باز یہودی کو بے یارومددگار چھوڑنے کی۔[3]

ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی زبیر بن باطا کے لیے سفارش

ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا: ''مجھے زبیر یہودی عطا کر دیجیے کہ میں اسے ''بعاث'' کے دن کے احسان کا بدلہ دے سکوں۔'' آپ ﷺ نے درخواست قبول فرمائی، چنانچہ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ زبیر بن باطا کے پاس آئے اور کہا: ''ابو عبدالرحمٰن! مجھے پہچانتے ہو؟'' اس نے کہا: ''ہاں، کیا کوئی اپنے بھائی کو

1 المغازي للواقدي: 516/2، واليهود في السنة المطهرة للدكتور عبدالله الشقاري: 368/1.

2 اليهود في السنة المطهرة للدكتور عبدالله الشقاري: 368/1. 3 الصراع مع اليهود لأبي فارس: 115/2.

بھی بھول سکتا ہے؟!'' ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں بعاث کے دن کے تیرے احسان کا بدلہ چکانا چاہتا ہوں۔'' اس نے کہا: ''یہ تو ٹھیک ہے، ایک اچھا انسان احسان کا بدلہ دیا ہی کرتا ہے۔'' ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں نے ایسا کر لیا ہے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے تیرے متعلق اجازت لی تو آپ ﷺ نے میری درخواست قبول کر لی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے ثابت رضی اللہ عنہ نے اس کی رسیاں کھول دیں۔

زبیر نے کہا: ''تم لوگوں نے میری بیوی اور بیٹے کو قابو کر لیا ہے اور کوئی ساتھ لے جانے والا میرے پاس نہیں۔'' حضرت ثابت رضی اللہ عنہ دوبارہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ زبیر کی بیوی اور بیٹے کو بھی رہا کر دیجیے۔ آپ ﷺ نے درخواست قبول فرمائی۔ انھوں نے واپس آ کر زبیر سے کہا: ''رسول اللہ ﷺ نے تمھاری بیوی اور بیٹے کو رہا کر دیا ہے۔'' زبیر نے کہا: ''میرے باغ میں کئی کھجوریں ہیں۔ ان کے علاوہ میرا اور اہل خانہ کا کوئی ذریعہ معاش بھی نہیں؟'' حضرت ثابت رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پھر حاضر ہوئے۔ آپ ﷺ نے مال بھی واپس کر دیا۔ سیدنا ثابت رضی اللہ عنہ نے زبیر سے کہا: ''رسول اللہ ﷺ نے تمھارا مال و متاع واپس کر دیا ہے، اب اسلام قبول کر لو اور محفوظ ہو جاؤ۔''

زبیر نے اپنے دونوں ہم نشینوں کعب بن اسد اور حیی بن اخطب کے متعلق پوچھا کہ ان کا کیا بنا؟ اور اپنی قوم کے دیگر لوگوں کے متعلق بھی دریافت کیا۔ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا: ''انھیں قتل کیا جا چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شاید تمھیں نیکی کے لیے زندہ رکھا ہے۔''

زبیر نے کہا: ''ثابت! اللہ کے نام پر تجھ سے سوال کرتا ہوں اور بعاث کے دن کے احسان کا بھی واسطہ دیتا ہوں کہ مجھے بھی مقتولین کے ساتھ ملا دو، ان کے بعد میرے لیے زندگی میں کوئی بھلائی نہیں۔'' ثابت نے رسول اللہ ﷺ کو ساری بات عرض کر دی تو آپ ﷺ نے زبیر کے بھی قتل کا حکم دے دیا۔ یوں اسے بھی قتل کر دیا گیا۔[1]

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 254,253/3، ودلائل النبوة للبيهقي: 24,23/4.

رفاعہ بن سموئل کے لیے سلمی بنت قیس رضی اللہ عنہا کی سفارش

ام المنذر سلمی بنت قیس رضی اللہ عنہا سلیط بن قیس رضی اللہ عنہ کی بہن تھیں۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خالہ بھی تھیں، قبلتین کی طرف نماز بھی پڑھ چکی تھیں اور دیگر خواتین کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت بھی کر چکی تھیں۔ سلمٰی بنت قیس رضی اللہ عنہا نے یہودی رفاعہ بن سموئل قرظی کی سفارش کی۔ رفاعہ بالغ آدمی تھا جس نے ان سے پناہ طلب کی تھی۔ وہ پہلے سے ان کے خاندان سے متعارف تھا۔ حضرت سلمی رضی اللہ عنہا نے بارگاہ نبوی میں عرض کیا: ''اے اللہ کے نبی! میرے ماں باپ آپ پر قربان! رفاعہ کو رہا کر دیجیے۔ اس کا خیال ہے کہ وہ نماز بھی پڑھے گا اور اونٹ کا گوشت بھی کھائے گا۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے درخواست قبول فرمائی۔ یوں سلمٰی رضی اللہ عنہا نے رفاعہ کو بچا لیا۔[1]

اس واقعے سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام عورت کی عزت کرتا اور اس کی سفارش کو معتبر جانتا ہے۔[2]

اختلاف رائے کے آداب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کو سمجھنے میں بعض اوقات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں اختلاف ہو جاتا تھا۔ اس کی وضاحت درج ذیل ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «أَلَا لَا يُصَلِّيَنَّ أَحَدٌ الْعَصْرَ إِلَّا فِي بَنِي قُرَيْظَةَ»
''سنو! ہر شخص عصر کی نماز بنی قریظہ ہی میں پڑھے۔''

بعض صحابہ نے سمجھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد صرف جلدی جانا ہے، لہٰذا انھوں نے نمازِ عصر وقت پر ادا کر لی۔ بعض نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کو ظاہر پر محمول کیا اور نماز بنو قریظہ میں پہنچ کر ادا کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فریقین میں سے کسی سے تعرض نہیں کیا۔ یوں

1 السيرة النبوية لابن هشام:3/255. 2 الصراع مع اليهود لأبي فارس: 2/116.

شریعت کا ایک اہم اصول سامنے آیا کہ فروعی مسائل میں اختلاف ہوسکتا ہے۔ یوں فروعی مسائل کے اختلاف کو گویا برقرار رکھا گیا۔ فریقین کو درست اور معذور قرار دیا گیا۔

اس سے یہ دلیل بھی ملتی ہے کہ ایسے فروعی مسائل جن کی بنیاد لوگوں کے اختلاف رائے پر ہوتی ہے انھیں بالکل ختم کر دینا ممکن نہیں اور نہ ہی ایسی کوئی کوشش کامیاب ہوسکتی ہے۔[1]

فروعی مسائل کے اختلاف کو ختم کرنے کی کوشش، شریعت مقرر کرنے کے سلسلے میں حکمت ربانی اور تدبیر الٰہی کے آگے ڈھٹائی اور ضد بازی کی ایک صورت ہے۔ ایسے مسائل میں اختلاف نہ ہونے کی ضمانت کیسے دی جاسکتی ہے جن کی بنیاد احتمال پر ہو۔ ہمارے زمانے میں اگر اختلاف ختم ہونے کا احتمال ہے تو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تو یہ احتمال بالاولیٰ تھا۔ فروعی اختلاف میں نہ پڑنے کے سب سے زیادہ حق دار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے۔ فروعی مسائل میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اختلاف ہوسکتا ہے تو ہمارا کیوں نہیں ہوسکتا؟[2]

اس حدیث سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ جس شخص نے قرآن پاک کی آیت یا حدیث کے ظاہری معنی لیے اسے معیوب نہیں سمجھنا چاہیے۔ اور اسے بھی معیوب نہیں سمجھنا چاہیے جو نص سے ایسا مسئلہ اخذ کرتا ہے جو نص کو خاص کر دے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ فروعی اختلاف رکھنے والے مجتہدین میں سے جو غلطی پر ہے وہ بھی گناہ گار نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

«إِذَا حَكَمَ الْحَاكِمُ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَصَابَ فَلَهُ أَجْرَانِ، وَإِذَا حَكَمَ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَخْطَأَ فَلَهُ أَجْرٌ»

”جب حاکم سوچ سمجھ کر فیصلہ دے اور اس کا فیصلہ درست ہو تو اس کے لیے دو اجر ہیں اور جو سوچ سمجھ کر فیصلہ دے مگر فیصلہ غلط صادر ہو جائے تو اس کے لیے

1 فقه السيرة للبوطي، ص:226. 2 فقه السيرة للبوطي، ص:226.

ایک اجر ہے۔"[1]

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ بعض صحابہ نے آپ ﷺ کی طرف سے صادر ہونے والی نہی کو ظاہر پر محمول کیا اور وقت نماز کے نکلنے کی پروا نہ کی۔ وقت سے نماز موخر کرنے کی ممانعت کے عام حکم کو وقت پر نہ پڑھنے کے اس خاص حکم کے پیش نظر انھوں نے یہی سمجھا کہ بنوقریظہ پہنچ کر نماز پڑھنے کا خاص حکم ہے اور نماز وقت پر پڑھنا عام ہے۔ (اور انھوں نے خاص حکم پر عمل کیا۔)[2]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس واقعے سے یہ استدلال کرنا درست نہیں کہ ہر مجتہد مطلق طور پر درست ہی ہوتا ہے۔ اس میں تو صرف یہ بیان ہوا ہے کہ جو کوئی اجتہاد کرے اسے ملامت نہ کی جائے۔ مطلب یہ ہے کہ اسے گناہ گار نہیں کہا جائے گا۔ واقعے کا ماحصل یہ ہے کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ کے فرمان کو ظاہری معنی پر محمول کیا اور دوسری نہی کی بنا پر پہلی نہی (تاخیر نماز کی نہی) کی پروا نہ کی۔ انھوں نے جنگی معاملات میں مصروفیت کی بنا پر نماز موخر کرنے کو جائز سمجھا۔ اس کو دیکھتے ہوئے کہ غزوۂ خندق کے ایام میں نماز موخر ہوجایا کرتی تھی۔ دیگر صحابہ کرام نے آپ کی ممانعت کو ظاہری معنی پر محمول نہ کیا۔ وہ یہ سمجھے کہ آپ کے حکم سے مراد صرف جلدی کرنا اور بنوقریظہ تک نہایت تیزی سے پہنچنا ہے۔ جمہور نے اجتہاد کرنے والے کو درست کہا ہے کیونکہ آپ ﷺ نے فریقین میں سے کسی سے بھی تعرض نہیں کیا۔ کسی بھی فریق سے گناہ کا ارتکاب ہوتا تو آپ ﷺ ضرور تعرض کرتے۔[3]

بنوقریظہ کی غنیمتوں کی تقسیم

صحابہ نے بنوقریظہ کے چلے جانے کے بعد جو غنیمتیں اکٹھی کیں ان کی تفصیل کچھ یوں

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 7352، وصحيح مسلم، حديث: 1716. [2] المستفاد من قصص القرآن لعبدالكريم زيدان: 286/2. [3] خلاصہ از فتح الباری: 473/7، شرح الحديث: 4119.

ہے۔ پندرہ سو تلواریں، دو ہزار نیزے۔ تین سو درعیں، چھوٹی بڑی پندرہ سو ڈھالیں، اس کے علاوہ بڑی تعداد میں بکریاں، اونٹ، گھریلو سازوسامان اور بہت سے برتن۔ مسلمانوں نے کئی مٹکے شراب بھی پائی۔ منقولہ غنیمت، (مثلاً: اسلحہ، گھریلو سامان وغیرہ) مجاہدین اور انصار و مہاجرین میں تقسیم کر دی گئی، غنیمت کے پانچ حصوں میں سے چار حصے تقسیم ہو گئے۔ گھڑسواروں کو دو حصے، ایک حصہ گھوڑے کا اور ایک حصہ خود اس کا، جبکہ پیادہ کو ایک حصہ ملا۔ [1]

جو شراب ہاتھ لگی اسے بہا دیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے سوید بن خلاد رضی اللہ عنہ کا حصہ مقرر فرمایا جنھیں ایک یہودی عورت نے چکی گرا کر شہید کر دیا تھا۔ یہ حصہ ان کے وارثوں کو دیا گیا۔ [2] اس صحابی کا حصہ بھی مقرر کیا گیا جو بنو قریظہ کے محاصرے کے دوران فوت ہو گیا تھا۔ [3]

اسی جنگ میں شریک صحابیات صفیہ بنت عبدالمطلب، ام عمارہ، ام سلیط، ام العلاء، سمیرا بنت قیس اور حضرت سعد بن معاذ کی والدہ ام سعد رضی اللہ عنہن کے لیے آپ ﷺ نے حصہ تو مقرر نہ فرمایا مگر انھیں بھی مالِ غنیمت سے نوازا۔ [4]

غیر منقولہ اموال، مثلاً: اراضی، گھر، یہ رسول اللہ ﷺ نے صرف مہاجرین کو دیے اور انصار کو ان میں سے کچھ نہ دیا۔ آپ ﷺ نے حکم دیا کہ مہاجرین وہ زمین اور کھجور کے درخت انصار کو واپس کر دیں جنھیں وہ ان سے ادھار لے کر اپنے استعمال میں لا رہے تھے۔ [5]

اراضی اور گھروں کے متعلق فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَـُٔوْهَا ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ۝ ﴾

1 الصراع مع اليهود لأبي فارس:97,96/2. 2 الصراع مع اليهود لأبي فارس: 2 / 97.
3 اليهود في السنة المطهرة للدكتور عبدالله الشقاري:375/1. 4 اليهود في السنة المطهرة للدكتور عبدالله الشقاري:375/1. 5 الصراع مع اليهود لأبي فارس:98/2.

''اور اللہ نے تمھیں ان کی زمینوں، ان کے گھروں، ان کے مالوں اور اس زمین کا وارث بنا دیا جسے تم نے پامال نہیں کیا تھا اور اللہ ہر شے پر خوب قادر ہے۔''[1]

پروفیسر محمد عزت دروزہ لکھتے ہیں: ﴿وَاَرْضًا لَّمْ تَطَـُٔوْهَا﴾ کے متعلق مفسرین کا خیال ہے کہ اس سے مراد خیبر کی زمین ہے۔ یہ فتح خیبر کی پیشگی خوشخبری ہے۔ مگر آیت کے سیاق و سباق سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس سے مراد بنوقریظہ کی وہ اراضی ہے جو ان کے گھروں سے دور تھی۔ جو بلا جنگ اور بلا محاصرہ اس کے مالکوں کے انجام کی وجہ سے مسلمانوں کے ہاتھ لگی۔[2]

رسول اللہ ﷺ نے (تقسیم کے ساتھ ساتھ) حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو بنوقریظہ کی قیدی عورتیں اور بچے دے کر شام بھیجا۔ انھوں نے قیدیوں کو وہاں فروخت کر کے اسلحہ اور گھوڑے خریدے۔ اس طرح آپ ﷺ نے کچھ قیدی دے کر حضرت سعد بن زید انصاری رضی اللہ عنہ کو نجد بھیجا۔ انھوں نے بھی قیدی بیچ کر اسلحہ خریدا۔[3]

ریحانہ بنت عمرو رضی اللہ عنہا کا قبول اسلام

بنوقریظہ کے خاندان بنوعمرو کی ایک قیدی عورت ریحانہ بنت عمرو بن خنافہ بھی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارادہ فرمایا کہ وہ اسلام قبول کر لیں تو میں ان سے عقد کر لوں مگر وہ متردد رہیں اور کچھ عرصہ اپنے دین پر ہی قائم رہیں، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کا سینہ کھول دیا تو وہ مسلمان ہوگئیں۔ رسول اللہ ﷺ نے انھیں ایک ماہ کے لیے ام منذر بنت قیس رضی اللہ عنہا کے گھر بھیج دیا۔ جب وہ پاک ہوگئیں تو آپ ﷺ خود وہاں تشریف لے گئے اور اسے اختیار دیا کہ آزادی کے بعد عقد کر لے یا صرف ملکیت میں رہنا پسند کرے۔ اس نے صرف ملکیت میں رہنا پسند کیا۔[4]

---

1 الأحزاب 27:33. 2 سيرة الرسول ﷺ للأستاذ محمد عزة دروزة:202/2. 3 الصراع مع اليهود لأبي فارس:98/2. 4 الصراع مع اليهود لأبي فارس:99/2.

غزوۂ احزاب میں اسلام کا پرچار

شعراءِ صحابۂ کرام اپنے بھرپور جہادی کردار کو قصائد کے رنگ میں رنگنے لگے اور انھوں نے غزوۂ احزاب میں مسلمانوں کے دلیرانہ اقدام کا بھرپور اظہار کیا۔ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے یوں کہا:

''بہت سی پوچھنے والیاں ہم سے پوچھتی ہیں کہ ہم کس چیز سے دوچار ہوئے۔ اگر وہ دیکھ لیتیں تو ہمیں اس موقع پر (مقابلے میں) صابر پاتیں۔

ہم نے پورے صبر و استقلال کا مظاہرہ کیا۔ ہم اپنا ثانی نہیں پاتے جو اللہ تعالیٰ پر ایسا صبر و توکل کر دکھاتا جو ہم نے سختیوں کے وقت کر دکھایا۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حق و صداقت میں ہمارے مددگار تھے، ان کے ساتھ ہم ساری مخلوق پر برتری حاصل کر لیں گے۔

ہم ان لوگوں سے ہمیشہ لڑتے رہیں گے جو ظالم ہیں اور جنھوں نے صرف عداوت کی بنا پر ہمارے خلاف جنگ کی۔

جب وہ ہماری طرف آئیں گے تو ہم ان کا ایسی تلواروں کے ذریعے بندوبست کریں گے جو جلد بازوں پر نہایت تیزی سے چلیں گی۔

تم ہمیں میدان کے تالابوں جیسی کھلی اور کشادہ زرہوں میں ملبوس دیکھ رہے تھے۔''

کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کے مزید اشعار کا ترجمہ:

''ہم جنگ اس لیے کر رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ اور احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت و حمایت کریں۔ اس کے نتیجے میں ہم اللہ کے سچے اور مخلص بندے بن سکیں گے۔

اور اس لیے بھی کہ اہل مکہ اور وہ گروہ جو اکٹھے ہو کر آئے تھے، پلٹتے وقت جان لیں کہ واقعی اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں اور اللہ تعالیٰ بلاشبہ مومنوں کا دوست ہے۔

اگر چہ تم نے اپنی حماقت سے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا ہے تو کیا ہوا، اللہ تعالیٰ تو سب پر قدرت رکھنے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ بہت جلد سعد رضی اللہ عنہ کو پاکیزہ باغات میں جگہ دے گا۔ وہ جگہ اللہ کے نیک بندوں کی اقامت گاہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تمھیں شکست دے کر واپس بھگا دیا۔ تم غصے سے ہونٹ چباتے ذلیل وخوار اور نامراد ہو کے لوٹے۔

تمھارے لیے یہی رسوائی بہت ہے کہ تمھیں یہاں سے کچھ حاصل نہیں ہوا بلکہ قریب تھا کہ تم نیست و نابود ہو جاتے۔

طوفانی ہوا نے تمھیں اوندھے منہ پچھاڑ دیا تھا۔"

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن زبعری کے جواب میں طویل قصیدہ کہا۔ ایک جگہ وہ کہتے ہیں:

"اور ہمیں اپنے رب کی جانب سے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں) پاکیزہ زبان عطا ہوئی جو بڑے ثواب کا وعدہ دیتی ہے۔

احزاب کو بھی یہ نصیحتیں کی گئی تھیں لیکن انھوں نے عمل نہ کیا۔ ہمیں نصیحت کی گئی تو ہم نے اسے بڑے شوق سے یاد رکھا۔

ایسے احکام ملے جنھیں کم عقل لوگ مشکل اور ناقابل عمل سمجھتے تھے لیکن اہل دانش انھیں صحیح اور قابل عمل سمجھ رہے تھے۔

قریش کی غصے میں بھری جماعت اس نیت سے آئی تھی کہ اپنے ہی رب پر غالب آئے گی۔ لیکن انھیں شاید اندازہ نہیں کہ سب پر غالب آنے والے سے جو بھی مقابلہ کرتا ہے وہ خود مغلوب ہو جاتا ہے۔"

ابن ہشام کہتے ہیں: "ایک قابل اعتماد شخص نے مجھ سے بیان کیا کہ عبدالملک بن یحییٰ

بن عباد بن عبداللہ نے کہا: جب حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے یہ آخری شعر کہا:

جَاءَتْ سَخِينَةُ كَيْ تُغَالِبَ رَبَّهَا
فَلَيُغْلَبَنَّ مُغَالِبُ الْغَلَّابِ

''قریش کی غصے میں بھری جماعت اس ارادے سے آئی تھی کہ اپنے ہی رب پر غالب آئے گی لیکن انھیں شاید اندازہ نہیں کہ سب پر غالب آنے والے سے جو بھی مقابلہ کرتا ہے وہ خود مغلوب ہو جاتا ہے۔''

اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «لَقَدْ شَكَرَكَ اللّٰهُ يَا كَعْبُ! عَلٰى قَوْلِكَ هٰذَا» ''اے کعب! اللہ تعالیٰ نے تمھارے اس شعر کی بڑی قدر فرمائی ہے۔''[1]

[1] السيرة النبوية لابن هشام:3/273.

حصہ 14

غزوۂ احزاب اور غزوۂ حدیبیہ کے درمیانی عرصے کے اہم واقعات

فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ
عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا
مِنْهُنَّ وَطَرًا ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ○

”پھر جب زید نے اس سے اپنی حاجت پوری کر لی
تو ہم نے اس کا نکاح آپ سے کر دیا، تاکہ مومنوں کے لیے
اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں (سے نکاح) میں کوئی حرج نہ رہے،
جب وہ ان سے (اپنی) حاجت پوری کر لیں اور اللہ کا حکم تو (پورا)
ہو کر ہی رہتا ہے۔“

(الأحزاب 33:37)

زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کا نکاح اور متبنیٰ کا قاعدہ

جنگی گروہوں کے آنے جانے، حکومت کی تشکیل اور جزیرہ نمائے عرب میں اس کا رعب و دبدبہ قائم ہونے کے پہلو بہ پہلو، امت کا تشریعی ڈھانچہ تکمیل کے مراحل طے کر رہا تھا، مثلاً: منہ بولا بیٹا قرار دینے کا طریقہ ختم کیا جا رہا تھا۔ پردہ لازم ہو رہا تھا۔ خوشی منانے کا طریقہ مقرر ہو رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی ضرورت و اہمیت واضح کی جا رہی تھی۔ رسوم و رواج سے نپٹا جا رہا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سیدہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے عقد فرمانا بھی اسی سلسلے کی کڑی تھا۔

ام المومنین زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کا نام و نسب

زینب بنت جحش بن رئاب بن یعمر اسدی۔ یہ عبداللہ بن جحش اور حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہما کی بہن تھیں۔ ان کی والدہ امیمہ بنت عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف بن قصی ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بہن تھیں۔[1]

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی کنیت، ام الحکم اور نام برہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدل کر زینب رکھ دیا۔[2]

حضرت زینب رضی اللہ عنہا پہلے پہل ہجرت کرنے والوں میں شامل تھیں، بڑی پرہیز گار

1 الاستیعاب لابن عبدالبر:1/372. 2 الاستیعاب لابن عبدالبر:2/97.

خاتون تھیں۔ ہمیشہ روزہ رکھتیں۔ قیام اللیل کرتیں۔ بکثرت صدقہ کرتیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَسْرَعُكُنَّ لِحَاقًا بِي أَطْوَلُكُنَّ يَدًا»

''تم میں سے سب سے پہلے مجھ سے وہ ملے گی جس کے ہاتھ زیادہ لمبے ہیں۔''

ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن اپنے اپنے ہاتھ ناپنے لگیں تاکہ معلوم ہو کس کے ہاتھ زیادہ لمبے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں ہم میں سے زینب کے ہاتھ سب سے زیادہ لمبے تھے، وہ اپنے ہاتھ سے محنت کرتی اور صدقہ دیتی تھیں۔[1]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی بڑی تعریف کی ہے۔ وہ فرماتی ہیں:

''میں نے کوئی عورت ایسی نہیں دیکھی جو ان سے زیادہ دین دار، اللہ سے ڈرنے والی، سچی بات کہنے والی، صلہ رحمی کرنے والی اور صدقہ و خیرات کرنے والی ہو اور نہ ان سے بڑھ کر کوئی عورت اپنے آپ کو دین کے کاموں میں مصروف رکھتی تھی۔ تاہم ان کی طبیعت میں تھوڑی تیزی تھی لیکن اس پر بھی وہ جلد قابو پالیتی تھیں۔''[2]

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما سے نکاح

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارادہ تھا کہ وہ طبقاتی فرق جو جاہلیت کا حصہ ہے اسے ختم کر دیا جائے، تمام لوگ کنگھی کے دندانوں کی طرح برابر ہو جائیں۔ تقویٰ کے سوا کوئی اور وجہ فضیلت نہ ہو۔ عرب معاشرے میں آزاد کردہ غلاموں کو کمتر سمجھا جاتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے غلام حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کو آزاد کر کے منہ بولا بیٹا بنا لیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال تھا کہ قبیلہ اسد سے تعلق رکھنے والی اپنی پھوپھی زاد زینب سے ابتدا کر کے طبقاتی اونچ نیچ کو ختم کر دیا جائے۔ طبقاتی اونچ نیچ کی جڑیں اتنی گہری تھیں کہ اسے

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 1420، وصحيح مسلم، حديث: 2452 واللفظ له. [2] صحيح مسلم، حديث: 2442، والسنن الكبرىٰ للنسائي: 7/64-66.

رسول اللہ ﷺ ہی ختم کر سکتے تھے تا کہ امت مسلمہ اسے نمونہ بنالے اور انسانیت ہدایت کی اس راہ پر چل پڑے۔

اس شادی کی ایک حکمت یہ بھی تھی کہ متبنیٰ بنانے یا نہ بنانے کے بارے میں تشریعی حکم کا مقدمہ بن سکے۔ یہ حکمت بھی معاشرے اور خاندانی فلاح و بہبود کے لیے پہلی حکمت سے کسی طرح کم نہیں، تاہم یہ حکمت ابتدا میں سامنے نہیں آئی۔[1]

رسول اللہ ﷺ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کی منگنی کرنے بذات خود تشریف لے گئے۔ حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کو ان سے نکاح کے لیے کہا تو زینب رضی اللہ عنہا نے جواباً کہا: ''میں اس سے نکاح نہیں کروں گی۔'' آپ ﷺ نے حکم دے کر فرمایا: «بَلٰی ، فَانْکِحِیهِ» ''کیوں نہیں! اس سے نکاح کرو۔'' زینب رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! میں ذرا سوچ بچار کرلوں؟'' یہ گفتگو جاری تھی کہ قرآن پاک کی آیت نازل ہوئی:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۝﴾

''اور کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں تو ان کے لیے اپنے معاملے میں ان کا کوئی اختیار (باقی) رہے اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے تو وہ یقیناً کھلم کھلا گمراہ ہو گیا۔''[2]

ان آیات کے نزول کے بعد حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! ان سے میری شادی پر آپ راضی ہیں؟'' نبی ﷺ نے فرمایا: «نَعَمْ!» ''ہاں۔'' اس پر زینب رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: ''میں رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی نہیں کروں گی۔ میں زید سے

1 قضايا نساء النبي ﷺ والمؤمنات لحفصة بنت عثمان الخليفي، ص: 205. 2 الأحزاب: 36:33.

شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔"[1]

حضرت زید رضی اللہ عنہ ان دنوں ابھی زید بن محمد کے نام سے پکارے جا رہے تھے۔ زید رضی اللہ عنہ نے ان سے نکاح کر لیا اور 10 دینار، 60 درہم، اوڑھنی، چادر، زرہ، 60 مد اناج اور 10 مد کھجور بطور حق مہر دی۔[2]

حضرت زید رضی اللہ عنہ کا حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق دینا

حضرت زید رضی اللہ عنہ اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا میں نباہ نہ ہو سکا۔ ازدواجی زندگی بس سے باہر ہو گئی۔ حضرت زید نے حضرت زینب سے جدائی کا پختہ ارادہ کر لیا۔ اس سے پہلے بھی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بندھن کے قائم نہ رکھ سکنے کی شکایت کرتے رہتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں ہمیشہ بیوی کے متعلق اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے اور طلاق نہ دینے کا مشورہ دیتے حتی کہ اللہ تعالیٰ نے طلاق کی اجازت دے دی اور زید رضی اللہ عنہ نے طلاق دے دی۔ یہ شادی تقریباً ایک سال قائم رہی۔

ابن کثیر رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا ایک سال تک یا ایک سال سے چند روز اوپر زید رضی اللہ عنہ کے پاس رہیں، پھر ان میں اختلاف ہو گیا تو حضرت زید رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی۔ آپ زید کو ہمیشہ تاکید کرتے: ﴿ اَمۡسِكۡ عَلَيۡكَ زَوۡجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ ﴾ "اللہ سے ڈر اور اپنی بیوی اپنے پاس رکھ۔"[3]

اب تو حضرت زید رضی اللہ عنہ کو حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی کوئی چاہت ہی نہ رہی تھی۔ وہ بڑے شریف النفس انسان تھے۔ انھیں پسند نہیں تھا کہ اپنی خوشی کے لیے کسی کو تنگی میں ڈالیں۔ یوں انھوں نے علیحدگی کا پختہ ارادہ کر لیا۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نہایت مضطرب تھیں۔ خارجی سبب یا فرد کی مداخلت کے بغیر ہی دونوں کے درمیان علیحدگی ہو گئی۔ طلاق میں صرف اور

[1] تفسیر الطبري: 11/22، والدر المنثور: 609/5. [2] تفسیر ابن کثیر: 489/3. [3] تفسیر ابن کثیر: 491/3.

صرف حضرت زید رضی اللہ عنہ کے ارادے کا دخل تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں اللہ تعالیٰ کا خوف دلاتے اور بیوی نہ چھوڑنے کو کہتے رہے۔[1]

ابن کثیر یہ سبب بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے اسلاف سے کئی روایات نقل کی ہیں مگر ان کے غیر صحیح ہونے کی بنا پر ہم ان کا ذکر نہیں کرتے۔[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے نکاح میں پوشیدہ حکمت

منہ بولا بیٹا بنانے کی عادت لوگوں کے دلوں میں گھر کر چکی تھی اور رسم و رواج کا حصہ بن چکی تھی۔ اس رسم کو اور اس کے نتائج کو ختم کرنا آسان نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ رسم ختم کرنی چاہی اور آیات نازل فرمائیں کہ منہ بولا بیٹا حقیقی بیٹا نہیں ہوتا۔ یہ تو صرف زبان کا کہنا ہے جو حقیقت کو نہیں بدل سکتا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهٖ ۚ وَمَا جَعَلَ اَزْوٰجَكُمُ الّٰٓـِٔيْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ ۝﴾

''اللہ نے کسی شخص کے سینے میں دو دل نہیں رکھے۔ اور تم اپنی جن بیویوں کو ماں کہہ بیٹھتے ہو، انھیں اس (اللہ) نے تمھاری مائیں نہیں بنایا اور نہ اس نے تمھارے لے پالکوں (منہ بولے بیٹوں) کو تمھارے (حقیقی) بیٹے بنایا ہے، یہ تو تمھارے اپنے مونہوں کی باتیں ہیں اور اللہ حق (بات) کہتا ہے اور وہی (سیدھا) راستہ دکھاتا ہے۔''[3]

[1] قضايا نساء النبي ﷺ والمؤمنات لحفصة بنت عثمان الخليفي، ص: 209. [2] تفسير ابن كثير: 491/3. [3] الأحزاب 33:4.

اللہ تعالیٰ نے حکم دے دیا کہ منہ بولے بیٹوں کو ان کے اصلی والدین کے نام سے پکارا کرو، عدل وانصاف کا یہی تقاضا ہے۔ارشاد ربانی ہے:

﴿ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ ۭ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ ۙ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝﴾

''ان (لے پالکوں) کو ان کے (حقیقی) باپوں کی نسبت سے پکارو، اللہ کے نزدیک یہ بہت انصاف کی بات ہے، پھر اگر تمھیں ان کے باپوں کا علم نہ ہو تو وہ تمھارے دینی بھائی اور تمھارے دوست ہیں اور اس معاملے میں تم بھول چوک جاؤ تو اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں اور لیکن تمھارے دل جس بات کا عزم کرلیں (تو وہ گناہ ہے) اور اللہ بہت بخشنے والا، بڑا رحم کرنے والا ہے۔''[1]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو زید بن محمد کہتے تھے حتی کہ یہ فرمان الٰہی نازل ہوا۔[2]

منہ بولے بیٹے کے اصلی والد کا علم نہ ہو تو بھی انھیں وقتی طور پر اس رسم کے مطابق بلانے کی اجازت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ رسم اس وقت ختم کر دی اور فرمایا کہ بصورت دیگر وہ ان کے بھائی اور دوست ہیں۔

یعنی اگر تمھیں ان کے والد کا علم نہیں تو تمھارے اور ان کے درمیان صرف دینی بھائی چارے اور دوستی (موالاۃ) کا رشتہ ہے۔ اور دینی بھائی چارہ اس لیے ہے کہ ان کا نسب نامعلوم ہے، لہٰذا اس طرح کہہ دیا جائے کہ فلاں مولیٰ فلاں، یا مولیٰ بنی فلاں۔[3]

دین میں بھائی چارے اور رشتہ موالات کی بڑی اہمیت ہے۔ وہ لوگ جن کے والد کا علم ہے ان کے لیے بھی یہ بھائی چارہ قائم ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت زید بن

1 الأحزاب 33:5. 2 صحيح البخاري، حديث: 4782. 3 تفسير السعدي: 4/136.

حارثہ رضی اللہ عنہما سے فرمایا:

«أَنْتَ أَخُونَا وَ مَوْلَانَا»

''تم ہمارے بھائی اور ہمارے دوست ہو۔''[1]

یعنی ہمارے اسلامی بھائی اور دوست ہو جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ﴾

''مومن تو (ایک دوسرے کے) بھائی ہیں۔''[2]

متبنیٰ (منہ بولا بیٹا) کی ممانعت میں دیگر نصوص بھی وارد ہوئی ہیں۔ اور یہ صورت بیٹے کے خود کو کسی کی طرف منسوب کرنے کے حوالے سے ہے۔ شریعت میں اس بات کی سختی سے حرمت موجود ہے کہ کوئی شخص جان بوجھ کر اپنے نسب کو اپنے حقیقی والد کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف منسوب کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَنِ ادَّعٰى إِلٰى غَيْرِ أَبِيهِ، أَوِ انْتَمٰى إِلٰى غَيْرِ مَوَالِيهِ، فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ، لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ تَعَالٰى مِنْهُ صَرْفًا وَّلَا عَدْلًا» ''جس شخص نے اپنے آپ کو اپنے والد کے علاوہ کسی اور کی طرف منسوب کیا یا جس غلام نے اپنے آپ کو غیر موالی کی طرف منسوب کیا تو اس پر اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہو۔ اللہ تعالیٰ اس سے کوئی نفلی یا فرض عبادت قبول نہیں کریں گے۔''[3]

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے اثبات نسب کے لیے واضح طور پر فرما دیا ہے کہ اس کی یہ صورت ہے کہ عورت سے عقد ہوا ہو یا وہ آدمی کی ملکیت ہو اور آدمی نے اس سے ازدواجی تعلق قائم کیا ہو۔ اس سلسلے میں آپ ﷺ نے جاہلیت والا یہ طریقہ بھی ختم کر دیا جس میں تھا کہ بدکاری کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اولاد اس زانی کی طرف منسوب ہوتی

1 صحيح البخاري، حديث:2699، ومسند أحمد:98/1و155. 2 الحجرات10:49.
3 صحيح البخاري، حديث:1870، وصحيح مسلم، حديث:1370 واللفظ له.

تھی ارشادِ نبوی ہے:

«اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ وَلِلْعَاهِرِ الْحَجَرُ»

''بچہ اس کا ہے جس کے ہاں پیدا ہوا اور بدکار کے لیے پتھر ہیں۔''[1]

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو اولاد صحیح عقد زواج یا لونڈی سے ملاپ کے بعد پیدا ہو اس کا نسب باپ کے ساتھ ملایا جائے گا، جبکہ بدکاری اور زنا نسب کا ذریعہ بننے کے لائق نہیں بلکہ یہ ایک اور معاملے کا سبب بنے گا اور وہ ہے رجم اور پتھر۔[2]

اللہ تعالیٰ نے متبنیٰ کے اپنے غیر حقیقی باپ کی طرف نسبت کرنے سے منع اور حقیقی والد کی طرف نسبت کرنے کا حکم یا اسلامی اخوت اور ولاء کے حکم کی وضاحت کرنے کے بعد جان بوجھ کر ایسی غلطی کرنے اور جاہلیت والا طریقہ اپنانے والے کے بارے میں وضاحت فرما دی اور اسی طرح بھول چوک کرنے والے کے بارے میں بھی شریعت کا حکم واضح کر دیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآىِٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ ۭ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ ۙ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝﴾

''ان (لے پالکوں) کو ان کے (حقیقی) باپوں کی نسبت سے پکارو، اللہ کے نزدیک یہ بہت انصاف کی بات ہے، پھر اگر تمھیں ان کے باپوں کا علم نہ ہو تو وہ تمھارے دینی بھائی اور تمھارے دوست ہیں اور اس معاملے میں تم بھول چوک جاؤ تو اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں اور لیکن تمھارے دل جس بات کا عزم کر لیں (تو وہ گناہ ہے) اور اللہ بہت بخشنے والا، بڑا رحم کرنے والا ہے۔''[3]

1 صحيح البخاري، حديث: 6818، وصحيح مسلم، حديث: 1458. 2 علاقة الآباء بالأبناء في الشريعة الإسلامية للدكتور سعاد الصانع، ص: 53,52. 3 الأحزاب 5:33.

اس آیت میں بھول چوک کرنے والے، تلاش بسیار کے بعد غلطی کرنے والے، یا سبقت لسانی سے ایسے الفاظ ادا کر گزرنے والے کو رعایت دی گئی ہے۔ لیکن جان بوجھ کر اپنے باپ کو تبدیل کرنے یا نسب کو غلط منسوب کرنے والے کو اللہ تعالیٰ نے گناہگار اور معیوب قرار دیا ہے۔[1]

منہ بولا بیٹا بنانے کا رواج لوگوں میں پختہ ہو چکا تھا۔ عرب معاشرے میں اس کی جڑیں بہت گہری تھیں۔ سیدہ زینب رضی اللہ عنہا سے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح اس رسم کا عملی خاتمہ تھا۔[2]

سیدہ زینب رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح کی حکمت اظہر من الشّمس ہے جسے اللہ تعالیٰ نے یوں واضح فرمایا:

﴿ لِكَیْ لَا یَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ حَرَجٌ فِیْۤ اَزْوَاجِ اَدْعِیَآىِٕهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ﴾

”تاکہ مومنوں کے لیے اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں (سے نکاح) میں کوئی حرج نہ رہے، جب وہ ان سے (اپنی) حاجت پوری کر لیں۔“[3]

باطل نظریات کے حامل اور ان کے خوشہ چینوں نے غیر ثابت شدہ روایات کا سہارا لے کر اس سلسلے میں کئی کہانیاں گھڑی ہیں، جنھیں وہ دہراتے رہتے ہیں۔ وہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر یوں جھوٹ باندھتے ہیں کہ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے زینب رضی اللہ عنہا کی شادی ہوئی تو آپ کو زینب رضی اللہ عنہا سے محبت ہو گئی۔ زید کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق دینے کا ارادہ کر لیا۔[4]

---

1 قضايا نساء النبي والمؤمنات لحفصة بنت عثمان الخليفي، ص: 192,191. 2 من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 311. 3 الأحزاب 37:33. 4 المفصل في أحكام المرأة لعبدالكريم زيدان: 475,474/11.

یہ بات بالکل غلط ہے، امام ابن العربی نے اس کی تردید میں لکھا ہے: ''یہ کہنا قطعی غلط ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے زینب کو دیکھا تو وہ آپ ﷺ کے دل میں گھر کر گئی۔ زینب کو رسول اللہ ﷺ نے اس سے پہلے بھی دیکھا تھا۔ اس وقت تو پردہ بھی مانع نہیں تھا۔ بعد میں یہ تعلق کیسے پیدا ہو گیا۔ پہلے تو ایسی کوئی بات نہیں تھی لیکن جونہی زینب کا نکاح ہوا ایک دم سے یہ معاملہ کیونکر ہو گیا؟ رسول اللہ ﷺ کا دل ایسی باتوں سے پاک تھا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِۦٓ أَزْوَٰجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ ۚ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ۝﴾

''اور اپنی نگاہیں ہرگز ان چیزوں کی طرف نہ دوڑانا جو ہم نے ان میں سے مختلف لوگوں کو آرائش دنیا (کی خاطر) دے رکھی ہیں تاکہ انھیں اس میں آزمالیں تیرے رب کا دیا ہوا اس سے بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔''[1]

عورتیں سامان دنیا کی رونق ہیں مگر مطلقہ عورتوں میں وہ صورت کہاں اور پھر شادی شدہ عورتوں میں کیسے؟

فرمان الٰہی ہے:

﴿وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا ٱللَّهُ مُبْدِيهِ﴾

''اور آپ اپنے دل میں وہ بات چھپاتے تھے جسے اللہ ظاہر کرنے والا تھا۔''[2]

یعنی آپ ﷺ اس سے نکاح کا معاملہ دل میں چھپائے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں تھی جو بعد میں سامنے آتی۔ میں کہتا ہوں کہ اگر رسول اللہ ﷺ کے دل میں زینب رضی اللہ عنہا کی محبت ہوتی تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور ظاہر کر دیتا۔ یوں ہمیں یقین ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو بات دل میں چھپا رکھی تھی وہ ارادۂ نکاح ہی تھا۔ گمراہ لوگ جو کچھ

1 طٰهٰ 131:20۔ 2 الأحزاب 37:33۔

تصور کیے بیٹھے ہیں ویسا ہر گز نہیں تھا۔''[1]

شرع کا ارادہ تھا کہ منہ بولا بیٹا بنانے کے نظام اور اس کے نتائج کو بالکل باطل قرار دیا جائے اور اس رسم کے بطلان کی وضاحت عملی طور ہی پر ممکن تھی۔ یہ کام صرف یوں ممکن تھا کہ وہ شخصیت جو لوگوں کے لیے نمونہ ہے اس نئے حکم الٰہی کو عملی صورت میں پیش کرے۔ یوں زینب رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح رب حکیم کے حکم سے ہوا۔[2]

واقعۂ نکاح

سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کی عدت پوری ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید رضی اللہ عنہ سے فرمایا: «اِذْهَبْ فَاذْكُرْهَا عَلَيَّ» ''جاؤ اور اس کے پاس (نکاح کے لیے) میرا تذکرہ کرو۔'' حضرت زید رضی اللہ عنہ چل پڑے۔ جب ان کے ہاں پہنچے تو وہ آٹا گوندھ رہی تھیں۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جب میں نے زینب کو دیکھا تو میرے دل میں اس کی عظمت پیدا ہوگئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پیغام نکاح دیا ہے۔ یہ خیال آیا تو میں اسے نظر اٹھا کر دیکھ بھی نہ سکا۔ میں نے پیٹھ پھیر لی اور کہا: ''زینب تمھیں مبارک ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے تمھاری طرف بھیجا ہے وہ تمھیں پیغام نکاح دیتے ہیں۔'' وہ کہنے لگیں: ''میں اپنے رب سے مشورہ کیے بغیر کچھ نہیں کہوں گی۔'' وہ فوراً جائے نماز کی طرف گئیں، ادھر قرآن نازل ہوگیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجازت لیے بغیر اس کے پاس چلے گئے۔[3]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار سو درہم حق مہر دیا۔ اور مشہور روایت کے مطابق یہ نکاح 5 ھ میں ہوا۔ امام بیہقی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بنو قریظہ کے بعد زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا۔[4]

1 أحكام القرآن لابن العربي:1532,1531/3. 2 المفصل في أحكام المرأة لعبدالكريم زيدان: 476/11. 3 صحيح مسلم، حديث:1428، ومسند أحمد:195/3. 4 البداية والنهاية:147/4.

رسول اللہ ﷺ نے سیدہ زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح کے بعد اہتمام سے ولیمہ کیا۔ اس مقصد کے لیے آپ ﷺ نے ایک بکری ذبح کی اور ہر اس شخص کو دعوت دی گئی جو حضرت انس رضی اللہ عنہ کو ملا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کسی بیوی کے لیے ایسا ولیمہ کرتے نہیں دیکھا جیسا ولیمہ آپ ﷺ نے زینب رضی اللہ عنہا کے لیے کیا۔ آپ ﷺ نے ان کے ولیمے پر ایک بکری ذبح کی۔[1]

سبق آموز باتیں

① نبی اکرم ﷺ کی جانب سے سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کی طرف نکاح کا پیغام لے جانے والے ان کے پہلے خاوند حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما تھے۔ عین ممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے زید رضی اللہ عنہ کو اس کام کے لیے قصداً منتخب کیا ہو تاکہ ان بدطینت لوگوں کی زبان بند کر سکیں اور ان کے اس خیال کی تردید بھی ہو سکے کہ حضرت زید نے زینب کو اپنی مرضی سے طلاق نہیں دی تھی یا ان کے دل میں اس نکاح کو باقی رکھنے کی آرزو تھی۔ اس کے متعلق حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ''نکاح کا پیغام پہلا خاوند لا رہا ہے۔ یہ بات بڑی اہم ہے تاکہ کوئی یہ خیال نہ کرے کہ اس کی مرضی کے بغیر زبردستی طلاق ہوئی تھی۔ یہ اس امر کا امتحان بھی تھا کہ آیا زید کو سابقہ بیوی سے کچھ لگاؤ باقی ہے کہ نہیں۔''[2]

اس میں یہ حکمت بھی تھی کہ زوجین کی باہمی نفرت، اختلاف اور بالآخر طلاق کو ایک دوسرے کی خیر خواہی میں مانع نہیں ہونا چاہیے اخوت ایمانی کا لحاظ پھر بھی ہونا چاہیے۔

② اس سے متعلق نازل کردہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ پر عتاب فرمایا ہے۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کی شکایت کرتے اور انھیں طلاق دینے کی خواہش ظاہر کرتے تو آپ ﷺ کہتے: ''اللہ تعالیٰ سے ڈر اور طلاق دینے کا خیال چھوڑ دے۔''[3]

[1] صحیح البخاري، حدیث: 5168، وصحیح مسلم، حدیث: (90)-1428. [2] فتح الباري: 524/8. [3] الأحزاب 37:33.

جبکہ رسول اللہ ﷺ اپنے دل میں اللہ تعالیٰ کے پیغام کو چھپا رہے تھے کہ زید اسے طلاق دے دے گا اور وہ عنقریب آپ ﷺ کے نکاح میں ہوگی۔ آپ ﷺ اس بات سے ڈر رہے تھے کہ جب ایسا ہوگا تو لوگ کہیں گے: ''آپ نے اپنے متبنیٰ زید بن حارثہ کی بیوی سے شادی کر لی!''

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ شکایت لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے تو آپ ﷺ ان سے فرمانے لگے: ''اللہ سے ڈر اور اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھ۔'' حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اگر رسول اللہ ﷺ نے وحی میں سے کچھ چھپایا ہوتا تو یہ آیت ضرور چھپا لیتے۔[1] اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے اپنے پر نازل کردہ (وحی) میں سے کچھ چھپایا ہوتا تو یہ آیت ضرور چھپا لیتے۔[2]

الشیخ عبدالرحمٰن سعدی اسی آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے اسلام کی نعمت سے نوازا اور رسول اللہ ﷺ نے اسے آزاد کیا اور خود اس کی تعلیم و تربیت فرمائی۔ جب وہ آپ ﷺ کے پاس مشورہ لینے آیا کہ بیوی کو چھوڑ دوں تو آپ ﷺ نے اسے یوں نصیحت فرمائی کہ اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھو، اسے طلاق مت دو، تکلیف پر صبر کرو، عام معاملات میں بھی اور بالخصوص بیوی کے متعلق اللہ تعالیٰ سے ڈرو کیونکہ اللہ کا ڈر صبر کی تلقین کرتا ہے، جبکہ آپ ﷺ اپنے دل میں کچھ چھپا رہے تھے جسے اللہ تعالیٰ ظاہر فرما دینے والا تھا۔ آپ نے اپنے دل میں یہ بات چھپا رکھی تھی کہ اگر زید نے اسے طلاق دے دی تو آپ خود اس سے نکاح کر لیں گے۔''[3]

سید قطب رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ وہ چیز جسے نبی مکرم ﷺ نے اپنے دل میں چھپا رکھا تھا

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 7420. [2] صحيح مسلم، حديث: (288)-177، وجامع الترمذي، حديث: 3208، ومسند أحمد: 241/6. [3] تفسير السعدي: 154/3.

اور معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ اسے ظاہر کرنے والے ہیں وہ یہ تھا جو آپ ﷺ مستقبل میں کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ جبکہ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کی جانب سے صریح حکم نہ ملا تھا وگرنہ آپ ﷺ نہ تو اس معاملے میں تردد کرتے، نہ اسے موخر کرتے اور نہ اسے موخر کرنے کا ارادہ کرتے بلکہ آپ ﷺ متوقع انجام اور لوگوں کا سامنا کرنے سے بے خوف ہوکر اس کا اس وقت اظہار فرما دیتے۔ اب اللہ تعالیٰ نے اس کا اذن دیا اور بالآخر زید رضی اللہ عنہ نے زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق دے دی، نہ تو اسے کچھ علم تھا اور نہ زینب رضی اللہ عنہا کو کہ اس کے بعد کیا ہوگا۔ عرف عام میں زینب رضی اللہ عنہا زید بن محمد کی مطلقہ تھیں، جاہلیت کے رسم و رواج کے مطابق رسول اللہ ﷺ کے لیے حلال نہیں تھیں۔ [1]

③ حضرت زید کے لیے یہ بڑے شرف کی بات ہے جو صرف انھی کو حاصل ہوئی کہ قرآن مجید میں ان کے علاوہ کسی صحابی کا نام نہیں آیا۔ سہیلی کہتے ہیں: ''زید بن حارثہ کو زید بن محمد ہی کہا جاتا تھا، پھر ﴿ ادْعُوهُمْ لِآبَائِهِمْ ﴾ ''لے پالکوں کو ان کے (حقیقی) باپوں کی طرف نسبت کر کے بلاؤ۔'' [2] کا حکم نازل ہوا تو انھوں نے کہا: ''میں زید بن حارثہ ہوں۔'' لٰہذا جب ان سے یہ شرف لے لیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی پریشانی کا علم تھا۔ یوں انھیں خاص طور پر وہ شرف عطا کیا گیا جو اصحاب نبی میں سے کسی کو حاصل نہ تھا، یعنی قرآن پاک میں ان کا نام آیا۔ اب تو ان کا نام محرابوں میں تلاوت ہونے لگا۔ انھیں بڑی عظمت مل گئی۔ یہ سب محمد ﷺ کا بیٹا کہلانے کے اعزاز کا بدل اور دل جوئی کے طور پر تھا۔ دیکھیے ایک مرتبہ جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے کہا تھا:

«إِنَّ اللّٰهَ أَمَرَنِي أَنْ أَقْرَأَ عَلَيْكَ سُورَةَ كَذَا»

''اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمھیں فلاں سورت پڑھ کے سناؤں۔''

[1] تفسیر في ظلال القرآن لسید قطب:2869/5. [2] الأحزاب37:33.

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ مارے خوشی کے رو پڑے اور عرض کیا: ''کیا وہاں میرا تذکرہ ہوا ہے؟'' [1] وہ شخص جس کا نام ہمیشہ کے لیے قرآن کا حصہ بن جائے۔ اہل دنیا جب بھی قرآن مجید پڑھیں تو اس کے نام کی بھی تلاوت کریں، اس طرح اس کا نام ہمیشہ مومنوں کی زبان پر رہے، خاص طور پر رب العالمین کے ہاں ذکر ہوتا رہے کیونکہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا قدیم اور ازلی کلام ہے۔ ہمیشہ رہے گا۔ اس کو زوال نہیں۔ ایسا شرف تو انبیاء کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں تھا جو زید رضی اللہ عنہ کے حصے میں آیا۔ [2]

④ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کی شادی رب تعالیٰ کے حکم سے تھی۔ خود اللہ تعالیٰ نے یہ شادی کرائی تھی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِيٓ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللَّهَ وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَن تَخْشَىٰهُ ۖ فَلَمَّا قَضَىٰ زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنَٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِيٓ أَزْوَٰجِ أَدْعِيَآئِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ۚ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا ۝﴾

''اور (اے نبی! یاد کریں) جب آپ اس شخص (زید بن حارثہ) سے جس پر اللہ نے انعام کیا اور آپ نے بھی انعام کیا تھا، کہہ رہے تھے کہ تو اپنی بیوی (زینب) کو اپنے پاس رکھ اور اللہ سے ڈر اور آپ اپنے دل میں وہ بات (لے پالک کی مطلقہ سے نکاح) چھپاتے تھے جسے اللہ ظاہر کرنا چاہتا تھا اور آپ لوگوں سے ڈرتے تھے، حالانکہ اللہ زیادہ حق دار ہے کہ آپ اس سے ڈریں، پھر جب زید نے اس سے اپنی حاجت پوری کرلی تو ہم نے اس کا نکاح آپ سے کر دیا، تاکہ مومنوں کے لیے اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں (سے نکاح) میں کوئی حرج نہ رہے، جب وہ ان سے (اپنی) حاجت پوری کرلیں اور اللہ کا حکم تو (پورا) ہو کر

[1] صحیح البخاري، حدیث:3809، وصحیح مسلم، حدیث:799. [2] تفسیر القرطبي:194/14.

ہی رہتا ہے۔''[1]

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے لیے یہ بڑے شرف کی بات تھی۔ اسے وہ ہمیشہ بڑے فخر سے بیان کرتی تھیں۔ یہ فخر ان کے لائق بھی تھا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ حضرت زینب ازواج رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں فخر کیا کرتی اور کہتی تھیں: ''تمھارے نکاح تمھارے گھر والوں نے کیے جبکہ میری شادی اللہ تعالیٰ نے سات آسمانوں کے اوپر سے کی۔''[2]

ایک روایت میں ہے کہ حضرت زینب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے مقابلے میں فخر کرتی اور کہتی تھیں: ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے میرا نکاح آسمان میں کیا تھا۔''[3]

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو یہ عظیم رتبہ شاید اس لیے ملا تھا کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مولیٰ زید بن حارثہ سے نکاح کیا تھا۔ حالانکہ زینب رضی اللہ عنہا، زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کو پسند نہیں کرتی تھیں، تاہم جب انھیں معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حکم دے رہے ہیں تو انھوں نے رشتہ قبول کر لیا۔[4]

⑤ سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کا ولیمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی دلیل ہے۔ اس موقع پر دعوت کے کھانے میں اضافے کا معجزہ ظاہر ہوا تھا۔ اس ولیمے کے موقع پر امہات المومنین کے لیے حجاب کا حکم آیا اور مہمان نوازی کے آداب مقرر ہوئے۔[5]

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب زینب رضی اللہ عنہا سے شادی کی اور اپنی اہلیہ کے پاس گئے تو میری والدہ نے حیس (کھجور، گھی اور ستو سے تیار کردہ ڈش) بنا کر ایک برتن میں ڈالا اور کہنے لگیں: ''انس! یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے جاؤ اور عرض کرنا، یہ میری امی نے آپ کے لیے بھیجا ہے۔ وہ آپ کو سلام کہتی ہیں اور یہ بھی کہتی ہیں کہ اے اللہ کے رسول! ہماری جانب سے یہ ہدیہ قبول کیجیے۔''

1 الأحزاب37:33. 2 صحیح البخاري، حدیث: 7420. 3 صحیح البخاري، حدیث: 7421. 4 قضایا نساء النبي والمؤمنات لحفصة بنت عثمان الخلیفي، ص: 218. 5 قضایا نساء النبي والمؤمنات لحفصة بنت عثمان الخلیفي، ص: 218.

آپ ﷺ نے فرمایا: «ضَعْهُ» ''اسے رکھ دو۔'' پھر گویا ہوئے: «اِذْهَبْ، فَادْعُ لِي فُلَانًا وَّ فُلَانًا وَّمَنْ لَّقِيتَ» ''جاؤ، فلاں اور فلاں کو اور جو بھی تمھیں ملتا ہے، اسے بلا لاؤ۔'' آپ ﷺ نے کچھ لوگوں کے نام بھی لیے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا کہنا ہے کہ میں نے انھیں بلایا جن کا آپ ﷺ نے نام لیا تھا اور جو بھی مجھے ملا میں نے اسے بھی بلایا۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ''وہ افراد تقریباً کتنے تھے؟'' کہا: ''تقریباً تین سو۔'' رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: ''انس برتن لے آؤ۔'' اتنے میں اصحاب کرام رضی اللہ عنہم آگئے اور صفہ (چبوترہ) اور حجرہ دونوں بھر گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«لِيَتَحَلَّقْ عَشَرَةٌ عَشَرَةٌ وَّلْيَأْكُلْ كُلُّ إِنْسَانٍ مِّمَّا يَلِيهِ»

''دس دس کی ٹولیاں بنالو اور ہر شخص اپنے سامنے سے کھائے۔''

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں سب لوگ کھا کر سیر ہو گئے۔ ایک جماعت کھا کر چلی جاتی اور دوسری آجاتی، یہاں تک کہ سب نے کھا لیا، آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: «يَا أَنَسُ! ارْفَعْ» ''انس، برتن اٹھالو۔'' میں نے اٹھایا معلوم نہیں جب میں نے رکھا تھا اس وقت زیادہ تھا یا جب اٹھایا، اس وقت زیادہ تھا۔ کچھ لوگ رسول اللہ ﷺ کے گھر میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ آپ ﷺ تشریف فرما تھے۔ زوجہ محترمہ دیوار کی طرف منہ کیے بیٹھی تھیں۔ ان لوگوں کا دیر تلک بیٹھنا آپ ﷺ پر گراں گزرا۔ مروت بہت تھی۔ زبان سے کچھ نہیں کہا۔ گھر سے نکلے۔ کسی اور گھر چلے گئے۔ واپس آئے تو بیٹھے ہوئے لوگوں نے جب دیکھا کہ آپ ﷺ واپس آگئے ہیں اور سوچا کہ وہ آپ پر بوجھ بنے ہیں۔ تو سب دروازے کی طرف لپکے اور نکل گئے۔ آپ ﷺ تشریف لائے۔ پردہ لٹکا دیا اور اندر چلے گئے۔ میں اس وقت حجرے میں بیٹھا تھا۔ آپ ﷺ تھوڑی دیر بعد (پردے سے) میری جانب نکل آئے اور یہ آیت نازل ہوئی۔ آپ ﷺ باہر تشریف لے گئے اور لوگوں کو یہ آیت پڑھ کے سنائی:

﴿يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ وَلٰكِنْ اِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ ۭ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ ۡ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ ۭ وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْــَٔـلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَاۗءِ حِجَابٍ ۭ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ ۭ وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا ۭ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا ﴾

''اے ایمان والو! تم نبی کے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو الا یہ کہ تمھیں کھانے کے لیے اجازت دی جائے، نہ یہ کہ (وہاں جاکر) کھانا پکنے کا انتظار کرتے رہو اور لیکن جب تمھیں دعوت دی جائے تب تم داخل ہو جاؤ، پھر جب کھانا کھا چکو تو منتشر ہو جاؤ اور (وہیں) باتوں میں نہ لگے رہو، بلاشبہ تمھاری یہ روش نبی (ﷺ) کو تکلیف دیتی ہے، چنانچہ وہ تم سے شرماتے ہیں اور اللہ حق بات سے نہیں شرماتا اور جب تم ان (ازواج نبی) سے کوئی چیز مانگو تو پردے کے پیچھے سے مانگو، یہ بات تمھارے دلوں اور ان کے دلوں کے لیے زیادہ پاکیزہ ہے اور تمھارے لیے یہ جائز نہیں کہ تم اللہ کے رسول کو ایذا دو اور نہ یہ (جائز ہے) کہ تم ان (کی وفات) کے بعد کبھی ان کی بیویوں سے نکاح کرو، بے شک تمھارا یہ فعل اللہ کے نزدیک بہت بڑا (گناہ) ہے۔''[1]

جناب جعد (ابو عثمان جعد بن دینار یشکری، بصری حضرت انس رضی اللہ عنہ کے شاگردوں میں سے ہیں) کہتے ہیں: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے تھے: ''یہ آیات سب سے پہلے مجھے معلوم ہوئیں۔''[2] اور آیت اترتے ہی رسول اللہ ﷺ نے ازواج مطہرات کو

1 الأحزاب33:53,54. صحيح البخاري، حديث:5163، وصحيح مسلم، حديث:(95,94)، 1428، والسنن الكبرىٰ للنسائي: 136/6. 2 صحيح مسلم، حديث: (94)-1428، وجامع الترمذي، حديث:3218.

پردہ کرادیا۔

آیات حجاب کا نزول حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی موافقات میں سے تھا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت درج کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! برے بھلے سب لوگ آپ کی خدمت میں آتے ہیں، کاش! آپ امہات المومنین کو پردے کا حکم دیں۔'' اس پر اللہ تعالیٰ نے پردے کا حکم اتار دیا۔ [1]

مطلب یہ تھا کہ ازواج مطہرات اور غیر محرموں کے درمیان پردہ حائل ہونا چاہیے، جب یہ آیت اتری تو امہات المومنین کے باپ، بیٹوں اور رشتہ داروں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ہم بھی امہات المومنین سے پردے کی اوٹ سے بات چیت کریں؟ اللہ تعالیٰ نے جواباً فرمایا:

﴿لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِيْٓ اٰبَآئِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآئِهِنَّ وَلَآ اِخْوَانِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآءِ اِخْوَانِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآءِ اَخَوٰتِهِنَّ وَلَا نِسَآئِهِنَّ وَلَا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ ۚ وَاتَّقِيْنَ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا﴾

''عورتوں پر اپنے باپوں اور اپنے بیٹوں اور اپنے بھائیوں اور اپنے بھتیجوں اور اپنے بھانجوں اور اپنی عورتوں اور جن کے مالک ہوئے ہیں ان کے دائیں ہاتھ (ان کے سامنے آنے میں) کوئی گناہ نہیں اور (اے عورتو!) تم اللہ سے ڈرتی رہو، بے شک اللہ ہر چیز پر گواہ ہے۔'' [2]

ازواج مطہرات کے لیے بات چیت اور گھروں میں رہنے کے آداب کے متعلق ارشاد ہوا:

﴿يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝ وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا﴾

1 صحيح البخاري، حديث:4790. 2 الأحزاب55:33.

”اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو، اگر تم متقی و پرہیزگار ہو تو (کسی بھی غیر محرم سے) آہستگی و نرمی سے بات نہ کیا کرو کہ پھر وہ شخص، جس کے دل میں روگ ہو طمع و لالچ کرنے لگے اور تم سیدھی صاف اچھی بات (سختی سے) کہا کرو۔ اور تم اپنے گھروں میں ٹک کر رہو اور گزشتہ دورِ جاہلیت کی زیب و زینت کی نمائش کے مانند (اپنی) زیب و زینت کی نمائش نہ کرتی پھرو اور نماز قائم کرو اور زکاۃ دو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اے اہل بیت! بس اللہ تو چاہتا ہے کہ وہ تم سے ناپاکی دور کر دے اور تمھیں بالکل پاک صاف کر دے۔“[1]

جمہور مفسرین کا خیال ہے کہ اگرچہ یہ آیات ازواج مطہرات کے حق میں نازل ہوئی ہیں مگر ان کا حکم امت کی تمام عورتوں کے لیے ہے، البتہ ازواج رسول ﷺ (امہات المومنین) کو ان کے بلند مقام و مرتبے کی وجہ سے خصوصی حکم دیا گیا تھا۔[2]

امام قرطبی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ”اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ عورتیں عام طور پر گھروں میں رہیں۔ اگرچہ یہ خطاب نبی مکرم ﷺ کی ازواج کو ہے لیکن اس حکم میں دیگر خواتین بھی شامل ہیں۔ یہ ہم اس وقت بھی کہتے جب دیگر خواتین کو اس حکم کے مخاطبوں میں شامل کرنے کی کوئی خاص دلیل نہ ہوتی لیکن شریعت نے تو جابجا تمام عورتوں کو گھروں میں رہنے کا پابند کیا ہے، انھیں صرف اشد ضرورت کے پیش نظر ہی گھر سے نکلنا چاہیے۔“[3]

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنی موقر کتاب میں مسلمان خواتین کو حکم دیا ہے کہ بدن کے محاسن مثلاً سینہ، پیٹ، گردن، پنڈلی، بازو اور بال وغیرہ ڈھانپ کر رکھیں۔[4]

ام المومنین سیدہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا نے 20 ھ میں وفات پائی۔ ان کی عمر 53 برس تھی۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی پیش گوئی کے مطابق رسول اللہ ﷺ کی وفات

---

1 الأحزاب 33:32،33. 2 السيرة النبوية لأبي شهبة: 312/2. 3 تفسير القرطبي: 179/14.
4 السيرة النبوية لأبي شهبة: 312/2.

کے بعد امہات المومنین میں سے سب سے پہلے وفات پائی۔[1]

بقی بن مخلد کے مطابق ان کی روایت کردہ احادیث کی تعداد گیارہ ہے۔[2] کتب ستہ میں ان کے واسطے سے پانچ روایات درج ہیں۔[3] دو متفق علیہ ہیں۔[4] اس ضمن میں بھی انھوں نے امت مسلمہ کے لیے بہت اچھی یادیں چھوڑیں۔[5]

[1] الطبقات الكبرٰى لابن سعد: 115/8. [2] تلقيح الفهوم لابن الجوزي، ص: 370. [3] تحفة الأشراف للمزّي:1/321-323. [4] سير أعلام النبلاء: 121/2. [5] دورالمرأة في خدمة الحديث لآمال قرداش، ص: 85.

باب 2

غزوۂ احزاب کے بعد مسلمانوں کی جنگی پالیسی

رسول اللہ ﷺ پڑوس کی تمام طاقتوں پر نظر رکھے ہوئے اور دشمن کی حرکات وسکنات سے مکمل باخبر تھے۔ آپ ﷺ نے غزوۂ خندق کے بعد واضح کر دیا کہ اب مسلمانوں میں پیش قدمی کی طاقت پہلے سے بڑھ چکی ہے۔ آپ ﷺ نے مدینہ کے ارد گرد موجود باقی ماندہ طاقتوں کو زیر کرنے کے لیے تیاریاں شروع کر دیں۔ مستقبل میں قریش سے جنگ کرنے کے لیے ایسا اقدام لازمی اور سابقہ جنگ کا نتیجہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک ہی برس میں دو بڑی جنگیں لڑیں اور چار چھوٹے لشکر روانہ کیے۔ یہ سب ان کارروائیوں کے علاوہ ہے جو آپ نے پانچ ہجری کے اختتام پر کیں۔ آپ کا ارادہ تھا کہ قریش کا محاصرہ مزید سخت کر کے ان کی طاقت توڑ دی جائے اور یہ بھی مقصود تھا کہ قریش کے ان حلیفوں کے ہاتھ کاٹ دیے جائیں جو قریش کو مدد دے رہے تھے۔ [1]

رسول اللہ ﷺ نے احزاب کا راستہ روکا اور ان کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔ یہود بنو قریظہ کی تدابیر کو ناکام بنایا۔ یوں آپ ﷺ نے جو کامیابی حاصل کی اس کے اچھے نتائج سامنے آنے لگے۔ اب آپ نے اپنے مخالفین کے خلاف بھرپور محاذ کھول دیا۔ آپ نے قریش کی اقتصادی شہ رگ پر ہاتھ ڈالا، یعنی احزاب کی معاونت کرنے والوں کو سزا دینے کے لیے چند فوجی مہمات روانہ کیں، ان قبائل سے بدلہ لینے کے لیے بھی لشکر روانہ کیا

[1] دراسات في عهد النبوة للدكتور عبدالرحمن الشجاع، ص: 139۔

جنھوں نے مبلغین کو دھوکا دیا تھا یا جو اسلام کے خلاف علم عداوت بلند کیے ہوئے تھے۔
اس دوران اسلامی جنگی تحریک درج ذیل صورت میں سامنے آئی۔

بنوقرطاء کی طرف محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کی مہم

بت پرست بدوی گروہوں میں سے نجدی قبائل مسلمانوں کے خلاف سب سے زیادہ جرأت دکھاتے تھے۔ کیونکہ یہ لوگ بڑے جنگجو، طاقت ور اور خاصی تعداد میں تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہ نجدی قبائل احزاب میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے تھے۔ احزاب کی اصل قوت یہی شر پسند قبائل تھے۔ احزاب میں چھ ہزار جنگجو غطفان، اشجع، اسلم، بنوفزارہ اور بنواسد کے نجدی قبائل ہی سے تعلق رکھتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ جنگ احزاب کے بعد نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمن کو سبق سکھانے کے لیے جو پہلی مہم ارسال کی وہ انھی نجدی قبائل پر حملہ آور ہوئی تھی۔ بنوقرطاء ضریہ [1] کی جانب مدینہ سے سات راتوں کی مسافت پر قرطاء میں مقیم تھے۔ یہود بنوقریظہ سے فارغ ہونے کے بعد محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں تیس افراد پر مشتمل ایک جماعت کو بنوقرطاء پر شب خون مارنے بھیجا گیا۔ بنوقرطاء بنوبکر بن کلاب سے تعلق رکھتے تھے۔ [2]

یہ واقعہ دس محرم چھ ہجری کو پیش آیا۔ [3] محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے اچانک حملہ کیا اور ان کے دس آدمی قتل کر دیے جبکہ باقی بھاگ گئے۔ ان کے بہت سے اونٹ اور دیگر جانور غنیمت کے طور پر مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔

ثمامہ بن اُثال کی قید اور قبول اسلام: بنوقرطاء سے واپسی پر مسلمانوں نے بنوحنیفہ کے سردار ثمامہ بن اُثال حنفی کو قید کر لیا۔ صحابۂ کرام اسے جانتے نہیں تھے۔ وہ اسے پکڑ کر مدینہ منورہ لے آئے اور مسجد کے ستون سے باندھ دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور

---

1 ضریہ: بصرہ سے نجد جاتے ہوئے مکہ کے راستے میں واقع ایک آباد بستی کا نام ہے۔ 2 صلح الحديبية لمحمد أحمد باشميل، ص:241. 3 تاريخ الإسلام (المغازي) للذهبي، ص:351.

پوچھا: «مَاذَا عِنْدَكَ يَا ثُمَامَةُ؟» ''ثمامہ کیا کہتے ہو؟''

اس نے کہا: ''اچھی ہی بات کہتا ہوں۔ اگر آپ مجھے مار ڈالیں گے تو میرے خون کا بدلہ لیا جائے گا۔ اور اگر آپ احسان کریں گے تو شکر گزار پر احسان کریں گے۔ اگر آپ مال چاہتے ہیں تو مانگیں، دیا جائے گا۔'' یہ سن کر آپ ﷺ نے ثمامہ کو وہیں رہنے دیا۔ پھر دوسرے دن تشریف لائے اور پوچھا: «مَاذَا عِنْدَكَ يَاثُمَامَةُ؟» ''کیا کہتے ہو؟'' اس نے کہا: ''میں عرض کر چکا ہوں اگر آپ احسان کریں گے احسان کا بدلہ چکانے والے پر احسان کریں گے۔'' یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے اسے ویسے ہی چھوڑ دیا۔ پھر تیسرے دن آپ ﷺ نے اس سے پوچھا: «مَاذَا عِنْدَكَ يَاثُمَامَةُ؟» ''ثمامہ! کیا کہتے ہو؟'' اس نے کہا: ''میں عرض کر چکا ہوں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: «أَطْلِقُوا ثُمَامَةَ» ''ثمامہ کو چھوڑ دو۔'' وہ مسجد کے قریب ایک چشمے پر گیا غسل کیا، مسجد میں آیا اور کہنے لگا:

«أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللّٰهِ»

''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی سچا معبود نہیں اور بیشک محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔''

اس کے بعد ثمامہ کہنے لگے: ''اے محمد! ساری زمین پر آپ کے چہرے سے بڑھ کر میرے لیے قابل نفرت کوئی چہرہ نہ تھا مگر آج آپ کا چہرہ مجھے سب چہروں سے زیادہ محبوب ہے۔ اللہ کی قسم! آپ کے دین سے زیادہ مجھ کو کسی دین سے نفرت نہ تھی، اب آپ کا دین مجھے سب دینوں سے زیادہ پسند ہے۔ اللہ کی قسم! آپ کے شہر سے زیادہ مجھے کسی شہر سے نفرت نہ تھی، اب آپ کا شہر مجھے سب شہروں سے زیادہ محبوب ہے۔ آپ کے سواروں نے مجھے اس حال میں پکڑا تھا کہ میں عمرہ کی نیت سے جا رہا تھا، اب آپ کیا فرماتے ہیں؟'' رسول اللہ ﷺ نے ثمامہ رضی اللہ عنہ کو خوش خبری دی اور اور عمرہ ادا کرنے کی اجازت دی۔ جب ثمامہ رضی اللہ عنہ عمرہ کرنے مکہ پہنچے تو کوئی کہنے لگا: ''ثمامہ بے دین ہو گیا۔''

ثمامہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ”نہیں، میں تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا ہوں۔ یہ جان لو کہ یمامہ سے تمھیں گیہوں کا ایک دانہ بھی نہیں آئے گا جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجازت نہ دیں گے۔“[1]

ثمامہ رضی اللہ عنہ نے اپنی قسم پوری کر دکھائی اور انھوں نے اہل مکہ کے سرداروں کو مجبور کر دیا کہ وہ رشتہ داری کا واسطہ دے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کریں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ثمامہ کو لکھیں کہ وہ ہمیں غلہ اٹھانے کی اجازت دے دے۔[2] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمنی کے باوجود اپنی قوم کی یہ خواہش پوری کر دی اور بنو حنیفہ کے سردار ثمامہ رضی اللہ عنہ کو لکھ بھیجا کہ میری قوم اور ان کے غلے کے درمیان رکاوٹ نہ بنو، لہٰذا حضرت ثمامہ رضی اللہ عنہ نے اپنے پیغمبر کی بات تسلیم کی اور بنو حنیفہ کو غلہ جات مکہ ارسال کرنے کی اجازت دے دی۔[3]

ثمامہ رضی اللہ عنہ کی قید سے ماخوذ سبق آموز باتیں: ❁ کافر کو مسجد میں قید کرنے کا جواز۔

❁ کافر قیدی پر احسان کرنا بھی درست ہے۔ خطا کار سے درگزر کرنے کی بڑی اہمیت ہے۔

❁ اسلام قبول کرتے وقت غسل کرنا جیسا کہ ثمامہ رضی اللہ عنہ نے اسلام لاتے وقت کیا۔

❁ احسان بغض و کینہ ختم کرتا اور محبت پیدا کرتا ہے۔

❁ کافر کے لیے بھی یہی حکم ہے کہ جب وہ بھلائی کے کام کا ارادہ کرے، پھر اسلام قبول کر لے تو اسے نیکی کا کام کرنا چاہیے۔

❁ مصلحت کے پیش نظر قیدی سے اچھا سلوک کرنا چاہیے۔ بالخصوص جب قیدی کے مسلمان ہو جانے کی بھی امید ہو، خصوصاً جب اس کے مسلمان ہونے پر دوسرے بہت سے لوگ بھی مسلمان ہو جائیں۔

---

1 صحيح البخاري، حديث:4372، وصحيح مسلم، حديث:1764. 2 نضرة النعيم:330/1.
3 السيرة الحلبية:298/2.

❁ اسلام، مسلمان کے کردار کو یکسر تبدیل کر دیتا ہے حتیٰ کہ مسلمان اپنی تمام صلاحیتیں اسلام کے تابع کر لیتا ہے جیسا کہ ثمامہ رضی اللہ عنہ نے کیا۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر اہل مکہ کو گندم بھیجنا بند کر دیا۔

❁ مومن کو چاہیے کہ ایمان لاتے وقت سابقہ تمام معاملات ختم کر دے، کفر چھوڑتے وقت اس کے تمام تر متعلقات ترک کر دے اور ایمان لانے کے بعد رب العالمین کے جملہ احکام کا التزام کرے۔[1]

سیف البحر کی طرف ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کا سریّہ

سمندر کنارے ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا سریہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس جنگی حکمت عملی کا حصہ تھا جس کے تحت آپ دور دراز تک قریش کی اقتصادی ناکہ بندی کرنا اور اسے کمزور کر دینا چاہتے تھے، چنانچہ آپ نے حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو تین سو سواروں کے ساتھ ساحل کی طرف روانہ کیا تاکہ قریش کے ایک قافلے کا پتا چلائیں اور گھات لگائیں۔ دستہ رستے ہی میں تھا کہ زاد راہ ختم ہو گیا۔ حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے لشکر کے پاس موجود تمام زاد راہ اکٹھا کرنے کا حکم دیا۔ یہ کھجوریں تھیں۔ وہ روزانہ تھوڑا تھوڑا زادراہ دیتے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہر ایک کو ایک ایک کھجور ملنے لگی۔ لشکر کو انتہائی سخت حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ انھوں نے خندہ پیشانی اور کھلے دل سے حالات کا مقابلہ کیا۔ بلکہ انھوں نے انتہائی بدحالی میں اپنے قائد کا منصوبہ پورا کرنے میں مکمل تعاون کیا۔ تمام لوگ ایک ایک کھجور پر گزارا کر رہے تھے۔[2]

لشکر کے ایک سپاہی حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم کھجور کو بچوں کی طرح چوستے اور پانی پی لیتے تو وہ ہمیں ایک دن رات تک کے لیے کافی ہو جاتی۔[3]

---

1 صحیح السیرة النبویة لإبراهیم العلي، ص 387,38:0. 2 السرایا والبعوث النبویة للدکتور بریك بن محمد بریك، ص: 118. 3 شرح النووي: 13/84.

وہب بن کیسان نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ ایک کھجور سے کیسے گزارا چلتا ہوگا۔ انھوں نے کہا: ''جب وہ بھی نہ رہی تو ہم کو اس کی قدر معلوم ہوئی۔''[1]

سپاہیوں کو درختوں کے پتے کھانے پڑے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے ہم اپنی لاٹھی پتوں پر مارتے اور انھیں پانی میں تر کر کے کھا لیتے۔[2]

اسی لیے اس لشکر کا نام ''جیش الخبط'' (جھاڑے ہوئے پتے کھانے والا عسکری لشکر) پڑ گیا۔ اس صورت حال نے اس لشکر کے ایک فرد قیس بن سعد رضی اللہ عنہما پر گہرا اثر ڈالا جو دریا دل گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے لشکر کے لیے تین اونٹ ذبح کیے، پھر تین اونٹ ذبح کیے، پھر تین اونٹ ذبح کیے۔ اس کے بعد ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اسے منع کر دیا۔[3]

بھوک اور تنگی کی اسی حالت میں مبتلا تھے کہ سمندر نے بڑے زور کی لہر اچھالی جس میں اللہ تعالیٰ نے ایک بہت بڑی مچھلی نکال پھینکی۔ اس عجیب وغریب مچھلی کی ضخامت کے متعلق حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم سمندر کے کنارے سفر جاری رکھے ہوئے تھے کہ ہمارے سامنے بہت بڑے ٹیلے کی طرح کوئی چیز نمودار ہوئی۔ ہم اس کے پاس آئے تو دیکھا وہ عنبر نامی مچھلی تھی۔ پہلے تو حضرت ابوعبیدہ نے کہا: مردار ہے، پھر کہنے لگے کہ نہیں، ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرستادہ اور اللہ کے راستے میں ہیں اور اس وقت مجبور و مضطر بھی ہیں، لہٰذا کھاؤ۔ ہم ایک ماہ وہاں رہے، ہم تین سو آدمی تھے اور اسے کھا کھا کر موٹے ہو گئے۔ جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''ہم اس کی آنکھ کے گڑھے سے مٹکے بھر بھر کے چربی نکالتے۔ بیل کی جسامت جتنے گوشت کے ٹکڑے کاٹتے۔ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے ہم میں سے تیرہ آدمی اس کی آنکھوں کے گڑھے میں بٹھائے۔ انھوں نے اس کی ایک پسلی لی اسے کھڑا کیا تو ہمارے اونٹوں میں سے سب سے اونچا اونٹ (سوار سمیت) اس کے نیچے سے گزر گیا۔

1 صحيح البخاري، حديث: 4360، وصحيح مسلم، حديث: 1935. 2 شرح النووي: 84/13. 3 صحيح البخاري، حديث: 4361، وصحيح مسلم، حديث: (19)-1935.

ہم نے اس کے گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے زادِراہ کے طور پر ساتھ لے لیے۔ مدینہ پہنچے تو آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: «مَاحَبَسَكُمْ؟» ”تمھیں کس نے روک لیا تھا؟“ عرض کیا: ”ہم قریشی قافلوں کا پیچھا کر رہے تھے۔“

اسی طرح ہم نے آپ ﷺ کو اس (سمندری) جانور کے متعلق بھی بتایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «هُوَ رِزْقٌ أَخْرَجَهُ اللّٰهُ لَكُمْ، فَهَلْ مَعَكُمْ مِنْ لَّحْمِهٖ شَيْءٌ فَتُطْعِمُونَا» ”وہ تو اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے رزق نکالا تھا۔ تمھارے پاس اس میں سے کچھ ہو تو ہمیں بھی کھلاؤ۔“ چنانچہ ہم نے آپ ﷺ کی طرف وہ گوشت بھیجا تو آپ ﷺ نے بھی اسے تناول فرمایا۔[1]

راجح یہی ہے کہ یہ واقعہ صلح حدیبیہ سے پہلے کا ہے۔ ابن سعد کے مطابق یہ واقعہ 8 ھ رجب میں پیش آیا۔[2] ابن سعد کا بیان درست نہیں ہے۔

اس کے دو اسباب ہیں:

- رسول اللہ ﷺ نے حرمت والے مہینے میں کبھی جنگ نہ کی اور نہ لشکر روانہ کیا۔
- رجب 8 ھ صلح حدیبیہ طے پا جانے کے بعد کا وقت ہے۔ (اور رسول اللہ ﷺ کی طرف سے عہد شکنی ممکن نہیں۔)[3]

ابن سعد اور واقدی نے بیان کیا ہے کہ آپ ﷺ نے ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے اس لشکر کو جہینہ کے ایک قبیلے کی طرف بھیجا تھا۔[4] ابن حجر کہتے ہیں: ”یہ بات صحیح بخاری میں آنے والے واقعے کے خلاف نہیں ہے کیونکہ دونوں باتیں ممکن ہیں۔ آپ ﷺ نے انھیں قریش کے قافلے پر نظر رکھنے اور جہینہ قبیلے کی طرف (بیک وقت) بھیجا ہو۔ یہ بھی احتمال ہے کہ ان کا

1. صحيح البخاري، حديث:4362، وصحيح مسلم، حديث: 1935، وصحيح سنن النسائي للألباني: 910/3، وشرح النووي: 87/13. 2. الطبقات لا بن سعد: 132/2، والمغازي للذهبي، ص: 519. 3. المجتمع المدني للدكتور العمري، ص: 125. 4. المغازي للواقدي: 774/2، والسيرة النبوية للدكتور مهدي رزق الله، ص:480.

قافلے سے تعرض اس سے جنگ کے لیے نہیں بلکہ جہینہ سے بچانے کے لیے ہو۔ صحیح مسلم میں مذکورہ واقعے کے ضمن میں یہ الفاظ: ''رسول اللہ ﷺ نے ارضِ جہینہ کی طرف لشکر بھیجا.....'' اس تطبیق و جمع کی تائید کرتے ہیں۔''[1]

اس قصے میں کئی ایک اسباق و حکمتیں ہیں:

① حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی حکمت کہ انھوں نے تمام زادِ راہ اکٹھا کر لیا اور اسے مجاہدین میں برابر تقسیم کیا تاکہ وہ یہ مشکل گھڑی گزار سکیں۔ یہ وہ کام تھا جو انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے عملی طور پر سیکھا تھا۔

② مشکل وقت میں قیس بن سعد رضی اللہ عنہما کی سخاوت، حالانکہ ان دنوں ان کے پاس لوگوں کی مشکل حل کرنے کو کچھ نہ تھا۔ واقدی کی روایت ہے کہ حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہ نے یہ اونٹ جہینہ کے ایک شخص سے ادھار لیے تھے۔ انھیں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے یہ کہتے ہوئے روک دیا تھا: ''تیرے پاس (اس وقت) مال تو نہیں کیا تو اس طرح عہد شکنی کرنا چاہتا ہے۔''[2]

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا ارادہ ان کے ساتھ نرمی کا تھا۔[3]

حضرت قیس رضی اللہ عنہ تو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے منع کرنے تک برابر ذبح کیے جا رہے تھے۔ جب انھیں ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے روکا تو کہنے لگے: ''اے ابوعبیدہ! کیا آپ کا خیال ہے کہ جو ابوثابت لوگوں کے قرض اتارتا ہے، ان کے بوجھ (اپنے اوپر) لاد لیتا ہے، بھوک میں کھانا کھلاتا ہے وہ اللہ کے رستے میں جہاد کرنے والوں کے لیے کھجوروں کی ادائیگی ہی نہ کرے گا؟''

---

1 صحيح مسلم، حديث: 1935، وفتح الباري لابن حجر: 78/8، مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ نے لکھا ہے: ''یہ لشکر ارضِ جہینہ کی طرف بھیجا'' اس کا مطلب یہ نہیں کہ مقصود ارضِ جہینہ پر حملہ تھا بلکہ اصل مطلوب قریش کا تجارتی قافلہ ہی تھا۔ (منة المنعم: 308/3) 2 من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 323، والسرايا والبعوث النبوية للدكتور بريك بن محمد بريك، ص: 119. 3 السرايا والبعوث النبوية للدكتور بريك بن محمد بريك، ص: 119.

قیس رضی اللہ عنہ نے ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو یہ بات اس لیے کہی تھی کہ قیس نے جہینہ کے ایک شخص سے سودا کر لیا تھا کہ اس سے لشکر کے لیے کچھ اونٹنیاں خریدیں گے جن کے بدلے میں اسے کھجوریں دیں گے۔ جہینہ کے شخص نے یہ بیع قبول کر لی تھی۔

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے ان کے بیٹے قیس کو اس لیے منع کر دیا ہے کہ اس کے پاس مال نہیں بلکہ مال تو اس کے باپ کا ہے تو سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے اسی وقت اپنے بیٹے کو چار باغ دے دیے جن میں سب سے کمتر باغ سے ساٹھ وسق کھجوریں حاصل کی جاتی تھیں۔[1]

③ اس سریّے میں مسلمانوں کو شدید بھوک لگی۔ سفر اور مشقت کے باوجود دن بھر میں ایک آدمی کو ایک کھجور میسر تھی۔ بعد میں انھیں وہ کھجور بھی میسر نہ رہی اور نوبت پتے کھانے تک پہنچ گئی۔ اس کے باوجود جہینہ قبیلے کا وہ شخص جس سے قیس رضی اللہ عنہ نے اونٹ خریدے تھے، یا اس کی قوم کے پاس سے مسلمانوں کا گزر ہوتا ہے مگر ان کے دل میں یہ خیال بھی پیدا نہیں ہوتا کہ ان پر حملہ کر کے ان سے کھانے کی اشیاء چھین لیں جیسا کہ جاہلیت میں ہوتا تھا۔ کیونکہ آج وہ اللہ تعالیٰ کے اس دین کے ہمراہ چل رہے تھے جو لوگوں کے جان و مال محفوظ کرنے آیا تھا۔ آج وہ حلال و حرام میں تمیز کر رہے تھے جسے انھوں نے رب العالمین کے منہج و طریق سے سیکھا تھا۔[2]

④ یہ قصہ آبی مردار کے کھانے کے جواز اور اس چیز پر بھی دلالت کرتا ہے کہ آبی مردار اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ذکر کردہ مردار جانور میں شامل نہیں:

﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَأَنْ تَسْتَقْسِمُوا بِالْأَزْلَامِ ذَٰلِكُمْ فِسْقٌ ۗ الْيَوْمَ يَئِسَ

[1] من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 323، وشرح الزرقاني: 282/2. [2] من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 324.

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ۚ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○﴾

’’تمھارے لیے حرام کیے گئے ہیں مردہ جانور، خون، سؤر کا گوشت اور وہ جانور جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے اور گلا گھٹنے سے مرجانے والا، چوٹ لگ کر مرنے والا، اوپر سے گر کر مرجانے والا، کسی کا سینگ لگ کر مرنے والا اور وہ جانور بھی جسے درندے کھا جائیں، سوائے اس کے جسے تم ذبح کرلو اور وہ جانور جو آستانوں پر ذبح کیا جائے اور یہ کہ تم فال کے تیروں سے قسمت معلوم کرو، یہ سب گناہ (کے کام) ہیں۔ آج وہ لوگ ناامید ہوگئے جنھوں نے تمھارے دین کا انکار کیا، لہٰذا تم ان سے نہ ڈرو اور مجھی سے ڈرو، آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کردیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کردی اور تمھارے لیے اسلام کو دین کے طور پر پسند کرلیا، پس جو شخص بھوک سے بے بس ہو جائے جبکہ وہ گناہ پر مائل ہونے والا نہ ہو تو یقیناً اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔‘‘ [1]

نیز ارشاد فرمایا:

﴿اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ ۚ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ○﴾

’’تمھارے لیے سمندر کا شکار اور اس کا کھانا حلال کیا گیا ہے، یہ تمھارے اور مسافروں کے فائدے کے لیے ہے۔ اور جب تک تم احرام کی حالت میں ہو، تمھارے لیے خشکی کا شکار حرام کیا گیا ہے۔ اور تم اللہ سے ڈرتے رہو جس کی طرف تم اکٹھے کیے جاؤ گے۔‘‘ [2]

1 المآئدة 5:3. 2 المآئدة 5:96.

حضرت ابوبکر، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم اور صحابہ کی ایک جماعت سے صحیح سند سے مروی ہے کہ ﴿صَيْدُ الْبَحْرِ﴾ سے مراد وہ آبی جانور ہے جو دریا سے یا سمندر وغیرہ سے شکار کیا گیا ہو اور ﴿وَطَعَامُهُ﴾ سے مراد وہ بحری جانور ہے جو پانی ہی میں مر گیا ہو۔

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے سنن میں مرفوعاً اور موقوفاً مروی ہے:

«أُحِلَّتْ لَنَا مَيْتَتَانِ وَدَمَانِ، فَأَمَّا الْمَيْتَتَانِ: فَالسَّمَكُ وَالْجَرَادُ، وَأَمَّا الدَّمَانِ: فَالْكَبِدُ وَالطِّحَالُ»

''ہمارے لیے دو مردار اور دو خون حلال ہیں۔ دو مردار تو مچھلی اور ٹڈی [1] ہیں اور دو خون جگر اور تلی ہیں۔'' [2]

یہ موقوف بھی مرفوع کے حکم میں ہے کیونکہ صحابہ کا یوں کہنا: ''ہمارے لیے حلال کیا گیا یا ہم پر حرام کیا گیا۔'' اس کا مطلب یہی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حلال یا حرام کیا ہے۔ [3]

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس مچھلی کا گوشت کھانا جس کو مسلمان کئی دن تک کھاتے رہے، آبی مردار کے حلال ہونے کی دلیل بھی ہے۔ [4]

اسی طرح مفتی کے لیے مستحب ہے کہ جن بعض مباح اشیاء میں فتویٰ طلب کرنے والے کو شک گزر رہا ہو تو مفتی خود انھیں اپنائے بشرطیکہ اس میں مفتی کے لیے کوئی مشقت نہ ہو، خصوصاً جبکہ اس میں فتویٰ طلب کرنے والے کے لیے اطمینان کا پہلو بھی ہو۔ یہ امام نووی کا قول ہے۔ [5]

چند احکام جنھیں امام نووی نے بیان کیا ہے درج ذیل ہیں:

---

1 ایک پردار کیڑا جو زراعت کو نقصان پہنچاتا ہے۔ گزشتہ زمانے میں عام تھا۔ اسے مچھلی کی طرح بغیر ذبح کیے کھایا جاتا ہے۔ 2 مسند أحمد: 97/2، وسنن ابن ماجه، حديث: 3218، وسنن الدارقطني: 272,271/4. 3 السرايا والبعوث النبوية للدكتور بريك بن محمد بريك، ص: 123. 4 السيرة النبوية للدكتور مهدي رزق الله، ص: 480. 5 شرح النووي: 86/13.

امام نووی رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جن سے جنگ ہو ان کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنا، ان پر اچانک حملہ کرنا، ان کے اموال قبضے میں کرنا اور بطور غنیمت حاصل کرنا درست ہے۔

لشکر کا امیر ایسا ہو جو انھیں منظم کر سکے۔ اور تمام لشکر والے اس کے احکامات تسلیم کرتے ہوں۔ یہ بھی چاہیے کہ ان کا امیر ان سے افضل ہو۔

علماء کا یہ بھی خیال ہے کہ جماعت خواہ تھوڑی ہی ہو انھیں اپنے اوپر ایک امیر مقرر کر لینا چاہیے اور اس کی اطاعت بھی کرنی چاہیے۔

ہمارے اصحاب (شوافع) اور دیگر علماء کا بھی خیال ہے کہ مسافروں کی جماعت کو چاہیے اپنے زاد راہ ملا لیا کریں تا کہ کھانا ان کے لیے زیادہ برکت کا باعث ہو۔

بعض افراد کو دوسروں سے الگ ہو کر نہیں کھانا چاہیے۔ واللّٰہ أعلم۔[1]

دومۃ الجندل کی جانب عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا سریہ

جزیرۃ العرب میں نبوی لشکر جن دور دراز مقامات تک پہنچے یہ ان میں سب سے دور جانے والا لشکر تھا۔ دومۃ الجندل اس وقت کے شام کی سرحد کے قریب ہے اور دمشق سے اس کی جتنی مسافت ہے اس سے تین گنا مدینہ سے ہے۔ یہ مقام عرب کے صحرائے نفود کے عین درمیان روم اور جزیرہ نمائے عرب کے درمیان تعلق کا ذریعہ تھا۔ اس کے باسی کلب قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ عیسائی روم کے پڑوس اور ان سے متاثر ہونے کی وجہ سے یہاں کے تمام باشندے عیسائیت میں داخل ہو گئے تھے۔ یہ لشکر گویا رومی سلطنت کے ساتھ ٹکراؤ کے نبوی منصوبے کا ایک حصہ تھا۔

اس لشکر کے امیر عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ آپ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں اسلام قبول کیا اور آغاز ہی سے دعوتِ اسلامیہ کے اہم ستونوں میں

[1] شرح النووي: 13/86.

سے ایک ستون رہے۔ اس لشکر کشی کے دو نمایاں پہلو تھے:

① دعوتی نقطۂ نظر ② جنگی نقطۂ نظر

اس لیے آپ ﷺ نے اس کے لیے عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا انتخاب فرمایا جو ابتدائے اسلام ہی سے خالصتاً اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق تربیت یافتہ تھے۔[1]

اس جنگ کے متعلق عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو بلا بھیجا اور فرمایا: «تَجَهَّزْ فَإِنِّي بَاعِثُكَ فِي سَرِيَّةٍ فِي يَوْمِكَ هٰذَا أَوْ مِنْ غَدٍ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ» ”تیاری کرلو میں تمھیں آج یا کل جنگ پر روانہ کرنے والا ہوں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔“

ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں یہ گفتگو میں نے بھی سن لی۔ میں نے دل میں کہا: ”میں یہاں ہی رہوں گا اور صبح نماز آپ ﷺ کے ساتھ ادا کروں گا اور عبدالرحمٰن بن عوف کے لیے آپ ﷺ کی وصیت لازمی طور پر سنوں گا۔“

ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: ”صبح ہوئی، میں نے نماز پڑھی اور دیکھا کہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما اور کئی مہاجرین بھی وہاں موجود تھے۔ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے انھیں حکم دے رکھا تھا کہ راتوں رات دومۃ الجندل کی طرف روانہ ہو جاؤ اور انھیں اسلام کی طرف دعوت دو۔ آپ ﷺ نے عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے پوچھا: «مَا خَلَّفَكَ عَنْ أَصْحَابِهِ؟» ”تمھیں تمھارے ساتھیوں سے کس چیز نے پیچھے کر دیا؟“

ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ان کے ساتھی فجر سے پہلے ہی جا چکے تھے اور جرف مقام پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ وہ سات سو آدمی تھے۔ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول! میں چاہتا تھا کہ لباسِ سفر پہن کر سب سے آخر میں آپ سے ملوں۔“

ابن عوف رضی اللہ عنہ نے سر پر پگڑی لپیٹ رکھی تھی۔ آپ ﷺ نے انھیں پاس بلایا۔ اپنے

[1] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 4/ 168,167.

سامنے بٹھایا اور اپنے ہاتھ سے پگڑی کھول دی، پھر انھیں اپنی سیاہ پگڑی پہنائی اور پگڑی کا شملہ دونوں کندھوں کے درمیان لٹکاتے ہوئے فرمایا: «هٰكَذَا فَاعْتَمَّ يَا ابْنَ عَوْفٍ» ''ابن عوف! اس طرح پگڑی پہنا کرو۔''

ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ابن عوف رضی اللہ عنہ گردن میں تلوار لٹکائے ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (وصیت کرتے ہوئے) فرمایا:

«أُغْزُ بِاسْمِ اللّٰهِ، وَفِي سَبِيلِ اللّٰهِ، فَقَاتِلْ مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ، لَا تَغُلَّ وَلَا تَغْدُرْ، وَلَا تَقْتُلْ وَلِيدًا»

''اللہ تعالیٰ کے نام سے جنگ کرو اور اس کی راہ میں، پس جو کوئی اللہ تعالیٰ کا انکار کرے اس سے لڑو، (دیکھو) نہ خیانت کرنا، نہ بدعہدی کرنا اور نہ کسی بچے کو قتل کرنا۔''

ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دست مبارک پھیلایا اور ارشاد فرمایا:

«يَا أَيُّهَا النَّاسُ! اِتَّقُو خَمْسًا قَبْلَ أَنْ يَّحِلَّ بِكُمْ: مَا نَقَصَ مِكْيَالُ قَوْمٍ إِلَّا أَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِالسِّنِينَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ، وَمَانَكَثَ قَوْمٌ عَهْدَهُمْ إِلَّا سَلَّطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ عَدُوَّهُمْ وَمَامَنَعَ قَوْمٌ الزَّكَاةَ إِلَّا أَمْسَكَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ قَطْرَالسَّمَاءِ، وَلَوْلَا الْبَهَائِمُ لَمْ يُمْطَرُوا، وَمَا ظَهَرَتِ الْفَاحِشَةُ فِي قَوْمٍ إِلَّا سَلَّطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الطَّاعُونَ، وَمَا حَكَمَ قَوْمٌ بِغَيْرِ آيِ الْقُرْآنِ إِلَّا أَلْبَسَهُمُ اللّٰهُ شِيَعًا وَّأَذَاقَ بَعْضَهُمْ بَأْسَ بَعْضٍ»

''اے لوگو! پانچ باتوں سے بچو اس سے پہلے کہ وہ تمھیں آلیں: ''جس قوم نے ناپ تول میں کمی کی اللہ نے اسے قحط سالی اور پیداوار کی کمی کا شکار کر دیا تاکہ وہ اس عمل سے پلٹ جائیں۔ جس قوم نے اپنا عہد توڑا اللہ نے اس پر ان کا دشمن

مسلط کر دیا۔ جس قوم نے زکاۃ روک لی اللہ نے ان پر بارش روک دی۔ اگر جانور نہ ہوں تو انھیں بارش کا ایک قطرہ بھی نہ ملے۔ جس قوم میں بے حیائی (بدکاری) عام ہو جائے ان پر اللہ تعالیٰ طاعون مسلط کر دیتا ہے۔ اور جو لوگ قرآن حکیم کی آیات کے بغیر فیصلے کرنے لگتے ہیں انھیں اللہ تعالیٰ گروہوں میں تقسیم کر دیتا ہے اور خانہ جنگی سے دوچار کر دیتا ہے۔''[1]

اس کے بعد عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ چل پڑے اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ دومۃ الجندل پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر وہاں کے باسیوں کو اسلام کی دعوت دی۔ تین دن دعوت دیتے رہے۔ تیسرا دن تھا کہ ایک عیسائی سردار اصبغ بن عمرو کلبی مسلمان ہو گیا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر پہنچائی اور جہینہ کا ایک آدمی رافع بن مکیث بھی ساتھ بھیجا اور یہ بھی لکھا کہ میں ان میں شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً لکھا کہ تماضر بنت اصبغ سے شادی کرنا۔ ابن عوف نے وہیں تماضر سے شادی کی۔ واپس آئے تو وہ ام ابی سلمہ کے نام سے پکاری گئیں۔ واقدی نے بیان کیا ہے کہ یہ غزوہ شعبان 6 ھ میں واقع ہوا۔[2]

سبق آموز باتیں

① نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنے ساتھیوں کے ساتھ شفقت: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا مبارک عمامہ ابن عوف رضی اللہ عنہ کو پہنایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے یہ خاطر مدارات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حوصلے بڑھاتی اور انھیں دین کی مزید خدمت پر آمادہ کرتی تھی۔ قائد اور اس کے ماتحتوں میں اخوت کامیابی کی ضمانت ہے۔

② عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا یہ لشکر عقیدے کی اصلاح اور اسلام کی بنیادی تعلیمات

---

[1] دلائل النبوة للبيهقي: 85/4، اس روایت کا آخری حصہ سنن ابن ماجہ میں بھی حسن سند سے مروی ہے۔(سنن ابن ماجه، حديث:4019) [2] المغازي للواقدي:561,560/2.

سکھانے نکلا اور لق و دق صحرا کی وسعتوں میں اللہ کا پیغام پہنچانے گیا تھا۔ یہ لشکر مقاصدِ جہاد کی تکمیل کا ذریعہ بنا تھا۔

مسلمانوں کی جنگ اللہ تعالیٰ کے منکروں سے ہے چاہے وہ کوئی بھی ہوں۔ یہ جنگ جاہلیت کے طرز اور اصولوں پر نہیں ہوتی جیسا کہ اس شعر میں جاہلیت کی جنگوں کا ذکر ہوا ہے:

وَأَحْيَانًا عَلٰى بَكْرٍ أَخِينَا

إِذَا مَا لَمْ نَجِدْ إِلَّا أَخَانَا

''جب ہم اس اپنے بھائی کے علاوہ کسی اور کو نہ پائیں تو کبھی کبھی ہم اپنے بھائی بکر ہی پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔''

تاہم اسلام کا مضبوط لشکر زمین پر صرف اس لیے پیش قدمی کرتا ہے کہ اللہ کے منکروں سے نبرد آزما ہو۔[1]

③ رسول اللہ ﷺ نے عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو خیانت، یعنی قبل از تقسیم مال غنیمت میں سے کچھ لینے سے منع فرمایا۔ بچوں کو قتل کرنے سے منع کیا۔ یہ جہاد میں اسلامی آداب کا ایک نمونہ ہے۔ جنگ میں عموماً ظلم و ستم ڈھایا جاتا ہے۔ لیکن ان مسلمانوں کے نزدیک جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے خیانت اور حسد سے پاک رکھا ہے۔ یہی جنگ حق کو غالب کرنے اور باطل کو دبانے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ وہ صرف حق کو غالب کرتے، اہل حق کی مدد کرتے اور ظالم کو ظلم سے روکتے ہیں۔ جہاد اسلامی اخلاقِ عالیہ کا حامل ہے۔ یہ اخلاق انسان کو قوت دیتے اور اس میں نرمی اور رحم دلی کے اوصاف پیدا کرتے ہیں۔[2]

④ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ امت کے مایہ ناز افراد میں سے ایک اور اسلام کے سرگرم مبلغ تھے۔ آپ نہایت رحم دل، دانا، تعلیم یافتہ، تجربہ کار اور عظیم انسان تھے۔ سابقین اولین میں

1 التربية القيادية للدكتور الغضبان: 4/172. 2 التاريخ الإسلامي للحميدي: 6/184.

شامل تھے۔ اسلام کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ بڑے نرم خو، پرسکون اور لوگوں کی دلی کیفیات کا اندازہ لگانے والے تھے۔ اسلام کی خاطر انھوں نے بڑی محنت کی اور ان کی محنت رنگ لائی۔

⑤ دومۃ الجندل میں ابن عوف رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بنو کلب کے سردار اصبغ بن عمرو کا قبول اسلام ہمیں جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی یاد دلاتا ہے۔ ان کے ہاتھ پر شاہِ حبشہ نجاشی اسلام لایا تھا۔ مدینہ میں مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر سردارانِ اوس و خزرج نے اسلام قبول کیا تھا۔ یہ تینوں جلیل القدر اصحاب اسلام کے اولین حدی خواں تھے۔ آپ مکہ مکرمہ کی پہلی اسلامی دانش گاہ کے بانیوں میں شمار ہوتے تھے۔

غزوۂ احد میں عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو اکیس زخم آئے۔ بعض زخم اتنے کاری تھے کہ ان کے اثر سے چال میں لنگڑا پن آ گیا تھا۔ اب جزیرۃ العرب کے شمال میں اپنے لشکر کے ہمراہ اسلام کا نیا مرکز قائم کر رہے تھے۔ لشکر میں بڑی تعداد میں لوگ اسلام قبول کر کے شامل ہو رہے تھے تا کہ بالآخر دومۃ الجندل اسلام کا ایک نیا مرکز بن جائے۔ کیونکہ مسلمانوں کے پاس مستقبل قریب میں اسلام کے دشمن عرب اور روم سے دور دراز جنگ کرنے کے لیے اس سے بہتر قلعہ اور کوئی نہیں تھا۔[1]

یہ پہلا موقع تھا کہ اسلام اپنی حدود سے باہر عیسائی حدود میں اپنے احکام کا نفاذ کر رہا تھا اور دومۃ الجندل میں مسلمان اور عیسائی ایک ہی حکومت کے زیر سایہ زندگی بسر کرنے لگے تھے۔

مسلمانوں پر اسلامی احکام نافذ ہوتے اور عیسائیوں سے جزیہ وصول کیا جاتا تھا، یہ مستقبل میں نئے معاشرے کے قیام کے لیے صحابۂ کرام کی مشق تھی۔ عراق و شام اور فارس و روم میں انھیں ایسے معاشرے سے واسطہ پڑنے والا تھا جسے انھوں نے یہ باور کرانا

[1] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 4/ 174.

تھا کہ عقیدہ باہمی گفت وشنید سے قرار پکڑتا ہے نہ کہ طاقت وتلوار سے۔ اسلامی اصولوں میں ذاتی طور پر اتنی قوت ہے کہ وہ تاریکی میں ڈوبے ہوئے معاشروں کو روشنی سے ہمکنار کرسکیں۔[1]

⑥ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا دومۃ الجندل کے رئیس اور بنوکلب کے سردار کی بیٹی سے نکاح دومۃ الجندل میں نئے مسلمان لیڈر اور مدینہ منورہ کی اسلامی حکومت کے روابط کو مزید مستحکم کر رہا تھا۔ یہ نیا رابطہ دومۃ الجندل کے ایک اسلامی ریاست میں بدل جانے کا اور ان کے لیڈر کے اسلام کی چھاؤں میں آنے کا پیش خیمہ تھا کیونکہ اس کے دل کا ٹکڑا مملکت اسلامیہ کے دارالحکومت مدینہ منورہ میں تھا۔[2]

خود رسول گرامی صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلامی قیادت قبائل کے رؤسا سے رشتہ داری قائم کرنے کے خواہاں رہتے تھے کیونکہ یہ امر اسلامی دعوت کے لیے بڑا مفید اور سودمند تھا۔ سسرالی رشتہ قرب، اسبابِ عداوت کو جڑ سے اکھیڑنے اور بالآخر اسلام میں داخلے کا سبب بنتا ہے۔[3]

غزوۂ بنولحیان

غزوۂ خندق کے بعد مسلمان دفاعی پوزیشن سے پیش قدمی کی پوزیشن میں آ چکے تھے۔ اب وہ اقدام کرنے پر قادر تھے اور پورے عرب میں قیادت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے تھے۔ بنولحیان کو سبق سکھانے کا وقت آ گیا تھا۔ جنھوں نے رجیع کے دن حضرت خبیب رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں سے دھوکا کیا تھا، لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم ربیع الاول یا جمادی الاولی چھ ہجری میں دوسو صحابہ کے ساتھ روانہ ہوئے۔[4]

دشمن کو رسوا کرنا: بنولحیان مدینہ منورہ سے دوسو میل سے زیادہ دوری پر تھے۔ راہ کٹھن تھی۔ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان گھٹیا قبائل سے جن کے ہاں ایفائے عہد کی کوئی قدر وقیمت نہیں

1 التربية القيادية للدكتور الغضبان: 174/4. 2 التربية القيادية للدكتور الغضبان: 174/4.
3 التاريخ الإسلامي للحميدي: 186/6. 4 السيرة النبوية للدكتور مهدي رزق الله، ص: 468.

تھی، ان صحابہ کا ہر صورت بدلہ لینا چاہتے تھے جنھیں انھوں نے دھوکا دہی سے شہید کر دیا تھا۔ نبی مکرم ﷺ نے اس حملے کو خفیہ رکھنے کے لیے پہلے شمال کی طرف پیش قدمی فرمائی اور شام پر حملہ کرنے کا ارادہ ظاہر فرمایا۔ بنولحیان جنوب میں رہائش پذیر تھے۔ صحابہ کرام کو بھی جنوب کی طرف گھومنے سے پہلے علم نہ تھا کہ آپ ﷺ بنولحیان پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ آپ ﷺ انھیں لے کر دشمن پر بڑی عمدگی سے کاری ضرب لگانے کے لیے عین شمال میں بیس میل تک گھستے گئے۔

''بتراء'' نامی جگہ سے آپ ﷺ شمال سے جنوب کی جانب مڑے۔ وہاں سے مغرب کو ہوتے ہوئے لشکر کو سیدھا جنوب کی سمت ڈال دیا۔[1]

نبی مکرم ﷺ کے پہنچنے سے پہلے بنولحیان کا فرار: بنولحیان انتہائی چوکس تھے۔ انھوں نے جاسوس راہوں میں پھیلا رکھے تھے۔ آپ ﷺ کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی یہ لوگ بھاگ گئے اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر چلے گئے۔ رسول اللہ ﷺ جب لشکر سمیت وہاں پہنچ گئے تو ان کے گھروں میں پڑاؤ ڈالا اور صحابہ کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں ان دھوکے بازوں کی سرکوبی کے لیے روانہ کیں تاکہ جو مل سکے اسے پکڑ لائیں۔ دو دن تک آپ ﷺ کے بھیجے ہوئے گروہ انھیں تلاش کرتے اور بھگاتے رہے۔ مگر ان بلند ترین پہاڑوں کی چوٹیوں میں پناہ گزینوں کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ آپ ﷺ ان کی سرزمین پر ان کے گھروں میں انھیں مرعوب کرنے اور چیلنج کرنے کے لیے دو دن رہے تاکہ دشمن کو مسلمانوں کی قوت اور خوداعتمادی کا اندازہ ہو اور یہ بھی کہ مسلمان جب چاہیں دشمن تک پہنچنے کی قوت رکھتے ہیں۔[2]

مکہ مکرمہ میں دشمن کو مرعوب کرنا: رسول اللہ ﷺ لشکر سمیت مکہ کے قریب تھے۔ آپ ﷺ نے اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا، چنانچہ طے پایا کہ مکہ میں مشرکین کو بھی

[1] صلح الحدیبیة لمحمد أحمد باشمیل، ص: 35,34. [2] صلح الحدیبیة لمحمد أحمد باشمیل، ص: 35,34.

دھمکی سے مرعوب کیا جائے۔ آپ ﷺ نے لشکر کے ساتھ وادی عسفان میں پڑاؤ ڈال دیا۔ (مکہ، مدینہ کے راستے میں مکہ سے تقریباً دو دن کی مسافت پر ایک بستی ہے) وہاں آپ ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بلا کر دس شہسوار صحابہ دیے اور کہا کہ انھیں لے کر مکہ کی طرف بڑھو تا کہ اہل مکہ کے دلوں میں خوف و ہراس پیدا ہو، چنانچہ ابوبکر رضی اللہ عنہ انھیں لے کر ''کراع الغمیم'' (مکہ سے 64 کلومیٹر کے فاصلے پر اور عسفان سے 8 میل کے فاصلے پر) پہنچ گئے۔ قریش نے ان کی آمد کے متعلق سنا تو خیال کیا کہ آپ ﷺ ان پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ انھیں انتہائی خوف، ڈر اور گھبراہٹ لاحق ہوئی۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو جو ذمہ داری رسول اللہ ﷺ نے سونپی تھی اس کا مقصود بھی یہی تھا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ دس ساتھیوں کے ہمراہ جب ''کراع الغمیم'' پہنچ گئے اور انھیں محسوس ہوا کہ اہل مکہ کو خوف و ہراس میں ڈال دیا ہے تو وہ صحیح سلامت واپس پلٹ آئے۔ اس کے بعد آپ ﷺ لشکر سمیت واپس مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔[1]

شہداء کے لیے دعا و رحم کا اظہار: رسول اللہ ﷺ جب وادی ''غُرَان'' (''سایہ'' اور مکہ کے درمیان وادی ہے) پہنچے جس جگہ ہزیل کے دھوکا بازوں کے ہاتھوں صحابہ شہید ہوئے تھے تو آپ ﷺ نے ان شہداء کے لیے دعا کی۔[2]

غابہ کی جنگ اور ملحق کارروائیاں

رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ بنولحیان سے واپسی کے بعد چند ہی راتیں گزاری تھیں کہ عیینہ بن حصن فزاری نے غطفان کے چالیس شہسواروں کے ساتھ ''غابہ''[3] نامی جگہ میں رسول اللہ ﷺ کی (دودھیل) اونٹنیوں پر چھاپہ مارا۔ ابوذر رضی اللہ عنہ کے بیٹے ''ذر'' کو قتل کر دیا اور اس کی بیوی لیلیٰ کو قیدی بنا لیا اور 20 اونٹ ہانک کر لے گئے۔ رسول اللہ ﷺ کو جب عیینہ کی کارروائی کا علم ہوا تو آپ ﷺ پانچ سو سواروں کے ساتھ اس کے تعاقب

1 صلح الحديبية لمحمد أحمد باشميل، ص: 37. 2 صلح الحديبية لمحمد أحمد باشميل، ص: 38. 3 غابہ: شام کی جانب مدینہ کے قریب ایک جگہ جو مسلمانوں کی چراگاہ کے طور پر مشہور تھی۔

میں روانہ ہوئے۔ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو ان کی قوم کے تین سو افراد کے ہمراہ مدینہ کی حفاظت پر مامور کیا۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذی قرد[2] کے پاس دشمن کو جا لیا۔ بعض افراد کو قتل کیا اور اونٹ چھڑا لیے۔

جب تک نبوی لشکر نہیں پہنچ پایا، سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ نے بڑی بہادری دکھائی۔ یہ بھی غابہ کے علاقے میں چرواہوں کے ساتھ ہی تھے۔ انھوں نے اکیلے ہی سب چھاپہ ماروں کو مصروف کر رکھا تھا۔ وہ دشمن پر تیر پھینک رہے تھے۔ بڑے ماہر تیر انداز تھے، شہسواروں کی آمد سے پہلے ہی کئی اونٹ چھڑا چکے تھے۔[3]

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے بیٹے جنھیں مشرکین نے چھاپے کے دوران شہید کر دیا تھا ان کی بیوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عضباء اونٹنی پر سوار دشمن سے اونٹ کے کئی بچے واپس لیے صحیح سلامت مدینہ منورہ پہنچ گئی۔ اس نے نذر مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اسے نجات دے دی تو وہ اس اونٹنی کو ذبح کر دے گی جس پر سوار تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنی نذر کا ذکر کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سن کر مسکرا دیے اور فرمایا: «بِئْسَمَا جَزَيْتِهَا» ”تو نے بہت برا بدلہ دیا اس کو۔“ یعنی اس نے تجھے اپنے اوپر سوار کیا اور دشمن سے خلاصی دلوائی۔ اب اس کا بدلہ ذبح کرنا ٹھہرا؟ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «لَا نَذَرَ فِي مَعْصِيَةِ اللّٰهِ وَلَا فِيمَا لَا تَمْلِكِينَ» ”اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں نذر نہیں اور نہ اس میں نذر ہے جس کی تو مالک نہیں۔“[4]

غزوۂ خیبر سے قبل یہ سب سے بڑا تادیبی غزوہ تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں نجد کے بدوؤں کے خلاف لڑا گیا۔ یہ غزوہ غزوۂ احزاب اور غزوۂ بنو قریظہ کے بعد پیش

[1] عیون الأثر لابن سید الناس: 2/73,72. [2] (ذی قرد۔غطفان کے پاس مدینہ سے ایک برد (12 میل) دور ایک چشمہ ہے۔) [3] صلح الحدیبیة لمحمد أحمد باشمیل، ص: 43. [4] مسند أحمد: 4/430، وصحیح مسلم، حدیث: 1641، وسنن أبي داود، حدیث: 3316.

آیا تھا۔[1]

غزوۂ ذی قرد کے بعد رسول اللہ ﷺ نے مشرکین کو سبق سکھانے کے لیے پے در پے کئی لشکر تیار کیے۔ جن میں کچھ کامیاب رہے جبکہ کچھ اپنے مقاصد نہ پا سکے۔ ان میں سے سب سے مشہور عکاشہ بن محصن اسدی رضی اللہ عنہ کا سریہ ہے جو سریۂ غمر[2] کے نام سے مشہور ہے۔ اس فوجی دستے کو آپ ﷺ نے بنو اسد کی جانب ربیع الاول 6 ہجری میں روانہ فرمایا۔ یہ لشکر غمر نامی جگہ پہنچا۔ دیکھا کہ تمام لوگ اِدھر اُدھر بکھر کر قریب ترین پہاڑوں میں منتشر ہو چکے ہیں، چنانچہ حضرت عکاشہ اور ان کے ساتھیوں نے ان کے جانوروں پر چھاپہ مارا اور بطور غنیمت دو سو اونٹ لے کر مدینہ واپس آ گئے۔[3]

ان عسکری مہمات میں سے ایک اور مشہور سریہ محمد بن مسلمہ انصاری رضی اللہ عنہ کی قیادت میں ذوالقصہ کی جانب گیا تا کہ بنو ثعلبہ اور عوال کو ڈرایا دھمکایا جائے اور انھیں مدینہ منورہ کی چراگاہ پر چھاپہ مارنے سے روکا جائے۔ لہٰذا ربیع الاول 6 ھ میں محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ دس ساتھیوں سمیت راتوں رات دشمن تک جا پہنچے۔ دشمن نے بھانپ لیا۔ ان کی تعداد ایک سو تھی۔ رات کے وقت تھوڑی دیر تو ایک دوسرے کو تیر مارتے رہے، پھر بدویوں نے مجاہدین پر نیزوں سے حملہ کر کے انھیں شہید کر دیا۔ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ بھی زخمی ہو گئے۔ زخم اتنے کاری تھے کہ وہ واپس نہیں آ سکتے تھے۔ ادھر سے اچانک کسی مسلمان کا گزر ہوا۔ وہ انھیں اٹھا کر مدینہ منورہ لے آیا۔[4]

اس واقعے کے فوراً بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو چالیس آدمی دے کر ان کی طرف روانہ کیا مگر انھوں نے وہاں کسی کو نہ پایا، چند جانور ملے جنھیں

---

1 صلح الحدیبیة لمحمد أحمد باشمیل، ص:45. 2 غمر: فید مکہ مکرمہ کے راستے پر ایک قلعہ ہے وہاں سے دو رات کی مسافت پر بنو اسد کے چشمے کا نام غمر ہے۔ 3 تاریخ الطبري:640/2. 4 التاریخ السیاسي والعسکري للدکتور علي معطي، ص:328.

وہ ہانک کر مدینہ لے آئے۔[1]

اسی سال جمادی الاولیٰ میں حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کا دوسرا سریہ ایک سو ستر مجاہدین کی معیت میں قریش کے شام سے واپس آنے والے قافلے کو روکنے کے لیے "عیص"[2] گیا۔ انھوں نے وہ قافلہ پا لیا۔ اس کا سارا مال قبضے میں کیا اور بعض افراد کو قید کر لیا جن میں حضرت زینب بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاوند ابو العاص بن ربیع، ان کی والدہ اور آپ کی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہ کی بہن ہالہ بنت خویلد اور مغیرہ بن معاویہ بن ابوالعاص بھی شامل تھے۔

شعبان 6 ہجری میں ایک سریہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی قیادت میں بنوسعد بن بکر کی طرف بھیجا گیا جو خیبر کے یہود کی امداد کرنا چاہتے تھے۔ یہ لشکر 100 افراد پر مشتمل تھا۔ انھوں نے ان پر چھاپہ مارا اور کچھ جانور بطور غنیمت لے کر مدینہ پلٹ آئے۔[3]

یہ سریہ ہر اس آدمی کو سبق سکھانے کے لیے تھا جس کا نفس یہود کی متوقع خباثت پر امداد فراہم کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ اس طرح انھیں اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ مدینہ منورہ اپنے اردگرد سے باخبر ہے اور آس پاس کی تمام حرکات و سکنات پر اس کی نظر ہے۔[4]

ریاست مدینہ منورہ کی نظر دشمن کے متعلق خاص طور پر انتہائی چوکس تھی۔ ایک پر امن اور محفوظ جنگی منصوبہ ایسا ہی ہوتا ہے۔[5]

سرایا اور لشکروں کی نقل و حرکت سے دشمنوں سے متعلق معلومات رکھنے کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مختلف ذرائع سے معلومات آتی تھیں، مثلاً: اطلاعات فراہم کرنے والے سرایا، خفیہ طور پر مسلمان ہونے والے، مسلمانوں کے لیے نرم گوشہ رکھنے والے، مجاہدین، بھانپ لینے والی نگاہ اور درپردہ حقائق سے واقفیت کا ملکہ۔

---

[1] المغازي للواقدي: 551/1. [2] عیص اور مدینہ منورہ کے درمیان چار راتوں کی مسافت ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ، لمحمد رضا، ص: 246,245. [3] التاريخ السياسي والعسكري للدكتور علي معطي، ص: 330. [4] من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 325. [5] التاريخ الإسلامي للحميدي: 189/6.

الغرض رسول اللہ ﷺ کو داخلی سازش، خارجی دباؤ اور دھمکی سے کبھی مرعوب نہ کیا جا سکا۔ [1]

عرنیین کی جانب حضرت کرز بن جابر فہری رضی اللہ عنہ کا سریہ

شوال 6 ہجری میں عکل اور عرینہ قبیلے کے چند لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام کا دعویٰ کیا۔ انھوں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! ہم دودھیل جانوروں والے تھے۔ زراعت پیشہ نہ تھے۔'' انھیں مدینہ کی آب و ہوا موافق نہ آئی۔ آپ ﷺ نے چند اونٹ اور ایک چرواہا ان کے ساتھ روانہ کر کے حکم دیا کہ تم ان کو جنگل میں لے جاؤ، ان کا دودھ اور پیشاب استعمال کرو۔ وہ جب حرہ کی طرف گئے تو انھوں نے چرواہے کو مار ڈالا اور اونٹ بھگا لے گئے۔

یہ خبر رسول اللہ ﷺ کو پہنچی تو آپ نے انھیں پکڑنے کے لیے دستہ روانہ کیا۔

انھیں پکڑ لیا گیا تو آپ ﷺ کے حکم پر ان کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھیری گئیں، ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے گئے اور انھیں حرہ میں پھینک دیا گیا حتی کہ وہ مر گئے۔ حدیث کے راوی قتادہ کہتے ہیں کہ ہمیں پھر یہ خبر پہنچی کہ نبی اکرم ﷺ اس کے بعد صدقہ و خیرات کی ترغیب دیتے اور مثلہ سے منع فرماتے تھے۔ [2]

ابو قلابہ اپنی روایت میں کہتے ہیں کہ عکل اور عرینہ والوں نے چوری کی، قتل کیا، ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کیا اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے لڑائی مول لی تھی۔ [3]

جمہور علماء کی رائے کے مطابق مذکورہ آیت انھی عرینہ والوں کے متعلق اتری:

﴿إِنَّمَا جَزَٰٓؤُا۟ ٱلَّذِينَ يُحَارِبُونَ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ وَيَسْعَوْنَ فِى ٱلْأَرْضِ فَسَادًا أَن يُقَتَّلُوٓا۟ أَوْ يُصَلَّبُوٓا۟ أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم مِّنْ خِلَٰفٍ أَوْ يُنفَوْا۟ مِنَ ٱلْأَرْضِ ۚ ذَٰلِكَ لَهُمْ خِزْىٌ فِى ٱلدُّنْيَا ۖ وَلَهُمْ فِى ٱلْءَاخِرَةِ عَذَابٌ

[1] الأساس في السنة لسعيد حوّى: 712/2. [2] صحيح البخاري، حديث: 4192، والسيرة النبوية للدكتور مهدي رزق الله، ص: 478. [3] السيرة النبوية للدكتور مهدي رزق الله، ص: 478.

عَظِيمٌ ﴾

''جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے لڑیں اور زمین میں فساد کرتے پھریں ان کی سزا یہی ہے کہ وہ قتل کر دیے جائیں یا سولی چڑھا دیے جائیں۔ یا انھیں جلاوطن کر دیا جائے، یہ تو ہوئی ان کی دنیوی ذلت اور خواری اور آخرت میں ان کے لیے بڑا بھاری عذاب ہے۔''[1]

ایک قول یہ بھی ہے کہ اس آیت کے نزول کے مزید اسباب بھی ہیں۔[2]

بہر صورت عام طور پر الفاظ کے عموم کا اعتبار ہوتا ہے نہ کہ خاص اسباب کا۔ لہٰذا یہ حکم آج بھی باقی ہے۔ اس پر امت کا اجماع ہے کہ اسلام میں دنگا فساد کرنے والے کا آج بھی یہی حکم ہے، خواہ اصلاً آیت کفار کے متعلق اتری تھی یا مسلمانوں کے متعلق۔ اور یہ آیت بخاری کی روایت کے مطابق مشرکین کے متعلق اتری تھی۔[3] یہی اس بات کی دلیل ہے کہ الفاظ کا اعتبار عموم کا ہوتا ہے نہ کہ اسباب کے ساتھ خاص ہونے کا۔

رہی یہ بات کہ مثلہ تو ممنوع ہے، پھر نبی اکرم ﷺ نے ان کی آنکھوں میں لوہے کی گرم سلائیاں کیوں پھیریں؟ نبی اکرم ﷺ نے یہ عمل مثلہ کے طور پر نہیں بلکہ قصاص کی صورت میں بدلے کے طور پر اختیار کیا تھا کیونکہ انھوں نے نبی ﷺ کے چرواہوں سے یہی سلوک کیا تھا۔[4]

عرنیین کا یہ واقعہ فساد کے متعلق حکم کے عملی نفاذ کا ذریعہ ثابت ہوا۔ اس کے متعلق واضح آیات نازل ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ نے فساد کرنے والوں کی سزا کے صرف چار طریقے مقرر

1 المآئدة 5: 33. سبل الهدى والرشاد للصالحي: 6/181-190. 2 تفسير الطبري: 10/242-244. 3 علاج القرآن الكريم للجريمة للدكتور عبدالله الشنقيطي، ص:298,297.

4 صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عرنیین کی آنکھوں میں اس لیے سلائیاں پھروائی تھیں کہ انھوں نے بھی چرواہوں کی آنکھوں میں سلائیاں پھیری تھیں، دیکھیے: (صحيح مسلم، حديث: (14)-1671

کیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان چار طریقوں کی تاکید کے لیے لفظ ﴿إِنَّمَا﴾ بیان فرمایا۔ یہ لفظ عربی زبان میں کسی بات کا خاص دائرہ مقرر کرنے کے لیے آتا ہے۔ مطلب یہ کہ جو بات ﴿إِنَّمَا﴾ کے ذریعے سے کہی گئی وہ حکم کے خاص دائرے میں مقید ہو گئی۔ دائرے کے باہر اس کی کوئی عملداری نہیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کے کرتوت بیان کیے تاکہ کوئی عقل مند آدمی ان کے ارتکاب سے بچتے ہوئے ان سے نفرت کرے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّمَا جَزَٰٓؤُا۟ ٱلَّذِينَ يُحَارِبُونَ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ وَيَسْعَوْنَ فِى ٱلْأَرْضِ فَسَادًا أَن يُقَتَّلُوٓا۟ أَوْ يُصَلَّبُوٓا۟ أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم مِّنْ خِلَٰفٍ أَوْ يُنفَوْا۟ مِنَ ٱلْأَرْضِ ۚ ذَٰلِكَ لَهُمْ خِزْىٌ فِى ٱلدُّنْيَا ۖ وَلَهُمْ فِى ٱلْءَاخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ○ إِلَّا ٱلَّذِينَ تَابُوا۟ مِن قَبْلِ أَن تَقْدِرُوا۟ عَلَيْهِمْ ۖ فَٱعْلَمُوٓا۟ أَنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ○﴾

”جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد کے لیے بھاگ دوڑ کرتے ہیں، ان کی سزا تو صرف یہ ہے کہ انھیں قتل کیا جائے یا سولی دی جائے یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف جانب سے کاٹ دیے جائیں یا انھیں جلاوطن کر دیا جائے۔ یہ دنیا میں ان کے لیے ذلت ہے اور آخرت میں ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو اس سے پہلے کہ تم ان پر قابو پاؤ، توبہ کر لیں، پس تم جان لو کہ بے شک اللہ بہت بخشنے والا، بڑا رحم کرنے والا ہے۔“[1]

انھوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے لڑائی کی، اہل زمین کو خوف میں مبتلا کیا اور زمین میں فساد کے مرتکب ہوئے اور صرف فساد اور سرکشی کرتے ہوئے بلاوجہ ان کی مملوکہ اشیاء کو لوٹا، ان سے زبردستی چھینا اور قتل و غارت کی، لہٰذا اللہ تعالیٰ رحمٰن و رحیم کی ان پر اور اپنی دیگر مخلوق پر رحمت کا تقاضا تھا کہ ان کے متعلق اس نے ان چار امور میں

1 المآئدة 5:33، 34.

سے ایک فیصلہ دیا:

① قتل

② سولی

③ مخالف سمت سے ہاتھ پاؤں کاٹنا۔

④ انھیں عام لوگوں سے الگ کر کے جلا وطن کر دینا۔

تا کہ ایسا قبیح فعل ان سے بار بار سرزد نہ ہو۔ اور دوسروں سے بھی ایسے قبیح جرم کا ارتکاب نہ ہونے پائے۔ اور اگر توبہ کرنا چاہیں اور رشد و ہدایت کی طرف لوٹنا چاہیں تو گناہوں کی وجہ سے وہ جس سزا کے مستحق تھے انھیں اس سے بری قرار دیا جائے۔

مسلمانوں کو اذیت دینے کی وجہ سے دنیا کی زندگی میں ان کے لیے ذلت و رسوائی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ اس ذلت و رسوائی کے تاحیات رہنے کا ذکر فرمایا کہ انھوں نے فساد برپا کرنے کا جرم کیا ہے۔ اور ان کے ساتھ یہی ذلت روز قیامت تک رہے گی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے آخرت میں عذاب عظیم تیار کر رکھا ہے۔

بعدازاں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا جو توبہ تائب ہو جائیں۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے بڑا موثر، حکیمانہ انداز اختیار فرمایا جو انھیں ایسے قبیح عمل سے توبہ کی طرف لے آئے۔ یعنی جب وہ پکڑے جانے سے پہلے توبہ کر لیں اور واپس آ جائیں تو ان کے لیے معافی ہے۔ کیونکہ ان کی توبہ کی دلیل ان کی صداقت اور سچائی ہے کیونکہ وہ قابو ہونے سے پہلے واپس آ گئے ہیں۔

قرآن پاک جرائم کی روک تھام میں ایسا ہی عمدہ انداز اختیار کرتا ہے۔ یہ علاج، ذوقِ سلیم کے مطابق ہوتا ہے۔ آخر میں اللہ تعالیٰ نے دونوں آیات کو اپنے وصف ''غفور و رحیم'' پر ختم کیا کہ وہ توبہ کرنے والے اور صلح جو کے لیے غفور و رحیم ہے۔ اس کی وسیع رحمت سے کوئی نا امید نہیں ہوتا اور نہ کوئی بندے اور اس کے رب کی رحمت و مغفرت کے درمیان

حائل ہوسکتا ہے، خواہ اس کا گناہ کتنا ہی بڑا، اس کی کوتاہی کتنی ہی زیادہ ہو بشرطیکہ اس نے شرک نہ کیا ہو۔ قصہ مختصر قرآنی آیات نے اسلامی معاشرے میں دنگا فساد کا ایسا علاج کیا ہے کہ اس سے بہتر علاج کی گنجائش نہیں۔ یہ ان نکات سے واضح ہو رہا ہے:

① فسادی کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے نبرد آزما کہنا۔

② فساد فی الارض پر بلاتفریق بہت بڑی سزا کا اعلان۔

③ اگر فسادی توبہ نہ کرے تو دنیا و آخرت میں اس کا مقام نیچا رہے۔

④ ایسے سنگین جرم کے لیے بھی درِ توبہ کھلا رکھا گیا ہے، تاکہ واپسی کے راستے کی بندش اس کو اپنے جرم میں جاری رہنے اور اس پر مزید آگے بڑھنے پر آمادہ نہ کرے۔[1]

1 علاج القرآن الكريم للجريمة للدكتور عبدالله الشنقيطي، ص: 313-315.

باب 3

سازشی عناصر کا صفایا

سریہ عبداللہ بن عتیک رضی اللہ عنہ

بنو نضیر سے تعلق رکھنے والا ایک یہودی ابو رافع سلام بن ابی الحقیق لوگوں کو اسلامی حکومت کے خلاف بھڑکاتا رہتا تھا۔ اس نے غطفان اور ان کے اردگرد مشرک قبائل کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ کرنے پر بہت بڑی رقم کا اعلان کیا تھا۔ اس کا یہ سازشی کردار زبان زد عام تھا۔ احزاب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اکٹھا کرنے والا بھی یہی شخص تھا۔ اسے لگام ڈالنا ضروری ہو گیا تھا۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو رافع یہودی کی جانب انصار کے کچھ لوگ بھیجے جن کا امیر عبداللہ بن عتیک رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا۔ ابو رافع اپنے قلعے میں رہتا تھا۔ جب مسلمان قلعے کے پاس پہنچے تو سورج غروب ہو چکا تھا۔ لوگ اپنے اپنے جانور واپس لے جا چکے تھے، عبداللہ بن عتیک رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں سے کہا: ''تم یہیں ٹھہرو۔ میں جا کر دربان کے ساتھ کوئی حیلہ کرتا ہوں، شاید اس طرح قلعے میں داخل ہو سکوں۔ یہ آ کر دروازے کے قریب سر کو کپڑے سے ڈھانپ کر ایسے بیٹھ گئے گویا قضائے حاجت کر رہے ہیں۔ تمام لوگ اندر داخل ہو چکے تھے۔ دربان نے اونچی آواز میں پکارا: ''ارے اللہ کے بندے! اندر آنا چاہتا ہے تو داخل ہو۔ میں دروازہ بند کرنا چاہتا ہوں۔'' عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں بھی داخل

[1] قراءة سياسية للسيرة النبوية للدكتور قلعجي، ص:212.

ہو کر چھپ گیا۔ جب تمام لوگ داخل ہو گئے تو دربان نے دروازہ بند کر دیا اور چابیاں کھونٹی پر لٹکا دیں۔

ابن عتیک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے اٹھ کر چابیاں لیں اور دروازہ کھول دیا۔[1]

جب عبداللہ بن عتیک رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی قلعے میں گھس گئے تو ابو رافع کے قتل کا مناسب موقع دیکھنے لگے۔

بخاری کی روایت کے مطابق عبداللہ بن عتیک رضی اللہ عنہ نے ابو رافع کے کچھ ساتھیوں کو اس کے ساتھ باتیں کرتا پایا، وہ اوپر اپنے بالا خانے میں تھا۔ ابن عتیک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں وہاں چھپ گیا۔ جب سب داستاں گو چل دیے تو میں اس کی جانب چڑھا۔ میں جس دروازے میں داخل ہوتا اسے اندر سے بند کر لیتا تا کہ کوئی بھی ابو رافع کا کام تمام کرنے میں رکاوٹ نہ بن سکے۔ وہاں پہنچا تو ابو رافع کو اندھیری کوٹھڑی میں بال بچوں سمیت پایا۔ لیکن معلوم نہ تھا وہ کس جگہ ہے۔ میں نے آواز دی: ''ابو رافع!'' اس نے کہا: ''کون ہے؟'' میں آواز کی طرف لپکا اور تلوار کی ایک ضرب لگائی۔ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اس وار سے کچھ کام نہ بنا۔

ابو رافع چلایا۔ میں کوٹھڑی سے باہر آ گیا، تھوڑی دیر ٹھہر کر پھر کوٹھڑی میں گیا اور کہا: ''ابو رافع! یہ آواز کیسی تھی؟''

اس نے کہا: ''تیری ماں کے لیے ہلاکت ہو! ابھی ابھی کسی نے مجھ پر تلوار کا وار کیا۔'' یہ سنتے ہی میں نے اس پر ایک اور ضرب لگائی۔ اگرچہ اب اس کو کاری زخم لگا مگر وہ مرا نہیں۔ آخر میں نے تلوار اس کے پیٹ پر رکھ کر دبا دی وہ اس کی پیٹھ تک پہنچ گئی۔ جب مجھے یقین ہوا کہ اب میں نے اسے مار ڈالا ہے، تب میں لوٹا۔

ایک ایک کر کے دروازہ کھولتا گیا حتی کہ آخری سیڑھی تک پہنچ گیا۔ چاندنی رات تھی۔

[1] السيرة النبوية للدكتور مهدي رزق الله، ص:465.

میں نے پاؤں رکھا اور سمجھا کہ زمین آ گئی ہے۔ میں گر پڑا اور میری پنڈلی ٹوٹ گئی۔ میں نے اسے پگڑی سے باندھ لیا، پھر جا کر دروازے پر بیٹھ گیا اور (دل میں) کہا: ''میں یہاں سے اس وقت تک نہ جاؤں گا جب تک مجھ کو ابو رافع کی موت کا یقین نہ ہو جائے۔'' جب مرغ نے بانگ دی اس وقت موت کی خبر دینے والا قلعے کی دیوار پر کھڑا ہوا اور پکارنے لگا: ''اہل حجاز کے تاجر ابو رافع کی موت کی خبر دیتا ہوں۔'' یہ سنتے ہی میں اپنے ساتھیوں کی طرف گیا اور ان سے کہا: ''جلدی بھاگو، اللہ تعالیٰ نے ابو رافع کو قتل کر دیا ہے۔'' میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچا اور تمام قصہ سنایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «أُبْسُطْ رِجْلَكَ» ''اپنی ٹانگ پھیلاؤ۔'' میں نے ٹانگ پھیلائی تو آپ ﷺ نے اس پر ہاتھ پھیرا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے ٹانگ کو کبھی کوئی تکلیف ہوئی ہی نہ تھی۔[1]

بخاری ہی کی دوسری روایت میں ہے کہ عبداللہ بن عتیک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے آواز دی: ''ابو رافع!'' اس نے کہا: ''کون ہے؟'' میں آواز کی طرف بڑھا اور تلوار کی ضرب لگائی۔ ابو رافع نے چیخ ماری۔ مگر اس ضرب سے کچھ کام نہ بنا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں دوبارہ ابورافع کے پاس اس طرح گیا جیسے اس کی مدد کو آیا ہوں اور آواز بدل کر پوچھا: ''ابو رافع کیا ہوا؟'' اس نے کہا: ''تیری ماں مرے، ابھی ابھی کوئی میرے پاس گھس آیا اور مجھ پر تلوار کا وار کیا۔'' میں آگے بڑھا اور پھر ایک ضرب لگائی، پھر بھی کوئی کام نہ بنا۔ اس نے چیخ ماری جس سے اس کے گھر والے بھی جاگ اٹھے، پھر میں تیسری بار گیا اور آواز بدل کر پوچھا جیسے کوئی مدد کو آتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہ چت لیٹا ہوا تھا۔ میں نے تلوار اس کے پیٹ پر رکھی، پھر اپنے سارے بدن کا بوجھ اس پر ڈال دیا حتی کہ ہڈیاں ٹوٹنے کی آواز سنی۔[2]

سیرت کی کتابوں میں یہ بھی منقول ہے کہ جب ابو رافع کو تلوار کا وار لگا تو اس کی بیوی

1 صحيح البخاري، حديث:4039. 2 صحيح البخاري، حديث:4040.

بھی چیخی۔ عبداللہ بن عتیک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے اسے بھی قتل کرنا چاہا مگر رک گیا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے منع کیا تھا۔ [1]

ابن عتیک رضی اللہ عنہ یہودیوں کی زبان بول لیتے تھے وہی زبان انھوں نے وہاں بولی تھی۔

سیرت نگار بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ بن عتیک رضی اللہ عنہ کے تمام ساتھی ابو رافع کو قتل کرنے میں شریک ہوئے۔ شرکاء میں سے ہر ایک کا دعویٰ تھا کہ اس کا وار فیصلہ کن تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «عَجِّلُوا بِأَسْيَافِكُمْ» ”جلدی جلدی اپنی تلواریں لے آؤ۔“ وہ اپنی تلواریں لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں دیکھا اور فرمایا: «هٰذَا قَتَلَهُ» ”اس نے اسے مارا ہے۔“ اور وہ عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ کی تلوار تھی۔ عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ کی تلوار پر (ابورافع کے کھائے ہوئے) کھانے کے کچھ اثرات بھی تھے۔ [2]

عام قاری بخاری اور دیگر روایات میں تناقض محسوس کرتا ہے جن میں مذکور ہے کہ کاری وار عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ کا تھا۔ صحیح یہ ہے کہ یہ تناقض نہیں کیونکہ عبداللہ بن عتیک رضی اللہ عنہ اپنی خبر خود بتاتے ہیں اور انھیں ظن غالب یہی تھا کہ وہی قاتل ہیں۔ اسی طرح انھوں نے ابورافع کو ٹھکانے لگانے میں اپنا کردار واضح کیا ہے جس کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی اور اس میں شریک نہ تھا۔ اور نہ انھوں نے اسے قتل کرنے میں دوسروں کی شراکت کا انکار کیا۔ یہ روایات اس طرح ایک دوسری روایت کی شرح و تکمیل کرتی ہیں۔ روایات کو دیکھیں تو ہر کوئی اس کا دعویدار ہے کہ اسی کا وار فیصلہ کن تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تلواروں کو دیکھا اور فیصلہ دیا کہ فیصلہ کن وار عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ کا تھا کیونکہ اس پر کھانے کے نشانات واضح تھے، یعنی یہی تلوار تھی جو ابورافع کے پیٹ میں گھسی، اس کی انتڑیوں کو پھاڑا، اندر کی ہر چیز کٹ پھٹ گئی اور تلوار اس کے پیٹ میں موجود غذا سے لت پت ہوئی۔ [3]

---

1 شرح المواهب للزرقاني: 168/2. 2 الطبقات الكبرىٰ: 92,91/2، والسنن الكبرىٰ للبيهقي: 221/3، والمصنف لعبدالرزاق: 5/407-410، والسيرة النبوية لابن هشام: 3/286-288.

3 الصراع مع اليهود لأبي فارس: 189/1.

سیرت کی کتابوں کے مطابق اس سریے میں یہ افراد شامل تھے۔ عبداللہ بن عتیک، مسعود بن سنان، عبداللہ بن انیس، ابوقتادہ حارث بن ربعی اور خزاعی بن اسود رضی اللہ عنہم۔[1]

سریہ عبداللہ بن عتیک رضی اللہ عنہ کے اسباق و فوائد: ① اس سریے کے تمام افراد خزرج سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ اوس کی طرح ہم بھی کوئی کارنامہ انجام دیں۔ قبیلہ اوس والوں نے کعب بن اشرف کو ٹھکانے لگایا تھا۔ یہ دونوں قبیلے اچھائیوں میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے میں دو مقابل گھوڑوں کی طرح تھے۔ یہ دنیاوی زندگی کے مال اور عہدوں میں باہم بازی لے جانے کا مقابلہ نہ تھا بلکہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پسندیدہ امور میں باہمی مقابلہ تھا جس کا اصل مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا اور آخرت کی سعادت تھی۔[2]

کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جو بندوبست فرمایا اس کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ انصار کے یہ دونوں قبائل اوس اور خزرج آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ دو بڑے اونٹوں کی طرح، آپ کی خدمت میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش میں لگ گئے تھے۔ اوس کوئی بھی خدمت انجام دیتے تو خزرج کہتے: ''اللہ کی قسم! تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی خدمت میں یہ فضیلت ہم سے زیادہ حاصل نہیں کر سکتے۔'' وہ اُن جیسا فعل و عمل کرنے سے ہرگز نہ رکتے۔ اور جب خزرج اس طرح کی خدمت انجام دیتے تو اوس بھی اسی قسم کے جذبات کا اظہار کرتے۔[3]

② **دشمن کی زبان سیکھنے کا فائدہ:** اس فن کی بدولت عبداللہ بن عتیک رضی اللہ عنہ ابورافع کے قلعے میں گئے اور اس کی بیوی سے بات کی۔ اسی فن کی بدولت وہ اس گھر میں اطمینان سے داخل ہو سکے کیونکہ اس وقت انھوں نے ان سے یہود کی زبان ہی میں گفتگو اور مکالمہ کیا تھا۔

1 صلح الحديبية لمحمد أحمد باشميل، ص: 91. 2 التاريخ الإسلامي للحميدي: 177/6.
3 السيرة النبوية لابن هشام: 286/3.

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ غیر مسلم اور خاص طور پر دشمن کی زبان سیکھنی چاہیے۔ خصوصاً ان جنگجوؤں کے لیے تو یہ بہت ضروری ہے جو دشمن کی خبریں اکٹھی کرتے اور معلوماتی مہمات سر کرتے ہیں، پھر قیادت ان خبروں کی روشنی میں منصوبہ بندی کرتی ہے۔[1]

③ ابن عتیک رضی اللہ عنہ کے منصوبے کی کامیابی کے اسباب و ذرائع میں ان کا اکیلا جانا بھی شامل ہے۔ انھوں نے طے کیا کہ قلعے کی جانب اکیلے جائیں اور اس میں داخل ہونے کی کوشش کریں، پھر دیگر افراد کے داخلے کا طریقہ ڈھونڈیں۔ ان کی عام فطری چال ڈھال نے کسی بھی محافظ کی توجہ ادھر مبذول نہ ہونے دی۔ اسی وجہ سے انھوں نے چوکیدار کو بھی چکما دے دیا اور اسے یہ باور کرایا کہ وہ قضائے حاجت کر رہے ہیں۔ اس بات نے چوکیدار کو اس کی طرف دیکھنے، اس کے چہرے پر غور کرنے اور جانچنے سے روکے رکھا، پھر قلعے کے اندر داخل ہو کر ان کا چوکیدار پر کڑی نگاہ رکھنا اور ایسی جگہ چھپ جانا جہاں محافظ کو تو محسوس نہ ہو لیکن محافظ پر نگاہ رکھی جا سکے حتی کہ وہ ایک خاص جگہ پر چابی رکھ کر چلا جائے تاکہ وہاں سے چابی لے کر جب چاہیں جیسے چاہیں استعمال کریں۔[2]

④ اپنے دوستوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت و کرم نوازی: یہ عظیم صحابی ٹانگ پر چوٹ آنے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت سے چلتے اور اپنی توانائیاں صرف کرتے رہے گویا اس کو کسی مرض کی شکایت ہی نہیں مگر جب اس کی ذمہ داری ختم ہو گئی اور مزید کوشش کرنے کی ضرورت نہ رہی تو تکلیف شروع ہو گئی اور ساتھی اسے اٹھا کر لے آئے۔ اس نے اپنا قصہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «أُبْسُطْ رِجْلَكَ» ”اپنی ٹانگ پھیلاؤ۔“ وہ کہتے ہیں کہ میں نے ایسا ہی کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر اپنا دستِ مبارک پھیرا تو وہ ایسے ہو گئی گویا کبھی تکلیف تھی ہی نہیں۔[3]

---

1 الصراع مع اليهود لأبي فارس: 191/1. 2 الصراع مع اليهود لأبي فارس: 192/1-193.
3 صحيح البخاري، حديث:4039.

⑤ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس قصے سے فوائد و نتائج کا استخراج کرتے ہوئے کہتے ہیں:

❁ اس حدیث سے ایسے کافر پر اچانک حملہ کرنا درست ہوتا ہے جسے دعوتِ اسلام پہنچ چکی ہو اور وہ پھر بھی کفر پر اصرار کیے بیٹھا ہو۔

❁ اسی طرح ایسے شخص کو قتل کرنا درست ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہاتھ، مال یا زبان سے تعاون کر رہا ہو۔

❁ اہل حرب کی جاسوسی اور ان کے غفلت کے اوقات ڈھونڈنا درست ہے۔

❁ مشرکین سے جنگ میں سختی برتنی چاہیے۔

❁ مصلحت کا تقاضا ہو تو بات کو مبہم رکھنا درست ہے۔

❁ تھوڑی تعداد کے مسلمان زیادہ تعداد کے مشرکین سے پنجہ آزمائی کر سکتے ہیں۔

❁ دلیل اور علامت کی بنا پر فیصلہ کر لینا بھی درست ہے جیسا کہ ابن عتیک رضی اللہ عنہ نے ابورافع کی آواز ہی سے اس جگہ کا اندازہ لگایا تھا جہاں وہ موجود تھا۔ اسی طرح انھوں نے موت کی خبر دینے والے کی آواز پر بھی اعتبار کیا تھا۔ واللہ اعلم۔[1]

⑥ حضرت عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ کا عام سپاہی کے طور پر سریہ میں شامل ہونا، تربیتی و تعلیمی لحاظ سے بڑی رہنمائی دیتا ہے۔ یہ بدری صحابی اور بیعت عقبہ میں شریک ہونے کے ساتھ ساتھ دونوں قبلوں کی طرف نماز ادا کرنے والے، انصار کے السابقون الاولون میں سے تھے۔ بایں ہمہ یہ جہاد اور بہادری کے میدان میں کوئی غیرِ معروف شخصیت نہیں تھے۔ یہ اکیلے ہی مکہ کے پاس سفیان بن خالد ہذلی کو ٹھکانے لگانے والے ہیں جو مدینہ پر حملہ آور ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ حضرت عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ اپنی مہم جوئی میں بہت کامیاب رہے تھے۔ انھوں نے ابن رافع کو اس کے بستر پر قتل کر دیا تھا، پھر اس کی قوم بھی انھیں گرفتار نہ کر سکی اور وہ کامیاب و کامران واپس آئے۔ غرضیکہ عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ صاحبِ

[1] فتح الباري:7/400.

فضیلت ہونے کے باوجود اس گروہ کے امیر نہیں بلکہ ایک فرد تھے، حالانکہ وہ اپنے رب تعالیٰ کے ہاں، لوگوں کی نگاہ میں آنے سے قبل، اس روشن تاریخ کے حامل شخص تھے۔

یہ وہ تربیتی سبق ہے جو صحابۂ کرام مکمل طور پر حاصل کیے ہوئے تھے۔ تربیت کی دنیا میں ایسی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ افواج میں یہ قانون رائج ہے کہ رتبے کا لحاظ رکھا جائے۔ بلکہ اگر ایک ہی مقام و مرتبہ کے اشخاص ہیں تو قدیم عہدے دار نئے عہدے دار پر حکم چلائے گا۔ اور نئے عہدے دار پر سابقہ عہدے دار کی سمع و طاعت لازمی ہے، خواہ وہ اس سے چند ماہ ہی پہلے آیا ہو۔ اس اعتبار سے عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ سے کوئی بھی آگے بڑھنے کا حقدار نہ تھا۔ لیکن یہاں تو یہ عظیم نبوی تربیت تھی تاکہ یہ نسل پہلوں سے سیکھے اور ان کے ہاتھوں تربیت پا سکے۔ آپ ﷺ نے کتنی ہی اس قسم کی فوجی مہمات روانہ فرمائی ہیں جن میں ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما عام مجاہد اور فوجی کی طرح شامل تھے۔ [1]

عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کا سریہ یُسیر بن رزام یہودی کی جانب

رسول اللہ ﷺ کو خبر پہنچی کہ سلام بن ابی الحقیق کے بعد خیبر میں یہود کا سردار یسیر بن رزام شمال میں مقیم یہودیوں کو جمع کر کے آپ ﷺ کے خلاف بھڑکا رہا ہے۔ اس پر اکتفا نہیں بلکہ وہ غطفانی قبائل اور ان کے لشکروں کو آپ ﷺ سے جنگ پر آمادہ کر رہا ہے۔ جب آپ ﷺ کو یہود کی منصوبہ بندی کا علم ہوا تو آپ ﷺ نے کسی بھی اقدام سے پہلے اس خبر کی تصدیق کرنا چاہی۔ آپ ﷺ نے عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو چند مسلمانوں کے ہمراہ روانہ کیا کہ وہ پہلے یہود کی سازش کا پتا چلائیں۔ [2]

نبوی خبر رسانوں نے یسیر بن رزام کے منصوبے کی تصدیق کی۔ یہی دلیل آپ ﷺ کو عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں تیس سواروں کو بھیجنے کے لیے کافی تھی۔ ان میں

---

1 التربية القيادية للدكتور الغضبان: 148/4. 2 اليهود في السنة المطهرة للدكتور عبدالله الشقاري: 389,388/1.

عبداللہ بن اُنیس رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ یہ ابن رزام کے پاس آئے اور کہا: ”ہمیں رسول اللہ ﷺ نے تیری طرف بھیجا ہے تا کہ تجھے خیبر کا عامل مقرر کر دیں۔“ یہ اسے ایسی اُمیدیں آرزوئیں دلاتے رہے حتی کہ وہ اپنے تیس ساتھیوں کے ہمراہ ان کے ساتھ ہولیا۔ ان میں سے ہر شخص کے پیچھے ایک ایک مسلمان تھا۔ یہ خود حضرت عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ کے اونٹ پر ان کے پیچھے سوار تھا۔ جب یہ قافلہ خیبر سے چھ میل کے فاصلے پر ”قرقرہ ثیار“ پہنچا تو یسیر، رسول اللہ ﷺ کی جانب جانے پر نادم ہوا۔ اس نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے حضرت عبداللہ بن انیس کی تلوار پر ہاتھ ڈالا۔ وہ اس کا مقصد بھانپ گئے، لہٰذا تلوار اس سے زبردستی چھین لی، پھر تلوار مار کر اس کا پاؤں کاٹ دیا۔ یسیر نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا لکڑی کا مضبوط اور سخت ڈنڈا عبداللہ بن انیس کے منہ پر مار کر انھیں زخمی کر دیا۔

اس کے بعد ہر مسلمان نے اپنے ساتھ بیٹھے یہودی کو قتل کر دیا مگر ایک شخص بچ نکلا۔ عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ جب رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچے تو آپ ﷺ نے ان کے زخم پر لعاب مبارک لگایا، پھر (زندگی بھر) نہ تو وہ زخم خراب ہوا اور نہ کبھی تکلیف ہوئی۔[1]

یہ سریہ شوال چھ ہجری میں پیش آیا۔

اس مہم میں کئی ایک اسباق اور عبرتیں ہیں:

① ابتدا ہی سے رسول اللہ ﷺ کا منصوبہ تھا کہ مسلمانوں اور یہود کے درمیان خونریزی کو روک کر رکھیں۔ عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کا کردار بھی اسی پالیسی کا حصہ تھا۔ لیکن کینہ پرور یہودی بغض و عناد کا زہر ہمیشہ مسلمانوں کے خلاف اُگلتے رہتے تھے۔ اب بھی یہی بغض و عناد ان پر غالب رہا۔ یوں امن کے سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ انھوں نے ہمیشہ مسلمانوں کو دھوکا دینا چاہا مگر برا انجام انھی کے حصے میں آیا۔

② جنگ میں جب تک دلیری کا مظاہرہ نہ ہو تو آئے روز دشمن کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 267,266/3، والسيرة النبوية للدكتور مهدي رزق الله، ص: 477.

جنگ ہر چیز کو کھا جاتی اور فنا کر دیتی ہے، لہٰذا دشمن کے دل میں خوف و ہراس پیدا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اور جب بات چیت کام نہ آئے تو سختی سے کام لینا لازمی ہو جاتا ہے اور اس قدر سختی ضروری ہو جاتی ہے کہ دشمن اپنے مخالف کو اچھی طرح سمجھ لے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں کسی بھی ملامت گر کی ملامت سے نہیں ڈرتا۔

③ چھٹے ہجری سال نے دشمن کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے کے عملی اقدامات میں بھرپور پیش قدمی دیکھی۔ کوئی ایک ماہ بھی کسی ایسی مہم سے خالی نہ تھا۔ اسلامی لشکر کہیں صحرا پاٹ رہا ہے تو کہیں دشمن کا اجتماع منتشر کر رہا ہے، کہیں دشمن کی کمر توڑ رہا ہے تو کہیں کسی طاغوت پر اچانک جھپٹ رہا ہے گویا اس مرحلے کی کارروائیوں کا ماٹو اب یہ تھا:
«اَلْآنَ نَغْزُوهُمْ وَلَا يَغْزُونَنَا» ''اب وہ ہم سے نہیں لڑیں گے بلکہ ہم ان سے جنگ کریں گے۔''

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا گروہ اللہ تعالیٰ کے نام سے دنیا میں پھیل رہا تھا اور ابدی اصول و ضوابط، بلند ترین اور عظیم اخلاقی قدریں ساری مخلوق کے سامنے پیش کر رہا تھا۔ ان اصولوں کا مقابلہ کرنے والے اور رکاوٹ بننے والے طاغوتی عناصر کو منظر سے ہٹایا جا رہا تھا۔ ہم اللہ تعالیٰ کے اس گروہ کے ایک ایک فرد کو جو خود تربیت کے اخلاقی، فکری، عسکری اور سیاسی بلند معیار پر فائز تھا دیکھتے ہیں کہ کس عمدہ طریقے سے وہ اس منصوبے اور پروگرام کا نفاذ کر رہا ہے۔ اور ان کی حالت کیسے ان کے اصول و مبادیات کی زندہ عملی تصویر بن چکی ہے۔ اور کس طرح وہ آہستہ آہستہ نئے مرحلے کی طرف بڑھ رہے ہیں جس کے خدوخال اور نمایاں آثار صلح حدیبیہ سے شروع ہو رہے ہیں۔[1]

[1] التربية القيادية للدكتور الغضبان: 4/189-192.

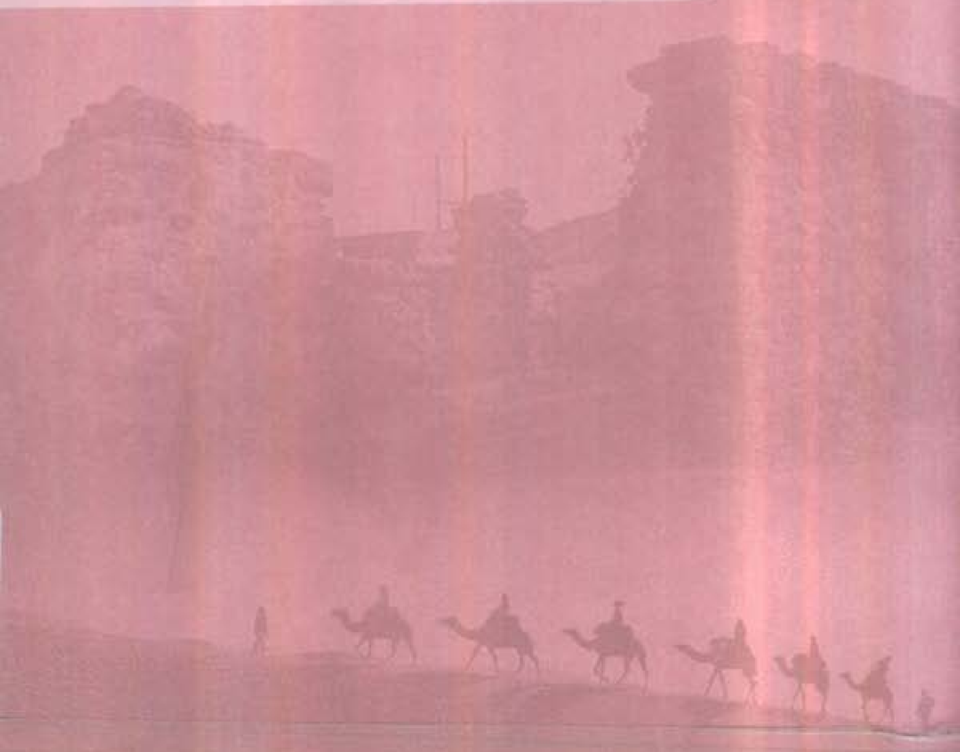
حصہ 15

صلح حدیبیہ

باب: 1 صلح حدیبیہ کی تاریخ اور اسباب و واقعات

باب: 2 صلح حدیبیہ اور اس کے نتائج

باب: 3 حکمتیں، عبرتیں اور فوائد



إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ۝

"بے شک ہم نے آپ کو ایک کھلم کھلا فتح دی ہے۔"

(الفتح 48:1)

لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا ۝

"البتہ تحقیق اللہ مومنوں سے راضی ہوگیا جب وہ درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے، چنانچہ ان کے دلوں میں جو (خلوص) تھا، وہ اس نے جان لیا، تو اس نے ان پر طمانیت و تسکین نازل کی اور بدلے میں انھیں قریب کی فتح دی۔"

(الفتح 48:18)

باب 1

صلح حدیبیہ کی تاریخ اور اسباب و واقعات

تاریخ حدیبیہ اور اس کے اسباب

رسول اللہ ﷺ یکم ذوالقعدہ بروز پیر 6 ہجری [1] کو عمرے کی ادائیگی کے لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہمراہ مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ کی جانب روانہ ہوئے۔ [2]

اس غزوے کا سبب وہ خواب بنا جو رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ میں دیکھا۔ آپ ﷺ نے خواب دیکھا کہ اصحاب کرام کے ہمراہ احرام باندھے عمرہ کی ادائیگی کے لیے مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے ہیں۔ تعظیم بیت اللہ کے لیے ساتھ قربانی بھی ہے۔ آپ ﷺ نے ساتھیوں کو عمرے کی ادائیگی کی خوشخبری دی تو وہ بہت خوش ہوئے۔ [3]

مکہ مکرمہ اور کعبۃ اللہ کی محبت صحابۂ کرام کو گھٹی میں ملی تھی اور ان کے رگ و ریشہ میں سرایت کیے ہوئے تھی۔ اسی طرح وہاں سے گئے ہوئے انھیں عرصہ بیت گیا تھا۔ اسلام نے بیت اللہ سے تعلق اور شوق کو مزید بڑھا دیا تھا۔ وہ دل و جان سے بیت اللہ کے طواف کے انتہائی مشتاق تھے، خصوصاً مہاجرین تو مکہ کی جانب بہت زیادہ چاہت رکھے ہوئے تھے کیونکہ وہ وہیں پیدا ہوئے، پرورش پائی اور وہ اپنے آبائی وطن سے شدید محبت رکھتے تھے۔ ان کے اور مکہ مکرمہ کے درمیان رکاوٹ حائل تھی، چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ نے

---

1. اس تاریخ پر اہل علم کا اجماع ہے، دیکھیے: المجموع للنووي: 78/7. 2. نضرة النعيم: 334/1.
3. حديث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ للدكتور محمد بكر آل عابد: 495/2.

انھیں مکہ مکرمہ داخلے کی یہ خبر سنائی تو وہ اس عظیم زیارت کے لیے تیار ہو گئے۔[1]

رسول اللہ ﷺ نے آس پاس کے لوگوں کو بھی ساتھ جانے کے لیے کہا کیونکہ آپ ﷺ کو خدشہ تھا کہ قریش بیت اللہ سے روکیں گے۔ اسلامی ریاست کو خبر رساں دستوں کے ذریعے سے اطلاعات مل چکی تھیں کہ مدینہ کے جنوب میں واقع قریش اور شمال میں واقع خیبر کے درمیان جنگی معاہدہ ہو چکا ہے۔ اس معاہدے کا مطلب اسلامی حکومت کو دو تلواروں کے درمیان رکھنا اور بالآخر اسلامی وجود کا خاتمہ تھا۔ سیاسی طور پر اس معاہدے کو ختم کرنے کا وقت بھی آ چکا تھا۔

تمام عرب سمجھتے تھے کہ کعبہ قریش کی ذاتی ملکیت نہیں ہے بلکہ ان سب کے باپ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی وراثت ہے، لہٰذا قریش کا حق نہیں کہ جسے چاہیں اس کی زیارت سے روک دیں اور جسے چاہیں اجازت دیں، لہٰذا محمد ﷺ اور ان کے ساتھیوں کو بھی کعبۃ اللہ کی زیارت کا حق حاصل ہے۔[2]

رسول اللہ ﷺ کے مکہ جانے کی خبر عرب قبائل میں پھیل گئی۔ اس خبر کے پھیلنے کا عام آدمی کی رائے پر بڑا اثر تھا۔ اور خاص طور پر جب رسول اللہ ﷺ نے یہ بات اچھی طرح واضح کر دی کہ آپ ﷺ جنگ نہیں چاہتے بلکہ صرف شعائر اللہ کی تعظیم اور عمرے کی ادائیگی کا ارادہ ہے۔ اس عمدہ عمل نے بڑے اچھے تشہیری مقاصد حاصل کیے۔ آپ ﷺ کا مقصد بالکل علانیہ اور واضح تھا۔ اور وہ تھا بیت اللہ کی زیارت اور عمرے کی ادائیگی۔ آپ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سلے کپڑوں کی جگہ احرام باندھ لیا۔ قربانی والے جانوروں کو قلادہ ڈالنے اور اِشعار[3] کرنے کے بعد ذوالحلیفہ سے عمرے کے لیے احرام باندھا۔[4]

[1] السيرة النبوية للندوي، ص: 273. [2] قراءة سياسية للسيرة النبوية للدكتور قلعجي، ص: 214,213. [3] قربانی کے جانور کو زخم لگا کر خون کے ساتھ نشان زدہ کرنا تاکہ دوسرے جانوروں سے اس کی پہچان ہو سکے اِشعار کہلاتا ہے۔ [4] مرويات غزوة الحديبية للدكتور حافظ الحكمي، ص: 55.

رسول اللہ ﷺ نے حالات کا جائزہ لینے کے لیے بشر بن سفیان خزاعی رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا۔ اس کے متعلق واقدی کہتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ نے عباد بن بشر رضی اللہ عنہ کو بلایا اور بیس شاہسواروں کی معیت میں، جو مہاجرین و انصار دونوں میں سے تھے، خبریں لینے کے لیے اپنے آگے روانہ کیا۔'' [1]

اس سے رسول اللہ ﷺ کا مقصد ان اچانک پیش آمدہ حالات کی تیاری تھا جن کے پیش آنے کا امکان تھا۔ ایسے ہی اس پیش رو گروہ کا مقصد دشمن کی خبریں معلوم کرنا بھی تھا۔ [2]

ذوالحلیفۃ میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشورے کو قبول فرمایا۔ انھوں نے یہ مشورہ دیا تھا: ''اے اللہ کے رسول! آپ ایسے لوگوں کے پاس جا رہے ہیں جو ہمارے دشمن ہیں اور بغیر جنگی ساز و سامان کے جا رہے ہیں۔'' چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے وہیں سے مدینہ آدمی بھیجا جو اسلحہ لے آیا۔ [3]

اس سے آپ ﷺ کا ارادہ ان دشمنوں کے مدمقابل تیاری تھی جو مسلمانوں کو نقصان پہنچانے اور پست کرنے کے لیے ہر قسم کے اسلحے اور تیاری سے لیس تھے۔ [4]

رسول اللہ ﷺ کا یہ عمل اسباب و ذرائع اختیار کرنے کی آپ کی عادت مبارکہ کا حصہ ہے جسے آپ نے بہت سارے فوائد کی بنا پر اختیار کیا تاکہ آپ کے امتی بھی اسی طرح کریں۔ اس لیے کہ باہمی مشاورت سے ان دشمنوں کی تدبیروں کو بھی ناکام کیا جا سکتا ہے جو ہمیشہ مسلمانوں پر مصائب و آلام کے پہاڑ ٹوٹ پڑنے کے منتظر رہتے ہیں۔ [5]

رسول اللہ ﷺ وادی عسفان میں

رسول اللہ ﷺ جب عسفان پہنچے تو وہاں بشر بن سفیان کعبی خزاعی رضی اللہ عنہ آپ ﷺ

1 المغازي للواقدي: 974/2. 2 صلح الحديبية لمحمد أحمد باشميل، ص: 309. 3 تاريخ الطبري: 622/2. 4 القيادة العسكرية في عهد الرسول ﷺ للدكتور محمد الرشيد، ص: 489.
5 تاريخ الطبري: 622/2.

سے آ ملے اور انھوں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! قریش آپ کی آمد کی اطلاع پا کر بچوں اور عورتوں سمیت نکل آئے ہیں۔ انھوں نے چیتوں کی کھالیں پہنی ہوئی ہیں اور وہ اس بات پر قسمیں کھا رہے ہیں کہ وہ آپ کو کبھی بھی زبردستی مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔'' یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا: «يَا وَيْحَ قُرَيْشٍ! لَقَدْ أَكَلَتْهُمُ الْحَرْبُ، مَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ خَلُّوا بَيْنِي وَبَيْنَ سَائِرِ الْعَرَبِ، فَإِنْ هُمْ أَصَابُونِي كَانَ ذٰلِكَ الَّذِي أَرَادُوا، وَإِنْ أَظْهَرَنِي اللّٰهُ عَلَيْهِمْ دَخَلُوا فِي الْإِسْلَامِ وَافِرِينَ، وَإِنْ لَّمْ يَفْعَلُوا قَاتَلُوا وَبِهِمْ قُوَّةٌ، فَمَا تَظُنُّ قُرَيْشٌ، فَوَاللّٰهِ لَا أَزَالُ أُجَاهِدُهُمْ عَلَى الَّذِي بَعَثَنِي اللّٰهُ بِهِ حَتّٰى يُظْهِرَهُ اللّٰهُ أَوْ تَنْفَرِدَ هٰذِهِ السَّالِفَةُ»

> ''قریش کو جنگوں نے تباہ و برباد کر دیا۔ افسوس! کیا اچھا ہوتا کہ وہ مجھے دوسرے لوگوں سے لڑنے بھڑنے دیتے۔ اگر وہ مجھ پر غالب آجاتے تو قریش کا مقصد پورا ہو جاتا اور اگر اللہ تعالیٰ مجھے لوگوں پر غالب کر دیتا تو وہ بھی اسلام قبول کر لیتے اور صحیح سالم بھی رہتے اور اگر اسلام قبول نہ کرتے تب بھی قوت کے ساتھ تو لڑتے۔ قریش نے کیا سمجھ رکھا ہے؟ اللہ کی قسم! میں ان سے لڑتا رہوں گا حتی کہ اللہ تعالیٰ اس دین کو غالب فرما دے جو مجھے دے کر بھیجا گیا ہے یا پھر میری گردن تن سے جدا ہو جائے۔''[1]

قریش کی تیاری کی اطلاع پہنچتے ہی رسول اللہ ﷺ نے ساتھیوں سے مذکورہ دو ارادوں کے بارے میں مشورہ طلب فرمایا:

① مسلمانوں کو بیت اللہ سے روکنے اور جنگ کرنے کے لیے آنے والے قریش کے مخلوط مددگار قبائل کی آل اولاد پر حملہ کر دیا جائے۔

② بیت اللہ الحرام کا سفر جاری رکھیں۔ جو بھی راہ میں آئے، مقصد حاصل کرنے تک اس

[1] السيرة النبوية لابن هشام:3/323.

سے جنگ جاری رکھیں۔[1]

جب رسول اللہ ﷺ نے اس کے بارے میں صحابہ سے مشورہ طلب فرمایا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی مدلل رائے کا یوں اظہار کیا کہ جنگ کا ارادہ ترک کر دیا جائے اور اصل مقصد "ادائے عمرہ" کے لیے سفر جاری رکھیں اور اگر لڑائی کی نوبت آئے بھی تو پہل ان کی طرف سے ہو۔ آپ ﷺ نے اس رائے کو سراہتے ہوئے اختیار فرمایا اور لوگوں کو روانہ ہونے کا حکم دیا۔[2]

مشرکین کے سوار جب مسلمانوں کے بالکل قریب پہنچ گئے تو عسفان میں رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو صلاۃ الخوف پڑھائی۔

رسول اللہ ﷺ کا حدیبیہ میں پڑاؤ

رسول اللہ ﷺ کو اطلاع ملی کہ قریش آپ ﷺ کو روکنے نکلے ہیں اور خالد بن ولید کی قیادت میں مسلمانوں کے خلاف گھات لگائے بیٹھے ہیں۔ آپ ﷺ نے مشرکین سے تصادم مول نہ لینے کے لیے راہ تبدیل کرنا پسند کیا۔ فرمایا:

«مَنْ رَّجُلٌ يَّخْرُجُ بِنَا عَلٰى طَرِيقٍ غَيْرَ طَرِيقِهِمُ الَّتِي هُمْ بِهَا؟»

"کون ہے جو ہمیں قریش کے راستے کو چھوڑ کر کسی دوسرے راستے سے لے چلے۔"

قبیلۂ اسلم کے ایک آدمی نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! یہ خدمت میں انجام دوں گا۔" یہ اسلمی شخص گھاٹیوں کے اندر سے ہوتا ہوا مسلمانوں کو سخت پتھریلے راستے پر لے گیا۔ مسلمانوں کے لیے یہ راستہ بڑا دشوار تھا۔ اس راستے سے تمام لوگ وادی کے کنارے نرم زمین پر پہنچے تو آپ ﷺ نے لوگوں کو حکم دیا:

1 القيادة العسكرية في عهد الرسول ﷺ للدكتور محمد الرشيد، ص:489. 2 ملامح الشورى في الدعوة الإسلامية للشيخ عدنان النحوي، ص: 160.

«قُولُوا: نَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَنَتُوبُ إِلَيْهِ»

''سب کہو، ہم اللہ تعالیٰ سے بخشش کے طالب ہیں اور اس سے توبہ کرتے ہیں۔''

پھر فرمایا: «وَاللّٰهِ! إِنَّهَا الْحِطَّةُ الَّتِي عُرِضَتْ عَلٰى بَنِي إِسْرَائِيلَ، فَلَمْ يَقُولُوهَا» ''اللہ کی قسم! یہ وہی ''حطہ'' (جس کا ذکر اس آیت میں ہے: ﴿وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ﴾ (البقرة 58:2)) ہے جو بنی اسرائیل کو پیش کیا گیا تھا مگر انھوں نے نہ کہا۔''[1]

اب رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو حکم دیا کہ دائیں طرف مقام حَمْش کی پشت کے درمیان اسی راستے پر چلو جو ثنیۃ المرار کی طرف جا نکلتا ہے۔ لشکر مکہ کے زیریں جانب حدیبیہ کی طرف چل پڑا۔ اور اس راستے پر آہستگی سے رواں دواں تھا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

خالد بن ولید نے مسلمانوں کے لشکر کا گردوغبار اڑتا دیکھا تو اپنے سواروں سمیت انتہائی سرعت سے نئی صورت حال کے خطرے سے اہل مکہ کو آگاہ کرنے روانہ ہوا۔[2] تاکہ وہ اس تازہ ترین صورت حال کے مقابلے کی تیاری کریں۔ مشرکین بہت پریشان تھے کہ اسلامی لشکر اچانک حدیبیہ پہنچ گیا اور اب مکہ خطرے میں تھا۔

جنرل محمود شیت اس انتہائی عمدہ اور سبق آموز صورتِ حال کے متعلق لکھتے ہیں: اس (نئے) راستے پر مسلمانوں کا سفر (مخالف) لشکر کے ڈر کی وجہ سے نہ تھا کیونکہ جو کوئی دشمن سے ڈرتا ہے وہ اس کے پڑاؤ کے قریب نہیں جاتا۔[3]

اقتباس النظام العسکری فی عهد النبی کے مصنف جنرل محمود شیت خطاب رسول اللہ ﷺ کے رستہ تبدیل کرنے کی حکمت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: نئے راستے کے لیے رہبر لینے اور محفوظ اور پرامن راستے کو اختیار کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ

[1] السيرة النبوية لابن هشام:338/3. [2] غزوة الحديبية لأبي فارس، ص:39. [3] الرسول القائد لمحمود شيت خطاب، ص:187,186.

بیدار مغز، صاحب بصیرت قیادت لشکر کے لیے ایسا راستہ اختیار کرتی ہے جو خطرات و مشکلات سے دور ہوتا ہے۔ اور ایسے راستے سے اجتناب کرتی ہے جہاں دشمن کے حملوں کا خطرہ ہو۔''[1]

جب رسول اللہ ﷺ حدیبیہ کے قریب پہنچے تو اونٹنی ''قصواء'' بیٹھ گئی۔ صحابہ نے کہا: ''قصواء اڑ گئی ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: «مَا خَلَأَتِ الْقَصْوَاءُ وَمَا ذَاكَ لَهَا بِخُلُقٍ وَّلٰكِنْ حَبَسَهَا حَابِسُ الْفِيلِ»

''قصواء اڑی نہیں، نہ یہ اس کی عادت ہے بلکہ اسے اس ہستی نے روک رکھا ہے جس نے ہاتھی کو روک دیا تھا۔'' پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

«وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهٖ! لَا يَسْأَلُونَنِي خُطَّةً يُّعَظِّمُونَ فِيهَا حُرُمَاتِ اللّٰهِ إِلَّا أَعْطَيْتُهُمْ إِيَّاهَا»

''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! یہ لوگ میرے سامنے جو بھی منصوبہ رکھیں بشرطیکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی حرمتوں کی تعظیم کر رہے ہوں تو میں اسے ضرور تسلیم کر لوں گا۔''[2]

اس کے بعد آپ ﷺ نے اونٹنی کو ڈانٹا تو وہ اچھل کھڑی ہوئی، پھر آپ ﷺ نے مکہ کے راستے میں تھوڑی تبدیلی کی اور چلتے رہے یہاں تک کہ اقصائے حدیبیہ میں ایک چشمے پر فروکش ہوئے۔ وہاں تھوڑا سا پانی تھا۔ چند ہی لمحوں میں لوگوں نے سارا پانی نکال (کر ختم کر) لیا اور رسول اللہ ﷺ سے پیاس کی شکایت کی۔ آپ ﷺ نے اپنے ترکش سے ایک تیر نکالا اور حکم دیا اسے چشمے میں ڈال دیں۔ تیر چشمے میں گیا ہی تھا کہ چشمے کا پانی ابل پڑا اور تمام لوگوں نے سیر ہو کر پانی پیا۔

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کنویں کے کنارے بیٹھ گئے۔ تھوڑا پانی منگوا

---

1 اقتباس النظام العسكري في عهد النبي ﷺ لمحمود شيت خطاب، ص: 258. 2 صحيح البخاري، حديث: 2732,2731.

کر کلی کی اور اسے کنویں میں پھینکا۔[1]

دونوں روایات میں تطبیق یوں ممکن ہے کہ دونوں کام بیک وقت ہوئے ہوں۔ حافظ ابن حجر کی رائے بھی یہی ہے۔[2]

واقدی کی روایت بھی اس کی تائید کرتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ڈول میں کلی کی اور اسے کنویں میں ڈال دیا اور ساتھ ہی اپنے ترکش سے ایک تیر نکال کر کنویں میں ڈالا اور دعا فرمائی تو کنواں جوش مارنے لگا۔[3]

چند نصائح و اسباق

کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی مشیّت اور حکم سے جاری و ساری ہے۔ غور کیجیے کہ رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی کہاں بیٹھی اور کیسے صحابہ نے اس کا بیٹھنا ناپسند کیا اور پھر انھوں نے اسے اٹھانے کی کوشش بھی کی تاکہ اونٹنی سفر جاری رکھے اور وہ بھی اس کے ساتھ بیت اللہ کی جانب رواں دواں رہیں، خواہ نتائج کچھ بھی نکلیں لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔[4]

رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان: ''اس (اونٹنی) کو ہاتھی روکنے والے نے روک دیا'' سے حافظ ابن حجر نے ایک بہت عمدہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔ حافظ صاحب کہتے ہیں: ''اس قصے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عمومی لحاظ کا اعتبار کر کے تشبیہ دینی جائز ہے اگرچہ اس کا کوئی خاص پہلو مختلف ہی کیوں نہ ہو کیونکہ اصحاب الفیل تو خالصتاً باطل پر تھے جبکہ اس اونٹنی والے خالصتاً حق پر ہیں، لہٰذا اس مثال میں تشبیہ اللہ تعالیٰ کے حرم سے مطلقاً روک دینے کے اعتبار سے ہے۔''[5]

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مشرکین، اہل بدعت، اہل فسق، ظالم اور باغی جب ایسے

---

[1] فتح الباري: 758/14، شرح الحديث: 3577. [2] فتح الباري: 164/11، شرح الحديث: 2732,2731. [3] المغازي للواقدي: 588/2. [4] صلح الحديبية لأبي فارس، ص: 43. [5] فتح الباري: 261/6.

صلح حدیبیہ

(ذی القعدہ 6ھ)

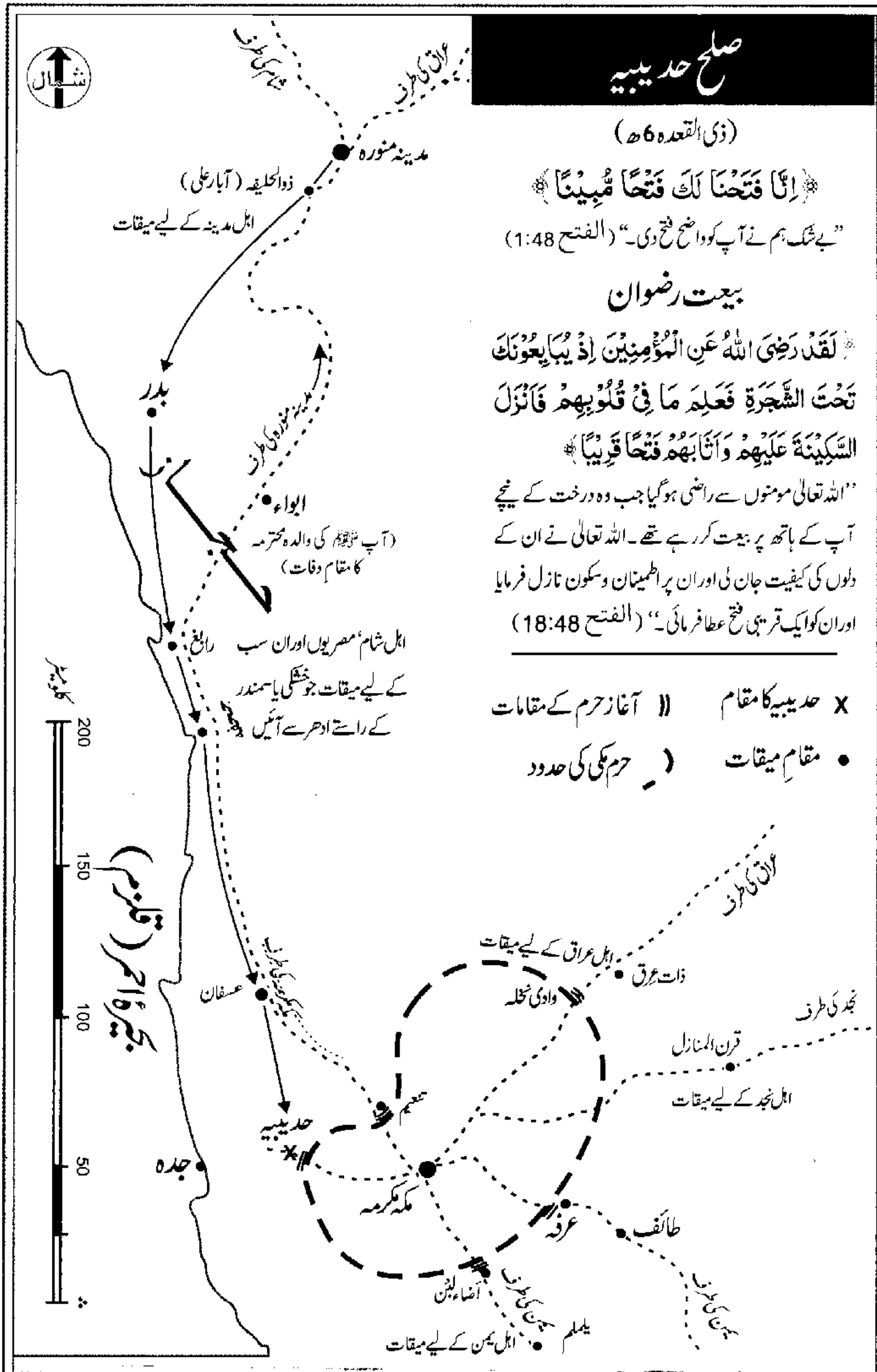
﴿اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا﴾

"بے شک ہم نے آپ کو واضح فتح دی۔" (الفتح 1:48)

بیعت رضوان

﴿لَقَدۡ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اِذۡ يُبَايِعُوۡنَكَ تَحۡتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيۡ قُلُوۡبِهِمۡ فَاَنۡزَلَ السَّكِيۡنَةَ عَلَيۡهِمۡ وَاَثَابَهُمۡ فَتۡحًا قَرِيۡبًا﴾

"اللہ تعالیٰ مومنوں سے راضی ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کی کیفیت جان لی اور ان پر اطمینان و سکون نازل فرمایا اور ان کو ایک قریبی فتح عطا فرمائی۔" (الفتح 18:48)



امر کا تقاضا کریں جن میں شعائر اللہ (دین) کا احترام ہوتا ہو تو ان کی بات تسلیم کرنی چاہیے۔ تعاون پیش کرنا چاہیے اور صرف اس بات میں تعاون ہونا چاہیے جس میں حرمات اللہ کی عظمت پائی جائے نہ کہ ان کے کفر اور ظلم و زیادتی میں تعاون کیا جائے۔ [1]

اللہ جل جلالہ کا یہ فیصلہ تھا کہ اس بار مسلمانوں اور مشرکوں میں جنگ کی نوبت نہ آئے کیونکہ اس میں کئی حکمتیں پوشیدہ تھیں جن کا ظہور بعد میں ہوا، مثلاً:

- مسلمانوں کا بزور شمشیر داخل ہونے کا مطلب تھا کہ کشت و خون اور دونوں جانب سے لاتعداد جانوں کا ضیاع۔
- مکہ مکرمہ میں موجود کمزور مسلمان بھائیوں کے بھی مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہو جانے کا اندیشہ تھا جو اپنی قوم کے ڈر سے اسلام کو دلوں میں چھپائے ہوئے تھے۔

یہ بات اللہ تعالیٰ کے علم میں پہلے سے موجود تھی کہ یہی لوگ جو آج رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کو مسجد حرام سے روک رہے ہیں عنقریب اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کو اسلام کے لیے کھول دے گا۔ اللہ تعالیٰ ان کے ہاتھوں بہت سے ملک فتح کرائے گا۔ یہی لوگ پیغام الٰہی لوگوں تک پہنچائیں گے اور بھٹکے ہوؤں کو راستہ دکھائیں گے۔ [2]

رسول اللہ ﷺ اور قریش کے درمیان سفارت کاری

رسول اللہ ﷺ نے قریش کو یقین دہانی کرانے کی حتی الوسع کوشش فرمائی کہ میں تم سے جنگ نہیں کرنا چاہتا بلکہ صرف بیت اللہ کی زیارت کا ارادہ ہے۔ اور یہ مسلمان اور غیر مسلم ہر کسی کا حق ہے۔ قریش کو جب اس کا یقین ہو گیا تو انھوں نے بات چیت کرنے کے لیے اور مسلمانوں کو جنگ پر مجبور کیے جانے کی صورت میں ان کی ممکنہ قوت جانچنے کے لیے کچھ لوگ بھیجے۔ ان سفیروں کا اور مقصد یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کو جنگ کے بغیر مذاکرات کے

[1] صلح الحديبية لأبي فارس، ص:48. [2] صلح الحديبية لأبي فارس، ص:45.

ذریعے بیت اللہ سے روکا جا سکے تو روک لیا جائے۔[1]

بدیل بن ورقاء کی قیادت میں بنوخزاعہ کا سفارتی وفد

بدیل بن ورقاء چند خزاعی لوگوں کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اہل تہامہ میں سے خزاعہ آپ ﷺ کے خیر خواہ اور تعلق دار تھے۔ انھوں نے آ کر واضح طور پر بتایا کہ قریش آپ ﷺ کے مکہ مکرمہ میں داخلے کو روکنے پر تلے ہوئے ہیں۔ آپ ﷺ نے بھی اپنے مکہ آنے کا مقصد اور ممکنہ جنگ کی صورت میں قریش کے نقصان کا تذکرہ فرمایا۔ آپ ﷺ نے قریش کے لیے معاملہ واضح ہونے تک انھیں جنگ بندی کی پیشکش بھی کی۔ یہ بھی بتایا کہ اگر وہ ایسا نہیں چاہتے تو پھر جان کی کوئی پروا نہیں، جنگ کا رستہ کھلا ہے۔ وفد نے یہ باتیں جا کر قریش کو بتائیں۔ اور انھیں سمجھایا کہ اے گروہ قریش! محمد ﷺ کے معاملے میں تم جلد بازی کر رہے ہو۔ محمد ﷺ قتال کے لیے قطعی نہیں آئے۔ ان کا مقصد صرف بیت اللہ کی زیارت ہے۔ اس پر قریش نے انھیں مورد الزام ٹھہرا کر نازیبا باتیں کیں۔ اور کہنے لگے: ''اگرچہ وہ قتال کے ارادے سے نہیں آیا مگر اللہ کی قسم! پھر بھی انھیں بیت اللہ میں بزور داخل نہ ہونے دیا جائے گا اور عرب کو چاہیے کہ اس بارے میں ہم سے بات بھی نہ کریں۔''[2]

مشرکین مکہ کے سامنے رسول اللہ ﷺ کی صلح اور عدم جنگ کی اعلیٰ ترین سیاسی پیشکش کئی اہم مقاصد پر منتج ہوئی، مثلاً:

① قریش سے صلح کا مطلب انھیں جزیرۃ العرب میں واقع ہونے والے کسی بھی معرکے سے الگ تھلگ کر دینا تھا، خواہ وہ قریش کے علاوہ دیگر عربی قبائل کے ساتھ ہو یا دھوکا باز اور گھٹیا دشمن یہود کے ساتھ ہو۔ یہود تو مسلمانوں کے لیے ہمہ وقت مشکل گھڑی کے منتظر رہتے تھے۔

[1] السيرة النبوية للدكتور مهدي رزق الله، ص:485. [2] السيرة النبوية لابن هشام:340/3.

② رسول اللہ ﷺ کی خواہش تھی کہ ہمارے اور قریش کے درمیان بات چیت کا دروازہ کھلا ہی رہے تاکہ سفارت اور خط کتابت کے ذریعے سے ایک دوسرے کی بات سنتے سناتے رہیں۔ دلوں کو قریب کرنا اور فضا پر امن رکھنا بھی مطلوب و مقصود تھا۔ آپ ﷺ جنگ کی فضا کو ہموار سطح پر لانا اور جنگ کی طرف ان کی پیش قدمی کو کمزور کرنا چاہتے تھے۔

③ رسول اللہ ﷺ کی خواہش تھی کہ خزاعہ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ ان کا حلیف طاقتور ہے، لہٰذا اسلام سے قبل بنو ہاشم کے ساتھ طے پانے والے معاہدے پر انھیں اعتماد کرنا چاہیے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر وہ معاہدہ بحال رہا اور ختم ہونے کے بجائے مزید پختہ ہوا۔

④ اہل عقل و دانش جب رسول اللہ ﷺ کی باتیں سنیں گے کہ وہ بیت اللہ کی زیارت کے لیے آئے ہیں اور مشرک انھیں واپس لوٹا رہے ہیں اس کے باوجود وہ بیت اللہ کی زیارت پر مصر ہیں تو یہ اہل دانش و بینش آپ ﷺ کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے اور آپ ﷺ کے لیے نرم گوشہ رکھیں گے جس سے آپ کا مرکز قیادت طاقتور اور قریش کا مرکز کمزور ہوتا چلا جائے گا۔

⑤ مشرکینِ مکہ بدیل کی بات چیت سے مطمئن نہ ہوئے۔ انھیں خزاعہ کے دلی جذبات کا آپ ﷺ کے حق میں ہونے کا علم تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ خزاعہ کی حمایت مسلمانوں کے ساتھ ہے۔[1]

⑥ رسول اللہ ﷺ کے بدیل بن ورقاء کو جواب دینے سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ اطاعت بجا لانے یا اس تک پہنچنے کے لیے نرم پہلو اختیار کرنا چاہیے، خواہ ایسا کرنا ضروری نہ بھی ہو۔ کیونکہ آپ ﷺ نے انھیں (بڑے ٹھنڈے مزاج سے) جواب دیا اور اپنی طبعی خوش خلقی کی بنا پر اس ناراضگی کا اظہار نہ ہونے دیا جو دل میں موجود تھی۔ کیونکہ جس نیکی کی بجا آوری کے لیے آپ ﷺ گھر سے نکلے تھے اس طرح اس تک پہنچنے کی بھی امید

1 صلح الحديبية لأبي فارس، ص:67.

کی جا سکتی تھی۔[1]

عروہ بن مسعود ثقفی کی سفارت

بدیل بن ورقاء نے رسول اللہ ﷺ کی باتیں قریش کو بتائیں۔ انھوں نے ان باتوں کو تسلیم نہ کیا بلکہ خزاعہ کو متہم قرار دیا اور انھیں نازیبا باتیں کیں۔ اب عروہ بن مسعود ثقفی نے پیش کش کی میں رسول اللہ ﷺ سے ملتا ہوں اور ان کے خیالات سن کر صحیح خبر لاتا ہوں۔[2]

اس واقعے کو امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں بھی بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس دوران عروہ بن مسعود ثقفی کھڑا ہوا اور کہنے لگا: ''اے میری قوم! کیا تم میری اولاد کے درجے میں نہیں ہو؟'' انھوں نے کہا: ''کیوں نہیں۔'' عروہ نے کہا: ''کیا میں تمھارے اندر باپ کی حیثیت نہیں رکھتا؟'' انھوں نے کہا: ''کیوں نہیں۔'' عروہ کہنے لگا: ''کیا تم مجھے متہم قرار دیتے ہو؟'' قریش کہنے لگے: ''نہیں۔'' عروہ نے کہا: ''کیا تم جانتے نہیں کہ میں نے اہل عکاظ کو اکٹھا کیا۔ انھوں نے جب میرا انکار کیا تو میں بیوی بچوں کو ساتھ لے کر آ گیا ہوں۔'' قریش نے کہا: ''کیوں نہیں۔'' اس نے کہا: ''اس شخص نے تمھارے سامنے اچھی تجویز پیش کی ہے اسے قبول کر لو۔ اور مجھے ان کے پاس جانے دو۔'' قریش نے کہا: ''جائیں۔'' چنانچہ وہ گیا۔ آپ ﷺ نے اس سے بھی وہی بات کہی جو بدیل سے کہی تھی۔

اس پر عروہ نے کہا: ''اے محمد (ﷺ!) یہ بتائیے کہ اگر آپ نے اپنی قوم کا صفایا بھی کر دیا تو کیا اس سے پہلے کسی عرب کے متعلق سنا ہے کہ اس نے اپنی قوم کا صفایا کر دیا ہو۔ اور اگر دوسری صورت پیش آئی تو خدا کی قسم! میں (قابل اعتماد) چہرے نہیں دیکھ رہا۔ میں تو ایسے اوباش لوگوں کو دیکھ رہا ہوں جو آپ کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔''

[1] صلح الحديبية لأبي فارس، ص: 68. [2] صلح الحديبية لأبي فارس، ص: 68.

اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''جا! لات کی شرمگاہ چوس! کیا ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے؟''

عروہ نے پوچھا: ''یہ کون ہے؟'' لوگوں نے کہا: ''ابوبکر ہیں۔'' اس نے انھیں مخاطب کر کے کہا: ''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر تمھارا مجھ پر ایک احسان نہ ہوتا جس کا میں بدلہ نہیں دے سکا تو یقیناً میں تمھاری اس بات کا جواب دیتا۔''[1]

عروہ نے مسلمانوں پر نفسیاتی جنگ مسلط کرنے کا عزم کیا تھا تاکہ انھیں نفسیاتی طور پر شکست دے دے، چنانچہ اس نے اپنی بات بڑھا چڑھا کر بیان کی۔ اس نے قریش کی جنگی قوت، ان کا موقف اور تیاری نہایت مبالغہ آمیزی سے بیان کر کے قریش کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کی۔

عروہ بن مسعود ثقفی نے نفسیاتی طور پر مسلمانوں کی صفوں میں انتشار ڈالنے اور سالارِ لشکر کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے کی کوشش کی۔ یوں اس نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے لشکر کے درمیان مشکلات پیدا کرنے کی کوشش کی تاکہ ان کے عزائم کو خاک میں ملایا جائے اور احساسات و خیالات پر برا اثر ڈالا جائے۔ مذاکرات کے دوران مسلمانوں کے خلاف نفسیاتی جنگ کے مختلف انداز اختیار کیے گئے۔ یہ ان سب میں سے موثر ترین حربہ تھا۔

عروہ نے قریش کی طاقت کا رعب ڈال کر بھی مسلمانوں کو خوف میں مبتلا کرنے کی کوشش کی۔ عروہ نے مذاکرات کے دوران نفسیاتی جنگ کا ہر حربہ استعمال کیا۔[2]

مگر یہ تمام کوششیں گہرے ایمان، اعلیٰ جماعت اور سیسہ پلائی اسلامی صف بندی کے آگے ناکام ثابت ہوئیں۔

عروہ بن مسعود کے ساتھ مذاکرات کے دوران جو امتیازی اوصاف سامنے آئے ان

---

1 صحيح البخاري، حديث:2732,2731. 2 منهج الإعلام الإسلامي في صلح الحديبية لسليم حجازي، ص:132,131.

میں سے انتہائی تعجب خیز واقعہ وہ تھا جو اصحاب رسول کی قوتِ ایمانی کی دلیل کے طور پر سامنے آیا۔ اس میں اس بات کی بھی قوی دلیل موجود تھی کہ دین اسلام میں ایک عام عربی بدو کو فضیلت کا حامل اور اخلاقی معراج پر پہنچانے کی کس قدر قدرت وطاقت ہے۔

عروہ بن مسعود کے ساتھ مذاکرات کے دوران آپ ﷺ کی حفاظت پر مامور اشخاص میں مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ [1] بھی تھے جو اسی عروہ بن مسعود کے بھتیجے تھے۔

مشرف بہ اسلام ہونے سے پہلے مغیرہ بن شعبہ ایک ڈاکو اور شراب نوشی کرنے والے نوجوان تھے۔ اسلام سے وابستگی نے انھیں ایک اور ہی انسان بنا دیا اور ان کی کایا پلٹ دی اور اب اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے وہ ایک ممتاز مومن بن چکے تھے۔ جنگ کے بادلوں سے اٹی ہوئی فضا میں رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کی ذمہ داری کا امتحان ان پر آ گیا۔ مذاکرات کے وقت جاہلیت کی عادت کے مطابق فریق مخالف اپنے ہم منصب کے داڑھی ہاتھ میں لیتا۔ اسی عادت کے پیش نظر عروہ بن مسعود گفتگو کے دوران رسول اللہ ﷺ کی داڑھی مبارک کو چھوتا۔ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ چہرے پر خود چڑھائے رسول گرامی ﷺ کے پہلو میں کھڑے تھے۔ انھیں یہ دیکھ کر طیش آ گیا، انھوں نے اپنے چچا کو ڈانٹا اور تلوار کا دستہ اس کے ہاتھ پر مارتے ہوئے کہا:

”رسول اللہ ﷺ کی داڑھی مبارک سے اپنا ہاتھ ہٹا لے ورنہ یہ ہاتھ واپس نہیں آئے گا۔“

نبی مکرم ﷺ مشرک چچا اور مومن بھتیجے کے معاملے پر تبسم فرما رہے تھے چونکہ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ اپنے جنگی لباس میں ملبوس تلوار سونتے، زرہ لگائے، خود چڑھائے کھڑے تھے،

---

1 حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ حدیبیہ سے قبل اسلام لائے اور حدیبیہ میں شامل ہوئے۔ یوں بیعت رضوان میں بھی شرکت کی۔ جنگ یرموک میں ان کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی تھی۔ جنگ قادسیہ میں رستم کی طرف حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے ایلچی یہی تھے۔ الإصابة: 452/3.

عروہ نے انھیں نہیں پہچانا۔ عروہ نے غصے سے کہا: ”کاش! مجھے پتا چلے کہ تم کون ہو؟“ اس نے پوچھا: ”اے محمد (ﷺ)! یہ کون ہے؟“ رسول گرامی ﷺ نے فرمایا:

«هٰذَا ابْنُ أَخِيكَ الْمُغِيرَةُ بْنُ شُعْبَةَ»

”یہ تمھارا بھتیجا مغیرہ بن شعبہ ہے۔“

تو عروہ نے کہا: ”او بدعہد! تو......؟ تو نے ثقیف قبیلے کے ساتھ ہمیشہ کے لیے ہماری لڑائی بنا دی ہے۔ اللہ کی قسم! ابھی کل میں نے تیری خباثت دھوئی ہے۔“

واقعہ یہ پیش آیا تھا کہ جاہلیت میں مغیرہ کچھ لوگوں کے ساتھ تھے، پھر ان کو قتل کر کے ان کا مال لے بھاگے اور مسلمان ہو گئے۔ اس پر نبی ﷺ نے فرمایا تھا کہ میں تمھارے اسلام کو تو قبول کر لیتا ہوں لیکن مال سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔

عروہ مذاکرات میں ناکام رہا مگر واپسی پر قریش کو مسلح تصادم سے ڈراتے ہوئے کہنے لگا: ”اے میری قوم! میں قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے درباروں میں جا چکا ہوں۔ بخدا! میں نے کسی بادشاہ کو نہیں دیکھا کہ اس کے ساتھی اس کی اتنی تعظیم کرتے ہوں جتنی محمد (ﷺ) کے ساتھی ان کی تعظیم کرتے ہیں۔ اللہ کی قسم! وہ اسے بھرپور نظر سے دیکھتے بھی نہیں تھے اور نہ اس کے پاس اپنی آواز بلند کرتے، اسے کسی کام کی طرف صرف اشارے کی ضرورت ہوتی ہے، پھر وہ کر دیا جاتا ہے۔ وہ تھوکتے بھی تھے تو کسی نہ کسی آدمی کے ہاتھ پر پڑتا تھا اور وہ شخص اسے اپنے جسم پر مل لیتا تھا۔ اور جب وہ وضو کرتے تو ہر کوئی وضو کا پانی حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ میں نے ان کا صحیح صحیح اندازہ لگایا ہے۔ تمھیں یقین آ جانا چاہیے کہ اگر تم لڑنا بھی چاہتے ہو تو وہ اس میں پس و پیش نہ کریں گے بلکہ لڑائی کا حق ادا کر دیں گے۔ میں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں کہ ان کے ساتھ کچھ بھی ہو جائے انھیں پروا تک نہیں، جبکہ وہ اپنے صاحب (محمد ﷺ) کو بچا لیں اور محفوظ کر لیں۔ بخدا! میں نے اس کے ساتھ ایسی جماعتیں دیکھی ہیں جو کسی صورت میں بھی محمد (ﷺ) کو نہیں چھوڑ سکتیں۔

کوئی مستحکم رائے قائم کرو اور کمزور آراء سے بچو۔ لوگو! اس کے ساتھ معاملہ طے کرلو (اس سے ڈر جاؤ، بچو) اس نے جو پیشکش کی ہے قبول کرو۔ میں تمھارا خیر خواہ ہوں اور یاد رکھو مجھے ڈر ہے کہ اس کے خلاف تمھیں (غیبی) امداد بھی میسر نہ ہو گی کیونکہ وہ بیت اللہ کی جانب تعظیم کی غرض سے آیا ہے، اس کے ساتھ قربانیاں ہیں جنھیں وہ ذبح کرے گا اور واپس چلا جائے گا۔'' یہ سن کر قریش نے کہا: ''اے ابو یعفور! (عروہ کی کنیت) ایسی باتیں مت کرو۔ کوئی اور یہ باتیں کرتا تو ہم اسے ملامت کرتے۔ اس سال ہم اسے بیت اللہ سے واپس کریں گے۔ وہ آئندہ سال آ جائے۔''[1]

نفسیاتی جنگ مسلمانوں کے بجائے قریش پر مسلط ہو گئی۔ عروہ نے جن حالات کی عکاسی کی وہ بالکل صحیح عکاسی تھی۔ اس نے حدیبیہ میں مسلمانوں کی جو کیفیت دیکھی، کھول کر بیان کر دی کہ وہ اپنے پیغمبر ﷺ کی تعظیم کرتے ہیں اور اس کے ساتھ انھیں کس قدر محبت ہے۔ اس کے دفاع کے لیے کتنی قربانی دینے والے ہیں اور وہ نفسیاتی برتری کے حامل ہیں۔ ان کی جنگی اور نفسیاتی تیاری بیان سے باہر ہے۔ گویا عروہ کا بیان قریش کے لیے براہ راست تنبیہ تھی کہ جلد بازی سے کام لے کر نبی ﷺ سے جنگ مول نہ لیں۔ عین ممکن ہے کہ جنگ کے نتائج مسلمانوں کے حق میں نکلیں۔

ان باتوں نے قریش کی قیادت کو پریشان کر دیا۔ وہ معاملے کی سنگینی کا اس حد تک اندازہ نہیں لگا سکتے تھے۔ قریشی قیادت پر ثقیف کے سردار کا ایک ایک لفظ بجلی بن کر گر رہا تھا۔ رسول اللہ ﷺ (بلاشبہ) اللہ تعالیٰ کے تائید یافتہ تھے۔ اس کا اثر عروہ بن مسعود پر بھی ہوا جس سے قریشی لشکر میں آہستہ آہستہ پھوٹ پڑنے لگی۔ اور قریشی لشکر سچی، مضبوط، خود دار اور حق کی قیادت کے بالمقابل اپنی جائے پناہ ڈھونڈنے لگے۔ یوں نبی ﷺ کے خلاف عرب کو اکٹھا کرنے کی دلیل بھی خود بخود ختم ہو گئی۔

1 المغازي للواقدي: 598/3.

رسول اللہ ﷺ نے اپنی حکمت و ذہانت سے بڑی کامیابی حاصل کی۔ آپ ﷺ نے مقصود حاصل کرنے کے لیے کئی قسم کی ڈپلومیسی اختیار کی تاکہ (مخالف کے) دلوں میں شکست کا یقین بٹھا دیں اور انھیں ان کے طرفداروں سے دور کر دیں۔ سیاسی اور عسکری سطح پر یہ بہت بڑی فتح سمجھی جاتی ہے جو رسول اللہ ﷺ نے حاصل کی۔ [1]

حلیس بن علقمہ کی سفارت

پھر قریش نے حلیس بن علقمہ کنانی کو بھیجا۔ یہ اس وقت احابش کا سردار تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے دیکھ کر فرمایا:

«إِنَّ هٰذَا مِنْ قَوْمٍ يَتَأَلَّهُونَ فَابْعَثُوا الْهَدْيَ فِي وَجْهِهٖ حَتّٰى يَرَاهُ»

''اس شخص کا تعلق نیک قوم سے ہے وہ قربانی کے جانوروں کا بے حد احترام کرتے ہیں۔ اس کے سامنے جانوروں کو کھڑا کر دو تاکہ وہ دیکھ لے۔''

اور ساتھ ہی آپ ﷺ نے بہ آواز بلند تلبیہ کہنے کا حکم دیا۔ حلیس بن علقمہ نے جب قربانی کے اونٹوں کو وادی سے اپنی طرف آتے دیکھا تو رسول اللہ ﷺ سے ملے بغیر واپس پلٹ گیا۔

جہاں اونٹ تھے وہ وادی انتہائی خشک تھی۔ اس میں پانی تھا نہ چارا۔ قربانی کے اونٹ اتنی مدت یہاں ٹھہرنے کی بنا پر اپنی مینگنیاں کھانے پر مجبور تھے۔ اس نے مسلمانوں کو بھی دیکھا جنھوں نے تلبیہ بلند کرتے ہوئے اس کا استقبال کیا اور وہ احرام پہنے ہوئے تھے۔ عرصے تک احرام میں رہنے کی بنا پر ان کی حالت پراگندہ ہو چکی تھی۔ اسے قریش کا سخت رویہ بہت ناگوار گزرا۔ بنو کنانہ کا سردار رسول اللہ ﷺ سے گفتگو کیے بغیر ہی واپس قریش کے پاس چلا گیا۔ اس نے طے شدہ پروگرام کے مطابق بات چیت بھی نہ کی۔ اس نے

1 منهج الإعلام الإسلامي في صلح الحديبية لسليم حجازي، ص: 145.

بیت اللہ کی زیارت کرنے والوں کے خلاف مشرکین مکہ کے اس رویے کو دشمنی پر مبنی اور غیر منصفانہ قرار دیا اور یہ بھی فیصلہ دیا کہ اس صورت حال میں قریش کی حمایت بھی جائز نہیں۔[1]

بہرحال حلیس قریش کے مخالف خیالات لیے واپس آیا۔ اس موجودہ صورتِ حال میں قریش کی صفوں میں دراڑیں پڑنے اور قریش کے ساتھ ملنے والے دیگر قبائل میں ہونے والے معاہدے کے کالعدم قرار دیے جانے کے خدشات نمایاں تھے۔ اس لیے قریش نے کوشش کی کہ اس صورت حال کی تلافی کی جائے۔ اب قریش اور دیگر قبائل کے سردار حُلیس سے کہنے لگے: ''تم نے جو کچھ دیکھا وہ محمد ﷺ اور اس کے ساتھیوں کی چال ہے۔ تم ذرا رُک جاؤ، ہم اپنے لیے کوئی ایسی بات طے کرلیں جس پر ہم سب رضا مند ہو جائیں۔''[2]

رسول اللہ ﷺ کو حلیس کی شخصیت اور نفسیات کا اچھی طرح ادراک تھا، تبھی تو آپ نے فرمایا تھا کہ یہ نیک اور عبادت گزار قوم کا فرد ہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو اس شخص کی مکمل واقفیت تھی۔ آپ ﷺ نے حالات کے مطابق اس کی شخصیت کو پرکھا۔

رسول اللہ ﷺ کو خود بھی شعائر اللہ کی تعظیم اچھی لگتی تھی۔ اس بنا پر آپ ﷺ نے اس شخص کے سامنے مضبوط اور مناسب منصوبہ بندی کی اور اس کے سامنے مسلمانوں کا موقف واضح کیا۔ یا پھر اسے اس پر ابھارا کہ کم از کم وہ تو رکاوٹ بننے سے باز رہے اور قریش کا ساتھ نہ دے۔

حلیس بن علقمہ سارے عرب میں اپنی بہتر سوچ کی وجہ سے بہترین شہرت رکھتا تھا اور اسی بنا پر وہ احابش کا قائد اور سردار بھی تھا۔ اسی طرح آپ ﷺ اور قریش دونوں کی نگاہ

1 منهج الإعلام الإسلامي في صلح الحديبية لسليم حجازي، ص: 108. 2 المغازي للواقدي: 600/2.

میں بڑے احترام و مقام پر فائز تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ حق اور انصاف مسلمانوں کی جانب ہے تو وہ اس پوزیشن میں تھا کہ دو مدمقابل گروہوں میں امن وسلامتی کے لیے اہم کردار ادا کر سکے اور قریش کو لگام دے سکے اور اسے مسلمانوں کے خلاف دشمنانہ موقف اور مسجد حرام سے روکنے سے پھیر سکے۔ یہیں سے پتا چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا حلیس کی نفسیات کو جانچنا ان مبادیات سے بالکل ہم آہنگ تھا جن مبادیات پر وہ ایمان رکھتا تھا۔ یہ منصوبہ بڑا کارآمد اور موثر تھا اسی لیے اس سے برآمد ہونے والا نتیجہ توقع کے عین مطابق اور پسندیدہ تھا۔[1]

رسول اللہ ﷺ کی تدبیر عروہ بن مسعود اور حلیس بن علقمہ پر بڑی کارگر ثابت ہوئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشرکین مکہ کی صفوں میں آہستہ آہستہ اختلاف پیدا ہونے لگا۔ اس بارے میں پروفیسر عقاد ذکر کرتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ لشکروں کی منصوبہ بندی اور جاسوسی گروہوں کی تیاری سے کمال حد تک واقف تھے اور اپنی دسترس میں موجود ہر قوت وصلاحیت کو برمحل استعمال کرنے پر قادر تھے، خواہ وہ رائے کی قوت ہو یا زبان کی قوت ہو یا قوتِ نفاذ۔ ہم تاریخ میں کسی کو ایسا نہیں پاتے کہ اس نے قائل کرنے یا سفارتکاری کی قوت کو مقصود تک لے جانے کے لیے آپ ﷺ سے زیادہ موثر اور نفع بخش طریقہ اختیار کیا ہو۔''

مصنف مزید لکھتے ہیں: جنگ میں سفارتکاری کی دیگر اغراض میں سے دو اہم اغراض یہ ہوتی ہیں:

① مدّ مقابل کو اپنا آپ منوا لینا اور دیگر (غیر جانبدار) لوگوں کو اپنے حق میں کر لینا۔

② دشمن کا شیرازہ بکھیر کر اور اس کے عزائم توڑ کر اسے میدانِ کارزار میں مقابلے میں آنے سے روکنا۔

[1] منهج الإعلام الإسلامي في صلح الحديبية لسليم حجازي، ص: 111.

بعدازاں مصنف کہتے ہیں: ''بسا اوقات آپ ﷺ ایسے اہداف ایک ہی آدمی کی سفارتکاری سے حاصل کر لیتے جنھیں حکومتیں بڑی منظّم ایجنسیوں اور گروہوں سے حاصل نہیں کر پاتیں۔''[1]

مکرز بن حفص کی سفارت

حدیبیہ کے روز مکرز بن حفص بھی قریش کے سفراء میں تھا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کا ذکر کیا ہے: ...... تب قریش میں سے مکرز بن حفص کھڑا ہوا اور کہنے لگا: ''اب بات چیت کے لیے مجھے جانے دو۔'' انھوں نے کہا: ''چلو تم بھی ہو آؤ۔'' جب وہ آیا تو رسول اللہ ﷺ نے اسے دیکھتے ہی فرمایا: «هٰذَا مِكْرَزٌ وَّهُوَ رَجُلٌ فَاجِرٌ» ''یہ مکرز ہے اور یہ فاجر آدمی ہے۔'' وہ رسول اللہ ﷺ سے بات کرنے لگا۔ وہ بات کر ہی رہا تھا کہ سہیل بن عمرو آ گیا۔

معمر کہتے ہیں مجھ سے ایوب نے عکرمہ کے واسطے سے بیان کیا ہے کہ جب سہیل بن عمرو آ گیا تو نبی ﷺ نے فرمایا: «قَدْ سَهُلَ لَكُمْ مِّنْ أَمْرِكُمْ» ''تمھارا کام تمھارے لیے آسان ہو گیا ہے۔''[2]

نبوی سفیر

رسول اللہ ﷺ نے خیال کیا کہ قریش کی جانب خصوصی ایلچی بھیجنے کی ضرورت ہے جو انھیں آپ ﷺ کی صلح پسندی اور جنگ نہ کرنے کی رغبت سے باخبر کرے۔ قریش کو بتایا جائے کہ ہمارا مقصد صرف مقامات مقدسہ کا احترام اور مناسک عمرہ کی ادائیگی ہے۔ اس کے بعد ہم مدینہ پلٹ جائیں گے۔ رسول اللہ ﷺ کا پیغام قریش کی جانب لے جانے کے لیے خراش بن امیہ خزاعی کا انتخاب ہوا۔ آپ ﷺ نے اسے اپنے ''ثعلب'' نامی اونٹ پر سوار کیا۔ جب وہ مکہ میں داخل ہوا تو قریشیوں نے اونٹ کی کونچیں کاٹ ڈالیں

1 عبقرية محمد ﷺ للعقاد، ص:49. 2 صحيح البخاري، حديث:2732,2731.

اور خراش کو بھی قتل کرنا چاہا مگر احابش نے انھیں بچا لیا۔ خراش بن امیہ رسول اللہ کے پاس واپس آئے اور آپ ﷺ کو قریش کے سلوک کی خبر دی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا بطور سفیر چناؤ

رسول اللہ ﷺ نے دوسرا سفیر روانہ کرنا چاہا تو ابتدائی طور پر عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو چنا۔[1] حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کو معذرت پیش کرتے ہوئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھیجنے کا اشارہ کیا۔[2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی رائے کی واضح دلیل دی کہ ان دشمنوں سے میل جول کے لیے ایسے شخص کا انتخاب اچھا ہوگا جس کی وہاں عزت و حمایت ہے۔ یہ چیز عمر رضی اللہ عنہ کو میسر نہ تھی تو نبی مکرم ﷺ کے سامنے انھوں نے عثمان رضی اللہ عنہ کا نام پیش کیا۔ کیونکہ مشرکین سے ان کی حفاظت کے لیے وہاں ان کا قبیلہ موجود تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! مجھے اپنے متعلق قریش سے ڈر ہے۔ ان کے معاملے میں آپ میری سختی کو خوب جانتے ہیں اور مکہ میں بنو عدی کا کوئی آدمی بھی نہیں جو میری حمایت کر سکے، پھر بھی آپ پسند فرمائیں تو میں ان کے پاس چلا جاتا ہوں۔'' آپ ﷺ نے یہ سن کر کچھ نہ کہا۔ حضرت عمر نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! میں آپ کو ایسے آدمی کے متعلق بتاتا ہوں جو مکہ میں مجھ سے زیادہ باعزت ہے، اس کا خاندان بھی زیادہ ہے اور محفوظ بھی ہے۔ وہ ہے: ''عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ۔''

رسول اللہ ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بلایا اور فرمایا: «اِذْهَبْ إِلٰى قُرَيْشٍ فَأَخْبِرْهُمْ أَنَّا لَمْ نَأْتِ لِقِتَالِ أَحَدٍ وَّ إِنَّمَا جِئْنَا زُوَّارًا لِّهٰذَا الْبَيْتِ، مُعَظِّمِينَ لِحُرْمَتِهٖ، مَعَنَا الْهَدْيُ نَنْحَرُهُ وَنَنْصَرِفُ» ''قریش کے پاس جا کر انھیں بتاؤ کہ ہم کسی سے لڑنے نہیں آئے۔ ہم محض بیت اللہ کی حرمت کی پاسداری کرتے ہوئے اس کی

[1] غزوة الحديبية لأبي فارس، ص:83. [2] المغازي للواقدي:600/2.

زیارت کے لیے آئے ہیں، ہمارے ساتھ قربانیاں ہیں، ہم انھیں ذبح کریں گے اور واپس چلے جائیں گے۔'' حضرت عثمان رضی اللہ عنہ روانہ ہوئے ''بلدح'' پہنچے تو وہاں کچھ قریش ملے۔ انھوں نے پوچھا: ''کہاں کے ارادے ہیں؟''

عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے تمھاری طرف ہی بھیجا ہے کہ تمھیں اللہ تعالیٰ اور اسلام کی دعوت دوں۔ سب اللہ کے دین میں داخل ہو جاؤ۔ یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے دین اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو غالب کرنے والا ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ تم لڑائی سے باز آؤ۔ یہ کام دوسروں کو کرنے دو۔ اگر عرب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر غالب آگئے تو تمھارا مقصد پورا ہو جائے گا۔ اور اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو غلبہ ملا تو تمھیں اختیار ہوگا کہ تم چاہو تو اس دین میں داخل ہو جاؤ جس میں لوگ داخل ہوئے یا پھر تم لڑنا چاہو تو بھی تازہ دم ہو کر پوری قوت سے لڑو۔ جنگ تمھیں توڑ چکی ہے۔ تمھارے سب بڑے بڑے اس کی نذر ہو چکے ہیں۔''

عثمان رضی اللہ عنہ ان سے ایسی باتیں کرنے لگے جو وہ سننا نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے جواباً کہا: ''ہم تمھاری باتیں سن رہے ہیں مگر ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کبھی بزور ہمارے ہاں نہیں آسکیں گے۔ اپنے ساتھی کے پاس واپس جاؤ اور انھیں بتا دو کہ وہ ہم تک کبھی نہیں پہنچ سکیں گے۔''

ابان بن سعید بن عاص نے آگے بڑھ کر عثمان رضی اللہ عنہ کو مرحبا کہا۔ انھیں اپنی پناہ میں لے لیا۔ اور کہا کہ آپ اپنا کام مکمل طور پر انجام دیں۔ بعدازاں وہ اپنے گھوڑے سے اترا اور اس پر زین کس کر عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنے پیچھے بٹھا لیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مکہ گئے۔ وہاں ہر ایک سربراہ سے ملے۔ ابوسفیان بن حرب، صفوان بن امیہ اور ان کے علاوہ کچھ لوگ بلدح میں اور کچھ مکہ میں ملے، سب یہی جواب دیتے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے ہاں مکہ میں کبھی نہ آسکیں گے۔[1]

1 زاد المعاد: 290/3، والسيرة النبوية لابن هشام: 344/3.

مشرکین مکہ نے عثمان رضی اللہ عنہ کو طوافِ بیت اللہ کی پیشکش کی مگر آپ نے یہ پیشکش مسترد کر دی۔[1]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ کا پیغام مکہ میں موجود کمزور مسلمانوں کو بھی پہنچایا اور انھیں خوشخبری دی کہ قید و بند اور مشقتوں کے ختم ہونے کا وقت آ چکا ہے۔[2]

کمزور مسلمانوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے زبانی پیغام واپس بھی بھیجا کہ ہماری طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کہیے، بلاشبہ جس ذات نے انھیں حدیبیہ میں اتارا ہے وہ وادی مکہ میں داخل کرنے پر بھی قادر ہے۔[3]

صلح کا معاملہ طے ہوتے ہوتے مسلمان اور مشرکین آپس میں گھل مل گئے۔ اچانک فریقین میں سے کسی شخص نے دوسرے فریق کے ایک آدمی کو پتھر دے مارا جس سے جھگڑا شروع ہو گیا، دونوں طرف سے تیر اور پتھر برسنے لگے۔ دونوں جماعتیں اس (اچانک جھگڑا) پر چیخ اٹھیں جسے ختم کرنے کے لیے دونوں جانب کے لوگوں نے اس میں شامل افراد کو بطور گروی روک لیا۔[4]

قرآن پاک نے اس طرف اشارہ کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُم بِبَطْنِ مَكَّةَ مِن بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا﴾

''اور وہ (اللہ) ہی تو ہے جس نے وادی مکہ میں ان (کفار) کے ہاتھ تم سے اور تمھارے ہاتھ ان سے روک دیے بعد اس کے کہ اس نے تمھیں ان پر کامیابی دی تھی اور اللہ اسے خوب دیکھ رہا ہے جو تم عمل کرتے ہو۔''[5]

گزشتہ آیت کا سبب نزول امام مسلم رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ اہل مکہ کے 80 مسلح آدمی

1 السيرة النبوية لابن هشام: 344/3. 2 زاد المعاد: 290/3. 3 غزوة الحديبية لأبي فارس، ص: 85. 4 زاد المعاد: 291/3. 5 الفتح 24:48.

رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں پر اچانک حملہ کرنے کے لیے جبل تنعیم سے اترے۔ مسلمانوں نے انھیں گرفتار کر لیا مگر رسول اللہ ﷺ نے انھیں معاف کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری۔[1]

سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سارا واقعہ یوں بیان کرتے ہیں: ''جب مشرکوں نے ہماری طرف صلح کے پیغام بھیجے تو لوگ ایک دوسرے کی طرف آنے جانے لگے اور ہم نے صلح کر لی۔ میں طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کی خدمت کرتا تھا، ان کے گھوڑے کو پانی پلاتا ان کی پیٹھ کھجاتا، ان کی خدمت کرتا حتی کہ انھی کے ساتھ کھانا کھاتا۔ میں اپنا گھر بار، دولت سب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف ہجرت کر کے چھوڑ چکا تھا۔ جب ہماری اور اہل مکہ کی صلح ہو گئی اور ہمارا ہر ایک دوسرے سے ملنے لگا تو میں ایک درخت کے پاس گیا اور اس کے نیچے جگہ صاف کی اور جڑ کے پاس لیٹ گیا۔ اتنی دیر میں اہل مکہ میں سے چار مشرک میرے پاس آئے اور رسول اللہ ﷺ کے بارے میں نازیبا الفاظ کہنے لگے۔ مجھے ان پر غصہ آیا، لہٰذا میں دوسرے درخت کے نیچے چلا گیا۔ انھوں نے اپنے ہتھیار لٹکائے اور لیٹ گئے۔ وہ اسی حالت میں تھے کہ اچانک وادی کے نشیب سے کسی نے آواز دی: ''اے مہاجرین دوڑو! ابن زُنیم رضی اللہ عنہ مارے گئے۔'' میں نے اپنی تلوار سونتی اور ان چاروں کو ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا، جبکہ وہ ابھی سو رہے تھے۔ میں نے ان کے ہتھیار لے کر گٹھا بنایا اور ایک ہاتھ میں کر لیا، چنانچہ میں نے کہا: ''قسم اس ذات کی جس نے حضرت محمد ﷺ کے چہرے کو عزت دی! تم میں سے جس نے سر اٹھایا میں اس کے اس عضو پر ماروں گا جس میں آنکھیں ہیں۔'' پھر میں انھیں پیچھے سے ہانکتا ہوا رسول اللہ ﷺ کے پاس لایا۔ میرے چچا عامر رضی اللہ عنہ، عبلات (قریش کی ایک شاخ) کے مکرز نامی شخص کو ہانکتے

1 صحيح مسلم، حديث: 1808، وسنن أبي داود، حديث: 2688، وجامع الترمذي، حديث: 3264، ومسند أحمد: 122/3.

ہوئے رسول اللہ ﷺ کے پاس اسلحہ بند گھوڑے پر سوار حالت میں لائے۔ اس کے ساتھ ستر مشرک بھی تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے انھیں دیکھا اور فرمایا: «دَعُوهُمْ، يَكُنْ لَّهُمْ بَدْءُ الْفُجُورِ وَثِنَاهُ» ''ان کو چھوڑ دو، انھی کی جانب سے عہد شکنی شروع ہونے دو اور پھر دوبارہ بھی یہی عہد شکنی کا باعث بنیں۔'' پھر رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کو معاف کر دیا۔ تب اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت اتاری۔''[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے مومن بندوں پر احسان جتلانا ہے کہ اس نے مشرکین کے ہاتھوں کو ان سے روک لیا، ان کی جانب سے انھیں کوئی بھی گزند نہ پہنچا اور اسی طرح مومنوں کے ہاتھوں کو مشرکینِ مکہ سے روک رکھا۔ انھوں نے مسجد حرام کے پاس ان سے لڑائی نہ کی بلکہ اس نے دونوں گروہوں کو محفوظ رکھا اور ان میں صلح کرا دی جس میں مومنوں کے لیے بھلائی اور دنیا و آخرت کی عافیت تھی۔[2]

﴿كَفَّ﴾ کسی کو ایسے کام سے باز رکھنا جسے وہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے یا اسے شروع کر چکا ہے۔ یہ کلمہ اسم ''کف'' بمعنی ہاتھ سے مشتق ہے۔ کیونکہ روکنے میں اصل یہی ہے کہ ہاتھ سے روکا جائے (دھکیلا اور ہٹایا جائے۔) کہا جاتا ہے: «كَفَّ يَدَهُ عَنْ كَذَا» ''اس نے اپنے ہاتھ کو فلاں کام سے روک لیا۔''[3]

اللہ تعالیٰ کا فرمان ﴿بِبَطْنِ مَكَّةَ﴾ کے بارے میں امام راغب کہتے ہیں: ''ہر چیز میں اوپر (ظاہر) کا متضاد بطن کہلاتا ہے۔ نچلی جانب کو ''بطن'' اور اوپر بلند جانب کو ''ظہر'' کہتے ہیں۔''[4]

جمہور مفسرین نے اسی آیت میں مذکور ﴿بِبَطْنِ مَكَّةَ﴾ سے مراد حدیبیہ لیا ہے۔ یہاں ''بطن'' کا اطلاق نشیبی جگہ پر ہوا ہے۔ حدیبیہ مکہ کے زیادہ قریب ہے۔ یہ جگہ حرم

---

1 صحيح مسلم، حديث: 1807. 2 تفسير ابن كثير: 192/4. 3 التحرير والتنوير لابن عاشور: 178/26. 4 المفردات للراغب، ص: 51.

سے باہر ہے مگر اس کی کچھ زمین حرم میں شامل ہے۔ حدیبیہ مکہ مکرمہ اور جدہ کے راستے پر واقع ہے اور یہ (جدہ کی نسبت) مکہ کے قریب ہے۔[1]

اللہ تعالیٰ نے اس فرمان پر آیت ختم فرمائی:

﴿مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ۝﴾

''بعد اس کے کہ اس نے تمھیں ان پر کامیابی دی تھی اور اللہ اسے خوب دیکھ رہا ہے جو تم عمل کرتے ہو۔''[2]

یہ اس جانب اشارہ ہے کہ ایک دوسرے کے قتال سے باز رہنا مسلمانوں کی جانب سے تھا کیونکہ انھوں ہی نے دشمن پر قابو پانے کے بعد بھی ان پر احسان کیا تھا۔[3]

بیعتِ رضوان

رسول اللہ ﷺ کو یہ اطلاع ملی کہ عثمان رضی اللہ عنہ شہید کر دیے گئے ہیں۔ آپ ﷺ نے اپنے ساتھیوں سے مشرکین کے ساتھ جنگ کرنے کی بیعت کی۔ صحابۂ کرام نے لبیک کہا اور آپ ﷺ کے ہاتھ پر موت کی بیعت کی۔[4] ایک روایت میں ہے کہ یہ بیعت دشمن کے مقابلے میں ڈٹ جانے پر تھی۔[5] اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ یہ بیعت جنگ سے راہ فرار اختیار نہ کرنے پر تھی۔[6] بہر حال ان روایات میں باہمی تعارض نہیں کیونکہ موت پر بیعت کا مطلب ہی یہ ہے کہ دشمن کے مقابلے میں ڈٹ جایا جائے اور راہِ فرار اختیار نہ کی جائے۔[7]

اس بیعت میں صرف ایک آدمی نے جو منافق تھا، شرکت نہ کی۔ اس کا نام جد بن

1 التحرير والتنوير لابن عاشور: 184/26. 2 الفتح:48:24. 3 حديث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ للدكتور محمد بكر آل عابد: 230/2. 4 صحيح البخاري، ص: 4169، وصحيح مسلم، حديث: 1860. 5 السيرة النبوية للدكتور العمري، ص: 486. 6 صحيح مسلم، حديث: 1856. 7 السيرة النبوية للدكتور العمري، ص: 486.

قیس تھا۔[1]

رسول اللہ ﷺ سے سب سے پہلے ابو سنان عبداللہ بن وہب اسدی رضی اللہ عنہ نے بیعت کی، پھر عام لوگ بیعت کے لیے ایک دوسرے سے آگے بڑھنے لگے۔

حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ نے تین مرتبہ بیعت کی۔ شروع میں، درمیان میں اور آخر میں۔[2]

رسول اللہ ﷺ نے اپنے دائیں ہاتھ کے متعلق فرمایا: «هٰذِهٖ عَنْ عُثْمَانَ» ”یہ عثمان کی طرف سے ہے۔“ پھر آپ ﷺ نے اپنا دایاں دستِ مبارک دوسرے دستِ مبارک پر رکھا۔[3]

رسول اللہ ﷺ نے درخت تلے جن صحابہ سے بیعت لی تھی ان کی تعداد ایک ہزار چار سو تھی۔[4]

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا﴾

”بلاشبہ جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں، وہ تو بس اللہ سے بیعت کرتے ہیں، اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے، پھر جس نے عہد شکنی کی، تو بس وہ اپنی ہی ذات کے خلاف عہد شکنی کرتا ہے اور جس نے (وہ) عہد پورا کیا جو اس نے اللہ سے باندھا تھا، تو عنقریب وہ اسے بہت بڑا اجر دے گا۔“[5]

---

[1] السيرة النبوية للدكتور مهدي رزق الله، ص:486. [2] صحيح مسلم، حديث: 1807، وزاد المعاد: 291/3. [3] صحيح البخاري، حديث:3699، وجامع الترمذي، حديث:3706، ومسند أحمد: 102,101/1. [4] صحيح البخاري، حديث: 4154، وصحيح مسلم، حديث: (69)-1856، والسيرة النبوية للدكتور مهدي رزق الله، ص:482. [5] الفتح 10:48.

اس آیت میں بیعت رضوان والوں کی بڑی تعریف و مدح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول سے ان کی بیعت کو اپنے ساتھ بیعت قرار دیا ہے جس میں ان کی انتہائی عزت افزائی اور مرتبہ و مقام ہے۔[1]

امام ابن قیم رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ کے اس فرمان پر غور کیجیے: جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ یقیناً اللہ تعالیٰ سے بیعت کرتے ہیں ان کے ہاتھوں پر اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہے۔'' جب صحابہ کرام رسول اللہ ﷺ سے اپنے ہاتھوں کے ساتھ بیعت کر رہے تھے اور آپ اپنا مبارک ہاتھ ان کے ہاتھوں پر رکھ رہے تھے اور رسول اللہ ﷺ لوگوں کے درمیان اور اللہ تعالیٰ کے درمیان سفیر تھے تو مسلمانوں کی یہ بیعت اللہ تعالیٰ ہی سے ہوئی۔ اور چونکہ اللہ تعالیٰ عرش پر ہے اور اپنی ساری مخلوق سے اوپر ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہی ہوا جس طرح اللہ تعالیٰ خود بھی ان سے اوپر عرش پر مستوی ہے۔[2]

اس آیت میں وعدہ پورا کرنے پر اجر کا جو تذکرہ ہے اس سے مراد بہت زیادہ ثواب جنت کی صورت میں ہے اور اس میں جو کچھ بھی ہے نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا اور نہ ہی کسی انسان کے دل میں اس کا تصور گزرا۔[3]

اللہ تعالیٰ اس بیعت میں شامل ہونے والوں کو اپنی رضا مندی کی خبر دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ۝ وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝﴾

''البتہ تحقیق اللہ مومنوں سے راضی ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے آپ سے بیعت

1 عقيدة أهل السنة في الصحابة للدكتور ناصر حسن الشيخ: 205/1. 2 الصواعق المرسلة لابن القيم: 172/2. 3 روح المعاني للآلوسي: 97/26.

کر رہے تھے، چنانچہ ان کے دلوں میں جو (خلوص) تھا، وہ اس نے جان لیا، تو اس نے ان پر طمانینت وتسکین نازل کی اور بدلے میں انھیں قریب کی فتح دی۔ اور بہت سی غنیمتیں بھی (عطا کیں) جو وہ حاصل کریں گے۔ اور اللہ نہایت غالب، خوب حکمت والا ہے۔''[1]

یہاں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ وہ ان منتخب افراد سے راضی ہو چکا ہے جو بیعت رضوان والے ہیں۔ اللہ کی قسم! جو مقام و مرتبہ بیعتِ رضوان والوں کو مل گیا کس قدر عظیم مرتبہ ہے، کس قدر بڑی فضیلت ہے۔ اے محمد! اللہ تعالیٰ مومنوں سے راضی ہو چکا ہے۔ بیعت میں آپ کے ساتھیوں نے آپ کے ہاتھ پر قریش کا مقابلہ کرنے اور نہ بھاگنے کی درخت کے نیچے بیعت کی تھی۔ ان کی بیعت کیکر کے درخت تلے تھی۔ اے محمد! درخت تلے جب آپ کے صحابہ آپ سے بیعت کر رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے خوب جان لیا کہ وہ صدقِ نیت اور وفاداری سے بیعت کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے دکھائے ہوئے حق کے رستہ پر کس قدر حسنِ بصیرت اور پختگی کا انھوں نے مظاہرہ کیا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان پر سکون واطمینان نازل فرمایا۔

فتح سے مراد فتح خیبر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے لیے بیعت کرنے والوں کو طویل سلسلہ غنائم بصورتِ فتح خیبر و فتح مکہ عطا فرمایا اور لاتعداد ممالک دیے۔ انھیں اپنی رضامندی سے نوازا۔ ان پر سکون واطمینان نازل فرمایا اور دشمنوں کے خلاف فتح عطا کر دی۔[2]

اس لیے ارشاد ہوا:

﴿وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا۝﴾

''اور بہت سی غنیمتیں بھی (عطا کیں) جو وہ حاصل کریں گے۔ اور اللہ نہایت غالب، خوب حکمت والا ہے۔''[3]

---

[1] الفتح 48:18،19. [2] تفسير الطبري: 26/85،86، وتفسير القرطبي: 16/178. [3] الفتح 48:19.

اللہ تعالیٰ نے بیعت رضوان والوں کے متعلق بتایا کہ اس نے انھیں تقویٰ کی بات پر جمائے رکھا اور وہی اس کے زیادہ اہل اور حق دار تھے۔ مزید ارشاد ہے:

﴿ إِذْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَأَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَىٰ وَكَانُوا أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ﴾

''جن لوگوں نے کفر کیا جب انھوں نے اپنے دلوں میں حمیت (غیرت) پیدا کرلی۔ جاہلیت کی حمیت (غیرت)۔ تو اللہ نے اپنے رسول پر اور مومنوں پر تسکین نازل کی اور ان کو تقویٰ کی بات پر ثابت قدم رکھا اور وہ اس کے زیادہ مستحق اور اہل تھے۔ اور اللہ ہر شے کو خوب جانتا ہے۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی کفار کی نسبت کلمہ تقویٰ کے زیادہ اہل اور حقدار تھے اور اللہ تعالیٰ کے علم میں وہی اس کے اہل تھے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین اور پیغمبر کی مصاحبت کے لیے اہل خیر و صلاح لوگوں ہی کو چنا ہے۔[2]

حدیبیہ کے مقام پر جن صحابہ نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی ان کے حق میں یہ قرآن کی زبان میں تعریف و تحسین ہے۔ ان کے متعلق بہت سی احادیث بھی آئی ہیں، چند ایک یہ ہیں:

① حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: ''حدیبیہ کے روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا: «أَنْتُمْ خَيْرُ أَهْلِ الْأَرْضِ» ''تم اہل زمین میں سب سے بہتر لوگ ہو۔'' ہم اس وقت چودہ سو تھے۔ میں اگر دیکھ رہا ہوتا تو تمھیں اس درخت کی جگہ دکھاتا۔''[3]

اصحاب شجرہ کی فضیلت کے متعلق یہ حدیث صریح ہے۔ اس وقت مسلمانوں میں سے

---

1 الفتح 26:48. 2 تفسير الطبري: 26/103-106. 3 صحيح البخاري، حديث: 4154، وصحيح مسلم، حديث: (71)-1856.

کچھ لوگ مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور ان کے علاوہ دیگر مقامات پر بھی موجود تھے۔ بعض شیعہ نے اس سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت و برتری ثابت کی ہے کیونکہ درخت تلے بیعت کرنے والوں اور اس فرمان کے مخاطبین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے جبکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس وقت وہاں حاضر نہ تھے۔ یہ استدلال درست نہیں ہے۔ کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان رضی اللہ عنہ کی جانب سے خود بیعت کی تھی۔ تو حدیث میں مذکور فضیلت میں وہ بھی برابر کے حقدار ہوئے۔ اور پھر اس حدیث میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک دوسرے پر فضیلت کا بیان مقصود بھی نہیں ہے۔[1]

② حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھے ام مبشر نے بتایا کہ اس نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا:

«لَايَدْخُلُ النَّارَ إِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنْ أَصْحَابِ الشَّجَرَةِ أَحَدٌ مِّنَ الَّذِينَ بَايَعُوا تَحْتَهَا»

''درخت کے نیچے بیعت کرنے والوں میں سے کوئی بھی ان شاء اللہ آگ میں داخل نہ ہو گا۔'' تو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! کیسے؟'' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں ڈانٹا۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: ''پھر قرآن کی اس آیت کا مفہوم کیا ہے: ﴿وَإِنْ مِّنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا﴾ ''تم میں سے ہر ایک وہاں ضرور وارد ہونے والا ہے۔''[2]

تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«قَدْ قَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ:

﴿ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِينَ فِيهَا جِثِيًّا ۝﴾

اللہ تعالیٰ نے یہ بھی تو فرمایا ہے: ''پھر ہم متقی لوگوں کو نجات دیں گے اور ہم

[1] فتح الباری: 7/443. [2] مریم 19:71.

ظالموں کو اس میں گھٹنوں کے بل گرے ہوئے چھوڑ دیں گے۔"[1]

امام نووی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کہنا کہ "اصحاب شجرہ میں سے کوئی بھی ان شاء اللہ آگ میں داخل نہیں ہوگا۔" کے معنی یہ ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی یقیناً آگ میں داخل نہ ہوگا۔ آپ نے "ان شاء اللہ" برکت کے طور پر کہا ہے نہ کہ شک کی بنا پر۔ رہا حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کا سوال اور قرآنی آیت تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کے بعد والی آیت پڑھ کر سنا دی۔

اس میں مناظرانہ اسلوب میں جواب دینے کی دلیل موجود ہے۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کا مقصود بھی یہی تھا نہ کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کو رد کرنا چاہتی تھیں۔ اور اس وارد ہونے کے متعلق صحیح قول یہی ہے کہ اس سے مراد "پل صراط" پر سے گزرنا ہے۔ پل صراط جہنم کے اوپر لگایا جائے گا تو جہنمی اس میں جا گریں گے اور باقی بچ نکلیں گے۔[2]

③ امام مسلم رحمہ اللہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ يَّصْعَدُ الثَّنِيَّةَ، ثَنِيَّةَ الْمُرَارِ، فَإِنَّهُ يُحَطُّ عَنْهُ مَا حُطَّ عَنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ»

"جو شخص مرار گھاٹی پر چڑھ جائے گا اس کے گناہ ایسے معاف ہو جائیں گے جیسے بنی اسرائیل کے معاف ہو گئے تھے۔"

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں تو سب سے پہلے اس گھاٹی پر ہمارے گھوڑے چڑھے، یعنی خزرج کے، پھر لوگوں کا تانتا بندھ گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «كُلُّكُمْ مَغْفُورٌ لَّهُ إِلَّا صَاحِبَ الْجَمَلِ الْأَحْمَرِ» "تم میں سے ہر ایک کی بخشش ہو گئی سوائے لال اونٹ والے کے۔" ہم اس شخص کے پاس گئے اور ہم نے کہا: "چل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تیرے لیے

---

1 مريم: 72:19، صحيح مسلم، حديث: 2496، وسنن ابن ماجه، حديث: 4281، ومسند أحمد: 285/6. 2 شرح النووي: 85/16.

مغفرت کی دعا کریں۔'' وہ بولا: ''اللہ کی قسم! میں اپنی گمشدہ چیز پالوں یہ مجھے زیادہ پسند ہے کہ تمھارے صاحب کی دعا سے مجھے بخش دیا جائے۔'' حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ وہ شخص اپنی گم شدہ چیز ڈھونڈ رہا تھا۔[1]

اس حدیث میں حدیبیہ والوں کی بہت بڑی فضیلت کا ذکر ہوا ہے، یعنی انھیں اللہ تعالیٰ کی جناب سے مغفرت کا پروانہ نصیب ہوا۔ پروردگار نے انھیں کس قدر فضیلت سے نوازا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں ان کے اخلاص کا صلہ اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سمع و طاعت کا نتیجہ تھا۔[2]

صحیح نصوص میں حدیبیہ والی جماعت کی متعدد صفات بیان ہوئی ہیں کہ وہ تمام اہلِ زمین سے افضل ہیں، انھیں اللہ تعالیٰ نے مغفرت سے نوازا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی آگ میں نہیں جائے گا۔ اس جلیل القدر جماعت کا جب ہم اہل بدر سے تقابل کرتے ہیں تو ہمیں کل لشکر میں نصف سے زیادہ مہاجرین نظر آتے ہیں۔ بدر میں مہاجرین کی تعداد تراسی اور اب آٹھ سو۔ یہ پڑوس میں واقع چھوٹے چھوٹے عرب قبائل سے آنے والے مہاجرین تھے۔ ان کے نوجوان مدینہ منورہ آتے۔ مسجد نبوی میں تربیت پاتے اور غزوات سے عملی تربیت حاصل کرتے۔ وہ خالص فوجی تربیت حاصل کرتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بلا واسطہ دین کا فہم حاصل کرتے۔ اور وہ اپنے سے پہلے مسلمان ہونے والے مہاجرین و انصار کے بلند ترین نمونے کے سایے تلے پروان چڑھ رہے تھے۔ اطاعتِ الٰہی میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں رہتے۔ یوں ان کے قبائل شرف و عزت میں بڑے بڑے قبائل سے بہت آگے بڑھ گئے، جبکہ بڑے بڑے قبائل اسلام کے سایے میں آنے اور مددگار بننے سے پیچھے رہ گئے تھے، قبیلہ اُسلم اور غفار ان قبائل میں سب سے آگے تھے۔ اس کا سہرا اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی کے بعد مسلمانوں میں سے سبقت لے

1 صحیح مسلم، حدیث: 2780. 2 عقيدة أهل السنة والجماعة: 212/1.

جانے والے اور دعوت اسلامی کے بنیادی اراکین کے سر جاتا ہے۔ یوں کہہ لیجیے کہ مکہ مکرمہ میں السابقون الاولون کے ہمراہ اسلام لانے والے صحابی حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو یہ فضیلت و مرتبہ حاصل ہے کہ وہ اپنی قوم میں داعی بن کر گئے اور غزوۂ احد کے بعد غفار کے ستر گھرانوں کو ساتھ لے کر مدینہ منورہ حاضر ہوئے۔ یہ فضیلت بریدہ بن حصیب اسلمی رضی اللہ عنہ کو بھی حاصل ہے جو ہجرت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور اپنی قوم کے ستر آدمیوں کے ہمراہ اسلام لائے تھے۔[1]

رہے بقیہ قبائل جیسے مزینہ، جہینہ، اشجع اور خزاعہ تو ان کے نوجوان بہت تھوڑی تعداد میں اسلام قبول کر کے مدینہ منورہ آئے تھے، جبکہ ان کی اکثریت شرک و کفر ہی میں گھری رہی۔ اور وہ لوگ مدینہ منورہ کے تربیتی ماحول سے کنارہ کش رہتے ہوئے اپنے اجڈپن میں مگن رہے۔ دراصل یہ فضیلت ان کے مقدر میں نہیں تھی۔ وہ لوگ نبوت کی چھاؤں سے محروم رہے۔ لہٰذا حدیبیہ کی طرف آنے والے اسلامی لشکر میں عدم شمولیت کی وجہ سے وہ آیات ان پر بجلیاں بن کر برسیں جن میں ان پیچھے رہنے والوں کو ڈانٹ ڈپٹ کی گئی تھی۔[2]

1. التربية القيادية للدكتور الغضبان: 4/214. 2. التربية القيادية للدكتور الغضبان: 4/216.

باب 2

صلح حدیبیہ اور اس کے نتائج

رسول اللہ ﷺ اور سہیل بن عمرو کی بات چیت

قریش کو بیعتِ رضوان کی خبر ہوئی اور ان کے سرداروں نے رسول اللہ ﷺ کے ارادۂ جنگ کو بھانپ لیا تو جھٹ پٹ سہیل بن عمرو کی معیت میں اپنے کچھ لوگوں کو آپ سے بات چیت کے لیے بھیج دیا۔[1] ادھر آپ ﷺ نے سہیل کو آتے دیکھ کر فرمایا: «لَقَدْ أَرَادَ الْقَوْمُ الصُّلْحَ حِينَ بَعَثُوا هٰذَا الرَّجُلَ» ''اس شخص کو بھیجنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ قریش صلح چاہتے ہیں۔''[2]

سہیل بن عمرو قریش کے سرکردہ سرداروں میں سیاسی بصیرت اور ہوشیاری میں مشہور تھا۔ منجھا ہوا خطیب اور پختہ رائے والا آدمی تھا۔ اور گہری سوجھ بوجھ کا مالک تھا۔

فریقین صلح کی دفعات پر بات چیت کرنے لگے۔ یاد رہے صلح کا یہ معاملہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی واپسی کے بعد شروع ہوا تھا۔ فریقین نے معاہدہ صلح کے اہم نکات طے کیے۔ اختلاف کا باعث بننے والے امور پر بھی غور کیا۔ فریقین ابتدائی بعض نکات پر متفق ہو گئے۔ چند دفعات کے متعلق اختلاف باقی رہا۔ اختلاف نے خاصا طول پکڑا۔ بالآخر خاصی بحث و تمحیص کے بعد فریقین ایک رائے پر متفق ہو گئے۔ لیکن جب معاہدے کو

[1] التاريخ السياسي والعسكري للدكتور علي معطي، ص: 340,339. [2] المغازي للواقدي: 602/2، 605,604.

آخری شکل دینے کی باری آئی تو بعض نکات پر فریقین میں پھر اختلاف ہو گیا۔ قریب تھا کہ سارا معاملہ چوپٹ ہو جاتا۔

رسول اللہ ﷺ معاہدے کی تحریر لکھوانے لگے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو لکھنے کا حکم دیا کہ ”بسم اللہ الرحمٰن الرحیم“ سے تحریر کی ابتدا کرو۔ یہاں قریشی وفد کے سربراہ سہیل بن عمرو نے اعتراض کیا کہ رحمٰن کو میں نہیں جانتا۔ آپ یوں لکھیے (جیسے دور جاہلیت میں لکھا جاتا تھا): «بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ» ”اے اللہ! تیرے نام سے۔“

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا کہ ہم تو رحمٰن ہی لکھیں گے۔ لیکن نبی اکرم ﷺ نے سیاسی حکمت کے پیش نظر لچک اختیار کرتے ہوئے کاتب سے فرمایا: «اُكْتُبْ بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ» ”لکھو! اے اللہ تیرے نام سے۔“[1]

یوں تحریر معاہدہ کی کارروائی جاری رہی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: لکھو: «هٰذَا مَا اصْطَلَحَ عَلَيْهِ رَسُولُ اللّٰهِ» ”یہ وہ عہد نامہ ہے جس پر اللہ کے رسول ﷺ نے صلح کی......“ ابھی آپ یہ جملہ مکمل نہیں کر پائے تھے کہ قریشی وفد کے سربراہ نے لفظ ”رسول اللہ“ پر اعتراض کرتے ہوئے کہا:

”اگر میں یہ مانتا ہوتا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں تو میں آپ کی مخالفت نہ کرتا بلکہ آپ کی پیروی کرتا۔ کیا آپ اپنے اور اپنے والد کے نام محمد بن عبداللہ کو پسند نہیں کرتے! اپنا اور اپنے والد کا نام تحریر کیجیے۔“[2]

اس پر بھی مسلمانوں نے اعتراض کیا مگر رسول اللہ ﷺ نے حکمت اور دور اندیشی سے اختلاف ختم کرتے ہوئے کاتب کو تحریر معاہدہ سے لفظ ”رسول اللہ“ ختم کرنے کا حکم دیا، چنانچہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اسے خاموشی سے قبول کر لیا۔

نبی ﷺ نے ”بسم اللہ الرحمٰن الرحیم“ کے بدلے بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ لکھنے پر

1 المغازي للواقدي: 610/2. 2 المغازي للواقدي: 610/2.

مشرکین سے اتفاق کیا۔ ''رسول اللّٰہ'' کے بجائے ''محمد بن عبداللّٰہ'' کے الفاظ پر بھی آمادگی ظاہر کی۔ اور یہ بھی مان لیا کہ مسلمانوں میں سے جو کوئی ان کے پاس جائے گا وہ اسے واپس نہیں کریں گے، جبکہ ان میں سے جو کوئی مسلمانوں کے پاس آئے گا، مسلمان اسے واپس کر دیں گے۔ آپ نے یہ تمام شروط، صلح سے حاصل ہونے والی اہم ترین مصلحت کے سبب قبول کیں، جبکہ ان کے قبول کرنے میں کوئی خرابی بھی نہیں تھی، مثلاً: ''بسمله'' اور ''بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ'' ایک ہی معنی رکھتے ہیں اور محمد بن عبداللہ ہی رسول اللہ ہیں۔ اس جگہ اللہ سبحانہ کے اوصاف ''الرحمٰن الرحیم'' ترک کرنے میں اس ذات بابرکات کی نفی بھی لازم نہ آتی تھی۔ اسی طرح ''رسول اللہ'' کی عدم کتابت سے رسالت پر کوئی حرف نہ آ رہا تھا، لہٰذا انھوں نے جو بھی تقاضا کیا اس میں کوئی خرابی تھی نہ نقصان۔ خرابی کی صورت تب ہوتی جب وہ ناجائز امور لکھنے کا تقاضا کرتے، مثلاً: اپنے معبودان باطلہ کی تعظیم وغیرہ۔

رہی یہ شرط کہ مکہ سے آنے والے کو واپس کریں گے جبکہ مسلمانوں سے جانے والا واپس نہ کیا جائے گا تو آپ ﷺ نے اس کی وضاحت اور حکمت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

«مَنْ ذَهَبَ مِنَّا إِلَيْهِمْ فَأَبْعَدَهُ اللّٰهُ وَمَنْ جَاءَ نَا مِنْهُمْ سَيَجْعَلُ اللّٰهُ لَهُ فَرَجًا وَّمَخْرَجاً»

''جو ہمیں چھوڑ کر ان مشرکین کی طرف جائے گا اسے ہم سے اللہ نے دور کر دیا اور ان کا جو آدمی ہمارے پاس آئے گا اللہ تعالیٰ اس کے لیے کشادگی اور نکلنے کی کوئی نہ کوئی صورت بنا دے گا۔''[1]

بالآخر ایسا ہی ہوا جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا تھا۔

معاہدے کی شروط اور دفعات

یوں یہ معاہدہ تشکیل پا گیا جس میں درج ذیل دس دفعات تھیں:

[1] صحیح مسلم، حدیث: 1784.

① «باسمك اللّٰهم» ”اے اللہ تیرے نام سے۔“

② یہ وہ شرائط ہیں جن پر محمد بن عبداللہ نے سہیل بن عمرو سے معاہدہ صلح کیا ہے۔

③ دونوں نے اتفاق کرلیا ہے کہ دس سال تک جنگ بند رہے گی۔ ان دس برسوں میں لوگ امن کی زندگی بسر کریں گے اور (ایک دوسرے سے) ہاتھ روک کر رکھیں گے۔

④ محمد ﷺ کے ساتھیوں میں سے جو کوئی بغرض حج وعمرہ یا کاروبار مکہ جائے گا اس کا خون اور مال محفوظ رہے گا، اس طرح قریش کا کوئی مکی شخص مدینہ آئے یا بغرض تجارت وکاروبار مصر یا شام جانے کے لیے وہاں سے گزرے تو اس کا بھی مال و جان محفوظ ہوگا۔

⑤ قریش کا جو آدمی ولی کی اجازت کے بغیر محمد (ﷺ) کے پاس آئے گا اسے محمد (ﷺ) قریش کے پاس لوٹا دیں گے اور محمد (ﷺ) کے ساتھیوں میں سے جو آدمی قریش کے پاس آئے گا قریش اسے محمد (ﷺ) کو واپس نہ کریں گے۔

⑥ دلوں کی عداوتیں دلوں ہی میں رہیں گی۔ انھیں ظاہر نہ کیا جائے گا۔ نہ بدعہدی اور خیانت کی جائے گی۔

⑦ اور یہ کہ جو محمد (ﷺ) کے عہد میں داخل ہونا پسند کرے وہ اس میں داخل ہوجائے اور جو قریش کے عہد میں داخل ہونا پسند کرے وہ ان کے عہد میں داخل ہوجائے۔ یہ معاہدہ طے پاتے ہی بنوخزاعہ نے آگے بڑھ کر کہا: ”ہم لوگ محمد (ﷺ) کے عہد میں ہیں۔“ اور بنوبکر نے آگے بڑھ کر کہا: ”ہم قریش کے عہد میں ہیں۔“

⑧ اور آپ اس سال واپس جائیں اور ہمارے ہوتے ہوئے مکہ میں داخل نہ ہوں۔ جب اگلا سال آئے گا تو ہم آپ کے لیے مکہ خالی کر دیں گے۔ آپ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ مکہ میں داخل ہوں اور یہاں تین دن قیام کریں۔ آپ کے ساتھ مسافروں والے ہتھیار ہوں گے، تلواریں نیاموں میں ہوں گی، اس صورت کے بغیر داخل نہ ہونا۔

⑨ اور جو قربانیاں آپ لے کر آئے ہیں اس کی ہمیں ضرورت نہیں۔

⑩ اس صلح پر کچھ مسلمانوں اور کچھ مشرکین نے شہادت دی۔ مسلمانوں میں سے ابوبکر صدیق، عمر بن خطاب، عبدالرحمٰن بن عوف، عبداللہ بن سہیل بن عمرو، سعد بن ابی وقاص، محمد بن مسلمہ اور کاتب معاہدہ حضرت علی رضی اللہ عنہم اور مشرکین کی طرف سے مکرز بن حفص اور سہیل بن عمرو۔ [1]

بین الاقوامی معاہدات میں یہ معاہدہ اپنی مثال آپ ہے کہ اس کے طے ہونے سے پہلے کتنے مذاکرات ہوئے۔ اس کی متعدد شروط پر بحث ہوئی۔ فریق ثانی کی رضامندی پر نبی ﷺ کی طرف سے نرمی برتنے کا عظیم اخلاق سامنے آیا۔ کس طرح اس کو پایہ تکمیل تک پہنچایا گیا اور پھر اس کا خیال رکھا گیا۔

اس معاہدے سے پہلے مسلمانوں اور مشرکین مکہ کے درمیان مذاکرات کے کئی دور ہوئے۔ دونوں کے مختلف نمائندے اتفاق رائے تک پہنچنے میں ناکام رہے، پھر فریقین میں اس معاہدے تک پہنچنے کے لیے کئی مشورے ہوئے۔ بالآخر دونوں فریق رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام سمیت اور مشرکین کے نمائندے سہیل بن عمرو کے درمیان معاہدہ طے پا گیا۔

یہ معاہدہ اس وقت طے ہوا جب مسلمان ایک قوت بن چکے تھے اور کمزور ہرگز نہ تھے۔ وہ اتنی طاقت رکھتے تھے کہ یہ شروط جن کے متعلق صحابہ کرام کی اکثریت تنگ دل تھی، قبول نہ کریں لیکن وہ ایسے ہرگز نہ تھے جو رسول ﷺ کی اطاعت سے ہاتھ کھینچ لیں، حالانکہ آپ ﷺ اپنی مرضی سے گفتگو ہی نہیں کرتے۔

مذاکرات کے دوران متعدد بار قریشی سفیر نے رسول اللہ ﷺ سے زبان درازی بھی کی۔ وہ اس وقت مسلمانوں کے لشکر میں تھا، پھر بھی اسے تکلیف نہ پہنچی، نہ مسلمانوں نے اسے قتل کرنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ کیونکہ ''سفراء کو قتل نہیں کیا جاتا'' اس کے بجائے

[1] المعاهدات في الشريعة الإسلامية والقانون الدولي للدكتور محمد الديك، ص:271,270.

رسول اللہ ﷺ اسے راضی کرتے ہیں اور بردباری و نرمی سے کام لیتے ہیں تا کہ اس نتیجے تک رسائی حاصل کی جا سکے جو اسلام کا اصل مقصود و مطلوب ہے، یعنی جان کی حفاظت اور امن و سلامتی کا دور دورہ۔ اس امید پر کہ شاید لوگ حق کی پہچان کر لیں اور اپنے غلط موقف سے رجوع کریں، کلام الٰہی کو سنیں اور اسلامی دعوت نئے دور میں داخل ہو جائے، نئے انداز سے پھیلے اور لوگوں سے میل جول شروع ہو۔ جب ہم حدیبیہ کے معاہدے میں طے پانے والی دفعات پر غور کرتے ہیں تو ان سے درج ذیل نتائج برآمد کر سکتے ہیں:

① اسلامی معاہدات کی ابتدا «بسم اللّٰه» یا «باسمك اللّٰهم» سے ہوتی تھی۔ بین الاقوامی قانونِ معاہدات کی رو سے ”معاہدات کی ابتدا کتابت کے ایسے طریقے پر ہوتی ہے جس پر فریقین کا اتفاق ہو۔“

قابل ملاحظہ بات یہ ہے کہ اسلام میں معاہدات کی ابتدا لازمی طور پر اللہ تعالیٰ کے بابرکت نام سے ہوتی ہے چونکہ وہ دلوں اور نیتوں کا محاسب و نگہبان ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا نام ہر مومن کے نزدیک مقدس و محترم ہے حتیٰ کہ وہ لوگ جن کے عقائد میں خرابی آ چکی ہوتی ہے وہ بھی ذات الٰہی کا انکار نہیں کرتے، مگر اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق ان کا تصور فاسد ہو چکا ہوتا ہے۔

چند ایسے لوگ جو کھوکھلے نعروں سے عوام کے دلوں کو مائل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں ان میں یہ بات پھیل جاتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نام کے بجائے ”شعب“ یا ”الأمۃ“ کا نام لیتے ہیں۔ اپنے خیال کے مطابق وہ مذکورہ نام کو بطور تقدیس استعمال کرتے ہیں۔ لیکن جس شخص کا اللہ تعالیٰ پر یقین و ایمان ہے وہ اپنے اعتقادات میں کسی کو اللہ تعالیٰ کے برابر نہیں سمجھتا یہی وجہ تھی کہ اس معاہدے کی ابتدا «بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ» سے ہوئی۔

② بین الاقوامی قانون کی طرح یہاں بھی ”دیباچہ“ کے بعد معاہدے میں طرفین کا تعین اور ذکر کیا گیا ہے۔ بین الاقوامی قانون میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ دیباچے کے بعد

معاہدے میں بات چیت کرنے والے ممبران کا ذکر کیا جاتا ہے یا ان حکومتوں کا تذکرہ ہوتا ہے جو معاہدے کے فریق ہوتے ہیں۔

③ معاہدے کے محرکات: معاہدے کے شروع میں دس سال تک جنگ بندی کی شرط پر صلح کا ذکر آیا ہے۔ بین الاقوامی قانون بھی یہی چاہتا ہے۔

④ معاہدے کی شروط اور دفعات: معاہدہ میں آپ ﷺ نے طرفین کی متفق علیہ شروط کا ذکر کیا ہے۔ بین الاقوامی قانون بھی اسی کی رہنمائی کرتا ہے۔

⑤ صلح حدیبیہ کے معاہدے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ جب ''رئیس الدولۃ الاسلامیہ'' سمجھے کہ اس بات میں مسلمانوں کی مصلحت ہے تو وہ دشمن سے صلح کا تقاضا کر سکتا ہے۔ اس کا دارومدار اس پر نہیں ہے کہ پہلے دشمن کی جانب سے تقاضائے صلح ہو۔ [1]

⑥ زیادہ خرابی کو دور کرنے اور راجح مصلحت کے تحت کفار سے بعض ایسے امور پر بھی مصالحت ہو سکتی ہے جس میں مسلمان بظاہر حرج محسوس کریں۔ دراصل زیادہ خرابی کو تھوڑی خرابی سے ختم کرنا مقصود ہوتا ہے۔

⑦ اللہ تعالیٰ نے ''صلح حدیبیہ'' کا نام فتح رکھا ہے۔ لغت میں فتح سے مراد بندش کو کھولنا ہے۔ حدیبیہ میں مشرکین سے صلح سے قبل صلح کے تمام راستے مسدود تھے جنھیں اللہ تعالیٰ نے کھول دیا۔ یوں صلح فریق مخالف کے بند دلوں کو کھول دیتی ہے۔

حدیبیہ کی ظاہری صورت حال میں جو شرطیں لکھی گئیں وہ مسلمانوں پر زیادتی تھی، تاہم یہی شرائط دراصل فتح و نصرت کا پیش خیمہ تھیں۔ رسول اللہ ﷺ مستقبل میں معاہدے کے نتیجے میں حاصل ہونے والی فتح کو بصیرت افروز نگاہوں سے دیکھ رہے تھے جو واقعی عظیم فتح تھی۔ آپ مشرکین کی جن شرائط کو منظور کر رہے تھے وہ اکثر صحابہ کی سمجھ میں نہ آئیں لیکن بظاہر ناپسندیدہ شرائط کے پردے میں جو عمدہ پہلو تھے آپ ﷺ انھیں دیکھ رہے تھے۔ [2]

[1] زاد المعاد:306/3. [2] المعاهدات في الشريعة الإسلامية للدكتور محمد الديك، ص:272.

⑧ معاہدہ بسا اوقات کھلا رکھا جاتا ہے تا کہ اس میں اطراف و جوانب سے کوئی بھی داخل ہو سکے اور کوئی حکومت بھی شامل ہو سکے۔ اس عالمی قانون کے تحت آپ ﷺ نے معاہدہ کھلا رکھا تھا کہ اِدھر اُدھر سے جو بھی چاہے اس میں داخل ہو سکے۔ خزاعہ اور بنوبکر قبیلے اس صلح میں شامل ہو گئے۔ یوں ان دونوں قبیلوں کی دیرینہ عداوتوں کا خاتمہ ہوگیا۔[1]

⑨ دونوں جانب سے معاہدے پر دستخط اور گواہیاں ضروری ہوتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے دستخط اور گواہیاں بین الاقوامی قانون کے مطابق ہوئی تھیں۔

⑩ معاہدے میں یہ بھی درست ہوتا ہے کہ کوئی غیر متنازع شخص ثالث بن جائے اور وہ معاہدے کو حتمی شکل دینے کے لیے شریک ہو جس کے خیالات فریقین سے ملتے ہوں۔

احابش کا سردار حلیس بن علقمہ بطور ثالث درمیان میں آیا جو قریش کا سب سے بڑا حلیف تھا۔ قریش نے خود بھی اسے ثالثی کا کردار ادا کرنے کو کہا، یہ شخص بڑا عقل مند اور صاحبِ بصیرت تھا۔ اس کی بات اپنی قوم میں رد نہ کی جاتی تھی۔ آپ ﷺ اسے ذاتی طور پر بھی جانتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ اس میں عبادت گزاری اور تعظیم حرم کا جذبہ موجزن رہتا ہے۔

قریش نے جب اسے سفارت کے لیے چنا تو انھیں توقع تھی کہ یہ آدمی عرب میں ممتاز حیثیت کی بنا پر اس کام کو تکمیل تک لے جائے گا۔ اسے نبی ﷺ کے ہاں بھی عزت والا مقام حاصل ہے، لہٰذا یہ آپ ﷺ اور آپ کے صحابہ پر اثر انداز ہوگا۔[2]

بین الاقوامی قانون کا تقاضا بھی یہی ہے کہ کبھی تو معاہدہ ایسی حکومت کی وساطت سے طے پاتا ہے جو جھگڑے میں فریق نہیں ہوتی یا ایسے سفراء کے ہاتھوں طے پا جاتا ہے جو

1 صلح الحديبية لمحمد أحمد باشميل، ص: 280. 2 صلح الحديبية لمحمد أحمد باشميل، ص: 200,199.

جھگڑے سے تعلق نہیں رکھتے یا جھگڑے سے ان کی حکومت کا تعلق نہیں ہوتا۔

⑪ معاہدے اور اس کی شرائط پر اتفاق ہو جانا ہی معاہدے کی تنفیذ کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ نہ لکھا گیا ہو اور نہ ابھی اس پر دستخط ہوئے ہوں۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے معاہدے کی پانچویں شق پر سہیل بن عمرو کے بیٹے ابو جندل رضی اللہ عنہ کے متعلق یہی طرز عمل اختیار کیا تھا۔ معاہدے میں یہ طے پایا تھا کہ قریش کا کوئی فرد اپنے ولی کی اجازت کے بغیر محمد (ﷺ) کے پاس جائے گا تو اسے واپس لوٹا دیا جائے گا۔

یوں رسول اللہ ﷺ نے اس شق کا اعلان فرمایا اور اسے نافذ العمل قرار دیا اگرچہ ابھی نہ معاہدہ تحریر ہوا تھا اور نہ اس پر دونوں جانب سے دستخط ہوئے تھے۔

⑫ معاہدے کے دو نسخے تیار کر کے ہر فریق کو ایک نسخہ دیا جاتا ہے، چنانچہ جب حدیبیہ میں صلح کے معاملات پایہ تکمیل کو پہنچ گئے تو ہر فریق نے اپنا اپنا نسخہ لیا۔ قریشی فریق اپنی تحریر لے کر مکہ روانہ ہو گئے۔ *

ابو جندل رضی اللہ عنہ کا موقف اور ایفائے عہد

صلح حدیبیہ کا ایک اہم سبق ایفائے عہد ہے۔ ایک مسلمان جو بات اپنے اوپر لازم کر لے وہ اسے پورا کرتا ہے۔ ماضی و حال کی تاریخ میں تحریری یا زبانی کلامی بات چیت کی پاسداری کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ نے بذات خود اعلیٰ مثال قائم فرمائی۔ اس معاہدے کی عملی صورت اس وقت پیش آئی جب سہیل بن عمرو حدیبیہ میں مذاکرات کر رہا تھا وہیں پر اس کا مسلمان بیٹا ابوجندل بھی بیڑیاں پہنے پہنچ گیا۔ وہ مشرکین مکہ کے قید خانے سے بھاگ آیا تھا۔ مشرکینِ مکہ کے ہاتھوں سے بچ نکلنے کے بعد مسلمانوں کے سامنے آ کر فریاد کرنے لگا۔ ادھر اس کا باپ مذاکرات کر رہا تھا۔ اس نے بیٹے کو دیکھا تو اٹھ کر اس

* المعاهدات في الشريعة الإسلامية للدكتور محمد الديك، ص:273.

کے گریبان سے پکڑتے ہوئے کہا: ''اے محمد (ﷺ) میرے اور تمھارے درمیان معاملہ طے پا چکا ہے۔'' یعنی اس کی آمد سے پہلے ہم بات چیت سے فارغ ہو چکے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «صَدَقْتَ» ''تم سچ کہتے ہو۔'' ابو جندل رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اے مسلمانوں کی جماعت! کیا میں مشرکوں کی طرف واپس لوٹا دیا جاؤں گا جو مجھے دین کے متعلق آزمائش میں ڈالیں گے۔'' اس کی یہ فریاد و التجا بھی کام نہ آئی اور آپ ﷺ نے یہ کہتے ہوئے اسے واپس کر دیا:

«إِنَّا قَدْ عَقَدْنَا بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ صُلْحاً، وَّأَعْطَيْنَاهُمْ عَلٰى ذٰلِكَ وَأَعْطَوْنَا عَهْدًا وَّإِنَّا لَانَغْدِرُ بِهِمْ»

''ہم نے ایک دوسرے سے صلح کا معاہدہ کر لیا ہے اور اس پر ہم نے بھی اور انھوں نے بھی پکا عہد کر لیا ہے۔ ہم یہ عہد کسی صورت میں توڑنے والے نہیں۔''

ہاں یہ ضرور ہے کہ آپ ﷺ نے اس کربناک صورت حال میں جس میں معاہدے کی دفعات رکاوٹ تھیں، ابو جندل اور اس صورت حال سے دوچار دیگر مستضعفین کو تنگی کے دن بہت جلد ختم ہونے کی بشارت دی۔ رسول اللہ ﷺ نے تسلی دیتے ہوئے فرمایا:

«يَا أَبَا جَنْدَلٍ! اِصْبِرْ وَاحْتَسِبْ، فَإِنَّ اللّٰهَ جَاعِلٌ لَّكَ وَلِمَنْ مَّعَكَ مِنَ الْمُسْتَضْعَفِينَ فَرَجًاوَّ مَخْرَجاً»

''اے ابو جندل! صبر سے کام لو اور ثواب کا خیال رکھو۔ اللہ تعالیٰ تمھارے اور تمھارے ساتھ دیگر کمزور مسلمانوں کی تکالیف کا ازالہ فرمائے گا اور ان کے لیے نجات کا کوئی راستہ ضرور نکالے گا۔''[1]

کلامِ نبوت سے ایفائے عہد کے متعلق آپ کے بھرپور اہتمام کا پتا چلتا ہے۔ نتائج و

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 3/347.

عواقب کیسے ہی ہوں، لوگ اسے جیسی بھی نگاہ سے دیکھیں مگر آپ ﷺ نے ایسی مثال قائم کر دی ہے جس سے بڑھ کر وفا ناممکن ہے۔[1]

رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے ابو جندل رضی اللہ عنہ کا معاملہ ایفائے عہد کا سخت ترین امتحان تھا۔ جس میں آپ ﷺ نے اور صحابہ نے اپنے جذبات و احساسات کو حتی المقدور دبا کر ثابت قدمی دکھائی۔

اپنے بھائی ابو جندل رضی اللہ عنہ کی خستہ حالی پر انھوں نے صبر کا مظاہرہ کیا۔ ابو جندل کا باپ جب مسلمانوں کے ایک دینی بھائی کو گریبان سے پکڑے کھینچ رہا تھا اور اس کے بدن سے خون بہہ رہا تھا تو ان کی تکلیف میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ان کی اکثریت اس بھائی کی کربناک حالت پر ترس کھاتے ہوئے اپنے آنسو نہ روک سکی۔ وہ اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے کہ اس کا بت پرست اور مشرک باپ اسے مکہ مکرمہ کی خوفناک جیل میں دوبارہ گھسیٹتے لیے جا رہا تھا۔

ابو جندل نے دین و عقیدہ کی راہ میں صبر کا دامن تھامے رکھا اور یوں اس پر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا اطلاق ہوا۔

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۚ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۚ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ۚ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ۝﴾

”اور جو شخص اللہ سے ڈرے تو وہ اس کے لیے (مشکلات سے) نکلنے کا راستہ بنا دیتا ہے۔ اور وہ اسے رزق دیتا ہے جہاں سے اسے گمان تک نہیں ہوتا۔ اور جو شخص اللہ پر توکل کرے تو وہ اس کے لیے کافی ہے، بے شک اللہ اپنا کام پورا کر کے رہتا ہے۔ بے شک اللہ نے ہر چیز کے لیے اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔“[2]

[1] محمد رسول اللہ ﷺ لصادق عرجون: 275/4. [2] الطلاق 65:2,3.

معاہدے کے بعد ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ مکہ مکرمہ میں موجود دیگر کمزور مسلمان مکہ کی جیلوں سے نکل آئے۔ ابو بصیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر وہ ایک قوت بن گئے۔ اہل مکہ ان سے خوف کھانے لگے۔ اور یوں شام سے آنے والے قریشی قافلے ان کی دسترس میں آ گئے۔

نیک نیتی سے اختلاف رائے

معاہدہ صلح پر اتفاق سے پہلے مسلمانوں میں معاہدے کے متعلق شدید اختلاف ہو گیا۔ خاص طور پر ان دو دفعات پر جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پناہ کی غرض سے آنے والے مسلمانوں کو واپس کرنے کے پابند تھے، جبکہ قریش اس کے پابند نہ تھے کہ ان کے پاس آنے والے مرتد کو واپس کریں۔

اور اسی طرح وہ شق جس کی بنا پر طے پایا کہ مسلمان اس سال مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے بغیر واپس مدینہ جائیں گے۔ دفعات کے متعلق اختلاف کرنے والوں میں عمر بن الخطاب، اوس کے سردار اسید بن حضر اور خزرج کے رئیس سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہم پیش پیش تھے۔

روایات میں ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اس معاہدے کی مخالفت کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ گئے اور عرض کیا: ''کیا آپ اللہ تعالیٰ کے رسول نہیں ہیں؟''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «بَلٰی!» ''کیوں نہیں!''

عمر رضی اللہ عنہ: ''کیا ہم مسلمان نہیں ہیں؟''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «بَلٰی!» ''کیوں نہیں!''

عمر رضی اللہ عنہ: ''کیا وہ مشرک نہیں۔؟''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «بَلٰی!» ''کیوں نہیں!''

عمر رضی اللہ عنہ: ''تو پھر دین کے معاملے میں ہمیں کس بنا پر ذلت کا سامنا ہے؟''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: «إِنِّي رَسُولُ اللّٰهِ وَلَسْتُ أَعْصِيهِ» ''میں اللہ کا رسول ہوں۔

میں اس کے حکم کی مخالفت نہیں کر سکتا۔''[1]

ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں:

«أَنَا عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُولُهُ لَنْ أُخَالِفَ أَمْرَهُ وَلَنْ يُّضَيِّعَنِي»

''میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ اس کے حکم کی خلاف ورزی ہرگز نہیں کروں گا اور وہ مجھے کسی طرح بھی ضائع نہیں کرے گا۔''[2]

عمر رضی اللہ عنہ: ''کیا آپ نے ہمیں کہا نہیں تھا کہ ہم بیت اللہ کی زیارت کریں گے اور اس کا طواف کریں گے؟''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «بَلٰى! فَأَخْبَرْتُكَ أَنَّا نَأْتِيهِ الْعَامَ؟» ''کیوں نہیں! کیا میں نے یہ بھی کہا تھا کہ ہم اسی سال کریں گے؟''

عمر رضی اللہ عنہ: ''نہیں۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: «فَإِنَّكَ آتِيهِ وَ مُطَوِّفٌ بِهِ» ''بہر حال تم بیت اللہ تک پہنچو گے اور اس کا طواف بھی کرو گے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ پھر میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اور کہا: ''اے ابوبکر! کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول نہیں؟''

ابوبکر رضی اللہ عنہ: ''کیوں نہیں!''

عمر رضی اللہ عنہ: ''کیا ہم مسلمان نہیں؟''

ابوبکر رضی اللہ عنہ: ''کیوں نہیں!''

عمر رضی اللہ عنہ: ''کیا یہ لوگ مشرک نہیں؟''

ابوبکر رضی اللہ عنہ: ''کیوں نہیں!''

عمر رضی اللہ عنہ: ''پھر دین کے معاملے میں ہمیں ذلت کا سامنا کیوں ہے؟''

---

[1] صحيح البخاري، حديث:2732,2731. [2] تاريخ الطبري:634/2.

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو سمجھاتے ہوئے کہا: ''جھگڑا اور مخالفت ترک کر دو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو تھامے رکھو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ انھوں نے جو کہا وہی درست ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی ہرگز نہیں کریں گے اور اللہ تعالیٰ انھیں ہرگز ضائع نہیں کرے گا۔''

ابو جندل رضی اللہ عنہ کے واقعے کے بعد صحابہ پھر سے معاہدہ صلح سے اپنے اختلاف کو سامنے لاتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ دیگر کئی صحابہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے اور معاہدے سے اختلاف کا اظہار کیا۔ مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں صبر و حکمت، بردباری اور قوتِ دلیل سے صلح کی افادیت پر قائل کر لیا اور بتایا کہ یہ سراسر مسلمانوں کے مفاد میں ہے اور ان کے لیے دراصل فتح و نصرت ہے۔[1]

اور یقیناً اللہ تعالیٰ ابو جندل رضی اللہ عنہ جیسے کمزور مسلمانوں کے لیے کوئی رستہ ضرور نکالے گا اور پھر واقعی ایسا ہی ہوا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے نیک نیتی پر مبنی اختلاف رائے کو عملاً جائز قرار دیا۔ آپ نے قائدین کو نیک نیتی پر مبنی اختلاف رائے کا احترام کرنے کا سبق دیا۔[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طرز عمل آزادی رائے کو قابل احترام قرار دے رہا ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ اسلامی معاشرے کے افراد کو اظہار رائے کا حق حاصل ہے، خواہ وہ رائے حاکم یا خلیفہ پر تنقید سمجھی جائے۔

یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ سربراہ کی رائے سے اختلاف جرم نہیں کہ رائے دہندہ کو جیل کی سلاخوں میں بند کر دیا جائے۔[3]

---

[1] صلح الحديبية لمحمد أحمد باشميل، ص:270. [2] القيادة العسكرية في عهد الرسول ﷺ للدكتور محمد الرشيد، ص:495. [3] غزوة الحديبية لأبي فارس، ص:135,134.

عمرے کا احرام کھولنا اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا مشورہ

صلح نامہ سے فراغت کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا: «قُومُوا فَانْحَرُوا ثُمَّ احْلِقُوا» ''اٹھو، جانور قربان کر دو اور سر منڈوا دو۔''

یہ بات رسول اللہ ﷺ نے تین بار دہرائی لیکن کوئی نہ اٹھا۔ آپ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے خیمے میں گئے اور لوگوں کے طرز عمل کا ذکر فرمایا۔ ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا گویا ہوئیں: ''اے اللہ کے نبی! اگر آپ ایسا ہی چاہتے ہیں تو پھر باہر تشریف لے جائیے اور کسی سے بات کیے بغیر چپ چاپ اپنا جانور ذبح کر دیجیے اور حجام کو بلا کر سر منڈا دیجیے۔''

آپ خیمے سے باہر آئے اور کسی سے کچھ کہے بغیر قربانی ذبح کر ڈالی اور حجام کو بلا لیا۔ جب لوگوں نے یہ منظر دیکھا تو فوراً اٹھے، اپنے اپنے جانور ذبح کر دیے اور ایک دوسرے کا سر مونڈنے لگے۔ معلوم ہوتا تھا کہ فرطِ غم سے ایک دوسرے کا گلا کاٹ ڈالیں گے۔ [1]

حدیبیہ کے روز کچھ لوگوں نے سر کے پورے بال منڈوائے اور کچھ لوگوں نے کتروائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «يَرْحَمُ اللّٰهُ الْمُحَلِّقِينَ» ''اللہ تعالیٰ سر منڈانے والوں پر رحم فرمائے۔'' لوگوں نے عرض کیا: ''اور ان لوگوں پر بھی جنھوں نے بال کتروائے ہیں۔'' رسول اللہ ﷺ نے پھر بھی یہی فرمایا: ''اللہ تعالیٰ سر منڈانے والوں پر رحم فرمائے۔'' لوگوں نے پھر عرض کیا کہ بال کتروانے والوں پر بھی؟ اب آپ ﷺ نے فرمایا: «وَالْمُقَصِّرِينَ» ''اور بال کتروانے والوں پر بھی رحم فرمائے۔'' [2]

حدیبیہ کے روز رسول اللہ ﷺ کی قربانیوں میں ایک اونٹ ابوجہل کا بھی تھا۔ [3] جس کی ناک میں چاندی کا چھلا تھا۔ اس کی قربانی کا مقصد یہ تھا کہ مشرک جل بھن کر

[1] صحيح البخاري، حديث: 2731، 2732. [2] صحيح البخاري، حديث: 1727، وصحيح مسلم، حديث: 1301، ومسند أحمد: 216/1. [3] ابوجہل کا یہ اونٹ غزوۂ بدر کے موقع پر مالِ غنیمت کے طور پر حاصل ہوا تھا۔ (عون المعبود: 172/5).

رہ جائیں۔[1]

اس واقعے میں کئی دروس و حکمتیں ہیں جو ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں، مثلاً:

عورت کی رائے: ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی رائے بڑی مبارک اور درست تھی۔ وہ سمجھ گئیں کہ صحابہ یہ خیال کر رہے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں احرام اتارنے کا جو حکم دیا ہے وہ صرف ان کے لیے رخصت ہے۔ جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود احرام کی حالت میں رہیں گے، چنانچہ ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ دیا کہ آپ خود احرام سے نکل آئیں تاکہ ان کا اگر یہ وہم ہو تو دور ہو جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ام المومنین کے مشورے کو درست خیال فرمایا، لہٰذا صحابہ نے بھی آپ کی دیکھا دیکھی وہی کیا جو آپ کر رہے تھے، خواہ اس وقت آپ نے انھیں ایسا نہیں کہا تھا۔ اس کے بعد تو مزید کسی بات کی گنجائش ہی نہ رہی۔ یہ بڑی درست رائے اور بابرکت مشورہ تھا۔

اس میں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ اگر عمدہ رائے، اچھی سوچ اور مثبت خیالات کی حامل کوئی خاتون مشورہ دے تو اس کا مشورہ قبول کرنا چاہیے۔[2]

یہ واقعہ ان اسلام دشمن عناصر کے منہ پر طمانچہ ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام نے عورت کے حقوق دبائے ہیں اور اسے اس کا جائز مقام نہیں دیا۔ عورت کے حقوق کا اس سے بڑا بھی کوئی اعتراف ہو سکتا ہے۔ عورت کی رائے کا اس سے زیادہ احترام کیا ہوگا کہ ایک عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ دے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس پریشان کن کیفیت کے حل کے لیے اس مشورے پر عمل پیرا ہوں۔[3]

عملی نمونہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کام کرنے کا تین بار حکم دیا۔ مخاطب افراد میں بڑے

1 سنن أبي داود، حديث: 1749، ومسند أحمد: 234/1، وسنن ابن ماجه، حديث: 3076، والمعجم الكبير للطبراني، رقم: 11148,11147، والسيرة النبوية لابن هشام: 349/3. 2 ملامح الشورىٰ في الدعوة الإسلامية للشيخ عدنان النحوي، ص: 161. 3 المعاهدات في الشريعة الإسلامية للدكتور محمد الديك، ص: 273.

بڑے صحابہ موجود تھے اس کے باوجود کسی نے بھی آپ ﷺ کی بات پر عمل نہ کیا۔ مگر جب ام المومنین کے بتائے ہوئے عملی پہلو کو آپ ﷺ اختیار فرمایا تو مقصد فوراً حل ہو گیا۔ ایسے معاملات میں عملی نمونہ بے حد نفع بخش ثابت ہوتا ہے۔[1]

حج و عمرہ میں رکاوٹ پیدا ہو جانے کا حکم: معاہدۂ صلح کے بعد رسول اللہ ﷺ کا حالت احرام سے نکل آنا، قربانی کرنا اور سر منڈوانا اس بات کی دلیل ہے کہ مجبور و محصور آدمی کے لیے حالت احرام سے نکلنا درست ہے۔ تفصیل کتب فقہ میں دیکھیے۔ یاد رہے کہ فوت شدگان اور خیبر میں شہید ہونے والوں کے علاوہ ''عمرۃ القضاء'' میں تمام شرکائے صلح حدیبیہ ادائیگی عمرہ کے لیے آئے تھے۔[2]

مدینہ منورہ واپسی اور سورۂ فتح کا نزول: رسول اللہ ﷺ نے حدیبیہ سے مدینہ کا قصد فرمایا۔ ابھی آپ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان ہی تھے کہ سورۂ فتح نازل ہوئی۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿سَيَقُوْلُ لَكَ الْمُخَلَّفُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ شَغَلَتْنَآ اَمْوٰلُنَا وَ اَهْلُوْنَا فَاسْتَغْفِرْ لَنَا ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۚ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا ۚ بَلْ كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝﴾

''دیہاتیوں میں سے پیچھے چھوڑے جانے والے لوگ آپ سے ضرور کہیں گے: ہمارے مالوں اور ہمارے اہل و عیال نے ہمیں مشغول کر دیا تھا، لہٰذا آپ ہمارے لیے مغفرت طلب کریں، وہ اپنی زبانوں سے وہ (بات) کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہے، آپ کہہ دیجیے: پھر کون تمھارے لیے اللہ سے کسی شے کا اختیار رکھتا ہے اگر وہ تمھیں کوئی نقصان پہنچانا چاہے یا کوئی نفع دینا چاہے؟ (کوئی

---

[1] تأملات في السيرة النبوية لمحمد السيد الوكيل، ص: 211. [2] فقه السيرة للبوطي، ص: 243.

بھی نہیں) بلکہ اللہ اس سے خوب باخبر ہے جو تم عمل کرتے ہو۔'' [1]

رسول اللہ ﷺ نے اس سورت کے نزول پر اپنی خوشی کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

«أُنْزِلَتْ عَلَيَّ اللَّيْلَةَ سُورَةٌ هِيَ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا طَلَعَتْ عَلَيْهِ الشَّمْسُ»

''آج رات مجھ پر ایسی سورت اتاری گئی ہے جو دنیا جہان سے بڑھ کر مجھے محبوب ہے۔'' [2]

پھر آپ ﷺ نے اس کی تلاوت فرمائی: ﴿إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا﴾ ''بے شک ہم نے آپ کو ایک کھلم کھلا فتح دی ہے۔'' صحابہ نے کہا: ''مبارک مبارک۔ اے اللہ کے رسول! ہمارے لیے کیا ہے؟'' نبی ﷺ نے تلاوت فرمائی:

﴿لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَيُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ ۚ وَكَانَ ذَٰلِكَ عِندَ اللَّهِ فَوْزًا عَظِيمًا﴾

''تاکہ مومن مردوں اور عورتوں کو ان جنتوں میں لے جائے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے اور ان سے ان کے گناہ دور کر دے اور اللہ کے نزدیک یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔'' [3]

رسول اللہ ﷺ ''کراع الغمیم'' میں اپنی سواری پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ لوگ آپ کی طرف لپکے۔ آپ ﷺ نے ان کے سامنے سورۂ فتح کی پہلی آیت تلاوت فرمائی تو ایک شخص نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! کیا یہ فتح ہے؟'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«نَعَمْ! وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ! إِنَّهُ لَفَتْحٌ»

''ہاں! قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے یہ یقیناً فتح ہے۔'' [4]

1 الفتح 48:11. 2 صحيح البخاري، حديث: 4177. 3 الفتح 48:5. صحيح البخاري، حديث: 4172، وصحيح مسلم، حديث: 1786. 4 سنن أبي داود، حديث: 2736، والمستدرك للحاكم: 131/2.

چنانچہ مسلمانوں کا غم اور پریشانی انتہائی خوشی میں بدل گئی۔ انھیں یقین ہو گیا کہ وہ اسباب و نتائج کا قطعاً ادراک نہیں کر سکتے۔ ان کی اپنی اور دعوتِ اسلامی کی ساری بھلائی اس میں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں۔[1]

قرآن نے سورۂ فتح میں اس عظیم واقعے کا تذکرہ کیا ہے۔ غزوہ حدیبیہ کو بیان کرنے میں قرآن کا اپنا مخصوص انداز ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن نے جب اس غزوے کا تذکرہ کیا ہے تو اس نے فریقین کی صلح اور عدم جنگ کو ''فتح مبین'' کا نام دیا ہے۔ سورۂ فتح کے اسباب نزول پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ صلح سے فارغ ہو کر واپس مدینہ منورہ آ رہے تھے اس وقت یہ سورت نازل ہوئی۔ آپ ﷺ اور جملہ مومنین عمرے کے حوالے سے اپنی دلی امید بر نہ آنے کے بعد کئی ایک بڑے بڑے مراحل سے گزر چکے تھے، مثلاً: مشرکین کا آمنا سامنا، بیعتِ رضوان اور صلح حدیبیہ۔ جس پر بعض صحابہ کرام خوش نہ تھے اور ان معاملات کے متعلق ان کے دلوں میں کئی خیالات جنم لے چکے تھے۔

قرآن کریم اترتا ہے اور مسلمانوں کے لیے واضح ہوتا ہے کہ یہ صلح درحقیقت ''فتح مبین'' ہے اور قرآن یہ بات تاکید سے بیان کرتا ہے کہ قبول صلح کے سلسلے میں نبی مکرم ﷺ صحیح موقف پر قائم تھے۔ تاکہ جب رسول اللہ ﷺ انھیں دنیا والوں کے سامنے خوشخبری دیں کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں صلح کے ساتھ فتح سے ہمکنار کیا اور اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی مقدم و موخر کوتاہیاں معاف فرما دیں تو آپ ﷺ پر مومنوں کا اعتماد (عزت افزائی کے طور پر) مزید پختہ ہو جائے اور انھیں اطمینان حاصل ہو کہ آپ ﷺ درستگی پر ہیں اور آپ نے جو قدم اٹھایا ہے وہی صحیح ہے اور اس کا انجام خوش بختی اور سعادت مندی ہی ہے۔

[1] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 449/2.

بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی توفیق مومنوں کے ساتھ تھی۔ اس نے تو اپنے رسول کو صبر کی توفیق بخشی کہ بالآخر وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ معاہدۂ صلح پر متفق ہو گئے اور یہ معاہدہ ان کے دلوں میں نزول سکینت کا سبب بنا۔ حتی کہ ان کے دلوں پر بھی جنھوں نے صلح کی بعض شرائط ماننے سے انکار کر دیا تھا اور بڑی گرانیِ طبع کے ساتھ تسلیم کیا تھا، ان کی جانب سے بھی صلح کا معاملہ ترک کر دینے کی نوبت نہ آئی۔ بلکہ تمام کے تمام ہی اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ سکینت کی بنا پر رسول اللہ ﷺ کے فیصلے سے راضی ہو گئے۔ ارشاد ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ ۗ وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝﴾

”وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں طمانینت وتسکین نازل کی تاکہ ان کے ایمان میں اور (مزید) ایمان کا اضافہ ہو اور آسمانوں اور زمین کے (سب) لشکر اللہ ہی کے ہیں، اللہ خوب جاننے والا، خوب حکمت والا ہے۔“[1]

قرآن پاک اس بات کی وضاحت فرما رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے ان پر اطمینان نازل فرمایا تاکہ وہ اس کا فضل واحسان یاد رکھیں اور ہمیشہ ان کا شکریہ ادا کریں۔ اطمینان وسکون کے اتارنے کی خبر قرآن پاک نے صرف اسی غزوے کے متعلق دی ہے۔ یہ سکینت غیر حسی ہے۔ اس کی کیفیت نزول اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔ قرآن نے بیعتِ رضوان کی تعریف فرمائی اور اسے قرآن میں بیان کر کے دوام بخشا ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بیعت کرنا قرار دیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ۭ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰي نَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ

[1] الفتح 4:48.

﴿فَسَيُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ۝﴾

"بلاشبہ جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں، وہ تو بس اللہ سے بیعت کرتے ہیں، اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے، پھر جس نے عہد شکنی کی تو بس وہ اپنی ہی ذات کے خلاف عہد شکنی کرتا ہے اور جس نے (وہ) عہد پورا کیا جو اس نے اللہ سے باندھا تھا تو عنقریب وہ اسے بہت بڑا اجر دے گا۔"[1]

غزوات کے متعلق قرآنی امتیاز یہ ہے کہ وہ حقائق بھی واضح کرتا ہے اور عقائد کی تصحیح بھی، نفوس کی تربیت بھی کرتا ہے اور منافقین کی رسوائی بھی۔ اسی طرح اس سورت میں عنقریب ہاتھ آنے والی خیبر کی غنیمتوں کے متعلق خوشخبری بھی ہے۔ عذر تراشنے والوں کا بھی تذکرہ ہے۔ جہاد سے پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہر ایک کے لیے سرزنش نہیں بلکہ کچھ کے لیے استثنا بھی ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی کمال رحمت ہے۔ جب صلح حدیبیہ مکمل ہو چکی، مسلمان مدینہ لوٹ آئے اور ان کا مکہ مکرمہ میں داخلے کا ارادہ پورا نہ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کے خواب کے متعلق بتایا کہ وہ سچا خواب تھا۔ یہ بھی فرمایا کہ وہ بہت جلد شرمندہ تعبیر ہوگا۔ ارشاد ہوا:

﴿لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ۗ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ۝﴾

"البتہ تحقیق اللہ نے اپنے رسول کو خواب میں حق کے ساتھ سچی خبر دی کہ اگر اللہ نے چاہا تو تم اپنے سر منڈاتے اور بال کترواتے ہوئے مسجد حرام میں ضرور داخل ہوگے، تم (کسی سے) نہ ڈرتے ہوگے، چنانچہ اللہ وہ بات جانتا تھا جو تم نہیں جانتے تھے، لہٰذا اس نے اس سے پہلے ایک فتح جلد ہی عطا کر دی۔"[2]

یہ عظیم المرتبت سورت نبی ﷺ اور آپ کے صحابۂ کرام کی تعریف پر اختتام پذیر ہوتی

[1] الفتح 10:48. [2] الفتح 27:48.

ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۡ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۭ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۫ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْــــَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَــظَ فَاسْتَوٰى عَلٰي سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ۭ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝﴾

”اور وہ (اللہ) ہی تو ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ اسے سب ادیان پر غالب کردے اور اللہ بطور گواہ کافی ہے۔ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں کافروں پر سخت ہیں آپس میں رحم دل ہیں تو انھیں دیکھے گا کہ رکوع اور سجدے کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ کے فضل اور رضا مندی کی جستجو میں ہیں۔ ان کا نشان ان کے چہروں پر سجدوں کے اثر سے ہے، ان کی پہلی مثال تورات میں ہے اور ان کی مثال انجیل میں ہے۔ مثل اسی کھیتی کے جس نے اپنی کونپل نکالی، پھر اسے مضبوط کیا اور وہ موٹا ہو گیا، پھر اپنے تنے پر سیدھا کھڑا ہو گیا اور کسانوں کو خوش کرنے لگا، تاکہ ان کی وجہ سے کافروں کو چڑائے۔ ان ایمان والوں اور نیک اعمال والوں سے اللہ نے بخشش کا اور بہت بڑے ثواب کا وعدہ کیا ہے۔“[1]

ان آیات نے اصحاب محمد ﷺ کے نیک کردار کی بڑی خوبصورت عکاسی کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ کر رکھا ہے۔[2]

1 الفتح 48:28,29۔ 2 حديث القرآن الكريم عن غزوات الرسول ﷺ لأبي بدر محمد بكر آل عابد: 2/548-555۔

مسلمانوں کے لیے عمومی مغفرت کا یہ وعدہ ایسی صفات عالیہ کے تذکرے کے بعد کیا گیا ہے جو انھیں مغفرت الٰہی کا اولین مستحق بناتی ہیں۔ یہ عزت افزائی ان کے لیے کافی ہے اور یہ رضا مندی اجر عظیم ہے۔ لیکن فیضانِ الٰہی لامحدود ہے اور اللہ تعالیٰ کی عطا تو ایسی ہے کہ ختم ہی نہیں ہوتی۔[1]

سید قطب رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''چودہ سو برس کے بعد میں ایک مرتبہ پھر ان باسعادت افراد کے دلوں میں جھانکنے کی کوشش کر رہا ہوں جبکہ وہ رضا مندی، عزت افزائی اور عظیم وعدے کا فیض حاصل کر رہے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اس کا اہل محسوس کر رہے ہیں۔ میں انھیں بہ چشم تصور سورۂ فتح کے نزول کے بعد حدیبیہ سے لوٹتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ یہ سورت انھیں پڑھ کر سنائی گئی وہ اس پر کیف فضا، جادوئی سماں اور پرانوار ماحول میں اپنے قلوب و اذہان اور روح و وجدان سے اس خداوندی ضمانت و کفالت سے زندگی گزار رہے ہیں اور اس کی نعمت کا اثر محسوس کرتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔[2]

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اس امر کا یقین کر لیا تھا کہ اب اسلامی دعوت نئے انداز، یقینی فتح اور وسیع تر مفاد کے ساتھ منصۂ شہود پر آئے گی۔ انھوں نے جانا کہ دین اسلام کی فطرت یہی ہے کہ وہ جنگ کے بجائے امن و سلامتی کے ماحول میں پروان چڑھتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ صلح حدیبیہ کے درج ذیل اچھے نتائج ان کے سامنے آنے لگے:

① معاہدہ صلح میں قریش نے مسلمانوں کو جداگانہ سیاسی قوت کے طور پر تسلیم کر لیا تھا۔ معاہدہ تو ہمیشہ برابر کی قوتوں میں ہوتا ہے۔ ان قبائل پر قریش کی اس ہٹ دھرمی کا گہرا اثر پڑا جو قریش کے ''میں نہ مانوں'' کے اصول سے واقف تھے۔ وہ اسی اصول کو رہنما اصول سمجھتے تھے۔

1 التربية القيادية للدكتور الغضبان: 4/290-292. 2 تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب: 6/3333.

② مشرکین و منافقین کے دلوں میں ڈر پیدا ہو گیا۔ اکثر کو غلبہ اسلام کا یقین تھا۔ قریش کے بڑے بڑے متعدد سرداروں، مثلاً: خالد بن ولید اور عمرو بن العاص کی اسلام سے رغبت اس امر کا واضح اعلان تھا۔ مدینہ منورہ کے پڑوس میں مکین بدوؤں کا پیچھے رہنے پر معذرت خواہ ہونا بھی مستقبل میں اسلام کے غلبے کی ایک نشانی تھی۔

③ صلح نے اسلام کے پھیلنے اور لوگوں کو اس سے متعارف ہونے کا موقع فراہم کر دیا، جو بہت سے قبائل کے داخلۂ اسلام کا سبب بنا۔ امام زہری رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''اس سے پہلے اسلام میں ایسی عظیم فتح نہیں ہوئی تھی۔ لوگ جہاں بھی اکٹھے ہوتے جنگ کی نوبت آتی۔ مگر جب صلح ہو گئی، جنگ بندی ہوئی تو لوگ ایک دوسرے سے بے خوف ہو گئے۔ میل جول ہوا۔ بات چیت ہوئی۔ عقل مند افراد نے اسلام کے متعلق بات چیت کی اور اسلام میں داخل ہو گئے۔ ان دو برسوں میں اتنے لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے جتنے اس سے پہلے کل تعداد میں تھے۔''[1]

ابن ہشام اس کے بعد کہتے ہیں: ''زہری کے قول کی دلیل یہ ہے کہ بقول جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلح حدیبیہ کے موقع پر 1400 آدمی اپنے ساتھ لے کر نکلے تھے مگر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم دو سال بعد فتح مکہ کے سال نکلے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ 10,000 جانباز تھے۔''[2]

④ مسلمان قریش کے خطرے سے محفوظ ہو چکے تو اب رخ یہود اور ان کے طرفدار دیگر قبائل کی طرف ہو گیا۔ یوں صلح حدیبیہ کے بعد غزوۂ خیبر واقع ہوا۔

صلح کے مذاکرات سے قریش کے حلیف مسلمانوں کا موقف سمجھنے لگے اور ان کا جھکاؤ اسی طرف ہو گیا۔ حلیس بن علقمہ نے مسلمانوں کو تلبیہ کہتے سنا تو یہ کہتے ہوئے اپنے ساتھیوں کی طرف لوٹا: ''میں نے نشان زدہ قربانیاں دیکھی ہیں جنھیں قلادے پہنائے گئے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ انھیں بیت اللہ سے روکنا چاہیے۔''

1 السيرة النبوية لابن هشام: 351/3. 2 السيرة النبوية لابن هشام: 352,351/3.

⑤ صلح حدیبیہ نے رسول اللہ ﷺ کو غزوۂ موتہ کی تیاری کا موقع دیا۔ یوں جزیرۃ العرب سے باہر اسلامی دعوت کو نئے انداز سے پھیلانے کا ایک اور طریقہ میسر آ گیا۔

⑥ صلح حدیبیہ نے رسول اللہ ﷺ کو رومی، فارس، قبطی بادشاہوں کو اسلام کے دعوتی خطوط بھیجنے میں مدد دی۔

⑦ صلح حدیبیہ فتح مکہ کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ ابن قیم رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''صلح، عظیم فتح کا پیش خیمہ تھی۔ جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور لشکر کو سرفراز کیا۔ لوگ اللہ کے دین میں فوج درفوج داخل ہو گئے۔ یہ صلح فتح مکہ کا دروازہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کا طریقہ ہے کہ بڑے معاملات سے پہلے آدمی کو ذہنی طور پر تیار کرتا ہے۔''[1]

ابو بصیر رضی اللہ عنہ کی مدینہ منورہ آمد

صلح حدیبیہ کے فوراً بعد ابو بصیر عتبہ بن اسید رضی اللہ عنہ مشرکینِ مکہ کی قید سے بھاگ نکلے اور مدینہ منورہ میں رسول اللہ ﷺ سے جا ملے۔ معاہدے کی شرط کے مطابق قریش نے ان کے پیچھے دو آدمی بھیجے۔ آپ ﷺ نے ابو بصیر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: «يَا أَبَا بَصِيرٍ! إِنَّا قَدْ أَعْطَيْنَا هٰؤُلَاءِ الْقَوْمَ مَا قَدْعَلِمْتَ، وَلَا يَصْلُحُ لَنَا فِي دِينِنَا الْغَدْرُ، وَإِنَّ اللّٰهَ جَاعِلٌ لَّكَ وَلِمَنْ مَّعَكَ مِنَ الْمُسْتَضْعَفِينَ فَرَجًا وَّمَخْرَجًا فَانْطَلِقْ إِلٰى قَوْمِكَ» ''اے ابو بصیر! ہم نے اس قوم سے جو عہد کیا ہے وہ تمھیں معلوم ہی ہے اور عہد شکنی کی ہمارے دین میں کوئی گنجائش نہیں۔ اللہ تعالیٰ تمھارے لیے اور تمھارے ساتھ دوسرے کمزور مسلمانوں کے لیے کوئی راہ نکالے گا، لہٰذا تم اپنی قوم کے پاس واپس چلے جاؤ۔'' ابو بصیر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! کیا آپ مجھے ان مشرکوں کے حوالے کر رہے ہیں جو میرے دین کے معاملے میں مجھے آزمائش میں مبتلا کریں گے؟''

[1] زادالمعاد:309/3.

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «يَا أَبَا بَصِيرٍ، اِنْطَلِقْ، سَيَجْعَلُ لَكَ وَلِمَنْ مَّعَكَ مِنَ الْمُسْتَضْعَفِينَ فَرَجًاوَّ مَخْرَجًا»

"ابو بصیر! تم چلے جاؤ۔ اللہ تعالیٰ عنقریب تمھارے لیے اور تمھارے ساتھ دوسرے کمزور مسلمانوں کے لیے کوئی نہ کوئی راہ نکالے گا۔"[1]

چنانچہ ابو بصیر رضی اللہ عنہ ان کے ساتھ چل دیے۔ مسلمانوں کو یہ بات بہت گراں گزری کہ ان کا ہم عقیدہ بھائی قریش کے ظلم کی چکی سے نجات میں کامیاب تو ہو گیا مگر پھر اس جیل میں واپس جا رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ عہد کی پاسداری کا بہت اہتمام فرماتے تھے۔ آپ ﷺ کے ہاں یہ صرف کاغذی کارروائی نہیں تھی، یہ آپ کا معمول تھا۔ اللہ تعالیٰ نے بھی تو عہد نبھانے کا حکم دے رکھا ہے اور کئی ایک آیات میں عہد شکنی سے بچنے کی تلقین کی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝﴾

"اور اللہ کا عہد پورا کرو جب تم آپس میں عہد کر لو اور قسمیں پکی کرنے کے بعد نہ توڑو جبکہ تم نے اللہ کو اپنا کفیل بنایا ہو۔ بے شک اللہ جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔"[2]

مزید ارشاد ہوا:

﴿وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا ۝﴾

"اور تم عہد پورا کرو، بے شک عہد کی بابت سوال کیا جائے گا۔"[3]

ایفائے عہد دین اسلامی کا ایک بنیادی اصول ہے۔ اس اصول کو پیش نظر رکھنا ہر مسلمان پر واجب ہے۔[4]

1 السيرة النبوية لابن هشام: 337/3. 2 النحل 16:91. 3 بني إسراء يل 17:34. 4 منهج الإعلام الإسلامي في صلح الحديبية لسليم حجازي، ص:329.

رسول اللہ ﷺ نے قریش سے کیے ہوئے عہد کا التزام فرمایا اور ابو بصیر رضی اللہ عنہ کو ان کے بھیجے ہوئے دو آدمیوں کے سپرد کر دیا۔ ابو بصیر رضی اللہ عنہ ابھی ان کے ساتھ چلے دیے۔ جب وہ ذوالحلیفہ پہنچے تو ان دو میں سے ایک شخص سے کہا: ''اے عامری بھائی! کیا تمھاری تلوار کاٹ دار ہے؟'' اس نے کہا: ''ہاں!'' ابو بصیر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''کیا میں دیکھ سکتا ہوں؟'' عامری نے جواب دیا: ''چاہو تو دیکھ سکتے ہو۔''

ابو بصیر رضی اللہ عنہ نے تلوار ہاتھ میں لیتے ہوئے اس پر حملہ کیا اور اسے قتل کر دیا۔ دوسرا شخص بھاگتا ہوا رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچ گیا اور کہا: ''آپ کے ساتھی نے میرے ساتھی کو قتل کر دیا ہے۔ ابھی وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ہی تھا کہ ابو بصیر رضی اللہ عنہ بھی تلوار سونتے پہنچ گئے اور کہا: ''اے اللہ کے رسول! آپ کی ذمہ داری پوری ہو گئی اور اللہ تعالیٰ نے جو کچھ آپ کی طرف سے واجب تھا ادا کر دیا، آپ نے مجھے ان کے سپرد کر دیا اور میں اپنے دین کے متعلق فتنے میں پڑنے سے بچ گیا۔'' اس پر نبی ﷺ نے فرمایا:

«وَيْلُ أُمِّهِ مِسْعَرُ حَرْبٍ لَّوْ كَانَ لَهُ أَحَدٌ»

''اس کے لیے افسوس! اگر اسے ساتھ مل جائے تو یہ جنگ بھڑکا دے گا۔''[1]

یہ بات سن کر ابو بصیر رضی اللہ عنہ سمجھ گئے کہ انھیں پھر کافروں کے حوالے کیا جائے گا، اس لیے وہ مدینہ سے نکل کر ساحل سمندر پر چلے گئے۔

مکہ میں رہنے والے کمزور مسلمان مکہ سے بھاگ بھاگ کر ابو بصیر کے پاس ساحل سمندر پر اکٹھے ہونے لگے۔ ادھر ابو جندل رضی اللہ عنہ بھی آ گئے۔ ابو بصیر رضی اللہ عنہ کے پاس خاصی جماعت اکٹھی ہو گئی۔ اس کے بعد ان لوگوں کو ملکِ شام سے آنے والے کسی قریشی قافلے کا پتا چلتا تو وہ اس سے ضرور چھیڑ چھاڑ کرتے اور قافلے والوں کو قتل کر کے مال لوٹ لیتے۔ قریش نے رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ اور قرابت کا واسطہ دیتے ہوئے یہ پیغام دیا

1 صحيح البخاري، حديث: 2732,2731، وسنن أبي داود، حديث: 2765.

کہ آپ انھیں اپنے پاس بلا لیں۔ اب ہمارے پاس سے جو بھی آپ ﷺ کے پاس جائے گا وہ مامون رہے گا۔ قریش خود ہی اپنی ظالمانہ شرائط سے دست بردار ہو گئے۔ یوں قریش کو وہاں سے ذلت ملی جہاں سے انھوں نے عزت حاصل کرنی چاہی تھی۔[1]

یہ ساٹھ یا ستر افراد جو عیص میں جمع تھے۔ سب آپ ﷺ کے پاس آ گئے۔ آپ ﷺ نے ان کو اپنے ہاں جگہ دی۔ ان کی آمد سے مسلمانوں کی قوت میں اضافہ ہوا۔ لیکن اس گروہ کے روح رواں ''ابو بصیر رضی اللہ عنہ'' کی قسمت میں مدینہ آنا نہیں تھا۔ جب انھیں نبی اکرم ﷺ کا خط موصول ہوا تو وہ بسترِ مرگ پر تھے۔ عین موقع پر ان کی سانسوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔[2]

ابو بصیر اور ابو جندل کا واقعہ ثابت قدمی اور اخلاص کا مظہر ہے۔ مشرکین کو اس حد تک ذلیل کر دیا کہ وہ خود اپنی ہی شرائط سے دست بردار ہونے کے لیے مسلمانوں ہی کا سہارا ڈھونڈنے لگے۔ یہ واقعہ عقیدے کی ثابت قدمی اور اس کی نصرت وحمایت کے سلسلے میں حتی الوسع ہمت کے اظہار کا نمونہ ہے۔ اس نے اس مشہور مقولے کو عملاً ثابت کر دکھایا کہ «قَدْ يَسَعُ الْفَرْدُ مَالَا يَسَعُ الْجَمَاعَةُ» ''کبھی کبھی ایک فرد وہ کچھ کر دکھاتا ہے جو ایک جماعت مل کر نہ کر سکے۔'' ابو بصیر اور اس کے ساتھیوں نے مشرکین کو ناکوں چنے چبوائے جو اس وقت کی صلح پاسداری کرتے ہوئے پوری اسلامی مملکت بھی نہ کر سکتی تھی۔ مگر ابو بصیر اور اس کے ساتھی حکومت کے عمل دخل سے باہر تھے۔ ابو بصیر اور مکہ مکرمہ کے دیگر کمزور افراد نے مکہ مکرمہ کے سرکشوں کے آگے کمزوری نہیں دکھائی کہ وہ انھیں ان کے دین کے متعلق فتنے میں مبتلا رکھیں اور انھیں مدینہ سے روکیں۔ انھوں نے وہ موقف اختیار کیا جس میں ان کی خلاصی تھی اور ان کی اپنی حکومت (اسلامیہ) کی قوت تھی، (یعنی) ایسے کردار سے جو

---

1 محمد رسول اللهﷺ صادق عرجون: 281/4. 2 صور و عبر من الجهاد النبوي في المدينة للدكتور فوزي فيض الله، ص:296.

مکہ مکرمہ کے معاشی حالات کو کمزور کر دے اور اوقات صلح میں احساس امن کو ختم کر دے۔

ان واقعات پر غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان صحابہ کرام کو اپنی حفاظت و رعایت سے کس قدر نوازا تھا۔ اور بلاشبہ کچھ ایسے اسباب بھی ہیں جو انھوں نے اختیار کیے جنھوں نے ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظت کا حق دار بنایا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جا بجا اپنی رعایت و عنایت کی اہلیت کے اسباب کا تذکرہ فرمایا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوا وَّالَّذِينَ هُم مُّحْسِنُونَ ۝﴾

''بلاشبہ اللہ ان کے ساتھ ہے جنھوں نے پرہیز گاری کی اور وہ احسان کرتے ہوں۔''[1]

اور ارشاد ہے:

﴿وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا وَادْعُوهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۚ إِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ ۝﴾

''اور زمین کی اصلاح کے بعد تم اس میں فساد نہ کرو اور اللہ کو خوف سے اور طمع کرتے ہوئے پکارو، بے شک اللہ کی رحمت احسان کرنے والوں کے قریب ہے۔''[2]

ارشاد ہے:

﴿وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَل لَّهُ مَخْرَجًا ۝﴾

''اور جو شخص اللہ سے ڈرے تو وہ اس کے لیے (مشکلات سے) نکلنے کا راستہ بنا دیتا ہے۔''[3]

یہ بھی فرمانِ الٰہی ہے:

1 النحل 16:128۔ 2 الأعراف 7:56۔ 3 الطلاق 65:2۔

﴿وَالَّذِيْنَ جٰهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝﴾

''اور جولوگ ہماری راہ میں جہاد کریں ہم انھیں اپنی راہیں ضرور دکھاتے ہیں اور یقیناً اللہ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''[1]

یہ اوصاف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بدرجۂ اتم موجود تھے، جس کے سبب انھوں نے اللہ تعالیٰ کی حفاظت وعنایت پائی۔ یہ اسباب جب بھی کسی شخص یا امت میں پائے جائیں کسی بھی جگہ، کسی زمانہ میں، اللہ تعالیٰ کی عنایت بہت جلد ان کا رخ فرمائے گی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہی وعدہ ہے اور اس کا وعدہ سچا ہے۔[2]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مہاجر عورتیں واپس کرنے سے انکار

مکہ مکرمہ میں کئی ایک کمزور مسلمان عورتوں نے جن میں ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط رضی اللہ عنہا پیش پیش تھیں، دارالکفر سے دارالاسلام کی طرف ہجرت کا پختہ ارادہ کیا۔ اور ان خواتین نے صلح حدیبیہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کر لی۔ ادھر کفار مکہ نے انھیں واپس لانا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق حکم نازل فرمایا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ ۚ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ ؕ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ؕ وَاٰتُوْهُمْ مَّاۤ اَنْفَقُوْا ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ؕ وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ وَسْـَٔلُوْا مَاۤ اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْـَٔلُوْا مَاۤ اَنْفَقُوْا ؕ ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ ؕ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝﴾

''اے ایمان والو! جب تمھارے پاس مومن عورتیں ہجرت کرکے آئیں تو تم ان کا امتحان لو، اللہ ان کے ایمان کو خوب جانتا ہے، پھر اگر تم انھیں مومن جانو تو انھیں

1 العنکبوت 29:69. 2 مرویات غزوة الحدیبیة للحکمي، ص:320.

کفار کی طرف نہ لوٹاؤ، نہ وہ (عورتیں) ان (کفار) کے لیے حلال ہیں اور نہ وہ (کافر) ان (عورتوں) کے لیے حلال ہیں اور تم ان (کفار) کو دے دو جو (مہر) انھوں نے خرچ کیا اور تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم ان سے نکاح کرلو جب تم انھیں ان کے مہر دے دو اور تم کافر عورتوں کی عصمتیں قبضے میں نہ رکھو اور مانگ لو جو (مہر) تم نے خرچ کیا اور چاہیے کہ وہ (کفار) بھی مانگ لیں جو (مہر) انھوں نے خرچ کیا، یہ اللہ کا حکم (فیصلہ) ہے وہ تمھارے درمیان فیصلہ کرتا ہے اور اللہ خوب جاننے والا، خوب حکمت والا ہے۔''[1]

اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ان کا امتحان یہی تھا کہ وہ «لا إله إلا الله محمد رسول الله» کی گواہی دیں اور اقرار کریں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ مُؤْمِنَٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى ٱلْكُفَّارِ ۖ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ﴾ یہی وہ آیت ہے جس نے اترتے ہی مسلمان عورتوں کو مشرکین پر حرام قرار دے دیا۔

امام قرطبی کے بقول یہ پہلی دلیل ہے کہ مسلمان عورت کے لیے اس کے (غیر مسلم) خاوند سے علیحدگی کا سبب اس کا اسلام ہے نہ کہ عورت کی ہجرت۔[2]

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَءَاتُوهُم مَّآ أَنفَقُوا۟ ۚ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ أَن تَنكِحُوهُنَّ إِذَآ ءَاتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ﴾ یعنی مہاجر خواتین کے مشرک خاوندو نے ان پر حق مہر کی جو چٹی بھری ہے وہ انھیں دے دو۔

اور فرمانِ الٰہی: ﴿وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ أَن تَنكِحُوهُنَّ إِذَآ ءَاتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ﴾ کے متعلق ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب انھیں ان کے حق مہر دے دو تو ان سے نکاح کر لو بشرطیکہ ان کی عدت گزر جائے اور ولی کی شرط وغیرہ پوری ہو۔[3]

---

[1] الممتحنة 10:60. [2] تفسير القرطبي: 63/18. [3] تفسير ابن كثير: 351/4.

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تُمْسِكُوا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ﴾

عِصَم، عِصْمَةٌ کی جمع ہے۔ ''عصمة'' کا اصل مفہوم ''رسّی'' کا ہے۔ ہر وہ چیز جو کسی چیز کو روک لے اس پر بھی ''عَصَمَهُ'' (اس نے اسے روکا) کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہاں عِصمة سے مراد نکاح ہے۔ 'الکوافر' کافرۃ کی جمع ہے مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو کافر عورتوں کے نکاح پر قائم رہنے سے منع فرمایا ہے اور انھیں اپنے سے الگ کرنے کا حکم دیا ہے۔ جب یہ آیت اتری تو عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے پاس موجود دو مشرک عورتوں کو طلاق دے دی۔[1]

اور فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَسْئَلُوا مَآ أَنفَقْتُمْ وَلْيَسْئَلُوا مَآ أَنفَقُوا ۚ ذَٰلِكُمْ حُكْمُ اللَّهِ ۖ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾

''اور مانگ لو جو (مہر) تم نے خرچ کیا اور چاہیے کہ وہ (کفار) بھی مانگ لیں جو (مہر) انھوں نے خرچ کیا، یہ اللہ کا حکم (فیصلہ) ہے وہ تمھارے درمیان فیصلہ کرتا ہے اور اللہ خوب جاننے والا، خوب حکمت والا ہے۔''[2]

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین کا کہنا ہے کہ قاعدہ یہ تھا کہ جو مسلمان عورتیں اسلام چھوڑ کر ایسے کفار کی جانب چلی جاتیں جن کے ساتھ معاہدہ ہے تو کفار سے کہا جاتا کہ ان عورتوں کا حق مہر ہمیں دے دو۔ اور کوئی عورت مسلمان ہو کر ہجرت کر کے ادھر آ جاتی تو کہا جاتا اس کا حق مہر کفار کو لوٹا دو۔ دونوں صورتوں میں یہ قانون عدل و انصاف پر مبنی تھا۔

امت کا اجماع ہے کہ اس واقعے کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ حکم اسی زمانے سے خاص

[1] صحيح البخاري، حديث:2733. [2] الممتحنة 10:60.

تھا۔ یہ بات ابن العربی نے نقل کی ہے۔[1]

فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَاِنْ فَاتَكُمْ شَیْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ اِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ فَاٰتُوا الَّذِيْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَآ اَنْفَقُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝﴾

''اور اگر تمھاری بیویوں میں کوئی تم سے کفار کی طرف چلی جائیں، پھر تم (کفار سے) بدلہ لو (اور غنیمت ہاتھ لگے) تو جن کی بیویاں چلی گئیں، انھیں اس (مہر) کے برابر دے دو جو انھوں نے خرچ کیا اور تم اللہ سے ڈرو جس پر تم ایمان رکھتے ہو۔''[2]

یعنی اگر کوئی مومن عورت کفار مکہ سے جا ملے جبکہ تمھارے اور ان کے درمیان کوئی عہد و پیمان نہیں ہے اور تم میں اس عورت کا خاوند بھی موجود ہے۔ تو اگر تمھیں کہیں سے غنیمت ہاتھ لگے تو اس مسلمان خاوند کو غنیمت میں سے خمس نکالنے سے پہلے ہی اس کی طرف سے ادا کردہ حق مہر دے دو۔[3]

امام زہری کہتے ہیں: اس کا حق مہر مال فے سے دیا جائے گا اور اسی طرح جو خاتون مسلمانوں سے آ ملے اس کا حق مہر بھی دیا جائے گا۔[4]

امام مجاہد کہتے ہیں کہ ﴿فَعَاقَبْتُمْ﴾ سے مراد یہ ہے کہ قریش یا دیگر کفار سے غنیمت ہاتھ لگے۔[5]

ابو سعود کہتے ہیں کہ ﴿فَعَاقَبْتُمْ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جب تمھاری حق مہر ادا کرنے کی باری آئے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں اور کافروں کو ادائے مہر کے متعلق جو حکم دیا ہے کہ مسلمان کافروں کو دیں اور کافر مسلمانوں کو اس میں اللہ تعالیٰ نے باری باری حق مہر کی

---

1 تفسیر القرطبي: 68/18، حدیث القرآن عن غزوات الرسولﷺ لأبي بدر محمد بکر آل عابد: 545/2. 2 الممتحنة 11:60. 3 حدیث القرآن عن غزوات الرسولﷺ لأبي بدر محمد بکر آل عابد: 545/2. 4 تفسیر ابن کثیر: 352/4. 5 تفسیر ابن کثیر: 352/4.

ادائیگی کو ایسے معاملے سے تشبیہ دی ہے جس میں باریاں مقرر ہوتی ہیں جیسا کہ باری باری سواری پر سوار ہونا۔ [1]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد مومنوں کی عورتوں میں سے کوئی عورت مشرکین کی طرف چلی جائے تو مسلمان اس کے مومن خاوند کو جو اس نے خرچ کیا تھا ان عورتوں کے ان نفقات میں سے دے دیں جو ان مسلمان اور مہاجر عورتوں کی طرف سے مسلمانوں نے حکمِ الٰہی کے مطابق مشرکین کو ادا کرنے ہیں، پھر اگر کچھ باقی بچے تو وہ مشرکین کی طرف لوٹا دیں۔ [2]

اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے ساتھ آیت ختم کر دی گئی: ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝﴾ ''اور تم اللہ سے ڈرو جس پر تم ایمان رکھتے ہو۔'' [3] یعنی جس کا تمھیں حکم دیا گیا ہے اس سے تجاوز کرنے سے بچو۔

امام زہری رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''ہمارے علم میں نہیں آیا کہ ایمان لانے کے بعد کسی بھی مہاجر عورت نے ارتداد اختیار کیا ہو۔'' [4]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''زہری کا مقصود یہ ہے کہ آیت میں مذکور سزا جس کا ذکر جانبین کی نسبت ہوا ہے وہ صرف عملاً ایک ہی جانب وقوع پذیر ہوئی کیونکہ ایسا نہیں ہوا کہ کوئی مومن عورت مسلمانوں سے بھاگ کر مشرکوں کے پاس چلی گئی ہو جبکہ مشرکین کے پاس سے عورتیں آئی تھیں۔'' [5]

صلح حدیبیہ کی اس شق میں اختلاف ہوا جس میں تھا کہ ''جو شخص اپنے ولی کی اجازت کے بغیر قریش کی جانب سے محمد ﷺ کے پاس آئے گا، اسے واپس کر دیا جائے گا۔ مشرکین کا خیال تھا کہ یہ شق مرد و زن دونوں کے لیے ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا موقف تھا

1 تفسير أبي السعود: 240/8. 2 تفسير ابن كثير: 352/4. 3 الممتحنة 11:60. 4 صحيح البخاري، حديث: 2733. 5 فتح الباري: 415/5.

کہ اس سے مراد صرف مرد ہیں کیونکہ اس شق میں مذکر کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے رسول ﷺ کے موقف کی تائید فرمائی، لہٰذا کسی بھی مومن مہاجر عورت کو جو مدینہ آ گئی واپس نہ کیا گیا۔ بلکہ اس کا امتحان لیا گیا اور پھر اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اسے قبول کر لیا گیا۔ [1]

مجمل روایات کے ساتھ آیت کو ملایا جائے تو یہ مفہوم سامنے آتا ہے کہ وہ بعض مومن عورتیں جو صلح سے پہلے ہجرت کا موقع نہ پا سکی تھیں، انھوں نے اب اس فرصت کو غنیمت جانا، لہٰذا جان چھڑا کر ہجرت کر لی۔ ادھر ان کے ذمہ دار صلح کی شرائط کے پیش نظر ان کی واپسی کا مطالبہ لے کر آ گئے تو انھیں واپس نہ کرنے کے متعلق آیت اتر آئی۔ ہاں اس آیت نے حکم ضرور دیا کہ ان کا حق مہر ان کے سابقہ خاوندوں کو واپس کیا جائے۔ صلح کے وثیقہ کی نص کے متعلق کئی ایک اقوال ہیں:

مثلاً یہ قول ہے کہ شق عام تھی اور صرف مذکر کے صیغے سے تھی، لہٰذا قریش مکہ خیال کرتے تھے کہ یہ شق مرد و زن کو بیک وقت شامل ہے۔ وہ عورتوں کی واپسی کا مطالبہ لے کر آ گئے۔ آپ ﷺ سمجھتے تھے کہ وہ دفعہ عورتوں کو شامل نہیں، لہٰذا آیت کے اترنے سے مسئلہ واضح ہو گیا اور یہی بات قابل فہم تھی۔ [2]

استاذ غزالی کہتے ہیں: ''صلح حدیبیہ کے بعد مسلمانوں نے مسلمان مہاجر عورتوں کو ان کے اولیاء کے پاس لوٹانے سے انکار کر دیا، خواہ اس لیے کہ ان کی سمجھ کے مطابق معاہدہ صرف مردوں کے متعلق تھا یا اس لیے کہ مسلمان عورتیں اسلام قبول کرنے پر سزا برداشت نہیں کر سکتیں اور نہ مکہ چھوڑ کر ادھر اُدھر جا سکتی ہیں۔ اہل مکہ کی تدابیر کے ردعمل کے طور پر جیسا کہ ابو بصیر، ابو جندل وغیرہ نے کر لیا تھا۔ سبب کوئی بھی ہو اسلام قبول کرنے والی عورتوں کا اِدھر روک رکھنا قرآن پاک کی تعلیمات ہی سے مکمل ہوا۔'' [3]

[1] مرويات غزوة الحديبية للحكمي، ص: 187. [2] سيرة الرسول للأستاذ محمد عزة دروزة: 354/2. [3] فقه السيرة للغزالي، ص: 367.

باب 3

حکمتیں، عبرتیں اور فوائد

غزوہ حدیبیہ میں عقیدہ و فقہ اور اصول تربیت وغیرہ کے علاوہ بہت سے اسباق اور حکمتیں ہیں۔ ان میں سے بطور مثال چند ایک حکمتوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

عقیدے سے متعلق احکام

بڑے آدمی کے پہلو میں کھڑا ہونا، جبکہ وہ بیٹھا ہو: رسول اللہ ﷺ بیٹھے ہوں اور کوئی آپ ﷺ کے پہلو میں کھڑا ہو یہ آپ کی عادت مبارکہ نہ تھی۔ یہ صرف ایک طریقہ ہے جسے دشمن کے سفیروں کی آمد کے وقت عزت و وقار کا اظہار کرنے کے لیے اختیار کیا جاسکتا ہے تاکہ امام کی تعظیم و اطاعت کے ساتھ ساتھ اسے شر پسندوں کے شر سے بھی محفوظ رکھا جا سکے۔ مسلمانوں کے سفراء جب کفار کے پاس جاتے ہیں یا کفار کے سفیر جب مسلمانوں کے پاس آتے ہیں تو یہ عام عادت و طریقہ ہے۔ یہ وہ قیام نہیں جس کی نبی ﷺ نے یوں مذمت فرمائی ہے: «مَنْ أَحَبَّ أَنْ يَتَمَثَّلَ لَهُ الرِّجَالُ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ» ''جو شخص یہ پسند کرتا ہے کہ لوگ اس کے لیے کھڑے ہونے کی صورت اختیار کیے رکھیں تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔''[1]

اسی طرح جنگ میں فخریہ انداز اختیار کرنا بھی قابل مذمت نہیں ہے۔[2] جیسا کہ جنگِ

1 سنن أبي داود، حديث:5229، وجامع الترمذي، حديث:2755. 2 زاد المعاد:3/304.

احد میں ابودجانہ رضی اللہ عنہ فخریہ انداز میں چلے تھے۔ اکڑ کر چلنا شرعاً ناجائز ہے لیکن حالت جنگ میں یہ جائز ہے۔ اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابودجانہ کی چال دیکھ کر فرمایا تھا: «إِنَّهَا مَشْيَةٌ يَكْرَهُهَا اللّٰهُ إِلَّا فِي هٰذَا الْمَوْضِعِ» ”یہ ایسی چال ہے جسے اس مقام کے سوا دیگر مقامات پر اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے۔“[1]

نیک فال کا استحباب اور بدشگونی کی ممانعت: جب سہیل بن عمرو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مذاکرات کی غرض سے آیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دیکھتے ہی فرمایا: «سَهُلَ أَمْرُكُمْ» ”تمھارا کام آسان ہوگیا۔“[2]

اس فرمان نبوی میں نیک فال کے استحباب کی دلیل ہے اور یہ ناپسندیدہ بدشگونی نہیں ہے۔[3]

فال کے معنی کی وضاحت کے سلسلے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی ایک احادیث مروی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

«لَا طِيَرَةَ وَخَيْرُهَا الْفَأْلُ»

”طیرہ (بدشگونی) کی کوئی (حقیقت) نہیں اور ایسی چیزوں میں سے بہتر (نیک) فال ہے۔“ صحابہ نے عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول! فال کیا ہے؟“ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «اَلْكَلِمَةُ الصَّالِحَةُ يَسْمَعُهَا» ”اچھی بات جو تم میں سے کوئی سنتا ہے۔“[4]

اور بدشگونی اور فال میں فرق یہ ہے کہ فال اللہ تعالیٰ سے حسن ظن کا طریقہ ہے، جبکہ بدشگونی ناپسندیدہ ہے۔[5]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس طیرہ کا ذکر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] المعجم الكبير للطبراني، رقم: 6508، ومجمع الزوائد: 109/6. [2] صحيح البخاري، حديث: 2732، وزادالمعاد: 305/3. [3] زاد المعاد: 305/3. [4] صحيح البخاري، حديث: 5755,5754. [5] فتح الباري: 225/10.

«أَحْسَنُهَا الْفَأْلُ وَلَا تَرُدُّ مُسْلِمًا فَإِذَا رَأٰى أَحَدُكُمْ مَّا يَكْرَهُ فَلْيَقُلْ: اَللّٰهُمَّ لَا يَأْتِي بِالْحَسَنَاتِ إِلَّا أَنْتَ وَلَا يَدْفَعُ السَّيِّئَاتِ إِلَّا أَنْتَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِكَ»

''ان میں سے بہتر نیک شگونی ہے۔ اور یہ بدشگونی کسی (مسلمان) کو (اپنے کام سے) مت روکے۔ اگر کوئی شخص ناپسندیدہ چیز دیکھے تو یوں کہے: ''اے اللہ! تیرے سوا کوئی کسی طرح کی کوئی بھلائی نہیں لاسکتا اور تیرے سوا کوئی کسی برائی کو روک نہیں سکتا۔ برائی کا دور ہونا اور بھلائی کا حاصل ہونا تیری مدد ہی سے ممکن ہے۔''[1]

بارش کے اترنے میں ستاروں کو موثر جاننے والا شخص کافر ہے: حضرت خالد جہنی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حدیبیہ میں رات کو بارش ہوئی۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ہمیں صبح کی نماز پڑھائی۔ جب آپ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا: «هَلْ تَدْرُونَ مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ؟» ''تم جانتے ہو کہ تمھارے پروردگار نے کیا فرمایا ہے؟'' انھوں نے کہا: ''اللہ اور اس کے رسول ﷺ خوب جانتے ہیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: «قَالَ: أَصْبَحَ مِنْ عِبَادِي مُؤْمِنٌ بِي وَكَافِرٌ، فَأَمَّا مَنْ قَالَ: مُطِرْنَا بِفَضْلِ اللّٰهِ وَرَحْمَتِهِ فَذٰلِكَ مُؤْمِنٌ بِي وَكَافِرٌ بِالْكَوْكَبِ، وَأَمَّا مَنْ قَالَ: مُطِرْنَا بِنَوْءِ كَذَا وَكَذَا فَذٰلِكَ كَافِرٌ بِي وَمُؤْمِنٌ بِالْكَوْكَبِ» ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''میرے بندوں میں سے بعض نے صبح مجھ پر حالتِ ایمان میں کی اور بعض نے میرے ساتھ کفر پر کی۔ جس نے کہا: بارش اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحمت سے ہوئی وہ مجھ پر ایمان لایا ہے اور ستاروں (کی تاثیر) سے کفر کرنے والا ہے۔'' مگر جس نے کہا: ''ہم پر بارش ستاروں کی گردش سے ہوئی تو وہ مجھ سے کفر کرنے والا ہے اور ستارے پر ایمان لانے والا ہے۔''[2]

1 سنن أبي داود، حديث:3919، والسنن الكبرىٰ للبيهقي: 139/8. 2 صحيح البخاري، حديث:846، وصحيح مسلم، حديث:71.

حدیث میں مذکور کفر علماء کے نزدیک حسب ذیل دونوں اقسام میں سے ایک ہو سکتا ہے: کفر اعتقادی یا کفرانِ نعمت۔

جو شخص کہتا ہے کہ فلاں فلاں ستارے کی بنا پر بارش ہوئی ہے اور اس کا عقیدہ یہ ہے کہ ستارہ بارش کے نازل ہونے میں فعلاً وعملاً موثر ہے وہ شخص ایسا کفر اختیار کرتا ہے جو اسے ملت اسلامیہ سے خارج کر دینے والا ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''جو شخص یہ کہتا ہے کہ بارش فلاں فلاں ستارے کی بنا پر ہوئی ہے، اس کا یہ کہنا اہل جاہلیت کے طریقے پر ہے جو بارش کی نسبت کرتے وقت مراد یہی لیتے تھے کہ یہ فلاں فلاں ستارے کی بنا پر ہے۔ ایسا اعتقاد ونظریہ کفر ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا۔ کیونکہ ''نوء'' ایک وقت ہے اور وقت بذات خود ایک مخلوق ہے۔ جو اپنے لیے اور نہ کسی اور کے لیے کسی چیز کا مالک ہے، لہٰذا جو شخص کہتا ہے کہ ستارے کے فلاں جگہ پہنچنے کے وقت بارش ہوئی تو یہ کفر نہیں لیکن اس طرح کی بات بھی مجھے پسند نہیں۔''[1]

نیک لوگوں کی یادگاروں اور استعمال شدہ اشیاء سے تبرک کا مسئلہ؟ عروہ بن مسعود نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد موجود صحابہ کرام کی جن خوبیوں کا ذکر کیا اس میں وہ کہتا ہے: ''اللہ کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھوکتے بھی تھے تو کسی نہ کسی آدمی کے ہاتھ پر پڑتا تھا اور وہ شخص اسے اپنے جسم اور چہرے پر مل لیتا۔ اور جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم وضو کرتے تو ہر کوئی اس پانی کو پانے کی کوشش کرتا حتی کہ قریب تھا کہ وہ آپس میں لڑ پڑیں۔''[2]

امام شاطبی اس حدیث اور اس جیسی دیگر احادیث پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''ظاہراً اس واقعے یا اس جیسے دیگر واقعات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص کی ولایت مسلّم ہو اور وہ متبع سنت شخص ہو تو اس کی استعمال شدہ اشیاء سے تبرک حاصل کیا جانا

[1] الأم للشافعي:1/252. [2] صحيح البخاري، حديث:2731.

درست ہے۔ اس کے وضو کے بقیہ پانی سے تبرک لیا جائے۔ اس کا تھوک ملا جائے اور اس کی دیگر یادگاروں سے شفا حاصل کی جائے۔ لیکن ہمارے سامنے اس کے خلاف ایک قطعی دلیل ہے کہ نبی مکرم ﷺ کی وفات کے بعد کسی بھی صحابی کی نسبت ایسا واقعہ نہیں ہوا۔ آپ ﷺ کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے زیادہ افضل اور کوئی نہیں تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفۂ رسول تھے مگر ان سے تبرک حاصل کرنے کا کوئی واقعہ نہیں۔ نہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے کبھی لوگوں نے ایسا استفادہ کیا، نہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے اور نہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے۔ یہی لوگ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد بالترتیب افضل ہیں بلکہ دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم جو امت میں سب سے افضل ہیں ان میں سے کسی ایک سے کسی تبرک حاصل کرنے والے نے مذکورہ طریقے پر تبرک نہیں لیا۔ بلکہ انھوں نے ان اقوال و افعال اور سیرت و سنت کی اقتدا کی جن میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی مکرم ﷺ کی اتباع کی تھی۔ گویا یہ ان کی طرف سے ایسے امور ترک کرنے پر اجماع تھا۔''[1]

ابن وہب نے اپنی جامع میں یونس بن یزید کے واسطے سے ابن شہاب کی روایت بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں: ''مجھ سے انصار کے ایک شخص (عبدالرحمن بن أبی قرد رضی اللہ عنہ) نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب وضو کرتے یا تھوکتے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کے وضو کے پانی اور تھوک کی جانب لپکتے۔ وہ پانی پی لیتے اور تھوک اپنے جسم پر مل لیتے۔ آپ ﷺ نے جب انھیں ایسا کرتے دیکھا تو دریافت فرمایا: «لِمَ تَفْعَلُونَ هٰذَا؟» ''تم ایسا کیوں کرتے ہو؟''

انھوں نے عرض کیا: ''ہم اس سے پاکیزگی اور برکت حاصل کرتے ہیں۔'' تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُحِبُّ أَنْ يُّحِبَّهُ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ، فَلْيَصْدُقِ الْحَدِيثَ وَلْيُؤَدِّ الْأَمَانَةَ وَلَا يُؤْذِ جَارَهُ» ''تم میں سے جو کوئی بھی یہ

1 غزوة الحديبية للحكمي، ص:305.

پسند کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ اس سے محبت کریں تو اسے چاہیے کہ بات سچی کرے، امانت ادا کرے اور اپنے پڑوسی کو تکلیف مت دے۔''[1]

فقہی اور اصولی احکام

حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کا قصہ اور آیت فدیہ کا اترنا: حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حدیبیہ میں رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لائے۔ اس وقت جوئیں میرے سر سے گر رہی تھیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «أَيُؤْذِيكَ هَوَامُّكَ؟» ''کیا تیری جوئیں تجھے تکلیف دے رہی ہیں۔'' میں نے عرض کیا: ''ہاں۔'' تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «فَاحْلِقْ رَأْسَكَ» ''تم سر منڈا دو۔'' حضرت کعب بن عجرہ کا کہنا ہے کہ تب یہ آیت اتری:

﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ﴾

''البتہ تم میں سے جو بیمار ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو (جس کی وجہ سے سر منڈا لے) تو اس پر فدیہ ہے، خواہ روزے رکھ لے، خواہ صدقہ دے، خواہ قربانی کرے۔''[2]

نبی ﷺ نے فرمایا: «صُمْ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ، أَوتَصَدَّقْ بِفَرَقٍ بَيْنَ سِتَّةٍ، أَوِانْسُكْ مِمَّا تَيَسَّرَ» ''تین دن روزے رکھو یا (کھجوروں کا) ایک ٹوکرا (تقریباً پونے سات کلو گرام) چھ مساکین کو خیرات دو یا جو میسر ہو قربانی کر دو۔''[3]

صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرے جبکہ وہ مکہ میں داخل ہونے سے قبل حالت احرام میں حدیبیہ میں تھے۔ وہ

---

1 المصنف لعبدالرزاق، رقم:19748، والسلسلة الصحيحة، رقم:2998. اس حدیث کے متعلق البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: طبرانی کی دونوں معاجم وغیرہ میں اس کے ثابت شدہ طرق اور شواہد موجود ہیں۔

2 البقرة 2:196. 3 صحيح البخاري، حديث: 1815، وصحيح مسلم، حديث: (82)-1201.

ہنڈیا کے نیچے آگ جلا رہے تھے، جبکہ جوئیں ان کے چہرے پر گر رہی تھیں۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: «أَيُؤْذِيكَ هَوَامُّكَ؟» "کیا تیری جوئیں تجھے تکلیف دیتی ہیں؟" انھوں نے عرض کیا: "جی ہاں" تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«فَاحْلِقْ رَأْسَكَ وَأَطْعِمْ فَرَقًا بَيْنَ سِتَّةِ مَسَاكِينَ۔ وَالْفَرَقُ ثَلَاثَةُ آصُعٍ۔ أَوْصُمْ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ، أَوِانْسُكْ نَسِيكَةً»

"تم سر منڈا دو اور چھ مساکین کو ایک ٹوکرا کھلا دو۔ (فرق (ٹوکرا) تین صاع کا ہے) یا پھر تین دن کے روزے رکھ لو یا پھر ایک قربانی کرو۔"[1]

سورۂ بقرہ کی سابقہ آیت ایسے صاحبِ احرام کا حکم واضح کر رہی ہے جس کے سر میں تکلیف ہو۔ یہ آیت اگرچہ حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کے متعلق نازل ہوئی تھی مگر اس کا حکم ہر اس مسلمان کے لیے ہے جو ایسی حالت سے گزرے۔

قیام گاہ میں نماز پڑھنے کی مشروعیت: امام ابن ماجہ نے ابوملیح بن اسامہ سے روایت کی ہے کہ میں ایک رات بہت زیادہ بارش میں مسجد کی جانب گیا۔ جب میں نے واپس آ کر دروازہ کھلوایا تو میرے والد[2] نے کہا: "کون ہے؟" میں نے کہا: "ابوملیح۔" انھوں نے کہا: "حدیبیہ کے دن ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ بارش ہوئی (مگر اتنی کم کہ) اس سے ہمارے جوتوں کے تلوے بھی تر نہ ہوئے مگر آپ ﷺ کے اعلان کرنے والے نے رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اعلان کیا: «صَلُّوا فِي رِحَالِكُمْ» "اپنی قیام گاہوں میں نماز ادا کرو۔"[3]

یہ روایت صحیح ہے، راوی ثقات ہیں اور سند متصل ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اسے صحیح

---

1 صحيح مسلم، حديث: (83)- 1201. 2 ابوملیح کے والد کا نام اسامہ بن عمیر ہذلی رضی اللہ عنہ ہے۔ اس صحابی سے صرف ان کے بیٹے نے روایت کی ہے۔ 3 سنن ابن ماجه، حديث: 936، وسنن أبي داود، حديث: 1059، والسنن الكبرىٰ للنسائي: 111/2.

قرار دیا ہے۔[1]

مسلمانوں کا حدیبیہ سے واپس ہونا اور صبح کی نماز کے وقت سوتے رہ جانا:

حدیبیہ میں مسلمان تقریباً انیس دن مقیم رہے۔ ابن سعد اور واقدی کے مطابق بیس راتیں قیام پذیر رہے۔[2]

ابن عائذ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو اس غزوے میں ڈیڑھ ماہ کا عرصہ لگا۔ روایات ملانے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ابن سعد اور واقدی نے آپ ﷺ کے حدیبیہ میں رہنے کی مدت شمار کی ہے اور ابن عائذ نے آپ ﷺ کے مدینہ سے واپس مدینہ پہنچنے تک کی مکمل مدت کا تذکرہ کیا ہے۔

مسلمان جب عمرے کا احرام اتار چکے تو واپس مدینے کا سفر شروع کیا۔ دورانِ سفر رات کے وقت سو گئے اور بلال رضی اللہ عنہ کو حفاظت کی ذمہ داری سونپ دی۔ مگر بلال رضی اللہ عنہ بھی سو گئے اور انھیں سورج کی دھوپ ہی نے بیدار کیا۔[3]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں: ''حدیبیہ کے بعد ہم آپ ﷺ کے ساتھ واپس آ رہے تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ يَّكْلَؤُنَا» ''ہماری حفاظت اور چوکیداری کون کرے گا؟'' حضرت بلال رضی اللہ عنہ بولے: ''میں۔'' چنانچہ ان کے علاوہ سب سو گئے اور ان کو بھی نیند آ گئی حتی کہ (صبح ہوئی) اور سورج بلند ہو گیا۔ سب سے پہلے نبی اکرم ﷺ ہی بیدار ہوئے تو فرمایا: «اِفْعَلُوا كَمَا كُنْتُمْ تَفْعَلُونَ» ''ایسے ہی (نماز ادا) کرو جیسے عام حالات میں (ادا) کرتے ہو۔'' عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «فَكَذٰلِكَ فَافْعَلُوا لِمَنْ نَّامَ أَوْنَسِيَ» ''جو بھی سو جائے یا بھول جائے تو ایسا ہی کیا کرے۔''[4]

---

[1] فتح الباري: 184/2، وغزوة الحديبية للحكمي، ص: 221. [2] المغازي للواقدي: 616/2، والطبقات الكبرىٰ: 98/2. [3] مرويات غزوة الحديبية للحكمي، ص: 151. [4] سنن أبي داود، حديث: 447، ومسند أحمد: 386و391، والسنن الكبرىٰ للنسائي، رقم: 8802.

دیگر احادیث میں آیا ہے کہ صبح کی نماز کے وقت سونے کا واقعہ حدیبیہ کے علاوہ کسی اور موقع پر پیش آیا تھا۔ بعض علماء نے روایات کو تطبیق دینے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر حافظ حکمی کا موقف یہ ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت اور دیگر روایات میں جو اختلاف ہے اس کا سبب تعدد واقعات ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے بھی اس کو راجح قرار دیا ہے۔[1] ابن کثیر، ابن حجر اور زرقانی رحمہم اللہ کا میلان بھی اسی طرف ہے۔[2] بلکہ امام سیوطی نے یہاں تک کہا ہے کہ اس کی تطبیق تعدد واقعات ماننے کی صورت ہی میں ممکن ہے۔[3]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیدار ہونے کے بعد اذان دلوائی۔ وضو کیا اور دو رکعت نفل ادا کیے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز باجماعت ادا فرمائی۔ اس کے بعد یہ وضاحت فرمائی کہ اگر کوئی سو جائے یا بھول جائے تو جیسے ہی جاگے یا یاد آئے تو نماز ادا کرے۔

صلح کی مشروعیت اور مدتِ صلح: ائمہ کرام اور علمائے عظام نے صلح حدیبیہ سے مسلمانوں اور اہلِ حرب کے درمیان ایک مدت تک جنگ نہ کرنے کے معاہدے کی دلیل لی ہے، خواہ یہ صلح معاوضہ کے بدلے ہو یا بلا معاوضہ۔ بلا معاوضہ کی دلیل تو مدینہ کی صلح ہے۔ رہا کسی بدلہ کے عوض تو ''قیاس اولیٰ'' کی بنا پر، یعنی جب صلح بلا معاوضہ درست ہے تو معاوضہ سے تو بطریق اَولیٰ درست ہوگی۔

لیکن اگر مسلمانوں کی طرف سے دولت دے کر صلح ہو رہی ہو تو جمہور کے نزدیک درست نہیں کیونکہ اس میں مسلمانوں کی ذلت ہے اور اس لیے بھی کہ کتاب و سنت میں اس کے جواز کی کوئی دلیل موجود نہیں، ہاں ایسی صورت میں امکان ہے جب اس کی ضرورت ہو اور اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ ہو، مثلاً: صلح نہ ہونے کی صورت میں ہلاکت یا قید کا ڈر ہو۔ ایسی صورت میں صلح جائز ہے۔ جس طرح کہ قیدی کے لیے اپنا آپ

---

1 شرح النووي: 5/182,181، ومرويات غزوة الحديبية للحكمي، ص: 258. 2 البداية والنهاية: 4/213، وفتح الباري: 1/449، وشرح الزرقاني على الموطأ: 1/47، 3 تنوير الحوالك: 1/33.

چھڑانے کے لیے فدیہ (مال) دینا درست ہے۔

امام شافعی، امام احمد اور بہت سارے دیگر علماء کا خیال ہے کہ صلح صرف محدود مدت تک ہی ہوسکتی ہے اور وہ بھی زیادہ سے زیادہ دس سال تک کیونکہ نبی ﷺ نے حدیبیہ کے سال قریش سے اتنی ہی مدت کے لیے صلح کی تھی۔ [1]

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا خیال ہے کہ یہ امام کی رائے پر منحصر ہے وہ اگر مصلحت دیکھے تو دس سال سے بھی طویل مدت تک کے لیے صلح کرسکتا ہے۔ [2]

تحقیق یہ ہے کہ حدیث کے ظاہر کی بنا پر پہلا قول راجح ہے۔ ہاں اگر اس سے زیادہ مدت تک صلح کرنے میں مصلحت ہوتو معاہدہ دس سال کے بعد دوبارہ کیا جاسکتا ہے جیسا کہ امام شافعی رحمہ اللہ کا خیال ہے۔ [3]

بعض متاخرین کا کہنا ہے کہ درج ذیل آیت کی بنا پر دائمی صلح کا معاہدہ کرنا بھی درست ہے۔ اور وہ اس فرمانِ الٰہی سے استدلال کرتے ہیں: [4]

﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَ اَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ۝﴾

''سوائے ان کے جو اس قوم سے تعلق رکھتے ہوں جن سے تمھارا معاہدہ ہوچکا ہے یا جو تمھارے پاس اس حالت میں آئیں کہ تم سے جنگ کرنے سے بھی تنگ دل ہیں اور اپنی قوم سے بھی جنگ کرنے سے تنگ دل ہیں۔ اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو انھیں تم پر مسلط کر دیتا اور وہ تم سے یقیناً جنگ کرتے پس اگر یہ لوگ تم سے کنارہ کشی

1 فقه السيرة للبوطي، ص: 242. 2 فتح القدير: 546/5، وغزوة الحديبية للحكمي: 294.
3 مرويات غزوة الحديبية للحكمي، ص: 295. 4 آثار الحرب في الفقه الإسلامي للزحيلي، ص: 680.

اختیار کر لیں اور تم سے لڑائی نہ کریں اور تمھاری جانب صلح کا پیغام ڈالیں تو اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے ان پر (لڑائی کی) کوئی راہ نہیں کی۔''[1]

اس قول کی بنیاد اس اصل پر ہے کہ کفار سے مسلمانوں کا تعلق صلح پر مبنی ہے نہ کہ جنگ پر اور جہاد صرف مسلمانوں کے دفاع کے لیے فرض کیا گیا ہے۔[2]

مگر یہ بات درج ذیل دلائل کی بنا پر مسترد ہے:

① اس قول کے قائل پہلے خود بیان کر چکے ہیں کہ فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ دشمن سے صلح لازمی طور پر مقررہ مدت کے لیے ہونی چاہیے۔ اور بلاتعین مدت ہمیشہ کے لیے صلح کا معاہدہ درست نہیں۔ یہ قول نقل کرنے کے بعد خود اس سے اختلاف بھی کر رہے ہیں۔[3]

② جس آیت مبارکہ سے دلیل لی گئی ہے وہ حسب ذیل آیت مبارکہ کی وجہ سے منسوخ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِذَا انْسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَوٰةَ وَآتَوُا الزَّكَوٰةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾

''پھر حرمت والے مہینوں کے گزرتے ہی مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کرو، انھیں گرفتار کرو۔ ان کا محاصرہ کر لو اور ان کی تاک میں ہر گھات کی جگہ جا بیٹھو، ہاں اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز کے پابند ہو جائیں اور زکوٰۃ ادا کرنے لگیں تو تم ان کی راہیں چھوڑ دو یقیناً اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔''[4]

ابن جریر نے یہی بات عکرمہ، حسن، قتادہ اور ابن زید سے نقل کی ہے۔[5]

امام قرطبی نے مجاہد سے نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس آیت کا یہی مفہوم سب سے

---

1 النسآء 4:90. 2 آثار الحرب في الفقه الإسلامي للزحيلي، ص:675. 3 آثار الحرب في الفقه الإسلامي للزحيلي، ص:675. 4 التوبة 9:5. 5 تفسير الطبري:9/24-26.

صحیح ہے۔[1]

③ جس اصل پر اس قول کی بنیاد ہے وہ سورۂ توبہ کی مذکورہ آیت کی بنا پر ویسے ہی مسترد ہے۔

④ رہی یہ سوچ کہ جہاد صرف مسلمانوں کے دفاع کے لیے مقرر ہوا تو یہ نظریہ باہر سے ٹھونسا ہوا ہے۔ سید قطب رحمہ اللہ نے اس نظریے کی خوب خبر لی ہے اور اسے بالکل باطل قرار دیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ یہ سوچ ان لوگوں کی ہے جنھوں نے مستشرقین کے سامنے ہتھیار ڈال دیے ہیں اور اسلامی دعوت کے مراحل سے وہ یکسر ناآشنا ہیں۔[2]

مطلق حکم کو مطلق ہی رکھا جائے: یہ ایک فقہی اصول ہے مطلق مطلق رہتا ہے مقید نہیں ہوتا اور مقید غیر مقید یا مطلق نہیں ہوتا۔ اس کی تائید ابن ہشام کی اُس روایت سے بھی ہوتی ہے جو انھوں نے ابو عبید کے حوالے سے نقل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بعض صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: ''کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا نہیں تھا کہ آپ مکہ میں امن و امان سے داخل ہوں گے۔'' فرمایا: «بَلٰى، أَفَقُلْتُ لَكُمْ مِّنْ عَامِي هٰذَا؟» ''کیوں نہیں! لیکن کیا میں نے تم سے یہ کہا تھا کہ اس سال؟'' لوگوں نے کہا: ''نہیں'' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «فَهُوَ كَمَا قَالَ لِي جِبْرِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ» ''میرا یہ کہنا اس کے مطابق تھا جو مجھ سے جبریل علیہ السلام نے کہا تھا۔''[3]

من جملہ یہ مستقبل میں فتح مکہ کی بشارت تھی۔ اس نے صحابہ کی نگاہیں اس طرف بھی پھیر دیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مطلقاً کسی حکم کا کہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطلق حکم کو مطلق ماننا بھی لازمی ہے۔ بغیر اس کے کہ اسے ایسی قیود پر محمول کیا جائے جو اسے اس کے اطلاق سے پھیر دیں۔[4]

[1] تفسیر القرطبي:308/5. [2] تفسیر في ظلال القران لسید قطب:1433/3. [3] السیرة النبویة لابن هشام:341/3. [4] مرویات غزوة الحدیبیة للحکمي، ص:313.

رسول اللہ ﷺ کی اطاعت لازمی ہے، خواہ آپ ﷺ کا حکم بظاہر قیاس کے خلاف ہو اور دل اسے نہ چاہتے ہوں۔ حدیبیہ کے واقعات میں یہ بات آ چکی ہے کہ جب عمر رضی اللہ عنہ اور کچھ دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم نے مسلمانوں کے حقوق کے متعلق شرائط میں ظلم اور زیادتی دیکھی تو قریش کے ساتھ صلح نہ کرنا چاہی لیکن بعد ازاں وہ اپنے اس فعل پر نادم ہوئے اور سمجھنے لگے کہ وہ گناہ میں مبتلا ہو گئے ہیں کیونکہ ایک ایسا معاملہ جس پر رسول اللہ ﷺ راضی ہیں، انھوں نے اسے ناپسند کیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے:

''اے لوگو! دین کے بارے میں اپنی رائے کو درست نہ جانو۔ میں نے ابو جندل (کے معاملے) والے دن، دیکھا کہ میں اپنی رائے سے بطور اجتہاد رسول اللہ ﷺ کے حکم کو رد کر رہا تھا۔ لیکن اب اللہ کی قسم! کبھی حق کو تسلیم کرنے میں کوتاہی نہ کروں گا۔''[1]

سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے: ''اے لوگو! اپنی رائے کو ہمیشہ صحیح نہ کہو۔ میں نے ابو جندل کے دن دیکھا کہ اگر رائے سے رسول اللہ ﷺ کے حکم کو رد کرنا چاہتا تو کر سکتا تھا۔''[2] حضرت عمر رضی اللہ عنہ عرصے تک حدیبیہ میں اپنے کردار سے متعلق بطور سزا نزولِ قرآن سے ڈرتے رہے۔ وہ خود اپنا واقعہ بیان کر کے کہتے تھے:

''اس موقع پر جو کچھ میں نے کیا اس کے ڈر سے ایک عرصے تک روزے رکھتا رہا، صدقہ دیتا رہا، غلام آزاد کرتا رہا، یہاں تک کہ مجھے امید ہو گئی کہ اب معاملہ بخیر انجام پائے گا۔''[3]

1 مسند البزار، رقم: 1813، ومجمع الزوائد: 146,145/6. 2 مرويات غزوة الحديبية للحكمي، ص: 313. 3 السيرة النبوية لابن هشام: 331/3، وحدائق الأنوارو مطالع الأسرار: 622/2.

ابن دیبع شیبانی اس واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''علماء کا کہنا ہے کہ اس قصے سے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت و فرماں برداری کے وجوب کا معاملہ کسی پر مخفی نہیں رہتا، خواہ اطاعت رسول ظاہری قیاس کے تقاضے کے خلاف اور نفوسِ انسانیہ کو ناگوار ہو، لہٰذا ہر مکلّف کو یہی نظریہ و عقیدہ رکھنا چاہیے کہ آپ ﷺ کے حکم ہی میں ہر قسم کی بھلائی ہے۔ یہی بجا آوری دنیا و آخرت کی سعادت مندی کی ضمانت ہے۔ آپ ﷺ دنیا و آخرت کی سعادت مندی کے امور کامل و اکمل طور پر لے کر آئے ہیں، جبکہ اکثریت کی سمجھ بوجھ ان احکام کے اغراض و نتائج کے ادراک و احاطے سے قاصر رہی ہے۔''[1]

نبوی تربیت کے نمونے

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

''جو شخص مرار گھاٹی پر چڑھے گا اس کے گناہ ایسے معاف ہو جائیں گے جیسے بنی اسرائیل کے معاف ہو گئے تھے۔''[2]

یہ فرمان تربیت نبوی کا عظیم پہلو سموئے ہوئے ہے۔ یہ اس بات پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب کو گھاٹی پر چڑھنے کے لیے ابھارتے ہیں اور انھیں یہ بتاتے ہیں کہ جو کوئی اس پر چڑھے گا عنقریب اللہ تعالیٰ کی مغفرت کا مستحق ٹھہرے گا۔ ہم جب اس حدیث پر غور کرتے ہیں تو اس سے بڑے بڑے عظیم معانی ہمارے سامنے آتے ہیں، مثلاً:

① رسول اللہ ﷺ چاہتے تھے کہ اپنے اصحاب کے دلوں کو ان کی زندگی کے ہر ہر لمحے میں آخرت کے دن سے جوڑ دیں۔

② آپ ﷺ یہ بھی چاہتے تھے کہ ان کی نظریں اس جانب لگا دیں کہ ان کی زندگی کی ہر حرکت اور ہر فعل و عمل حتی کہ جنھیں وہ عادات یا طبعی میلانات خیال کرتے ہیں انھیں بھی آخرت کے دن کے لیے غنیمت خیال کریں۔ آپ ﷺ ہمیشہ یہی مفہوم اپنے ساتھیوں

1 مرويات غزوة الحديبية للحكمي، ص: 315. 2 صحيح مسلم، حديث: 2780.

کے دلوں میں پختہ کرنے کی کوشش فرماتے۔ رسول اللہ ﷺ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں: «وَفِي بُضْعِ أَحَدِكُمْ صَدَقَةٌ» ''حقوقِ زوجیت کی ادائیگی بھی صدقہ ہے۔'' صحابہ نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! ہم میں سے کوئی شخص اپنی شہوت پوری کرتا ہے تو کیا اس میں بھی ثواب ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: «أَرَأَيْتُمْ لَوْ وَضَعَهَا فِي حَرَامٍ أَكَانَ عَلَيْهِ وِزْرٌ؟ فَكَذٰلِكَ إِذَا وَضَعَهَا فِي الْحَلَالِ كَانَ لَهُ أَجْرٌ» ''کیوں نہیں، دیکھو! اگر وہ حرام جگہ شہوت پوری کرے تو اس پر وبال ہوا کہ نہیں؟ اسی طرح جب حلال جگہ شہوت پوری کرتا ہے تو ثواب بھی ملتا ہے۔''[1] ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا:

«وَإِنَّكَ مَهْمَا أَنْفَقْتَ مِنْ نَفَقَةٍ فَإِنَّهَا صَدَقَةٌ حَتَّى اللُّقْمَةِ الَّتِي تَرْفَعُهَا إِلٰى فِي امْرَأَتِكَ»

''اور تو جو بھی خرچ کرے گا، وہ صدقہ ہی ہے۔ یہاں تک کہ وہ لقمہ بھی جو تو اپنی بیوی کے منہ تک لے جاتا ہے۔''[2]

مفاہیم جب مسلمان کے دل میں پختہ ہو جاتے ہیں تو بس یہی اس کی ساری زندگی کو اکیلے اللہ تعالیٰ کی غلامی کے رنگ میں رنگنے کے لیے کافی ہیں۔ اور جب مسلمان کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو عبادت گھیر لے تو اس کا انتہائی مبارک اثر ایک مسلمان پہلے اپنی زندگی پر محسوس کرے گا اور پھر اس کے اردگرد کے لوگ محسوس کریں گے۔[3]

اللہ کی غلامی قبول کرنے کے دو نمایاں اثرات

① مسلمان کی زندگی اور اعمال جب ربانی رنگ میں رنگے جاتے ہیں تو یہ صورت اسے تمام معاملات میں جنھیں وہ ادا کرتا ہے اللہ تعالیٰ سے وابستہ کر دیتی ہے۔ یہ اعمال وہ ایک

1 صحيح مسلم، حديث: 1006، وسنن أبي داود، حديث: 5244،5243، ومسند أحمد: 168،167/5. 2 صحيح البخاري، حديث: 2742، وصحيح مسلم، حديث: 1006. 3 مرويات غزوة الحديبية للحكمي، ص: 315.

متواضع اور متدین عبادت گزار کی نیت سے بجا لاتا ہے۔ اور پھر یہ کردار اس کے لیے ہر نفع مند عمل اور بہتر نتائج اور ہر اس طریق کی طرف جانا آسان کر دیتا اور آگے بڑھاتا ہے جس کی بنا پر وہ اور اس کے ہم جنس افراد زندگی سے بھرپور اور اعلیٰ ترین نہج پر فائدہ اٹھا سکیں۔

بعد ازاں یہ صورت اسے نیکیوں اور قربت الٰہی کے جذبے سے مزید سرشار کر دیتی ہے۔ اور اس کا یہ کردار اسے دنیاوی اعمال میں حسن، عمدگی اور پختگی کی جانب بلاتا ہے کیونکہ وہ یہ سب اپنے پروردگار کی رضا اور بہتر انجام کے لیے کر رہا ہوتا ہے۔

② اس کا دوسرا لازمی اثر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک مسلمان کو ساری زندگی میں یک جہتی اور ایک ہی نتیجے کے حصول کا خواہش مند بنا دیتا ہے، چنانچہ وہ جو بھی کرتا یا چھوڑتا ہے تو اس میں بھی وہ اکیلے پروردگار کو راضی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر اپنے پروردگار کی طرف تمام تر دنیاوی اور اخروی کوششوں سے متوجہ ہوتا ہے۔ اس کی شخصیت اور زندگی ٹوٹ پھوٹ اور اندرونی کشمکش کا شکار نہیں ہوتی اور نہ وہ ڈبل مائنڈڈ ہوتا ہے۔[1]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم انھی کرداروں پر زندگی بسر کر گئے۔ انھوں نے ان کرداروں کو اپنی جیتی جاگتی زندگی میں عملاً داخل کر لیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کی زندگیوں کو اس لیے محفوظ فرمایا ہے کہ ہم اپنی زندگی میں ان کی اقتدا کریں اور ان کے بعد کسی بھی آنے والے کے لیے ان کی سیرت دلیل و حجت بن جائے۔[2]

راقم نے غزوۂ حدیبیہ کے موضوع پر زیادہ تر استفادہ ''حکمی'' کی ''مرویات غزوۃ الحدیبیۃ''، باشمیل کی ''صلح الحدیبیۃ'' اور ابو فارس کی ''غزوۃ الحدیبیۃ'' سے کیا ہے۔ یہ کتابیں اس موضوع کے حوالے سے نہایت عمدہ ہیں۔ اگرچہ دیگر کئی کتابوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

1 العبادة في الإسلام للقرضاوي، ص: 66. 2 مرويات غزوة الحديبية للحكمي، ص: 316.

حصہ 16

صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیان کے اہم واقعات

باب: 1 غزوۂ خیبر

باب: 2 حکمرانوں اور امراء کو دعوتِ اسلام

باب: 3 عمرۂ قضا

باب: 4 جنگِ موتہ

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ
وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ
فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ○

اے اہل کتاب! ایسی انصاف والی بات کی طرف آؤ جو ہم میں تم
میں برابر ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں نہ اس کے ساتھ کسی
کو شریک بنائیں نہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر آپس میں ایک دوسرے کو رب بنائیں،
پھر اگر وہ منہ پھیر لیں تو تم کہہ دو کہ گواہ رہو ہم تو مسلمان ہیں۔"

(آل عمران 3:64)

اَللّٰهُ أَكْبَرُ! اَللّٰهُ أَكْبَرُ! خَرِبَتْ خَيْبَرُ، إِنَّا إِذَا نَزَلْنَا
بِسَاحَةِ قَوْمٍ فَسَاءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِينَ

"اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔ خیبر برباد ہو گیا۔
جب ہم جنگ کے لیے کسی قوم کے مکانوں کے سامنے اتر جائیں
تو ڈرائے اور متنبہ کی گئی قوم کا برا حال ہو جاتا ہے۔"

(صحيح البخاري، حديث: 610، وصحيح مسلم، حديث: [4665](120)، 1365)

باب 1

غزوۂ خیبر

تاریخ و اسباب

ابن اسحاق نے ذکر کیا ہے کہ یہ غزوہ محرم 7 ہجری میں ہوا۔[1]

واقدی نے ذکر کیا ہے کہ یہ غزوہ صفر یا ربیع الاول 7 ہجری میں غزوۂ حدیبیہ سے واپس آجانے کے بعد ہوا۔[2]

ابن سعد کی رائے یہ ہے کہ یہ غزوہ جمادی الاولیٰ 7ھ میں ہوا۔[3] امام زہری اور امام مالک کہتے ہیں کہ یہ محرم 6ھ میں ہوا۔[4]

ابن اسحاق اور واقدی میں محض دو ماہ کا اختلاف ہے اور یہ اختلاف معمولی نوعیت کا ہے۔ اسی طرح ان دونوں اور امام زہری و امام مالک کے درمیان اختلاف کا سبب پہلے ہجری سال کی ابتدا کے اختلاف کی بنا پر ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ابن اسحاق کے موقف کو واقدی کے موقف پر ترجیح دی ہے۔[5]

یہود خیبر نے مسلمانوں سے دشمنی کا اظہار اس وقت تک نہیں کیا جب تک وہاں بنونضیر کے وہ سردار نہیں جا بسے جن کے دلوں میں جلا وطنی کا دکھ تھا، جبکہ جلا وطن کرنا ان کی طاقت

1 السيرة النبوية لابن هشام: 455/3. 2 المغازي للواقدي: 634/2. 3 الطبقات لابن سعد: 106/2. 4 تاريخ دمشق لابن عساكر: 33/1. 5 فتح البارى: 41/16، والسيرة النبوية للدكتور مهدي رزق الله أحمد، ص: 500.

کمزور کرنے کے لیے کافی نہ تھا۔ انھوں نے مدینہ اس حال میں چھوڑا کہ ان کی عورتیں، بچے اور اموال ساتھ تھے۔ اور ان کے پیچھے گانے والی کنیزیں دف اور باجے بڑی رونق اور فخر سے بجا رہی تھیں کہ اس زمانے میں کسی قافلے کے متعلق ایسا منظر نہ دیکھا گیا تھا۔[1]

بنونضیر جب خیبر کی طرف جلاوطن کر دیے گئے تو اس وقت ان کے سردار سلام بن ابی الحقیق، کنانہ بن ابی الحقیق اور حیی بن اخطب تھے۔ جب یہ وہاں سکونت پذیر ہوئے تو وہاں کے سرداران کے ماتحت ہو گئے۔[2]

یہود خیبر کی سرداری کا ان کے ہاتھ آجانا انھیں جنگ، مقابلہ آرائی اور مسلمانوں سے انتقام لینے کی غرض سے ان کے خلاف اٹھ کھڑا ہونے کے لیے کافی تھا۔ اپنے گھروں کو پلٹنے کی شدید خواہش اور دل میں چھپا کینہ انھیں چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ اس کے لیے ان کی پہلی زبردست پلاننگ غزوۂ احزاب کی صورت میں سامنے آئی، جس میں خیبر اور خاص طور پر بنونضیر کے سردار، قریش اور دیگر بدو قبائل کو مسلمانوں کے خلاف جمع کر لائے تھے۔ جس میں انھوں نے بے تحاشا اموال بھی جھونک دیے، پھر ان کا بنوقریظہ کو بدعہدی پر ابھارنے اور احزاب سے تعاون کرنے کی کوشش پر رضامند کرنا بھی شامل تھا۔[3]

یوں خیبر مسلمانوں کے لیے اور ان کی پروان چڑھتی ہوئی حکومت کے لیے بہت بڑے خطرے کا مرکز بن گیا۔

صلح حدیبیہ کے بعد مسلمان یہود خیبر کے خطرے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے فارغ ہو گئے جس نے ان کے امن کو بار بار چیلنج کر رکھا تھا۔ صلح حدیبیہ کے بعد اترنے والی سورت ''الفتح'' میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے فتح خیبر کا وعدہ اور ان کے اموال کو بطور غنیمت حاصل کرنے کی بشارت شامل تھی۔[4]

---

[1] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 319/1. [2] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 319/1. [3] نضرة النعيم: 349/1. [4] نضرة النعيم: 349/1.

ارشادِ الٰہی ہے:

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا ۝ وَمَغَانِمَ كَثِيرَةً يَأْخُذُونَهَا ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ۝ وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيرَةً تَأْخُذُونَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هَٰذِهِ وَكَفَّ أَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ ۚ وَلِتَكُونَ آيَةً لِلْمُؤْمِنِينَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا ۝ وَأُخْرَىٰ لَمْ تَقْدِرُوا عَلَيْهَا قَدْ أَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا ۝﴾

”البتہ تحقیق اللہ مومنوں سے راضی ہوگیا جب وہ درخت کے نیچے آپ سے بیعت کررہے تھے، چنانچہ ان کے دلوں میں جو (خلوص) تھا، وہ اس نے جان لیا، تو اس نے ان پر طُمانینت وتسکین نازل کی اور بدلے میں انھیں قریب کی فتح دی۔ اور بہت سی غنیمتیں بھی (عطا کیں) جو وہ حاصل کریں گے۔ اور اللہ نہایت غالب، خوب حکمت والا ہے۔ اور اللہ نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ فرمایا ہے کہ تم انھیں حاصل کروگے، چنانچہ اس نے جلد ہی وہ تمھیں عطا کردیں اور لوگوں کے ہاتھ تم سے روک دیے، تاکہ یہ مومنوں کے لیے ایک نشانی ہوجائے اور تاکہ وہ تمھیں صراط مستقیم کی ہدایت دے۔ اور (اللہ نے) دوسری غنیمتوں کا بھی (وعدہ کیا) جن پر تم قدرت نہیں رکھتے تھے (مگر) اللہ نے ان کا احاطہ کر رکھا ہے اور اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔“[1]

اسلامی لشکر کی خیبر کی طرف روانگی

خیبر کی جانب لشکر بلند یقین وایمان کے ساتھ چل پڑا، باوجودیکہ انھیں علم تھا کہ خیبر بڑے بڑے ناقابلِ شکن قلعوں اور سخت جنگجو لوگوں پر مشتمل ہونے کے ساتھ ساتھ اسلحے کا

[1] الفتح 48:18-21.

ڈھیر بھی ہے۔ مسلمان بلند آوازوں سے اللہ اکبر اور لا الہ الا اللہ پکارتے جا رہے تھے۔

آپ ﷺ نے یہ کہتے ہوئے پرسکون رہنے کا حکم دیا کہ

«أَيُّهَا النَّاسُ، ارْبَعُوا عَلٰى أَنْفُسِكُمْ فَإِنَّكُمْ لَا تَدْعُونَ أَصَمَّ وَلَا غَائِبًا وَّلٰكِنْ تَدْعُونَ سَمِيعًا بَصِيراً»

''اے لوگو! اپنے آپ پر مہربانی کرو کیونکہ تم کسی بہرے یا غائب کو نہیں پکار رہے ہو بلکہ تم اسے پکار رہے ہو جو خوب سنتا اور خوب دیکھتا ہے۔''

رسول اللہ ﷺ لشکر کے ہمراہ رات کا سفر کر رہے تھے۔ حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نبی ﷺ کے ساتھ خیبر کی جانب نکلے۔ ہم رات بھر چلتے رہے۔ عامر بن اکوع رضی اللہ عنہ لوگوں کے حدی خواں تھے۔ وہ کہہ رہے تھے:

اَللّٰهُمَّ لَوْلَا أَنْتَ مَا اهْتَدَيْنَا وَلَا تَصَدَّقْنَا وَلَا صَلَّيْنَا

''اے اللہ! اگر تو نہ ہوتا تو ہم ہدایت نہ پاتے نہ صدقات دیتے اور نہ نماز پڑھتے۔''

فَاغْفِرْ فِدَاءً لَّكَ مَا اتَّقَيْنَا وَثَبِّتِ الْأَقْدَامَ إِنْ لَّاقَيْنَا

''ہم تجھ پر جان سے فدا! چنانچہ تو ہمیں بخشتا رہ جب تک ہم پرہیزگاری اختیار کریں۔ اور دشمن سے واسطہ پڑے تو تُو ہمیں ثابت قدم رکھ۔''

وَأَلْقِيَنْ سَكِينَةً عَلَيْنَا إِنَّا إِذَا صِيحَ بِنَا، أَتَيْنَا

''اور ہم پر اپنی رحمت وطمانیت نازل فرما۔ ہمیں جب (دشمن کی طرف سے) للکارا گیا ہم آگئے۔''

وَبِالصِّيَاحِ عَوَّلُوا عَلَيْنَا

''اور چیخنے کے ساتھ انھوں نے ہم پر شور کیا ہے۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ هٰذَا السَّائِقُ؟» ''یہ حدی خواں کون ہے؟'' لوگوں نے بتایا کہ یہ عامر بن اکوع رضی اللہ عنہ ہیں۔ آپ ﷺ نے انھیں یوں دعا دی: «يَرْحَمُهُ اللّٰهُ!» ''اللہ ان پر رحم فرمائے۔''

اس پر ایک شخص، اور وہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ تھے،[1] نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! آپ نے تو اسے شہادت کا مستحق قرار دے دیا۔ کاش! آپ ہمیں ان سے مزید فائدہ اٹھانے دیتے۔''[2]

جب لشکر اسلامی خیبر کے قریب صہباء پہنچا تو رسول اللہ ﷺ نے نماز عصر ادا کی، پھر زاد راہ منگوایا تو صرف ستو ہی لایا گیا، چنانچہ وہی آپ ﷺ کے حکم سے بھگویا گیا۔ وہ آپ ﷺ نے بھی کھایا اور آپ کے ساتھ صحابہ نے بھی کھایا، پھر آپ ﷺ نماز مغرب کے لیے اٹھے کلی کی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نماز پڑھائی اور وضو نہ فرمایا۔[3]

رسول اللہ ﷺ نے عباد بن بشر رضی اللہ عنہ کو دشمن کی خبریں اکٹھی کرنے کے لیے ایک گروہ دے کر روانہ کر دیا تاکہ اگر دشمن کہیں چھپ کر بیٹھا ہے تو ان کی کمین گاہوں کا پتا چلایا جائے۔ انھیں راستے میں یہود کی جانب سے بھیجا ہوا ''اشجع'' قبیلے کا ایک جاسوس ملا۔ عباد رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا: ''تم کون ہو؟'' اس نے کہا: ''میری اونٹنی گم ہوگئی ہے اس کی تلاش میں ہوں۔'' عباد رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''کیا تمھیں خیبر کے بارے میں کچھ علم ہے؟'' اس نے کہا: ''بہت تھوڑی مدت ہوئی وہاں سے آیا ہوں۔ تم اس کے متعلق کیا پوچھتے ہو؟'' عباد رضی اللہ عنہ نے کہا: ''یہود کے متعلق۔'' اس نے کہا: ''ہاں، کنانہ بن ابی الحقیق اور ہوذہ بن قیس اپنے غطفانی حلفاء کے پاس گئے تھے۔ اور انھیں ایک سال کا خیبر کا پھل دینا طے کیا، لہٰذا وہ گھوڑوں اور اسلحے سے تیار ہو کر عتبہ بن بدر کی قیادت میں بطور امداد آ گئے ہیں

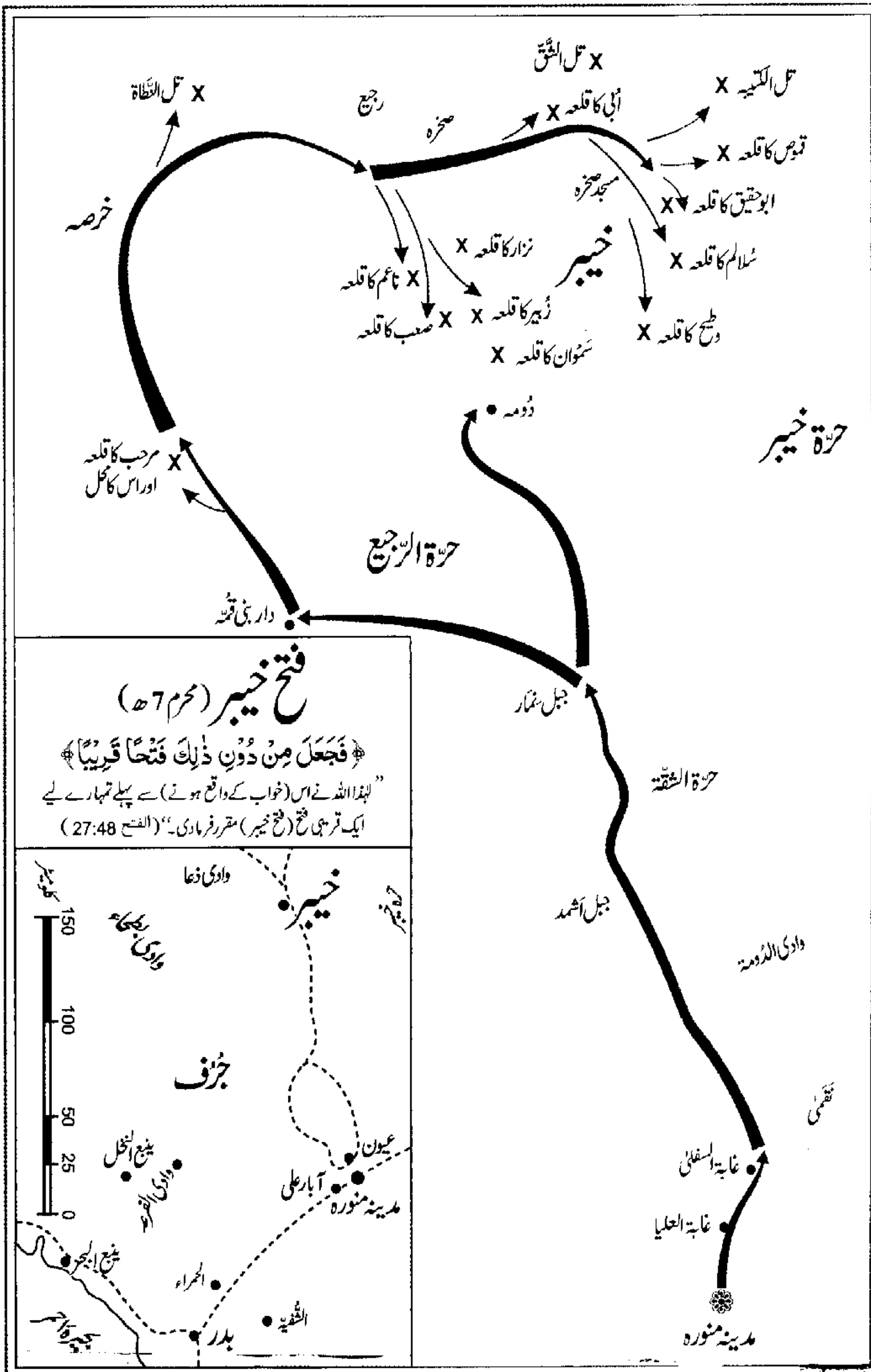
1 فتح الباري: 530/7، میں ہے کہ وہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ تھے۔ 2 صحيح البخاري، حديث: 4196، وصحيح مسلم، حديث: 1802. 3 صحيح البخاري، حديث: 4195، ودلائل النبوة للبيهقي: 200/4، والصراع مع اليهود لأبي فارس: 30/2.

اور یہود کے ساتھ ان کے قلعوں میں داخل ہو گئے ہیں۔ ان قلعوں میں دس ہزار جنگجو ہیں اور وہ ایسے قلعوں کے مالک ہیں کہ انھیں سر نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے پاس قلعوں میں کئی سال کی خوراک موجود ہے اور قلعوں ہی میں پینے کا پانی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کسی میں بھی ان سے لڑنے کی طاقت ہو۔

حضرت عباد بن بشر رضی اللہ عنہ نے کوڑا اٹھایا اور اسے کئی کوڑے رسید کر دیے اور کہا: ''تم ان کے جاسوس ہو۔ میرے سامنے سچ بولو، وگرنہ تمھاری گردن مار دوں گا۔'' اب بدوی نے کہا: ''تم نے یہود سے یثرب میں جو سلوک کیا اس بنا پر یہاں کے لوگ تم سے بڑے مرعوب اور خائف رہتے ہیں۔ مجھے کنانہ نے کہا تھا کہ میں آپ کو راستے میں ملوں۔ کیونکہ مسلمان تم کو قابل نفرت نہیں سمجھیں گے۔ اور انھوں نے یہ بھی ذمہ داری لگائی کہ میں آپ کی تعداد ان تک پہنچاؤں، ایک سائل بن کر آپ کے قریب ہو جاؤں۔ پھر آپ پر یہودیوں کی کثرتِ تعداد اور ان کی تیاری کا رعب ڈالوں۔ کیونکہ آپ ضرور مجھ سے پوچھیں گے۔ اور پھر آپ کی خبریں لے جا کر جلدی ان تک پہنچاؤں۔[1]

جب مسلمانوں کا لشکر خیبر کی بلند گھاٹیوں کے پاس پہنچ گیا تو رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا: «قِفُوا» ''ٹھہرو۔'' پھر یہ دعا پڑھی: «اَللّٰهُمَّ رَبَّ السَّمٰوَاتِ وَمَا أَظْلَلْنَ، وَرَبَّ الْأَرَضِينَ وَمَا أَقْلَلْنَ وَرَبَّ الشَّيَاطِينِ وَمَا أَضْلَلْنَ، وَرَبَّ الرِّيَاحِ وَمَا ذَرَيْنَ، فَإِنَّا نَسْئَلُكَ خَيْرَ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ وَخَيْرَ أَهْلِهَا وَخَيْرَ مَا فِيهَا، وَنَعُوذُبِكَ مِنْ شَرِّهَا وَشَرِّ أَهْلِهَا وَشَرِّمَا فِيهَا» ''اے میرے اللہ، اے آسمانوں اور جو کچھ ان کے سایے میں ہے اس کے پروردگار! اور اے زمینوں اور جو کچھ وہ اگاتی ہیں ان کے پروردگار اور شیاطین اور جنھیں وہ گمراہ کرتے ہیں ان کے پروردگار اور اے ہواؤں کے اور جنھیں وہ اڑاتی ہیں ان کے پروردگار! ہم تجھ سے اس بستی اور اس کے

[1] المغازي للواقدي: 641/2.


تل النطاۃ
رجیع
صخرہ
تل الشق
اُبی کا قلعہ
تل الکتیبہ
قموص کا قلعہ
مسجد صخرہ
ابو حقیق کا قلعہ
خرصہ
نزار کا قلعہ
خیبر
ناعم کا قلعہ
سُلالم کا قلعہ
زُبیر کا قلعہ
صعب کا قلعہ
وطیح کا قلعہ
سموان کا قلعہ
دومہ
حرۃ خیبر
مرحب کا قلعہ اور اس کا محل
حرۃ الرجیع
دار بنی قمہ
فتح خیبر (محرم 7ھ)
﴿فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيبًا﴾
"لہٰذا اللہ نے اس (خواب کے واقع ہونے) سے پہلے تمہارے لیے ایک قریبی فتح (فتح خیبر) مقرر فرمادی۔" (الفتح 27:48)
جبل نمار
حرۃ الشقۃ
جبل اشمد
وادی الدومۃ
غابۃ السفلیٰ
غابۃ العلیا
مدینہ منورہ
وادی ذعا
خیبر
کلومیٹر
150
100
50
25
0
جرف
ینبع النخل
عیون
آبار علی
مدینہ منورہ
ینبع البحر
الحمراء
الصفراء
بدر

باشندوں کی بھلائی اور جو کچھ اس میں ہے اس کی بھلائی کی درخواست کرتے ہیں اور اس بستی کے شر اور اس کے باشندوں کے شر اور جو کچھ اس میں ہے اس کے شر سے تیری پناہ چاہتے ہیں۔'' [1]

رسول اللہ ﷺ یہ دعا ہر بستی میں داخل ہوتے وقت پڑھتے تھے۔ جب رات کے وقت رسول اللہ ﷺ خیبر پہنچے تو آپ ﷺ نے لشکر کو خیبر کے بالائی علاقے میں رات گزارنے کا حکم دیا۔ اسلامی لشکر منہ اندھیرے بیدار ہوا اور وادی رجیع میں معسکر قائم کیا۔ یہ وادی خیبر اور غطفان کے درمیان تھی۔ اس طرح مسلمانوں نے غطفان کی طرف سے یہودیوں کو ملنے والی کمک کا راستہ روک دیا۔ [2]

جب صبح ہوئی تو یہود بیلچے، پھاوڑے اور ٹوکریاں اٹھائے کھیتوں میں نکلے تو انھوں نے مسلمانوں کا لشکر دیکھا اور کہنے لگے: ''اللہ کی قسم! محمد آگئے۔ اور ان کا لشکر بھی۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «اَللّٰهُ أَكْبَرُ! اَللّٰهُ أَكْبَرُ! خَرِبَتْ خَيْبَرُ، إِنَّا إِذَا نَزَلْنَا بِسَاحَةِ قَوْمٍ فَسَاءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِينَ» ''اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔ خیبر برباد ہو گیا۔ جب ہم جنگ کے لیے کسی قوم کے مکانوں کے سامنے اتر جائیں تو ڈرائی اور متنبہ کی گئی قوم کا برا حال ہو جاتا ہے۔'' [3]

خیبر کے قلعوں کی فتح

یہود اپنے قلعوں میں داخل ہو گئے۔ مسلمانوں نے ان کا محاصرہ کر لیا۔ اور ایک ایک کر کے قلعے فتح کرنے شروع کر دیے۔ سب سے پہلے ناعم کا قلعہ فتح ہوا۔ پھر خیبر کی

[1] السنن الكبرىٰ للبيهقي: 252/5، وصحيح ابن حبان، رقم: 2709، وصحيح ابن خزيمة، رقم: 565، والمعجم الكبير للطبراني، رقم: 7299، والمستدرك للحاكم: 101,100/2.
[2] الصراع مع اليهود لأبي فارس: 45/2. [3] صحيح البخاري، حديث: 610، وصحيح مسلم، حديث: [4665](120)-1365.

شمال مشرقی جانب نطاۃ علاقے میں قلعہ ''صعب'' اورشق علاقے میں قلعہ ابو النزار'' فتح کیا۔ پھر ابی الحقیق کا قلعہ ''قموص'' فتح ہوا۔ یہ کتیبہ کے علاقے میں سب سے مضبوط قلعہ تھا۔ بعدازاں مسلمانوں نے وطیح اور سلالم علاقے کے قلعے بھی فتح کر لیے۔[1]

مسلمانوں کو بعض قلعے فتح کرنے میں شدید مزاحمت اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ قلعہ ناعم فتح کرتے وقت محمود بن مسلمہ انصاری رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے۔ ان کے سر پر مرحب نے چکی کا پاٹ پھینک دیا تھا۔[1] اس قلعے کی فتح میں دس دن لگے۔[2]

محاصرے کی ابتدا کے وقت مسلمانوں کے علَم بردار صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تھے لیکن فتح حاصل نہ ہوسکی۔ جب لوگوں کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنِّي دَافِعٌ اللِّوَاءَ غَدًا إِلٰى رَجُلٍ يُّحِبُّهُ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَيُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ، لَا يَرْجِعُ حَتّٰى يُفْتَحَ لَهُ»

''کل میں ایسے شخص کو جھنڈا دوں گا جس سے اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم محبت کرتے ہیں اور وہ بھی اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتا ہے۔ وہ فتح کیے بغیر نہیں لوٹے گا۔''

یہ سن کر لوگ خوش ہو گئے، چنانچہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسرے دن کی نمازِ فجر پڑھ لی تو حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو بلا کر جھنڈا دے دیا۔ انھوں نے جھنڈا لے لیا اور ان کے ہاتھوں قلعہ فتح ہو گیا۔[3]

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلایا تو اس وقت وہ آشوب چشم میں مبتلا تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی آنکھوں میں لعاب دہن لگایا اور ان کے لیے دعا کی تو ان کی آنکھیں ٹھیک ہو گئیں۔[4]

[1] السيرة النبوية للدكتور مهدي رزق الله، ص:501. [2] المغازي للواقدي:2/657. [3] مسند أحمد:5/353. [4] صحيح البخاري، حديث:4210، وصحيح مسلم، حديث:2406.

رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نصیحت فرمائی کہ یہود سے ٹکراؤ سے قبل انھیں اسلام کی طرف دعوت دینا اور فرمایا:

«فَوَاللّٰهِ لَأَنْ يَّهْدِيَ اللّٰهُ بِكَ رَجُلًا وَّاحِدًا خَيْرٌ لَّكَ مِنْ أَنْ تَكُونَ لَكَ حُمْرُ النَّعَمِ»

''اللہ کی قسم! اگر تیری وجہ سے اللہ تعالیٰ ایک شخص کو راہ راست پر لے آئے تو وہ تیرے لیے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔''[1]

اور جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا: ''اے اللہ کے رسول! کس بات پر میں ان سے لڑتا رہوں؟'' تو فرمایا:

«قَاتِلْهُمْ حَتّٰى يَشْهَدُوا أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللّٰهِ فَإِذَا فَعَلُوا ذٰلِكَ مَنَعُوا مِنْكَ دِمَائَهُمْ إِلَّا بِحَقِّهَا وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ»

''جب تک وہ اس بات کی گواہی نہ دیں کہ کوئی برحق معبود نہیں سوائے اللہ کے اور یقیناً محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، ان سے لڑتے رہو۔ جب وہ یہ گواہی دے دیں تو انھوں نے تجھ سے اپنی جان اور مال بچا لیا مگر سوائے کسی بدلے کے اور ان کا حساب اللہ تعالیٰ پر ہے۔''[2]

جب مسلمانوں نے قلعے کا محاصرہ کیا تو اس کا سردار اور پہلوان مرحب سامنے آیا۔ یہی شخص حضرت عامر بن اکوع رضی اللہ عنہ کی شہادت کا سبب بنا تھا۔ اب حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کے مقابلے میں آئے اور اسے قتل کر دیا۔[3]

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اسے محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے قتل کیا تھا۔ اس کے قتل نے یہود پر گہرا

[1] صحيح مسلم، حديث: 2406. [2] صحيح مسلم، حديث: 2405، ودلائل النبوة للبيهقي: 260/4. [3] السيرة النبوية للدكتور مهدي رزق الله، ص: 502.

اثر چھوڑا جس کا نتیجہ ان کی شکست کی صورت میں نکلا۔[1]

متعدد روایات میں آیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک بہت بڑے دروازے کو ڈھال بنا لیا جو ناعم قلعہ کے پاس تھا۔ جبکہ یہودی نے ہاتھ سے ڈھال گرا دی تھی۔ مگر یہ تمام روایات ضعیف ہیں۔ ایسی روایات پر اعتماد نہ کرنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شجاعت و بہادری کی نفی نہیں کرتا۔ ان کی بہادری کے متعلق جو روایت ثابت ہیں وہی کافی ہیں۔[2]

قلعہ ''ناعم'' فتح کرنے کے بعد مسلمان قلعہ ''صعب بن معاذ'' کی طرف متوجہ ہوئے۔ علمبردار حضرت حباب بن منذر رضی اللہ عنہ تھے۔ انھوں نے تین دن بعد اسے بڑی بہادری سے فتح کر لیا۔ اس قلعے سے انھیں وافر کھانا اور سامان میسر آیا۔ ان دنوں مسلمان قلت طعام سے دوچار تھے۔

بعدازاں مسلمان قلعہ ''زبیر'' کی طرف متوجہ ہوئے۔ جس میں ''ناعم'' اور ''صعب'' کے بھگوڑے اور دیگر مفتوحہ قلعوں کے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ مسلمانوں نے اس کا محاصرہ کیا اور باہر سے جانے والا پانی بند کر کے انھیں جنگ پر مجبور کر دیا۔ یوں تین دن بعد انھیں بھی شکست فاش ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی ''نطاۃ'' کے علاقے کے وہ تمام قلعے مسلمانوں کے زیرنگیں ہو گئے جن میں سخت ترین یہودی آباد تھے۔

اب مسلمان ''شق'' کے علاقے کے قلعوں کی طرف متوجہ ہوئے اور ''اُبَیّ'' نامی قلعے سے ابتدا کی اور اس پر غلبہ حاصل کیا۔ مگر یہاں سے چند جنگجو بھاگ کر قلعہ ''نزار'' کی جانب چلے گئے۔ مسلمان ان کی طرف متوجہ ہوئے، محاصرہ کیا تو انھوں نے قلعہ کھول دیا۔ ''شق'' نامی علاقے کے بقیہ لوگ اپنے قلعوں سے بھاگ کر ''قموص'' کے محفوظ ترین قلعے اور وطیح و سلالم کے قلعوں میں جمع ہو گئے۔ مسلمانوں نے ان کا چودہ دن تک محاصرہ کیے رکھا یہاں تک کہ انھوں نے صلح کا مطالبہ کر دیا۔[3]

---

1 السيرة النبوية للدكتور مهدي رزق الله، ص: 502. 2 السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري:1/324. 3 المغازي للواقدي:2/658-671.

یوں خیبر جنگ سے فتح ہوا کیونکہ مذکورہ روایات اس بات کی تائید کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ بخاری، مسلم، ابو داود میں بھی یہی مروی ہے کہ آپ ﷺ نے خیبر پر چڑھائی کی اور اسے فتح کیا۔[1]

اس کے ساتھ ہی خیبر مکمل طور پر مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا۔ ادھر خیبر کے شمال میں اہلِ فدک نے فوراً صلح کا تقاضا کر دیا اور یہ مطالبہ کیا کہ ان کی جانیں محفوظ رکھی جائیں۔ اس کے عوض انھوں نے بہت سارے اموال بھی پیش کیے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے یہ پیش کش قبول فرما لی۔

فدک کو فتح کرنے کے لیے چونکہ مسلمانوں نے کوئی لشکر کشی نہیں کی تھی۔ اس لیے یہ علاقہ رسول اللہ ﷺ کے لیے خاص قرار پایا۔[2] بعدازاں مسلمانوں نے ''وادی القریٰ'' کا محاصرہ کر لیا۔ اس میں ''خیبر اور تیماء'' کے درمیان کئی بستیاں تھیں۔ بالآخر انھوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ یہاں بھی مسلمانوں نے بے تحاشا اموال بطور غنیمت حاصل کیے۔ زمین اور کھجوریں یہود کے پاس رہنے دیں۔ ان سے بھی خیبر والوں کی طرح معاملات طے کر لیے۔ اہل تیماء نے بھی ''خیبر اور وادی القریٰ'' کی شرائط پر مصالحت کر لی۔

یوں یہود کے تمام قلعے مسلمانوں کی طاقت کے آگے سرنگوں ہو گئے۔ خیبر کے تمام معرکوں میں یہود کے 93 آدمی جہنم واصل ہوئے۔[3]

عورتیں اور بچے قیدی بنا لیے گئے۔ انھی قیدیوں میں صفیہ بنت حیی بن اخطب بھی تھیں۔ انھیں رسول اللہ ﷺ نے آزاد کر کے ان سے شادی کر لی۔[4]

---

[1] صحیح البخاري، حدیث: 3009و4210، وصحیح مسلم، حدیث:2406,2405، وسنن أبي داود، حدیث: 3009، والسیرة النبویة للدکتور مهدي رزق الله، ص: 504. [2] صحیح مسلم، حدیث:1551، وسنن أبي داود، حدیث:3006، ومسند أحمد:451/2. [3] السیرة النبویة للدکتور مهدي رزق الله، ص: 504. [4] صحیح البخاري، حدیث: 371، وصحیح مسلم، حدیث:[3498]-(84)-1365.

ابن اسحاق کی روایت کے مطابق مسلمانوں کے بیس آدمی شہید ہوئے۔ [1]
واقدی کی روایت کے مطابق مسلمانوں کے پندرہ آدمی شہید ہوئے۔ [2]

شہید بدوی

ایک بدوی نبی اکرم ﷺ کے پاس آکر ایمان لے آیا اور آپ ﷺ کا مصاحب ہوگیا۔ اس نے عرض کیا: ''کیا میں آپ کے ساتھ مہاجر بن کر رہ سکتا ہوں؟'' آپ ﷺ نے اپنے بعض ساتھیوں کو اس کا خیال رکھنے کی وصیت فرمائی۔ جب جنگ خیبر کا موقع آیا اور آپ ﷺ کو کچھ غنیمتیں حاصل ہوئیں جنھیں آپ ﷺ نے تقسیم فرما دیا اور اس بدوی کو بھی حصہ دیا۔ اس کے ساتھیوں نے اس کا حصہ لے لیا۔ وہ ان کے جانور چرایا کرتا تھا۔ جب وہ آیا تو انھوں نے اس کا حصہ اسے تھما دیا، اس نے کہا: ''یہ کیا ہے؟'' ساتھیوں نے بتایا: ''رسول اللہ ﷺ نے تیرا حصہ دیا ہے۔'' وہ اسے لے کر نبی اکرم ﷺ کے پاس گیا اور پوچھنے لگا: ''اے اللہ کے رسول! یہ کیا ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: «قَسَمْتُهُ لَكَ» ''میں نے تقسیم میں سے تیرا حصہ نکالا ہے۔'' اس نے عرض کیا: ''میں نے آپ کی اتباع اس کے لیے تو نہیں کی تھی بلکہ میں نے تو اس لیے آپ کا ساتھ دیا تھا کہ میرے یہاں ...... اپنے حلق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ...... تیر لگے اور میں شہید ہو کر جنت میں چلا جاؤں۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِنْ تَصْدُقِ اللّٰهَ يَصْدُقْكَ» ''اگر تم اللہ تعالیٰ سے صدقِ دل سے اس کا مطالبہ کرو گے تو اللہ تعالیٰ بھی سچا کر دکھائے گا۔'' پھر وہ دشمن سے لڑنے کو اٹھا اور شہید ہوگیا۔ اسے آپ ﷺ کے پاس لایا گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «أَهُوَ هُوَ؟» ''یہ وہی ہے نا؟'' صحابہ نے عرض کیا: ''جی ہاں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: «صَدَقَ اللّٰهَ فَصَدَقَهُ» ''اس کا جذبہ صادق تھا تو اللہ تعالیٰ نے بھی اسے سچا کر دکھایا۔'' آپ ﷺ نے اسے اپنی ''عبا'' مبارک میں کفن دیا، پھر اس کی نماز جنازہ

[1] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري:327/1. [2] المغازي للواقدي:700/2.

پڑھائی۔ آپ ﷺ نے اس کے لیے یہ دعا کی تھی: «اَللّٰهُمَّ هٰذَا عَبْدُكَ خَرَجَ مُهَاجِرًا فِي سَبِيلِكَ قُتِلَ شَهِيدًا وَّأَنَا عَلَيْهِ شَهِيدٌ» ”اے اللہ! تیرے اس بندے نے تیری راہ میں ہجرت کی اور شہید ہوا ہے اور میں اس کا گواہ ہوں۔“[1]

حبشی چرواہا

اہل خیبر کے ایک مالدار یہودی کا حبشی غلام بکریاں چرایا کرتا تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ تمام خیبر والوں نے ہتھیار لگائے ہوئے ہیں۔ اس نے ان سے ان کے ارادے پوچھے تو انھوں نے کہا: ”یہ شخص جو نبوت کا دعویٰ کرتا ہے ہم اس سے لڑیں گے۔“ وہ بکریاں لے کر رسول اللہ ﷺ کی طرف آ گیا اور پوچھنے لگا: ”آپ کیا کہتے ہیں؟ اور کس بات کی دعوت دیتے ہیں؟“ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «أَدْعُو إِلَى الْإِسْلَامِ وَأَنْ تَشْهَدَ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنِّي رَسُولُ اللّٰهِ وَأَنْ لَّا تَعْبُدَ إِلَّا اللّٰهَ» ”میں اسلام کی دعوت دیتا ہوں اور یہ کہ تم اس بات کی گواہی دو کہ اللہ کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں اور عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی کرو۔“ غلام نے عرض کیا: ”اگر میں بھی اللہ پر ایمان لے آؤں اور یہی گواہی دینے لگوں تو مجھے کیا ملے گا؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: «لَكَ الْجَنَّةُ إِنْ مِتَّ عَلٰى ذٰلِكَ» ”اگر تمھیں اس عقیدے پر موت آجائے تو تمھارے لیے جنت ہے۔“ وہ وہیں مسلمان ہو گیا، پھر اس نے عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول! یہ بکریاں میرے پاس امانت ہیں۔“ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «أَخْرِجْهَا مِنْ عِنْدِكَ وَارْمِهَا بِالْحَصْبَاءِ فَإِنَّ اللّٰهَ سَيُؤَدِّي عَنْكَ أَمَانَتَكَ» ”انھیں اپنے ہاں سے ہانک دو اور ان پر کنکریاں پھینکو۔ اللہ تعالیٰ یہ امانت تیری طرف سے ادا کر دے گا۔“ (یہ خود اپنے مالک

[1] السنن الكبرٰى للنسائي: 4/60، 61، والمستدرك للحاكم: 3/595، 596، ودلائل النبوة للبيهقي: 4/222، والسنن الكبرٰى للبيهقي: 4/15، 16.

کے پاس چلی جائیں گی) اس نے ایسا ہی کیا۔ وہ تمام بکریاں اپنے مالک کے پاس چلی گئیں۔ یہودی کو معلوم ہو گیا کہ اس کا غلام مسلمان ہو گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو وعظ فرمایا۔ انھیں جہاد کی رغبت دلائی، جب مسلمانوں اور یہود کی مڈھ بھیڑ ہوئی تو یہ حبشی غلام بھی شہید ہو گیا۔ مسلمان اسے اٹھا کر اپنے معسکر میں لے آئے اور خیمے میں رکھ دیا۔ صحابہ کا خیال ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خیمے میں نگاہ ڈالی اور پھر صحابہ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا:

«لَقَدْ أَكْرَمَ اللّٰهُ هٰذَا الْعَبْدَ وَسَاقَهُ إِلٰى خَيْبَرَ، وَلَقَدْ رَأَيْتُ عِنْدَ رَأْسِهِ اثْنَتَيْنِ مِنَ الْحُورِ الْعِينِ، وَلَمْ يُصَلِّ لِلّٰهِ سَجْدَةً قَطُّ»

''اللہ تعالیٰ نے اس غلام کو سرخرو کر دیا اور اسے خیبر کی طرف لایا۔ میں نے اس کے سر کے پاس خوبصورت آنکھوں والی دو جنتی حوروں کو دیکھا ہے، حالانکہ اس نے ابھی تک ایک سجدہ بھی نہ کیا تھا۔''[1]

بہادر ہونے کے باوجود جہنم کی طرف

مسلمانوں کا ایک شخص (قزمان) خیبر میں ایسا بھی تھا کہ کسی اکیلے مشرک کو نہ پاتا مگر اس کا صفایا کر دیتا اور پیچھا کر کے تلوار سے اس کا کام تمام کر دیتا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «أَمَا إِنَّهُ مِنْ أَهْلِ النَّارِ» ''وہ تو دوزخی ہے۔'' لوگوں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! اگر وہ دوزخی ہے تو پھر ہم لوگوں میں جنتی کون ہے؟'' اتنے میں ایک آدمی (اکثم بن ابوالجون) کہنے لگا: ''اللہ کی قسم! میں اس کا ہر حال میں پیچھا کروں گا۔'' یہ کہتے ہوئے اکثم اس کی نگرانی کرنے کے لیے اس کے ساتھ ساتھ رہا اور وہ لڑتا رہا حتی کہ شدید زخمی

1 المستدرك للحاكم: 136/2، والسنن الكبرىٰ للبيهقي: 143/9، ودلائل النبوة للبيهقي: 220,219/4، وزاد المعاد: 324,323/3، والسيرة الحلبية: 39/3.

ہوگیا۔ اس نے زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے خودکشی کر لی۔ اس نے اپنی تلوار کو زمین پر رکھا اور اس کی (اَنی) نوک سینے سے لگائی، پھر اپنا بوجھ تلوار پر ڈال کر اس نے اپنے آپ کو قتل کر لیا۔ اب پیچھا کرنے والا شخص (اکثم) رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا: ''میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: «وَمَا ذَاكَ؟» ''بات کیا ہے؟'' اس نے سارا واقعہ بیان کر دیا۔

تب آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ الرَّجُلَ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ فِيمَا يَبْدُو لِلنَّاسِ وَإِنَّهُ مِنْ أَهْلِ النَّارِ، وَإِنَّهُ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ فِيمَا يَبْدُو لِلنَّاسِ وَإِنَّهُ لَمِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ»

''ایک شخص بظاہر اہل بہشت کے کام کرتا ہے مگر ہوتا دوزخی ہے۔ اور ایک شخص دوزخیوں کے کام کرتا ہے لیکن ہوتا بہشتی ہے۔''[1]

جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور مہاجرینِ حبشہ کی واپسی

فتح خیبر کے روز حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والے دیگر صحابہ واپس تشریف لائے۔ رسول اللہ ﷺ نے جعفر رضی اللہ عنہ کی پیشانی پر بوسہ دیا، سینے سے لگایا اور فرمایا: «مَا أَدْرِي بِأَيِّهِمَا أَنَا أَسَرُّ بِفَتْحِ خَيْبَرَ أَمْ بِقُدُومِ جَعْفَرٍ؟!» ''میں نہیں بتا سکتا کہ کس بات کی زیادہ خوشی ہے، فتح خیبر کی یا آمد جعفر کی؟''[2]

رسول اللہ ﷺ کے جو ساتھی حبشہ میں مقیم تھے انھیں واپس لانے کے لیے آپ ﷺ نے عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ کو نجاشی کے پاس بھیجا تھا۔ عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ ان صحابہ کرام کو دو

[1] صحيح البخاري، حديث: 4207. [2] المستدرك للحاكم:3/409,408، والسنن الكبرى للبيهقي: 8/101، ومجمع الزوائد:9/272,271، والطبقات الكبرى:4/35.

کشتیوں میں بٹھا کر خیبر کے روز رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لائے۔ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ اور ان کے دیگر رفقاء بھی حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے ہمراہ تھے۔[1]

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم نے یمن میں سنا کہ رسول اللہ ﷺ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ کی طرف روانہ ہو چکے ہیں تو ہم بھی آپ ﷺ کی طرف روانہ ہوئے۔ میں تھا اور دو میرے بھائی۔ میں ان میں سب سے چھوٹا تھا۔ ایک کا نام ابو بردہ تھا اور دوسرا ابورُہم اور چند آدمی یا ترپین یا باون افراد ہماری قوم کے تھے۔ ہم ایک کشتی میں سوار ہوئے۔ کشتی نے ہمیں حبشہ میں نجاشی کے پاس پہنچا دیا، وہاں ہمیں جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ملے تو ہم وہیں رہنے لگے، پھر ہم سب اس وقت مدینہ آئے جب رسول اللہ ﷺ نے خیبر میں فتح پالی تھی۔[2]

حضرت جعفر اور دیگر مہاجرین تقریباً انیس سال حبشہ میں رہے۔ اس دوران قرآن کا بڑا حصہ نازل ہو چکا تھا۔ کافروں سے کئی معرکے لڑے جا چکے تھے۔ یوں بعض مسلمانوں نے یہ خیال کیا کہ مہاجرین حبشہ چونکہ اس اجر سے محروم رہے تھے، اس لیے فضیلت میں دوسروں کی نسبت کمتر ہیں۔[3]

مہاجرین حبشہ کی فضیلت: حضرت ابوموسیٰ اشعری سے روایت ہے کہ کچھ لوگ ہم سے کہتے تھے کہ ہم تم سے ہجرت میں سبقت لے گئے ہیں۔ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا ملاقات کے لیے ام المؤمنین حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئیں۔ یہ بھی نجاشی کی طرف ہجرت کرنے والوں میں شامل تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اتفاق سے وہاں پہنچ گئے۔ اسماء رضی اللہ عنہا بھی وہیں موجود تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''یہ کون ہیں؟'' حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بولیں: ''اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا ہیں۔'' پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والی؟ سمندر

---

[1] من معين السيرة لصالح الشامي، ص:353. [2] صحيح البخاري، حديث:4230، وصحيح مسلم، حديث:2502. [3] فقه السيرة للغزالي، ص:350.

میں سفر کرنے والی؟'' اسماء رضی اللہ عنہا نے کہا: ''ہاں!'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ہم نے ہجرت (مدینہ) میں تم سے سبقت حاصل کی، اس لیے ہم تمھاری نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیادہ قریب ہیں۔'' یہ سن کر اسما رضی اللہ عنہا کو انتہائی غصہ آیا۔ انھوں نے کہا: ''اللہ کی قسم! ایسا ہرگز نہیں ہے۔ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ وہ تمھارے بھوکے کو کھانا دیتے اور تمھارے جاہل کو نصیحت کرتے اور ہم دور دراز دشمن کے ملک میں تھے (اور ہمیں اذیت دی جاتی تھی اور ڈرایا دھمکایا جاتا تھا) اور یہ سب اللہ تعالیٰ کے لیے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تھا۔ اللہ کی قسم! میں اس وقت تک نہ کھاؤں گی اور نہ پیوں گی جب تک جو تم نے کہا ہے اس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ کر دوں اور اس کے متعلق پوچھ نہ لوں۔ اللہ کی قسم! میں نہ جھوٹ بولوں گی نہ کج روی اختیار کروں گی اور نہ زائد بات کہوں گی۔'' پھر جب وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو انھوں نے سب کچھ کہہ سنایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «لَيْسَ بِأَحَقَّ بِي مِنْكُمْ، وَلَهُ وَلِأَصْحَابِهِ هِجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ، وَّلَكُمْ أَنْتُمْ، أَهْلُ السَّفِينَةِ هِجْرَتَانِ» ''وہ تم سے زیادہ حق نہیں رکھتے۔ بلکہ ان کی اور ان کے ساتھیوں کی ایک ہجرت ہے اور تمھاری یعنی حبشہ کی طرف کشتی کے ذریعے سفر کرنے والوں کی دو ہجرتیں ہیں۔''[1]

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے عزت و شرف کا یہ نشان لیا اور اس وفد کے ارکان جہاں کہیں تھے ان میں خوب نشر کیا۔[2]

وہ خود کہتی ہیں کہ وہ (ہجرت حبشہ کی سعادت حاصل کرنے والے) میرے پاس گروہ در گروہ آتے اور اس حدیث کو سنتے اور دنیا میں کوئی چیز اتنی خوشی نہ دیتی تھی اور نہ ان کے لیے اتنی مرتبے والی تھی جتنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان تھا۔[3]

1 صحيح البخاري، حديث:4231,4230، وصحيح مسلم، حديث:2503,2502. 2 فقه السيرة للغضبان، ص: 535. 3 صحيح البخاري، حديث:4231,4230، وصحيح مسلم، حديث:2503,2502.

رسول اللہ ﷺ نے فتح خیبر میں شریک صحابہ سے دریافت کرنے کے بعد ہجرت حبشہ والوں کو بھی خیبر کی غنیمتوں میں حصہ دار قرار دیا۔[1]

مال غنیمت کی تقسیم

غزوات میں سب سے زیادہ غنیمت غزوۂ خیبر میں ہاتھ آئی، مثلاً: اراضی، کھجوریں، کپڑے، کھانے کی اشیا وغیرہ۔ کتب سیرت کی بیان کردہ تفصیلات سے درج ذیل اشیائے غنیمت سامنے آتی ہیں:

① کھانا، خیبر کے قلعوں سے کھانے کی اشیاء کی وافر مقدار ہاتھ لگی جس میں چربی، گھی، شہد اور تیل وغیرہ شامل تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان اشیاء کے کھانے کو جائز قرار دیا اور ان میں سے خمس نہیں نکالا۔[2]

② کپڑے، گھریلو سامان، اونٹ، گائے اور بکریاں۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک خمس اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ مصارف میں خرچ کر کے بقیہ چار حصے تقسیم فرما دیے۔

③ قیدی۔ مسلمانوں نے بہت ساری یہودی عورتیں قید کی تھیں۔ یہ غنیمت کے حکم میں آتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے قیدی بھی مسلمانوں میں تقسیم کر دیے۔

④ اراضی اور کھجوریں۔ رسول اللہ ﷺ نے انھیں 36 حصوں میں تقسیم فرمایا، پھر ہر حصہ مزید 100 حصوں میں تقسیم کیا چھتیس سو (3600) حصے بنے۔ رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو کل کا آدھا حصہ ملا۔ یعنی اٹھارہ سو (1800) حصے ملے۔ کل کا دوسرا آدھا حصہ، یعنی اٹھارہ سو (1800) حصے پیش آمدہ مسائل اور مسلمانوں کی عام ضروریات کے لیے رکھے گئے۔

⑤ مسلمانوں کو خیبر میں تورات کے کچھ صحائف بھی ملے۔ یہود نے ان کا مطالبہ کیا۔

---

[1] صحيح مسلم، حديث: 2502، والصراع مع اليهود لأبي فارس: 96/3. [2] الصراع مع اليهود لأبي فارس: 140/3.

رسول اللہ ﷺ نے واپس کرنے کا حکم دیا۔ اور ویسا نہیں کیا جیسا رومیوں نے یروشلم فتح کرتے وقت کیا تھا کہ تمام مقدس کتابیں جلا ڈالیں اور نہ عیسائیوں کی طرح کیا کہ انھوں نے یہود پر اندلس میں غلبہ پاتے وقت تورات کے تمام نسخے جلا دیے تھے۔[1] اور نہ آج کل کے نام نہاد عیسائی پادریوں کی طرح کہ جنھوں نے سب سے سچی الہامی اور ڈیڑھ ارب مسلمانوں کی مقدس کتاب ''قرآن مجید'' کو نذر آتش کیا اور ان کی نام نہاد جمہوری حکومتیں اسے آزادی رائے کا اظہار قرار دے کر خاموش رہیں۔[2]

رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے یہود کو اس شرط پر وہیں رہنے دیا کہ کاشت کاری میں سرمایہ کاری کریں اور محنت کریں تو انھیں وہاں کا آدھا پھل دیا جائے گا۔ مسلمان جب بھی چاہیں، انھیں وہاں سے جلا وطن کر سکتے ہیں۔ بلکہ خود یہود نے آگے بڑھ کر یہ مطالبہ کیا کہ ہم تمھاری نسبت زمین کی زیادہ شناخت رکھتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ اگرچہ انھیں جلاوطن کرنے کا ارادہ فرما چکے تھے، پھر اس شرط پر انھیں خیبر میں رہنے دیا گیا۔[3]

یہ شرط بھی طے ہوگئی تھی کہ مسلمان انھیں جب چاہیں جلاوطن کر سکتے ہیں۔ یہود کا اس زمین کو کاشت کرنا مسلمانوں کے لیے بہتر تھا۔ دوسری بات یہ بھی تھی کہ یہود زمیندار تھے۔ دوسروں کی نسبت اچھی کاشت کاری جانتے تھے، لہٰذا ان کا یہاں رہنا نتیجہ خیز ثابت ہو سکتا تھا۔ خاص طور پر جبکہ وہ اس پر مزدوری کے بجائے زمین کی پیداوار کا حصہ لیں گے۔

رسول اللہ ﷺ نے یہ شرط لگا کر کہ مسلمان جب چاہیں انھیں جلاوطن کر دیں گے۔ ان کو پست رکھنے اور ان کی طاقت توڑنے کا کام کیا تھا۔ یہود کو معلوم ہو گیا تھا کہ ان کی

---

[1] الصراع مع اليهود لأبي فارس: 142,141/3. [2] السيرة النبوية لأبي شهبة: 419/2. [3] سنن أبي داود، حديث: 3410، وسنن ابن ماجه، حديث: 1820، والسيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 328/1.

طرف سے جب بھی مسلمانوں کے مفاد کو ٹھیس پہنچے گی وہ انھیں جلاوطن کر دیں گے اور وہ یہاں دوبارہ کبھی نہیں آسکیں گے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانے میں عملاً ایسا ہی ہوا کہ انھوں نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما پر زیادتی کر کے ان کے بازو کہنیوں سے کھینچ دیے۔ اس سے پہلے انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عبداللہ بن سہل رضی اللہ عنہ پر زیادتی کر کے انھیں شہید کر دیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب ان کے دھوکے اور خیانت کا ثبوت مل گیا تو آپ نے انھیں جلاوطن کر دیا۔[1]

خیبر کے یہود نے چاہا کہ سونا چاندی چھپالیں۔ یوں انھوں نے حیی بن اخطب کی کستوری بھی غائب کر دی۔ حیی بن اخطب بنوقریظہ کے ساتھ قتل ہو گیا تھا۔ جب بنونضیر کو جلاوطن کیا گیا تھا اس وقت وہ کستوری ساتھ اٹھا لایا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حیی بن اخطب کے چچا سعیہ سے حیی کی کستوری کے بارے میں پوچھا: «أَيْنَ مِسْكُ حُيَيِّ بْنِ أَخْطَبَ؟» ''حیی بن اخطب کی کستوری کہاں ہے؟'' وہ کہنے لگا: ''وہ جنگوں اور اخراجات میں ختم ہو گئی ہے۔''[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «اَلْعَهْدُ قَرِيبٌ وَّالْمَالُ أَكْثَرُ مِنْ ذٰلِكَ» ''ابھی اتنا عرصہ بھی نہیں گزرا اور مال بھی کافی زیادہ تھا۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کے حوالے کر دیا۔ انھوں نے اسے کچھ سزا دی۔ اس نے کہا: ''میں نے اس بنجر جگہ حیی کو آتے جاتے دیکھا تھا۔'' صحابہ نے وہاں جا کر ادھر ادھر دیکھا تو اسی بنجر جگہ میں وہ کستوری مل گئی۔[3]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور یہود کے درمیان زمین کی کاشت کاری کا جو معاہدہ طے ہوا تھا اس پر آپ نے عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا۔ وہ ہر سال ان کے پاس آتے اور کاشت

1 تأملات في سيرة الرسول ﷺ لمحمد سيد الوكيل، ص:229,228. 2 السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري:326/1. 3 تاريخ الإسلام (المغازي) للذهبي، ص:424.

کا اندازہ لگا جاتے۔ یہودیوں نے آپ ﷺ کے پاس ان کے اندازے میں سختی کرنے کی شکایت کی اور ساتھ ہی انھیں رشوت کی پیش کش بھی کی۔ انھوں نے کہا: ''اے اللہ کے دشمنو! مجھے حرام کھلاتے ہو؟ اللہ کی قسم! میں تمھارے پاس اس شخص کے پاس سے آیا ہوں جو مجھے سب لوگوں سے زیادہ محبوب ہے۔ رہے تم، تو تم خنزیروں اور بندروں کے خمیر سے اٹھنے والو، مجھے سب سے زیادہ ناپسندیدہ ہو لیکن تمھارے ساتھ میرا البغض اور ان سے میری محبت بھی مجھے اس بات پر نہیں ابھار سکتی کہ میں تم سے عدل سے کام نہ لوں۔'' یہ سن کر وہ کہنے لگے: آسمانوں اور زمین کی بقا اسی عدل و انصاف کی وجہ سے ہے۔''[1]

خیبر اب مسلمانوں کی ملکیت میں آ گیا تھا۔ اور یہ اہم ذریعہ آمدن ثابت ہوا۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: «مَاشَبِعْنَا حَتّٰى فُتِحَتْ خَيْبَرُ» ''ہم نے خیبر فتح ہونے سے پہلے کبھی سیر ہو کر کھانا نہ کھایا تھا۔''[2]

فتح خیبر کے بعد مسلمانوں کی اقتصادی حالت بہتر ہو گئی اور ساتھ ہی مہاجرین نے انصار کے کھجور کے درخت واپس کر دیے جو انھوں نے دے رکھے تھے۔[3]

رسول اللہ ﷺ کا صفیہ بنت حیی بن اخطب رضی اللہ عنہا سے نکاح

مسلمانوں نے جب ابوالحقیق کا قلعہ قموص فتح کر لیا تو سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا بھی قیدیوں میں شامل تھیں، جسے آپ ﷺ نے دحیہ کلبی کو عطا کر دیا۔ ایک آدمی آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا: ''آپ نے دحیہ کو حیی کی بیٹی دے دی جو اپنی قوم (بنوقریظہ اور بنونضیر) کی سردار ہے۔ وہ تو سوائے آپ کے کسی کے لائق نہیں۔'' آپ ﷺ نے اس کی بات کو اچھا جانا اور دحیہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: «خُذْ جَارِيَةً مِّنَ السَّبْيِ غَيْرَهَا» ''تم قیدیوں میں سے کوئی اور لونڈی لے لو۔'' پھر آپ نے صفیہ کو آزاد کر دیا اور ان کی آزادی کو حق مہر قرار دے کر

1 تاريخ الإسلام (المغازي) للذهبي، ص:424. 2 صحيح البخاري، حديث:4243.
3 من معين السيرة لصالح الشامي، ص:352.

ان سے نکاح کر لیا۔[1] اس سے پہلے صفیہ رضی اللہ عنہا مسلمان ہو چکی تھیں۔[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی خیبر سے نکلے نہ تھے کہ صفیہ پاک ہو گئیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں سواری پر اپنے پیچھے سوار کر لیا۔ خیبر سے چھ میل کے فاصلے پر آپ پڑاؤ ڈالنا چاہتے تھے تا کہ ان کے ساتھ رات گزاریں مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات دلی طور پر محسوس ہوئی۔ جب ''صہباء'' پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں فروکش ہوئے۔ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے صفیہ رضی اللہ عنہا کو آراستہ کیا، خوشبو لگائی اور رات کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیج دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دولہا کی حیثیت سے ان کے ہمراہ صبح کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صفیہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا: «مَاحَمَلَكِ عَلَى الْاِمْتِنَاعِ مِنَ النُّزُولِ أَوَّلًا» ''تجھے اس سے پہلے کس بات نے فروکش نہ ہونے پر اکسایا؟'' صفیہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: ''وہاں ابھی یہود قریب تھے۔ مجھے آپ کے متعلق خوف سا ہوا کہ وہ آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچائیں۔'' اس بات سے آپ کے دل میں ان کی عزت بڑھ گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صہباء میں تین دن مقیم رہے۔ ولیمہ کیا اور مسلمانوں کو دعوت دی۔ اس میں گوشت نہ تھا۔ صرف کھجور، پنیر اور گھی تھا۔ مسلمانوں کو پتا نہ تھا کہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا امہات المؤمنین میں سے ہیں یا آپ کی کنیز ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر کا آغاز کیا تو اپنے پیچھے ان کی جگہ بنائی اور پردہ لگایا تو مسلمانوں کو یقین آ گیا کہ وہ امہات المؤمنین سے ہیں۔[3]

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے ایک رات خواب دیکھا تھا۔ امام بیہقی ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بسند صحیح طویل روایت میں ذکر کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صفیہ کی آنکھ پر نیل پڑا دیکھا تو دریافت کیا: «يَا صَفِيَّةُ! مَا هٰذِهِ الْخَضِرَةُ؟» ''صفیہ! یہ نیل کا نشان کیسا ہے؟'' تو وہ کہنے لگیں: ''میرا سر ابن حقیق کی گود میں تھا۔ میں سوئی ہوئی تھی اور خواب دیکھا کہ چاند

1 صحيح البخاري، حديث:371، وصحيح مسلم، حديث:[3497] (84)-1365. 2 الصراع مع اليهود لأبي فارس: 101/3. 3 السيرة النبوية لأبي شهبة: 384/2.

میری گود میں اترا ہے۔ میں نے خواب اسے بتایا تو اس نے میرے چہرے پر تھپڑ مارتے ہوئے کہا: تو نے یثرب کے بادشاہ کی آرزو کی (یعنی شادی کرنا چاہتی) ہے؟''[1]

یوں اللہ تعالیٰ نے صفیہ رضی اللہ عنہا کا خواب سچ کر دکھایا اور انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آنے کا شرف بخشا۔ دوزخ سے چھٹکارا دلا دیا اور مومنوں کی ماں بنا دیا۔ جنت میں خاتم الانبیاء والمرسلین کی زوجہ محترمہ کا شرف بخشا۔[2] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی عزت افزائی فرمائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے اونٹ کے پاس جاتے، اپنا گھٹنا رکھ دیتے تاکہ صفیہ اپنا قدم اس مبارک زانو پر رکھ کر سوار ہوں۔ وہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتنا ادب کرتی تھیں کہ اپنا پاؤں کبھی بھی اس مبارک گھٹنے پر نہ رکھتیں بلکہ اپنا گھٹنا اس پر رکھ کر سوار ہو جاتیں۔[3]

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا خود اخلاقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہتر اخلاق والا نہیں دیکھا۔ میں خیبر میں رات کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی پر سوار تھی۔ مجھے اونگھ آتی تو میرا سر کجاوے سے لگ جاتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے ہاتھ سے جگاتے ہوئے فرماتے: «يَا هٰذِهِ مَهْلًا» ''ارے! ذرا سنبھل کر۔''[4] حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ مجھے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حفصہ رضی اللہ عنہا کی یہ بات پہنچی کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں صفیہ سے زیادہ قدر و منزلت والی ہیں کیونکہ ہم ازواجِ رسول بھی ہیں اور عم زاد بھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب صفیہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے تو انھوں نے یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «أَلَا قُلْتِ: وَكَيْفَ تَكُونَانِ خَيْرًا مِّنِّي، وَزَوْجِي مُحَمَّدٌ وَّأَبِي هَارُونُ وَ عَمِّي مُوسٰى؟!» ''تم نے اس طرح کیوں نہ کہا کہ تم مجھ سے کیسے بہتر ہو سکتی ہو، جبکہ میرے خاوند محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)، میرے باپ ہارون علیہ السلام اور میرے چچا موسیٰ علیہ السلام ہیں۔''[5]

1 السنن الكبرىٰ للبيهقي: 138/9. 2 الصراع مع اليهود لأبي فارس: 122/3. 3 صحيح البخاري، حديث: 2235. 4 مجمع الزوائد: 252/9، ومسند أبي يعلىٰ، رقم: 7120. 5 جامع الترمذي، حديث: 3892، والمستدرك للحاكم: 29/4.

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق سے بے حد متاثر ہوئیں۔ اس کا نتیجہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ہاں تمام لوگوں سے زیادہ محبوب بن گئے بلکہ آپ ان کے ہاں ان کی اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب ٹھہرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی بیمار پڑتے تو وہ آرزو کرتیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحت و عافیت سے رہیں اس کے بدلے میں مرض مجھے لاحق ہو جائے۔

ابن سعد نے حسن سند سے حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ کے حوالے سے روایت بیان کی ہے کہ مرض الموت کے وقت تمام ازواجِ مطہرات جمع تھیں۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کہنے لگیں: ''اللہ کے نبی، اللہ کی قسم! میں یہ پسند کرتی ہوں کہ جو مرض آپ کو لاحق ہے مجھے لاحق ہو جائے۔'' دیگر ازواج مطہرات نے ان کو ایسی بات سے باز رہنے کا آنکھوں سے اشارہ کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیگر ازواج کو دیکھ لیا تو فرمایا: «مَضْمِضْنَ» ''تم سب کلی کرو۔''

انھوں نے عرض کیا: ''کس بنا پر؟''

فرمایا: «مِنْ تَغَامُزِكُنَّ بِهَا وَاللّٰهِ إِنَّهَا لَصَادِقَةٌ» ''اس بنا پر کہ تم نے اسے کنکھیوں سے اشارہ کیا ہے، حالانکہ اللہ کی قسم! وہ سچی ہے۔''[1]

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح کا ایک پہلو یہ بھی رہا کہ جس دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے تو ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ آپ کی حفاظت کرتے رہے۔ ابن اسحاق سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر ہی میں یا خیبر کے راستے میں کسی جگہ صفیہ رضی اللہ عنہا سے شادی کی۔ ابو ایوب خالد بن زید رضی اللہ عنہ تلوار لے کر رات بھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خیمے کا پہرہ دیتے رہے، یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ صبح جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو ایوب رضی اللہ عنہ کو اپنی جگہ دیکھا تو پوچھا: «مَالَكَ يَا أَبَا أَيُّوبَ؟»

''ابو ایوب کیا بات ہے؟''

انھوں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! مجھے آپ کے متعلق اس عورت کا اندیشہ

[1] سیر أعلام النبلاء: 235/2.

تھا۔ یہ وہ عورت ہے جس کے باپ، شوہر اور قوم کو آپ نے ختم کر دیا ہے اور یہ ابھی نئی نئی مسلمان ہوئی ہے، اس لیے مجھے آپ ﷺ کے متعلق اس سے خطرہ تھا۔''[1]

رسول اللہ ﷺ ان کے اس عمل پر بہت خوش ہوئے۔ ان کا یہ عمل محبت و ایمان کا تقاضا تھا۔ آپ ﷺ نے ان کے لیے دعا فرمائی:

«اَللّٰهُمَّ احْفَظْ أَبَا أَيُّوبَ كَمَا بَاتَ يَحْرُسُنِي»

''اے اللہ! تو ابو ایوب کی حفاظت فرما جیسا کہ اس نے رات بھر میری حفاظت کی ہے۔''[2]

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ شادی کرنے میں بڑی حکمت تھی۔ اس نکاح سے رسول اللہ ﷺ کا ارادہ شہوت پوری کرنا نہ تھا۔ جیسا کہ کچھ لوگ بہتان تراشی کرتے ہیں۔ آپ ﷺ کا مقصود صرف یہ تھا کہ اسے عزت ملے اور اسے ایسے عام آدمی کے حوالے نہ کیا جائے جو اس کے حسب ونسب سے میل نہ کھاتا ہو۔ اس کا باپ، بھائی اور قوم کے بہت سے لوگ قتل ہو چکے تھے۔ یوں اسے کچھ حوصلہ بھی ہوا۔ آپ ﷺ کے اس کے ساتھ اس سلوک سے بہتر کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ نبی اکرم ﷺ اور یہود کے درمیان سسرالی رشتہ قائم کرنا بھی مقصود تھا۔ اس امید پر کہ عین ممکن ہے اس طرح اسلام کے ساتھ ان کی دشمنی میں کمی آئے۔ وہ اسلام کے پرچم تلے آ جائیں اور ان کی ریشہ دوانیوں میں کچھ کمی آ جائے۔[3]

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا بڑی زیرک، بردبار اور سچی خاتون تھیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کی لونڈی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس آئی اور شکایت کی کہ صفیہ رضی اللہ عنہا ہفتے کے روز سے محبت رکھتی ہے اور یہود سے صلہ رحمی کرتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی طرف دریافت کرنے کے لیے قاصد بھیجا۔ انھوں نے جواب دیا: ''جب سے ہفتے کے دن

[1] زاد المعاد: 328/3. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 355,354/3، السيرة النبوية لأبي شهبة: 385/2. [3] السيرة النبوية لأبي شهبة: 385/2.

کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے مجھے جمعہ عطا کیا ہے میں نے کبھی ہفتے کے دن کو پسند نہیں کیا۔ رہے یہود تو ان سے میری رشتہ داری ہے۔ میں ان سے صلہ رحمی کرتی ہوں۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی وضاحت قبول کی۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے کنیز سے پوچھا: ''تم نے ایسا کیوں کہا؟'' جواب دیا: ''شیطان نے اکسایا تھا۔'' حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے جواباً کہا: ''جاؤ تم آزاد ہو۔''

ام المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا رمضان 50 ھ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں فوت ہوئیں۔ بعض نے 52 ھ کا تذکرہ کیا۔[1]

زہر آلود بکری، یہود کی ناپاک جسارت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب خیبر فتح ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک زہر آلود بکری ہدیہ دی گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «اِجْمَعُوا لِي مَنْ كَانَ هَاهُنَا مِنَ الْيَهُودِ» ''یہاں جتنے یہود ہیں انھیں اکٹھا کرو۔'' وہ اکٹھے کیے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِنِّي سَائِلُكُمْ عَنْ شَيْءٍ فَهَلْ أَنْتُمْ صَادِقِيَّ عَنْهُ؟» ''میں تم سے کسی چیز کے متعلق دریافت کروں گا، کیا تم مجھے سچ سچ بتاؤ گے؟'' انھوں نے کہا: ''ہاں، ابوالقاسم!'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: «مَنْ أَبُوكُمْ؟» ''تمھارا جداعلیٰ کون ہے؟'' انھوں نے کہا: ''فلاں شخص ہے۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «كَذَبْتُمْ، بَلْ أَبُوكُمْ فُلَانٌ» ''تم لوگوں نے غلط بتایا ہے بلکہ تمھارا باپ فلاں ہے۔'' انھوں نے کہا: ''آپ نے درست کہا ہے۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا: «فَهَلْ أَنْتُمْ صَادِقِيَّ عَنْ شَيْءٍ إِنْ سَأَلْتُكُمْ عَنْهُ؟» ''اگر میں تم سے کسی چیز کے بارے میں دریافت کروں تو کیا میرے سامنے سچ کہو گے؟''

[1] السيرة النبوية لأبي شهبة: 385/2.

انھوں نے کہا: ’’ہاں اے ابوالقاسم! اور اگر ہم جھوٹ بولیں گے تو آپ کو سابقہ سوال کی طرح معلوم ہو جائے گا۔‘‘ آپ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ أَهْلُ النَّارِ؟» ’’دوزخی کون ہیں؟‘‘ وہ بولے: ’’ہم دوزخ میں تھوڑی مدت کے لیے رہیں گے، بعدازاں تم ہماری جگہ آ ؤ گے۔‘‘ آپ ﷺ نے فرمایا: «اِخْسَؤُوا فِيهَا، وَاللّٰهِ! لَا نَخْلُفُكُمْ فِيهَا أَبَدًا» ’’تم ہی اس میں ذلیل وخوار ہو کر رہو، اللہ کی قسم! ہم وہاں تمھارے بعد ہرگز نہ ہوں گے۔‘‘

آپ ﷺ نے پھر دریافت فرمایا:

«فَهَلْ أَنْتُمْ صَادِقِيَّ عَنْ شَيْءٍ إِنْ سَأَلْتُكُمْ عَنْهُ؟»

’’اگر میں تم سے کوئی بات پوچھوں تو کیا تم میرے سامنے سچ کہو گے؟‘‘

انھوں نے کہا: ’’ہاں۔‘‘

آپ ﷺ نے پوچھا: «هَلْ جَعَلْتُمْ فِي هٰذِهِ الشَّاةِ سُمًّا؟»

’’کیا تم نے اس بکری (کے گوشت) میں زہر ملایا ہے؟‘‘

انھوں نے کہا: ’’ہاں۔‘‘ آپ ﷺ نے پوچھا: «مَا حَمَلَكُمْ عَلٰى ذٰلِكَ؟» ’’تمھیں اس بات پر کس نے آمادہ کیا؟‘‘ انھوں نے کہا: ’’اس بات نے کہ اگر آپ جھوٹے ہیں تو ہمیں آپ سے راحت مل جائے گی اور اگر نبی ہیں تو یہ آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔‘‘ [1]

بلوغ الأمانی کے مولف لکھتے ہیں کہ یہ زہریلی بکری آپ ﷺ کو سلام بن مشکم کی بیوی زینب بنت حارث نے بطور ہدیہ دی تھی۔ زینب پہلے دریافت کر چکی تھی کہ بکری کا کون سا حصہ آپ ﷺ کو زیادہ مرغوب ہے۔ اسے بتایا گیا کہ آپ ﷺ کو دستی زیادہ پسند ہے تو اس نے دستی میں نسبتاً زیادہ زہر ملا دیا۔ آپ ﷺ نے جب دستی اٹھا کر تناول فرمائی۔ پہلا ہی لقمہ چبایا مگر نگلا نہ۔ آپ کے ساتھ بشر بن براء رضی اللہ عنہ بھی کھانے میں شریک

[1] صحيح البخاري، حديث: 3169، ومسند أحمد: 451/2.

تھے۔ انھوں نے لقمہ اٹھا کر کھالیا اور نگل گئے اور اس سے وفات پا گئے۔ [1]

عروہ بن زبیر کی ''مغازی'' میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دستی لی اور اس میں سے کچھ کھایا، جبکہ بشر رضی اللہ عنہ نے دوسری ہڈی لی اور اس میں سے کھایا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اگل دیا تو بشر رضی اللہ عنہ نے بھی جو کچھ منہ میں تھا، اگل دیا، پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «اِرْفَعُوا أَيْدِيَكُمْ، فَإِنَّ كَتِفَ الشَّاةِ تُخْبِرُنِي أَنِّي قَدْ بُغِيتُ فِيهَا» ''اپنے ہاتھ اٹھا لو، یہ دستی مجھے بتا رہی ہے کہ میں زہر آلود ہوں۔'' اب حضرت بشر بن براء رضی اللہ عنہ نے کہا: ''قسم اس ذات کی جس نے آپ کو عزت عطا کی ہے! میں نے بھی اس کھانے میں یہی محسوس کیا جو کھا چکا ہوں۔ مگر میں نے اسے صرف اسی لیے نہیں پھینکا تھا کہ آپ ﷺ کا کھانا ترک کرنا مجھے اچھا نہ لگا۔ اور پھر جب آپ ﷺ نے اپنے منہ مبارک میں موجود کھانا کھا لیا تو مجھے ہرگز اپنی جان آپ ﷺ سے عزیز تر نہ تھی (مگر میری یہی خواہش ہے کہ کاش! آپ اسے زہر آلود ہونے کی بنا پر نہ کھاتے) مجھے امید تھی کہ اگر یہ کھانا زہر آلود ہے تو آپ ﷺ ضرور اسے ترک کر دیں گے۔'' [2]

ابن قیم رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس عورت کو رسول اللہ ﷺ کے پاس لایا گیا تو وہ بولی: ''میں آپ (ﷺ) کو قتل کر دینا چاہتی تھی۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: «مَاكَانَ اللّٰهُ لِيُسَلِّطَكِ عَلَيَّ» ''اللہ تعالیٰ تجھے مجھ پر طاقت دینے والا نہیں۔'' صحابہ نے عرض کیا: ''اسے قتل نہ کر دیں؟'' فرمایا: «لَا» ''نہیں۔'' [3] آپ ﷺ نے اسے کچھ نہ کہا اور نہ ہی سزا دی۔ آپ نے گردن کے پاس کمر پر سینگی لگوائی اور دیگر متاثرین کو بھی سینگی کا حکم دیا مگر کچھ صحابہ اس بنا پر وفات بھی پا گئے۔

اس عورت کے قتل کے متعلق اختلاف ہے مگر صحیح یہ ہے کہ جب حضرت بشر بن

---

1 بلوغ الأماني بحاشية الفتح الرباني: 123/21. 2 مغازي رسول الله ﷺ لعروة بن الزبير، ص: 198، والمعجم الكبير للطبراني، رقم: 1204، ومجمع الزوائد: 153/6. 3 صحيح مسلم، حديث: 2190.

براء رضی اللہ عنہ وفات پا گئے تو اسے قتل کر دیا گیا تھا۔[1]

وہ زہر انتہائی مہلک تھا، اس لیے حضرت بشر بن براء رضی اللہ عنہ فوراً وفات پا گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی رفیق اعلیٰ کے پاس چلے جانے تک اس زہر کی تکلیف محسوس کرتے رہے۔[2]

امام بخاری رحمہ اللہ اپنی صحیح میں روایت لائے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مرض الموت میں فرما رہے تھے:

«يَا عَائِشَةُ! مَا أَزَالُ أَجِدُ أَلَمَ الطَّعَامِ الَّذِي أَكَلْتُ بِخَيْبَرَ فَهٰذَا أَوَانُ وَجَدْتُ انْقِطَاعَ أَبْهَرِي مِنْ ذٰلِكَ السُّمِّ»

''عائشہ! میں نے جو کھانا خیبر میں کھایا تھا اس کی تکلیف برابر پاتا رہا ہوں۔ اس وقت بھی اس زہر کی وجہ سے رگِ جاں کا کٹ جانا محسوس کر رہا ہوں۔''[3]

حجاج بن علاط سلمی رضی اللہ عنہ کا مکہ مکرمہ سے اپنے اموال واپس لانا

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ خیبر فتح ہو جانے کے بعد حجاج بن علاط نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! مکہ میں میرا بہت سا مال ہے اور میرے گھر والے بھی وہیں ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان سے حساب کتاب کر لوں۔ اور مجھے ضرورتاً کچھ غلط باتیں بھی کہنی پڑیں گی۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حسب ضرورت کچھ کہنے کی اجازت دے دی۔ مکہ پہنچ کر وہ اپنی بیوی کے پاس آیا اور اس سے کہا: ''تمھارے پاس جو دولت ہے ساری اکٹھی کر کے مجھے دے دو۔ میرا ارادہ ہے کہ میں خیبر جا کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کی (جو) غنیمت (یہود کے ہاتھ آئی ہے اسے) خرید لوں۔ وہ تمام قتل کر دیے گئے ہیں۔ ان کے اموال لوٹ لیے گئے ہیں۔ یہ بات مکہ

[1] زاد المعاد: 336/3. [2] الصراع مع اليهود لأبي فارس: 121/3. [3] صحيح البخاري، حديث: 4428 بعد الحديث: 4430، وفتح الباري، شرح الحديث: 5777.

مکرمہ میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ مسلمان اپنی اپنی جگہ چھپ گئے۔ مشرکین نے بڑے جشن اور خوشی کا اظہار کیا۔ یہ خبر عباس رضی اللہ عنہ کو پہنچی تو ان کی ٹانگیں کانپنے لگیں اور وہ کھڑے ہونے سے بھی گئے۔

معمر کہتے ہیں کہ مجھے عثمان جزری نے مقسم کے حوالے سے بتایا کہ عباس پشت کے بل چت لیٹ گئے اور اپنا بیٹا ''قثم'' جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ تھا اپنے سینے پر بٹھا لیا اور درج ذیل اشعار کہنے لگے:

''میرا پیارا بیٹا قثم، میرا پیارا بیٹا قثم، اس اونچی ناک والے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) سے ملتا جلتا۔''

''جو بھی اسے ناپسند کرے اس کی ناپسندیدگی کے باوجود وہ اس محسن و منعم پروردگار کا نبی ہے۔''

ثابت بن انس کہتے ہیں: پھر انھوں نے اپنا غلام حجاج کی طرف یہ پیغام دے کر بھیجا کہ تو ذلیل ہو کیسی خبر لایا ہے؟ اور کیا کہتا ہے؟ تیری خبر سے تو اللہ تعالیٰ کا کیا ہوا وعدہ بہت بہتر ہے۔ حجاج بن علاط نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے غلام سے کہا: ''ابو الفضل عباس کو میرا سلام کہنا اور ان سے کہنا کہ اپنے کسی گھر میں مجھ سے علیحدہ ملنے کا بندوبست کریں تاکہ میں ان کے پاس آسکوں۔ خبریں اس کی خوشی کے عین مطابق ہیں۔''

غلام واپس پلٹا اور جب گھر کے دروازے پر آیا تو کہنے لگا: ''ابو الفضل! آپ کو مبارک ہو۔'' عباس رضی اللہ عنہ خوشی کے مارے اُچھل پڑے۔ اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ اس نے حجاج کی ساری گفتگو کہہ سنائی۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اسے آزاد کر دیا، پھر حجاج رضی اللہ عنہ بھی عباس رضی اللہ عنہ کے پاس آگئے۔ انھیں بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر فتح کر لیا ہے، ان کے اموال بطور غنیمت ہاتھ لگ گئے ہیں، اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ان کی تقسیم بھی ہو چکی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صفیہ بنت حیی کو اپنے لیے پسند فرما کر اسے اختیار دیا ہے کہ

چاہے تو وہ آزاد رہے اور چاہے تو آپ کی بیوی کی حیثیت سے رہے۔[1]

میں تو یہاں اپنے مال کی غرض سے آیا ہوں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اجازت طلب کی تھی اور آپ ﷺ نے مجھے دے دی تھی۔ اے ابو الفضل! تین دن تک اس خبر کو پوشیدہ رکھو، پھر جیسے چاہو کہہ ڈالو۔[2]

حجاج کی بیوی نے تمام زیور اور سامان اکٹھا کر کے اسے دے دیا اور وہ سامان سمیٹ کر چپکے سے نکل گئے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ تین دن کے بعد حجاج کی بیوی کے پاس گئے اور کہا: ''تمھارے خاوند نے کیا کیا؟'' اس نے بتایا کہ وہ تو فلاں فلاں دن چلا گیا ہے۔ وہ کہنے لگی: ''اے ابو الفضل! اللہ تعالیٰ آپ کو ہرگز رسوا نہ کرے گا۔ آپ کو جو خبر پہنچی ہے ہمیں اس کا دکھ ہوا ہے۔'' عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ایسا ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے رسوا نہیں کیا اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ وہی ہوا جو ہم چاہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے خیبر فتح کر دیا ہے۔ تمھیں اگر ضرورت ہے تو اپنے خاوند کے پاس جا سکتی ہو۔'' وہ کہنے لگی: ''بخدا معلوم ہوتا ہے آپ سچ کہتے ہیں۔'' حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں سچا ہوں۔ معاملہ ایسے ہی ہے جیسے میں نے تمھیں بتایا۔'' پھر عباس رضی اللہ عنہ قریش کی مجالس کے پاس گئے۔ عباس رضی اللہ عنہ جب وہاں سے گزرے تو وہ کہنے لگے: ''اے ابو الفضل! تم کو خیر و عافیت ہی ملے گی۔'' حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے جواباً فرمایا: ''الحمد للہ! اللہ تعالیٰ نے مجھے عافیت ہی سے نوازا ہے۔ حجاج بن علاط نے مجھے بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خیبر فتح کر دیا ہے۔ اس میں خدائی تقسیم کا اجرا بھی ہو چکا ہے۔ آپ ﷺ نے صفیہ بنت حیی کو اپنے پاس رکھ لیا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ یہ خبر تین دن تک پوشیدہ رکھنا۔ وہ تو صرف اپنا مال سمیٹنے آیا تھا اور اس کا جو بھی مال یہاں تھا اسے لے کر واپس چلا جانا چاہتا تھا۔''

[1] صحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 459. [2] تاريخ الإسلام (المغازي) للذهبي، ص: 439.

اس خبر کے پھیلنے کے ساتھ ہی جو غم مسلمانوں کو لاحق تھا مشرکین کو لاحق ہو گیا۔ تمام مسلمان باہر نکل آئے اور جو کوئی بھی عباس رضی اللہ عنہ کے گھر چھپ کر بیٹھا تھا سب عباس رضی اللہ عنہ کے پاس جمع ہو گئے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے یہی خبر انھیں بھی دی۔ تمام مسلمانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ تمام غم، پریشانی اور ملال اللہ تعالیٰ نے مشرکین پر ڈال دیا۔[1]

اس روایت میں بہت سی سمجھنے والی باتیں اور فقہی مسائل ہیں:

جب انسان اپنا حق لینے کے لیے اپنے متعلق یا دوسرے کے متعلق جھوٹ بولے، جبکہ اس سے دوسرے شخص کا نقصان نہ ہو رہا ہو تو یہ درست ہے۔ حجاج بن علاط نے مسلمانوں کے متعلق جھوٹ بولا تاکہ مکہ سے اپنے مال سمیٹ سکے، جبکہ اس جھوٹ سے وہاں مقیم مسلمانوں کو کوئی نقصان نہیں ہوا مگر اس سے مکی مسلمانوں کو جو غم اور تکلیف ہوئی اس کے بعد انھیں سچی خبر سے کامل طور پر خوشی اور مسرت بھی حاصل ہوئی اور ایمان مزید بڑھ گیا، لہٰذا اس بڑے فائدے کا سبب یہی جھوٹ تھا۔

غزوے سے متعلق بعض فقہی احکام

① **گھریلوں گدھوں کا حرام ہونا:** حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے دن گھریلو گدھوں کے گوشت سے منع فرما دیا۔[2]

② **حاملہ کنیزوں سے مجامعت کی حرمت:** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: «مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلَا يَسْقِ مَاءَهُ زَرْعَ غَيْرِهِ» ”جو کوئی اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے وہ دوسرے کی کھیتی کو پانی نہ پلائے۔“[3]

---

[1] مسند أحمد: 139,138/3، والمصنف لعبدالرزاق: 5/466-469، والسنن الكبرىٰ للبيهقي: 151/9، والمعجم الكبير للطبراني، رقم: 3196، والمسند لأبي يعلىٰ، رقم: 3479، ومسند البزار، رقم: 1816. [2] صحيح البخاري، حديث: 4218، وصحيح مسلم، حديث: [5008]-561.
[3] سنن أبي داود، حديث: 2158، وجامع الترمذي، حديث: 1131.

③ غیر حاملہ کنیزوں سے استبرائے رحم سے پہلے مجامعت کی حرمت: فرمانِ رسول ﷺ ہے: «لَا يَحِلُّ لِامْرِئٍ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ يَّقَعَ عَلَى امْرَأَةٍ مِّنَ السَّبْيِ حَتّٰى يَسْتَبْرِئَهَا» ”جو شخص اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اس کے لیے درست نہیں کہ کسی کنیز سے حیض سے پاک ہونے سے پہلے جماع کرے۔“[1]

صرف ایک حیض سے پاک ہونا ہی استبرائے رحم کہلاتا ہے۔ اس کے لیے عدت ضروری نہیں، خواہ وہ کافر سے شادی شدہ ہو، خواہ وہ مر چکا ہو یا بقید حیات ہو کیونکہ عدت فوت ہونے والے خاوند سے وفا داری اور غم کے اظہار کے لیے ہوتی ہے، جبکہ کافر پر اظہار غم نہیں ہوتا۔[2]

④ ربا الفضل کی حرمت: حضرت ابوسعید خدری اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو خیبر کا عامل بنایا۔ وہ آپ ﷺ کے پاس جنیب (عمدہ قسم کی) کھجور لے کر آیا تو رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا: «كُلُّ تَمْرِ خَيْبَرَ هٰكَذَا؟» ”کیا خیبر کی ساری کھجور ایسی ہی ہوتی ہے؟“ وہ بولا: اے اللہ کے رسول! ایسی نہیں ہوتی۔ ہم اس کھجور کا ایک صاع، دوسری کھجور کے دو یا تین صاع کے بدلے لیتے ہیں۔“ تب آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «لَا تَفْعَلْ، بِعِ الْجَمْعَ بِالدَّرَاهِمِ ثُمَّ ابْتَعْ بِالدَّرَاهِمِ جَنِيباً» ”ایسا نہ کیا کرو، جمع شدہ کھجور کو دراہم کے عوض بیچو، پھر دراہم سے یہ عمدہ کھجوریں خرید لیا کرو۔“[3]

لہٰذا ایک ہی جنس کے تبادلے میں کمی بیشی سود ہے اور یہی ”ربا الفضل“ ہے، یعنی جب

---

1. سنن أبي داود، حديث: 2159,2158، والسنن الكبرىٰ للبيهقي: 124/9، ومسند أحمد: 108/4. 2. الصراع مع اليهود لأبي فارس: 134/3. 3. صحيح البخاري، حديث: 4244، وصحيح مسلم، حديث: 1593.

ایک صاع کے بدلے میں ایک سے زیادہ صاع لے لے تو یہ زیادتی سود کہلاتی ہے۔ اور یہ حرام ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ آپ ﷺ نے اس کا بہتر حل بیان فرمایا کہ پہلے اپنے پاس موجود کھجور فروخت کر دو، پھر اس رقم کے عوض جس قدر چاہے عمدہ یا دوسری قسم کی کھجور خرید لو کیونکہ ضرورت اور مجبوری کبھی بھی کسی کو سود کے قبول کرنے پر آمادہ کر سکتی ہے۔[1]

⑤ سونے کے ڈھیلے کی بیع خالص سونے سے اور چاندی کے ڈھیلے کی خالص چاندی سے بیع: حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے روز سونے کے ڈھیلے کی خرید و فروخت خالص ڈھلے ہوئے سونے کے بدلے منع فرما دیا۔ اسی طرح چاندی کا ڈھیلا خالص ڈھلی ہوئی چاندی کے بدلے میں بھی ممنوع ہے۔ ارشاد نبوی ہے: «اِبْتَاعُوا تِبْرَ الذَّهَبِ بِالْوَرِقِ الْعَيْنِ وَتِبْرَ الْفِضَّةِ بِالذَّهَبِ الْعَيْنِ» "سونے کی ڈلی کی بیع بغیر ڈلی یا خالص چاندی سے کر لو۔ اور چاندی کی ڈلی کی بیع خالص سونے یا ڈلی سے کر لو۔"[2]

حدیث شریف کا مقصد یہ ہے کہ سونا سونے کے بدلے برابر خریدا جائے۔ اور چاندی چاندی کے بدلے برابر برابر خریدی جائے، کمی یا زیادتی نہ ہو۔ مگر جب سونا چاندی کے بدلے میں ہو تو برابری ضروری نہیں ہے۔[3]

⑥ مساقات اور مزارعت کا جواز: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے خیبر کی زمین خیبر کے یہودیوں کو اسی شرط پر دی کہ وہ اس میں زراعت اور محنت و مشقت کریں اور آدھی پیداوار وہ لیں۔[4]

1 الصراع مع اليهود لأبي فارس: 134/3. 2 السيرة النبوية لابن هشام: 346/3. 3 صور وعبر من الجهاد النبوي للدكتور فوزي فيض الله، ص: 321. 4 صحيح البخاري، حديث: 4248.

بعض محققین نے یہاں سوال اٹھایا ہے کہ ان بیوع کے احکام خیبر کے موقع پر کیوں آئے اس میں کیا راز ہے؟

اس کا جواب شیخ ابو زہرہ نے یوں دیا ہے کہ خیبر کی فتح مالی لین دین کے اعتبار سے ایک نئی فتح تھی، لہٰذا اس وقت ہی مزارعت و مساقات کا حکم سامنے آیا جبکہ عام طور پر یہ یثرب میں نہ ہوتا تھا۔[1]

⑦ **متعہ کی حرمت:** حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے روز عورتوں سے متعہ کرنا منع فرما دیا اور گھریلو گدھوں کا گوشت بھی۔[2]

غزوۂ خیبر میں خواتین کی شرکت

حضرت امیہ بنت ابی الصلت بنوغفار کی ایک خاتون سے بیان کرتی ہیں کہ میں بنوغفار کی چند عورتوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ ہم نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! ہم سب نے ارادہ کیا ہے کہ اس سفر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہیں گی تاکہ زخمیوں کا علاج اور مرہم پٹی کر سکیں اور اپنی طاقت کے مطابق ان کی مدو بھی کریں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «عَلٰى بَرَكَةِ اللّٰهِ» ''اللہ تعالیٰ سے برکت کی امید رکھتے ہوئے چل پڑو۔'' یہ غفاری عورت کہتی ہیں کہ پھر ہم سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ روانہ ہوئیں۔ اللہ کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کے وقت اترے اور میں بھی کجاوے سے اتری۔ کہتی ہیں کہ میں نے دیکھا کہ کجاوے میں میری بیٹھنے کی جگہ پر میرا خون پڑا ہوا ہے۔ یہ ایام حیض کا پہلا خون تھا جو مجھے آیا، چنانچہ میں اونٹنی کی طرف سمٹ گئی اور مجھے بڑی شرم آئی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری حالت دیکھی اور خون دیکھا تو فرمایا: «مَالَكِ، لَعَلَّكِ نُفِسْتِ؟» ''تجھے کیا ہوا؟ شاید تیرے مخصوص ایام آئے ہیں؟'' میں نے عرض کیا:

---

1 خاتم النبيين لأبي زهرة: 1104/2، والصراع مع اليهود لأبي فارس: 136/3. 2 صحيح البخاري، حديث: 5523، وصحيح مسلم، حديث: 1407.

’’جی ہاں۔‘‘ فرمایا: «فَأَصْلِحِي مِنْ نَّفْسِكِ، ثُمَّ خُذِي إِنَاءً مِّنْ مَّاءٍ فَاطْرَحِي فِيهِ مِلْحًا، ثُمَّ اغْسِلِي مَا أَصَابَ الْحَقِيبَةَ مِنَ الدَّمِ، ثُمَّ عُودِي لِمَرْكَبِكِ» ’’تو اپنے آپ کو درست کر، (یعنی اپنی شرمگاہ پر کوئی کپڑا یا کوئی ایسی چیز رکھ لو جس سے خون باہر نہ نکلے) پھر پانی کا ایک برتن لے اس میں نمک ڈال، پھر اس سے گٹھڑی میں جہاں خون لگا ہے دھو ڈال اور اپنی سواری پر واپس چلی جا۔‘‘

جب خیبر فتح ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے مال غنیمت میں سے مجھے بھی کچھ دیا اور یہ ہار جو میرے گلے میں نظر آ رہا ہے آپ ﷺ نے اس موقع پر مجھے عنایت فرمایا تھا اور اپنے دستِ مبارک سے میرے گلے میں ڈالا تھا۔ اللہ کی قسم! یہ ہار میرے گلے سے کبھی دور نہیں ہوا۔

انھوں نے یہ وصیت بھی کی تھی کہ یہ ہار بھی ان کے ساتھ ہی قبر میں دفن کیا جائے۔ ان کا بیان ہے کہ ایام کے بعد جس پانی سے طہارت کرتی تھیں اس میں نمک ضرور ملاتی تھیں اور انھوں نے یہ بھی وصیت کی تھی کہ جب مروں تو غسل کے پانی میں بھی نمک ملا لیا جائے۔[1] ہر نوجوان عورت کے سامنے ایک ایسی عورت کی زندہ تصویر ہے جو مسلمانوں کے شانہ بشانہ جہاد میں شرکت کا ارادہ رکھتی ہے۔[2]

رسول اللہ ﷺ اسی طرح صلح و جنگ کے زمانے میں امت کی تربیت فرماتے تھے۔

فتح خیبر کا اثر

خیبر، فدک، وادی القریٰ اور تیماء کی فتح سے جزیرۃ العرب کے مختلف قبائل میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ قریش کو غیظ و غضب اور پریشانی نے آلیا۔ انھیں اس بات کی ہرگز توقع نہ تھی کیونکہ یہود کے مضبوط ترین قلعوں، ان کے لاتعداد جنگجوؤں، بے بہا اسلحے اور دیگر

[1] مسند أحمد: 380/6، والسنن الكبرىٰ للبيهقي: 407/2، والسيرة النبوية لابن هشام: 357/3، والبداية والنهاية: 204/4. [2] فقه السيرة للغضبان، ص: 534.

سازوسامان کا انھیں بخوبی علم تھا۔[1]

وہ عربی قبائل جو قریش کے ہمنوا اور مددگار تھے، انھیں بھی خیبر میں یہود کی شکست اور مسلمانوں کی فتح نے پریشان اور رسوا کر دیا تھا۔ نتیجتاً وہ مسلمانوں کے ساتھ صلح کی طرف مائل ہونے لگے کیونکہ انھیں احساس ہو چکا تھا کہ مسلمانوں کی دشمنی سے انھیں کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس فتح نے جزیرۃ العرب کے کناروں تک اسلام کے پھیلنے کی راہ ہموار کر دی۔ مسلمانوں کا اقتصادی و معاشی استحکام بھی دشمن کی نظر میں ان کے پروقار ہونے کا سبب بنا۔[2]

فتح خیبر کے بعد چھوٹے چھوٹے لشکر ارسال کرنے کا کام جاری رہا۔ رسول اللہ ﷺ نے جلیل القدر صحابہ کرام کو ان لشکروں کا سپہ سالار بنایا۔ بعض مہمات میں جنگ کی نوبت آئی اور بعض میں نوبت جنگ تک نہ پہنچی۔[3]

[1] نضرة النعيم:353/1. [2] نضرة النعيم:353/1. [3] السيرة النبوية للندوي، ص:221.

باب 2

حکمرانوں اور امراء کو دعوتِ اسلام

صلح حدیبیہ اسلامی قلمرو کا پہلا قدم تھا۔ اب یہ سلطنت جزیرہ نمائے عرب کے کونے کونے تک پھیل رہی تھی بلکہ جزیرہ کی حدود سے باہر بھی پھیل رہی تھی۔

رسول اللہ ﷺ نے قریش کے ساتھ صلح حدیبیہ کا معاہدہ کیا۔ معاہدے کے فوراً بعد ہی حجاز کے شمال میں مقیم خیبر، وادی القریٰ، تیماء، فدک کے یہودی زیرِنگیں آئے۔ اب رسول اللہ ﷺ نے حجاز کی حدود سے باہر اسلام کی نشرواشاعت کا آغاز کر دیا۔

رسول اللہ ﷺ نے اسلام کی دعوت کو سفیروں کے ذریعے جزیرہ نمائے عرب اور اس سے باہر کے ہم عصر عالمی رہنماؤں تک پہنچایا۔

یہ اسلام اور عرب کی تاریخ کا انقلاب آفریں موڑ تھا۔ اس لیے نہیں کہ رسول اللہ ﷺ عنقریب جزیرہ نمائے عرب کے عربوں کو متحد کر دیں گے بلکہ اس لیے کہ عرب کے لوگوں نے اسلام اور آسمانی پیغام قبول کر کے پوری انسانیت کی طرف دعوت اسلام پہنچانے کی ذمہ داری قبول کر لی تھی۔ [1]

رسول اللہ ﷺ کا رؤسا اور حکمرانوں کو دعوت دینے کا منہج دعوت کے لازمی وسائل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ رؤسا اور قبائل کو دعوت دینے کے لیے رسول اللہ ﷺ نے دعوت کا نیا انداز اختیار فرمایا، یعنی رؤسا اور قبائل کے سربراہوں کی جانب (سفیر روانہ کیے اور)

[1] السفارات النبوية للدكتور محمد العقيلي، ص: 15.

کتابت کی۔ خط کتابت سے واضح اثر ہوا۔ کچھ نے تو اسلام قبول کر لیا، جبکہ دیگر نے اسلام سے محبت کا اظہار کیا۔ اسی طرح ان خطوط سے اسلامی دعوت اور مدینہ منورہ کی حکومت کے متعلق خیالات بھی بعض رؤسا اور حکمرانوں کے سامنے آ گئے۔ یوں ان خطوط سے کئی اہم نتائج برآمد ہوئے۔ اسلامی حکومت نے مختلف خطوط کے مختلف ردعمل کے لحاظ سے نیا سیاسی منہج تشکیل دیا۔*

ان میں سے اہم خطوط درج ذیل ہیں:

① ہرقل کو دعوتِ اسلام

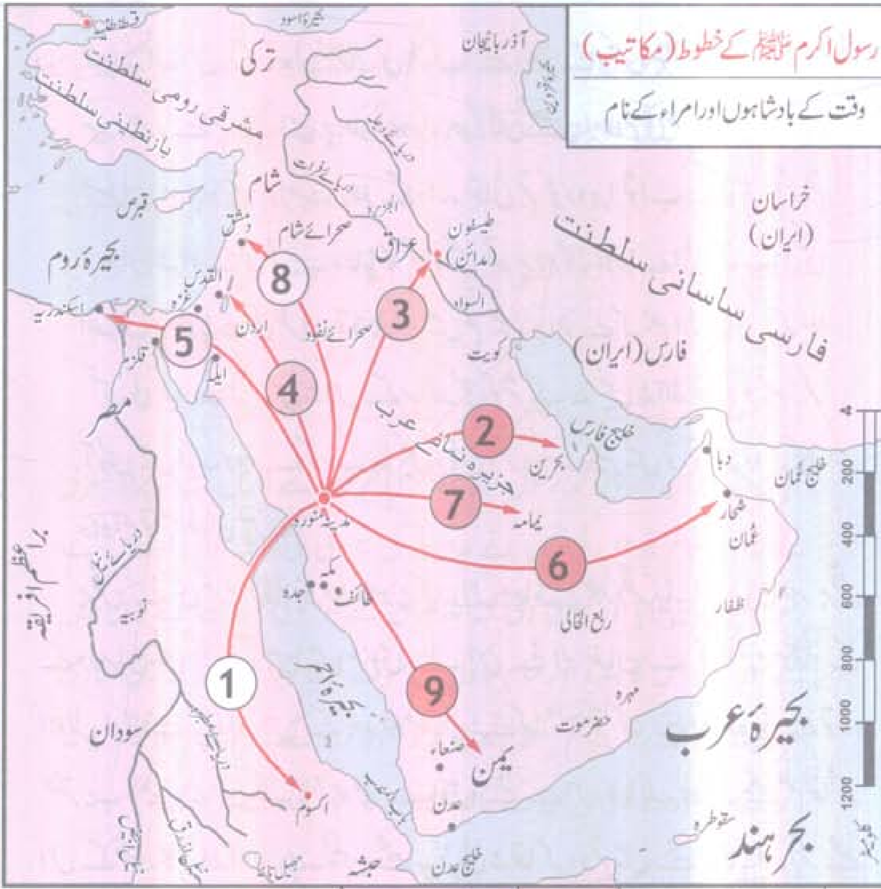
صحیح روایات میں اس نامۂ مبارک کی تفصیلات موجود ہیں جسے رسول اللہ ﷺ نے دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں، رومی حکمران ہرقل کے نام بھیجا تھا۔ یہ نامۂ مبارک صلح حدیبیہ کے بعد زمانۂ صلح میں بھیجا گیا تھا۔

اس کی عبارت درج ذیل تھی:

«بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ، مِنْ مُّحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ وَرَسُولِهٖ إِلٰى هِرَقْلَ عَظِيمِ الرُّومِ، سَلَامٌ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى. أَمَّا بَعْدُ: فَإِنِّي أَدْعُوكَ بِدِعَايَةِ الْإِسْلَامِ، أَسْلِمْ، تَسْلَمْ، يُؤْتِكَ اللّٰهُ أَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ، فَإِنْ تَوَلَّيْتَ فَعَلَيْكَ إِثْمُ الْأَرِيسِيِّينَ وَ ﴿يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝﴾

”شروع اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بہت مہربان ہے نہایت رحم والا ہے۔ محمد بن

* العلاقات الخارجية للدولة الإسلامية للدكتور سعيد المهجر، ص: 112.



نمبر شمار	حامل مکتوب	ملک/شہر	مکتوب الیہ
1	عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ	اکسوم (حبشہ)	نجاشی
2	علاء بن الحضرمی رضی اللہ عنہ	بحرین	منذر بن ساوی
3	عبداللہ بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ	طیسفون (مدائن)	کسرائے فارس خسرو پرویز
4	دحیہ بن خلیفہ کلبی رضی اللہ عنہ	القدس (یروشلم)	قیصر روم ہرقل
5	حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ	اسکندریہ (مصر)	مقوقس
6	عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ	عمان	جیفر و عبد پسران جلندی
7	سلیط بن عمرو عامری رضی اللہ عنہ	یمامہ	ہوذہ بن علی
8	شجاع بن وہب اسدی رضی اللہ عنہ	غوطہ (نواح دمشق)	حارث بن ابی شمر غسانی
9	مہاجر بن ابی امیہ رضی اللہ عنہ	یمن	حارث بن عبد کلال ← اسے دکتور صلابی نے اپنی کتاب میں دیے گئے نقشے میں شامل کیا ہے۔

نبی کریم ﷺ کا مکتوب

منذر بن ساوی کے نام



عبداللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے روم کے رئیس ہرقل کی طرف! جو سیدھے رستے پر چلے اس پر سلام ہو، امابعد! میں تمھیں اسلام کی طرف بلاتا ہوں، مسلمان ہو جاؤ تم سلامت رہو گے، اللہ تعالیٰ تم کو دوہرا ثواب دے گا۔ اگر تم مسلمان نہ ہوئے تو غریب رعایا کا گناہ بھی تجھ پر ہوگا۔ اور اے اہل کتاب: ایسی انصاف والی بات کی طرف آؤ جو ہم میں تم میں برابر ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنائیں نہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر آپس میں ایک دوسرے کو رب بنائیں، پس اگر وہ منہ پھیر لیں تو تم کہہ دو کہ گواہ رہو ہم تو مسلمان ہیں۔''[1]

ہرقل نے نبی مکرم ﷺ کا خط وصول کیا۔ اس معاملہ پر غور وفکر کیا۔ ابوسفیان اور ہرقل کے درمیان لمبی گفتگو صحیحین میں مروی ہے۔ اس نے ابوسفیان سے نبی اکرم ﷺ کے احوال دریافت کیے اور اس کے بعد ابوسفیان سے کہا: ''جو تو کہتا ہے اگر وہ سچ ہے تو وہ عنقریب (میرے اس ملک کا) جو میرے پاؤں تلے ہے اس کا مالک ہوگا۔ مجھے علم تھا کہ اس کے ظہور کا زمانہ آرہا ہے۔ لیکن مجھے یہ خیال نہ تھا کہ وہ تم میں سے ہوگا۔ اور اگر مجھے یہ امید ہوتی کہ میں اس تک پہنچ پاؤں گا تو میں ضرور اس سے ملنے کی کوشش کرتا اور اگر میں وہاں ہوتا تو اس کے پاؤں دھوتا (خدمت کرتا)۔''[2]

② شاہ فارس کسریٰ کے نام

نبی اکرم ﷺ نے فارس کے حکمران کسریٰ کو خط ارسال فرمایا۔ وہ خط آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں بھیجا اور انھیں حکم دیا کہ وہ یہ خط بحرین کے حاکم کو دیں۔ وہ اسے کسریٰ کے پاس پہنچا دے گا جو اس نے کسریٰ کو پہنچا دیا۔ کسریٰ نے

[1] آل عمرٰن 3:64. [2] صحيح البخاري، حديث:4553، وصحيح مسلم، حديث:1773.

خط پڑھ کر پھاڑ دیا تو رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کے لیے بددعا کی: ''اللہ انھیں ملیامیٹ کردے۔''[1] طبری کی روایت کے مطابق اس خط کی عبارت یہ تھی:

«بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ، مِنْ مُّحَمَّدٍ رَّسُولِ اللّٰهِ إِلٰى كِسْرٰى عَظِيمِ فَارِسَ، سَلَامٌ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى، وَآمَنَ بِاللّٰهِ وَرَسُولِهٖ وَشَهِدَ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنِّي رَسُولُ اللّٰهِ إِلَى النَّاسِ كَافَّةً لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا، أَسْلِمْ تَسْلَمْ، فَإِنْ أَبَيْتَ فَعَلَيْكَ إِثْمُ الْمَجُوسِ»

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف سے فارس کے سربراہ کسریٰ کے نام۔ سلام ہو اس پر جس نے ہدایت کی پیروی کی، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لایا اور گواہی دی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے اور میں اس کا بندہ اور تمام لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہوں تاکہ میں ساری انسانیت کو متنبہ کروں۔ تم اسلام قبول کر لو محفوظ رہو گے۔ دعوتِ اسلام قبول نہ کرنے کی صورت میں ایران کے تمام مجوسیوں کا گناہ تمھارے سر ہوگا۔''[2]

③ شاہ حبشہ نجاشی کے نام خط

رسول اللہ ﷺ نے حبشہ کے حکمران نجاشی کو عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں خط روانہ فرمایا۔ خط کی عبارت درج ذیل ہے:

«بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ، مِنْ مُّحَمَّدٍ رَّسُولِ اللّٰهِ، إِلَى النَّجَاشِيِّ مَلِكِ الْحَبْشَةِ، أَسْلِمْ أَنْتَ، فَإِنِّي أَحْمَدُ إِلَيْكَ اللّٰهَ الَّذِي لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ، السَّلَامُ، الْمُؤْمِنُ، الْمُهَيْمِنُ،

1 صحيح البخاري، حديث:4424، ومسند أحمد:243/1، ودلائل النبوة للبيهقي:387/4.

2 تاريخ الطبري:655,654/2.

وَأَشْهَدُ أَنَّ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رُوحُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلٰى مَرْيَمَ الْبَتُولِ الطَّيِّبَةِ الْحَصِينَةِ فَحَمَلَتْ بِهٖ، فَخَلَقَهُ مِنْ رُّوحِهٖ وَنَفْخِهٖ كَمَا خَلَقَ آدَمَ بِيَدِهٖ، وَإِنِّي أَدْعُوكَ إِلَى اللّٰهِ وَحْدَهُ لَاشَرِيكَ لَهُ وَالْمُوَالَاةِ فِي طَاعَتِهٖ وَأَنْ تَتَّبِعَنِي وَتُؤْمِنَ بِالَّذِي جَاءَنِي، فَإِنِّي رَسُولُ اللّٰهِ وَإِنِّي أَدْعُوكَ وَجُنُودَكَ إِلَى اللّٰهِ- عَزَّوَجَلَّ- وَقَدْ بَلَّغْتُ وَنَصَحْتُ، فَاقْبَلُوا نَصِيحَتِي وَالسَّلَامُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى»

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، محمد رسول اللہ ﷺ کی جانب سے شاہ حبشہ نجاشی کے نام! تم اسلام قبول کرلو۔ میں تمھاری طرف اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ جو بادشاہ، نہایت پاک، سلامتی والا، امن دینے والا، نگران ہے۔ اور میں شہادت دیتا ہوں کہ عیسیٰ ابن مریم، اللہ تعالیٰ کی روح اور اس کا کلمہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں پاکیزہ اور پاکدامن مریم بتول کی طرف ڈال دیا اور اس کی روح اور پھونک سے مریم عیسیٰ علیہ السلام کے لیے حاملہ ہوئیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا۔ میں اللہ وحدہ لاشریک کی جانب اور اس کی اطاعت پر ایک دوسرے کی مدد کی جانب دعوت دیتا ہوں اور اس بات کی طرف بلاتا ہوں کہ تم میری پیروی کرو اور جو کچھ میرے پاس آیا ہے اس پر ایمان لاؤ کیونکہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں۔ اور میں تمھیں اور تمھارے لشکر کو اللہ عزوجل کی طرف بلاتا ہوں۔ اور میں نے تبلیغ و نصیحت کر دی ہے، لہٰذا میری نصیحت قبول کرو اور اس شخص پر سلام ہو جو ہدایت کی پیروی کرے۔''[1]

[1] نصب الراية للزيلعي: 421/4.

④ مقوقس حاکم مصر کا تذکرہ

نبی مکرم ﷺ کا حاکم مصر مقوقس کو خط ارسال کرنا اور اسی طرح اس کا آپ ﷺ کو واپسی جواب دینا صحیح روایات سے ثابت نہیں ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ آپ ﷺ نے اسے خط ارسال ہی نہیں کیا۔ اور نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ نصوص تاریخی اعتبار سے بھی قابل طعن ہیں۔ بسا اوقات نصوص شکل و مضمون کے اعتبار سے صحیح ہوتی ہیں مگر ملکی نظم و نسق میں شرعی اعتبار سے ان سے حجت نہیں لی جاتی۔[1]

محمد بن سعد نے اپنی کتاب ''طبقات'' میں یہ بات ذکر کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسکندریہ کے حکمران اور قبطیوں کے رئیس کی طرف حاطب بن ابی بلتعہ لخمی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ خط ارسال فرمایا تھا۔ اور یہ بھی کہ اس نے تعریف کی اور معاملہ بالکل قریب ہو گیا تھا مگر وہ مسلمان نہ ہوا۔ اس نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں کئی تحفے ارسال کیے جن میں ماریہ قبطیہ بھی تھیں۔ جب مقوقس کا جواب آپ ﷺ کو پہنچا تو آپ نے فرمایا:

«ضَنَّ الْخَبِيثُ بِمُلْكِهِ وَلَا بَقَاءَ لِمُلْكِهِ»

''خبیث اپنی حکمرانی پر ریجھ گیا ہے، حالانکہ اس کی حکومت کو بقا نہیں۔''*

⑤ حاکم دمشق کی طرف نامۂ مبارک

رسول اللہ ﷺ نے حدیبیہ سے واپسی پر شجاع بن وہب رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں منذر بن حارث بن ابوشمر غسانی حاکم دمشق کی جانب خط روانہ کیا۔ خط کی عبارت یہ تھی: «سَلَامٌ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى، وَآمَنَ بِهِ، إِنِّي أَدْعُوكَ إِلٰى أَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، يَبْقٰى لَكَ مُلْكُكَ» ''اس شخص پر سلام ہو جو ہدایت کی پیروی کرے اور

---

[1] السيرة النبوية الصحيحة: 459/2. * الطبقات الكبرىٰ: 261,260/1، والبداية والنهاية: 340/5، ونصب الراية للزيلعي: 422/4.

اس پر ایمان لائے۔ میں تمھیں دعوت دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لاؤ جو اکیلا ہے اور جس کا کوئی شریک نہیں۔ تمھارے لیے تمھاری بادشاہت باقی رہے گی۔''[1]

⑥ حدیبیہ سے واپسی پر ہوذہ بن علی حنفی کی طرف مکتوب گرامی

رسول اللہ ﷺ نے حضرت سلیط بن عمرو عامری رضی اللہ عنہ کو خط دے کر ہوذہ بن علی حنفی کی طرف روانہ کیا۔ ہوذہ نے مکتوب گرامی پڑھ کر (اسلام لانے کے لیے) شرط لگائی کہ کچھ کار پردازی میرے اختیار میں بھی دے دیں۔ آپ ﷺ نے اس کا مطالبہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ (ہوذہ، یمامہ کا حاکم تھا۔ فتح مکہ کے چند دن بعد فوت ہو گیا)[2]

⑦ منذر بن ساویٰ کی طرف مکتوب

حدیبیہ سے آتے ہی رسول اللہ ﷺ نے ابو العلاء حضرمی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ بحرین کے امیر منذر بن ساوی العبدی کو خط ارسال فرمایا۔ تاریخی حوالہ جات بیان کرتے ہیں کہ منذر نے آپ ﷺ کے خط کے جواب میں اسلام قبول کیا اور اس کے ساتھ بحرین کے تمام عرب بھی مسلمان ہو گئے۔ لیکن شہروں میں بسنے والے دیگر یہود و مجوس نے حضرت علاء اور منذر سے اس شرط پر صلح کر لی کہ ہر بالغ ایک دینار دے گا۔[3]

ابو عبید قاسم بن سلام نے منذر کی جانب لکھے گئے خط کی نقل بروایت عروہ بن زبیر بیان کی ہے۔ متن یہ ہے: «سَلَامٌ أَنْتَ، فَإِنِّي أَحْمَدُ إِلَيْكَ اللّٰهَ الَّذِي لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ، أَمَّا بَعْدُ! فَإِنَّ مَنْ صَلّٰى صَلَاتَنَا، وَاسْتَقْبَلَ قِبْلَتَنَا، وَأَكَلَ ذَبِيحَتَنَا، فَذٰلِكَ الْمُسْلِمُ الَّذِي لَهُ ذِمَّةُ اللّٰهِ وَذِمَّةُ الرَّسُولِ، فَمَنْ أَحَبَّ ذٰلِكَ مِنَ الْمَجُوسِ فَإِنَّهُ آمِنٌ وَّمَنْ أَبٰى، فَإِنَّ الْجِزْيَةَ عَلَيْهِ»

1 تاريخ الطبري: 652/2، ونصب الراية للزيلعي: 424/4. 2 نصب الراية للزيلعي: 425/4، وإعلام السائلين لابن طولون، ص: 105-107. 3 نصب الراية للزيلعي: 420/4.

''تم پر سلام ہو، میں تمھاری طرف اس اللہ کی حمد بیان کرتا ہوں جس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں۔ اما بعد! جو ہم جیسی نماز ادا کرے، ہمارے قبلے کی طرف منہ کرے، ہمارا ذبح کیا ہوا جانور کھائے تو وہ مسلمان ہے۔ جس کا ذمہ وعہد اللہ تعالیٰ پر ہے اور رسول پر۔ مجوس میں سے جو پسند کرے اسے امن حاصل ہوگا اور جو انکار کرے گا اس پر جزیہ لاگو ہوگا۔''[1]

⑧ شاہانِ عمان کی طرف مکتوبِ گرامی

ذوالقعدہ 8 ھ میں رسول اللہ ﷺ نے عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو خط دے کر جلندی کے بیٹوں جیفر اور عبد کی طرف روانہ کیا جن کا تعلق ازد سے تھا اور وہ عمان کے حاکم تھے۔[2] اس میں لکھا تھا:

«وِمنْ مُّحَمَّدٍ النَّبِيِّ رَسُولِ اللّٰهِ لِعِبَادِ اللّٰهِ الْأَزْدِيِّينَ مُلُوكِ عُمَّانَ وَأُسَدِ عُمَّانَ مَنْ كَانَ مِنْهُمْ بِالْبَحْرَيْنِ، إِنَّهُمْ إِنْ آمَنُوا، وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَطَاعُوا اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَأَعْطَوْا حَقَّ النَّبِيِّ وَنَسَكُوا نُسْكَ الْمُؤْمِنِينَ فَإِنَّهُمْ آمِنُونَ وَأَنَّ لَهُمْ مَّا أَسْلَمُوا عَلَيْهِ، غَيْرَ أَنَّ مَالَ بَيْتِ النَّارِ ثُنْيًا لِّلّٰهِ وَرَسُولِهِ وَأَنَّ عُشُورَ التَّمْرِ صَدَقَةٌ وَّنِصْفُ عُشُورِ الْحَبِّ، وَأَنَّ لِلْمُسْلِمِينَ نَصْرَهُمْ وَنُصْحَهُمْ وَأَنَّ لَهُمْ عَلَى الْمُسْلِمِينَ مِثْلَ ذٰلِكَ وَأَنَّ لَهُمْ أَرْحَائَهُمْ يَطْحَنُونَ بِهَا مَا شَاؤُوا»

''اللہ کے رسول محمد کی طرف سے، عمان کے بادشاہ اور بہادر ازدیوں کی جانب، بحرین کے باشندوں میں سے جو بھی ایمان لے آئیں، نماز ادا کرنے لگیں، زکاۃ کی ادائیگی کریں، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت بجا لائیں، نبی ﷺ کا حق ادا کریں، دیگر اہل ایمان کی طرح مناسک ادا کریں تو وہ سب محفوظ و مامون ہیں، اسلام قبول کرتے

1 الأموال لأبي عبيد: 28. 2 صبح الأعشى: 376/6.

وقت ان کے پاس جو بھی (جائیداد) ہے وہ ان کی رہے گی مگر وہ مال جو کنیسوں میں ہے وہ اللہ اور اس کے رسول کے لیے خاص ہے۔ اس طرح کھجور کا عشر (دسواں حصہ) صدقہ ہوگا۔ غلہ میں نصف عشر (بیسواں حصہ) ہوگا۔ مسلمانوں کی مدد اور خیر خواہی کرنا ان کا فرض ہوگا۔ مسلمانوں پر بھی ان کا اسی طرح حق ہوگا، ان کی چکیاں ان کی ملکیت میں رہیں گی۔ جس قدر چاہیں جو چاہیں ان سے پیس سکتے ہیں۔" [1]

ان خطوط کے علاوہ بھی کئی دیگر خطوط تاریخ کتب میں ملتے ہیں مگر حدیث کے تحقیقی اعتبار سے ثابت نہیں۔ [2]

میدانِ سفارت کے شاہسواروں کے لیے

"محمود شیت خطاب" نے تمام خطوط سفراء پر مشتمل ایک انوکھی کتاب "سفراء النبی" میں جمع کیے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اسلامی پالیسی ساز شخص کے شرائط و اوصاف کا استنباط بھی کیا ہے، ان میں سے اہم یہ ہیں:

اسلام اور اس کی طرف دعوت: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۚ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○﴾

"(اے نبی!) کہہ دیجیے: یہی میری راہ ہے، میں اور میرے فرماں بردار اللہ کی طرف بلا رہے ہیں، پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ۔ اور اللہ پاک ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں۔" [3]

جب تمام مسلمان ہی دین الٰہی کے داعی ہیں تو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں بادشاہوں کی طرف بھیجے گئے سفیر تو ان داعیوں میں سے بھی چنے ہوئے لوگ تھے۔ [4]

[1] الأموال لأبي عبيد، ص: 31,30، رقم: 52. [2] نضرة النعيم: 348/1. [3] يوسف 108:12.
[4] سفراء الرسول ﷺ لمحمود شيت خطاب: 258/2.

فصاحت و بلاغت: سیاسی ذمہ داری نبھانے والے شخص کے لیے، فصاحت، عمدہ الفاظ اور خوبصورت معانی و مفاہیم ضروری امور میں سے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کے ذریعے فصاحت و بلاغت کا سہارا طلب کیا تھا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ○ هٰرُوْنَ اَخِي ○ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ○﴾

''اور میرا وزیر میرے خاندان میں سے کر دے، (یعنی) میرے بھائی ہارون علیہ السلام کو، تو مجھے اس کے ذریعے تقویت دے۔''[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب میں سے اپنے تمام سفراء و مبعوثین وہ منتخب کیے تھے جنھوں نے جزیرہ نمائے عرب ہی میں تربیت پائی اور کبھی کبھار بدویوں کے ساتھ رہے۔ یہ تمام صاف ستھری زبان کے مالک تھے۔ ابھی تک عجمیوں سے میل جول کی بنا پر ان کی زبان و طبع دھندلائی نہ تھی۔ یہ تمام ہی فصاحت و بلاغت کی خوبیوں سے متصف تھے۔

حسن اخلاق: نبوی سفراء کے اخلاق وہی تھے جو اسلام کے اخلاق تھے۔ جنھیں اللہ تعالیٰ نے قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنت میں مفصل ذکر فرمایا ہے، سفیر میں خاص طور پر سچائی اور تواضع ہونی چاہیے۔[2]

علم: یہاں ہمارے پیش نظر علم کا مقام و مرتبہ بیان کرنا نہیں کیونکہ یہ طویل موضوع ہے۔ ہم یہاں یہ بات بالتاکید بیان کرنا چاہتے ہیں کہ کسی چیز کے متعلق علم کا ہونا خیال و نظریہ کے منتقل کرنے کا ذریعہ ہے۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نجاشی سے بڑے عمدہ پیرائے میں تبادلہ خیالات کرتے ہیں اور پھر سورہ ''مریم'' اس کے روبرو تلاوت کرتے ہیں۔ اس سے ہمیں بڑی حد تک پیغمبرانہ چناؤ کی عمدگی کا یقین ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جعفر رضی اللہ عنہ کی گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک عالم کی گفتگو کیسی واضح اور نکھری ہوئی ہوتی ہے۔ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ الفاظ کے انتخاب اور عبارت کے

1 طٰہٰ 20:29-31. 2 سفراء الرسول ﷺ لمحمود شیت خطاب: 278/2.

چناؤ پر انھیں کس قدر کامل عبور تھا۔ [1]

صبر: ارشاد باری ہے:

﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِل لَّهُمْ ۚ كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوعَدُونَ لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً مِّن نَّهَارٍ ۚ بَلَاغٌ ۚ فَهَلْ يُهْلَكُ إِلَّا الْقَوْمُ الْفَاسِقُونَ﴾

''تو (اے نبی!) آپ صبر کریں جس طرح عزم و ہمت والے رسولوں نے صبر کیا اور ان کے لیے جلدی (عذاب) طلب نہ کریں، گویا کہ وہ (کافر) جس دن اس (عذاب) کو دیکھیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے (تو سمجھیں گے کہ) وہ تو (دنیا میں) دن کی بس ایک گھڑی ہی ٹھہرے۔ یہ (تو پیغام) پہنچا دینا ہے، چنانچہ نافرمان لوگوں کے سوا کوئی ہلاک نہیں کیا جائے گا۔'' [2]

حقیقت یہ ہے کہ صبر ہی ایک داعی کی پونجی اور اس راہ پر چلنے والے کے لیے زاد راہ ہے۔ اگر آپ رسول اللہ ﷺ کی سیرت اور جلیل القدر صحابہ کی زندگیوں کی ورق گردانی کریں گے تو اسے صبر سے پُر پائیں گے۔ طائف میں آپ ﷺ کا کردار اس کی زندہ مثال ہے۔

شجاعت و بہادری: اسلامی تاریخ نے مسلمان سفراء اور رسول اللہ ﷺ کے بادشاہوں کی طرف بھیجے گئے صحابۂ کرام کی زندگیوں سے پردہ اٹھایا ہے کہ وہ کسی ملامت گر کی ملامت سے ہرگز نہ ڈرتے تھے۔

حکمت و دانائی: رسول اللہ ﷺ کے سفیر حکمت و دانائی سے متصف ہوتے تھے۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ تو اپنی مثال آپ تھے۔ ان سے پوچھا گیا: ''عاقل کون ہوتا ہے؟'' فرمایا: ''اندازے سے درستگی تک رسائی حاصل کر لینا، ماضی سے مستقبل کو بھانپ

[1] الفقه السياسي للوثائق النبوية لخالد الفهداوي، ص: 114. [2] الأحقاف 35:46.

جانا۔ عاقل وہ نہیں جو شر سے خیر کو ممتاز کر لے بلکہ عاقل تو وہ ہے جس کے سامنے دونوں صورتیں شر ہی کی ہوں پھر بھی وہ ان میں سے خیر کا پہلو بھانپ لے۔"[1]

چارہ گری کی وسعت: سفیر کے لیے سیاسی دور اندیشی کا ہونا لازمی عنصر ہے۔ ایسے ہی وہ حلیم الطبع، راز دان اور بڑا چارہ گر ہو۔ اس کا سارا دار و مدار ذہانت و ذکاوت پر ہے جو سفیر کی اہم علامات میں سے ایک ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے سفیر عقل و دانش، ہوشیاری و چالاکی، اچانک پیش آمدہ مشکلات کا مناسب حل نکالنے والے اور کسی بھی ناگہانی صورت سے نپٹنے والے تھے اور یہی امور چارہ جوئی کی بنیادیں ہیں۔

خوبصورت شکل وصورت: اندرونی طور پر پاکی وطہارت اور صاف دلی کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ کے سفیر ظاہری شکل و شباہت کے لحاظ سے بھی ممتاز تھے، آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کرام میں مذکورہ صفات کے حاملین کے ساتھ ساتھ ایسے سفراء کا انتخاب فرمایا جن میں عقلی اور نفسیاتی خوبیوں کے علاوہ حسن و جمال بھی وافر موجود تھا۔[2]

یہ وہ اہم صفات ہیں جنھیں محمود شیت خطاب نے نبی اکرم ﷺ کے سفراء کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد ہمارے سامنے رکھا ہے۔ یہ ایسی صفات ہیں جو کسی بھی مسلمان سفیر کو اپنے اندر پیدا کرنی چاہئیں اور ایک اسلامی حکومت کو اس اہم عہدے کا انتخاب کرنے کے لیے انھیں معیار بنانا چاہیے۔

حکمتیں، عبرتیں اور فوائد و نصائح

"اَرِیسِیِّین" کی تحقیق: صرف ہرقل کی طرف لکھے گئے خط میں "اَرِیسِیِّین" یا "یَرِیسِیِّین" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اور کسی خط میں یہ لفظ نہیں آیا۔

علمائے حدیث اور اہل لغت اس کلمے کے مدلول و مفہوم میں اختلاف رکھتے ہیں۔

1 سفراء الرسول لمحمود شيت خطاب: 301/2. 2 مقومات السفراء في الإسلام لحسن فتح الباب، ص: 60.

مشہور قول یہ ہے کہ ''اَرِیسِّیِین'' اُرَیسِی'' بمعنی غلام، لونڈی یا کاشت کار کی جمع ہے۔[1]

علامہ ابو الحسن کے مطابق ''اَرِیسِّیِین'' سے مراد اُریوس کے پیروکار ہیں جو مصری تھا۔ اس نے ایک مسیحی فرقے کی بنیاد رکھی جس کا مسیحی عقائد کی تاریخ اور دینی اصلاح میں بڑا کردار ہے۔ اس کا بازنطینی حکومت اور مسیحی گرجا پر عرصہ دراز تک اثر و رسوخ رہا۔ آریوس وہی ہے جس نے توحید، خالق اور مخلوق میں امتیاز اور باپ، بیٹا میں تمیز، جیسا کہ یہ اصطلاحیں عیسائیوں کے ہاں معروف ہیں، کی آواز کئی صدیوں تک بلند رکھی۔[2]

''آریوس'' کا عقیدہ اور دعوت، حضرت مسیح کو خدا اور ایک خدا کے مساوی قرار دینے کے عقائد سے عرصہ دراز تک ٹکراتا رہا۔ آپس میں لڑائی برابر جاری رہی۔ بازنطینی حکومت کے مشرقی علاقوں میں بہت سارے عیسائی اس عقیدہ کو اپنا چکے تھے تا آنکہ ''تیوسورس الکبیر'' نے قسطنطنیہ میں ایک مسیحی کانفرنس کا انعقاد کیا اور اس میں حضرت مسیح کے خدا ہونے اور خدا کا بیٹا ہونے کے عقیدے کا فیصلہ کیا۔ اس اعلان نے ''اُریوس'' کے پھیلائے ہوئے عقیدہ کو پس پشت ڈال دیا اور اس طرح وہ پردۂ اخفا میں جاتا گیا۔ لیکن اس کے بعد یہ عقیدہ ختم نہیں ہوا بلکہ عیسائیوں کا ایک گروہ اس پر کاربند رہا جو آہستہ آہستہ ''اُریسیہ'' یا ''اَرِیسِّیِین'' کے نام سے مشہور ہوا، لہٰذا راجح یہی ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے نامۂ مبارک میں یہی لوگ مراد لیے تھے۔

یہی گروہ عالمی بازنطینی حکومت میں توحید پرست تھا اور اس گروہ کا سردار خود ہرقل تھا۔[3]

1 السيرة النبوية للندوي، ص:304. 2 السيرة النبوية للندوي، ص:305. 3 علامہ ندوی رحمہ اللہ کی اُریسیوں کے متعلق اسی رائے کو معروف ڈاکٹر دوالبی نے اختیار کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے فرمان عالی میں اُریوس کے پیروکار مسیحی فرقے ہی کو مراد لیا ہے جو اکیلا دنیا میں بشریتِ مسیح کا قائل اور الوہیت مسیح کا منکر تھا۔ یہ عمدہ بحث ''نظرات اسلامیہ'' ص: 68-83، میں بھی قابلِ مطالعہ ہے۔ اور ملاحظہ کیجیے: السيرة النبوية للندوي، ص: 290.

امام ابوجعفر طحاوی نے اس فرقے کے متعلق کہا ہے کہ اس فن کے بعض ماہرین نے کہا ہے کہ ہرقل کے گروہ میں ایک فرقہ بنام ''اُروسیہ'' پایا جاتا تھا جو اللہ تعالیٰ کو اکیلا جانتا تھا۔ حضرت مسیح کے بندۂ خدا ہونے کا اقرار کرتا تھا اور جو عیسائی لوگ عیسیٰ علیہ السلام کو رب کہتے ہیں، ان کا ایسا کوئی نظریہ نہیں تھا۔ اس طرح یہ لوگ حضرت مسیح علیہ السلام کی نبوت پر یقین رکھتے تھے۔ یہ فرقہ انجیل مسیح کے دین مسیح کو اختیار کیے ہوئے تھا۔ اس کے سوا نصاریٰ جو بھی کہتے ہیں اس کا یہ فرقہ انکاری تھا۔ اور اگر واقعی بات ایسے ہی ہے تو اس فرقہ کو حالت رفعی میں ''اریسیون'' اور نصبی اور جری حالت میں ''اَریسِیِّین'' کہنا صحیح ہے، جیسا کہ محدثین کا خیال ہے۔[1]

خطوط نبوی میں بادشاہوں کے متعلق خصوصی حکمتیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہوں کے نام جو خطوط روانہ کیے ان کا ایک منفرد پہلو یہ بھی تھا کہ جس بادشاہ کا جو عقیدہ یا نظریہ تھا اس کی طرف دعوت نامے میں اسی کا خیال رکھا گیا۔ اس اسلوب کی بنیاد دعوتی حکمتِ عملی تھی، لہٰذا اگر ہرقل اور مقوقس کلیتًا الوہیت اپنائے ہوئے تھے اور وہ عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا مانتے تھے تو ان دونوں کی طرف ارسال کردہ خط میں اپنے نام کے ساتھ ''عبداللہ'' کا کلمہ ذکر کیا۔ بسم اللہ کے بعد خط کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے: ''محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول کی طرف سے روم کے رئیس ہرقل کی طرف'' اور اسی طرح ''محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول کی طرف سے قبطیوں کے سردار مقوقس کی طرف'' جبکہ کسریٰ خسرو پرویز کی طرف لکھے گئے خط میں ایسا نہیں بلکہ صرف ''رسول اللہ'' پر اکتفا کیا گیا۔ عبارت یوں تھی: ''اللہ کے رسول محمد کی طرف سے ایران کے سربراہ کسریٰ کے لیے۔''

اسی طرح حسب ذیل آیت مبارکہ بھی ہرقل اور مقوقس کی طرف لکھے گئے مکتوبات میں شامل فرمائی:

[1] مشكل الآثار للطحاوي:3/399.

﴿ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴾

''اے اہل کتاب! ایسی بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو رب نہ بنائے، پھر اگر وہ منہ موڑیں تو تم کہہ دو: اس بات کے گواہ رہو کہ بے شک ہم اللہ کے فرمانبردار ہیں۔''[1]

جبکہ کسریٰ پرویز کو لکھے گئے خط میں یہ آیت بھی نہیں ہے کیونکہ اس آیت میں ان اہل کتاب سے تخاطب ہے جو الوہیت مسیح کا دین اپنائے ہوئے تھے۔ اور جنھوں نے مسیح ابن مریم اور اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ رب بنا رکھا تھا۔ ہرقل بازنطینی حکومت کا رئیس اور مقوقس مصر کا حاکم تھا۔ دونوں حکمران سیاسی قائد ہونے کے ساتھ ساتھ دنیائے مسیحیت کے بڑے اہم دینی پیشوا بھی تھے۔[2]

ایرانی کسریٰ خسرو پرویز اور اس کی قوم سورج اور آگ کی عبادت کرتے تھے اور دو خداؤں کا نظریہ رکھتے تھے۔ ایک خیر کا خدا ''یزدان'' اور دوسرا شر کا خدا ''ہرمن'' تھا۔ یوں یہ لوگ نبوت کے درست مفہوم سے ہی دور اور آسمانی ہدایت کے تصور سے نابلد تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے ایرانی حاکم کو جو خط لکھا اس میں یہ عبارت تھی:

«وَأَنِّي رَسُولُ اللّٰهِ إِلَى النَّاسِ كَافَّةً لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا»

''میں تمام لوگوں کی جانب اللہ تعالیٰ کا پیغام رساں ہوں تاکہ زندہ (شعور والے) کو ڈراؤں۔''

1 آل عمرٰن 3:64. 2 ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين للندوي، ص:39,38.

حکمرانوں کا ان خطوط کو وصول کرنے کا انداز بھی مختلف تھا۔ ہرقل، نجاشی اور مقوقس نے تو مؤدبانہ انداز اختیار کیا اور اپنے اپنے جوابات میں نرمی کا پہلو اپنایا۔ نجاشی اور مقوس نے رسول اللہ ﷺ کے سفیروں کا اکرام کیا۔ مقوقس نے تو تحفے تحائف بھی روانہ کیے جن میں دو کنیزیں بھی تھیں۔ ایک رسول اللہ ﷺ کے بیٹے ابراہیم کی والدہ ''ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا'' تھیں۔

کسریٰ پرویز نے آپ ﷺ کا خط پھاڑ دیا۔ اور کہا: ''میرا غلام ہو کر مجھے ایسا خط لکھتا ہے۔'' رسول اللہ ﷺ کو اس کے طرز عمل کی خبر ملی تو آپ ﷺ نے فرمایا: «مَزَّقَ اللّٰهُ مُلْكَهُ» ''اللہ تعالیٰ اس کی حکومت پارہ پارہ کر دے۔''[1]

کسریٰ نے یمن کے ایرانی باجگزار گورنر باذان کو حکم دیا کہ وہ اس (خط ارسال کرنے والے) کو میرے دربار میں حاضر کرے۔ اس نے ''بابویہ'' کو یہ پیغام دے کر (رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں) روانہ کر دیا کہ حاکموں کے حکمران نے باذان کو لکھا ہے کہ آپ (ﷺ) کو اس کے ہاں حاضر کیا جائے۔ باذان نے مجھے آپ کی طرف روانہ کیا ہے کہ آپ (ﷺ) میرے ساتھ چلیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے کسریٰ پر اس کے بیٹے شیرویہ کو مسلط کر دیا ہے اور اس نے اپنے باپ کو قتل کر دیا ہے۔[2]

رسول اللہ ﷺ نے جیسا بتایا تھا ویسا ہی ہوا۔ ایرانی تخت پر کسری پرویز کے بیٹے قباذ، جس کا لقب ''شیرویہ'' تھا، نے قبضہ کر لیا۔ کسریٰ اپنے بیٹے کے اشارے پر 628ء میں ذلیل و خوار حالت میں قتل کر دیا گیا۔ اس کی وفات کے بعد اس کی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر حکمران خاندان کے ہاتھوں کھلونا بن گئی۔ خود ''شیرویہ'' بھی صرف چھ (6) ماہ زندہ رہ سکا۔ بعدازاں تخت پر چار (4) سال میں دس (10) حکمران پے در پے آئے۔ حکومت کی چولیں ڈھیلی ہو گئیں تا آنکہ لوگ ''یزدگرد'' پر متفق ہوئے جو بنو ساسان کا آخری فرمانروا

[1] تاریخ الطبري: 90/3. [2] تاریخ الطبري: 91,90/3.

ثابت ہوا۔ یہی شخص ساسانی سلطنت کو زمین بوس کرتی ہوئی اسلامی یلغار کے سامنے آیا۔ چار سو سال تک پھلنے پھولنے والی یہ حکومت کلیتاً 637ء میں پارا پارا ہوگئی۔ یوں صرف آٹھ سال کی قلیل مدت میں رسول اللہ ﷺ کی پیش گوئی پوری ہوگئی۔[1]

رسول اللہ ﷺ کے خطوط کا عمومی وصف: ایک محقق یہ بات ملاحظہ کرے گا کہ تمام حکمرانوں اور گورنروں کو لکھے گئے رسول اللہ ﷺ کے خطوط کی عام باتیں ایک جیسی ہیں۔ ان سے ہم درج ذیل امور کا استنباط کر سکتے ہیں:

جو خطوط رسول اللہ ﷺ نے حاکموں اور گورنروں کو لکھے وہ سب بسم اللہ سے شروع ہوتے ہیں۔ اور بسم اللہ کتاب اللہ کی ایک آیت ہے۔ اس سے تحریر کی ابتدا بہت اہمیت رکھتی ہے۔ آپ ﷺ کی اقتدا میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے تحریروں کو شروع کرنا مستحب ہے۔ آپ ﷺ خط کتابت ہمیشہ اسی سے شروع فرماتے تھے۔

اس سے یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ خط کتابت خواہ کافر کی طرف ہی ہو شروع میں بسم اللہ لکھنا درست ہے۔ یہ بھی ثابت ہوا کہ کافر قرآن پاک کی ایک آیت یا اس سے بھی زیادہ قرآن پاک پڑھ سکتا ہے کیونکہ آپ ﷺ کے خطوط میں بسم اللہ اور دیگر آیات لکھی ہوتی تھیں۔

اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جنبی شخص ایک آیت یا مزید قرآن پاک پڑھ سکتا ہے کیونکہ کافروں کی طرف یہ خطوط ارسال کیے گئے ان میں بسم اللہ بھی موجود ہے، حالانکہ وہ نجاست و جنابت سے قطعاً احتراز نہیں کرتے، لہٰذا وہ جنبی ہوتے ہوئے بھی وہ خط پڑھیں گے جس میں قرآنی آیات ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے حکمرانوں اور گورنروں کی جانب خطوط سے ہم درج ذیل مسائل کا استنباط کر سکتے ہیں:

[1] السيرة النبوية للندوي، ص:300.

❁ مسلمان سفیروں کو ائمہ کفر کی طرف بھیجنا درست ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ جو بھی خط لکھتے تھے وہ کسی مسلمان شخص کے ہاتھوں مکتوب الیہ تک پہنچتا تھا۔

❁ دین و دنیا کے معاملات میں کفار سے خط کتابت کا جواز۔

❁ مرسل، مرسل اِلیہ اور خط کا موضوع تمام خطوط میں لکھنا چاہیے۔ اسلام کی دعوت دیتے وقت اختصارِ کلام ملحوظ خاطر رہے۔

❁ کافر کو ابتدا میں اسلام کا ''سلام'' السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ نہیں کہنا چاہیے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے کسی بھی خط میں کسی بادشاہ کو بھی یہ ''سلام'' نہیں لکھا۔ بلکہ آپ ﷺ اس طرح سلام فرماتے: «اَلسَّلَامُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى» ''جس نے ہدایت کی پیروی کی اس پر سلام۔'' یعنی اسلام قبول کر کے امن و سلامتی میں ہو جاؤ۔ اس سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ کافر کو اسلام والے ''سلام'' سے سلام نہیں کہنا چاہیے۔

❁ رسول اللہ ﷺ خط لکھنے کے بعد اس پر اپنی مہر ثبت فرماتے جس پر یہ تین الفاظ کندہ تھے: ''محمد رسول اللہ۔'' ایک سطر میں ''اللہ''، ایک سطر میں ''رسول'' اور ایک میں ''محمد'' لکھا ہوا تھا۔''[1]

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ نے روم کے بادشاہ کو خط لکھنا چاہا تو لوگوں نے آپ سے عرض کیا: ''روم کے لوگ وہی خط پڑھتے ہیں جس پر مہر لگی ہو۔'' تو آپ ﷺ نے چاندی کی ایک انگوٹھی بطور مہر بنوائی۔ گویا میں انگوٹھی کی سپیدی آپ ﷺ کے ہاتھ میں دیکھ رہا ہوں۔ اس پر ''محمد رسول اللہ'' کندہ کرایا گیا تھا۔''[2]

مردم شناسی: رسول اللہ ﷺ نے جب دیکھا کہ باذان بن ساسان کامیاب منتظم اور اچھا حکمران ہے تو آپ ﷺ نے اس کے اسلام قبول کرنے کے بعد اسے یمن سے معزول

1 صحيح البخاري، حديث: 65 و 5878، وصحيح مسلم، حديث: (56)-2092. 2 صحيح البخاري، حديث: 2938.

نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ لوگوں کی خوبیوں کی قدر افزائی فرماتے اور باصلاحیت انسان کو مناسب جگہ دیتے تھے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ آپ ﷺ نے یمنی حکمران کے فوت ہونے پر اس کے بیٹے ''شہر بن باذان'' کو یمن کا حاکم بنایا تھا۔[1]

مجوسیوں سے جزیہ لینا جائز ہے: یہ بات منذر بن ساوی کو لکھے گئے خط سے معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس میں رسول اللہ ﷺ نے یہود اور مجوس کے متعلق اپنے موقف کا تذکرہ یوں فرمایا تھا: ''جو شخص یہودیت یا مجوسیت پر قائم رہا اس سے جزیہ وصول کیا جائے گا۔''[2]

امام ابن قیم رحمہ اللہ اور چند دیگر علماء کا خیال ہے کہ جو بھی انسان جزیہ دے مسلمان اسے قبول کریں گے، خواہ وہ اہل کتاب سے ہو یا نہ ہو، چاہے وہ عرب علاقوں کا بت پرست ہی ہو۔ زاد المعاد میں مرقوم ہے کہ علماء کا ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ جزیہ ہر ایک امت سے قبول کیا جائے گا، جبکہ وہ دینا پسند کریں۔ یہود و نصاریٰ سے کتاب اللہ کی بنا پر اور مجوس سے سنت کی دلیل سے۔ ان کے علاوہ دیگر اقوام کو بھی اس پر قیاس کیا جائے گا کیونکہ مجوس مشرک ہیں۔ ان کے ہاں کوئی کتاب (آسمانی) نہیں۔ ان سے جزیہ وصول کرنے کا مطلب تمام اہل شرک سے جزیہ وصول کرنا ہے۔ رہی یہ بات کہ رسول اللہ ﷺ نے عرب بت پرستوں سے جزیہ قبول نہیں کیا تو دراصل یہ لوگ جزیہ کی آیت نازل ہونے سے پہلے مسلمان ہو چکے تھے۔ یہ آیت تبوک کے بعد نازل ہوئی ہے۔[3]

کافر کا ہدیہ قبول کرنے کا جواز: رسول اللہ ﷺ کو مصر کے حاکم مقوقس نے حالت کفر میں آپ ﷺ کے سفیر حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ دو کنیزیں، سواری کے لیے ایک خچر اور لباس بطور ہدیہ بھیجا، جسے آپ ﷺ نے شرف قبولیت سے نوازا۔ انھی دو کنیزوں

---

1. غزوة الحديبية، لأبي فارس، ص:242. 2. غزوة الحديبية، لأبي فارس، ص:242.
3. زاد المعاد:91/5.

میں سے ایک ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا تھیں۔[1]

بادشاہوں اور امراء کو بھیجے گئے خطوط کے نتائج: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خارجی سیاست میں غیر معمولی سیاسی بصیرت کا ثبوت دیا۔ اور بعد میں آنے والے خلفاء کے لیے ایک یادگار مثال چھوڑ گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی بہادری اور قوت کا بھی مظاہرہ کیا۔ ایسے موقع پر اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کوئی بھی اور شخص ہوتا تو معاملے کے انجام سے ڈر (کر بیٹھ) جاتا۔ خاص طور پر جبکہ ان میں سے بعض خطوط بڑے طاقتور حکمرانوں کو بھی لکھے گئے جن کی سرحدیں عرب کے ساتھ ملتی تھیں، مثلاً: ہرقل، کسریٰ اور مقوقس وغیرہ۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اللہ کی دعوت پہنچانے کا عزم اور اس کی تائید ونصرت نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے اقدامات پر ابھارا اور اس سیاست نے درج ذیل بہتر نتائج دیے:

- رسول گرامی قدر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سیاست کے ذریعے سے بین الاقوامی طور پر ایسے تعلقات کی بنیاد رکھی کہ اس سے قبل انسانیت اسے جانتی ہی نہ تھی۔
- حکومت اسلامیہ کی قوت تسلیم کی گئی۔
- رسول گرامی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس خط کتابت نے حکمرانوں اور امراء کی چھپی نیتوں اور سیاسی پالیسیوں کو کھول کر رکھ دیا اور یہ بھی کہ وہ آپ کی دعوت کے متعلق کیا سوچتے ہیں۔
- اسلامی دعوت کے عالمی ہونے کی یہ ایک عملی تدبیر تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جزیرۂ عرب سے باہر کے حاکموں سے خط کتابت کی۔ وہ اسلامی عالمگیریت جس کا تذکرہ مکی عہد میں نازل ہونے والی قرآنی آیات نے یوں کیا ہے:

﴿وَمَآ أَرْسَلْنَٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَٰلَمِينَ ۝﴾

''اور (اے نبی!) ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر ہی بھیجا ہے۔''[2]

[1] غزوة الحديبية لأبي فارس، ص:243. [2] الأنبيآء21:107.

اسی طرح مزید ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا﴾

''کہہ دیجیے: اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔''[1]

حقیقت یہی ہے کہ جزیرہ نمائے عرب کی سرحدوں کے ساتھ جن ممالک کی سرحدیں ملتی تھیں وہاں کے حکمرانوں اور عرب امراء کی جانب رسول اللہ ﷺ کے خطوط سے آپ کی سیاست کے خارجی اقدام کا آغاز ہوا، چنانچہ حکومت کا مرتبہ و مقام بڑھا۔ بین الممالک دینی وسیاسی مقام پیدا ہوا۔ اور یہ سب کچھ فتح مکہ سے پہلے ہوا۔ اس طرح اسی سیاست نے ''عام الوفود'' کے لیے بطورِ تمہید تمام بلادِ عرب میں رسول ﷺ کی حیثیت کو واضح کیا۔[2]

1 الأعراف 7:158. 2 التاريخ السياسي والعسكري للدكتور علي معطي، ص:351.

عمرۂ قضا (7ھ)

7ھ ذوالقعدہ میں رسول اللہ ﷺ عمرے کے ارادے سے مکہ مکرمہ سے روانہ ہوئے جیسا کہ صلح حدیبیہ میں قریش کے ساتھ معاہدہ ہو چکا تھا۔ عمرہ قضا کے لیے نکلنے والوں کی تعداد (عورتوں اور بچوں کے علاوہ) دو ہزار تھی۔ اہل حدیبیہ میں سے صرف وہی افراد پیچھے رہے جو خیبر میں شہید ہو چکے تھے یا اس سے پہلے فوت ہو گئے تھے۔[1]

نبوی قافلہ بستیوں اور وادیوں کو عبور کرتا ہوا بڑی شان وشوکت اور بارعب طریقے سے مکہ مکرمہ کے راستے پر چلا جا رہا تھا۔ یہ مقدس قافلہ مکہ و مدینہ کے رستے پر واقع بستیوں کے قریب سے گزرتا تو دونوں اطراف کے باسی اس بے مثال منظر کو دیکھتے رہ جاتے کہ تمام مسلمان احرام زیب تن کیے، بآواز بلند تلبیہ کہتے، قربانیوں کو نشان لگائے اور قلادے پہنائے قدم بقدم آگے بڑھ رہے تھے۔[2]

احتیاطی تدابیر

نبی مکرم ﷺ نے اپنے ساتھ مکمل اسلحہ لیا تھا۔ کسی بھی ناگہانی صورت حال کے پیش نظر صرف تلواروں پر اکتفا نہ کیا۔ یہ احتیاط خصوصاً اس لیے تھی کہ مشرکین طے شدہ معاہدے اور پختہ قسم کے عہد کا بھی کوئی خیال نہیں رکھتے تھے۔[3]

قافلے کا ہراول دستہ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں دو سو سواروں پر مشتمل تھا۔ قریش

[1] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري، ص:464. [2] منهج الإعلام الإسلامي لسليم حجازي، ص:310. [3] صلح الحديبية لأبي فارس، ص:267.

کو خبر پہنچی تو انھوں نے فوراً مکرز بن حفص کو، قریش کے چند لوگوں کے ہمراہ معاملے کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے روانہ کیا۔ یہ لوگ مرّ الظہران کی وادی یاجج[1] میں مسلمانوں اور رسول اللہ ﷺ سے آ ملے اور پوچھا: ''اے محمد! بخدا آج تک بچپن یا اس عمر میں ہم نے آپ کو دھوکا کرتے نہیں دیکھا! (آج) آپ حرم میں بحالت اسلحہ داخل ہو رہے ہیں! حالانکہ آپ نے شرط مانی تھی کہ معاہدے کے مطابق ہی داخل ہوں گے اور پھر حرم میں صرف نیام بند تلواریں لے کر آئیں گے۔'' رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا: «لَا نَدْخُلُهَا إِلَّا كَذٰلِكَ» ''ہم شرط کے مطابق ہی داخل ہوں گے۔'' اس کے بعد مکرز اپنے ساتھیوں سمیت تیزی سے مکہ مکرمہ واپس چلا گیا اور ان سے کہا: ''محمد (ﷺ) طے شدہ شرائط پر قائم ہیں اور حرم میں اسلحے سمیت داخل نہیں ہوں گے۔''[2]

رسول اللہ ﷺ نے اسلحہ احتیاط کے پیش نظر حرم سے باہر قریب ہی رکھ دیا اور محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں دو سو شاہسوار حفاظت پر مامور کیے جو رسول اللہ ﷺ کے حکم کا انتظار کریں اور جس جانب بھی ضرورت پڑے فوراً حرکت میں آئیں۔[3]

رسول اللہ ﷺ قریش کی چالوں سے بے خبر نہ تھے۔ قبل ازیں انھوں نے آپ پر اور مسلمانوں پر متعدد دفعہ ناگہانی حملے کا پروگرام بنایا تھا، اس لیے اب آپ نے بچاؤ کا پورا بندوبست کیا تھا لیکن معاہدہ بھی پورا کیا۔ یوں آپ ﷺ نے امت کو دشمن کے متعلق احتیاط برتنے کا طریقہ بھی بتا دیا۔[4]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کا اسلحے کی حفاظت پر مامور رہنا عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔[5]

---

[1] یاجج: مکہ مکرمہ کے قریب آٹھ میل کے فاصلے پر ایک وادی ہے۔ [2] دلائل النبوة للبيهقي: 321/4، والمغازي للواقدي: 734/3، والطبقات الكبرىٰ: 121/2. [3] صلح الحديبية لأبي فارس، ص: 268. [4] صلح الحديبية لأبي فارس، ص: 275. [5] صلح الحديبية لأبي فارس، ص: 277.

مکہ مکرمہ میں داخلہ، طواف اور سعی

رسول اللہ ﷺ نے وادی یاجج سے اپنی اونٹنی ''قصواء'' پر مکہ مکرمہ کی جانب سفر جاری رکھا۔ آپ مکہ مکرمہ میں اس گھاٹی سے داخل ہوئے جو ''حجون'' پر جانکلتی ہے۔ اس دوران مسلمان حفاظت نبوی کی بنا پر تلواریں گردنوں میں لٹکائے ہر طرف نظر رکھے ہوئے تھے اور لبّیك اللّٰھم لبّیك کی صدائیں گونج رہی تھیں۔[1]

تلبیہ پکارنے کا ایک مقصد اعلان توحید اور اسلام کی رفعت تھا۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب شرک کو باطل قرار دینا تھا۔ یہ اس ذات باری تعالیٰ کی حمد و ثنا کا اعلان بھی تھا جس نے انھیں اس عبادت کو بجالانے کا موقع عطا فرمایا تھا۔[2]

حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نبوی سواری کی لگام تھامے ہوئے یوں رجزیہ اشعار پڑھ رہے تھے:

خَلُّوا بَنِي الْكُفَّارِ عَنْ سَبِيلِهِ
خَلُّوا فَكُلُّ الْخَيْرِ فِي رَسُولِهِ

''اے کفار کے بیٹو! اللہ کے رسول کا راستہ چھوڑ دو، راستہ چھوڑ دو کہ ساری بھلائی اللہ کے پیغمبر ہی میں ہے۔''

يَا رَبِّ إِنِّي مُؤْمِنٌ بِقِيلِهِ
أَعْرِفُ حَقَّ اللّٰهِ فِي قَبُولِهِ

''اے پروردگار! میں ان کی بات پر ایمان رکھتا ہوں۔ انھیں مان کر ہی اللہ تعالیٰ کا حق پہچانتا ہوں۔''

1 التاريخ السياسي والعسكري للدكتور علي معطي، ص: 353. 2 صلح الحديبية لأبي فارس، ص: 277.

ضَرْباً يُزِيلُ الْهَامَ عَنْ مَقِيلِهِ
وَيُذْهِلُ الْخَلِيلَ عَنْ خَلِيلِهِ

”(تمھیں) ایسی مار ماریں گے کہ کھوپڑی اپنی جگہ سے چھٹک جائے گی۔ اور دوست کو دوست سے بے خبر کر دے گی۔“[1]

اکثر کتب سیرت و مغازی نے تذکرہ کیا ہے کہ اہل مکہ بلند جگہ سے مسلمانوں کا منظر دیکھنے کے لیے پہاڑوں کی چوٹیوں پر چلے گئے، جبکہ ان کی اکثریت، اس وقت کعبہ کے ساتھ موجود دارالندوہ کے پاس رہی تاکہ مکہ مکرمہ اور بیت اللہ الحرام میں داخل ہوتے ہوئے رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کا مشاہدہ کریں۔[2]

مشرکین نے مسلمانوں کے خلاف مشہور کر رکھا تھا کہ انھیں یثرب کے بخار نے کمزور کر دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کو حکم دیا کہ پہلے تین چکروں میں رمل (پہلوانوں کی طرح کندھے ہلاتے ہوئے تیز تیز چلنا) کریں مگر رکن یمانی اور حجرِ اسود کے درمیان (عام چال) چلتے ہوئے گزریں۔[3]

تاکہ مشرکین ان کی جسمانی قوت کا مشاہدہ کرلیں۔ رسول اللہ ﷺ بیت اللہ الحرام میں داخل ہوئے اور اپنی چادر سے اضطباع کیا۔ (دائیں بغل کے نیچے سے چادر (احرام) کا کچھ حصہ گزار کر (دوسرا کنارہ) بائیں کندھے پر ڈال لینا)۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنا دایاں کندھا کپڑے سے باہر رکھا اور طواف شروع کر دیا۔ آپ کے اصحاب بھی آپ کی پیروی کر رہے تھے۔ جب مشرکین نے یہ دیکھا تو کہنے لگے: ”یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق تم سمجھ رہے تھے کہ بخار نے انھیں کمزور کر دیا ہے۔ دیکھو! یہ کتنے طاقتور ہیں۔“[4]

---

1 جامع الترمذي، حديث: 2847، والسنن الكبرىٰ للنسائي: 202/5، ودلائل النبوة للبيهقي: 323/4، وصحيح السيرة النبوية للدكتور العمري، ص: 481. 2 منهج الإعلام الإسلامي لسليم حجازي، ص: 314. 3 صحيح البخاري، حديث: 4256، وصحيح مسلم، حديث: 1266.
4 صحيح مسلم، حديث: 1266، وصحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 481.

مسجد حرام میں داخل ہوتے وقت، اضطباع کرنے، رمل کرنے اور تلبیہ کہنے سے رسول اللہ ﷺ کا مقصد قریش کو مرعوب کرنا تھا تاکہ اس طرح ان کے سامنے مسلمانوں کی قوت، عزم وارادہ، دین سے مضبوط لگاؤ اور اپنے دفاع کی بھرپور صلاحیت کا اظہار کیا جائے۔ اس پالیسی نے مشرکین کے دلوں پر گہرا اثر چھوڑا۔[1]

رسول اللہ ﷺ نے اس انداز سے مشرکین کو غیظ وغضب میں مبتلا کر دیا۔ مشرکینِ مکہ کی چالوں کو ناکام کرتے ہوئے اور انھیں غصہ دلاتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے قرب الٰہی کو پالیا۔ غزوۂ احد میں بھی آپ ﷺ نے ابو دجانہ رضی اللہ عنہ کو مشرکین کے سامنے اکڑ کر چلنے کی اجازت دی تاکہ مومن کی عزت و وقار کا اظہار ہو۔ اور اسی لیے بھی کہ یہ بات مشرکین کو غصہ دلانے والی تھی۔ انھیں مزید غصہ دلانے کے لیے ابو دجانہ رضی اللہ عنہ نے سر پر سرخ پٹی باندھ لی اور رسول اللہ ﷺ نے اسے ناپسند نہ فرمایا۔ اسی طرح غزوۂ حدیبیہ کے موقع پر جب قربانی کرنے کا وقت آیا تو آپ ﷺ نے ابوجہل کے اونٹ کو بھی مشرکین کے سامنے ذبح کیا تاکہ مشرکین کو غزوۂ بدر میں اپنے سرداروں کی موت اور قیدیوں کی ذلت یاد آئے اور انھیں غم لاحق ہو۔ یہاں بھی عمرے کے دوران رمل کرنے اور مسلمانوں کی قوت کا اظہار کرنے کا مقصد یہی تھا کہ ان کی سوچیں اور تدبیریں ناکام بنا دی جائیں۔[2]

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ مشرکین کے ساتھ تدابیر اختیار کرنے میں اپنی تمام تر توانائیاں صرف فرماتے تھے۔''[3]

یہ نفسیاتی جنگ تھی، اس کے بہتر نتائج بھی سامنے آئے۔ آپ تین دن مکہ مکرمہ میں مقیم رہے۔ بیت اللہ الحرام کا طواف کرتے رہے۔ اذانیں بلند ہوتی رہیں اور آپ ﷺ باجماعت نماز کا اہتمام فرماتے رہے۔ حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ بلند آواز سے بیت اللہ

[1] منهج الإعلام الإسلامي لسليم حجازي، ص: 315. [2] صلح الحديبية لأبي فارس، ص: 282. [3] زاد المعاد: 371/3.

الحرام کی چھت پر اذان دیتے۔ اس کا مشرکوں پر بجلی کے کڑکے کا سا اثر ہوتا تھا۔[1]

رسول اللہ ﷺ اسلحہ اور دیگر دفاعی سامان کی حفاظت کرنے والے رفقاء کو بھی نہ بھولے۔ ان کی جگہ دوسروں کی ذمہ داری مقرر کر دی جو طواف وسعی کر چکے تھے۔[2]

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے نکاح

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا ام الفضل (سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کی بیوی) کی ہمشیرہ تھیں۔ جب ان کے خاوند ابو رہم بن عبدالعزیٰ فوت ہوئے تو اس وقت ان کی عمر چھبیس برس تھی، خاوند کے فوت ہونے پر انھوں نے اپنا معاملہ ام الفضل کے سپرد کر دیا۔ ام الفضل رضی اللہ عنہا نے یہ ذمہ داری اپنے خاوند حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو سونپ دی، چنانچہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے ان کا نکاح اپنے بھتیجے حضرت محمد ﷺ سے کر دیا اور اپنی طرف سے چار سو درہم حق مہر بھی ادا کر دیا۔[3]

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی خالہ تھیں۔ حدیبیہ کے معاہدے کے مطابق جب تین دن گزر گئے تو آپ چاہتے تھے کہ میمونہ رضی اللہ عنہا کے عقد نکاح کو اپنے اور قریش کے درمیان گفت وشنید اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا ذریعہ بنائیں۔ اس دوران سہیل بن عمرو اور حویطب بن عبدالعزیٰ معززین قریش کا وفد لے کر آگئے اور کہا: ''آپ کا طے شدہ وقت گزر چکا ہے، لہٰذا یہاں سے چلے جائیے۔''

ابن اسحاق کی روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: «وَمَا عَلَيْكُمْ لَوْ تَرَكْتُمُونِي فَأَعْرَسْتُ بَيْنَ أَظْهُرِكُمْ وَصَنَعْنَا لَكُمْ طَعَامًا، فَحَضَرْتُمُوهُ؟!» ''اگر تم مجھے یہاں ابھی رکنے دیتے تو کیا حرج تھا کہ میں تمھارے ہاں شادی کرتا، ہم تمھارے لیے کھانا تیار کرتے، پھر تم اس میں شریک ہوتے۔'' مگر ان لوگوں نے جواب دیا: ''ہمیں آپ کے کھانے کی ضرورت نہیں، بس مکہ چھوڑ کر چلے جائیں۔''[4]

1 صلح الحديبية لأبي فارس، ص:270. 2 صلح الحديبية لأبي فارس، ص:277. 3 صور وعبر من الجهاد النبوي للدكتور فوزي فيض الله، ص:326. 4 السيرة النبوية لابن هشام: 4 / 14، ودلائل النبوة للبيهقي:4/330.

چنانچہ آپ ﷺ مکہ مکرمہ سے روانہ ہوگئے اور اپنے آزاد کردہ غلام حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ کو حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی خدمت کے لیے چھوڑ گئے۔ جب آپ ﷺ سرف میں پہنچے تو وہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کو لے کر وہیں آ گئے۔

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا ازواج مطہرات میں شامل ہونے والی آخری (خوش قسمت) خاتون تھیں۔ امہات المومنین میں سے بھی آپ سب سے آخر میں وفات پانے والی ہیں۔ ام المومنین میمونہ رضی اللہ عنہا سرف میں فوت ہوئیں اور یہیں دفنائی گئیں اور یہی ان کی جائے ولیمہ بھی تھی۔[1]

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی شادی کے متعلق ایک مشہور فقہی مسئلہ بھی موجود ہے جس کے بارے میں فقہاء کے درمیان خاصا اختلاف رہا ہے۔ وہ یہ کہ آیا رسول اللہ ﷺ نے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے حالت احرام میں نکاح کیا یا حالت احرام سے نکل کر؟ فقہی کتب میں اس مسئلے سے متعلق خاصی تفصیلات موجود ہیں۔[2]

حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کی بیٹی کا مسلمانوں سے ملنا

اسلام کی وجہ سے لوگوں میں بڑی تبدیلی آ چکی تھی۔ وہی بیٹی جس کو شرفائے عرب باعث عار قرار دیا کرتے تھے اور اس عار کے ڈر سے بعض قبائل میں بیٹی کو زندہ درگور کرنے کی روایت چل نکلی تھی۔ وہی بیٹی اب انسانوں کو اچھی لگنے لگی تھی۔ اس کی تربیت کے سلسلے میں مسلمان ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس ضمن میں ہر آدمی اپنا حق دوسرے کے برابر خیال کرتا، الا یہ کہ کسی خاص صورت میں کسی کو اس کی تربیت کا زیادہ حق ملتا۔[3]

1 هذا الحبيب محمد ﷺ يا محب للجزائري، ص:375. 2 فقه السيرة للبوطي، ص:258.
3 السيرة النبوية للندوي، ص:321.

نبی اکرم ﷺ نے مکہ مکرمہ سے واپسی کا ارادہ فرمایا تو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی چچا چچا پکارتے ہوئے آ گئی، انھیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لے لیا اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کہا: ''اپنے چچا کی بیٹی لے لو۔'' حضرت علی رضی اللہ عنہ، زید رضی اللہ عنہ اور جعفر رضی اللہ عنہ اس کے متعلق جھگڑنے لگے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''یہ میرے چچا کی بیٹی ہے۔'' حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میرے بھی چچا کی بیٹی ہے اور اس کی خالہ (اسماء بنت عمیس) میرے نکاح میں ہے۔'' حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما نے کہا: ''یہ میری بھتیجی ہے۔'' آخر نبی اکرم ﷺ نے اس کی خالہ کے حق میں فیصلہ دے دیا اور فرمایا: «اَلْخَالَةُ بِمَنْزِلَةِ الْأُمِّ» ''خالہ ماں کی طرح ہے۔'' رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: «أَنْتَ مِنِّي وَأَنَا مِنْكَ» ''تو میرا ہے اور میں تیرا ہوں۔'' اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: «أَشْبَهْتَ خَلْقِي وَخُلُقِي» ''تو صورت اور سیرت میں میرے مشابہ ہے۔'' اور حضرت زید رضی اللہ عنہ سے فرمایا: «أَنْتَ أَخُونَا وَمَوْلَانَا» ''تو ہمارا بھائی اور ہمارا دوست ہے۔''[1] حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ سے عرض کیا: ''آپ حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی سے نکاح کر لیجیے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّهَا ابْنَةُ أَخِي مِنَ الرَّضَاعَةِ» ''وہ تو میرے دودھ شریک بھائی کی بیٹی ہے۔''[2]

اس قصے میں کئی اسباق، عبرتیں، حکمتیں اور فائدے ہیں جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

- خالہ، ماں کی طرح ہے۔
- والدین کی عدم موجودگی میں بچے کی پرورش کا زیادہ حق خالہ کو ہے۔
- حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی پاکیزگی کا تذکرہ بھی اس فرمان میں موجود ہے: ''تو صورت اور سیرت میں میری طرح ہے۔''

---

1 صحيح البخاري، حديث: 4251,2699، وجامع الترمذي، حديث: 1904. 2 صحيح البخاري، حديث: 4251، وصحيح مسلم، حديث: 1446.

❀ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا عظیم مرتبہ بھی واضح ہے: ''تو مجھ سے اور میں تجھ سے ہوں۔'' نسب اور سسرالی رشتے کے لحاظ سے، سبقت الی الاسلام اور باہمی محبت کے اعتبار سے۔

❀ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کا یہ عظیم شرف کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اپنا بھائی اور دوست قرار دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے درمیان مواخات قائم فرمائی تھی، لہٰذا وہ حضرت حمزہ کے بھائی ٹھہرے۔ یوں وہ اپنے ذمے سگے بھائی کے واجبات وحقوق خیال کرتے تھے، اس لیے وہ سمجھتے تھے کہ ان پر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کا سرپرست بننا واجب ہے۔

❀ پرورش میں خالہ کو چچی اور پھوپھی کے مقابلے میں ترجیح دی جائے گی۔ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی اہلیہ کو حق پرورش دیا، حالانکہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب رضی اللہ عنہا، یعنی بچی کی پھوپھی بقید حیات تھیں۔

❀ کسی بھی عورت کا نکاح کر لینا اس کے ذمے کسی کے حق پرورش کو ختم نہیں کرتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کی پرورش کا فیصلہ خالہ کے حق میں صادر فرمایا، حالانکہ اس وقت وہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی زوجہ تھیں۔

❀ خالہ بھانجی کو اس وقت پرورش میں لے سکتی ہے جب خاوند اس سے اتفاق کرے۔ بیوی خاوند کی پابند ہوتی ہے، اس لیے خاوند کی اجازت طلب کرنا ضروری ہے۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے ازخود حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی کو اس کی خالہ (اپنی اہلیہ) کی پرورش میں دینے کا مطالبہ کیا ہے۔ یہی بات ان کی رضامندی کی دلیل ہے۔

❀ بچہ اگر اپنے چچا کے ساتھ دودھ میں شریک ہو جائے تو وہ اس کا بھائی قرار پائے گا۔ اور چچا کی تمام بیٹیاں (عم زادیاں) اس کی بھتیجیاں سمجھی جائیں گی، لہٰذا اس کے لیے ان سے نکاح کرنا حرام ہوگا۔[1]

[1] زاد المعاد: 3/375,374، وصلح الحديبية لأبي فارس، ص: 286.

عمرۂ قضا کے نتائج

پورے جزیرہ نمائے عرب پر عمرۂ قضا کا اچھا اثر پڑا۔ مسلمانوں کی تبلیغ سے خالد بن ولید، عمرو بن العاص اور عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہم نے اسلام قبول کیا۔

قریش پر اس عمرے کا گہرا اثر ہوا۔ جنرل محمود شیت خطاب کہتے ہیں: ''عمرۃ القضاء نے قریش پر گہرا اثر چھوڑا۔ اکثر قریشی دارالندوہ کے پاس کھڑے رہے اور دیگر افراد آس پاس کی پہاڑیوں پر کھڑے ہو گئے تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کا مکہ مکرمہ میں داخلے کا منظر دیکھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں داخل ہوئے تو دایاں کندھا چادر سے باہر نکالا اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا:

«رَحِمَ اللّٰهُ امْرَأً أَرَاهُمُ الْيَوْمَ مِنْ نَّفْسِهِ قُوَّةً»

''اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم فرمائے جس نے مشرکین مکہ کو اپنی قوت کا مشاہدہ کرایا۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجرِ اسود کو بوسہ دیا اور صحابہ کے ساتھ رمل کرنے لگے۔ ابھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ بھی نہ چھوڑ پائے تھے کہ خالد بن ولید قریش کے ایک گروہ میں کھڑے ہو کر کہہ رہے تھے۔ ہر عقل مند کے سامنے یہ بات کھل گئی ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نہ جادوگر ہیں نہ شاعر اور وہ جو کلام سناتے ہیں وہ رب العالمین کا کلام ہے۔ ہر ذی شعور پر لازم ہو گیا ہے کہ وہ ان کی اتباع کرے۔

خالد کی یہ بات ابوسفیان کو معلوم ہوئی تو اس نے تصدیق چاہی اور خالد سے پوچھا: آپ نے یہ بات کی ہے؟ خالد نے تصدیق کی۔ ابوسفیان غصے سے بھرا اس کی جانب لپکا مگر وہاں موجود عکرمہ بن ابی جہل نے معاملہ رفع دفع کرا دیا۔ اور کہا: ''ابوسفیان! ٹھہر جاؤ، اللہ کی قسم! میں خود خالد جیسے خیالات کی بنا پر ایسی ہی بات زبان پر لانے اور اس جیسا

نظریہ اپنانے کا خدشہ محسوس کر رہا ہوں۔ تم خالد کی رائے جو اس نے خود اختیار کی ہے، اس پر لڑتے ہو! قریش سارے کے سارے اس کے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہیں! اللہ کی قسم! مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ ایک سال کے اندر اندر تمام اہل مکہ محمد (ﷺ) کی اتباع کر لیں گے۔''

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے بعد عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بھی مسلمان ہو گئے اور خود کعبۃ اللہ کے متولی عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ بھی مسلمان ہو گئے۔ بلکہ مکہ مکرمہ کے ہر گھر میں اسلام علانیہ یا چپکے چپکے داخل ہو چکا تھا۔ اس کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''عمرۃ القضاء'' نے مسلمانوں کے مکہ مکرمہ فتح کرنے سے پہلے ہی اہل مکہ کے دلوں کے در کھول دیے تھے۔[1]

عباس محمود العقاد کہتے ہیں: ''یہ کوئی معمولی بات نہیں کہ عمرۃ القضاء کے مثبت اثرات نے خالد بن ولید اور عمرو بن العاص جیسے یگانہ روزگار افراد کو اسلام قبول کرنے پر آمادہ کر لیا۔''[2]

عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام: آئیے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام کا واقعہ انھی کی زبانی سنتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے: ''جب ہم غزوۂ خندق کے بعد لشکروں سمیت واپس ہوئے تو میں نے قریش کے کچھ آدمی جمع کیے جو میری بات بھی سن سکتے تھے اور میرے ہمنوا بھی تھے۔ میں نے ان سے کہا: ''اللہ کی قسم! تم دیکھ رہے ہو کہ محمد (ﷺ) ہر لحاظ سے غالب آتا جا رہا ہے۔ میری ایک رائے ہے مگر تم بتاؤ تمھارا کیا خیال ہے؟'' انھوں نے پوچھا: ''تمھارا کیا خیال ہے؟'' میں نے کہا: ''میرا خیال ہے کہ ہم نجاشی کے پاس چلے جائیں اور وہیں سکونت اختیار کر لیں، محمد (ﷺ) اگر اپنی قوم کے مقابلے میں فتح یاب ہوتا ہے تو ہمیں کیا غرض۔ ہم تو وہاں ہوں گے اور ہمیں اس کی ماتحتی کے مقابلے میں نجاشی کی تابعداری قبول ہو گی۔ مگر ہماری قوم نے اس پر فتح پائی تو وہ ہمیں جانتے ہی

[1] الرسول القائد ﷺ لمحمود شیت خطاب، ص: 210,209. [2] عبقریۃ محمد ﷺ للعقاد، ص: 69.

ہیں۔ہمیں ان سے اچھی ہی توقع ہوگی۔'' سب نے اس رائے پر اتفاق کرلیا۔ میں نے کہا: ''نجاشی کے لیے ہدیہ اکٹھا کریں۔'' ہمارے ہاں سے اسے بہتر ہدیہ چمڑا ہی پیش ہوتا تھا، چنانچہ ہم نے ڈھیر سارا چمڑا جمع کرلیا اور اس کی جانب چل دیے۔اللہ کی قسم! ہم اس کے پاس ہی تھے کہ وہاں عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ آ گئے جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کے پاس حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کے متعلق گفتگو کے لیے بھیجا تھا۔عمرو رضی اللہ عنہ اس کے پاس گئے، پھر واپس ہوئے تو میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا: ''یہ عمرو بن امیہ ہے۔'' اگر میں نجاشی کے پاس جاؤں اور اس سے اسے مانگ لوں، وہ مجھے دے دے تو اسے قتل کرسکتا ہوں، اگر ایسا کیا تو قریش سمجھیں گے کہ میں نے ان کی جانب سے کفایت کی ہے۔(ان کی کمی پوری کردی ہے) کیونکہ محمد(صلی اللہ علیہ وسلم) کا سفیر قتل کردیا ہے،مشورہ کرکے میں نجاشی کے پاس چلا گیا۔حسب روایت اسے سجدہ کیا تو اس نے کہا: ''اے دوست! خوش آمدید۔اپنے علاقے سے کوئی ہدیہ بھی لائے ہو۔'' میں نے کہا: ''جی ہاں، بادشاہ سلامت! میں ڈھیر سارا چمڑا بطور ہدیہ لایا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے چمڑا آگے بڑھا دیا۔اس کو وہ بڑا اچھا لگا۔

پھر میں نے عرض کیا: ''بادشاہ سلامت! میں نے یہاں سے ابھی ایک آدمی کو نکلتے دیکھا ہے۔وہ ہمارے دشمن کا سفیر ہے۔آپ وہ مجھے دے دیں تو میں اسے قتل کردوں کیونکہ ان لوگوں نے ہمارے بہت سارے معزز اور شرفا مار ڈالے ہیں۔'' یہ سن کر نجاشی غصے سے بھر گیا۔اس نے اپنا ہاتھ دراز کیا اور میری ناک پر اس زور سے مارا کہ میں سمجھا میری ناک ٹوٹ گئی ہے۔مجھے اتنا ڈر لگا کہ اگر زمین پھٹ کر جگہ دے دیتی تو میں اس میں داخل ہوجاتا۔میں نے عرض کیا: ''بادشاہ سلامت! اگر مجھے علم ہوتا کہ آپ اس مطالبے پر ناراض ہوں گے تو میں ایسا سوال ہی نہ کرتا۔'' نجاشی نے کہا: ''تم اس شخص کا سفیر قتل کرنے کے لیے مانگتے ہو جس کے پاس وہ فرشتہ آتا ہے جو موسیٰ کے پاس آیا کرتا تھا۔''

میں نے کہا: ''بادشاہ سلامت! کیا واقعی ایسا ہے؟'' نجاشی نے کہا: ''تیرا ستیا ناس! اے عمرو! میرا کہا مانو تو اس کی اتباع کرلو۔ اللہ کی قسم! وہ حق پر ہے۔ اور وہ اپنے مخالفین پر ایسے ہی غالب آئے گا جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون اوراس کے لشکروں پر غالب آگئے تھے۔'' میں نے عرض کیا: ''کیا آپ مجھے قبول اسلام پر بیعت کراتے ہیں؟'' اس نے کہا: ''ہاں!'' نجاشی نے ہاتھ بڑھایا تو میں نے اسلام کی بیعت کرلی، پھر میں اپنے ساتھیوں کی طرف آیا۔ میری رائے بدل چکی تھی۔ میں نے قبول اسلام اپنے ساتھیوں سے چھپایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر اسلام قبول کرنے کے لیے چل دیا۔ فتح مکہ سے تھوڑی مدت پہلے کی بات ہے کہ مکہ مکرمہ سے آتے ہوئے مجھے خالد بن ولید مل گئے۔ میں نے پوچھا: ''ابوسلیمان کدھر؟'' انھوں نے کہا: ''اللہ کی قسم! راستہ واضح ہوگیا ہے۔ یہ آدمی واقعی نبی ہے، میں تو بخدا جاتا ہوں اوراسلام قبول کرتا ہوں۔ آخر کب تک؟ (اس کی مخالفت کریں گے)؟'' میں نے کہا: ''اللہ کی قسم! میں بھی اسلام قبول کرنے کے لیے آیا ہوں۔'' ہم دونوں مدینہ منورہ چلے گئے۔ پہلے خالد بن ولید آگے بڑھے اور اسلام قبول کیا، پھر میں قریب ہوا اور عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! میں اس شرط پر بیعت کرتا ہوں کہ میری سابقہ غلطیاں معاف کر دی جائیں اور جو ہو چکا میرے سامنے اسے نہ دہرایا جائے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«يَا عَمْرُو! بَايِعْ، فَإِنَّ الْإِسْلَامَ يَجُبُّ مَا كَانَ قَبْلَهُ وَ إِنَّ الْهِجْرَةَ تَجُبُّ مَا كَانَ قَبْلَهَا»

''اے عمرو! بیعت کرو، یقیناً اسلام کی بدولت سابقہ تمام گناہ مٹ جاتے ہیں اور ہجرت سابقہ ہر کوتاہی ختم کر دیتی ہے۔''[1]

[1] مسند أحمد: 4/199,198، ودلائل النبوة للبيهقي: 4/348,343، والسيرة النبوية لابن هشام: 3/289-291، علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے دیکھیے: (إرواء الغليل، حديث: 1280)

عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے اسلام میرے دل میں اتار دیا تو میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا اور عرض کیا: ''اپنا دایاں ہاتھ بڑھائیے تاکہ میں آپ کی بیعت کروں۔'' آپ نے ہاتھ آگے بڑھایا تو میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ آپ نے فرمایا: «مَالَكَ يَا عَمْرُو؟» ''عمرو! کیا بات ہے؟'' میں نے عرض کیا: ''میں شرط لگانا چاہتا ہوں۔'' فرمایا: «تَشْتَرِطُ مَاذَا؟» ''کیا شرط لگانا چاہتے ہو؟'' میں نے کہا: ''یہ کہ میرے گناہ معاف کر دیے جائیں۔'' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَمَا عَلِمْتَ أَنَّ الْإِسْلَامَ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ وَأَنَّ الْهِجْرَةَ تَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهَا وَأَنَّ الْحَجَّ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ»

''آپ جانتے نہیں کہ اسلام پہلے گناہوں کو مٹا دیتا ہے، ہجرت بھی سابقہ گناہوں کو مٹا دیتی ہے اور حج بھی پہلے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔''[1]

خالد بن ولید اور عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہما کا قبول اسلام: حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اپنے قبول اسلام کی کہانی خود سناتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے میرے ساتھ مہربانی کا ارادہ فرمایا تو میرے دل میں اسلام کی محبت ڈال دی، میں نے سوچا میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تمام معرکوں میں شامل رہا ہوں۔ میں جس مقام پر بھی ان کے بالمقابل آیا، میری کوئی وقعت نہیں رہی اور وہی غالب رہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ کے لیے آئے تو میں مشرکین کے شاہسواروں کے ہمراہ نکلا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عسفان میں ہمارا آمنا سامنا ہوا۔ کسی اور مقصد کا اظہار کرتے ہوئے آپ کے بالمقابل ٹھہرا رہا، چنانچہ جب آپ نے اپنے ساتھیوں کو بے خوف ہو کر نماز ظہر پڑھائی تو ہمارا ارادہ تھا کہ اچانک حملہ کر دیں لیکن یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ اور اس میں بھلائی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ارادے بھانپ گئے تو ساتھیوں کو صلاۃ الخوف پڑھائی۔ میرے دل پر اس کا بڑا عجیب اثر ہوا۔ میں نے

[1] صحیح مسلم، حدیث: 121، ومسند أحمد: 4/205، وصحیح ابن خزیمة، رقم: 2515.

سوچا یہ آدمی ضرور کسی کی حفاظت میں ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم جدا جدا ہو گئے۔ آپ ہمارے گھوڑوں کے راستے سے ایک جانب ہو کر چل دیے۔ جب آپ نے قریش سے مصالحت کر لی اور قریش نے آپ کو واپس جانے کو کہا تو میں نے دل میں سوچا: ''اب (آگے) کیا بچا ہے؟ اب کہاں جاؤں؟ نجاشی کے پاس چلا جاؤں مگر اس نے تو محمد ﷺ کی اتباع کر لی ہے۔ اس کے ساتھی اس کے پاس پر امن ہیں۔تو کیا ہرقل کی طرف بھاگ جاؤں؟ اپنا دین چھوڑ کر یہودیت یا نصرانیت اختیار کر لوں۔ عجمیوں کے ساتھ ان کے تابع ہو کر رہوں یا پھر لوگوں کے ساتھ اپنے گھر میں ٹھہرا رہوں۔'' میں یہی سوچ رہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ ''عمرۃ القضاء'' کے لیے آ گئے، میں مکہ چھوڑ گیا اور جب تک وہ وہاں رہے میں وہاں نہ آیا۔ میرا بھائی ولید بن ولید بھی عمرے میں آپ ﷺ کے ہمراہ تھا۔ اس نے مجھے بہت تلاش کیا مگر میں اسے نہ ملا۔ اس نے مجھے یہ خط لکھا:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اما بعد! مجھے اسلام سے تمھاری پہلو تہی پر تعجب ہے، جبکہ تم انتہائی عقل مند آدمی ہو۔ کیا کوئی شخص اب بھی اسلام سے ناواقف رہ سکتا ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے تمھارے متعلق دریافت فرمایا ہے۔ آپ فرما رہے تھے: «أَيْنَ خَالِدٌ؟» ''خالد کہاں ہے؟''

تو میں نے عرض کیا: ''اللہ تعالیٰ اسے لے آئے گا۔''

آپ ﷺ نے فرمایا:

«مَا مِثْلُهُ جَهِلَ الْإِسْلَامَ! وَلَوْ كَانَ جَعَلَ نِكَايَتَهُ وَجِدَّهُ مَعَ الْمُسْلِمِينَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ، لَكَانَ خَيْرًا لَّهُ، وَلَقَدَّمْنَاهُ عَلٰى غَيْرِهِ»

''خالد جیسا شخص اسلام سے بے بہرہ نہیں رہ سکتا، اگر وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر مشرکین کے خلاف نبرد آزما ہوتے تو ان کے لیے خیر و برکت کا باعث ہوتا۔ ہم انھیں دیگر لوگوں سے مقدم رکھیں گے۔''

میرے بھائی! بہت ہو گیا۔ اب لوٹ آیئے اور تلافی کیجیے۔"

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: جب مجھے ولید کا خط ملا تو اس نے اسلام کی طرف میری کشش بڑھا دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات مجھے بہت اچھی لگی اور مجھ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ انھی دنوں میں نے خواب دیکھا کہ تنگ و تاریک جگہ پر ہوں، پھر کشادہ و سرسبز جگہ کی جانب چلا گیا ہوں۔ میں نے دل میں کہا: "یہ غیر معمولی خواب ہے۔" جب میں مدینہ آ گیا تو میں نے سوچا یہ خواب ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بتاؤں۔ انھیں بتایا تو انھوں نے یہ تعبیر کی کہ جو تم نے تنگ و تاریک جگہ دیکھی تھی وہ کفر کا ظلمت کدہ تھا اور پھر جو وسیع اور سرسبز و شاداب جگہ دیکھی وہ اسلام کی روشن راہ تھی۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں جب میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آنے کا ارادہ کر لیا تو سوچا کسے ساتھی بناؤں؟ میں صفوان بن امیہ سے ملا اور کہا: "اے ابو وہب! دیکھ نہیں رہے کہ ہماری حالت کیا ہے؟ "ہم تو صرف سری کھانے والے ہیں۔" (یہ مقولہ تب بطور کنایہ بولتے ہیں جب تعداد اتنی تھوڑی ہو کہ جانور کی سری پر گزارا ہو جاتا ہو) ادھر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے کہ عرب و عجم پر غلبہ پا گیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ہم بھی اس کے پاس جا کر اتباع کر لیں، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سارے عرب کے مقابلے میں معزز ہو گیا ہے۔" مگر صفوان نے سختی سے انکار کر دیا اور کہا: "اگر سارے قریشی بھی مسلمان ہو جائیں تب بھی وہ اسلام قبول نہیں کرے گا۔" اس کے بعد ہم جدا ہو گئے۔

میں نے خیال کیا یہ اپنے مقتولین بدر، باپ اور بھائی کا بدلہ نہیں لے سکا، اس لیے بدلے کی نیت لیے ہوئے ہے، اس کے بعد میں عکرمہ بن ابوجہل سے ملا۔ اس سے بھی وہی بات کہی۔ اس نے بھی تقریباً ویسا ہی جواب دیا۔ میں نے اس سے کہا: "اس بات کا تذکرہ کسی سے نہ کرنا۔" میں نے سوچا کہ اس کے بھی رشتے دار بدر میں مارے گئے ہیں لیکن میں نے اسے وہ یاد دلانا پسند نہ کیا، پھر میں نے سوچا کہ مجھے اکیلے جانے میں کیا ڈر

ہے، پھر میں مکہ سے چل پڑا۔ راستے میں مجھے عثمان بن طلحہ ملا۔ میں نے سارا معاملہ کھول کر بتادیا اور کہا: ''ہماری مثال اس لومڑ جیسی ہے جو زمین میں گھس کر بیٹھا ہو مگر اسے جس وقت چاہیں وہاں پانی ڈال کر نکال سکتے ہیں اور وہ نکلنے پر مجبور ہوگا۔'' اس سے بھی میں نے وہی بات کہی۔اس نے میری بات فوراً مان لی اور کہا: ''میں تو آج صبح ہی سے جانے کا ارادہ کر رہا تھا۔ یہ دیکھو صحن میں میری سواری بھی تیار ہے۔'' چنانچہ ہم دونوں نے یاجج اکٹھے ہونے کا وعدہ کرلیا کہ اگر تم پہلے پہنچ جاؤ تو میرا انتظار کرو اور اگر میں پہلے پہنچ گیا تو تمھارا انتظار کروں گا۔ ہم رات کی تاریکی ہی میں چل پڑے۔ ابھی فجر طلوع نہ ہوئی تھی کہ یاجج میں جا ملے۔ صبح چلتے رہے اور ''ہدہ'' مقام پر پہنچے تو وہاں عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ مل گئے۔ انھوں نے مرحبا کہا۔ ہم نے بھی مرحبا کہا۔ انھوں نے پوچھا: ''کہاں کے ارادے ہیں؟'' ہم نے کہا: ''آپ کیسے یہاں آئے؟'' انھوں نے ہمارے سوال پر پھر سوال کر دیا کہ ''آپ کا اس طرف رخ ہے تو اس کا باعث کیا ہے؟''

ہم نے کہا: ''قبول اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع۔'' انھوں نے کہا: ''میری غرض بھی یہی ہے۔'' ہم اکٹھے مدینہ پہنچ گئے۔ ہم نے حرہ میں اپنی سواریاں بٹھا دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی گئی تو آپ بہت خوش ہوئے۔ میں نے اپنا بہترین لباس زیب تن کیا اور آپ کی طرف چل دیا۔ رستے میں مجھے ولید ملا اور کہنے لگا: ''جلدی کیجیے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی اطلاع دے دی گئی ہے۔ آپ کے آنے پر وہ بہت خوش ہیں اور آپ کا انتظار فرما رہے ہیں۔'' میں تیز تیز چلتے ہوئے جلدی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تبسم فرما رہے تھے۔ میں نے سلام نبوت پیش کیا۔ آپ نے خندہ پیشانی سے جواب دیا۔ میں نے کہا:

«إِنِّي أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّكَ رَسُولُ اللّٰهِ»

''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور آپ اللہ کے رسول ہیں۔''

آپ ﷺ نے فرمایا:

«اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي هَدَاكَ، قَدْ كُنْتُ أَرٰى لَكَ عَقْلًا رَّجَوْتُ أَلَّا يُسَلِّمَكَ إِلَّا إِلَى الْخَيْرِ»

''ہر قسم کی تعریف کے لائق وہ ذات ہے جس نے تمھیں ہدایت بخشی۔ مجھے تمھاری دانشمندی اور دوراندیشی سے امید تھی کہ وہ تمھیں ضرور نیکی و خیر سے وابستہ کرے گی۔''

میں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! آپ کو معلوم ہی ہے کہ میں حق کی دشمنی میں آپ کے بالمقابل آیا کرتا تھا، لہٰذا اللہ تعالیٰ سے میری مغفرت کی دعا فرما دیجیے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: «اَلْإِسْلَامُ يَجُبُّ مَاكَانَ قَبْلَهُ» ''اسلام سابقہ گناہوں کو کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔'' میں نے عرض کیا: ''اس کے باوجود بھی آپ دعا کر دیجیے۔'' تو آپ ﷺ نے دعا فرمائی: «اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِخَالِدٍ كُلَّ مَا أَوْضَعَ فِيهِ مِنْ صَدٍّ عَنْ سَبِيْلِكَ»

''اے اللہ! آج تک خالد تیرے راستے سے روکنے کے لیے جتنی کوششیں کرتا رہا ہے اس کی وہ سب کوتاہیاں معاف فرما دے۔''

حضرت عمرو بن العاص اور عثمان بن طلحہ بھی آگے بڑھے اور رسول اللہ ﷺ سے بیعت کی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ اپنے اسلام لانے کا مہینہ صفر قرار دیتے ہیں۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب سے میں اسلام لایا، رسول اللہ ﷺ مشکل کے موقع پر صحابہ میں سے کسی پر مجھ سے زیادہ اعتماد نہیں کرتے تھے۔[1]

قبول اسلام کے مذکورہ واقعات سے ماخوذ اسباق: حضرت عمرو بن عاص اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہما کے اسلام لانے کے قصے میں کئی حکمتیں، نکتے اور عبرتیں ہیں:

---

1 دلائل النبوة للبيهقي:4/349-352، والبداية والنهاية:4/239,240، والتاريخ الإسلامي للحميدي:7/95.

❁ نجاشی کا غصے میں آنا اس کے صدق ایمان اور رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں سے سچی محبت کی علامت ہے۔ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ پر نجاشی کی صداقت ایمانی کا گہرا اثر ہوا۔ ایک قریشی سردار کو اسلام کی طرف لانے پر نجاشی بڑے اجروثواب کا مستحق ٹھہرا۔[1]

❁ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا اسلام لانا اسلام اور مسلمانوں کے لیے بڑی برکت اور قوت کا باعث بنا۔ انھوں نے اپنی خداداد عقل و فراست کو اسلام کی دعوت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ان کے قبول اسلام سے کفر کو بڑا خسارہ ہوا۔ مشرکین انھیں ایسے بڑے بڑے معاملات میں آگے کرتے جو بڑے عقل و فراست کے متقاضی ہوتے تھے۔ خاص طور پر جن معاملات کا تعلق اسلام اور مسلم دشمنی سے ہو۔[2]

❁ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بھانپ چکے تھے کہ میدان بالآخر رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ آنے والا ہے۔ ان کی یہ بات قابل غور ہے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ میں نبی ﷺ کے بالمقابل ہر جگہ موجود رہا مگر جہاں بھی ہمارا آمنا سامنا ہوا آپ ﷺ ہی غالب رہے اور میں مغلوب، پھر میں یہ بھی دیکھتا کہ رسول اللہ ﷺ بہت جلد فاتح و غالب ہو جائیں گے۔[3] حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے اس اعتراف و تجزیے میں دشمنانِ اسلام کے لیے عبرت ہے۔[4]

❁ کسی کی قدردانی اس پر اثر انداز ہونے کا بہترین ذریعہ ہے، اس لیے تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا تھا: ''خالد جیسا زیرک انسان اسلام سے بے بہرہ نہیں رہ سکتا۔ اگر وہ اپنی قوت مسلمانوں کے ساتھ مل کر مشرکین کے خلاف استعمال کریں تو ان کے لیے سراسر خیر و برکت کا باعث ہوگا اور ہم انھیں دیگر لوگوں سے مقدم رکھیں گے۔''

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام کے سلسلے میں ان پُر اثر کلمات کا بڑا کردار ہے۔

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي: 90/7. [2] التاريخ الإسلامي للحميدي: 90/7. [3] صلح الحديبية لأبي فارس، ص: 263. [4] التاريخ الإسلامي للحميدي: 95/7.

رسول اللہ ﷺ دلوں پر اثر ڈالنے سے خوب واقف تھے۔ آپ کو معلوم تھا کہ خالد میں قیادت کی فطرتی صلاحیتیں موجود ہیں، لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے اس کی صائب رائے، عمدہ عقل و دانش اور پختگی فکر کی تعریف فرمائی۔ آپ کی اس تعریف نے خالد رضی اللہ عنہ کے لیے وہ تمام راستے مسدود کر دیے جو انھیں شرک پر صرف اس لیے قانع کیے ہوئے تھے کہ انھیں اس میں قیادت و سیادت حاصل تھی۔ جب انھیں احساس ہوا کہ جو مقام مشرکین نے انھیں دے رکھا ہے اسلام میں بھی حاصل رہے گا اور یقین ہو گیا کہ اسلام قبول کر کے وہ آخری صف میں نہیں دھکیل دیے جائیں گے اور بالکل بھلا نہیں دیے جائیں گے تو انھی باتوں نے انھیں شیطانی وسوسوں کے مقابلے میں فتح یاب کر دیا۔

❁ حضرت عمرو بن عاص اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہما کی اسلام سے وابستگی اسلام کے لیے باعث قوت اور کفر کے لیے باعث ذلت تھی۔ ان دونوں کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی جہادی تاریخ میں درخشاں ابواب کا اضافہ فرمایا جو امت کے لیے رہتی دنیا تک باعث فخر رہے گا۔[1]

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي: 96,95/7.

باب 4

جنگِ موتہ (8ھ)

اسباب اور تاریخ

شام کے عربوں نے مسلمانوں اور بازنطینیوں میں جنگ وجدل کی آگ بھڑکا دی تھی۔ قضاعہ کے قبیلہ کلب نے، جو دومۃ الجندل میں مقیم تھے، مسلمانوں کو تنگ کرنے کی عادت بنالی۔ ان کا ارادہ تھا کہ اشیائے ضرورت شام سے مدینہ منورہ لے جانے والے تاجروں کو تنگ کر کے مدینہ منورہ کی معیشت کمزور کر دی جائے۔ اس کے لیے رسول اللہ ﷺ نے قبیلۂ کلب پر دومۃ الجندل میں پانچ ہجری کو یلغار کی مگر آپ ﷺ کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ ادھر اُدھر منتشر ہو چکے تھے۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبی رضی اللہ عنہ کو ایک مہم پر روانہ کیا۔ حضرت دحیہ رضی اللہ عنہ اسی مہم کو پورا کر کے واپس آ رہے تھے تو ''جذام'' اور ''لخم'' کے کچھ لوگوں نے ''حِسمٰی'' مقام پر ان کا راستہ روک کر انھیں لوٹ لیا۔ 6 ہجری میں ''حِسمٰی'' کی جانب حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کا معرکہ بھی اسی غرض سے ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ایک شرارت یہ بھی ہوئی کہ مذحج اور قضاعہ قبیلوں نے 6 ہجری میں حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما اور ان کے ساتھیوں پر زیادتی کی جو دعوت الی اللہ کے سلسلے میں وادی القریٰ بھیجے گئے تھے۔ اسی طرح صلح حدیبیہ کے بعد جب رسول اللہ ﷺ نے حاکمِ بُصریٰ، جو اس وقت رومی حکمران کے ماتحت تھا، کی طرف اپنے سفیر حارث بن عمیر ازدی رضی اللہ عنہ کو روانہ فرمایا تو انھیں شہید کر دیا گیا۔ اس سے ان کی جانب سے خطرات مزید بڑھتے چلے گئے۔[1]

1 المسلمون والروم في عصر النبوة لعبدالرحمٰن أحمد سالم، ص: 87.

شرحبیل بن عمرو غسانی نے سفیروں اور ایلچیوں کے عمومی احترام و تکریم کو پس پشت ڈالتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے سفیر حارث بن عمیر ازدی رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا۔[1] حارث بن ابوشمر غسانی حاکم دمشق نے بھی رسول اللہ ﷺ کے سفیر سے بدسلوکی کی اور مدینہ منورہ پر چڑھائی کی دھمکی دی۔ اس سے بھی زیادہ قابل مذمت واقعات رونما ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمرو بن کعب غفاری کی قیادت میں ایک جماعت کو ''ذات اَطلاح'' کی طرف دعوت اسلام دینے بھیجا۔ اہلِ علاقہ نے اسلام قبول کرنے کے بجائے داعیوں کو چاروں طرف سے گھیر کر لڑائی شروع کر دی اور سب کو شہید کر ڈالا۔ ان میں سے صرف ''امیر'' قافلہ بچا جو زخموں سے چور مدینہ منورہ پہنچا اور رسول اللہ ﷺ کو تمام حالات سے مطلع کیا۔[2]

ادھر شام کے عیسائی رومی حکومت کے ایما پر مسلمانوں سے سخت زیادتیاں کرنے لگے۔ انھوں نے ''مَعان'' کے گورنر کو اسلام لانے کے جرم میں شہید کر دیا۔ شام میں جس عرب نے بھی اسلام قبول کیا اسے شہید کر دیا گیا۔[3]

یہ دردناک واقعات خاص طور پر رسول اللہ ﷺ کے سفیر حارث بن عمیر رضی اللہ عنہ کی شہادت مسلمانوں کے دلوں کو تحریک دینے اور اس بات پر ابھارنے کے لیے کافی تھی کہ وہ عیسائیوں کی اسلام دشمن سرگرمیوں کی روک تھام کریں اور اپنے ان اسلامی بھائیوں کے خون کا بدلہ چکائیں جنھیں اکیلے اللہ کو رب ماننے اور محمد ﷺ کو اس کا رسول ماننے کے جرم میں قتل کر دیا گیا ہے۔[4]

اسی طرح رومی حکومت کے تابع فرمان عرب جو مسلمانوں کو پریشان کرنے کے عادی تھے، آئے دن دھمکیاں دیتے۔ اس سے قبل وہ کئی داعیانِ اسلام کو شہید کر چکے تھے۔ مسلمانوں کے نزدیک داعیانِ اسلام کا قتل ناقابل معافی جرم تھا۔ یہ تمام امور مسلمانوں

---

1 أسد الغابة: 216/1. 2 تاريخ الطبري: 103/3. 3 الصراع مع الصليبيين لأبي فارس، ص: 20. 4 الصراع مع الصليبيين لأبي فارس، ص: 20.

کے سامنے واضح ہدف کی صورت اختیار کر گئے تاکہ مستقبل میں اس طرح کے بھیانک جرائم کی روک تھام ہو۔ مسلمان داعی اپنی جانوں کو محفوظ سمجھیں اور مسلمان تاجر شام اور مدینہ کے درمیان آزادی سے تجارتی سامان منتقل کر سکیں۔[1]

لشکر اسلامی کی تیاری

8 ہجری میں رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو جنگ کی تیاری کا حکم دیا۔ مسلمانوں نے بے مثال تیاری شروع کر دی۔ تین ہزار مجاہد تیار ہو گئے۔ سپہ سالاری کے لیے آپ ﷺ نے بالترتیب تین افراد کا انتخاب فرمایا۔ سب سے اول زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما، پھر حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، پھر حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے حوالے سے باسند روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ موتہ کے لیے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کو امیر مقرر کرتے ہوئے فرمایا:

«إِنْ قُتِلَ زَيْدٌ فَجَعْفَرٌ، وَإِنْ قُتِلَ جَعْفَرٌ، فَعَبْدُ اللّٰهِ بْنُ رَوَاحَةَ»

''اگر زید کو شہید کر دیا جائے تو جعفر امیر ہوں گے اور اگر وہ بھی درجہ شہادت پا لیں تو امیر عبداللہ بن رواحہ ہوں گے۔''[2]

رسول اللہ ﷺ نے اسلامی سپاہ کو حکم دیا کہ جس جگہ حضرت حارث بن عمیر ازدی رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تھے وہاں پہنچ کر لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں اگر وہ قبول کر لیں تو بہتر ورنہ اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کریں اور ان پر یلغار کر دیں۔[3]

رسول اللہ ﷺ کی عادتِ مبارکہ تھی کہ آپ لشکروں کو آدابِ قتال پر مشتمل نصائح کے ساتھ رخصت فرماتے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے انھیں بھی اپنی انمول نصائح سے نوازا۔[4]

---

[1] المسلمون و الروم في عصر النبوة لعبدالرحمٰن أحمد سالم، ص: 89. [2] صحيح البخاري، حديث: 4261. [3] السيرة الحلبية: 787/2. [4] الصراع مع الصليبيين لأبي فارس، ص: 21.

رسول اللہ ﷺ نے اہل لشکر کو یوں نصیحت فرمائی:

«أُوصِيكُمْ بِتَقْوَى اللّٰهِ وَبِمَن مَّعَكُمْ مِّنَ الْمُسْلِمِينَ خَيْرًا، اُغْزُوا بِاسْمِ اللّٰهِ، فِي سَبِيلِ اللّٰهِ، مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ، لَا تَغْدِرُوا وَلَا تَقْتُلُوا وَلِيدًا وَّلَا امْرَأَةً وَّلَا كَبِيرًا فَانِيًا وَّلَا مُنْعَزِلًا بِصَوْمَعَةٍ وَّلَا تَقْرَبُوا نَخْلًا وَّلَا تَقْطَعُوا شَجَرًا وَّلَا تَهْدِمُوا بِنَاءً وَّإِذَا لَقِيتُمْ عَدُوَّكُمْ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ فَادْعُوهُمْ إِلٰى إِحْدٰى ثَلَاثٍ: فَإِمَّا الْإِسْلَامِ وَ إِمَّا الْجِزْيَةِ وَإِمَّا الْحَرْبِ»

''میں تمھیں اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں۔ اپنے ہمراہی مسلمانوں سے اچھا سلوک کرنا، اللہ تعالیٰ کے نام سے، اللہ تعالیٰ کی راہ میں اور اللہ تعالیٰ کا انکار کرنے والوں سے جنگ کرو۔ بدعہدی نہ کرنا، کسی بچے اور عورت اور انتہائی عمر رسیدہ بوڑھے اور تارک الدنیا راہب کو قتل نہ کرنا اور کوئی کھجور اور درخت نہ کاٹنا اور کسی عمارت کو منہدم نہ کرنا۔ دشمن سے ملو تو اسے تین میں سے ایک شرط قبول کرنے کی دعوت دینا: اسلام قبول کر لیں یا جزیہ ادا کریں یا پھر جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔''[1]

لشکر اسلامی کی روانگی

لشکر اسلامی جب مکمل طور پر تیار ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ اور مسلمان اسلامی لشکر کو الوداع کہتے ہوئے اپنے ہاتھ عاجزی کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں بلند کرتے ہوئے دعا گو تھے کہ اے اللہ! ہمارے مجاہد بھائیوں کی مدد و نصرت فرما۔ رسول اللہ ﷺ اور وہاں موجود مسلمانوں نے سب کو سلام کہا اور اس دعا سے الوداع کیا: «دَفَعَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَرَدَّكُمْ صَالِحِينَ غَانِمِينَ» ''اللہ تعالیٰ تم سے ہر بلا دور فرمائے اور تمھیں صحیح سلامت اور غنیمت کے ساتھ واپس لوٹائے۔''[2]

[1] المغازي للواقدي: 758,757/2. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 21/4.

لوگوں نے جب عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو سلام کر کے الوداع کیا تو وہ رو دیے۔ لوگوں نے تعجب سے پوچھا: ''ابن رواحہ آپ کیوں رو رہے ہیں؟'' انھوں نے کہا: ''اللہ کی قسم! مجھے دنیا کی محبت یا تمھارے ساتھ تعلقِ خاطر کی بنا پر رونا نہیں آیا بلکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کتاب اللہ کی یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا ہے جس میں جہنم کا ذکر ہے:

﴿وَإِنْ مِّنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا﴾

''تم میں سے ہر شخص جہنم پر وارد ہونے والا ہے یہ تمھارے رب پر ایک لازمی اور طے شدہ بات ہے۔''[1]

میں نہیں جانتا کہ جہنم پر وارد ہونے کے بعد کیسے پلٹ سکوں گا؟'' مسلمانوں نے کہا: ''اللہ تعالیٰ تمھارے شاملِ حال ہو، تمھارا دفاع فرمائے اور تمھیں صحیح سلامت واپس لائے۔'' حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے جواباً یہ اشعار پڑھے:

لٰكِنَّنِي أَسْأَلُ الرَّحْمٰنَ مَغْفِرَةً
وَضَرْبَةً ذَاتَ فَرْغٍ تَقْذِفُ الزَّبَدَا

''لیکن میں تو رحمٰن سے مغفرت کا سوال کرتا ہوں اور تلوار کا ایسا گہرا زخم کھانے کی دعا کرتا ہوں جو خون کی جھاگ اڑانے والا ہو۔''

أَوْ طَعْنَةً بِيَدَيْ حَرَّانَ مُجْهِزَةً
بِحَرْبَةٍ تُنْفِذُ الْأَحْشَاءَ وَالْكَبِدَا

''یا کسی خون کے پیاسے نیزہ باز کے دونوں ہاتھوں سے پر زور نیزہ کھانے کا سوال کرتا ہوں جو (نیزہ) آنتوں اور جگر سے پار اتر جائے۔''

حَتّٰى يُقَالَ إِذَا مَرُّوا عَلٰى جَدَثِي
أَرْشَدَهُ اللّٰهُ مِنْ غَازٍ وَّقَدْ رَشَدَا

1 مریم 71:19۔

"تاکہ جب لوگ میری قبر سے گزریں تو کہیں: "اللہ تعالیٰ نے اس مجاہد کو صحیح رستہ دکھایا اور اس نے وہی راستہ اختیار بھی کر لیا۔"[1]

رسول اللہ ﷺ نے عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو الوداع کہا تو انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں یہ شعر پڑھے:

يُثْبِتُ اللّٰهُ مَا آتَاكَ مِنْ حَسَنٍ
تَثْبِيتَ مُوسٰى وَنَصْرًا كَالَّذِي نُصِرُوا
إِنِّي تَفَرَّسْتُ فِيكَ الْخَيْرَ نَافِلَةً
فِرَاسَةً خَالَفْتُهُمْ فِي الَّذِي نَظَرُوا
أَنْتَ الرَّسُولُ فَمَنْ يُّحْرَمْ نَوَافِلَهُ
وَالْوَجْهُ مِنْهُ فَقَدْ أَزْرٰى بِهِ الْقَدَرُ

"اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو محاسن عطا فرمائے ہیں وہ انھیں پایۂ ثبوت تک پہنچائے جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے محاسن پایۂ تکمیل تک پہنچ گئے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کی ایسی ہی مدد و نصرت فرمائے جس طرح دیگر (انبیاء) کی مدد فرمائی۔ میں نے یہ بات فراست سے سمجھ لی ہے کہ آپ ﷺ میں خیر و صلاح اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ تحفہ ہے۔ میری فراست ان (کفار) کی فراست سے بالکل مختلف ہے جیسا انھوں نے دیکھا میں نے ویسا نہیں دیکھا۔ فراست میں میرا نقطۂ نظر ان سے بالکل الٹ ہے۔ آپ برحق رسول ہیں، چنانچہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ عطیات اور اس کی خوشنودی کے حصول سے محروم رہے گا اس کی قسمت نے اسے بہت نقصان میں رکھا۔"[2]

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 16,15/4، ودلائل النبوة للبيهقي: 359/4. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 16/4، ودلائل النبوة للبيهقي: 360,359/4.

اسلامی لشکر میدانِ جنگ میں اور جرنیلوں کی شہادت

اسلامی لشکر شام کے علاقے ''معان'' پہنچا۔ یہ علاقہ اب سلطنت اردن کا حصہ ہے۔ اطلاع ملی کہ عیسائیوں نے عرب و عجم کی بہت بڑی تعداد جنگ کے لیے جمع کر رکھی ہے۔ عربی قبائل لخم، جذام، بہرا اور بلی ایک عیسائی مالک بن رافلہ کی قیادت میں ایک لاکھ کی تعداد میں اکٹھے ہوئے ہیں اور ہرقل نے ایک لاکھ رومیوں کا لشکر بھی جمع کیا ہوا ہے۔ اس طرح دشمن کا لشکر دو لاکھ جنگجوؤں تک پہنچ گیا۔ جو مکمل اسلحے سے لیس، ریشم کا لباس پہنے، بڑے غرور سے میدانِ جنگ میں کھڑے تھے تاکہ مسلمان ان کی قوت کو دیکھ کر مرعوب ہو جائیں۔[1]

مسلمان ''معان'' میں دو دن مشورہ کرتے رہے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ہم رسول اللہ ﷺ کو خط لکھ کر دشمن کی کثیر تعداد کی اطلاع دیں، آپ چاہیں تو مزید کمک دے دیں اور اگر چاہیں تو ہمیں جنگ کا حکم دیں، ہم تعمیل کریں گے۔[2] بعض نے سپہ سالار حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کو مشورہ دیا کہ آپ نے ان کو خوف زدہ کر دیا ہے، لہٰذا واپس چلیے، خیر و عافیت کا کوئی نعم البدل نہیں۔[3]

لیکن حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے یہ کہتے ہوئے اس بات کی نفی کر دی کہ لوگو! اللہ کی قسم! جس چیز سے تم کترا رہے ہو یہ تو وہی شہادت ہے جس کی طلب میں تم نکلے ہو۔ یاد رکھو! دشمن سے ہم تعداد، قوت اور کثرت کے بل پر نہیں لڑتے بلکہ ہم محض اس دین کے بھروسے پر لڑتے ہیں جس سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں سرفراز فرمایا ہے، اس لیے آگے بڑھو! ہمیں دو بھلائیوں میں سے ایک بھلائی حاصل ہو کر رہے گی (یا تو غالب آجائیں گے یا شہادت سے سرفراز ہوں گے۔) نائب سپہ سالار کے ان پُر تاثیر الفاظ نے مجاہدین کو گرما دیا۔ حضرت زید بن

---

1 شرح المواهب اللدنية للزرقاني: 271/2. 2 زاد المعاد: 382/3. 3 تاريخ دمشق لابن عساكر: 396/1.

حارثہ رضی اللہ عنہما لوگوں کو ”کرک“ کے کچھ جنوب میں ”موتہ“ کی جانب لے چلے، پھر وہاں وہ تاریخی جنگ ہوئی جسے تینوں سپہ سالاروں نے اپنے خون سے رقم کیا۔[1]

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما بسالت کا مظاہرہ کرتے ہوئے جھنڈا اٹھا کر دشمن کی صفوں میں جا گھسے یہاں تک کہ وہ شہید ہو گئے۔

اس کے بعد جھنڈا حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے تھام لیا اور صلیبیوں سے بے مثال جنگ شروع کر دی۔ یہاں تک کہ وہ بھی ان کے نرغے میں آ گئے مگر اس سے ان کے عزم و ارادے اور نیزہ بازی میں نرمی آئی نہ کمزوری بلکہ انھوں نے جنگ مسلسل جاری رکھی۔ گھوڑے سے کود پڑے۔ گھوڑے کی ٹانگیں کاٹ ڈالیں۔ اور یہ شعر پڑھنے لگے:

يَا حَبَّذَا الْجَنَّةُ وَاقْتِرَابُهَا

طَيِّبَةٌ وَبَارِدًا شَرَابُهَا

وَالرُّومُ رُومٌ قَدْ دَنَا عَذَابُهَا

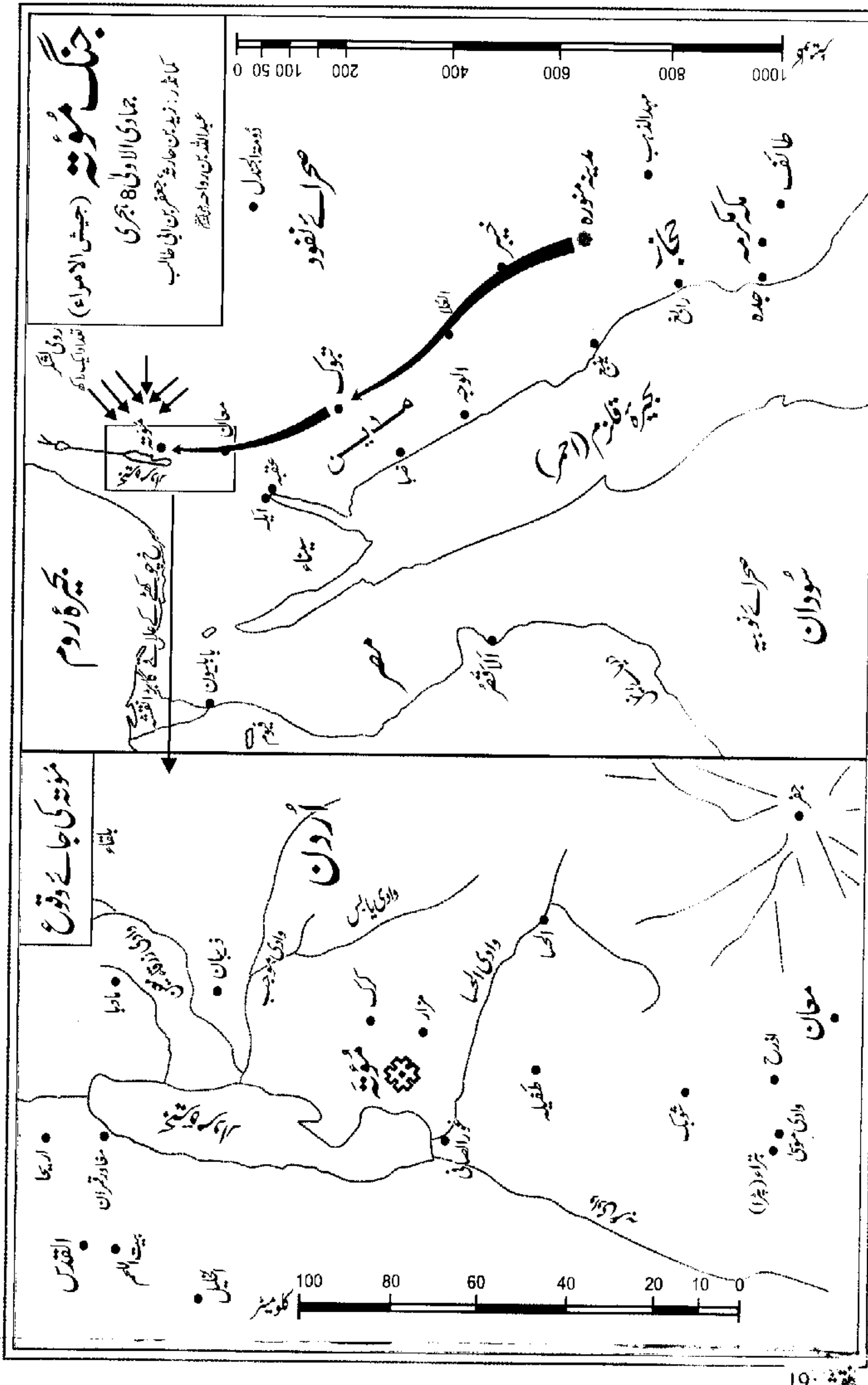
كَافِرَةٌ بَعِيدَةٌ أَنْسَابُهَا

عَلَيَّ إِذْ لَاقَيْتُهَا ضِرَابُهَا

”کیا خوب! جنت اور اس کا اس قدر قریب ہو جانا، اس کی شراب بڑی عمدہ اور ٹھنڈی ہے۔ یہ رومی تو وہ ہیں جن پر عذاب کا وقت بالکل قریب آ گیا ہے، ان کے نسب ہم سے بہت دور ہیں۔ میں جب ان سے نبرد آزما ہوں تو انھیں تلواروں سے مارنا ضروری ہے۔“[2]

سیدنا جعفر رضی اللہ عنہ نے علم دائیں ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ وہ کٹ گیا تو بائیں ہاتھ میں پکڑ

[1] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 468/2. [2] المعجم الكبير للطبراني، رقم: 4655، والسيرة النبوية لابن هشام: 19/4، ومجمع الزوائد للهيثمي: 159/6.


جنگ موتہ (جیش الامراء)
جمادی الاولیٰ 8 ہجری
کمانڈر: زید بن حارثہ، جعفر بن ابی طالب، عبداللہ بن رواحہ
0 50 100 200 400 600 800 1000
مدینہ منورہ
خیبر
تبوک
مدین
حجاز
مکہ مکرمہ
طائف
جدہ
رابغ
بحیرۂ قلزم (احمر)
بحیرۂ روم
سوڈان
مصر
موتہ کی جائے وقوع
اردن
موتہ
معان
0 10 20 40 60 80 100
کلومیٹر

نقشہ: 19

لیا۔ وہ بھی کٹ گیا تو دونوں بازوؤں سے جھنڈے کو سینے سے لگا کر تھاما اور اس حالت میں لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ ان کی عمر تینتیس برس تھی۔ آپ زخموں سے چور ہو چکے تھے۔ جسم پر تلواروں، نیزوں اور تیروں کے نوے زخم آئے۔ ان میں سے کوئی بھی زخم پشت پر نہ تھا بلکہ تمام زخم سینے پر تھے۔[1]

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ذکر کی ہے کہ میں بھی اس غزوے میں موجود تھا۔ ہم نے حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو ڈھونڈا تو وہ ہمیں شہداء میں اس حالت میں نظر آئے کہ ان کے جسم پر نیزے اور تیروں کے نوے سے زیادہ زخم تھے۔[2]

اللہ تعالیٰ نے حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو ان کے بازوؤں کے بدلے دو پر عنایت فرما دیے۔ امام بخاری رحمہ اللہ عامر شعبی رحمہ اللہ کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب بھی جعفر رضی اللہ عنہ کے بیٹے (عبداللہ) کو سلام کرتے تو اس طرح کہتے: «اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا ابْنَ ذِي الْجَنَاحَيْنِ» ”اے دو پروں والے کے صاحبزادے! تجھ پر سلام ہو۔“[3]

حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد علم حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے تھام لیا اور گھوڑے پر بیٹھتے ہوئے یہ اشعار پڑھے:

أَقْسَمْتُ يَا نَفْسُ لَتَنْزِلِنَّهْ
لَتَنْزِلِنَّ أَوْ لَتُكْرَهِنَّهْ
إِنْ أَجْلَبَ النَّاسُ وَشَدُّوا الرَّنَّهْ
مَالِي أَرَاكِ تَكْرَهِينَ الْجَنَّهْ

---

1 الصراع مع الصليبيين لأبي فارس، ص: 58. 2 صحيح البخاري، حديث: 4261، ودلائل النبوة للبيهقي: 4/361. 3 صحيح البخاري، حديث: 4264، ودلائل النبوة للبيهقي: 4/372.

قَدْ طَالَ مَا قَدْ كُنْتِ مُطْمَئِنَّه
هَلْ أَنْتِ إِلَّا نُطْفَةٌ فِي شَنَّه
يَا نَفْسُ إِلَّا تُقْتَلِي تَمُوتِي
هَذَا حِمَامُ الْمَوْتِ قَدْ صَلِيتِ
وَمَا تَمَنَّيْتِ فَقَدْ أُعْطِيتِ
إِنْ تَفْعَلِي فِعْلَهُمَا هُدِيتِ

''اے نفس، میں نے اس بات کی قسم کھائی ہے کہ تو معرکۂ جنگ میں ضرور مقابلہ کرے گا تو ضرور خود بخود مقابلہ کے لیے میدان میں کود جا، ورنہ تجھ کو اس مقابلہ کے لیے زبردستی میدان میں اتارا جائے گا۔ اگر لوگ واویلا کرتے ہیں اور آہ و بکا کرتے ہیں (تو کرنے دے) مگر میں تجھے منہ موڑتا ہوا، ناپسند کرتا ہوا کیوں پا رہا ہوں۔ تو تو اس چیز پر مدت سے مطمئن ہے، پھر یہ بھی ہے کہ تو پرانے مشکیزے میں پڑے ایک نطفے سے زیادہ کیا حیثیت رکھتا ہے۔ اے نفس، اگر تو قتل نہ کیا گیا تو اپنی موت آپ مر جائے گا۔ یہ تو وہ موت ہے جو تیری قسمت میں لکھی جا چکی ہے۔ جس چیز کی تجھے تمنا تھی وہی تو دی جا رہی ہے، اے نفس! اگر تو ان دونوں (زید بن حارثہ اور جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہم) جیسا کام کرے گا تو درست کام کی طرف رہنمائی کیا گیا ٹھہرے گا۔''[1]

ذکر کیا جاتا ہے کہ ان کے ایک چچا زاد نے انھیں ایک گوشت لگی ہڈی لا کر دی اور کہا: ''یہ کھا کر ذرا کمر مضبوط کر لیجیے۔ ایام سفر میں آپ کو انتہائی مشقت سے واسطہ پڑا ہے۔'' عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے اسے کھانا شروع کیا۔ ادھر دشمن کے ہجوم سے آوازیں سنیں

1 دلائل النبوة للبيهقي: 364,363/4، والسيرة النبوية لابن هشام: 21/4، ومجمع الزوائد للهيثمي: 159/6.

تو بولے: ''ابھی تو دنیا میں ہی ہے۔'' لقمہ پھینک دیا اور آگے بڑھ کر تا شہادت دشمن سے لڑتے رہے، یوں دن کے آخری حصے میں جام شہادت نوش فرمالیا۔[1]

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی امارت پر اجماع

سیدنا عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کی شہادت پر جھنڈا سرنگوں ہوا تو آگے بڑھ کر ثابت بن اقرم بن ثعلبہ انصاری رضی اللہ عنہ نے اسے تھام لیا اور ساتھ ہی کہا: ''مسلمانو! کسی امیر پر اتفاق کر لو۔'' سب نے کہا: ''آپ ہی ہمارے امیر ہیں۔'' انھوں نے کہا: ''میں یہ کام انجام نہیں دے سکتا۔'' چنانچہ سب نے بالاتفاق حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو سپہ سالار منتخب کرلیا۔[2]

''اِمتاع الاسماع'' میں ہے کہ حضرت ثابت بن اقرم رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا: ''اے ابوسلیمان! علَم تھام لیجیے۔'' حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''آپ اس کے زیادہ حق دار ہیں کیونکہ آپ نے ایک عمر گزاری ہے اور تجربہ کار ہیں اور بدر میں شمولیت کا شرف بھی رکھتے ہیں۔'' حضرت ثابت رضی اللہ عنہ نے دوبارہ کہا: ''میں نے یہ جھنڈا صرف آپ کو دینے کی غرض سے اٹھایا ہے، لہٰذا قبول کیجیے۔'' اب حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے جھنڈا تھام لیا۔[3]

اس کٹھن موقع پر حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو اہم مسئلہ یہ درپیش تھا کہ اپنی فوج کو ممکنہ اجتماعی ہلاکت سے کیسے نکالیں۔ کئی ایک تجاویز اور ان کے نتائج پر غور وخوض کے بعد یہ طے کیا کہ میدان جنگ سے کنارہ کشی ہی سب سے بہتر اور کم نقصان والا حل ہے۔ جب دشمن کی تعداد بمقابلہ اسلامی لشکر تقریباً 66 فی صد زیادہ ہے تو منصوبہ بندی کے تحت میدان جنگ سے ہاتھ کھینچ لینا ہی بہتر حل ہے۔ اس بنیاد کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے یہ پروگرام تشکیل دیا:

1 الصراع مع الصليبيين لأبي فارس، ص:61. 2 السيرة النبوية لابن هشام:27/4.
3 إمتاع الأسماع للمقريزي:249,248/1.

❁ مسلمان اور رومی لشکر کے مابین کوئی ایسی پلاننگ کرنا تاکہ اس آخری حل کے مطابق سلامتی سے میدان جنگ چھوڑا جا سکے۔

❁ اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری تھا کہ دشمن کو اس وہم میں مبتلا کیا جائے کہ ہمارے پاس تازہ دم کمک پہنچ گئی ہے تاکہ اس کے دباؤ میں کمی آئے اور اس طرح مسلمان ایک دفعہ منصوبے کے تحت میدان کارزار سے کنارہ کش ہوسکیں۔ اس منصوبے پر عمل درآمد کرنے کے لیے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ شام تک میدان کارزار میں ڈٹے رہے۔ اور رات کی تاریکی میں لشکر کی حالت تبدیل کر لی۔ میمنہ کو میسرہ اور میسرہ کو میمنہ کی جگہ کر دیا۔ مقدمہ کو ساقہ اور ساقہ کو مقدمہ کی جگہ متعین کیا۔ لشکر کی نئ ترتیب دیتے وقت نعرہ ہائے تکبیر کی بلند آوازوں سے میدان میں ہلچل مچ گئی اور ساتھ ہی فجر کے وقت دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ اور مسلسل، شدت آمیز حملے کر کے دشمن کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اسلامی لشکر کو تازہ کمک پہنچ گئی ہے۔[1]

یہ چال کامیاب رہی۔ دشمن نے صبح ہوتے ہی نئے جھنڈے اور نئے چہرے دیکھے جو قبل ازیں سامنے نہ تھے اور یہ بھی کہ مسلمان پہلے سے بڑھ کر جوانمردی دکھا رہے ہیں تو دشمن کو یقین آ گیا کہ واقعی کمک پہنچ گئی ہے اور وہی تازہ دم لشکر ہم سے نبرد آزما ہے۔ مسلمانوں کی جان توڑ بہادری نے رومیوں کے اعصاب شل کر دیے۔ انھیں یہ یقین کر لینے میں دیر نہ لگی کہ مسلمان لشکر کو حتمی شکست سے دوچار کرنا ممکن نہیں، چنانچہ وہ ان نئے حملوں کے آگے دل ہار بیٹھے۔ پہلی سی چستی ختم ہو گئی۔ اسلامی لشکر پر دباؤ میں کمی آ گئی، حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تھوڑا تھوڑا پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی ''جنگِ موتہ'' سے اس طرح کامیاب واپسی عالمی جنگی تاریخ کی کامیاب ترین اور ماہرانہ چال سمجھی جاتی ہے۔ زمانہ حال کی جنگی حکمت عملی کے لحاظ سے یہ

1 البداية والنهاية:4/247، والمغازي للواقدي:2/764.

بالکل راست اقدام تھا۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے میمنہ میسرہ کو قلب کے بل پر پیچھے ہٹایا وہ دونوں جانب بہت پیچھے ہٹ گئے۔ بعد ازاں قلب کو دونوں جوانب کی حفاظت میں پیچھے ہٹا لیا۔ اس طرح تمام لشکر دشمن کے نرغے سے نکل آیا۔[1]

مورخین کے بقول اس معرکے میں صرف بارہ مسلمان شہید ہوئے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا کہنا ہے کہ موتہ کے روز میرے ہاتھ سے نو تلواریں ٹوٹیں اور بالآخر ایک یمنی تیغہ میرے ہاتھ میں رہ گیا۔[2]

اللہ تعالیٰ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے منصوبے کی بدولت مسلمانوں کو یقینی شکست سے بچا لیا۔ معرکے سے پسپائی ہی حالات کا تقاضا اور بڑی فتح تھی۔ ایسے نازک حالات میں مشکل ترین اور نفع بخش جنگی چال یہی ہوتی ہے کہ میدان سے کنارہ کرلیا جائے۔[3]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ اور لشکر موتہ کی نسبت اہل مدینہ کا موقف

معرکہ موتہ کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک معجزہ ظہور میں آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کی خبریں آنے سے پہلے ہی زید، جعفر اور ابن رواحہ رضی اللہ عنہم کی شہادت کی خبر دے دی تھی۔[4] لشکر کے حالات سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بے حد غمگین ہوئے۔ آنسو بہہ پڑے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ اس کے بعد حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے علم سنبھالا اور صحابہ کرام کو ان کے ہاتھوں فتح کی بشارت دیتے ہوئے انھیں ''سیف اللہ'' کا لقب عطا کیا۔[5] اس کے بعد جنگ کی خبر دینے والا بھی پہنچ گیا جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی اطلاع ہی کی تصدیق کی۔[6]

یہ لشکر جب مدینہ منورہ کے قریب پہنچا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے اس کا استقبال

[1] معارك خالد بن الوليد للدكتور ياسين سويد، ص: 173. [2] صحيح البخاري، حديث: 4265، ودلائل النبوة للبيهقي: 373/4. [3] معارك خالد بن الوليد للدكتور ياسين سويد، ص: 175.
[4] صحيح البخاري، حديث: 4262. [5] نضرة النعيم: 360/1. [6] البداية والنهاية: 255/4.

کیا، بچے بھاگ بھاگ کر ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ لوگوں کے ساتھ اپنی سواری پر تشریف لا رہے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «خُذُوا الصِّبْيَانَ وَاحْمِلُوهُمْ وَأَعْطُونِي ابْنَ جَعْفَرٍ» ''بچوں کو سواریوں پر بٹھا لو اور مجھے جعفر کا بیٹا تھما دو۔'' عبداللہ بن جعفر کو لایا گیا اسے آپ ﷺ نے اپنے آگے سوار کر لیا۔ لوگ یہ کہتے ہوئے لشکر پر مٹی پھینکنے لگے:

''ارے! اللہ تعالیٰ کے راستے سے بھاگ آئے ہو۔''

رسول اللہ ﷺ فرمانے لگے: «لَيْسُوا بِالْفُرَّارِ وَلٰكِنَّهُمُ الْكُرَّارُ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالَى» ''یہ بھاگنے والے نہیں بلکہ ان شاء اللہ تعالیٰ پلٹ کر حملہ کرنے والے ہیں۔''[1]

فوائد، نصائح اور اسباق

اس معرکے کے متعدد اسباق و نصائح ہیں، چند ایک یہ ہیں:

معرکۂ موتہ کی اہمیت: مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان ہونے والی جنگوں میں یہ ایک اہم معرکہ آرائی تصور کی جاتی ہے۔ فریقین کے درمیان یہ پہلا قابل ذکر معرکہ تھا۔ رومی حکومت کے مستقبل پر اس کا گہرا اثر ہوا۔ یہی معرکہ شامی علاقوں کی فتح اور انھیں رومیوں کے تسلط سے آزاد کرانے کا سبب بنا تھا۔ یہ غزوہ نبی اکرم ﷺ کا ایک عملی اقدام تھا جس کے ذریعے بالآخر شامی علاقوں سے رومی حکومت کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اس معرکے کی ہیبت نے سارے عرب کے دلوں کو ہلا کر رکھ دیا۔[2]

اس جنگ نے مسلمانوں کو رومی قوت کی حقیقت سے آگاہ کیا۔ ان کے جنگی اسلوب اور طور طریقے سامنے آئے۔

1 السيرة النبوية لابن هشام: 24/4، ودلائل النبوة للبيهقي: 374/4. 2 الصراع مع الصليبيين لأبي فارس، ص: 64.

شوقِ شہادت ہی قربانی پیش کرنے کا باعث ہے: تینوں سپہ سالاروں اور دیگر مجاہدین کے صبر و ثبات اور قربانی پیش کرنے کا اصل باعث مجاہدین کی ثواب اور شہادت کی رغبت تھی تاکہ انھیں بھی اللہ تعالیٰ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی رفاقت سے نواز دے اور اپنی ان وسیع و عریض جنتوں میں داخل فرما دے جن میں وہ کچھ ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا خیال ہی پیدا ہوا۔

معرکہ موتہ کا خصوصی امتیاز: صرف یہی معرکہ ایسا ہے جس کی خبر آسمان سے دی گئی، تینوں شیر صفت سپہ سالاروں کی شہادت کی اطلاع رسول اللہ ﷺ نے میدان جنگ سے خبریں لانے والے سے پہلے دے دی تھی۔ بلکہ آپ ﷺ نے اس معرکے کی دیگر کارروائیاں بھی بتا دی تھیں۔ اس معرکے کا امتیاز یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ نے اس کے لیے یکے بعد دیگرے تین امیر چنے۔ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما پھر حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اور پھر عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ۔[1]

نبی مکرم ﷺ کی طرف سے اولادِ جعفر کی عزت و تکریم: حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد رسول اللہ ﷺ ان کی زوجہ محترمہ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کے پاس گئے اور فرمایا: «اِئْتِنِي بِبَنِي جَعْفَرٍ» ''جعفر کے بچوں کو میرے پاس لاؤ۔'' بچوں کو آپ کے پاس لایا گیا۔ آپ ﷺ نے انھیں اپنے قریب کر کے اپنے ناک مبارک کو پیار سے ان کے چہرے پر لگایا اور انھیں بوسہ دیا۔ آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا پوچھتی ہیں: ''آپ کے پاس جعفر اور ان کے ساتھیوں سے متعلق کوئی خبر آئی ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: «أُصِيبُوا هٰذَا الْيَوْمَ» ''وہ آج شہید ہو گئے ہیں۔'' حضرت اسماء رضی اللہ عنہا اب کھڑی ہو کر رونے چلانے لگیں۔ اس پر آپ ﷺ نے صحابہ کرام سے فرمایا:

[1] الصراع مع الصليبيين لأبي فارس، ص: 66.

«لَاتَغْفُلُوا عَنْ آلِ جَعْفَرٍ أَنْ تَصْنَعُوا لَهُمْ طَعَاماً فَإِنَّهُمْ قَدْ شُغِلُوا بِأَمْرِ صَاحِبِهِمْ»

''جعفر کے اہل خانہ کے لیے کھانا تیار کرنے میں غفلت نہ کرنا، وہ تو سب جعفر کے صدمے میں پڑے ہیں۔''[1]

اس حدیث میں کئی ایک مسائل ہیں، مثلاً:

❋ **فوت شدہ خاوند کے لیے عورت کا رونا درست ہے:** جب رسول اللہ ﷺ نے اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کو حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کی شہادت سے باخبر کیا تو حضرت اسماء رضی اللہ عنہا باآواز بلند روئیں۔ آپ ﷺ نے اسے نہ برا جانا، نہ منع فرمایا۔ معلوم ہوا کہ عورت خاوند کی وفات پر روسکتی ہے۔ اگر رونا ممنوع ہوتا تو آپ ﷺ یقیناً انھیں روک دیتے۔ ہاں جو رونا اسلام میں منع کیا گیا ہے وہ زمانہ جاہلیت والا تھا جس میں نوحہ کرنا، گریبان چاک کرنا اور منہ کو پیٹنا وغیرہ ہوتا تھا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کا انکار اور دیگر ایسے امور پر مشتمل تھا جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی تک لے جانے والے تھے۔

❋ **پسماندگان کے لیے کھانا تیار کرنا مستحب ہے:** رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو آل جعفر کے لیے کھانا تیار کرنے پر ابھارا تھا جس میں پسماندگان کے ساتھ غمخواری کا اظہار اور ان کی تکلیف میں کمی کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپس میں دکھ سکھ بانٹنا بھی مقصود ہوتا ہے۔ اس کے بجائے بعض مسلمان معاشروں میں فوتگی والے تعزیت کے لیے آنے والوں کے لیے کھانا تیار کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو اس قبیح رسم سے دور رہنا چاہیے۔

اس کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ نے تین دن سے زیادہ رونے سے بھی منع فرمایا

---

1 مسند أحمد: 380/6، وسنن ابن ماجه، حديث: 1611، ومجمع الزوائد للهيثمي: 161/6، ودلائل النبوة للبيهقي: 370/4، والسيرة النبوية لابن هشام: 22/4. 2 الصراع مع الصليبيين لأبي فارس، ص: 68.

ہے۔ آپ ﷺ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لائے اور فرمایا: «لَاتَبْكُوا عَلٰى أَخِي بَعْدَ الْيَوْمِ أُدْعُو لِي بَنِي أَخِي» ''میرے بھائی کے بیٹے میرے پاس بلاؤ اور دیکھو آج کے بعد میرے بھائی پر نہ رونا۔'' آپ ﷺ نے حجام بلا کر بچوں کے بال منڈوائے اور ارشاد فرمایا:

«أَمَّا مُحَمَّدٌ فَشَبِيهُ عَمِّنَا أَبِي طَالِبٍ، وَأَمَّا عَبْدُاللّٰهِ فَشَبِيهُ خَلْقِي وَخُلُقِي، ثُمَّ أَخَذَ بِيَمِينِ عَبْدِاللّٰهِ وَقَالَ: اَللّٰهُمَّ اخْلُفْ جَعْفَرًا فِي أَهْلِهِ وَبَارِكْ لِعَبْدِ اللّٰهِ فِي صَفْقَةِ يَمِينِهِ»

''محمد تو ہمارے چچا ابو طالب سے ملتا جلتا ہے اور عبداللہ صورتاً اور سیرتاً میرے مشابہ ہے، پھر عبداللہ کا ہاتھ پکڑ کر دعا فرمائی: ''اے اللہ! جعفر کے بعد اس کے گھر والوں کی کفالت فرما اور عبداللہ کی تجارت میں برکت ڈال دے۔'' یہ بات آپ ﷺ نے تین بار دوہرائی۔

ان بچوں کی والدہ نے بچوں کی یتیمی اور ناتوانی کا ذکر کیا تو فرمایا: «اَلْعَيْلَةَ تَخَافِينَ عَلَيْهِمْ وَأَنَا وَلِيُّهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ» ''کیا تو ان کی محتاجی سے ڈرتی ہے، میں تو دنیا و آخرت میں ان کا سرپرست ہوں۔''[1]

شہداء کی اولاد کی تکریم و کفالت کا یہ نبوی منہج لائق اتباع ہے۔[2]

اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شادی: حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے ایام عدت گزرنے پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انھیں نکاح کا پیغام دیا۔ انھوں نے قبول کیا اور یہ نکاح ہو گیا۔ انھی سے محمد بن ابی بکر پیدا ہوئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد اسماء رضی اللہ عنہا سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عقد کر لیا۔ ان سے بھی اللہ تعالیٰ نے انھیں اولاد سے نوازا رضوان اللہ علیہم اجمعین۔[3]

1 مسند أحمد: 204/1، وسنن أبي داود، حديث: 4192، والسنن الكبرٰى للنسائي: 182/8، والبداية والنهاية: 252/4. 2 السيرة النبوية لأبي شهبة: 430/2. 3 البداية والنهاية: 353/4.

ابن کثیر رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا نے اپنے طویل قصیدے میں اپنے خاوند جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو ان اشعار کی صورت میں خراج تحسین پیش کیا۔ وہ کہتی ہیں:

فَآلَيْتُ لَاتَنْفَكُّ نَفْسِي حَزِينَةً
عَلَيْكَ وَلَا يَنْفَكُّ جِلْدِي أَغْبَرَا
فَلِلّٰهِ عَيْنَا مَنْ رَّأٰى مِثْلَهُ فَتًى
أَكَرَّ وَأَحْمَرَ فِي الْهِيَاجِ وَأَصْبَرَا

''میں نے قسم اٹھالی ہے کہ میرا دل تیری وجہ سے ہمیشہ غمگین رہے گا۔ اور میرا جسم غبار آلود رہے گا۔ اللہ تعالیٰ بھلا کرے ان آنکھوں کا جنھوں نے ان جیسا نوجوان دیکھا ہے۔ جنگ میں بار بار حملہ کرنے والا اور ثابت قدمی دکھانے والا (اپنی مثال آپ تھا)۔''[1]

قیادت کا حق؟: نبی کریم ﷺ کی طرف سے مقرر کردہ آخری امیر حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ بھی جام شہادت نوش کر گئے تو حضرت ثابت بن اقرم عجلانی رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر جھنڈا تھام لیا اور ان پر بحیثیت فوجی جو حق تھا وہ انھوں نے ادا کر دیا۔ علم کا سرنگوں ہونا لشکر کی شکست سمجھا جاتا ہے۔ انھوں نے علم کو تھاما اور مسلمانوں کو آواز دی کہ اپنا قائد چن لیں۔ عرصۂ جنگ میں انھیں امارت کی پیش کش ہوئی مگر وہ کہنے لگے: ''یہ بوجھ میں نہیں اٹھا سکتا۔'' چنانچہ لوگوں نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا انتخاب کر لیا۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ علم اٹھائے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوئے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں یہ علم آپ سے نہیں لوں گا، آپ ہی

[1] البداية والنهاية: 4/353.

اس کے زیادہ حق دار ہیں۔" انھوں نے جواباً کہا: "اللہ کی قسم! میں نے آپ کو دینے کے لیے ہی اسے تھاما تھا۔"

دونوں روایات کا مفہوم ملتا جلتا ہے کہ حضرت ثابت نے پہلے مسلمانوں کو اکٹھا کیا اور جھنڈا حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے سپرد کیا اور منصب کو اس کے حوالے کر دیا جو اس کا اہل تھا۔[1]

لوگوں نے اگرچہ ان سے کہا تھا کہ آپ ہی ہمارے امیر ہیں لیکن انھوں نے یہ منصب لینا اچھا نہ سمجھا کیونکہ وہ سمجھ رہے تھے کہ اس وقت لشکر میں ان سے بہتر قیادت سنبھالنے والا موجود ہے اور جب عہدہ ایسے شخص کو سونپ دیا جائے جو اس کا اہل نہیں تو خرابی کا امکان رہتا ہے۔

حضرت ثابت رضی اللہ عنہ جنگ بدر میں شرکت کر چکے تھے، اس لیے وہ اس عہدے کے لیے نااہل نہیں تھے مگر انھوں نے اپنے سے بہتر شخص کے ہوتے ہوئے اسے قبول کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اگرچہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو ابھی اسلام قبول کیے صرف تین ماہ ہوئے تھے۔ اس سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی بہتر طور پر تنفیذ اصل مقصود ہے۔[2]

آج کے دور میں اسلامی دعوت کی قیادت پر مسلط طبقہ نئی قیادت اور اعلیٰ اقتدار کے حاملین کے سامنے طرح طرح کی مشکلات کھڑی کر دیتا ہے۔ جس کا اصل مقصد اس خطرے سے تحفظ ہوتا ہے جو قیادت کے ہاتھ سے نکل جانے کی صورت میں ان کے سروں پر منڈلا رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح شخصی طور پر حاصل شدہ امتیازات و مفادات اور دنیوی اغراض و مقاصد کو برقرار رکھنا بھی مقصود ہوتا ہے۔ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کے اس اعلیٰ کردار سے ایسے قائدین کو درس عبرت لینا چاہیے مگر یہ تو اس کا نصیب ہے جس کے پاس سمجھنے والا دل، سننے والے کان اور شعور و احساس موجود ہے۔

---

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي: 124/7. [2] من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 376.

قیادت کے احترام کا نبوی سبق: حضرت عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کے ساتھ جنگ موتہ میں جو لوگ گئے تھے میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ ہم چلتے چلتے رومی لشکروں سے جا ٹکرائے۔ ان کا ایک شخص سرخ رنگ کے گھوڑے پر سوار تھا جس کی زین اور اسلحہ سونے سے ملمع کردہ تھا۔ وہ رومی مسلمانوں کو بے تحاشا مارنے لگا۔ ادھر یمنی امدادی قافلوں میں آنے والا میرا (حمیری) ساتھی ایک چٹان کے پیچھے (اس کی گھات میں) بیٹھ گیا۔ جب رومی ادھر سے گزرا تو اس نے آگے بڑھ کر تلوار سے اس کے گھوڑے کی کونچیں کاٹ ڈالیں۔ رومی بھاگا تو اس نے اس پر بھی حملہ کر کے اسے قتل کر دیا اور گھوڑے سمیت اس کا اسلحہ اپنے قبضے میں کر لیا۔ جب مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے پیغام بھیج کر سلب میں سے کچھ حصہ اپنے پاس جمع کر لیا۔ حضرت عوف رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اور کہا: ''خالد! آپ کو علم نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سامانِ سلب قاتل کو دلایا ہے۔'' حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے کہا: ''یقیناً ایسا ہی ہے مگر مجھے یہ سامان زیادہ معلوم ہوتا ہے۔'' میں نے کہا: ''یہ (سارا) سامان اسے دیں یا پھر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس مال کے حوالے سے سوال ضرور اٹھاؤں گا۔'' مگر حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے پھر بھی وہ مال واپس کرنے سے انکار کر دیا۔

حضرت عوف رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اکٹھے ہوئے تو میں نے اس حمیری کا سارا قصہ بیان کر دیا اور جو کچھ حضرت خالد نے کہا وہ بھی کہہ سنایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «یَا خَالِدُ! مَا حَمَلَكَ عَلٰی مَا صَنَعْتَ؟» ''خالد! تم نے ایسا کیوں کیا؟'' عرض کیا: ''میں نے وہ سامان اس کے لیے بہت زیادہ خیال کیا۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «رُدَّ عَلَيْهِ الَّذِي أَخَذْتَ مِنْهُ» ''اس سے جو کچھ بھی لیا ہے واپس کر دو۔''

حضرت عوف رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے خالد رضی اللہ عنہ سے کہا: ''خالد! مزا چکھ لو۔ کیا میں نے اپنی بات پوری نہیں کر دکھائی (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شکایت کر کے سامان واپس کرا دیا

ناں!)؟'' رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: «وَمَا ذٰلِكَ؟» ''وہ کیا تھا؟'' میں نے آپ ﷺ کو بتا دیا۔ آپ ﷺ نہایت غصے ہوئے اور فرمایا:

«يَا خَالِدُ! لَا تَرُدَّ عَلَيْهِ، هَلْ أَنْتُمْ تَارِكُونَ لِي أُمَرَائِي؟ لَكُمْ صَفْوَةُ أَمْرِهِمْ وَعَلَيْهِمْ كَدَرُهُ»

''اے خالد! مت لوٹا اسے، کیا تم میرے مقرر کردہ امیروں کو میری وجہ سے معاف نہیں کر سکتے۔ ان کے معاملے کا صاف صاف تمھارے لیے اور معاملے کا گدلا پن (کمی کوتاہی) ان کے اپنے ذمے ہے۔''[1]

امراء و قائدین سے بھی بتقاضائے بشریت غلطی کا امکان باقی رہتا ہے۔ ایسے میں کمی کوتاہی واقع ہونے سے متعلق رسول اللہ ﷺ کا امراء کی حمایت و تائید میں یہ موقف نہایت اعلیٰ ہے۔ ان کی بھی اصلاح کی کوشش ہونی چاہیے لیکن تنقیص و اہانت کے بغیر۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے جب اس حمیری مجاہد کو مکمل سلب لینے سے روکا تو انھوں نے ان کی بے عزتی ہرگز نہ کی بلکہ اجتہاد کے تحت مصلحت عامہ کو سامنے رکھا کہ یہ سلب ایک آدمی کے لیے بہت زیادہ ہے اور اگر اسے عام مال غنیمت میں شامل کر لیا جائے تو متعدد مجاہدین کے لیے سود مند ہو سکتا ہے۔

حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ نے اپنی حد تک حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو اس سے منع کرنے کا فرض ادا کر لیا اور صحیح صورت مسئلہ بتا دی مگر جب حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے بات تسلیم نہ کی تو معاملہ رسول اللہ ﷺ تک پہنچایا۔ اب تک ان کا کردار اصلاح پسندانہ تھا اور اب انھیں اس قضیے کو یہیں روک دینا چاہیے تھا کہ حق تو حقدار تک پہنچ چکا ہے۔ لیکن انھوں نے یہاں بس نہ کی بلکہ اس معاملے کو اصلاح کے دائرے سے نکال کر شخصی مسئلہ بنا ڈالا اور اس کے ذریعے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے سامنے اپنے انتقامی جذبے کی تسکین اور ان کی تحقیر کا

[1] صحيح مسلم، حديث: 1753، ومسند أحمد: 27/6، وسنن أبي داود، حديث: 2719، 2720.

اظہار کیا۔ یہی وجہ تھی کہ اب رسول اللہ ﷺ نے حضرت عوف رضی اللہ عنہ کی تائید نہ کی بلکہ سختی سے ڈانٹا اور امراء کے اپنی رعایا پر عظیم حق کی وضاحت فرمائی۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو سلب واپس نہ کرنے کا حکم دے کر اس حمیری مجاہد کا حق ضبط کیا یا کم کیا؟ یہ ناممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ کسی کی کوتاہی کی سزا کسی دوسرے کو دیں، لہٰذا یہ بات طے شدہ ہے کہ لازماً وہ حمیری مجاہد اس فیصلے پر راضی ہوا ہوگا، خواہ اسے اس کا بدلہ دے کر راضی کیا گیا ہو یا اس نے خود ہی اپنے حق سے دست برداری اختیار کر لی ہو۔ اس واقعے میں یہ تفصیل ذکر نہیں ہوئی۔[1]

جو لوگ اپنے امراء اور قائدین کا مقام و مرتبہ اور احترام کرنا نہیں جانتے ان میں کوئی نظام و قانون پروان نہیں چڑھ سکتا۔ نبوی تربیت ہی نے اس امت کو ایک بلند معیار دیا۔ مسلمانوں کی یہ کتنی بڑی ضرورت ہے کہ ہر شخص کو اس کی جگہ پر رکھیں اور اس کا احترام بھی ہو۔ اور یہ بھی چاہیے کہ انسان کو دین کے ناتے اس کا وہ مقام دیا جائے جو اس کا حق ہے اور پھر تمام لوگ اپنے اپنے دائرے میں رہیں جس کا تعین اللہ تعالیٰ نے کر رکھا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ۚ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝﴾

”اے ایمان والو! تم میں سے جو شخص اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ تعالیٰ جلد ایسی قوم کو لائے گا جو اللہ تعالیٰ کی محبوب ہوگی اور وہ بھی اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتی ہوگی وہ نرم دل ہوں گے مسلمانوں پر اور سخت اور تیز ہوں گے کفار پر، اللہ تعالیٰ

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي: 130/7.

کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا بھی نہ کریں گے۔ یہ ہے اللہ تعالیٰ کا فضل جسے چاہے دے۔ اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا زبردست علم والا ہے۔"[1]

رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان: "کیا تم میرے مقرر کردہ امیروں کو معاف نہیں کر دیتے؟" خالد رضی اللہ عنہ کے لیے ایک تمغہ ہے کہ خود آپ ﷺ نے انھیں اپنے امراء میں شمار کیا۔ یہ نبوی طریقہ ہے انسانوں کے مقام و مرتبہ کے لحاظ کا۔[2]

ایمان کے پیمانے اور جنگوں میں ان کا اثر: اسلامی لشکر "معان" میں دشمن کی کثرت تعداد پر گفتگو کرنے کے لیے ٹھہرا رہا۔ مسلمانوں کے مادی وسائل جنگ کرنے کے لیے ان کی حوصلہ افزائی نہیں کر رہے تھے اس کے باوجود مسلمان اپنے طریقے پر چلے اور ایمانی معیار اور ایمانی وسائل بروئے کار لاتے ہوئے جنگ میں داخل ہو گئے۔ مسلمان تو طلبِ شہادت کی غرض سے نکلے تھے اب وہ اپنے مطلوبہ ہدف کو سامنے پا کر میدانِ جنگ سے کیوں فرار اختیار کرتے۔

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں یتیم تھا اور عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کی سرپرستی اور نگرانی میں تھا۔ اس سفر میں عبداللہ رضی اللہ عنہ نے مجھے بھی اپنے ساتھ لے لیا اور اپنے کجاوے کی پیچھے والی لکڑی پر بٹھا لیا۔ اللہ کی قسم! رات کا وقت تھا وہ چلے جا رہے تھے اور یہ اشعار پڑھتے جاتے تھے اور میں سن رہا تھا ؎

وَجَاءَ الْمُسْلِمُونَ وَ غَادَرُونِي

بِأَرْضِ الشَّامِ مُشْتَهَى الثَّوَاءِ

"اور مسلمان آئے اور مجھے شام میں چھوڑ کر چلے گئے ہیں وہ جگہ جس کے لیے میں بہت خواہش مند ہوں کہ اس جگہ رہ جاؤں۔"

1 المآئدة 5:54. 2 من معين السيرة لصالح الشامي، ص:378.

میں نے یہ شعر سنا تو رونے لگا۔ اس پر انھوں نے مجھے درہ مارا اور کہا: ''اے ڈرپوک! تیرا اس میں کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے شہادت نصیب کرے اور تو آزادی سے کجاوے پر بیٹھ کر واپس پلٹے؟''[1]

صرف ٹیکنالوجی میں برتری ہی قوموں کے فاتح ہونے کا سبب نہیں بلکہ روحانی اور نفسیاتی برتری ہی فاتح اقوام کا اصل ہتھیار ہوا کرتی ہے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ اس معرکے کے متعلق اپنی رائے قائم کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''یہ بڑی بات ہے کہ مخالف دین رکھنے والے دو لشکر آپس میں لڑیں۔ ایک اللہ تعالیٰ کی راہ میں جن کی تعداد صرف تین ہزار اور دوسرا لشکر کافر جن کی تعداد دو لاکھ جنگجو۔ ایک لاکھ رومی اور ایک لاکھ عرب عیسائی، دونوں آپس میں فرداً فرداً مقابلہ بھی کریں اور عام جنگ بھی ہو، پھر بھی مسلمانوں کے صرف بارہ شہداء ہوں اور مشرکین کی کثیر تعداد موت کے گھاٹ اترے۔ اس غزوے میں شریک صرف ایک مجاہد خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ اس روز میرے ہاتھ سے نو تلواریں ٹوٹیں، بالآخر میرے ہاتھ میں صرف ایک یمنی بانا رہ گیا۔ دیکھیں انھوں نے ان تلواروں سے صلیب کے کتنے ہی پجاری قتل کیے ہوں گے۔ باقی کا معاملہ چھوڑ بھی دیں تو یہی تعداد کچھ کم نہ ہوگی؟ بقیہ حاملینِ قرآن نے بھی ہر موقع پر صلیب کے پجاری ملعونین کو دل کھول کر جہنم واصل کیا۔''[2]

شہدائے موتہ کے لیے حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کا خراجِ تحسین

فِي لَيْلَةٍ وَرَدَتْ عَلَيَّ هُمُومُهَا
طَوْراً أَحِنُّ وَتَارَةً أَتَمَلْمَلُ

1 السيرة النبوية لابن هشام: 4/25,24. 2 البداية والنهاية: 4/259.

وَاعْتَادَنِي حُزْنٌ فَبِتُّ كَأَنَّنِي

بِبَنَاتِ نَعْشٍ وَّالسِّمَاكِ مُوَكَّلُ

وَكَأَنَّمَا بَيْنَ الْجَوَانِحِ وَالْحَشٰى

مِمَّا تَأَوَّبَنِي شِهَابٌ مُّدْخَلُ

وَجْداً عَلَى النَّفَرِ الَّذِينَ تَتَابَعُوا

يَوْماً بِمُؤْتَةَ أُسْنِدُوا لَمْ يُنْقَلُوا

صَلَّى الْإِلٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْ فِتْيَةٍ

وَسَقٰى عِظَامَهُمُ الْغَمَامُ الْمُسْبِلُ

صَبَرُوا بِمُؤْتَةَ لِلْإِلٰهِ نُفُوسَهُمْ

حَذَرَ الرَّدٰى وَمَخَافَةً أَنْ يَّنْكُلُوا

فَمَضَوْا أَمَامَ الْمُسْلِمِينَ كَأَنَّهُمْ

فُنُقٌ عَلَيْهِنَّ الحَدِيدُ الْمُرْفَلُ

إِذْ يَهْتَدُونَ بِجَعْفَرٍ وَّلِوَائِهِ

قُدَّامَ أَوَّلِهِمْ فَنِعْمَ الْأَوَّلُ

حَتّٰى تَفَرَّجَتِ الصُّفُوفُ وَجَعْفَرٌ

حَيْثُ الْتَقٰى وَعْثُ الصُّفُوفِ مُجَدَّلُ

فَتَغَيَّرَ الْقَمَرُ الْمُنِيرُ لِفَقْدِهِ

وَالشَّمْسُ قَدْ كَسَفَتْ وَكَادَتْ تَأْفِلُ

"میں ایسی رات کبھی تو روتا ہوں اور کبھی کروٹیں بدلتا ہوں جس میں غموں نے میرے گرد ہجوم ڈال دیا ہے۔

غم مجھ پر ایسے مسلط ہو گیا ہے گویا میں بنات النعش (قطب شمالی کے سات ستارے) اور (ستارہ) سماک کے سپرد کر دیا گیا ہوں۔ (نیند رات بھر نہ آنے سے یہ استعارہ ہے اور "تارے گنتے رات گزرنا" یہ محاورہ بھی اسی سے ہے۔)

اور گویا پسلیوں کے درمیان ایک شہاب ثاقب داخل کر دیا گیا ہے جو اندر ہی اندر بھڑک رہا ہے۔

یہ ساری کیفیت ان لوگوں کے غم والم کے سبب ہے جو موتہ کے دن یکے بعد دیگرے شہید ہو گئے۔ انھیں وہیں سپرد خاک کر دیا گیا اور یہاں منتقل بھی نہ کیے گئے۔

اللہ تعالیٰ ان جوانوں پر اپنی رحمت نازل فرمائے۔ کیسے ہی اچھے جوان تھے۔ ان کی قبروں کو رحمت کی موسلا دھار بارش سیراب کرتی رہے۔

انھوں نے موتہ میں اللہ کے لیے صبر کیا۔ اس خوف سے کہ کہیں ہلاکت میں نہ پڑ جائیں اور اس ڈر سے کہ بے مقصد واپس نہ لوٹیں اور راہ فرار اختیار نہ کریں۔

یہ (بہادر) مسلمانوں کے آگے آگے ایسے چل رہے تھے گویا نر اونٹ ہیں۔ اور ان کی (مضبوط) زرہیں زمین پر گھسٹ رہی تھیں۔

جعفر رضی اللہ عنہ بھی کیا ہی خوب سپہ سالار تھے جو خود جھنڈا بلند کیے سب سے آگے تھے (اور خوب دادِ شجاعت دے رہے تھے)۔ لیکن جب صفیں الگ الگ ہونے لگیں تو جعفر رضی اللہ عنہ وہیں شہید ہو کر گر پڑے۔ (ان کی شہادت کے غم میں) دمکتے چاند کا رنگ فق ہو گیا اور سورج بھی اتنا گہنا گیا قریب تھا کہ وہ ڈوب جاتا۔"[1]

یہ وہ چند اشعار ہیں جو حضرت کعب بن مالک نے شہدائے موتہ کو خراجِ تحسین پیش

1 السيرة النبوية لابن هشام:4/33-34.

کرتے ہوئے کہے تھے۔ ادھر حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے بھی شہدائے موتہ، حضرت جعفر بن ابی طالب، زید بن حارثہ اور عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم کے متعلق درد انگیز قصائد کہے۔ مسلمانوں کی طرف سے قصائد کی صورت میں عقیدتیں نچھاور کرنے والے اپنا فرض بڑی ذمہ داری اور سنجیدگی سے ادا کرتے تھے، اس لیے یہ افراد اپنی اس انوکھی خداداد صلاحیت کو بروئے کار لاکر اشعار کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی عبادت بجا لاتے تھے اور نیکی کی نیت رکھتے تھے۔

غزوۂ ذات السلاسل

غزوۂ موتہ سے لوٹے ابھی چند ہی دن ہوئے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی قیادت میں ”ذات السلاسل“ کی طرف ایک لشکر روانہ فرما دیا تاکہ قضاعہ کے ان لوگوں کے خلاف کارروائی کی جائے جو موتہ میں رومی لشکر میں شامل تھے اور مسلمانوں کی پسپائی پر بڑے گھمنڈ میں مبتلا ہوئے اور اب اطرافِ مدینہ پر حملہ بولنے کی غرض سے اکٹھے ہو رہے تھے۔ لہٰذا حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے تین سو مہاجرین و انصار کے ہمراہ ان کی جانب پیش قدمی کی۔

یہ لشکر جب دشمن کے قریب پہنچا تو معلوم ہوا کہ ان کی جمعیت بہت بڑی ہے، انھوں نے مزید کمک کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آدمی بھیجا۔ حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کی قیادت میں انھیں دو سو افراد کی کمک مل گئی۔[1]

مسلمانوں نے کفار پر جنگ مسلط کردی۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ قضاعہ کے علاقے میں دور تک بڑھتے چلے گئے۔ اہل علاقہ شکست خوردہ ہوکر بھاگ نکلے۔ یوں حضرت عمرو

1 السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 471/2، والمغازي للواقدي: 769/2-771.

بن عاص رضی اللہ عنہ شامی اطراف و جوانب میں اسلام کا رعب و دبدبہ بحال کرنے، سابقہ معاہدہ کرنے والوں کو پہلے جیسے معاہدے پر قائم رہنے اور دیگر کئی قبائل کو مسلمانوں کے حلیف بنانے میں کامیاب رہے۔ بنوعبس، بنومرہ اور بنوذبیان کے اکثر لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ بنوفزارہ اوران کا سردار عیینہ بن حصن فزاری مسلمانوں کے معاہدہ میں شامل ہو گیا۔ ان کے ساتھ ساتھ بنوسُلیم اور ان کا سردار عباس بن مرداس اور بنو اشجع بھی معاہدے میں شامل ہو گئے۔ عرب بھر میں نہ سہی مگر عرب کے شمالی علاقوں میں مسلمان ہی سب سے طاقتور ہو گئے تھے۔[1]

حکمتیں، عبرتیں اور اسباق

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا اخلاص: حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے پیغام بھیجا کہ ہتھیار پہن کر میرے پاس آؤ۔ میں گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم وضو فرما رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری جانب سر سے پاؤں تک دیکھا اور ارشاد فرمایا:

«إِنِّي أُرِيدُ أَنْ أَبْعَثَكَ عَلٰى جَيْشٍ فَيُسَلِّمَكَ اللّٰهُ وَيُغْنِمَكَ وَأَرْغَبُ لَكَ فِي الْمَالِ رَغْبَةً صَالِحَةً»

”میں تمھیں ایک لشکر کا امیر بنا کر بھیجنا چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ تمھیں صحیح سلامت رکھے گا اور غنیمت دے گا اور میں بھی تمھیں خاصی مقدار میں مال دینا چاہتا ہوں۔“

میں نے عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول! میں دولت کے لیے تو مسلمان نہیں ہوا تھا۔ بلکہ میں تو اسلام کو پسند کر کے مسلمان ہوا تھا اور اس لیے بھی کہ اس طرح مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ میسر رہے گا۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[1] السيرة النبوية لأبي شهبة:2/433.

«يَا عَمْرُو! نِعْمَ الْمَالُ الصَّالِحُ لِلْمَرْءِ الصَّالِحِ»

''اے عمرو! اچھا مال، نیک انسان کے لیے اچھا ہوتا ہے۔''[1]

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا موقف ان کے اخلاص، سچائی اور قوت ایمان کا مظہر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے یہ بات واضح فرمائی کہ حلال مال جب نیک انسان کے ہاتھ میں آئے تو یہ بڑی نعمت ہے۔ وہ اس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرے گا اور اسے نیکی کے کاموں میں صرف کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو اور اہل خانہ کو ہاتھ پھیلانے سے محفوظ رکھے گا۔[2]

اتفاق و اتحاد طاقت اور اختلاف کمزوری ہے: اس غزوے کے لیے بھیجی گئی کمک حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کی قیادت میں جب وہاں پہنچی تو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے سارے لشکر کی قیادت اپنے ہاتھ میں لینا چاہی تو عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے کہا: ''آپ بطور کمک میرے پاس آئے ہیں، لہٰذا امامت کا آپ کو حق نہیں۔ امیر کارواں میں ہی رہوں گا۔ آپ تو صرف امدادی بن کر آئے ہیں۔'' مہاجرین نے کہا: ''ہرگز ایسا نہیں ہوگا۔ تم اپنے ساتھیوں کے امیر ہو اور ابوعبیدہ اپنے ساتھیوں کے سالار۔''

حضرت عمرو رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''نہیں، تم سب ہماری کمک کے طور پر آئے ہو۔''

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نرم مزاج آدمی تھے۔ اس اختلاف کو دیکھتے ہوئے کہنے لگے: ''اے عمرو! مطمئن رہو، (میں اس بات کو تنازع کا سبب نہیں بننے دوں گا کیونکہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے آخری نصیحت کرتے ہوئے فرمایا تھا: «إِذَا قَدِمْتَ عَلٰى صَاحِبِكَ فَتَطَاوَعَا وَلَا تَخْتَلِفَا» ''دیکھو! جب وہاں عمرو کے پاس پہنچ جاؤ تو ایک دوسرے کی بات ماننا اور آپس میں اختلاف نہ کرنا۔'' واللہ! اگر تم میرا کہا نہ مانو گے تو بھی میں یقیناً تمھاری

[1] مسند أحمد: 4/ 197، والأدب المفرد للبخاري، رقم: 299، والمستدرك للحاكم: 2/2و236، وصحيح ابن حبان، رقم: 3211. [2] التاريخ الإسلامي للحميدي: 133/7.

اطاعت کروں گا۔'' یہ کہتے ہوئے انھوں نے ان کی سربراہی تسلیم کر لی۔ اس کے بعد نمازوں کی امامت حضرت عمرو رضی اللہ عنہ ہی کراتے رہے۔[1]

حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ یہ بات سمجھ گئے کہ مسلمانوں میں کسی بھی قسم کا اختلاف شکست سے دوچار کر سکتا ہے۔ نتیجتاً دشمن غالب و فاتح ہو جائے گا۔ لہٰذا اس جھگڑے کو فوراً ختم کرتے ہوئے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی امارت میں ایک سپاہی کے طور پر شامل ہو گئے تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی بجا آوری ہو سکے۔[2]

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی اپنی مکمل قوت محفوظ رکھنے کی شدید خواہش: غزوۂ ذات السلاسل میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی اعلیٰ مہارت کا اندازہ صفوں میں اتحاد و اتفاق قائم رکھنے سے ہوتا ہے اور یہاں کئی مقامات پر اس کا ظہور ہوا، مثلاً: عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ رات کو چلتے اور دن کو چھپے رہتے۔ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ اپنی دور اندیشی اور ثاقب نظری سے یہ بات بھانپ گئے تھے کہ ممکن ہے دشمن مڈھ بھیڑ سے پہلے ہی ہمارے متعلق جاسوسی کر کے بہتر صورت میں اپنی تیاری کر لے، انھوں نے سوچا کہ رات کو سفر کریں اور دن کو چھپے رہیں۔ اپنی قوت کو محفوظ کرنے کا یہی بہتر طریقہ ہے۔ اس حکمت عملی سے انھیں دو اہم مقاصد حاصل ہوئے۔

- دشمن سے اپنی پیش قدمی مخفی رکھ کر مکمل جنگی قوت محفوظ رکھی۔
- لشکر کو گرمی کی حدت سے بچانا تاکہ وہ دشمن سے آمنا سامنا ہونے تک بالکل چاق و چوبند ہوں اور دشمن سے مڈھ بھیڑ کی مکمل طاقت رکھتے ہوں۔

لشکر کو آگ جلانے سے منع کرنا: لشکر والوں نے جب حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے سردی کی وجہ سے آگ جلانے کی اجازت طلب کی تو انھوں نے اجازت نہ دی۔

---

1 مغازي رسول الله ﷺ لعروة بن الزبير، ص: 207، سند ضعیف ہے۔ 2 غزوة الحديبية لأبي فارس، ص: 209.

اس کا سبب ان کی وہ گہری جنگی سوچ اور تجربہ تھا کہ آگ تاپنے کی مصلحت سے کئی گنا بڑا نقصان ہوسکتا ہے۔ آگ کی روشنی دشمن کے لیے مسلمانوں کی قلت تعداد کا راز کھول دے گی اور وہ اچانک حملہ کر سکتے ہیں۔ یہی مقصد اس وقت سامنے آیا جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان سے اس بارے میں گفتگو کی تو فرمانے لگے: ''جس شخص نے بھی آگ جلائی میں اسے اٹھا کر اس میں پھینک دوں گا۔''

مدینہ واپس آنے پر لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کا شکوہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا تو عمرو رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''میں نے اس لیے اجازت دینا پسند نہ کیا کہ وہ آگ جلائیں گے اور اس طرح دشمن ہماری قلت تعداد کو جان جائے گا۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس فعل کو درست قرار دیا۔[1]

راہ فرار اختیار کرنے والے دشمن کا پیچھا کرنے کی ممانعت: جب مسلمانوں نے دشمن کو شکست دے دی تو وہ چاہتے تھے کہ گرتی دیوار کو مزید دھکا دینے کے لیے بچے کھچے گروہوں کا پیچھا کیا جائے۔ قائد لشکر حضرت عمرو رضی اللہ عنہ نے پیچھا کرنے سے روک دیا کہ ایسا نہ ہو کہیں مسلمان دشمن کے حصار میں آجائیں اور یہ فتح شکست میں بدل جائے۔ دشمن کی تعداد تو اب بھی مسلمانوں سے کئی گنا زیادہ تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان سے اس کے متعلق دریافت فرمایا تو انھوں نے جواب دیا: ''میں نہیں پسند کرتا تھا کہ دشمن کا پیچھا کر کے اسے موقع فراہم کیا جائے۔''[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی لشکر کو مامون و محفوظ رکھنے والا ان کا یہ حکیمانہ عمل بھی درست قرار دیا۔[3]

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی فقاہت: حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں

---

1 صحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص:509. 2 صحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص:509. 3 القيادة العسكرية في عهد الرسول ﷺ للدكتور محمد الرشيد، ص:540.

غزوۂ ذات السلاسل میں سخت سرد رات کو احتلام زدہ سو گیا میں ڈرا کہ اگر غسل کیا تو زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھوں گا، لہٰذا میں نے تیمّم کر لیا، پھر اس طرح ساتھیوں کو نماز پڑھا دی۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو بتا دیا تو آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: «صَلَّيْتَ بِأَصْحَابِكَ وَأَنْتَ جُنُبٌ؟» ''کیا تم نے جنبی حالت ہی میں ساتھیوں کو نماز پڑھا دی؟''

میں نے اپنا عذر پیش کیا جس کی بنا پر غسل نہ کر سکا تھا اور پھر عرض کیا کہ چونکہ میں نے یہ قرآنی آیت سنی ہوئی تھی:

﴿وَلَا تَقْتُلُوٓا أَنفُسَكُمْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا ۝﴾

''اپنی جان کو ہلاکت میں نہ ڈالو، اللہ تعالیٰ تم پر رحم کرنے والا ہے۔''[1]

تو آپ ﷺ ہنس کر خاموش ہو گئے اور کچھ نہ کہا۔[2]

اس قصے سے کئی احکام نکلتے ہیں:

- پانی میسر ہونے کے باوجود جب پانی کے استعمال سے نقصان کا اندیشہ ہو تو اس کی جگہ جنبی کے لیے تیمّم کافی ہوگا۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ پانی ہونے کے باوجود جب جنبی ہوئے تو تیمّم کر کے نماز ادا کی اور رسول اللہ ﷺ نے اس کا انکار نہ فرمایا۔
- رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ میں بھی اجتہاد کا جواز و امکان موجود تھا۔ حضرت عمرو بن عاص نے ایک آیت کو سامنے رکھتے ہوئے سردی کی رات غسل کے بجائے صرف وضو پر اکتفا کرتے ہوئے نماز ادا کی۔ ان کے اس استدلال و اجتہاد کو رسول اللہ ﷺ نے غلط نہ جانا بلکہ ان کے دو امور کو صائب قرار دیا:

(ا) اجتہاد کرنے کا جواز۔

(ب) اس موقع پر انھوں نے جو اجتہاد کیا تھا اسے درست قرار دیا۔

---

1 النسآء 4:29. 2 مسند أحمد: 204,203/4، وسنن أبي داود، حديث: 334، وصحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 509.

❁ تیمّم کے جواز کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ سخت سردی کی بنا پر پانی کا استعمال تکلیف دہ اور مشکل ہو۔

❁ تیمّم والا، وضو والوں کی امامت کرا سکتا ہے۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے تیمم کر کے پانچ سو صحابہ کی امامت کرائی جنھوں نے وضو کر رکھے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا بھی انکار نہ فرمایا بلکہ اسے درست قرار دیا۔

❁ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کا اجتہاد ان کی فقاہت اور دانش مندی کی دلیل ہے۔[1]

فقہاء نے اس واقعے سے کئی احکام کا استخراج کیا ہے جن میں سے سیرت کے حوالے سے چند باتیں درج ذیل ہیں:

① عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو اسلام قبول کیے ابھی صرف چار ماہ ہوئے تھے۔ قرآن سے اتنی جلدی اتنا گہرا تعلق کہ آیات مبارکہ سے مسائل کا استخراج اور اس قدر سوجھ بوجھ! اس کا سبب صرف اور صرف دین کی فقاہت حاصل کرنے کا شوق تھا۔ یہ امکان بھی بعید نہیں کہ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ اسلام قبول کرنے سے پہلے حتی الوسع قرآن پاک سن چکے ہوں اور اس کی جستجو میں رہتے ہوں۔

② اس احتمال کا اعتبار کر لیں تو قرآن کی عظمت کی ایک اور مثال ہاتھ آئے گی کہ قرآن نے کس طرح اسلام کے دشمنوں کو بھی اپنی طرف مائل کیے رکھا کہ دشمن ہونے کے باوجود اسے سننے کی کوشش کرتے تھے۔ اور مکی دور میں ایسا ہوتا بھی رہا۔ حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کے متعلق اس سلسلے کی ایک اور دلیل بھی ہے کہ انھیں قبولِ اسلام سے پہلے ہی قرآن سے کتنا شغف تھا جیسا کہ انھوں نے نجاشی سے کہا تھا کہ مہاجرین حبشہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق سوال کریں۔[2]

شمال کی جانب پیش قدمی کے اثرات: صلح حدیبیہ کے بعد مسلمانوں کے جنگی حملے شمال

[1] غزوة الحديبية لأبي فارس، ص: 210. [2] من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 381.

کا رخ اختیار کر گئے۔ یوں جزیرہ نمائے عرب کی مغربی اور جنوب مغربی جانب، جس جگہ مکہ مکرمہ ہے، صلح کے سایے تلے پر امن بن گئی۔[1]

رسول گرامی ﷺ کے لشکروں نے عرب کے شمال میں اپنے مقاصد و نتائج مکمل طور پر پاتے ہوئے روم کی سرحدوں پر جا دستک دی۔ یوں حکومت اسلامیہ کی سرحدیں مامون و محفوظ ہو گئیں۔ ہیبت پھیل گئی اور مدینہ منورہ پر حملہ کرنے اور شب خون مارنے کے تمام منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ لشکروں کو مشین کی طرح حرکت میں رکھنے کی نبوی سیاست سے دو اہم اغراض حاصل ہو گئیں:

- داخلی طور پر دین اسلام کی حفاظت کی ضمانت
- بیرونی خطرات سے بھی محفوظ و مامون۔[2]

سیرت نبویہ پر گہری نگاہ رکھنے والا اور باریکی سے اس کی تفاصیل اور واقعات و حوادث جاننے والا شخص، بلاشبہ اس نتیجے تک پہنچے گا کہ صلح حدیبیہ سیاسی، عسکری اور ابلاغی پہلو سے اہم ترین کامیابی تھی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اسلام اور بت پرستی کے درمیان عہد نبوی میں ہونے والے معرکوں میں سے بہتر نتائج دینے والا معرکہ یہی تھا جس نے ایک طرف تو اسلام کی بنیادیں مضبوط کر دیں اور دوسری جانب شرک اور بت پرستی کے ستون زمین بوس کر دیے۔

خیبر میں ہونے والی فتوحات، جنگ موتہ کی فتح و نصرت اور غزوۂ ذات السلاسل میں اسلامی قلمرو کی ہیبت کا سکہ، یہ سب کچھ صلح حدیبیہ ہی کی بدولت تھا۔[3]

1 المجتمع المدني للدكتور العمري، ص: 170. 2 الإعلام في صدر الإسلام للدكتور عبداللطيف حمزة، ص: 173. 3 منهج الإعلام الإسلامي لسليم حجازي، ص: 338.

غزوۂ فتح مکہ 8ھ



جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبٰطِلُ
اِنَّ الْبٰطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ○

''حق آ گیا اور باطل مٹ گیا۔ یقیناً باطل ہے ہی مٹنے والا۔''

(بنی اسرائیل 17:81)

اَلْيَوْمُ يَوْمُ بِرٍّ وَّوَفَاءٍ

''آج نیکی اور ایفائے عہد کا دن ہے۔''

(المعجم الکبیر للطبرانی، رقم: 8395)

لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ

''آج تم پر کوئی سرزنش نہیں۔''

(دلائل النبوۃ للبیہقی: 58/5)

باب 1

اسباب، تیاری اور پیش قدمی

اسباب

قریش نے مسلمانوں کے حلیف بنوخزاعہ کے خلاف اپنے حلیف بنوبکر کی مدد کر کے ناقابل تلافی غلطی اور بہت بڑی کوتاہی کی۔ انھوں نے بنوبکر کو گھوڑوں، اسلحہ اور جنگجوؤں کی صورت میں امداد فراہم کی۔ بنوبکر نے اپنے دوسرے حلیفوں کے ساتھ مل کر ''وتیر'' نامی چشمے کے پاس قبیلہ خزاعہ پر شبخون مارا اور ان کے بیس سے زیادہ آدمی قتل کر دیے۔[1]

خزاعہ کی کوئی جنگی تیاری نہ تھی، لہٰذا وہ بنوبکر سے بچنے کے لیے حرم میں پناہ گزین ہوئے، جہاں جنگ جائز نہیں، تاکہ بنوبکر جنگ سے رک جائیں۔ بنوخزاعہ نے بنوبکر کے قائد سے یہ بھی کہا: ''اے نوفل! اب تو ہم حرم میں داخل ہو گئے ہیں۔ تمھیں تمھارے الٰہ کا واسطہ!'' تو نوفل نے جواب دیا: ''بنوبکر! آج کوئی الٰہ نہیں، اپنا بدلہ چکا لو۔''[2]

تب عمرو بن سالم خزاعی قبیلے کے چالیس افراد کے ہمراہ رسول اللہ ﷺ کے پاس مدینہ جا پہنچا۔ اس نے بنوبکر کے مظالم اور اپنے مقتولین کا تذکرہ کیا اور بتایا کہ قریش نے ہمارے خلاف بنوبکر کی مدد کی ہے۔

رسول اللہ ﷺ اس وقت مسجد نبوی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان تشریف فرما تھے۔ عمرو بن سالم نے آپ ﷺ کے سامنے یہ اشعار پڑھے:

1 المغازي للواقدي: 2/781-784. 2 السيرة النبوية لابن هشام: 4/39.

يَا رَبِّ إِنِّي نَاشِدٌ مُحَمَّدَا
حِلْفَ أَبِينَا وَ أَبِيهِ الْأَتْلَدَا

''اے پروردگار! میں محمد (ﷺ) کو ان کے آباء و اجداد اور اپنے آباء و اجداد کا قدیم معاہدہ[1] یاد دلاتا ہوں۔''

قَدْ كُنْتُمْ وُلْدًا وَّكُنَّا وَالِدَا
ثُمَّتْ أَسْلَمْنَا فَلَمْ نَنْزِعْ يَدَا

''تم لوگ ہماری نسل ہو اور ہم تمھیں جننے والے تھے،[2] پھر ہم نے تابعداری اختیار کی اور کبھی دست کش نہ ہوئے۔''

فَانْصُرْ هَدَاكَ اللّٰهُ نَصْرًا أَعْتَدَا
وَادْعُ عِبَادَاللّٰهِ يَأْتُوا مَدَدَا

''اللہ تعالیٰ آپ کو ہدایت پر قائم رکھے، پُر زور مدد کیجیے اور اللہ تعالیٰ کے بندوں کو بلائیے کہ وہ (ہماری) نصرت و کمک کے لیے حاضر ہوں۔''

فِيهِمْ رَسُولُ اللّٰهِ قَدْ تَجَرَّدَا
إِنْ سِيمَ خَسْفًا وَّجْهُهُ تَرَبَّدَا

''ان میں اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں وہ بھی ہتھیار پوش، اگر آپ پر زیادتی (یا) آپ کی توہین کی جائے تو آپ کے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے۔''

فِي فَيْلَقٍ كَالْبَحْرِ يَجْرِي مُزْبِدَا
إِنَّ قُرَيْشًا أَخْلَفُوكَ الْمَوْعِدَا

---

[1] عبدالمطلب کے زمانے میں بنو ہاشم اور بنو خزاعہ کا باہم صلح کا معاہدہ ہوا تھا۔ حدیبیہ کے موقع پر اس کی تجدید بھی ہوئی تھی۔ [2] مراد یہ تھا کہ عبدمناف اور قیصر دونوں کی مائیں خزاعیہ تھیں۔

''آپ ایک ایسے عظیم لشکر میں تشریف لائیے جو جھاگ اچھالتے سمندر کی طرح متلاطم ہو، یقیناً قریش نے آپ سے وعدہ خلافی کی ہے۔''

وَنَقَضُوا مِيثَاقَكَ الْمُؤَكَّدَا
وَجَعَلُوا لِي فِي (كَدَاءٍ) رُصَّدَا

''انھوں نے آپ کے انتہائی پختہ عہد و پیمان کو توڑا ہے اور میرے لیے لوگوں کو ''کداء'' مقام میں گھات میں بٹھایا ہے۔''

وَزَعَمُوا أَنْ لَّسْتُ أَدْعُو أَحَدَا
وَهُمْ أَذَلُّ وَ أَقَلُّ عَدَدَا

''اور انھوں نے سمجھا کہ میں کسی کو نہیں پکاروں گا اور خود ان کا حال یہ ہے کہ نہایت ذلیل اور تعداد میں بہت کم ہیں۔''

هُمْ بَيَّتُونَا بِالْوَتِيرِ هُجَّدَا
وَقَتَلُونَا رُكَّعًا وَّ سُجَّدَا

''انھوں نے ہم پر ''وتیر'' میں شبخون مارا اور ہمیں بحالت رکوع و سجود قتل کیا۔''

یہ اشعار سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«نُصِرْتَ يَا عَمْرَو بْنَ سَالِمٍ! لَا نَصَرَنِيَ اللّٰهُ إِنْ لَّمْ أَنْصُرْ بَنِي كَعْبٍ!»

''اے عمرو بن سالم! تیری مدد کی جائے گی، اگر میں نے بنی کعب کی مدد نہ کی تو اللہ تعالیٰ میری مدد نہ کرے گا۔''

پھر آسمان سے ایک بادل نمودار ہوا تو فرمایا:

«إِنَّ هٰذِهِ السَّحَابَةَ لَتَسْتَهِلُّ بِنَصْرِ بَنِي كَعْبٍ»

”یہ بادل بنوکعب کی مدد کی بشارت وخوشخبری سے چمک رہا ہے۔“[1]

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب ان سب معاملات کو سن کر تحقیق کر لی تو قریش کو پیغام بھیجا:

«أَمَّا بَعْدُ! فَإِنَّكُمْ إِنْ تَبْرَؤُوا مِنْ حِلْفِ بَنِي بَكْرٍ، أَ تَدُوا خُزَاعَةَ، وَإِلَّا أُوذِنُكُمْ بِحَرْبٍ»

”تم بنوبکر سے کیے ہوئے معاہدے سے براءت کا اظہار کر کے خزاعہ کو ان کا خون بہا دیتے ہو؟ وگرنہ میں تمھارے خلاف اعلان جنگ کرتا ہوں۔“

اس کے جواب میں قرظہ بن عبد عمرو بن نوفل بن عبد مناف نے کہا (یہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سسر تھے): ”بنوبکر نامبارک، منحوس لوگ ہیں۔ (مرضی کے مالک ہیں) ان کے ہاتھوں مرنے والوں کی دیت دینے کے بعد ہمارے پاس کچھ بھی نہ بچے گا، رہی بات ان سے معاہدہ ختم کرنے کی تو اس وقت ہمارے دین پر ان کے علاوہ کوئی اور باقی نہیں رہا، لہٰذا ہم ان سے اظہار براءت بھی نہیں کر سکتے۔ بلکہ ہم آپ کا اعلان جنگ (قبول) کرتے ہیں۔“[2]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قریش کے ساتھ اچانک جنگ نہیں کی بلکہ انھیں تین امور میں سے ایک کا اختیار دیا تو انھوں نے جنگ کو پسند کیا۔[3]

ابوسفیان کی سفارت

قریش نے ابوسفیان کو صلح کی تجدید کرنے کے لیے مدینہ روانہ کیا۔ مدینہ آکر ابوسفیان نے رسول اللہ ﷺ کو آنے کی غرض بتائی تو آپ ﷺ نے منہ پھیر لیا اور کوئی جواب نہ

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 37,36/4، والسنن الكبرىٰ للبيهقي: 234,233/9، ودلائل النبوة للبيهقي: 7,6/5، والبداية والنهاية: 278/4. [2] المطالب العالية: 243/4، رقم: 4361.
[3] التاريخ الإسلامي للحميدي: 164/7.

دیا۔ اس کے بعد اس نے کبار صحابہ ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کو سفارشی بنانا چاہا مگر سب نے انکار کر دیا۔ ابوسفیان کسی بھی عہد و پیمان یا اتفاق رائے کی کوشش میں ناکام واپس مکہ مکرمہ لوٹ گیا۔[1]

بیان کیا جاتا ہے کہ ابوسفیان جب مدینہ آیا تو اپنی صاحبزادی ام المومنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے گھر گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر مبارک پر بیٹھنا چاہا تو انھوں نے بستر لپیٹ دیا۔ ابوسفیان نے کہا: ''بیٹی! کیا تم نے اس بستر کو میرے لائق نہیں سمجھا یا مجھے اس بستر کے لائق نہیں سمجھا؟'' وہ کہنے لگیں: ''یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر ہے اور آپ ناپاک مشرک ہیں۔'' ابوسفیان کہنے لگا:

''اللہ کی قسم! میرے ہاں سے آنے کے بعد تم خراب ہو گئی ہو۔''[2]

ام المومنین ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے یہ سلوک کوئی انوکھا نہیں۔ آپ نے تو دین کے لیے دو مرتبہ ہجرت کی اور مدت ہوئی جاہلیت سے اپنے تعلقات منقطع کر چکی تھیں۔ باپ کی شکل و صورت دیکھے سولہ برس گزر چکے تھے۔ اب جو دیکھا تو وہ محترم و معزز اور قابلِ قدر باپ کی صورت میں نہ آیا تھا بلکہ اس حال میں آیا کہ ایک عرصے سے کفر کا سرغنہ بن کر اسلام کے راستے میں کھڑا ہے۔[3] صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عقیدۂ ولاء و براء کا کس قدر اہتمام کرتے اور اسلام اور مسلمانوں کو کس حد تک معزز خیال کرتے تھے!

ابوسفیان صرف اپنی قوم کی حد تک نہیں بلکہ پورے عرب میں ایک بلند مقام رکھتا تھا مگر ام المومنین ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا اپنے والد سے یہ انداز ان کے قوت ایمانی اور عقائد کی پختگی کی علامت ہے۔ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے اس کردار سے پتا چلتا ہے کہ مسلمان اسلامی تشخص اور اسلامی تعلیمات و احساسات کی حفاظت و ترقی کا کس قدر خیال رکھتے تھے۔[4]

1 التاريخ السياسي والعسكري للدكتور علي معطي، ص: 365. 2 البداية والنهاية: 4/479.
3 من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 395. 4 التاريخ الإسلامي للحميدي: 7/170,171.

مسلمانوں سے کیے ہوئے پختہ عہد کی قریش کی طرف سے خلاف ورزی پر رسول اللہ ﷺ نے انھیں سزا دینے اور مکہ مکرمہ کو فتح کرنے کا عزم فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق کے ساتھ ساتھ درج ذیل امور بھی آپ ﷺ کے معاون ثابت ہوئے:

- مسلمانوں کی داخلی جماعتی صورت حال انتہائی مضبوط تھی۔ حکومت اسلامیہ بنوقینقاع، بنونضیر، بنوقریظہ اور خیبر کے یہود پر کنٹرول پا کر یہودی دھوکے سے بالکل محفوظ ہو چکی تھی۔
- اندرونی مخالفین بھی کمزور پڑ چکے تھے۔ ان میں سب سے آگے آگے منافقین تھے جنھیں اب تدبیریں اور گر بتانے والے مشیر اور ان کے گرو یہود کی مدد حاصل نہ رہی۔
- رسول اللہ ﷺ نے صلح حدیبیہ کی مدت میں جنگی قوت بڑھانے اور مختلف اطراف میں لشکر ارسال کرنے کا ہدف مکمل فرمالیا تھا۔ اب مسلمان تعداد، جنگی تیاری اور معنوی و روحانی جذبے میں مشرکین قریش سے برتری حاصل کر چکے تھے۔
- فتح مکہ سے پہلے قریش اقتصادی لحاظ سے کمزور تھے اور اسلامی حکومت خیبر فتح کر کے وافر اموال غنیمت کی بنا پر اقتصادی طور پر اہل مکہ سے برتری حاصل کر چکی تھی۔
- مدینہ منورہ کے آس پاس کے قبائل میں اسلام پھیل چکا تھا۔
- مکہ فتح کرنے کے لیے قانونی اور حقیقی سبب قریش کی عہد شکنی کی صورت میں بھی پیدا ہوگیا تھا،[1] یعنی ہم دیکھ رہے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا بلکہ بڑی حکمت و دانائی سے اسے استعمال کیا، چنانچہ صلح حدیبیہ کے بعد خیبر فتح ہوگیا اور اب قریش کی عہد شکنی سے ایک اور موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ علاقے میں طاقت کا توازن تبدیل ہو چکا تھا۔ اس نئی فرصت سے فائدہ اٹھانا ضروری تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے دس ہزار کا لشکر تشکیل دیا۔ اس قدر عظیم لشکر تا حال حجاز کی تاریخ نے نہیں دیکھا تھا۔[2]

---

1 السيرة النبوية لأبي فارس، ص:401. 2 الكامل في التاريخ:244/2، والتاريخ السياسي و العسكري للدكتور علي معطي، ص:266.

پیش قدمی کے لیے تیاری

رسول اللہ ﷺ کی حکومت سازی، معاشرے کی تربیت، سرایا بھیجنے کا طریقہ اور جنگوں میں نکلنے کا رنگ ڈھنگ ہمیں بتاتا ہے کہ اسباب معنوی ہوں یا ظاہری، انھیں کس طرح کارآمد بنایا جاتا ہے۔ فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ کی سیرت کا یہ پہلو بالکل واضح نظر آتا ہے، چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ نے مکہ فتح کرنے کا ارادہ کرلیا تو اسے امکان بھر پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی تاکہ ایسا نہ ہو کہ قریش کو اطلاع ہو جائے اور وہ مقابلے کے لیے تیاری کرکے انجام سے پہلے کوئی رکاوٹ ڈال دیں۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے آپ ﷺ نے درج ذیل اسباب اختیار کیے:

پیش قدمی کی منصوبہ بندی مکمل راز داری میں

رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ فتح مکہ کی منصوبہ بندی کو بہت زیادہ پوشیدہ رکھا حتی کہ اپنے سب سے قریبی ساتھی سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بھی نہ بتایا۔ محبوب ترین بیوی ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کو بھی نہ بتایا۔ آپ ﷺ کیا کرنا چاہتے ہیں، کدھر کا ارادہ ہے، کس دشمن سے نبرد آزما ہونے کا خیال ہے، ان حقائق کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جب اپنی بیٹی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ رسول اللہ ﷺ کے کیا ارادے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے کسی بات کا ذکر نہیں کیا۔ اور کبھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا خاموشی اختیار کرلیتیں۔ دونوں میں سے کوئی صورت ہو مقصد یہی ہے کہ نبی ﷺ کے ارادوں کا انھیں علم نہیں تھا۔[1]

رسول اللہ ﷺ کے اس حکیمانہ طرز عمل سے معلوم ہوا کہ سپہ سالاروں کو اپنے پروگرام رفیقہ حیات سے بھی مخفی رکھنے چاہئیں کیونکہ وہ کبھی حسن نیت ہی سے راز افشا کرسکتی ہیں

[1] البداية والنهاية: 282/4، والرسول القائد ﷺ لمحمود شيت خطاب، ص: 334,333.

اور پھر یہ راز زبان زد عام ہو کر کسی بڑے حادثے کا سبب بن سکتا ہے۔[1]

سریہ اِضم

رسول اللہ ﷺ نے مکہ کی جانب روانگی سے پہلے آٹھ آدمیوں پر مشتمل ایک سریہ روانہ فرمایا تاکہ آپ ﷺ اصل ارادے کو پوشیدہ رکھ سکیں۔ ابن سعد اس کے متعلق لکھتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ نے جب اہل مکہ سے جنگ کا عزم کرلیا تو ابو قتادہ ربعی رضی اللہ عنہ کی زیر قیادت آٹھ آدمیوں پر مشتمل سریے کو ''وادیِ اضم''[2] روانہ کیا۔ مقصد یہ تھا کہ سمجھنے والا سمجھے کہ آپ ﷺ اسی علاقے کا رخ کریں گے، چنانچہ یہ لوگ وہاں گئے مگر کسی لشکر سے آمنا سامنا نہ ہوا، لہٰذا واپس ذی خشب پہنچ گئے تو انھیں خبر ملی کہ رسول اللہ ﷺ مکہ کی طرف روانہ ہو چکے ہیں تو وہ وہیں سے روانہ ہوئے اور ''سقیا''[3] میں آپ ﷺ سے جا ملے۔

بعد میں آنے والے قائدین کے لیے لازمی احتیاط اختیار کرنے کے لیے یہ نبوی منہج ہے تاکہ دشمن کو ہر ممکن طریقے سے غلط فہمی میں ڈالا جائے کیونکہ اس طرح راہ خدا میں جہاد کرنے والے اسلامی لشکروں کے اصل مقاصد سے لوگوں کی آنکھوں کو پھیرا جاسکتا ہے، حتی کہ وہ اپنے مقاصد وارادے پورے کرلیں اور دشمنوں کی تدبیروں سے بھی محفوظ رہ سکیں۔[4]

جاسوسی کا مضبوط نیٹ ورک

رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ اوراس کے آس پاس آدمی ارسال فرمائے تاکہ مدینہ کی خبریں قریش تک نہ پہنچ سکیں۔

---

1 القيادة العسكرية في عهد الرسول ﷺ للدكتور محمد الرشيد، ص:396,395. 2 اِضَم: یہ مدینہ کی وہ وادی ہے جہاں بطحان، قناۃ اور عقیق کی وادیاں آپس میں ملتی ہیں۔ 3 سقیا: یہ وادی القریٰ میں ایک مقام ہے۔ معجم البلدان: 288/3، والطبقات الكبرىٰ لابن سعد: 132/2. 4 القيادة العسكرية في عهد الرسول ﷺ للدكتور محمد الرشيد، ص:498.

اس کام کے لیے رسول اللہ ﷺ نے کچھ نقیب منتخب فرمائے اور ان پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ بطور نگران چکر لگاتے رہے اور انھیں خبردار کرتے کہ جو بھی اجنبی شخص ملے اسے واپس لوٹا دو اور کوئی مکہ مکرمہ یا اس کے اطراف واکناف میں جا رہا ہو تو اسے بھی واپس لوٹا دو۔[1]

بارگاہِ الٰہی میں درخواست

رسول اللہ ﷺ انسانی وسائل و ذرائع بروئے کار لانے کی حتی الوسع کوشش کے بعد عاجزی وانکسار کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوئے اور دعا کی:

«اَللّٰهُمَّ خُذْ عَلٰى أَسْمَاعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ فَلَا يَرَوْنَنَا إِلَّا بَغْتَةً وَّلَا يَسْمَعُونَ بِنَا إِلَّا فُجَاءَةً»

''اے اللہ! قریش کے جاسوسوں اور مخبروں کو روک لے کہ وہ ہمیں نہ دیکھ سکیں مگر یہ کہ ہم ان پر اچانک پہنچ جائیں اور انھیں ہماری خبر بھی اچانک ہی ملے۔''[2]

نبی مکرم ﷺ کی یہی عادت مبارکہ ہوتی تھی کہ تمام تر تدابیر بروئے کار لانے کے بعد بھی اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا ہرگز نہ بھولتے تھے۔

راز افشا کرنے کی ناکام کوشش

رسول اللہ ﷺ نے مکہ کی جانب روانگی کا قصد فرمایا تو حاطب رضی اللہ عنہ نے قریش کو ایک خط لکھا جس میں انھیں مطلع کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کی طرف روانگی کا ارادہ کر لیا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو بذریعہ وحی ابتدا ہی میں مطلع فرما دیا، چنانچہ آپ ﷺ نے اس پر جلد ہی قابو پا لیا۔ آپ ﷺ نے حضرت علی، مقداد اور زبیر رضی اللہ عنہم کو روانہ کیا جنھوں نے مدینہ سے بارہ میل پر ''روضۂ خاخ'' مقام پر اس عورت کو جا پکڑا اور اسے دھمکی دی کہ اگر اس نے خود خط نہ نکالا تو پھر ہم تلاشی لیں گے، لہٰذا اس نے خود ہی

1 المغازي للواقدي:2/796. 2 دلائل النبوة للبيهقي: 11/5، والبداية والنهاية:4/282.

خط نکال کر ان کے حوالے کر دیا۔

رسول اللہ ﷺ نے تحقیق کے لیے حاطب رضی اللہ عنہ کو بلوایا تو اس نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! میرے بارے میں فیصلہ کرنے میں جلدی نہ فرمائیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ میں خود قریش کا آدمی نہیں، البتہ ان سے منسلک ہوں، ان کا حلیف ہوں۔ مہاجرین کے وہاں قرابت دار ہیں جو ان کے اہل و عیال کی حفاظت کرتے ہیں جبکہ یہ تحفظ مجھے حاصل نہ تھا تو میں نے چاہا کہ قریش پر ایک احسان کر دوں جس کے عوض وہ میرے اہل و عیال کی حفاظت کریں۔ میں نے یہ کام ازراہ ارتداد نہیں کیا اور نہ اسلام قبول کرنے کے بعد میں نے کفر پسند کیا ہے۔'' رسول اللہ ﷺ نے (عذر قبول کیا اور) فرمایا: «أَمَا إِنَّهُ قَدْ صَدَقَكُمْ» ''اس نے تمھیں سچ سچ بتا دیا ہے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! مجھے اجازت دیجیے میں اس کی گردن مار دوں۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّهُ قَدْ شَهِدَ بَدْرًا وَّمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ اللّٰهَ اطَّلَعَ عَلٰى مَنْ شَهِدَ بَدْرًا فَقَالَ: اِعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ»

''یہ جنگ بدر میں حاضر ہو چکا ہے، عمر! تجھے کیا معلوم ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کو دیکھ کر کہا ہو کہ تم لوگ جو چاہو کرو، میں نے تمھیں بخش دیا ہے۔''[1]

اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ ۚ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ ۭ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ ۤ

[1] صحيح البخاري، حديث:3983و4274، وصحيح مسلم، حديث:2494، ومسند أحمد: 80,79/1.

تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَيْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ○﴾

''اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ، تم انھیں دوستی کے پیغام بھیجتے ہو حالانکہ انھوں نے تمھارے پاس جو حق آیا ہے اس کا انکار کیا ہے۔ پیغمبر کو اور خود تمھیں بھی محض اس وجہ سے جلا وطن کرتے ہیں کہ تم اپنے رب پر ایمان رکھتے ہو، اگر تم میری راہ میں جہاد کے لیے اور میری رضامندی کی طلب میں نکلے ہو (تو ان سے دوستیاں نہ کرو) تم ان کے پاس محبت کا پیغام پوشیدہ پوشیدہ بھیجتے ہو اور مجھے خوب معلوم ہے جو تم نے چھپایا اور وہ بھی جو تم نے ظاہر کیا تم میں سے جو بھی اس کام کو کرے گا وہ یقیناً راہِ راست سے بہک جائے گا۔''[1]

اس آیت نے مسلمانوں کو کفار کے ساتھ معاملہ کرنے کا واضح منہج دیا ہے۔

امام قرطبی کہتے ہیں: ''یہ سورت کفار سے دوستی کی ممانعت کے لیے بنیاد ہے۔''[2]

یہاں (کفار و مشرکین) سے مراد وہ مشرکین اور کفار ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ اور مومنوں سے نبرد آزما ہیں، جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے دشمنی اور ان کی بیخ کنی کا حکم صادر فرمایا ہے۔ انھیں دوست اور ساتھی بنانے سے منع فرما دیا ہے۔[3]

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''تم انھیں دوستی کے پیغام بھیجتے ہو، حالانکہ وہ اس حق کو نہیں مانتے جو تمھارے پاس آیا ہے۔'' یعنی تم انھیں مسلمانوں کے راز بتاتے ہو، ان کی خیر خواہی سوچتے ہو، حالانکہ وہ تمھارے نبی ﷺ اور اس قرآن کا انکار کرتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے تم پر واضح حق کے ساتھ نازل فرمایا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ''انھوں نے پیغمبر کو اور خود تمھیں اس لیے نکالا ہے کہ تم اپنے رب پر ایمان رکھتے ہو'' کے بارے میں ابن کثیر کا کہنا ہے کہ آیت کا یہ حصہ

1 الممتحنة 1:60. 2 تفسير القرطبي: 52/18. 3 تفسير ابن كثير: 346/4.

بھی سابقہ حصے کی طرح ان کے ساتھ دشمنی رکھنے اور دوستی نہ کرنے پر ابھار رہا ہے۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ اور ان کے ساتھیوں کو توحید اور اللہ وحدہ لا شریک کے لیے خالصتاً عبادت کرنے کے جرم میں اپنے درمیان سے نکال دیا۔ اور ان کے نزدیک تمھارا جرم یہی تھا کہ تم اللہ رب العالمین پر ایمان لا چکے تھے۔ [1]

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''اگر تم میری راہ میں جہاد کے لیے اور میری رضا کی تلاش میں نکلے ہو۔'' مطلب یہ ہے کہ اگر تم ایسی حالت میں ہو تو انھیں دوست نہ بناؤ، اگر تم میری راہ میں جہاد کی غرض سے میری رضامندی کے حصول کی بنا پر نکلے ہو تو میرے اور اپنے دشمن کو کبھی دوست نہ بناؤ، انھی نے تو تم سے دشمنی اور تمھارے دین سے ناراضگی کی بنا پر تمھیں تمھارے گھروں اور اموال سے بے دخل کیا ہے۔ [2]

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''تم چوری چھپے ان سے خیر خواہی کرتے ہو اور مجھے خوب معلوم ہے جو تم نے چھپایا۔''

یعنی تم یہ کام کرتے ہو، حالانکہ میں پوشیدہ باتوں اور چھپے رازوں کو جانتا ہوں۔ [3]

پھر اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان کرتے ہوئے آیت مکمل کی کہ جو بھی تم میں سے ان سے چوری چھپے دوستی کرے گا یا انھیں راز لکھ کر بتائے گا تو اس نے یقیناً غلط راستہ چنا اور وہ سیدھی راہ سے بھٹک گیا۔

میرے استاد شیخ محمد بن بکر آل عابد کہا کرتے ہیں: ''ہم اس آیت کو فتح مکہ کی تمہید سمجھتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کفار سے دوستی نہ رکھنے کا حکم دیا ہے تاکہ مہاجرین کے اہل مکہ کے ساتھ جو رشتے ناطے اور ان کی اہل مکہ سے جو مادی مصلحتیں قائم تھیں وہ ان سے متاثر نہ ہوں۔'' [4]

---

[1] تفسیر ابن کثیر: 347/4. [2] تفسیر ابن کثیر: 347/4. [3] تفسیر ابن کثیر: 347/4.

[4] حدیث القرآن للدکتور محمد بکر آل عابد: 569,568/2.

استاد سید قطب کہتے ہیں: ''باوجودیکہ مہاجرین نے اہل مکہ کی طرف سے بڑی تکلیف اٹھائی تھی، پھر بھی بعض مہاجرین چاہتے تھے کہ اہل مکہ سے دوستی اور اچھے رواتب قائم ہوجائیں تو بہتر ہے۔ یہ آپس کی تکلیف دہ جنگ جس کی بنا پر وہ اپنے ہی گھر والوں اور رشتہ داروں کو قتل کرنے پر مجبور ہیں اور یہ صورت حال ان کے پرانے تمام تعلقات ختم کر رہی ہے، بند ہو جائے تو اچھا ہے، جبکہ ان آیات کی بدولت اللہ تعالیٰ گویا چاہتے ہیں کہ ان قدسی صفات لوگوں کو ان تمام تعلقات سے بالاتر کرکے اپنے دین، عقیدہ اور منہج کے لیے خاص فرمالیں، لہٰذا حکمت کے ساتھ واقعات و معاملات پر گرفت کرکے اللہ تعالیٰ نے بہترین حل اور مناسب طریقے سے انھیں درست فرما دیا۔ عین موقع پر گرفت گرم گرم لوہے کو کوٹنے کے مترادف ہوتی ہے۔''[1]

حضرت حاطب رضی اللہ عنہ سے بہت بڑی بھول ہوئی، اس لیے اس موقع پر قرآن پاک اسلامی معاشرے کے دشمنوں کے ساتھ طرز عمل کے متعلق نازل ہوا۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حاطب رضی اللہ عنہ سے بڑا فیاضانہ، رحیمانہ سلوک کیا جو اپنے ساتھیوں سے آپ کی انتہائی وفاداری کا آئینہ دار ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ سلوک اسلام میں سبقت رکھنے والوں کی کمی کوتاہی سے درگزر کرنے پر دلالت کرتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حاطب رضی اللہ عنہ کی سابقہ بہتر کارکردگی کو معافی کا سبب قرار دیا۔ یہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکمت پر مبنی طرز عمل ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حاطب رضی اللہ عنہ کو بڑی کوتاہی کے حوالے ہی سے نہیں دیکھا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گزشتہ زندگی میں جہاد فی سبیل اللہ کے معاملے میں ان کی پیش رفت اور دین اسلام کے لیے ان کی سرفروشی پر نگاہ ڈالی۔ گویا اس میں مسلمانوں کو رہنمائی ہے کہ غلطی کرنے والوں پر مکمل نگاہ ڈالیں، یعنی امت کے لیے ان کے دعوت و جہاد اور علم و تربیت جیسے اچھے کردار کو بھی سامنے رکھیں کیونکہ جو شخص فرض کفایہ کی ادائیگی اپنے سر لے

1 تفسیر في ظلال القرآن لسید قطب: 6/358.

کر ادا کرتا ہے تو وہ احترام و مقام کا مستحق ہوتا ہے، خواہ کبھی جلد بازی میں اس سے کوئی کوتاہی بھی سرزد ہو جائے۔

یہ تو اس وقت ہے جب ایسے لوگوں سے واضح غلطی اور بھول چوک ہو جائے۔ مگر مجتہد ہونے کی بنا پر ان سے صرف اجتہادی غلطی ہو جائے تو وہ کس قدر صرفِ نظر کے مستحق ہوں گے؟

اس زمانے میں بعض طلبہ صرف اس بنا پر کہ کچھ علماء نے بعض علماء میں اجتہادی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے، ان علماء پر بے سوچے سمجھے طعن کرنے لگتے ہیں بلکہ ان کی یہ عیب جوئی بسا اوقات استہزاء اور مذاق تک بھی جا پہنچتی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ طلبہ اہل علم کی غلطی کو یوں بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں اور سامعین کے سامنے ایسی صورت میں رکھتے ہیں گویا ان علماء کی اسلام اور مسلمانوں کے لیے کوئی بھی گراں قدر خدمت نہیں بلکہ ان سے صرف غلطیاں، کوتاہیاں ہی سرزد ہوتی رہی ہیں اور بس۔ حالانکہ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ پہلے ان کی گراں قدر خدمات کا تذکرہ علم و دعوت اور اسلام کی خدمت کے لیے ان کی محنتیں اور کوششیں بیان کی جائیں، پھر علمی نقد و جرح اور پیمانہ و قیاس کی رو سے اہل نقد کی نگاہ میں ان کی اغلاط اور درست باتیں بیان کی جائیں۔ حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ سے سرزد ہونے والی اس عظیم کوتاہی کے بالمقابل اسلوب نبوی ہماری اسی طرز عمل کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

حضرت حاطب رضی اللہ عنہ کی جہاد فی سبیل اللہ میں گراں قدر تاریخ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے (گویا) شفاعت و سفارش ثابت ہوئی۔ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں نہ خوار کیا اور نہ سزا دی۔ بلکہ حضرت حاطب رضی اللہ عنہ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا:

«وَلَا تَقُولُوا لَهُ إِلَّا خَيْرًا»

’’اور ان کے بارے میں اچھی بات ہی کرو۔‘‘ [1]

اس فرمان کے بعد کسی صحابی سے بھی انھوں نے کوئی نازیبا بات نہ سنی۔ [2]

حضرت حاطب رضی اللہ عنہ سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور عمر رضی اللہ عنہ کے مابین جو گفتگو ہوئی اس سے ہم کچھ مسائل اخذ کر سکتے ہیں:

- بعض حضرات مذکورہ حدیث سے مسلم جاسوس کے قتل پر استدلال کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب رسول گرامی کو قتل کا مشورہ دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سزا کو غلط قرار نہ دیا بلکہ صرف بدری ہونے کی بنا پر اسے یہ سزا نہ دی۔ [3]
- حق کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی غیرت وحمیت کا اظہار اس وقت ہوا جب انھوں نے حاطب رضی اللہ عنہ کی گردن مارنے کا مطالبہ کیا۔
- حضرت حاطب رضی اللہ عنہ سے جاسوسی کی جو کوتاہی سرزد ہوئی وہ کبیرہ گناہ تھا، پھر بھی وہ مومن ہی قرار پائے اور ان کا ایمان برقرار رہا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا صرف یہ مقصد تھا کہ حاطب رضی اللہ عنہ نے اپنے ظاہر کے خلاف کردار ادا کیا تھا کیونکہ حاطب رضی اللہ عنہ نے جو جاسوسی کا خط لکھا تھا وہ ان کے ایمان کے منافی تھا جس کے لیے وہ جہاد کر رہے تھے اور اپنا خون بھی پیش کر رہے تھے۔ [4]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب سے عمر رضی اللہ عنہ متاثر ہوئے، لہٰذا چند ہی لمحات کے اندر اندر وہ شخص جو طیش میں بھرا بیٹھا تھا اور حاطب رضی اللہ عنہ کے لیے سخت ترین سزا کا مطالبہ کر رہا تھا اب

---

1 صحيح البخاري، حديث: 6939. 2 التاريخ الإسلامي للحميدي: 176/7. 3 وضاحت: مصنف نے جو موقف بیان کیا ہے وہ محل نظر ہے کیونکہ اس حدیث میں وجہِ قتل واضح ہے، «دَعْنِي أَضْرِبْ عُنُقَ هٰذَا الْمُنَافِقِ» ’’مجھے اجازت دیجیے میں اس منافق کو قتل کر دیتا ہوں۔‘‘ (صحيح البخاري: 3007) عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں منافق قرار دیا لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تردید فرمائی کہ «إِنَّهُ شَهِدَ بَدْرًا» یہ بدری ہے اور بدری منافق نہیں ہو سکتا۔ اس حدیث سے یہ استدلال کرنا کہ حاطب رضی اللہ عنہ کو سزا اس لیے نہیں دی گئی کیونکہ وہ بدری تھے درست نہیں کیونکہ اگر بدری سے جرم سرزد ہو جائے تو اسے سزا دی جائے گی، جیسا کہ مِسطح بن اثاثہ کو بدری ہونے کے باوجود سزا ملی تھی۔ 4 السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 404.

ایسے شخص کا روپ دھار لیتا ہے جو متاثر ہو کر خوف کے مارے رو رہا ہے اور زبان سے کہہ رہا ہے: «اَللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ!» ''اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ ہی خوب جانتے ہیں، بہتر جانتے ہیں۔'' دراصل بات یہ تھی کہ عمر رضی اللہ عنہ کا غصہ فقط اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کی خاطر تھا، لہٰذا جب ان کے سامنے یہ بات کھل گئی کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کو یہ پسند ہے کہ جہاد میں حاطب رضی اللہ عنہ کی خدمات کے اعتراف کے طور پر اس سے بہتر رویہ اپنایا جائے اور اس کی کوتاہی سے صرفِ نظر کیا جائے تو انھوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے فیصلے کو (دل و جان سے) قبول کرلیا۔[1]

حضرت حاطب رضی اللہ عنہ کی معافی ان جیسی کوتاہی کا ارتکاب کرنے والے کے لیے معافی کی دلیل نہیں بن سکتی۔ (ان کی معافی اپنی مثال آپ تھی) عبدالکریم زیدان اسی رائے کو اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جو شخص حاطب رضی اللہ عنہ جیسی کوتاہی کر گزرے، تو حاطب رضی اللہ عنہ کو ملنے والی معافی کی بنا پر اسے معافی دینا درست نہیں ہوگا۔ کیونکہ انھیں جو معافی ملی اس کا ایک خاص سبب تھا جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے کے بعد پایا جانا ممکن نہیں اور وہ ہے ان کا بدر میں حاضر ہونا، لہٰذا یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کے قابل ہے۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ نے اس مسئلے کے متعلق تحقیق پیش کی ہے۔ وہ ائمہ اربعہ کے اقوال بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں: ''صحیح بات یہ (معلوم ہوتی) ہے کہ جاسوس کا قتل کرنا امام کی رائے پر ہے۔ اگر وہ دیکھے کہ مسلمانوں کی مصلحت اسے قتل کرنے میں ہے تو اسے ٹھکانے لگا دے، تاہم اگر اس کو باقی رکھنا زیادہ بہتر ہے تو زندہ رکھا جائے۔''[2]

فتح مکہ کے سفر کا آغاز اور راستے میں پیش آمدہ حالات

رسول اللہ ﷺ نے 10 رمضان 8 ہجری کو مکہ مکرمہ کا رخ کیا۔[3] اور مدینہ منورہ پر

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي:177,176/7. [2] زاد المعاد:443/3. [3] السيرة النبوية للدكتور مهدي رزق الله أحمد، ص:561,560.

ابورہم کلثوم بن حصین بن عتبہ بن خلف غفاری رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر فرمایا۔ لشکر کی کل تعداد دس ہزار تھی۔ کوئی مہاجر اور انصاری پیچھے نہ رہا۔

جب لشکر کدید[1] پہنچا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ افطار (توڑ) کر دیا۔ صحابہ نے بھی روزہ ختم کر دیا۔[2]

حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ سے ملاقات: جحفہ میں حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ ملے جو مسلمان ہوکر اپنے بال بچوں سمیت ہجرت کرتے ہوئے تشریف لا رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے بڑی خوشی ہوئی۔[3]

حضرت عباس رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ کی جنگی خبریں یا عمومی خبریں مدینہ ارسال کرتے رہتے تھے۔ اب ان کا اہل و عیال سمیت وہاں سے ہجرت کر لینا اس کی نشاندہی کرتا تھا کہ مکہ میں ان کی ذمہ داری ختم ہو چکی تھی۔ خاص طور پر جب ہم یہ بات سامنے رکھیں کہ ان کا وہاں قیام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق تھا۔[4]

ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب اور عبداللہ بن ابی امیہ کا اسلام لانا: ابوسفیان بن حارث اور عبداللہ بن ابی امیہ بن مغیرہ بھی مکہ مکرمہ سے نکل چکے تھے۔ یہ دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ و مدینہ کے درمیان ''ثنیۃ العقاب'' میں ملے۔ ان دونوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے لیے کوئی راہ نکالنے کی کوشش کی تو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے ان کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! آپ کا چچیرا بھائی اور آپ کا پھوپھی زاد اور برادر نسبتی (ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا بھائی) یہ دونوں آپ سے ملنے کے خواہش مند ہیں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

1 کَدِیْد: مکہ سے عسفان کی جانب 42 میل کے فاصلے پر ایک مقام ہے۔ 2 صحیح البخاري، حديث:4275، وصحيح مسلم، حديث: 1113. 3 البداية والنهاية: 286/4، والسيرة النبوية لأبي فارس، ص:406. 4 تأملات في السيرة النبوية لمحمد السيد وكيل، ص:254.

«لَا حَاجَةَ لِي فِيهِمَا أَمَّا ابْنُ عَمِّي فَهَتَكَ عِرْضِي وَأَمَّا ابْنُ عَمَّتِي وَصِهْرِي فَهُوَ الَّذِي قَالَ لِي بِمَكَّةَ مَاقَالَ»

''مجھے ان کی کوئی ضرورت نہیں، چچیرے بھائی نے میری ہتک کی اور پھوپھی زاد بھائی اور برادر نسبتی وہی ہے جس نے مکہ مکرمہ میں مجھ سے وہ باتیں کہیں جو کسی طرح بھی مناسب نہ تھیں۔''

رسول اللہ ﷺ کی اس بات کی خبر جب انھیں پہنچی تو ابوسفیان نے کہا، حالانکہ اُس کے ساتھ ایک چھوٹا بچہ بھی تھا: ''اللہ کی قسم! یا تو رسول اللہ ﷺ مجھے اجازت دیں گے یا میں اپنے بچے کا ہاتھ پکڑ کر کہیں چلا جاؤں گا اور وہیں بھوکا پیاسا مر جاؤں گا۔'' رسول اللہ ﷺ کو جب یہ معلوم ہوا تو آپ ﷺ کے دل میں دونوں کے لیے رقت پیدا ہو گئی۔ (اور انھیں اجازت دے دی) وہ دونوں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

ابوسفیان بن حارث رضی اللہ عنہ نے حسب ذیل شعر پڑھے اور جو کچھ اس سے پہلے کہہ چکے تھے اس سے معذرت کی اور اسلام قبول کر لیا:

لَعَمْرُكَ إِنِّي يَوْمَ أَحْمِلُ رَايَةً
لِتَغْلِبَ خَيْلَ اللَّاتِ خَيْلَ مُحَمَّدِ

''تیری زندگی کی قسم! یقیناً (اس سے پہلے) میں لات (ومنات) کے جھنڈے کو اٹھائے ہوئے تھا تاکہ اس کے سوار محمد ﷺ کے سواروں پر غالب آجائیں۔''

لَكَالْمُدْلِجِ الْحَيْرَانِ أَظْلَمَ لَيْلُهُ
فَهٰذَا أَوَانُ الْحَقِّ أُهْدٰى وَ أَهْتَدِي

''اُس وقت میں قطعی طور پر اس شخص کی مانند تھا جو انتہائی اندھیری رات میں ادھر اُدھر ہاتھ پاؤں مار رہا ہو مگر اب وقت ہے کہ میں سیدھی راہ پر لگا دیا جاؤں اور اسی راہ

کو اختیار کروں۔"

فَقُلْ لِّثَقِيفٍ لَّا أُرِيدُ قِتَالَكُمْ
وَقُلْ لِّثَقِيفٍ تِلْكَ عِنْدِي فَأَوْعِدِي

"ثقیف سے کہہ دو کہ اب میں تم سے قتال نہیں کرنا چاہتا، ثقیف کو یہ بھی کہہ دو کہ لڑنا اب میرے اختیار میں ہے (مجھ پر لڑائی مسلط نہیں کی جاسکتی) لہٰذا اب کسی اور ہی کو دھمکی دو۔"

هَدَانِي هَادٍ غَيْرَ نَفْسِي وَ دَلَّنِي
عَلَى اللّٰهِ مَنْ طَرَدْتُّ كُلَّ مُطَرَّدِ

"مجھے میرے نفس نے نہیں بلکہ ایک ہادی و رہنما نے ہدایت دی ہے اور مجھے اللہ تعالیٰ سے اس نے ملا دیا ہے جس سے میں نے ہر طرح کا مقابلہ کیا۔"

أَفِرُّ سَرِيعًا جَاهِدًا عَنْ مُّحَمَّدٍ
وَأُدْعٰى وَ إِنْ لَّمْ أَنْتَسِبْ لِمُحَمَّدِ

"میں محمد ﷺ سے لڑتے لڑتے بڑی تیزی سے ان سے (دور) بھاگ جاتا تھا اور مجھے محمد ﷺ سے تعلق کی بنا ہی پر پہچانا جاتا تھا اگرچہ میں یہ انتساب ظاہر نہ کرتا تھا۔"

هُمُ عُصْبَةٌ مَّنْ لَّمْ يَقُلْ بِهَوَاهُمُ
وَ إِنْ كَانَ ذَا رَأْيٍ يُّلَمْ وَ يُفَنَّدِ

"یہ ایک ایسا گروہ ہے جو اپنی خواہش و مرضی سے کچھ نہیں کہتا۔ اگر یہ خود صائب رائے ہوتا تو ان کی ملامت بھی کی جاتی اور انھیں جھٹلا بھی دیا جاتا۔"

أُرِيدُ لِأَرْضِيَهُمْ وَ لَسْتُ بِلَائِطٍ
مَّعَ الْقَوْمِ مَا لَمْ أُهْدَ فِي كُلِّ مَقْعَدِ

''میں اب انھیں خوش کرنے کی خواہش رکھتا ہوں اور اپنی قوم سے اس وقت تک نہیں ملوں گا جب تک میں ہر ہر موقع کے متعلق رہنمائی و ہدایت نہ حاصل کر لوں۔''

فَمَا كُنْتُ فِي الْجَيْشِ الَّذِي نَالَ عَامِرًا
وَّمَا كَانَ عَنْ جَرًّا لِسَانِي وَلَا يَدِي

''میں اس لشکر میں نہ تھا جس نے عامر کو پایا تھا۔ اور نہ ہی وہ لشکر میری زبان اور میرے ہاتھ سے لایا گیا تھا۔''

قَبَائِلُ جَاءَتْ مِنْ بِلَادٍ بَعِيدَةٍ
تَوَابِعُ جَاءَتْ مِنْ سِهَامٍ وَّ سَرْدَدِ

''یہ وہ قبائل تھے جو دور افتادہ شہروں سے آئے تھے یہ وہ گھٹیا لوگ (پچھلگ) تھے جو سہام اور سردد کی زمین سے آئے تھے۔''

وَإِنَّ الَّذِي أَخْرَجْتُمْ وَ شَتَمْتُمْ
سَيَسْعىٰ لَكُمْ سَعْيَ امْرِيءٍ غَيْرَ مُقْدَدِ

''بلاشبہ جس شخص کو تم نے نکال دیا اور برا بھلا کہا، تمھارے لیے ایک پختہ رائے والے آدمی کی سی سعی و کوشش بجا لائے گا۔''[1]

راوی کہتا ہے کہ جب ابوسفیان بن حارث رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو یہ کہا: ''میں نے ہر طرح کا مقابلہ کیا۔'' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سینے پر ضرب سی لگائی

1 صحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 517.

اور فرمایا: «أَنْتَ طَرَدْتَنِي كُلَّ مُطَرَّدٍ» ''تو نے ہر طرح میرا مقابلہ کیا تھا؟'' [1]

ابوسفیان بن حارث اکثر و بیشتر اشعار میں رسول اللہ ﷺ کی ہجو کرتا تھا۔ عبداللہ بن ابی اُمیہ نے رسول اللہ ﷺ سے کہا تھا: ''اللہ کی قسم! میں تجھ پر اس وقت ایمان لاؤں گا جب تو آسمان تک ایک سیڑھی لگائے گا، پھر میری آنکھوں کے سامنے آسمان پر چڑھے گا، پھر وہاں سے ایک مکتوب لائے گا جس کی گواہی ساتھ اترنے والے چار فرشتے دیں کہ جیسا تو کہتا ہے ویسا ہی ہے۔ تُو اگر یہ تمام کام کر بھی لے تو اللہ کی قسم! میں تجھے پھر بھی سچا تسلیم نہیں کروں گا۔'' [2]

باوجود اس کے کہ ان کا جرم بہت بڑا تھا مگر نبی مکرم ﷺ نے عذر قبول کرتے ہوئے ان سے درگزر کیا۔ رحمت، شفقت اور درگزر کرنے کی یہ بلند ترین مثال ہے۔ ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے بھی مدحت رسول ﷺ میں فصیح و بلیغ قصیدہ کہہ کر اپنے سابقہ اشعار کا کفارہ ادا کر دیا۔ اس قصیدے میں اس نے مدح کے ساتھ ساتھ اپنی ہدایت کا بھی ذکر کیا ہے۔ بعدازاں وہ ایک اچھے مسلمان ثابت ہوئے اور رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ جنگ حنین میں بڑا بہتر کردار ادا کیا۔ [3]

مرالظہران میں پڑاؤ اور ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام: رسول اللہ ﷺ مسلسل سفر کرتے ہوئے ''مرّ الظہران'' [4] پہنچے۔ شام کے وقت وہاں فروکش ہوئے۔

آپ ﷺ نے لشکر کو اپنی اپنی آگ جلانے کا حکم دیا۔ اس طرح دس ہزار جگہ آگ جل اٹھی۔ ادھر آپ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پہرے پر مقرر کر دیا۔ [5]

---

1 السيرة النبوية لابن هشام: 44,43/4، والمعجم الكبير للطبراني، رقم: 7264، ودلائل النبوة للبيهقي: 28,27/5، ومجمع الزوائد للهيثمي: 165/6، وتاريخ الطبري: 115,114/3، والطبقات لابن سعد: 50,49/4. 2 السيرة النبوية لابن هشام: 1/295-200. 3 التاريخ الإسلامي للحميدي: 182/7. 4 مرالظہران: مکہ مکرمہ کے شمال میں حجاز کی ایک وادی ہے جو مکہ سے 22 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ 5 من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 387، والطبقات لابن سعد: 135/2.

حضرت عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''میں نے سوچا، ہائے قریش کی تباہی، واللہ اگر قریش کے خود آ کر ملنے اور حصول امن کی درخواست سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بزور بازو مکہ مکرمہ داخل ہو گئے تو ہمیشہ کے لیے قریش کی موت ہو جائے گی۔'' یہ سوچ کر حضرت عباس رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خچر پر سوار ہو کر نکل پڑے تا کہ اہل مکہ تک کسی خبر رساں کو ڈھونڈ سکیں اور قریش رسول اللہ کے مکہ میں بزور طاقت داخل ہونے سے پہلے خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نکلیں اور امن کی درخواست کر لیں۔

ادھر ابوسفیان بن حرب، حکیم بن حزام اور بدیل بن ورقاء بھی مکہ سے نکل کر خبروں کی جستجو میں تھے اور وہ بھی وہاں آ پہنچے۔ اتنی زیادہ آگ دیکھ کر ابوسفیان نے کہا: ''آج کی رات جگہ جگہ جلتی ہوئی آگ اور آج کی رات کا سا عظیم لشکر میں نے کبھی نہیں دیکھا۔'' بدیل نے جواباً کہا: ''اللہ کی قسم! یہ خزاعہ قبیلہ ہے جسے جنگ نے جلا رکھا ہے۔'' ابوسفیان بولا: ''کس قدر بڑا یہ لشکر ہے اور ہر طرف جلتی آگ، خزاعہ کی نہ تو اتنی تعداد ہے نہ اتنی طاقت۔''

حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے ان کی آوازیں سن لیں اور ان کو پہچان لیا، پھر آواز دی: ''اے ابو حنظلہ'' اس نے پوچھا: ''آپ ابو الفضل ہیں؟'' حضرت عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا: ''ہاں۔''

ابوسفیان بولا: ''کیا بات ہے؟ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں!''

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا: ''تمھارا برا ہو اے ابوسفیان! یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (قریب ہی) ہیں، اللہ کی قسم! قریش کی تباہی نظر آ رہی ہے۔''

ابوسفیان نے کہا: ''میرے ماں باپ آپ پر قربان! اب کیا چارہ جوئی کی جائے؟''

حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: ''بخدا اگر تم ان کے ہاتھ لگ گئے تو وہ تمھاری گردن مار دیں گے، لہٰذا خچر پر بیٹھو، میں تمھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے چلتا ہوں اور تمھارے لیے امان طلب کیے دیتا ہوں۔'' ابوسفیان ان کے پیچھے بیٹھ گئے اور ان کے دونوں ساتھی

واپس چلے گئے۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو لے کر چلا۔ جب کسی الاؤ کے پاس سے گزرتا تو لوگ کہتے: ''یہ کون ہے؟'' مگر جب دیکھتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خچر ہے اور میں اس پر سوار ہوں تو کہتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خچر پر ہیں۔ یہاں تک کہ جب ہم عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے الاؤ کے پاس سے گزرے تو انھوں نے کہا: ''یہ کون ہے؟'' اور اٹھ کر میری طرف آئے۔ جب پیچھے ابوسفیان کو دیکھا تو کہنے لگے: ''ابوسفیان!! اللہ کا دشمن! اللہ ہی کی تعریف ہے کہ اس نے بغیر عہدو پیمان کے تجھے ہمارے حوالے کر دیا۔'' اس کے بعد عمر رضی اللہ عنہ جلدی جلدی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے: ''اے اللہ کے رسول! یہ ابوسفیان ہے۔ اسے اللہ نے بلا عہدو پیمان ہمارے حوالے کر دیا ہے۔ مجھے اجازت دیجیے میں اس کی گردن ماردوں۔'' حضرت عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! اسے میں نے پناہ دی ہے۔'' جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابوسفیان کے متعلق بار بار کہا تو میں نے کہا: ''عمر! ٹھہر جاؤ، اللہ کی قسم! اگر یہ تمھارے خاندان بنو عدی بن کعب کا آدمی ہوتا تو تم ایسی بات نہ کہتے۔'' عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''عباس! رکو۔ اللہ کی قسم! تمھارا اسلام لانا میرے نزدیک خطاب کے اسلام لانے سے، اگر وہ اسلام لاتے، زیادہ پسندیدہ ہے اور اس کی وجہ میرے لیے صرف یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک تمھارا اسلام لانا خطاب کے اسلام لانے سے زیادہ پسندیدہ ہے۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «اِذْهَبْ بِهٖ يَا عَبَّاسُ! إِلٰى رَحْلِكَ، فَإِذَا أَصْبَحْتَ فَأْتِنِي بِهٖ» ''عباس! اسے اقامت گاہ میں لے جاؤ، صبح میرے پاس لے آنا۔'' میں نے صبح اسے خدمت نبوی میں پیش کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دیکھ کر فرمایا: «وَيْحَكَ يَا أَبَا سُفْيَانَ! أَلَمْ يَأْنِ لَكَ أَنْ تَعْلَمَ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ؟!» ''ابوسفیان، تجھ پر افسوس! کیا اب بھی تمھارے لیے وہ وقت نہیں آیا کہ تم یہ جان سکو کہ اللہ کے سوا کوئی

عبادت کے لائق نہیں۔'' ابوسفیان نے کہا: ''میرے ماں باپ آپ پر قربان! آپ کتنے بردبار، کتنے کریم اور کتنے خویش پرور ہیں۔ میں اچھی طرح سمجھ چکا ہوں کہ اگر اللہ کے سوا کوئی اور الٰہ ہوتا تو اب تک میرے کچھ کام آیا ہوتا۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: «وَيْحَكَ يَا أَبَا سُفْيَانَ! أَلَمْ يَأْنِ لَكَ أَنْ تَعْلَمَ أَنِّي رَسُولُ اللّٰهِ؟!» ''ابوسفیان تم پر افسوس! کیا تمھارے لیے اب بھی وہ وقت نہیں آیا کہ تم جان سکو کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔'' ابوسفیان نے کہا: ''میرے ماں باپ آپ پر قربان! آپ کس قدر حلیم، کس قدر کریم اور کس قدر صلہ رحمی کرنے والے ہیں۔ اس بات کے متعلق تو اب بھی دل میں کچھ نہ کچھ کھٹک ہے۔'' اس پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: ''تجھ پر افسوس! اس سے پہلے کہ ہم تیری گردن مار دیں اسلام قبول کر لے۔'' ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے حق کی گواہی دی اور اسلام قبول کر لیا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! ابوسفیان چودھراہٹ پسند آدمی ہے اسے کوئی اعزاز دے دیجیے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: «نَعَمْ! مَنْ دَخَلَ دَارَ أَبِي سُفْيَانَ فَهُوَ آمِنٌ، وَّمَنْ أَغْلَقَ عَلَيْهِ بَابَهُ فَهُوَ آمِنٌ، وَّمَنْ دَخَلَ الْمَسْجِدَ فَهُوَ آمِنٌ» ''ٹھیک ہے، جو ابوسفیان کے ڈیرے میں داخل ہو جائے گا، اسے امان ہے۔ جو اپنا دروازہ اندر سے بند کر لے اسے بھی امان ہے اور جو مسجد حرام میں داخل ہو جائے، اسے بھی امان ہے۔''

جب ابوسفیان رضی اللہ عنہ جانے لگے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «يَا عَبَّاسُ! اِحْبِسْهُ بِمَضِيقِ الْوَادِي عِنْدَ خَطْمِ الْجَبَلِ حَتّٰى تَمُرَّ بِهِ جُنُودُ اللّٰهِ فَيَرَاهَا» ''اے عباس! ابوسفیان کو وادی کی تنگ جگہ پہاڑ کے ناکے پر روک رکھو تاکہ یہ وہاں سے گزرنے والے اللہ تعالیٰ کے لشکروں کو ذرا دیکھ لے۔''

حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے ایسا ہی کیا جس جگہ آپ ﷺ نے فرمایا تھا انھیں وہیں روک لیا۔ ادھر قبائل اپنے اپنے پھریرے لیے گزر رہے تھے۔ جب وہاں سے کوئی قبیلہ گزرتا تو

ابوسفیان رضی اللہ عنہ پوچھتے: ''عباس! یہ کون ہیں؟'' تو وہ جواب میں کہتے: ''یہ فلاں قبیلہ ہے۔'' ابوسفیان رضی اللہ عنہ کہتے: ''مجھے اس سے کیا واسطہ؟'' پھر کوئی قبیلہ گزرتا تو ابوسفیان پوچھتے: ''اے عباس! یہ کون لوگ ہیں؟'' وہ کہتے: ''مزینہ ہیں۔'' ابوسفیان کہتے: ''مجھے مزینہ سے کیا مطلب؟'' یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انصارومہاجرین پر مشتمل اپنے سبز دستے میں تشریف لائے۔ اسلحے سے لیس ہونے کے باعث ان سرفروشوں کی صرف آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے کہا: ''سبحان اللہ، اے عباس! یہ کون لوگ ہیں؟'' عباس رضی اللہ عنہ نے بتایا: ''یہ انصار ومہاجرین کے جلو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔'' ابوسفیان رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ''بھلا ان سے محاذ آرائی کی طاقت کسے ہے'' پھر کہنے لگے: ''بخدا، اے ابوالفضل! تمھارے بھتیجے کی بادشاہت بڑی پھیل گئی ہے۔'' حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ابوسفیان! یہ نبوت ہے۔'' وہ کہنے لگے: ''ہاں فی الواقع یہی بات ہے۔'' عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ پھر میں نے کہا: ''اپنی قوم کی فکر کرو۔''[1]

دروس، عبرتیں اور فوائد

ابوسفیان رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے قابو آگئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف ایک ہی اشارے سے انھیں پناہ مل گئی، حالانکہ ان کے بارے میں عمر رضی اللہ عنہ کے ارادے خطرناک تھے، چنانچہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے انھیں اپنی پناہ میں کرلیا اور دوسرے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو پیش کردیا۔ انھیں ڈانٹ، تذلیل اور توبیخ کے بجائے اچانک جس چیز سے واسطہ پڑا وہ اسلام کی طرف دعوت تھی۔ وہ اس کریمانہ کردار سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے بلکہ اس پر

1 صحيح البخاري، حديث: 4280، والمصنف لعبدالرزاق: 5/374-378، ودلائل النبوة للبيهقي: 5/32-35، والسيرة النبوية لابن هشام: 4/44-47، ومجمع الزوائد للهيثمي: 6/164-167، والطبقات لابن سعد: 2/134-137، والمطالب العالية: 4/244-246، وصحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 518-520.

عش عش کر اٹھے اور اسے ان کے ضمیر نے یہ کہنے پر مجبور کر دیا:

''اے محمد آپ پر میرے ماں باپ قربان! آپ کس قدر حلیم الطبع، کس قدر کریم اور کتنے ہی صلہ رحمی کرنے والے ہیں۔''

اب ابوسفیان اپنے ماں باپ آپ ﷺ پر فدا کر رہا ہے اور ہر قسم کی تعریف بجا لا رہا ہے۔[1]

اور پھر جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ سرداری اور عہدے کو پسند کرتے ہیں، لہٰذا آپ انھیں کوئی اعزاز دے دیجیے تو آپ ﷺ نے انھیں یہ اعزاز بخشا کہ جو بھی ان کے ڈیرے میں داخل ہو جائے گا امن میں رہے گا۔ ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو یہ خصوصی مقام دینا ان کی خواہش کی تسکین کر رہا تھا۔ یہ اعزاز مرحمت فرمانا دراصل انھیں اسلام پر پختہ اور ایمان پر پکا رکھنے کے لیے تھا۔[2]

رسول اللہ ﷺ کا یہ اندازِ کریمی ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے دل سے حسد وکینہ نکال دینے کے لیے ایک وسیلہ تھا۔ اور اس کے لیے یہ واضح پیغام تھا کہ اگر وہ مخلص ہیں اور اللہ کی راہ میں اپنی توانائیاں صرف کریں گے تو قریش میں انھیں جو مقام و مرتبہ حاصل تھا اسے کم نہ کیا جائے گا۔[3]

آپ ﷺ کا یہ فیاضانہ انداز علماء اور داعیانِ اسلام کے لیے ایک نمونہ ہے جسے انھیں مکمل طور پر اختیار کرنا چاہیے۔

ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو وادی کی تنگ نائے (گزرگاہ) پر کھڑا کرنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ وہاں سے گزرنے والے اسلامی لشکروں کا مشاہدہ کر لیں۔ رسول اللہ ﷺ چاہتے تھے کہ قریش پر نفسیاتی جنگ مسلط کریں تاکہ اس طرح قریشی سردار کے مقابلہ کرنے کے خیالات کو بہتر

[1] فقه السيرة النبوية، للغضبان ص: 564، وصحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 518-520. [2] المستفاد من قصص القرآن للدكتور عبدالكريم زيدان: 403/2 [3] قراءة سياسية للسيرة النبوية لمحمد رواس، ص: 245.

طریقے سے بدل کر ماتحت کرلیں۔ اور یہ بھی مقصد تھا کہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ دیکھ لیں کہ اسلامی لشکر کس قدر، حسن اطاعت اور نظم و ضبط کا منہ بولتا ثبوت اور اسلحہ سے لیس ہے۔ اس طرح شرک اور بت پرستی کے پنجوں سے مکہ مکرمہ کو آزاد کرانے کے موقع پر اگر اہل مکہ کے دماغوں میں اس مبارک لشکر کے ساتھ مقابلہ کرنے کا کوئی خیال آرہا ہے تو اسے درست کرلیں۔ *

رسول اللہ ﷺ کا یہ حربہ واقعی کارگر ثابت ہوا۔ ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا کہ قریش کو اس مسلمان لشکر کا مقابلہ کرنے کی استطاعت ہرگز نہیں ہے۔ حتی کہ جب مہاجرین و انصار کا لشکر ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے قریب سے گزرا تو ابوسفیان نے پوچھا: ''سبحان اللہ! عباس! یہ کون لوگ ہیں؟'' حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے بتایا: ''یہ مہاجرین و انصار کے جلو میں رسول اللہ ﷺ ہیں۔'' ابوسفیان رضی اللہ عنہ بولے: ''اللہ کی قسم، اے ابوالفضل! ان لوگوں کا کوئی بھی مقابلہ نہیں کرسکتا اور نہ ایسی کسی میں طاقت ہے۔ تمھارے برادر زادے کی حکومت عظیم الشان ہوگئی ہے۔'' حضرت عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا: ''ابوسفیان! یہ نبوت ہے۔'' وہ کہنے لگا: ''تب تو اور بھی اچھا ہے۔''

''یہ نبوت ہے۔'' یہ وہ کلمہ ہے جو حکمت الٰہی نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی زبان پر جاری کرایا تاکہ روز قیامت تک اس شخص کا ردّ ہوتا رہے جو خود یہ وہم رکھتا ہے یا کسی کو اس وہم میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی دعوت حکمرانی یا چودھراہٹ کے لیے تھی، یا اس کا مقصد (عرب) قومیت یا عصبیت کا زندہ کرنا تھا۔ یہ وہ کلمہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کی اوّل تا آخر زندگی کا عنوان تھا۔ آپ ﷺ کی زندگی کے لمحات اور مراحل اس کے منہ بولتے گواہ ہیں کہ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی رسالت ساری دنیا کے لوگوں تک پہنچانے کا مشن دیا گیا تھا نہ کہ دنیا میں اپنے دل کی چاہت کے مطابق حکمرانی

* القيادة العسكرية في عهد الرسول ﷺ للدكتور محمد الرشيد، ص: 447.

قائم کرنے کا پروگرام۔[1]

رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ کے سفر کے دوران دشمنوں پر نفسیاتی جنگ مسلط رکھی۔ اس کے لیے آپ ﷺ نے کئی مقامات پر آگ جلانے کا حکم دیا۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے دس ہزار الاؤ ایک ہی رات میں روشن کر کے فضا کو منور کر دیا۔ لشکر کے قیام کا منظر اتنا رعب دار اور ہولناک تھا کہ اس کی ہیبت سے قریشیوں کے دل پھٹنے کے قریب تھے۔[2]

رسول اللہ ﷺ کا بھی اس سے یہی ارادہ تھا کہ دشمن کے عزائم کو خاک میں ملایا جائے اور ان کے خیالات پر ایسی کاری ضرب لگائی جائے کہ وہ کسی قسم کے مقابلے کا خیال بھی دل میں نہ لائیں۔ انھیں اطاعت قبول کرنے پر مجبور کر دیا جائے تا کہ خون بہائے بغیر مقصود حاصل کر لیا جائے۔ اس اسلوب کو عملاً وفعلاً اختیار کر کے آپ ﷺ نے مطلوبہ نتائج حاصل کر لیے اور اپنے ارادوں میں کامیاب رہے۔ نبی مکرم ﷺ اپنے بالمقابل لڑنے والے کے خیالات کا جنگ سے پہلے اچھی طرح جائزہ لے لیتے تھے۔ جنگ سے پہلے جنگ کا یہ بہترین اصول ہے۔ اس کی اہمیت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ زمانہ نبوی کے بعد جنگی قوانین مرتب کرنے والے کیڈٹ کالجز میں جنگی اعتبار سے اس پہلو کو بڑا اہم گردانا جاتا ہے اور اس کا بڑا اہتمام کیا جاتا ہے۔[3]

[1] فقه السيرة النبوية للبوطي، ص:275. [2] الطبقات لابن سعد:135/2. [3] العبقرية العسكرية وغزوات الرسول للواء محمد فرج، ص:565.

باب 2

مکہ مکرمہ میں داخلے اور فتح کی منصوبہ بندی

قائدین صحابہ میں اہم امور کی تقسیم

ذی طویٰ پہنچ کر رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام میں ذمہ داریاں تقسیم فرمائیں۔[1]

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو میمنہ پر رکھا۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو میسرہ پر مقرر فرمایا۔ اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو پیادوں پر مقرر کیا اور یہ سب بطن وادی سے مکہ میں داخل ہونے کے لیے تیار تھے۔ نبی ﷺ نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: «يَا أَبَا هُرَيْرَةَ! أُدْعُ لِي الْأَنْصَارَ» ''ابوہریرہ! انصار کو میرے پاس بلاؤ۔'' انصار بھاگتے ہوئے آئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «يَا مَعْشَرَ الْأَنْصَارِ! هَلْ تَرَوْنَ أَوْبَاشَ قُرَيْشٍ؟!» ''اے خاندانِ انصار! کیا تم قریش کے اوباشوں کو دیکھ رہے ہو؟'' عرض کیا: ''جی۔'' فرمایا: «انْظُرُوا إِذَا لَقِيتُمُوهُمْ غَدًا أَنْ تَحْصُدُوهُمْ حَصْدًا» ''کل جب ان سے مڈبھیڑ ہو تو انھیں کاٹ کر رکھ دو۔'' اور آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے اشارہ فرمایا۔ اپنا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھا اور فرمایا: «مَوْعِدُكُمُ الصَّفَا» ''تم مجھے صفا پہاڑ پر ملنا۔''[2]

رسول اللہ ﷺ نے حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کو مہاجرین اور ان کے شاہسواروں پر مقرر کر کے بھیجا اور فرمایا کہ مکہ مکرمہ کے بالائی حصے، یعنی کداء سے داخل ہوں اور حجون میں رسول اللہ ﷺ کا جھنڈا گاڑ کر آپ ﷺ کی آمد تک وہیں رہیں۔ حضرت خالد بن

(1) من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 389. (2) صحيح مسلم، حديث: (86)-1780.

ولید رضی اللہ عنہ کو قضاعہ اور سلیم وغیرہ کے قبائل پر مقرر کر کے بھیجا اور انھیں حکم دیا کہ مکہ کے زیریں حصے سے داخل ہوں اور گھروں کے بالکل قریب جھنڈا گاڑ دیں۔ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو انصار کے ایک گروہ کے ہمراہ آگے آگے روانہ فرمایا اور انھیں حکم دیا کہ اپنے ہاتھ روک کر رکھیں۔ صرف اس سے لڑائی کریں جو خود قتال کرے۔ ●

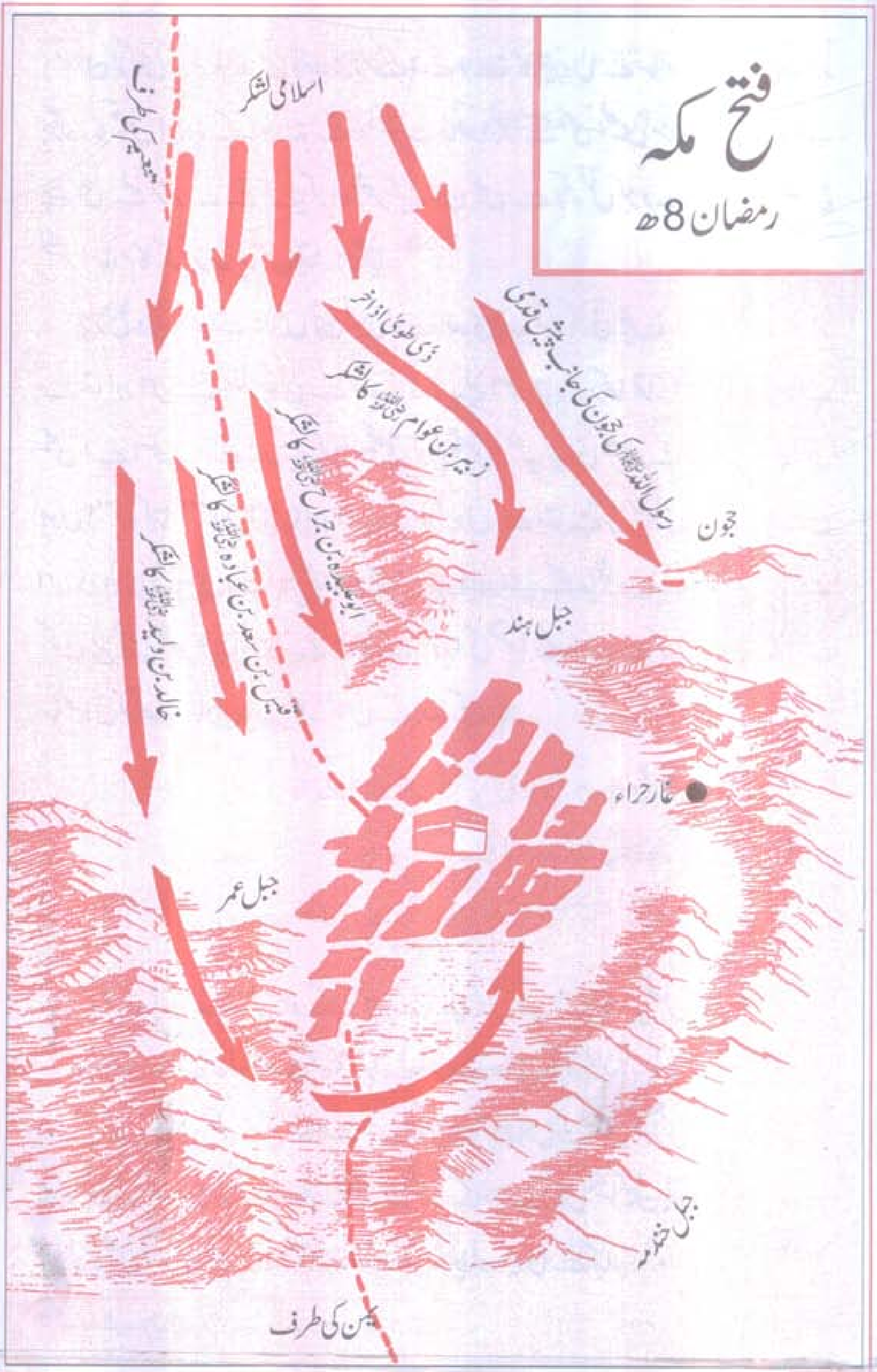
اس طرح تمام افراد کی ذمہ داریاں مقرر ہو گئیں۔ ہر کسی نے اپنی ذمہ داری جان لی اور جس رستے سے جانا ہے وہ بھی معلوم کر لیا۔ ●

مسلمان لشکر بیک وقت مکہ مکرمہ کے چاروں اطراف سے داخل ہو گیا۔ اسلامی افواج کے سامنے کوئی نہ آیا۔ چاروں اطراف سے بیک وقت اسلامی لشکر کا داخل ہونا، مشرکین گروہوں کے لیے ضرب کاری کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ ایک جگہ اکٹھے ہو ہی نہ سکے اور مقابلے کا وقت نکل گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پر حکمت جنگی تدبیر تھی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت اپنائی جب جنگی تیاری اور کثرتِ تعداد کی بنا پر دشمن سے زیادہ قوی تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ منصوبہ کامیاب رہا، چنانچہ مشرکین میں نہ مقابلے کی طاقت تھی اور نہ وہ ام القریٰ کی طرف رواں دواں اس لشکر کے سامنے ٹھہر سکے۔ تمام سپہ سالاروں نے سونپے گئے علاقے کو امن و سلامتی سے زیر نگین کر لیا۔ سوائے اس علاقے کے جدھر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ گئے تھے۔ ●

اس جانب قریش کے کچھ سر پھرے اکٹھے ہو گئے۔ ان میں صفوان بن امیہ، عکرمہ بن ابو جہل اور سہیل بن عمرو وغیرہ تھے۔ ان کے ساتھ کچھ حلیف بھی تھے۔ یہ تمام لوگ "خندمہ" ● میں جمع تھے۔

● من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 390. ● من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 390.
● صور وعبر من الجهاد النبوي في المدينة للدكتور فوزي فيض الله، ص: 397. ● **خندمہ:** یہ مکہ کے مشرقی جانب ایک پہاڑی سلسلہ ہے جو اُبوقبیس سے متصل ہے اور اس کا آخری شمال مشرقی حصہ سبیل الخضراء کہلاتا ہے۔ [معجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية، ص: 110]


فتح مکہ
رمضان 8ھ
اسلامی لشکر
رسول اللہ ﷺ کی حجون کی جانب پیش قدمی
زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کا لشکر
ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کا لشکر
قیس بن سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کا لشکر
خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا لشکر
حجون
جبل ہند
غار حراء
جبل عمر
جبل خندمہ
یمن کی طرف

ان لوگوں نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے اگلے دستے کا تیروں کے ساتھ استقبال کیا۔ اور جنگ کا مکمل ارادہ کیے ہوئے تھے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے بھی انھیں مٹا ڈالنے کا حکم دیا۔ چند ہی لمحے گزرے تھے کہ یہ گروہ بکھر گیا۔ ان میں سے کچھ قتل کر دیے گئے۔ اس طرح لشکر اسلام کا مکہ مکرمہ پر مکمل قبضہ ہو گیا۔[1]

تاریخ وسیر کی کتب حماس بن قیس بن خالد کا قصہ ذکر کرتی ہیں۔ یہ شخص قبیلہ بنو بکر سے تھا اور اس نے مسلمانوں سے لڑنے کے لیے اسلحہ تیار کر رکھا تھا۔ اس کی بیوی جب بھی اسے اسلحہ درست اور تیار کرتا دیکھتی تو پوچھتی: ''یہ تیاری کیسی ہے جو میں دیکھ رہی ہوں؟'' وہ کہتا: ''محمد (ﷺ) اور اس کے ساتھیوں سے مقابلے کی تیاری ہے۔'' ایک دن اس کی بیوی نے اس سے کہا: ''بخدا! محمد (ﷺ) اور اس کے ساتھیوں کے مقابل آج تک کوئی چیز نہیں ٹھہر سکی۔'' اس نے جواباً کہا: ''خدا کی قسم! مجھے امید ہے کہ میں ان کے بعض ساتھیوں کو تمھارا خادم بناؤں گا۔'' اس کے بعد کہنے لگا:

إِنْ يُّقْبِلُوا الْيَوْمَ فَمَالِي عِلَّةٌ
هٰذَا سِلَاحٌ كَامِلٌ وَّأَلَّةٌ
وَذُو غِرَارَيْنِ سَرِيعُ السَّلَّةِ

''اگر وہ آج مد مقابل ہو گئے تو میرے لیے کوئی عذر نہ ہو گا، یہ مکمل ہتھیار ہیں: دراز اَنّی والا نیزہ اور جھٹ سونتی جانے والی دو دھاری تلوار۔''

فتح مکہ کے دن عکرمہ کی جماعت میں شامل ہو کر حماس نے بھی تھوڑی دیر مقابلہ کیا مگر پھر دیکھا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے لشکر کے مقابلے میں مشرکین بھاگتے نظر آ رہے ہیں تو یہ بھی شکست کھا کر بھاگتا ہوا اپنے گھر پہنچا اور بیوی سے کہا: ''دروازہ بند کر دو۔''

[1] قيادة الرسول ﷺ لأحمد راتب، ص: 123,122.

تو بیوی نے اپنے شاہسوار خاوند سے دریافت کیا: ''بہادر! وہ تمھارا دعویٰ کہاں گیا جو تم کیا کرتے تھے؟'' تو اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا:

إِنَّكِ لَوْ شَهِدْتِّ يَوْمَ الْخَنْدَمَةْ
إِذْ فَرَّ صَفْوَانُ وَفَرَّ عِكْرِمَةْ

''اگر تو خندمہ کی جنگ خود دیکھ لیتی، جب صفوان بھاگ کھڑا ہوا اور عکرمہ بھی بھاگ نکلا۔''

أَبُو يَزِيدَ قَائِمٌ كَالْمُؤْتَمَهْ
وَاسْتَقْبَلَتْهُمْ بِالسُّيُوفِ الْمُسْلِمَهْ

''ابو یزید! ستون بن کر کھڑا رہ گیا اور ان سب کا استقبال مسلم تلواروں نے کیا۔''

يَقْطَعْنَ كُلَّ سَاعِدٍ وَّجُمْجُمَهْ
ضَرْبًا فَلَا يُسْمَعُ إِلَّا غَمْغَمَهْ

''تلواریں ہر کلائی اور ہر کھوپڑی پر پڑ کر اسے کاٹ رہی تھیں اور بجز ملی ہوئی آوازوں کے کچھ سنائی نہ دے رہا تھا۔''

لَهُمْ نَهِيتٌ خَلْفَنَا وَهَمْهَمَهْ
لَا تَنْطِقِي فِي اللَّوْمِ أَدْنَى كَلِمَهْ

''ہمارے پیچھے ان کی دھاڑیں اور سینے سے اٹھنے والا غصہ ابلتا ہی سنائی دے رہا تھا، لہٰذا تو اپنی زبان سے ملامت کا ادنی کلمہ بھی نہ بول۔''[1]

رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ میں اسلامی لشکر کے داخل ہونے سے تھوڑی دیر پہلے کرفیو کا اعلان کروایا تا کہ آپ ﷺ مکہ مکرمہ کی فتح کے معاملے کو الجھاؤ کے بغیر کم از کم خون بہا

1 البداية والنهاية: 4/295.

کر مکمل کرسکیں۔ آپ ﷺ کا واضح اعلان تھا:

«مَنْ دَخَلَ دَارَ أَبِي سُفْيَانَ فَهُوَ آمِنٌ، وَمَنْ أَغْلَقَ بَابَهُ فَهُوَ آمِنٌ، وَمَنْ دَخَلَ الْمَسْجِدَ فَهُوَ آمِنٌ»

''جو ابوسفیان کے ڈیرے میں داخل ہو جائے اسے امان ہے۔ جو اپنا دروازہ اندر سے بند کر لے اسے امان ہے اور جو مسجد حرام میں داخل ہو جائے اسے بھی امان ہے۔''

رسول اللہ ﷺ نے ابوسفیان کی حویلی کو اہمیت دی تا کہ اس طرح وہ اہل مکہ کو پرسکون رہنے اور اطاعت اختیار کرنے پر قانع کرنے میں آپ ﷺ کا معاون ثابت ہو۔ اور ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو پر امن طریقے سے بغیر کشت وخون کیے مکہ مکرمہ کی فتح کا راستہ ہموار کرنے کے لیے کنجی بنایا جا سکے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ فخر و سرداری پسند کرنے والے کو بھی سامان فراہم کیا جائے تا کہ اس طرح اس کے دل میں ایمان پختہ ہو جائے۔[1]

ابوسفیان رضی اللہ عنہ نہایت تیزی سے مکہ پہنچے اور بلند آواز سے پکارنے لگے:

''اے قریش کے لوگو! یہ محمد ﷺ ہیں، تمھارے پاس اتنا بڑا لشکر لائے ہیں کہ تم میں مقابلے کی تاب نہیں، لہٰذا جو ابوسفیان کے ڈیرے میں داخل ہو جائے اسے امان ہے۔''

اتنے میں ہند بنت عتبہ اٹھی اور اپنے خاوند ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی مونچھ پکڑ کر بولی: ''مار ڈالو اس مشک کی طرح چربی سے بھرے پتلی پنڈلیوں والے کو۔ برا ہو ایسے پیشرو خبر رساں کا۔'' ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے کہا: ''تمھاری بربادی ہو! دیکھو تمھاری جانوں کے بارے میں یہ عورت تمھیں دھوکے میں نہ ڈال دے کیونکہ محمد ﷺ ایسا لشکر لائے ہیں جس سے مقابلے کی تاب نہیں، اس لیے جو ابوسفیان کے ڈیرے میں گھس جائے اسے امان ہے۔'' لوگوں نے کہا: ''اللہ تجھے مارے! تیرا ڈیرہ ہمارے کتنے آدمیوں کے کام آ سکتا ہے؟'' ابوسفیان رضی اللہ عنہ

[1] دراسات في السيرة النبوية للدكتور عماد الدين خليل، ص:245.

نے کہا: ''اور جو اپنا دروازہ اندر سے بند کر لے، اسے بھی امان ہے۔ اور جو مسجدِ حرام میں داخل ہو جائے اسے بھی امان ہے۔'' لہٰذا (یہ سن کر) لوگ اپنے اپنے گھروں اور مسجد حرام کی طرف بھاگے۔[1]

رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو مکہ کی بالائی جانب ''کداء'' سے مکہ میں اترنے کا کہا۔ آپ ﷺ نے پسند فرمایا کہ آج اس مقام ''کداء'' سے مکہ میں داخل ہوں جس کا تذکرہ حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے اپنے قصائد میں قریش کی ہجو کرتے ہوئے کیا تھا۔ ان کا یہ قصیدہ بڑا ہی عمدہ اور دلکش سمجھا جاتا ہے۔ اس قصیدے کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے ؎

عَدِمْنَا خَيْلَنَا إِنْ لَّمْ تَرَوْهَا
تُثِيرُ النَّقْعَ مَوْعِدُهَا كَدَاءُ

''ہمارے شہسوار یہاں نظر نہیں آ رہے اگر تم نے بھی انھیں نہیں دیکھا تو وہ غبار اڑا رہے ہوں گے، اب وہ ''کداء'' مقام میں ملیں گے۔''[2]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی درج ذیل روایت بھی دلالت کرتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ چاہتے تھے کہ کداء ہی سے داخل ہوں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: عام الفتح کے موقع پر جب رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ عورتیں گھوڑوں کے چہروں پر اپنے دوپٹے مار رہی ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: «يَا أَبَا بَكْرٍ! كَيْفَ قَالَ حَسَّانُ؟» ''اے ابوبکر! حسان رضی اللہ عنہ نے اس موقع کے متعلق کیا کہا تھا؟'' تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت حسان رضی اللہ عنہ کا یہ شعر پڑھا:

تَظَلُّ جِيَادُنَا مُتَمَطِّرَاتٍ
تُلَطِّمُهُنَّ بِالْخُمُرِ النِّسَاءُ

---

1 البداية والنهاية:290/4. 2 البداية والنهاية:309/4.

"ہمارے عمدہ گھوڑے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں ہوں گے تو ان کے چہروں پر عورتیں دوپٹے مار رہی ہوں گی۔"[1]

فتح مکہ کے وقت تواضع اور انکسار کا عالم

فتح مکہ کے دن رسول اللہ ﷺ بلا احرام مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔ آپ ﷺ کے سر مبارک پر سیاہ عمامہ تھا۔[2]

جب دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے فتح سے نوازا ہے تو سر مبارک تواضع سے اللہ تعالیٰ کے سامنے اس قدر جھکا ہوا تھا کہ ریش مبارک کجاوے سے لگ رہی تھی۔[3] آپ ﷺ اس وقت سورۂ فتح کی تلاوت فرما رہے تھے۔[4]

رسول اللہ ﷺ اس وقت فتح مکہ، گناہوں کی بخشش اور بلند پایہ فتح و نصرت کی نعمت کے احساس سے معمور تھے۔[5]

رسول اللہ ﷺ جزیرۃ العرب کے دل اور اس کے سیاسی و روحانی مرکز مکہ مکرمہ میں جب فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے تو عدل و انصاف اور تواضع و انکسار کا ہر شعار اپنائے رکھا، چنانچہ اپنی سواری پر پیچھے اپنے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کے صاحبزادے اسامہ رضی اللہ عنہ کو سوار فرمایا۔[6] حالانکہ قریش کے رؤسا یا بنو ہاشم کے بیٹوں میں سے بہت سے افراد موجود تھے مگر آپ نے ان میں سے کسی کو اس موقع پر اپنے پیچھے سوار نہیں کیا۔[7]

رسول اللہ ﷺ جمعۃ المبارک، 20 رمضان 8ھ کی صبح مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔[8]

---

1 المغازي للواقدي: 831/2. 2 صحيح مسلم، حديث: 1358، وسنن أبي داود، حديث: 4076، وجامع الترمذي، حديث: 1735، والسنن الكبرىٰ للنسائي: 201/5، وسنن ابن ماجه، حديث: 2822، ومسند أحمد: 363/1. 3 دلائل النبوة للبيهقي: 68/5، والمستدرك للحاكم: 47/3، ومسند أبي يعلىٰ، رقم: 3393، ومجمع الزوائد للهيثمي: 169/6. 4 صحيح مسلم، حديث: (238)-794. 5 صوروعبرمن الجهاد النبوى للدكتور فوزي فيض الله، ص: 396. 6 صحيح البخاري، حديث: 4289. 7 السيرة النبوية للندوي، ص: 337. 8 السيرة النبوية للندوي، ص: 337.

محمد الغزالی، نبی مکرم ﷺ کے دخولِ مکہ کی منظر کشی کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''جب ایک عظیم لشکر رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھا اور آپ ﷺ سیاہ عمامے کا تاج سجائے اپنی اونٹنی پر بیٹھے اللہ تعالیٰ کے سامنے اظہار عاجزی کے طور پر سر مبارک جھکائے ہوئے تھے۔ لشکر آہستہ آہستہ حرم مکی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ زرہ پوش لشکر جو چاند کے ''ہالے'' کی طرح آپ کے ارد گرد تھا اور آپ کے ایک اشارے کا منتظر تھا۔ یہ فتح مبین آپ ﷺ کو عمر رفتہ کی کہانی بھی یاد کرا رہی تھی۔ مشرکین مکہ کا ستایا حق کا ایک عظیم داعی قوت اور سچائی کے ساتھ واپس آ رہا تھا۔ اللہ کا یہ عظیم احسان یاد آیا تو رسول اللہ ﷺ کا سر فرطِ عقیدت سے اللہ کے حضور جھکتا ہی چلا گیا۔[1]

بایں ہمہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن پوری کوشش فرمائی کہ مکہ میں امن و امان بحال رہے، چنانچہ جب آپ ﷺ کو حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی ابوسفیان سے کہی یہ بات پہنچی کہ آج کا دن کشت وخون کا دن ہے، آج کعبۃ اللہ کی حرمت حلال سمجھی جائے گی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«هٰذَا يَوْمٌ يُّعَظِّمُ اللّٰهُ فِيهِ الْكَعْبَةَ، وَيَوْمٌ تُكْسٰى فِيهِ الْكَعْبَةُ»

''(ایسا ہرگز نہیں ہوگا) بلکہ آج تو اللہ تعالیٰ کعبے کی عظمت کو بڑھائیں گے اور آج کعبے کو غلاف اوڑھایا جائے گا۔''[2]

بعد ازاں رسول اللہ ﷺ نے سعد رضی اللہ عنہ سے جھنڈا لے کر ان کے بیٹے قیس بن سعد رضی اللہ عنہما کو دے دیا۔ یوں آپ ﷺ نے ایک ایسا فیصلہ فرمایا جس سے نہ تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو ناراضگی ہوئی اور نہ انصار کو۔ رسول اللہ ﷺ نے جھنڈا کسی مہاجر کے سپرد نہیں فرمایا بلکہ انصاری سے لیا اور اسی کے بیٹے کو دے دیا۔ اور یہ انسانی فطرت اور کمزوری ہے کہ وہ

---

1 فقه السيرة للغزالي، ص:380,379. 2 صحيح البخاري، حديث: 4280، ودلائل النبوة للبيهقي:38/5، وتاريخ الطبري: 118/3.

صرف اپنے بیٹے کو خود سے افضل و بہتر جان سکتا ہے اور کسی کو نہیں۔[1]

رسول اللہ ﷺ جب مکہ میں تشریف فرما ہو چکے اور لوگ آرام سے ٹھہر گئے تو آپ ﷺ بیت اللہ تشریف لے گئے اور طواف کیا۔ بحالتِ طواف آپ ﷺ کے ہاتھ میں چھڑی یا کمان تھی۔ بیت اللہ کے ارد گرد اور اس کی چھت پر تین سو ساٹھ بت تھے۔ آپ ﷺ اس کمان یا چھڑی سے ان بتوں کو مارتے جاتے اور کہتے جاتے تھے:

﴿جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبٰطِلُ ۚ اِنَّ الْبٰطِلَ كَانَ زَهُوْقًا﴾

"حق آ گیا اور باطل مٹ گیا۔ یقیناً باطل ہے ہی مٹنے والا۔"[2]

﴿جَآءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبٰطِلُ وَمَا يُعِيْدُ﴾

"حق آ گیا اور باطل نہ تو پہلے کچھ کر سکا اور نہ کر سکے گا۔"[3]

اور آپ ﷺ کی ضرب سے بت چہروں کے بل گرتے جاتے تھے۔[4]

اللہ تبارک و تعالیٰ کی جانب سے اپنے رسول ﷺ کی مدد و تائید کا یہ بڑا ہی خوش کن منظر تھا۔[5]

رسول اللہ ﷺ نے کعبے کے اندر بنی ہوئی تصویروں کو بھی مٹانے کا حکم صادر فرمایا، جو فوراً مٹا دی گئیں۔[6]

تصاویر کے ہوتے ہوئے آپ ﷺ کعبے میں داخل نہ ہوئے۔ بیت اللہ میں کچھ ایسی تصاویر بھی تھیں جن کے متعلق لوگ سمجھتے تھے کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی تصاویر ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں قسمت معلوم کرنے کے تیر تھے۔ آپ ﷺ نے (دیکھ کر) فرمایا:

---

[1] قيادة الرسول ﷺ لأحمد راتب، ص: 196. [2] بني إسرائيل 81:17. [3] سبا 49:34. [4] السيرة النبوية للندوي، ص: 339. [5] فقه السيرة للبوطي، ص: 282. [6] السيرة النبوية للندوي، ص: 339.

«قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ لَقَدْ عَلِمُوا مَا اسْتَقْسَمَا بِهَا قَطُّ»

''اللہ تعالیٰ انھیں ہلاک کرے یہ خوب جانتے ہیں کہ ان دونوں پیغمبروں نے کبھی قسمت کے تیر استعمال نہیں کیے۔''[1]

پھر رسول اللہ ﷺ بیت اللہ میں داخل ہوئے، اس میں توحید کے کلمات کہے، پھر نماز ادا کی۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما، بلال رضی اللہ عنہ اور عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ کعبے میں داخل ہوئے۔ دروازہ بند کر لیا اور کچھ دیر اندر ٹھہرے رہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جب باہر نکلے تو میں نے بلال رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا: ''رسول اللہ ﷺ نے کیا کیا؟'' انھوں نے بتایا: ''آپ ﷺ اس طرح کھڑے ہوئے کہ دو ستون آپ کی بائیں جانب ایک دائیں جانب اور تین پیچھے تھے۔ ان دنوں کعبے کے چھ ستون تھے پھر آپ ﷺ نے نماز پڑھی۔''[2]

قبول اسلام سے قبل کعبہ کی کنجی عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ کے پاس تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پانی پلانے کے اعزاز کے ساتھ ساتھ کلید برداری کا اعزاز بھی حاصل کرنے کی خواہش کی لیکن رسول اللہ ﷺ نے کعبے سے نکلتے ہوئے چابی سیدنا عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ کو واپس کرتے ہوئے فرمایا:

«اَلْيَوْمُ يَوْمُ بِرٍّ وَّوَفَاءٍ»

''آج نیکی اور ایفائے عہد کا دن ہے۔''

رسول اللہ ﷺ نے ہجرت سے پہلے عثمان بن طلحہ سے کعبے کی چابی مانگی تو اس نے جواب

1 صحيح البخاري، حديث: 4288، ومسند أحمد: 365/1. 2 صحيح البخاري، حديث: 505، وصحيح مسلم، حديث: [3230]-1329، وسنن أبي داود، حديث: 2023، والسنن الكبرىٰ للنسائي: 63/2.

میں برا بھلا کہا اور نہایت غلیظ زبان استعمال کی تھی۔ آپ ﷺ نے بردباری سے کام لیا اور فرمایا:

«يَا عُثْمَانُ! لَعَلَّكَ تَرَىٰ هٰذَا الْمِفْتَاحَ يَوْماً بِيَدِي أَضَعُهُ حَيْثُ شِئْتُ»

''اے عثمان! امید ہے کہ یہ چابی کسی نہ کسی دن میرے ہاتھ میں آئے گی اور میں اسے اپنی مرضی سے جسے چاہوں گا دوں گا۔''

عثمان نے جواب دیا تھا: ''اگر ایسا وقت آیا تو وہ قریش کی ہلاکت اور ذلت کا وقت ہوگا۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: «بَلْ عَمَرَتْ وَعَزَّتْ يَوْمَئِذٍ» ''ایسا نہیں! بلکہ اسی وقت تو قریش کی آبادکاری اور عزت وتکریم ہوگی۔''

وہ پرانی گفتگو آج حقیقت کا روپ دھار رہی تھی اور عثمان بن طلحہ یہی سوچ رہا تھا کہ جو کچھ ماضی میں آپ ﷺ نے کہا تھا وہ حرف بحرف پورا ہو رہا ہے۔[1]

بعدازاں رسول اللہ ﷺ نے اسے یہ کہتے ہوئے چابی واپس کر دی: «هَاكَ مِفْتَاحُكَ يَا عُثْمَانُ! اَلْيَوْمُ يَوْمُ بِرٍّ وَّوَفَاءٍ خُذُوهَا خَالِدَةً، تَالِدَةً، لَايَنْزِعُهَا مِنْكُمْ إِلَّا ظَالِمٌ» ''عثمان! اپنی چابی سنبھالو آج نیکی اور ایفائے عہد کا دن ہے۔ یہ چابی ہمیشہ کے لیے لے لو۔ تم سے صرف ظالم ہی اسے چھینے گا۔''[2]

نبی مکرم ﷺ نے حضرت بلال کو کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان کہنے کا حکم دیا۔ اہل مکہ اس نئی آواز کو خاموشی سے سن رہے تھے، گویا وہ محوِ خواب تھے۔ فضا میں گونجتے ہوئے یہ کلمات شیاطین کے دلوں پر رعب و دبدبے کے ہتھوڑے برسا رہے تھے۔

اللہ اکبر، اللہ اکبر کی بارعب آواز کے آگے آج ان کے لیے دو ہی راستے تھے: پیٹھ

---

[1] المغازي للواقدي: 838/2. [2] المغازي للواقدي: 838/2، والمعجم الكبير للطبراني، رقم: 8395، والمصنف لعبدالرزاق: 84,83/5، ومجمع الزوائد للهيثمي: 177/6، والسيرة النبوية لابن هشام: 62,61/4، سند ضعیف ہے۔

پھیر کر بھاگ جائیں یا ایمان قبول کرلیں۔[1]

وہی سزا و عذاب کے کوڑوں تلے اَحد اَحد کی سنائی دینے والی دھیمی سی آواز آج کعبے کے اوپر «لا إله إلا الله محمد رسول الله» کے نغمے سے گونج رہی ہے اور ہر کوئی خاموش، ہمہ تن گوش اور سر جھکائے ہوئے ہے۔[2]

عام معافی کا اعلان

اہل مکہ نے رسول اللہ ﷺ اور آپ کی دعوت کو طرح طرح کی تکالیف اور رکاوٹوں سے دو چار کر رکھا تھا۔ اب اسلامی لشکر انھیں نیست و نابود کرنے کی مکمل طاقت رکھتا ہے، اس کے باوجود آپ ﷺ نے عام معافی کا اعلان کر دیا۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: «مَاتَظُنُّونَ أَنِّي فَاعِلٌ بِكُمْ؟» ''تمھارا کیا خیال ہے کہ میں تمھارے ساتھ کیسا سلوک کرنے والا ہوں؟'' انھوں نے جواباً عرض کیا: ''اچھے سلوک کی امید رکھتے ہیں۔ آپ قابلِ قدر بھائی ہیں اور قابلِ قدر بھائی کے صاحبزادے ہیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَاتَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ»

''آج تم پر کوئی سرزنش نہیں۔''[3]

عام معافی کا یہ فائدہ ہوا کہ لوگوں کی جانیں قتل یا قید ہونے سے محفوظ ہوگئیں۔ منقولہ اور غیر منقولہ اموال مالکوں کے پاس رہے۔ ان پر خراج بھی مقرر نہ کیا گیا۔ اس طرح ان کے ساتھ دیگر مفتوحہ علاقوں جیسا سلوک نہ ہوا۔ یہ سب مکہ مکرمہ کی حرمت اور پاکیزگی کے لیے کیا گیا۔ یہ پارسا لوگوں کا مسکن اور پروردگار کا حرم ہے۔ اس لیے جمہور ائمہ سلف و خلف کا خیال ہے کہ مکہ مکرمہ کی اراضی فروخت کرنا یا کرایہ و اجرت پر دینا صحیح نہیں ہے

1 فقه السيرة للغزالي، ص: 383. 2 فقه السيرة للبوطي، ص: 269. 3 دلائل النبوة للبيهقي: 58/5، والسنن الكبرىٰ للبيهقي: 118/9، والطبقات لابن سعد: 142,141/2، والمجتمع المدني للعمري، ص: 179.

بلکہ یہاں جو پہلے آئے اس کی جگہ ہوگی۔ اہل مکہ ضرورت کے مطابق گھروں میں رہ سکتے ہیں اور جو گھر ان کی ضرورت سے زائد ہوگا وہ حاجیوں، عمرہ کرنے والوں اور عبادت کی غرض سے یہاں آنے والوں کی اقامت گاہ بنے گا، جبکہ بعض علماء کا خیال ہے کہ مکہ مکرمہ کی زمین فروخت کی جا سکتی ہے اور اس کے گھر کرایہ پر دیے جا سکتے ہیں اور دلائل کے اعتبار سے یہی رائے قوی ہے، جبکہ اس کے مخالف رائے والوں کے تمام دلائل یا تو مرسل روایات پر مشتمل ہیں یا موقوف روایات پر۔[1]

بعض افراد کو قتل کرنے کا حکم

قیادت جن صفات سے متصف ہونی چاہیے ان کے تقاضے پورے کرتے ہوئے مکہ میں احتیاط کا دامن بھی نہیں چھوڑا گیا، اسی لیے عام معافی سے دس سے کچھ زیادہ افراد کو مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ وہ افراد خواہ کعبے کے پردے سے بھی چمٹے نظر آئیں تو انھیں قتل کر دیا جائے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے اللہ تعالیٰ، رسول مقبول ﷺ اور اسلام سے متعلق جرائم بہت بڑے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے متعلق یہ ڈر اور اندیشہ بھی تھا کہ فتح کے بعد لوگوں میں فتنہ پھیلائیں گے۔[2]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں بیان کرتے ہیں: ”ان افراد کے نام درج ذیل ہیں جو الگ الگ روایات سے لیے گئے ہیں: عبدالعزیٰ بن خطل، عبداللہ بن سعد بن ابی سرح، عکرمہ بن ابوجہل، حویرث بن نُقید، مقیس بن صبابہ، ہبّار بن اسود، فرتنیٰ اور قُریبہ (ابن خطل کی یہ دونوں لونڈیاں گا گا کر نبی مکرم ﷺ کی ہجو کرتی تھیں) بنوعبدالمطلب کی آزاد کردہ لونڈی سارہ۔ اسی طرح ابومعشر نے ان میں حارث بن طلاطل خزاعی کا نام اور حاکم نے کعب بن زہیر، وحشی بن حرب اور ہند بنت عتبہ کے نام بھی شامل کیے ہیں۔“[3]

---

1 المجتمع المدني للعمري، ص: 180. 2 السيرة النبوية لأبي شهبة: 451/2، وتأملات في السيرة، ص: 262. 3 فتح الباري، شرح الحديث: 4280.

ان میں سے کچھ لوگوں کو قتل کر دیا گیا اور کچھ نے اسلام قبول کر کے توبہ کر لی تو رسول اللہ ﷺ نے انھیں معاف فرما دیا اور ان کے اسلام کی کیفیت اچھی رہی۔[1]

نبی مکرم ﷺ کا خطبہ اور اہل مکہ کا قبولِ اسلام

فتح کی صبح نبی مکرم ﷺ کو یہ بات پہنچی کہ آپ ﷺ کے حلفاء خزاعہ نے ہذیل کے ایک شخص پر، جو مشرک تھا، حملہ کر کے اسے قتل کر دیا ہے۔ یہ جاہلیت کے ایک مقتول کا بدلہ تھا۔ آپ ﷺ بہت ناراض ہوئے، پھر لوگوں میں کھڑے ہو کر یہ خطبہ ارشاد فرمایا:

«يَا أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَرَّمَ مَكَّةَ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوَاتِ، وَالْأَرْضَ، فَهِيَ بِحُرْمَةِ اللّٰهِ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ، فَلَا يَحِلُّ لِامْرِئٍ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ يَّسْفِكَ فِيهَا دَماً، وَّلَا يَعْضِدَ- يَقْطَعَ- فِيهَا شَجَراً، لَمْ تَحِلَّ لِأَحَدٍ كَانَ قَبْلِي، وَلَا تَحِلُّ لِأَحَدٍ يَّكُونُ بَعْدِي، وَلَمْ تَحِلَّ لِي إِلَّا هٰذِهِ السَّاعَةَ غَضَباً عَلٰى أَهْلِهَا، ثُمَّ قَدْ رَجَعَتْ كَحُرْمَتِهَا بِالْأَمْسِ، فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ مِنْكُمُ الْغَائِبَ، فَمَنْ قَالَ لَكُمْ: إِنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَدْ قَاتَلَ فِيهَا، فَقُولُوا: إِنَّ اللّٰهَ قَدْ أَحَلَّهَا لِرَسُولِهِ، وَلَمْ يُحِلَّهَا لَكُمْ، يَا مَعْشَرَ خُزَاعَةَ! اِرْفَعُوا أَيْدِيَكُمْ عَنِ الْقَتْلِ، فَلَقَدْ كَثُرَ الْقَتْلُ أَنْ يَّقَعَ، لَقَدْ قَتَلْتُمْ قَتِيلًا لَأَدِيَنَّهُ، فَمَنْ قُتِلَ بَعْدَ مَقَامِي هٰذَا، فَأَهْلُهُ بِخَيْرِ النَّظَرَيْنِ، إِنْ شَاؤُوا فَدَمُ قَاتِلِهِ، وَإِنْ شَاؤُوا فَعَقْلُهُ»

’’اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے جس دن زمین و آسمان پیدا کیے، اس دن سے مکہ کو

1 السيرة النبوية لأبي شهبة: 451/2.

حرمت والی جگہ قرار دیا۔ پس وہ اس وقت سے برابر حرمت کی جگہ چلا آ رہا ہے اور قیامت تک اسی طرح محترم رہے گا، لہٰذا کسی بھی ایسے آدمی کے لیے جو اللہ تعالیٰ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے، یہ بات جائز نہیں کہ مکہ میں کسی کا خون بہائے یا یہاں کا کوئی درخت کاٹے۔ یہ مجھ سے پہلے کسی بھی شخص کے لیے حلال نہیں ہوا اور نہ میرے بعد کسی شخص کے لیے حلال ہو گا۔ میرے لیے بھی حلال نہیں ہوا، ہاں صرف اس وقت محض اس لیے حلال ہوا کہ اہل مکہ پر اللہ تعالیٰ کو اظہارِ غضب مقصود تھا۔ اس وقت کے بعد اس کی حرمت کل کی طرح پھر لوٹ آئی، لہٰذا تمھیں چاہیے کہ جو بھی یہاں موجود ہے وہ میری بات اسے پہنچا دے جو یہاں موجود نہیں۔ ہاں! جو تم سے یہ کہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں قتال کیا تھا اس سے کہہ دینا کہ اللہ تعالیٰ نے صرف اپنے رسول ﷺ کے لیے اسے حلال کیا تھا۔ تمھارے لیے حلال نہیں کیا۔ اے خاندانِ خزاعہ! قتل سے اپنے ہاتھ اٹھا لو۔ بہت خون ہو چکا۔ تم نے ایک آدمی کو قتل کیا۔ میں اس کی دیت ضرور دوں گا۔ میرے یہاں کھڑے ہونے کے بعد جو شخص قتل کیا گیا اس کے ورثاء کو دو چیزوں کا اختیار ہو گا۔ اگر وہ چاہیں تو قصاص لے لیں اور چاہیں تو خون بہا لے لیں۔‘‘[1]

رسول اللہ ﷺ کے تمام اہل مکہ کو معافی دینے اور کچھ ایسے لوگوں کو بھی معافی دینے کا جن کے قتل کا آپ حکم دے چکے تھے، فائدہ یہ ہوا کہ اہل مکہ خواہ مرد ہوں یا عورتیں، آزاد ہوں یا غلام یا آزاد شدہ غلام تمام تر راضی خوشی اللہ تعالیٰ کے دین میں داخل ہو گئے۔ اور ادھر مکہ مکرمہ کے اسلامی مملکت میں بدلتے ہی تمام لوگ گروہ در گروہ اسلام کی طرف چلے آئے۔ اللہ تعالیٰ کی نعمت پوری ہو گئی اور شکر الٰہی لازم ٹھہرا۔[2]

[1] سنن أبي داود، حديث: 4504، وجامع الترمذي، حديث: 1406، ودلائل النبوة للبيهقي: 84,83/5، والسيرة النبوية لأبي شهبة: 451/2. [2] السيرة النبوية لأبي شهبة: 456/2.

رسول اللہ ﷺ نے صفا پہاڑی پر بیٹھ کر تمام مردوں، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں سے بیعت لی۔ ابتدا مردوں سے کی۔ آپ ﷺ اسلام، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی بیعت لے رہے تھے۔ فتح مکہ کے بعد مجاشع بن مسعود رضی اللہ عنہ اپنے بھائی مجالد کو لے کر آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اس سے ہجرت کی بیعت لیجیے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «ذَهَبَ أَهْلُ الْهِجْرَةِ بِمَا فِيهَا» ''ہجرت کرنے والے ہجرت کے فضائل و مراتب لے چکے ہیں۔'' اس نے عرض کیا: ''تو پھر آپ کس بات کی بیعت لیں گے؟'' فرمایا: «أُبَايِعُهُ عَلَى الْإِسْلَامِ وَالْإِيمَانِ وَالْجِهَادِ» ''میں اس سے اسلام، ایمان اور جہاد کی بیعت لوں گا۔''[1]

مراد یہ ہے کہ مکہ مکرمہ سے جو ہجرت پہلے فرض تھی اب فتح مکہ کے بعد اختتام پذیر ہوئی ہے۔ اسلام غالب آچکا ہے۔ اس کی جڑیں مضبوط ہو چکی ہیں اور لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہو رہے ہیں۔ ہاں دارالکفر سے دارالاسلام کی طرف ہجرت یا ایسے علاقے سے ہجرت جس میں ایک مسلمان اپنے دین پر قائم نہیں رہ سکتا اور وہ شعائرِ اسلام کا اظہار نہیں کر سکتا، ایسی جگہ سے ہجرت کرنا قیامت تک باقی ہے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ قبل از فتح مکہ جیسی افضل ہجرت یہ نہیں ہوگی۔ کیونکہ اب کبھی تو ہجرت واجب کبھی غیر واجب ہوگی، جس طرح کہ جہاد اور فی سبیل اللہ خرچ قیامت تک باقی ہے مگر مکہ مکرمہ فتح ہونے سے پہلے جو ثواب جہاد اور انفاق فی سبیل اللہ کا تھا وہ اب میسر و ممکن نہیں ہوگا۔

ارشاد ہے:

﴿ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً

1 صحيح البخاري، حديث: 4306,4305، وصحيح مسلم، حديث: 1863، ومسند أحمد: 469/3.

مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴾

''تمھیں کیا ہو گیا ہے جو تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے؟ دراصل آسمانوں اور زمینوں کی میراث کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ تم لوگوں میں سے جنھوں نے فتح مکہ سے پہلے فی سبیل اللہ خرچ کیا اور قتال کیا ہے وہ دوسروں کے برابر نہیں بلکہ درجے میں ان سے بہت عظیم ہیں جنھوں نے فتح کے بعد انفاق فی سبیل اللہ اور جہاد کیا۔ ہاں بھلائی کا وعدہ تو اللہ تعالیٰ کا ان سب سے ہے، جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے اللہ تعالیٰ خوب باخبر ہے۔''[1]

جب رسول اللہ ﷺ مردوں کی بیعت سے فارغ ہوئے تو خواتین سے بیعت لی۔ خواتین میں ہند بنت عتبہ بھی بھیس بدل کر بیٹھی تھی۔ اسی نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش کا مثلہ کیا تھا اور اب خوف زدہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ کہیں اسے پہچان نہ لیں۔ (آپ ﷺ نے بیعت لینے کے لیے فرمایا) میں ان خواتین سے اس بات پر بیعت لیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک نہ کریں گی۔ اور چوری نہ کریں گی اور زنا نہ کریں گی اور اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی اور کوئی بہتان نہ گھڑیں گی اور کسی بھی نیک کام میں (آپ کی) نافرمانی نہ کریں گی۔''

جب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اور چوری نہ کریں گی۔'' اس پر ہند بول اٹھی: ''اے اللہ کے رسول! ابوسفیان بخیل آدمی ہے۔ مجھے اتنا نہیں دیتا جو مجھے اور میری اولاد کو کافی ہو سکے۔ اگر میں اسے بتائے بغیر اس کے مال سے کچھ لے لوں تو کوئی گناہ ہے؟'' تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «خُذِي مِنْ مَّالِهِ مَايَكْفِيكِ وَبَنِيكِ بِالْمَعْرُوفِ» ''اس کے مال سے اتنا لے لے جو تجھے اور تیرے بچوں کو معروف طریقے سے کافی ہو سکے۔'' اور جب آپ ﷺ نے فرمایا: ''اور زنا نہیں کریں گی۔'' تو ہند کہنے لگی: ''کیا آزاد عورت بھی زنا کرتی ہے؟''

[1] الحدید:10:57.

جب آپ ﷺ نے ہند کو پہچان لیا تو فرمایا: «وَإِنَّكِ لَهِنْدُ بِنْتُ عُتْبَةَ؟» ”ہو نہ ہو تو ہند بنت عتبہ ہے؟“ وہ بولی: ”جی ہاں، اے اللہ کے رسول! جو کچھ گزر چکا ہے اسے معاف فرما دیجیے، اللہ تعالیٰ آپ کو معاف فرمائے۔“

عورتوں نے رسول اللہ ﷺ سے بغیر ہاتھ ملائے بیعت کی۔ آپ ﷺ عورتوں سے کبھی ہاتھ نہ ملاتے تھے اور نہ کبھی عورت کو ہاتھ لگاتے سوائے اس عورت کے جسے اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے حلال کر دیا ہے یا آپ ﷺ کی محرم خواتین ہیں۔ صحیحین میں حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے وہ کہتی ہیں: ”ہرگز نہیں، اللہ کی قسم! کبھی بھی رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ نے کسی عورت کے ہاتھ کو نہیں چھوا۔“[1]

اور ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ عورتوں سے زبانی کلامی ہی بیعت کرتے تھے۔ اور فرماتے:

«إِنَّمَا قَوْلِي لِامْرَأَةٍ وَّاحِدَةٍ كَقَوْلِي لِمِائَةِ امْرَأَةٍ»

”میرا ایک عورت کو (بیعت کے لیے) کہنا ایک سو عورت کو کہنے کی طرح ہے۔“[2]

بنو جذیمہ کی طرف حضرت خالد بن ولید ؓ کی روانگی

رسول اللہ ﷺ نے حضرت خالد ؓ کو تبلیغِ اسلام کے لیے بنو جذیمہ کی جانب روانہ فرمایا۔ انھیں شوال 8 ھ کو جنگ حنین سے پہلے بنو سلیم، مدلج اور کچھ انصار اور مہاجرین کے ہمراہ بھیجا جن کی تعداد تقریباً ساڑھے تین سو تھی۔ بنو جذیمہ نے حضرت خالد ؓ کی قیادت میں لشکر دیکھا تو اپنا اپنا اسلحہ تان لیا۔

حضرت خالد نے کہا: ”اسلحہ رکھ دو۔ یقیناً لوگوں کی اکثریت اسلام لا چکی ہے۔“ یہ سن کر ان میں سے جحدر نامی ایک شخص کھڑا ہوا اور بولا: ”بنو جذیمہ! تمھارے لیے تباہی ہو۔

---

1 صحيح البخاري، حديث: 5288، وصحيح مسلم، حديث: 1866. 2 البداية والنهاية: 319/4.

یہ خالد ہے! بخدا اسلحہ رکھنے پر تو قید ہی ہوں گے، پھر قید کے بعد گردنیں ماری جائیں گی۔ اللہ کی قسم! میں تو اسلحہ نہیں رکھوں گا۔'' لوگ اسے آمادہ کرتے رہے یہاں تک کہ وہ مان گیا اور اس نے بھی ہتھیار ڈال دیے۔ جب اس نے بھی ہتھیار ڈال دیے تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے انھیں گرفتار کرنے کا حکم دیا، چنانچہ سب گرفتار ہو گئے۔ اب انھیں اسلام کی طرف دعوت دی۔ انھوں نے «أَسْلَمْنَا» ''ہم مسلمان ہو گئے۔'' کہنے کے بجائے «صَبَأْنَا صَبَأْنَا» ''ہم پچھلے دین سے پھر گئے ہم نے نیا دین اختیار کر لیا۔'' کہنا شروع کیا۔ اب حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اس (بات) پر انھیں قتل کرنا اور قیدی بنانا شروع کر دیا۔ مگر خالد رضی اللہ عنہ کے بعض ساتھیوں نے قتل کرنے سے انکار کر دیا اور ان کے اس فعل پر تنبیہ کی کہ آپ صحیح نہیں کر رہے۔ بعد ازاں حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے تمام قیدی اپنے ساتھیوں کے قبضے میں دے دیے۔ پھر ایک دن حکم دیا کہ ہر آدمی اپنے قیدی کو قتل کر دے، بعض تو حکم ماننے کے لیے تیار ہو گئے لیکن حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور ان کے ساتھیوں نے اس حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا۔ جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا تذکرہ کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ بات سن کر سخت ناراض ہوئے اور اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف یہ کہتے ہوئے اٹھائے:

«اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَبْرَأُ إِلَيْكَ مِمَّا صَنَعَ خَالِدٌ»

''اے اللہ! خالد نے جو کچھ کیا میں اس سے تیرے حضور اظہار براءت کرتا ہوں۔''[1]

حضرت خالد اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما کے مابین اس بات پر گفتگو ہوئی اور معاملہ جھگڑے تک جا پہنچا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو محسوس ہوا کہ یہ جو ہوا ہے کہیں خالد رضی اللہ عنہ نے بنوجذیمہ سے اپنے چچا فاکہ بن مغیرہ کا بدلہ نہ لیا ہو جو جاہلیت میں

[1] صحيح البخاري، حديث: 4339، والسنن الكبرىٰ للنسائي: 237/8، ومسند أحمد: 151,150/2، والطبقات لابن سعد: 148,147/2، والسيرة النبوية لأبي شهبة: 464/2.

بنو جذیمہ کے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔ صحیح مسلم اور دیگر کتب احادیث کی روایت بھی اسی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ حضرت خالد بن ولید اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما کے مابین کچھ جھگڑا ہوا تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے ان کو برا بھلا کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پتا چلا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا تَسُبُّوا أَحَدًا مِّنْ أَصْحَابِي فَإِنَّ أَحَدَكُمْ لَوْأَنْفَقَ مِثْلَ أُحُدٍ ذَهَبًا مَّا أَدْرَكَ مُدَّ أَحَدِهِمْ وَلَا نَصِيفَهُ»

''میرے اصحاب میں سے کسی کو برا مت کہو۔ اگر تم میں سے کوئی احد پہاڑ کے برابر بھی سونا خرچ کر دے تو ان کے مد یا نصف مد کے برابر بھی نہیں ہو سکتا۔''[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان کی طرف بھیج کر ان کی دیتیں ادا کر دیں۔ بلکہ دیت سے کچھ زیادہ بھی دے دیا تاکہ ان کے دل خوش ہو جائیں اور اسلام کی ان مقتولین سے براءت ہو سکے۔[2]

اس حکیمانہ اسلوب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو جذیمہ سے غمخواری کا اظہار فرمایا اور ان کے دلوں کو لاحق غم والم کا ازالہ فرمایا۔[3]

بت کدوں کا انہدام

بیت اللہ کو اس میں موجود بتوں سے پاک کرنے کے بعد علاقے بھر سے بت خانے گرانے ضروری تھے کیونکہ یہ عرصہ دراز سے جاہلیت کے نشانات اور شعائر تھے۔[4]

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جزیرۃ العرب کو ان سے پاک صاف کرنے کے لیے پے در پے سرایا و لشکر روانہ فرمائے۔ ان میں سے چند ایک کا تذکرہ درج ذیل ہے:

1 صحيح البخاري، حديث: 3673، وصحيح مسلم، حديث: 2541. 2 السيرة النبوية للدكتور مهدي رزق الله، ص: 579. 3 السيرة النبوية لأبي شهبة: 465/2. 4 من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 394.

عزیٰ کی جانب حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا لشکر: حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی قیادت میں تیس سواروں پر مشتمل سریہ ''عزیٰ'' کی جانب روانہ ہوا۔ ''عزیٰ'' قریش ہی نہیں عرب بھر میں مقام و مرتبے کے اعتبار سے سب سے بڑا بت تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نام و نشان مٹا دینے کے لیے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا۔ جب یہ جماعت نخلہ مقام میں عزیٰ تک پہنچ گئی تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر کیکر کے درخت کاٹ دیے اور اس جگہ بنے ہوئے مکان یہ کہتے ہوئے گرا دیے۔

كُفْرَانَكَ لَا سُبْحَانَكَ

إِنِّي رَأَيْتُ اللّٰهَ قَدْ أَهَانَكَ

''ہم تیری پاکی نہیں بیان کرتے بلکہ انکار کرتے ہیں۔ میں نے دیکھ لیا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے تجھے ذلیل کر دیا ہے۔'' *

حضرت خالد رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے واپس آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی مہم کی کامیابی کی خبر دی لیکن نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مہم ادھوری چھوڑنے پر سپہ سالار سے سوال کیا: «هَلْ رَأَيْتَ شَيْئًا؟» ''تم نے وہاں کچھ دیکھا؟'' حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''نہیں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «اِرْجِعْ فَإِنَّكَ لَمْ تَصْنَعْ شَيْئًا»

''اے خالد! واپس جاؤ، تم نے تو کچھ نہیں کیا۔''

حضرت خالد رضی اللہ عنہ اپنی ذمہ داری کو مطلوبہ تقاضے کے مطابق پوری نہ کر پانے کی وجہ سے غصے کی حالت میں واپس گئے۔ جب وہاں دوبارہ پہنچے تو مجاور یہ سمجھ گئے کہ اب کی بار یہ نامکمل اور ادھورا کام مکمل کرنے پہنچ گئے ہیں تو وہ بآواز بلند یہ کہتے ہوئے پہاڑ کی جانب

* المعجم الكبير للطبراني، رقم: 3811، ومجمع الزوائد: 176/6، والسرايا والبعوث النبوية للدكتور بريك بن محمد بريك، ص:282.

بھاگ گئے: ''اے عزیٰ! اسے دیوانہ کر دے اس کی ایک آنکھ ضائع کر دے!'' حضرت خالد رضی اللہ عنہ قریب ہوئے تو دیکھا ایک ننگی عورت، سر کے بال کھولے اپنے سر پر مٹی ڈال رہی تھی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ اپنے مخصوص انداز شجاعت میں آگے بڑھے اور اسے تلوار مار کر قتل کر دیا۔ واپس آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «تِلْكَ هِيَ الْعُزّٰى» ''وہی عزیٰ تھی۔''[1]

حضرت سعد بن زید اشہلی رضی اللہ عنہ ''منات'' کی جانب: منات اس بت کا نام ہے جو بحر احمر کے ساحل پر، قدید[2] کے پاس مشلّل میں تھا یہ اوس، خزرج اور غسان وغیرہ کا بت تھا۔ وہ جاہلیت میں اس کی عبادت کرتے، تعظیم کرتے اور یہیں سے حج کا احرام باندھتے تھے۔ اس کی اس قدر تعظیم کرتے کہ اس کے احترام میں صفا و مروہ کا طواف نہ کرتے تھے۔ ان کے آباء کا یہی طور طریقہ تھا کہ جو منات کا احرام باندھتا صفا و مروہ کا طواف نہ کرتا تھا۔[3]

اسلام لانے تک ان کی یہی عادت تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کے لیے آئے تو انھوں نے اسی بات کا تذکرہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ۚ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ○ ﴾

''بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں، پس جو شخص بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ ان دونوں کا طواف کرے اور جو شخص خوشی سے کوئی نیکی کرے تو بے شک اللہ قدر کرنے والا، خوب جاننے والا ہے۔''[4]

جزیرۃ العرب میں شرک اور بت پرستی کو رواج دینے والا پہلا شخص، جس نے حضرت

---

1 دلائل النبوة للبيهقي: 77/5، ومجمع الزوائد: 176/6، ومسند أبي يعلى، رقم: 902.
2 قدید: مکہ و مدینہ کے درمیان ساحل سمندر پر ایک جگہ ہے۔ 3 السرايا والبعوث النبوية، ص:286.
4 البقرة 158:2.

ابراہیم علیہ السلام کے دینِ حنیف میں تحریف کی ''عمرو بن لحی خزاعی'' تھا۔ [1]

جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے مکہ مکرمہ فتح کر دیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منات کی بیخ کنی کے لیے اس شخص کو روانہ کیا جو دور جاہلیت میں اس کی تعظیم کرتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد بن زید اشہلی رضی اللہ عنہ کو بیس سوار دے کر روانہ فرمایا۔ [2]

حضرت سعد رضی اللہ عنہ اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے انتہائی سرعت کے ساتھ روانہ ہوئے۔ جب وہاں پہنچے تو مجاور نے پوچھا: ''کیا چاہتے ہو؟'' حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''منات کو ڈھانا چاہتا ہوں۔'' مجاور نے کہا: ''تم جانو اور تمھارا کام۔'' جب حضرت سعد رضی اللہ عنہ منات کی جانب بڑھے تو ایک کالی، ننگی اور پراگندہ حالت والی عورت اپنا سینہ پیٹتے اور ہائے وائے کرتے ہوئے بت سے باہر نکلی۔ مجاور نے بڑے اعتماد سے آواز لگائی:

''منات! اپنے نافرمانوں کو پکڑ لے۔''

لیکن اس کی یہ آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے اس کی مطلق پروا نہ کی اور اس زور کی تلوار ماری کہ اس عورت کا کام تمام کر دیا، پھر ساتھیوں سمیت بت کی جانب متوجہ ہوئے، اسے گرایا اور توڑ پھوڑ دیا۔

خزانے سے کچھ نہ ملا۔ بعد ازاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹ گئے۔ [3]

کہتے ہیں کہ یہ روایت اصول حدیث کے لحاظ سے ضعیف ہے لیکن اہل مغازی کی ان تاریخی روایات سے اسے تقویت مل جاتی ہے جن میں ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جزیرۃ العرب کے بتوں کا کام تمام کرنے کے لیے کئی ایک سرایا روانہ فرمائے تھے۔ ایسی صورت میں منات کو چھوڑ دینا ممکن نہیں کیونکہ یہ بھی جزیرۃ العرب کے بڑے بڑے طاغوتوں میں سے ایک تھا۔

1 السرايا والبعوث النبوية للدكتور بريك بن محمد بريك، ص: 287. 2 الطبقات: 146/20.
3 السرايا والبعوث النبوية للدكتور بريك بن محمد بريك، ص: 288.

''سواع'' کی طرف حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا سریہ: اللہ تعالیٰ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:

﴿ وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا ﴾

''اور انھوں نے کہا کہ اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا اور نہ ود اور سواع اور یغوث اور یعوق اور نسر کو چھوڑنا۔''[1]

''سواع'' ان بتوں میں سے ایک بت ہے جسے بعد میں ہذیل قبیلے نے، جو مضر سے تعلق رکھتا تھا، اختیار کر لیا۔[2]

ہذیل قبیلے کے افراد دیگر لوگوں کے ساتھ مسلمان ہو گئے اور مکہ مکرمہ فتح ہو گیا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی قیادت میں لشکر بھیجا کہ ''سواع'' کے ٹکڑے کر دیے جائیں۔ اس لشکر کے قائد حضرت عمرو رضی اللہ عنہ اپنا واقعہ خود بیان کرتے ہیں کہ میں وہاں پہنچا تو مجاور نے پوچھا: ''تم کیا چاہتے ہو؟'' میں نے کہا: ''مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ڈھانے کا حکم دیا ہے۔'' اس نے جواب دیا: ''تم یہ طاقت نہیں رکھتے۔'' میں نے کہا: ''کیوں؟'' اس نے کہا: ''کوئی رکاوٹ حائل ہو جائے گی۔'' میں نے کہا: ''تم اب تک باطل پر ہو؟ تم پر افسوس! کیا یہ سنتا یا دیکھتا ہے؟'' پھر حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''میں نے پاس جا کر اسے توڑ ڈالا اور اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ اس کے خزانے والا مکان ڈھا دیں مگر اس میں سے انھیں کچھ نہ ملا۔ میں نے پھر مجاور سے کہا: ''بتاؤ کیسا رہا؟'' اس نے کہا: ''میں اللہ پر ایمان لاتا ہوں۔''[3]

بتوں کو توڑنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھیجے ہوئے لشکروں سے یہ ثابت ہوتا ہے

1 نوح 71:23. 2 سبل الهدىٰ والرشاد للشامي:6/303. 3 المغازي للواقدي:2/780.

کہ اگر بتوں اور مقامات شرک کے مٹانے کی کبھی طاقت میسر آ جائے تو اس کے ہوتے ہوئے انھیں باقی رکھنا درست نہیں ہے۔ کیونکہ وہ کفر و شرک کے نشانات ہیں اور یہ وہ بدترین برائیاں ہیں جنھیں طاقت کے باوجود قبول کرنا اور برقرار رکھنا ہرگز درست نہیں۔ بلکہ قبروں پر بننے والے قبوں کا بھی یہی حکم ہے جنھیں اب اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر معبود بنا لیا گیا ہے۔ اسی طرح وہ پتھر جن کی طرف نذر و نیاز، تعظیم، برکت اور بوسہ دینے کے لیے سفر کیا جاتا ہے ان کو مٹانے کی قوت کے باوجود روئے زمین پر باقی رکھنا ہرگز جائز نہیں ہے۔ اب ایسی قبروں اور طاغوتوں میں سے اکثر لات وعزیٰ اور منات کا مقام لے چکے ہیں بلکہ ان کے پاس اور ان کے باعث ان سابقہ بتوں سے بھی بڑھ کر شرک ہو رہا ہے۔ [1]

[1] السرايا والبعوث النبوية للدكتور بريك بن محمد بريك، ص:302.

باب 3

اسباق، نصائح اور عبرتیں

نزول سورۂ نصر اور رحلتِ رسول ﷺ کی خبر

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اکثر یہ فرماتے تھے: «سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ، أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَأَتُوبُ إِلَيْهِ» ''پاک ہے اللہ تعالیٰ اور اسی کی تعریف ہے۔ میں اسی سے بخشش طلب کرتا اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔'' میں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! میں دیکھتی ہوں کہ آپ مذکورہ دعائیں کثرت سے مانگتے ہیں؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: «خَبَّرَنِي رَبِّي أَنِّي سَأَرَى عَلَامَةً فِي أُمَّتِي، فَإِذَا رَأَيْتُهَا أَكْثَرْتُ مِنْ قَوْلِ: سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ، أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَأَتُوبُ إِلَيْهِ فَقَدْ رَأَيْتُهَا» ''مجھے میرے رب نے بتایا کہ تو اپنی امت میں ایک نشانی دیکھے گا۔ جب میں اس نشانی کو دیکھتا ہوں تو زیادہ تر یہی کہتا ہوں: «سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَأَتُوبُ إِلَيْهِ» میں نے وہ نشانی دیکھ لی ہے۔ (وہ نشانی اس سورت میں ہے:)

﴿إِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللّٰهِ أَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا ۝﴾

''جب اللہ تعالیٰ کی مدد اور فتح آ جائے۔ اور آپ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے دین میں جوق در جوق آتا دیکھ لیں تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کریں اور اسی سے مغفرت کی دعا مانگیں بے شک وہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا ہے۔''[1]

---

[1] النصر 110:1-3. صحیح مسلم، حدیث: (220)-484.

امام قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب مکہ مکرمہ فتح ہو گیا تو اہل عرب نے کہا:

''محمد ﷺ اہل حرم کا فاتح بن چکا ہے، حالانکہ انھیں اللہ تعالیٰ نے ''اصحاب الفیل'' سے محفوظ رکھا تھا تو تمھیں اس سے مقابلے کی ہرگز طاقت نہیں ہے، لہٰذا وہ گروہ در گروہ، جماعت در جماعت آتے اور اسلام قبول کر لیتے۔''[1]

عمرو بن سلمہ کہا کرتے تھے: ''ہم سرِ راہ ایک چشمے کے قریب رہتے تھے۔ ہمارے پاس سے قافلے گزرتے تو ہم ان سے پوچھتے: ''لوگوں کو کیا ہوا؟ لوگ کیا کر رہے ہیں؟ یہ شخص کیسا ہے؟'' وہ کہتے: ''اس کا خیال ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ اس کی طرف وحی کی جاتی ہے۔ وہ کہتے اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف یہ کلام وحی کیا ہے۔ میں وہ کلام (سن کر) یاد کر لیتا۔ وہ کلام تو گویا میرے دل میں گھر ہی کر جاتا۔''

عرب فتح مکہ تک اسلام قبول کرنے کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ یہ بات کہتے تھے کہ اسے اس کی قوم کے رحم و کرم پر چھوڑ دو۔ اگر وہ ان پر غالب آ گیا تو سچا نبی ہے، لہٰذا جب فتح مکہ کا یہ واقعہ رونما ہو گیا تو ہر کوئی جلد از جلد اسلام قبول کر لینا چاہتا تھا۔

یہ سورت ''سورۃ التودیع'' ہے کیونکہ یہ حضرت محمد ﷺ کی وفات کے قریب آنے کی خبر دے رہی ہے۔[2]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بزرگ بدری صحابہ کے ساتھ مشورہ کرتے ہوئے مجھے بھی بلا لیتے تھے۔ بعض احباب کو یہ ناگوار گزرا، لہٰذا انھوں نے کہا: ''آپ اسے ہمارے ساتھ کیوں بلا لیتے ہیں اس جیسے (کم عمر) تو ہمارے بیٹے بھی ہیں؟''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''تم اس کی وجہ جان لو گے!'' چنانچہ ایک روز حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عمر رسیدہ صحابہ کو بلایا۔ مجھے بھی ان کے ساتھ بلا لیا۔ میں سمجھ گیا کہ ان کے سامنے

[1] تفسير القرطبي:20/230. [2] حديث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ لأبي بدر محمد بكر آل عابد:2/572.

میرے علم کا اظہار چاہتے ہیں۔ اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: ''تم ﴿ اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَالۡفَتۡحُ ○﴾ کے متعلق کیا جانتے ہو؟'' کچھ صحابہ نے کہا: ''جب ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے فتح و نصرت مل جائے تو ہم اس کی تعریف کریں اور اسی سے بخشش مانگیں۔'' جبکہ بعض صحابہ خاموش رہے اور کچھ بھی جواب نہ دیا۔ اس کے بعد عمر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے کہا: ''ابن عباس! کیا تم بھی یہی کہتے ہو؟'' میں نے کہا: ''نہیں!'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''تو تم کیا کہتے ہو؟'' میں نے کہا: ''اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجل کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَالۡفَتۡحُ ○﴾ ''یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اَجل کی علامت ہے۔'' اور اب آپ کو یہ کرنا ہے کہ ﴿ فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ وَاسۡتَغۡفِرۡهُ ۚ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ○﴾ ''چنانچہ اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کریں اور اس سے بخشش طلب کریں۔ بے شک وہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ''میں بھی یہی سمجھتا ہوں جو تم سمجھے۔''[1]

سید قطب اس سورۂ مبارکہ سے متعلقہ بعض مطالب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''دنیا کے واقعات و حوادث اور جو کچھ اس زندگی میں رونما ہوتا ہے اس کی حقیقت کے متعلق اس سورت کی ابتدا میں خاص تصور دیا گیا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کا دعوت الی اللہ کی بابت جو عظیم کردار ہے اور یہ کہ اس میدان میں انھیں کس حد تک جانا ہے، ان امور کو اس سورت کی ابتدا میں یوں واضح کر دیا گیا: ﴿ اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَالۡفَتۡحُ ○﴾ یہ وہ امداد و نصرت ہے جو اللہ تعالیٰ ہی بذات خود جیسے چاہے، مناسب وقت پر ایک خاص نتیجے کے لیے عطا فرماتا ہے۔ اس میں رسولِ گرامی قدر اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ وہ تو صرف اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے جسے وہ اپنے رسول کے ذریعے یا کسی بھی فرد کے ذریعے نافذ کر سکتا ہے۔ ہاں! البتہ اتنا ضرور ہے کہ یہ ان کے لیے

[1] صحيح البخاري، حديث:4970.

اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک خاص شرف ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ہاتھوں اسے وقوع پذیر کرا دے اور انھیں اس کی حفاظت بھی سونپ دے اور انھیں اس کا امین بھی بنا دے۔ اللہ تعالیٰ کے دین میں لوگوں کے فوج در فوج داخلے کے متعلق اس فتح و نصرت میں ان کا بس یہی کردار اور حصہ ہے۔"[1]

یہ وہ گہرا ایمانی مفہوم ہے جسے قرآن پاک نے مومنوں کے دلوں میں پختہ کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ یعنی یہ غلبہ وقوت اور کسی کو استحکام عطا کر دینا اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ وہی اکیلا زمان و مکان اور ان لوگوں کا انتخاب فرماتا ہے جن کے ہاتھوں پر نصرت و فتح جاری کرنا چاہتا ہے۔ یہ اس کا خاص فضل و کرم ہے جس کے ساتھ اس نے اپنے سچے ستھرے بندوں کو نوازا ہے۔

تسخیر قلوب اور دعوتی کردار

سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام: سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں داخل ہو گئے تو میں نے اپنے گھر کا دروازہ بند کر لیا اور اپنے بیٹے عبداللہ بن سہیل رضی اللہ عنہ کو پیغام بھیجا کہ میرے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے امان طلب کرو۔ مجھے ڈر ہے کہ مجھے قتل کر دیا جائے گا۔ ادھر میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے ساتھ اپنے گزشتہ سلوک کو یاد کرتا تو مجھے نظر آتا کہ مجھ سے زیادہ برا سلوک کرنے والا اور کوئی نہ تھا۔ میں حدیبیہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جس طرح پیش آیا تھا کوئی اور ایسے پیش نہ آیا تھا۔ اس روز میں نے ہی وہ مسودہ طے کیا اور مزید یہ کہ میں جنگ بدر اور احد میں بھی مسلمانوں کے مدمقابل رہا تھا۔ بلکہ جب بھی قریش کوئی دشمنانہ کارروائی کرتے میں ساتھ ہوتا۔ اس کے مقابلے میں قربان جائیے پیغمبر رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی حلم و بردباری پر! کہ عبداللہ

[1] تفسیر في ظلال القرآن لسید قطب:6/3996.

بن سہیل رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دریافت کیا: ''اے اللہ کے رسول! کیا آپ سہیل کو امان دے دیں گے؟''

فرمایا: «نَعَمْ! هُوَ آمِنٌ بِأَمَانِ اللّٰهِ، فَلْيَظْهَرْ»

''ہاں! وہ اللہ تعالیٰ کے عہد و پیمان سے مامون و محفوظ ٹھہرا۔ اسے چاہیے کہ سامنے آئے۔ چھپے مت۔''

پھر آپ ﷺ نے اپنے ارد گرد بیٹھے ساتھیوں سے فرمایا: «مَنْ لَّقِيَ سُهَيْلَ بْنَ عَمْرٍو فَلَا يَشُدَّ النَّظْرَ إِلَيْهِ، فَلْيَخْرُجْ، فَلَعَمْرِي، إِنَّ سُهَيْلًا لَّهُ عَقْلٌ وَّشَرَفٌ، وَمَا مِثْلُ سُهَيْلٍ جَهِلَ الْإِسْلَامَ وَلَقَدْ رَأٰى مَاكَانَ يُوضَعُ فِيهِ، أَنَّهُ لَمْ يَكُنْ لَّهُ بِنَافِعٍ!» ''جو شخص بھی سہیل بن عمرو کو ملے اس کی طرف تیز نگاہ سے بھی نہ دیکھے اور اسے چاہیے کہ باہر نکلے۔ اللہ کی قسم! سہیل تو بڑا دانا اور معزز ہے۔ سہیل جیسا (عظیم) شخص اسلام سے بے بہرہ نہیں رہ سکتا۔ بخدا اس نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے کہ جس کے لیے اسے دوڑ دھوپ کرائی جاتی تھی اس نے اسے کوئی نفع نہیں پہنچایا۔''

یہ سن کر عبداللہ رضی اللہ عنہ اپنے باپ کی طرف گئے۔ سہیل کا کہنا ہے: ''اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ سب سے بڑھ کر ایفائے عہد والے تھے۔ بچپن میں بھی اور بڑھاپے میں بھی۔'' چنانچہ اب سہیل بن عمرو عام زندگی گزار رہے تھے۔ روپوش نہیں تھے۔ سہیل رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حالت کفر ہی میں حنین کی جانب نکلے بالآخر جعرانہ پہنچ کر انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔[1]

ان ترغیبی الفاظ کا سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہ پر بڑا اثر ہوا۔ وہ عمر بھر رسول اللہ ﷺ کی صلح پسندی اور نیکی کا تذکرہ کرتے رہے، پھر اس کے بعد وہ اسلام میں بھی داخل ہو گئے۔ اور بڑے اچھے مسلمان ثابت ہوئے۔ کثرت سے نیک اعمال بجالانے والے تھے۔[2]

---

1 المستدرك للحاكم: 281/3، والمغازي للواقدي: 847,846/2. 2 التاريخ الإسلامي للحميدي: 217,216/7.

زبیر بن بکار کا بیان ہے کہ اس کے بعد سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہ کثرت سے نماز، روزہ اور صدقہ کیا کرتے تھے۔ اپنی جماعت سمیت شام کی طرف جہاد کے لیے بھی نکلے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہ نے اس قدر روزے اور تہجد کا اہتمام کیا کہ ان کا رنگ ہی بدل گیا۔ وہ قرآن پاک سن کر بہت روتے تھے۔ وہ جنگ یرموک میں لشکر کے بہت بڑے حصے کے امیر تھے۔ [1]

صفوان بن امیہ رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام: حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: ''صفوان بن امیہ بھاگ کے شعیبہ [2] چلا گیا اس نے اپنے غلام یسار سے کہا: ''تیرا برا ہو! دیکھ کون نظر آ رہا ہے؟'' غلام نے کہا: ''عمیر بن وہب ہے۔'' صفوان بولا: ''اس سے میرا کیا تعلق! وہ لازماً میرے قتل کے ارادے سے آ رہا ہے۔ اس نے میرے خلاف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدد کی ہے۔'' اتنے میں عمیر رضی اللہ عنہ اس کے پاس پہنچ گئے۔ صفوان نے کہا: ''اے عمیر! تم نے جو کچھ پہلے میرے ساتھ کیا وہ کافی نہ تھا؟ پہلے تم نے اپنا قرض اور بچوں کا بوجھ مجھ پر ڈالے رکھا اور اب میرے قتل کا ارادہ کیے آ گئے ہو!''

عمیر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''میں تجھ پر قربان! تیرے پاس اس ہستی کا سفیر بن کر آیا ہوں جو تمام لوگوں سے نیکی اور صلہ رحمی کرنے والی ہے۔''

عمیر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا: ''اے اللہ کے رسول! صفوان میری قوم کا سردار ہے۔ وہ بھاگ کر نکل گیا ہے تا کہ سمندر میں کود کر اپنے آپ کو فنا کر ڈالے۔ آپ پر میرے ماں باپ قربان! اسے ڈر ہے کہ آپ اسے امان نہ دیں گے؟'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «قَدْ أَمَّنْتُهُ» ''میں نے اسے امان دی۔'' یہ سن کر عمیر رضی اللہ عنہ اس کی تلاش میں نکل پڑے اور صفوان سے مل کر کہا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تجھے امان دے دی ہے۔'' صفوان کہنے لگا: ''اللہ کی قسم! ایسا ہرگز ممکن نہیں۔ میں تیرے ساتھ اس وقت تک واپس نہیں

---

1 سیر أعلام النبلاء: 190/2. 2 شعیبہ: جدہ کی طرف حجاز کے ساحل سمندر پر مکہ مکرمہ کی بندرگاہ ہے۔

جاؤں گا جب تک کہ تو کوئی ایسی نشانی لے آئے جسے میں پہچانتا ہوں۔" چنانچہ عمیر رضی اللہ عنہ دوبارہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! میں صفوان کے پاس سے آیا ہوں۔ وہ بھاگ گیا ہے اور اپنے آپ کو مار ڈالنا چاہتا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ آپ نے اسے امان دے دی ہے مگر اس نے یہ کہتے ہوئے آنے سے انکار کر دیا ہے کہ میں اس وقت تک تیرے ساتھ نہیں جا سکتا جب تک تو کوئی ایسی نشانی نہ لائے جسے میں پہچانتا ہوں۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «خُذْ عَمَامَتِي» "یہ میرا عمامہ لے لو۔" عمیر رضی اللہ عنہ یہ نشانی لے کر اس کے پاس گئے۔ یہ وہی یمنی منقش چادر تھی جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سر مبارک پر باندھے مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تھے۔ عمیر اب دوبارہ چادر لیے صفوان کی تلاش میں نکلے۔ اسے مل کر کہا: "اے ابو وہب! تیرے پاس اس شخص کی طرف سے آیا ہوں جو سب سے افضل، سب سے زیادہ رشتے داری کا خیال کرنے والا، سب سے نیک اور سب سے بڑھ کر بردبار ہے۔ اس کا شرف تیرا شرف اور اس کی عزت تیری عزت اور اس کی حکومت تیری حکومت ہے۔ وہ تمھارا اپنا ہے چنانچہ دل میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرو (اور میرے ساتھ چل پڑو۔)"

صفوان نے کہا: "مجھے ڈر ہے کہ میں قتل کر دیا جاؤں گا۔"

عمیر رضی اللہ عنہ: "آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تجھے اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دی ہے۔ اگر تو راضی ہو تو ٹھیک ورنہ تیرے لیے پھر بھی دو ماہ چلنے پھرنے کا موقع ہوگا۔ تجھے معلوم نہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں سے زیادہ وفادار اور صالح انسان ہیں۔ انھوں نے تیری طرف اپنی عمدہ چادر نشانی کے طور پر بھیجی ہے جسے اوڑھے ہوئے وہ مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تھے۔ تم وہ چادر پہچان لو گے؟" صفوان نے کہا: "ہاں۔" عمیر رضی اللہ عنہ نے چادر سامنے کی تو صفوان بولا: "ہاں یہ وہی چادر ہے۔" اس (یقین دہانی) کے بعد صفوان واپس آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت مسجد میں نماز عصر پڑھا رہے تھے۔ یہ دونوں

آ کر کھڑے ہو گئے۔ صفوان نے دریافت کیا: ''آپ دن رات میں کتنی نمازیں ادا کرتے ہیں؟'' عمیر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''پانچ نمازیں۔'' صفوان نے پوچھا: ''ساری نمازیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی پڑھاتے ہیں؟'' عمیر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ہاں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب سلام پھیرا تو صفوان بآواز بلند بولا: ''اے محمد! عمیر بن وہب میرے پاس آپ کی چادر لایا اور اس نے اس خیال کا اظہار کیا کہ آپ نے مجھے اپنے پاس آنے کی دعوت دی ہے اور یہ بھی کہ اگر میں اسلام پر راضی ہوا تو صحیح، ورنہ پھر بھی مجھے دو ماہ معاملات کا جائزہ لینے کے لیے آنے جانے کی اجازت ہوگی!'' رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: «اِنْزِلْ أَبَا وَهْبٍ!» ''اے ابووہب! سواری سے اتر آؤ۔''

صفوان نے کہا: ''اللہ کی قسم ہرگز نہیں! یہاں تک کہ بات واضح ہو جائے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «بَلْ تُسَيَّرُ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ» ''نہیں! تجھے چار ماہ (جائزہ لینے اور سوچنے کے لیے) دیے جاتے ہیں۔'' یہ سن کر صفوان سواری سے اتر آیا۔[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوازن کی طرف روانہ ہوئے تو صفوان بن امیہ بحالتِ کفر ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صفوان کو پیغام بھیجا کہ اپنا اسلحہ اُدھار دے دو۔ اس نے ایک سو زرہیں مع ساز و سامان دیتے ہوئے پوچھا: ''یہ زبردستی ہے یا بخوشی؟'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «عَارِيَةٌ مُؤَدَّاةٌ» ''یہ ادھار ہیں جو واپس کر دی جائیں گی۔''[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے حکم دیا تو یہ اسلحہ وہ حنین لے گیا۔ وہ حنین اور طائف میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم جعرانہ واپس پہنچے۔ یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم مال غنیمت کا جائزہ لے رہے تھے، صفوان بھی ساتھ تھا۔ اس نے دیکھا کہ ساری وادی بکریوں، اونٹنیوں اور غلاموں سے پُر ہے۔ یہ کافی دیر انھیں دیکھتا رہا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس پر نگاہ

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 60/4، ودلائل النبوة للبيهقي: 46/5. [2] سنن أبي داود، حديث: 3562، ومسند أحمد: 401/3 و 465/6، والمستدرك للحاكم: 49/3، والسنن الكبرىٰ للبيهقي: 89/6.

رکھے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: «أَبَا وَهْبٍ! يُعْجِبُكَ هٰذَا الشِّعْبُ؟» ''اے ابو وہب! یہ وادی تجھے اچھی لگ رہی ہے؟'' اس نے کہا: ''جی ہاں۔'' ارشاد فرمایا: «هُوَ لَكَ وَمَا فِيهِ» ''یہ وادی ساز و سامان سمیت تیری ہوئی۔'' صفوان بولا: ''اس طرح کی سخاوت پر ایک نبی ہی بخوشی حکم دے سکتا ہے۔'' اور پکار اٹھے: «أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ» اور اس طرح انھوں نے اسی جگہ اسلام قبول کر لیا۔[1]

اس روایت سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے صفوان کے دل میں اسلام کی الفت و محبت پیدا کرنا چاہی بالآخر وہ مسلمان ہو گئے۔ محبتِ اسلام پیدا کرنے کے لیے آپ ﷺ نے اسے پہلے تو امان عنایت فرمائی، پھر چار ماہ کا اختیار دیا اور اس کو ڈھیروں مال دے دیا کہ عام انسان سے اس قدر عطیہ ملنا ناممکن تھا۔ پہلے تو اسے دیگر مکی سرداروں کے ساتھ سو اونٹ عطا کیے، پھر ایک گھاٹی میں موجود تمام اونٹ اور بکریاں عنایت کر دیں۔ یہ دیکھتے اور لیتے ہوئے وہ پکار اٹھا کہ اس قدر عطیہ بخوشی صرف ایک نبی ہی دے سکتا ہے کسی عام انسان کے بس کی بات نہیں۔ اور اسی جگہ اسلام قبول کر لیا۔[2]

خود صفوان آپ ﷺ کی اس سخاوت کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتا ہے:

''اللہ کی قسم! آپ میری نگاہ میں سب لوگوں سے زیادہ برے تھے۔ آپ ﷺ نے مجھے ڈھیروں مال دیا اور یہ سلسلہ جاری رکھا یہاں تک کہ آپ ﷺ میرے نزدیک سب لوگوں سے زیادہ محبوب ہو گئے۔''[3]

عکرمہ بن ابو جہل رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام: حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ عکرمہ بن ابو جہل کی بیوی ام حکیم رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! عکرمہ آپ کے ڈر سے یمن بھاگ گیا ہے۔ اسے ڈر ہے کہ آپ اسے قتل کر دیں گے، لہٰذا اسے امان عنایت فرمائیے۔''

---

1 المغازي للواقدي: 2/853-855، وكنزالعمال، رقم: 30170. 2 التاريخ الإسلامي للحميدي: 7/220. 3 صحيح مسلم، حديث: 2313.

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «هُوَ آمِنٌ» ''اسے امان ہے۔'' (یہ سن کر) ام حکیم اپنے ساتھ اپنا ایک رومی غلام لیے اس کی تلاش میں نکل پڑی۔ اس غلام نے انھیں بہکانا چاہا۔ یہ اسے حیلے بہانے عك کے ایک قبیلے تک لے آئیں اور ان کے پاس آ کر اس غلام کے خلاف مدد کی طالب ہوئیں تو انھوں نے اس غلام کو پکڑ کر اچھی طرح باندھ دیا۔ ام حکیم رضی اللہ عنہا نے تہامہ کے ایک ساحل پر عکرمہ کو ڈھونڈ لیا جو کشتی میں سوار ہو چکا تھا۔ ملاح اسے کہہ رہا تھا: ''صرف ایک رب کو پکار۔'' عکرمہ نے کہا: ''میں کیا کہوں۔'' ملاح بولا: ''کہو لا إلٰه إلا اللّٰه'' عکرمہ نے جواب دیا: ''میں اس کلمے سے تو بھاگا ہوں۔'' یہی گفتگو ہو رہی تھی کہ ام حکیم رضی اللہ عنہا بھی پہنچ گئیں اور عکرمہ سے واپسی کے لیے اصرار کرتے ہوئے کہنے لگیں: ''اے میرے چچازاد! میں آپ کے پاس سب سے نیک، صلہ رحمی کرنے والے اور سب سے بہتر انسان کی طرف سے آئی ہوں۔ اپنے آپ کو تباہی میں نہ ڈالیں۔'' عکرمہ (یہ سن کر) ام حکیم کے لیے رک گیا۔ اس نے پھر کہا: ''میں محمد رسول اللہ ﷺ سے آپ کے لیے امان حاصل کر چکی ہوں۔'' عکرمہ نے (تعجب سے) پوچھا: ''کیا واقعی تو ایسا کر چکی ہے؟'' ام حکیم رضی اللہ عنہا نے کہا: ''ہاں! میں نے بذات خود آپ ﷺ سے گفتگو کی تو انھوں نے آپ کو امان دے دی۔'' یہ سن کر عکرمہ ان کے ساتھ واپس آ گیا۔ عکرمہ نے ان سے غلام کی کردار کشی سن کر اسے قتل کر دیا۔ عکرمہ تاحال دولتِ اسلام سے محروم تھے۔ جب یہ دونوں مکہ مکرمہ کے قریب پہنچ گئے تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا: «يَأْتِيكُمْ عِكْرِمَةُ بْنُ أَبِي جَهْلٍ مُّؤْمِنًا، مُّهَاجِراً، فَلَا تَسُبُّوا أَبَاهُ، فَإِنَّ سَبَّ الْمَيِّتِ يُؤْذِي الْحَيَّ، وَلَا يَبْلُغُ الْمَيِّتَ» ''تمھارے پاس عکرمہ ایمان کی حالت میں ہجرت کر کے آنے والا ہے، لہٰذا تم نے اس کے باپ کو برا بھلا نہیں کہنا۔ کیونکہ فوت شدہ کو گالی دینے سے زندہ انسان کو اذیت و تکلیف ہوتی ہے، جبکہ میت کو وہ (گالی) نہیں پہنچتی۔''[1]

1 شیخ البانی رحمہ اللہ نے اس روایت کو موضوع کہا ہے، دیکھیے: (السلسلة الضعيفة: 505/3)

راوی کہتا ہے کہ اس دوران عکرمہ اپنی بیوی کے قریب آنے کا ارادہ کرتا تو وہ انکار کرتے ہوئے کہتی: ''تم کافر ہو اور میں مسلمان ہوں۔''

عکرمہ کہتا: ''جس معاملے نے تجھے مجھ سے بھی روک دیا ہے واقعی وہ کوئی بہت بڑا معاملہ ہے۔''

نبی مکرم ﷺ نے عکرمہ کو دیکھا تو اسے خوش آمدید کہتے ہوئے اس کی طرف اس طرح لپکے کہ رسول اللہ ﷺ کی چادر کندھوں سے گر گئی۔ رسول اللہ ﷺ تشریف فرما ہوئے تو عکرمہ بھی آپ کے سامنے بیٹھ گئے۔ ان کی بیوی ام حکیم رضی اللہ عنہا بھی نقاب اوڑھے موجود تھیں۔

عکرمہ نے کہا: ''اے محمد! اس نے مجھے بتایا ہے کہ آپ نے مجھے امان دے دی ہے؟''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «صَدَقَتْ فَأَنْتَ آمِنٌ» ''اس نے سچ کہا، تم امان میں ہو۔''

عکرمہ نے کہا: ''اے محمد! آپ کس چیز کی دعوت دیتے ہیں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: «أَدْعُوكَ إِلٰى أَنْ تَشْهَدَ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنِّي رَسُولُ اللّٰهِ وَأَنْ تُقِيمَ الصَّلَاةَ وَتُؤْتِيَ الزَّكَاةَ وَتَفْعَلَ وَتَفْعَلَ» ''میں تجھے ایک معبود کی اور اپنی رسالت کی گواہی دینے کی طرف دعوت دیتا ہوں، اسی طرح نماز ادا کرنے، زکاۃ دینے اور فلاں فلاں امور انجام دینے کی طرف بلاتا ہوں۔'' رسول اللہ ﷺ نے چند خصائل و اوصاف کا تذکرہ فرمایا جن کا اسلام میں پایا جانا ضروری ہے۔

عکرمہ نے کہا: ''آپ نے یقیناً سچی بات کہی اور اچھے معاملے کی دعوت دی ہے۔ آپ بخدا حق کی دعوت سے پہلے بھی ہم میں سب سے سچے اور سب سے نیک تھے، لہٰذا میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔'' رسول اللہ ﷺ اس بات سے انتہائی خوش ہوئے۔ عکرمہ نے پھر عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! مجھے کوئی اچھی بات بتائیں جسے میں پڑھتا رہوں۔'' فرمایا: تو یہ پڑھ لیا کر: «أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ» عکرمہ نے

پھر عرض کیا: ''اس کے بعد کیا پڑھوں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: «تَقُولُ: أُشْهِدُ اللّٰهَ وَأُشْهِدُ مَنْ حَضَرَ أَنِّي مُسْلِمٌ مُّهَاجِرٌ وَّمُجَاهِدٌ» ''تم کہو: میں اللہ تعالیٰ کو اور تمام حاضرین کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں مسلمان، مہاجر اور مجاہد ہوں۔''

عکرمہ نے یہی بات دہرا دی۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَا تَسْأَلْنِي الْيَوْمَ شَيْأً أُعْطِيهِ أَحَدًا إِلَّا أَعْطَيْتُكَهُ» ''آج تم مجھ سے اس قسم میں سے جو کچھ مانگو گے جو میں کسی کو دے سکتا ہوں تو میں تمھیں وہ دے دوں گا۔''

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''میں درخواست کرتا ہوں کہ میں نے آج تک آپ سے جو بھی دشمنی کی میرے لیے اللہ کے حضور اس کی معافی طلب کیجیے یا جس کسی راہ میں آپ کے خلاف مجھے رکھا گیا یا کسی بھی مقام پر میں آپ ﷺ کو برائی کے ارادے سے ملا ہوں یا جو کوئی بھی بات آپ ﷺ کے سامنے یا پیچھے کہی ہو تو میرے لیے اللہ سے معافی طلب کیجیے۔''

رسول اللہ ﷺ نے دعا فرما دی:

«اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَهُ كُلَّ عَدَاوَةٍ عَادَانِيهَا، وَكُلَّ مَسِيرٍ سَارَ فِيهِ إِلٰى مَوْضِعٍ يُّرِيدُ بِذٰلِكَ الْمَسِيرِ إِطْفَاءَ نُورِكَ، فَاغْفِرْلَهُ مَا نَالَ مِنِّي مِنْ عِرْضٍ فِي وَجْهِي أَوْ أَنَا غَائِبٌ عَنْهُ»

''اے اللہ! عکرمہ نے میرے ساتھ جو کوئی بھی دشمنی کی ہے یا جس کسی جگہ کی طرف بھی تیرے نور کو بجھانے کے لیے گئے ہیں تو وہ اسے معاف فرما دے۔ اور اسی طرح اس نے میرے سامنے یا پشت پیچھے میری جو بھی بے ادبی کی ہے تو اسے بھی معاف فرما دے۔''

عکرمہ نے سن کر کہا: ''اے اللہ کے رسول! میں خوش ہوں۔ میں اللہ کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے جس قدر خرچ کرتا تھا اس سے دو گنا اللہ کی راہ میں خرچ کروں گا۔ میں اللہ کے راستے سے روکنے کے لیے جس قدر لڑائی کرتا تھا اب اس سے دو گنا اللہ کی راہ میں جہاد کروں گا۔'' پھر واقعی حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے جہاد کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی حتی کہ (یرموک کے دن) شہادت سے ہم کنار ہو گئے۔ ان کے اسلام قبول کر لینے پر ان کی بیوی سابقہ نکاح ہی پر ان کے پاس چلی گئی۔[1]

عکرمہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مشفقانہ سلوک ہی انھیں اسلام کی طرف کھینچ لانے کے لیے کافی تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر جلدی سے آگے بڑھے کہ چادر اوڑھنے کی بھی پروانہ کی۔ ان کے آنے پر خوشی کا اظہار فرمایا اور انھیں مرحبا کہا۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا: «مَرْحَبًا بِالرَّاكِبِ الْمُهَاجِرِ» ''خوش آمدید! اے مہاجر بن کر آنے والے۔''[2]

عکرمہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہتر سلوک سے متاثر ہوئے تو مسلمان ہو گئے۔ اسی طرح حضرت ام حکیم بنت حارث بن ہشام رضی اللہ عنہا کا کردار بھی شاندار ہے۔ انھوں نے اپنے خاوند کے لیے پروانہ امان حاصل کیا اور اپنے آپ کو خطرات سے دو چار کر کے انھیں تلاش کرتی رہیں کہ شاید اللہ تعالیٰ انھیں ہدایت سے نواز دے جیسا کہ انھیں ہدایت نصیب ہو ہی گئی۔ اور جب ان کے خاوند نے ان کے نزدیک آنے کی خواہش کی تو وہ یہ کہتے ہوئے الگ رہیں کہ تم کافر ہو اور میں ایک مسلمان عورت ہوں۔ اس سلوک پر عکرمہ کے لیے اسلام کی عظمت واضح ہو گئی۔ انھوں نے یہ محسوس کر لیا کہ وہ واقعی ایک عظیم دین کے سامنے کھڑے ہیں۔ حضرت ام حکیم رضی اللہ عنہا نے انھیں اسلام کے متعلق غور و فکر کی تحریک دی،

1 المغازي للواقدي: 2/851-853. 2 جامع الترمذي، حديث: 2735، والمعجم الكبير للطبراني: 7/373,374، ومجمع الزوائد للهيثمي: 9/385.

پھر انھیں رسول اللہ ﷺ کے سامنے تاجِ اسلام پہنا دیا گیا۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ اسلام قبول کرنے میں سچے تھے، اسی لیے رسول اللہ ﷺ کی طرف سے (پیش کش کے باوجود) انھوں نے دنیا طلب نہ کی بلکہ صرف یہ سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ میرے پچھلے گناہ معاف فرما دے۔ پھر انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے روبرو قسم اٹھائی کہ وہ جاہلیت کی نسبت فی سبیل اللہ دو گنا خرچ کریں گے اور اسی طرح یہ بھی کہ اللہ کی راہ میں جاہلیت کی نسبت بڑھ چڑھ کر جنگ کریں گے۔ انھوں نے واقعی اپنا وعدہ نبھایا، چنانچہ انھوں نے مرتدین کے خلاف جنگوں میں مسلمان سپہ سالاروں اور عام مجاہدین کی نسبت زیادہ بہادری دکھائی۔ اور شام کی فتوحات میں بھی بطور سپہ سالار شامل ہوئے۔ بالآخر جنگ یرموک میں جام شہادت نوش کیا۔[1]

نبوی تواضع کی اعلیٰ مثال اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے والد گرامی کا قبول اسلام: ابوبکر رضی اللہ عنہ کے والد ابو قحافہ کے قبول اسلام کا قصہ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ مکہ میں داخل ہو کر مسجد حرام میں تشریف لے گئے تو ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے والد گرامی کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے آئے۔ آپ ﷺ نے دیکھ کر فرمایا: «هَلَّا تَرَكْتَ الشَّيْخَ فِي بَيْتِهِ حَتّٰى أَكُونَ أَنَا آتِيهِ فِيهِ» ”بزرگ آدمی کو گھر ہی میں کیوں نہ رہنے دیا؟ میں خود وہاں جا کر ان سے مل لیتا۔“ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ”زیادہ مناسب یہی تھا کہ یہ چل کر آپ کے پاس آئیں۔“ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: پھر آپ ﷺ نے (میرے دادا جان) ابو قحافہ کو اپنے سامنے بٹھا لیا۔ ان کے سینے پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا: «أَسْلِمْ» ”اسلام لے آؤ۔“ ابو قحافہ رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کر لیا۔ ان کے سر کے بال بالکل سفید تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «غَيِّرُوا هٰذَا مِنْ شَعْرِهِ» ”ان کے بال رنگ دو۔“

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي: 7/223-225.

پھر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ انھیں لے کر گھر میں داخل ہوئے۔[1]

یہ بھی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ان کے والد گرامی کے اسلام قبول کرنے پر مبارک باد بھی دی۔[2]

اس واقعے سے اسوۂ نبوی کا پتا چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بڑی عمر کے لوگوں کی عزت واحترام کا منہج دیا ہے۔ آپ ﷺ کا یہ فرمانِ عالی اس کی تاکید کر دیتا ہے:

«لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ يُوَقِّرْ كَبِيرَنَا، وَ يَرْحَمْ صَغِيرَنَا»

''جو ہمارے بڑے کا احترام اور چھوٹے پر شفقت نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔''[3]

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«إِنَّ مِنْ إِجْلَالِ اللّٰهِ تَعَالٰى إِكْرَامَ ذِي الشَّيْبَةِ الْمُسْلِمِ»

''بلاشبہ سفید بالوں والے ضعیف العمر شخص کی تعظیم، اللہ تعالیٰ کی تعظیم میں سے ہے۔''[4]

رسول اللہ ﷺ نے اسلام کی راہ میں مصائب برداشت کرنے والوں، اسلام کے لیے خرچ کرنے والوں اور پہلے اسلام قبول کرنے والوں اور ان کے عزیز و اقارب کی بھی تکریم کا حکم دیا ہے۔[5]

رسول اللہ ﷺ رحم و کرم اور عفو و درگزر کا نمونہ: فضالہ بن عمیر نے رسول اللہ ﷺ

1 مسند أحمد: 6/ 350,349، وصحيح ابن حبان، رقم: 7208، والمستدرك للحاكم: 3/47,46، والمعجم الكبير للطبراني: 24/89,88، ومجمع الزوائد للهيثمي: 6/174,173، والسيرة النبوية لابن هشام: 4/55,54. 2 السيرة النبوية للدكتور مهدي رزق الله، ص: 577. 3 جامع الترمذي، حديث: 1921، ومسند أحمد: 1/257، وصحيح ابن حبان، رقم: 459. 4 سنن أبي داود، حديث: 4843، علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو حسن کہا ہے، دیکھیے: (السلسلة الضعيفة: 7/247) 5 التاريخ الإسلامي للحميدي: 7/195.

کو فتح مکہ کے وقت بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے قتل کرنے کا ارادہ کیا مگر جب نبی ﷺ اس کے قریب ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: «أَفُضَالَةُ؟» ''کیا تم فضالہ ہو؟'' اس نے جواب دیا: ''اے اللہ کے رسول! ہاں فضالہ ہوں۔'' آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: «مَاذَا تُحَدِّثُ بِهِ نَفْسَكَ؟» ''تم اپنے دل میں کیا بات سوچ رہے تھے؟'' فضالہ نے کہا: ''کچھ نہیں، میں (فقط) اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہا تھا۔''

راوی کہتا ہے کہ آپ ﷺ یہ سن کر ہنس پڑے، پھر فرمایا: «اِسْتَغْفِرِ اللّٰهَ» ''فضالہ اللہ سے استغفار کرو۔'' اور ساتھ ہی اپنا دستِ مبارک اس کے سینے پر رکھ دیا۔ اس کا دل پرسکون ہو گیا۔ فضالہ کا کہنا ہے: ''اللہ کی قسم! آپ ﷺ نے دستِ مبارک میرے سینے سے اٹھایا ہی تھا کہ اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوق میں آپ ﷺ سے زیادہ محبوب میرے لیے اور کوئی نہ رہا۔'' فضالہ کہتے ہیں: ''پھر میں اپنے اہل و عیال کی طرف واپس آیا۔ میں ایک عورت کے پاس سے گزرا جس سے گفتگو کیا کرتا تھا تو اس نے پوچھا: ''کوئی خبر لائے ہو تو مجھے بتاؤ۔'' میں نے کہا: ''کوئی خبر نہیں۔'' ساتھ ہی فضالہ نے یہ اشعار پڑھے:

قَالَتْ هَلُمَّ إِلَى الْحَدِيثِ فَقُلْتُ لَا   يَأْبَى عَلَيْكِ اللّٰهُ وَالْإِسْلَامُ

''اس نے کہا: ''آؤ باتیں کریں۔'' میں نے کہا: ''نہیں، اللہ تعالیٰ اور اسلام منع کرتا ہے۔''

لَوْمَا رَأَيْتِ مُحَمَّدًا وَّقَبِيلَهُ   بِالْفَتْحِ يَوْمَ تُكَسَّرُ الْأَصْنَامُ

''اگر تو محمد ﷺ اور آپ کی جماعت کو فتح مکہ کے موقع پر دیکھ لیتی جب بت ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔''

لَرَأَيْتِ دِينَ اللّٰهِ أَضْحٰى بَيِّنًا   وَالشِّرْكُ يَغْشٰى وَجْهَهُ الْإِظْلَامُ

''تو تو دیکھ لیتی کہ اللہ تعالیٰ کا دین بالکل واضح ہو گیا ہے اور شرک کے چہرے پر تاریکی چھا گئی ہے۔''

حدود اللہ میں سفارش کی حیثیت؟

حضرت عروہ بن زبیر کہتے ہیں کہ ایک عورت نے رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں چوری کر لی، اس کی برادری گھبرا کر اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کے پاس پہنچی تا کہ سفارش کر سکیں۔ عروہ بن زبیر کہتے ہیں کہ جب اسامہ رضی اللہ عنہ نے اس عورت کے متعلق بات کی تو آپ ﷺ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ جب پچھلا پہر ہوا تو رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے اور خطبہ ارشاد فرمایا:

«أَمَّا بَعْدُ! فَإِنَّمَا أَهْلَكَ النَّاسَ قَبْلَكُمْ: أَنَّهُمْ كَانُوا إِذَا سَرَقَ فِيهِمُ الشَّرِيفُ تَرَكُوهُ، وَإِذَا سَرَقَ فِيهِمُ الضَّعِيفُ أَقَامُوا عَلَيْهِ الْحَدَّ، وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ! لَوْ أَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ يَدَهَا»

''امابعد: تم سے پہلے لوگوں کو اس بات نے تباہ کیا کہ جب ان میں کوئی مالدار اور وڈیرہ آدمی چوری کرتا تو وہ اس کو چھوڑ دیتے اور جب کوئی غریب چوری کرتا تو اس پر حد قائم کرتے۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔''

پھر رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا اور اس عورت کا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔ اس عورت نے اپنی توبہ کا پاس لحاظ رکھا اور اس نے نکاح کر لیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ اس کے بعد وہ میرے پاس آیا کرتی تھی اور میں اس کی ضرورت رسول اللہ ﷺ سے عرض کر دیتی۔[1]

یوں امت کی تربیت کا عمل جاری رہتا ہے۔ شریعت الٰہی کے نفاذ کے سلسلے میں

1 صحيح البخاري، حديث:4304، وصحيح مسلم، حديث:(9)-1688.

پورے عدل و انصاف سے قریبی اور دور والے سے سلوک ہو رہا ہے۔ دونوں پر حد کے نفاذ میں کوئی اونچ نیچ نہیں ہے۔ قریش نے یہ جان لیا کہ پروردگار کی شریعت میں انھیں عام لوگوں کے مقابلے میں کوئی امتیاز حاصل نہیں۔ رب العالمین کے روبرو تمام لوگ برابر ہیں۔ شرف و عزت کے پیمانے صرف اللہ تعالیٰ کے احکام و اوامر سے منسلک ہو گئے۔ [1]

''پناہ یا امان'' دینے کا قانون

ام ہانی رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بالائی مکہ میں نزول فرمایا تو میرے دو دیور دوڑتے ہوئے آئے۔ وہ دونوں خاندان بنی مخزوم سے تعلق رکھتے تھے۔ ام ہانی رضی اللہ عنہا ہبیرہ بن ابو وہب مخزومی کی زوجیت میں تھیں۔

حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ پھر (اسی وقت) میرے بھائی حضرت علی رضی اللہ عنہ گھر میں داخل ہوئے اور کہا: ''اللہ کی قسم! میں ان دونوں کو ضرور قتل کر دوں گا۔'' میں نے ان دونوں کو اندر کر کے دروازہ بند کر دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بالائی مکہ میں پہنچی۔ میں نے دیکھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک ٹب سے غسل فرما رہے تھے۔ اس ٹب میں آٹے کے نشان بھی نظر آ رہے تھے۔ آپ کی صاحبزادی سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ کے آس پاس پردے کی اوٹ کیے ہوئے تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم غسل سے فارغ ہوئے تو کپڑے لے کر پہنے، پھر چاشت کی آٹھ رکعات نماز ادا کی۔ بعدازاں میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: «مَرْحَباً وَّ أَهْلًا يَّا أُمَّ هَانِئٍ! مَا جَاءَ بِكِ؟» ''خوش آمدید ام ہانی! کیسے آنا ہوا؟'' میں نے اپنے دونوں دیوروں اور ان کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے تاثرات بتائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«قَدْ أَجَرْنَا مَنْ أَجَرْتِ، وَأَمَّنَّا مَنْ أَمَّنْتِ، فَلَا يَقْتُلْهُمَا»

''جسے تم نے پناہ دی اسے ہم نے بھی پناہ دی، جسے تم نے امان دی اسے ہم نے

---

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي: 233/7، ومن معين السيرة لصالح الشامي، ص: 402.

بھی امان دی، لہٰذا علی انھیں قتل نہ کرے۔'' [1]

آنکھ کا اشارہ منصب نبوت کے شایان نہیں

عبداللہ بن سعد بن ابی سرح مسلمان ہو کر کچھ عرصے تک کاتب وحی بھی رہا لیکن پھر مرتد ہو گیا۔ جب رسول اللہ ﷺ مکہ میں داخل ہوئے تو آپ ﷺ نے اس کا خون رائیگاں قرار دے دیا۔ وہ بھاگ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس آگیا جو اس کے رضاعی بھائی تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اسے لے کر امان کی درخواست کے لیے آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے تو رسول اللہ ﷺ خاصی دیر تک خاموش رہے، پھر فرمایا: «نَعَمْ!» ''چلو ٹھیک ہے۔'' اس کے بعد جب وہ عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ چلا گیا تو رسول اللہ ﷺ نے اردگرد بیٹھے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا: «أَمَا كَانَ فِيكُمْ رَجُلٌ رَّشِيدٌ يَّقُومُ إِلٰى هٰذَا حِينَ رَآنِي قَدْ صَمَتُّ فَيَقْتُلَهُ؟» ''تم میں سے کوئی بھی سمجھ دار نہ تھا کہ جس دوران میں نے کوئی جواب نہ دیا اسی اثنا میں وہ اس کی گردن اڑا دیتا۔'' صحابہ نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! آپ اشارہ فرما دیتے۔'' نبی ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ النَّبِيَّ لَا يَقْتُلُ بِإِشَارَةٍ» ''نبی اشارے سے قتل نہیں کرتا۔'' [2]

ایک روایت میں ہے:

«إِنَّهُ لَا يَنْبَغِي لِنَبِيٍّ أَنْ يَّكُونَ لَهُ خَائِنَةُ أَعْيُنٍ»

''آنکھ کا اشارہ (جو خیانت پر مبنی ہو) منصب نبوت کے شایان نہیں۔'' [3]

ابن ہشام کہتے ہیں: ''اس کے بعد عبداللہ بن سعد رضی اللہ عنہ بلند کردار مسلمان ثابت

---

1 صحيح البخاري، حديث: 3171، وصحيح مسلم، حديث: [1669](82)-336. 2 المعجم الأوسط للطبراني، رقم: 6573، ومجمع الزوائد: 167/6، والبداية والنهاية: 296/4. 3 سنن أبي داود، حديث: 2683و4359، والسنن الكبرىٰ للنسائي: 106,105/7، وصحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 528.

ہوئے، پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اور پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انھیں اپنے اپنے عہد خلافت میں عمّال میں شامل کیا تھا۔''[1] ابن کثیر کا کہنا ہے کہ ان کی وفات فجر کی نماز پڑھنے کے بعد گھر ہی میں ہوئی تھی۔[2]

انصار سے محبت کا اعلان

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صفا کی جانب گئے۔ اس پر چڑھ کر ایسی جگہ کھڑے ہوئے جہاں سے بیت اللہ سامنے نظر آتا تھا۔ تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے لگے اور حسب منشا ذکر و دعا کی۔ ادھر انصار نیچے موجود تھے۔

انھوں نے ایک دوسرے سے کہا: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے شہر سے محبت اور اپنی قوم سے نرمی پیدا ہوگئی ہے۔ (لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہیں قیام فرمائیں گے۔)''

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اس دوران وحی آگئی۔ جب وحی کا نزول ہوتا تھا تو ہر کسی کو معلوم ہو جاتا اور اختتام تک کوئی بھی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب نگاہ نہ اٹھاتا تھا، جب وحی مکمل ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سر مبارک اٹھایا اور فرمایا:

«يَامَعْشَرَ الْأَنْصَارِ! قُلْتُمْ: أَمَّا الرَّجُلُ فَأَدْرَكَتْهُ رَغْبَةٌ فِي قَرْيَتِهِ وَرَأْفَةٌ بِعَشِيرَتِهِ؟»

''اے گروہِ انصار! تم نے کہا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے شہر سے محبت اور قوم سے نرمی نے آلیا ہے؟''

انھوں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! واقعی ہم نے ایسا ہی کہا ہے۔'' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا:

«فَمَا اسْمِي إِذًا؟ كَلَّا، إِنِّي عَبْدُاللّٰهِ وَرَسُولُهُ، هَاجَرْتُ إِلَى اللّٰهِ

1 السيرة النبوية لابن هشام: 58/4. 2 البداية والنهاية: 296/4.

وَإِلَيْكُمْ، فَالْمَحْيَا مَحْيَاكُمْ، وَالْمَمَاتُ مَمَاتُكُمْ»

''تو پھر میرا کیا نام ہوگا؟ ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ میں نے اللہ تعالیٰ کی طرف اور تمھاری جانب ہجرت کی تھی۔ میرا جینا مرنا اب تمھارے ساتھ ہے۔''

یہ سن کر تمام انصار روتے ہوئے آپ ﷺ کی طرف آئے اور عرض گزار ہوئے: ''اللہ کی قسم! ہم نے جو کچھ بھی کہا صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی شدید خواہش و چاہت رکھتے ہوئے کہا۔'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: «فَإِنَّ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ لَيُصَدِّقَانِكُمْ وَيَعْذِرَانِكُمْ» ''اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول تمھیں اس میں سچا سمجھتے ہیں اور تمھارا عذر مقبول گردانتے ہیں۔''[1]

شاعرِ قریش عبداللہ بن زبعریٰ کا قبول اسلام

مکہ مکرمہ فتح ہوا تو عبداللہ بن زبعریٰ سہمی نجران کی طرف بھاگ گیا۔ یہ شخص اسلام سے انتہائی دشمنی کرنے والا تھا۔ اسے وہاں بھی حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے اشعار سے واسطہ پڑ گیا۔ ان اشعار میں حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے اسے بزدلی اور راہ فرار اختیار کرنے کی عار دلائی، حسان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

لَا تَعْدِ مَنْ رَجُلًا أَحَلَّكَ بُغْضُهُ
نَجْرَانَ فِي عَيْشٍ أَحَذَّ لَئِيمِ

''ارے! ایسی جگہ کو چھوڑ کر ہرگز آگے تجاوز نہ کر، جس سے دشمنی نے تجھے نجران میں جا پھینکا ہے۔ تو وہاں ایسی زندگی میں ہے جو سب سے الگ، انتہائی گھٹیا اور غیر شریفانہ ہے۔''

[1] صحیح مسلم، حدیث: 1780، ومسند أحمد: 2/539,538.

یعنی (حضرت حسان رضی اللہ عنہ دست بدعا ہیں کہ) اللہ تعالیٰ ہمارے لیے عظیم ہستی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو باقی رکھے، یہ وہ ہستی ہیں جن سے بغض و عناد نے تجھے نجران کے علاقے میں جا پھینکا ہے۔ اے ابن زبعریٰ! اللہ تعالیٰ تجھے دائمی ذلت آمیز زندگی، اہانت آمیز سلوک اور نحوست میں رکھے۔

اس کے بعد (اشعار میں) حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ سے ابن زبعریٰ اور اس کی اولاد کے لیے بددعا کرتے اور غضب الٰہی کے نزول کی درخواست کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ سے سوال کرتے ہیں کہ اسے ہمیشہ ہمیش بدترین عذاب اور دردناک اذیت میں مبتلا رکھے۔[1]

غَضِبَ الْإِلٰهُ عَلَى الزِّبَعْرٰى وَابْنِهِ

وَعَذَابُ سُوءٍ فِي الْحَيَاةِ مُقِيمُ

''اللہ تعالیٰ زبعریٰ اور اس کے بیٹے سے ناراض ہو جائے اور اس پر زندگی بھر دائمی عذاب مسلط رہے۔''

یہ اشعار بہت جلد ابن زبعریٰ تک بھی پہنچ گئے۔ وہ انتہائی تلملایا۔ معاملات کا کئی کئی بار جائزہ لیا، پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرمایا، چنانچہ اس نے اسلام میں داخل ہونے کا پختہ ارادہ کر لیا اور مکہ مکرمہ کی جانب روانہ ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہو کر اسلام قبول کر لینے کا اعلان کر دیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور اسلام کے متعلق میں نے عداوت کا جس طرح بھی اظہار کیا اس کی معافی کی دعا فرمائیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّ الْإِسْلَامَ يَجُبُّ مَاقَبْلَهُ»

''بلاشبہ اسلام سابقہ تمام کوتاہیوں کو ختم کر دیتا ہے۔''[2]

---

[1] الصحابي الشاعر عبداللّٰہ بن الزبعرٰی لمحمد كاتبي، ص: 92. [2] المغازي للواقدي: 848/2.

رسول اللہ ﷺ نے ابن زبعریٰ کو اپنے قریب کرلیا، اس سے محبت بھرا سلوک فرمایا، پھر اسے ایک سوٹ بھی عنایت فرمایا۔[1]

مورخین نے بالاتفاق ذکر کیا ہے کہ ابن زبعریٰ نے اسلام قبول کر لینے کے بعد بہت زیادہ اور بہت عمدہ اشعار کہے جن میں وہ رسول اللہ ﷺ سے معذرت کے آرزومند بھی رہے۔''[2]

حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ابن زبعریٰ کے مدحت رسول ﷺ کی بابت اشعار خاصی تعداد میں ہیں۔

الاصابہ میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا بھی یہی کہنا ہے کہ پھر انھوں نے اسلام قبول کرلیا اور نبی مکرم ﷺ کی مدح کی تو رسول اللہ ﷺ نے اسے ایک سوٹ دینے کا حکم دیا۔[3]

امام قرطبی کا بیان ہے کہ یہ بڑے عمدہ شاعر تھے۔ ان کے مدحت رسول ﷺ میں بڑی تعداد میں ایسے اشعار ہیں جن کے ذریعے وہ حالت کفر میں کہے ہوئے اشعار کو منسوخ کرتے ہیں۔[4]

ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''یہ اسلام کے بڑے بڑے دشمنوں میں سے ایک تھا اور ان شعراء میں سے تھا جنھوں نے اپنی پوری ہمت وقوت مسلمانوں کی مذمت میں صرف کر دی، پھر اللہ تعالیٰ نے اسے اسلام کی طرف جھکاؤ کی توفیق بخشی اور توبہ قبول فرما کر اس پر احسان وانعام فرمایا۔ اس پر یہ احسان بھی فرمایا کہ قبولِ اسلام کے بعد یہ اسلام کی نصرت و حمایت کے ساتھ ساتھ اس پر اٹھنے والے اعتراضات کا دفاع کرتے رہے۔[5]

ابن زبعریٰ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی مدح سرائی میں بہت سے اشعار کہے، اسی طرح قبول اسلام سے قبل اسلام دشمنی اور قبولِ اسلام میں تاخیر پر ندامت کی بابت بھی

---

1 الأعلام للزركلي: 87/4، والإصابة لابن حجر: 308/2. 2 الصحابي الشاعر عبدالله بن الزبعرى، ص: 97. 3 الإصابة: 308/2. 4 تفسير القرطبي: 407/6. 5 البداية والنهاية: 308/4.

اشعار کہے۔ ان اشعار میں سے چند ایک کا ترجمہ قارئین کے پیشِ خدمت ہے:

''ایسی تاریک و سیاہ رات جس میں تاریکیاں تہ بہ تہ تھیں، طرح طرح کے وساوس اور غموں نے میری نیند اُڑا دی۔''

''اس کے باعث کہ مجھے یہ خبر پہنچی تھی کہ احمد مصطفیٰ ﷺ نے میری مذمت و ملامت کی ہے، وہ رات میں نے بیداری میں گزاری۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مجھے بخار ہو رہا ہے۔''

''اے ان لوگوں میں سے سب سے اعلیٰ ہستی جنھیں کسی مضبوط، تیز رفتار مناسب اعضاء والی اونٹنی نے اپنے اوپر بٹھایا ہے، یعنی اعلیٰ اور تیز رفتار اونٹوں پر سوار ہونے والوں میں سے اعلیٰ شخصیت، عربوں میں سے اعلیٰ ہستی!''

''میں آپ سے اپنی اس کوشش پر معذرت خواہ ہوں جس کا تانا بانا (الفاظ و معانی) میں نے خود ہی گھڑا اور دراصل میں اس وقت (جب یہ اشعار کہے) گمراہی میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔''

''یہ ان دنوں کی باتیں ہیں جب ایک طرف مجھے قبیلہ سہم کے لوگ گمراہ کن نظریات پر آمادہ کرتے تھے تو دوسری طرف قبیلہ مخزوم کے لوگ گمراہ کن عقائد پر ابھارتے تھے۔''[1]

غزوۂ فتح مکہ سے ماخوذ احکامِ شرعیہ

فتح مکہ کے دوران کئی ایک شرعی مسائل واضح ہو گئے، چند ایک حسب ذیل ہیں:

(ا) مسافر رمضان میں روزہ رکھ بھی سکتا ہے اور افطار بھی کر سکتا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ سے لشکر کی روانگی کے موقع پر روزہ رکھا تھا اور کدید پہنچ کر افطار کر دیا۔[2]

1 البداية والنهاية: 4/307، 308. 2 السيرة النبوية للدكتور مهدي رزق الله، ص: 574.

(ب) رسول اللہ ﷺ نے چاشت کی ہلکی پھلکی آٹھ رکعات ادا فرمائیں۔[1]

(ج) مسافر چار رکعات والی نماز کو قصر کرے گا۔ نبی مکرم ﷺ مکہ مکرمہ میں انیس (19) دن قصر کرتے رہے۔[2]

(د) متعہ تین دن کے لیے مباح کیا گیا اور اس کے بعد ہمیشہ کے لیے حرام ہو گیا۔[3]

امام نووی کا خیال ہے کہ متعہ دو مرتبہ حلال اور دو ہی مرتبہ حرام ہوا ہے۔[4] فتح خیبر سے پہلے متعہ حلال تھا اور فتح خیبر کے دن حرام کر دیا گیا، پھر فتح مکہ کے موقع پر حلال ہوا اور دوسری مرتبہ ہمیشہ کے لیے حرام کر دیا گیا۔ جبکہ امام ابن قیم رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ متعہ فتح خیبر کے موقع پر حرام نہیں کیا گیا بلکہ صرف فتح مکہ کے موقع پر حرام ہوا۔[5] امام ابن قیم رحمہ اللہ نے جہاں غزوۂ خیبر اور غزوۂ فتح مکہ کے واقعات سے فقہی مسائل کا استنباط کیا ہے وہاں اس مسئلے (حرمت متعہ) پر سیر حاصل بحث اور ائمہ کرام کے خیالات و نظریات کا جائزہ لیا ہے۔

بہر حال اس بات پر اتفاق ہے کہ فتح مکہ کے بعد متعہ ہمیشہ کے لیے حرام کر دیا گیا۔[6]

(ہ) رسول اللہ ﷺ نے طے فرما دیا کہ بچہ بستر والے کا ہوتا ہے اور زنا کرنے والے کے لیے پتھر ہیں۔ جس طرح کہ زمعہ کی لونڈی کے بیٹے کے متعلق یہ بات حدیث میں وارد ہے۔ اس کے متعلق حضرت سعد بن ابی وقاص اور عبد بن زمعہ نے جھگڑا کیا تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے متعلق فیصلہ فرمایا کہ یہ عبد بن زمعہ کا ہے کیونکہ وہ عبد بن زمعہ کے باپ کے بستر پر پیدا ہوا ہے۔[7]

(و) تہائی مال سے زائد کی وصیت جائز نہیں، جیسا کہ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے قصے سے

---

1 السيرة النبوية للدكتور مهدي رزق الله، ص: 574. 2 المجتمع المدني للدكتور العمري، ص: 185. 3 السيرة النبوية للدكتور مهدي رزق الله، ص: 575. 4 شرح النووي: 181/9.
5 زاد المعاد: 3/343-345 و459-464. 6 السيرة النبوية للدكتور مهدي رزق الله، ص: 575.
7 صحيح البخاري، حديث: 4303.

ظاہر ہے۔ جب وہ مکہ مکرمہ میں بیمار ہوئے اور رسول اللہ ﷺ سے تہائی مال سے زیادہ کی وصیت کرنے کے متعلق مشورہ کیا۔ [1]

مکہ مکرمہ میں رسول اللہ ﷺ کی اقامت گاہ

رسول اللہ ﷺ نے ''حجون'' میں قیام فرمایا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں قریش نے بنو ہاشم اور مسلمانوں سے قطع تعلقی کا معاہدہ کیا تھا۔ جب حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما نے دریافت کیا کہ کیا آپ اپنے گھر میں تشریف فرما ہوں گے؟ تو فرمایا:

«وَهَلْ تَرَكَ لَنَا عَقِيلٌ مِّنْ رِّبَاعٍ أَوْ دُوْرٍ؟»

''کیا عقیل نے ہمارے لیے رہنے کو کوئی گھر چھوڑا ہے؟'' [2]

رسول اللہ ﷺ واضح طور پر فرما رہے تھے: «لَا يَرِثُ الْمُسْلِمُ الْكَافِرَ»

''مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوتا۔'' [3]

عقیل اور اس کا بھائی طالب ابو طالب کے وارث ہوئے تھے تو عقیل نے تمام گھر فروخت کر دیے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہ مسلمان ہونے کی بنا پر وارث ہی نہ ٹھہرے تھے کیونکہ ابو طالب نے حالت کفر میں وفات پائی تھی۔ [4]

فتح مکہ کے نتائج

فتح مکہ کے متعدد نتائج تھے:

① مکہ مکرمہ اب کفار کی دسترس سے نکل کر مسلمانوں کی عملداری میں آ گیا تھا، چنانچہ اس طرح حنین اور طائف میں شرک کے گڑھ کا خاتمہ کرنے اور پھر اس کے بعد سارے جہان

---

1 المجتمع المدني للدكتور العمري، ص: 186. 2 صحيح البخاري، حديث: 1588، وصحيح مسلم، حديث: 1351. 3 صحيح البخاري، حديث: 6764، وصحيح مسلم، حديث: 1614، والسيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 482/2. 4 السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 482/2.

سے اسے ختم کرنے کا موقع میسر آ گیا۔

② جزیرۃ العرب میں مسلمان سب سے بڑی قوت بن کر ابھرے۔اور فتح مکہ کے ساتھ ہی رسول اللہ ﷺ کی امید بَر آئی کہ قریش کو اسلام قبول کر لینا چاہیے۔مسلمان جزیرۃ العرب میں ایک ایسی قوت کے طور پر ابھر کر سامنے آئے جس کے سامنے کوئی قبائلی قوت ٹھہر نہ سکتی تھی، جبکہ اس میں اتنی قوت تھی کہ سارے عرب کو اسلام کے پرچم تلے جمع کر لے اور آس پاس کے علاقوں تک رسائی حاصل کرے۔تاکہ ظلم کی حکومتوں کو مٹایا جاسکے اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو آزادی سے ہمکنار کیا جائے اور وہ اللہ تعالیٰ کے دین میں داخل ہو کر اس اکیلے معبود کی عبادت کریں۔[1]

③ اس فتح کے دینی، سیاسی اور معاشرتی اثرات تھے۔جو شخص بھی اس مبارک فتح کو گہری نظر سے دیکھے گا اسے وہ اثرات واضح طور پر نظر آئیں گے۔معاشرتی اثرات تو اس طرح سامنے آئے کہ رسول گرامی ﷺ نے لوگوں سے انتہائی نرمی کا سلوک کیا اور ان کی راہنمائی کی تاکہ ان کی خود اعتمادی بحال ہو اور جس نئی صورتِ حال نے ان کے شہر پر غلبہ حاصل کر لیا تھا اس پر بھی انھیں یقین آ جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ چھوڑتے وقت حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یہیں رکھا تھا تاکہ وہ نماز پڑھائیں اور دین کے مسائل بتائیں۔

رہے سیاسی اقدامات تو رسول اللہ ﷺ نے مکہ مکرمہ پر حضرت عتاب بن اَسید رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر فرمایا تاکہ وہ لوگوں میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کریں، کمزور کو اس کا حق دلائیں اور ظالم کے خلاف مظلوم کی مدد و حمایت کریں۔[2]

فتح مکہ کے دینی اثرات یوں مرتب ہوئے کہ فتح مکہ اور اس شہر کے اسلامی قلمرو میں

1 قيادة الرسول ﷺ السياسية والعسكرية لأحمد عرموش، ص: 129. 2 تأملات في سيرة الرسول ﷺ لمحمد السيد الوكيل، ص: 466.

شامل ہونے سے تمام عرب کو یقین آ گیا کہ اسلام ہی (انسانوں کے لیے) اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین ہے، چنانچہ اب وہ گروہ در گروہ اسلام میں داخل ہونے لگے۔[1]

④ مومنوں کو باوقار جگہ دینے کے متعلق اللہ کا وعدہ پورا ہو گیا۔ تمام مراحل طے کر لیے گئے۔ اور اس کے لیے اہل ایمان نے گراں قدر قربانیاں دے کر تمام شرائط پوری کر دی تھیں، مثلاً: آزمائش کا سامنا کرنا، مزاحمت کا طریقہ اختیار کرنا، رفتہ رفتہ استحکام اور قوت حاصل کرنا، دلوں میں انقلاب برپا کرنا اور تمام اسباب اختیار کر لینا۔

ہم یہاں وہ تعجب خیز منظر نہیں بھول سکتے کہ ایک طرف حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا مکہ کے سنگریزوں پر، وادیوں میں، بیڑیوں اور زنجیروں میں جکڑے «أحد أحد» پکارنا اور آج ان کا کعبۃ اللہ کی چھت پر چڑھنا اور حلاوت ایمانی سے اپنی سریلی آواز میں اذان کہنا کتنا بڑا انقلاب تھا۔

1 تأملات في سيرة الرسول ﷺ لمحمد السيد الوكيل، ص:264.

18

غزوۂ حنین و طائف 8ھ

باب: 1 اسباب و واقعات اور نبوی منصوبہ بندی

باب: 2 لوگوں سے معاملات میں رسول اللہ ﷺ کی دور اندیشی

باب: 3 اسباق، عبرتیں اور فوائد

باب: 4 تبوک سے قبل اہم واقعات

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ
وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ
فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ
الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ○

''یقیناً اللہ تعالیٰ نے بہت سے میدانوں میں تمھاری مدد فرمائی اور حنین کی لڑائی والے دن بھی۔ جبکہ تمھیں اپنی کثرت پر ناز ہو گیا تھا لیکن اس نے تمھیں کوئی فائدہ نہ دیا بلکہ زمین باوجود اپنی کشادگی کے تم پر تنگ ہو گئی پھر تم پیٹھ پھیر کر مڑ گئے۔''

(التوبۃ 9:25)

باب 1

اسباب و واقعات اور نبوی منصوبہ بندی

مکہ مکرمہ فتح ہو گیا اور قریش نے اطاعت قبول کر لی تو ہوازن اور ثقیف کے کان کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے باہم مشورہ کیا کہ اب محمد (ﷺ) ہمارے ساتھ جنگ کرنے کے لیے فارغ ہو چکے ہیں، لہٰذا ان کے جنگ مسلط کرنے سے پہلے ہی ہم ان سے جا لڑیں۔ اس پر اتفاق کر لینے کے بعد انھوں نے مالک بن عوف نصری کو اپنا سپہ سالار مقرر کر لیا۔ کعب اور کلاب کے سوا تمام ہوازن، ثقیف اور بنو ہلال اکٹھے ہو گئے۔ ان کے ہمراہ مشہور جنگجو، بہادر اور صائب الرائے درید بن صمہ بھی تھا۔ اگرچہ اب وہ شدید بڑھاپے کی بنا پر صرف رائے ہی دے سکتا تھا۔

مالک بن عوف کی رائے تھی کہ بال بچے اور تمام جانور ساتھ لے چلیں تاکہ بھاگنے کا تصور ہی نہ رہے۔ اس کا خیال جب درید بن صمہ کو معلوم ہوا تو اس نے دریافت کیا: ''وہ کس لیے؟''

مالک بن عوف نے کہا: ''میں چاہتا ہوں کہ ہر آدمی کی پشت پر اس کے ڈھور ڈنگر اور گھر بار ہو۔ وہ ان کی حفاظت کے لیے جان لڑائے۔'' درید نے کہا: ''تم تو بخدا چرواہے ہو، شکست خوردہ کو بھلا کوئی روک سکتا ہے؟ کیونکہ اگر فیصلہ تمھارے حق میں ہوتا ہے تو بھی صرف ایک شخص اپنی تلوار اور نیزے کے ساتھ ہی تیرے کام آ سکتا ہے لیکن اگر معاملہ الٹ ہو جاتا ہے اور تم مغلوب ہوتے ہو تو تب تم اپنے مال اور اہل و عیال سمیت رسوا ہو

جاؤ گے!!'' مگر اس نے درید کا مشورہ تسلیم نہ کیا۔[1]

اسلامی سپاہ کی پیش قدمی

مسلمان پانچ شوال کو حنین کی جانب روانہ ہوئے اور دس شوال شام کو وہاں پہنچ گئے۔[2]

رسول اللہ ﷺ نے نکلتے وقت حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کو مکہ کا امیر مقرر کیا۔ آپ ﷺ کے ساتھ بارہ ہزار کا لشکر تھا۔ ہوازن اور ثقیف کی تعداد دوگنا یا اس سے بھی زیادہ تھی۔ چند نومسلموں نے اسلامی لشکر کا جائزہ لیا تو کہنے لگے: ''آج ہم ہرگز شکست نہیں کھا سکتے کیونکہ ہماری تعداد زیادہ ہے۔'' یوں ان کے دلوں میں غرور آ گیا۔[3]

ہوازن اور ثقیف کے سپہ سالار کا جنگی منصوبہ

مالک بن عوف نے جنگی منصوبے پر کئی پہلوؤں سے مکمل تیاری کی تھی، چند پہلو درج ذیل ہیں:

لشکر کے حوصلوں کو بلند کرنا: مالک بن عوف لشکر میں ثابت قدمی اور بہادری دلانے کے لیے کھڑا ہوا اور لشکر سے یوں مخاطب ہوا: ''آج تک محمد (ﷺ) نے کسی سے جنگ ہی نہیں کی۔ یہ ناتجربہ کار لوگوں پر اچانک حملہ آور ہو جاتا اور اس طرح ان پر فاتح بن بیٹھتا رہا ہے۔''

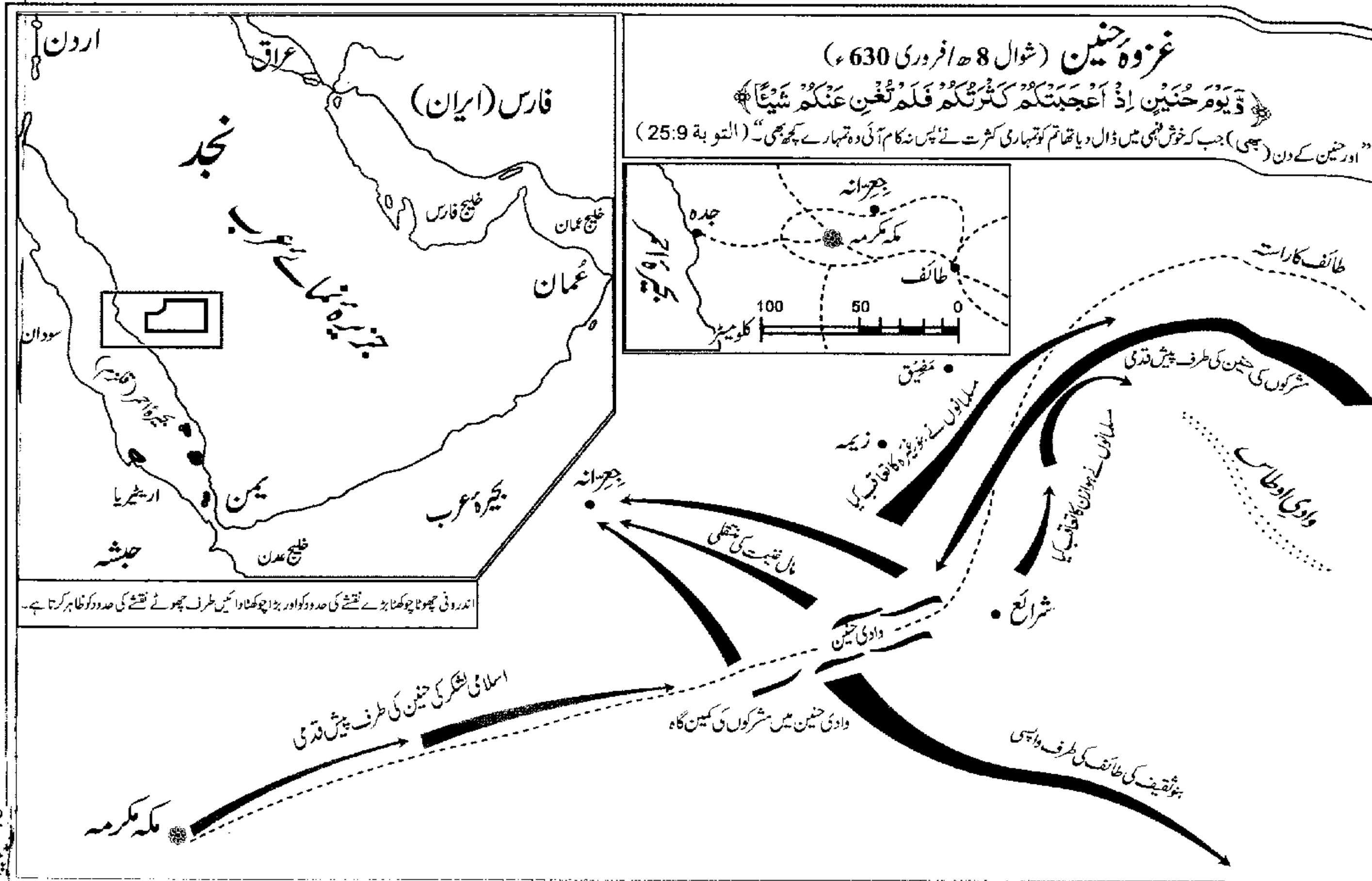
مالک بن عوف نے تمام جنگجوؤں کی اولاد اور ڈھور ڈنگر ان کی پشت پر لا اکٹھے کیے۔ سپہ سالار نے حکم دیا کہ تمام جنگجوؤں کی بیویاں، بچے اور مال ان کی پشت پر جمع کر دیے جائیں۔ اس منصوبے سے اس کا مقصد لڑنے والوں کو بہادری اور ثابت قدمی پر ابھارنا تھا کہ دشمن کے سامنے ڈٹ جائیں۔ کیونکہ لڑنے والا جب یہ سوچے گا کہ اس کا قیمتی اور

1 السيرة النبوية لابن هشام: 88/4، والسيرة النبوية لأبي شهبة: 467/2. 2 الطبقات لابن سعد: 150/2. 3 السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 497/2.

غزوۂ حنین (شوال 8ھ / فروری 630ء)

﴿ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا ﴾

"اور حنین کے دن (بھی) جب کہ خوش فہمی میں ڈال دیا تھا تم کو تمہاری کثرت نے پس نہ کام آئی وہ تمہارے کچھ بھی۔" (التوبة 25:9)



نقشہ 21

معزز سرمایہ تو اس کے ہمرکاب ہے تو اس طرح میدان جنگ میں انھیں چھوڑ کر راہ فرار اختیار کرنا گراں ہوگا۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب ہم نے مکہ فتح کر لیا تو حنین کی جانب جہاد کے لیے نکل پڑے۔ مشرک خوب صفیں باندھ کر آئے۔ پہلے گھڑ سواروں کی صف، پھر پیدل لڑنے والوں کی صف، اس کے پیچھے عورتوں کی صف لگائی گئی پھر بکریوں اور اس کے بعد چوپاؤں کی صف۔ [1]

تلواریں ننگی کرنا اور ان کے میان توڑ دینا: عرب کی عادت تھی کہ لڑائی سے پہلے تلواروں کے میان توڑ دیتے تھے۔ جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ لڑنے والا مخالف کے سامنے فتح یا موت تک لڑتا رہے گا۔ مالک بن عوف نے یہی بات سامنے رکھتے ہوئے تمام لشکر کو میان توڑنے کا حکم دے دیا۔ اس کا کہنا تھا: ''جب دشمن پر تمھاری نگاہ پڑے تو دیکھتے ہی میان توڑ دو اور ان پر یکبارگی ٹوٹ پڑو۔'' [2]

مسلمانوں پر اچانک حملہ کرنے کے لیے کمین گاہوں کی تیاری: مالک بن عوف کے پاس میدان جنگ کی معلومات تھیں۔ اس نے زمینی ہتھیار کو بھی استعمال کرنے کا ارادہ کیا۔ اس نے تجربہ کار شاہسوار کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اسلامی لشکر کے لیے کمین گاہوں کا انتخاب کیا۔ اللہ تعالیٰ کی خصوصی کرم نوازی نہ ہوتی تو اس کی یہ چال مسلمانوں کا صفایا کر دیتی۔

مسلمانوں پر حملہ کرنے کا فیصلہ: لشکر ہوازن کے سپہ سالار کو اندازہ تھا کہ فتح آگے بڑھ کر حملہ کرنے والے کو نصیب ہوتی ہے۔ دفاع کرنے والا عموماً کمزوری دکھاتا ہے۔ اس نے پہلے خود حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ اس چال نے کچھ وقت تک اسے پورا پورا

---

1 صحيح مسلم، حديث: (136)-1059. 2 مجمع الزوائد للهيثمي: 180,179/6، والمستدرك للحاكم: 49,48/3.

فائدہ دیا۔ مگر بعد میں بفضل الٰہی قوت کے پیمانے بدل گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ثابت قدمی دکھائی تو مسلمانوں نے دوبارہ مڑ کر ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا اور دشمن پر غالب آ گئے۔[1]

مسلمانوں کے خلاف نفسیاتی جنگ کا حربہ: اہل ہوازن کی جنگی چالوں میں دلوں پر اثر کرنے والی نفسیاتی چال بھی شامل تھی۔ اس نے مسلمانوں کے دلوں پر رعب طاری کرنے کے لیے نفسیاتی جنگ کا سہارا لیا۔ اس نے میدان جنگ میں لائے گئے ہزاروں اونٹوں پر عورتیں سوار کر دیں۔ دیکھنے والا سمجھتا کہ لشکر کے پیچھے مزید ایک لاکھ جنگجو بھی ہیں، حالانکہ حقیقت ایسی نہ تھی۔[2]

ٹڈی دل لشکر کو روکنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کی منصوبہ بندی

رسول اللہ ﷺ کو جب یہ بات معلوم ہوئی کہ ہوازن جنگ پر آمادہ ہیں تو آپ ﷺ نے درج ذیل منصوبہ بنایا:

لشکر کی مکمل معلومات: عبداللہ بن ابی حدرد اسلمی رضی اللہ عنہ کو ہوازن کی یقینی اور مکمل خبر لانے کو بھیجا۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ وہاں گئے۔ ان میں ایک دو دن قیام کیا اور واپس آ کر رسول اللہ ﷺ کو سب کچھ بتایا۔

عبداللہ رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے حکم پر گئے اور واپس آ کر ان کی خبریں آپ ﷺ کو بتائیں مگر وہ فرائض کی ادائیگی صحیح طور پر نہ کر سکے۔ انھیں چاہیے تھا کہ ان کے ساتھ گھل مل جاتے اور وہ مسلمانوں کے خلاف جو منصوبہ بنا رہے تھے اسے دیکھتے، سنتے اور رسول اللہ ﷺ کو اطلاع دیتے۔ ان کا فرض تھا کہ ان مقامات پر نگاہ ڈالتے جن پر وہ لوگ پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ (چونکہ ایسا نہ ہوا) لہٰذا مسلمانوں کو نشیبی جگہوں پر کمین گاہوں سے اچانک واسطہ پڑا۔ وہیں سے انھوں نے مسلمانوں پر تیروں کی بارش کر دی جس کے نتیجے میں

[1] القيادة العسكرية في عهد الرسول ﷺ للدكتور محمد الرشيد، ص: 252. [2] غزوة حنين لمحمد أحمد باشميل، ص: 128-131.

ابتدائی طور پر مسلمانوں کو شکست کا سامنا ہوا۔ ابتدائی ہزیمت میں ان کمین گاہوں کے متعلق عدم معرفت اہم سبب ثابت ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ نے دشمن کے متعلق چھوٹی بڑی معلومات حاصل کرنے کے لیے پوری کوشش فرمائی تا کہ اس کی روشنی میں دشمن کے مقابلے کے لیے مناسب جنگی کارروائی اور منصوبہ بندی کر سکیں۔[1]

اسلامی لشکر کی تیاری: رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ کے لیے نکلتے وقت دس ہزار کا لشکر تیار فرمایا۔ اب دو ہزار نئے مسلمان بھی ساتھ مل گئے۔ اس طرح اسلامی لشکر 12000 کی تعداد کو پہنچ گیا۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حنین کے دن ہوازن اور غطفان اپنی اولادیں اور جانور سب لے کر آ گئے۔ ادھر آپ ﷺ کے ساتھ دس ہزار صحابہ کے علاوہ دو ہزار نو مسلم بھی مل گئے۔[2]

رسول اللہ ﷺ نے لشکر کو مسلح کرنے کے لیے اپنے چچا زاد نوفل بن حارث بن عبدالمطلب سے تین ہزار نیزے اور صفوان بن امیہ سے زرہیں طلب کیں۔ اور واپسی کی ذمہ داری اپنے سر لی۔ نوفل اور صفوان ابھی تک شرک پر قائم تھے۔ صفوان بن یعلی بن امیہ اپنے باپ یعلیٰ سے اور وہ نبی مکرم ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ان سے کہا: «إِذَا أَتَتْكَ رُسُلِي فَأَعْطِهِمْ۔ أَوْقَالَ: فَادْفَعْ إِلَيْهِمْ۔ ثَلَاثِينَ دِرْعاً وَّثَلَاثِينَ بَعِيرًا أَوْ أَقَلَّ مِنْ ذٰلِكَ» ”میرے بھیجے ہوئے آدمی جب تمھارے پاس آئیں تو انھیں تیس زرہیں اور تیس یا اس سے کم و بیش اونٹ دے دینا۔“ اس نے پوچھا: ”اے اللہ کے رسول! کیا یہ اسلحہ عاریتاً لینا ہے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: «نَعَمْ!» ”ہاں۔“[3]

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صفوان بن امیہ سے حنین کے دن زرہیں

---

1 القيادة العسكرية في عهد الرسول ﷺ للدكتور محمد الرشيد، ص: 369. 2 صحيح مسلم، حديث: (135)-1059. 3 سنن أبي داود، حديث: 3566، والسنن الكبرىٰ للنسائي، حديث: 15744، ومسند أحمد: 4/222.

عاریتاً طلب فرمائیں تو وہ بولا: ''محمد (ﷺ)! کیا آپ یہ اسلحہ غصب کرنے کی غرض سے لینا چاہتے ہیں۔'' فرمایا: «لَا، بَلْ عَارِيَةٌ مَّضْمُونَةٌ» ''نہیں! بلکہ عاریتاً ضمانت پر لیں گے، پھر اسے واپس کر دیں گے۔'' راوی کے بقول جنگ کے موقع پر عاریتاً لیے ہوئے اسلحے میں سے کچھ گم ہو گیا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے گم شدہ اسلحے کا معاوضہ صفوان کو دینا چاہا تو اس نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! آج مجھے مال سے زیادہ اسلام سے رغبت ہے۔''[1]

امام ابوداود کہتے ہیں کہ یہ اسلحہ اس نے اسلام قبول کرنے سے پہلے عاریتاً دیا تھا، پھر بعد میں اس نے اسلام قبول کر لیا۔[2]

میدانِ جنگ میں رسول اللہ ﷺ کی ثابت قدمی اور اس کے اثرات: ہوازن مسلمانوں سے پہلے وادی حنین میں پہنچ گئے۔ انھوں نے میدانِ جنگ میں من پسند جگہیں قبضے میں کر لیں اور اپنے جنگی دستے وہاں کی وادیوں، گھاٹیوں اور درختوں میں پھیلا دیے۔ منصوبہ یہ تھا کہ مسلمان وادی حنین کی نشیبی جگہ پر اتریں تو ان پر اچانک تیروں کی موسلا دھار بارش برسا دیں، چنانچہ جب مشرکین نے ہر طرف سے اچانک تیروں کی بارش کر دی تو مسلمانوں کی صفیں منتشر ہو گئیں اور حالات دگرگوں ہو گئے۔ اس اچانک اور ناگہانی آفت کا نتیجہ یہ ہوا کہ لشکر کا بڑا حصہ شکست کھا کر بھاگنے پر مجبور ہو گیا۔ ہر کوئی اپنا بچاؤ کر رہا تھا۔ اب میدان میں مشرکوں کے حملوں کا نشانہ صرف رسول اللہ ﷺ اور چند ایک مسلمان تھے۔

اس خوفناک منظر کا بیان ہم رسول اللہ ﷺ کے چچا عباس رضی اللہ عنہ سے سنتے ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں حنین کے روز رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھا۔ میں اور ابوسفیان بن حارث آپ ﷺ سے جدا نہ ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ اس وقت ایک سفید خچر پر سوار تھے۔

---

[1] سنن أبي داود، حديث: 3562، ومسند أحمد: 465/6، والمستدرك للحاكم: 49/3، والسنن الكبرىٰ للبيهقي: 89/6. [2] سنن أبي داود، حديث: 3563.

مسلمانوں اور کافروں کا جب آمنا سامنا ہوا تو مسلمان پیٹھ پھیر کر بھاگ رہے تھے مگر رسول اللہ ﷺ خچر کو کافروں کی طرف ایڑ لگا رہے تھے۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں آپ ﷺ کے خچر کی لگام پکڑے ہوئے تھا اور اسے روک رہا تھا کہ تیز نہ چلے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «أَيْ عَبَّاسُ! نَادِ أَصْحَابَ السَّمُرَةِ» ”اے عباس! بیعت رضوان والوں کو پکارو۔“

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی آواز نہایت بلند تھی۔ انھوں نے بلند آواز سے کہا: ”کہاں ہیں موت پر بیعت کرنے والے؟“ یہ سنتے ہی اللہ کی قسم! وہ ایسے لوٹے جیسے گائے اپنے بچوں کے پاس بھاگتی ہوئی پلٹتی ہے۔ اور کہنے لگے: ”ہم حاضر ہیں، حاضر ہیں۔“ پھر وہ کفار سے لڑنے لگے، پھر انصار کو یوں بلایا: ”اے انصار کے لوگو! اے انصار کی جماعت!“ پھر پکار بنو حارث بن خزرج تک محدود ہوگئی۔ اب رسول اللہ ﷺ نے اپنے خچر پر بیٹھ کر میدان جنگ کی جانب دیکھا اور فرمایا: «هٰذَا حِينَ حَمِيَ الْوَطِيسُ»

”یہ وقت ہے تنور کے جوش مارنے کا (اب جنگ خوب گرما گرمی سے ہو رہی ہے۔)“[1]

حنین کے دن اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ کی کئی طرح سے مدد فرمائی:

- آسمان سے فرشتوں کا اترنا۔
- رعب و دبدبہ کا نزول۔[2]
- کنکریوں کی دو مٹھیوں اور مٹی کا دشمن کی آنکھوں میں اثر انداز ہونا۔

کنکریاں اور مٹی وہ مادی اسلحہ تھا جس کے ذریعے حنین کے دن اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کی مدد فرمائی۔ کنکریوں اور مٹی کی وہ دو مٹھیاں جنھیں آپ ﷺ نے مشرکوں

1 صحیح مسلم، حدیث: 1775، والمصنف لعبدالرزاق: 380,379/5، والسیرۃ النبویۃ لابن هشام: 87/4. 2 صحیح السیرۃ النبویۃ لإبراهیم العلي، ص: 559.

کے چہروں پر پھینکا۔ ان میں سے ہر کوئی اس کا اثر محسوس کرنے لگا اور بالآخر یہی ان کی شکست کا سبب بنیں۔[1]

حضرت عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ کنکریاں پکڑیں اور انھیں کفار کے چہروں کی جانب پھینکتے ہوئے فرمایا: «اِنْهَزَمُوا وَرَبِّ مُحَمَّدٍ!» ''محمد کے رب کی قسم! کافر شکست کھا گئے۔''

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں دیکھنے لگا تو جنگ ابھی پہلی حالت ہی پر جاری تھی۔ مگر اللہ کی قسم! جونہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف کنکریاں پھینکیں تو میں کیا دیکھتا ہوں کہ ان کا زور ٹوٹ گیا اور جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔[2]

اوطاس اور طائف کی طرف بھاگنے والوں کا تعاقب

سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا کہنا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حنین کی لڑائی سے فارغ ہوئے تو ابو عامر کو لشکر دے کر اوطاس کی جانب بھیجا۔ ان کی درید بن صمہ سے مڈھ بھیڑ ہوئی۔ درید مارا گیا اور اس کے ساتھیوں کو اللہ تعالیٰ نے شکست دی۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ابو عامر کے ساتھ روانہ کیا۔ ابو عامر کے گھٹنے پر ایک جشمی کا تیر لگا جو اس جگہ پیوست ہو گیا۔ میں نے ان کے پاس پہنچ کر پوچھا: ''چچا جان! یہ تیر آپ کو کس نے مارا؟'' انھوں نے کہا: ''فلاں شخص نے مجھے قتل کرنے کے لیے تیر مارا ہے۔'' میں نے اس شخص کا پیچھا کیا اور اس سے جا ملا۔ اس نے جو مجھے دیکھا تو بھاگ کھڑا ہوا۔ میں اس کے پیچھے ہولیا اور اسے کہتا جا رہا تھا: ''او بے حیا! کیا تو ٹھہرتا نہیں۔'' تو وہ رک گیا۔ پھر میرا اس سے مقابلہ ہوا۔ اس نے بھی وار کیا، میں نے بھی وار کیا، آخر میں نے اسے مار ڈالا۔ میں نے واپس آ کر ابو عامر کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے

1 القيادة العسكرية في عهد الرسول ﷺ للدكتور محمد الرشيد، ص: 259. 2 صحيح مسلم، حديث: 1775.

آپ کے قاتل کو مار دیا ہے۔ ابو عامر کہنے لگے: ''اب یہ تیر نکال دو۔'' میں نے وہ تیر نکالا تو وہاں سے پانی نکلا (نہ کہ خون۔) ابو عامر نے کہا: ''اے میرے بھتیجے! رسول اللہ ﷺ کو میری طرف سے سلام کہنا اور عرض کرنا: ''میرے لیے بخشش کی دعا فرمائیں۔'' اور ابو عامر نے مجھے لوگوں کا امیر بنا دیا۔ تھوڑی دیر زندہ رہنے کے بعد وہ فوت ہو گئے۔ جب میں لوٹ کر آیا تو رسول اللہ ﷺ کے پاس گیا۔ آپ ﷺ خیمے میں بان کی چار پائی پر تشریف فرما تھے۔ آپ کی پیٹھ اور پسلیوں پر چارپائی کے بان کا نشان تھا۔ میں نے اپنا سارا قصہ بیان کیا، ابو عامر کا حال ذکر کیا اور ان کا یہ کہنا بھی کہ میرے لیے استغفار کی درخواست کیجیے گا۔ آپ ﷺ نے پانی منگوایا، وضو فرمایا، اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور کہا: «اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِعُبَيْدٍ أَبِي عَامِرٍ» ''اے اللہ! ابو عامر کو بخش دے۔'' میں نے آپ ﷺ کے دونوں بغلوں کی سفیدی دیکھی، آپ ﷺ نے پھر دعا فرمائی: «اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَوْقَ كَثِيرٍ مِّنْ خَلْقِكَ مِنَ النَّاسِ» ''اے اللہ! ابو عامر کو قیامت کے دن بہت سے لوگوں کا سردار بنا۔'' میں نے عرض کیا: ''اور میرے لیے بھی بخشش کی دعا فرما دیجیے۔'' تو آپ ﷺ نے دعا فرمائی: «اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِعَبْدِ اللّٰهِ بْنِ قَيْسٍ ذَنْبَهُ وَأَدْخِلْهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مُدْخَلًا كَرِيمًا» ''اے اللہ! عبداللہ بن قیس (ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ) کے گناہ معاف فرما دے اور قیامت کے روز اس کو داخل ہونے کی باعزت جگہ (جنت میں) داخل فرما۔''

ابو بردہ کہتے ہیں کہ ایک دعا ابو عامر رضی اللہ عنہ کے لیے کی اور دوسری ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے لیے تھی۔ (ابو بردہ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے بیٹے اور اس حدیث کے راوی ہیں۔)[1]

طائف کی جانب بھاگنے والوں کا محاصرہ

رسول اللہ ﷺ نے اہل طائف کا محاصرہ کیا اور ان سے جنگ اور محاصرے کے لیے

[1] صحيح البخاري، حديث:2884، وصحيح مسلم، حديث:2498.

نئے نئے طریقے استعمال کیے۔ اور شوریٰ سے مشورہ بھی لیا۔ محاصرے کے وقت ایک مناسب جگہ پسند کی اور دشمن کو ذہنی طور پر مرعوب کرنے کے لیے اور ان پر اپنی دھاک بٹھانے کے لیے بطور ہتھیار جدید اسالیب اختیار فرمائے جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

جنگ کے لیے نیا انداز

طائف کا محاصرہ کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے ایک نیا ہتھیار استعمال کیا جو کبھی اس سے پہلے استعمال نہ کیا گیا تھا۔

منجنیق اور دبابہ: یہ بات ثابت ہے کہ طائف میں ثقیف کے قلعے کا محاصرہ کرتے وقت آپ ﷺ نے منجنیق کا ہتھیار استعمال کیا۔[1]

منجنیق بھاری اسلحہ ہے۔ یہ محاصرے کے دوران بڑے بڑے پتھر پھینکنے کے کام آتا ہے۔ اس کے ذریعے قلعے کی فصیل اور بلند مینار گرائے جاتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ بڑے بڑے گولے پھینک کر آگ لگانے کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ جنگ میں منجنیق کو استعمال کرنے کے لیے ایک خصوصی دستہ تشکیل دیا جاتا ہے جو اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔[2]

طائف کے محاصرے میں پہلی مرتبہ جو اسلحہ رسول اللہ ﷺ نے استعمال کیا اس میں دبابہ بھی شامل تھا۔ یہ لکڑی کا بنا چھوٹے کمرے کی طرح کا اسلحہ ہوتا ہے جسے دشمن کے تیروں سے بچاؤ کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ اسے قلعے کی دیوار توڑنے کے لیے بھی کام میں لایا جاتا ہے۔ یہ اہل لشکر کو تیروں سے محفوظ چھت فراہم کرتا ہے۔[3]

کانٹے دار پھندا (گوکھرو): یہ بھی طائف میں پہلی بار استعمال ہونے والا جدید اسلحہ تھا۔ یہ ایک موثر دفاعی ہتھیار ہے۔ دو لکڑیاں صلیب کی شکل پر باندھ کر ساتھ کانٹے

---

1 جامع الترمذي، حديث:2762، والمراسيل لأبي داود، حديث:335. 2 المدرسة العسكرية الإسلامية للواء محمد فرج، ص: 407. 3 القيادة العسكرية في عهد الرسول ﷺ للدكتور محمد الرشيد، ص:405.

باندھے جاتے ہیں۔ اس طرح یہ چار کونوں کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ کسی جگہ اسے پھینک دیں تو اس کا ایک پہلو اوپر اٹھا رہتا ہے اور گھوڑوں اور پیدل چلنے والوں کو گرانے کا کام دیتا ہے، اس طرح میدان جنگ کی تیز حرکت رک جاتی ہے۔[1]

اصحاب المغازی والسیر نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل طائف کا محاصرہ کرتے وقت یہ اسلحہ بھی استعمال کیا۔ آپ ﷺ نے اپنے لشکروں کو ثقیف کے قلعے کے اردگرد کانٹے دار پھندے پھیلا دینے کا حکم دیا۔[2]

رسول اللہ ﷺ کے اس عمل میں امت کی قیادت کے لیے خصوصاً اور عام مسلمانوں کے لیے عموماً راہ نمائی ہے کہ اپنی عقل وفکر کو نئی سے نئی اور نفع مند اشیاء سے استفادہ کرنے سے روک نہ رکھیں بلکہ انھیں ہر اس چیز سے فائدہ حاصل کرنا چاہیے جو امت کے لیے نفع مند اور مصلحت والی ہو اور دشمن سے امت کا دفاع کر سکے۔

جنگ کے موقع پر مناسب جگہ کا انتخاب

اسلامی لشکر قلعے سے قریب ہی (غیر محفوظ) کھلی جگہ پر فروکش ہوا۔ ابھی مکمل لشکر نے پڑاؤ بھی نہ ڈالا تھا کہ دشمن نے تیروں کی بارش کر دی۔ بہت سے لوگ تیروں کی زد میں آگئے۔ اس وقت حضرت حباب بن منذر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کو اس جگہ کے بجائے اہل طائف کے تیروں سے محفوظ جگہ منتقل ہونے کا مشورہ دیا جسے آپ ﷺ نے قبول فرمایا۔ حضرت حباب رضی اللہ عنہ کو وسیع جنگی تجربہ حاصل تھا، لہٰذا آپ ﷺ نے انھیں مناسب جگہ ڈھونڈنے کی ذمہ داری سونپ دی۔ یہ گئے اور ایک مناسب جگہ کی نشاندہی کر کے واپس آئے اور نبی مکرم ﷺ کو اطلاع دی۔ آپ ﷺ نے لشکر کو اس نئی جگہ منتقل ہونے کا حکم صادر فرمایا۔

---

[1] الفن الحربي في صدر الإسلام للواء عبدالرؤف عون، ص: 195. [2] الطبقات الكبرىٰ: 214/2.

اس کارروائی کے عینی شاہد حضرت عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

جب ہم نے ان کے پاس جا کر پڑاؤ ڈالا تو ہمارے اوپر تیروں کی اتنی شدید بارش ہوئی کہ جیسے ٹڈی دل کا تیز حملہ ہو، اس حالت کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے، پھر ہم نے اپنا دفاع کیا مگر مسلمانوں میں سے کئی لوگ زخمی ہو گئے۔ ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حباب رضی اللہ عنہ کو بلا کر فرمایا کہ دشمن سے ذرا ہٹ کر کوئی مناسب اور بلند جگہ دیکھو، حباب رضی اللہ عنہ چلے گئے۔ یہاں تک کہ مسجد کی جگہ پہنچ گئے۔ (اب یہی مسجد ابن عباس کے نام سے معروف ہے۔)

پھر واپس آ کر حباب رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام لشکر کو وہاں چلے جانے کا حکم دیا۔[1]

مرعوب کرنا اور نفسیاتی جنگ کا ہتھیار استعمال کرنا

اہل طائف کے ساتھ جب جنگ اور مقابلہ بازی سخت ہو گئی اور انھوں نے مسلمانوں کی ایک خاصی تعداد شہید بھی کر دی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے انگور اور کھجور کے وہ باغات جو طائف کے اردگرد تھے جلانے کا حکم دیا تا کہ ان پر دباؤ بڑھایا جائے۔ اور جب ثقیف نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ اور رشتہ داری کا واسطہ دیا کہ یہ کام روک دیا جائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف کے غلاموں تک یہ بات پہنچائی کہ جو کوئی بھی قلعے سے اتر پڑے گا اور مسلمانوں کی جانب آ جائے گا وہ آزاد ہے۔ یہ سن کر تینتیس (33) غلام قلعے سے باہر آ گئے۔ جن میں ابوبکرہ ثقفی بھی تھے۔ انھوں نے اسلام قبول کر لیا تو انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آزاد کر دیا اور ثقیف کے اسلام قبول کر لینے پر بھی انھیں واپس نہ کیا۔[2]

[1] المغازي للواقدي: 1/416. [2] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 2/510.

محاصرہ ختم کرنے کی حکمت

رسول اللہ ﷺ کی طرف سے محاصرہ ختم کرنے کی حکمتِ عملی بالکل واضح تھی۔ اردگرد کا علاقہ بنوثقیف کے ماتحت نہیں تھا۔ بلکہ حکومت اسلامیہ کی قلمرو میں شامل تھا۔ قلعہ والوں کو کہیں سے امداد ملنے کی توقع نہ تھی بلکہ ان کا سارا ساز و سامان قلعہ ہی میں موجود تھا۔ ایک تجربہ کار سپہ سالار کے سامنے ایسے لوگوں کا محاصرہ کرنا یا نہ کرنا برابر تھا، چنانچہ آپ ﷺ نے محاصرہ جاری رکھنے یا اٹھا لینے سے متعلق اپنے ساتھیوں سے مشورہ طلب کیا تو نوفل بن معاویہ دیلی نے عرض کیا: ''لومڑی اپنے بھٹ میں گھس گئی ہے۔ اگر آپ اس پر ڈٹے رہے تو پکڑ لیں گے۔ اور اگر چھوڑ کر چلے گئے تو وہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔'' لہٰذا آپ ﷺ نے واپسی کا اعلان کرا دیا۔ اس سے لوگ شور کرنے لگے۔ وہ کہنے لگے: ''طائف فتح کیے بغیر واپس ہوں گے؟'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «فَاغْدُوا عَلَى الْقِتَالِ» ''اچھا تو کل لڑائی پر چلنا ہے۔'' دوسرے دن لوگ لڑائی پر گئے لیکن سوائے زخموں کے کچھ حاصل نہ ہوا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے پھر فرمایا: «إِنَّا قَافِلُونَ غَدًا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ» ''ہم کل ان شاء اللہ واپس جائیں گے۔'' اس پر لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور انھوں نے اب بلا چون و چرا رختِ سفر باندھنا شروع کر دیا۔ یہ کیفیت دیکھ کر رسول اللہ ﷺ مسکراتے رہے۔[1]

لوگوں نے جب اپنا ساز و سامان اٹھا کر کوچ کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«قُولُوا: آئِبُونَ، تَائِبُونَ، عَابِدُونَ، لِرَبِّنَا حَامِدُونَ»

''تم کہو: ہم پلٹنے والے ہیں، توبہ کرنے والے، عبادت گزار ہیں اور اپنے رب کی حمد بیان کرتے ہیں۔''[2]

---

1 صحيح البخاري، حديث: 4325، وصحيح مسلم، حديث: 1778. 2 صحيح البخاري، حديث: 1797، وصحيح مسلم، حديث: 1344، ومسند أحمد: 21/2.

پھر کہا گیا کہ اے اللہ کے رسول! آپ ثقیف والوں کے لیے بددعا کریں۔ آپ ﷺ نے یوں دعا فرمائی:

«اَللّٰهُمَّ اهْدِ ثَقِيفًا وَّائْتِ بِهِمْ»

''اے اللہ! ثقیف کو ہدایت دے اور انھیں لے آ۔''[1]

1 جامع الترمذي، حديث: 3942، ومسند أحمد: 343/3، والمصنف لابن أبي شيبة: 201/12.

باب 2

لوگوں سے معاملات میں رسول اللہ ﷺ کی دور اندیشی

بت پرستی کی طرف پلٹنے کی کوئی گنجائش نہیں

غزوۂ طائف کے کئی ایک واقعات سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ بت پرستی کے لیے دوبارہ سے کوئی جگہ نہیں۔ حنین کو جاتے ہوئے کچھ نئے مسلمان بھی رسول اللہ ﷺ کے ہمرکاب تھے۔ راستے میں ایک ایسا سرسبز درخت تھا جس کو ''ذات انواط'' کہا جاتا تھا۔ مشرکین ہر سال اس درخت کے تلے جاتے، اس کے ساتھ اپنا اسلحہ لٹکاتے، اس کے پاس جانور ذبح کرتے اور اس کے اردگرد ایک دن کے لیے مجاور بن کر بیٹھتے۔ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جاتے ہوئے ان کی نگاہ اس پر پڑی تو زمانۂ جاہلیت کے میلوں کا تذکرہ ان کی زبان پر آ گیا۔ عرض کرنے لگے: ''اے اللہ کے رسول! آپ ہمارے لیے بھی ''ذات انواط'' بنا دیجیے جیسے مشرکین کے لیے ''ذات انواط'' ہے۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«اَللّٰهُ أَكْبَرُ! قُلْتُمْ وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ! كَمَا قَالَ قَوْمُ مُوسٰى لِمُوسٰى: ﴿اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ۚ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ﴾ لَتَرْكَبُنَّ سُنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ» ''اللہ اکبر! اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! تم نے ویسی ہی بات کہی جیسی موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے کہی تھی: ''ہمارے لیے بھی ایک معبود مقرر کر دیجیے جس طرح ان کے معبود ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ واقعی تم لوگوں میں بڑی

جہالت ہے۔''[1] تم لوگ بھی یقیناً پہلوں کے طریقوں پر چلو گے۔''[2]

اس سے پتا چلتا ہے کہ اسلام قبول کر لینے کے باوجود ان کے ہاں خالص توحید کا تصور غیر واضح تھا۔ نبی مکرم ﷺ نے جو شرک کا مفہوم واضح کیا اس سے انھیں دوبارہ ایسا مطالبہ کرنے سے محتاط رہنے کا حکم دیا مگر اس موقع پر نہ انھیں سزا دی اور نہ سرزنش کی کیونکہ رسول اللہ ﷺ کو معلوم تھا کہ یہ لوگ نئے نئے مسلمان ہوئے ہیں۔[3]

اگرچہ رسول اللہ ﷺ نے انھیں جہاد میں شریک ہونے کی اجازت اس لیے مرحمت فرما دی تھی کہ جہاد میں شرکت کے لیے اعتقاد کا جاہلیت کے میل کچیل سے کلیتاً صاف ہونا شرط نہیں ہے۔ جہاد تو ایک نیک عمل ہے جس کے کرنے والے کو اس کا ثواب بہر حال مل جائے گا، خواہ دین کے دیگر امور میں اس سے کوتاہی ہو جاتی ہو۔ بلکہ جہاد ایک تربیت گاہ ہے جس میں مجاہدین عقائد و احکام اور اخلاق سیکھتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ اس میں سفر ہوتا ہے۔ ایک دوسرے سے ملاقات کے دوران باہمی تبادلہ خیالات ہوتا ہے، افکار سامنے آتے ہیں اور سیکھنے کا موقع میسر آتا ہے۔[4]

کثرتِ تعداد پر گھمنڈ کا انجام

کثرت پر بھروسا اور غرور نصرت الٰہی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ جنگ کے آغاز میں نصرت کثرت پر گھمنڈ کے باعث روک لی گئی۔ قرآن پاک نے اس کی یوں تعبیر کی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ

[1] الأعراف 138:7. [2] جامع الترمذي، حديث: 2180، ومسند أحمد: 218/5، ودلائل النبوة للبيهقي: 125/5، والسيرة النبوية للندوي، ص: 349. [3] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري، ص: 497. [4] التاريخ الإسلامي للحميدي: 62/8.

﴿ثُمَّ وَلَّيْتُم مُّدْبِرِينَ ۝﴾

”یقیناً اللہ تعالیٰ نے بہت سے میدانوں میں تمھاری مدد فرمائی اور حنین کی لڑائی والے دن بھی۔ جبکہ تمھیں اپنی کثرت پر ناز ہو گیا تھا لیکن اس نے تمھیں کوئی فائدہ نہ دیا بلکہ زمین باوجود اپنی کشادگی کے تم پر تنگ ہوئی پھر تم پیٹھ پھیر کر مڑ گئے۔“[1]

رسول اللہ ﷺ نے بھی اس بات پر تنبیہ کرتے ہوئے یوں وضاحت فرمائی: «لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ» ”اے اللہ تیرے سوا (نیکی کرنے کی) طاقت نہیں اور تیرے بغیر (برائی سے بچنے کی) قوت نہیں۔“ اسی طرح آپ ﷺ فرماتے: «اَللّٰهُمَّ بِكَ أَجُولُ، وَبِكَ أَصُولُ، وَبِكَ أُقَاتِلُ» ”اے میرے اللہ! میں تیری ہی نصرت سے آتا جاتا ہوں، تیرے ہی بھروسے پر حملہ کرتا ہوں اور تیرے ہی سہارے جنگ کرتا ہوں۔“[2]

رسول اللہ ﷺ میدانِ جنگ میں بھی مسلمانوں کی اس طرح تربیت فرماتے رہتے تھے۔[3]

غزوۂ حنین کے موقع پر مسلمانوں کو غیر متوقع صورت حال کا سامنا کرنے کی بنا پر ابتدا میں شکست ہوئی۔ اکثریت میدان چھوڑ گئی، پھر بھی رسول اللہ ﷺ نے کسی بھاگنے والے کو ڈانٹ نہ پلائی بلکہ جب بعض مسلمانوں نے مطالبہ کیا کہ نئے مسلمانوں اور اعراب کو قتل کرنے کی اجازت دیجیے کہ یہ معرکے سے بھاگے ہیں تو آپ ﷺ نے اس کی بھی موافقت نہ فرمائی۔[4]

تالیفِ قلبی بذریعہ غنائم

رسول اللہ ﷺ نے سوچا کہ آزاد کردہ لوگوں (فتح مکہ کے موقع پر جنھیں عام معافی ملتی

1 التوبة 9:25. 2 مسند أحمد: 333,332/3، وصحيح ابن حبان، رقم: 1975، وسنن الدارمي، رقم: 2485، وعمل اليوم والليلة للنسائي، رقم: 614. 3 المجتمع المدني في عهد النبوة للدكتور العمري، ص: 199. 4 المجتمع المدني في عهد النبوة للدكتور العمري، ص: 205,204.

تھی) اور بدوؤں کے دلوں کو اموالِ غنیمت سے اسلام کی طرف مائل کیوں نہ کیا جائے۔ کیونکہ یہ لوگ ابھی نئے نئے مسلمان ہوئے ہیں، چنانچہ آپ ﷺ نے سردارانِ قریش و غطفان اور تمیم کو بڑے بڑے عطیات سے نوازا۔ ایک ایک کو سو سو اونٹ دیا گیا۔ ان میں ابوسفیان بن حرب، سہیل بن عمرو، حکیم بن حزام، صفوان بن امیہ، عیینہ بن حصن فزاری، اقرع بن حابس، معاویہ اور یزید بن ابوسفیان اور قیس بن عدی شامل تھے۔[1]

اس کرم نوازی کا بنیادی مقصد ان کے دلوں کو دنیا کی محبت سے ہٹا کر اسلام کی محبت کی طرف لانا تھا۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ کئی لوگ اسلام صرف دنیا کے حصول کی خاطر قبول کرتے مگر جب اسلام قبول کر لیتے تو وہ انھیں دنیا اور اس کی تمام موجودات سے زیادہ محبوب ہو جاتا۔[2]

صفوان بن امیہ اس معاملے کی یوں تعبیر کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اس سے پہلے میری نگاہ میں سب لوگوں سے زیادہ برے تھے۔ (نعوذ باللہ) پھر آپ نے مجھ پر اس قدر سخاوت کی کہ آپ سب لوگوں سے زیادہ میری نگاہ میں محبوب بن گئے۔[3]

انصار سے اظہار محبت وعقیدت

انصار کے نوخیز جوان بہ تقاضائے بشریت تقسیم غنیمت سے متاثر ہوئے اور آپس میں چہ مگوئیاں ہوئیں۔ رسول اللہ ﷺ نے انصار کے اس اعتراض کا پورا پورا لحاظ رکھا اور ان کی دلی کوفت کو دور کرنے کی بھرپور کوشش فرمائی۔ ان کے سامنے اموال غنیمت کی اس طرح تقسیم کی حکمت واضح کی اور انصار کو ایسا ایمان افروز خطاب فرمایا کہ صدیاں بیت گئیں مگر آج بھی ایک مسلمان اسے بغیر آنسو بہائے نہیں پڑھ پاتا۔

[1] من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 421. [2] صحيح مسلم، حديث: (58)-2312.
[3] صحيح مسلم، حديث: 2313.

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! آپ نے مالِ فے (غنیمت) کی تقسیم میں جو طریقۂ کار اختیار فرمایا ہے اس پر انصار دل میں ناراض ہیں بقول ان کے آپ نے مالِ غنیمت اپنی قوم میں تقسیم فرمایا ہے۔ قبائل عرب کو بڑے بڑے عطیے دیے ہیں لیکن انصار کو کچھ نہیں دیا؟''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «فَأَيْنَ أَنْتَ مِنْ ذٰلِكَ يَا سَعْدُ؟» ''سعد! اس بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟'' انھوں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! میں بھی تو اپنی قوم ہی کا ایک فرد ہوں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «فَاجْمَعْ لِي قَوْمَكَ فِي هٰذِهِ الْحَظِيرَةِ» ''اچھا! تو اپنی قوم کو اس حویلی میں جمع کرو۔'' کچھ مہاجرین بھی آ گئے۔ سعد رضی اللہ عنہ نے انھیں داخل ہونے دیا۔ اسی دوران کچھ دوسرے لوگ بھی آ گئے تو انھیں واپس بھیج دیا۔ جب تمام انصار جمع ہو گئے تو حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے آ کر بتایا کہ انصار جمع ہو گئے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لے گئے۔ اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی، پھر فرمایا:

«يَا مَعْشَرَ الْأَنْصَارِ، مَا قَالَةٌ بَلَغَتْنِي عَنْكُمْ، وَجِدَةٌ وَّجَدْتُّمُوهَا فِي أَنْفُسِكُمْ، أَلَمْ آتِكُمْ ضُلَّالًا فَهَدَاكُمُ اللّٰهُ بِي، وَعَالَةً فَأَغْنَاكُمُ اللّٰهُ بِي، وَأَعْدَاءً فَأَلَّفَ اللّٰهُ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ؟»

''اے انصار کے لوگو! تمھاری یہ کیا چہ میگوئیاں ہیں جو میرے علم میں آئی ہیں اور یہ کیا ناراضگی ہے جو جی ہی جی میں تم نے میری طرف سے محسوس کی ہے۔ کیا ایسا نہیں کہ میں تمھارے پاس اس حالت میں آیا کہ تم گمراہ تھے، اللہ تعالیٰ نے تمھیں میری وجہ سے ہدایت دی اور تم اس وقت محتاج تھے، اللہ تعالیٰ نے تمھیں میری بدولت غنی بنا دیا اور تم باہم دشمن تھے، اللہ تعالیٰ نے میرے سبب تمھارے دل جوڑ دیے؟''

لوگوں نے کہا: ''کیوں نہیں، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا بڑا فضل وکرم ہے۔''

پھر آپ ﷺ نے فرمایا: «أَلَا تُجِيبُونِي يَا مَعْشَرَ الْأَنْصَارِ؟!» ''انصار کے لوگو! مجھے جواب کیوں نہیں دیتے؟'' انصار نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! بھلا ہم کیا جواب دیں؟ ہم پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا فضل و کرم ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَمَا وَاللّٰهِ لَوْشِئْتُمْ، لَقُلْتُمْ، فَلَصَدَقْتُمْ، وَلَصُدِّقْتُمْ: أَتَيْتَنَا مُكَذَّباً، فَصَدَّقْنَاكَ، وَمَخْذُولًا فَنَصَرْنَاكَ، وَطَرِيداً فَآوَيْنَاكَ، وَعَائِلًا فَآسَيْنَاكَ، أَوَجَدْتُّمْ عَلَيَّ يَا مَعْشَرَ الْأَنْصَارِ! فِي أَنْفُسِكُمْ فِي لَعَاعَةٍ مِّنَ الدُّنْيَا تَأَلَّفْتُ بِهَا قَوْماً، لِيُسْلِمُوا، وَوَكَلْتُكُمْ إِلٰى إِسْلَامِكُمْ، أَلَا تَرْضَوْنَ يَا مَعْشَرَ الْأَنْصَارِ! أَنْ يَّذْهَبَ النَّاسُ بِالشَّاءِ، وَالْبَعِيرِ وَتَرْجِعُونَ بِرَسُولِ اللّٰهِ إِلٰى رِحَالِكُمْ؟ فَوَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ! لَمَا تَنْقَلِبُونَ بِهٖ خَيْرٌ مِّمَّا يَنْقَلِبُونَ بِهٖ. وَلَوْلَا الْهِجْرَةُ لَكُنْتُ امْرَأً مِّنَ الْأَنْصَارِ، وَلَوْ سَلَكَ النَّاسُ شِعْباً وَّوَادِياً، وَّسَلَكَتِ الْأَنْصَارُ شِعْباً وَّوَادِياً، لَّسَلَكْتُ شِعْبَ الْأَنْصَارِ وَوَادِيَهَا، اَلْأَنْصَارُ شِعَارٌ، وَّالنَّاسُ دِثَارٌ، اَللّٰهُمَّ! ارْحَمِ الْأَنْصَارَ وَأَبْنَاءَ الْأَنْصَارِ، وَأَبْنَاءَ أَبْنَاءِ الْأَنْصَارِ»

''دیکھو! اللہ کی قسم! اگر تم چاہو تو کہہ سکتے ہو اور سچ ہی کہو گے اور تمھاری بات سچ ہی مانی جائے گی کہ آپ ہمارے پاس اس حالت میں آئے کہ آپ کو جھٹلایا گیا تھا مگر ہم نے آپ کی تصدیق کی، آپ کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا تھا ہم نے آپ کی مدد کی۔ آپ کو دھتکار دیا گیا تھا ہم نے آپ کو ٹھکانا دیا۔ آپ کو ضرورت تھی ہم نے آپ کی غمگساری کی۔ اے انصار کے لوگو! تم اپنے جی میں دنیا کی اس عارضی دولت کے لیے ناراض ہو گئے جس کے ذریعے میں نے لوگوں کا دل جوڑا ہے تاکہ وہ مسلمان ہو جائیں اور تمھیں میں نے تمھارے اسلام کے حوالے کر دیا

ہے۔ اے انصار! کیا تم اس سے راضی نہیں کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے کر جائیں اور تم رسول اللہ ﷺ کو لے کر اپنے ڈیروں میں پلٹو؟
اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! یقیناً جسے تم لے کر گھروں کو جاؤ گے وہ اس سے بہت بہتر ہے جسے دوسرے لوگ گھروں کو لے کر جائیں گے۔ اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں بھی انصار ہی کا ایک فرد ہوتا۔ اگر سارے لوگ ایک وادی یا گھاٹی میں چلیں اور انصار دوسری میں تو میں انصار ہی کی راہ پر چلوں گا۔ دوسرے لوگوں کی نسبت انصار کا میرے ساتھ خصوصی تعلق ہے۔ اے اللہ! انصار پر رحم فرما اور ان کے بیٹوں پر اور ان کے بیٹوں کے بیٹوں (پوتوں) پر رحم فرما۔''

انصار آپ ﷺ کا خطاب سن کر اس قدر روئے کہ داڑھیاں تر ہو گئیں اور کہنے لگے: ''ہم راضی ہیں کہ ہمارے حصے میں رسول اللہ ﷺ ہیں۔'' اس کے بعد رسول اللہ ﷺ واپس چلے گئے اور لوگ بکھر گئے۔ [1]

ایک روایت میں ہے کہ فرمایا: «إِنَّكُمْ سَتَلْقَوْنَ بَعْدِي أَثَرَةً، فَاصْبِرُوا حَتّٰى تَلْقَوْنِي عَلَى الْحَوْضِ» ''دیکھو! میرے بعد لوگوں کو تم پر ترجیح دی جائے گی، اس لیے صبر کرنا یہاں تک کہ تم مجھے حوضِ کوثر پر ملو۔'' [2]

اس جگہ یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ یہ باتیں تمام انصار سے سرزد نہ ہوئی تھیں۔ بلکہ صرف ان کے کم سن افراد کی زبان پر آئی تھیں۔ اس کی تائید بخاری و مسلم میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے جنگ حنین میں اپنے پیغمبر کو ہوازن کے مال عطا فرمائے تو آپ ﷺ نے قریش کے بعض افراد کو سو سو اونٹ دینا شروع کیے۔ انصار کے کچھ لوگ کہنے لگے: ''اللہ تعالیٰ

[1] مسند أحمد: 3/ 77,76، ومجمع الزوائد: 10/ 32، وزاد المعاد: 3/ 474. [2] صحيح البخاري، حديث: 4330، وصحيح مسلم، حديث: 1061.

رسول اللہ ﷺ کو بخشے، آپ قریش کے لوگوں کو دے رہے ہیں اور ہمیں محروم کر رہے ہیں، حالانکہ ہماری تلواروں سے ابھی تک ان کا خون ٹپک رہا ہے۔'' حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو انصار کی یہ بات معلوم ہوگئی۔ آپ ﷺ نے انھیں بلا بھیجا اور انھیں چمڑے کے ایک خیمے میں جمع کیا۔ جب وہ تمام اکٹھے ہو گئے تو آپ ﷺ تشریف لائے اور پوچھا: «مَا حَدِيثٌ بَلَغَنِي عَنْكُمْ؟» ''یہ کیا بات ہے جو مجھ کو تمھاری طرف سے پہنچی ہے؟'' انصار میں جو سمجھ دار لوگ تھے، انھوں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! ہم میں جو معتبر لوگ ہیں انھوں نے ایسا نہیں کہا۔ چند نوجوانوں نے ایسی باتیں کی ہیں۔ وہ کہنے لگے: ''اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ کو معاف فرمائے آپ قریش کو دیتے ہیں اور ہمیں چھوڑ رہے ہیں اور ابھی تک ہماری تلواروں سے ان کا خون ٹپک رہا ہے۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «فَإِنِّي أُعْطِي رِجَالًا حَدِيثِي عَهْدٍ بِكُفْرٍ أَتَأَلَّفُهُمْ» ''میں تو ایسے لوگوں کو دیتا ہوں جو ابھی نئے نئے مسلمان ہوئے ہیں، میں مال دے کر ان کے دل جوڑتا ہوں۔''[1]

امام ابن قیم رحمہ اللہ اس واقعے سے استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''کبھی کبھی دشمنانِ اسلام کو اپنی طرف کھینچنے اور مسلمانوں سے ان کے شر کو دور کرنے کی خاطر امام پر ان کی تالیف قلبی ضروری ہو جاتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ امام، قیام دین اور مسلمان کے مصالح کا خیال کرنے میں مسلمانوں کا نائب ہوتا ہے۔ اگر اسلام کے دفاع اور اس کے دارالخلافہ کی حفاظت کے لیے دشمنانِ اسلام کے سرغنوں کو مائل کرنے کے لیے تالیف قلبی کی ضرورت محسوس ہو تو یہ اس کے لیے جائز ہی نہیں بلکہ لازمی ٹھہرتا ہے۔ کیونکہ اگرچہ (ایک عرصے سے اسلام سے وابستہ لوگوں کو) محروم رکھنے میں ایک قسم کی خرابی ہے لیکن دشمن کی تالیف قلبی نہ کرنے میں اس سے بھی بڑی خرابی کا احتمال ہے، جبکہ شریعت کی بنیاد اس پر ہے کہ چھوٹی خرابی برداشت کر کے بڑی کو دور کیا جائے۔ اور دو مصلحتوں میں سے جو مصلحت

1 صحيح البخاري، حديث:4331، وصحيح مسلم، حديث:1059.

زیادہ فائدے مند اور کامل ہے اسے حاصل کیا جائے، خواہ دوسری مصلحت رہ جائے بلکہ دین و دنیا کی تمام مصلحتوں کی بنیاد اسی اصول پر ہے۔''[1]

اس قسم کے لوگوں کی تالیف قلبی ابتدا میں ان کی حوصلہ افزائی اور اسلام کی طرف رغبت کے لیے ہوتی ہے تاکہ ایمان ان کے دلوں میں گھر کر جائے اور وہ اس کی مٹھاس سے لطف اندوز ہوں۔

شیخ محمد غزالی اس معاملے کی حقیقت کو ایک حسی مثال سے واضح کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ دنیا میں بہت سارے لوگ ایسے ہیں جنھیں حق کی طرف پیٹ کے بل لایا جاتا ہے نہ کہ عقلوں کے ذریعے۔ جس طرح جانور کو گھاس دکھایا جاتا ہے تو وہ اس کی جانب اپنا منہ کرتا ہوا چلتا آتا ہے حتی کہ اطمینان سے اپنے باڑے میں داخل ہو جاتا ہے اسی طرح انسانوں کی یہ قسم بھی کئی ایک ترغیبات کی محتاج ہوتی ہے تاکہ وہ ایمان سے مانوس ہو جائیں اور اس کے لیے نرم پڑ جائیں۔[2]

نبی مکرم ﷺ نے انصار کے سامنے بڑی مؤثر صورت رکھی۔ کچھ ایسے لوگ ہیں جو ایمان سے خوش ہو جاتے ہیں۔ ان کے بالمقابل کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اونٹوں کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ ایک ایسی قوم ہے جن کے ساتھ رسول اللہ ﷺ رہتے ہیں اور ان کے بالمقابل ایسے لوگ بھی ہیں جو جانوروں کی صحبت میں رہتے ہیں۔ انصار کو ان تصاویر و مناظر نے بیدار کر دیا۔ انھوں نے محسوس کر لیا کہ وہ ایسی غلطی کا ارتکاب کر بیٹھے ہیں جو ان جیسے لوگوں کو لائق نہ تھی۔ یہ سنتے ہی وہ رونے لگے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ زبانوں پر رضا مندی کا ترانہ آ گیا۔ اب تو ان کے دل خوش ہو گئے اور آپ ﷺ کی حکیمانہ سیاست کے باعث ان کے دل مطمئن ہو گئے۔[3]

---

[1] زاد المعاد: 486/3. [2] فقه السيرة للغزالي، ص: 427. [3] المجتمع المدني في عهد النبوة للدكتور العمري، ص: 219.

بدوؤں کی بدسلوکی پر صبر

رسول اللہ ﷺ کی طرف سے بار ہا بدوؤں کی بدسلوکی، اموال کے لالچ اور عہدوں کی حرص پر صبر کا اظہار ہوا۔ آپ ﷺ ایسے مربی کے لیے نمونہ تھے جو لوگوں کے حالات، ان کے ماحول کی تاثیر، ترشی اور انفرادیت پسندی کو سامنے رکھتا ہے۔ آپ ﷺ ان کے سامنے اپنا اخلاق پیش فرماتے۔ ان کی مصلحتوں پر انھیں مطمئن کرتے اور ان کی عقل کے مطابق گفتگو فرماتے۔ آپ ﷺ ان کے ساتھ حد درجہ مشفق تھے۔ ان کے لیے مربی اور مصلح کی حیثیت رکھتے تھے۔ آپ ﷺ نے ان کے ساتھ کبھی ہم عصر حکمرانوں کا سا برتاؤ نہ کیا جن کے سامنے لوگ جھکتے، سجدہ کرتے اور ان کے سامنے اپنی عرض رکھنے کے لیے تعظیم و بزرگی کے ایسے القابات سے نوازتے جیسے ایک بندہ اپنے معبود کے سامنے پیش کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ تو ان میں انھی کے ایک فرد کی طرح تھے آپ سے وہ گفتگو بھی کر لیتے اور کبھی غصہ بھی اتار لیتے۔ آپ ﷺ کبھی بھی ان سے الگ تھلگ پردے میں نہ رہتے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ ﷺ کے سامنے آداب کا خیال رکھتے، آہستہ آواز سے بات کرتے، اپنے دلوں کو محبتِ رسول سے سرشار رکھتے، جبکہ سخت دل بدوؤں کو بے ادبی، سختی، آواز بلند کرنے اور رسول اللہ ﷺ سے مخاطب ہوتے وقت انتہائی بے باکی اختیار کرنے پر ڈانٹ بھی پلائی جاتی۔[1]

یہ حالات و واقعات بدوؤں کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے بہترین معاملے کی دلیل ہیں۔

دیہاتی جس نے خوشخبری کو ٹھکرا دیا: حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس تھا۔ آپ اس وقت جعرانہ میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ آپ کے ساتھ حضرت بلال رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ اتنے میں ایک گنوار دیہاتی آپ ﷺ کے پاس آیا اور بولا: ''آپ میرے ساتھ کیا ہوا وعدہ پورا نہیں کرتے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا:

[1] المجتمع المدني في عهد النبوة للدكتور العمري، ص: 219.

«أَبْشِرْ» ”خوشخبری قبول کرو۔“ وہ بولا: ”آپ یہ «أَبْشِرْ» کا کلمہ بہت زیادہ دہرائے رہتے ہیں۔“ آپ ﷺ غصے کی حالت میں ابوموسیٰ اور بلال رضی اللہ عنہما کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: «رَدَّ الْبُشْرٰی، فَاقْبَلَا أَنْتُمَا» ”اس نے خوشخبری کو ٹھکرا دیا ہے، لہٰذا تم دونوں اسے قبول کرلو۔“ ان دونوں نے عرض کیا: ”ہمیں قبول ہے۔“ پھر آپ ﷺ نے ایک پیالہ پانی کا منگوایا اور دونوں ہاتھ اور چہرہ مبارک دھویا اور پیالے میں کلی کی پھر فرمایا: «اِشْرَبَا مِنْهُ وَأَفْرِغَا عَلٰی وُجُوهِكُمَا وَنُحُورِكُمَا وَأَبْشِرَا» ”اس پانی کو پی لو اور اپنے منہ اور سینے پر ڈالو اور خوش ہو جاؤ۔“ ان دونوں نے پیالہ لے کر ایسا ہی کیا۔ ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے انھیں پردے کی آڑ سے آواز دی: ”اپنی اماں جان کے لیے بھی کچھ بچاؤ۔“ تو انھوں نے ان کے لیے بھی پانی میں سے کچھ بچایا اور انھیں دیا۔[1]

ایک دیہاتی کی الزام تراشی: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حنین کے دن رسول اللہ ﷺ نے چند لوگوں کو غنیمت کا مال زیادہ دیا۔ اقرع بن حابس تمیمی کو ایک سو اونٹ دیے اور عیینہ کو بھی اتنے ہی اونٹ دیے اور چند رؤسائے عرب کو بھی نوازا اور انھیں بھی دوسرے لوگوں سے مقدم رکھا۔ اتنے میں ایک آدمی نے کہا: ”اللہ کی قسم! یہ تقسیم ایسی ہے کہ اس میں عدل نہیں ہوا اور نہ اس میں اللہ تعالیٰ کی رضا مندی ملحوظ رکھی گئی ہے۔“ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے سوچا کہ میں ضرور رسول اللہ ﷺ کو اس کی خبر دوں گا۔ میں آپ ﷺ کے پاس گیا اور یہ بات بتا دی۔ (خبر سنتے ہی) آپ ﷺ کا چہرۂ انور سرخ ہو گیا، پھر فرمایا: «فَمَنْ يَّعْدِلُ إِنْ لَّمْ يَعْدِلِ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ؟!» ”اگر اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول عدل نہ کرے گا تو کون عدل کرے گا؟“ پھر فرمایا: «يَرْحَمُ اللّٰهُ مُوسٰی! قَدْ أُوذِيَ بِأَكْثَرَ مِنْ هٰذَا فَصَبَرَ» ”اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام پر رحم فرمائے۔ ان کو اس سے زیادہ ستایا گیا مگر انھوں نے صبر کیا۔“ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے دل میں

[1] صحيح البخاري، حديث:4328، وصحيح مسلم، حديث:2497.

تہیہ کرلیا کہ آج کے بعد میں آپ ﷺ کو ایسی کوئی خبر نہیں پہنچاؤں گا۔ [1]

ہوازن کے قبول اسلام پر رسول اللہ ﷺ کا ان سے برتاؤ

اسلام قبول کر لینے کے بعد ہوازن کا ایک گروہ جعرانہ میں رسول اللہ ﷺ سے ملا اور عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! ہم عرب کے اصلی باشندے ہیں اور قریش سے خاندانی تعلق بھی ہے۔ اور ہم پر جو مصیبت آئی ہے وہ آپ سے پوشیدہ نہیں، لہٰذا ہم پر احسان فرمائیے اللہ تعالیٰ آپ پر احسان فرمائے گا۔'' ان کا خطیب ابوصرد زہیر بن صرد کھڑا ہوا اور عرض کرنے لگا: ''ان باڑوں میں آپ کی پھوپھیاں اور خالائیں ہیں جو آپ کو دودھ پلاتی رہی ہیں۔ یہ وہ ہیں جنھوں نے آپ کی پرورش کی ہے۔ اگر ہم نے حارث بن ابوشمر یا نعمان بن منذر پر اس طرح کا احسان کیا ہوتا اور پھر ہم پر وہ مصیبت نازل ہوتی جو اب نازل ہوئی ہے تو ہم ان سے مہربانی کی امید رکھتے، جبکہ آپ تو اللہ کے رسول ہیں اور جن کی بھی پرورش ہوئی ان میں سے سب سے بہتر ہیں۔'' پھر اس نے شعر کہنے شروع کیے:

اُمْنُنْ عَلَيْنَا رَسُولَ اللّٰهِ! فِي كَرَمٍ

فَإِنَّكَ الْمَرْءُ نَرْجُوهُ وَنَنْتَظِرُ

''اے اللہ کے رسول! سخاوت کرتے ہوئے ہم پر احسان فرمائیے۔ آپ تو ایسے شخص ہیں جن سے ہم اُمید لگائے ہوئے منتظر بیٹھے ہیں۔''

پھر وہ اور بھی اشعار کہتا رہا اور آخر میں اس نے یہ شعر کہے:

اُمْنُنْ عَلٰى نِسْوَةٍ قَدْ كُنْتَ تَرْضَعُهَا

إِذْ فُوكَ يَمْلَؤُهُ مِنْ مَّحْضِهَا دَرَرُ

''ان عورتوں پر احسان فرمائیے جن کا آپ دودھ پیتے رہے۔ جب ان کے وافر

1 صحيح البخاري، حديث: 3150، وصحيح مسلم، حديث: 1062.

دودھ سے آپ کا منہ مبارک بھر جاتا تھا۔"

اُمْنُنْ عَلٰی نِسْوَةٍ قَدْ كُنْتَ تَرْضَعُهَا

وَإِذْ يَزِينُكَ مَا تَأْتِي وَمَا تَذَرُ

"ان عورتوں پر احسان فرمایئے جن کا آپ دودھ نوش کرتے رہے۔ آپ جو (اچھا) عمل کریں گے اور جو (غیر محمود) فعل ترک کریں گے وہ آپ کے لیے (مزید) رونق افروز ہوگا۔"

اس طرح یہ ہوازن کے تمام چھوٹوں بڑوں کی رہائی کا سبب بن گیا۔ اور آپ ﷺ کی تمام مہربانیاں ان پر خوب برسیں۔[1]

وفد ہوازن کی گفتگو سن کر آپ ﷺ نے ان سے پوچھا: «نِسَائُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ أَحَبُّ إِلَيْكُمْ أَمْ أَمْوَالُكُمْ؟» "تمھیں اپنے بچے اور عورتیں زیادہ پیارے ہیں یا اپنے اموال؟" انھوں نے عرض کیا "اے اللہ کے رسول! آپ نے ہمیں اموال یا عورتوں اور بچوں میں انتخاب کا اختیار دیا ہے تو ہمیں اپنے بیٹے (اولاد) اور عورتیں زیادہ پسند ہیں۔"

تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«أَمَّا مَا كَانَ لِي وَلِبَنِي عَبْدِ الْمُطَّلِبِ فَهُوَ لَكُمْ، وَإِذَا أَنَا صَلَّيْتُ بِالنَّاسِ فَقُومُوا، فَقُولُوا: إِنَّا نَسْتَشْفِعُ بِرَسُولِ اللّٰهِ ﷺ إِلَى الْمُسْلِمِينَ وَبِالْمُسْلِمِينَ إِلٰى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فِي أَبْنَائِنَا وَنِسَائِنَا، فَإِنِّي سَأُعْطِيكُمْ عِنْدَ ذٰلِكَ وَأَسْأَلُ لَكُمْ»

"دیکھو! میرے اور بنو عبدالمطلب کے حصے میں جو کچھ آئے گا وہ تو تمھارا ہو گیا۔ اور جب میں لوگوں کو (ظہر کی) نماز پڑھا لوں تو تم کھڑے ہو کر ان سے کہنا:

[1] البداية والنهاية: 352/4 و 364,363.

''ہم اپنے بچوں اور عورتوں کی رہائی کے سلسلے میں مسلمانوں کے سامنے رسول اللہ ﷺ سے سفارش کروانا چاہتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کے سامنے مسلمانوں سے سفارش کرانے کے آرزومند ہیں۔'' اس وقت میں تمھیں تمھارے قیدی دے سکوں گا اور تمھارے لیے سب سے کہہ سکوں گا۔''

چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ ظہر کی نماز پڑھا چکے تو بنو ہوازن نے کھڑے ہو کر وہی کہا جس کا مشورہ رسول اللہ ﷺ نے دیا تھا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: «أَمَّا مَا كَانَ لِي وَلِبَنِي عَبْدِ الْمُطَّلِبِ فَهُوَ لَكُمْ» ''میرے اور بنو عبدالمطلب کے حصے میں جو قیدی آئے وہ تمھارے ہیں۔'' اس پر مہاجرین نے کہا: ''ہمارے حصے میں جو قیدی آئے وہ رسول اللہ ﷺ کے ہیں۔'' انصار نے بھی یہ کہا: ''جو ہمارے حصے میں آئے وہ بھی رسول اللہ ﷺ کے ہیں۔'' پھر اقرع بن حابس تمیمی نے کہا: ''میں اپنا اور بنو تمیم کا حصہ دینے کے لیے تیار نہیں۔'' اسی طرح عیینہ بن حصن فزاری نے کہا: ''میں اپنا اور بنو فزارہ کا حصہ دینے پر تیار نہیں۔'' عباس بن مرداس نے کہا: ''میں بھی اپنا اور بنو سلیم کا حصہ دینے کے لیے تیار نہیں۔'' بنو سلیم بول اٹھے: ''جو قیدی ہمارے حصے میں آئے وہ رسول اللہ ﷺ کے ہیں۔'' اس پر عباس بن مرداس نے بنو سلیم سے کہا: ''تم نے مجھے شرمندہ کیا ہے!'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ أَمْسَكَ مِنْكُمْ بِحَقِّهِ فَلَهُ بِكُلِّ إِنْسَانٍ سِتُّ فَرَائِضَ مِنْ أَوَّلِ فَيْءٍ نُّصِيْبُهُ فَرُدُّوا إِلَى النَّاسِ نِسَائَهُمْ وَأَبْنَائَهُمْ»

''تم میں سے جو اپنا حصہ بغیر کسی عوض انے کے واپس نہیں کرنا چاہتا تو اسے ہر انسان کے بدلے چھ چھ اونٹ دیے جائیں گے، یہ ہم اس پہلی غنیمت پر دیں گے جو ہمارے ہاتھ لگے گی، لہٰذا تم سب ہی ان کی عورتیں اور بچے واپس کر دو۔''

(لوگوں نے بنو ہوازن کی عورتیں اور بچے واپس کر دیے۔) [1]

ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خطبہ ارشاد فرمایا اور کہا:

«إِنَّ إِخْوَانَكُمْ هٰؤُلَاءِ جَاؤُونَا تَائِبِينَ، وَإِنِّي أَرَدْتُّ أَنْ أَرُدَّ إِلَيْهِم سَبْيَهُمْ، فَمَنْ أَحَبَّ مِنْكُمْ أَنْ يُّطَيِّبَ ذٰلِكَ، فَلْيَفْعَلْ وَمَنْ أَحَبَّ أَنْ يَّكُونَ عَلٰى حَظِّهِ حَتّٰى نُعْطِيَهُ إِيَّاهُ مِنْ أَوَّلِ مَا يَفِيءُ اللّٰهُ عَلَيْنَا فَلْيَفْعَلْ»

''یہ تمھارے بھائی توبہ کر کے آ گئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کے قیدی واپس کر دوں، لہٰذا تم میں سے جو کوئی راضی خوشی پسند کرے تو قیدی واپس کر دے اور جو چاہتا ہے کہ اپنا حصہ محفوظ رکھے تو وہ بھی ایسا کر سکتا ہے ہم اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئندہ عطا ہونے والی پہلی غنیمت میں سے دے دیں گے۔''

لوگوں نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! ہم دل کی خوشی سے قیدی واپس کرتے ہیں۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّا لَا نَدْرِي مَنْ أَذِنَ مِنْكُمْ فِيهِ مِمَّنْ لَّمْ يَأْذَنْ فَارْجِعُوا حَتّٰى يَرْفَعَ إِلَيْنَا عُرَفَاءُكُمْ أَمْرَكُمْ» ''(آپ کے اس جواب سے) ہم جان نہیں سکے کہ آپ میں سے کون راضی ہے اور کون نہیں۔ لہٰذا آپ لوگ واپس جائیں اور آپ کے زعماء آپ کے معاملے کو ہمارے سامنے پیش کریں۔'' لہٰذا تمام لوگ واپس چلے گئے اور پھر ان کے زعماء نے ان سے گفتگو کی، پھر واپس آ کر آپ ﷺ کو بتایا کہ ہم تمام قیدی بخوشی واپس کرتے ہیں۔ [2]

بنو ہوازن کے قبول اسلام پر رسول اللہ ﷺ بہت خوش ہوئے۔ آپ ﷺ نے ان

---

1 مسند أحمد: 184/2، والمعجم الكبير للطبراني، رقم: 5304، ودلائل النبوة للبيهقي: 195,194/5، ومجمع الزوائد: 188,187/6، وتاريخ الطبري: 135/3، والبداية والنهاية: 353,352/4. 2 صحيح البخاري، حديث: 4319,4318، ودلائل النبوة للبيهقي: 192/5.

کے سردار مالک بن عوف نصری کے متعلق دریافت فرمایا تو انھوں نے بتایا کہ وہ ثقیف کے ساتھ طائف میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے وعدہ کیا کہ اگر وہ میرے پاس مسلمان ہو کر آئے گا تو میں اس کے اہل وعیال واپس کر دوں گا اور ایک سو اونٹ بھی دوں گا، چنانچہ مالک بن عوف رضی اللہ عنہ بھی مسلمان ہو کر آپ ﷺ سے آ ملے۔ آپ ﷺ نے ان کی بڑی تکریم فرمائی اور اسے اس کی قوم اور آس پاس کے دیگر قبائل کا امیر مقرر کر دیا۔ مالک بن عوف رسول اللہ ﷺ کے فیاضانہ سلوک پر بہت خوش ہوا اور اس نے فی البدیہہ یہ اشعار کہے:

مَا إِنْ رَأَيْتُ وَلَا سَمِعْتُ بِمِثْلِهِ
فِي النَّاسِ كُلِّهِمْ بِمِثْلِ مُحَمَّدِ

”دنیا جہان کے تمام انسانوں میں محمد ﷺ جیسا آدمی نہ میں نے دیکھا، نہ سنا۔“

وَإِذَا الْكَتِيبَةُ عَرَّدَتْ أَنْيَابُهَا
بِالسَّمْهَرِيِّ وَضَرْبِ كُلِّ مُهَنَّدِ

”سمہری نیزوں اور ہندی تلواروں کی مار سے جب ان کے لشکر کے دانت خوب تیز ہو جاتے ہیں۔“

فَكَأَنَّهُ لَيْثٌ عَلَى أَشْبَالِهِ
وَسْطَ الْهَبَاءَةِ خَادِرٌ فِي مَرْصَدِ

”تو وہ غبارِ جنگ میں اس شیر کی طرح معلوم ہوتے ہیں جو اپنے بچوں کی نگرانی کے لیے دشمن کی گھات لگائے کچھار میں بیٹھا ہو۔“[1]

مد مقابل کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا برتاؤ حد درجے نرم تھا۔ اسی حکیمانہ سیاست کی

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 4/144.

بدولت آپ ﷺ نے بنو ہوازن اور ان کے حلیفوں کو اسلام کی صف میں لا کھڑا کیا۔ آپ ﷺ نے اس طاقتور قبیلے کو علاقے میں بت پرستی کی طاقتوں کو مٹانے کے لیے ہتھیار بنا لیا۔ اسلام نے طائف کو ہر طرف سے گھیر لیا تھا۔ ثقیف اب نہ ادھر ادھر آ جا ہی سکتے تھے اور نہ تجارت کرنے کی پوزیشن میں تھے۔ ان کے سردار عروہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ جیسے لوگ اسلام کی طرف لپکے۔ اور اس سرعت سے کہ رسول اللہ ﷺ حنین کی غنیمت تقسیم کرنے کے بعد عمرہ کی ادائیگی سے فارغ ہو کر ابھی مدینہ بھی نہیں پہنچے تھے کہ وہ آپ سے راستے میں جا ملے اور اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔ اور واپس طائف پہنچ گئے۔ ثقیف کے سرداروں میں سے یہ ان کے محبوب ترین سردار تھے۔ انھوں نے واپس آ کر انھیں اسلام کی دعوت دی اور اپنے مکان کی بلند جگہ پر کھڑے ہو کر اذان کہنے لگے۔ اسی اثناء میں انھیں کسی نے تیر مار کر شہید کر دیا۔ انھوں نے مرتے وقت اپنی قوم سے کہا کہ مجھے محاصرۂ طائف کے دوران شہید ہونے والے مسلمانوں کے ساتھ دفن کیا جائے۔[1]

ایک عام آدمی رسول اللہ ﷺ کے عام لوگوں سے معاملات اور دین الٰہی کی مضبوطی کے لیے کی گئی کوششوں پر حیران ہوتا ہے کہ کس طرح آپ نے مکہ کے اردگرد سے بت پرستی کے مراکز ختم کیے، اسلامی قلمرو میں نئے شامل ہونے والے علاقوں کے تنظیمی معاملات درست فرمائے، مکہ پر عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کو گورنر مقرر کیا اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو اہل مکہ کا مربی، رہنما اور معلم مقرر فرمایا۔[2] اسی طرح مالک بن عوف رضی اللہ عنہ کو ہوازن کا امیر بنا کر عمرہ کیا، پھر مدینہ پلٹ گئے۔

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 4 / 192. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 4 / 153.

اسباق، عبرتیں اور فوائد

غزوۂ حنین سے متعلق آیات کی تفسیر

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۝ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝ ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾

''یقیناً اللہ نے بہت سے مواقع پر تمھاری مدد کی ہے اور حنین کے دن (بھی) جبکہ تمھاری کثرت نے تمھیں خوش فہمی میں ڈال دیا تھا تو وہ تمھارے کچھ بھی کام نہ آئی اور زمین فراخی کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی، پھر تم پیٹھ پھیر کر پلٹے، پھر اللہ نے اپنے رسول پر اور مومنوں پر اپنی طرف سے تسکین نازل کی اور اس نے ایسے لشکر اتارے جنھیں تم نے نہیں دیکھا اور جن لوگوں نے کفر کیا انھیں عذاب دیا اور کافروں کی یہی سزا ہے، پھر اس کے بعد اللہ جس پر چاہے گا مہربانی فرمائے گا اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔''[1]

[1] التوبة 9:25-27.

ان آیات میں مسلمانوں کی حالت کی بڑی انوکھی تصویر پیش کی گئی ہے۔ سننے والے کو ایک صورت سے دوسری صورت کی جانب منتقل کیا گیا ہے۔ پہلے مسلمانوں کی ایسی صورت بیان کی جب وہ اپنی کثرت پر خوشی سے پھولے نہیں سما رہے، پھر وہ صورت سامنے رکھی کہ ان کی کثرت ان کے کچھ کام نہ آئی اور وہ شکست سے دو چار ہوتے ہیں، پھر ان کے خوف کی تصویر سامنے لائی گئی ہے کہ زمین ان کے لیے تنگ ہوگئی۔ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صرف چند لوگ باقی رہ گئے۔ غزوۂ حنین میں ابتدائی طور پر دشمن سے مڈھ بھیڑ کے وقت لاحق ہونے والے خوف و ہراس کے بعد اللہ تعالیٰ کی نصرت بھی پہنچ گئی جسے اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ سے تعبیر کیا ہے:

﴿ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ○﴾

’’پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی سکینت اپنے نبی پر اور مومنوں پر اتاری اور وہ لشکر بھیجے جنھیں تم دیکھ نہیں رہے تھے اور کافروں کو پوری سزا دی، اور کفار کا یہی بدلہ ہے۔‘‘[1]

السکینہ سے مراد اطمینان، رحمت اور امن وسکون ہے۔[2]

مفسر قاسمی کہتے ہیں: سکینت سے مراد یہ ہے کہ جس سے تم سکون پاتے ہو اور ثابت قدم ہو جاتے ہو۔ اور فرار کے بعد دوبارہ حملہ کرنے پر مسلمانوں کے دلوں کا اطمینان بھی اس میں شامل ہے۔ ﴿عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ یعنی ان مومنوں پر بھی جو شکست کھا گئے تھے۔ حرف جر ﴿وَعَلٰى﴾ تنبیہ کے لیے دوبارہ لایا گیا تا کہ دونوں کے مختلف حالات میں ہونے پر دلالت کرے۔ یا وہ لوگ مراد ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ثابت قدم رہے اور بھاگے نہیں یا پھر اس سے مراد یہ ہے کہ تمام مسلمانوں پر سکینت و

[1] التوبة 26:9. [2] حديث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ لأبي بدر محمد بكر آل عابد: 598/2.

اطمینان نازل فرمایا اور یہی معنی موقع ومحل کے مناسب ہیں۔[1]

اور امام طبری رحمہ اللہ ﴿جُنُودًا﴾ "لشکروں" سے مراد "فرشتے" لیتے ہیں۔[2]

﴿وَعَذَّبَ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ "اور کافروں کو عذاب دیا" سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفر اختیار کرنے والوں کو قتل اور قید و بند کی سزا دی۔ اور کافر جب تک ایمان کے مقابلے میں کفر کو اختیار کرتے رہیں گے اور اہل ایمان سے دشمنی رکھیں اور اہل اسلام سے لڑتے رہیں گے تو ان کا دنیا میں یہی بدلہ ہوگا۔"[3]

﴿ثُمَّ يَتُوبُ اللَّهُ مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝﴾[4]

اس فرمانِ باری تعالیٰ سے مراد یہ ہے کہ ان مشرکوں کو سزا سے دوچار کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ جس کی چاہے توبہ قبول فرمالے گا۔ اور اس کی صورت یہ بنے گی کہ وہ انھیں اسلام کی توفیق عطا کردے گا اور انھیں بخش دے گا۔ اس کی رحمت ہر چیز پر وسیع ہے۔[5]

سید قطب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "غلطی کرنے والے کے لیے بخشش و توبہ کا در ہمیشہ کھلا ہے۔ معرکہ حنین میں نتائج کے طور پر جس حقیقت سے پردہ کشائی کی جارہی ہے وہ یہ ہے کہ قوتوں کی اصل وہ ہے جس پر اعتقاد کی بنیاد ہے۔ کثرت تعداد تو کوئی چیز نہیں۔ اصل قوت تو وہ قلیل تعداد ہے جو حقیقت شناس، ثابت قدم اور عقیدے کے بندھن سے منسلک ہے۔ اور یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہر عقیدہ پسندیدہ اور گنے چنے افراد کی وجہ سے قائم ہوتا ہے نہ کہ اس کثیر جھاگ کی وجہ سے جو خشک ہوکر ختم ہو جائے یا ان کثیر سوکھے تنکوں کے باعث جنھیں ہوائیں اڑاتی پھریں۔[6]

غزوۂ حنین کی شکست و ریخت کا تذکرہ قرآنِ مجید میں اس لیے موجود ہے تاکہ ہر

1 تفسير القاسمي: 151/8. 2 تفسير الطبري: 104,103/10. 3 تفسير المراغي: 87/4. 4 التوبة 27:9. 5 حديث القرآن عن غزوات الرسولﷺ لأبي بدر محمد بكر آل عابد: 599/2.
6 تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب: 1618/3.

زمانے اور ہر جگہ کے لوگ عبرت حاصل کریں۔قرآن کریم نے اس قصے میں جو ربانی منہج پیش کیا ہے اس کے چند اہم نکات درج ذیل ہیں:

① قرآن کریم نے یہ بات واضح طور پر بیان کر دی تھی کہ مسلمان اپنی کثرتِ تعداد کی وجہ سے خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے مگر اس کثرت تعداد نے انھیں کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔[1]

② قرآنِ کریم نے واضح طور پر بیان کیا کہ نبی اکرم ﷺ اور چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علاوہ دیگر مسلمان شکست خوردہ ہو گئے اور راہِ فرار اختیار کر گئے۔

③ قرآن کریم نے وضاحت فرمائی ہے کہ اس جنگ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کی مدد فرمائی اور آپ ﷺ کو اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو سکینت سے نوازا۔

④ قرآن کریم نے وضاحت فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حنین میں اپنے نبی محمد ﷺ کو فرشتوں کے ذریعے سے امداد دی۔

⑤ یہ بات اللہ تعالیٰ نے بالتاکید ذکر فرمائی کہ وہ اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے اور جسے چاہتا ہے توبہ کی توفیق دیتا ہے۔[2]

اسباب شکست اور اسباب فتح

ابتدائی شکست کے کئی اسباب تھے جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

① مسلمانوں نے جب اپنی تعداد دیکھی تو ان کے دلوں میں خوش فہمی پیدا ہوئی۔ ایک نے کہا: آج ہم تعداد کی کمی کی وجہ سے ہرگز شکست سے دوچار نہیں ہوں گے۔ اس کی یہ بات رسول اللہ ﷺ کو انتہائی ناگوار گزری، چنانچہ شکست ہو گئی۔

② کچھ ایسے نوجوان بھی ساتھ ہو گئے جن کے پاس ہتھیار نہیں تھے اگر تھے بھی تو نامکمل۔ ان کے پاس صرف جذبہ اور جلد بازی تھی۔

[1] حديث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ لأبي بدر محمد بكر آل عابد: 603,602/2.

[2] المستفاد من قصص القرآن لعبدالكريم زيدان: 409/2.

③ مشرکوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ وہ مسلمانوں سے تعداد میں دوگنا سے بھی زیادہ تھے۔

④ مالک بن عوف حنین میں پہلے پہنچ گیا۔ اس نے وہاں مکمل تیاری کی۔ مورچے بنا لیے، وادی کی تنگ گھاٹیوں میں تیر انداز مقرر کر دیے۔ انھوں نے مسلمانوں پر اچانک تیر برسانے شروع کر دیے اور آناً فاناً حملہ کر دیا۔

⑤ اسلامی لشکر کے سامنے آنے کے بعد دشمن بالکل تیار، منظم اور لڑائی کے لیے مستعد تھا۔ مشرکوں نے بے مثال صف بندی کی تھی۔ گھوڑوں کی صف، پیادہ، جنگجوؤں کی صف، پیچھے عورتیں تھیں، پھر بکریاں اور دیگر جانور۔

⑥ اسلامی لشکر میں کچھ ایسے کمزور ایمان والے افراد بھی موجود تھے جو ابھی مکہ مکرمہ میں مسلمان ہوئے تھے۔ وہ جب بھاگے تو آگے والے لوگ پیچھے آنے والوں پر پلٹ پڑے۔ نتیجتاً بدانتظامی کا مظاہرہ ہوا اور یہ لوگ دوسرے لوگوں کے لیے شکست کا ذریعہ بنے۔[1]

حنین میں فتح کے کئی اسباب تھے جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

① رسول اللہ ﷺ کا ثابت قدمی دکھانا اور واپسی اختیار نہ کرنا، جس کا اثر یہ ہوا کہ تمام لشکر اپنے ثابت قدم قائد کی آواز پر پلٹ آیا اور میدان کارزار میں جم گیا۔

② سپہ سالار کی دلیری۔ رسول اللہ ﷺ جو لشکر کے قائد بھی تھے نہ صرف اپنی جگہ ثابت قدم رہے بلکہ اپنے خچر پر سوار دشمن کی جانب پیش قدمی کرتے رہے۔ لشکر پسپائی دکھاتا ہے اور آپ ﷺ خچر کو دشمن کی جانب ایڑ لگاتے ہیں۔ جبکہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ لگام تھامے اسے آگے بڑھنے سے روک رہے ہیں۔

③ چند دیگر مسلمانوں کا بھی آپ ﷺ کے ساتھ ثابت قدم رہنا، حتی کہ پیٹھ دکھانے

1 المستفاد من قصص القرآن لعبدالکریم زیدان: 409/2.

والے بھی پلٹ آئے اور انھوں نے فتح تک ثابت قدمی اور وفاداری کا ثبوت دیا۔

④ بھاگنے والوں کا جلد پلٹ آنا اور معرکہ آرائی میں شامل ہونا۔

⑤ مخالف لشکر کا ہلاکت خیز غلطی کر جانا۔ وہ غلطی یہ ہے کہ اسلامی لشکر کے منہ پھیرنے کے بعد ان کا پیچھا کر کے انھیں مزید نہ دھکیلنا، جس نے اسلامی لشکر کو سنہری موقع دیا کہ وہ اپنی کوتاہی کا تدارک کر سکیں اور میدان جنگ میں پھر سے پلٹ آئیں۔ تا کہ اپنے بہادر سپہ سالار رسول اللہ ﷺ کی قیادت میں از سر نو جنگ شروع کریں۔

⑥ کنکریاں پھینکنا۔ نبی مکرم ﷺ نے ایک مٹھی کنکریاں لیں اور یہ کہتے ہوئے انھیں کفار کے چہروں پر پھینکا: «اِنْهَزَمُوا وَرَبِّ مُحَمَّدٍ» ''رب محمد کی قسم! یہ شکست کھا چکے۔''[1]

⑦ اللہ تعالیٰ سے مدد و نصرت طلب کرنا۔ رسول اللہ ﷺ انتہائی الحاح وزاری کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے فتح کی دعا فرما رہے تھے۔

⑧ جنگ میں فرشتوں کا نزول اور شرکت، اللہ تعالیٰ نے سورۂ توبہ میں فرشتوں کی اس شرکت کا تذکرہ فرمایا۔[2] ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَأَنزَلَ جُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ﴾

''اور وہ لشکر اتارے جنھیں تم دیکھ نہیں رہے تھے اور کافروں کو پوری سزا دی۔ اور کفار کا یہی بدلہ ہے۔''[3]

غزوۂ حنین اور طائف سے ماخوذ احکام و مسائل

لونڈیوں کی پاکیزگی کے بارے میں وضاحت: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

[1] صحیح مسلم، حدیث: 1775. [2] السيرة النبوية لأبي فارس، ص: 423. [3] التوبة 26:9. السيرة النبوية لأبي فارس، ص:423.

﴿ وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمٰنُكُمْ ﴾

''اور شادی شدہ عورتیں (بھی حرام ہیں) مگر جو تمھاری ملکیت میں آ جائیں۔''[1]

یہ آیت مبارکہ اَوطاس کی شادی شدہ لونڈیوں کے متعلق اتری۔ غلامی اور قید نے ان کے اور ان کے خاوندوں میں تفریق ڈال دی تھی۔ اس آیت نے عدت گزرنے کے بعد ان سے استواریِ تعلقات کو درست قرار دیا۔[2]

ہیجڑوں کی اجنبی عورتوں کے ہاں جانے کی ممانعت: اس سے پہلے ہیجڑوں کو عورتوں سے بے رغبتی کی بنا پر اجنبی خواتین کے پاس آنے جانے کی اجازت تھی۔ مگر بعد میں ہیجڑوں کو اس سے منع کر دیا گیا۔ اس ممانعت کا سبب امام بخاری رحمہ اللہ نے بروایت ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کیا ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے۔ اس وقت میرے پاس ایک ہیجڑا بیٹھا تھا۔ میں نے اسے کہتے ہوئے سنا وہ عبداللہ بن امیہ رضی اللہ عنہ سے کہہ رہا تھا: ''اے عبداللہ! اگر کل اللہ تعالیٰ نے طائف فتح کر دیا تو تم غیلان کی بیٹی کو ہاتھ سے نہ جانے دینا۔ وہ آ رہی ہو تو اس کے چار بَل نظر آتے ہیں اور واپس جا رہی ہو تو آٹھ بَل دکھائی دیتے ہیں۔'' یہ سن کر نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: «لَا يَدْخُلَنَّ هٰؤُلَاءِ عَلَيْكُمْ» ''یہ ہیجڑے آئندہ ہرگز تمھارے پاس نہ آئیں۔''[3]

اس ممانعت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد اسلامی معاشرے کو برے اخلاق سے محفوظ رکھنا تھا۔

بچوں، بوڑھوں، عورتوں اور جنگ نہ کرنے والوں کو قتل کرنے کی ممانعت: امام ابن کثیر رحمہ اللہ ذکر کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حنین کے دن ایک عورت کے پاس سے گزرے جسے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے قتل کر دیا تھا۔ لوگوں نے وہاں مجمع لگا رکھا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «مَا كَانَتْ هٰذِهِ لِتُقَاتِلَ» ''یہ کون سی جنگ کر رہی تھی؟''

[1] النسآء 24:4. [2] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 250/2. [3] صحيح البخاري، حديث: 4324.

اور قریب کھڑے ایک آدمی سے فرمایا: «اِلْحَقْ خَالِدًا، فَقُلْ لَّهُ: لَا يَقْتُلَنَّ ذُرِّيَّةً وَّلَا عَسِيفاً» ''خالد سے ملو اور کہو کہ وہ کسی بچے اور مزدور کو قتل نہ کرے۔''

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خالد رضی اللہ عنہ کو پیغام بھجوایا: «إِنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَنْهَاكَ أَنْ تَقْتُلَ وَلِيدًا، أَوِامْرَأَةً، أَوْ عَسِيفاً» ''رسول اللہ ﷺ آپ کو بچے، عورت اور مزدور کو قتل کرنے سے منع کرتے ہیں۔''[1]

جعرانہ کو میقات (احرام باندھنے کی جگہ) مقرر فرمانا: مکہ مکرمہ میں داخل ہوتے وقت رسول اللہ ﷺ نے عمرے کے لیے جعرانہ سے احرام باندھا۔ طائف اور اس کے آس پاس سے مکہ مکرمہ میں داخل ہونے والوں کا یہی میقات ہے۔ لیکن اب عوام اور بے علم لوگ مکہ مکرمہ سے جعرانہ جاتے ہیں تاکہ عمرے کا احرام باندھ کر آئیں، حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا ہرگز نہیں کیا تھا۔ اور نہ اہل علم میں سے کسی نے اس کو اچھا سمجھا ہے۔ ایسا کام صرف عامۃ الناس کرتے ہیں جو اپنے خیال کے مطابق رسول اللہ ﷺ کی اتباع میں ایسا کر رہے ہوتے ہیں، حالانکہ یہ ان کی غلطی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے تو جعرانہ سے مکہ مکرمہ میں داخل ہوتے ہوئے احرام باندھا تھا۔ آپ ﷺ نے ایسا تو نہیں کیا تھا کہ مکہ مکرمہ سے جعرانہ اس لیے گئے ہوں کہ وہاں سے احرام باندھ کر مکہ آئیں۔[2]

عمرے میں خوشبو اور احرام کا حکم: حضرت یعلیٰ بن منیہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جعرانہ میں تھے۔ وہاں آپ ﷺ کے پاس ایک شخص جبہ پہنے ہوئے آیا اس پر خوشبو لگی ہوئی تھی یا زرد رنگ کی خوشبو کا نشان تھا۔ اس نے سوال کیا کہ میں عمرے میں کیا کروں؟ آپ کا کیا حکم ہے؟ اتنے میں آپ ﷺ پر وحی اترنے لگی۔ آپ ﷺ نے کپڑا اوڑھ لیا۔

---

[1] سنن أبي داود، حديث:2669، وسنن ابن ماجه، حديث:2842، ومسند أحمد:488/3، وصحيح ابن حبان، رقم:4791، والسنن الكبرىٰ للنسائي، رقم:8571-8573. [2] زاد المعاد: 504/3.

یعلیٰ بن منیہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھے آرزو تھی کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی اترتے وقت دیکھوں۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کپڑے کا ایک کنارہ اٹھا دیا۔ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے خراٹے کی آواز آ رہی ہے، پھر جب وحی مکمل ہوگئی تو فرمایا: «أَيْنَ السَّائِلُ عَنِ الْعُمْرَةِ؟ اِغْسِلْ عَنْكَ الصُّفْرَةَ۔ أَوْقَالَ: أَثَرَ الْخُلُوقِ وَاخْلَعْ عَنْكَ جُبَّتَكَ، وَاصْنَعْ فِي عُمْرَتِكَ مَا أَنْتَ صَانِعٌ فِي حَجَّتِكَ» ”عمرے کے متعلق پوچھنے والا کہاں ہے؟ زرد رنگ والی خوشبو کا نشان دھو ڈالو۔“ یا فرمایا: ”خوشبو کا نشان (دھو ڈالو) اور اپنا جبہ بھی اتار دو۔ اور عمرے میں وہی کرو جو تم حج میں کرتے ہو۔“[1]

کافر کا سامان اس کے مسلمان قاتل کے لیے: حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حنین کے دن میں نے ایک مسلمان کو ایک مشرک سے لڑتے دیکھا، وہیں ایک دوسرا مشرک اس مسلمان کے پیچھے سے اسے قتل کرنے کی تاک میں تھا۔ میں تیزی سے اس تک جا پہنچا تو اس نے مجھے مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ میں نے اس کے ہاتھ پر وار کیا اور اسے کاٹ دیا اس کے باوجود اس نے مجھے اتنا دبایا کہ مجھے اپنی موت نظر آنے لگی، پھر وہ بیٹھ گیا اور الگ ہوگیا۔ اس کا زور کم ہو گیا۔ میں نے اسے دھکیل کر قتل کر دیا۔ مسلمان جنگ سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ میں بھی ان کے ساتھ بھاگ نکلا۔ دیکھتا ہوں کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ڈٹے ہوئے لوگوں میں سے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا: ”یہ مسلمانوں کو کیا ہو گیا ہے؟“ انھوں نے کہا: ”اللہ کی مرضی۔“

بعدازاں مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب واپس ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا: «مَنْ أَقَامَ بَيِّنَةً عَلٰى قَتِيلٍ قَتَلَهُ، فَلَهُ سَلَبُهُ» ”جو شخص گواہی سے ثابت کر دے کہ اس نے فلاں کافر کو مارا ہے تو اس کا سامان وہی لے گا۔“ میں نے جس کافر کو مارا تھا اس پر گواہ ڈھونڈنے لگا مگر مجھے کوئی گواہ نہ ملا۔ آخر میں تھک ہار کر بیٹھ گیا، پھر میرے دل

[1] صحيح البخاري، حديث: 1536، وصحيح مسلم، حديث: 1180.

میں خیال آیا تو میں نے یہ معاملہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے رکھا۔ یہ سن کر آپ ﷺ کے پاس بیٹھے لوگوں میں سے ایک شخص بولا: ''جس مقتول کے سامان کا یہ ذکر کر رہا ہے وہ میرے پاس ہے۔ آپ ابوقتادہ کو اپنی طرف سے راضی کر دیجیے۔'' اس پر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا! پرندوں کی طرح عاجز ایک قریشی کو تو آپ نوازیں مگر اللہ کے شیروں میں سے ایک شیر کو جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی حمایت میں لڑتا رہا اسے محروم کر دیں۔'' چنانچہ رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے اور وہ سامان مجھ کو دلا دیا۔ میں نے اسے بیچ کر ایک باغ خریدا۔ وہ پہلی جائیداد تھی جو میں نے زمانۂ اسلام میں حاصل کی۔ [1]

اس روایت سے ہم یہ بات سمجھ سکتے ہیں کہ ابوقتادہ انصاری رضی اللہ عنہ نے اپنے مسلمان بھائی کی سلامتی کی پوری کوشش کی اور انتہائی کوشش کے بعد اس کافر کو قتل کیا۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا موقف بھی حق دار کو حق دلانے اور اس کا دفاع کرنے کی پوری کوشش پر دلالت کرتا ہے۔ [2]

خیانت کی ممانعت: حنین کے روز نبی مکرم ﷺ نے غنیمت کے اونٹ کے کوہان سے کچھ بال لیے اور انھیں اپنی دو انگلیوں میں دبا کر فرمایا:

«أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّهُ لَا يَحِلُّ لِي مِمَّا أَفَاءَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ قَدْرَ هٰذِهِ إِلَّا الْخُمُسُ، وَالْخُمُسُ مَرْدُودٌ عَلَيْكُمْ، فَأَدُّوا الْخِيَاطَ وَالْمِخيَطَ. وَإِيَّاكُمْ وَالْغُلُولَ فَإِنَّ الْغُلُولَ عَارٌ، وَّ نَارٌ وَّ شَنَارٌ عَلٰى أَهْلِهِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ»

''لوگو! تمھارے مال غنیمت میں سے بجز خمس کے میرے لیے اس قدر بھی حلال نہیں۔ اور یہ خمس بھی تمھیں واپس ہوجاتا ہے، اس لیے تم لوگ دھاگا اور سوئی تک

[1] صحيح البخاري، حديث:4322،4321، وصحيح مسلم، حديث: 1751. [2] التاريخ الإسلامي للحميدي:26/8.

جمع کرا دو کیونکہ مالِ غنیمت میں خیانت کرنا قیامت کے روز اور دنیا میں بھی بڑی عار، آگ اور شرم کا باعث ہوگا۔''[1]

جب لوگوں نے اس کے متعلق اس قدر وعید سنی تو بہت زیادہ گھبرا گئے۔ اس کے بعد ایک انصاری بالوں کا ایک گچھا سا لے کر آئے اور عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! میں نے یہ گچھا لے لیا تھا۔ اس میں سے میں اپنے زخمی کوہان والے اونٹ کے لیے دری بُن رہا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «أَمَّا حَقِّي مِنْهَا وَمَا كَانَ لِبَنِي عَبْدِالْمُطَّلِبِ فَهُوَ لَكَ» ''اس میں سے جو میرا اور بنو عبدالمطلب کا حصہ ہے وہ میں نے تمھیں دیا۔'' انصاری نے کہا: ''جب اس گچھے کو رکھنے کا جرم اس قدر ہے تو مجھے اس کی ضرورت نہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے وہ گچھا (مالِ غنیمت کے ڈھیر پر) پھینک دیا۔[2]

ادھر عقیل بن ابوطالب جنگ حنین میں اپنی بیوی فاطمہ بنت شیبہ کے پاس گئے۔ اس وقت ان کی تلوار خون آلود تھی۔ اپنی بیوی سے کہنے لگے: ''یہ سوئی ہے اس سے اپنے کپڑے سی۔'' اور سوئی انھیں دے دی، پھر انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی طرف سے منادی کرنے والے کو یہ کہتے سنا کہ جس نے جو چیز لی ہو واپس کر دے۔ سوئی اور دھاگا تک واپس کر دے۔ عقیل پلٹ کر گھر آئے اور بیوی سے سوئی واپس لے لی اور جا کر اسے اموال غنیمت میں شامل کر دیا۔[3]

جاہلیت میں مانی ہوئی نذر کا پورا کرنا: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب ہم حنین سے لوٹے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''میں نے جاہلیت میں اعتکاف کی نذر مانی تھی؟'' رسول اللہ ﷺ نے انھیں پورا کرنے کا حکم دیا۔[4]

---

1 البداية والنهاية: 353/4. 2 سنن أبي داود، حديث: 2694، ومسند أحمد: 184/2، والسنن الكبرىٰ للنسائي: 264،263/6. 3 السيرة النبوية لابن هشام: 145/4. 4 صحيح البخاري، حديث: 4320، وصحيح مسلم، حديث: 1656.

بعض صحابہ کرام اور صحابیات کے کارہائے نمایاں

انس بن ابومرثد غنوی رضی اللہ عنہ کی پہرے داری

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حنین کے معرکے سے پہلے فرمایا: «مَنْ يَّحْرُسُنَا اللَّيْلَةَ؟» ''آج رات ہماری حفاظت کون کرے گا؟'' جواب میں حضرت انس بن ابومرثد رضی اللہ عنہ نے کہا: ''یہ کام آج میں کروں گا۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «فَارْكَبْ» ''سوار ہوکر آؤ۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم سنتے ہی انس رضی اللہ عنہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوکر حاضر خدمت ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «اِسْتَقْبِلْ هٰذَا الشِّعْبَ حَتّٰى تَكُونَ فِي أَعْلَاهُ وَلَا نُغَرَّنَّ مِنْ قِبَلِكَ اللَّيْلَةَ» ''رات بھر سامنے کی گھاٹی کا اوپر تک خاص خیال رکھنا تاکہ اُدھر سے کوئی اچانک ہم پر حملہ نہ کرنے پائے۔''

سہل بن حنظلیہ کہتے ہیں کہ جب صبح ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لیے تشریف لائے، دو رکعات ادا کیں، پھر دریافت فرمایا: «هَلْ أَحْسَسْتُمْ فَارِسَكُمْ؟» ''کیا تم نے اپنے سوار کو دیکھا؟'' لوگوں نے کہا: ''نہیں۔''

اسی دوران نماز کے لیے اقامت کہی گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھانی شروع کی اور ساتھ ساتھ مسلسل اس گھاٹی کی طرف بھی متوجہ رہے۔ نماز مکمل کر لی تو فرمایا: «أَبْشِرُوا فَقَدْ جَاءَ كُمْ فَارِسُكُمْ» ''خوش ہو جاؤ، تمھارا گھڑ سوار آ پہنچا ہے۔'' آپ درختوں کے اندر سے گھاٹی میں دیکھ رہے تھے، یہاں تک کہ سوار آ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا: ''مجھے آپ نے جہاں جانے کا حکم دیا تھا میں وہیں پر چلا گیا تھا۔ جب صبح ہوئی تو میں دونوں گھاٹیوں پر چڑھا مگر مجھے کوئی شخص نظر نہ آیا۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: «هَلْ نَزَلْتَ اللَّيْلَةَ؟» ''تم رات کو سواری سے اترے تھے؟'' انس رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''سوائے نماز ادا کرنے اور قضائے حاجت کے، لمحہ بھر کے لیے بھی نہیں اترا۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: «قَدْ أَوْجَبْتَ، فَلَا عَلَيْكَ أَنْ لَا تَعْمَلَ بَعْدَهَا» ''تم نے (جنت) واجب کر لی ہے اب کوئی بھی عمل نہ کرو تو تمھارا مواخذہ نہیں ہے۔''[1]

یہ واقعہ اس بات کی دلیل ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے ساتھیوں کو خصوصی اہمیت دیتے تھے۔ نماز میں اس کی طرف دیکھتے رہنا اور نماز کے بعد اس کی آمد کی لوگوں کو خوشخبری سنانا اسلامی معاشرے میں اس کی اہمیت جتلانے کے لیے تھا۔ وہاں لوگ مقصد کے بغیر جمع نہیں ہوتے تھے، نہ وہاں محض خانہ پری ہوتی تھی اور نہ ہی لوگ وہاں وقتی فائدہ اٹھانے کے لیے استعمال کیے جاتے تھے بلکہ وہاں تو ایسا اقدام کیا جاتا تھا جو الٰہی منہج کی عملی تفسیر ہوتا تھا۔[2]

اس قصے سے ایک اور بات بھی سمجھ آتی ہے کہ دشمن کے حالات سے واقف رہنا، محتاط اقدام کرنا، حرکات کا جائزہ لینا، اس کی تعداد، قوت، اسلحہ اور جنگی چالوں سے باخبر رہنا نہ صرف منہج نبوی ہے بلکہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے کوشش کرنے والے حکمرانوں کے لیے اہم سیاسی نکتہ بھی ہے۔[3]

رسول اللہ ﷺ نے جو انس بن ابی مرثد رضی اللہ عنہ کو آئندہ کوئی بھی عمل نہ کرنے کی صورت میں مواخذہ سے آزاد قرار دیا، اس سے مراد نوافل ہیں، یعنی ایسے اعمال جن سے گناہ معاف ہوتے اور درجات بلند ہوتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ انس بن ابو مرثد غنوی رضی اللہ عنہ نے اتنا بڑا عمل کیا کہ مستقبل میں اگر کوئی کمی کوتاہی ہوگی تو یہ عمل کفایت کر جائے گا۔ اس کا یہ ہرگز مفہوم نہیں ہے کہ یہ عمل فرائض و واجبات کو بھی کافی ہو جائے گا۔[4]

حنین کے دن ام سلیم رضی اللہ عنہا کی بہادری

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حنین کے دن ام سلیم رضی اللہ عنہا کے پاس ایک خنجر تھا۔

1 سنن أبي داود، حديث: 2501، والسنن الكبرىٰ للنسائي، رقم: 8819. 2 من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 429. 3 محمد رسول الله ﷺ لصادق عرجون: 366/4. 4 التاريخ الإسلامي للحميدي: 14/8.

ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ نے وہ خنجر دیکھا تو عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! ام سلیم کے پاس خنجر ہے۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: «مَا هٰذَا الْخَنْجَرُ؟» ''یہ خنجر کیسا ہے؟'' کہنے لگیں: ''میں نے یہ خنجر اس لیے لیا ہے کہ اگر کوئی مشرک ہمارے قریب آئے تو میں اس کا پیٹ چاک کر دوں۔'' یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہنسنے لگے۔ ام سلیم بولیں: ''اے اللہ کے رسول! جو لوگ آپ کو چھوڑ کر پسپا ہوتے ہوئے پیچھے ہٹ گئے ہیں انھیں قتل کر دیجیے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: «يَا أُمَّ سُلَيْمٍ! إِنَّ اللّٰهَ قَدْ كَفٰى وَ أَحْسَنَ» ''ام سلیم! دیکھیے اللہ تعالیٰ خود کافی ہو گیا ہے اور اس نے بڑا احسان فرما دیا ہے۔''[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی بہن شیماء بنت حارث رضی اللہ عنہا

مسلمانوں نے قیدیوں میں حضرت حلیمہ کی بیٹی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی بہن شیماء بنت حارث کو بھی پیش کیا۔ انھوں نے بے خبری میں دیگر قیدیوں کے ہمراہ ان پر بھی سختی کی تو اس نے مسلمانوں سے کہا: ''تمھیں علم ہے کہ میں تمھارے ساتھی یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی بہن ہوں!'' مگر انھوں نے یہ بات تسلیم نہ کی بلکہ اسے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آئے۔ شیماء نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوتے ہی عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! میں آپ کی رضاعی بہن ہوں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: «مَا عَلَامَةُ ذٰلِكَ؟» ''اس کی کوئی نشانی بھی ہے؟'' شیماء نے عرض کیا: ''میری پشت پر دانت سے کاٹنے کا ایک نشان ہے۔ یہ آپ نے اس وقت کاٹا تھا جب میں آپ کو پشت پر اٹھائے ہوئے تھی۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ علامت پہچان لی، چنانچہ شیماء کے لیے اپنی چادر بچھا دی اور فرمایا: «إِنْ أَحْبَبْتِ فَعِنْدِي مَحَبَّةٌ مَكْرَمَةٌ وَإِنْ أَحْبَبْتِ أَنْ أُمَتِّعَكِ وَتَرْجِعِي إِلٰى قَوْمِكِ فَعَلْتُ» ''اگر تم پسند کرو تو میرے پاس رہو تمھیں بڑی چاہت اور عزت دی

[1] صحیح مسلم، حدیث: 1809.

جائے گی اور اگر تم پسند کرو کہ میں تمھیں سازوسامان دے دوں اور تم اپنی قوم میں واپس چلی جاؤ تو میں یہ بھی کر دوں گا۔'' شیماء نے کہا: ''بلکہ آپ مجھے کچھ سازوسامان دے دیجیے اور مجھے اپنی قوم میں واپس بھیج دیجیے۔'' رسول اللہ ﷺ نے انھیں بہترین سازوسامان سے نوازا اور واپس بھیج دیا، پھر وہ مسلمان ہوگئیں۔[1]

رسول اللہ ﷺ نے انھیں تین غلام، ایک لونڈی کچھ اونٹ اور چند بکریاں عنایت فرمائیں۔[2]

مشہور شاعر کعب بن زہیر کا قبولِ اسلام

رسول اللہ ﷺ جب طائف سے واپس ہوئے تو شاعر ابن شاعر کعب بن زہیر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے رسول اللہ ﷺ کی مذمت میں اشعار کہے تھے۔ پھر اس پر زمین تنگ ہوگئی اور اسے اپنے متعلق بھی ڈر محسوس ہوا۔ اس کے بھائی بجیر نے اسے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے پر آمادہ کیا۔ بصورت دیگر اسے برے انجام سے بھی باخبر کر دیا۔ اس نے اس موقع پر وہ مشہور قصیدہ کہا جس نے ''بانت سعاد'' کے نام سے بے مثال شہرت پائی۔ وہ مدینہ منورہ آیا۔ رسول اللہ ﷺ صبح کی نماز پڑھ چکے تھے۔ اس نے اپنا ہاتھ آپ ﷺ کے ہاتھ میں دیا اور بیٹھ گیا۔ رسول اللہ ﷺ اسے نہیں جانتے تھے۔ وہ عرض کرنے لگا: ''اگر کعب بن زہیر آپ کے پاس توبہ تائب ہو کر آئے اور امان کا طالب ہو تو کیا آپ اسے امان دیں گے؟'' اتنے میں ایک انصاری اچھل کر آ گیا اور عرض کرنے لگا: ''اے اللہ کے رسول! مجھے اجازت دیجیے، میں اللہ کے اس دشمن کی گردن اڑا دوں۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «دَعْهُ عَنْكَ، فَقَدْ

1 البداية والنهاية: 4/463، والسيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 2/506. 2 السيرة النبوية لابن هشام: 4/101,100، ودلائل النبوة للبيهقي: 5/200,199، والمصنف لعبدالرزاق: 7/479، رقم: 13958، وتاريخ الطبري: 3/132,131، والسيرة النبوية للندوي، ص: 358.

جَاءَ تَائِباً نَّازِعاً» ''اسے جانے دو۔ یہ توبہ تائب ہو کر آیا ہے۔'' تب کعب نے اپنا مشہور قصیدہ لامیہ کہا۔

بَانَتْ سُعَادُ فَقَلْبِي الْيَوْمَ مَتْبُولُ
مُتَيَّمٌ إِثْرَهَا لَمْ يُفْدَ مَكْبُولُ

''سعاد مجھ سے جدا ہو گئی، اس لیے آج میرا دل اس کے عشق میں بیمار ہے۔ اس کے پیچھے ذلیل و رسوا ہے۔ بے پا بہ زنجیر اسیر ہے۔''

وَمَا سُعَادُ غَدَاةَ الطَّرْفِ إِذْ رَحَلُوا
إِلَّا أَغَنَّ قَرِيرُ الْعَيْنِ مَكْحُولُ

''سعاد کو جب کوچ کے وقت صبح بخیر کہا تو وہ گنگنا رہی تھی اور اس نے خوشی و رضا مندی کا سرمہ آنکھوں میں ڈالا ہوا تھا۔''

إِنَّ الرَّسُولَ لَنُورٌ يُّسْتَضَاءُ بِهِ
مُهَنَّدٌ مِّنْ سُيُوفِ اللّٰهِ مَسْلُولُ

''بلاشبہ رسول گرامی قدر ایک ایسا نور اور چراغ ہیں جس سے روشنی حاصل کی جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی تلواروں میں سے ایک بے نیام ہندی تلوار ہیں۔''

فِي عُصْبَةٍ مِّنْ قُرَيْشٍ قَالَ قَائِلُهُمْ
بِبَطْنِ مَكَّةَ لَمَّا أَسْلَمُوا زُولُوا

''قریش کی جماعت میں سے کسی کہنے والے نے اس وقت کہا تھا جب وہ بطن مکہ میں مسلمان ہوئے کہ یہاں سے چلے جاؤ۔''

شُمُّ الْعَرَانِينِ أَبْطَالٌ لُبُوسُهُمْ
مِّنْ نَّسْجِ دَاوُدَ فِي الْهَيْجَا سَرَابِيلُ

''وہ معزز ومحترم اور بہادر لوگ ہیں۔ جنگ میں ان کا لباس حضرت داود علیہ السلام کی بنی ہوئی زرہیں ہوتی ہیں۔'' [1]

مشہور یہی ہے کہ جب اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ اشعار پڑھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنی مبارک چادر عنایت فرمائی۔ یہی چادر پھر خلفاء کے پاس بھی رہی۔ [2]

ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ بڑا مشہور واقعہ ہے مگر یہ ان قابل اعتماد اور شہرت یافتہ کتب میں قابلِ اعتماد سند سے ثابت نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ [3]

کہا جاتا ہے کہ یہ قصیدہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «لَوْلَا ذَكَرْتَ الْأَنْصَارَ بِخَيْرٍ فَإِنَّ الْأَنْصَارَ لِذٰلِكَ أَهْلٌ» ''تم نے انصار کا بھی اچھے الفاظ میں تذکرہ کر دیا ہوتا تو (اچھا تھا) کیونکہ وہ بلاشبہ تعریف کے مستحق ہیں۔''

تو اس نے کہا:

مَنْ سَرَّهُ كَرَمُ الْحَيَاةِ فَلَا يَزَلْ
فِي مِقْنَبٍ مِّنْ صَالِحِي الْأَنْصَارِ

''جسے زندگی کی شرافت سے خوشی ہوتی ہے، اسے چاہیے کہ انصار کے نیک گروہ کے ساتھ رہے۔''

وَرِثُوا الْمَكَارِمَ كَابِرًا عَنْ كَابِرٍ
إِنَّ الْخِيَارَ هُمْ بَنُو الْأَخْيَارِ

''انصار نسل درنسل بزرگی وشرافت کے وارث چلے آئے ہیں۔ واقعی بات یہی ہے کہ بہترین لوگ صرف انصار کی اولادیں ہیں۔''

---

1 المستدرك للحاكم:3/579-583، والمعجم الكبير للطبراني: 19/176-179، رقم: 403، ودلائل النبوة للبيهقي: 5/207-211، ومجمع الزوائد:9/393,394، والبداية والنهاية: 4/369-371. 2 السيرة النبوية لأبي شهبة:2/487. 3 البداية والنهاية:4/373.

الْمُكْرَهِينَ السَّمْهَرِيَّ بِأَذْرُعٍ
كَسَوَالِفِ الْهِنْدِيِّ غَيْرِ قِصَارِ

''وہ اپنے ہاتھوں سے مضبوط، سخت نیزوں کو جو لمبائی میں طویل ہندی تلواروں کے مانند ہیں، خوب چلاتے ہیں۔''

وَالنَّاظِرِينَ بِأَعْيُنٍ مُّحْمَرَّةٍ
كَالْجَمْرِ غَيْرَ كَلِيلَةِ الْأَبْصَارِ

''وہ انگارے کی طرح سرخ سرخ آنکھوں سے جو تھکی ہوئی ہرگز نہیں ہوتیں، دیکھتے ہیں۔''

وَالْبَائِعِينَ نُفُوسَهُمْ لِنَبِيِّهِمْ
لِلْمَوْتِ يَوْمَ تَعَانُقٍ وَّكِرَارِ

''یہ انصار اپنی جانیں اپنے پیغمبر کو موت کے عوض فروخت کر دینے والے ہیں، اس دن جب گھمسان کی جنگ ہو، جب تلواریں گردنوں سے معانقہ کریں اور بار بار حملہ ہو۔''

وَالْقَائِدِينَ النَّاسَ عَنْ أَدْيَانِهِمْ
بِالْمَشْرَفِيِّ وَبِالْقَنَا الْخَطَّارِ

''اور وہ لوگوں کو ان کے اپنے ادیان سے متحرک نیزوں اور تلواروں سے روکنے والے ہیں۔''

يَتَطَهَّرُونَ يَرَوْنَهُ نُسُكاً لَّهُمْ
بِدِمَاءِ مَنْ عَلِقُوا مِنَ الْكُفَّارِ

''انصار وہ لوگ ہیں جو ان کفار کے خون سے طہارت حاصل کرتے ہیں جو اپنے کفر کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں اور اسے انصار اپنے لیے عبادت سمجھتے ہیں۔''

حتی کہ کعب بن زہیر نے یہاں بات مکمل کی:

لَوْ يَعْلَمُ الْأَقْوَامُ عِلْمِي كُلَّهُ
فِيهِمْ لَصَدَّقَنِي الَّذِينَ أُمَارِي

''جو شخص مجھ سے ان کے متعلق جھگڑتے ہیں اگر ان لوگوں کو بھی وہ تمام معلومات حاصل ہو جائیں جو مجھ تک پہنچ چکی ہیں تو یقیناً وہ میری تصدیق کریں گے۔''

قَوْمٌ إِذَا خَوَتِ النُّجُومُ فَإِنَّهُمْ
لِلطَّارِقِينَ النَّازِلِينَ مَقَارِي

''یہ ایسے لوگ ہیں کہ جب ستارے گرنے لگتے ہیں (قحط پڑ جاتا ہے) تو یہ رات کو مہمان بن کر آنے والوں کے لیے بہترین مہمان نواز ثابت ہوتے ہیں۔''[1]

یہ بات ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ کعب رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کے ساتھ ہی اسلامی دعوت کے مخالف شعراء کا باب بالکل بند ہو گیا۔ اب تک بڑے بڑے شعراء ضرار بن خطاب، عبداللہ بن زبعری، ابوسفیان بن حارث، حارث بن ہشام اور عباس بن مرداس اور دیگر شعراء اسلام قبول کر چکے تھے۔ یہ تمام شعراء ایمان و یقین کے ساتھ اسلامی صف میں شامل ہو چکے تھے۔ ان میں کئی ایک تو وہ تھے جنھوں نے اسلام کی حمایت میں اپنی زبان ہی نہیں تلوار بھی استعمال کی۔ ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ یہ فتح مکہ کی برکات تھیں۔[2]

غزوۂ حنین اور طائف کے نتائج

① مسلمانوں کا بنو ہوازن اور بنو ثقیف کے قبائل پر غالب آنا۔

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 4/168,167. [2] من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 431-433.

② حنین اور طائف مشرکین عرب کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے آخری غزوات تھے۔

③ اموالِ غنیمت کے ذریعے اکثر اہل مکہ اور بدویوں کے قلوب میں اسلام کے لیے نرم گوشہ پیدا کیا گیا۔ انصار کو بڑا اعزاز ملا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے لیے اور ان کے بیٹوں اور پوتوں کے لیے دعائے خیر فرمائی اور اس کے ساتھ ساتھ یہ شرف بھی انصار ہی کو حاصل تھا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی معیت میں واپس مدینہ پہنچے۔

④ اہل مکہ اور ہوازن کی صورت میں اسلام کو اعلیٰ پائے کی قیادت میسر آئی۔ وہ خود عرب میں بتوں، آستانوں اور دور جاہلیت کے بتکدوں کے خلاف کمربستہ ہو گئے۔ جیسا کہ اہل طائف پر دائرہ تنگ کرنے اور انھیں اسلام کے دامن میں لانے کے سلسلے میں قبیلہ بنو ہوازن کا نمایاں کردار تھا۔

⑤ اسلامی حکومت وسعت اختیار کر گئی اور اس کا عمل دخل مزید بڑھ گیا۔ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے مکہ مکرمہ اور بنو ہوازن پر امراء مقرر کیے گئے۔ یہ تمام مقامات حکومت کا حصہ بن گئے۔ رسول اللہ ﷺ کے لیے ہر طرف بلا خوف وخطر دعوتی قافلے بھیجنا ممکن ہو گیا۔ فتح مکہ کے بعد مدینہ منورہ میں تسلسل سے اسلام قبول کرنے والے قافلوں اور گروہوں کا استقبال ہونے لگا۔ چھوٹی چھوٹی جماعتیں بآسانی بتوں اور آستانوں کا صفایا کر رہی تھیں۔ ساتھ ہی رسول اللہ ﷺ نے قبائل سے زکاۃ جمع کرنے کا نظام بھی تشکیل دے دیا اور اس کے لیے بعض افراد کو ذمہ داریاں بھی سونپ دی گئیں۔ [1]

[1] الأساس في السنة لسعيد حوّى: 961/2.

باب 4

تبوک سے قبل اہم واقعات

صدقات وصول کرنے کا طریق کار

رسول اللہ ﷺ ذوالقعدہ کے آخر میں مدینہ منورہ واپس تشریف لائے۔ اور اب حکومتی معاملات کو منظم فرمانے لگے۔ آپ ﷺ جب عمرے سے فارغ ہوئے تو مکہ مکرمہ پر عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب مقرر فرما دیا۔ قرآن پاک کی تعلیم دینے اور لوگوں کو دینی مسائل سمجھانے کے لیے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا۔ رسول اللہ ﷺ کی عادتِ مبارکہ تھی کہ جب بھی اور جہاں سے بھی کچھ قبائل اسلام میں داخل ہوتے آپ ﷺ ان کی تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام فرماتے اور وہاں اس کام کے لیے ایک شخص کو متعین کر دیتے۔ کیونکہ نئے لوگ صحیح اسلامی تصورات و عقائد کے خصوصی محتاج ہوتے ہیں، چنانچہ 9ھ کے شروع میں رسول گرامی ﷺ نے اپنے عمال مختلف مقامات کی طرف بھیجے۔ بریدہ بن حصیب رضی اللہ عنہ کو اسلم اور غفار قبیلوں کی طرف، عباد بن بشر رضی اللہ عنہ کو سُلیم اور مزینہ قبیلوں کی طرف، رافع بن مکیث رضی اللہ عنہ کو جہینہ قبیلے کی جانب، عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو فزارہ قبیلے کی طرف، ضحاک بن شعبان کلابی رضی اللہ عنہ کو بنو کلاب قبیلے کی طرف، بسر بن سفیان کعبی رضی اللہ عنہ کو بنو کعب کی سمت اور ابن لتبیہ ازدی رضی اللہ عنہ کو بنو ذبیان کی طرف بھیجا۔ بنو سعد بن ہذیم کی طرف انھی میں سے ایک شخص کو بھیجا۔ مہاجر بن ابی امیہ رضی اللہ عنہ کو صنعاء کی طرف، زیاد بن لبید رضی اللہ عنہ کو حضر موت کی طرف، زبرقان بن بدر اور قیس بن عاصم رضی اللہ عنہما کو

بنو سعد کی طرف، علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ کو بحرین کی طرف اور علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو نجران کی طرف زکاۃ وصول کرنے اور جزیہ اکٹھا کرنے کے لیے روانہ فرمایا۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عمال سے پورا پورا حساب لیتے۔ ان سے آمدن اور خرچ کا حساب کرتے۔ ایک عامل ابن لتبیّہ ازدی (جب واپس آئے تو) کہنے لگے: ''یہ آپ کا مال ہے اور یہ مال مجھے بطور تحفہ ملا ہے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر کھڑے ہوئے، اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی اور فرمایا:

«مَا بَالُ عَامِلٍ أَبْعَثُهُ، فَيَقُولُ: هٰذَا لَكُمْ وَهٰذَا أُهْدِيَ لِي، أَفَلَا قَعَدَ فِي بَيْتِ أَبِيهِ أَوْ بَيْتِ أُمِّهِ حَتّٰى يَنْظُرَ أَيُهْدٰى إِلَيْهِ أَمْ لَا؟! وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ! لَا يَنَالُ أَحَدٌ مِّنْكُمْ شَيْئًا إِلَّا جَاءَ بِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَحْمِلُهُ عَلٰى عُنُقِهٖ، إِنْ كَانَ بَعِيرًا لَّهُ رُغَاءٌ، أَوْ بَقَرَةً لَّهَا خُوَارٌ أَوْ شَاةً تَيْعَرُ»

''اس عامل کا کیا حال ہے جس کو میں مقرر کرتا ہوں۔ (جب زکاۃ و صدقات جمع کرانے کا وقت آتا ہے) تو کہتا ہے: ''یہ آپ کا مال ہے اور یہ مجھے ہدیہ ملا ہے۔'' وہ اپنے باپ یا ماں کے گھر میں کیوں نہ بیٹھا رہا؟ پھر دیکھتا کہ اسے ہدیہ ملتا ہے یا نہیں۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے! تم میں سے جو کوئی بھی ایسا مال لے گا وہ اسے قیامت کے روز اپنی گردن پر لاد کر لائے گا، اونٹ ہو گا تو وہ بلبلاتا ہو گا، گائے ہو گی تو وہ ڈکراتی ہو گی اور بکری ہو گی تو وہ منمناتی ہو گی۔''

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے حتی کہ ہمیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «اَللّٰهُمَّ هَلْ بَلَّغْتُ؟» ''اے اللہ! کیا میں نے تیرا حکم پہنچا نہیں دیا؟''[2] یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو بار دُہرائی۔

[1] نضرة النعيم:384/1. [2] صحيح البخاري، حديث:6979، وصحيح مسلم، حديث:1832.

اسی طرح آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے:

«أَيُّمَا عَامِلٍ اسْتَعْمَلْنَاهُ وَفَرَضْنَا لَهُ رِزْقًا فَمَا أَصَابَ بَعْدَ رِزْقِهِ فَهُوَ غُلُولٌ»

''کسی شخص کے ذمے ہم کام لگائیں اور اس پر معاوضہ بھی مقرر کر لیں تو وہ شخص اس مقرر کردہ معاوضے کے سوا کچھ بھی لے گا تو وہ خیانت ہوگا۔''[1]

''ذوالکفلین'' کی جانب طفیل بن عمرو رضی اللہ عنہ کی پیش قدمی

رسول اللہ ﷺ جس وقت حنین میں قیام پذیر تھے اور ابھی طائف کی جانب نہ بڑھے تھے، آپ ﷺ نے طفیل بن عمرو رضی اللہ عنہ کو ''قبیلۂ دوس'' کا بت ''ذوالکفلین'' گرانے کے لیے روانہ فرمایا اور اسے حکم دیا کہ اپنی قوم کی کمک کے ہمراہ مجھے طائف میں آ ملو۔ حضرت طفیل رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے حکم کو بجا لاتے ہوئے ''ذوالکفلین'' کو گرا کر جلا دیا۔ اور پھر قوم کے چار سو آدمی بطور امداد اور ایک منجنیق ساتھ لیے رسول اللہ ﷺ کو طائف میں جا ملے۔ ابھی آپ ﷺ کو وہاں پہنچے صرف چار دن ہوئے تھے۔[2]

عبداللہ بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ کا سریہ

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک چھوٹا فوجی دستہ ایک انصاری کی قیادت میں روانہ فرمایا اور لوگوں کو حکم دیا کہ امیر کی اطاعت کریں۔ ایک بار ایسا ہوا کہ امیر کو غصہ آ گیا۔ وہ کہنے لگا: ''کیا رسول اللہ ﷺ نے تمھیں میری اطاعت کا حکم نہیں دیا؟'' لوگوں نے کہا: ''کیوں نہیں؟ دیا ہے۔'' اس نے لوگوں کو لکڑیاں جمع کرنے کا حکم دیا۔ لوگوں نے لکڑیاں جمع کر دیں۔ اس نے کہا: ''آگ جلاؤ۔'' لوگوں

---

1 سنن أبي داود، حديث:2943، والتراتيب الإدارية للكتاني:265/1، علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے، دیکھیے: (صحيح سنن أبي داود، حديث:2943.) 2 نضرة النعيم:385/1.

نے آگ جلا دی۔ اس نے کہا: ''اب اس میں کود پڑو۔'' کچھ لوگوں نے ارادہ کیا کہ کود پڑیں مگر دوسرے افراد روکنے لگے اور کہنے لگے: ''ہم تو رسول اللہ ﷺ کے پاس اس لیے آئے تھے کہ آگ سے بچیں۔'' یہی باتیں کر رہے تھے کہ آگ بجھ گئی اور امیر کا غصہ بھی ٹھنڈا ہو گیا۔ یہ خبر آپ ﷺ کو پہنچی تو فرمایا: «لَوْ دَخَلُوهَا مَا خَرَجُوا مِنْهَا إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ، اَلطَّاعَةُ فِي الْمَعْرُوفِ» ''اگر وہ اس آگ میں گھس جاتے تو قیامت تک کے لیے اس سے نہ نکلتے۔ امیر کی اطاعت صرف جائز کاموں میں ہے۔''[1]

''طے'' کے بت ''فُلس'' کو گرانے کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روانگی

ربیع الآخر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی معیت میں ''طے'' کا بت ''فُلس'' گرانے کے لیے لشکر روانہ ہوا جو ڈیڑھ سو افراد پر مشتمل تھا۔ وہ تمام انصاری تھے۔ یہ لشکر ایک سو اونٹ، پچاس گھوڑوں، ایک بڑے سیاہ جھنڈے اور ایک سفید چھوٹے علَم کے ساتھ روانہ ہوا۔ انھوں نے فجر کے وقت محلّہ آل حاتم (اسی حاتم طائی سے منسوب محلّہ جو سخاوت میں ضرب المثل ہے۔) پر حملہ کیا۔ ''فُلس'' کو گرا کر برباد کر دیا۔ اور دیگر مال غنیمت اور قیدیوں میں عدی بن حاتم کی بہن بھی قید ہوئی، جبکہ عدی خود شام کی جانب بھاگ گیا۔[2]

ذوالخلصہ کی جانب جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ کا لشکر

حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: «أَلَا تُرِيحُنِي مِنْ ذِي الْخَلَصَةِ؟» ''کیا تم ''ذوالخلصہ'' کو گرا کر مجھے راحت نہیں پہنچاتے؟'' میں نے عرض کیا: ''کیوں نہیں۔'' میں نے ایک سو پچاس ماہر گھڑ سوار ساتھ لیے مگر میں خود گھوڑے پر اچھی طرح بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ یہ بات میں نے رسول اللہ ﷺ

1 صحيح البخاري، حديث: 4340، وصحيح مسلم، حديث: 1840. 2 تاريخ الإسلام (المغازي) للذهبي، ص: 624.

سے عرض کی تو آپ ﷺ نے میرے سینے پر اپنا ہاتھ رکھا یہاں تک کہ میں نے آپ ﷺ کی انگلیوں کا اثر اپنے سینے میں محسوس کیا۔ پھر آپ ﷺ نے دعا فرمائی: «اَللّٰهُمَّ ثَبِّتْهُ وَاجْعَلْهُ هَادِيًا مَّهْدِيًّا» ''اے اللہ! اسے گھوڑے پر جم کر بیٹھنے کی ہمت عطا فرما اور اس کو راستہ دکھانے والا اور راستہ پانے والا بنا دے۔''

حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں اس کے بعد کبھی گھوڑے سے نہیں گرا۔

''ذوالخلصہ'' یمن میں خثعم اور بجیلہ قبائل کا بت خانہ تھا۔ اسے ''کعبہ یمانیہ'' بھی کہا جاتا تھا۔ حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ نے اسے گرا کر جلا ڈالا۔

حضرت جریر رضی اللہ عنہ یمن پہنچ گئے وہاں ایک شخص تیروں سے فال نکالا کرتا تھا۔ لوگوں نے اس سے کہا: یہاں رسول اللہ ﷺ کا ایک ایلچی آیا ہوا ہے۔ اگر اس نے تجھے پالیا تو تیری گردن مار دے گا، پھر ایسا ہوا کہ وہ فال نکال رہا تھا کہ حضرت جریر رضی اللہ عنہ وہاں پہنچ گئے اور اس سے کہا: ''یہ فال کے تیر توڑ ڈال اور لا إلٰه إلا اللّٰه پڑھ لے، ورنہ میں ابھی تیری گردن ماردوں گا۔'' اس نے وہ تیر توڑ دیے اور اللہ تعالیٰ کی واحدانیت کی گواہی دی، پھر حضرت جریر رضی اللہ عنہ نے قبیلہ ''اُحمس'' کا ایک شخص رسول اللہ ﷺ کو خوشخبری دینے کے لیے روانہ کیا۔ اس کی کنیت ''ابوارطاۃ'' تھی۔ جب وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا تو اس نے یوں خبر دی: ''اے اللہ کے رسول! میں جب وہاں سے آیا تب تک ذوالخلصہ خارش زدہ اونٹ کی طرح بنا دیا گیا تھا۔'' اس پر رسول اللہ ﷺ نے احمس کے گھوڑوں اور ان کے سواروں کے لیے پانچ بار برکت کی دعا فرمائی۔ [1]

عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام

عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ قید ہو کر آئی تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے ساتھ بڑا

[1] صحيح البخاري، حديث: 4357، و صحيح مسلم، حديث: 2476، و سنن أبي داود، حديث:2772، و مسند أحمد:4/362، والسنن الكبرٰى للنسائي، رقم:8245.

کریمانہ اور فیاضانہ سلوک کیا۔ یہ مسلمانوں کی قید میں بھی معزز و مکرم رہی، پھر رسول اکرم ﷺ نے اسے فاخرانہ لباس پہنا کر زادِ سفر دے کر اپنے بھائی کی تلاش میں روانہ فرما دیا۔ یہ شام میں اپنے بھائی عدی کے پاس پہنچی اور اسے رسول اللہ ﷺ کے پاس جانے پر آمادہ کیا تو وہ مدینہ آ گیا۔[1]

ابو عبیدہ بن حذیفہ کی زبانی عدی بن حاتم طائی کا قصۂ اسلام سنتے ہیں: حضرت ابو عبیدہ بن حذیفہ کا بیان ہے کہ میں بالواسطہ عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کا قصہ بیان کیا کرتا تھا۔ ایک روز میں نے دل میں سوچا کہ کوفہ میں عدی رضی اللہ عنہ موجود ہیں کیوں نہ میں ان کے پاس جا کر ان کی زبانی وہ واقعہ سن لوں۔ میں ان کے پاس گیا اور عرض کیا: ”میں آپ کے قبول اسلام کا قصہ سناتا رہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ میں آپ سے بلاواسطہ وہ واقعہ سن لوں۔“ یہ گزارش سن کر انھوں نے یہ قصہ یوں بیان کرنا شروع کیا:

”جب اللہ عزوجل نے رسول اللہ ﷺ کو نبی بنا کر مبعوث فرمایا تو میں بھاگ کر روم میں اس جگہ چلا گیا جو مسلمانوں سے بہت دور تھی۔ میں نے اس جگہ رہنا پسند نہ کیا۔ اور یہ جگہ مجھے میری سابقہ جگہ سے بھی انتہائی معیوب معلوم ہونے لگی، لہٰذا میں نے سوچا کہ میں ضرور اس شخص (رسول اللہ ﷺ) کے پاس جاؤں گا۔ اگر وہ سچا ہے تو میں اس کی سنوں گا۔ لیکن اگر وہ جھوٹا ہے تو مجھے نقصان نہ پہنچا سکے گا، چنانچہ میں مدینہ آ گیا۔ لوگوں نے مجھے دیکھتے ہی شور مچا دیا: ”عدی بن حاتم، عدی بن حاتم۔“ یہ بات غالباً عدی رضی اللہ عنہ نے تین بار کہی۔ عدی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں (کہ میں نبی ﷺ کے پاس پہنچا) تو رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: «يَا عَدِيُّ بْنَ حَاتِمٍ! أَسْلِمْ تَسْلَمْ» ”عدی! اسلام قبول کر لو بچ جاؤ گے۔“

عدی کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: ”میں پہلے ہی ایک دین پر ہوں۔“ آپ ﷺ نے دوبارہ فرمایا: «يَا عَدِيُّ بْنَ حَاتِمٍ! أَسْلِمْ تَسْلَمْ» ”اے عدی بن حاتم! اسلام قبول کر لو محفوظ رہو گے۔“

---

[1] التاريخ الإسلامي للحميدي: 81/8.

میں نے جواباً عرض کیا: ''میں تو پہلے ہی ایک دین پر ہوں۔'' آپ ﷺ نے یہ بات تین دفعہ دُہرائی۔

آپ ﷺ نے فرمایا: «أَنَا أَعْلَمُ بِدِينِكَ مِنْكَ» ''تیرے دین کو میں تجھ سے بھی زیادہ جانتا ہوں۔''

میں نے تعجب سے دریافت کیا: ''آپ میرے دین کو مجھ سے بھی زیادہ جانتے ہیں؟''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «نَعَمْ، أَلَسْتَ مِنَ الرَّكُوسِيَّةِ وَأَنْتَ تَأْكُلُ مِرْبَاعَ قَوْمِكَ؟» ''ہاں! کیا تم عیسائیوں اور صابیوں (بے دینوں) سے ملتے جلتے دین کو اختیار کرنے والوں میں سے نہیں ہو؟ اور تم اپنی قوم کے مالِ غنیمت میں سے چوتھائی سے فائدہ اٹھاتے ہو؟'' میں نے کہا: ''ہاں! کیوں نہیں؟'' نبی ﷺ نے فرمایا: «فَإِنَّ هٰذَا لَا يَحِلُّ لَكَ فِي دِينِكَ» ''یہ تمھارے دین میں تمھارے لیے حلال نہیں۔''

عدی کہتے ہیں کہ جب آپ ﷺ نے یہ بات کہی تو میں نے سرِتسلیم خم کرلیا، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: «وَإِنِّي قَدْ أَرٰى أَنَّ مِمَّا يَمْنَعُكَ خَصَاصَةً تَرَاهَا مِمَّنْ حَوْلِي. وَأَنَّ النَّاسَ عَلَيْنَا إِلْبًا وَّاحِدًا، هَلْ تَعْرِفُ مَكَانَ الْحِيرَةِ؟» ''میرا خیال ہے کہ میرے اردگرد کے لوگ دولتمند نہیں شاید تم اسی لیے اسلام قبول نہیں کر رہے۔ اور اس لیے بھی کہ تمام لوگ ہمارے خلاف متحد ہیں۔ مگر عدی کیا تم ''حیرہ'' شہر سے واقف ہو؟'' میں نے عرض کیا: ''سنا تو ہے مگر دیکھا نہیں۔'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: «لَتُوشَكَنَّ الظَّعِينَةُ أَنْ تَخْرُجَ مِنْهَا بِغَيْرِ جِوَارٍ حَتّٰى تَطُوفَ بِالْكَعْبَةِ، وَلَتُوشَكَنَّ كُنُوزُ كِسْرَى بْنِ هُرْمُزَ تُفْتَحُ» ''وہ وقت دور نہیں جب ایک عورت حیرہ سے چلے گی اور کسی سے پناہ لیے بغیر کعبے کا طواف کرے گی اور وہ وقت بھی دور نہیں کہ کسریٰ بن ہرمز کے خزانے فتح ہوں گے۔'' عدی کہتے ہیں کہ میں نے (جلدی سے) کہا: ''کسریٰ بن ہرمز کے خزانے؟'' آپ ﷺ نے تین بار فرمایا: «كِسْرَى بْنِ هُرْمُزَ - وَلَيُوشَكَنَّ أَنْ

يَبْتَغِي مَنْ يَّقْبَلُ مَالَهُ مِنْهُ صَدَقَةً فَلَا يَجِدْ» ''کسریٰ بن ہرمز......۔ اور وہ وقت بھی عنقریب آئے گا کہ ایک شخص صدقہ وصول کرنے والے کو تلاش کرے گا مگر کسی کو نہ پائے گا۔'' عدی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، دو پیش گوئیاں پوری ہوتی تو یقیناً میں نے دیکھ لی ہیں: ① میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ایک عورت حیرہ سے چل کر مکہ آئی اور اس نے بیت اللہ کا طواف کیا۔ ② اور ان شاہسواروں میں میں خود شریک رہا ہوں جنھوں نے مدائن پر حملہ کیا تھا۔ اور تیسری بات بھی اللہ کی قسم پوری ہو کر رہے گی کیونکہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے (کوئی عام بات نہیں۔)[1]

ایک روایت میں ہے کہ میں چل پڑا حتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مدینہ منورہ پہنچ گیا۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے۔ میں نے سلام کیا تو فرمایا: «مَنِ الرَّجُلُ؟» ''تم کون ہو؟'' میں نے کہا: ''عدی بن حاتم۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے اور مجھے اپنے گھر کی طرف لے گئے۔ اللہ کی قسم! وہ مجھے گھر لیے جا رہے تھے کہ راستے میں ایک بوڑھی عورت آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملی۔ وہ اپنی ضرورتوں کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے باتیں کرتی رہی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم بڑی دیر تک اس کے لیے کھڑے رہے۔ عدی کہتے ہیں کہ میں نے دل میں سوچا: ''اللہ کی قسم! یہ بادشاہ نہیں۔'' بہر حال آپ صلی اللہ علیہ وسلم پھر مجھے ساتھ لے چلے۔ گھر کے اندر پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چمڑے کا ایک تکیہ، جو کھجور کے درخت کی چھال سے بھرا ہوا تھا، میری طرف کیا اور فرمایا: «اِجْلِسْ عَلٰى هٰذِهٖ» ''اس پر بیٹھو۔'' میں نے عرض کیا: ''نہیں آپ بیٹھیں۔'' لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اصرار کرتے ہوئے فرمایا: «بَلْ أَنْتَ» ''تم ہی بیٹھو۔'' تو میں اس پر بیٹھ گیا اور خود رسول گرامی صلی اللہ علیہ وسلم زمین پر بیٹھ گئے۔ تو میں نے دل میں سوچا کہ اللہ کی قسم! یہ کام کسی بادشاہ کا نہیں ہوسکتا۔''[2]

---

1 صحيح البخاري، حديث:3595، ومسند أحمد:257/4، و صحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص:580. 2 السيرة النبوية لابن هشام:236/4.

اسباق، عبرتیں اور فوائد

① عدی رضی اللہ عنہ جب مدینہ کی طرف محوِ سفر تھے تو ان کے ذہن میں یہ شک تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نبی ہیں یا حکمران۔ لیکن جب بوڑھی عورت کی لمبی باتیں سنتے دیکھا تو حکمرانی والا شک ختم ہوگیا کیونکہ اتنی عاجزی اور تواضع صرف نبی ہی میں ہوسکتی ہے۔

② عدی رضی اللہ عنہ نے جب یہ دیکھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میرے مذہب کے مطابق حلال وحرام تک کی معلومات رکھتے ہیں تو اسے یقین ہوگیا کہ یہ نبی ہوسکتے ہیں۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد تمام لوگ ایسی معلومات سے ناواقف تھے اور یہ بات عدی رضی اللہ عنہ بخوبی جانتے تھے۔

③ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب عدی رضی اللہ عنہ کی خاموشی دیکھی تو انھیں ان کی سوچ کے مطابق قبولِ اسلام میں جو موانع تھے وہ بتا دیے کہ یہ مت سوچو کہ مسلمان فقر و فاقہ کا شکار ہیں یا اسلامی حکومت محدود ہے۔ اسلامی حکومت کا دائرہ کار اور امن و امان کی صورت حال بھی واضح فرمائی اور فقر و فاقہ کے زوال اور کثرتِ اموال کا تذکرہ کر دیا۔

④ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زبردست ماہرِ نفسیات تھے، ہر شخص کے دل کی بیماری سے واقف ہو کر اسے دعوت پیش کرتے اور ساتھ ساتھ بیماری کا علاج بھی کرتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر شخص سے سلوک اس کے علم اور سوچ کے مطابق ہوا کرتا تھا۔ آپ اسی کے احساسات اور خیالات وشعور کو پرکھ کر اسے دعوت دیتے۔ یہ بات بڑے بڑے سرداروں کو شدید متاثر کرتی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے۔[1]

⑤ عدی رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرت اور صفات سے سچی و صادق نبوت دیکھ لی تھی۔ انھیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو اور طرز تکلم میں بھی نبوت جھلکتی نظر آ رہی تھی۔ اسی بنا پر عدی رضی اللہ عنہ مال و دولت کے خوبصورت پردوں اور رنگینیوں سے باہر آ گئے اور اپنے آپ کو اسلام کے سپرد کر دیا۔ نبوی پیش گوئیوں کی تعبیر جب انھوں نے اپنی آنکھوں سے

1 التاريخ الإسلامي للحميدي: 8/85,86.

دیکھی تو یہ ان کے مزید یقین، اسلام اور استحکام کا سبب بنا۔ [1]

8 ھ کے دیگر واقعات

ابن کثیر رحمہ اللہ واقدی کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اسی سال عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو جیفر بن جلندیٰ اور عمرو بن جلندیٰ کی طرف قبیلۂ ازد میں بھیجا۔ جزیرۃ العرب اور اردگرد کے اعرابیوں سے جزیہ لیا گیا۔ اسی سال رسول اللہ ﷺ نے فاطمہ بنت ضحاک بن سفیان کلابی سے ذوالقعدہ میں عقد فرمایا مگر اس نے آپ سے پناہ چاہی تو اسے الگ کر دیا۔ اس سال ذوالحجہ میں ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا سے آپ ﷺ کے صاحبزادے ابراہیم پیدا ہوئے۔ [2]

8 ھ کو ہی رسول اللہ ﷺ کی بڑی صاحبزادی زینب رضی اللہ عنہا فوت ہوگئیں۔ یہ ابوالعاص بن ربیع رضی اللہ عنہ کی زوجہ محترمہ تھیں۔ یہ نبوت سے دس سال پہلے پیدا ہوئیں۔ ان کے بعد حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا، پھر ام کلثوم رضی اللہ عنہا اور پھر فاطمہ رضی اللہ عنہا پیدا ہوئیں۔ رسول اللہ ﷺ اپنی اس صاحبزادی سے بڑی محبت رکھتے تھے، یہ شروع ہی میں مسلمان ہوگئی تھیں۔ پھر خاوند کے قبول اسلام سے 6 سال قبل ہجرت کی۔

ہجرت کے موقع پر انھیں زخمی کر دیا گیا، زخم سے خون نہ تھم سکا۔ بیماری آہستہ آہستہ بڑھتی گئی حتی کہ آپ فوت ہوگئیں۔ فوت ہونے پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا:

«اِغْسِلْنَهَا وِتْرًا ثَلَاثًا أَوْ خَمْسًا وَاجْعَلْنَ فِي الْآخِرَةِ كَافُورًا»

”اسے طاق غسل دینا، خواہ تین بار یا پانچ مرتبہ ہو اور آخری مرتبہ (غسل کے پانی میں) کافور ملا لینا۔“ [3]

---

1 فقه السيرة للبوطي، ص: 321. 2 البداية والنهاية: 374/4. 3 صحيح البخاري، حديث: 1258، و صحيح مسلم، حديث: (40)939.

حصہ 19

غزوۂ تبوک 9ھ

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ
الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ
مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ
ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ○

''یقیناً اللہ نے نبی اور ان مہاجرین و انصار پر مہربانی فرمائی جنھوں نے تنگی کی گھڑی میں آپ کی پیروی کی، بعد اس کے کہ ان میں سے ایک گروہ کے دل بہک جانے کو تھے، پھر اللہ نے ان پر مہربانی فرمائی۔ بے شک وہ ان پر بہت شفقت کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔''

(التوبۃ 9: 117)

باب 1

تاریخ واسباب اور نام و تیاری

غزوۂ تبوک کی تاریخ

محاصرۂ طائف سے مدینہ پلٹنے کے تقریباً چھ ماہ بعد رسول اللہ ﷺ غزوۂ تبوک کے لیے رجب 9 ہجری میں روانہ ہوئے۔[1]

مختلف نام اور ان کی وجہ تسمیہ

یہ جنگ اس چشمے کی بدولت تبوک کے نام سے مشہور ہے جہاں مسلمان لشکر پہنچا تھا۔ یہ وجہ تسمیہ صحیح مسلم میں ہے۔ امام مسلم رحمہ اللہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«سَتَأْتُونَ غَدًا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ ـ عَيْنَ تَبُوكَ وَ إِنَّكُمْ لَنْ تَأْتُوهَا حَتّٰى يُضْحِيَ النَّهَارُ، فَمَنْ جَاءَهَا مِنْكُمْ فَلَا يَمَسَّ مِنْ مَّائِهَا شَيْئًا حَتّٰى آتِيَ»

’’ان شاء اللہ تم کل تبوک کے چشمے پر پہنچ جاؤ گے۔ تم وہاں دن چڑھے ہی پہنچ پاؤ گے، لہٰذا تم میں سے جو کوئی بھی وہاں جائے میرے پہنچنے تک پانی کو ہاتھ نہ لگائے۔‘‘[2]

1 فتح الباري: 237/16، وتفسير الطبري: 14/540-542، والسيرة النبوية للدكتور مهدي رزق الله، ص: 614. 2 صحيح مسلم، حديث: [5947]-706.

اس غزوے کا دوسرا نام ''غزوۃ العسرہ'' ہے۔ قرآن مجید نے سورۂ توبہ میں اس غزوے کا ذکر اسی نام سے کیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ ﴾

''یقیناً اللہ نے نبی اور ان مہاجرین و انصار پر مہربانی فرمائی جنھوں نے تنگی کی گھڑی میں آپ کی پیروی کی، بعد اس کے کہ ان میں سے ایک گروہ کے دل بہک جانے کو تھے، پھر اللہ نے ان پر مہربانی فرمائی۔ بے شک وہ ان پر بہت شفقت کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔''[1]

امام بخاری رحمہ اللہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کرتے ہیں کہ مجھے میری قوم والوں نے، جو ''جیش العسرہ'' میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جانے والے تھے، سواریاں مانگنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا اور یہی غزوۂ تبوک تھا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس پر ان الفاظ میں عنوان قائم کیا ہے: «بَابُ غَزْوَةِ تَبُوكَ وَهِيَ غَزْوَةُ الْعُسْرَةِ» ''غزوۂ تبوک کا باب اور یہی غزوۃ العسرہ ہے۔''[2]

چونکہ اس میں مسلمانوں کو انتہائی دشواری کا سامنا کرنا پڑا، اس لیے اس لشکر کا نام ہی ''جیش العسرہ'' رکھا گیا، مثلاً: اس وقت انتہائی گرمی تھی۔ سفر دور کا تھا۔ اور مزید یہ کہ میدان جنگ تک پہنچنے کے لیے سواریوں کی قلت کی بنا پر اور زیادہ مشقت ہو گئی علاوہ ازیں پانی کی بھی قلت تھی، اس کے ساتھ ساتھ لشکر کی تیاری اور آنے جانے کے اخراجات کی کمی بھی پائی جاتی تھی۔[3]

[1] التوبة 9: 117. [2] صحيح البخاري، قبل الحديث: 4415. [3] الصراع مع الصليبيين لأبي فارس، ص: 83.

تفسیر عبدالرزاق میں معمر، ابن عقیل سے بیان کرتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سواریوں کی قلت اور سخت گرمی میں نکلے۔ قلت آب کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اونٹ ذبح کر کے اس کے معدے کا پانی پینے کے لیے استعمال کرتے تھے۔[1]

مسلمانوں کو اس جنگ میں کس قدر پیاس کا سامنا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبانی سنتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: ''ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سخت گرمی میں تبوک کی طرف روانہ ہوئے۔ دورانِ سفر ہم ایک جگہ اترے، وہاں ہمیں انتہائی پیاس لگی۔ ہم نے یقین کر لیا کہ ہم یہیں ختم ہو جائیں گے۔ ہم میں سے اگر کوئی قضائے حاجت کے لیے باہر چلا جاتا تو اسے یوں معلوم ہوتا کہ واپس آتے آتے اس کی جان نکل جائے گی، نوبت یہاں تک پہنچی کہ اونٹ ذبح کرنے والا اس کی اوجھڑی نچوڑ کر پی لیتا اور بقایا اپنے جگر کے پاس باندھ کر لٹکا لیتا۔[2]

زرقانی نے اپنی کتاب شرح المواهب اللدنیہ میں اس غزوے کے تیسرے نام ''الفاضحۃ'' کا بھی ذکر کیا ہے۔[3]

یہ نام اس لیے رکھا گیا کہ اس غزوے نے منافقین کی قلعی کھول دی، ان کے پردے چاک کر دیے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف ان کی مکارانہ چالیں واضح کر دیں۔[4]

تبوک شمالی حجاز میں واقع ہے اور موجودہ راستے کے مطابق مدینہ منورہ سے 778 میل پر ہے۔ اس وقت یہ علاقہ ''دیار قضاعہ'' میں شمار ہوتا تھا۔ اور رومی حکومت کے ماتحت تھا۔[5]

1 فتح الباري، شرح الحديث: 4415. 2 مجمع الزوائد: 194/6، ومسند البزار، رقم: 1841.
3 شرح المواهب اللدنية للزرقاني: 62/3. 4 الصراع مع الصليبيين لأبي فارس، ص: 84.
5 المجتمع الإسلامي للدكتور العمري، ص: 229.

غزوۂ تبوک کے اسباب

مورخین نے غزوۂ تبوک کے اسباب کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو شام سے مدینہ منورہ تیل لانے والے عجمی تاجروں کے ذریعے خبر پہنچی کہ رومیوں نے ایک بہت بڑا لشکر تیار کیا ہے اور عرب طرف داروں لخم اور جذام وغیرہ کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا ہے اور ان کے لشکر کا پہلا حصہ بلقاء تک پہنچ گیا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارادہ فرمایا کہ بجائے اس کے کہ وہ ہم سے لڑنے یہاں آئیں ہم خود ہی وہاں پہنچ جاتے ہیں۔[1]

ابن کثیر رحمہ اللہ کا خیال ہے کہ اس غزوے کا سبب، فریضہ جہاد کے تقاضوں کو پورا کرنا تھا۔ روم چونکہ دیگر لوگوں کی نسبت زیادہ قریب تھے، اس لیے رومی دعوت کے زیادہ حق دار تھے۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ نے ان سے جنگ کا ارادہ فرمایا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ۝﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم ان کافروں سے لڑو جو تمھارے قرب و جوار میں ہیں اور چاہیے کہ وہ تمھارے اندر سختی پائیں اور جان لو کہ یقیناً اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔''[2]

ابن کثیر کی رائے زیادہ درست معلوم ہوتی ہے۔

مورخین کا یہ ذکر کرنا کہ تبوک کی جانب پیش قدمی کا اصل سبب رومیوں کا مسلمانوں کے دارالحکومت پر حملہ کرنے کا ارادہ تھا، بعید از قیاس نہیں ہے۔ مسلمانوں کو شام کی طرف سے غسانیوں کے حملہ آور ہونے کا خدشہ رہتا تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ پیش آنے والے واقعے سے اس کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

[1] الطبقات الکبریٰ: 165/2. [2] التوبة 9:123. البداية والنهاية: 3/5.

رسول اللہ ﷺ نے ازواجِ مطہرات سے ایک ماہ الگ رہنے کی قسم اٹھائی تھی۔ صحیح بخاری میں بیان کردہ تفصیلی واقعے کا کچھ حصہ یوں ہے: ''ہم میں یہ چرچا ہوتا تھا کہ غسان کا بادشاہ ہم سے لڑنے کے لیے اپنے گھوڑوں کے پاؤں میں آہنی حلقے لگوا رہا ہے۔'' چنانچہ ایک دن میرا انصاری ساتھی زیریں مدینہ گیا، پھر وہ عشاء کے وقت ہمارے پاس آیا اور یہ کہتے ہوئے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا: ''تعجب ہے کہ یہ سویا ہوا ہے؟'' میں گھبرا گیا اور باہر نکلا۔ اس نے کہا: ''غضب ہو گیا۔'' میں نے کہا: ''کیا ہوا، غسانی آ گئے ہیں؟'' اس نے کہا: ''نہیں، اس سے بھی افسوسناک خبر ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی تمام بیویوں کو طلاق دے دی ہے۔''[1]

انفاق کا جذبہ اور جہاد کا شوق

اس غزوے میں خرچ کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو شوق دلایا۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے انفاق کرنے والوں کے لیے بہت بڑے اجر کا وعدہ کیا، لہٰذا ہر کسی نے اپنی اپنی ہمت کے مطابق خرچ کیا۔ اس جنگ میں خرچ کرنے کے حوالے سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سب سے بازی لے گئے۔[2]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے انفاق کا واقعہ عبدالرحمٰن بن خباب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: جب رسول اللہ ﷺ جیش العسرہ کے متعلق خرچ کرنے کی ترغیب دلا رہے تھے میں اس وقت حاضر تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! میں ایک سو اونٹوں کا مع ساز و سامان ذمہ لیتا ہوں۔'' آپ ﷺ نے پھر ترغیب دلائی تو عثمان رضی اللہ عنہ دوبارہ کھڑے ہوئے اور عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! میں ساز و سامان سمیت دو سو اونٹوں کا ذمہ لیتا ہوں۔'' رسول اللہ ﷺ نے لشکر کے لیے ترغیب دلائی تو پھر حضرت

[1] صحيح البخاري، حديث: 5191، و صحيح مسلم، حديث: (31)-1479. [2] السيرة النبوية للدكتور مهدي رزق الله، ص: 615.

عثمان رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! میں تین سو اونٹوں کا ساز و سامان سمیت ذمہ لیتا ہوں۔'' راوی کہتا ہے کہ میں نے دیکھا: ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم منبر کی سیڑھی سے اترتے ہوئے فرما رہے تھے: «مَا عَلٰى عُثْمَانَ مَا عَمِلَ بَعْدَ هٰذِهٖ! مَا عَلٰى عُثْمَانَ مَا عَمِلَ بَعْدَ هٰذِهٖ» ''عثمان! آج کے بعد جو بھی کرے اس پر کوئی گرفت نہیں۔ عثمان! آج کے بعد جو چاہے کرے اس پر کوئی گرفت نہیں۔''[1]

عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جیش العسرہ کی تیاری کے وقت عثمان رضی اللہ عنہ اپنی چادر میں ایک ہزار دینار لے کر آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں الٹنے پلٹنے لگے اور فرمانے لگے: «مَا ضَرَّ ابْنَ عَفَّانَ مَا عَمِلَ بَعْدَ الْيَوْمِ» ''آج کے بعد عثمان جو کام بھی چاہے کرے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ بات بار بار دہرا رہے تھے۔[2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا آدھا مال صدقہ کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح (آج) وہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے سبقت لے جائیں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ سارا قصہ خود بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز ہمیں صدقہ کرنے کا حکم دیا۔ اتفاقاً اس وقت میرے پاس کافی مال تھا۔ میں نے دل میں کہا: ''اگر ابوبکر سے سبقت لینا ممکن ہے تو آج سبقت لے سکتا ہوں۔'' میں اپنا آدھا مال لے آیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: «مَا أَبْقَيْتَ لِأَهْلِكَ؟» ''اپنے عیال کے لیے کس قدر باقی رکھا ہے؟'' میں نے بتایا کہ جتنا لایا ہوں اتنا ہی۔ ادھر ابوبکر رضی اللہ عنہ سارا مال لے آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا: «مَا أَبْقَيْتَ لِأَهْلِكَ؟» ''تم نے اپنے عیال کے لیے کیا چھوڑا؟'' ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''ان کے لیے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم چھوڑے ہیں۔'' (عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: یہ سن کر) میں نے کہا: ''ابوبکر! میں آپ سے کسی چیز میں بھی آگے نہ بڑھ سکوں گا۔''[3]

1 جامع الترمذي، حديث: 3700، و مسند أحمد: 75/4. 2 جامع الترمذي، حديث: 3701، ومسند أحمد: 63/5. 3 سنن أبي داود، حديث: 1678، و جامع الترمذي، حديث: 3675.

بیان کیا گیا ہے کہ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے جیش العسرہ کے لیے اپنا آدھا مال دو ہزار درہم دے دیا۔[1] اسی طرح عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ، طلحہ بن عبیداللہ، محمد بن مسلمہ اور عاصم بن عدی رضی اللہ عنہم جیسے صحابہ نے بھی گراں قدر عطیات دیے۔[2]

مسلمان یہ بات اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ مال جنگ کے لیے ایک اہم وسیلہ ہے اور مالدار صحابہ نے یہ ثابت کر دکھایا کہ ان کا مال خدمتِ دین کے لیے (وقف) ہے جسے وہ خوشی اور چاہت سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں لٹاتے ہیں۔ اور دولتمند مسلمانوں کی تاریخ روشن ہے۔ یہ تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ وہ لوگ مال کے پجاری نہیں تھے اور مال کی چاہت ان پر مسلط نہیں تھی بلکہ مال ان کے قبضے میں تھا۔[3]

دولت مند صحابہ کا انفاق میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لینا مومنوں کے دلوں پر ایمان کے اثر انداز ہونے کی دلیل ہے۔ یہ دلیل ہے نیکی کی جانب بڑھنے اور خواہشاتِ نفس اور اس کے میلانات کا مقابلہ کرنے کی۔ دشمن پر برتری کی یہی تو ضمانت ہے۔[4]

اس موقع پر غریب مسلمانوں نے اپنی محنت سے کمایا ہوا مال شرماتے شرماتے دیا۔ اس لیے انھیں منافقین کی طعنہ زنی سے بھی واسطہ پڑا۔ حضرت ابوعقیل رضی اللہ عنہ آدھا صاع کھجور لائے۔ ایک اور صحابی اس سے کچھ زیادہ لائے تو منافقین نے پہلے صحابی پر یہ کہتے ہوئے طعنہ زنی کی: ''اللہ تعالیٰ اس کے صدقے سے بے پروا ہے۔'' اور دوسرے صحابی کے متعلق یہ کہنے لگے: ''اس نے تو صرف دکھلاوے کے لیے دیا ہے۔'' تب فرمانِ باری تعالیٰ نازل ہوا:

﴿ اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ ﴾

1 السيرة النبوية للدكتور مهدي رزق الله، ص: 616. 2 المغازي للواقدي: 391/3. 3 من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 449. 4 السيرة النبوية للسباعي، ص: 161.

”جو لوگ عیب جوئی کرتے ہیں کھلے دل سے خیرات کرنے والے مومنوں پر، (ان کے) صدقات کی بابت اور ان پر بھی جو اپنی (تھوڑی سی) محنت مزدوری کے سوا کچھ نہیں رکھتے، تو وہ ان کا مذاق اڑاتے ہیں، اللہ بھی ان کا مذاق اڑائے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔“ [1]

نادار مسلمان جہاد کے لیے نفقہ نہ ہونے پر انتہائی غمگین تھے، مثلاً: حضرت علبہ بن زید رضی اللہ عنہ ان صحابہ میں سے ہیں جو رات نماز پڑھتے پڑھتے رو پڑے اور انھوں نے عرض گزاری: ”اے اللہ! تو نے جہاد کا حکم دیا، مجھے اس کی چاہت ہے مگر تو نے مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر کے اخراجات کی طاقت سے محروم رکھا ہے، لہٰذا جس کسی مسلمان نے بھی میری عزت اور جسم پر زیادتی کی ہے میں اسے معاف کرتا ہوں۔“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے بھی معاف کر دیا ہے۔ [2]

اس موقع پر اترنے والی آیات میں اخلاص، اللہ تعالیٰ کے دین اور جہاد کی محبت اور اسے چہار سو پھیلانے کی امنگ کا تذکرہ ملتا ہے۔ [3]

حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ کا قصہ

حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ اپنا واقعہ خود بیان کرتے ہیں کہ جب غزوۂ تبوک کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلایا تو میں اپنے گھر والوں کی جانب گیا۔ اس وقت صحابہ کا پہلا گروہ غزوے کے لیے آگے نکل چکا تھا۔ میں نے مدینہ میں باآواز بلند کہنا شروع کیا: ”ہے کوئی بندۂ خدا جو مجھے سواری فراہم کرے۔ اس غزوے میں مجھے جو بھی حصہ ملے گا اس کا ہو گا۔“ اچانک ایک عمر رسیدہ انصاری شخص سامنے آئے اور کہنے لگے: ”ٹھیک ہے۔ مگر تمھارا کھانا پینا ہمارے ساتھ ہوگا اور ہم سواری پر باری باری سوار ہوں گے۔“ میں نے کہا:

1 التوبة 9:79، السيرة النبوية للدكتور مهدي رزق الله، ص:617,616. 2 المجتمع المدني للدكتور العمري، ص:235. 3 محمد رسول الله ﷺ لصادق عرجون:4/443.

''مجھے قبول ہے۔'' انھوں نے کہا: ''تو پھر اللہ کا نام لو اور اس کی برکت سے چلو۔'' میں اس اچھے ہمسفر کے ساتھ ہولیا حتی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے مالِ فے سے نوازا۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھے اس جنگ میں چند اونٹ بطور غنیمت ملے۔ میں نے وہ تمام اونٹ ساتھ لیے اور ان انصاری کے پاس چلا گیا۔ وہ باہر نکل کر اپنے اونٹ کے ایک تھیلے پر بیٹھ گئے، پھر مجھ سے کہنے لگے: ''انھیں چند قدم آگے لے جاؤ۔'' پھر کہنے لگے: ''انھیں میری طرف ہانک کر لاؤ۔'' جب وہ ان سواریوں کو آگے پیچھے سے دیکھ چکے تو کہنے لگے: ''تیرے اونٹ بہت اچھے ہیں۔'' میں نے کہا: ''مگر یہ تو وہ مالِ غنیمت ہے جس کی میں نے آپ کے ساتھ شرط لگائی تھی۔'' تو وہ انصاری کہنے لگے: ''میرے بھتیجے! اپنے اونٹ لے جاؤ، ہمارا مقصد تمھارا حصہ لینا نہیں بلکہ کچھ اور تھا۔''[1]

واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ اخروی ثواب کے لیے اپنے حقِ غنیمت سے دستبردار ہو گئے اور اسی طرح انصاری صحابی نے بھی اپنی راحت کی قربانی دیتے ہوئے اتنے لمبے سفر میں انھیں اپنی سواری پر سوار کر لیا۔ اور کھانے پینے کے سامان میں بھی انھیں برابر شریک رکھا۔ یہ سب کچھ اجر و ثواب کے لیے تھا۔ ایسے تصورات و خیالات صرف کتاب اللہ اور سنتِ نبوی کی روشنی میں تربیت پانے والے افراد ہی کے ہو سکتے ہیں۔ یہ معاشرہ کتاب و سنت کے نور کا حامل تھا۔[2]

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی قیادت میں اشعری قبیلے کے لوگ حاضر ہوئے۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ ہمیں جہاد کے لیے سواریاں دی جائیں۔ تیاری کرتے ہوئے خاصا عرصہ گزر گیا مگر کوئی سواری میسر نہ آ سکی بالآخر تین تین کو ایک ایک سواری دی گئی۔[3]

---

1 سنن أبي داود، حديث: 2676، وجامع الأصول، رقم: 6188، ومن معين السيرة لصالح الشامي، ص: 453. 2 من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 453. 3 صحيح البخاري، حديث: 4415، والمجتمع المدني للدكتور العمري، ص: 236.

کمزور یا بیمار یا زاد راہ نہ ہونے کے باعث پیچھے رہ جانے والے افراد احساس گناہ سے انتہائی گریہ وزاری تک جا پہنچے حتی کہ ان کے متعلق قرآن نازل ہوا:

﴿ لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ○ ﴾

”ضعیفوں اور بیماروں پر اور جو لوگ کوئی چیز نہیں پاتے کہ وہ خرچ کریں، ان پر (پیچھے رہنے میں) کوئی گناہ نہیں جبکہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے لیے خیر خواہی کرتے ہیں۔ نیکی کرنے والوں پر (گرفت کی) کوئی راہ نہیں۔ اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔ اور (اے نبی!) نہ ان لوگوں پر (کوئی گناہ ہے) جو آپ کے پاس آئے کہ آپ انھیں (سفر جہاد کے لیے) سواری دیں (اور) آپ نے کہا کہ میرے پاس کوئی سواری نہیں تو وہ اس حال میں لوٹ گئے کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بہ رہی تھیں کہ ان کے پاس کچھ نہیں جسے وہ (اللہ کی راہ میں) خرچ کریں۔“[1]

رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں جہاد کی رغبت و چاہت کی یہ بہترین تصویر ہے۔ اس میں یہ بھی وضاحت ہے کہ سچا ایمان رکھنے والے مادی ساز و سامان میسر نہ ہونے کی وجہ سے پیچھے رہ جانے پر تکلیف محسوس کرتے ہیں۔ یہ مجبور طبقہ اور دیگر معذور یا بیمار افراد دلی طور پر مجاہدین کے ہمسفر تھے۔[2]

یہی وہ قابل قدر افراد ہیں جنھیں رسول اللہ ﷺ نے اپنے اس فرمان میں مجاہدین کی

[1] التوبة9:91،92. [2] السيرة النبوية للدكتور مهدي رزق الله، ص:618.

معیت کا سرٹیفکیٹ عطا فرمایا: «إِنَّ بِالْمَدِينَةِ أَقْوَامًا، مَّا سِرْتُمْ مَّسِيرًا وَّلَا قَطَعْتُمْ وَادِيًا إِلَّا كَانُوا مَعَكُمْ» ”مدینہ میں بعض افراد ایسے ہیں کہ ہر راستے اور ہر وادی و منزل پر تمھارے ساتھ ساتھ تھے۔“ لوگوں نے پوچھا: ”اے اللہ کے رسول! مدینہ میں ہو کر بھی؟“ فرمایا: «وَهُمْ بِالْمَدِينَةِ حَبَسَهُمُ الْعُذْرُ» ”ہاں! وہ مدینہ میں کسی عذر کی وجہ سے رکے ہوئے ہیں۔“[1]

غزوۂ تبوک اور منافقین کا کردار

رسول اللہ ﷺ نے جب غزوۂ تبوک کے لیے روانگی اور اس کے لیے انفاق کا اعلان فرمایا تو منافقین مسلمانوں کی ہمتیں پست کرنے کی سعی نامشکور میں لگ گئے۔ وہ مسلمانوں سے کہتے: ”دیکھو (اس قدر) گرمی میں مت نکلو۔“ اللہ تعالیٰ نے ان سے متعلق قرآن پاک نازل فرمایا:

﴿ فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ۭ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ۭ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ۝ فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا ۚ جَزَاۗءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ ﴾

”جو لوگ پیچھے چھوڑ دیے گئے تھے وہ رسول اللہ کے پیچھے اپنے بیٹھ رہنے پر خوش ہوئے اور انھوں نے ناپسند کیا کہ اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کریں اور انھوں نے (اوروں سے) کہا کہ گرمی میں کوچ نہ کرو۔ (اے نبی!) کہہ دیجیے: جہنم کی آگ (اس سے) کہیں زیادہ گرم ہے۔ کاش! وہ یہ بات سمجھتے۔ چنانچہ انھیں چاہیے کہ وہ تھوڑا ہنسیں اور زیادہ روئیں ان اعمال کے بدلے میں جو وہ کماتے رہے۔“[2]

1 صحیح البخاري، حدیث: 4423، وسنن أبي داود، حدیث: 2508، وسنن ابن ماجه، حدیث: 2764، ومسند أحمد: 103/3، وصحیح ابن حبان، رقم: 4731. 2 التوبة 9: 81، 82.

رسول اللہ ﷺ جب تیاری میں مصروف تھے تو آپ نے جد بن قیس سے کہا: «يَا جَدُّ! هَلْ لَّكَ الْعَامَ فِي جِلَادِ بَنِي الْأَصْفَرِ؟» ''اے جد! کیا رومی لوگوں سے جنگ کی غرض سے تمھارے لیے یہ سال مناسب ہے؟'' اس نے جواباً کہا: ''اے اللہ کے رسول! کیا آپ یہ کر سکتے ہیں کہ مجھے اجازت دے دیں اور فتنے میں نہ ڈالیں؟ کیونکہ اللہ کی قسم! میری قوم کو معلوم ہے کہ مجھ سے زیادہ عورتوں پر فریفتہ ہونے والا کوئی نہیں اور مجھے اندیشہ ہے کہ اگر میں نے رومیوں کی عورتوں کو دیکھ لیا تو برداشت نہ کر سکوں گا۔'' رسول اللہ ﷺ نے اس سے اعراض کر لیا اور فرمایا: «قَدْ أَذِنْتُ لَكَ» ''میری طرف سے تمھیں اجازت ہے۔''[1] پھر اس کے متعلق یہ آیت اتری:

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ۭ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ۭ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝﴾

''اور ان میں سے کوئی آپ سے کہتا ہے کہ مجھے اجازت دے دیں اور فتنے میں نہ ڈالیں۔ سن لو! وہ فتنے میں تو پڑ چکے ہیں۔ اور بے شک جہنم یقیناً کافروں کو گھیرنے والا ہے۔''[2]

اسی طرح دیگر کئی لوگ بھی آپ ﷺ کے پاس جھوٹے عذر لائے تاکہ انھیں پیچھے رہنے کی اجازت دے دی جائے۔ آپ ﷺ نے اجازت دے دی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمان نازل فرمایا:

﴿عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ۝﴾

''(اے نبی!) اللہ نے آپ کو معاف کر دیا آپ نے ان (منافقین) کو اجازت کیوں دی؟ (آپ اجازت نہ دیتے) یہاں تک کہ آپ پر ظاہر ہو جاتے سچے

1 تفسير الطبري: 10/148,149، و دلائل النبوة للبيهقي: 5/213,214، والمعجم الكبير للطبراني، رقم: 2154 و 12654، ومجمع الزوائد: 7/30. 2 التوبة 9:49.

لوگ اور آپ جھوٹوں کو جان لیتے۔''[1]

رسول اللہ ﷺ کو خبر ملی کہ کچھ لوگ سویلم یہودی کے گھر میں جمع ہو رہے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کے خلاف لوگوں کو ورغلا رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے ادھر کچھ آدمی روانہ فرمائے کہ سویلم کا گھر لوگوں سمیت جلا ڈالا جائے۔[2]

اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان منافقین اور یہود کا گہری نگاہ سے جائزہ لیتے رہتے اور ان کے حالات کی مکمل معرفت رکھتے تھے۔ مسلمانوں کی نگاہیں بڑی بیداری سے یہود اور منافقین کی حرکات، اجتماعات اور سازش گاہوں کو دیکھ رہی تھیں۔ بلکہ مسلمان ان کے رازوں اور پوشیدہ اجتماعات سے بھی باخبر تھے اور ان میں جو جو رائے طے ہوتی اور جنگ کے لیے نہ نکلنے والوں کو جو نت نئے بہانے سمجھائے جاتے وہ تمام کے تمام مسلمانوں کے علم میں تھے۔

فتنہ پروروں کی سازش گاہ کا رسول اللہ ﷺ نے دانشمندانہ علاج تجویز فرمایا۔ آپ ﷺ نے اس سازش گاہ کو سازشی گروہ سمیت جلانے کا حکم صادر فرمایا اور ساتھ ہی اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے صحابہ کو روانہ کیا اور نصیحت کی گئی کہ بڑی احتیاط سے ایسا کر گزرو، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ قرآنِ پاک نے منافقین کے جنگ سے پہلے، دورانِ جنگ اور جنگ سے بعد کے موقف کا تذکرہ کیا ہے۔ غزوے سے پہلے قرآن پاک نے ان کے اجازت طلب کرنے اور جنگ کے لیے نکلنے سے کنارہ کشی اور پیچھے رہنے کا تذکرہ کیا ہے۔ عبداللہ بن ابی بھی پیچھے رہنے والوں میں شامل تھا، لہٰذا ان منافقین کے متعلق قرآنِ پاک کا یہ بیان ہے:

﴿ لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوكَ وَلَٰكِنۢ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ۚ وَسَيَحْلِفُونَ بِاللَّهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ يُهْلِكُونَ أَنفُسَهُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ۝ ﴾

[1] التوبة 9:43. [2] السيرة النبوية لابن هشام: 4/160.

''اگر مال (غنیمت) قریب الحصول اور سفر درمیانہ ہوتا تو وہ (منافق) آپ کے ساتھ ضرور چلتے اور لیکن کٹھن منزل ان پر دور ہو گئی اور عنقریب وہ اللہ کی قسمیں کھائیں گے کہ اگر ہم طاقت رکھتے تو تمھارے ساتھ ضرور نکلتے۔ وہ خود کو ہلاک کر رہے ہیں۔ اور اللہ جانتا ہے کہ بے شک وہ سراسر جھوٹے ہیں۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا ہے کہ ان کے پیچھے رہنے کا سبب سفر کی دوری اور دشواری ہے۔ اگر رسول اللہ ﷺ انھیں سامانِ دنیا اور نعمت و دولت کی طرف بلاتے اور سفر بھی آسان ہوتا تو وہ ضرور آپ کے ساتھ چلتے، مگر چونکہ ایسا نہ تھا، اسی لیے یہ نکلے ہی نہیں اور پیچھے رہ گئے۔ آیت مبارکہ نے پہلے تو ان کے جنگ کے لیے نہ نکلنے اور اس کے سبب کو واضح کیا، پھر اس کا بیان کیا جو وہ مسلمانوں کی واپسی پر کہیں گے۔

یہ آیت رسول اللہ ﷺ کے تبوک سے لوٹنے سے پہلے ہی اتر چکی تھی۔

آیت مبارکہ کا مطلب یہ ہے کہ منافقین یہ کہتے ہوئے جھوٹ موٹ کی قسمیں کھائیں گے کہ اے مسلمانو! اگر ہم میں تبوک جانے کی طاقت ہوتی تو ہم تمھارے ساتھ ضرور جاتے، مگر ہم تو مجبوری کی حالت میں پیچھے رہے ہیں، ہمارے معقول عذر تھے جنھوں نے ہمیں پیچھے رکھا۔[2]

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يُهْلِكُونَ أَنفُسَهُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ۝﴾

''وہ خود کو ہلاک کر رہے ہیں۔ اور اللہ جانتا ہے کہ بے شک وہ سراسر جھوٹے ہیں۔''[3]

ابن عاشور کہتے ہیں: ''اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتے ہوئے قسمیں کھاتے ہیں۔ لفظ «هلك» فنا اور موت پر بولا جاتا ہے۔''

1 التوبة 42:9. 2 حديث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ لأبي بدر محمد بكر آل عابد: 647/2. 3 التوبة 42:9

اس لفظ کا اطلاق جسمانی نقصانات و تکالیف پر (بھی) ہوتا ہے اور اسی جگہ یہی مناسب ہے، یعنی یہ لوگ جھوٹی قسموں کی بنا پر اپنا نقصان کر رہے ہیں، یعنی دنیا کا نقصان اور آخرت کا عذاب۔ آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ جھوٹی قسم ہلاکت تک لے جاتی ہے۔[1]

بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے (ہمارے محبوب) نبی مکرم ﷺ سے توبیخ آمیز لہجے میں فرمایا:

﴿عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ○﴾

"(اے نبی!) اللہ نے آپ کو معاف کر دیا آپ نے ان (منافقین) کو اجازت کیوں دی؟ (آپ اجازت نہ دیتے) یہاں تک کہ آپ پر ظاہر ہو جاتے سچے لوگ اور آپ جھوٹوں کو جان لیتے۔"[2]

مجاہد کہتے ہیں: "یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں اتری جن لوگوں نے آپس میں طے کر لیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ سے اجازت طلب کرو اگر اجازت مل جائے تو اچھا اور اگر اجازت نہ بھی دیں تو بیٹھے رہو۔"[3] یہ منافقین کا ایک ٹولہ تھا جن میں عبداللہ بن ابی، جد بن قیس، رفاعہ بن تابوت وغیرہ شامل تھے۔ یہ کل انتالیس افراد تھے جنھوں نے جھوٹے عذر پیش کیے تھے۔[4]

اس آیت کریمہ میں لطیف وخبیر کی جانب سے اولیٰ کو ترک کرنے پر اپنے حبیب ﷺ کی بڑے لطیفانہ و کریمانہ انداز میں توبیخ کی گئی ہے کہ آپ ﷺ کو معاملہ واضح ہونے اور حقیقتِ حال کھل جانے تک اجازت دینے میں توقف اختیار کرنا چاہیے تھا۔[5] بعد ازاں فرمایا:

---

1 التحرير والتنوير لابن عاشور: 209/10. 2 التوبة 43:9. 3 تفسير ابن كثير: 360/2
4 التحرير والتنوير: 210/10. 5 حديث القرآن عن غزوات الرسولﷺ لأبي بدر محمد بكر آل عابد: 647/2.

﴿لَا يَسْتَـْٔذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ○ اِنَّمَا يَسْتَـْٔذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ○﴾

''(اے نبی!) جو لوگ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ آپ سے اجازت نہیں مانگتے اس سے کہ وہ اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کریں۔ اور اللہ پرہیز گاروں کو خوب جانتا ہے۔ آپ سے اجازت تو صرف وہ لوگ مانگتے ہیں جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کے دل شک میں پڑے ہیں، لہٰذا وہ اپنے شک میں پڑے تردد کر رہے ہیں۔''[1]

جہاد کے ذریعے سے مومنوں اور منافقوں میں تمیز کرنے والی یہ پہلی نازل ہونے والی آیات ہیں۔[2]

اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ آخرت کے دن پر ایمان رکھنے والوں کی یہ عادت ہی نہیں کہ وہ جہاد فی سبیل اللہ کو ترک کرنے کے لیے رخصت طلب کریں۔ یہ تو منافقین کی صفت ہے جو بلا عذر ہی اجازت طلب کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس وصف کو اور ان کے دل میں شک کی صورت کو بیان فرمایا، یعنی انھیں آپ ﷺ کے لائے ہوئے دین پر شک ہے اور اسی کی وجہ سے وہ حیران و سرگرداں ہیں کبھی پاؤں آگے کرتے ہیں کبھی پیچھے۔ انھیں کسی چیز میں پختگی حاصل ہی نہیں۔[3]

غزوۂ تبوک کو اپنی ابتدا ہی میں مومنین اور منافقین میں تمیز اور فرق کر دینے سے خاص مناسبت ہے۔ دونوں جانب میں پوشیدہ فرق اور پردے گر گئے، منافقین کے لیے خوش معاملگی، میانہ روی اور چھپنے کا کوئی موقع ہی نہ رہا۔ تبوک کے لیے اعلانِ عام کے بعد

[1] التوبة 9:44، 45. [2] تفسير المراغي: 4/127. [3] تفسير ابن كثير: 2/361.

مسلمانوں کو روکنے اور رسول اللہ ﷺ کی صریح مخالفت سے ان کی اسلام دشمنی واضح ہوگئی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ منافقین کے نفاق کو بے نقاب کرنا اور انھیں لگام دینا ایک شرعی فریضہ ٹھہرا۔[1]

کوچ کا اعلان اور لشکر کی تیاری

غزوۂ تبوک میں جانے کے لیے اعلانِ عام ہوگیا۔ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تبوک کی جانب جانے والوں کی تعداد تیس ہزار کو پہنچ گئی۔ قرآنِ پاک نے اس میں سستی کرنے والوں کو ان الفاظ میں ڈانٹ پلائی:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمُ انفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ ۚ أَرَضِيتُم بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ ﴾

''اے ایمان والو! تمھیں کیا ہوگیا ہے، جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں نکلو تو تم زمین کی طرف بوجھل ہو جاتے ہو، کیا تم آخرت کے مقابلے میں دنیاوی زندگی پر ریجھ گئے ہو؟ چنانچہ دنیا کی زندگی کا فائدہ تو آخرت (کے مقابلے) میں بہت ہی حقیر ہے۔''[2]

قرآنِ پاک نے، نوجوانوں، بوڑھوں، اغنیاء اور فقراء سب ہی سے اپنے اس فرمان کے ذریعے جنگ کے لیے نکلنے کا حکم فرمایا:

﴿ انفِرُوا خِفَافًا وَثِقَالًا وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴾

''تم ہلکے (بھی) نکلو اور بوجھل (بھی) اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کرو، یہ تمھارے لیے بہت بہتر ہے اگر تم علم رکھتے ہو۔''[3]

1 نضرۃ النعیم:389/1۔ 2 التوبۃ 38:9۔ 3 التوبۃ 41:9۔

رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین و انصار، اہل مکہ اور دیگر عربی قبائل سے تیس ہزار مجاہد تیار کر لیے۔[1]

رسول اللہ ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ دشمن پر اچانک حملہ کرنے اور لشکر کی آمد و رفت کو پوشیدہ رکھنے کے لیے کبھی بھی اپنا مطلوبہ دشمن اور راستہ صراحتاً نہ بتاتے بلکہ عموماً توریہ کرتے۔ مگر اس موقع پر آپ ﷺ نے صراحتاً اعلان فرمایا کہ میں رومیوں سے جنگ کا ارادہ رکھتا ہوں۔[2] آپ ﷺ نے عادت مبارکہ سے ہٹ کر اس غزوے میں جس جانب جانا چاہتے تھے اس کی صراحت فرما دی اور اس معاملے کو مسلمانوں کے سامنے کھول دیا جس کے کئی ایک اسباب تھے، چند ایک یہ ہیں۔

① سفر کی طوالت: رسول اللہ ﷺ کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ روم کے علاقے کی طرف جانا مشکل کام سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ (اکثر) سفر ایسے راستے سے ہوگا جو دور دور تک صحرائی ہے۔ پانی کی قلت ہے۔ گھاس کی بھی کمی ہے۔ اس کے پیشِ نظر تمام ضروریات کا بندوبست اور مجاہدین کے آنے جانے کے لوازمات لشکر کے روانہ ہونے سے پہلے مکمل کر لینے ضروری تھے۔ تاکہ ان میں کمی اصل مقاصد کے حصول میں رکاوٹ نہ بنے۔

② رومیوں کی کثرتِ تعداد: رومیوں سے جنگ آزما ہونے کے لیے خصوصی تیاری کی ضرورت تھی۔ یہ دشمن ہر اعتبار سے ان دشمنوں سے جداگانہ تھا جن کے ساتھ اب تک مقابلہ ہو چکا تھا، مثلاً: ان کے پاس وافر اسلحہ، گہرا جنگی تجربہ اور لڑنے کی اعلیٰ صلاحیت تھی۔[3]

③ موسمی شدت و تمازت: تاکہ ہر کوئی اپنا اپنا بندوبست کرے اور انتہائی لمبے سفر کے لیے

---

[1] الصراع مع الصليبيين لأبي فارس، ص: 97. [2] الرسول القائد ﷺ لمحمود شيت خطاب، ص: 398. [3] الرسول القائد ﷺ لمحمود شيت خطاب، ص: 398.

اپنا ضروری سامان تیار کر لے اور پیچھے اہل و عیال کا بھی بندوبست کرے۔

④ اس وقت اسے چھپانے کا کوئی مقصد ہی نہ تھا کیونکہ جزیرۃ العرب میں آپ ﷺ کے مدمقابل کوئی ایسی طاقت تھی ہی نہیں کہ اس کے لیے اس قدر بڑا لشکر اکٹھا کیا جائے۔ اب تو صرف رومی تھے اور وہ عرب عیسائی جو ان کے ساتھ ملحق علاقہ تبوک، دومۃ الجندل اور عقبہ وغیرہ میں رہائش پذیر تھے۔[1]

جب مسلمانوں کو مقامِ جنگ معلوم ہو گیا تو انھوں نے فوراً تیاری شروع کر دی اور رسول اللہ ﷺ نے اسی کے لیے یہ کہتے ہوئے انفاق پر ابھارا: «مَنْ جَهَّزَ جَيْشَ الْعُسْرَةِ فَلَهُ الْجَنَّةُ» ''جس نے لشکرِ تبوک کی تیاری میں حصہ ڈالا اس کے لیے جنت ہے۔''[2]

رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ پر محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب مقرر فرمایا اور اپنے گھر والوں پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نگران چھوڑا۔ منافقین نے یہ خبر اُڑا دی کہ انھیں تو رسول اللہ ﷺ نے خواہ مخواہ کا بوجھ سمجھتے ہوئے پیچھے رہنے دیا ہے، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنا اسلحہ لیا اور آپ ﷺ سے جا ملے۔ اس وقت ابھی آپ ﷺ ''جرف'' میں رُکے ہوئے تھے۔[3]

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! منافقوں نے افواہ پھیلا رکھی ہے کہ مجھے آپ نے بوجھ سمجھتے ہوئے وزن ہلکا کرنے کو پیچھے چھوڑا ہے۔'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«كَذَبُوا وَلٰكِنِّي خَلَّفْتُكَ لِمَا تَرَكْتُ وَرَائِي، فَارْجِعْ فَاخْلُفْنِي فِي أَهْلِي وَأَهْلِكَ، أَفَلَا تَرْضٰى أَنْ تَكُونَ مِنِّي بِمَنْزِلَةِ هَارُونَ مِنْ مُّوسٰى؟ إِلَّا أَنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِي»

''انھوں نے جھوٹ بولا ہے لیکن میں نے تو تمھیں ان کی نگرانی کے لیے رہنے دیا

1 غزوة تبوك لمحمد أحمد باشميل، ص: 57. 2 صحيح البخاري، قبل الحديث: 3695، والسنن الكبرٰى للبيهقي: 167/6، وسنن الدارقطني، رقم: 4401. 3 زاد المعاد: 529/3.

تھا جنھیں میں پیچھے چھوڑے جا رہا ہوں، لہٰذا تم جاؤ اور میرے اور اپنے گھر والوں کا خیال رکھو۔ کیا تم اس بات پر خوش نہیں کہ میرے ہاں تمھارا وہ درجہ ہو جو حضرت موسیٰ کے ہاں حضرت ہارون کا تھا؟ صرف اتنا فرق ہے کہ میرے بعد کوئی دوسرا پیغمبر نہیں۔'' [1] اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ واپس مدینہ آ گئے۔ [2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے گھر والوں پر نائب قرار دینا اس بنا پر تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول گرامی قدر صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد بھی ہیں اور چچازاد بھی۔ گویا ان کی نیابت خاص مقصد کے لیے تھی اور وہ تھا اہل خانہ کا خیال کرنا۔ جبکہ محمد بن مسلمہ انصاری رضی اللہ عنہ کو بھی اس غزوے میں پیچھے رکھا گیا جن کے سپرد عام نیابت تھی۔ بعض لوگ اس سے خیال کر بیٹھے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت علی کو نائب بنانا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت کی جانب اشارہ تھا۔ یہ بات قطعاً درست نہیں کیونکہ ان کی نیابت صرف اہل خانہ تک محدود تھی۔ [3]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں عام لوگ ثنیۃ الوداع میں جمع ہو گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائدین اور علم برداروں کا تعین فرمایا۔ سب سے بڑا علم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو تھمایا اور نشانِ لشکر کا جھنڈا حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کو دیا۔ اوس کا جھنڈا حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ اور خزرج کا ابودجانہ رضی اللہ عنہ کو تھمایا اور پھر ہر انصاری خاندان کو اپنا اپنا جھنڈا بنانے کا حکم دیا۔ [4]

میدان تبوک میں پہنچنے کے دن سے واپسی تک تبوک کی حفاظت و نگرانی عباد بن بشر رضی اللہ عنہ کو سونپی گئی، وہ اپنے ساتھیوں سمیت معسکر کی نگرانی میں مصروف رہتے۔ [5]

1 صحيح البخاري، حديث: 4416، و صحيح مسلم، حديث:(32,31)-2404، و صحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 589. 2 زادالمعاد: 530/3. 3 صور و عبر من الجهاد النبوي في المدينة للدكتور فوزي فيض الله، ص:467,466. 4 المغازي للواقدي: 996/3، والطبقات الكبرٰى لابن سعد: 166/2. 5 سبل الهدٰى والرشاد للصالحي: 652/5، و الصراع مع الصليبيين لأبي فارس، ص: 99.

اس غزوے میں رہبری کا فریضہ علقمہ بن فغواء خزاعی کے سپرد تھا، تبوک کے رستے کی انھیں خاصی معلومات تھیں۔ [1]

لشکر کے جھنڈوں کی تقسیم اور راستے کے متعلق ساری معلومات سیرت نگار واقدی ہی کی بیان کردہ ہیں اور وہ ''متروک'' ہے۔ لیکن یہ بات مسلّم ہے کہ اس کے پاس سیرت کی معلومات بڑی وافر مقدار میں ہیں اور پھر اس سے اس قسم کی معلومات لینے میں (اس وقت) کوئی مضائقہ بھی نہیں (جب تک کوئی اس کے مخالف بات نہ کرے)۔ [2]

ایک محقق اس جنگ کا جائزہ لے سکتا ہے کہ کس طرح جنگجوؤں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور خصوصی طور پر گھڑسواروں کی بڑھوتری کتنی تیزی سے ہوئی۔ تاریخ اسلام، اسلامی حکومت کی بنیادوں اور اسلامی لشکر کی جنگی قوت کا مطالعہ کرنے والا یہ ضرور محسوس کرے گا کہ قوت کے میدان میں مسلمانوں کی انتہائی تیزی سے ترقی ہوئی۔ مسلمان جنگِ بدر میں 313، احد میں 700 اور جنگ احزاب میں تین ہزار تھے۔ پھر یہ تعداد فتح مکہ میں دس ہزار اور حنین میں بارہ ہزار تک جا پہنچی اور آخر میں تبوک کے موقع پر مجاہدین کی تعداد تیس ہزار یا اس سے بھی زیادہ تھی۔ اسی طرح جنگ بدر میں دو شہ سوار اور بعض روایات کے مطابق احد میں بھی دو ہی تھے مگر چھ سال بعد یہ تعداد بڑھتی ہوئی دس ہزار تک پہنچ جاتی ہے۔ اور یہ سب کچھ اسلام کے پھیلاؤ کا نتیجہ ہی ہے خصوصاً دیہاتوں میں، کیونکہ اہل دیہات شہر والوں کی نسبت گھوڑے پالنے اور سدھانے کا اہتمام کثرت سے کرتے ہیں۔ [3]

---

[1] إمتاع الأسماع للمقريزي: 451/1، وشرح المواهب اللدنية للزرقاني: 72/3. [2] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 532/2. [3] الصراع مع الصليبيين لأبي فارس، ص: 100.

باب 2

سفرِ تبوک اور اہم واقعات

لشکر کی مکمل تیاری اور ذمہ داریوں اور جھنڈوں کی تقسیم کے بعد لشکر اسلامی رسول اللہ ﷺ کی قیادت میں تبوک کی جانب روانہ ہوا۔ پیچھے رہنے والے کسی فرد کا انتظار نہ کیا گیا، اگرچہ چند نیک مسلمان پیچھے رہ گئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے سامنے جب بھی کسی پیچھے رہنے والے شخص کا نام لیا جاتا تو آپ ﷺ فرماتے: «دَعُوهُ، إِنْ يَكُ فِيهِ خَيْرٌ فَسَيُلْحِقُهُ اللّٰهُ تَعَالٰى بِكُمْ وَ إِنْ يَكُ غَيْرَ ذٰلِكَ فَقَدْ أَرَاحَكُمُ اللّٰهُ مِنْهُ» ”اسے چھوڑو۔ اگر اس میں کچھ خیر ہو گی تو اللہ تعالیٰ اسے تمھارے ساتھ ملا دے گا اگر ایسا نہیں تو (پھر کیا ہوا؟) اللہ تعالیٰ نے تمھیں اس سے محفوظ کر دیا ہے۔“ [1]

سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ کا قصہ

ابن اسحاق کا بیان ہے کہ پھر رسول اللہ ﷺ چلتے گئے۔ ایک شخص پیچھے رہنے لگا تو لوگوں نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! ایک آدمی پیچھے رہ گیا ہے۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اسے چھوڑو۔“ اگر اس میں کوئی بھلائی ہو گی تو اللہ تعالیٰ عنقریب اسے تم لوگوں کے ساتھ ملا دے گا اگر ایسا نہیں تو اللہ تعالیٰ نے تمھیں اس سے نجات دے دی ہے۔“ یہاں تک کہ کہا گیا: ”اے اللہ کے رسول! ابوذر پیچھے رہ گئے اور انھیں ان کے اونٹ نے پیچھے چھوڑ دیا ہے۔“ تب بھی رسول اللہ ﷺ نے پہلے جیسی بات کہی۔ ابوذر رضی اللہ عنہ آہستہ آہستہ اونٹ پر سوار چلے آ رہے تھے مگر جب وہ خاصے پیچھے رہ گئے تو انھوں نے اپنا سامان اپنی

[1] المستدرك للحاكم: 3/50، والاكتفاء للكلاعي: 2/276.

پشت پر لادا اور رسول اللہ ﷺ کے نشانِ قدم پر پیدل چلنے لگے۔ آپ ﷺ نے ایک منزل پر قیام کیا تو کسی دیکھنے والے نے دیکھ کر کہا: ''اے اللہ کے رسول! ایک شخص راستے پر بالکل تنہا چل (کر ہماری طرف آ) رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «کُنْ أَبَا ذَرٍّ!» ''ابوذر ہی ہو۔'' پھر جب لوگوں نے ذرا غور سے دیکھا تو کہنے لگے: اے اللہ کے رسول! اللہ کی قسم! وہ تو ابوذر ہی ہیں۔ یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا: «رَحِمَ اللّٰهُ أَبَا ذَرٍّ، يَمْشِي وَحْدَهُ، وَيَمُوتُ وَحْدَهُ، وَيُبْعَثُ وَحْدَهُ» ''ابوذر پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے، یہ تنہا چلے گا، اکیلا مرے گا اور حشر کے دن تنہا اٹھایا جائے گا۔''[1]

وقت گزرتا رہا حتی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت آ گیا، پھر کچھ ایسے حالات ہو گئے کہ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو ''ربذہ'' بھیج دیا گیا۔ جب ان کی موت کا وقت آیا تو انھوں نے اپنی بیوی اور غلام کو وصیت کی کہ میں جب فوت ہو جاؤں تو مجھے غسل دینا اور کفنانا اور پھر عام راستے پر رکھ دینا، پھر پہلی جماعت جو تمھارے پاس سے گزرے، اس سے کہنا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا ساتھی ابوذر ہے۔

چنانچہ ان کے فوت ہونے پر انھوں نے ایسا ہی کیا۔ ادھر ایک قافلہ آیا، انھیں میت کا علم ہی نہ تھا۔ قریب تھا کہ ان کی سواریاں جنازے کو روند ڈالتیں۔ اسی گروہ میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ انھوں نے پوچھا: ''یہ کیا ماجرا ہے؟'' انھیں بتایا گیا کہ یہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا جنازہ ہے۔ یہ سن کر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور بولے کہ رسول اللہ ﷺ نے سچ فرمایا تھا:

''اللہ تعالیٰ ابوذر پر رحم فرمائے، یہ تنہا چلے گا، اکیلا مرے گا اور اکیلا حشر کے روز اٹھایا جائے گا۔''[2]

اس قصے میں کئی ایک اسباق اور عبرتیں ہیں جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

---

1 السيرة النبوية لابن هشام: 178/4. 2 السيرة النبوية لابن هشام: 178/4.

① حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو شدید مشکلات و مصائب سے واسطہ پڑا مگر اللہ تعالیٰ نے انھیں اس مشکل امتحان میں کامیاب ٹھہرایا اور صبر کی توفیق بخشی۔ انھوں نے اپنا سامان پیٹھ پر لادے پیدل چلتے ہوئے پرمشقت سفر طے کیا حتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے جاملے تاکہ جہاد فی سبیل اللہ سے مشرف ہوسکیں۔[1]

② رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ابوذر رضی اللہ عنہ کے بارے میں مستقبل کی خبر دینا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی صداقت کی روشن دلیل ہے۔ کیونکہ ایسے اُمور کے متعلق خبر دینا جو مستقبل میں واقع ہونے تھے اور تاحال واقع نہیں ہوئے تھے، معجزہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی نوازش ہے۔[2]

③ اس قصے سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے قوت حافظہ کی دلیل بھی ملتی ہے۔ کتنے برسوں بعد بھی ان کے ذہن میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے آخری ایام سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی محفوظ تھی۔[3]

حضرت ابوخیثمہ انصاری رضی اللہ عنہ کا قصہ اور اسباق و حکمتیں

ابن اسحاق بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روانگی کے کئی روز بعد ابوخیثمہ رضی اللہ عنہ ایک گرم دن میں اپنے اہل و عیال کی طرف آئے تو انھوں نے دیکھا کہ ان کی دونوں بیویاں ان کے باغ میں چھپر بنائے ہوئے ہیں اور ان میں سے ہر ایک نے اپنے چھپر میں چھڑکاؤ کیا ہوا ہے اور اس میں ٹھنڈا پانی بھی ہے اور کھانا بھی تیار ہے۔ جب وہ آئے تو چھپر کے دروازے پر رک گئے۔

پھر ابوخیثمہ رضی اللہ عنہ نے اپنی دونوں بیویوں کو اور ان کے تیار کردہ کھانے کو دیکھا تو کہنے لگے: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دھوپ، گرم ہوا اور گرمی میں ہوں، جبکہ ابوخیثمہ ٹھنڈے سایے

---

1. الصراع مع الصليبيين لأبي فارس، ص: 129، والتاريخ الإسلامي للحميدي: 114/8.
2. الصراع مع الصليبيين لأبي فارس، ص: 129. ❀ التاريخ الإسلامي للحميدي: 114/8.

تلے، تیار کھانے اور خوب صورت بیویوں کے ساتھ اپنے گھر میں مقیم ہو، یہ انصاف نہیں۔ اللہ کی قسم! میں تم دونوں میں سے کسی کے چھپر میں داخل نہ ہوں گا یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ سے جاملوں۔ تم دونوں میرا زادِ راہ تیار کرو۔'' انھوں نے تیار کر دیا، پھر ان کا اونٹ لایا گیا تو انھوں نے اس پر کجاوہ کسا، پھر وہ رسول اللہ ﷺ کی تلاش میں نکل گئے یہاں تک کہ جب آپ ﷺ تبوک میں اترے تو وہ آپ ﷺ کو جا ملے۔

ابوخیثمہ رضی اللہ عنہ کے تبوک پہنچنے سے قبل دورانِ سفر ایسا ہوا کہ راستے میں عمیر بن وہب جمحی رضی اللہ عنہ ابوخیثمہ رضی اللہ عنہ سے ملے۔ وہ بھی رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کے لیے نکلے ہوئے تھے، چنانچہ وہ بھی ان کے ساتھ ہو گئے۔ جب وہ تبوک کے قریب پہنچے تو ابوخیثمہ نے عمیر بن وہب سے کہا: ''میں نے ایک گناہ کا کام کیا ہے، رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچنے تک تم مجھ سے پیچھے رہ جاؤ (تاکہ میں اکیلا ان کے پاس پہنچوں)''۔ اس نے ایسے ہی کیا۔ جب ابوخیثمہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے قریب پہنچے تو آپ تبوک میں پڑاؤ ڈال چکے تھے۔ لوگوں نے کہا: ''ایک سوار آرہا ہے۔'' تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «كُنْ أَبَا خَيْثَمَةَ» ''ابوخیثمہ ہی ہو۔'' جب قریب پہنچے تو صحابہ نے کہا: ''اے اللہ کے رسول! اللہ کی قسم! وہ ابوخیثمہ ہی ہے۔'' وہ اونٹ بٹھا چکے تو آکر رسول اللہ ﷺ کو سلام کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: «أَوْلٰى لَكَ يَا أَبَا خَيْثَمَةَ» ''ابوخیثمہ تیرے لیے یہی بہتر تھا'' پھر انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو سارے حالات کہہ سنائے تو آپ ﷺ نے ان کے لیے بھلائی کی دعا فرمائی۔[1]

ابن ہشام کا بیان ہے کہ اس واقعے سے متعلق ابوخیثمہ مالک بن قیس رضی اللہ عنہ نے یہ اشعار بھی کہے تھے:

[1] المعجم الكبير للطبراني، رقم: 5419، و دلائل النبوة للبيهقي: 223,222/5، ومجمع الزوائد: 193,192/6، والبداية والنهاية: 8/5.

لَمَّا رَأَيْتُ النَّاسَ فِي الدِّينِ نَافَقُوا
أَتَيْتُ الَّتِي كَانَتْ أَعَفَّ وَأَكْرَمَا

''جب میں نے لوگوں کو دین میں منافقت کرتے دیکھا تو میں نے وہ کام کیا جو بہت پاکیزہ اور بزرگی والا تھا۔''

وَبَايَعْتُ بِالْيُمْنٰى يَدِي لِمُحَمَّدٍ
فَلَمْ أَكْتَسِبْ إِثْمًا وَّلَمْ أَغْشَ مَحْرَمَا

''اور میں نے دائیں ہاتھ سے محمد ﷺ کی بیعت کی، پس میں نے نہ تو کوئی گناہ کیا اور نہ کسی حرام کا ارتکاب کیا۔''

تَرَكْتُ خَضِيبًا فِي الْعَرِيشِ وَصِرْمَةً
صَفَايَا كِرَامًا بُسْرُهَا قَدْ تَحَمَّمَا

''میں نے شامیانے میں سیاہ زلفوں والی خوبصورت بیوی اور بہت اچھے پھل والے کھجور کے درخت چھوڑے جن کی (کچی) گدّر کھجوریں سیاہ ہوگئی تھیں۔''

وَكُنْتُ إِذَا شَكَّ الْمُنَافِقُ أَسْمَحَتْ
إِلَى الدِّينِ نَفْسِي شَطْرَهُ حَيْثُ يَمَّمَا

''اور جب منافق شک کرتا تو میں وہ شخص تھا کہ میرا دل ایمان کی طرف جھک کر اس کا مطیع و منقاد ہو گیا اور جس طرف دین چلنے کا قصد کرتا، میرا دل بھی اسی طرف چلتا۔''[1]

اس قصے میں کئی ایک اسباق و نصائح ہیں جن میں چند ایک درج ذیل ہیں:

① مسلمان زندہ ضمیر ہوتا ہے: حضرت ابوخیثمہ انصاری رضی اللہ عنہ جب تازہ کھانا، ٹھنڈا پانی،

[1] البداية والنهاية: 8/5.

ٹھنڈی چھاؤں، بہتر رہائش اور خوبصورت بیویوں کے ساتھ پُرسکون اور خوشحال زندگی کا رسول اللہ ﷺ کے سفر، دھوپ، گرمی اور تکلیفوں سے موازنہ کرتے ہیں تو ضمیر جاگ اٹھتا ہے۔ اہل تقویٰ پر اگر بسا اوقات کمزوری چھا بھی جائے تو کوتاہی کے احساس پر مضبوط ایمان سے متصف ہوجاتے ہیں۔ یہی چیز اس ارشاد باری تعالیٰ میں ہے:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَٰئِفٌ مِّنَ الشَّيْطَٰنِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُم مُّبْصِرُونَ ۝ ﴾

’’بے شک جن لوگوں نے تقویٰ اختیار کیا جب انھیں شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ آلیتا ہے تو وہ چونک پڑتے ہیں، پھر وہ یکا یک سوجھ بوجھ والے ہو جاتے ہیں۔‘‘[1]

حضرت ابوخیثمہ انصاری رضی اللہ عنہ کو جیسے ہی یاد آیا فوراً نکل پڑے، اپنی کوتاہی کا تدارک کیا اور تبوک میں نبی ﷺ سے جا ملے اور آپ ﷺ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرلی۔[2]

② **پہچان میں مہارت اور خوبیوں سے واقفیت:** رسول اللہ ﷺ کا ابو ذر رضی اللہ عنہ یا ابوخیثمہ انصاری رضی اللہ عنہ کو پہچان لینا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ اپنے ساتھیوں کی عادات و خصائل سے خوب واقف تھے۔ آپ ﷺ اس بات کو جانتے تھے کہ کون پیچھے رہنے اور پھسلنے کے بعد جلدی توبہ تائب ہوتا ہے۔ آپ ﷺ کو اپنے ساتھیوں کے بارے میں وسیع معلومات تھیں۔ یہ دلیل ہے کہ آپ ان کے انتہائی قریب تھے، گھل مل جاتے تھے، ان کی باتیں سنتے سناتے تھے اور وہ آپ ﷺ کے سفر و حضر کے ساتھی اور ایک جھنڈے تلے جہاد کرنے والے تھے۔[3]

③ **حضرت ابوخیثمہ رضی اللہ عنہ کا صبر اور پختہ عزم:** حضرت ابوخیثمہ رضی اللہ عنہ کا اکیلا سفر کر کے

---

1 الأعراف 201:7. 2 التاريخ الإسلامي للحميدي: 112,111/8. 3 الصراع مع الصليبيين لأبي فارس، ص: 133.

رسول اللہ ﷺ سے جا ملنے کا فیصلہ غور طلب ہے۔ یہ خوف و رجا سے پُر، قِلّتِ آب اور جھلسانے والی گرمی پر مشتمل صحرا کا سفر تھا۔ انھوں نے یہ بہت اچھا فیصلہ کیا اور اس پر بڑی عمدگی سے عمل پیرا ہوئے۔ یہ ان کے پختہ عزم، پختہ ارادے، بہادری اور صبر کی علامت ہے۔[1]

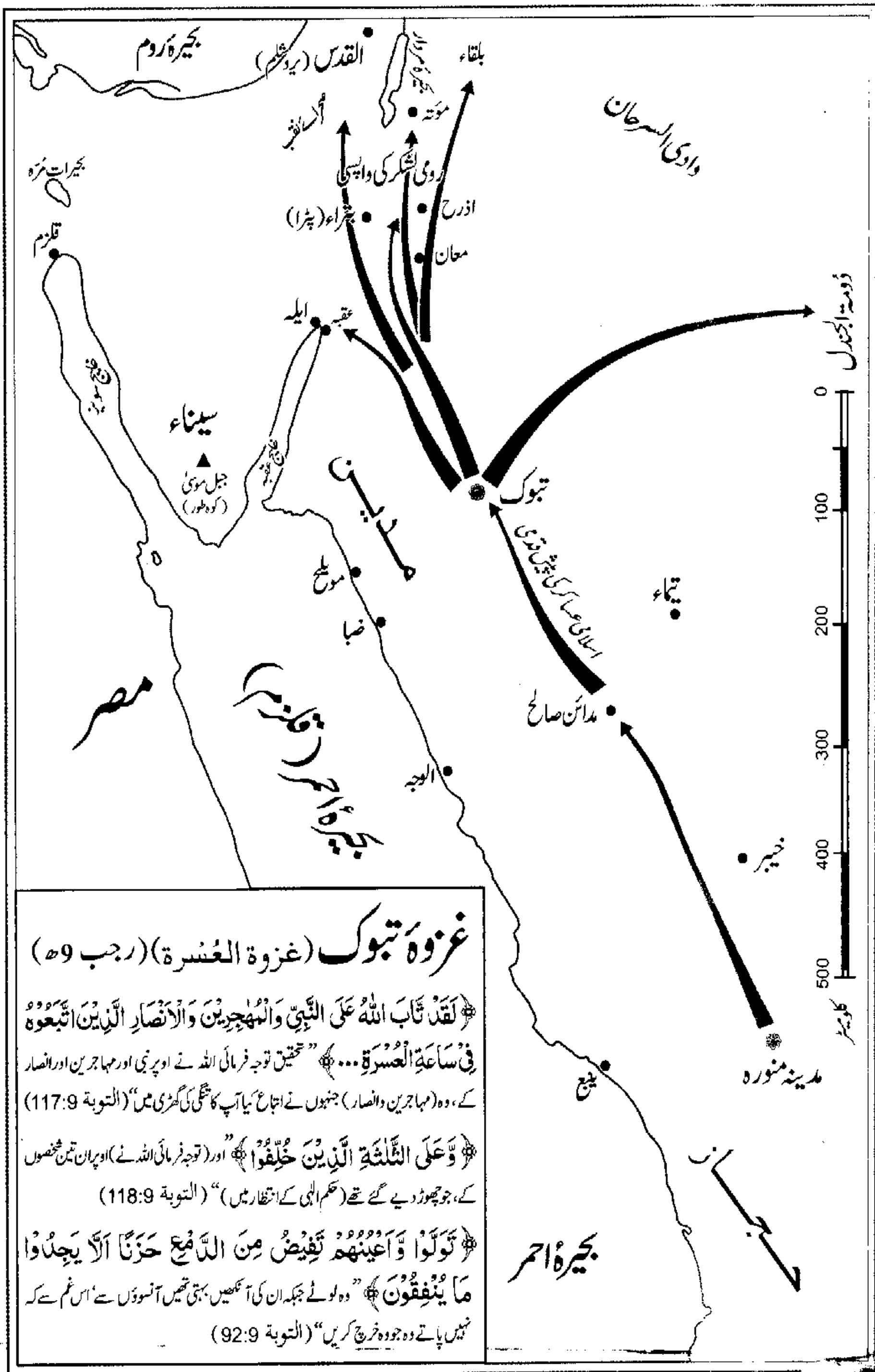
تبوک آمد

جب رسول اللہ ﷺ تبوک پہنچ گئے تو وہاں عربی قبائل یا رومی لشکر کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔ اسلامی لشکر میدان تبوک میں بیس رات مقیم رہا۔ رومی قیادت نے مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے کے متعلق سوچا ہی نہ تھا۔ حتی کہ عرب عیسائی قبائل نے بھی صلح اور امن و سکون کو ترجیح دی۔ شام کے آس پاس شہروں کے حکّام نے صلح اور ادائے جزیہ قبول کرنے میں عافیت سمجھی۔ ''ایلہ'' کے حکمران نے رسول اللہ ﷺ کو ایک سفید خچر اور کچھ چادریں ہدیہ ارسال کیں اور جزیہ پر صلح کر لی۔ آپ ﷺ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو چار سو بیس شاہسواروں کے ہمراہ دومۃ الجندل روانہ کیا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے یہاں کے حاکم اُکیدر بن عبدالملک کندی کو شکار کرتے ہوئے قیدی بنا لیا۔[2] اس سے بھی آپ ﷺ نے جزیہ پر صلح کر لی۔

مسلمان اکیدر کی قبا کو دیکھ کر تعجب کر رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «أَتَعْجَبُونَ مِنْ هٰذَا؟ فَوَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ! لَمَنَادِيلُ سَعْدِ بْنِ مُعَاذٍ فِي الْجَنَّةِ أَحْسَنُ مِنْ هٰذَا» ''کیا تم اس پر تعجب کر رہے ہو؟ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! جنت میں سعد بن معاذ کے رومال اس سے کہیں زیادہ بہتر ہیں۔''[3]

---

1 الصراع مع الصليبيين لأبي فارس، ص:134,133. 2 الإصابة:1/412-415، والسيرة النبوية لابن هشام: 4/180. 3 صحيح البخاري، حديث:3802، و صحيح مسلم، حديث:2468، ومسند أحمد:3/238، والسيرة النبوية لابن هشام:4/180.



غزوۂ تبوک (غزوۃ العُسرۃ) (رجب 9ھ)

﴿لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ ...﴾ ”تحقیق توجہ فرمائی اللہ نے اوپر نبی اور مہاجرین اور انصار کے، وہ (مہاجرین وانصار) جنھوں نے اتباع کیا آپ کا تنگی کی گھڑی میں“ (التوبة 117:9)

﴿وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا﴾ ”اور (توجہ فرمائی اللہ نے) اوپر ان تین شخصوں کے، جو چھوڑ دیے گئے تھے (حکم الٰہی کے انتظار میں)“ (التوبة 118:9)

﴿تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ﴾ ”وہ لوٹے جبکہ ان کی آنکھیں بہتی تھیں آنسوؤں سے، اس غم سے کہ نہیں پاتے وہ جو وہ خرچ کریں“ (التوبة 92:9)

یہ ذکر بھی آیا ہے کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو اُکیدر سے آٹھ سو قیدی، ایک ہزار اونٹ، چار سو زرہیں اور چار سو نیزے بطور غنیمت ہاتھ لگے۔ [1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل جرباء اور اَذرح والوں اور مقنا کے باسیوں کے لیے معاہدات لکھے۔ [2]

ان معاہدات کے پیش نظر اہل عرب کے تمام عیسائی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جزیہ دیں گے اور مسلمان حکومت کے تابع ہوں گے۔

جزیرۃ العرب کے شمال میں واقع چھوٹی چھوٹی حکومتوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی مرتبہ معاہدے کیے اور اس کے ساتھ ہی اسلامی حکومت کی شمالی سرحدیں محفوظ ہوگئیں۔ [3]

ان معاہدوں کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رومیوں کے پر کاٹ دیے۔ یہ تمام قبائل رومی حکومت کے تابع تھے اور عیسائیت اختیار کر چکے تھے۔ ان میں سے جس نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مصالحت کی یا جزیہ دینے کا معاہدہ کیا گویا اس نے سابقہ تعلقات ختم کر ڈالے۔ اور یہ معاہدے روم سے ان کے تعلقات کو کالعدم قرار دینے کے مترادف تھے۔ دوسرے لفظوں میں عوام کو ان قوتوں سے آزادی دلوانا بھی مقصود تھا جو انھیں رومی حکمرانوں کے آگے ذلیل و رسوا کرتے اور اس کا تابع فرمان رکھتے تاکہ یہ ان کے بچے کھچے ٹکڑے کھانے پر اکتفا کریں اور رومیوں کی زبردست قوت سے مرعوب رہیں۔ انھوں نے صلح کا معاہدہ پورا کیا اور جزیہ مسلسل ادا کرتے رہے۔ [4]

حکومت تشکیل دینے کے لیے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکیمانہ اندازِ سیاست تھا اور یہ تھا اللہ تعالیٰ کے دین کی جانب دعوت دینے کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا انداز۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں اور رومیوں کے درمیان کچھ ایسی حکومتیں قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے جو مسلمانوں کے

---

1 البداية والنهاية: 17/5. 2 المغازي للواقدي: 1032/1، والوثائق السياسية في عهد النبوة والخلافة الراشدة للدكتور حميد الله، ص: 119-124. 3 الصراع مع الصليبيين لأبي فارس، ص: 217. 4 محمد رسول الله ﷺ لصادق عرجون: 479/4.

تابع فرمان تھیں۔ آگے چل کر خلفاء کے زمانے میں یہی حکومتیں تھیں جن سے اسلامی فتوحات آسان ہوگئیں۔ انھی کی بنا پر اسلامی سلطنت شمال کی جانب پھیلتی چلی گئی۔ [1]

حجر میں ثمود کے مساکن سے گزرتے وقت رسول اللہ ﷺ کی لشکر کو وصیتیں

ابو کبشہ انصاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ غزوۂ تبوک میں دورانِ سفر لوگ اہل حجر کی طرف جانے میں جلدی کرنے لگے۔ جب رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع ملی تو آپ نے لوگوں کو جمع کرنے کے لیے اعلان کروایا۔ ابو کبشہ کا بیان ہے کہ میں آپ ﷺ کے پاس آیا تو آپ اپنے اونٹ کی لگام تھامے ہوئے فرما رہے تھے: «مَا تَدْخُلُونَ عَلٰی قَوْمٍ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ» ''تم ان لوگوں کے پاس جا کر کیا کرو گے جن پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوا۔'' ایک شخص نے اونچی آواز سے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! ان سے عبرت حاصل کریں گے۔'' تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَفَلَا أُنْذِرُكُمْ بِأَعْجَبَ مِنْ ذٰلِكَ؟ رَجُلٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كَانَ قَبْلَكُمْ وَمَا هُوَ كَائِنٌ بَعْدَكُمْ، فَاسْتَقِيمُوا وَسَدِّدُوا، فَإِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ لَا يَعْبَأُ بِعَذَابِكُمْ شَيْئًا، وَسَيَأْتِي قَوْمٌ لَّا يَدْفَعُونَ عَنْ أَنْفُسِهِمْ شَيْئًا»

''کیا میں تمھیں اس سے بھی زیادہ تعجب خیز چیز سے مطلع نہیں کر رہا، تمھی میں سے ایک شخص تم کو پہلے اور بعد کے واقعات کی اطلاع دیتا ہے۔ پس سیدھے ہو جاؤ اور درستگی اختیار کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ تم کو عذاب دینے کے بارے میں کسی چیز کی پروا نہیں کرے گا۔ اور عنقریب ایک قوم ہوگی جو اپنے آپ سے کسی چیز کو ہٹا نہیں سکے گی۔'' [2]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ لوگ جب تبوک میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے تو حجر میں ثمود کے گھروں کے پاس اترے۔ اور ان کے کنوں سے پانی پیا اور آٹا

---

[1] الصراع مع الصليبيين لأبي فارس، ص:221. [2] مسند أحمد:231/4، ومجمع الزوائد:194/6.

گوندھا تو آپ ﷺ نے حکم دیا کہ جنھوں نے ان کنووں سے پانی لیا ہے اسے انڈیل دیں اور گوندھا ہوا آٹا اونٹوں کو کھلا دیں اور انھیں حکم دیا کہ اس کنویں سے پئیں جس سے اونٹنی پانی پیا کرتی تھی۔

پھر آپ ﷺ نے فرمایا: «لَا تَدْخُلُوا مَسَاكِنَ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ، إِلَّا أَنْ تَكُونُوا بَاكِينَ حَذَرًا أَنْ يُصِيبَكُمْ مِثْلُ مَا أَصَابَهُمْ» ''ان لوگوں کے مساکن (گھروں) میں داخل نہ ہونا جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا مگر روتے ہوئے جاؤ کہ تمھیں وہ عذاب نہ آلے جس نے انھیں آلیا تھا۔'' پھر آپ ﷺ نے اپنی سواری کو ڈانٹا اور جلدی چلایا یہاں تک کہ حجر پیچھے رہ گیا۔[1]

دیارِ ثمود سے عبرت ونصیحت کے لیے یہ ایک خاص منہج ہے کہ ان مقامات سے بے خبر یا غافل انداز میں نہ گزریں بلکہ رونے جیسی صورت بنا کر جلدی جلدی وہاں سے نکل جائیں۔ اگر غضب شدہ قوموں کے چشموں یا کنووں سے استفادہ کیا گیا ہے تو پانی بہا دیں اور دوسری چیزیں جانوروں کو کھلا دیں۔ اور عذاب الٰہی کی تاثیر محسوس کرتے ہوئے دل میں نرمی کا سامان پیدا کر کے نصیحت وعبرت حاصل کریں۔ اللہ کی ناراضگی کا خوف بڑھنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے وہاں سے گزرتے ہوئے اپنے اوپر چادر اوڑھ لی۔ اور سواری کو تیز کر دیا۔[2]

حضرت عبداللہ ذوالبجادین رضی اللہ عنہ کی وفات اور دروس وحکمتیں

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں غزوۂ تبوک میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھا۔ نصف شب کو بیدار ہوا تو لشکر کے ایک کنارے پر آگ جلتی ہوئی دیکھی۔ میں اس

---

[1] صحيح البخاري، حديث: 3378-3381. قبل الحديث: 3346، و صحيح مسلم، حديث:(39)-2980. [2] صور و عبر من الجهاد النبوي في المدينة للدكتور فوزي فيض الله، ص:480.

آگ کی جانب چلا کہ دیکھوں کیا ماجرا ہے۔ وہاں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ، ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ وہاں موجود ہیں اور عبداللہ ذوالبجادین مزنی رضی اللہ عنہ وفات پا چکے ہیں۔ ان لوگوں نے ان کے لیے قبر کھودی اور رسول اللہ ﷺ اس قبر کے اندر کھڑے تھے۔ ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما انھیں آپ ﷺ کی طرف نیچے اتار رہے تھے اور آپ ﷺ فرما رہے تھے: «أَدْنِيَا إِلَيَّ أَخَاكُمَا» ''اپنے بھائی کو میری طرف (اتارو) قریب کرو۔'' تو ان دونوں نے ذوالبجادین رضی اللہ عنہ کو اتار دیا، پھر جب آپ ﷺ نے انھیں پہلو پر لٹایا تو دعا فرمائی:

«اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَمْسَيْتُ رَاضِيًا عَنْهُ، فَارْضَ عَنْهُ»

''اے اللہ! میں اس سے راضی ہوں تو بھی اس سے خوش ہو جا۔''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا:

«يَا لَيْتَنِي كُنْتُ صَاحِبَ الْحُفْرَةِ»

''کاش میں اس قبر میں دفن ہوتا۔''[1]

ابن ہشام کہتے ہیں کہ ان کا نام ذوالبجادین، اس لیے رکھا گیا کہ یہ اپنی قوم کے لوگوں سے اسلام کے لیے جھگڑتے رہتے تھے اور اسی لیے انھوں نے ان کی زندگی تنگ کر رکھی تھی۔ ان کی حالت یہ تھی کہ انھوں نے جسم پر صرف ایک موٹی چادر رہنے دی، اس کے علاوہ ان کے جسم پر کچھ نہ تھا۔ آخر یہ بھاگ کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آگئے۔ جب یہ رسول اللہ ﷺ کے قریب ہوئے تو انھوں نے چادر پھاڑ کر دو ٹکڑے کر لیے، ایک ٹکڑے کو تہ بند اور دوسرے کو اوڑھنے والی چادر بنا لیا، پھر (اس حالت میں) رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس بنا پر انھیں ''ذوالبجادین'' (دو چادروں والا) کہا گیا۔[2]

---

1 مسند البزار، رقم: 2736، و دلائل النبوة لأبي نعيم: 2/524-526، و مجمع الزوائد: 9/369، وصحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 598. 2 السيرة النبوية لابن هشام: 4/182.

اس قصے میں اسباق، عبرتیں اور دانائی کی باتیں ہیں جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

① **نبی کریم ﷺ کی جانب سے صحابہ کی تکریم:** رسول اللہ ﷺ کا فوت شدہ صحابی کے ساتھ یہ حسن سلوک اس بات کی دلیل ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے ساتھیوں کی تکریم فرماتے تھے۔ زندگی تو زندگی رہی بعد از وفات بھی آپ ﷺ ان کی عزت افزائی فرماتے۔ کیونکہ انھوں نے بھی تو ہر گراں سے گراں چیز کو پیچھے چھوڑتے ہوئے اپنے آپ کو جہاد فی سبیل اللہ کے لیے پیش کر دیا تھا۔ آپ ﷺ کا فوت شدہ صحابی سے یہ سلوک دنیا میں ان کی عزت و تکریم کا بین ثبوت تھا۔ یہ عزت افزائی دیگر افراد کو میدانِ جہاد میں آگے بڑھنے اور فدا ہونے کی رغبت دلاتی ہے۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسلم سپہ سالار رسول اللہ ﷺ کا لشکر کے افراد سے یہ سلوک ایسی خوبی ہے جسے دنیاوی قوانین نے اسلام کے چمکنے کے صدیوں بعد پہچانا اور اپنایا ہے۔[1]

② **رات کو دفن کرنا اور اچھائی پر رشک کرنا صحیح ہے:** رسول اللہ ﷺ نے ذوالبجادین رضی اللہ عنہ کو رات میں دفن کیا۔ سنت یہی ہے کہ میت کو دفن کرنے میں جلدی کی جائے۔ اچھائی پر رشک درست ہے یعنی جس طرح دیگر بھائیوں کو خیر و خوبی حاصل ہے ایسی ہی بھلائی کی تمنا و آرزو کرنا درست ہے۔ لیکن یاد رہے یہ حسد کے بالکل الٹ ہے کیونکہ حسد میں دوسرے کی نعمت کے زوال کی تمنا کارفرما ہوتی ہے اور صاف نظر آتا ہے کہ حسد شر ہی شر ہے۔ رہا رشک تو وہ صرف اچھے معاملات ہی میں ہوتا ہے۔[2]

غزوۂ تبوک میں رونما ہونے والے چند معجزات

غزوۂ تبوک میں کئی معجزات ظاہر ہوئے جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

1 المدخل إلى العقيدة والاستراتيجية العسكرية لمحمد جمال الدين، ص: 299. 2 الصراع مع الصليبيين لأبي فارس، ص:164,163.

بارانِ رحمت کی دعا: نبی اکرم ﷺ جب حجر ثمود سے آگے گزرے تو لوگوں کے پاس پانی بالکل نہیں تھا۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ بات بتائی۔ آپ ﷺ نے دعا کی اور اپنے ساتھیوں کے لیے بارش طلب کی۔ اللہ تعالیٰ نے ایک بادل بھیج دیا۔ اس سے خوب بارش ہوئی۔ لوگ سیراب ہو گئے اور اپنی ضروریات کے لیے بھی پانی محفوظ کر لیا۔ سیرت نگار ابن اسحاق نے اس شخص سے بیان کیا ہے جس نے محمود بن لبید سے پوچھا: ''کیا لوگ منافقین کے نفاق کو جانتے تھے؟'' انھوں نے جواب دیا: ''ہاں ہاں، آدمی اپنے بھائی، اپنے باپ، اپنے چچا اور اپنے خاندان کے لوگوں میں نفاق جانتا تھا مگر یہ لوگ ایک دوسرے سے بیان کرنے میں اشتباہ پیدا کر دیتے تھے۔'' اس کے بعد محمود نے بیان کیا کہ مجھے میری قوم کے کچھ آدمیوں نے ایک منافق کا حال سنایا جس کا نفاق معلوم ہو گیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ جہاں جاتے وہ آپ کے ساتھ جایا کرتا۔ مقام حجر میں پانی کی ضرورت پیش آئی تو رسول اللہ ﷺ کی دعا پر اللہ تعالیٰ نے بادل بھیج دیا، اس سے بارش ہوئی اور لوگ پانی پی پی کر خوب سیراب ہو گئے تو ہم اس منافق کی طرف متوجہ ہوئے اور ہم نے اس سے کہا: ''تیرا برا ہو کیا اس کے بعد بھی کوئی چیز باقی رہ گئی؟'' اس منافق نے کہا: ''یہ بادل تو گزر ہی رہا تھا۔''[1]

رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی کا واقعہ: رسول اللہ ﷺ تبوک کی جانب جا رہے تھے کہ راستے میں اونٹنی گم ہو گئی۔ آپ ﷺ اپنے صحابہ کے ساتھ تلاش میں نکلے۔ ادھر رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابی عمارہ بن حزم رضی اللہ عنہ تھے وہ بیعتِ عقبہ اور غزوۂ بدر میں شامل تھے اور بنو عمرو بن حزم کے چچا تھے۔ ان کی اقامت گاہ میں زید بن لصیت قینقاعی بھی تھا جو منافق تھا۔

زید بن لصیت عمارہ رضی اللہ عنہ کی اقامت گاہ میں بیٹھا کہنے لگا: ''کیا محمد ﷺ کا خیال یہ

1 السيرة النبوية لابن هشام: 176/4، وصور و عبر من الجهاد النبوي في المدينة للدكتور فوزي فيض الله، ص: 473.

نہیں کہ وہ نبی ہیں اور تم لوگوں کو آسمان کی خبریں سناتے ہیں، پھر بھی انھیں یہ معلوم نہیں کہ ان کی اونٹنی کہاں ہے؟''

ادھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جبکہ عمارہ رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے پاس تھے: «إِنَّ رَجُلًا قَالَ: هٰذَا مُحَمَّدٌ يُّخْبِرُكُمْ أَنَّهُ نَبِيٌّ، وَّيَزْعَمُ أَنَّهُ يُخْبِرُكُمْ بِأَمْرِ السَّمَاءِ، وَهُوَ لَا يَدْرِي أَيْنَ نَاقَتُهُ؟ وَإِنِّي وَاللّٰهِ مَا أَعْلَمُ إِلَّا مَا عَلَّمَنِيَ اللّٰهُ وَقَدْ دَلَّنِيَ اللّٰهُ عَلَيْهَا وَهِيَ فِي هٰذَا الْوَادِي، فِي شِعْبِ كَذَا وَكَذَا، قَدْ حَبَسَتْهَا شَجَرَةٌ بِزِمَامِهَا فَانْطَلِقُوا حَتّٰى تَأْتُونِي بِهَا» ''ایک آدمی نے کہا ہے: ''یہ محمد (ﷺ) کہتے ہیں کہ وہ رسول ہیں اور تمھیں آسمان کی خبریں بتاتے ہیں، حالانکہ وہ یہ نہیں جانتے کہ ان کی اونٹنی کہاں ہے۔ میرا حال یہ ہے کہ اللہ کی قسم! اللہ نے مجھے جو علم دیا ہے اس کے سوا مجھے کسی چیز کا علم نہیں اور اب اللہ تعالیٰ نے مجھے بتا دیا ہے کہ اونٹنی کہاں ہے۔ وہ اس وادی میں ہے۔ فلاں گھاٹی میں مہار الجھنے کی وجہ سے ایک درخت نے اسے روک لیا ہے، تم لوگ جاؤ اور اسے لے کر آؤ۔'' چنانچہ لوگ وہاں گئے اور اسے لے آئے، پھر عمارہ رضی اللہ عنہ اپنی اقامت گاہ میں واپس آئے اور بتایا کہ اللہ کی قسم! ایک چیز بڑی حیرت انگیز ہے جو ابھی ابھی رسول اللہ ﷺ نے ہم لوگوں کے سامنے بیان کی ہے۔ اور وہ کسی شخص کی یہ یہ گفتگو ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو باخبر کر دیا ہے۔ یہ سن کر عمارہ رضی اللہ عنہ کی اقامت گاہ میں جو لوگ موجود تھے ان میں سے ایک شخص نے، جو اس وقت رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر نہ تھا، کہنا شروع کر دیا کہ اللہ کی قسم! یہ تو وہی بات ہے جو زید بن لصیت نے تمھارے آنے سے پہلے کہی تھی۔ حضرت عمارہ رضی اللہ عنہ یہ سن کر زید پر پل پڑے۔ اس کی گردن پر مارتے جاتے اور کہتے جاتے: ''لوگو! ادھر دیکھو! میری اقامت گاہ میں ایک بہت بڑی آفت ہے جسے میں نہیں جانتا تھا۔ ارے اللہ کے دشمن! یہاں سے نکل اور میرے ساتھ نہ بیٹھ۔''[1]

[1] تاريخ الطبري: 145/3، والأنساب الأشراف للبلاذري: 85/1، و دلائل النبوة للبيهقي: 232/5، والسيرة النبوية لابن هشام: 177/4، و إعلام النبوة للماوردي، ص: 100.

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ زید بن لصیت نے اس کے بعد توبہ کر لی اور بعض نے کہا کہ وہ مرتے دم تک نفاق میں مبتلا رہا۔[1]

سخت ہوا چلنے کی خبر اور اس سے احتیاط: تبوک میں رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو انتباہ فرمایا کہ عنقریب سخت ہوا چلے گی، لہٰذا خود بھی محتاط رہو اور جانوروں کا بھی خیال رکھو۔ ادھر ادھر باہر نہ جاؤ۔ جانوروں کو رسیوں سے باندھ رکھو، چنانچہ آپ ﷺ کی اطلاع کے مطابق تیز آندھی چلی۔ جو بھی کھڑا تھا اسے اس نے دور پھینک دیا۔[2]

ابو حمید بیان کرتے ہیں کہ ہم تبوک تک چلتے گئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «سَتَهُبُّ عَلَيْكُمُ اللَّيْلَةَ رِيحٌ شَدِيدَةٌ، فَلَا يَقُمْ فِيهَا أَحَدٌ مِّنْكُمْ، فَمَنْ كَانَ لَهُ بَعِيرٌ فَلْيَشُدَّ عِقَالَهُ» ''آج شب تیز ہوا چل سکتی ہے، لہٰذا اس میں تم میں سے کوئی آدمی کھڑا نہ رہے اور جس کے پاس اونٹ ہو وہ اس کو رسی کے ساتھ مضبوطی سے باندھ دے۔'' چنانچہ رات کو تیز ہوا چلی جس میں ایک آدمی کھڑا ہو گیا تو اسے ہوا نے اٹھا کر طَے کے پہاڑ پر پھینک دیا۔[3]

چشمۂ تبوک: حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّكُمْ سَتَأْتُونَ غَدًا۔ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ۔ عَيْنَ تَبُوكَ، وَإِنَّكُمْ لَنْ تَأْتُوهَا حَتّٰى يَضْحَى النَّهَارُ، فَمَنْ جَاءَ هَا مِنْكُمْ فَلَا يَمَسَّ مِنْ مَّائِهَا شَيْئًا حَتّٰى آتِيَ» ''تم کل ان شاء اللہ تبوک کے چشمے پر پہنچو گے۔ اور تم دن چڑھے ہی وہاں پہنچ سکو گے، لہٰذا تم میں سے جو کوئی وہاں جائے اس کے پانی کو ہاتھ نہ لگائے حتی کہ میں آجاؤں۔'' ہم اس چشمے پر پہنچے تو ہم سے پہلے وہاں دو آدمی پہنچ چکے تھے۔ پانی اس قدر کم تھا کہ جوتی کے تسمے کے برابر ہوگا وہ بھی آہستہ آہستہ بہہ رہا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں

1 السيرة النبوية لابن هشام: 4/177. 2 الصراع مع الصليبيين لأبي فارس ص: 141،
3 صحيح البخاري، حديث: 1481، و صحيح مسلم، حديث: [5948]-1392.

آدمیوں سے پوچھا: «هَلْ مَسَسْتُمَا مِن مَّائِهَا شَيْئًا؟» ”کیا تم نے اس کے پانی کو چھوا؟“ انھوں نے کہا: ہم ایسا کر بیٹھے ہیں۔ آپ ﷺ نے ان کی سرزنش کی، پھر لوگوں نے چلو بھر بھر کر تھوڑا تھوڑا پانی کر کے ایک برتن میں جمع کیا تو کچھ پانی اکٹھا ہو گیا۔ آپ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ اور چہرہ مبارک اسی برتن میں سے دھویا، پھر وہ پانی اس چشمے میں ڈال دیا۔

وہ چشمہ جوش مار کر ابلنے لگا حتی کہ تمام لوگوں نے اپنے جانوروں کو پانی پلا لیا۔

رسول اللہ ﷺ نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے فرمایا: «يُوشِكُ يَا مُعَاذُ! إِنْ طَالَتْ بِكَ حَيَاةٌ أَنْ تَرٰى مَا هَاهُنَا قَدْ مُلِئَ جِنَانًا» ”اے معاذ! اگر تیری زندگی دراز ہوئی تو تو دیکھے گا کہ ساری جگہ باغوں سے بھر جائے گی۔“[1]

پانی کی قلت کی بنا پر تبوک اور یہ وادی جس میں یہ چشمہ تھا بالکل بنجر تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کے دست مبارک پر پانی میں برکت ڈال دی اور وہ چشمہ جوش مارنے لگا۔ اور یہ صرف اسی لشکر کی ضرورت پوری کرنے کی حد تک نہ تھا بلکہ آپ ﷺ نے بتایا کہ یہ اب جاری و ساری رہے گا اور مستقبل میں اسی جگہ پھل دار درختوں کے باغات بھی ہوں گے۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد آپ ﷺ کی پیشین گوئی سچ ثابت ہوئی۔ اس وقت سے آج تک تبوک اپنے باغات، کھجور اور دیگر درختوں کی وجہ سے مشہور ہے جو رسول گرامی قدر کی سچی نبوت کی منہ بولتی گواہی ہے۔[2]

کھانے میں کئی گنا اضافہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب غزوۂ تبوک میں لوگوں کو سخت بھوک لگی، انھوں نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! اگر آپ ہمیں اجازت دیں تو ہم اپنے اونٹوں کو ذبح کر لیں تا کہ ہم انھیں کھا بھی لیں اور چربی بھی حاصل

---

1 صحیح مسلم، حدیث: [5947](10)-706، وسنن أبي داود، حدیث: 1260، و جامع الترمذي، حدیث: 553، و سنن ابن ماجه، حدیث: 1070، ومسند أحمد: 237/5، 238، والسنن الكبرىٰ للنسائي: 285/1. 2 الصراع مع الصليبيين لأبي فارس، ص: 142.

کرلیں۔'' (تندرست و توانا ہو جائیں) آپ ﷺ نے اجازت دے دی۔ اتنے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ آگئے۔ انھوں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! اگر انھوں نے ایسا کیا تو سواریاں کم ہو جائیں گی۔ سب لوگوں کو بلائیے کہ اپنا اپنا بچا ہوا توشہ لے کر آئیں، پھر آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ وہ اس میں برکت ڈال دے۔ ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ اس میں برکت پیدا کر دے۔ تب رسول اللہ ﷺ نے ایک دستر خوان بچھوایا، پھر سب کا بچا ہوا توشہ منگوایا گیا تو کوئی مٹھی بھر جوار لایا، کوئی مٹھی بھر کھجور، کوئی روٹی کا ٹکڑا، یہاں تک کہ دستر خوان پر تھوڑا سا کھانا اکٹھا ہو گیا، پھر رسول اللہ ﷺ نے برکت کی دعا کی۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے انھیں حکم دیا: «خُذُوا فِي أَوْعِيَتِكُمْ» ''اسے اپنے برتنوں میں بھر لو۔'' سب نے اپنے اپنے برتن بھر لیے، لشکر کا کوئی برتن نہ چھوڑا گیا جس کو نہ بھرا ہو، پھر سب نے کھانا شروع کیا اور سیر ہو گئے۔ اور اس میں سے کچھ بچ بھی گیا۔ تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنِّي رَسُولُ اللّٰهِ، لَا يَلْقَى اللّٰهَ بِهِمَا عَبْدٌ غَيْرَ شَاكٍّ فَتُحْجَبَ عَنْهُ الْجَنَّةُ» ''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں۔ جو شخص ان دونوں باتوں پر یقین کر کے اللہ تعالیٰ سے ملے گا وہ جنت سے محروم نہیں ہوگا۔''[1]

غزوۂ تبوک کے دوران منافقین کے کردار پر قرآن پاک کا تبصرہ

غزوۂ تبوک کے دوران ایک منافق نے مجلس میں بیٹھے کہا: ''ہمارے یہ قاری لوگ بڑے شکم دار، زبان کے جھوٹے اور جنگ میں بزدلی دکھانے والے ہیں۔'' وہاں بیٹھے ایک شخص نے اسے جواب دیا: ''تو جھوٹ بکتا ہے تو منافق ہے۔ میں یہ گفتگو ضرور رسول اللہ ﷺ کو بتاؤں گا۔'' چنانچہ یہ خبر آپ ﷺ تک بھی پہنچ گئی اور اس سے متعلق قرآن پاک نازل

1 صحیح مسلم، حدیث: 27، ومسند أحمد: 11/3، ودلائل النبوة للبیهقي: 5/229، 230، وصحیح ابن حبان، رقم: 6530، ومسند أبي یعلی، رقم: 1199.

ہوا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ میں نے اسے دیکھا، رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی کی پیٹی (وہ بیلٹ جس سے کجاوہ بندھا ہوتا ہے) سے چمٹا ساتھ ساتھ چل رہا تھا اور پتھر اسے زخمی کر رہے تھے وہ کہتا جا رہا تھا: ''اے اللہ کے رسول! ہم تو یونہی وقت گزاری کے لیے ہنس رہے تھے۔'' رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے:

﴿ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ ﴾

''کیا تم اللہ تعالیٰ، اس کی آیات اور اس کے رسول کے ساتھ مذاق کر رہے تھے؟''[1]

قتادہ کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ جب تبوک کی جانب رواں دواں تھے تو آگے آگے کچھ منافقین چل رہے تھے اور آپ ﷺ کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے: ''یہ شخص شام کے محلات اور قلعے فتح کر لینا چاہتا ہے، یہ بالکل ناممکن ہے!'' ادھر اللہ تعالیٰ نے ان کی اس بات سے نبی مکرم ﷺ کو باخبر کر دیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: «اِحْبِسُوا عَلَيَّ هٰؤُلَاءِ الرَّكْبَ» ''اس گروہ کو میرے پہنچنے تک ذرا روکو۔'' آپ ﷺ نے آ کر پوچھا کہ تم نے ایسی ایسی باتیں کہی ہیں؟'' تو انھوں نے قسم اٹھالی کہ ہم صرف ہنسی مذاق کر رہے تھے۔[2]

تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں:

﴿ يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۚ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ۝ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ ۚ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ ﴾

''منافقین (اس بات سے) ڈرتے ہیں کہ ان (مسلمانوں) پر کوئی سورت نازل کر دی جائے جو انھیں (ہر بات) بتا دے، جو ان (منافقوں) کے دلوں میں

[1] تفسير الطبري: 172/10، والدرالمنثور للسيوطي: 230/4. [2] تفسير الطبري: 172/10، والدرالمنثور للسيوطي: 230/4.

ہے۔ کہہ دیجیے: تم مذاق کرتے رہو، بے شک اللہ وہ باتیں ظاہر کرنے والا ہے جس سے تم ڈرتے ہو اور البتہ اگر آپ ان سے پوچھیں تو وہ ضرور کہیں گے کہ ہم تو صرف شغل کے طور پر باتیں اور دل لگی کرتے تھے۔ کہہ دیجیے: کیا تم اللہ اور اس کی آیتوں اور اس کے رسول کے ساتھ مذاق کیا کرتے تھے؟''[1]

آیت کا مفہوم یوں ہوگا: ''اے محمد! زجر و توبیخ کرتے ہوئے ان سے پوچھیے کہ کیا تمھیں اندھیروں سے روشنی میں لانے والے تمھاری ہدایت کے لیے اللہ کے بھیجے ہوئے رسول اور اللہ کے احکام و فرائض مذاق کے لیے ملے ہیں اور کوئی چیز نہیں ملی۔ تمھارا یہ عمل کفر ہے۔'' ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ۚ اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةً ۢ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ۝ ﴾

''(اب) بہانے مت بناؤ، یقیناً تم نے اپنے ایمان کے بعد کفر کیا ہے، اگر ہم تم میں سے ایک گروہ کو معاف بھی کر دیں تو دوسرے گروہ کو اس وجہ سے عذاب دیں گے کہ وہ مجرم تھے۔''[2]

مطلب یہ ہے کہ تم بہانے نہ بناؤ یقیناً تم ایمان کے بعد بے ایمان ہو گئے ہو۔ اگر تم میں سے کچھ لوگوں سے درگزر بھی کر لیں تو کچھ لوگوں کو ان کے سنگین جرم کی سزا بھی دیں گے۔ آیت مبارکہ کا مفہوم یہ ہے کہ اس جرم کو مٹانے کے لیے یہ عذر مت کرو۔ کیونکہ کھیل کود کے لیے بھی کفریہ کردار قطعاً درست نہیں، گویا تمھارا یہ عذر لنگ اعترافِ جرم ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے: ''عذرِ گناہ بدتر از گناہ۔''

اور اسی طرح اگر ہم مُخَشّن بن حُمَیِّر جیسے توبہ اور رجوع کرنے والوں سے درگزر کر بھی لیں تو کئی دیگر مجرموں اور اس گناہ پر اصرار کرنے والوں کو سزا بھی دیں گے۔[3]

1 التوبة 9:64,65. 2 التوبة 9:66. 3 تفسير المراغي: 153/4.

رسول اللہ ﷺ پر اچانک حملے کا پروگرام

منافقین کے متعلق یہ فرمان الٰہی بھی نازل ہوا:

﴿ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا ۚ وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝ ﴾

''وہ (منافقین) اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ انھوں نے (کوئی بات) نہیں کہی، حالانکہ انھوں نے یقیناً کلمۂ کفر کہا تھا اور وہ اسلام لانے کے بعد کافر ہو گئے۔ اور انھوں نے وہ کچھ کرنے کا ارادہ کیا جو وہ نہ کر سکے۔ اور انھوں نے غصہ نہیں نکالا، مگر اس بات پر کہ اللہ اور اس کے رسول نے اپنے فضل سے انھیں غنی کر دیا، پھر اگر وہ توبہ کر لیں تو ان کے لیے بہتر ہو گا اور اگر وہ پھر جائیں تو اللہ انھیں دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب دے گا اور ان کا زمین میں کوئی حمایتی اور کوئی مددگار نہ ہو گا۔''[1]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ ضحاک کہتے ہیں: غزوۂ تبوک میں ایک رات دس سے کچھ زیادہ منافقین نے رسول اللہ ﷺ پر اچانک حملہ کرنا چاہا۔ انھی کے متعلق یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی۔[2]

ضحاک سے واحدی کی روایت میں ہے کہ غزوۂ تبوک میں منافق بھی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ وہ جب بھی آپس میں اکٹھے ہوتے تو رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں نازیبا الفاظ کہتے اور دین میں بھی عیب لگاتے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے

1 التوبۃ 9:74. 2 تفسیر ابن کثیر 2/372.

رسول اللہ ﷺ کو ان کی یہ گفتگو بتلا دی۔ آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: «يَا أَهْلَ النِّفَاقِ! مَا هٰذَا الَّذِي بَلَغَنِي عَنْكُمْ؟!» ''اے نفاق والو! یہ مجھے تمھارے متعلق کیسی خبریں پہنچ رہی ہیں؟'' انھوں نے جھٹ سے قسم کھالی کہ اس قسم کی کوئی بات سرے سے ہوئی ہی نہیں۔ تب اللہ تعالیٰ نے انھیں جھوٹا کرنے کو مذکورہ آیت نازل فرمائی۔[1]

اس آیت مذکور میں ﴿وَهَمُّوا بِمَا لَمْ يَنَالُوا﴾ ''اور انھوں نے وہ کچھ کرنے کا ارادہ کیا جو وہ نہ کر سکے۔'' (التوبة 74:9) سے اس واقعے کی طرف اشارہ ہے جب تبوک سے واپسی پر آپ ﷺ گھاٹی میں پہنچے اور منافقین نے اچانک حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔

ابن کثیر رحمہ اللہ نے امام بیہقی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی کی مہار پکڑے ہوئے تھا اور عمار رضی اللہ عنہ اونٹنی کو پیچھے سے ہانک رہے تھے یا میں پیچھے سے ہانک رہا تھا اور عمار رضی اللہ عنہ اسے آگے سے کھینچ رہے تھے۔ جب ہم گھاٹی میں پہنچے تو بارہ گھڑ سوار سامنے سے آدھمکے میں نے رسول اللہ ﷺ کو بتایا تو آپ ﷺ نے انھیں للکارا۔ وہ پشت پھیر کر بھاگ گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ہم سے پوچھا: «هَلْ عَرَفْتُمُ الْقَوْمَ؟» ''تم نے ان لوگوں کو پہچان لیا ہے؟'' ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول وہ چہروں پر ڈھاٹے باندھے ہوئے تھے۔ ہم انھیں نہیں پہچان سکے لیکن ہم نے ان کی سواریوں کو پہچان لیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «هٰؤُلَاءِ الْمُنَافِقُونَ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَهَلْ تَدْرُونَ مَا أَرَادُوا؟» ''یہ لوگ قیامت تک منافق رہیں گے۔ اور کیا تم جانتے ہو ان کا ارادہ کیا تھا؟'' ہم نے عرض کیا: ''نہیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: «أَرَادُوا أَنْ يَّزَاحَمُوا رَسُولَ اللّٰهِ فِي الْعَقَبَةِ» ''انھوں نے گھاٹی میں اللہ کے رسول ﷺ سے ٹکرانے اور وہاں گھاٹی میں رسول اللہ ﷺ کو گرانے کا ارادہ کیا تھا۔''[2]

1 أسباب النزول للواحدي، ص:251. 2 دلائل النبوة للبيهقي:260/5، 261، والدر المنثور للسيوطي:244/4.

باب 3

غزوۂ تبوک سے واپسی

پیچھے رہ جانے والوں اور مسجد ضرار پر قرآن کا تبصرہ

تبوک میں بیس دن قیام کے بعد رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ واپس تشریف لائے۔[1]

واپس پہنچتے ہی آپ ﷺ نے منافقین کی بنائی ہوئی مسجد ''ضرار'' کو گرانے کا حکم صادر فرما دیا۔

آپ ﷺ جب ثنیۃ الوداع کے قریب آگئے تو مدینہ منورہ کے بچے استقبال کے لیے نکلے۔ آپ ﷺ مدینہ تشریف لائے۔ مسجد نبوی میں دو رکعات نفلی نماز ادا کی، پھر لوگوں کی ضروریات و مسائل کے لیے مسجد میں تشریف فرما ہوئے تو غزوہ تبوک سے پیچھے رہنے والے اپنے اپنے عذر پیش کرنے آگئے، پیچھے رہنے والے چار قسم کے لوگ تھے۔

کچھ تو شرعی عذر کی وجہ سے معذور تھے اور ان کا عذر اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول تھا۔ کچھ کے پاس کوئی شرعی عذر تو نہ تھا مگر اللہ تعالیٰ نے انھیں معاف فرما دیا تھا، ان میں سے کچھ مدینہ کے منافقین تھے اور کچھ مدینہ منورہ کی مضافاتی بستیوں کے منافقین تھے۔

شرعی عذر کی وجہ سے پیچھے رہ جانے والے افراد: ان کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

[1] صحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص:603.

﴿ لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ۚ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ۝ ﴾

"ضعیفوں اور بیماروں پر اور جو لوگ کوئی چیز نہیں پاتے کہ وہ خرچ کریں، ان پر (پیچھے رہنے میں) کوئی گناہ نہیں جبکہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے لیے خیر خواہی کرتے ہوں۔ نیکی کرنے والوں پر (گرفت کی) کوئی راہ نہیں۔ اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔ اور (اے نبی!) نہ ان لوگوں پر (کوئی گناہ ہے) جو آپ کے پاس آئے کہ آپ انھیں (سفر جہاد کے لیے) سواری دیں (اور) آپ نے کہا کہ میرے پاس کوئی سواری نہیں تو وہ اس حال میں لوٹ گئے کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بہہ رہی تھیں کہ ان کے پاس کچھ نہیں جسے وہ (اللہ کی راہ میں) خرچ کریں۔"[1]

ان آیات کریمہ نے شرعی عذر کے حامل پیچھے رہنے والوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کے پیچھے رہنے کی وجہ سے ان پر کوئی گناہ اور حرج نہیں ہے۔ کیونکہ ان کے پاس شرعی عذر تھا جس کی بنا پر وہ ساتھ نہ جا سکے۔ اس جگہ ضعفاء سے انتہائی بوڑھے افراد مراد ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ بچے مراد ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ مراد پاگل اور دیوانے ہیں۔ ان کی عقل کمزور ہونے کے سبب انھیں ضعیف کہا گیا۔ یہ دونوں قول ماوردی نے بیان کیے ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ یہاں اپاہج، نابینے، عمر رسیدہ اور جسمانی طور پر انتہائی لاغر افراد مراد ہیں۔ اور "بیمار" سے مراد ایسے لوگ ہیں جن پر ایسا مرض لاحق ہے جو جنگ کے لیے نکلنے سے مانع ہو۔[2]

1 التوبة 9:91,92. 2 زاد المسير 4/485.

اور ان لوگوں پر بھی کوئی حرج نہیں جن کے پاس غزوے میں جانے کے لیے زادراہ نہیں ہے اور ان آیات سے یہ بھی واضح ہے کہ یہ رفع حرج تب ہے کہ جب وہ حق کی شناخت رکھیں اور حق پرستوں سے محبت اور باطل کے پرستاروں سے عداوت رکھیں۔ [1]

طبری کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں: ''جس شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پیچھے رہ جانے کے باوجود اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی خیر خواہی کی ہے، پیچھے رہنے میں اس کے پاس معقول عذر بھی تھا، اس شخص کا کوئی گناہ ایسا نہیں جس پر اسے سزا دی جائے اور ان آیات میں یہ بھی وضاحت ہے کہ اللہ تعالیٰ نیکوکاروں کے گناہوں کی پردہ پوشی کرنے والا ہے۔ ان پر عفو ودرگزر کے دہانے کھول دیتا ہے اور انتہائی مشفق ہے۔ [2]

امام قرطبی کہتے ہیں: ''یہ آیت عاجز شخص پر سے تکالیف شرعیہ کے سقوط کے لیے اصول کی حیثیت رکھتی ہے۔ عجز خواہ قوت و استطاعت نہ ہونے کی بنا پر ہو یا مال نہ ہونے کی بنا پر۔'' [3]

اور ان آیات میں یہ بھی وضاحت ہے کہ وہ لوگ جو مالی طور پر کمزور ہونے کے باعث رسول اللہ ﷺ کے پاس تشریف لائے اور ساتھ جانے کے لیے سواریوں کا مطالبہ کرنے لگے۔ ایسے لوگ دوسروں سے الگ تھلگ اور اعلیٰ قسم کے لوگ ہیں باوجودیکہ یہ جہاد میں شریک نہیں ہوئے۔ یہاں ان کی تعریف بھی کی گئی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ ان کے لیے سواریوں کا کوئی بندوبست نہ کر سکے تو وہ اس غزوے میں عدم شرکت کی بنا پر شدت غم سے رونے لگے۔ [4]

شرعی عذر نہ ہونے کے باوجود توبہ قبول ہونا: وہ پیچھے رہ جانے والے لوگ جن کا عذر شرعی تو نہیں تھا مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

1 تفسير القرطبي: 226/8. 2 تفسير الطبري: 211/10. 3 تفسير القرطبي: 226/8. 4 حديث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ لأبي بدر محمد بكر آل عابد: 673,672/2.

﴿ وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾

''اور کچھ دیگر لوگ ہیں جنھوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا، انھوں نے ملا جلا عمل کیا، ایک اچھا اور دوسرا برا، امید ہے کہ اللہ ان کی توبہ قبول فرمائے گا، یقیناً اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔''[1]

آیت مبارکہ کا مفہوم یہ ہے کہ یہ لوگ جو بلا عذر غزوۂ تبوک سے پیچھے رہ گئے تھے اب اس پر ندامت کا اظہار کر رہے ہیں۔ منافقین کی طرح یہ بھی جھوٹے بہانے گھڑ کر نہیں لائے بلکہ توبہ کی اور اپنے گناہ کا اعتراف کیا اور اللہ تعالیٰ سے معافی کی امید بھی رکھی ہے۔ ان کے اچھے یا نیک عمل سے مراد ہے ان کا اسلام قبول کرنا اور احکام شرعی پر عمل درآمد اور پھر ہر جنگ میں ساتھ دینا۔

برے عمل سے مراد ان کا اس غزوے میں پیچھے رہ جانا ہے اور پھر انھوں نے اس گناہ کے بعد نیک عمل، یعنی کوتاہی کا اعتراف اور توبہ بھی کی ہے۔

اعتراف جرم کی اصل یہ ہے کہ اپنے جرم کا اقرار کیا جائے۔ مگر توبہ تب ہی قابل قبول ہوگی جب گناہ پر ندامت اور مستقبل میں اسے چھوڑنے کا عزم شامل ہو۔ اور ان لوگوں نے ایسا ہی طرز عمل اختیار کیا۔ ''خلط'' کے معنی ہیں کہ انھوں نے گناہ اور توبہ میں سے ہر ایک کو دوسرے کے ساتھ ملا دیا ہے۔ جس طرح کہتے ہیں: میں نے پانی کو دودھ میں اور دودھ کو پانی میں ملا دیا ہے۔ اس آیت میں یہ بھی وضاحت ہے کہ اعتراف گناہ کے ساتھ ساتھ ان کی طرف سے ایسی صورت کا بھی اظہار ہوا ہے جو قبولیت توبہ میں مفید ہو۔ اور وہ ہے ''اعتراف'' اور اعتراف (بسا اوقات) توبہ کے قائم مقام بھی ہو جاتا ہے۔

[1] التوبة 9:102.

اور حرفِ امید ''عسیٰ'' یہاں پر یقین کا مفہوم دے رہا ہے کیونکہ اللہ کی طرف امید کا اظہار کسی کام کے یقینی وقوع پذیر ہونے کے مترادف ہوتا ہے اور وہی گناہ بخشتا اور اپنے بندوں پر مزید فضل بھی کرتا ہے۔[1]

توبہ کے امیدوار: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴾

''اور کچھ دوسرے لوگ ہیں جن کا معاملہ اللہ کا حکم آنے تک مؤخر کر دیا گیا ہے، یا تو وہ انھیں سزا دے گا یا ان کی توبہ قبول کرلے گا اور اللہ خوب جاننے والا، خوب حکمت والا ہے۔''[2]

اس آیت میں مذکورہ افراد سے مراد وہ ہیں جن کا معاملہ ملتوی ہو گیا تھا، یعنی ہلال بن امیہ، کعب بن مالک اور مرارہ بن ربیع رضی اللہ عنہم۔ یہ لوگ بغیر کسی وجہ یا عذر کے رسول اللہ ﷺ سے پیچھے رہ گئے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ آپ ﷺ کو راستے میں جا ملیں گے مگر ایسا نہ ہو سکا۔ یہ لوگ انتہائی مخلص تھے اور نفاق کے سبب پیچھے نہ رہے تھے۔ جب رسول گرامی ﷺ غزوے سے واپس تشریف لائے اور پیچھے رہ جانے والوں کا معاملہ پیش آیا تو ان تینوں نے کہا: ''ہمارے پاس کوتاہی کے سوا کوئی عذر ہی نہیں ہے۔'' انھوں نے جھوٹے بہانے بھی پیش نہ کیے اور نہ گناہ کے اعتراف میں مسجد کے ستون سے اپنے آپ کو باندھ لینے والوں کی طرح اپنے آپ کو باندھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے بائیکاٹ کا حکم صادر فرمایا۔ اور ان پر معاملے میں انتہائی سختی کی جیسا کہ آگے پورا قصہ آرہا ہے۔ ان کا معاملہ پچاس راتوں تک معلق رہا۔ انھیں معلوم نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ ان سے کیا سلوک فرمائیں گے۔[3]

ان تین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے واقعے میں چونکہ متعدد حکمتیں، دروس اور عبرتیں ہیں، اس

[1] فتح القدير للشوكاني:2/399. [2] التوبة 9:106. [3] تفسير الآلوسي: 11/17.

لیے ہم چند صفحات کے بعد ذرا تفصیل سے اس کا جائزہ لیتے ہیں۔

مدینہ منورہ اور گردوپیش کے دیہاتیوں میں سے پیچھے رہنے والے منافق: بدوی منافقین کے متعلق درج ذیل آیت مبارکہ نازل ہوئی:

﴿ وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَقَعَدَ الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ ﴾

''اور دیہاتیوں میں سے بہانے باز آئے کہ انھیں اجازت دی جائے اور وہ لوگ بیٹھ رہے جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول سے جھوٹ بولا، ان میں سے جن لوگوں نے کفر کیا انھیں جلد ہی دردناک عذاب آ پکڑے گا۔''[1]

آیت مبارکہ کا مفہوم یہ ہے کہ بدویوں کے کچھ افراد سچے جھوٹے عذر لے کر حاضر ہو گئے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ان کے غزوے سے پیچھے رہنے کا عذر قبول کریں۔ مگر ان میں سے ایک گروہ نے عذر بھی پیش نہیں کیا۔ بلکہ وہ جنگ میں گئے بھی نہیں اور ان کے پاس کوئی معقول عذر بھی نہیں تھا۔ بدویوں میں سے یہی لوگ منافق ہیں جنھوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی تکذیب کی ہے۔ بعدازاں اللہ تعالیٰ نے ان بدویوں میں سے جنھوں نے جھوٹے بہانے گھڑے ہیں انھیں اور جو عذر پیش کرنے بھی نہیں آئے بلکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی تکذیب کرنے والے ہیں انھیں ڈانٹ پلاتے ہوئے فرمایا کہ ان کے لیے بہت تکلیف دہ عذاب ہے۔ اس سے دنیا و آخرت دونوں کا عذاب مراد ہے۔[2]

ان اعرابیوں اور بدویوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو خبر دی ہے کہ اے مومنو! تمھارے شہر مدینہ کے اردگرد منافق بدویوں کی ایک قوم آباد ہے ان سے بچ کر رہنا۔[3]

ارشاد ربانی ہے:

[1] التوبة 9:90. [2] فتح القدير للشوكاني: 391/2. [3] حديث القرآن عن غزوات الرسولﷺ لأبي بدر محمد بكر آل عابد: 681/2.

﴿فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْۤا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ؕ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ؕ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ○ فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ○ فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا ؕ اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَ ○﴾

''جو لوگ پیچھے چھوڑ دیے گئے تھے وہ رسول اللہ کے پیچھے اپنے بیٹھ رہنے پر خوش ہوئے اور انھوں نے ناپسند کیا کہ اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کریں اور انھوں نے (اوروں سے) کہا کہ گرمی میں کوچ نہ کرو۔ (اے نبی!) کہہ دیجیے: جہنم کی آگ (اس سے) کہیں زیادہ گرم ہے۔ کاش! وہ یہ بات سمجھتے۔ چنانچہ انھیں چاہیے کہ وہ تھوڑا ہنسیں اور زیادہ روئیں ان اعمال کے بدلے میں جو وہ کماتے رہے۔ (اے نبی!) پھر اگر اللہ آپ کو واپس لے آئے ان (منافقین) میں سے کسی گروہ کی طرف، پھر وہ آپ سے (جہاد پر) نکلنے کی اجازت مانگیں تو کہہ دیجیے: تم اب میرے ساتھ کبھی بھی (جہاد پر) نہیں نکلو گے اور نہ کبھی میرے ساتھ (مل کر) دشمن سے لڑو گے، یقیناً تم پہلی بار (پیچھے) بیٹھ رہنے پر راضی ہو گئے تھے تو (اب بھی) پیچھے رہنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔''[1]

گزشتہ آیات کی تفسیر یہ ہے: ﴿الْمُخَلَّفُوْنَ﴾ اسم مفعول ہے جو کہ «خَلَّفَ فُلَانٌ فُلَانًا وَّرَاءَهُ» سے لیا گیا ہے۔ یہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی کسی کو پیچھے چھوڑ دے۔ ''المخلّف'' پیچھے چھوڑا ہوا شخص ہوتا ہے۔[2]

﴿بِمَقْعَدِهِمْ﴾ اپنے بیٹھنے کے سبب۔

[1] التوبة 9:81-83. [2] زاد المسیر:3/478.

﴿خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ﴾ علامہ فخر الدین رازی کہتے ہیں: ''اس کے بارے میں دو قول ہیں:

① اس کا مفہوم ہے رسول اللہ ﷺ کے بعد۔

② رسول اللہ ﷺ کی مخالفت میں، یعنی وہ رسول اللہ ﷺ کی مخالفت میں بیٹھے رہے۔''[1]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ منافقین کی مذمت کرتے ہوئے فرماتے ہیں جو غزوۂ تبوک میں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں سے پیچھے رہ گئے تھے اور آپ ﷺ کے چلے جانے کے بعد بیٹھے رہنے پر خوش تھے۔ ﴿وَكَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا﴾ یعنی آپ ﷺ کے ساتھ جہاد پر جانے کو ناپسند کرتے تھے اور آپس میں ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ اتنی گرمی میں باہر نہ نکلو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ سے فرمایا کہ ان سے کہیں: ''جہنم کی آگ جس کی طرف تم رسول اللہ ﷺ کی مخالفت میں جا رہے ہو، اس گرمی سے زیادہ سخت ہے جس سے اب تم راہ فرار اختیار کر چکے ہو۔'' کاش! تم عقل کے ناخن لیتے۔''[2]

ان آیات میں یہ بھی وضاحت ہے کہ یہ لوگ دنیا میں ساری عمر ہنستے اور اتراتے رہے ہیں مگر یہ ہنسنا ان کے آخرت میں رونے کے مقابلے میں انتہائی کم ہے کیونکہ دنیا فانی اور آخرت ہمیشہ ہمیش کے لیے ہے۔

اس طرح ان آیات میں موجود لفظ ﴿طَآئِفَةٍ﴾ سے مراد منافقین کا وہ ٹولہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ غزوۂ تبوک کے لیے نہیں نکلا تھا۔

اور ﴿الْخٰلِفِيْنَ﴾ کی تفسیر میں بقول امام رازی کئی توجیہات ذکر کی گئی ہیں:

① خالفون جمع ہے جس کا واحد خالف ہے۔ اس سے مراد وہ شخص جو قوم میں پیچھے رہے۔ مفہوم یہ ہوگا کہ تم پیچھے رہ جانے والے لوگوں میں رہو جو ہمیشہ گھروں ہی میں دبکے

[1] تفسیر الرازي: 151/15. [2] تفسیر ابن کثیر: 376/2.

رہتے ہیں۔

② خالفین کا معنی مخالفین کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص نے اس کی اس کے اہلِ خانہ کے بارے میں مخالفت کی ہے جب وہ شخص ان کا مخالف ہو۔ ایک مراد یہ بھی ہے کہ دوسرے لوگوں سے بہت زیادہ اختلاف کرنے والے۔

③ برے آدمی کو بھی ''خالف'' کہا جاتا ہے۔ اصمعی کہتے ہیں: ''اس سے مراد یہ ہے کہ وہ ہر بھلائی سے پیچھے رہتا ہے۔'' یہ اس وقت بولتے ہیں جب کوئی شخص برا ہو جائے یا بدتر ہو جائے۔ یہ ''فَسَدَ اللَّبَنُ'' کے محاورے سے ماخوذ ہے۔ اور یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب دودھ خراب ہو جائے۔

ان تمام توجیہات سے پتا چلتا ہے کہ اس لفظ کی ان میں سے کوئی بھی توجیہہ ممکن ہے کیونکہ منافقین میں یہ سب قباحتیں پائی جاتی تھیں۔[1]

یہ واضح ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی سیاست منافقین کے ساتھ معاملات نپٹانے میں باوجود ان کے بہانے تراشنے کے اور تھی اور مسلمانوں کے ساتھ اور تھی۔ آپ ﷺ نے منافقین کے ساتھ نرمی اور پہلو تہی برتی، جبکہ سچے مسلمانوں کے لیے سختی اور سزا کا پہلو اختیار کیا۔ بلاشبہ مسلمانوں سے سختی اور شدت عزت افزائی اور تکریم کی مظہر تھی، جبکہ منافقین اس کے اہل نہ تھے۔ دنیا میں یہ لوگ جن کرتوتوں کا مظاہرہ کرتے ہیں انھیں اس کی بدولت آخرت میں مہلک ترین جگہ ''جہنم کی سب سے نچلی جگہ'' سے کوئی نہیں چھڑا سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان کے حال پر چھوڑنے اور دنیاوی احکام ان کے ظاہر کے مطابق جاری کرنے کا حکم دیا ہے، لہٰذا ان کے بہانوں اور عذر کی حقیقت اور اصل کس لیے دیکھی جائے یا ان کے اقوال کی حقیقت کا جائزہ کیوں لیا جائے۔ اور دنیا میں انھیں ان کے جھوٹ کی سزا کیونکر دی جائے!؟ ہم تو انھیں ان کے ظاہر کی بنا پر ان احکام کا مستحق

[1] تفسیر الرازي: 151/15.

قرار دیتے ہیں جس طرح یہ خود بھی ہم کو اپنے عقائد کا ظاہر ہی پیش کرتے ہیں۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے جرائم پر سزا اور مواخذے کے سلسلے میں ایسے ہی کرتے ہیں، چنانچہ وہ اپنے محبوب بندۂ مومن کو معمولی لغزش اور کوتاہی پر ہی عتاب و سزا سے دو چار کر دیتے ہیں تاکہ وہ بیدار اور محتاط رہے۔ اور وہ شخص اللہ تعالیٰ کے ہاں قابل تکریم و ستائش بھی ہوتا ہے۔ لیکن جو اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں گھٹیا ہو اور اس کے ہاں بے قدرا ہو تو اللہ تعالیٰ اس شخص اور اس کے گناہوں سے ایک طرف ہو جاتے ہیں۔ وہ مزید گناہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اسے مزید نعمت سے نوازتے ہیں (مگر اس کی آخرت نہایت بری ہوتی ہے۔)''[1]

مسجد ضرار: مسجد ضرار کے حوالے سے تبوک سے مدینہ واپسی پر درج ذیل آیات نازل ہوئیں:

﴿ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى ۚ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ○ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ۚ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ۚ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۚ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ○ ﴾

''اور وہ لوگ جنھوں نے ایک مسجد بنائی تاکہ (مسلمانوں کو) ضرر پہنچائیں اور کفر پھیلائیں اور مومنوں کے درمیان تفرقہ ڈالیں اور اس شخص کے لیے گھات لگائیں جو اس سے پہلے اللہ اور اس کے رسول سے لڑ چکا ہے۔ اور وہ ضرور قسمیں کھائیں گے کہ ہمارا ارادہ تو نیک ہی تھا۔ اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ بے شک وہ سراسر جھوٹے ہیں۔ (اے نبی!) آپ اس مسجد (ضرار) میں کبھی بھی کھڑے نہ ہوں، البتہ

[1] زاد المعاد: 578/3.

وہ مسجد جس کی بنیاد اول روز ہی سے تقوے پر رکھی گئی ہے اس بات کی زیادہ حق دار ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں۔ اس میں ایسے لوگ ہیں جو (اس بات کو) پسند کرتے ہیں کہ وہ پاک صاف ہوں اور اللہ پاک صاف رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''[1]

ان آیاتِ مبارکہ کا سبب نزول یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ہجرت سے پہلے مدینہ منورہ میں خزرج قبیلے کا ایک شخص ابو عامر راہب تھا۔ زمانہ جاہلیت میں یہ نصرانی بن گیا تھا۔ اس نے اہل کتاب کا علم بھی سیکھا تھا۔ جاہلیت میں بڑا عبادت گزار تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قبیلہ خزرج اس کی بزرگی کا قائل تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے، آپ ﷺ کے پاس مسلمان جمع ہونے لگے، اسلام کو قوت ملنے لگی اور مسلمانوں کی شہرت ہونے لگی۔ ادھر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بدر کے دن غالب کر دیا تو ابو عامر ملعون جل بھن گیا۔ کھلم کھلا عداوت کرنے لگا۔ یہاں سے بھاگ کر کفار مکہ سے جاملا اور انھیں رسول اللہ سے جنگ پر اکسانے لگا۔ اور اپنے ساتھ دیگر بہت سے عربی قبائل کو اکٹھا کر کے اُحد کی جنگ کے لیے گیا۔ اس لڑائی میں مسلمان جن حالات سے دوچار ہوئے وہ تو معلوم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا پورا پورا امتحان لیا۔ انجام کار مومنوں ہی کے حق میں ہوا۔ ابو عامر فاسق نے مسلمانوں اور کافروں کے درمیان بہت سے گڑھے کھود رکھے تھے۔ ایک گڑھے میں رسول اللہ ﷺ گر پڑے۔ آپ ﷺ کو انتہائی تکلیف پہنچی اور زخمی بھی ہو گئے۔ سامنے والے نچلے دو دانتوں کے ساتھ والا دایاں دانت ٹوٹ گیا اور آپ ﷺ کا سر مبارک بھی زخمی ہو گیا۔

لڑائی شروع ہوتے ہی ابو عامر اپنی قوم انصار کے پاس گیا۔ ان سے مخاطب ہوا اور انھیں مسلمانوں کی مخالفت پر اکسایا۔ انھوں نے جب اس کی آواز پہچانی تو کہنے لگے: ''ارے فاسق! اے اللہ کے دشمن! اللہ تعالیٰ تیری آنکھیں ٹھنڈی نہ کرے۔'' انھوں نے

[1] التوبة 9:107، 108.

جب اسے برا بھلا کہا اور بے عزتی کی تو وہ یہ کہتے ہوئے واپس ہوا کہ میری قوم تو میرے بعد خراب ہوگئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ میں اسے بہت سمجھایا تھا۔ قرآن پڑھ کر نصیحت کی تھی۔ اسلام کی دعوت دی گئی مگر اس نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا اور مزید بگڑ گیا تو آپ ﷺ نے اس کے لیے بددعا کی تھی کہ اللہ تعالیٰ اسے ذلت و حقارت کی موت دے۔ یہی بددعا اسے لگ گئی۔ جب لوگ جنگ احد سے فارغ ہوئے اور اس نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کا معاملہ شہرت و غلبہ پا رہا ہے تو وہ بھاگا اور شاہ روم ہرقل کے پاس پہنچا۔ اسے رسول اللہ ﷺ کے خلاف جنگ پر آمادہ کیا۔ اس نے وعدہ کر لیا۔ اس نے ہرقل کے پاس قیام پذیر ہو کر انصار میں سے اپنے ہم خیال منافقین کو، جو ابھی تک منافقانہ رویہ اپنائے ہوئے تھے، لکھا اور ان سے وعدہ کیا کہ لشکر لاؤں گا جس کے ذریعے رسول اللہ ﷺ سے جنگ آزما ہو کر غالب آؤں گا اور انھیں ان نظریات و خیالات سے ہٹا دوں گا۔

مزید یہ کہ اپنے ہاں ایک ایسی جگہ تعمیر کرو جس میں یہاں سے آنے والے قاصد ٹھہریں اور میں بھی آکر اس سے فائدہ اٹھا سکوں۔ انھوں نے مسجد قباء کے نزدیک ایک مسجد بنانی شروع کر دی اور تبوک کی لڑائی کے لیے رسول اللہ ﷺ کی روانگی سے پہلے ہی اسے خوب مضبوط اور پختہ بنا لیا اور آکر رسول اللہ ﷺ سے کہنے لگے کہ آپ ہماری مسجد میں تشریف لائیں اور نماز ادا کریں تاکہ اس مسجد کے جواز کا ثبوت مل جائے اور ہم وہاں نماز شروع کر دیں۔ اور کہنے لگے کہ سردی کی راتوں میں کمزور، ضعیف اور بیماروں کے لیے ہم نے یہ مسجد بنائی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو اس میں نماز ادا کرنے سے بچا لیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّا عَلٰى سَفَرٍ وَّلٰكِنْ إِذَا رَجَعْنَا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ»

”اس وقت تو ہم سفر پر ہیں لیکن ان شاء اللہ واپسی پر دیکھیں گے۔“

جب آپ ﷺ تبوک سے مدینہ منورہ لوٹ رہے تھے ابھی ایک دن یا کچھ کم فاصلے پر تھے کہ جبرائیل امین وحی لے کر آ گئے اور مسجد ضرار کی حقیقت واضح کر دی گئی کہ اس کے بانیوں نے مسجد بناتے وقت مسلمانوں کی جماعت میں تفرقہ ڈالنے اور کفر کے بیج بونے کی نیت کی تھی۔ اور وہاں کی مسجد قباء کے بارے میں یہ وضاحت بھی کر دی گئی کہ اس کی بنیاد پہلے روز ہی سے تقوے پر رکھی گئی تھی اور وہاں نماز پڑھنے کا حکم صادر ہوا۔ آپ ﷺ نے وہیں سے کچھ مسلمانوں کو بھیج دیا کہ جاؤ میرے پہنچنے سے پہلے مسجد ضِرار کو گرا دو۔[1]

اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیات میں خبر دی ہے کہ منافقین نے چار اغراض کے پیشِ نظر مسجد بنائی تھی:

① مسلمانوں کو تکلیف دینے کے لیے اور یہ ارادہ انتہائی تکلیف دہ تھا۔

② اللہ کا انکار کرنے اور اسلام کے خلاف فخر و غرور کا اظہار کرنے کے لیے کیونکہ اس سے ان کا ارادہ اہلِ نفاق کو مضبوط کرنے کا تھا۔

③ مسلمانوں میں تفریق ڈالنے کے لیے کیونکہ ان کا ارادہ مسجد قباء میں نہ جانے کا تھا اس طرح مسلمان جماعت کی تعداد قباء میں تھوڑی ہوگی اور ان کا اور مسجد قباء والوں کا اختلاف بھی ہوگا اور اس طرح محبت ختم ہوگی۔

④ اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ کے لیے جگہ مہیا کرنا، یعنی ہر اس شخص کو موقع فراہم کرنا جو اللہ اور اس کے رسول سے نبرد آزما ہے۔[2]

اللہ تعالیٰ نے ان کی کوششوں کو نامراد اور ان کی تدبیروں کو باطل کرتے ہوئے اپنے نبی ﷺ کو حکم دیا کہ اسے گرا کر ختم کر دیا جائے۔

اللہ کے اسی فرمان میں: ﴿وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى﴾ ''اور وہ ضرور قسمیں

[1] تفسير الطبري: 23/11، ودلائل النبوة للبيهقي: 263,262/5، والسيرة النبوية لابن هشام: 174,173/4، وتفسير ابن كثير: 388/2. [2] فتح القدير للشوكاني: 403/2.

کھائیں گے کہ ہمارا ارادہ تو نیک ہی تھا۔'' ان کی جھوٹی گفتگو اور قسموں پر ان کی مذمت کی گئی ہے، اس لیے فرمایا: ﴿ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴾ ''اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ بے شک وہ سراسر جھوٹے ہیں۔''

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور دیگر مسلمانوں کو بھی اس میں نماز پڑھنے سے قطعاً منع کر دیا۔ ابن عاشور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ﴿ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ﴾ ''(اے نبی!) آپ اس مسجد میں کبھی بھی کھڑے نہ ہوں۔'' میں کھڑے ہونے سے مراد نماز ہے۔ اس میں نماز پڑھنے سے اس لیے روکا گیا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے نماز پڑھنے سے اس میں برکت ہو جائے گی اور مسلمان مسجد قباء کو اس پر کسی برتری اور خوبی والی نہ سمجھیں گے۔ اسی لیے نبی ﷺ نے عمار بن یاسر اور مالک بن دخشم کے ساتھ چند دیگر ساتھیوں کو حکم دیا کہ اس مسجد کو جلا دو اور گرا دو تو انھوں نے ایسا ہی کیا۔[1]

ان آیات میں مسجد قباء کے حوالے سے یہ بھی وضاحت ہے کہ یہی مسجد پہلے دن سے تقویٰ کی بنیاد پر تعمیر کی گئی ہے، اسی لیے اللہ نے اپنے نبی کو حکم دیا وہ اس میں نماز پڑھیں چہ جائیکہ ان کی مسجد میں جائیں یا بصورتِ دیگر نماز چھوڑ کر شیطان کو خوش نہ کریں بلکہ مسجد نبوی یا مسجد قباء میں نماز ادا کریں۔[2]

اسی طرح اس میں منافقین کے امکانی پروپیگنڈے کو بھی دور کیا گیا ہے کہ وہ ایسا نہ کہیں کہ دیکھو نبی مکرم کو نماز کی دعوت دی گئی مگر انھوں نے ایسا نہ کیا۔ لفظ ﴿ اَحَقُّ ﴾ اگرچہ اسم تفضیل ہے مگر یہاں پر فضیلت کے معنی مقابلتاً نہیں ہیں بلکہ مسجد ضرار میں تو نماز کی ادائیگی اور جواز ہی کو سرے سے ختم کر دیا گیا ہے۔ شاید یہاں اسم تفضیل لانے سے یہ مقصود ہو کہ منافقین کو ندامت دلائی جائے اور انھیں نبی ﷺ کو نماز پڑھنے کی دعوت دینے کا جواب اسی انداز میں ملنا چاہیے تھا کہ مسجد قباء ہی ایسے شرف کی حقدار ہے کیونکہ

[1] السيرة النبوية لابن هشام: 184/4. [2] حديث القرآن لأبي بدر محمد بكر آل عابد: 661/2.

اس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی اور مسجد ضرار کی بنیاد وہ نہیں۔[1]

ابن عاشور نے یہ بھی کہا ہے کہ ''تقویٰ کی بنیاد پر قائم کی گئی مسجد'' سے مراد ہر وہ مسجد ہے جو تقویٰ کی بنیاد پر بنائی جائے اور یہاں مخصوص کوئی ایک مسجد مراد نہیں لیکن یہ خوبی اس وقت مسجد نبوی اور مسجد قباء دونوں ہی میں پائی جاتی تھی۔[2]

ان آیات میں انصار کی پاکیزگی کے حوالے سے تعریف بھی کی گئی ہے۔ ابن ماجہ میں روایت ہے کہ جب یہ آیات اتریں تو رسول اللہ ﷺ نے انصار سے فرمایا: «يَا مَعْشَرَ الْأَنْصَارِ! إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَدْ أَثْنٰى عَلَيْكُمْ فِي الطُّهُورِ، فَمَا طُهُورُكُمْ؟» ''اے انصار کی جماعت! یہ کون سی طہارت ہے جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے تمھاری تعریف فرمائی ہے؟'' انھوں نے کہا: ''ہم نماز کے لیے وضو، جنابت پر غسل اور قضائے حاجت پر پانی سے استنجا کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «فَهُوَ ذَاكَ، فَعَلَيْكُمُوهُ» ''بس یہی وہ طہارت ہے۔ تم اسے ضرور اختیار کیے رکھو۔''[3]

حکمتیں اور اسباق: مسجد ضرار کے قصے سے چند اسباق درج ذیل ہیں۔

① **سارا کفر ایک ہی ملت ہے:** ابو عامر فاسق کے کردار سے یہ بات واضح ہے کہ اسے بدر میں مشرکین کی شکست کا انتہائی افسوس ہوا۔ وہ مکہ جا بسا اور کافروں کو مسلمانوں سے لڑنے پر ابھارتا رہا حتی کہ احد میں خود بھی ان کے ساتھ آ دھمکا اور مسلمانوں کی جمعیت کو بکھیرنے کی اس نے ناکام کوشش بھی کی۔[4] اللہ نے سچ فرمایا ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَ فَسَادٌ كَبِيْرٌ ۝﴾

''اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ (اے

1 التحرير والتنوير لابن عاشور: 31/11. 2 التحرير والتنوير لابن عاشور: 31/11. 3 سنن ابن ماجه، حديث: 355. 4 الصراع مع الصليبيين لأبي فارس، ص: 179.

مسلمانو!) اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد مچے گا۔'' [1]

② **معاملے کو مسلمانوں سے چھپانے کی کوشش:** منافقین نے کوشش کی کہ اس عمارت کو شرعی جواز مہیا کیا جائے۔ اس کے لیے انھوں نے نبی ﷺ کو نماز پڑھنے کی دعوت بھی دی تاکہ اس سے برکت بھی حاصل ہو اور شرعی طور پر مسجد کا درجہ بھی مل جائے لیکن ان کے ارادے تو کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ نبی ﷺ کے نماز پڑھ لینے اور مسجد کو شرعی حیثیت دے دینے کے بعد تو ان کے اصل مقاصد کی ابتدا ہوتی تھی جنھیں انھوں نے مسلمانوں سے چھپایا ہوا تھا۔ [2]

③ **حفاظت الٰہی:** ایک محقق اس واقعے میں یہ دیکھ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کی کس طرح حفاظت فرمائی اور منافقین کے بھید اور خفیہ ارادے کس طرح واضح کر دیے۔ اگر آپ ﷺ کو ان کے ارادوں کا پتا نہ چلتا تو وہاں نماز ادا کر کے مسجد کو اتھارٹی دے دیتے جس کی وجہ سے مدینہ ہی میں مسلمانوں کے خلاف ایک محاذ کھلتا اور عام مسلمان بھی ان کے پروپیگنڈے سے متاثر ہوتے۔ [3]

④ **فیصلہ کن علاج:** رسول اللہ ﷺ نے مسجد ضرار کو جو گرانے کا حکم دیا تھا یہی اس کا بہترین علاج تھا۔ یہ سربراہان امت کے لیے نمونہ اور اسوہ بھی ہے کہ ہر وہ چیز جس سے وحدتِ امت کو پارہ پارہ کرنے یا نقصان پہنچانے کی کوشش کی جائے تو اس کا علاج یہی ہے کہ اس کی جڑ کاٹ دی جائے تاکہ وہ کسی دوسری صورت میں بھی سامنے نہ آئے۔ اس علاج کے نتیجے میں اس معاشرے سے نفاق کے اثرات ختم ہونے لگے۔ جب رسول اللہ ﷺ فوت ہوئے تو ان منافقین کی تعداد انتہائی قلیل تھی اور انھوں نے دوبارہ اس طرح کے اقدام کی کوشش بھی نہیں کی کیونکہ انھیں یقین تھا کہ حقیقت حال کھل جائے گی

[1] الأنفال 8:73. [2] الصراع مع الصليبيين لأبي فارس، ص: 181. [3] الصراع مع الصليبيين لأبي فارس، ص: 179.

اور اسی طرح کا سلوک کیا جائے گا۔[1]

⑤ **مسجد ضرار کے حکم سے ملحق احکام و مسائل:** مفسرین نے مسجد ضرار کے حکم سے ملتے جلتے مسائل بھی بیان کیے ہیں جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

(ا) زمخشری کہتے ہیں کہ جو بھی مسجد فخر و غرور دکھلاوے، ریا کاری یا رضائے الٰہی کی نیت کے علاوہ کسی بھی غرض سے بنائی جائے یا حرام مال سے تعمیر کی جائے تو اس کا حکم مسجدِ ضرار والا ہے۔[2]

عبدالکریم زیدان امام زمخشری کے اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کیا اس مسجد کو مسجد ضرار کی طرح گرا دیا جائے گا؟ میں یہ نہیں سمجھتا کہ ایسا ہو بلکہ صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مسجد تقویٰ اور اخلاص کی بنیاد پر نہیں بنائی گی۔[3]

(ب) امام قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہمارے علماء (شافعی) کا کہنا ہے کہ ہر وہ مسجد جو تکلیف رسانی، ریا کاری اور دکھلاوے کے لیے بنائی گئی وہ مسجد ضرار کے حکم میں ہے اور اس میں نماز ادا کرنا درست نہیں۔[4]

سید قطب رقمطراز ہیں: ''اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بنائی جانے والی مسجد ضرار جیسی مسجدیں مختلف ادوار میں بنتی چلی آئی ہیں۔ بظاہر تو یہ اسلام کی سربلندی کے لیے بنائی جاتی ہیں مگر درپردہ اسلام کی بیخ کنی اور اس کی شکل بگاڑنا مقصود ہوتا ہے اور اس کے لیے اسلام کے نام کو بطور ڈھال استعمال کرتے ہیں اور ایسے علمی مباحثے ہوتے ہیں جن سے اسلام کو مٹانے اور ختم کرنے والے لوگوں کو سکون فراہم کرتے ہیں اور انھیں باور کراتے رہتے ہیں کہ انھیں اسلام سے کوئی خطرہ نہیں۔''[5]

⑥ **مسجد ضرار جیسے دیگر مقامات کا حکم:** عبدالکریم زیدان کہتے ہیں کہ ہر وہ چیز جسے

---

1 التاريخ الإسلامي للحميدي: 130/8. 2 تفسير الزمخشري: 310/2. 3 المستفاد من قصص القرآن لعبدالكريم زيدان: 304/1. 4 تفسير القرطبي: 254/8. 5 تفسير في ظلال القرآن لسيد قطب: 1710/3، 1711.

بظاہر شرعی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے بنایا گیا ہو مگر بنانے والے غیر شرعی مقصد پورا کرنا چاہتے ہوں تو بھی مسجد ضرار کے حکم میں ہے۔ اس قاعدے کے متعلق ہم اختصار سے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہر وہ چیز جس کا ظاہر تو شرعی طور پر درست ہو مگر اس کو اختیار کرنے والے، مومنوں کو نقصان پہنچانا چاہتے ہوں تو وہ مسجد ضرار ہی کے حکم میں شامل ہے۔[1] اس قاعدے کی رو سے وہ امور بھی مسجد ضرار کے حکم میں شامل ہیں جنھیں امام ابن قیم رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے، مثلاً: شرک کے اڈے، گناہ اور نافرمانی کے گڑھ، مثلاً: شراب خانے، نشے کے اڈے اور دیگر بے حیائی کے مقامات وغیرہ۔ یہ قبیح مقامات ظاہراً و باطناً دونوں صورتوں میں غلط ہیں اور انھیں مٹانا ضروری ہے۔[2]

⑦ **مسلم ممالک میں مساجد ضرار کا وجود اور حکم:** ہمیشہ سے منافقین، ملحدین، عیسائی اور کفار فاتحین عبادت کے نام پر ایسے معبد تعمیر کرتے چلے آئے ہیں جن کا مقصد اسلام میں طعن و تشنیع اور مسلمانوں کے عقائد و عبادات میں شبہات پیدا کرنا ہوتا ہے، اسی طرح تعلیم و تربیت کے نام پر سکول بنا کر بچوں کے ذہن میں زہر انڈیلنا، ثقافت کے نام پر ادبی مجالس قائم کر کے اخلاقی اقدار کو متزلزل کرنا اور ہسپتال وغیرہ بنا کر انسانی خدمت کے نام پر بیماروں اور کمزوروں پر اثر انداز ہو کر انھیں دین سے پھیرنا مقصود ہوتا ہے۔ افریقی ممالک میں وہ یہ تجربہ کر کے اثر انداز ہو چکے ہیں۔[3]

مسجد ضرار اسلامی معاشرے میں ہونے والا ایسا حادثہ اور واقعہ نہیں جو ہوا اور مٹ گیا بلکہ یہ ایک دائمی سوچ اور فلسفے کا نام ہے جس کے لیے گہرے مقاصد سامنے رکھ کر زبردست منصوبہ بندی کی جاتی ہے اور موثر ترین وسائل استعمال میں لائے جاتے ہیں اور پھر انھیں اسلام اور مسلمانوں کے متعلق کیے گئے دیگر منصوبہ جات سے ہم آہنگ کر کے

---

1 المستفاد من قصص القرآن لعبدالكريم زيدان: 506/2. 2 المستفاد من قصص القرآن لعبدالكريم زيدان: 506/3. 3 السيرة النبوية لأبي شهبة: 508/2.

اسلام میں شکوک وشبہات پیدا کیے جاتے ہیں اوراس کی ایسی قبیح صورت حال بنا کر پیش کی جاتی ہے تا کہ لوگ دین سے متنفر ہو جائیں اور ایسے کاموں میں مشغول ہوں جس سے ان کا اخروی گھر تباہ و برباد ہو جائے۔[1]

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کا قصہ اور اسباق وفوائد

حضرت کعب، ہلال اور مرارہ رضی اللہ عنہم کا واقعہ کئی کتبِ تفسیر، حدیث اور سیرت میں سے ملتے جلتے الفاظ سے مروی ہے۔ اس کی تشریح وتعلیم کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ یہ واقعہ صحیح بخاری میں دیگر کتب کی بہ نسبت زیادہ تفصیل اور احتیاط سے بیان ہوا ہے۔[2]

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ ہی کی زبانی یہ واقعہ سنتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں غزوۂ تبوک کے سوا کسی جنگ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے نہ رہا تھا۔ ہاں غزوۂ بدر میں پیچھے رہ گیا تھا مگر اس میں پیچھے رہنے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے کوئی تعرض نہ کیا تھا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف قریش کے قافلے کی جستجو میں نکلے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے انھیں اور قریش کو بغیر کسی پروگرام کے اکٹھا کر دیا۔ میں بیعتِ عقبہ میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ موجود تھا۔ جب ہم نے اسلام کی مدد کرنے کی بیعت کی تھی۔ میں نہیں چاہتا اس کے بدلے میں جنگ بدر میں شریک ہوتا، اگرچہ لوگوں میں جنگ بدر بیعت عقبہ سے زیادہ مشہور ہے۔ غزوہ تبوک سے پیچھے رہنے کا میرا قصہ یہ ہے کہ میں کبھی اتنا آسودہ حال اور طاقتور نہ تھا جتنا اس وقت تھا۔ اللہ کی قسم! میرے پاس کبھی اکٹھی دو اونٹنیاں جمع نہ ہوئی تھیں مگر اس غزوے میں دو اونٹنیاں میرے پاس تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی جنگ کا ارادہ فرماتے تو توریے کے طور پر کسی اور جگہ کا نام لیتے۔ مگر یہ جنگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شدید گرمی میں لڑی۔ دور دراز کا سفر کیا، کئی میدان و جنگل طے کیے۔ دشمن کی بڑی تعداد سے واسطہ پڑنا تھا، لہٰذا

[1] الصراع مع الصليبيين لأبي فارس، ص: 182. [2] الصراع مع الصليبيين لأبي فارس، ص: 187.

آپ ﷺ نے مسلمانوں کو محاذ جنگ کے متعلق واضح طور پر بتا دیا تا کہ وہ اس کے لیے بھرپور تیاری کریں۔ آپ ﷺ جس جانب جانا چاہتے تھے اس کے متعلق بھی بتا دیا۔ آپ ﷺ کے ساتھ مسلمانوں کی کثیر تعداد تھی جسے کسی رجسٹر میں محفوظ نہیں کیا گیا تھا۔

حضرت کعب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ کوئی شخص غائب رہنا چاہتا تو اسے خیال آتا کہ وہ نزول وحی تک ہی پوشیدہ رہے گا اور نزولِ وحی کے بعد اس کا بھید کھل جائے گا۔ یہ جنگ رسول اللہ ﷺ نے اس وقت لڑی جب پھل تیار ہو چکے تھے اور سایے بھی خوب تھے۔ رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں نے جنگ کی تیاری کی۔ میں بھی ان کے ساتھ تیاری کرنے لگا مگر میں خود کوئی قطعی فیصلہ نہ کر پایا۔ اپنے دل میں کہتا کہ میں تو غزوے میں شمولیت پر قادر ہوں۔ اس طرح میں سستی کرتا رہا۔ لوگ بھرپور تیاری کرنے لگے۔

رسول اللہ ﷺ مسلمانوں کے ساتھ چل پڑے مگر میں نے کوئی فیصلہ نہ کیا اور سوچا ایک دو دن میں تیار ہو جاؤں گا، پھر ان کے ساتھ جا ملوں گا۔ ان کے جانے کے بعد تیاری کے لیے گیا اور واپس آیا، پھر بھی کوئی فیصلہ نہ کر سکا، پھر گیا اور واپس آ گیا مگر کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔

میری مسلسل یہی کیفیت رہی یہاں تک کہ مجاہدین تیزی سے چلتے گئے اور جنگ کا وقت جاتا رہا۔ میں نے سفر کر کے ان سے جا ملنے کا ارادہ کیا اور کاش کہ میں ایسا کر لیتا۔ مگر میرے مقدر میں نہ ہو سکا۔ اور جب رسول اللہ ﷺ کے چلے جانے کے بعد میں لوگوں میں گھوما پھرا تو مجھے اس بات نے غمگین کر دیا کہ میں صرف ان لوگوں کو دیکھتا ہوں جو نفاق زدہ ہیں یا معذور ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی مجھے تبوک پہنچ ہی کر یاد کیا۔ آپ ﷺ نے تبوک میں لوگوں کے اندر بیٹھے دریافت فرمایا: «مَا فَعَلَ كَعْبٌ؟» ”کعب کا کیا بنا؟“ تو بنوسلمہ کے ایک آدمی نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! اس کے کپڑوں اور اس کے تکبر و غرور نے اسے روک دیا ہے۔“

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے کہا: ”تو نے بہت بری بات کہی ہے۔ اے اللہ کے رسول! اللہ کی قسم! ہم نے تو اسے اچھا پایا ہے۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔ اتنے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا جو سفید کپڑے پہنے ہوئے آ رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”(اللہ کرے) ابوخیثمہ ہو۔“ تو وہ ابوخیثمہ انصاری رضی اللہ عنہ ہی تھے۔ یہی وہ شخص تھا جس نے ایک صاع کھجور صدقہ دی تو منافقین نے اسے طعنہ دیا تھا۔

حضرت کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب مجھے خبر پہنچی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے واپس روانہ ہو گئے ہیں تو میرا رنج بڑھ گیا۔ میں نے جھوٹے بہانے بنانا شروع کیے کہ کون سی بات کیسے کہوں جس سے کل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے غصے سے بچ جاؤں۔ اس کے لیے میں اپنے گھر کے ہر صاحب رائے سے مدد لے رہا تھا۔ مگر جب مجھے بتایا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قریب آ پہنچے ہیں تو سارا جھوٹ کافور ہو گیا اور میں سمجھ گیا کہ اب کوئی جھوٹا بہانہ پیش کرکے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بچ نہیں سکتا تو میں نے سچ بولنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی سفر سے آتے پہلے مسجد میں جاتے، دو رکعات ادا کرتے اور پھر لوگوں سے ملنے کے لیے بیٹھ جاتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب فارغ ہو چکے تو جنگ سے پیچھے رہ جانے والے عذر بہانے پیش کرنے لگے اور قسمیں کھانے لگے۔ یہ تعداد میں اسی (80) سے کچھ اوپر لوگ تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ظاہر کو مان لیا اور ان سے بیعت کی اور ان کے لیے دعائے مغفرت فرما دی اور ان کے دل کی بات اللہ تعالیٰ کے سپرد کی۔ ادھر میں بھی آ گیا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غصے کی حالت جیسا تبسم فرمایا، پھر فرمایا: «تَعَالَ» ”آگے آ جاؤ۔“ میں چلتا ہوا آیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیٹھ گیا۔ فرمایا: «مَا خَلَّفَكَ؟ أَلَمْ تَكُنْ قَدِ ابْتَعْتَ ظَهْرَكَ؟» ”تو پیچھے کیوں رہ گیا؟ تو نے سواری خرید لی تھی نا؟“ میں نے عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول! اگر میں آپ کے سوا

اہلِ دنیا میں سے کسی اور شخص کے سامنے بیٹھتا تو میں کوئی عذر کر کے اس کے عتاب سے نکل جاتا کیونکہ مجھے اللہ تعالیٰ نے فصاحت و بلاغت دی ہے لیکن اللہ کی قسم! میں جانتا ہوں کہ اگر میں جھوٹ بات آپ سے کہہ دوں گا اور آپ خوش بھی ہو جائیں گے تو عین ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو مجھ سے ناراض کر دے اور اگر میں آپ سے سچ سچ کہوں تو آپ ضرور غصے ہوں گے لیکن مجھے اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا انجام بخیر فرمائے گا۔ (تو بات یہ ہے کہ) اللہ کی قسم! میں کبھی نہ اتنا طاقت والا تھا اور نہ اتنا مالدار تھا جتنا اس وقت تھا جب آپ سے پیچھے رہ گیا۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «أَمَّا هٰذَا فَقَدْ صَدَقَ، فَقُمْ حَتّٰى يَقْضِيَ اللّٰهُ فِيكَ» ''اس نے سچ کہا ہے، اچھا تم یہاں سے چلے جاؤ حتی کہ اللہ تعالیٰ تمھارا فیصلہ فرما دے۔'' چنانچہ میں اٹھ کھڑا ہوا اور بنوسلمہ کے چند لوگ دوڑ کر میرے پیچھے ہوئے اور کہنے لگے: ''اللہ کی قسم! ہمیں نہیں معلوم کہ تم نے اس سے پہلے کوئی غلطی کی ہو تو تم کیوں عاجز ہو گئے کہ کوئی عذر اس طرح کا تم بھی پیش کر دو جس طرح دیگر پیچھے رہنے والوں نے کیا ہے۔ تمھارا گناہ ختم ہونے کے لیے رسول اللہ ﷺ کا استغفار کافی تھا۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں تو بخدا وہ لوگ برابر مجھے ملامت کرتے ہی رہے یہاں تک کہ میں نے ارادہ کر لیا کہ پھر واپس جا کر رسول اللہ ﷺ کے سامنے اپنے آپ کو (پہلی بات میں) جھوٹا کہوں (اور کوئی بہانہ پیش کر دوں) مگر پھر میں نے ان سے دریافت کیا کہ میرے جیسا سلوک کسی اور سے بھی ہوا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہاں دو شخص اور بھی ہیں۔ انھوں نے بھی وہی کہا جو تم نے کہا تو انھیں بھی وہی جواب ملا جو تمھیں ملا۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا: ''وہ دو شخص کون سے ہیں؟'' انھوں نے بتایا کہ مرارہ بن ربیع اور ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہما۔ ان لوگوں نے ایسے دو شخصوں کا نام لیا جو واقعی نیک تھے اور بدر کی جنگ میں حاضر تھے۔ اور دونوں بہترین نمونہ تھے۔ تو جب انھوں نے ان دونوں کا نام لیا تو میں چل

دیا۔ میں نے سابقہ بات پر پکا رہنا پسند کیا اور اپنی بات سے رجوع کا فیصلہ ترک کر دیا۔

رسول اللہ ﷺ نے پیچھے رہنے والوں میں سے ہم تینوں سے عام مسلمانوں کو گفتگو کرنے سے منع فرما دیا۔ لوگ ہم سے اجتناب کرنے لگے اور بالکل ہی بدل گئے حتی کہ زمین بھی گویا ہمارے لیے بدل گئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے یہ وہ زمین ہی نہیں جسے میں پہچانتا تھا۔

ہم پچاس راتیں اس حالت پر رہے۔ میرے دونوں ساتھی تو عاجز ہو گئے اور روتے روتے اپنے گھروں میں بیٹھ گئے مگر میں ان کی نسبت زیادہ جوان اور طاقتور تھا۔ میں نکلتا، نماز میں حاضر ہوتا، بازاروں میں بھی پھرتا مگر مجھ سے کوئی آدمی گفتگو نہ کرتا۔ رسول اللہ ﷺ جب نماز کے بعد اپنی جگہ تشریف فرما ہوتے تو میں آتا اور سلام کہتا اور دل میں کہتا کہ کیا آپ ﷺ نے اپنے لب مبارک سلام کا جواب دینے کے لیے ہلائے ہیں یا نہیں، پھر میں آپ ﷺ کے قریب نماز پڑھتا اور کنکھیوں سے آپ کو چوری چوری دیکھتا۔ جب میں نماز میں ہوتا تو آپ ﷺ میری طرف دیکھتے اور جب میں آپ کی طرف دیکھتا تو آپ ﷺ چہرہ پھیر لیتے۔

مسلمانوں کے اس طرز عمل کو خاصے دن گزر گئے تو میں اپنے چچا زاد ابوقتادہ کے باغ کی دیوار پر چڑھا اور اندر چلا گیا، ویسے بھی میرا ان سے بہت گہرا تعلق تھا۔ میں نے انھیں سلام کیا تو اللہ کی قسم! انھوں نے میرے سلام کا جواب بھی نہ دیا۔ میں نے ان سے پوچھا: ''اے ابوقتادہ! میں آپ کو قسم دیتا ہوں! کیا آپ نہیں جانتے کہ میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کرتا ہوں۔'' مگر وہ خاموش رہے۔ میں نے پھر پوچھا اور قسم دے کر پوچھا مگر وہ خاموش رہے۔ تیسری بار میں نے پھر قسم دے کر پوچھا تو کہنے لگے: ''اللہ اور اس کا رسول خوب جانتے ہیں۔'' یہ سن کر میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، پھر میں واپس پلٹا، دیوار پر چڑھا اور باہر نکل آیا۔

کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں مدینہ کے بازار میں جا رہا تھا کہ شام سے مدینہ منورہ اناج

لانے والا ایک تاجر کہہ رہا تھا: ''کوئی مجھے کعب کا پتا دے گا؟'' لوگوں نے میری طرف اشارہ کیا تو میرے پاس آ کر اس نے مجھے غسان کے حاکم کا ایک خط دیا۔ میں نے پڑھا تو خط میں لکھا تھا: ''ہمیں اطلاع ملی ہے کہ آپ کے ساتھی نے آپ پر زیادتی کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ذلت میں رہنے کے لیے پیدا کیا ہے اور نہ اس لیے کہ سب آپ سے رخ موڑ لیں، لہٰذا آپ ہمارے ہاں آ جائیں۔ ہم آپ کے ساتھ بہتر سے بہتر معاملہ کریں گے۔''

میں نے خط پڑھا تو سوچا یہ ایک اور آزمائش ہے۔ میں نے اسے تنور میں جلا دیا۔ جب چالیس راتیں گزر گئیں اور وحی نہ آئی تو آپ ﷺ کی طرف سے پیغام لانے والا میرے پاس آیا اور کہنے لگا: ''رسول اللہ ﷺ تمھیں حکم دیتے ہیں کہ اپنی بیوی سے الگ رہو۔'' میں نے پوچھا: ''کیا اسے طلاق دے دوں یا پھر کیا کروں؟'' اس نے کہا: ''طلاق نہیں بلکہ اس سے الگ رہو اور اس کے پاس مت جاؤ۔'' ادھر میرے دیگر دونوں ساتھیوں کو بھی اسی طرح کا پیغام بھیجا گیا۔

حضرت کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنی بیوی سے کہا: ''تم میکے چلی جاؤ اور وہیں رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس معاملے کا فیصلہ فرما دیں۔''

ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہ کی بیوی رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئی اور عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! ہلال بن امیہ عمر رسیدہ ہیں۔ ان کے پاس کوئی خادم بھی نہیں۔ میں ان کی خدمت کروں تو کیا آپ ناپسند تو نہیں فرمائیں گے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: «لَا وَلٰكِنْ لَّا يُقَرِّبَنَّكِ» ''نہیں! میں خدمت کو ناپسند نہیں سمجھتا لیکن وہ تیرے قریب نہ جائے۔'' وہ بولی: ''اللہ کی قسم! انھیں تو اب ایسی کوئی حاجت نہیں رہی۔ اور اللہ کی قسم! جب سے یہ واقعہ ہوا ہے اس دن سے آج تک وہ مسلسل روئے جا رہے ہیں۔''

میرے گھر والوں میں سے کسی نے کہا: ''تم بھی رسول اللہ ﷺ کے پاس جا کر اپنی بیوی کے متعلق اجازت کیوں نہیں لے لیتے؟ آپ ﷺ نے ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہ کی بیوی

کو بھی تو خدمت کی اجازت دے دی ہے۔'' میں نے کہا: ''نہیں! میں تو اجازت نہ لوں گا۔ میں جوان ہوں اور معلوم نہیں کہ آپ ﷺ کیا جواب دیں۔''

مزید دس راتیں اسی حال میں گزر گئیں اور پچاس راتیں پوری ہو گئیں۔ میں صبح اپنے گھر کی چھت پر بیٹھا تھا اور حالت وہی تھی جو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ذکر فرمائی ہے کہ زمین کشادہ ہونے کے باوجود مجھ پر تنگ ہو چکی تھی۔ اتنے میں میں نے سلع پہاڑی پر سے کسی پکارنے والے کی آواز سنی جو کہہ رہا تھا: ''اے کعب بن مالک! تمھیں مبارک ہو۔'' یہ سنتے ہی میں سجدے میں گر گیا اور مجھے معلوم ہو گیا کہ مشکل گھڑیاں ختم ہو چکی ہیں۔ دراصل رسول اللہ ﷺ نے فجر کی نماز پڑھنے کے بعد لوگوں کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں معاف فرما دیا ہے۔ لوگ ہمیں خوش خبری دینے کے لیے دوڑے۔ میرے دونوں ساتھیوں کے پاس بھی خوشخبری دینے والے گئے۔ ایک شخص نے میری طرف گھوڑا دوڑایا۔ ادھر اسلم قبیلے سے ایک دوڑنے والا میری طرف دوڑا، اس کی آواز مجھے گھوڑے والے سے پہلے پہنچ گئی۔ جس شخص کی آواز پہاڑی سے مجھ تک پہنچی تھی جب وہ میرے پاس پہنچا تو میں نے اسے اپنے پہنے ہوئے کپڑے خوشخبری دینے کی خوشی میں دیے۔ اللہ کی قسم! اس وقت میرے پاس وہی دو کپڑے تھے، (کوئی اضافی سوٹ نہیں تھا) میں نے دو کپڑے ادھار لے کر پہنے۔ اور وہ اسے دے دیے، پھر میں رسول اللہ ﷺ کی طرف چل پڑا۔ لوگ گروہ در گروہ مجھے ملتے اور معافی پر مبارک باد دیتے رہے۔ وہ کہتے: ''تمھیں اللہ تعالیٰ کے توبہ قبول کرنے پر مبارک باد ہو۔'' یہاں تک کہ میں مسجد میں جا پہنچا۔ رسول اللہ ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے۔ لوگ آپ کے ارد گرد بیٹھے تھے۔ طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ بھی وہاں موجود تھے انھوں نے میری طرف دوڑ کر مجھ سے مصافحہ کیا اور مجھے مبارک باد دی۔ اللہ کی قسم! مہاجرین میں سے ان کے سوا کوئی شخص کھڑا نہ ہوا۔ کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ طلحہ رضی اللہ عنہ کا یہ احسان میں کبھی نہ بھولوں گا۔ جب میں نے رسول اللہ ﷺ کو سلام کیا تو آپ کا چہرۂ انور خوشی سے چمک دمک رہا تھا۔

آپ ﷺ فرما رہے تھے: «أَبْشِرْ بِخَيْرِ يَوْمٍ مَرَّ عَلَيْكَ مُنْذُ وَلَدَتْكَ أُمُّكَ» ''تجھے پیدائش کے بعد سب سے بہتر دن کی مبارک ہو۔'' میں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! یہ معافی آپ کی طرف سے ہے یا اللہ کی طرف سے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: «لَا بَلْ مِنْ عِنْدِاللّٰهِ» ''نہیں! بلکہ اللہ کی طرف سے ہے۔'' رسول اللہ ﷺ جب خوش ہوتے تو آپ ﷺ کا چہرہ مبارک چاند کی طرح چمکتا تھا۔ اور ہم اس کیفیت کو بخوبی پہچان لیتے تھے۔ جب میں آپ ﷺ کے سامنے بیٹھا تو میں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! میری توبہ کا تقاضا یہ ہے کہ میں اپنا سارا مال بطور صدقہ اللہ اور اس کے رسول کے سپرد کر دوں۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: «أَمْسِكْ بَعْضَ مَالِكَ فَهُوَ خَيْرٌلَّكَ» ''تمھارے لیے بہتر یہ ہے کہ کچھ مال اپنے پاس رکھ لو۔'' میں نے عرض کیا: ''میں اپنا خیبر کا حصہ اپنے پاس رکھ لوں گا۔'' میں نے پھر عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! آخر اللہ تعالیٰ نے سچائی ہی کی وجہ سے نجات دی۔ اب میں اپنی توبہ کی قبولیت کی خوشی میں یہ عہد کرتا ہوں کہ جب تک زندہ ہوں ہمیشہ سچ ہی بولوں گا۔'' کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''اللہ کی قسم! میں نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی مسلمان کے سچ بولنے پر اس قدر احسان کیا ہو جس قدر مجھ پر کر دیا۔ اور اللہ کی قسم! جب سے میں نے رسول اللہ ﷺ سے عہد کیا تھا اس وقت سے آج تک کبھی بھی جھوٹ نہیں بولا۔ اور مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ باقی زندگی میں بھی مجھے جھوٹ سے بچائے گا۔'' حضرت کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل کی تھیں:

﴿ لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ○ وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ۭ حَتّٰٓي اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ۭ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ○ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ○ ﴾

''یقیناً اللہ نے نبی اور ان مہاجرین و انصار پر مہربانی فرمائی جنھوں نے تنگی کی گھڑی میں آپ کی پیروی کی، بعد اس کے کہ ان میں سے ایک گروہ کے دل بہک جانے کو تھے، پھر اللہ نے ان پر مہربانی فرمائی۔ بے شک وہ ان پر بہت شفقت کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔ اور ان تین افراد پر بھی (مہربانی فرمائی) جنھیں (حکمِ الٰہی کے انتظار میں) چھوڑ دیا گیا تھا، حتی کہ جب زمین فراخی کے باوجود ان پر تنگ ہوگئی اور ان کی جانیں (بھی) ان پر تنگ ہوگئیں اور انھوں نے سمجھا کہ اللہ (کے غضب) سے خود اس کے سوا ان کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں، پھر اللہ نے ان پر مہربانی کی تاکہ وہ توبہ کریں۔ بے شک اللہ بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ سے ڈرو اور سچ بولنے والوں کے ساتھ ہو جاؤ۔''*

حضرت کعب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ کی قسم! اسلام قبول کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس سے بڑا مجھ پر کوئی انعام نہیں کیا جتنا بڑا احسان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سچ بولنے کے نتیجے میں مجھ پر کیا۔ میں نے اگر جھوٹ بول دیا ہوتا تو دیگر ہلاک شدگان کی طرح میں بھی ہلاک ہو جاتا۔

اللہ تعالیٰ نے جب وحی اتاری تو جھوٹ بولنے والوں کی بہت شدید سرزنش کی۔

ارشاد ہوا:

﴿ سَيَحْلِفُونَ بِاللَّهِ لَكُمْ إِذَا انْقَلَبْتُمْ إِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوا عَنْهُمْ ۖ فَأَعْرِضُوا عَنْهُمْ ۖ إِنَّهُمْ رِجْسٌ ۖ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ○ يَحْلِفُونَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۖ فَإِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَرْضَىٰ عَنِ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ○ ﴾

* التوبة 9:117-119.

''عنقریب وہ تمھارے لیے اللہ کی قسمیں کھائیں گے جب تم ان کی طرف پلٹو گے تاکہ تم ان سے درگزر کرو، چنانچہ تم ان سے درگزر (ہی) کرو۔ بلاشبہ وہ ناپاک ہیں اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے، ان (کاموں) کے بدلے میں جو وہ کماتے رہے۔ وہ تمھارے لیے قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ، سو اگر تم ان سے راضی ہو بھی جاؤ تو بھی اللہ ان (لوگوں) سے راضی نہیں ہوتا جو نافرمان ہیں۔''[1]

حضرت کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''ہم تینوں آدمی دیگر قسمیں کھانے والوں سے توبہ یا معافی کے معاملے میں پیچھے رکھے گئے۔ جن قسمیں کھانے والوں سے ان کی قسموں کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معذرت قبول کر لی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے بیعت بھی کر لی اور ان کے لیے استغفار بھی کیا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارا معاملہ مؤخر کر دیا حتی کہ اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرما دیا۔ اسی کو اللہ تعالیٰ نے بیان فرماتے ہوئے کہا:

﴿وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا حَتّٰٓى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ﴾

''اور ان تین افراد پر بھی (مہربانی فرمائی) جنھیں (حکمِ الٰہی کے انتظار میں) چھوڑ دیا گیا تھا، حتی کہ جب زمین فراخی کے باوجود ان پر تنگ ہوگئی اور ان کی جانیں (بھی) ان پر تنگ ہوگئیں اور انھوں نے سمجھا کہ اللہ (کے غضب) سے خود اس کے سوا ان کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں، پھر اللہ نے ان پر مہربانی کی، تاکہ وہ توبہ کریں۔ بے شک اللہ بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔''[2]

اللہ تعالیٰ نے جو ہمارے پیچھے رہنے کا ذکر فرمایا ہے تو اس سے مراد ہمارا غزوے سے پیچھے رہنا نہیں بلکہ مراد ہے ہماری معافی کا معاملہ پیچھے رکھا گیا اور اسے مؤخر کر دیا گیا

[1] التوبة 9:95، 96. [2] التوبة 9:118.

بہ نسبت ان کے جنھوں نے آپ ﷺ کے سامنے قسمیں کھا لیں اور معذرت کی تو آپ ﷺ نے اسے قبول کر لیا۔[1]

اس قصے میں کئی ایک اسباق، عبرتیں اور فوائد ہیں جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

عمدہ انداز، دلکش اسلوبِ بیان اور اعلیٰ ادبی ذوق: یہ حدیث عمدہ اسلوبِ بیان، دلچسپ انداز اور اعلیٰ ادبی ذوق کی بہترین مثال ہے۔ یہ حدیث اور اسی اسلوبِ بیان سے ملتی جلتی صلح حدیبیہ اور واقعۂ افک کی احادیث عربی ادب کے بہترین نمونے ہیں۔ کاش! بچوں کی ادبی نشو ونما کرنے والے اور ان میں ادبی ملکہ پیدا کرنے کے آرزو مند افراد اور انھیں بلند وبالا ادبی ولغوی سرمایہ فراہم کرنے والے نصابی کتب تشکیل دیتے وقت ایسی اور ان جیسی دیگر احادیث کو بھی اپنے نصاب میں شامل کریں۔ اس حدیث میں مثال کے طور پر حضرت کعب رضی اللہ عنہ کا یہ قول قابل ستائش ہے:

«فَلَمَّا قِيلَ: إِنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَدْ أَظَلَّ قَادِمًا زَاحَ عَنِّي الْبَاطِلُ وَعَرَفْتُ أَنِّي لَنْ أَخْرُجَ مِنْهُ أَبَدًا بِشَيْءٍ فِيهِ كَذِبٌ، فَأَجْمَعْتُ صِدْقَهُ»

''جب مجھے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ کے قریب آ پہنچے ہیں تو میرا سارا جھوٹ کافور ہو گیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ میں اس معاملے میں جھوٹ بول کر اپنے آپ کو کسی طرح محفوظ نہیں رکھ سکتا، چنانچہ میں نے سچ بولنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔''[2]

سچائی سفینۂ نجات ہے: حضرت کعب، ہلال اور مرارہ رضی اللہ عنہم سمجھ گئے کہ جھوٹ کا انجام برا ہوگا۔ انھوں نے یہی سوچتے ہوئے سچائی اور سیدھی سادی بات کہنے کا عزم کیا۔ اگرچہ (وقتی طور پر) یہ ان کے لیے تنگی اور مشکلات ہی کا سبب بنا۔ لیکن انھیں اللہ تعالیٰ سے پوری

[1] صحيح البخاري، حديث: 4418، وصحيح مسلم، حديث: 2769. [2] التاريخ الإسلامي للحميدي: 138/8.

امید تھی کہ وہ ان کی توبہ قبول فرمائے گا اور وہ پہلے سے بہتر جذبات کے ساتھ اسلامی صف میں شامل ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے کعب رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کی توبہ کا معاملہ کیسے بہتر انداز سے اختتام کو پہنچایا اور فرمایا:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ ﴾

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو اور سچ بولنے والوں کے ساتھ ہو جاؤ۔''[1]

قطع تعلقی کے ذریعے تربیت اور اس کا معاشرے پر اثر: مسلم معاشرے میں اچھائی کو پروان چڑھانے، برائی کا قلع قمع کرنے اور واجب کے ترک یا حرام کے ارتکاب سے بچنے کے لیے ''قطع تعلقی'' ایک بہترین ذریعہ تربیت ہے کیونکہ غیر شرعی کام کرنے والا جب یہ سوچے گا کہ سارا معاشرہ مجھے چھوڑ دے گا اور مجھے الگ تھلگ ہونا پڑے گا تو وہ ایسا نہیں کرے گا۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ اس فیصلے کی عملی تطبیق اور کامیابی صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ جب معاشرہ نبوی معاشرے جیسا ہو۔ حکومتی گرفت مضبوط اور تمام افرادِ معاشرہ متحد ہوں اور جس شخص کے لیے قطع تعلقی کا فیصلہ کیا جائے اس کے فتنے میں پڑنے کا امکان بھی نہ ہو۔

ہمارے معاشرے میں بائیکاٹ کی ایک صورت موجود ہے جو صرف دنیاوی مقاصد کے لیے ہوتی ہے، اس میں اور حقیقی شرعی قطع تعلقی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ شرعی قطع تعلقی تو دین کے لیے ہوتی ہے اور اس پر ثواب بھی ملتا ہے مگر رائج قطع تعلقی ذاتی مفاد اور دنیاوی مفاد اور دنیاوی اغراض و مقاصد کے لیے ہوتی ہے، اس لیے یہ ناجائز ہے اور اگر یہ تین دن سے بڑھ جائے تو حرام ہے۔[2]

---

1 التوبة 9:119. التاريخ الإسلامي للحميدي: 8/137. 2 التاريخ الإسلامي للحميدي: 8/139.

ارشادِ نبوی ہے:

«لَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يَّهْجُرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثِ لَيَالٍ، يَلْتَقِيَانِ فَيُعْرِضُ هٰذَا وَيُعْرِضُ هٰذَا، وَخَيْرُهُمَا الَّذِي يَبْدَأُ بِالسَّلَامِ»

''کسی بھی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے تین دنوں سے زیادہ قطع تعلق رہے۔ جب بھی ان کا آمنا سامنا ہوتا ہے دونوں ایک دوسرے سے منہ پھر لیتے ہیں۔ ان میں بہتر وہ ہے جو سلام کرنے میں پہل کرے۔''[1]

ایک اور ارشادِ گرامی ہے:

«مَنْ هَجَرَ أَخَاهُ سَنَةً فَهُوَ كَسَفْكِ دَمِهِ»

''جس نے اپنے بھائی سے ایک سال کے لیے قطع تعلقی کی گویا کہ اس نے اسے مار دیا۔''[2]

سارا اسلامی معاشرہ قائد کے احکام بجا لاتا ہے: عظیم قائد کی طرف سے سارے اسلامی معاشرے کو بائیکاٹ کا حکم صادر ہوا تو اس پر پورے اسلامی معاشرے نے لبیک کہا۔ تمام لوگوں ہی نے ان تینوں سے بات چیت بند کر دی۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ خود بیان کرتے ہیں۔ ''...... لوگ ہم سے کنارہ کشی کرنے لگے۔ وہ تو بالکل ہی بدل گئے، حتی کہ زمین بھی میرے لیے بدل گئی۔ یہ تو وہ زمین ہی نہ تھی جسے میں پہچانتا تھا۔ میرے دونوں ساتھی تو عاجز ہو گئے اور روتے ہوئے اپنے گھروں میں بیٹھ گئے۔ مگر میں ان کی نسبت جوان اور طاقتور تھا، میں نکلتا، نماز میں حاضر ہوتا، بازاروں میں بھی پھرتا مگر کوئی بھی آدمی مجھ سے بات نہ کرتا۔''

1 صحيح البخاري، حديث: 6237، و صحيح مسلم، حديث: 2560. 2 مسند أحمد: 220/4، وسنن أبي داود، حديث: 4911، والآداب للبيهقي، رقم: 280، والمستدرك للحاكم: 163/4، والأدب المفرد للبخاري، رقم: 404.

حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے اپنے چچا زاد ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کو سلام کیا تو انھوں نے بھی سلام کا جواب نہ دیا۔

انھیں بار بار قسمیں ڈالیں کیا تمھیں علم ہے کہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتا ہوں مگر وہ خاموش رہے، حالانکہ وہ انھیں تمام لوگوں سے زیادہ محبوب تھے۔ اس مقام پر ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کو ایک محبوب انسان، جو ان کے ہاں بڑا معزز تھا، اس سے تعلق اور قطع تعلقی میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا تھا لیکن ان کے ایمان نے انھیں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو بجا لانے پر آمادہ کیا۔[1]

قطع تعلقی کے نبوی حکم کی پاسداری اس وقت انتہا کو پہنچ گئی جب رسول گرامی صلی اللہ علیہ وسلم نے تینوں اشخاص کو خدائی فیصلے کے انجام تک پہنچ جانے تک اپنی بیویوں سے بھی الگ ہونے کا حکم دیا۔ ہر ایک نے اس فیصلے کو اپنے اوپر لازم قرار دیا۔ ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہ کی خدمت کے لیے کوئی موجود نہ تھا، لہٰذا ان کی بیوی نے خدمت کی اجازت طلب کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دیتے ہوئے ان سے الگ رہنے کا حکم دیا جس کی پاسداری انھوں نے بھی کی۔[2]

مکمل تعلق اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے لیے: صلیبی دشمن ایسے مواقع کا منتظر تھا تاکہ داخلی محاذ میں رخنہ اندازی پیدا کر سکے اور مسلمانوں کے درمیان فتنے کی آگ بھڑکا کر اس کی بنیاد کو کمزور کرے اور حکومت کو منہدم کر سکے۔ اسی لیے غسانی حاکم نے حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے مسلمانوں کی قطع تعلقی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تادیبی کارروائی کو غنیمت جانا اور سفیر کے ذریعے حضرت کعب رضی اللہ عنہ کو اپنا خصوصی خط بھیجا جس میں وہ انھیں اس سلوک کے خلاف برانگیختہ کر رہا تھا۔ شاہِ غسان کی اس بات پر غور کیجیے: ”ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ تمھارے ساتھی نے تم پر زیادتی کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمھیں ہرگز ذلت میں رہنے کے

1 التاريخ الإسلامي للحميدي: 140/8. 2 الصراع مع الصليبيين لأبي فارس، ص: 196.

لیے پیدا کیا ہے اور نہ اس لیے کہ لوگ تم سے رخ موڑتے رہیں۔ تم ہمارے ساتھ آ ملو، ہم تمھاری خاطر داری کریں گے۔''

حضرت کعب رضی اللہ عنہ کی اس خط سے متعلق رائے یہ تھی: ''یہ ایک اور آزمائش ہے، میں نے ایسی غلطی کر لی ہے کہ اب دشمن بھی مجھ سے آس لگائے بیٹھے ہیں!'' یہ کہتے ہوئے انھوں نے خط جلا دیا۔[1]

حضرت کعب رضی اللہ عنہ کا خط سے متعلق اظہار ان کے لیے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے انتہائی دوستی و تعلق اور قوت ایمانی کے ساتھ ساتھ ان کی ذاتی عظمت کی بھی واضح دلیل ہے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ یہ ایک نئی آزمائش ہے۔ تو انھوں نے فوراً خط تنور میں ڈال کر جلا ڈالا۔ اس امتحان اور آزمائش میں وہ انتہائی پاکیزہ انداز میں کامیاب و کامران ٹھہرے۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ کے نہ تو کہیں قدم ڈگمگائے اور نہ ہی وہ شاہِ غسان کے خط سے متاثر ہوئے۔[2]

قبولیت توبہ ایک مومن کی حقیقی دولت ہے: جب ان تینوں اشخاص کی قبولیت توبہ سے متعلق آیاتِ مبارکہ نازل ہوئیں تو وہ دن مسلمانوں کے لیے عظیم دن تھا۔ اس روز رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور پر خوشی کی لہر دوڑ گئی حتی کہ وہ چاند کی مانند چمک اٹھا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے چہروں پر بھی خوشی نمایاں تھی۔ وہ انھیں گروہ در گروہ مبارک باد دے رہے تھے۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک خوشی سے چمک دمک رہا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا:

«أَبْشِرْ بِخَيْرِ يَوْمٍ مَرَّ عَلَيْكَ مُنْذُ وَلَدَتْكَ أُمُّكَ»

''تجھے پیدا ہونے کے بعد سب سے بہتر دن کی مبارک ہو۔''

---

1 المغازي للواقدي: 1052-1051/3. 2 السيرة النبوية لأبي شهبة: 517/2، وفقه السيرة للبوطي، ص:307.

اس سے توبہ کا مقام و مرتبہ واضح ہو جاتا ہے اور توبہ سے مراد بندے کا پھر سے اللہ کی رضامندی میں چلے جانا ہوتا ہے۔[1] یہی ایک مسلمان کی زندگی کا مقصد اور متاعِ حیات ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ بندہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی حفاظت اور آخرت میں اس کی طرف سے عزت افزائی کا اہل بن جائے۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ کی توبہ کی قبولیت ان کے لیے واقعی ایک عظیم تر خوشی تھی۔ انھوں نے اس خوشخبری دینے والے کو ایک جوڑا بطور ہدیہ دیا۔[2]

اور اسی طرح حضرت کعب کا مبارک باد دینے والے اور مصافحہ کرنے والے کو نہ بھولنا اور اسے اس کا عظیم احسان سمجھ کر ہمیشہ اچھے لفظوں سے یاد کرنا بھی اس خوشی میں اضافے کی بات ہے۔[3]

حضرت کعب کے دیگر دونوں ساتھیوں کی خوشی اسی طرح کی تھی مگر اس روایت میں انھوں نے صرف اپنا حال ذکر کیا ہے۔[4]

واقدی کی روایت میں مذکور ہے کہ حضرت ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہ کو توبہ کی مبارک باد حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ نے دی تھی۔ ان کا بیان ہے کہ میں بنو واقف کی طرف گیا۔ انھیں خوش خبری دی تو وہ فوراً سجدہ ریز ہو گئے۔ حضرت سعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھے گمان گزر رہا تھا کہ اسی حالت میں ان کی جان نکل جائے گی۔[5]

شکرانے کے لیے عبادات: کسی انعام پر اللہ تعالیٰ کا شکرانہ ادا کرنے کے لیے کئی قسم کی عبادات مشروع ہیں۔ جس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی توبہ قبول فرمائی تو ان کی خوشی کی کوئی حد ہی نہ رہی۔ انھوں نے اس کا شکرانہ کئی قسم کی عبادات کر کے ادا کیا، مثلاً:

1 السيرة النبوية لأبي شهبة: 517/2. 2 التاريخ الإسلامي للحميدي: 142/8. 3 السيرة النبوية لأبي شهبة: 518/2. 4 التاريخ الإسلامي للحميدي: 142/8. 5 المغازي للواقدي: 1054/3.

❁ سجدہ شکر: قبولیتِ توبہ کی بشارت جونہی حضرت کعب رضی اللہ عنہ کے کان میں پڑی وہ فوراً اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرنے کی غرض سے سجدہ ریز ہو گئے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عادت مبارکہ تھی کہ جب بھی انھیں کوئی نعمت حاصل ہوتی یا کوئی سختی ٹل جاتی تو وہ سجدۂ شکر بجا لاتے۔ یہ طریقہ شکر انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھا تھا۔[1]

❁ مبارک باد دینے والے کو انعام: حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے جس شخص سے بشارت سنی اسے اپنے تن کے کپڑے اتار کر بطور ہدیہ دے دیے، جبکہ اس وقت ان کے پاس کپڑوں کا صرف یہی جوڑا تھا۔[2]

❁ سارا مال صدقہ کر دینا: حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے توبہ قبول ہونے پر سارا مال صدقہ کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مشورہ کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سارا مال صدقے میں دے دینے کو قبول نہ فرمایا بلکہ کچھ مال اپنے پاس رکھنے کے لیے بھی کہا۔[3]

اسی سے فقہی اختلاف پیدا ہوا کہ اگر کوئی آدمی سارا مال صدقہ کرنے کی نذر مان لے تو کیا حکم ہے، جبکہ صدقہ کرنا مستحب اور نذر پوری کرنا واجب ہے۔

مگر حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے نذر نہیں مانی تھی بلکہ سارا مال صدقہ کرنے کا مشورہ طلب کیا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورہ دیا کہ کچھ مال اپنے پاس رکھ لے۔

1 صوروعبرمن الجهاد النبوي للدكتور فوزي فيض الله، ص:493. 2 صور و عبر من الجهاد النبوي للدكتور فوزي فيض الله، ص:493، و الصراع مع الصليبيين لأبي فارس، ص:202.
3 صوروعبر من الجهاد النبوي للدكتور فوزي فيض الله، ص:493.

نصائح، فوائد، عبرتیں اور حکمتیں

① غزوۂ تبوک کے متعلق قرآنی منہج

مسلمانوں کے دوسرے تمام غزوات اور جنگوں کی نسبت غزوۂ تبوک کی بابت سب سے زیادہ قرآن نازل ہوا۔ ان آیات میں مسیحی یلغار کے خلاف کمر بستہ ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بتا دیا گیا کہ دین کی حمایت اور پیغمبر ﷺ کی نصرت میں ذرہ بھر کوتاہی قبول نہیں کی جائے گی۔ رومیوں کے مقابل کسی بھی قسم کی پسپائی ارتداد اور نفاق شمار ہوگی۔[1]

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمُ انْفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ ۚ أَرَضِيتُمْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ ○ إِلَّا تَنْفِرُوا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ○ ﴾

''اے ایمان والو! تمھیں کیا ہو گیا ہے، جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں نکلو تو تم زمین کی طرف بوجھل ہو جاتے ہو، کیا تم آخرت کے مقابلے میں دنیاوی زندگی پر ریجھ گئے ہو؟ چنانچہ دنیا کی زندگی کا فائدہ تو آخرت (کے مقابلے) میں بہت ہی تھوڑا ہے۔ اگر تم نہیں نکلو گے تو وہ (اللہ) تمھیں دردناک عذاب دے گا اور بدل کر تمھارے علاوہ کسی اور قوم کو لے آئے گا اور تم اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو

[1] فقه السيرة للغزالي، ص:404.

گے اور اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔''[1]

سورۂ توبہ نے اس غزوے کا ذکر کرتے ہوئے مخصوص اسلوب اپنایا ہے، مثلاً:

(ا) اس غزوے کا دوسرے غزوات سے فرق کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ اس میں شرکت کے لیے قرآن نے خود لوگوں کو ابھارا ہے اور پیچھے رہنے والوں کو سخت ڈانٹ بھی پلائی گئی ہے۔ اس غزوے کے ساتھ ہی رسول اللہ ﷺ کے غزوات کا اختتام ہوا اور یوں یہ غزوہ اس نصِ قرآنی کی عملی تطبیق بھی تھا، ارشاد ہے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ قَٰتِلُوا۟ ٱلَّذِينَ يَلُونَكُم مِّنَ ٱلْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا۟ فِيكُمْ غِلْظَةً ۚ وَٱعْلَمُوٓا۟ أَنَّ ٱللَّهَ مَعَ ٱلْمُتَّقِينَ ○ ﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم ان کافروں سے لڑو جو تمھارے قرب و جوار میں ہیں اور چاہیے کہ وہ تمھارے اندر سختی پائیں اور جان لو کہ یقیناً اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔''[2]

اس آیت مبارکہ سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جزیرہ نمائے عرب کو فتح کر لیا اور آپ کے آس پاس جتنے کافر تھے سب آپ کے ماتحت تھے۔ یہ غزوہ تبوک چونکہ جزیرہ نمائے عرب سے باہر تھا اس لیے یہ اس آیت کی عملی تفسیر بنا۔[3]

(ب) دیگر غزوات کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اسے ﴿سَاعَةِ ٱلْعُسْرَةِ﴾ سے تعبیر کیا ہے اس لیے اس غزوے کو ''غزوۃ العسرہ'' کہا جاتا ہے۔

(ج) اس غزوے کو یہ بھی خصوصیت حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کمزور مسلمانوں کی عیب جوئی کرنے پر منافقین کی سرزنش فرمائی ہے، ارشاد ہے:

﴿ ٱلَّذِينَ يَلْمِزُونَ ٱلْمُطَّوِّعِينَ مِنَ ٱلْمُؤْمِنِينَ فِى ٱلصَّدَقَٰتِ وَٱلَّذِينَ لَا يَجِدُونَ إِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُونَ مِنْهُمْ ۙ سَخِرَ ٱللَّهُ مِنْهُمْ وَلَهُمْ

1 التوبة 9:38، 39. 2 التوبة 9:123. 3 حديث القرآن عن غزوات الرسول ﷺ لأبي بدر محمد بكر آل عابد: 2/702.

عَذَابٌ اَلِیْمٌ ○﴾

''جو لوگ عیب جوئی کرتے ہیں کھلے دل سے خیرات کرنے والے مومنوں پر، (ان کے) صدقات کی بابت اور ان پر بھی جو اپنی (تھوڑی سی) محنت مزدوری کے سوا کچھ نہیں رکھتے، تو وہ ان کا مذاق اڑاتے ہیں، اللہ بھی ان کا مذاق اڑائے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔''[1]

(د) اس غزوے میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نکلنے والوں کے لیے اجر عظیم کا بھی وعدہ کیا گیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ ۡ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○﴾

''لیکن رسول (ﷺ) اور جو لوگ ان کے ساتھ ایمان لائے، انھوں نے اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کیا اور بھلائیاں بھی انھی لوگوں کے لیے ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''[2] مزید فرمایا:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ۚ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ○﴾

''یہ اس لیے کہ یہ بلاشبہ وہ (لوگ) ہیں کہ انھیں اللہ کی راہ میں جو بھی پیاس اور تھکاوٹ اور بھوک (کی تکلیف) پہنچتی ہے اور وہ جو بھی ایسی جگہ روندتے ہیں، جو کافروں کو سخت ناگوار ہو اور وہ دشمن سے جو بھی کامیابی حاصل کرتے ہیں، اس کے بدلے میں ان کے لیے نیک عمل لکھا جاتا ہے۔ بے شک اللہ محسنین کا اجر ضائع نہیں کرتا۔''[3]

1 التوبة 9:79. 2 التوبة 9:88. 3 التوبة 9:120.

اس جنگ میں شوریٰ کی عملی پاسداری

اس غزوے میں رسول اللہ ﷺ نے شوریٰ کا اہتمام فرمایا اور بعض کٹھن مراحل پر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا مشورہ قبول بھی کیا۔ ان پیش آمدہ مشکلات میں سے چند ایک یہ ہیں:

لشکر کی پیاس اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا مشورہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم سخت گرمی میں تبوک کی طرف نکلے۔ ایک جگہ راستے میں پڑاؤ ڈالا تو ہمیں سخت پیاس لگی۔ ہمیں یقین ہونے لگا کہ شاید ہم یہیں ختم ہو جائیں گے۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ لوگ پیاس بجھانے کے لیے اونٹ ذبح کر کے اس کی اوجھ نچوڑ کر پی لیتے۔

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ صورت حال دیکھ کر عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ آپ کی دعا کے نتیجے میں بھلائی ہی عطا فرمائی ہے آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: «أَتُحِبُّ ذٰلِكَ؟» ''کیا تم پسند کرتے ہو کہ ایسا کروں؟'' عرض کیا: ''بالکل۔''

آپ ﷺ نے دعا کے لیے ہاتھ بلند فرمائے۔ ابھی ہاتھ نیچے نہ کیے تھے کہ موسم بدلنے لگا۔ بادل سایہ فگن ہوگئے اور بارش ہونے لگی۔ سب نے اپنے اپنے برتن بھر لیے۔ بعد ازاں ہم ادھر اُدھر بارش کے نشانات دیکھنے لگے تو ہمیں لشکر سے آگے کہیں بارش کے اثرات نظر نہ آئے۔[1]

سواریوں کی قلت اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا مشورہ: تبوک کی طرف جاتے ہوئے ایک موقع پر اونٹ ذبح کرنے کی نوبت آ گئی۔ رسول اللہ ﷺ سے اجازت طلب کی گئی تو

1 دلائل النبوة للبيهقي: 231/5، والمستدرك للحاكم: 159/1، و مجمع الزوائد للهيثمي: 194/6، و صحيح ابن حبان، رقم: 1383، ومسند البزار، رقم: 1841.

آپ ﷺ نے اجازت دے دی۔ ادھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ حاضر ہو کر عرض کرنے لگے: ''اے اللہ کے رسول! اگر لشکر کو اس کی اجازت دی گئی تو اس طویل ترین سفر میں سواریوں کی ضرورت پیش آئے گی تو مشکل کا سامنا ہو گا۔ اور ساتھ ہی اس مسئلے کا یہ حل پیش کیا کہ تمام لوگوں کے زاد راہ جمع کر کے برکت کی دعا کی جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس مشورے پر عمل فرمایا، چنانچہ لوگ اس بابرکت کھانے کو سیر ہو کر کھانے لگے اور اس کے بعد وہ اپنے اپنے برتن بھی بھر کر لوٹے۔[1]

حدود شام سے واپسی کی بابت عمر رضی اللہ عنہ کا مشورہ: رسول اللہ ﷺ جب تبوک پہنچے تو معلوم ہوا کہ رومی مسلمانوں کے ڈر سے بھاگ نکلے ہیں۔ اب رسول اللہ ﷺ نے شام کی سرحد عبور کرنے کے متعلق صحابہ کرام سے مشورہ طلب کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ لشکر سمیت واپس چلے جائیں، کیونکہ رومیوں کے پاس بہت سے لشکر ہیں اور یہاں مسلمان آبادی نہیں ہے۔ ان کا مشورہ مبارک مشورہ تھا۔ کیونکہ رومی شہروں کے اندر گھس کر لڑنا مشکل کام تھا۔ صحرا کی جنگ شہروں کی جنگ سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ مشکل بھی تھی کہ شام میں تقریباً اڑھائی لاکھ رومی تھے اور شہروں کے اندر اس قدر بڑی تعداد کا حلقہ بند ہو کر لڑنا اسلامی لشکر کے لیے خطرے کا باعث تھا۔[2]

عملی مشق

تبوک کی طرف نکلنے اور لمبا سفر کرنے سے کئی فوائد سامنے آتے ہیں جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اپنی رفاقت میں انتہائی گرم فضاء میں لمبا سفر کرا دیا۔ معاشی مشکل کے ساتھ ساتھ بھرپور گرمی اور پانی کی قلت کا اس قدر سامنا تھا کہ

[1] صحيح مسلم، حديث:(45)-27. [2] غزوة تبوك لمحمد أحمد باشميل، ص:176-177.

جان بہ لب تھی، پھر سواریوں اور زاد راہ کی قلت میں یہ سفر ایک مشکل مشق اور انتہائی صبر آزما لمحات سے بھرپور تھا۔

اسی کے متعلق جنرل محمود شیت خطاب کہتے ہیں: ''زمانہ جدید میں لشکروں کی سخت ترین مشقوں اور دشوار گزار مواقع سے گزارنے کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ مختلف ماحول اور موسم میں طویل مسافت اور بسا اوقات کھانا و پانی سے محرومی کی مشق بھی کرائی جاتی ہے تاکہ پیش آمدہ مشکل اوقات کے لیے لشکر کو تیار کیا جاسکے۔ جیش العسرہ کی مشکلات اور مشقیں بھی ایک زبردست جنگی تجربہ تھا اور اس کا مقصود یہ تھا کہ اسلام کے پیغام کو آزادی سے جزیرہ نمائے عرب سے باہر پھیلانے کے لیے مسلمانوں کو تیار کیا جاسکے۔ یہ نبی ﷺ کا آخری غزوہ تھا۔ اس لیے رفیق اعلیٰ سے ملنے سے قبل اپنے لشکروں کی تیاری اور مطلوب قوت سے اطمینان بھی حاصل کرنا تھا جو اس غزوے میں عملی طور پر ثابت ہو گیا۔''[1]

غزوۂ تبوک کے نتائج

① جزیرہ نمائے عرب کے تمام لوگ خواہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم ان کے دلوں سے روم کی ہیبت ختم ہو گئی۔ اس سے پہلے عرب کو خیال تھا کہ روم کا مقابلہ کرنا اور اسے شکست دینا محال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب روم سے جنگ کا نام لیا جاتا تو وہ گھبرا سے جاتے۔ علاوہ ازیں ''غزوۂ موتہ'' میں مسلمانوں کی عارضی پسپائی نے بھی اس خیال کو مزید پختہ کر دیا جو زمانہ جاہلیت سے اہل عرب کے ذہن میں راسخ تھا کہ رومی ناقابل تسخیر ہیں، لہٰذا عام لشکر کشی کا اعلان کر کے عربوں کے ذہن سے اس نفسیاتی شکست کو ختم کرنا ضروری تھا۔

② اسلامی حکومت کا اس طور پر تعارف کہ جزیرہ نمائے عرب کی وہی ایک ایسی قوت ہے جو عالمی طور پر موجود کسی بھی قوت کو چیلنج کر سکتی ہے لیکن اس کے پیچھے نہ تو عصبیت ہے اور نہ حکومت حاصل کرنے کا لالچ۔ بلکہ اس کا محرک صرف اور صرف جذبہ آزادی ہے جس کی

1 الرسول القائد ﷺ لمحمود شیت خطاب، ص:282,281.

دعوت ہے کہ انسانیت کو انسانوں کی غلامی سے آزاد کر کے انسانوں کے پروردگار کی غلامی میں لایا جائے۔ رومیوں کے بھاگ نکلنے کے باوصف غزوۂ تبوک نے اپنا مقصد پالیا۔

رومیوں نے مسلمانوں کے لیے میدان خالی کر کے گویا بلا جنگ مسلمانوں کو فاتح بنا دیا۔ نتیجتاً روم کے حلیف دومۃ الجندل اور ایلہ کی عیسائی حکومتیں اسلام کے سامنے سرنگوں ہوگئیں۔[1]

اسی طرح شام کے دیگر عرب قبائل بھی تبوک کے موقع پر اسلامی اثر و رسوخ دیکھ کر اسلامی سلطنت اور بازنطینی سلطنت میں تقابل کرنے لگے کہ انھیں کس کا ساتھ دینا زیادہ نفع مند ہے۔ تبوک میں جو کچھ ہوا یہ شامی علاقوں میں اسلامی فتوحات کا عملاً نقطۂ آغاز ثابت ہوا۔[2]

غزوۂ تبوک سے پہلے بھی اس جانب کئی کارروائیاں ہوئی تھیں مگر سب سے زیادہ تاثیر اسی کی تھی۔ یہ غزوہ رومی علاقوں کو فتح کرنے کی بشارت کا آغاز بھی تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی وفات سے قبل اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کی سرکردگی میں تیار لشکر کو اسی جانب روانہ فرمایا تھا۔ آپ ﷺ نے شامی و دیگر علاقوں کی فتوحات کے لیے خود تبوک جا کر قابل عمل مثال اور اساس فراہم کر دی۔[3]

جزیرۃ العرب کا اتحاد اسلامی حکومت کے سایے میں

فتح مکہ، غزوۂ خیبر اور غزوۂ تبوک جیسے پر اثر واقعات نے عربی قبائل کو ایک حکومت کے ماتحت رہنے پر آمادہ کیا۔ جب اسلامی حکومت کی سرحدیں روم سے جا ملیں اور نجرانی عیسائی بھی جزیہ دینے لگے تو جزیرہ نمائے عرب کے تمام قبائل نے کوشش کی کہ وہ جلد از جلد اسلام کے سایے تلے نبوی قافلے میں شامل ہوجائیں۔ ان قبائل کے پاس اس کے

1 دراسات في عهد النبوة للشجاع، ص: 209. 2 المسلمون والروم في عصر النبوة لعبدالرحمٰن أحمد، ص: 120. 3 دراسات في عهد النبوة للشجاع، ص: 209.

علاوہ کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ غزوۂ تبوک کے بعد جزیرۃ العرب کے اطراف و جوانب سے اس قدر وفود آنے لگے کہ 9ھ کو ''عام الوفود'' کا نام دیا گیا۔

اسی بابرکت غزوے کے ساتھ غزوات رسول کا سلسلہ اختتام پذیر ہوتا ہے جن کی قیادت رسول اللہ ﷺ نے خود فرمائی۔ آپ ﷺ کی ساری عمر مبارک حکمتوں سے بھرپور ہے جن پر امت مسلمہ کی آئندہ نسلیں پروان چڑھ رہی ہیں۔[1]

[1] نضرۃ النعیم:396,395/1.

حجۃ الوداع سے قبل تا وفاتِ نبوی

باب : 1 غزوۂ تبوک اور حجۃ الوداع کے درمیانی اہم واقعات

باب : 2 حجۃ الوداع 10ھ

باب : 3 رسول اللہ ﷺ کا مرض اور وفات

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلٰمَ دِيْنًا

"آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو دین کے طور پر پسند کیا۔"

(المائدة 5:3)

لَبَّيْكَ، اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ، لَاشَرِيكَ لَكَ لَبَّيْكَ، إِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِيكَ لَكَ

"حاضر ہوں میں تیری خدمت میں، اے اللہ میں حاضر ہوں۔ تیرا کوئی شریک نہیں، میں حاضر ہوں۔ بیشک ہر قسم کی تعریف اور نعمت تیرے لیے ہے اور بادشاہت بھی تیری اور تیرا کوئی شریک نہیں۔"

(صحيح البخاري، حديث 1549، و صحيح مسلم، حديث 1184)

باب 1

غزوۂ تبوک اور حجۃ الوداع کے درمیانی اہم واقعات

وفد ثقیف کی آمد اور ان کا قبول اسلام

رسول اللہ ﷺ جب طائف سے واپس ہوئے تو عروہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ آپ کے پیچھے پیچھے چل دیے اور مدینہ پہنچنے سے پہلے راستے ہی میں آپ ﷺ سے جا ملے۔ اسلام قبول کیا اور واپس اپنی قوم میں چلے گئے۔ قوم کو اسلام کی دعوت دی تو انھوں نے ان پر تیروں کی بارش کر دی، جس سے وہ شہید ہو گئے۔

بعد ازاں بنو ثقیف نے باہم مشورہ کیا کہ انھیں مسلمانوں اور آس پاس کے عرب قبائل سے جنگ کرنے کی طاقت نہیں۔ اس پر اتفاق ہوا کہ کچھ آدمیوں کو رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیجیں، چنانچہ 9 ھ کو جب آپ ﷺ تبوک سے واپس ہوئے تو رمضان میں ان کے چھ آدمی آپ ﷺ کے پاس پہنچے۔[1]

وفد میں کل چھ سردار تھے۔ تین عبد یالیل سے اور تین ان کے حلیفوں سے۔ یہ تمام عبد یالیل بن عمرو کی سرپرستی میں تھے۔[2]

وفد کی یہ تشکیل ان کی گہری سیاسی دور اندیشی پر دلالت کرتی ہے کیونکہ ثقیف نے سوچا کہ بنو امیہ کے مہاجرین ان کے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان واسطہ بنیں گے تو صلح یقینی ہو گی کیونکہ بنو امیہ کا حلیفوں سے قدیمی تعلق تھا۔[3]

1 رسالة الأنبياء لعمر أحمد عمر، ص: 199. 2 السيرة النبوية لابن هشام: 193/4. 3 رجال الإدارة في الدولة الإسلامية للدكتور حسين محمد، ص: 76.

صحابہ کرام جانتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ ثقیف کے اسلام قبول کرنے کی شدید خواہش رکھتے ہیں، چنانچہ ثقیف کا وفد مدینہ منورہ کے قریب پہنچا تو حضرت ابوبکر اور حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہما میں سے ہر ایک کی خواہش تھی کہ وفد کی آمد کی خوشخبری رسول اللہ ﷺ کو وہی دے۔ مگر حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حق میں پیچھے ہٹ گئے۔[1]

رسول اللہ ﷺ نے بڑی خوشی سے وفد کا استقبال فرمایا اور (مسجد کے قریب ہی) ان کے خیمے لگا دیے تاکہ وہ قرآن پاک سنیں اور لوگوں کو نماز ادا کرتے ہوئے دیکھیں۔ ان کی میزبانی خود رسول اللہ ﷺ کے ذمے تھی۔ یہ روزانہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آتے اور عثمان بن ابوالعاص کو پڑاؤ میں اپنے اونٹوں کے پاس ٹھہرا دیتے۔ عثمان کی عادت تھی کہ جب یہ لوگ واپس آتے اور دوپہر کا آرام کرنے کے لیے لیٹتے تو یہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آ جاتا، دین کے متعلق پوچھتا اور قرآنِ حکیم کی تعلیم حاصل کرتا۔ حتی کہ اس نے دین وعلم کے بارے میں کافی کچھ سیکھ لیا۔ وہ جب دیکھتا کہ رسول اللہ ﷺ سوئے ہوئے ہیں تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچ جاتا۔ اس نے اپنی یہ تعلیم اپنے ساتھیوں سے چھپانے کی کوشش کی۔ آپ ﷺ کو اس کی یہ عادت بڑی پسند آئی۔[2]

یہ وفد کئی دن تک نبی اکرم ﷺ کے پاس رہا۔ آپ ﷺ انھیں اسلام کی طرف دعوت دیتے رہے۔ ایک دن عبد یالیل نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: ''کیا آپ ہمارے ساتھ بات چیت کرتے ہیں تاکہ ہم اپنے گھر اور اپنی قوم کی طرف پلٹ سکیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: «نَعَمْ! إِنْ أَنْتُمْ أَقْرَرْتُمْ بِالْإِسْلَامِ، قَاضَيْتُكُمْ وَإِلَّا فَلَا قَضِيَّةَ وَلَا صُلْحَ بَيْنِي وَ بَيْنَكُمْ» ''ہاں! اگر تم اسلام قبول کر لو تو میں تمھیں اقرار نامہ دے دیتا ہوں۔ بصورت دیگر میرے اور تمھارے درمیان کوئی فیصلہ یا معاہدہ نہیں۔''

عبد یالیل نے کہا: ''آپ کا زنا و بدکاری کے متعلق کیا خیال ہے؟ ہم دور دراز سفروں

1 السيرة النبوية لابن هشام: 153/4. 2 تاريخ الإسلام، (المغازي) للذهبي، ص: 670.

پر اکیلے جاتے ہیں اور عورتوں سے علیحدگی پر صبر مشکل ہے، لہٰذا یہ تو ہمارے لیے لازمی چیز ہے۔'' رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا: «وَهُوَ مِمَّا حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَى الْمُسْلِمِينَ، يَقُولُ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ۝﴾» ''اسے تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر حرام کر دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور تم زنا کے قریب مت جاؤ، یقیناً وہ بے حیائی اور بری راہ ہے۔''[1]''

اس نے پوچھا: ''تو سود کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟'' فرمایا: «اَلرِّبٰو حَرَامٌ» ''سود حرام ہے۔'' اس نے کہا: ''ہمارے تو تمام اموال بھی سود پر ہیں۔''

فرمایا: «لَكُمْ رُؤُوسُ أَمْوَالِكُمْ يَقُولُ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝﴾» ''تمھارے لیے صرف تمھارا مال ہی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو اور جو سود باقی ہے وہ چھوڑ دو اگر تم مومن ہو۔''[2]''

اس نے پوچھا: ''شراب کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ کیونکہ وہ تو ہمارے انگوروں کا نچوڑ ہے اور ہمارے لیے ضروری بھی ہے۔''

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «فَإِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَرَّمَهَا!» ''اللہ تعالیٰ نے اسے حرام قرار دے دیا ہے۔'' پھر یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بے شک شراب اور جوا، آستانے اور فال نکالنے کے تیر، سب گندے کام ہیں اور شیطان کے عمل سے ہیں، پس تم ان سے بچو، تاکہ تم فلاح پاؤ۔''[3]

[1] بني إسرآئيل 32:17. [2] البقرة 278:2. [3] المآئدة 90:5.

یہ سن کر وہ سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک دوسرے سے الگ ہو کر مشورہ کرنے لگے۔

عبدیالیل نے کہا: ''کیا ہم اپنی قوم کی طرف ان تینوں اشیاء کی حرمت کے ساتھ لوٹیں گے۔ اللہ کی قسم! ثقیف تو کبھی بھی شراب اور زنا سے باز نہ آسکیں گے۔''

سفیان بن عبداللہ نے کہا: ''ارے اگر اللہ تعالیٰ ثقیف سے خیر خواہی چاہتا ہے تو وہ ان امور سے باز آ جائیں گے۔ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہنے والے لوگ بھی تو اسی قسم کی کوتاہیوں میں مبتلا تھے۔ اب انھوں نے صبر سے کام لیا ہے اور سابقہ عادات چھوڑ چکے ہیں۔ ہاں دوسری بات یہ بھی ہے کہ ہم اس شخص سے خائف بھی ہیں جس نے ساری زمین کو روند ڈالا ہے۔ ہم ایک جانب قلعہ بند ہیں جبکہ ہمارے اردگرد اسلام پھیلا ہوا ہے۔ بخدا اگر اس نے ہمارے قلعے کا ایک ماہ تک محاصرہ کر لیا تو ہم بھوکوں مر جائیں گے۔ میرا تو خیال یہ ہے کہ صرف اسلام ہی واحد راستہ ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اہل مکہ جیسا دن ہمیں بھی نہ دیکھنا پڑے۔''

رسول اللہ ﷺ اور اس وفد کے درمیان گفتگو خالد بن سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کے ذریعے کی جارہی تھی۔ اس نے مکتوب بھی لکھا۔ رسول اللہ ﷺ انھیں کھانا بھیجتے مگر وہ اس وقت تک ہرگز نہ کھاتے جب تک آپ ﷺ بھی ساتھ نہ کھاتے۔ بالآخر انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔

انھوں نے پوچھا: ''لات کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟'' نبی ﷺ نے فرمایا: «هَدْمَهَا» ''اسے منہدم کر دیا جائے گا۔''

کہنے لگے: ''یہ تو ممکن نہیں۔ اگر اسے معلوم ہو گیا کہ ہم نے اسے گرانے کی کوشش کی ہے تو وہ ہمارے گھر بار تباہ کر ڈالے گا۔'' اس پر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بولے: ''عبدیالیل! تیرا برا ہو، لات تو ایک پتھر ہے۔ اسے یہ معلوم نہیں اس کی کون عبادت کر رہا ہے اور کون نہیں!'' عبدیالیل نے کہا: ''عمر! ہم تیرے پاس تو نہیں آئے۔''

بہر حال وہ سب مسلمان ہو گئے، صلح ہو گئی اور خالد بن سعید رضی اللہ عنہ نے عہد نامہ تحریر کیا۔ جب صلح مکمل ہو گئی اور اسے لکھ لیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنے لگے: ''تین سال تک لات کو چھوڑ دیں اور گرائیں نہیں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا، پھر انھوں نے دو سال کا مطالبہ کر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پھر بھی نہ مانے۔ کہنے لگے: ''ایک سال'' مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پھر بھی نہ مانے۔ وہ ایک ماہ پر آ گئے مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی بھی مدت بطور مہلت دینے سے انکار فرمایا۔ وہ اسے منہدم نہ کر کے اپنی قوم کے بیوقوف لوگوں، عورتوں اور بچوں کی طرف سے مامون ہونا چاہتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اسے گرا کر اپنی قوم کو پریشانی میں مبتلا کریں۔ اب انھوں نے درخواست کی کہ خود ہمیں گرانے کا حکم نہ دیا جائے۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مطالبہ منظور فرما لیا۔ انھوں نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ ہمیں نماز معاف فرما دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: «لَا خَيْرَ فِي دِيْنٍ لَّا صَلَاةَ فِيهِ» ''اس دین میں کوئی بھلائی نہیں جس میں نماز نہیں۔''[2]

وفد ثقیف نے مطالبہ کیا کہ بعض فرائض کی ادائیگی میں ان سے درگزر کیا جائے اور کچھ محرمات ان کے لیے حلال کر دی جائیں مگر وہ اپنے مطالبات میں ناکام رہے اور حقیقت حال کے آگے سرنگوں ہو گئے۔[3]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی انتہائی تکریم کی۔ آتے وقت بھی، پھر جب وہ رہائش پذیر رہے تب بھی اور جب وہ واپس جانے لگے تو بھی بہت اچھی ضیافت کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر میں سب سے چھوٹے مگر قرآن کی تعلیم اور دین کی سمجھ بوجھ کے حامل جوان حضرت عثمان بن ابو العاص رضی اللہ عنہ کو طائف بھر کا امیر مقرر فرمایا۔[4]

[1] المغازي للواقدي: 968/3. [2] مسند أحمد: 218/4، وسنن أبي داود، حديث: 3026، و دلائل النبوة للبيهقي: 5/299-301، ومسند أبي داود الطيالسي، رقم: 939، والمغازي للواقدي: 968/3، والتاريخ الإسلامي للحميدي: 50/8. [3] المجتمع المدني في عهد النبوة للدكتور العمري، ص: 221-223. [4] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 519/2.

وفدِ ثقیف رسول اللہ ﷺ کے حسن سلوک اور مسلمانوں سے میل ملاقات سے بہت متاثر ہوا، حتی کہ انھوں نے رمضان کے مہینے کے روزے بھی رکھے۔ وفد مدینہ منورہ میں پندرہ دن قیام کے بعد واپس طائف لوٹ گیا۔[1]

ان کے واپس جانے پر رسول اللہ ﷺ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی قیادت اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ[2] اور ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ[3] کی شراکت سے ایک چھوٹا سا لشکر تشکیل دیا اور ان کے پیچھے انھیں بھیج دیا۔[4]

جب وفد کی کوشش سے اہلِ ثقیف نے اسلام قبول کر لیا تو انھوں نے ''لات'' کے انجام سے بھی مطلع کر دیا۔ اتنے میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ دس سے کچھ اوپر آدمیوں کو لیے لات کو گرانے کے لیے پہنچ گئے۔[5]

''لات'' کو گرانے کا سارا کام حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کی قوم ''بنومعتّب'' کے زیرنگرانی ہو رہا تھا جو وہیں کھڑے تھے۔ انھیں خطرہ تھا کہ عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرح ان پر بھی تیر نہ چلائے جائیں یا انھیں ویسے ہی زخمی نہ کر دیا جائے۔[6]

بنوثقیف کے تمام مرد، عورتیں اور بچے حتی کہ جوان لڑکیاں بھی وہاں سے نکل گئیں۔ یہ لوگ نئے نئے مسلمان ہوئے تھے، لہٰذا ان کا خیال تھا کہ لات کو گرایا نہیں جا سکتا اور انھیں یقین تھا کہ اسے گرانے والوں کے ہاتھوں سے ضرور ہی بچا لیا جائے گا۔

حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ ایک خوش طبع آدمی تھے۔ وہ اپنے ساتھیوں سے کہنے لگے: ''اللہ کی قسم! میں تمھیں ہنساؤں گا۔'' انھوں نے کدال ماری اور گر کر ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ اہل طائف نے ایک نعرہ مارا اور خوش ہو کر کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ مغیرہ کو ہلاک کرے، لات نے اسے قتل کر دیا ہے۔[7]

---

1 السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 520,519/2. 2 السيرة النبوية لابن هشام: 195/4. 3 المجتمع المدني في عهد النبوة للدكتور العمري، ص:221-223. 4 دلائل النبوة للبيهقي: 304,303/5. 5 المغازي للواقدي: 671/3. 6 دلائل النبوة للبيهقي: 304/5. 7 السرايا والبعوث النبوية للدكتور بريك بن محمد بريك، ص:300.

اور اہل ثقیف لشکر والوں سے کہنے لگے کہ تم میں سے جو بھی اس کے نزدیک جانا چاہتا ہے وہ نزدیک چلا جائے اور اسے گرانے کی پوری کوشش کرے۔ بخدا یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ لات کو گرایا جائے۔ اتنی دیر میں حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ اچھل پڑے اور کہا: ''اے ثقیف کے لوگو! تمھیں اللہ مارے۔ یہ تو صرف پتھر اور مٹی سے بنا ہوا گھٹیا بت ہے، تم اب اللہ تعالیٰ کی عافیت کو قبول کرو اور صرف اسی کی عبادت کیا کرو۔'' [1]

حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے اس طاغوت کو گرا کر زمین کے برابر کر دیا۔

''لات'' کا مجاور ایک جانب کھڑا لات کے تباہ ہونے کا منظر دیکھتا رہا۔ [2]

جب مسلمان اس کی بنیاد تک پہنچے تو وہ مجاور چیخ اٹھا کہ عنقریب جب یہ بنیاد تک پہنچیں گے تو انھیں دھنسا دیا جائے گا۔ [3]

حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے یہ فضول بات سنی تو امیر لشکر سے کہنے لگے: ''آپ مجھے اس کی بنیاد کھودنے دیں۔'' انھوں نے بنیاد کو کھودا اور اس کی مٹی نکال دی اور اس میں چھپا زیور قابو کر لیا، ثقیف یہ دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئے۔ [4]

مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں بھیجا ہوا دستہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وہاں کے زیورات اور غلاف وغیرہ لے آیا جنھیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی روز تقسیم کر دیا۔ وفد نے اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی اور اس کے رسول کی نصرت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ [5]

اس طرح جزیرۃ العرب کے دوسرے بڑے بت ''لات'' کا کام تمام ہوا اور اس کی جگہ خدا کا ایک گھر تعمیر ہو گیا۔ جس کا حکم آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گورنر طائف حضرت عثمان بن ابوالعاص رضی اللہ عنہ کو دیا تھا کہ جس جگہ ان کا بت تھا اس جگہ مسجد طائف بنا دو۔ [6]

1 دلائل النبوة للبيهقي:303/5. 2 السرايا والبعوث النبوية للدكتور بريك بن محمد بريك، ص:300. 3 المغازي للواقدي:972/3. 4 دلائل النبوة للبيهقي:303/5، و السرايا والبعوث النبوية للدكتور بريك بن محمد بريك، ص:301. 5 السرايا والبعوث النبوية للدكتور بريك بن محمد بريك، ص:300. 6 سنن أبي داود، حديث:450، وسنن ابن ماجه، حديث:743.

رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کی موت

شوال 9 ھ کی چند راتیں باقی تھیں کہ عبداللہ بن ابی بیمار ہوا اور ذوالقعدہ 9 ھ میں مر گیا۔[1]

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عبداللہ بن ابی کی عیادت کے لیے گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا:

«قَدْ كُنْتُ أَنْهَاكَ عَنْ حُبِّ يَهُودَ»

''میں نے تجھے یہود کی محبت سے منع کیا تھا۔''

اس نے جواب دیا: ''سعد بن زرارہ (رضی اللہ عنہ) نے ان سے نفرت کی ہے۔'' یہ کہنا تھا کہ وہ مر گیا۔

ابن اُبی مر گیا تو اس کے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کیا: ''آپ مجھے اپنی قمیص دیں تاکہ میں اس میں اپنے باپ کو کفن دوں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قمیص دے دی۔[2] اس نے عرض کیا: ''آپ اس کی نماز جنازہ پڑھائیں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی نماز جنازہ پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اٹھ کر آپ کا کپڑا پکڑ لیا اور عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! آپ اس کی نماز جنازہ پڑھیں گے، حالانکہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے؟'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِنَّمَا خَيَّرَنِي اللّٰهُ فَقَالَ:

﴿ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ ﴾ وَسَأَزِيدُهُ عَلَى السَّبْعِينَ»

---

[1] تاريخ الإسلام (المغازي) للذهبي، ص:659. [2] سنن أبي داود، حديث:3094.

''میرے رب نے مجھے اختیار دیا ہے اور فرمایا ہے:''(اے نبی!) آپ ان کے لیے بخشش مانگیں یا نہ مانگیں (برابر ہے۔) اگر آپ ان کے لیے ستر بار (بھی) بخشش مانگیں گے تو بھی اللہ انھیں نہیں بخشے گا۔ یہ اس لیے کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''[1] اور آج میں اس کے لیے ستر دفعہ سے بھی زیادہ مغفرت کی دعا کروں گا۔''

عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''یہ تو منافق ہے۔'' مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نمازِ جنازہ پڑھی۔ تب اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل فرمایا:

﴿ وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ﴾

''اور (اے نبی!) ان میں سے جو مرجائے آپ اس کی نماز (جنازہ) ہرگز نہ پڑھیں اور نہ کبھی اس کی قبر پر کھڑے ہوں۔''[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ظاہراً مسلمان ہونے کو دیکھتے ہوئے اس کی نماز جنازہ پڑھی اور یہ بھی کہ اس کا بیٹا عبداللہ رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابی تھا۔ اس کی تکریم بھی مقصود تھی۔اس نے غزوۂ بنو مصطلق کے موقع پر اپنے باپ کی بدگوئی پر اسے قتل کرنے کی اجازت بھی چاہی تھی۔ اس میں اور بھی مصلحت تھی یعنی اس کی قوم اور دیگر طرف داروں کی تالیف قلبی بھی مقصود تھی۔ منافقین کا ایک بڑا گروہ اس کا طرفدار و حمایتی تھا۔ بہتر سلوک سے توقع تھی کہ وہ متاثر ہوں گے اور اپنے نفاق سے باز آ جائیں گے۔

اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ممانعت سے پہلے ہی نماز جنازہ نہ پڑھتے اور اس کے بیٹے کی فرمائش قبول نہ کرتے تو یہ امر اس کے بیٹے اور قوم کے لیے عار کا باعث ہوتا، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو امور میں سے بہتر کو اختیار کیا تا آنکہ صراحتاً اس سے روکا گیا تو رک گئے۔[3]

[1] التوبة 9:80. [2] التوبة 9:84، صحيح البخاري، حديث: 4670، وصحيح مسلم، حديث: 2400. [3] السيرة النبوية لأبي شهبة: 2/533-534.

قمیص کا معاملہ یہ تھا کہ اسے قمیص نہ دینا بخل کے زمرے میں آتا تھا، جبکہ رسول اللہ ﷺ کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ کسی بھی ضرورت مند کو کبھی بے مراد نہ لوٹاتے تھے۔ اسی طرح ابن ابی کے اس احسان کا بدلہ چکانا بھی مقصود تھا جو اس نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے بدر میں قیدی بن کر آتے وقت انھیں قمیص دے کر کیا تھا۔ آپ ﷺ اور جملہ اہل بیت کی عادت مبارکہ تھی کہ احسان کا بدلہ بہتر احسان سے دیتے تھے۔[1]

ابن ابی کی موت کے ساتھ ہی نفاق کی تحریک دم توڑ گئی۔

10 ھ میں منافقین کی کوئی واضح موجودگی نظر نہیں آتی، چند ایک غیر معروف افراد باقی رہ گئے تھے جن کا علم راز دار نبوت حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہما کو تھا۔[2]

بعدازاں جب کسی شخص کے حوالے سے صورت حال واضح نہ ہوتی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ صرف اس کا جنازہ پڑھتے جس کا جنازہ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہما پڑھتے۔[3]

9 ھ میں تو تحریک نفاق کا صفایا ہو گیا۔ اسلام کو استحکام حاصل ہوا اور اسلام پورے عرب پر غالب آ گیا۔[4]

امام ابن قیم نے منافقین کے متعلق ان الفاظ میں وضاحت فرمائی ہے: ''اسلام نے حکم دیا ہے کہ ان کے ظاہر کو قبول کیا جائے اور باطن اللہ کے سپرد کر دیا جائے۔ ان سے یقین اور حجت کے ساتھ جہاد کیا جائے، ان سے پہلو تہی برتتے ہوئے دلوں تک رسائی رکھنے والی نصیحت کی جائے، ان کے جنازے نہ پڑھے جائیں، دعائے مغفرت نہ کی جائے کیونکہ اللہ رب العزت انھیں ہرگز معاف نہیں کرے گا۔''[5]

منافقین کے متعلق اس طرح کے احکام سورۂ توبہ کی روشنی میں ہیں۔ سورۂ توبہ آدھی سے زیادہ منافقین کی عادات، حیلے بہانے، نظریات، اسلام دشمنی، جنگوں اور خصوصاً غزوۂ

1 صحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص:622,621، والسيرة النبوية لأبي شهبة:534/2.
2 دراسات في عهد النبوة للشجاع، ص:221. 3 من معين السيرة لصالح الشامي، ص:464.
4 دراسات في عهد النبوة للشجاع، ص:269. 5 زادالمعاد:91/2.

تبوک سے پیچھے رہنے کے اسباب، غزوۂ تبوک سے پہلے اور بعد ان کا موقف اور اس کی حقیقت، اسلامی صفوں میں انتشار کی کوششیں، رسول اللہ ﷺ کو ایذا پہنچانے کی کوشش اور دنیا و آخرت میں ان کے ہولناک انجام پر مشتمل ہے۔ [1]

منافقین کا معاملہ اور احکام و مسائل

نماز جنازہ پڑھنے کی ممانعت: ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا تُصَلِّ عَلَىٰٓ أَحَدٍ مِّنْهُم مَّاتَ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَىٰ قَبْرِهِۦٓ ۖ إِنَّهُمْ كَفَرُوا۟ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ وَمَاتُوا۟ وَهُمْ فَٰسِقُونَ ۝ وَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَٰلُهُمْ وَأَوْلَٰدُهُمْ ۚ إِنَّمَا يُرِيدُ ٱللَّهُ أَن يُعَذِّبَهُم بِهَا فِى ٱلدُّنْيَا وَتَزْهَقَ أَنفُسُهُمْ وَهُمْ كَٰفِرُونَ ۝ ﴾

''اور (اے نبی!) ان میں سے جو مر جائے آپ اس کی نماز (جنازہ) ہرگز نہ پڑھیں اور نہ کبھی اس کی قبر پر کھڑے ہوں۔ بے شک انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا اور وہ حالت فسق میں مرے۔ اور (اے نبی!) ان کے مال اور ان کی اولاد آپ کو حیرت میں نہ ڈالیں۔ بے شک اللہ تو چاہتا ہے کہ ان کی وجہ سے انھیں دنیا میں عذاب دے اور ان کی جانیں حالت کفر میں نکلیں۔'' [2]

منافقین کی مسجد کو گرانا: اس سے مراد مسجد ضرار ہے جو منافقین نے تعمیر کی تھی۔

کفار کی طرح جنگ کرنے کا حکم: ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِىُّ جَٰهِدِ ٱلْكُفَّارَ وَٱلْمُنَٰفِقِينَ وَٱغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۚ وَمَأْوَىٰهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ ٱلْمَصِيرُ ۝ ﴾

''اے نبی! کفار اور منافقین سے جہاد کیجیے اور ان پر سختی کیجیے اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔'' [3]

1 المنافقون لمحمد جميل غازي، ص:92، 93. 2 التوبة 9:84، 85. 3 التحريم 9:66.

منافقین کے اعمال و عادات کی کھل کر وضاحت: جیسا کہ سورۂ توبہ میں بھی ذکر ہوا ہے کہ یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے مسلمانوں کو جہاد میں نہ جانے کی ترغیب دی تھی اور یہی وہ لوگ تھے جو مسلمانوں کے صدقات پر عیب جوئی کرتے تھے۔ اور قول و فعل سے آپ ﷺ کو ایذا پہنچاتے تھے۔"[1]

9 ھ میں منافقین اور تحریک نفاق سے سلوک کا یہ نبوی طریقہ کار تھا۔

رسول اللہ ﷺ کا ازواج مطہرات کو اختیار دینا (نبوی گھرانوں سے سبق)

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ○ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ○ ﴾

"اے نبی! اپنی بیویوں سے کہہ دیجیے: اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ میں تمھیں کچھ (دنیوی) فائدہ دوں اور تمھیں اچھے طریقے سے رخصت کردوں۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور آخرت کے گھر کو چاہتی ہو، تو اللہ نے تم میں سے نیک کام کرنے والیوں کے لیے بہت بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔"[2]

صحیح احادیث سے پتا چلتا ہے کہ یہ دونوں آیات رسول اللہ ﷺ کے ازواج مطہرات سے الگ ہونے کے بعد نازل ہوئی تھیں۔ آپ ﷺ نے قسم کھا لی تھی کہ ایک ماہ تک ازواج کے پاس نہ جائیں گے، چنانچہ آپ ﷺ ان سے بالا خانے میں الگ ہو گئے۔[3]

ان آیات کا سبب نزول ازواج مطہرات کا گھریلو نفقہ و اخراجات میں بڑھوتری کا مطالبہ بنا۔ امام مسلم رحمہ اللہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ حضرت

1 دراسات في عهد النبوة للشجاع، ص:220. 2 الأحزاب 33:28,29. 3 قضايا نساء النبي والمؤمنات لحفصة بنت عثمان، ص:51.

ابوبکر رضی اللہ عنہ آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاضر ہونے کی اجازت چاہی، ادھر لوگوں کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر جمع ہیں کسی کو اندر جانے کی اجازت نہ ملی تھی۔ مگر ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اجازت مل گئی تو وہ اندر چلے گئے، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے اجازت چاہی۔ انھیں بھی اجازت مل گئی۔ انھوں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غمگین ہیں اور چپ چاپ تشریف فرما ہیں۔ ازواج مطہرات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد بیٹھی ہیں۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دل میں کہا کہ میں ایسی بات کہوں گا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہنسا دوں گا، لہٰذا انھوں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! کاش آپ اس وقت ہوتے جب خارجہ کی بیٹی (حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زوجہ) نے مجھ سے خرچ طلب کیا تو میں نے کھڑے ہو کر اس کا گلا دبا دیا۔ (یہ سن کر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہنس دیے اور گویا ہوئے: «هُنَّ حَوْلِي كَمَا تَرٰى يَسْأَلْنَنِي النَّفَقَةَ» ''یہ سب جو میرے گرد جمع ہیں تم دیکھ ہی رہے ہو، یہ مجھ سے خرچ مانگ رہی ہیں۔'' ابوبکر رضی اللہ عنہ کھڑے ہو کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا گلا دبانے لگے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہو کر حفصہ کا گلا گھونٹنے لگے۔ دونوں اپنی اپنی بیٹیوں سے کہنے لگے: ''کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ چیز طلب کرتی ہو جو آپ کے پاس نہیں۔'' وہ کہنے لگیں: ''اللہ کی قسم! ہم کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی چیز نہ مانگیں گی جو آپ کے پاس نہیں ہے۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے ایک ماہ یا انتیس روز جدا رہے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مذکورہ آیات نازل ہوئیں۔ [1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں کی معاشی حالت ایک جیسی رہتی تھی۔ اگرچہ بعض اوقات فراوانی کے کافی امکانات موجود ہوتے تھے۔

ازواج مطہرات کے گھر انتہائی چھوٹے تھے۔ دکتور ابو شہبہ ان کی حالت بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد کے اردگرد ہی گھر تعمیر کر رکھے تھے۔ وہ کوئی بادشاہوں، رومی و ایرانی حکمرانوں کے محلات کے مانند نہ تھے بلکہ دنیا اور اس کی زینت سے بالاتر

[1] صحيح مسلم، حديث: 1478، ومسند أحمد: 328/3.

رہنے والے اور آخرت کے متلاشی گھرانے تھے۔ یہ گھر مسجد نبوی کی طرح پتھر اور گارے کے بنے ہوئے تھے۔ جن کی چھتیں کھجور کے تنوں اور ٹہنیوں سے بنی ہوئی تھیں۔ بوسیدگی کے قریب تر، بہت تھوڑے بلند، بڑا بچہ ہاتھ لمبا کرے تو اونچائی کو پہنچ سکتا تھا۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی لونڈی خیرہ رضی اللہ عنہا کا ایک بیٹا تھا جو وہاں ان کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ازواج مطہرات کے حجروں میں سے جس کی چھت سب سے بلند تھی، میں اس کی چھت کو ہاتھ لگا سکتا تھا۔ ہر حجرے کے دو دو دروازے تھے ایک اندر کو مسجد کی جانب تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آسانی سے مسجد میں تشریف لاسکیں اور ایک باہر کو۔[1]

رہی بات روشنی کی تو روشنی کے لیے وہاں چراغ تو تھا ہی نہیں۔ بخاری شریف کی یہ حدیث اسی بات پر دلالت کرتی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے (لیٹی) ہوتی اور میرے پاؤں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے قبلے کی طرف ہوتے۔ جب آپ سجدہ کرنے کا ارادہ فرماتے تو میرے پاؤں پر کچوکا مارتے اور میں پاؤں سمیٹ لیتی۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو جاتے تو میں پاؤں پھیلا لیتی تھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ ان دنوں گھروں میں چراغ نہیں ہوتے تھے۔[2]

نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم جس بستر پر آرام فرماتے تھے رسیوں پر مشتمل چٹائی تھی جس پر بچھانے کے لیے کوئی اور کپڑا نہ ہوتا تھا۔ اس سے آپ کے پہلوئے مبارک پر نشان پڑ جاتے۔ کھجور کی چھال سے بھرے تکیے سے آپ ٹیک لگاتے۔[3]

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نہیں جانتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی بھر میدے کی پکی روٹی دیکھی اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آنکھوں سے مکمل بھونی ہوئی بکری دیکھی۔[4]

---

1 السيرة النبوية لأبي شهبة:2/35,36. 2 صحيح البخاري، حديث:382، و صحيح مسلم، حديث:(272)-512. 3 صحيح البخاري، حديث:6456، و صحيح مسلم، حديث:2082.
4 صحيح البخاري، حديث:6457.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ دو دو مہینے اس طرح گزرتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں چولھا تک نہ جلتا۔ حضرت عروہ بن زبیر نے دریافت کیا: ''تو پھر آپ کیا کھاتے تھے؟'' فرمایا: ''کھجور اور پانی۔''[1]

یہ بات بھی ہے کہ جب خیبر فتح ہوا اور فتح مکہ اور غزوۂ تبوک بھی ہو چکے تو مال کی فراوانی ہو گئی تھی اور ازواج مطہرات کو تلاوتِ قرآنِ پاک سے یہ سمجھ بھی آ رہی تھی کہ فضول خرچی کیے بغیر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے مستفید ہونا کوئی گناہ نہیں ہے تو ان کے دلوں میں بھی اس فراوانی سے اپنا حصہ طلب کرنے کی چاہت پیدا ہوئی، مال اور فراوانی سے مستفید ہونے کے حوالے سے ارشاد ربانی ہے:

﴿ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۝ ﴾

''اے بنی آدم! تم ہر نماز کے وقت اپنی زینت اختیار کرو اور کھاؤ اور پیو اور فضول خرچی نہ کرو، بے شک وہ (اللہ تعالیٰ) فضول خرچی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''[2]

اور اسی طرح اللہ تعالیٰ نے رزق میں سے پاکیزہ اشیاء کھانے کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

﴿ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۚ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ ﴾

''(اے نبی!) کہہ دیجیے: جو زینت اور کھانے پینے کی پاکیزہ چیزیں اللہ نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہیں، وہ کس نے حرام کی ہیں؟ کہہ دیجیے: یہ (پاکیزہ چیزیں) دنیا کی زندگی میں ان لوگوں کے لیے بھی ہیں جو ایمان لائے، جبکہ

[1] صحيح البخاري، حديث:6459. [2] الأعراف7:31.

قیامت کے دن یہ خالص مومنوں ہی کے لیے ہوں گی، اسی طرح ہم آیات کو ان لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔'' [1]

اور اللہ تعالیٰ نے نفقہ وخرچ میں میانہ روی اور اعتدال اختیار کرنے کی رغبت دلاتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا ۝ ﴾

''اور اپنا ہاتھ اپنی گردن کے ساتھ بندھا نہ رکھ اور نہ اسے پوری طرح کھول دے کہ پھر ملامت زدہ، تھکا ہارا ہو کر بیٹھ رہے۔'' [2]

مگر دوسری طرف قرآن پاک میں رسول اللہ ﷺ سے متعلق اللہ تعالیٰ کی رہنمائی کا ایک پہلو اور بھی ہے جس کی بنا پر آپ نے ان مباح چیزوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ آپ ﷺ کو یہی ادبِ ربانی تھا۔ ارشاد ہے:

﴿ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ ۝ ﴾

''اور ہم نے مختلف قسم کے لوگوں کو جو مال ومتاع دیا ہے اس کی طرف آپ اپنی نظریں نہ اٹھائیں اور نہ ان (کی حالت) پر غم کھائیں اور اپنے (پُر شفقت) بازو مومنوں کے لیے جھکائے رکھیں۔'' [3]

اور فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ ۚ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ۝ ﴾

''اور (اے نبی!) ان چیزوں کی طرف آپ اپنی نگاہیں نہ اٹھائیں جو چیزیں

[1] الأعراف 7:32. [2] بني إسرائيل 17:29. [3] الحجر 15:88.

زندگانی دنیا کی آرائش کی ہم نے ان میں سے مختلف قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہیں، تاکہ ہم انھیں ان کے ذریعے سے آزمائیں اور آپ کے رب کا رزق بہتر اور باقی رہنے والا ہے۔''[1]

اسی لیے تخییر کی آیات نازل ہوئیں تو ازواج مطہرات اس اختیار کے مسئلے میں بلاتردد اپنے مضبوط موقف پر قائم رہیں اور انھوں نے اللہ تعالیٰ، اس کے رسول ﷺ اور آخرت کو پسند کیا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے نفقہ بڑھانے کا مطالبہ کر رہی تھیں لیکن جب معاملہ دو میں سے ایک کے انتخاب تک پہنچا یعنی دنیا کی زینت اور یہی زندگانی یا اللہ تعالیٰ، اس کے رسول مقبول ﷺ اور آخرت کا گھر تو انھوں نے دوسری چیز اختیار کرنے میں لمحہ بھر تردد نہ کیا بلکہ سب نے بیک زبان کہا:

''ہم اللہ تعالیٰ، اس کے رسول ﷺ اور آخرت کی خواہش مند ہیں۔''[2]

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے حکم ہوا کہ اپنی بیویوں کو اختیار دیں تو آپ ﷺ نے سب سے پہلے مجھ سے پوچھا، آپ ﷺ فرمانے لگے: «إِنِّي ذَاكِرٌ لَّكِ أَمْرًا، فَلَا عَلَيْكِ أَلَّا تَعْجَلِي حَتّٰى تَسْتَأْمِرِي أَبَوَيْكِ» ''عائشہ! میں تجھ سے ایک بات کہنے والا ہوں تو اس کے بارے میں اپنے ماں باپ سے مشورہ کر لے۔ جلدی جواب دینا ضروری نہیں۔'' حالانکہ آپ ﷺ خوب جانتے تھے کہ میرے ماں باپ آپ ﷺ سے الگ ہونے کی رائے کبھی نہ دیں گے۔ حضرت ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں تو پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''ارشادِ خداوندی ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ○ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ○﴾

1 طٰهٰ 131:20. 2 قضايا نساء النبي والمؤمنات لحفصة بنت عثمان، ص: 77.

''اے نبی! اپنی بیویوں سے کہہ دیجیے: اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ میں تمھیں کچھ (دنیوی) فائدہ دوں اور تمھیں اچھے طریقے سے رخصت کردوں۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور آخرت کے گھر کو چاہتی ہو، تو اللہ نے تم میں سے نیک کام کرنے والیوں کے لیے بہت بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔''[1]

میں نے کہا: ''بھلا اس کے بارے میں میں اپنے والدین سے رائے لوں گی۔ میں تو اللہ تعالیٰ، اس کے رسول ﷺ اور آخرت کی طلبگار ہوں۔'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں، پھر آپ ﷺ کی تمام بیویوں نے وہی جواب دیا جو میں نے دیا تھا۔[2]

امہات المومنین کے اس موقف سے ان کی قوتِ ایمانی اور اللہ کے ساتھ اخلاص کی واضح عکاسی ہوگئی۔ آیات تخییر میں اس بات کا وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر وہ دنیاوی زیب و زینت کی خواہاں ہیں تو وہ انھیں ان کی خواہش کے مطابق دے دی جائے گی اور اسی طرح ان آیات میں اجر کے حوالے سے وضاحت ہے کہ وہ نیکوکاروں کے لیے ہے اور یہ امہات المومنین کی نیکی کی ایک صورت ہی ہے کہ انھوں نے اللہ، اس کے رسول ﷺ اور آخرت کے دن کو ترجیح دی۔ اور اسی طرح ان کا ازواج رسول ہونا بھی اس اجر کے لیے کافی ہے۔[3]

''اجر عظیم'' کا وعدہ دراصل ان کے دنیاوی زیب و زینت اور ساز و سامان کے مطالبے کو ترک کر دینے کی طرف ترغیب ہے اور اجر میں عظمت کا اندازہ صرف اللہ تعالیٰ ہی لگا سکتے ہیں اور یہ دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی اور اچھائی کو شامل ہے۔[4]

خلفائے راشدین نے ''قصہ تخییر'' کو ایک مشفقانہ نبوی منہج خیال کیا ہے اور یہ وہ اعلیٰ نشان ہے جسے قائدین امت کو اپنانا چاہیے۔ تاریخ پر گہری نگاہ ڈالنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ ایک انتہائی لطیف پہلو ہے اور اس سے ''استقامت علی الھدایۃ'' سے قریب یا دور

---

1 الأحزاب 29,2833. 2 صحيح البخاري، حديث:4786، و صحيح مسلم، حديث:1475.
3 قضايا نساء النبي والمؤمنات لحفصة بنت عثمان، ص:79. 4 تفسير السعدي:148/5.

ہونے کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ تاریخ اسلامی جب مومن قائدین کی حامل تھی اس وقت اس منہج کا بخوبی خیال رکھا جاتا تھا۔ خلافت راشدہ میں اس کی عملی اور فعلی اس قدر مثالیں ہیں کہ تلاش کرنے والے کو کوئی دشواری نہ ہوگی۔[1]

امت کی قیادت ایک ذمہ داری اور بوجھ ہے مفت ملنے والی چیز نہیں، جو لوگ اس منصب پر فائز ہوتے ہیں انھیں دنیاوی گھٹیا ساز و سامان کے مقابلے میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور آخرت کا شوق رکھنا چاہیے۔[2]

حج صدیق اکبر رضی اللہ عنہ

زمانہ نبوی میں معاشرے کی تربیت اور تکمیل تمام پہلوؤں، مثلاً: عقیدہ، اقتصاد، اجتماعیت، سیاست، فوج وغیرہ میں جاری تھی، مگر فریضہ حج کسی خاص منہج پر نہ تھا۔ اور 8 ھ کا حج عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ نے اس طرح ادا کروایا جس طرح مشرکین مکہ کے دور میں ہوتا تھا۔ کوئی خاص جداگانہ طریقہ نہ تھا۔[3]

جب اگلے سال حج کا وقت آیا تو آپ ﷺ نے چاہا کہ میں حج کروں مگر پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّهُ يَحْضُرُ الْبَيْتَ عُرَاةٌ مُّشْرِكُونَ يَطُوفُونَ بِالْبَيْتِ فَلَا أُحِبُّ أَنْ أَحُجَّ حَتّٰى لَا يَكُونَ ذٰلِكَ»

''مشرکین بھی آئیں گے اور بیت اللہ کا ننگے طواف کریں گے لہٰذا میں نہیں پسند کرتا کہ ایسی حالت میں حج کروں۔''

آپ ﷺ نے 9 ھ کو ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حج کا امیر بنا کر روانہ فرمایا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ صحابہ کرام کی

---

1 البدايه والنهاية: 136/7. 2 من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 475. 3 السيرة النبوية لأبي شهبة: 536/2، والدراسات في عهد النبوة للشجاع، ص: 222.

کثیر تعداد کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہوئے۔[1] قربانی کے جانور بھی ساتھ تھے۔[2]

جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حجاج کے قافلے سمیت روانہ ہو چکے تو سورۂ توبہ نازل ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلایا اور انھیں حکم دیا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ سے جا ملو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی ''عضباء'' پر روانہ ہوئے اور ذوالحلیفہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے جا ملے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: ''امیر یا ماتحت۔'' کہا: ''ماتحت'' پھر وہ دونوں چلتے رہے۔ اس سال صحیح روایات کے مطابق حج ذوالحجہ ہی میں ہوا تھا نہ کہ ذوالقعدہ میں جیسا کہ یہ بات کہی جاتی ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے 8 ذوالحج سے پہلے، عرفات کے دن، قربانی کے دن اور پھر گیارہ ذوالحج کو بھی خطبات دیے۔ وہ لوگوں کو بتاتے کہ حج کیسے کرنا ہے، کہاں کیسے ٹھہرنا ہے، واپس ہونے کے آداب کیا ہیں؟ اسی طرح قربانی، منیٰ سے واپسی اور کنکریاں مارنے کے آداب سمجھاتے۔

ان کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہر جگہ لوگوں کے سامنے سورۂ توبہ (براءت) کی ابتدائی آیات تلاوت فرماتے اور پھر ان چار امور کا اعلان فرماتے: ''مومن کے سوا کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا اور نہ کوئی آئندہ برہنہ ہو کر بیت اللہ کا طواف کرے گا اور جس کسی کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عہد ہے اس کی مدت تک اس کا عہد برقرار رہے گا۔ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے گا۔''[3]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور چند دیگر صحابہ کو بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ذمہ داری نبھانے کے لیے معاون بنا دیا۔[4]

---

1 نضرة النعيم:398/1، والطبقات الكبرى:168/2. 2 فتح الباري:82/8. 3 جامع الترمذي، حديث:871 و3092، ومسند أحمد:79/1، ومسند أبي يعلى، رقم:452. 4 السيرة النبوية لأبي شهبة:537/2.

سورۂ توبہ کی ابتدائی آیات میں شرک اور مشرکین کے ساتھ تعلقات کلیتاً ختم کر لینے کا اعلان ہے۔ اس طرح اس میں ان کے حج کرنے پر پابندی لگا دی گئی اور ان کے ساتھ اعلان جنگ کر دیا گیا ہے۔[1]

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ اعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ ○ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَرَسُوْلُهٗ ؕ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ○ ﴾

''(اے مسلمانو!) جن مشرکین سے تم نے عہد کر رکھا تھا، اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان سے (اعلان) براءت ہے۔ چنانچہ (اے مشرکو!) تم زمین میں چار ماہ چل پھر لو اور جان لو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے اور یہ کہ اللہ کافروں کو رسوا کرنے والا ہے۔ اور حج اکبر کے دن اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے لوگوں کے لیے اعلان ہے کہ بلاشبہ اللہ اور اس کا رسول مشرکوں سے بری ء الذمہ ہیں، لہٰذا (اے مشرکو!) اگر تم توبہ کر لو تو یہ تمھارے لیے بہتر ہے اور اگر تم نے (حق سے) منہ موڑے رکھا تو جان لو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے۔ اور (اے نبی!) آپ ان کافروں کو دردناک عذاب کی خبر سنا دیں۔''[2]

جن لوگوں سے معاہدے ہو چکے تھے انھیں مدت کے اختتام تک کی مہلت دی گئی۔

ارشاد ہے:

[1] نضرة النعيم: 399/1. [2] التوبة 9:1-3.

﴿ اِلَّا الَّذِیْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ ثُمَّ لَمْ یَنْقُصُوْكُمْ شَیْــٴًـا وَّ لَمْ یُظَاهِرُوْا عَلَیْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْۤا اِلَیْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ ۝ ﴾

”لیکن جن مشرکوں سے تم نے عہد کیا ہے، پھر انھوں نے تمھارے حق میں کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمھارے مقابلے میں کسی کی مدد کی تو ان سے (مقررہ) مدت تک ان کا عہد پورا کرو۔ بے شک اللہ متقیوں کو پسند کرتا ہے۔“[1]

اسی طرح جن مشرکین کے ساتھ کوئی معاہدہ نہ تھا انھیں حرمت والے مہینے گزرنے تک کی مہلت دی اور اس کے بعد ان کی حالت ایسے ہوگی جیسے وہ مسلمانوں کے ساتھ حالت جنگ میں ہوں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِیْلَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ ﴾

”پھر جب حرمت والے مہینے گزر جائیں تو تم مشرکین کو جہاں کہیں پاؤ قتل کر دو اور انھیں پکڑ لو اور ان کا محاصرہ کر لو اور ہر گھات کی جگہ ان کی تاک میں بیٹھے رہو، پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکاۃ دیں تو ان کی راہ چھوڑ دو۔ بے شک اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔“[2]

عرب کے عام رواج کے مطابق معاہدہ کرنے یا توڑنے کا کام سردار یا اس کا خاندانی رشتہ دار انجام دیتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے سب مشرکوں تک معاہدات ختم کرنے کا اعلان پہنچانے کے لیے حج کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا۔ عربوں کا یہ رواج چونکہ اسلام کے منافی نہ تھا، لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے اسے باقی رکھا۔

1 التوبة 4:9. 2 التوبة 5:9.

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سورۂ براءت (توبہ) کی ابتدائی آیات دے کر روانہ کرنے کا مقصد وہ نہ تھا جس کا رافضی لوگ خیال کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر کی نسبت خلافت کے زیادہ حق دار ہیں۔ ڈاکٹر محمد ابوشہبہ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مجھے معلوم نہیں کہ یہ کہنے والے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی یہ بات کیسے بھول گئے جو انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھی تھی کہ آپ امیر ہیں یا مامور۔ تو پھر مامور، امیر کی نسبت خلافت کا زیادہ حق دار کیسے ہو گیا؟ [1]

یہ حج حجۃ الوداع کے لیے مقدمے کی حیثیت رکھتا تھا۔ [2]

ابوبکر رضی اللہ عنہ کی امارت میں حج کے دوران یہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ بتوں کا زمانہ بیت چکا ہے اور ایک نیا دور شروع ہو چکا ہے۔ لوگوں کے سامنے اب ایک ہی راستہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شریعت پر لبیک کہیں۔ عربی قبائل نے یقین کر لیا کہ اسلام غالب ہو کر رہے گا۔ اور واقعی بت پرستی کا زمانہ گزر چکا ہے، چنانچہ قبائل قبولِ اسلام اور عقیدۂ توحید اختیار کرنے کے اعلان کے ساتھ اپنے اپنے وفود بارگاہِ رسالت میں بھیجنے لگے۔ [3]

9 ھ وفود کا سال

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کر لیا اور تبوک سے فارغ ہوئے اور بنوثقیف اسلام لے آئے اور بیعت کر لی۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین عرب کے لیے چار ماہ کی مدت مقرر فرما دی تا کہ وہ اسلامی حکومت کے حکم نافذ کرنے سے پہلے پہلے خود ہی اپنے لیے ایک راہ متعین کر لیں۔ اب عرب کے وفد اعلانِ ایمان اور حکومت اسلام سے منسلک ہونے کے لیے ہر جانب سے آنے لگے۔ [4]

1 السيرة النبوية لأبي شهبة: 540/2. 2 السيرة النبوية لأبي شهبة: 540/2. 3 قراءة سياسية للسيرة النبوية للدكتور قلعجي، ص: 283. 4 السيرة النبوية لأبي شهبة: 284.

وفود کی حتمی تاریخ اور تعداد میں علماء کا اختلاف ہے۔بعض تاریخی مصادر سے اشارہ ملتا ہے کہ کچھ وفد 9ھ سے پہلے ہی مدینہ منورہ آئے تھے، اس لیے وفود کی تعداد میں بھی اختلاف ہے۔بعض کے بقول کل تعداد ساٹھ جبکہ دیگر مورخین کے ہاں یہ تعداد سو سے بھی زائد ہے۔ممکن ہے بعض نے صرف مشہور وفود کا تذکرہ کیا ہو۔[1]

ابن اسحاق کا بیان ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے مکہ فتح کیا اور تبوک سے فارغ ہوئے، ثقیف اسلام لے آئے اور بیعت کر لی تو ہر طرف سے عربوں کے وفود آپ کے پاس آنے لگے۔[2]

ابن سعد نے وفود کے متعلق تمام معلومات جمع کی ہیں اور ان کی تفصیل بھی ذکر کی ہے، وفود میں شریک افراد کے حالات ذکر کیے ہیں اور ان میں سے جو شرف صحابیت سے مشرف ہوئے ان کا تذکرہ بھی کیا ہے۔اور پھر وہ روایات جمع کی ہیں جو ان کے ذریعے موصول ہوئیں۔ابن سعد کی روایات میں ثقات بھی ہیں مگر اسناد جرح وطعن سے محفوظ نہیں۔[3]

بلاشبہ مورخین کی ذکر کردہ روایات محدثین کے اندازِ تحقیق اور معیار صحت پر نہیں پہنچتیں۔لیکن بایں ہمہ ان وفود کے متعلق خاصی تعداد میں روایات ثابت اور صحیح ہیں۔[4]

مثلاً امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں وفدِ تمیم کی آمد کا ذکر کیا ہے اور اسی طرح دیگر وفود، عبدالقیس، بنوحنیفہ، نجران، اشعریین، اہل یمن اور وفد دوس کا تذکرہ کیا ہے۔[5]

کتبِ سیر و مغازی اور دیگر تاریخی مصادر میں ذکر آنے سے ان وفود کی معلومات میں مزید اضافہ ہوا اور ان کے متعلق یقین حاصل ہو گیا ہے۔[6]

یہ مسئلہ باقی رہ جاتا ہے کہ وفود سے متعلق تفصیلی روایات کی تاریخی حیثیت اور ان پر تنقید کا اہتمام کیا جائے۔[7]

---

1 نضرة النعيم: 396/1. 2 البداية والنهاية: 47,46/5. 3 نضرة النعيم: 397/1. 4 السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 542/2. 5 صحيح البخاري، حديث: 4365 و 4368 و 4372 و 4392. 6 ملاحظہ کیجیے: البداية والنهاية: 5/40-98. 7 السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 544/2.

وفود کے واقعات والی روایات میں تعلیم و تربیت، گہری سوچ بوجھ، دلوں کو ایک مرکز پر اکٹھا کرنے، افراد کو جوڑنے اور اسلام سے وابستہ رکھنے والی سوچ اور فقہ کا گرانمایہ سرمایہ موجود ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ نجی، اجتماعی، اقتصادی، تنظیمی و دفتری، سیاسی و عسکری اور دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے لیے وافی و شافی اصول و ضوابط موجود ہیں جو انھیں دیگر باتوں سے مستغنی کر دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔[1]

بایں ہمہ 9ھ "وفودِ عرب کا سال" کے طور پر مشہور ہے۔ استقبال کی صورت یہ تھی کہ آنے والوں کی رہائش کے لیے مہمان خانہ تھا۔[2]

جس میں وفود اقامت کرتے۔ مسجد نبوی آنے والوں کے لیے کھلا صحن تھا۔ اور بعض آنے والوں کے لیے کچھ صحابہ کو رضا کارانہ اور کچھ کو حکماً مہمان نوازی کا فریضہ سونپا جاتا تھا۔[3]

رسول اللہ ﷺ نے ان وفود کو بڑی اہمیت دی اور ان کی تعلیم و تربیت کا انتہائی خیال رکھا۔ یہ وفود خود بھی اسلام کو سمجھنے، اس کی تعلیمات و احکام جاننے، زندگی میں انھیں اپنانے اور معلومات کو عملی شکل دینے کے انتہائی خواہش مند تھے۔ انھی اوصاف نے انھیں فضائل و حسنات کی زندہ مثالیں بنا دیا۔ ان میں سے اکثر کے حوالے سے ایسے سوالات منقول ہیں جو وہ اپنے ہاں کے معاملات سے متعلق دریافت کرتے تھے تاکہ حلال و حرام کو پہچان سکیں۔ اور رسول گرامی ﷺ تو ان کی دین میں سمجھ بوجھ کے انتہائی خواہش مند تھے تاکہ ان کے استفسارات کا جواب دیں۔ ان میں سے جس کے متعلق معلوم ہوتا کہ اسے قرآن پاک سیکھنے کی زیادہ خواہش ہے اور وہ قرآن پاک زیادہ یاد کرنا چاہتا ہے اسے آپ ﷺ اپنے قریب تر کر لیتے اور اپنے ساتھیوں سے بھی فرماتے: «فَقِّهُوا إِخْوَانَكُمْ» "اپنے بھائیوں کو دین سمجھاؤ۔"[4]

---

1 الأساس في السنة لسعيد حوّى: 1014/2. 2 المدينة النبوية وفجر الإسلام لمحمد شراب: 400/2. 3 دراسات في عهد النبوة للشجاع، ص: 221. 4 محمد رسول الله ﷺ لصادق عرجون: 520/4.

ان کے رؤساء میں سے جنھیں رسول اللہ ﷺ پہچانتے تھے اس کے متعلق پوچھتے رہتے۔ لہٰذا جب وہ اپنے علاقوں کو واپس جانے کی چاہت کا اظہار کرتے آپ ﷺ انھیں حق کا دامن پکڑے رکھنے کی تلقین کرتے۔ اور انھیں ابھارتے کہ صبر کا دامن تھامے رکھنا۔ پھر انھیں اچھے اچھے قیمتی تحائف و ہدایا سے نوازتے اور مساوات کا خیال فرماتے، چنانچہ یہ وفود اپنی اقوام کی طرف لوٹنے کے موقع پر ہدایت سے سرشار، دعوت کے جذبے سے لبریز اور نورِ ایمان سے منور دلوں کے حامل ہوتے۔ جو سیکھا ہوتا لوگوں کو سکھاتے اور جو سنا ہوتا بیان کرتے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے اعلیٰ اخلاق، حسنِ سلوک، شکل و شباہت اور روشن چہرے کا تذکرہ کرتے۔ اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا آپس میں بھائی چارہ، محبت اور غمخواری کا جو جو منظر دیکھا ہوتا اسے بیان کرتے تاکہ اسی طرح ان سامعین کے دلوں میں رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام سے ملاقات کا شوق پیدا ہو۔ اور ان کے دلوں میں ان کے اخلاق فاضلہ اور نمونہ و اسوہ کی اقتدا کی چاہت بھی پیدا ہو۔[1]

بعض وفود نے عیسائیت پر باقی رہنا پسند کیا جیسا کہ نجران کے وفد نے عیسائیت پر رہتے ہوئے جزیہ دینے پر موافقت کر لی۔

ان وفود میں سے وفد عبد قیس، وفد بنو سعد بن بکر اور وفد نجران کے تذکرے میں کئی نصائح، عبرتیں اور سبق ہیں لہٰذا ہم ان کے متعلق علیحدہ علیحدہ بحث کرتے ہیں۔

وفد عبدالقیس

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ان کے آنے سے متعلق بیان کرتے ہیں کہ عبدالقیس کا وفد رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا۔ آپ ﷺ نے پوچھا: «مَنِ الْوَفْدُ؟۔ أَوْ۔ مَنِ الْقَوْمُ؟» ''کون لوگ ہیں یا کون سا وفد ہے؟'' انھوں نے عرض کیا: ''ہم بنو ربیعہ سے ہیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: «مَرْحَبًا بِالْقَوْمِ۔ أَوْ بِالْوَفْدِ۔ غَيْرَ خَزَايَا وَلَا نَدَامٰى»

1 محمد رسول اللہ ﷺ لصادق عرجون: 251/4.

''خوش آمدید! پریشانی یا شرمندگی کی کوئی بات نہیں۔'' وفد نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! ہمارے اور مشرکین مضر کے درمیان چپقلش پائی جاتی ہے اور ہم آپ کے پاس بڑی مسافت طے کر کے آئے ہیں۔ ہم صرف حرمت کے مہینوں میں آپ کے پاس آ سکتے ہیں۔ آپ ہمیں فیصلہ کن بات بتا دیں جس کی خبر ہم پیچھے جو لوگ ہیں انھیں بھی دیں اور جنت میں داخل ہو سکیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا کہنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انھیں چار باتوں کا حکم دیا اور چار ہی باتوں سے منع فرمایا۔ انھیں اکیلے اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا حکم دیا۔

فرمایا: «هَلْ تَدْرُونَ مَا الْإِيمَانُ بِاللّٰهِ؟» ''کیا تم جانتے ہو اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا کیا ہے؟'' انھوں نے عرض کیا: ''اللہ اور اس کے رسول خوب جانتے ہیں۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: «شَهَادَةُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللّٰهِ، وَ إِقَامُ الصَّلَاةِ وَ إِيتَاءُ الزَّكَاةِ وَصَوْمُ رَمَضَانَ وَ أَنْ تُؤَدُّوا خُمُسًا مِّنَ الْمَغْنَمِ» ''یہ شہادت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد ﷺ، اللہ کے رسول ہیں اور نماز ادا کرنا، زکاۃ دینا، رمضان کے روزے رکھنا اور یہ کہ تم غنیمت کا خمس ادا کرو۔''

رسول اللہ ﷺ نے انھیں کدو کے برتن، تارکول چڑھے برتن، روغنی مٹکے یا لکڑی کرید کر بنائے گئے برتن کے استعمال سے منع فرمایا۔

اور فرمایا: «اِحْفَظُوهُنَّ وَ أَخْبِرُوا بِهِنَّ مَنْ وَّرَاءَكُمْ» ''ان باتوں کو یاد رکھو اور ان لوگوں کو بھی خبر دو جو تمھارے پیچھے ہیں۔''[1]

ایک روایت میں ہے کہ اشج عبدالقیس (منذر بن عائذ) سواریوں کے پاس رہ گیا تھا۔ اس نے انھیں بٹھایا۔ تمام لوگوں کا سامان سمیٹا، پھر سکون سے چلتا ہوا آیا۔ رسول اللہ ﷺ کا ہاتھ مبارک پکڑا اور اسے چوما۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ فِيكَ خَصْلَتَيْنِ

[1] صحيح البخاري، حديث: 53، و صحيح مسلم، حديث: 17.

يُحِبُّهُمَا اللّٰهُ وَرَسُولُهُ» ''تجھ میں دو خصلتیں ایسی پائی جاتی ہیں جنھیں اللہ اور اس کا رسول پسند کرتے ہیں۔'' اس نے سوال کیا: ''کیا وہ میری فطرت میں ہیں یا میں نے خود سے انھیں اختیار کیا ہوا ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: «بَلْ جَبْلٌ» ''بلکہ وہ تیری فطرت میں ہیں۔'' وہ کہنے لگا: ''اس اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے ایسی فطرت پر پیدا کیا ہے جسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پسند کرتے ہیں۔''[1]

ضمام بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ کا وفد

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم مسجد میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ایک آدمی اونٹ پر آیا۔ اس نے اونٹ کو مسجد میں بٹھا کر باندھ دیا، پھر پوچھنے لگا: ''تم میں محمد ﷺ کون ہیں؟'' اس وقت رسول گرامی ﷺ صحابہ کے جلو میں ٹیک لگائے تشریف فرما تھے۔ ہم نے کہا: ''وہ ٹیک لگائے ہوئے سفید رنگ کے شخص۔''

وہ شخص اب آپ ﷺ سے مخاطب ہوا: ''آپ ابن عبدالمطلب ہیں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ایسا ہی ہے۔'' اس شخص نے آپ سے کہا: ''میں آپ سے کچھ سوال کرنا چاہتا ہوں اور میرا سوال کرنے کا انداز درشت ہوگا۔ آپ اپنے دل میں ان کا رنج بالکل نہ کرنا اور مجھ پر غصے نہ ہونا۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: «سَلْ عَمَّا بَدَا لَكَ» ''جو دل میں آئے پوچھو۔''

تو اس نے کہا: ''میں آپ کو اس اللہ کی قسم دیتا ہوں جو آپ کا پروردگار ہے اور آپ سے پہلے جو لوگ گزر چکے ان کا معبود بھی ہے۔ کیا اس اللہ نے آپ کو ہماری طرف رسول بنا کر بھیجا ہے؟''

آپ ﷺ نے جواب دیا: «اَللّٰهُمَّ نَعَمْ!» ''ہاں، اللہ کی قسم!''

اس نے پھر کہا: ''میں آپ کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا آپ کو اللہ تعالیٰ نے

[1] سنن ابن ماجه، حديث: 4187، ومسند أحمد: 206/4، و الأدب المفرد للبخاري، رقم: 584.

حکم دیا ہے کہ رات دن میں پانچ نمازیں پڑھا کرو؟''

آپ ﷺ نے فرمایا: «اَللّٰهُمَّ نَعَمْ!» ''ہاں! اللہ کی قسم!''

اس نے کہا: ''میں آپ کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ ہم سال میں اس ماہ کے روزے رکھا کریں۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: «اَللّٰهُمَّ نَعَمْ!» ''ہاں، اللہ کی قسم!''

اس نے دریافت کیا: ''آپ کو اللہ تعالیٰ کی قسم دیتا ہوں کہ کیا آپ کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ہمارے اغنیاء سے صدقات لے کر ہمارے فقراء میں تقسیم کر دیں۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «اَللّٰهُمَّ نَعَمْ!» ''ہاں، اللہ کی قسم!''

تب وہ آدمی کہنے لگا: ''میں ہر اس بات پر ایمان لاتا ہوں جو آپ لے کر آئے ہیں۔ اور میں اپنی قوم کا ایلچی ہوں۔ میں ضمام بن ثعلبہ ہوں اور میرا تعلق بنو سعد بن بکر سے ہے۔''[1]

ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ جب وہ (سوالات و جوابات سے) فارغ ہوا تو کہنے لگا: ''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ میں یہ فرائض ضرور ادا کروں گا اور جس سے آپ نے منع کیا ہے اس سے اجتناب کروں گا، پھر میں اس میں کوئی کمی بیشی نہیں کروں گا۔''

اس کے بعد وہ اپنے اونٹ کی طرف لوٹا۔ جب وہ واپس ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: «إِنْ يَّصْدُقْ ذُو الْعَقِيصَتَيْنِ يَدْخُلِ الْجَنَّةَ» ''اگر بالوں کی دولٹوں والے نے صدقِ دل سے یہ بات کہی ہے تو جنت میں داخل ہوگا۔'' پھر وہ اپنے اونٹ کے پاس آیا، اسے کھولا اور اپنی قوم کے پاس چلا گیا۔ قوم کے تمام لوگ اس کے پاس جمع ہو گئے۔ اس نے سب سے پہلے یہ بات کہی کہ لات و عزی کتنے برے ہیں؟ اس پر قوم کے لوگ بولے:

1 صحيح البخاري، حديث: 63، وسنن أبي داود، حديث: 486، وسنن ابن ماجه، حديث: 1402، ومسند أحمد: 168/3، والسنن الكبرٰى للنسائي: 122/4.

”ضمام باز آجاؤ! برص ہونے سے ڈرو، جذام سے ڈرو، جنون سے ڈرو۔“

ضمام نے جواب دیا: ”تمھارا برا ہو، اللہ کی قسم! یہ دونوں نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ نفع۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے ایک رسول بھیجا ہے اور اس پر ایک کتاب نازل فرمائی ہے۔ جس کے ذریعے اس نے تمھیں اس سے نکالا جس میں تم پڑے ہوئے تھے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اکیلے اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے بندے اور رسول ہیں۔ اور میں تمھارے لیے ان کے پاس سے وہ باتیں لایا ہوں جن کا انھوں نے تمھیں حکم دیا ہے اور وہ باتیں بھی لایا ہوں جن سے انھوں نے تمھیں منع کیا ہے۔“

راوی کہتا ہے: ”اللہ کی قسم! اس روز قبیلے کے مردوں اور عورتوں میں کوئی ایسا نہ تھا جو شام ہونے سے پہلے پہلے مسلمان نہ ہو گیا ہو۔“

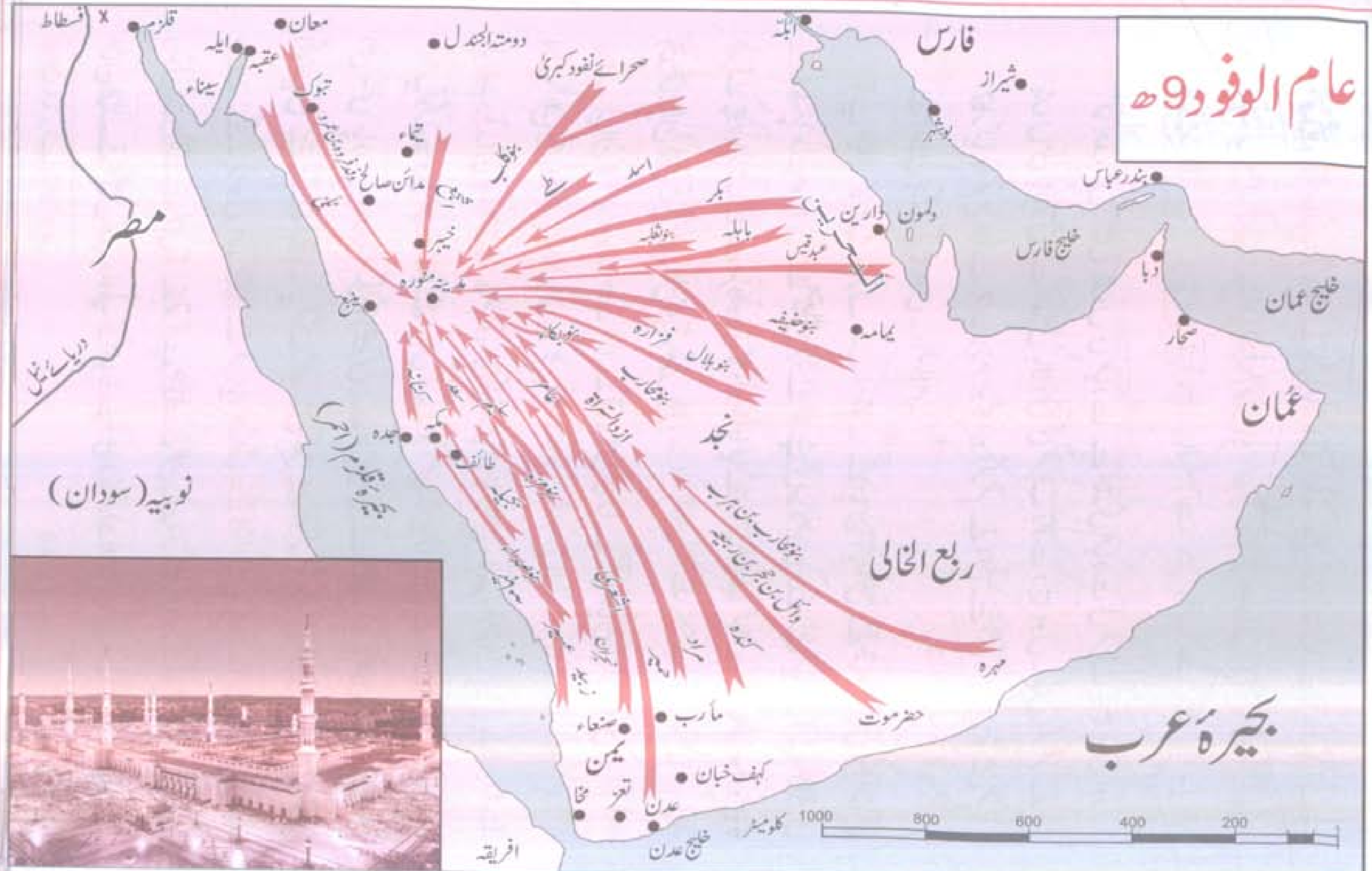
حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ہم نے کسی قوم کے آنے والے کو ضمام بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ جیسا افضل نہیں پایا۔[1]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قبائل عرب میں اسلام کی تعلیمات کس قدر پھیل چکی تھیں۔ ضمام بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ اسلام کے متعلق دریافت کرنے نہیں آئے تھے۔ صرف تصدیق کے لیے آئے تھے اور یکے بعد دیگرے سوال پوچھتے گئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ کے پاس آنے سے پہلے ہی انھیں ان تمام امور سے متعلق وافر معلومات حاصل تھیں۔[2]

نجرانی عیسائیوں کا وفد

رسول اللہ ﷺ نے نجران[3] کی طرف ایک خط ارسال فرمایا، اس میں تحریر کیا:

[1] مسند أحمد: 264/1، وسنن أبي داود، حديث: 487، وسنن الدارمي، رقم: 656، وصحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 630. [2] السيرة النبوية للدكتور مهدي رزق الله أحمد، ص: 650. [3] نجران: یمن کی جانب مکہ مکرمہ سے سات منازل پر ایک بڑا شہر ہے۔


عام الوفود ۹ھ
فارس
شیراز
بوشہر
بندر عباس
خلیج فارس
خلیج عمان
صحار
دبا
عمان
یمامہ
بنو حنیفہ
عبد قیس
بابلہ
بکر
اسد
طے
صحرائے نفود کبریٰ
دومتہ الجندل
معان
ایلہ
عقبہ
قلزم
فسطاط
سیناء
مصر
دریائے نیل
تبوک
تیماء
خیبر
مدینہ منورہ
ینبع
جدہ
مکہ
طائف
نجد
بنو ہلال
فزارہ
بنو حارث
ازد و استرہ
بنو حارب بن حرب
وائل بن حجر بن ربیعہ
کندہ
ربع الخالی
مہرہ
حضر موت
مأرب
صنعاء
یمن
کہف خبان
تعز
عدن
مخا
خلیج عدن
افریقہ
نوبیہ (سودان)
بحیرۂ عرب
کلومیٹر
1000
800
600
400
200

«أَمَّا بَعْدُ! فَإِنِّي أَدْعُوكُمْ إِلٰى عِبَادَةِ اللّٰهِ مِنْ عِبَادَةِ الْعِبَادِ وَ أَدْعُوكُمْ إِلٰى وِلَايَةِ اللّٰهِ مِنْ وِّلَايَةِ الْعِبَادِ، فَإِنْ أَبَيْتُمْ، فَالْجِزْيَةُ فَإِنْ أَبَيْتُمْ آذَنْتُكُمْ بِحَرْبٍ وَّالسَّلَامُ»

''اما بعد، میں تمھیں بندوں کی عبادت سے اللہ کی عبادت کی طرف بلاتا ہوں اور بندوں کی بالادستی سے اللہ کی بالادستی کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ پس اگر تم نے انکار کیا تو تم پر ادائے جزیہ لازم ہوگا اور اگر تم نے اس سے بھی انکار کیا تو میں تم سے اعلانِ جنگ کرتا ہوں۔ والسلام۔''[1]

آپ ﷺ کا نامۂ مبارک جب اسقف کے پاس آیا اس نے تمام لوگوں کو اکٹھا کر کے خط پڑھا۔ اور اس کے متعلق رائے طلب کی۔ انھوں نے طے کیا کہ آپ ﷺ کی طرف چودہ بڑے بڑے سرداروں کا وفد بھیجا جائے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ساٹھ سواروں کا وفد تھا۔ ان میں تین شخص اہل حل وعقد تھے:

عاقب: یہ ان کا امیر اور صاحب الرائے تھا۔ اس کی رائے حتمی خیال کی جاتی تھی۔

السید: ان کے سفروں کا لیڈر تھا۔

ابو الحارث: ان کا اسقف، عالم اور ان کی تعلیم گاہ کا رئیس و ذمہ دار تھا۔

یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے تو مسجد میں داخلے کے وقت ان کے بدن پر اعلیٰ یمنی چادریں اور ریشم کی آستینوں سے مزین کپڑے تھے۔ یہ ہاتھوں میں سونے کی انگوٹھیاں پہنے ہوئے تھے۔ یہ لوگ مسجد میں کھڑے ہو کر مشرق کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے لگے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «دَعُوهُمْ» ''انھیں چھوڑ دو۔'' بعد ازاں وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے تو آپ ﷺ نے ان سے منہ پھیر لیا اور گفتگو نہ فرمائی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انھیں توجہ دلائی کہ تمھارے اسی (فاخرانہ) لباس کی وجہ سے یہ سلوک ہوا

[1] البداية والنهاية:5/48.

ہے، چنانچہ وہ اس دن واپس چلے گئے، صبح راہبانہ لباس میں آئے۔ سلام پیش کیا تو آپ ﷺ نے سلام کا جواب دیا اور انھیں اسلام کی طرف دعوت دی۔ مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ اور کہنے لگے کہ ہم پہلے سے مسلمان چلے آ رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «يَمْنَعُكُمْ مِّنَ الْإِسْلَامِ ثَلَاثٌ: عِبَادَتُكُمُ الصَّلِيبَ وَ أَكْلُكُمْ لَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَزَعْمُكُمْ أَنَّ لِلّٰهِ وَلَدًا» ”تمھارے لیے تین چیزیں قبول اسلام سے مانع ہیں:

① تمھارا صلیب کی عبادت کرنا۔

② خنزیر کا گوشت کھانا۔

③ اور تمھارا یہ خیال کہ اللہ تعالیٰ کا بیٹا ہے۔“ [1]

رسول اللہ ﷺ اور ان کے درمیان بحث و مباحثہ طویل ہوتا گیا۔ آپ قرآن پاک سے دلائل اخذ کرتے اور اس کی تلاوت فرماتے۔ انھوں نے آپ ﷺ کو جو کچھ کہا اس میں یہ بھی تھا کہ آپ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو برا بھلا کہتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ وہ اللہ کا بندہ تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «أَجَلْ إِنَّهُ عَبْدُاللّٰهِ وَرَسُولُهُ وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلٰى مَرْيَمَ الْعَذْرَاءِ الْبَتُولِ» ”ہاں، بلاشبہ وہ اللہ تعالیٰ کا بندہ اور رسول تھا اور اللہ کا کلمہ تھا جسے اس نے پاکباز اور عفت مآب مریم کی جانب ڈالا۔“ انھوں نے کہا: ”کبھی آپ نے باپ کے بغیر بھی کوئی انسان دیکھا ہے؟ اگر آپ سچے ہیں تو ہمیں اس جیسا کوئی اور دکھائیں؟“ تب اللہ تعالیٰ نے ان کی تردید کے لیے قرآن پاک اتار دیا:

﴿ إِنَّ مَثَلَ عِيسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ۖ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝ ﴾

”بے شک اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے، اللہ نے اسے مٹی سے پیدا کیا، پھر اس سے کہا کہ ہو جا، تو وہ ہو گیا۔ (یہ) آپ کے رب کی طرف سے

[1] السيرة النبوية لأبي شهبة: 547/2.

حق ہے، لہٰذا آپ شک کرنے والوں میں سے نہ ہوں۔‘‘[1]

یہ دلیل ان کی کھوپڑی توڑ دینے والی تھی۔ اس میں باعث تعجب (بغیر باپ کے) تخلیق کو اس سے بھی زیادہ باعث تعجب (بغیر ماں باپ کے) تخلیق سے مشابہت دی گئی تھی۔[2]

مگر جس وقت حکمت و دانائی سے بحث مباحثہ اور بہتر طریقے پر نصیحت کارگر نہ ہوئی تو (آپ نے) انھیں اس فرمانِ خداوندی کی عملی صورت کے لیے مباہلے کی دعوت دی۔[3]

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ۝﴾

’’پھر علم آ جانے کے بعد جو کوئی عیسیٰ کے متعلق آپ سے جھگڑا کرے تو آپ کہہ دیں: آؤ ہم اور تم اپنے اپنے بیٹوں کو اور اپنی اپنی عورتوں کو بلا لیں اور خود بھی (حاضر ہوں) پھر گڑگڑا کر اللہ سے دعا کریں کہ جھوٹوں پر اللہ کی لعنت ہو۔‘‘[4]

رسول اللہ ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حسن رضی اللہ عنہ، حسین رضی اللہ عنہ اور فاطمہ رضی اللہ عنہا سمیت آئے اور فرمایا: «وَإِذَا أَنَا دَعَوْتُ فَأَمِّنُوا» ’’جب میں دعا کروں تو تم آمین کہنا۔‘‘[5]

اب انھوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ وہ چونکہ جانتے تھے کہ نبی ﷺ برحق ہیں اس لیے وہ تباہ و برباد ہونے سے ڈر گئے۔ اور یہ کہ جس کسی قوم نے بھی کسی پیغمبر سے مباہلہ کیا ہے وہ ہلاک ہو گئی، چنانچہ انھوں نے مباہلہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اور کہنے لگے: ’’ہمارے متعلق وہی فیصلہ کیجیے جو آپ کو پسند ہو۔‘‘ آپ ﷺ نے ان سے کپڑے کے دو ہزار جوڑوں، ایک ہزار رجب میں اور ایک ہزار صفر میں لینے پر مصالحت کر لی۔[6]

1 آل عمرٰن 60,59:3. 2 زاد المعاد: 633/3، والسيرة النبوية لأبي شهبة: 547/2. 3 السيرة النبوية لأبي شهبة: 547/2. 4 آل عمرٰن 61:3. 5 السيرة النبوية لأبي شهبة: 547/2. 6 السيرة النبوية لأبي شهبة: 547/2.

انھوں نے جب واپسی کا ارادہ کیا تو نبی مکرم ﷺ سے کہنے لگے: ''آپ ہمارے ساتھ کوئی امانت دار شخص روانہ کریں تاکہ ہم سے وہ مال وصول کرے جس پر صلح ہوئی ہے۔'' آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: «لَأَبْعَثَنَّ مَعَكُمْ رَجُلًا أَمِينًا حَقَّ أَمِينٍ» ''میں تمھارے ساتھ نہایت امانت دار شخص ہی کو بھیجوں گا۔'' اس شرف کو حاصل کرنے کے لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم منتظر رہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: «قُمْ يَا أَبَا عُبَيْدَةَ بْنَ الْجَرَّاحِ» ''اے ابوعبیدہ بن جراح! کھڑے ہو جاؤ۔'' وہ جب کھڑے ہو گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: «هٰذَا أَمِينُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ» ''یہ اس امت کے امین ہیں۔''[1]

اسلام سکھانے کے لیے جماعتیں تشکیل دینا اور حکومتی و مالی معاملات کی ترتیب

لوگ اسلام قبول کرنے اور اسلامی حکومت و سیادت کا سایہ حاصل کرنے کے لیے گروہ درگروہ چلے آ رہے تھے۔ تمام لوگ چاہتے تھے کہ اپنے اپنے علاقوں کو لوٹنے سے پہلے مدینہ منورہ میں رہتے ہوئے دینی تعلیم حاصل کر لیں۔ ادھر رسول اللہ ﷺ دین سکھلانے کے لیے معلم بھی ان کے ساتھ بھیجتے تھے۔ آپ ﷺ نے کئی علاقوں کی طرف اپنے داعی روانہ کیے۔ خاص طور پر جزیرہ نمائے عرب کی جنوبی جانب جہاں یمنی قبائل آباد تھے تاکہ انھیں اسلام کے ابتدائی احکام و تعلیمات سے روشناس کرایا جائے۔ جزیرہ نمائے عرب اور اس کے اردگرد اسلام کی شہرت عام ہو چکی تھی۔ اور لوگوں کے سامنے اسلام کی حقیقت کھول کر رکھنے کے لیے اساتذہ اور داعیوں کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ تاکہ لوگوں کے دل پاک صاف ہو سکیں اور وہ جاہلیت کے امراض سے شفایاب ہوں۔

بنوحارث بن کعب کا قبیلہ اسلام میں داخل ہونے سے انکار کر گیا تو آپ ﷺ نے ان کی طرف حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی ہمراہی میں ایک سریہ ارسال فرمایا۔[2]

1 صحيح البخاري، حديث: 4382، وجامع الترمذي، حديث: 3791، وسنن ابن ماجه، حديث: 155,154، ومسند أحمد: 184/3. 2 فقه السيرة للبوطي، ص: 322.

حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی بنو حارث بن کعب کی طرف روانگی (10ھ)

بنو حارث بن کعب نجران میں رہتے تھے۔ ان میں سے کسی ایک نے بھی اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو ربیع الآخر یا جمادی الاولیٰ 10ھ میں بھیجا اور ہدایت فرمائی کہ جنگ سے پیشتر تین دن تک اسلام کی دعوت دینا۔ اگر وہ قبول کرلیں تو تم بھی مان لینا اور اگر وہ تمھاری دعوت پر لبیک نہ کہیں تو ان سے جنگ کرنا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ وہاں پہنچ گئے اور اپنے گھڑسواروں کو ہر طرف پھیلا دیا جو انھیں اسلام کی دعوت دینے لگے۔ لوگوں نے اسلام قبول کرلیا۔ پھر حضرت خالد رضی اللہ عنہ وہاں مقیم رہے۔ انھیں اسلام اور کتاب اللہ کی تعلیم دیتے رہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا۔ پھر حضرت خالد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں خط بھیجا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ یہ لوگ اسلام لے آئے ہیں اور میں ان میں مقیم ہوں۔ یہیں رہوں گا حتی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا (دوسرا) حکم پہنچ جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جوابی خط حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو پہنچا کہ مدینہ آجاؤ اور ان کا ایک وفد بھی ساتھ آنا چاہیے۔ حضرت خالد نے حکم کی تعمیل کی۔ جب یہ لوگ آگئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیس بن حصین رضی اللہ عنہ کو ان کا امیر مقرر فرما دیا۔

ان کے چلے جانے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کو بنو حارث کی طرف بھیج دیا کہ وہاں جا کر ان میں دین اور سنتِ رسول کی تعلیم دیں۔[1]

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد رضی اللہ عنہ کے بجائے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا تھا۔ وہ جب ہمدان کے قبائل میں پہنچے اور ان کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مکتوب پڑھا تو تمام ہمدانیوں نے اسلام قبول کرلیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خط کے ذریعے ان کے قبولِ اسلام کی اطلاع دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خط پڑھتے ہی سجدہ ریز

1 السيرة النبوية لابن هشام: 250/4.

ہو گئے، پھر فرمایا:

«اَلسَّلَامُ عَلٰى هَمْدَانَ، اَلسَّلَامُ عَلٰى هَمْدَانَ»

''ہمدان پر سلامتی ہو، ہمدان پر سلامتی ہو۔''[1]

رسول اللہ ﷺ کی یہ شدید خواہش تھی کہ اسلامی حکومت کی جنوبی سمت تابع ہو جائے اور یمنی قبائل اسلام میں داخل ہو جائیں۔

اس سمت پر آپ ﷺ کی خصوصی توجہ و اہتمام کا نتیجہ دعوت کی اثر انگیزی کی صورت میں سامنے آنے لگا۔ یمن کے اطراف و اکناف سے قافلے مدینہ منورہ آ رہے تھے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یمن کی جانب مبعوثین کی دعوت یمن سے متصل اور دور دراز علاقوں تک پہنچ چکی تھی۔

رسول اللہ ﷺ کے سراپا دعوت کی اس پر امن تحریک کو قوت فراہم کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو اور پھر حضرت علی بن ابو طالب رضی اللہ عنہ کو اس غرض سے بھیجا تھا۔[2]

رسول اللہ ﷺ نے یمنی قبائل اور حضرموت کے قبائل سے کافی تعداد میں معاہدے کر رکھے تھے جنھیں ڈاکٹر حمید اللہ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''مجموعة الوثائق السياسية'' میں جمع کیا ہے۔[3]

سیدنا معاذ بن جبل اور ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما کی یمن روانگی

رسول اللہ ﷺ نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کی جانب قاضی، مسائل بتانے والا، صدقات اکٹھا کرنے والا اور امیر و گورنر بنا کر روانہ فرمایا۔ یہ حلال و حرام کے بارے میں سب سے زیادہ جانتے تھے۔ انھیں یمن کے دو حصوں میں سے بالائی یمن پر مقرر فرمایا۔

[1] دلائل النبوة للبيهقي: 396/5. [2] الفقه السياسي لخالد الفهداوي، ص: 231. [3] الوثائق السياسية للدكتور حميد الله، رقم: 111، ص: 230.

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ جب روانہ ہونے لگے تو رسول اللہ ﷺ الوداع کہتے اور وصیت کرتے ہوئے ساتھ ساتھ چلے۔ اس دوران حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سوار تھے اور رسول اللہ ﷺ ساتھ ساتھ پیدل چل رہے تھے۔ آپ ﷺ نے انھیں ڈھیر ساری وصیتیں کیں اور دعوت کا ایک عظیم منہج و طریقہ انھیں سمجھایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّكَ سَتَأْتِي قَوْمًا مِّنْ أَهْلِ كِتَابٍ، فَإِذَا جِئْتَهُمْ فَادْعُهُمْ إِلٰى أَنْ يَّشْهَدُوا أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللّٰهِ فَإِنْ هُمْ أَطَاعُوا لَكَ بِذٰلِكَ فَأَخْبِرْهُمْ أَنَّ اللّٰهَ فَرَضَ عَلَيْهِمْ خَمْسَ صَلَوَاتٍ كُلَّ يَوْمٍ وَّلَيْلَةٍ، فَإِنْ هُمْ أَطَاعُوا لَكَ بِذٰلِكَ فَأَخْبِرْهُمْ أَنَّ اللّٰهَ فَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ فَتُرَدُّ عَلٰى فُقَرَائِهِمْ، فَإِنْ هُمْ أَطَاعُوا لَكَ بِذٰلِكَ فَإِيَّاكَ وَكَرَائِمَ أَمْوَالِهِمْ، وَاتَّقِ دَعْوَةَ الْمَظْلُومِ، فَإِنَّهُ لَيْسَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ اللّٰهِ حِجَابٌ»

”تمھیں ایسے لوگوں کے پاس جانا ہے جو اہل کتاب ہیں۔ جب ان کے پاس پہنچو تو انھیں ایک اللہ کی طرف دعوت دینا جس کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اگر وہ یہ مان لیں تب ان سے کہو کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر دن رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ اگر وہ یہ بھی مان لیں تو ان سے کہو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مالداروں پر زکاۃ فرض کی ہے جو ان سے لے کر انھی کے محتاجوں کو دی جائے گی۔ اگر وہ یہ بھی مان لیں تو ایسا کرنا کہ ان کا عمدہ عمدہ مال مت لینا اور دیکھو مظلوم کی بد دعا سے بچتے رہنا، مظلوم کی بددعا سیدھی پروردگار تک پہنچتی ہے۔“[1]

[1] صحیح البخاري، حدیث: 1458، و صحیح مسلم، حدیث: 19.

اس حدیث میں نبی مکرم ﷺ کی جانب سے دعوت الی اللہ کا کام کرنے والوں کے لیے رہنمائی ہے کہ دعوت درجہ بدرجہ دینی چاہیے۔ پہلے سب سے اہم، پھر اس سے کم تر، چنانچہ پہلے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمانِ محکم کی دعوت دینی چاہیے۔ ایسا ایمان جو دلوں میں راسخ ہو جائے اور خیالات و کردار پر غالب ہو۔ بعد ازاں ارکانِ اسلام کی عملی تطبیق کی دعوت دینی چاہیے جو اس ایمان کو پختہ کر دے اور مزید بڑھا دے۔ پھر اس کے بعد واجبات اور محرمات سے بچنے کا کہنا چاہیے۔ تو اس طرح لوگ اسلام کے ان احکامات کو بھی قبول کر لیں گے جو بسا اوقات ان کے نفس کی خواہش کے خلاف ہی ہوں کیونکہ اس وقت ان کے دل ایمان و یقین سے سرشار ہو چکے ہوں گے۔[1]

یہ وہ نبوی طریقہ کار ہے جو آپ ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے لیے اور ہر اس شخص کے لیے مقرر فرمایا ہے جو صحابۂ کرام کی سیرت پر چلنا چاہتا ہے۔ جن لوگوں نے اپنے آپ کو دعوت الی اللہ کے سپرد کر رکھا ہے وہ اس ہدایت نبوی کو اپنانے کے کس قدر مستحق ہیں۔ انھیں چاہیے کہ اس کی قدم بقدم اتباع کریں۔ سمجھنے، یاد کرنے اور عملی تطبیق کے طور پر اس کا احاطہ کرنے کے شدید ضرورت مند ہیں۔ تب ان کے قدم واقعی صحیح راہ پر ہوں گے۔[2]

رسول اللہ ﷺ جب معاذ رضی اللہ عنہ کو وصیت کر چکے تو فرمایا: «يَا مُعَاذُ! إِنَّكَ عَسٰى أَلَّا تَلْقَانِي بَعْدَ عَامِي هٰذَا وَلَعَلَّكَ أَنْ تَمُرَّ بِمَسْجِدِي هٰذَا، وَ قَبْرِي» ''اے معاذ! اس بات کا امکان ہے کہ تم مجھے اس سال کے بعد نہ مل سکو۔ اور شاید تم میری اسی مسجد اور میری قبر کے پاس سے گزرو۔''[3]

تو (یہ سن کر) حضرت معاذ رضی اللہ عنہ غم کے مارے رو پڑے۔ آپ ﷺ نے جیسا اشارہ

---

1 التاريخ الإسلامي للحميدي: 187/8. 2 من معين السيرة لصالح الشامي، ص: 486.
3 صحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 654.

فرمایا تھا ویسا ہی ہوا۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ یمن میں ہی رہے اور پھر وفاتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد واپس لوٹے۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو یمن کے زیریں علاقے کا قاضی بنا کر، دین سمجھانے، صدقات اکٹھے کرنے اور گورنر کے طور پر بھیجا۔ انھیں اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو اکٹھی وصیت فرمائی:

«يَسِّرَا وَلَا تُعَسِّرَا، وَبَشِّرَا وَلَا تُنَفِّرَا وَتَطَاوَعَا وَلَا تَخْتَلِفَا»

''آسانی کرنا، دشواری اور سختی مت کرنا۔ خوشخبری دینا اور نفرت مت دلانا اور اتفاق سے کام کرنا، پھوٹ مت پیدا کرنا۔''[2]

یہ نبوی کریمانہ منہج ہے جس کی جانب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ اور ابوموسیٰ رضی اللہ عنہما کی رہنمائی فرمائی کہ لوگوں سے نرمی اختیار کریں، انھیں لوگوں پر سختی سے منع فرمایا۔ دونوں کو خوشخبری دینے کا حکم دیا اور نفرت دلانے سے روکا۔[3]

حکومتی اور مالی امور کی ترتیب

نظام اس دین کا ایک حصہ ہے اور اس کے تمام امور میں داخل ہے۔ کیونکہ نظام مختلف امور کو اکٹھا کر کے اہداف و نتائج یقینی بناتا ہے۔ نظام ابتدا ہی سے اسلام کا ایک خاص وصف اور امتیاز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی مدینہ منورہ سے باہر تشریف لے جاتے تو وہاں کے معاملات نپٹانے کے لیے کسی نہ کسی کو ضرور متعین فرماتے۔ اس طرح جب بھی کوئی علاقہ فتح کرتے تو اس پر امیر ونگران مقرر کر دیتے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وفد آتے تو آپ ان پر اپنی طرف سے ایک امیر مقرر فرماتے، پھر دین سمجھانے کے لیے کسی کا تعین ان پر چھوڑ دیتے۔ اور اسی طرح صدقات جمع کرنے

[1] السيرة النبوية لأبي شهبة: 559/2. [2] صحيح البخاري، حديث: 4342,4341، وصحيح مسلم، حديث: 1733. [3] التاريخ الإسلامي للحميدي: 186/8.

والا بھی ان کی طرف روانہ کرتے۔[1]

رسول اللہ ﷺ ایسے عاملین منتخب کرتے جو نیک، اہل علم اور دیندار ہوں اور جنھیں ان قبائل میں اثر و رسوخ حاصل ہو اور عرب میں وہ قابلِ لحاظ بھی ہوں۔

مکہ مکرمہ پر رسول اللہ ﷺ کے عامل عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ اور طائف پر عثمان بن ابوالعاص رضی اللہ عنہ تھے اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ اور ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو یمن کی جانب روانہ کیا۔ بعض حالات میں آپ ﷺ نے ان امراء اور حکمرانوں کو بحال رکھا جو اسلام لے آئے تھے یا جن سے جزیہ قبول کیا گیا تھا۔ ان میں سے بہرام کی اولاد سے باذان بن ساسان ہے جسے اسلام قبول کر لینے پر آپ ﷺ نے یمن پر بحال رکھا۔ اور جب آپ ﷺ کو اس کی موت کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے اس کی ذمہ داریوں کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت میں تقسیم کر دیا۔ صنعاء پر شمر بن باذان کو مقرر کیا۔ مأرب پر ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو اور جند پر یعلی بن امیہ رضی اللہ عنہ کو اور ہمدان پر عامر بن شمر ہمدانی کو۔ نجران اور زمع اور زبید کے درمیانی علاقوں پر خالد بن سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کو، نجران پر عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کو اور حضر موت کے شہروں پر زیاد بن لبید بیاضی کو، سکاسک اور سکون پر عکاشہ بن ثور رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا۔[2]

رسول اللہ ﷺ عمال سے پورا حساب لیتے۔ آمدن اور خرچ کا پورا حساب ہوتا تھا۔ بعض عہدہ داروں کے وظائف مقرر کیے جن میں سے عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ گورنر مکہ تھے انھیں ایک درہم یومیہ ملتا۔[3]

اور جب قیس بن مالک رضی اللہ عنہ کو ان کی اپنی قوم ہمدان پر عامل بنایا تو ان کے لیے زمین کا ایک حصہ الگ کر دیا کہ اس کی آمدنی تم لے سکتے ہو۔ عمّال کے وظائف حالات کے موافق بدلتے رہتے تھے وہ معین نہ تھے۔[4]

1 دراسات في عهد النبوة للشجاع، ص: 221. 2 العبر وديوان المبتدأ والخبر لابن خلدون: 59/2. 3 السيرة النبوية لابن هشام: 153/4. 4 الدولة العربية الإسلامية لمنصور حرابي، ص: 44.

رسول اللہ ﷺ کا اعلان تھا۔ جو ہمارے کام پر مقرر ہوا ہے اگر اس کے پاس گھر نہیں گھر بنا لے، اگر بیوی نہیں وہ شادی کر لے اگر اس کے پاس سواری کے لیے جانور نہیں تو وہ بھی خرید لے۔[1]

اس وقت ایک حکمران کو انھی چیزوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ آپ ﷺ نے ان کی اجازت دے دی تا کہ رشوت لینے سے روکا جا سکے۔ موجودہ زمانے کے قوانین سے کہیں پہلے یہ وہ قاعدہ اور قانون ہے جو اسلام نے بیان کیا تھا، یعنی یہ کہ "حاکم کو ہدیہ دینا صراحتاً رشوت ہے۔"[2]

[1] مسند أحمد: 229/4، وسنن أبي داود، حديث: 2945، و صحيح ابن خزيمة، حديث: 2370. [2] الدولة العربية الإسلامية لمنصور الحرابي، ص: 44.

حجۃ الوداع 10ھ

حج اسلام کے پانچ ارکانوں میں سے ایک ہے جو دس ہجری میں فرض کیا گیا۔ یہ رائے امام ابن قیم رحمہ اللہ نے اختیار کی ہے۔ اس کی ایک بڑی قوی دلیل یہ ہے کہ آپ ﷺ کبھی فریضے کو مؤخر نہ کرتے تھے۔[1]

کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ﴾

"اللہ نے ان لوگوں پر بیت اللہ کا حج فرض کیا ہے جو اس کی طرف سفر کرنے کی طاقت رکھتے ہوں۔"[2]

یہ آیت 9 ہجری کے آخر میں عام الوفود میں نازل ہوئی۔[3]

رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ سے تشریف لا کر صرف 10 ھ کا ہی حج کیا تھا۔ یہ حج حجۃ الاسلام، حجۃ البلاغ اور حجۃ الوداع کے ناموں سے مشہور و معروف ہے کیونکہ آپ ﷺ نے اس میں لوگوں کو الوداع کہا اور اس کے بعد کوئی اور حج نہ کیا۔

حجۃ البلاغ: کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو حج کے موقع پر اللہ تعالیٰ کی شریعت عملاً اور قولاً پہنچا دی تھی۔ اسلام کے قواعد وضوابط کی ہر ہر چیز آپ ﷺ نے اس موقع پر بتا دی۔ جب آپ ﷺ نے حج کا مکمل طریقہ بیان کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے حسب ذیل آیت نازل فرمائی اس وقت آپ ﷺ میدانِ عرفات میں کھڑے ہوئے تھے:

1 زادالمعاد: 3/595. 2 آل عمرٰن 3:97. 3 زادالمعاد: 3/595، والسيرة النبوية للدكتور مهدي رزق الله، ص:680.

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلٰمَ دِيْنًا ؕ ﴾

''آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو دین کے طور پر پسند کیا۔''[1]

جب یہ آیت نازل ہوئی تو بعض صحابہ رونے لگے۔ جن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ گویا وہ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے قریب آنے کا اشارہ سمجھ گئے تھے۔ اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ آپ کو کیا بات رُلاتی ہے؟ تو انھوں نے کہا: ''کسی چیز کی تکمیل کے بعد پھر اس میں صرف کمی و نقصان ہی ہوا کرتا ہے۔''[2]

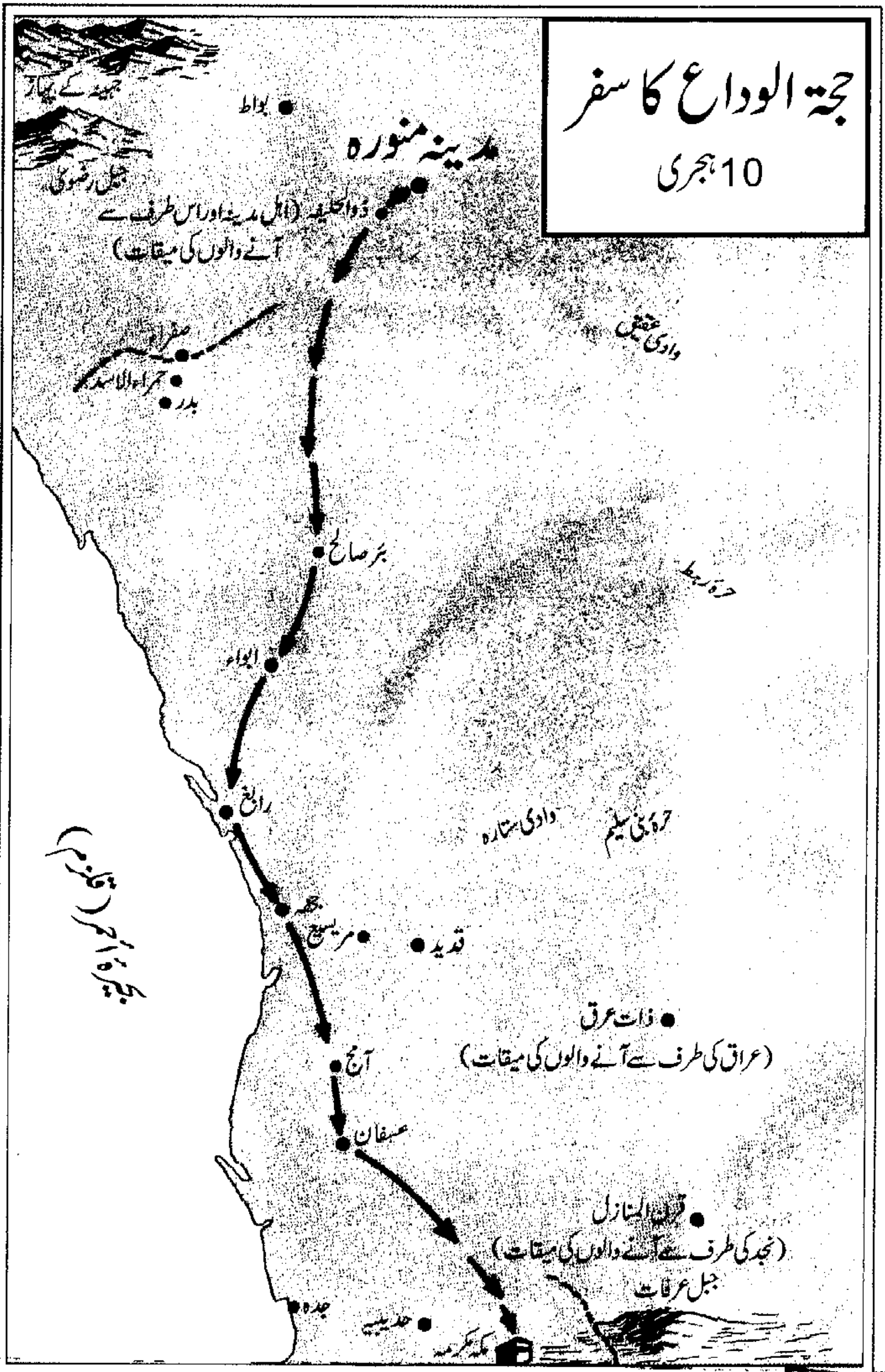
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حج

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کرنے کا ارادہ فرمایا تو ساتھ ہی لوگوں کو بھی بتا دیا کہ میں حج کرنا چاہتا ہوں۔ یہ ذوالقعدہ 10 ھ کی بات ہے۔ لوگ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ راستے میں اتنے لوگ ساتھ ہو گئے کہ شمار سے باہر تھے۔ دائیں بائیں، آگے پیچھے تاحدِ نگاہ لوگ ہی لوگ تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم 25 ذوالقعدہ، بروز ہفتہ ظہر کی چار رکعات ادا کرنے کے بعد دوپہر ہی کو مدینہ سے روانہ ہوئے۔[3]

اس سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو خطبہ دے کر احرام کا طریقہ اور ضروری امور بتائے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم تلبیہ کہتے ہوئے چل پڑے۔ آپ کہہ رہے تھے:

«لَبَّيْكَ، اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ، لَاشَرِيكَ لَكَ لَبَّيْكَ، إِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِيكَ لَكَ»

[1] المآئدة 5:3. صحيح البخاري، حديث:4407، و صحيح مسلم، حديث: 3017. [2] السيرة النبوية لأبي شهبة: 575. [3] صحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص:664، والسيرة النبوية للندوي، ص:386.


حجۃ الوداع کا سفر
10 ہجری
جہینہ کے پہاڑ
جبل رضوی
بواط
مدینہ منورہ
ذوالحلیفہ (اہل مدینہ اور اس طرف سے آنے والوں کی میقات)
وادی عقیق
صفراء
حمراء الاسد
بدر
بئر صالح
حرہ رہط
الابواء
رابغ
وادی ستارہ
حرہ بنی سلیم
بحیرہ احمر (قلزم)
جحفہ
مریسیع
قدید
ذات عرق
(عراق کی طرف سے آنے والوں کی میقات)
آمج
عسفان
قرن المنازل
(نجد کی طرف سے آنے والوں کی میقات)
جبل عرفات
جدہ
حدیبیہ
مکہ مکرمہ

نقشہ: 24

''حاضر ہوں میں تیری خدمت میں، اے اللہ میں حاضر ہوں۔ تیرا کوئی شریک نہیں، میں حاضر ہوں۔ بیشک ہر قسم کی تعریف اور نعمت تیرے لیے ہے اور بادشاہت بھی تیری اور تیرا کوئی شریک نہیں۔'' [1]

لوگ آپ ﷺ کے ساتھ کبھی گھٹتے اور کبھی بڑھتے رہے اور آپ ﷺ مسلسل تلبیہ کہتے ہوئے ''عرج'' پہنچ گئے، پھر ''ابواء'' سے چلے تو سرف مقام میں ''وادی عسفان'' جا پہنچے۔ وہاں سے چلے تو ''ذی طوی'' میں جا کر اتوار کی رات آرام فرمایا۔ ذوالحج کی چار تاریخ ہو چکی تھی۔ وہیں صبح کی نماز پڑھی اور غسل فرمایا اور دن چڑھے بالائی مکہ سے مکہ میں داخل ہوئے۔ اور مسجد الحرام میں چاشت کے وقت پہنچے۔ [2]

پھر تین چکروں میں رمل (چھوٹے چھوٹے قدم، شانے اچھال اچھال کر تیز چلنا) کیا اور چار چکر عام عادت کے مطابق لگائے۔ مقام ابراہیم کی طرف بڑھے تو تلاوت فرمائی:

﴿وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا وَّاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِمَ مُصَلًّى ۭ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّاۗىِٕفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ○﴾

''اور جب ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لیے بار بار لوٹ کر آنے کی اور امن کی جگہ بنایا اور (حکم دیا کہ) تم مقام ابراہیم کو جائے نماز بناؤ اور ہم نے حکم دیا ابراہیم اور اسمٰعیل کو کہ تم دونوں میرا گھر پاک کرو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے۔'' [3]

اب آپ ﷺ نے مقام ابراہیم کو اپنے اور بیت اللہ کے درمیان کر لیا۔ آپ ﷺ نے دو رکعتیں پڑھیں۔ ان میں ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ اور ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ کی

1 صحيح البخاري، حديث: 1549، و صحيح مسلم، حديث: 1184. 2 السيرة النبوية للندوي، ص: 387. 3 البقرة 125:2.

تلاوت فرمائی۔ پھر حجر اسود کی طرف لوٹ آئے۔ اسے بوسہ دیا۔ دروازے سے صفا کی جانب نکلے۔ جب اس کے قریب ہوئے تو پڑھا:

﴿ إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ۚ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ○ ﴾

''بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں، پس جو شخص بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ ان دونوں کا طواف کرے اور جو شخص خوشی سے کوئی نیکی کرے تو بے شک اللہ قدر کرنے والا، خوب جاننے والا ہے۔''[1]

اور صفا سے سعی شروع کی، صفا پر چڑھے یہاں تک کہ جب بیت اللہ کو دیکھا تو قبلہ رخ ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کی توحید و کبریائی بیان کی اور کہا:

«لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ أَنْجَزَ وَعْدَهُ وَنَصَرَ عَبْدَهُ وَهَزَمَ الْأَحْزَابَ وَحْدَهُ»

''اللہ کے سوا کوئی معبود عبادت کے لائق نہیں۔ وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کی بادشاہی ہے اور اسی کے لیے ہر قسم کی تعریف ہے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ اکیلا ہے۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ اپنے بندے کی مدد کی اور اکیلے نے لشکروں کو شکست دی۔''

اس دوران دیگر دعائیں بھی کیں۔ آپ ﷺ نے یہ کلمات تین بار دوہرائے، پھر مروہ کی جانب اترے۔ میدان کے درمیان میں اترے تو دوڑے۔ یہاں تک کہ جب اوپر چڑھنے لگے تو چلنے لگے۔ پھر مروہ آئے تو اس پر بھی صفا پر ٹھہرنے کی طرح ہی کیا۔ جب مروہ پر آخری چکر تھا تو فرمایا: «لَوْ أَنِّي اسْتَقْبَلْتُ مِنْ أَمْرِي مَا اسْتَدْبَرْتُ لَمْ أَسُقْ

[1] البقرة 2: 158.

الْهَدْيَ وَجَعَلْتُهَا عُمْرَةً، فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ لَيْسَ مَعَهُ هَدْيٌ فَلْيَحِلَّ وَلْيَجْعَلْهَا عُمْرَةً» ’’جو کام بعد میں معلوم ہوا اگر مجھے پہلے سے معلوم ہوتا تو میں قربانی ساتھ نہ لاتا اور اس احرام کو عمرے کا احرام بنا لیتا۔ لہٰذا تم میں سے جس کے پاس قربانی نہیں ہے وہ احرام کھول دے اور اسے عمرہ ٹھہرا لے۔‘‘[1]

پھر سراقہ بن مالک بن جعشم کھڑے ہوئے اور عرض کیا: ’’اے اللہ کے رسول! یہ حج کو عمرہ کر ڈالنا ہمارے اس سال کے لیے خاص ہے یا ہمیشہ کے لیے اس کی اجازت ہے۔‘‘ تو آپ ﷺ نے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے میں ڈالیں اور فرمایا: «دَخَلَتِ الْعُمْرَةُ فِي الْحَجِّ» ’’عمرہ حج میں داخل ہو چکا ہے۔‘‘ یہ آپ ﷺ نے دو مرتبہ فرمایا، پھر فرمایا: «لَا بَلْ لِأَبَدِ أَبَدٍ» ’’نہیں بلکہ یہ ہمیشہ کے لیے داخل ہو چکا ہے۔‘‘ آپ ﷺ چار دن، اتوار پیر، منگل اور بدھ کو مکہ مکرمہ میں رہے جمعرات کے روز جب چاشت کا وقت ہوا، تمام مسلمانوں کو اپنے ساتھ لیے منیٰ کی جانب روانہ ہوئے۔ وہیں جا پڑاؤ ڈالا۔ وہیں ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور فجر کی نمازیں ادا کیں۔ اب تھوڑی دیر ٹھہرے کہ سورج طلوع ہو گیا۔ آپ ﷺ نے حکم دیا کہ بالوں کے بنے خیمے کو ’’نمرہ‘‘ میں لگا دیا جائے۔ یہ عرفات کے قریب ہے مگر عرفات میں شامل نہیں۔ اب رسول اللہ ﷺ چلے اور قریش کو یقین تھا کہ آپ ﷺ ’’مشعر الحرام‘‘ میں رک جائیں گے۔ جیسا کہ جاہلیت کے زمانے میں سب قریش کرتے تھے۔ مگر آپ ﷺ آگے گزر گئے۔ عرفات پہنچے۔ آپ ﷺ نے دیکھا خیمہ نمرہ میں لگایا جا چکا ہے تو آپ ﷺ یہاں اترے۔

حجۃ الوداع کے خطبات

جب سورج ڈھل گیا تو آپ ﷺ نے قصواء (نامی اپنی اونٹنی) منگوائی۔ وہ لائی گئی تو آپ ﷺ اس پر سوار ہو کر وادی کے درمیان پہنچ گئے اور خطبہ ارشاد فرمایا:

1 صحیح مسلم، حدیث: 1218.

«إِنَّ دِمَاءَكُمْ، وَ أَمْوَالَكُمْ حَرَامٌ عَلَيْكُمْ، كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا، فِي شَهْرِكُمْ هٰذَا، فِي بَلَدِكُمْ هٰذَا، أَلَا كُلُّ شَيْءٍ مِّنْ أَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ تَحْتَ قَدَمَيَّ مَوْضُوعٌ، وَدِمَاءُ الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوعَةٌ، وَّ إِنَّ أَوَّلَ دَمٍ أَضَعُ مِنْ دِمَائِنَا دَمُ ابْنِ رَبِيعَةَ بْنِ الْحَارِثِ، كَانَ مُسْتَرْضِعًا فِي بَنِي سَعْدٍ، فَقَتَلَتْهُ هُذَيْلٌ، وَّرِبَا الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوعٌ، وَّأَوَّلُ رِبًا أَضَعُ رِبَانَا، رِبَا الْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ، فَإِنَّهُ مَوْضُوعٌ كُلُّهُ.

فَاتَّقُوا اللّٰهَ فِي النِّسَاءِ، فَإِنَّكُمْ أَخَذْتُمُوهُنَّ بِأَمَانِ اللّٰهِ واسْتَحْلَلْتُمْ فُرُوجَهُنَّ بِكَلِمَةِ اللّٰهِ، وَلَكُمْ عَلَيْهِنَّ أَلَّا يُوطِئْنَ فُرُشَكُمْ أَحَدًا تَكْرَهُونَهُ، فَإِنْ فَعَلْنَ ذٰلِكَ فَاضْرِبُوهُنَّ ضَرْبًا غَيْرَ مُبَرِّحٍ، وَّلَهُنَّ عَلَيْكُمْ رِزْقُهُنَّ، وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ.

وَقَدْ تَّرَكْتُ فِيكُمْ مَّا لَنْ تَضِلُّوا بَعْدَهُ إِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهِ، كِتَابَ اللّٰهِ، وَأَنْتُمْ تُسْأَلُونَ عَنِّي، فَمَا أَنْتُمْ قَائِلُونَ؟»

”تمھارے خون اور اموال ایک دوسرے پر اسی طرح حرام ہیں جس طرح آج کا دن حرمت کے اس مہینے اور اس شہر میں محترم ہے۔ زمانہ جاہلیت کی ہر چیز میرے پاؤں تلے روندی گئی ہے۔ زمانہ جاہلیت کے کیے گئے قتل معاف کیے جاتے ہیں۔ پہلا خون جو میں معاف کرتا ہوں ابن ربیعہ کا خون ہے جو بنو سعد میں دودھ پیتا تھا اور ہذیل نے اسے قتل کر دیا تھا۔ اور اسی طرح زمانہ جاہلیت کا تمام سود بھی ختم کر دیا گیا ہے اور پہلا سود جو ہم ختم کرتے ہیں وہ عباس بن عبدالمطلب کا سود ہے وہ سب معاف کر دیا گیا ہے۔

تم سب لوگ عورتوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا تقوی اختیار کرو۔ تم نے انھیں اللہ کی ضمانت پر حاصل کیا ہے اور ان کی شرمگاہ کو تم نے اللہ تعالیٰ کے کلمے سے حلال کیا ہے۔ اور تمھارا ان پر یہ حق ہے کہ وہ تمھارے گھر کسی ایسے شخص کو نہ آنے دیں جس کا آنا تمھیں ناگوار ہو۔ پھر اگر وہ ایسا کریں تو ان کو ایسا مارو کہ سخت چوٹ نہ لگے اور ان کا تمھارے اوپر یہ حق ہے کہ انھیں لباس اور کھانا عام دستور کے مطابق مہیا کرو۔

اور میں تمھارے درمیان ایسی چیز چھوڑے جا رہا ہوں کہ اگر تم نے اسے مضبوطی سے پکڑے رکھا تو کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ (وہ ہے) اللہ تعالیٰ کی کتاب۔ تم سے میرے متعلق پوچھا جائے گا تو کیا کہو گے؟''

ان سب نے عرض کیا: ''ہم گواہی دیں گے کہ آپ نے اللہ کا پیغام پہنچا دیا، رسالت کا حق ادا کر دیا اور امت کی خیر خواہی کی۔'' پھر آپ ﷺ نے انگشتِ شہادت سے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ آپ ﷺ اسے آسمان کی طرف اٹھاتے اور لوگوں کی طرف جھکاتے اور فرماتے تھے: «اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ! اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ» ''اے اللہ گواہ رہنا۔'' اے اللہ گواہ رہنا۔ تین بار یہی فرمایا اور یونہی اشارہ کیا۔

پھر اذان ہوئی۔ تکبیر ہوئی اور ظہر کی نماز ہوئی۔ پھر اقامت ہوئی اور عصر کی نماز ادا کی۔ ان دونوں نمازوں کے درمیان کوئی (نفلی) نماز نہ پڑھی۔ پھر رسول اللہ ﷺ سوار ہوئے اور موقف کی جگہ تشریف لائے۔ اونٹنی کا پیٹ جبلِ رحمت کی نچلی طرف پتھروں کی جانب کیا، جبل المشاۃ کو اپنے آگے کر کے غروب آفتاب تک قبلہ رخ کھڑے رہے۔ سورج کی زردی تھوڑی تھوڑی جاتی رہی اور سورج کی ٹکیا ڈوب گئی۔

ابو الحسن ندوی نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھی اور غروب آفتاب تک عاجزی، تضرع اور دعا میں مصروف رہے۔ آپ ﷺ سینۂ مبارک تک ہاتھ اٹھائے مسکین

کے کھانا طلب کرنے کے مانند دعا کر رہے تھے:

«اَللّٰھُمَّ إِنَّكَ تَسْمَعُ كَلَامِي وَتَرٰى مَكَانِي، وَتَعْلَمُ سِرِّي وَعَلَانِيَتِي لَا يَخْفٰى عَلَيْكَ شَيْءٌ مِّنْ أَمْرِي، أَنَا الْبَائِسُ الْفَقِيرُ، الْمُسْتَغِيثُ الْمُسْتَجِيرُ الْوَجِلُ الْمُشْفِقُ الْمُقِرُّ الْمُعْتَرِفُ بِذُنُوبِي، أَسْأَلُكَ مَسْأَلَةَ الْمِسْكِينِ، وَأَبْتَهِلُ إِلَيْكَ ابْتِهَالَ الْمُذْنِبِ الذَّلِيلِ، وَأَدْعُوكَ دُعَاءَ الْخَائِفِ الضَّرِيرِ، مَنْ خَضَعَتْ لَكَ رُقْبَتُهُ، وَفَاضَتْ لَكَ عَيْنَاهُ، وَذَلَّ جَسَدُهُ، وَرَغِمَ أَنْفُهُ لَكَ، اَللّٰھُمَّ لَا تَجْعَلْنِي لِدُعَائِكَ رَبِّ شَقِيًّا، وَّكُنْ بِي رَؤُوفًا رَّحِيمًا، يَا خَيْرَ الْمَسْؤُولِينَ! وَ يَا خَيْرَ الْمُعْطِينَ!»

”اے اللہ! تو میری بات سنتا ہے اور جہاں میں ہوں اسے بھی دیکھتا ہے، میرے پوشیدہ اور ظاہر کو جانتا ہے، تجھ سے میری کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی، میں مصیبت زدہ، محتاج، فریادی اور پناہ کا خواستگار ہوں، پریشان و ہراساں اور اپنے گناہوں کا اقرار اوراعتراف کرنے والا ہوں، تیرے آگے بے کسوں جیسا سوال کرتا ہوں، گنہگار، کمزور اور حقیر سے شخص کی طرح گڑ گڑاتا ہوں، خوف رسیدہ اور آفت زدہ کے جیسے طلب کرتا ہوں اور اس شخص کی طرح مانگتا ہوں جس کی گردن تیرے سامنے جھکی ہوئی ہو، آنسو بہہ رہے ہوں، تن بدن سے وہ تیرے آگے فروتنی کیے ہوئے ہو اور اپنی ناک تیرے سامنے رگڑ رہا ہو، اے میرے رب! میں دعا کر رہا ہوں تو مجھے محروم نہ کرنا اور میرے حق میں بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہو جا، اے سب مانگے جانے والوں سے بہتر اور سب دینے والوں سے اچھے!“ [1]

وہیں آپ ﷺ پر یہ آیت نازل ہوئی:

1 السيرة النبوية للندوي، ص:389.

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلٰمَ دِيْنًا ۭ ﴾

''آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو دین کے طور پر پسند کر لیا۔''[1]

جب سورج غروب ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ عرفات سے لوٹے، اسامہ رضی اللہ عنہ کو اپنے پیچھے بٹھا لیا اور چل پڑے۔ ''قصواء'' کی مہار اس قدر کھینچی ہوئی تھی کہ اس کا سر آپ کے کجاوے کی اگلی لکڑی سے لگ رہا تھا (مورک وہ جگہ جہاں سوار تھک کر اپنے پاؤں اس کے اوپر رکھ لیتا ہے) اور ساتھ ساتھ آپ فرما رہے تھے: «أَيُّهَا النَّاسُ! عَلَيْكُمُ السَّكِينَةَ» ''اے لوگو! آرام سے چلو۔''[2]

رسول اللہ ﷺ دوران سفر تلبیہ پکار رہے تھے اور مزدلفہ تک تلبیہ نہ چھوڑا۔ وہاں پہنچ کر اونٹوں سے سامان اتارنے اور انھیں بٹھانے سے پہلے ہی آپ ﷺ نے اذان کا حکم دیا تو اذان ہوئی پھر اقامت ہوئی اور آپ ﷺ نے نماز مغرب پڑھائی۔ پھر جب سامان اتار لیا تو اقامت کا حکم دیا اور عشاء کی نماز ادا کی۔ پھر صبح تک محو آرام رہے۔ فجر کی نماز طلوع فجر پر اول وقت میں ادا کی۔ پھر سوار ہو کر ''مشعر حرام'' آئے، قبلہ رخ ہو کر دعا اور الحاح و زاری شروع کی۔ روشنی پھیل جانے تک تکبیر و تحمید و تہلیل اور ذکر الٰہی میں مشغول رہے۔ ابھی سورج طلوع نہ ہوا تھا۔ یہاں سے فضل بن عباس رضی اللہ عنہما کو پیچھے سوار کر کے تلبیہ پکارتے ہوئے چل دیے۔

آپ ﷺ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کو سات کنکریاں چننے کو کہا۔ یہاں تک کہ جب آپ ''وادیٔ محسر'' میں پہنچے تو اونٹنی کو ذرا حرکت دی اور تیز چلے۔[3] کیونکہ وہاں ہاتھی والوں کو

[1] المآئدة 5:3. [2] صحيح مسلم، حديث: 1218، صحيح السيرة النبوية، ص:662. [3] صحيح السيرة النبوية لابراهيم العلي، ص:662، والسيرة النبوية للندوي، ص:389.

عذاب پہنچا تھا۔ یہاں تک کہ منیٰ پہنچ گئے۔ تو ''جمرة العقبہ'' کے پاس آئے۔ سواری پر بیٹھے ہی سات کنکریاں ماریں۔ اور سورج طلوع ہونے کے بعد تلبیہ پکارنا بند کر دیا۔ [1]

پھر منیٰ لوٹ آئے اور لوگوں کو بڑا فصیح و بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس میں آپ ﷺ نے انھیں قربانی کے دن کی عزت و حرمت، اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی فضیلت اور ساری دنیا پر مکہ مکرمہ کی حرمت بتائی۔ لوگوں کو بتایا کہ جو بھی کتاب اللہ کی روشنی میں ان کی قیادت کرے اس کی اطاعت کریں۔ ان سے کہا کہ حج کے اعمال مجھ سے سیکھ لو۔ انھیں یہ بھی فرمایا کہ میرے بعد اسلام چھوڑ کر ایک دوسرے کی گردنیں نہ مارنا شروع کر دینا اور میرے احکام و اقوال دوسروں تک بھی پہنچا دینا۔ [2]

اس خطبے میں آپ ﷺ نے فرمایا: «أَتَدْرُونَ أَيُّ يَوْمٍ هٰذَا؟» ''کیا تمھیں معلوم ہے یہ کونسا دن ہے؟'' صحابہ نے کہا: ''اللہ اور اس کے رسول خوب جانتے ہیں۔'' آپ خاموش ہو گئے، یہاں تک کہ ہم نے خیال کیا کہ آپ ﷺ اس کا کوئی اور نام رکھیں گے۔ آپ ﷺ نے پھر دریافت فرمایا: «أَلَيْسَ ذَالْحَجَّةِ؟» ''کیا یہ ذوالحج نہیں؟'' ہم نے عرض کیا: ''کیوں نہیں!'' پھر آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: «أَيُّ بَلَدٍ هٰذَا؟» ''یہ کون سا شہر ہے؟'' ہم نے عرض کیا: ''اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول خوب جانتے ہیں۔'' آپ ﷺ خاموش رہے یہاں تک کہ ہم نے خیال کیا کہ آپ اس کا سابقہ نام کے سوا کوئی اور نام رکھیں گے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: «أَلَيْسَتْ بِالْبَلْدَةِ الْحَرَامِ؟» ''کیا یہ حرمت والا شہر نہیں؟'' ہم نے عرض کیا: ''کیوں نہیں!'' آپ ﷺ نے فرمایا: «فَإِنَّ دِمَاءَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ عَلَيْكُمْ حَرَامٌ، كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا، فِي شَهْرِكُمْ هٰذَا، فِي بَلَدِكُمْ هٰذَا، إِلٰى يَوْمِ تَلْقَوْنَ رَبَّكُمْ، أَلَا هَلْ بَلَّغْتُ» ''تمھارے خون اور مال (ایک روایت میں ہے اور تمھاری عزتیں) تم پر ایسے ہی قابل احترام ہیں جیسے تمھارا یہ دن

[1] السيرة النبوية للندوي، ص:389. [2] السيرة النبوية للندوي، ص:89.

تمھارے لیے تمھارے اس ماہ میں، تمھارے اس شہر میں محترم ہے۔'' پھر آپ ﷺ نے فرمایا: «أَلَا هَلْ بَلَّغْتُ؟» ''بتاؤ! کیا میں نے (پیغام الٰہی) پہنچا دیا ہے؟'' صحابہ نے جواباً عرض کیا: ''جی ہاں۔''

آپ ﷺ نے فرمایا:

«اللّٰهُمَّ اشْهَدْ، فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ، فَرُبَّ مُبَلَّغٍ أَوْعٰى مِنْ سَامِعٍ، فَلَا تَرْجِعُوا بَعْدِي كُفَّارًا يَّضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ»

''اے میرے اللہ گواہ رہنا۔ یہاں موجود آدمی کو چاہیے کہ غیر حاضر شخص تک یہ پیغام پہنچا دے۔ بسا اوقات جسے بات پہنچائی جائے وہ سننے والے سے زیادہ محفوظ کرنے والا ہوتا ہے۔ (دیکھو) میرے بعد کافر نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔''[1]

قربانی اور بقیہ امور

پھر آپ ﷺ منیٰ میں قربان گاہ کی طرف گئے۔ وہاں اپنے ہاتھ سے تریسٹھ اونٹ ذبح کیے، یہ تعداد آپ ﷺ کی عمر مبارک کے برسوں جتنی تھی۔ بعد ازاں آپ ﷺ رک گئے اور باقی قربانیوں کے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ذبح کرنے کا حکم دیا۔ جب مکمل قربانیاں ذبح ہو گئیں تو حجام کو بلایا، سر منڈایا اور بال موجود لوگوں میں تقسیم فرما دیے۔ پھر سوار ہو کر مکہ مکرمہ کی طرف تشریف لائے اور طوافِ افاضہ کیا۔

مکہ مکرمہ میں نماز ظہر ادا کی، پھر بنو عبدالمطلب کے پاس آئے جو لوگوں کو زمزم پلا رہے تھے۔ ان سے فرمایا: «اِنْزِعُوا بَنِي عَبْدِالْمُطَّلِبِ، فَلَوْلَا أَنْ يَّغْلِبَكُمُ النَّاسُ

[1] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري، ص: 550/2، والسيرة النبوية لأبي شهبة، ص: 578/2.

عَلٰی سِقَایَتِکُمْ لَنَزَعْتُ مَعَکُمْ» ’’اے بنوعبدالمطلب! پانی نکالو، اگر مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ لوگ بھیڑ کر کے تمھیں پانی نہ پلانے دیں گے تو میں بھی تمھارے ساتھ شریک ہو کر پانی نکالتا۔‘‘ پھر ان لوگوں نے آپ ﷺ کو ایک ڈول پیش کیا جس سے آپ ﷺ نے پانی پیا۔

پھر آپ ﷺ اس روز منیٰ واپس چلے گئے۔ وہیں رات گزاری۔ صبح ہوئی تو زوالِ شمس کا انتظار فرمایا۔ زوال کے بعد کنکریاں مارنے چلے تو پہلے جمرۂ اولیٰ، پھر وسطیٰ اور پھر جمرۂ ثالثہ کو کنکریاں ماریں۔ یہی تیسرا ’’جمرہ عقبہ‘‘ ہے۔

آپ ﷺ نے منیٰ میں دو بار خطبہ ارشاد فرمایا۔ پہلا یومِ نحر کو اور دوسرا یوم نحر کے اگلے دن۔[1]

یہی ’’نفر اوّل‘‘ سفر کا پہلا دن ہے۔ تیسرے خطبے میں آپ ﷺ نے پہلے دونوں خطبات، یعنی خطبہ عرفہ اور خطبہ منیٰ ہی کے بعض امور کی تاکید فرمائی تھی۔[2]

مدینہ منورہ کی طرف واپسی

اس کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ تینوں ایام تشریق میں کنکریاں مارنے تک وہیں منی میں رہے پھر مکہ مکرمہ آئے اور فجر کے وقت طواف وداع کیا۔ اور لوگوں کو سفر کا حکم دیا اور مدینہ منورہ کا رخ کیا۔[3]

حجۃ الوداع سے واپسی پر رسول اللہ ﷺ نے جحفہ میں ’’غدیر خم‘‘ کے قریب اٹھارہ ذوالحج کو خطبہ ارشاد فرمایا، اس میں آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَمَّا بَعْدُ! أَلَا أَيُّهَا النَّاسُ! فَإِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ يُوشِكُ أَنْ يَأْتِيَ رَسُولُ رَبِّي فَأُجِيبَ، وَأَنَا تَارِكٌ فِيكُمْ ثَقَلَيْنِ، أَوَّلُهُمَا كِتَابُ اللّٰهِ فِيهِ الْهُدٰى

1 السيرة النبوية للندوي، ص: 390. 2 المستفاد من قصص القرآن لعبدالكريم زيدان: 2/515.
3 السيرة النبوية للندوي، ص: 390.

وَالنُّورُ، فَخُذُوا بِكِتَابِ اللّٰهِ وَاسْتَمْسِكُوا بِهِ»

''اما بعد! لوگو اچھی طرح سنو، میں بھی ایک انسان ہوں، ممکن ہے میرے پاس بھی میرے اللہ کا فرشتہ پہنچ جائے اور میں اس کی بات مان لوں۔ میں تم میں دو بھاری چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ ایک تو کتاب اللہ ہے جس میں ہدایت اور نور ہے تم کتاب اللہ کو خوب تھام کر رکھو۔''

آپ ﷺ نے کتاب اللہ سے متعلق لوگوں کو خوب ابھارا اور اس کی رغبت دلائی، پھر ارشاد فرمایا: «وَأَهْلُ بَيْتِي، أُذَكِّرُكُمُ اللّٰهَ فِي أَهْلِ بَيْتِي، أُذَكِّرُكُمُ اللّٰهَ فِي أَهْلِ بَيْتِي، أُذَكِّرُكُمُ اللّٰهَ فِي أَهْلِ بَيْتِي» ''اور میرے گھر والے، میں تم کو اپنے اہل بیت سے متعلق یاد دہانی کرا رہا ہوں، میں تمھیں اپنے اہل بیت سے متعلق اللہ تعالیٰ یاد کراتا ہوں، میں تمھیں اپنے اہل بیت کے بارے میں اللہ (کی نصیحت) یاد دلاتا ہوں۔''[1]

ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا: «مَنْ كُنْتُ وَلِيَّهُ، فَهٰذَا وَلِيُّهُ، اَللّٰهُمَّ وَالِ مَنْ وَّالَاهُ وَعَادِ مَنْ عَادَاهُ» ''جس کا میں دوست ہوں یہ اس کا دوست ہے، اے اللہ! جو اس سے دوستی رکھے تو بھی اس سے دوستی رکھ اور جو اس سے دشمنی رکھے اس سے تو بھی دشمنی رکھ۔''[2]

ایک روایت ہے: «مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ» ''جس کا میں دوست ہوں اس کا علی بھی دوست ہے۔''[3]

اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ یمن سے آئے تھے اور حجۃ الوداع میں حاضر ہوئے تھے۔[4] لشکر (یمن) میں شریک کچھ لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا شکوہ کیا تھا کہ وہ ان کے ساتھ سختی سے پیش آتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نائب نے کچھ کپڑے تقسیم کیے تھے

---

1 صحيح مسلم، حديث:2408، ومسند أحمد:14/3 و 17. 2 مسند أحمد:118/1. 3 جامع الترمذي، حديث:37/3، ومسند أحمد:368/4. 4 البداية والنهاية:209/5.

جنھیں انھوں نے واپس کرا لیا۔ لہٰذا آپ ﷺ نے ''غدیر خم'' کے مقام پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقام و مرتبہ واضح فرمایا تاکہ لوگ ان کی شکایت کرنے سے باز رہیں۔[1]

اس موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ درست موقف پر تھے۔ انھوں نے نائب کے دیے ہوئے مال کو واپس کیا کیونکہ وہ اموال صدقات اور خمس کے تھے۔[2]

آپ ﷺ جب ذوالحلیفہ پہنچے تو وہاں رات گزاری۔ مدینہ منورہ پر نگاہ پڑی تو تین مرتبہ ''اللہ اکبر'' کہا اور دعا پڑھی:

«لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ، وَلَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ، آيِبُونَ تَائِبُونَ عَابِدُونَ سٰجِدُونَ لِرَبِّنَا حَامِدُونَ ، صَدَقَ اللّٰهُ وَعْدَهُ، وَنَصَرَ عَبْدَهُ وَهَزَمَ الْأَحْزَابَ وَحْدَهُ»

''اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں، اس کی بادشاہی ہے اور حمد بھی اسی کی اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، ہم لوٹنے والے، توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، سجدے کرنے والے، اور اپنے رب کی حمد و ثنا کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ سچا کر دیا ہے، اپنے بندے کی مدد کی ہے اور اس اکیلے نے لشکروں کو شکست دے دی ہے۔''

پھر آپ دن کے وقت مدینہ منورہ میں داخل ہوئے۔[3]

حکمتیں، اسباق اور فوائد

استحکامِ امت

10ھ کو امت اسلامیہ ترقی و استحکام کے اعلیٰ مقام پر پہنچ چکی تھی۔ لہٰذا یہ ترقی چند ایک

1 السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 551/2. 2 السيرة النبوية لأبي شهبة: 581/2.
3 صحيح البخاري، حديث: 1797، و صحيح مسلم، حديث: 1344.

اہم امور کی متقاضی تھی۔ لہٰذا سفر حج اور وفود کے استقبال کی صورت میں آپ ﷺ نے 10,9 ھ کو براہِ راست حصول دین کا دائرہ وسیع تر کر دیا۔ اسی طرح آپ ﷺ نے اس بات کا اہتمام کیا کہ آپ کی دعوت آپ سے براہ راست لی جائے۔ اسلام کی سربلندی اور اسے تا قیامت باقی رکھنے کا یہ موثر ترین ذریعہ تھا۔[1]

اس طرح حجۃ الوداع میں افراد اور پورے معاشرے کی کتاب و سنت پر تربیت کا معاملہ اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔

جاہلیت سے کنارہ کش رہنے اور گناہوں سے دور رہنے کی تربیت

(ا) آپ ﷺ نے ایک مسلمان کے سامنے عہد جاہلیت کے امور مثلاً بت، جاہلی خلفشار یا سود خوری وغیرہ سے اظہار لاتعلقی کی اہمیت کو خوب اجاگر کیا۔ اور یہ کوئی زبانی دعویٰ اور محض وصیت نہ تھی بلکہ ایک قرارداد تھی جس کا اظہار آپ ﷺ نے اپنے آس پاس کے تمام لوگوں کے سامنے کیا اور بعد میں آنے والوں کو بھی یہی پیغام دیا۔ اس قرارداد کے الفاظ یہ تھے: ''خبردار زمانہ جاہلیت کی ہر چیز میرے دونوں قدموں کے نیچے رکھ دی گئی ہے۔ زمانہ جاہلیت کے خونوں کا بدلہ نہیں لیا جائے گا ...... زمانہ جاہلیت کا تمام سود ختم کر دیا گیا ہے۔''[2]

کیونکہ وہ نئی زندگی جس کے مطابق ایک مسلمان اسلام لانے کے بعد زندگی گزارے وہ ایسی ہونی چاہیے کہ اس کا ماضی کی نجاستوں اور میل کچیل سے کوئی تعلق نہ رہے۔[3]

(ب) آپ ﷺ نے گناہوں، غلطیوں اور کوتاہیوں سے، خواہ وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ تنبیہ کرتے ہوئے ڈرایا کیونکہ گناہ اور غلطیاں ایک انسان پر ایسے منفی اثرات چھوڑتی

[1] الأساس في السنة لسعید حوّى: 1054/2. [2] فقه السيرة للبوطي، ص: 331. [3] قراءة سياسية للسيرة النبوية للدكتور قلعجي، ص: 303.

ہیں کہ دشمن بھی یہ کام نہیں کر سکتا۔ دنیا میں انسان کے مصائب کا یہی بنیادی سبب ہیں۔ ارشاد ہے:

﴿وَمَآ اَصٰبَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ﴾

"تمھیں جو کچھ مصیبتیں پہنچتی ہیں وہ تمھارے اپنے ہاتھوں کی کرتوت کا بدلہ ہے اور وہ تو بہت سی باتوں سے درگزر فرما دیتا ہے۔"[1]

اس طرح یہ گناہ اور غلطیاں بالآخر انسان کو آخرت میں جہنم رسید کر دیں گی۔ معاشرے میں گناہوں کا ایسا منفی اثر سامنے آتا ہے جو تلوار سے بھی نہیں ہو سکتا۔ آپ ﷺ نے واضح کیا کہ میری مراد گناہوں سے بت پرستی نہیں کیونکہ جن عقلوں میں توحید کھلے دل داخل ہوئی ہے اور انھوں نے انشراح سے توحید کو قبول کر لیا ہے وہ اس ظاہر اور جلی شرک کی طرف نہیں لوٹ سکتیں لیکن شیطان اس سے ناامید ہرگز نہیں ہوا کہ وہ اس بت پرستی تک گناہوں اور غلطیوں کے سوراخوں سے لے آئے۔ حتی کہ ان کے مرتکب کو بالآخر ہلاکت خیز گڑھوں میں ڈال دے۔[2]

تربیتِ معاشرہ کی اساس

(ا) اسلامی بھائی چارہ ہی ایک مضبوط کڑا اور اساس ہے جو تمام مسلمانوں کو باہم منسلک رکھ سکتا ہے۔

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ﴾

"(یاد رکھو!) سارے مسلمان بھائی بھائی ہیں۔"[3]

آپ ﷺ کا فرمان ہے: "اے لوگو! میری بات سنو اور اسے اچھی طرح سمجھو یہ خوب

1 الشورٰی 30:42. 2 قراءة سياسية للسيرة النبوية للدكتور قلعجي، ص:303. 3 الحجرات 10:49.

جان لو کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ اور تمام مسلمان بھی آپس میں بھائی بھائی ہیں، لہٰذا کسی بھی شخص کے لیے اس کے بھائی سے صرف اسی قدر حلال و جائز ہے جو وہ اپنے دل کی خوشی سے دے دے، لہٰذا اپنے اوپر ظلم وزیادتی نہ کیا کرو۔''

مزید ارشاد فرمایا: ''تمھارے خون اور تمھارے اموال اور تمھاری عزتیں آپس میں تم پر ایسے ہی محترم ہیں جیسی حرمت تمھارے اس دن کی، تمھارے اس شہر میں ہے اور یہ حرمتیں اس وقت تک ہیں جب تک تم اپنے پروردگار سے جا ملو تو وہ تم سے تمھارے اعمال کے متعلق پوچھے گا۔ خبردار! میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔''[1]

(ب) کمزوروں اور ناداروں کا خیال رکھنا تا کہ ان کی کمزوری معاشرے کی عمارت میں رخنہ ثابت نہ ہو۔ لہٰذا آپ ﷺ نے کمزور افراد میں بطور نمونہ عورت اور غلام کا ذکر فرمایا اور ان کے متعلق خیر خواہی کی وصیت فرمائی۔[2]

آپ ﷺ نے عورتوں سے بہتر سلوک کی وصیت کی۔ اور انتہائی مختصر مگر جامع گفتگو میں زمانہ جاہلیت کے عورت پر ہونے والے بدترین مظالم کا خاتمہ کرنے کو کہا اور تاکیداً احکام شریعت میں پائے جانے والے عورت کے حقوق وعزت واکرام کا بار بار حکم دیا۔[3]

(ج) اسلامی احکام کے نفاذ کے لیے حکومت اسلامیہ سے تعاون اور شریعتِ الٰہی کی پاسداری کا حکم، خواہ حاکم ایک حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ اس میں دنیا و آخرت کی فلاح وسعادت پنہاں ہے۔[4]

آپ ﷺ نے وضاحت فرمائی کہ حاکم اور محکوم کا باہمی تعلق سمع و طاعت کا ہے جب

---

[1] صحيح مسلم، حديث: 1218. [2] قراءة سياسية للسيرة النبوية للدكتور قلعجي، ص: 304.
[3] فقة السيرة للبوطي، ص: 332. [4] دولة الرسول من التكوين إلى التمكين للدكتور كامل سلامة، ص: 576.

تک حاکم کتاب اللہ اور سنت رسول کے مطابق فیصلہ کرتا رہے۔ اور جب ان دونوں سے پھر جائے تو اس کی سمع و اطاعت نہیں ہے، گویا حاکم اللہ تعالیٰ کے حکم کی تنفیذ و اجرا کے لیے مسلمانوں کی طرف سے ایک امین کی حیثیت رکھتا ہے۔ [1]

مساوات

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: «لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى أَعْجَمِيٍّ، وَلَا لِأَعْجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ، وَلَا لِأَبْيَضَ عَلٰى أَسْوَدَ، وَلَا لِأَسْوَدَ عَلٰى أَبْيَضَ إِلَّا بِالتَّقْوٰى، النَّاسُ مِنْ آدَمَ، وَآدَمُ مِنْ تُرَابٍ» ''کسی عربی کو عجمی پر کوئی برتری نہیں اور نہ عجمی کو عربی پر ہے اور نہ کسی سفید کو کالے پر اور نہ کسی کالے کو سفید پر برتری حاصل ہے مگر تقویٰ کی بدولت۔ تمام لوگ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور آدم علیہ السلام مٹی سے ہیں۔'' [2]

آپ ﷺ نے وضاحت کر دی کہ برتری کی بنیاد جنس، رنگ، وطن اور قومیت پر نہیں ہے۔ برتری و فضیلت کی بنیاد صرف بلند تر اخلاقی وصف ہے جو انسان کو انتہائی بلند تر مقامات تک لے جاتے ہیں۔ [3]

شریعت کے بنیادی مآخذ کی حد بندی

رسول اللہ ﷺ نے احکامِ شریعت لینے اور مسلمانوں کی مشکلات کے حل کی اعلیٰ و افضل اساس کی تحدید و تعیین فرما دی۔ تمام مشکلات کا حل صرف کتاب و سنت کی طرف رجوع میں پنہاں ہے اس کے ساتھ کوئی تیسری چیز نہیں ہے اور پھر آپ ﷺ نے ان دونوں کو مضبوطی سے تھام لینے کی صورت میں ہر گمراہی اور شقاوت سے محفوظ رہنے کی ضمانت دی ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں کے تھام رکھنے کا

1 فقه السيرة للبوطي، ص: 333. 2 مسند أحمد: 411/3. 3 الموسوعة في سماحة الإسلام لصادق عرجون: 876/2.

عہد لیا ہے اور اسی پر ثابت قدم رہنے پر آنے والی تمام نسلوں کو ہدایت کی ضمانت دی ہے تاکہ یہ بھی واضح فرما دیں کہ ان دونوں دلیلوں کو تھام لینے کی ضرورت کسی ایک زمانے پر موقوف نہیں، اور کسی بھی معاشرتی ترقی یا کسی زمانے کا عرف ان دونوں پر برتری اور غلبے کا حق نہیں رکھتا۔'' [1]

رسول اللہ ﷺ نے مرض اور اس کے علاج کو واضح کر دیا ہے اور تمام تر مشکلات کا حل صرف کتاب اللہ اور سنت رسول سے مکمل وابستگی کو قرار دیا، چنانچہ فرمایا: «تَرَكْتُ فِيكُمْ مَّا إِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِ لَنْ تَضِلُّوا بَعْدِي أَبَدًا كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّتِي» ''میں تم میں وہ کچھ چھوڑ کر جا رہا ہوں کہ اگر تم نے اسے تھام رکھا تو میرے بعد ہرگز گمراہ نہ ہو گے وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور میری سنت ہے۔'' یہ ہے مستقل دائمی علاج۔ آپ ﷺ نے ہر زمان و مکان کے لوگوں کو بار بار یہی دعوت دی ہے کہ پیش آمدہ تمام مشکلات کا حل کتاب و سنت سے رہنمائی لینے میں ہے، کیونکہ ان دونوں کے ساتھ گہری وابستگی سے لوگ گمراہی سے بچ سکتے ہیں۔ اور کتاب و سنت ہی حال یا استقبال میں سیدھی راہ پر گامزن کرنے کے ضامن ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات اور ہدایات جزیرۃ العرب سے باہر پہنچ گئیں۔ ان تعلیمات نے زمان و مکان کی تمام تر حدود کو برطرف کر دیا۔ اس کی صدا و پکار آج تک سنائی دے رہی ہے بلکہ یہ قیامت تک یوں ہی قائم دائم رہے گی کیونکہ آپ ﷺ کبھی اپنے سامعین کو اس طرح مخاطب نہ ہوتے تھے کہ «أَيُّهَا الْمُؤْمِنُونَ، أَيُّهَا الْمُسْلِمُونَ، أَيُّهَا الْحُجَّاجُ» ''اے مومنو!''، ''اے مسلمانو!''، ''اے حاجیو!'' بلکہ آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے: «أَيُّهَا النَّاسُ» ''اے لوگو!'' آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے جہانوں کے لیے رحمت اور دنیا بھر کے تمام انسانوں کی طرف مبعوث فرمایا تھا، اس لیے آپ ﷺ نے اکثر مواقع پر اپنی پکار میں خاص جنس، زمانے، جگہ یا رنگ کے لوگوں کے بجائے عام

[1] فقه السيرة للبوطي، ص:333.

اور تمام لوگوں کو پکارا ہے۔[1]

حجۃ الوداع کے خطبات میں تعلیمی اسالیب

① **جس کی تعلیم دینا مقصود ہو اس کی عملی و فعلی تعلیم:** رسول اللہ ﷺ نے اپنے معزز ساتھیوں کو اعمال حج عملی صورت میں سکھائے، وہ اس طرح کہ آپ ﷺ نے صرف زبانی طور پر سکھانے پر اکتفاء کے بجائے عملاً خود کر کے دکھا دیا، اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا: «خُذُوا عَنِّي مَنَاسِكَكُمْ» ''اپنے اعمالِ حج مجھ سے لے لو۔''[2]

لٰہذا داعی حضرات جب لوگوں کو مفاہیم اسلام سکھاتے ہیں تو انھیں چاہیے کہ یہ تمام اعمال اور احکامِ شرعیہ یا کم از کم ان میں سے کچھ ہی، مثلاً: وضو، نماز اور قرآن پاک کی تعلیم بہتر طریقے سے عملی طور پر سکھائیں۔[3]

② **متعدد بار خطبات دینا:** ہم مطالعہ کر چکے ہیں کہ آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر کئی مرتبہ خطبہ ارشاد فرمایا۔ آپ ﷺ نے عرفہ میں خطبہ دیا، پھر منیٰ میں دو مرتبہ خطبہ ارشاد فرمایا۔ اسی طرح ان میں موجود بعض مسائل کا بار بار ذکر کیا۔ دعاۃ کو بھی چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ کی اقتدا کریں خطبات کو دہرائیں اور پھر ضرورت والے مسائل کو بار بار بیان کریں یہاں تک کہ سامعین انھیں اچھی طرح ازبر اور یاد کر لیں۔ کیونکہ خطیب کے خطبے کا مقصد سامعین کو بات سمجھانا ہوتا ہے اور جب خطبہ یا بعض مسائل دہرائی کے ذریعے ہی سمجھ آنے والے ہوں تو ان کا اعادہ ضروری ہو جاتا ہے اور داعی کو چاہیے کہ انھیں دہرا دے۔ خطیب جب تک محسوس کرے کہ خاص مفاہیم سامعین کے ذہن نشین کرانا ضروری ہیں تو خطبے میں نئی گفتگو لانے کی خواہش نہیں ہونی چاہیے۔ کیونکہ داعی اور

1 الجانب السياسي في حياة الرسول ﷺ لمحمد أحمد باشميل، ص: 131. 2 صحيح مسلم، حديث: 1297، والسيرة النبوية الصحيحة: 549/2. 3 المستفاد من قصص القرآن لعبد الكريم زيدان: 518/2.

خطیب کا اصل کام اور ارادہ یہ ہوتا ہے کہ سامعین کو فائدہ پہنچائے۔ اس کا یہ مقصد ہی نہیں کہ خطبات میں اپنی خوبی کا اظہار کرتا جائے۔ نئے سے نئے مسائل بلا غور وفکر ذکر کرتا جائے اور سامعین کی ضرورت کا کوئی خیال ہی نہ ہو۔ اور ان کے سمجھنے اور مسائل پر احاطہ کر لینے کے متعلق سوچے ہی نہ![1]

③ **موجود شخص کو چاہیے کہ غیر حاضر تک بھی یہ پیغام پہنچا دے:** اس میں رسول اللہ ﷺ کی اعلیٰ رہنمائی پائی جارہی ہے کہ حتی الامکان زیادہ سے زیادہ لوگوں کو فائدہ حاصل ہوسکے۔ یہ بھلائی ونیکی پر تعاون کے باب میں آتا ہے۔ کیونکہ جو شخص ایسی مجلس میں نہیں آسکا بسا اوقات وہ سننے والے کی نسبت زیادہ علم وفہم اور ادراک رکھنے والا ہوتا ہے، لہٰذا داعیانِ دین اور علمائے کرام کو چاہیے کہ کوئی بھی محاضرہ یا درس دینے کے بعد سامعین سے کہیں کہ تم میں سے حاضر شخص کو چاہیے کہ اس نے جو کچھ سنا ہے اسے غیر موجود لوگوں تک پہنچا دے۔

④ **دورانِ تقریر حاضرین کو بیدار و چوکس رکھنے کا تقاضا:** رسول اللہ ﷺ نے سامعین سے اس دن، مہینے اور شہر کی بابت پوچھا، حالانکہ وہ انھیں جانتے تھے۔ دراصل اس انداز سے سامعین کو بیدار ہونے کا کہا جارہا تھا کہ وہ ہونے والی بات کی طرف بھرپور توجہ کریں کہ ممکن ہے آپ کا ان سوالات سے ارادہ کچھ اور ہو۔

امام قرطبی کہتے ہیں: ''نبی مکرم ﷺ کا دن، ماہ اور شہر کے متعلق سوال کرنا اور پھر ہر سوال کے بعد خاموشی اختیار کرنا ان کی حاضر دماغی کے لیے تھا اور اس لیے بھی کہ وہ اس بات کی طرف مکمل طور پر متوجہ ہوں اور جو بات ان سے کہی جانے والی ہے اس کی عظمت کا خیال رکھیں۔ لہٰذا علماء و داعیانِ دین کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی کہی جانے والی گفتگو سے پہلے ایسی صورت حال پیدا کریں جو سامعین کی بیداری کا موجب بنے اور

[1] المستفاد من قصص القرآن لعبد الكريم زيدان: 2/518,517.

انھیں متکلم کے کلام کی جانب بھرپور راغب کر دے۔"[1]

حجۃ الوداع سے سمجھے جانے والے چند فقہی احکام

حجۃ الوداع میں بہت سے شرعی احکام پائے جاتے ہیں۔ خاص طور پر جن کا تعلق حج اور وصیتوں سے اور ان احکام سے ہے جو عرفات کے خطبے میں آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علماء نے حجۃ الوداع کو بڑی اہمیت دی اور اس سے حج و قربانی کے بہت سے احکام کا استنباط کیا ہے۔ جن سے فقہ اور حدیث کی تشریح والی کتب بھری پڑی ہیں۔ بعض نے تو صرف حجۃ الوداع ہی پر مستقل کتب تالیف کی ہیں۔[2]

ہم ان میں سے بعض احکام کی طرف انتہائی اختصار سے اشارہ کر رہے ہیں:

عرفہ کے دن حاجیوں کے لیے روزہ رکھنا مسنون نہیں: ام المومنین حضرت میمونہ بنت حارث رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ یوم عرفہ کے متعلق لوگوں نے شک کیا کہ کیا آپ ﷺ کا روزہ ہے یا نہیں، چنانچہ میں نے آپ ﷺ کی طرف دودھ کا برتن بھیجا، آپ اس وقت "موقف" (میدان عرفات) میں کھڑے تھے تو آپ ﷺ نے وہ دودھ پیا اس دوران تمام لوگ آپ ﷺ کو دیکھ رہے تھے۔[3]

احرام میں کوئی فوت ہو جائے تو......؟ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عرفات میں کھڑا تھا کہ اپنی اونٹنی پر سے گر پڑا تو اس کی گردن ٹوٹ گئی۔ رسول اللہ ﷺ سے اس کا ذکر کیا گیا تو فرمایا: «اِغْسِلُوهُ بِمَاءٍ وَّسِدْرٍ وَّكَفِّنُوهُ فِي ثَوْبَيْنِ وَلَا تُحَنِّطُوهُ، وَلَا تُخَمِّرُوا رَأْسَهُ، فَإِنَّهُ يُبْعَثُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مُلَبِّيًا» "اس کو پانی اور بیری کے پتوں سے غسل دو اور اسے دو کپڑوں

[1] المستفاد من قصص القرآن لعبد الكريم زيدان: 518/2. [2] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 549/2. [3] صحيح البخاري، حديث: 1989، و صحيح مسلم، حديث: 1123-(110).

میں کفن دے دو۔ اس کے سر کو نہ ڈھانپو اور نہ ہی خوشبو لگاؤ پس یہ قیامت کے روز لبیک پکارتا ہوا اٹھایا جائے گا۔"[1]

کسی اور کی طرف سے حج: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ فضل بن عباس رضی اللہ عنہما اونٹنی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سوار تھے۔ اس وقت قبیلہ خثعم کی ایک عورت آئی۔ وہ فضل کی طرف دیکھنے لگی اور فضل اس کی طرف دیکھنے لگے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فضل کا چہرہ دوسری طرف پھیرنے لگے۔ اس عورت نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! اللہ تعالیٰ نے جب اپنے بندوں پر حج فرض کیا ہے میرے باپ پر بھی اس وقت فرض ہوا ہے۔ مگر وہ بوڑھے ہیں اور سواری پر سوار بھی نہیں ہو سکتے۔ تو کیا میں ان کی طرف سے حج کروں؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «نَعَمْ!» "ہاں۔" اور یہ حجۃ الوداع کا موقع تھا۔[2]

حج میں آسانی پیدا کرنا: حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سواری پر کھڑے ہوئے تو لوگ آپ سے مسائل پوچھنے لگے۔ ایک شخص نے کہا: "اے اللہ کے رسول! مجھے علم ہی نہ تھا کہ رمی قربانی سے پہلے ہے مگر میں نے رمی سے پہلے قربانی کر لی ہے؟" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «اِرْمِ وَلَا حَرَجَ» "اب رمی کرو کچھ مضائقہ نہیں ہے۔" دوسرے نے عرض کیا: "مجھے معلوم ہی نہ تھا کہ قربانی حلق سے پہلے کرنا ضروری ہے، لہٰذا میں نے قربانی سے پہلے ہی سر منڈا لیا ہے۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «اِنْحَرْ وَلَا حَرَجَ» "اب قربانی کر لو، کوئی مضائقہ نہیں۔" راوی کہتا ہے: میں نے سنا کہ جس شخص نے بھی اس دن ایسے کام سے متعلق پوچھا جسے انسان بھول کر آگے پیچھے کر لیتا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فرمایا: «اِفْعَلْ وَلَا حَرَجَ» "اب کر لو، کوئی حرج نہیں۔"[3]

1 صحيح مسلم، حديث: 1206، وسنن ابن ماجه، حديث: 3084، ومسند أحمد: 215/1، والسنن الكبرى للنسائي: 195/5. 2 صحيح البخاري، حديث: 1513، و صحيح مسلم، حديث: 1334. 3 صحيح البخاري، حديث: 83، وصحيح مسلم، حديث: 1306.

حج کے مختلف دنوں کے مختلف نام رکھنے کا فائدہ

سات ذوالحج کو ''یوم الزینہ'' کہا جاتا تھا کیونکہ اس دن قربانی کیے جانے والے جانوروں کو سجایا جاتا تھا۔

آٹھ ذوالحج کو ''یوم الترویہ'' کہتے ہیں کیونکہ اس دن وہ لوگ اپنے اونٹوں کو خوب پانی پلا لیتے اور عرفات اور اس کے بعد کے دنوں کے لیے خود بھی پانی لے لیتے تھے۔ کیونکہ ان مقامات میں ان دنوں نہ کنویں تھے اور نہ چشمے، اگرچہ اب تو بحمد اللہ وہاں پانی کی کوئی کمی نہیں۔

نویں ذوالحج کو ''یوم عرفہ'' اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ اس دن لوگ میدانِ عرفات میں ٹھہرتے تھے۔

دسویں دن کو ''یوم النحر، یوم الاضحیٰ اور یوم الحج الاکبر'' کہتے ہیں۔

گیارھویں دن کو ''یوم القرّ'' اس لیے کہ اس روز وہ ادھر ادھر آنے جانے سے رک جاتے تھے۔ اسے یوم الرؤوس بھی کہتے کیونکہ اس روز قربانیوں کی سریاں کھاتے تھے۔ اور یہی ایام تشریق کا پہلا دن تھا۔

تشریق کے دوسرے دن کو ''یوم النفر الاوّل'' کہتے۔ کیونکہ جسے جلدی ہو اس کے لیے اس دن مکہ مکرمہ کی جانب چلے آنا جائز ہوتا ہے۔

ایام تشریق کے تیسرے دن کو ''یوم النفر الثانی'' کہتے۔[1] ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ۚ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝ ﴾

1 السيرة النبوية لأبي شهبة: 579/2.

''اور گنتی کے چند دنوں میں تم اللہ کو یاد کرو، پھر جس نے دو دنوں (منیٰ سے مکے کی طرف واپسی) میں جلدی کی تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور جس نے (ایک دن کی) تاخیر کی تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں (بشرطیکہ) وہ تقویٰ اختیار کرے اور تم اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ بے شک تمھیں اسی کے حضور اکٹھا کیا جائے گا۔''[1]

1 البقرة 2:203.

رسول اللہ ﷺ کا مرض اور وفات

بعض آیات نے آپ ﷺ کے بشر ہونے کی حقیقت کو تاکید کے ساتھ ذکر کیا ہے اور اس کا تذکرہ کیا ہے کہ آپ ﷺ بھی انسان ہونے کے اعتبار سے موت اور اس کے مقدمات سے دو چار ہوں گے جیسا کہ سابقہ انبیائے کرام علیہم السلام (عیسیٰ علیہ السلام کے علاوہ) نے بھی موت کو گلے لگایا۔ رسول اللہ ﷺ بعض آیات سے قربِ موت کو سمجھ چکے تھے۔ بعض صحیح احادیث میں آپ ﷺ کی وفات کے قریب آنے کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ کچھ احادیث تو ایسی ہیں جو وفات پر صراحتاً دلالت کرنے والی ہیں اور کچھ صریح نہیں جنھیں چند بزرگ صحابہ جیسے ابوبکر، عباس اور معاذ رضی اللہ عنہم کے سوا اکثر صحابہ نہ سمجھ سکے۔[1]

رسول اللہ ﷺ کی وفات سے متعلق آیات و احادیث درج ذیل ہیں:

قرآنی آیات میں وفاتِ نبوی کا اشارہ

① ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَا۟ىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَـيْـــًٔـا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ﴾

”اور محمد (ﷺ) ایک رسول ہی تو ہیں۔ ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔ اگر ان کا انتقال ہو جائے یا یہ شہید ہو جائیں تو کیا تم اسلام سے اپنی ایڑیوں

[1] مرض النبي ﷺ و وفاته لخالد أبي صالح، ص:33.

کے بل پھر جاؤ گے؟ اور جو کوئی اپنی ایڑیوں کے بل پھر جائے تو وہ اللہ کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکے گا۔ اور اللہ شکر ادا کرنے والوں کو اچھی جزا دے گا۔''[1]

امام قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بتایا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قوموں میں ہمیشہ نہیں رہتے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم خواہ وفات یا شہادت کی صورت میں چلے جائیں تب بھی ہر صورت ان کی تعلیمات کو مضبوطی سے اپنائے رکھنا ضروری ہے۔

② ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ۝ ﴾

''(اے نبی!) بلاشبہ آپ بھی وفات سے ہمکنار ہونے والے ہیں اور وہ (کافر) بھی یقیناً مرنے والے ہیں۔''[2]

ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ آیت ان میں سے ایک ہے جن سے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی دلیل سمجھا حتی کہ لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا یقین کرلیا۔[3]

③ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۭ اَفَا۟ىِٕنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ۝ ﴾

''اور (اے نبی!) ہم نے آپ سے پہلے بھی کسی بشر کو ہمیشہ کی زندگی نہیں دی، پھر اگر آپ مر جائیں تو کیا وہ ہمیشہ رہنے والے ہیں؟''[4]

پھر اس کے بعد ذکر کیا کہ موت ایک لازمی چیز اور طے شدہ بات ہے۔ ارشاد ہے:

﴿ كُلُّ نَفْسٍ ذَاۗىِٕقَةُ الْمَوْتِ ۭ وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ۭ وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ۝ ﴾

''ہر نفس موت کو چکھنے والا ہے۔ اور ہم تمھیں پرکھنے کے لیے برائی اور بھلائی سے

[1] آل عمرٰن 3:144. [2] الزمر 30:39. [3] تفسیر ابن کثیر: 4/53. [4] الأنبياء 21:34.

آزماتے ہیں اور آخرکار تمھیں ہماری ہی طرف پلٹنا ہے۔''[1]

یہ آیات صریح اور آپ ﷺ کی وفات پر نص ہیں۔ بعض آیات ایسی بھی ہیں جن میں صراحت تو نہیں مگر اشارات موجود ہیں، مثلاً:

① ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ○ وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ○﴾

''اور یقیناً آپ کے لیے آخرت، دنیا سے بہت بہتر ہے۔ اور جلد آپ کا رب آپ کو اتنا دے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔''[2]

② ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ○ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ○ ﴾

''ہر چیز، جو اس (زمین) پر ہے، فنا ہونے والی ہے۔ اور آپ کے رب کا چہرہ باقی رہے گا جو بڑی شان اور عزت والا ہے۔''[3]

③ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ۭ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○ ﴾

''اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس کی ذات کے، اسی کی حاکمیت و فرمانروائی ہے اور تم (سب) اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔''[4]

یہ آیات وضاحت کر رہی ہیں کہ تمام اہل زمین کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فیصلہ نافذ ہو کر رہے گا اس سے کوئی بھی کبھی بھی محفوظ نہ رہے گا۔

④ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۭ ﴾

[1] الأنبياء 35:21. [2] الضحٰى 5,4:93. [3] الرحمٰن 27,26:55. [4] القصص 88:28.

”آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو دین کے طور پر پسند کر لیا۔“ [1]

جب یہ آیت اتری تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ رونے لگے۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ کو کیا بات رلاتی ہے؟“ تو کہا: ”کمال کے بعد صرف کمی و کوتاہی ہوتی ہے۔“ گویا انھوں نے اس آیت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کو محسوس کر لیا تھا۔ [2]

⑤ ارشاد ہے:

﴿ إِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝ ﴾

”(اے نبی!) جب اللہ کی مدد اور فتح آ جائے۔ اور آپ لوگوں کو دیکھیں کہ وہ اللہ کے دین میں گروہ در گروہ داخل ہو رہے ہیں۔ تو آپ اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کیجیے اور اس سے بخشش مانگیے، بلاشبہ وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔“ [3]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سورت کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا: تو انھوں نے کہا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا اشارہ ہے۔ جس کی اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ”میں بھی وہی سمجھتا ہوں جو تم نے (اس سے) سمجھا تھا۔“ [4]

طبرانی کی روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ”جب یہ آیت اتری تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وفات کی اطلاع دی گئی۔“ [5]

احادیثِ مبارکہ میں وفاتِ نبوی کی طرف اشارہ

وہ احادیث جو وفات النبی کی جانب اشارہ کرتی ہیں، درج ذیل ہیں:

[1] المآئدة 5:3. [2] البداية والنهاية: 189/5. [3] النصر 110: 1-3. [4] صحيح البخاري، حديث: 4430. [5] المعجم الكبير للطبراني، رقم: 2676، ومجمع الزوائد: 27,26/9، والموضوعات لابن الجوزي: 1/295-301.

① حضرت عائشہ ؓ بیان کرتی ہیں کہ ہم سب بیویاں رسول اللہ ﷺ کے پاس اکٹھی تھیں۔ اتنے میں حضرت فاطمہ ؓ آئیں۔ اللہ کی قسم! ان کی چال رسول اللہ ﷺ کی چال سے بالکل مشابہ تھی۔ جب آپ ﷺ نے انھیں دیکھا تو فرمایا: «مَرْحَبًا بِابْنَتِي» ''میری بیٹی خوش آمدید!'' پھر انھیں اپنے دائیں یا بائیں بٹھالیا۔ اس کے بعد ان کے کان میں کوئی بات کہی تو وہ رونے لگیں۔ پھر دوبارہ سرگوشی کی تو وہ ہنسنے لگیں۔ میں نے فاطمہ سے کہا: ''رسول اللہ ﷺ نے سب کو چھوڑ کر آپ سے راز کی بات کی ہے اور آپ رو رہی ہیں؟'' جب وہ کھڑی ہوئیں تو میں نے ان سے پوچھا: ''بتائیں تو سہی، رسول اللہ ﷺ نے تم سے آہستہ آہستہ کیا فرمایا تھا؟'' انھوں نے کہا: ''میں رسول اللہ ﷺ کی راز کی بات افشا نہ کروں گی۔'' جب آپ ﷺ کی وفات ہوگئی اس وقت میں نے ان سے کہا:

''آپ پر میرا جو حق ہے اس حوالے سے میں پوچھتی ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس روز تم سے کیا فرمایا تھا؟'' انھوں نے کہا: ''اب اس کے بیان کرنے میں کوئی (حرج) نہیں، پھر کہنے لگیں: جب آپ ﷺ نے پہلی بار میرے کان میں بات کی تھی تو یہ فرمایا تھا: «إِنَّ جِبْرِيلَ كَانَ يُعَارِضُنِي فِي الْقُرْآنِ كُلَّ سَنَةٍ مَّرَّةً وَّقَدْ عَارَضَنِي فِي هٰذَا الْعَامِ مَرَّتَيْنِ وَلَا أَرٰى ذٰلِكَ إِلَّا عِنْدَ اقْتِرَابِ أَجَلِي، فَاتَّقِي اللّٰهَ وَاصْبِرِي، فَنِعْمَ السَّلَفُ أَنَا لَكِ!» ''جبرئیل علیہ السلام ہر سال مجھ سے قرآن پاک کا ایک بار دور کیا کرتے تھے اس سال انھوں نے دوبار دور کیا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ میری موت قریب ہے۔ تم اللہ تعالیٰ سے ڈرتی رہنا اور صبر کرنا۔ میں تمھارے لیے آخرت میں اچھا پیش خیمہ ہوں گا۔'' یہ سن کر میں رونے لگی۔ آپ ﷺ نے پھر مجھ سے سرگوشی کی اور فرمایا: «أَلَا تَرْضَيْنَ أَنْ تَكُونِي سَيِّدَةَ نِسَاءِ الْمُؤْمِنَاتِ أَوْ سَيِّدَةَ نِسَاءِ هٰذِهِ الْأُمَّةِ» ''اے فاطمہ! کیا تم اس سے خوش نہیں کہ تم سب مسلمانوں کی عورتوں یا یوں فرمایا کہ اس

امت کی عورتوں کی سردار ہوگی؟" تو میں ہنسنے لگی۔[1]

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ کی قرب وفات کا واضح اشارہ اور قطعی دلیل موجود ہے کہ جدائی کی گھڑی سر پر کھڑی ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ آپ ﷺ نے یہ صرف اپنی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بتایا۔ دیگر مسلمانوں کو اس کا آپ ﷺ کی وفات کے بعد ہی پتا چلا۔[2]

② حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی مکرم ﷺ کو "یوم النحر" سوار حالت ہی میں کنکریاں مارتے دیکھا۔ آپ ﷺ فرما رہے تھے: «لِتَأْخُذُوا مَنَاسِكَكُمْ فَإِنِّي لَا أَدْرِي لَعَلِّي لَا أَحُجُّ بَعْدَ حَجَّتِي هٰذِهِ» "مجھ سے اپنے حج کے مناسک سیکھ لو کیونکہ میں نہیں جانتا! شاید اس حج کے بعد پھر حج نہ کر سکوں۔"[3]

③ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو خطبہ ارشاد فرمایا: «إِنَّ اللّٰهَ خَيَّرَ عَبْدًا بَيْنَ الدُّنْيَا وَبَيْنَ مَا عِنْدَهُ ، فَاخْتَارَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ» "اللہ تعالیٰ نے ایک بندے کو اختیار دیا ہے کہ دنیا رکھ لو یا جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اسے اختیار کر لو تو اس بندے نے جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اسے پسند کر لیا۔" راوی کہتا ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ یہ سن کر رونے لگے۔ تو ہم نے ان کے رونے پر تعجب کیا کہ اس میں رونے کی کونسی بات ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی بندے کو اختیار دیے جانے کا تذکرہ ہی تو کیا ہے۔ ہمیں بعد میں پتا چلا کہ جسے اختیار دیا گیا تھا وہ رسول اللہ ﷺ ہی تھے اور واقعی ابوبکر رضی اللہ عنہ ہم سب سے زیادہ صاحبِ علم تھے۔[4]

④ حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ گویا زمین مضبوط رسیوں کے ساتھ آسمان کی جانب کھینچی جا رہی ہے۔ میں نے یہ خواب

---

1 صحيح البخاري، حديث:6286,6285، و صحيح مسلم، حديث:(99,98)-2450 و المعجم الكبير للطبراني: 275/16. 2 مرض النبي ﷺ و وفاته لخالد أبي صالح، ص:35. 3 صحيح مسلم، حديث: 1297. 4 صحيح البخاري، حديث: 466، و صحيح مسلم، حديث: 2382.

آپ ﷺ سے بیان کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: «ذَاكَ وَفَاةُ ابْنِ أَخِيكَ» ''یہ تو تمھارے بھتیجے کی موت (کا اشارہ) ہے۔''[1]

اس حدیث میں بھی آپ ﷺ کی وفات کے قریب آنے کی خبر ہے اور یہ بھی کہ مومن کا خواب سچا ہوتا ہے۔ اور یہ بھی کہ بعض صحابہ کو آپ ﷺ کی وفات کا حال معلوم کرا دیا گیا تھا۔[2]

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انھیں جب یمن کی جانب بھیجا تو وہ سوار ہو کر مدینہ منورہ سے نکلے، جبکہ نبی مکرم ﷺ ان کی سواری کے ساتھ ساتھ پیدل چل رہے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «يَا مُعَاذُ! إِنَّكَ عَسٰى أَلَّا تَلْقَانِي بَعْدَ عَامِي هٰذَا فَتَمُرَّ بِقَبْرِي وَمَسْجِدِي» ''اے معاذ! ممکن ہے تم اس سال کے بعد مجھ سے نہ مل سکو اور تم میری قبر اور مسجد کے پاس سے گزرو۔'' (یہ سن کر) معاذ رضی اللہ عنہ (فراق کی اس خبر پر) رو پڑے تو آپ ﷺ نے فرمایا: «لَا تَبْكِ يَا مُعَاذُ فَإِنَّ الْبُكَاءَ مِنَ الشَّيْطٰنِ» ''معاذ مت رو، رونا (چیخنا، چلانا) تو شیطان کی جانب سے ہوتا ہے۔''[3]

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو اپنی وفات کے قریب آنے کی اطلاع دی ہے کہ عین ممکن ہے تم مجھے اس سال کے بعد نہ مل سکو۔ اس سے آپ ﷺ کے ساتھ صحابہ کرام کی والہانہ محبت کا بھی پتا چلتا ہے کہ جب ان کے سامنے آپ کے فراق کا تذکرہ ہوتا تو وہ (بے اختیار) رو پڑتے۔[4]

---

1 مسند البزار، رقم: 844، و مجمع الزوائد للهيثمي: 24,23/9. 2 مرض النبي ﷺ ووفاته لخالد أبي صالح، ص: 37. 3 مسند أحمد: 235/5، والمعجم الكبير للطبراني: 121/2، ومجمع الزوائد للهيثمي: 22/9، وصحيح ابن حبان، رقم: 647. 4 مرض النبي ﷺ ووفاته لخالد أبي صالح، ص: 38.

رسولِ گرامی ﷺ کا مرض

لشکرِ اسامہ کی روانگی اور مرض کی ابتداء

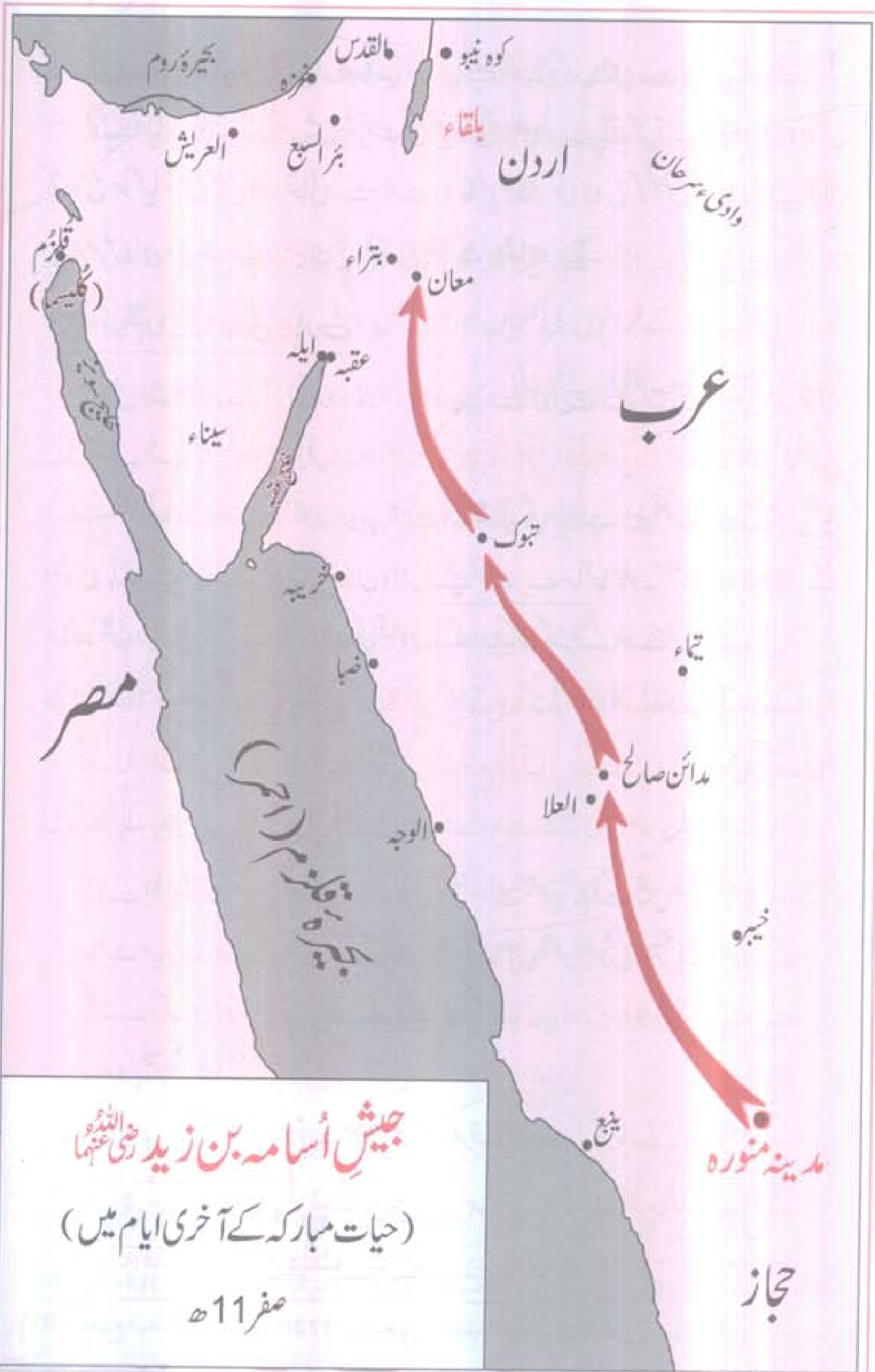
رسول اللہ ﷺ ذوالحج میں حجۃ الوداع سے واپس لوٹے اور اس کے بعد 10 ھ کا بقیہ ذوالحج کا مہینہ اور محرم اور صفر میں مدینہ منورہ ہی میں اقامت گزیں رہے۔

حج سے واپسی پر حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کا لشکر تیار کرنے لگے۔ آپ ﷺ نے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو امیر بنا کر حکم دیا کہ فلسطین اور بلقاء کی طرف پیش قدمی کرو۔ لوگ تیار ہو گئے۔ ان میں عام مہاجرین و انصار اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما بھی شامل تھے۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی عمر اس وقت صرف اٹھارہ سال تھی۔ بعض لوگوں نے اعتراض بھی کیا کہ اس لشکر میں بڑے بڑے انصار و مہاجرین موجود ہیں تو اس چھوٹی عمر کے اور آزاد کردہ غلام (کے بیٹے) کو امیر کیونکر بنایا جا رہا ہے؟ مگر رسول اللہ ﷺ نے اسامہ رضی اللہ عنہ کی امارت کے متعلق کسی بھی قسم کے اعتراض کو قبول نہ کیا۔[1] اور فرمایا:

«إِنْ تَطْعَنُوا فِي إِمَارَتِهِ فَقَدْ كُنْتُمْ تَطْعَنُونَ فِي إِمَارَةِ أَبِيهِ مِنْ قَبْلُ، وَايْمُ اللّٰهِ! إِنْ كَانَ لَخَلِيقًا لِلْإِمَارَةِ، وَإِنْ كَانَ لَمِنْ أَحَبِّ النَّاسِ إِلَيَّ، وَإِنَّ هٰذَا لَمِنْ أَحَبِّ النَّاسِ إِلَيَّ بَعْدَهُ»

”اگر تم اسامہ کی امارت پر اعتراض کرتے ہو تو تم نے اس سے پہلے اس کے باپ کی امارت پر بھی اعتراض کیا تھا۔ اور اللہ کی قسم! وہ امارت کے لائق تھا اور وہ سب لوگوں

[1] السيرة النبوية الصحيحة للدكتور العمري: 552/2.


بحیرہ روم
غزہ
القدس
کوہ نیبو
بلقاء
اردن
وادی سرحان
العریش
بئر السبع
قلزم
(کلیسما)
بتراء
معان
ایلہ
عقبہ
سیناء
عرب
تبوک
تیماء
مصر
مدائن صالح
العلا
الوجہ
بحیرہ قلزم (بحر احمر)
خیبر
ینبع
مدینہ منورہ
حجاز
جیشِ اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہما
(حیات مبارکہ کے آخری ایام میں
صفر 11ھ

میں سے مجھے زیادہ پیارا تھا۔ اور اب اسامہ مجھے سب لوگوں میں سے زیادہ پیارا ہے۔''[1]
لوگ اسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر میں شرکت کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ مرض شروع ہوگیا جس میں اللہ تعالیٰ نے رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کو قبض کر لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض اور وفات کے درمیان کئی ایک واقعات رونما ہوئے۔

بقیع اور شہدائے احد کی زیارت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام ابومویہبہ سے روایت ہے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نصف شب میں بلوایا اور فرمایا: «يَا أَبَا مُوَيْهِبَةَ! إِنِّي قَدْ أُمِرْتُ أَنْ أَسْتَغْفِرَ لِأَهْلِ الْبَقِيعِ، فَانْطَلِقْ مَعِي» ''ابومویہبہ! مجھے اللہ تعالیٰ کی جانب سے حکم ملا ہے کہ میں بقیع والوں کے لیے دعائے مغفرت کروں، اس لیے تم میرے ساتھ چلو۔'' میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چل دیا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی قبروں کے درمیان کھڑے ہوئے تو فرمایا:

«اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا أَهْلَ الْمَقَابِرِ لِيَهْنَ لَكُمْ مَّا أَصْبَحْتُمْ فِيهِ مِمَّا أَصْبَحَ النَّاسُ فِيهِ، أَقْبَلَتِ الْفِتَنُ كَقِطَعِ اللَّيْلِ الْمُظْلِمِ، يَتْبَعُ آخِرُهَا أَوَّلَهَا، وَالْآخِرَةُ شَرٌّ مِّنَ الْأُولٰى»

''اے اہل قبور! تم پر سلامتی ہو، لوگوں کی نسبت جس حالت میں تم ہو تمھیں وہ حالت مبارک ہو، فتنے اس طرح سامنے آگئے ہیں جس طرح تاریک رات کے ٹکڑے، کہ ہر دوسرا فتنہ پہلے کے پیچھے چلا آ رہا ہے اور ہر دوسرا فتنہ پہلے سے زیادہ پرفتن ہے۔''

ابومویہبہ کہتے ہیں کہ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم میری طرف متوجہ ہوکر فرمانے لگے:

«يَا أَبَا مُوَيْهِبَةَ! إِنِّي أُوتِيتُ مَفَاتِيحَ خَزَائِنِ الدُّنْيَا وَالْخُلْدَ فِيهَا، ثُمَّ الْجَنَّةَ فَخُيِّرْتُ بَيْنَ ذٰلِكَ وَبَيْنَ لِقَاءِ رَبِّي وَالْجَنَّةِ»

[1] صحيح البخاري، حديث:3730، وصحيح مسلم، حديث:2426.

”مجھے ایک طرف دنیا بھر کے خزانوں کی کنجیاں، ہمیشہ کی زندگی اور پھر جنت اور دوسری طرف رب تعالیٰ سے ملاقات اور ساتھ ہی جنت ملنے کے درمیان اختیار دیا گیا ہے۔“

حضرت ابو مویہبہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: ”آپ پر میرے ماں باپ قربان! آپ دنیا کے خزانوں کی کنجیاں اور ان میں ہمیشہ کے لیے رہنا اور پھر جنت کو اختیار کر لیجیے۔“ آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَا وَاللّٰهِ! يَا أَبَا مُوَيْهِبَةَ، لَقَدِ اخْتَرْتُ لِقَاءَ رَبِّي وَالْجَنَّةَ»

”نہیں، اللہ کی قسم! اے ابو مویہبہ! میں تو اپنے رب کی ملاقات اور جنت کو اختیار کر چکا ہوں۔“

پھر آپ ﷺ نے اہل بقیع کے لیے دعائے مغفرت کی اور واپس تشریف لے آئے۔ اس کے بعد آپ ﷺ کا وہ مرض شروع ہو گیا جس میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو اپنی طرف بلا لیا۔[1]

حضرت عقبہ بن عامر جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے احد کے شہداء کی آٹھ سال بعد ایسے نماز پڑھی جیسے زندوں اور مردوں کو رخصت کر رہے ہوں۔

پھر آپ ﷺ منبر پر تشریف فرما ہوئے اور فرمایا:

«إِنِّي بَيْنَ أَيْدِيكُمْ فَرَطٌ وَّ أَنَا عَلَيْكُمْ شَهِيدٌ، وَإِنَّ مَوْعِدَكُمُ الْحَوْضُ، وَإِنِّي لَأَنْظُرُ إِلَيْهِ أَنَا فِي مَقَامِي هٰذَا، وَإِنِّي لَسْتُ أَخْشٰى عَلَيْكُمْ أَنْ تُشْرِكُوا، وَلٰكِنْ أَخْشٰى عَلَيْكُمُ الدُّنْيَا أَنْ تَنَافَسُوهَا»

”میں حوض پر تمھارا پیش رو ہوں اور میں تمھارا گواہ بنوں گا۔ اب حوض پر

1 مسند أحمد: 489/3، والمستدرك للحاكم: 56/3، والمعجم الكبير للطبراني: 347,346/22، ومجمع الزوائد للهيثمي: 24/9، وسنن الدارمي، رقم: 79.

ملیں گے۔ میں اس وقت اس جگہ حوض کو دیکھ رہا ہوں۔ مجھے تم سے یہ خدشہ نہیں کہ تم شرک کرو گے بلکہ مجھے تمھارے متعلق ڈر ہے کہ تم دنیا کے حصول میں ایک دوسرے سے آگے بڑھو گے۔''

حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے کا یہ میرا آخری موقع تھا اس کے بعد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ نہ سکا۔[1]

ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں اقامت

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری سخت ہو گئی اور طبیعت انتہائی بوجھل ہوگئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے گھر میں رہنے کے لیے دیگر ازواج سے اجازت لی۔ انھوں نے اجازت دے دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دو آدمیوں کے سہارے نکلے ایک حضرت عباس رضی اللہ عنہ تھے اور ایک اور آدمی تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یوں آرہے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں پاؤں زمین پر لکیر بناتے ہوئے گھسٹتے جا رہے تھے۔ (حضرت عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ دوسرے شخص حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے) اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے حجرے میں تشریف لے آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری شدت اختیار کر گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا: «هَرِيقُوا عَلَيَّ مِنْ سَبْعِ قِرَبٍ لَّمْ تُحْلَلْ أَوْكِيَتُهُنَّ، لَعَلِّي أَعْهَدُ إِلَى النَّاسِ» ''سات مشکیزے پانی لاؤ جن کے منہ نہ کھولے گئے ہوں اور میرے اوپر بہا دو۔ شاید میں لوگوں کو وصیت کرسکوں۔'' تو ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے ایک ٹب میں بٹھا دیا۔

پھر وہ مشکیزے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر بہانا شروع کر دیے۔ یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارے سے فرمایا کہ بس کرو، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کی طرف تشریف لائے، ان کو نماز پڑھائی اور وعظ فرمایا۔[2]

[1] صحيح البخاري، حديث:4042، وصحيح مسلم، حديث:2296. [2] صحيح البخاري، حديث:198.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے زیادہ شدت والا مرض کسی شخص پر نہیں دیکھا۔[1]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس اس وقت گیا جب آپ ﷺ کو سخت بخار تھا۔ میں نے ہاتھ سے چھوا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ کو تو بہت سخت بخار ہے۔'' فرمایا: «أَجَلْ! إِنِّي أُوعَكُ كَمَا يُوعَكُ رَجُلَانِ مِنْكُمْ» ''ہاں! مجھے اتنا بخار ہے جس قدر تم میں سے دو آدمیوں کو ہو۔'' میں نے عرض کیا: ''اس لیے آپ ﷺ کو دوہرا اجر ملتا ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: «أَجَلْ» ''ہاں۔'' پھر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«مَا مِنْ مُّسْلِمٍ يُّصِيبُهُ أَذًى مِّنْ مَّرَضٍ فَمَا سِوَاهُ إِلَّا حَطَّ اللّٰهُ بِهِ سَيِّئَاتِهِ كَمَا تَحُطُّ الشَّجَرَةُ وَرَقَهَا»

''جس مسلمان کو کوئی تکلیف پہنچے، بیماری یا اس کے علاوہ کوئی بھی تکلیف ہو اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کے گناہ ایسے جھاڑ دیتے ہیں جس طرح درخت پتے گرا دیتا ہے۔''[2]

1 صحيح البخاري، حديث:5646، و صحيح مسلم، حديث:2570. 2 صحيح البخاري، حديث:5647، و صحيح مسلم، حديث:2571.

آخری ایام میں رسول اللہ ﷺ کی وصیتیں

انصار کے لیے وصیت

حضرت عباس رضی اللہ عنہ انصار کی ایک مجلس سے گزرے۔ دیکھا کہ وہ رو رہے ہیں۔ یہ نبی ﷺ کی بیماری کے دنوں کا واقعہ ہے۔ ان سے پوچھا: ''تم کیوں رو رہے ہو؟'' انھوں نے کہا: ''ہمیں رسول اللہ ﷺ کی مجلس یاد آتی ہے۔'' عباس رضی اللہ عنہ نے آ کر رسول اللہ ﷺ کو بتایا تو آپ ﷺ کے سر پر کپڑے کی پٹی باندھی گئی اور آپ ﷺ باہر آ کر آخری بار منبر پر تشریف فرما ہوئے۔ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی، پھر ارشاد فرمایا:

«أُوصِيكُمْ بِالْأَنْصَارِ، فَإِنَّهُمْ كَرِشِي وَعَيْبَتِي، وَقَدْ قَضَوُا الَّذِي عَلَيْهِمْ، وَبَقِيَ الَّذِي لَهُمْ، فَاقْبَلُوا مِنْ مُّحْسِنِهِمْ، وَتَجَاوَزُوا عَنْ مُّسِيئِهِمْ»

''لوگو! میں تمھیں انصار کے بارے میں وصیت کرتا ہوں وہ تو میرے مخلص ساتھی اور ہمراز ہیں۔ ان پر جو حق تھا انھوں نے پورا کر دیا ہے، اب ان کا حق باقی ہے۔ ان میں سے جو نیک ہو اس کی قدر کرنا اور جو برا ہو اس سے درگزر کرنا۔''[1]

اس حدیث سے انصار کی رسول اللہ ﷺ سے شدید محبت، آپ کی بیماری پر گریہ زاری اور مجلس سے محرومی پر غمگین ہونے کا پتا چلتا ہے۔[2]

(1) صحيح البخاري، حديث: 3799، وصحيح مسلم، حديث: 2510. (2) مرض النبي ووفاته لخالد أبي صالح، ص: 65.

مشرکین کو جزیرۃ العرب سے نکالنے اور وفود کی خاطر تواضع کرنے کا حکم نامہ

رسول اللہ ﷺ کا مرض شدت اختیار کرتا گیا۔ اب ایک دن میں کئی کئی مرتبہ بے ہوشی ہو جاتی لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ دنیا کو ترک کر دینا چاہتے تھے اور آپ ﷺ اس سے مطمئن تھے کہ میری امت گمراہی اختیار نہ کرے گی۔ آپ ﷺ نے ارادہ فرمایا کہ ایک مفصل مکتوب دے دوں تاکہ لوگ اس پر اتفاق کر لیں اور جھگڑا نہ کریں۔ مگر جب لوگوں نے اختلاف کرنا شروع کیا تو آپ لکھنے سے تو رک گئے مگر زبانی تین امور کی وصیت فرما دی۔ راوی نے ان میں سے دو کا تذکرہ کیا ہے: «أَخْرِجُوا الْمُشْرِكِينَ مِنْ جَزِيرَةِ الْعَرَبِ وَ أَجِيزُوا الْوَفْدَ بِنَحْوِ مَا كُنْتُ أُجِيزُهُمْ بِهِ» ''مشرکین کو جزیرۃ العرب سے نکال دو اور جو سفارتی وفود آئیں ان کی خاطر اسی طرح کرنا جس طرح میں کیا کرتا تھا۔''[1]

اپنی قبر کو سجدہ گاہ بنانے سے روکنا

رسول اللہ ﷺ کا آخری فرمانِ مبارک یہ تھا:

«قَاتَلَ اللّٰهُ الْيَهُودَ وَالنَّصَارٰى، اِتَّخَذُوا قُبُورَ أَنْبِيَائِهِمْ مَّسَاجِدَ»

''اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ کو تباہ کرے، انھوں نے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔''[2]

اللہ تعالیٰ سے حسنِ ظن

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی وفات سے تین دن

---

1 صحيح البخاري، حديث: 3053، و صحيح مسلم، حديث: 1637. 2 صحيح البخاري، حديث: 437، و صحيح مسلم، حديث: 530.

پہلے سنا، آپ فرما رہے تھے: «لَا يَمُوتَنَّ أَحَدُكُمْ إِلَّا وَهُوَ يُحْسِنُ الظَّنَّ بِاللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ» ”تم میں سے ہر شخص اس حال میں فوت ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں نیک گمان رکھتا ہو۔“ [1]

نماز اور غلاموں سے حسن سلوک کی وصیت

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا وقت آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت نماز اور غلاموں سے متعلق تھی۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ وصیت کرتے کرتے غرغرہ آ گیا اور آپ کی زبان اسے ادا نہیں کر سکتی تھی۔ [2]

نبوت کے خوش کن امور میں سے صرف (سچا) خواب باقی رہ گیا ہے

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیماری کی حالت میں سر پر پٹی باندھے ہوئے پردہ اٹھایا اور فرمایا:

«اَللّٰهُمَّ! هَلْ بَلَّغْتُ؟ ـ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ـ إِنَّهُ لَمْ يَبْقَ مِنْ مُبَشِّرَاتِ النُّبُوَّةِ إِلَّا الرُّؤْيَا، يَرَاهَا الْعَبْدُ الصَّالِحُ أَوْ تُرٰى لَهُ، أَلَا وَ إِنِّي قَدْ نُهِيتُ عَنِ الْقِرَائَةِ فِي الرُّكُوعِ وَالسُّجُودِ، فَإِذَا رَكَعْتُمْ فَعَظِّمُوا اللّٰهَ، وَإِذَا سَجَدْتُّمْ فَاجْتَهِدُوا فِي الدُّعَاءِ، فَإِنَّهُ قَمِنٌ أَنْ يُّسْتَجَابَ لَكُمْ»

”اے میرے اللہ! کیا میں نے (تیرا پیغام) پہنچا دیا ہے؟“ تین بار ایسا ہی فرمایا۔ پھر فرمایا: ”اب نبوت کی خوشخبری دینے والے امور میں سے صرف (نیک) خواب ہی رہ گیا ہے جو نیک بندہ دیکھے یا اس کو دکھایا جائے۔ اور تمھیں معلوم رہے

---

[1] صحيح مسلم، حديث: 2877، ومسند أحمد: 293/3، وسنن أبي داود، حديث: 3113، وسنن ابن ماجه، حديث: 4167. [2] سنن ابن ماجه، حديث: 2697، و مسند أحمد: 117/3، و صحيح ابن حبان: 66/5.

کہ مجھے رکوع اور سجود میں قرآن پڑھنے سے منع کیا گیا ہے۔ جب تم رکوع کرو تو اپنے اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرو اور جب سجدہ کرو تو خوب دعا کرو کیونکہ اس وقت تمھاری دعا قبول ہوگی۔"[1]

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی امامت

جب رسول اللہ ﷺ کا مرض شدت اختیار کر گیا اور نماز کا بھی وقت ہو گیا تو بلال رضی اللہ عنہ نے اذان کہہ دی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «مُرُوا أَبَا بَكْرٍ فَلْيُصَلِّ» "ابوبکر سے کہو نماز پڑھائے۔" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی: "ابوبکر بہت نرم دل ہیں۔ وہ جب آپ کی جگہ کھڑے ہوں گے تو لوگوں کو نماز نہ پڑھا سکیں گے۔" آپ ﷺ نے دوبارہ یہی فرمایا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پھر وہی بات دہرائی تو آپ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّكُنَّ صَوَاحِبُ يُوسُفَ، مُرُوا أَبَا بَكْرٍ فَلْيُصَلِّ بِالنَّاسِ» "تم یوسف علیہ السلام (کے قصے میں مذکور) عورتوں کی طرح ہو۔ ابوبکر سے کہو کہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔" تو ابوبکر (امامت کے لیے) آگے بڑھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی طبیعت میں ذرا ہلکا پن محسوس کیا۔ آپ ﷺ دو آدمیوں کے کاندھوں کا سہارا لے کر مسجد میں تشریف لائے۔ مگر تکلیف کے سبب قدم مبارک گویا گھسٹتے جا رہے تھے۔ اس وقت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پیچھے ہٹنا چاہا لیکن رسول اللہ ﷺ نے اشارے سے اپنی جگہ کھڑے رہنے کا حکم دیا، پھر آپ ﷺ کو ابوبکر کے پہلو میں لایا گیا تو آپ ﷺ تشریف فرما ہو گئے۔

اعمش سے کہا گیا: تو کیا رسول اللہ ﷺ نماز پڑھا رہے تھے اور ابوبکر آپ ﷺ کی اقتدا میں نماز پڑھ رہے تھے اور لوگ ابوبکر کی اقتدا کر رہے تھے؟ تو انھوں نے سر ہلا کر کہا: "ہاں۔"[2]

---

1 صحيح مسلم، حديث: 479، وسنن أبي داود، حديث: 876، وسنن ابن ماجه، حديث: 3899، ومسند أحمد: 219/1، والسنن الكبرٰى للنسائي: 189/2. 2 صحيح البخاري، حديث: 664 و 712، و صحيح مسلم، حديث:(95)-418.

رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ کے آخری لمحات

رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ کا آخری دن

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے۔ پیر کا دن تھا اور لوگ نمازِ فجر کی صفیں بنائے ہوئے تھے، رحمت عالم ﷺ نے حجرۂ مبارک کا پردہ ہٹایا، مسلمانوں کو دیکھنے لگے کہ وہ رب العالمین کے حضور کھڑے ہیں۔ آپ ﷺ نے دیکھا کہ میری دعوت و جہاد کی فصل کیسے بار آور ہے۔ کیسی خوب امت ہے جو نماز کی محافظ ہے اور اپنے پیغمبر کے ہوتے ہوئے اور نہ ہونے کی صورت میں بھی اس کا خیال رکھے ہوئے ہے تو اس پُر رونق منظر سے آپ ﷺ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوگئیں۔ آپ ﷺ مطمئن ہوگئے کہ اس امت کا دین سے تعلق مضبوط تر ہے۔[1]

صحابہ کرام کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے کا پردہ ہٹایا اور کھڑے ہمیں دیکھنے لگے۔ آپ ﷺ کا چہرہ انور مصحف کا ورقہ معلوم ہوتا تھا۔ پھر آپ ﷺ مسکرا دیے۔ ہم خوشی کے مارے نماز توڑنے والے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ آپ ﷺ نماز کے لیے آنے والے ہیں مگر آپ ﷺ نے اشارہ فرمایا کہ اپنی نماز مکمل کرو اور ساتھ ہی حجرے میں چلے گئے۔ اور پردہ ڈال دیا۔[2]

صحابہ کرام میں سے کچھ اپنے کاموں کو نکل گئے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنی صاحبزادی ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئے اور کہا: ''میرا خیال ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو مرض سے افاقہ ہے

[1] السيرة النبوية للندوي، ص:401. [2] صحيح البخاري، حديث:4448.

اور یہ بنتِ خارجہ (ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ایک بیوی) کا دن ہے۔ وہ "سنح" مقام پر رہتی تھی۔ یہ کہتے ہوئے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے اہل خانہ کی طرف چلے گئے۔[1]

رفیق اعلیٰ کی جانب

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما آئے مگر رسول اللہ ﷺ اس وقت خاموش تھے اور کلام نہ کر سکتے تھے۔ آپ ﷺ اپنے ہاتھ مبارک آسمان کی طرف اٹھاتے اور پھر اسامہ پر رکھ دیتے۔ وہ سمجھ گئے کہ میرے لیے دعا فرما رہے ہیں۔ ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ کو اپنے سینے اور گلے کے درمیان ٹیک دی ہوئی تھی۔ اسی دوران عبدالرحمٰن بن ابوبکر رضی اللہ عنہما آئے ان کے ہاتھ میں مسواک تھی۔ رسول اللہ ﷺ اس کی طرف دیکھنے لگے۔ ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: "میں آپ کے لیے مسواک لوں؟" آپ ﷺ نے سر مبارک سے اشارہ فرمایا: "ہاں۔"

ام المومنین نے بھائی سے مسواک لے کر چبائی، نرم کی اور آپ ﷺ کو تھما دی۔ آپ ﷺ نے بڑے اچھے انداز سے مسواک کی۔ اس دوران آپ ﷺ برابر "فِي الرفيق الأعلىٰ" کہتے جا رہے تھے۔[2]

آپ ﷺ ہاتھ مبارک پانی کی چھاگل میں داخل کرتے اور اسے چہرہ مبارک پر پھیرتے اور فرماتے: «لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ إِنَّ لِلْمَوْتِ سَكَرَاتٍ» "لا الٰہ الا اللہ موت کی بڑی سختیاں ہوتی ہیں۔" پھر آپ ﷺ نے ہاتھ مبارک اٹھایا اور کہنے لگے: "فی الرفيق الأعلىٰ" یہاں تک کہ آپ ﷺ کی روح مبارک پرواز کر گئی اور ہاتھ ایک جانب لٹک گیا۔[3]

ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ فرما رہے تھے: «اَللّٰهُمَّ أَعِنِّي عَلٰى سَكَرَاتِ

---

1 السيرة النبوية لأبي شهبة: 593/2. 2 صحيح البخاري، حديث: 4438، و صحيح مسلم، حديث: (87)-2444. 3 صحيح البخاري، حديث: 4449.

الْمَوْتِ» ''اے میرے اللہ! موت کی سختیوں پر میری مدد فرما۔''[1]

ایک روایت میں ہے کہ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے کان لگا کر نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی پیٹھ میری طرف کر کے ٹیک لگائے ہوئے کہہ رہے تھے:

«اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِي وَارْحَمْنِي وَأَلْحِقْنِي بِالرَّفِيقِ الْأَعْلٰی»

''اے اللہ! مجھے معاف فرما دے اور مجھ پر رحم فرما اور مجھے بلند رفیقوں سے ملا دے۔''[2]

احادیث میں یہ بھی آیا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ''ہائے میرے ابا جان کتنی تکلیف میں ہیں۔'' تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: «لَيْسَ عَلٰی أَبِيكِ كَرْبٌ بَعْدَ الْيَوْمِ» ''بس آج ہی کا دن ہے، اس کے بعد تمھارے باپ پر کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔'' جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ''اے میرے ابا جان! آپ نے اپنے رب کا بلاوا منظور کرلیا۔ اے میرے ابا جان! آپ نے جنت الفردوس میں ٹھکانا بنالیا۔ اے ابا جان! میں جبریل کو آپ کی موت کی خبر سناتی ہوں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب دفن کر دیا گیا تو فاطمہ رضی اللہ عنہا انس رضی اللہ عنہ سے فرمانے لگیں: ''تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مٹی ڈالنا کیسے گوارا کرلیا!''[3]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کیسے چھوڑی؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے اس وقت تشریف لے گئے جب جزیرۃ العرب پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم چلتا تھا۔ دنیا کے حکمران آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ڈرتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقائے گرامی جان و مال اور اولاد سمیت قربان جانے کو تیار تھے۔ فوت ہوتے وقت کوئی

---

1 جامع الترمذي، حديث: 978، وسنن ابن ماجه، حديث: 1623، و مسند أحمد: 64/6، وعمل اليوم والليلة للنسائي، رقم: 1039۔ 2 صحيح البخاري، حديث: 4440، وصحيح مسلم، حديث: (85)-2444۔ 3 صحيح البخاري، حديث: 4462۔

درہم و دینار نہ چھوڑے۔ نہ کوئی غلام، نہ لونڈی اور نہ کچھ اور صرف ایک سفید خچر، اسلحہ اور کچھ زمین جو صدقہ کر رکھی تھی۔ [1]

رسول اللہ ﷺ کی ایک زرہ تیس صاع جَو کے عوض ایک یہودی کے پاس رہن رکھی ہوئی تھی۔ [2]

پیر بروز 12 ربیع الاول، 11ھ کو زوال کے بعد آپ ﷺ کی وفات ہوئی۔ [3]

اس وقت آپ ﷺ کی عمر مبارک تریسٹھ برس تھی۔ [4]

مسلمانوں کے لیے دکھ کے اعتبار سے یہ تمام ایام میں سے تاریک اور مشکل ترین دن تھا اور انسانیت کے لیے انتہائی آزمائش کا دن تھا، جبکہ آپ ﷺ کی پیدائش کا دن دنیا کے ایام میں انتہائی سعادت والا دن تھا۔ [5]

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جس روز رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو ہر چیز چمک اٹھی تھی مگر جس دن فوت ہوئے یہاں ہر چیز تاریک ہوگئی۔ [6]

ام ایمن رضی اللہ عنہا رونے لگیں۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ کیوں کر رو رہی ہیں کہنے لگیں: ''مجھے معلوم ہے کہ آپ ﷺ کے لیے جو اللہ کے ہاں ہے وہ بہت بہتر ہے مگر میں تو اس لیے رو رہی ہوں کہ ہم سے وحی روک دی گئی ہے۔'' [7]

وفات نبوی کا المناک صدمہ اور اس موقع پر ابوبکر رضی اللہ عنہ کا کردار

ابن رجب حنبلی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ فوت ہوئے تو مسلمان انتہائی مضطرب و پریشان ہو گئے۔ کئی تو ایسے تھے کہ دہشت کے مارے ہوش گنوا بیٹھے۔ کچھ ایسے

1 صحيح البخاري، حديث: 4461. 2 صحيح البخاري، حديث: 2916. 3 البداية والنهاية: 223/4. 4 صحيح البخاري، حديث: 3902، 3903، وصحيح مسلم، حديث: 2351. 5 السيرة النبوية للندوي، ص: 404. 6 جامع الترمذي، حديث: 3618، وسنن ابن ماجه، حديث: 1631، ومسند أحمد: 221/3. 7 صحيح مسلم، حديث: 2454، وسنن ابن ماجه، حديث: 1635.

بیٹھے کہ اٹھنے کی ہمت ہی نہ رہی۔ کچھ وہ تھے کہ زبان گنگ ہوگئی اور کلام کرنے کی طاقت ختم ہوگئی اور کچھ وہ بھی تھے کہ انھوں نے آپ کی موت ہی کا انکار کر دیا۔[1]

امام قرطبی رحمہ اللہ اس مصیبت کی ہولناکی اور اس کے اثرات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ سب سے بڑی مصیبت دین کے متعلق مصیبت ہوتی ہے۔ ارشادِ نبوی ہے:

«إِذَا أَصَابَ أَحَدَكُمْ مُّصِيبَةٌ فَلْيَذْكُرْ مُصَابَهُ بِي فَإِنَّهَا أَعْظَمُ الْمَصَائِبِ»

''تم میں سے کسی کو جس وقت کوئی مشکل لاحق ہو تو اسے مجھے لاحق ہونے والی مصیبت کو یاد کر لینا چاہیے کیونکہ یہ تمام مصائب سے بڑی مصیبت ہے۔''[2]

آپ ﷺ نے بجا فرمایا ہے کیونکہ قیامت تک ایک مسلمان کو لاحق ہونے والی مصیبتوں میں سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ وحی رک گئی، نبوت ختم ہوگئی، اس پر شریہ سامنے آیا کہ عرب اور غیر عرب مرتد ہو گئے۔ یہ پہلا موقع تھا خیر کے کم اور ختم ہونے کا۔[3]

وفاتِ رسول نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہوش اڑا دیے، چنانچہ جو کہتا کہ آپ ﷺ فوت ہو گئے ہیں وہ اسے دھمکی دیتے، (مار سے) ڈراتے اور فرماتے: ''آپ ﷺ ہرگز فوت نہیں ہوئے بلکہ جس طرح موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم سے چالیس دن غائب رہ کر واپس تشریف لے آئے تھے اسی طرح آپ ﷺ بھی اپنے رب کی طرف گئے ہیں اور اللہ کی قسم! حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح آپ ﷺ بھی واپس آ جائیں گے۔ اور ان لوگوں کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالیں گے جو سمجھتے ہیں کہ آپ ﷺ فوت ہو گئے ہیں۔''[4]

جب سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کی وفات کا سنا تو اپنی رہائش گا ''سنح'' سے

---

1 لطائف المعارف، ص: 114. 2 مجمع الزوائد للهيثمي: 3/2، و المعجم الكبير للطبراني، رقم: 6718، وشعب الإيمان للبيهقي، رقم: 10152. 3 تفسير القرطبي: 2/176. 4 سبل الهدىٰ والرشاد للصالحي: 4/287، و السيرة النبوية لأبي شهبة: 2/594.

گھوڑے پر آئے اور اتر کر مسجد میں چلے گئے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں جانے تک لوگوں سے بات نہ کی۔ پھر رسول اللہ ﷺ (کے جسدِ اطہر) کی طرف بڑھے۔ آپ ﷺ یمنی چادر میں لپٹے ہوئے تھے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے چہرۂ انور سے چادر کو ہٹایا، پھر جھک کر بوسہ دیا اور رو پڑے اور کہنے لگے: ''اے اللہ کے رسول! آپ پر میرے ماں باپ قربان! اللہ کی قسم! آپ پر اللہ تعالیٰ دو موتیں کبھی جمع نہیں کرے گا جو موت مقرر تھی وہ آ چکی ہے۔''[1]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ باہر نکلے تو عمر رضی اللہ عنہ لوگوں سے باتیں کر رہے تھے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''عمر بیٹھ جایئے!'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیٹھنے سے انکار کیا وہ اپنے غم اور جوش میں تھے، چنانچہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی اور اس کے بعد فرمایا:

''تم میں سے جو شخص محمد ﷺ کی عبادت کرتا تھا وہ جان لے کہ محمد ﷺ فوت ہو چکے ہیں اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا تھا وہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ زندہ ہے اسے موت نہیں آئے گی۔'' اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝ ﴾

''اور محمد (ﷺ) ایک رسول ہی تو ہیں۔ ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔ اگر ان کا انتقال ہو جائے یا یہ شہید ہو جائیں تو کیا تم اسلام سے اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے؟ اور جو کوئی اپنی ایڑیوں کے بل پھر جائے تو وہ اللہ کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکے گا۔ اور اللہ شکر ادا کرنے والوں کو اچھی جزا دے گا۔''[2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''جب میں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے یہ آیت سنی تو میں زمین پر

[1] صحیح البخاري، حدیث: 4452،4453. [2] آل عمرٰن 3:144.

گرنے لگا۔ میرے قدموں نے میرا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ رسول اللہ ﷺ وفات پا چکے ہیں۔'' [1]

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس موقع پر اس آیت کی تلاوت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شجاعت و دلیری کی بہت بڑی دلیل ہے۔ بہادری و دلیری یہی ہوتی ہے کہ مصائب کے موقع پر آدمی کا دل ثابت رہے۔ آپ ﷺ کی وفات سے زیادہ مشکل گھڑی کون سی تھی کہ اس موقع پر بھی سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے شجاعت اور علم کا ثبوت دیا۔ لوگ کہہ رہے تھے رسول اللہ ﷺ فوت ہی نہیں ہوئے۔ عمر رضی اللہ عنہ بھی انھی میں سے تھے۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے تو بالکل چپ سادھ لی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ویسے ہی باہر نہ نکلے۔ معاملہ انتہائی بگڑ گیا، جسے ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی رہائش گاہ ''سنح'' سے آکر سنبھالا اور اس آیت سے حقیقت واضح کی۔ [2]

اے اللہ! صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر رحم فرما انھوں نے کتنی مشکلات و مصائب کو امت سے دور کیا۔ کتنی ہی آزمائشیں ان کے ہاتھوں ختم ہوئیں۔ کتنے ہی ایسے پیچیدہ مسائل تھے جنھیں انھوں نے قرآن و سنت کے روشن دلائل سے کھول کر رکھ دیا جو عمر رضی اللہ عنہ جیسے لوگوں پر بھی پوشیدہ رہے۔ لہٰذا لوگو! صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا حق، مرتبہ پہچاننے کی کوشش کرو، رسولِ خدا کے محبوب سے محبت رکھو۔ ان سے محبت ایمان اور ان سے بغض نفاق کی علامت ہے۔ [3]

ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعتِ خلافت

مسلمانوں نے ''سقیفہ بنوساعدہ'' میں ابوبکر رضی اللہ عنہ سے خلافت کی بیعت کر لی تاکہ شیطان امت کے اتحاد میں دراڑ کے لیے کوئی بھی راہ نہ پائے اور دلوں میں اٹھنے والے خیالات ان کو ادھر اُدھر نہ لے جائیں۔ اور اس لیے بھی کہ رسول اللہ ﷺ اس دنیائے فانی سے اس حال میں رخصت ہوں کہ مسلمان متحد و متفق ہوں، ان کا نظام مرتب ہو، ان

1 صحيح البخاري، حديث:4454. 2 تفسير القرطبي:222/4. 3 مرض النبي ﷺ ووفاته لخالد أبي صالح، ص:24.

کے معاملات کی ذمہ داری لینے والا ان پر امیر موجود ہو، ان معاملات میں سے رسول اللہ ﷺ کے کفن دفن کا معاملہ بھی تھا۔[1]

رسول اللہ ﷺ کا غسل، کفن اور نماز جنازہ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: ''جب لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کو غسل دینے کا ارادہ کیا تو کہنے لگے: کیا رسول اللہ ﷺ کے کپڑے اتار دیے جائیں جیسا کہ عام طور پر ہم میت کے کپڑے اتار دیتے ہیں۔ یا یہ کہ آپ ﷺ کو کپڑوں سمیت غسل دیا جائے۔ جب یہ اختلاف پیدا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر نیند مسلط کر دی۔ یہاں تک کہ ان میں کوئی بھی ایسا شخص نہ تھا جس کی ٹھوڑی اس کے سینے سے نہ لگ گئی ہو۔ اس وقت ایک کونے سے نا معلوم آواز آئی معلوم نہیں وہ کون تھا جو کہہ رہا تھا: ''رسول اللہ ﷺ کو کپڑوں سمیت غسل دو۔'' چنانچہ انھوں نے قمیص سمیت غسل دیا۔ قمیص کے اوپر ہی سے پانی ڈالتے رہے اور اس طرح بدن مبارک ملتے رہے کہ قمیص بیچ میں حائل رہی۔'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں اب جو بات میرے علم میں آئی اگر پہلے ہوتی تو آپ ﷺ کو ازواجِ رسول ہی غسل دیتیں۔[2]

رسول اللہ ﷺ کو تین سحولی کپڑوں میں کفن دیا گیا (سحول یمن کا شہر ہے) ان میں نہ تو قمیص تھی اور نہ ہی پگڑی۔[3]

تمام مسلمانوں نے آپ ﷺ کی نماز جنازہ پڑھی۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں جس وقت رسول اللہ ﷺ فوت ہو گئے تو مردوں کو داخل کیا گیا تمام مردوں نے اکیلے اکیلے نماز پڑھی۔ پھر عورتوں کو موقع دیا گیا انھوں نے بھی نماز پڑھی۔ اسی طرح

1 السيرة النبوية للندوي، ص: 606. 2 سنن أبي داود، حديث: 3141، وسنن ابن ماجه، حديث: 1464، والمستدرك للحاكم: 3/60,59. 3 صحيح البخاري، حديث: 1271 و صحيح مسلم، حديث: 941.

پھر بچوں کو موقع دیا گیا تو انھوں نے نماز ادا کی، پھر غلاموں کو موقع دیا گیا تو انھوں نے بھی اکیلے اکیلے نماز پڑھی۔ رسول اللہ ﷺ کی نماز جنازہ میں کسی نے امامت نہ کرائی۔[1]

امام ابن کثیر کہتے ہیں: یہ نماز جنازہ بلا امامت ہوئی۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں بلکہ اجماع ہے۔[2]

دفن کی جگہ، وقت، قبر کی کیفیت اور قبر میں اتارنے والے؟

اس وقت مسلمان رسول اللہ ﷺ کے دفن کرنے کی جگہ میں مختلف الرائے ہو گئے، بعض نے کہا: ''منبر کے پاس دفن کیا جائے گا۔'' دیگر کہنے لگے: ''بقیع میں دفن ہوں گے۔'' کسی نے کہا: ''نماز پڑھنے کی جگہ میں۔''[3]

اتنے میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس اختلاف کو آپ ﷺ سے سماعت شدہ فرمان کے حوالے سے ختم کر دیا۔

حضرت عائشہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کہتے ہیں: جس وقت رسول اللہ ﷺ فوت ہو گئے اور کفن دے دیا گیا تو لوگ مقامِ دفن میں اختلاف کرنے لگے، تب ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے جو رسول اللہ ﷺ سے سنا تھا ابھی بھولا نہیں ہوں۔ آپ ﷺ فرماتے تھے:

«مَا قَبَضَ اللّٰهُ نَبِيًّا إِلَّا فِي الْمَوْضِعِ الَّذِي يُحِبُّ أَنْ يُدْفَنَ فِيهِ»

''اللہ تعالیٰ ہر نبی کو اس جگہ فوت کرتے ہیں جس جگہ وہ دفن ہونا پسند کرتے ہیں۔ لہٰذا آپ ﷺ کو اسی بستر کی جگہ دفن کر دو۔[4]

اس حدیث میں اگرچہ صحت کے اعتبار سے ضعف ہے لیکن اس پر اجماع ہے کہ

1 دلائل النبوة للبيهقي: 7/250، وسنن ابن ماجه، حديث: 1628، حدیث ضعیف ہے۔

2 البداية والنهاية: 5/232. 3 الموطأ، رقم: 545، والطبقات لا بن سعد: 2/293. 4 جامع الترمذي، حديث: 1018. امام ترمذی کہتے ہیں: هذا حديث غريب. اور عبدالرحمن بن ابی بکر الملیکی حافظے کے لحاظ سے ضعیف ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو فوت ہونے کی جگہ ہی دفن کیا گیا تھا۔"[1]

ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: "تواتر سے معلوم ہوا ہے کہ آپ ﷺ کو حضرت عائشہ کے حجرۂ مبارکہ میں دفن کیا گیا جو آپ ﷺ کی مسجد کے مشرق میں حضرت عائشہ کے لیے مخصوص تھا۔ آپ ﷺ کو حجرے کے سامنے کے مغربی کونے میں دفن کیا گیا پھر بعد ازاں اس حجرے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی دفن کیا گیا۔[2]

رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک لحد والی بنائی گئی۔ اگرچہ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ لحد اور شق دونوں جائز ہیں لیکن جب زمین سخت ہو اور مٹی بُر بری سی ریتلی وغیرہ نہ ہو تو لحد افضل ہے مگر زمین اس کے برعکس ہو تو شق افضل ہے۔[3]

علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "لحد اور شق دونوں قسم کی قبروں پر رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں عمل جاری تھا، لہٰذا دونوں ہی درست ہیں لیکن لحد افضل ہے۔"[4]

کیونکہ اللہ تعالیٰ ہمارے پیغمبر ﷺ کے لیے افضل ہی کو پسند کرتے ہیں۔[5]

رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کوہان نما[6]، یعنی بلند تھی۔

جمہور علماء کا یہی موقف ہے کہ قبر بنانے میں کوہان نما بنانا ہی مستحب ہے اور ایسا کرنا برابر بنانے سے افضل ہے۔[7]

امام ابن قیم دونوں آراء کو قریب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ صحابہ کرام کی قبریں نہ تو اونچی تھیں نہ بالکل زمین کے برابر اور آپ ﷺ کی قبر بھی ایسی ہی تھی اور آپ ﷺ کے دونوں ساتھیوں کی قبریں بھی ایسی ہی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک ماہی پشت کی طرح ہے اور وہاں سرخ کنکریاں بچھائی گئی ہیں۔ جس پر کوئی تعمیر نہیں تھی اور نہ مٹی سے

---

1 مرض النبي ﷺ ووفاته لخالد أبي صالح، ص:160. 2 البداية والنهاية 238/5. 3 المجموع للنووي: 287/5. 4 أحكام الجنائز، ص: 133. 5 مرض النبي ﷺ ووفاته لخالد أبي صالح، ص: 160. 6 صحيح البخاري، حديث: 1390. 7 مرض النبي ﷺ ووفاته لخالد أبي صالح، ص: 163.

لیپ کیا گیا تھا اور اسی طرح آپ ﷺ کے دونوں ساتھیوں کی قبریں بھی ہیں۔[1]

پہلے آپ ﷺ کی قبر مبارک سطح زمین سے کچھ بلند تھی۔[2]

ابن اسحاق کے بقول آپ ﷺ کو قبر مبارک میں اتارنے والے حضرات میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ، فضل بن عباس اور قثم بن عباس رضی اللہ عنہم کے علاوہ آپ ﷺ کے آزاد کردہ غلام شقران بھی تھے۔[3]

نووی اور مقدسی نے ان حضرات کے ساتھ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو بھی شمار کیا ہے۔[4]

نووی کہتے ہیں کہ کہا جاتا ہے کہ اسامہ بن زید اور اوس بن خولی رضی اللہ عنہم بھی ان کے ساتھ تھے۔[5] آپ ﷺ کو لحد میں اتارا گیا۔ اس پر کچی اینٹیں چن دی گئیں۔ کہا جاتا ہے کہ 9 اینٹیں تھیں۔ پھر لوگوں نے مٹی ڈال دی۔[6]

دفن کا وقت: اکثر علماء کا خیال ہے کہ آپ ﷺ کو بروز بدھ رات کے وقت دفن کیا گیا۔

ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: جمہور سے یہی مروی ہے کہ آپ ﷺ بروز پیر فوت ہوئے اور بروز بدھ رات کے وقت دفن ہوئے۔[7]

آپ ﷺ کی وفات کا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر گہرا اثر ہوا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے نبی مکرم ﷺ کو دفن کر کے ابھی ہاتھ نہ جھاڑے تھے۔ ابھی ہم دفن ہی میں مشغول تھے کہ دل بدلتے ہوئے محسوس ہوئے۔[8]

وفاتِ نبوی پر کہے گئے بعض اشعار

سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے اشعار: حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے زندگی بھر آپ ﷺ کی مدافعت کی، اسلام اور مسلمانوں کا ایسے عمدہ و اعلیٰ اشعار کے ذریعے سے دفاع کیا

[1] زادالمعاد: 524/1. [2] تهذيب السنن لابن القيم: 338/4. [3] السيرة النبوية لابن هشام: 321/4. [4] تهذيب الأسماء للنووي، ص: 23، ومختصر السيرة للمقدسي، ص: 35. [5] مرض النبي ﷺ ووفاته لخالد أبي صالح، ص: 173. [6] تهذيب الأسماء للنووي، ص: 23. [7] البداية والنهاية: 237/5، وصحيح السيرة النبوية لإبراهيم العلي، ص: 728. [8] جامع الترمذي، حديث: 3618، و سنن ابن ماجه، حديث: 1631.

جنھوں نے عرب کو ہلا کر رکھ دیا اور ان پر گہرا اثر چھوڑا۔ یہ عظیم شاعر رسول اللہ ﷺ کی وفات سے انتہائی زیادہ متاثر ہوئے اور انھوں نے غم میں ڈوبے اور رُلا دینے والے اشعار کے ذریعے اپنے جذبات کا اظہار کیا جنھیں زمانہ و حالات کے پردوں اور رکاوٹوں نے ہم سے چھپایا نہیں بلکہ تاریخ نے انھیں محفوظ رکھا۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی یاد میں روتے ہوئے کہتے ہیں:

''تیری آنکھ کو کیا ہو گیا ہے کہ اسے نیند نہیں آ رہی، گویا اس کے کناروں میں آنسوؤں کا سرمہ لگا دیا گیا ہے۔''

''اس ہادی و مہدی ﷺ پر آہ و بکا کرنے کی وجہ سے جو اپنے ٹھکانے جا پہنچا ہے۔ اے وہ ہستی جو زمین پر چلنے والوں میں سے سب سے بہتر ہیں، مجھ سے دور نہ ہوں۔''

''اللہ کی قسم! اللہ کے رسول اور امت کے ہادی ﷺ کے مانند آج تک کسی بھی ماں نے نہ کوئی بچہ حمل میں رکھا ہے اور نہ جنا ہے۔''

''اور اللہ تعالیٰ نے آج تک اپنی ساری مخلوق میں ایسا کوئی بنایا ہی نہیں جو پڑوس کی ذمہ داری نبھانے اور عہد پورا کرنے میں اس سے بڑھ کر ہو۔''

''وہ ہستی جس کے ذریعے سے روشنی حاصل کی جاتی تھی، جس کا ہر معاملہ بابرکت تھا اور جو رشد و ہدایت اور عدل و انصاف والا تھا۔''

''اے وہ ہستی جو تمام انسانوں میں افضل ہے! میں پہلے ایک دریا میں تھا اور اب اس دریا سے اس آدمی کی طرح ہو گیا ہوں جو اکیلا اور پیاسا ہو۔''[1]

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اشعار: ''جب میں نے اپنے نبی مکرم ﷺ کو لیٹا ہوا دیکھا تو میرا گھر باوجود وسعت کے مجھ پر تنگ ہو گیا۔''

''میرا دل آپ کی وفات پر بے قرار ہو گیا اور میری ہڈیاں تادمِ زندگی ٹوٹ پھوٹ کا شکار رہیں گی۔''

1 السيرة النبوية لابن هشام: 329/4.

''اے بوڑھے، تجھ پر افسوس! تیرا دوست چلا گیا ہے۔ اب تو جب تک زندہ رہے تیرے لیے صبر کرنا ہی آسان ہے۔'' [1]

ابوسفیان بن حارث رضی اللہ عنہ کے اشعار: ''میں نے رات جاگ کر گزاری پر رات گزرتی ہی نہ تھی، مصیبت زدہ کی رات لمبی ہی ہوتی ہے۔''

''اب رونا ہی میری زندگی ہے اور یہ مسلمانوں کو پہنچنے والی مصیبت کے بدلے میں بہت تھوڑا ہے۔''

''اس رات ہماری مصیبت بڑھتی ہی چلی گئی جب کہا گیا کہ اللہ کے رسول ﷺ وفات پا گئے ہیں۔'' [2]

حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب رضی اللہ عنہا کے اشعار: ''اے اللہ کے رسول! آپ ہماری امیدوں کا مرکز اور بھلائیاں کرنے والے تھے۔ آپ سخت گیر نہ تھے۔''

''آپ رحیم و کریم رہنما اور معلم انسانیت تھے۔ جو کوئی رونے والا ہو اسے آج خوب رونا چاہیے۔'' [3]

خاتمہ

اللہ تعالیٰ نے ان واقعات، سیرت اور حقائق کا جمع و مرتب اور تجزیہ کرنا میرے لیے آسان فرمایا۔ اس کا عنوان ہے: ''سیرت نبوی سے متعلقہ دروس، عبرتیں، امت کی تربیت اور ریاست کا قیام۔''

اس میں جو درست اور صحیح بات ہے وہ صرف اور صرف مجھ پر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی بنا پر ہے، لہٰذا اس پر اسی کے لیے حمد و ستائش ہے۔ اور اس میں جو کوئی بھی خطا ہو تو اس پر میں اللہ تعالیٰ سے معافی کا طالب ہوں اور اسی کی جانب توبہ و رجوع کرتا ہوں مگر

[1] المستطرف للأبشيهي، ص: 366. [2] الاكتفاء للكلاعي: 456/2. [3] تفسير القرطبي: 220,219/4.

اس خطا سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ بری الذمہ ہیں۔

مجھے یہی کافی ہے کہ میں غلطی وکوتاہی میں بچنے کا انتہائی خواہش مند رہا ہوں اور پر امید ہوں کہ مجھے اجر وثواب سے محروم و مایوس نہیں رکھا جائے گا۔

میری اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کتاب کے ذریعے سے میرے مسلمان بھائیوں کو نفع دے اور یہ بھی کہ اسے پڑھنے والے مجھے بھی دعاؤں میں یاد رکھیں کیونکہ پیٹھ پیچھے ایک مسلمان کی دوسرے مسلمان کے لیے دعا ضرور قبول ہوتی ہے میں اس دعا پر اس کتاب کو ختم کر رہا ہوں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمٰنِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۝﴾

”اور (مالِ فَے ان کے لیے ہے) جو ان (مہاجرین و انصار) کے بعد آئے، وہ کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو بخش دے جنھوں نے ایمان میں ہم سے پہل کی اور ہمارے دلوں میں اہل ایمان کے لیے کوئی کینہ نہ رکھ۔ اے ہمارے رب! بے شک تو بہت نرمی والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔“[1]

«سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ»

”اے اللہ! تو پاک ہے اور تمام تعریفیں تیرے لیے ہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں، میں تجھ سے بخشش کا طلبگار ہوں اور تیری طرف رجوع کرتا ہوں۔“

[1] الحشر 10:59۔

مصادر و مراجع

کتاب کی تیاری میں چند بنیادی مصادر و مراجع حروف تہجی کی ترتیب سے درج ذیل ہیں

الکتاب	المؤلف	التحقیق	دارالنشر	تاریخ الطبع
آثار الحرب في الفقه الإسلامي	د. وهبة الزحيلي	دراسة مقارنة	دارالفكر	1401ھ 1981م ط: الثالثة
آثارتطبيق الشريعة	د. محمد عبدالله الزاحم		دارالمنار	1412ھ 1991م ط:الأولىٰ
آفات على الطريق	محمد سيد نوح		دارالوفاء، المنصورة ـ مصر	1400ھ 1990م ط:الخامسة
أسد الغابة في معرفة الصحابة	علي بن أبي الكرم (ابن الأثير)		دارالكتب العلمية	1417ھ 1996م ط: الأولىٰ
الأم	محمد بن إدريس الشافعي		دار الفكر، بيروت لبنان	1410ھ 1990م
الإتقان في علوم القرآن	عبدالرحمٰن السيوطي		المكتبة الثقافية، بيروت، لبنان	بدون تاريخ
الإدارة الإسلامية في عصر عمر بن الخطاب	د. فاروق مجد لاوي		دار مجدلاوي، عمان	1418ھ 1998م ط: الثانية
الإصابة في تمييز الصحابة	أحمد بن علي بن حجر العسقلاني	علي محمد البجاوي	دار النهضة، مصر	

الاعتصام	إمام الشاطبي		دار الفكر، الناشر مكتبة الرياض الحديثة بالرياض	
الإعلام في صدر الإسلام	د. عبداللطيف حمزة		دار الفكر	
إمتاع الأسماع	الشيخ أحمد بن علي المقريزي	محمود محمد شاكر	لجنة التأليف والترجمة بالقاهرة	1941م
الأحاديث الواردة في فضائل المدينة	صالح الرفاعي		دار الخضيري، المدينة	1418هـ ط: الثالثة
أحكام الجنائز وبدعها	الشيخ محمد ناصر الدين الألباني		المكتب الإسلامي، بيروت	
أحكام السوق في الإسلام	أحمد الدرويش		دار عالم الكتب	1409هـ 1989م ط: الأولىٰ
أحكام القرآن	أبو بكر محمد بن عبدالله المعروف بابن العربي المعافري الأندلسي	محمد عبدالقادر عطا	دارالكتب العلمية- بيروت	1408هـ ط: الأولىٰ
الأخلاق الإسلامية وأسسها	عبد الرحمٰن حبنكة الميداني		دارالقلم- دمشق	
الأخوات المسلمات وبناء الأسرة القرآنية	محمود محمد الجوهري			
الأساس في السنة و فقهها- السيرة النبوية	سعيد حوّى		دارالسلام بمصر	1409هـ 1989م ط: الأولىٰ
إرواء الغليل في تخريج أحاديث منار السبيل	الشيخ محمد ناصر الدين الألباني			

أساليب التشويق والتعزيز في القرآن الكريم	د. الحسين جرنو محمود جلو		موسسة الرسالة، دارالعلوم الإنسانية	1414هـ 1994م ط: الأولیٰ
أسباب النزول	أبو الحسن علي بن أحمد الواحدي النيسا بوري		دالكتب العلمية، بيروت ـ لبنان	1402هـ 1982م ط: الأولیٰ
أسباب هلاك الأمم السالفة	سعيد محمد بابا سيلا		سلسلة الحكمة البريطانية	1420هـ 2000م ط: الأولیٰ
الاستخبارات العسكرية في الإسلام	عبدالله علي السلامة مناصرة		مؤسسة الرسالة، بيروت۔ لبنان	1412هـ 1991م ط: الثانية
الإسلام في خندق	مصطفیٰ محمود		دار أخبار اليوم، القاهرة۔ مصر	1414هـ 1994م
أصول الفكر السياسي في القرآن المكي	التجاني عبدالقادر حامد		دارالبشير، الأردن، عمان	1416هـ 1995م ط: الأولیٰ
أضواء على الهجرة	توفيق محمد سبع		مطبعة الهيئة العامة لشئوون المطابع الأميرية	1393هـ 1973م
أعلام النبوة	للماوردي		الكليات الأزهرية	
إغاثة اللّهفان عن مصائد الشيطان	ابن القيم الجوزية		دارالكتب العلمية۔ بيروت	1408هـ 1998م ط: الأولیٰ
الاكتفاء بما تضمنه من مغازي الرسول والثلاثة الخلفاء	أبو الربيع سليمان بن موسى الكلاعي الأندلسي		عالم الكتب	1417هـ 1997م ط: الأولیٰ
الأموال	أبو عبيد القاسم بن سلام		مؤسسة ناصر الثقافية۔ بيروت	

الانحرافات العقدية والعلمية	علي بن نجيب الزاهراني		دار طيبة	1418هـ 1998م ط: الثانية
أنساب الأشراف	أحمد بن يحيىٰ البلاذري	محمد حميدالله	دارالمعارف	
الأنساب	أبو سعيد عبدالكريم بن محمد السمعاني		دائرة المعارف العثمانية، حيدر آباد، الهند	1382هـ 1962م
أهمية الجهاد في نشر الدعوة	د. علي العلياني		دار طيبة	1405هـ 1985م ط: الأولىٰ
البحر الرائق في الزهد والرقائق	أحمد فريد		دارالبخاري، القصيم بالسعودية	1411هـ 1991م ط: الأولىٰ
بدائع السالك في طبائع الممالك	أبو عبدالله بن الأزرق	علي سامي النشار	منشورات وزارة الإعلام ـ الجمهورية العراقية	
البداية والنهاية	أبو الفداء ابن كثير الدمشقي		دار الريان للتراث	1408هـ 1988م ط: الأولىٰ
بلوغ الأرب في معرفة أحوال العرب	محمود شكري الآلوسي	محمد بهجة الأثري	دارالكتب العلمية، بيروت	ط: الثانية
بناء المجتمع الإسلامي في عصر النبوة	محمد توفيق رمضان		دار ابن كثير، دمشق	1409هـ 1989م ط: الأولىٰ
بهجة المحافل، وبغية الأماثل في تلخيص المعجزات، والسير والشمائل	جمال الدين محمد الأشخر اليمني		دار صادر، بيروت	

تأملات في سورة الكهف	الشيخ أبو الحسن الندوي		دارالقلم	
تأملات في سيرة الرسول ﷺ	د. محمد السيد الوكيل		دار المجتمع	1408ھ 1987م ط: الأولىٰ
تاريخ الإسلام	شمس الدين محمد بن أحمد بن عثمان الذهبي	عمر عبدالسلام تدمري	دار الكتاب العربي	1410ھ 1990م ط: الثانية
التاريخ الإسلامي- مواقف وعبر	د. عبدالعزيز الحميدي		دار الدعوة، الإسكندرية	1418ھ 1997م ط: الأولىٰ
التاريخ السياسي والحضاري	د. السيد عبدالعزيز سالم			
التاريخ السياسي والعسكري، لدولة المدينة في عهد الرسول ﷺ	د. علي معطي		مؤسسة المعارف، بيروت	1419ھ 1998م ط: الأولىٰ
تاريخ الطبري	أبو جعفر محمد بن جرير	محمد أبو الفضل إبراهيم	دار سويدان، بيروت	
تاريخ اليهود في بلاد العرب	ولفنسون		طبعة القاهرة	1927م
تاريخ خليفة بن خياط		أكرم ضياء العمري	مطبعة الآداب، النجف	1967م
تاريخ دولة الإسلام الأولىٰ	فايد حماد عاشور		دار قطري بن الفجاءة، الدوحة	1409ھ 1989م ط: الأولىٰ
تاريخ صدر الإسلام	عبدالرحمٰن عبدالولي شجاع		دار الفكر المعاصر، صنعاء	1419ھ 1999م ط: الأولىٰ

التحائف السياسي في الإسلام	منير محمد غضبان		دارالسلام	1408ھ 1988م ط: الثانية
التحرير والتنوير	الشيخ محمد الطاهر ابن عاشور		دار الكتب الشرقية، تونس	
تحفة الأحوذي بشرح جامع الترمذي	محمد بن عبدالرحمٰن المباركفوري	عبدالرحمٰن محمد عثمان	مطبعة الاعتماد	
تحفة الأشراف	جمال الدين أبو الحجاج يوسف بن الزكي عبدالرحمٰن المزي		الدار القيمة	1384ھ
التربية القيادية	منيرمحمد الغضبان		دارالوفاء، المنصورة	1418ھ 1998م ط: الأولىٰ
تفسير أبي السعود، المسمىٰ إرشاد العقل السليم إلى مزايا الكتاب الكريم	قاضي القضاة أبو السعود محمد العمادي الحنفي	عبدالقادر أحمد عطاء	مكتبة الرياض الحديثة، الرياض و مطبعة السعادة، القاهرة	
تفسير القرآن العظيم	ابن كثير القرشي		دار الفكر، و دار القلم، بيروت۔لبنان	ط: الثانية
تفسير الألوسي المسمىٰ روح المعاني في تفسير القرآن العظيم والسبع المثاني	محمود الآلوسي البغدادي		إدارة الطباعة المصطفائية بالهند	
تفسير البغوي المسمىٰ معالم التنزيل	أبو الحسين الفراء البغوي الشافعي		دار المعرفة، بيروت۔ لبنان	

تفسير البيضاوي	الإمام ناصر الدين أبو الخير عبدالله الشيرازي البيضاوي		دارالفكر للطباعة والنشر والتوزيع	1402ھ 1982م
تفسير الرازي			دار إحيا التراث العربى، بيروت	ط: الثالثة
تفسير الزمخشري المسمىٰ بالكشاف			دارالمعرفة	1967م
تفسير السعدي	عبدالرحمٰن ناصر السعدي		المؤسسة السعدية بالرياض	1977م
تفسير القرطبي	أبو عبدالله محمد بن أحمد الأنصاري القرطبي		دار إحيا التراث العربي، بيروت۔ لبنان	1965م
تفسير المراغي	أحمد مصطفىٰ المراغي		دار الفكر،بيروت	1394ھ ط: الثالثة
تفسر المنار	محمد رشيد رضا		دارالمعرفة، بيروت۔ لبنان	
التفسير المنير	د. وهبة الزحيلي		دارالفكر المعاصر۔ بيروت، دارالفكر، دمشق	1411ھ 1991م ط: الأولىٰ
تفسير النسفي	الإمام عبدالله أحمد بن محمد النسفي		دارالكتاب العربي، بيروت	
تفسير ابن عطية المسمىٰ المحرر والوجيز في تفسير الكتاب العزيز	أبو محمد عبدالحق بن عطية الأندلسي		من مطبوعات رئاسة المحاكم الشرعية والشوؤن الدينيةبدولة قطر	1412ھ 1991م ط: الأولىٰ
تفسير سورة فصلت	د. محمد صالح علي مصطفىٰ		دارالنفائس	1409ھ 1989م ط: الأولىٰ
تلقيح فهوم أهل الأثر	ابن الجوزي		مكتبة الآداب، القاهرة	

التمكين للأمة الإسلامية في ضوء القرآن الكريم	محمد السيد حمد يوسف		دارالسلام، مصر	1418ھ 1997م ط: الأولىٰ
تنظيمات الرسول الإدارية في المدينة	صالح أحمد العلي		مجلة المجمع العلمي العراقي، المجلد السابع عشر، بغداد	1969م
تنوير الحوالك شرح موطأ الإمام مالك	جلال الدين عبدالرحمٰن بن أبي بكر السيوطي		دار إحياء الكتب	
تهذيب مدارج السالكين	ابن القيم	عبدالمنعم صالح العلي العزي	مؤسسة الرسالة	1409ھ 1989م ط: الثالثة
جامع الأصول لابن الأثير	أبو السعادات المبارك بن محمد الجزري	عبدالقادر الأرناؤوط	مكتبة الحلواني، سورية	1392ھ
جامع العلوم والحكم	الإمام ابن رجب الحنبلي		دارالفكر بيروت	
الجامع لأخلاق الراوي، وآداب السامع	خطيب الغدادي		مكتبة المعارف بالرياض	1403ھ 1983م
الجهاد والقتال في السياسة الشرعية	محمد خير هيكل		دارالبيارق، عمان۔ بيروت	1414ھ 1993م ط: الأولىٰ
الجواب الصحيح لمن بدل دين المسيح	أبو العباس أحمد بن عبد الحليم		مطابع المجد	
جوامع السير	ابن حزم علي بن أحمد بن سعيد	د. إحسان عباس، د. ناصر الدين الأسد	دار إحياء السنة۔ باكستان	1368ھ

جيل النصر المنشود	د. يوسف القرضاوي		مكتبة وهبة، القاهرة۔ مصر	1405ھ 1985م ط:السادسة
حاشية ابن عابدين			مطابع مصطفىٰ البابي	
حدائق الأنوار و مطالع الأسرار	ابن الربيع الشيباني	عبداللّٰه إبراهيم الأنصاري		
حديث القرآن عن غزوات الرسولﷺ	د. محمد بكر آل عابد،		دار الغرب الإسلامي	ط: الأولىٰ
الحرب النفسية ضد الإسلام في عهد الرسولﷺ في مكة	د. عبدالوهاب كحيل		عالم الكتب،بيروت	1406ھ 1986م ط: الأولىٰ
الحركة السنوسية في ليبية	علي محمد الصلابي		دارالبيارق، عمان	1999م ط: الأولىٰ
حقوق النبيﷺ على أمته	د. محمد بن خليفة التميمي		دار أضواء السلف	1418ھ 1997م ط: الأولىٰ
الحكم والتحاكم في خطاب الوحي	عبدالعزيز مصطفىٰ كامل		دار طيبة	1415ھ 1995م ط: الأولىٰ
الحكومة الإسلامية	أبو الأعلى المودودي	ترجمة أحمد إدريس	المختار الإسلامي للطباعة والنشر۔ القاهرة	1397ھ 1977م ط: الأولىٰ
حلية الأولياء	أبو نعيم أحمد بن عبداللّٰه الأصبهاني		دار الكتب العلمية، بيروت، لبنان	1418ھ 1997م ط: الأولىٰ
حوار الرسولﷺ مع اليهود	د. محسن الناظر		دار الوفاء	1412ھ 1992م ط: الثانية

خاتم النبيين ﷺ	الشيخ محمد أبو زهرة		دار الفكر، بيروت	1972م ط: الأولىٰ
الخصائص العامة للإسلام	د. يوسف القرضاوي		مكتبة وهبة، القاهرة، مصر	1409هـ 1989م ط: الرابعة
الخصائص الكبرىٰ	عبدالرحمٰن بن أبي بكر السيوطي		دارالكتب العلمية، بيروت	
دائرة المعارف الكاثوليكية				
الدر المنثور في التفسير بالمأثور	الإمام السيوطي		محمد أمين دمج، بيروت، لبنان	
دراسات في السيرة النبوية	د. عماد الدين خليل		دار النفائس، بيروت	1409هـ 1989م ط: حادي عشر
دراسات في السيرة النبوية	د. عبدالرحمٰن الشجاع		دارالفكر المعاصر، صنعاء	1419هـ 1999م ط: الأولىٰ
دراسات قرآنية	محمد قطب		دار الشروق	1408هـ 1988م ط: الخامسة
دراسة تحليلية لشخصية الرسول ﷺ	د. محمد قلعجي		دار النفائس	1408هـ 1988م ط: الأولىٰ
الدرر في اختصار المغازي والسير	يوسف بن عبد البر		وزارة الأوقاف بمصر، لجنة إحياء التراث، القاهرة	1414هـ 1994م
دروس في الكتمان	محمود شيث خطاب		مكتبة النهضة، بغداد	1988م ط: العاشرة

دستور للأمة من القرآن والسنة	د. عبدالناصر العطار		مؤسسة علوم القرآن، الشارقة۔عجمان، دار ابن كثير، دمشق، بيروت	1414هـ 1993م ط: الأولىٰ
الدعوة الإسلامية	عبدالغفار عزيز			
دعوة الله بين التكوين والتمكين	د. علي جريشة		مكتبة وهبة۔ مصر	1406هـ 1986م ط: الأولىٰ
دلائل النبوة	الحافظ أبو بكر أحمد البيهقي	عبدالمعطي قلعجي	دارالكتب العلمية	1405هـ ط: الأولىٰ
دور المرأة في خدمة الحديث	آمال قرداش		كتاب الأمة، دوحة قطر	1420هـ ط: الأولىٰ
دولة الرسولﷺ من التكوين إلى التمكين	كامل سلامة الدقس		دار عمار ، عمان	1415هـ 1994م ط: الأولىٰ
الدولة العربية الإسلامية	منصور الحرابي		منشورات جمعية الدعوة الإسلامية بليبيا	1983م ط: الثانية
ديوان أبي بكر الصديق		راجي الأسمر	دار صادر، بيروت	1997م ط: الأولىٰ
ديوان شوقي، الأعمال الشعرية الكاملة			دار العودة۔ بيروت	1986هـ
ديوان عنترة	فاروق الطباع		دارالقلم، بيروت۔ لبنان	
الرؤى والأحلام في النصوص الشرعية	أسامة عبدالقادر			

الرؤيا ضوابطها و تفسيرها	هشام الحمصي		دار الكلم الطيب، دمشق، بيروت	1417هـ 1996م ط: الثانية
رجال الإدارة في الدولة الإسلامية	د. حسين محمد سليمان		دار الإصلاح۔ الدمام بالسعودية	
الرحيق المختوم	صفي الرحمٰن المباركفوري		مؤسسة الرسالة لبنان	1417هـ 1996م ط: الأولىٰ
رسالة الأنبياء	عمر أحمد عمر		دارالحكمة۔ دمشق	1418هـ 1997م ط: الأولىٰ
الرسول القائدﷺ	محمود شيث خطاب		مكتبة الحياة،و مكتبة النهضة۔ بغداد	1960م
الرسول المبلغﷺ	د. صلاح عبدالفتاح الخالدي		دار القلم، دمشق	1418هـ 1997م ط: الأولىٰ
الرسول المعلمﷺ وأساليبه في التعليم	الشيخ عبدالفتاح أبي غدة		دار مكتب المطبوعات الإسلامية۔ حلب	1417هـ 1996م ط: الأولىٰ
الروض الأنف في شرح السيرة النبوية	ابن هشام أبو القاسم السهيلي	عبدالرحمٰن الوكيل	دارالكتب الحديثة	1387هـ
زاد المسير في علم التفسير	أبوالفرج جمال الدين عبدالرحمٰن بن علي الجوزي القرشي البغدادي		المكتب الإسلامي	1384هـ 1965م ط: الأولىٰ
زاد المعاد في هدي خير العباد	ابن القيم الجوزية	شعيب الأرناؤوط، وعبدالقادر	دار الرسالة	1399هـ
زاد اليقين	لاشين أبو شنب		دار البشير، طنطا مصر	1413هـ 1993م ط: الأولىٰ

الزهد	أحمد بن حنبل		دار الريان للتراث، القاهرة، مصر	1412هـ 1992م ط: الثانية
زيد بن ثابت، كاتب الوحي، وجامع القرآن	صفوان داودي		دار القلم، دمشق	1411هـ 1990م ط: الأولىٰ
سبل الهدىٰ والرشاد في سيرة خير العباد	محمد بن يوسف الصالحي	مصطفىٰ عبدالواحد	لجنة إحياء التراث الإسلامي	1394هـ 1974م
السرايا و البعوث النبوية حول المدينة ومكة	د . بريك محمد بريك		دار ابن الجوزي	1417هـ 1996م ط: الأولىٰ
السفارات النبوية	د. محمد العقيلي		دار إحياء العلوم، بيروت	1406هـ 1986م
سفراء الرسولﷺ	محمود شيت خطاب		مؤسسة الريان، دار الأندلس الخضراء	1417هـ 1996م ط: الأولىٰ
سنن أبي داود	الإمام أبو داود سليمان السجستاني	عزت الدعاس، سورية		1391هـ
سنن ابن ماجه	الإمام أبو عبدالله محمد بن يزيد القزويني		دار الفكر	
سنن الترمذي	الإمام أبو عيسىٰ محمد بن عيسىٰ الترمذي		دار الفكر	1398هـ
سنن الدار قطني	علي بن عمر الدار قطني		عالم الكتب، لبنان	
سنن النسائي	أبو عبدالرحمٰن أحمد بن شعيب النسائي		مطبعة مصطفى الحلبي، القاهرة	1964م

سير أعلام النبلاء	شمس الدين محمد بن أحمد بن عثمان الذهبي		مؤسسة الرسالة	1403هـ ط: الأولیٰ
السير والمغازي	ابن إسحاق	سهيل زكار	دار الفكر	1978م ط: الأولیٰ
السيرة الحلبية	علي بن برهان الدين الحلبي		دار المعرفة	
سيرة الرسولﷺ صور مقتبسة من القرآن الكريم	الأستاذ محمد عزة دروزة	الأستاذ عبداللّٰه إبراهيم الأنصاري		1400هـ
السيرة النبوية	أبو الحسن الندوي		دار التوزيع و النشر الإسلامية، القاهرة	
السيرة النبوية دارسة وتحليل	محمد أبو فارس		دار الفرقان، عمان	1418هـ 1997م ط: الأولیٰ
السيرة النبوية	شمس الدين محمد بن أحمد بن عثمان الذهبي	حسام الدين القدسي	مكتبة هلال۔ بيروت	
السيرة النبوية الصحيحة	د. أكرم العمري		مكتبة المعارف والحكم بالمدينة المنورة	1412هـ 1992م ط: الأولیٰ
السيرة النبوية تربية أمة، وبناء دولة	لصالح أحمد الشامي		المكتب الإسلامي	1412هـ 1992م ط: الأولیٰ
السيرة النبوية دروس وعبر	د. مصطفیٰ السباعي		المكتب الإسلامي، بيروت۔لبنان	1406هـ 1986م ط: الأولیٰ
السيرة النبوية في ضوء القرآن والسنة	محمد أبو شهبة		دار القلم۔ دمشق	1417هـ 1996م ط: الثالثة

السيرة النبوية في ضوء المصادر الأصلية	د. مهدي رزق الله أحمد		مركز الملك الفيصل للبحوث والدراسات الإسلامية۔ الرياض	1412ھ 1992م ط: الأولىٰ
السيرة النبوية	أبو حاتم البستي		مؤسسة الكتب الثقافية، بيروت	1407ھ 1987م ط: الأولىٰ
السيرة النبوية	أبو محمد بن عبدالملك بن هشام		دار الفكر	
السيرة النبوية	ابن كثير، الإمام أبو الفداء إسماعيل	مصطفىٰ عبدالواحد	دار الفكر، بيروت۔ لبنان	1398ھ ط: الثانية
السيرة النبوية	محمد الصويياني		مؤسسة الريان	1420ھ 1999م ط: الأولىٰ
شذرات الذهب	عبدالحي بن العماد الحنبلي		دار إحياء التراث العربي، بيروت	
شرح السنة	أبي محمد الحسن بن مسعود البغوي	علي محمد معوض، وعادل أحمد عبدالموجود	دار الكتب العلمية، القاهرة	1965ھ ط: الأولىٰ
شرح العقيدة الطحاوية	ابن أبي العز الحنفي	عبدالله بن عبد المحسن التركي، وشعيب الأرناؤوط	مؤسسة الرسالة، بيروت	1412ھ 1992م ط: الرابعة
شرح المعلقات	حسين الزوزني	يوسف علي بديوي	دار ابن كثير، دمشق	1410ھ 1989م ط: الأولىٰ
شرح المواهب اللدنية	محمد بن عبدالباقي الزرقاني		دار المعرفة، بيروت	
شرح النووي علىٰ صحيح مسلم	أبو زكريا محي الدين يحيىٰ ابن شرف النووي		المطبعة المصرية ومكتبتها، القاهرة	1349ھ

شرح رسالة التعاليم	محمد عبدالله الخطيب		دار الوفاء	
الشفا في التعريف بحقوق المصطفىٰ	الإمام القاضي عياض		إستانبول، عثمانية	
صبح الأعشىٰ في صناعة الإنشاء	أحمد بن علي القلقشندي	محمد حسين شمس الدين	دارالكتب العلمية۔ بيروت	1407ھ 1987م ط: الأولىٰ
الصحابي الشاعر عبدالله بن الزبعري	محمد علي كاتبي		دار القلم، دمشق	1419ھ 1999م ط: الأولىٰ
صحيح البخاري	محمد بن إسماعيل البخاري		دار الفكر	1411ھ 1991م ط: الأولىٰ
صحيح الجامع الصغير وزياداته	محمد ناصر الدين الألباني		المكتب الإسلامي، بيروت، لبنان	1408ھ 1988م ط: الثالثة
صحيح السيرة النبوية	محمد بن رزق الطرهوني		مكتبة ابن تيمية، القاهرة	1414ھ ط: الأولىٰ
صحيح السيرة النبوية	إبراهيم العلي		دار النفائس	1408ھ 1998م ط: الثالثة
صحيح سنن ابن ماجه	محمد ناصر الدين الألباني		مكتب التربية العربي لدول الخليج۔ الرياض	1408ھ 1988م ط: الثالثة
صحيح مسلم	أبو الحسين مسلم بن حجاج النيسابوري	تحقيق محمد فؤاد عبدالباقي	دار إحياء التراث العربي، بيروت، لبنان	1972م ط: الثالثة
الصراع مع الصليبيين	محمد عبدالقادر أبو فارس		دار البشير، طنطا	1419ھ 1999م

الصراع مع اليهود	محمد أبو فارس		دار الفرقان	1411ھ 1990م ط: الأولیٰ
صفة الصفوة	ابن الجوزي	محمود خوري، ومحمد رواس قلعجي	دار المعرفة، بيروت	1399ھ ط: الثانية
صفة الغرباء	سلمان العودة		دار ابن الجوزي	1412ھ 1991م ط: الثانية
صفة التفاسير	الصابوني		دار القرآن الكريم، بيروت	1401ھ ط: الأولیٰ
صلاح الدين الأيوبي	عبدالله علوان			
صلح الحديبية	محمد أحمدباشميل		دار الفكر	1393ھ 1973م ط: الثالثة
صور من حياة الرسول	أمين دويدار		دار المعارف، القاهرة	
صور وعبر من الجهاد النبوي في المدينة	د. محمد فوزي فيض الله		دار القلم، دمشق، الدار الشامية، بيروت	1416ھ 1996م ط: الأولیٰ
ضوابط المصلحة	محمد سعيد رمضان البوطي		مؤسسة الرسالة	1402ھ ط: الرابعة
الطاعة، والمعصية وأثرهما في المجتمع	محمد بن صالح العثيمين		دار المسلم للنشر والتوزيع	1991م ط: الأولیٰ
طبقات الشعراء	أبو عبدالله محمد بن سلام بن عبدالله الجمحي			
الطبقات الكبریٰ	محمد بن سعد الزهري		دار صادر، ودار بيروت للطباعة والنشر	1376ھ 1957م

طريق النبوة والرسالة	د. حسين مؤنس		دار الرشاد	1418ھ 1997م ط: الثانية
الطريق إلى المدائن	عادل كمال		دار النفائس، بيروت- لبنان	1407ھ 1987م ط:الخامسة
الطريق إلى المدينة	محمد العبده		دار الجوهرة، عمان	1999م ط: الثانية
الطريق إلى الجماعة المسلمين	حسين بن محسن بن علي جابر		دار الوفاء بالمنصورة، مصر	1413ھ 1992م ط:الخامسة
ظاهرة الإجارة لسفر الحوالي			مكتبةالطيب، القاهرة	1417ھ ط: الأولىٰ
العبادة في الإسلام	يوسف القرضاوي		مؤسسة الرسالة بيروت	1405ھ 1985م ط: الثانية عشر
عبدالله بن مسعود	عبدالستار الشيخ		دار القلم، دمشق	1410ھ 1990م ط: الثانية
العبقرية العسكرية في غزوات الرسول ﷺ	محمد فرج		دار الفكر العربي، القاهرة	1977م ط: الثالثة
عقيدة أهل السنة في الصحابة	د. ناصر حسن الشيخ		مكتبة الرشد	1413ھ 1993م ط: الأولىٰ
علاج القرآن الكريم للجريمة	د. عبدالله الشنقيطي		مكتبة ابن تيمية، القاهرة	1413ھ ط: الأولىٰ

العلاقات الخارجية للدولة الإسلامية	د. سعيد عبدالله حارب المهيري		مؤسسة الرسالة	1416هـ 1995م ط: الأولىٰ
علاقة الآباء بالأبناء في الشريعة الإسلامة	د. سعاد الصالح		الناشر تهامة، جدة	1401هـ ط: الأولىٰ
عمدة القاري، شرح صحيح البخاري	بدرالدين العيني			
العهد والميثاق في القرآن الكريم	د. ناصر العمري		دار العاصمة	1413هـ ط: الأولىٰ
عون المعبود شرح سنن أبي داود		عبدالرحمٰن محمد بن عثمان	دارالفكر، بيروت	
عيون الأثر في فنون المغازي، والشمائل، والسير	ابن سيد الناس		دار المعرفة، بيروت	
الغرباء الأولون	سلمان العودة		دار ابن الجوزي، الدمام السعودية	1412هـ 1991م ط: الثالثة
غزوة أحد	أحمد عزالدين			
غزوة أحد	محمد عبدالقادر أبو فارس		دارالفرقان، عمان ـالأردن	1402هـ 1982م ط: الأولىٰ
غزوة الأحزاب	محمد عبدالقادر أبوفارس		دار الفرقان، عمان	1403هـ 1983م ط: الأولىٰ
غزوة بدر الكبرىٰ الحاسمة	محمود شيت خطاب			
غزوة بدر الكبرىٰ	محمد عبدالقادر أبو فارس		دارالفرقان، عمان	1402هـ 1982م ط: الأولىٰ

غزوة بدر الكبرىٰ	محمد أحمد باشميل		دار الفكر	1394هـ ط:السادسة
غزوة تبوك	محمد أحمد باشميل		دارالفكر، بيروت	
فتح الباري	ابن حجرالعسقلاني		دارالمعرفة، بيروت- لبنان	
الفتح الرباني لترتيب مسند أحمد بن حنبل			دار الشهاب، القاهرة	
فتح القدير الجامع بين فني الرواية والدراية من علم التفسير	محمد بن علي الشوكاني		دار الفكر	
الفصل في الملل، والأهواء، والنحل	ابن حزم		مكتبة السلام العالمية	
فصول في السيرة النبوية	عبدالمنعم السيد			
فقه الإسلام شرح بلوغ المرام	الشيخ عبدالقادر شيبة الحمد		مطابع الرشيد المدينة المنورة	1403هـ ط: الأولىٰ
فقه الابتلاء	محمد أبو صعيليك		دار البيارق، عمان، بيروت	1420هـ 1999م ط: الأولىٰ
فقه التمكين في القرآن الكريم	علي محمد الصلابي		دار البيارق عمان	1999م ط: الأولىٰ
فقه الدعوة إلى اللّٰه	عبد الحليم محمود		دار الوفاء	1410هـ 1994م ط: الأولىٰ
فقه الدعوة الفردية	د. سيد محمد نوح		دار اقرأ، صنعاء	
فقه الزكاة	يوسف القرضاوي		مكتبة وهبة	1414هـ 1994م ط: الحادية والعشرون

الفقه السياسي للوثائق النبوية	خالد الفهداوي		دار عمار	1419هـ 1998م ط: الأولى
فقه السيرة النبوية	منير الغضبان		معهد البحوث العلمية، وإحياء التراث، مكة المكرمة	
فقه السيرة	محمد سعيد رمضان البوطي		دار الفكر دمشق، سورية	1991م ط: الحادية عشرة
فقه السيرة	الشيخ محمد الغزالي		دار القلم ، دمشق۔ سورية	1409هـ 1989م ط: الرابعة
فلسفة التربية الإسلامية	ماجد عرسان الكيلاني		مكتبة هادي، مكة المكرمة	1409هـ
الفوائد	محمد بن أبي بكر بن قيم الجوزية		دار الريان للتراث، القاهرة	1407هـ 1987م ط: الأولى
في السيرة النبوية جوانب الحذر والحماية	د. إبراهيم علي محمد أحمد		وزارة الأوقاف، بدولة قطر	1417هـ ط: الأولى
في ظلال السيرة النبوية، الهجرة النبوية	د. محمد عبدالقادر أبو فارس		دار الفرقان، عمان۔ الأردن	1408هـ 1988م ط: الثانية
القاموس المحيط	مجد الدين محمد الفيروز آبادي		مطبعة مصطفى البابي ، بمصر	1371هـ 1952م ط: الثانية
قرأة سياسية للسيرة النبوية	محمد قلعجي		دار النفائس، بيروت ۔لبنان	1416هـ 1996م ط: الأولى

قصديدة بانت سعاد لكعب ابن زهير وأثرها في التراث العربي	د. السيد إبراهيم محمد		المكتب الإسلامي	1406هـ 1986م ط: الأولى
قضايا في المنهج	سلمان العودة		دار مكتبة القدس	1420هـ 1999م ط: الثالثة
قضايا نساء النبي ﷺ والمؤمنات	حفصة بنت عثمان الخليفي		دار المسلم	1418هـ 1997م ط: الأولى
قواعد الأحكام في مصالح الأنام	أبو محمد عزالدين عبدالعزيز بن عبدالسلام السلمي		المكتبة الحسينية المصرية، بجوار الأزهر	1353هـ 1934م ط: الأولى
القول المبين في سيرة سيد المرسلين	د. محمد الطيب النجار		دار اللواء، الرياض	1401هـ 1981م
قيادة الرسول السياسية، والعسكرية	أحمد راتب عرموش		دار النفائس	1419هـ 1989م ط: الأولى
القيادة العسكرية في عهد الرسول ﷺ	عبدالرشيد محمد الرشيد		دار القلم	1410هـ 1990م ط: الأولى
الكامل في التاريخ	أبو الحسن علي بن محمد المعروف بابن الأثير		دار صادر بيروت	
لسان العرب	محمد بن مكرم بن منظور		دار صادر- بيروت	
لقاء المؤمنين	عدنان النحوي		مطابع الفرزدق التجارية، الرياض	1405هـ 1985م ط: الثالثة

ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين	أبو الحسن علي الحسيني الندوي		دار المعارف	1408هـ 1988م ط: السابعة
المال في القرآن الكريم	سليمان الحصين		دار المعراج الدولية	1415هـ 1995م ط: الأولى
مباحث في التفسير الموضوعي	مصطفیٰ مسلم		دار القلم، دمشق۔ سورية	
مباحث في علوم القرآن	مناع القطان		مكتبة المعارف، الرياض	1401هـ 1981م ط: الثامنة
مبادئ علم الإدارة	محمد نور الدين عبدالرزاق		مكتبة الخدمات الحديثة، جدة۔ السعودية	ط: الأولیٰ
مبادئ نظام الحكم في الإسلام	عبدالحميد المتولي		دار المعارف	ط: الأولیٰ
المجتمع المدني في عهد النبوة	د. أكرم العمري			1404هـ 1984م ط: الأولیٰ
مجلة المجتمع الكويتية، عدد رقم248				17صفر 1399هـ
مجمع الزوائد، ومنبع الفوائد	نور الدين علي بن أبي بكر الهيثمي		دار الكتاب العربي، بيروت	
مجموع فتاویٰ	شيخ الإسلام ابن تيمية	جمع عبدالرحمٰن بن محمد قاسم العاصمي النجدي،	المكتب التعليمي السعودي بالمغرب	

مجموع الوثائق السياسية	محمدحميدالله		دار النفائس	1405ھ 1985م ط:الخامسة
محاسن التأويل للقاسمي	محمد جمال الدين القاسمي		دار الفكر، بيروت	
المحرر الوجيز في تفسير الكتاب العزيز	أبو محمد عبدالحق بن غالب ابن عطية الأندلسي	المجلس العلمي بفاس	وزارة الأوقاف والشؤون الإسلامية بالمغرب	
محمد رسول اللهﷺ	محمد رشيد رضا		دار الكتب العلمية، بيروت	1975م
محمد رسول اللهﷺ	محمد صادق عرجون		دار القلم	1415ھ ط: الثانية
محنة المسلمين في العهد المكي	د. سليمان السويكت		مكة التوبة۔ الرياض	1412ھ 1992م ط: الأولىٰ
المختار من كنوز السنة	محمد عبدالله دراز		دار الأنصار، القاهرة	1978م ط: الثانية
مختصر سيرة الرسولﷺ	محمد بن عبدالوهاب		جامعة الإمام محمد بن سعود	
مختصر صحيح مسلم	حافظ زكي عبدالعظيم عبدالقوي بن سلامة المنذري	محمد ناصرالدين الألباني	المكتب الإسلامي۔ دمشق	1397ھ 1977م ط: الثالثة
المدخل إلى العقيدة والاستراتيجة العسكرية	محمد جمال الدين علي محفوظ		مطابع الهيئة المصرية للكتاب بالقاهرة	
مدخل لفهم السيرة	د. يحيىٰ اليحيىٰ		لم يطبع	
المدرسة النبوية العسكرية	أبو فارس		دار الفرقان، عمان	

المدينة النبوية، فجر الإسلام، والعصر الراشدي	محمد حسن شراب		دار القلم- دمشق، الدار الشامية- بيروت	1415ھ 1994م ط: الأولى
المرأة في العهد النبوي	د. عصمة الدين كركر		دار الغرب الإسلامي، بيروت	1993م ط: الأولى
مرض النبي ﷺ ووفاته وأثره على الأمة	خالد أبو صالح		دار الوطن	1414ھ ط: الأولى
مرويات عزوة أحد	حسين أحمد الباكري			1400ھ
مرويات غزوة الحديبية	د. حافظ الحكمي		دار ابن القيم	1411ھ ط: الأولى
مرويات غزوة بدر	أحمد باوزير		مكتبة طيبة	1400ھ 1980م ط: الأولى
مرويات غزوة بني المصطلق	إبراهيم القريبي		طبع المجلس العلمي بالجامعة الإسلامية- المدينة المنورة	1402ھ ط: الأولى
مساجد القاهرة ومدارسها	أحمد فكري		طبعة الإسكندرية	1961م
المستدرك على الصحيحين	إمام أبو عبدالله الحاكم النيسابوري	وبذيله التلخيص للذهبي	دار النشر مكتب المطبوعات الإسلامية	1390ھ 1970م
المستشفيات الإسلامية	د. عبدالله عبدالرزاق مسعود العيد		دار الضياء للنشر والتوزيع، عمان الأردن	1408ھ 1987م ط: الأولى
المستطرف في كل فن مستظرف	لشهاب الدين الأبشيهي		مكتبة الحياة ـ بيروت	

المستفاد من قصص القرآن للدعوة والدعاة	عبدالكريم زيدان		مؤسسة الرسالة	1418ھ 1997م ط: الأولیٰ
المسلمون والروم في عصر النبوة	عبدالرحمٰن أحمد سالم		دار الفكر العربي	1418ھ 1997م ط: الأولیٰ
المسند	أحمد بن حنبل		المكتب الإسلامي، بيروت	
المشروع الإسلامي لنهضة الأمة قرأة في فكر حسن البنا				
مشكاة المصابيح	خطيب التبريزي	محمد ناصر الدين الألباني	المكتب الإسلامي، دمشق	1381ھ 1961م ط: الأولیٰ
مصعب بن عمير، الداعية المجاهد	محمد حسن بريغش		دار القلم، دمشق	1407ھ 1987م ط: الرابعة
مصنف عبدالرزاق	أبو بكر عبدالرزاق بن همام الصنعاني	حبيب الرحمٰن الأعظمي		ط: الأولیٰ
المطالب العالية بزوائد المسانيد الثمانية	أحمد بن علي بن حجر العسقلاني	حبيب الرحمٰن الأعظمي		ط: الأولیٰ
معارك خالد بن الوليد	د. ياسين سويد		المؤسسة العربية للدراسة والنشر	1989م ط: الرابعة
معالم قرآنية في الصراع مع اليهود	د. مصطفیٰ مسلم محمد		دار المسلم۔ الرياض	1415ھ 1994م ط: الأولیٰ
المعاهدات في الشريعة الإسلامية والقانون الدولي	د. محمد الديك		دار الفرقان للنشر والتوزيع	1418ھ 1997م ط: الثانية

معجم البلدان	ياقوت الحموي		دار صادر ، بيروت	1404هـ 1984م
معجم الطبراني	سليمان بن أحمد الطبراني		دار العربية۔بغداد	1398هـ
المعجم الكبير	أبو القاسم سليمان بن أحمد الطبراني		دار مكتبة العلوم والحكم	1406هـ 1985م ط: الثانية
معركة الوجود بين القرآن والتلمود	عبدالستار فتح اللّٰه السعيد		مكتبة المنار	
المعوقون للدعوة الإسلامية في عهد النبوة	د. سميرة محمد جمجوم		دار المجتمع۔جدة	1407هـ 1987م ط: الأولىٰ
المغازي النبوية	ابن شهاب الزهري	سهيل زكار	دار الفكر۔ دمشق	1401هـ 1981م
مغازي رسول اللّٰه ﷺ لعروة بن الزبير	محمد الأعظمي		مكتب التربية العربي لدول الخليج۔ الرياض	1401هـ 1981م ط: الأولىٰ
المغازي	محمد بن عمر بن واقد الأسلمي الواقدي	مارسدن جونس	عالم الكتب، بيروت	1404هـ 1984م
مفاهيم ينبغي أن تصحح	محمد قطب		دار الشروق۔ القاهرة	1413هـ 1993م ط: الثامنة
المفصل في أحكام النساء	عبدالكريم زيدان		مؤسسة الرسالة	1413هـ 1993م ط: الأولىٰ

مقاصد الشريعة الإسلامية	د. محمد سعد اليوبي		دار الهجرة۔ الرياض	1418ھ 1998م ط: الأولىٰ
المقاصد العامة للشريعة الإسلامية	يوسف حامد العالم		الدار العلمية للكتاب الإسلامي	1415ھ 1993م ط: الأولىٰ
مقدمة ابن الصلاح و شرحها	الحافظ العراقي أبو عمرو عثمان بن عبدالرحمٰن		دارالكتب العلمية، بيروت۔ لبنان	
مقدمة ابن خلدون	علامة عبدالرحمٰن بن محمد ابن خلدون		المكتبة التجارية الكبرىٰ، القاهرة	
مقومات الداعية الناجح	د. علي باد حدح		دار الأندلس الخضراء، جدة	1417ھ 1996م ط: الأولىٰ
مقومات السفراء في الإسلام	حسن فتح الباب		المجلس الأعلىٰ للشؤون الإسلامية، القاهرة	1970م
مقومات النصر	د. أحمد أبو الشباب		المكتبة العصرية۔ لبنان	1420ھ 1999م
مكة والمدينة في الجاهلية و عصر الرسولﷺ	الأستاذ أحمد الشريف			
ملامح الشورىٰ في الدعوة الإسلامية	عدنان النحوي			ط: الثانية
من معين السيرة	صالح أحمد الشامي		المكتب الإسلامي	1413ھ 1992م ط: الثانية
من هدي سورة الأنفال	محمد أمين المصري		دار الأرقم، الكويت	

المنافقون	محمد جميل غازي		مكتبة المدني ومطبعتها، جدة، السعودية	1972م
منامات الرسول ﷺ	عبدالقادر الشيخ إبراهيم		دار القلم العربي بحلب	1419هـ 1999م ط: الأولىٰ
مناهج وآداب الصحابة في التعلم والتعليم	د. عبدالرحمٰن البر		دار اليقين المنصورة	1420هـ 1999م ط: الأولىٰ
المنتظم في تاريخ الملوك والأمم	أبو الفرج ابن الجوزي	محمد عبدالقادر عطا	دار الكتب العلمية، بيروت، لبنان	
منهاج السنة النبوية	أبو العباس أحمد بن عبدالحليم ابن تيمية		مؤسسة قرطبة للطباعة، والنشر والتوزيع	1416هـ 1986م ط: الأولىٰ
المنهاج القرآني في التشريع	عبدالستار فتح الله سعيد		دار الطباعة الإسلامية	1413هـ 1992م ط: الأولىٰ
منهج الإعلام الإسلامي في صلح الحديبية	سليم الحجازي		دار المنارة	1406هـ 1986م ط: الأولىٰ
منهج الإسلام في تزكية النفس	د. أنس أحمد كرزون		دار نور المكتبات، دار ابن حزم	1418هـ 1997م ط: الثانية
المنهج التربوى للسيرة النبوية التربية الجهادية	منير محمد الغضبان		مكتبة المنار	1411هـ 1991م ط: الأولىٰ
منهج التربية الإسلامية	محمد قطب		دار الشروق	1403هـ 1983م ط: الخامسة

المنهج الحركي للسيرة النبوية	منير محمد الغضبان		مكتبة المنار۔ الأردن	1411هـ 1990م ط: الثالثة
منهج الرسول في غرس الروح الجهادية في نفوس أصحابه	السيد محمد نوح		نشرته جامعة الإمارات العربية المتحدة	1411هـ 1990م ط: الأولىٰ
الموازنة بين ذوق السماع، و ذوق الصلاة، والقرآن	الإمام ابن قيم الجوزية	مجدي فتحي السيد		
الموافقات في أصول الأحكام	أبو إسحاق إبراهيم موسىٰ اللخمي الشهير بالشاطبي		دار الفكر	1341هـ
الموسوعة في سماحة الإسلام	محمد صادق عرجون		الدار السعوديةللنشر والتوزيع، جدة	1404هـ 1984م ط: الثانية
نشأة الدولة الإسلامية	د. عون الشريف قاسم		دار الكتاب اللبناني۔ بيروت	1400هـ 1980م ط: الثانية
نصب الراية في أحاديث الهداية	عبداللّٰه بن يوسف بن محمد الزيلعي		المكتب الإسلامي۔ دمشق	1393هـ
نظام الحكم في الشريعة والتاريخ الإسلامي	ظافر القاسمي		دار النفائس	1411هـ 1990م ط:السادسة
نظام الحكومة النبوية المسمىٰ: التراتيب الإدارية	محمد عبدالحي الكتاني		دار الأرقم، بيروت۔ لبنان	ط: الثانية
النظام السياسي في الإسلام	محمد عبدالقادر أبو فارس		دارالفرقان	1407هـ 1986م ط: الثانية

نظرات في السيرة	الإمام حسن البنا		مكتبة الاعتصام، القاهرة	1399ھ 1979م ط: الأولیٰ
نضرة النعيم في مكارم أخلاق الرسول الكريم	إعداد مجموعة من المختصين بإشراف صالح بن حميد		دار الوسيلة	1418ھ ط: الأولیٰ
نفوس و دروس في إطار التصوير القرآني	توفيق محمد سبع		مجمع البحوث الإسلامية، القاهرة، مصر	ط: الأولیٰ
النكت والعيون (تفسير الماوردي)	أبو الحسن علي بن حبيب الماوردي	خضر محمد خضر	نشر وزارة الأوقاف والشؤون الإسلامية، والتراث الإسلامي، بالكويت	
النهاية في غريب الحديث	ابن أثير	طاهر أحمد الزاوي، ومحمود محمد الطناحي		
نور اليقين	محمد الخضري		دار القلم ، دمشق، سورية	
نيل الأوطار شرح منتقى الأخبار من أحاديث سيد الأخبار	محمد بن علي الشوكاني		دار الحديث، القاهرة	
الهجرة الأولیٰ في الإسلام	د. سليمان العودة		دار طيبة للنشر ، الرياض	1419ھ ط: الأولیٰ
هجرة الرسولﷺ وصحابته في القرآن والسنة	أحمد عبدالغني النجولي الجمل		دار الوفاء	1409ھ 1989م ط: الأولیٰ
الهجرة في القرآن الكريم	أحزمي سامعون جزولي		مكتبة الرشد، الرياض	1417ھ 1996م ط: الأولیٰ

الهجرة النبوية المباركة	د. عبدالرحمٰن البر		دار الكلمة المنصورة، مصر	1418ھ 1997م :الأولىٰ
هذا الحبيب محمدﷺ يا محب	أبو بكر الجزائري		مكتبة لينة	
هذا الدين	سيد قطب		دار الشروق، القاهرة، مصر	1412ھ 1992م ط: الرابعة
واقعنا المعاصر	محمد قطب		مؤسسة المدينة للصحافة، والطباعة والنشر، جدة	1408ھ 1987م ط: الثانية
الوحي والرسالة	د. يحيىٰ اليحيىٰ			
الوسطية في القرآن الكريم	علي محمد الصلابي		دار النفائس، دار البيارق	1419ھ 1999م ط: الأولىٰ
وفاء الوفا بأخبار دار المصطفىٰ	أبو الحسن بن عبدالله السمهودي		دار المصطفىٰ، القاهرة	1326ھ ط: الأولىٰ
الوفود في العهد المكي، وأثره الإعلامي	علي رضوان أحمد الأسطل		دار المنار الأردن، عمان	1404ھ 1984م ط: الأولىٰ
وقفات تربوية مع السيرة النبوية	أحمد فريد		دار طيبة ،الرياض	1417ھ 1997م ط: الثالثة
وقفات تربوية من السيرة النبوية	عبدالحميد البلالي		المنار الكويت	1411ھ 1991م ط: الثالثة
الولاء والبراء في الإسلام	محمد سعيد قحطان		دار طيبة الرياض	1413ھ ط:السادسة

ولاية الشرطة في الإسلام	نمر محمد الحميداني		دار عالم الكتب	1414هـ 1994م ط: الثانية
يقظة أولى الاعتبار مما ورد في ذكر الجنة والنار	صديق حسن			
اليهود في السنة المطهرة	د. عبدالله الشقاري		دار طيبة ، الرياض	1417هـ 1996م ط: الأولىٰ
اليوم الآخر في الجنة والنار	د. عمر الأشقر		مكتبة الفلاح الكويت	1408هـ 1988م ط: الثانية

سیرت النبی ﷺ

جلد سوم

نبی امی ﷺ کی سیرت مبارکہ کو امت نے ہر دور میں نئے سے نئے اسلوب میں پیش کیا ہے۔ سیرت کا موضوع ہر مؤلف، مترجم اور ناشر کے لیے حصول سعادت کا ذریعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیرت کی کتب اپنے اندر ندرت وحکمت کے کئی پہلو لیے ہوئے منصۂ شہود پر آتی اور دادِ تحسین وصول کرتی ہیں۔

زیرِ نظر کتاب بھی ندرت کے کئی پہلوؤں کی حامل ہے۔ سیرتِ مبارکہ اور قرآنِ مجید کے باہمی ربط کا اظہار، واقعاتِ سیرت کے بیان میں اختلاف کا حل، اسلوب میں ادبی چاشنی اور سطر سطر سے نبی کریم ﷺ سے محبت کے جھلکتے آثار اس کتاب کی نمایاں خوبیاں ہیں مگر اس میں جس پہلو کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے وہ ہے واقعاتِ سیرت کو متعدد قدیم مراجع سے اخذ کر کے انھیں موجودہ حالات پر منطبق کرنا اور ان سے دروس وعبر اور اسباق و نصائح کشید کر کے دورِ جدید سے ہم آہنگ کرنا ہے۔

علاوہ ازیں مؤلف کتاب ڈاکٹر علی محمد صلابی ﷾ سیرت طیبہ پر مستشرقین کے رکیک حملوں کا دندان شکن جواب دیتے ہیں اور اصولِ روایت کا دامن بھی نہیں چھوڑتے۔ اس طرح 350 قدیم وجدید مصادر ومراجع کی روشنی میں مرتب کردہ یہ کتاب سیرت اعلیٰ ترتیب، عمدہ اسلوب، دلکش پیرائے، انتہائی جامعیت، عبرتوں، حکمتوں اور اسباق سے لبریز، عمدہ طباعت کے ساتھ ایک عظیم شاہکار بن گئی ہے۔



دارالسلام
کتاب وسنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ
9786035000949